مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی اور اہم کتابیں

نقدِ حرف (تنقیدی مضامین) پروفیسر ممتاز حسین

پروفیسر ممتاز حسین کا شمار اُردو کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے۔ "نقدِ حرف" آپ کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے جس میں موضوع کے ۲۴ بلند پایہ مضامین شامل ہیں =/48

گدازِ شب (شعری مجموعہ) معین احسن جذبی

"گدازِ شب" جذبی کا صرف مجموعۂ کلام ہی نہیں بلکہ حاصل کلام بھی ہے۔ جذبی کی ترقی پسند غزل میں صرف منظوم خیال ہی نہیں بلکہ انھوں نے خیال کو واردات میں اور لفظ کو نغمے میں تبدیل کر کے معنی کا ایک منظر نامہ مرتب کیا ہے جس کا اندازہ کتاب کو پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ =/40

سرسید کی تعلیمی تحریک اختر الواسع

(مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد)

سرسید کی تعلیمی تحریک اور جدید ہندستانی نشاۃ الثانیہ کی روایت میں اس تحریک کے رول پر ایک اہم دستاویزی کتاب۔ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور فکری صورتِ حال پر ایک مستقل نوعیت کا علمی کارنامہ جسے حوالے کی ایک مستند کتاب کے طور پر ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔ اس کتاب میں اکابرین کی نادر و نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ =/25

تعلیم اور اُس کے وسائل ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے تقریباً ۴۰ سال جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کی خدمات انجام دی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں موصوف نے تعلیم کے مقاصد کے حوالے سے تعلیم کے مسئلہ اور اس کے وسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ =/

تحفۃ السرور مرتبہ: شمس الرحمن فاروقی

مجموعۂ مضامین جو پروفیسر آل احمد سرور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ سرور صاحب نے تنقید کے افق کو نہ صرف وسیع کیا بلکہ اُردو تنقید (اور اس طرح اردو ادب) کو خود اعتمادی بھی سکھائی۔ ۰؍۰ر

مشفق خواجہ ایک مطالعہ مرتبہ: خلیق انجم

ممتاز ادیبوں کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ جو مشفق خواجہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مشفق خواجہ اُردو کے ممتاز محقق، ادیب، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ =/30

غالب اور صفیر بلگرامی مشفق خواجہ

اس کتاب میں غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات کی تفصیل کے ساتھ ساتھ صفیر بلگرامی کی جملہ تصنیفات کی فہرست بھی ہے۔ غالب کے شاگردوں میں صفیر نمایاں مقام رکھتے تھے۔ =/36

گفتارِ غالب مالک رام

اُردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات جناب مالک رام کی اہم کتاب۔ =/48

دردِ دل (افسانے) ستارہ جعفری

تعارف: قرۃ العین حیدر

ستارہ جعفری اُس کثیر الجہت اُردو تہذیب کی پروردہ ہیں جس نے ادب، شاعری، زبان دانی اور طرزِ معاشرت کی نفاست اور شائستگی کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں سادگی بھی اور سوز بھی۔ =/18

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

جنوری ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۱

فی پرچہ	۳/-
سالانہ	۲۵/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	۱۰/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	۲۲/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	۴۵/-

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات تنقید و تبصرے کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید قاسم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

زندگی کی طرف (ڈرامے) شمیم حنفی -/۳۶

ماہنامہ لسان الصدق اڈیٹر ابوالکلام آزاد -/۷۵

نظام رنگ ڈاکٹر اسلم فرخی -/۱۵

پرانی بات ہے زبیر رضوی -/۳۰

مولانا آزاد کی کہانی ڈاکٹر ظفر احمد نظامی -/۱۸

حاجی بابا ظ انصاری ۶/۵۰

خالی ہاتھ ابصار عبدالعلی -/۹

مضامین سیدین مرتبہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی -/۴

توفیق الحکیم (ناول نگاری کا ایک جائزہ) ڈاکٹر بدرالدین الحافظ -/۷

دکھوٹا سکہ (بچوں کی کہانیاں) مناظر عاشق ہرگانوی -/۳

"کوہسار جرنل" (خاص نمبر ۸۹ء) مدیر اعلیٰ: " " -/۱

زخم کے پھول (شعری مجموعہ) ڈاکٹر محمد محسن -/۳۵

جائزے (نفسیات) " -/۲۰

مولانا آزاد البم (حالات، تصاویر) خلیق احمد نظامی -/۱۲۵

فراق گورکھپوری یادوں کے جھروکے سے (پرانی یادیں) مطرب نظامی -/۱۳۵

فکر و نظر نامورانِ علی گڑھ (تیسرا کارواں) مجلہ مدیر شہریار -/۲۵

خبر نگاری (رپورٹنگ) شافع قدوائی -/۳۵

ملک الشعراء گرامی جالندھری (سوانحی حالات) طارق کفایت اللہ -/۴۰

شعری رویے (تنقید) زینت اللہ ساجد -/۴۰

انسانی شخصیت کا تصور قرآن مجید کی روشنی میں (مذہب) ذاکر حسین نقوی -/۴

فتاویٰ عالمگیری جلد اول تا جلد دہم (فتاویٰ) سید امیر علی -/۸۰۰

کنٹر ادب کی تاریخ (ادب) آر۔ ایس موگلی -/۷۵

آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ (تنقید) محمد شفیع -/۱۰

پریم چند کے نئے مباحث (تنقید) مانک ٹالہ -/۱۰

سرہند میں فارسی ادب (ادب) ادریس احمد -/۱۲

جولیس سیزر (ڈراما) شیکسپیر -/۲

اردو نثر میں ظرافت (تنقید) اقبال اختر -/۵۰

تنقید مشرق " پروفیسر عبدالمغنی -/۳۷

خلیل الرحمٰن اعظمی (سیرت و شخصیت) اسلام حشر -/۵۰

اردو میں گلدستوں کی روایت (ادب) ساحل احمد -/۳۰

امکان سلسلہ (انتخاب) مراسمی عصری ادب -/۴۰

خونی عاشق (ناول) مرزا رسوا ترتیب محمد مظاہر الحق -/۷

خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۴۷ مجلہ خدا بخش لائبریری پٹنہ -/۲۵

خطوط شبلی بنام آزاد (خطوط کا مجموعہ) ڈاکٹر سید محمد حسنین -/۲۰

مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد (سوانح) عبدالقوی دسنوی -/۱۵

اشاریہ آج کل (اشاریے) جمیل اختر -/۷۶

حواشی ابوالکلام (ادب) -/۶۲

آشوب غم (شاعری) خالد کفایت اللہ [illegible]

دیباچہ دیوان غرۃ الکمال (فارسی کلام) امیر خسرو -/۶

طب اسلامی برصغیر میں (علمی سمینار) خدا بخش لائبریری پٹنہ -/۵

البیرونی کے جغرافیائی نظریات (معلومات) ڈاکٹر حسن عسکری -/۱۱

ہندستان کی عظیم عورتیں (تاریخ) صفدر حسین -/۸

بارہ شہزادے (سوانح) طاہرہ رضوی -/۶

ایوان اردو (مولانا آزاد نمبر) مجلہ اردو اکیڈمی دہلی -/۶

خون بہا (شاعری) یوگیندر بہل تشنہ -/۱۰

بام ہنر " شکیل رحمانی -/۱۵

حفیظ اور ان کی شاعری (تحقیق) ڈاکٹر سید سمیع احمد -/

حوصلہ (ناول) مصطفیٰ کمال -/

میثاق النبیین (سیرت) مولانا عبدالحق [illegible] -/

مہمان مدیر
شمیم حنفی
B,114, Zakir Bagh,
M.M.Ali Road,
New Delhi-25

اشاریہ

عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت

ادب کی عوامی صنفیں اور روایتیں اُردو معاشرے میں اپنے لیے کوئی مستقل جگہ کیوں نہیں بنا سکیں ؟ اس سوال کا جواب بہت واضح ہے اور انتہائی افسوس ناک بھی۔ اُردو کی اشرافیت (SOPHISTICATION) اور مدنیت (URBANITY) نے برِ صغیر کے مجموعی کلچر میں جن عناصر اور جہتوں کا اضافہ کیا ہے، وہ بہت قیمتی ہیں۔ ہمارے علوم، افکار اور فنون کی دنیا ان اضافوں کے بغیر، وہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی جیسی کہ آج ہے۔ اُردو کی اشرافیت اور مدنیت صرف اس زبان کے بولنے والوں کی اجتماعی زندگی اور ذہنی و جذباتی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوئی ؛ دوسری زبانوں نے بھی کسی نہ کسی سطح پر، اس سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اسی لیے اُردو زبان و ادب کا سفر جن خطوط پر ہوا، اور اس سفر میں جن منزلوں تک ہماری رسائی ہوئی، مجھے ان کی طرف سے کوئی بے کلی نہیں ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اُردو کی ادبی روایت اور اس روایت سے مالا مال ثقافتی ورثے کے بغیر ہم نہ تو اپنے تجربوں کا مفہوم متعین کر سکتے تھے، نہ اپنی شناخت قائم کر سکتے تھے۔ ہندوستان کی موسیقی، مصوّری، رقص، فنِ تعمیر اور ہماری کئی علاقائی زبانوں کے ادب پر اُردو کی ثقافتی روایت اب تک سایہ فگن ہے۔ زبان جب بجائے خود ایک تہذیبی اور جمالیاتی حوالہ بن جاتی ہے تو اُس کے اقتدار کا علاقہ اپنے آپ وسیع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مجھے اُن اصحاب سے کچھ کم وحشت نہیں ہوتی جو اُردو کلچر کی اشرافیت اور مدنیت کے سلسلے میں اعتذار کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

لیکن مجھے اِس واقعے کے اعتراف میں بھی کوئی جھجک نہیں کہ اُردو کلچر نے اپنی اشرافیت اور مدنیت کی قیمت ضرورت سے بہت زیادہ چکائی ہے۔ مانا کہ اِس کلچر نے جو رُخ اپنایا، اس کی منطق گزشتہ اَدوار کی تاریخ کی عمل میں موجود ہے۔ مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اس منطق کے سامنے سپر ڈال دی اور اپنی کامرانیوں کے نشے میں یہ بات بھلا دی کہ ہم نے اپنا سفر حصول اور بے حصولی کی سطح پر ساتھ ساتھ طے کیا ہے۔ اپنی بے حصولی اور نارسائی کا حساب کریں تو خیال ہوتا ہے کہ وہ عناصر جو اُردو کلچر کی تشکیل میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کے محدود تصور نے اُن کی ناقص تعبیر ہی دراصل ہمارے لیے کا سبب بنی۔ ان اسباب کی نشاندہی مختصراً اس طرح کی جا سکتی ہے :

۱۔ اشرافیت کے غلط تصور نے ایک طرح کی لسانی تنگ نظری اور سنوبری کو راہ دی ہے۔
۲۔ مدنیت پر ضرورت سے زیادہ توجہ ہمارے تجربوں کی تحدید اور تخصیص پر منتج ہوئی۔
۳۔ زبان کی صحت اور لغات کی پابندی پر غیر متوازن اصرار کی وجہ سے ہماری روایت حکائی (ORAL) الفاظ کی طاقت :

محروم اور تحریری (WRITTEN) لفظ کے تسلط کا شکار ہوتی گئی۔

۴۔ اُردو نے مشرق کی جن زبانوں کو اپنا بنیادی سرچشمہ بنایا، اُن میں ارضیت کی لے کمزور تھی۔ اسی لیے ہماری ادبی روایت میں ذہنی اور تجریدی تجربوں سے شغف بہت نمایاں ہے۔

۵۔ ہم نے اشیا سے زیادہ اشیا کے تصور سے سروکار رکھا۔ آج بھی ہمارے یہاں ایسے دانش ور موجود ہیں جو علامت سازی کو بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں اور فکر کی تجسیم کے عمل کو ذہنی پس ماندگی کا نام دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عمل قدیم انسان کی سادہ فکری کا ترجمان ہے۔

اصل میں ترقی پذیری اور پسماندگی کے تصورات کی نوعیت ادب اور فنون کی دنیا میں، سماجی سطح پر ترقی اور پسماندگی کے تصورات کا ہو بہو عکس نہیں ہوتی۔ اظہار اور فکر میں بظاہر مراجعت کا زاویہ تمنا کا دوسرا قدم بھی ہو سکتا ہے۔ اِس کی شہادتیں ہمیں سب سے زیادہ مصوری میں اور تھیئٹر میں ملتی ہیں جہاں پُرانے اسالیب کو ایک نئی معنویت کی دریافت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ میں یہاں وضاحت کے لیے صرف دو مثالیں دوں گا۔ ایک تو رام چندرن کا معروف میورل یاتی اور اُن کی تصویروں کی وہ سیریز جو "کٹھ پتلیوں کا رنگ منچ" کے نام سے سامنے آئی تھی۔ اُن میں رام چندرن نے بنیادی رنگوں، مصوری کی لوک روایتوں اور قدیم انسان کی سادہ فکری کے استعاروں سے آج کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے بعض مسائل کی ترجمانی کا کام لیا تھا۔ متھلا پنٹنگز کے ایک مبقر (رتنادھرجھا) کا قول ہے کہ یہ تصویریں اپنی عنصری سادگی اور ہر قسم کے حجاب سے عاری بصیرت کی بنیاد پر آج کر شیلا کرافٹ کے حقیقی ماحول میں ہوا کے ایک تازہ جھونکے کی طرح ہیں۔ مدھوبنی یا متھلا پنٹنگز کی طرح رام چندرن کی یاتی اور "کٹھ پتلیوں کا رنگ منچ" دونوں میں کہانی کا عنصر نمایاں ہے۔ لوک روایت میں اس عنصر کی حیثیت بنیادی ہے۔

دوسری مثال لوک ساہتیہ سے ہے۔ ناٹک کی عوامی روایت جاترا جو جدید کاری کے سیلاب میں پسِ پشت جا پڑی تھی اور جس کا حلقہ اثر بنگال کے گانووں تک محدود رہ گیا تھا، پچھلے کچھ برسوں میں اُس کا تماشا اہل شہر کے لیے بھی نئے سرے سے پُرکشش بن گیا ہے۔ اِس صنف میں عام انسانی صورتِ حال سے نہایت شدید اور انہماک آمیز رشتہ چونکہ اساسی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے یہ صنف جدید کاری کے جھٹکوں کو جھیل گئی۔ سیاسی بیداری اور بصیرت میں اضافے کے ساتھ ساتھ جاترا کے واسطے سے سیاسی مفہوم اور معنویت رکھنے والے کھیلوں سے دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ اسی طرح اُتر پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ میں شہروں کے تھیئٹر گروپ شاید اپنے آزمودہ اسالیب کے حدود اور ان اسالیب کے مسدود مستقبل کی وجہ سے لوک روایتوں کی مدد سے نئے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ نوٹنکی کے اسلوب کی تجدید ہوئی ہے اور اِس پُرانے اسلوب میں نئے انسان کا قصہ سنایا جا رہا ہے۔

اُردو کا حال اس معاملے میں سرے سے مختلف ہے۔ لوک روایتوں کی بحالی تو دور رہی، ہمارے علما نے لوک عناصر سے آراستہ اسالیب اور اصناف کو بھی کبھی سنجیدہ تفہیم اور تجزیے کا موضوع نہیں بننے دیا۔ وہ بے (دیہاتی مرثیے) پوربی بھاشا میں لکھے ہوئے سوز اور نوحے، لوک گیتوں کے انداز میں منظوم سیاسی اور سماجی واردات اور عوامی تھیئٹر سے ایک غیر شعوری لاتعلقی ہمارا عام شیوہ ہے۔ اس کے برعکس ہندی میں لوک گیتوں کے ذریعے سماجی، سیاسی، تہذیبی صورتِ حال اور واقعات پر تبصروں کی روش روز بروز مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ اس موقعے پر دو حقائق کی نشاندہی ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ زندگی کی بنیادی سچائیوں میں یقین عوامی ادب کی فکری اساس ہے۔ دوسرے یہ کہ عوامی تجربے شخصی تجربوں کی ضد نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں کہ اِن حقیقتوں کی طرف سے ہم یکسر بے خبر رہے ہیں۔ واقعہ یوں ہوا کہ ہماری لسانی عادتوں

اور ادب کے اختصاصی تصور کا جوہمارے گلے کا طوق ہو گیا۔ اس امر کی جانب بھی توجہ نہ دے سکے کہ زندہ زبانیں اپنے ادب کے لوک روایت اور اُس کی امتیازی یا اشرافی روایت میں کوئی ٹکراو پیدا کیے بغیر، دونوں کو ساتھ ساتھ آگے بڑھاتی ہیں۔

اُردو میں دکنی ادب کا سرمایہ، پھر شمالی ہندستان میں اُردو کی ادبی روایت کے ابتدائی ادوار میں لوک عناصر کا آہنگ کبھی زبان کی اصلاح کی زد میں، کبھی دربار سے وابستہ مصنوعی ماحول اور رکھ رکھاو کے شور میں، دبتا گیا۔ کبیر، نانک، جائسی، بلگرام کے سنت شاعر، اور تو اور ہم نے نظیر اکبرآبادی تک کو ایک عرصے تک لائقِ اعتنا نہیں سمجھا کہ اُن سب کے یہاں لوک عناصر کی لے بہت اونچی تھی۔ گاندھی جی کی ہدایت پر ہندی میں رام نریش ترپاٹھی اور اُردو میں دیویندر ستیارتھی نے اپنی لوک روایتوں کی بازیافت کا سلسلہ ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دیویندر ستیارتھی کی زنبیل میں لوک گیتوں کا ذخیرہ جس تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا، اُردو سے ان کے روابط میں اسی تیزی کے ساتھ کمی آتی گئی۔ اس سلسلے میں ہمارا دھیان اِس رمز پر بھی نہیں گیا کہ لوک ادب زبانوں کی حد بندی سے ماورا احساس اور فکر کی ایک ایسی کائنات ترتیب دیتا ہے جہاں کبیر اور بلھے شاہ اور نانک دیو اور للّ دید اور سلطان باہو اور عبداللطیف بھٹائی ایک دوسرے کے لیے لسانی اعتبار سے بھی اجنبی نہیں رہ جاتے۔ انسان کے بنیادی تجربوں سے یگانگت اور مذہب و ملت، فرقے اور جماعت کی تفریق سے ماورا انسانی حالت کا ادراک ان سب کو ہمارے لیے تقریباً یکساں طور پر قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔

میرؔ صاحب کے اس بیان سے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میرؔ صاحب نے یہاں عوامی ادب کی اہمیت کا احساس جگایا ہے۔ عوامی ادب اور عوام سے وجدانی، ذہنی اور جذباتی قربت کا اظہار کرنے والا ادب، دو الگ الگ اکائیاں ہیں۔ عوام کے شاعر تو جوشؔ صاحب بھی تھے۔ ایم۔ ایف حسین بھی اپنے آپ کو عوام کا آرٹسٹ کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں عوامی ادب کی ترقی پسند تعبیر نے وامق جون پوری کو اِس گمان کی راہ دکھائی تھی کہ اُردو میں عوامی شاعر سچ پوچھیے تو بس وہی ہیں۔ مگر اِس نوع کی شاعری یا مصوری میں عوام کی حیثیت ایک معروض (OBJECT) یا شے (COMMODITY) کی ہوتی ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ سوچ کر بھی ڈر لگتا ہے کہ لوک کلاؤں اور ساہتیہ کی تجدید کا جو ہنگامہ ان دنوں برپا ہے وہ کہیں انھیں MUSEUM-PIECE بنا کر نہ رکھ دے۔ قبائلیوں کی بنائی ہوئی چیزیں یا دیہی صناعوں کی تیار کردہ اشیا کا حال (PRESENT) اگر نودولتیے طبقے کے ڈرائنگ روموں سے وابستہ ہے تو یقین جانیے کہ ان کا مستقبل صرف میوزیمس (MUSEUMS) میں محفوظ رہے گا۔ صارفیت لفظوں کے معنی بدل دیتی ہے کہ اب انقلاب فکر میں اور قوموں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں نہیں، بلکہ فیشن کی دنیا میں آتے ہیں۔ ایسی صورت میں لوک ساہتیہ یا لوک کلاؤں کا شہری معاشروں میں CRAZE بن جانا خطرے کا سگنل بھی ہے۔ کھلے آسمانوں میں اُڑنے والے پرندے کا دم پنجرے میں گھٹنے لگتا ہے۔ جنگل میں اُگنے والا پودا گملوں کے لیے نہیں ہوتا۔ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اشیا ہوں یا احساسات، اُن کی طلب اگر فیشن کا حصّہ بن جائے تو پھر وہ اپنی ندرت اور تازگی کھو بیٹھتے ہیں۔

کمارگندھرو کا کہنا ہے کہ ہمارے شاستریہ راگوں کا سرچشمہ لوک دھنیں ہیں۔ دوسری طرف ابھی چند روز پہلے ہی استاد غلام مصطفےٰ خاں نے ریڈیو پر ایک انٹرویو کے دوران یہ کہا کہ شاستریہ سنگیت اب جس مقام پر ہے وہاں اس

میں اور لوک سنگیت میں نسبت تلاش کرنا مناسب نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اصولی طور پر یہ دونوں بیانات حقیقت پر مبنی ہیں۔ مگر ان کے نتائج پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ریست کی تبدیلی اشیا اور احساسات کی ماہیت کو بھی تبدیل کر دیتی ہے۔ عوامی ادب بھی اگر محض ہماری حسّیت کے سرچشمے کی حیثیت پر رُک جائے تو اُس کا رول پورا نہ ہو سکے گا۔ ایسے شعر جو خواص پسند ہوں، چاہے اُن کا مکالمہ عوام سے ہی کیوں نہ ہو، عوامی ادب کا بدل نہیں ہوتے۔

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ادب کی صنفوں میں لوک عناصر کی شمولیت کو ہی کافی نہ سمجھیں۔ نظیر اکبرآبادی کی تقویم و تعبیر میں ہمارا رویہ پہلے جیسا نہیں رہا، ٹھیک ہے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے اس صدی کے اوائل میں اُردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ اُن کے مشاہدات کا رُخ دجلہ و فرات کی جگہ گنگا اور جمنا کی طرف ہونا چاہیے۔ ہم نے یہ بات مان لی، یہ بھی ٹھیک ہے، مگر یہ کافی نہیں ہے۔ یہ مقامیت کا شعور ہے، عوامی ادب کے مضمرات کا نہیں۔ لوک روایتوں کو اور ان سے جڑے ہوئے اسالیب کو مسخ DISTORT یا CORRUPT کیے بغیر انھیں تخلیقی بصیرت اور شعور کے ایک نئے منطقے سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ انھیں زماں اور مکاں کے ایک نئے دائرے میں لانے کی ضرورت ہے، اس طرح کہ ان روایتوں اور اسالیب کی صورتیں بگڑنے نہ پائیں اور یہ دائرہ بھی نہ ٹوٹے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ سوچتے ہوں کہ لوک ادب کی روایت اور اسلوب جب آج کی حسّیت سے مربوط ہوں گے تو اس حسّیت کی شرطوں پر ہمیں اس روایت اور اسلوب کے کچھ عناصر کو قبول کرنا ہوگا، کچھ کو مسترد کرنا ہوگا۔ مگر یہ کام تو کم و بیش ہر اُس شاعر اور ادیب نے کیا ہے جو گرد و پیش کی دنیا کے سیاق میں اپنے تجربے کا مفہوم متعین کرنا چاہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس مفہوم کی ترسیل کا رُخ کس کی طرف ہے۔ اب میں چند ٹھوس حوالوں اور مثالوں کے ذریعے اپنی بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے لوک ساہتیہ کی جمالیات میں اب سے پہلے کئی ایسے انسانی تجربے ہیں جنھیں صرف اس لیے برتا نہیں گیا کہ یہ تجربے اُس وقت یا تو وجود میں نہیں آئے تھے، یا پھر انھیں آج کی جیسی اہمیت نہیں ملی تھی۔ مثلاً مہنگائی، قرض اور سُود کا چکر، جہیز کی رسم یا BRIDE-BURNING اب ہندی کے ایک نئے شاعر رمیش رنجک کا یہ گیت سنیے:

مہنگائی نے جُلُم کری ڈارے بہنا	महंगाई ने जुलुम करि डारे बहिना
دام دال کے بڑھے، دام چینی کے چڑھے	दाम दाल के बढ़े, दाम चीनी के चढ़े
دام ایک ایک چیز کے کرارے بہنا	दाम एक एक चीज के करारे बहिना
مہنگائی نے جُلُم کری ڈارے بہنا	महंगाई ने जुलुम करि डारे बहिना
دھوتی جوڑ کی نئی، پونے تیس کی بھئی	धोती जोड़ की नई, पौने तीस की भई
موہے دیکھ گئے دن میں ستارے بہنا	मोहे दीख गये दिन में सितारे बहिना

اس گیت کی دُھن بھی لوک ہے، حسّیت کی سطح بھی۔ حسّیت کی اس سطح پر آئے بغیر، زیادہ سے زیادہ وہی کیا جا سکتا ہے جو اُردو ہندی کے بہت سے گیت کاروں نے کیا، یعنی یہ کہ عوامی روایت سے تشبیہیں اور اظہار کے کچھ سانچے اخذ کر لیے۔ اُردو نظم کے نئے شاعروں میں یہ رویّہ سب سے زیادہ طاقت کے ساتھ اختر الایمان، مجید امجد، زاہد ڈار اور عمیق حنفی کے یہاں سامنے آیا ہے۔ اس کے کچھ چھینٹے عظمت اللہ خاں اور میراجی کی نظموں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر لوک روایت کو آج کی زندگی کے پس منظر میں ایک موثر حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوئی بڑی مثال ہمیں اُردو میں نہیں ملتی۔ اس معاملے میں ہندی تھیٹر اور ہندی گیت دونوں اُردو سے بہت آگے ہیں۔ اُردو والوں میں، ایک حبیب تنویر کو چھوڑ کر، جنھوں نے چھتیس گڑھی روایت کو اپنے عہد کی حسّیت سے ملانے کی چند بہت اچھی کوششیں کیں (مٹی کی گاڑی،

چرن داس چور) ہمیں سطح صاف نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ہندی میں تصویر مختلف ہے۔ اسے آپ آریائی ذہن کا کرشمہ کہیں یا حواس کی کائنات اور خیال کی کائنات کو بٹ کر ایک اکائی کے روپ میں سمجھنے اور دیکھنے کی عادت، بولیوں کے ادب نے جس لوک روایت کی تعمیر کی تھی، کھڑی بولی ہندی نے اُس روایت سے اپنا تعلق ٹوٹنے نہیں دیا۔ بھارتیندو کے عہد سے نوٹنکی کی روایت جو چلی تو اب تک چلتی چلی آرہی ہے۔ مثال کے طور سر وریشور دیال سکسینہ (بکری)، لکشمی نرائن لال (ایک ستیہ ہریش چندر) مدرا راکھشس (آتم سوہن اور اعلا افسر)، سشرو جوشی (ایک تھا گدھا عرف قصہ میاں داد)، اصغر وجاہت (در گتی) اور اشوک چکر دھر (چکن چمیلی) کے یہاں خود گاندھی وادیوں کے ہاتھوں گاندھی واد کے قتل، سماجی قدروں کے زوال، سیاسی اخلاقیات اور بیورو کریسی اور کرپشن کے مسائل سے لے کر ریلوے ملازمین کی ہڑتال اور لکھنؤ میں چکن کا کام کرنے والی عورتوں کے استحصال تک ــــ اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے لوک روایتوں کا سلسلہ موجودہ معاشرے کی زندہ سچائیوں سے آملا ہے۔ نکڑ ناٹک کی روایت بھی اسی سلسلے میں شامل ہے۔ اس صورت حال کے برخلاف اُردو ڈرامے کی روایت میں آغا حشر اور امانت لکھنوی کی روایت کو ترقی دینا تو الگ رہا، اسے ایک نئی معاشرتی تعبیر کے خام مواد حیثیت سے باقی رکھنے کی جستجو بھی نہیں ہوئی۔

اُردو میں عوامی ادب کا راستہ جو لوک روایتوں کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں بھی ہموار نہ ہو سکا تو صرف اس لیے کہ ہم اُن روایتوں کی طاقت، اُن میں مخفی امکانات اور اجتماعی زندگی پر اُن کے اثرات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ ہمارے احساسات پر اُردو ثقافت کی اشرافیت اور مدنیت کا بوجھ الگ ــــ ستم بالائے ستم یہ کہ ابلاغ (COMMUNICATION) کا مسئلہ، ہیئت اور مواد کی اکائی کا مسئلہ، حکائی روایت اور بیانیہ اصناف پر تحریری اسالیب اور تجرید کا اظہار کے تفوق کا مسئلہ ــــ یہ مسئلے ہمارے لیے آج بھی بحث طلب ہیں اور انھیں ہم ابھی تک حل نہیں کر سکے ــــ متوسط طبقے کی زندگی کے غیر متناسب عمل دخل کی وجہ سے ہندی میں بھی کہانی اور ناول کی صنفیں لوک عناصر کو اس فراخ دلی کے ساتھ جذب نہیں کر سکیں جس کا اظہار ناٹکوں میں ہوا ہے۔ تاہم اس میلان کے واضح نشانات وجے دان دیتھا سے لے کر اصغر وجاہت اور عبد البسم اللہ تک، جہاں تہاں موجود ہیں۔ نظم ہو یا فکشن، ہم جب تک کہانی پن کے عنصر اور موضوعاتی (THEMATIC) صداقت کے عنصر سے بدکتے رہیں گے، لوک روایتوں سے اخذ و استفادے کا میلان ہماری حسیت کا حصہ نہیں بن سکے گا۔ لوک روایتوں نے ادب کی جمالیات کے جس نئے تصور کی تشکیل آج کی حقیقتوں کے فریم ورک میں کی ہے، ہمارے لیے یہ تصور تا حال اجنبی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بنگالی یا ہندی کی لٹل میگزینس (LITTLE MAGAZINES) مثلاً پہل (पहल)، اُترگاتھا (उत्तरगाथा) اور (और) اور کیوں (क्यों) کے خطوط پر ہمیں پُرانی لوک روایت سے نکلی ہوئی اُس نئی جمالیات کو اپنے نظام احساس کا جزو بنانے اور معاصر عہد کے آشوب اور اجتماعی واردات سے اُس نئی جمالیات کے تعلق پر پھر سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی حد تک، عوامی ادب کے مسائل ہماری اپنی "بصیرت" نے پیدا کیے ہیں۔ یہ بصیرت "پتا نہیں کیوں" اپنی روایت، اپنی لسانی تربیت اور اپنے تمدن کا احاطہ کرنے والی مشینی جمالیات کے بھاری بوجھ کو اب تک اٹھائے پھرتی ہے۔ ہماری بصیرت بھول کر بھی نہیں سوچتی کہ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کا ایک صاف اور سیدھا راستہ ہماری لوک روایتوں سے نکلتا ہے۔ زبان و بیان کی لیبوریٹری کے جس سے ہم آزاد ہو سکیں تو غالباً اس کا اندازہ بھی کر سکیں گے کہ آج کے انسانی تجربے اور صورت حال کی تعبیر و تفہیم کا ایک زاویہ ہماری لوک روایت سے جڑا ہوا ہے۔ میرے اپنے وجدان میں اس زاویے کو مراجعت کا نام دے کر مسترد کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ شاید میں جدید انسان کے افکار و احساسات کی دنیا میں بے حساب ترمیموں سے پہلا ہوا آدمی ہوں۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۷۵

نظام رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہید جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پرسے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما
تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۷۵

ساز سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی متشرح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

حسن نعیم
C-7, Shalimar,
Navyug Nagar,
Dahisar (East)
BOMBAY-68
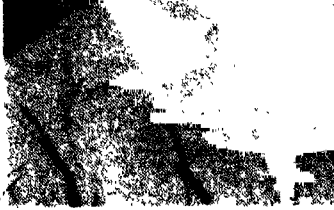
حسن نعیم
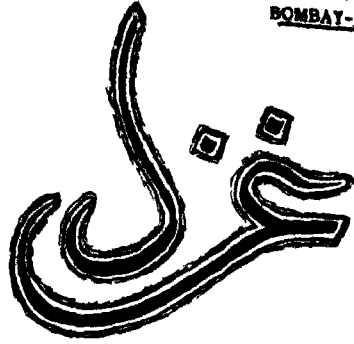
✽ صوفی مصور عبدالحمید خاں کی نذر ✽

سب ہُنر آتے تھے لیکن عقل سے یاری نہ تھی
صرف کیسے روز و شب ہوں؟ اس کی تیاری نہ تھی

جن دنوں اخلاص میں تھوڑی سی عیاری نہ تھی
بارگاہِ دوست میں ثابت وفا داری نہ تھی

سرکشی کے عہد ناموں کی حفاظت کے لیے
میرے قلب و جاں سے بہتر کوئی الماری نہ تھی

جن اصولوں کے لیے جینا بہت مشکل ہوا
اُن کی خاطر جان دے دینے میں دُشواری نہ تھی

حُسن ہی کا وہ علاقہ تھا جہاں سب کچھ مِلا
عِشق کی اپنی الگ کوئی زمینداری نہ تھی

سب پریشاں ہیں کہ آخر کس وبا میں وہ مرے!
جن کو غربت کے علاوہ کوئی بیماری نہ تھی

کس طرح بادِ فنا سے میں بچا لیتا اُسے
اُس غزل پیکر میں کچھ بھی فن کی چنگاری نہ تھی

روز اک موذی کو نیزے پر اُٹھاتا تھا نعیم
انقلابی قوتوں کی جب سمجھ داری نہ تھی

ننھّے مُنّے بچّوں
کے
لیے
جادو کی ہنڈیا
4/50
چاند کی بیٹی
4/50
شیر اور بکری
6/=
دم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

…ں افاضلی

103, Amar Apartmen
Dan-Para,
Khar (W)
BOMBAY-52.

مِل جُل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

ہر زندگی ہے ہاتھ میں کشکول کی طرح
محرومیوں کے پاس بغاوت نہیں رہی

مسمار ہو رہی ہیں دلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی

مُلکِ خدا میں ساری زمینیں ہیں ایک سی
اِس دَور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی

بے چہرہ ہوگئی ہیں ہواؤں کی دستکیں
آنکھوں کو انتظار کی عادت نہیں رہی

سَب اپنی اپنی مَوت سے مرتے ہیں اِن دِنوں
اب دَشتِ کربلا میں شہادت نہیں رہی

فضیل جعفری
D-414.Vrindevan No.3,
Raheja Township,
Malad(East),
BOMBAY-400097.

زبیر رضوی کے لیے

سپاہِ شب سے نبرد آزما ہوئے تو سہی
چراغ ایک ہی دو تھے مگر جلے تو سہی

دراز دستیِ اہلِ وفا کا شکر کرو
ثمر بدوش درختوں کے سر جھکے تو سہی

پکے ہوئے تھے سبھی پھل کہ کچھ سڑے بھی تھے؟
ذرا توجہ سے سرکار، دیکھئے تو سہی!

پکارے جائیں گے مجرم ضرور نام بہ نام
کہیں عدالتِ صدق و صفا سجے تو سہی

رہِ جنوں میں یہ سر کیا ہے، اس کی قیمت کیا!
ہمارے ساتھ کوئی سرو قد چلے تو سہی

بجا ہے درسِ شہادت، مگر فضیل، کوئی
خود آگے بڑھ کے تہِ تیغ سر دھرے، تو سہی

مصنف کا ناقدین کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

بھارت کی معروف ناول نگار قرۃ العین حیدر سے جنگ پینل کا خصوصی انٹرویو

میزبان
حسن رضوی

رپورٹ
ابصار عبدالعلی

پینل
ڈاکٹر آغا سہیل
پروفیسر سجاد حیدر ملک
ڈاکٹر سلیم اختر

اُردو کی صفِ اوّل کی ناول نگار اور ممتاز افسانہ نگار محترمہ قرۃ العین حیدر گذشتہ دنوں بھارت سے پاکستان آئیں۔ لاہور میں قیام کے دوران ادیبوں نے اُن کے اعزاز میں ادبی نشستوں کا اہتمام کیا۔ مختلف مقامی ادبی تنظیموں کے اصرار کے باوجود انھوں نے کسی باقاعدہ ادبی تقریب میں شمولیت سے گریز کیا۔ ہاں نجی ادبی محفلوں میں وہ شریک ہوئیں اور ادب اور تاریخ کے مختلف موضوعات پر بات چیت کی مگر باقاعدہ انٹرویو کسی رسالے یا اخبار کو نہیں دیا۔ اس اعتبار سے "جنگ" کو یہ اولیت اور امتیاز حاصل ہے کہ محترمہ قرۃ العین حیدر نے پاکستان میں اپنا پہلا پینل انٹرویو "جنگ" کے لیے ریکارڈ کروایا۔ ان کا یہ انٹرویو ہم "کتاب نما" کے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔

میزبان ... آج ہم اُردو کی نامور ناول نگار اور افسانہ نگار محترمہ قرۃ العین حیدر سے گفتگو کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ شریکِ گفتگو ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل ڈاکٹر سلیم اختر جناب ابصار عبدالعلی اور پروفیسر سجاد حیدر ملک۔ میں عینی آپا سے ایک روایتی سا سوال پوچھنا چاہوں گا۔ آپ کا تعلق علم و ادب کے ایک محترم گھرانے سے ہے۔ آپ نے ناول نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ شعر گوئی کی طرف کیوں توجہ نہیں دی۔

قرۃ العین حیدر ... یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ نے کرکٹ کھیلنے کا خیال کیوں آیا۔ فٹ بال کیوں نہیں کھیلا۔ رجحان کی بات ہے۔

میزبان ... آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو کیا پہلی ہی کہانی سے آپ کی شناخت ہوئی۔

قرۃ العین حیدر ... میں نے لکھنے کا آغاز بچپن میں پھول اخبار سے کیا۔ پھر تہذیبِ نسواں میں لکھا اور میں یہ سب ۲۵ بار بتا چکی ہوں ... کوئی اور سوال کیجیے

میزبان ... لیکن کچھ ناقدین کا خیال ہے کتاب کی پہچان اصل میں جو ہوئی تو وہ "آگ کا دریا" سے ہوئی۔

قرۃ العین حیدر ..... اچھا تو ہوئی۔ "آگ کا دریا" کو بھول جائیے۔ میری اور کتابیں بھی رہیں۔ اس ناول پر بہت بات ہو چکی ہے۔ پڑھنے والے تو میری اور بھی تخلیقات کو بھی پڑھتے رہیں مگر ناقدین ایک ہی ناول کی بات کرتے رہتے ہیں اس حد تک کہ یہ ...... بن جاتا ہے۔

میزبان... صرف ایک چھوٹا سا سوال اس بارے میں "آگ کا دریا" کو زیادہ تر ناقدین نے تاریخ اور سیاست کے حوالے سے لیا ہے۔ اس سے آپ متفق ہیں۔

میرا خیال ہے آگ کا دریا کے ذریعے تاریخیت کا رجحان پیدا ہوا۔

قرۃ العین حیدر... یہ ناقدین کی اپنی سمجھ بوجھ پر منحصر ہے۔ اس لیے میں کیا کر سکتی ہوں، آپ جس حوالے سے چاہیں اسے پڑھیے۔

میزبان... ویسے آپ کا اپنا نقطۂ نظر کیا ہے؟

قرۃ العین حیدر... میں نے ایک ناول لکھا ہے اسے لوگ پڑھیں اور اپنے اپنے طور پر سمجھیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر... "آگ کے دریا" کے حوالے سے ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر... پھر آگ کا دریا۔

ڈاکٹر سلیم اختر... یہ تو آپ کا بنیادی کام ہے اس پر گفتگو ہوگی ہی۔ آپ کو خواہ برا ہی کیوں نہ لگے۔

قرۃ العین حیدر... بنیادی کام تو آپ لوگوں نے طے کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرا بنیادی کام نہیں ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... ایک تخلیق وجہ شہرت بھی ہو تو ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر... ضروری نہیں کہ مصنف ناقدین کی رائے کو مانے اور ان کی رائے، ان کے فرمان کے مطابق چلے۔

ابصار عبدالعلی... پھر آپ اپنی کس تخلیق کو اپنا بنیادی کام سمجھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر... انسان لکھتا رہتا ہے کوئی چیز اچھی لکھتا ہے۔ کوئی بری لکھتا ہے۔

ابصار عبدالعلی... آپ کے نزدیک آپ کی کون سی تخلیق اچھی ہے۔

قرۃ العین حیدر... یہ بتانا بہت مشکل ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل... دیکھیے ہم بات کو کچھ آگے بڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد... !

قرۃ العین حیدر... پھر "آگ کا دریا" پر آجائیں، بھئی دیکھیے میں نے بہت سے افسانے ایسے لکھے جن پر بات ہو سکتی ہے۔ کوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتا کہ کن افسانوں نے کوئی ٹرینڈ شروع کیا۔ کس رجحان کو متاثر کیا۔ بس وہی "آگ کا دریا"۔ کہ اس میں سیاست ہے۔ اس میں سنسکرت ہے۔ اس میں ہندو تہذیب ہے۔ میں سمجھتی ہوں یہ تکرار مجھ سے ناانصافی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے ناول، ناولٹ یا افسانے اپنی جگہ پر ایک انفرادی حیثیت اس لحاظ سے رکھتے ہیں کہ یہ ان کی اپنی ان کا اپنا کنسیو کرنے کا طریقہ ہے اور اسے پیش کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ اب "آگ کا دریا" ہی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کوکھ سے نئے ناول پیدا ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے پیروی کی بھی کوشش کی۔

قرۃ العین حیدر... میرا اپنا خیال ہے کہ "آگ کا دریا" کے ذریعہ "تاریخیت" کا رجحان پیدا ہوا کہ لوگ تاریخ کو سمجھیں۔ اب اس میں فہم کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ سمجھا یہ جا رہا ہے کہ تاریخ سیاست کو ڈکٹیٹ کرتی ہے اور سیاست تاریخ کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہندوستان میں کچھ اور تو

ہے۔ وہاں مختلف حلقوں کی موجودہ نشر پیشن ہیں۔ مگر وہاں پی۔ ایم۔ اے ک کا ایک چھوٹا سا گروپ ہے ساتھ ہی پروفیسر عرفان حبیب جیسے مارکسٹ مورخ بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک گروپ وہاں صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کا بھی تھا۔ کسی چیز کو ہم کلیتہً کے طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہاں محض ایک ٹرینڈ اور یہاں ایک۔ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے پاکستان کا جو نظریہ ہے۔ پاکستانی تشخص کو دریافت کرنے کا جو عمل ہے اس لحاظ سے تاریخیت کا جو تصور ہے میں سمجھتی ہوں اس میں "آگ کا دریا" نے کچھ مدد کی ہے کہ لوگوں نے اس طریقے سے لکھنا شروع کیا۔ پہلے طبقاتی کشمکش کی عکاسی کا رجحان تھا۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" سے نفسیاتی ترجمے کا آغاز کیا۔ گھریلو لڑکی کی نفسیات اور ان کے مڈل کلاس کے فرسٹریشن پر لکھا۔ اس سے پہلے مرزا محمد نے ہندستانی پڑھے لکھے مڈل کلاس نوجوانوں کے مغرب سے انکاؤنٹر پر لکھا تھا۔ اس کے بعد عصمت چغتائی اور کرشن چندر کے ہاں ایک قسم کی غنائیت غنائی رومانیت ترقی پسندی آئی۔ اس کے ساتھ انھوں نے بہت سے سماجی مسائل پیش کیے۔ کشمیر کی غربت کا مسئلہ پیش کیا۔ یہ الگ الگ چلتا رہا اس کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں۔ آپ مجھے بتلائیے پریم چند کو چھوڑ کر۔ اس دور میں یا آپ اگر سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" سے شروع کرتے ہیں تو بہت سی چیزیں اس دور میں لکھی گئی ہیں۔ پھر اس کے بعد "آگ کا دریا" نے جو ایک عجیب سا تہلکہ مچا دیا اس کی وجہ سے تاریخیت کا تصور ہے۔ تاریخ کیا ہے تاریخ کو ہم کس طرح دیکھیں اس کے بارے میں ہم کس طرح سوچیں۔ کس طرح سوچتے ہیں۔ کس طرح سوچیں تو پھر ایک بات ہوگی کہ ایسے سوچو۔ یہ کہ انسان کس طرح انفرادی طور پر تاریخ سے ان

ڈاکٹر سلیم اختر

انکاؤنٹر کرتا ہے۔ ہر شخص کے لاشعوری طور پر اپنے کچھ رہنما اصول موجود ہیں۔ خود اس کی اپنی تہذیب بھی اس میں شامل ہے۔ ہندستان میں ملی جلی اجتماعی تہذیب کا مسئلہ تھا۔ دو تہذیبوں دو لسانی خاندانوں کے ٹکراؤ کا مسئلہ تھا۔ یعنی ترکی عربی فارسی کا ٹکراؤ انڈک تہذیب سے ہے اور انڈک (ہندستانی) زبانوں سے ہوا۔ اس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا خیالات اور تہذیب کا۔ اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ان مسائل کو لوگوں نے مختلف طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس ناول میں اسی ارتقاء کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا کوئی تاریخ کا ڈسپلن نہیں تھا۔ میں نے تاریخ صرف بی۔ اے میں پڑھی تھی۔ میں نے اس مضمون میں ایم۔ اے نہیں کیا تھا۔ میں نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ مجھے شوق تھا۔ اس سے راستہ کھل گیا اور پاکستان میں چونکہ یہاں پہلا ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان بنا۔ اور اب اس کے بعد اس کی تاریخ، پاکستان کو اس طرح بنا کہ یہ ایک مقدمہ تھا جو جیتا گیا۔ سیاست کے میدان میں تین فریق تھے کانگرس برطانیہ اور مسلم لیگ۔ اسی کیس کو قائد اعظم نے جیتا۔

پاکستان بنا۔ بعد میں یہ مسائل پیش آئے کہ کس طرح ہم اس کو ماضی سے مربوط کریں۔ ماضی کیا ہے۔ اس ماضی کے لیے میرا انٹرپریٹیشن مختلف ہے۔ آپ کا مختلف۔ میں نے اپنا انٹرپریٹیشن پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے یہاں پر یہ رجحان پیدا ہوا کہ تاریخ کی طرف توجہ ہوئی اور میرے خیال میں اس طرح کے ناول بھی لکھے گئے جیسے ڈاکٹر احسن فاروقی کا "سنگم" جو جواب کے طور پر لکھا گیا۔ حالانکہ جب "آگ کا دریا" شائع ہوئی تو ڈاکٹر فاروقی نے اس کی بے حد تعریف میں "ساقی" میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا تراشہ میرے پاس موجود ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... مگر بعد میں وہ آپ کے خلاف ہوگئے۔

قرۃ العین حیدر... جی ہاں... اسے ایک سیاسی قصہ بنا لیا گیا ہے۔ یہ بیکار سی بات ہے۔ اس طرح میں نے جتنی چیزیں لکھی ہیں۔ ان میں انسان کو میں ایک اکائی کے طور پر نہیں دیکھتی ہوں۔ اس کے پیچھے بہت ساری چیزیں کارفرما ہیں جن میں اس کی تہذیب ہے جو ایک اجتماعی عمل ہے۔ آپ کہیں بھی جائیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی تہذیب بالکل شدھ (خالص) ہے۔ برطانیہ کی بھی نہیں ہے۔

ابصار عبدالعلی... شدھ رہ بھی نہیں سکتی۔ راستہ کھلا ہے۔ باہر سے اثرات آتے رہتے ہیں۔

نقاد چند الفاظ کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر... جی ہاں... یہ اثرات مذہب، زبان اور تجارت کے ذریعہ آتے رہتے ہیں۔ آپ کو تاریخ مارکس کے نظریہ سے پڑھیے یا بالکل تجدید پرست ہو جائیے۔ آپ اسلام کے نقطۂ نظر سے دیکھیے یا ہندو روائیولزم کے نقطۂ نظر سے پڑھیے۔ تاریخ تو اپنی جگہ موجود ہے اس کی تصریح آپ اپنے اپنے طور پر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل... عینی آپا بہت اہم بات کہہ رہی ہیں۔ تاریخ اور تاریخیت میں بہت فرق ہے۔ وہ ہسٹریو گرافی کی بات کر رہی ہیں۔

قرۃ العین... نہیں ہسٹریوگرافی... یعنی تاریخیت جس کا مطلب ہے تاریخ کا احساس۔

ابصار عبدالعلی... یہ احساس جمیلہ ہاشمی کے ناولوں میں ملتا ہے۔ جیسے چہرہ بہ چہرہ روبرو اور "دشتِ سوس" میں۔

آغا سہیل... جی ہاں انھوں نے عینی آپا کو فالو کیا ہے۔ ویسے تاریخیت میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں اس میں کلچر بھی آتا ہے۔ نفسیات اور عمرانیات بھی آتی ہے۔

میزبان... ابھی حال ہی میں "کتاب نما" میں شمیم حنفی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ قرۃ العین حیدر علامہ اقبال کے مانند آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی تمام تر سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے۔

قرۃ العین حیدر... اب جن کا جو چاہے وہ کہے۔ ویسے تاریخ کھوے کھووں کی جستجو نہیں ہے۔

میزبان... اور وہ جو آپ کی علامہ اقبال سے مماثلت کی بات ہے۔

ابصار عبدالعلی

ابصار عبدالعلی... کیا آپ اس کی تردید کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر... یہ اقبال کے مآثت کا چکر جانے کس طرح شروع ہوگیا۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔

ابصار عبدالعلی... پھر بھی۔

قرۃ العین حیدر... علامہ اقبال ایک بہت عظیم شاعر اور مفکر تھے۔ میں ان سے بے حد متاثر ہوں۔ لیکن وہ تاریخ کو اسلام اور مسلمانوں کے رول کے مطابق دیکھ رہے تھے۔ میں اس نقطۂ نظر کے علاوہ تاریخ کے اور بھی جو دھارے تھے انھیں بھی دیکھتی ہوں۔

ڈاکٹر آغا سہیل... اقبال اسلامی ما بعد الطبیعات کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

قرۃ العین حیدر... وہ فلسفی تھے۔ میں فلسفی نہیں ہوں۔

ڈاکٹر آغا سہیل... بات کہیں اور نکل گئی۔ ہم دراصل "آگ کا دریا" سے "گردشِ رنگِ چمن" تک آنا چاہتے ہیں جو عینی آپا کا تازہ ناول ہے۔ اس میں بھی تاریخیت موجود ہے۔ اس میں زوال پذیر سوسائٹی کو انھوں نے پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے محرکات و عوامل کی نشان دہی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو ناول میں یہ بات پہلی مرتبہ آئی ہے۔ اس میں وہ بہت کامیاب رہی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ انھوں نے کئی صدیوں پر محیط تاریخ کو صرف تاریخ کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ تاریخیت کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بہت اہم ناول ہے۔ لہٰذا میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ دنیا کے بڑے ادب میں جو بڑے ناول لکھے گئے ہیں ان بڑے ناولوں کے برابر یہ ایک ناول لکھا گیا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہاں لوگوں میں اس پر گفتگو ہوئی۔ بعض لوگوں کو بعض چیزوں سے اختلاف بھی تھا۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک بھرپور ناول ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے یہاں سے ٹکٹ خریدا، دلی پہنچیں اور وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ امام باڑے دیکھے، گومتی دیکھی، ٹنڈے کے کباب کھائے، ڈیڑھ دن لکھنؤ میں گزارا اور.....

قرۃ العین حیدر... اور یہ سمجھ لیا کہ انھوں نے لکھنؤ کا کلچر دیکھ لیا۔

ڈاکٹر آغا سہیل... یہ بات درست نہیں۔ عینی آپا نے لکھنؤ کے کلچر کو خود دیکھا ہے۔ ایک ایک بات کا تجزیہ کیا ہے۔ کسی نتیجے پر پہنچی ہیں۔ اس ناول کا موضوع مشکل تھا۔ ہم یہاں سے سراغ لگانا چاہتے ہیں کہ جب بنیاد پرستوں نے ہماری سوسائٹی کو بدلنے کی کوشش کی۔ ہماری تاریخ میں ایسے زمانے آئے جب جنوبی ہند کے تمام رشتے ٹوٹ گئے۔ اس کے نتیجہ میں شمالی ہند میں جو گڑبڑ ہوئی ہے وہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا سبب بنی۔ یہ واقعہ بذاتِ خود کچھ نہیں۔ عینی آپا نے ان واقعات کے پیچھے جو محرکات و عوامل کام کر رہے ہیں انھیں کنسیو کرنے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں انھوں نے ایک ہونی کا کردار پینٹ کیا ہے۔ میرے دوستوں کا خیال ہے کہ وہ ناول سے کوئی الگ چیز ہے۔

قرۃ العین حیدر... وہ تو اس پورے سیٹ اپ کا ایک حصہ ہے۔ ہندستان کے لوگ ایک ایسی سوسائٹی میں رہ رہے ہیں جس میں دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک پلورلسٹ سوسائٹی ہے جس میں مختلف فرقوں اور طبقات کا انٹریکشن ہے۔ یہ بات صدیوں سے ہے مختلف اسٹریس اور اسٹرینز ہوتے ہیں۔ پریشر ہوتے ہیں۔ جھگڑے فساد ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ جو ہم آہنگی، سنتھیسس کے مظاہرے ہوتے ہیں وہ سب شامل ہیں اور یگانگت کی چیزیں بھی شامل ہیں۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں عروج و زوال سیاسی

پاکستان میں بھی ادیب خوب جھگڑتے ہیں

تغیرات کے لحاظ سے ہوتے رہیں گے۔ اس لیے ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ آج یہ چال ہے اور کل یہ ہو گا۔ گویا

حالات بدلتے رہیں گے لیکن فریم ورک ایک رہے گا۔ پاکستان میں سوسائٹی پیور لسٹک نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کا ایک ملک ایک قوم ایک زبان اور ایک مذہب ہے۔ ہندستان ایک ملک ہے کئی زبانیں، کئی مذہب اور کئی کلچر ہیں اور ان کا ٹکراؤ بھی ہے۔ انٹریکشن بھی ہے اور مفاہمت بھی۔ پرانی روایتیں بھی ہیں۔ صنعتی دور کی آمد سے جو نئی روایتیں بن رہی ہیں وہ بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر اب اچھوت اچھوت نہیں رہا ہے۔ اب شیڈول کاسٹ ملوں کی کینٹین میں برہمن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

ابصار عبد العلی ... یہ بتائیے کہ یہ اچھوت جو ملوں کی کینٹین تک پہنچ گیا ہے اس سے آگے اور اس سے اوپر کب پہنچے گا جو انسانیت کے حوالے سے اس کا حقیقی مقام ہے۔

قرۃ العین حیدر ... یہ سیاسی سوال ہے۔ میں اچھوت لیڈر نہیں۔ میں آپ کو کیا بتا سکتی ہوں۔ یہاں کوئی دلت رائٹر آئے تو یہ سوال آپ اس سے کیجیے۔ میں صنعتی دور کی سوسائٹی کی بات کر رہی ہوں جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب شامل ہیں۔ آپ جب وہاں (بھارت میں) رہیں گے نہیں تب تک آپ کو کس طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں وہاں اٹھائیس سال سے رہ رہی ہوں۔ میں نے وہاں صحافی کے طور پر کام کیا ہے۔ میں جنوبی ہند اور اتر پردیش وغیرہ کے دیہات میں گئی ہوں۔ وہاں کی زندگی سے واقف ہوں۔ میں کھلے دل سے ہر چیز کو دیکھتی ہوں۔ ہر ایک سے بات کرتی ہوں۔ میرا لوگوں سے رابطہ ہے۔ اس میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ میں ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں کوئی حکم نہیں لگاتی۔ میں کوئی فیصلے نہیں کرتی۔ میں سیاسی ججمنٹ نہیں دیتی۔ میں نے اس سوسائٹی کی موجودہ صورت حال کے ایک پہلو کو ایک حصہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو بمبئی لکھنؤ دلی اور دوسری جگہوں پر میں نے دیکھا ہے۔ اس میں عورت کا جو رول ہے، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے تو مسلمان عورت کو طوائف دکھایا ہے۔ یہ تو عجیب سی بات لوگ کہتے ہیں۔ بھئی آخر کیا ہمارے معاشرے میں طوائفوں کا طبقہ موجود نہیں ہے۔ یہاں لاہور میں پورا شاہی محلہ آباد ہے۔ مسلمان عورتوں کا عموماً جس طرح استحصال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے فیوڈل تہذیب کے حوالے سے میں نے اسے پیش کر دیا۔ یہ بزرگ کا کردار جو میرے ناول "گردشِ رنگِ چمن" میں ہے۔ وہ وہاں کے دیہات اور قصبوں کی خانقاہی تہذیب کے حوالے سے ایک زندہ حقیقت ہے۔ میں نے وہ بھی پیش کیا۔ یہ سب مناظر آپس میں مربوط ہیں۔ میرے بارے میں یہاں یہ بھی کہا گیا کہ میں نے بھگتی تحریک کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھگتی تحریک کی تجدید کی جا رہی ہے۔ میرے بارے میں بالکل بے بنیاد بات ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل ... ایک قاری کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی اپروچ صحیح ہے۔ آپ نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ بنیاد پرستوں نے گڑبڑ مچائی ہے اور سوسائٹی کو بگاڑنے میں انھوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے اور جو آپ نے لکھا ہے وہی اس کا علاج ہے۔

قرۃ العین ... جی نہیں ... میں نے کوئی نسخے نہیں پیش کیے۔ میری بنیادی اپروچ انسانی برستی ہے

اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت کو میں ضروری نہیں سمجھتی۔ میں نے تو ایک سماجی منظر پیش کیا ہے جس میں میں نے چند انسانوں کی ایک کہانی بیان کی ہے جیسے وشا دلی خاں ہیں۔ ایسے کردار آج کل بھی موجود ہیں۔ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں

اسے میں نے پیش کر دیا۔ اب میرے بارے میں یہ کہنا کہ میں نے نوسٹلجیا کے چکر میں ایسا کیا تو یہ غلط ہے۔ نوسٹلجیا کے نقطے کو آپ لوگ بھول جائیے۔ ایک انسان ناول لکھ رہا ہے۔ وہ کردار تخلیق کر رہا ہے۔ اس کا ایک ٹیک آف پوائنٹ ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر مصنف تخلیق کرتا ہے۔ اسے نوسٹلجیا کہہ دینا مجھے بڑی عجیب بات لگتی ہے۔ آخر نقاد دل نے اپنے آپ کو اس جیسے چند الفاظ میں کیوں گرفتار کر لیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... جس ناول کا ذکر ہو رہا ہے وہ میں نے اسی مہینے پڑھا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ۱۹۴۴-۴۳ء میں کوئی فلم بن رہی تھی جس کے مکالمے علامہ اقبال نے لکھے تھے۔

قرۃ العین حیدر... کہانی علامہ اقبالؒ نے لکھی اور مکالمے خواجہ حسن نظامی نے لکھے اور فلم کے مکالمے آزاد نے لکھے تھے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... دوسری ایک بات ہے کہ اپنے ناول میں آپ نے ایک خاتون کے پہلے دیوان کا ذکر کیا ہے اور اس کے سرورق کی تصویر بھی دی ہے۔ یہ فکشن ہے یا حقیقت۔

قرۃ العین حیدر... ملک جان کے دیوان کے ٹائٹل کے لیے میں نے شروع میں لکھا بھی ہے کہ بشکریہ برٹش لائبریری لندن اور سرورق کی تصویر بھی دی ہے پھر آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ یہ فکشن ہے کیا آپ نے اسے دیکھا نہیں۔ ملک جان ایک گلوکارہ تھیں۔ ان کی بیٹی گوہر جان تھیں اسی لیے میں نے اس ناول کو نیم دستاویزی کہا ہے۔ دوسری بات علامہ اقبالؒ کے بارے میں ہے جو بلا تحقیق اپنی طرف سے کیسے کہہ سکتی ہوں کہ انھوں نے فلم کی کہانی لکھی تھی۔

ڈاکٹر سلیم اختر... یہاں کسی کو اس بات کا علم نہیں۔

قرۃ العین حیدر... اس لاعلمی کے متعلق میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ نیرنگ خیال کے ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کے شمارے دیکھیے۔

ان میں آپ کو فلم افغان شہزادہ کا اشتہار پورے صفحہ پر مل جائے گا۔ جس کی کہانی علامہ اقبالؒ نے لکھی تھی۔

حسن رضوی... "گردشِ رنگِ چمن" پر بہت سے تبصرے آ چکے ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ آپ کے اس ناول کا ڈھانچہ آپ کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں بہت مضبوط ہے۔

قرۃ العین حیدر... ہو گا۔

سجاد حیدر ملک... آپ کے اس ناول میں ایک جہت مجھے اور نظر آئی۔ آپ نے نوآبادیاتی دور کی ایک لڑکی کے کردار کا ذکر کیا ہے جو فرانسیسی اور ہندوستانی والدین کی اولاد ہے۔ پھر ایک اور انگریز نوجوان ہے جو انگریز اور ہندوستانی والدین کی اولاد ہے۔ اس جہت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

قرۃ العین حیدر... یہ مسئلہ آئڈنٹٹی کرائسس کا ہے۔ یعنی ہم اصلیت میں کیا ہیں۔ یہ مسئلہ آج کل کافی لوگوں کو پریشان کر رہا ہے۔ فرداً فرداً بھی اور قومی سطح پر بھی۔ اینگلو انڈین طبقے کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلومات ہیں۔ جس گارڈنر خاندان کا میں نے ذکر کیا ہے یہ انگریز اور ہندوستانی والدین کی اولاد ہیں۔

اور ان میں سے بہت سے لوگ ابھی موجود ہیں۔ گارڈنر خاندان کے بہت سے نکاح فارسی اور اُردو میں میرے پاس موجود ہیں۔ جن میں درج ہے کہ مسٹر فلاں فلاں گارڈنر کی شادی بلقیس زمانی بیگم سے ہوئی۔ اس طرح مسلمان لڑکیوں اور عیسائی لڑکوں میں نکاح ہوا کرتا تھا اور دونوں اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے تھے۔ اس طرح کے کئی خاندان ہیں۔ اسکنز اور کرک پیٹرک وغیرہ۔ رام بابو سکسینہ کی کتاب "اُردو کے انڈین یوروپین شعراء" آپ نے دیکھی ہوگی۔ گارڈنر خاندان کے متعدد افراد کا ذکر اس میں ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں۔

میں نے کتاب "گردشِ رنگِ چمن" میں سلیمان شکوہ کے اینگلو انڈین سلسلے کا تذکرہ کیا ہے۔ شہزادہ سلیمان شکوہ کی لے پالک بیٹی قمر چہرہ کے سگے پڑپوتے بھی اینگلو انڈین ہیں اور دلی میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت سے خاندان آج بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ انگریز فوجی اور پلانٹر تھے۔ اکثر مسلمان نوابوں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے تھے۔ بشپ آف کلکتہ ان شادیوں کو درست قرار دیتا تھا۔ یہ دراصل ایک کلاس کا معاملہ تھا۔ ایک صاحب لارڈ رابرٹس تھے۔ ان کے خاندان کی ایک شاخ تھی۔ ان کے ایک بھائی کی اولاد میں امام باڑہ شاہ نجف کے ایک صاحب مرثیہ خواں بھی ہوئے۔ ہر زمانے کے اپنے معیارا در اخلاقیات ہوا کرتی ہے اور اس کو قبول بھی کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی سے لے کر ۱۹۲۰ء تک ایک مخلوط انڈو برٹش کلچر رہا جس کا ایک سبب انگریزوں اور مسلمانوں کی آپس کی شادیاں بھی تھیں۔

ابصار عبدالعلی :۔ ہندستان میں ششی کپور نے ایک فلم بھی ایسے ہی ایک خاندان کے بارے میں بنائی ہے جس میں انگریز مرد کی ہندستانی عورت سے شادی ہوئی ہے۔ اس ضعیف ہندستانی عورت کا کردار عصمت چغتائی نے ادا کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر... جی ہاں اس فلم کا نام "جنون" ہے۔ مسوری میں ایک اینگلو انڈین ادیب رہتے ہیں جن کا نام رسکن لانڈ ہے۔ اس کہانی کی بنیاد غالباً ان کی کسی رشتہ دار کی ڈائری میں لکھے ہوئے واقعات پر رکھی گئی ہے۔

سجاد حیدر ملک... آپ کے ناول گردشِ رنگِ چمن میں عنبرین کا جو کرب ہے وہ کسی بھی اور کردار سے الگ ہے۔

قرۃ العین حیدر... اس کا کرب اس لیے الگ ہے کہ وہ ایک ایسی قدامت پرست سوسائٹی میں پیدا ہوئی جہاں شادی کا ادارہ قائم ہے۔ اگر وہ آج کے امریکہ یا سویڈن میں پیدا ہوئی ہوتی جہاں شادی کا ادارہ تقریباً ختم ہو چکا ہے تو اس کے کرب کی یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ عنبرین اس کرب کا سامنا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک قدامت پسند معاشرہ میں رہ رہی ہے۔

ابصار عبدالعلی... مگر فرانس، امریکہ اور سویڈن کی وہ نسل جو شادی کے بغیر پیدا ہوئی ہے ابھی چھوٹی ہے۔ اسے آگے چل کر اس کرب کا سامنا ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... اس ناول پر آپ نے بڑی محنت کی ہے۔ بڑی تحقیق کی ہے۔ یہ بتائیے کہ اسے تحریر کرنے پر آپ کا کتنا وقت صرف ہوا۔

قرۃ العین حیدر... کوئی چار پانچ مہینے لگے۔ میں رام پور چلی گئی تھی۔ وہاں بیگم صاحبہ رام پور سے بے نظیر کے میلے اور گوہر جان وغیرہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ بیگم رضا علی خاں آف رام پور کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

سجاد حیدر ملک... چونکہ ہر مصنف کا کسی بھی تخلیق کو مکمل کرنے کا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بارے میں بتائیے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... محسوس ہوتا ہے کہ تحریر کے مقابلے میں تحقیق پر آپ کا وقت زیادہ صرف ہوا۔

قرۃ العین حیدر... آپ کی مراد یہ ہے کہ میری تحریر سرسری ہے۔

ابصار عبدالعلی... آپ پاکستان تشریف لائی ہیں یقیناً آپ کو یہاں سے اپنے نئے ناول کے لیے بہت سا مواد ملا ہوگا۔ ہم آپ کے نئے ناول کی کب تک توقع کریں۔

قرۃ العین حیدر... میں اس کی قائل نہیں کہ کسی ملک میں ایک دو مہینے کے لیے جاؤں اور وہاں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرلاؤں۔ یا اپنے تاثرات کی بنا پر کوئی ناول لکھ ڈالوں۔

ابصار عبدالعلی... مگر ایک طبقہ ایسا ہے جو ایسا کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر... اگر کرتا ہے تو غلط کرتا ہے

ڈاکٹر سلیم اختر... لوگ تین دن کسی ملک میں رہتے ہیں اور سفرنامہ لکھ ڈالتے ہیں۔

ابصار عبدالعلی... بلکہ بعض سفرنامے تو پاسپورٹ سے پہلے ہی مکمل ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر... یہ بھی غلط ہے۔ چند دن کے مشاہدے پر رپورتاژ تو لکھا جاسکتا ہے جو میں نے بہت لکھے ہیں ناول نہیں لکھا جاسکتا۔

ابصار عبدالعلی... آپ تقریباً اٹھائیس تیس برس کے بعد پاکستان آئی ہیں۔ ہندستان اور یہاں (پاکستان) کی معاشرت، رہن سہن میں آپ کو کیا فرق محسوس ہوا!

میزبان... یہاں بہت سے لوگوں سے آپ ملی ہیں جن میں مصنف اور فن کار سب ہی شامل ہیں۔ تو اس ضمن میں آپ کے کیا تاثرات ہیں۔

قرۃ العین حیدر... یہاں چند طبقات کو جو خوشحالی ملی ہے۔ اس میں وہ بڑے خوش ہیں۔ بڑے مطمئن ہیں۔ رائٹرز بھی ہمارے ہاں جیسے ہیں، خوب جھگڑتے ہیں۔ بحثیں کرتے ہیں۔ گو ان کے مسائل دوسرے ہیں اور ہندستان کے ادیبوں کے دوسرے۔

ڈاکٹر سلیم اختر... پاکستان کے قیام کے بارے میں کوئی رپورتاژ تو لکھا جائے گا یا وہ بھی نہیں۔

قرۃ العین حیدر... دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر آغا سہیل... یہ بتائیے کہ آپ نے جس زوال پذیر معاشرہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے اس معاشرے کے زوال کے محرکات عوامل کیا تھے۔

قرۃ العین حیدر... اس کی بنیادی وجہ اٹھارویں صدی میں بادشاہوں کی عیاشی اور جدید تعلیم کی طرف سے بیزاری تھی۔ میں نے اس بات کی ایک فوجی مہم جو کلاڈ مارٹن کے حوالے سے پیش کیا ہے جو ہندستان آتا ہے۔ وہ یورپین بچوں کے لیے ایک زبردست ٹرسٹ چھوڑ کر جاتا ہے۔ جس کے تحت آج بھی ایک کالج چل رہا ہے۔ اس کے زمانے میں مسلمان فوجی سردار صرف عیاشی میں لگے رہے۔ ایک کالج ایک اسکول نہیں کھولا۔ جدید تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ کلاڈ مارٹن سے آصف الدولہ توپیں ڈھلواتے تھے جو ٹیپو سلطان کے خلاف استعمال کی

سجاد حیدر

گئیں۔ خانہ جنگیوں میں استعمال ہوئیں۔ یہ کس قدر کربناک صورت حال تھی۔

جس توپ کا میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ ٹیپو سلطان کے خلاف استعمال ہوئی وہ آج بھی لا مارٹینیر کالج کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ عیاشی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انگریز جب ٹیپو سلطان کو ہرا کر آتے ہیں تو اس خوشی میں انگریزوں کی طرف سے چندا بائی مہ لقا کو منصب عطا ہوتا ہے جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ابصار عبدالعلی... اور چندا بائی مہ لقا نے قبول کر

کرتیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر... کیوں نہ کرتی، چندا بائی بھی تو اسی زوال پذیر معاشرہ کی فرد تھی۔ مطلب یہ کہ زوال تو شروع ہوگیا تھا مگر مسلمانوں میں اس کا احساس شروع نہیں ہوا تھا۔

ابصار عبدالعلی... سرسید کے دور میں آکر یہ احساس جاگا۔ غالب کے ہاں بھی یہ احساس ملتا ہے۔

قرۃ العین حیدر... جی ہاں... شاہ ولی اللہ کے ہاں بھی یہ احساس موجود تھا۔ لیکن ایک اور حوالے سے تھا۔ مگر اس سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ ماڈرن کونشس تو تھی ہی نہیں۔ میں نے اپنی کسی کتاب میں لکھا ہے کہ کچھ انگریزی کتابیں عیسائی مشنریوں نے ترجمہ کروائی تھیں۔ یہ ڈاکٹر جانسن کی کچھ کتابیں اور کچھ دوسرے ناول تھے اور انھیں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے لیے ماڈل بنایا تھا۔

ڈاکٹر آغا سہیل... جیسے توبۃ النصوح۔

قرۃ العین حیدر... جی نہیں۔ یہ ڈاکٹر جانسن کا ایک ناول تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ یورپین اس قدر مہذب ہیں کہ کالے لوگوں کو تہذیب آشنا کرنا اور ان پر حکومت کرنا ان کا حق ہے۔ یہ ناول اردو میں ترجمہ کرا کے لوگوں کو پڑھائے جاتے تھے۔ اس دور کے مسلمانوں میں کچھ حساس اور ذہین لوگ بھی تھے جیسے بادشاہ نصیرالدین حیدر۔ اس نے لکھنؤ کو واقعی جدید بنانے کی کوشش کی، ہسپتال، پرنٹنگ پریس اور انگریزی اسکول قائم کیے۔ مگر انگریزوں نے اسے بھی عیاشی اور حرم میں لگا دیا اور وہ سب بھول گیا۔ اب آپ جو یہ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کا زوال دکھایا ہے تو اس زوال کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ میں نے محض آنکھ بند کر کے نہیں لکھا۔ یہ مسلمانوں کا نہیں ایک تہذیب کا زوال تھا۔

میزبان... بھارت میں اردو کا مستقبل کیا ہے

قرۃ العین حیدر... یہ ایک سیاسی سوال ہے اور اس سے ادبی گفتگو میں اس کا مفصل جواب دینے کی گنجائش نہیں۔ ہندستان میں اردو کے مستقبل کا انحصار وہاں کے سیاسی حالات پر ہوگا۔ اس برصغیر میں زبانوں کی سیاست ایک پیچیدہ صورت اختیار کر چکی ہے۔ پاکستان اس نوع کی صورتِ حال کا سامنا مشرقی پاکستان کے زمانے میں کر چکا ہے۔ آج بھی

علامہ اقبال بہت بڑے شاعر اور مفکر تھے
میں ان سے بے حد متاثر ہوں

برصغیر کے لسانی مسائل کا تعلق ان ممالک کے سیاسی معاملات سے ہے۔

میزبان... انتظار حسین کو آپ نے پڑھا ہے ان کی کہانیوں اور ناول میں ایک ہی صورتِ حال ہے لیکن آپ نے اپنے ناولوں میں مختلف اسالیب سے کام لیا ہے۔ یہ شعوری کوشش کا نتیجہ ہے یا یہ لاشعوری طور پر ہوا ہے۔

قرۃ العین حیدر... ہر شخص کا اپنا اپنا اسٹائل ہوتا ہے۔

میزبان... پاکستان اور ہندستان دونوں جگہ آپ کے ناولوں کے حوالے سے آپ کے مغرب زدہ ہونے کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر... بھئی سارا پاکستان، سارا ہندستان

ہی مغرب زدہ ہوگیا ہے۔

سجاد حیدر... آپ کی کتابوں میں انگریزی کے لفظ بہت آتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر سے نفسیاتی ٹرینڈ کا آغاز کیا

قرۃ العین حیدر... اردو کی شاعری، تنقید اور افسانے میں انگریزی کے بے حد الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ آپ نے یہ سوال کیا۔ مجھے تعجب ہوا۔ روز مرہ کی بول چال میں آپ خود انگریزی کے کتنے الفاظ بولتے ہیں۔

سجاد حیدر ملک... میرا مطلب ہے کہ بہت سے انگریزی الفاظ جو آپ استعمال کرتی ہیں اس کے اردو متبادل موجود ہیں۔

قرۃ العین حیدر... میرے بارے میں اظہار رائے اور "تنقید صرف چند الفاظ یعنی نوسٹلجیا" مغرب زدگی اور انگریزی زبان کا استعمال میں ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ بات مختصر یہ کہ ہمارے ہاں فکشن کی تنقید ہے ہی نہیں۔ ابھی ہمارے ہاں فکشن کو پڑھا ہی نہیں گیا۔ آپ لوگ بس شاعری کو سمجھ لیتے ہیں کیونکہ یہ اردو بہت پہلے سے موجود ہے۔

ابصار عبدالعلی:... ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اس کا جواب دیں۔ جیسی آپا تنقید نگار پر تنقید کر رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر... ٹھیک کر رہی ہوں۔ ہمارے ناقدین نے فکشن کو پڑھا ہی نہیں۔ بس شاعری پر تنقید کرتے ہیں اور اچھی تنقید کرتے ہیں۔ فکشن پر تو تنقید کی ہی نہیں گئی۔

ڈاکٹر آغا سہیل... اور اگر کی بھی گئی تو تنقید نگار نے اسی حوالے سے خود اپنا قد بڑا کرنے کی کوشش کی۔

ابصار عبدالعلی:۔ تاریخیت کے حوالے سے جیلہ ہاشمی کے ناولوں کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے۔ خاص طور سے "چہرہ بہ چہرہ" "روبرو" پر جو قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں ہے اور "دشت سوس" جو منصور کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر... میں کیا تبصرہ کروں۔ جیلہ ہاشمی زندہ ہوتیں تو خود بتاتیں۔

ابصار عبدالعلی... میں ایک بہت بڑی ناول نگار سے اس کے بعد آنے والی ناول نگار کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ دونوں ہم عصر بھی ہیں۔

قرۃ العین حیدر... ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔

میزبان... دونوں ملکوں کے ادیبوں اور فنکاروں کی آمد و رفت کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں آپ کا خیال۔

قرۃ العین حیدر... یہ سیاسی سوال ہے یہ لوڈڈ سوال ہے

میزبان..... ہندوستان کے علاوہ آپ کی تمام کتابیں پاکستان سے بھی مختلف ناشرین نے شائع کی ہیں۔ سنا ہے ان ناشرین سے آپ کو کچھ شکایات ہیں۔

قرۃ العین حیدر... بھئی کچھ نہیں۔ بہت سی شکایات ہیں۔ دیکھیے "آگ کا دریا" کے پہلے اڈیشن ۱۹۶۰ء سے لے کر آج تک مجھے رائلٹی ادا نہیں کی گئی۔ جب کہ پاکستان میں میری رائلٹی کے قانونی حق دار موجود ہیں۔ جن کو رائلٹی ادا کرنے کے لیے میں نے بار بار ناشرین کو لکھا۔ اس ناول کے متعدد اڈیشن پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان پر ناشرین کی طرف سے یہ اطلاع بھی موجود ہے کہ "جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں" اور یہ کتاب مصنفہ کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔ میں نے جو کتابیں لکھی ہیں جو ۱۹۶۰ء تک پاکستان اور تا دم تحریر برانڈ یا میں چھپی ہیں۔ ان کی تحریر ایک درجن سے زائد نہیں۔ علاوہ چند روسی کتابوں کے تراجم کے جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیے تھے لیکن پاکستان میں میری کتابیں جو مختلف عنوانات سے

بلا اجازت چھاپی جا رہی ہیں ان کی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ یہ کتابیں لاہور، راولپنڈی اور کراچی کے ناشرین نے میرے مختلف افسانوں اور مضامین کے عنوانات کے رد و بدل کے ساتھ شائع کی ہیں اور اس طرح قارئین کو بھی دھوکا دیا ہے۔ میں ضروری سمجھتی ہوں کہ ان تمام جعلی اڈیشنوں کی فہرست یہاں شائع کر دی جائے جن کو میری بغیر اجازت اور مختلف عنوانات سے چھاپا گیا ہے "کار جہاں دراز ہے" پہلی دو جلدیں اکٹھی کر کے اسے ایک ساتھ چھاپا گیا ہے۔ ایک اور کتاب کا نام "میرے بہترین افسانے" ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افسانے گویا میں نے خود منتخب کر کے ناشر کو دیے ہیں۔ بیشتر کتابوں پر میری ایک پرانی تصویر بھی چھاپی جاتی ہے۔ حال ہی میں "ہمیں چراغ ہمیں پروانے" کے سرورق پر یہ تصویر کلر میں شائع کی گئی ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ان کتابوں کے اندر "انتساب" میری طرف سے خود تحریر کر کے شامل کیے گئے ہیں اور دوسرے مصنفین کے مضامین بطور دیباچہ موجود ہیں۔ میری کتابوں کے جو مختلف جعلی اڈیشن شائع ہوئے وہ یہ ہیں۔

(۱) میرے بھی صنم خانے (۲) ستاروں سے آگے۔ (۳) سفینۂ غم دل (۴) شیشے کے گھر (۵) آگ کا دریا (۶) آخر شب کے ہم سفر (۷) پکچر گیلری (۸) سیتا ہرن (۹) کار جہاں دراز ہے (جلد اول و دوم) (۱۰) پت جھڑ کی آواز (۱۱) روشنی کی رفتار (۱۲) آدمی کا مقدر (۱۳) ماں کی کھیتی (۱۴) گردش رنگ چمن (۱۵) گمگشتہ (۱۶) ایس کے گیت (۱۷) چائے کے باغ (۱۸) تلاش (۱۹) جہاں دیگر (۲۰) ہمیں چراغ ہمیں پروانے (۲۱) ڈالنگو (۲۲) دلربا (۲۳) جہاں پھول کھلتے ہیں (۲۴) قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے (۲۵) میرے بہترین افسانے (۲۶) فصل گل آئی یا اجل آئی (۲۷) جگنوؤں کی دنیا (۲۸) اودھ کی شام (۲۹) روشنی کی رفتار (۳۰) تین ناولٹ (۳۱) خضر سوچتا ہے (۳۲) ستمبر کا چاند (۳۳) کلیسا میں قتل (۳۴) اڈنے خاکے (۳۵) کچے گھروندے (۳۶) جہاں پھول کھلتے ہیں (۳۷) چار ناولٹ۔

یہ نامے

دہلی سے

قرۃ العین حیدر

کا خط

نئی دہلی ۱۲ر جون ۸۸ء

جناب حسن رضوی صاحب السلام علیکم۔ کل مجھے لندن سے کسی نے جنگ کا تراشہ انٹرویو کی پہلی قسط کا بھیجا۔ آپ نے تو بھیجا نہیں اسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ جو مسودہ میں نے تصحیح کر کے آپ کو بھیجا تھا وہ شائع نہیں کیا گیا۔ بہرحال اب ایک ضروری تصحیح منسلک کر رہی ہوں اس کو جنگ کے سارے پاکستانی اڈیشن اور لندن اڈیشن میں فوراً شائع کروا دیجیے۔

شکریہ والسلام

(قرۃ العین حیدر)

ایک ضروری تصحیح

اپنے انٹرویو دجنگ لندن ۳-۴ جون ۱۹۸۸) میں میں نے کہا ہے کہ علامہ اقبال کی کہانی پر مبنی فلم کا اشتہار رسالہ نیرنگ خیال میں چھپا تھا۔ پاکستان سے واپس آکر میں نے اپنے کاغذات میں چیک کیا۔ علامہ اقبال کی لکھی ہوئی کہانی کا اشتہار نیرنگ خیال میں نہیں بلکہ ماہنامہ تصویر لاہور میں شائع ہوا تھا اور اس کی پوری عبارت میں نے نقل کرلی تھی۔ یہ رسالہ مجھے صولت لائبریری رام پور دیوپی) میں ۱۹۸۳ء میں دستیاب ہوا۔ اس کتب خانے میں اردو رسالوں کا نایاب ذخیرہ موجود ہے۔

ایشیاٹک مووی ٹون لمیٹڈ لاہور کا پہلا بہترین شاہکار افغان شہزادہ یا ترکی خون

جس کی کہانی ایشیا کے مایۂ ناز شاعر علامہ سر محمد اقبال کے جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مکالمے خواجہ حسن نظامی نے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر شاہ جی آغا ایشیاٹک مووی ٹون لمیٹڈ۔ بیڈن روڈ۔ لاہور

رسالہ تصویر لاہور ص ۱۸ جنوری ۱۹۳۵ء

پس نوشت... مولانا ابوالکلام آزاد کی کہانی اور مکالموں پر مبنی فلم۔ بنگال ٹاکیز کلکتہ نے اناؤنس کی تھی ڈائریکٹر موہن بوس۔

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

غزل نما — ادا جعفری — ۷۵/-
سازِ سخن — " — ۴۵/-
ترجمۂ قرآن — پروفیسر مشیر الحق — ۸/-
تحقیقی مضامین (تحقیق) مالک رام — ۶۰/-
باتیں کچھ سریلی سی (سوانح ماہرین موسیقی) داؤد رہبر — ۳۶/-
خسرو نامہ (تحقیق) مجیب رضوی — ۲۱/-
تعلیم و تربیت اور والدین (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۵۱/-
کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) جگن ناتھ آزاد — ۴۹/-
پتھر بولے جیون..... (ڈرامے) عمیق حنفی — ۴۵/-
ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش — ۲۱/-
بنجر بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر — ۳۳/-
دائروں میں پھیلی لکیر (شعری مجموعہ) کشور ناہید — ۳۰/-
آنکھ میں سمندر (شعری مجموعہ) زاہد ڈار — ۳۰/-
تذکرہ (ناول) انتظار حسین — ۵۴/-
ذرے کی کہانی (سائنس) مہدی جعفر — ۲۱/-
حیات جامی (سوانح) مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۲/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات (خطبہ) پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی — ۸/-
نقشِ ذاکر (مضامین) مرتب: عبدالحق خاں — ۵۱/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ) شمس الرحمٰن محسنی — ۵/-
دنیا کے بڑے مذہب (علمی) عماد الحسن آزاد فاروقی — ۸۵/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۵/-
تعلیم اور رہنمائی (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں (تعلیم) معین الدین — ۱۵/-
یادوں کا اجالا (آپ بیتی) بھگوان سنگھ / مترجم شمیم حنفی — ۴۰/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات (مضامین) مرتبہ: عماد الحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-

پنشکن کے دیس میں (سفرنامہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد — ۲۵/-
آنکھ اور خواب کے درمیان (شعری مجموعہ) ندا فاضلی — ۲۱/-
سدا بہار چاندنی (افسانے) رام لعل — ۳۰/-
دل دریا (افسانے) شروَن کمار ورما — ۲۵/-
رنگ نمبر (انشائیے) شفیقہ فرحت — ۱۴/-
رات کے مسافر (شعری مجموعہ) مرتبہ انور سجاد — ۲۸/-
زوال کا عروج (ڈراما) بریخت مترجم: انور عظیم — ۳۶/-
اثبات و نفی (تنقیدی مضامین) شمس الرحمٰن فاروقی — ۴۰/-
مالک رام ایک مطالعہ (مجموعہ مضامین) مرتبہ علی جواد زیدی — ۵۰/-
فی الحال (مزاحیہ مضامین) یوسف ناظم — ۱۸/-
حرف حرف روشنی (شعری مجموعہ) حمایت علی شاعر — ۳۵/-
فرار (ناول) ظفر پیامی — ۴/-
تین چہرے تین آوازیں (افسانے) صالحہ عابد حسین — ۱۸/-
نقدِ حرف (تنقیدی مضامین) پروفیسر ممتاز حسین — ۴۰/-
گدازِ شب (شعری مجموعہ) معین احسن جذبی — ۴۰/-
سرسید کی تعلیمی تحریک (روداد) اختر الواسع / مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد — ۲۵/-
گفتارِ غالب (مضامین) مالک رام — ۴۸/-
تعلیم اور اس کے وسائل (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۹/-
تحفۃ السرور (آل احمد سرور پر مضامین) مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-
غالب اور صفیر بلگرامی (تحقیق) مشفق خواجہ — ۳۶/-
جائزے (تبصرے) مرتبہ مظفر حنفی — ۴۵/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ (مجموعۂ مضامین) مرتبہ خلیق انجم — ۳۰/-
مجھے گھر یاد آتا ہے (ڈرامے) شمیم حنفی — ۲۱/-
رسول اکرمؐ اور یہود حجاز (علمی) سید برکات احمد۔ ترجمہ مشیر الحق — ۴۰/-
تاریخ انگلینڈ (ایک مختصر خاکہ ۱۴۸۵ء - ۱۹۰۱ء) (خاکہ) سید محمد عزیز الدین حسین — ۹/-
محبوب الارث (علمی) مولانا اسلم جیراجپوری — ۴/-
دردِ دل (افسانے) تعارف۔ قرۃ العین حیدر۔ ستار جعفری [illegible]
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیبی لین دین اور فنونِ لطیفہ) مرتبہ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی [illegible]

☆ ☆ ☆

رفعت سروش

D-2/A,DDA FLATS,
MUNIRKA,
NEW DELHI-110067.

آوارہ بادل

میں اک آوارہ بادل ہوں
میں اُڑتا پھر رہا ہوں وسعت افلاک میں،
بے نام، اَن دیکھی فضاؤں میں
کبھی میں کوہ و صحرا پر،
کبھی میں دشت و دریا پر،
کبھی آبادیوں کے اونچے محلوں پر،
کبھی کچّے گھروندوں پر،
کبھی سرسبز کھیتوں پر،
کبھی پیاسے پٹھاروں پر
گزرتا ہوں جدھر سے،
رقص کرتا ہوں سُرور و کیف و مستی میں
مگر ہر لمحہ یہ احساس رہتا ہے،
نہ جانے کب بکھر جائے ہواؤں کا یہ شیرازہ
نہ جانے کب، کہاں پر، میں برس جاؤں
ابھی میں دیو پیکر ہوں
نہ جانے کب مگر میں قطرہ قطرہ بن کے بہہ جاؤں
نہ روکو تم مجھے اے آسمانوں کے نگہبانو!
مجھے اُڑنے دو، اُڑنے دو،
فضا میں رقص کرنے دو،
نہ پوچھو میری منزل کا پتا مجھ سے
کہ میں آوارہ بادل ہوں

ڈاکٹر حقیر آستانی

702, Gold Crown,
J.P.Road, andheri (West)
BOMBAY.

اجنبی

اجنبی ہوں
اب تو اپنے آپ سے بھی
رفتہ رفتہ
ہوگیا ہوں اجنبی
میری اب پہچان مشکل ہوگئی ہے

یہ سہی دستورِ عالم، نظمِ قدرت
کوئی شے بھی ایک محور پر نہیں رہتی

مگر ہے بات اتنی
میں نہیں ہوں جو کہ تھا
پھیلا ہوا، سمٹا ہوا، اُلجھا ہوا، سُلجھا ہوا
میں جو بھی تھا
اب وہ
نہیں ہوں
سوچتا ہوں کیا زمانے کے فسانوں میں
کہیں ہوں؟

خالد رحیم
Mani Sahoo Chowk,
Buxi bazar,
CUTTACK-753001.

چھوڑ آئے ہیں کہاں بزمِ طرب مت پوچھو
خود کو سولی پہ چڑھانے کا سبب مت پوچھو

اسی مٹی سے حسب اور نسب تھا اپنا
کیوں ہوئے شہر میں آوارہ نسب مت پوچھو

ہم بھی پوشاک اتار آئے عجائب گھر میں
وقت کا سلسلۂ غیظ و غضب مت پوچھو

اپنا گھر چھوڑ کے آئے تھے جو خیموں کی طرف
زندگی ساتھ انھیں لائی تھی کب مت پوچھو

دھوپ کے شہر میں ہم روند گئے تھے خود کو
لوگ کیوں ہم پہ ہوئے خندہ بہ لب مت پوچھو

خود سے دوری کا بھی احساس نہ ہو پایا کبھی
فاصلے، درمیاں کیسے تھے عجب مت پوچھو

چاند کو میں نے کئی بار پکارا خالد
کیوں میرے ساتھ چلی تیرۂ شب مت پوچھو

ملک زادہ جاوید
6,professor's Flat,
babu Ganj,
LUCKNOW.(U.P.)

اگر یہ راہ میں بوڑھا شجر نہیں ہوتا
شدید دھوپ میں مجھ سے سفر نہیں ہوتا

ہمارا عہد ہے مردہ پرست لوگوں کا
جلا چراغ یہاں معتبر نہیں ہوتا

امیرزادے جو خود کو سنبھال کر رکھتے
حویلیوں کا مقدر کھنڈر نہیں ہوتا

میں اپنے بچوں کو مرنے کے بعد کیا دیتا
جو میرے پاس بزرگوں کا گھر نہیں ہوتا

عظیم لوگوں کی تاریخ پڑھ کے دیکھ ذرا
کوئی بھی معرکہ، لمحوں میں سر نہیں ہوتا

اکبر علی خاں عرشی زادہ
PHULWAR,
RAMPUR-244901.

فیض — اختر شیرانی کی صدائے بازگشت

چند اشارے

فیض اپنی ابتدائی تعلیم مرے کالج سیال کوٹ سے مکمل کرکے اعلا تعلیم کے لیے ۱۹۲۹ء میں لاہور پہنچے۔ ان کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ لاہور کی عظیم ادبی روایت ہی میں فیض نے اپنے ادبی مزاج کو بنایا، سنوارا اور نکھارا اُنہیں سے وہ باقاعدہ طور پر ادبی محفل میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُردو کے مشہور رومانوی شاعر اختر شیرانی کی نغمگی اُردو کی ساری فضا میں بسی ہوئی تھی اور جس کے زیر اثر آنے سے اختر شیرانی کے معاصر ہم عمر شعرا مثلاً ساغر نظامی، روش صدیقی اور احسان دانش وغیرہ بھی نہیں بچ سکے تھے۔ تو پھر فیض اس نغمگی سے مسحور ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے جن کا مزاج بھی رومانی تھا یہی وجہ ہے کہ فیض کی کئی ابتدائی نظمیں موضوع اور لہجے دونوں اعتبار سے اختر شیرانی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

اختر شیرانی اُردو کے اوّلین سانیٹ لکھنے والوں میں سے ہیں اور شاید سب سے بہتر سانیٹ نگار بھی۔ فیض کی ابتدائی کئی نظموں میں اختر شیرانی کے سانیٹ عکس پذیر نظر آتے ہیں۔ فیض کی یہ نظمیں سانیٹ تو نہیں کہی جا سکتیں البتہ سانیٹ کی ہیئت اور مزاج سے قریب تر ضرور ہیں۔ یہاں یہ امر بھی لائق اظہار ہے کہ اختر شیرانی کے سانیٹوں کا مجموعہ فیض ہی کا مرتبہ ہے اور انھوں نے ہی اس کا پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ فیض کی مذکورہ نظموں میں اختر شیرانی کے الفاظ ہی نہیں دکھائی دیتے فضا بھی صاف محسوس ہوتی ہے۔ وہ اختر شیرانی سے اپنے نیاز مندانہ تعلقات کے ذکر کے باوجود فیض نے خود کہیں یہ اعتراف نہیں کیا کہ وہ براہ راست اختر شیرانی سے متاثر ہیں۔ لیکن جن حضرات نے اختر شیرانی اور فیض دونوں کو پڑھا ہے ان کے لیے فیض کی جانب سے کسی اعتراف کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ البتہ فیض نے کیٹس اور شیلی نیز انگریزی کے دوسرے رومانی شعرا سے متاثر ہونے کا ذکر اکثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کی ابتدائی نظمیں یعنی نقشِ فریادی کا بیشتر حصہ اختر شیرانی اور انگریزی کی رومانوی شاعری کا امتزاج معلوم ہوتا ہے۔

گورنمنٹ کالج سے فراغت کے بعد ۱۹۳۵ء میں فیض نے امرتسر کے ایم اے او کالج میں انگریزی کے لکچرار کے طور پر ملازمت کر لی۔ یہاں ان کی ملاقاتیں رام پور کے صاحبزادہ رشید الظفر

اور ان کی باذوق اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئیں۔ یہ دونوں ترقی پسند تحریک کے زبردست مبلغ اور مارکسسٹ تھے۔ جلد ہی انھوں نے فیض کو متاثر کر لیا اور فیض اس تحریک کے لیے سرگرم رکن بن گئے کہ پھر پنجاب میں تحریک کی رہنمائی فیض ہی نے کی۔

قارئین اگر اس امر کو بھی پیش نظر رکھیں تو بہتر ہوگا کہ فیض ذاتی طور پر بھی اختر شیرانی سے بہت نزدیک تھے۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' (ص ۵۰ تا ۵۲ طبع ۱۹۵۹ء) میں لکھا ہے کہ جب وہ اس تحریک کا علم لے کر پنجاب پہنچے تو فیض انھیں اختر شیرانی سے ملانے لے گئے اور ان سے تحریک کی حمایت میں اس کے محضر پر دستخط حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سجاد ظہیر اور فیض دونوں کی نظر میں اختر شیرانی کی اہمیت کس قدر تھی۔

بگمان غالب، فیض امرتسر پہنچنے سے قبل ہی اپنے عشق میں ناکام ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے فیض کی اس دردمندی کو بھانپ لیا۔ اور ان کے دل میں غم عشق کے ساتھ غم جہاں کا بیج بھی بو دیا۔ اس تخم ریزی نے فیض کو ایک نئے نشے سے آشنا کیا۔ جو غم عشق سے مل کر دو آتشہ ہو گیا۔ اور فیض کی شاعری کو صحیح سمت میسر آگئی۔ اب فیض نے جو نظمیں کہیں ان میں شعوری طور پر ترقی پسند خیالات اور عقائد کو بھی سمویا۔ وہ بنیادی طور پر رومانی مزاج کے مالک تھے اس لیے تحریک سے وابستگی کے باوجود بھی ان کی شاعری پر محبوب ہی چھایا رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"، "رقیب سے" اور "موضوع سخن" جیسی چونکا دینے والی نظمیں تخلیق کیں۔ گو ان نظموں میں عشق جاناں سے دست برداری کا برملا اعلان کیا گیا ہے لیکن فیض کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ واقعتہً وہ غم عشق سے دست بردار کبھی نہیں ہوئے۔ اور نہ کبھی اختر شیرانی کے اثرات سے باہر نکل سکے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" پڑھ کر جو فیض کی ایک مشہور نظم کا بنیادی خیال ہی نہیں ان کے زباں زد مصرعوں میں سے بھی ایک ہے اختر شیرانی کا یہ مصرعہ ؎

اور بھی بخشیں ہیں مسجد میں عبادت کے سوا

یاد آجانا قدرتی بات ہے۔ اسی طرح فیض کی ایک نظم میں "رقیب سے" ان کا دوستانہ رویہ بھی اختر شیرانی کی ایک مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کے درج ذیل مصرعے سے متاثر ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ ؎

ہم دونوں تھے جس کے پروانے وہ شمع شبستاں کیسی ہے ؟

اختر شیرانی کے اس مصرعے میں جس خیال کو پیش کیا گیا ہے اس کی ندرت اور اہمیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ چناں چہ ۱۹۳۹ء میں فراق گورکھپوری نے اردو کی عشقیہ شاعری پر اپنا مقالہ لکھا تو اس میں فیض کی نظم "رقیب سے" کا خاص طور پر تذکرہ کیا اور ان الفاظ میں داد دی کہ اس موضوع پر جو کچھ فیض نے اپنی نظم میں لکھا ہے اس سے زیادہ کالی داس، سعدی اور شیکسپیر بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ جیسا کہ اختر شیرانی کے مندرجہ بالا مصرعے سے ظاہر ہے بنیادی خیال اختر شیرانی ہی کا ہے اس لیے داد کے پہلے مستحق بھی اختر شیرانی ہی ٹھہرتے ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ فیض نے اختر

شیرانی سے موضوع اور بنیادی خیال مستعار لینے کے باوجود اس کو اپنی تحریک کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جو قلم کاری کی ہے اس نے مضمون کو موجودہ ذہن کے لیے کچھ اور پرکشش بنا دیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فیض نے اپنے چراغ کے واسطے روغن اختر شیرانی ہی کے چراغ سے لیا ہے۔ امر بھی سامنے رہنا چاہیے کہ اختر شیرانی کی نظم "اودیس سے آنے والے بتا" کی بحر فیض کی پسندیدہ ترین بحروں میں سے ہے اور فیض کی تقریباً بیس غزلیں اور نظمیں اختر شیرانی کی اسی نظم کی بحر میں لکھی گئی ہیں۔

نقشِ فریادی کے بعد دستِ صبا اور زنداں نامہ دونوں قید و بند کے تجربات پر مبنی ہونے کے باوجود رومان اور حقیقت کے سنگم کو پیش کرتی ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے بھی کئی جگہ اختر شیرانی کی یاد آجاتی ہے۔ دستِ صبا کی ایک مشہور اور مقبول نظم "دو عشق" ہے اس کا مرکزی خیال اختر شیرانی ہی کے چار مصرعوں کا مرہونِ منت ہے ملاحظہ ہو۔

عشق و آزادی بہارِ زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی مرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

بلکہ ان مصرعوں کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ فیض نے عشق کو قربان کرنے کی س طرح جرأت بھی نہیں کی جس طرح اختر شیرانی نے کی۔

فیض نے دستِ صبا اور زندہ نامہ ہی میں نہیں بعد کے کلام میں بھی، خاص طور پر غزلوں بں دار و رسن، قید و بند اور صیاد و قفس کو سیاسی پس منظر میں جس طرح استعمال کیا ہے اسے اختر شیرانی بض سے بہت پہلے استعمال کر کے دکھا چکے تھے۔ اور فیض کے سامنے یہ نمونے موجود تھے۔ لبانگِ قفس" کے نام سے اختر شیرانی کی ایک غزل مسلسل ہے جس کا زیادہ موزوں عنوان "زنداں نامہ" وتا۔ اختر شیرانی کے زنداں نامے کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مدت سے نہ آئی کوئی خبر یارانِ گلستاں کیسے ہیں؟
اے بادِ صبا آ نا تو بتا سرو و گل و ریحاں کیسے ہیں؟
پابندِ قفس تو کیسے کہیں اور کس سے کہیں رودادِ قفس
آزادِ قفس بتلائیں ہمیں اربابِ گلستاں کیسے ہیں؟
ہر ایک قدم یہاں محبسِ غم ہر تازہ ستم اک محشرِ الم
اس حال میں پوچھیں کس سے یہ ہم غم دیدۂ کنعاں کیسے ہیں؟
ہمدرد ہے اپنا کون یہاں لا تو ہی خبر اے بادِ خزاں
اس سال وطن کے باغوں میں گل ہائے بہاراں کیسے ہیں؟
غربت ہی نہ تھی کم ہوش رُبا اس پر یہ اسیری رنج فزا
ہے کون جو پوچھے آ کے ذرا آباد یہ زنداں کیسے ہیں؟

اے موجِ نسیمِ صبحِ چمن خوش باش سنا حالِ وطن
کہدو وطن کس حال میں ہیں وادی و خیاباں کیسے ہیں؟

کیا پوچھتی ہے اے شامِ قفس افسانۂ رنگ و بوئے چمن
ہم قیدیوں کو کیا علم کہ اب گل کیسے، گلستاں کیسے ہیں؟

گلبانگِ قفس ہی بن جائے اے کاش نوائے آزادی
کیا کہیے کہ اختر سینے میں مچلے ہوئے ارماں کیسے ہیں!

اختر شیرانی سے فیض کی اثر پذیری تفصیلی مطالعہ کا موضوع ہے یہاں میرا مقصود صرف چند اشارے کرنا تھا۔ فیض کی شاعری کو تارِ حریر دو رنگ کا حسن نصیب ہوا تو اس میں اختر شیرانی کی شاعری اور اس کے اثرات کو ضرور دخل ہے ورنہ فیض جس تحریک سے وابستہ تھے اس کے بیشتر قلم کاروں کا تخلیق کردہ ادب نعروں سے بھرا ہوا ہے اور ایک یلغار کی سی کیفیت نظر آتی ہے اس کے برخلاف فیض ہیں جن کی شاعری دیوار پر لگے ہوئے پوسٹر یا الیکشنی تقریر سے مختلف ہے۔

فیض کے پڑھنے والوں کو ان کے کلام میں کہیں کہیں اندازِ بیان کی اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس کا سبب فیض کا یہ حسنِ ظن ہے کہ وہ اپنے قاری کو انگریزی شاعری سے اتنا ہی آشنا جانتے ہیں جتنے وہ خود تھے۔ شکر ہے کہ فیض نے اُردو شاعری کے کلاسکی سرمائے سے بھی فیض اٹھایا اور اس کی لفظیات کو اس حسن، خوبی اور سلیقے کے ساتھ استعمال کیا کہ یہی آج ان کی پہچان اور شناخت بھی ہے۔

فیض تقریباً نصف صدی تک لکھتے رہے۔ اور ایک پرتسلسل ادبی شخصیت بنے رہنے کے بعد ۲۰ر نومبر ۸۴ء کو ہم سے رخصت ہوگئے۔ ادیبوں اور شاعروں کی زندگی میں جہاں ان کے خیالات اور شخصی زندگی کے پہلوؤں کو سمجھنا آسان ہوتا ہے وہیں کچھ موانع بھی ہوتے ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کی زندگی میں اس پر لکھنے والے کبھی کبھی دلداری کی خاطر یا دل آزاری کے خوف سے مکمل سچ نہیں لکھ پاتے۔ لیکن کسی فنکار کے بزمِ ہستی سے اٹھ جانے کے بعد جب لپسے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں کہ اس فنکار کے اندازِ فکر یا اندازِ بیان میں کوئی تبدیلی آئے۔ دلداری اور دل آزاری کا معاملہ بھی اتنا نازک نہیں رہتا جتنا اس فنکار کی زندگی میں ہوتا ہے اب نقد و نظر کی نئی راہیں کھلتی ہیں، جائزہ لینے والوں کے سامنے فن کار کا کل سرمایہ ہوتا ہے اور وہ آزادانہ اظہارِ خیال بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ آج فیض کی شخصیت اور فن پر لکھنے والوں کا معیار گزشتہ سے بہتر ہوگا۔ اور پرکھ کی بنیاد بھی زیادہ مضبوط دلائل پر رکھی جائے گی۔

اختر شیرانی اور فیض کے رشتوں کی طرف اشارے کرنے کا مقصد اور سبب بس یہی ہے کہ کوئی صاحب اس موضوع پر مفصل اور مبسوط تحریر پیش کر سکیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو ادب کی سب سے زیادہ متاثر کرنے والی اور سب سے زیادہ ہدفِ تنقید بننے والی تحریک کے لاتعداد شعرا میں سب سے روشن نام فیض ہی کا ہے اور اس منصب پر وہ ہمیشہ فائز رہیں گے۔ شرف ہر دور میں معدودے چند کو نصیب ہوتا ہے فیض اسی مختصر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

[illegible] اس طرح برآمد ہوئے جیسے [illegible] پناہ میں تھے — [illegible]

میں امّی کے پاس بھاگا کہ ساری خواتین سے مخدوم کا تعارف کروانے کا سہرا اپنے سر باندھ لوں — [illegible] دم کون سے ہیں — کہاں ہیں مخدوم؟ — مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے — امّی، بیگم صاحبہ، پھوپی [illegible] جانے کون کون خواتین جمع ہیں۔ سبھی سے، میں ذرا اپنی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتا ہوں — [illegible] بابا، میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ آپ لوگوں کو بتلاؤں — مخدوم کون ہیں؟

چلمنیں، بیش پردے، اب کچھ اس طرح ہلنے لگے ہیں، جیسے ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں — شعرا اپنے [illegible] طرف بڑھ رہے ہیں — وہ رہے مخدوم — وہ — وہ رہے — ابھی جنھوں نے اپنے بال برابر کیے — ہاں ہاں وہی لمبے بالوں والے، کیا پہن رکھا ہے؟ — پہن رکھا ہے — پہن رکھا ہے — کسی نے [illegible] کسی نے نہیں دیکھا — میں اپنی اہمیت جتلا چکا تھا — اب مجھے کیا کہ کسی نے نہیں دیکھا ہو — پھر [illegible] شعرا کے کیمپ میں چلا آیا۔

کتنی اہمیت تھی میری خواتین کے کیمپ میں — اس خیمے میں آکر مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں کچھ [illegible] ہوں ہی نہیں — ہر ایک کا منہ تکتا ہوں، پھر ذہن میں ان کے ناموں کا ورد کرتا ہوں — لیکن ہر پھر کر نظر مخدوم محی الدین پر جم جاتی ہے — چہرے چہرے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں — پھر کیا وجہ ہے کہ آنکھیں ان کو دیکھنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہیں — سارے شاعر ہنس بول رہے ہیں — لیکن مخدوم کچھ مطمئن نظر نہیں آتے — جانے کس چیز کی کمی ہے — وہ کچھ سوچ رہے ہیں — احباب کے لیے کچھ ہنس بھی لیتے ہیں — لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اندر سے کچھ ٹوٹے ہوئے ہیں — ہاتھ میں کامریڈ رندیوے کی کوئی کتاب ہے — [illegible] دور پانو فرش میں دھنس رہے ہیں۔

تمکین صاحب سے مخاطب ہو کر کہ رہے ہیں —

اتنا آرام کہ جی گھبرانے لگے۔

تمکین صاحب مخدوم کے مدّاحوں میں ہیں — ان کو مشاعرے میں مدعو کرنے سے پہلے ہی انھوں نے گھر بھر میں مخدوم کی بہت سی باتیں کی ہیں — انھوں نے بڑے پیار سے پوچھا —

"کیوں؟ — کچھ مطمئن نہیں ہو"

کہا — "ہاں — زیادہ آرام کی بے آرامی سے غیر مطمئن ہوں"

تمکین صاحب بات کی تہ تک پہنچ نہ سکے — کہا "کچھ دیر آرام کرنا چاہو تو پلنگ لگوا دوں"

مخدوم مسکرائے — کہنے لگے "میں مزید کچھ منگوانے کی بات نہیں کر رہا ہوں جو ہے اس کو اٹھوانے کی بات کر رہا ہوں — آپ لوگوں نے تو یہ احساس ہی چھین لیا کہ ہمارے پیر زمین پر ہیں — شاعروں کو ہمیشہ اپنے پیر زمین پر رکھنے چاہییں"

مجھے مخدوم سب سے مختلف، کچھ نرالے سے لگے — میں کونے میں کھڑا انھیں تکتا اور سوچتا رہا کہ یہ عجیب تقشف آدمی ہے — ایسی بھی کیا قلندری کہ آدمی اپنی راہ سے پھول ہٹا کر کانٹے بچھانے کا مطالبہ کرے —

[illegible]
ہیں۔ مگر وہ ابھی مشاعرہ گاہ کی طرف چلنے کے لیے مائل نہیں ہیں ــــ تشنگی جام و مینا شباب پر ہے۔ مشاعرہ شروع کروا دیجیے، تمکین صاحب، ہم بس آتے ہی ہیں ــــ کسی نے کہا۔

مخدوم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے ــــ "نہیں نہیں، یہ بری بات ہے۔ وہاں بھی بہت سے شاعر ہیں جو ہمارے منتظر ہیں۔ ہم سے سُننا اور ہم کو سنانا چاہتے ہیں"۔ مخدوم کا اٹھنا تھا کہ محفل کی حیات و کائنات ساتھ ہوئی۔

لطیف ساجد نے مجھے ٹہوکا دیا ــــ حسینی شاہد یوں مسکرائے جیسے زندہ باد کا نعرہ لگا رہے ہوں ــــ کوئی احترام، کوئی بے نام سی عظمت، سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھی۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ مقامی شعرا کے بعد مہمان شعرا نے نظمیں اور غزلیں سنائیں۔ خوب خوب داد حاصل کی ــــ نظر حیدر آبادی، صاحبزادہ میکش اور شیب حزیں نے سماں باندھ دیا۔ اس مشاعرے کے سب سے نوعمر شاعر لطیف ساجد تھے۔ چنانچہ مہمان شعرا میں ان کا نام سب سے پہلے پکارا گیا۔

لطیف ساجد

ترنم میں پڑھتے تھے اور ڈوب کر پڑھتے تھے۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ مخدوم نے ان کی آمد آمد کا مژدہ اہلِ ذوق کو سنا دیا تھا۔ اس کم عمری میں زبان پر ایسی دسترس، لہجے میں ایسا گداز کہ شعر کی تہ داریاں بکھر جائیں ــــ تیور کہہ رہے تھے کہ مستقبل ان کا منتظر ہے لیکن اس بار طرحدار نے مستقبل کو انتظار کی زحمت نہیں دی اور اس درجہ شتابی سے نکل گیا جیسے محفل میں آیا ہی نہیں تھا ــــ میرا حیدر آباد دفنانے اور دفنا کر بھول جانے کے ہنر میں بڑا مشاق ہے ــــ لطیف ساجد نوجوانی میں تو مر گیا تھا پھر اور زندہ رہتا تو شاید حیدر آباد کے ذہن کا حصہ بن سکتا کیونکہ ہند و پاک کے مؤقر جرائد میں ابھی ابھی اس کا کلام شائع ہونے لگا تھا ــــ باہر سے اگر آپ اپنی توقیر اور ناموس کا سامان فراہم کرتے ہیں تو میرا حیدر آباد آنکھ اٹھا کر آپ کی طرف ایک نظر دیکھ سکتا ہے ــــ وہ خود سے کسی کو کچھ نہیں دیتا ــــ اتنا ہنستا بستا قبرستان آپ نے کیوں دیکھا ہوگا ــــ اداس آنکھیں، شعر میں انہیں آنکھوں کی اداسیاں شاید مکمل مل گئی تھیں ــــ سنا رہے ہیں۔ ؎

آخر آخر شکستگی دل کی
زندگی کے شعور تک پہنچی

سلیمان اریب

سلیمان اریب سنبھل کر اٹھے ہیں۔ گورا چٹا رنگ، تیکھے نقوش، بشرہ بتا رہا ہے کہ میں شاعر ہوں ــــ چہرے پہ چیچک کے داغ لگتا ہے انھوں نے بڑے چاؤ سے سجا رکھے ہیں۔ اس کے باوجود پرکشش شخصیت۔ لانبے سنہرے بال ــــ زندگی کو ابھی با اندازِ دگر نہیں دیکھا ہے ــــ ابھی تو چاہنے اور چاہے جانے کے دن ہیں ــــ ان منزلوں سے گزر کر سلیمان اریب نے بہت جلد عروسِ حیات کے چہرے سے جب گھونگھٹ اٹھایا تو اسی لغزش پا نے دور تک ان کا ساتھ دیا جس کے بل بوتے پر وہ اُردو شاعری کی زلفیں سنوارنے

تھے لیکن عروسِ حیات گریزاں تھا ۔۔ ترنم میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے سنا رہے ہیں ؎

گوری باہیں مری گردن میں حائل کر دیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کر دیں

نظر حیدر آبادی

سانولا سلونا رنگ ۔ دکن کا یہ شاعر بہت تیزی سے مقبول خاص و عام ہوتا جا رہا ہے ۔ شاعری ورثے میں ملی ہے ۔ علی اختر کا بیٹا جن کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا ۔ یہ وہی علی اختر ہیں جن کے قولِ فیصل کو علامہ نیاز فتح پوری نے کبھی جوش ملیح آبادی کے حرفِ آخر پر فضیلت دی تھی ۔۔ نظر حیدر آبادی ترنم میں پڑھتے ہیں ۔۔ رنگ اتنا کم ہے کہ گندمی بھی نہیں کہا جا سکتا ۔۔ لیکن نقوش ایسے تیکھے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھوں کو چہرے کی کشش اپنا لیتی ہے ۔۔ پاٹ دار آواز اور آواز کے زیر و بم پر ایسی قدرت کہ چٹیاں لگ لگ کر مزا دیتی ہیں ۔۔ بہت اطمینان سے نغمہ سرا ہیں ۔ شہرت حیدر آباد سے آگے نہ جا سکی ورنہ ہندوستان کے اچھا پڑھنے والوں میں شمار ہوتا ۔ کراچی میں پیوند خاک ہوئے ۔

فسانہ سنانے کو جی چاہتا ہے
انہیں بھی رلانے کو جی چاہتا ہے

علی صائب میاں

لیجیے صاحب ۔ مشاعرے کے سنجیدہ ماحول میں کچھ پھلجڑیاں بھی تو چھوٹیں ۔۔ دراز قد کا یہ شاعر کہیں سے شاعر نظر ہی نہیں آتا ۔۔ بھورے دیدے ، کھلا رنگ ، چہرے پر دور دور تک کوئی ایسا پر تو نہیں جو دیکھنے والوں کی نظروں کو گھڑی بھر اپنے پاس ٹھہرا سکے ۔ نہ دیکھو تو آنکھیں دیکھنے کا تقاضا نہیں کریں گی اور جو دیکھو تو کسی نہ کسی بہانے کچھ اور تلاش کریں گی ۔۔ وردی پہنا دو تو فوجی لگے ۔ کمبل اٹھا کر ہاتھ میں درانتی دے دو تو کسان لگے ۔۔ حیدر آباد کی کھڑی بولی یا مقامی زبان میں شعر کہتا ہے اور سچ پوچھیے تو شاعری کا حق ادا کرتا ہے ۔ تحت میں طرح پڑھتا ہے جیسے گھاس کاٹ رہا ہو ۔۔ ہاں گھاس البتہ سلیقے سے کاٹتا ہے لیکن شعر میں ایسی صلابت ہے کہ آپ کا ذہن گرفت سے نکل نہیں سکتا ۔ یہ قومی ہیکل دہقانی شاعر بڑی قومی ہیکل شاعری کرتا ہے ۔۔ عنوان جنگ ہے ۔ سامعین ہنسنے کے بجائے گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں ۔ ؎

قبر میں بند ہو کر اب سفر انسان کرتا ہے
دیا لے کیا چلے ہیں ایک قبرستان چلتا ہے

نذیر دہقانی

اب چونکہ مشاعرے کا رنگ بدل گیا ہے اس لیے نذیر دہقانی کو زحمتِ کلام دی جاتی ہے ۔ بہت کم رو ، مشت استخوان علی صائب میاں کی ضد ۔۔ حیدر آباد کی کھڑی بولی کو اس قدر صحت کے ساتھ استعمال

کر نوالا شاعر کہ اس کے کلام سے دیہاتی زبان اور محاورے کو استناد حاصل ہو۔ گویا یہ دکنی دیہاتی زبان کے میرانیس ہیں۔ بہت سُریلی مگر باریک آواز میں لیکن اتنی باریک کہ پردے کے پیچھے سے اس کی جنس پہچانی نہ جائے۔ پڑھتا ہے تو ایک سماں باندھ دیتا ہے۔ ؎

آنتاں سہتا جا' ہنستا جا، گاتا جا
ہنڈی والے

اشعار یاد نہیں رہے۔ ہر بند کے بعد بنڈی والے کا ٹکڑا، دو بیلوں کی اس سواری اور سواری کے چلانے والے سے کچھ اس درجہ تعلق خاطر پیدا کر دیتا ہے کہ آپ شاعر کی آواز میں ہمدردانہ آواز ملانے لگتے ہیں اگر آدابِ مشاعرہ مانع نہ ہوں۔

اب مشاعرے کو پھر سے اس کی سنجیدگی عطا کر دینا ذرا مشکل ہے۔ لہٰذا تھوڑی دیر کے لیے وقفہ دیا جاتا ہے اور چائے کے دور کے بعد دو ایک مقامی شعرا پڑھائے جاتے ہیں جو قریبی قصبات سے تاخیر سے پہنچے ہیں اور اپنا کلام سنانے کے خواہش مند ہیں۔ مشاعرے کا رنگ بدل جاتا ہے حضرت تمکین سرمست منتظم مشاعرہ سے اپنا نام پکارنے کی خواہش کرتے ہیں۔ تاکہ مشاعرہ پوری طرح اس کیفیت کو چھوئے جس کو محسوس کر کے انھیں یہ طمانیت ہو سکے کہ باقی مہمان شعرا کے لیے انھوں نے سامعین کا اشتیاق فزوں تر کر دیا۔

تمکین سرمست

تمکین سرمست ترنم میں پڑھتے ہیں۔ آواز بہت سُریلی پائی ہے لیکن سر دھیمے ہیں۔ اپنی مشہور نظم "آنکھ مچولی" سنا رہے ہیں جو کبھی علامہ نیاز فتح پوری کے نگار میں شائع ہو کر اس درجہ مقبول ہوئی تھی کہ تمکین حیدرآباد میں آنکھ مچولی والے تمکین کی مناسبت سے یاد کیے جانے لگے تھے۔ تمکین سرمست اور تمکین کاظمی کی پہچان میں گویا اس نظم نے اپنا حصّہ ادا کیا۔ نظم کی غنائیت، لفظیات کی نرم روئی اس پر مستزاد حُسن و محبت کا موضوع۔ یہ نظم اپنی گہرائی اور تہ داری معنی آفرینی کے سبب بلند ہے۔ عہدِ طفولیت کی معصومیت بھی اس میں ہے، غرورِ حسن کی تمکنت بھی۔ بچے پڑھیں تو اپنی سمجھیں، نوجوان پڑھیں تو سوچ سوچ کر سر دُھنیں۔ چنانچہ اس نظم نے عرصے از بر ہو کر دادی۔ مشاعرے نے پھر سے اپنی تہذیب و تکمیل کے سامان فراہم کر لیے ہیں۔ ؎

چور بنے تم حیراں ہوں میں
کیا کروں اور اب کیا نہ کروں میں
کس کے دل میں جا کے چھپوں میں
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

صاحبزادہ میکش

اس کے بعد تمکین سرمست نے صاحبزادہ میکش کے نام کی فرمائش کر دی۔ تمکین جانتے تھے کہ قدم

کے حیدرآباد کی مقبول ترین شخصیت صاحبزادہ میکش کی ہے۔ مشاعرہ جس کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ میکش بھی ترنم میں پڑھتے ہیں۔ رندی و سرشاری کو تجسیمی پیکر عطا کرنے والا یہ جواں سال شاعر اپنی آنکھوں سے شراب چھلکاتا ہوا پڑھتا ہے۔ پُرگوئی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت نے بھی ذہن رسا کو بے بس نہیں کیا۔ خاصا ضخیم دیوان چھوڑ کر اس نے آسمان کی پہنائیاں وقت سے پہلے ناپ لیں۔

شرابِ ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا
پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا

صمد رضوی ساز

صمد رضوی ساز جامعہ عثمانیہ کے جانے مانے شاعر ہیں۔ گورا رنگ، میانہ قد، گٹھیلا بدن۔ صورت سے شاعر کم عہدہ دار زیادہ لگتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں مجلۂ عثمانیہ کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ترنم میں شعر سناتے ہیں۔ بڑے تکلف اور رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ ترنم میں جو دھیمی دھیمی لَے ہے وہ اسی رکھ رکھاؤ نے ان کے شعر کو ودیعت کی ہے۔ نظم سنا رہے ہیں۔ مفلس دہقانوں کا مرثیہ جیسے خود دہقانوں کو لوری دے رہے ہوں ۔۔ موضوع سے کتنا الگ الگ سے کٹے کٹے سے ہیں۔ نہ سپردگی نہ وارفتگی۔ اسی غیر فطری، پُر تصنع اندازِ تفکر نے انھیں شعر کی گیرائی تک پہنچنے نہ دیا اور وہ پاکستان منتقل ہونے سے پہلے ہی بہ حیثیت شاعر بھلا دیے گئے۔ ہاں شعرائے عثمانیہ کی جلد اوّل میں محفوظ ہیں۔ ؎

بوڑھے املی بن میں مفلس دہقانوں کی اک وادی
یعنی تمدن کی لعنت، تہذیب کی خانہ بربادی

اب سامعین میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ آبا حاکم ضلع تھے۔ ان کی موجودگی میں نظم و ضبط کا مظاہرہ سا کے لیے ضروری تھا۔ اس کے باوجود کسی نہ کسی گوشے سے دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔۔ مخدو مخدوم محی الدین ۔۔ آبا نظریں اٹھا کر ہر اس گوشے کی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں گویا تنبیہ تھی، تاکید بھی اس بات کی کہ، ملحوظ و ملزوم رہے کہ مشاعرہ صرف تفریحِ طبع کے لیے نہیں ہے ۔۔ سخن فہمی ذہن و دل کی ایسی شائستگی کا نام ہے جو دل کی پاسبانی بھی کرتی ہے اور ذہن کو کبھی تن بھی نہیں کرتی لیکن اس عمل میں مزاحمت کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا سوائے موانست کے ۔۔ تمکین سرمست بھی بھانپ گئے تھے کہ یہ بے چینیاں اب رنگ لا کر ہی رہیں گی ۔۔ چنانچہ انھوں نے خود اعلان کیا کہ ہمارے مہمان شاعروں میں شعیب حزیں نے اپنے کلام سے ابھی ہمیں نہیں نوازا ہے۔ ان کے بعد مخدوم محی الدین آپ جی بھر کر سن سکتے ہیں۔

شعیب حزیں

شعیب حزیں آئے۔ شعرائے عثمانیہ میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے حزیں کو بڑا اعتبار حاصل تھا کہتے بھی بڑی منجھی ہوئی اور سجل غزل تھے۔ ان کے نوک پلک سے درست اشعار غزل کا مزاج پہچانتے تھے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ڈوب ڈوب کر مضامین کی کھوج شاعری کے بحرِ بے کنار میں ان کی غواصی کا پ

دیتی تھی۔ پڑھتے بھی اچھا تھے۔ عجیب کھن کھناہٹ تھی آواز میں جیسے چاندی کے سکے شیشے کے فرش پر گر رہے ہوں۔ پازیب لگتا تھا رقاصہ کے پاؤں سے نکل کر ان کے گلے میں بج رہی ہے۔ پاکستان چلے گئے پھر کسی کو کچھ خبر نہ ملی، اللہ کرے حیات ہوں۔ ؎

ہم تو حزیں یہ سمجھے تھے دامن جو بھگو دے پانی ہے
آنسو تو وہی اک قطرہ ہے پلکوں پہ جو تڑپے بہہ نہ سکے

مخدوم محی الدین

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی — مشاعرہ گاہ میں ایک عجیب انجانی سی ہل چل مچ رہی تھی لوگ اپنی نشستیں درست کر رہے تھے۔ جس کو جس قدر قریب آنے کا موقع تھا کھسک آتا تھا۔ مخدوم آئے۔ دبتا ہوا رنگ، تیکھے نقوش، کھب جانے والا چہرہ، لانبے لانبے بال، چھریرا بدن، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس شخص میں کیا ہے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس شخص میں کیا نہیں ہے — لوگ کسی شخص سے نہیں شاید شخصیت سے مل رہے تھے۔ کلام کا سحر، آواز کا فسوں، سینوں میں دل جیسے رُک رُک کر دھڑک رہے تھے۔ کون جادوگر تھا وہ۔ لوگ مسحور تھے، مبہوت تھے۔ مخدوم جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی تھے۔ ان کی آواز کا درد شعر میں ڈھلتا رہتا اور شعر کی غنائی جراحتیں آواز میں ڈھلتی رہیں۔

جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جائے پسینے میں
مے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

فرمائش ہوئی کہ آواز نے روح پر کمندیں پھینکیں

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

یوں محسوس ہوتا کہ مشاعرہ گاہ میں سارے کے سارے جسم اپنی روح کا انتظار کر رہے ہیں۔

بانسری سی بجائے جاتا ہے
آگ تن میں لگائے جاتا ہے

نئی دُلھن کی تھرتھری بن کر
اس کے ہونٹوں کی کپکپی بن کر

میرے دل میں سما گیا کوئی
میری ہستی پہ چھا گیا کوئی

نظم "سجدہ" ختم ہوئی کہ تلنگن کا شور اُٹھا — تلنگن سنانے لگے تو مشاعرہ گاہ میں کتنی ہی آوازیں تھیں جو مخدوم کے ساتھ نغمہ سرا تھیں۔ مخدوم پڑھتے پڑھتے رُک کر مسکرانے لگے لیکن مشاعرہ جاری رہا۔

دخترِ پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کی تہذیبِ نو سے بے خبر

اب مخدوم سامع کی حیثیت سے اپنی نظم سُن رہے تھے۔ یہ باتیں ۱۹۳۹ء کی ہیں۔

(۲)

میں سٹی کالج میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں ۔ لطیف ساجد اور حسینی شاہد انٹرمیڈیٹ میں تھے۔ مخدوم اُستاد بن کر سٹی کالج آچکے تھے ۔ ایک دن ہم نے سُنا کر اُردو کی کلاس اب مخدوم محی الدین لیا کریں گے۔ ہماری خوشی چھپائے نہیں چھپتی ہے ۔ اُردو کے اُستاد آدمی بھلے سے تھے لیکن مزاج دینیات کے مولوی کا رکھتے تھے ـــ ادبیات پڑھانے اور دینیات پڑھانے میں جو فرق ہے اس کو محسوس کرنا بھی بچاروں کے بس کا روگ نہ تھا ۔

کسی اُستاد کے لیے شاگرد کو علم سے نواز دینا کوئی بات نہیں ہے کہ وہ روٹی اسی کی کھاتا ہے ۔ کتنے ایسے استاد ہیں جنھوں نے اپنے شاگردوں کو شعور سے نوازا ـــ علم اور بات ہے، آگہی اور ہی کچھ ـــ مخدوم محی الدین کلاس میں آئے تو درسی کتابیں بستوں میں دھری رہیں ـــ پہلا سوال استادِ محترم نے یہ کیا ۔

تم لوگوں میں شاعر کون کون ہے ـــ ارے یہ تو آتے ہی دوست بن گئے ۔ یہ دوست بننے والا استاد کچھ ہی دنوں میں اپنے شاگردوں کا دل بن کر دھڑکنے لگا ـــ میں غلو سے کام نہیں لے رہا ہوں ـــ مخدوم محی الدین کسی شخص کا نام نہیں ہے ۔ ایک محبت کا نام ہے ۔ ایسی محبت کا جو دل میں بستی بھی ہے اور دل میں بسا بھی لیتی ہے ـــ حیدرآباد ہوسکتا ہے کہ مخدوم سے بڑا شاعر پیدا کرے لیکن مخدوم سے بڑے انسان کے لیے جانے کتنی صدیاں وقت کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر چلا ئیں گی کہ سارے سمندر کھنگال ڈالے ۔ کسی منجد سیپی میں ویسا موتی نہیں ملا ۔

توصاحب ارشاد ہوا ـــ کلاس میں جتنے شاعر اور ادیب ہیں، ہاتھ اُٹھائیں "
ہاتھوں کو گن کر مسکرائے ۔ کہنے لگے ـ " کلاس کی اکثریت میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتی ہے ـــ کہا ـ اپنا اپنا تعارف کراؤ "

ہم اُٹھتے جاتے ـــ اپنا اپنا نام اور تخلص بتاتے جاتے

اختر شاہ خاں عادل ، غلام مصطفےٰ ساغر ، عاتق شاہ خاں ، منیر الدین شرر ، نور الدین نور ، سیف الدین سیف ، رحمت اللہ رحمت ، ناظم علی ناظم ، سبحان علی نشتر ، سید مسیح الدین خاں متین وغیرہ ـــ اور بھی نام ہیں ایک نام جو اپنے تخلص کی بنا پر اہم ہے، جو رہ گیا ہے ـــ اسد علی فی ہو ۔

پوچھا ـــ " یہ فی ہو کیا ہے "

منیر الدین شرر بڑے شریر تھے ـــ واقعی شرر تھے ۔ تعارف بھی انھوں نے ہی کروایا تھا ـــ کہنے لگے ـ

" جی اِن کا پاتابوں (موزوں) کا کارخانہ ہے ۔ ' فائین ہاوزیری ورکس ' اس کا مخفف ہے فی ہو ـــ اور یہ تخلص بھی یہی کرتے ہیں "

اسد علی کھڑے ہوئے خجل ہو رہے تھے ۔ طبعاً بڑے شریف اور کم گو آدمی تھے ۔ مخدوم کو ان کی شرم و حیا پر ترس آیا ہوگا ـــ اسد سے محبت سے بات کی ـــ اور منیر الدین شرر سے مخاطب ہو کر کہا ـــ

مخدوم کو ان کی جسارت بُری نہیں لگی، لیکن دوسروں کو شرمندہ کرکے خوش ہونے والی ادا کچھ بھائی نہیں ـــ شاید اسی لیے "گربہ کشتن روزِ اوّل" کے مصداق انھوں نے شرر کو آپ اور جناب کہہ کر مخاطب کیا ـــ

کچھ ہی دن میں ہم جان گئے کہ مخدوم کسی طالب علم سے خفا ہو کر بات کریں تو "تم" کے بجائے آپ کہیں گے ـ جناب کہہ دیں تو سمجھو کہ زیادہ ہی خفا ہیں۔

ہم لوگ محسوس کرتے کہ یہ شخص دوسرے استادوں سے مختلف ہے۔ خفا ہوگا تو تم سے تو کے بجائے تم سے آپ کہے گا۔

کلاس میں اشا سید ما جواب دے دیں یا سبق یاد کیے بغیر پڑھنا چاہیں تو رہ ـــ جناب آپ بیٹھ جائیے، کہہ کر کھڑے ہوئے طالب علم کو بٹھا دیں گے۔ جہاں دوسرے استاد بیٹھے ہوئے طالب علم کو کھڑا کر دیتے ہیں۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مخدوم کا آپ کہہ دینا ہمارے لیے کتنی بڑی سزا تھی۔ اور ہم کتنے ملول ہو جاتے تھے ـــ کلاس میں ان کے تم کہہ کر مخاطب کرنے تک جی نہ لگتا۔ لگتا کوئی چیز ہم نے کھو دی ہے۔

ایک بار کلاس میں مشاعرہ ہو رہا تھا ـ شاگردوں سے کلام سننے کے بعد مخدوم اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ اکثر و بیشتر ایسے مواقع پر جب کہ کلاس درس و تدریس سے نکل کر شعر خوانی کے حوالے ہو جاتی تھی تو کلاس کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے تاکہ قریب کی دوسری کلاسیں بھی نہ شریک ہو جائیں اس دن شاید باہر کی ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ضد تھی کہ مخدوم کو سنیں۔ بھڑے ہوئے پٹ کھل گئے مخدوم نظم سناتے رہے۔ کسی نے کھلے دروازے کی طرف نظر بھی نہیں کی۔ اعظم صاحب راؤنڈ لینے کے لیے نکلے۔ وہ پرنسپل تھے۔ ان کا طریقہ تھا وہ کلاس کے دروازے میں داخل ہو کر وہیں رک جاتے اور آٹھ دس سکنڈ بعد آگے بڑھ جاتے یا کسی کلاس پر نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر جاتے اور اتنا ہی اساتذہ کے لیے بہت تھا ـــ چپراسی نے لپک کر بتایا کہ اعظم صاحب آ رہے ہیں ـ مخدوم نے کچھ اس طرح چپراسی کو دیکھا کہ وہ خفیف سا ہو کر چلا گیا، اور وہ نظم سناتے رہے۔ بعد میں اعظم صاحب کے اردلی نے بتایا کہ جب وہ کلاس کے قریب پہنچے تو مخدوم کی آواز سن کر ٹھہر گئے ـ منٹ دو منٹ، تین منٹ ـ اعظم صاحب کو اس طرح کھڑا دیکھ کر طالب علم تو رہے ایک طرف، اساتذہ نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں ـ مخدوم کے نظم ختم کرتے ہی اعظم صاحب لوٹ گئے۔ آگے نہیں بڑھے ـ انھیں مخدوم کی کلاس کے سامنے سے ہو کر گزرنا گوارا نہ ہوا۔

مخدوم، پرنسپل سٹی کالج سید محمد اعظم صاحب کے چہیتے تھے، لیکن وہ بھی اعظم صاحب کا پاس و لحاظ کرتے۔ سٹی کالج کا گولڈن جوبلی فنکشن تھا۔ پرنس آف برار ولی عہد اعظم جاہ بہادر ـ فنکشن کی تقاریب میں شرکت کرنے والے تھے۔ احکام صادر ہوئے کہ پرنسپل سے لے کر سارے اساتذہ دستار اور ریگلوس لگا کر تقاریب میں شریک ہوں ـ مخدوم کے لیے آداب شاہی کھلا چیلنج تھے۔ اُن کے وقار کا مسئلہ تھا۔ وہ شخص جو شاہی کا مخالف تھا۔ وہ شخص جس پر اس کے پیچھے پیچھے آنے والی نسل کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں ـ وہ شخص جسے بادشاہِ وقت سے اس طرح مخاطب ہونا تھا کہ:

حضور آصف سابع پہ ہے عشق
بڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری

بھلا وہ شخص شاہ کے فرزندِ ارجمند کے آگے دستار اور بگلوس لگاکر کورنش بجا لاسکتا ہے ؟ — جو کام دوسروں کے لیے بہت آسان تھا، باعثِ صد افتخار تھا۔ مخدوم کے لیے ناممکن تھا، باعثِ ندامت تھا — انھوں نے اپنے بعد کی نسل کو اس درجہ تیزی سے متاثر کردیا تھا کہ کالج کے نوجوانوں کی اکثریت انھیں تکنے لگی تھی۔ اگر ارشادِ خسروی یہ ہوتا کہ طالب علم بھی دستار اور بگلوس لگاکر آئیں تو ہم کالج چھوڑ دیتے۔ یہ تھا نوجوانوں کا ردِ عمل — انھیں تو اپنے اساتذہ کا بھی اس طرح شاہی کے آگے جھکنا بڑا اہانت آمیز لگ رہا تھا — اور یہ اندازِ فکر دین تھی مخدوم محی الدین کی۔

مخدوم دستار لگائیں گے؟ مخدوم بگلوس باندھ کر کربستہ وصف بستہ کورنش بجالائیں گے؟

"ناممکن۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا"

"یہ ہوکر رہے گا جناب" طلبہ کے ایک مخصوص گوشے سے آواز آئی جن کے پاجاموں کے پائنچے ٹخنوں کے اوپر تھے۔ آصف سابع کو ظل اللہ اور ظلِ سبحانی سمجھنے والے وفاداران علم و ہنر اپنی ٹولیاں الگ بنائے سازشوں میں مبتلا بھی تھے مگن بھی۔

یہ تو حسرت ہی رہ جائے گی دوست — ہمارے گروپ نے آوازہ پھینکا۔

لہجے بدل گئے اور دلوں کا اضطراب کلاس میں اپنے جسم پھینک کر پرنسپل کے اجلاس کے گرد جماؤ بڑھا کر آخر کیا کھچڑی پک رہی ہے — جتنے منہ اتنی باتیں۔ بعض اساتذہ نے جو مخدوم کے چاہنے والے تھے اور جوان کے طالب علموں کے گروپ کو بھی عزیز رکھتے تھے بڑے اعتماد سے یہ بات پھیلادی کہ مخدوم نے اعظم صاحب سے اُن کے پاس ولحاظ کے ساتھ بہت ہی انکسار سے سمجھایا کہ آپ بھی اعظم ہیں۔ آپ کے مہمان خصوصی تو اعظم جاہ ہیں اور بدنصیبی یہ ہے میں بھی خادم نہیں مخدوم ہوں — یہ مثلث آپ غور کیجیے بن ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ لکیریں کہیں مل ہی نہیں سکتیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ میرا استعفا قبول کریں۔

"تو پھر مخدوم استعفا دے دیں گے؟"

"مخدوم کالج چھوڑ دیں گے؟"

"مخدوم ہم سب کو چھوڑ دیں گے؟"

"ہم دیکھیں گے کہ تقاریب کس طرح ہوتی ہیں؟"

آج یہ باتیں جو میں آپ کے سامنے اس طرح آسانی سے کہہ رہا ہوں ان دنوں بڑی مشکل تھیں۔ سرگوشیوں کے لیے بھی دیواریں کان رکھتی تھیں۔ ایک شخص کے ماتھے کی تیوری حیدرآباد کے ہر فرد کی ہتھیلی پر کی لکیر بن سکتی تھی۔ بہت پہلے جوش ملیح آبادی صرف اس بات پر کہ ؎

کسی کی آئی سو اری کسی کی جان گئی

شہر بدر کر دیے گئے تھے — مخدوم کا معاملہ تو پھبتی کسنے اور طنز کرکے گزر جانے کا نہیں تھا — وہ تو سر ہتھیلی پر رکھ کر چلے تھے — اور حیدرآباد کے ہر فرد کی ہتھیلی پر قسمت کی لکیریں بدلنے والی تیوری' یہ جان گئی تھی کہ ایک ہتھیلی ایسی بھی ہے جس پر لکیریں نہیں ہیں سر ہے — اور پھر یوں ہوا تھا کہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے اس سر کے لیے بڑے بڑے انعام و اکرام کا اعلان ہوا — یہ باتیں کچھ بعد کی ہیں — قصہ مختصر — مخدوم کالج ڈے میں اس طرح شریک ہوئے کہ بہت دیر سے آئے — تقاریب میں شرکت نہیں کی — ڈنر میں اپنی سیٹ پر موجود تھے۔

میں مجروح کا یہ شعر ذراسی زمانی ترمیم کے ساتھ نقل کر رہا ہوں ؎

سر پر ہوا ئے ظلم چلی سو جتن کے ساتھ
اس کی کلاہ کج تھی اسی بانکپن کے ساتھ

ایک شاخسانہ اس وقت بھی پیدا کیا گیا تھا۔ جن دنوں مخدوم' سبط حسن کی ادارت میں چھپنے والا رسالہ "نیا ادب اور کلیم" کالج میں لاکر بیچا کرتے تھے ۔ چند اساتذہ نے پرنسپل صاحب تک یہ بات کچھ اس انداز سے پہنچائی کہ مخدوم کمیونسٹ لٹریچر کالج کے نوجوانوں میں بانٹ رہے ہیں اور اس طرح کالج کی علمی اور ادبی فضا مسموم ہو کر بے دینی، الحاد اور ارتداد کی ظلمتوں کا شکار ہو رہی ہے ۔۔۔ پھر مخدوم قومی جنگ لا نے لگے خود بیچتے اور اپنے ہم خیال شاگردوں کے توسط سے بکواتے ۔

اسی زمانے میں مخدوم نے اپنی بے پناہ نظم "انقلاب" کہی تھی ۔

نہ تابناکی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم
گرز بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

آخر ش مخدوم سٹی کالج کی لکچرر شپ سے مستعفی ہو گئے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے ۔

اس طرح مخدوم کا جسمانی وجود ایک حد تک ہم سہل پسندان بساط ادب سے دور ہو گیا لیکن مخدوم جاتے جاتے ہمارے قلم کی روشنائی میں اپنا تھوڑا سا لہو بھی ملاتے گئے اور دیکھتے دیکھتے وہ خون ہماری روشنائی کا جز بن گیا ۔

یہ باتیں ۱۹۴۱ء کی ہیں ۔

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

مانگے کا اجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

آج کل کتاب کی قیمت مصنّف کی قیمت سے بڑھ گئی ہے

ہم آج تک یہ مسئلہ حل نہیں کرسکے کہ میرزا ادیب کسی ایک شخص کا نام ہے یا بہت سے افراد کا۔ نصف صدی سے میرزا صاحب کی ایک ہی جیسی تصویریں چھپ رہی ہیں، بلکہ یہ کہیے کہ ایک ہی تصویر چھپ رہی ہے، جو اُن کی جوانی کے زمانے کی ہے۔ اس تصویر کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ "میرزا ادیب" کے پردۂ زنگاری میں ایک ہی شخص کارفرما ہے، لیکن اس نام سے جو ایک گرس کتابیں چھپی ہیں، وہ موضوعات کے اعتبار سے اتنی متنوع ہیں کہ یقین نہیں آتا کہ یہ ایک ہی شخص کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی شخص رومانی کہانیوں، مختصر افسانوں، ڈراموں انشائیوں، شخصی خاکوں، سفرناموں، کالموں، تبصروں، تنقید پاروں، ترجموں اور بچوں کے لیے کہانیوں کے ڈھیر لگا دے اور ساتھ ہی ان کا معیار اتنا اعلا ہو کہ ہر تحریر پر ادب عالیہ کا گمان گزرے۔ ادب عالیہ سے ہماری مُراد یہ نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی تحریروں پر ڈاکٹر عالیہ امام کی تحریروں کا گمان ہوتا ہے، بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ میرزا صاحب جو کچھ لکھتے ہیں، وہ سراپا انتخاب ہوتا ہے۔

میرزا صاحب نے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں بھی لکھی ہیں، جن میں خود ان کی اپنی سوانح عمری بھی شامل ہے۔ یہ "مٹی کا دیا" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ میرزا صاحب کی سوانح عمری کوئی دوسرا شخص بھی لکھ سکتا تھا، لیکن جس عقیدت اور احترام سے یہ کام خود میرزا صاحب نے انجام دیا ہے، اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ہم نے میرزا صاحب سے عرض کیا تھا کہ ہم آپ کی سوانح عمری لکھنا چاہتے ہیں۔ میرزا صاحب یہ سُن کر خاموش ہو گئے، جس کا واضح طور پر مطلب یہ تھا کہ وہ ہمیں اس کام کا اہل نہیں سمجھتے۔ "اس کام کے لیے عطاء الحق قاسمی کیسے رہیں گے؟ انھیں آپ کے بارے میں بے شمار ایسے واقعات معلوم ہیں، جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔" میرزا صاحب نے فرمایا: "وہ تو کالم نگار ہیں۔" ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے کہ رہے ہوں: "کالم نگاری والے آلودہ ہاتھوں سے وہ کوئی اچھا کام کیسے کر سکتے ہیں۔" ہم نے دو چار اور نام لیے۔ میرزا صاحب نے

سب کو مسترد کر دیا۔ آخر میں فرمایا: "چھوٹے صاحب کسی اور موضوع پر بات کیجیے۔"

"اس واقعے کے کوئی دو مہینے بعد "مٹی کا دیا" شائع ہوئی تو یہ راز کھلا کہ واقعی اس کام کے لیے میرزا صاحب سے زیادہ کوئی اور شخص موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اگر ان کی سوانح عمری لکھتے تو کچھ سنی سنائی باتوں اور کچھ چشم دید واردالتوں کو سو، ڈیڑھ سو صفحے میں قلم بند کر دیتے۔ عطاء الحق قاسمی لکھتے تو افواہوں اور لطیفوں کی مدد سے ڈھائی تین سو صفحات لکھ دیتے لیکن چھ سات سو صفحات لکھنا میرزا صاحب ہی کے بس کی بات ہے۔" "مٹی کا دیا" اردو کی چند بہترین خود نوشت سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں صرف ایک شخص کے حالاتِ زندگی ہی نہیں ملتے، بلکہ پورے ایک عہد کی علمی ادبی اور تہذیبی زندگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ میرزا صاحب نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اُسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے آنے والی نسلوں کے سامنے ایک مستند ادبی و تہذیبی دستاویز پیش کر دی۔

میرزا صاحب ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں، جنھوں نے ادب کی خدمت صرف کتابیں لکھ کر نہیں کی، کئی اور طریقوں سے بھی انھوں نے ہمارے ادب کو نوازا ہے۔ مثلاً موجودہ دور کے بے شمار ادیبوں کی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ وہ سترہ برس تک اُردو کے ممتاز رسالے "ادبِ لطیف" کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ "ادبِ لطیف" اب بھی نکلتا ہے، مگر میرزا ادیب کی ادارت کے زمانے میں یہ محض کاغذی گھوڑا نہیں تھا، بلکہ ایک ادبی تحریک تھا۔ اُردو کے تمام بہترین ادیب اس میں لکھتے تھے۔ میرزا ادیب صرف "بہترین" اور "بڑے" ادیبوں کے شائق نہیں تھے، وہ نئے ادیبوں کو تلاش کرتے اور "ادبِ لطیف" کے ذریعے انھیں متعارف کراتے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ میرزا کی بجائے "میرزا ادیب گر" کہلانے کے مستحق ہیں۔

میرزا صاحب بلاشبہ ہمارے مقبول مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کے کئی کئی اڈیشن شائع نہ ہوئے ہوں، بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب کا پہلا اڈیشن ختم بھی نہیں ہوتا اور دوسرا شائع ہو جاتا ہے۔ اگر ادبی انعامات کو مقبولیت کا معیار بنایا جائے تو اس اعتبار سے بھی میرزا صاحب پاکستان کے تمام ادیبوں سے آگے ہیں۔ انھیں درجنوں ادبی انعامات مل چکے ہیں۔ اسی لیے تو بعض حاسد یہ کہتے ہیں کہ ادبی انعامات میرزا صاحب کا ذریعۂ معاش ہیں۔

میرزا صاحب کو حُسنِ کارکردگی کا صدارتی تمغہ بھی مل چکا ہے۔ اس تمغے سے یہ خوشگوار یادداشت وابستہ ہے کہ مشہور اداکارہ روحی بانو کو بھی میرزا صاحب کے ساتھ ہی صدارتی تمغہ ملا تھا۔ اسی سال لاہور میں ان دونوں کے اعزاز میں ایک مشترکہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ یہ دونوں اسٹیج پر پھولوں کے ہار پہن کر بیٹھے۔ ایک ہندستانی ادیب بھی ان دنوں لاہور میں تھے، وہ بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ یہ صاحب پاکستانی ادیبوں سے اس حد تک ناآشنا تھے کہ ساتھ کی کرسی پر بیٹھے ہوئے عطاء الحق قاسمی سے کہنے لگے۔ "اسٹیج پر موجود دونوں مہمانوں میں میرزا ادیب

کون سے ہیں؟ عطاء الحق نے جواب دیا۔ "میں خود بھی یہی معلوم کرنے کے لیے اس تقریب میں آیا ہوں۔" یہ واقعہ ہمیں خود عطاء الحق قاسمی نے سنایا تھا۔ اس لیے اس کے درست ہونے کی ذمہ داری ان ہی پر ہے۔

میرزا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ادبی گروہ میں شامل نہیں ہیں۔ وہ گروہ بندی پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ ادیب کی شناخت اس کے گروہ سے نہیں، تحریروں سے ہوتی ہے۔ جہاں سے گروہ بندی شروع ہوتی ہے، وہاں سے ادب رخصت ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے پاکستانی ادیبوں کی اکثریت اس خیال کو پسند نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا صاحب اکیلے نظر آتے ہیں۔ جو اپنی ذات سے ایک انجمن ہو، اسے ستائشِ باہمی کی انجمنوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

میرزا صاحب گذشتہ کئی برسوں سے "نوائے وقت" لاہور میں ہفتہ وار کالم لکھ رہے ہیں۔ کالم نگاری میں انھوں نے ایک نیا اسلوب ایجاد کیا ہے۔ وہ عام کالم نگاروں کی طرح جملے بازی اور پارٹیشن یا بابازی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، شائستہ پیرائے میں لکھتے ہیں، قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور اسے اہم مسائل پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ میرزا صاحب اپنے کالم میں عموماً ادبی موضوعات پر لکھتے ہیں۔ کبھی کسی کتاب کو موضوع بنا لیا، کبھی کسی شخصیت کا تذکرہ کر دیا اور کبھی کسی اہم مسئلے پر گفتگو کر لی۔ تاہم تہذیبی اور معاشرتی مسائل پر بھی وہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں اور یہ حق ہے کہ لکھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

میرزا صاحب کے کالموں کا انتخاب "اذکار و افکار" کے نام سے گذشتہ ہفتے شائع ہوا ہے۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اقبال اور اقبالیات پر ۱۹ کالم ہیں۔ دوسرے حصے میں ادبی، لسانی اور ثقافتی مسائل پر ۲۴ کالم ہیں۔ تیسرے حصے میں ۳۱ شخصیات کا تذکرہ ہے۔ چوتھے حصے میں ۲۳ کتابوں پر تبصرے ہیں۔ پانچواں حصہ "متفرقات" کا ہے۔ یہ پہلے چار حصوں کی طرح فکر انگیز نہیں۔ اس میں شگفتہ انداز کے ۱۴ کالم ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عمدہ مزاح کسے کہتے ہیں۔ ہم نے سب سے پہلے اسی حصے کو پڑھا کہ کالموں کے ذریعے علم حاصل کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں جب علم کے بغیر کام چل سکتا ہے تو میرزا ادیب کی زیرِ نظر کتاب کے پہلے چار حصوں کو پڑھے بغیر بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ کتاب کے آخری حصے کا سب سے اچھا کالم "سائیکل سے کار تک" ہے! اس میں میرزا صاحب نے نہایت خوبصورت انداز میں لاہور کے سائیکل سوار ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم تو لاہور کے بیشتر ادیبوں کو "پیدل" سمجھتے تھے، لیکن مرزا صاحب نے اچھے اچھوں کو سائیکل پر بٹھا دیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: بیدی لاہور کے جنرل پوسٹ آفس میں ملازم تھے۔ لفافوں اور کارڈوں پر مہریں لگایا کرتے تھے۔ ایک عدد سائیکل کے بھی مالک تھے، مگر میں نے انھیں اکثر و بیشتر سائیکل کے اوپر نہیں، سائیکل کے پہلو میں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ

جب بھی "ادب لطیف" کے دفتر میں جاتے تو وہ سائکل کے اور سائکل ان کے ہم قدم ہوتا۔
کنہیا لال کپور کہتے تھے کہ بیدی اپنے "سائیکل کی ناز برداری کیا کرتا ہے، تاکہ وہ روٹھ نہ جائے۔"
مشکور حسین یاد سے میرزا صاحب نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔
"یاد کا سائکل ایک زمانے میں ان کے لیے نشانِ تشخص بن گیا تھا۔ ان کا سائکل ان ہی کی طرح دراز قد تھا، مگر چشمِ فلک یہ جوڑی برداشت نہ کرسکی۔ یاد نے آج کل ایک اسکوٹر سے یارانہ گانٹھ رکھا ہے اور ہر جگہ اسے لیے پھرتے ہیں۔ یاد طبعاً ہرجائی واقع ہوئے ہیں۔ کچھ مدت پہلے انھیں اپنے سائیکل کے علاوہ گدھوں سے بھی بڑی محبت تھی اور پیار بھرے انداز میں ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اب جو دیکھتا ہوں، تو انھوں نے گدھوں سے نظریں پھیر کر گھوڑوں سے پیار کی پینگیں بڑھانی شروع کردی ہیں۔"
یہ گدھوں، گھوڑوں والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

کتاب صاف ستھری چھپی ہے لیکن قیمت بہت زیادہ ہے ڈیڑھ سو روپے۔ یہ مانا کہ مہنگائی کا زمانہ ہے لیکن اتنی بھی مہنگائی نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی کتاب ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کی جائے۔ حیف در حیف کہ میرزا صاحب خود تو سُرمہ مفت نظر بن کر بلا قیمت چشمِ خریدار پر احسان فرمائیں اور ان کی کتاب خریدار کو سُرمہ در گلو کردے۔ ہمیں اگر یہ کتاب مفت نہ ملتی تو شاید ہم اس سے محروم رہتے اب جب کہ ہم اسے پڑھ چکے ہیں تو جو چاہے، اسے آدھی قیمت پر خرید سکتا ہے۔ اس پیشکش سے خود میرزا صاحب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، کیونکہ سننے میں آیا ہے کہ جب ان کی کوئی کتاب چھپتی ہے، تو وہ دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے چار پانچ درجن نسخے ضرور خریدتے ہیں۔

آخری بات

احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کی یاد میں مرتب کیا گیا "کتاب نما" کا یہ گوشہ نہ تو ان کے قد کو خواہ مخواہ اونچا کرنے کی کوشش ہے نہ کسی مصلحت کا تقاضا اور مجبوری کا نتیجہ ہے۔ پاشا صاحب اپنی بساط بھر اردو زبان و ادب کی اتنی خدمت ضرور کر گئے ہیں کہ اب انھیں دنیائے ادب میں تا دیر زندہ رہنے کے لیے کسی "خاص نمبر" کی ضرورت نہیں۔ یہ خصوصی گوشہ نکالنے والوں کو کسی ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا بھی نہیں ہے۔ انھوں نے خود انتہائی خاموشی اور غیر جانب داری کے ساتھ زبان و ادب کے لیے اتنا کچھ کیا ہے کہ انھیں کسی پر یہ جتانے کی ضرورت نہیں ع ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

ایسی صورت میں اس "گوشۂ احمد جمال پاشا" کی حیثیت اعترافِ کمال اور خراجِ عقیدت سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہمیں اپنے بزرگ ادیبوں کی خدمات کا وقتاً فوقتاً اعتراف کرنا بھی چاہیے کیونکہ اس سے ایک تو تازہ واردانِ بساطِ ادب کو توانائی ملتی ہے، دوسرے ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہوتی رہتی ہے کہ اگر ان کا قد اونچا ہے تو اس لیے کہ وہ اپنے بزرگوں کے کندھوں پر کھڑے ہیں۔ اس سے پچھلی نسلوں کا احترام باقی رہتا ہے۔

چند ذاتی مجبوریوں کے سبب اس گوشے کی تیاری کے لیے ہم زیادہ محنت نہ کرسکے۔ جو کچھ میسر آیا قارئین کے سامنے اس یقین کے ساتھ پیش کردیا ہے کہ اس سے احمد جمال پاشا کی یاد یقیناً تازہ ہوگی اور ان کے مطالعے کی نئی راہیں ہموار ہوں گی۔

اعجاز علی ارشد

مرتب

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

پروفیسر وہاب اشرفی

Head,
Department of Uesu,
Ranchi University,
RANCHI. (Bihar).

O SACRED WEAPON ! LEFT FOR TRUTH'S DEFENCE,
SOLE DREAD OF FOLLY, VICE, AND INSOLENCE
TO ALL BUT HEAVEN'S--DIRECTED HANDS DENY'D,
THE MUSE MAY GIVE THEE, BUT THE GOD MUST GUIDE
REV'RENT I TOUCH THEE "

احمد جمال پاشا کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات پر پوپ کے یہ اشعار صادق آتے ہیں۔ آخر شعر و ادب میں طنز و مزاح کی کارگزاری کیا ہے؟ اور ان کا منصب کن امور سے متعین ہوتا ہے، جواب پوپ کی سطروں میں موجود ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نثر نگار کا MUSE سے کوئی علاقہ نہیں لیکن خدا تو اس کے یہاں بھی موجود ہے جو زندگی کے بے شمار ناہمواریوں کی شکایت کا اسے موقع فراہم کرتا ہے، محض شکایات کا نہیں بلکہ ان کے خلاف احتجاج کا بھی۔ یہ احتجاج ہنستے ہوئے انداز میں ہوا اور رُلانے کی سبیل پیدا کر دے تو بڑا مزاحیہ اور طنزیہ ادب پیدا ہوتا ہے۔

احمد جمال پاشا احتجاجی مزاحیہ نگار ہیں لیکن ان کا احتجاج چیخ نہیں ہے، اشارے اور کنایے کے ساتھ ساتھ واقعات و سانحات کے شیریں کیپسول میں چھپا ہوتا ہے، اور آئی۔ این۔ جیک کی تعریف پر منطبق ہے کہ

SATIRE IS BORN OF THE INSTINCT TO PROTEST WHICH
BECOME ART.

احمد جمال پاشا بھی اپنے احتجاج کو فن کی سطح پر لے جاتے ہیں، ورنہ وہ محض احتجاجی ادیب ہوتے فنکار نہ بن پاتے۔ آج کل یونی ورسٹیوں میں ڈگریوں کے حصول کے لیے تحقیق کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے خلاف احتجاج کا ایک منظر دیکھیے، احتجاج میں کہیں گھن گرج نہیں، ایک فنی رکھ رکھاؤ ہے جو دیدنی ہے:

انھوں نے نہایت اطمینان سے ہمارا مرثیہ سنا اس کے بعد پوچھا:
تمھاری تھیسس کا عنوان کیا ہے؟

عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب، عنوان ہے "اُردو شاعری میں تال و سُر کی اہمیت۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اندر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ہم پر ہنستے ہوئے واپس آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک نہایت بوسیدہ جلد تھی جو رسالہ گیت کارہ کے سال بھر کی فائل تھی۔ بولے ـــ
"دیکھو یہ رسالہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانے میں نکلتا تھا۔ اس کی اب دوسری جلد کہیں نہ ملے گی۔ قطعی نایاب ہے۔ اس میں استاد اللہ رکھے کا ایک مسلسل مقالہ "تال و سُر کی شعریت میں اہمیت" چھپا تھا۔ تم اسے ابواب میں تقسیم کرکے اپنی سناپسس کے مطابق نقل کرتے جاؤ اور جہاں لفظ "شعریت" آئے وہاں "شاعری" لکھ دینا۔ بس پھر تم کو دنیا میں ڈاکٹر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

(ہم نے ریسرچ کی)

سماج کے اندر پھیلی ہوئی پراگندگی کا احساس کسے نہیں ہے۔ کون برائی کو برائی باور نہیں کرتا، عیب تو عیب ہیں، استحصال کسے پسند ہے؟ لیکن ہم اپنی ذات کے خول میں گم ہیں۔ ہمارے پاس آنکھیں ہیں لیکن بے نور، ہم معاشرے کی تمام تر گندگیوں کے ساتھ جی لینے کے عادی ہو چکے ہیں، ادیب خصوصاً طنز و مزاح سے وابستہ ادیب ایسا نہیں کرسکتا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اندھیرے میں لالٹین لیے ایسے معاشرے میں گھومتا۔ ہنتا ہے، اس پر بھی آپ کی آنکھیں بند ہی رہیں تو فنکار کیا کرسکتا ہے۔ ڈیفو کا تصور مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ احمد جمال پاشا اپنے مزاح میں REFORMATION کا پہلو رکھتے ہیں۔ ڈیفو کا خیال تھا کہ طنزیہ تحریریں اصلاحی کارکردگی کی حامل ہوتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ احمد جمال پاشا کی تحریروں میں یہ جذبہ یعنی اصلاح کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"نوے سال تک ہم نے اپنی قومی جڑوں کی سینچائی کی تو تراش تراش کر ایک آزاد قوم کی شکل میں دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے۔ مگر آزادی کے سورج کی روشنی صرف میزبانوں کے باورچی خانوں پر پڑی۔ جمہوریت کا مطلع ابر آلود ہی رہا۔ مَن کی دنیا تن کی دنیا میں بدلی تو ہم نے بجائے دماغ کے معدے سے سوچنا شروع کردیا اور رفتہ رفتہ قومی ضعیف معدہ میں مبتلا ہوگئے۔ ہمارا قومی کردار اگر کوئی تھا بھی تو ان گنت مراد آباد اور جمشید پوروں نے چیچک زدہ کردیا۔ خدا بھلا کرے ان برساتی مینڈکوں کا جو خیر سے خدائی فوجدار بلکہ خدائی خوار لیڈران وقت کا جو اُز روئے پیشہ اب پشتینی لیڈر کہلانے کی چمک دمک میں قومی درخت کی پتیوں پر چھڑ کاؤ میں مصروف ہیں۔ زمانہ عمل کا نہیں بیانات کا ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں۔ ناگفتنی صورتِ حال یہ ہے کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔"

(جڑوں کی تلاش میں)

SUIFT نے طنز کے بارے میں بڑی دل چسپ باتیں کہی ہیں، وہ لکھتا ہے:

"IT IS A SORT OF GLASS WHERE IN BEHOLDERS DO

GENERALLY DISCOVER EVERYBODY'S FACE BUT THERE OWN, WHICH IS THE CHIEF REASON FOR THAT KIND OF RECEPTION IT MEET IN THE WORLD, AND THAT SO VERY FEW ARE OFFENDED WITH IT".

احمد جمال پاشا، جو چہرے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، حمق کی جس کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں، ہم ان سے آگاہ اور آشنا ہو جاتے ہیں، ان کے اس فنکارانہ رویّہ سے کسی کا دل بھی نہیں دُکھتا پاشا اور کئی دوسرے طنز و ظرافت سے وابستہ ادیبوں میں حدِ فاصل بھی یہی ہے۔ پاشا چاہے مسخ شدہ چہرے دکھائیں یا کسی واقعے کی سفاکانہ صورت سامنے لائیں، قاری ہنستے ہنستے ہی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ اب وہ ایسے معاملات سے تب بھی اپنے آپ کو الگ رکھے اور 'اصلاح' پر کمربستہ نہ ہو تو اس میں خالق کا کیا قصور؟ "تماشائے ادب" میں وہ لکھتے ہیں:

"ادبی تماشوں میں ٹیپ کا بند ادبی تقریب یا شعری تقریب، ادبی ہنگامی نشستوں کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے جس کے لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر عذرِ ہنگامہ یا وجہ بلوہ تلاش کی جاتی ہے۔ چُن چُن کر برسرِ اقتدار اور صاحب کرسی عزت مآبوں کو برآمد کیا جاتا ہے کیونکہ مجمع اہلِ زبان کا ہوتا ہے، اس لیے بے زبان کرسیوں پر بٹھا دیے جاتے ہیں۔ گوشت کے بورے سجا دیے جاتے ہیں، احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر پڑھا لکھا آدمی آئے تو اس کی رائے نہ خراب ہو جائے۔ پڑھائی لکھائی کا بھرم نہ کُھل جائے۔ اگر اس نشست یا تقریب کا تعلق اُردو ے مرحوم سے ہے تو صدارت کرنے والے مہمان یا مدعوئین خصوصی یا وی آئی پی حضرات راجستھانی جانتے ہوں گے، گجراتی کے ماہر ہوں گے، اُڑیا کے عالم ہوں گے، انگریزی میں فاضل ہوں یا پشتو میں فاضل اجل ہوں بلوچی، بنگلہ یا سندھی ادب کے گُل سرسبد ہوں مگر ٹوٹی پھوٹی اُردو پر بھی قادر نہ ہوں گے۔"

RONALD KONX نے طنز نگار کو ایسے بچّے سے مماثل قرار دیا ہے جس کے ہاتھوں میں پانی بھری پستول ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا نشانہ اگر ٹھیک بھی بیٹھے تو زخمی کا کیا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں میں جو پستول ہے وہ انتہائی گرم پانی سے بھری ہوتی ہے اور جس پر نشانہ لگایا جاتا ہے وہ یقینی جُھلس جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے زخمی چہرے کو ہم اپنی ننگی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے لیکن جسے مجروح ہونا تھا وہ مجروح ہو چکا ہے۔ پاشا کی DELICACY کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ہنستے ہنستے زخمی کرتے ہیں۔ زخمی ہونے والا بھی ہنستا ہے لیکن اس کا جسم مجروح ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسے ہی طریقۂ کار کو 'ART LIES IN CONCEALING ART" کہتے ہیں۔ گویا احمد جمال پاشا ہماری مہذب سوسائٹی کے جری نقّاد ہیں۔ سماج کی آلودگیوں سے نبرد آزما ہیں، زندگی کے احمقانہ تصوّرات کے خلاف صف آرا ہیں۔ معاشرے سے اس کے تمام عیوب دھو ڈالنا چاہتے ہیں۔ کوزن کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ:

"HE IS A MAN WHO TAKES IT UPON HIMSELF TO CORRECT.

SOCIETY AND THUS TO LEARNING CONTEMPT AND DERISION UPON ABBERRATIOUS FROM A DESIRABLE AND CIVILIZED NORM".

یہ ایک طرح کی یوٹوپیائی تعبیر کا خواب بھی ہو سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ احمد جمال پاشا ایسے خواب دیکھتے ہیں، جن کی تعبیر ان کی تلخ و شیریں تخلیقات ہیں جن میں ہمارا سماج ننگا ہے، ایسے ننگے سماج سے ہم ہمدردی نہیں کر سکتے۔ اگر ازالہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ پاشا کی غایت بھی یہی ہے اور ان کی فکر کا محور بھی یہی۔ در نہ محض ہنسنے ہنسانے کا کام تو چٹکلوں سے بھی انجام پا جاتا ہے۔ لیکن احمد جمال پاشا کی فکر کی کلید ہنسنے ہنسانے میں نہیں بلکہ معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں احمد جمال پاشا کی نگارشات میں HUMOUR تلاش نہیں کرتا بلکہ IRONICAL صورت واقعہ کی تفصیل میں اتر جانا چاہتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ احمد جمال پاشا کا علاقہ ہیومر سے زیادہ WIT سے ہے اور یہ ایک بڑی تخلیقی صلاحیت ہے جس کے بغیر کوئی تخلیق IRONICAL ہیئت اختیار نہیں کر پاتی۔ سترھویں صدی کے انگریزی شعرا مثلاً ڈن، ہربرٹ، کراشا وغیرہ کو وٹ کا شہنشاہ کہا جاتا ہے لیکن وہاں وٹ دوسرے معنی میں بھی ہے۔ پھر بھی ان شعرا کے یہاں بھی IRONICAL SITUATIONS اسی تخلیقی صلاحیت کے باعث پیدا ہوئی ہیں۔ اگر کوئی شخص پاشا کے یہاں PARADOXES کا متلاشی ہو تو اسے بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوگی لیکن اگر اس کی سمجھ یہ ہو کہ ان کی تخلیقات میں وٹ اور آئرنی کی جستجو کرے تو اسے سرتاسر کامیابی نصیب ہوگی۔ اس کی مثالیں احمد جمال پاشا کے کئی مضامین میں ملتی ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ "ادب میں مارشل لا" میں یہ صورت حال پوری طرح ابھری ہے۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ادب میں انقلاب کے اسباب وہ حالات ہیں جو اور زیادہ خراب نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس خرابی سے خون خرابے کے کام لیے جا رہے تھے۔ گو کہ طوائفوں نے لکھنؤ اسکول کے بعد سے ایک حد تک اردو ادب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی موجودہ دور مکمل طور پر طوائف الملوکی میں مبتلا تھے۔ سارا ادب ایک گمنام دیوان کے نامکمل مقدمہ کے گرد بلا کسی تھیوری کے گھوم رہا تھا۔ الٹی سیدھی تعبیریں پیش کرنے والے ناقدین کی بستیاں اپنی برادری تک محدود رہتیں اور برادری کے باہر جانے والے کا حقہ پانی بند کر دیتیں۔ شخصی تاثرات کے عمل اور ردِ عمل نے ادب کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ امرا، حکام، رشتہ دار، احباب اور خدمت گزار ہی ادب کے دائرے میں آتے ہیں۔ ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل بنانا جانتے ہوں بلکہ تاج محل کھودنے کے فن سے واقف ہوں۔ عموماً جس کے بارے میں کسی کونے سے کوئی فتوا صادر کر دیا جاتا، بقیہ سب اسی کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتے۔ ادبی سرقے، سرقہ بالجبر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادب، صحافت اور حماقت کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ نئے نام لیتے ہوئے سب بے حد ڈرتے اور گھبراتے اچھا ادب وہ سمجھا جانے لگا جو زیادہ بکے۔"

معیاری طنزیہ و مزاحیہ تحریریں سنجیدگی سے آراستہ ہوتی ہیں، ان میں ٹھٹھول تقریباً نہیں ہوتا۔ لیکن

ردو کے کئی مزاح نگار مسخرے بن جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی نگارشات کا وزن اور وقار سرے سے
عدوم ہو جاتا ہے۔ پاشا اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے مزاح میں کڑوم جرارہ چھپا ہوتا ہے۔ اب ڈنک کے
ثر کو کوئی سہن کرے تو اور بات ہوئی۔ اسے بہر طور تلملانا چاہیے۔ پاشا کی ہنسی زہر میں بجھا ہوا تیر ہے جو ہمیشہ
نشانے پر بیٹھتا ہے۔

احمد جمال پاشا پلان، ڈیزائن یا پیٹرن کے بغیر کوئی طنزیہ یا مزاحیہ مضمون نہیں لکھتے۔ لہٰذا ان کی طنزیہ اور
مزاحیہ تحریریں، خاکے، چربے، فیچر سب کے سب PRE-CONCEIVED ہیئت رکھتے ہیں، وہی IRONICAL
ہیئت جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ گویا ان کے مضامین میں انشائیائی رنگ نہیں ہے بلکہ بہترین ماجرا سازی
ہے۔ ان کی تحریروں کا یہ وصف اُن کے معاصرین سے ان کو الگ بھی کرتا ہے اور ایک امتیاز بھی بخشتا ہے۔ اچھی
ماجرا سازی کے بطن سے SUSPENCE اور CURIOSITY پیدا ہوتی ہے۔ یہ عناصر پڑھنے والوں کو اختتام کی
منزل تک لے جاتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ پاشا کے مضامین ایک بار گرفت میں لے لیتے ہیں تو پھر چھوڑتے
نہیں، جب تک کہ آخری منزل نہ آ جائے اور قاری کی مکمل تھارسس نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں "رستم امتحان
کے میدان میں"، "ہم نے ریسرچ کی"، "ادیبوں کی قسمیں"، "نثری شاعری"، "وزیر قحط" اور "پہیوں پر چھڑکاؤ"
کے کئی مضامین بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

انگریزی کی ایک ادبی اصطلاح ہے TAPINOSIS اس کے ذریعے بڑی بلاغت سے مبالغے کے
انداز میں بڑی چیزوں کو چھوٹی بنا کر پیش کرایا جاتا۔ سودا کے یہاں گھوڑے کے ہجو اس کی ایک عمدہ مثال
ہے۔ پوپ کے یہاں TIMON'S VILLA کی تصویر دیکھیے:

GREATNESS WITH TIMON, DWELLO IN SUCH A DROUGHT.
AS BRINGS ALL BROBDIGANG BEFORE YOU THOUGHT,
TO COMPASS THIS, HIS BUILDING IS A TOWN,
HIS POND AN OCEAN, HIS PARTERRE A DOWN
WHO BUT MUST LAUGH, THE MASTER WHEN HE SEES
A PUNY INSECT, SHIVRING AT A BREEZE
LO, WHAT HUGE HEAP'S OF LITTLENESS AROUND.

(EPISTLE IV)

یں ایسے تاثر کے حصول کے لیے احمد جمال پاشا بھی TAPINOSIS کی صنعت کا استعمال کرتے ہیں۔ ان
ے یہاں عظیم اشیا جس طرح حقیر بنا کر پیش کر دی جاتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں
س باب میں احمد جمال پاشا کا کوئی دوسرا حریف نہیں۔ ہاں طنز نگار شعرا کے یہاں ایسی صورت کمیاب
ہیں ہے، لیکن جب میں احمد جمال پاشا کے معاصرین کی باتیں کرتا ہوں تو صرف ہندستانی ادبا میری نگاہ
ما ہیں۔ پاکستان کے مزاحیہ اور طنزیہ نگاروں نے ادھر اس صنف پر خوب خوب توجہ دی ہے۔ "زرگزشت"
TAPINOSIS کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس طرف مجتبیٰ حسین نے ایسے عمل سے اپنی تحریروں کی ے
رنی شروع کر دی ہے لیکن احمد جمال پاشا کے یہاں یہ عمل INTERENT ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس صنف
شعوری طور پر واقف نہ ہوں لیکن ان کے محتویات کا جائزہ لیجیے تو اس کی کارکردگی کا اندازہ لگانا مشکل
وگا۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ احمد جمال پاشا اپنے شکار کو LAMPOON بنا ڈالتے

ہیں، یعنی اُن کے یہاں ROUGH CRUDILITY نہیں ہے۔ دراصل ان کا مقصد کسی چہرے کو مسخ کرنا نہیں ہوتا، اس فن میں تو DRYDEN ماہر تھا۔ شیڈول کو مڈگ کی شکل میں دیکھنا ہو تو ABSOLAIN AND ACHITOPHEL کا مطالعہ کیجیے، لیمپوننگ کی ساری تکنیک سمجھ میں آجائے گی۔ پاشا چہرے کی دھول صاف کرتے ہیں، اسے داغ دار نہیں بناتے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ احمد جمال پاشا کے یہاں کسی شے کے لیے شدید نفرت، ناپسندیدگی یا بورژیت کے اظہار کا جذبہ نہیں پایا جاتا لیکن اس حد تک نہیں کہ ایسے اظہار کو INVECTIVE کہ دیا جائے۔ دراصل پاشا اپنے ردِ عمل پر ایک دل کش نقاب چڑھا ڈالتے ہیں اس لیے طنز کا زہر تلخ ہونے کے باوجود DISGUST کا پہلو نہیں پیدا کرتا۔ اس باب میں بھی ادب میں مارشل لا، کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

احمد جمال پاشا طنز و مزاح کے منصب اور ان کی کارکردگی سے بخوبی واقف ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے تمام مضامین کی تحلیل کی جائے، تجزیہ سے گزرا جائے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے۔ امتیازی طور پر جن نکات کی نشاندہی ہوسکتی ہے وہ احاطۂ تحریر میں آچکے ہیں، میری گزارش ہوگی کہ اس پس منظر میں قارئین احمد جمال پاشا کے مضامین کا مطالعہ کریں تو اُن پر ایک نیا عالم خیال روشن ہوگا۔

پروفیسر قاضی عبدالستار
Head,
Department of Urd
Aligarh Muslim Universit
ALIGARH-202001

احمد جمال پاشا

جس طرح ایک طبقہ علوم کو ادبیات پر فضیلت دینے کی غلطی کرتا ہے اسی طرح ایک دوسرا طبقہ ادبیات میں طنز و مزاح کو دوسرے درجے کی شہریت دینے پر اصرار کرتا ہے اور یہ دونوں طبقے آسمان سے نہیں اترے بلکہ ہماری سیاسی اور سماجی تاریخ کی دین ہیں اور ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہیں۔

اگر ہم ماضی کی کتاب کھولیں تو بڑی دلچسپ تصویریں نظر آتی ہیں یعنی علوم کے عالم مسندِ وزارت پر متمکن اور دربارِ شاہی پر متصرف ہیں لیکن شاعر درجہ اول کا شہری، فرصت و فراغت کے لمحات میں تختِ شاہی سے دور اور پا انداز کے قریب کھڑا نظر آتا ہے جو بازیابی کو بذات خود انعام سمجھتا ہے اور خمارِ حضوری میں سر سے پانوٴ تک شرابور ہے اور اس رقاصہ کے پہلو میں کھڑا شعر سنا رہا ہے جسے شاعر کے بعد اپنے گھنگھروں کا کمال دکھانا اور دربار کو نشہ پلانا ہے۔

اور اسی شہر ادب کے دوسرے درجے کا شہری داستان گو، پردۂ خاص کے سامنے دوزانو بیٹھا داستان سنا رہا ہے کہ ایک خواجہ سرا سایے کی طرح آتا ہے اپنا بھاری ہاتھ اٹھا کر داستان گو کو داستان روک دینے کا حکم دیتا ہے کہ بادشاہ سو چکا اور داستان گو کی خدمت پوری ہو چکی۔

تیسری تصویر اس سے زیادہ دردناک ہے اور بہت دیر میں کسی صفحے پر دھندلی سی نظر آجاتی ہے یہاں طنز و مزاح کے ماہرین نٹوں، کلاونتوں، کشمیریوں، بھانڈوں اور میراثیوں کے غول بیابانی میں اس طرح کھو سے گئے ہیں کہ صورتیں نہیں پہچانی جاتیں اور اسی بھیڑ بھاڑ میں انشاءاللہ خاں انشا جیسے ذہین فن کار دھکے کھاتے نظر آتے ہیں۔

اس طول کلامی کا حاصل یہ ہے کہ ہم کو جو روایت ملی وہ بڑی دلچسپ ہے یعنی ایک طرف تو خالص طنز و مزاح کو فنونِ شریفہ کے درجے سے نکال کر صنعت و حرفت کے خانے میں بند کر دیا گیا اور دوسری طرف جب اپنے کسی چہیتے شاعر کو دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں بلند قامت دکھلانا منظور ہوا تو اس کے بت کو طنز و مزاح کے ڈائس پر کھڑا کر کے قامت کو دراز کر دیا گیا۔

بہت دنوں بعد مغرب کے معلّم نے ہم کو سبق دیا کہ تہذیب کے رچاو اور زبان کی پختگی کے ایک معانی نثر کی بلوغت بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ طنز و مزاح کی دولت کے بغیر زبان دولت مند اور نثر شاداب نہیں ہوتی اور اس انکشاف کے بعد ہی اچھوتوں کی طرف ہم نے توجہ دی اور مقدس دروازے ان پر کھول دیے

لیکن پروہت (نقاد) نے خاصی سرد مہری سے ان نوواردوں کا استقبال کیا لیکن وقت کی رفتار نے جو تغیرات کے گل کترتی ہے اپنا کرشمہ دکھلایا اور خالص مزاح وظرافت کے نقطۂ نظر سے بھی ادب کا مطالعہ کیا جانے لگا اور نہ صرف کتابیں لکھی جانے لگیں بلکہ زندہ دلانِ حیدرآباد نے تو مزاح نگاروں کی ایک پوری کانفرنس برپا کر دی۔ یہ تہذیب اور زبان اور معاشرے کے بالغ ہونے کی نشانیاں ہیں۔

۱۹۵۰ء کے بعد جو لوگ خالص مزاح وظرافت کے نثری ادب میں نمایاں ہوئے ہیں ان میں احمد جمال پاشا ممتاز لکھنے والوں میں ہیں۔ اس وقت میرا موضوع جمال ہیں اور یہ نام آتے ہی ماضی کے اوراق بکھر جاتے ہیں کوئی موضوع ہو ...... ماضی سے نجات کہاں؟ ان اوراق کی پیشانی پر لکھنؤ کی مہر ثبت ہے ..... لکھنؤ ......

ع لکھنؤ چھوڑ کے ابیات کا لکھنا چھوڑا۔

اس ایک لفظ کے دھڑکتے ہی کیسی کیسی روشن ہوتی ہوئی صورتوں کا جلوس گزر جاتا ہے جلوس میں شامل شخص کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھ نہیں پاتا اور اگر اپنے آپ کو دیکھ لیتا ہے تو جلوس کے نظارے سے محروم رہتا ہے اس لیے ہم عصر پر احتیاط سے قلم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کے قول کے مطابق لکھنؤ اجڑ چکا تھا۔ اجڑ چکا ہوگا لیکن اس کا اجاڑ پن بھی بڑے بڑے شہروں کے بناؤ سے حسین تھا۔ نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی، مسعود حسن رضوی، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، آنند نرائن ملا، حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور، احتشام حسین، نورالحسن ہاشمی، رضا انصاری، اسرارالحق مجاز، سلام مچھلی شہری، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد حسن، مسیح الحسن رضوی، کمال احمد صدیقی، رام لعل، باقر مہدی، منظر سلیم، عابد سہیل، رتن سنگھ، قمر رئیس، وارث کرمانی، احمد جمال پاشا، اقبال مجید، عثمان غنی، حسن عابد زیدی اور کتنے ہی چہرے جن کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں یہ سب اسی اجڑے دیار میں شاد ہوں یا نہ ہوں آباد ضرور تھے۔

وہ شام میرے سامنے اس طرح کھڑی ہے جیسے ابھی کل گزری ہو۔ اختر منزل کے کشادہ کمرے کے ایک گوشے میں جوتوں کے ڈھیر اور کپڑوں کے انبار کے پاس اسٹوو سنسنا رہا تھا۔ کھونٹیوں پر خالی ہینگر ٹنگے تھے اور کتابوں کی شیلف اور کرسیوں پر شیروانیاں اور سوٹ ایک دوسرے سے بغل گیر پنکھے کی تیز ہواؤں میں لرز رہے تھے اور مسہری کے سامنے میز پر چائے کی میلی پیالیاں پڑی تھیں کہ کسی نے جمال کا تعارف کرایا۔ ایک دبلا پتلا گورا چٹا، دھلا دھلایا پستہ قد، دلنشیں سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ میری طرف بڑھے ہوئے تھے اور مسکراہٹ لمبی چوڑی مسکراہٹ کانوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس کو پندرہ سولہ سال کا سمجھ بیٹھتا اگر چہرے پر کسی قدر پختگی نہ ہوتی۔ نازک سنہرے فریم کی عینک کے ہلکے آسمانی شیشوں کے پیچھے تیز بے تاب آنکھیں اس کی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں۔ پھر کسی معمولی سی بات پر اس نے زوردار مردانہ قہقہہ لگایا اور میں چونک پڑا۔ عمر کے متعلق پھر رائے بدلنا پڑی۔ اس ملاقات کی کوئی بات مجھے یاد نہیں سوا اس کے کہ جمال بغیر کسی تمہید کے مجھ سے اچانک بے تکلف ہو گیا تھا جیسے بالر بغیر اسٹارٹ لیے بال پھینک دے اور وکٹ اڑ جائے۔ میری کم آمیزی کو ایسا ہی دھچکا لگا تھا اور میں پیشین کی طرح سمٹ کر رہ گیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں قاضی صاحب سے قاضی بھائی کی منزل پر اتر آنا مجھے پسند نہ تھا لیکن میں تو آؤٹ ہو چکا تھا۔

اب وہ اس گروپ میں شامل ہو چکا تھا جو ہوٹلوں، گھروں، محفلوں اور سڑکوں پر ایک ساتھ دیکھا جاتا تھا اور جس کا موضوع کتابوں، ادیبوں، ادبی محفلوں اور محبوبوں تک محدود تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب

ہم منی آرڈر اور محبوب کے علاوہ کسی کو اس لائق نہ سمجھتے تھے کہ اس کا انتظار کیا جائے اور ان دونوں میں بھی منی آرڈر کو ترجیح حاصل تھی۔

پھر ہم لوگ یعنی قمر رئیس، اقبال مجید، احمد جمال پاشا اور عثمان غنی علی گڑھ آ گئے لیکن اب ہم سب لوگ بدل چکے تھے۔ بے نیازی اور خود فراموشی کے ریشمی پیراہن لکھنؤ میں ہی رہ گئے تھے۔ سنگین حقیقتیں ہمارے راستے میں کھڑی تھیں۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی ہم فضا میں معلق تھے۔ ہم پر انکشاف ہو چکا تھا کہ ہم کو خود کنواں کھودنا ہے اور پانی پینا ہے اور آنکھوں میں چھائے ہوئے غبار نے زمین کو آسمان بنا دیا تھا۔ سرور صاحب اور ڈاکٹر محمد حسن اپنی منصبی ذمے داریوں میں کھو چکے تھے لیکن ہم اب بھی کبھی کبھی محفل آرا ہو کر مرحوم لکھنؤ کی یاد تازہ کر لیتے تھے مگر اب وہ مزا نہ تھا۔ وہ چٹخارا نہ تھا کہ پھیکے حال اور کڑوے مستقبل نے زبان کا ذائقہ تبدیل کر دیا تھا۔ میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔ قمر پرانی نظمیں سنا رہے تھے۔ ہم دونوں پر تھیسس سوار تھی۔ عثمان تلخ ہو گیا تھا۔ اقبال نے مدتوں سے افسانہ نہیں لکھا تھا کہ جمال نے ایک مزاحیہ مضمون لکھا "پیروڈی" جو مقامی طور پر ہٹ ہو گیا مگر ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پھر دوسرا مضمون سنا گیا، "رستم امتحان کے میدان میں" ہر چند کہ ہم اپنے خول میں بند تھے تاہم ہمارے ابرو اُچک کر ایک پاس آ گئے یعنی پہلی بار جمال کے لیے سنجیدگی سے تامل کی زحمت گوارا کی گئی اور پھر تو جیسے مضامین برسنے لگے اور ہم نے بڑے تکلف کے بعد اقرار کیا کہ ایک ذہین مزاح نگار پیدا ہوا ہے۔

ان مضامین میں زبان کا کرشمہ بھی ہے اور تخیل کا پینترہ بھی۔ طنز کی نشتر زنی اور مزاح کی دھار دونوں بیک وقت موجود ہیں۔ اور اس فنی بلوغت کی پرچھائیاں بھی نظر آ جاتی ہیں جو لب کشائی سے گزر کر ذہن میں چاندنی بکھیر دیتی ہیں اور تخیل کے دریچوں پر زعفرانی پھولوں کے گلدستے رکھ دیتی ہیں۔ جمال کا فن تہ داری اور حجم ...... لیکن میں تو جمال کے فن پر نہیں جمال پر مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔

جمال کے فن میں تضادات کا عرفان اور معمولات سے چھانا ہوا کرب جس طرح ارزاں ہے اس کی تخلیق کے لیے شخصیت میں جس توانائی اور لچک کی ضرورت ہے وہ ان کے پاس موجود ہے اور میں شخصیت کے اسی گوشے پر سے نقاب اٹھانا چاہتا ہوں۔

کچھ سال ہوئے لکھنؤ میں کسی نے بتایا کہ جمال ایک سنگین نجی حادثے سے دوچار ہو گیا۔ مجھ پر بہت اثر ہوا اور اس سفر میں جمال سے نہ ملنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک شام میں عابد سہیل کے ساتھ امین آباد سے گزر رہا تھا کہ جمال سے ٹکرا گیا۔ اب جمال کا پیٹ نکلنے لگا تھا اور بال اڑنے لگے تھے اور آنکھوں میں فنی اعتماد کی روشنی تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا اور میں اس اچانک ملاقات سے پریشان تھا کہ عابد سہیل کے کسی جملے پر جمال نے اپنا جانا بوجھا قہقہہ سر کیا اور میں جو تعزیت اور رسمی ہمدردی کی ابجد سے قطعی ناآشنا ہوں جیسے زندہ ہو گیا۔ اب جمال چل نکلے تھے اور حسب دستور باغ و بہار تھے۔ میں قہقہوں کو بجا بجا کر دیکھ رہا تھا۔ مسکراہٹوں کو پرکھ رہا تھا۔ لہجے اور الفاظ کے غلافوں کو ہٹا ہٹا کر اپنے مطلب کے معانی کی جستجو کر رہا تھا لیکن وہاں کچھ تھا ہی نہیں سوا اس کے جو چہرے پر چمک رہا تھا جو ہونٹوں سے برس رہا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص پندرہ دن اور آج پہلی بار اپنے دفتر گیا ہے اور سولہ دن پہلے اتنے سنگین حادثے سے دوچار ہوا ہے۔ فن کاروں میں یہ توانائی عام نہیں ہوتی۔ گزر رنے کی طاقت ایک چیز ہے اور ہنس کر جھیل جانے

استقامت بالکل دوسری شے ہے۔ دوسروں پر تو کتے بھی بھونک لیتے ہیں۔ اپنے آپ پر ہنسنا فرشتوں
ے لیے بھی دشوار ہے۔

میں لکھنؤ میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ رام لعل اور جمال کے تعلقات خراب تھے۔ ایک دوسرے سے مخاطب
ب نہ ہوتے تھے۔ ہم لوگ کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ جمال آگئے۔ ڈھلکتے ہوئے، مسکراتے ہوئے۔ مجھے سلام
با، ہاتھ ملایا۔ میں نے کہا یہ رام لعل ہیں۔ جمال نے جواب دیا "جانتا ہوں"۔ میں نے کہا ان سے ہاتھ ملائیے۔
مال نے ایک لمحہ کے لیے تامل کیا، مجھے گھور کر دیکھا اور اخبار پڑھتے ہوئے رام لعل کے سامنے دونوں ہاتھ
ڑھا دیے۔ گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ جمال نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔
مال نے مسکرا کر رام لعل سے سگریٹ مانگی اور انہیں سے کافی منگوانے کے لیے کہا۔ پھر قہقہے لگے۔ لطیفے ہوئے،
لیفے ہوئے اور دوستی ہو گئی۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن بڑی بڑی باتوں کی بشارت دیتی ہیں۔ انانیت
ن کار کے خون میں شامل ہوتی ہے کوئی اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے اور کوئی آستین میں ٹانک
ر نمایش کرتا گھومتا ہے لیکن اپنے پالے پوسے جذبات کو تعلقات پر قربان کر دینا اس لوچ کی شہادت دیتا ہے
ں کے بغیر کبھی کبھی شخصیت ٹھٹھر جاتی ہے اور فن سوکھنے لگتا ہے۔

اگر آپ جمال سے متعارف ہو گئے ہیں اور آپ نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے تو یہ چند اقتباسات
ہ لیجیے:

"جناب کتاب تو مشکل سے چھٹانک بھر کی ہے لیکن مقدمہ اس پر لکھا گیا ہے پنسیری بھر کا۔
کہیں صرف مقدمہ ہی ملا اور کتاب کے سلسلے میں محض اشاروں سے کام لیا گیا یا مقدمہ
حاضر ہے کتاب کا کہیں دور دور پتا نہیں۔" (مقدمہ)

"الٹی سیدھی تعبیر پیش کرنے والے ناقد جو انگریزی کے شوق میں اُردو کے زعم میں
انگریزی سے نابلد تھے عموماً ایک ہی مضمون میں ایک سے زیادہ رائے کا استعمال
کر ڈالتے۔ ناقدین کی بستیاں اپنی برادری تک محدود رہتیں اور برادری کے باہر
جانے والے کا حقہ پانی بند کر دیتیں۔ شخصی تاثرات کے عمل اور ردِ عمل نے ادب کو گورکھ
دھندہ بنا دیا .... ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل بنانا چاہتے
ہوں بلکہ تاج محل کھودنے سے واقف ہوں .... ادب، صحافت اور حماقت کے
درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل تھا .... نقادوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں لوگوں
نے قدیم ادب اور جدید ادب کے مطالعے کے بجائے تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اصل
کتاب پڑھنے کا فیشن اب تقریباً آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا۔" (ادب میں مارشل لا)

"اگر الف، بے کو بھرے مجمع میں ایشیا کا عظیم ترین فن کار کہہ رہا ہے تو بے کا فرض ہے کہ وہ
اس کو اسی مجمع کے سامنے نہ صرف دنیا کا بہترین نقاد تسلیم کرے بلکہ مجمع سے اس کی
حیثیت منوا بھی لے۔"

"ایک ایوریج شاعر کی ہا بیات ترتیب کو کوسنا، فرشتوں کو بے نقط سنانا، بلبل کو باغ کا
پتا دینا، مرغ کو برا بھلا کہنا، چکور کو چاند تک پہنچانا، آسمان کو اس کے بڑھاپے کا احساس

دلانا، عاشق کو معشوق کی جوتیاں کھلوانا، شاعرے کے لیے غزل تیار کرنا اور شراب ساز کمپنیوں کی پبلسٹی کرنا ہوتا ہے۔" (مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا)

یہ چند سطور اس لیے منتخب کی گئیں کہ مصنف نے یہاں ثقہ موضوعات کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ اپنی خلاقی ذہانت اور بصیرت سے وہ نقوش اجاگر کیے ہیں جن کا نظارہ صرف تبسم کی پذیرائی نہیں کرتا بلکہ تفکر کی دعوتِ عام بھی دیتا ہے۔ آنسوؤں میں شرابور دنیا میں ایک مسکراہٹ، بے ساختہ مسکراہٹ بھی بہ ذات خود انعام ہے پھر ایسی مسکراہٹ جو پہلو دار بھی ہو، جرم بھی رکھتی ہو اور جس پر بلاغت کی چھوٹ پڑ رہی ہو، ادب میں اضافہ ہوا کرتی ہے۔

اھلِ قلم سے درخواست

براہِ کرم اپنے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہرگز نہ بھجوائیں بلکہ اصل مسودہ بھجوائیں اور فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اکثر و بیشتر حروف اڑ جاتے ہیں اس سے پروف ریڈر اور کاتب حضرات کو بڑی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے

سرور جمال
Kothi 'Nishat Afza'
Telhatta,
SIWAN-841226.

احمد جمال پاشا۔ میرے رفیقِ حیات

آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

زندگی میں بڑے امتحانوں سے گزری۔ خصوصاً ان پانچ مہینوں میں کہ یہ مسلسل امتحان و آزمایش کا دور رہا۔ ایسا وقت مجھ پر بار بار آیا۔ جب کوئی میرے پاس تعزیت کے لیے آیا، جب کسی نے اُن پر مضمون لکھا اور میں نے پڑھا، جب کسی نے اُن پر رسالہ کا خاص نمبر نکالا، جب اُن کا سفری بیگ مجھے ملا، جب اُن کا غالب ایوارڈ مجھے ملا اور اس طرح کے بارہا مواقع پر مجھے اپنے دلی جذبات کو دبانا پڑا۔ اپنی آہوں، اپنی سسکیوں اور کراہوں کو اندر ہی اندر جذب کر لینا پڑا۔ اپنے آنسوؤں کو روکنا پڑا۔ اِس لیے کہ میں ایک بڑے انسان کی شریکِ زندگی ہوں۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو اپنے جذبات کو کچلنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن یہ امتحان بڑا سخت ہے۔ فرمایش ہے کہ میں پاشا صاحب کی گھریلو زندگی اور شخصیت پر اپنے تاثرات لکھوں۔ میں یہ فرمایش کس طرح پوری کروں؟ اِس کے لیے مجھے اپنی زندگی کے تمام بکھرے ہوئے اوراق کو ایک جگہ کرنا پڑے گا۔ ماضی کے بند دریچوں کو کھولنا پڑے گا۔ مجھے خوف ہے کہ میں اُن کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکوں گی۔ کیا میں اپنے تاثرات بجا طور پر پیش کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں؟ میں کیسے یہ سب کچھ کر سکوں گی۔ کاش کہ میں ایک عام گھریلو عورت ہوتی! کیسے اپنے زخموں کو اپنے ہاتھوں کریدوں؟

۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کل کا دن لگ رہا ہے ہاں کل کا دن۔ آہ! میں دیکھ رہی ہوں یہ میرا نکاح ہو رہا ہے۔ میں اپنے گھر سے رخصت ہو رہی ہوں، سروری منزل پہنچ رہی ہوں۔ لکھنؤ میں کم و بیش دس سال گزارنے کے بعد واپس سیوان پہنچ جاتی ہوں۔ اُن کے ساتھ بائیس سال کیسے گزرے، زندگی میں کیسے کیسے اتار چڑھاو آئے۔ شادی کے بعد کی زندگی خواہ لکھنؤ ہو خواہ سیوان مسلسل جدوجہد کی زندگی رہی۔ گھریلو ذمے داریاں گھریلو فرائض، سماج کا غم، قوم کا درد۔ ہم دونوں اپنے اپنے طور پر اسے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے، ہم نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ زندگی کے بنجر اور سنگلاخ راستے پر آگے بڑھتے رہے، ہم نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

پاشا صاحب ہمیشہ دوسروں کی مدد کو تیار۔ ان کا لباس، اُن کے جوتے، ان کا بستر، ان کی ضرورت کی چیزیں برابر دوسروں کے استعمال میں آتی رہیں۔ کوئی پینٹ استعمال کر رہا ہے تو کوئی قمیص۔ سیوان سے میں نے ان کے لیے ایک خوبصورت سا سوئٹر بُن کر بھیجا تھا جب میں لکھنؤ پہنچی تو دیکھا ان کے ایک دوست وہ

سوئٹر پہنے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ان کے پاس بھی ایسا ہی سوئٹر ہوگا۔ میرے لکھنؤ جانے کے بعد وہ کہیں اور پڑھنے کی غرض سے چلے گئے لیکن ہر روز وہ میرے یہاں آتے۔ غیر ارادی طور پر میری نظر میں ان کے سوئٹر پر چلی جاتیں وہ بھی تاڑ گئے۔ "بھابی، سوئٹر کو آپ غور سے نہ دیکھیں۔ میں جاتے وقت دے کر جاؤں گا۔" میں شرم سے گڑ گئی۔ وہ صاحب جاتے وقت بڑی احتیاط سے سوئٹر دے گئے۔ لیکن پاشا صاحب مجھ پر خفا ہوئے کہ "تم نے میری بے عزتی کر دی۔ اس نے تمھیں کتنا تنگ نظر سمجھا ہوگا۔ زندگی میں ایک دوسرے کے کام آیا ہی جاتا ہے۔" اب آگے کو میرے بھی کان ہو گئے۔

پاشا بڑے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ جب کوئی مہمان آتا تو اس کے قیام وطعام کے ساتھ کپڑے وغیرہ کا انتظام بھی ہمارے یہاں ہوتا۔ اب عالم یہ ہے کہ مہمان پلنگ پر دراز ہے تو ہم فرش پر۔ تکیے اس کے سر کے نیچے ہیں تو ہمارے ہاتھ ہمارے سرھانے۔ لیکن پاشا اپنے حال میں مست رات رات بھر ان سے باتوں میں مصروف۔ صبح ویسے ہی تر و تازہ اٹھ رہے ہیں۔ اب جناب ٹوتھ پیسٹ مہمان کے پاس، شیو کا سامان مہمان عزیز کے قبضے میں۔ دفتر جانے کی جلدی، بغیر شیو کیے دفتر چلے گئے۔ تیار ہو کر جوتے ڈھونڈ رہے ہیں پتا چلا مہمان عزیز پہن کر چلے گئے۔ میرے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار لیکن وہ چپل پہن کر خوشی خوشی دفتر چلے گئے
اکثر ایسے مہمان وارد ہوتے جن کی جیب سفر ہی میں کٹ چکی ہوتی۔ اب ان کے گھمانے پھرانے سے لے کر زادِ راہ اور واپسی تک کا ٹکٹ ہمارے ذمے۔ یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان مہمان کے ساتھ اور کتنے لوگ ہوا کرتے تھے۔

وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ بڑے لوگ، بڑے ادیب، بڑی بڑی اکیڈمیاں، مشہور و معروف ادیبوں سے ملنے کے بے شمار مواقع۔ بڑے بڑے جلسے ہوتے۔ بڑی بڑی محفلیں سجائی جاتیں اور یہ اپنی باتوں سے محفلوں کو زعفران زار بنا رہے ہیں، قہقہے بلند ہو رہے ہیں لیکن بعض اوقات یہ گھر آکر بہت اداس ہو جاتے انھیں ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ اپنوں نے دل توڑا، دوستوں نے بے اعتنائیاں برتیں، نقادوں نے بے انصافیاں کیں۔ وہ سب سہتے رہے، ہنستے رہے، مسکراتے رہے۔ ان کے چہرے پر شگفتگی اور ہونٹوں پر لازوال مسکراہٹ مرتے دم تک قائم رہی۔

یہ میری خوش قسمتی رہی کہ قدرت نے ہمیں ہم مذاق بنایا تھا۔ ہماری پسند ایک، شوق ایک، ذوق ایک، دلچسپی ایک۔ ہم برابر ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے۔ اگر انھیں پھولوں کا شوق ہے تو مجھے بھی، مجھے گھر سجانے کا شوق ہے تو انھیں بھی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ہم دونوں کو تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ دوسری مصروفیات میں پھنس کر میرا مطالعہ تو نہیں لیکن لکھنے کا شوق تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ گھریلو کاموں میں بھی اکثر و بیشتر میری مدد کیا کرتے۔ خاص کر دعوت وغیرہ کے موقع پر۔ میں منع کرتی تو کہتے میں تمھارا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔
لباس کی طرح گھر کی صفائی کا بھی انھیں بہت دھیان رہتا تھا۔ اس معاملہ میں وہ بہت نفاست پسند تھے۔ چیزوں کا اِدھر اُدھر پھیلا رہنا یا جگہ سے بے جگہ ہونا انھیں سخت ناپسند تھا۔ کچھ دنوں سے میرا لکھنا کافی حد تک چھوٹ گیا تھا وہ طرح طرح سے ترغیبیں دیتے۔ میز پر لکھنے پڑھنے کے تمام لوازمات رکھ دیتے اور کہتے جاکر لکھو۔" میں کہتی ــــ
"آج میرا دماغ پریشان ہے۔" کہتے "اسی پر لکھو۔"

"موڈ ٹھیک نہیں ہے"

"آہا! اس سے بڑھ کر کیا ٹاپک ہو سکتا ہے۔ اسی پر لکھو"

"اسکول میں بہت کام ہے"

"اس کام ہی پر لکھو"

غرضیکہ طرح طرح سے گھیر باندھ کر لکھنے کی طرف مائل کرتے رہتے اور میں کاموں کے انبار تلے ایسی دبی کہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔

اسکول میں طرح طرح کے مسائل، اس کی عزرتیں، جائداد کے مسائل، لوگوں کا طرح طرح کا دباؤ۔ حالات کے چکروں نے مجھے کچھ دنوں تک بالکل ہی لکھنے سے مجبور کر دیا۔ میں بیمار رہنے لگی۔ پاشا صاحب کو خود طرح طرح کے طوفانوں سے ٹکرانا پڑا یہاں تک کہ یہ خود ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے۔ لیکن انھوں نے حالات کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے۔ مطالعہ کی کثرت نے ان کی صحت پر بڑا اثر ڈالا۔ آرام کرنا جانتے نہیں تھے۔ کبھی کیاریوں کی صفائی ہو رہی ہے، پھولوں کی سینچائی ہو رہی ہے۔ کبھی گھر کی صفائی میں مشغول ہیں۔ کبھی طلبہ کو پڑھانے میں، کبھی خود مطالعہ میں غرق ہیں۔

مزاح نگاری کو عموماً تفننِ طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض بزعمِ خود غلط قسم کے نقاد اسے دوسرے درجے کا ادب بھی سمجھ بیٹھے ہیں۔ مزاح نگار کے دل تک کوئی نہیں پہنچتا۔ اس کے قہقہوں کو تو لوگ یاد رکھتے ہیں لیکن اس کے دل کے اندر جھانکنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا۔ مزاح نگار درحقیقت سماج کی برائیوں اور اس کی ناہمواریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا کام ایک معلم، ایک مصلح اور ایک واعظ کا ہوتا ہے۔ فرق صرف اسلوب، اندازِ بیان یا طرزِ تحریر کا ہے۔ پاشا صاحب کا فن محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھا۔ وہ جب بھی لکھنے بیٹھتے ڈوب کر لکھتے۔ اپنے قلم کو انھوں نے سماج کی برائیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنایا۔ وہ سماج میں پھیلی طرح طرح کی برائیوں اور گندگیوں سے بہت نالاں رہا کرتے تھے۔ خاص کر ہم دونوں موجودہ تعلیمی نظام سے بہت نالاں رہتے تھے۔ ہماری باتوں کا موضوع اکثر یہی ہوا کرتا۔ لیکن پاشا صاحب کا اندازِ بیان جارحانہ نہیں تھا ان کا دل بھی ان کے چہرے کی طرح خوبصورت اور شگفتہ تھا۔

شروع شروع میں وہ میرا بہت مذاق اڑاتے، اکثر "مولبیائن" کہہ کر پکارتے۔

"ارے مولبیائن! کہاں ہو؟"

"مولبیائن سنو تو۔ آج ایسا ہو گیا!"

"مولبیائن یہ بات ہوئی ..... وہ بات ہوئی" وغیرہ وغیرہ

میں کبھی ہنستی، کبھی چڑ جاتی۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے بھی ان کی چڑھ نکالی — "ارے واہ! اتنے بڑے ادیب، ایم۔ اے علیگ۔ اتنا بھی نہیں جانتے مولوی کی بیوی کو مولبیائن کہا جاتا ہے۔ اب آپ خود مولوی ہو گئے"

پھر وہ مجھے "ملّانی" کہنے لگے۔ میں نے پھر بحث کی۔

"بات کچھ بنی نہیں، ملّانی بھی ملّا کی بیوی ہوتی ہے"

لیکن آخری زمانہ میں مذہب کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ داڑھی رکھ لی۔ فریضۂ حج سے سرفراز ہوئے

ر شروع کی تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ۔ بیچے صاحب اب روزے بھی رکھنے لگے۔ حتیٰ کہ کسی دن سحری
نہیں اُٹھے تو بھی روزہ رکھ لیا۔ تراویح پڑھ رہے ہیں تو تین تین ختم کر لیے۔ مدرسہ کی ختم ہوئی تو مسجد جانے
ے۔ وہاں کی ختم ہوئی تو گھر پر سورہ تراویح پڑھنے لگے۔

ان کے مزاج میں اس قدر سادگی اور انکساری تھی کہ کوئی اجنبی انھیں ہرگز اتنا بڑا آدمی نہیں سمجھتا۔
Adjestment کا مادّہ ان میں بہت زیادہ تھا۔ لکھنؤ جیسے بڑے اور بارونق شہر سے سیوان
جیسے ٹمٹماتے شہر میں آکر رہے تو بالکل یہاں والوں کی طرح ہو گئے۔ انھوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں
پسے چھوٹے شہر میں ہوں۔ انھوں نے اپنا ادبی ماحول خود پیدا کر لیا۔ یہاں والوں میں اس قدر گھل مل
گئے، رس بس گئے کہ یہاں والوں ہی جیسے لگنے لگے۔ حتیٰ کہ یہاں کی زبان بھی وہ بہت تیزی سے پکڑنے
لگے۔ اکثر بھوجپوری الفاظ کے معنی پوچھتے اور ٹوٹی پھوٹی بولی بھی سمجھ لیتے۔ جب وہ سیوان آکر رہنے لگے
تو "لوہا سنگھ" ڈراما بہت شوق سے سنتے تھے۔ یہ ڈرامے کا اثر تھا یا ہنسی کی رو تھی وہ مجھے "کھیدرن کی مائی"
کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ میں کبھی ہنس دیتی، کبھی جھنجھلاتی، کبھی غصّے میں لڑ پڑتی۔ یک لخت انھوں نے اپنا اندازِ
تخاطب بدل دیا۔ کچھ دنوں بعد ایک دن میں نے خود چھیڑ نکالی ــــ

"آپ کی کھیدرن کی مائی کہاں گئی؟"

"مجھے معاف کر دو، میں ہنسی کی رو میں کہہ جاتا تھا۔ تمھارے جذبات کو ٹھیس لگتی تھی نا، اب نہیں کہوں گا۔"

باقیات پاشا میں اہم ترین شے ان کی ذاتی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ کتابیں
خریدنے کا انھیں جنون کی حد تک شوق تھا۔ جب وہ سفر سے آتے کتابوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ لائبریری میں
سیکڑوں نادر و نایاب کتابیں ہیں۔ قلمی نسخے اور مخطوطات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ نادر کتابوں
کے لیے وہ منہ مانگی قیمت دینے کو تیار رہتے۔ ان کے بیش تر شاگرد سیوان کے مضافات سے نادر و نایاب
کتابوں کا پتا لگا کر انھیں تحفتاً یا قیمتاً لاکر دیا کرتے تھے۔ کتابوں کے لیے ان کی نگاہیں بڑی دور بیں تھیں۔
فٹ پاتھ پر کتابیں بیچنے والے ہوں یا ردّی بیچنے والے، وہ ان کے یہاں سے بھی انمول ہیرے نکال لیتے۔ اکثر
بیش بہا کتابیں کوڑیوں کے مول مل گئیں۔ انھوں نے اپنی لائبریری کا نام پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رکھا
تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ محض نام کا نہیں بلکہ یہاں دن رات کام ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے ریسرچ اسکالرس نے
یہاں بیٹھ کر کام کیا۔ پاشا صاحب کی نگرانی میں تحقیقی مقالے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے تھیسس لکھے۔ پاشا صاحب
ان کی سناپسس سے لے کر viva تک کی ذمّہ داری اپنے سر لیتے۔ لیکن تھیسس سامنے آتا تو پاشا کے
بجائے کوئی اور نگراں نظر آتا۔ میرے لیے یہ بڑا افسوسناک پہلو تھا۔ اکثر یہاں دور دراز اور مشہور و
معروف یونی ورسٹیوں کے طلبہ و طالبات ریسرچ کرنے آتے اور ہمارے یہاں ٹھہر کر اپنا کام ہفتوں یا
مہینوں میں پورا کرتے۔ خاص کر ظرافت اور انشائیہ پر کام کرنے والوں کے لیے یہاں سے بڑا کتابوں کا
ذخیرہ کہیں اور نہیں مل سکتا تھا۔

پاشا صاحب کتابیں لائبریری کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے خریدتے تھے۔ اگر یوں کہا جائے
کہ کتابیں ہی اُن کی زندگی تھیں تو غلط نہ ہوگا۔ مطالعہ کا شوق اِس قدر تھا کہ جب تک اپنی لائی ہوئی ساری
کتابیں پڑھ نہ لیتے انھیں چین نہیں ملتا تھا ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب اُن کے ہاتھ میں ہوتی۔ مطالعہ

کے لیے نہ توکوئی وقت مقرر تھا اور نہ ہی جگہ۔ وہ کہیں بھی ہوں، کسی حال میں ہوں، مطالعہ جاری ہے۔ بجلی نہیں رہی، لالٹین یا لیمپ نہیں مل سکا تو ٹارچ کی روشنی میں پڑھ رہے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہوں یا ٹہل رہے ہوں، کسی کی بات سُن رہے ہوں یا کسی سے باتیں کر رہے ہوں، کتابوں کا اُن کے ہاتھوں میں ہونا ضروری تھا۔ یادداشت غضب کی تھی۔ وہ علم کا سمندر تھے۔ سیمینار یا کانفرنس وغیرہ میں وہ چھا جاتے۔ اکثر اوقات میں نے محسوس کیا کہ لوگ ان کے علم سے گھبراتے تھے۔ لیکن ایسی باتوں کو وہ خود پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ان کے سامنے شرمندہ ہو۔ لہٰذا معاملہ کبھی ہنسی مذاق سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔

لیکن یہی پاشا صاحب کسی کم علم یا جاہل سے ملتے تو نقشا کچھ اور ہوتا۔ یہ اس سے بھی کم علم دکھائی دیتے۔ پُرانا مالی آگیا تو زمین پر بیٹھ کر اس سے باغبانی کی باتیں کرنے لگے۔ اسکول میں کام کرنے والے مزدوروں اور مستریوں سے خوب باتیں کرتے اور ان کے فن کی بڑی تعریفیں کرتے۔ یہاں تک کہ وہ خوشی سے پُھول جاتے۔ نوکروں کو کبھی نوکر نہیں سمجھا۔ اپنی پلیٹ خود دھوکر رکھ دیتے۔ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹا دیتے۔ گھر کی صفائی میں لگے ہیں تو گرد و غبار میں اٹے صفائی کر بھی رہے ہیں کرا بھی رہے ہیں۔ رکشے پر بیٹھے ہیں تو رکشے والے سے خوب باتیں ہو رہی ہیں اور اس لطف و کرم کے ساتھ کہ رکشا والا انھیں اپنوں میں سے ایک سمجھنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بے ڈھب رکشے والا ان کے مذاق کو نہ سمجھتے ہوئے اُلجھ جاتا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ ہنس رہے ہیں اور وہ برس رہا ہے۔

سادہ لوح ہوتے ہوئے وہ اپنی باتوں میں بے باک اور نڈر تھے۔ کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ زبردست سے کبھی نہیں دبے۔ کمزوروں کی ہمیشہ حمایت کی بلکہ اکثر ان کے حق کے لیے لڑ بھی پڑتے۔ خاندان میں غریب اور کمزور رشتہ دار اُن کا سب سے بڑا رشتہ دار ہوتا۔ امیر رشتہ داروں سے کترایا کرتے تھے غریب رشتہ داروں سے ٹوٹ کر ملتے۔

جس طرح ان کی شخصیت باغ و بہار تھی اور مزاج میں رنگا رنگی تھی اسی طرح ان کی تحریروں میں بھی رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ لیکن ہر رنگ میں وہ منفرد رہے اور اپنا ایک الگ مقام بنا کر رکھا۔ طنز و مزاح کے تو وہ واقعی بادشاہ تھے۔ ان کی پیروڈیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ فنِ انشائیہ پر انھوں نے دسترس حاصل کی اور انھوں نے جو انشائیے لکھے وہ فنِ انشائیہ کی کسوٹی پر پورے اترے اور ان کے انشائیوں نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ خاکے لکھنے لگے تو اس فن کو کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ آخری خاکہ "احمد جمال پاشا" کے عنوان سے ہے۔ اب سے چند سال پہلے نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل نے "نقوش" کا ادبی معرکے نمبر نکالنے کا ارادہ کیا۔ ان سے بھی چند معرکوں پر لکھنے کی فرمائش کی۔ اب یہ معرکے لکھنے میں بالکل کھو گئے۔ کئی معرکے لکھ ڈالے۔ خدا جانے وہ معرکے کیوں نہیں شائع ہوئے۔ اگر وہ شائع ہو جاتے تو پاشا صاحب کی ایک نئی ادبی حیثیت سامنے آجاتی۔ میں نے وہ معرکے پڑھے بھی تھے اور انھیں لکھتے ہوئے دیکھا بھی تھا جس میں انھوں نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش کی تھی۔ دراصل پاشا صاحب انتہا پسند تھے۔ جس چیز میں لگ جاتے اس میں جی جان سے لگتے۔ آج کل وہ تذکروں پر کام کر رہے تھے۔ "تذکرۂ صوفیائے بہار"، "تذکرۂ صوفیائے سارن"، "تذکرۂ ہزار داستان" (دفترِ ظرافت)، تذکرۂ صنم خانۂ تبسم"، "تذکرۂ بہارِ بہار"، "تذکرۂ نامہ نگارانِ اودھ پنچ" وغیرہ کے مسودے مکمل اور

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

یوسف ناظم
19, Al-Hilal,
13, Bandra Reclemation,
Bandra,
Bombay.

احمد جمال پاشا کو وداعی سلام

ابھی فکر تونسوی کو ہم ٹھیک سے رخصت بھی نہ کر پائے تھے کہ پٹنہ سے یہ خبر آئی کہ احمد جمال پاشا چل بسے۔ فکر کو گزرے جملہ پندرہ ۱۵ ہی دن ہوئے تھے۔ پندرہ دنوں میں دو ۲ مزاح نگار۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں ہوا ستم ظریفی ہوئی۔ یہ تیغ دو دم ایسی لگی کہ تسمہ لگا نہ رہا۔ احمد جمال پاشا کی طرف سے کسی کو کوئی ایسی تشویش نہیں تھی۔ فکر کا معاملہ الگ تھا وہ تو ایک عرصے سے ڈینجر زون میں تھے۔ احمد جمال پاشا اپنی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کھانے پینے میں محتاط ہو گئے تھے۔ گھومنا پھرنا تو اُن کا کم ہو ہی گیا تھا۔ جب سے سیوان منتقل ہوئے تھے سیوان ہی کے ہو کر رہ گئے تھے اور یہ سیوان برائے نام ہی ہندستان میں ہے۔ اُن کے دوست احباب نے انھیں لکھنؤ چھوڑنے پر شاید بُرا بھلا کہا بھی ہو لیکن احمد جمال پاشا نے سیوان میں اپنی الگ سلطنت بنالی تھی۔ کوئی ادارہ تھا جس کے وہ سربراہ تھے۔ کہتے تھے میں نے وہاں ایک بہت بڑی لائبریری بھی بنالی ہے۔ میں نے تو ایک مرتبہ پوچھا بھی تھا کہ اس لائبریری میں کتابیں بھی ہوں گی اگر ہیں تو اس لائبریری کا نام خدا بخش لائبریری شاخ سیوان رکھ لو۔ احمد جمال پاشا، سیوان میں باغبانی بھی کرتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ وہاں کی سخت زمین سے طرح طرح کے پودے نکالتے ہیں۔ بہرحال انھوں نے اپنے آپ کو معروف و مسرور رکھنے کے بہانے ڈھونڈ رکھے تھے ـــــ حج بیت اللہ سے فارغ ہونے کے بعد یا شاید اس سے بہت پہلے ہی انھوں نے اپنے معمولات کو راہِ مستقیم پر ڈال دیا تھا۔ ظرافت نگاری کو بھی مکروہاتِ دنیوی سمجھنے لگے تھے۔ ہیرا پھیری کی بات اور تھی ورنہ وہ ظرافت کی بازی گاہ میں نان پلیئنگ کپتان Nonplaying Captain کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ کبھی کسی کی پیٹھ تھپک دی کبھی کسی کو دعائیں دے دیں اور کبھی جھنجھلا کے کسی کو اناڑی یا نومشق کہہ دیا ـــــ یہ سب باتیں کھیل کا حصہ تھیں۔ میں ان سے بہت ـــــ بہت زیادہ بلکہ نازیبا حد تک بے تکلف تھا اور یہ حُسنِ سلوک دوطرفہ تھا۔ اب بھی احمد جمال پاشا کا مُسکراتا چہرہ، ہنستی آنکھیں کچھ حیران پریشان حُلیہ میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ احمد جمال پاشا جھینپتے تھے تو اور زیادہ خوش گوار دکھائی پڑتے تھے۔ لطیفے بہت سناتے تھے اور محفل میں اپنی جان پر کھیل جاتے تھے کہ سب سے معرکتہ الآرا بات رہی کہیں۔ کہیں سے خود پر چوٹ پڑتی تو اس کا لطف لیتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ احمد جمال تھے اور جمال ہم نشینی سمٹنے اور بکھرنے کے شوقین۔

دو یا تین سال پہلے جب حج کے لیے گئے تو بمبئی ہی سے گئے۔ ان کی نیت اور ارادے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اچانک ایک دن خط ملا۔ لکھا کہ میں فلاں دن بمبئی پہنچوں گا۔ صابو صدیق مسافر خانے میں ٹھہروں گا۔ وہیں آکر مل لینا۔ میں بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔ ہر طرف ڈھونڈا۔ تینوں چاروں منزلیں دیکھ ڈالیں۔ داخلہ رجسٹر میں نام تلاش کیا۔ مائکروفون پر اعلان کیا۔ اُن کے لیے زرین ٹراویلرس کی طرف سے ایک نوجوان انھیں ڈھونڈنے کی مہم پر آئے تھے وہ انھیں جانتے نہیں تھے میرے ساتھ ہی لگے رہے کہ احمد جمال پاشا ہاتھ لگ جائیں تو انھیں ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے لیکن احمد جمال پاشا نے شاید یہ طے کیا تھا کہ حج پر جانے سے پہلے ایک آخری ظریفانہ حرکت کر جائیں وہ وہاں آئے ہی نہیں۔ رات کے ۱۱ بجے کے قریب جب میں گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو حسن کمال کے ہاں موجود ہیں اور اب اپنی قیام گاہ پر واپس جانے ہی والے ہیں —— بس اس وقت فون ہی پر بات ہو سکی ملاقات نہ ہو سکی جس کا افسوس رہا لیکن جلد ہی اس کی تلافی ہو گئی۔ مارچ ۱۹۸۶ء میں دلّی میں اُن سے ملاقات ہوئی اور مکتبہ جامعہ کی ایک رنگا رنگ محفل میں دن بھر اُن سے جی بھر کر رقیبانہ اور حریفانہ معاملہ ہوتا رہا۔ اس محفل کی روداد اعجاز علی ارشد نے لکھی جو جون ۸۶ء کے کتاب نما میں شائع ہوئی۔ تصویر کے ساتھ۔ یہی احمد جمال پاشا سے آخری ملاقات تھی —— اب اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو تصویر بے رنگ نظر آتی ہے۔ الحسن کا جمال جاتا رہا۔

احمد جمال پاشا محفل کے آدمی تھے۔ جی چاہتا تھا کہ ان سے چھیڑ کی جائے۔ یہ وہ چھیڑ نہیں تھی جس میں حسرت کا پہلو ہوتا ہے یہ تو سرت بلکہ بے تحاشا مسرت کی چھیڑ تھی۔ کرشن جی تو انھیں "خوباں" بھی سمجھتے تھے۔ اُردو کے مزاح نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہیں لکھا تھا کہ بشمول کرشن چندر مزاح نگاروں میں صرف احمد جمال پاشا "قابلِ دید" تھے۔ (قابلِ دید کے الفاظ میرے ہیں کرشن جی کے الفاظ کچھ اور تھے)۔ احمد جمال پاشا کو لباس کی نفاست اور سجاوٹ سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ کسی جلسے میں جانا ہوتا تو لکھنے کی میز پر شاید اتنا وقت نہ صرف کرتے ہوں گے جتنا دوسری میز پر خرچ کرتے تھے۔ بار بار آواز دینی پڑتی تھی۔

احمد جمال پاشا عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن انھوں نے بہت پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور اُن کے لکھنا شروع کرتے ہی شہرت ان کے گھر دوڑی دوڑی چلی آئی تھی۔ "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا اور اس میں بھی ان کا ایک مضمون موجود ہے۔ "نقوش" کے شخصیات نمبر میں بھی احمد جمال پاشا موجود ہیں جب کہ یہ ۱۹۵۸ء یا ۵۹ء میں چھپا تھا اور اس وقت احمد جمال پاشا تو اپنی عمر کے نصف بہتر حصے تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ احمد جمال پاشا نے کوئی دس پندرہ کتابیں لکھی ہوں گی۔ ان کے اپنے مضامین کے مجموعے کم ہیں لیکن تالیفات بہت ہیں۔ لطیفے جمع کرنے کا انھیں بہت شوق تھا۔ انھوں نے نہ صرف فنِ لطیفہ گوئی پر ایک کتاب آج سے ۲۰ سال پہلے شائع کی تھی بلکہ مزاح نگاروں کے لطیفے، مجاز کے لطیفے اور ملّا نصر الدین کے لطیفے بھی کتابی شکل میں شائع کیے تھے۔ شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت اور اُردو کے چار مزاحیہ شاعر بھی اُن کی تخلیقات میں شامل ہیں۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوئی میں ان سے یہی پوچھتا کہ اب کون سا لطیفہ گو شخص یا شاعر تمھارے زیرِ طبع ہے اور وہ بھی بلا جھجکے کسی نہ کسی کتاب کا نام لے لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجویاتِ میر پر بھی اُن کی ایک کتاب ہے۔

احمد جمال پاشا سے ایک بہت دلچسپ ملاقات کئی سال پہلے بمبئی میں ہوئی تھی اس وقت وہ سگار لکھنوی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور لکھنؤ کے جب دو ہم مشرب یا دو ہم مکتب آپس میں ملتے ہیں تو لکھنوی آداب اور تکلفات کو یہ دونوں گھر کے طاقوں پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ کوئی ۲۰ سال پہلے کی بات ہوگی۔ اس وقت تو احمد جمال پاشا کھانے پینے میں بھی اتنے محتاط نہیں تھے اور سگار لکھنوی کی بیگم خالص لکھنوی اور اودھی کھانے پکانے کی مشاق تھیں۔ احمد جمال پاشا نے شاید دو مرتبہ اپنی واپسی کا ٹکٹ منسوخ کروا یا تھا۔ وجہ وہی دسترخوان تھا۔ ان دنوں میں احمد جمال پاشا نے اپنے پرانے لطیفوں کا سارا خزانہ نذر سگار کر دیا تھا۔ جب بھی وہ کوئی لطیفہ سناتے بس یہی کہتا کہ ٹھہرو میں اس سے زیادہ پرانا لطیفہ سناتا ہوں لیکن اس معاملے میں انھوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔

احمد جمال پاشا کے دوستوں کا سلسلہ، سلسلہ کوہ قراقرم کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ دلّی میں ایک مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ زبردستی ہمدرد نگر لے گئے۔ شہر سے کئی میل دور۔ جاتے وقت تو میں راستہ بھر ان سے لڑتا جھگڑتا رہا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ احمد جمال پاشا نے بھولے ہی سے سہی لیکن کرم کیا جو مجھے ساتھ لے گئے۔ یہ ہمدرد نگر میں کب دیکھ پاتا۔ یہ تو اچھی خاصی دانش گاہ ہے۔ نسیم شاہ وہاں ایڈمنسٹریٹر تھے۔ غالباً دسنوی صاحب کے وہاں سے جانے کے بعد اُن ہی کا تقرر ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی ڈگریوں سے آراستہ تھے اور ان میں سے دو ڈگریاں بزنس ایڈمنسٹریشن اور پرسونل اسٹڈیز کی تھیں۔ میں نے احمد جمال سے پوچھا کہ اتنے قابل شخص سے تمھاری دوستی کیسے ہوئی۔ ہمدرد نگر میں میں نے دیکھا کہ ہر کونے سے کوئی نہ کوئی احمد جمال پاشا کا عزیز یا عزیزہ چلی آ رہی ہیں۔ اُس دن مجھے اندازہ ہوا کہ احمد جمال پاشا معقول آدمی ہیں۔ انھیں زبردستی کھانے پر روک لیا گیا میں بہرحال واپس آ گیا کیونکہ شاید اُسی دن مجھے بمبئی واپس ہونا تھا۔

میں لکھنؤ میں اُن کے گھر بھی جا چکا ہوں۔ وہ اتفاق سے لکھنؤ میں اس وقت موجود تھے۔ عابد سہیل کے ساتھ میں اُن کے گھر گیا تھا اور اس دن مجھے معلوم ہوا کہ لکھنؤ گلیوں کا شہر ہے۔ اکیلا تو میں شاید ہی اُن کے گھر پہنچ سکتا لیکن احمد جمال پاشا گھر پر تھے نہیں سرور جمال تھیں اور انھوں نے بتایا کہ وہ سیوان کے ٹکٹ لانے اسٹیشن گئے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کے جلسوں میں بھی احمد جمال پاشا شریک ہوا کرتے تھے اور اپنی پتلون کی کریز کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اس شخص کو میں بھول نہیں سکوں گا۔ اسے اصل میں ایسا کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں کون سا غالب ہوں لیکن احمد جمال پاشا مجھے عارف ہی کی طرح عزیز تھے۔ زبان پر کبھی یہ بات نہیں آئی لیکن سب باتیں کہنے کی تھوڑی ہوتی ہیں۔

اعجاز علی ارشد
HEAD OF DEPTT. OF URDU,
B.N. COLLEGE,
PATNA - 4.

اپنی یادیں بھی لیے جاؤ

۲۷ ستمبر کی خوشگوار صبح کو جب احمد جمال پاشا حسب معمول اپنے عزیز شاگرد ظفر کمالی کے ہمراہ ہنستے مسکراتے میرے گھر آئے تو مجھے قطعی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ نہ صرف بیمار ہیں بلکہ ملک الموت نے انھیں صرف بیس بائیس گھنٹوں کی مہلت دے رکھی ہے۔ انھوں نے آتے ہی پہلے تو ہاتھ ملایا، پھر گلے ملے اور اس کے بعد ناشتے کی فرمائش کر دی۔ میں نے از راہ مذاق کہا کہ میں تو ناشتہ کر چکا ہوں اور اب باہر نکلنے کی تیاری میں ہوں۔ پھر کیا تھا، نہایت رقت آمیز لہجے میں میزبان اور مہمان کے رشتوں اور مہمان داری کے دینی و دنیاوی فوائد پر تقریر شروع کر دی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں فوری طور پر چائے اور اس کے بعد بہترین ناشتے کا انتظام کروں۔ میں نے ان سے بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ انھیں صبر کی تلقین کی اور اطمینان سے بیٹھنے پر آمادہ کر لیا۔ پھر چائے آئی اور ناشتے کا دور چلا جس کے دوران خوش گپی بھی ہوتی رہی۔ بات ادب سے چل کر سیاست کی طرف آئی اور پھر ملک کے موجودہ حالات تک پہنچی۔ مرحومین میں سے شوکت تھانوی، اعظم کریوی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالودود اور فکر تونسوی کی یاد آئی، زندوں میں سے آل احمد سرور، محمد حسن، قمر رئیس، عنوان چشتی، شاہد علی خاں اور یوسف ناظم کا ذکر ہوا۔ اندرا گاندھی کے تذکروں، لکھنؤ کے ادبی، صحافتی اور سیاسی جلسوں کے قصوں اور علی گڑھ کے ادبی ہنگاموں کی یاد نے مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ خود انھوں نے ہاتھ دھونے کی بھی زحمت گوارا نہ کی اور ایک کے بعد ایک لطیفے سناتے رہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ گھنٹوں اسی طرح سنجیدہ ترین موضوعات کو چٹکیوں میں اڑاتے رہیں گے اس لیے میں نے اپنی تمام مصروفیات بلا نوٹس منسوخ کر دیں لیکن کوئی سات آٹھ سگریٹ جلانے اور تقریباً اتنے ہی لطیفے سنانے کے بعد انھوں نے خلاف معمول واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر اسی بیچ اسرار جامعی آ گئے۔ پھر روئے سخن ان کی طرف ہو گیا۔ پہلے تو فرمانے لگے:

"کیوں علامہ! یہ حمل حرام کی طرح آپ کا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟"

اس کے بعد انھیں مشاعروں میں کامیابی کے نسخے بتانے لگے۔ بیچ بیچ میں ایک دو جملے میری طرف بھی اچھال دیتے جنھیں میں ہنس کر جھیل جاتا۔ تقریباً سوا بارہ بجے انھوں نے گویا آخری وارننگ کے طور پر کہا:

"یار آپ تو عظیم آباد کی عزت خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اتنی دیر سے علامۂ ظرافت یہاں موجود ہیں اور آپ نے چائے تک نہیں پلوائی"۔

اسرار جامعی کچھ جھینپے، کچھ شرمائے۔ میں ہنستے ہوئے چائے لانے چلا گیا لیکن چائے کا یہ آخری کپ ان کی قسمت میں نہ تھا۔ چائے آئی، انھوں نے پیالی اٹھائی اور پھر واپس رکھ کر باتھ روم کی طرف چلے گئے۔ واپس آئے تو کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے کہا، خیریت؟ مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"یار! یہ بلڈ پریشر کل سے تنگ کر رہا ہے۔ میں ابھی اس کا دماغ درست کرتا ہوں"۔

پھر وہ بستر پر لیٹ گئے اور پسینے کی شدت سے یکے بعد دیگرے کپڑے اتارنے لگے۔ میں نے کسی نامعلوم احساس کے تحت فوراً ایک ڈاکٹر بلوایا جس نے دیکھتے ہی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں ان کی نبض کے ساتھ ہمارے دل بھی ڈوبتے ابھرتے رہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اپنی مضبوط قوت ارادی کے سبب وہ موت کی سرحد پر جا کر لوٹ آئے ہیں۔ اسی دوران ان کی علالت کی خبر سن کر ڈاکٹر عابد رضا بیدار وہاں پہنچ گئے تھے، پھر سمیع عسکری، احمد یوسف اور ظہیر صدیقی آئے۔ اور اس کے بعد تو لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ لیکن وہ کسی کو دیکھتے کب تھے؟ جب کبھی ہوش آتا اور کچھ بولنے کی کوشش کرتے تو ہم لوگ اشارے سے منع کرتے۔ جواباً مسکرا کر بڑی معصومیت سے بس اتنا ہی پوچھتے کہ میں بالکل خاموش رہوں تو کیا اچھا ہو جاؤں گا؟ ہم لوگ انھیں یقین دلا دیتے کہ انشاء اللہ آپ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔ پھر وہ آنکھیں بند کر لیتے اور ہم لوگ بارگاہ خداوندی میں دست دعا دراز کر دیتے۔ مگر ۲۴ ستمبر کی صبح انھوں نے ایک بار اسی طرح آنکھیں بند کیں تو پھر قیامت تک کے لیے سو گئے۔ بیگم سرور جمال اور ان کے دوسرے عزیز و اقارب پٹنہ پہنچ چکے تھے، پروفیسر ممتاز احمد، پروفیسر محمد علی خاں، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر سمیع عسکری، ڈاکٹر متین، اسلم آزاد، رضوان احمد اور یونس مشہری وغیرہ بھی آ گئے تھے۔ ان کے جسد خاکی کو سیوان لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں اور دن کے دو بجے وہ پٹنہ سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

اس کے دوسرے ہی دن آل انڈیا ریڈیو والوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ پہلی بار پٹنہ کب آئے تھے؟ میں نے کہا شاید ۱۹۶۹ء میں غالب صدی سیمینار میں، یا اس سے بھی پہلے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ صدیوں سے پٹنہ ہی میں رہتے ہیں۔ یہاں کی قدیم ادبی شخصیتوں اور سیاسی و تاریخی اداروں سے انھوں نے کتابوں کے ذریعہ شناسائی حاصل کی تھی لیکن جب کبھی کسی موضوع پر گفتگو کرتے انداز چشم دید

اچھا ہوتا۔ بہار کے باصلاحیت مگر گمنام ادیبوں کو اردو دنیا کے نقشے پر نمایاں کرنے کے لیے انھوں نے برابر کوششیں کیں۔ انجم مانپوری کے بارے میں ایک ضخیم خاص نمبر نکالنے کا وہ مدتوں سے منصوبہ بنا رہے تھے اور اس کے لینے کے لیے کافی مضامین فراہم کر چکے تھے۔ ذکی انور مرحوم کے افسانوں کا مجموعہ شایع کرنے کے لیے انھوں نے کئی بار مجھے توجہ دلائی اور یہاں تک کہا کہ وہ اس کی اشاعت کا نصف خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ عنایت خاص صرف بہار کے ادیبوں تک محدود نہ تھی۔ ادیب خواہ اتر پردیش کا ہو، کرناٹک یا مہاراشٹر کا، وہ ایسی تندہی سے اس کی دیکھ بھال کرتے تھے جیسے جوہری اپنے نگینوں کی۔ نوجوان ادیبوں پر خاص طور سے نظر رکھتے تھے۔ کسی طالب علم میں لٹریچر کا تھوڑا سا بھی ذوق دیکھتے تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ پہلے اس کے لیے پسندیدہ موضوع پر کتابیں فراہم کرتے اور پڑھواتے۔ پھر لکھنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس کے مضامین کی اشاعت کے لیے مدیروں کو خط لکھتے اور کبھی کبھی کتابوں کی اشاعت کے لیے اپنے پاس سے روپے دیتے۔ جب کبھی ایسے کسی نو وارد کو ان کے ساتھ دیکھ کر میری نگاہوں میں کوئی سوال ابھرتا تو بڑے پر لطف اور رازدارانہ انداز میں کہتے:

"ابھی ایسے پھنسا رہا ہوں۔ ایک بار ادب کا چسکا پڑ جائے پھر نکل نہیں سکتا۔"

ادب سے اپنی اسی دلچسپی کے سبب انھوں نے مختصر سے عرصے میں سیوان کی مردم خیز سرزمین میں ایک بار پھر ادبی سرگرمیوں کے لیے قوت نمو پیدا کر دی تھی۔

ادب اور ادب دوستوں سے ان کی یہ وابستگی عشق کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ شاید اسی لیے صف اول کے ادیبوں میں شامل ہونے کے باوجود ان کے ناز و انداز بڑے ادیبوں جیسے نہیں تھے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے لے کر فٹ پاتھ پر لگے ہوئے ٹی۔ اسٹالوں تک میں وہ بیٹھ جاتے اور جبیں پر ہلکی سی شکن تک نہ آتی۔۔ جولائی ۱۹۸۴ء میں حکومت ہند کی منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے ہم دونوں دہلی پہنچے، دیر رات گئے جامعہ ملیہ کے دوستوں سے ملنے کے بعد قیام کی فکر ہوئی۔ ہوٹل تو کوئی ملا نہیں البتہ نظر برنی مل گئے اور ان کے توسط سے غالباً یونی ورسٹی کے یونین آفس میں ایک کمرہ مل گیا۔ برسات کے دن تھے اور کمرے میں سیلن خاصی تھی۔ اس پر سے مچھروں کا حملہ۔ میرے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ کروٹیں بدلتے رہے ساری رات ہم۔ مگر پاشا صاحب رات بھر خراٹے لیتے رہے۔ دوسرے دن میں نے ہوٹل چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ وہیں رہنے پر بضد ہو گئے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے، نظر برنی کی دل شکنی ہوگی۔ میں اتفاق سے اسی شام پٹنہ واپس آگیا۔ وہ شاید دو تین دنوں تک اسی کمرے میں مقیم رہے، اور مچھروں سے رزم آرائی کرتے رہے۔ یہی نہیں اس کے بعد کئی بار نظر برنی کے گھر بھی ٹھہرے۔ ایک دن میں نے مذاقاً کہا کہ مچھر تو عنوان چشتی صاحب کے یہاں بھی بہت ہیں۔ کہنے لگے "اگلی بار وہیں ٹھہروں گا۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ دل شکنی انھیں آتی ہی نہ تھی۔ دردمندی اچھی چیز ہے مگر وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ دوستوں کی تو بات الگ ہے۔ کوئی انجان آدمی بھی دست سوال دراز کرتا تو اس کی حاجت روائی کو اپنا فرض سمجھ کر جان ہتھیلی پر لیے پھرتے۔ سفر سے بے حد بھاگتے تھے لیکن کسی غریب لڑکی کا رشتہ طے کرنے، کسی دوست کے لڑکے کا داخلہ کرانے یا کسی پڑوسی کو نوکری دلانے کے لیے دور دراز کا بھی سفر کرنے کو تیار ہو جاتے واپس آتے تو ہفتوں پریشان رہتے۔ بس بھلا کس منہ سے انھیں اس پریشان حالی سے باز رہنے کا مشورہ دیتا مگر کبھی کبھی چچا غالب کے حوالے سے سمجھانا چاہا کہ ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند کس کی حاجت روا کرے کوئی

وہ بھلا کب ماننے والے تھے۔ جہاں تک بن پڑا ہر ضرورت مند کی دامے، درمے، قدمے، سخنے پردہ داری کے ساتھ مدد کرتے رہے۔ ابھی پچھلے دنوں بہار کے مختلف علاقوں میں خوفناک سیلاب آیا تو ریلیف کے کپڑے خود اپنے کندھوں پر لاد کر مصیبت زدگان کو پہنچائے۔ کسی نے ہمدردی جتائی تو کہا — "پل صراط طے کرنے کی پریکٹس کر رہا ہوں!"

احمد جمال پاشا کی ادبی او صحافتی زندگی کا آغاز طالب علمی کے دور سے ہو گیا تھا۔ علی گڑھ میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے "اسکالر" کا "پیروڈی نمبر" نکالا جو اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا نمبر ہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء سے انھوں نے مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے لیکن انھیں شہرت "ادب میں مارشل لا" اور "کیوں، ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" سے ملی۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "اندیشۂ شہر" کے نام سے چھپا۔ لذت آزار، ستم ایجاد، مضامین پاشا اور چشم حیراں کے بعد ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ "پتیوں پر چھڑکاؤ" کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس کا انتساب فکر تونسوی کے نام تھا اور مقدمہ پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا تھا۔ غالب پر لکھے گئے ان کے مزاحیہ مضامین "غالب سے معذرت کے ساتھ" کے عنوان سے اور ظرافت نگاری سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین "ظرافت اور تنقید" کے نام سے چھپے۔ دنیا کی نوک کہانیاں، بہادر رتنا، طلسمی یاقوت اور بالشتیے کی گھنٹی وغیرہ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں ہیں۔ ان میں سے آخری کتاب ہندی میں بھی شائع ہوئی۔ مجموعی طور پر ان کی کوئی اٹھائیس کتابیں مطبوعہ ہیں اور چودہ غیر مطبوعہ۔ اس کے باوجود اگر بغور دیکھا جائے تو احمد جمال پاشا نے پڑھا زیادہ اور لکھا کم ہے۔ حالانکہ آج کل زیادہ تر ادیب اس کے برعکس کر رہے ہیں۔

پچھلے دس بارہ سالوں سے وہ ذکیہ آفاق کالج سیوان کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ معلم کم اور عالم زیادہ تھے۔ ان کا مطالعہ بھی ان کی لائبریری کی طرح وسیع تھا کیونکہ وہ کتابیں صرف جمع نہیں کرتے تھے، پڑھتے بھی تھے۔ کتابیں پڑھنے کا انھیں چسکا نہیں ہوکا تھا۔ جہاں کسی نادر کتاب یا مسودے پر نظر پڑتی اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ کہیں بھی جاتے تو چند گھنٹے فٹ پاتھ پر بکنے والی پرانی کتابوں

کی چھان پھٹک میں ضرور صرف کرتے اور کوئی اچھی کتاب مل جاتی تو اس طرح اس کی حفاظت کرتے جیسے سرمایہ دار اپنے بینک بیلنس کی کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انھوں نے ایک بڑی اور اچھی لائبریری تیار کر لی تھی جس میں دنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے بہترین ظریفانہ ادب کا سرمایہ خاص طور پر قابل دید تھا۔ دور دور سے ریسرچ اسکالر آتے اور کامیاب و کامراں واپس جاتے تھے۔ ان کے بعد یہ سرمایۂ ادب موجود تو رہے گا مگر شاید اچھی طرح محفوظ نہ رہ سکے کیونکہ کتابوں کی دیکھ بھال کسی اکلوتی اولاد کی طرح اب کون کرے گا؟

احمد جمال پاشا صرف تحریروں میں ہی ظرافت کے جلوے نہیں بکھیرتے تھے۔ عملی زندگی میں بھی بڑے باغ و بہار آدمی تھے اور ان کی جرأت رندانہ کا یہ حال تھا کہ کلیم الدین احمد اور قاضی عبد الودود جیسے سنجیدہ اور بزرگ حضرات سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کا مضمون نما کالم "تحقیق اور گلی ڈنڈا" اس سلسلے کی ایک دلچسپ کڑی ہے لطف تو یہ ہے کہ ان کی بذلہ سنج طبیعت خود اپنے بزرگوں کو بھی نہیں بخشتی تھی۔ کسی محفل میں ہم دونوں کے ایک مشترک شاگرد نے ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کچھ جرح کی تو کہنے لگے:

> "اصل میں ہم سب سولہ سترہ بھائی بہن تھے۔ اس لیے ہماری امّی جان ایک کی تاریخ پیدائش کو ہمیشہ دوسرے سے CONFUSED کر دیتی تھیں۔ ایسی حالت میں مجھے اپنی صحیح تاریخ پیدائش کیسے معلوم ہو سکتی ہے"!

پٹنہ میں ان کے علمی مذاق کا سب سے پہلا نمونہ غالباً اس وقت دیکھنے کو ملا جب انھوں نے شعبۂ اردو کے ایک JUNIORMOST اور ایک SENIORMOST استاد کو قاضی عبد الودود صاحب کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے بھیج دیا کہ میں نے قاضی صاحب سے بات کر لی ہے وہ پارلیمنٹ کی ٹکٹ کے لیے فخر الدین علی احمد صاحب سے آپ کی سفارشیں کر دیں گے۔ دونوں اساتذہ چند منٹوں کے وقفے سے قاضی صاحب کے گھر پہنچے۔ نتیجہ کیا نکلا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ان کے عملی مذاق کا شکار کبھی ان سے شکایت کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہتا تھا کیونکہ جب تک وہ دوبارہ ان سے ملتا پاشا صاحب کسی اور پر ہاتھ صاف کر چکے ہوتے اور وہ بے چارا اپنا غم بھول کر دوسرے کی درگت سے لطف اندوز ہونے لگتا تھا۔

اپنی ان ساری حرکتوں کے ساتھ پاشا صاحب بظاہر مجسّم ظرافت نظر آتے تھے۔ لیکن شاید ایک غم انھیں اندر ہی اندر گھلا رہا تھا اور وہ تھا لاولدی کا غم۔ نہ معلوم کیوں ایک مرد بے تکلف کے ساتھ قدرت نے کچھ ایسے تکلف سے کام لیا تھا کہ طنز و ظرافت کے میدان میں گل بوٹے کھلانے والا آخر عمر بھر بے برگ و بار رہا۔ میں نے بارہا اندازہ لگایا کہ یہی احساس محرومی طالب علموں کے ساتھ ان کے جذبۂ ہمدردی کی شکل میں ابھرتا تھا۔ کسی طالب علم کے داخلے کے لیے سفارش کرتے کسی کی فیس گھٹ جاتی تو اپنی طرف سے جمع کر دیتے اور کسی کو ملازمت نہ ملتی تو اسے اپنے پاس سے "بے روزگاری بھتہ" دیتے رہتے۔ یہی نہیں

ہ ان کی وفات کے بعد کسی نے یہ بھی بتایا کہ ہندستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں کوئی ایک
بن ایسے لڑکے زیر تعلیم ہیں جن کی وہ مستقل امداد کیا کرتے تھے۔ سیوان میں "داؤد میموریل
یس ہائی اسکول" کا قیام گرچہ ان کی بیگم کی خواہش پر عمل میں آیا تھا لیکن اس کی ترقی کے
یے پاشا صاحب کی محنت اور دلچسپی قابل دید تھی۔

۱۹۸۵ء میں پاشا صاحب نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ میں اسی سال
ظلینڈ جا رہا تھا۔ انھیں اطلاع دی تو فی البدیہہ اکبر کا مصرع ہوا میں اچھالتے ہوئے بولے۔
ال بھئی، "وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے"، والا معاملہ ہے۔ حج سے واپس
ئے تو کئی گھنٹوں تک سفر اور سعودی عرب میں قیام کی داستان مزے لے لے کر بیان کرتے
رہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں آپ نے دو عراقی پہلوانوں کو اپنی ظرافت طبع اور خوش اخلاقی کا
اسیر بنا لیا تھا جن کی مدد سے طواف کعبہ کرتے اور حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے۔ حج کے مختلف
مرحلوں پر حاجیوں کی حیرانی و پریشانی کا انھوں نے جس طرح ذکر کیا اسے سن کر میں بار بار
ہنس پڑا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ لگے ہاتھوں ایک سفر نامہ بھی لکھ دیں تو یہ اپنی نوعیت
کا انوکھا سفر نامۂ حج ہوگا۔ موصوف نیم رضا مند تو ہوئے مگر مولویوں سے خاصے خائف
تھے۔ پتا نہیں وہ چیز لکھی گئی یا نہیں مگر سفر پاکستان اور فریضۂ حج کی ادائگی نے ان پر یہ
اثر ضرور ڈالا کہ وہ مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ چہرے پر داڑھی کا اضافہ ہوا۔ معمولات
میں نماز کا اور مضامین میں سنجیدگی کا۔ بے فکری کے ساتھ ہنس ہنس کر سماج کے کمزور پہلوؤں
کا مذاق اڑانے والا مزاح نگار جب کسی مفکر کی طرح یہ سوچنے اور سمجھانے لگا کہ ہماری قومیت
کا درخت سوکھ رہا ہے اسکی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں اور بزعم خود باغباں بننے والے پتیوں پر
چھڑکاؤ کر رہے تھے، تو مجھے اس کی صحت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے کئی بار ٹوکا بھی کہ کام
کے ساتھ کچھ آرام کا خیال رکھیے۔ مگر "پتیوں پر چھڑکاؤ" کے بعد "چراگاہ" کی تصنیف اس بات
کا ثبوت ہے کہ انھوں نے نہ صرف لکھنا جاری رکھا بلکہ سوچنا بھی۔ ان کے مضامین کا یہ مجموعہ
پریس میں ہے۔ یہ منظر عام پر آجائے اور آپ اس کا مطالعہ کریں تو خود ہی اس نتیجے تک
پہنچ جائیں گے کہ شدت احساس کی جس کیفیت میں احمد جمال پاشا مبتلا تھے، اس کے ساتھ زیادہ
دنوں تک زندہ رہنا مشکل ہی تھا۔ انھیں دل دھوکا نہ دیتا تو شاید فکر تونسوی کی طرح دماغ دھوکا دے
دیتا۔ اس دور ناہنجار میں زندہ رہ کر بھی وہ کیا کرتے۔ بھونپو بننے کی انھیں عادت نہ تھی۔ فغان درویش کون سنتا؟

احمد جمال پاشا ہم عصر مزاح نگاروں میں فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین کے بڑے قائل تھے۔ پچھلی دو دہائیوں میں
فکر کے یہاں جو نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آیا تھا اس کی وہ برابر تعریف کیا کرتے تھے۔ کبھی مجتبیٰ حسین کا ذکر آتا تو بڑی بے تکلفی کے ساتھ
کہتے: "یار اس شخص کے یہاں طنز و ظرافت میں درمندی کی جو کیفیت نمایاں ہے وہ مجھے بےحد متاثر کرتی ہے کمبخت ہنساتے ہنساتے
یکایک رلا دیتا ہے"۔ مجھے علم نہیں کہ پاشا اپنی زندگی میں یہ کام کر سکتے تھے یا نہیں مگر جاتے جاتے وہ یہ کام ضرور کر گئے۔ میں ان
کے اس ظریفانہ رویّے سے بھی محظوظ ہوتا لیکن عمر بھر رونا کچھ آسان نہیں۔ اس لیے باچشم نم اور بادل نخواستہ بس یہی
کہہ سکتا ہوں ع

اپنی یادیں بھی لیے جاؤ بچھڑنے والو

ظفر کمالی

C/o Book Impororium,
Subzi Bagh,
PATNA-800004.

احمد جمال پاشا سے ایک ملاقات

میں گرمیوں کی تعطیل میں اپنے وطن رانی پور سیوان گیا تھا۔ فرصت کے دو تین دن میسر تھے۔ سوچا کوئی مفید ادبی کام کر ڈالوں۔ لہذا ۱۵ر جون کو میں پاشا صاحب کے دولت کدے کوٹھی نشاط افزا، پہنچا۔ اطلاع کرائی تو فوراً باہر آئے بڑے تپاک سے گلے ملے میں نے انٹرویو لینے کی خواہش کا اظہار کیا اور تھوڑی دیر کے بعد چائے کے ساتھ ہماری گفتگو کا سلسلہ یوں شروع ہوا

ظفر کمالی ـــــ محترم پاشا صاحب! آج کی اس ملاقات میں تسلسل کے ساتھ کسی ایک موضوع پر اظہار خیال کی زحمت نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ کچھ بکھرے ہوئے سوالات ہیں جن پر میں چاہوں گا کہ آپ کھل کر اپنی رائے پیش کریں۔ سب سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے کب اور کن حالات میں مزاح نگاری شروع کی؟

احمد جمال پاشا:ـــــ اسکول میں ساتویں آٹھویں درجہ ہی سے میرے ساتھی اقبال مجید، قیصر تمکین، عابد سہیل اور اعجاز نقوی وغیرہ کے افسانے اور مضامین چھپنے لگے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ۷، بروروڈ لال باغ میں سرور صاحب کے یہاں ہوتے تھے۔ اس میں یہ لوگ تخلیقات پیش کرتے اور بحث میں حصہ لیتے جس سے مجھ میں بھی لکھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور میں نے جو کچھ لکھا وہ مزاحیہ تھا۔ اس طرح میں نے مزاح نگاری شروع کی۔

ظفر کمالی:ـــــ آپ کے خیال میں ایک ظرافت نگار کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے؟

احمد جمال پاشا:ـــــ ظرافت نگار کے اندر ایک دل درد مند ہونا چاہیے۔ دوسرا بنیادی وصف یہ کہ اس کا سماجی شعور بیدار اور بالیدہ ہو، نظر گہری ہو اور انسانی حرکات و سکنات اور چہروں کے پڑھنے کا علم اور مشاہدہ بھی عمیق ہو۔ ظرافت نگار کو طبقاتی امتیاز سے دور ہونا چاہیے۔ اسے عوام میں گھلنا ملنا چاہیے۔

ظفر کمالی:ـــــ اچھا پاشا صاحب! اُردو ظرافت کا سنہرا دور ابھی آیا ہے یا نہیں؟

احمد جمال پاشا:ـــــ اُردو ظرافت کا سنہرا دور ہم اسی کو کہیں گے جب ہماری ظرافت سیاسی اور جغرافیائی حدود کو توڑ کر عالم گیر ظرافت کا حصّہ بن جائے ابھی تک نظم و نثر دونوں میں ایسا نہیں ہو سکا

ہے ابھی تک ہم اس کی چوکھٹ تک بھی نہیں پہنچے ہیں مگر ماضی وحال کے چند اچھے ظرافت نگاروں کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُردو ظرافت کا اچھا دور ہے۔

ظفر کمالی :— پطرس بخاری کی ظرافت کے سبھی نقاد قائل ہیں۔ ان کی شہرت میں اعلا عہدے کی کرامت تو شامل نہیں ؟

احمد جمال پاشا :— میں سمجھتا ہوں کہ ابتدا میں اس سے شہرت میں کچھ مدد ملی ہوگی لیکن ان کے بیشتر مضامین ایسے بے ساختہ ہیں کہ اگر وہ اعلا عہدے پر نہ ہوتے تب بھی انھیں شہرت ضرور ملتی۔

ظفر کمالی :— رشید احمد صدیقی کا شمار اُردو کے صفِ اوّل کے ظرافت نگاروں میں ہوتا ہے جا بجا ان کے فقروں کی تہ داری اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کے بیشتر مضامین ابتدا سے انتہا تک ظرافت کا اعلا معیار پیش نہیں کرتے ؟

احمد جمال پاشا :— جہاں تک رشید احمد صدیقی کا تعلق ہے تو ان کی اہمیت دراصل تاریخی ہے ان کی شہرت بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک طرف تو ان کے جملوں، فقروں اور خاکوں کا جواب نہیں تو دوسری طرف ان کے دونوں مضامین کے مجموعوں میں جو خاکے ہیں ان میں تو وہ کامیاب ہیں، چند مضامین بھی اچھے ہیں مگر باقی کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں اکثریت ایسے مضامین کی ہے جو فنّی اعتبار سے بے حد ناقص اور ناکام ہیں۔ ظرافت نگار کی حیثیت سے وہ اچھے فن کار نہیں تھے۔ ان کی شہرت کے دوسرے عوامل ہیں۔

ظفر کمالی :— ظرافت سے متعلق خواجہ عبد الغفور کی کتاب "طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ"، ہے جس پر انھیں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہی کتاب "شگوفہ زار" کے عنوان سے پہلے بھی چھپ چکی ہے اور پٹنہ یونی ورسٹی کے بی۔ اے کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ جسے مکتبہ جامعہ دہلی سے آج بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے ؟

احمد جمال پاشا :— خواجہ عبد الغفور صاحب کی کتاب "اُردو طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ"، شگوفہ زار کا نیا ایڈیشن ہے۔ کتاب کا نام بدل گیا ہے مگر ہے "شگوفہ زار" ہی۔ ڈگری ملنے سے مواد تو نہیں بدل سکتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے محض پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ایسا کیا۔ تعجب ہے کہ انھوں نے اُردو طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ کیوں نہیں پیش کیا۔ کوئی یونی ورسٹی بھی اگر اسے نصاب میں شامل کرے تو اس سے کتاب کے اس پہلو پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ معاملہ بہرحال جیسا بھی ہو مگر حیرت خیز ضرور ہے۔

ظفر کمالی :— انجم مانپوری جیسے ذہین فن کار کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے ایسی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھیں اب تک کیوں قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔

احمد جمال پاشا :— انجم مانپوری کے ساتھ ناانصافی کے ذمّہ دار اہلِ بہار ہیں۔ اہلِ لاہور کو دیکھیے اقبال کو کیسا چمکا کر پیش کیا۔ اہلِ الٰہ آباد نے اکبر کو اور اہلِ دہلی نے غالب کو کس طرح سجایا سنوارا۔ مانپوری کی آخر کون سی کتاب کا ایک اچھا اڈیشن کسی نجی اُدارے یا بہار اُردو اکادمی نے آج تک شائع کیا، ان پر اہلِ بہار نے آج تک ایک نمبر بھی نہیں نکالا۔ ایک بھی ایسی تحقیق نہیں

ہوئی جو کتابی شکل میں شائع ہو جاتی جب "نقوش" کا طنز و مزاح نمبر نکلا اور میں نے طفیل صاحب سے شکایت کی کہ آپ نے انجم مانپوری کے "میر کلو کی گواہی" کو کیوں نہیں شامل کیا تو انھوں نے معذرت کے ساتھ بتایا کہ میں نے بہار کے ہر بڑے ادیب، ناقد اور محقق کو خطوط لکھے مگر کسی نے انجم مانپوری کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ کوئی چیز بھیجی۔ پھر شکوہ کس بات کا؟

ظفر کمالی :— بہار اُردو اکادمی کے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ آپ خود بھی اس ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ نے اکادمی کے ذمہ داران کی توجہ اس جانب کیوں نہیں مبذول کرائی؟

احمد جمال پاشا :— اکادمی میں میری حیثیت ہی کیا ہے۔ پھر بھی میں نے اس جانب ذمہ داران کو متوجہ کرنے کی کوششیں کیں اور یہ بھی پیش کش کی کہ ایڈیٹنگ وغیرہ کا کام میں خود کر دوں گا لیکن "ہم غور کریں گے" کہہ کر ہر مرتبہ بات ٹال دی گئی۔ آخر کوئی کہاں تک پیچھے پڑے؟

ظفر کمالی :— اچھا پاشا صاحب! اب ایک نظر شاعری کے طرف بھی۔ اُردو کی ظریفانہ شاعری آج بھی اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے جہاں اسے اکبر الٰہ آبادی چھوڑ گئے تھے۔ بلکہ اب تو ترقیِ معکوس کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟

احمد جمال پاشا :— جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے طویل نظموں اور مثنویوں کو نہیں اپنایا ہے۔ دوسرے ہمارے جو ظریف شعرا ہیں وہ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی استحصال کی تیز رفتار رو جس سے روزمرہ کی زندگی کی ناہمواریاں اُبھرتی ہیں انھیں کو اپنا نشانہ بنا رہے ہیں اور وقتی مسائل سے آگے نہیں بڑھ پا رہے ہیں۔ مسائل سے زیادہ تفریح و تفنن پر نظر ہے۔ بیوی، بیگم، داماد، سالا، بہنوئی جیسے پُر مذاق موضوعات پر شاعری کی بیڑی چھوٹ جاتی ہے۔ اگر کسی نے بہت ہمت کی تو کاروبارِ شعر و ادب پر دو چار چھینٹے اڑا دیے۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ موجودہ زمانے میں اقدار کی شکست و ریخت، زندگی، ادب اور سیاست کی نئی نئی الجھنیں اور پیچیدگیاں، سائنسی دور اور زندگی کی بھاگ دوڑ، افراتفری، بڑھتا ہوا سماجی عدم توازن، ناہمواریاں، بے اعتدالیاں وغیرہ نہ تو اس کی گرفت میں آپاتی ہیں اور نہ تو اس کی نظر مسائل کے در پردہ کارفرما قوتوں تک پہنچ پاتی ہے۔ اس لیے آگے کی بات تو دور رہی مزاحیہ شاعری "اودھ پنچ" اور اکبر کے دور میں جس بلند مقام تک پہنچ گئی تھی اس تک بھی رسائی نہیں ہو پاتی۔

ظفر کمالی :— آپ حال ہی میں پاکستان کے دورے سے واپس آئے ہیں۔ وہاں اور ہندستان کے ادبی ماحول میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا۔

احمد جمال پاشا :— پاکستان میں اُردو ادب میں بڑی ہماہمی اور زندگی کے آثار مجھے نظر آئے۔ وہاں بے شمار ادبی انجمنیں ہیں جو یوں آپس میں قبائلی جنگ میں مصروف رہتی ہیں۔ بہت سی گروہ بندیاں ہیں لیکن اس انسانی کمزوری سے قطع نظر ان میں سے بیشتر انجمنیں بے حد فعال ہیں اور بڑا کام کر رہی ہیں۔ کراچی میں "ادبستان" کے فورم میں جس کے روحِ رواں ڈاکٹر محمد علی صدیقی ہیں، میں نے نہ صرف ادیبوں کا بڑا مجمع دیکھا بلکہ بحث و مباحثے کی سطح بھی بے حد بلند تھی اور سوالات خاصے ٹیڑھے تھے۔ اگر ادیب بہت باخبر نہ ہو تو اس کی جان چڑیا نوچن میں پڑ جائے "ہم عصر" کے

بزم میں کیپٹن انور کے کچھ ساتھی باقاعدہ آستین چڑھا کر بحث کرتے ہیں اور اس گرمئی بزم میں خلوص بھی نظر آتا ہے جو ادب کے گہرے مطالعے اور وابستگی سے پیدا ہوتا ہے۔ کراچی میں سب سے زیادہ جس دربار نے مجھے متاثر کیا اور جہاں بڑے بڑے مؤدب داخل ہوتے ہیں وہ خواجہ کا دربار ہے اور وہیں جاکر سمجھ میں آتا ہے کہ "کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں"! ان سے مل کر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کاظم علی خاں کا باوقار اڈیشن ہیں۔ میں نے بے شمار یادگارِ زمانہ بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ گھروں میں بھی جھانکا ہے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ایسی بیش بہا لائبریری۔ ایسا عالم بے بدل میری نظر سے نہیں گزرا۔ پاکستان میں عموماً شاعر، ادیب، ناقد خوش حال ہیں۔ ادب ان کا ذریعہ معاش ہے۔ ان کے اندر بلاکی خوداعتمادی اور بذلہ سنجی ہے۔ وہاں پر اُردو نثر اور خصوصاً تخلیقی نثر نے حیرت انگیز ترقّی کی ہے جب کہ ہم ابھی ٹھکانے سے صحافتی نثر کی منزل بھی طے نہیں کر پائے ہیں۔ ہمارے یہاں عام عدم تحفظ کا احساس غیر یقینی صورتِ حال اور معاشی زبوں حالی نے عدم اعتماد کی صورتِ حال پیدا کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ سے شعر و ادب پر بہت خراب اثر پڑا ہے۔ وہ اگر ہمارا ذریعہ معاش بنتا بھی ہے تب بھی ناآسودگی کی فضا برقرار رہتی ہے جس کی وجہ سے دانش ور طبقے کو ادب کے علاوہ دوسرے میدانوں اور وسائل کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ کرسی، اقتدار اور سیاست کی دیوی کو پوجنا پڑتا ہے اور ہمارے اندر کا خلوص اور فن سے وابستگی رخصت ہو جاتی ہے۔

ظفر کمالی :— پاشا صاحب! مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ ہندستان میں اُردو کے سبھی ادیب و دانشور اسی صورتِ حال کا شکار ہیں جو آپ نے بیان کی۔ یہاں بھی بہت سارے باصلاحیت ادبا و شعرا ایسے موجود ہیں جو معاشی طور پر فارغ البال ہیں۔ پھر بھی ان فنکاروں کے یہاں وہ چیز نظر کیوں نہیں آتی جو پاکستانی ادیبوں کے یہاں موجود ہے؟

احمد جمال پاشا :— ہمارے یہاں کے جو خوش حال ادیب ہیں اُن کی اصل توجہ ادب پر حکمرانی کی ہے۔ ہمہ دانی اور ہمہ گیری کا خبط ہے۔ جس کی وجہ سے جو مجموعی اثر خود اُن کے ادب پر پڑتا ہے۔ وہ منفی ہے۔

ظفر کمالی :— دورِ حاضر میں اُردو ظرافت کی ترقّی پاکستان میں زیادہ ہوئی ہے یا ہندستان میں اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

احمد جمال پاشا :— آزادی کے بعد پاکستان میں اُردو ظرافت نے مسلسل ترقّی کی۔ ہمارے یہاں وہاں کی طرح کھل کر بے لاگ تبصرے نہیں ہوتے۔ ہم یقیناً ادبی مروّت کا شکار رہیں۔ یہاں صرف فکر تونسوی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین اور رضا نقوی واہی قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ ہیں لیکن کیا کوئی سوال اٹھا سکتا ہے کہ آخر فن پر کس کی توجہ ہے؟ پاکستان نے نظم و نثر دونوں میں ایک سے بڑھ کر ایک ظرافت نگار پیش کیے۔ جنھوں نے اُردو ظرافت کو ہزل اور مضمون نگاری کے تنگ دائرے سے نکال کر ناول نگاری، سفرنامہ، ڈائری، روزنامچہ، رپورتاژ، افسانے، ڈرامے اور طویل نظم جیسا وسیع میدان عطا کیا۔ خاکہ نگاری، کیری کیچر اور آپ بیتی کے فن کو ترقّی دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں شگفتہ بیانی اور اسلوب پر خاص توجہ صرف کی۔ انھوں نے کالم نگاری کے میدان میں حیرت انگیز ترقّی کی ہے۔ جب کہ ہمارے یہاں فکر تونسوی کو چھوڑ کر اس پایے کا کوئی دوسرا کالم نگار نظر نہیں آتا۔

ظفر کمالی :۔ ہندستان میں فی الوقت آپ کن ظرافت نگاروں کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

احمد جمال پاشا :۔ ہندوستان میں نثر میں فکر تونسوی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کو پسند کرتا ہوں۔ فکر تونسوی کا اپنا ایک بے ساختہ انداز ہے۔ ان کا سماجی شعور بہت گہرا ہے۔ طبقاتی کش مکش پر بھی نگاہ ہے۔ ان کو پسند کرنے کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ تازہ دم ہیں، صاحب طرز ہیں، بہت سی اچھی چیزیں لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ یوسف ناظم کے یہاں آمد بھی ہے اور آورد بھی۔ جب کبھی وہ موڈ میں ہوتے ہیں تو بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک انداز ہے جو مجھے پسند ہے۔ مجتبیٰ حسین کے یہاں سادہ بیانی ہے، ان کا بیان شگفتہ، دلاویز اور پرکشش ہوتا ہے۔ ان کے لکھنے کا ایک مخصوص انداز اور خیال کا ایک منفرد سانچہ ہے۔ وہ اپنے افسانہ نما مضمون میں کلائمکس ضرور لاتے ہیں اور اس انتہا میں عموماً وہ PATHUS پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ قہقہے کو آنسوؤں سے ملا دینا اور پھر اس سے شگفتگی پیدا کرنا کمالِ فن کی دلیل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔

ظفر کمالی :۔ اور شاعری میں؟

احمد جمال پاشا :۔ شاعری میں مجھے واہی پسند ہیں ان کی "متاعِ واہی" اور "شعرستان" ان کے مخصوص دائرے میں ظرافت کا اچھا نمونہ ہیں۔ ان کے یہاں طنز اور ہجو کی قوت بہت نمایاں ہے۔ مگر انھوں نے اس سے کوئی بڑا کام نہیں لیا ہے۔ اگر شخصیات سے قطع نظر وہ مثنوی، مسدس یا قصیدے وغیرہ کے فارم میں مسلسل بیانی سے کام لیں اور عالم گیر ناہمواریوں کو نشانہ بنائیں تو ان کے جیسا قادر الکلام شاعر زیادہ بڑے شاہکار پیش کر سکتا ہے۔

ظفر کمالی :۔ آپ نے اپنے مقالہ "انشائیہ" کی اصطلاح میں لکھا ہے کہ انشائیہ کے حقیقی موجد وزیر آغا ہیں۔ جب کہ پروفیسر حسنین صاحب یہ سہرا اختر اورینوی کے سر باندھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ آپ اب تک ایک دوسرے کے نظریات سے متفق نہیں ہو سکے؟

احمد جمال پاشا :۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انشائیہ کے حقیقی موجد وزیر آغا ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اختر اورینوی نے "ایسے" کے لیے انشا کی رعایت سے انشائیہ کی اصطلاح کا استعمال کیا تھا مگر واضح ہو کہ انھوں نے صرف اصطلاح کا استعمال کیا تھا لیکن ان کی ساری بحث "ایسے" سے ہے پرسنل "ایسے" سے نہیں۔ وزیر آغا پرسنل "ایسے" کی بات کرتے ہیں، پرسنل ایسے لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ اور ان کی ساری تنقید اسی پر ہے۔ وہ ایسے اور پرسنل ایسے کی شناخت بھی بتلاتے ہیں جب کہ حسنین صاحب کو پرسنل ایسے عزیز ہیں مقدمہ بھی اسی موضوع پر ہے۔ لیکن انتخاب ایسیز کا ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی نظموں کا انتخاب کر کے اس پر غزل کا مقدمہ لکھ دے۔ اگر اختر اورینوی پرسنل ایسے کی مثالیں بھی دیتے تو وہ اس کے موجد مانے جا سکتے تھے۔ اصل شے اصطلاح نہیں بلکہ اصطلاح کی عملی شکل ہے۔ یہ چیز وزیر آغا کے یہاں ہی ملتی ہے۔ یہ ساری بحثیں آپ تمام حضرات کی پیدائش سے بہت پہلے سے انگریزی میں موجود تھیں۔ اس لیے تاریخی طور پر وزیر آغا انشائیہ کے موجد ہیں۔ یہ تحریک ان کی کتاب "خیال پارے" سے شروع ہوئی ہے۔

ظفر کمالی :۔ وارث علوی جو تنقید یں لکھ رہے ہیں انھیں ظرافت کے دائرے میں

رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

احمد جمال پاشا :۔۔۔ تنقید تو ایک باقاعدہ فن ہے۔ جس میں گہرے مطالعے اور فکر کی مدد سے ادبی شاہکاروں کے تجزیے کیے جاتے ہیں۔ تحلیل و موازنے کی منزل سے گزارا جاتا ہے۔ تنقید کا منصب ایک جج کا ہے جس میں میزانِ عدل کا ہونا ضروری ہے۔ آڑی ترچھی تحریریں، جملے بازی، فقرے چُست کرنے، نفظی ہاتھا پائی اور ابے تبے کی اس میں قطعاً گنجائش نہیں۔ ظرافت خود سماجی اور معاشرتی تنقید ہے جو ظرافت کے فنی اصولوں کے تابع ہے۔ اسی لیے ہم وارث علوی کی تنقیدوں کو غیر متوازن تنقید کے دائرے میں تو رکھ سکتے ہیں مگر ظرافت کے نہیں۔

ظفر کمالی :۔۔۔ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ادبی اداروں کی جانب سے ہر سال مختلف حضرات کو جو ایوارڈ عطا کیے جاتے ہیں کیا ان میں ایمانداری سے کام لیا جاتا ہے اور حق دار کو اس کا حق پہنچتا ہے؟

احمد جمال پاشا :۔۔۔ جہاں تک انعام و اعزاز کا تعلق ہے تو اُردو ادب میں ابتدا سے ہی ہمیں درباروادی قصیدہ گوئی اور سیاست و سازش کا ماحول ملتا ہے۔ اب ہم ایک آزاد جمہوری ملک میں رہتے ہیں مگر جاگیردارانہ قدروں سے دامن کشاں نہیں ہو سکے ہیں۔ بیشتر انعام و اعزاز سیاسی ہوتے ہیں اور مخصوص برسرِاقتدار طبقے تک محدود رہتے ہیں مگر اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وقت سب سے بڑا منصف مورخ اور محقق ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی پیش کر دیتا ہے۔ اس لیے ایوارڈ وغیرہ کے معاملے میں نہ تو پریشان ہونا چاہیے اور نہ اس پر ایمانداری کا لیبل دیکھ کر گھبرانا چاہیے فردوسی کو شاہ نامے کا حق نہیں مل سکا لیکن آج اس کا نام ساری دنیا میں روشن ہے اس لیے فن کار اگر فن کار رہے تو اس کا اصل حق تاخیر سے ہی سہی لیکن ہمیشہ مل جاتا ہے۔

ظفر کمالی :۔۔۔ ہر چند کہ میرے ذہن میں ابھی بہت سارے سوالات باقی ہیں مگر اب آپ کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں ہیں اس لیے بقیہ باتیں کسی اور ملاقات پر اُٹھا رکھتا ہوں سے

بہت جی خوش ہوا آپ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بقیہ صفحہ ۶۵ کا

نامکمل حالت میں رکھے ہوئے ہیں۔ تنقید و تالیف کا کام جاری تھا۔ عالمی شاہکاروں کے ترجمے کرتے رہتے تھے جس میں سب سے اہم کارنامہ ہیرن منک ہاؤزن، کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب زیرِ طباعت ہے۔

اِس وقت میرے سامنے اُن کی یادوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں کیا چھوڑوں۔ یہ واقعات ایسے نہیں جو چند صفحات میں سما جائیں اُن کے لیے تو ایک مکمل کتاب ہونی چاہیے۔ ان واقعات کی آخری کڑی ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کا سانحہ ہے جس دن ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے پھر کبھی نہ ملنے کے لیے لیکن اُن کی یادیں اور اُن کے ادھورے کام دنیا میں میری زندگی کا سہارا ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے اِرادوں کو استحکام بخشے۔ آمین۔

خودنوشت

یکم جون ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں پیدا ہوا۔ دراصل یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے۔ میں اس سے چار سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ پیدا ہو چکا تھا۔

پدرم سلطان کا دلچسپ سلسلہ شاہی اور فقیری کا خاندانی شجرے میں پایا جاتا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر صوفی اور معاصر ولی دکنی، میر ناصر علی سرہندی کا اجداد میں شمار ہے۔ تواتر کے ساتھ نسل در نسل عربی، ترکی، فارسی اور اُردو شعرا اس کثرت سے گزرے ہیں کہ شاعری کا کوٹا ختم ہو چکا ہے۔ آخری سلسلہ والد اور بڑے بھائی تک ملتا ہے۔

جس ماحول اور فضا میں آنکھیں کھولیں شعر و ادب سے معمور تھی۔ گھر کتابوں، رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ خواتین میں محمدی بیگم نذر سجاد حیدر، جہاں بانو نقوی، حجاب اسماعیل، مرزا ادیب، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ایم اسلم، راشد الخیری، نشتر اور سرشار بے حد مقبول تھے۔ حور، زیب النساء، جوہر نسواں، عصمت، بنات، سہاگن اور پھول کھانے کے کمرے سے باورچی خانے تک نظر آتے۔ مردانے میں طلسم ہوش ربا، داستان امیر حمزہ، نیرنگِ خیال، خیام، ساقی، اُردو، ادیب، زمانہ، ادبی دنیا، الناظر، نگار اور اودھ پنچ کا دور دورہ تھا۔ والد کے بے تکلف احباب میں جوش، آسی، کیپٹن ضامن علی، جگر، قاضی خورشید احمد، حیدر حسین، فراق، سر رضا علی، یلدرم، نیاز، ثاقب، عزیز، صفی، زوّر، حسینی اور اعجاز حسین وغیرہ تھے۔ شام کو شطرنج کی بساط جمتی۔ رات کو شعری ادبی نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے۔

ابتدا میں مرزا ادیب کے صحرانورد کے خطوط۔ "سورج مکھی" اور چغتائی نے بہت متاثر کیا پھر جاسوسی ناول پڑھنے کا دورہ پڑا۔ تیرتھ رام فیروزپوری، سز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی اور شفیق الرحمان ہمارے پسندیدہ ادیب تھے۔

اسکول میں اُن ہی سے دوستی ہوئی جو شاعر ادیب تھے۔ جن کی مداخلت پر جاسوسی کی جگہ ادبی اور مزاحیہ کتب نے لے لی۔ نرالی دنیا، آر پہ ورت، مستانہ جوگی کی جگہ ادبِ لطیف، سویرا، شاہراہ، نقوش، سب رس اور آئینہ پڑھنے لگے۔ اسکول سے کالج اور یونی ورسٹی پہنچے تو ادب اوڑھنا بچھونا ہو چکا تھا۔ اساتذہ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، احتشام حسین، آل احمد سرور، نورالحسن ہاشمی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ساتھیوں میں قمر رئیس، قاضی عبدالستار، شہاب جعفری، تنویر احمد، اقبال مجید، قیصر تمکین،

(مستند شہادتوں کی بنیاد پر آشنا کا سالِ پیدائش ۱۹۲۹ء قرار پاتا ہے۔ ادارہ)

یت شعر، احراز نقوی، آغا سہیل، محسن کمال، عابد رضوی، شارب ردولوی، افتخار اعظمی، محمود الحسن، فدا عباس
ن عابد، سبط اختر اور سلام مچھلی شہری تھے۔ جو کافی ہاؤس اور چائے خانوں میں جمتے سرور اور احتشام صاحب
کے یہاں ادبی نشستوں میں بحثیں ہوتیں آستینیں چڑھتیں۔ شرکت کرنے والوں میں مقامی اور باہر کے
شاہیر رام بابو سکسینہ، عبدالستار صدیقی، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، جوش ملیح آبادی،
یاز جعفری، مخدوم، مجاز، زیدی، فراق، جمیل، پرویز زور، صدیقی، ہاشمی، مالک رام وغیرہ ہوا
کرتے۔

۱۹۵۰ء سے مزاحیہ لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء تک ہماری گاڑی ادب کی پٹری پر جو چلی تو اب تک چلتی جا رہی ہے۔ مزاحیہ مضامین کے مجموعے "اندیشۂ شہر"، "لذت آزار"، "ستم ایجاد" "چشم حیراں اور مضامین پاشا" شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح اور دوسرے موضوعات پر اب تک تقریباً پچاس کتابیں اور رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

میرا معاملہ اور دلچسپی ہمیشہ ادب سے رہی۔ سیاست کے نام سے ہمیشہ وحشت رہی، نہ کبھی کسی پارٹی میں شامل ہونے یا گروہ بندی کا خیال آیا نہ کبھی اس میں دلچسپی رہی۔ جب سے ادیبوں نے سیاست والوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا۔ میں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ صحافت سے پڑھانے کے پیشے میں داخل ہوا۔ اپنی دلچسپیاں پڑھنے پڑھانے تک محدود کر لیں۔ اردو کے مزاحیہ ادب کو ترقی دینے کے خیال سے عالمی ادب میں دلچسپی پیدا کی۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین، انشائیے اور تنقیدیں لکھتا رہتا ہوں۔ تراجم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مزاحیہ ادب کے جائزے لیتا رہتا ہوں۔ لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے میں محنت اور مشق پر یقین رکھتا ہوں۔ کتابوں خصوصاً نادر و نایاب قلمی کتب کا شوق ایک بڑی لائبریری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ میری ہابی باغبانی ہے۔ دیسی اور ولایتی پھلوں اور پھولوں کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپی کیکٹس میں ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیکڑوں عجیب و غریب قسمیں جمع کی ہیں۔ جن کے پھول دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مزاحیہ ادب کی تاریخ، تذکرے اور انشائیہ پر کئی سال سے کام کر رہا ہوں۔ پڑھنا لکھنا بہت سکون اور فرصت اور تنہائی چاہتا ہے اسی لیے ادبی ہنگاموں سے طبیعت بھاگتی ہے۔

شریک حیات کو قواعد، درسیات، مذہبیات اور مزاح سے دلچسپی ہے اصلاحی جذبہ شدید ہے۔ "داد میموریل اردو گرلس ہائی اسکول" قائم کیا جس میں پانچ سو طالبات ہیں اس کی سکریٹری ہیں۔ دو لائبریریاں "شمیم میموریل لائبریری" اور "سرور چلڈرن لائبریری" قائم کرنے کے بعد اب لڑکیوں کے لیے ایک پالی ٹکنیک قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ لائبریری کا بڑا ہال تعمیر کروا چکی ہیں۔ ایک مسجد اور عربی مدرسہ چل رہا ہے۔ جب ہم دونوں دماغی اور جسمانی طور پر تھکے ہوئے ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو تازہ کرنے کے لیے تازہ ترین کتب و رسائل شعر و ادب پر گپ کرتے ہیں، پڑھائی لکھائی کا سلسلہ وقفوں سے فجر تا عشا جاری رہتا ہے۔ سفر سے بہت گھبراتا ہوں۔ ہوائی جہاز کے ہر سفر کو سفرِ آخرت سمجھتا ہوں۔ ڈرتا تو بجلی کے کڑکنے سے بھی ہوں۔ جو بھی چیز لکھتا ہوں مختلف نشستوں میں پھر اُسے بار بار ٹھیک ٹھاک کرتا ہوں۔ میں نے حال ہی میں ایک مضمون "کتاب کی جلد" اور ایک

انشائیہ سے تربیتی" لکھا تھا دونوں کو تقریباً ستر بار REWRITE کیا تھا۔ میں اپنی کسی تحریر یا خیال سے مطمئن چھپ جانے کے بعد نہیں ہوتا۔ قطع و برید تراش و خراش کا سلسلہ برابر جاری رکھتا ہوں۔ تخلیقی نثر لکھنا سب سے مشکل فن ہے جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ یہ خرگوش نہیں کچھوے کا عمل ہے۔ افسوس کہ طبیعت کی عجلت اور صحت اتنی محنت و ریاضت نہیں کرنے دیتی کہ ادب و مزاحیہ ادب کا حق ادا کرسکوں۔

بنیادی طور پر پکا مسلمان ہوں۔ کیونکہ اسلام مذہب انسانیت ہے اور بلا گہری انسانی ہمدردی کے شخصیت سوز و ساز سے محروم رہتی ہے۔ ایسی ظرافت جس سے شخصیت کی خواہ کتنی ہی توسیع کیوں نہ کی گئی ہو لیکن اگر اس سے معاشرے کے سماجی اظہار کا کام نہ لیا گیا ہو، اس میں "پک ویک پیپرز" والی گہری انسانی ہمدردی نہ ہو تو ادب میں کسی پائدار مقام کی حامل نہیں ہوسکتی۔ تمسخر، تفنن، پھکڑ، شخصی ہجو، مزاح برائے تفریح کبھی بھی ادب کا جز نہیں بن سکتے۔ ادبی ظرافت اور مسخرے پن کا کوئی میل نہیں۔ ادب میں طنز اور مزاح کی جو کچھ بھی اہمیت ہے وہ بہت گہرائی سے صالح اور عظیم مقصدیت سے جڑی ہوئی ہے جو "ڈان کوئکزوٹ" کی طرح قہقہوں میں سے آنسوؤں کو برآمد کرسکے۔ اور آنسوؤں میں سے قہقہے بلند ہوسکیں۔ میں اسی ظرافت کی تلاش میں زندگی کے میدان میں اہرن بنا چکا ہوں۔ چندرن اور بنا کر بس اب آؤٹ ہوجانا ہے کیونکہ صحت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے کیا حق بات کہی تھی۔ "اب کچھ کچھ سوچنا سمجھنا، پڑھنا اور لکھنا آیا تو بلاوا آگیا"!

(مطبوعہ شگوفہ۔ ہندستانی مزاح نمبر جون ۱۹۸۵ء)

ادب میں مارشل لا

"مزاحیہ"

حالات اب صدرِ اُردو کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ علمی، ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں نے ادبی مزاج کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ملکِ ادب خوفناک اور گندی سیاست میں مبتلا تھا۔ ادب، صحافت اور پمفلٹ میں تمیز کرنا بدتمیزی تصور کی جانے لگی تھی اور ہنگاموں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ دائمی قدروں کو وقتی قدروں میں تبدیل کرنے والے اب اسے لمحاتی قدروں میں تبدیل کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ مجبوراً صدر نے ملکِ ادب پر مارشل لا نافذ کر دیا۔ ادب کا نظم و نسق براہِ راست ادبی فوج کے ہاتھ میں آگیا اور صبح جب اہلِ ادب کی آنکھ کھلی تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ جمہوریت کی چڑیا اڑ چکی تھی اور فوج کی طوطی بول رہی تھی۔

بریگیڈیر گل دار نے منتظم اعلا مارشل لا کی حیثیت سے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے ادبی قوم کے نام ایک مخصوص نشریے میں بتایا کہ:

"ہمارے پاس ادبی تنقید کا کوئی جمہوری طریقہ نہیں۔ فی زمانہ ادب میں خواجہ سرائیاں عام ہیں سرقہ، توارد اور آورد سے شعرا نے ادب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ موجودہ ادیب ادب کے نام پر ٹربش لکھ رہے ہیں۔ ادب اس وقت پیسا کمانے، نعرے بازی، گروپ بندی اور پگڑی اچھالنے کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے۔ ادب کی محترم ہستیاں بے ادبی تک کرنے سے نہیں چوک رہی ہیں۔ ہم کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ادب کی رفتار سنبھالنا ہے۔ ہم اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ موجودہ ادب کو دنیا کے صالح ترین ادب کے مقابلے میں نہ کھڑا کر دیں۔"

اعلانات کے مطابق دھمکی دی گئی کہ اگر کسی ادیب یا پبلشر نے دکان بند کی تو اس کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ کاروبارِ ادب کو حسبِ معمول چلانے پر زور دیا گیا۔

اس فوجی عدالت کے روحِ رواں بریگیڈیر گل دار، لیفٹیننٹ کرنل غیض، کرنل مشفق الرحمان، کیپٹن منیر جعفری، ملک ادب کے ممتاز ترین جاسوس کرنل آفریدی کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ سارا

پلان نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا۔ رات کے بارہ بجے انقلاب عمل میں آیا، ادبی مراکز اور صدر کی رہائش گاہ فوج کی حفاظت میں ہیں۔ بڑے بڑے شاعر ادیب اور نقاد اپنے اپنے گھروں میں نظر بند کر دیے گئے۔

ابھی تک کسی شورش کی خبر نہیں آئی۔ پورے ملک میں امن و امان رہا۔ ادب میں انقلاب کے اسباب وہ حالات ہیں جو اور زیادہ خراب نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اسی خرابی سے خون خرابے کے کام لیے جا رہے تھے۔ گو کہ طوائفوں نے لکھنؤ اسکول کے بعد سے ایک حد تک اُردو ادب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا مگر پھر بھی موجودہ دور مکمل طور پر طوائف الملوکی میں مبتلا تھا۔ سارا ادب ایک گمنام دیوان کے نامکمل مقدمہ کے گرد بلا کسی تغیوری کے گھوم رہا تھا۔ الٹی سیدھی تعبیریں پیش کرنے والے ناقدین کی بستیاں اپنی برادری تک محدود۔ رہتیں اور برادری کے باہر جانے والے کا حقہ پانی بند کر دیتیں۔ شخصی تاثرات کے عمل اور ردِعمل نے ادب کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ امرا، حکام، رشتہ دار احباب اور خدمات گزار ہی تعریف کے دائرے میں آتے، ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل بنانا جانتے ہوں بلکہ تاج محل کھودنے کے فن سے واقف ہوں۔ عموماً جس کے بارے میں کسی کونے سے کوئی فتوا صادر کر دیا جاتا بقیہ سب اسی کو اپنے الفاظ میں دہرا دیتے۔ ادبی سرقے، سرقہ بالجبر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادب، صحافت اور حماقت کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ نئے نام لیتے ہوئے سب بے حد ڈرتے اور گھبراتے۔ اچھا ادب وہ سمجھا جانے لگا جو زیادہ بکے۔ زیادہ تر ادیب سرِشام ہی کرداروں کی تلاش میں آبادی سے دور نکل جاتے، جہاں وہ سنسنی خیز ڈاکو، جنگلی درندوں، بدروحیں، بھوت پریت، ٹارزن، ڈریکولا اور کنگ کانگ جیسے عجوبے اٹھا لاتے، تقریباً بیشتر ادب اسی قسم کے داغ دھبوں سے چیچک زدہ ہو رہا تھا جس کی صفائی اب فوج کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔

نقادوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں لوگوں نے قدیم اور جدید ادب کے مطالعے کے بجائے تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اصل کتاب پڑھنے کا فیشن اب تقریباً آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا۔ نقادوں کے مسلسل اصرار پر بہت سے اچھے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے افسانے اور ناول لکھنے سے توبہ کر لی تھی۔ لوگوں نے بھی بہترین ناول و افسانے پڑھنے کے بجائے بدترین تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں مگر خود تنقیدیں پتا لگانا مشکل تھا کہ کس کا کون رنگ ہے یا موجودہ رنگ کہاں سے اڑایا گیا ہے اگر مقالہ نگاروں کے نام اڑا دیے جائیں تو وہ سب کسی ایک ہی نومشق طالب علم کی تحریریں معلوم ہوں۔ ایک ہی بات کو بار بار کہنے کا مرض عام ہو گیا تھا۔ اس استادانہ پینترے بازی میں ایک ممتاز نقاد نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان حضرت نے کسی زمانے میں مومن پر ایک مقالہ لکھا جس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اس مقالے کو پھر نئے عنوان سے شائع کروا دیا اور پھر واہ واہ مچ گئی۔ فوجی حکام نے جب ان کے گھر پر چھاپہ مارا تو ان کی کل کائنات ادب یعنی مومن پر مقالہ برآمد کر لیا گیا۔ فوجی حکومت کے ایک اعلانیے کے مطابق پہلے اس مقالے کا عنوان صرف "حکیم مومن خان مومن" تھا جس کو انھوں نے حسبِ ذیل عنوانات سے متعدد

بار بچھوایا:

"حکیم مومن خاں مومن"۔ "مومن خان مومن"۔ "مومن کی شاعری"۔ "مومن کی غزل گوئی"۔ "مومن شاعری کے آئینے میں"۔ "مومن بہ حیثیت شاعر"۔ "مومن اور ان کی شاعری"۔ "مومن کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ"۔ "مومن کا ایک مطالعہ"۔ "مومن میری نظر میں"۔ "مومن اُردو شاعری کی نظر میں"۔ "مطالعۂ مومن"۔ "مومن کی شخصیت اور شاعری"۔ "مومن اور تصوف"۔ "مومن کا محبوب"۔ "مومن کا لب و لہجہ"۔ "مومن اور ہم"۔ "مومن اور میں"۔ "مومن، ایک سوال"۔ "کیا مومن شاعر تھے؟"

قبلہ کا ارادہ اب اس پر مقدمہ لکھوا کر مجموعہ شائع کروانے کا تھا مگر فوج نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ان کو فریب دہی کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا اور وارننگ دے دی گئی کہ آئندہ وہ کبھی مومن پر کچھ نہ لکھیں۔ خیال ہے کہ جیل میں ان کو سزا کے طور پر مومن کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی قید بامشقت دی جائے گی۔ ایک دوسرے بزرگ وارجن کا کورٹ مارشل کرنل آفریدی کی عدالت میں کیا گیا، کپتان وحید کی اطلاعات کے مطابق وہ بہت سے تنقیدی مقالات اور کتب سامنے رکھ غالب کے اوپر ایک مقالہ منتقل کرتے ہوئے پکڑے گئے ان پر غالب کی توہین کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے انھیں عبور دریائے ادب کی سزا دی۔ ایک ممتاز نقاد کے گھر سے بیش تر ایسی کتابیں نکلیں جن پر ان کی تنقیدیں اور تبصرے شائع ہو کر ملک میں خاصے مقبول ہو چکے تھے مگر ان تبصرہ شدہ کتابوں کے ورق تک نہیں کٹے تھے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ان کو ان کے آبائی کتب خانے میں قید کر دیا گیا اور ان کو ان تمام کتابوں کے ورق کاٹنے کی سزا دی گئی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ جب تک ساری کتابوں کے ورق نہ کٹ جائیں ان کو ان پر مزید تبصرہ کرنے کا کوئی لائسنس نہیں ملے گا۔

شام کی خبروں میں گرفتار ہونے والوں کی جو فہرست سنائی گئی اس میں اچھی خاصی تعداد ان بزرگوں کی ہے جنھوں نے ادب کے منصب، اپنے دوستوں رشتہ داروں اور ہم وطنوں میں تقسیم کر کے حقداروں کو ان کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ یہ سب اب فوجی حراست میں ہیں ان کی ضمانتیں نامنظور کر دی گئی ہیں بہت ممکن ہے کہ اپنی تحریروں کی تردید شائع کرنے پر ان کی سزاؤں میں تخفیف کر دی جائے مگر ان لوگوں کی سزاؤں میں کمی نہیں کی جائے گی جنھوں نے خود لکھ لکھ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو شاعر ادیب بنانے کی وقتی کوششیں کی تھیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو موقع پانے پر چربہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے اور ہمیشہ گمنام ناموں سے دوسروں پر مضامین اور تخریبی خطوط لکھ لکھ کر رسائل کے ذریعہ کیچڑ اُچھالا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فوج نے نہایت کلاسیکل قسم کی سزا مقرر کی ہے۔ ایسے تمام لوگوں کو گدھے پر سوار کرا کے مع ان کے اصلی نام کے سائن بورڈ کے روزانہ صبح و شام ہوا خوری کے لیے بھیجا جائے گا اور عبرت ہونے پر ان کو اصلی نام سے لکھنے کی اجازت دی جائے گی۔ اُن لوگوں کو جنھوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے فیشن کے مطابق لکھے لکھائے اور پامال مضامین کو پھر سے باندھ کر اور بھی پامال کر دیا تھا۔ ان پر سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ ان کی مستقل تصنیف ایک بھی نہیں۔ ان کی سزا

اس وقت مکمل سمجھی جائے گی جب وہ جیل سے ایک مستقل تصنیف پیش کر دیں گے۔

ایک صاحب پر الزام ہے کہ وہ بالکل معمولی سی بات کو غیر معمولی طول دے کر لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔ غیر معمولی طوالت نے مسئلے کو جو سلجھا سلجھایا تھا۔ تفصیل میں ڈبو کر خاصا الجھا دیا۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان پر پبلک کا وقت اور دماغ خراب کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ فی الحال ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جملہ ضخیم تصانیف کو مختصر کرنے کا کام شروع کر دیں جس کتاب کی تلخیص پیش کرنے میں وہ ناکام رہیں گے وہ ضبط کر لی جائے گی۔ ایک دوسری اطلاع کے بموجب آج کل جیل میں ان سے مختصر نویسی کی مشقت لی جا رہی ہے۔

ایک دوسرے محترم چلتی ٹرین میں کچھ لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کی تلاشی لینے پر بھی کچھ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ جو کچھ لکھ رہے تھے اس میں محض پھلی پڑھائی اور حاضر دماغی کا فتور پایا گیا۔ اعلامیے میں کہا گیا کہ وہ ریڈیو ٹاک تھی۔ اس قسم کے معرکے وہ بلا پڑھے لکھے مسلسل بیس سال سے انجام دے رہے تھے۔ ان کی مصروفیات کے پیش نظر عملاً اب یہ ممکن نہیں کہ وہ لکھ پڑھ سکیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک انھوں نے جتنی ٹاک دی ہیں۔ ان کے سلسلہ میں ایک مزید ٹاک کے ذریعہ پبلک سے باقاعدہ معافی منگوائی جائے۔ فوج نے ان کے اوپر فریب دہی اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سلسلے میں مقدمہ قائم کیا ہے۔ چھان بین ہو رہی ہے، توقع ہے کہ اس قسم کی گرفتاریاں اور بھی جلد ہی عمل میں آجائیں گی، جن سے پھر ایک "ریڈیو سیریز" — "معافی ہی توبہ ہے" کے سلسلے میں نشریہ پروگرام ہوا کرے گا۔

ایک بزرگ جو روپوش ہو گئے ہیں۔ ان پر مغربی تصانیف کے حوالے اور غیر زبانوں کے الفاظ کی بھرمار کے سلسلے میں باز پرس کی جائے گی، ان کو عدالت میں حاضر ہونے کے بعد بطور ضمانت ایک مقالہ خاص اُردو میں لکھ کر دینا ہوگا۔

گرفتار ہونے والوں میں سب سے دلچسپ ایک بزرگ ہیں جو "تحقیق لفظ ل" کے ادپر ہزار صفحات جہازی کا ایک مختصر رسالہ تصنیف کرتے ہوئے پکڑے گئے، سارا طومار اس بات پر تھا کہ "ل" عربی ہے یا "ترکی"؟ ان پر یہ الزام ہے کہ جب تک وہ اختلاف کا پہلو پیدا نہ کر لیں قلم نہیں اُٹھاتے۔ ان پر نقض امن اور پیپر کنٹرول ایکٹ کی خلاف ورزی کر کے کاغذ خراب کرنے کے سنگین الزامات ہیں، فوجی وکیل کا کہنا ہے کہ جو بات یہ لکھ رہے تھے اور نہ جانے کب تک لکھتے رہتے یہ بات تو دو لفظوں میں بھی بیان کی جا سکتی تھی کہ "آیا . . . . ہے . . . . یا . . . . نہیں ہے ؟"

کچھ بزرگوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے گمنام شعرا اور ادیبوں کے خطوط شائع کرنے شروع کر دیے تھے، ان پر الزام یہ تھا کہ جب ان شعرا کا کلام خراب تھا تو پھر تفصیل سے ان کے حالات بیان کر کے ان کو بدنام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ادیبوں کے خطوط شائع کرنے والوں پر فی الحال "ڈیڈ لیٹرس آفس" میں داخلے پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔

بہت سے ایسے بزرگوں کا انکشاف ہوا جو اس انتظار میں رہتے کہ کوئی ادیب یا شاعر مرے تو اس پر کچھ لکھیں، کچھ اور نہ سہی تو تاریخ وفات ہی سہی، ان لوگوں سے یہ وعدے لے کر چھوڑ

دیا گیا کہ وہ آیندہ صرف زندہ لوگوں پر لکھنے کے مجاز ہیں۔

وہ ادیب جو جدید اور قدیم کے سلسلے میں تنقیدیں پڑھ پڑھ کر اُلجھ گئے تھے۔ ان کو فی الحال نئے قانون کے مطابق اس وقت تک اپنے خیالات کے اظہار کی اجازت نہ ملے گی جب تک کہ وہ جدید اور قدیم کے گہرے مطالعے کے بعد اپنی فکر اور اظہار میں ایک توازن نہ پیدا کرلیں، اس درمیانی وقفے میں ہر قسم کے بحث و مباحثہ سے ان کا سخت پرہیز کرایا جائے گا۔

ایک مشہور و معروف نقاد اور ان کے غیر معروف شاگرد جو تنقید میں قتلِ عام کے قائل ہیں، عدالت میں انھوں نے حلف اٹھایا کہ زندگی بھر وہ کسی کی ایک لفظ بھی تعریف نہ کرسکے، اگر ایک جملے میں تعریف بھی کی تو اگلے پیراگراف میں تکذیب بھی کردی، ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اب بقیہ تمام زندگی اُن تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں، جن کو وہ اپنے قلم سے بے ہوش کیا کرتے تھے ہوش میں لانے کے لیے ان کی خوبیاں تلاش کریں، خصوصاً جن سے وہ ذاتی طور پر خوش نہیں ہیں ان کی خوبیاں برسرِ عدالت تحریری صورت میں سب سے پہلے پیش کریں۔ اور اپنا ایجاد کردہ دل آزار طریقہ فوراً بند کردیں۔ ایک اطلاع یہ بھی ملی ہے کہ شاید جلد ہی ان کو کسی مشرقی کتب خانے میں قید کردیا جائے جہاں اُن کو مشرقی ادب پاروں کو خالص مشرقی انداز سے پرکھنے کی مفت تربیت دی جائے گی۔ جس کے انتظامات ہورہے ہیں۔ پکڑے جانے والے افسانہ نگاروں میں زیادہ تعداد اُن کی ہے جو قاری کو اجنبی سرزمینوں میں لے جاکر اجنبی کرداروں سے ملواتے تھے اب غالباً ان سے دیسی کرداروں کے روزمرّہ کے مسائل کی عکاسی کروائی جائے گی، بہت سے افسانہ نگاروں پر یہ الزام تھا کہ جب تک اس دن کا اخبار نہ پڑھ لیں افسانہ نہیں لکھ سکتے، اور جب تک اس دن کا اخبار پڑھ لیا جائے جس دن افسانہ لکھا گیا تھا، موضوع کے ہنگامے کا قاری کے ذہن میں آنا ممکن نہیں، ایسے افسانہ نگاروں کو اس روش سے بچ کر چلنے کی ہدایت کی ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جملہ تصانیف کے ساتھ "ببلوگرافی" کا بھی اضافہ کردیا کریں، تاکہ ہنگامے کا پتا چلانے میں آسانی ہو۔ خاصی تعداد ان کی ہے جو کسی نہ کسی سے بُری طرح متاثر تھے ان کی انفرادیت واپس لانے کے لیے شاید اب ان کو سب سے الگ تھلگ رکھا جائے گا۔

ایک مشہور افسانہ نگار جن پر الزام ہے کہ وہ راہ چلتے مونگ پھلی کھاتے، دہی بڑوں کے پتّے چاٹتے، بیڑی پیتے، سڑکوں پر آوارہ گھومتے فاقہ مستی کرتے اور معمولی ملازمت کرتے تھے بڑے شاندار افسانے لکھا کرتے تھے، مگر جب سے ان کو عزّت، شہرت اور دولت ملی، وہ فلمی دنیا میں چلے گئے تو جاتے وقت وہ ساتھ میں اپنا قلم بھی لیتے گئے جس سے اب وہ خراب سے خراب افسانے لکھنے کی مشق کررہے ہیں، چنانچہ ان کو مجبوراً اسی معمولی ملازمت پر اس تنبیہ کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے کہ اگر اب بھی اچھے افسانے نہیں لکھے گئے تو آئندہ ان کو اس سے بھی معمولی نوکری پر تعینات کیا جائے گا۔ ایک ان سے بھی زیادہ ممتاز افسانہ نگار جو کسی زمانہ میں تار گھر میں کلرکی کرتے اور شاندار افسانے لکھتے تھے۔ شہرت اور دولت راس آنے پر ان کو بھی "فلمیریا" ہوگیا تھا۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے سے توبہ کرلی اور بالکل اچھے ہوگئے، ان کو وارننگ دے دی گئی

ہے کہ اگر انھوں نے جلد ہی اسی پیمانے پر افسانہ نگاری نہ شروع کر دی تو ان کے پرانے تار گھر ان کو بذریعہ تار واپس بلالیا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک معزز افسانہ نگار خاتون بھی آتی ہیں جو پہلے کسی اسکول میں اُستانی تھیں اور غضب کے افسانے لکھا کرتی تھیں، مگر جب سے انھوں نے کسی فلم ساز سے شادی کر لی اور فلمی دنیا سے لاکھوں روپے کمانے لگیں، تب سے وہ اپنی افسانہ نگاری کی جانب سے غافل ہو گئی ہیں۔ ان اُستانی جی کو ان کے پُرانے اسکول میں وہی ایک سو بیس روپیا کی پرانی جگہ پر واپس بھیجنے کے فوج انتظامات کر رہی ہے۔ ویسے ان سب پر "بہ حیثیت مجموعی" "دولت اور شہرت کے راس نہ آنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

کرنل آفریدی اور کیپٹن وحید نے بالکل نئے قسم کے ادیب گُر پیدا کر لیے ہیں۔ جن کے اوپر مستقل سنسنی خیزی کرنے کا الزام ہے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ جاسوسی اور سائنسی ادب پیدا کر لیتے ہیں، تحقیقات سے پتا چلا کہ سائنس ان کے خاندان میں کسی نے نہیں پڑھی، اس وجہ سے وہ بہ آسانی سائنس ادب پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب "لاشوں کا پہاڑ" بناتے ہوئے پکڑے گئے، دوسرے صاحب "بے گناہ قاتل کو جنم دیتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے"۔ ان سب کو سنسنی خیز کرنے، راتوں کی نیند حرام کرنے، بھوک پیاس اُڑانے، مار دھاڑ، قتل، چوری، اور ڈاکے سے رغبت دلانے، اخلاق خراب کرنے اور گھر سے بھاگنے کی تربیت دینے کے الزام میں مقدمہ چلائے جائیں گے۔ ان میں ایک صاحب اپنے ہیرو کو روحوں کی دنیا میں پہنچانے کے لیے خون کے دریا بہاتے ہیں اور ہیروئن کی تلاش میں پولیس کو پریشان کرتے ہوئے پکڑے جانے کے الزام میں ماخوذ ہیں۔ ان کے پاس سے بڑی تعداد میں افیون، اسے کشید کرنے کے آلات اور قدیم مصری جادو سے متعلق کچھ نقلی کتابیں، کچھ انگریزی کے جاسوسی ناول بھی برآمد کیے گئے جو ان کی شہرت کا اصلی باعث تصور کیے جا رہے ہیں۔ جیل میں ان سب سے انسانوں اور انسانی مسائل پر لکھنے کی جبری مشق کرائی جائے گی۔

شاعروں کے بارے میں جو سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں ان سے ان کی چال اور نقل و حرکت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے، زیادہ تر اس وقت حراست میں ہیں۔ بقیہ کی تلاش جاری ہے، شعرا دوسروں کی زمینوں میں شعر کہتے، چاہے خانوں یا مےخانوں میں، دین و دنیا، بیوی بچوں سے ایک دم غافل پائے گئے۔ ان میں شاعر کم اور شاعر کے بھیس میں زیادہ تھے۔ فوج کی جانب سے ایک اعلانیے میں بتایا گیا ہے کہ منچلے "بوہمین شعرا" فوراً اپنے آپ کو انسان ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ فی الحال جو شاعر کماتا نہ ہوگا بیوی بچوں کو ٹھیک سے نہ رکھتا ہوگا، اس کا کلام بحق فوج ضبط کر لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے "دواوین" کی اصلاح نظر ثانی اور مختصر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، دوسروں کی زمینوں میں کہنے اور دوسروں کے رنگ کو اپنانے والوں کے کلام کو دریا بُرد کیا جا رہا ہے، جو شعرا غزل کی گردن مارنے پر تیار رہتے تھے ان کو اب صرف غزل ہی کہنے کا لائسنس مل سکے گا، اور آزاد نظم کے پرستاروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غزل کی مخالفت بند کر کے نظم کی نزاکتوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دیں۔ شعرا کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ آبادیوں کے باہر ویرانوں میں جانا اور آبادیوں کو کوسنا فوراً بند کر دیں، مسلسل اور طویل نظمیں، غزلیں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہیں۔

ملک ادب کے شمالی گوشوں سے خبر آئی ہے کہ وہاں بکثرت واہ واہ کرنے والے گرفتار کر لیے گئے جو مشاعروں میں صرف آواز پر داد دے رہے تھے مشاعروں پر شعرا اور انتخاب کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی۔ مزید شعرا کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں فی الحال فوج نے معذوری کا اظہار کر دیا۔ کیونکہ اس طرح آبادی اور فوج کا بیشتر حصہ حراست میں آجائے گا۔ اس لیے ان پر قاعدے قانون کی سختی کر دی گئی ہے، شعرا کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ محض شاعر نہ بنیں بلکہ کام کے آدمی بھی بنیں، گلے بازی کو سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔

ایک شاعر رسالے کو غزل بھیجتا ہوا پکڑا گیا - اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے "علامہ" ___ اور ___ "ایشیا کا عظیم ترین شاعر" وغیرہ لکھا تھا اس پر دوسروں سے بھی جبراً اپنے آپ کو عظیم شاعر کہلوانے اور خلافِ مرضی تعریفی اداریے لکھوانے کے جرم میں مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک اور شاعر جو کسی اعلا عہدے پر فائز تھے اپنے اسٹینو سے خود اپنی ہی شان میں تنقیدی مقالہ لکھواتے ہوئے بروقت پکڑ لیے گئے۔ کیونکہ وہ شاعر خراب ہیں مقالہ اچھا تھا اس لیے اس کو ضائع کر دیا گیا۔ تلاشی لینے پر ان کے قبضہ سے کافی مقدار میں اس قسم کے جبریہ قصائد برآمد ہوئے۔ ایک نیوز بلیٹن میں تمام ماتحتوں کو حکام پر لکھنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کو سخت جرم قرار دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے ماتحتوں کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ آئندہ اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو ان کو سزا کے طور پر افسر بنا دیا جائے گا، اس قسم کے تمام گراں قدر مضامین کی تلاش ان کو ضائع کرنے کے لیے برابر جاری ہے۔

ایک ممتاز شاعر پر یہ الزام ہے کہ جب تک وہ جیل میں تھے بہت اچھی چیزیں کہتے تھے، مگر جب جیل سے رہا ہوئے ہیں تقریباً خاموش ہیں۔ چنانچہ اس تدبیر میں کہ وہ دوبارہ اسی زور و شور سے شاعری شروع کر دیں ان کو پھر جیل خانے روانہ کر دیا گیا ہے۔ ایک بزرگ شاعر جن کے اوپر الزام ہے کہ جب اقبالؔ و اصغرؔ وغیرہ نے شاعری شروع کی تھی تب وہ ان کو باقاعدہ اپنا معاصر و حریف خیال کر کے ان کے خیالی مخالفتیں کرتے رہتے تھے اور ہر پہلو سے ان کو اپنے سے کمتر درجے کا شاعر ثابت کرنے پر اپنی ساری آدرصرف کر دیتے تھے اور اب وہ فیضؔ اور ان کے بعد کی نسل تک کے ہر ایک نئے شاعر کو اسی پیمانے پر اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ ان کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ وہ ادبی معرکوں اور دنگلوں میں جو وقت ضائع کر دیا کرتے ہیں اس کو اپنی شاعری پر صرف کر کے اس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں ان کو اصلاح کا آخری موقع دیا گیا ہے، مگر اس شرط پر کہ یا تو شرط منظور کریں ورنہ اپنے کو مردہ اعلان کر کے لکھنا چھوڑ دیں۔

کرنل مشفق الرحمان نے کئی ممتاز مزاح نگاروں کو حراست میں لے لیا۔ جن پر یہ الزام ہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر ہنسی بھی نہیں آئی، رونا تو دور کی بات ہے۔

اینٹی کرپشن ڈپارٹ منٹ نے کچھ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کیا ہے جو پیسے کمانے کے لیے دوسروں کے ناموں سے اُلٹا سیدھا لکھتے تھے یا ان کو مرے ہوئے ادیبوں کے نام سے منسوب کر کے غلط فائدہ اُٹھاتے تھے ان کو چار سو بیس کرنے کے جرم میں

سزائیں دی جائیں گی، محکمہ نے چند ایسے صحافیوں کو بھی حراست میں لے لیا ہے جو مخالفت کر کے بحثیں چلاتے، خواہ مخواہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھلوا کے روپیا کماتے اور محض روپیا کی خاطر ہر اچھی چیز کی مخالفت کرتے تاکہ پڑھنے والے چونک اٹھیں اور اسی بہانے ان کا رسالہ چل نکلے، اکثر نے اپنے نام و شہرت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی کتابیں ردّی کاغذ پر چھاپ چھاپ کر کوڑیوں میں اشرفیاں کمائی تھیں۔ ان سب کی ضمانت کے لائسنس ضبط کر کے ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ محکمہ نے ان موسمی ادیبوں پر رسالہ نکالنے کی ممانعت لگا دی ہے جو اس وقت تک ادیب رہتے ہیں جب تک ان کا رسالہ نکلتا رہے۔ اس کے بعد وہ بھی رسالے کی پلٹن کے ساتھ میدان سے غائب ہو جاتے، سزا کے طور پر ان کو اب بلا رسالہ کے میدان میں لایا جائے گا۔ اینٹی کرپشن والوں نے ایسے بہترین ادب کے انتخاب کرنے والے برآمد کیے ہیں جو ہر سال اس وجہ سے خود انتخاب کرتے تھے تاکہ ان کی چیزیں بھی انتخاب میں آجائیں۔ یہ انتخاب ضائع کر دیے گئے اب اینٹی کرپشن والے خود اپنی نگرانی میں نئے سرے سے سارے انتخاب کروا رہے ہیں، سزا کے طور پر ان لوگوں کی کوئی چیز انتخاب میں شامل نہیں کی جائے گی۔ آج شام کو اینٹی کرپشن والوں نے ایسے ادیب بھی گرفتار کیے جو ہر سال دوڑ دھوپ کر کے اور تعلقات کے بل بوتے پر غلط کتابوں پر (سال بھر میں شائع ہونے والی بہترین کتابوں کا) انعام حاصل کر لیتے۔ ان سب کی ضمانتیں اس وقت تک منظور نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ انعام کے روپے واپس اور جرمانہ ادا نہ کر دیں۔ محکمہ نے ایک ادیب کے گھر دوڑ بھیجی وہ بڑا شاعر نکلا جو اس وقت اپنی بیوی پر رعب جمانے کے لیے سوائے اپنے سارے شاعروں اور ادیبوں کو جاہل ثابت کرنے کے علاوہ اپنا کلام بے لگام بھی متواتر سُنا رہا تھا جسے سُن سُن کر بیوی بچاری سخت بور ہو رہی تھی۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو لے جاتے وقت بیوی نے فوج کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ہوٹلوں اور چائے خانوں پر چھاپے مار کر بہت سے شاعر اور ادیب دوسروں کی غیبت کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ پکڑے جانے والوں میں بہت سے "انٹلیکچول" جو کافی ہاؤس میں آفاقی ادب کے سلجھے ہوئے مسائل کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے' ان پر اینٹی کرپشن والوں نے دو الزامات عاید کیے ـــــ ایک تو زیرِ بحث موضوع سے متعلق جن کتابوں کے حوالے دیے جا رہے تھے یا تو وہ زیر طبع تھیں یا ابھی تک پڑھی نہیں گئی تھیں، دوسرے سب ایک دوسرے پر اپنی قابلیت اور علم کا غلط سکہ جمانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، ان کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا، فی الحال کافی ہاؤس میں ان کے داخلے پر پابندی عاید کر دی گئی ہے ایک حالیہ اعلان میں محکمہ نے ان تمام نوجوانوں کو ان کے کام پر واپس جانے کا حکم دے دیا ہے، جنھیں "ادب" ہو گیا تھا۔ یعنی وہ کرتے کچھ اور تھے اور رہتے ادب کی جان پر سوار تھے اور اپنے کام کے ساتھ ادب کی بھی مٹی پلید کیے ہوئے تھے۔

موجودہ انقلاب اور اصلاحات کا ہر حلقۂ ادب میں بے پناہ استقبال کیا جا رہا ہے۔ ادب میں انتشار پیدا کرنے والے اب تقریباً منتشر ہو چکے ہیں۔ ادب میں ایک توازن سنجیدگی اور پائیداری کی ہر طرف اُمید کی جا رہی ہے "ادبی جمود" کا نعرہ لگانے والے "مارشل لا" کے طفیل میں اب مقالے لکھ لکھ کر ثابت کر رہے ہیں کہ ادب میں نہ کبھی جمود تھا اور نہ ہے۔ آگے چل کر یہ ادبی مارشل لا" کا دور تاریخ ادب میں ادب کے سنہرے دور کے نام سے یاد کیا جائے گا جس میں زیادہ تر عظیم اور صالح ادب تخلیق ہوا اور تمام بنیادی کام انجام دیے گئے۔

(پیروڈی)

"گلیمر بوائے کا خط"

قرۃ العین حیدر کے نام

پوم پوم ڈارلنگ!

اُمید ہے کہ اس وقت آپ مع اپنے تمام سفید خرگوشوں، بھورے چوہوں اور ایرانی بلیوں کے ساتھ بہ خیریت ضرور اودھ جم خانہ، سیٹرڈے کلب، روشن آرا کلب، محمد باغ کلب، فلائنگ کلب، چھتر منزل کلب، میرس کلب، ازابیلا تھوبرن کالج، کیننگ کالج، شانتی نکیتن، لکھنؤ یونی ورسٹی، کرواہاراج، امیر پور ہاؤس، گورنمنٹ ہاؤس، لالہ رخ، وائی، ڈبلو۔ سی۔ اے ہاؤس، ٹیلر پیلس، وائلڈ فلاور ہاؤس، کلائیڈ روڈ، کابلیس روڈ، مال بینٹ ہال۔ مسوری، ہوٹل کانٹینٹل، نیوانڈیا میٹرو پول، دل کشا۔ حضرت گنج، مانا تھسیر، آئی وی کورٹ اور نشیمنے کے گھر کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں پاکستان یا ہندستان ہیں ضرور ہوں گی۔

جہاں بلاشبہ اس وقت سرخ چٹانوں کے پیچھے سہار کا نارنجی آفتاب طلوع ہو رہا ہو گا۔ اور لوہستانی پھولوں کی مہک پر سرخ قالین والی گیلری سے سفید فام ارمنی لڑکیاں مع اپنے سرخ بالوں والے بچوں کے رنگین سنگریزوں سے اس خدا کی بستی میں کھیل رہی ہوں گی۔ ہر طرف سکونِ ابدی سکون لامتناہی خاموشی، اچانک کسی خواب آگیں سحر سے ٹکرانے کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔ قریب ہی سوئمنگ پول کے سامنے ہوٹل کی رقص گاہ میں ڈانس کے بینڈ پر پورچ کی مدھم روشنی میں تھندر کی ایسی ناک والے موسیو شومین کا کارنیول بج رہا ہو گا۔ داہنی جانب سفید برساتی مشروم کی طرح آپ کے گرد ٹیرس کے نیچے فورس لینڈنگ کرنے والے نیلی ٹوسیٹر سے اترے سیاہ آنکھوں والے مغرور ہندستانی رجواڑے جن میں۔ امیر پور راج کا انور اعظم، شانتی نکیتن کا ضبط، سعید، رجیندر کمار ردھن، سید افتخار کنور عرفان علی پیچو، لولو، ڈون مافالو، لوز، پوپو، ٹوٹو، اور دوسرے ہنٹ سے ولایت پلٹ نودولتیے پروفیسر وغیرہ جیسے شرافت کے مجسمے۔ غرض سارے جرکٹ چڑی مار اور دوسرے سپر مین ہندستان آنے کے بعد کسی سیٹرڈے کلب کے پہلے ڈنر میں جمع ہوں گے۔

ان کی سامنے والی کرسیوں اور صوفوں میں دھنسی ہوئی عنابی، بالوں والی امریکن لڑکیاں روشنی ڈارلنگ، سلطنت آراء بیگم، رخشندہ بیگم، کرسٹابل، گنی فول، منارکا، ڈائمنڈ، عالیہ باجی، لیلیٰ بلگرامی، بیگم عرفان احمد زینت ریاض، شیلا رحمان، کنور رانی اور ڈور نھی جیسی میڈ ہیٹرس پارٹی براجمان ہو گی۔

اور دور کہیں وہ افق کے پار لاؤنج کے سرخ سرخ پردوں سے پرے آتش دان کے قریب سنگ مرمر کی میز پر بقول آپ کے صبح کی ہوائی ڈاک پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ٹی روم کے ستونوں کے پرے سرخ قالینوں پر بقول بال کے دبیز گدیلوں کے درمیان بے کراں "تاریکی میں" میں اکیلا بیٹھا اپنے صوفے پر چائے کی پیالی میں چمچہ بجا تا ہوں گا۔ میرے اوپر بیٹھے بٹھائے یک لخت زندگی کے سارے آثار پیدا ہو چکے ہوں گے۔ اور میں اٹھ کر ریڈیو پر دنیا کے سارے اسٹیشنوں کو ٹیوئن کرنے لگا ہوں گا، ہالی وڈ کی تازہ ترین دھنیں تقریباً مجھے سراسیمہ کر چکی ہوں گی۔ اوہ گوش! مجھے سیاہ آنکھوں والا پر اسرار مغرور ہندستانی گلیمر بوائے، جو ابھی ابھی دوبارہ دھم سے صوفے پر بیٹھ چکا ہے۔ اور جلد ہی صوفے کو خدا حافظ کہ کر یونی ورسٹی اسٹائل سے جا کر اپنے مشہور و معروف موٹر کی اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھ کے چپ چاپ سگرٹ پی رہا ہو گا۔ گویا ابھی گیلری کانفرنس سے واپس پلٹا ہوں، جیسے اب میں باقاعدہ ایک پبلک پارک کی کیاریوں میں تتلیوں کا پیچھا کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس دوران چاکلیٹ کھا کر فلسفۂ حیات پر بحث کرنے لگوں اور جلد ہی اس سے اکتا کر نہایت سنجیدگی سے سب کی لائف انشورنس کمپنیوں کے پتے نوٹ کرنے لگوں کہ مشغلہ برا نہیں۔

اور میں جو ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ بے حد سپر انٹلیکچول اور سٹائل قسم کا جینیس ہوں اور بڑے بوہیمین انداز سے میڈ ہیٹرس پارٹی کے درمیان بیٹھا باری باری سب کی پیالیوں میں چمچے بجا کر جلنرنگ کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ ہوا نہ ہو گی۔ ہینڈسم لسٹ پر بغیر کسی کمپٹیشن کے میں واحد سپر ڈیلشر اسمیشر گلیمر بوائے ہوں۔ یعنی بہت ہی بوشٹ قسم کا میری رونلڈ کولمین ٹائپ کی مونچھیں جن کی داہنی نوک پر آج کل اپنی ساری توجہ صرف کر رہا ہوں۔ اس تھکا دینے والی یکسانیت سے اکتا کر ابھی میں دریچے سے باہر کود کر باغ والے کمرے میں واپس چلا جاؤں گا باغ جس کے کورٹ میں اگر ذرا ابھی رک گیا تو پھر فوراً میری گر بنڈ اور مارولس پرسنالٹی (جو آپ کی اطلاع کے لیے مردانہ وجاہت کا بہت ہی ٹھوس ثبوت ہے) بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کے غل غپاڑوں میں کھو جائے گی۔ اور میرا صندلی گرم جسم امتحانی تخ بستہ ہواؤں سے ٹکرا کر میرے وجود کو پاش پاش کر دے گا۔ جیب سے نکل کر کافی ہاؤس، پکچرس، یوکلپٹس کے جھنڈ انٹیلکچول فلرٹ اور رگیا سٹک مل جل کر منل زرد پتوں اور گرد کے بگولوں کے میری زندگی کی متضاطبیعی رَو کو جو میں کبھی کبھی سبق یاد کرنے میں لگا سکتا ہوں۔ وقت کے ریگستانوں میں کھو دینے کے اسکوپ، رقصاں ہو جائیں گے۔ اس وقت میرا ایسا سنجیدہ اور مغرور انسان اپنے آپ کو کس قدر بے وقوف اور احمق محسوس کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ چار منگ ان لوکر بھی اس وقت مجھے اپنی جانب متوجہ نہ کر سکے اور میں استغنا مآبڑی کا ہلی سے ایک طرف کو آرام کرسی پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہوں گا

جس کے درمیان یقیناً بدترین اسکینڈل کے امکانات پر غور کرتے کرتے جھکیے سے خراٹوں کا بائی
میٹر آف فیکٹ قسم کی خراہٹ جس کو خواہ آپ کنفیوژن ازم کہیں یا ایبوژن اور خرگوش کی طرح
پھولا رہوں گا۔ ایک دم سوئٹ اور گڈ اولڑکے کی طرح محض خواتین کو شوک پہنچانے کی خاطر کیونکہ
میں جو گلیمر ہوائے ہوں جس کا مجھے رُبیلی بہت سختی سے احساس ہے۔ کیوں کہ یونیورسٹی کے
سارے پچھلے ریکارڈس کھٹا کھٹ توڑ چکا ہوں اور بس اتنی سی بات پر مجھے دیکھتے ہی اچھی خاصی
لڑکیوں کے ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔ اور میں ساری لڑکیوں کی ماؤں کے لیے
ایک مستقل موضوعِ گفتگو کی حیثیت اختیار کر چکا ہوں اور بے حد اسمارٹ طریقے پر زندگی گزار
رہا ہوں اور بے حد گلینٹ و شیورلس ہوں۔ رئیلی فارمی لائف از ویری فنی اینڈ اسٹریٹنگ۔ اکثر
اکسائمیٹ کے لیے فینٹنگ طریقے سے پبلک میں قلابازیاں کھانے کی مشق بھی کر لیتا ہوں لیکن اگر
اس میں بھی آپ اپنی موربڈیٹی کی وجہ سے بوریت محسوس کریں تو اس کی گارنٹی نہیں کیوں کہ
ایسے موقعوں پر پبلک کے لیے مرنے اور بور ہونے کی خواہش بے حد عام اور بے وقعت چیز ہے
جس کے باوجود میں گلیمر ہوائے عرف لڑاکا مرغا ہمیشہ گھر میں بے حد شور مچاتا ہوں۔ جس سے
میری دانست میں سب پر بڑا نفیس امپریشن پڑتا ہے آپ کو اپیل کرے یا نہیں۔ میں سوچتا
ہوں اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو اپنی مرضی کو طاق پر رکھ کر خوابوں کے ساحل پر جا کر زندگی
سے صلح کر لینا چاہیے۔ ورنہ زندگی کے مٹیا فزیکل سائے آپ کو محض پروفیشنل طور پر انسان بن کر
زندہ رہنے پر مجبور کر دیں گے۔ اور یہ ٹریجک شخصیتیں آپ کو جینے نہ دیں گی۔ اور آپ یہ سوچنے
پر مجبور ہو جائیں گے کہ آپ کے سامنے کوئی مستقبل نہیں۔ آپ کے پیچھے کوئی ماضی نہیں۔

مثال کے طور پر شفق کے اس اجالے میں آج میں جب اپنے مخصوص آکسفورڈ اسٹائل سے
حسبِ معمول گھر سے امپلائمنٹ ایکسچینج کی طرف چلا تھا تو مشرق کا ستارہ آگے آگے میری رہنمائی
کر رہا تھا۔ گھانس پر سے ہوا روتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور کہیں خلاؤں میں مسوری کی روشنیاں
جھلملا رہی ہوں گی۔ جن کے ساتھ ایک ماضی وابستہ ہے اور کچھ اسی قسم کا رومان۔ روزگار کے
دفتر کی ایلزبیتھن وضع کی دو منزلہ عمارت جس کی مشہور و معروف دیوار سے کسی بے روزگار کی طرح آئی
وی چمٹی ہوئی ہے۔ طیوروں کے جھنڈ سیب کے شگوفے، جن پر گلابی چونچ والا کاکاتوا ہمیشہ
شور مچاتا رہتا ہے۔

غرض تم نہیں جانتیں کہ یوم یوم ڈارلنگ یہاں کیا ہوتا ہے! لہٰذا، مجھے گھانس پر بیٹھ کر
رونے دو۔ کیوں کہ میں مرزاپور اور دلیوریا جیسی خوف ناک جگہوں، نجم الدولہ ہاوس اور اپنے باپ
کے گھر کی مشترکہ اونچی سفید سیڑھیوں پر نہایت کاہلی سے بیٹھ کر سگرٹ کے دھویں کو غور سے دیکھ
رہا ہوں۔ اکثر میں خالی دفتروں میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں اور کیبر اینڈ کوربیٹر کے مطالعہ کے ساتھ
ساتھ چیزوں کے خاموش وجود کو محسوس کرتا رہتا ہوں۔ آپ نے بار ہا میرا نفسیاتی مطالعہ اولڈ
میڈ سائیکالوجی کے بیسس پر کیا ہوگا۔ انٹلیکچول قسم کی گفتگو سے قہوہ برج کے دور میں ادھیڑ
عمر کے شادی شدہ لوگوں میں جو بیٹھے ایک دوسرے سے فلرٹ کرتے رہتے ہیں۔ پیکاسو جیس

وائنس، رسالہ ملت بیضا، اٹلی کی نیو کلاسزم ذہنی فن کاروں کی تصویریں اور ۔۔۔ خاندانی پالیٹکس، گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم، ڈپلومیٹک فلاورشو، حماقت زدہ، عالمگیر سیاست انڈوچائنا، انڈونیشیا ملک کے اقتصادی مسائل سائمنیٹ، کرسمس بون فائر، عارضی کیمپ، سٹنگ روم۔ کامن روم پائن اور سلور اوک کے درخت، یوکلپٹس کے جھنڈ، تعلق داروں کی ایسوسی ایشن اور امپیڈیر میں آپ نے لیڈی لائک اسٹائل سے کلک کرتے ہوئے فلسفے کے موڈ میں ہال کی نیم تاریک لائٹس میں جب کہ بن جانسن کا مشہور نغمہ بج رہا ہوگا اور آپ میڈونا کی طرح خاموش اور ڈرفٹنگ انداز میں کوئک کوئک سلو سلو فوکس ٹروٹ والوں گرینڈ قسم کے کونسرٹ میں اپنے فیشن اینڈ بیوٹی ویمن اینڈ ہوم کے ماٹو کے مطابق کوک ٹیل تیار کرانے میں مصروف ہوں گی یا رونے کی دھیمی آواز پر غور کر رہی ہوں گی کہ "آہیں نہ بھر یں" کے ریکارڈ پر بہترین والز ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی ڈماسٹر لیشن ڈانس بھی کیا جا سکتا ہے خوشبوؤں اور فٹ لائٹس کی روشنی میں کپورز کے ایک کرنے میں کوئین روز کے گرین روم میں آپ پر نہایت امچور قسم کے فلسفہ کا دورہ پڑ رہا ہو اور ٹینگو قسم کے ڈانس کیبرے اور وائلن کے پیارسروں پر آپ اپنے مع ساری آئیڈلس کے ٹیون کر رہی ہوں۔

مگر میں یعنی گلبرٹ بوائے یعنی بھوراچرا۔ جس کے یہاں بقول آپ کے بے حد اہم مہمان بس آنے ہی والے ہیں۔ اور میں جو ایک مینگو میں آم کی آئس کریم کی تیاری کے وقفوں میں قلابازیوں کی مشق کر کے کسی نہ کسی کو ضرور غلط نمبر پر ڈائل کر چکا ہوں اور اب نہایت مصروفیت سے چائے پینے بیٹھ گیا ہوں۔ پروبلم چائلڈ کی طرح۔۔۔ اسکینڈلز انسائیکلوپیڈیا بنا ہوا اپنی بڑی پلکیں جھپکا رہا ہوں۔ میں نے اپنے مونکل اتار کر پیکسیپ ایک جانب ہوا میں اُچھال دی ہے۔ جیسے میری ستی گم ہو چکی ہے۔ کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر میں مینگو پارٹی ختم ہو جائے گی اور دھوبی ڈے شروع ہو جائے گا۔ جس کے اختتام پر میں ہلکا پھلکا شب بخیر کہہ کر یہاں سے چل دوں گا اور باغ میں جا کر ناک پر سنترے بیلنس کرنے کی مشق شروع کر دوں گا۔ باغ میں انگور کے بیل کے پتوں کی سرسراہٹ میں برکھا کی مہاوٹیں برس رہی ہوں گی۔ ہرے لان میں اونچے اونچے بارش میں جھولتے ہوئے اشوک کے درخت لہرا رہے ہوں گے، سامنے سرخ خیالی پتھروں کے فوارے پر نارنجی ناچنے کا فرشتہ اپنا بربط لیے حسب معمول ایک ستون پر چڑھا بیٹھا ہوگا۔ ہولی ہوکس کے پودے لہرا رہے ہوں گے۔ چمپئی اور سویٹ پی کے شگوفے کھل رہے ہوں گے۔

اور میں یعنی گلبرٹ بوائے یعنی سب کا فرسٹ کزن جس کی خدمت کے لیے فی الحال نہ کوئی گل شبو ہے نہ حسینی خانم، نہ عباسی خانم، اور نہ شعلہ پری، نہ عمدہ گھوڑوں کی اور نئی قسم کے ہوائی جہازوں کے خواب ہیں۔ نہ فلائنگ کلب اور نہ نئے ماڈلس کے موٹر۔۔۔ ان سب سے دور بہت دور چھپر ٹولیا کوارٹرز میں واقعی نہایت مصروفیت سے چائے پینے بیٹھ چکا ہوں۔ گو کہ دن بھر محلے کے چائے خانے میں یوں بھی ریڈیو سیلون کے ریکارڈس پر والز کرنا ہے آج مجھے

امپلائمنٹ ایکس چینج بھی نہیں جانا ہے، کیوں کہ ابھی وہ مجھے کال نہیں کر رہے ہیں۔ فی الحال میں کوارٹرز کے مشترکہ زینوں کی نچلی سیڑھیوں پر ایک قدم اور رکھے چوٹوں کی چپکا کھڑا ہوں۔ مگر اس وقت میری خواہش ہے کہ کسی پبلک ہال کو کرایہ پر لے کر عین اس کے وسط میں قلابازیاں کھاؤں یا چھت میں لٹک جاؤں — یا بالکل ایک ناکام، اُجاڑ، اُداس اور رنجیدہ کردار کی طرح جو ان سیڑھیوں سے وقت کے آبشار کی طرح سرسراتا ہوا نیچے گر رہا ہو اور منہ کے بل گرنے کے بعد چلّا چلّا کر کہوں کہ میں یعنی گلیمر بوائے خود نہایت اعلیٰ قسم کی بکواس ہوں فقط

یورز
انسائیکلوپیڈیا اسکنڈل
"گلیمر بوائے"

انشائیہ

بنجاروں کی بستی میں لڑکیاں رسی بٹ رہی ہیں، عورتیں پتھر کی سلیں گھڑ رہی ہیں، لوٹکریاں بُن رہی ہیں۔ لڑکے نٹ کے کرتب کی بانسوں پر مشق کر رہے ہیں، کھانا پک رہا ہے چولھے کے نزدیک بلّیاں اور کتے مورچے جمائے بیٹھے ہیں۔ سامنے بنجارے نیزوں پر شکار آویزاں کیے ہنستے گاتے قطار میں چلے آرہے ہیں۔ ان کے خیموں کے اردگرد زندگی کی عجیب چہل پہل اور ریل پیل ہے۔ بنجاروں کی اس تازہ آباد بستی کے روزانہ دو ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ اس اجنبی ماحول میں مجھے بڑی کشادگی، معصومیت اور مسرت کا احساس ہوا کرتا ہے۔ اس وقت میں اپنے آپ کو قدرت کی آغوش میں محسوس کرتا ہوں۔

ایک صبح جو میں نظارہ کرنے پہنچا تو دیکھا کہ ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

جہاں بستی تھی وہاں زندگی کا ایک تازہ دم قافلہ سرگرم سفر ہے۔ خچروں پر ان کے خیمے اور ضروریاتِ زندگی لدی ہوئی تھیں۔ کسی پر معصوم بچے کلبلیں کر رہے تھے تو کسی گدھے پر پتیلیوں کے سامنے پنجرے میں میاں مٹھو دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ آگے آگے بنجاروں کا سردار بڑی شان سے سینہ تانے چل رہا ہے۔ ہر طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا۔ لڑکیوں، عورتوں اور لڑکوں کے پیچھے بنجاروں کی صفیں ہیں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ کسی کے ہاتھ میں گائے کی رسی تو کسی کے بکری کی ڈوری کا سرا۔ پیچھے پیچھے سر جھکائے کتے چل رہے ہیں جیسے انھیں اس مقام سے انسیت ہو گئی ہو اور بستی کے اجڑنے سے ان کے دل ٹوٹ گئے ہوں۔

شہر سے دور ریلوے اسٹیشن کے نزدیک اب اس بارونق بستی کی جگہ ایک سنسان اور ویران میدان اپنے مکینوں کو الوداع کہہ رہا ہے۔ میں نے سوچا، بنجارے چل دیے۔ بنجارہ تو سدا کا خانہ بدوش ہے۔ وہ تو ازل سے غذا، چارہ اور پناہ کی تلاش میں ہجرت کے محور پر رقص کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ بھلا خانہ بدوش بھی کبھی کسی جگہ کے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے تو ہر ملک ملکِ ماست والا معاملہ ہے۔ صاحب! یہ تو سائبیریا کی موسمی مرغابیاں ہیں۔ اِدھر وقت

نے شمالی پہاڑوں اور وادیوں کا گھراؤ شروع کیا اور یہ بادِ شمال کے برفانی حصار کو توڑ کر جنوب کی جانب پرواز کر گئیں۔ زمانے کے شکاری بھی ان کی یلغار نہیں روک سکتے۔ نیلی جھیلوں اور خوش نما چشموں میں بسیرے لیتی، کلیلیں کرتی، ظلمات کے مسافر کی طرح برابر آگے بڑھتی اور بھٹکتی رہتی ہیں۔ بہار کی تلاش میں خزاں سے ٹکراتی، آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کرتی، مائل بہ پرواز رہتی ہیں اور اس طرح سائبیریا واپس پہنچ جاتی ہیں۔ گویا شمال سے جنوب مشرق کی جانب وہ سرمائی تعطیلات گزارنے گئی تھیں اور چھٹی ختم ہو جانے پر گھر واپس آ گئی ہیں۔

ان خانہ بدوشوں کے مقابلے میں، جن کی زندگی داستانِ گل گامش کا ایک مستقل رجز یہ ہے مہذب انسان کتنا معذور نظر آتا ہے اس کی خواہشات کا لال قلعہ تو بس ایک مکان ہوا کرتا ہے جسے وہ زندگی بھر جوڑ بٹور کر، مر مر کر، کسی نہ کسی طرح بنا بھی لیتا ہے۔ پھر اس سے بقیہ زندگی بلکہ پشتوں تک طفیلی بیل کی طرح چپٹا زندگی نچوڑتا رہتا ہے۔ خانہ بدوش کا گھر اور دھندا تو معصوم بچّے کا ریت کا گھر ہے۔ خانہ بدوش تو زندگی کا کمہار ہے۔ جس کے چاک سے روزانہ طرح طرح کے گھروندے اور دھندے بنتے رہتے ہیں۔ اِدھر ذرا کسی زندگی کے کھلونے کی شکل بگڑی اور اس نے اسے مٹّی کے لوندے میں مِلا کر پھر مٹی سان دی۔

میں جب بھی خانہ بدوشوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سماج سے کٹے ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ اتنے مکمل کٹ چکے ہیں کہ اب وہ خود ایک سماج بن گئے ہیں جیسے زمین اور چاند اپنے اپنے مدار پر گردشِ ماہ و سال میں مصروفِ سفر ہوں۔ سماج سے کٹ کر وہ اتنے کمزور ہو گئے ہیں جیسے بڑے بھائی کے مقابلے میں چھوٹا بھائی۔ اسی لیے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی آبادیوں کے دلوں میں ان کے لیے نہ کوئی جگہ باقی رہ گئی ہے نہ عزّت۔ اسی لیے یہ برادرِ خورد بستی کے باہر کسی ریلوے اسٹیشن، تالاب یا افتادہ باغ کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں جہاں ان کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ اسی لیے قانون کا آہنی شکنجہ انھیں کسے رہتا ہے اور ہر ناکردہ گناہ کی سزائیں انھیں خوش آمدید کہتی رہتی ہیں۔ انھیں قدرت کی گود سے چھین کر شہر کے قدموں پر بھینٹ چڑھانے کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے اور بَن باس کا چاند گرہن میں رہتا ہے۔

میں جب بھی ہجرت پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ ہجرت تو حضرتِ انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کی ہجرت کا سلسلہ تو جنّت سے شروع ہوا تھا اسے حکمِ سفر ہوا تھا کہ "جاؤ اور ہماری بنائی ہوئی دنیا میں آباد ہو جاؤ۔" الغرض جنّت کی آرزو اور توقع میں روزِ آفرینش سے ہجرت میں مصروف ہے کہ یہ جنّت سے نکالا ہوا ابنِ آدم پھر جنّت تک کیسے واپس پہنچے جو اس کی آخری اور مستقل اقامت گاہ ہے جس میں پہنچنے کے بعد ہجرت کا ازلی سلسلہ اپنے ابدی سرے سے مل جائے گا۔

اگر کسی سیاست کے نتیجے میں آپ نے ہجرت اختیار کی ہے یا ہجرت کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا گیا ہے جس میں ہاتھ سیاست کا ہو یا علاقائیت کا سیلاب آپ کو بہا لے گیا ہو یا اب تک آپ غیر کے پالے میں تھے اور اب آپ اغیار کے نرغے میں ہیں تو پھر وطن بھی آپ کو راس نہ آیا اور

ت ہیں اب آپ کی حالت ایک بے جڑ کے پودے کی ہے۔

سائنس اپنی ترقی کی انتہا پر پہنچ کر نیچر اور روحانیت سے مل جاتی ہے مادیت روحانیت کے آگے ہیار ڈال دیتی ہے۔ ناستک سے ناستک سائنس داں بھی آخر میں کلمہ پڑھ کر خدا کے وجود پر ایمان لے آتا ہے۔ اس لیے مجھے شبہ ہے کہ سائنس داں چاند ستاروں پر جو کمندیں ڈال رہے ہیں وہ سیارے سے دوسرے سیارے کی جانب ہجرت کے جو سامان پیدا کر رہے ہیں، کہیں یہ دریافت اور انکشاف کی آڑ میں جنت تک پہنچنے کا کوئی شارٹ کٹ تو نہیں تلاش کر رہے ہیں۔

ہجرت تو ایک فرض ہے جسے اوّل یا آخر سب کو ادا کرنا ہے جس میں چوکنے والا بھی اس آخری ہجرت سے نہیں بچ سکتا جس کے محمود اور ایاز سبھی پابند ہیں۔ بہتر حالات اور اچھے مستقبل کی تعمیر کے لیے ہجرت کرنے والے اسی لیے پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کر لیتے ہیں کہ ہجرت استحکام کی علامت ہے۔

ہجرت تو سبھی کرتے ہیں۔ اگر آپ کا رزق ملازمت کے دامن سے بندھا ہوا ہے تو آپ کو دورانِ ملازمت سینکڑوں کنوئیں جھانکنے پڑیں گے۔ تبادلے کی حالت میں آپ کا عمل ایک خانہ بدوش کا ہوگا کہ چولھے چکی سے توتے کے پنجرے تک گرہستی سے لدے پھندے، قریہ قریہ کوچ کرتے، گھر بساتے اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کرتے پھریں۔ دوسروں کے لیے جگہ خالی نہ کرنا صرف ایک تہذیبی عمل بلکہ قانونِ قدرت بھی ہے۔ آپ بے شک مکان بنا سکتے ہیں مگر یہ آپ بھی نہیں بتا سکتے کہ اس میں آپ کو رہنا کتنے دن ہے اور بسنا کس کس کو ہے۔ مکان ہوتے ہوئے بھی شہروں شہروں، بستی بستی کب تک آپ کو پردیس کا پانی پینا ہے۔

اگر آپ دیارِ عرب، یورپ یا امریکہ میں مقدر آزمائی کر رہے ہیں تو پھر آپ کی خانہ بدوشی رنگ لا رہی ہے۔ ایسا مقدر کا سکندر تو ڈال کا ٹوٹا پتّہ ہے جسے خود نہیں معلوم کہ ہوا کا اگلا جھونکا اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ خود کہاں؟ بیوی بچے، دوست احباب کہاں؟ وہ جہاں بھی جائے گا اس کا خوشگوار ماضی یادوں کے گھوڑے پر سوار اس کا تعاقب کرتا رہے گا۔

مغرب کی جانب ہجرت تو ایسی ہے جیسے کسی آزاد پنچھی کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا جائے۔ مغرب غلامی کی علامت ہے۔ اس میں ایک تو مہاجر کو تنہا ہجرت کرنی ہوتی ہے یہاں انصار کا کوئی قافلہ نہیں ہوتا۔ دوسرے کنبے اور کلچر سے دست بردار ہو کر باس میں وہ تنہا دیس سے آنے والے خطوں کے سہارے جیتا ہے۔ ہر خط اس کے لیے ایک نیا دھماکہ ہوتا ہے۔ وہ ایرکنڈیشنڈ مکان میں رہتا ہے۔ موٹروں پر اُڑا اُڑا پھرتا ہے۔ اپنی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کو کھلونوں کی طرح سجائے ان سے کھیلتا رہتا ہے مگر قوتِ خرید بھی اسے طمانیت اور ذہنی آسودگی نہیں بخش سکتی۔

مہاجر تو چھوٹا بھائی ہے جو اپنے مدار سے ہٹ کر گردش میں ہے۔ خود تو انتہائی بہتر مگر صبر آزما حالات میں ہے مگر دور دراز وطن میں اس کی بیوی اس کے آبائی گھر میں حسب اصول اُپلے تھاپ رہی ہوگی یا کھانا پکانے میں باورچی خانے کی سل پر مسالا پیس رہی ہوگی۔ سرپرست اور

(باقی صفحہ ۱۴۹ پر)

پطرس بخاری

پطرس بخاری صفِ اوّل کے مزاح نگار تھے۔ ایک بڑا مزاح نگار ہونے کے لیے ایک بڑی شخصیت بھی درکار ہوتی ہے اور پطرس کی شخصیت مسلّمہ طور پر عظیم تھی۔ اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پروفیسر، پرنسپل اور ریڈیو ڈائرکٹر جنرل وغیرہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں اقوام متحدہ میں اسسٹنٹ سکریٹری جنرل کے منصب جلیلہ کی خدمات انھیں سونپی گئیں۔ وہ جس عہدے پر بھی رہے اس کی وقعت بڑھ گئی اور آخری اعزاز تو اتنا بڑا تھا کہ اب تک بہت کم ایشیائیوں کو نصیب ہوا ہے۔

فرائض منصبی کی مصروفیات نے شعر و ادب کی خدمت کے لیے ان کو کبھی مہلت نہ دی مگر جب کبھی ان کو موقع اور وقت ملا انھوں نے اس طرف بھی توجہ دی۔ گو کہ انھوں نے بہت کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ اوّل درجہ اور اعلا معیار کا۔

پطرس کے بارے میں ایک نقاد کا یہ قول مشہور ہے کہ "انھوں نے اپنی ظرافت کا مواد زندوں سے لیا ہے۔" زندوں سے مواد کوئی زندہ دل ہی لے سکتا ہے جس نے زندگی کو محسوس کیا اور برتا ہو جس نے انسانوں میں رہ کر ان کی ذہنی اور عملی حرکات کے ایک ایک پہلو کو ہمدردی سے دیکھا ہو۔ زندگی سے یہ لگاؤ غالب کے بعد پطرس کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایک نے ناکامیوں سے کام لے کر مشکلوں کو آسان کر لیا تھا اور دوسرے کے سر اتنا کام آ پڑا کہ نمٹ نہ سکا۔

غالب اور پطرس کا نام میں نے اس وجہ سے ساتھ ساتھ لیا ہے کہ دونوں بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ غالب کو مرنے کی فرصت نہ تھی ان کو جینے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کو اپنے مزاح نگار ہونے کا علم کبھی نہ ہو سکا دوسرے کو لوگوں نے احساس بھی کرا دیا تو کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک نے اپنی شخصیت کا اظہار شاعری میں کیا مگر اس کے دامن کو تنگ پا کے خطوط کا سہارا لیا۔ دوسرے نے محض چند مضامین، خطوط اور تقاریر پر اکتفا کیا۔ عملی زندگی کی مصروفیات اور ذمہ داریوں نے شخصیت کے ارتقا کے دوسرے راستے ڈھونڈ لیے۔ تحریر و تقریر و تنظیم میں ضم ہو کر رہ گئی اور ہمارے ہاتھ چند مضامین ہی لگے۔ اختصار میں پطرس غالب سے بھی آگے بڑھ گئے۔ غالب نے لکھنے پڑھنے کے بعد انتخاب کیا تھا اور انھوں نے انتخاب کر کے لکھا۔ دونوں کا اعجاز ایجاز میں نمایاں ہوا۔

"پطرس کے مضامین" کے علاوہ بھی انھوں نے چند مضامین وقتاً فوقتاً لکھے تھے جو بکھرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک دل چسپ تنقیدی مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ فرضی نام سے۔ اس میں ان کا بہترین مضمون "غنچۂ تبسّم کے دیباچوں پر ایک نظر" کے عنوان سے تھا۔ اس کے علاوہ "نیاز مندانِ لاہور" کا سلسلہ بھی پطرس ہی کے قلم کا رہینِ منّت ہے۔

انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا وہ ظرافت کے بڑے بڑے کارناموں پر بھاری ہے۔ اتنا مختصر رختِ سفر لے کر بقائے دوام کی منزل تک پہنچنا بڑی ہمّت کی بات ہے۔

اُن کے مضامین میں ایک لطیف مذاقِ زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی شخصیت میں گہرائی، بے تکلّفی اور علمی بصیرت اتنی رچی بسی تھی کہ آورد میں آمد پیدا کر لیتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں ایک قسم کا اعتدال اور ٹھہراو تھا۔ اس لیے ادب کو تفریح کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا اصل مقصد تفریح ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔ قدرت نے انھیں ایسی غیر معمولی اور سدابہار طبیعت عطا کی تھی جس کی گیرائی، جزرسی اور ذہانت نے ان کی مزاح نگاری کو ان کا بالکل فطری مشغلہ بنا دیا تھا گویا وہ صرف اسی کام کے لیے بنائے گئے تھے۔ اُن کے غیر معمولی مطالعے، مشاہدے، سوجھ بوجھ اور غور و فکر نے ان کے مضامین کی فنّی عظمت کا معیار متعین کیا ہے۔

پطرس کے سوچنے کا انداز مزاحیہ تھا وہ ہر چیز کو مزاح کی عینک سے اور ایک مخصوص زاویے سے دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹی سی چھوٹی اور باریک سی باریک بات میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے اعتدال واختصار کے باعث وہ بڑی صنعت کاری کے ساتھ بلا کسی شدت کے ذاتی جذبے سے علاحدہ ہو کر ایک قسم کی تبسم پیدا کر لیتے تھے۔ ان کے یہاں جذبات نہیں ملتے۔ بظاہر نہ وہ خود ہنستے ہیں اور نہ دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ اس احساس کو ابھار دیتے ہیں جو قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے کرداروں کی حرکات و سکنات، واقعات کا انوکھاپن اپنے فطری تسلسل کے ساتھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں خود بہ خود مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔

ان کا ہر خیال مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دل چسپی کے سامان افراط سے مل جائیں گے۔ واقعات و اندازِ بیان کی مضحک کیفیات ظرافت کے طوفان کے ساتھ ان کے خیال کی انگلی پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ یہ روانی اور شگفتگی ان کے معمولی سے معمولی خیال کو بھی بلند سے بلند کر دیتی ہے۔ اس کا سبب ان کا سلیقہ تھا۔ یہ سلیقہ کے مزاج کا مزاج ہے۔ پطرس کے موضوعات بالکل سیدھے سادے اور روزمرّہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سادگی میں بے پناہ سنجیدگی ہے۔ اس سنجیدگی میں ایسی غیر محسوس ذہنی منطق ہے جو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتی ہے۔ یہ واقعات ایسے عام اور روزمرّہ کے ہیں جو ہمیشہ پیش آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ اسی وجہ سے ان کو ہمیشہ اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

پطرس نے مزاح نگاری کے فطری انداز کو اپنی تحریروں میں مغرب کی ساری رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ سمو لیا ہے۔ اس کا سبب چستی، اختصار، تسلسل اور انتخاب ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا لینا چاہیے اور کیا چھوڑ دینا چاہیے۔ اس لیے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ ہماری زندگی کے پنہاں

گوشوں کو اپنی ذہانت اور ظرافت کی چاشنی کی مدد سے روشنی میں لے آتے ہیں۔ مغربی اثر کے تحت خالص اور لطیف ظرافت کی وجہ سے ان کی تحریریں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اُردو ادب میں اس کی مثال شاید مشکل سے ملے۔

مغرب کا اثر ان کے یہاں ایک ایسے عالم گیر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو ذرا بھی گراں نہیں گزرتا اور نہ ترجمہ یا نقّالی معلوم ہوتا ہے۔ مغربی انداز کی خارجیت، ٹھہراو اور اعتدال ان کے جذبات کو روکے رکھتا ہے۔ یہی آگ ان کے سینے میں دب کر گلزارِ ابراہیم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور ہمارے قلب ونظر کو گرماتی ہے۔

پطرس کی زبان میں بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔ سادگی، شگفتگی، آمد، روانی، دلچسپی یہ سب خوبیاں ان کو صاحبِ طرز بنادیتی ہیں۔ ان کا اسلوب زبان و بیان کی لطافتوں سے مالامال ہے۔ اس میں ظرافت کے لیے نہ وہ الفاظ کے گھروندے بناتے ہیں نہ الفاظ کی چاشنی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اس حسنِ بیان میں ایسی سادگی ہوتی ہے گویا وہ اپنے قاری سے بے تکلّف گفتگو کر رہے ہوں۔ ان کی نظر اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ مشاہدے کی قوت سے وہ عام انسان کی مضحکہ خیز حرکات کو اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں اُجاگر کر دیتے ہیں۔ واقعات کے نشیب و فراز سے وہ ایک ماہرِ نفسیات کی طرح گزر جاتے ہیں۔ اس وجہ سے سیرت و کردار کے ارتقا میں کبھی ان کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ بالکل معمولی انداز میں چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا، حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، جلوت و خلوت کے مناظر وہ اپنے مشاہدے کی قوت سے دکھا دیتے ہیں۔ وہ عام کمزوریاں جو ہمارے سب کے اندر موجود ہیں، ہمہ وقت ان کے سامنے رہتی ہیں۔ مگر ہماری ان کی روح تک رسائی نہیں ہوتی۔ پطرس کی نظروں سے دیکھ کر ہم اپنی ہی ان کمزوریوں پر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں۔

وہ ہم کو پلاٹ کی بھول بھلیوں میں بھٹکاتے اور نہ اجنبی کرداروں میں گم کر دیتے ہیں بلکہ بڑی خوبصورتی سے ہماری ہی روزمرہ کی زندگی کے مناظر میں ہم کو گم کر دیتے ہیں۔ ان آئینوں میں ہم کو خود اپنی حماقتوں کے عکس دکھائی دیتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ ہم انھیں دوسروں سے اور دوسرے ہم سے منسوب کر کے ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں۔

ان کی حقیقت نگاری اپنے وقت کی رومانویت کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل اور بغاوت تھی انھوں نے بجائے مرصّع کاری کے واقعیت اور حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فن کاری پر زور دیا اور زندگی کو ہم سے اور بھی قریب کر دیا۔

وہ اپنے زمانے کے ہنگامی اور معاشرتی مسائل، قدیم و جدید، مشرق و مغرب میں نہیں اُلجھے بلکہ عمومی اور آفاقی مسائل کو روزمرہ کی زندگی سے انتخاب کر کے ان کے مختلف گوشوں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ موضوعات کی تازگی کی وجہ سے ان کی تحریریں ہر دور میں اور ہر شخص کے لیے واردانِ تازہ کی حیثیت رکھیں گی۔

مشاعرے اور ہنگامے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ شہروں کا انتظام میونسپلٹیاں جس سلیقے سے کرتی ہیں اس سے کون واقف نہیں؟ ریل پر کس نے سفر نہیں کیا ہے؟ لیکن تا ستے۔ ان کو زندہ رکھنے کے

یے کافی تھا۔ مگر جس طرح غزل کا ایک اچھا شعر کہنے کے لیے پوری غزل کہنا پڑتی ہے اسی طرح انھوں نے اس مضمون کی رعایت سے پورا مجموعہ ترتیب دے دیا۔ غزل ایسی مرصّع نکلی کہ اس کا ہر شعر حاصل غزل ٹھہرا۔ پطرس کی تحریریں، تقریریں اور تراجم، ان کی دل کشی و دل آویز شخصیت کے ایسے نقش ہیں جو عرصے تک ہمارے لیے نشانِ راہ بنے رہیں گے۔

کوثر مظہری
Begum Lodge,
Mahindero,
PATNA-6.

"اچانک
اجل گھر میں آئی ہمارے"

شگفتہ چمن تھا، شاداب منظر
چہکتے تھے بلبل منور تھا گھر گھر
اچانک اجل گھر میں آئی ہمارے
تمھیں لے گئی ہم ہوئے بے سہارے
اٹھا گھر سے طنز و ظرافت کا سورج
لیاقت بھری نیک طینت کا سورج
جہانِ ادب کی گئی تازگی بھی
گئی چشمِ طنّاز کی روشنی بھی
نہ الفاظ و جملے میں ہیں شوخیاں وہ
نہ لہجے میں باقی رہیں بجلیاں وہ
مذاقِ ظرافت یوں تم پہ عیاں تھا
نہیں نکتۂ فکر کوئی نہاں تھا
مگر اب تو ہر سو ہے رنج والم بس
یہ اچھا ہے مانگیں خدا کا کرم بس
نہ کچھ دے اے کوثرؔ خدا، اور اگر دے
لحد کو وہ انوارِ رحمت سے بھر دے

عطا کاکوی
'Ata Manzil,
Nughara, Sultan Ganj,
PATNA.

قطعہ تاریخ رحلت
پروفیسر احمد جمال پاشا

احمد جمال پاشا کی رحلت!! یہ کیا ہوا
جس نے بھی یہ خبر سنی حیران رہ گیا
پٹنہ میں آنا شرکتِ جلسہ کے واسطے
اس کی نہ تھی خبر کہ سفر یہ عدم کا تھا
وہ شہرِ لکھنؤ کے اودھ پنچ کا مدیر
وہ منفرد ادیب، صحافت میں فرد تھا
وہ اس کی بذلہ سنجی، وہ چٹکی، وہ خوش دلی
انسانیت کا پیکر و مہرِ خلوص تھا
کھلتے تھے گفتگو میں ظرافت کے پھول خوب
سنجیدہ طنز کا تھا سلیقہ اسے بڑا
افسوس اس کے قلب کی حرکت ہوئی جو بند
چشم زدن میں کوچ وہ دنیا سے کر گیا
ہے دل سے یہ عطاؔ کی دعا اس کے واسطے
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"
اس سانحے پہ خود ہی الم نے جھکا کے سر
"مرگِ ظریفِ ہند" کہا سال فوت کا
۱۴۰۹-۱ = ۱۴۰۸ھ

اُردو تنقید کا حال کلیم الدین احمد سے پہلے کچھ ویسا ہی تھا، جیسا کہ طلوعِ اسلام سے قبل اہلِ عرب کا کلیم الدین احمد اُردو تنقید کے شاہنامہ کے رستم ہیں۔ انھوں نے اُردو تنقید کی ساری مہمات کو اپنے رخشِ خیال اور گرزِ گاؤ سر سے سر کیا ہے۔ سوا تین سو من کا یہ گرزِ گاؤ سر جس کے بھی پڑ گیا پھر اس نے پانی نہ مانگا۔ دوسری ضربات کا ذکر ہی کیا۔ کارزارِ نقد ابھی تک ان کی پہلی ضرب ہی سے نہیں سنبھل پائی ہے۔ اوّلین ضربِ کلیم تو آپ کو بھی یاد ہوگی یعنی :

"اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نکتہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔"

اُردو تنقید ہر چند کہ اس آفتابِ نقد کی تابانیوں سے منوّر ہے مگر جس کو تنقید کہتے ہیں وہ اب بھی معشوق کی موہوم کمر کے فرضی حصار سے بڑی حد تک نہیں نکل پائی ہے۔

بیشتر اُردو ناقد عصری تنقید میں تعصب، تنگ نظری اور جاہ پرستی کے تنگ دائروں سے نہیں نکل پائے ہیں۔ اسے وہ ہوس، اقتدار اور کمائی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ اوّلین ضربِ کلیم سے سب سے زیادہ زخمی ناقدین کا یہی نام نہاد گروہ ہے جس میں خواہ اہم ترین ناقد ہوں یا ابھرتے ہوئے سب دھان بائیس پنسیری کے ہیں پہلے یہ تنقید کو کلاسیکی، جمالیاتی، تاثراتی، نفسیاتی، سماجی اور مارکسی خانوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے کبوتروں کی کابک میں گرہ باز، شیرازی، لقا اور گولہ وغیرہ کو الگ الگ بند کیا جاتا ہے۔ پھر ان کی ذہنی پرواز کے مقابلوں کا تجزیہ کرتے ہیں مگر آسمان سے زمین تک آتے آتے کبوتر، بٹیروں میں تبدیل ہو کر پالیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ان ڈھرے کی میکانکی تنقیدوں میں قاری کو ترقی پسندی، جدیدیت، مقصدیت، مارکسیت، افادیت، سماجی کش مکش ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی اصطلاحی پریڈ کرائی جاتی ہے لیکن قلم صرف اسی پر اٹھایا جاتا ہے جو افسرِ اعلا ہو، خیر سے صدرِ شعبہ ہو، ریڈیو، ٹیلی وژن، انعامی بورڈ، اکادمیوں، کمیٹیوں، فلم یا سول سروس میں ہو اور جن سے براہِ راست آمد و ترقی کی راہ ہموار ہو سکے۔ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب دکھانے والے اس میں سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بقائی شعور کا پرچم بلند کرنے والوں نے بھی ابھی تک کسی عزیب شاعر، ادیب، ناقد پر قلم اٹھانے کی زحمت بے جا گوارا نہیں کی ہے۔ جن کو اس کا دعوانہ ہو ان کا ذکر ہی کیا۔

اوّلین ضرب کلیم سے پیدا ہونے والی ضیا میں اگر ہم دیکھیں تو ہمارے بیشتر ناقد جن کا ادب میں سکہ چل رہا ہے، مذہب ذات پات، علاقائیت، طبقے واریت، تعصب، تنگ نظری، جہالت اور بددیانتی کے سیاہ دائروں سے ابھی تک اپنے آپ کو نہیں نکال پائے ہیں۔ ہندستان پاکستان بن جانے کے اوجود ادب میں مسلم لیگ اور مہاسبھا پہلے سے کہیں زیادہ سرگرم ہیں۔ اُردو کی عصری تنقید تنقید سے ریادہ کمائی، گروہ بندی اور کردار کشی کا آئینہ ہے۔

اُردو تخلیقات کے مطالعے سے بیشتر ناقد کتراتے ہیں۔ وہ نئی کتاب پر اس وقت تک تبصرہ نک نہیں کر سکتے جب تک کہ اس پر دس پانچ تبصرے نہ آجائیں اور انھیں وہ سجا بنا کر اپنے الفاظ میں کچھ اختلاف کے ساتھ نہ پیش کر سکیں۔ یہ ناقد جنھوں نے ضرب کلیم پر سب سے زیادہ چیخ پکار مچائی اور رجمی دکھائی دیے، صرف تنقید پڑھتے ہیں خواہ تنقید انگریزی کی ہو یا اُردو کی بس کام چل جاتا ہے۔ مل تخلیقات کے مطالعے کی نہ انگریزی میں نوبت آتی ہے اور نہ اُردو میں۔ سارا کام حوالوں اور والوں کے حوالوں سے بآسانی چل جاتا ہے۔

بیشتر کا علم محدود ہے۔ معاشی سرگرمی پڑھنے لکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ پھر بھی بجائے کسی صنف ادب میں مہارت کے پورے ادب کا چھپر اُٹھانے پر اُن کا اصرار رہتا ہے۔ اس لیے نہ تو کسی بات کی یہ تاب لا سکتے ہیں اور نہ دوسرے کی غذا لگی برداشت کر سکتے ہیں۔ بس چند بندھے ٹکے فارمولے اور کچھ اصطلاحات ہیں جس کے سہارے اُردو تنقید کی بیل گاڑی وہ ہانک رہے ہیں۔

علم کی اس کمی کو جس کی تنقید میں ضرورت پڑتی ہے، یہ لڑ جھگڑ کر، تحریکوں، گروہوں اور مجموں کے واسطے دے دے کر اصولی بحثیں چلا کر اور اگر مگر و چنیں چناں کر کے پوری کر لیتے ہیں۔ ں سے سوائے اس کے، کہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ "اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، اقلیدس کا خیالی نکتہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر" تو کیا بے جا ہوگا۔

تنقید کے اس اندھیرے میں جو نئی روشنی آئی اسے ہم سوائے "ضیائے کلیم" کے کسی دوسرے م سے نہیں یاد کر سکتے۔ یہ کلاسکی تنقید اور ہمارے کلاسیک کا ایک روشن باب ہے۔ اسے ہیئتی س لیے کہتے ہیں کہ ہیئت پر یہ بہت زور دیتے ہیں۔ ان کا فن پارے کی سائنسی تحلیل و تجزیے ر بہت زور ہوتا ہے ان کے پیمانے مغرب کے ضرور ہیں مگر جہاں تذکروں، قدیم شاعری یا داستانوں و وہ فن کی کسوٹی پر کستے ہیں، مشرق کے اصول و آداب بھی برتتے ہیں۔ ان اصول و نظریات میں دگہرا تنقیدی شعور ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔

ان کا نظریہ یہ ہے کہ آرٹ کا وجود فنکار کی کاوشوں سے ہوتا ہے۔ یہ ایسی روشن حقیقت ہے ں سے کوئی سمجھ دار ناقد انکار نہیں کر سکتا۔ فن کی تخلیق میں بنیادی اہمیت فنکار کی ہے، فنکار کی انفرادیت ا ہے۔

ان کا زور ادب برائے ادب پر ہے۔ ادب کا مقصد ادب ہے۔ ادب کے باہر کچھ نہیں۔ ان کا

یہ نظریہ اُن کی تحریروں میں قطعی طور پر واضح ہے وہ کہتے ہیں "آرٹ کا وجود فنکار کی کاوشوں سے ہوتا ہے"
وہ فن کی تخلیق تسکین و مسرت کے لیے کرتا ہے۔ سب سے اہم چیز فنکار کا تجربہ ہے۔ وہ اس سے اپنی
مسرت، اپنی تشفی کا سامان کرنا چاہتا ہے۔ فن کا مقصد بنیادی طور پر حصولِ حظ اور روحانی تسکین ہے ادب
و شعر انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہیں۔ ادب کا براہِ راست تعلق دماغ سے ہے۔ غرض
کلیم الدین احمد آزادیٔ خیال کے حامی ہیں۔ وہ کسی حد تک سماجی اثرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نظریۂ
فن میں سب سے اہم پہلو اُن کے نقطۂ نظر کی ندرت ہے۔

وہ فنکار کی قوتِ بیان اور تسلسلِ خیال کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کا موازنہ انگریزی
ادبیات سے کرتے ہیں۔ مغرب کے ادب اور تنقید کی عالمانہ بصیرت اس موازنے اور مقابلے میں ان
کے طریقۂ کار کو ان تمام اُردو ناقدین سے مختلف کر دیتی ہے جن کی رسائی مغرب تک برائے بیت
ہے۔

اُن کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ یہ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں جس کے باوجود شعر و ادب کی تہ تک
پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح پہلے سے سوچے سمجھے اور پرکھے ہوئے مواد کو قاری تک خیالات کے عطر کی
شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ تنقید میں ان کے یہاں قدیم اساتذہ کی شان ملتی ہے۔ یہ اصلاح بھی دیتے
ہیں اور راستہ بھی بتاتے ہیں۔ یہ عمل مسلسل بُت شکنی کا ہے مگر یہ اپنے آپ کو بُت شکن نہیں باغ کا مالی
قرار دیتے ہیں جس کا کام باغ کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کرنا اور تزئینِ گلستاں ہے۔ جراحی کے اس عمل میں
بیزاری کا احساس قاری کو جلد ہو جاتا ہے کیونکہ مسلسل اختلاف کے باوجود وہ کسی کو مکمل طور پر مسترد نہیں
کرتے بلکہ توصیف، اصلاح اور مذمت کا سلسلہ تقریباً ساتھ ساتھ چلتا ہے اس لیے وہ خواہ اصناف ان
کے عناصر سے بحث کریں یا فنکار کے کسی فن پارے سے، ان کے اس انوکھے پن سے قاری نہ صرف چونک
اٹھتا ہے بلکہ ذہنی طور پر بیدار ہو جاتا ہے۔ اس اکھڑے اکھڑے انداز میں جس کو کاتب اور بھی اکھاڑ
دیتا ہے، دلچسپی کے ساتھ عجیب ذہنی مرعوبیت اور تقدس کے ملے جلے جذبات سے قاری دوچار ہوتا
ہے۔ لیکن یہ اکھڑی ہوئی نثر اس سجی سجائی نثر پر بہت بھاری پڑتی ہے جو ذہن میں فکر و خیال کی کوئی
روشن نہیں کرتی۔

فن کی جانچ میں وہ دیکھتے ہیں کہ ناقد حصولِ مدعا میں کسی حد تک کامیاب ہو سکا ہے تنقید جیسے
مشکل ترین فن یا صناعی میں کسی حد تک کامیاب ہو سکا ہے، اس کے فنی اصول و ضوابط، اغراض و مقاصد
کیا ہیں، اس کی تخلیق کی ادب میں کیا اہمیت ہے، اس میں وسعتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر کس حد تک
ہے، اس میں متاثر ہونے کی صلاحیت کس حد تک ہے، اپنے تاثرات سے وہ کوئی تصویر بنا سکا ہے؟
تجربے کی ادبی قدر و قیمت کا وہ اندازہ کر سکتا ہے؟ اپنے ذاتی خیالات، جذبات و رجحانات کو وقتی طور پر
فراموش کر سکتا ہے؟

کلیم الدین احمد کا فن اختصار اور ایجاز کا ہے۔ اپنے پڑھنے والوں سے وہ براہِ راست خطاب
کرتے ہیں، انھیں سمجھاتے ہیں، لطیفے سناتے ہیں، اکثر ڈانٹ بھی دیتے ہیں، کبھی بیان میں کھردرا پن
آ جاتا ہے مگر اس کھردرے پن کا حُسن غازے سے بے نیاز ہے۔ اختصار کے ساتھ وہ بنیادی باتوں،

رتے ہیں، مصنف کی تحریر کی تہ میں اتر کر اس کے کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ اس عمل
ں ان کی رائے سب سے الگ ہوگی، اس رائے میں قیامت کا اعتماد اور غضب کی جسارت ہوگی۔ وہ سر
ٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے اپنی رائے کا قاری پر اظہار کریں گے۔ اس رائے میں
ازگی ہوگی، نیا پن ہوگا، انفرادیت ہوگی، خلوص ہوگا۔ یہ بے لاگ لہجہ بڑے گہرے علم اور بڑے وسیع مطالعے
کے بعد ہی ممکن ہے اسی لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کلیم الدین احمد نے اُردو تنقید میں دو ٹوک
بات کرنے کے فن کو رواج دیا ہے۔

خواہ "اُردو شاعری پر ایک نظر" ہو، "اُردو تنقید پر ایک نظر" ہو، "سخن ہائے گفتنی"، "عملی تنقید" ہو، "فنِ داستان گوئی" ہو یا "معاصر" کی ادارت، انھوں نے ہمیشہ کھل کر بات کی ہے۔ بے کم و کاست کی ہے۔ لگاوٹ کا ان کے یہاں گزر نہیں۔ "اُردو تنقید پر ایک نظر" میں انھوں نے جس طرح قدیم تذکروں سے موجودہ اہم ناقدین تک تنقیدی نظریات سے بحث کی ہے، تذکروں میں تنقیدی شعور کی کمی، ہمارے اوّلین ناقدوں میں بصیرت کی کمی، اُردو تنقید کا تذکروں کے حصار سے نہ نکل پانا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رائے کتنی گہری کتنی نپی تُلی ہے۔ چند فقروں میں جو اُنھوں نے کہہ دیا ہے شاید دوسرے ضخیم دفتروں میں بھی نہ بتا پائیں۔ اُنھوں نے جس طرح تنقیدی کارناموں کو چھان کر ان کا عطر پیش کر دیا ہے اس کی دوسری مثال ہماری تنقید میں نہیں ملتی اس لیے یہ افکار و خیال ہماری تنقید کی تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔

اگر کلیم الدین احمد "اُردو شاعری پر ایک نظر" کے بعد ایک لفظ بھی نہ لکھتے تب بھی تاریخ ادب میں ان کی جگہ محفوظ رہتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ "مقدمہ شعر و شاعری" کے بعد اپنے موضوع پر یہ دوسری اس سے کہیں بلند پایہ تصنیف ہے۔

ان تصنیفات نے اُردو تنقید اور نقادوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ایوانِ نقد میں ان سے زلزلے اور بھونچال آ گئے۔ ان کا کارنامہ ہے کہ اُنھوں نے نقادوں کو اصل کے مطالعے اور غور و فکر پر مجبور کر دیا قاری میں مغربی علوم کے حصول کا ذوق بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ سہل پسند نقادوں پر کلیم کے فکری تازیانے ضربِ کلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جتنا شور اُردو ادب میں کلیم الدین احمد کی تنقیدوں پر ہوا ہے، جتنے ہنگامے اور مخالفتیں ہوئی ہیں ان کی دوسری مثال نہیں ملتی مگر اس مخالفت کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کے مخالفین اپنی انتہائی مخالفت کے باوجود آج تک انھیں رد نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے منکر بھی ان کی ادبی اہمیت پر ایمان رکھتے ہیں اور معترضین بھی تھوڑی ہی دیر میں اعتراض بھول کر اپنے دعوے کی دلیل میں ان کے اقتباسات پیش کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مخالف بھی ان کے تنقیدی جملوں پر چونک پڑتے ہیں اور ان کا مسلسل اختلاف ان کی ہمتیں پست کر دیتا ہے۔

یہ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہوگا کہ کلیم الدین احمد بلا شرکتِ غیرے اُردو دنیا کے سب سے بڑے نقاد ہیں، شہنشاہ نقد ہیں۔ ان کی مغربی ادبیات کی روشنی سے دنیائے تنقید منور رہی ہے۔ اس

تنقید سے ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی جیسے اعلا ناقدین کے حلقۂ خیال نے گہرے اثرات قبول کیے اور نئی نسل نے روشنی حاصل کی۔ ہمارے زمانے میں ان کی ذاتِ گرامی مثالی ہے۔ ہر طرف ان ہی کا سکّہ چل رہا ہے۔ وہ سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی مثال تاریکی ہیں مشعل کی ہے۔ انھوں نے تنقید کو غیر جانب داری کی جو راہ دکھائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارے عہد کی مستقبل میں ایک اہمیت یہ بھی ہوگی کہ اس نے کلیم الدین احمد نے براہِ راست روشنی حاصل کی تھی۔ ضیائے کلیم سے خیرہ ہونے والوں میں خوش قسمتی سے ہم بھی ہیں اور آپ بھی۔

بقیہ صفحہ ۱۰۰ کا

نگراں سے محروم اس کے بچے اسکول سے بھاگ کر گلی میں گلی ڈانڈا کھیل رہے ہوں گے۔ وہ خود کسی عالی شان دفتر یا عظیم الشان فیکٹری میں ان کے حالات بہتر بنانے کے لیے اوور ٹائم اور زر کشی میں مصروف ہوگا مگر حالات کا اونٹ گھر میں کسی اور کروٹ بیٹھ رہا ہوگا۔

میں جب بھی ہجرت کا تصور کرتا ہوں تو مجھے اس میں انسانی بھائی چارہ، عالمی یک جہتی استحکام اور وسعت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسا پھیلاؤ جو زمین کے کناروں تک کو سمیٹ لے۔ میں دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اَن گنت اجتماعی اور انفرادی نقطے ہجرت کے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہجرت تو دنیا کی قوموں اور آبادیوں کی تاریخ ہے۔ افراد کا نوشتہ ہے۔ ہجرت تو ایک مسلسل عمل ہے جس کے بغیر متحرک اور فعال دنیا کا کوئی بھی تصور ممکن نہیں۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

نومبر کا کتاب نما موصول ہوا۔ "کتاب نما" بلاشبہ اب "ادب نما" بن چکا ہے۔ اس سے اُردو کی ادبی رفتار کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا اداریہ واقعی ایسا تھا کہ لوگ توجہ دیتے اور تبصرہ کرتے۔ انھوں نے بعض بڑی فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ فاروقی صاحب کے اداریے کے آخری پیراگراف کو سنجیدہ تحریر سمجھ کر پروفیسر سیّد محمد رضا نے خواہ مخواہ نصیحتیں کر ڈالیں حالانکہ وہ طنز کا بہترین نمونہ تھا!

شان الحق حقّی ماہر لسانیات ہیں۔ اُردو لغت کے سلسلے میں کام کرتے ہوئے عمر عزیز کا بیشتر حصّہ صرف کیا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر بعض اہم نکات اٹھائے ہیں۔ "چڑھ" ہندی کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن اُردو میں چونکہ ایک عرصے سے "چڑ" مستعمل ہے اس لیے یہی املا مناسب ہے۔ شان صاحب نے نا انصاری کے خط کے تعلق سے لکھا ہے کہ "شتابدی" (صد سالہ برسی) میرے لیے نیا اور دلچسپ لفظ ہے۔ تعجب ہے انھیں یہ لفظ نیا لگا۔ ہندی میں یہ لفظ ایک مُدّت سے صدی یا CENTURY کے معنوں میں مستعمل ہے سرِ دست میرے پاس "شبداولی" نہیں لیکن ٹوئنٹیتھ سنچری اینگلو ہندی ڈکشنری موجود ہے جس میں سنچری کے معنی شتابدی درج ہیں (یہ ڈکشنری ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی تھی) ممکن ہے جدید ہندی میں شتابدی کو محض صدی نہیں بلکہ "صد سالہ برسی" کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا ہو۔

سیّد قیصر قلندر کی نظم "شعلے کی آواز" کے پیکر میں فنّی طور پر کچی لیکن اچھّی تاثراتی نظم پڑھنے کو ملی۔ یہ نظم متعدد مرحوم "عمیق حنفیوں" پر صادق آتی ہے (جمع کے لیے عمیق حنفی مرحوم سے معذرت) قلندر نے خلوصِ دل سے بہت سوں کی ترجمانی کر دی۔ اب کے نظم و نثر میں کتابت کی خاصی غلطیاں رہ گئیں۔ توجہ دیجیے گا۔

محسن بھوپالی، کراچی (پاکستان)

ویسے مہمان مدیروں نے اب تک جو اداریے لکھے ہیں ان میں سے ظفر پیامی اور شمس الرحمٰن فاروقی پر جو تنقید ہوئی ہے وہ صحت مند نہیں ہے۔ غالبًا آپ نے توازن قائم رکھنے کے لیے ایسی بہترین تحریروں کے خلاف مراسلے شائع کر کے اپنی انتہائی غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے مگر اس سے بیچارے شمس الرحمٰن فاروقی کو جواب لکھنے میں بہت جز بز ہونا پڑا اور سچّی بات تو یہی ہے کہ صالح اور صحت مند لکھنے والوں کے خلاف ایسی ناروا تنقید کو برداشت کرنا بڑے جگر گردے کا کام ہے۔ اسعد بدایونی نے انھیں ناحق

بہت متاثر رہا ہے۔ کیا آئینہ دکھانا اتنا مہنگا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس سلسلے میں تھوڑی قینچی ضرور چلانی چاہیے۔ صاحب باتوں کو چھاپنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ڈاکٹر یعقوب عمر۔ حیدرآباد

❁ پچھلے کچھ شماروں میں اشاریہ کے تحت جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری کا اداریہ ایک آئینہ ہے جس میں ہمارے تمام شاعر، افسانہ نگار، ناقد، مدیر، محقق، طالب علم، استاد اور اردو کے تمام بہی خواہ اپنا چہرہ بالکل صاف صاف دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کتنے جوانمرد ایسے ہیں جو اس آئینے میں اپنی بگڑی ہوئی صورت کو دیکھ کر آئینے کے بجائے اپنے خط و خال سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم سنجیدگی سے اس امر پر غور و فکر کریں اور دوسروں پر الزام تراشی کی عادت چھوڑ کر خود اپنا محاسبہ کریں۔ ورنہ یہ ذہنی پستی پتا نہیں ہمیں کس کھائی میں جا گرائے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری پر چراغ پا نہ ہو کر ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان لوگوں نے اتنے بیباک اور صاف لفظوں میں دوٹوک باتیں کیں اور اپنی ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا۔

توقع ہے کہ مہمان مدیر کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور خطوط کا کالم اسی طرح بحث و مباحثہ کی صورت اور سنگین مسائل پر دعوتِ غور و فکر دیتا رہے گا۔ کتاب نما بھرپور رسالہ بن چکا ہے۔ دیگر مشمولات کے انتخاب کے علاوہ "خامہ بگوش" کے کالم کے لیے بھی ادبی حلقہ میں "کتاب نما" کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

عالم خورشید۔ پٹنہ

❁ ولی گجراتی اور ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی "یادر فتگاں۔ ن۔م راشد۔ باقر مہدی" مضامین بہت پسند آئے۔ حصہ نظم، طنز و مزاح، انشائیہ وغیرہ بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ بالخصوص کھلے خطوط کا شہرہ ملک کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں میں ہے۔ یہ سلسلہ تو اردو ادب کی تاریخ بندی میں بے حد معاون اور کارآمد ہے۔

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے اپنی تحقیقی عرق ریزی کا ثبوت جن مکمل حوالوں سے دیا ہے اس کی روشنی میں ولی کی تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ ہی سچی ہے۔

تسنیم فاروقی۔ لکھنؤ

❁ کتاب نما برابر نکھر رہا ہے۔ تازہ شمارے میں فضیل جعفری کا اداریہ بہت پسند آیا۔

آشا پربھات۔ سیتا مڑھی

❁ "کتاب نما" ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ کارآمد مضامین، اچھے افسانے، معیاری طنزیہ مزاحیہ مضامین، اور سب سے بڑھ کر دلچسپ مانگے کا اجالا۔

رفعت نواز، اورنگ آباد۔

❁ 'اشاریہ' میں کلام حیدری صاحب خوب کھری کھری سنا گئے۔ پوری تحریر نشتریت سے پُر ہے۔ لیکن تعمیری نشتریت ہے۔ بعض جملوں اور عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشاریہ بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے لہٰذا کہیں کہیں جمع فاعل کے لیے مفرد فعل اور مفرد حرف اضافت کا استعمال ملتا ہے۔ ورنہ کلام صاحب کی پختگی کلام میں کسی صاحب کلام کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔

اپنے وقیع مقالے "اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر" میں ڈاکٹر عبدالمغنی کے پیش کردہ مشوروں پر محکمہ تعلیمات حکومت ہند کو عمل کرنا چاہیے۔ قوم کی فلاح اسی میں مضمر ہے۔

شعری حصہ پسند آیا۔ 'کتاب نما' نے ہمیشہ نام کو نہیں کلام کو اہمیت دی ہے۔ احمد صغیر صدیقی، عرفانہ عزیز، عمران عظیم، ڈاکٹر اسلم حنیف سب کی تخلیقات پسند آئیں۔ محترمہ عرفانہ عزیز کے مطلع کے مصرع ثانی میں قواعدی صحت توجہ طلب ہے۔ عرض کروں کہ دس بارہ شماروں سے 'کتاب نما' میں کتابت کی غلطیاں ملنے لگی ہیں۔ کم سے کم شعری حصے میں پروف پر ضرور توجہ دی جائے۔ کاتب کی بے توجہی سے عرفانہ عزیز کے حسن مطلع کا مصرع ثانی ناموزوں شائع ہو گیا ہے۔ اگرچہ موزوں طبیعتیں 'زہر ہلا ل' کو 'زہر ہلاہل' پڑھ ہی لیں گی۔ اسلم حنیف نے غالباً "شہپروں" لکھا ہوگا جسے کاتب نے "شہیدوں" لکھ دیا ہے۔ انجام کار مصرع ناموزونیت اور معنوی خبط دونوں کا شکار ہو گیا۔

ڈاکٹر شاداب رضی۔ بھاگلپور یونیورسٹی۔ بھاگلپور

❁ کلام حیدری کا 'اشاریہ' ان کی احساس کمتری کو ظاہر کر رہا ہے۔ پڑھ کر ایسا لگا کہ وہ گھٹن کے شکار ہوں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے بڑا کینوس لیا ہے۔ مگر اپنی بات کھل کر نہیں کہہ سکے۔ زبیر رضوی نے بڑی فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج بہت سے ادارہ گزیدہ، فیشن گزیدہ، تنگ نظر، مصلحت کوش اور مفاد پرست حضرات تخلیقیت افروز فکر و فن کی توحید کو مجروح کر رہے ہیں اور غیر مشروط آفاقی وحدانیت کو فنا کر کے اور آدمی زندگی اور فن کو خانہ بند اور گروہ بند کر کے فن دشمن آدمی دشمن، کائنات دشمن اور خدا دشمن فرقہ وارانہ ابلیسیت کی تحریک کو جنم دے رہے ہیں۔ اور تازہ کار نیا مربوط اور مرتب جامع نظام ادب سے چشم پوشی کر کے اپنی قیادت کے جھنڈے گاڑنے کے خبط اور سنک میں مبتلا ہیں اور اردو کو نیوکلیائی آتش فشاں کے قریب بے محابا دھکیل رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اردو کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اردو ادب کے محافظوں کو چاہیے کہ نا آدمی NO-MAN اور نیا آدمی NEO-MAN کے فرق کو سمجھیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

❁ میری رائے میں اس کا معیار اتنا بلند ہو چکا ہے کہ ہر ماہ اس کا نظر سے گذرنا ضروری ہے۔ بصورت دیگر کوئی بھی ادیب ہم عصر ادب سے کٹ کے رہ جائے گا۔

کرامت علی کرامت۔ برہم پور

ان کی عمر ۹۲ سال تھی۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوی تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کو دو ماہ قبل دماغ کی رسولی کے آپریشن کے لیے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ پے چیدہ امراض میں مبتلا ہو گئے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ نفسیات میں قومی یکجہتی پر دو روزہ سمینار

نئی دلی ۲ دسمبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ نفسیات اور آئی۔ سی۔ ایس۔ ایس۔ آر نے ۲۹ اور ۳۰ نومبر کو ایک بین اقوامی سمینار کیا جس کا موضوع تھا "قومی یکجہتی میں اقلیت اور غریب نوجوان کا کردار" اس میں ملک کے مختلف حصّوں اور باہر کے اسکالروں نے حصّہ لیا اور ملک کے اتحاد سے متعلق مسئلوں پر اپنے مقالے پڑھے۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر مملکت برائے ٹیکسٹائل جناب رفیق عالم نے کہا کہ ہندستانی سماج کے موجودہ مسئلوں کی اصل وجہ برطانی سامراجی کا دور ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف نے کہا کہ اصل مقصد حاصل کرنے کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔ سمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایم جی حسین نے کہا کہ بہت سی نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے اقلیتیں محسوس کرتی ہیں کہ انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس سمینار میں بیس سے زیادہ مقالے پیش کیے گئے اور قومی یکجہتی کے لیے بہت سی تجویزیں پیش کی گئیں۔

ثاقب گنگوہی کو غالب ایوارڈ

بنگلور ۳۰ نومبر۔ غالب کلچر ایسوسی ایشن بنگلور کی جانب سے مشہور شاعر ثاقب گنگوہی کو ہوٹل اشوکا کی ایک پُروقار تقریب میں جناب رفیق عالم مرکزی وزیر نے غالب ایوارڈ اور آفتابِ سخن کے خطاب سے نوازا۔

سنسکرت کے ممتاز فاضل گوسوامی کا انتقال

نئی دہلی۔ یکم دسمبر۔ سناتن دھرم کے معروف قائد اور سنسکرت کے ممتاز فاضل ڈاکٹر گردھاری لال گوسوامی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے آج صبح سویرے یہاں انتقال کر گئے

علاقہ وردبھ کے بزرگ صوفی شاعر حضرت شاطر حکیمی صاحب رحلت فرما گئے

ہندستان گیر شہرت کے مالک، علاقہ وردبھ کے عظیم شاعر حضرت شاطر حکیمی صاحب ۷ دسمبر ۸۸ء بوقت ۱۱ بجے صبح رحلت فرما گئے انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت موصوف ایک شاعر۔ ایک صوفی اور دیندار شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کے معتقدین ہندستان کے ہر ایک گوشے میں موجود ہیں اور آپ کے شاگردوں میں برصغیر ہندستان، پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی موجود ہیں۔

مرزا ادیب پر پی، ایچ، ڈی

حیدرآباد کے پروفیسر نثار خاں نے ایم فل کا مقالہ "مرزا ادیب کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ" پر لکھا تھا۔ اب وہ مرزا ادیب کی ادبی خدمات" پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

عثمان حُسین خاں نہیں رہے

بمبئی۔ روزنامہ اجمل کے پاشر اور منیجر ممتاز صحافی، بزرگ دوست اور ہر دلعزیز شخصیت جناب عثمان حُسین خاں کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ موصوف بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ادارہ کتاب نُما، مکتبہ جامعہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

جشنِ کامل چاندپوری

جشنِ کامل چاندپوری رنگ بھون میں بروز سنیچر ۲۲ نومبر ۸۸ء

کی شب کو شاندار طریقے سے منایا گیا۔ خوبصورت مجلہ بھی شائع کیا۔ ایک اچھے رقابی مشاعرہ منعقد ہوا۔ شب غزل میں دلیپ طاہرا ور جنیدہ اختر نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

جشن میں اُردو کے ممتاز شعرا، اہم سیاسی اور سماجی شخصیتیں اور باذوق حضرات نے شرکت کی۔

بلند شہر میں اُردو کے مسائل پر کانفرنس اور سمینار

اتر پردیش اُردو ٹیچر ایسوسی ایشن نے ایک سمینار کا اہتمام کیا۔ جس کی صدارت اتر پردیش کے وزیر تعلیم جناب سریندر سنگھ چوہان نے کی۔ افتتاح وزیر محنت جناب سعید الحسن نے کیا۔

سمینار میں اُردو تعلیم اور اُردو ٹیچرز کے مسائل کا جائزہ لیا گیا۔ اس موقع پر دہلی کے مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور محقق شریک ہوئے۔

سمینار میں اُردو ٹیچروں نے ایک عرضداشت پیش کی۔ جس میں اُردو اور اُردو ذریعہ تعلیم کے مسائل نیز بحیثیت ٹیچر پیش آنے والی دشواریوں پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اس ۱۲ نکاتی میمورنڈم کا جواب دیتے ہوئے جناب سریندر سنگھ چوہان وزیر تعلیم اتر پردیش نے کہا کہ وہ ان کے مسائل پر غور کرنے کے بعد انھیں حل کرنے پر غور کریں گے۔

اس موقع پر جناب سعید الحسن وزیر محنت اتر پردیش نے کہا کہ اُردو زبان ملک کی زبان ہے اور اس کو معقول اور مناسب مقام دینے کی کوشش کی جائے گی۔ اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اُردو کے پروفیسر جناب عنوان چشتی نے مقالہ پڑھا جس میں کہا گیا کہ اُردو زبان کو سرکار محض ووٹ کے لیے حربے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکار اُردو کے مسئلہ کو حقیقی طور پر حل کرنا نہیں چاہتی اور اس کو لٹکائے رکھنا چاہتی ہے۔

اس موقع پر ضلع مجسٹریٹ [illegible] نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان کو زیادہ عملی اور جدید بنانے کے لیے تعلیم یافتہ اور اہل علم کو اُردو زبان پر تحقیق کرنی چاہیے اس سے پہلے صوبائی اُردو ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر جناب مسعود [illegible] نے انجمن کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر محمد حنیف کیفی پروفیسر مقرر

اُردو کے علمی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اُردو کے مشہور نقاد اور شاعر ڈاکٹر حنیف کیفی کا تقرر بحیثیت پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اُردو میں ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے اپنے عہدہ کا چارج لے لیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ جگہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے دہلی یونی ورسٹی چلے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کیفی اس شعبہ میں ۱۹۷۲ء سے بحیثیت لکچرر اور سنہ ۱۹۸۳ء سے بحیثیت ریڈر کام کرتے رہے ہیں۔

"نظام رنگ" کی رسم رونمائی

نئی دہلی۔ ۲۸ نومبر ۸۸ء کو بستی نظام الدین اولیاءؒ کے خواجہ ہال میں بزم مقالات بعنوان "سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ کی حیاتِ پاک اور تعلیمات" منعقد ہوئی جس کی صدارت سید مظفر حسین برنی چیرمین اقلیتی کمیشن نے فرمائی۔ اسی جلسے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کی تالیف نظام رنگ (حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا ادبی خاکہ) کی رسم رونمائی صاحبزادہ فضل المتین صاحب درگاہ اجمیر شریف کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ جلسے میں اُردو کے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔

غنی غازی کی کتاب

پھول پتّے کو مالی امداد منظور

انجمن خیر الاسلام اُردو پرائمری ہائی اسکول مدنپورہ بمبئی کے ٹیچر، صحافی اور بچوں کے ادیب غنی غازی کی چھٹی کتاب "پھول پتّے" کی اشاعت کے لیے بہار [illegible]

کے دوران ۔۔۔ منظور کر لیا تھا۔

حلقۂ ادب بہار کے ادبی جلسے میں مذاکرہ و مشاعرہ

پٹنہ ۲ دسمبر ۸۹ء۔ اُردو بھون میں حلقۂ ادب بہار کی جانب سے جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت اُردو کے معروف بزرگ افسانہ نگار ڈاکٹر سید محمد محسن صاحب نے فرمائی۔ اس جلسے میں "موجودہ اُردو ادب میں شہرت پسندی کا رجحان" کے موضوع پر مذاکرے کے علاوہ ایک مخصوص شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔

جلسے کی نظامت اُردو کے معروف افسانہ نگار اور حلقۂ ادب بہار کے جنرل سکریٹری جناب فخر الدین عارفی نے انجام دی۔

مذاکرے میں ڈاکٹر سید محمد محسن، ڈاکٹر عبدالمغنی پروفیسر سید محمد شفیع احمد، پروفیسر سمیع الدین حیدر، پروفیسر عبدالمعیز منظر، جناب ہارون رشید، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، فخر الدین عارفی، پروفیسر جاوید حیات اور مشتاق احمد نوری وغیرہ نے حصہ لیا۔

ماہنامہ انشاء کلکتہ ۷۳ کا خاص شمارہ "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" مطالعہ کا ایک نیا پس منظر

ادارۂ انشاء بہت جلد "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" کے عنوان سے ایک خاص نمبر شائع کرنے والا ہے جس میں پہلی بار منتخب اُردو و غیر اُردو شاعروں اور ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ کو یکجا پیش کیا جا رہا ہے۔

پنڈت نہرو کے صد سالہ جشن پیدائش کے موقع پر خدا بخش لائبریری میں نہرو سمپوزیم اور کتابی نمائش

پٹنہ۔ یکم دسمبر ۸۸ء۔ مجاہد آزادی ہند، معمار ملک و ملت پنڈت جواہر لال نہرو کی صد سالہ پیدائشی تاریخ کے موقع پر نہرو کی عظیم خدمات کی یاد میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ۴ بجے شام سے ۸ بجے شب تک ۔۔۔ کتابوں کی نمائش ہوئی۔ نمائش کے دوران نہرو پر ایک سمپوزیم بھی ہوا جس میں شہر اور بیرون شہر کے معزز اہل علم حضرات نے نہرو کی متنوع شخصیت کے رنگا رنگ پہلو پر شعاع ریزی کی اور اس جواہر ہند کو اپنے اپنے الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

مس ثنا گستہ خاں نے نہرو پر ایک پُر مغز مقالہ پیش کیا جس میں نہرو کی علمی، ادبی، قومی و ملی خدمات پر مبسوط روشنی ڈالی۔

نہرو پر ڈاکٹر خدا حاتم کے مقالے کا مختصر خلاصہ بھی پیش کیا گیا جو کسی معذوری کے تحت شریک محفل نہ ہو سکیں مقالہ کا عنوان تھا "نہرو کا سوویت دلیس" جناب محمود عالم صاحب نے نہرو کی عظیم المرتبت شخصیت پر اپنی عقیدت و محبت کے چند کلمات پیش کیے۔ ڈاکٹر عتیق الرحمٰن نے نہرو کی علم دوستی علم نوازی، علم پروری اور علمی و ادبی خدمات پر مختصر روشنی ڈالی اور خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب وشونا تھ سنگھ ڈائرکٹر پبلک ایڈمنسٹریشن نے بھی نہرو کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نہرو کی انتظامی صلاحیت اور انتظامی خدمات پر اظہار خیال فرمایا۔ ڈاکٹر محمود الحسن صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو سے اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار فرمایا اور بتایا کہ پنڈت نہرو ایک مخلص، ہمدرد اور درد مند انسان تھے۔ علی گڑھ سے آئے ہوئے ایک مہمان ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب نے بھی عربی کا ایک شعر پڑھ کر نہرو کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اخیر میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے فرمایا، اس ملک کا وہ تنہا وزیر اعظم تھا اور تنہا علم کا قدرداں جو ہندوستان کے اس عظیم کتب خانہ خدا بخش لائبریری کا پٹنہ میں آیا۔ ان سے پہلے گاندھی جی یہاں آ چکے تھے۔ وہ خود علم کا بڑا قدرداں تھا، علمی حلقوں میں بھی اس کی بڑی قدر تھی۔ وہ پہلا رہنما تھا جس نے سیاست کی بنیاد شرافت پر رکھی۔ اپنی تقریر کے دوران ۔۔۔

[illegible] میں صنعت کے ترقی [illegible]

[illegible] ہیں رکھتے۔ اہمیت اس بات کی ہے جس [illegible] کو کوئی دھیان نہیں دیتا کہ وہ شہر دا اور آزاد کے ویلیوز VALUE (و) قدار جو مہر بند ہو گئے ہیں وہ صہر آج [illegible] نہیں ٹوٹی اور اس مہر کے توڑنے کی کوئی فکر بھی نہیں [illegible] رتا۔ اسے ہم سب کو مل کر توڑنا ہے اور ان قدروں، VALUE کو بنیاد بنا کر ہمیں چلنا ہے تبھی ہماری اور ملک کی ترقی ہو سکتی ہے۔

سیرت ادبی ایوارڈ

مشہور عالم دین اور رسالہ "الرسالہ" کے مدیر مولانا وحیدالدین خاں کو ان کی تصنیف "محمدؐ: پیغمبر انقلاب" کے لیے حکومت پاکستان نے سیرت ادبی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ حکومت پاکستان ہر سال یہ اعزاز دیتی ہے جو دو ہزار ڈالر اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ حال ہی میں پاکستان کے کارگزار صدر غلام اسحاق خاں نے اسلام آباد میں یہ اعزاز مولانا وحیدالدین خاں کو پیش کیا تھا۔ اُردو میں ان کی چالیس کتابیں اور انگریزی میں سات اسلامی تصانیف ہیں۔

کوکن (مہاراشٹر) کے انیس اساتذہ کو نقش کوکن ٹیلینٹ فورم کا بیسٹ اسکول ٹیچر ایوارڈ

نقشِ کوکن ٹیلینٹ فورم بمبئی کے چیرمین ڈاکٹر عبدالکریم نائیک نے ایک پریس ریلیز کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ مہاراشٹر میں واقع خطۂ کوکن کے چار اضلاع (رتناگری، رائے گڑھ، تھانے اور سندھو درگ) کی اُردو پرائمری اسکولوں کے ۱۹ اساتذہ کو ان کی تعلیمی، تدریسی، سماجی و دیگر خدمات کے اعتراف میں "نقشِ کوکن ٹیلینٹ فورم بیسٹ اسکول ٹیچر ایوارڈ" دینے کا فیصلہ فورم کی مجلس منتظمہ نے کیا ہے۔ ۵ار جنوری ۹۸۹ کو واڈو دفا ضل بھائی ہال [illegible] بمبئی میں منعقد ہونے والے جلسۂ تقسیم انعامات و اعزازات میں ان اساتذہ کو ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔

ٹیلینٹ فورم بیسٹ اسکول ٹیچر ایوارڈ پانے والے معاون مدرسین کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

(۱) سید عثمان پیر (تھانے) (۲) عبدالرحیم منشی (اجیبت [illegible])
(۳) عبدالرزاق جمعدار (مروڈ) (۴) محمد رضا بیگ (کھیڈ [illegible])
(۵) مختار احمد فہمی (دہور) (۶) نثار احمد سوداگر (ساونت واڑی)
(۷) یوسف دارو غہ (مہسلہ) (۸) میمونۃ النساء حکیم (تھانے)
(۹) امانت انصاری (راجیواڑی) (۱۰) عبدالرشید حمزہ (اگرو [illegible])
(۱۱) دستگیر حوالدار (کڈ وئی) (۱۲) الطاف امانت علی (چپلون)
(۱۳) یوسف حسین جبسکر (رتناگری) (۱۴) اے۔آر۔ڈی خطیب [illegible]
(۱۵) ملک احمد مُسلّا (دلچگمی) (۱۶) عالمگیر خان (کلیان)
(۱۷) ذوالفقار احمد (بانکوٹ) (۱۸) حامد علی صدیقی (شری وردھن)
(۱۹) اسرار احمد شیخ (داپھول)

"مطالعہ ودود" کا رسمِ اجرا

اردو اور فارسی کے معتبر اور مستند محقق قاضی عبدالودود کی یاد میں قمر آزاد لائبریری پٹنہ کی جانب سے ۱۸ ستمبر ۸۸ء کو بوقت ۵ بجے شام ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر عطا کاکوی نے فرمائی جلسے میں ادیبوں، شاعروں، عالمین شہر کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سب سے پہلے جناب شمس قدر کی مرتبہ کتاب "مطالعہ ودود" کا رسم اجرا عطا کاکوی کے ہاتھوں ہوا۔

اس موقع پر نوجوان محقق ڈاکٹر سید حسین احمد نے فرمایا کہ قاضی صاحب نے نہ صرف محققین کی ایک نسل کو متاثر کیا بلکہ ان سے محققوں کی کئی نسلیں متاثر ہوئیں۔ لیکن بہار اُردو اکادمی، انجمن ترقی اُردو بہار، بہار اُردو اکادمی [illegible] بہار کی یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو قاضی صاحب کی یاد میں آج تک کچھ نہیں کیا۔

پروفیسر سید حسن سرمد نے کہا۔ جناب شمس قدر [illegible] ہمارے شکریہ و ستائش کے مستحق ہیں۔ انھوں نے قاضی صاحب کے متعلق مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کر کے قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو یاد دلانے کی کوشش [illegible]

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے فرمایا۔ بیچ کا دوسرا نام قاضی عبدالودود ہے۔ یہ ہمیشہ حق کی تلاش کے لیے محنت کرتے رہے۔ قاضی صاحب نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن ان نمازیوں سے بہتر تھے جو نماز پڑھ کر بھی جھوٹ بولتے ہیں حق گوئی اور راست گوئی ان کا شعار تھا ان کی شخصیت اتنی پرکشش تھی کہ جو بھی ان کے پاس گیا یا اس نے ان کی تحریروں کو پڑھا وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جلسے کے آخر میں پروفیسر عطا کاکوی نے قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کے متعلق گراں قدر تقریر کی اور انھوں نے فرمایا کہ قاضی صاحب ایک دن میں قاضی صاحب نہیں ہوگئے تھے بلکہ برسوں کی محنت اور مطالعہ نے قاضی صاحب کو قاضی صاحب بنایا۔

آخر میں افضال علی اسعد صاحب نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس جلسے کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔

اس سال کا خدابخش ایوارڈ ننگا جمنی کلچر کو جائے گا

پٹنہ۔ ۲۵ر نومبر ۸۸ء خدابخش لائبریری نے ان موضوعات پر جو اس لائبریری کو خصوصی دلچسپیوں میں شامل ہیں۔ اسکالروں کی طبع زاد اور تحقیقی خدمات کے اعتراف میں ہر سال ایک خدابخش ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ خدابخش ایوارڈ پچاس ہزار روپے اور متعلقہ اسناد پر مشتمل ہے۔ وہ موضوعات جن پر ایوارڈ دیا جائے گا یہ ہیں۔ تصوف، تقابلی مذاہب، مشترکہ تہذیب، طب، وسط ایشیائی مطالعات، مغربی ایشیائی مطالعات، علوم اسلامیہ جنوبی ایشیائی مطالعات، تاریخ ہند، عربی ادب، فارسی ادب اردو ادب، عہد وسطیٰ کے فنون لطیفہ اور علوم (سائنس)

یہ ایوارڈ ہر سال کسی ایک اسکالر کو اس کے مجموعی طبع زاد و تحقیقی کاموں کے مجموعی جائزہ کی بنیاد پر دیا جائے گا۔

جشن زریں، فیکلٹی تعلیم، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

جامعہ کے یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر ۸۸ء کے موقع پر دن کے ساڑھے گیارہ بجے شعبہ اُردو سے متصل میدان کے اندر ایک شاندار پنڈال میں فیکلٹی تعلیم کی جشن زریں تقریبات کا افتتاح ہوا۔ ڈائس اپنے حسن سادہ کی بھرپور کشش رکھتا تھا جو کہ فیکلٹی تعلیم کے شعبۂ آرٹ اینڈ کرافٹ ایجوکیشن کے طلبہ اور طالبات نے اپنے نامور اساتذہ کی نگرانی میں تیار کیا تھا جس سے ان کے سلیقے اور ذوق کے اعلا معیار کی غمازی ہوتی تھی۔

جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جو کہ قاری محمد سلیمان قاسمی صاحب امام مسجد جامعہ نے فرمائی۔ تلاوت کے بعد جامعہ سینیر سکنڈری اسکول کے طلبہ و طالبات نے جامعہ کا ترانہ سنایا اور جامعہ نرسری اسکول کے ننھے منھے بچوں نے ڈائس پر رونق افروز شخصیات کو گلدستے پیش کیے۔

اس کے بعد جشن زریں کمیٹی کے داعی جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں جامعہ کے اندر تربیت اساتذہ کی پچاس سالہ (۱۹۳۸ء تا ۱۹۸۸ء) ترقی اور اس کے اہم معماروں کا بخوبی تعارف کرایا گیا ہے۔

قادری صاحب کی رپورٹ کے بعد جناب شیخ الجامعہ پروفیسر علی اشرف نے حاضرین جلسہ کا پرتپاک خیر مقدم فرمایا اور صدر جلسہ پروفیسر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری کو پرخلوص خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے جامعہ اور اہل جامعہ کے ساتھ مشفقانہ تعلق کو سراہا اور انھیں خوش آمدید کہا۔

شیخ الجامعہ صاحب کے خیر مقدمی کلمات کے بعد جناب ڈاکٹر سلامت اللہ نے فیکلٹی تعلیم کے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرمائے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس فیکلٹی کے تین اہم معماروں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے کم و بیش اڑتیس سال اس ادارے کی آبیاری کی ہے اور اسے ملک کے اندر تربیت اساتذہ کے مرکزوں میں ایک ممتاز مقام پر پہنچا کر ۱۹۷۶ء میں بحیثیت ڈین فیکلٹی اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے ہیں۔ انھوں نے ادارے کی خصوصیات کی طرف توجہ دلائی اور اقدار

[illegible]

تعلیم کی اہمیت اور ایک مغربی و مشرقی ثقافت کا دل سوزی

امتزاج رکھتی تھی۔ ان کے بعد ڈاکٹر بی۔ این پنڈت نے اپنے جذبات سے پر لہجے میں ان دنوں کی مرقع کشی کی جب کہ ۱۹۳۸ء میں استادوں کا مدرسہ قائم ہوا تھا اور وہ اس کے پہلے سال کے ایک طالب علم تھے۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا "استادوں کا مدرسہ میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے"۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر کو کم و بیش ان الفاظ پر ختم فرمایا کہ "آج نصف صدی گزرنے کے بعد جب کہ کچھ یادیں روشن ہیں کچھ مدھم پڑ چکی ہیں اور کچھ بالکل دھندلا گئی ہیں۔ جامعہ میں جو تجربات مجھے حاصل ہوئے، ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور سعید انصاری صاحب جیسے اپنے بزرگوں سے تمام زندگی قائم رہنے والی جو رفاقتیں مجھے نصیب ہوئیں، وہ میری زندگی کا انمول سرمایہ ہیں۔" ڈاکٹر پنڈت کا تعارف کراتے ہوئے قادری صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ آج کل ہل گرد و پبلک اسکول دہلی کے ڈائرکٹر ہیں اور تعلیمی حلقوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

آخر میں ممتاز دانش ور ماہر تعلیم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر ڈی۔ ایس کوٹھاری نے اپنا خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ انھوں نے اپنی تقریر اردو میں فرمائی اور جگہ بہ جگہ اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی تقریر سے پڑھا جو کہ اس موقع کے لیے ہی انھوں نے تحریر فرمائی تھی۔ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں میں ایک نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے۔" ان الفاظ سے انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے اس جشن زریں کے موقع پر اپنی دلی مبارک باد پیش فرمائی اور ادارے کی ترقی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں سیرت سازی کی اہمیت پر خاص طور پر زور دیا۔ تعلیم کا سیرت ساز رول یہی ہے کہ وہ ہمارے اعمال میں اخلاق پیدا کرے جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ اس طور تربیت اساتذہ کے پیشے میں ایک نہایت اہم جہت کا اضافہ ہوتا

[illegible]

انھیں ماضی کے عظیم اساتذہ کی یاد دلاتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا "استاد کا کام طالب علم کو صرف معلومات بہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ اسے ابھارنا، اپنی مثال سے اس کی سیرت تعمیر کرنا، اور علم کو سماج کی بھلائی کے لیے استعمال کرنے کا اہل بنانا ہے۔" انھوں نے تعلیم میں کام کی اہمیت کو سراہا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ کا زندگی اور لوگوں کی توقعات کے ساتھ براہ راست اور بامعنی تعلق ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے اختتام پر اپنے اظہار مسرت اور پسندیدگی کے طور پر قادری صاحب کو ایک گلدستہ پیش فرمایا۔

اس کے بعد فیکلٹی تعلیم کے ڈین، سردار پرم جیت سنگھ نے تمام مہمانان اور کارکنان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کوٹھاری صاحب کو یقین دلایا کہ ہم ان کے مشوروں پر عمل کریں گے اور ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ان جیسے اپنے شفیق بزرگ اور بلند پایہ تعلیمی مفکر کی توقعات کو پورا کریں۔

تقریباً ایک بجے جلسے کا اختتام قومی ترانے پر ہوا۔ اس کے بعد جملہ حاضرین جلسہ کو کافی پینے کے لیے مدعو کیا گیا جو کہ کشادہ ماحول اور معتدل موسم کے ساتھ پر تکلف بھی ثابت ہوئی۔

ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان

ہمدرد ہمہ وقت علمی، ادبی، فلاحی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی، سائنسی اور دینی خدمت کے انجام دہی میں مصروف ہے۔ تعاون مصنفین کے پیش نظر علمی، ادبی، فلاحی اور اخلاقی کتب خرید کر ملک کی اہم شخصیات، جامعات اور لائبریریوں کو وقتاً فوقتاً بھجوائی جاتی ہیں تاکہ مصنف کا فن پارہ خاص و عام میں روشناس ہو سکے اور مصنف کی بھی ہمت افزائی ہو

صابر دت کی دو اہم کتابیں
چند تصویرِ بُتاں
(ایک البم)
اُردو کے مشاہیرِ قلم کی نایاب تصویروں کی نمائش۔ امیر خسرو سے لے کر
عہدِ جدید تک کے اہم قلم کاروں کا نگار خانہ مع مستند حواشی۔
صابر دت نے بڑی عرق ریزی سے
اُردو زبان کے سفر کی کہانی تصویروں میں تحریر کی ہے
آرٹ پیپر پر دیدہ زیب طباعت، خوبصورت، مضبوط مخملی جلد
قیمت: تین سو روپے (زیرِ طبع)
"پل دو پل" کے بعد صابر دت کا دوسرا شعری مجموعہ
موجِ عارض
ترے عارض کی ہلکی سی جھلک سے
منور رات ہے جس چاندنی سے
خوبصورت طباعت، دلپذیر سرورق جسے پاکستان کے نامور آرٹسٹ موجد نے تیار کیا ہے
قیمت: تیس روپے (زیرِ طبع)
(آج ہی اپنی کاپی بک کرائیے)
ساحر پبلشنگ ہاؤس
"پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی ۴۰۰۰۴۹
فون: 6202837
جاری کردہ انور سلطانہ

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

فروری ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۲

فی پرچہ ۴/-

سالانہ ۳۵/-

غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) ۱۰۰/-

(بذریعہ ہوائی ڈاک) ۲۲۰/-

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے ۴۵/-

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

پرنٹر پبلشر سید ناظم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

اردو میں کلاسیکی تنقید (تنقید) پروفیسر عنوان چشتی ۴۸/-

تفہیم و تنقید (تنقید) پروفیسر حامدی کاشمیری ۴۲/-

فی الفور (طنزیہ و مزاحیہ مضامین) یوسف ناظم ۳۰/-

گول مال " شفیقہ فرحت ۱۸/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات (تاریخ) ڈاکٹر مجیب اشرف ۱۲/-

انتخاب نعتیہ کلام اعلیٰ حضرت رضا بریلوی
مولانا عبدالمبین نعمانی ۵/-

فیض الحکمۃ (اردو ترجمہ) احمد القادری مصباحی ۴/-

قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری
ڈاکٹر ایم کمال الدین ۵۰/-

تتلیوں کے گیت (گیت) عبدالمتین نیاز ۱۰/-

شہرگ (طنزیہ مزاحیہ مضامین) سید شمیم گوہر ۷/-

الف (شعری مجموعہ) یعقوب یاور کوٹی ۸/-

محرک (تنقیدی مضامین) شاہد کلیم ۳۰/-

نئے موسم کی تلاش (شعری مجموعہ) عالم خورشید ۳۰/-

سوچ سمندر " جمال قریشی ۳۰/-

اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب (سائنسی ادب)
ڈاکٹر محمد شکیل خاں ۴۴/-

صبائے سنگ (شعری مجموعہ) محمد سالم ۳۰/-

چہرہ چہرہ دھرتی " تسنیم فاروقی ۱۷/-

سید سلیمان ندوی (مقالات) مرتبہ خلیق انجم ۴/-

اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں (عروض)
ڈاکٹر منظر اعظمی ۳۶/-

پیغمبرانِ حق (سوانح) ڈاکٹر عقیل ہاشمی ۱۵/-

جامعہ عثمانیہ (رسالہ) ڈاکٹر حسن الدین احمد ۱۵/-

حیدرآباد کبھی ایسا بھی تھا (مضامین) تمکین کاظمی ۱۰/-

امجد سے شاذ تک (شعری انتخاب) تعارف عابد علی خاں ۲۴/-

قصہ مہرافروز اور دلبر مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۵/-

بہادر شاہ ظفر (سوانح) اسلم پرویز ۶۰/-

حیاتِ محروم (شخصیت اور فن) پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۴۰/-

امید کی کرن (بچوں کی کہانیاں) تسکین زیدی ۱۰/-

سفر ہم سفر (سفرنامہ) راغب شکیب ۱۵/-

آدھی صدی کے بعد (شعری مجموعہ) وزیر آغا ۲۵/-

سپہر کی خزاں (افسانوں کا مجموعہ) رشید امجد ۲۴/-

دستِ نگاریں (شعری مجموعہ) رشید نثار جہانپوری ۴۰/-

پرواز (انشائیے) رشیدہ قاضی ۴۰/-

گہوارۂ علم و ہنر (شعری مجموعہ) جگن ناتھ آزاد ۲۵/-

مہمان مدیر
وارث علوی
SYED WADA,
ASTODIA,
AHMADABAD.

افسانہ نگار اور قاری

وارث علوی نے ہماری درخواست اور کتاب نما کی ضخامت کا خیال رکھتے ہوئے "مختصر ترین" اشاریہ مرحمت فرمایا ہے جو قارئین کتاب نما کی خدمت میں نہایت مسرت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ ادارہ

آج کل ادب میں جمود طاری ہے لیکن جدید افسانے پر تنقید کا بازار گرم ہے۔ اب تو وہ لوگ بھی افسانوں پر تنقیدیں لکھ رہے ہیں جو صورت سے رسالہ مولوی کے اڈیٹر نظر آتے ہیں اور جن کے متعلق یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ تزکیۂ نفس کے علاوہ وہ تخلیہ کا استعمال کسی نوع کی ذہنی تفریح وغیرہ قسم کے ادنا مشاغل کے لیے کرتے ہوں گے۔ اگر جدید افسانے پر زیادہ تر تنقیدیں سرد ہاتھوں کا لمس معلوم ہوتی ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ نقاد افسانوں کے عاشق نہیں بلکہ منکوحہ شوہر ہیں اور من جملہ اور اصناف کے اگر افسانے کو بھی گھر میں ڈال لیا ہے تو اس کی دیکھ بھال کرنا بھی فریضۂ شرعی ہے۔ اُن کی تحریروں سے پتا ہی نہیں چلتا کہ افسانہ بھی ان کے لیے تجربۂ حسن اور سرچشمۂ نشاط رہا ہے۔ شوہر کے بطن میں عاشق کو زندہ رکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا نقاد میں قاری کو زندہ رکھنا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیوی اور افسانہ دونوں گھر اور تنقید کا کاروبار چلانے کی چیز بن جاتے ہیں۔ بیوی کے پھیلنے اور افسانے کے سکڑنے کا غم دونوں کو نہیں ستاتا کیونکہ دونوں پیشہ ور حکیم کی صورت نبض کو دیکھتے ہیں ساعد سیمیں کو پُر شوق ہاتھوں سے نہیں تھامتے۔ ناول اور افسانے کے پُر شوق قاری کے لیے فلابیر اور ڈکنس کے بھرے بھرے ناول ایک پُر نشاط کائنات اصغر ہیں گم شدگی کا وہ تجربہ ہیں جو فنا فی الذات صوفی کی بے خودی کے تجربے سے مختلف نہیں۔ اس تجربے کے سامنے نفس دیندار کی ابلہ فریبیاں اور ناقدانہ کروفر کی عشوہ فروشیاں بے بضاعت نظر آتی ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ آج کل تو ہم فلابیر کی دنیا میں ہیں یا جی چاہتا ہے پھر سے ڈکنس کی دنیا میں جایا جائے۔ ہر ناول کی دنیا زمان و مکاں سے بلند اپنا ایک وجود رکھتی ہے جس میں آدمی عمر کی ہر منزل میں جب بھی جی چاہے داخل ہو سکتا ہے اور جارج ایلیٹ اور ٹالسٹائی کا وہ ناول جو انگلینڈ اور روس کی سرزمین پر آج سے سو سال پہلے لکھا گیا تھا، ایک ہندستانی قاری

کے لیے جتنا چوبیس سال کی عمر میں تازہ کار تھا چوسٹھ سال کی عمر میں بھی اتنا ہی حیرت ناک اور پُر نشاط رہتا ہے۔ قاری کے لیے صرف تیاری شرط ہے۔ اور اس تیاری کے لیے ذہن کو غیر ابر آلود کرنا ضروری ہے تاکہ آدمی بچّہ بنے بغیر بچّے کی اس معصومیت کو پالے جس کے بغیر جیسا کہ انجیل میں کہا گیا ہے کہ آدمی مملکتِ خداوند میں داخل نہیں ہو سکتا۔ گھر کی اُلجھنوں اور تنقید کے الجھاؤں میں جکڑا ہوا آدمی نظر کی اس پاکیزگی سے محروم ہو جاتا ہے جو دنیائے افسانہ کی سیر کے لیے ضروری ہے۔ ذات سے غیر ذات کی طرف اس پُر شوق سفر کا کوئی نشان تنقید کے شوہروں کی سبھا کلنے میں نظر نہیں آتا۔

عموماً کہا یہ جاتا ہے کہ ہمارا مزاج افسانہ سے زیادہ شاعری کی طرف مائل رہا ہے حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہندستان صدیوں سے کہانی کا گہوارہ اور کتھاؤں کا ساگر رہا ہے۔ وہ چند تہذیبیں جنھوں نے ڈرامے کو فروغ دیا ہندستان ان میں بھی پیش پیش تھا۔ یہاں کے مذاہب کی تعمیر رزمیہ قصّوں اور پورانک کتھاؤں پر ہوئی ہے۔ قصّے کہانیوں کی دنیاؤں میں جینا ہر ملک کے آدمی کی فطری اور نفسیاتی ضرورت رہی ہے۔ لہٰذا ہم کسی ایسی تہذیب کا تصوّر نہیں کر سکتے جو کہانیوں کے سرمایہ سے محروم ہو۔ سائنس اور عقلیت پسندی کے ہاتھوں دنیا بدلی تب بھی آدمی کی کہانیوں کی ضرورت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ قدیم اساطیر، رومان، اور داستانوں کی جگہ ناول اور افسانہ نے لے لی۔ پچھلے دو سو سال سے ناول انسان کی تخیلی اور تہذیبی زندگی کا سب سے زیادہ طاقت ور عنصر رہا ہے۔ کسی زبان میں فکشن کی کمی اس کی کم مائیگی، افلاس اور انحطاط ہی کی نشان دہی کرتی ہے۔ اگر شاعری میں بھی ہم نظم پر غزل کے غلبہ کو دیکھیں اور غزل پر لکھی گئی تنقید کی فقیہانہ موشگافیوں پر نظر کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ایک معنی خیز اور تازہ کار تخلیقی، تخیلی اور تہذیبی زندگی کا سودا ہم نے کیسے استادانہ کرتبوں اور زبان و بیان کی سرد اور بے جان ماہرانہ موشگافیوں سے کیا ہے۔ ناول اور افسانہ کی کمی کو ناول اور افسانہ ہی پوری کر سکتا ہے۔ شاعری دو آتشہ سہی لیکن پیاس شراب سے نہیں پانی ہی سے بجھتی ہے اور اسی لیے ناول کا قاری قلزم آشام ہوتا ہے، اور جس طرح ہم نہیں جانتے کہ زندگی بھر ہم نے کتنا پانی پیا اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہماری زندگی کتنے ناولوں اور افسانوں سے سیراب ہوتی ہے۔ جدید انسان کی چند ایسی جذباتی ضرورتیں ہیں جو پہلے اساطیر، مذاہب، فلسفہ اور تاریخ پوری کیا کرتی تھیں۔ آج یہی ضرورتیں ناول پوری کر رہا ہے، اور اسی معنی میں ناول تاریخ بھی ہے اور مابعد الطبعیات بھی فلسفیانہ سرگرمی بھی ہے اور اسطور سازی بھی۔ یہ ضرورتیں پوری نہ ہوں تو زندگی نہایت ہی تشنہ کام گزرے۔

لیکن ہم اُردو والوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ شاعری کے ایسے قدح خوار ٹھہرے کہ پانی سے سگ گزیدہ کی طرح بھاگنے لگے۔ غزل کے ایک شعر میں پورے افسانہ کو رقص کناں دیکھ لیا۔ جس طرح ہم نے ڈراموں کے بغیر جینا سیکھ لیا تھا اسی طرح ناولوں کے بغیر بھی جینے کی عادت ڈال لی۔ اگر جدید افسانہ کا پانی اسی طرح تجریدیت کے صحرا میں مرتا رہا، تو وہ دن دُور نہیں جب ہم

افسانوں کے بغیر بھی جینا سیکھ لیں گے۔

> نقادوں کا کیا ہے، اگر افسانہ بالکل نا پید ہو جائے تب بھی پانچ سو صفحات کی کتاب اس موضوع پر لکھ ڈالیں گے کہ ہمارے یہاں افسانہ کیوں نہیں۔

نقاد دعوت کام و دہن پر قناعت نہیں کرتا بلکہ کھانے کے بعد ڈکراتا بھی ہے، اور غذا ثقیل الہضم ہو تو گرجتا بھی ہے۔ لیکن اب تو تنقید بگھارنے کے لیے بھی سبزیاں نہیں ملتیں کیونکہ علامات اور استعارات کے کارخانوں سے جو کیمیاوی کھاد پیدا ہوئی ہے اس نے دنیائے افسانہ کے وافر حصہ کو بنجر بنا دیا ہے۔ بیج کھاد ہی میں فنا ہو جاتا ہے اور برگ و بار پیدا نہیں کر پاتا۔ اللہ سبزی خور کو ہمیشہ سبزی نہیں دیتا۔ اس لیے نقاد کو ایسی سبزیوں پر بھی گزارا کرنا پڑتا ہے جن میں کیڑا لگ گیا ہو۔ ایسے وقت میں تنقید بگھارنے کا کام کیڑے نکالنے سے مختلف نہیں رہتا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جدید افسانہ کا کریلا نہ کڑوا رہا نہ نیم چڑھا بلکہ شاعری کے شہتوت کو جا چمٹا اور صفاتِ شکر قندانہ پیدا کر لیں۔ وہ نقاد جو سبزی پکانے کا کام بھی سبز باغ دکھانے کے انداز میں کرتے ہیں وہ کریلے کی ہنڈیا میں ڈالتے تو ہیں تنقید کے مانوس مسالے ہی یعنی تکنک، اسلوب، اسطور کا نون مرچ اور دھنیا، لیکن جو پکوان پلیٹ میں پیش کیا جاتا ہے وہ کریلے کا ساگ نہیں بلکہ کریلے کی کھیر ہوتی ہے جس سے زبان داں، زبان کی چاشنی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ چونکہ پکوان کے اس کرتب پر ہمیں اختیار نہیں اس لیے ہم نے اپنا ڈیڑھ اینٹ کا چولھا الگ بنا رکھا ہے۔

اس چولھے کے پاس بیٹھ کر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اے وائے حسرتا! کاش ہم بھی شاعر ہوتے تو میاں نظیر کی طرح نہ سہی کہ جس دور میں ہم رہتے ہیں اس میں نہ کبیرا روتا ہے نہ بنجارہ گاتا ہے، حضرت جوش ملیح آبادی ہی کی طرح مینڈکوں کا جلوس قسم کی نظم لکھ کر چھٹکارا حاصل کر لیتے۔ لیکن نقاد ہوئے تو سنجیدگی بھی لازم آئی۔ جس کا پہلا سبق یہ تھا کہ صفحۂ وقت پر نقشِ دوام ثبت کرو۔ تنقیدی مضامین کو دیکھتا تو ان کی عمرِ گریز پا اور جوانا مرگی عبرت دلاتی کہ کم از کم مضامین کو اُن افسانوں کے چالیسویں تک تو جینا چاہیے تھا جنھیں حیاتِ جاوداں عطا کرنے کے لیے وہ لکھے گئے تھے۔ چنانچہ طو مار نویسی کو شعار بنایا کہ قبر کچی ہی سہی اگلی برسات تک تو اس کے آثار نظر آتے رہیں کہ نئے برساتی کیڑے اپنے گورکن آپ پیدا کرتے ہیں۔ جاں سپاری کا یہ حوصلہ فدوی میں پیدا نہ ہوا کہ دو صفحوں کا کفن باندھے لیتھوکے پتھروں کے بیچ دم توڑنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ فنا کی طاقتوں پر اپنا کوئی اختیار نہیں لیکن زندہ رہنے کی اس سعیٔ لاحاصل کی داد چاہوں گا کہ مضمون کی کتابت سے پہلے کاتب اپنا وصیت نامہ تیار کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جدید افسانوں پر نظر کیجیے جن کی کتابت بعینہٖ اس طرح ہوتی ہے گویا مسجد کے مولوی صاحب کفن پر مغفرت کی آیات لکھ رہے ہیں۔

ایک ایسے دورِ ابتلا میں جب کہ افسانہ نگار نوکِ قلم سے نہیں بلکہ نوکِ سناں سے اپنا لوہا منوانے کے لیے کمربستہ ہوں، اور ہفتہ وار اور پندرہ روزہ اخبارات میں اپنی علاقائی شناخت کا غلغلہ بلند کر رہے ہوں اور صحافت کے زور پر اپنا وہ حق مانگ رہے ہوں جو ادب کے زور پر انھیں نہیں ملا، کم از کم کوئی بھی دانشمند نقاد اپنے ڈیڑھ اینٹ کے چولھے پر کوئی ایسی ہانڈی نہیں پکائے گا

جو بیچ چوراہے کے پھوٹ کر نقضِ امن کا سبب بنے۔ لیکن ایسی دانشمندی کبھی ہمیں کب راس آئی ہے۔ تنقید کی یہی تو مصیبت ہے کہ وہ دوست دشمن میں بھی تمیز نہیں کرتی بلکہ جنھیں وہ پسند کرتی ہے انھیں بھی گزند پہنچانے سے وہ باز نہیں رہتی۔ مثلاً قرۃ العین حیدر کے ناول اور افسانے مجھے پسند ہیں، لیکن جب اُن پر قلم اٹھاتا ہوں تو تنقید پسندِ خاطر ہی کا نہیں غبارِ خاطر کا بھی آئینہ بنتی ہے۔ سنا ہے ، "آخرِ شب کے ہم سفر" پر میری تنقید سے وہ کبیدہ خاطر ہوئی تھیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھے افسوس ہے خیر، اس کی تلافی عبد المغنی نے اُن پر ایک پوری کتاب لکھ کر کر دی جس میں انھیں جیمس جائس اور ورجینیا وولف سے بھی بڑا ناول نگار ثابت کیا ہے۔ یہاں تک تو خیر کوئی ہرج کی بات نہیں تھی۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ لیکن عبد المغنی کے نزدیک دنیا کا صرف ایک ناول نگار مس حیدر سے بڑا ہے۔ اور وہ ہے نسیم حجازی۔ جوہر شناسوں کی یہی وہ جنبشِ لب ہے جو کشتۂ تنقید کے لیے گہوارہ جنبانی کا کام کرتی ہے۔

احمد مشتاق اچھے بھلے شاعر تھے۔ انھوں نے نہ فراق کا کچھ بگاڑا تھا نہ فاروقی کا۔ لیکن فاروقی نے انھیں فراق کے ساتھ جا بھڑایا۔ نہ فاروقی کا کچھ گیا نہ فراق کا۔ لوگوں نے احمد مشتاق کے لتّے لے ڈالے۔ ان کا انجام دیکھ کر اب انور خان تھر تھر کانپتے ہیں، کیونکہ اپنے کسی اسلوبیاتی نکتہ کی وضاحت کے لیے فاروقی نے بیدی کے اسلوب کا مقابلہ انور خاں کے اسلوب سے کیا ہے اور انور خاں کے سپاٹ بیانیہ کو بیدی کے تہ دار بیانیہ سے اگلا قدم بتایا ہے نئے افسانہ نگاروں کو بھی بہت چاؤ تھا کہ تنقید میں ان کا ذکر چلے۔ انھیں تنقید کے چونچلوں کا پتا نہیں تھا۔ اب پناہ مانگتے ہیں۔

> اور یہ سب کارہائے نمایاں سنجیدہ تنقید کے ہیں اور میں سنجیدگی کی قدر پہچانتا ہوں کیونکہ جو چیز آدمی کے پاس نہیں ہوتی اس کی قدر وہ زیادہ ہی کرتا ہے۔

میں خوب جانتا ہوں کہ جراح کے لیے سنجیدگی ضروری ہے لیکن کیا کیا جائے، ہمارے اکثر لکھنے والوں میں ناقص عضلات اور فضلات کا ایسا بکھیڑا ہوتا ہے کہ جراح کے نشتر کا استعمال بھی قصاب کے بغدے کی طرح کرنا پڑتا ہے اور اس ناگوار صورتِ حال کو جو چیز گوارا بناتی ہے وہ اکثر و بیشتر تو ایک فقرے کا وہ کسا ہوا جھٹکا ہوتا ہے جس کے ساتھ الجھے ہوئے افکار کی دس سیر کی گانٹھ مرتبان میں لڑھک آتی ہے۔ گردے میں پھنسی ہوئی ننھی سی پتھری کا آپریشن ظاہر ہے اس طرح نہیں کیا جاتا۔ وہ نقاد جو گانٹھ اور گردے کے فرق سے واقف نہیں وہ رگِ گل کو بغدے سے کاٹتے ہیں اور یہ بت شکن تنقید کا شیوہ ہے، یا نشتر کا استعمال برگد کی جٹاؤں پر کرتے ہیں جو بت پرست تنقید کا شعار ہے۔ چونکہ یہ دونوں کام سنجیدگی سے کیے جاتے ہیں اس لیے ان شعائر سے الگ کوئی اور طریقہ اپنانا تنقید کی متانت کو مجروح کرتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بعض حالات میں مسخرگی سچائی اور ایمانداری کی آخری پناہ گاہ کیسے بنتی ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جسے پانے کے لیے آدمی کو بہت سے نیک کام بھی قضا کرنے پڑتے ہیں۔ اگر میاں نظیر بھی ہاتھ باندھ کر نمازیوں میں شامل ہو جاتے تو جوتے چرانے والے کو کون دیکھتا۔

ظاہر ہے خدا دیکھتا اور مسکراتا۔ بس میاں نظیر کو یہی بات گوارا نہیں تھی کہ بندۂ مجبور اور مقہور سے خدا اس کے مسکرانے کی سعادت بھی چھین لے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہوا تو خدائی ہٹلریت میں بدل جائے گی۔ آمروں کی سلطنتوں میں لوگ ہنستے نہیں۔ ساواک اور سیوک، گستاپو اور رضاکاروں کے کیل لگے جوتوں کی آہٹ پر چہرے زرد ہو جاتے ہیں اور آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ اس کے برعکس خدائی گستاپو، چاہے کاتبین ہوئے یا نکیریں، اسرافیل ہوئے یا عزازیل سب کی آدمی نے کیا گت بنائی ہے۔ میاں نظیر کی تان پر فرشتۂ موت تو ایسا بنجارہ بن گیا ہے جس کا تماشہ دیکھنے لوگ شہر کے سقف و بام پر امنڈ آئے ہیں۔ نہیں صاحب! یہ مسکرانے کا حق میاں نظیر کبھی چھوڑنے والے نہیں۔ اس لیے جب محمود وایاز ایک ہی صف میں کھڑے رکعت باندھ رہے ہوتے ہیں تو میاں نظیر مولسری کے پیڑ کے نیچے کسی ٹوٹی قبر سے کمر لگائے اس آدمی کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو چھپ چھپ کر اس آدمی کو تاڑتا ہے جو چپکے چپکے محمود و ایاز کے جوتے چراتا ہے۔ علامہ نے محمود و ایاز کو دیکھا اور نماز کے بعد مساوات پر وعظ پڑھا۔ میاں نظیر نے نماز ہی نہیں پڑھی تھی تو وعظ کیا پڑھتے۔ ٹک دیکھا، چٹکی بجائی اور چل دیے۔ انھیں کہاں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرنے تھے۔

مساوات پر لکچر ہم نے نہ علامہ کے سنے نہ ترقی پسندوں کے۔ اب بات قر ہدی پلا رہے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہم ان کے سامنے کیا پیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ادب میں گنگا اشنان کے ہم نے وہ مزے لوٹے ہیں کہ تنقید کے حوض پر جب بھی وضو بنانے بیٹھے مسح بس کان کے پیچھے کا حصہ ہمیشہ کورا رہ گیا۔ تنقید مکروہ ہوئی اور رباب قبول ہمارے لیے بند رہا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایصالِ ثواب اور فلاحِ دارین کے کام ہم سے ہو نہیں پاتے۔ لکچر مساوات پر ہوں یا اصوات پر، ہم مدرسہ کے اُن بھگوڑوں میں سے ہیں جو میاں نظیر کے ساتھ بھالو کا ناچ دیکھتے نظر آئیں گے۔

لیکن جدید افسانہ مرگِ انبوہ کا جو منظر آج پچھلے بیس پچیس سال سے پیش کر رہا ہے اور ابھی تک جشن کی کوئی صورت پیدا نہیں کر سکا، مسخرے کو بھی سنجیدہ بننے پر مجبور کرتا ہے کہ جنازے کو کاندھا سنجیدگی سے ہی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دستارِ فضیلت میں تو رومال باندھ کر ہی صوتیات کے اصولوں کے مطابق کلمۂ شہادت ادا کرتے ہوئے جدید افسانہ کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتے آئے ہیں۔ اس کام سے ہم اتنے تھک گئے ہیں کہ جنازہ کبھی کبھی لواحقین کے حوالے کر کے کسی پیڑ کے نیچے بیڑی پینے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس وقت ہمیں ہماری حالتِ زار پر زار زار ہنسی آتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سنجیدہ نہیں رہے حالانکہ ہمارا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ سر کے رومال کو دستارِ فضیلت میں تبدیل کرنا نہیں چاہتے کہ اتنے طویل قبرستانی فاصلوں میں دستار کی فضیلت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی تنقید کی تاریخی افادیت سے متعلق جو خوش فہمیاں عموماً نقادوں کو ہوتی ہیں اس سے ہم محروم ہیں۔ ورنہ ہم سے یہ بعید نہیں تھا کہ ہم بھی سال بہ سال ادبی رفتار کی سالانہ رپورٹ کو فاضلانہ مضمون کی صورت دیتے اور اس طرح اسقاط شدہ افسانوں کا بھی اندراج ہوتا رہتا کہ نو مرگوں کے نام درجِ گزٹ ہونے کی ایک صورت یہ بھی نکل آئی ہے۔

دیکھیے! میں بالزاک اور ڈکنس کا نام لے کر رعب گانٹھنا نہیں چاہتا، البتہ اسے آپ مباہات

نہ سمجھیں تو میں عرض کروں کہ میں ادب کا شب زندہ دار ہوں اور بڑی نمازیں پڑھتا ہوں، لیکن ساتھ ہی مختصر افسانوں پر بھی شکرانہ کی نفل ادا کرنے کو فضیلت سمجھتا ہوں۔ چھوٹی نمازوں کا بھی اپنا ایک روحانی کیف ہے۔ اب رہے وہ کھانستے کھنکارتے ہڈیوں کے ڈھانچے جو علامت کی کھاٹ پر پیدا ہوتے ہی اس لیے دم توڑ دیتے ہیں کہ سنجیدہ تنقید میں جاوداں ہو جائیں تو اس پر تو صرف نماز جنازہ ہی واجب آتی ہے اور وہ بھی اس امام کے پیچھے نہیں جس کی تکبیر کی صوتیات نومولود کے کان میں اذان دینے کی ہوں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ نقاد کی بڑی آزمایش تو یہی ہے کہ وہ اپنے اندر رہے ہوئے قاری کو مرنے نہ دے۔ اس ذوقِ تجسس، اس جذبۂ حیرانی، اور آرزوئے نشاط کو مرنے نہ دے جو آرٹ کی تخیلی دنیاؤں میں ایک سیاح کی طرح اسے لیے پھرتی ہے۔ قاری کے اعصاب زندہ ہوتے ہیں اور جھوٹ نہیں بولتے۔ تنقید جھوٹ بولتی ہے کیونکہ تنقید نظریاتی اور گروہی پاسداریوں کے تحت یا اپنی عالمانہ نخوت اور بلند جبینی کی نمایش کی خاطر پر فریب بیانات دینے کے ہتھکنڈوں سے واقف ہوتی ہے۔ نقاد جب ایک خاص قسم کے ادب کا داعی بنتا ہے تو وہ ایک چرب زبان سیلز مین کی طرح اپنی برانڈ کی تعریف کرتا ہے۔ نقاد اور قاری کا رشتہ سیلز مین اور کنزیومر کے رشتے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لکھنے والے بھی نقادوں کے دست نگر بن جاتے ہیں کہ ان ہی کی نگاہِ التفات سے اُن کی بے جان تحریریں جنسِ گراں بن سکتی ہیں۔ ایک وقت وہ آتا ہے جب نقاد خود اپنی چرب زبانی اور طراری کا ایسا گرویدہ ہو جاتا ہے کہ نہ اسے قاری کی ضرورت رہتی ہے نہ فنکار کی۔ جنس بکے یا نہ بکے افسانہ چلے یا نہ چلے، بہرصورت اس کا قلم چلتا رہتا ہے۔ خود کام تنقید کو ادب تک کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ بولتی رہتی ہے، ادب کے حوالوں کے بغیر ادیبوں کے ذکر کے بغیر تاریخ فلسفہ، تہذیب اور معاشرتی علوم کے متن کے بغیر۔ یہ تنقید ادب نہیں بولتی، صرف تنقید بولتی ہے اور ایک ایسی زبان میں جو اس کا جارگون کہلاتی ہے۔

تنقید کا فنکشن برانڈ کی تعریف نہیں بلکہ شئے کی صفات اور خصوصیات کا تعین اور محاکمہ ہے۔ سیلز مین کی دلچسپی شئے کو دیکھنے میں نہیں بلکہ اسے کھپانے میں ہوتی ہے۔ وہ بحر سے بحر نظم اور نکمے سے نکمے افسانہ کی بلند بانگ تعریف کرنے سے نہیں ہچکچاتا۔ اگر افسانہ جذباتی اور تبلیغی ہے تو اسے انسان دوست اشتراکی حقیقت نگاری کا نمایندہ ثابت کرنا، فیشن پرستانہ ہے تو اسے اجتہادی میلان کا علم بردار کہنا، ادب لطیف قسم کی کوئی چیز ہے تو اسے شاعرانہ کہنا، خطیبانہ ہے تو اس کی نثر کے آہنگ کو پروقار گردانتا، کبڑا ہے تو اس میں علامت کی سلاخ ٹھونکنا، لنگڑا ہے تو اساطیر کی بےساکھیاں بغل میں دے کر اسے رواں کرنا، تنقید کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ظاہر ہے ایسے نقاد کمزور لکھنے والوں کے پیر و مرشد ٹھہرتے ہیں اور وہ اپنے دبلے پتلے مریل افسانوں کو جھاڑ پھونک کے لیے ایسے ہی مسیحا نفسوں کے آستانے پر لے جاتے ہیں۔

ایک طرف تو نقاد قاری سے اپنا رشتہ توڑتا ہے کیونکہ سیلز مین بننے کے لیے وہ اپنے اندر رہے ہوئے قاری کو جو سیلز مین کا جارگون نہیں بلکہ اپنے احساس کی زبان بولنا چاہتا ہے،

مارتا ہے۔ دوسری طرف افسانہ نگار بھی قاری سے اپنا رشتہ توڑتا ہے اور قاری کے دل و دماغ میں زندہ رہنے کی بجائے نقاد کی تنقید میں باریاب ہونے پر قناعت کرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ تنقید میں آگیا تو ادب میں بھی آگیا۔

لیکن تنقید مردہ تنوں میں جان ڈالنے کا کام نہیں کرتی۔ تنقید مسیحا نفسی اور اعجاز نہیں ہے، محض چھان پھٹک، پرکھ اور تحسین ہے۔ تنقید صرف اتنا کرتی ہے کہ وہ جو ہمارے لیے پُرلطف تھا اسے مزید پرلطف بناتی ہے۔ مبہم کو واضح اور نیم روشن کو منور کرتی ہے فنی پیچیدگیوں اور معنوی تہ داریوں کا شعور عطا کرتی ہے۔ تنقید نئے تجربات قبول کرنے کے لیے ذہن کو ہموار کرتی ہے اور یہ کام ناکارہ تجربات کو کامیاب تخلیقات ثابت کرنے سے مختلف ہے۔

ترقی پسندوں نے جمالیات میں اتنی ہی دلچسپی لی جتنی کہ فتاویٰ کا مارا مولوی صوفی کے ملفوظات میں لیتا ہے۔ اگر کوئی آکر مولوی کو خبر دے کہ قریب کے ٹیلہ پر حسنِ ازل کا نور جلوہ افروز ہوا ہے تو اس کی نظر گھڑی پر جائے گی کہ کہیں نماز کا وقت تو ہاتھ سے نہیں نکلا جارہا۔ تجربۂ جمال سے اس گریز نے ترقی پسندوں کو اپنے ارکانِ مذہبی کا ایسا پابند بنا کر رکھ دیا تھا کہ حوض پر وضو بنانا پھر پانی چاہے اتنا گدلا ہو اور باجماعت نماز ادا کرنا چاہے امام کریہ الآواز ہو۔ اُن کی کل روحانی کائنات ٹھہری تھی۔

اسی طرح اسلوب پرستی، ترقی پسند نقادوں کی نظر میں اتنی ہی مذموم بدعت ہے جتنی کہ وہابیوں کی نظر میں قبرپرستی۔ لیکن قبر اگر امریکی خارجہ پالیسی کی ہو تو اہلِ ایمان کا یہ طائفہ جدید افسانہ پر فاتحہ پڑھنے کی بجائے افسانہ پڑھ ڈالتا ہے۔ چنانچہ بلراج مینرا کے افسانہ "کمپوزیشن پانچ" میں ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس کو ویٹ نام نظر آیا تو دونوں نے سمجھا کہ اب اس افسانہ کی تعریف دونوں پر مباح ہے۔ افسانہ اگر اپنے آرٹ میں بدعتی ہے بھی تو ذکرِ ویٹ نام نے اسے بدعتِ حسنہ بنا دیا ہے۔ افسانہ کی تعریف سے اُن کے سر سے یہ تہمت بھی اٹھ جائے گی کہ جدید افسانہ کی طرف ان کا رویہ متعصبانہ ہے۔ اگر جدید افسانہ بھی عقائدِ راسخہ کو تقویت عطا کرتا ہے تو صالح ہے اور اس میں علامات کا استعمال موجبِ ملامت نہیں۔ ویٹ نام کا نام دیکھنے کے بعد دونوں نقادوں کو اس بات کی حاجت نہ رہی کہ یہ بھی دیکھیں کہ افسانہ افسانہ ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو کیسا ہے۔ یہاں وہ اپنی سیاست سے مجبور تھے کہ قاری کو صحیح بات نہ بتاتے کہ اس طرح اُن کے ہاتھ سے ویٹ نام چلا جاتا جو بڑی مشکل سے مریدوں کی ٹولی کے ایک افسانہ نگار کے ہاتھ آیا تھا۔ خاطر نشان رہے کہ افسانہ کا موضوع ویٹ نام نہیں، اس میں صرف ویٹ نام کا ذکر ہے اور اس ذکر پر ترقی پسندوں کا وجد اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل اللہ کے لیے لفظ کیسے LOGOS بنتا ہے۔

اب تو خیر چین کے ساتھ تصادم اور کامبوچیا میں قتلِ عام کے بعد ویٹ نام کے لفظ میں وہ برکت نہیں رہی جو پہلے تھی، لہٰذا نظموں، افسانوں اور تنقیدوں میں یہ لفظ اس تعویذ کے مانند جھولتا نظر آتا ہے جو بخار اتر جانے کے باوجود گلے سے اتارا نہیں جاتا۔ پھر بھی یہ دیکھنا غیر ثمر آور ثابت نہیں ہوگا کہ آخر مینرا کے اسلوب کا وہ کون سا تیر تھا جس نے ترقی پسند آشیانہ کے ان دو مرغان قبلہ نما

کو تڑپا کر رکھ دیا۔ زنگ آلود سہی، آیئے آج اس تیر کو ہم بھی جگر کے پار کرنے کے مزے لوٹیں۔ افسانہ میں ویٹ نام کا ذکر خفی اور جلی دونوں انداز میں اس طرح ہوتا ہے۔

"آنے والے کل کا شہر جہاں آج گھنی، گہری، نیلی آنسو گیس پھیلی رہتی ہے۔ جہاں آنکھوں سے لہو بہتا ہے۔ ان گنت قابلِ فہم اور مانوس آوازوں کا شہر جہاں ہمارا نام، تمھارا نام — ویت نام، ہر ایک آواز مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک، صبح و شام، آٹھوں پہر جستجو، جدوجہد اور جنگ کا لازوال ہتھیار ہے۔"

اس اسلوبی تراشیے اس قلم قتلے، زبان کے اس چھلاوے اور لفظوں کے اس مایاجال پر آدمی کیا تنقید کر سکتا ہے۔ جب الفاظ عملیات بنتے ہیں تو نقّاد رخصت ہوتا ہے اور ترقی پسند اور جدید اسلوب پرست اور موضوع پرست سبھی پر وجد کا عالم طاری ہوتا ہے۔ جدید اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ انھیں خود کو ریڈیکل بتانا ہے۔ ترقی پسند اس لیے کہ آرٹ کے معاملہ میں انھیں فرسودہ اور از کار رفتہ نہ سمجھ لیا جائے۔ سریندر پرکاش کا افسانہ "برف پر مکالمہ" چونکہ روسی آمریت کے خلاف ہے اس لیے باوجود اعلا علامتی فنکاری کے اُن کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

اسی طرح وہ جدید افسانے جو افسانوی ساخت، بیانیہ، زبان اور اسلوب کی سطح ہی پر دم توڑ دیتے ہیں اور ادبِ لطیف، نثری نظم اور خلیل جبرانیت کا ملغوبہ بن جاتے ہیں یا لطیفہ، چٹکلہ، حکایت، صحافتی تمثیل اور فنتاسی کا بے کیف نمونہ ان کی بھی ایسی علامتی اور اسطوری تفسیریں پیش کی جاتی ہیں کہ اس طریقۂ کار کے تحت تو نوح ناروی کا ہر مقطع علامتی اور اسطوری قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے علامتی نقّادوں کی حالت ضبطِ تولید کے اُن رضا کاروں کی سی ہو گئی ہے جو دفتر کے اندراجات پُر کرنے کے لیے لنجے، لنگڑے بوڑھے بھکاریوں تک کو خصّی کر ڈالتے ہیں۔

دہلی اردو اکاڈمی کی جانب سے منعقدہ فکشن سیمینار میں پڑھے گئے افسانوں، اُن کے تجزیوں اور اُن پر کی گئی بحثوں کو کتابی صورت میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "نیا اردو افسانہ" کے نام سے مرتّب کیا ہے۔ اور دہلی اکاڈمی نے اسے شائع کیا ہے۔ راقم الحروف بھی اس سیمینار میں شریک تھا۔ اس وقت احمد آباد میں زبردست قومی فسادات برپا ہو گئے تھے، اور میں ان کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ لیکن میری اس پریشانی میں مزید اضافہ کر رہے تھے خراب افسانوں پر لکھے گئے وہ تجزیاتی مضامین جو افسانوں پر علامت کی تہمت رکھ کر انھیں ہر اعتبار سے اچھا اور کامیاب ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے نقّاد سیمینار میں افسانوں کے لتّے لینے کے لیے مدعو نہیں کیے گئے تھے۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ادب کے طالب علموں کے لیے یہ مضامین کیسے گمراہ کُن ثابت ہو سکتے ہیں۔ طالب علم بار بار افسانہ پڑھے گا، بور ہوگا، بال نوچے گا اور بالآخر خود ہی کو ملزم ٹھہرائے گا کہ فتور اس کی فراست کا ہے کہ اسے افسانہ میں وہ فنی اسرار اور معنوی ابعاد نظر نہیں آ رہے جو نقّادوں کی جوہر شناس نظروں نے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوگا اور پھر زبردستی افسانہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تپسوی کی طرح کیلوں کے تختہ پر دراز ہو جائے گا۔ اور یہ سب محض اس لیے ہوگا کہ نقّاد نے افسانے کو بطور سیمینار کے مدعو نقّاد

پڑھا ہے بطور قاری کے نہیں پڑھا۔ افسانے کے بے جان اور بے کیف ہونے کا قاری کا احساس سچا ہے۔ اس کے اعصاب، افسانے کی طرف اس کے ذہن کی اوّلین لرزشیں اسے بتادیتی ہیں کہ افسانہ نگار افسانوی تخیل کی نعمت سے محروم ہے۔ افسانہ ایک غیر تخلیقی تحریر ہے، پھوہڑ نثر ہے، افسانہ نگاری کے آرٹ کا پروَرژن ہے۔ ایک FAKE افسانہ میں لسانی اور معنوی محاسن کی تلاش خود نقاد کی شخصیت کو FAKE بناتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے یہاں بھی جھوٹ سچائی کو الجھن میں ڈالتا ہے اور کھوٹا سکّہ کھرے سکّے کو باہر نکالتا ہے۔

ایک سیمنار میں محمود ہاشمی نے کہا تھا کہ وارث علوی دراصل بسٹ سیلرز قسم کی ناولیں پڑھتے رہتے ہیں۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں کون سے عظیم فنکاروں کو پڑھتا رہا ہوں، اس کا بیان چاہے جتنا منکسرانہ ہوتا بڑبولا پن ہی معلوم ہوتا۔ میں کرم کتابی نہیں ہوں کتابوں کا عاشق ہوں، ادب کا وہ عیاش جو عیاشی کے آداب جانتا ہے۔ ادب میرے لیے نہ وقت گزاری ہے نہ عقدہ کشائی، اسی لیے تفریحی ادب سے بھی اتنا ہی دُور رہتا ہوں جتنا چیستانی ادب سے۔ بازاری عورت اور صبر آزما بیوی دونوں سے معشوقِ طرحدار مختلف ہوتا ہے اور میں اس کی اداؤں کو پہچانتا ہوں۔

وضاحتی کتابیات (جلد دوم) مرتبہ گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی میرے سامنے ہے۔ ۸۰۔۱۹۷۷ء میں، اس کتاب کے مطابق لگ بھگ ۱۹۲ ناول شائع ہوئے ہیں۔ کرشن چندر کے "اس کا بدن میرا چمن" قسم کے دو چار تفریحی ناولوں کے علاوہ مرزا رسوا کے دو ناولوں کے نئے اڈیشن ہیں۔ پھر قرۃ العین حیدر کا کارِ جہاں دراز ہے کی جلد اوّل ہے۔ ان تین ناموں کے علاوہ باقی سب کے سب نام تفریحی ناول نگاروں کے ہیں۔ مثلاً گلشن نندہ، اے آر خاتون، عفت موہانی، دیبا خانم، عطیہ پروین زبیدہ خاتون، رضیہ بٹ، نسیم انہونوی وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے وضاحتی کتابیات فہرست کتب نہیں ہوتی کہ جو کچھ کوڑا کرکٹ چھپا اسے شمار میں لیا جائے۔ لیکن مرتبین بھی کیا کرتے کہ بصورت دیگر ناول کا باب کورا رہ جاتا۔ لہٰذا تفریحی ناولوں کا ذکر بھی ادبی ناولوں کے طور پر کرنا پڑا۔ نارنگ کی افسانہ کی بوطیقا وضاحتی ناول کو خاطر میں نہیں لاتی۔ وضاحتی کتابیات میں جو نان آرٹ ہے اسے کتاب میں شامل کرنا پڑا۔ لگ بھگ یہی حال افسانے کے باب کا ہے۔

میں اگر صرف اُردو پڑھتا رہتا تو یہ ممکن ہے کہ بطور نقاد کے مجھے بہت سے فوائد حاصل ہوتے۔ وہ تمام وقت جو میں نے مغربی ناول، افسانہ اور ڈراما پڑھنے میں غارت کیا، عروض، قوائد، لسانیات، علم بیان، رس سدھانت اور اردو فارسی شاعروں کے سیکڑوں دواوین کے مطالعہ میں صرف ہوتا۔ اس طرح میں شعریات کی مشرقی روایت سے زیادہ واقف ہوتا۔ یہ تمام چیزیں مجھے ایک جیّد عالم اور بڑا نقاد بننے میں معاون ثابت ہوتیں۔ لیکن میرے حوصلے اتنے بلند نہیں تھے۔ ادب کا مطالعہ میرے لیے وادیٔ گل کا تماشا تھا اور میں اپنی گل چینی پر قانع تھا۔ ایسے آدمی کے لیے اردو فکشن کا دامن چند ہی برسوں میں تنگ ہو جاتا ہے۔ اردو میں ناول، افسانہ اور ڈراما کی پیداوار اتنی نہیں ہے کہ اس پر گزر بسر ہو سکے۔ جب ہم عام قاری کی بات کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جو صرف اُردو پڑھتا ہے۔ کیا

ہم اتنا افسانوی ادب تخلیق کرتے ہیں جو قارئین کے اس طبقے کی پیاس بجھا سکے۔ صاف بات ہے نہیں کرتے ہیں اور اُن کے لیے عامیانہ اور مقبول ناولوں کے ڈھیر لگاتے ہیں۔ لیکن قارئین کا جو طبقہ فی الوقت پیشِ نظر ہے وہ عامیانہ ناولیں پڑھنے والا نہیں ہے۔ وہ ادبی ناولیں چاہتا ہے۔ یہ طبقہ ناول کے آرٹ میں تجربات کو بہت پسند نہیں کرتا۔ ناول کا قاری عام طور پر دقیانوسی ہوتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اٹکل، مشکل اور چیستانی تجربات اس کے لیے صبر آزما ثابت ہوں۔ اسی لیے انگریزی میں دوئم درجہ کے ناولوں کی بھی ایک مستحکم روایت ہے۔ ہر ناول شاہکار نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر بڑے ناول نگار کی ہر تخلیق اوّل درجہ کی ہوتی ہے۔ اس لیے بے شمار ایسے ناول لکھے جاتے ہیں جو ادبی ہوتے ہیں، دلچسپ ہوتے ہیں، اور زبان و بیان، قصہ گوئی، کردار نگاری، نفسیاتی اور اخلاقی بصیرت کی ایسی خوبیاں لیے ہوتے ہیں جو اعلا ناولوں کی مماثل ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اوّل درجہ کی تخلیق نہیں بن سکتے۔ یہی دوئم درجہ کی روایت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ناول کا قاری چونکہ قلزم آشام ہوتا ہے اس لیے وہ اس روایت پر تکیہ کرتا ہے۔ اس کی پیاس بجھتی رہے تو وہ تجرباتی اور مشکل ادب پر دماغ ریزی سے گھبراتا نہیں۔ ادبی ناولوں کے پڑھنے والے اسی طبقے کے سبب ناول مارکٹ کی چیز بنتا ہے۔ قاری ناول خریدتا ہے اور ناول نگاری ذریعۂ معاش بنتی ہے۔

قارئین کے اس طبقے کے لیے پریم چند، بیدی، منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے ناول اور افسانے لکھے۔ اسی طبقے کے لیے عسکری نے فلابیر اور ستاں دال کی ناولوں کے ترجمے کیے۔ ایک زمانہ تھا جب اعلاترین ناولوں کے تراجم کی ہمارے یہاں ریل پیل تھی۔ قارئین کا یہ طبقہ آج بھوکوں مر رہا ہے۔ انگریزی وہ پڑھتا نہیں۔ تراجم ہوتے نہیں، روایتی افسانہ دم توڑ چکا ہے اور پڑھنے کے لیے یا تو بسٹ سیلرز رہ گئے ہیں یا بے کیف اور بدہیئت تجرباتی یا تمثیلی افسانے چنانچہ وہ ادب پڑھنے کی بجائے دوسری تفریحات تلاش کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید افسانہ کا کوئی قاری ہے ہی نہیں۔ اسے وہی لوگ پڑھتے ہیں جو خود افسانہ نگار بننے کے حوصلے رکھتے ہیں یا بطور نقاد کے یا خطوط نویس کے ادب میں آنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو میں ادب کا بے لوث قاری نہیں سمجھتا۔

بے لوث قاری بے لاگ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نہیں خود کو خوش کرنے کے لیے ادب پڑھتا ہے اور جو ادب اسے خوش نہیں کرتا اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر نقاد داستانیں پڑھتا ہے تو اس کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے داستانوں پر کتاب لکھنا ایسے مقاصد پارینہ اور فرسودہ کتابوں کے مطالعے کو بھی دلچسپ بناتے ہیں۔ نقاد کو اس کے مطالعے کا پھل ملتا ہے۔ قاری نقاد کی کتاب پڑھے گا لیکن داستانیں نہیں پڑھے گا کیونکہ اس کا مطالعہ مقصدی نہیں شوقیہ ہے اور اسی لیے وہ اپنے انتخاب میں آزاد ہے اور ان کتابوں پر وقت برباد کرنے کے لیے رضامند نہیں ہوتا جو جدید ذہن کے لیے دلچسپی کھو بیٹھی ہیں۔

ادب شوقِ فضول سہی لیکن بقول آڈن وہ چند چیزیں ہیں جن کے لیے آدمی اپنی جان کی بازی

لگا دیتا ہے، اُن میں اُس کا شوق فضول بھی شامل ہے۔

تخلیق اور تخلیقی صلاحیت عطیۂ خداوندی ہے۔ یہ بہت عام بھی نہیں۔ وقت کا سفاک ہاتھ چند نام چن لیتا ہے جو جاوداں ہو جاتے ہیں، باقی دو چار دہائیوں میں بھلا دیے جاتے ہیں۔ اکثریت کے لیے تو رسالوں کے صفحات ہی ان کا مدفن بنتے ہیں۔ لکھنے والوں کے پندار کی شکست کے لیے ادبی تاریخ کے وہ اوراق کافی ہیں جن میں خاقانیٔ عصر ساحلِ وقت پر شکستہ جہازوں کی مانند پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نظارہ ہی ہیچ مقداری کے احساس کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے فنکاری جذبۂ بے اختیارِ شوق ہے۔ ایک ایسی اندرونی تخلیقی لگن، اندھی جبلّت کا وہ فشار جس کے سامنے آدمی بے دست و پا ہے۔ فنکاری جنون ہے، پُر جلال خبط ہے، کیمیا کی تلاش کا پاگل کر دینے والا جذبہ، وہ پُر اسرار علم جو الفاظ کو منتروں میں منقلب کر کے نئی دنیائیں خلق کرتا ہے۔ بہت کم لوگ اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔ زیادہ تر تو اپنے شعبدے دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کے اس عظیم جذبے کے بغیر بڑی نظمیں، بڑی ناولیں اور بڑے ڈرامے نہیں لکھے جا سکتے۔ تخلیق کا یہ جذبہ اتنا شدید اور طاقتور ہوتا ہے کہ جب تک فنکار اپنے اندر کے آسیب کو باہر نہیں نکالتا اسے چین نہیں آتا۔ فنکار کے لیے راہبانہ تیاگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تخلیق کی جن ان دیکھی ان جانی اور اندھی قوتوں کے بھنور میں وہ گھرا ہوتا ہے وہاں ساحل کی سبک ساری اور عافیت کا اسے خیال ہی نہیں آتا۔ وہ آرٹ کے لیے زندگی کا تیاگ نہیں کرتا بلکہ آرٹ ہی اس کی زندگی بن جاتا ہے۔

نقاد کی مصیبت یہی ہے کہ وہ فنکاری سے واقف ہوتا ہے۔ وہ آرٹ اور نان آرٹ کے فرق کو جانتا ہے۔ وہ شاعر اور نا شاعر میں تمیز کر سکتا ہے۔ اور تُک بندوں کے لیے چاہے وہ نثر کے ہوں یا نظم کے اس کے دل میں کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ تخلیق کے جنون اور لکھنے کی بیماری میں تفاوت کر سکتا ہے۔ ایک کیڑا ہوتا ہے جو لکھنے والوں کے ذہن میں سرسراتا ہے اور اس کے لعاب سے وہ میٹھی خارش پیدا ہوتی ہے جو صرف قلم گھسنے سے راحت پاتی ہے۔ یہ کیڑا آدمی کو کسی کام کا نہیں رکھتا۔ نہ وہ زندگی سے لطف لے سکتا ہے نہ ادب سے۔ اوسط درجہ کی چیزیں لکھنے کے لیے وہ اعلا ادب تک پڑھنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ لکھنے والے ادب کے ایک عام قاری سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ عام قاری ادب کو بھوگتا ہے، عظیم فن پاروں کی دنیا میں جیتا ہے اور خلاق ترین ذہنوں کی صحبت اسے میسر ہوتی ہے۔ اس کے ذہن کی دنیا رنگا رنگ تصویروں کا نگار خانہ ہوتی ہے۔ ذہن کی ایسی بزم آرائیوں سے لکھنے والا محروم ہوتا ہے۔ وہ تخلیق کے کرب میں نہیں بلکہ لکھنے کی اذیت میں جیتا ہے۔ وہ اپنی انا کا غلام ہوتا ہے۔ رشک و حسد کا مارا ہوتا ہے۔ اپنی شناخت کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے۔ اور یہ سب عذاب محض اس لیے جھیلتا ہے کہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کیے بغیر اس نے ایک روگ پال لیا ہے جس نے ایک نارمل آدمی کی زندگی اس پر حرام کر دی ہے۔

قاری یہ روگ نہیں پالتا۔ وہ خوش ہے اپنی کتابوں کی حرم سرا میں، وہ مگن ہے تخیل کی

تراشی ہوئی جادونگری ہیں۔ اسے اپنی انا کی مدھم لالٹین جلانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اُس کا اندرون چراغاں ہے خلاق دماغوں کے قمقموں سے۔ وہ رشک وحسد کا مارا نہیں کہ ادب وہ خزانہ ہے جو سب کی دسترس میں ہے اور اس سے فیض یاب ہونے کے لیے کسی فضیلت کی ضرورت نہیں، صرف تیاری شرط ہے۔ خاطر نشاں رہے کہ ادب کا مطالعہ اکتسابِ علم بھی نہیں کہ عالمانہ پندار کی تسکین ہو۔ فسادات پر لکھے ہوئے افسانے پڑھ کر آدمی ہندو مسلم مسئلہ پر ایسی عالمانہ بحث کیسے کرسکتا ہے جو مثلاً سیمینار کے شمارے میں شامل ہو۔ طوائفوں، موچیوں، اڈلٹری، اور جوان ہوتی لڑکیوں کی نفسیات پر لکھے ہوئے افسانے پڑھ کر آدمی عالم کیسے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ادب کا قاری دانشوری کے پندار کی تسکین بھی نہیں کر پاتا۔ اگر ادب کے ذریعہ تہذیب نفس کے کوئی معنی ہیں تو یہی کہ آدمی غیر شعوری طور پر اپنے باطن کو بدلتا چلا جاتا ہے۔ اور اُس کی ہمدردیوں کے آفاق وسیع ہوتے جاتے ہیں اور زندگی کے غم ونشاط کا عرفان اسے فکر ونظر کی کشادگی سے مالا مال کرتا ہے۔

ایک نظر سے دیکھیں تو ادب کے جس قاری کی ہم بات کر رہے ہیں وہ ہمارے زمانہ میں شاعری کا نہیں بلکہ نثری اصناف کا پیدا کردہ ہے۔ دورِ جدید میں شاعری کا چلن ویسے بھی کم ہوگیا اور ہمارے یہاں شاعری غزل کی ہم معنی بن کر رہ گئی اور غزل نے ایک طرف تو مشاعرے برپا کیے اور دوسری طرف غزل گانے والوں کی محفلیں۔ دونوں سماعی مشغلے ہیں اور لٹریچر تحریری چیز ہے جو تخلیہ کی فعال ذہنی سرگرمی ہے۔ میری بات کو آپ غلط معنی نہ پہنائیں تو میں یہ کہنے کی جرائت کروں گا کہ غزل گو شاعروں کے وہ طائفے جو ہر شہر اور ہر قریہ میں بکھرے پڑے ہیں، ان میں بھی بہت کم لوگ ایسے نظر آئیں گے جو صحیح معنی میں ادب کے قاری ہوں۔ یہ شاعر مشاعرہ پڑھتے ہیں ادب نہیں پڑھتے۔ ادب کا کیا ذکر شاعری میں بھی ان کا مطالعہ اگر ہے تو صرف زبان کے استادوں کی غزلوں تک محدود ہے۔ اکثر و بیشتر تو وہ ان شعروں پر ہی گزارا کر لیتے ہیں جو مشاعرے میں ایک دوسرے کی نذر کیے جاتے ہیں۔ نظمیہ شاعری اُن کے نزدیک تراویح کی وہ نمازیں ہیں جو نثر کے روزے معاف کرانے کے عوض اُن کے گلے پڑگئی۔ صاف کہتے ہیں کہ نظم اُن سے نہیں پڑھی جاتی۔ راشد اور اختر الایمان کی شاعری ان کے لیے دکنیات کی قسم کی کوئی چیز ہے، یعنی اُردو زبان کا ایسا جدید روپ جو قدیم روپ ہی کی مانند "تغزل" کے کام نہیں لگتا۔ جس طرح عورت پر حکمرانی کے لیے مرد کا شوہر ہونا کافی ہے اسی طرح شاعری پر حکمرانی کے لیے صرف غزل گو ہونا کافی ہے۔ آپ ایک تخلص رکھ لیجیے اور مشاعرے میں دو بول پڑھ لیجیے۔ اور آپ شعر و ادب کے نوشہ ہیں۔ آپ جناب بھی ہیں اور صاحب بھی جب کہ ادب کا عام قاری اس تخلص صاحبیت سے محروم رہتا ہے۔ غیر زبان اور اپنی زبان کے لوگ اُردو ادب کو ان ہی صاحبوں کے کلام سے جانتے ہیں۔ مشاعروں کے ریکٹ نے ایسے بہت سے شاعروں کو پیدا کر دیا ہے جو دوسروں سے غزلیں لکھوا کر پڑھتے ہیں۔ مشاعروں کے ذریعہ نہ صرف عوامی مقبولیت حاصل ہوتی ہے بلکہ حکومت کی سرپرستی بھی۔ وزیروں کا شعر وادب سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہوتا اس لیے کچھ بھی

لیے دیے بغیر جب وہ اقلیت یا اقلیت کی زبان کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں تو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشاعروں کو نوازتے ہیں۔ وزیر آتے ہیں تو اُن کے ساتھ اخباری رپورٹر بھی آتے ہیں اور ٹی وی کے کیمرے بھی۔ شاعر کو شہرت، مقبولیت دولت اور اہلِ اقتدار کی سرپرستی ملتی ہے۔ چلیے اور کچھ نہیں تو اس سے بھی اردو کی چہل پہل قائم ہے۔ مشاعرے تو ہوتے ہیں، ورلڈ اردو کانفرنسیں تو ہوتی ہیں۔ جشن تو منائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شہر اور ہر گاؤں میں اُردو کا نام ان ہی غزل گویوں کی وجہ سے زندہ ہے۔ وہ نہ ہوں تو لوگ یہ بھی بھول جائیں کہ اردو زبان ہے کس چڑیا کا نام۔ اس اعتراف حقیقت کے بعد میں پھر اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ غزل کا شاعر اردو ادب کا قاری نہیں ہوتا۔ اس کے لیے صرف غزل کا شاعر ہونا کافی ہے اور اس حیثیت میں اسے اتنی مراعات حاصل ہوتی ہیں کہ ادب پڑھنے کی اسے ضرورت نہیں رہتی۔ غزل اس کی کل کائنات ہے اور اس کائنات کے باہر۔ ادب، آرٹ، کلچر، نظم، ناول، ڈراما، افسانہ، تنقید، وہ مکروہات ہیں جن کے لیے غزل سراؤں کے پاس نہ وقت ہوتا ہے نہ ان میں دلچسپی۔ ادب ان کی کل وقتی سرگرمی نہیں۔ ان کا زیادہ وقت مشاعروں کی دوڑ بھاگ میں صرف ہوتا ہے۔ مطالعے کے لیے انھیں جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہے وہ کم ہی میسر آتی ہے۔ شاعروں پر کتابیں لادنا گھوڑے پر گھاس لادنے والی بات ہوگئی ہے۔ نقاد مجنوں کی سانس تو ہیں نہیں جو شاعروں سے بی اے ہونے کا مطالبہ کرکے مضحکہ خیز بنیں۔ افسوس یہ ہے کہ وہی پڑھا لکھا طبقہ جہاں سے ادب کے ذہین قاری پیدا ہونے کی امید ہوتی ہے، یعنی اسکول ٹیچرس، کالج کے اساتذہ، صحافی، اور گاؤں گاؤں پھیلے ہوئے غزل کے شاعر، وہی ادب کے سنجیدہ مطالعہ سے پہلو تہی کرتا ہے اور غزل کے اشعار پر تکیہ کرکے ایک محدود اور پر فریب ادبی شخصیت کے دکھاوے پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ میرا مقصد شعر گوئی کی قدر گھٹانا نہیں ہے۔ نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ صرف گنے چنے یا منتخب روزگار لوگ شاعری کرتے رہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس میں تخلیق کا جوہرِ پنہاں ہے تا وقتے کہ مشقِ سخن اور فکر سخن کی کٹھن منزلوں سے گزر کر وہ اپنا طرزِ سخن نہیں پاتا۔ لیکن تخلیق کا یہ کام ایک معتبر شعری، فکری اور ادبی سرزمین میں ہونا چاہیے۔ جس زبان میں وہ شعر کہتا ہے اس کی شعری روایات، ادبی اصناف اور اس کے علمی اور تہذیبی سرمایہ سے اسے واقف ہونا چاہیے۔ بالفرض وہ اچھا شاعر نہ بن سکا تب بھی وہ نفع میں رہے گا کہ مطالعہ کے ذریعہ وہ شعر و ادب کی دولت سے مالا مال ہوا۔ تسکین کا یہ پہلو آج کے ادبی منظر نامے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ غزل عام مشاعرے باز شاعروں کے ہاتھوں میں تفریح کا ایک ذریعہ ہے اور پیشہ ور بازاری ناشروں نے مشاعروں کی رہی سہی ادبی اہمیت بھی ختم کر دی ہے۔

جب تک شاعری سننے سنانے کی چیز تھی آہ اور واہ سے کام نکل جاتا تھا۔ شاید اسی سبب سے ہمارے تذکروں میں تنقید نہیں ملتی۔ شاعری اور ادب جب تحریری شکل میں انفرادی مطالعے کا ذریعہ بنے، زیادہ معنی خیز، تہ دار اور پیچیدہ بنے، ایسے ادب کی تفہیم و تحسین کے لیے تنقید ناگزیر بن گئی۔ شیکسپیئر، ملٹن، کیٹس کے پیچھے تین سو سالہ تنقیدی روایت ہے جو انگریزی کے علاوہ یورپ کی دوسری

زبانوں پر پھیلی ہوئی ہے، شیکسپیئر کو آپ تھیٹر میں دیکھ سکتے ہیں، پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن اس کی مکمل تفہیم کے لیے اس کی گہرائیوں کی تھاہ پانے کے لیے ان تنقیدوں کا پڑھنا ضروری ہے جو بہترین دماغوں نے اس پر لکھی ہیں۔ ان کے حوالوں کے بغیر آپ شیکسپیئر پر گفتگو نہیں کر سکتے۔ ایٹس اور ایلیٹ کی شاعری کے نکات اور جہتوں کو آپ تنقید کے بغیر نہیں سمجھ پاتے۔ دوستو وسکی، کامیو اور سارتر پر لکھی گئی تنقیدوں کے بغیر ان کی ناولوں کی فلسفیانہ جہتیں ہماری دسترس میں نہیں آتیں۔ یہی سبب ہے کہ ان فنکاروں پر جو بھی نئی کتاب آتی ہے قاری اسے پڑھنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ قاری اس نخوت کا مارا نہیں ہوتا جو عبدالمغنی جیسے نقادوں میں پائی جاتی ہے کہ ہر فنکار کے متعلق وہ خود فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ بڑے دماغوں اور مفکروں کی قدر پہچانتا ہے اور اُن کے افکار کی روشنی سے اپنے ذہن کو منور کرتا ہے۔ وہ عبدالمغنی کی طرح تنقیدیں یہ فیصلہ کرنے کے لیے نہیں پڑھتا کہ آیا کیٹس بالغ شاعر تھا یا نابالغ بلکہ بصیرت حاصل کرنے کے لیے پڑھتا ہے اور بصیرت جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، اور فنکار پر ہر نئی کتاب کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا ہے، خود رائی کا پندار ٹوٹتا جاتا ہے۔ اور آخری فیصلوں کی قطعیت پر پہنچنے کے نوشابانہ جوش کی بجائے، قاری کا ذہن فکر و احساس کی اس ملائم چاندنی میں سرخوش و سرشار رہنا پسند کرتا ہے جہاں تخیلی تجربات اپنی سریت کا حسن منواتے ہیں اور قطعی فیصلوں کے آمرانہ غضب کی آگ برداشت نہیں کر سکتے۔

جی نہیں! کیٹس بالغ تھا یا نابالغ، جوش، فراق، مجاز، بیدی اور منٹو بڑے فنکار تھے یا چھوٹے، ایسے فیصلوں پر پہنچنے کے لیے قاری اپنا جی ہلکان نہیں کرتا۔ "بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں" کی طرح قاری فنکاروں سے سلوک نہیں کرتا۔ وہ ہر ایک کے فن کی جدلیات کو قبول کرتا ہے اور اس کا باہوش، حیرت زدہ اور مسحور ذہن اس جدلیات کی جولانگاہ ہوتا ہے۔ یہ فیصلوں پر پہنچنے کے اعصابی تناؤ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ نقاد کے اندر رہا ہوا یہ قاری جتنا جاندار ہوگا تنقید موکلانہ چالاکیوں، حاکمانہ فیصلوں اور فقیہانہ فتوؤں سے محفوظ رہے گی۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ادب کے جس قاری کو جدید نثر اور اس کی اصناف نے پیدا کیا وہ شاعری کے قاری خصوصاً ہمارے مشاعروں کی غزلیہ شاعری کے دل دادگان سے مختلف تھا۔ غزل کی مانند افسانے کو مشاعرے کے پلیٹ فارم سے اُن پڑھ سامعین کے سامنے داغا نہیں جا سکتا تھا۔ اسے تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ کم از کم قاری کا پڑھا لکھا ہونا ضروری تھا۔ افسانے میں لفظوں کے الٹ پھیر، مضامین کی تکرار، تقلید، فرسودگی بیش پا افتادگی کی اتنی گنجائش نہیں تھی جتنی کہ غزل میں، بلکہ یہ چیزیں جو غزل کے لیے قند نبات تھیں، افسانہ کے لیے زہر ہلاہل ثابت ہوتیں۔ غزل کو تو شاعر کا ترنم، مغنی کا نغمہ یا خود شعر کا عروض و آہنگ جس کی اپنی ایک HYPNOTIC کیفیت ہوتی ہے، سنبھال لیتا۔ افسانے کو تو اپنے ہی پیروں پر چلنا پڑتا تھا۔ اس میں اگر تازگی، ندرت، ایجاد، بصیرت، زبان و بیان کا حسن، کہانی کی دروبست، کردار کی پیش کش، فضا بندی،

جزئیات نگاری، فلسفیانہ سوجھ بوجھ، نفسیاتی گہرائی، سماجی اور اخلاقی مسائل کا عرفان، گردوپیش کی دنیا کا عکس، تصویرکشی، امیج سازی، علامات اور اساطیر کا استعمال، اور زبان کے کھردرے پن سے لے کر پرکیف غنائیت تک کی پہنائیاں نہ ہوں، تو افسانے کی قیمت چوتی کی رہ جاتی ہے جو چوتی مارکہ رسالوں میں چھپ کر ان ہی غیر تربیت یافتہ لوگوں کی ذہنی تفریح کا باعث بنتا ہے جو مشاعروں مجروں اور قوالیوں کی محفلیں گرماتے ہیں۔

ناول، افسانے اور ڈرامے کا قاری شاعری کے مقابلہ میں نثر کا دل دادہ ہونے کے سبب تنقید میں جن علوم کا ذکر ہوتا ہے مثلاً تاریخ، فلسفہ، نفسیات، عمرانیات وغیرہ کی طرف زیادہ مائل ہوا، وہ علوم جن کا خصوصی طور پر شاعری کے ساتھ تعلق تھا مثلاً عروض، قواعد، صنائع بدائع، علم بیان، لسانیات وغیرہ مجرا اور تدریسی بنتے گئے اور پنڈتائی کے سبب ہندستان کا رس ناطیہ اور ستر عات شاستر ہو یا عربی فارسی کا علم بیان، جدید قاری اور نقاد کے لیے زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ وہ نقاد جو ان علوم میں دلچسپی رکھتے تھے وہ بھی اُن میں نئی روح پھونک نہ سکے۔ دراصل فکشن، ڈراما اور شاعری کی مغربی تنقید نئے تصورات اور پیمانوں کو لے کر آئی تھی اور وہ ادب انسان اور زندگی کو ایک ایسے نئے تناظر میں دیکھ رہی تھی جہاں قدیم مشرقی تصورات از کار رفتہ اور فرسودہ نظر آتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں نثر ان تمام افکار و خیالات کی بازی گاہ تھی اور اسی لیے افسانہ کا قاری غزل کے عاشقوں کی بہ نسبت زیادہ ہوش مند، باشعور اور زیرک بنتا گیا۔ ذہن کی یہی رنگا رنگ تربیت اسے نظمیہ شاعری کی طرف لے گئی کیونکہ غزل کے مقابلہ میں نظم زیادہ پہلودار، ماجرائی، واردانی، ڈرامائی اور PARADOXICAL ہوتی ہے۔ جدید نظم چونکہ مشکل تہ دار، پیچیدہ اور مبہم تھی، اس لیے گہرا مطالعہ چاہتی اور قاری ان مضامین کو بھی دلچسپی سے پڑھتا جو ان کی تفہیم اور تحسین میں لکھے جاتے۔ یہ مضامین غزل کی رسمیہ تنقید کے مقابلے میں فکر و احساس کے وسیع تر منطقوں کا احاطہ کرتے۔ چونکہ ہمارے پس ماندہ ملک کی کوئی بھی علاقائی زبان اس قدر ثروت مند نہیں تھی کہ وہ قاری کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پوری کر سکے، اس لیے دوسری زبانوں کے اعلاترین ناولوں، افسانوں، اور ڈراموں کے تراجم بھی کثرت سے ہونے لگے جو سمندِ شوق کے لیے تازیانہ بنے اور ذوقِ تجسس قاری کو دوسری زبانوں کے مطالعہ کی طرف لے گیا۔ وہاں اس نے شعر و ادب کے ایسے مظاہر دیکھے کہ مبہوت اور مسحور ہو گیا۔ اجنبی زبانوں کے ادب خصوصاً شاعری اور ڈرامے کا مطالعہ آسان نہیں تھا۔ لیکن شوق اور لگن اتنی شدید تھی کہ وہ محض ادب کا قاری نہ رہ کر ایک پرجوش اور محنتی طالب علم بن گیا۔ ذوقِ ادب ایک ایسے شغف میں بدل گیا جو اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اب اس کی دسترس میں مشرق و مغرب کے قدیم و جدید فن پارے تھے۔ اس کی ذہنی دنیاؤں کی ثروت مندی کا نہ اور تھا نہ چھور۔ وہ کتابوں کا عاشق، مطالعہ کا رسیا، جہانِ افکار کا مہم جُو، تخیل کی کرشمہ سازیوں کا شاہد، اور آرٹ کی طلسماتی دنیاؤں کا سیاح تھا۔ اس کا ذہن نغموں کا رنگ محل، تصویروں کا نگار خانہ، کرداروں کا رنگ منچ اور بتانِ آذری کا سومنات بنا۔ اس نے سنی لفظوں کے چٹکنے کی کنواری آواز، زبان کے

جل ترنگ کا سرمدی نغمہ اور بیان کے آہنگ کا پُراسرار سنگیت۔ اس نے دیکھا وہ سماں جب زبان کی وادیوں میں بیان کی بہاریں خیمہ زن ہوتی ہیں، جب علامتوں کے ٹمٹماتے ستارے افسانوی فضاؤں کو نیم روشن نیم تاریک دھندلکوں میں ملفوف کرتے ہیں اور جب استعاروں کی دھنک کھل کر اسالیب کو رنگ کا فشار بناتی ہے۔ وہ جانتا ہے لفظ کیسے گنج معانی بنتا ہے، معنی کے موتی کو تخئیل کی کرن کیسی نزاکت سے چھوتی ہے، اور سفید کاغذ کے سیاہ حروف کیسے جگمگاتے شہروں، خاموش دیہاتوں، افسردہ شاموں، چلچلاتی دوپہروں، گلیوں، بازاروں اور گھروں کے بولتے مرقعوں میں بدل جاتے ہیں جی ہاں! وہ آرٹ کے جادو، ادب کی بصیرت اور پردۂ سخن کے اسرار سے واقف ہے۔

ادب کا یہ قاری شاعری اور غزل کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ جسے بلند جبیں نقاد تھرڈ کلاس صنفِ ادب کہتے ہیں یعنی افسانہ کا پیدا کردہ ہے۔ نوعمری کا وہ زمانہ جب کہ وہ ادب کی سرحد میں پہلا قدم رکھتا ہے، شاعری کے لیے سازگار نہیں ہوتا کہ شعری تخلیقات اپنے دقائق، مشکلات اور زبان و بیان کی نادرہ کاری کے سبب جس ذہنی پختگی، متانت اور نکتہ سنجی کی متقاضی ہوتی ہیں وہ سوائے معدودے چند کے سب کو حاصل نہیں ہوتیں۔ پھر نوعمری کا زمانہ عالمِ رنگ و بو کی شناسائی اور دریافت کا زمانہ ہوتا ہے اور یہ کام ناول اور افسانہ شاعری سے بہتر طور پر کرتے ہیں۔ ہر آدمی ایک بند کتاب ہے اور ناول نگار ہی کتاب کھولتا ہے۔ ہر آدمی ایک ورقِ سادہ ہے، افسانہ نگار اسی ورق پر افسانہ لکھتا ہے۔ انسان کے ظاہر اور باطن کی ان دیکھی ان جانی دنیاؤں کی دریافت ایک مہم سے کم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ ذہنی مہم جوئی اُس نشہ سے الگ چیز ہے جس میں غزل کا رسیا بالم ہر شعر کے افیونی ہلکورے میں جھولتا رہتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اردو کے ہزاروں غزل گو شاعر اور ان کے لاکھوں سننے والے ذہنی نشوونما کی کوئی نشانی نہیں رکھتے۔ وہ جہاں چوبیس سال کی عمر میں تھے چونسٹھ سال کی عمر میں بھی وہیں رہتے ہیں۔ وہی اساتذۂ سخن کے فرسودہ لطیفے، اصلاحاتِ سخن کی پارینہ باتیں، صحتِ زبان، صحتِ قوافی اور عروض کی بے ثمر اور بے کیف دقیقہ سنجیاں، ایک ایسے محدود اور مخصوص حلقہ کی نشان دہی کرتی ہیں جس کا عام ادبی کاروبار سے کوئی سروکار نہیں۔

اُردو ادب کا یہ قاری آج آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا ہے اور اسے ختم کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ جدید افسانے کا ہے۔ دنیائے افسانہ اس کے لیے اجنبی بن گئی ہے۔ افسانہ اس کی زندگی کا جزو نہیں رہا۔ اس کے بک شیلف پر انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے بعد کسی اور افسانہ نگار کے مجموعے نظر نہیں آئیں گے۔ ایک اور نام محمد منشا یاد کا اضافہ کر لیجیے، پھر خلا ہی خلا ہے۔ دوسروں کے یہاں بہت ہوا تو ایک آدھ قابلِ برداشت افسانہ مل جائے گا۔ لیکن افسانہ نگاری غزل گوئی نہیں ہے کہ ایک شعر بھی اچھا نکل آیا تو غزل پر عرق ریزی رائگاں نہیں گئی۔ ہمارے یہاں تو نہیں لیکن دوسری زبانوں میں ناول اور افسانوں کا رشتہ قاری سے براہِ راست ہونے کے سبب ناول اگر مارکیٹ میں ناکام ہوتا ہے تو دوسرے ناول کے لیے ناول نگار کو پبلشر نہیں ملتے۔ جدید افسانے کا کوئی مارکیٹ نہیں ہے کیونکہ اس کے خریدار نہیں ہیں۔ رسالوں میں جنم لینا اور رسالوں میں دفن

ہونا جدید افسانہ نگاروں کا مقدر ہے۔ البتہ اکادمیوں کے قائم ہونے کے بعد بہت سوں کو کتابوں کا کفن بھی مل جاتا ہے۔ جہاں تک رسالوں کا تعلق ہے اردو میڈیوکریٹی پر قناعت کر چکی ہے۔ اوسط رسالہ میں اوسط ذہن کا آدمی اوسط درجہ کے افسانہ نگار یا شاعر پر مضمون لکھ کر سب کو اوسط درجہ کی خوشی بہم پہنچاتا ہے۔ چھوٹے رسالوں میں بڑے نام بھی نظر آتے ہیں لیکن اپنی ایسی نگارشات کے ساتھ جو رسالہ کا وزن نہیں بڑھاتیں اور بڑے ناموں کی قدر کم کرتی ہیں۔ نئے نقاد ادب میں ان مضامین کے ذریعہ آنا چاہتے ہیں۔ جو انھوں نے ان افسانہ نگاروں پر لکھے ہیں جنھیں ادب اپنے دائرے سے خارج کر چکا ہے۔ میڈیوکریٹی ہمیشہ خود فریبی پر پلتی ہے۔ اسے کبھی زندگی اور ادب کی TRIVIALITIES کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ اپنے پندار کی تسکین کے اسفل جذبہ پر دنیائے ادب کی بیکراں مسرتوں کو قربان کر دیتی ہے۔ میڈیوکریٹی قلم گھسیٹوں کا ایک ایسا حلقہ بناتی ہے۔ جس میں انبساط اور نشاط کا سرچشمہ شعر و ادب نہیں رہتے بلکہ خراب چیزوں پر باہمی مدح و تحسین کا وہ پر فریب سلسلہ ہوتا ہے جو نرگسی شخصیت کے اندرونی بگاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک معنی میں میڈیوکریٹی ادب کا نہیں بلکہ نفسیات کا مسئلہ ہے۔ اس میڈیوکریٹی کے ساتھ ادب کے قاری کا کوئی رشتہ نہیں۔ وہ اس فریب خوردہ گروہ کا آدمی نہیں۔ نہ اسے ان کے ادب میں دلچسپی ہے نہ ان کے مسائل میں۔ نہ وہ نرگسی ہوتا ہے نہ انانیت کا مارا۔ اس کی مسرتوں کا سرچشمہ اس کی ذات نہیں بلکہ وہ عظیم فن پارے ہیں جن میں وہ اپنی ذات کو فنا کر دیتا ہے۔ اس قاری کے لیے ہمارا ادب فن پارے تخلیق کرنے کی بجائے ناکارہ افسانے اور افسانہ نگاروں کے حواریوں کی لکھی ہوئی ناکارہ تر تنقیدیں پیدا کر رہا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک باشعور قاری اپنی فرصت کے قیمتی لمحات اس ہوکس پوکس کی نذر کرے گا جس پر میڈیوکریٹی چیتھڑے رسالوں میں پل رہی ہے۔

حد تو یہ ہے کہ "شب خون" جیسے معیاری رسالے میں جس میں ایک پورے دور کی ادبی تاریخ بکھری پڑی ہے ایسی ناکارہ کہانیاں شائع ہوئی ہیں کہ اگر اُن کی اشاعت کی کوئی وجہ جواز ہو سکتی ہے تو صرف مدیر محترم کی کشادہ قلبی ہے۔ لیکن چونکہ مدیر بھی نئے افسانہ کے پر جوش حامی ہیں اس لیے قاری یہی محسوس کرتا ہے کہ جو بھی افسانہ رسالے میں شائع ہوتا ہے وہ کم از کم ایک نئی طرز کا نمائندہ ہونے کے سبب اہم ہوتا ہے۔ لیکن قاری یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ افسانہ خراب اور ناکارہ ہی نہیں بلکہ بوگس ہے۔ "شب خون" جیسے رسالے کے لیے ایسا سوچ بھی کون سکتا ہے کہ وہ بوگس لٹریچر اور نان رائٹرس کو ادب میں پھیلانے کا کام کر رہا ہے۔ قاری کو تو یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا ہے کہ اس کا فکشن کا مذاق دقیانوسی ہے، وہ تجربات سے ڈرتا ہے، علامتی ابہام، اسطوری تہ داری، معنوی پیچیدگی اور بیانیہ کی باریکیوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اور یہ سب باتیں ایک خراب افسانے کو اچھا افسانہ ثابت کرنے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ ایک عام قاری جس ہم بگ کو دیکھ پاتا ہے اسے ہمارے نقاد نہیں دیکھ پاتے۔ اسے میں مذاق سخن کی تبدیلی نہیں کہوں گا بلکہ پرورشن کہوں گا۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ خراب لکھنے والے اور فیشن پرست تو ہر دور میں ہوتے ہیں۔

ں قاری جب خراب لکھنے والوں اور فیشن پرستوں کے نام کی فہرست تیار کرتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران
جاتا ہے کہ یہ سب کے سب نام تو "شب خون" اور "جواز" اور "الفاظ" اور "شاعر" اور کو لنوں
مدروں ہیں سے نکلنے والے دوسرے رسائل میں بھی نظر آتے ہیں۔ اب اتنی جرأت تو ایک
م قاری میں کیا مجھ جیسے جلاد میں بھی نہیں کہ پچھلے پچیس سال سے نئے افسانہ کے نام پر جونان آرٹ
لہ بوگس لٹریچر کا انبار جمع ہو رہا ہے اسے سوختنی قرار دوں۔ حالانکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ
دو ادب کی نجات اسی میں ہے کہ نئے افسانہ کی گردن پہ دریغ مار دی جائے۔

یہ قتل اس لیے ضروری ہے کہ اردو ادب کو اپنا کھویا ہوا قاری مل جائے۔ قاری کے
بغیر ادب زندہ نہیں رہتا اور اس قاری کو ہمیں پھر سے پیدا کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے قاری کو پیدا
کرنے کے لیے ہمیں افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار بھی پیدا کرنے ہوں گے۔ ادب کی تخلیقی
اصناف زندہ نہ ہوں تو ادب تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، مذہبی اور عالمانہ کتابوں کا ذخیرہ رہ جاتا ہے۔ ہمارے
ہاں بیورو اور اکاڈمیاں ایسی ہی کتابیں شائع کر رہی ہیں۔ لیکن یہ کتابیں زبان کی زندگی کی
علامت نہیں بلکہ موت کی نشانیاں ہیں۔ زبان کو صرف شاعر اور افسانہ نگار ہی زندہ رکھتا ہے۔
زبان جب تخلیقی تخیل کی کرشمہ سازیوں کا ذریعہ نہیں رہتی تو جادو کی چھڑی کی بجائے ہاتھ کا ہتھوڑا
بن جاتی ہے جو مفید اور کارآمد کام کرتا ہے لیکن تخیلی کرشمے نہیں دکھاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب
زبان اپنی مرگ کے قریب آتی ہے تو پنڈت اور عالم زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے
مرنے کے بعد بھی سنسکرت کا پنڈت نہیں مرا تھا بلکہ آج بھی زندہ ہے۔ ہتھوڑا جادوئی چھڑی
سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اور جب ٹوٹ جائے تو دوسرا بنایا جا سکتا ہے۔ جادوئی چھڑی
ایک بار گم ہو جائے تو اسے حاصل کرنے کے لیے دوسرے ہزار جادو ٹونوں سے کام لینا پڑتا
ہے۔ اس کا دوبارہ ملنا بھی ایک معجزہ ہی ہوتا ہے اور آج اردو افسانہ اسی معجزے کے انتظار میں
ہے ورنہ سمجھو وہ بھی مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، داستان، ناول اور ڈرامے کے پہلو میں دفن ہو گیا۔

میں سنگین کی نوک پر بھی یہ بات کہنا پسند نہیں کروں کہ ہمیں پھر سے حقیقت پسند افسانے
کو زندہ کرنا چاہیے اور پریم چند کی روایت سے رشتہ جوڑنا چاہیے کیونکہ میں رولاں بارتھ کی
یہ بات جانتا ہوں کہ جدید افسانہ کے خلاف آپ جو کہنا چاہتے ہیں کہیے لیکن اب بالزاک اور ڈکنس
کی کہانی لکھنا ممکن نہیں۔ تو کیوں نہ ہم اپنے کام کا آغاز آغاز ہی سے کریں، پریم چند سے بھی نہیں
اور پرانے قصے کہانیوں سے بھی نہیں۔ یعنی ہم اردو ادب کا قاری پیدا کریں کہ اسی قاری کے بطن
سے شاعر افسانہ نگار نقاد اور ادیب کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ اور ادب کے قاری
پیدا کرنے کی ہماری جو کچھ بھی امیدیں ہیں وہ اسکولوں اور کالجوں سے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے جب میں سنتا کہ امریکا کے بعض کالجوں میں افسانہ نگاری اور تخلیقی فن
کی تعلیم بھی دی جاتی ہے تو میں ہنس دیتا کیونکہ تخلیقی فن کا میرا پورا تصور رومانی، ماورائی
اور پراسرار تھا۔ ابن سعادت بزور بازو نیست پر میرا ایمان تھا۔ میں ابھی بھی سمجھتا ہوں کہ
نابغہ کو قدرت پیدا کرتی ہے۔ لیکن میں نابغوں کی بات نہیں کر رہا۔ انھیں تو جب قدرت کو

پیدا کرنا ہوگا کہ ے گی' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کا نابغہ اردو جاننے والوں میں سے ہی پیدا ہوگا۔ سرِدست میرا سروکار صلاحیتوں سے ہے۔ اردو افسانہ صلاحیتوں کے فقدان کا حوصلہ شکن منظر پیش کرتا ہے۔ لیکن صلاحیتوں کے فقدان کا رونا تضیع اوقات ہے۔ صلاحیت اگر انھیں ہے تو پیدا کرنی چاہیے۔ کم ہے تو اسے تراشنا، نکھارنا اور سنوارنا چاہیے۔ معمولی ہے تو اس پر زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ کیا ہم یہ بات نہیں جانتے کہ تخلیقِ فن میں دس فیصد الہام ہوتا ہے اور نوّے فیصد عرق ریزی۔ معمولی صلاحیتوں سے بھی لوگوں نے بڑے کام نکالے ہیں۔ اور سب سے بڑی چیز تو صلاحیتوں کی شناخت، تربیت اور نگہداشت ہے۔ یہ تنقید کا فریضۂ اولین ہے۔ ہم نے یہ فرض ادا نہیں کیا اور اچھی صلاحیتوں کو بھی تباہ ہوتے دیکھا۔ غلط قسم کی حوصلہ افزائی نے نہ صرف ناکارہ لکھنے والوں کے حوصلے بلند کیے بلکہ اچھا لکھنے والوں کی غلط روش کی گرفت نہ کر کے انھیں گمراہ ہونے سے بچا نہ سکے۔

صلاحیت پیدا کرنے، صلاحیت سے کام لینے، اور صلاحیت کی نگہداشت کرنے کی پوری ذمہ داری اب ہماری تعلیم گاہوں پر ہے۔ جس طرح طالبِ علموں سے مضمون نویسی کرائی جاتی ہے، اسی طرح اُن سے افسانہ نویسی، ڈراما نگاری، فیچر اور سکرپٹ رائٹنگ کا کام بھی لینا چاہیے۔ ریڈیو اور ٹی وی ہماری زندگی میں آئے ہیں اور رہنے کے لیے آئے ہیں۔ اُن کی خراب سکرپٹ کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم ان کے لیے اچھی سکرپٹ لکھیں۔ طالب علموں کو اچھے افسانے ناول اور ڈرامے پڑھانے چاہئیں اور ان پر کالج کی کلاسوں میں مباحث رکھنے چاہئیں۔ کالج کا نصاب ادب کے سکالر پیدا کرتے ہیں جو آگے چل کر ادب کے پروفیسر بنتے ہیں۔ ہمیں ادب کے پروفیسروں کی ضرورت ہے لیکن ان سے کہیں زیادہ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی ضرورت ہے کہ ادب ان کی تخلیقات سے زندہ رہتا ہے۔ مردہ ادب کی تعلیم مجاوری اور فاتحہ خوانی ہے۔ کلاسک کے مطالعہ کے معنی ٹوٹی پھوٹی قبروں پر دیے جلانا نہیں ہے۔ یادِ رفتگاں یادِ ماضی، قبرستانوں کی سیر کا بہانہ نہیں ہیں۔ کالج کو ادارۂ تحقیق سمجھنا مخطوطات کے کیڑے پیدا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جامعات میں تعلیم کا رومانس ختم ہو چکا ہے۔ تعلیم ذہنوں کو شگفتہ نہیں کرتی بلکہ انھیں مرجھا دیتی ہے۔ تعلیم اب سفرِ شوق، سیاحتِ افکار، عرفانِ حیات، تلاش، تجسس اور مہم سازی نہیں رہی۔ وہ مردہ افکار، مردہ اصناف، مجہول تصورات کا بے کیف تواتر بن گئی ہے۔ پروفیسر اردو ڈرامے پر پرچہ کیا پڑھائے جب کہ عرصہ ہوا اردو ڈراما مر چکا ہے۔ تھیئٹر زندہ نہیں اور طالب علم صرف فلموں اور ٹی وی سیریلوں سے واقف ہیں۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلاس روم میں ہی ادب نہ پڑھے بلکہ کلاس روم کے باہر بھی ادب پڑھے، ادب جئے، اور ادب میں ڈوبا رہے۔ جب ادب میں ڈراما زندہ ہوتا ہے، تھیئٹر میں جان ہوتی ہے، نت نئے ڈرامے سٹیج ہوتے رہتے ہیں، نئی تحریکیں، نئے رجحانات اور میلانات پیدا ہوتے ہیں، اخباروں، رسالوں اور ڈرامائیگزینوں میں نئے اور پرانے ڈراموں پر تنقیدوں، تبصروں اور مباحثوں کے ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں، تو طالب علم صحیح معنی میں

سنگ منچ کی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے اور پھر وہ کلاس روم میں بھی ان ڈراموں کو شوق سے پڑھتا ہے جو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں بصورتِ موجودہ چند سکّہ بند باتیں ہیں جو نوٹنکی، رام لیلا، کرشن لیلا، اندر سبھا اور نسروان جی فرام جی سے چلتی چلتی اپنے حشر کو پہنچتی ہیں، اس کلاس سے جو طالب علم نکلے گا اس کے ڈرامائی ادب کے اچھے طالب علم بننے کے کیا امکانات ہیں۔

دیکھیے ادب زندہ نہ ہو تو ادب کی تعلیم بھی زندہ نہیں رہتی۔ پھر جہاں تک اردو کی تعلیم کا تعلق ہے یہ اتنا دردناک موضوع ہے کہ مجھ جیسے لوگ جو بقول باقر مہدی مضمون کو دلچسپ بنانے پر اپنی قوت صرف کرتے ہیں، اس سے بارہ پتھر دور ہی رہتے ہیں۔ اردو اسکولیں مسلسل بند ہوتی جا رہی ہیں۔ گجرات ہی کی مثال لیں تو دیہاتوں اور قصبوں میں اردو اسکولیں ختم ہو گئیں۔ پھر بڑے شہروں میں یعنی بھڑوچ، جوناگڑھ، بڑودہ اور سورت میں بند ہونا شروع ہوئیں اور اب وہاں اکّا دکّا اسکولوں میں غریب بچے اردو پڑھتے نظر آئیں گے۔ احمد آباد جو اردو کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہاں بھی اردو اسکولوں کی تعداد بتدریج گھٹ رہی ہے۔ شہر کے جن علاقوں میں تین اسکول تھے وہاں ایک رہ گیا ہے اور اس ایک اسکول میں بھی بچوں کی تعداد حوصلہ شکن حد تک کم ہو گئی ہے۔ سندھیوں نے ایک مستحکم تعلیمی نظام کے ذریعہ اپنی زبان اور اپنے کلچر کو بچا لیا۔ ہم نہیں بچا سکے۔ اردو اسکولوں میں طالب علموں کی شرحِ اموات یا MORTALITY — RATE — اتنی ہولناک ہے کہ اعداد و شمار جو اپنی فطرت ہی میں سرد اور بے حس ہوتے ہیں ان سے بھی خون کی بو آنے لگتی ہے۔ سو میں سے مشکل سے دس بچے دسویں تک پہنچ پاتے ہیں۔ باقی بیچ کی کلاسوں میں سے اٹھ کر کام دھندوں پر لگ جاتے ہیں۔ اردو اسکولیں وہ مخدوش علاقے بن گئی ہیں جہاں ماں باپ اپنے جگر گوشوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے جو دس بچے دسویں پاس کرتے ہیں اُن میں سے پانچ ان ہی سکولوں میں بطور پرائمری ٹیچر لوٹ آتے ہیں۔ جو پانچ کالج پہنچ کر اردو میں ایم۔اے کرتے ہیں اُن میں سے ایک دو اردو کے لکچرار بن کر پھر اُن پانچ بچوں کے لیے دعائے خیر کرتے رہتے ہیں جو اسکولوں کے قتلِ عام سے بچ کر اُن تک پہنچ پائیں گے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹوٹے پھوٹے اساتذہ اِن گرے پڑے بچوں کو افسانہ نگاری کے گُر سکھائیں۔ گویا میں بھی اپنے کام کا آغاز وہیں سے کرنا چاہتا ہوں جہاں سے اردو اکاڈمیاں کرتی ہیں۔ اردو اسکول بند ہو جاتے ہیں تو اکاڈمیاں اردو کلاسیں شروع کرتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کھیت اجاڑنے کے بعد لیبارٹری میں سبزیاں پیدا کی جائیں۔ یہ سبزیاں نمائشوں کے کام آتی ہیں جن میں انعام سبزیاں اگانے والے کو ملتا ہے۔ اکاڈمیاں کتابیں شائع کرتی ہے اور کتابوں کی اشاعت میں مالی تعاون دیتی ہے۔ یہ نیک کام ہے لیکن ایسے وقت کیا جا رہا ہے جب کام کی گھڑی بیت چکی ہے۔ اردو نے کتابیں پڑھنے والے اور لکھنے والے دونوں کی پیداوار بند کر دی ہے۔ کیا ڈاکٹر گیان چند جین نے اعلان نہیں کیا کہ خدارا انھیں کتابیں نہ بھیجی جائیں۔ کیا محمد حسن اور فضیل جعفری ماتم کناں نہیں ہیں کہ وہ کتابیں چھپ رہی ہیں جو نہیں چھپنی چاہیے تھیں۔ کیسی افسوس ناک

صورت حال ہے کہ زیورطبع سے آراستہ ہوتے ہی کتاب کا سہاگ لٹ جاتا ہے۔ مرتی ہوئی زبان کی جانیاں دینے کے بعد کتابیں اردو اسکولوں کی لائبریریوں میں داخل کی جاتی ہیں جہاں وہ بچوں کے لیے بیکار اور اساتذہ کے لیے بے فیض ثابت ہوتی ہیں۔ کتاب اپنے صحیح قاری تک نہ پہنچے تو مرجاتی ہے۔ اس نظر سے دیکھیں تو اکاڈمیاں وہ زچہ خانے ہیں جہاں اسقاط کا کاروبار زیادہ ہوتا ہے۔

اردو کو ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام ملتے ہیں۔ یہ بھی نیک کام ہے لیکن یہاں بھی آکسیجن مریض کے لیے پیغام موت لاتا ہے۔ ضیق النفس میں گرفتار زبان نہ ریڈیو کے لیے مُنہ کھول سکتی ہے نہ ٹی وی کو مُنہ بتا سکتی ہے۔ ایک تقریر، یا ایک انٹرویو، کلام شاعر بزبانِ شاعر اور چند قوالیاں، اللہ اللہ خیر صلاّ۔ اردو نے خلاّق اور دانشور طبقہ پیدا کرنا ہی بند کر دیا ہے جو ماس میڈیا کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ ویسے بھی ماس میڈیا یاجوج ماجوج ہے جو اوسط درجہ کے ذہنوں کو ایک ہی لقمہ میں نگل جاتا ہے اور ڈکار نہیں لیتا۔ اردو کی اشک شوئی اس وقت ہونے لگی جب آنکھوں میں خون آنے لگا۔ انگلیاں جب فگار ہوگئیں تو چارہ گر آگے بڑھا۔ آستیں میں دشنۂ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا۔

اکاڈمیوں نے معذور ادیبوں کو وظیفہ دے کر، انعامات دے کر، ان کی اَنا اور سرکشی کی گردن توڑ دی۔ عطائے او بہ لقائے او بخشیدم کہنے والا ہمارے یہاں کوئی نہ رہا۔ آدمی چاہے جتنا سرکش ہو دینے والے کے سامنے اسے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ مانگنے جاؤ تو ہونٹ مسکراہٹوں کے حسابی زاویے آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ "غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا" کی آواز سے اردو کا ایوان کبھی خالی نہیں رہا۔

زبان کے زوال کے ساتھ خراب ادیب ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ اکاڈمیوں اور اداروں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے سبب خراب ادیبوں کے اندر اسفل انسان بھی ہاتھ پیر نکالنے لگا۔ بندر بانٹ شروع ہوئی۔ اقبال پر سیمینار ہے تو جو اقبال پر استناد کا درجہ رکھتے ہیں وہ مدعو نہیں۔ لیکن جنھوں نے زندگی بھر تنقیدی مضمون نہیں لکھا، ان سے دو صفحے گھسٹوا کر پندرہ سو روپے ان کی جیب میں ڈال دیے۔ پوچھنے والا کون ہے۔

قاری ادب کا مطالعہ کرتا ہے حسن کے تجربہ سے گزرنے کے لیے، اسفل اور رکیک لوگوں کی پھیلائی ہوئی غلاظتوں میں لوٹنے کے لیے نہیں۔ ہماری تمام ادبی چہل پہل اور ہنگامہ آرائی ایک مدقوق کے رخسار کی سرخی ہے۔ ایک قلاّش مسلمان کی بارات کی مانند جو گھر رہن رکھ کر آتش بازی سے شہر کی رات کو چراغاں کر دیتا ہے۔ چار ہی دن کے بعد اس کی تاریک کھولی کی گندی موری پر زبان کی دلھن برتن مانجھتی نظر آتی ہے۔

غالب اکیڈمی میں فکشن پر پانچ روزہ سیمینار تھا۔ ماضی کی موت، روایت کی گم شدگی، ذات کے بحران پر جب تقریریں بے کیف اور یک آہنگ بن جاتیں تو میں ہال کے باہر نکل آتا۔ لاریوں میں تکّے اور کباب بکتے۔ ان کے قریب بچے اجابت کرتے۔ مرزا غالب کے مزار کا بدصورت اور ویران صحن نظر آتا۔ ایک دکان پر لکھا ہوتا۔ بھینس کا گوشت یہاں ملتا ہے۔ گرد، کیچڑ، مکھیاں، فقیر، گندی ہوٹلیں،

تبلیغی جماعت کا مرکز، نظام الدین اولیا کا مزار شریف۔ ماضی مرا کہاں ہے۔ وہ تو زندہ ہے بستی نظام الدین میں زندہ ہے۔ جامع مسجد کو جانے والی اس سڑک پر زندہ ہے جس کی کولتار کی تہ پر ایک اور تہہ جم گئی ہے جو مرغیوں اور مچھلیوں کے فضلے اور بھینس کے گوشت کی چربی سے بنی ہے۔ ہر شہر کے مسلمانوں کی ہر بستی میں ماضی زندہ ہے۔ روایت کی گلی سڑی لاش بھی موجود ہے جس پر وہ مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں جو جدید تمدن کے فضلے سے اڑ کر آ بیٹھی ہیں۔ ان بستیوں میں وہ حُسن بھی نہیں جو بیتی ہوئی تاریخ کی انگلیاں آثار قدیمہ کو عطا کرتی ہیں۔ کھنڈر کا اپنا ایک افسردہ حُسن ہوتا ہے۔ بوسیدہ گھر کثیف اور بدصورت ہوتا ہے۔

ہندستان میں مسلمانوں کا مڈل کلاس طبقہ لگ بھگ ختم ہو چکا ہے۔ ایک طرف دولت مند طبقہ ہے جو شادی بیاہ پر لاکھوں خرچ کرے گا کتاب پر کوڑی نہیں۔ دولت بغیر کلچر کے بربریت پیدا کرتی ہے۔ مذہبی احیا پرستوں اور بنیاد پرستوں کا طبقہ اسی دولت مند طبقے کی خیرات اور بخششوں پر پلتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں کی مانند ان مذہبی رہنماؤں کو بھی کلچر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ زبان اگر مرتی ہے تو مرے، مذہب اگر دیوناگری کے سہارے بھی زندہ رہتا ہے تو ان کے لیے کافی ہے، کلچر، تعلیم، دانشوری سے محروم دولت مند طبقہ تفریحات کا رسیا ہے۔ غزل اس کے لیے سنگیت کا لباس پہنتی ہے، شاعری مشاعرے کا روپ اختیار کرتی ہے، افسانہ ٹی وی سیریل بنتا ہے، دانشوری لچھے دار تقریر۔ یا مذہبی وعظ۔

دوسری طرف غریبوں کا طبقہ ہے۔ تہذیب و تمدن کی برکتوں سے محروم، فلاکت کے مارے فرقہ وارانہ نفرت کے ہدف، فسادات کے صید زبوں، جاہل مولویوں کے پھیلائے ہوئے توہمات، تعصبات اور تنگ نظری کا شکار، پارینہ رسوم، بوسیدہ روایات اور گنجلک عقائد کے مارے ہوئے سیاسی پارٹیوں کے ووٹ بنک، دان چوروں، داداؤں، اور منشیات فروشوں کے سیاسی اور مذہبی دباؤ تلے جینے والے اس طبقہ کے بچے ہی ہیں جو اردو اسکولوں میں قتل ہونے کے لیے جاتے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں ایرکنڈیشنڈ ہال کے مشاعروں کا، ورلڈ کانفرنسوں کا، اردو جشنوں کا، لندن اور کینیڈا کے سفروں کا، اس طبقے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اکاڈمیوں نے ان بچوں میں کتنی کتابیں تقسیم کی ہیں؟ کتنے رسالے ہیں جو اس طبقے کے آدمیوں تک پہنچتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس طبقے کا افسانہ نگار، ناول نگار اور ڈراما نگار کہاں ہے؟ جب ضرورت تھی ہمیں ڈکنس اور پریم چند کی تو ہم نے پیدا کیے جدید افسانہ نگار جنھوں نے حقیقت کو دیکھنے کی بجائے تمثیلیں ایجاد کیں، سامنے کی بستیاں چھوڑ کر داستانوں کی خیالی بستیاں سجائیں، سانپ، بچھو، گدھ اور چھپکلیوں کو دیکھا ان انسانوں کو نہ دیکھ سکے جو شر کی سیاہ کاریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ جب حقیقت کو کھلی آنکھ سے دیکھنے کی ضرورت تھی تو ہم نوستالجیا کی لجلجی دلدل میں جا گرے۔ جب گلی سڑی روایت کو طنز کے نشتر کی ضرورت تھی ہم نے اس پر جذباتیت کا مرہم رکھا۔ ہم نے ذات کے بحران کی بات کی حالاں کہ یہ بحران ایک نئے عہد کا ذہنی پختگی سے مقابلہ نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔ ہم وقت کے موڑ کے نوحہ گر رہے لیکن ہم نے یہ جانا ہی نہیں کہ جینے کے لیے ہمیں کون سا موڑ لینا ہے۔ چنانچہ ہمارے افسانوں میں عتاب نہیں، جھنجھلاہٹ نہیں، احتجاج نہیں،

طنز نہیں، المیہ نہیں، ڈراما نہیں، کوئی تاثر ہی نہیں، محض جذباتیت ہے جو روایت کی شکست اور ماضی کے نوستالجیا کی زائیدہ ہے۔ یہ آرٹ نہیں، SELF-INDULGENCE ہے۔

ماضی اس کے لیے زندہ ہوتا ہے جس کا حال بھی زندہ ہو۔ وہی لڑکی اپنی بوڑھی ماں سے پیار سے چمٹتی ہے جو بھری دوپہر میں انار کے پیڑ کے نیچے کسی کی گرم باہوں سے نکل کر آئی ہو۔ شوہر کی ماری ساس کی جھڑکیاں، گندے برتنوں کے ڈھیر، روتے بلکتے بچوں اور اپنی بیماریوں میں گھری ہوئی تھکی ماندی کچیٹ عورت جھلاہٹ سے رسوئی کی تھالی بڑھیا کے سامنے پٹخ دیتی ہے اور پھر آنگن کی دھوپ میں کھاٹ پر بیٹھی دروازے پر لٹکتے ٹاٹ کے میلے پردے کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور سر کھجاتی ہے۔

ایسی عورت کا مسئلہ ماضی نہیں حال ہے۔ حال سے مکتی، حال سے نجات، ٹاٹ کے پردے کے پرے کہیں کھلی فضا کا حیات بخش لمس۔ ماضی راہ گریز ہے، راہِ نجات نہیں۔ نجات تو ان قوتوں کی سرکوبی اور ان حالات کے خلاف جنگ میں ہے جنھوں نے زندگی کو باسی ایٹھن سے بھری تھالی میں لیس دار کپڑے کی کراہیت انگیز سرسراہٹ بنا دیا ہے۔

وجودیوں کی بغاوت اسی جمود اور باسی پن کے خلاف تھی۔ ماضی سے انقطاع کا تجربہ دو طرح کے احساسات کو جنم دیتا ہے۔ ایک تو افسردگی کا اور دوسرا آزادی اور نجات کا۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ روایت کے بیر تسمہ پا اور تاریخ کے کابوس سے نجات پا گیا ہے۔ اور اپنی زندگی جی سکتا ہے۔ یہ دوسرا احساس جدید اردو افسانہ میں بالکل ناپید ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اجتماعی MYTHOS کے مقابلہ میں ہم انفرادی ETHOS پیدا نہ کر سکے۔ پریم چند سے لے کر منٹو اور بیدی تک کا احساس زندگی کی بے معنویت کا نہیں بلکہ حیات کش اخلاقیات اور عقائد اور شر کی طاقتوں کے خلاف انسان کی جدوجہد، اور ان طاقتوں کے ہاتھوں زندگی کی رائگانی اور اس سے پیدا شدہ گہری الم ناکی کا احساس ہے۔ انھوں نے شخصی احساسات کو انسانی ڈرامے کا معروض عطا کیا جو فکشن کے آرٹ کا صحیح طریقہ ہے۔ افسانہ میں کہانی کا عنصر فی نفسہٖ احساس کو فکر کے دائرے میں لے جاتا ہے کہ ایک کے بعد ایک رونما ہوتے والے واقعات اور اُن کے تحت کرداروں کے نفسیاتی اور جذباتی رویوں میں تبدیلی کا باہمی تفاعل کردار کو واقعات کی جبریت سے نجات دلاتا ہے اور جیسا کہ زندگی میں ہوتا ہے آدمی اپنی فکر، اپنی قوتِ ارادی، اور اپنے اخلاقی عمل کے ذریعہ انتہائی حوصلہ شکن حالات کے شکنجہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا یہ اس کا المیہ ہے لیکن اس کی جدوجہد قوتِ حیات کا مظہر بنتی ہے، جو موت کی طاقتوں کے سامنے آسانی سے سپر انداز نہیں ہوتی۔ یہ اخلاقیات بیدی اور منٹو نہیں سکھاتے بلکہ خود بیدی اور منٹو کو ان کے کردار ہولی اور رانو، باسط اور بابو گوپی ناتھ سکھاتے ہیں۔ کرداروں اور کہانی کو تجنے کی سزا جدید افسانہ نگار کو یہ ملی کہ حوادثات کی دنیا اس کے لیے سبق آموز نہ رہی۔ وہ اس دانشمندی سے محروم ہو گیا جو تاریخ کے بحران میں گھرے انسان کے ہولناک اور ہوش ربا تجربات سے آنکھیں چار کرنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے احساس کی سطح سے بلند نہ ہو پایا، اور گو شاعری احساس کی زبان

ہوتی ہے مگر اچھی شاعری بھی اس جذباتی سطح پر قناعت نہیں کرتی) لیکن افسانہ تو حسیت کے چٹخارے کو مشکل ہی سے برداشت کر پاتا ہے۔ فنکار کو اپنے احساس کے سفر کی داستان بھی افسانوی عمل کے ذریعہ حقائق کی دنیا میں بیان کرنی پڑتی ہے۔ ہرمن ہیس نے بھی یہی کیا اور ورجینیا وولف اور قرۃ العین حیدر نے بھی یہی کیا۔ عینی حیدر کے یہاں زندگی کی بے معنویت اور جبریت، مقدر کے عروج و زوال کا احساس وقت کے تناظر میں تاریخ کے مدوجزر کا ڈرامائی عمل لیے ہوئے ہے۔ یہی مدوجزر حالی کے مسدس کو ایک ڈرامائی عمل کا ڈائمنشن عطا کرتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حالی کے مسدس کو ایک زمانہ میں مسلمان اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح دوسری قومیں اپنے مقدر کی داستان کو اپنے ڈراموں میں دیکھا کرتی تھیں۔ ماضی حالی کے یہاں زندہ ہے کیونکہ وہ حال سے آنکھیں چار کرتے ہیں اور حال کا بیان حالی کے یہاں کتنا جزرس، حقیقت پسندانہ، سفاک، غصہ ور، طنزیہ، غم ناک اور دردمندانہ ہے۔ مسلمانوں کے نکبت و افلاس کا منظر ان کے دل میں جذبات کا کیسا جوار بھاٹا پیدا کرتا ہے۔ جب جذبات اور احساسات میں مدوجزر ہو تو کسی ایک جذبہ پر کائی جمنے نہیں پاتی۔ حالی کسی بھی مقام پر اپنے زخموں کو کریدتے یا کسی ایک احساس کی انفعالیت کا شکار ہوتے نظر نہیں آتے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ فکشن سیمینار کے ایک اجلاس کی صدارت حالی کر رہے ہوتے تو وہ بھی ماضی کی نوحہ گری سے گھبرا کر باہر نکل آتے۔ بستی نظام الدین کو شاید اپنا ناول نگار مل جاتا۔

کلچر کے خلاف جرائم میں بڑا سرمایہ، مافیا، مذہبی ادارے اور سیاست ہمارے وقت کے سب سے ناپاک گٹھ جوڑ میں شامل ہو گئے۔ میں مذہب کے خلاف ایک لفظ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ میرے دل میں جی گوارا کے اس بیان کی بڑی قیمت ہے کہ ہمیں لوگوں کی مانوس وابستگیوں کو گزند نہیں پہنچانی چاہیے۔ وہ جن کے پاس جینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا وہ اپنے عقائد، اپنی مقدس وابستگیوں، اپنے رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں، جاتراؤں، اور تیوہاروں کے ذریعہ اپنی بے مایہ زندگی کو کسی نہ کسی طرح بامعنی اور خوشگوار بنا لیتے ہیں۔ ہولی اور سوگندھی کا مذہب ہوائی جہازوں میں اڑنے والے مہاتماؤں اور مولویوں کا مذہب نہیں ہے بلکہ ایک نامہربان کائنات میں تنہا غم زدہ وجود کا آخری دلاسا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہولی اور سوگندھی تو ایک لمبے سوالیہ نشان کی صورت ابھرتے ہیں جو خیر کی قدروں پر قائم پورے نظامِ خداوندی کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ سوائے دردمندی کے زندگی کے مطالعہ کا آدمی کے پاس کوئی زاویہ نہیں رہتا۔ اسی دردمندی نے حالی سے مناجاتِ بیوہ لکھوائی۔ حالی، پریم چند، منٹو اور بیدی انسان دوستی کی ایک ہی روایت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس طرح کبیر اور میرا سناتن دھرمیوں کی روایت کا حصہ نہ بن سکے، اسی طرح وہ جنھوں نے لب ترشوا کر لب کشائی کی، ان کی ملامت کا ہدف سرسید کے بعد حالی ہی بنے۔ مولوی ہونے کے باوجود الطاف حسین مولویوں کے کام کی چیز نہیں تھے کیونکہ ان کے لیے اقبال پیدا ہو چکے تھے۔ مذہب اور سیاست کو دردمندی کی نہیں بلکہ جلیل الشان آدرشوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بات ہمیں کبیر، حالی، بیدی اور منٹو نے سکھائی ہے کہ انسانی دردمندی کا چشمہ اگر سوکھ جائے تو آدرش اور اخلاق سفاکیوں کی نقاب بن جاتے ہیں۔ اس لیے سلمان رشدی ہوں

باسوامی اگنی ویش، ایک کی مذہب دشمنی اور دوسرے کا دھرماتما پن دونوں اس ریگزار کے ببول ہیں جس میں انسان دوستی کا جھرنا سوکھ گیا ہے۔ یہ لوگ سیاست اور مذہب کے آدمی ہوسکتے ہیں، کلچر کے آدمی نہیں۔ ایلیٹ نے بتایا ہے کہ کلچر چاہے جتنا چھوٹا اور معمولی سہی قابل احترام ہے کہ وہ لوگوں کو حیات کا قرینہ بخشتا ہے۔ کسی بھی کلچر کو گزند پہنچانے اور تباہ کرنے کی کوشش انسانیت کے خلاف ہولناک جرم ہے۔ بلراج مینرا کی کہانی "ریپ" اسی جرم کا پردہ فاش کرتی ہے۔ کہانی کا مرکزی خیال یہی ہے کی کہانی کا کردار ایک راستے سے مانوس ہے۔ راستے کا نام بدل دیا جاتا ہے۔ اور کردار اندر سے ٹوٹ جاتا ہے کہ یہ اس کی مانوسیت، اس کی جذباتی وابستگی پر بے حس انتظامیہ کی ضرب ہے۔ کہانی سرخ بتی تھی اس ذہنیت کے خلاف جو آج اپنی فاشی شکل میں شہروں تک کے نام بدلنا چاہتی ہے۔

لیکن کلچر ریاست، حکومت، اور اکاڈمیوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ کلچر تو انسان میں رچی ہوئی تخلیقی جبلت کا بے ساختہ اظہار ہے۔ گرد و پیش کی دنیا کے ساتھ حواس کا وہ کھیل ہے جسے انسان سنگ وصوت ورنگ کے ساتھ کھیلتا ہے۔ کلچر تو لیلا ہے، برہم لیلا کی مانند جس میں تخیل کا بازیگر بتانِ آذری تراشتا ہے جو برہمانڈ کے مقابلہ میں اپنی کائنات اصغر تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ کھیل اس وقت تک کھیلا جاتا ہے جب تک آدمی کا گرد و پیش کی دنیا سے رشتہ حرکی، جدلیاتی اور تخلیقی ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو والے پچھلے چالیس سال سے جس لسانی تعصب کی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کے سبب یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ غیروں کے تعصب اور اپنی بے حسی کے جو بیج ہم نے بوئے تھے اس کا پھل آج ہمیں مل رہا ہے۔ ناول، افسانہ، ڈراما سوکھے کی ماری زمین کی صورت بے برگ وگیاہ ہیں۔ غزل اپنے غمزوں سے عیش کوش بورژوازیوں کی تفریح کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ تنقید ببول کے پیڑ کی مانند الجھتی زیادہ ہے چھاؤں کم دیتی ہے۔ جب بے مہری کی زمستانی ہوائیں چلتی ہیں اور کلچر کی گل پوش وادی برف کے سفید کفن تلے چھپ جاتی ہے تو پالے کے مارے لوگ کانپتے ٹھٹھرتے آثارِ قدیمہ کی شکستہ دیواروں تلے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ اکاڈمیوں سے دھڑادھڑ وہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن میں ہمارا ماضی دفن ہے۔ اس کام کی بھی بڑی اہمیت ہے لیکن اس وقت جب دوسری چیزیں ٹھکانے پر ہوں۔ نوادرات ڈرائنگ روم ہی میں اچھے لگتے ہیں، کباڑخانے میں نہیں۔ ادب کا ڈرائنگ روم منتظر ہے اس ملاقاتی کا جس کی پہلی نظر بک شیلف کی طرف جائے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید
پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید
حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات
ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف
شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال
شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور
یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی
ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین
مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیّدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم
نادل نگاری کا جائزہ
ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

قتیل شفائی

QATEEL SHIFAI STREET,
GHALIB COLONEY,
SAMANABAD,
LAHORE-25
PAKISTAN

یوں لگتا ہے لاشں ہماری موم کا پہنے ہوئے کفن ہے
پھینکے گئے سمندر میں ہم پھر بھی اپنا خشک بدن ہے

کیوں تالاب میں عکس ہمارا صاف نظر نہیں آتا ، لوگو
یا کچھ مسخ ہے چہرہ اپنا' یا پانی میں گدلا پن ہے

کون سا بدلہ ہم سے لینے بھیجی گئی برسات فلک سے
کہاں سے بچ کر گزرے کوئی ساری گلیوں میں پھسلن ہے

رَب کو خوش کرنے کے بہانے کرے دل آزاری بندوں کی
اک موذی بس اسی کام میں بڑے خلوص کے ساتھ مگن ہے

اُسی کے گھر سے ہوگا برآمد لٹا ہوا سب مال ہمارا
ہم رہبر سمجھے تھے جس کو وہ اک پشتینی رہزن ہے

ہر بن باسی ہے خطرے میں جاننا چاہیے ہر سیتا کو
جہاں کہیں ہے کوئی لنکا وہاں کا راج پتی راون ہے

کون بتائے کس ظالم نے آکر توڑ دیے سب جھولے
چُپ ہیں کوئلیں اور پپیہے خوب قتیل اب کے ساون ہے

اکرم باقی
MAQBOOL LARI MANZIL,
NEAR CITY STATION,
LUCKNOW-18. (UP)

"اندھی تصویر کا مصوّر ـــــ!"

میں اک مصوّر ہوں
انگلیوں میں ہے پھر سے میری
عجیب ایک اضطراب پنہاں
اسی سے پھر ارتعاش پیدا
چلو کہ چہرہ میں رنگ بھر دیں
کہ چہرہ عنواں ہے زندگی کا

میں اک مصوّر ہوں
دھندلا سا خاکہ سا ذہن میں ہے
کہ اس دفعہ بھی
یہ شاہکار میرا
بس ایسے رنگوں پہ مشتمل ہو
کہ جن سے مانوس ہر کوئی ہے
وہی سفید و سیاہ اور سرخ ـــــ!

میں اک مصوّر ہوں
خود سے میں نے کیا ہے وعدہ
حقیقتوں سے ہی رنگ لے لوں
وہ دیکھو پھر شام ڈھل رہی ہے
چلو شفق سے گلاب عارض کے بڑھ کے چن لیں
شتاب دیکھو وہ ظلمتِ شب
لیے کھڑی ہے سیاہیاں بھی
کہ جس سے زلفوں کے کالے بادل سنور سکیں گے
اور آنکھ کی وہ سیاہ پتلی بھی بن سکے گی۔

میں اک مصوّر ہوں
منتظر ہوں کہ شب جو گزرے
تو ہو نمودِ سپیدیِ صبح
نئی سحر کا ہے انتظار اب
سحر کہاں ہے!
سحر نہیں تو سیاہ پتلی بھی کیا کرے گی۔؟

میں اک مصوّر ہوں
میرے فن کو سپیدیِ صبح چاہیے اب
ہنر کو میرے ملے ہیں اب تک
یہ رنگ دو ہی
کہ رنگ سرخ و سیاہ پُر ہے حقیقتوں سے
سمو گئی پختگی بھی ان میں جنم جنم کی
سحر کی کوئی خبر نہیں ہے تو میں کیونکر سحر کو ڈھونڈو ا
طویل تر ان شبوں کے اندر سفید رنگت کہاں سے لاؤں
کہاں سے تصویر کے ادھورے پن کو آخر چُرا کے لاؤں

میں اک مصوّر ہوں
سنا ہے میں نے کہ خوں کا رنگ اب سفید ہی ہے
اسی بھروسے پہ میں نے مارے ہیں کتنے شب خوں
ملی ہے اب تک لہو کی سرخی
مگر نہیں میں نے ہار مانی
میں قتل و غارت گری کے در پے
سفید خوں کی تلاش میں ہوں

میں اک مصوّر ہوں
مجھکو ڈر ہے
کہ اندھی تصویر کا مصوّر
نہ کوئی کہہ کر مجھے پکارے

رفیعہ شبنم عابدی

HEAD,
DEPARTMENT OF URDU,
MAHARASHTRA COLLEGE,
BOMBAY-400008.

جب سے اُس دھوپ کی خواہش میں بھگولیں آنکھیں
اک رُت بیتی، کسی سے نہیں بولیں آنکھیں

اب تو آجاؤ کہ یہ رشتۂ جاں ٹوٹ نہ جائے
رہ گزاروں میں کئی دن سے پرولیں آنکھیں

اُس نے مدہوشی سے لہجے میں یہ پوچھا ہم سے
'سچ کہو، کیا مئے گلفام سے دھولیں آنکھیں'

خواب در خواب کی لذت سے ہوئے ہیں دوچار
اُس کی آنکھوں کے تصور میں نہ کھولیں آنکھیں

آپ تو پار نہ کر پائے رواجوں کی ندی
ہم نے تو خوں کے سمندر میں ڈبولیں آنکھیں

اتنا موقع ہی کہاں تھا کہ جھکاتی پلکیں
اُس نے آنکھوں میں کچھ اس طرح سمولیں آنکھیں

جس کی راہوں میں دیے بن کے جلا کرتی تھی
آج اُسے دیکھا تو کچھ دیر کو رولیں آنکھیں

اب تو دن رات انھیں اور کوئی کام نہیں
روتے روتے کبھی جاگیں کبھی سولیں آنکھیں

جس نے تپتی ہوئی وادی کو بھی سیراب کیا
شبنمؔ اُس ابرِ گہربار کی ہولیں آنکھیں

ساحل احمد

HEAD,
DEPARTMENT OF URDU,
CHRISTIAN COLLEHE,
ALLAHABAD-3.

کون ہے اس زندگی سے آشنا
اک سسکتی روشنی سے آشنا

کون کیسے جی رہا ہے دہر میں
تو نہیں ہے زندگی سے آشنا

وہ نہ سمجھے گا کہ کیا ہے روشنی
جو نہیں ہے تیرگی سے آشنا

لوگ کیسے ہیں تمھارے شہر کے
جو نہیں ہیں آشتی سے آشنا

کاش ایسی ہم بسائیں بستیاں
آدمی ہو آدمی سے آشنا

دشمنی کا نام تم نے کب سُنا
کاش ہوتے دوستی سے آشنا

کرشن موہن
158,Pushpanjali,
I.P.Extn II,
DELHI 92.

غزل

سچ کہنے سے کب چوکا ہوں
ہاں میں شہرت کا بھوکا ہوں

تلخ حقائق میرے دشمن
میں شیدا، رنگ بو کا ہوں

دل میں گھر کر کے ہی رہوں گا
معنی، شعرِ دلجو کا ہوں

پل دو پل میں گر جاؤں گا
ایک گھروندا بالو کا ہوں

تڑپاتی ہے یادِ جوانی
صید، رمیدہ آہو کا ہوں

بسیا ہوں غم کی بستی کا
رسیا تیرے جادو کا ہوں

جانے کب ہو جاؤں غائب
باسی 'مایا تنبو' کا ہوں

مایا جال میں جکڑا ہوں میں
گو پینٹھ کی آیو کا ہوں

من بہلاؤں ہر پرانی کا
مچلا جھونکا وایو کا ہوں

میرا جیون سُکھ کا سپنا
جھونکا چنچل خوشبو کا ہوں

میرا ہر شعر تر بولے
مُن ہر، موتی آنسو کا ہوں

کرشنا موہن کا رُہوں میں
متر بنا جو شترو کا ہوں

نوما تقی نوما
Urdu Bhawan, Sabungaran,
MEERUT -2.(U.P.)

غزل

سستا خون اور منہگا پانی
بول رہی مچھلی کتنا پانی

جذبے پر پہرے نہ بٹھاؤ
کب رُکتا ہے بہتا پانی

شام، دھندلکا، تیر، شکاری
خون، کبوتر، دریا، پانی

اُس کا میرا ساتھ ہی کیا ہے
ایک جگہ ہیں شعلہ، پانی

کب سے بیٹھا روئے مچھیرا
چھوٹا جال اور گہرا پانی

اُس کی آنکھیں اشک بھری تھیں
ہم نے دیکھا بولتا پانی

لاکھ جھیلے ایک تمنا!
تھوڑا کھانا تھوڑا پانی

ہم پیاسوں تک نور آئے کیوں
اندھے رستے، بہرا پانی

تحقیق و ترتیب
حکیم محمد حسین خاں شفا

تعارف

پنڈت مدن موہن مالویہ کی سوانح

مولفہ ۱۹۱۹ء سید ابوالاعلیٰ مودودی

البیرونی نے ۱۰۳۰ء سے قبل ہندستان کی توصیف و تقدیس بیان کرتے ہوئے ہندستانیوں کے بارے میں لکھا تھا "یہ لوگ حُمق و خود فریبی کے لا علاج مرض میں مبتلا ہیں۔ اونچ نیچ چھوت چھات، طبقاتی کشمکش کا شکار ہیں۔ اپنی ذات اور اپنے فرقے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بیرونی دنیا کے بارے میں ان کی معلومات بے حد محدود ہیں۔ سمندر پار سفر کرنا ان کے یہاں گناہ ہے۔"

اگر یہ لوگ ان خامیوں کی اصلاح کر لیں تو اپنے بزرگوں کی طرح دنیا میں نام روشن کر سکتے ہیں۔ ان کے اجداد جن کے علمی کارنامے ہمارے سامنے ہیں ایسے نہیں تھے۔ البیرونی نے ہزار سال قبل جن امراض کی نشاندہی کی تھی۔ ہندستانیوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جس کے نتیجہ میں بیرونی طاقتیں ہندستان پر یلغار کرتی رہیں اور فتح یاب ہوتی رہیں۔ اور انگریزوں نے انتہائی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے ایک لمبے عرصہ تک ہندستان کو اپنا غلام بنائے رکھا جس کے خلاف محب وطن ہندستانیوں کو اپنے پورے وسائل کے ساتھ ایک طویل جنگ آزادی لڑنا پڑی۔ اس جنگ میں مختلف موڑ اور نشیب و فراز آئے۔ مختلف الخیال لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے اس جنگ میں حصہ لیا۔ اور اپنے مطمع نظر سے اس کی داستان تحریر کی، ہندستان میں کانگریس پارٹی کی تشکیل اور اس میں مولانا محمد علی جوہر و گاندھی جی کی شمولیت ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ان دونوں لیڈروں نے اس بات کو محسوس کیا کہ انگریزوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے ہندستانی قوم میں سیاسی شعور اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد بھی اشد ضروری ہے۔ اتفاق سے اسی دوران مسئلہ بقائے خلافت عالم اسلام کو درپیش ہوا۔ جو خالص ایک مذہبی مسئلہ اور مسلمانوں سے متعلق تھا۔ اس کے سلسلے میں ہندستانی مسلمان بہت پُرجوش تھے۔ یہ گاندھی جی کی سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی حمایت کرکے ان کا دل جیت لیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ دونوں قومیں شیر و شکر ہوگئیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کا ایسا منظر دیکھنے میں آیا جو اس سے پہلے یا بعد ہندستان کی تاریخ میں ظہور میں نہیں آیا۔ گاندھی جی نے تحریک خلافت کے ساتھ اپنی ستیہ گرہ اور تحریک آزادی کو ملا دیا۔ ان تحریکوں کے دوران یہ طے ہوا کہ ہندو اور مسلمان لیڈر اور اہل قلم

دونوں فرقوں کے قومی رہنماؤں کا احترام کریں۔ قوم کو کانگریس کی پالیسیوں سے روشناس کرائیں۔ اور قومی یکجہتی کو فروغ دیں۔ اگر خدا نخواستہ دونوں فرقوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو اپنے ہی فرقے کی اصلاح کی کوشش کریں۔ دوسرے فرقہ کو موردِ الزام نہ ٹھہرائے۔ ان دونوں قومی لیڈروں کے اس جذبے کو پروان چڑھانے والوں میں ایک نوجوان صحافی سیدابوالاعلیٰ مودودی کا نام بھی آتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اخبار تاج جبل پور، مدینہ بجنور، وہ دیگر اخبارات و رسائل میں مضامین کے ساتھ دو اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ایک مہاتما گاندھی کی سوانح اور دوسری پنڈت مدن موہن مالویہ کے حالاتِ زندگی سے متعلق، اس تحریک سے متعلق جو لٹریچر عالم وجود میں آیا تھا وہ آج بھی بے حد اہم ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس عہد کی کچھ یادگار چیزیں ذخیرۂ رامپور میں محفوظ ہیں جن میں مذکورہ کتاب بھی شامل ہے۔

اس کتابچہ کی اہمیت مختلف حیثیات سے بہت زیادہ ہے۔

(۱) یہ ۱۹۱۹ء میں لکھی ہوئی پنڈت مدن موہن مالویہ جی کی پہلی سوانح ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی۔ اس میں ضمناً کانگریس پارٹی کی تاریخ بھی آگئی ہے۔

(۲) اس کے مصنف عظیم ادیب اور مفکرِ اسلام اور جماعت اسلامی کے بانی ہیں۔

یہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جو پہلی مرتبہ علمی حلقوں میں روشناس ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا ذکر نہ تو مولانا نے خود اپنی کسی تحریر یا تقریر میں کیا ہے اور نہ مولانا پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

(۳) مشہور ادیب ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ بہار نے ایک اہم کتاب "مشاہیر کے اولین صحیفے" کے نام سے ۱۹۷۰ء مرتب کی ہے۔ جس میں کافی تحقیق و تلاش کے بعد دیگر مشاہیر کی اولین تحریروں کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اولین تحریر حوادث سمرنا سے متعلق یک ورقی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۲۱ء کو قرار دیا ہے۔ بیدار صاحب مزید لکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کی زیرِ نظر تصنیف سے قبل کی کوئی باقاعدہ تصنیف مجھے ابھی نہیں ملی ہے، ہماری دریافت شدہ کتاب ۱۹۱۹ء کی مطبوعہ ہے۔ اور یہ قومی یکجہتی و ہندو مسلم اتحاد کے اس سلسلے کی مولانا کی دوسری باقاعدہ تصنیف ہے۔ مولانا نے اپنی سوانح میں خود تحریر کیا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں میں نے اور میرے بھائی نے اخبار "مدینہ" بجنور میں مل کر کام کیا یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں سیاسی تحریک کی زبردست ابتدا ہو رہی تھی۔ میں نے "انجمن اعانت نظربندانِ اسلام" میں بھی کام شروع کر دیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب

سلہ اس عہد میں یعنی ۱۹۱۸ء سے کئی سال تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا موضوعِ تحریر ہی ہندو مسلم اتحاد اور ہندو دانشوروں کی حمایت میں رہا۔ چنانچہ جب مسٹر آصف علی بیرسٹر نے ٹیگور کی کتاب چترا، پر اعتراضات کیے تو مودودی صاحب نے رسالہ دلکش مراد آباد جس کو مسٹر اوتار کرشن اگروال نکالا کرتے تھے اس رسالہ کے فروری کے شمارے میں مولانا کا مقالہ ٹیگور کی حمایت میں بعنوان "مسٹر آصف علی بیرسٹر کی بیدردیاں ٹیگور کے ساتھ" شائع ہوا۔ جس پر مارچ ۱۹۲۰ء میں چکبست نے صبح امید لکھنؤ میں تبصرہ کیا، از خدابخش جرنل ۱۹۷۹ء شمارہ ۱۰ صفحہ ۴۸۵۔

خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا اسی زمانہ میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ مگر وہ ابھی زیر طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرلیا گیا؛" دراصل مولانا نے دو کتابیں گاندھی جی اور مالویہ جی پر ایک ساتھ لکھی تھیں برٹش حکومت جو ہندو مسلم تفریق اور تصادم کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔ اسے مولانا مودودی کا ہندو مسلم اتحاد قومی یکجہتی اور کانگریس پارٹی کی حمایت میں کچھ لکھنا گوارہ نہیں تھا۔ لہذا مولانا کی ان دونوں کتابوں کو ضبط کرلیا گیا۔

گاندھی جی سے متعلق کتاب کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیا حشر ہوا یا اب کہاں ہے؟ البتہ حالات زندگی پنڈت مدن موہن مالویہ جو مولانا نے دفتر تاج جبل پور سے شائع کرائی یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا اور مالویہ جی پر کافی لکھا جا چکا ہے اس کتاب میں بھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جس کی وجہ سے اس کی ضخامت کو کئی گنا زیادہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت مناسب یہی خیال کیا گیا کہ اس کو اپنی اصل شکل میں اہل علم و قدر دانوں تک پہنچا دیا جائے۔ ہندستان کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے قومی ایکتا کے پیش نظر جہاں مسلم مشاہیر کی ہندوؤں سے متعلق کتابوں کی اشاعت کی ضرورت ہے وہاں رتن لال بنسل کی کتاب مسلم دیش بھگت جیسی کتابوں کی بھی اشاعت ضروری ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
Urdu Department,
Golden College,
RAWALPINDI,
(PAKISTAN)

اردو میں جاسوسی ادب

جاسوسی ادب کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے ہم عہدِ قدیم کی مشرقی داستانوں خصوصاً 'الف لیلہ
(بغداد و مصر سے متعلق حصے)، 'طلسم ہوشربا' اور 'بوستانِ خیال' تک جا نکلتے ہیں، اور سب سے بڑھ
کر یہ کہ جارج ولیم ایم رینالڈز کی ناولیں خصوصاً 'الہ دین ویلیئے' (ترجمہ: منشی امیر حسن) یاد آتا ہے۔ یوں
مغرب و مشرق ہر دو اطراف میں داستانوی حیرت و استعجاب کو جگانے والے محیر العقول قصے، یہ
ثابت کرتے ہیں کہ انسان ابتدا سے اس رُخ پر رواں ہے۔ جارج ولیم ایم۔ رینالڈز کی GOTHIC
نے مغرب اور مشرق میں تقریباً ایک صدی تک دھومیں مچائی ہیں اور یہ سلسلہ آج کے THRILLERS'
سائنسی اور عقلی دور میں جاسوسی ادب کے ایک الگ شعبے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

مغرب میں ہورس وال پول جب جاسوسی ناولوں کی طرف آیا تو اسے 'GOTHIC' ناول لکھنے
والا کہا گیا۔ اس سے پہلے جرمنی میں یہ تجربہ خاصا کامیاب شمار کیا گیا تھا۔ وال پول سے مغرب میں جو
لوگ متاثر ہوئے اور جاسوسی ادب کی طرف آئے ان میں ایڈگر ویلیس، آرتھر کونن ڈائل، ولیم لیکو
کریس، آپنہم اور مسز کلارا کے نام نمایاں ہیں۔ علی عباس حسینی کے مطابق[1] وال پول کے تتبع میں
بیک فورڈ نے 'خلیفہ واتھک کی کہانی'، مسز ریڈ فورڈ نے 'جنگل کا رومان'، لیوس نے 'راہب'
(THE MONK) میری روچ نے 'کلیسا کے بچے' (THE CHILDREN OF ABBEY) جیسے ناول
لکھے، جب کہ امریکی ناول نگاروں میں براؤن نے 'وی لینڈ' (VIE LAND) شیلے نے 'زاستروزی'
(ZASTROZZI) مسز شیلے نے FRANKENSTEIN جیسے شہرت یافتہ ناول لکھے، حتیٰ کہ ہاتھورن
اور سر والٹر اسکاٹ تک نے اس مقبول رجحان سے اثر قبول کیا۔

اردو میں جاسوسی ناول کے ترجمے کی روایت اس تاریخی تسلسل کے ساتھ آگے نہیں بڑھی اور نہ ہی
ترجمہ یا اخذ کرتے وقت ہمارے ہاں کے مترجمین نے اچھے بُرے ناول کی تمیز کو روا رکھا۔ جاسوسی ناول
کی روایت سے لاعلمی اور تخلیقی/غیر تخلیقی کام میں فرق نہ کر سکنے کی وجہ سے ہمارے ہاں جاسوسی ادب لکھ

---

[1] ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۹۱، ۹۲

تو بہت گیا، اور ترجمہ بھی ہوا لیکن کسی اعلا معیار تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ جاسوسی فکشن ہمارے ہاں ادب میں شمار ہی نہیں ہوئی۔

اردو میں جاسوسی ناول کو متعارف کروانے کا سہرا ظفر عمر کے سر ہے، جنھوں نے مارس لیبلانک کے عالمی شہرت یافتہ جاسوسی ناول 'نیلی چھتری' کا ترجمہ کیا اور اس کے بعد مرزا ہادی رسوا، تیرتھ رام فیروز پوری، ندیم صہبائی اور پنڈت ملک راج شرما آنند اس راہ پر چل نکلے۔ یہاں تک کہ ترجمے کے باب میں یہ تمام حضرات جاسوسی ناول سے ہی متعلق ہو کر رہ گئے[۱]

اردو کے پہلے بڑے کل وقتی جاسوسی ناول نگار ابن صفی[۲] نے ڈیڑھ سو زائد ناول لکھے اور بڑی شہرت سمیٹی۔ ابن صفی اپنے طریقۂ کار کے اعتبار سے آرتھر کانن ڈائل اور ارل اسٹینلے گارڈنر سے متاثر تھے اور ہمیشہ کانن ڈائل کے طرزِ استدلال، اور ہیرلڈ رابنس کے "انوکھے پن" کی جستجو کرتے رہے۔ اُن کے آٹھ ناول کلی یا جزدی طور پر انگریزی جاسوسی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اس بات کا اعتراف انھوں نے اپنے ۷۵ ویں ناول 'زمین کے بادل'[۳] کے دیباچہ میں کیا ہے:

پہلا ناول 'دلیر مجرم' تھا۔ اس کا مرکزی خیال مغربی ادب سے لیا گیا تھا۔ یہ ایک جرمن مصنف کا کارنامہ تھا جس پر دنیا کے کئی مصنفوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثال کے طور پر پیٹر شینی نے اس پلاٹ کو 'سنٹرل ڈیز ائن' کے نام سے پیش کیا ہے۔ وکٹر گن نے یہی کہانی 'آئرن سائیڈس' کے نام سے لکھی ہے۔ وکٹر گن کا انداز پیٹر شینی سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے مقابلے پیٹر شینی کا ناول کسی بچے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ پیٹر شینی، وکٹر گن سے زیادہ مشہور ہے۔ ہندی میں بھی آپ کو اس پلاٹ پر ایک ناول 'قیامت کی رات' کے نام سے مل جائے گا۔ اس کے مصنف کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

ہاں تو 'دلیر مجرم' کا پلاٹ میں نے انگریزی سے لیا تھا! لیکن فریدی اور حمید میرے اپنے کردار تھے۔ میں نے اس کہانی میں کچھ ایسی دل چسپیوں کا اضافہ بھی کیا ہے جو اوریجنل پلاٹ میں نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ جاسوسی دنیا میں ایسے ناول اور بھی ہیں جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے تھے مثلاً "پُراسرار اجنبی"، "رقاصہ کا قتل"، "ہیرے کی کان"، "خونی پتھر"۔ ان پانچ ناولوں کے علاوہ آپ کو میرے ایک سو دو ناولوں میں ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا پلاٹ میرا اپنا نہ ہو ــــ البتہ 'خوف' اک ہنگامہ' کا کردار پروفیسر درّانی انگریزی سے آیا ہے، صرف کردار ہی، کہانی میری اپنی ہے۔ اسی طرح 'پہاڑوں کی ملکہ' کا بن مانس اور سفید ملکہ بھی انگریزی ہی سے آئے ہیں لیکن پلاٹ میرا اپنا ہے ــــ عمران کے سارے ناول بے داغ ہیں۔ ان میں نہ آپ کو کوئی ایسی کہانی ملے گی جس کا پلاٹ انگریزی سے لیا گیا ہو اور نہ کوئی ایسا کردار

---

[۱] البتہ رسوا کی 'امراؤ جان ادا'، اور تیرتھ رام فیروز پوری کی 'ہیرے کی پہچان'، طبع زاد ناولوں میں یادگار رہیں۔

[۲] اسرار ناروی کے نام سے شاعری اور طغرل فرغان کے قلمی نام سے مزاح لکھتے رہے (پ-۱۹۲۸ء)

[۳] اسرار پبلی کیشنز۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔ س۔ن

ملے گا۔

اسی طرح ان ایک سو دو ناولوں میں بہ مشکل سات یا آٹھ ناول ایسے نکلیں گے جن میں کسی قسم کی 'ملاوٹ' مل سکے ورنہ بقیہ سب خالص ہیں! وہ پانچ ناول جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے ہیں ترجمہ نہیں ہیں۔ ان کی ایک ایک سطر پر میرا دعوا ہے۔"

ص ۱۵ اور ۱۶ سے اقتباس

اسی کے ساتھ ابن صفی کے ناول 'دلیر مجرم' کا ابتدائیہ بھی دیکھتے چلیے:

"مجھے جانا ہی پڑے گا مامی"

ڈاکٹر شوکت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اوور کوٹ کی دوسری آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا:

"ایشور تمھاری رکھشا کرے اور اس کے سوا میں کہہ ہی کیا سکتی ہوں"

بوڑھی سیتا دیوی بولیں:

"لیکن سر میں اچھی طرح مفلر لپیٹ لو ــــ سردی بہت ہے"

"مامی۔" ڈاکٹر شوکت بچکانے انداز میں بولا:

"آپ تو مجھے بچہ ہی بنائے دے رہی ہیں۔ مفلر سر میں لپیٹ لوں! ہاہاہا۔"

ابن صفی کے جاسوسی ادب کی طرف آنے سے پہلے ہمارے ہاں جاسوسی ادب کا دائرۂ کار عام طور پر ترجموں تک محدود تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۲ء (جب ابن صفی کا 'دلیر مجرم' شائع ہوا) کے بعد اس شعبے میں طبع زاد کام زیادہ ہوا۔ یہ بات اپنی جگہ کہ ابن صفی کے فریدی اور حمید کے سامنے کوئی اور کرداری سلسلہ بچا نہیں۔

اردو میں جاسوسی ناول کے باب میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"ہنوز 'طلسم ہوشربا' کے خیال سے دامن چھوٹ نہیں سکا۔ ان میں وہی روایتی تخیل اور کسی قدر مافوق الفطرت باتوں کی جھلک نظر آتی ہے، غور کرنے سے طلسم ہوشربا اور آج کی جاسوسی ناولوں میں ایک گونا مماثلت ملتی ہے، جیسے اس میں خیر و شر کی لڑائی میں قلت کثرت پر فتح پاتی ہے ویسا ہی آج جاسوسی ناولوں میں نیک و بد کی لڑائی نظر آئے گی، جیسے اس زمانے میں امیر حمزہ کے ساتھ عمر عیار کا جز و لاینفک ہو گیا تھا ویسے ہی آج بھی خفیہ پولیس آفیسر کے ساتھ ایک ہمزاد نظر آتا ہے، جیسے جاسوسی ناول میں فریدی کے ساتھ حمید سائے کی طرح ہر وقت ساتھ رہتا ہے"[1]

ابن صفی سے قبل طبع زاد جاسوسی ناول لکھنے والوں میں پنڈت کشور چند مصنف 'رتن بے بہا' (پانچ جلدوں میں) 'بیماری' (دو جلدوں میں) 'جام دلربا' 'بدرالنسا بیگم' 'پلیڈر کی کرتوت' 'پدماوتی' وغیرہ (طابع: لالہ دیوی داس جانکی داس، تاجران کتب بازار مائی سیواں، امرتسر)

---

[1] "اردو ادب آزادی کے بعد" ص ۲۶۲، ۲۶۳

طالب بہ فارسی لکھنوی مصنف "ایران کا چاند"، (طابع: سیٹھ آدم جی عبداللہ اینڈ کمپنی بمبئی لے۔ نولکھا بازار، لاہور طبع اوّل اپریل ۱۹۴۹ء) فدا علی خنجر (خونی بھائی، ۱۹۲۲ء) سید شہنشاہ حسین (خونی بہن، ۱۹۲۲ء) بی۔ ایس۔ نسیم (خونی ٹولہ) نور محمد عشرت (خونی بہرام) احمد اللہ خاں (خونی ہتکڑی) اور طالب الہ آبادی (خونی پہچان، ۱۹۲۹ء) نے بہت شہرت پائی۔

جہاں تک تراجم کا معاملہ ہے تو مرزا ہادی رسوا کے ترجموں سے متعلق ڈاکٹر ظہیر فتح پوری لکھتے ہیں:

"رسوا ایک کامیاب مترجم تھے اور ان کے سب سے بہتر نمونے وہ تراجم ہیں جو انہوں نے دار الترجمہ حیدر آباد دکن میں کیے۔ اس کے برخلاف متذکرہ بالا ناولوں[1] میں بیشتر مقامات پر ترجمے کا معیار بہت ہلکا ہے۔ یہ سب معمولی درجے کے انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم ہیں جن کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے[2]"

مرزا رسوا نے میری کوریلی کے ناول 'WORWOOD' کو ترجمہ کرتے وقت یہاں تک کیا ہے کہ اکثر فرانسیسی اشعار کی جگہ پورے پورے گیت شامل کر دیے ہیں اور بغیر کسی جواز کے کچھ حصّے حذف بھی کر دیے ہیں مثلاً اصل ناول کے باب ۱۴ اور ۱۵ کو حذف کر کے ۱۳ کے بعد باب ۱۶ شروع کر دیا ہے۔ رسوا نے ترجمہ کرتے وقت حاشیہ آرائی بھی کی ہے مثلاً ایک مقام پر ناول کا ملحد ہیرو کہتا ہے:

"دنیا کے ایجادی خاکے میں کچھ نقص رہ گیا ہے۔ اور شاید وہ عظیم قوّت جو کہ مستغنی اور بے نیاز ہے، جس کو نہ کوئی آنکھ سے دیکھتا ہے، نہ ہاتھ سے چھو سکتا ہے، کسی خاص وقت میں جب کہ طبیعت متوجہ نہ تھی۔ ایک سوال حل کیا تھا۔ بہت بڑا مسئلہ جس کی وسعت زمین و آسمان سے بڑھی ہوئی تھی، وہ حل ہو گئی مگر خود فطرت اس کو بھول گئی"

•خونی عاشق۔ ص ۳۱۹ سے اقتباس

مرزا رسوا نے سخت ناگواری کے عالم میں اس پر حاشیہ لکھا:

"یہ بے وقوف ہمیشہ خدا پر اعتراض کیا کرتا ہے اس کو یہ نہیں معلوم کہ

---

[1] خونی مصوّر۔ اشاعت ۱۹۱۹ء ۔ از میری کوریلی ''WORWOOD'' کا ترجمہ
خونی عاشق۔ " ۱۹۲۰ء "
خونی شہزادہ۔ " ۱۹۲۱ء " لیتھو ڈسٹ پبلی شنگ ہاؤس، لکھنؤ
خونی بھید۔ " ۱۹۲۴ء "
خونی جورو۔ " ۱۹۲۸ء " انڈین پریس لکھنؤ
بہرام کی رہائی۔ (ماخوذ و ترجمہ)۔ از مارس بسلانک (فرانسیسی سے ترجمہ)

[2] "رسوا کی ناول نگاری"، طابع: حروف، ۲۲۲ـــ P سیٹلائٹ راولپنڈی ۱۹۷۰ء ص ۳۹۸

ع دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

خود امکان ناقص ہے، جو کچھ خرابیاں ہیں وہ امکان کی ذات سے ہیں نہ کہ خالق کی ذات سے۔ جو کچھ امکان میں تھا، ویسا ایجاد ہوا ہے یہ کہ ضدیں ایک جگہ جمع ہو جائیں یہ امکان میں نہیں لہٰذا اعتراض پوچ اور لچر ہے۔"

میری کوریلی کی ناول "WORMWOOD" اور اس کے ترجمے 'خونی عاشق'، کا تقابلی مطالعہ خود کر دیکھیے۔

" AND THEN WITH AN INDISCRIBABLE SLIDE FORWARD AND AN IMPUDENT BRACING OF THE ARMS AKIMBO THEY. STARTED THE "CAN-CAN"

PAGE311

"پھر بڑی بے شرمی سے کہنی کو آگے بڑھا کر اور کولھے پر ہاتھ دھر کے مٹکنا اور تھرکنا شروع کیا:

مہاراجا سے ینہہ لگیئے ہمار کوؤ کا کرتہیئے
تھری لاگ پہ نہیہ لگیئے
جیا کی پتن بجھئے ہمار کوؤ کا کرتہیے
مہاراجا سے ینہہ لگیئے ہمار کوؤ کا کرتہیے

ص ۲۳۶

"UGH ! THOSE BLUE,SWOLLEN CONTORTED LIMBS"

PAGE 294

"اُف نیلے پھولے ہوئے اور اکڑے ہوئے اعضا! ؎

عاشق کا بانکپن نہ گیا بعد مرگ بھی
تختے پہ غسل کے جو لٹایا اکڑ گئے

ص ۲۲۱

مرزا ہادی رسوا نے میری کوریلی کے ایک جاسوسی ناول کا ترجمہ 'خونی مصوّر' کے عنوان سے ۱۹۱۹ء میں کیا تو اس ترجمے کی مقبولیت کے سبب تقریباً ہر جاسوسی ناول کے ترجمے کا عنوان 'خونی' کے اضافی لفظ کے ساتھ قائم کیا جانے لگا۔ خود مرزا ہادی رسوا تک نے اپنے ترجموں میں یہی صورت برقرار رکھی۔

تیرتھ رام فیروز پوری کے تین تراجم "خونی چکر"، "خونی تلوار" (دو جلدیں) اور "خونی ہیرا" (دو جلدیں) میں 'خونی' کا لفظ مشترک ہے۔ اسی طرح طبع زاد لکھنے والوں نے بھی مقبولیت کے پیشِ نظر اس 'لفظ' کو خوب برتا۔ ایک مختصر فہرست ملاحظہ ہو:

'خونی بھائی' (ناول) از فدا علی خنجر مطبوعہ: ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء
'خونی بہن' (ناول) از سید شہنشاہ حسین مطبوعہ: " " ۱۹۲۲ء
'خونی ٹولہ' (ناول) از بی۔ ایس نسیم مطبوعہ: خواجہ محمد شفیع لاہور۔ س۔ ن
'خونی ملّاح' (ناول) مطبوعہ: انڈین پریس لکھنؤ۔ س۔ ن
'خونی بہرام' (ناول) از نور محمد عشرت مطبوعہ: فضل بک ڈپو لاہور، س۔ ن
'خونی ہتکڑی' (ناول) از احمد اللہ خاں مطبوعہ: شمس المطابع آگرہ، س۔ ن

'خونی کی پہچان، (ناول) از طالب الہٰ آبادی مطبوعہ: ۱۹۲۹ء
خونی کی پیاس، (ناول) مطبوعہ: دارالاشاعت پنجاب لاہور، ۱۹۲۶ء
سو کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ہاں جاسوسی ادب قاری کو پسند یا ناپسند کے زیر اثر ترجمہ ہوا۔

ہماری جاسوسی دنیا کے بے تاج بادشاہ منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے آرتھر کانن ڈائل، مارس لیبلانک، ولیم لیکو، فری مین ولز کرافٹس، ویلنٹائن ولیمز، ایلن اپسرڈ، رچرڈ ہنری سیویج، جیکس فیوٹرل، چارلس میک اوائے، ایڈگر ویلس، لارڈ فریڈرک ہملٹن، ای فلپس اوپنہم، جے۔ ایس۔ فلیچر، سیکس روہمر اور گئی بوتھبی کے لگ بھگ پچاس جاسوسی ناول اردو میں منتقل کیے، جن میں سے بیشتر کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل تھے مثلاً ویلنٹائن ولیمز کا ضخیم ناول "تلافی گناہ"، "لنگڑا جاسوس"، اور "کلب فٹ کا جاسوس" کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔

تیرتھ رام فیروز پوری کے یہ تراجم اوّل اوّل نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب (لاہور۔ امرتسر۔ جالندھر) اور رلال برادرس لاہور نے ۱۹۳۹ء سے قبل شائع کیے تھے۔ بعد میں ان تراجم کو کتابی دنیا سیالکوٹ روڈ لاہور نے شائع کیا۔ ان تراجم میں سے اکثر اب نایاب ہیں جیسے سیکس روہمر کے ناول کا ترجمہ "فو مانچو کی تلاش"۔

ویلنٹائن ولیمز کے ناول "دی تھری آف کلبز" کے ترجمے "چڑیا کی ٹکی" کے ابتدائیے سے نمونہ ملاحظہ ہو:

"عالی شان سفارت خانے میں محفل رقص جاری تھی۔
امریکہ کی کانفرنس اسلحہ کے اختتام پر ڈیلیگیٹوں کے اعزاز میں سفیر ارجنٹائنا کی طرف سے جو جلسہ منعقد ہوا تھا، اس کے لیے ملک کے بہترین سازندے طلب کیے گئے تھے۔ جو اپنی دردناک لے سے روحوں پر کیف طاری کرتے تھے۔ ارجنٹائن کے میدانوں کے آتش افروز نغمے تاروں کی چھانوں میں کیے ہوئے عشق جانستاں کی یاد سے بریز واشنگٹن کے بیشتر اہل کاروں کو جو اس بزم میں شریک تھے، ناچ جاری رکھنے پر اکساتے اور رُخ تاباں کی یاد تازہ کرکے اُن کے سینوں کو برماتے تھے۔"

لعل مقدس، از ایلن اپسرڈ "THE ACCUSED PRINCE" کا ترجمہ ۱۴ ابواب پر مشتمل ناول۔
ابتدائیہ سے نمونہ:

"سہپہر کا وقت تھا اور ہیگنز برگ کے قصر شاہی کے ایک حصے میں شہ دروازے کے سامنے ایک سلحشور سپاہی وردی پہنے سنگین چڑھائے بے تابی سے ادھر ادھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ چونکہ جولائی کا مہینا تھا اور آفتاب کی رخصتی کرنیں سیدھی اس کے منہ پر آکر لگتی تھیں، اس لیے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ کبھی اپنی ٹوپی کو ہلانے کبھی رومال سے پسینا پونچھنے کو کھڑا ہوجاتا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ پانچ آدمیوں کی جماعت سامنے کے میدان سے اس کی طرف چلی آتی ہے۔"

قدیم عہد کے دیگر مترجمین کے مندرجہ ذیل تراجم اپنے اپنے زمانے میں خاصے مقبول رہے:

یادگار شرلک ہومز، از آرتھر کانن ڈائل / فیروز الدین مراد ۱۹۲۹ء سے قبل
شرلک ہومز کا پہلا کارنامہ، " / " "
حکایات شرلک ہومز، " / " "
خونابۂ عشق، " / " لاہور ۱۹۲۱ء
فاتح یورپ یا اسرار دربار نپولین، " / رفیع احمد خاں - لکھنؤ ۱۹۲۱ء
مجلس ہفت ملوک، X / غلام مصطفٰے رسا حیدر آبادی- ۱۹۲۹ء سے قبل
ورس عشق، X / مرزا خاں دہلوی "
الماس یعنی ہیروں کا بادشاہ، X / غلام حسین پشاوری "
تگنڈم، X / دوارکا پرشاد افق "
دو جہاں کی سیر، از میری کوریلی / X فیروز پور- ۱۹۰۸ء
روح لیلیٰ، " / X س.ن
رموز قدرت، " / راجا محمد افضل خاں س.ن
زسکا، " / پنڈت ملک راج شرما آنند لاہور ۱۹۱۸ء
جذبۂ انتقام، " / ایم۔ ایچ۔ حیدری کتاب گھر راولپنڈی س ن

انگریزی جاسوسی ادب کے نئے ناموں میں ارل اسٹینلے گارڈنر مغرب اور مشرق ہر دو اطراف
یکساں مقبولیت کا حامل نام ہے۔ ۱۹۶۲ء سے پہلے انور پبلشرز نے اس کے درجن بھر ناول ترجمہ
روائے اور شائع کیے جس کے فوراً بعد یہ نام اردو کے ترجمہ شدہ جاسوسی ادب پر چھا گیا۔ ارل
ٹینلے گارڈنر کے تمام ناول پیری میسن جاسوس کے کارناموں سے متعلق ہیں۔ اردو میں مغرب کے
ن جاسوسی ناول نگاروں کے تراجم سب سے زیادہ ہوئے ان میں جیمز ہیڈلے چیز، رچرڈ ایس- راتھر،
رٹر براؤن، اے۔ اے فیئر، الیسٹر میکلین، بیرام سٹوکر، آرتھر۔ ای۔ ہر ٹزلر، ڈان بیلانی، مائک بریٹ،
یڈگر ویلس، آئین فلیمنگ، جان ڈکسن کار، جین بروکس، برٹ ہالیڈے، جان کریزی، مچل ایوالون،
وز میکڈانلڈ، ڈینس ویٹلی، رچرڈ ماش، جان ہملٹن، میری شیلے، گوتھری جونیئر اور اگاتھا کرسٹی کے
م بہت نمایاں ہیں۔

جاسوسی ادب کی اس گہما گہمی کے سبب اردو کے بہت نمایاں ادیبوں نے بھی مرزا ہادی رسوا کی
رح جاسوسی ادب کے ترجمے کیے۔ اس خصوص میں پنڈت ملک راج شرما آنند (زسکا، یا ارواح
کے ظہور کا راز — از میری کوریلی)، راجا محمد افضل خاں (رموز قدرت، از میری کوریلی) آغا شاعر
زلباش (جلوہ) شوکت تھانوی (۲۰۱۴) محمود نظامی (نیلی بستیاں، از گوتھری جونیئر) اور کمال
احمد رضوی (راجا ایگرائیڈ کا قتل، — (میسوپوٹامیہ میں قتل — از اگاتھا کرسٹی) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ جاسوسی ادب سے دل چسپی کا اظہار ۱۹۰۲ء میں علمی اور سائنسی تراجم
کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا، جب پانی پت سے ۱۹۰۲ء میں جاسوسی قصے نام کی ایک انتھالوجی
شائع ہوئی، لیکن ہمارے ادب کے ناخداؤں نے جاسوسی ادب کو تا حال مان کر نہیں دیا۔

مظہر امام
AMIR MANZIL,QILAGHAT,
DARBHANGA-846004.

ترقی پسند ادبی تحریک: بے سمت سفر

مجھے پرانے کاغذات میں اپنے ایک مضمون کا مسودہ مل گیا جو اب سے ۳۶-۳۷ سال پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کلکتہ کی نشست میں پڑھا گیا تھا۔ اس پر تاریخ تحریر ۳ راگست ۱۹۵۲ء درج ہے۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے زوال کے آثار ۵۲-۱۹۵۱ء سے ہی نمایاں ہونے لگے تھے اور اس کی ذمہ داری بطور خاص اس تحریک کے ایک مخصوص گروہ پر تھی، جسے قافلہ سالاری کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ لیکن ان پر تنقید خواہ دبے دبے الفاظ میں نجی محفلوں میں کی جاتی ہو لیکن کھل کر ان کی بابت اظہار خیال نہیں ہوتا تھا۔ زیر نظر مضمون غالباً اردو میں پہلا مضمون تھا جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے "اکابرین" پر دو ٹوک انداز میں تنقید کی گئی تھی۔

اس تحریر کی محرک دراصل وہ بحث و تمحیص ہے جو کلکتہ کی انجمن میں پڑھے گئے بسنت کمار چٹرجی کے ایک افسانے کے سلسلے میں ہوئی۔ چٹرجی ان دنوں کلکتہ کی اردو صحافت سے وابستہ تھے اور کبھی کبھی افسانے لکھا کرتے تھے۔ آج کل غالباً وہ دہلی میں ہیں۔ اس مضمون کو کلکتہ کے مشہور صحافی ابراہیم ہوش روزنامہ آزاد ہند کے ہفتہ وار اڈیشن اجالا میں شائع کرنا چاہتے تھے، مگر پرویز شاہدی بوجوہ اس کی اشاعت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی خواہش کے احترام میں یہ مضمون تاحال غیر مطبوعہ رہا۔]
مظہر امام

بسنت کمار چٹرجی کا وہ افسانہ جس کا عنوان انھوں نے "اُف!" مقرر کیا ہے، گذشتہ کئی نشستوں سے ہماری انجمن میں زیر بحث ہے۔ چٹرجی نے بڑے ردّوکد کے بعد دبی زبان سے قلنکیک آمیز لہجے میں تسلیم کر لیا ہے کہ: "ممکن ہے یہ افسانہ ترقی پسند نہ ہو!" چٹرجی کے اس اعتراف پر ہم نے بڑی مسرت کا اظہار کیا ہے اور یہ اعلان کرتے ہوئے ہماری آنکھیں چمک اٹھی ہیں کہ بسنت کمار چٹرجی نے اپنی شکست مان لی ہے۔ یہاں میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ

محض اعتراف شکست ہی ترقی پسندی نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ چیٹرجی کا اعتراف شکست کہیں خود ہماری شکست تو نہیں! وہ اپنے افسانے پر کیے گئے اعتراضات سن کر فرماتے ہیں کہ "اگر میں آپ کی جگہ کھڑا ہو جاؤں تو اس افسانے پر یہی اعتراضات کر سکتا ہوں" ان کے خیال میں وہ ہم سے (یعنی ترقی پسندوں سے) الگ دوسری جگہ کھڑے ہیں، حالانکہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی وابستگی نئی نہیں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری آپس میں کوئی نظریاتی ہم آہنگی نہیں اور ہماری انجمن ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کی صراحت کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اگر تنہا ایک فرد کی ذات اس تذبذب اور تشکیک کا شکار ہوتی، تو اس قدر فکرمند ہونے کی بات نہیں، لیکن میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انجمن کے دوسرے اراکین بھی اسی نوع کے نظریاتی تذبذب کے شکار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے ترقی پسندی کا واضح شعور پیدا کرنے کی بجائے اذہان کے آئینے کو مزید مکدر کیا ہے۔ میری دانست میں اس کی براہ راست ذمہ داری ترقی پسند ادبی تحریک کے رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ میں اپنے اس الزام کی تائید میں ترقی پسند تحریک کی گذشتہ سترہ سالہ تاریخ کا مختصر جائزہ پیش کرتا ہوں:

۱۹۳۵ء میں ملک راج آنند، سجاد ظہیر وغیرہ نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۶ء میں پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں انجمن کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی اور اسی وقت سے ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد سجاد ظہیر، احمد علی، اختر حسین رائے پوری وغیرہ کی کوششوں سے ہوا۔ اسے جواہر لال نہرو، حسرت موہانی، مولوی عبدالحق، نیاز فتحپوری وغیرہ کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ پہلے منشور کے تحت انجمن کا مقصد یہ قرار پایا کہ "ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"

۱۹۳۶ء کی کانفرنس میں ان باتوں کے ساتھ ساتھ "سائنسی عقلیت پسندی" پر کافی زور دیا گیا۔ اسی کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں "انگارے" کے نام سے افسانوں کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا، اسے ترقی پسند ادبی تحریک کے ہراول کی حیثیت حاصل ہے۔ احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کی ان کہانیوں میں مذہب، اخلاق اور مروجہ رسم و رواج پر نہایت رکیک اور غیر سنجیدہ حملے کیے گئے تھے۔ آپ اسے ادبی دہشت پسندی سے تو تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے کسی نہج سے ترقی پسند ادب کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ ۱۹۳۶ء سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے اوائل تک جو ادب پیدا ہوا، وہ بڑا امید افزا تھا، لیکن اس کے بعد ترقی پسندی کے نام کا اس بری طرح استحصال کیا جانے لگا کہ اب ہم صرف کف افسوس ملتے ہیں اور اپنی خفت کا اظہار کرتے ہیں۔ محمد حسن عسکری کا رسوائے زمانہ افسانہ "پھسلن" ترقی پسندی کے سرکاری جریدے "نیا ادب" میں شائع ہوا۔ جنسی کجروی کے سارے مظاہر ترقی پسندی کے نام پر بے نقاب کیے جانے لگے اور فرائیڈزم سائنسی تحقیق کی معراج کمال قرار پایا۔ خود ترقی پسند نقادوں نے "لحاف" اور "بو" کی قصیدہ خوانی کی۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوران جنگ کا سارا ادبی سرمایہ مریضانہ جنس پرستی کا شکار ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے بہترین نمونے دوران جنگ ہی میں سامنے آئے۔

لیکن جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اس دور کے ادب پر "اعصابی تناؤ" حاوی ہے۔ محض "اعصابی تناؤ" تک ہی بات ختم نہیں ہو جاتی۔ اس دور کے ادب میں گھٹا گھٹا ماحول، تنہائی کا شدید احساس، یاسیت، مریضانہ بے عملی جیسے مظاہر بہ افراط ملیں گے۔ افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ ایسا ادب کیوں معرض وجود میں آیا، زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ ترقی پسندی کی آڑ میں اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، ترقی پسندی کے نام پر ہوتا رہا۔

اب ۱۵ اگست ۴۷ء کو ذہن میں رکھیے۔ پورن چند جوشی کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی کے رول کے اثر کی وجہ سے ہمارے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے بھی آزادی کا جشن منایا۔ سردار جعفری نے، جو بقول کرشن چندر "ترقی پسند تحریک کے روح رواں ہیں" اعلان کیا کہ:

میری محبوب دلی

اب سے خود کام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے

اور انھوں نے سارے ایشیا کو مسرور ہونے کی دعوت دی۔ کیفی، جان نثار اختر اور مجاز کی نظمیں بھی کم و بیش ایسے ہی خیالات کی حامل ہیں۔ اس کے برعکس فیض نے، جسے خود سجاد ظہیر نے مسلم لیگی تسلیم کیا تھا، پاکستان حاصل کرنے کے باوجود اس آزادی کے بارے میں اس طرح کے تاثرات پیش کیے:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر

اور

کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی

اور

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

کیا ہم یہ سوچنے پر مجبور نہیں ہو جاتے کہ فیض نے سردار کے مقابلے میں اس وقت زیادہ ترقی پسندی کا ثبوت دیا! یہ بات بھی کچھ کم مضحکہ انگیز نہیں ہے کہ سردار جعفری کی متذکرہ بالا نظم جو علی گڑھ میگزین میں "جشن آزادی" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اب "خون کی لکیر" میں "خواب" کے نام سے شامل کی گئی ہے۔ اس آزادی کو فریب سے تعبیر کرنے کی توفیق سردار جعفری کو اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک کمیونسٹ پارٹی نے مارچ ۴۸ء میں بی۔ ٹی۔ رندیوے کی سرکردگی میں باضابطہ ایک انتہا پسند ULTR-LEFTIST اور SECTARIAN MANIFESTO منظور نہیں کیا۔ منٹو کے مجموعہ "چغد" پر جو دیباچہ سردار جعفری نے لکھا ہے اور جس پر ماہ تحریر مارچ یا اپریل ۴۸ء درج ہے، ترقی پسندوں کو مزید شک و شبہ میں مبتلا کرتا ہے۔ اس مجموعے کے ہر افسانے کی بلا تخصیص غیر معمولی طور پر تعریف و تحسین کی گئی ہے، حالانکہ اس مجموعے کے شاید ہی کسی افسانے کو ترقی پسند تسلیم کیا جا سکے۔ اسی مجموعے میں ایک کہانی "جانکی" بھی شامل ہے جو اپنے قریبی ملنے والوں کو اپنا جسم "بڑے خلوص سے" سپرد کرتی ہے۔ اس کہانی کے "کردار" میں (جو خود منٹو ہے) کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ننگی جانکی کو دور پڑی ہوئی شلوار دے دیا کرے تاکہ [illegible] کہانی میں ترقی پسند عنصر تلاش

کرنے میں ناکام رہا۔ لیکن وہی منٹو جو کمیونسٹ پارٹی کی عملی پالیسی کے باوجود ترقی پسند تھا، پاکستان منتقل ہونے کے بعد محمد حسن عسکری سے اپنی کتاب "سیاہ حاشیے" پر دیباچہ لکھوا لینے کے باعث مطعون اور گردن زدنی قرار پایا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ منٹو تو ہمیشہ سے رجعت پسند تھا، پتا نہیں ہم کیسے اسے اپنوں میں شمار کرتے رہے۔ ایسا محض اس لیے ہوا کہ جس وقت سردار نے "چغد" کا دیباچہ لکھا تھا، اس وقت تک کمیونسٹ پارٹی سے منٹو کا "ناجائز تعلق" باقی تھا' لیکن جب عسکری کی معیت میں ایک "اسلامی مملکت" سے اس کے جائز یا ناجائز تعلقات قائم ہوئے اور اس نے ترقی پسندوں کے خلاف ایک مضمون بھی لکھا جو ساحر لدھیانوی کی کوششوں سے چھپ نہیں سکا، تو اس کی ساری کہانیاں حتیٰ کہ "قانون" اور "دیوانہ شاعر" تک نظر انداز کر دی گئیں۔

مئی ۱۹۴۹ء کی بھیمڑی کانفرنس ترقی پسند ادیبوں کے لیے دس گیارہ سال بعد ایک نیا منشور لائی۔ منشور جیسا تھا، وہ تو خیر تھا ہی۔ لیکن اس کے بعد ترقی پسند ادب کے سالاروں نے جو ہنگامہ برپا کیا، اس کی مثال کم از کم ہندستان کے کسی ادب کی تاریخ میں تو نہیں ملتی۔ سردار جعفری نے گزشتہ ۱۵ سالہ ترقی پسند ادب کو سراسر رومانوی بتایا اور انھیں اپنی تازہ ترین نظم "رومان سے انقلاب تک" کے علاوہ سارے اشعار بے اثر نظر آنے لگے خواہ ان کے اپنے اشعار ہوں یا کسی اور کے ۔ حتیٰ کہ خود ان کی اپنی نظم "نئی دنیا کو سلام" بھی۔ اس دور میں ایسے مافوق البشر کرداروں کی تخلیق کی گئی جو سنجیدہ اذہان کو انتہائی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ مہندر ناتھ کے کرداروں "ایک ہی شب میں" (OBERNIGHT) "اپنے طبقے سے الگ" DE-CLASS ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک DE--CLASS ہونے کے لیے سگریٹ کی بجائے بیڑی پینا کافی ہے۔ کرشن چندر کی ایک چینی لڑکی، جو بمبئی میں پھول بیچتی ہے، ایک ہی سال میں عصمت فروشی کیے بغیر محض پھول بیچ کر چین جانے کا کرایہ جمع کر لیتی ہے (ہماری موجودہ حکومت میں پھول بیچنے والیاں بھی اتنی خوش حال ہیں) اور انقلاب کے بعد وہاں پہنچ کر اسکول مسٹرس بن جاتی ہے اور جب کوریا میں لڑائی چھڑتی ہے تو وہ نرس بن کر محاذ جنگ پر چلی جاتی ہے اور پھر اس کا کٹا ہوا سر بمبئی کے ہفتہ وار "بلٹز" میں شائع ہوتا ہے۔ یہ کردار آپ کو کرشن کی مشہور کہانی "میں انتظار کروں گا" میں ملے گا، جس کی تعریف میں احتشام حسین بھی رطب اللسان ہیں۔ اس طرح کے کرداروں میں اور پرانی داستانوں کے جنّوں، دیووں اور پریوں میں بڑی مماثلت ہے۔ اردو کے ترقی پسند ادیب دور کی کوڑی لانے میں ماہر ہیں۔ حال ہی میں "فروزاں" کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے جس کے دیباچے میں جذبی نے یہ بھی لکھا ہے: "ہم میں سے اکثر ترقی پسندی کی رو میں ادب کے تقاضوں کو بھول گئے۔ چنانچہ اس دوران میں جو ادب پیدا ہوا ہے اسے ہم مشکل ہی سے ادب کہہ سکتے ہیں۔"

۱۹۵۰ء میں کمیونسٹ پارٹی نے پھر اپنی پالیسی بدلی۔ نتیجتاً ترقی پسند ادب میں بھی "متحدہ محاذ" کا نعرہ بلند کیا جانے لگا اور وہ سارے ادیب جنھیں ہم نے اپنی "ذات" سے خارج کر دیا تھا، غیر مشروط طور پر واپس بلائے جانے لگے۔ اور ہم نے اپنے رسائل کی آغوش ان کی بے معنی

اور غیر ترقی پسندانہ تحریروں کے لیے بھی وا کردی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے لیے ایک نئے منشور کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے اور مرکز کو چھوڑ کر انجمن کی ساری شاخیں اپنے طور پر منشور کا خاکہ تیار کررہی ہیں' اور وہ بڑے خلوص سے ترقی پسند ادبی تحریک کو آگے بڑھانے کی مساعی میں مصروف ہیں' لیکن ہمارے نام نہاد "رہنما" کیا کر رہے ہیں؟ سردار جعفری کے خیال میں اردو کے عظیم ترین شعرا کیفی' نیاز حیدر اور مجروح ہیں۔ وہ کلکتہ کی امن کلچرل کانفرنس (اپریل ۵۲ء) پر منعقدہ مشاعرے میں بار بار اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ نیاز حیدر کی ایک معمولی نظم کو امن پر لکھی ہوئی ساری اردو نظموں میں افضل ترین سمجھتے ہیں' حالانکہ اس نظم کا موضوع "امن" ہے ہی نہیں۔ وہ سامعین کے بار بار اصرار اور مطالبے کے باوجود مناسب وقت پر پرویز شاہدی کو اپنا کلام سنانے کا موقع نہیں دیتے۔

گروپ بندی کا اس سے بھی بدتر نمونہ اس مجموعے میں ملے گا جو مکتبۂ شاہراہ کی طرف سے ہر سال "بہترین ادب" کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ ان انتخابات سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) سال کا بہترین ادب وہی پیش کر سکتا ہے جو کئی سال سے رسائل میں چھپتا رہا ہو اور شہرت حاصل کر چکا ہو یا خود مجموعہ کا مرتب ہو یا مرتبین سے قریبی تعلقات رکھتا ہو۔

(۲) ایسا ادیب یا شاعر سال کے بہترین ادب میں شامل ہونے کے لائق ایک ہی چیز پیش کر سکتا ہے۔

(۳) اور وہ ہر سال ایک ایسی چیز ضرور پیش کرتا ہے جو سال کے بہترین ادب میں جگہ پا سکے۔

(۴) کوئی ایسا ادیب اچھا ادب پیش نہیں کر سکتا جو بہار یا بنگال میں رہتا ہو۔

(۵) سال کے بہترین ادب کی بابت فیصلہ کرنے کا اختیار کلی دو چار خاص لکھنے والوں کو اور بالخصوص سردار جعفری اور پرکاش پنڈت کو حاصل ہے۔

اس عصبیت اور حلقہ بندی کے باعث ہمارے ادب کی شاخیں مرجھانے لگی ہیں۔ کرشن چندر کے تازہ افسانے "چار ہزار ایک سو بہتر لڑکیاں" کو لیجیے۔ ماحول کی غلط پیش کش سے صرف نظر کیجیے۔ صرف کرداروں کو دیکھیے۔ اس افسانے میں تین خاص کردار پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک پرویز بھی ہے جو شاعر ہے' کلکتے میں عرصے سے رہتا ہے اور بہار کا رہنے والا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور کردار ہیں۔ انجم' جو مالیگاؤں کا ایک شاعر ہے' دوسرا رمیش۔ کلکتہ والے انجم اور رمیش کو تو آسانی سے نہیں پہچان سکتے لیکن ان کے لیے پرویز کو پہچاننا بہت آسان ہے۔ یہ کہانی کلکتہ کی طوائفوں سے متعلق ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کہانی میں پرویز کو غلط رنگ میں پیش نہیں کیا گیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے کرداروں کی شخصیت پوشیدہ رکھنے اور ایک کو ظاہر کرنے میں کون سی ترقی پسندی کارفرما ہے؟

پرکاش پنڈت نے امن کلچرل کانفرنس پر جو ایک سطحی مضمون لکھا ہے' اور جسے وہ بزعم خود رپورتاژ کہتے ہیں' اس میں مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہیں پرویز شاہدی کا نام نہیں لیا گیا' حالانکہ مشاعرے میں انھیں دوسرے تمام "برگزیدہ" ترقی پسند شاعروں سے زیادہ داد ملی تھی اور جن کی نظم حاصل مشاعرہ تھی۔

آج سے تین چار سال پہلے شائع شدہ "نیا ادب" کے "آزادی کی منزلیں" نمبر (جنوری فروری ۱۹۴۸ء) کو گروپ بندی کی معراج سمجھنا چاہیے جس میں مرتبین سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی دس دس بارہ بارہ چیزیں شامل تھیں، لیکن اس میں پریم چند کے اس تاریخ ساز خطبے کے لیے بھی جگہ نہ نکل سکی جو انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ اس خاص نمبر کی جانب داری سے دل برداشتہ ہو کر احمد ندیم قاسمی نے بھی ایک سخت مضمون "نقوش" میں لکھا تھا۔

آپ خواہ جو بھی تاویل کریں اور اپنے دل کی تسلی کے لیے جتنے جواز بھی چاہیں، تلاش کر لیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ کے ذہن میں بھی بار بار یہ سوالات گونجتے ہیں کہ ہم ترقی پسندوں کے یہاں گروپ بندی، حلقہ پروری، احباب نوازی اور عصبیت کے اتنے گھناؤنے جراثیم کیوں پرورش پا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم ان سوالات کے جوابات تلاش نہیں کر لیتے، ہماری ترقی پسند ادبی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی، آج ہمارے ادب پر بحران طاری ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ ہمارے یہاں گزشتہ پانچ چھ سال کے دوران قدر اول کا کوئی نیا لکھنے والا پیدا نہیں ہوا۔

گزشتہ بہار ریاستی اردو کانفرنس (۱۹۵۰ء) کے موقع پر پٹنہ میں ڈاکٹر عبدالعلیم نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے تنظیمی امور پر گفتگو کرتے ہوئے ہم لوگوں سے کہا تھا کہ مرکز سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب تنظیم کے تعلق سے انھوں نے سردار جعفری اور راجندر سنگھ بیدی کو خطوط لکھے تو انھیں وہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ شہرت حاصل کر لینے کے بعد ان قافلہ سالاروں کو تحریک سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک بڑی تیزی سے آگے بڑھی تھی، مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ایک موڑ پر آ کر رک گئی ہے۔ آپ چٹرجی کا مرض تو دریافت کر لیتے ہیں، لیکن اس مرض کے اسباب پر کبھی غور نہیں کرتے۔ گزشتہ ۱۷ برسوں کے دوران ترقی پسند ادبی تحریک کے مختلف موڑ آئے ہیں، اور ہر موڑ پر ہم نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ اس سے پہلے کا موڑ ایک فریب تھا۔ ایک نیا لکھنے والا، جس کے ذہن و شعور کا افق ابھی وسیع نہیں ہوا، لازمی طور پر انتشار و اختلال میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ ان چیزوں کو ترقی پسندی سے تعبیر کرنے لگتا ہے جو کسی طرح ترقی پسند نہیں ہیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے قافلہ سالاروں کا رویہ اس تحریک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ میری جسارت کو معاف کیا جائے۔ اگر میں یہ عرض کر دوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہمیں فراق کے اس شعر پر عمل کرنا چاہیے:

انھیں دھکیل کے بڑھیں قافلے والے آگے ■■■ قدم اٹھتے ہیں غلط قافلہ سالاروں کے

منیر الدین احمد
Deutsches Orient-Institut
Mittelweg 150
2000 Hamburg 13
West Germany

احمد ندیم قاسمی سے گفتگو

مقام: گُمر فیلڈ نزد ہمبرگ (مغربی جرمنی)
تاریخ: ۲۲ / اگست ۱۹۸۷ء

اردو ادب کی ممتاز شخصیت جناب احمد ندیم قاسمی صاحب ان دنوں یورپ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ آپ ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور اتنے ہی بڑے افسانہ نگار۔ ان دو چیزوں کا ایک شخصیت میں مجتمع ہو جانا بجائے خود ایک غیر معمولی چیز ہے۔ آپ ساتھ کے ساتھ "مجلس ترقی ادب" لاہور، جیسے ادارے کے ڈائرکٹر ہیں اور اردو زبان کا اعلا ترین مجلّہ شائع کرتے ہیں۔ آپ کے رسالے "فنون" کی ہر اشاعت کو پاکستان کے ادبی حلقوں میں ایک معرکہ قرار دیا جاتا ہے جس کے لیے رسالے کا غیر معمولی حجم ہی ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ فنون میں چھپنے والے ادب پاروں کا بلند معیار اس بات کا ضامن ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کے اعزاز میں انگلستان میں تقاریب منعقد ہوئیں۔ جہاں پر اردو ادب و بیان کے پرستاروں نے آپ کو خراج تحسین پیش کیا۔ مغربی جرمنی میں آپ کی آمد ہمارے لیے باعث مسرت اور افتخار ہے۔

منیر الدین احمد: جناب قاسمی صاحب، میں آپ سے پہلا سوال تو یہ کروں گا کہ آپ یورپ اور بالخصوص جرمنی کن توقعات کو لے کر آئے ہیں کیا آپ نے یورپ کو ویسا ہی پایا ہے جیسا کہ آپ نے اُسے اپنی باطنی نظر میں تصور کر رکھا تھا، یا اس سے مختلف؟

احمد ندیم قاسمی: یہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ میرے تصوّرات کے عین مطابق ہے۔ میں بر اعظم یورپ میں آنا چاہتا تھا، مدتوں سے میری خواہش تھی، لیکن حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ دراصل یہ جو قدرتی مناظر ہیں، ان سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ چاہتا تھا کہ اُن علاقوں کی ایک جھلک دیکھوں، جہاں اتنے بڑے بڑے شعرا، اتنے بڑے بڑے ادبا، اتنے بڑے بڑے ڈرامانگار اور اتنے عظیم سائنس داں اور دانشور پیدا ہوئے ہیں۔ تو میرے پاس بہت کم وقت تھا۔ میں ایک دو روز ہی ہر جگہ پر رُکا ہوں، لیکن اپنے احباب کے کرم سے مجھے ادبی حلقوں سے تعارف حاصل ہوا ہے، اِن میں بیٹھ کر، ان لوگوں سے گفتگو کر کے مجھے محسوس ہوا ہے کہ یہ لوگ اپنی عظیم روایات کے علمبردار ہیں اب بھی، اور ان کو آگے بڑھانے میں بڑی محنت اور کاوش کر رہے ہیں۔

منیر الدین احمد: ہم اس بارے میں آپ سے چند اور سوالات بھی کریں گے۔ مگر اس سے پہلے آپ سے چند باتیں آپ کے اپنے ادب کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ادب پر بالخصوص روسی ادب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جرمن ادیب پیٹر شوٹ نے آپ کی کہانی "ایک عورت — تین کہانیاں" کو پڑھتے ہی کہا تھا کہ اس پر چیخوف کا اثر نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا منشی پریم چند کے افسانے پڑھ کر۔ منشی پریم چند ہماری اردو افسانہ نگاری کے یوں سمجھ لیجیے کہ باوا آدم ہیں۔ وہ حقیقت پسندی کے علمبردار تھے افسانے میں، حق کی بات کہتے تھے، سچی بات کہتے تھے۔ جن تجربات میں سے گزرتے تھے، ان کا اظہار کرتے تھے۔ جب میرا مطالعہ وسیع ہوا اور میں نے انگریزی اور فرانسیسی اور جرمن اور روسی افسانہ نگاروں کے افسانے پڑھنے شروع کیے تو میں نے محسوس کیا کہ روس کے افسانہ نگار مثلاً چیخوف اور گوگول اور ترگنیف اور گورکی وغیرہ میرے ذہن کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس معاشرتی تبدیلی کے خواہش مند ہیں، جو انسان کو مساواتِ انسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے آپ بالکل درست فرماتے ہیں کہ میری افسانہ نگاری پر روسی افسانہ نگاروں کا خاصا اثر ہے۔

منیر الدین احمد: اس کے ساتھ ساتھ جس چیز کو قاری آپ کے افسانوں میں محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے افسانوں میں دیہاتی ماحول کو اوّلین درجہ حاصل ہے۔

احمد ندیم قاسمی: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ نگار کو ان موضوعات پر لکھنا چاہیے جو اس کے تجربے اور مشاہدے میں سے گزرے ہیں۔ میں چونکہ دیہات کا رہنے والا ہوں اور دیہات میں میں نے زندگی کا خاصا حصہ بسر کیا ہے۔ میں نے وہاں کے معاشرے کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ وہاں کے معاشرے کے بڑے اہم کرداروں کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے میرے افسانے بیشتر دیہاتی ماحول کے متعلق ہوتے ہیں اور مجھے یہ بہت غلط لگتا ہے کہ کوئی شخص کسی ایسے علاقے، کسی ایسی شخصیت یا انسانی گروہ کے بارے میں لکھے جس سے وہ بالکل متعارف نہیں ہے اور اس کے بارے میں اس نے صرف کتابوں میں پڑھا ہے۔ میں نے ایک بار اپنے ایک اچھے بھلے افسانہ نگار کے افسانے میں دیکھا کہ وہ ریگستان کا ذکر کر رہے تھے اور لکھا تھا کہ حدِ نظر پر انھیں صنوبر کا ایک درخت نظر آ رہا تھا۔ تو انھوں نے صنوبر بھی نہیں دیکھا تھا اور انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ صنوبر پہاڑوں پر پیدا ہوتا ہے۔ تو اس طریق سے جو کچھ اچھا افسانہ نگار بھی تجربے اور مشاہدے کے برعکس کوئی چیز لکھتا ہے تو وہ نکما لکھتا ہے۔

منیر الدین احمد: آپ نے دیہاتی ماحول کے بارے میں اپنی کہانیاں لکھنے کی جو بات کی ہے، وہ مجھے بھی بہت درست لگتی ہے اور جب پرسوں ہم جرمن ناول نگار یوا خیم زائپل (JOACHIM SEYPPE) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تو وہاں پر بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ تو ان سے ہم نے پوچھا کہ آپ برلن پہ اپنے ناول لکھتے ہیں، لیکن رہتے آپ ہمبرگ میں ہیں اور اس سے پہلے امریکا میں رہے ہیں، دوسرے ملکوں میں رہتے ہوئے بھی آپ برلن کے بارے میں ناول لکھتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ میرا برلن میرے سینے میں ہے۔ اب یوا خیم چاہے اس وقت برلن میں نہیں ہے، لیکن برلن

کو وہ اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ان کی ایک اور بات مجھے اچھی لگتی، بہت بھلی معلوم ہوئی، سچی معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ انھوں نے کہا کہ میں بھی دیہاتی ہوں، اگرچہ میں برلن کا رہنے والا ہوں۔ کیونکہ برلن بہت سے دیہات کا مجموعہ ہے۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگی اس لیے کہ انسان کی بنیاد تو دیہات ہی ہے۔ انسان کا آغاز دیہات ہی سے ہوا ہے۔

منیر الدین احمد: یہ شہر بھی جس میں آپ بیٹھے ہیں یعنی ہمبرگ، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پینتیس ۳۵ دیہات کا مجموعہ ہے۔ تو شہر سارے دراصل دیہات سے ہی بنے ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دیہات کی زندگی پر لکھنا دراصل ہماری آج کی شہری زندگی پر بھی لکھنا ہے۔

احمد ندیم قاسمی: جی درست ہے۔

منیر الدین احمد: آپ کا مقام اردو شاعری میں اور بالخصوص غزل میں بہت بلند گنا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کی زبانی ہم اردو غزل کے بارے میں کچھ سُننا چاہتے ہیں۔ آپ کی رائے میں اردو غزل کس رنگ میں جا رہی ہے اور اس میں ترقی کے امکانات کیسے ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں پاکستان میں، پاکستان کا خصوصیت سے ذکر کر رہا ہوں، اگرچہ ہندستان میں بھی غزل لکھی جا رہی ہے۔ لیکن پاکستان میں جو غزل لکھی جا رہی ہے اور خاص طور پر یہ نوجوان شعرا جو آ رہے ہیں، غزل گو شعرا، تو میں نے محسوس کیا ہے کہ نہ صرف ان کی ڈکشن (DICTION) مختلف ہے، ان کی تشبیہات اور ان کے استعارے مختلف ہیں ہم لوگوں سے اور پُرانی کلاسیکی غزل سے، بلکہ وہ سوچتے بھی کسی دوسرے زاویے سے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کسی ایسے زاویے سے جو اس عہد سے مطابقت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس غزل میں بڑی تازگی ہے اور میں غزل کے مستقبل سے پاکستان میں پُرامید ہوں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ آگے چل کر غزل ہی ذریعۂ اظہار ٹھہرے گی۔ اس لیے کہ یہ تیز رفتاری اور سپیڈ کا زمانہ ہے، اور اگر کوئی شخص شاعری کو پسند کرتا ہے تو غزل کا ایک شعر اپنے ذہن میں بسا لے تو دو چار ہفتے اس کے بڑے سکون سے گزر جائیں گے۔

منیر الدین احمد: جب آپ نے غزل کے بارے میں اتنی باتیں کہی ہیں تو ہمیں نظم کے بارے میں بھی کچھ بتائیے۔

احمد ندیم قاسمی: ہاں نظم تو پہلی لائن سے لے کر آخری لائن تک ایک کمپیکٹ (COMPACT) چیز ہوتی ہے۔ اس میں سے ایک آدھ مصرع یا ایک آدھ لفظ بھی خارج کر دیجیے تو پوری عمارت گر جاتی ہے۔ نظم لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ غزل کے مقابلے میں، میں سمجھتا ہوں کہ نظم کی تعمیر اور اس کا WIND UP کرنا بہت دشوار کام ہے۔ میں نے نظمیں تو غزلوں سے بھی زیادہ لکھی ہیں اور مجھے یہ تجربہ ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ دنیا بھر کی شاعری میں نظم لکھی گئی ہے۔ ہم لوگ جو ہیں پاکستان، ہندستان ایران یا افغانستان میں، ہم نے غزل لکھی ہے۔ اس میں ہر شعر انڈیپنڈنٹ (INDEPENDENT) ہوتا ہے، خود مختار ہوتا ہے، آزاد ہوتا ہے، دوسرے شعر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ صرف ردیف قافیہ کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن نظم جو ہے وہ پوری دنیا میں، ہر زبان کی شاعری میں لکھی گئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نظم بھی اتنی ہی بلند اور عظیم صنف ہے شاعری کی، جس طرح غزل۔

منیرالدین احمد : شاید آپ کی نظر سے یہ بات گزری ہوگی کہ گوئٹے جو جرمن زبان کا عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا ہے اُس نے بھی غزل لکھی ہے۔ اُس نے یہ غزلیں فارسی غزلوں سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی : میں نے دو چار تراجم پڑھے تھے ان کی غزلوں کے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہے تو ان میں وہ خواجہ حافظ والا رنگ اور حافظ سے وہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے اشعار میں تسلسل ہے۔

منیرالدین احمد : آج ہمارے ہاں بھی تو غزل مسلسل لکھی جا رہی ہے۔

احمد ندیم قاسمی : غزل مسلسل تو نظم ہو جاتی ہے۔ غزل مسلسل لکھنے کا ایک سلسلہ جو چلا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ جوش ملیح آبادی تو پھر غزل کے مسلسل استاد ہوئے ناں، اس لیے کہ ان کی جو ہیئت ہوتی ہے نظموں کی وہ تو غزل کی ہوتی ہے۔ لیکن وہ مسلسل اشعار یعنی نظم کی صورت میں کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کا موڈ (MOOD) ایک ہونا چاہیے اور ایک شعر دوسرے شعر سے اتنے الگ موڈ کا نہیں ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو جھٹکا محسوس ہو۔ بس اسی کو غزل مسلسل کہہ دیجیے یا کچھ اور کہہ دیجیے۔

منیرالدین احمد : اس سلسلے میں مجھے یہ خیال آتا ہے کہ آپ سے یہ سوال بھی کروں کہ نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کل جب ہم جرمن شاعر پیٹر شوٹ کے ساتھ بات کر رہے تھے تو وہاں پر بھی یہ بات پیدا ہوئی تھی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ پیٹر شوٹ ان لوگوں میں سے ہے جس نے پابند شاعری بھی کی ہے، لیکن اس کی شاعری کا ایک بڑا حصہ نثری نظموں میں ہے۔ اور وہ جرمنی میں خاصا مقبول شاعر ہے اور اس کے علاوہ غیر ملکوں میں بالخصوص مشرقی یورپ کے ملکوں میں وہ بہت بڑا شاعر گنا جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی : نثری نظم کے سلسلے میں میرا نقطۂ نظر جو ہے وہ بالکل واضح ہے۔ کئی دفعہ میں اس کا اظہار کر چکا ہوں، اپنی تحریروں میں بھی۔ بات یہ ہے کہ یہاں اگر یورپ میں نثری نظم لکھی جا رہی ہے اور اگر شوٹ صاحب لکھتے ہیں، تو وہ لکھتے رہیں۔ اس لیے کہ یورپ میں نثری نظم لکھنے کی ایک روایت موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے۔ میں نئے تجربوں کے خلاف نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے نئے تجربوں کا۔ شاعری میں بھی اور افسانہ نگاری میں بھی اور دوسری تخلیقی اصناف فن میں بھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر فن متقاضی ہوتا ہے ایک ڈسپلن (DISCIPLINE) کا، ایک ضبط کا۔ اور پھر شاعری میں جس ڈسپلن کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں صوتی آہنگ اس قدر ضروری ہے کہ اس سے اگر ذرا سا بھی آپ ہٹ جائیں تو آپ صرف نثر لکھتے ہیں نثری شاعری نہیں کرتے۔ اور اگر نثری شاعری اتنی ہی بڑی چیز ہے تو کتنے بے شمار ہمارے نثر نگار ایسے گزرے ہیں، انگریزی میں بھی اور جرمن میں بھی یقیناً ہوں گے، فرنچ میں، اردو میں بھی کہ ان کی نثری تحریروں کے بعض ٹکڑے جو ہیں وہ الگ کر کے رکھ دیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم لکھی ہے۔

منیرالدین احمد : آپ کی ملاقات یہاں پر کئی جرمن ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی۔ میں یہاں پر ایک شخص کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے ساتھ ہماری ملاقات کل بہت خوشگوار تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی مادری زبان جرمن نہیں ہے۔ میں ذکر کرنا چاہتا ہوں گابریل لاؤب......

(GABRIEL LAUB) کا، جو رہنے والا پولینڈ کا ہے جس نے عمر کا کچھ حصہ روس میں گزارا۔ اس کے بعد چیکوسلواکیہ میں رہا اور پھر وہ جرمنی آگیا ہے اور جرمن زبان میں وہ بہت بڑا ادیب سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس کے افورسم (APHORISM) قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کا تاثر گابریل لاؤب کے بارے میں جو ہے وہ چند لفظوں میں بیان کیجیے۔

احمد ندیم قاسمی: اب وہ تو منیر الدین احمد صاحب آپ کے توسط سے اور آپ کی ہی برکت سے ہمیں ان سے متعارف ہونے کی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ تین حضرات سے ہم ملے ہیں اور تینوں کے تینوں شخصیات جو ہیں، ان میں ایسی ایسی خوشگوار خصوصیات میں نے محسوس کی ہیں کہ بہت ہی لطف آیا ہے۔ اس لیے کہ ادیب کو اتنا ہی وسیع القلب اور شگفتہ طبع ہونا چاہیے۔ یہ جن صاحب کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔

منیر الدین احمد: گابریل لاؤب

احمد ندیم قاسمی: جی ہاں گابریل لاؤب، تو یہ کل گفتگو بھی یوں کرتے رہے کچھ انگریزی میں بولتے تھے تو ہماری سمجھ میں آجاتا تھا اور ہم اس سے لطف اندوز ہوتے تھے اور ہم محسوس کرتے تھے کہ یہ جو افورسم لکھتے ہیں تو یہ گفتگو جو کرتے ہیں وہ بھی افورسم پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب وہ جرمن زبان میں بولتے تھے اور آپ سب لوگ ہنستے تھے اور قہقہے لگاتے تھے اور آپ مدد کو آتے تھے ہماری اور ہمیں بتاتے تھے کہ انھوں نے یہ کہا ہے تو ہم اور لطف اندوز ہوتے تھے کہ یہ عجیب وغریب شخص ہے کہ کوئی بھی موضوع چھیڑیے وہ اس کا کوئی ایسا پہلو ڈھونڈ نکالے گا جس سے سارے خوش بھی ہوتے ہیں، آسودگی بھی محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کی گفتگو میں اور ان الفاظ میں یہ محض گپ شپ والی بات نہیں ہوتی، فن ہوتا ہے، تخلیق ہوتی ہے۔ تو میں متاثر ہوا ہوں اس شخص سے۔

منیر الدین احمد: آپ کی ملاقات کل، یہاں یہ جرمن ادیبوں کی ایک محفل میں کچھ اور لوگوں سے بھی ہوئی اور آپ نے وہاں پر اس ادارے کے بارے میں بھی چند باتیں سنیں۔ آپ کیا تاثر لے کر جا رہے ہیں کہ ہم ہمبرگ میں ادیب جو ہیں وہ کس رنگ میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور کس رنگ میں مل کر اپنے فن کی پرورش کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی: مجھے تو بڑی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ جرمن زبان کے لکھنے والے سب مل بیٹھتے ہیں اور بھرپور محفلیں منعقد کرتے ہیں اور اس میں RECITATION ہوتی ہیں یا کہانیاں پڑھی جاتی ہیں، ڈرامے پڑھے جاتے ہیں یا گفتگو ہوتی ہے سب پر۔ تو میں جس معاشرے سے یہاں پہنچا ہوں، تو وہاں تو دو چار ادیبوں کا مل کے بیٹھنا ذرا مشکل ہو رہا ہے آج کل۔ اس لیے کہ ان کی انا کی دھاریں اتنی تیز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرتی ہیں، مل بیٹھنا ادیبوں کا۔ میں تو بہت بڑی بڑی ملک گیر انجمنوں کا عہدیدار رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جتنے بھی تخلیقی فنکار ہیں، وہ یکجا نہیں ہو سکتے۔ عجیب وغریب بات ہے اور آپ یکجا بیٹھے ہیں اور آپ ایک بہت ہی اچھا کام کر رہے ہیں، مثبت کام کر رہے ہیں اور ایسا کام کر رہے ہیں کہ جس سے نوجوان لکھنے والے جو ہیں

ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ میں اس کی داد دیتا ہوں اور کاش ہم بھی اپنے ملک میں اس طرح کی محفلیں برپا کر سکیں۔ ...

منیرالدین احمد: جناب قاسمی صاحب آپ کو ہمارے اس پروجیکٹ کا بھی علم ہے جو انشاء اللہ آئندہ چند مہینوں کے اندر انجام پائے گا۔ ہم یہاں پر آپ کے افسانوں کا ایک انتخاب جرمن زبان میں شائع کر رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی: یہ آپ کا کرم ہے اور آپ ہی کی محنت اور توجہ کی وجہ سے یہ کام ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے مجھے یہ سوچ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ ایک اور عظیم زبان کے پڑھنے والے میرے افسانے پڑھیں گے اور مجھے اشتیاق رہے گا کہ ان کا ردِ عمل کیا ہے۔

منیرالدین احمد: آپ نے کچھ ردِ عمل تو کل اپنی اس کہانی کے بارے میں سن لیا جو یہاں پر پچھلے سال ترجمہ ہوئی تھی اور جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کہانی کو نہ صرف جرمن ریڈیو نے نشر کیا اور مختلف جگہوں پر اس کی RECITATION ہوئی، بلکہ ہندستانی سے ایک جرمن زبان میں چھپنے والے رسالے میں اُسے نقل کیا گیا۔ (یہ رسالہ کیرالا سے شائع ہوتا ہے)

احمد ندیم قاسمی: یہ بہت حوصلہ افزا کیفیت ہے۔

منیرالدین احمد: ہم آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہیں۔ (یہ گفتگو ڈوئچے ویلے، کولون سے نشر ہوئی)

ڈاکٹر سیفی پریمی
"Nigaristan" Zakir Nagar,
NEW DELHI-110025.

راجیندر بہادر موجؔ (فتح گڑھ)

مغلیہ سلطنت کے آخری تاجداروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے دربار کے ذی اثر اُمراکی سازش کا ہدف بن گئے۔ ایک وہ دور بھی تھا کہ نواب محمد خاں بنگش اور سیّد برادرس میں چشمک پیدا ہوئی اور نواب کو مرکز سے دور رکھنے کے لیے انھیں کڑا اور الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔ اسی سیاسی چال نے نواب محمد خاں بنگش کو بددل کر دیا اور وہ اپنی ریاست میں خود مختار حکمراں کی حیثیت سے فرماں روائی کرنے لگے مگر مرکز کی اعانت و بہبود کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تاجدار مغلیہ فرخ سیر کے نام پر شہر فرخ آباد بسایا۔ علوم و فنون کی سرپرستی اور شعرا کی قدر و منزلت کے باعث اس ریاست کو بڑی شہرت ملی۔

نواب احمد خاں بنگش نے مہربان خاں رندؔ کو دیوان ریاست کے عہدے پر فائز کیا۔ میر تقی میرؔ نے دورانِ سفر لکھنؤ چند روز فرخ آباد میں قیام کیا۔ نواب کی کوٹھی "حسن افزا" میں مشاعرہ ہوا۔ میرؔ نے اپنی معروف غزل سنائی۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

مرزا سوداؔ دہلوی اور میر سوزؔ دہلوی نے کئی برس اس شہر میں قیام کیا۔ میر ببر علی انیسؔ لکھنوی نے یہیں مرثیہ نجف اشرف کہا۔

غالبؔ دہلوی یہاں دو ہفتہ رہے اور نواب تجمل حسین خاں کو اپنا کلام پیش کیا۔ دو شعر نہایت مشہور ہیں۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے　　بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زبانہ عہد میں ہے اس کے محوِ آرایش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

مرزا داغؔ دہلوی اس شہر میں وارد ہوئے اور یہاں وہ غزل کہی جس کے دو شعر زند رقا ئین ہیں:-

ہمارے خون کا الزام بھی الزام ہے کوئی　　یوں ہی دبتے ہزاروں دامن قاتل میں رہتے ہیں
کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد یہ کہہ دینا　　تخلص داغؔ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

منشی پورن چند ذرّہؔ کے فرزند، شنکر دیال فرحتؔ لکھنوی، اصل میں جلال آباد ضلع فرخ آباد

کے رہنے والے تھے۔ فرحت کو فارسی، اردو، ہندی، انگریزی چاروں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔

انگریزوں نے فرّخ آباد سے تین میل کے فاصلے پر فتح گڑھ بسایا۔ اس کو فوجی سنٹر اور ضلع کا صدر مقام بنایا۔ سکھوں کی دوسری جنگ میں شکست کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو انگریزی سلطنت میں ملا لیا تھا۔ فتح گڑھ میں مہاراجا دلیپ سنگھ کئی برس نظر بند رکھے گئے۔ بعد میں انھیں انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ نظر بندی کے دوران انھوں نے کئی غزلیں کہیں۔ ایک شعر آج تک مشہور ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سوداگروں پر گہرا اور معنی خیز طنز ہے۔

آئے دل لینے کو اور لے کر گئے جان دلیپ　　کس کی حسرت تھی، نکل آیا، لو ار ماں کس کا

نواب مرزا کلب حسین خاں نادر فتح گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا۔ یہ مقدمہ ان کے اجلاس میں پیش ہوا۔ انھوں نے منیر کو بری کر دیا اور اپنے یہاں مہمان بھی رکھا۔

احمق پھپھوندی معروف و ممتاز مزاح نگار شاعر [محمد مصطفیٰ خاں مداح تلمیذ مولانا احسن مارہروی] جنگ آزادی کے مجاہدین میں تھے۔ طنز و مزاح کے لیے احمق تخلص اختیار کر لیا تھا۔ وہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے فتح گڑھ جیل میں رکھے گئے۔ انھوں نے وہاں بھی شاعری برپا کر دی۔ ایک شعر:

وہی چرچے، وہی بکریں، وہی رونق ہے اے احمق
فتح گڑھ جیل کیا ہے، کانگریس والوں کا دفتر ہے

منشی رام کنور سکسینہ، فارسی، اردو کے معروف شاعر تھے۔ صوفی تخلص کرتے تھے۔ ان کا وطن بھیلپور، تحصیل چھبرامئو ضلع فرّخ آباد تھا۔ ۲ر جولائی ۱۹۲۲ء کو ان کے یہاں ایک ستارا چمکا۔ یعنی "راجیندر بہادر موج"، یہ خاندان ترک سکونت کر کے فتح گڑھ میں آباد ہو گیا۔ وہاں کی تعلیم مکمل کرنے پر اعلا تعلیم کے لیے سینٹ جونس کالج آگرہ میں داخلہ لیا۔ بی اے پاس کیا اور ڈی، اے، وی کالج کانپور سے ایل، ایل بی کیا۔ ۱۹۴۵ء سے فتح گڑھ میں وکالت شروع کی۔ منشی منگو لال سکسینہ اٹاوی کی صاحبزادی شکنتلا موج جیون ساتھی بنیں۔ وہ خود اعلا تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔ بی اے وشارد کی سند کے علاوہ مصنف بھی ہیں۔ تذکرہ شعرائے فرّخ آباد اور ل دمینتی اُن کی معروف تصانیف ہیں۔

راجیندر بہادر موج کی زندگی میں ادبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور انتظامی سرگرمیاں اور کارکردگی موج زن رہی ہے۔ اشارے کے لیے درج ذیل حوالے کافی ہیں۔

(۱) ضلع وکیل سرکاری، (فوجداری) ۲۔ صدر ضلع بار ایسوسی ایشن۔ ۳۔ ممبر انتظامیہ یوپی اردو اکادمی۔ ۴۔ علی صدر یوپی جرائم انسداد کمیٹی۔ ۵۔ نائب صدر بھارت اسکاؤٹ اینڈ گائڈ ایسوسی ایشن ۶۔ رکن مجلس عام انجمن ترقی اردو (ہند) ۷۔ فتح گڑھ میں ان کے نام پر "موج روڈ" قائم ہے۔

شاعری کا آغاز ۱۹۳۵ء سے ہوا۔ اب تک حسب ذیل مقبول اضافے خزینہ شاعری میں ہو چکے ہیں۔

۱۔ طوفان (۱۹۵۴ء) ۲۔ موج وساحل (۱۹۵۸ء) ۳۔ موج در موج (۱۹۸۰ء) ۴۔ ساگر

(۱۹۸۲ء) ۵۔ موجیں (۱۹۸۴ء) ۶۔ لہریں، دو اڈیشن (۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء) اردو اکادمی یوپی سے کئی کتابوں پر انعام مل چکا ہے۔

یہ بات اہل قلم بخوبی جانتے ہیں کہ محرک شاعری، محاسن و معائب شعری کی پرکھ، معانی و بیان کی جانکاری، مستند شعراء کے کلام کا مطالعہ، ادبی انجمن سے وابستگی، اُستادی شاگردی کی رسم، ہم جماعت موزوں طبع ساتھیوں کا حلقہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا بیان شاعر کے حالات زندگی میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ ورق کورا ہے اور ایک سوالیہ نشان؟ اگرچہ کلام میں محاسن شعری کی بھرپور جھگاہٹ ہے۔

یوں تو ہر شعری مجموعے میں لکھنؤ، یونی ورسٹی کے ممتاز پروفیسروں اور اردو اکادمی یوپی کے معزز عہداروں کی قیمتی رائے شامل ہے۔ لیکن تبصرے میں اس کی گنجایش کہاں، اسی لیے یہاں بدایوں اور اکبر آباد کی سندِ اعتبار پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اظہارِ خیال

پروفیسر مولانا ضیا احمد بدایونی

"خوش رو، خوش خو، خوش وضع درمیانہ قد، مسکراتا چہرہ، چمکتی آنکھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چہرے کی مسکراہٹ میں چوٹ کھائے دل کا کرب چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چال ڈھال اور بات چیت سے شرافت و تہذیب نمودار، رواداری اور بے تعصبی آشکار، اگرچہ ہندو ہیں لیکن بزرگان اسلام سے بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ پیشہ وکالت ہے۔ اور مشغلہ شاعری ___ یہ ہیں جناب موج فتح گڑھی۔ میں جب کبھی ان سے ملا، ان کی شرافت اور خوش مزاجی کا اچھا اثر دل پر لے کر آیا۔ اسی تاثیر کا نتیجہ یہ رباعی ہے جو میں نے ان کو ایک زمانے میں لکھ کر بھیجی تھی۔

مجموعۂ اخلاص و صداقت ہیں موج
مدّاحِ شہنشاہِ رسالت ہیں موج
خالق انھیں طوفانِ حوادث سے بچائے
اک گوہرِ دریائے شرافت ہیں موج

موّج کو اردو سے شغف اور غزل سے دلچسپی ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ان کی اعلا صلاحیت کا ثبوت ہیں۔ ان کی زبان صاف اور خیالات پاکیزہ ہیں ___ ان کی غزل میں تصوّف اور عشق حقیقی کی جھلک ملتی ہے جو شاعر کے ستھرے مذاق کی دلیل ہے۔

صرف نظروں سے پردہ داری ہے ۔۔۔ ورنہ ہر شے سے رونما تم ہو

ان کا عشق مجاز بھی پاک اور بلند ہے۔ مثلاً

یوں تو ہنستے ہیں چاند تارے بھی ۔۔۔ ان کی کچھ اور بات ہوتی ہے

مومن کی طرح موج کے مقطعوں میں بھی تخلص کی رعایت کثیر الوقوع ہے۔

وہ کیا گزریں گے طوفاں سے جو اے موّج ۔۔۔ نگاہ موج و ساحل دیکھتے ہیں

(اقتباس از موج و ساحل) [ضیا احمد بدایونی۔ ۲۴، جون ۱۹۵۸ء

موج کے سفینے میں حمد، نعت، منقبت، غزل، رباعی، قطعہ، نظم وغیرہ اصنافِ سخن کے گوہر
تابدار ملتے ہیں۔ نظموں میں صبح نو، گاندھی جی، یوم جمہوریہ، ہولی، عید اضحیٰ، یوم آزادی، عید الفطر،
تالاب کا منظر، تلادان، گرم منظر، اردو زبان، کرشن لیلا، نہ میرے ساتھ چلو، جو میں نہ ساتھ چلوں، تیرے
بغیر (اندرا گاندھی) شامل ہیں۔

انتخابِ غزل

نگاہوں کے تصادم کو زمانہ ہو گیا لیکن — خلش اس حادثے کی آج بھی معلوم ہوتی ہے
جستجو میں تیری ہم اس مقام پر پہنچے — اس قدر اجالا ہے کچھ بھی سوجھتا نہیں
اُن آنکھوں سے آنسو چھلکے — بہ نکلے پتھر بھی پگھل کے
یہی ہو نہ ہو کوئے جاناں ہے شاید — زمیں بھی حسیں ہے فلک بھی حسیں ہے
یہ لگتا ہے روٹھی ہوئی زندگی ہے — بغیر اُن کے ان کی قسم توبہ توبہ
گماں ان کی آواز کا ہر صدا پر — ہر آہٹ پہ ان کا بھرم توبہ توبہ
وہ اُلجھے ہوئے سے سوالات دل میں — وہ حالات کا پیچ و خم توبہ توبہ
وہ بہکی جوانی وہ بہکی نگاہیں — بہکتا ہوا ہر قدم توبہ توبہ

انتخابِ رباعی

تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے — آتی ہے مصیبت تو ٹل جاتی ہے
دانائی و ترکیب سے بگڑی ہوئی بات — انسان سنبھالے تو سنبھل جاتی ہے

چلتے میں شرابِ ارغوانی چھلکے — عارض سے ترے صبح کی سرخی ڈھلکے
گورا سا بدن، اس پہ ہلکا ملبوس — لو شمع کی، فانوس میں جیسے جھلکے

وہ آنا نزاکت سے جھکائے ہوئے سر — وہ پھول سے رُخسار، لچکدار کمر
مدہوش کیے دیتے ہیں ساری محفل — دو مدھ بھرے نینوں کے چھلکتے ساغر

گر تم نہیں آئے تو فضا کاٹے گی — نازک سی کلی، بادِ صبا کاٹے گی
برسات کا موسم، یہ ترشح، یہ بہار — چھو جائے گی جب ٹھنڈی ہوا کاٹے گی

مستی بھرے کجلائے ہرن جیسے نین — چھلکے ہوئے جامِ آتشیں گلابوں کے سُمن
یہ روپ یہ رنگ اندر دھنش بھی شرمائے — یہ ریشمی اعضا، یہ ملائم سا بدن

راجیندر بہادر موج کی غزلوں کا کینوس ہمارے سامنے ہے۔ یہاں رجائیت، گہرا مشاہدہ
حسیت، انسانی زندگی کے تجربے، نفسیاتِ عشق اور اسی ضمن میں SCHOLARS کے اثرات ہیں۔
سیکولر اور سائنسی ذہن کا جلوہ ہے۔ یہ شعر خاص توجہ چاہتا ہے۔

جستجو میں تیری ہم اس مقام پر پہنچے		اس قدر اجالا ہے کچھ بھی سوجھتا نہیں

یہ خیال قرآن کی آیت وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا یعنی تجلی طور سے لیا گیا ہے۔ اس میں سائنسی عنصر بھی ہے۔ بے محابا تجلی حسن کا عالم اور جلوہ بقدر ظرف نظر کی تفسیر بھی۔ اردو شاعری میں محبوب کی سنگ دلی مشہور ہے۔ اس کے ساتھ آئینہ کی نسبت سے پتھر کا پانی ہونا بھی داخل روایت ہے۔ موج نے ایک نیا خیال پیش کیا ہے۔ آنسو کی نسبت سے عشق میں حسن کی سنگ دلی پگھلنے کا تصور سامنے رکھا ہے۔ یہاں کوئے جاناں میں قیامت اور قتل کا منظر نہیں بلکہ فرش تا عرش، حسن ہی حسن ہے۔ محبوب کی نظروہ کافر نہیں جس سے دل کی دنیا ہلتی ہے۔ اور تجلی خانہ لٹ جاتا ہے۔ بلکہ "بات کچھ بھی نہیں بات نظروں کی ہے" یہ جس نظر میں محبت کا جادو بھرا ہے۔ اس سے زندگی اور دنیا کا یا پلٹ ہو سکتی ہے۔

شاعر کی رباعی میں بھی سائنسی اور معروضی نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔ تدبیر عقل اور انسانی کردار، بادیہ پیمائی کو وسعت کو خلائی وسعت کی تسخیر میں بدل سکتا ہے۔ شاعر کے یہاں حسن صرف احترام کی چیز نہیں وہ پرستش کے لائق اور زندگی میں سمونے کی چیز ہے۔ انسانی زندگی کے ساتھ اس میں فطری مظاہر و آثار کو بدلنے کا معجزہ ہے۔ لمحات مفارقت میں سہانی فضا، کچی کلی اور باد صبا سے خلش ہی نہیں ملتی۔ بلکہ نشترزنی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ برسات کی پھوار، قاتل بن جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے بھی دل کسک پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف کسی پیکر رعنا کو دیکھیے تو رفتار میں رقص کی مستی عارض میں صبح شفق اور باریک پیراہن سے۔ گورے بدن کی کرنیں پھوٹتی ہے۔ موج نے خوبصورت ہندی الفاظ کو حسن کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ مثلاً چشم آہو کی جگہ ہرن جیسے نین، جام آتشیں کی بہ جائے گلابوں کے سمن اور قوس قزح کے لیے اندر دھنش کا استعمال نیز ریشمی اعضا وغیرہ فن کی تلاش اور قدرت بیان کا ثبوت ہیں۔ روحانیت اور معرفت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی موج کی رباعیوں میں عزیز سرمایہ ملتا ہے۔

آخر میں شاہ میکش اکبرآبادی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

موج		میری نظر میں۔

جناب راجیندر موج فتح گڑھی، اب ماشاءاللہ ایڈوکیٹ انعامی شاعر و صاحب دیوان ہیں میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ کے طالب علم تھے ابتدا ہی سے ان کے کلام میں جان تھی۔ آمد تھی، اور اپنی عمر سے بہتر کہنے والوں میں تھے۔ اور اب یہ ان کا مجموعہ " موج در موج " آپ کے سامنے ہے۔ کتنی روانی ہے۔ خیالات کتنے پاکیزہ اور بلند ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ان کے انتظار میں عمر مختصر گئی		اِک حسیں فریب میں راہ یہ گزر گئی
اب دلوں میں نہیں تیرا پرتو		عیب پڑنے لگا نگینوں میں
زندگی اِک حسین خواب ہے		آنکھ جھپکی سحر ہو گئی
پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی ہیں		رہرو راہِ عشق سنبھل کے
حسن کی جفائیں بھی کتنی خوبصورت ہیں		آپ کی عنایت کا میں نہیں تمنائی
"اک دلِ حزیں اس پر ظلم کل زمانے کے		کوئی دیکھتا نہیں، کوئی بولتا نہیں"

(میکش اکبرآبادی)

٭٭٭٭٭

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۷۵

نظامِ رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہیدِ جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما
تصحیح و ترتیب ادا جعفری
(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۷۵

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی منشرح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

ڈاکٹر انور سدید بہت کم عمری ہی میں ساٹھ برس کے ہوگئے

آج کل اخباروں اور رسالوں پر ڈاکٹر انور سدید اسی طرح چھائے ہوئے ہیں، جیسے وہ سارے سال دبستان سرگودھا کے بدخواہوں پر چھائے رہتے ہیں۔ ہر طرف ان کی ساٹھویں سالگرہ کی دھوم ہے اور اس مناسبت سے ان کے بارے میں مضامین چھپ رہے ہیں۔ خبریں گھڑی جارہی ہیں اور انٹرویو لیے جارہے ہیں۔ یہ دھوم دھڑکا صرف کراچی اور لاہور تک محدود نہیں، ہندستان کے دارالسلطنت دہلی میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ رسالہ 'کتاب نما' دہلی کے تازہ شمارے میں ان کے بارے میں ایک گوشہ شائع ہوا ہے۔ سنا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس والے ایک خاص پروگرام نشر کرنے کی فکر میں ہیں۔ فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد ڈاکٹر انور سدید تیسرے ادیب ہیں، جن کی سال گرہ اس بڑے پیمانے پر منائی جارہی ہے۔

اس مبارک موقع پر ہم ڈاکٹر صاحب کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ تادیر سلامت رہیں اور زبان وادب کی خدمت کرتے رہیں۔ البتہ ایک بات پر ہمیں بے حد حیرت ہے کہ وہ کم عمری ہی میں ساٹھ برس کے ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ دبستانِ سرگودھا کے دفاع میں ان کی تحریروں کو ہم ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔ ان تحریروں کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ نوجوان ہوں گے۔

ویسے ہی نوجوان جن کے حوالے سے میر حسن کا یہ مصرع مشہور ہے۔ "جوانی کی راتیں مرادوں کے دن"۔ افسوس کہ ہمارے ذہن میں انور سدید نام کا جو نوجوان رہتا تھا" وہ چشم زدن میں پیر شصت سالہ بن گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ پیری یا بزرگی صرف "بہ سال" نہیں "بہ حلم" بھی ہے۔ موصوف پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے پڑھا زیادہ ہے یا لکھا۔ شاید ہی کوئی کتاب ہو جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو اور شاید ہی کوئی موضوع ہو، جسے ان کے اشہبِ جہندۂ قلم نے پامال نہ کیا ہو۔

ساٹھویں سال گرہ کی مناسبت سے جو مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو خود ڈاکٹر صاحب نے 'من آنم' کے عنوان سے لکھا ہے اور دوسرا میرزا ادیب کی شوخیِ تحریر کا نمونہ ہے، جس کا عنوان ہے

اردو ادب کا جمال آفریں مستری" یہ دونوں مضامین "کتاب نما" دہلی میں شائع ہوئے ہیں

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مضمون میں بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں، جو ہمیں معلوم نہیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فلمی رسالوں سے کیا تھا، جن میں ان کے افسانے چھپتے تھے۔ ان افسانوں کی بنا پر انھیں "مصورِ جذبات" کا خطاب دیا گیا تھا۔ حیرت ہے کہ اتنا خوبصورت خطاب ڈاکٹر صاحب نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جب تحریک آزادی کے زمانے میں بہت سے خان بہادروں نے اپنے خطاب واپس کیے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے بھی جذبات کی رو میں اپنا خطاب واپس کر دیا ہو۔ ایسا کر کے انھوں نے اچھا نہیں کیا۔ "ڈاکٹر انور سدید" کی بجائے اگر وہ "مصورِ جذبات انور سدید" کے نام سے مشہور ہوتے تو اچھا تھا۔ بہرحال اب بھی اگر وہ اس خطاب کو استعمال فرمائیں تو کوئی حرج نہیں۔ خصوصاً دبستان فنون کے خلاف ان کے جو مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ تو اس خطاب کا استعمال مضامین کی معنویت میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔

اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "میں نے ایم۔ اے اول بدرجۂ اول پاس کیا۔ میرا ریکارڈ خارجی طلبہ میں اب بھی قائم ہے۔ اس دور میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایم اے میں میرے ساتھ شریک ہوئے، لیکن مجھ سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکے۔ امجد اسلام امجد تو ایک پرچے میں بمشکل پاس ہوئے وقار عظیم صاحب نے ان کی بہت معاونت کی۔"

ڈاکٹر صاحب کو داد دیجیے کہ انھوں نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے بڑی خوبی سے امجد اسلام امجد کے حالات زندگی بھی بیان کر دیے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طرف تو اپنا ریکارڈ قائم کرنے کی دھاک بٹھا دی اور دوسری طرف دبستان فنون کے ایک اہم رکن کا ریکارڈ یہ کہہ کر خراب کر دیا کہ اگر وقار عظیم ان کی مدد نہ کرتے تو وہ کم از کم ایک پرچے میں ضرور فیل ہو جاتے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ امجد اسلام امجد جس پرچے میں فیل ہونے سے بال بال بچے، وہ شاعری یا ڈرامے کا تھا۔ تاہم اہل نظر پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے آج شاعر اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد کو ادب میں جو منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے، اس کا سبب کمزور تعلیمی پس منظر ہے۔

ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دبستان فنون کے نامی گرامی ارکان امجد و عطا اور دبستان سرگودھا کے سپہ سالار ڈاکٹر انور سدید کے درمیان "خوشگوار" تعلقات کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انھوں نے پہلے تو ایم۔ اے کا امتحان ایک ساتھ دیا اور پھر ادبی زندگی کے امتحانوں اور آزمائشوں میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں تینوں کے ساتھ ہیں۔ ہم دبستانوں کے جھگڑے میں غیر جانبدار ہیں۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کون غلط ہے اور کون راہ راست پر ہے۔ ہم تو بس اس سے خوش ہیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے ادبی دنیا میں رونق رہتی ہے۔

مذکورہ تینوں افراد ہم جماعت تھے۔ اس لیے یقیناً ہم عمر بھی ہوں گے۔ معلوم نہیں امجد و عطاء نے اپنی ساٹھویں سالگرہ منانے کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ بہرحال ہم ان کی خدمت میں بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی

اسی ذوق و شوق اور لگن سے ادب کی خدمت کرتے رہیں، جس طرح انھوں نے گزشتہ ساٹھ برسوں میں کی ہے۔

میرزا ادیب نے ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں انھوں نے خاصی کاریگری یا ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ پہلے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف چند نامعلوم لوگوں کے انتہائی سخت جملے درج کیے ہیں (توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک آدھ بے ضرر سا جملہ تعریف میں بھی ہے) اس کے بعد لکھا ہے "انور سدید اردو ادب کی ایک متنازعہ شخصیت ہیں... کیا ایک ایسی شخصیت جس کے متعلق لوگوں کی رائیں متضاد نوعیت کی ہوں ایک اہم شخصیت نہیں ہوتی؟ ہر شخص تو ادب کی ایسی شخصیت نہیں بن جاتا۔ لوگ عام شریف آدمی کے بارے میں سوچنا بھی مناسب نہیں سمجھتے، مگر ایک متنازعہ آدمی کے بارے میں ضرور سوچا جاتا ہے اور ایسے آدمی کے بارے میں رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ جو متضاد ردعمل کا محور بن گیا ہو۔

میرزا ادیب کی کاریگری یہ ہے کہ انھوں نے "متنازعہ آدمی" کو "شریف آدمی" کی ضد بتایا ہے۔ گویا متنازعہ آدمی، شریف آدمی نہیں ہوتا۔ ہم اس اندازِ فکر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور میرزا ادیب سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی بزرگی کا نہ سہی، انور سدید صاحب کی بزرگی کا تو خیال کریں، جو اس مہینے کی چوتھی تاریخ کو ساٹھ برس پورے کر چکے ہیں۔

آگے چل کر مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"انور سدید کو متنازعہ شخصیت کہہ کر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ آپ کو یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ اس آدمی کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ اہمیت نہ ہوتی تو ہمارے نقادوں کے لیے ایک مسئلہ کیوں بن جاتا؟" جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انور سدید آج تک نقادوں کے لیے مسئلہ نہیں بنے، بلکہ اس کے برعکس انھوں نے ہمیشہ نقادوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ مثلاً وہ ہر سال اردو ادب کا جائزہ لکھتے ہیں۔ اس جائزے کو سامنے رکھ کر نقاد فکر انگیز تنقیدی مطالعے قلم بند فرماتے ہیں۔ جو شخص نقادوں کو مقالہ نویسی کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہو، وہ نقادوں کا محسن ہے۔ ایسے شخص کو نقادوں کے لیے مسئلہ قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ میرزا ادیب فرماتے ہیں "انور سدید کی مخالفت کرنے والوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ مختلف ناموں سے کراچی کے اخباروں میں مخالف گروپ کے لوگوں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ سچی بات کہوں گا کہ سدید صاحب کے اس رویّے پر مجھے بھی اعتراض ہے..... کوئی نقاب چہرے پر ڈال کر لکھنا میرے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے۔ کوئی شخص کچھ لکھتا ہے تو اسے سامنے آ کر اپنی تحریر کی پوری پوری ذمہ داری قبول کرنی چاہیے، چھپنا نہیں چاہیے۔

میرزا صاحب نے انور سدید پر جو اعتراض کیا ہے، اس کے بارے میں پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ ان کے مخالفین یہ اعتراض کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں۔ "اس رویّہ پر مجھے بھی اعتراض ہے" گویا میرزا صاحب خود بھی انور سدید کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ میرزا صاحب کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قلمی ناموں سے لکھنا غلط کام ہے۔ اگر یہ کام غلط ہوتا تو پھر احمد شاہ بخاری "پطرس" کے نام سے، اورنگ زیب خاں "قتیل شفائی" کے نام سے اور دلاور حسین "میرزا ادیب" کے نام سے لکھنے کی غلطی نہ کرتے۔ میرزا صاحب خدا کے فضل و کرم سے تین درجن سے زیادہ کتابوں

(باقی صفحہ ۹۷ پر)

وجاہت علی سندیلوی
NUSRAT MANZIL,
SANDILA. (U.P.)

جشنِ بہاراں کی رسمِ اجرا

بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن وہ بتنگڑ محض اس لیے بن گئی تھی کہ اس میں ہمارے دوست حسن طاہر قاضی جو اپنے آپ کو ایچ۔ ٹی قاضی اور ہم سب ان کے دوست انھیں ہیٹ ٹرک قاضی کہتے۔ کسی جملہ معترضہ کی طرح گھس پڑے تھے۔ اور ان پر کچھ ترمیم کے ساتھ غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے گرمی سہی مزاج ہیں، لیکن نہ اس قدر۔ کی جو بھی بات اس میں حماقت ضرور کی۔

ہمارے دوست گلشن پرشاد گلشنؔ کا مجموعہ غزلیات جشنِ بہاراں صدر اردو اکیڈمی کی عنایت اور اکیڈمی کی اعانت سے شائع ہوا تو اتنا تو گلشن صاحب اور ہم اس کے مقدمہ نگار بھی جانتے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے ہم دونوں کے مکانوں کے آگے پچھواڑے تالاب میں کوئی آگ نہیں لگ جائے گی۔ دو معلم الملکوت قسم کے جگادری نقادوں اور ان کے قبیلوں کے درمیان اردو شاعری کے اظہار و ابلاغ کی متعلق پانچ سال سے جو قلمی جنگ چھڑی ہوئی ہے وہ بند نہیں ہو جائے گی یا ہمارے محقق دوست علامہ حوادث بیگ پوری اردو شاعری کو کھنگال کر اپنے پسندیدہ ساڑھے چار شاعروں کی جو فہرست بنائے پھرتے ہیں۔ اس میں ہمارے گلشن صاحب کا نام نہیں شامل ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود ہمیں اپنے علم دوست اور ادب نواز قصبے کے اربابِ ذوق سے ایسی کھلی تنگ دلی بلکہ سنگ دلی کی امید نہیں تھی کہ وہ اس کا ایک سرے سے کوئی نوٹس ہی نہیں لیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور کسی گوشے سے 'واہ' نہ سہی 'آہ' کی بھی صدا سنائی نہیں دے گی۔ گویا سانپ سونگھ گیا ہو سب کو۔

گلشن صاحب بچارے اپنے مجموعے کی پچیس تیس جلدوں پر بہت خوشخط "عقیدت اور احترام کے ساتھ خزاں رسیدہ گلشن کی جانب سے فلاں صاحب کی نذر" لکھ کر پورے قصبے کے ہر اس فلاں صاحب جس کا کوئی تخلص تھا' کی خدمت میں خود جا کر ایک ایک جلد پیش کر آئے تھے لیکن کسی بھی فلاں صاحب کو ٹھیک سے شکریہ ادا کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی بلکہ گلشن صاحب کی روایت کے بموجب بعض حضرات نے تو کتاب کھول کر دیکھی بھی نہیں بلکہ اسے صرف سونگھ کر اپنے سے دور ایسے رکھ دیا جیسے اس میں کوئی قابلِ دست اندازی پولیس والی چیز چھپے ہونے کا اندیشہ ہو۔

مانا کہ کسی ہم عصر کی تعریف کرنے کو اکثر لوگ کم ظرفی سمجھتے ہیں لیکن آخر اس میں کیڑے نکالنے سے انھیں کس نے روکا تھا۔ کچھ نہیں تو جشنِ بہاراں کے لیے یہی کہہ دیا جاتا کہ یہ ایک تیسرے درجے کے شاعر کا چوتھے درجے کا کلام ہے جس پر ایک پانچویں درجے کے مقدمہ نگار نے ایسا واہیات مقدمہ لکھا ہے کہ خود اس پر مقدمہ چلا دیا جانا چاہیے۔ کچھ غزلوں کو خارج از بحر قرار دیا جاتا۔ کچھ ترکیبوں کو غلط اور کچھ بندشوں کو ڈھیلی بتا دیا جاتا، کہیں الف کے گرنے اور کہیں عین کے دبنے کی شکایت کر دی جاتی، کسی شعر پر سرقہ یا پھر سرقے میں توارد کا الزام لگا دیا جاتا، کوئی تنافر لفظی یا شکستِ ناروا ہی پکڑ لی جاتی تو کبھی مجموعے کے مصنف اور مقدمہ نگار کے بہت کچھ آنسو ڈھل جاتے۔ وہ آپس میں کچھ اس قسم کی باتیں کرتے کہ ہوتا آیا ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں، قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری، بندر کیا جانے سونٹھ کا مزا۔ شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنے دلوں کو بہلا لیتے۔ بھاگے بھوت کی لنگوٹی بہت کے مصداق یہ تسلی بھی کم نہیں تھی کہ ہماری تخلیق کے وجود کو کسی نہ کسی طور سے تسلیم تو کیا گیا اور لاکھ ڈنڈی ماردی گئی ہو — اور وہ کب نہیں ماری جاتی، اسے نقد ونظر کے ترازو پر تولنے کے لائق تو سمجھا گیا۔ لیکن یہاں تو خاموشی تھی، سناٹا تھا، ہو کا عالم تھا۔ قبرستان کا نہیں، قبر کے اندر کا اور بقول شخصے کوئی گھاس ڈالنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

ہمارے لیے ذاتی طور سے قصبے میں ادب کے ٹھیکیداروں کی بے رخی کی یہ صورتِ حال ایک طرح سے اور بھی ناقابل برداشت تھی۔ اور وہ یوں کہ ہم دیکھتے کہ گلشن صاحب اس پر نہ صرف شاکر بلکہ کچھ اس انداز سے مطمئن نظر آتے جیسے وہ کسی محفل میں اپنے ساتھ کوئی کیچڑ میں لت پت کتا لے آئے ہوں اور استقبال تو دور رہا وہ اسی کو بہت غنیمت سمجھتے ہوں کہ کسی نے ان پر نظر نہیں ڈالی اور کوئی ان کو اور ان کے کتے کو نکالنے کے لیے ان کے پیچھے نہیں دوڑا۔ انھیں کچھ تو لحاظ چاہیے تھا ہمارے مقدمے کا جو ان کی تصنیف سے زیادہ عرق ریزی سے لکھا گیا تھا۔ اور انھیں کبھی تو ہمارے ساتھ اہالیان قصبے کی بے اعتنائی کے شکوے میں شریک ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ان کی موٹی کھال پر کسی موسم کا کوئی اثر نہ تھا۔

ایک روز سویرے ہواخوری میں ہیبت ٹرک قاضی مل گئے اور ہماری جو شامت آئی تو ہم نے اپنا درد دل ان سے بیان کر دیا۔ کچھ دیر خاموش اور سر ہلاتے رہے اور ہمیں توقع ہوئی کہ اب شاید وہ کوئی سنجیدہ مشورہ دیں لیکن انھوں نے ایک بالکل غیر متوقع سوال داغ دیا۔ آپ کے جشنِ بہاراں کی رسمِ اجرا کس منتری نے کی تھی؟" اور جب ہم نے جواب دیا کہ کوئی رسمِ اجرا ہی نہیں ہوئی تو الٹے ہم سے خفا ہو گئے "جب تک رسمِ اجرا نہیں ہوتی۔ کوئی صاحبِ ذوق کسی کتاب کا نوٹس نہیں لیتا۔ میں خود شادی اور ناجائز تعلقات کے درمیان دعوت ولیمہ کو حد فاصل سمجھتا ہوں۔"

ہم نے جھنجھلا کر پوچھا "اور دیوان غالب کی رسمِ اجرا کب ہوئی تھی؟" قاضی نے

ایسے خوش ہو کر جیسے خود ہم نے ان کے دعوے کی دلیل پیش کر دی ہو جواب دیا" تبھی تو آج تک کسی اکیڈمی نے اس پر کوئی انعام نہیں دیا۔"

اب ہماری سمجھ میں آگیا کہ قاضی بی۔ اے کے امتحان میں تین مرتبہ علاحدہ علاحدہ تین مضامین میں کیوں فیل ہوئے تھے اور ان کا نام ہیٹ ٹرک قاضی کیوں پڑا تھا۔ قاضی نے ہماری خاموشی کو ہماری جہالت پر محمول کیا اور اسے دور کرنے کی کوشش میں بولے " برادرم آج کل کتاب لکھنا اور چھپوانا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ اس کی رسم اجرا کرنا۔ کسی کتاب کا دوسرا اڈیشن چھپتے کم دیکھا ہے لیکن ایک ہی کتاب کی دو دو تین تین بار رسوم اجرا میں شرکت کرنے کا اکثر موقع ملا ہے۔ فتنہ صاحب مسکین کی کتاب ابھی پریس ہی میں تھی کہ قضا کار ان کے قصبے میں ایک منتری جی کسی اسکول کی لائبریری کا اُدگھاٹن کرنے آگئے۔ انھوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اپنے دھوبی کے حساب کی کاپی ہی کو چکنے گوٹے لگے ایک جزدان میں لپیٹ کر رسم اجرا کا فرض پورا کر دیا اور پھر جب کتاب چھپی تو جھک مار کر اکیڈیمی والوں کو بھی اسے انعام دینا پڑا۔ رسم اجرا کے بعد پھر کتاب کی اشاعت کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی جیسے ہمارے قصبے میں تین منتری تین دفعہ آکر آنکھوں کے اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھ چکے ہیں لیکن آج تک اسپتال بننے کی نوبت نہیں آئی۔

ہم قاضی کی اس قسم کی گفتگو پر سوائے خاموش رہنے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ ذرا دم لے کر قاضی پھر بولے " خیر رسم اجرا تو اب بھی ہو سکتی ہے۔"

" لیکن رسم اجرا میں خرچ ہوگا پیسہ اور گلشن صاحب جشن بہاراں کو چھپوا کر ہی اپنے آشیانے پر بجلی گرا چکے ہیں" ہم نے دبی زبان سے عرض کیا۔

" میاں! دوست آخر کس مرض کی دوا ہوتے ہیں" اور قاضی نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا " رسم اجرا کے سب اخراجات میں برداشت کروں گا۔ دیکھنا کیسے دھاکڑ منتری کو لا کر کتاب کا فیتہ کٹواؤں گا کہ اغیار کے سینوں پر چھری چل جائے گی۔"

اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا " تو کیا اب ادبی تقریبوں کے لیے سیاسی پہلوانوں کی سرپرستی ناگزیر ہو گئی ہے۔ رسم اجرا کے لیے لائیے تو کوئی پروفیسر لائیے، نقاد لائیے اور کچھ تو کوئی شاعر یا ادیب ہی لائیے۔"

کچھ اور زیادہ بقراط بن کر قاضی نے کہا " آپ ان سیاسی پہلوانوں کو سمجھتے کیا ہیں ؟۔ کالجوں اور یونیورسٹی کی تقرری ہیں، اکیڈیمیوں کے ممبروں کی نامزدگی ہیں، اداروں کے انعامات کی تقسیم ہیں، امتحانوں کے نتائج ہیں حتّٰی کہ رسالوں میں مضامین کی اشاعت میں مشاعروں اور سیمیناروں کے دعوت ناموں میں غرض کہ ہر طوطی خانے میں ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی کا نقارہ بج رہا ہے۔ آپ سیاسی داؤ پیچ سے بچ کر جائیے گا کہاں، جدھر دیکھیے منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔"

گھر واپس آکر میں نے ہیٹ ٹرک قاضی کے منصوبے کا تذکرہ گلشن پرشاد سے کیا تو وہ کانپنے اور ہکلانے لگے " یہ کیا غضب کیا آپ نے۔ بخشو بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا!

سوتے کتوں کو جگانا کون سی عقلمندی یا کار ثواب ہے۔ قاضی کو سب جانتے ہیں۔ اس سے تو کوئی کچھ نہ کہے گا لیکن میں نقص امن کے سلسلے میں جیل بھیج دیا جاؤں گا۔"

گلشن پرشاد کی اکیلے قاضی کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لہٰذا میں نے بہت شیر چیتا بنا کر جمن خاں کو جو روزنامہ سرکاری آواز کے غیر سرکاری نامہ نگار ہیں ان کے ساتھ کردیا۔ پورے پانچ گھنٹوں کے بعد یہ دونوں حضرات جھنڈ حال واپس آئے جیسے کسی اکھاڑے میں کشتی لڑ کر لوٹے ہوں۔ گلشن میں بولنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ آکر صرف صوفے پر گر پڑے۔ جمن خاں نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر بڑی رازداری سے بتایا "رسم اجرا قاضی نے معاف کردی لیکن اس کی خبر اخبار میں چھپے گی۔"

پندرہ روز بعد جشن بہاراں کی رسم اجرا کی خبر سرکاری آواز کے پہلے صفحے پر بڑی آب و تاب سے شائع ہوئی۔ ان رسمی باتوں کے علاوہ کہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے جشن بہاراں زندہ باد اور حضرت گلشن زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے تھے اور رسم اجرا کمیٹی نے معزز مہمانوں کی پر تکلف ضیافت کی وغیرہ وغیرہ، یاران نکتہ داں کے لیے اس خبر کے خاص اجزا تین تھے۔

۱۔ مکھ منتری اس جلسے کی صدارت کرنے والے تھے لیکن انھیں کسی ضروری کام سے عین وقت پر دہلی جانا پڑ گیا لہٰذا جلسے کی صدارت حسین طاہر قاضی نے کی۔

۲۔ ملک کے کئی نامور محقق اور نقاد جلسے میں موجود تھے اور سب نے متفقہ طور سے جشن بہاراں کو دنیائے شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ بتایا (کسی محقق یا نقاد کا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی)

۳۔ قصبے کے جملہ قابل ذکر شاعر اور ادیب جلسے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ شریک تھے اور بار بار جناب قاضی اور حضرت گلشن کی تاجپوشی کر رہے تھے۔

"قابل ذکر" کے ٹکڑے نے وہی کیا جس کے لیے وہ استعمال کیا گیا تھا یعنی قصبے کے ادبی پھوس میں ایک دم سے آگ لگ گئی۔ قصبے کے جو شاعر اور ادیب اب تک کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے آپ کو نا قابل ذکر سمجھے جانے پر ایک دم سے ہڑبڑا کر بھاگ پڑے اور انھوں نے اپنی توپوں کے دہانے جشن بہاراں اور حضرت گلشن پر کھول دیے اور ہر طرف شعلے بھڑک اٹھے۔ بالآخر ہوا یہ کہ جشن بہاراں کی جتنی جلدیں کتب فروشوں کے یہاں تھیں ان کو نذر آتش کرنے کے لیے وہ شاعر اور ادیب خریدے گئے جو مفرور ضمیر رسم اجرا میں بلانے نہیں گئے تھے اس کی رسم اجرا سے چونکہ مکھ منتری کا کسی نہ کسی طور سے منسوب تھا۔ لہٰذا ریاستی اردو اکیڈمی نے اپنی تابناک روایت کے بموجب جشن بہاراں کو شاعری سے متعلق اپنے سب سے بڑے انعام سے نوازا۔ گلشن صاحب اب قصبے کی کسی تقریب یا مشاعرے میں بلائے نہیں جاتے ہیں اور سر بازار ہوٹنگ کے ڈر سے وہ قصبے کی آمد کی سڑکوں کی بجائے اس کے باہر کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوکر اپنے دفتر جاتے ہیں۔

ننھے منّے بچوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
جادو کی ہنڈیا
4/50
شیر اور بکری
دم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

دلیپ سنگھ
59/4, Rajinder Nagar,
NEW DELHI-110060
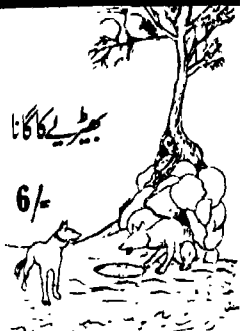
ہدایت نامہ مصنّفین

میرا خیال تھا کہ ہندستان میں سب سے آسان کام بچے پیدا کرنا ہے، کیونکہ یہاں ان لوگوں کے بھی بچے ہیں جن کی ابھی عقل داڑھ نہیں نکلی۔ [اگر نکلی ہوتی تو شاید وہ اس کام میں سمجھ بوجھ سے کام لیتے] لیکن کچھ عرصے سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بچے پیدا کرنے سے بھی زیادہ آسان کام اُردو میں کتاب پیدا کرنا ہے۔ یہ روز ڈاک میں مجھے کم از کم دو کتابیں وصول ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ ایسے ایسے آدمی اور عورتیں مصنف بنتے جا رہے ہیں جن کی عقل داڑھ تو کیا، چہرے پر مونچھ تک نہیں نکلی [میں مردوں کی بات کر رہا ہوں]

کہا جاتا ہے کہ کتابوں کی اس افراط کی ذمہ دار اُردو اکیڈمیاں ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ اُن کی جزوی امداد سے ہو رہا ہے۔

اولاد کے پیدا کرنے میں کسی زمانے میں دائی اور آج کل میٹرنٹی ہوم کی جزوی امداد شامل ہوتی ہے۔ لیکن اس جزوی امداد کی ضرورت اس وقت محسوس کی جاتی ہے جب ماں باپ بہت سا کام خود کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اُردو اکیڈمیوں کی جزوی امداد تو ایک طرح کا بیج ہے جو ایک ادیب کو صاحبِ اولاد بننے کی ترغیب دیتا ہے۔

نہ جانے اکیڈمیوں کو نابالغ لوگوں کو صاحبِ اولاد بنانے میں کیا مزا آتا ہے، لیکن اس میں کچھ ہے ضرور کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اس وقت اُردو کتابوں کی مجموعی تعداد اردو پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

سمجھدار لوگوں کا کہنا ہے کہ اکیڈمیوں کو جزوی امداد کی درخواست دیتے وقت اگر سمجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو نہ صرف ایک کتاب چھپ سکتی ہے، بلکہ صاحب کتاب کا تن ڈھانپنے کے لیے ایک پتلون بھی سل سکتی ہے۔ ہمیں اس کام کا ابھی تک کچھ ذاتی تجربہ نہیں لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہم اکیڈمیوں کے کام کی سراہنا کرتے ہیں کہ وہ ادیبوں کے تن ڈھانپنے کا ایک نیک کام کر رہی ہیں۔ لیکن اُسی ادیب کی کتاب چھپوا کر اُسے ننگا کرنے میں انھیں کیا لذت نصیب ہوتی ہے، اس کا ہمیں علم نہیں۔

کچھ پیشہ ور نقاد اور کچھ بھلے مانس ادیب دیباچے، پیش لفظ اور کتاب کی جیکٹ پر رائے لکھ کر مصنف

کی عریانی کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات یہ دیباچے اور پیش لفظ مصنف کے ساتھ ان نقادوں اور ادیبوں کو بھی عریاں کر دیتے ہیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اُردو میں چھپی ہوئی کتابوں کی تعداد اردو پڑھنے والوں کی تعداد سے تجاوز کر گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کے خریدار ملنے مشکل ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی حوصلہ شکن بات نہیں ہے۔ کتاب کو تحفتاً لینے کے لیے دوسرے ادیب ہر دم تیار رہتے ہیں۔ ایک مصنف جب دوسرے مصنف کو اپنی کتاب پیش کرتا ہے تو یہ رسم دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ تحفہ لینے والا کتاب کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں تک لے جاتا ہے۔ مصنف کو محسوس ہوتا ہے کہ تحفہ لینے والا کتاب کو آنکھوں کا بوسہ دے رہا ہے لیکن حقیقتاً تحفہ لینے والا کتاب کے وزن کا تخمینہ کر رہا ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ ردّی کا بھاؤ آج کل تین روپے کلو ہے۔ اسی لیے بھاری کتاب کو دل و جان سے قبول کیا جاتا ہے۔ کتاب کی جیکٹ پر جب ناقد لکھتا ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تو جھوٹ نہیں لکھتا۔

میں مصنفین کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مصنف بننے سے پہلے ادیب اگر اس کام کی تھوڑی بہت ٹریننگ لے لیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اسی بات کو ذہن میں رکھ کر میں یہ ہدایت نامہ لکھ رہا ہوں۔ میں نئے مصنفین سے درخواست کروں گا کہ مصنف بننے سے پہلے اس ہدایت نامہ کو پڑھ لیں۔ جب بڑھئی یا لُہار اپنا اپنا کام ٹریننگ لیے بغیر شروع نہیں کرتے تو پھر کتاب کا مصنف بننے سے پہلے ذراسی ٹریننگ لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہونے والے ماں باپ بھی بازار سے خرید کر یا پڑوسیوں سے مانگ کر ایک بے بی بک ضرور پڑھ لیتے ہیں۔

میری دانست میں اُردو میں آج تک کل دو ہدایت نامے لکھے گئے ہیں۔ ایک ہدایت نامہ خاوند اور دوسرا ہدایت نامہ بیوی۔ اور میں نے سُنا ہے کہ ہدایت نامہ خاوند کو بیویاں اور ہدایت نامہ بیوی کو خاوند لوگ مزے اور لحاف لے کر پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان پر عمل نہیں کرتے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے ہدایت نامے کو مصنف بننے کا ہر امیدوار بلا تفریقِ جنس پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا۔ اتنا عرض کر دوں کہ یہ ہدایت نامہ پڑھتے وقت قاری کو لحاف اوڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس ہدایت نامے کی خاطر میں ادب کو دو حصوں میں تقسیم کروں گا تنقیدی اور تخلیقی۔ تخلیقی کام قدرے مشکل ہوتا ہے اس لیے میں اس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے تنقیدی حصے سے نپٹ لیں۔

تنقیدی ادب کا مصنف بننے کے لیے یوں تو کسی خصوصی قابلیت کی ضرورت نہیں لیکن اُردو میں ایم۔اے ہونا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اُردو میں ایم۔اے کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ویسے بھی اُردو میں ایم۔اے عام طور پر وہی کرتے ہیں جنھیں دوسرے مضامین شرفِ قبولیت نہیں بخشتے۔ اگر آپ کو اُردو میں بہت زیادہ لوگ ایم۔اے کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایم۔اے میں داخلہ لینے کے لیے بی۔اے پاس ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ شرط ہٹا دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ دودھ پیتے بچے اُردو میں ایم۔اے کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

اگر آپ اُردو میں ایم۔اے نہیں ہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ پھر بھی تنقیدی کتاب کے مصنف بن سکتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تنقیدی کتابوں کو صرف تنقید نگار ہی پڑھتے ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں۔ اس لیے آپ کچھ بھی لکھ دیں گے تو چل جائے گا۔ یوں بھی تنقید نگار کا کام عام طور پر تخلیقی کام میں

نقص نکالنا ہوتا ہے۔ نقص نکالنا کچھ اتنا مشکل کام نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے اگر کسی عورت کو دال میں کنکر چنتے دیکھا ہو تو آپ جانتے ہوں گے کہ وہ صاف ستھری دال کو ادھر اُدھر کرتی ہوئی ایک آدھ کنکر نکال ہی لیتی ہے۔ اور اگر وہ صاف ستھری دال میں سے کنکر نکال سکتی ہے تو آپ اچھے بھلے شعر میں نقص کیوں نہیں نکال سکتے
مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ امیر خسرو کا کلام پڑھ رہا تھا۔ خسرو کا دوہا ہے

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو دیس

میں نے تو خسرو کو والہانہ داد دی لیکن میرے دوست گہری سوچ میں کھو گئے۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا" کہنے لگے "سوچ رہا ہوں۔ دوہے میں کہیں گڑبڑ ہے۔ دیکھیے نا گوری اگر سیج پر سوئی ہوئی ہے تو اس کے کیس تو اس کی گردن کے پیچھے، پیٹھ کے نیچے اور بستر پر ہوں گے۔ مکھ پر کیسے آ گئے۔ میں نے کہا "ہو سکتا ہے اُس نے خود ہی مکھ پر بکھیر لیے ہوں" کہنے لگے "ایسا کرنے سے بال ناک میں گھس جائیں گے۔ چھینکیں آئیں گی۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرے گی"۔ میں تھوڑا سا گرم ہو کر بولا "تو کیا آپ امیر خسرو کو گھٹیا شاعر سمجھتے ہیں"۔ کہنے لگے فی الحال تو میں ایسا نہیں کہوں گا۔ البتہ دوہے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ پھر ایک دم چونک کر بولے "ارے صاحب، ساری گڑبڑ تو کاتب نے کی ہے۔ سیدھی سی تو بات ہے خسرو نے لکھا ہوگا "گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کھیس" کیونکہ کھیس سوئے ہوئے لوگوں کو ہلکی سردی سے بچاتا ہے اور کاتب نے کھیس کو کیس کر دیا ہوگا"۔ میں سمجھ گیا کہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے ہی سہی، ادب میں ایک تنقید نگار کا اضافہ ہو گیا ہے۔

چند سال پہلے کی بات ہے میں نے ایک رسالے میں ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ایک ناقد نے ساحر لدھیانوی کو بڑی ڈانٹ پلائی تھی۔ ساحر نے ایک نظم میں اپنی محبوبہ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے تاج محل کے پاس نہیں، بلکہ کہیں اور ملا کرو۔ ناقد نے قریب چوبیس صفحوں کے ایک مضمون میں اس کو خوب کھری کھری سنائیں کہ کیوں بھائی تاج محل کے پاس ملنے میں تمہیں کیا تکلیف ہے۔ کہتے ہیں ساحر نے ناقد کے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے اور کہا کہ حضور میں نے تو یوں ہی لکھ دیا تھا۔ آپ لڑکی سے ملنے کا انتظام کروا دیجیے۔ جہاں آپ کہیں گے، وہیں ملنے آ جایا کروں گا۔ لیکن ناقد بار بار یہی کہتا تھا کہ تم نے پہلے تاج محل کے پاس ملنے سے انکار کیوں کیا۔

آپ اگر اسی طرح دن میں چار شاعروں کو بھی ڈانٹ پلا دیں تو ہفتے دس دن میں ایک کتاب آسانی سے تیار ہو سکتی ہے۔

آپ کی کتاب بکے نہ بکے۔ اس کو کوئی پڑھے یا نہ پڑھے۔ ناقد بننے سے آپ کا رتبہ ادب میں بہت بلند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کسی کتاب کی رسم اجرا پر اور کسی ادیب کے مرنے کے بعد جو جلسے ہوتے ہیں ان میں ناقد کی تقریر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ادیب کے مرنے کے بعد ناقد جو تقریر کرتا ہے اس میں مرنے والے کی خوبیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس تقریر کو سن کر اکثر لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہی ناقد تو ادیب کی زندگی میں اس کے نقص نکالا کرتا تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اگر دال میں ناموجود کنکر تلاش کیے جا سکتے ہیں تو ان ہی کنکروں کو موقع کی مناسبت سے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔

اب ہم تخلیقی ادب کی طرف آتے ہیں۔

اس ہدایت نامے کے لیے ہم نے تخلیقی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعری ادب اور نثری ادب
شعری ادب تین طرح کا ہوتا ہے۔

(۱) پابند شاعری
(۲) آزاد نظم، اور
(۳) نثری نظم

پابندِ شاعری

اگر آپ شاعر بننے پر تُل ہی گئے ہیں تو پابند شاعری کیجیے کیونکہ شاعری کی یہ سب سے آسان قسم ہے
مشکل اس میں صرف یہ ہے کہ اس میں وزن کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور اس میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ رہتا
ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس میں ڈرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وزن جب بنیے کے ترازو سے غائب ہو گیا ہے
تو شاعری میں یہ پابندی کیوں۔ آسانی پابند شاعری میں یہ ہے کہ سارا سامان بنا بنایا مل جاتا ہے۔ قافیے
اور ردیف تیار مل جاتے ہیں۔ معشوق کے جسم کے کون کون سے پرزے حسین ہیں۔ وصل میں مزا کیوں ہے
اور ہجر میں تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ یہ سارے فیصلے اساتذہ کر چکے ہیں۔ آپ نے اس سامان کو صرف آگے
پیچھے یا نیچے اوپر کرنا ہے۔ نہ سمجھے ہوں تو کسی عورت سے پوچھیے کہ پرانی ساری میں سے غرارہ کیسے بنایا جاتا
ہے یا کرتے میں سے بلاوز کیسے نکلتا ہے۔ آپ پابند شاعری کے تمام رموز سے واقف ہو جائیں گے۔

آزاد نظم

شروع شروع میں آزاد نظم اس نظم کو کہتے تھے جس میں ردیف وقافیہ یا وزن کی قید نہ ہو۔ آج
کل اس کو کہتے ہیں جو سمجھ میں نہ آئے اور کمال یہ ہے کہ شاعر خود اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ اُن کی شاعری
میں پیچ وخم اس قدر زیادہ ہیں کہ قاری کا پورا وجود اُن میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے
اشعار میں معنیٰ نہیں ہے تو نہ سہی لیکن میں سمجھتا ہوں وہ بس کہتے ہی ہیں۔ دل ہی دل میں وہ سوچتے ہیں
کہ نظم تو لکھیں، کوئی سر پھرا ناقد اُس کا کچھ نہ کچھ مطلب نکال ہی لے گا۔ مرزا غالبؔ کا ایک شعر ہے:

نہ ستائش کی تمنّا ہے نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ نہ سہی

مجھے بی۔اے کے امتحان میں غالبؔ کا "نقشِ فریادی" والا شعر تشریح کو دیا گیا تھا۔ میں نے
صاف صاف لکھ دیا کہ شعر کے معنی تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ خود مرزا نے کہا ہے کہ میرے اشعار میں معنی
نہیں ہیں۔ پروفیسر تلوک چند محروم نے، جو میرے ممتحن تھے، میرے پرچے پر لکھ دیا کہ شعر میں معنیٰ تلاش
کیجیے ورنہ ہم سمجھیں گے کہ آپ کو صلے کی پروا نہیں ہے۔ اس لیے ہم آپ کو زیرو نمبر دے رہے ہیں۔

نثری نظم

شاعری کی یہ قسم ابھی تک خود ہماری سمجھ میں نہیں آئی، آپ کو کیا سمجھائیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اگر

کوئی تخلیق نثر ہے تو نظم نہیں ہے اور اگر نظم ہے تو نثر نہیں ہے۔ پھر نثری نظم کیا چیز ہوئی۔ آخر تھک ہار کے اپنے آپ کو سمجھایا ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی ناخلف اولاد کو فرزند ارجمند کہنے پر تل جائے تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔

آئیے اب نثری ادب پر کچھ بحث ہو جائے۔

نثری ادب کی سب سے اہم صنف ہے افسانہ۔ کسی زمانے میں افسانے کا مطلب کہانی ہوتا تھا وہی کہانی جو آپ دادی اور نانی سے سنتے آئے ہیں۔ آج کل افسانے کا مطلب حساب کا سوال ہوتا ہے۔ جسے حل کرنے کے لیے ایک فارمولے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف کو آسانی یہ ہے کہ ممتحن کی طرح اسے صرف سوال لکھ دینا ہے۔ اس کا جواب کیا ہے، یہ اسے خود معلوم نہیں۔ مثال کے طور پر مولی کا افسانے میں مطلب عورت بھی ہو سکتا ہے اور ترکاری بھی۔ میں سمجھتا ہوں یہ صورت حال نئے افسانہ نگاروں کے لیے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے کسی نے ایک سوال کیا تھا جو کچھ اس طرح تھا۔

"ایک پہاڑ کے پاس ایک درخت تھا جس پر کچھ چڑیاں بیٹھی تھیں۔ ایک شکاری نے بندوق سے کچھ چڑیاں مار دیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پہاڑ، درخت سے کتنی دوری جا کر گرا۔" میں نے جواب دیا کہ جناب نہیں معلوم، آپ ہی بتا دیجیے۔

کہنے لگے اگر ہمیں پتا ہوتا تو ہم آپ سے کیوں پوچھتے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اس سوال کو ذہن میں رکھیں تو آسانی سے جدید افسانہ نگار بن سکتے ہیں۔

مزاح نگاری

یہ نثری ادب کی دوسری صنف ہے۔ ویسے تو مزاح نگار بننا کچھ مشکل کام نہیں کیونکہ ہمارے سیاسی رہ نما اور سرکاری ملازم آئے دن ہمیں اپنے اوپر ہنسنے کے بے شمار موقع بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور کچھ نہ ہو تو آپ گھر کی بیگم کو تختۂ مشق بنا سکتے ہیں۔ لیکن آج کل مزاح نگاری کی سند لینے کے لیے حیدر آباد کا ایک چکر لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ بلکہ اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ پیدا ہی حیدر آباد میں ہوئے تھے تو آپ کے مزاح نگار بننے میں آسانی ہو جائے گی۔ برتن چاہے کہیں بھی بنے اس پر مراد آباد کی مہر لگ جائے تو اس کا بکنا آسان ہو جاتا ہے۔

سفرنامہ

یہ نثری ادب کی جدید ترین صنف ہے۔ یوں تو اس کے لکھنے کے لیے ایک سفر کرنا ضروری ہے لیکن اگر آپ اس کے اہل نہیں ہیں کہ کوئی یورپ اور امریکہ سے آپ کو فری ٹکٹ بھجوائے تو ہم کو ایسے ہتھکنڈے بھی بتا سکتے ہیں کہ آپ گھر بیٹھے بٹھائے سفرنامہ تصنیف کر سکتے ہیں۔ اتنا تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہر ہدایت نامے کے ساتھ ایک سربمہر لفافہ منسلک ہوتا ہے۔ جس میں کچھ خفیہ ہدایات درج ہوتی ہیں۔ یہ لفافہ صرف اس کے نصیب میں آتا ہے جو وہ کتاب خریدتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے کے لیے ہماری ہدایات بھی ایک سربمہر لفافے میں بند ہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی صاحب وہ ہدایات پڑھنے کے خواہش مند ہوں تو ہمیں منی آرڈر بھیجیے۔ لفافہ آپ کو بذریعہ رجسٹری بھجوا دیا جائے گا۔

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

☆☆☆

ایم۔ کے مہتاب
مترجم : سری نواس لاہوٹی

پنجابی کہانی

"اُس سرکار کا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ سات سات منزلہ عمارتیں کھڑی کردی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ یہاں بجلی بھی فیل ہوسکتی ہے، لفٹ بھی خراب ہوسکتی ہے اور جتنی اچھی غذا کھانے کو ملتی ہے اس سے تو یہ سات منزلہ عمارتیں چڑھتے چڑھتے انسان کے دل کی حرکت بند ہوسکتی ہے"۔

ہربنس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں میز پر رکھ دیں اور نڈھال ہوکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہرنام نے پسینے میں شرابور ہربنس کی طرف دیکھا۔ اس کی انگلیاں ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" پر رُک گئیں۔ عادت کے مطابق اس کی آنکھوں اور مونچھوں کے سائے میں کھلنے والی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھل گئی۔ وہ اٹھا اور ہربنس کو سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ لوگ پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ شکایت کریں — والدین سے شکایت، بہن بھائی سے شکوہ، معشوقہ سے گلہ اور اگر کچھ اور نہ ہو تو وقت کا رونا اور یہ بھی نہ ہو تو بچاری سرکار تو ہے ہی، اس پر اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ بھلے آدمی اپنی قسمت کی شکایت کیوں نہیں کرتے۔ جب تم نیچے تھے تو بھی بجلی فیل تھی اب تم اوپر آگئے تو بجلی بھی چالو ہوگئی ہے"۔ ہرنام نے ایک ٹیبل پر رکھے ہوئے ڈیلکس پنکھے کا بٹن دبا دیا اور ہوا کی زوردار لہریں ہربنس کے چہرے پر بالوں سے کھیلنے لگیں۔

"میں ہر روز تمھارے اس بھون کے سامنے سے گزرتا ہوں لیکن فرش سے عرش پر ملنے کے لیے کون آئے"۔

"اور پھر تم بچپن کی دوستی کا دم بھرتے ہو" ہرنام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ دلی ہے۔ یہاں کی دوستی تو یہی ہے کہ تم سال بھر میں دوست کو کتنی بار یاد کرتے ہو یا سرکاری فون سے اسے کتنی بار فون کرتے ہو"۔ ہربنس نے کہا

"پورے نو مہینے کے بعد ملے ہو اور پھر کہتے ہو کہ دلی میں رہتے ہو۔ چلو اوپر کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کریں"۔

زینے چڑھتے ہوئے ہربنس نے سوچا کہ وہ جس کام کے لیے آیا ہے وہ راستے ہی میں کہہ دے لیکن اسے اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ شخص جو اس کے ساتھ اتنا پیار اور محبت

کا برتاؤ کر رہا ہے کہیں اس کا سوال سن کر ٹھنڈا نہ پڑ جائے کیونکہ قرض پیار کی قینچی ہے۔
بیرے نے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس لا کر میز پر رکھ دیے۔ ہرنام اپنا گلاس ہربنس کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے کہنے لگا: "مجھے آج تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ بولو کیا کھاؤ گے۔ آملیٹ، فش، چکن، سنڈوچ، مٹن کٹلسٹ! بولو جلدی بولو! بڑے صاحب کو ہر پندرہ منٹ کے بعد گھنٹی بجانے کا شوق ہے"۔
ہربنس کوئی جواب دیے بغیر مسکرانے لگا۔
"ہنسنے سے تو بھوک اور کھلتی ہے۔ تکلف برطرف جلدی بولو"۔ "جو تمھاری خواہش" ہربنس خیالوں کے سمندر سے سر اٹھا کر کہنے لگا۔
"میری خواہش تو ہے کہ آملیٹ اور مٹن کٹلسٹ"۔ بیرے کو آرڈر دے کر دونوں دوست پھر باتوں میں محو ہو گئے۔ ہربنس سوچ رہا تھا کہ وہ ہرنام سے صاف صاف یہ کہہ دے کہ وہ اس کے پاس خاطرداری کے لیے نہیں آیا ہے بلکہ وہ تو کچھ روپے ادھار مانگنے آیا ہے تاکہ کل صبح اپنی لڑکی کی فیس ادا کر سکے۔ اگر فیس جمع نہیں ہو سکی تو اس کی لڑکی امتحان میں شریک نہیں ہو سکے گی اگر اس بار وہ امتحان میں شریک نہ ہو سکی تو اس کا ٹرم ختم ہو جائے گا اور پھر اس کی آشا نراشا میں بدل جائے گی لیکن زبان بند تھی۔ ہرنام اس سے کتنی محبت سے پیش آ رہا تھا۔ ایسے میں وہ رونی صورت بنا کر اسے کیا کہے کہ اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے۔
"دوست بہت دنوں بعد ملے ہو اپنے رومان کی بات تو بتاؤ۔ وہ وجے لکشمی پورے طور پر تمھارے قابو میں آئی یا نہیں؟ حقیقت میں وہ لڑکی بڑی لاجواب ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے اسے تمھارے صاحب کے ساتھ پارک رسٹورنٹ میں کولڈ کافی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ سچ کہتا ہوں اس کے جسم سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی کہ تم نے بھی کس پھول کی ڈال پر ہاتھ رکھا ہے لیکن اس خیال سے دل کھٹا ہو جاتا تھا کہ دوسرے لوگ بھی اس ڈالی کے پھول سونگھ رہے ہیں۔ کیا تمھارا صاحب وجے کو تمھارے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے تو تفریح کے لیے دلّی کی خوبصورت ترین عورتیں مل سکتی ہیں۔ اس دن تمھاری وجے نے ناک میں جو لونگ پہن رکھی تھی اس کا رنگ روشنی میں خوب چمک رہا تھا اور میں نے چھری کانٹا پلیٹ میں رکھ کر پنجابی کا یہ محاورہ یاد کرنے لگا کہ "تمھاری لونگ کی روشنی کو دیکھ کر ہل چلانے والوں نے ہل کھڑے کر دیے"۔
ہربنس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "وجے کے ساتھ اپنا عشق تو صرف مہینے کی تین تاریخ کو ہوتا ہے"۔
"کیا مطلب؟" آملیٹ کا ٹکڑا ہرنام کے کانٹے پر اٹکا رہ گیا۔
"مطلب یہ ہے کہ میں رشوت نہیں کھاتا۔ تنخواہ میں سے جتنے پیسے میری جیب خرچ کے لیے بچ رہیں (ادھر) سے تین تاریخ کو وجے کے ساتھ ایک بار کہیں جانے ہو جاتی ہے۔ یہی

بہت ہے کہ وہ اس دن کسی اور کو وقت نہیں دیتی۔ میں اس سے زیادہ "افورڈ" AFFORD نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ باقی دنوں میں چاہے بڑے صاحب کے ساتھ یا چھوٹے صاحب کے ساتھ۔"

"تم عجیب آدمی ہو"۔ ہرنام نے بیرے کو دو آئس کریم کافی لانے کے لیے آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں! آج لُٹنے کی ٹھان کر آئے ہو کیا؟ معمولی کافی منگوا لو!" ہربنس نے ہنستے ہوئے ہرنام سے کہا "تم اپنی کم خرچی کو رہنے دو۔ کیوں مرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ کچھ کھایا پیا کرو، تم لوٹ کر کیا کہو گے کہ پچھے زینے چڑھ کر ہرنام کے پاس گیا تھا۔ اس نے گرم پانی پلا کر نیچے دھکیل دیا۔ تم مجھے اتنے اچھے لگتے ہو جتنی تمھیں وجے لکشمی! کیا باغ و بہار قسم کی چیز ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر تم اس کا تبادلہ ہمارے دفتر کروا دو تو آدھے لوگ کام چھوڑ کر بیٹھ جائیں اور آدھے پاگل بن جائیں۔ مجھے تو تمھاری مردانگی پر شبہہ ہونے لگا ہے"۔

"گولی مارو، مردانگی کو! اتنا کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے ہنستی بولتی ہے۔ اس سے دو میٹھی باتیں کر کے گھر کی سب کڑواہٹ بھول جاتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ سرکار نے اپنی حکومت میں صرف یہی ایک قرینے کا کام کیا ہے۔ دفتروں میں رنگ برنگے پھول کھلا دیے ہیں جن کی خوشبو سے دفتر مہک اٹھے ہیں۔ دل بہل جاتا ہے۔ صاحب لوگ خوب بن سنور کر دفتر آتے ہیں۔ ہرنام یہ خوبصورت لڑکیاں بھی، گلوروفارم سے کم نہیں ہیں ان سے دو باتیں ہو جائیں تو ہوش و حواس غائب ہو جاتے ہیں"۔

"واہ، واہ! کیا غضب کی بات کی ہے ہربنس تم نے! بولتے جاؤ! مجھے بڑا لطف آرہا ہے۔ ہمارے کینٹین کی آئس کریم و کافی پی کر دیکھو۔ اگلے مہینے کی تین تاریخ کو وجے کو یہیں لے آنا! پھر وہ پیچھے سے آئس کریم منہ میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "آہا۔ آہا۔ لڑکیاں، لڑکیاں ہی ہوتی ہیں ہربنس"۔

اور ہربنس اپنا اسٹرا گلاس میں ڈبو کر کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اپنی لڑکی آشا کا خیال کرنے لگا جس کی فیس جمع کرانے کی فکر میں کل سے ڈوبا ہوا تھا پھر بھی کچھ روپے کم پڑ گئے تھے جس کی خاطر وہ یہاں آیا تھا۔ لڑکیاں، لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ اگر آشا لڑکا ہوتا تو وہ اس سے کہتا ہے جاؤ دفع ہو جاؤ۔ پڑھو یا عشق لڑاؤ۔ میں نے تمھیں پیسے دینے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ لیکن آشا تو لڑکی تھی اور اس کی زندگی کی مٹھاس میں زہر گھول رہی تھی۔ اگر وہ امتحان میں کامیاب نہ ہوئی تو اس کے کندھوں پر اور کتنا بوجھ پڑ جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ آشا نے اس کے دماغ سے وجے کو نکال باہر کیا تھا۔ اس کا دل چاہا کر گلاس چھوڑ کر ہاتھ ہرنام کے آگے پسار دے لیکن اس کا ہاتھ گلاس پر یوں جم گیا جیسے بجلی کے کھمبے سے چپک گیا ہو۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا "ہرنام!"۔

"میں سب سمجھتا ہوں پیارے! یہ عشق بری بلا ہے۔ یہ شادی اور غیر شادی شدہ میں

کوئی فرق نہیں کرتی۔ میرا صاحب دفتر آتے ہوئے دو چار دن ایک پڑوسی لڑکی کو کار میں لفٹ دیتا رہا ہے لیکن اب وہ کسی چھوکرے کے ساتھ اسکوٹر پر دفتر چلی آتی ہے اور یہ بد قسمت اس کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے پانچ منٹ تک ہارن بجاتا رہتا ہے ــــ سناؤ کافی پسند آئی ؟"

"تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ ہر روز یہاں آجایا کروں۔"

"کہاں !" ہرنام ہنسا اور عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "چھوڑو تم کب آتے ہو۔ چلو تین تاریخ کو وجے لکشمی کو ہی لے آیا کرو۔ کچھ دل چسپ باتیں ہو جایا کریں گی۔ یہاں مدراس کا "اسپیشل وڑا" بڑا مزے دار بنتا ہے۔ اے بیرے، دو اسپیشل وڑے" لانا"۔

ہرنس کے منع کرنے پر بھی ہرنام نے آرڈر دے دیا۔ ہرنس ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ہرنام تمھاری باتیں سن کر مجھے فراق گورکھپوری کا یہ شعر یاد آگیا۔

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں

زلف و رخسار کی باتیں کریں

اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ان پر دام بھی نہیں لگتے اور لطف بھی آجاتا ہے۔ مہینا بھر فریج، کولر، ٹیلی ویژن، ٹرانسسٹر تیار کرنے والی کمپنیوں کے خوبصورت اشتہارات دیکھتے ہیں۔ مختلف کمپنیوں کے مال کی قیمت کا موازنہ کرتے ہیں اور پہلی تاریخ کو تنخواہ اور بلوں کی ادائگی کا موازنہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں ہرنس! اگر باتوں پر امتناع عائد کر دیا جائے تو لوگ بڑھتے ہوئے جذبات کے ابال سے پاگل ہو جائیں گے۔ تمھاری وجے لکشمی کی باتیں سن کر کتنا لطف اٹھا ہے۔ تم چاہتے ہو باتیں بھی نہ کریں اور قبروں کی طرح خاموش رہیں۔ یہ "وڑے" تو کھاؤ کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے۔ کتنے مزے دار ہیں۔ ایسی ہی مزے دار بات اور کوئی سناؤ۔"

"نہیں دوست! تم بہت زیادہ تکلف کر رہے ہو۔"

"تکلف پر لعنت بھیجو۔ اتنے دنوں کے بعد ملے ہو اور مجھے خدمت کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔ دنیا میں کھانے پینے کے سوا اور رکھا بھی کیا ہے۔ باقی تو آنکھیں دیکھ لیں گی اور کان سن لیں گے۔" ہرنام نے ہرنس کا کندھا دبا کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

ہرنام نے پھر کسی خوبصورت لڑکی کا ذکر چھیڑ دیا تو ہرنس بیٹھ گیا۔ لیکن اس کے دل کی تکلیف چہرے پر عیاں ہو رہی تھی۔ وہ خوبصورتی اور پیار کی دنیا سے نکل کر ہرنام کے آگے ہاتھ پھیلا دینا چاہتا تھا کہ اسے کل صبح آشا کے اسکول جانا ہے۔ دنیا کی تلخ حقیقتوں کے مقابلے میں خوابوں کی دنیا کتنی حسین ہے۔ وجے لکشمی کتنی سندر ہے۔ ہرنام کی آنکھیں اس کے ذکر سے کس طرح چمکنے لگتی ہیں۔ اگر وہ کسی دن وجے کو یہاں لے آئے تو ہرنام اسے ایک پیسا بھی خرچ کرنے نہیں دے گا اور وجے بھی ایسے خوش باش انسان سے مل کر کتنی خوش ہوگی۔

"سناؤ دوست! لطف آیا کہ نہیں؟ کیسی خوشبو ہے جیسے......!!
بھئی۔ بس بس! رہنے دو اب زلف و رخسار کو! آہی جاؤ نا کسی دن ہمارے دفتر میں تمھارا دل خوش ہو جائے گا۔ ہرنس نے پلیٹ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔
"مشورہ تو بہت اچھا ہے لیکن اپنا رام تو اپنے آپ پر ایسا عاشق ہے کہ اپنے کام تو صرف باتوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اچھا بولو اب، ایک ایک پیالہ گرم کافی کا ہو جائے"..؟
"پاگل ہو گئے ہو گیا؟ نہیں اور کچھ نہیں لوں گا۔" "دوست اتنے دن کے بعد ملے ہو کیا یاد کرو گے؟"
"نہیں۔ بس بس"۔ اور ہرنس نے اب اس کے آگے ہاتھ پھیلانے کا قطعی ارادہ کر لیا۔
بیرا بل لے آیا اور ہرنام نے فوراً نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔
"ہرنام! ایک کام سے آیا تھا۔ بُرا تو نہیں مانو گے؟۔ کل آشا کی فیس داخل کرنی ہے نہیں تو اس کا نام خارج ہو جائے گا۔ دس روپے دے سکو گے؟ دوسری تاریخ کو واپس کر دوں گا؟" ہرنس ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور پیشانی پر پسینا آ گیا۔
ہرنام نے پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ اتنی سی بات کے لیے تم نے اتنی دیر کر دی۔ آتے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔ میری بات کا بُرا تو نہیں مانو گے۔ میرے پاس صرف یہی ایک نوٹ تھا جس سے میں نے بل ادا کر دیا۔ اب میں پانی پیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ شام کو کس کے اسکوٹر پر گھر جاؤں گا"۔

(بقیہ صفحہ ۶۳)

کے مصنف ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب بھی دلاور حسین کے نام سے شائع نہیں ہوئی۔ اگر چہرے پر نقاب ڈالنا کوئی غلط کام ہوتا تو مرزا صاحب کم از کم ایک بار تو بے نقاب نظر آتے۔

میرزا صاحب نے اپنے مضمون میں انور سدید کا ایک قول بھی نقل کیا ہے، جو یہ ہے "روزِ قیامت میرے اعمال کی پرسش ہوگی، تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کر دوں گا کہ یہی میرا اعمال نامہ ہے"۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انور سدید خود اپنے لکھے پر پکڑے جائیں گے۔ انھیں غالب کی طرح یہ شکوہ نہیں ہوگا۔
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منّے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چاند کی بیٹی (باتصویر)	۴/۵۰
دُم کٹی لومڑی 〃	۶/:
جادو کی ہنڈیا 〃	۴/۵۰
شیر اور بکری 〃	۶/:
کوّے کا خواب 〃	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا 〃	۶/:
چالاک بلّی 〃	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری 〃	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصّہ اژدہا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
پراسرار غار	۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/:

کتاب	قیمت
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/:
سہانے ترانے	۶/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
شریر شیرا	۳/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵۰
ظالم ڈاکو	۶/:
مہکتی کلیاں	۶/:
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ بونے	۳/:
ایک دیس ایک خون	۳/:
جیت کس کی	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
ذرّے کی کہانی	۲۱/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نائی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:
بی مینڈک اور کوّا	۳/:
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۵۰
لال مرغی	۳/:

کتاب	قیمت
ننھا ٹٹو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلامہ معصامہ	۵:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ایک کھلا راز	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۳:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا ناصح	۳/:
ہار کی تلاش	۶/:
سرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۶/:
ننھا فرشتہ	۲/۵۰
جوہر قابل	۳:
بھیڑیے کے بچے	۳/:
ننھا جبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۶/:
بچوں کے افسر	۶/:
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/:
شیر خاں	۳/:
رحمت شہزادہ	۴/:
لومڑی کے بچے	۳/:
اس نے کیا کرنا جانا	۳/:
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
امیر خسرو	۳/:
بہادر سیاح	۳/:
دادا نہرو	۶/:
جادو کا گھر	۳/:
جنگو کی بلّی	۲/:
کٹا ہوا ہاتھ	۶/۵۰

علی امام نقوی

کھوئی

میں کیٹس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

زرد، زرد سے ہونٹ ہلے اور چرس میں گندھی ہوئی آواز نتھنوں پر حملہ کرنے کے بعد کانوں میں اترتی چلی گئی، یہ جملہ یا اس کی یہ ادھوری خواہش میرے لیے نئی نہیں۔ نہ ہی وہ تجسس نیا ہے جو اس ادھوری خواہش کے اظہار کے بعد میرے ذہن میں رینگتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اونیل اب خاموش ہو جائے گی۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے ہوٹل ڈپلومیٹ میں کیبرے کرتے ہوئے دھوئیں میں وہ کیٹس کو تلاش کر لے گی۔

ہم پچھلے ہفتہ ہی ملے تھے ٹیلی فون کے رانگ نمبر کی طرح۔ فریاس کی دن بھر کی تھکن اتارنے کی غرض سے میں اس روز ڈپلومیٹ میں آ بیٹھا تھا کہ وہاں کی تیز اور قہوہ کی مانند چائے کی دو پیالیاں پی کر ساری تھکن اتار دوں، بیوی نے ابھی چاء سرد بھی نہ کی تھی کہ وہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ دوسری میزوں پر یونی ورسٹی کے اوباش لونڈے اپنی اپنی گرل فرینڈز یا پھر ہپیوں سے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ کچھ دلال دو ایک عربوں سے چمٹے ہوتے تھے، میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا اور اس نے جواباً میرے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

"بہت بھیڑ ہے۔

"ہاں۔ ہے تو۔

"میں.... ادھر بیٹھ جاؤں۔

"ہاں، ہاں، شوق سے۔

میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تھی اور دوسرے ہی پل وہ کرسی پر براجمان تھی۔ جینز کی پتلون پر اس نے پرنٹڈ سلک کا کرتا پہن رکھا تھا اور مجھے وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تھی۔

"تم... ادھر... روز.... میرا مطلب.....

"ہاں۔

شاید وہ میرا مطلب سمجھ گئی یا نہ بھی سمجھی ہو اور یہ بھی ممکن ہے وہ مجھے گاودی ہی سمجھی ہو۔ لیکن میں

نے اس ذرا سی دیر میں اسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ امریکن تھی۔ اس کا حلیہ ہپیوں سا تھا۔ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے چائے آفر کی۔

"کیا ہم دوست بن سکتے ہیں۔

"ہاں۔ لیکن...... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن کیا۔؟

"اس درخت پر ہی دشمنی کے پھل آتے ہیں مسٹر۔

"زویری۔ مائی نیم۔ اے۔ بی زویری۔

"اونیل۔ آئی۔ ایم۔ اونیل۔

"اونیل۔

"یس میرا نام اونیل ہے اور میں کیتھس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

"کیتھس۔

"یا

"تمہارا دوست تھا۔

"دوست بھی... اور......

کیتھس، میں، اونیل اور ہماری باتیں آنے والی آوازوں کے شور میں دب گئیں۔ وہ سب امریکن تھے۔ لڑکے، لڑکیاں وہ سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے اور میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آٹھ دس منٹ بور ہونے کے بعد میں اجازت لیے بغیر اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر چائے اور سگریٹ کے پیسے ادا کرتے ہوئے میں نے مڑ کر اونیل پر نگاہ ڈالی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کسی سنجیدہ مسئلے پر گفتگو کر رہی تھی۔

تیسرے روز میں ڈپلومیٹ پہنچا تو اونیل اپنی میز پر تنہا ملی۔ برابر والی کرسی اس نے بیگ سے انگیج کر رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں بول اٹھیں۔ جواباً میرے ہونٹ سکڑے۔ اس نے ہاتھ لہرا کر مجھے وش کیا۔ میرے ہونٹ دوبارہ بول اٹھے اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ کرسی پر سے اپنا بیگ اٹھا چکی تھی۔

"لاؤ۔ سگریٹ نکالو۔ جلدی۔

"کیوں، جلدی کیوں ہے۔ میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے انڈیا میں چھٹیاں بہت ہوتی ہیں۔

"پھر۔

"پھر یہ کہ بینک بھی کلوز۔ اس نے داہنے ہاتھ کی دونوں بڑی انگلیوں کو ملاتے ہوئے کہا۔

"میاں آج بینک بند ہے۔

"اور میرا پرس خالی ہے۔

"اوہ۔ میرے ہونٹ سکڑے، فوراً ہی میرا ہاتھ جیب پاکٹ کی طرف بڑھا۔

"نو.. نو زویری۔ ہاں سگریٹ دو۔

" تم... تم رات کو.....
" یہ میرا میرا پرابلم ہے
کچھ دیر کو میں سٹ پٹا گیا۔ اس کورے جواب کی مجھے قطعی توقع نہ تھی۔ اسے سگریٹ دینے کے بعد اور خود بھی سگریٹ کے چند کش لینے کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔
" اونیل۔
" یا۔
" دیکھو..... برا نہ ماننا۔ ہمارے بھارت میں دوستی کا اپنا طریقہ ہے۔
اونیل کی خالی خالی نظریں میری آنکھوں میں اتر گئیں۔ پھر اس نے سر گھما کر کاؤنٹر پر بیٹھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
" اس کے سر پر خمینی کا فوٹو دیکھا۔
" ہوں۔
" پہلے ادھر شاہ ہوا کرتا تھا۔
" وہ ایرانی ہے۔ ایرانی۔ میں کسی قدر جھنجھلا گیا۔
" میں نے سنا انڈیا میں آریا زیادہ ہیں۔
" تم بھی کیا فالتو بات کرتی ہو۔ میری مزید جھنجھلاہٹ کا خیال کرتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا۔
" میں سمجھ گئی۔ تم لوگ کھانا کھلا کر دوستی جتاتے ہو۔
" امریکن ہونا کیسے نہیں سمجھو گی
SATIRE نہیں زویری COLONIALISM کی اترتی ہوئی لہروں میں کودنے والوں پر تم سائٹر نہیں کر سکتے۔
" مجھے تمھاری پالیٹکس سے مطلب نہیں ہے۔
" نہ ہو۔ لیکن تم اس سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟
" اونیل۔ اچھا ہو۔ اگر ہمارے بیچ سیاست نہ آئے۔
" وہ تو ہر جگہ ہے زویری۔ اس ٹیبل پر، اس کاؤنٹر پر، یا ہر فٹ پاتھ پر... لیکن میں شاید غلط کہہ گئی۔ تم لوگوں میں پالیٹکس سنس ہے ہی نہیں۔ خیر ہٹاؤ... تم اس سے الرجی ہو؟
" یوں ہی سمجھو۔
" جب یوں ہی سمجھنا ہے تو پھر..... وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور بولی۔
" کل بات یہاں ختم ہوئی تھی۔
" کل نہیں، پرسوں اور..... بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ رہ گئی تھی۔
" ہاں۔ وہی سمجھو۔ تو میں کہہ رہی تھی.....
" تم کیٹنس سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔
" راتھٹ..... لیکن..... آہ... میری سب سے عزیز خواہش... آہ... اوہ... گوڈ۔

" تمھارے ماں باپ نے ریفیوز کیا۔
" نو۔
" اسے کوئی اور لڑکی پسند آگئی۔
" نہیں ایسا بھی نہیں ہوا۔
" اس کے ماں باپ نے تمھیں ریجیکٹ کیا ہوگا۔
" کاش ایسا ہی ہوتا..... ایسا ہوتا تو..... اتنا دکھ تو نہ ہوتا۔
اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے، کچھ دیر بعد اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔
" میں اس بوجھ کو وہیں، کہیں پھینک کر، جو کبھی سوجھتا، کر بیٹھتی ... لیکن اب..... اب تو ایک بوجھ ہے۔ میں تمھارے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ وہ بوجھ آج بھی دل پر ہے۔ چرس، گانجہ... بھنگ ... شا.... بکواس.... سب بکواس اب تو.... اب تو اسے LETHE میں ڈبو دینا چاہیے۔
" اس سے کیا ہوگا۔
" تم نہیں جانتے۔ یا۔ تم جان کر بھی نہیں جاننا چاہتے زوبیری۔ اچھا ہے۔ یہ ہماری باتیں ہیں... ہم ہی..... پھر کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ میں نے قہوے جیسی کڑوی کسیلی چائے کا آرڈر دیا تھا۔ نجانے کب بیرا سرو کر گیا تھا اس ٹھنڈی چائے کو بھی ہم نے سپ کیا۔ آخری چسکی لے کر پیالی رکھتے ہوئے اوسیل نے مجھ سے کہا۔
" چلو۔ واک کرتے ہیں۔
ویدر روڈ کا چکر کاٹ کر ہم ریڈیو کلب کی طرف نکل گئے۔ ریڈیو کلب کے سامنے پہنچ کر میں نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھ دیا تو اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
" یہاں آکر سنا..... لوگ یادوں کے سہارے بھی زندگی گزارتے ہیں
" ہاں۔ پھیکی اور بدمزہ۔
" پھر لائف۔
" میرے خیال سے زندگی بھرپور ہونی چاہیے۔
" لیکن یادیں۔
" وہ تو راستے کے پتھر ہیں۔ ان پر بیٹھ کر ہمت ہارنا ٹھیک نہیں۔ سستا کر، دم لے کر، پھر چل پڑنا چاہیے۔
" سچ۔
" ہاں۔
ایک مرتبہ پھر اوسیل نے مجھے دیکھا۔ بھرپور مسکراہٹ، اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ میرے کچھ اور قریب آئی تو میں نے بھی اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔
ساحل کی دیوار پر کچھ عرب بیٹھے آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کو للچائی للچائی نظروں سے دیکھ کر

ان پر عربی میں فقرے کس رہے تھے۔ یہاں بھی کچھ دلال عربوں کو گھیرنے میں مصروف تھے۔ کچھ جوڑے ایک دوسرے میں گم شام کی زلفوں سے گرتے اندھیرے کا حصہ بن جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خوانچہ والے چنے، بھنی ہوئی مونگ پھلیاں، شکرقند، ابلی ہوئی مونگ پھلی اور گنڈیریاں بیچ رہے تھے۔ میں نے ایک کماٹی کو روک کر ابلی ہوئی مونگ پھلیاں خریدیں۔ اس نے خاموشی سے ایک مونگ پھلی اٹھا کر منہ میں ڈالی اور دوسرے ہی لمحہ برا سا منہ بنا کر مونگ پھلی تھوک دی۔

اگلے دو تین روز مجھے فریاس میں گزارنے پڑے۔ اور اس سے اگلے دن اونیل ڈپلومیٹ نہیں آئی۔ میں نے اس کا کافی انتظار کیا۔ انتہائی طور پر اس رات میں نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ پیری ویدر روڈ سے ہوتا ہوا ریڈیو کلب بھی گیا۔ اسی امید پر کہ اونیل سے وہاں ملاقات ہو جائے گی۔ البتہ۔

آج وہ مجھے مل گئی۔ ڈپلومیٹ میں نہیں۔ ریڈیو کلب پر بھی نہیں۔ بلکہ تاج محل ہوٹل کے برابر نارتھ کورٹ نرسنگ ہوم کی دیوار پر بیٹھی تھی وہ۔ اور ایک لڑکا اسے ایلورا اور اجنتا کی گپھاؤں کے سلائڈز خریدنے پر اکسا رہا تھا۔

"تم یہاں بیٹھی ہو۔

"ہائے۔ وہ چہکی۔

"میں سمجھا تم ناراض ہو گئی ہو۔

"تم لوگ فضول باتیں جلد سمجھتے ہو۔

"اچھا۔

"ہاں۔

"تو آؤ۔ کچھ کام کی باتیں کریں۔

"چلو۔ مگر کہاں؟

"کہاں — میں نے پل بھر سوچا پھر فوراً ہی جواب دیا۔

"سی۔ وے۔ چلتے ہیں۔

وہ دیوار پر سے کود پڑی، کودنے سے پہلے اس نے میرے شانوں کا سہارا لیا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کچھ ہی دیر میں سی وے پہنچ گئے۔ وہاں معمول کے مطابق خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف خوانچہ والے آوازیں لگا رہے تھے میں نے کماٹی کو بلایا۔ وہ جب خوانچہ اتار چکا تو اونیل نے کہا۔

"شو، گرکین پیس۔

میں نے گنے کی گنڈیریاں خریدیں۔ اور رومال پھیلا کر گنڈیریاں اس پر منتقل کر دیں۔ میں گنڈیریاں کھا کر کھوئی اِدھر اُدھر پھینکتا رہا اور اونیل اس کی کھوئی ایک ہی جگہ ڈھیر کرتی رہی۔

"آج مجھے کیتھس بہت یاد آیا۔

"کیتھس۔

"ہاں۔ میرا دوست۔ میرا فیانسی۔

"لیکن تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری شادی کیوں نہ ہو سکی۔

"شاید میں نے بتادیا تھا۔
"نہیں۔
"سچ۔
"ہاں۔ تم نے اس دن اپنی یادوں کو لپیٹے میں غسل دیا تھا۔
"اوہ شریر کہیں کے۔
اس نے ہاتھ اٹھاکر میرے شانے پر رکھ دیا۔ اک ذراسی جھجکی اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر
رگڑنے لگی۔ سی۔ وے کا رومان پرور ماحول خاموشی اور اوڈنیل کی خودسپردگی۔ میرے ذہن میں چیونٹیاں
سی رینگنے لگیں۔ جواباً میں نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اس نے ہونٹوں پر سے ہونٹ ہٹاتے ہوئے کہا
"ایسے ہی کیڈٹس کو کس کیا کرتی تھی میں۔
"تمہارا دوست تھا۔ فیانسی تھا۔
"ہوں" اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ماضی میں کھو گئی۔ لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں وہ بلا
کی حسین نظر آرہی تھی۔
"اوڈنیل۔
"ہوں۔
"آنکھیں کھولو۔
"تمہیں جانتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکوں گی۔
"اوڈنیل۔ میں... زوبیری ہوں۔
"زوبیری — اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھا۔ پھر یک بیک اس کا رنگ زرد ہوتا
چلا گیا۔ کافی دیر بعد اس نے کہا۔
"تم نے پوچھا تھا ہماری شادی کیوں نہ ہوسکی۔ ہے نا؟ ویت نام کی جنگ یاد ہے تمہیں؟ اس جنگ کے
لیے ہمارے یہاں جبراً فوجی بھرتی ہوئی تھی کم بخت..... اف..... میں خوش ہوں زوبیری۔ وہ جنگ ختم ہوئی۔ پر تم
جانتے ہو وہ اپنے پیچھے کتنا زہر چھوڑ گئی۔ تمہیں پتا ہے پچیس ہزار کیڈٹس کام آئے۔ لاکھوں بھاگ گئے۔
"ہٹاؤ اس بور سبجیکٹ کو۔
میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ چیونٹیاں کچھ زیادہ ہی تیزی سے میرے دماغ میں رینگنے لگی تھیں۔ کنپٹیاں
دہک رہی تھیں۔ میں نے اوڈنیل کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اس کا چہرہ اٹھاکر اس کے ہونٹوں پر اپنے
ہونٹ رگڑنے لگا۔ وارفتگی کچھ زیادہ بڑھی تو توا سے چپٹاتے چپٹاتے زمین پر لیٹ گیا۔ اور جب میری
گستاخیاں زیادہ بڑھیں تو اوڈنیل کسمساکر میرے پہلو سے نکل گئی۔ فوراً ہی میں بھی اٹھ بیٹھا۔ میں نے
دیکھا۔ اوڈنیل نے اپنے لباس کو درست کیا۔ پھر میرا رومال اٹھاکر بچی کھچی گنڈیریاں ہوا میں اچھال دیں
اور دوسرے ہی پل جھک کر اس نے کھوئی بٹور کر رومال پر رکھی اور میری طرف متوجہ ہوئی۔ میں نے
دیکھا۔ اس کے ہاتھ میری طرف بڑھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں رومال تھا اور رومال پر کھوئی ◉

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

❋ جنوری ۸۹ء کے "اشاریہ" کے تحت جناب شمیم حنفی نے اردو کی ادبی روایات میں عوامی اصناف اور عوامی مذاق و مزاج کی کمی کی طرف بجا طور سے توجہ دلائی ہے۔ اس کمی کو پہلے بھی محسوس کیا جاتا رہا ہے اور اس کے تدارک کے لیے کچھ شعوری کوششیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان میں آورد کا شائبہ موجود تھا کیونکہ یہ غلط سمت سے چلی تھیں۔ عوامیت تو عوامی سطح ہی سے ابھر سکتی ہے لیکن ادب عوام کی پہنچ سے باہر تھا۔ ہمارے معاشرے میں عوام کے ساتھ جہالت کا تصور لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ یہاں خواندگی ہمیشہ سے محدود رہی ہے اور ابھی تک اس کی شرح نہایت پست ہے۔ اردو کی نوشت و خواند اور بھی محدود۔ عوامیت کی کمی دراصل زندگی سے دوری ہے۔ کیونکہ عوام میں معاشرے کی بنیاد اور اصل حقیقت ہیں۔ اور اس دوری کے دو کھلے اسباب ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

اول تو زندگی کے تمام شعبوں سے اردو کی بے دخلی۔ یہ نہ سرکار کی زبان ہے نہ تعلیم کی نہ کاروبار کی۔ ایک زندہ زبان کو زندگی کے ہر گوشے میں ہوا کی طرح جاری و ساری رہنا چاہیے۔ تبھی اس کے ادب میں بھی سچائی اور توانائی پیدا ہو سکتی ہے۔ اردو اسپرانٹو طرح ایک بادر ہوا میڈیم بن کر رہ گئی ہے۔ جس کی جڑیں زمین سے کٹتی جا رہی ہیں، اگرچہ یہ زمین ہی سے پھوٹی تھی، ابتدا ہی سے عوام کی زبان تھی۔ اس میں شعر گوئی کی ابتدا بھی عوامی اصناف سے ہوئی تھی، پہیلیاں کہ مکرنیاں وغیرہ۔ اس کے اسالیب۔ محاورات، ضرب الامثال یا کہاوتوں میں آج بھی عوامی بلکہ دیہی عنصر نمایاں ہے۔ ہمارے کاریگروں نے بھی اپنے ہنر اور پیشے سے تعلق رکھنے والے اوزاروں، کلوں، جنتروں، مسالوں، ترکیبوں اور تدبیروں کے بے شمار نام وضع کر لیے تھے جو جدید مصطلحات کی طرح مغلق نہیں۔ عوامی بولی ہی کی طرح مانوس، ہلکے پھلکے اور پر معنی ہیں۔ ان کا کچھ ذخیرہ مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی نے فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران میں محفوظ یا بہر بند کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ جیتے جاگتے لفظ انگریزی کے غلبے اور انگریزی لغات کی یلغار کے سبب بے موت مر کر رہ گئے۔

میں نے ایک مضمون "جوتے کی اصل" آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ یہ الفاظ کے اشتقاق سے تعلق رکھتا تھا۔ چونکہ پیرایہ ہلکا پھلکا تھا اس لیے اس نے بچوں کا رسالہ "پیام تعلیم" میں جگہ پائی۔ میں نے لکھا تھا کہ جوتے کے ہم اصل الفاظ کا سلسلہ یہاں سے لے کر یورپ کی زبانوں تک پہنچتا ہے۔

خیر اس طرح بچوں کو شاید کچھ لسانیات سے دلچسپی پیدا ہو۔ اس میں میں نے مثال کے طور پر بھی لکھا تھا کہ اگر ہم اپنی اصلاح ساز کمیٹیوں سے کہتے کہ VACCICATION کے لیے کوئی اردو لفظ وضع کریں تو شاید وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے یا عمل تعلیم و تلقیح کی قسم سے کوئی اصلاح تجویز کرتے۔ ہمارے عوام نے ایک مدت پہلے ایک ہلکا پھلکا لفظ "ٹیکا" بناکے چالو کر دیا تھا۔ آج ہمیں خیال بھی نہیں آتا کہ یہ کیونکر بنا اور درست ہے یا نادرست۔

مدعا یہ کہ آبادی کے سواد اعظم کو تعلیم سے اور زبان کو چلن سے محروم رکھنے کے سبب زبان کی ترقی میں عوامی جینئس بروئے کار نہیں آتا اور عوام کی زبردست فاؤقی صلاحیت سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہی ہماری کوتاہی ہے اور اس کا اثر ادب پر بھی نمایاں ہے۔

اتنا اور عرض کروں گا کہ زبان کی طرح ادب کا میدان بھی پوری نمائندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ نہ صرف عوامی بن سکتا ہے نہ خواص کے ادب تک محدود۔ اس میں جیتی جاگتی زندگی کی سچائیاں اور گرما گرمی بھی ہونی چاہیے۔ معاشرے کے دکھ درد بھی، لطائف و مطائبات بھی۔ غزل کے ساتھ ہزل بھی۔ سادگی کے ساتھ تفنن یا سوفسٹیکیشن کو بھی ادب سے خارج نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ رنگارنگی ہی ادب کو وقیع بناتی ہے۔ ادب کسی بندش کو قبول نہیں کرے گا۔ ہر مذاق اور ہر سطح کا ادب پیدا ہوتا رہے گا۔ تبھی ہم اسے توانا اور سچا ادب کہہ سکیں گے۔ البتہ رد و قبول کا حق ہر طبقے اور پورے معاشرے کو حاصل رہے گا۔

شان الحق حقّی ۔ کراچی

کتاب نما کے تازہ شمارے میں شمیم حنفی صاحب نے ایک نئے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ورنہ پچھلے چند شماروں سے تو "کتاب نما" میدان کارزار بنتا جا رہا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ظفر پیامی اور پھر کلام حیدری کے مہمان اداریوں نے خاصی گرمی پیدا کی ہے جو اس ماحول کے لیے مفید بھی ہو سکتی ہے۔ مگر کلام حیدری صاحب کے یہاں فرسٹریشن نمایاں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ لوگ اردو کے اساتذہ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر کوئی مضامین وغیرہ نہ لکھے تو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب فلاں فلاں لوگ اردو کی روٹی کھا رہے ہیں اور برس دو برس میں دو چار مضامین بھی لکھتے پڑھتے نہیں۔ پھر کوئی لکھنے لگے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اردو کے اساتذہ خواہ مخواہ تعلیم و تدریس کا میدان چھوڑ کر ادب کے میدان میں داخل ہو جاتے ہیں اور دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ اب کوئی بتلائے کہ بے چارے اردو کے پروفیسر بشمول ریڈر اور لیکچرر کیا کریں؟

بہرحال یہ الگ معاملہ تھا۔ تازہ شمارہ اپنے مواد کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ البتہ پروف ریڈنگ پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے اور ہاں۔ یہ اکبر علی خاں عرشی زادہ کا مضمون چھاپنے میں آپ سے شاید دیر ہو گئی؟ "ایوان اردو" دہلی کے جولائی ۸۸ء کے شمارے میں یہی مضمون چند لفظوں کی کٹوتی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ "گوشۂ احمد جمال پاشا" کے بارے میں بھی ایک بات کہنی ہے۔ اس میں پہلی بات پر آخری بات کی سرخی لگا کر آپ نے شاید علمی مزاح کی صورت پیدا کی ہے۔ اگر یہ عنوان میں نے

لکھا ہوگا تو یہ سوچ کر کہ اسے گوشے کے آخری صفحے پر شائع ہونا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو سکا بہتر ہے۔
ڈاکٹر اعجاز علی ارشد پٹنہ

سال نو مبارک ہو۔ جنوری ۸۹ء کا کتاب نما موصول ہوا۔ گرانقدر مشمولات پر مشتمل یہ کافی پسند آیا۔ خاص طور سے اس شمارے کا خصوصی حصہ "گوشہ احمد جمال پاشا" بہت اچھا لگا۔

مہمان اداریہ کے تحت جناب شمیم حنفی نے بڑی حد تک حقیقت پسندانہ باتیں کی ہیں۔ عوامی ادب کے مسائل اور اردو کی ادبی روایت کے تعلق سے موصوف نے جو سوال اٹھائے ہیں وہ غور طلب ہیں۔ حسن نعیم صاحب کی غزل صوفی مصور عبدالحمید خاں کی نذر مجھے بہت پسند آئی۔ ندا فاضلی، خالد رحیم، اور ملک زادہ جاوید کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا انٹرویو شائع کر کے آپ نے محترمہ کو سمجھنے کا موقع عنایت فرمایا۔ فیض۔ اختر شیرانی کی صدائے بازگشت،، کے تعلق سے اور بھی باتیں آنی چاہییں تھیں۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم۔ کھیریا نددہ۔ بھاگلپور

'کتاب نما' موصول ہوا۔ شکریہ۔ اس مکتوب کی توجیہ یہ ہے کہ میری غزل جو آپ کے موقر جریدے میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کتابت کی ذرا سی غلطی ہو گئی ہے۔ غزل کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں 'زہر ہلاھل' کی بجائے 'زہر ہلال' شائع ہو گیا ہے۔ آخری شعر میں لفظ 'فرقت' کی بجائے 'الفت' ہونا چاہیے۔ براہ کرم وضاحت کر دیجیے گا۔

عرفانہ عزیز۔ کنیڈا

حسب عادت دسمبر ۱۹۸۸ء کا "کتاب نما" خریدا۔ مشمولات کافی دلچسپ ہیں۔ کلام حیدری صاحب کی مزاحیہ تحریر دجی ہاں، خالص مزاحیہ ہے رویئے زار زار اور کیجیے ہائے ہائے آپریشن تنقید نگار اور تنقید نگاری کی حامل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مہمان اداریہ کے متعلق نامی انصاری صاحب کا مراسلہ پڑھا۔ یہ مراسلہ مراسلہ نگار کے مفلوج دماغ و ذہن کا آئینہ دار ہے۔ فاروقی صاحب صف اول کے نقاد ہیں۔ انھوں نے تنقید نگاری کو نئے اسلوب سے ہم کنار کیا ہے۔ نامی صاحب نے ان کی شان میں گستاخی کر کے اردو کے ان گنت سامعین / قارئین ARDENT کا دل دکھایا ہے۔

(ایم خاور سونگڑہ۔ کٹک)

کلام حیدری کا اشاریہ کوزہ میں سمندر کا مصداق ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پر اپنی بات کہنا اور منوا لینا بھی ایک فن ہے۔ تحقیق کی زبوں حالی کا کیا رونا۔ آج کل پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں خصوصاً بہار میں تین ہزار سے پانچ ہزار روپے میں تفویض کی جاتی ہیں۔

الیاس احمد گدی کی کہانی 'معرکہ' پسند آئی۔ کہانی میں جو تجربات کی گہرائی، فکر کا اچھوتا پن، احساس و خیال کی ندرت اور سادگی و رعنائی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، موصوف کی امتیازی خصوصیت

ہے۔

اس ماہ ' مانگے کا اجالا' سنسنی خیز رہا۔ اسی طرح کے انکشافات مستقبل قریب میں بھی ہوتے رہیں تو ہو سکتا ہے محقق انفعال سے اور رضا واہی نقوی صاحب دلّی جاکر مالک رام سے اس بارے میں دریافت کرنے سے بچ جائیں کہ

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے
کون دلّی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

(شمیم عالم مصحفی بھاگل پور (بہار)

ماہ نومبر ۸۸ء کے شمارے میں طنز و مزاح سے بھرپور مضمون ' عمر رفتہ' پڑھنے کو ملا۔ واقعی اس مضمون میں ہر عمر کے مرد و خواتین کی نفسیات کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے جو موقع بہ موقع زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔

محمد عبدالرحیم۔ سکریٹری اقبال اکیڈمی محبوب نگر

ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ بڑا لطف آیا۔ کتاب نما کے کالمز ' مانگے کا اجالا' اور ' کھلے خطوط' کے یہ الزامات نہایت افسوس ناک ہیں کہ اردو کے RESEARCH SCHOLAR اپنے مقالوں میں مال یہاں یا وہاں سے چوری کر کے جمع کیے ہیں۔ بھئی دیکھیے میں انھیں الزامات ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں خود بھی ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ صرف اتنا ہے کہ چوری کا الزام اردو والوں پر ہے اور جس قدر محفوظ ہوں کہ میرا تعلق انگریزی ادب سے ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان ناقدین کے سوچنے کا ایک پہلو یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ سارے ہندستانی سماج میں اور شاید پاکستان میں بھی SLIP OF TONGUE یا SLIP OF PEN کافی مقبول اور معروف ذریعہ مغفرت ہیں۔ لہٰذا میری اپیل ہے کہ ان مظلوموں پر صرف SLIP OF PEN کے ہی الزام لگائے جائیں۔ کیونکہ حقیقتاً ' INVERTED COMMAS' لگانا بھول گئے ہیں۔ کیا اتنی چھوٹی سی غلطی بھی معاف نہیں کی جا سکتی ؟

خدارا اب آپ یہ بھی نہ کہیں کہ میں نے بھی یہ بات کہیں سے اڑا لی ہے۔

خورشید احمد سالار۔ کالی کٹ

' کتاب نما' دسمبر ۸۸ء کا تازہ شمارہ پڑھا۔ اپنے منتخب متنوع اور معیاری مضامین اور نثر و نظم کے باعث یہ شمارہ بھی خاصا جاندار اور وقیع ہے۔ مہمان مدیر جناب کلام حیدری کا اداریہ مختصر ہوتا ہوئے بھی بہت جامع ہے۔ بلاشبہ ان کا اداریہ سچ بولتی تصویر ہے۔

الیاس احمد گدی کا افسانہ ' معرکہ' صوری و معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوبصورت ہے۔ افسانے میں کہانی پن موجود ہے اور پلاٹ خاصا اہم ہے۔ اس شمارے میں کھلے خطوط بھی

خاصے معلوماتی ہیں اور بہت دلچسپ بھی۔

مصطفیٰ مومن، رحمت گنج، دھنباد

"شعلے کی آواز" نظم تو چھپ گئی ہے مگر کرامات کاتب بھی اس سے صاف ظاہر ہو رہی ہیں۔ "خوف" کو "خون" لکھ کر محاورہ کو مسخ کرنا اور "وجداں" کو "دو جہاں" کرنا اور مصرعے میں سقم پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ "خوف" والا مصرع یوں تھا:

خوف کی ماری ہو

اور "وجداں" والا مصرعہ یہ لکھا تھا:

میں وہ حرفِ مدعا تھا ذہن و وجداں میں سمایا

سیّد قیصر قلندر "گلریز" سری نگر

مہمان مدیر کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ متنوع موضوعات پر مختلف مشاہیر اہل قلم کی فکر انگیز تحریریں پڑھنے کے لیے مل جاتی ہیں، جن پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور مختلف ادبا اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا اداریہ اس اعتبار سے پر لطف اور متنازع فیہ تھا کہ اس میں انھوں نے بعض سچی باتیں بڑی جرأت اور لاگ لپیٹ کے بغیر کہی تھیں، جس نے قارئین اور مشاہرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لیں۔ یہ منافقت کی انتہا ہے کہ خود تو اردو والا ردو دُور دکریں اور اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھائیں۔ مانا کہ ہندستان میں اردو پڑھانے سے مالی اور اقتصادی فوائد حاصل نہیں ہوتے لیکن اس طرح اپنے تہذیبی تشخص کا تحفظ ہوتا ہے۔ ہمیں یہودیوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ بنی اسرائیل کو فلسطین سے نکلے کتنے ہزار سال ہو چکے۔ لیکن انھوں نے آج تک نہ صرف اپنی زبان و ادب کو بچائے رکھا بلکہ اپنی تہذیبی انفرادیت اور روایت میں بھی فرق نہیں آنے دیا۔ وہ جس ملک میں بھی گئے اس ملک کی زبان سیکھی اور اپنی زبان و تہذیب کی بھی حفاظت کی۔ ہندستانی مسلمانوں کی حالت تو یہودیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ وہ کم از کم اپنی سرزمین اور اپنے وطن میں تو ہیں۔ مسلمان اگر چاہیں تو ہندی اور علاقائی زبانیں سیکھنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی آسانی سے حفاظت کر سکتے ہیں۔ اردو اور اردو کے بنیادی الفاظ کے ذخائر تقریباً یکساں ہیں۔

ظ۔ انصاری کا مضمون "غالب اور دشمنان غالب" بھی بہت خوب تھا۔ پاکستان کے ماہنامہ "نگار پاکستان" نے ظ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اداریے کو یہاں نقل کیا ہے۔ اس طرح پاکستانی قارئین کو یہ دونوں عمدہ مضامین پڑھنے کے لیے مل جائیں گے۔ پاکستان میں اس وقت اردو تنقید کا حال بہت برا ہے، بلکہ نہایت تیزی سے زوال آمادہ ہے۔ روزنامہ جنگ کے کالم نگار کی حیثیت سے مجھے باقاعدگی سے ادبی نشستوں اور کتابوں کی اجرائی تقاریب میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ وہاں جو مضامین پڑھے جاتے ہیں وہ ہرگز سنجیدہ تنقید کے زمرے میں نہیں آتے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ان

ان مضامین کو نہایت شان سے ادبی رسائل میں شائع کرادیا جاتا ہے اور مدیران کرام بھی انھیں نہایت اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔

شہزاد منظر، بلاک ۱۶، گلشن اقبال کراچی ۴۷

بماہ دسمبر اور جنوری کے رسالے نظر نواز ہوئے۔ مشمولات پسند آئے۔ دن بہ دن کتاب نما خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ ایک عریضہ یہ ہے کہ اگر مضمون نگار حضرات انگریزی عبارات کا ترجمہ دے دیا کریں تو بڑا اچھا ہو۔ اس طرح ہر شخص مستفیض ہوسکے گا۔ ایک سوال اور ہے اور وہ یہ کہ کیا شاعری میں ایمان کے خلاف کہنا اور کفریات بکنا درست ہے؟

محمد قادری۔ بھدرک اڑیسہ

ادبی اور تہذیبی خبریں

عہد حاضر کے ممتاز نقاد وہاب اشرفی کے ساتھ ایک شام

رانچی کے نئے ادیبوں کی طرف سے ۶ نومبر ۸۸ء کو اردو کے "ممتاز نقاد پروفیسر وہاب اشرفی کے ساتھ ایک شام" کا انعقاد سرور ساجد کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔

ممتاز نقاد جناب محمود ہاشمی کی موجودگی سے اس ادبی نشست کی اہمیت اور بھی دوبالا ہو گئی۔

نشست کی ابتدا سرور ساجد کے تمہیدی کلمات سے ہوئی۔ اس نشست میں وہاب اشرفی صاحب پر چار مقالے پڑھے گئے۔ سرور ساجد نے اپنے مقالے بہ عنوان "وہاب اشرفی کے تنقیدی رویے کی ایک جھلک" میں وہاب اشرفی کے تنقیدی نقطۂ نظر کو پیش کیا۔

جناب سرور کریم نے اپنے مقالے بہ عنوان "وہاب اشرفی ایک معتبر ناقد" میں بڑی وضاحت سے وہاب اشرفی کے تنقیدی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی۔

جناب ڈاکٹر لیسین قاسمی نے اپنے مقالے بہ عنوان "وہاب اشرفی میری نظر میں" وہاب صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی۔

جناب بشیر احمد نے اپنے مقالے "وہاب اشرفی بحیثیت استاد اور ناقد" میں تفصیل کے ساتھ ان یادوں کا ذکر کیا جن کا تعلق بشیر احمد کے زمانہ طالب علمی سے تھا۔

جناب افروز عالم نے پڑھے گئے مقالوں پر اپنی صاف صاف دو ٹوک رائے دی۔ مقالوں کے اختتام کے بعد ممتاز نقاد جناب محمود ہاشمی صاحب نے وہاب اشرفی کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ادب میں تعلقات کو راہ نہیں دیتا۔ وہاب اشرفی سے میری ایک طویل اختلافی بحث چلی لیکن ہمارے مراسم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ محمود ہاشمی نے وہاب اشرفی کو اردو تنقید کا ایک ممتاز نام قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہاب صاحب نے اردو تنقید کو تنقیدی اصول دیے ہیں۔ یہ کارنامہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

ممتاز جدید شاعر ڈاکٹر صدیق مجیبی صاحب نے وہاب اشرفی کو متنی تنقید کا معتبر ناقد کہا۔

ماہر لسانیات جناب عزیز الحسن نے نوجوان ادیبوں کو اس طرح کی شام منعقد کرنے پر مبارکباد دی۔ آخر میں پروفیسر وہاب اشرفی جو اس نشست کے مہمان خصوصی بھی تھے۔ اپنے تنقیدی نقطہ نظر کی وضاحت کی۔ وہاب اشرفی نے فرمایا کہ ادب کا مطالعہ کرتے وقت پہلے سے قائم کیے گئے نظریے کو معطل کر دینا چاہیے۔ اگر ہم پہلے سے قائم نظریے کو معطل کر دیں گے تبھی فن پارے کے تجزیے میں اس گہرائی تک اتر سکیں گے جہاں سے فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اس ادبی نشست کی نظامت کے فرائض جناب سرور ساجد نے انجام دیے۔

سرور ساجد اور سرور کریم نے مل کر اس شام کا اہتمام کیا۔ افروز عالم، فیروز رامش، اور عمر شاہین حمیدی نے انتظامی امور میں مدد دی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی، پروفیسر اسلم پرویز، عبدا لـ ۔ ایم راجن، اظفر جمیل، انور رایج، محفوظ عالم، عبدالمغنی، امان اللہ خاں وغیرہ نے شرکت کی۔

اُردو میں بچوں کے ادب پر سمینار

لکھنؤ۔ یکم دسمبر۔ اُردو ہندستان میں زندہ رہے گی۔ اس لیے کہ اب نئی نسل نے ایک طرح سے اس کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ بزم اُردو کے زیر اہتمام "اُردو میں بچوں کا ادب" پر ہونے والے سیمنار کی دوسری کڑی میں چھوٹے بچوں نے جس ذوق و شوق سے حصہ لیا اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ اب اُردو کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن و تابناک ہے۔

حامد ہ حبیب اللہ صاحبہ کی قیام گاہ کا وسیع ہال مدعوئین اور بزم کے مہمان سے ایسا بھرا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پروگرام کا آغاز علامہ اقبال کی نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" سے ہوا۔ آٹھ اور بارہ سال کی عمر کے درمیان بچوں نے اُردو میں لطائف، نظمیں اور کہانیاں بڑے اعتماد سے سنائیں جن اسکولوں کے بچوں نے اس پروگرام میں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔ تعلیم گاہ نسواں، الہدیٰ، مولانا آزاد میموریل اسکول، لارٹیو کانونٹ، سلیٹ ایگلیس اسکول اور مدرسہ اتالیہ۔

جلسے کی صدارت بیگم زیبا صلاح الدین نے کی اور بزم کی جانب سے بچوں کو انعامات تقسیم کیے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے بچوں کو ایک کہانی سنائی۔ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے بچوں سے اُردو کے متعلق کچھ سوالات کیے جن کے بہت حوصلہ افزا جوابات ملے۔ جب بچوں سے یہ پوچھا گیا کہ تم بڑی کلاسوں میں پہنچ کر کون سا مضمون لوگے تو زیادہ تر بچوں نے کہا کہ "ہم اُردو کی اعلا تعلیم حاصل کریں گے"۔ نظامت بزم کی سکریٹری قدسیہ ہاشمی نے کی۔

جناب آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی سبکدوشی

۳۱ رجولائی ۱۹۸۸ء کو جناب اے۔ ایم زتشی گلزار دہلوی مدیر "سائنس کی دنیا" اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ اس دن موصوف کو ایک خصوصی تقریب میں الوداع دی گئی۔ ادارہ کے اڈیٹر ان چیف جناب ایس پی امبشتا نے آپ کی خدمات پر روشنی ڈالی اور خراج تحسین پیش کیا آپ کی جگہ پر محمد خلیل صاحب "سائنس کی دنیا" کے انچارج اور مدیر مقرر کیے گئے ہیں۔

بہادر یار جنگ پر تحقیقی مقالہ
ذاھد عرفان کو ڈاکٹریٹ

گلبرگہ۔ ۴ راگست۔ ہندستان کے بے مثال خطیب اور سیاسی رہنما قائد ملت نواب بہادر یار جنگ پر پہلی مرتبہ ایچ۔ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ گلبرگہ یونی ورسٹی میں پیش گیا تھا جس پر زاہد عرفان تاپوری کو پی۔ ایچ۔ ڈی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ اردو کے مشہور استاد ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی پروفیسر و صدر شعبہ اردو گلبرگہ یونی ورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔

مصنف، شاعر سید اطہر حسین کی وفات

لکھنؤ ۲۳ ردسمبر۔ اردو شاعر اور مصنف سابق آئی اے ایس افسر، اور اودھ کی ایک ممتاز شخصیت سید اطہر حسین صاحب کل رات فیض آباد میں جہاں وہ ریٹائر ہونے کے بعد مقیم ہوگئے تھے۔ قلبی عارضہ میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی تدفین آج دن میں فیض آباد میں ہوئی۔

سید اطہر حسین مرحوم کی عمر تقریباً ۶۸ برس کی تھی۔ ادارہ "کتاب نما" پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

عظیم شاعر زبان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے
حافظ شیرازی پر ۳ روزہ سمینار کے اختتامی اجلاس میں مونس رضا کی تقریر

نئی دہلی ۲۷ ردسمبر۔ دہلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مونس رضا نے آج کہا کہ ہر بڑا شاعر صرف جغرافیائی اعتبار سے ہی برتر نہیں ہوتا بلکہ زبان سے بھی برتر ہوتا ہے وہ آج یہاں ایران کلچرل ہاؤس اور آل انڈیا فارسی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام حافظ شیرازی پر ۳ روزہ سمینار کے اختتامی اجلاس میں مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے کہا کہ حافظ میرا محبوب شاعر ہے لیکن وہ جس زبان میں شعر کہتا ہے وہ زبان مجھے نہیں آتی۔ جناب مونس رضا نے اپنے انفرادی انداز میں کہا کہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ یونیسکو کو اس سال یہ معلوم ہوا کہ حافظ بہت بڑا شاعر تھا اور یونیسکو کا ۱۹۸۸ء کو آفاقی شاعر کا سال قرار دیا۔ تہذیبی ناانصافیوں کو درست کرنے کی جانب ایک قدم ہے۔ جناب مونس رضا نے حافظ شیرازی کو آفاقی شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

اس سے قبل آج دن میں حافظ شیرازی پر تقریباً ایک درجن مقالے پڑھے گئے۔ جن میں حافظ کی شاعری کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ پروفیسر عطا کریم برق نے حافظ کی شیرازی کو سیکولرزم کی عمدہ مثال بتایا اور اس سلسلے میں ان کی شاعری سے حوالے پیش کیے۔ جناب آصف نعیم صدیقی نے حافظ کی غزل میں "استعاراتی نظام" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ پروفیسر سمیع الدین احمد نے "حافظ کا اسلوب" پر اپنے مقالے میں بھرپور بحث کی اور ان کی شاعری میں استعمال لفظ 'صبا' سے حافظ کی شاعری کے اسلوب کو اجاگر کیا۔ اس اجلاس کے صدر پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کہا کہ حافظ شیرازی اپنے عظیم تصورات کی وجہ سے آفاقی شاعر بن گئے ہیں۔ آج ڈاکٹر حبیب المرسلین، ڈاکٹر ایس کے کیو جعفری، پروفیسر بنی ہادی پروفیسر مقبول احمد خاں، ڈاکٹر مسز آصفہ زمانی، ڈاکٹر محمود صدیقی، ڈاکٹر اسلم خاں اور ڈاکٹر شریف حسین کاظمی نے اپنے مقالے پڑھے۔

پاکستان میں مزاح نگاری پر فوجیوں کا غلبہ

نئی دہلی۔ ۷ دسمبر۔ پاکستان میں اردو طنز و مزاح نگاری کے میدان پر مسلح افواج حاوی ہیں۔ یہ حقیقت اردو طنز و مزاح پر ایک دو روزہ ہند پاک سیمینار کے دوسرے دن سامنے لائی گئی۔ یہ سیمینار کل یہاں ختم ہو گیا۔ اس کا اہتمام اردو اکادمی دہلی نے کیا تھا۔

پاکستان کے ایک نمائندہ ڈاکٹر سلیم اختر نے بہت سے ایسے مزاح نگاروں، طنز نگاروں اور کالم نویسوں کے نام بیان کیے جو فوج میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

"انجمن زندہ دلان حیدرآباد" کے جناب مصطفیٰ کمال نے کہا کہ طنز و مزاح جاگیردارانہ تہذیب و تمدن کی دین ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی تنظیم نئے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے شکایتی انداز میں کہا کہ عورتوں کو مزاح کی آڑ میں تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس پر ایک مزاح نگار نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا "عورت کو نہیں بیوی کو!"

دہلی اردو اکادمی سیمینار کمیٹی کے چیئرمین دیوان بیریندر ناتھ نے اعلان کیا کہ اکادمی کے زیر اہتمام ہر سال ایک اجلاس منعقد کیا جائے گا جو صرف طنز و مزاح کے لیے وقف ہوگا۔ اکادمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی نے کہا کہ اکادمی کے رسالہ میں باقاعدگی کے ساتھ ایک حصہ طنز و مزاح کے لیے رکھا جائے گا۔

سیمینار میں صبح کی نشست مشہور اردو مزاح نگار آنجہانی فکر تونسوی کے بارے میں اظہار خیال کے لیے مخصوص رہی جو تیس برس سے زیادہ عرصہ تک دہلی کے اردو اخبار روزنامہ "ملاپ" میں مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ یکے بعد دیگرے اظہار خیال کرنے والے مقررین نے فکر تونسوی کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا۔ ایک مقرر نے کہا کہ فکر تونسوی نے اردو میں تقریباً ۱۱ ہزار مزاحیہ کالم اور ۲۵ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے کچھ کتابوں کا ترجمہ ہندی میں بھی کیا گیا ہے۔

سابق وزیر اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال نے اجلاس کی صدارت کی۔ انھوں نے فکر تونسوی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کا موازنہ مشہور کارٹون ساز آر کے لکشمن سے کیا اور کہا کہ ان کا تبصرہ بڑا جاندار ہوتا تھا۔

پروفیسر اے۔ آر۔ سید کا انتقال

نئی دہلی۔ ۲۳ جنوری۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سوشیالوجی شعبہ کے سربراہ پروفیسر اے آر سید کا کل اچانک انتقال ہو گیا۔ اطلاع کے مطابق وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ بمبئی جا رہے تھے کہ راستے میں ہی دل کا شدید دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ پروفیسر سید کو سوشیالوجی میں بین اقوامی شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے متعدد عالمی سیمیناروں میں شرکت کی۔ اس سے قبل وہ امریکہ میں ویزیٹنگ پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ اور ایک لڑکا شامل ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آج ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔

طالب چکوال سپرد آتش

نئی دہلی ۲۴ دسمبر۔ اردو کے جانے مانے شاعر منوہر لال طالب چکوال کا آج دوپہر یہاں انتقال ہو گیا اور آج

بھی شام انھیں سپردِ آتش کر دیا۔ وہ ۹۵ برس کے تھے۔ پس ماندگان میں ۲ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ چکوال کی شاعری کے دو مجموعے "برگِ سبز" اور "برگِ ناد" پر یوپی اور دہلی کی اکیڈمیوں کی جانب سے انعام مل چکے ہیں۔

ہاشم علی، کرن بیدی اور علی صدیقی

کنشکا ایوارڈ پانے والوں میں شامل

۲۵ دسمبر۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید ہاشم علی، دہلی پولیس کی ڈپٹی انسپکٹر مز کرن بیدی اور عالمی اردو کانفرنس کے چیرمین علی صدیقی ۱۹۸۸ء کے لائنز کنشکا ایوارڈ پانے والے ۱۶ ممتاز لوگوں میں شامل ہیں۔ انھیں اپنے متعلقہ شعبوں میں سال رواں میں نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں یہ ایوارڈ یکم جنوری کو پیش کیے گئے۔

اوما شنکر جوش کا انتقال

بمبئی۔ ۲۰ دسمبر۔ مشہور گجراتی ادیب اور شاعر اوما شنکر جوشی کا گزشتہ رات یہاں کے ٹاٹا میموریل اسپتال میں پھیپھڑے کی بیماری میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۷ برس کے تھے۔ وہ گجرات یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور آل انڈیا ساہتیہ اکیڈمی اور گجرات ساہتیہ پریشد کے سابق چیرمین رہے۔

"زیر فلک" کا اجرا

نئی دہلی ۹ دسمبر۔ مشہور خاتون پولیس افسر کرن بیدی کے ہاتھوں کل ایوانِ غالب میں نئے ماہانہ رسالہ "زیر فلک" کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ رسالہ خاتون مدیروں کی ذہنی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ مسز کرن بیدی نے رسالے کے مدیروں کو مبارک باد پیش کی اور صحافت کے ذریعہ ملک و عوام کی خدمت کرنے کے ان کے عزم کو سراہا۔ اس [illegible] رسالہ کی چیف اڈیٹر ایم جبیں نے شکریہ کے ساتھ تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ بعد میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا۔

رام پنڈت کے اعزاز میں نشست

پچھلے دنوں تکمیل رائٹرس گروپ کے زیر اہتمام مراٹھی کے مشہور و معروف شاعر و ادیب و مترجم جناب رام پنڈت کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا انعقاد جناب مشتاق مومن کے دولت کدہ پر کیا گیا۔ اس کی صدارت مشہور شاعر جناب یعقوب راہی صاحب نے فرمائی۔

سب سے پہلے تکمیل رائٹرس گروپ کے سکریٹری جناب مظہر سلیم و مدیر تکمیل نے جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جدید افسانہ نگار جناب سلام بن رزاق نے مختصر اور اپنے بیانیہ پیرائے میں شری رام پنڈت کا تعارف پیش کیا اور بتایا کہ رام پنڈت کے مراٹھی میں دو شعری مجموعے اور ایک اردو کہانیوں کا ترجمہ "ترجمہ" کے نام سے اور ایک اردو نظموں کا مجموعہ "ریوڑ سے الگ" منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رام کی شاعری میں جھلکتی اور فلسفہ کا گہرا اثر ہے۔ بھونڈی سے آئے ہوئے نوجوان افسانہ نگار جناب ایم مبین صاحب نے رام پنڈت کی شاعری پر ایک تبصراتی مضمون بھی پڑھا۔ ہمارے دوسرے مہمان جناب غلام نبی مومن نے رام پنڈت کے مجموعے "ریوڑ سے الگ" کو دیوناگری میں دیکھ کر افسوس کا اظہار کیا اور کچھ نظموں کے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ بمبئی کے ایک معتبر افسانہ نگار جناب انور خاں نے کہا کہ رام پنڈت کے یہاں سنجیدگی اور متانت ہے اور اپنے کام کو کرنے کی لگن بھی۔ مگر شاعری کو رومانی بھی ہونا چاہیے۔ اور ان کی نظمیں رومانی نہیں ہیں۔

اس محفل میں بمبئی کے ایک اور معتبر افسانہ نگار جناب انور قمر نے رام پنڈت کی کچھ نظموں کا ذکر کرتے ہوئے "ریوڑ سے الگ" کی اردو نظموں کو دیوناگری رسم الخط میں دیکھ کر اسے انقلابی قدم قرار دیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر یونس

اگا سکھ نے اپنا مختصر مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ رام پنڈت کے موضوعات شعر ان کے تہذیبی اثر سے ابھرے ہیں۔ جدید شاعر جناب شمیم عباس نے بھی رام پنڈت کی شاعری پہ لب کشائی کی۔

جدید اردو افسانے کا ایک اہم نام (ستون) جناب سریندر پرکاش نے اپنی تخیلی اور علامتی تقریر میں کہا کہ ایک ایسی شخصیت جو آپ کے پاس سے سرسراتی گزر جائے وہ ہی دراصل رام پنڈت ہیں۔ کسی چڑیا کا پتھر لگنے سے تڑپنا دراصل شاعری ہے۔ اردو کے ایک اہم اور معروف سیاسی طنز نگار جناب یوسف ناظم نے کہا کہ میں زبان اور اسکرپٹ کو ایک ہی چیز نہیں سمجھتا۔ میں چاہوں گا کہ یہ کتاب اردو میں بھی شائع ہو۔

خطبۂ صدارت میں جناب یعقوب راہی نے کہا کہ رام پنڈت پوری اکیڈمی کا کام اکیلا کر رہا ہے۔ یعنی اردو افسانے اور شاعری کو مراٹھی روپ دینا۔

صاحب اعزاز جناب رام پنڈت نے کہا کہ آج شاعری کو کوئی چھاپتا نہیں اور کتاب کوئی خریدتا نہیں۔

آخر میں سہ ماہی "تکمیل" کے مدیر اور "تکمیل" کے رائٹرس گروپ کے سکریٹری جناب مظہر سلیم نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست میں شاہد ندیم، الیاس شوقی اور رم ناگ بھی شریک تھے۔ مقصود اظہر نے جو اس نشست کی نظامت بھی کر رہے تھے نشست کے خاتمے کا اعلان کیا۔

صرف اردو رسم الخط بدلنے کی بات اردو دشمنی ہے
بیکل اتساهی

بھوپال ۴ اکتوبر۔ اگر اردو رسم الخط تبدیل کیا جاتا ہے تو نہ صرف اس کا مخصوص مزاج ختم ہو جائے گا بلکہ اس کے ساتھ جڑی ہوئی تہذیبی اور تاریخی روایتوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ جو زبان کے ساتھ قوم کا بھی ایک بڑا نقصان ہوگا۔

ان خیالات کا اظہار آج شعبۂ اردو، سیفیہ کالج نصر سلطانی بھوپال میں منعقدہ ایک خصوصی نشست میں جناب بیکل اتساہی (ممبر پارلیمنٹ) نے صدر شعبہ جناب عبدالقوی دسنوی کے ایک سوال کے جواب میں کیا۔

نشست کے آغاز میں شعبہ اردو کے استاد جناب محمد نعمان نے مہمان محترم کا تعارف کرایا اور سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری جناب ملا فخرالدین صاحب نے گل پوشی کی۔ صدر شعبہ اردو جناب عبدالقوی دسنوی کے ایک سوال کے جواب میں مہمان محترم نے فرمایا کہ آج کل مشاعروں میں معیار کی بات کرنا ہی سرے سے بیکار ہے انھوں نے بتایا کہ "کوی سمیلن" کے نام سے ایک فلم بنی جس میں میں نے بھی کام کیا۔ اس میں ہندی کے معتبر کوی ہری ونش رائے بچن نے اپنا کلام ہارمونیم پر سنایا اور عین ممکن کہ اس کی تقلید میں مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام موسیقی کے ساتھ پڑھے جانے لگے۔

اس گفتگو میں صدر شعبہ اردو جناب عبدالقوی دسنوی، شعبہ اردو کے استاد جناب محمد نعمان خاں، معاشیات کے پروفیسر جناب مرتضیٰ علی شاد، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری جناب فضل تابش اور ریسرچ اسکالر جناب یعقوب یاور کوٹی نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ سیفیہ آرٹس کالج کے پرنسپل جناب لنکور خاں اور سیفیہ سائنس کالج کے پرنسپل جناب سید ناصر علی کے ساتھ حاضرین کی ایک قابل لحاظ تعداد بھی موجود تھی۔ گفتگو کے بعد جناب بیکل اتساہی نے اپنا منتخبہ کلام پیش کیا جسے حاضرین نے داد و تحسین کے ساتھ سنا۔

بہار اردو اکیڈمی کا علاقائی دفتر مظفر پور میں قائم کیا جائے

مظفر پور۔ ۶ر نومبر ۸۸ء کو دس بجے دن میں اردو ریسرچ اسکالرس ایسوسی ایشن بہار، مظفر پور کی سالانہ کانفرنس زیر صدارت پروفیسر متین احمد صبا

صدر شعبۂ فارسی، بہار یونی ورسٹی منعقد ہوئی جس کا افتتاح بہار، کشمیر اور متعدد یونی ورسٹیوں کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز دانشور پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب نے کیا۔

اس کانفرنس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں شکیل الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کا رسمی افتتاح فرمایا۔ اس کے بعد ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر ولی احمد نے فارسی زبان وادب کے مشہور دانشور پروفیسر متین احمد صاحب کا نام نامی صدارت کے لیے تجویز کیا جس کی تائید ڈاکٹر سلیم اللہ نے کی۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری حامد خاں نے بہار اردو اکیڈمی کی بے اثری تعطل اور محدود دائرہ کار کا تذکرہ کیا اور مظفر پور میں اس کی ریجنل دفتر کے قیام پر زور دیا۔

ڈاکٹر عبدالواسع صاحب نے پروفیسر صدر شعبہ اردو بہار یونی ورسٹی کی خدمت میں ایسوسی ایشن کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا۔ جناب جلال اصغر فریدی نے پروفیسر قمراعظم ہاشمی صاحب کے علمی وادبی اور تفصیلی خدمات کے پیش نظر ایک منظوم سپاس نامہ بعنوان "عظمت قمر" پیش کیا جسے سامعین کی بھرپور داد تحسین ملی۔ ڈاکٹر قمراعظم ہاشمی چیرمین اردو ریسرچ ایسوسی ایشن نے اپنی تقریر میں مہمان خصوصی پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کے پس منظر میں ان کی انتظامی اور ایماندارانہ کارکردگی کی تحسین کی۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنی عالمانہ تقریر کے دوران ملک وملت کے مختلف مسائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انھوں نے موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا کہ سطحی سیاسی مفادات کو حاصل کرنے کے لیے نفرتوں اور عداوتوں کی پرورش کی جاتی ہے اور انسانی خدمات کے جذبات بالکل بے تعلق ہو کر فرقہ پرستی کا زہر ماحول میں تحلیل کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہولناک نتائج برآمد ہوں گے۔ انھوں نے ان کی تعلیمی ترقی پر زور دیا اور کہا کہ بین الاقوامی سطح پر یہودیوں اور انگریزوں کی سازشوں کے تحت لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کر کے اسلامی عقائد پر حملے کیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" ہے۔

مہمان خصوصی کی اس تقریر کے بعد مظفر پور کے ایک بزرگ سماجی کارکن اور مشہور ومعروف ایڈووکیٹ جناب محمد علی مرتضٰی صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر کے دوران اردو ریسرچ اسکالروں کی علمی سرگرمیوں کی تحسین کی اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر متین احمد صاحب نے کہا کہ وہ اردو ریسرچ اسکالرس ایسوسی ایشن کے اس پہلے سالانہ عظیم الشان جلسہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کی شرکت آوری نے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر وحیب الرحمٰن نے تمام شرکائے جلسہ، ارباب مدرسہ جامع العلوم، صدر جلسہ اور مہمان خصوصی کا ایک بار پھر پُرخلوص شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

جناب عبدالستار کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

پٹنہ۔ جناب عبدالستار کو پٹنہ یونی ورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ: "پریم چند کے نمائندہ کردار — ناول کی روشنی میں" پر پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس تحقیقی مقالہ کے نگراں جناب ڈاکٹر اسلم آزاد، یونی ورسٹی پروفیسر شعبہ اردو پٹنہ یونی ورسٹی پٹنہ تھے اور ممتحن ڈاکٹر محمود الٰہی پروفیسر شعبہ اردو گورکھپور یونی ورسٹی گورکھپور اور پروفیسر عبدالرؤف صاحب، شعبۂ اردو کلکتہ یونی ورسٹی کلکتہ تھے۔

امر اجالا کے بانی کا انتقال

بریلی۔ ۱۳ر جنوری۔ ہندی روزنامہ امر اجالا کے دوسرے بانی مراری لال مہیشوری کا اچانک انتقال ہو جانے سے

اردو صحافت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ یاد رہے کہ ابھی تقریباً چار ماہ قبل امر اجالا کے چیف بانی ڈوری لال اگروال کا انتقال ہوگیا تھا۔ اب اچانک آگرہ ہی میں مراری لال مہیشوری کا انتقال ہوگیا۔ ان کی آخری رسومات بریلی میں ادا کی گئیں۔

پروفیسر شمیم جیراجپوری

علی گڑھ۔ ۱۱ر جنوری۔ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ زوولوجی کے سربراہ پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری کا زولوجیکل سروے آف انڈیا کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے عہدہ کا چارج لے لیا ہے۔

سندھی شاعر کا انتقال

نئی دہلی ۱۱ر جنوری۔ سرکردہ سندھی شاعر نرائن شیام کا کل رات یہاں انتقال ہوگیا وہ ۶۵ برس کے تھے۔ پس ماندگان میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ نرائن شیام ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کر چکے تھے اور ۱۴ سال سے زائد عرصے تک اکادمی کے ایگزیکٹو کے ممبر بھی رہے۔

موتی لال مصری انتقال کر گئے

سری نگر ۷ر جنوری۔ جموں و کشمیر کے ایک سرکردہ ترقی پسند رہنما دانشور اور صحافی موتی لال مصری طویل علالت کے بعد بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ان کے سیاسی افق سے اٹھ جانے کے بعد ترقی پسند تحریک میں ایسی خلیج پیدا ہوئی ہے جو پر نہیں کی جا سکتی۔

موتی لال مصری طالب علمی کے زمانے میں ہی مہاراجہ کے خلاف تحریک میں شریک ہوئے اور کئی بار جیل گئے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے قریبی ساتھیوں میں وہ بھی شامل تھے۔

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ

علی گڑھ ۱۲ر جنوری۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ۱۲ ہزار سے زائد قدیم اور نایاب مسودے اور دستاویزات ہیں۔ یہ لائبریری عالمی شہرت کی مالک ہے اس میں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کا تحریر کردہ ۱۳۵۰ سالہ قدیم قرآن پاک کا نسخہ موجود ہے۔ یہ قرآن کوفی رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ رامائن اور مہابھارت کے فارسی تراجم موجود ہیں۔

لائبریری کے ایک ذمہ دار جناب عشرت قریشی نے بتایا کہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ اکبر بادشاہ کے ایک درباری نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوا ابوالفضل نے بھگوت گیتا اور ہندوؤں کی بیشتر مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جناب قریشی نے کہا کہ فارسی اسکالر ہندوستانی رزمیہ داستانوں سے بے حد متاثر تھے۔

جناب قریشی نے کہا کہ ابوالفضل نے کئی سنسکرت ڈراموں کا فارسی میں ترجمہ کیا یہ ڈرامہ مغل امرا اور ادب نواز حضرات میں بے حد مقبول ہوا۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ تر قدیم نسخے عربی اور فارسی کے ہیں، ان کے علاوہ لاطینی، انگریزی، جرمن، سنسکرت، فرانسیسی اور عبرانی زبانوں کے قدیم نسخے بھی ہیں۔ مہاتما گاندھی کی بہت سی اہم تصانیف بھی اس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اس میں نہج البلاغہ کا وہ نسخہ بھی ہے جو شریف الرضی کا مرتب کردہ ہے۔ یہ کتاب گیارہویں صدی میں لکھی گئی تھی یہ سب کتابیں نایاب کتابوں کے سیکشن میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

جناب قریشی نے بتایا کہ دارا شکوہ جو کہ شہنشاہ شاہجہاں کا بیٹا تھا۔ سنسکرت کا مشہور عالم تھا اس نے جوگ وششٹ اور اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مغل شہنشاہ میدان جنگ میں جاتے ہوئے جو قمیص زیب تن کرتے اسی پر قرآنی آیات خط غبار میں لکھی ہیں۔ یہ قمیص یہاں محفوظ ہے۔ یہ قمیص سرسید کے پوتے سر راس مسعود کو لارڈ لوتھین نے اس وقت پیش کی جب کہ وہ لندن گئے تھے۔ اس لائبریری میں ایک مشہور پینٹر کی مصوری کا وہ نایاب نمونہ بھی محفوظ ہے۔ جس کی قیمت ۲۰ لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہے یہ جہانگیر

کے صد سالہ جشن تھا۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جناب حبیب الرحمٰن شیروانی نے یونیورسٹی کو عطا کیا تھا مختلف ہندوستانی رجواڑوں اور نوابوں کی عطا کردہ ۸۵ لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔

شاعری کا عالمی اجتماع بھوپال میں شروع

بھوپال ۱۱ر جنوری۔ شاعری کا عالمی اجتماع جھیلوں اور پہاڑیوں کے خوب صورت شہر بھوپال میں آج سے شروع ہو گیا افتتاحی تقریب ہندوستان کے ہندی شاعر رگھوبیر سہائے سمیت دنیا کے ۵ شاعروں کے کلام کے ساتھ شروع ہوئی۔ شاعری کا یہ عالمی اجتماع یہاں "بھارت بھون" میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس اجتماع کو "واگرتھ" کا نام دیا گیا ہے۔

"واگرتھ" کا اہتمام حکومت مدھیہ پردیش۔ بھارت بھون، مرکزی کابینہ کے سکریٹریٹ کے تعاون سے جواہر لال نہرو صد سالہ تقریبات کمیٹی کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔ اس شعری اجتماع میں دنیا کے تمام چھ براعظموں کے ۱۲ اہم شاعر شرکت کر رہے ہیں۔ اردو کی نمائندگی ممتاز شاعر اخترالایمان کر رہے ہیں۔ افتتاحی تقریب میں مرکزی وزیر محترمہ سشیلا روہتگی وزیر اعلا ارجن سنگھ، بھارت بھون کی صدر پوپل جے کر سمیت کئی اہم علمی و ادبی ہستیاں موجود تھیں۔

یہ پہلا موقع ہے جب دنیا کی مختلف زبانوں کے اہم شعرا ایک ساتھ ایک چھت کے نیچے ہندوستان میں اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال بھارت بھون نے ایشیائی شاعروں کو یہاں جمع کیا تھا۔ یہ تقریب بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی۔

روٹی چاہیے شاعری نہیں
عالمی شاعری کانفرنس کے باہر عورتوں کا مظاہرہ

بھوپال ۱۲ر جنوری دسمبر ۱۹۸۴ء کے گیس حادثہ میں متاثرہ سیکڑوں عورتوں نے "روٹی اور ملازمت چاہیے شاعری نہیں" کا مطالبہ کرتے ہوئے کل یہاں بھارت بھون کے باہر زوردار مظاہرہ کیا جہاں عالمی شاعری کانفرنس منعقد ہو رہا ہے۔

مظاہرین کو جن کی اکثریت برقع پوش خواتین اور گود میں لیے ہوئے بچوں پر مشتمل تھی۔ پولیس نے بھارت بھون کے باہر کافی فاصلہ پر روک دیا۔ کیونکہ عمارت کے باہر بڑی تعداد میں پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ مظاہرین نے حکومت پر نکتہ چینی کی کہ وہ عالمی شاعری کانفرنس کا انعقاد ایک ایسے وقت میں کر کے دو کروڑ روپے صرف کر رہی ہے جب دنیا کے بدترین گیس حادثہ کے شکار افراد کو بازآبادکاری کی بے حد ضرورت ہے۔ انھوں نے کانفرنس میں شریک شعرا سے بھی اپیل کی کہ وہ کانفرنس کا بائیکاٹ کر کے متاثرہ افراد کے ساتھ اظہار یک جہتی کریں۔

اردو صحافی او پی بھارتی کا انتقال

نئی دہلی ۸ار جنوری۔ اردو کے سرکردہ صحافی اور روزنامہ پرتاپ کے چیف رپورٹر جناب او پی بھارتی کا آج دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا وہ ۵۸ برس کے تھے جناب بھارتی نیوز پیپر ایمپلائز ویلفیئر سوسائٹی کے صدر بھی تھے اور دو پہر کو نا ڈونڈیشن فار ایمیٹی انیڈ نیشنل سولیڈرٹی کی پریس کانفرنس میں شرکت کے بعد انڈین نیوز پیپر سوسائٹی (آئی۔ این۔ ایس) بلڈنگ میں بھارت ویج بورڈ کی میٹنگ میں اخباری نمائندوں کے کیس کی پیروی کر رہے تھے کہ ان پر شدید دل کا دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ انھیں فوراً رام منوہر لوہیا اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کی موت کا اعلان کر دیا۔

اردو کے ساتھ ناانصافی افسوس ناک

نئی دہلی ۲۵ر دسمبر۔ کل یہاں ہماچل بھون میں ادبی سنگم کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے اتر پردیش کے سابق وزیر اعلا جناب رام نریش یادو نے اردو سے ناانصافی کو افسوس ناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ پورے ملک کے ساتھ زیادتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندستان کی عظیم زبان ہے اردو جمہوریت کی علمبردار ہے●

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر تجارتی ادارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

مارچ ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۳

فی پرچہ ۴/-

سالانہ ۳۵/-

غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) ۱۰۰/-

(بذریعہ ہوائی ڈاک) ۲۲۰/-

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے ۴۵/-

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا

اس شمارے میں

گئو دان (نیا اڈیشن) (ناول) منشی پریم چند ۶۰/-

نورِ غارِ حرا (مجموعہ نعت شریف) ظفر علی راہی جونپوری ۱۰/-

حرفِ منطق (شعری مجموعہ) عبدالعزیز منطق امجدی ۱۰/-

نقش بر نقش " شارق جمال ناگپوری ۱۵/-

نقشِ بند (فن اور شخصیت) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ۳۰/-

حافظ ملت اور ان کی خدمات مولانا محمد عبدالسمیع ۴/-

خندۂ گل (شعری مجموعہ) شیخ غلام علی بلبل کاشمیری ۴۵/-

حیدرآباد تب اور اب (مجموعہ مضامین) محمد عبدالقیوم ۴/-

لاشریک (شعری مجموعہ) ف۔ س اعجاز ۵۰/-

غالب اور انقلاب ستاون (غالبیات) معین الرحمن ۶۰/-

مقالاتِ مسعود (ادبی مضامین) پروفیسر مسعود حسین خاں ۱۲۵.

تدریس تاریخ (تاریخ) خلیل الرب ۱۸/-

اردو داستانوں میں دیلین کا تصور (تذکرہ)
ڈاکٹر شفیق احمد شفیق } ۵/-

افسر شناسی (مضامین) مرتبہ ڈاکٹر مصطفےٰ نظرت ۱/-

اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب (ادب)
ڈاکٹر محمد شکیل خاں } ۸۸/-

عرشی صاحب کے خطوط (خطوط) ذکیہ جیلانی ۸۰/-

ہم کیوں مسلمان ہوئے (مذہب) پروفیسر عبدالغنی فاروقی ۴۵/-

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت (مذہب)
مولانا اخلاق حسین قاسمی } ۵۰/-

فرہنگِ اصطلاحات فلسفہ نفسیات اور تعلیم
ترقی اردو بورڈ نئی دہلی } ۳۰/-

مور رقص اور تماشائی (افسانے) نورالحسنین ۲۸/-

ایکشن ری پلے (ٹی۔ وی۔ ڈراما) اسلم داحدی ۲۵/-

بکھرے پھول (نظمیں) مرتضیٰ فہیم ۸/-

چار ناولٹ (نیا اڈیشن) (ناولٹ) قرۃ العین حیدر ۵۰/-

رمزِ حسن (شاعری) شاہد نجیب آبادی ۵۰/-

تاریخ تصوف (تصوف) صابر کلوروی ۱۳/-

عملی تنقید اوّل نیا اڈیشن (ادب)
کلیم الدین احمد } ۴۰/-

کارخانہ اور آئندہ زمانہ (ڈراما) محمد فضل الرحمٰن ۴/-

باط نو (شاعری) محمد فضل الرحمٰن ۴/-

اشرف علی صبوحی ایک مطالعہ (ادبی سوانح)
مبینہ بیگم } ۳۰/-

فن شاعری نیا اڈیشن (بوطیقا) عزیز احمد ۲۵/-

ہندستان کی زراعتی زمینیں اور ان کی زرخیزی
سید مسعود حسین جعفری } ۱۳/-

گہوارۂ علم و ہنر (شعری مجموعہ) جگن ناتھ آزاد ۲۵/-

احوال آثار سراج الدین خاں آرزو (سوانح)
ڈاکٹر ریحانہ خاتون } ۵۰/-

سرکہسار (شاعری) ڈاکٹر زبیر فاروق ۳۰/-

بیت جھڑ میں خود کلامی رشید امجد ۳۰/-

قیدی سانس لیتا ہے (افسانے) زاہدہ حنا ۵/-

صدا ابھرتی ہے (شاعری) رئیس علوی ۴۰/-

کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری ڈاکٹر احمد حسن ۶/-

مکالماتِ جوش و راغب (پاکستانی)
راغب مرادآبادی } ۵۰/-

مشرقی تنقید (تنقید) ڈاکٹر محمد حسن ۳۵/-

اردو الفاظ ایک بین الاقوامی رابطہ (ادب)
محمد نعیم اللہ خیالی } ۳۰/-

پھول جیسے لوگ (ناول) انور خاں ۴۰/-

سائنس کی کہانیاں اوّل (سائنس)
انیس الدین ملک } ۱۰/۵۰

سائنس کی کہانیاں دوم (سائنس)
انیس الدین ملک } ۱۲/-

تذکرہ علماء بستی (تذکرہ) انجم بستوی ۳۰/-

چار شہر ایک کہانی (سفرنامہ) وحید انور ۴۰/-

ہندستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین (آزادی)
شیو رام گپت } ۳۵/-

مہمان اداریہ

اقبال متین

C/o IQBAL JAVED,
RAOD NO.3,
AHMAD PURA COLONY,
NIZAMABAD-503001
(A.P.)

اشاریہ

اُردو کہانی کی عمومی بے جہتی

میں کہانی کی کسی مخصوص جہت کے تعلق سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطمح نظر ان سطور میں جو آپ کے گوش گذار کی جارہی ہیں کچھ عمومی سا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میں کہانی کی پہچان کا مطالبہ کرتا ہوں اور یہ مطالبہ مجھے اس لیے کرنا ہے کہ آج کل کہانی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت کھو رہی ہے —— وہ لوگ جو کہانی کی صورت گری کا دعوا کرتے ہیں وہی کہانی کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں —— اجتہاد کے نام پر کہانی نے جتنے صدمے اٹھائے ہیں وہ کسی اور صنفِ ادب نے نہیں اٹھائے —— دروں بینی، تجرید، علامتی اظہار، استعاراتی اندازِ نگارش، اساطیری طرزِ تحریر، کیا وجہ ہے کہ اردو کہانی کا چہرہ نہیں سنوار سکے۔ حالاں کہ اردو کہانی میں ان سب کے امکانات کے کئی پہلو تھے اور آج بھی ہیں —— لیکن حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی سفر کا کوئی دیانت دارانہ تصور ہی ہمارے ساتھ نہیں رہا۔ ہم نے افسانے کی تخلیقی راہیں، متعین ہی ادعائیت پر کیں۔ اور یہ ادعائیت صرف اس لیے معرض وجود میں آئی کہ ہم اپنی ادبی شخصیت کو بیک جست اوپر اٹھا سکیں۔ عصری حسیت کے نام پر زندگی کی تہذیب کا بارِ گراں کتنی کہانیوں نے اٹھایا —— عصری حسیت کے نام پر ذات کے انتشار کو زندگی کا انتشار تسلیم کروانے میں کتنی ہی کہانیاں ہیں جن سے ہمارا جدید ادب بھرا پڑا ہے اور یہ کہانیاں صرف اس لیے کہانیاں ہیں کہ ہمارے جرائد کے مدیران ان کو افسانے کے باب میں شائع کرتے ہیں اور تخلیق کار ان کو یکجا کرکے جو کتابیں چھپواتے ہیں وہ صنفِ افسانے کی تعریف میں پیش کی جاتی ہیں۔ آپ ان افسانوں کو کتنے ہی خلوص کے ساتھ پڑھیے افسانہ آپ کو کہیں نہیں ملے گا —— ہاں نثر کی ایسی ایسی مسخ شدہ عبارتیں ضرور ملیں گی جن میں ابلاغ کا ماتم چھپا رہے گا۔

میں کہوں، ترسیل کا یہ المیہ کوئی المیہ ہے ہی نہیں۔ اس کو المیہ قاری کے اخلاص نے بنایا ہے —— زمانے تک جدیدی کہانی کے ساتھ اس کے قاری نے اپنے ذہنی رشتے استوار کرنے کی سعیٔ نامشکور کی اور جب وہ حقیقتِ حال کو جان کر بدک گیا تو تخلیقات کو رد کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور ازالہ نہیں تھا —— ادھر تخلیق کار کو اپنی برتری منوالے کی فکر لاحق تھی چنانچہ اس نے قاری کی ذہنی سطح کو بزعم خود کھائیوں میں کھوجنے کی اہانت منظور نہیں کی اور کوہساروں پر کمندیں پھینک کر زمین کا ملیں ہی بھول بیٹھا۔ اس قضیے میں ایک ایسا گروہ شامل ہے جو جدیدی ادب کا ہراول دستہ بننے کی تمنا میں اپنا تخلیقی اعتبار بھی کھو بیٹھا۔

اس صورتِ حال کو آپ کیا کہیں گے کہ جدیدی افسانہ نگاروں نے اپنا قبلۂ فکر و نظر سعادت حسن منٹو کو بنا رکھا ہے اور کرشن چندر کے نام سے انھیں الرجی ہے —— منٹو بڑے افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے کہانی کے فن کو بیانیہ سے نکلے بغیر عظمتیں عطا کیں —— اردو ادب میں کہانی کے فن کو اس قدر تکمیل کے ساتھ برتنے والا افسانہ نگار کم ہی ملے گا —— برخلاف اس کے کرشن نے اپنی بڑائی کے باوجود کہانی کے فن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا —— انھوں نے ہیئت سے لے کر برتاو اور اظہار تک اتنے تجربے کیے کہ ان میں ترسل کی ناکامی کے المیۂ کو چھوڑ کر تو سب کچھ تھا لیکن کہانی نہیں تھی۔ جدیدی افسانوی مزاج کے اعتبار سے میرِ کارواں کرشن کو ہونا چاہیے تھا۔ سرخیلِ رنداں دہی بے دلی کے کرشن تھے لیکن جدیدیوں نے انھیں صرف اس بنیاد پر لائقِ اعتنا نہیں سمجھا کہ ترقی پسندوں نے کبھی انھیں ایشیا کا عظیم افسانہ نگار کہا تھا اور منٹو کی کھچائی کی تھی اور کبھی انھیں رجعت پسند قرار دیا تھا۔ میں ترقی پسندوں کے اس اعلانِ شہانہ سے ہرگز متفق نہیں ہوں اور یہاں اس بات کی اہمیت بھی نہیں ہے۔ یہاں تو صرف اس قدر دکھلانا مقصود ہے کہ جدیدیوں نے ترقی پسندوں کی ضد میں ایسے "اپنے" پر تبرہ بھیجا جس کے ہاتھ میں آج بھی جدیدیوں کے اندھیروں کے لیے مشعل ہے ورنہ جدیدیوں نے منٹو کی کہانی کے فن کو نہ صرف درخورِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ اس کے نام کی مالا جپ کر کہانی کو تاراج کیا۔ ایک ایسے فن کار کو اپنا سالارِ اعظم بنایا جس نے کہانی کے مرکزی تصور سے روگردانی کرنے والے ایک جملے کو بھی کہانی میں جگہ دینے سے اجتناب کیا۔ اور جدیدیوں نے اس کے حجرۂ اعتکاف کو رِواق تک پہنچایا۔

آج کہانی میں ایک اور بدعت بڑے رکھ رکھاو سے در آئی ہے اور وہ ہے اردو کو تخلیقی سطح پر جانے بغیر اردو کو اس طرح برتنا کہ اس کی کس مپرسی احتجاج بھی نہ بن سکے۔ اردو کا جدیدی افسانہ نگار اپنی دانست میں اس بلندی پر پہنچ گیا ہے کہ اردو زبان و بیان اس کے آگے حقیر ہو کر رہ گئے ہیں —— اس طرح جدیدیت نے ایک اور فیشن کو رواج دیا ہے اور کھُردری زبان کے نام پر ایک ایسا جواز فراہم کر دیا ہے کہ آج تو، الفاظ اپنے معانی کھو چکے ہیں —— اس ادعا کے پیچھے منطق اور استدلال کا دور دور تک کہیں گزر نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف اس حد تک کہ اپنے مفروضوں کو ثابت کرنے کے لیے از کار رفتہ تاویلات بروئے کار لائی جائیں۔

آج جب کہ آپ کے "لفظ" آپ کا "میڈیا" - آپ کا "نطق" - آپ کا "اظہار"، اپنی پہچان کھو رہے ہیں تو اس لیے نہیں کہ "لفظ" اب مفہوم کا بوجھ اٹھانے کا یارا نہیں رکھتے —— یہ ساری باتیں تو ان افسانہ نگاروں کی ذہنی پناہ گاہیں ہیں جو اپنی استطاعت کی پردہ پوشی کے لیے عجزِ بیاں کو ہنرمندی ٹھہراتے ہیں۔ اس ادعا کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

سوال یہ ہے کہ جب الفاظ مجبورِ محض ہیں تو پھر آپ کا میڈیا کیا ہے، وسیلۂ اظہار کیا ہے۔ جب کہ آپ الفاظ کی اعانت سے نہ کسی کے ذہن تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں نہ دل تک —— آپ کا فن اگر "لفظ" ہے تو لفظ کے لیے آپ کو اپنا خونِ جگر دینا ہوگا —— میرے نزدیک تو لفظ و معانی کا درک ہنرمندی کی پہلی پہچان ہے۔

اسی عجزِ بیان نے ہمارے آج کے جدید افسانہ نگاروں کو ایک اور مسند بھی عطا کردی ہے۔ اور اس مسند نشینی کی سند انھیں ہمارے جید نقادوں نے دے رکھی ہے —— ہمارے انگریزی زدہ اردو ادیب جو اپنی پہچان اور منزلت اُردو میں اپنی افسانوی تخلیقات کے برتے پر بنانا چاہتے ہیں —— غلط اردو لکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے کہ اب اس زبان کا مقدر یہی ہے اور یہی اردو کے ادیب انگریزی میں غلطی کر جانے پر حد درجہ شرمسار لگتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ اپنی مادری زبان ان کے بس میں ہے نہ ہی اس زبان پر ان کا یارا ہے جو ان کی اپنی دانست میں ان کی فوقیت تسلیم کرواتی ہے اور علمی استعداد کی بے بضاعتی چھپا لیتی ہے۔ اردو افسانے پر، اردو شعروادب پر بات کرتے ہوئے انگریزی کے دو اُلٹے سیدھے جملوں میں اپنی اردو دانی کی استطاعت پر پردہ اُٹھا کر اترانا ان اردو ادیبوں کا وصفِ خاص ہے۔ ان کے لیے اردو میں سوچنا اور انگریزی میں غلطی کرنا باعثِ شرم وندامت ہے۔ اردو ہی میں سوچنا اور اُردو ہی میں غلطی کرنا مباح وزیادت۔

اس کجروی میں اردو بھی ایک ڈھکی چھپی بات ہے جو ناقدینِ ادب ہی کی ودیعت ہے۔ اردو کے اکثر نقادوں کا ایک غیرستودہ نظریہ تنقیدیوں میں بھی ہے کہ ہندستان کے افسانوی ادب میں اچھائی اور تازگی، بلندی وبرتری کی تلاش اسی وقت ان کے لیے ممکن ہوسکتی ہے جبکہ وہ انگریزی اور فرانسیسی ادب کا اثر اس پر ثابت کریں۔ اس بزعمِ خود غلط نظریے نے اردو افسانے کی تنقید کو بھی اس قدر پُرتصنع بنا دیا ہے کہ ہم اس ملمع سازی کی چکاچوند میں سوائے اپنی زبان وادب کے ہر چیز تلاش کرسکتے ہیں۔

کسی بھی دور اور کسی بھی ملک کا شعروادب۔ اپنے ماحول، اپنے مزاج، اپنے معاشرے، اپنی زندگی، اپنی زمین اور اپنی ہوا سے روحِ تخلیق حاصل کرتا ہے —— اردو زبان وادب کا ہندستانی مزاج نہ فرانس میں پنپ سکتا ہے نہ انگلستان اور امریکا میں نمو پاسکتا ہے —— ایسے میں کیا ضروری ہے کہ اردو افسانے کو جو وہاں نہیں، یہاں ہندستان میں تخلیق کیا گیا ہے، مغربی شعروادب کی تحریکات سے اس حد تک وابستہ کیا جائے جبکہ ہماری آب وہوا سے لے کر معاشرے اور تہذیب تک، حالات و مسائل تک، اتنا بڑا فرق ہے کہ ایک دوسرے پر ان کا پرتو آج بھی ممکن نہیں ہے —— آج بھی ہمارا معاشرہ زراعتی معاشرہ ہے۔ صنعتی معاشرہ نہیں۔

یہ ادعا کہ دُنیا، وقت اور فاصلے پر انسانی دسترس کے سبب سمٹ کر رہ گئی ہے —— درست —— لیکن کیا تہذیبیں، معاشرے، ماحول بھی اسی سرعتِ رفتار سے بدل جاتے ہیں؟ —— مضحکہ خیز ہے ان حالات میں اگر ہمارا افسانوی ادب اپنے ملک کی روح کو خیرباد کر کے مغرب کی خوشہ چینی کو اپنی عظمت کا شکار گردانتا ہے۔ تو ہمارا افسانہ نگار کن بنیادوں پر اس عمل کو عصری حیثیت کا نام دیتا ہے۔

ادبی زاویۂ نظر سے عصری اور جدید دو اہم اصطلاحیں ہیں اور جو اپنا مخصوص معنوی سیاق وسباق رکھتی ہیں —— ان اصطلاحوں کے پیشِ نظر عصری افسانے اور جدیدی افسانے میں بڑا تضاد ہے۔

میں جدیدیوں کے ساتھ، صرف جدید کا لفظ استعمال کرنا نہیں چاہتا، اور اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ میر وغالب سے لے کر آج تک شعروادب نے جدت کے کئی مراحل طے کیے ہیں —— آج کل جس جدید شعروادب کا بول بالا ہے اگر وہی صرف جدید ہے تو پھر آپ کو یہ ماننا ہوگا کہ میر سے فیض اور

ناصر کاظمی تک پہنچتے پہنچتے شعر کا کوئی جدید سفر ہے ہی نہیں۔ اور اسی طرح مرزا محمد ہادی رسوا سے کرشن چندر اور غیاث احمد گدی تک اردو نثر کا —— اس گڈمڈ تو ضیح کو واضح شکل دینے کے لیے میں جدیدی شاعری و جدیدی ادب کی اصطلاح کو مناسب و معقول سمجھتا ہوں —— تاکہ آپ جدیدی شاعر و ادیب کو کل بھی اسی اصطلاح کی سیاق و سباق میں پہچان سکیں جبکہ شعر و ادب کسی اور جدید راستے پر گامزن ہو کر جدید تر ہو جائے گا۔ لیکن وہ جدیدی شعر و ادب سے اپنی الگ پہچان کا تقاضہ کر سکے گا۔

لہذا میں اپنے نزدیک یہ بات طے کر لوں کہ جدیدیت سے "جدیدیا" اور "جدیدیے" معرض وجود میں آئیں گے۔ اور خود جدیدیت جدیدی جدیدیت کہلائے گی —— اور ان سے جدیدی شاعر، اور جدیدی افسانہ نگار وغیرہ اور پھر جدیدی نظم، جدیدی افسانہ، جدیدی ناول اور جدیدی تنقید

اب یہاں ایک اور اہم بات معرض بحث میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جدیدی افسانہ کس حد تک عصری آگہی اور عصری حسیت سے علاقہ رکھتا ہے —— جدیدی افسانہ نگار کو اپنے تخلیقی فن کے لیے عصری حسیت سے آگہی کا ادعا کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی ہے جبکہ اس کی تخلیقات میں عصری آگہی کا دور دور تک پتا نہیں چلتا۔

عصری ادیب یا شاعر سماج سے اپنے ربط کو نظر انداز کر کے عصری کہلایا ہی نہیں جا سکتا —— عصری فن کار اپنی تخلیقات میں خود کو NON COMMITTED غیر وابستہ قرار ہی نہیں دے سکتا۔ اس کی تحریروں میں اپنے عہد پر طنز و تضحیک کا پہلو ابھرتا ہی اس وقت ہے جبکہ وہ سماجی اور سیاسی شعور کو زندگی سے وابستہ رکھے۔ تاریخی قوتوں پر جس کی سوچ گرفت رکھتی ہو —— سائنس کی ترقی سے ہراساں ہونے کے بجائے وہ اس کو انسانیت کی حفاظت اور عزت نفس کا پابند بنانے کے لیے اپنے تخلیقی سرچشموں کو بروئے کار لاتا ہو۔ عصری فن کا معاشرے کے سوشلسٹ نظام سے دلچسپی ہی نہیں رکھتا بلکہ اس نظام حیات کو نجات کا راستہ تسلیم کرتا ہے —— وہ اسی دنیا میں سانس لیتا ہے —— اس کا ماضی، حال، مستقبل، سبھی کچھ ہیں۔ وہ اسی سماج کا ایک فرد ہے۔ وہ زندگی سے کٹ کر زندگی کا کوئی قائم بالذات تصور نہیں کر سکتا —— صرف سانس کی آمد شد کو زندگی قرار نہیں دے سکتا —— اس کے پاس ماضی کا نوسٹلجیا اس کو اپنے حال سے جدا کر کے نہیں رکھتا —— عصری حسیت کی بات عصری آگہی کو پس پشت ڈال کر وہ کر ہی نہیں سکتا۔ اس کو معلوم ہے! سے سماج میں غیر جانب دارانہ رویہ تعمیر و تخریب کی تمیز مٹا دیتا ہے۔

برخلاف اس کے جدیدی افسانہ نگار ذات کے خول میں بند رہ کر خارجی عوامل سے داجبی علاقہ رکھتا ہے —— وہ داخلیت کا اس حد تک شکار ہے کہ انسانی اجتماعی دکھ درد کے کسی واضح تصور سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے کی ضرورت اس کے پاس کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ کسی معاشرے کو اس کے ماضی میں تلاش کر کے اور آخرش اس کو ماضی کے سپرد کر کے زندگی کی رفتار کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی اپنے جدیدیاتی عمل میں ہر اس مزاحمت کو پس پشت ڈال کر نکل آتی ہے جو اس کی شناخت سے روگردانی کر کے اس کی قوت رفتار و قوت نمو سے انکار کرے —— ایسے میں یہی زندگی دروں بینی کے نام پر معروضیت کی نفی نہیں کرتی۔ انسانیت کی عظمت سے انکار نہیں کرتی —— مایوسی اور ناامیدی سے سمجھوتا کر کے فعالیت کو کندھا دیے اور چالیس قدم چل کر

چھوڑ رہنے کے حیلے بہانے نہیں تلاشتی اور اگر وہ یہی سب کچھ کرنے کے درپے ہو تو پھر زندگی خود اس مجہول زندگی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ہماری جدیدی کہانی نے اس بات کو محسوس کرنے کی زحمت ہی نہیں کی اور غم ذات، خود آگہی اور دروں بینی کے مرکب الفاظ تراش کر ایسی ظلمتوں میں کھو گئی جہاں زندگی کی بے معنویت سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیے۔

مغربی ممالک کی مشینی زندگی کی دوڑ میں جدیدی ادیب جدیدی افسانہ نگار ہندستان میں رہ کر بھی اس خشوع و خضوع سے شامل ہے کہ ہر لحظہ موت کی تلوار اپنی گردن پہ دھری محسوس کرتا ہے اور عصری حسّیت کے معنیٰ و مفہوم اسی فراریت میں ڈھونڈھتا ہے —— اور شاید خود کو کسی ماورائی عصری حسّیت کے غیر عصری تصور میں گم رکھتا ہے۔

ان حالات میں کہانی پر جو بیتنی تھی سو بہر حال بیت کر رہی۔ اور اس صورتِ حال کو ہوا دی ایسے نقادوں نے جنھیں افسانہ نگاروں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر آگے بڑھانا تھا تاکہ وہ اپنے لیے راستہ بنائیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پوری کرتب بازی میں افسانہ نگار کم ESTABLISH ہوئے ہیں —— ان کے نقاد زیادہ۔

آج بھی گوپی چند نارنگ نے سریندر پرکاش کے افسانے "جبور الغریم کو جو "شاعر" میں چھپا تھا —— بہت بلند پایہ تخلیق قرار دیتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ بہت سوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ یا پھر اس کو ہضم کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں —— الفاظ من وعن یہ نہیں ہیں کیوں کہ اس وقت رسالہ میرے سامنے نہیں ہے۔ لیکن مفہوم بغیر کسی مبالغے کے یہی ہے اب سریندر پرکاش کے لیے نارنگ ہی کے دماغ کی ضرورت ہے۔ تب کہیں جاکر کہانی سمجھی اور پہچانی جاسکتی ہے —— چلیے جھوٹی ہوئی میں نے بھی دانشوری کی سند حاصل کرنے کے لیے افسانے کو سمجھنا چاہا۔ —— بہت کوشش کے باوجود پڑھ ہی نہ سکا تو پھر ہضم کیا خاک کرتا —— لہذا میں نے دونوں ہی کی بڑائی تسلیم کرلی —— خالق کی بھی ناقد کی بھی —— ویسے سریندر پرکاش اچھے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے بلاشبہ اردو ادب کو بعض اچھی کہانیاں دی ہیں۔ ان کی کہانیاں پوسٹر، بجوکا، سوکھا وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جن کو زندہ رکھنے میں ان کے فن کی پُر اعتماد توانائی کسی نقاد وقت سے سند کا مطالبہ ہی نہیں کرتی۔

اب نارنگ کبھی نہ کبھی اس کہانی کا تجزیہ کردیں گے اور وہ وہ زمین آسمان کے قلابے ملائیں گے اور ایسی ایسی دور دور کی کوڑیاں لے آئیں گے کہ آپ ہم بھی انگشت بدنداں، ششدر و حیراں کبھی کہانی کا منہ تکیں گے کبھی تجزیے کا —— آج کل کہانی، کہانی کو خود نہیں پہچانتی، تجزیے پہچانتے ہیں —— جب نقاد تجربوں کا آئینہ خانہ سجا دیتے ہیں تو کہانی سج دھج کر اپنا چہرہ اس آئینہ خانے میں اس طرح دیکھتی ہے جیسے کسی اور کا چہرہ دیکھ رہی ہو۔ ایسے میں نقاد آگے بڑھ کر کہانی سے سرگوشی کرتا ہے —— یہ تم ہو —— مان لو کہ یہ تم ہی ہو —— دور کیوں جایئے۔ قمر رئیس جیسے دیانت دار نقاد نے بھی ماہنامہ عصری آگہی میں جدیدی کہانیوں سے زیادہ خوبصورت ان کہانیوں کے تجزیئے کیے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ گوپی چند نارنگ کی ناقدانہ تحریروں کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ جب اردو کے کلاسیکی شعر و ادب پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کی ناقدانہ بصیرت ان کی تحریروں کی گیرائی و تہہ داری ذہن کو اپنا لیتی ہے۔ لیکن جب وہ جدیدی اردو افسانے کی بات کرتے ہیں تو انگاروں پر

ہاتھ مارتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

ہم کو دبی زبان سے کم سے کم ادب میں دیانت داری کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے ـــــ اور اگر نہ دیجیے تو کم ازکم اس بات کا حق دیجیے کہ ہم حق و باطل کی پہچان میں اپنے ذہن کو اس حد تک کھلا رکھیں کہ وقت پڑنے پر وہ ہماری آنکھوں کو بھی راستہ سجھا سکے۔

اب تو اُردو ادب کی بے ادبی کا عالم یہ ہے کہ شب خون کے کسی شمارے میں احمد ہمیش نے گوپی چند نارنگ کو صرف اس بنیاد پر کہ نثری نظم کے سلسلے میں نارنگ نے ہمیش کا نام نہیں لیا، اس ڈھٹائی سے للکارا ہے اور لعن طعن کی ہے کہ نارنگ نے احمد ہمیش کی شکایت سر آنکھوں پر، کے الفاظ سے جواب کا آغاز کیا ہے۔ اب جو مضمون نارنگ لکھیں گے اس میں کسی نہ کسی بہانے احمد ہمیش کا ذکر ضرور لائیں گے اور یہ بھول جائیں گے کہ انھوں نے کبھی احمد ہمیش ہی سے تخلیق کے معیار کی بات کی تھی ـــــ مصیبت یہی ہے کہ ایک خاص گروہ ایک دوسرے کی حمایت کو ادب کی حقیقی خدمت سمجھتا ہے۔

کتنے ایسے نقادان فن ہیں جو وحید اختر، قمر رئیس، وارث علوی، سید محمد عقیل، اصغر علی انجینیر اور عتیق اللہ کی طرح بغیر کسی ذہنی تحفظ گروہ بندی اور جغرافیائی عصبیت کے، شاعری کو شاعری اور افسانے کو افسانے کے بل بوتے پر قبول کرتے ہیں ـــــ مستقبل ہی بتلائے گا کہ کون سا ادب اچھا ہے اور کون سا بُرا ـــــ اور یہ اس وقت ہوسکے گا جب مصنف نقاد کو ڈرانے دھمکانے کے لیے یا قدم بوس ہوکر گڑگڑانے کے لیے زندہ رہے گا اور نہ نقاد ناموں کے ہی کھاتے سے ادیب یا شاعر کو خارج اور داخل کرنے کے لیے۔

اب تو اردو ادب کے لیے سب سے اہم سوال اردو کی بقا کا ہے۔ اردو بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے ـــــ اس کے لیے حکومت کم ذمّہ دار ہے اور اکادمیوں کے نام پر آستین میں چھپے خنجر جو پیٹ میں نہیں پیٹھ میں گھونپے جاتے ہیں، وہ بھی اتنے ذمّہ دار نہیں ہیں، جتنا خود اردو کے شاعر، ادیب اور اساتذہ ہیں ـــــ اداروں اور اکادمیوں کے تماشے میلہ گھومنے کے لیے تو ٹھیک ہیں کہ اشک شوئی ہو جائے اور دل زدہ بل کو جی بھی بہل جائے لیکن نس نس میں اس زہر کی آہستہ روی کا معالجہ و مداوا نہیں ہیں جو خود اردو والے اُردو کو پلا رہے ہیں۔

چلیے صاحب ایک سروے کرتے ہیں ـــــ اردو کے ادیب، شاعر اور اساتذہ ـــــ کتنے ایسے ہیں جو اپنے بچّوں کے لیے اردو ذریعہ تعلیم اپنائے ہوئے ہیں ـــــ ہمیں اس درجہ محرومی ہوگی کہ اردو کا مستقبل قریب ترین نظر آئے گا ـــــ ہمیں اپنی آنکھوں کے شہتیر نظر نہیں آتے جو دوسرے کی آنکھ کے تنکے سے بھی چھوٹے ہیں ـــــ میں نے آج سے بیس برس پہلے اپنے افسانے۔

"میں بھی فسانہ تم بھی کہانی" ـــــ میں اردو کی آخری سانسیں گن لی تھیں۔

اجازت دیجیے کہ چلتے چلتے میں ایک دلچسپ بات آپ سے کرتا چلوں۔

ہمارے دکن کی مقامی زبان کے ایک اہم شاعر ہیں۔ علی صاحب میاں۔ ضعیف آدمی ہیں۔ اسّی کے پیٹے میں ہوں گے یا شاید متجاوز ہوں۔ انھوں نے موٹر کے عنوان سے ایک بہت ہی خوبصورت نظم ادھر حال ہی میں کہی ہے یہ نظم اس معاشرے میں زندگی کی صعوبتوں پر، جس سے کوئی اہل ہنر گزرتا ہے۔ بڑا بھرپور اور تیکھا طنز ہے ـــــ اس نظم کا ایک اور حسن یہ ہے کہ موٹر کے سارے اہم کل پرزوں کو

انسانی، اعصابی دُکھ درد کا استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم پچھڑی ہوئی مقامی دیہاتی زبان میں ہے۔
اس نظم کا لفظیاتی سرمایہ چند متروک الفاظ کا بارِ گراں بھی اٹھائے ہوئے ہے۔

ٹام گن ایک اہم اور خوبصورت نظم ON THE MOVE بھی اسی زمرے میں آتی ہے ـــــ یہاں تقابل مقصود نہیں ہے۔ اتنا بتلا نا ضرور مقصود ہے کہ ٹام گن موٹر جیسی نظم لکھ ہی نہیں سکتا تھا اور علی صاحب میاں ON THE MOVE جیسی نظم لکھ ہی نہیں سکتے ـــــ موٹر میں جو ہندستانی معاشرہ سانس لیتا ہے وہ ٹام گن کا معاشرہ نہیں ہے اور ON THE MOVE میں جو سماجی نظام (SOCIAL SET UP) سانس لیتا ہے وہ مغرب میں نوجوانوں کی سماجی بے چینی، ان کی زندگی کی لایعنیت، ان کے اندرونی خلفشار مزاجی اور اضطراری کیفیات کی نشان دہی کرتا ہے ـــــ اور یہ نظام علی صاحب میاں کی بصارت و بصیرت سے پرے ہے ـــــ دوڑتا ہوا موٹر سائکل۔ اس کی سمت کا تعین کرنے والے تاثر کا ایک رُخی دباؤ۔ چمڑے کے جیکٹ اور دھوپ کی عینک جیسے "لفظ" اس سماجی نظام کی ہر بے چینی کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

علی صاحب میاں کے نام سے ٹام گن واقف نہیں ہے اور ٹام گن کے نام سے علی صاحب میاں واقف نہیں ـــــ لیکن ہم ٹام گن کا نام اپنے علمی افتخار کی سطح بنانے کے لیے لیتے ہیں ـــــ علی صاحب میاں کا نام علمی گراوٹ کی سطح چھپانے کے لیے نہیں لیتے ـــــ جب ہماری ذہنیت ہمیں یہاں تک لے جاسکتی ہے تو گویا در پردہ ہم اپنے فن کار کو قتل کرکے اس کی لاش دفنانا بھی نہیں چاہتے اور باہر کے ادیب اور شاعر کا جسم اس کی روح کو پہچانے بغیر اٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں کہ اس جسم کا مظاہرہ ہماری علمی بصیرت کی ضمانت ہے ـــــ اس غلط اندازِ فکر نے آج اُردو تخلیق و تنقید دونوں پر اس درجہ تصنع کے غلاف چڑھا دیے ہیں کہ ہمیں آج ہمارے ادب و شعر کی وساطت سے اپنی خوشی پہچانی جاتی ہے اور نہ اپنا غم۔

چلئے صاحب کچھ باتیں آپ سے بھی پُوچھتا چلوں تو کیا مضائقہ ہے۔

- کیا اب جدید کہانی میں کہانی پن کی آوازِ بازگشت پھر سے دھیمی دھیمی ہی نہیں سُنائی دے رہی
- کیا اب جدید جدیدیت کے خلاف اور خاص طور پر جدید افسانے کے خلاف کوئی تازہ ردِ عمل شروع نہیں ہو چکا؟
- کیا آج بھی جدید افسانے کی تنگ و تاریک گلیوں میں معروضی اخلاص کی تازہ ہوائیں نہیں در آئیں جو نئی نسل کی تحریروں کی علاحدہ شناخت کر رہی ہیں؟
- کیا آج بھی جدید جدیدیت ہندستان کے تہذیبی و معاشرتی ورثے سے دامن کشاں، اپنا تخلیقی سفر جاری رکھنے کا کوئی ساختہ پرداختہ ادعا کر رہی ہے ـــــ جو اس نے کبھی سرگوشی میں کیا تھا
- کیا آج بھی جدید لکھنے والے اپنے خارجی عوامل سے کٹ کر غمِ ذات کے خول میں، بلا شرکتِ غیرے بند رہنے کو مباہات سمجھتے رہیں۔؟
- کیا آج بھی، علامت پرست اور تجریدی جدید افسانہ نگار اپنی جدید کہانی کو معروضیت اور مقصد سے الگ رکھ کر زندہ رکھنے کا ادعا کر رہے ہیں ـــــ یا اس کی نفی کی طرف مائل نہیں؟

آپ بھی تو مجھے کچھ سمجھائیے۔

٭٭٭٭

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

باقر مہدی

E/1, Ravi Darshan,
Carter Road,
Bandra(w),
BOMBAY-400050

مرزا عزیز جاوید کی یادیں

(ایک کالی نظم اور ایک کالی غزل مرزا صاحب کی پانچویں برسی کے موقع پر شائع کی جارہی ہے)

بھیگے بھیگے ہوئے لہجے میں سُنیں تیری غزل
کاش ایسا ہو کہ پھر تجھ کو غزلخواں دیکھیں!
دوست پھر تیری رفاقت سے جھجھک کر رہ جائیں
محسنوں کو بھی سرِ بزم پشیماں دیکھیں!
تیرا ماتم نہ کریں جام کو چھلکائیں نہیں
"شہرِ مدفون" میں پھر رقصِ غزالاں دیکھیں!
کسی فٹ پاتھ پہ بیٹھیں یونہی گپ شپ کرنے
اور آئینہ صفت لوگوں کو حیراں دیکھیں!
پاس بیٹھی ہوئی افلاس کی تصویروں میں
رنگ اشکوں کا بھریں اور چراغاں دیکھیں!
جام کو توڑ کے دُہرائیں ترا اک مصرع
"کتنے زخم آئے تجھے گردشِ دوراں دیکھیں"!
ڈھونڈیں اک اور تسلی کا بہانہ باقر
آؤ پھر بیٹھ کے جاوید کا دیواں دیکھیں!

اب رونے سے کیا ہوتا ہے
جب وہ زندہ تھا تب تم نے کچھ نہ کیا —!
اکثر یوں ملتے تھے جیسے اس کے یار تم ہی ہو —!
اور یوں بھول بھی جاتے جیسے وہ کوئی انجانا ہے
اکثر تم ایسے شاعر اور دانشور
اہلِ ثروت سے نفرت کرنے کے بعد بھی
اُن کی خوبو رکھتے ہو —!
رحم و کرم کو سپر بنا کر جیتے ہو —!
کل جب وہ گلی گلی میں ٹھوکر کھاتا پھرتا تھا
تم آرام سے اس کے شعر پڑھا کرتے تھے
ناقد — ہونا — سارے غموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھا کرتے ہو
کچھ بتلاؤ — اک نادار کی موت میں کیا رکھا ہے ؟
اس کے غم میں — ہمدردی کا مرہم کتنا جالی
کتنا اصلی ہے ؟

تم سارے شاعر اور ناقد
اک احساسِ جرم کے مارے
خالی بے حس سائے ہو —!
جاؤ دیکھو — مرنے والے کا سایہ زندہ ہے!
"مدن پورہ" کی گلی گلی میں
ٹھوکر کھاتا پھرتا ہے

مرزا جاوید شعری مجموعہ

عبدالمغنی
'WARSI KUNG'
ALAM GANJ,
PATNA.800007

گردشِ رنگِ چمن

تاریخ اور تہذیب شروع سے قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں کا موضوع رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خاص کر انقلابِ زمانہ کی تصویر کشی بہت ہی حیرت انگیز انداز سے کرتی رہی ہیں۔ وقت قرۃ العین حیدر کے فکشن کا سب سے بڑا اور بنیادی کردار ہے جو دوسرے تمام کرداروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں ان کے انسانی پیچ و خم ابھارتا رہتا ہے۔ بڑے ناولوں میں "آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہمسفر" اور "کارِ جہاں دراز ہے" تاریخ و تہذیب کے افسانوی مرقعے ہیں جن میں واقعات و حادثات کو داستان کا رنگ و آہنگ دیا گیا ہے۔ گرچہ اس وجہ سے پہلے اور دوسرے ناول کو بالکل تاریخی ناول کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ تیسرا ناول ضرور سوانحی و تاریخی ہے، جب کہ پہلے اور دوسرے کا انداز فن کی ہیئت میں ایک عمرانی مطالعے کا ہے۔

مصنفہ کا تازہ ترین ناول "گردشِ رنگِ چمن" بھی ایسا ہی ایک مطالعہ ہے، جس کے اختتامیہ میں "نیم دستاویزی ناول" کہا گیا ہے۔ یہ دستاویز ان اشخاص اور خاندانوں کے احوال کی ہے جن کی جڑیں قدیم جاگیردارانہ ماحول میں ہیں اور شاخیں اپنے برگ و بار کے ساتھ جدید تکنیکی اور نیوکلیائی معاشرے میں لہراتی نظر آتی ہیں۔ اس منظر نامے پر تقسیم ہند اور جنگِ عظیم ثانی دونوں کے ہولناک اثرات ٹھہرے ہیں جنھوں نے تاریخ کا دھارا اور تہذیب کا ڈھنگ بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس تبدیلی میں نسلوں اور ہر نسل کے مرد و زن کا خلط ملط سب سے نمایاں عنصر ہے۔ نئے زمانے کے معاشرتی رجحانات کے ساتھ ساتھ ذہنی، روحانی اور اخلاقی میلانات اس عنصر کو نہایت پیچیدہ و مرکب شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس پیچیدگی اور ترکیب میں معیشت و سیاست سے مذہب اور تصوف تک کے عوامل کارفرما ہیں۔ ناول کے آخری ابواب پر تصوف کا عکس بہت گہرا ہے، گرچہ اس عکس کے خلاف سائنس کا احتجاج بھی جابجا موجود ہے، مگر اس کی آواز کم زور پڑتی معلوم ہوتی ہے حالانکہ فنکار نے ہیرو اور ہیروئن کو ان کے مخصوص حالات کے تقاضے کے باوجود تصوف کی بڑھتی ہوئی گرفت سے آزاد رکھا ہے لیکن مصنفہ کی وسعتِ نظر بجائے خود ایک نیم فلسفیانہ کے ساتھ ساتھ نیم صوفیانہ انداز رکھتی ہے، اس لیے کہ ان کی تہذیبی رواداری ہر قسم کے متضاد عناصر کو سمیٹ کر ایک نیم روشن دائرے میں یکجا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی اور عمومی طور پر اس ناول میں قرۃ العین حیدر کا مذہبی رجحان پہلے سے زیادہ بہت نمایاں ہے۔ لیکن

ہے کہ وہ "آگ کا دریا" کی تصنیف کے وقت سے زندگی کی جس حقیقت و صداقت کا سراغ لگانے کی کوشش مسلسل کرتی رہی ہیں اس کا پتا انھیں مذہب کے ایک خاص تصور میں مل رہا ہو۔

ناول کا عنوان غالب کے اس مصرعے سے لیا گیا ہے:

گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

قصے کی اہم ترین شخصیت کا نام عندلیب بانو بنایا گیا ہے اور اس مناسبت سے اس کی سرگذشت کو "ماہ و سالِ عندلیب" تصور کر کے ایک وسیع تناظر میں "گردشِ رنگِ چمن" کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اس روداد میں عندلیب بانو کا کردار ایک یونانی المیے کی شخصیت کے ساتھ ساتھ کورس کا ہے، جو دوسرے کرداروں کے افعال اور واقعات کی رفتار پر رواں تبصرہ کر کے سبھوں کو ان کی حقیقت کا آئینہ دکھاتا اور اس طرح ان کی داستانِ حیات کا مفہوم واضح کرتا ہے۔ لیکن عندلیب بانو گزرے ہوئے زمانے کا ایک مرقعِ عبرت ہیں۔ جب کہ عصرِ حاضر کے انسان بالخصوص عورت کی ترجمان ان کی بیٹی ڈاکٹر عنبرین بیگ ہے جو اپنے مصنوعی ماحول کے خلاف بغاوت کر کے اس مشتبہ ورثے کو رد کرنا چاہتی ہے جسے اس کی ماں نے اس کی طرف منتقل کیا ہے۔ مگر اس کا یہ انقلابی قدم حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر لڑکھڑانے لگتا ہے، حالانکہ اس کے پختہ ارادوں میں کوئی کمی نہیں آتی، مگر حالات کا دباؤ اس کے ذہن کو بری طرح مجروح کرتا ہے اور وہ ذہنی اختلال کا شکار ہوتی نظر آتی ہے۔

اس نازک حالات میں ڈاکٹر عنبرین بیگ کی دست گیری ایک جوان صالح ڈاکٹر منصور کاشغری کرتا ہے۔ جو عنبرین کی غلط خاندانی روایات کو جان کر بھی اپنی محبوبہ سے منہ نہیں موڑتا بلکہ جیسے جیسے اس کی حالت زیادہ سے زیادہ خراب ہوتی جاتی ہے وہ اس کے ساتھ اپنی ہمدردی، غم گساری اور چارہ جوئی بڑھاتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسے پوری طرح صحت مند بنا کر دم لیتا ہے۔ گرچہ عنبرین ایک ماہرِ اعصابیات کے علاج سے شفا یاب ہوتی ہے، مگر دراصل یہ منصور کی توجہ، وفاداری اور چارہ سازی ہے جو عنبرین کی روح کے مہلک زخم کو مندمل کر دیتی ہے۔ اس طرح پچھلی چند صدیوں کے پس منظر میں منصور گویا ایک نیا، بہتر اور برتر مرد یا انسان بن کر ابھرتا ہے جو اپنے عمل سے ایک قیمتی زندگی کو بچا کر معاشرے کو اصلاح کا راستہ دکھاتا ہے۔

ناول میں ایک بہت دل چسپ کردار راجا دلشاد علی خاں کا ہے جو ہندستانی مسلمان ہونے کے باوجود ایک بین الاقوامی فریب کار بن گیا ہے اور اپنی بد معاشیوں کا مرکز ایک مدت کے لیے یورپ اور امریکہ کو بناتا ہے۔ یہ موجودہ آفاقی یا عالمی کہلانے والی تہذیب کا ایک تاریک ترین نمایندہ اور نمونہ ہے۔ لیکن بالآخر جب وہ ایک عرصے کے بعد اپنے وطن کی ایک کاروباری سیاحت کے لیے ہندستان آتا ہے تو ایک صاحبِ دل اور روشن ضمیر صوفی اس کی قلب ماہیت کر دیتا ہے اور دلشاد اپنے گناہوں سے تائب ہو کر اپنی پرانی زندگی کو ترک کر دیتا اور حجاز پہنچ کر ایک صاف ستھری زندگی گزارنے لگتا ہے۔ اس کردار کا کارنامہ حیاتِ ماضی قریب اور زمانۂ حال کے جدید تمدن کا نفرت انگیز نقشہ پیش کر کے ایک امید افزا مستقبل کا پتا اسی طرح دیتا ہے جس طرح منصور کا عنبرین کے ساتھ سلوک گرچہ دونوں کرداروں کے اطوار و اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ان کرداروں کے مقابلے میں نگار خانم اور شہوار خانم کے کردار، دونوں بہنوں کی سیرتوں میں کچھ فرق کے باوجود، اس نو دولت، سطحی اور رواج پرست طبقے کی نمایندگی کرتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے ہر قسم کی ملمع کاری کر رہا ہے، مگر اس کے فریب کا پردہ چاک ہو کر رہتا ہے اور جھوٹی عزت حاصل کرنے کی کوشش میں اسے ذلت نصیب ہوتی ہے۔ عندلیب اور عنبریں ماں بیٹی کے مقابلے میں نگار و شہوار بہنیں کم نظر اور کم ظرف نظر آتی ہیں۔ حالانکہ ان کا متوسط درجے کا خاندان برا نہیں، جب کہ عندلیب و عنبریں کا کوئی خاندان نہیں۔ لیکن یہ ماں بیٹی کے پورے خلوص اور صاف دلی کے ساتھ ایک بہتر مستقبل کی تلاش کرتی ہیں جب کہ نگار و شہوار بہنیں دورِ جدید میں سانس لیتے ہوئے عہدِ قدیم کی مٹی ہوئی جاگیردارانہ شان و شوکت کی طلب گار ہیں۔ ذہنوں کے اسی فرق نے دونوں قسم کے کرداروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ اس اختلاف احوال سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے قابل اعتبار اور سرمایۂ افتخار ذاتی کردار ہے، نہ کہ نسلی ورثہ۔

ذاتی کردار کو ناول میں اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ رائے بہادر امبا پرشاد احقر اپنی ڈھیلی ڈھالی زندگی کے باوجود ایک بہتر انسان معلوم ہوتے ہیں، جب کہ ان کے مقابلے میں سید شکور حسین کٹر خاندانی آدمی ہونے کے باوصف ایک بدتر شخص نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ان کے سماجی محرکات و مقاصد اپنی جگہ قابل فہم ہیں اور بالکل ناقابل قدر نہیں۔ اس تقابل میں یقیناً فیصلہ کن امر نظریہ پرستی کے بجائے انسان دوستی اور پاکبازی کے دعوے کے بجائے حسن سلوک کی دلیل ہے۔ یہ دلیل چودھری فتح محمد اور نور ماہ خانم جیسے کرداروں میں بھی، جن کی پوری زندگی ایک گناہ میں ملوث ہے، پائی جاتی ہے۔ سندر کشور نراین سنگھ عرف کنور سینڈی اس کی ایک نمایاں مثال ہے، جو عقیدتاً و اصلاً ہندو اور ایک زمانے میں راجا دلشاد علی خاں کی شرارتوں میں شریک رہ کر بھی اپنے شخصی عمل سے اس حد تک راہِ راست پر آتا ہے کہ نہ صرف ایک مسلم صوفی کا مرید بلکہ اپنے بھٹکے ہوئے دوست، راجا دلشاد علی خاں کا گویا رہ نما اور اس لحاظ سے مصلح بن جاتا ہے، اس لیے کہ وہی اس انٹرنیشنل فنکار پر اور پلے بوائے کو اپنے مسلم پیر تک پہنچا کر اس کے انقلابِ طبیعت اور اصلاحِ احوال کا باعث ہوتا ہے۔ اس منظر نامے میں متعدد چھوٹے چھوٹے کردار بھی اپنا رول بہت خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان کی نیک سیرتیں ان کے بڑوں کو حقیقت و صداقت کا آئینہ دکھاتی اور ان کے سدھرنے اور سنورنے کا سبب بنتی ہیں۔

عورتوں میں بہ کثرت کردار طوائفوں کے ہیں اور تقریباً ہر طوائف کو حالات کے جبر کا ایسا قیدی دکھایا گیا ہے جو قفس میں بند پرندے کی طرح قید سے آزاد ہونے کے لیے بے چین ہے، حالانکہ اس کے پر اس بری طرح کاٹ دیے گئے ہیں اور فضا اتنی محبوس ہے کہ اپنے پنجرے سے نکل کر اڑ جانا اس کے لیے سخت دشوار ہے، چنانچہ جو مقید پرندے اپنی طاقتِ پرواز کا کچھ مظاہرہ کرتے ہیں وہ پر شکستہ ہو کر گر جاتے ہیں، مگر ان میں بعض اپنی ہمت دشوار پسند سے سعی آزادی کی راہیں ضرور روشن کرتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں دلنواز عرف چمن بی ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب زمانہ کا شکار ہو کر بالآخر طوائف کا پیشہ ترک کر دیتی اور آخر میں عزت کی زندگی گزارنے کے لیے بڑی مشقتیں اٹھاتی اور اذیتیں برداشت

کرتی ہے، مگر عندلیب بانو جیسی عورت کو ایک راستہ دکھا جاتی ہے، جس پر چل کر وہ اپنی بیٹی ڈاکٹر عنبرین کی نجات کا سامان کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے بیسویں صدی کی آخری چوتھائی تک ایک صدی سے زیادہ مدت میں قرۃ العین حیدر نے گردش رنگ چمن کی نقاشی بڑی لطافت و نفاست کے ساتھ کی ہے۔ ناول کی تکنیک اور اسلوب بیان کے جدید ہونے کے باوجود ماجرا نویس اور کردار نگاری اتنی نمایاں ہے کہ قصے کی دلچسپی، اپنے تمام رموز و اسرار اور تجسس و تمثیل کے ساتھ شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے، یہاں تک کہ نقطۂ عروج بالکل فطری طور سے سامنے آتا ہے اور داستان کے خاتمے پر انجام کی طرف ایک واضح اشارہ خیال انگیز علامتی انداز سے ہوتا ہے:

> "کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پر وہ چونکے انگلیوں سے پلکیں رگڑیں۔ ماچس تلاش کر کے بجھی ہوئی موم بتی جلائی۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ ہتھیلی پہ لگی راکھ آستین سے پونچھی۔ پانو کی بیڑیاں گھسٹتے ۔۔۔ کھسکتے، گھڑونچی تک پہنچے۔ اس کے ایک شکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی۔ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا، گھڑا نیچے آرہا۔ پانی سے شرابور ہوگئے۔ لیکن انھوں نے پروا نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تولا۔ پھر پوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہوگئے۔"

یہ جملے ناول کے ایک ذیلی کردار 'خواجہ سبز پوش' کے متعلق ہیں، جو نگار وشہوار کے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے اور درد مند و مخلص انسان ہیں جنھوں نے اپنے سوتیلے بھائیوں اور بہنوں کی بہبود کے لیے گویا اپنے کو مٹا دیا، مگر ان کے بھائیوں اور بہنوں نے اپنے سماجی ملمع کاری کے چکر میں پڑ کر انھیں ایک پاگل قرار دے دیا اور ایک اجنبی کی طرح مقید کر دیا۔ اس قید و بند میں رہتے ہوئے بھی خواجہ سبز پوش ایک مجذوب کے رول میں اپنے ملمع پسند اعزا اور ان سے ملنے والوں کو عجیب و غریب انداز سے تنبیہ کرتے رہتے ہیں۔ عندلیب بانو کے مانند وہ بھی گریک کورس کا کام ایک مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ قصے کے خاتمے پر حقیقتوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھتے ہیں اور ناول کی ہیروئن اپنی نیم دیوانگی سے شفایاب ہونے کے بعد اس حصار کو توڑ دیتی ہے جو حالات نے اس کے گرد کھڑا کیا تھا ("بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز") تو خواجہ سبز پوش بھی اپنے پانو میں پڑی ہوئی ان بیڑیوں کو کاٹنے لگتے ہیں جو انھیں پہنا دی گئی تھیں "اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہوگئے"، بندش احوال اور گردش ایام سے آزادی کے اس تخیل کو گرچہ علامتی رنگ میں پیش کیا گیا ہے، مگر اس لطیف طریقے پر کہ واقعے کی جزئیات چند لفظوں میں درج ہو کر قاری کو قائل کر دیتی ہیں کہ کہانی فطری طور پر اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے۔ گھڑونچی کے ایک شکستہ پائے کے نیچے سے صرف ایک اینٹ نکالنے کے اثرات کا نقشا جس طرح کھینچا گیا ہے وہ پوری تصویر کو ایک مانوس شکل میں پیش کرتا ہے اور اس میں کوئی اجنبی عنصر داخل ہو کر قصے کو چیستاں نہیں بناتا۔ یہ فنی چابک دستی اور افسانہ طرازی میں مہارت کی دلیل ہے۔

ناول کے اندر جا بہ جا، موقع بہ موقع منظر کشی کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں جن میں فطرت کے جلوے انسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں اور اس طرح قصے کے مختلف پہلوؤں کو منعکس کرتے ہیں۔ اس انعکاس کی تاثیر افسانے میں واقعیت پیدا کرتی ہے۔ خاتمے کا پس منظر جن تصویروں سے تیار کیا گیا ہے ان میں چند یہ ہیں:

"آبشار والے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے اٹھ کر "خواجہ سبز پوش" نے کپڑوں سے مٹی جھاڑی۔ سرد بھیگی زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو چکی تھیں۔ ایک چنڈول پھر سے اڑا۔ احاطے کے باہر آوارہ کتا مسلسل رو رہا تھا۔ ایک گرگٹ رات کی رانی کی ٹہنی پر سے اچھل کر عشق پیچاں کی گھنی بیل میں غائب ہو گیا ــــ اکیلا جگنو گلاب کی شبنم آلود جھاڑے میں دمکنے جا رہا تھا۔ چاروں طرف تاکتے، جھکے جھکے، تنا گرد بینیے کی سمت بڑھے۔ اپنی اندھیری کوٹھری میں پہنچ کر بجلی کا سوئچ اون کیا۔ بلب کا فیوز پھر اڑ گیا۔ موم بتی تلاش کی۔ کواڑ بند کر کے چٹخنی لگائی۔ اپنی "چاہ بابل" کی سلاخوں والی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر زہرہ اور مشتری تیزی سے چمک رہی تھیں۔ قطب ستارہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ ہوا چلی۔ مینہہ برسنے لگا۔" (صفحہ ۷۰۰ ـ ۷۰۱)

اس قسم کی مرقع نگاری ایک ایسی پُراسرار فضا پیدا کرتی ہے جو بالکل موقعے کے مناسب ہوتی ہے۔ اس سے ایک تجسس ابھرتا ہے اور حقیقت نگاری کا فسوں قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اور قاری آنے والے واقعات کی منطق کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہے۔

"گردشِ رنگِ چمن" ایک عمرانی مطالعہ ہے اور عمرانیات کے شعبۂ انسانیات ANTHRO POLOGY سے متعلق ہے۔ گردشِ ایام میں انسان کا ارتقا ناول کا خاص موضوع ہے مصنفہ نے اس موضوع پر ایک تبصرہ خود ہی ان لفظوں میں کیا ہے:

"تاریخ کا جوار بھاٹا ثابت و سالم اشیا کو کھلے سمندر میں پہنچا دیتا ہے۔ خستہ اور بیکار چیزیں ساحل کی ریت میں معدوم ہونے کے لیے پڑی رہ جاتی ہیں۔" (ص ۵۵)

تاریخ کے بدلتے ہوئے منظر نامے کے تناظر میں مشرق و مغرب کی کشمکش قصے میں ایک خاص دلچسپی اور آگہی پیدا کرتی ہے۔ اس کشمکش کا مجسم نمونہ راجا دلشاد علی خاں ہے جس کی جہاں بینی میں جب دروں بینی کی کیفیت ابھرتی ہے تو وہ تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس کا یہ جدیدیت پر مبنی بیان ہے:

"یہ (ہندستانی یا مشرقی) بہت بوڑھا تمدن اپنے سیکنڈ چائلڈ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ کلچر سینائل ہو چکی ہے۔ ذہنی صحت بڑی نعمت ہے جو ہم کو اب تک مغرب میں میسر رہی۔ وہ سرد، بے پروا، خود پسند، مغرور، بیزار خیر سہی۔ لیکن ایک نہایت منظم، سائنٹفک، حقیقت پسند معاشرہ ہے جس کے اندر ہمارا پرسنل کمیو فلر ہمارا منتظر ہے۔ بےشک میرا لاڈلا نورمن چند سال بعد مجھے نورما اور

اور سیلی سمیت کسی بوڑھوں کے گھر میں ڈال آئے گا۔ لیکن وہ بھی کیا فرسٹ کلاس "ہوم" ہو گا۔ یہاں تو ممکن ہے کسی سڑک کے کنارے ٹین ہو جائیں اور راہ گیر پلٹ کر نہ دیکھیں۔ تشدد، خود غرضی، بے حسی اور لالچ ان پر ختم ہے، مگر اپنی "روحانیت" کی ڈفلی بجائے جا رہے ہیں۔ ویسٹ جیسی اعلا ترین کمیونٹی سروسیز اور سوک سنس ان کے ہاں اگلے سو سال میں بھی نہیں پیدا ہو گا۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی۔ ان سب کو سیاہ پوش گریک کورس کی طرح اپنی حالِ زار پہ ماتم کرنا چاہیے۔ یہ اہلِ مشرق کس منہ سے مغربی مادیت کو برا کہتے ہیں۔

(ص ۷۶۔ ۵۷۵)

دوسری طرف وہی دلشاد اپنے ہندستانی و مشرقی پیرِ طریقت، ایک مسلم صوفی کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"وہ تخت رواں (ٹیلی وژن) کے سین سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہونے والے میاں ہیں۔ سارے اتھاہ ماضی سے جانے کس قسم کا گہرا پُراسرار رابطہ رکھتے ہیں اور حال میں پوری طرح سے شامل ۔ ایک موڈرن مائنڈ رکھتے ہیں اور قدرت نے ان کو ناقابلِ یقین روحانی طاقتیں عطا کر رکھی ہیں۔"

(ص ۵۲۔ ۶۵۱)

دلشاد اس کش مکش سے اس طرح نجات پاتا ہے کہ بالآخر انگلستان کو چھوڑ کر حجاز میں جا بستا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کے ایک جواب کی طرف کچھ اشارہ عندلیب بانو کے اس بیان سے ملتا ہے:

"...اپنی تمام خرابیوں کے باوجود کردار سازی فیوڈلزم کا ایک وصف تھا۔ آج کردار کی تباہی ہم اپنے ننھیال کے تبھرا نے خدمت گاروں کو ماموں پکارتے تھے......سن رسیدہ نوکروں اور ہندو و مسلمان اہلِ محلّہ، اہلِ قریہ بڑے بوڑھوں کی عزت۔ کوئی دادا۔ کوئی نانا۔ کوئی چاچا۔ مذہبی تعصبات مفقود۔ کردار کی پختگی۔ ادب لحاظ۔ تمیز۔ حفظِ مراتب۔"

(ص ۶۶۵)

بن بیہ عندلیب دوسرے موقعے پر مشرقی صوفیا کا مذاق بھی اڑاتی ہے:

"یہ جو اتنے بزرگوں اور GODMAN کی یہاں ریل پیل ہے، اپنی نگاہ کرم سے ملک کے حالات کیوں نہیں بدل دیتے؟ یہ شیعہ سنی، ہندو مسلم مارا ماری ہو نہ ہر یجن زندہ جلائے جائیں نہ دلہنیں۔ نہ لوگ بھوکوں مریں نہ کوئی بیمار پڑے۔ نہ حادثے ہوں۔ بس ایک ایک تعویذ سب نے پہنا اور سارے دلدّر دور۔"

(ص ۶۷۴)

عندلیب بانو کی یہ کش مکش دور کرنے کے لیے ان کے سامنے کوئی پیرِ طریقت اس طرح نہیں آتا جس طرح دلشاد کے سامنے، بلکہ ان کی بیٹی عنبرین کے مرض کا علاج جسمانی طور پر ایک موڈرن ڈاکٹر اور روحانی یا اخلاقی طور پر دوسرا موڈرن ڈاکٹر کرتا ہے، پھر یہ علاج ہی گویا عندلیب کی زندگی بھر کی کش مکش کا

ں ثابت ہوتا ہے۔

ان نکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر صرف آج کے انسان کے مسئلے یا مسائل تجزیہ تو افسانوی واقعات کی صورت میں پیش کر سکتی ہیں، مگر کسی معین اور واضح حل کی طرف ںشارہ کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خود ناول نگار کا ذہن ایک کش مکش ں اسیر ہے۔ وہ ایک جدید ذہن رکھنے کے باوجود دورِ قدیم کی تہذیبی قدروں کی طرف ایک حسرت سے نگاہ ڈالتی ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل کے جاگیردارانہ کہلانے والے ہندستانی سماج کے لیے ان کا NOSTALGIA ان کے فکشن کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ بات یہ ہے کہ زبردست فکری دت کے باوجود قرۃ العین حیدر کو عمرانیات کے تحقیقی مطالعے کا موقع نہیں ملا ہے، لہٰذا ان کی ذہانت رف حالات پر تنقید یا زیادہ سے زیادہ ان کا تجزیہ کر سکتی ہے۔ جب کہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا ن کے بس سے باہر ہے، گرچہ "گردشِ رنگ چمن" کے چند واقعات سے اس نکتے کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ مصنفہ تصوف کی طرف شدت سے مائل ہیں۔ شاید یہی میلان کچھ الجھنیں بھی ناول نگار کے ذہن یں پیدا کرتا ہے اس لیے کہ تصوف کی بنیاد ابہام پر ہے اور جب تک اس کے پیچھے ایک محکم دینی نقطہ نظر نہ ہو۔ محض تصوف نہ تو افکار کی وضاحت کر سکتا ہے نہ زندگی کے نصب العین کا تعین، زیادہ سے زیادہ یہ تصوف ایک اخلاقی رویے کی نشان دہی یا اس کی جانب رہ نمائی کر سکتا ہے۔ یہی واقعہ راجا دلشاد علی خاں کے ساتھ ہوا، مگر عندلیب بانو کے ذہن کی گرہ نہیں کھلی، گرچہ ان کی بیٹی کے بہتر مستقبل کی امید ڈاکٹر منصور کے اخلاقی رویے کے سبب ہو گئی۔

اب یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ قرۃ العین حیدر کی ذہنی وابستگی راجا دلشاد علی خاں کے ساتھ ہے یا عندلیب بانو کے ساتھ۔ ان کی ہمدردی اپنے تخلیق کیے ہوئے دونوں کرداروں کے درمیان منقسم نظر آتی ہے۔ وہ شاید بیک وقت دونوں کے ساتھ ہیں۔ آدھی ادھر آدھی ادھر۔ یہ تذبذب ہے یا غیر جانب داری؟ خالص فن کے اعتبار سے اس کو غیر جانب داری کہہ سکتے ہیں، جو فن میں معروضیت کا نشان ہے، مگر فکری لحاظ سے یہ تشکیک (SCEPTCISM) ہے، جو کلبیت (CYNICISM) سے بہتر تو ضرور ہے، لیکن یقین کا بدل نہیں ہو سکتی، جب کہ کسی بھی "بیاباں کی شب تاریک" میں "قندیل رہبانی" یقین ہی ہو سکتا ہے، شک نہیں، اور یقین واضح ہوتا ہے، مبہم نہیں، شک کو اہل مغرب صحت مند تصور کر سکتے ہیں تو یہی ان کا مرض (MORBIDITY) ہے جس کا علاج "یقینِ محکم" کے سوا نہیں ہو سکتا۔ عصر حاضر کے بنیادی اور تاریخی مرض کی تشخیص اور اس کا نسخۂ شفا دونوں اقبال کے اس لطیف شعر میں موجود ہیں:

وہی دیرینہ بیماری، وہی نا محکمیِ دل کی — علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

اس آب حیات کی جستجو بھی فن کا ایک فریضہ ہے جس کی ادائیگی کی کوشش تو قرۃ العین حیدر "آگ کا دریا"، "آخرِ شب کے ہمسفر"، "کارِ جہاں دراز ہے" اور "گردشِ رنگ چمن" میں مسلسل کرتی رہی ہیں مگر کامیابی کی منزل ابھی آئی نہیں، گرچہ تازہ ترین ناول اس منزل کی طرف ایک قدم کہا جا سکتا ہے اور یہی پچھلے ناولوں کے مقابلے میں اس کا فکری امتیاز ہے، جب کہ فن کے لحاظ سے بھی یہ اپنی جگہ عمدہ و اعلا ہے●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ ۷۵/=

نظام رنگ ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ ــ یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۷۵/=

پرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ ۳۰/=

غزل نما تصحیح و ترتیب ادا جعفری

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے)

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ ۷۵/=

سازِ سخن ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی متشرح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ ۴۵/=

ترجمۂ قرآن پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۱۳/اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ ۸/=

نذرِ مختار مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ ۱۰۱/=

شجاع خاور
DY. COMMISSIONER OF POLICE,
4-OFFICERS FLATS,
POLICE STATION MANDIR MARG,
NEW DELHI-110001.

عزیز قیسی
B,26,
B-26, OSMAN CHAMBERS,
2nd. PANDYA LANE JUHU,
BOMBAY-49

حالت اسے دل کی نہ دکھائی، نہ بیاں کی
خیر اس نے نہ کی بات، تو ہم نے ہی کہاں کی

تھا شہر تصور میں عجب خوف کا عالم
تشبیہہ کبھی لفظوں کے دریچے سے نہ جھانکی

اللہ کا بندہ کوئی گھر سے نہیں نکلا
تفسیر سبھی کرتے رہے کون و مکاں کی

ایک اس کا سراپا ہے کہ بس میں نہیں آتا
کیا ہوگئی حالت مرے اندازِ بیاں کی!

طوفانِ معانی مرے ہر لفظ کے پیچھے
تیزی ہے ہر اک شعر میں دلّی کی زباں کی

ایک ایک ستم گار کو قدموں میں گراکر
کل ہم نے تصور کی زباں خوب رواں کی

صحرائے عدم کا بھی شجاع اپنا مزہ ہے
تم سوچتے رہتے ہو فقط گلشنِ جاں کی

دور سے اک آواز آتی ہے شب ہمہ شب
نیند سحر تک اڑ جاتی ہے شب ہمہ شب

سوتی جاگتی ہجر کی ماری آنکھوں میں
اک پرچھائیں لہراتی ہے شب ہمہ شب

دھیرے دھیرے اتر کے افق سے شام ڈھلے
ایک پری پر پھیلاتی ہے شب ہمہ شب

آنگن پل پل پھولوں سے بھر جاتا ہے
چاندنی نغمے برساتی ہے شب ہمہ شب

سورج کا آنا جانا ہے فیض ہوا
تاریکی بڑھتی جاتی ہے شب ہمہ شب

وقت کے پہرے سے جو چرا کر لائے تھے
ہم کو وہی شب یاد آتی ہے شب ہمہ شب

جس نے کہا تھا، ہم کو آپ بھلادیں گے
قیسی اس کی یاد آتی ہے شب ہمہ شب

شاہد نجیب آبادی
BAHRAIN
P.O. BOX NO. 261
BAHRAIN
(A.GULF)

غزل

دل بقدرِ ضربِ خود سینہ سپر ہوتا گیا
چوٹ پر جب چوٹ کھائی معتبر ہوتا گیا

ترکِ الفت پر مجھے یاد آئی اس کی اور بھی
دور وہ جتنا ہوا نزدیک تر ہوتا گیا

قطرۂ خوں سے صدا آئی اسی کے نام کی
یعنی قاتل ہی مری جان و جگر ہوتا گیا

عقل نے سب ہی تحفظ کے کیے تھے اہتمام
حسن کا ہر وار پھر بھی کارگر ہوتا گیا

واہ کتنا پرکشش نکلا طریقِ عشق بھی
جو بھی رستے میں ملا وہ ہم سفر ہوتا گیا

قابلِ صد رشک ہے وہ خاک کا ذرہ کہ جو
ان کے قدموں سے غبارِ رہگذر ہوتا گیا

واحد قریشی
URDU DEPARTMENT
GOVT. GIRLS POST-GRADUATE COLLEGE,
UJJAIN (M.P.)

غلط نگاہ کے رشتے تھے اور کیا تھا بس
ہمارے بیچ میں ٹوٹا ہوا خدا تھا بس

مرے خلاف بھی صف آرا ہو گئی دنیا
اس اک نگاہ کا حقدار بن گیا تھا بس

تمام سود و زیاں سے گزر گیا آخر!!!
اسے تو میرے تناظر میں سوچنا تھا بس

سزائے سخت کا میں خود ہی مرتکب نکلا
بنائے حرف و صدا کوئی سلسلہ تھا بس

تمام نقش ترے آنسوؤں میں ڈوب گئے
تری لکیر پہ کچھ یوں ہی چل پڑا تھا بس

انور سدید
174, Satlaj Block,
Iqbal Town,
LAHORE -8,
PAKISTAN

خواتین کے افسانوں میں سماجی آگہی

نارتھ روپ فرائی NORTHROP FRYE نے "اناٹومی آف کریٹی سزم" ANATOMY OF CRITCISM - میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ارسطو کی بوطیقا کے دوسرے پیرے میں افسانوی کرداروں کی مختلف سطحوں کے بارے میں جو زاویۂ نظر پیش کیا گیا ہے اس پر جدید نقادوں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ بعض افسانوی کردار ہماری نسبت بہتر ہوتے ہیں۔ کچھ افسانوں میں کرداروں کی سطح ہمارے کردار کی سطح کے برابر ہوتی ہے اور بعض کی ہم سے بدتر۔ نیک اور بد کرداروں کے اس تصور سے ارسطو نے ادب کا اخلاقی نقطۂ نظر متعین کرنے کی کاوش کی ہے او اسی سے عصری آگہی کا احوال بھی سامنے آتا ہے جسے نقاد حضرات افسانے کی مجموعی فضا میں بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس مقالے میں اس قسم کی عصری آگہی کو موضوع بنایا ہے اور اسے خواتین افسانہ نگاروں تک محدود رکھا ہے۔

افسانے میں ایک بنیادی چیز وہ عمل ہے جو کرداروں کی معاونت سے ہمارے سامنے معاشرتی سطح پر ظہور پذیر ہوتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مخصوص سماجی ردعمل پیدا کرتا ہے۔" افسانہ چونکہ زندگی کی تلاش ہوتا ہے اور جولاں گاہ حیات سے ڈھونڈا جاتا ہے اس لیے عصری حقیقت اس میں موجود ہوتی ہے۔ اور یہ حقیقت بیک وقت تین سمتوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اولاً کرداروں کی سمت اور یہ افسانے کی صورت واقعہ، عمل اور ردعمل سے متعین ہوتی ہے۔ دوم۔ افسانہ نگار کی ذہنی سمت جو افسانے کے بطون میں خون کی طرح گردش کرتی ہے اور افسانے کو فنکارانہ طور پر ایک خاص جہت میں لے جاتی اور قاری کو اس سمت میں سفر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ سوم قاری کے ردعمل کی سمت جو کبھی تو افسانہ نگار کے متعین کردہ خطوط سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اپنی افتادِ طبع کے مطابق نئی جہت اختیار کرتی ہے۔ ان خطوط پر اگر افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو اکثر اوقات نہ صرف افسانے کی نئی تعبیر سامنے آتی ہے بلکہ بعض اوقات کسی ایک سمت کی دریافت کا عمل تخلیقی عمل کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے۔

عام طور پر ہمارے ہاں افسانے کو کہانی پیش کرنے کا عمل تصور کیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار ایک مخصوص منطقی ترتیب کو پیش نظر رکھتا ہے اور صورت واقعہ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کہانی ایک مناسب کلائمکس سے گزر کر اختتام کو پہنچ جاتی ہے اور قاری کتھارسس محسوس کرنے لگتا ہے۔

لیکن اب کچھ عرصے سے کہانی کو ابتدا، عروج اور زوال کے منطقی مدارج سے گزارنے کے بجائے کسی واقعے یا تاثر کو غیر منطقی انداز میں پیش کرنے کا رجحان پرورش پانے لگا ہے۔ اور اہمیت اس معاشرتی مسئلے کو دی جانی لگی ہے جو کہانی کے بطون میں موجود ہوتا ہے لیکن کسی بڑے منطقی افسانے کا موضوع نہیں بن پاتا۔ اس کی ایک صورت علامتی اور تجریدی افسانے میں ظاہر ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ المیہ بھی ظہور میں آیا کہ علامتی اور تجریدی افسانے میں کہانی کا فریم شکستہ ہو گیا اس شکستہ فریم سے کہانی اپنی رونمائی پھر کرنے لگی ہے تو مجھے سب سے خوش آیند بات یہ نظر آئی کہ اب افسانہ نگار صرف کہانی پیش کر کے مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ وہ فوقیت عصری مسائل کو دیتا ہے اور اکثر اوقات تو سماجی مسئلہ ہی افسانہ لکھنے کی وجہ جواز بن جاتا ہے۔ آج کی اس مجلس میں مجھے چند ایسے افسانوں کا تذکرہ کرنا ہے جو اسی زاویے کو سامنے لائے ہیں اور جن کی تخلیق کا شرف ہماری خواتین افسانہ نگاروں کو حاصل ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے رپورتاژ کی ٹیکنیک میں لکھا ہوا ہاجرہ مسرور کا افسانہ "ایک اور نعرہ" لیجیے، اس افسانے کا بنیادی موضوع جنسی جرائم پر کوڑے مارنے کی عملی سزا کا ایک واقعہ ہے۔ لیکن ہاجرہ مسرور نے نہ تو اس واقعے کو بلاواسطہ کہانی کا موضوع بنایا ہے اور نہ کوڑے مارنے کے عمل کی منظر کشی کی ہے۔ یہ افسانہ ان تاثرات کو مجتمع کرتا ہے جو راوی کھلے کوڑے مارنے کے میدان میں سے حاصل کر رہا ہے اور اب اس میں پڑھنے والوں کو بھی شریک کر رہا ہے۔ بظاہر مجرم کو کوڑے مارنے کا عمل پیش منظر کے طور پر موجود رہے لیکن ہاجرہ مسرور نے اہمیت اس ردعمل کو دی ہے جو ہجوم کے مختلف حصوں میں مرتب ہو رہا ہے۔ اور آخر میں جب بکری چانن کا روپ اختیار کر جاتی ہے اور حیرا اپنی چانن کے لیے کوڑے کھانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتا ہے تو افسانے کو ایک نئی جہت مل جاتی ہے۔ اس افسانے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ افسانے کا مرکزی خیال اور افسانہ نگار دونوں ایک ہی سمت میں سفر کرتے ہیں اور آخر میں قاری بھی ان کا ہم خیال ہو جاتا ہے۔ گویا تینوں سمتیں ایک سرحد پر مل جاتی ہیں۔ اور افسانہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ یہ افسانہ عصری آگہی کا آئینہ ہے۔ اس کا انعکاس خاصہ تلخ اور زہریلا ہے۔ لیکن افسانہ نگار نے اپنے معتدل اور صحت مند رویے سے تاثر کو تو دوچند کر دیا ہے۔ لیکن زہرناکی میں شعوری شرکت نہیں کی اور معاشرے کے اجتماعی شعور کو آشکار کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہاجرہ مسرور ایک طویل، لمبی اور پر اسرار غیر حاضری کے بعد اردو افسانے میں وارد ہوئی ہیں۔ "ایک اور نعرہ" ان کے ترقی پسند نظریے کی نمایندگی کرتا ہے اور خوبی یہ کہ نظریہ افسانے کے بطون میں تو موجود ہے لیکن چیختا چنگھاڑتا ہوا قاری پر حملہ زن نہیں ہوتا اور افسانہ ترشا ہوا مکمل ادب پارہ محسوس ہوتا ہے۔ اس افسانے کی دوسری خوبی یہ ہے کہ کردار کی سطح معاشرے کے مجموعی کردار کے مطابق دکھائی گئی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا تاثر گہرا ہے۔

فرخندہ لودھی زندگی اور معاشرے کی وسعتوں کو افسانے کی نسبت میں شامل کرنے اور ایک جداگانہ تاثر پیدا کرنے والی افسانہ نگار ہیں۔ اب کچھ عرصے سے انھوں نے اندھیرے سے جگنو پکڑنے اور زندگی کی مختصر سی قاش سے اسی قسم کا تاثر پیدا کرنے کی کاوش کی ہے۔ ان کا افسانہ "گندی مچھلی" بظاہر

گل جاناں بار بار بکنے کی جنس۔ لیکن اس افسانے میں یہ دونوں کردار پروفیشنل کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور ایک ایسے معاشرتی المیے کو ابھارتے ہیں جو تناظر تبدیل کر کے سامنے آتا ہے۔ لیکن تاثر کی ایک جیسی کیفیت بار بار پیدا کرتا ہے۔ اس افسانے میں سائرہ ہاشمی کا رخ معاشرے کی طرف ہے اور وہ زندگی کو ایسی حقیقتوں کا مرقع بنا دیتی ہیں جس میں بظاہر لطافت نظر آتی ہے اور مرد ان لطافتوں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ زہرناکیوں کا مجموعہ ہے جو لمحہ بہ لمحہ انسانیت کے وجود میں سرایت کر رہا ہے لیکن عالم یہ ہے کہ خود انسان کو اس حقیقت کا علم نہیں۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں میں رومانیت کی لہر خاصی تیز ہے لیکن یہ رومانیت خوابناک نہیں، ان کے پاؤں زمینی حقیقتوں میں دھنسے ہوئے ہیں لیکن وہ انھیں اونچی فضا میں پرواز کرنے کی اجازت بھی دیتی ہیں اور پھر انھیں واپس زمین کی طرف بھی لے آتی ہیں، اس عمل سے ہی سائرہ ہاشمی کے افسانوں کا معاشرتی المیہ جنم لیتا ہے۔ "زندگی کی بند گلی" میں ظہیر خاں ایک ایسا ہی کردار ہے اور گل جاناں ہمہ تن لذت انگیز دعوت۔ لیکن کیا یہ دونوں مشیت کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں نہیں ہیں؟ افسانے کے اختتام پر جب گل جاناں مر جاتی ہے اور ظہیر خاں ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے تو اس کی ذہنی، جذباتی اور حسی شکست مجسم ہو جاتی ہے اور اس کی بے اختیاری یوں سامنے آجاتی ہے۔

> "زندگی کے سفر کے کئی پڑاؤ ہیں۔ مصنوعات کی ترقی کی کئی منزلیں ہیں، دولت کی لے پر رقص کرتے لوگوں کی تال بدل چکی ہے۔ پھیلاؤ کے دائرے چکر در چکر سوچوں کے پاتال میں معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور میں جو تمام عمر دلوں سے دلوں کی طرف محو سفر رہتا ہوں، یادوں کے ایک لمحہ میں ساکت ہو گیا ہوں۔"

میرا خیال ہے کہ شکست پندار کے ایک نقطے کو ہی سرخ خطرناک دائرہ بنانے کے لیے سائرہ ہاشمی نے "زندگی کی بند گلی" جیسا طویل افسانہ لکھا ہے اور ایسے کرداروں کو ابھارا ہے جو معاشرتی پستی کو آشکار کرتے ہیں اور کسی مقام پر بھی اپنی پستی کو بلندی کی طرف لانے کی آرزو نہیں کرتے۔

عذرا سید نے افسانہ سودا کو زندگی کے گھمسان سے حاصل کیا ہے۔ سائرہ ہاشمی کے افسانے "زندگی کی بند گلی" میں عورت مقام کی قید سے بے نیاز ہو کر بکتی ہے۔ عذرا سید کے افسانے "سودا" میں بوجو کے ساتھ اس کی ریڑھی بھی بک جاتی ہے۔ لیکن جس طرح "زندگی کی بند گلی" میں گل جاناں قیمت فروخت پر نظر رکھتی ہے اسی طرح "سودا" کی اپاہج بھکارن بوجو بھی روپے پیسے کی قدر پہچانتی ہے اور اپنی محنت کو سخی مجاور کے کھاتے میں جمع نہیں ہونے دیتی۔ اس افسانے کو پڑھ کر حیات اللہ انصاری کا لازوال افسانہ "آخری کوشش" اور انتصار حسین نبوتوی کا "سائبان" یاد آتے ہیں۔ لیکن سودا کا عمل اور معاشرتی ردعمل مختلف نوعیت کا ہے۔ اس کی کیفیت الگ ہے۔ عذرا سید کے بے پناہ مشاہدے نے مٹی میں روندی ہوئی حقیقت کو پکڑا اور معاشرے سے کٹے ہوئے ایک مفلس طبقے کو ذہنی اور عملی طور پر دوبارہ معاشرے کا جزو بنا دیا۔ فیروزہ جعفر نے اپنے افسانے "ہوا کا جھونکا" میں یورپ کے معاشرتی ماحول کا منظرنامہ پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ بظاہر یہ تارک وطن روحی کا افسانہ ہے جو دوسرے ملکوں کی خوشبوئیں جمع کر رہی ہے۔ لیکن درحقیقت

…یا کی بصیرت کا افسانہ ہے لیکن اس نے انسان کے بنیادی گناہ کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور چھیبو وہ لڑکی ہے جو یہ گناہ ”حرامکاری“ کے شعور سے کرتی ہے اور پکڑی نہیں جاتی ہے۔ پکڑی جائے تو چھوڑ دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا کھاتہ شراکت داری کا ہے اور اس میں سنتری سے لے کر اوپر تک کے کئی لوگ شریک ہیں، فرخندہ لودھی نے اس چھیبو کی ایک ہلکی سی جھلک یوں دکھائی ہے۔

”مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نماز ظہر کا اعلان ہوا۔ چھیبو نے دوپٹہ سر پہ لے لیا۔ اس کے سر پہ کھڑی لیڈی کانسٹبل نے سگریٹ کے تین چار لمبے لمبے کش لے کر چھیبو کو گھورا۔ ناک بھوں چڑھائی۔ پر چھیبو کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ فطانت تھا، جیسے دعا کے وقت ہوتا ہے۔“

اور یہ وہ چھیبو ہے، جو حرام کاری سے صاف بچ نکلتی ہے لیکن تخریب کاری میں الجھا دی جاتی ہے اور سمجھ نہیں پاتی کہ

”حرام کاری تو میرا پیشہ ہے۔ یہ تخریب کاری کہاں سے آگئی۔“

فرخندہ لودھی کا یہ افسانہ معاشرتی منافقت کا آئینہ ہے۔ اس افسانے میں ”گناہ“ قابل سزا نہیں ناکردہ گنہی قابل تعزیر ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار عام معاشرتی سطح سے پست ہے اور فرخندہ لودھی نے اس معاشرتی سطح سے بلند کرنے کی سعی بھی نہیں کی۔ لیکن افسانے کے اختتام پر معاشرہ اس کردار کے سامنے حقیر اور کردار کا پورا عمل روشن نظر آنے لگتا ہے۔ ان کا افسانہ انقلاب سے پہلے میں دو متضاد زاویے سامنے آتے ہیں، ایک زاویہ زندگی کی طرف کھینچتا ہے۔ دوسرا زاویہ اذیت سے مسرت کشید کرتا ہے۔ افسانے کا ایک رخ طمانیت کو جنم دیتا ہے۔ پیٹ کی بھوک کا ازالہ کرتا ہے۔ دوسرا رخ خوف کو ابھارتا ہے اور شدید پریشان پیدا کرتا ہے۔ فرخندہ لودھی کا افسانہ ”ایک قطعہ زمین“ میں عصری آگہی نے بقا کی آرزو سے نمود پذیر ہوتی ہے لیکن پس منظر میں انسانی لالچ کی بھیانک کیفیات بھی موجود ہیں جن سے خلق خدا کبھی دھوکا کھا جاتی ہے اور انسان کی عیاری کبھی پردہ پوش رہتی ہے۔ فرخندہ لودھی کے افسانے قاری کو سوچ کے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ سماجی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتے بلکہ قاری کے ذہن میں طوفان بپا کر دیتے ہیں اور پھر وہ افسانے یا افسانہ نگار کی سمت قبول کرنے کے بجائے ایک نئی سمت میں چل پڑتا ہے۔ فرخندہ لودھی کے کردار بلاشبہ نچلی طبقاتی سطح کے ہیں لیکن ان کا عمل بلند ہے۔

”یقیں سے آگے، گماں کے پیچھے“ میں جیلانی بانو نے اس فرد کو موضوع بنایا ہے جس کا یقین متزلزل ہے، جو گماں کے پیچھے گردن ڈالے دوڑ دوڑ کر اب ہانپنے لگا ہے۔ مجموعی طور پر یہ افسانہ اس شعور کو مجسم کرتا ہے جو معاشرے کے ذہنی سکون کو چٹ کر جاتا ہے اور فرد ایک عذاب مسلسل کی زد میں آجاتا ہے۔ اس افسانے میں جیلانی بانو نے رمز IRONY کا فن کارانہ استعمال کیا ہے اور اسے افسانے کے باطن سے ابھارا ہے۔ انھوں نے عصری آگہی کو سیدھے بیانیہ سے پیش کرنے کے بجائے بالواسطہ طریق اختیار کیا۔ لفظ تھوڑے استعمال کیے، لیکن مفاہیم میں وسعت پیدا کر دی جیلانی بانو بنیادی طور پر نسوانی حقیقتوں کی آشنا ہیں، اس افسانے میں انھوں نے معاشرے کے اجتماعی شعور سے

آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ اور مرکزی کردار کو معاشرتی حقیقت کا نمائندہ بنا دیا ہے

سیدہ حنا کا افسانہ "برف" پروفیشنل عورت کی ان ذمہ داریوں کو روشن کرتا ہے جو اسے مختلف سماجی سطحوں پر سرانجام دینی پڑتی ہیں۔ مثلاً وہ بیٹی ہونے کے ناطے پورے کنبے کی کفالت کرتی ہے اور پھر طویل عرصے تک محض اس لیے بن بیاہی رہتی ہے کہ اس کی شادی کے بعد کنبے کا کفیل کون ہوگا؟ شادی کے بعد اس عورت کے مسائل ایک نیا سماجی رخ اختیار کر جاتے ہیں اور اگر اس دوران میں کہیں محبت کی رمق پیدا ہو جائے اور شادی کہیں اور بندھ جائے تو المیہ متعدد نئے زاویوں کو جنم دے ڈالتا ہے۔ سیدہ حنا نے اس معاشرتی مسئلے کو پوری سماجی آگہی سے "برف" میں پیش کیا ہے اور اس عورت کا حقیقی افسانہ لکھا ہے جو ہر روز اپنی قربانی دیتی ہے، ہر روز اپنے جذبوں کو بھینٹ چڑھاتی ہے اور آخر کار ایک مجسم آنسو بن جاتی ہے۔ نگہت سیما کا افسانہ "بے چہرہ" میں پروفیشنل عورت کا ایک اور چہرہ سامنے آتا ہے۔ اس سے داخلی المیے کے بجائے ایک نئی خارجی حقیقت منعکس ہوتی ہے۔ "بے چہرہ" کاروباری بدعملی کا افسانہ ہے۔ اس بدعملی جس نے مسابقت کی دوڑ کو تیز کر رکھا ہے۔ لیکن یہ ایسی دوڑ ہے جو انسان کے داخل کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے "رفعت" بھی ایک ایسی ہی ٹیچر ہے جو اس معاشرتی عیب سے نفرت کرتی ہے لیکن جب خود امتحان میں پڑتی ہے تو حالات کے سامنے دیمک زدہ لکڑی کی طرح گر جاتی ہے۔ نگہت سیما کا ایک اور افسانہ "آکسیجن آکسیجن" ایسے معاشرتی مسائل کو پیش کرتا ہے جس میں فضا آکسیجن سے محروم ہو جاتی ہے گھٹن بڑھ جاتی ہے اور سانس رکنے لگتی ہے۔ اس افسانے کی "آپو جان" وسیم، منیر اور شیرازی سب کے سماجی المیے مختلف نوعیتوں کے ہیں۔ لیکن سب آکسیجن کی کمی کا شکار ہیں، سب کا دم گھٹ رہا ہے۔ سب کی زبانیں باہر نکلی ہوئی، آنکھیں پھٹی ہوئی اور چہروں پر وحشت ہے۔ سب اس تضاد کا شکار ہیں جو ان کے داخل اور خارج میں پیدا ہو چکا ہے اور جسے اب پر کرنا ممکن نہیں اور نگہت سیما کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے داخل اور خارج کے تصادم کو کئی زاویوں سے اجاگر کیا ہے عملی سطح پر ٹوٹے ہوئے انسان کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ سیدہ حنا اور نگہت سیما کے کردار کئی سطحوں پہ ہمیں اپنی بہ نسبت بہتر نظر آنے لگتے ہیں۔

شمع خالد نے "سبز شہر کے سوکھے پتے" میں علامتی طور پر اس سرسبز درخت کا افسانہ پیش کیا گیا ہے جو اپنے پتوں کو کھا جاتا ہے اور پھر بہت سے سبزے میں ٹنڈ منڈ نظر آنے لگتا ہے۔ شمع خالد نے ہمیں اس پریکٹیکل انسان کا افسانہ سنایا ہے جو کاروباری کامیابی کے لیے اخلاقی قدروں کو شکستہ کر دیتا ہے۔ لیکن، اپنے اندر کے سچے انسان کا سامنا نہیں کر سکتا۔ خوابوں سے محرومی اس افسانے کا ایک بلیغ اشارہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کا انسان ایک بیکراں خزینے سے محروم ہو جاتا ہے اور نتیجہ مسلسل محرومی اور دائم اداسی ہے۔

سائرہ ہاشمی کے افسانے "زندگی کی بند گلی" میں بظاہر داخل ہونے کے سیکڑوں راستے ہیں اور نکلنے کے رستے بھی بند نہیں ہیں۔ لیکن اس افسانے کی غیر معمولی بات یہ ہے کہ مرد جبلتوں کا غلام ہے اور عورتیں پیٹ کے تقاضے پورے کرنے کے لیے جسم بیچ رہی ہے۔ ظہیر خاں خریدار ہے

یہ افسانہ اس حقیقت کا اعلامیہ ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں آپس میں مل نہیں سکتے چنانچہ جب ٹی۔ وی پر گزرے سال کی بمباری، زلزلے، طوفان اور ہنگامے دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیے جاتے ہیں تو روحی کا میاں کہتا ہے "اپنے ہسپانوی دوست کا پتا نوٹ کر و"۔ روحی نے جواب میں صرف یہ کہنا چاہا کہ "میں نے اپنے ہسپانوی دوست کا پتا لیا ہی کب تھا؟" لیکن وہ اتنی سی بات بھی نہ کہہ سکا اور واپس مشرقی فضا میں ڈوب گئی، مشرق جو روحی کی فطرت ہے۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والی خون کی لہر ہے۔ "ہوا کا جھونکا" مغربی فضا میں پروان چڑھنے والی معاشرتی حقیقت کا افسانہ ہے۔

میں نے اس تجزیے میں نئے رسائل میں چھپنے والے تازہ افسانوں کو بطور خاص منتخب کیا ہے مجموعی طور پر دیکھیں تو بانو قدسیہ، عذرا اصغر، رفعت مرتضیٰ، فردوس حیدر۔ نشاط فاطمہ۔ شکیلہ رفیق۔ قدسیہ انصاری۔ پروین سرور۔ جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، پروین عاطف۔ فریدہ حفیظ۔ الطاف فاطمہ، حمیدہ معین رضوی۔ محسنہ جیلانی۔ نیلو فر اقبال۔ افضل توصیف اور متعدد دوسری خواتین بڑی خوبی اور فن کاری سے عصری شعور کو گرفت میں لیا ہے اور اسے افسانے کی بنت میں اس موثر انداز میں شامل کیا کہ ارسطو کی وضع کردہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک افسانے سے ظاہر ہو گئی اور یوں افسانہ موجود معاشرتی حقیقت کا آئینہ دار بن گیا۔

چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ رواں معاشرتی حقیقت کی عکاسی میں افسانہ نگار خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں تو یہ بالکل درست ہو گا۔ ❋❋❋

اہل قلم حضرات سے درخواست

اس وقت دفتر میں خاصی تعداد میں مضامین، کہانیاں، نظمیں، غزلیں جمع ہو چکی ہیں۔ اہل قلم حضرات سے ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ تا اعلان ثانی بلا طلب اپنی تخلیقات روانہ نہ فرمائیں۔

ڈاکٹر محمد حسن
D-7, MODEL TOWN,
DELHI-110009.

شہرِ آرزو

یوں تو زندگی کا بڑا حصہ پانچ شہروں میں گزرا۔ مرادآباد میں آنکھ کھولی لکھنؤ میں پڑھا علی گڑھ میں پڑھایا۔ سری نگر کشمیر میں کچھ سال گزارے اور دلّی میں عمر کے لگ بھگ بائیس سال بیتے، مگر باسی رہے ایک چھٹے شہر کے جو تصوّر میں بسا رہا اور میسر نہ ہوا شاید کبھی میسّر نہ ہو مگر خیالوں میں کروٹیں برابر لیتا ہے اس وقت بھی جب بمبئی کی جھک دمک لندن کی ہما ہمی اور نیویارک کی جگمگاہٹ مقابل ہو جب بنگلور کی نرم روی، میسور کی سرسبز فضا حیدرآباد کی شائستگی دامن دل کھینچتی ہو۔ یہ شہر آرزو خیالوں کی اوٹ سے جھانکتا ضرور ہے۔

مگر یہ شہر ہے ہی کہاں۔ سچ پوچھیے تو یہ خواب ہے۔ ایسی بستی کا جو شہر کے نواح میں تو ہو مگر شہر نہ ہو دیہات کا حصّہ ایسا ہو جہاں کچی پگڈنڈیاں ہوں، کھلی ہوا ہو، سبزیاں اگانے کے لیے تھوڑی سی کچی زمین ہو۔ تھوڑا سا حصّہ ایسا ہو جہاں جانور پالے جا سکتے ہوں۔ شہر کی آسانیاں ہوں تو صرف دو ایک بجلی کی آسانی میسر ہو۔ دوسرے آمدورفت کے لیے گاڑی یا موٹر کہ جب ضرورت پڑے یا جی چاہے آ جا سکیں۔ ممکن ہے اس خواب میں کچھ کو رابنسن کروسو کا عکس نظر آئے تو کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔

روسو نے معاہدہ عمرانی کو ان ہی لفظوں میں شروع کیا تھا۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے" فرد اور معاشرے کے گہرے رشتوں سے کسے انکار ہے یہ بھی درست ہے کہ انسان مجلسی حیوان ہے تنہا زندہ نہیں رہ سکتا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ فرد اپنی زندگی کی ایک ایک پرت اتارتا جائے اور اپنا بوجھ اس حد تک معاشرے پر ڈال دے کہ اس کی اپنی ذات سوائے ایک بیساکھی کے اور کچھ نہ رہ جائے۔

وہ تھکن جو عمر بھر کی چوہوں کی دوڑ نے ہڈیوں میں پیوست کر رکھی ہے وہ لالچ جو دولت بٹورنے کی کبھی نہ ختم ہونے والی ہوس نے پیدا کیا ہے وہ اکتاہٹ جو برابر اپنے کو اپنے پڑوسی کی عقل اور اس کی دولت سے جو آگے نکلتے رہنے کی کاوش سے پیدا ہوئی ہے وہ طمانیت جو لگاتار سعی وطلب میں کہیں کھو گئی ہے۔ [illegible]

ہم نے ایک ایک کر کے معاشرے کے نام لکھ دیا اور پھر معاشرے کو بدلنے کی جاں کاہ جہاد میں لہولہان ہوں اور یہ وقت کی دیوار نوک زباں سے چاٹ چاٹ کر روز کاغذ سے زیادہ پتلی کر دیں اور دوسرے دن پھر اسی طرح بلند اور مضبوط پائیں اور پھر اسی کوشش میں لگ جائیں بقول فیض۔ یہ تو جی چاہتا ہی ہے کہ

کہیں تو ہو گا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

اس لگاتار اجتماعی دوڑ دھوپ میں فرد خود اپنے آپ کو بھول سا گیا ہے خیر دوسروں کی بات نہیں کہتا اپنے آپ کی طرف مراجعت کا ارمان ضرور رکھتا ہوں اور یہ مراجعت اسی شہر آرزو میں ممکن ہے جہاں جگمگاہٹ اتنی نہ ہو جتنی طمانیت ہو جہاں دوڑ دھوپ اتنی نہ ہو جتنی دلجمعی ہو۔ جہاں ضروریات زندگی کی طرف توجہ ہو۔ کم ہو اور عیش وآرام کی طرف اتنا دھیان نہ ہو۔

ایک چھوٹی سی خودکفالتی سی اکائی ہو شاید ایک چھوٹا سا مکان کچا پکا مگر سستا اور سادہ سا، جو کچھ ٹالسٹائی کے فارم کے طرز پر کچھ گاندھی جی کے سیواگرام کے طرز پر ہو، اصحاب صفہ کی سخت گیری ضروری نہ ہو نہ سہی انسان کی اپنی ذات اس کی صفات پر غالب ہوں۔ انسانی زندگی کی ساری حسرت تو شرکت میں ہو مگر شرکت بھی اسی وقت مزا دیتی ہے جب شرکت کرنے والا اپنی ذات کا پورا احساس لے کر شریک ہو۔ اپنی ذات نفی کر کے نہیں۔

ارمان ہے تو یہ کہ اس شہر آرزو میں صاف ستھری ہوا ہو۔ گرد و غبار دھویں اور گیس سے ڈھکا آسمان نہ ہو تاکہ صبح اور شام اس کے افق پر شفق کے رنگ بکھریں نہ آنکھیں انھیں دیکھ سکیں اور رنگینیوں سے محروم نہ ہوں۔ ضروریات زندگی میسّر ہوں اور اس طرح کہ ان کے فراہم کرنے میں خود اپنی بھی جسمانی محنت تمام تر نہ سہی تھوڑی بہت ضرور شامل ہو، کیسی محرومی ہے ان کے لیے جو جگنوؤں کی طرح خیالات کے تعاقب میں نکلیں اور اپنے تن بدن سے غافل ہو جائیں۔ ذہن کے اس طرح غلام ہو جائیں کہ جسمانی محنت ان کے مقدر میں نہ رہے۔

فریاد کرنے کو بہت کچھ ہے مگر میں تو یہاں ذکر کر رہا ہوں۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کا۔ میرا خواب یہی ہے کہ میرا وجود مختلف قسم کی مہارتوں میں نہ بٹے اور اسے ایک وحدت کی طرح جینا نصیب ہو، اور جینا بھی سچ مچ کا جینا۔ زندگی کی وہ فراغتیں جو اس کی سادگی میں ہیں شان وشوکت ترق بھڑک میں نہیں ہیں۔ اس میں دوسروں کی بھلائی کا تصوّر بھی موجود ہے۔ جو نشاط اور کیف کی اصل ہے اور خود اپنی آزادی اور آزادگی کا لطف بھی ہو جیسے غالبؔ نے اپنے خط میں اس طرح ظاہر کیا تھا کہ ایک شطرنجی اور ایک لوٹا لٹکایا اور کبھی مصر جا نکلے کبھی ایران جا پہنچے۔ سفر میں بھی اپنا مزا ہے مگر میرا شہر آرزو بھی اس کیف اور لطف سے خالی نہیں۔

انسان ایک دفعہ ہوس اور لالچ کی دوڑ سے آزاد ہوئے تو نہ جانے کتنے شہر آرزو آباد ہو جائیں۔ میرے شہر آرزو میں آرزو کی روشنی تو ہو گی مگر ہوس کی آگ نہیں ہو گی آس

پاس انسان آباد ہوں گے جن کے اپنے اپنے چہرے بھی ہوں گے ان کو اپنی ہستی اپنے مذہب اپنی شہریت اپنی تہذیب اپنی اپنی انفرادیت اپنا اپنا انوکھا پن تو ہو گا مگر آپس کی رقابتیں نہیں ہوں گی۔ یہ چھوٹی چھوٹی اکائیاں ملیں گی مگر شرکت کے لیے مقابلے کے لیے نہیں۔ ٹیم ورک کا لطف ہے بھی اسی شرکت میں مقابلے میں یہ مزا کہاں۔

اصل زندگی بیدار حسیات کی زندگی ہے اور لالچ، پیسے، عیش آرام کے نام پر نمود و نمائش کی دوڑ میں حسیات ہی کی موت واقع ہو جاتی ہے انسان کو سب کاموں کا تو وقت ملتا ہے نہیں تو جینے کا وقت نہیں ملتا زندگی کی جو نعمتیں ہمیں ہر لمحے میسّر ہیں اور ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں ان سے ہم بے نیاز نہ گزر جاتے ہیں جب زندگی کا آخری لمحہ آتا ہے تو اچانک خیال آتا ہے کہ جس لمحۂ فراغت کے ساتھ سارے پاپڑ بیلے تھے وہ تو ہم نے نظرانداز ہی کر دیا گویا سب کچھ جیسے زندگی کے لیے کیا تھا اور سارا وقت کوشش اور سعی مطلب ہی نکل گیا فراغت کے ساتھ جینے کو ایک نفس بھر بھی مہلت نہ ملی

میرا شہر آرزو اسی فرصت اور فراغت کا نگر ہے جہاں زندگی جینے کو ترستی نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بہت ضروری ہے

دوڑ بھاگ کے شہر امکانات سے بس ذرا سے فاصلے پر میرا شہر آرزو آباد ہے جہاں پاگلوں کی سی دوڑ بھاگ نہیں ایک خوددار طمانیت ہے خودکفالتی معاشرے کی جھلک ہے تکلیفوں میں بھی لطف کا احساس ہے اور اپنے مسئلے اپنی الجھنیں خود سلجھانے کی للکار ہے آسمانوں پر شفق رنگ بادل بھی ہیں اور زمین اس حالت میں ہے جس میں کبھی ہوا کرتی تھی سونا نہیں اناج اور ترکاریاں بکھیرتی ہوئی پھولوں کی رنگت اور بہتے ہوئے چشموں کی موسیقی ہے حیات ابھی بے بہرہ نہیں ہوئی ہیں اور انسانوں کے دل ان انجانے لطیف نرم گوشوں سے اجنبی نہیں ہوئے جہاں اپنے جیسے انسانوں کے لیے یہی نہیں اپنے گھونسلوں کی طرف واپس جاتے ہوئے پرندوں کے لیے بھی کوئی جگہ باقی ہے۔

انسان زندگی بھر دوسروں کا سامنا کرتا رہتا ہے اور اپنے آپ سے نظریں چراتا رہتا ہے۔ میرا شہر آرزو ایسا ہو گا جہاں دوسروں سے زیادہ انسان خود اپنا سامنا کرنے پر مجبور ہو گا زندگی کی لذتوں کی تعریف اقبال کے لفظوں میں یہ نہیں ہو گی جیسے جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا کہہ کر لہو گرم رکھنے کا بہانہ قرار دیا جا سکے اور اس کی خاطر کبوتر کے لہو کے مزے سے زیادہ کبوتر پر جھپٹنے سے لذت لی جائے بلکہ یہ شہر آرزو تو ایسے لمحوں سے عبارت ہو گا جہاں میں کم سے کم اپنے آپ سے سمجھوتہ کر سکوں، اپنے سے نظریں ملا سکوں اور اس طرح جی سکوں جس طرح جینے کا ارمان لیے زندگی گزر گئی یا عمر بیت گئی ساری۔

اپنے آپ کو مجتمع کرنے کا خیال محض شاعری نہیں ہے عملی ضرورت ہے انسان، اس کا علم، اس کی شخصیت، اس کے ارمان، حتیٰ کہ اس کا وجود [illegible]

کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے ۔اس بکھراؤ کو روکنے کی ضرورت ہے۔کم سے کم مجھے اب بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ علم کے بنیادی نکتے اب بھی ایسے ہیں جو ایک انسان کی دسترس میں آسکتے ہیں علم بہت بڑھا بہت بٹا مگر پھر وہ حصہ جو انسان کی زندگی کو لذت زیست اور کیف عرفان و کیف دے سکے بہت کچھ سمٹا ہوا ہے حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس یکجائی ذات ہی کے نہیں علم کے بہت سے کٹے پٹے حصے یکجا ہو جائیں گے اور انسانی زندگی کی جو پوری تصویر چھوٹی چھوٹی مہارتوں کی جزئیات میں کھو گئی ہے شاید پھر سے ابھر آئے۔

تنہائی عذاب بھی ہے اور رحمت بھی لیکن دراصل تنہائی تنہائی میں فرق ہے اگر سادی ر[illegible]نے کو تنہائی ہو تو وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں لیکن اگر تنہائی رفاقت کی محرومی یا اس سے گریز کا نام ہو تو پھر عذاب ہے۔ شہر آرزو کی تنہائی اس عذاب سے خالی ہوگی اس میں دوسروں کو رفاقت کی نظر سے تو دیکھا جا سکے گا رقابت کی نظر سے ہرگز نہیں کیونکہ اس کی بنیاد مقابلے پر نہیں شرکت پر ہوگی اور شرکت رقابت نہیں رفاقت سکھاتی ہے۔

یہ شہر آرزو کبھی خواب کی سرحدوں سے باہر آسکے گا یا نہیں ؟ کون کہ سکتا ہے مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ محض خواب نہیں ہے اور اگر خواب ہو بھی تو اس کی تعبیر ممکن ہے اور اس طرز کے شہر آرزو کا خیال سے عمل میں آنا ممکن ہے اگر یہ بھروسہ ہو تو زندگی بھر کی دوڑ دھوپ کوئی کیوں کرے۔ کہیں کوئی تصور کا سائبان ہے جو اس دھوپ سے پناہ دیتا ہے ۔ جہاں خوابوں کے دھندلکوں میں سے کسی شہر آرزو کی جھلکیاں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

یا بقول حافظ

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

(بہ شکریہ اردو سروس)

پروفیسر قمر رئیس
HEAD,
DEPARTMENT OF URDU,
DELHI UNIVERSITY,
DELHI

ابر احسنی: فن اور شاعری

جنون عقل کے مارے ہوئے قدر اس کی کیا جانیں
کوئی دیوانہ صدیوں میں ہوا کرتا ہے مشکل سے

ایسے فرزانے تو بہت مل جاتے ہیں جنھوں نے اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور اپنی روٹی روزی بنا لیا ہو لیکن ایسے دیوانے خال خال ہی نظر آتے ہیں جن کو خود اردو زبان نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا ہو۔ اپنی زندگی، سلامتی اور ترقی کا وسیلہ سمجھا ہو۔ حضرت ابر احسنی مرحوم ایسے ہی چند دیوانوں میں سے ایک تھے۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اب سے پندرہ بیس سال قبل مجھے حضرت ابر احسنی سے یو پی کے بعض مشاعروں اور بے تکلف محفلوں میں ملنے اور گفتگو کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کے اولین استاد منشی سخاوت حسین سخا شاہجہاں پوری تھے۔ ان کے علاوہ وہ حضرت شا شاہجہانپوری اور حضرت بیباک شاہجہانپوری جیسے اساتذہ فن کو بھی اپنا بزرگ جانتے تھے اور ان سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اپنے وطن کے اس رشتے سے بھی حضرت ابر سے میرا ایک تعلق رہا ہے۔ ان کی سادگی، نفاست پسندی اور شعرخوانی کے ایک اچھوتا اور اثر آفریں انداز کے نقش آج بھی ذہن میں تازہ ہیں۔ لیکن ان ذاتی رشتوں سے ذرا ہٹ کر اور کچھ فاصلے سے جب ایک باکمال شاعر اور استادِ فن کی حیثیت سے ان کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی قادر الکلامی اور بے مثل فنی بصیرت سے انھوں نے تنِ تنہا اردو زبان کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا دعوا اردو کے بعض ادارے بھی نہیں کر سکتے۔

ہندستان کی جدید زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کی تشکیل، توسیع اور ترقی کے ساتھ ساتھ معیار بندی کا کام بھی اعلا پیمانہ پر ہوتا رہا۔ الفاظ کی تراش خراش، ترک و قبول اور بندش و ترکیب کے قاعدے بنتے رہے۔ الفاظ کے صحیح تلفظ اور تذکیر و تانیث کا تعین ہوتا رہا۔ اہل زبان اور زبان داں دونوں محاورات، امثال اور روزمرّہ کے صحیح ترکیب استعمال اور محل استعمال پر زور دیتے رہے۔ الغرض زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ صرف و نحو کے ضابطے بھی وضع ہوتے رہے۔ زبان کے ضابطے اور قاعدے بنانا کوئی ایسا

دشوار کام نہیں ہے۔ اصل مرحلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے ان پر تقریر و تحریر کی سطح پر عمل درآمد کی بات شروع ہوتی ہے۔ اردو میں یہ مشکل کام جس ہمہ گیر پیمانہ پر اور جس نظم و ضبط کے ساتھ اصلاحِ شاعری یا استادی اور شاگردی کے ادارہ نے انجام دیا ہے اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو طرحی اور مشاعروں کا ادارہ بھی اسی ادارہ کی سرگرمیوں اور کارگزاریوں کا نتیجہ اور مظہر رہا ہے۔ طرحی مشاعروں میں ہر علاقہ اور ہر شہر کے اساتذۂ فن اپنے اپنے تلامذہ کی صفیں آراستہ کر کے کمال و ہنر کا مظاہرہ اور مقابلہ کرتے تھے۔ پھر ایسی محفلوں میں خوش ذوق اور فن آشنا سامعین بھی اس طرح چاق و چوبند ہو کر آتے تھے کہ ذرا کسی شعر میں ایطائے جلی یا خفی کا شبہہ ہوا یا تذکیر و تانیث یا محاورہ کی لغزش ہوئی اور فقرے چست ہونے لگے۔ اردو کی ادبی تاریخ شاہد ہے کہ اصلاحِ سخن اور مشاعروں کی مہذب دار و گیر یا داد و بے داد نے اردو زبان کی چمن بندی میں کیسا اہم رول ادا کیا ہے۔ حضرت ابراحسنی مرحوم اس عظیم روایت کے سب سے بڑے مبلغ اور محافظ تھے یوں تو اس دور میں حضرت سالک دہلوی، سیماب اکبرآبادی۔ ولی شاہجہانپوری، صفی لکھنوی، جوش ملسیانی، جمیل مظہری اور دوسرے ایسے اساتذۂ فن بھی ہوئے ہیں، جن کی اصلاح سے ہزاروں شعرا نے فیض اٹھایا ہے لیکن حضرت ابراحسنی مرحوم نے اپنے دو ہزار سے زائد شاگردوں کی اصلاح کر کے اور باقاعدہ اصلاحِ سخن کے موضوع پر کتابیں تصنیف کر کے جس طرح اس روایت کو ایک برگزیدہ فن کا درجہ دیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو فنِ شاعری کے معائب اور محاسن کے ساتھ ساتھ زبان اور محاورہ کی حرمت کا احساس بھی دلایا اور اس پر زور دیا کہ اگر زمانۂ گذشتہ کے باکمال شاعر زبان کی صحت اور فن کی پابندیوں کا احترام کرتے ہوئے بلند پایہ شعری تخلیقات پیش کر سکتے تھے تو آج یہ کیونکر ممکن نہیں ہے۔ حضرت ابراحسنی نے اپنی تصنیف "میری اصلاحیں" حصہ دوم میں لکھا ہے۔

> "حقیقت یہ ہے کہ قدرت کی جانب سے شعر گوئی کی کچھ صلاحیتیں ہر شخص کو ملا کرتی ہیں۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ مثلاً موزونیٔ طبع، قوت تخیل، ذہانت، اظہار بیان کا سلیقہ وغیرہ (لیکن) چونکہ ان سب قوتوں کے اظہار کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہوگی اور زبان چونکہ قدرتی چیز نہیں ہے۔ وہ انسانوں کی بنائی ہوئی ہے لہٰذا اس کو ہر حالت میں انسانوں ہی سے سیکھنا پڑے گا۔ اس کے نکات، اس کے معائب و محاسن قدرت سکھا کر کسی کو نہیں بھیجتی وہ کسب ہی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں اور اس کو کوئی ماہر و نکتہ شناس زبان سکھا سکتا ہے۔"
>
> (صفحات ۱۰-۱۱)

اس بیان میں جو صداقت ہے وہ تشریح کی محتاج نہیں۔ حضرت ابراحسنی نے یہ دعوا

نہیں کہا کہ زبان کے رموز و نکات سے واقفیت اعلا شاعری کو جنم دے سکتی ہے لیکن انھوں نے یہ ضرور کہا کہ اس سے عدم واقفیت یا اس پر عدم قدرت اعلا تخلیقی صلاحیتوں کے موثر اظہار میں مانع ہو سکتی ہے۔

ادھر کچھ مدت سے بعض جدید شعرا نے زبان کی شکست و ریخت کو لازمۂ فنِ شاعری قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان اور اس کے ضابطوں کی توڑ پھوڑ کے بغیر نئی حسیت یا نئے شعری تجربات کا بھرپور اظہار ممکن نہیں۔ اگر اس بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ کہا جائے گا کہ زبان اور اس کے قاعدوں سے انحراف یا ان کی شکست و ریخت کا حق تو اسی کو ہو گا جو ان سے واقف ہو۔ زبان کے رموز سے عدم واقفیت کی بنیاد پر سرزد ہونے والی غلطیوں اور کج ردیوں کو انحراف اور بغاوت کا نام دینا شاعرانہ سادہ لوحی ہی کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بہت سے باصلاحیت شعرا کے کلام میں جو حشو و زوائد ملتے ہیں، زبان اور محاورہ کے استعمال کی جو بے اعتدالیاں نظر آتی ہیں۔ اگر وہ حضرت ابر احسنی یا دوسرے اساتذہ کے رسائل کا مطالعہ کر لیں تو ان معائب سے ان کا کلام پاک ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ ان بزرگ اساتذہ فن نے معائب یا متروکات کی جو فہرست دی ہے اس کا ترک کرنا لازم ہے یا شعرا کے کلام پر انھوں نے جو بے شمار اصلاحیں دی ہیں وہ سب صحیح اور درست ہیں ایسا ہرگز نہیں ہر استاد کے متروکات کی فہرست اور اصلاحات کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے ان کی پابندی ضروری نہیں لیکن ان کے علم سے جو بصیرت اور علم بیان اور زبان کے رموز پر جو قدرت حاصل ہوتی ہے وہ بہت ضروری ہے۔

مولانا ابر احسنی یقیناً ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ لیکن کسی شاعر کی قادر الکلامی پر زور دینے کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ اس کے یہاں دوسرے شاعرانہ عناصر کی کمی ہے۔ اور اکثر ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ استادی کا کمال حسن بیان ہے ؟ کہ میدان میں ہی دکھایا جاتا ہے۔ کیا کہا ہے احساس یا فکر و نظر کا کون سا نیا پہلو شعر میں ادا کیا ہے ؟ اس پر توجہ نہیں ہوتی۔ مولانا ابر احسنی کے بارے میں بھی مجھے کچھ ایسا ہی گمان تھا۔ لیکن حال ہی میں جب ان کے تینوں مجموعے میں نے جستہ جستہ پڑھے تو محسوس ہوا کہ یہ تاثر تعصب کا حامل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ غزل کے مروجہ مضامین اور موضوعات کے دائرہ سے بہت کم قدم باہر نکالتے ہیں۔ لیکن غزل کے ان مروجہ مضامین میں بھی اتنی وسعت ہے کہ اس میں زندگی کے نفسیات اور مشاہدات کے بے شمار پہلو مختلف زاویوں اور رشتوں کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ پھر اس میں ہر شاعر کی ترجیحات ہوتی ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور اپنی طبیعت کی افتاد کے مطابق کچھ خاص موضوعات خاص ذہنی تصویروں کی طرف بار بار لوٹ کر جاتا ہے۔ مولانا ابر احسنی کے کلام میں مجھے عشق بلاخیز کی نیرنگیوں کے علاوہ، رواداری اور وسیع المشربی، امن و حانیت کی آرزو، آزادی اور رہائی کی خواہش، یقین و اعتماد کے ساتھ حوصلہ خیز خودداری، اور

دیوانگی کا ایک عجیب وغریب احساس نظر آیا۔ میں یہاں ان کے ایک پسندیدہ موضوع کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے دیوانگی۔ اسی دیوانگی کے کہیں دھندلے اور کہیں روشن نقش ان کی غزلوں میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اس کی پہلی صورت تو وہی ہے جو عشق کا عطیہ ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے اس کیفیت کے نئے اور نازک نفسیاتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔

مجھ کو دیوانہ کسی کا جان کر ہنستے ہیں لوگ
احتیاطاً آپ کو بھی مسکرانا چاہیے

اور ضبطِ غم کی تاکید یں مجھے فرمائیے
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوا جاتا ہوں میں

آج تک ربط دماغ و دل نہ قائم ہو سکا
اس نے ایک دن کہہ دیا تھا ہنس کے دیوانہ مجھے

زمیں کی گردشیں ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہیں یہ کس وادی میں آکر رک گئے ہیں ان کے دیوانے

یہ اشعار صرف قادر الکلامی یا شوخ بیانی کا کرشمہ نہیں۔ یہ ایسی روحانی وارداتیں ہیں جن سے انسان گزرتے ہیں لیکن ان کو کوئی کام نہیں دے پاتے۔ خاص طور پر آخری شعر میں یہ خیال کہ منتہائے عشق میں شب و روز کا قافلہ عاشق کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ وقت کی زنجیروں کے احساس سے آزاد ہو جاتا ہے اور زندگی کی شادابی بے کراں محسوس ہوتی ہے۔ کس لطیف استعاراتی اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

شاعر نے انسانی زندگی میں دیوانگی کا ایک دوسرا رنگ بھی دیکھا ہے۔ جب ظلم وستم کی طاقتوں اور غم واندوہ کی یورش کے مقابلہ میں انسان دیوانگی کو سپر بنا لیتا ہے۔ یہ دیوانگی اس کی اعلا انسانی اقدار کی پر وقار شائستگی بھی ہو سکتی ہے۔

میں جفا کیشوں سے بھی پیہم وفا کرتا رہا
ہوشیار اس کو مرا دیوانہ پن کہتے رہے

درد سے ناآشنا، ہر غم سے بیگانہ رہے
ان کے لطف خاص سے جو بن کے دیوانہ رہے

کم ہو یارب کچھ یوں ہی احساس غم
دل تو دے لیکن دل دیوانہ دے

ہوش جب آیا تو تصویر الم بن جائے گا
ہے اسی میں خیریت دیوانہ، دیوانہ رہے

حواس و ہوش کھو کر چھوٹ جاتے ہیں ہر اک غم سے
کہا کس نے خرد کو مات دیوانے نہیں دیتے

ان اشعار میں جو بے ساختہ تیور ہیں وہ دیوانگی میں انتہائے فرزانگی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ درد و اثر میں ڈوبے ہوئے اس رنگ کے دوسرے اشعار بھی ان کی غزلوں میں مل جاتے ہیں۔ لیکن حضرت ابر کے کلام میں دیوانگی کا ایک رنگ اور بھی ہے جو ان کی ذات کو ان کے عہد کے آشوب سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور ذاتی دیوانگی سماجی فرزانگی کا متحرک روپ اختیار کر لیتی ہے۔

صرف فرزانے الجھ جاتے ہیں فرزانے سے
ورنہ دیوانوں کو خطرہ نہیں دیوانے سے

کر و حدل کی بات اہل خرد سے   اگر ان کا دیوانہ پن دیکھنا ہے

ان اشعار میں جو معنوی تہہ داری ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں لیکن ابر احسنی یہیں پر ٹھہر نہیں جاتے۔ وہ دیوانگی کو قدر اعلا کا رتبہ دیتے ہیں اور انسانیت کے مستقبل کو اسی جرأت آزما جذبہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں

جو بدل دے ہوش مندوں کا مزاج خودسری
کوئی ایسا اس بھری محفل میں دیوانہ بھی ہے

اور پھر خود اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔

ابھی کچھ اور فتنے ہوشمندوں کو اٹھانے دو
بدل جائیں گے نقشے ہوش میں جب آئے دیوانے

بتاؤ کیا کبھی اس راہ تک پہنچے ہیں فرزانے
مقام دار سے ہنس کر گزر جاتے ہیں دیوانے

حضرت ابر احسنی کی اس دیوانہ وشی سے مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ ایک بادشاہ سے کسی جوتشی نے کہا کہ فلاں دن ابر چھائے گا لیکن اس دن کا برسا ہوا پانی جو لوگ پئیں گے وہ دیوانے ہو جائیں گے اور سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ پانی پی کر شہر کی ساری خلقت دیوانی ہو گئی۔ دوسری طرف بادشاہ نے جس نے وہ پانی نہیں پیا تھا محسوس کیا کہ سارے شہر میں وہی ایک دیوانہ ہے اور اس نے بھی وہ پانی پی لیا۔

حضرت ابر گنوری نے اپنی تصانیف اور تلامذہ کے ذریعہ زبان و فن کی نکتہ رسی اور اردو کی خدمت

گزاری کا جو مینہہ برسایا ہے اور اس برکھا سے اپنی دیوانگی کا جو نشہ پھیلایا ہے کاش آج ہم جنون عقل کے مارے ہوئے اس سے کچھ فیض اٹھا سکیں لیکن

جنون عقل کے مارے ہوئے قدر اس کی کیا جانیں
کوئی دیوانہ صدیوں میں ہوا کرتا ہے مشکل سے

شاہد لطیف
M-6, Rashid Compound,
Kausar, Mumbra,
Didtrict THANA-400612.

غزل

تعلقات نہیں ہیں دعا سلام تو ہے
ہمارے اس کے یہاں زندگی کا نام تو ہے

سکونِ ذہن میسر تو ہے کہیں نہ کہیں
برائے نام سہی اپنی اپنی شام تو ہے

اسی سے خوف بڑھائیں، ڈرائیں، دھمکائیں
نہیں ہے تیغ جری کم سے کم نیام تو ہے

خوشی کا وقت معین ہے غم کا وقت بھی طے
خوشی مناؤ کہ اس درجہ اہتمام تو ہے

یہ نسل پھولے، پھلے گی دعائیں روشن ہیں
کہ اس کے دل میں بزرگوں کا احترام تو ہے

مبصرین کی رائے کا غم نہیں کہ ابھی
معززین کی فہرست میں اپنا نام تو ہے

شاہد کلیم
DOODH KATORA,
ARA-802301.

اُمید ہی کیا رکھیں اب اس کالی گھٹا سے
ہم روزِ ازل سے رہے پیاسے ہی کے پیاسے

دہلیز پہ جلتا ہوا میں اک دیا ہوں
کوئی تو بچا لے مجھے طوفانی ہوا سے

چہروں پہ اُداسی بھری تحریر لکھی ہے
ہر شخص ہے سہما ہوا آوازِ بلا سے

تنہائی میں بیٹھا ہوا میں سوچ رہا ہوں
کیا مانگ رہا ہے کوئی پتھر کے خدا سے

تسکیں کے لیے گھر میں خموشی بھی نہیں ہے
ہر لمحہ عجب شور ہے باہر کی صدا سے

شاہد میں سیہ رات کی انگنائی میں اکثر
بے خواب لیے پھرتا رہا آنکھوں کے کاسے

سطوت رسول
DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA MILLIA ISLAMIA,
NEW DELHI-25.

(محمد رفیع کی آواز کے نام)

دور سے آرہی ہے، اک آواز
جیسے کانوں میں گھنٹیاں سی بجیں

ساز اپنے سنگار میں گم ہے
بندشوں کے نکھار میں گم ہے

رقص میں ہے، اساوری کا لوچ
صبح دم، دیولوک کی آواز

کتنی محتاج ہے، صدا کے لیے
لفظ محتاج ہیں ادا کے لیے

گیت، ٹھمری، غزل کی گائیکی
نغمگی ڈھل گئی تخیل میں

گیت کتنے ہیں گنگنائے ہوئے
حرف جس سے ہوں، لو لگائے ہوئے

نیند سی آرہی ہے آنکھوں میں
اپنے کومل سُروں میں وہ آواز

وہی آواز کا حسین طلسم
توڑ دیتی ہے پتھروں کا جسم

میٹھے سنگیت میں وہی جادو
بربط و چنگ و دف میں کھوئی ہوئی

رامش و رنگ میں وہی خوشبو
شہپر دوش پر بجیں گھنگرو

صندلیں نور میں نہائی ہوئی
بھیرویں صبح کی ہو، گائی ہوئی

محبوب راہی
Gulzari Masjid,
P.O.Barsi Takli-444401
District AKOLA.

نیزے پر جو سر ہنستا ہے
وحشتِ قاتل پر ہنستا ہے

چشم و لب ہی کیا سر تا پا
اس کا تو پیکر ہنستا ہے

ٹوٹی چھت گرتی دیواریں
مجھ پر میرا گھر ہنستا ہے

ہنستے ہیں سب دیوانے پر
دیوانہ سب پر ہنستا ہے

چوم کے میری پیشانی کو
نوکیلا پتھر ہنستا ہے

میرے دکھ پر رونے والا
اندر ہی اندر ہنستا ہے

راہی بھی کیا دیوانہ ہے
تیروں کی زد پر ہنستا ہے

عنبر بہرائچی
B-5, Officers Colony,
UNNAO.(U.P.)

وقت بتا اِس بار ہَوا یہ کیسی ہے؛
چندن کے پیڑوں سے آگ برستی ہے

سادہ دِل نے کھائے ہیں اکثر دھوکے
اب چہرے پڑھنا میری مجبوری ہے

منظر اور پسِ منظر دونوں زخمی
آنسو کا ہر قطرہ بیر بہوٹی ہے

سوکھے پتّوں پر شبنم نے گیت لکھے
انگاروں پر لوٹ رہی ہریالی ہے

غم نے تو شبخون بہت مارے لیکن
دل کی شہر پناہوں پر خوش رنگی ہے

خواب میں عنبر دھوپ کے ٹکڑے ہیں چبھتے
برسوں سے ہر سمت فضا برفیلی ہے

ظفر اقبال
170.kheldar,
FATEHPUR.(U.P.)

مرے مکان کے جلنے کی روشنی ہے ابھی
یہ کیسے کہہ دوں اندھیرے میں کٹ رہی ہے ابھی

نہ جانے کتنے ہی لمحوں کا کرب تھا اُس میں
وہ ایک چیخ فضا میں جو کھو گئی ہے ابھی

وہ بھیگا اوس میں شفّاف چاندنی سا بدن
کہ جیسے ریت پہ چاندی پگھل رہی ہے ابھی

میں خود کو ٹوٹتا محسوس کر رہا ہوں بہت
یہ کون شے مرے دل میں اُتر گئی ہے ابھی

کہانی اپنی سُنا کر وہ جا چکا کب کا
دلوں میں آگ ہمارے دہک رہی ہے ابھی

تم اپنے گھر کی فصیلوں کو اُونچا کر لو ظفر
ہَوا زمانے میں نفرت کی چل رہی ہے ابھی

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
QILA MASJID WARD,
BEHIND URDU GIRLS SCHOOL,
DARWHA-445202.

مذہب ہر زمانے میں ادب بالخصوص شاعری کے لیے سرچشمۂ الہام رہا ہے۔ پھر بھی مذہبی شاعری کو اکثر و بیشتر رطب و یابس کا مرقع سمجھ کر ناقدانِ فن نے اس سے بالعموم اغماض برتا ہے۔ اس عدم توجہی کے باعث مذہبی شاعری میں ڈھلے نادر خیالات کی پذیرائی نہ ہو سکی اور غیر فصیح و غیر شاعرانہ خیالات خس و خاشاک کی طرح پھیل گئے۔

مذہبی شاعری کی ایک صنف نعت بھی ہے۔ نعت دراصل وصفِ محمود ہے، لیکن اصطلاح میں مدحتِ رسولؐ ہی کو نعت کہا جاتا ہے۔ یہ محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن کا بیان یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رسمی عقیدت کا اظہار ہی نہیں ہوتی، بلکہ ہر وہ شعر نعت کے دائرے میں آجاتا ہے جس میں حضورؐ کی مدح ہو، حضورؐ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خطاب ہو اور جس کا تاثر ہمیں آپ کی ذاتِ گرامی سے قربت کا احساس دلادے۔ حضورِ اکرمؐ سے محبت اور دائمی عقیدت رکھنے والے صحابیوں نے توصیفِ رسولؐ میں میں جو اشعار کہے ہیں، عربی ادب کا وہ بیش بہا خزانہ ہیں۔ اس وادیٔ ایمن کی رہ نوردی میں فارسی زبان و ادب بھی عربی کے شانہ بشانہ چلے ہیں۔ اردو شعرا نے بھی دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری کے سلسلے میں عرب ایرانی شعرا کے اس قبیل کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھا۔ لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ ان کے خلاقِ تخیل نے دیگر اصناف کی طرح اس صنف میں بھی اپنے ہی دلی جذبات کی اپنے مخصوص انداز میں ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ پاکستان کے معروف شاعر غوث محمد خاں ماہر براری، صدر گلستانِ ادب بزمِ مصطفےٰ کراچی کے مجموعۂ کلام "حمد و مدح" میں "نامِ محمدؐ" کے عنوان سے دو قطعات ملتے ہیں، جن میں ریاضی اصول پر ابجدی طریقے سے ہر نام سے نام محمدؐ کے اعداد مستخرج کیے گئے ہیں۔ قطعہ درج ذیل ہے۔

نام کوئی لیں، ابجد سے اعداد کا کریں مجموعہ
چار ضرب دیں، دو جوڑیں پھر پانچ ضرب اک بار کریں
بیس سے ہو تقسیم، جو باقی بچ جائے تو نو کی ضرب
دو جوڑیں تو پائیں ماہر نام محمد پیارا کریں

مثالوں میں لفظ "قرآن" اور "خدا" کے اعداد پر قطعہ میں بتائے ہوئے عمل سے ۹۲ مستخرج کیے گئے ہیں۔ جیسے

ق ر ا ن
۱۰۰ + ۲۰۰ + ۱ + ۵۰ = ۳۵۱

۳۵۱
۴ ×
۱۴۰۴
۲ +
۱۴۰۶
۵ ×
۲۰) ۷۰۳۰ (۳۵۱
۷۰۲۰
۱۰
۹ ×
۹۰
۲ +
۹۲ = ۴۰ + ۸ + ۴۰ + ۴
م ح م د

شاعر نے اس طرح ثابت کیا ہے کہ ؎

ماہر نہیں ہوتا ہے کہاں نام محمدؐ؟
ہر نام میں ہوتا ہے نہاں نام محمدؐ

ماہر بزاری نے اس "طریقۂ خاص" کو اپنا نتیجۂ فکر بتایا ہے۔

ابھی حال ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ہیریٹیج بمبئی کی جانب سے "الرسول القائد" نامی ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب کو شمیم طارق نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے ایک مضمون بعنوان "ہر شے میں ہے جلوۂ نام محمدؐ" میں گرونانک سے منسوب ایک رباعی دی گئی ہے۔ جو اس طرح ہے۔

ہر عدد کو چوگن کر لو، دو کو اس میں دو بڑھائے
پورے جوڑ کو پنج گن کر لو، بیس سے اس میں بھاگ لگائے
باقی بچے کو نو گن کر لو، دو کو اس میں دو بڑھائے
گرو نانک یوں کہے، ہر شے میں محمدؐ کو پائے

کتاب میں لفظ "ظفر" اور "نقوش" کے اعداد پر مندرجہ بالا عمل کر کے ۹۲ حاصل کیے گئے ہیں۔ اس رباعی کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

(۱) گرونانک سے منسوب اس رباعی کی نکھری ہوئی زبان اس کی قدامت میں شبہہ پیدا کر دیتی ہے۔
(۲) آخری مصرع خارج از وزن ہے۔ تخلص کو ٹھونس کر داخل کرائے جانے کا گمان ہوتا ہے۔
(۳) حالیہ تحقیق تک (جس کا مجھے علم ہے) مدح رسولؐ میں گرونانک کا صرف ایک دوہا ملتا ہے جو یوں ہے ؎

ڈٹھا نورِ محمدی ڈٹھا نبیِ رسول
نانک قدرت دیکھ کر خودی گئی سب بھول

(ماخوذ از غازیان ہند ــــــ سردار کرشن سنگھ ص ۱۱۷)

(۴) نانک نے بطور تخلص کہیں گرو نانک کا استعمال نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کسی دوسرے شاعر نے گرو نانک کے نام کا استعمال کر کے یہ رُباعی ان سے منسوب کر دی ہو۔

(۵) یہ اشعار رُباعی کے کسی وزن پر پورے نہیں اُترتے، بلکہ ہندی بحر سے زیادہ قریب تر ہیں۔

(۶) ہندو شعرا میں لالہ نانک چند کھتری لکھنوی (ولادت ۱۸۹۴ء) کا نعتیہ کلام عقیدت رسول سے پُر ہے۔ ان کے یہاں نانک اور "لالہ نانک" دونوں طرح کے تخلص کا استعمال ہوا ہے۔ اغلب ہے کہ یہ اشعار ان ہی کے رہے ہوں لیکن قطعیت کے ساتھ پھر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بہرحال باوجود ان اشتباہات کے یہ اشعار ماہر کے قطعہ سے قدیم تر ہیں۔ دونوں شعرا کے نعتیہ کلام میں "رباعی ہنر مندی" کی اس مماثلت کو آیا ہم سرقہ سے تعبیر کریں یا محض اتفاق پر محمول کریں ؎

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ال احمد صدیقی
106, Block-1,
Old Campus,
Jawaharlal Nehru University
New Delhi.

آنند نرائن مُلّا

ہر بڑا فن کار صاحبِ طرز ہوتا ہے۔ آنند نرائن مُلّا کے بڑے شاعر اور صاحبِ طرز شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ اس بات کا احساس خود اُن کو بھی ہے :

پاکیٔ ذوق نے مُلّاؔ مجھے چلنے نہ دیا
کسی اُس راہ پر جو ہو چکی گام آلودہ

یہی بات ایک دوسرے طریقے سے ایک اور مقطع میں کہی ہے :

وادیٔ شعر میں یہ جادۂ ملّاؔ تو نہیں
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

آنند نرائن مُلّا نے اس بات کا تو بے باکی سے ذکر کیا ہے کہ ان کا رنگِ سخن دوسروں سے مختلف ہے۔ لیکن اپنی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں تعلّی سے پرہیز کیا ہے۔ حالانکہ شعر میں تعلّی جائز بھی ہے اور روا بھی رکھی گئی ہے۔ یہ بات ملّا صاحب کی مخصوص افتادِ طبع اور ذہنی تربیت کا پتا بھی دیتی ہے۔ انھوں نے جاگیردارانہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اور آج اگرچہ وہ اس نظام کو آدرش نظام نہیں سمجھتے، سرمایہ دارانہ نظام کو بھی آدرش نظام نہیں سمجھتے۔ لیکن ان کو وہ آداب بہت عزیز ہیں جو ان کو بزرگوں سے ملے۔ مُلّا صاحب خود شایستگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں سماج اور سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں ان کا ایک روّیہ ہے۔ یہ نظریہ میں نے جان بوجھ کر نہیں قائم کیا ہے کیونکہ نظریہ ہر جگہ ایک ہم آہنگی چاہتا ہے۔ ملّا صاحب نظریہ پر روّیہ کو سبقت دیتے ہیں۔ روّیے کا تعین اخلاق سے اور نظریہ کا اقدار سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مُلّا صاحب اقدار یا اُن کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن شعوری سطح پر بھی وہ روّیے کو قدرِ اوّل سمجھتے ہیں۔ جب بھی کہیں کوئی بُری انسانیت سوز بات ہوتی ہے تو اُن کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس تکلیف کو وہ شعر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

امیر مینائی نے کہا تھا :

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ، سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آنند نرائن مُلّا کے یہاں سارے جہاں کا درد مختلف نظموں اور غزلوں میں طرح طرح سے ظاہر ہوا۔ دوسروں کا درد جب اُن کا درد بن جاتا ہے تو شعری تخلیق سرانجام پاتی ہے۔ اُن کا دل بھی گداختہ ہے اس لیے وہ دوسروں کے دلوں کی کسک کو سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ماحول اور اپنی دنیا سے اور اس میں رہنے والوں سے دردِ مشترک کا رشتہ قائم کرتے ہیں جو اُن کو بہت عزیز ہے۔

مُلّا صاحب نے اپنے تیسرے مجموعے کلام " میری حدیثِ عمرِ گریزاں " میں اپنے پڑھنے والوں کے نام ایک خط لکھا ہے۔ وہ ایک باقاعدہ مقدمہ بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن عدالتِ عالیہ میں مقدموں کے فیصلے کرنے، اور اس سے پہلے اور بعد عدالتوں میں مقدموں کی پیروی کرنے کی وجہ سے اس لفظ کی وہ معنویت اور وابستگی ان کے لیے نہ ہو جو مضمون اور مقدمہ نگاروں کے لیے ہوتی ہے۔ اپنے اس خط میں بڑے بے ساختہ اور بے تکلف انداز میں اُنھوں نے شعر و ادب اور شاعر کے فرائض اور کردار کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

" میرے نزدیک دنیا آج اُس مقام پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں صرف اُسی دیوانے کی سماج میں گنجایش ہے۔ جس کی دیوانگی پروردۂ خرد ہے، اور وہ دیوانگی جس کے رشتے خرد سے ٹوٹ چکے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے لیے مُضر ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنون و خرد، کا جو مفہوم میرے ذہن میں ہے وہ یہاں پیش کردوں یہ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ میں نے اکثر اپنے اشعار میں جنوں کو خرد پر ترجیح دی ہے، اور بظاہر یہ میرے اوپر والے (یعنی پہلے کے) بیان کی تردید کرتا ہے۔ جنوں دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو کسی مشترکہ انسانی مفاد کے آگے اپنا ذاتی مفاد نہیں دیکھتا، بلکہ کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسرا جنون وہ ہوتا ہے جو نراج (انگریزی) چاہتا ہے اور جو اپنی ذاتی آرزوئیں اور اغراض پورے کرنے کے لیے سماج اور اخلاق کی صالح پابندیوں کو زنجیریں سمجھتا ہے اور انھیں توڑ کر اپنے انفرادی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی قسم کا جنون ایک شریف انسان کے دل میں پرورش پاتا ہے۔ اور دوسری قسم کا جنون ایک بیمار غیر متوازن ذہن میں۔ میں نے جس جنون کو سراہا ہے۔ وہ پہلی قسم کا جنون ہے، نہ کہ دوسری قسم کا جنون۔ "

مُلّا صاحب کو انسانیت اور انسانیت کو فلاح عزیز ہے اور جنون کی تعریف کے بارے میں اُنھوں نے اپنا رویّہ واضح کیا ہے۔ فرد اور سماج کے رشتے کو اُنھوں نے اور بھی واضح کیا ہے۔ لیکن اس وقت میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ مُلّا صاحب جس جنون کی

حمایت کرتے ہیں وہ خرد کا پروردہ ہے۔ یعنی یہ دیوانگی ہوشیاری کی سب سے بلند سطح ہے۔ ظاہری طور پر ان کے جنون اور اقبال کے عشق میں ایک بُعد ہے بلکہ تضاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنون اور مصلحت کی جو کشمکش ملّا کے یہاں ہے۔ وہی اقبال کے یہاں عشق اور عقل کی کشمکش ہے۔ کشمکش ایک ہی ہے، استعارے اور ارشادیت میں ناموں کا فرق ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال کی بات چھڑ گئی ہے، تو اقبال سے جو تعلق خاطر ملّا کو ہے اس سے کترا کے گزر جانا مناسب نہ ہوگا۔ آنند نرائن ملا نے شاعری ہی اقبال کے ترجمے سے شروع کی۔ یوں بھی ملّا اور اقبال میں کشمیر، بلکہ ترکِ کشمیر قدرِ مشترک ہے۔ اقبال کے اجداد ڈھائی سو برس پہلے برہمن تھے اور کشمیر ہیں مسلمان ہو گئے تھے۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں اُن کے دادا کشمیر سے ترکِ وطن کر کے سیالکوٹ میں آ بسے آنند نرائن ملّا کے سگڑ دادا۔ پنڈت سیتارام اٹھارہویں صدی کے آخر میں کشمیر سے ترکِ وطن کر کے آئے اور لکھنؤ میں آباد ہوئے۔

پنڈت جگت نرائن ملا لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے۔ اور جج کے اعلیٰ منصب پر بھی فائز رہے۔ آبائی مکان رانی کٹرہ میں ۲۴ راکتوبر ۱۹۰۱ء کو آنند نرائن ملّا پیدا ہوئے۔ چار یا پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ مولانا برکت اللہ رضا فرنگی محل نے اردو سے کرائی۔ بعد میں انھیں سے فارسی کا درس بھی لیا۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم اے اور ۱۹۲۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۹۲۵ء میں بیماری کے زمانے میں شعلۂ طور کے عنوان کے تحت اقبال کے جو قطعات تھے، ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ غالب، انیس اور اقبال سے خاص طور پر متاثر رہے۔ شاعری میں فکری عنصر کی اہمیت کے قائل تھے، اس لیے اپنے عہد کے لکھنؤ کے شاعروں میں انھوں نے خود کو سراج لکھنوی کے قریب پایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ لکھنؤ میں انشا، مصحفی، میر، آتش، انیس اور چکبست وغیرہ کی روایت کے باوجود تلازموں کی شاعری زیادہ ہوئی۔ سراج نے غزل میں لکھنؤ کی زبان کے بانکپن کو برقرار رکھتے ہوئے تلازموں سے ہٹ کر شعر کے فکری پہلو پر زور دیا۔

ملّا کے ذہن پر اقبال کی شاعرانہ شخصیت کی گرفت رہی ہے۔ اُن کی شروع کی بعض نظموں کے عنوان، اقبال کی نظموں کے عنوان ہیں۔ اور یہ نہ تو توارد ہے، اور نہ اقبال سے مقابلے کی کوشش ہے۔ اور تو اور مسدس کا فارم جو اقبال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اقبال کو پسند تھا۔ انیس اور دبیر کے مرثیے بھی مسدس ہی کے فارم میں ہیں۔ لیکن اقبال نے یہ فارم "مد و جزر اسلام" (مسدس حالی) سے اسی فارم میں مُلّا کی پہلی نظم "پرستارِ حسن" ہے۔ اور اس کی بحر بھی اقبال کی محبوب بحروں میں سے ہے۔ ۱۹۲۶ء کی اس نظم کے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں۔

اپنے سوزِ غم کی شرح داستاں کیونکر کروں
دل کی جو باتیں ہیں وہ نذرِ زباں کیونکر کروں
بات جو مجھ سے بھی پنہاں ہے بیاں کیونکر کروں

اپنی ہستی کو زمانے پر عیاں کیونکر کروں
درد دل کو غم کہوں، الفت کہوں، سودا کہوں
میں بھی حیران ہوں، کس سے کہوں اور کیا کہوں
اے شعاعِ برق زالمے خاور پیمائے حسن
اے شرابِ دل گداز ساغرِ مینائے حسن
اے شرارِ عقل سوز شعلۂ سینائے حسن
اے نگاہِ فتنہ خیز دیدۂ بینائے حسن
تو نے سینے میں یہ کیسا درد پیدا کر دیا
میری ہستی کو مرے دل سے شناسا کر دیا

مسدس ہی کے فارم میں ان کی دوسری نظم "شمع" ہے۔ یہ بھی ۱۹۲۶ء کی ہے۔ ۱۹۲۶ء ہی کی ایک اور نظم ہے "انسان" یہ بھی مسدس کے فارم میں ہے ۱۹۲۶ء ہی کی نظم "شاعر" بھی ہے۔ اور مسدس کے فارم میں۔

یہ لہجہ بھی اقبال کا ہے، مصرعوں میں الفاظ کا دروبست اور بات کہنے کا ڈھنگ بھی اقبال کا ہے۔ لیکن یہ اقبال کی نقالی نہیں ہے۔ فکرِ اقبال اور رنگِ اقبال کی توسیع ہے۔

اقبال سے مُلاّ کی عقیدت بڑی والہانہ ہے۔ لیکن جب اُنھوں نے مرتب طریقے سے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا، تو یہ بات ان کو کھٹکی کہ اقبال ایک بڑے دائرے سے ایک چھوٹے دائرے کی طرف گئے۔ ایک طرف قدیم ہند دھکا اور قرونِ وسطیٰ کے مکانی مفکروں نے اقبال کو متاثر کیا تھا اور دوسری طرف جدید مغربی علوم نے ان کی فکر پر جلا کی تھی۔ فکرِ اقبال میں رندی اور قلندری کی جوشان تھی، وہ مذہب اور بین اسلامی تحریک کی طرف جھکاؤ سے ماند پڑ گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کی نظموں میں سے، مُلاّ کی ایک نظم "اقبال سے شکوہ" بھی ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

محمل میں چھپا ہے قیسِ حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

تو وہ قطرہ تھا، جو رشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا
تو جا کے صدف میں کیوں بیٹھا، جب یونہی گہر بن سکتا تھا

مذہب کی مینا کے قابل اے رند تری صہبا ہی نہیں
پوشاک جو تو نے پہنی ہے، قامت پہ ترے زیبا ہی نہیں

یہ پہلی نظم ہے، جسے ترکِ اقبال کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے مُلاّ اپنا لہجہ دریافت کرتے ہیں اور یہ محض اتفاق نہیں کہ فکر، موضوع اور اسلوب، تینوں ایک ساتھ تبدیل ہوتے ہیں۔ اقبال سے ذہنی طور پر قطع تعلق کے بعد، مُلاّ کی آواز نئے لکھنؤ کی آواز بن جاتی ہے۔

آنند نرائن مُلّا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ موضوع پر اس وقت تک فکر نہیں کرتے، جب تک اسے اس لائق نہ سمجھیں کہ وہ شعر یا نظم میں ڈھل سکتا ہے۔ دل سے جس معاملے کو وہ شعر کے لیے انتخاب کر لیتے ہیں۔ پھر چاہے رسوائی ہو یا نیک نامی، وہ شعر میں باقی رہتا ہے۔ اور شعر بیاض ہی میں نہیں مجموعے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ انتخاب کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ لیکن انتخاب نہ کرنے کے بھی کم فائدے نہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر بہت ناپ تول کر بات کرتا ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ بات مُلّا کے بارے میں درست ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شاعر کی فکر کے ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مُلّا صاحب ارتقا کے قائل ہیں، انقلاب کے نہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے تحریروں میں بھی کیا ہے اور بات چیت میں بھی یہ ذکر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انقلاب کے دلدادہ ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ انھوں نے ایک نظم کہی تھی۔ جس کے ٹیپ کے مصرعے اور عنوان دونوں میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ ہے:

شوق ہوا بے حجاب
ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب
قوم کا چمکا شباب
زندہ باد انقلاب
انقلاب زندہ باد

توڑ پُرانا نظام
دائرۂ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام
دے یہ جہاں کو پیام
لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

گویا انقلاب صرف اپنے وطن کے لیے نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے چاہتے ہیں۔ سارے جہان کو پیام ہے۔ قوم و مقام کی بندش سے آگے۔

اس نظم کا آخری بند ہے:

سہل کُن مشکلات
قوم کی راہِ نجات
دہر کا رازِ حیات
فلسفۂ کائنات
لاکھ سخن ایک بات
انقلاب زندہ باد

پھر ۱۹۳۷ء کی ایک نظم ہے "ہم لوگ" فارم غزل کا ہے۔ اور اس زمین میں جگر مرادآبادی کی رندی اور سرمستی سے لبریز غزل ہے۔ ملّا نے اس زمین میں بھی انقلاب اور وہ بھی انقلاب کے ایک مخصوص تصور کا نعرہ لگایا ہے۔ مطلع ہے:

سرخیِ انقلاب ہیں ہم لوگ
عنفوانِ شباب ہیں ہم لوگ

نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

کون دے گا صدا یہ اپنی صدا
نعرۂ انقلاب ہیں ہم لوگ

ملّا صاحب باشعور شاعر ہیں، اور شعوری طور پر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ نہ تو مزدور کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں، اور نہ مزدور راج قائم کرنے کے لیے گشت و خون کی ترغیب دینے ہی کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیتا ہوں" ہر بات ملّا نے "جوئے شیر" میں "بقلم خود" کے عنوان کے تحت لکھی تھی۔ لیکن اسی مجموعے میں نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی ایسے شعر ہیں۔ جو اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ملّا کے نظامِ فکر میں انقلاب کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کی ایک غزل کا مطلع ہے:-

سنہرے خرمنوں میں رنگ پنہا دیکھ لیتا ہوں
ہر اک دانے میں خونِ گرمِ دہقاں دیکھ لیتا ہوں

اس شعر میں غالب کے اس شعر کا فیض نمایاں ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کا

ابھی چند روز پہلے ملّا صاحب سے اس موضوع پر پھر گفتگو ہوئی اُنھوں نے یہ بات دہرائی کہ میں تو سب کے لیے بھلائی چاہتا ہوں۔ انسان انسان سب برابر ہیں)۔ میں نے کہا۔ ملا صاحب جب سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہو، اور مختلف طبقوں کے مفادات مختلف ہوں۔ ایک کا سود دوسرے کا زیاں ہو، تو یہ بات کیسے مانی جائے گی کہ آپ نا وابستگی کے ساتھ سوچ سکتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ملّا صاحب، آپ کی نظموں میں بھی اس بات کے واضح اشارے ہیں کہ آپ ظالم کے ساتھ نہیں، مظلوم کے ساتھ ہیں۔ ملا صاحب نے کہا کہ انصاف اور قانون کا تقاضہ ہے کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دیا جائے اور میں مظلوم کے ساتھ ہوں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس پر اصرار ہے کہ انسان اور انسان، سب برابر ہیں۔ میں نے جب اُنھیں کے شعر مثال میں پیش کیے۔ تو اُنھوں نے کہا۔ میں نے اپنا موقف بیان کر دیا، آپ کو میری شاعری کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے کی اور اس پر قائم رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے، جتنا مجھے اپنی رائے پر قائم رہنے کا ہے۔ پھر اُنھوں نے اپنی تازہ نظم سنائی۔ آپ بھی سُنیے:

صد شکر کہ میں اک چڑیا ہوں
اک ننھی منی سی چڑیا
عقاب نہیں
شاہین نہیں
یہ چونچ مری تلوار نہیں
میرے پنجوں میں خون نہیں
میں اڑتی ہوں اور گاتی ہوں
یہ وایومنڈل میرا ہے

●

چھوٹی چھوٹی چڑیو، آؤ
ہم اپنا پورا دل لے کر
اک بادل بن کر چھا جائیں
اور اپنی کروڑوں چونچوں میں
چھوٹے چھوٹے کنکرے کر
ان عقابوں پر برسائیں
شاہینوں پر پتھراؤ کریں
ان کے پنجے، بازو توڑیں
اور اپنے وایومنڈل میں
یہ خون و قعارت بند کریں

●

صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اک انساں ہوں
میں دھرتی کا
دھرتی میری
یہ مٹی میری ماتا ہے
اور میں
اس کا بالک بھی ہوں
وارث بھی ہوں
رکھوالا بھی

صد شکر کہ میں اک دیو نہیں
میرے دانتوں میں ماس نہیں
اور میرے نکیلے سینگوں سے
سینے میں کسی کے گھاؤ نہیں
اور میرے پیروں کے نیچے
کچلی ہوئی کوئی لاش نہیں

●

معمولی انسانو، آؤ
ہم سب مل کر ان دیووں کے
محلوں کی دیواریں توڑیں
محلوں کے چراغاں ختم کریں
ہر کٹیا میں اک دیپ جلے
اور سب مل کر اک جشن کریں
دھرتی کا نیا نغمہ گائیں

●

اب قصۂ شاہیں ختم ہوا
چڑیوں کا فسانہ آیا ہے
دیووں کا زمانہ بیت گیا
انساں کا زمانہ آیا ہے
آکاش کے تارے بجھنے دو
دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذرّوں سے شعاعیں پھوٹیں گی
مٹی کی خدائی باقی ہے
صد شکر کہ میں اک چڑیا ہوں
صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اک انساں ہوں

نظم سننے کے بعد وہی خیال میرے ذہن کی سطح پر بھی ابھرا، جو یقیناً اس وقت آپ کے ذہن میں ہوگا۔ "شاہین" اقبال کی محبوب علامت ہے۔ یہ شاہین "قوت اور عمل کی علامت ہونے کے باوجود فاسشٹ رجحان کی طرف لے جاتا ہے۔ چڑیوں کے سماج میں شاہین کم اور کمزور چڑیاں زیادہ ہیں۔ بالکل جس طرح ہمارے سماج میں ملّانے خود کو انھیں چھوٹی اور ننھی منی چڑیوں

سے IDENTITY کیا ہے۔ اور ایک جمہوری نظام کے قیام کے لیے اس بات کو ضروری سمجھا ہے کہ ننھی منی چڑیاں اپنی کروڑوں چونچوں میں کنکریاں لے کر عقابوں پر وار کریں اور ان کے پر توڑ دیں۔ ظاہر ہے یہ ارتقائے انقلاب کی طرف قدم ہے۔

مُلّا صاحب سے میں نے پوچھا: قرآن پاک میں ایک آیت ہے اصحاب فیل کے بارے میں دشمن ہاتھیوں پر بیٹھ کر جنگ کرنے آئے تھے۔ چھوٹی چڑیوں کا ایک غول آسمان پر چھا گیا۔ انھوں نے کنکریوں کا مینہ برسایا اور اصحاب فیل شکست کھا کر بھاگ گئے۔ ملا صاحب نے کہا کہ قرآن پاک کی یہ آیت شعوری طور پر بھی میرے ذہن میں تھی اور اس نظم میں یہ خیال وہیں سے آیا ہے۔

مُلّا صاحب کے تین مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔ جوئے شیر ۱۹۴۹ء میں۔ اور اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "کچھ ذرّے کچھ تارے" ۱۹۵۹ء میں۔ اتر پردیش کا غالب انعام جن دو کتابوں پر برابر تقسیم ہوا۔ ان میں سے ایک مُلّا کی "کچھ ذرے کچھ تارے" اور دوسری فراق گورکھپوری کی "گل نغمہ" ۔تیسرا مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا اور اس پر ساہتیہ اکاڈمی انعام دیا گیا۔

سیاسی موضوعات کے علاوہ سیاسی شخصیتوں پر بھی ملا کی نظمیں ہیں۔ بہت سی ایسی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جن کا تعلق دل کی دھڑکنوں سے ہے۔ جب دل کی کسک شعر کے پیکر میں آتی ہے تو عشقیہ شاعری ہو جاتی ہے، اور پھر وہ نجی نہیں رہتی۔ ان میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو بظاہر دوسروں سے واردات قلبی ہیں۔ لیکن جنھوں نے شاعر کو متاثر کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج کے سارے اسپکٹرم پر ملا کی نظر رہی ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں آنند نرائن مُلا ایک انڈو پاک ٹربیونل کے صدر مقرر ہوئے تھے اور مارچ ۵۲ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے کی ایک نظم ہے "سوغات" جو لاہور جاتے ہوئے سرانجام پائی تھی مسلسل غزل کا فارم ہے اور اس زمین میں کچھ کم تر درجے کے لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ چند شعر یہ ہیں:

پھر اک تجدیدِ الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں
میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں

بہ نامِ خطّۂ اقبال خاکِ میر و غالب سے
سلامِ شوق و نذرِ دوستانہ لے کے آیا ہوں

مجھے ٹھکرا نہ پاؤ گے، تمہیں اپنا بنا لوں گا
محبت کی شکستِ فاتحانہ لے کے آیا ہوں

ملا کی یہ نظم ہندستان اور پاکستان میں یاد رکھی جائے گی۔ کیونکہ جو بات انھوں نے اس

نظم میں کہی تھی وہ انھیں کے دل کی بات نہیں، بلکہ ہر ہندستانی کے دل کی بات ہے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اس تقسیم کے بعد ہندستان میں عوام نے ہمیشہ یہ چاہا کہ سرحدیں زمین پر کھنچی ہیں۔ دلوں پر یہ سرحدیں نہ کھنچیں۔ اور ہم اچھے پڑوسیوں کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہیں۔ اس کے باوجود سرد اور گرم، دونوں طرح کی جنگوں سے ہمیں گزرنا پڑا۔ پھر بھی، ہمارے خیالات اور ہمارے جذبات آج بھی وہی ہیں۔ جن کی ترجمانی مُلّا نے اس نظم میں کی ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے آنند نرائن مُلّا نے کچھ ایسے فیصلے بھی تحریر کیے جن کا چرچا سارے ملک میں رہا۔ جج کا منصب قانون کو انٹرپریٹ کرنا ہے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اگر قانون میں کوئی نقص ہو، تو وہ قانون کو کالعدم قرار دے دے۔ عدالتِ عالیہ میں بھی ملا صاحب کے شاعرانہ بانکپن نے ایک روایت قائم کی۔ چنانچہ ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے جو مسلسل غزل کہی۔ اس کے کچھ شعر اس بانکپن کا آئینہ ہیں:

یہ ہمت مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے

طاقت کی رعونت کے مقابل، بہ لبِ عدل
یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ساقی سے سوا، تشنہ لبوں سے تھا جسے اُنس
محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

کھنچتی ہی رہی شیخ کی داڑھی کے جو تنکے
یہ جراتِ رندانہ پھر آئے کہ نہ آئے

آتے ہی رہیں گے سرِ طور اور بھی موسیٰ
یہ ضربِ کلیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مسند پہ پہنچ کر بھی رہا حامیِ جمہور
مُلّا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ہر شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک مکمل نظم۔ اور پورے نظام کو ناپنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جو باتیں ملا نے کہی ہیں، وہ شاید غزل کی رمزیت کے سہارے کے بغیر نہیں کہی جاسکتی تھیں۔

نیکی اور بدی میں ایک جنگ ہمیشہ سے جاری ہے۔ ملّا اس جنگ سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ "بیسوا" مہاجن کی لڑکی، مزدور، عاشق، کلکتہ کے قحط زدہ لوگ، سب اس جنگ میں شریک ہیں۔ یہ جنگ ایوانِ عدالت میں بھی ہے اور تاریخ کے صفحات پر بھی۔ مُلّا قنوطیت کی نہیں رجائیت کی بشارت دیتے ہیں۔ "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں آخری نظم ہے "اور اک دن انسان جیتے گا۔" اس کے بعد ایک غزل اور دو شعر ہیں۔ نظم میں مختلف تلازموں میں خیر کی شکست اور شر کی فتح دکھائی ہے:

۱۔ پھر معرکہ خیر و شر میں نیکی ہاری اور شر جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی
۲۔ پھر دشت و چمن کے معرکے میں گلشن ہارا صحرا جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی
۳۔ حق اور ناحق کے معرکے میں پھر حق ہارا ناحق جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

اور آخر میں بند لکھتے ہیں :

جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا آیا، انساں ہارا شیطاں جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ یونہی ہوتی جائے گی میدان بدلتے جائیں گے
اور اک دن انسان جیتے گا

یہ جائزہ تھا اس شاعری کا جس کو فکری شاعری کہہ سکتے ہیں۔ فکری شاعری کی اصطلاح کوئی بہت اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ فکر کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ کسی دوسری مناسب اصطلاح کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس سے بہتر اصطلاح سمجھ میں نہیں آتی۔ خارجی حقیقت اور داخلی حقیقت کی شاعری؟ خارجیت اور داخلیت زیادہ الجھن پیدا کرنے والی، اور گمراہ کرنے والی اصطلاحیں ہیں۔ اس لیے میں نے دانستہ طور پر ان سے احتراز کیا ہے۔ اب مُلّا صاحب کی شاعری کے ایک دوسرے پہلو پر ایک نظر ڈالیں۔

سماجی اور خارجی حقیقتوں میں خود انسان کی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ پھر بھی ان کے بہت سے نجی مسائل، سماجی عوامل کی پیداوار ہونے کے باوجود، سماج سے کم اور اس کی شخصیت یا ذات سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔ عشق بھی ایک ایسی ہی ایک قدر ہے۔ مُلّا نے ایسی نظمیں (اور غزلوں میں ایسے شعر بھی) لکھے ہیں۔ جن میں دوسروں کے عشق کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہاں عشق ایک سماجی مسئلہ ہے۔ سماجی مسئلہ ان معنوں میں کہ سماج کے بندھن عشق میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ میرے نزدیک اس قبیل کی سب سے خوبصورت نظم ہے "سماج کا شکار" جو ۱۹۴۱ء کی نظم ہے۔ یہ ایک کہانی ہے۔ ایک مہاجن کی بیٹی کہتی ہے۔ " جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں۔ اور دو دو مربعوں کے چھ بندوں میں وہ بتاتی ہے کہ مزدور کا بیٹا ہر روز دن میں کئی کئی بار ادھر آتا ہے، سردی گرمی، بارش کے باوجود وہ ضرور آتا تھا۔ پرسوں میری سالگرہ تھی۔ شوالے، پوجا کے لیے جا رہی تھی کہ اُس نے مجھے پھولوں کا ہار لا کر دیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گئی اور اُس سے بات بھی نہیں کی، اور نہ ہار لیا۔ دربان نے دور سے دیکھ لیا تھا، اُس نے پتاجی کے نہ جانے کیا کان بھرے کہ انھوں نے جا کر اس کو بہت ڈانٹا۔ معلوم نہیں اُس نے یہ تو نہیں سمجھا کہ میں نے

پتا جی سے شکایت کی ۔ وہ چپ چاپ پتا جی کی باتیں سنتا رہا، پتا جی کو پرنام کیا اور چلا گیا ۔ اور اس کے بعد پلٹ کر نہ آیا ۔ جا پوچھ سکھی ری شور یہ کیسا ہے گلی میں ۔

وہ مزدور کا بیٹا کیسا نادان تھا کہ میرے جی کی بات نہیں سمجھا ۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھا کہ یہ تہذیب بھی جھوٹی ہے اور میری شرم بھی جھوٹی ہے ۔ یہ سماج کتنا ظالم ہے ۔ ایک بار وہ پھر ادھر آئے تو میں سماج اور دنیا کی پروا نہ کروں گی ۔ رسوائی گوارا کروں گی ۔ لیکن عشق کو رسوا نہ کروں گی ۔

جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اس کا تو یقیں ہے
دنیا بھی جوانی کی لگا ہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا رونا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے

جا پوچھ سکھی ری یہ کیسا شور ہے گلی میں

بیانیہ شاعری بہت مشکل ہوتی ہے ۔ مثنوی اور واسوخت کی روایت کے باوجود، بیانیہ شاعری میں اثر پیدا کرنا مشکل اس لیے ہے کہ ایک تو قصے میں جان ہو ۔ اب قصے میں جان ہے تو نظم کے بجائے نثر اس کے لیے زیادہ موزوں ہے ۔ قصے کو سپاٹ طریقے سے بیان کرنے سے نظم نہیں بنتی ۔ ملا کے دل میں مہاجن کی بیٹی کے دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے، اور اس طرح انھوں نے ایک خارجی حقیقت کو اپنے احساس اور اپنی کیفیت کے ساتھ نظم کیا ہے ۔ یہ نظم اسی وجہ سے پُراثر ہے ۔

اس سے پہلے کی ایک نظم ہے ۔ " دوشیزہ کا راز " عنفوان شباب میں پہلی بار جب کسی پر اس کا دل آتا ہے، تو اسے اپنی زندگی بامقصد معلوم ہوتی ہے ۔

بے خبر فطرت سے اپنی فطرت معصوم تھی
یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی
کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہو گئی
کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہو گئی

ملاّ نے دوشیزہ کے جذبات کی بہت اچھی ترجمانی کی ہے ۔ اس نظم میں ایک الجھن ہے ۔ پہلے بند سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی ہے ۔ لیکن آٹھویں بند میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے مخاطب نہیں ہے ۔

مجھ سے کہتی تھیں مری ہمجولیاں اکثر یہی
مرد ہیں سارے کہ سارے بے وفا، خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد، اس سے کل ہے بے رخی
ان کے بہکانے میں آتی، میں مگر ایسی نہ تھی

یا تو اُن کے حسن میں میری سی رعنائی نہ تھی
یا کبھی اُن پر کسی کی طبع یوں آئی نہ تھی

" طبع یوں آئی نہ تھی " ۔ بظاہر یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے ۔ لیکن لکھنؤ میں یہ مُلّا صاحب ہی لکھ سکتے تھے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کشمیری گھرانے فارسی کا ذوق اور فارسی کے الفاظ اپنے ساتھ لائے تھے ۔ اور وہ اُن کے گھروں میں رائج ہے (یہاں فارسی سے مراد وہ عربی الفاظ بھی ہیں جو فارسی میں رائج تھے) آنند نرائن مُلّا کی دادی ، یعنی پنڈت کالی سہائے کی بیوی اور پنڈت جگمی نرائن کی بہو تھوڑی بہت کشمیری جاننے والی آخری خاتون تھیں ۔ کشمیری زبان کی روایت ختم ہو جانے کے باوجود فارسی کی روایت باقی رہی ۔ لکھنؤ میں دھوپ سے بچنے کے لیے یوں کہتے تھے " وہاں کہاں بیٹھے ہیں اُدھر دھوپ ہے ، یہاں آجایئے ۔ " لیکن لکھنؤ میں آباد کشمیری گھرانوں میں بول چال یہ تھی ۔ " وہاں کیوں تشریف فرمائیں ۔ اُدھر آفتاب ہے ، اِدھر تشریف لے آئیں ۔ "

شاید فارسی کی اسی روایت کی وجہ سے " طبع یوں آئی نہ تھی " خلافِ محاورہ نظم ہوا ہے بات سے بات نکل آئی ۔ بات اور ہو رہی تھی کہ نظم کے مخاطب کی ۔ یہ مصرع :

اُن کے بہکانے میں آئی میں مگر ایسی نہ تھی

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نظم یا تو خود کلامی ہے ، یا پھر محبوب کے نام خط ہے آخری بند سے یہ دو امکان بھی ختم ہو جاتے ہیں ۔

لو نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں
میں نہیں ہوں غالباً اس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں
راز کو اپنے چھپاؤں گی لبِ خاموش میں
ہاں مگر جب تک یہ صبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

یہ خود کلامی بھی ہو سکتی ہے ۔ اُس صورت میں نظم کا تانا بانا تصور پر ہے ۔ لیکن نظم میں جو شدید جذباتی کیفیت ہے ۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نظم کا شاعر کی زندگی سے بھی تعلق ہے ۔ ہو سکتا ہے کسی خط نے ۔ یا " کسی " کے کسی جملے نے اس نظم کے لیے فضا بنائی ہو ۔

سماج میں نہ صرف دولت کی غیر مساوی تقسیم تھی بلکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ سامراج کا بھی غلبہ تھا ۔ اور یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں ۔ سماج مردوں کا تھا ۔ اس لیے عورت مظلوم تھی ۔ مُلّا نے سماج کے ہر شعبہ سے متعلق نظمیں لکھیں ۔ عورت کی مظلومیت کی داستان ابتدائی زمانے کی نظم " بیسوا " میں ہے ۔ صرف اربابِ نشاط ہی نہیں ، گھر کی ملکہ بھی مظلوم ہے ، اور مُلّا نے اس نظم پر آنسو بہائے ہیں ۔ مُلّا رونے دھونے والے شاعر نہیں ہیں ۔ ایک حساس دل رکھتے ہیں ۔ اور اُس حساس دل کی دھڑکن اُن کے ہر شعر میں ہے ۔

آنند نرائن مُلّا ، بقول خود نظریے کے نہیں ، ردیے کے شاعر ہیں ، لیکن نظریہ ہی ان کا

(باقی صفحہ ۶۶ پر)

یوسف ناظم

19, Al-Hilal,
13, Bandra Reclemation,
Bandra,
Bombay.

ہمارے نئے مرزا غالب اور ان کی نئی تاریخ پیدائش

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شخصیت کا سب سے ممتاز اور روشن پہلو جس کا میں دل و جان سے قائل ہوں یہ ہے کہ ان کی زندگی کے حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ صرف ان کا کلام ہی انھیں عظیم شاعر نہیں بناتا ان کے ہمیشہ اور پے در پے بدلنے والے حالات زندگی کا بھی اس میں بڑا دخل ہے ورنہ شاعر تو بہت گزرے ہیں اور اعلا پایے کے گزرے ہیں لیکن وہ سب حالات زندگی کے معاملے میں غالب سے بہت پیچھے ہیں کیونکہ ان کے حالات زندگی بالکل منجمد رہے ہیں۔ منجمد حالات زندگی بھی کوئی حالات زندگی ہوئے۔ یہ تو بینک کے ان کھاتوں کی طرح ہوئے جنھیں بحکم سرکار ناقابل عمل قرار دے دیا جاتا ہے۔ شاعر کا کلام ٹھوس ہونا چاہیے لیکن حالات زندگی سیال ہونے چاہییں۔ یہ بدوران زندگی بدلیں یا نہ بدلیں وفات کے بعد تو انھیں بدلنا ہی چاہیے۔ ادب میں جمود برا نہیں ہوتا لیکن شاعروں کے حالات زندگی میں جمود بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور محققین کی نشو و نما پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے۔

مرزا غالب کے تو کلام میں بھی وقتاً فوقتاً تبدیلیاں عمل میں آتی رہتی ہیں۔ یہ سب تحقیقی کارناموں کی دین ہے۔ مرزا غالب کا مروجہ اور متداول کلام جو ۱۰۰ سال سے یوں ہی اصلاح کے بغیر پڑا ہوا تھا اب ہمارے دور درشن پر اصلاح بلکہ اچھی خاصی مرمت کے بعد از سر نو پیش ہو رہا ہے اور اس میں نئے نئے مطالب و معنی خود بخود پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ غالب کے اشعار دیرینہ کو دنیائے شعر و ادب کے حالات حاضرہ اور نئے تقاضوں کے مطابق خارج از بحر بھی کیا جا رہا ہے۔ ساری دنیا میں اوزان و پیمانہ جات تبدیل ہوئے لیکن غالب کے اشعار ان ہی کہنہ اوزان کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ ان میں تبدیلی کی سخت ضرورت تھی۔ توقع یہ بھی کی جا رہی ہے کہ دور درشن پر پیش ہونے والی اگلی قسطوں میں مرزا غالب کے کلام کو آزاد غزلوں اور نثری نظموں کی شکل میں پیش کیا جائے گا جو مرزا غالب بہ نفس نفیس بذریعہ ترنم پیش کریں گے۔

دوردرشن پر مرزا غالب کے قد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافہ اس کلاہ کی بدولت ہوا ہے جو مرزا نوشاہ کی اصل کلاہ سے چار چھے انچ زیادہ اونچی ہے۔ یہ کلاہ حالیہ تحقیق کے مطابق اور بھی بلند ہونی چاہیے تھی لیکن دوردرشن کے اسٹوڈیو کے سقف و در ٹوپی میں اس سے زیادہ اونچائی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے خاص طور پر اس وقت جب مرزا نوشاہ اپنے پورے قد سے کھڑے ہو کر گولیاں کھیلتے ہیں۔ عش عش کرنا چاہیے کہ طویل و عریض قبا میں ملبوس، ایک کلاہ دراز سر پر رکھے، اس عمر میں بھی مرزا نوشاہ کا نشانہ کتنا صحیح تھا لیکن عش عش کرنے بلکہ غش کھا کر گرنے کا صحیح موقع تو وہ تھا جب کچھ رقم ہاتھ آ جانے پر مرزا نوشاہ شراب کی کئی بوتلیں خچر پر لاد کر اپنے گھر لاتے ہیں۔ خوشی ہوئی کہ غالب کے عہد میں بھی شراب کی بوتلوں کی ہوم ڈیلیوری کا اتنا عمدہ انتظام تھا۔ اس موقعہ پر تو ایک اور خچر کو بھی پیش کیا جا سکتا تھا جس پر ہمارے علم کے مطابق مرزا نوشاہ، جام سفال لاد کر لاتے تھے لیکن شاید وقت کی کمی کی وجہ سے دوسرے خچر کی گنجایش نہیں نکالی جا سکی حالانکہ اتنی ساری بوتلوں کے ساتھ، بکثرت جام سفالی ضروری تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دوردرشن پر جن مرزا غالب کو پیش کیا جا رہا ہے وہ اصلی مرزا غالب ہیں ہی نہیں بلکہ یہ اس شاعر اسدؔ کا بولتا ہوا مرقع جمیل ہے جو غالبؔ کے عہد میں بقید حیات تھا اور اسد کے تخلص کے ساتھ اس قسم کے اشعار کہتا تھا۔

اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب	ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

اور مرزا غالب نے اس کا یہ شعر سن کر تخلص اسدؔ ترک کر کے غالب کا تخلص اختیار کر لیا تھا ہو سکتا ہے کہ لوگوں کا یہ گمان غالب صحیح بھی ہو کہ دوردرشن پر جن مرزا غالب کو زحمت دی جا رہی ہے وہ صحیح مرزا غالب نہیں ہیں لیکن اس ضمن میں فی الحال کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی مزید تحقیق کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ خاکسار جس نکتے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے وہ مرزا غالب کی تاریخ ولادت ہے۔ آج سے چند دن پہلے اخبار میں غالب کی نئی تاریخ ولادت شائع ہوئی تو یقین مانیے میں فی الفور سجدہ شکر بجا لایا۔ غالب اپنی سابقہ تاریخ پیدائش کے مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اب کہیں جا کر وہ ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کی عمر عزیز میں یکمشت ۴ سال کا اضافہ ہو گیا۔ چار سال کا اضافہ میں نے بلحاظ سنہ ہجری شمار کیا ہے۔ کسی شخص کی وفات حسرت آیات کے بعد اور وہ بھی ۱۰۰ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے پر مرحوم کی عمر میں اچانک ۴ سال کا اضافہ معمولی بات نہیں۔ یہ واقعہ صرف غالب کے ساتھ ہی ہو سکتا تھا کیونکہ ان کا رخش عمر کسی معمولی شاعر کا رخش عمر تو ہے نہیں کہ اگر آگے نہ بڑھ سکے تو پیچھے بھی نہ ہٹ سکے۔ گردش ایام کو پیچھے کی طرف بھی دوڑایا جا سکتا ہے۔ غالب کی عمر میں مزید اضافہ ہوگا کیونکہ جب وہ کسی اور کو درازی عمر کی دعا اس طرح دے سکتے ہیں کہ تم سلامت رہو ہزار برس : ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار تو کیا خود ان کی عمر میں ہزار پندرہ سو دنوں کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے ممدوح نے بھی تو آخر خواب میں غالب کی درازی عمر کے لیے کوئی دعا مانگی ہو گی جو اب قبول

ہوئی اور اس کے اثر سے غالب ۱۲۱۲ھجری کی بجائے ۱۲۰۸ ہجری میں پیدا ہو گئے یعنی وہ اپنی معینہ ولادت سے ٹھیک ۴ سال قبل پیدا کر دیے گئے۔ سنہ تو بدلا لیکن تاریخ وہی ۸ رجب رہی جو خود غالب نے بیان کی تھی۔ انھوں نے نواب علاؤالدین خاں علائی کو اپنے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی تھی کہ "میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھجری کو رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ یہ خط انھوں نے جون ۱۸۶۱ء میں لکھا تھا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے یہ مصرع "کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے" ۱۸۶۱ء سے پہلے کہا تھا یا بعد میں۔ ویسے تو مرزا نوشاہ نے اس خط کی تصنیف سے بہت پہلے یعنی کوئی ۳۰، ۳۵ سال پہلے ایک قطعہ بھی کہا تھا جس میں اپنی تاریخ ولادت سے متعلق ان کا یہ شعر شامل ہے۔

تاریخ ولادت من از عالم قدس ہم شورش شوق آمد وہم لفظ غریب

"شورش شوق" اور "غریب" ان دونوں کے اعداد ۱۲۱۲ ہوتے ہیں۔ خاکسار کی رائے ہے کہ اب کسی محقق کو جو تھوڑا بہت شاعر بھی ہو، اسی بحر میں دو مصرعے اور کہنے چاہییں جن میں یہ کیا جائے کہ ۱۲۱۲ میں سے ۴ کا عدد منہا کیا جائے اور یہ مجوزہ مصرعے بھی غالب ہی کے نام سے مشہور کر دیے جانے چاہییں۔ محققین کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

مرزا غالب کی تاریخ ولادت کے بارے میں یہ قصہ بھی مشہور رہا ہے کہ مولانا احسن مارہروی کے پردادا صاحب عالم نے جن سے غالب کی خط وکتابت تھی (غالب کی خط وکتابت کس سے نہیں تھی) جب غالب کو ایک خط میں یہ لکھا کہ ان کی یعنی صاحب عالم کی تاریخ ولادت لفظ "تاریخ" سے برآمد ہوتی ہے یعنی ۱۲۱۱ تو مرزا غالب اس کے جواب میں اپنا یہ فی البدیہہ شعر لکھ بھیجا۔

ہاتف غیب سن کے یوں چیخا ان کی تاریخ میرا تاریخا

یعنی لفظ تاریخ میں حرف الف بڑھا دیا اور اسے ۱۲۱۲ کر دیا۔ غالب بھی بہر حال بہت بڑے آدمی تھے اس لیے محققین ان کی ہر بات تو رد نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہمارے محققین نے غالب کی آبرو اس طرح رکھ لی کہ ان کی بتائی ہوئی تاریخ ولادت ۸ رجب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ سن ولادت بدل دیا۔ یہ مصالحت کا جدید طریقہ ہے جو مجلس اقوام متحدہ میں بھی رائج ہے اور ایک چھوٹے سے دیہات کی پنچایت میں بھی مقبول ہے۔ خاکسار بھی اس طریقہ کار کو مستحسن مانتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ خاکسار کی تائید کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اس تحقیق شدہ تاریخ ولادت کی تائید کرتا ہے۔ مصلحت بھی یہی ہے ۱۲۰۸ ہجری مطابق ۱۷۹۴ء کو مرزا غالب کا سنہ ولادت تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے کئی فائدے ہوں گے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ مرزا غالب کے موجودہ حالات زندگی کے مطابق ان کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ۱۳ سال کی عمر بھی کوئی شادی کی عمر ہوتی ہے۔ یہ عمر تو شادی کیا، شادی کے دیباچے کی بھی عمر نہیں ہوتی۔ اس لیے ۱۲۱۲ ہجری کی بجائے مرزا غالب کو ۱۲۰۸ء میں رو بکاری کے لیے عالم خاکی میں بلانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ ان کی شادی کی عمر خود بخود

۱۷ سال طے ہو جائے گی جو ہر لحاظ سے قابل قبول ہے۔ بالغ ہونے کی قانونی عمر ۱۸ سال مقرر ہے لیکن شادی کے لیے ۱۸ سال کا ہونا صرف اس وقت ضروری ہے جب فریقین والدین کی رضامندی کے بغیر اس تقریب کا انعقاد کریں اور جہاں تک میرزا غالب کی شادی کا سوال ہے اس خوشی کے موقعہ پر ایسی کوئی ناگوار صورت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ شادی کی عمر ۱۷ سال قرار پاتی ہے تو اس پر آمنّا و صدّقنا کہنا چاہیے۔

سب جانتے ہیں کہ مرزا غالب نے عشق بھی کیا (اس عشق نے خود ان کے قول کے مطابق ان کو نکما بھی پیدا کر دیا تھا) ویسے عشق کرنے کے لیے کوئی خاص عمر مقرر نہیں ہے۔ بڑے لوگوں کے معاشقے مختلف عمروں میں شروع ہوئے ہیں جن کا سلسلہ تا دیر قائم رہا ہے لیکن شادی شدہ اشخاص کے لیے عشق کی صحیح عمر ۳۰ ہونی چاہیے۔ غالب کا عشق ہمارے تذکرہ کے مطابق ۲۵ سال کی عمر میں شروع ہوا یعنی ان کی ازدواجی زندگی کے آغاز کے ۱۸ سال بعد عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ۱۲ سال کا وقفہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور غالب کی عمر بھی ۳۰ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے جو ہر لحاظ سے عشق کے لیے مناسب ہے۔ ان تمام امور کے پیش نظر ان کی تاریخ ولادت ۱۲۰۸ ہجری ہی طے پائی ہے۔ یہ شعر نوجوانوں نے اپنی فین FAN کے انتقال کے بعد کہا تھا کہ

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

یقیناً ۳۰-۳۲ سال کی عمر میں کہا گیا ہوگا۔ ۲۵ سال کی عمر میں ہائے ہائے کی ردیف میں شعر نہیں کہے جاتے۔ یہ بات بھی ان کے تازہ سن ولادت کی تائید میں جاتی ہے۔

مرزا غالب کے نئے سنہ ولادت کے بارے میں کسی شک و شبہہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ یہ تبدیلی تو ایک دل خوش کن تبدیلی ہے۔ مرزا ۷۳ کی بجائے ۷۷ کے ہو گئے۔ بڑے آدمیوں کے سنہ وفات کے بارے تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہوتا کیونکہ جب بھی کسی بڑے آدمی کی وفات واقع ہوتی ہے سب کی نظروں کے سامنے واقع ہوتی ہے فوراً مشتہر بھی ہو جاتی ہے۔ سربراہان ملک کو تو ان کی وفات کے فوری بعد رخصت بھی نہیں کیا جاتا۔ دور دور سے جب تک لوگ آکر بچشم خود نہ دیکھ لیں، انھیں یوں ہی روکے رکھا جاتا ہے۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ بعد میں مورخ کو کسی قسم کی غلط بیانی کا موقعہ نہ ملے لیکن آدمی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اپنی ولادت کے وقت بالکل عام بچوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ناقابل ذکر ہوتا ہے۔ وہ قصہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ کسی سیاح نے ایک چھوٹے سے شہر میں کسی بچے سے جب یہ پوچھا کہ میاں تمھارے شہر میں کوئی بڑا آدمی بھی پیدا ہوا تھا تو اسے جواب ملا تھا کہ جی نہیں ہمارے ہاں سب بچے ہی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس صورت حال میں بڑے آدمیوں کی اور خاص طور پر اردو کے شاعروں کی تاریخ ولادت طے کرنے کی ذمہ داری محققوں کی ہوتی ہے۔ والدین اور خود شاعروں کو الگ رکھنا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو بیانات میں اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ ڈ ڈ جڑواں بچوں کی پیدائش کی تاریخیں بھی ایک نہیں ہوتیں۔ اس لیے تاریخ ولادت

اہم فرض محققین ہی انجام دیتے ہیں ثواب دارین حاصل کرتے ہیں۔ خود ان کی اپنی تاریخ ولادت مشکوک ہوتی ہے لیکن اپنے محبوب شاعر کی تاریخ ولادت معلوم کرنے میں یہ اپنی بینائی تک کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ دانائی بھی داؤں پر لگا دیتے ہیں (بشرطیکہ ہو) یوں بھی شاعر کا کلام اتنا اہم نہیں ہوتا جتنی کہ اس کی تاریخ ولادت اہم ہوتی ہے۔ یہ خاکسار تو اس معاملے میں جزئیات کا بھی قائل ہے اور صرف سنہ و تاریخ ولادت سے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ ولادت کی گھڑی کیا تھی اس کی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔ ولادت کا صحیح وقت اگر معلوم نہ ہو تو ہمارا سارا علم نجوم صفر ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ عقرب و زہرہ اور دیگر برزخ و سیارگان سب بیکار ہو جاتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ آیندہ اس معاملے میں محتاط رہیں کیا تعجب جو بچہ آج ان کے گھر میں نمودار ہوا ہے کل کے دن اس کی تاریخ ولادت کی تفتیش میں محققین سارے ملک کے کتب خانوں کی خاک چھانتے پھریں۔ مرزا غالب کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری عبرت کے لیے بہت کافی ہے۔ غالب نے کہا تھا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے۔ یہ انھوں نے غلط کہا تھا۔ ان کے ہونے نے تو محققوں کو ڈبو دیا۔ ان کا کیا بگڑا۔

آخری بات یہ کہ غالب کے اس کہنے کو کہ وہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو پیدا ہوئے محققین نے صحیح اس لیے نہیں مانا کہ غالب نے تو اپنی وفات کی تاریخیں بھی کہی تھیں لیکن وہ تاریخیں یوں ہی گزر گئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی وفات کے بعد دوسروں کو ان کی تاریخ وفات کہنی پڑی۔ محققین ان کی تاریخ وفات تو نہیں بدل سکتے لیکن اپنی تاریخ ولادت پہ غالب کا کیا اجارہ ہے یہ ان کے کلام کی طرح ان کے قارئین کی ملکیت ہے۔ آیندہ دو چار سال میں ان کی تاریخ ولادت بھی جس پر آج ہمارے زعمائے ادب نے مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے اور غالب جینتی کی تقریب کا اہتمام کیا ہے ممکن ہے ۱۲ را پریل میں تبدیل ہو جائے۔ کیونکہ ۱۲ را پریل کو بھی اچھی تاریخ ولادت مانا گیا ہے اور غالب نے تو صرف مرنے کی حد تک اعتراض کیا تھا کہ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا' لیکن جہاں تک ولادت کا تعلق ہے انھیں دو چار بار پیدا ہونے میں کوئی عار نہیں تھا۔ اور یوں بھی مرزا نوشاہ کے لیے تو اپریل کا مہینا اس لیے بھی مناسب ہے کہ یہ آموں کی فصل کا مہینا ہے اور غالب کی کمزوریوں کی فہرست میں آم سر فہرست ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔

رہرو راہ خلد کا توشہ　　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم　　　ناز پروردہ بہار ہے آم

آموں کے اس عاشق صادق کی آیندہ تاریخ ولادت اپریل سے جون تک کے مہینوں میں طے کی جائے تو یہ خاکسار متعلقہ محقق کی خدمت میں حج کا ثواب نذر کرنے پر رضا مند ہے۔ رجب کے مہینے کی شرط بھی غیر ضروری ہے۔

ضروری اطلاع { مارچ میں سالانہ اسٹاک شماری کی مصروفیات کی بنا پر اپریل کا کتاب نما ایک ہفتہ تاخیر سے پوسٹ کیا جا سکے گا۔
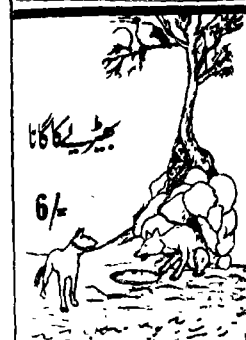
ننھے مُنّے بچّوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
چاند کی بندیا
4/50
شیر اور بکری
دُم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلّی
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

وہ تحقیقی کتابیں اس طرح لکھتے ہیں
جیسے منشی تیرتھ رام جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے

پچھلے دنوں انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں اس بات پر پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے ملک میں تھوک کے حساب سے اردو کے پی ایچ ڈی پیدا ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں تحقیق کا معیار گر گیا ہے اور اب نئے بجٹ میں ہر پی ایچ ڈی کو ۱۵۰ سو روپے ماہوار اضافی الاؤنس دینے کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے تحقیق کو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ۱۵۰۰ روپے کے لیے ہر بوالہوس، حسن پرستی کو اپنا شعار بنانے کی کوشش کرے گا۔

معلوم نہیں انتظار حسین کے دل میں تحقیق کے لیے ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی۔ وہ افسانہ نگار ناول نویس ہیں، انھیں چاہیے تھا کہ پہلے اس طرف توجہ دیتے کہ اردو میں ناول اور افسانے کے نام پر خرافات نگاری کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی روک تھام کی جائے۔ اس کے برعکس انتظار صاحب اتنے فراخدل ہیں کہ جو خرافات نگار بھی ان کے در دولت پر دستک دیتا ہے، وہ اسے ایک عدد تعریفی سند لکھ کر دے دیتے ہیں۔

ہم اتنا ہی لکھ پائے تھے کہ استاد لاغر مراد آبادی تشریف لے آئے۔ انھوں نے اوپر کی سطریں پڑھیں اور فرمایا۔ "خیریت تو ہے کہ آج آپ انتظار حسین سے اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ تو آپ کے محبوب مصنف ہیں۔" ہم نے عرض کیا۔ "محبوب ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کی غلط باتوں کو برداشت کر لیا جائے۔" اور پھر ہم نے انتظار حسین کا مذکورہ کالم لاغر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے کالم پڑھا اور فرمایا۔ "انتظار صاحب نے کون سی غلط بات لکھی ہے۔ ان کا یہ کہنا صد فی صد درست ہے کہ پی ایچ ڈی کرنے والوں کی وجہ سے تحقیق کا معیار پست ہوا ہے۔" ہم نے عرض کیا کوئی ثبوت پیش کیجیے۔ اس کے جواب میں لاغر صاحب نے ایک کتاب ہماری طرف بڑھادی۔ ہم نے کتاب کو ادھر ادھر سے دیکھا۔ صاف ستھری چھپی ہوئی کتاب تھی۔ کاغذ بھی اچھا، کتابت بھی عمدہ ہم نے پوچھا، اس میں کیا خرابی ہے؟ فرمایا "یہ پوچھیے اس میں کون سی خرابی نہیں ہے۔ انتظار حسین نے جو کچھ کہا ہے اس کی تصدیق کے لیے صرف یہی کتاب کافی ہے۔" اس کے بعد استاد لاغر مراد آبادی سے

اس کتاب کے بارے میں جو گفتگو ہوئی، وہ آپ بھی
ملاحظہ فرمایئے :

وہ : یہ کتاب جیسا کہ آپ نے دیکھا، اردو
شاعری میں ایہام گوئی کے بارے میں ہے۔ جناب
محقق اس حد تک ناموزوں طبع واقع ہوئے ہیں کہ
بے شمار شعر غلط نقل کیے ہیں۔ ہر صفحے پر ایک دو
ناموزوں مصرعے نظر آتے ہیں۔ ایسے ناموزوں طبع
محقق کو شاعری پر تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔

ہم : ہمیں آپ سے اتفاق نہیں۔ آج کل
کے تو شاعر بھی ناموزوں طبع ہوتے ہیں۔ اگر کسی بے چارے
محقق نے ناموزوں مصرعے لکھ دیے تو اس میں اعتراض
کی کیا بات ہے۔ محقق کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک
کتاب سے مصرعے اٹھا کر دوسری کتاب میں رکھ دیتا
ہے۔ نازک چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ
منتقل کرنے میں ٹوٹ پھوٹ کا امکان رہتا ہی ہے۔

وہ : اس میں غلط بیانیاں بھی ہیں۔

ہم : ادب تو ہے ہی آرائشِ بیان کا نام۔
اگر کوئی محقق کسی بات کو آرائشِ بیان کی خاطر ایک
خاص انداز سے لکھتا ہے تو اسے داد ملنی چاہیے،
آپ اعتراض فرما رہے ہیں۔

وہ : تحقیق میں آرائشِ بیان کی گنجائش
نہیں ہوتی۔ غلط بیانی کی ایک مثال دیکھیے۔ محقق
صاحب فرماتے ہیں، شاہجہاں نے شہر شاہجہاں آباد
کو ۱۰۵۴ھ میں آباد کیا تھا۔ حوالہ وہ ایک ایسی کتاب
کا دیتے ہیں جس کے مصنف کا نام انھیں معلوم نہیں۔

ہم : ہو سکتا ہے، اس کتاب کا کوئی مصنف
ہی نہ ہو اور یہ خود بخود وجود میں آگئی ہو۔

وہ : پہلے آپ پوری بات سن لیجیے۔ جناب
محقق اسی پر اکتفا نہیں کرتے۔ کہتے ہیں، سرسید
نے اپنی کتاب "تذکرہ اہل دہلی" میں شاہجہاں آباد
کے آباد کیے جانے کا سال ۱۰۵۸ھ غلط لکھا ہے
اول تو یہی بات غلط ہے کہ سرسید نے "تذکرۂ اہل
دہلی" نام کی کوئی کتاب لکھی تھی۔ یہ دراصل ان کی مشہور
تصنیف "آثار الصنادید" کا ایک باب ہے جو قاضی
احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اس نام سے چھاپا تھا۔
اگر محقق صاحب نے "آثار الصنادید" دیکھی ہوتی تو
انھیں معلوم ہوتا کہ سرسید نے اس کتاب میں تفصیل
سے لکھا ہے کہ ۱۰۴۸ھ میں قلعہ شاہجہاں آباد کی
تعمیر شروع ہوئی۔ جب یہ قلعہ تیار ہو گیا تو ۱۰۵۸ھ میں
پہلی مرتبہ شاہجہاں نے قلعے میں قدم رکھا۔ قلعے کی بنیاد
پڑتے ہی شاہجہاں آباد شہر بھی آباد ہونا شروع ہوا
اور ۱۰۵۸ھ میں یہ شہر دارالسلطنت قرار پایا۔ یہ
باتیں سرسید نے اپنی طرف سے نہیں لکھیں بلکہ قلعے
کے ایک کتبے پر یہ تمام تفصیلات آج بھی موجود ہیں۔

ہم : کسی محقق کو تفصیلات میں جانے کی کیا
ضرورت ہے۔ اس کا کام تو صرف اتنا ہے کہ سامنے
کی دو چار کتابوں سے استفادہ کر کے ایک نئی کتاب
لکھ دے۔

وہ : اگر محقق تن آسان ہو گا تو کام بگڑ جائے
گا۔ جن محقق کا اس وقت ذکر ہو رہا ہے، ان کی تن
آسانی کا عالم یہ ہے کہ فارسی تذکروں سے براہِ راست
استفادہ نہیں کیا، ان کے اردو ترجموں اور خلاصوں
سے کام چلایا ہے۔ مثلاً ایک فارسی تذکرۂ شعرا ہے
"مسرت افزا" اس کا متن قاضی عبدالودود نے شائع
کر دیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔
جناب محقق اس ترجمے سے کام چلاتے ہیں اور حوالہ
اس طرح دیتے ہیں جیسے اصول فارسی تذکرہ ان کے
سامنے ہے۔ جہاں کہیں انھوں نے کسی فارسی کتاب
سے براہِ راست حوالہ دیا ہے، وہاں نقل کرنے میں
غلطیاں کی ہیں۔ یہاں تک کہ نام بھی صحیح نہیں لکھے۔
مشہور فارسی تذکرہ نگار عوفی کو عرفی بنا دیا ہے جبکہ
عرفی ایک دوسری شخصیت ہے

ہم: جناب یہ تو صریحاً زیادتی ہے کہ اُردو
کے پی ایچ ڈی سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ فارسی داں
بھی ہو۔ فارسی کا تو اب رواج اُٹھ چکا ہے۔

وہ: قدیم اُردو ادب پر اس وقت تک تحقیق
نہیں کی جاسکتی جب تک کہ محقق کو فارسی زبان پر عبور نہ ہو۔
تمام قدیم ماخذ فارسی میں ہیں۔

ہم: آج کل کے محقق کوئی حافظ محمود شیرانی یا
قاضی عبدالودود تو ہیں نہیں کہ وہ فارسی بھی جانتے ہوں۔
اسی کو غنیمت جانیے کہ آج کل کے محقق اردو جانتے ہیں۔

وہ: یہ بھی آپ کی خوش فہمی ہے۔ ہاں تو ذکر
ہو رہا تھا ایہام گوئی والی کتاب کا۔ دلچسپ بات یہ
ہے کہ جناب محقق نے تحقیق اور نقل نویسی کو مترادف
سمجھ لیا ہے۔ دوسری کتابوں سے نقل کر دینا ہی اگر
تحقیق ہے تو پھر کاتبوں کا شمار بھی محققوں میں ہونا
چاہیے۔ اس کتاب میں شاید ہی کسی شاعر کا کلام
اس کے دیوان سے حاصل کیا گیا ہو۔ دوسروں کی
کتابوں میں جو کچھ مل گیا، اسی پر قناعت کر لی۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ جناب محقق کو یہ معلوم ہی نہیں کہ
کن کن شاعروں کے دیوان چھپ چکے ہیں یا قلمی صورت
میں کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ دیوان یکرو کے بارے میں
لکھا ہے کہ اسے ہندستان میں ایک صاحب نے
مرتب کر لیا ہے۔ حالاں کہ اسے چھپے ہوئے کئی برس
ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے
کہ شاہ عالم آفتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے
نثر میں ایک قصہ لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔ حالاں کہ
یہ قصہ "عجائب القصص" کے نام سے کئی سال ہوئے
لاہور سے چھپ چکا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی پنجاب
یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے۔ اتفاق سے جناب محقق
بھی لاہور ہی میں تشریف رکھتے ہیں۔ اس سے ان
کی بے خبری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہم: یہ تو کوئی اعتراض کی بات نہیں۔
ہم کراچی میں رہتے ہیں، ہمیں یہاں کے کئی ادیبوں
کی کتابوں کا تو کیا، خود ان کے موجود ہونے کا بھی
علم نہیں۔

وہ: آپ کی لاعلمی اپنی جگہ، لیکن کسی محقق کو
اس حد تک لاعلم نہیں ہونا چاہیے۔ ایک اور لطیفہ
سنیے۔ کتاب کے صفحہ ۸۱ پر مشہور تذکرۂ شعراء
"مجموعۂ نغز" کے مصنف کا نام لالہ سری رام لکھا ہے
جبکہ اس کا نام قدرت اللہ قاسم ہے۔

ہم: ہو سکتا ہے قدرت اللہ قاسم ہندو
سے مسلمان ہوا ہو اور اس کا سابقہ نام لالہ سری رام ہو۔

وہ: اس "ہو سکتا ہے" کا جواب نہیں۔
دلیل دینے کا یہ انداز ہمارے ممدوح نے بھی اختیار
کیا ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کے بیٹے احمد شاہ کو
شاعر ثابت کرنے کے لیے فرماتے ہیں، چوں کہ
وہ مشہور شاعر اشرف علی خاں فغاں کا رضاعی بھائی
تھا، اس لیے ضرور شعر کہتا ہوگا۔

ہم: تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ محقق
حبس اور گرمی کی پروا کیے بغیر تحقیق کرتا رہے۔ محقق
صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ایسے خراب حالات
میں کتاب تلاش نہ کی ورنہ ان کی صحت متاثر ہو سکتی تھی۔

وہ: موجودہ صورت میں کتاب پڑھنے والوں
کی صحت متاثر ہوئی ہے۔

ہم: آپ نے اس کتاب کے بارے میں
بہت کچھ بتا دیا ذرا مصنف کا تعارف بھی تو کرا دیجیے۔

وہ: ان کا نام ہے ڈاکٹر ملک حسن اختر۔
کتاب میں شامل ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ
کہ وہ دیڑھ درجن تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔
ان میں "مشہور زمانہ" "تاریخ ادب اُردو" بھی ہے
جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کا
ناولٹ "یا خدا" بنگال کے قحط سے متعلق ہے،
حالاں کہ یہ تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

ہم : ڈیڑھ درجن تحقیقی کتابیں لکھنا کوئی آسان کام نہیں محقق صاحب کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ وہ تحقیقی کتابیں اسی تیز رفتاری سے لکھتے ہیں جس طرح تیرتھ رام فیروز پوری جاسوسی ناول لکھا کرتے تھے۔

وہ : موصوف واقعی اردو تحقیق کے تیرتھ رام فیروز پوری ہیں۔ ان کی ایک کتاب کے فلیپ پر یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق میں حافظ محمود شیرانی کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ شیرانی صاحب کی روح کو شرمندہ کرنے کے لیے اس سے بہتر بات نہیں کہی جا سکتی۔

بقیہ صفحہ ۵۶

رویہ متعین کرتا ہے۔ اس بات سے ان کے اختلاف کو بہت اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ فیصلہ کرنے کے لیے ان کے بیان سے زیادہ ان کے شعروں کی CIRCUMSTANTIAL شہادت پر بھروسہ کرنا ہی مناسب ہے۔

مظہر سلیم

A/5/17, VINOBABHAVE NAGAR,
PIP ROAD, KURLA,
BOMBAY-400070

سوچ

ان دنوں کچھ یوں ہوا کہ "م" کے سارے جسم پر خوف و ہراس کی چیچک نکل آئی ہے۔ اس کی آنکھوں تلے کینسر وارڈ کا سارا منظر چھپا ہوا ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے بند کرتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی دروازے بند ہوتے ہیں۔ کھڑکیاں کھلتی ہیں، بند ہوتی ہیں، دروازے کھلتے ہیں بند ہوتے ہیں۔ اور پتا نہیں کیا کیا بند ہوتا ہے۔ اور کیا کیا کھلتا ہے۔ "م" اس خوف اور تشویش کے ماحول میں بھی اپنے آپ کو ایک دم محفوظ سمجھتا ہے۔

جب سورج کسی مہاجن کے روپے کی طرح گھر گھر اپنی شعاعیں بانٹتا ہے تو "م" بھی ان شعاعوں کو لے کر آفس جانے کے لیے نکل پڑتا ہے۔ اُس سڑک پر جس نے ایک بڑے علاقے کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور ایک ہی بستی کے یہ دو حصے ایسے ہیں جیسے ایک ماں کے دو جڑواں بیٹے، سڑک جو کہ بہت لمبی ہے اور سیاہ لباس میں ملبوس، وہ اس ہائی وے کی طرح پھیلی ہے جس پر روزانہ حادثات ہوتے ہیں۔ اس سڑک کا تارکول جگہ جگہ سے اُکھڑ چکا ہے اور گڑھے صاف طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف وہی علاقے ہیں۔ جس ایک علاقے میں چیچک زدہ "م" رہتا ہے۔ سڑک کے دائیں اور بائیں طرف فلک بوس عمارتیں ہیں۔ جو کھنڈر نما دکھائی دیتی ہیں۔ سنتے آئے ہیں بزرگوں سے کہ ان ہی عمارتوں میں لوگ رہتے ہیں۔ جو کبھی دکھائی نہیں دیتے۔ صرف سورج کو دن میں ٹھہرتے اور رات میں عمارتوں کی بوسیدگی کو دیکھا گیا ہے۔ آدمی ان بلڈنگوں سے لاپتہ کیوں ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ مگر "م" تو صرف اتنا جانتا ہے کہ وہ ایک معمولی کلرک ہے۔ اور اس کے سارے جسم پر خوف و ہراس کی چیچک نکل آئی ہے۔ چیچک تو ہر اس آدمی کو نکل آتی ہے جو جینا چاہتا ہے۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ تشویش کیوں بڑھ رہی ہے۔ اس کا ذکر ضروری نہیں ——؟

"م" کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے !!

سوچ کا پرندہ کچھ دیر اس کے دماغ کے پنجرے میں آ کر ٹھہرتا ہے، چہچہاتا ہے۔ اور ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا کر کے اڑ جاتا ہے۔ پرندہ برسوں سے اڑ رہا ہے، چیچک برسوں سے نکل رہی ہے "م" برسوں سے اسی علاقے کا باشندہ ہے اور محفوظ ہے۔ نہیں بھی۔ شعاعیں جب آسمان کی بلندی سے نیچے پھیلتی ہیں تو وہ بھی ان شعاعوں کے سہارے پھسلتے ہوئے دور تک نکل جاتا ہے اپنے گھر اپنے افرادِ خانہ

اور اپنے آپ کو بہت دور چھوڑ کر وہ آفس جاتا ہے۔ آفس میں بھی وہ اکیلا ہی ہوتا ہے۔ اس کے دماغ میں خیالات یلغار کرتے ہیں، وہ بالکل تنہا ہوتا ہے۔ بھیڑ میں تنہا، مگر اسے یہ احساس کسی دیمک کی طرح کھائے جا رہا ہے کہ شاید محفوظ نہیں ہے۔ اور ان لوگوں کے درمیان جی رہا ہے جو بھیڑیے ہیں۔ جو پلک جھپکتے ہی اس پر سفید چادر ڈال سکتے ہیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاسپٹل کا سارا منظر گھوم جائے گا۔

جب "م" آفس میں کام کر رہا ہوتا ہے تو اسے ایک ہی چیز بار بار اپنی طرف کھینچتی ہے یعنی بیوی اور بچوں کی فکر اور جوان بیٹی کی چنتا، اور وہ سارے دھاگے جو کچے ہوتے ہیں، سارے رشتے جو ٹوٹنے والے ہوتے ہیں۔ توڑ کر اس طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ گھر آ کر اسے اطمینان ہوتا ہے وہ خوش ہوتا ہے۔ بیوی کے پپڑی زدہ ہونٹوں پر جوان مسکراہٹ، بچوں کی کلکاریاں، اور جوان بیٹی کے جسم پر عزت و ناموس کی ساڑی ـــــ اور ساری فکر، چنتا ایک پل کے لیے، بچوں کی ہنسی اور مسکراہٹ کے نیچے دب کر دم توڑ دیتی ہے۔

گھر کا منظر اب تک شانت ہے کھڑکیاں کھلی، دروازے بند ہیں۔ اور پتا نہیں کیا کیا بند ہے۔ اور کیا کیا کھلا ہے۔ اس کی بیوی کا منہ بھی تو کھلا ہے۔ وہ کہتی ہے "اب ہماری گڈی کا جسم بھر گیا ہے اور اس کا قد سرو کی طرح ہوتا جا رہا ہے، اب وہ گڈی کہلانا پسند نہیں کرتی ــــ کیوں؟ اس لیے کہ اب اس کے ہونٹ جو گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ہیں۔ اس پر لپ اسٹک جینے لگی، بالوں کی لٹ چہرے پر گرنے لگی ہے۔ اس کا سارا جسم کپڑوں کے حصار کو توڑ کر باہر آنا چاہتا ہے، دوپٹہ بڑا ہی بے چین ہے۔ جو بار بار اس کے سینے سے پھسل جاتا ہے۔ گڈی اس دوپٹے کو پن لگاتی ہے، ہر بار پن ٹوٹ جاتی ہے اور کیا کیا ٹوٹتا ہے اس کے اندر کچھ علم نہیں۔ اب ہمیں اپنی آنکھوں میں خواب سجانے شروع کر دینے چاہیے۔ مگر پلکوں پر تو گرد جمی ہے۔

اب گھر کے سبھی لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ گڈی بڑی خوبصورت ہے۔ اس کا کپڑوں میں لپٹا ہوا جسم کبھی بھی باہر آ سکتا ہے۔

"م" جس علاقے میں رہتا ہے۔ وہ اس بستی کا بڑا ہی پاش علاقہ ہے۔ وہ اس کا اپنا علاقہ ہے اور نہیں بھی۔ وہ برسوں سے اس دھرتی پر رہتا ہے۔ جو اسے آج تک قبول نہیں کر سکی ہے۔ اس لمبی سڑک نے جب ایک ہی بستی کو دو بستیوں (علاقوں) میں منقسم کر دیا ہے۔ تب سے وہ ضرب ہی کر رہا ہے (کھا رہا ہے) اس علاقے میں جن لوگوں کے درمیان وہ رہائش پذیر ہے۔ بڑے بھیانک قسم کے ہیں۔ ان کے جسم سیاہ، بھدے چہرے اور بھنویں اوپر تک چڑھی ہوئیں۔ نوکیلے دانت اور ان کے ہاتھوں میں مخصوص قسم کے ہتھیار جو بس اُن کے ہی ہاتھوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ نہ کسی کے پاس دیکھے گئے نہ پائے گئے۔ وہ اتنے بھیانک چہرے والوں کے درمیان رہتا ہے یا اس نے اپنے آپ کو وہاں ADJUST کر لیا ہے۔

"م" ہر بار یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید وہ یہاں محفوظ نہیں ہے۔ پلک جھپکتے ہی مخصوص ہتھیار فضا میں لہرائیں گے، ایک فلک شگاف نعرہ ابھرے گا اور اس کی زندگی کی بس موت کی خلیج میں

جاگرے گی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ آخر اس علاقے سے وہ کوچ کیوں نہیں کرتا؟ اس بستی کی طرف اس علاقے کی طرف جہاں وہ برسوں سے جانا چاہتا ہے۔ اس کی دیرینہ خواہش یہی ہے کہ وہ اس بستی کے لوگوں سے ملے، اپنے دُکھ سُکھ کو ان کے دکھ سکھ کی طرح پرکھے۔ آج بھی اتنے برسوں بعد اس کے دل میں ہمدردی اور پیار کا سمندر موجزن ہے۔ اس کی آنکھیں اپنوں کو دیکھنے کی آس میں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ اور اس کا جسم ایک دم لاغر کہ وہ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنی زندہ لاش لیے وہاں تک کیسے پہنچے۔ اس بستی کو چھوڑنے کا خیال، سوال بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتا اور جب باہر نکلتا تو اس پر خوف طاری کر دیتا۔ سوال کا ٹائم بم ایک زمانے سے اس کے دماغ میں فٹ ہے۔ اس کے پھٹنے کے خوف نے اسے جانکنی کے عالم میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ ہر بار اس سوال کو کسی سود خور کے حساب کی طرح حل کرنے کی کوشش کرتا، ناکام رہتا۔ وہ سوالوں کے ان کیڑوں کو جو دماغ کی گتھیں کلبلاتے رہتے ہیں مارنے کی کوشش کرتا رہتا۔

"م" جانتا ہے کہ بھدے چہرے والے لوگ جب کبھی غصّے سے بے قابو ہوتے ہیں تو ان کے سیاہ جسم سرخ رنگ اختیار کر لیتے اور دہشت پسندوں کی طرح مخصوص قسم کے ہتھیاروں سے شہر اور محلّوں پر دھاوا بول دیتے۔ وہ اپنے آپ کو شکاری سمجھتے، اس لیے جانور اور پرندے ان کا پہلا شکار ہوتے بیچ بچاؤ کرنے جو لوگ آتے وہ بھی مارے جاتے۔ اور ان معصوم پرندوں اور جانوروں کے ساتھ ساتھ وہ ان انسانوں کا خون پیتے یا شکار کرتے جو اس علاقے میں پہلے ہی خوف زدہ ہیں۔ یا مظلوم ہیں۔ "م" سب کچھ جانتا ہے۔ مگر کبھی اس نے بیچ بچاؤ نہیں کیا۔ اس کے یہاں سے بھی کبوتر کی گردن مروڑ دی گئی تھی وہ کچھ نہ بولا، اس لیے وہ محفوظ ہے۔

"م" جب آفس میں تنہائی میں اپنی کرسی پر ہوتا تو وہ سوچنے لگتا کہ اسے اس بستی سے کوچ کرکے اُس بستی میں چلا جانا چاہیے۔ جو لمبی سڑک کے اس طرف ہے جہاں پر نورانی چہرے اور سفید لباس میں ملبوس لوگ رہتے ہیں۔ جو اس کے اپنے ہیں۔ اس کا جسم بھی تو نورانی ہے۔ برسوں سے وہ ان بدصورت اور بھدّے چہروں کے درمیان زندگی کی گاڑی کو بر آہنگی سے کھینچ رہا ہے۔ پھر بھی ہر وقت اسے نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے جسم کے مختلف علاقوں پر کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اسے اذیت اور خوف کا انجیکشن دیا جا رہا ہے۔ اسے پتا ہے اور نہیں بھی ہے۔ زندگی کو موت کے آہنی پنجے سے بچانے کی کش مکش میں وہ آج تک کوشاں ہے۔ کبھی کبھی اس کا دل تڑپ اٹھتا اپنے لوگوں کی یاد سے، یادیں اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر چھلک پڑتیں وہ زار و قطار رونے لگتا۔ کاش وہ یہاں نہیں ہوتا، وہاں ہوتا ـــ؟

وہاں، جہاں، سفید کپڑے اور نورانی چہرے والے لوگ بستے ہیں۔ جو کبھی پرندے اور معصوم جانوروں کا شکار نہیں کرتے اور نہ ہی ان لوگوں کو قتل کرتے جو مظلوم ہیں۔ ان کے پاس مخصوص قسم کے ہتھیار بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ کبھی اچانک کسی بستی پر حملہ کرتے۔ بھدے چہرے والے تو یہ چاہتے تھے کہ ان کے علاقے میں جو تھوڑے سے انسان باقی رہ گئے ہیں انھیں خوف زدہ کرکے بھگا دیا جائے۔ مگر وہ لوگ وہیں پر ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ اس علاقے سے، ماتر بھومی سے،

محبت کرتے تھے۔ ان ہی وفاداروں میں "م" بھی ہے۔ جوان خطرناک قسم کے لوگوں کے درمیان اب تک زندہ ہے۔ اس کے سارے ساتھی شہید ہو چکے ہیں۔ مگر اس کے جسم پر تو خوف وہراس کی چیچک نکل آئی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا بالکل ایسا ہے جیسے شیر کے پنجرے میں شیر کے ساتھ رہنا۔

"م" کو شدید طور پر جب یہ احساس ہوتا کہ اس کی بیٹی اب گڈی نہیں رہی ہے۔ اور اس کے جسم پر کپڑے پھسل جاتے ہیں یا جسم ہی کپڑوں کے باہر آنے کو بے تاب ہے۔ تب سے وہ ان بھدے چہرے اور سیاہ جسم والوں کے درمیان سے نکل جانا چاہتا ہے۔ انھیں اور بستی کو خیرباد کہنے کے متعلق سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔ ۴۴ سال تک وہ خاموش رہا۔ پل پل ڈرا اور لمحہ لمحہ خطرے سے اب وہ چوکنا ہو گیا ہے۔ اس کی زندگی کا چراغ، مخصوص قسم کا ہتھیار کبھی بھی بجھا سکتا ہے۔ اور اس کی بیٹی کے جوان جسم سے ساری کبھی بھی کھینچ لی جا سکتی ہے۔ اس کی کان اس نعرے سے مانوس ہو گئے وہ اب اپنا نعرہ بھولتا جا رہا ہے۔ وہ روزانہ اس نعرے کو سنتا ہے اور اس کی گونج کو سارے ماحول پر خوف بن کر پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

—— اس نے ہتھیار دیکھے ——
—— بھیانک چہرے اور نوکیلے دانت ——
—— سیاہ جسم اور سیاہ لباس ——

جب وہ ان کے متعلق سوچتا تو ایک لمحہ کے لیے خوف زدہ ہو جاتا۔ اس کا سارا جسم بھیگ جاتا جیسے آسمان سے بے موسم بارش ہوئی ہو۔ اسے اپنی زندگی اور اپنے بڑھاپے سے زیادہ اپنی گڈی بیٹی کی فکر ہے۔ جس کے ہونٹوں پر ان دنوں لپ اسٹیک جمنے لگی ہے، بالوں کی لٹ چہرے پر گرنے لگی ہے اور جسم کپڑوں سے باہر نکلنے کے لیے بے چین ہے۔ اسے تو صرف گڈی کی فکر ہے؟

"م" نے آج تک اس علاقے سے اس لیے بھی کوچ نہیں کیا کہ وہ اپنے قدم اسی علاقے میں جما چکا تھا۔ قدموں کو اس نے بہت اندر تک دھنسا دیا تھا۔ دھنسے ہوئے قدم نکالنے میں اُسے بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ مگر تشویش کی چیچک نے اس کے جسم کے سبھی علاقوں پر قبضہ کر لیا، خوف کے بادل اس کے دل کے آسمان پر چھا جاتے اور تعجب وحیرت کی بارش کر کے گزر جاتے۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار وہی منظر گھومنے لگتا ——!

—— بھیانک اور بھدے چہرے ——
—— نوکیلے دانت ——
—— مہلک ہتھیار ——
—— خون پیتے ہوئے جسم ——
—— کھڑکیاں دروازے بند —— نعروں کی آوازیں
—— اور دھواں دھواں فضا ——
—— زخمی کبوتر ——

کافی غور و خوض کے بعد "م" نے فیصلہ کیا کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ دے گا۔ اور یہاں سے کوچ کرے گا۔ چل پڑے گا اس طرف جہاں نورانی چہرے اور سفید لباس میں ملبوس لوگ رہتے ہیں۔ اس کے اپنے لوگ، اس کا اپنا ماحول، اس کی اپنی تہذیب، جو کچھ ادھر ہے سب کچھ اسی کا ہے۔ وہ وہاں جاکر اپنا آپ تلاش کرے گا۔ جو اس نے یہاں کھو دیا تھا۔ اسے وہاں اپنی شناخت کے لیے کوئی جواز پیش نہیں کرنا ہوگا۔ اب اس علاقے سے جو اس کے لیے پنجرہ تھا، قید خانہ تھا، چھٹکارا پالے گا وہ —

اور پھر ایک دن "م" کسی کو بتائے بغیر اپنے خاندان کے ساتھ نورانی چہرے والوں کی بستی میں منتقل ہوگیا۔ جہاں سبھی کے چہرے اس کے چہرے کی طرح تھے۔ لباس پاکیزہ اور دانت نوکیلے نہیں تھے۔ وہ بس وہیں بسنے کا پروگرام لیے اس علاقے میں داخل ہوگیا۔ اب اطمینان اس کے سارے جسم پر سرور بن کر پھیل گیا۔ اس نے زندگی کو موت کی خلیج سے گھسیٹ لیا تھا۔ اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ جانتا کہ اُن سیاہ جسم اور بھیانک چہرے اور نورانی چہروں کے درمیان ایک بہت لمبی سڑک حائل ہے۔ اس کہانی کی طرح جس میں سے لوٹنا مشکل ہوتا ہے یا معجزہ —

اب وہ خوش ہے، تشویش کی چیچک بھی ریزگاری کی طرح کہیں غائب ہوگئی، اب وہ دیکھ سکتا ہے کہ سورج کا پرندہ آسمان کے گھونسلے میں کس طرح حرکت کرتا ہے۔ اس نے برسوں سے آسمان نہیں دیکھا تھا۔ کھلا آسمان، وہ سینہ تان کر کبھی نہیں چلا۔ اس علاقے میں وہ سینہ تان کر چل سکتا ہے۔ اور آسمان کے گھونسلے میں مقید سورج کے پرندے کو اپنی آتشیں نظروں سے جلا سکتا ہے — ؟

پھر پتا نہیں کتنے دنوں بعد جب رات کے پردے اس نے کھڑکیوں سے ہٹائے اور سورج کو اندر آنے کی دعوت دی تو سورج کی شعاعوں نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ اس کے حواس گم ہو گئے۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس پر شبیر چھوڑ دیا ہو اور شبیر اس کے جسم کے ہر علاقے میں توڑ پھوڑ اور تباہی مچا رہا ہے۔ اس تباہی میں اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی بیٹی گڈی کا جسم، کپڑوں سے باہر ہے۔ اور سبھی سفید لباس میں ملبوس جسم نے اس پُر شباب جسم کے مختلف علاقوں میں توڑ پھوڑ مچا رکھی ہے۔ "م" یہ منظر دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ جس پُر شباب جسم کو وہ وہاں سے بچا کر لایا تھا۔ اسے یہاں اپنے ہی لوگوں نے لوٹ لیا۔ آخر یہ کیسے ہوا؟؟ جب اس نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو وہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں مستغرق ہوگیا۔ کیونکہ ان سفید لباس والوں کے سامنے وہ ایک دم سیاہ تھا اور اس کا چہرہ بھی — دراصل وہ سیاہ جسم اور بھدے چہروں کے درمیان رہتے رہتے ایک دم سیاہ ہوگیا تھا۔ اور بھیانک چہرے والا بھی ؟

اس نے محسوس کیا کہ خوف و ہراس کی چیچک اب بھی اس کے سارے جسم پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔

مگر وہ اب اس علاقے سے بھی کوچ کرنے کی سوچ رہا ہے۔ کیونکہ اب اس کے دوسرے نمبر کی بیٹی کا جسم بھی کپڑوں کے حصار سے باہر آنے کے لیے بے چین ہے —

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

مالک رام - ایک مطالعہ مرتبہ علی جواد زیدی
ماہر غالبیات جناب مالک رام کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ =/۵۰

چراغ اور کنول (شعری مجموعہ) اختر حمید خاں
"چراغ اور کنول" اختر حمید خاں کی غزلوں میں بیسویں صدی عیسوی کا ریاض ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا عرفان ہے۔ یہی قلب کا چراغ اور زندگی کا کنول ہے۔ =/۴۵

تحقیقی مضامین مالک رام
اُردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات مالک رام صاحب کے منتخب تحقیقی مضامین کا نیا مجموعہ۔ =/۶۰

باتیں کچھ سُریلی سی داؤد رہبر
عہدِ حاضر کے موسیقاروں کی مختصر سوانح اور فنِ موسیقی پر ایک بسیط مقالہ، موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ =/۳۶

خُسرو نامہ (تحقیق) مجیب رضوی
امیر خسرو وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ہندی زبان میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ ایک ایک لفظ میں جہاں معنی پنہاں ہو سکیں۔ اس کتاب میں خسرو کے اسی کارنامے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ =/۲۱

تعلیم و تربیت اور والدین ڈاکٹر محمد اکرام خاں
ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا نام اب محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ نے تعلیم کے موضوع پر کئی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ =/۵۱

کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) جگن ناتھ آزاد
پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ہندستان سے باہر کے بہت سے سفر کیے ہیں۔ اس سفرنامے میں شکاگو، واشنگٹن، نیویارک وغیرہ کے دلچسپ واقعات درج ہیں۔ =/۴۵

ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش
رفعت سروش صرف شاعر ہی نہیں ناول نگار بھی ہیں۔ "ریت کی دیواریں" آپ کا کامیاب رُومانی ناول ہے۔ =/۲۱

بنجر بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر
کشمیری لال ذاکر کا شمار اب صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کا یہ نیا ناول ایک اچھوتے اور دل ہلا دینے والے موضوع پر ہے =/۳۳

تذکرہ (ناول) انتظار حسین
قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر انتظار حسین نے ناول کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہے۔ =/۵۴

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

فروری کا کتاب نما ملا۔ ۲۵ صفحات پر مشتمل "مختصر ترین" اشاریہ وارث علوی کے قلم کا ایسا شاہکار ہے جو مدتوں یاد رہے گا۔ انشائیہ۔ ادب لطیف اور بیگماتی محاوروں سے مرصع اس چٹ پٹے اشاریے میں وہ سبھی گن موجود ہیں جن سے ایک نئی صنف نثر وجود میں آئی ہے جسے "شائستہ ہجو نگاری" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بات چلی تھی کچھ اشاریوں سے، جس پر زبیر رضوی کا محاکمہ یہ تھا کہ "توتے تو نہیں اُڑے کچھ پکے پھل البتہ زمین بوس ہو گئے۔" اس پر فضیل جعفری نے پیرائیہ میں جواب دیا کہ اتنے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں پکے پھلوں کے ساتھ کچھ سڑے ہوئے پھل بھی ضرور گرے ہوں گے۔ بات صرف اتنی تھی کہ اردو ادب کے گندم نما جو فروشوں کے کرتوت بہت گنوائے جا چکے اب مجرموں کو نام بنام پکارا جائے۔ یہ کسر وارث علوی صاحب نے پوری کر دی اور کتاب نما کے صفحات پر ایسی عدالت قائم کر دی جس میں مدعی سے لے کر منصف تک سبھی کردار اپنے لیے مخصوص کر لیے اور نیک نیتی کے ساتھ اردو ادب کے باغ میں اتنی زبردست خانہ برانداز ی کی کہ نہ صرف سڑے ہوئے بلکہ کچے پکے سارے پھل درختوں سے زمین پر آ رہے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، وہ تو خیریت گزری کہ یہ اشاریہ انھوں نے کتاب نما کے لیے لکھا تھا ورنہ شاعر، شب خون، جواز وغیرہ کی صف میں کتاب نما کا نام بھی ضرور تحریر کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس "مختصر ترین" اشاریے میں انھوں نے کچھ پتے کی باتیں بھی لکھی ہیں مگر ان کی دو دھاری تنقید نے وہی کام کیا ہے جس کے بارے میں وہ خود تسلیم کر چکے ہیں کہ "تنقید تو ببول کے پیڑ کے مانند الجھتی زیادہ ہے چھاؤں کم دیتی ہے۔" ڈاکٹر سیفی پریمی، مظہر امام اور منیر الدین احمد کے مضامین پسند آئے اور خامہ بگوش کے تو کیا کہنے نظر لگتی ہے۔

ڈاکٹر یعقوب عمر۔ حیدرآباد۔

ماہ فروری کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ پچیس صفحات پر مشتمل جناب وارث علوی کا "مختصر ترین" اشاریہ بڑا فکر انگیز تھا۔ لیکن "بہ شوق ہاتھوں" "پر شوق قاری اور" "پر نشاط کائنات" جیسے الفاظ کچھ عجیب سے لگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ الفاظ نامناسب یا نادرست ہیں۔ لیکن ایک ہی پیراگراف میں ان کا REPETITION وارث علوی جیسے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ "شرح اموات" کے بعد قوسین میں MORTALITY RATE

بے تکا سا لگا۔ میں جناب علوی کی شکایتوں سے اتفاق کرتا ہوں لیکن عبدالمغنی کو جس طرح انھوں نے آڑے ہاتھوں لینے کی ناکام کوشش کی ہے اسے ایلیٹ کے الفاظ میں TURSING LOOSE OF EMOTION ہی کہہ سکتے ہیں۔ تنقید کو DISINTERESTED ہونا چاہیے۔ مرزا حامد بیگ کا مضمون کافی معلوماتی رہا۔ موصوف نے بعض تصانیف کے اصل نام توسین میں انگریزی میں دیے ہیں اور بعض کے نام انگریزی میں نہیں لکھے ہیں۔ مثلاً "جنگل سا رومان" اور "خلیفہ" واہنک کی کہانی" کے اصل نام کیا ہیں یہ انھیں ضرور بتانا چاہیے تھا۔ راجیندر بہادر موج پر سیفی پریمی کا مضمون پسند آیا۔ وجاہت علی سندیلوی کا مزاحیہ مضمون "جشن بہاراں کی رسم اجرا" اپنے اندر طنز کا خوبصورت پہلو رکھتا ہے۔

"کھلے خطوط" کے تحت جناب خاور کا مراسلہ کچھ بچکانہ سا لگا۔ اردو ادب کوئی خانقاہ نہیں اور نہ ہی جناب فاروقی مرشد ہیں جن پر تنقیدی خط لکھنا ان کی شان میں گستاخی کرنے کے مترادف سمجھا جائے۔ جناب فاروقی پر نامی انصاری کا مراسلہ نہایت OBJECTIVE اور مدلل تھا۔ ادب میں کوئی بھی تنقید سے بالاتر نہیں۔ سچ پوچھیے تو بقول ایلیٹ اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا سانس لینا۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس تنقید سے ہر کوئی متفق ہو۔ ایلیٹ نے عدیم المثال ڈرامہ نگار شیکسپیر کی شاہکار تصنیف HAMLET کو فنی ناکامی کہا ہے۔ یہ ایلیٹ کا اپنا خیال تھا۔ ہم اسے شیکسپیر کی شان میں گستاخی نہیں کہہ سکتے۔ فاروقی صاحب نے نامی انصاری کے خط کا جواب بھی اچھا دیا ہے۔ اب کے غزلیں کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکیں۔

مرزا محمد الحسنی شاداب نئی دہلی ۲۵

کتاب نما فروری ۸۹ پیش نظر ہے۔ مہمان مدیر وارث علوی نے اپنی طول نگاری کی مروجہ روش سے ہٹ کر مختصر ترین انشائیہ تحریر فرمایا ہے جو رسالے کے ۲۵ صفحات پر محیط ہے۔ ورنہ ان کے لیے تو کتاب نما کے تمام تر صفحات کم پڑتے۔ وارث علوی کے خیالات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ تمام رکاوٹوں، بندشوں کو توڑتے، کناروں کو روندتے، موج در موج اچھلتے کودتے، دندناتے، چنگھاڑتے، پھنکارتے، ٹھاٹھیں مارتے چلے جاتے ہیں اور خس و خاشاک کی مانند بہائے لیے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی اور جب یہ سیل رواں تھمتا ہے تو تاحد نگاہ علم و عرفان کا ایک بحر بے کنار ہوتا ہے گہرائی و گیرائی ہے۔ مجھے وارث علوی کی تحریروں سے والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ ان کی تنقید پڑھ کر خشکی یا بوریت کا شمہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ بیحد دلچسپ اسلوب، انتہائی دلچسپ فقرے دل میں اتر جانے والے۔ عالمانہ بوجھل پن، خطیبانہ بلند بانگ آہنگی۔ گالیاں لیکن ایسی شیریں کہ کھانے والا بے مزہ نہ ہو کر لطف اندوز ہو۔ جلاّدی فرماتے ہیں لیکن وہیں جہاں از روئے تعزیرات ادب اس کے بغیر چارۂ کار نہیں ہوتا۔ جراحت کرتے ہیں تو ایک فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ بنا لاگ لپیٹ۔ دنیائے تنقید میں وارث علوی کی اپنی ایک نرالی دھج ہے۔ چونکہ انفرادی شناخت بھی ہے۔ دو اور بھی ہیں اپنی اپنی شناخت کی دنیائیں بسائے ہوئے، شمس الرحمٰن فاروقی اور ظ انصاری۔ ان اصحاب ثلاثہ کی تحریروں کا میں دیرینہ عاشق ہوں

بات چلی آ رہی تھی مہمان مدیر وارث علوی کی کاش میزبان ہوتے یا کم از کم مستقل مہمان بالفاظ دگر (پیئنگ گیسٹ) کے اداریے یا افسانہ نگار اور تارئ" کی۔ کوئی سہل پسند ہوتا تو دو چار صفحات میں جدید

افسانے کی بعید از فہم ابہام اور گنجلک علامت نگاری کی مثالیں پیش کرکے انھیں جدید افسانے سے قاری کی بیزاری اور برگشتگی کی وجہ (وجہ معقول بھی ہے) بتا دیتا اور اللہ اللہ خیر صلاّ لیکن یہ وارث علوی ہیں۔

محبوب راہی۔ باری ہانکی۔ ضلع اکولہ (مہاراشٹر)

مہمان مدیر کا سلسلہ پسند آیا۔ ماہنامہ "کتاب نما" لگا ہوا نوٹ "کہ ہماری درخواست پر مختصر ترین اشاریہ مرحمت فرمایا ہے۔ یہ بھی پسند آیا۔ اگر مختصر یہ ہے تو پھر طویل کیا ہوگا۔ اس مختصر اور طویل پر اپنا ایک شعر یاد آیا ؎ سفر طویل ہے یا مختصر نہیں معلوم ؛؛ رہے گا کون مرا ہم سفر نہیں معلوم۔ بہرحال شمارہ پسند آیا۔ شعری حصّہ بھی ایک کشش رکھتا ہے۔ طنز و مزاح کا حصہ بے حد پسند آیا۔ علی امام نقوی صاحب کا افسانہ "دکھوتی" ایک علامتی افسانہ ہے اور قدرے صاف ہے جو میری سمجھ میں آیا ہے۔ شاید افسانہ نگار کے کہنے کا بھی وہی مقصد ہو۔ جناب احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو معلوماتی ہے۔ نثری نظم کے متعلق ان کا خیال، بالکل درست ہے اور وہ میرے ہم خیال ہیں۔

شبیر حسن خاں شبیر پٹنہ بہار

اب کے جے پور جانا ہوا تو میں "کتاب نما" کا جنوری کا شمارہ لیتا آیا۔ جستہ جستہ پڑھا اور تسکین قلب و نظر کا سامان کیا۔

پروفیسر شمیم حنفی صاحب کے اشاریے کا موضوع خوب بلکہ بہت خوب ہے۔ حسن نعیم اور ندا فاضلی کی غزلیں اچھی ہیں اور متاثر کرتی ہیں۔

گوشۂ احمد جمال پاشا غنیمت ہے۔ اس گوشے سے پاشا مرحوم کے فن سے زیادہ ان کی شخصیت اور انسان پرستی نمایاں ہوتی ہے اور یہ اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے فن پر نسبتاً بہتر اور جاندار مضامین لکھوائے جاتے۔ ان کے فن پر واحد مضمون پروفیسر وہاب اشرفی کا ہے جس پر پاشا صاحب کی، مغربی تصانیف کے حوالے اور غیر زبانوں (انگریزی) کے الفاظ کی بھرمار والی بات صادق آتی ہے۔

کامران غنی۔ سیکھر راجستھان

تازہ کتاب نما ملا۔ کچھ دیر سے ملا۔ مگر پڑھا تو دل و دماغ میں ایک روشنی سی ہوگئی۔ محترمہ قرۃ العین حیدر سے بات چیت بے حد دلچسپ اور مفہوم خیز ہے۔ انتہا سے زیادہ پسند آئی۔ یہ گفتگو میں نے دوبارہ پڑھی۔ قند مکرر کا لطف آیا۔ گوشہ احمد جمال پاشا بھی خاصے کی عمدہ چیز ہے۔ ہم کسی جہاں سے سرسری گزر جاتے ہیں لیکن جب گلگشت چمن کا تفصیلی مرقع ملتا ہے تو آنکھیں کھلتی ہیں کہ ایں جہان دیگر است۔ احمد جمال پاشا کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بھی ایک عہد ساز شخصیت تھے۔

خامہ بگوش تو ہمیشہ ہی بڑے دلچسپ ثابت ہوتے ہیں۔ اب کی ان کا یہ فقرہ مزا دے گیا۔

"اس کام کے لیے عطاء الحق قاسمی کیسے رہیں گے؟ انھیں آپ کے بارے میں بے شمار

ایسے واقعات معلوم ہیں جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔"

محترم جناب عنوان چشتی صاحب کئی ماہ سے کتاب نما کے صفحات پر جلوہ گر نہیں ہوئے! ان کی کسی زبردست چیز کا انتظار ہے

عفت موہانی۔ حیدرآباد

ادبی صحافت میں کتاب نما نے اداریہ نگاری کا جو نیا طریقہ نکالا ہے وہ ایک قابل داد اور لائق تقلید جدت ہے کیونکہ یہ طرز آپ کے اور لکھنے والوں کی صدق دلی کا مظہر ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ساہتیہ اکادمی اور ریاستی اردو اکادمیوں کا کردار آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ ہفتے یہاں علی سردار جعفری نے بھی ان کے کردار کو مشتبہ قرار دیا ہے جب کہ وہ خود مہاراشٹر اردو اکادمی کے معزز رکن ہیں۔ ان سارے اداروں سے انعامات کی جو تقسیم ہوتی ہے ان میں حسن تخلیق کے بجائے دوستی اور ذاتی منفعت کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ عبدالقوی دسنوی کی فہرست سے نام بہائے جاسکتے ہیں۔ جنوبی ہند کے شاعروں اور ادیبوں سے تو ساہتیہ اکادمی واقف ہی نہیں تھی ورنہ مخدوم جیسے قدآور شاعر کو بعد از مرگ انعام نہیں ملتا۔

اردو اکادمیوں کا چلن ہی نرالا ہے۔ یہ بات عام ہے کہ ایک اکاڈمی کے سربراہوں نے شاگرد کو انعام اوّل سے نوازا تو ان کے استاد کی کتاب کو انعام سوم از راہ کرم دیا۔ یہ دونوں کتابیں ایک ہی سال میں شائع ہوئی تھیں۔ خیر حیدرآباد والوں کو ان اداروں سے کبھی نہ کبھی خیرات مل ہی جاتی ہے مگر مارے جاتے ہیں تو مدراس اور بنگلور میں رہنے والے تاریخ ساز ادیب اور شاعر۔

میری یہ تجویز ہے کہ یہ ادارے انعام کے لیے کتابیں منگوانے کے بجائے خود ہی کتابیں منتخب کریں۔ کیونکہ کئی خوددار ادیب و شاعر ان حالات میں اپنی کتابیں انعام کے لیے نہیں بھیجتے۔

ظفر محی الدین ۱۳۵۔ ایوان شاہی حیدرآباد

ہمیں 'کتاب نما' کے مطلوبہ پانچ شمارے موصول ہوئے۔ شکریہ!

'کتاب نما' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ رسالے کا پابندی سے نکلنا ہی اس کی مقبولیت کی دلیل اور زندہ رہنے کا ثبوت ہے۔ اس کے سبھی شمارے معیاری اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جب میں "کتاب نما" کے صفحات سے گزرتا ہوں تو مجھے ہر جگہ کھلی فضا میں سانس لینے کا احساس ہوتا ہے کیونکہ یہ رسالہ ہر مکتبۂ فکر کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔

عبدالحق امام۔ گورکھ پور

تازہ 'کتاب نما' میں 'مہمان مدیر' کا "مختصر ترین" اشاریہ نظر سے گزرا کافی دلچسپ ہے۔ باقی شعری و نثری حصہ بھی معیاری ہے۔ خامہ بگوش کے قلم سے بھی ہر ماہ بڑے اچھے کالم پڑھنے کو ملتے ہیں۔
امجد علی فیض۔ گلبرگہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جائزے

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

نظامِ رنگ

مصنف: ڈاکٹر اسلم فرخی
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری
قیمت: پندرہ روپے صفحات اسّی، مجلد
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

'نظامِ رنگ' کا تشریحی نام "حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ" ہے جسے ڈاکٹر اسلم فرخی نے پوری عقیدت مندی اور ہوش مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ سلطان المشائخؒ کی محبت سے سرشار ہونے کے باوجود ایک عالم کی ذمّے داری برتنے میں کماحقہٗ ہوشیار رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاکے میں اس ذاتِ بابرکات کی زندگی کی مختلف جھلکیاں پیش کی ہیں۔ یہاں ان کی جائے پیدائش اور وطن بدایوں میں ان کی دستار بندی کی منظرکشی بھی ملتی ہے اور حضرت مولانا علاء الدین اصولیؒ کے آگے زانوے ادب تہ کرنے کا نقشا بھی سامنے آتا ہے۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ نوعمری میں کیونکر ان کا دل حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی طرف رجوع ہوا، وہ دہلی کب آئے اور پھر کب دہلی سے حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں اجودھن حاضر ہوئے اور وہاں رشد وہدایت کی منزلیں کیسے سر ہوئیں۔ پھر بیعت کے بعد دہلی آکر کیا کیا دور دیکھے اور کیسے خلقِ خدا کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنے۔ فرخی صاحب نے موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ سلطان المشائخؒ کی تعلیم کا انداز کیا تھا اور ان کی تعلیم کی روح کیا تھی۔ فرخی صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ سلطان المشائخؒ نے مجاہدۂ نفس کی کیا مثال قائم کی اور دُنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کرنے کا مفہوم، اپنی زندگی سے کیسے سمجھایا۔ سلطان المشائخؒ نے کئی بادشاہوں کے دور دیکھے لیکن شاہ نوازی اور دربار داری دونوں سے دُور رہے۔ پھر بھی ان کی خانقاہ میں خلقت اُمڈی پڑتی تھی اور ان کی درگاہ آج تک برابر کیوں مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ یہ سب باتیں اس خاکے میں آگئی ہیں۔ نیز اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کی خوبی صرف یہی نہیں ہے کہ انھوں نے واقعات اور معاملات کو اچھّے پیرائے میں بیان کیا ہے بلکہ بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ خود ان کا ارشاد ہے کہ "اس پورے مضمون میں یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس کی تاریخی سند میری نظر سے نہیں گزری۔" (صفحہ ۶۶)۔ اس استثنار کا اشارہ محبوب الٰہیؒ کے دہلی میں بسنت میلہ کی ابتدا سے نسبت رکھنے سے متعلق ہے۔ اس قدر صحتِ بیان کا لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت کو اُجاگر کرنے کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔ تاہم ایک بات محلِ نظر ہے۔ فرخی صاحب نے سید الافراد حضرت خواجہ سید احمد بخاریؒ (والدِ ماجد حضرت شیخ المشائخؒ) کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "خواجہ صاحب نے قبہ الاسلام کے منصبِ قضا کو بفراغِ خاطر ٹھکرا دیا تھا۔" (صفحہ ۱۰)۔ لیکن بدایوں میں آسودگانِ خاک اولیاے کرام کے تذکرے 'مردانِ خدا' (مولفہ ضیا علی خاں اشرفی، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۰۷ء) میں سید الافراد کے بارے میں درج ہے کہ "آپ کے علم وفضل کا شہرہ سن کر ملک شمس الدین التمش ناظم بدایوں آپ سے ملنے کا خواہاں ہوا تھا اور مجلس خاص

میں آپ کو مدعو کیا تھا۔ ایک باریک اور لاینحل مسلہ پر قاضی وانیال فطرتی سے بحث کرائی تھی۔ دوران مباحثہ آپ نے تسلی بخش جواب دیتے ہوئے تقریر بے نظیر کی تھی جس کو سن کر التمش بہت خوش ہوا تھا اور منصب قضائے شہر عطا کیا تھا۔ آٹھ سال تک کار منصبی کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد ۵۱۶ھ میں مستعفی ہوکر خانہ نشین ہوگئے تھے۔" اشرفی صاحب کی تالیف اپنے موضوع سے متعلق نہ صرف تازہ ترین ہے بلکہ فاضل مؤلف نے بدایوں کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تاریخوں اور تذکروں کی روشنی میں واقعات قلم بند فرماتے ہیں۔

یوں تو یہ پورا خاکہ صحت زبان کی آئینہ داری کرتا ہے اور شستہ وشائستہ پیرایہ و بیان کا حامل ہے لیکن ابتدا میں تو بڑا بے ساختہ پن نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کوئی پکّا" دہلی والا" بول رہا ہو۔ یہ خاکہ اس بات کی بھی نظیر پیش کرتا ہے کہ بزرگانِ دین کی پاک صاف زندگی کو کس طور پیش کرنا چاہیے اور اس ضمن میں کیا ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے۔

فرخی صاحب نے اپنے پس نوشت کے آغاز پر تحریر فرمایا ہے کہ "حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے سالانہ عرس کی تقریبات میں ایک مجلسِ مقالات بھی شامل ہے جو مخدومی مکرمی خواجہ حسن ثانی نظامی کی سرپرستی میں منعقد ہوتی ہے۔ راقم آثم کو گذشتہ" دس برس سے اس مجلس میں شریک ہونے اور کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔" انھوں نے یہ خاکہ گذشتہ سال (۱۹۸۷ء)۔ محبوب الٰہیؒ کے عرس کے موقع پر ہی پڑھا تھا اور امسال بھی (گذشتہ دسمبر) وہ اس مبارک موقع پر تشریف لائے تھے۔ اور اس کتاب کی رسم اجرا بدست صاحبزادہ فضل المتین، درگاہ اجمیر شریف عمل میں آئی تھی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کا وطن فرخ آباد (اترپردیش) ہے۔ اس وقت وہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے رسالے "قومی زبان" کے مدیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ خفیف الجثہ ہے لیکن اپنے اندر معنوی وصوری دونوں لطافتیں رکھتی ہے۔ اور اس میں اہلِ دل اور اہلِ نظر دونوں کے لیے وافر سامانِ بصیرت و مسرت موجود ہے۔ ❁

داغ کے اہم تلامذہ

مصنف : اسعد بدایونی
مبصر : قیصر زماں قیس
قیمت : ۲۰/روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

داغ کی شاعری اپنی جگہ پر ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اسے عرفِ عام میں داغ اسکول بھی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت تاریخی ہے۔ داغ کا سب سے بڑا اکتساب ادبی ان کی شاعری کا انشائیہ لب ولہجہ ہے۔ داغؔ، ذوق کے شاگرد تھے، ان کی شاعری کی عمارت کی پہلی اینٹ حضرت ذوقؔ کا محاورہ بندی اور زبان کی صفائی پر ہے۔ لیکن داغؔ کی شاعری ذوقؔ اور شاہ نصیرؔ کی طرح صرف زبان کے بل بوتے پر پرورش نہیں پاتی بلکہ داغؔ جس عہد کے پروردہ تھے اس عہد کے مزاج اور شاعرانہ ابعاد بھی ان کے کلام میں جگہ پاتے ہیں اور یہ داغ کی شاعری کا اہم ادبی کارنامہ ہے کسی کا خیال ہے کہ "داغ کی شاعری مریضانہ یا منفی رجحان کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ یہ ایک عیاش آدمی کی آزادیوں اور اس کی فتوحات کا بیان ہے۔"

"داغ کے اہم تلامذہ" کے پہلے باب میں اُردو شاعری میں تلمذ کی روایت، دوسرے باب میں داغ کے طریقۂ اصلاح اور ان کی اصلاحات کے نمونے ہیں۔ تیسرا باب داغ کے گیارہ اہم شاگردوں کا تعارف انتخاب کلام اور تبصرے کے لیے مختص ہے چوتھے باب میں داغ کے تلامذہ کی فہرست اور آخر میں کتابیات کی فہرست ہے۔

حرفِ آغاز میں بیان ہے کہ "داغ اُردو کے اُن خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے رنگِ سخن کو ان کے عہد میں عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور مملکت شعر میں ان کا طوطی بولنے لگا، داغ کی مقبولیت میں اضافے اور ان کے رنگِ سخن کی توسیع و ترویج میں جہاں ایک طرف عوامی مزاج کا ہاتھ ہے، وہیں اُن کے تلامذہ کی کثیر تعداد بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئی ہے، ان کا رنگِ سخن ایک محدود دائرے کا اسیر ہے اور اس میں زبان و بیان کی کاری گری، محاورے اور روز مرّہ کی الٹ پھیر کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ رہے موضوعات تو سطحی جنسی جذبات اور محبوب کے خدوخال کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہیں۔ داغ کی شاعری میں زندگی سے بھرپور لطف کشید کرنے کی خواہش نظر آتی ہے۔ داغ کی شاعری محفلوں، مشاعروں اور درباروں کی پروردہ تھی۔ داغ نے اپنے رنگِ سخن کے تمام امکانات کو کھنگال لیا تھا لہٰذا ان کے تلامذہ میں سے کوئی بھی باوجود کوشش کے اس مرتبے کو نہ پہنچ سکا۔ داغ کے ممتاز شاگردوں میں صرف دو شاگرد یعنی اقبال اور سیماب ہی ایسے ہیں جنھوں نے مضمون آفرینی اور تفکر کو اپنے آیندہ سفر کے لیے منتخب کیا۔"

بہرطور ـــــ "داغ کے اہم تلامذہ" ایک ایسا موضوع ہے جس پر تحقیق کا حق اسعد بدایونی نے ادا کیا اور بڑی خوبی سے اپنے موضوع سے عہدہ برآ ہوئے۔ اسعد بدایونی جدید شاعری کے نمایندہ شاعر ہیں اس لیے اہم تلامذہ میں گیارہ شعرا کے کلام کا انتخاب اور تبصرہ خوبصورت ہے۔ انھوں نے بیخود بدایونی۔ احسن مارہروی۔ اقبال۔ نوح ناروی۔ سیماب اور جوش ملسیانی کے کلام کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔ داغ کے اہم تلامذہ کی فہرست جو مختلف مآخذ سے تیار کی گئی ہے۔ اس فہرست میں مقالہ نگار نے ۷۰ شاعروں کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس فہرست کو بھی حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔

داغ نے اُردو شاعری میں زبان و بیان کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہے اس سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں یہی وجہ ہے کہ داغ کی شاعری اہم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو شعروادب سے شغف رکھنے والوں کی خاطر اور خصوصاً داغ اسکول کی شاعری کے سلسلے میں یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ اہل ذوق حضرات سے خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔ ❁

میعار

مصنّف : ڈاکٹر قمر جہاں
مبصّر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۳۵ روپے
نوعیت : تنقیدی و تحقیقی مضامین
ناشر : سیما پبلی کیشن بھیکن پور (ہٹیا) بھاگلپور

"میعار" ڈاکٹر قمر جہاں کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں "چارہ گر" (افسانوی

مجموعہ) اور "اختر شیرانی کی جنسی و روحانی شاعری" (پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ) شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔
پیش نظر کتاب میں شاعروں، نقادوں اور افسانہ نگاروں کی کاوشوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اس میں اخترالایمان، علامہ جمیل مظہری، فیض احمد فیض، اقبال، رضا نقوی واہی، نیر سیفی، علیم اللہ حالی وغیرہ کی شاعری، غیاث احمد گدی، حسن رہبر اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں اور ڈاکٹر عنوان چشتی اور خلیل الرحمان اعظمی کی تنقید نگاری پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جن میں بعض مضامین اپنی نوعیت اور ندرت کے لحاظ سے ممتاز ہیں اور ان کی تنقیدی پرکھ اور معیار کے لحاظ سے نئے کہے جا سکتے ہیں۔ ایسے مضامین میں صف اوّل کا سرفہرست مضمون ان کے پسندیدہ شاعر "اخترالایمان کی شاعری میں وقت کا تصور" ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھوتا ہے اگرچہ ڈاکٹر قمر جہاں اخترالایمان کے تصورِ زماں کو فکر و فلسفہ کا وہ گہرا رنگ تو نہیں دے سکیں جو ہمیں شاعر مشرق علامہ اقبال کے یہاں ملتا ہے پھر بھی انھوں نے اخترالایمان کے تصورِ زماں پر ایک نئے نقطۂ نظر "پیکر" کے مطالعہ کے ذریعہ رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک جدید اور سائنٹی فک طریق تنقید ہے۔ ڈاکٹر قمر جہاں کا تجزیہ ہے کہ اخترالایمان کا تصورِ زماں یا میت پرستی کی طرف مائل ہے اور ان کی شاعری اعلا شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے مگر جہاں تک مطالباتِ حیات اور تصادم کائنات کا تعلق ہے ان کی بہت سی نظمیں انسان کو "فکری اعتبار سے مفلوج کرتی ہیں جو اپنی تمام تر فلسفیانہ قوتوں کے باوجود انسانیت کی تعمیر میں حصہ نہیں لے پائیں گی"۔
اسی طرح کتاب کا ایک اور اہم مضمون "ڈاکٹر عنوان چشتی ایک ناقد کی حیثیت سے" ان کے نئے انداز نظر کا غماز ہے اس مضمون میں پروفیسر عنوان چشتی کی تنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی مختلف تنقیدی تصانیف بالخصوص "عکس و شخص"، "اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے" اور "عروضی اور فنی مسائل کی روشنی میں مدلل تنقیدی بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر عنوان چشتی ایک بالغ نظر نقاد ہیں جو سائنٹی فک، علمی اور تجزیاتی انداز اظہار اختیار کرتے ہیں، موضوع کو اپنی گرفت میں لے کر رائے قائم کرتے ہیں، اردو کے مختلف نقادوں بالخصوص کمال احمد صدیقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی آرا کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ عنوان چشتی نے اُردو تنقید (لسانی، ہیئتی اور عروضی و فنی) میں پہل کی ہے اور اس کو فروغ دیا ہے۔
ڈاکٹر قمر جہاں کا اسلوب تحریر علمی اور پُر استدلال ہے۔ بڑی حد تک کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کے باوجود موضوع کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ بعض جگہ نقادوں سے اختلاف بھی ہے مثلاً "فیض ۔ نقش فریادی سے مرے دل مرے مسافر تک" میں انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے خیالات کی سختی سے تردید کی ہے۔ جواب میں معقول جواز بھی پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب میں مصنفہ نے "خالق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہماری رائے میں اس کی جگہ "تخلیق کار" ہونا چاہیے۔
کتابت عمدہ، سرورق سادہ اور دلکش ہے۔ توقع ہے کہ اہل نظر اور اہل علم حلقے میں پذیرائی حاصل کرے گی۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

انقلابی اردو شاعر نیاز حیدر کا انتقال

نئی دہلی۔ ملک کے مشہور انقلابی اردو شاعر نیاز حیدر کل رات دہلی میں انتقال کر گئے۔ چند ماہ قبل ان پر دل کا دورہ پڑا تھا اور اسی وقت سے وہ بیمار تھے۔ ۲ دن قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔

نیاز حیدر ہندستان میں ترقی پسند اردو ادب کی تحریک سے مشہور ہوئے جو چوتھی دہائی کے وسط سے شروع ہوئی تھی۔ وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے روح رواں تھے۔ وہ ملک کی آزادی اور حیدرآباد میں نظام کے خلاف تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کی شاعری اور انقلابی نظمیں مزدوروں کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ انھوں نے زندگی بھر کبھی اپنے اصولوں سے گر کر سمجھوتہ نہیں کیا۔

کامریڈ نیاز حیدر یوپی کے شہر رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اردو میں ایک درجن سے زیادہ ڈرامے تصنیف کیے ہیں۔ انھوں نے "شکنتلا" اور ٹی وی سیریل "جان عالم" کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے۔

آج شام تقریباً ساڑھے ۴ بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سوگواروں نے انھیں سپرد خاک کیا۔ تدفین کے وقت جامعہ بہادری کے علاوہ جناب حبیب تنویر، جناب غلام ربانی تاباں، جناب نعیم الدین فاروقی، جناب ظفر پیامی۔ جناب شریف الحسن نقوی۔ موہن مہارشی، تمبیٹر کی اہم شخصیتیں کمیونسٹ پارٹی کے متعدد کارکن اور کئی مزدور تنظیموں کے نمائندے موجود تھے۔ ان کے جسد خاکی پر سی پی آئی اور دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے پھول چڑھائے گئے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں وہ انقلابی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور مزدوروں کی تحریک سے ان کا بڑا گہرا تعلق رہا۔

ہندستانی تھیٹر نے ان کے کئی ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کیا۔ کامریڈ نیاز حیدر نے "جمال مصر" "ناقد اسرار نفس" اور "یہ ایک زندہ حقیقت ہے" جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انھوں نے "سحر عشق" اور دوسری کئی فلموں کی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

مولانا آزاد اسلامی تہذیب و تمدن کی دین تھے

نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما

نئی دہلی ۸ فروری۔ فرد کی حیثیت سے مولانا آزاد اسلامی تہذیب و تمدن کی دین تھے۔ بچپن اور جوانی میں مولانا کی تربیت اردو، فارسی، عربی زبان و ادب میں قدیم طرز پر ہوئی وہ اسلامیات اور فلسفہ اور ما بعد الطبیعات کے ماہر تھے۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے درس نظامیہ کا مطالعہ مکمل کر لیا تھا۔ یہ ان کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے اور ابھی تک بے مثال ہے۔ وہ ایک ایسے غیر معمولی شخص تھے جو بچپن ہی سے بے پناہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ علم اور معلومات کا خزانہ بھی بن گئے تھے اور جنھوں نے بعد میں ہمارے ملک کی اہم سیاسی مسائل پر اپنا دائرہ فکر مرکوز کر دیا تھا۔ یہ الفاظ نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے "مولانا آزاد کی کہانی" کی رسم رونمائی ادا کرتے ہوئے کہے۔ جو اکیڈمک اسٹاف کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ظفر احمد نظامی کی تصنیف ہے اور مکتبہ جامعہ نے مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر شرما نے مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے خیالات کی معنویت کو اہم قرار دیا اور کہا کہ آج جب کہ سماج میں تنزل پیدا ہو رہا ہے تو ایسی باتوں کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے۔ تنگ نظری کے خیالات کو ہمیں نظر انداز کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر نظامی کی کتاب ایک پیغام رکھتی ہے اور اسے دور

تک پھیلانا چاہیے۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف نے مولانا کے فکر کی کہانی کا جائزہ لیا اور اس پیغام کو آفاقی بتایا جو انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنے کی اصرار کرتا ہے انھوں نے مولانا کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے ملک و قوم کے لیے مولانا کی خدمات پر روشنی ڈالی۔

صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شمیم حنفی نے مولانا آزاد کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور "آزاد کی کہانی" کو سراہا۔

ادارہ تحقیقات اردو کے زیر اہتمام ادبی محفل کا انعقاد

پٹنہ ۷ر فروری بہار میں اردو تحقیق کی رفتار کو تیز کرنے اور اس کے معیار کو بلند کرنے کے پیش نظر اردو کے دیو قامت محقق قاضی عبدالودود مرحوم نے شہر عظیم آباد میں "ادارہ تحقیقات اردو" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جسے انھوں نے اپنی زندگی میں خدا بخش لائبریری کو سونپ دیا۔ قاضی صاحب کے اسی مشن کو زندہ رکھنے کی خاطر خدا بخش لائبریری ادارہ تحقیقات اردو کے زیر اہتمام گزشتہ چند سالوں سے وسیع پیمانہ پہ سہ روزہ "اردو ریسرچ کانفرنس" کا انعقاد ہر سال کراتی ہے جس میں ہندستان کے چیدہ چیدہ دانشوران علم و ادب اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالات پیش کرتے ہیں۔

اردو کے اسی ادارہ کے زیر اہتمام اردو کے نامور افسانہ و ناول نگار، مشہور و معروف ادیب و صحافی جناب شفیع مظفرپوری کے ساتھ ایک شام پورے اعزاز کے ساتھ منائی گئی جس کی صدارت حکیم عبدالاحد صاحب نے فرمائی۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کی شخصیت سے متعلق چند تعارفی کلمات پیش کیے اور ان کے ایک ڈرامہ "خون کی مہندی" پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس ڈرامے میں موجودہ سماج کی بھی تصویر بڑے حسین پیرائے میں پیش کی گئی ہے جو سماج پر ایک طنز بھی ہے۔ سچ پوچھ ڈرامہ وہ اگر کوئی بیٹے والا باپ پڑھے کہ ایک غریب باپ کس طرح اپنی بیٹی کو جہیز دیتا ہے تو وہ جہیز لینا چھوڑ دے یہی کسی لکھنے والے کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ قلم کا بہترین استعمال یہی ہے کہ آج کی دنیا کو اس سے اچھی دنیا میں بدل دے۔

کامریڈ حبیب الرحمٰن نے ان کی چند تصنیفات "ہزار راتیں"، "سڑک سے سڑک تک"، "طلاق طلاق طلاق"، "حلالہ"، "سکنڈ ہینڈ وائف"، "سو روپے کا نوٹ"، پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی بڑی ستائش کی۔

وہاب اشرفی نے بھی ان کی گوناگوں شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ وہ صرف ایک اچھے ناول نگار ہی نہیں ایک اچھے صحافی، اچھے شاعر، کالم نگار، انشائیہ نگار اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔

ادب روزمرہ کی سرگرمیوں کو بامعنی بناتا ہے

نئی دہلی۔ ۱۱ر فروری۔ ممتاز نقاد مسٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ادب روزمرہ کی سرگرمیوں کو بامعنی بنا دیتا ہے اور ادیب دنیا کے تمام اسرار کو عوام کے سامنے عیاں کرنے کی صلاحیت و جسارت رکھتا ہے۔ وہ آج یہاں "ذہن جدید" تنظیم کے زیر اہتمام "موجودہ عہد میں ادب کی افادیت" کے موضوع پر مباحثہ میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کی افادیت جیسے سوالات غیر اہم ہیں کیونکہ ادب ہمیشہ افادیت والا ہی ہوتا ہے اور دراصل غالب طبقہ ادبی تخلیق کو افادیت کا نام دے کر اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور یہی طبقہ ادیبوں کا استحصال اپنے طریقے سے کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادیبوں کو اپنی آزادی اور اظہار آزادی کا اعلان کرنا چاہیے۔ ہندی کے مشہور

شاعر رگھوبیر سہائے نے کہا کہ سماج کی تبدیلی کے عمل میں جہاں دوسری تمام قوتیں کام کرتی ہیں وہیں ادب بھی اس عمل میں شامل ہوتا ہے۔ پنجابی زبان کے اہم مصنف کرتار سنگھ دگل نے پنجاب کی موجودہ صورت حال پر مقالہ پڑھا اور ان مسائل کا حل ادب کے ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ تقریب کے صدر پنجابی کے ادیب مسٹر ہربھجن سنگھ نے ادب اور ادیب سے متعلق چند اہم سوالات کا احاطہ کیا اور کہا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تخلیق کار جس مقصد کے لیے لکھ رہا ہو۔ دوسرے بھی اس مقصد سے اتفاق کرتے ہوں۔ نظامت جناب زبیر رضوی نے کی اور گذشتہ کچھ برسوں سے ادب کے تئیں سماج و معاشرہ کے رویہ پر تشویش ظاہر کی۔ بحث میں جناب دلیپ سنگھ، جناب خلیق انجم، جناب انور عظیم اور دوسروں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، محترمہ زاہدہ زیدی، پروفیسر شمیم حنفی اور جمشید جہاں کے علاوہ متعدد دانشور اور ادیب موجود تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات پوری قوم کی ترقی میں حائل
مشیر الحق

نئی دہلی ۴ رفروری۔ کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق نے کہا کہ مولانا آزاد نے تقسیم وطن کی جن تلخ حقیقتوں سے عوام کو روشناس کرایا تھا اور اس کے دور رس جن منفی اثرات کا ذکر کیا تھا آج وہ سب کے سامنے ہیں۔ جناب مشیر الحق آج یہاں اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام آزاد پر ایک سیمینار میں "مولانا آزاد اور آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے مسائل پر اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "آزاد کا اسلوب اور اردو کلچر" پر اپنے مقالے میں کہا کہ نثر میں شعریت مولانا کے اسلوب کا خاص انداز ہے اور اصلی اسلوب "غبار خاطر" میں جلوہ گر ہے۔ نثار احمد فاروقی نے "الہلال" کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے "غبار خاطر" کو اردو نثر کا سرمایہ قرار دیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "مولانا آزاد اور انڈیا ونس فریڈم" پر اپنے مقالہ میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ کتاب مولانا کی تصنیف نہیں ہے۔ جناب اختر الواسع نے "آزاد کا سیاسی تدبر" پر اپنے مقالے میں کہا کہ آزاد مذہب کی طرح ہی زندگی کے ہر میدان میں تشکیک کے نہیں، بلکہ یقین کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ آج کے سیمینار میں جناب عبداللہ ولی بخش قادری جناب عبداللطیف اعظمی نے بھی اپنے مقالے پڑھے۔ سیمینار کمیٹی کے چیرمین جناب دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی اور اکیڈمی کے سکریٹری مسٹر شریف الحسن نقوی نے شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

اس سے قبل انقلابی شاعر نیاز حیدر کے انتقال کی خبر سنتے ہی اجلاس کی کارروائی کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دی گئی اور اس دوران ان کی موت پر سخت رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ نیاز حیدر کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ اجلاس کے صدر جناب مالک رام نے کہا کہ مولانا حقیقتاً مذہبی آدمی تھے اور ان کے اخبار "الہلال" اور کتاب "تذکرہ" کے اسلوب یکساں ہیں۔

شاعر انقلاب علامہ صابری کی نظموں کے مجموعہ کا اجرا

دہلی ۱۶ رفروری۔ شاعر انقلاب علامہ انور صابری کے مجموعۂ کلام "بہادر شاہ ظفر سے جواہر لال تک" کا اجرا نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما صاحب نے کیا۔ اس موقع پر اجرا کمیٹی کے چیرمین محمد شفیع قریشی نے اپنی تقریر میں علامہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب نے فرمایا کہ ہندستان کی آزادی میں جن شعرا نے بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ علامہ حسرت موہانی کی صف میں آتے ہیں۔ کتاب کا اجرا کے بعد ڈاکٹر شنکر دیال شرما صاحب نائب صدر جمہوریہ نے علامہ انور صابری کی خدمات کو بے حد سراہا۔ مشہور

شبنم صدیقی صاحب نے علامہ کی یاد میں اشعار سنائے۔

علامہ صادق الخیری کی وفات

نئی دہلی۔ ۲ر فروری۔ پاکستانی اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اردو کے مشہور ناول نگار علامہ صادق الخیری حال ہی میں کراچی میں وفات پا گئے۔ ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔ ان کے پسماندگان میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے شامل ہیں۔

وزیر آغا، انور سدید کو استقبالیہ

نئی دہلی۔ ۱۶ر فروری۔ پاکستان کے ممتاز ادیب ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ تخلیق کا سلسلہ لامتناہی مدت تک جاری رہتا ہے۔ وہ آج یہاں غالب اکیڈمی میں دہلی اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تخلیقی عمل کے دوران فنکار یا ادیب کو مختلف کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے پاکستان میں ۱۹۸۸ء کے دوران اردو نظم کے شعر کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس سے قبل اکیڈمی کی پروگرام کمیٹی کے چیرمین جناب ظفر پیامی نے جناب وزیر آغا اور جناب انور سدید کی ادبی خدمات کا مفصل طور سے ذکر کیا۔

دہلی میں کتابوں کی نمائش

(اپنے نمائندے سے)

نئی دہلی۔ ۳۰ر جنوری۔ آل انڈیا اردو پبلشرز اینڈ بک سیلرز ایسوسی ایشن نیشنل بک ٹرسٹ اور فیڈریشن آف انڈین پبلشرز کے تعاون سے "کتابوں کے قومی ہفتے کے دوران بہترین کتابوں کی ایک نمائش "جاوید منزل" نزد درگاہ صابریہ دریا گنج دہلی میں منعقد ہو رہی ہے۔ یہ نمائش ۱۲ر سے ۱۸ر فروری تک جاری رہی۔

عتیق حنفی کو مدھیہ پردیش کا "شکھر سمان"

بھوپال ۱۱ر فروری۔ مدھیہ پردیش حکومت کی جانب فن اور ادب کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں دیا جانے والا ایوارڈ "شکھر سمان" اس برس اردو کے ممتاز شاعر و ادیب مرحوم عتیق حنفی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس انعام میں ۵۰ ہزار روپے نقد دیے جاتے ہیں۔

افسانوی ادب پر جلسہ

نئی دہلی ۲۷ر جنوری۔ گزشتہ منگل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو میں اردو کے افسانوی ادب پر کل ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی۔ پروفیسر عنوان چشتی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے بیریندر ناتھ ظفر پیامی کی صحافتی علمی ادبی اور تخلیقی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا۔ ڈاکٹر عظیم الشان نے آزادی کے بعد اردو افسانے کے رجحانات پر مقالہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی جناب بیریندر ناتھ ظفر پیامی نے اپنی ایک غیر مطبوعہ تازہ کہانی "شب شہر یاراں" پڑھی جو پسند کی گئی۔ خیال رامپوری نے اپنا کلام سنایا۔ شعبے کی استاد ڈاکٹر صادقہ ذکی نے "شب شہر یاراں" کا فنی تجزیہ پیش کیا ڈاکٹر مظفر حنفی نے جلسے کی نظامت انجام دی۔

حسان جونپوری کا کراچی میں انتقال

مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خوان

جونپور ۲۵ر جنوری۔ تاخیر سے موصول ہونے والی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ مشہور مرثیہ گو شاعر اور مرثیہ خوان سید محمد محسن ذوالفقار حسان جونپوری کا طویل علالت کے بعد کراچی میں ۲۰ر جنوری کو انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر کلیم عاجز کو پدم شری ایوارڈ

امسال ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کو پدم شری سے نوازے جانے پر اردو دنیا کے ارض ہند و پاک میں مسرت و شادمانی کی لہر ہے۔ اردو والے اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ وہ کلیم عاجز صاحب کو صحت و سلامتی کے ساتھ ان کا سایہ

ہم لوگوں پر اور اردو زبان و ادب پر قائم رکھے تاکہ وہ اردو شاعری کے گیسو کو سنوارتے رہیں۔

منشی عتیق الرحمٰن کی زندگی اہل وطن کے لیے مشعلِ راہ

نئی دہلی ۱۲ر جنوری۔ مفتی عتیق الرحمٰن کی بلند و بالا اور پر وقار شخصیت سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا اخلاص جذبہ ملی، انسانی ہمدردی اور تنظیمی صلاحیتیں آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں ان میں بے پناہ خلوص اور لگن کے ساتھ عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ موجود تھا۔

ان خیالات کا اظہار مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مفتی عتیق الرحمٰن سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کیا جس میں اہل علم و دانش نے اپنے بصیرت افروز مقالات سے مفتی صاحب کی گوناگوں اور ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔

وزیر ٹیکسٹائل جناب رفیق عالم نے اپنے افتتاحی مقالے میں کہا کہ مفتی عتیق الرحمٰن کے علمی و اخلاقی کمالات اور ان کی تنظیمی خدمات کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے ملفوظات و ارشادات کو زندہ و تابندہ رکھا جائے اس سیمینار میں مقالات پیش کرنے والوں میں پروفیسر گلزار دہلوی، پروفیسر ڈاکٹر محسن عثمانی، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب کمال جعفری، مفتی فضیل الرحمٰن، بیگم شمیم صاحبہ، مولانا سعید الرحمٰن شمس، ڈاکٹر معین الدین بقائی اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔ اس موقع پر میر واعظ مولانا محمد فاروق اور مسٹر مہیندر سنگھ ساتھی کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے۔

دوسری نشست کی نظامت جناب اطہر الدین صدیقی نے کی شام کی نشست کی صدارت جناب مالک رام نے کی اور اپنے مخصوص اور عالمانہ انداز میں مفتی صاحب کی خدمات کو سراہا۔ آخر میں جناب عمید الرحمٰن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر سید حسن سرمد کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

پٹنہ ۳۱ر دسمبر۔ صدارتی ایوارڈ یافتہ پروفیسر سید حسن سابق صدر شعبۂ فارسی کے انتقال پر ملال پر ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر سید حسین احمد منعقد ہوا جس میں قمر آزاد لائبریری کے سکریٹری جناب شمس قدر آزاد، جناب شہاب احمد، اصغر علی اور محمد نصیر کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ شریک ہوئے۔

مقررین نے کہا کہ پروفیسر سید حسن کی موت پر جتنا ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔ مرحوم علم کے پیکر اور اخلاق کے مجسمہ تھے۔ آخر میں تمام حاضرین نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی اور کہا کہ قمر آزاد اردو لائبریری کے ممبران مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

مولانا آزاد کی عہد آفریں شخصیت کو زبردست خراج عقیدت

میسور۔ ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی، گورنمنٹ آف انڈیا اور انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے مشترکہ اہتمام میں فاروقیہ انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسی کے "بوعلی سینا" ہال میں مولانا آزاد کے فکر و فن پر مذاکرہ منعقد ہوا۔

تلاوت و نعت خوانی کے بعد حضرت تسلیم تنائی صدر انجمن نے مہمانان خصوصی کا تعارف کرایا۔ جناب شمیم احمد بی اے فیلڈ پبلسٹی افسر نے خیر مقدمی تقریر کی۔

تلاوت و نعت خوانی کے بعد حضرت تسلیم تنائی صدر انجمن نے مہمانان خصوصی کا تعارف کرایا۔ جناب شمیم احمد بی اے فیلڈ پبلسٹی افسر نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مذاکرے کا افتتاح فرماتے ہوئے معتبر صحافی، ادیب، محقق، نقاد اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دیرینہ رفیق حکیم محمد امام صاحب امامی مدیر "آفتاب اردو" بنگلور نے فرمایا کہ مولانا کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ میسور یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے سربراہ پروفیسر سید اقبال قادری نے فرمایا کہ الہلال برطانوی راج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی آتشیں دعوت دیتا تھا۔ پروفیسر محمد ہاشم علی شعبہ اردو جامعہ میسور نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مولانا آزاد عظمت اور طرازی کے کوہ پیما تھے علم و معرفت کے دریا بہانے والے مولانا صحیح معنوں میں ایک عبقری تھے۔

صابر دت کی دو اہم کتابیں
چند تصویرِ بُتاں
(ایک البم)
اردو کے مشاہیرِ قلم کی تاریخ تصویروں کی زبانی ۔ امیر خسرو سے لے کر
عہدِ جدید تک کے اہم قلم کاروں کا نگار خانہ مع مستند حواشی۔
صابر دت نے بڑی عرق ریزی سے
اردو زبان کے سفر کی کہانی تصویروں میں تحریر کی ہے
آرٹ پیپر پر دیدہ زیب طباعت، خوبصورت، مضبوط، مخملی جلد
قیمت : تین سو روپے (زیرِ طبع)
"پل دو پل" کے بعد صابر دت کا دوسرا شعری مجموعہ
موجِ عارض
ترے عارض کی ہلکی سی جھلک سے
منور رات ہے جس چاندنی سے
خوبصورت طباعت، دلپذیر سرورق جسے پاکستان کے نامور آرٹسٹ موجد نے تیار کیا ہے۔
قیمت : تیس روپے (زیرِ طبع)
(آج ہی اپنی کاپی بُک کرائیے)
ساحر پبلشنگ ہاؤس
جاری کردہ
انور سلطانہ
"پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی ۴۹ ۴۰۰۰
فون: 6202837

کتابیں
اچھی کتابیں

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لیے نئی نئی کتابیں

نیشنل بک ٹرسٹ بچوں اور بڑوں کے لیے طرح طرح کے موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے جو نہ صرف طباعتی خوبیوں سے بھرپور ہوتی ہیں بلکہ ان کی قیمتیں بھی کم ہوتی ہیں۔

نہرو بال پستکالیہ کے تحت بچوں کے لیے رنگارنگ تصاویر سے مزین خوبصورت کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

آدان پردان سلسلے میں ہندوستان کی علاقائی زبانوں سے منتخب ادب کے تراجم شائع کیے جاتے ہیں جن کا مطالعہ متعلقہ زبان کے ارتقا، کلچر اور تمدن کے بارے میں تفصیلی معلومات مہیا کرتا ہے۔

ہندوستان — سرزمین اور لوگ سلسلے کے تحت ہندوستانی موضوعات پر معلوماتی لٹریچر ہندوستانی زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔

قومی سوانح کا سلسلہ کے تحت ہندوستان کی عظیم شخصیات کی زندگی کے حالات شائع کیے جاتے ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ کی اردو کتابیں دہلی میں مندرجہ ذیل جگہوں سے خریدی جاسکتی ہیں۔

- این۔بی۔ٹی بک شاپ، اے ۵ گرین پارک، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶
- سیلز ایمپوریم، پبلی کیشنز ڈویژن، سپر بازار (سکنڈ فلور) کناٹ پلیس، نئی دہلی ۱۰۰
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ONTHLY

تپِ دق سے جنگ

۱. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی تپ دق کا شکار ہو سکتے ہیں۔

2. اپنا طبی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا۔ یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔

3. تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعینہ مدت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی۔جی۔ایچ۔ایس)
وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110002

davp 88/170 URDU

آج سے ۶۶ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اُردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۶۶ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دُنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دَور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اُردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک ۴ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ علمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

فروری ۱۹۸۹ء

یادداشت

★ براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمائیے۔

★ ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

★ اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوائیے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔

★ اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

★ مصارف ڈاک و ریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔

★ کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام انگریزی میں ضرور لکھ دیجیے۔

● کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اُس وقت مقرر ہوگی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دلی 110025
ٹیلی فون نمبر 630191

شاخیں
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار۔ دہلی 110006
ٹیلی فون 260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003
ٹیلی فون نمبر 363867

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نزد ڈاک خانہ جامعہ نگر نئی دلی 110025

مطبع
لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۰، پٹودی ہاؤس
دریا گنج۔ نئی دھلی، 110002
ٹیلی فون نمبر 276018

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر شائع کیا

ادب، تنقید، انشائیہ

لسان الصدق۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۷۵/-
اردو میں کلاسیکی تنقید۔ پروفیسر عنوان چشتی ۴۸/-
تفہیم و تنقید۔ پروفیسر حامدی کاشمیری ۴۸/-
نذرِ مختار۔ مرتبہ مالک رام ۱۰۱/-
تحقیقی مضامین۔ مالک رام ۹۰/-
خسرو نامہ مجیب رضوی ۲۱/-
تحفۃ السرور۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-
نقدِ بجنوری۔ صدیقہ بیگم ۲۵/-
ادبی سماجیات۔ ڈاکٹر محمد حسن ۱۵/-
الفاظ کا مزاج۔ غلام ربانی ۲۴/-
تقریر و تعبیر۔ محمد ہدایت اللہ ۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ۴۴/-
افسانہ کی حمایت میں۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۱۷/۵۰
علامتوں کا زوال۔ انتظار حسین ۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم مرتبہ مالک رام ۱۴/-
〃 سوم 〃 ۲۲/-
〃 چہارم 〃 ۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو۔ ڈاکٹر محمد حسن ۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت۔ پروفیسر علی محمد خسرو ۹/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ و خم۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۳۵/-
اثبات و نفی۔ شمس الرحمٰن فاروقی ۴۰/-
نقدِ حرف۔ پروفیسر ممتاز حسین ۴۸/-

اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۳۵/-
انشائیات۔ ڈاکٹر عابد حسین ۱۵/-
نظرے خوش گزرے بیگم انیس قدوائی ۱۲/-
فکر و ریاض۔ علی جواد زیدی ۱۲/-
بازگشت۔ کبیر احمد جائسی ۱۱/-
کچھ نثر میں بھی۔ آنند نارائن ملا ۱۶/-
مشاہیر کے خطوط۔ مرتبہ عبد اللطیف اعظمی ۱۲/-
اردو کیسے لکھیں۔ رشید حسن خاں ۱۰/۵۰
مسالک و منازل۔ ضیاء احمد بدایونی ۲۲/-
قدیم دلی کالج۔ مرتبہ مالک رام ۴/۵۰
نگارشات۔ پروفیسر محمد مجیب ۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۲۴/-
ہوا کے دوش پر۔ غلام ربانی تاباں ۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴/-
نظر اور نظریے۔ آل احمد سرور ۲۴/-
تجزیے۔ ڈاکٹر گیان چند جین ۱۳/-
باتیں کچھ سریلی سی داؤد رہبر ۳۶/-
اردو اسپیز۔ سید ظہیر الدین مدنی ۱۸/-
روحِ تہذیب۔ خواجہ غلام السیدین ۴/۵۰
نئی شعری روایت۔ پروفیسر شمیم حنفی ۲۱/-
دراسات۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ۱۵/-
دبستانِ آتش۔ شاہ عبد السلام ۱۶/-

تعلیم

تعلیم و تربیت اور والدین۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵/-
تعلیم اور رہنمائی۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں۔ معین الدین ۴۵/-

تعلیم اور اس کے مسائل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۲۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)۔ شکیل اختر فاروقی ۹/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۷/-
بنیادی اساتذہ کے لیے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۱۲/-
ہم کیسے پڑھائیں۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۵/۵۰
تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔ اختر الواسع ۲۵/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

شہید جستجو۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/۵
مولانا آزاد کی کہانی۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵/-
حیاتِ جامیؒ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
نقشِ ذاکر۔ مرتبہ عبدالحق خاں ۵/-
مالک رام ایک مطالعہ۔ مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ مرتبہ خلیق انجم ۲۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ مرتبہ انور صدیقی ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ مترجم شمیم حنفی ۴۲/-
مجیب صاحب احوال و افکار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹۰/-
حیاتِ عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغریٰ مہدی۔ ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین ۶۵/-
وجد شاعر اور شخص۔ مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبارِ کارواں۔ بیگم انیس قدوائی ۲۷/-
فراق شخص و شاعر۔ مہمان اڈیٹر شمیم حنفی ۳۵/-
حیاتِ حافظ۔ اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکارِ رومی۔ مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزمِ رفتگاں صباح الدین عبدالرحمٰن ۳۱/-

امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ پروفیسر ممتاز حسین ۳۵/-
مکالماتِ افلاطون۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۶/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النساء بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر ۱۲/-
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیاتِ اسماعیل: حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیسؒ۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۵/-
گنجہائے گرانمایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۳۶/-
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۰/-
قدسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انتشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
روسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

فی الفور۔ یوسف ناظم ۳۰/-
گول مال۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
فی الحال۔ یوسف ناظم ۱۸/-
رانگ نمبر۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
بالکلیات۔ یوسف ناظم ۱۸/-
برکت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
ذکر خیر۔ یوسف ناظم ۱۰/-
بے پرکی۔ حضرت آوارہ ۱۶/-

خنداں ۔ رشید احمد صدیقی ۔/۳۴

شگوفہ زار ۔ خواجہ عبدالغفور ۔/۴۱

دیوار قہقہہ (مزاجیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۔/۱۵

آشفتہ بیانی میری ۔ رشید احمد صدیقی ۔/۱۰

سفرنامے، رپورتاژ

کولمبس کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۔/۴۵

پشکن کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۔/۲۵

سفر زندگی کے لیے سوز و ساز ۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۔/۱۸

باتیں لاہور کی ۔ سوم آنند ۔/۱۶

رہ نوردِ شوق ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۴/۵۰

شعری مجموعے

پُرانی بات ہے ۔ زبیر رضوی ۔/۳۰

سازِ سخن ۔ ادا جعفری ۔/۴۵

غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری ۔/۷۵

دائروں میں پھیلی لکیر ۔ کشور ناہید ۔/۲۰

آنکھ میں سمندر ۔ زاہد ڈار ۔/۲۰

آنکھ اور خواب کے درمیان ۔ ندا فاضلی ۔/۲۱

رات کے مسافر ۔ مرتبہ انور سجاد ۔/۲۸

گدازِ شب ۔ معین احسن جذبی ۔/۴۰

ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۔/۴۰

حرف حرف روشنی ۔ حمایت علی شاعر ۔/۳۵

لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ۔/۲۷

دو ہے ۔ جمیل الدین عالی ۔/۱۲

کلیاتِ عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ۔/۷۵

رادار ۔ ساقی فاروقی ۔/۲۷

پتھر کی زبان ۔ فہمیدہ ریاض ۔/۱۵

شام کا پہلا تارا ۔ زہرا نگاہ ۔/۲۱

مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۔/۲۸

لہو پکارتا ہے ۔ علی سردار جعفری ۔/۱۵

شام شہرِ یاراں ۔ فیض احمد فیض مجلد ۔/۱۰ ۔/۶

جستہ جستہ ۔ خورشید الاسلام ۔/۱۸

گل افشانیِ گفتار ۔ نشور واحدی ۔/۵

کربِ آگہی ۔ آنند نرائن مُلّا ۱۰/۵۰

نوائے آوارہ ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰

اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں ۔/۱۲

پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۔/۱۵

انتخابِ حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۔/۱۵

شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۸/۵۰

ذوقِ سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۔/۵

کو بہ کو ۔ سلمان جاں نثار اختر ۔/۷

تاریخ، اسلامیات، مذہب

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۔/۱۲

ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش ۔ پروفیسر مشیر الحق ۔/۸

مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۔/۹

دنیا کے بڑے مذہب ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۔/۸۵

ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۔/۴۰

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمٰن محسنی ۔/۵۰

رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز ۔ سید برکات احمد ۔/۴۰

محبوب الارث ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۔/۴

ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۔/۲۰

اسلام دورِ حاضر میں ۔ ترتیب: پروفیسر مشیر الحق ۔/۳۶

اسلامیات ۔ مالک رام ۔/۲۴

عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۔/۹

حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۔ زیرِ طبع

علم حدیث اور چند اہم محدثین ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی زیرِ طبع

بہارادبی اوّل۔ سید شہاب الدین دسنوی -/۷
" دوم۔ " " " ۷/۵۰
" سوم۔ " " " ۷/۵۰
روح القرآن۔ مولانا عبدالسلام قدوائی -/۳۰
عشق اور بھگتی۔ عابد الحسن آزاد فاروقی -/۶
عورت اور اسلامی تعلیم۔ مالک رام -/۹
مسلمان اور وقت کے تقاضے۔ عبدالسلام قدوائی -/۸
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا۔ محمود الحسن -/۱۵
سماجی تبدیلیاں۔ مترجم قاضی عبیدالرحمٰن -/۲
مذہب اور جدید ذہن۔ پروفیسر مشیر الحق -/۱۶
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں۔ ڈاکٹر سالم قدوائی -/۱۶
دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر۔ مولانا محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی -/۱۲
کتاب و سنّت کے جواہر پارے۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
خواتین کربلا کلامِ انیس کے آئینے میں۔ صالحہ عابد حسین -/۱۴
مسلمان اور سیکولر ہندوستان۔ پروفیسر مشیر الحق -/۷
اسلامی عقائد و مسائل مذہب۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۹/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی -/۲۵
تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اوّل۔ مولانا اسلم جیراجپوری -/۱۲
" خلافت راشدہ " دوم " -/۱۵
" خلافت بنی امیہ " سوم " -/۱۰
" عباسیہ " چہارم " -/۱۵
" پنجم تا ہشتم " زیر طبع
فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی -/۲۰
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)۔ قاری محمد اسماعیل ۱/۵۰
" " " کلاں سائز " -/۲
اسلام اور بدلتی دنیا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی -/۲۱
بکھرے ورق۔ سینتی کمار چٹرجی -/۴
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین -/۹

ناول

تذکرہ۔ انتظار حسین -/۵۴

بریت کی دیواریں۔ رفعت سروش -/۲۱
بنجر بادل۔ کشمیری لال ذاکر -/۲۲
فرار۔ ظفر پیامی -/۲۰
ڈوبتے سورج کی کتھا۔ کشمیری لال ذاکر -/۳۶
لمحوں میں بکھری زندگی۔ کشمیری لال ذاکر -/۱۸
مہکتی بہاریں۔ کوثر چاند پوری -/۱۸
راگ بھوپالی۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی -/۱۵
دھرتی سدا سہاگن۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات۔ کشمیری لال ذاکر ۱۲/۵۰
میں واپس آؤں گا (ہاورڈ فاسٹ) مترجم محمد انس -/۲۵
پُروائی۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
انگوٹھے کا نشان۔ کشمیری لال ذاکر -/۷
ایک مہم جو دل۔ خالدہ رحمٰن -/۱۰
اشک خوں۔ صبیحہ بانو -/۱۰
اپنی اپنی صلیب۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پرائی دھرتی اپنے لوگ۔ جتندر بلو -/۱۲
ایک مٹھی ہندوستان۔ سید ضمیر اشرف -/۶
ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی -/۱۲
آلپس کے گیت۔ مترجم قرۃ العین حیدر -/۲
پیار کا موسم۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا۔ سلطان آصف فیضی -/۲
پابہ جولاں۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی -/۶
زندگی کی لہر (ساؤتھنگ) مترجم محمد خلیق -/۴
کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق -/۶
بیوہ۔ منشی پریم چند -/۱۶
گئودان (نیا اڈیشن) " -/۴۶
میدانِ عمل (نیا اڈیشن) منشی پریم چند -/۵۵
پودوکیہ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر -/۲
شکستِ ناتمام۔ زہرہ سیدین -/۱۲
جلیبیں۔ انور کمال حسینی -/۵

ابھی ڈور ۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۔ ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۔ ۲/۵۰

افسانے

سدابہار چاندنی ۔ رام لعل ۳۰/-
دل دریا ۔ شرون کمار ۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۸/-
دردِ دل ستارہ جعفری ۱۸/-
مکتی بودھ راجندر سنگھ بیدی ۲۵/۵۰
نیلی ساری خواجہ احمد عباس ۱۳/-
گرہن ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۵/-
کوکھ جلی ۔ " ۱۸/-
کھڑکی ۔ پرکاش پنڈت ۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ ۔ ہرچرن چاولہ ۱۲/۷۵
تیوری ۔ امر سنگھ ۱۴/۷۵
قلی نمبر ۳۹۹ ۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۴/۷۵
دانہ و دام ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
اپنے پرائے ۔ اوم پرکاش بجاج ۹/-
نئی دھرتی نئے انسان ۔ خواجہ احمد عباس ۱۲/-
درد و درماں صالحہ عابد حسین زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۔ راجندر سنگھ بیدی ۲۰/-
واردات ۔ پریم چند ۱۸/-
پت جھڑ کی آواز ۔ قرۃ العین حیدر زیر طبع
دس افسانے ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں ۔ انور خان ۶/-
جو میرے وہ راجہ کے نہیں ۔ صغریٰ مہدی ۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو ۔ راجندر سنگھ بیدی ۲۰/-

ڈرامے

زندگی کی طرف ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۲۴/-
زوال کا عروج ۔ مترجم: انور عظیم ۲۴/-
مجھے گھر یاد آتا ہے ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۲۰/-
انٹی گونی ۔ سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی ۹/-
خانہ جنگی پروفیسر محمد مجیب ۳/۵۰
حبہ خاتون ۔ پروفیسر محمد مجیب ۲/۵۰
تاریخ کے آنچل میں ۔ رفعت سروش ۱۸/-
اداس موڑ ۔ ابراہیم یوسف ۱۲/-
فاؤسٹ ۔ گوئٹے ۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۹/۵۰
مٹی کا بلاوا ۔ پروفیسر شمیم حنفی ۱۲/-
سات کھیل ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۴/۵۰
غالب کون ۔ سید محمد مہدی ۸/۵۰
خیال کی دستک ساگر سرحدی ۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا ۔ کرتار سنگھ دگل ۹/-
پہلے آپ ۔ (مزاحیہ ڈراما) افتخار عالم ۲/۵۰
آذر کا خواب ۔ قدسیہ زیدی ۸/۵۰
آزمائش ۔ پروفیسر محمد مجیب ۲/۵۰
انجام ۔ پروفیسر محمد مجیب ۲/-
کھیتی " ۲/۵۰
ہیروئن کی تلاش ۔ " ۲/۵۰
پردۂ غفلت ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۷/۵۰
دروازے کھول دو ۔ کرشن چندر ۲/۵۰
آئینۂ ایام ۔ جے برنیٹلے مترجم خلیق احمد ۲/۵۰
نقشِ آخر ۔ ۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن ڈاکٹر اخلاق اثر ۱۸/-
ریڈیو ڈرامے کی اصناف " ۲۰/-
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو " ۱۰/-
فاوسٹ (گوئٹے) مترجم: ڈاکٹر عابد حسین ۲۹/۵۰

اقبالیات

اقبالیات کی تلاش ۔ عبدالقوی دسنوی ۔ ۲۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) سید وحیدالدین ۔ ۲۷/-
اقبال اور دہلی ۔ عبدالقوی دسنوی ۔ ۹/۵۰
نقدِ اقبال ۔ میکش اکبرآبادی ۔ ۲۵/۵۰
نقشِ اقبال ۔ اسلوب احمد انصاری ۔ ۲۱/-

غالبیات

گفتارِ غالب ۔ مالک رام ۔ ۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی ۔ مشفق خواجہ ۔ ۳۶/-
تلامذۂ غالب ۔ مالک رام ۔ ۷۵/-
فسانۂ غالب ۔ مالک رام ۔ ۱۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۔ ۹/۵۰

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۔ ۱۲/۵۰
نیرنگِ خیال ۔ مالک رام ۔ ۱۵/-
یادگارِ غالب اردو ۔ " ۔ ۱۶/-
" فارسی ۔ " ۔ ۱۰/-
انتخاب مضامین سرسید ۔ انور صدیقی ۔ ۱۲/-
حیاتِ سعدی ۔ مرتبہ رشید حسن خاں
فسانۂ آزاد تلخیص ۔ " ڈاکٹر قمر رئیس ۔ ۳۶/-
فردوس بریں ۔ " عبدالحلیم شرر ۔ ۱۲/-
شریف زادہ ۔ " ڈاکٹر قمر رئیس ۔ ۱۵/-
امراؤ جان ادا (مرزا رسوا) محمد حسن ۔ ۱۶/-
فسانۂ مبتلا ۔ " صدیق الرحمٰن قدوائی ۔ ۱۰/-
توبۃ النصوح ۔ " مالک رام ۔ ۲۵/-
باغ و بہار ۔ " رشید حسن خاں ۔ ۲۶/-
ابن الوقت ۔ " ڈاکٹر خلیق انجم ۔ ۲۶/-
مجالس النساء ۔ " صالحہ عابد حسین
گزشتہ لکھنؤ ۔ " رشید حسن خاں
قصہ حاتم طائی ۔ " اطہر پرویز

انتخاب دہلی ۔ مرتبہ سید ظہیرالدین مدنی ۔ ۹/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۔ ۹/-
" مراثی انیس و دبیر ۔ رشید حسن خاں ۔ ۲۴/-
" نظیر اکبرآبادی ۔ " " ۔ ۳۰/-
" اکبر الٰہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی زیر طبع
" کلامِ میر ۔ ڈاکٹر محمد حسن زیر طبع
دیوان درد ۔ رشید حسن خاں ۔ ۱۲/-
انتخاب سودا "
" قلی قطب شاہ ۔ محمد اکبرالدین صدیقی زیر طبع
" ذوق ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی زیر طبع
مثنوی سحرالبیان ۔ رشید حسن خاں ۔ ۱۶/-
مثنوی گلزار نسیم ۔ " ۔ ۸/-
افادات سلیم ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۔ ۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری ۔ مرتبہ رشید حسن خاں زیر طبع

جیبی کتابیں

ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۔ ۱۰/-
آتشِ گل ۔ جگر مرادآبادی ۔ ۸/-
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۔ ۶/-
رومانی غزلیں ۔ ثمینہ حجاب ۔ ۶/-
انتخاب اکبر الٰہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۔ ۸/-
ساتواں آنگن ۔ صالحہ عابد حسین ۔ ۸/-
دھوپ ۔ رابعہ تبسم ۔ ۵/-
گھر ۔ ماریہ رحمٰن ۔ ۸/-
واپسی کا سفر ۔ عبداللہ حسین ۔ ۵/-
راگ بھوپالی ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۔ ۴/-
نشیب ۔ عبداللہ حسین ۔ ۵/-
موت کا بازار ۔ آفتاب ہلالی ۔ ۸/-

کتاب علم کی شمع ہمارے

اردو ادب ۷۷-۱۹۷۶ء محمود عالم ۔ ۲/-

مشرقی علوم و ادبستہ پر تحقیق ۔ حامد حسین ۳/-
پریم چند نمبر ۔ عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۱۶/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔ ادارہ ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر ۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی ۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر ۔ مالک رام ۱۲/-
سکندر علی وجد نمبر ۔ یوسف ناظم ۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
فراق نمبر ۔ شمیم حنفی زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر ۔ ادارہ ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰/-
جائزے ۔ مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-
نئی نظم کا سفر ۔ " ڈاکٹر خلیق الرحمٰن اعظمی زیر طبع
ماہنامہ جامعہ مجیب نمبر ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۵/-

بچوں کے لیے

مذہب

سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ حکیم محمد سعید ۳/۵۰
حضرت حمزہؓ ۔ احتشام علی رحیم آبادی ۳/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۔ " " " ۳/-
حضرت ابوہریرہؓ " " " ۳/-
حضرت محبوب الٰہیؒ ۔ مشیر الحق ۳/-
" قطب الدین بختیار کاکیؒ ۔ " ۲/-
" فریدالدین گنج شکرؒ ۔ " ۳/-
" معین الدین چشتیؒ ۔ " ۳/-
" ابوبکر صدیقؓ ۔ " ۴/-
" طلحہؓ ۔ " ۳/-
" سلمان فارسیؓ ۔ " ۳/-
" ابوذر غفاریؓ ۔ " ۳/-
" عبداللہ بن عمرؓ " ۳/-
" عبداللہ بن عباسؓ ۔ " ۳/-
نیک بیٹیاں ۔ " ۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا، حصہ اول عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
" حصہ دوم " ۶/-
قرآن کیا ہے؟ " ۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا؟ " ۶/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار 'اول' " ۴/-
" " 'دوم' " ۴/-
اسلام کے مشہور امیر البحر ۔ " ۴/۵۰
رسولِ پاکؐ ۔ " ۶/-
دس جنتی ۔ الیاس احمد مجیبی ۴/۵۰
سرکار کا دربار ۔ " " ۴/۵۰
چار یار ۔ الیاس مجیبی ۴/۵
آں حضرتؐ (اردو) الیاس مجیبی ۳/-
حضرت محمدؐ (ہندی) " ۰/۴۰
اللہ کا گھر ۔ خلیل احمد جامعی ۳/-
اللہ کے خلیل ۔ " " ۳/-
رسول پاک کے اخلاق ۔ " " ۳/-
اللہ کے صفی ۔ " " ۲/-
ہمارا دین حصہ اول سید شہاب الدین دسنوی ۷/۵۰
" 'دوم' " " " ۷/۵۰
" 'سوم' " " " ۷/۵۰
تحسین القرآن ۔ تالیف، خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین ۴/۵۰
منہاج القرآن ۔ " " ۴/۵۰
ائمۂ اربعہ ۔ مولانا ابوالعرفان ندوی زیر طبع
ارکان اسلام ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۳/-

کتاب	مصنف	قیمت
عقائدِ اسلام۔	ـــ " "	۲/-
خلفائے اربعہ۔	خواجہ عبدالحی فاروقی	۴/-
نبیوں کے قصے۔	" "	۵/-
ہمارے رسولؐ۔	" "	۵/-
پیارے رسولؐ۔	سلطانہ آصف فیضی	۲/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	ادارہ	۳/-
مسلمان بیبیاں۔	اعجاز الحق قدوسی	۴/-
ہمارے نبیؐ (اردو)	سید نواب علی رضوی	۲/۵۰
" (ہندی)	" " "	-/۴۰
سرکارِ دوعالم۔	محمد حسین حسان	۱۰/۵۰

نظمیں

کتاب	مصنف	قیمت
مہکتی کلیاں۔	خضر برنی	۴/-
ٹھنڈے کھلونے۔	سطوت رسول	۵/-
سہانے ترانے۔	شان الحق حقی	۴/۵۰
بچوں کے افسر۔	افسر میرٹھی	۴/-
بچوں کے اقبال۔	مرتبہ: اطہر پرویز	۴/۵۰

معلومات و سوانح

کتاب	مصنف	قیمت
مولانا آزاد کی کہانی۔	ظفر احمد نظامی	۱۸/-
ذرے کی کہانی۔	مہدی جعفر	۲۱/-
پرندوں سے جانوروں تک۔	شاہد عظیم	۴/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب۔	مرتبہ عبداللہ ولی بخش قادری	۴/-
اندرا گاندھی کی کہانی۔	شمیم حنفی	۴/-
بچوں کے چار بزرگ دوست۔	صالحہ عابد حسین	۳/-
امیر خسرو۔	ادارہ	۳/-
رنگوں کی بستی۔	سہیل انور	۲/۵۰
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں۔	زہرہ مشیر	۴/-
صحت کے ۱۰ نکتے۔	مسعود احمد برکاتی	۱/۵۰
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں۔	یوسف ناظم	۲/-
جدید پہیلیاں۔	راج کشور	۴/-

کتاب	مصنف	قیمت
جوہرِ قابل۔	مسعود احمد برکاتی	۳/-
شفیع الدین نیّر۔	اطہر پرویز	۴/۵۰
صحت کی الف بے۔	مسعود احمد برکاتی	۵/-
موم کا محل۔	پروفیسر محمد انس	(زیرِ طبع)
چٹانوں کی کہانی۔	محمد امین	۲/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی۔	بیگم قدسیہ زیدی	۱۰/-
میر انیس۔	محمد حسین حسان	۲/-
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے)	" "	۱/۵۰
ہمارے محاورے۔	ڈاکٹر سیفی پریمی	۸/۵۰
مقناطیس کی کہانی۔		(زیرِ طبع)
دہلی۔	مجاہد حسین زیدی	۳/-
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل تا چہارم)		۷/۷۵
سماجی زندگی۔ (اوّل تا چہارم)		۴/۹۰
کہاوت اور کہانی۔	ڈاکٹر سیفی پریمی	۴/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
شیر اور بکری۔	باتصویر کہانیاں	۴/-
چاند کی بیٹی۔	"	۴/۵۰
بھیڑیے کا گانا۔	"	۴/-
جادو کی ہنڈیا۔	"	۴/۵۰
چالاک بلی۔	"	۴/-
دُم کٹی لومڑی۔	"	۴/-
کوے کا خواب۔	"	۴/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری۔	کشور ناہید	۴/۵۰
بہادر علی۔	قمر علی عباسی	۷/۵۰
خالی ہاتھ۔	انصار عبدالعلی	۹/-
کھلونا نگر۔	ادارہ	۷/-
حاجی بابا کی ڈائری۔	ظ۔ انصاری	۶/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا۔	ادارہ	۵/-
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی۔	"	۹/-
ابو علی کا جوتا۔	"	۵/-

ننھا سراغ رساں۔	ادارہ۔	۵/-
پُراسرار غار۔	"	۵/-
ظالم ڈاکو۔	ریاض احمد خاں	۶/-
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں۔	انور خاں	۶/۵۰
دلّی کی شادی۔	اشرف صبوحی	۴/-
رحمت شہزادہ۔	" "	۴/-
اندھے کا بیٹا۔	شعیب اعظمی	۳/۵۰
پانچ جاسوس۔	امۃ الرحمٰن محسنی	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات۔	ریحان احمد عباسی	۶/-
اچھی کہانیاں۔	مرتبہ: ہمدرد فاؤنڈیشن	۲/۵۰
ہرن کا دل۔	اشرف صبوحی	۲/-
دریا کی رانی۔	" "	۲/-
گوہر شہزادی۔	" "	۴/-
شریر شیرا۔	" "	۳/-
پری رانی۔	صالحہ خاتون	۲/-
خطرناک سفر	ریاض احمد خاں	۳/۵
ننھا جھرو۔	ریحان احمد عباسی	۲/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں۔	یوسف ناظم	۳/۵۰
بابا ناصح۔	رشید الوحیدی	۳/-
سلامہ و صمصامہ۔	" "	۵/-
پہاڑ کی چوٹی پر۔	مرزا ادیب	۶/-
شرارت۔	محمد حسین حسّان	۲/-
ننھا فرشتہ۔	فہمیدہ عتیق	۳/۵۰
ایک کھلا راز۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۵۰
بھیڑا اور اس کی بیوی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز۔	شمیم حنفی	۶/-
ہار کی تلاش۔	ریاض احمد خاں	۴/-
خرگوش کی چال۔	بیگم آصفہ مجیب	۳/-
آؤ ڈراما کریں۔	محمد مجیب	۲/-
خرگوش کا سپنا۔	کرشن چندر	زیرِ طبع
دادا نہرو۔	منور لکھنوی	۴/-

نیلا ہیرا۔	مظفر حنفی	۴/۵۰
ایک کٹوری تیل میں۔	عبدالواحد سندھی	زیرِ طبع۔
شیر خاں۔	قرۃ العین حیدر	۳/-
بھیڑیے کے بچے۔	" "	۳/-
لومڑی کے بچے۔	" "	۳/-
میاں ڈھینچو کے بچے۔	" "	۱/۵۰
بہادر۔	" "	۳/۵۰
ہرن کے بچے۔	" "	۱/۵۰
اس نے کیا کر نہ جانا۔	آصفہ مجیب	۲/-
کٹا ہوا ہاتھ۔	شمیم حنفی	۶/۵۰
میگھ نگر کا راجا۔	ریاض احمد خاں	زیرِ طبع
جی دارا اور ننھا فرشتہ۔	"	"
سرکس۔	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
لومڑی کا گھر۔	"	۲/-
جادو کا گھر۔	"	۳/-
بی مینڈکی اور کوا۔	"	۲/-
تاک دنا دن تا کے سے۔	"	۱/۵۰
روٹی کس نے پکائی۔	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
پھوہڑ چگوں کیا خاک۔	"	۱/۵۰
پانچ بونے۔	"	۲/-
چیونٹی رانی۔	"	۱/۵۰
بچوں کی کہانیاں۔	"	۳/-
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔	"	۱/۵۰
پکڑ دُم کٹے کو۔	"	۱/۵۰
مدھوا نانا پردیس چلے۔	"	۱/۵۰
ہپتو جپتو۔	"	۱/۵۰
سُرخ بوتے۔	بیگم قدسیہ زیدی	۳/۵۰
ریڈیو فیچر۔	جگن ناتھ آزاد	زیرِ طبع
پلک شارو۔	یوسف ناظم	۶/-
ایک دیس ایک خون۔	صالحہ عابد حسین	۴/-

جادو کے کھیل۔ اطہر پرویز (زیر طبع)
انعامی مقابلہ۔ حسین خاں ۳/۲۵
دعوتِ طلاق۔ 〃 زیر طبع
جیت کس کی؟ 〃 ۲/۵۰
چینی کی گڑیا۔ 〃 زیر طبع
بہادر سیاح۔ 〃 ۲/-
چچا غالب۔ مرتبہ 〃 زیر طبع
تانبیل خاں۔ محمد حسین حسان ندوی ۱/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دو حصے) ترجمہ قرۃ العین حیدر۔ ۵/-
چوری کی عادت۔ عبدالغفار مدھولی ۳/۵۰
بغیر دستہ دار لڑکا۔ 〃 (زیر طبع)
جب اور اب۔ آصفہ مجیب 〃
سندر چنار۔ صالحہ عابد حسین ۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے۔ قدسیہ زیدی ۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد۔ 〃 ۲/-
ستاروں کی سیر۔ کرشن چندر زیر طبع
لال مرغی۔ عبدالواحد سندھی ۲/-
تین اناڑی۔ عصمت چغتائی ۶/-
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا۔ کوثر بانو زیر طبع
چپاوت کا آدم خور شیر۔ محمد حسین ۱/۵۰
ننھا ٹٹو۔ خورشید سلطان ۲/-
چنبیلی۔ محمد حسین حسان ۱/۳
شہزادہ اور ٹھگ۔ ادارہ ۲/-

تعلیم بالغاں کے سلسلے کی کتابیں

● پیشے

نصیب خاں حجام۔ مرتبہ: ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ -/۵۰
کفن دفن۔ 〃 〃 〃 〃 -/۵۰
عبدالرحمٰن راج۔ 〃 〃 〃 〃 -/۵۰

● جھلکیاں

احمد علی۔ 〃 〃 〃 -/۵۰
حیات اللہ انصاری۔ 〃 〃 -/۵۰

● تعلیم بالغان کے سلسلے کی نئی کتابیں

چوٹی کی چوٹ۔ معین الدین ۱/۲۵
چیچک۔ مشتاق احمد ۱/-
موسم کے بارے میں سو سوال۔ محمد امین ۱/۲۵
آستین کا سانپ۔ محمد حسین حسان ۱/-
الٹی دوا۔ 〃 〃 ۱/-
تاؤ کے لیڈریشن۔ 〃 〃 ۱/-
چاند۔ 〃 〃 ۱/-
دیمک۔ 〃 〃 ۱/-
کتنی زمین۔ 〃 〃 ۱/-
بچوں کی چھوٹی موٹی بیماریاں۔ 〃 〃 ۱/-
اندر و شواس۔ ہندی ۲/-
استری کو پڑھاؤ۔ 〃 ۳/۵۰
سب مل کر۔ 〃 ۳/۵۰
بینک آپ کی سیوا میں۔ 〃 ۳/۵۰

متفرق

پنچ تنتر دوم۔ -/۵۰
〃 〃 سوم۔ -/۵۰
بونے کی کھیتی۔ ۱/-
چیونٹی۔ -/۶۵
ٹھیک بات چیت کی جے۔ -/۵۰
اپنی کھیتی کو چیک کرو۔ -/۵۰
پیڑوں کی کاٹ چھانٹ۔ -/۵۰
ساگ سبزی اگائیے۔ -/۵۰
کھاد بنائیے کھاد ڈلیے۔ -/۵۰
ہرا چارہ ہرا رہے۔ -/۵۰
مقدمے کی مار۔ -/۵۰

• ہندی

سرل ہندی پرائمر ۱/۵۰
ہندی پرائمر اوّل، دوم فی حصہ -/۵۰
بال پریم اوّل تا چہارم ۵/۵۰
مٹی کی گاڑی ۲/۵۰
منورنجک پہیلیاں -/۷۵
ڈھول بھرے ہیرے -/۷۵
نو پربھات ۱/۷۵
کھیل دوارا شکشا اوّل ۲/-
آزمایش دوم ۱/- ۱/۲۵
بھارت نئے سمودھان تک ۳/-
آپ کا بالک اس کا سوستھ ۳/۵۰

• ہندی کی دوسری کتابیں

ہمارے نبیؐ زیر طبع
حضرت محمدؐ -/۶۰
ایورسٹ کی کہانی -/۵۰
گلستان کی کہانیاں ۱/۵۰
مولانا روم کی کہانیاں -/۵۰
موسموں کا کھیل -/۶۵
پرم پرا -/۶۵
اپنا گھر -/۵۰
امریکہ -/۵۰
دہلی -/۵۰
منورنجن اور کام -/۵۰
چاندی کا چمچہ -/۴۰
چمپا کا پھول -/۲۵

ہماری درسی کتابیں

• اردو

اردو قاعدہ -/۳۰
رنگین قاعدہ حصہ اوّل ۱/۸۰
" حصہ دوم ۱/۵۰

اردو کی پہلی کتاب ۲/-
" دوسری کتاب ۲/۵۰
" تیسری کتاب ۴/-
" چوتھی کتاب ۵/۵۰
اردو کی پانچویں کتاب ۶/-
" چھٹی کتاب ۶/-
" ساتویں کتاب ۶/۵۰
اردو کی آٹھویں کتاب ۸/-
بچوں کی پہلی ۲/-
اردو کی دوسری برائے دہلی ۳/-
" تیسری " ۵/۲۵
" چوتھی " ۵/۶۵
اردو خوش خطی حصہ اوّل ۲/۵۰
" " دوم ۲/۵۰
" سوم ۲/۵۰
چہارم ۲/۵۰

• حساب

جدید حساب درجہ دوم ترجمہ: یاور حسین ۵/-
حساب درجہ سوم ترجمہ: شکیل احمد ۹/-
جدید حساب چہارم " ملکہ بیگم قزلباش ۶/-
" " پنجم " محمد یونس ۶/۷۰

• طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت ۶/-
بھارت اور سنسار ۸/-
ہماری دلی سوم کلاس کے لیے ۹/۵۰
ماحول کے ذریعہ تعلیم سوم ۹/۵۰
آئیے سائنس کر کے سیکھیں چہارم ۶/۳۰
پنجم ۶/۳۰

• کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

نیا اردو نصاب۔ اوّل۔ تیمر زبیری/ محمد ذاکر ۸/۵۰
آئینہ ادب۔ ڈاکٹر علی رضا/ ڈاکٹر آدم شیخ ۱۲/-
انوار ادب۔ پروفیسر نصیر الدین/ ڈاکٹر سجاد حسین حسینی ۸/۵۰

مکتبہ جامعہ بک کلب

کا ممبر بن کر اُردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہمیں یقین ہے کہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کرسکیں۔

قواعد و ضوابط

(۱) بک کلب کی فیس رکنیت پانچ (/Rs.5) ہوگی۔ (ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس رکنیت بھیج دینا کافی ہے)

(۲) بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ چندہ 35 روپے ہے) صرف 33 روپے سالانہ چندہ لیا جائے گا۔

(۳) ہر ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) %25 اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اُردو کی کتابوں کی خریداری پر %$6\frac{1}{4}$ کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمائش پر کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

(۴) بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کی ممبر نہیں بن سکتی۔

(۵) ممبری کے دوران، ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

(۶) کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمّے ہوں گے۔

(۷) گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آیندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

(۸) بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہوجانے کے باوجود اگر کسی ممبر نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کردیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کرسکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

اپریل ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۴

فی پرچہ ۴/-
سالانہ ۳۵/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) ۱۰۰/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک) ۲۲۰/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے ۴۵/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

نور کے پھول (مذہب اخلاقیات) حکیم محمد سعید ۔/۹
سیرت پاک۔ مختصر مختصر (سیرت) احمد خاں خلیل ۔/۳
چور پکڑو (کہانیاں) مسعود احمد برکاتی ۔/۳
چالاک خرگوش کے کارنامے (بچوں کا مزاحیہ ناول) معراج ۵۰/۶
انتخاب نظیر (نیا اڈیشن) مرتبہ رشید حسن خاں ۔/۳۲
دیوان درد " " " ۔/۱۲
شریف زادہ " " ڈاکٹر قمر رئیس ۔/۱۵
اردو خوشخطی اول " ۲/۵۰
قاعدہ یسرنا القرآن خورد " قاری محمد اسمٰعیل ۱/۵۰
تحصیل و ترسیل (مقالات) ڈاکٹر محمد رضوان احمد خاں ۔/۲۲
نشاطِ خاطر (انشائیے) حسین عظیم آبادی ۔/۱۹
نفسِ مطلب (مقالات) سید محمد حسنین ۔/۱۲
ذیابیطس کا شافی علاج (طب) حکیم شاہ نور فیصل ۔/۵
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل (شعری مجموعہ) شررفتحپوری ۔/۲۲
اپنی تصویر (شعری مجموعہ) اظہر عنایتی ۔/۵
سرسبز (شمارہ جولائی تا دسمبر ۸۸ء) ترتیب کرشن کمار طور ۔/۲
خاطر کاشمیری کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر محمد شفیع ۔/۱۰
ستان دردا ستان (شعری مجموعہ) مست احسنی گنوری ۔/۳
جیندر بہادر موج (ادبی سفر کی داستان) مرتب اکرام فاروقی — قیمت درج نہیں ہے
ماہین (مرتبین) معین الدین عثمانی و صغیر احمد ۔ قیمت درج نہیں
شہزادہ (ناول) صفیہ یوسفی ۔/۴۵
ملا جوگندر پال ۔/۸۰
جو لے ہوئے راہی (ناول) محمد فیض ۔/۱۰
عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول (تنقید و تبصرہ) پروفیسر عبد السلام ۔/۱۵
صبیح الدین بلخی حیات اور کارنامے (سوانح) ڈاکٹر ظفر بلخی ۔/۱۰
مولانا ابو الکلام آزاد ذہن و کردار (شخصیت) عبد المغنی ۔/۳۰
دو گز زمین (ناول) عبد الصمد ۔/۶۰
سلطنت خداداد (نیا اڈیشن مصور) تاریخ محمود خاں بنگلوری ۔/۱۰
دکنی شاعری تحقیق و تنقید (تنقید) ڈاکٹر محمد علی اثر ۔/۲۵
کلیات ایمان (نعتیہ شاعری) سیدہ ہاشمی مجیب ۔/۵۰
جادۂ شوق (شاعری) بالاکرشن گوپال مخمور ۔/۶۰
اردو نثر کا ارتقا (ادب) ڈاکٹر عابدہ بیگم ۔/۱۰
آتے جاتے موسموں کا سچ (افسانے) ہرچرن چاولہ ۔/۶۰
مہمات الصرف والنحو (عربی قواعد) عبد الغفار ضیا نگرامی ندوی ۔/۶۰
سر بیریات (طب) سید محمد حسن نگرامی ۔/۳۰
بیت الحکمت کی طبی خدمات (طب) وسیم احمد اعظمی ۔/۴۵
یونانی میٹریا میڈیکا (علم الادویہ جدید) (طب) سید محمد حسان ۔/۴۰
قلم کہانیاں (افسانے) بشریٰ رحمان ۔/۱۲۵
اماں (ناول) رضیہ بٹ ۔/۱۰
ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں (تاریخی ناول) محمود خاں بنگلوری ۔/۲۵
ستارہ جو ٹوٹ گیا (ناول) عنایت اللہ شمس ۔/۳۰
محب وطن پریم چند اور دیگر مضامین (مضامین) شمس الحق عثمانی ۔/۶۰
نیاز فتح پوری فکر و فن (تحقیقی مقالہ) ڈاکٹر اختر یزدان محسن ۔/۱۰
سید حرمت الاکرام حیات اور کارنامے مرتبہ ایس جی ۔ آئی حیدر ۔/۳۰
دبستان وحشت کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر طراز عظیم ۔/۴۰

مہمان مدیر
جوگندر پال
204, MANDAKINE ENCLAVE,
NEW DELHI-110019.

اشاریہ

ججمنٹ کی خواہش بذات خود پارسائی سے عبارت ہے، تاہم جج اگر ملزم کے عذاب میں شریک ہوکر اُسے پھانسی کا حکم سناتا ہے اور یہ حکم سناتے ہوئے اپنے گلے میں بھی پھانسی کا رسہ چڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے تو اس کی ججمنٹ کی خواہش کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے خالق کے اتھاہ رحم و فہم کا یہ عالم ہے کہ وہ گنہگاروں کی گردنیں ناپنے کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ انھیں اپنے عمل کی تمام تر آزادیاں دیے ہوتا ہے۔ تاکہ وہ خود آپ ہی اپنی پابندیوں کو دریافت کر پائیں، انھیں قدم قدم پر پابندیوں کی دریافت کے مواقع میسر آتے ہیں، پھر بھی وہ پابند نہ ہوں تو خدا ان پر خارج سے کوئی سزا نہیں تھوپتا۔ وہ اپنے ہی کیے کو بھگتنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کے اس طرح بھگتنے کے عمل میں اس کی ہمدردانہ فہم میں یکسر کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

کہانی کار کو بھی اپنی کہانیوں میں ایسا ہی کمیشن روا رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں اور نہ ہی فکشن کے نقاد کو۔ جس طرح کہانی کار کو اپنے کرداروں کو اچھا یا بُرا ثابت کرنے کی بجائے ان کی زندگی کرنا ہوتی ہے، اسی طرح فکشن کے نقاد کو بھی تخلیق کاروں کی درجہ بندی نہیں کرنا ہوتی۔ درجہ بندی اسکولوں اور کالجوں کے مشق کاروں کی کی جاتی ہے۔ ادب کے نقاد سے یہ توقع کرنا بیجا نہیں کہ سب سے پہلے وہ کسی قاری کی انکساری سے ادیب کی واردات میں شرکت کا خواہشمند ہو اور پھر ایسے نئے یا پُرانے آلاتِ تنقید کام میں لا پائے جن کی بدولت عام قارئین پر اُس واردات کی تہیں کھلنے لگیں اور انھیں کھلتے ہوئے پاکر قارئین کو احساس ہونے لگے کہ انھوں نے گویا تخلیق کو اپنی اپنی توفیق اور تلازموں کی روشنی میں از سرِ نو تخلیق کیا ہے۔

پریم چند کے ناول "گئودان" کی عظمت کا گمان صرف ناول کے متن سے وابستہ نہیں، اس گمان میں اَن گنت قارئین اور ان کے ادوار کی تخلیقی بصیرت بھی شامل ہے۔ جس کا اہم تر اظہار تنقید کی صورت میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ کسی اعلا ادبی تصنیف کی کلاسیکی گنجایشیں اسی لیے دو ایک دن میں نہیں ٹھہرائی جا سکتیں کہ پہلے اس میں لاکھوں پڑھنے والوں کی فکر بھی شامل ہولے۔ جب اسے مصنف نے لکھا تھا تو وہ واحد آپ ہی اس کا مصنف تھا، مگر ایک طویل مدت کے دوران جو لوگ اس کے بارے میں سوچتے رہے وہ بھی گویا اسے لکھتے رہے اور یوں اس میں پھیلاو آتا چلا گیا۔ کوئی اچھی ادبی تصنیف

اسی طور دور بہ دور ہمہ گیر وسعت اختیار کر پاتی ہے۔ "گئو دان" بھی اس مقام پر پہنچ کر پریم چند کا "گئو دان" نہ رہا۔ آج وہ بنی نوع انسان کی ساجھی ملکیت ہے اور پریم چند کا نام اس سے انسان کے تخلیقی جوہر کی علامت کے طور پر جڑا ہوا ہے۔ اس معنی میں پریم چند، ٹالسٹائے یا وکٹر ہیوگو ہر زمانے کے انسان کو اپنی محدود وسعتوں میں پناہ دیتے دیتے آپ نہ جانے کب مرکھپ گئے مگر اُن کے پڑھنے والے اِن پناہ گاہوں کو متواتر وسیع کرتے گئے۔ ایسا ہو پانے کے لیے — ظاہر ہے — پہلی شرط تو یہ ہے کہ تخلیقی مصنف نے قارئین کی رسائی کے تعلق سے ممانعتیں روا نہ رکھی ہوں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کم اہم نہیں کہ کور چشم یا بد نیت تنقیدی تحکّم کے باعث فری اور سموتھ ٹریفکنگ کا ستدباب نہ ہوتا رہا ہو۔ شو کی موسیقی کے اس چمتکار میں یقینی طور پر دشنو کی حیات پرور سماعتوں کا بھی ہاتھ تھا کہ وہ پاتال اور دیو لوک تک شاہراہوں کا سماں باندھتی چلی گئی۔ جب سماعت گاتی ہوئی اور بول سنتے ہوئے محسوس ہونے لگیں تو تفاوت اور پیکار کے پہاڑ از خود اوجھل ہونے لگتے ہیں اور گھرے ہوے لوگ کھُلتے راستوں پر بلا جھجک ہو لیتے ہیں۔

ہر دور کو اپنی توفیق کا خدا ہی مل پاتا ہے۔ ہمارے دور کے بدبخت لوگوں نے اپنے لیے ایک ایسے خدا کو منتخب کیا جس کی مدد سے انھیں اپنی روزمرّہ سہولتوں کی گیجٹس فراہم ہوتے رہیں۔ فنون لطیفہ کی پرکھ کا بھی یہی معیار قرار پایا کہ ریاضت اور سپردگی کی پوبلی مقامی روایتیں اب کس کام کی، مغرب سے لمبے لمبے دانتوں والے گیجٹس درآمد کرو۔ تاکہ فنونِ لطیفہ کو منہ ہلائے بغیر ہڑپ کیا جا سکے، سو یہ ہوا کہ ہمارے لوگوں نے سب کچھ بیچ بچا کر امریکی کانزیومرزم (CONSUMERISM) کی مکمل مشینری اور اس کا نوہاؤ خرید کر لیا۔ اب فن پر بنی بنائی آرا عام دستیاب ہونے لگیں تو کسے پڑی تھی کہ دماغ پر خواہ مخواہ زور ڈالے ____ ضرورت کی جو رائے قابل فروخت ہے چپکے سے دام چکا کر اسے اٹھاؤ اور اپنی راہ ہو لو۔ جب ہم کنزیومر سوسائٹی کے ڈھانچے میں ڈھل ہی چکے ہیں تو پھر ضمیر اور آرٹ کی قدریں کس کام کی؟ جو کچھ اشتہار میں لکھا ہے وہی سچ ہے۔ بے سبب ضمیر کا جوکھم مت جھیلو اور مزے سے اشتہار پر ایمان لے آؤ ____ نجات ہے ____ ارے بھئی، اسی لیے تو اشتہار پر ایمان لانے کو کہہ رہا ہوں۔ آج تو پیا کے لیے بھی گھر کو خیرباد کہیں تو راستے پھر ہمیں عین گھر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں، یا پھر اگر ہم راستوں میں بھٹک جائیں تو کسی جیل میں جا پہنچتے ہیں۔

اردو فکشن کی تنقید کا باب بھی آج اشتہاری اور سہولتی سچائیوں کے صف آرا مصور ذکر سے سجا پڑا ہے۔ جس نے بزنس مینجمنٹ کا کورس کر رکھا ہو۔ اس دھندے میں اس کی چاندی ہی چاندی ہے۔ مغرب میں لوگ اب شاید پھر سے محسوس کرنے لگے ہیں کہ سب کچھ تو ہماری مشینیں ہی کرتی ہیں، گانا اور کھانا تو منہ سے ہی ہو تو ہو، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے پارکھوں کے نزدیک منہ سے کھانا اور ہاتھ سے کھانا یا لکھنا بیک ورڈنیس کے مترادف ہے۔ انھیں الیکٹرانک ٹائپ رائٹر سے لکھ کر اور کمپیوٹر میوزک سن کر ہی چین آتا ہے۔

جب تک مشینیں انسانی دکھ جھیلنے سے قاصر ہیں، اس وقت تک ہمیں اپنی ساری کہانیاں خود آپ ہی لکھنی اور پرکھنی ہوں گی، ایک دفعہ ایک دکھی کی مدد کرنے سے پہلے میں نے اپنی تسلّی کے لیے ایک کمپیوٹر سے رجوع کیا۔ کمپیوٹر نے فوراً اس کی ساری کہانی اس مکمل، صحیح ڈیٹا کے ساتھ پیش کر دی۔

مگر اسے پڑھ کر میں اُس دُکھی کی مدد پر آمادہ نہ ہو پایا اور پھر کیا ہوا کہ ایک بار اچانک میرا اُس دُکھی کے معصوم لڑکے سے سامنا ہو گیا اور اس کی بچھڑے کی سی بڑی بڑی خاموش اور ویران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے بے اختیار یہ خواہش ہوئی کہ میں اپنا سب کچھ اسے سونپ دوں، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ معصوم خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے ناچنے لگے۔ مشین ہمیں صحیح اطلاعات تو بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسان ہی انسان کو آمادہ کر سکتا ہے۔ اور انسانی عناصر سے ہی انسان کی ترسیل اور اس کے دُکھ کا مداوا ہو سکتا ہے۔ ہمارے دور کا انسان اپنی سہولتوں کی خاطر انسانیت کا جوہر کھو دینے پر تُلا ہے اور اپنا آدرش یعنی اپنی بنائی ہوئی مشین، خود آپ ہی بن جانا چاہتا ہے۔ اپنی مشینوں سے اس کی ہمسری کی چاہ تعجب خیز نہیں۔ کیوں کہ کانزیومر سوسائٹی کے اراکین اوائل میں عادتاً اور ہوتے ہوتے خوا اشیا کی ماہیت اختیار کر لیتے ہیں اور اس حالت میں انھیں ضمیر کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ پہلے غیر خوشگوار اطلاعات کو دبا دیا جاتا تھا کہ ان کے عام ہو جانے سے امن عامہ میں خلل واقع ہو جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ مگر آج کے آدمی نے اپنے دل و دماغ میں اتنی اعلا کوالٹی کے شاک آبزار بر کسے ہوئے ہیں کہ کسی بھی اطلاع سے نمودار ہونے والے المیوں سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سرکاری یا غیر سرکاری رپورٹوں میں ایسی خبریں پڑھ پڑھ کر کہ کسی قوم کا نصف، چوتھا یا آٹھواں حصہ غریبی کی ریکھا سے بھی نیچے رہ رہا ہے، ہم اپنی اس اولین صلاحیت سے بھی عاری ہو گئے ہیں کہ اپنے جاننے والوں میں سے کسی ایک بھوکے کی موت پر اک ذرا سا ہڑبڑا ہی دیں۔ ہمارے فکشن کے مبصّرین کو انسانی بے حسّی کی اس المناک مضحکہ خیزی کی کوئی سچویشن گدگداتی ہے، نہ اداس کرتی ہے وہ تو کسی کومل کہانی کو اپنی آہنی گرفت میں لے کر بس یہ تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے اکادمی مفروضوں پر پورا اُترتی ہے یا نہیں۔ انھیں تخلیق کار کا یہ پرابلم درپیش نہیں کہ انسان کو اس کے مشینی پوز سے نکال کر فطری طور پر ہنسنے یا رونے پر آمادہ کریں تاکہ اس کے دُکھ کا مداوا ہو جائے۔ انھیں نقطۂ زبان و بیان کے کسی جامد اور خارجی تصوّر کے واسطے سے اپنے متعین اکادمی مفروضوں کو برحق ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مہاپنڈتوں کا بس چلتا تو کبیر کی گیلی گیلی بھاشا سے بھانت بھانت کی انوکھی گھٹنائیں گھٹ آنے سے پہلے ہی وہ اُسے زندہ گاڑ دیتے۔ یہ ذات کا جلاہا کون ہوتا ہے جس کے سُوت کے چرخوں پر ہم کان دھریں، پہلے ویدوں کی شُدھ بھاشا تو سیکھ لے۔ شدھ بھاشا کیا ہوتی ہے؟ ــــ ان مُورکھ پنڈتوں کو معلوم نہیں کہ پوتر شلوکوں کی شُدھ بھاشا بھی اَنت میں اپنے ارتھوں سے اشُدھ ہو کر ہی شُدھ ہوتی ہے۔ ورنہ شُدھ کی شُدھ رہ جاتی ہے۔ پریم چند پر بھی ان کے بیشتر معاصر نقادوں کا یہی اعتراض تھا کہ وہ غلط اردو لکھتے ہیں۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ وہ غلط اردو میں صحیح فکشن رقم کر رہے ہیں۔ اور تو اور شیکسپیئر کو بھی اس کے پڑھے لکھے قلم گھسیٹ ہمعصروں نے اس کی زبان و بیان کی غلطیوں کا حوالہ دے کر گول کر جانا چاہا، مگر شیکسپیئر کو اپنی انگریزی کی نمائش کرنے کی بجائے انگریزی میں کچھ کہنا تھا، غیر ادب اور ادب کی یہ شناخت اٹل ہے کہ ایک میں زبان اپنے آپ کو بول بول کر ہمیں مرعوب کرنا چاہ رہی ہوتی ہے اور دوسرے میں اپنے مفاہیم میں ایسی گم، کہ کہیں دکھتی ہی نہیں۔ درست زبان کی اہمیت اپنی جگہ تاہم جملوں میں الفاظ کو صحیح طور پر ترتیب دے دینے سے ہی کہانی نہیں ہو جاتی، کہانی میں تو محاورے

کو گوندھنا پڑتا ہے، تاکہ محاورہ کہانی کی واردات کو اس طرح اٹھائے ہوئے لگے جیسے کسی ذی جان کا بدن اس کی ذات کو۔ ادبی زبان اپنی لغوی صحت کے باوصف مقامی مفاہیم کی مطابقت کے بغیر بے معنی ہوتی ہے۔

ہماری زبان میں فکشن کے کئی نقادوں نے جمالیات کی آڑ میں اسلوب کو کوئی مجرد شے قرار دیا ہے۔ یہ ایک گمراہ کن رویہ ہے۔ اصول کی بے واسطگی دراصل ادب کے بنجرپن کا حوالہ بن جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ادبی اسلوب اپنی جمالیاتی معراج پر کسی تخلیقی واردات کے اظہار کے لیے ایسے ہی عین موزوں ہوتا ہے جیسے کوئی جیتا جاگتا چہرہ جس پر ایک ذرا ٹکٹکی باندھ کر ہماری اس جاندار کے باطن تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اس باب میں قدرت کی بے حساب تخلیقات میں ہر چہرے کی یکتائی قابلِ غور ہے، ہر چہرہ آدمی کی جداگانہ ذات کا آئینہ دار ہے اور اس کے سنکاروں سے عین مناسبت رکھتا ہے۔ اس تخلیقی تقاضے کے پیشِ نظر ہمارے بعض نقادوں کے یہاں چند اسلوبی ترجیحوں پر اصرار اُن کی مجرمانہ غیر ذمہ داری کے مترادف ہے۔ بعض اوقات سیدھے سادے بیانیہ کے آنگن میں ہی کوئی افسانوی سچویشن آپ ہی آپ کسی پھول کی طرح کھل آتی ہے۔ مثلاً منٹو کی کہانی "کھول دو" کے راست بیانیہ سے ہی اس میں دم بھر آیا ہے۔ کہانی کی ساری سچویشن خود آپ ہی آپ ایک علامیہ بن گئی ہے اور کسی خارجی علامیے کی یکسر طلب گار نہیں۔ اس کے برعکس کافکا کی کہانی "میٹامورفسس" کے ایبزرڈ خارج سے ہی ہم پر اس کی بصیرت کی راہ کھلتی ہے۔ جیسے کسی شخص کی وہی ایک شکل اس کا اپنا آپ ہونے کی دلیل ہے۔ ویسے کسی کہانی کی ہیئت کے تعلق سے بھی ہمیں یہی خیال گزرنا چاہیے کہ کسی اور شکل میں وہ گویا مکھوٹا پہنے ہوئے ہوگی۔ منٹو کی ہی کہانی "پھندنے" کو لیجیے۔ اسے زبان و بیان کے مخصوص برتاؤ کے لحاظ سے نئے نقادوں نے نئی کہانی کا پیش رو کہا ہے۔ اس رائے سے اگر یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ "پھندنے" بھی ہماری بیشتر نئی کہانیوں کے مانند چست اور کھلنڈرے بیان کی ایک عمدہ مثال ہے تو یہ بات اس حد تک سمجھ میں آتی ہے، تاہم کہانی کے غیر وارداتی چست عوامل اس کا ایک کلیر امیج بنا پانے کے باوجود اس میں ماجرے کا وہ دم نہیں پھونک سکے ہیں جس سے اسی مصنف کی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جی پڑی ہے۔ "ماجرے" سے میری مراد محض واقعاتی تار و پود سے نہیں، بلکہ واقعاتی تار و پود کے ساتھ یا اس کے بغیر کسی ایسی واردات سے ہے جس سے کہانی میں کوئی اسرار پڑاؤ ڈال دے اور اسے پڑھنے والا ایک ذہنی تناؤ میں مبتلا ہو کر رہ جائے اور پھر اسے اپنے تلازموں کی روشنی میں عمر بھر بڑھاتا گھٹاتا چلا جائے۔ کسی کہانی میں کوئی ایسا ماجرا کھڑا ہو جائے تو باتوں باتوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ واقعاتی تسلسل یا اتھل پتھل سے بھی اور قاعدے سے بھی، اور بے قاعدے سے بھی، مگر جیسے بھی ہوگا تبھی ہوگا جب لگے کہ ایسا صرف اسی طور ہو سکتا تھا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ جسے ہم کہانی پن سے تعبیر کرتے ہیں وہ کہانی کی اسی خود رو کیفیت کا نام ہے۔

کہانی دراصل ایک ندی ہے جو اپنے نشیب پر آپ ہی آپ بہتی چلی جاتی ہے اور اس بہاؤ کے دوران آگے پیچھے ہونے کے باوجود اوّل تا آخر ایک ساتھ بھی ہوتی ہے اور اسی طرح پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اُتر آتی ہے۔ اور یہیں اپنا سفر طے کرتے ہوئے اس کے شعور میں ڈوب جاتی ہے۔ پڑھنے والے کو اگر تنقید کی دعواداری ہو تو وہ سورج کی شعاعوں میں روپوش ہو کر ندی کو کھارے پانیوں سے بوند بوند اڑا لیتا ہے اور پھر جب موسلا دھار برستا ہے تو ندی ایک انوکھی بہار لیے پھر چڑھ آتی ہے۔ نقاد کے اس تخلیقی منصب کے مدِّنظر اُسے وشنو بھگوان سے منسوب کیا گیا ہے۔ جو شعور کے سمندر میں

سیس ناگ کی سیج پر سے کائناتی روابط پر نظر رکھے ہوتا ہے۔ تخلیق کار جہاں اپنی تخلیق کے اسباب کا جویا ہوتا ہے، وہاں نقاد ان اسباب کے اسباب کے سراغ میں لگا ہوتا ہے۔ ادبی تنقید کا یہی رول اسے تخلیق کا اعتبار عطا کرتا ہے۔

غور کیا جائے تو ہم ماہ و سال بتا بتا کر بڑے نہیں ہوتے ہیں، یعنی وقت نہیں گزرتا، ہم ہی گزرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس اثنا میں جو گھٹنائیں ہم پر گھٹتی ہیں وہی گھٹ گھٹ کر ہمیں بڑا کیے جاتی ہیں اس لحاظ سے اگر کسی پر کچھ نہ بیتے تو سمجھیے وہ پیدا ہوا نہ مرا۔ جینا مرنا تو زندگی کرنے سے ہوتا ہے، زندگی کر کر کے ہی کہانی کار کو کائناتی روابط کا عرفان نصیب ہوتا ہے جب وہ اس مقام پر آ پہنچتا ہے تو پھر گویا کائنات ہی کائنات ہوتی ہے اور وہ گویا کائنات سے غائب ہو جاتا ہے اور اس طرح اوروں کی مسرتوں، اداسیوں ذلتوں، اور شرمندگیوں کو جی جی کر وہ ان کی کہانیاں لکھنے میں مگن رہتا ہے۔ کہانی کار کا مقدر اتنے بڑے حوصلے سے زندگی کر کر کے کہانیاں لکھنا ہوتا ہے اور فکشن کے نقاد کو وہ کہانیاں کر کر کے، نہایت انکساری سے اپنا سارا آپ انھیں سونپ سونپ کر ان پر اپنی تنقید تخلیقنا ہوتا ہے، چہ جائیکہ وہ جج کی مسند پر بیٹھے بے صبر تحکم سے سندیں بانٹتا ہوا محسوس ہو۔ تخلیق ادب میں ذوقِ فقر کے بغیر چارہ نہیں اور فقیروں کا بجی مٹی پر بیٹھنا نہ ہو تو اُن کی فکر کو پَر عطا نہیں ہوتے۔ ●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسانُ الصدق
مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۷۵

نظام رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہیدِ جستجو
(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پُرانی بات ہے
(سلسلہ وار نظمیں) زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما
تصحیح و ترتیب

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے) ادا جعفری

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیّاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/۷۵

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی متشرح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

ڈاکٹر سیفی پریمی
"Nigaristan" Zakir Nagar.
NEW DELHI-110025.

"نیگرو کا ضمیر"

(سوڈانی نظم کا انگریزی سے ترجمہ)

یہی کہو، کوئی اندیشہ و ہراس نہیں
یہی کہو کہ جھجکنا حرام ہے مجھ کو
یہی کہو بنی آدم کے روبرو ہو کر
کہ نیگرو ہے مری نسل، ابنِ زنگی ہوں
تمام شجرۂ اسلاف اپنا زنگی ہے
مرا وجود بھی ہے ایک بنتِ زنگی سے
اسی لیے تو بظاہر سیاہ فام ہوں میں
غلامِ عصر نہیں، ایک مردِ حُر ہوں میں
مرا عزیز وطن بے کنار افریقہ
وطن کی جے ہو، سلامت بہار افریقہ
مرے وطن کی طہارت کو داغ دار کیا
ہر ایک جسم کو زخموں سے لالہ زار کیا
ہر ایک روح کو مجروح و سوگوار کیا
سفید رنگ کے فوجی غلیظ قدموں نے
اُسی بہشتِ مقدّس کی عظمتوں کے لیے
مرا وجود، مری نسل کا وجودِ تمام
امینِ درد ہے، ایثار و خونبہا ہے اب
مرے وطن سے الگ، سرحدِ اجل سے دُور
گرج ہے، سوز ہے اجداد کی صداؤں میں
قسم ہے تم کو سپوتو! عزیز فرزندو!
چتا کی راکھ کو یوں نذرِ آب و باد کرو

کہ جابروں کا کہیں دہر میں نشاں نہ ملے
سیاہ رات کے تابوت کو الگ پھینکو
کہ اب نجات ملے اس نجس ہیولے سے
پہاڑیوں پہ شعاعِ ظفر کو پھیلا کر
زمیں پہ اور بڑھا دو، وقارِ افریقہ
وطن کو صبح کے نور و جمال سے بھر دو
زمانہ فخر و مسرت سے خود پئے تکریم
تمہارے پائے ظفریاب پر جبیں رکھ دے
حریم جہدِ بقا میں جو نامُراد رہے
ہم اپنا وارثِ مطرود، تم کو سمجھیں گے
سحر کے نور سے دیوارِ شب پگھلتی ہے
زرا بغور سنو، نغمۂ ظفریابی
اندھیرا لحہ بہ لمحہ ٹپکنے لگتا ہے
مآلِ کارِ شب تار کچھ نہیں رہتی
بس ایک نقطۂ معدوم و حرفِ غم کے سوا
عجیب چیز ہے خوابِ گراں سے بیداری
برہنہ سینہ ہمارے عوام اُٹھے ہیں
گرج کے ساتھ گزرتے ہوئے چٹانوں سے
رواں ہے قافلہ، طوفانِ نوح کی مانند
یہی ہے اپنا دُلارا عظیم افریقہ
زمیں پہ نورِ سحر میں جو مُسکراتا ہے
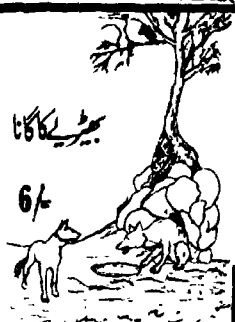
ڈاکٹر وزیر آغا
58, CIVIL LINES,
SARGODHA
(PAKISTAN)

نظم آزاد

آج سے کم و بیش ساٹھ برس پہلے جب اردو ادب میں نظم آزاد کا چلن عام ہوا تو ہر طرف ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک ایسی جنگ چھڑ گئی تھی جو بالائی سطح پر تجربے اور روایت کی آویزش میں اور داخلی سطح پر پرانی اور نئی نسل کے تصادم میں نمایاں ہو رہی تھی۔ اردو کی دیگر رائج اور مقبول شعری اصناف ایک خاص وضع کے معاشرتی نظم و ضبط نیز اس نظم و ضبط کے زمانی تسلسل کی داعی تھیں۔ ان کے مقابلے میں آزاد نظم تھی جو پرانی وضع سے منحرف اور آزادہ روی کی مبلغ تھی۔ یہ آزادہ روی اس کی مخصوص ہیئت کے علاوہ اس کو اختیار کرنے والے شعرا کے لہجہ اور زاویۂ نگاہ میں بھی موجود تھی۔ اسے رائج اسلوبِ حیات سے بغاوت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے ایک باغی رویّہ قرار دینے کے بجائے اس جدید حسیت کا علم بردار قرار دیا جائے جو بین الاقوامی سطح پر عام ہو رہی تھی۔ آزاد نظم ساری دنیا کے اس نئے فکری اور اساسی موسم کی علامت تھی اور اسے زود یا بدیر پوری اردو شاعری پر اپنے اثرات مرتسم کرنا تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد جب آزاد نظم کی آمد پر اٹھنے والے طوفان کا زور ٹوٹ گیا تو دیگر جملہ شعری اصناف بالخصوص غزل اور پابند نظم نے بھی نظم آزاد کے تتبع میں جدید حسیت کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ تاہم اسٹرکچر اور مزاج کے اعتبار سے آزاد نظم کی انفرادیت برقرار رہی۔

نظم آزاد جسے انگریزی میں فری ورس اور فرانسیسی میں VERS LIBRE کا نام ملا ہے، مغربی ادبیات میں ایک عرصہ سے مستعمل رہی ہے۔ اس کے اوّلین نقوش ملٹن کے ہاں ملتے ہیں۔ گوئٹے ہیوگو، بلیک اور آرنلڈ ــــ ان سب نے نظم آزاد کو برتا ہے۔ تاہم اسے زیادہ فروغ والٹ وہیٹ مین کی شاعری سے ملا۔ کہا گیا ہے بودلیر جو نظم آزاد کے سلسلے میں ایک بڑا نام ہے۔ والٹ وہیٹ مین سے متاثر تھا۔ بیسویں صدی کے انگلستان میں ایلیٹ، پاؤنڈ اور ڈی، ایچ لارنس نے بالخصوص شاعری کی اس صنف کو عام کرنے میں ایک اہم حصہ لیا۔ دراصل کوئی بھی صنف شعر محض پبلسٹی کے در پر فروغ نہیں پا سکتی۔ قبول عام کی سند حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ اس میں شاعری کے اعلا نمونے بھی تخلیق ہوں۔ ایلیٹ، پاونڈ اور لارنس کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے آزاد نظم کے ایسے نمونے پیش کیے جو اعلا شاعری کے زمرے میں شامل ہیں۔ یوں انھوں نے اس بات ثابت کر دیا کہ نظم آزاد کے اسٹرکچر میں اعلا شاعری تخلیق کرنے کے بے پناہ امکانات موجود ہیں۔

اسٹرکچر کا ذکر آیا ہے تو میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ اسٹرکچر سے مراد محض خارجی ہیئت نہیں ہے۔ اس سے مراد وہ داخلی ہیئت بھی ہے جو رشتوں سے مرتب ہوتی ہے۔ آج طبیعات، حیاتیات حتیٰ کہ جدید لسانیات اور ادبی تنقید تک میں اسٹرکچر کا یہی تصور قبول کیا جا چکا ہے۔ آرکی ٹائپ کی طرح اسٹرکچر بھی اندر سے خالی ہوتا ہے۔ اصلاً اسٹرکچر کھائیوں یا GROOVES پر مشتمل ہوتا ہے بعینہٖ جیسے آرکی ٹائپ بھی نسلی تجربات کی کھائیوں ہی سے مرتب ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسٹرکچر کھائیوں، رشتوں یا دھاگوں کی ایک گرہ ہے گرہ کھل جائے تو اسٹرکچر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اصل اسٹرکچر میں جب باہر سے کوئی شے داخل ہوتی ہے تو STRUCTURING کے عمل سے گزر کر اسٹرکچر کے مخصوص مزاج اور آہنگ کو اختیار کر لیتی ہے۔
اس زاویے سے غور کریں تو آزاد نظم کے اسٹرکچر میں یہ بات ودیعت دکھائی دے گی کہ وہ جب شعری مواد کو خود میں جذب کرتا ہے تو یہ شعری مواد آرائشی یا پُرتکلف نہیں رہتا بلکہ سبک بار ہو کر عام بول چال کی سطح پر آجاتا ہے یا کم از کم ایک طرح کی سلاست یا خود روانی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح آزاد نظم کے اسٹرکچر کو آہنگ کی پرزور دھمک اور تکرار بھی مرغوب نہیں۔ اس کے بجائے وہ نامیاتی آہنگ ORGANIC RHYTHM کو بروئے کار لاتا ہے۔ طبلے کی پرزور تھاپ اور تکرار اور سارنگی کی ناختم ابھرتی ڈوبتی ہوئی لَے میں جو فرق ہے وہی پابند شاعری کے آہنگ اور آزاد نظم کے آہنگ میں ہے موخرالذکر آہنگ ایک طرح کی داخلی میلوڈی کی صورت شعری مواد میں رچ بس جاتا ہے مراد یہ کہ آزاد نظم میں احساس اور احساس سے پھوٹنے والے تصورات اور ان تصورات کو صورت پذیر کرنے والے الفاظ ___ یہ سب مل جل کر ایک نامیاتی آہنگ کو وجود میں لاتے ہیں یعنی ایک ایسا آہنگ جس میں الفاظ کا جزر و مد احساس کے جزر و مد پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ نظم دو طرح کی ہوتی ہے ایک گیت ایسے ترنم کی حامل نظم جس میں یوں لگتا ہے جیسے نغمہ الفاظ کے تاروں یعنی STRINGS میں سے ابھر رہا ہو اور دوسری امیجری کی حامل نظم جس میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شبیہ یا منظر الفاظ کے اندر سے پھوٹ رہا ہو۔ آزاد نظم میں ان دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اس طور کہ گیت کا ترنم تصویر کی میلوڈی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آزاد نظم اور نثری نظم کا فرق بھی آئینہ ہوتا ہے۔ نثری نظم کا شاعر بھی شعری مواد کا اظہار چاہتا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ آزاد نظم کے اسٹرکچر سے باہر رہ کر تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے لہٰذا سٹرکچرنگ کے عمل سے محروم رہنے کی باعث شعری آہنگ سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ واضح رہے کہ شاعری اس وقت تخلیق نہیں ہوتی جب آپ شعری مواد کو شعوری طور پر شعری آہنگ کے سپرد کرتے ہیں۔ (مراد یہ کہ VERSIFICATION کے عمل میں مبتلا ہوتے ہیں)، کیوں کہ یہ ایک بالکل مصنوعی عمل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صنف شعر کا اسٹرکچر اپنے مخصوص اسٹرکچرنگ کے عمل کو بروئے کار لا کر شعری مواد کو منقلب کرے۔ صرف اسی صورت میں شعری مواد کنکریٹ صورت اختیار کر کے نظم کی اکائی پر منتج ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ایک عام سی پابند نظم میں (جو قافیوں کے التزام سے عبارت ہوتی ہے)، قافیے کا آہنگ مسلسل ٹوٹتا اور بنتا رہتا ہے۔ غزل کا معاملہ یہ ہے کہ غزل کے

شعر میں مصرعِ ثانی تو التزام کے ساتھ قافیے کے تابع ہوتا ہے مگر مصرعِ اوّل ہر بار قافیے کی چھاپ سے الگ ہو جاتا ہے۔ اکثر پابند نظموں میں بھی یہی صورت ابھرتی ہے۔ مگر آزاد نظم میں قافیے کے التزام کے بجائے صرف ارکان کے نامیاتی آہنگ کا اہتمام ہوتا ہے جو ایک ہی سائز کے مصرعوں میں نمودار ہونے کے بجائے چھوٹی بڑی لائنوں میں متشکّل ہو کر سامنے آتا ہے اور گو بعض لائنیں قدرتی طور پر ہم قافیہ بھی ہو جاتی ہیں۔ مگر نظم میں بحیثیت مجموعی آزادہ روی کا میلان ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یوں کہ آزاد نظم کی لائنیں قافیوں کے آہنگ میں محبوس ہونے کے بجائے محسوسات کے اتار چڑھاو کے تابع ہو کر طوالت یا اختصار کا مظاہرہ کرنے لگتی ہیں۔ بعض لائنوں کے آخری لفظ کو ایک نئی لائن کے صورت میں بطورِ خاص نمایاں کرنا یا اسے اگلی لائن میں ضم کر دینا بھی آزاد نظم کے مزاج میں شامل ہے۔ مثلاً میرآجی کی نظم "سمندر کا بلاوا" لیجیے۔ میراجی اپنے گھر سے سیکڑوں میل دور بمبئی کے ایک اسپتال میں پڑے تھے اور ان کی ماں جسے ان سے بے حد پیار تھا انھیں بار بار خط لکھ کر بلا رہی تھی مگر میراجی جا نہیں سکتے تھے پھر ایک روز انھیں ماں کا ایک ایسا محبّت بھرا خط ملا کہ میرآجی بیتاب ہو گئے تب انھوں نے یہ نظم لکھی جس کی پہلی لائن یہ ہے:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے
دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے۔

میراجی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس لائن کو کچھ اس طور تین لائنوں میں تقسیم کر دیتا:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں
اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے
مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے۔

مگر میراجی نے ان تینوں لائنوں کو اپنے احساس کے جزر و مد کے مطابق ایک لائن میں یوں سمو دیا ہے کہ دوسری لائن اپنی جگہ سے اوپر اٹھ کر پوری کی پوری پہلی لائن کے ساتھ جڑ گئی ہے۔ جب کہ تیسری لائن بھی ایک لہر کی طرح اوپر کو اٹھی ہے تاکہ وہ بھی پہلی اور دوسری لائن سے جڑ جائے۔ لیکن پوری طرح جڑ نہیں سکی۔ چنانچہ اس کا صرف ایک لفظ "مرے" اوپر کی لائن میں شامل ہوا ہے اور باقی ماندہ تیسری لائن اپنی ایک الگ حیثیت سے دست کش ہو کر اوپر کی لائن کی کھونٹی سے ٹنگی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ اس تیسری لائن میں "گہری تھکن" کا ذکر ہے۔ چنانچہ لائن میں سرگوشی اور بلاتے بلاتے ایسے فعّال عناصر تو یکجا ہوئے ہیں لیکن "گہری تھکن" ایسا منفعل عنصر لائن کے ساتھ منسلک ہونے کے باوجود اپنی تھکن کے باعث لائن سے نیچے گرتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی وفورِ جذبات کے تحت ایک ہی سانس میں کوئی بات کہنا چاہے مگر درمیان میں یکایک اس کی سانس اکھڑ جائے اور بات کے باقی ماندہ الفاظ سانس کی ڈوری سے موتیوں کی طرح ٹوٹ کر گریں اور دوسری سانس بمشکل انھیں سنبھالنے میں کامیاب ہو۔ یہی آزاد نظم کا کمال ہے کہ اس میں لائنیں از خود شاعر کے جذبات کے اتار چڑھاو میں متشکّل ہوتی چلی جاتی ہیں ــــــ ایک اور مثال لیجیے:

مجید امجد کی نظم "راتوں کو" کی پہلی چند لائنیں یوں ہیں:

آنکھوں میں کوئی بس جاتا ہے
میٹھی سی ہنسی ہنس جاتا ہے
احساس کی لہریں ان تاریک جزیروں سے ٹکراتی ہیں
جہاں نغمے پنکھ سنوارتے ہیں
سنگین فصیلوں کے گنبد سے پہرے دار پکارتے ہیں
"کیا کرتا ہے"
دل ڈرتا ہے
دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے

اس نظم کی کہانی یوں بنتی ہے کہ ایک سونی تنہائی کے دوران محبوبہ کی یاد نے ایک میٹھی سی ہنسی کی کھنک میں ڈھل کر شاعر کے اندر کے سمندر کو چھوا ہے جس سے سمندر میں احساس کی لہریں پیدا ہو کر ان تاریک جزیروں سے ٹکرائی ہیں جو شاعر کے بطون میں کہیں موجود ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ٹکراؤ سے جو سہانے نغمات پھوٹتے ہیں وہ جزیرے کے پنچھیوں کو پنکھ سنوارنے پر مائل کرنے لگے ہیں۔ پنکھ سنوارنے کا عمل ایک انتہائی پرسکون ماحول کا علامیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اندر کے جزیروں کے یہ پنچھی فی الوقت کسی قسم کے خوف میں مبتلا نہیں ہیں۔ مگر پھر اچانک سنگین فصیلوں کے گنبد سے ایک آواز آتی ہے یہ اس پہرہ دار کی آواز ہے جس نے گویا شاعر کی "چوری پکڑ لی ہے چنانچہ "وہ کیا کرتا ہے؟" کی للکار سے اسے ٹوکتا ہے۔ یہ پہرہ دار باہر کی دنیا میں بھی موجود ہے جہاں وہ ظالم سماج کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور خود شاعر کے اندر بھی! پہرہ دار کی للکار سن کر شاعر ڈر جاتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا خوف ان کالی اکیلی راتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن کا سہارا لے کر اس نے اپنی گم شدہ جنت میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی۔

اب دیکھیے کہ مجید امجد نے اس تجربے کے جزر و مد کو نظم کی لائنوں میں کس طرح "گرفتار" کیا ہے۔ پہلی دو لائنیں ہموار اور متوازی ہیں کیوں کہ ان میں دو ہم وزن تصورات یکے بعد دیگرے ابھرے ہیں۔ پہلے محبوبہ کا سراپا ابھرا ہے۔ پھر اس کی ہنسی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ہے۔ اب یکایک لہریں سی پیدا ہوتی ہیں جو دور تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ نظم کی تیسری لائن اس بصری تمثیل کے مطابق اچانک لمبی ہو گئی ہے۔ لیکن جس طرح سمندر کی لہریں جزیرے کے ساحل سے ٹکرا کر ابھی ختم نہیں ہوتیں کہ نظریں ان کے آگے جزیرے تک پہنچ جاتی ہیں بالکل اسی طرح نظم کی تیسری لائن ابھی ختم نہیں ہوئی کہ چوتھی لائن (جو جزیرے کے احوال پر مشتمل ہے) اوپر اٹھ کر تیسری لائن سے چپک گئی ہے یوں دو لائنوں نے مل کر بصری تمثیل کو گرفت میں لے لیا ہے۔

اب منظر بدلتا ہے اندر کے جزیرے کا ساحل فصیل بن کر ابھرتا ہے جس کے گنبد سے کوئی پہرہ دار اس بات کو محسوس کر کے کہ کوئی قلعہ میں آگیا ہے یا آنے کو ہے اسے للکارتا ہے اس کی یہ للکار پچھلی لائن کا حصہ نہیں ہے بلکہ ایک منفرد اور منشدد آواز ہے جو پورے ماحول سے الگ ہو کر اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے لہٰذا "کیا کرتا ہے؟" کے الفاظ بجائے خود ایک الگ لائن میں ڈھل گئے ہیں۔

دوسری طرف "چوری پکڑے جانے" کے احساس نے شاعر کے دماغ کو لحظہ بھر کے لیے معطل کر دیا ہے۔ لہذا وہ مجسم خوف بنا "للکار" کے سامنے بے حس و حرکت ہو گیا ہے۔ نتیجتاً "دل ڈرتا ہے" کے الفاظ بھی "کیا کرتا ہے" کے الفاظ کی طرح ایک بالکل الگ لائن کی صورت فضا میں معلق دکھائی دینے لگے ہیں مگر یہ تو محض ایک لمحہ ہے۔ اگلے ہی پل شاعر بلیک کر "کالی اکیلی رات" کی چادر میں چھپ گیا ہے بالکل جیسے کوئی چور خود کو چھپانے کے لیے تاریکی کا سہارا لیتا ہے۔ چنانچہ اس آخری لائن میں "دل ڈرتا ہے" کے الفاظ "ان کالی اندھیری راتوں سے دل ڈرتا ہے" کے الفاظ سے منسلک ہو گئے ہیں۔ منسلک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب شاعر کو اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ان کالی اکیلی راتوں ہی نے اس کے دل میں یادوں کا طوفان برپا کیا تھا جس کے نتیجے میں اس نے قلعے کے اندر داخل ہونے کا خطرہ مول لیا تھا۔ چنانچہ وہ اب کالی اکیلی راتوں سے خوفزدہ ہے کہ کہیں وہ دوبارہ اسے اس مصیبت میں مبتلا نہ کریں۔ "دل ڈرتا ہے ان کالی اکیلی راتوں سے دل ڈرتا ہے" میں "دل ڈرتا ہے" کے الفاظ دوبارہ آئے ہیں۔ پہلی بار ان کا تعلق پہرہ دار کی للکار سے ہے اور دوسری بار کالی اکیلی راتوں سے ـــــ دیکھنے کی بات ہے کہ شاعر نے کس طرح ایک ہی لائن میں دل کے خوف کو "للکار" سے کاٹ کر "کالی اکیلی رات" سے جوڑ دیا ہے۔ اس لائن کو اگر دو یا اس سے زیادہ لائنوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو قلب ماہیت کا یہ منظر قاری کی گرفت میں نہیں آ سکتا تھا۔

آزاد نظم کا صحیح لطف اس کی قرأت میں ہے کیوں کہ اس طرح لائنوں میں مضمر جذبے یا خیال کا اتار چڑھاو اپنے فطری انداز میں سامنے آتا ہے اور اس اتار چڑھاو کو گرفت میں لینے کے لیے شاعر نے نظم میں جن STRONG STRESSES، PAUSES، SLURS یا QUIVERS وغیرہ کو برتا تھا، ان کی کارکردگی کا بھی صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ مجھے اس کا تجربہ اس روز ہوا جب میں نے ویسٹ لینڈ کا کیسٹ سنا جو ٹی ایس ایلیٹ کی اپنی آواز میں تھا۔ میں ویسٹ لینڈ کئی بار پڑھ چکا تھا لیکن کیسٹ سن کر محسوس ہوا جیسے پہلی بار اس نظم کو پڑھ رہا ہوں۔ چنانچہ نظم کے متعدد مفاہیم جن تک میں پہلے پہنچ نہ سکا تھا، اس قرأت کے باعث مجھ پر آئینہ ہوتے چلے گئے تاہم شرط یہ ہے کہ خود شاعر کو نظم پڑھنے کا ڈھب آتا ہو۔ ورنہ وہ اپنی اچھی خاصی نظم کا بآسانی بیڑا غرق کر سکتا ہے۔ نظم آزاد کی بنت میں موجود لہروں کا یہ اتار چڑھاو جسے بعض لوگوں نے IN-BUILT MOMENTAM کا نام دیا ہے اور جس کا صحیح احساس نظم پڑھنے کے دوران ہوتا ہے (چاہے نظم شاعر پڑھ رہا ہو یا قاری)، اس صنف شعر کی خاص خوبی ہے۔ مگر یہ داخلی توازن صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کا شعری تجربہ اور اس کا شعری اسلوب بڑے فطری انداز میں باہم آمیز ہو گئے ہوں۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں شاعر مجبور ہو جاتا ہے کہ آرائشی اسلوب اختیار کرے اور داخلی توازن کی کمی کو گل افشانیِ گفتار سے پورا کرے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا آزاد نظم کو اردو ادب میں آئے کم و بیش ساٹھ برس ہو چکے ہیں۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے آزادی "قسطوں" ہی میں نصیب ہوئی ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ "آزادی" کی آخری قسط سے تاحال محروم ہے اوّل اوّل اس نے خود کو غزل کی ہیئت سے تو ایک حد تک

آزاد کر لیا تھا۔ مگر غزل کی تلمیحات، لفظی تراکیب نیز اس کے خاص آہنگ سے پوری طرح الگ نہ ہو سکی تھی۔ بعض شعرا کی آزاد نظموں میں تو آج بھی غزل کے یہ اثرات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے دور میں آزاد نظم کے ارد گرد کی اشیا اور مظاہر سے اپنا رشتہ استوار کیا اور یوں بہت سی ایسی اشیا اور مظاہر جنھیں، غزل نے "ممنوعات" میں شامل کر رکھا تھا، شاعر کے تجربے میں جذب ہو کر آزاد نظم کے پیکر میں جا بجا ابھر آئے۔ تیسرے دور میں آزاد نظم نے اپنے خاص اسٹرکچر کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور باہر کی دنیا اور اس کے واقعات و سانحات کو براہ راست بیان کرنے کے بجائے (جیسا کہ پرانی نظم میں دستور تھا) ان کی قلب ماہیت STRUCTURING کے عمل کی مدد سے کرنے لگی۔ یہ سب سے مشکل کام تھا جو ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ برگساں نے لکھا ہے کہ شاعر وہ ہے جس کے ہاں محسوسات بصری تمثیلوں میں ڈھلیں اور بصری تمثیلیں لفظوں میں منتقل ہوں اور الفاظ آہنگ کے قوانین کے تابع ہو کر ان تمثیلوں کو کنکریٹ صورت عطا کر دیں۔ چنانچہ جب ہم ان تمثیلوں کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو بباطن شاعر کے ان محسوسات کو چھو رہے ہوتے ہیں۔ جو ان تمثیلوں کے محرک تھے۔ مگر یہ جبھی ممکن ہے کہ الفاظ کو اپنی کارکردگی دکھانے کی پوری آزادی ہو اور یہ آزادی آزاد نظم ہی کے ذریعے ممکن ہے بشرطیکہ آزاد نظم کا خالق اس کے اسٹرکچر کے امکانات سے پوری طرح باخبر ہو۔ بے شک آزاد نظم لکھنے والے اردو شعرا میں سے بعض نے اس کے اسٹرکچر کو برتنے میں فنکارانہ بصیرت سے کام لیا ہے تاہم اکثر شعرا ابھی تک اس سلسلے میں ناپختگی اور خامکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نظم کے فروغ کے راستے میں رکاوٹیں سی ابھر آئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری آزاد نظم ان رکاوٹوں کو عبور کرے تاکہ اس کی نشو و نما کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے چلے جائیں۔

اس ضمن میں ایذرا پاؤنڈ کے اٹھائے ہوئے بعض نکات شاید ہماری نظم کو مکمل آزادی کے حصول میں کچھ مدد دے سکیں۔ مثلاً ایذرا پاؤنڈ نے آزاد نظم لکھنے والوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی نظم میں کوئی غیر ضروری یا فاضل لفظ استعمال نہ کریں اور نہ ایسے توصیفی کلمات ہی شامل کریں جو کسی نئی صورت حال کو منکشف نہ کر رہے ہوں۔ اردو کی آزاد نظموں کا مطالعہ کیجیے تو متثنیات سے قطع نظر آپ کو ان میں مترادفات کے ڈھیر دکھائی دیں گے مثلاً ایک ہی لائن میں تاریکی کے ساتھ "اندھیرا" اور "پیار" کے ساتھ "محبت" کے الفاظ کا استعمال تو ایک بالکل عام سی بات ہے۔ اس طرح توصیفی کلمات کا استعمال اتنی فراوانی سے ہوتا ہے کہ دم گھٹنے لگتا ہے آزاد نظم کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ ان زنجیروں سے خود کو آزاد کرے۔

ایذرا پاونڈ نے آزاد نظم لکھنے والوں کو دوسرا مشورہ یہ دیا ہے کہ وہ "امن کی دھندلی سرزمین" ایسے پیرایۂ اظہار سے اجتناب کریں۔ کیوں کہ یہ امیج کو رقیق کر دیتا ہے۔ مرئی میں غیر مرئی کی آمیزش کرتا ہے۔ یہ اس امر پر دال ہے کہ شاعر نہیں جانتا کہ شے بجائے خود بہترین علامت ہے اردو کی آزاد نظم میں یہ مریضانہ صورت حال اتنی نمایاں ہے کہ اسے مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو قدم قدم پر "اداسی کے افق"، "نفرت کی جھیل"، "مہربانی کے چراغ" اور "ہجر کے پتھر" ملیں گے۔

یہی نہیں کہ بلکہ محبت کا شبستان "خرد کا چراغ" اور احساس کا رخش، بھی نظر آئے گا۔ اس کے ساتھ اس قسم کی پٹی ہوئی تراکیب جیسے مئے عشق، نقشِ کفِ پا، آغوشِ محبت، فردوسِ نظر، غمِ دوراں، غمِ جاناں دستِ صبا، بارشِ سنگ، دیدہ و دل، سنگِ ملامت، دامِ وفا، حدیثِ درد، اور ان سب پر مستزاد "ہائے وہ معصوم قربے"، اور "اُف یہ ادراکِ مشیت"، بھی دکھائی دیں گے جن میں "ہائے"، اور "اُف"، کی آوازیں عجزِ اظہار کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید اسی لیے ڈبلیو۔ بی ییٹس نے نظم نگاری کے سلسلے میں خطیبانہ انداز RHETORIC جذباتیت SENTIMENTALITY اور اصلاحی رویے یعنی MORAL UP LIFT جیسے سہ گونہ عذاب سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ مگر ان کے علاوہ نظم نگار کو یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ شاعری پٹی ہوئی تشبیہات اور استعارات اور پیش پا افتادہ لفظی تراکیب کی متحمل نہیں ہو سکتی ہر سچا شاعر اپنے امیجز خود تخلیق کرتا ہے۔ اور ان کی ترسیل کے لیے اپنی زبان کو تخلیقی سطح پر فعال بناتا ہے۔ صرف دوسرے یا تیسرے درجے کے شعرا ہی شیر کے مارے ہوئے شکار کو کھاتے ہیں۔

ایذرا پاؤنڈ نے شعرا کو تیسرا مشورہ یہ دیا ہے کہ وہ اس بات پر اصرار نہ کریں کہ آزاد نظم کی ہر لائن اپنے آخری لفظ پر پہنچنے کے بعد لازمی طور پر رک جائے بلکہ جہاں کہیں احساس کے صوتی جزر و مد کے لیے ضروری ہو۔ (اور ایسا اکثر ہوتا ہے) وہ اگلی لائن کو اجازت دیں کہ پہلی لائن میں اٹھنے والی صوتی لہر کو گرفت میں لینے کے لیے خود بھی اوپر اٹھ آئے۔ اس ضمن میں ایذرا پاؤنڈ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

> DONT CHOP UP YOUR STUFF INTO SEPARATE IAMBS.
> DONT MAKE EACH LINE STOP DEAD AT THE END
> AND THEN BEGIN EVERY NEXT LINE WITH A HEAVE.
> LET THE BEGINNING OF THE NEXT LINE CATCH THE
> RISE OF THE RHYTHM WAVE UNLESS YOU WANT A
> DEFINITE LONGISH PAUSE.

گویا آزاد نظم کو احساس کے صوتی جزر و مد کے مطابق ہونا چاہیے۔ وہ شعرا جو آزاد نظم کو محض چند چھوٹی بڑی خود کفیل لائنوں میں بانٹ دینے کو آزاد نظم کے اسٹرکچر کا تقاضا سمجھتے ہیں، احساس کے مد و جزر کو متشکل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے حالاں کہ آزاد نظم کے اسٹرکچر کا اولین مقصد ہی یہ ہے کہ وہ نہ صرف احساس کے سارے اتار چڑھاؤ کی کمال فن کاری سے تجسیم کرے بلکہ اپنے اندر داخل ہونے والے باقی شعری مواد کو بھی اسی جزر و مد کا حصہ بنا لے۔

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منّے بچوں کے لیے

- چاند کی بیٹی (باتصویر) ۴/۵۰
- دُم کٹی لومڑی " ۶/:
- جادو کی ہنڈیا " ۴/۵۰
- شیر اور بکری " ۶/:
- کتے کا خواب " ۶/۵۰
- بھیڑیے کا گانا " ۶/:
- چالاک بلّی " ۶/:
- گدھے نے بجائی بانسری " ۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

- چور پکڑو ۳/-
- چالاک خرگوش کے کارنامے ۷/۵۰
- مولانا آزاد کی کہانی ۱۸/:
- خالی ہاتھ ۹/:
- حاجی بابا کی ڈائری ۶/۵۰
- بہادر علی ۷/۵۰
- کھلونا نگر ۷/:
- ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی ۶/:
- قصہ اژدہا پکڑنے کا ۵/:
- ننھا سراغ رساں ۵/:
- ابو علی کا جوتا ۵/:
- پراسرار غار ۵/:
- عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں ۶/۵۰
- بچوں کے ذاکر صاحب ۶/:

- بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/:
- سہانے ترانے ۶/۵۰
- پانچ جاسوس ۸/۵۰
- جنگل کی ایک رات ۶/:
- ہرن کا دل ۲/:
- اچھی کہانیاں ۲/۵۰
- دریا کی رانی ۲/:
- گوہر شہزادی ۳/:
- شریر شیرا ۳/:
- پری رانی ۳/:
- خطرناک سفر ۳/۵۰
- ظالم ڈاکو ۶/:
- مہکتی کلیاں ۶/:
- پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
- لوٹے کھلونے ۵/:
- اندھے کا بیٹا ۳/۵۰
- پانچ بونے ۳/:
- ایک دیس ایک خون ۳/:
- جیت کس کی ۲/۵۰
- انعامی مقابلہ ۳/۲۵
- ذرّے کی کہانی ۲۱/:
- تین اناڑی ۶/:
- چوری کی عادت ۳/۵۰
- شرارت ۳/:
- دلی کی شادی ۴/:
- گاندھی جی دکنی افریقہ میں ۲/:
- بندر اور نائی ۳/۵۰
- رنگوں کی بستی ۴/:
- بی مینڈک اور کوّا ۳/:
- مرغی کی چار ٹانگیں ۳/۵۰
- لال مرغی ۳/:

- ننھا منّو ۲/:
- آؤ ڈراما کریں ۳/:
- سلامہ صمامہ ۵/:
- مچھیرا اور اس کی بیوی ۳/۵۰
- ایک کھلا راز ۳/۵۰
- بھوتوں کا جہاز ۶/۵۰
- صحت کی الف بے ۵/:
- لومڑی کا گھر ۳/:
- بچوں کی کہانیاں ۳/:
- بابا ناصح ۳/:
- ہار کی تلاش ۶/:
- سُرخ جوتے ۳/۵۰
- اندرا گاندھی ۶/:
- ننھا فرشتہ ۳/۵۰
- جوہرِ قابل ۳/:
- بھیڑیے کے بچے ۳/:
- ننھا جبرو ۳/۵۰
- پلک نہ مارو ۶/:
- بچوں کے افسر ۶/:
- پہاڑ کی چوٹی پر ۶/:
- شیر خاں ۳/:
- رحمت شہزادہ ۴/:
- لومڑی کے بچے ۳/:
- اس نے کیا کرنا جانا ۳/:
- بچوں کے اقبال ۴/۵۰
- امیر خسرو ۳/:
- بہادر سیاح ۳/:
- دادا نہرو ۶/:
- جادو کا گھر ۳/:
- جنگو کی بلّی ۲/:
- کٹا ہوا ہاتھ ۶/۵۰

منیر احمد شیخ

DIRECTOR GENERAL OF
RESEARCH & REFERENCE
MINISTRY OF INFORMATION &
BROADCASTING,
ISLAMABAD.(PAKISTAN)

پاکستان میں ادبی صورتِ حال

کسی قوم یا ملک کے ادب میں تخلیقی سرگرمی اور اس کی رفتار کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ اُس میں لکھنے والوں کی تخلیقی سرگرمی میں اُس عہد کی شہادت ملتی ہے یا نہیں۔ وہی ادب تاریخ میں زندہ رہتا ہے۔ جو اپنے عہد کی گواہی دیتا ہے اور اُس کا خالق سچائی اور اعلا انسانی قدروں کے ساتھ کومٹڈ ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو پاکستانی ادب اس بنیادی فریضے میں پیچھے نہیں رہا جو اُس کے ذمے تھا۔ پچھلے دس گیارہ برس میں پاکستان کے اندر مخصوص حالات کی وجہ سے جو ایک شدید گھٹن چھائی رہی اور اظہار کی آزادی پہ طرح طرح کی پابندیاں عائد رہیں، پاکستانی ادب نے ان پابندیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اس گھٹن کے خلاف احتجاج کیا اور انسان کے بنیادی حق یعنی آزادیِ اظہار کے لیے سخت جدوجہد کی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جب اظہار پہ پابندیاں ہوتی ہیں۔ تو ادیب اور فن کار اظہار کے روایتی سانچوں سے انحراف کر کے علامتوں، استعاروں اور کنایوں کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اُس کے اس عمل میں ادب کی ظاہری ہیئت کے سانچے بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر آپ پاکستان کے پچھلے گیارہ برس کے ادب کا جائزہ لیں تو آپ کو ہیئت میں تبدیلی بڑے نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلی اردو شاعری کی نسبت اردو نثر میں زیادہ نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اردو افسانے اور ناول میں علامت نگاری ایک تحریک کے طور پر نہیں، ایک مجبوری کی وجہ سے در آئی اور بعد میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے اردو افسانے میں علامت نگاری کے رجحان میں جدید مغربی ادب کے اثرات کا بھی کچھ دخل عمل تھا اور نئے لکھنے والے مغرب میں علامتی ادب کی تحریک سے ایک حد متاثر ضرور ہوئے تھے۔ مگر صرف نقالی اور فیشن کے طور پر۔ اُن کی علامتیں اور استعارے اس قدر دور افتادہ اور غریب تھے کہ اردو ادب کے قاری تک اُن کا کوئی ابلاغ نہ ہو سکا۔ دنیا کا کوئی بھی ادب اگر ابلاغ کے بنیادی فریضے ہی سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو تو وہ ادب لکھنے والے کے باطنی ابہام کے عکس سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوتا اور اس میں حقیقت کی پرچھائیں کا کوئی شائبہ نہیں ملتا۔ کچھ یہی حال اردو کے علامتی افسانے کا ہوا۔ جدید اردو افسانے کے زیادہ تر افسانہ نگار محض فیشن پرستی کی رو میں بہ گئے اور علامت کی تلاش میں وہاں تک پہنچ گئے۔ جہاں پہنچ کر اُن کی تحریریں پڑھنے والوں پر کوئی تاثر مرتب نہ کر پائیں اگر کوئی تاثر مرتب ہوا تو وہ یہی تھا کہ یہ تحریریں ذات کے مبہم اظہار سے بلند نہیں ہو سکیں۔ اور

ان میں اپنے عہد کی حقیقتوں کی بجائے ان حقیقتوں سے فرار کی کوشش نمایاں تھی جسے اجنبی اور بے معنی علامتوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی گئی۔

اردو افسانے کے "علامتیے" اس حقیقت کو نہ جان سکے کہ علامتیں تو کسی معاشرے کی صدیوں پرانی تہذیب سے پھوٹتی ہیں اور ان کی جڑیں اس معاشرے کے ادب و فن کی روایات میں موجود ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال ہمارے یہاں صوفیہ اور بھگتوں کی شاعری ہے جس کی اثر انگیزی اور گہرائی کا راز اُن کے معاشرے میں سے جنم لینے والی علامت نگاری میں ہے۔ کہ انھوں نے اِن علامتوں کے استعمال سے الفاظ ہی کو نہیں، بلکہ زبان میں بھی کئی جہتیں پیدا کیں۔ اردو افسانے کے "علامتیے" تو اس کے برعکس حقیقت سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یہ سطحی نوعیت کا رُجحان خود ہی دم توڑ گیا حقیقت یہ ہے کہ اس میں دم شروع ہی سے موجود نہ تھا۔

اِس رویّے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید افسانہ نگاروں کی تحریریں قاری سے دور ہوتی چلی گئیں اور اِس کی وجہ یہ تھی کہ تجریدیت اور ابہام کے ساتھ ساتھ موضوع کے اعتبار سے افسانہ نگار تجربے اور واردات کا حصّہ بنانے کی بجائے داخلیت کا شکار ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے جدید اردو افسانہ اپنے تضاد کا شکار ہو گیا۔ اس کا شدید ردِّ عمل ہوا اور جدید اردو افسانہ جس کے اندر علامت تجرید اور استعارے کو افسانے کی بنیادی قدر کہہ کر اس کو بنیادی قدر یعنی کہانی پن کو رد کیا جاتا رہا تھا۔ اب وہی "علامت پسند" کہانی کے جوہر کی طرف واپس آ رہے ہیں۔

بایں ہمہ ایسے افسانہ نگار جو اس فیشن پرستی کا شکار نہیں ہوئے تھے، وہ برابر کہانی لکھتے رہے اور اُن کی ان کہانیوں میں اس دور کا اِبتلا اور کرب برابر ملتا ہے اور وہ اس دور کے کامیاب افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں۔ ان لکھنے والوں میں انتظار حسین، خالدہ حسین، منشا یاد، امراؤ طارق، رشید امجد، اسد محمد خاں اور کچھ دوسرے افسانہ نگار شامل ہیں جنھوں نے اپنے اردگرد کی زندگی کو فنّی اور تکنیکی حسن کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

افسانوں سے ذرا ہٹ کے ناول نگاری کی طرف آئیں تو انتظار حسین کے ناول "تذکرہ" میں ایک آدھ مقام ایسے آئے ہیں، جہاں ناول نگار نے اپنے عہد کی کسی سنگین حقیقت یا جبر کو دکھلانے کی کوشش میں استعارے اور علامت کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ ناول کے ایک باب میں انتظار حسین نے ایک سیاسی رہ نما کی پھانسی کے واقعے کو علامتی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہاں بھی انتظار حسین جیسا پختہ اور منجھا ہوا فن کار واقعے کی شدّت اور اس سے پیدا ہونے والے مزاحمتی رویّوں کی نشان دہی نہیں کر سکا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین کی علامتیں غیر واضح اور مبہم ہیں اور اس کے قارئین اس اہم تاریخی واقعے کے ہم عصر ہونے کے باوجود ظلم و جبر کا شدید تاثر اس باب میں نہیں پا سکے۔ میرے اس بیان سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہمارے ہاں کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کو علامت کے استعمال کا کوئی شعور ہی سرے سے نہ تھا۔ میرے نزدیک ہمارے اردو ادب کے علامت پسند علامت کے استعمال میں پُرخلوص نہیں تھے۔ انھوں نے علامت کو حقیقت کی سنگینی دکھانے کے لیے نہیں بلکہ اُس پہ پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا اور یوں تخلیقی دیانت داری سے اجتناب کیا۔

اس کے برعکس جدید اردو شاعری کا منظر نامہ اس سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے شعرا کے یہاں حقیقت کا ادراک بہت واضح صورت میں ملتا ہے اور انھوں نے اپنے عہد کی حقیقتوں کی گواہی اس شدت اور تخلیقی سچائی کے ساتھ دی ہے کہ اس شاعری نے ہمارے ادب کا ایک نیا باب ہی شروع نہیں کیا بلکہ پاکستانی معاشرے کو ایک بالکل نیا IDIOM عطا کیا ہے اور یہ IDIOM علامت کی زبان میں ہے۔ اردو شعرا نے افسانہ نگاروں کی طرح علامتیں باہر سے امپورٹ نہیں کیں۔ بلکہ اردو شاعری ہی کی روایت سے نئی حقیقتوں کے اظہار کو نئی علامتیں عطا کی ہیں جو بڑی گمبھیر اور تہ دار ہیں۔ پچھلے دس گیارہ برس کے اندر لکھی گئی اردو شاعری اپنے اندر نہ صرف اپنے عہد کی سنگین حقیقتوں کو سموئے ہوئے ہے بلکہ ان حقیقتوں سے پیدا ہونے والے اثرات کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ پیرایۂ اظہار بڑا جاندار ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل نیا اور تازہ ہے اور اس کی تازگی رگوں میں اترنے والی ہے۔ اس دور کی شاعری میں فیض احمد فیض کی شاعری نے بڑے اثر انگیز اثرات مرتب کیے اور ان کی شاعری کا پرتو قابل ذکر شعرا کے ذہن و فکر پہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ فیض احمد فیض کے ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی کا ذکر بھی لازم ہے کہ جبر و استبداد کے خلاف انھوں نے تخلیقی اظہار کا پرچم کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا اور ان کی شاعری فکر اور سوچ کے اعتبار سے اسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے جس سے فیض احمد فیض کا تعلق ہے۔

جیسے کہ میں نے پہلے کہا۔ پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کے شدید ردِ عمل کا اظہار ہمیں شعرا کے یہاں بہت واضح صورت میں ملتا ہے۔ ایک آمرانہ تسلط نے اردو غزل کے لیے اظہار کے نئے راستے پیدا کر دیے اور احتجاج پر مبنی شاعری نے مزاحمتی شاعری کی ایک تحریک پیدا کر دی۔ اس تحریک نے پرانے اور نئے سبھی تخلیق کاروں کو اپنی جلو میں لے لیا۔ شاعری میں نئے استعارے وجود میں آئے۔ "شہر"، "مکان"، اور "قلعہ" کے الفاظ ملک کا استعارہ بن گئے۔ "ہوا"، اور "آندھی"، جابرانہ اقتدار کی علامت ٹھہری۔ "دریچے"، اور "چراغ"، امید کے استعارے بن گئے۔ "پرندے"، اور "موسم"، حالات کی عکاسی کرنے لگے اور اس طرح غزل کی زبان میں ایک نئی سیاسی جہت کا اضافہ ہوا۔

آمریت کے تحت بسر ہونے والی زندگی کو منیر نیازی نے اپنے اس شعر میں یوں بیان کیا۔ جیسے کوزے میں دریا بند ہو جائے۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

منیر نیازی ہی کے ایک اور شعر میں صورتِ حال کی تعبیر یوں ہے۔

ہوں مکاں میں بند، جیسے امتحاں میں آدمی
سختیِ دیوار و در ہے جھیلتا جاتا ہوں میں

محسن احسان کو سنیے۔

بے زباں شہر کا سینہ ہے فغاں سے خالی
آگ اگلتی ہوئی سانسوں کا دھواں بوڑھا ہے

اقبال ساجد:

جہاں بھونچال، بُنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو، ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

اعزاز آذر:

کیا خبر کون مجھے مار دے کافر کہ کر
اب تو اس شہر کے ہر شخص سے ڈر لگتا ہے

افتخار عارف:

تیرے ہی شہر میں سر تن سے جُدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

احمد ندیم قاسمی:

جب سے آنکھوں میں کھٹکنے لگی ریت
میرے صحراؤں میں وُسعت نہ رہی

ان چند مثالوں سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں اردو غزل میں ڈکشن سے لے کے اُس کی نہج اور اس کے انداز اور لہجے میں اس قدر تبدیلی رونما ہوئی کہ اس میں مزاحمت کا جذبہ اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ انسانی آزادی اور انسانی حقوق کی سربلندی کے لیے ان شعرا کے علاوہ احمد فراز، حبیب جالب، کشور ناہید، فارغ بخاری اور شہرت بخاری کی آوازیں بھی شامل ہیں۔ گویا پچھلے دس گیارہ برس کی اردو شاعری کا نمایاں رُجحان، احتجاج، مزاحمت اور حالات کے خلاف شدید نفرت اور ناپسندیدگی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی اردو شاعری تخلیقی اعتبار سے بڑی جاندار، توانا، جذبے سے بھرپور اور افسانے کی نسبت اس میں کہیں زیادہ اپیل ہے۔

فارم IV حسب قاعدہ 8

بابت "کتاب نما" نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام: سید وسیم کوثر ہندستانی پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۴۔ پبلشر کا نام: " "

۵۔ اڈیٹر کا نام: شاہد علی خاں "

مالکان کا نام اور پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

چیرمین: کرنل بشیر حسین زیدی: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۱۔ ڈائرکٹر: نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ بمبئی ۵

۲۔ " سید مجتبیٰ حسین زیدی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۳۔ " ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۴۔ " مالک رام، ابو یحیٰ، سی ۴۔۵۰ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

۵۔ " پروفیسر علی اشرف وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی یتیم خانہ کینڈی سی فیس بمبئی ۷

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲۰ / مارچ ۱۹۸۹ء

دستخط
سید وسیم کوثر

محسن بھوپالی
Mohsin Manzil
IV F-5/3 A
Nazimabad
KARACHI (PAKISTAN)

یہ دنیا ہے

یہ دنیا ہے
اگر یہ ہاں کہے اور تم بھی ہاں کہہ دو
تو یہ دنیا تمھاری ہے

یہ دنیا ہے!
اگر یہ ہاں کہے،
اور تم نے نا کہنے کی جرأت کی
تو یہ اس وقت تک دشمن رہے گی
جب تلک اپنی خطا کو مان کر
اس کی اماں پھر سے نہ چاہو گے

یہ دُنیا ہے
یہاں پہ آنے والا کوئی بچّہ
چھل، کپٹ، نفرت، حقارت، جبر
کچھ بھی سیکھ کر پیدا نہیں ہوتا
یہ دُنیا خود سکھاتی ہے،
یہ دنیا ہے

شاہد میر
HEAD, BOT DEPARTMENT,
GOVT. COLLEGE,
BANSWARA-327001.(RAJ)

غزل

فہم کی شرط نہ ادراک کی حد ہوتا ہے
آج کا علم تو کاغذ کی سند ہوتا ہے

کتنی تقدیروں پہ پھرتی ہے سیاہی یکلخت
حاکمِ وقت کا فرمان جو رد ہوتا ہے

خود سے ملنے کی بھی فرصت نہیں ملنے پاتی
اپنی شہرت سے مجھے خود بھی حسد ہوتا ہے

وہی سفّاک ہواؤں کا ہدف بنتے ہیں
جن درختوں کا نکلتا ہوا قد ہوتا ہے

روز اب ان سے مُلاقات نہیں ہو پاتی
کوئی موقع کوئی حیلہ کوئی مد ہوتا ہے

مشتاق مدنی
R.O.P. P.O.BOX2,
D.P.M.S. MUSCAT.
S.OF OMAN.

واپس چلیں

یقین سے رشتہ مرا
رنگ مینچ کے مداریوں سا تو نہ تھا
یقین پر ایمان مرا
اپنی ماں کی ممتا سے کم بھی نہیں تھا
یقین پر گرفت مری
کچے دھاگوں کا پل نہ تھی
یقین پر یقین مرا
اپنے لہو کی سُرخی سے کہیں زیادہ تھا!
میں رہا سفر میں اور عقب میں اُڑتے بگولے
مرے کھیت کھلیان تاراج کرتے رہے
میں دھویں میں مشینوں کے
وجود کو اپنے
بے وجود کرتا رہا
مرے ہاتھوں نے کئی بلند اور فلک بوس عمارتوں کو جنما
مرے پیروں نے کئی سرسبز و شاداب جنگلوں کو میدان کیا
میں گھوما کیا شہر میں کسی شاہ بے پناہ کی طرح
مگر وہ تاج جو مری شہنشاہیت کا نشاں تھا
میں گاؤں کی کٹیا میں،
بھول آیا تھا — !
یقین سے رشتہ مرا
سدا کو ٹوٹ چکا تھا۔

رشید اعجاز
983, BHAWANI PETH,
PUNE-411042.

غزل

ہوا کے لب پہ ساری گنتیاں ہیں
کہ کس خیمے میں کتنی رسیاں ہیں

کہاں کا ہوش، کیسے درس و مکتب
کتابیں خواب اور گولیاں ہیں

خطائیں درگذر کا نام ٹھہریں
سزائیں سرکشی کی سیڑھیاں ہیں

کہاں تک شہر کے پیکر ٹٹولیں
لباس فاخرہ میں دھجیاں ہیں

کلر کی ذائقہ اپنا سلامت
پریشاں تو کچن کی رانیاں ہیں

منگیش پاڈ گانوکر
مترجم: عبدالستار دلوی
HEAD OF THE
URDU DEPARTMENT,
BOMBAY UNIVERSITY,
BOMBAY.

ٹھہری نہیں یہ رات ذرا بھی

تم نے ٹھہرنے کے لیے کہا، لیکن
ٹھہری نہیں یہ شب ذرا بھی
انجان مُلکوں کے
انجان پرندوں کی طرح
معمولی شناسائی کا چھوتا ہوا پر
احساس جدائی سے پریشاں، بیتاب
بس رہ گیا موجود یہاں
تم نے ٹھہرنے کے لیے کہا، لیکن
ٹھہری نہیں یہ شب ذرا بھی
کچھ ٹوٹتا معلوم ہوا
گہرے کا شریکِ غم شیشہ
اور اس میں سے دکھائی دیا جھانکتا
گہرے رنگوں کی تصویروں کا
پُراسرار سا جاپانی پنکھا
افق پہ گویا پَرافشاں
..... وہ بھی کھو جانے کے لیے .....

تم نے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ لیکن
ٹھہری نہیں یہ شب ذرا بھی
اور خواب کی جمنا کے پانی سے بھری
خمارِ شب کی وہ نازک صراحی
پھر خون سے لبریز سی معلوم ہوئی
درختوں کی محبوبائیں
گہرے اندھیروں کا دوشالہ اوڑھے
لگتا تھا، معدوم سی تھیں

پھر دونوں کو محسوس ہوا
درخت پھر درخت بن گئے
رات کی پُرانی شاخوں کے
زرد زرد پتوں سے لدے
جو ٹوٹ کر گر جانے کو تیار سے ہیں

نذیر فتح پوری
EDITOR 'ASBAQUE' 3/21,
NITA PARL RARK,
1986, YEROWDA-
PUNE-411006.(M.S.)

غزل

لہو کا گرم سا بازار ہے مرے اندر
مرا ہی اپنا خریدار ہے مرے اندر
نہ صرف یہ کہ ہویدا ہیں کائنات کے رنگ
ہر ایک چیز کا اظہار ہے مرے اندر
جلاتی رہتی ہے دن رات میری ہستی کو
عجب ہوائے شرربار ہے مرے اندر
ابھی تو میرے عزائم میں ہے بہت ہلچل
ابھی تو خون کی بوچھار ہے مرے اندر
طلوعِ صبح کی خبریں ہیں اس کے چہرے پر
سلگتی شام کا اخبار ہے مرے اندر
نذیر حبس کی سزائیں ہیں ضبط سے باہر
وہ میرا اپنا گنہگار ہے مرے اندر

نظام الدین نظام

94-B,A.VIRANI MARG,
IIIrd FLOOR,ROOM NO.17,
BOMBAY-400008.

کتنے جملے ہیں کہ جو روپوش ہیں یاروں کے بیچ
ہم بھی مجرم کی طرح خاموش ہیں یاروں کے بیچ

کیا کہیں کس نے بہاروں کو خزاں ساماں کیا
دیکھنے میں تو سبھی گلپوش ہیں یاروں کے بیچ

یہ بھی سچ ہے گھر کے بھیدی نے کیا گھر کو تباہ
یہ بھی لگتا ہے کہ سب بردوش ہیں یاروں کے بیچ

کیا پتا کب خون کا پیاسا یہاں سو جائے کون
یوں تو کہنے کو سبھی مے نوش ہیں یاروں کے بیچ

ہاں چلا اب ساقیا جادو بھری نظروں کے تیر
ہم بھی دیکھیں کس قدر ذی ہوش ہیں یاروں کے بیچ

بزمِ یاراں ہے یہ ساقی مے نہیں تو غم نہ کر
کتنے ہیں جو میکدہ بردوش ہیں یاروں کے بیچ

طرز پڑھتا ہے کوئی جب جھوم کر نظم و غزل
ایسا لگتا ہے فراق و جوش ہیں یاروں کے بیچ

توسیع یہ بھی خوب ہے، تجرید ہے عجب
تخلیق پر تسلطِ تنقید ہے عجب

عالم پناہ، گوشہ نشینوں پہ رحم ہو
دربار میں اذیتِ تائید ہے عجب

ویسے بھی اپنا ٹوٹنا تذلیل ہی تو ہے
یوں بھی تعلقات کی تجدید ہے عجب

دیکھا جو چاند کو تو تقاضے چمک اُٹھے
غربت کی برکتوں سے مری عید ہے عجب

شب خون قصرِ فکر و فراست پہ ہے نظام
مضمون ہے عجیب تو تمہید ہے عجب

ایک بھولی ہوئی یاد

(مجنوں گورکھپوری کی ایک یادگار تحریر)

آج بالکل اتفاق سے "تذکرۃ الخواتین" مصنفہ عبدالباری آسی کی ایک جلد پر میری نگاہ پڑ گئی جس کو اس سے پہلے میں نے دیکھا نہیں اور نہ دیکھنے کا شوق تھا۔ میں یوں ہی بلا ارادہ اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ صفحہ ۱۸ اپر "ظریفہ" کے ذکر میں اس غزل پر میری نگاہ رک گئی اور اس نے مجھے ایک بھولا ہوا زمانہ یاد دلا دیا۔

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے — کرتے بھی تو رسوا سرِ بازار نہ کرتے
ہیں آپ دکھاتی تمھیں سو رنگ کے جلوے — تم حسرتِ دیدار کا اظہار نہ کرتے
جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر — اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے
دل ہی میں چھپا رکھتے اگر رازِ محبت — اس دکھ کا علاج آپ ہی دشوار نہ کرتے
دیوانگیٔ عشق سے سرمایۂ راحت — تم پھول میں پیدا خلشِ خار نہ کرتے
منظور نہیں مجھ کو تنک ظرفیٔ منصور — دنیا پہ عیاں حالِ دلِ زار نہ کرتے

اتنا بھی نہ تھا مادۂ ضبط جو تم میں
بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے

آسی صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں "یہ غزل "نذرِ عشق" کے عنوان سے "آئینہ" اگست ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی۔ تلمیح طلب معلوم ہوتی ہے۔" "مگر" محتسب را درونِ خانہ چہ کار۔"

مجھے اب سے گیارہ برس پہلے کا زمانہ یاد آگیا، جب کہ میرا ادبی ولولہ جنوں کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور میں بڑی سرگرمی اور حوصلے کے ساتھ "ناہید" نامی ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی فکر میں کھانا پینا بھولا ہوا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ "ناہید" اگر نکلتا تو اس کا کیا مرتبہ ہوتا اور اس کا اثر بالآخر کیا ہوتا۔ مگر اب جب کہ وہ نہیں نکلا تو میں کہوں گا کہ وہ ایک تخیلی اکتساب تھا۔

چو وسعتِ عدمم در خیال می آید — ز تنگنائے وجودم ملال می آید

"ناہید" کی خبر میرے بعض کالج کے دوستوں نے ہر طرف اور بالخصوص لکھنؤ میں ببانگِ دہل

مشہور کر رکھی تھی اور میرے پاس بعض مضامین نظم و نثر کے چند لفافے آچکے تھے۔ ایک لفافہ کو کھولا تو وہ اسی "ظریفہ" کا تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ اس میں ایک تو یہی "نذر عشق" تھی جو اس سے پہلے "آئینہ" میں میری نظر سے گزر چکی تھی۔ اور مجھے زبانی یاد ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزیں بھی تھیں۔
یہ دو اشعار جو "آئینہ" میں چھپ چکے تھے:

ابھی تو طفلِ دبستاں ہو تم کو کیا معلوم — وفا وفا نہ کرو دہر میں وفا معلوم
جو کہہ رہا ہے دوائیں نہ کارگر ہوں گی — اسی کو خوب مرے دکھ کی ہے دوا معلوم

مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ امتیاز کے ساتھ میں ہفتوں ان اشعار پر سر دُھن چکا ہوں۔ ہم لوگوں نے بہت زور لگایا کہ مطلع کا پہلا مصرع کسی طرح بدل دیا جائے صرف اس لیے کہ "طفلِ دبستان" ایک عورت کی زبان سے کھٹک رہا تھا، لیکن مصرع اپنی جگہ اٹل رہا اور جب ہٹتا تھا تو شعر کا آہنگ بگڑ جاتا تھا۔ ان کے علاوہ میرے خط میں جو اشعار درج تھے وہ غالباً غیر مطبوعہ تھے۔ اس لیے کہ میری نظر سے کہیں گزرے نہیں۔ ایک تو خسروؔ کی غزل کے تین اشعار پر خمسہ تھا۔ دو میں فارسی مصرعے لگائے گئے تھے اور تیسرے میں اُردو۔ یہاں لکھنے والی کی نرالی آن بان ہے۔ بالخصوص فارسی اشعار ہیں۔ اُردو میں وہ بے ساختگی اور روانی پیدا نہیں ہو سکی۔

چہ شد اے جذبِ کامل بازنامد — چرا حل کردہ مشکل باز نامد
بہ شاہے رفتہ سائل بازنامد — صبا آمد و لے دل باز نامد
غریب ما بہ منزل باز نامد

بگویم قصۂ اندوہ گینے — خرابم در خیالے مہ جبینے
نہ دنیائے ہمیں دارم نہ دینے — دل من رفت با محمل نشینے
رود جاں ہم چو محمل باز نامد

تلافی محنتوں کی تھی ضروری — کہاں تک منزلِ مقصد سے دوری
ہوئی حاصل نہ جب تیری حضوری — بدریا غرق شد رخت صبوری
چو کشتی سوئے ساحل باز نامد

ان اشعار کی کیفیت کا وہی شخص اندازہ کر سکتا ہے جس کے دل میں خود کوئی کیفیت موجود ہو۔ میں نے اکثر اہلِ ذوق کے سامنے ان اشعار کو پڑھا ہے اور وہ دم بخود رہ گئے ہیں۔
آخر میں یہ اشعار تھے۔

دل لینے کی باتیں تھیں سب دل دے کر سب جان گئی — جاؤ بہت باتیں نہ بناؤ، جاؤ تمھیں پہچان گئی
آپ سراپا صدق و صفا ہیں آپ مجسّم عشق و وفا — دُھن کے پورے بات کے پکے مان گئی ہاں مان گئی

میں اس پُراسرار ہستی کو عرصہ سے بھولا ہوا تھا۔ لیکن آج آسیؔ کے تذکرہ نے اس کی یاد تازہ کر دی اور میں نے ڈھونڈ کر اس کا خط نکالا اور وہ ہستی کوئی بھی ہو مگر ہے بڑی ہٹی ہوئی۔ میں نے صرف ایک بار اس کا پتا لگانے کی کوشش کی۔ اتنا تو اُس کے خط میں لکھا تھا کہ وہ لکھنؤ میں عورتوں کے کالج میں پڑھتی ہیں "ظریفہ" والدین کے درمیان تھا اس لیے غالباً اس کا اصلی نام یہ نہ تھا اس کے بعد مجھے

معلوم ہوا کہ وہ شاید لکھنؤ چھوڑ کر الٰہ آباد چلی گئی۔ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء میں اپنے الٰہ آباد کے قیام میں میں نے اس کی تلاش کی مگر مجھے سخت ناکامی ہوئی۔ آسی بھی اس بارے میں عاجز رہے اور اس کا نام ونشان نہ بتا سکے۔ ایسی ہستی کا روپوش رہنا اور پھر یک قلم غائب ہوجانا بے انتہا عبرت ناک ہے۔ میں عورتوں کی شاعری اور ادبیت کا کچھ زیادہ قائل کبھی نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی عورت ایسے شعر کہہ سکے تو اس کو صرف شاعری کرنا چاہیے۔

جو اشعار پیش نظر ہیں ان سے ایک بات کا تو بہت صاف پتا چلتا ہے۔ یعنی یہ عورت بے انتہا نقد گو واقع ہوئی ہے اور یہ دلیل ہوتی ہے جذبات کی واقعیت اور ان کے خلوص کی جو کبھی طوالت اور تکلف کی تاب نہیں لا سکتے۔ بیان میں جو سادگی اور سہولت پائی جاتی ہے وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہستی نے اگر زندہ رہتے ہوئے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے تو اس نے یقیناً اپنی فطرت پر بہت بڑا ظلم کیا۔ ایک بات کسی قدر حیرت انگیز ہے۔ "نذر عشق" میں جو پندار غرورِ حسن پایا جاتا ہے۔ اس کا شائبہ بھی دوسرے اشعار میں نہیں ہے۔ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ "نذر عشق" کو تقدم زمانی حاصل ہے اور وہ اس دور سے پہلے کی چیز ہے جس کو شکستگی اور رنجوری کا دور کہنا چاہیے۔ لیکن اس دور کے جو اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں شعریت بہت زیادہ ہے۔ میں اس تذکرہ کو نہ بڑھانا چاہتا تھا اور نہ بڑھانے کے سامان مہیا رکھتا۔ اتنی خواہش ضرور ہے کہ اگر کسی کو اس عورت (جس کو کسی طرح "ظریفہ" کہہ کر پکارنے کو جی نہیں چاہتا) کا نام ونشان معلوم ہو تو وہ مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان سے کچھ اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور خود ان کی نظر سے یہ مضمون گزرے تو مجھے اپنا پتا دینے میں تامل نہ کریں، یہی نہیں بلکہ ایوان کے لیے کچھ اور کلام بھیجیں۔

چلتے چلتے میں ایک اور خیال کا بھی اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ عورت افسانے لکھنا شروع کردے تو شاید بہترین افسانہ نگاروں میں ہوجائے۔ مگر پھر خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے جذبات کی انتہائی واقعیت شرح وبسط کی اجازت نہ دے اور فسانہ میں شعر کے مقابلہ میں زیادہ شرح وبسط تو ماننا ہی پڑے گا۔ بہر حال مجھے اس عورت کا پتا درکار ہے۔

(بہ شکریہ قومی زبان)

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

غزل نما — ادا جعفری — ۷۵/-
سازِ سخن — // — ۴۵/-
ترجمۂ قرآن — پروفیسر بشیر الحق — ۸/-
تحقیقی مضامین (تحقیق) مالک رام ۶۰/-
باتیں کچھ سریلی سی (سوانح ماہرینِ موسیقی) داؤد رہبر ۳۶/-
خسرو نامہ (تحقیق) مجیب رضوی ۲۱/-
تعلیم و تربیت اور والدین (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵۱/-
کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) جگن ناتھ آزاد ۷۵/-
پتھر بولے چھن..... (ڈرامے) عتیق حنفی ۴۵/-
ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر ۳۳/-
دائروں میں پھیلی لکیر (شعری مجموعہ) کشور ناہید ۳۰/-
آنکھ میں سمندر (شعری مجموعہ) زاہدہ ڈار ۳۰/-
تذکرہ (ناول) انتظار حسین ۵۴/-
ذرے کی کہانی (سائنس) مہدی جعفر ۲۱/-
حیاتِ جامی (سوانح) مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات (خطبہ) پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۸/-
نقشِ ذاکر (مضامین) مرتب: عبداللطیف خاں ۵۱/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ) شمس الرحمٰن محسنی ۵/-
دنیا کے بڑے مذہب (علمی) عمادالحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۳۵/-
تعلیم اور رہنمائی (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۵/-
رسم اردو کیسے پڑھائیں (تعلیم) معین الدین ۱۵/-
یادوں کا اجالا (آپ بیتی) بھگوان سنگھ/مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات (مضامین) مرتبہ: عمادالحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

پشکن کے دیس میں (سفرنامہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
آنکھ اور خواب کے درمیان (شعری مجموعہ) ندا فاضلی ۲۱/-
سدا بہار چاندنی (افسانے) رام لعل ۳۰/-
دل دریا (افسانے) شرون کمار ورما ۲۵/-
رنگ نمبر (انشائیے) شفیقہ فرحت ۱۶/-
رات کے مسافر (شعری مجموعہ) مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
زوال کا عروج (ڈراما) بریخت مترجم: انور عظیم ۳۶/-
اثبات و نفی (تنقیدی مضامین) شمس الرحمٰن فاروقی ۴۰/-
مالک رام ایک مطالعہ (مجموعہ مضامین) مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
فی الحال (مزاحیہ مضامین) یوسف ناظم ۱۸/-
حرف حرف روشنی (شعری مجموعہ) حمایت علی شاعر ۳۵/-
فرار (ناول) ظفر پیامی ۶/-
تین چہرے تین آوازیں (افسانے) صالحہ عابد حسین ۱۸/-
نقدِ حرف (تنقیدی مضامین) پروفیسر ممتاز حسین ۴۰/-
گدازِ شب (شعری مجموعہ) معین احسن جذبی ۴۰/-
سرسید کی تعلیمی تحریک (روداد) اختر الواسع — مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد ۲۵/-
گفتارِ غالب (مضامین) مالک رام ۴۸/-
تعلیم اور اس کے وسائل (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
تحفۃ السرور (آل احمد سرور پر مضامین) مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی ۵۰/-
غالب اور صفیر بلگرامی (تحقیق) مشفق خواجہ ۳۶/-
جائزے (تبصرے) مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ (مجموعہ مضامین) مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
مجھے گھر یاد آتا ہے (ڈرامے) شمیم حنفی ۲۱/-
رسول اکرم اور یہود حجاز (علمی) سید برکات احمد۔ ترجمہ بشیر الحق ۴۰/-
تاریخ انگلینڈ (ایک مختصر خاکہ ۱۴۸۵ء-۱۹۰۱ء) (خاکہ) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-
محبوب الارث (علمی) مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
دردِ دل (افسانے) تعارف۔ قرۃ العین حیدر۔ ستار جعفری ۱۸/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیب یعنی دین اور فنونِ لطیفہ) مرتبہ۔ عمادالحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

☆☆☆

شیخ سلیم احمد
150, Basti Hazrat Nizamuddin
NEW DELHI-13

نئے مسیحا کا جنم

(رونمائی کی تقریب میں پڑھا گیا)

جگدیش چترویدی کو تجربوں کا شاعر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں بہت سے تجربے کیے ہیں۔ ہندی شاعری میں وہ اکویتا NON-POETRY تحریک کے بانی کہے جاتے ہیں۔ موصوف کی ذات متنازع فیہ بھی ہے۔ وہ نئی تشبیہات کے استعمال اور اپنے اچھوتے انداز بیان کے لیے بھی مشہور ہیں۔ شاعروں کی بھیڑ میں انھوں نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ صنف نازک سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ صرف شاعری کی حد تک ہی نہیں عملاً بھی۔ شاعری تو زندگی کا آئینہ ہے۔ جگدیش چترویدی کے تازہ ترین مجموعہ کلام "نئے مسیحا کا جنم" پڑھ کر ان تمام دعووں کی تائید ہو جاتی ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ اپنے کو چھپا نہیں سکتا۔ لیکن اگر کوئی لفظوں کی شعبدہ گری کرنے لگے تو اسے لفظوں کے بیچ ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے مگر جگدیش چترویدی تو دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں۔ بعض معاملات میں تو وہ مُنہ پھٹ معلوم ہوتے ہیں۔

پھول۔ خوشبو اور عورت قدرت کے حسین تحفے ہیں جو حسن کی علامت ہیں۔ پیغمبروں کو بھی یہ چیزیں پسند تھیں۔ بعض اوقات شاعری پیغمبری کے درجہ پر فائز نظر آتا ہے۔ وہ بھی اکثر قدرت کے ان حسین تحفوں سے دل بہلاتا ہے۔ جگدیش چترویدی ایک حساس انسان اور اچھے شاعر کی طرح پھول۔ خوشبو اور عورت سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ دراصل یہ تینوں چیزیں ایک ہی سچائی کے تین روپ معلوم ہوتے ہیں۔ خوشبو کہو کہ پھول، وہ بھی عورت ہی کے روپ ہیں۔ خاص طور پر جگدیش کی شاعری میں یہ تینوں چیزیں ایک ہی ذات میں گڈ مڈ نظر آتی ہیں اور وہ ہے عورت کی ذات۔ کسی نے کہا ہے کہ زندگی ایک چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جگدیش کے یہاں عورت کی اہمیت چاند پھول اور خوشبو سب سے زیادہ ہے۔ وہ زندگی اور کائنات کا ادراک عورت کے وجود کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ بدلتے آکاش کے رنگ ہوں یا پریم کویتائیں یا نئی سنسکرتی کا جنم۔ بیٹے کو لندن کے سفر پر رخصت کرنے کا موقع۔ اسپتال میں بیماری کی تکلیف اور درد یا فطرت کے حسین مناظر سے لطف اندوزی کا وقت یا خودکشی کرنے کی ذہنی کیفیت۔ ان سب حالتوں میں خوبصورت عورت کی مختلف تصویریں ڈوبتی واُبھرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی محبوبہ خیالی پیکر بھی نہیں ہے۔ وہ گوشت پوست کی عورت ہے جس کا وہ بوسہ لے سکتے ہیں جس کے کچے دودھ کی مادک گندھ اور جسم کے لمس سے تلذذ حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا جگدیش عورت کو محض ایک بھوگ

کی چیز سمجھتے ہیں۔ برنی کی ڈلی یا حلوے کا لقمہ۔ یا ان کے پاس کوئی سوچا سمجھا نظریہ ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اس بات کے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ عورت جسم سے ماورا بھی شے ہے۔ قرآن کی زبان میں عورت مرد کا لباس ہے۔ اس کی ناموس وعزت ہے۔ اسے کھیتی قرار دیا ہے اور مرد کی طاقت وقوت کا سرچشمہ بتایا ہے SUSTAINER OF MAN جگدیش کی شاعری میں ہمیں عورت کا یہ روپ بھی نظر آتا ہے۔

عورت کے تعلق سے ان کے نظریات کچھ بھی سہی، وہ نہایت بیباکی دایمانداری سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا حسن بھی ہے۔ روحانیت کی بلند ترین منزل تک پہنچنے کے لیے بھی جسم کے راستے سے ہو کر جانا ناگزیر ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں میں آج بھگوان رجنیش کافی مشہور یا بدنام ہے۔ بہت سے مذہبی پیشواؤں نے بھی اس کا پرچار کیا ہے۔ جگدیش بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مرد عورت کے بغیر نہ صرف یہ کہ نامکمل ہے بلکہ وہ نجات کا ذریعہ بھی ہے۔ جگدیش تمام دوسرے رشتوں میں مرد اور عورت کے درمیان جنسی رشتہ کو ہی سب سے بڑا اور اہم تصور کرتے ہیں۔

پریوار کا ایک لمبا جنگل، دوستوں کے اندھیرے میں ڈوبے چہرے
اور تمہارا اداس چہرہ کتنا اجلا ہوا اٹھا ہے میرے کندھوں پر
کہ تمام رشتے میرے من میں سنیاسی کی طرح نکت ہو گئے ہیں विरक्त
نراسکت۔ निरासक्त

وہ اپنے جنسی تعلق کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو بھی اپنے بڑھاپے کے معاشقوں پر ہنسی اڑانے کی اجازت دیتے ہیں اور خود بھی اپنے بیٹے کی محبوباؤں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی عورت کا جنسی تعلق بھی انھیں بے معنی لگتا ہے۔ عورت محض مدی کی ڈلی نہیں، زہر بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جذباتیت کی روایت کو سب سے پہلے سقراط نے ختم کیا کہ زہر کا پیالہ پینے اور انقلاب لانے کے لیے عورت کو اپنے وجود سے خارج کرنے کا مشورہ دیا۔ جگدیش اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قلم اور تندرستی دو چیزیں زندہ رہیں گی اور دونوں چیزوں کی حفاظت کے لیے "کئی نسل کی خبردار عورتوں" سے بچ کر رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں یہ جھنجھلاہٹ اور بیزاری ان کے احساس شکست کا اظہار ہے۔ اصل میں جگدیش کا نظریۂ محبت واضح نہیں ہے۔ وہ صنف نازک کے تعلق سے بھول بھلیوں میں بھٹکتے نظر آتے ہیں۔ یہ صرف ان کا ہی المیہ نہیں "چار پریم کویتاؤں" میں اپنے نظریات کو زیادہ واضح کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی چار پریمیکاؤں میں سے ایک ماں بھی ہے ایک محبوبہ کو وہ پران جل یعنی امرت پلانے والی کہتے ہیں۔ تیسری کو داہنا ہاتھ یا قوت بازو (دا نگک اکشمتا) اور جو تھی محبوبہ ان کی سمبھاونا ہے جو مستقبل کی تعمیر میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ آلنگم اور بوس وکنار والی عورتوں کے بیچ ایک دوست وہمدم کی تصویر بھی ابھرتی ہے وہ اس عورت کو بھی درشاتے ہیں جس کے ہاتھ میں پرچم ہے اور جو ملک کی تعمیر و ترقی میں مرد کی شریک ہے۔

کھلیں گے ریشمی پھول اور لوتیاں بھدر ولیوہار سے
سڑکوں پر چلیں گی پریم کے ساتھ ساتھ دلشنی کو پریرنا دینے

مگر شاعر کا دکھ یہ ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی اور مشینوں نے انسان کے لطیف جذبات

کو ختم کر دیا ہے اور وہ محبت کی سچی خوشی سے بھی محروم ہو گیا ہے اور اس کا پیار مشین کی طرح بے رس ہو کر رہ گیا ہے۔

نیتر رنگ عورتوں کی کھالوں کے کپڑے پہن کر
وگیان آدسکار میں دلیست ہے
اور عورت کی نابھی کے نیچے
شو نیہ میں مالونیت
اسنبھن آکار گھڑنے میں سنگلن
مجھے دیگانکوں سے
ساہتیہ کاروں سے
تمام نامرد پریمیوں سے ساہالو ہوتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جگدیش کے یہاں عورت سے محبت کا یہ سرچشمہ کہاں سے پھوٹتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ کیا بچپن کی محرومیاں اس کے پیچھے کارفرما ہیں۔ اسے لگتا ہے اسے کسی نے پیار نہیں کیا۔ گھر کا وشاکت واتاورن اور پتا کی خوفناک آواز سے وہ کھنچ جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ نتانت اکیلا ہے۔ اسا ہے اور سوپن جیوی۔ وہ ہر عورت میں ماں کا پیار پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ وہ ماں بچپن میں جس کے پیار سے وہ محروم ہو گیا تھا۔ یا شاید وہ جوانی میں کسی محبوبہ کا سچا پیار پانے میں ناکام رہا ہے وہ پیار جو ہر جوان اور تندرست مرد کا حق ہے۔ اسی لیے تو ان کے یہاں محبت کی اس درجہ پیاس ہے۔ عورت کا قرب پانے کی اتنی شدید تڑپ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ عمر بھر سے "برہ" کی آگ میں جلتا رہا ہے۔ جنسی جذبہ کی تسکین مرد کو عورت سے بے نیاز کر رہی ہے۔ کیا یہ جنسی ناآسودگی کا نتیجہ ہے کہ جگدیش چتروبدی آج بھی عورت کے پیچھے بھاگ رہا ہے؟

جگدیش کی شاعری میں عورت کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں ۴ ابواب ہیں اور یہ اس کی زندگی کے چار رنگوں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندو مذہب میں زندگی کو چار ATAGES میں تقسیم کیا گیا ہے۔ برہمچریہ۔ گرہست۔ ون آشرم اور سنیاس۔ جگدیش نے بھی زندگی کو چار حصوں میں بانٹنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ برہمچریہ ہو یا ون آدستھا یا سنیاس ہر اسٹیج میں بھوگ کرنے یا بھوگ کا ارمان لیے ہی نظر آتے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ ان کی خودنوشت سوانح بھی ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی جدوجہد کو بیان کیا ہے۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ وہ سماج میں ہو رہی بے انصافیوں اور ظلم سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ کمزوروں اور غریبوں کا استحصال بھی انھیں تکلیف پہنچاتا ہے۔ اس کتاب میں ان کے وطن کی سوندھی خوشبو بھی ہے۔ مالوے کا سنگیت ان کی ایک بہت خوبصورت نظم ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ انسان زمین کے جس ٹکڑے پر جنم لیتا ہے اسے کبھی بھی بھول نہیں پاتا ہے۔ وہاں کی مٹی کی خوشبو اور ہوائیں درختوں کے ہیولے (آکار) ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی تصویریں۔ گھر کی وہ تاریک کوٹھری جہاں اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ آنگن جس میں وہ گھٹنوں کے بل رینگتا تھا بچپن کے کھیل۔ بالو کی ریت۔ اپنے گانو کے تالاب اور دریا سب اس کے حواس پر چھائے رہتے ہیں۔

مالوہ جو جگدیش کا وطن ہے یوں بھی تاریخ اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ مالوہ صدیوں سے اپنی خوشگوار آب و ہوا کے لیے مشہور رہے۔ ایک دفعہ باہر گجرات کی مہم پر جاتے ہوئے مالوہ سے گزرا تھا تو وہاں کی آب و ہوا پر مرمٹا اور وہیں خیمے نصب کر دیے۔ مالوہ ہندستان کا مرکزی نقطہ (مادھیم ہندو) ہے۔ شاعر اُجین میں کالی داس کی سندریوں کو یاد کرتا ہے۔ پھولوں کے گجرے پہنے نوجوان مالنیاں اور کیلے کے پتوں پر ریشمی لباس پہنے۔ مٹھائی کھانے سادھوؤں کی قطاریں اس کے ذہنی پردہ پر ابھرتی ہیں۔ وہ بھرتری ہری کی گپھا کو یاد کرتا ہے۔ مالوہ جہاں کا پلکوں کے مٹھ ہیں۔ چرس اور گانجا میں مست سادھو ہیں جو اسے یاد آتے ہیں۔ یہ سب شاعر کو آج کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ مالوے کی راتوں کے حسن کو یاد کرتا ہے جن راتوں پر باج بہادر اور روپ متی کبھی جان چھڑکتے تھے۔

اتہاس ساکشی ہے یہاں کے سرووروں میں کمل کھلتے ہیں
اور بھوک سے کوئی بھی یہاں نہیں مرتا
یہاں کی مٹی سونا بکھیرتی ہے
اور یہاں کی دھرتی کنوریوں اور اپسراؤں کی
کھلکھلاہٹوں سے گونجتی ہے

اس کتاب کی پہلی نظم ساکشاتکار میں وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں جھانکتے دکھائی دیتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ دراصل اس کے چاروں طرف جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ خود اس کے اندر چھپے زہر کی پرچھائیاں ہیں۔

جگدیش نے نئی تشبیہات کا بھی استعمال کیا ہے۔ جیسے شہرت کا تازہ کباب اسے تھالی میں پروسا گیا۔ دیش کی ریڑھ کی ہڈی میں سوراخ۔ کندھوں پر ٹوٹے ہوئے وشواس، آنکھوں میں جلتی چھپکلیاں رات کے ہر پردے میں میں نے اپنی آنکھیں کاٹ کر چپکا دی ہیں وغیرہ جیسے محاورں کا استعمال جگدیش کی شاعری میں زبان کا نیا چٹخارا پیدا کرتا ہے۔

یہ سب رنگ ہمیں جگدیش کی شاعری میں بکھرے نظر آتے ہیں جو بھلے بھی لگتے ہیں لیکن سب سے گہرا رنگ ایک ہی ہے۔ باقی سب رنگ پھیکے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر اشتہاری کمپنیوں کا تصور اُبھرتا ہے کہ سگریٹ کا اشتہار ہو یا نرولک بینٹس یا ہوائی جہاز کا۔ یا ٹاٹا کی چائے ہو۔ یا ٹی۔ وی۔ خوبصورت لباس پہنے۔ ناز و ادا دکھاتی ہوئی اشتہار کے کسی نہ کسی گوشہ سے ایک خوبصورت عورت ضرور جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
4170, URDR BAZAR.
DELHI-110006.

شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا (حالیؔ)

"گھر میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا ہوں۔ باہر کیا نکلوں اور کہاں جاؤں۔ اگر کبھی باہر نکلتا ہوں تو نگاہیں دلی کو ڈھونڈتی ہیں مگر دلی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔"

یہ الفاظ ہیں اس مقدس باکمال علمی ادبی تاتاریخی ہستی کے جس کو ہم سب مولانا مفتی حفیظ الرحمان واصف دہلویؒ کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۰ء (۱۱ فروری) میں فقیہ اُمت ابوحنیفہ ہندی مفتی اعظم مولانا کفایت اللہؒ کی گود میں آنکھ کھولی۔ اور اسی گہوارۂ علم وادب چمنستانِ شعر وسخن یعنی شاہجہاں آباد کی روح افزا فضاؤں میں پرورش اور تربیت پائی۔ دہلی کے اہم تاریخی کوچہ "کوچہ چیلان" میں عمر کا خوشگوار ترین حصہ، بچپن اور لڑکپن گزارا۔

کوچہ چیلان اس وقت دہلی کا مدینۃ الحکمت بنا ہوا تھا۔ حضرت مفتی اعظمؒ۔ مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعیدؒ سحبان الہند، مُلّا واحدی، آصف علی بیرسٹر وغیرہ جیسے یکتائے روزگار حضرات حکیم مومن خان کے اس کوچہ کو رونق بخش رہے تھے اور ملک وملت اور مذہب وادب کی جلیل القدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ اور ان بزرگوں کے دم سے یہ کوچہ مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ اس علمی تہذیبی ماحول میں مولانا واصف دہلویؒ کی تربیت ہوئی تھی۔ اسی فضا میں ان کی ہمہ جہت شخصیت کی ساری صلاحیتیں ابھر کر منظر عام پر آئیں۔ مولانا کی شخصیت مشرقی تہذیب وتمدن اور ان اقدار کی علامت تھی جن پر دلی والوں کو ناز تھا۔

مولانا واصف دہلوی نے جن ہستیوں کی صحبتوں سے فیض اٹھایا وہ سب وہ تھے کہ اب ان کا ثانی شاید ہی چشم فلک کو دیکھنا نصیب ہو۔

مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مفتی اعظمؒ کی نگرانی میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ عربی فارسی زبان وادب علم عروض، علم حدیث، وفقہ کی باقاعدہ متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔ علم حدیث، علوم قرآنی، فقہ، افتا، تاریخ اسلام فلسفہ ومنطق وغیرہ منقولات ومعقولات کے علاوہ آپ علم عروض اور عربی فارسی ادب کے ماہر اور اردو زبان ولغت کے فاضل ومستند اہل زبان محقق تھے۔

محترم قبلہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:۔

" وہ (مولانا واصف دہلوی) بلاشبہ عربی فارسی اور اردو تینوں علوم میں خاکِ دہلی کے

آخری فرزند تھے اِن کے بعد ان علوم کے جوہر شناس اور جامع شاید ہی اٹھیں۔"

حضرت مولانا واصف دہلویؒ عالم دین تھے، مفتی تھے، مورخ تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، محقق و نقاد تھے غرض کہ ان کی ہستی میں قسّامِ ازل نے بے شمار علوم کو سمو دیا تھا۔

تعلیم مکمل ہونے کے بعد جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو سب سے پہلے محکمۂ تعلیم دہلی میں عربی ٹیچر مقرر ہوگئے۔ پھر حضرت مفتی صاحب کے حکم سے ملازمت چھوڑ کر کتب خانہ رحیمیہ دہلی کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ اور ۱۹۵۲ء میں جب حضرت مفتی صاحب کی وفات ہوئی تو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ حضرت مولانا احمد سعیدؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ اکابر نے باالتفاق مولانا واصف دہلویؒ کو مدرسہ امینیہ دہلی کا مہتمم بنادیا اور مولانا ۱۹۷۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

پھر حضرت مولانا مدرسہ کے اہتمام سے مستعفی ہوکر سبکدوش ہوگئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اب ان کا واحد مشغلہ یادِ الٰہی اور خدمتِ علم وادب تھی۔

آزادی سے پہلے مولانا کی شخصیت جن اعلا قدروں کی آئینہ دار رہی تھی آزادی کے بعد بھی ان بیش بہا قدروں کی امانت دار رہی۔ البتہ آزادی کے بعد جو تہذیبی اور سماجی تبدیلیاں ہوئیں ان کو مولانا نے قبول کرنے سے انکار کیا۔ وہ دنیا جس کی امتیازی خصوصیات کو اپنی شخصیت میں سمو کر جو ایک تہذیب و ثقافت اور علم وادب کی وضعدار علامتی ہستی تیار کی تھی وہ دنیا اب بالکل بدل چکی تھی۔ اس کا تذکرہ ان کی تخلیقات میں جا بجا ملتا ہے۔

اب کہاں واصف ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سربسر خوابِ پریشاں ہوگئیں

جناب جمیل مہدی مرحوم رقم طراز ہیں:۔

"وہ اس خانوادۂ علم و شریعت کے چشم و چراغ تھے جس نے ۱۸۵۷ء میں اُجڑنے والی دہلی کو از سرِ نو سجانے اور بہاروں سے آراستہ کرنے میں حصہ لیا تھا اور ایک پورے تمدن کی تباہی کے بعد اس کے ملبہ سے نئی اور دلآویز عمارت تعمیر کرنے کی ہمت دکھائی تھی۔"

حضرت مولانا واصف دہلوی کی جامع العلوم ہستی میں ان بزرگوں اور اہلِ علم حضرات کے اوصافِ حسنہ کی جھلک نمایاں تھی جن کے دم سے دلی عالم میں انتخاب قرار پائی اور دلی کہلائی۔ جہاں آپ کی آنکھوں نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی شان و شوکت دیکھی تھی وہیں حضرت مفتی اعظم کی سادہ مگر رعب و دبدبہ والی زندگی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ آپ نے حضرت سائل دہلوی کی صحبتوں میں اپنے ذوقِ شعر کو آسمانِ سخن کی بلندیوں پر پہنچایا اور خواجہ حسن نظامی کی بزم آرائیوں میں بھی شریک ہوئے۔ آپ کے کانوں میں اب بھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا آزاد اور مولانا احمد سعید دہلوی کی شعلہ بار تقریریں گونج رہی تھیں۔

آپ نے تحریکاتِ آزادی کے ہنگاموں میں آنکھ کھولی۔ جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ جنگِ آزادی کے بڑے بڑے سپہ سالاروں مولانا آزاد، مفتی کفایت اللہ، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا احمد سعید وغیرہ کی

ملاقاتیں اور جہد آزادی کی سرگرمیاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔

ڈاکٹر انصاری کی محبت، حلم وبردباری ان کو یاد آتی اور رلاتی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید کی شفقتیں وہ بھول نہ سکتے تھے۔

تحریک سول نافرمانی کے دور میں باغیانہ تقریریں کرنے کے جرم میں ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو حضرت مفتی کفایت اللہ کی پہلی گرفتاری عمل میں آئی اور پھر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں جب آپ ۱۱ر مارچ ۱۹۳۲ء کو جلوس لے کر آزاد پارک ٹاؤن ہال پہنچے تو وہاں تقریر شروع بھی نہ کی تھی کہ نہتے عوام پر لاٹھی چارج کرکے آپ کو دوسری بار گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا عبدالحلیم، ماسٹر ہلال احمد زبیری اور حضرت مولانا واصف صاحب نے جنگ آزادی کے جلیل القدر سپہ سالار کو گھیرے میں لے لیا اور لاٹھیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ مولانا واصف کے شانے میں اس شدت کی چوٹ آئی کہ کئی ماہ میں درد کی تکلیف کم ہوئی۔

تقسیم ملک نے ان کو بہت رنج پہنچایا تھا۔ فرماتے ہیں

اے ہم نشیں وطن کی مرے داستاں نہ پوچھ
لوٹا ہے کس نے آہ! مرا آشیاں نہ پوچھ

اب اجنبی وہ ہوئے جن سے چاہ تھی دل کو
گئے وہ جن سے کبھی رسم و راہ تھی دل کو

علمی و ادبی کارنامے:

حضرت مولانا واصف دہلوی کا سب سے اہم علمی و دینی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے فقہ احناف کا ایک انمول خزانہ یعنی فقیہ امت مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہؒ کے ساری دنیا میں منتشر فتاویٰ کو یکجا ترتیب دے کر "کفایت المفتی" کے نام سے محفوظ کر دیا۔ تاکہ شریعت کے دقیق و نازک مسائل پر مبنی عالمانہ و مجتہدانہ فتاویٰ سے جن کو شرعی و فقہی مسائل کی تحصیل کے لیے سند کا درجہ حاصل ہے، تشنگان علم دین سیرابی حاصل کرتے رہیں یہ کتاب نو ضخیم جلدوں میں ہے ملت بیضا پر آپ کا یہ احسان عظیم بھلایا نہ جا سکے۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی فرماتے ہیں:۔

"عربی فارسی اردو کے علاوہ لسانیات، عروض اور قواعد پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ میں نے ان کی کتاب "اردو مصدر نامہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان موضوعات کی طرف جانے سے سنگلاخ وادیوں میں بھٹک جانے کا ڈر رہتا ہے مگر مولانا نے جس خوش اسلوبی سے اس وادی کو طے کیا ہے یہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔"

نواب سائل دہلوی کے سوانح مولانا نے "تذکرۂ سائل" کے عنوان سے عقیدت مندوں کے سامنے پیش کی۔ اور اب تک سائل صاحب کا مطبوعہ کلام جو دستیاب ہوتا ہے (مختلف رسائل کے علاوہ) وہ بھی "پارۂ کشکول" کے نام سے مولانا نے ہی شائع کیا تھا۔

حضرت نوح ناروی نے مولانا کے کلام پر پیش لفظ میں تحریر فرمایا:۔

"میں نے بیشتر مولانا کا کلام ان کی زبان سے بھی سنا اور رسالوں میں بھی دیکھا

میں کہہ سکتا ہوں کہ علاوہ غیر معمولی ذہنی قابلیت کے انھیں شاعری میں خاص دخل ہے اور یہ ایک ممتاز شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔"

مولانا واصف دہلوی نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ غالباً فارسی میں ابتدا کی۔ مجموعۂ کلام "زرگل" میں صہ ۸ پر جو فارسی حمد درج ہے اس پر نوٹ لکھا ہے۔ "یہ نظم میری پہلی شاعری ہے۔" اردو میں پہلی شاعری جو شائع ہوئی وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں کہی گئی ہے۔ جو سہ روزہ الجمعیۃ میں چھپی تھی۔

مسیح الملک جو سدرہ نشینِ عزم و ہمت تھا
سحابِ فیض کو وہ استقامت بحرِ حکمت تھا
پیاپے آرہی ہے یہ صدا شہرِ خموشاں سے
جو قابل ناز کے تھی لٹ گئی رونق گلستاں سے

جنوری ۱۹۲۸ء میں حضرت سائل دہلوی سے رشتۂ تلمذ قائم ہوا اور یہ ربط سائل صاحب کی وفات تک باحسن وجوہ قائم رہا۔ آخر میں جب نواب صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے تب بھی روزانہ شام کو رکشا پر بیٹھ کر اردو بازار میں مولانا کے کتب خانہ رحیمیہ مرحوم پر تشریف لاتے رہے۔

مولانا واصف دہلوی نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"راقم الحروف نے آنکھ اس وقت کھولی جب کہ دلی مرحوم کے باعظمت و مقدس آثار میں سے کچھ تھوڑے سے بچے کھچے اور اجڑے پجڑے آثار باقی رہ گئے تھے۔ شہر شاہجہان آباد کا اجڑا ہوا کھنڈر عظمتِ رفتہ کا پتا دے رہا تھا۔"

(دلی والے۔ مرتبہ ڈاکٹر صلاح الدین)

انھیں آثار میں سے دلی کے گلی کوچوں میں ہونے والے مشاعرے بھی تھے۔ ان مشاعروں میں سائل و ساحر و زار و بیخود و کیفی جیسے اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں سے ایک مشاعرے میں مولانا واصف دہلوی نے پہلی مرتبہ شاعر کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ سولہ سترہ سال کی عمر اساتذہ کے سامنے غزل پڑھنے میں مولانا کو ذرا ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی تو استاذ محترم حضرت سائل نے اپنے ارشدِ تلامذہ کی غزل خود پڑھ کر سنائی۔ اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ۱۹۴۵ء میں نواب سائل دہلوی کی وفات ہو گئی تو سفینۂ داغ کے ایک اور ناخدا حضرت نوح ناروی سے بھی کچھ مشورہ سخن کیا۔

جن لوگوں نے مولانا کو جوانی کے زمانے میں مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے دیکھا اور ان کو سنا ہے وہ بتاتے ہیں کہ اول تو شعر زبان و بیان، محاورہ، بندش، مضامین، فصاحت و بلاغت اور فنی اعتبار سے اعلا درجہ کا ہوتا تھا اور اس پر یہ کہ منفرد دلکش ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ بار بار فرمایش ہوتی تھی، کئی کئی غزلیں سنی جاتی تھیں۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں اب چند اصحاب ہی باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، خواجہ محمد شفیع، کیف بھوپالی پنڈت گلزار دہلوی، جناب عزیز وارثی وغیرہ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

آزمایش گہہ غم میں دلِ نازک کو نہ لا — کہ زرِ گل نہیں ہوتا کبھی معیارِ طلب

اے میری حسرتو! ابھی سو جاؤ رات ہے یہ آہ کی چمک ہے نمودِ سحر نہیں

کیا بہار اور کیا خزاں واصف نظر کا کھیل ہے لی جہاں انگڑائی دل نے موسمِ گل آ گیا

مرے سر پھوڑنے کو موج بوئے گل ہی کافی ہے نہیں جوشِ جنوں وابستۂ دیوار و در اپنا

نہ پوچھو مجھ سے لیکن کیا مجھے دل سے بھلا دوگے کسی کی یاد مٹ جائے کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

ستارے یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری مرا ہر اک قدم خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

وفا ثابت ہوا اس بے مروّت کا خیال بے تکلف آ گیا خلوت میں دل بہلا گیا

تلاش بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں سمجھ لیتا جو خود کو بن ہی جاتا بیکراں اب تک

منافی تھا یہ اے منصور دستورِ امانت کے کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھ دینا

کسی کا نام آتے ہی مہک اٹھتے ہیں صحرا بھی بہاریں مسکراتی ہیں نظارے جگمگاتے ہیں

راہ طلب میں خوب نظر دیکھ کے دیے جلاؤ لیکن بہ ہر قدم ہے ضرورت رسول کی
واصف اگر نہیں ہے تمھیں تاب انتظار خود کو مٹا کے دیکھ لو صورت رسول کی

مولانا کو اردو زبان و لغت کے مسائل، الفاظ کی اصل، لسانیات و قواعدِ زبان پر انتہائی عبور حاصل تھا۔ وہ لغت و زبان کے ماہر اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھنے والے تھے۔ اِن علوم پر اِن کی جیسی دقیق نظر بہت کم لوگوں کی ہوتی ہے۔ ان کی اس دقّت نظر اور وسعتِ مطالعہ کا مظہر ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب "ادبی بھول بھلیاں" اور وہ لسانی ادبی شعری تحقیقی مقالات ہیں جو رسالہ "نگار"، "آج کل"، "برہان"، "کتاب نما"، اور "ہماری زبان" وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو مصادر کے عربی، فارسی مترادفات پر ایک "سہ لسانی مصدر نامہ" مرتب کیا۔

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ قرآن مجید کی ان آیات کا ترجمہ تفسیر و شرح کر کے "قرآنی پند نامہ" تحریر فرمایا جن کا تعلق آداب معاشرت سے ہے۔ مفتی اعظم کی شہرۂ آفاق کتاب "تعلیم الاسلام" کو نظم کیا اور "درس الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔ حضرت مفتیٔ اعظم کی سوانح حیات سے متعلق ایک کتاب "مفتی اعظم کی یاد" مرتب کی۔

حضرت مولانا مورخ بھی تھے۔ اور تاریخ میں علمی تحقیق کے مانند دیانت سے کام لیتے تھے۔
جمیعۃ علما کی تاسیس کی تاریخ اور اس میں حضرت مفتی اعظم کے مرکزی کردار پر "جمیعۃ علما پر ایک تاریخی تبصرہ" لکھا۔ مدرسہ امینیہ دہلی کی تاریخ پر ایک مستند رسالہ تصنیف کیا جو متعدد بار طبع ہوا۔ مدرسہ حسین بخش دہلی کی تاریخ پر جو رسالہ حضرت مولانا نے تحریر فرمایا اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر دستیاب نہیں ہو سکا۔ "اردو مصدر نامہ" کا مقدمہ از خود ایک مستقل اہمیت کا حامل تاریخی مقالہ ہے۔
علاوہ ازیں مختلف مذہبی مسائل پر بھی "مطلقہ کی شرعی حیثیت" اور عقیدہ اور رواداری" وغیرہ رسالہ تحریر کیے اور شائع کرائے۔
حضرت مولانا واصف دہلوی کی وفات پر جمیل مہدی صاحب مرحوم نے "برہان" میں طویل اداریہ لکھا تھا۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> " جگر مرادآبادی کے بعد مولانا واصف ہی اردو کے ایسے شاعر تھے جو خوشنویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور جن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے خطاط اور خوشنویس ہوتے۔ انھوں نے خوش نویسی نہ صرف اپنے والد سے ورثہ میں پائی تھی بلکہ مشق اور محنت کے ذریعہ اس میں استادانہ مہارت بھی حاصل کی تھی "!

خوشنویسی میں آپ منشی عبد الغنی کے شاگرد تھے۔ جو اپنے والد اور استاد منشی ممتاز علی کے واسطہ سے اعلیٰحضرت ظفر بہادر شاہ کے شاگرد تھے۔ مولانا کے خط نسخ و نستعلیق دونوں میں استادانہ شان تھی وہ تفریح طبع کے لیے طغرے تحریر فرماتے تھے۔ اور یہ عادت تھی کہ اپنی تصانیف کے سرورق خود اپنے ہی قلم سے تحریر فرمائے ہیں:
استغنا و خودداری، حلم و بردباری، امانت و دیانت، حق گوئی و حق شناسی آپ کے خصوصی اوصاف تھے۔ فرماتے ہیں:

میں بے نیاز تھا اس واسطے رہا معتوب
وہاں انھیں تھی ضرورت نیازمندوں کی

۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء بروز جمعہ بوقت عصر علم و حکمت، عرفان و آگہی کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ ایک یگانۂ روزگار باپ کا فخر روزگار بیٹا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دہلی سے اس کا مایۂ ناز سپوت چھن گیا۔ اور محفل داغ کے ایک انمول چراغ کی لو تھرتھرا کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ جامع العلوم حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی کا سفینۂ حیات زندگی کے گرداب سے نکل کر ساحل رحمت پر جا لگا۔ اور وہ ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر گلستان شاہ ولی اللہ میں جا سوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زمانہ ہلکا سا خاکا نہ لے سکا جن کا
نقوش دست قضا نے مٹائے ہیں کیا کیا

سیفی سرونجی

SAIFEE LIBRARY
SARONJ
(M.P.)

بات کچھ بھی نہ ہو پھر بھی یونہی جلتے رہنا
اس کو آتا ہے فقط رنگ بدلتے رہنا

میں چلا پار سمندر کے مری ناؤ لیے
تم مگر دوستو بس ہاتھ ہی ملتے رہنا

کیا کرے بات کوئی امن و اماں کی اس سے
کام جس کا ہو فقط زہر اُگلتے رہنا

تم چلے آئے میاں عشق کی راہوں میں مگر
مشورہ ہے یہی میرا کہ سنبھلتے رہنا

غم نہیں مجھ کو اگر پائی نہ منزل اب تک
کام بس میرا تو دن رات ہے چلتے رہنا

خوشتر مکرانوی

NOOR BULKHI MANZIL
MAKRANA-341505

زمین منقسم تجھ پر کھڑا ہوں!
نظر کی حد تلک پھیلا ہوا ہوں

بہت محتاط ہو کر سانس لینا
عبادت گاہ کا روشن دیا ہوں

دعاؤں کے لفافے کھل چکے ہیں
فرشتوں کے لکھے سے ڈر رہا ہوں

تمھیں بتلائے گی اولاد میری
میں اپنا عکس ہوں یا آئینہ ہوں

جہاں کو ہے مرے گھر کا تجسس
مگر میں اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہوں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیّدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدر الدین الحافظ
ناول نگاری کا جائزہ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۔/-

سلام بن رزّاق
11/9, L.I.G.,
V.Bhave Nagar,
Kurla (W),
BOMBAY - 400070.

خبر (افسانہ)

" وہ چاروں ٹیلی ویژن پر نظریں گڑائے بیٹھے تھے۔ ٹیلی ویژن سے حسب معمول خبریں ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھیں۔ مگر انھیں جس خبر کا انتظار تھا وہ خبر ابھی نہیں آئی تھی۔

" خبریں ختم ــــــ اب آپ ماسٹر راجا رام سے ٹھمری سنیے "

چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں سوالات حبابوں کی مانند تیر کر ڈوب گئے۔

" بند کرو یار! " ایک نے اکتا کر کہا۔

" برسوں سے یہی باتیں، سنتے آئے ہیں " دوسرا برہمی سے بولا۔

" ٹی وی، ریڈیو، اخبار، سب ہز ماسٹرز وائس کی تفسیریں بن گئے ہیں سالے "

تیسرا تلخی سے بولا۔

" یار تم لوگ تو خبروں کو سیریسلی SERIOUSLY لیتے ہو " چوتھا ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ تینوں چپ ہو گئے۔

ماسٹر راجا رام ٹھمری سنا رہا تھا " کب تک توری باٹ نہاروں "

چاروں تھوڑی دیر تک ٹھمری سنتے رہے۔

" میں کہتا ہوں بند کرو اسے " پہلے نے قدرے چڑ کر کہا۔

" یار ٹی وی بند کر دیں اور اس بیچ وہ خبر نشر ہو گئی تو ـ ؟ "

" مگر کب نشر ہوگی وہ خبر ــــ ہم لوگ کب سے انتظار کر رہے ہیں "

" خبر ہے کہ آج رات کسی بھی وقت نشر ہو سکتی ہے "

" یہ بھی تو خبر ہی ہے نا " چوتھا پھر طنزیہ ہنسی ہنسا۔

تینوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

" تم سالے بات بات پر ہنستے کیوں ہو ؟ ارسطو نے کہا ہے کہ بلا وجہ ہنسنے والا احمق ہوتا ہے "

" یار ارسطو کا نام مت لو، یہ شخص مجھے بالکل پسند نہیں "

" کیوں ؟ "

"کیوں کیا ؟ زندگی بھر سکندر کو درس دیتا رہا اور اسے بھی ریڈیکل RADICAL نہ بنا سکا۔
"مگر اس کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ بلا وجہ ہنسنے والا احمق ہوتا ہے۔"
"اچھا ـــــ یہ بات ہے تو پھر بتاؤ مونا لیزا کیوں ہنسی تھی ؟"
"کون مونا لیزا ؟"
"ارے وہی لیونارڈو والی ـــــ"
"سالے وہ ہنسی نہیں مسکرائی تھی۔"
"ہنسی اور مسکراہٹ میں کیا فرق ہے ؟"
"مہذب لوگ مسکراتے ہیں اور غیر مہذب لوگ ہنستے ہیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی ـــــ
"کیا ہم لوگ مہذب ہیں ؟"
"تو کیا ہم لوگ مہذب نہیں ہیں ؟"
"تمھیں یقین ہے کہ ہم لوگ مہذب ہیں۔"
"کیوں نہیں میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ ہم لوگ مہذب ہیں۔"
"تم جانتے ہو یقین کا تعلق علم سے زیادہ جہالت سے ہوتا ہے۔
"اس کے باوجود میں وثوق سے کہتا ہوں کہ ہم لوگ مہذب ہیں۔"
"اچھا تو یہی جملہ ایک اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دستخط کر سکتے ہو ؟"
"کون سا جملہ ؟"
"یہی کہ ہم مہذب ہیں۔"
"کیا بکواس کر رہے ہو۔"
"کیوں ؟ اگر تمھیں یقین ہے تو لکھ کر دینے میں کیا حرج ہے۔"
"نہیں۔ حرج تو نہیں۔ مگر ـــــ دیکھو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ تقریباً مہذب ہیں۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں اپنے بیان پر کامل یقین نہیں ہے۔"
"خیر ـــــ چلو لکھ دوں گا۔ مگر دستخط نہیں کروں گا۔"
"آ ہا ہا ـــــ میں نے کہا نا کہ تمھیں یقین نہیں ہے۔"
راجا رام گا رہا تھا ـــــ "کب تک توری باٹ نہاروں۔"
"یار تی وی بند نہیں کرتے تو کم از کم آواز تو دھیمی کر دو۔"
"تمھیں کیا تکلیف ہو رہی ہے ؟"
"ہماری باتوں میں خلل ہو رہا ہے۔"
"تم سالے باتیں ہی کون سی کام کی کر رہے ہو۔"
"بہرحال راجا رام کی ٹھمری سے زیادہ کار آمد ہیں۔"
"یار آخر ہم کب تک یہی ٹھمری سنتے رہیں گے۔ میں تو بور ہو رہا ہوں۔"
"بھائی یہ اس خاندان کی پسندیدہ ٹھمری ہے۔ راجا رام سے پہلے اس کی ماں بھی یہی ٹھمری گاتی تھی اور

ماں سے پہلے اس کا باپ ...."

"مگر حد ہے یار، سالا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے یہی ٹھمری سنتا آیا ہوں۔"

"مجھے شک ہے۔"

"کس بات پر؟"

"یہی کہ تم نے واقعی ہوش سنبھالا ہے۔"

"میں کہتا ہوں ہم لوگوں میں سے کسی نے بھی واقعی ابھی تک ہوش نہیں سنبھالا ہے۔ ذرا سوچو تو اگر ہمیں ذرا بھی ہوش مندی آتی تو آج ہم کہاں ہوتے۔"

"کہاں ہوتے؟"

"کم از کم جہاں ہیں وہاں تو نہ ہوتے۔"

"ارے ہم کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہوتے۔"

"یہ کہنے کی نہیں سوچنے کی بات ہے۔"

"تو آؤ سوچیں۔"

"ذرا ٹھہرو پہلے اس خبر کو نشر ہو جانے دو۔ اس کے بعد سوچیں گے۔"

"مگر تمہیں یقین ہے کہ آج وہ خبر نشر ہونے والی ہے۔"

"بالکل۔"

"مگر کب؟"

"ارے یار جہاں اتنی دیر انتظار کیا ہے۔ تھوڑی دیر اور کرلے۔"

"وہ تو کرنا ہی ہے۔ مگر پتا نہیں مجھے کیوں یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ خبر نشر ہوگی۔"

"تم تو پیدائشی بدگمان ہو۔"

"اتنے غچّے کھائے ہیں سالے کہ خوش گمانی کی ہوا نکل گئی ہے۔"

"خیر انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"مگر یہ پانچواں سوار بھی ابھی تک نہیں آیا ہے۔"

"ہاں اسے بھی گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی۔"

"آج ڈرائی ڈے ہے۔ اسٹف ڈھونڈنے میں دیر ہوگئی ہوگی۔"

"اب بلیک میں ہر چیز ہر وقت ہر جگہ دستیاب ہے۔"

"اس کے باوجود نہ ملے تو؟"

"پھر وہی بدگمانی۔"

"نہیں، وہ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہے۔ کہیں نہ کہیں سے لے کر ہی آئے گا۔"

"ہاں اس سے پہلے بھی ایسے موقعوں پر اس نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔"

"اس نے کہا تھا وہ آنے والی خبر کی تصدیق بھی کرتا آئے گا۔"

"ارے خبر جب ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہونے والی ہے تو پھر تصدیق کا کیا سوال؟"

" مجھے تو اب بھی شبہہ ہے "

" اب کی اگر تم نے شبہے کی بات کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ منحوس کہیں کے۔"

" ابے دیکھو، گالی مت دو "

" ورنہ تم کیا کر لو گے "

" بتاؤں "

" ہاں ___ ہاں ___ بتاؤ ___"

" ارے، رے، تم لوگ تو سچ مچ لڑنے لگے۔ یار بدشگونی مت کرو۔ دیکھو برسوں سے جس کا ہمیں انتظار تھا آج وہی خبر آنے والی ہے۔ اور تم لوگ آپس ہی میں جھگڑ رہے ہو "

" ہم اس خبر کا کب سے انتظار کر رہے ہیں ؟ "

" ابھی شام سے "

" نہیں کل سے "

" نہیں ایک برس سے "

" شاید پانچ برس سے "

" نہیں بیس برس سے "

" غلط چالیس برس سے "

" سو برس سے "

" ہزار برس سے "

" دس ہزار برس سے "

" یارو چپ کرو۔ انسان کی زندگی محض پانی کا بلبلا ہے۔ اور تم لوگ صدیوں اور قرنوں کی باتیں کر رہے ہو "

" آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں "

" یہ کون بولا "

" میں ___ "

" بھی تو سالے سادھو سنت ہونا چاہیے تھا۔ فرار چاہتے ہو۔ زندگی سے مقابلہ کرنا سیکھو "

" کر تو رہے ہیں مقابلہ ___ مگر کب تک ؟ "

" جب تک زندگی باقی ہے "

" زندگی ہی کے تعلق سے کہہ رہا ہوں۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں "

" مگر یہ خبر ابھی تک کیوں نہیں آئی ؟ "

" مجھے تو ذرا بھی یقین نہیں ہے "

" کس بات پر ؟ "

" کہ خبر آئے گی "

"قسم خدا کی میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا۔"
"تم لوگ پھر لڑنے لگے۔ چلو ایک دوسرے سے ہاتھ ملاؤ۔"
"ابے کیوں ملائیں ہاتھ؟"
"لڑائی بھڑائی اچھی چیز نہیں ہے وہ بھی آپس میں۔"
"ہم تو مذاق کر رہے تھے۔"
"نہیں یار ــــ لڑائی مذاق میں بھی اچھی چیز نہیں ہے۔"
"چپ بے گاندھی بیا۔"
"ابے وہ، ٹی وی کا کان مروڑ۔ یہ سالی ٹھمری ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔"
"دیکھ کہیں سیکنڈ چینل سے وہ خبر ٹیلی کاسٹ نہ ہو جائے۔"
"تم تو اس وثوق سے کہہ رہے ہو۔ جیسے اس خبر نامے پر تم خود مہر تصدیق ثبت کر کے آئے ہو۔"
"آخر تمھیں یقین کیوں نہیں آتا۔"
"آخر تمھیں یقین کیوں آگیا؟"
"تم نے خدا کو دیکھا ہے؟"
"نہیں۔"
"مگر تمھیں اس پر یقین ہے نا؟"
"تم سے کس نے کہا کہ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔
"تو کیا تم خدا پر یقین نہیں رکھتے۔"
"یہ خدا کا اور میرا معاملہ ہے۔ تمھیں کیوں بتاؤں؟"
"یار و کیوں فالتو بحث میں پڑے ہو۔ چلو شغل کے طور پر پتے کھیلتے ہیں۔"
"تاسغس کہاں ہے؟"
"وہ دیکھو وہ کتاب کے پیچھے رکھی ہے ذرا ہاتھ بڑھا کر اٹھا لو۔"
"ٹھہرو بانٹنے سے پہلے پتے گن لو۔ پتا نہیں پتے پورے بھی ہیں کہ نہیں۔"
"پتے تو پورے ہیں مگر اس میں جوکر نہیں ہے۔"
"جوکر نہیں ہے تو کھیل میں کون سی رکاوٹ پڑ جائے گی۔"
"رکاوٹ تو نہیں پڑے گی۔ مگر جوکر کے بغیر کھیل میں مزہ نہیں آتا۔"
"ایسا کرتے ہیں انھیں پتوں میں سے کسی کو جوکر بنا لیتے ہیں۔
"کس کو بنائیں؟"
"دُگی کو۔"
"کیوں سالے سب سے چھوٹا پتہ دیکھا اور جو چاہا بنا دیا۔ یہ ناانصافی ہے بلکہ ظلم ہے۔"
"پھر چھکے کو بنا دو۔"
"لاحول ولا...... یہ کیا بدذوقی ہے۔"

"ارے اس میں بدذوقی کی کیا بات ہے۔"
"ایک تو چھکا اوپر سے جوکر ــــ کریلا اور نیم چڑھا ــ"
"تو پھر ستا، اٹھا، نہلا، دہلا کسی کو بھی بنا دو۔"
"کیوں نہ غلام کو بنا دیں۔"
"نہیں یہ استحصال ہے۔"
"تو پھر رانی؟"
"نہیں اس میں نسوانیت کی ہتک ہے۔"
"بادشاہ ــ"
"ہاں ۔ آج سالے بادشاہ کو جوکر بنا دیتے ہیں۔"
"تو پھر بادشاہ کس کو بنائیں گے؟"
"غلام کو ــ"
"آہا ۔ مزہ آ جائے گا۔"
"پھر رانی کا کیا ہو گا؟"
"رانی کا کیا ہونا ہے ۔ عورت راجا کے پاس رہے کہ رنک کے پاس، ہر حال میں رانی ہی رہتی ہے۔"
"یہ بات تو صحیح ہے۔"
"ابے کیا صحیح ہے۔ ذرا فارس روڈ پر جا کر دیکھ رانیوں کی حالت کیا ہے۔"
"تو اپنی سوشیالوجی بگھارے گا کہ تاش کھیلے گا۔"
"یار پتے بانٹو۔ کب سے تاش پھینٹ رہے ہو۔"
"یہ لو۔"
"ابے تو نے کیا پھینکا؟"
"کیا پھینکا اسپیڈ کا بادشاہ۔"
"بھول گیا اب یہ بادشاہ نہیں جوکر ہے۔"
"اوہو ساری یار ــــ"
"ایک منٹ پہلے کی کہی ہوئی بات یاد نہیں رہتی اور خود کو بقراط سمجھتے ہو۔"
"تم اپنی رانی سنبھالو میاں ــــ یہ دیکھو بادشاہ۔"
"تم نے پھر جوکر پھینکا۔ اب یہ بادشاہ نہیں جوکر ہے جوکر۔"
"لاحول ولا قوۃ۔"
"یار یہ سیدھا سماجی نفسیاتی مسئلہ ہے۔"
"کون سا؟"
"یہی بادشاہ اور جوکر والا۔"

"یعنی ؟"

"برسہا برس سے جسے بادشاہ سمجھتے آئے ہیں۔ اسے بیک لخت جوکر کیسے سمجھ لیں۔"

"بات تو تمھاری درست ہے۔"

"اب اس احمق کو دیکھو۔"

"کیا ہوا ؟"

"ابے کون سا پتہ پھینک دیا ؟"

"غلام ــــ لال پان کا غلام۔"

"سالے، نئے کھیل کے مطابق اب یہ غلام نہیں بادشاہ ہے۔"

"اوہو، بھول گیا تھا۔"

"کیا بھول گیا تھا۔ تم لوگ کبھی نہیں سدھرو گے۔"

"یار، ہمارے نئے کھیل میں رانی جوں کی توں ہے۔ اس کی حیثیت کو بھی بدل دینا چاہیے۔"

"میں نے کہا تھا نا ــــ عورت کو کسی بھی حیثیت میں رکھو وہ عورت ہی رہتی ہے۔"

"میں تم سے متفق نہیں ہوں۔"

"عورت کو جب بھی موقع ملا ہے اس نے مرد ...."

"مگر عورت کو موقع دیتا کون ہے ؟ خود مرد نا ــــ"

"اسی لیے تو عورت کو مرد کی کمزوری کہا گیا ہے۔"

"تم لوگ پھر حکیم جالینوس کے زمانے کی بحث کرنے لگے۔"

"یار مجھے تو اب واقعی تشویش ہونے لگی ہے۔"

"کس بات کی ؟"

"اسی خبر کی یار ــــ پتا نہیں آتی بھی ہے کہ نہیں۔"

"اچھا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ اس خبر کے آتے ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"

"نہ صرف ٹھیک ٹھاک بلکہ سب کچھ بدل جائے گا۔"

"مجھے تو اب بھی شبہہ ہے۔"

"کس بات کا ؟"

"یہی کہ اس خبر کے آتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔"

"یار تاش میں بھی مزہ نہیں آرہا ہے۔"

"حالاں کہ ہم نے کھیل میں کافی تبدیلی کرلی تھی۔"

"غلام کو بادشاہ اور بادشاہ کو جوکر بنادیا تھا۔"

"آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم لوگ ہر تبدیلی سے جلد اکتا جاتے ہیں۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ......"

"آدمی کو تو جنت بھی زیادہ دن راس نہیں آئی۔"

"تم بڑی دقیانوسی باتیں کرتے ہو یار۔"
"چھوڑو یار ــــــ یہ بتاؤ اب تاش نہ کھیلیں تو کیا کریں۔ وقت کیسے گزاریں۔"
"کمبخت پانچویں نے بھی کافی دیر لگا دی۔ شراب آجاتی تو یہ تو بوریت ختم ہوجاتی۔"
"آخر کہاں رہ گیا ہوگا یہ کمبخت۔"
"میں نے کہا نا وہ خبر کی تصدیق کرکے ہی لوٹے گا۔"
"مگر وہ خبر آنی ہوتی تو اب تک ٹیلی ویژن پر آچکی ہوتی۔"
"یار تمھیں اس خبر کے آنے کا صحیح وقت بھی پتا ہے۔"
"صحیح وقت ؟ یں بالکل صحیح وقت کا تو پتا نہیں۔ مگر آج رات میں کسی بھی وقت آسکتی ہے۔"
"تو پھر بیٹھے رہو انتظار کرتے ہوئے۔ اتاولا پن کیوں کا مظاہرہ کر رہے ہو۔"
"مگر کیا سچ مچ اس خبر کے آتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔"
"ہوسکتا ہے۔"
"تم سب لوگ تشکیک کے خوفناک مرض میں مبتلا ہو۔"
"اچھا چلو فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خبر آگئی پھر کیا ہوگا؟"
"کیا ہوگا۔ ارے میں نے کہا نا کہ سب کچھ بدل جائے گا۔"
"ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ کیا بدلے گا۔"
"ٹھیک ٹھیک کیسے بتاؤں کہ کیا بدلے گا۔ کیوں کہ ٹھیک ٹھیک تو مجھے بھی نہیں معلوم۔"
"تم کنفیوژن کا شکار رہو۔"
"سالے تم نے مجھے کنفیوژڈ کر دیا۔"
"نہیں کسی نے کسی کو کنفیوژڈ نہیں کیا۔ مجموعی طور پر ہم سب ایک زبردست کنفیوژن کا شکار ہیں۔"
"شاید اس خبر کے آتے ہی ہمارا کنفیوژن دور ہو جائے۔"
"یہ بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔"
"پھر ہمیں اس خبر کا انتظار کیوں ہے ؟"
"شاید یہ بھی خود فریبی کی ایک صورت ہو۔"
"آخر ہم کو خود فریبی کے آکٹوپس سے کب نجات پائیں گے۔"
"مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے۔"
"تمھارا کسی نے منہ دبا رکھا ہے کیا؟"
"تم نے کیا پوچھا تھا۔"
"آخر ہم خود فریبی کے آکٹوپس سے کب نجات پائیں گے۔"
"میں کہتا ہوں۔"
"ابے جلدی بک کیا بکتا ہے۔ خواہ مخواہ سسپنس کریٹ کر رہا ہے۔"
"ایک بار پھر بتانا تو تم نے کیا کہا تھا۔"

" تیری ایسی کی تیسی ۔ سالے فضول میں بکواس کر رہا ہے "۔

" میں بتاتا ہوں ۔ اس نے کہا تھا آخر ہم خود فریبی کے آکٹوپس سے کب نجات پائیں گے "۔

" جب ہم خبروں کا انتظار کرنا چھوڑ دیں گے "۔

" کیا بات ہوئی "۔

" وہاں کچھ نہیں ہو سکتا جہاں لوگ محفوظ چہار دیواریوں میں بیٹھے صرف خبروں کا انتظار کرتے رہتے ہیں "۔

" پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟ "

" ہمیں خود خبر بن جانا چاہیے "۔

" ہمیں خود خبر ——— کیسے ؟ تمھارا مطلب ہے ہمیں خود ...... "

" بالکل ——— ہمیں خود "۔

" تم تو بڑی خطرناک بات کہہ رہے ہو "۔

" یہ تو خون خرابے والی بات ہے "۔

" مجھے تو بارود کی بو آرہی ہے "۔

" مجھے تو چاروں طرف آگ ہی آگ دکھائی دے رہی ہے "۔

" تم نے تو ہمیں تشویش میں ڈال دیا "۔

" پھر تم چاہتے کیا ہو "۔

" دراصل ہم بھی وہی چاہتے ہیں جو تم چاہتے ہو ۔ مگر ہم وہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے جو کرنا چاہتے ہیں "۔

" سالے فلسفے نے تمھارا کباڑا کر دیا ہے ۔ کبھی ڈائریکٹ بات نہیں کروگے ۔ ہر بات فلسفے کے پردے میں "۔

" چھوڑو یار ——— کم بخت ابھی تک نہ خبر آئی نہ اسٹف آیا "۔

" ارے آگیا ——— آگیا ——— "

" آہا اپنا پانچواں یار آگیا "۔

" کہاں رہ گئے تھے یار ——— انتظار کرتے کرتے ہم لوگ آدھے رہ گئے "۔

" پہلے بتاؤ اسٹف لے آئے ؟ "

" ہاں ——— "

" تھرے "۔

" اور خبر کا کیا ہوا ؟ خبر آگئی ——— ؟ "

" ہاں خبر تو آگئی "

" وہ مارا "

" خبر آگئی ——— پھر تم اتنے اداس کیوں ہو ؟ "

" یار خبر تو آگئی ——— مگر یہ وہ خبر نہیں ہے جس کا ہم سب کو انتظار تھا ۔ " ●

شعری مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
اندرونم	نورالحسن ہاشمی	۱۵/-
الہامات سرمد (سرمد کی فارسی رباعیوں کا اردو ترجمہ)	محمد مشتاق شارق	۲۰/-
ارمغانِ کندن	کندن لال کندن	۳۰/-
ایک چراغ اور	دھرم پال عاقل	۳۵/-
ابر فید	رباب رشیدی	۳۵/-
اثاثہ منصور	سید نذر الحسن قادری	۶/-
انگلیوں سے خون	سید علی ظہیر	۲۵/-
افکار صبا	قاسم صبا جمیل	۲۰/-
آہنگ	اسرار الحق مجاز	۲۰/-
آتش سیال	ساجدہ زیدی	۸/-
آئینہ در آئینہ	عزیز قیسی	۴/-
ایک تبسم ایک نظر	جاوید وششٹ	۶/-
بکھری زمیں	نواب دہلوی	۲۰/-
بند دروازے پر دستک	راج کھیتی	۳۰/-
باز یافت	محبوب راہی	۲۵/-
بولتی کنکریاں	سہیل احمد زیدی	۲۰/-
باقیات شہباز	سید صابر حسین	۲۵/-
بزم و رزم فطرت	ڈاکٹر سید عبدالمجید	۱۲/-
بوتے سمن	مسعودہ حیات	۲۰/-
بہتا پانی	احمد وصی	۱۵/-
زخم در زخم	خضر برنی	۵۰/-
سر و سامان	اختر الایمان	۱۰۰/-
سمندر پھر بلاتا ہے	عرفی آفاقی	۲۰/-
پیغمبرانِ سخن	علی سردار جعفری	۴۰/-
ملن کی آس	شمس فرخ آبادی	۱۵/-
لمعات نور	کلیم سیوہاروی	۱۰/-
موسم زرد گلابوں کا	شاہد میر	۲۵/-
جامِ فیروزاں	بشیر الہ آبادی	۲۵/-
مصرع ثانی	شجاع خاور	۵۰/-
طلسم سفر	شام رضوی	۲۰/-
وادین	شجاع خاور	۲۵/-
گرد بار	عزیز قیسی	۳۰/-
شمیم	شمیم جے پوری	۲۰/-
مثنوی زہر عشق	مرتبہ: امیر حسن نورانی	۶/-
پچھلے موسم کا پھول	مظہر امام	۵۰/-
ہندستان ہمارا۔ اوّل، دوم	جاں نثار اختر	۲۰/-
نوائے بلبل	مرتبہ: سردار علی خاں	۸/-
دیوان رضا عظیم آبادی	مرتبہ: قاضی عبدالودود	۱۰/-
معرکہ کربلا	الم مظفر نگری	۲/-
دیوانِ حضور	مرتبہ: مختار الدین احمد	[illegible]
بزم خیال	سیدہ فرحت	[illegible]
ید بیضا	ساحر بھوپالی	[illegible]
شہر خوں آشام	شمیم حنفی	[illegible]
متاع کلیم	کلیم احمد آبادی	[illegible]
ماتم سالک	جگن ناتھ آزاد	[illegible]
ذوق سفر	غلام ربانی تاباں	[illegible]
ضبط شدہ نظمیں	مرتبہ: خلیق انجم، مجتبیٰ حسین	[illegible]
سمندر آشنا	خالد محمود	[illegible]
جوئے شیر	آنند نرائن ملا	[illegible]
ہم اور ہمارے رسولؐ	مولانا ظفر علی خاں	[illegible]
سفینہ غزل	عروج زیدی	[illegible]
سبزۂ گفتار	یعقوب عامر	[illegible]
دست زلیخا	سلمیٰ جاوید	[illegible]
خوابوں کے گلاب	پرکاش ناتھ پرویز	[illegible]
شبنم شبنم	حسنیٰ سرور	[illegible]
رقص نوا	رضا امروہوی	[illegible]
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	[illegible]
لمحوں کی خوشبو	ڈاکٹر تنویر علوی	[illegible]

شمس فرخ آبادی
SEHRU MANZIL,
GOLA GANJ,
LUCKNOW.(U.P.)

"مراکوّ"

وہ اپنے کمرے میں تالا ڈال کر کوریڈور میں رکھے سامان پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے سوچنے لگا، کہ کوئی چیز بھول تو نہیں گیا ہے۔ تب ہی کمپاونڈ کے باہر کھڑے رکشا والے کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت اس کی بیوی ڈائننگ روم میں ٹی۔ وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں محو تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــــ میں جا رہا ہوں، دروازہ بند کر لو! ـــــ جسے سن کر اس کی بیوی نے وہیں سے جواب دیا۔ تمھارا ٹفن بوکس، پانی کی بوتل اور کافی کا تھرماس کھانے کی میز پر رکھا ہے۔ اسے مت بھول جانا۔ اتنا کہ کر وہ ایک جوشیلی سی آواز میں چیخی ـــــ وہ مارا چھکّا!!

جسے سن کر بڈھا آرٹسٹ، بڑبڑاتے ہوئے اپنا سامان اٹھانے لگا ـــــ اڑا تو دیا چھکّے چوّوں سے پانچوں کلاؤں کو جس میں دیش دھرم اور دھرتی کی سگندھ رچی بسی تھی۔ جس کی بدولت ہی دنیا میں کبھی کچھ سر بھی اونچا تھا۔ تب ہی تو عیار اور حاسد دشمنوں نے سب ہی کو کھیل پر لگا کر، صحت اور جسم کی تلعہ بندی کا خواب تو دکھایا، مگر اس میں بسنے والی روح کو بے یار و مددگار ہی کر دیا ـــــ کب تک بچیں گے یہ تاج محل، اجنتا، پرانے گرنتھ اور گائیگی۔ اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تو آنے والا دور ہی بتائے گا کہ کیا کچھ کھویا ہے، اور کیا پایا ہے!!

وہ اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے اپنے سامان کو کاندھے پر اٹھائے جب رکشا تک پہنچ گیا۔ تو اس نے اپنے سامان کو رکشا کے ہڈ پر احتیاط سے رکھ کر ان ساری باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہا، جو اس کی تخیل کو درہم برہم کر کے اس کے کام میں بھی رخنا سا بنی جا رہی تھیں ـــــ لیکن جب بھی اسے اپنی بیوی کی کوئی بات ناگوار گزری ہے تو اس کے طعنوں کی بازگشت سی ہونے لگتی تھی ـــــ "تم تو اپنے بیٹے کی شہرت، عزت اور دولت سے اس لیے حسد کرتے ہو کہ خود تم نے ایک بے مصرف سے کام کی خاطر ایک ناکام سی زندگی گزاری ہے۔ تم جانو بھی کیا نئے دور کے تقاضوں نئی روشنی کی اہمیتوں کو" ـــــ پگھلتے ہوئے سیسے کی مانند تپتے طعنے جب اس کے کانوں کی لوویں تک گرم کرنے لگتے تو وہ اپنی خیالی رو کو کسی اپنی زیرِ تکمیل تصویر کی جانب موڑ دیتا تھا۔ یوں بھی تصویروں کی ہونے والی نمائش میں وقت کم تھا۔ اس لیے وہ کسی عبادت کی سی یکسوئی کے ساتھ اپنی تصویر ہی کے خیال میں بھی غرق ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ کسی شاعر کسی ادیب کے فن پارے کی طرح اپنی تصویر کی ہر نوک پلک میں رنگ اور لکیر کے وسیلے سے ایک ایسی داستان سمو دینا چاہتا تھا۔

جو اس کے دیکھنے والوں کے افسردہ اور فکرمند دلوں کو دوا کی سی توانائی اور غذا کی سی تازگی بخش سکے۔ حالانکہ وہ ایک طویل عمر گنوا کر اپنی تصویروں کے نا آسودہ سے حالات کی بنا پر اب خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا تھا ___

اس کا رکشے والا رکشے پر لدی سواری اور سواری کے دل کے بوجھ سے بھی بے نیاز ہو کر، صرف اپنی بیوی بچوں کے گزارے کی فکر سے نبٹنے کے لیے اپنے رکشا کو بھگائے لیے چلا جا رہا تھا۔ ہچکولے کھاتے رکشا سے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پہیئے کی ایک آدھ تیلی ٹوٹ چکی ہو یا پھر اس کے پنکچر زدہ ٹیوب میں کوئی گانٹھ رکھا ہوا ہو۔ جس کی وجہ سے ناہموار سڑک کے کسی کھانچے میں رکشا کچھ اس طرح کھڑ بڑایا کہ ہڈ پر رکھے سامان کو بڈھا آرٹسٹ اگر اپنے دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیتا تو اس کی تصویر کے کینوس کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس کے ٹفن بوکس کا ہوا تھا۔ جس کے گرتے ہی اس کا کھانا نکل کر سڑک پر بکھر چکا تھا۔ جس کے لیے خود کو قصوروار سمجھتے ہوئے اس کا رکشے والا، سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو بوڑھے آرٹسٹ نے مسکراتے ہوئے کہا اسے سمیٹ کر ایک کنارے کر دو کوّوں، کتّوں، چڑیوں، چونٹیوں کے کہیں ہوٹل نہیں ہوتے۔ اور پھر اسے نوش جاں کرنے کی مجھے مہلت ہی کہاں ملتی۔ وہ تو میری بیوی مجھے کسی کے۔ جی کلاس کا بچّہ سا سمجھ کر یہ بوجھ مجھ پر اپنے کسی فرض کی خاطر زبردستی لاد دیتی ہے اتنا کہ کر پھر نہ جانے کسی خیال سے اس کی آنکھوں میں سچ مچ بچوّں کی سی چمک جاگ اٹھی۔ تو پھر وہ اپنے خیال کی بھول بھلیّوں میں کچھ ایسا گم ہوا کہ پھر تو اُسے پتا نہیں چلا کہ اس کا رکشا کب اور کیسے منزلِ مقصود تک پہنچا۔ رکشا کے رکتے ہی اپنا سامان اتار کر رکشا والے کو رخصت کرنے کے بعد وہ اس جگہ کو تلاش کرنے لگا جہاں بیٹھ کر اپنی اس تصویر کو بنا تا رہا تھا۔ وہ جگہ سڑک کے موڑ پر میل کے پتھر کے پاس ہی تھی۔ وہاں جا کر اس نے اپنی ایزل کو جما کر اس پر کینوس کے فریم کو رکھا پھر رنگ برش کے ڈبّے قرینے سے سجا کر، دور خلا میں گھورنے لگا۔ جہاں نیلگوں آسمان کے نیچے دو مختلف سی عبادت گاہوں کے سنہرے کلس جھلملا رہے تھے۔ انھیں کے درمیان کسی خمدار تلوار کی مانند ایک ندی خاموش پڑی تھی پھر اسی کے ساتھ کسی کھینچی ہوئی لکیر سا دہ خستہ سا سرخی مائل پل تھا جس کے دونوں سرے اپنی اپنی سمتوں کی گہرائی میں ڈوبتے چلے گئے تھے۔ اور ایک جانب کچھ نشیب میں ٹیلیفون کا ایک کھمبا پل کی جانب کچھ جھکا ہوا اونگھتا، ویران سا دکھائی دے رہا تھا۔ آرٹسٹ نے اس منظر سے ہٹ کر پھر اپنی ایزل پر رکھی پینٹنگ پر ایک نظر ڈالی۔ تو اس کے من وعن ہونے کا یقین کر کے وہ بچوّں کی سی خوشی سے اچھل پڑا۔ اب تو اُسے صرف ٹیلیفون کے کھمبے اور اس کی سوگواریت کی وجہ کے آخری منظر ہی کی تصویر کشی کرنا باقی تھی۔ اس نے اپنے سامان سے کاغذ میں لپٹا ایک پیکٹ اٹھایا۔ پھر ادھر ادھر کچھ دیکھ کر وہ ٹیلیفون کے کھمبے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے اطمینان تھا کہ ادھر سے لوگ کم ہی گزرتے ہیں۔ اس وقت تو سڑک کے موڑ پر رکھی پان کی گمٹی بھی سونی پڑی تھی، جس پر بیٹھا پان والا گاہکوں کے انتظار میں اونگھتا ہی رہتا تھا۔ کھمبے کے قریب پہنچ کر پیکٹ سے ایک مرے ہوئے کوّے کو نکالا، جس کے پنجے میں ایک مضبوط سی ڈور کا لنگر وہ پہلے ہی باندھ لایا تھا۔ اس نے اس لنگر کو گھماتے ہوئے کوّے کو کھمبے پر کچھ اس طرح اچھالا کہ وہ ٹیلیفون کے تاروں میں الجھ کر جھولنے لگا۔ تب اس نے بھی ایک اطمینان سانس کی اور اپنی

ایزل کے پاس آکر پلیٹ پر سیاہ سفید رنگ کھینچنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں کھمبے کے اردگرد ایک ایک کر کے کوّے منڈلانے لگے تھے۔ جن کی سوگ میں ڈوبی کاؤں کاؤں سے خاموش فضا کسی انجانے سے غم میں بوجھل سی ہوتی جارہی تھی۔ جس کے بعد اس کا برش بڑی تیزاور مہارت سے کبھی پلیٹ اور کبھی تصویر کے کینوس پر تھرکنے لگا تھا۔ وہ ان کے اضطراب کو ان کے غم کی تڑپن کو اپنے رنگ برش کے توسّل سے من وعن اپنی پینٹنگ پر منتقل کر دینا چاہتا تھا۔ پھر وہ اپنی اسی کوشش میں کچھ ایسا منہمک ہوا کہ اُسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا کہ سورج اس کے سر سے ہوتا ہوا کتنی دور جاچکا ہے۔ وہ تو تب ہی چونکا جب اس کے کانوں میں کسی بم کے دھماکے کی گونج کے ساتھ اس کے سارے جسم میں درد کا ایک کوندا سا لپک گیا، جس سے اس کی آنکھیں بھی مندتی چلی گئیں۔ پھر اسے کچھ نہیں معلوم کہ وہ اس مردہ جیسی کیفیت میں کب تک پڑا رہا۔ اسے تو جب کچھ ہوش آیا کچھ ایسا لگا کہ جیسے اس کا سارا جسم بے جان سا ہوچکا ہے۔ اور اس کے ہاتھ کسی لس دار گیلی مٹی میں لتھڑے ہوئے ہلنے جلنے سے بھی معذور ہیں۔ اس کی آنکھوں پر بھی اسی قسم کا لیس دار لیپ خشک ہو کر جم چکا تھا۔ تب اس نے اپنی ساری قوّت صرف کر کے اپنے تالو میں چپٹی خشک چمڑے جیسی زبان کو حرکت دینا چاہی جس سے اس کے پپڑیاں پڑے ہونٹوں پر ایک کمزور سی آواز لرزنے لگی تھی۔

مجھے بچالو .. .. میں تمہارا .. .. ایک بڑا .. .. .. چترکار ہوں .. .. ہوں:

اس کے لاشعور سے نکلی اس پکار کو اس کے اردگرد جمع ہوجانے والے تماش بینوں نے سُنا تو۔ مگر وہ سب کسی وسوسے کسی خدشے کی بنا پر صرف ایک دوسرے کا منہ تاکتے اور چہ میگوئیاں ہی کرتے رہے۔ کچھ لوگ تو لمحہ در لمحہ کو ٹھٹکتے اور وہاں پر جمع لوگوں میں سے کسی سے ایک آدھ سوال کرتے تو ان تماش بینوں میں سے ایک شخص پھر ایک کہانی سی دہرا دیتا۔

میں نے اپنی پان کی گمٹی سے ایک کار کو نکڑ کی طرف آتے دیکھا تو اس میں لگے ٹرانزسٹر میں رکٹ میچ کی کمنٹری آرہی تھی۔ وہ کار جیسے ہی نکڑ سے مڑی تو اس وقت کیپٹن رام ناتھ نے پھر ایک چوّا مارا تھا۔ جس کو سن کر کار چلانے والا بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر خوشی سے چیخا۔ تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کار اس بڈھے کو کچلتی دور چلی گئی۔

اپنی اسی نیم بیہوشی میں حادثے کی حقیقت جان کر اس بڈھے آرٹسٹ کے مردہ جسم میں زندگی کی ایک رمق ایک خواہش سی بیدار ہونے لگی تو پھر اس نے اپنی ساری طاقت یکجا کر کے مجمعے کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ہاں ...... ہاں .... میں اس کیپٹن رام ناتھ کا باپ ہوں: اتنا کہنے کے بعد اس کی آواز اس کے گلے میں رندھ سی گئی۔ تو مجمع کے لوگ بھی اس کی بات کو حیرت واستعجاب سے دہرانے لگے تھے۔ جسے سن کر ادھر سے گزرنے والے ایک کانسٹبل نے لوگوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ارے کوئی خود بھی جانتا ہے۔ یا اس کنگلے جیسے کے بیہوشی میں بکے جانے پر تم سب بھی کیپٹن رام ناتھ کا باپ کہے جارہے ہو۔

لیکن جب تفتیش کے طور پر بڈھے کی جامہ تلاشی لی گئی تو اس کی جیب سے جو پرس برآمد ہوا۔ اس میں " MYSON " کی عبارت کے ساتھ جو تصویر لگی تھی وہ تو کیپٹن رام ناتھ ہی کی تھی۔ جسے مل جھک کر لوگ حیرت سے دیکھنے لگے تو وہ کانسٹبل بھی پہلے تو کچھ اٹینشن سا ہوا پھر مجمع کو

اس بڑھے کی حفاظت کی تاکید کر کے خود قریب میں بنے بجلی کے ڈیوٹی روم کی جانب بھاگا۔ جہاں سے وہ اپنے آفیسرز کو اپنی کارگزدگی کی اطلاع فون پر دے کر جب واپس آیا تو اس کے کچھ ہی دیر بعد سڑک کے دونوں جانب سے پولس آفیسرز اور دوسرے حاکموں کی جیپس اور کاریں مع ایک ایمبولینس کے آچکی تھیں۔

دوبارہ جب اس آرٹسٹ کو ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی آرام دہ بستر پر ہے۔ مگر اس کے ہاتھ پانو، سر، آنکھیں سب پٹیوں کی گرفت میں ہیں اور اس کے قریب کسی سے کوئی کہہ رہا ہے۔

آپ تو بس دعا کیجیے۔ کوشش تو ہم کر ہی رہے ہیں، گورنر صاحب اور چیف منسٹر صاحب ٹھہر ٹھہر کر فون پر خیریت پچھوا رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہمیں ہدایتیں اور ہر طرح کی سہولتیں بھی مہیّا کی جا رہی ہیں۔ ہیلتھ منسٹر صاحب اور ان کا عملہ تو دس بجے رات کے بعد اٹھ کر گیا ہے۔ صبح تک دہلی سے بڑے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اور آجائے گی۔ ہمیں کیپٹن رام ناتھ جی کو کسی طرح کا کوئی غم نہیں پہنچنے دینا ہے۔ کیوں کہ وہ تو ملک کے وقار کو اونچا رکھنے کے لیے ہم سب کی عزّت کے لیے ہزاروں میل دور، جی جان سے کھیل رہے ہیں۔ صبح ہوتے ہی دیکھیے گا اپنے محبوب کھلاڑی کے پتاجی کی خیریت جاننے کے پرستاروں کا پھر ایک تانتا سا لگ جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب، کیا رام ناتھ کو اس کے پتاجی کے حادثے کی اطلاع دے دی گئی ہے؟

اس لرزتی سی آواز کو آرٹسٹ نے اپنے ہوش و حواس کی ناپختگی میں بھی بخوبی پہچان لیا تھا۔ وہ آواز اس کی بیوی بھانو ہی کی تھی۔ جس کے سوال پر ڈاکٹر اس سے کہہ رہا تھا ـــــــ نہیں ہمیں سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ جب تک ہم ان کے پتاجی کی حالت پر قابو نہ پالیں۔ کسی قسم کی کوئی خبر رام ناتھ جی کو نہ دی جائے۔ کیوں کہ میچ کو ابھی کئی دن، کئی ملکوں میں چلنا ہے۔

ڈاکٹر اس کی بیوی کو اس کے بیٹے کے حوالے سے مطمئن کر کے، اور چڑھنے والے خون کی بوتل کا معائنہ کر کے جب جاچکا تو اس بوڑھے آرٹسٹ کا دل اپنی بھانو سے کچھ بات کرنے کے لیے مچلنے سا لگا۔ کیوں کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی بے ہوش ہوجانے والی کیفیت سے اسے اندیشہ تھا کہ پتا نہیں پھر اُسے کب ہوش آئے یا نہ بھی آئے ـــ لیکن وہ اپنی گلوگیر آواز میں صرف بھانو ہی کہہ کر رہ گیا۔ جس کو سن کر اس کے بغل قریب بیٹھی اس کی بھانو، تڑپ کر اس کے کان کے پاس جھکتے ہوئے طرح طرح سے اس کی مزاج پُرسی کرتے ہوئے اُسے تسلّی دینے لگی تھی۔

جس پر وہ خود کچھ سنی ان سنی کیفیت میں پوچھ رہا تھا ـــــ میری وہ ادھوری پینٹنگ کہاں ہے؟ اور بھانو، قریب رکھے سامان سے، اس کی تصویر کا کینوس اٹھا کر، کسی ضدی سے بچّے کو بہلانے کے سے انداز میں، اُس کی پینٹنگ کو ایک کتاب کی طرح پڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ دیکھو ...... دیکھو یہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ اس کے نیلے آسمان سے باتیں کرتے دو عبادت گاہوں کے سنہرے کلس سے نور رحمت کے نور کی بارش سی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس کے درمیان سے بہتی ندی کی ترلاتی کو نو دیکھ کر روح کی پیاس تک بجھتی سی محسوس ہونے لگی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ خستہ اور کمزور سا بابا جو اپنا کشادہ سینہ سپر کیے اپنے دونوں بازو دو مختلف سی سمتوں میں پسارے، کتنے ہی جدا ہونے

والوں دور بسنے والوں کو ایک امید ایک ڈھارس سی دکھائی دیتا ہے لیکن یہ ایک ٹیڑھا سا ٹیلیفون کا کھمبا اور ...... اس پر ایک مرے ہوئے کے اردگرد یہ چیختے سے کوّے !!

اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لی، اور پھر ایک بناوٹی ہنستے ہوئے کہنے لگی ہاں، یاد آیا کہ تم گھر کے لان پر آگرے اس زخمی کوّے کو اس کے ساتھی کوّوں سے بچانے کے لیے کیوں اتنے پریشان تھے۔ تب ہی تو تم کھسیاکھسیا کر کہہ رہے تھے کہ ابھی تو یہ سب اپنے چونچ پنجوں سے نوچ نوچ کر اسے ہلکان کر رہے ہیں، پھر اس کے ختم ہو جانے پر اس کے اردگرد جمع ہو کر چیخیں گے چلّائیں گے ــــ

اتنا کہہ کر اس کا دم جب کچھ پھولنے سا لگا تو اس نے ایک لمبی سی سانس لیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا ــــ

ارے ایسا کھیل تو کبھی اپنے بچپن میں ہم نے اپنے گاؤں کے چھپّروں سے نکلے بانسوں یا آنگن کی الگنی پر مرے کوّے لٹکا کر شریر لڑکوں ہی کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا ہے ــــ جس کو سن کر وہ آرٹسٹ مردہ سی آواز میں کہنے لگا تھا ــــ

ہاں، بھانو یہ زندگی بھی تو بچّوں کا ایک کھیل جیسی ہے۔ پھر کسی دوسرے کھیل کی کیا ضرورت!! مگر میں اپنی پینٹنگ پر اپنے نام کا سورج نہیں لکھ سکا ہوں ــــ میرے اس ادھورے کام کو اب تم ہی پورا کر دو ــــ پلیٹ پر سے مہندی جیسا سرخ رنگ اپنی ہتھیلی اور اپنی پانچوں انگلیوں پر لگا کر اس کی چھاپ عین ٹیلیفون کے کھمبے کے نیچے لگا دو پھر اس پینٹنگ کو کسی ایسی جگہ چھپا دو کہ اسے کوئی پھر نہ دیکھنے پائے۔ لیکن اسے باقی رہنا چاہیے۔ سنا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے اور سنا تو یہ بھی ہے کہ ہر تخلیق کار کے لیے اس کی تخلیق ایک معنوی اولاد کا سا درجہ رکھتی ہے ــــ تو پھر اس کے ساتھ کسی سوتیلے پن کو یا کسی بے انصافی کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے مگر ...... مگر اب میں بالکل لاچار ہو چکا ہوں ......!

کہ اب تو ...... صرف ...... اور صرف کیپٹن رام ناتھ کا باپ ہی ہوں!!

اتنا کہہ کر اس کی آواز پھر گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی ــــ

صاؔبردت کی دو اہم کتابیں
چند تصویرِ بتاں
(ایک البم)
اردو کے مشاہیرِ قلم کی تاریخ تصویروں کی زبانی۔ امیر خسرو سے لے کر
عہدِ جدید تک کے اہم قلم کاروں کا نگار خانہ مع مستند حواشی۔
صاؔبردت نے بڑی عرق ریزی سے
اردو زبان کے سفر کی کہانی تصویروں میں تحریر کی ہے
آرٹ پیپر پر دیدہ زیب طباعت، خوبصورت، مضبوط، مخملی جلد
قیمت: تین سو روپے (زیر طبع)
"پل دو پل" کے بعد صاؔبردت کا دوسرا شعری مجموعہ
موجِ عارض
ترے عارض کی ہلکی سی جھلک سے
منور رات ہے جس چاندنی سے
خوبصورت طباعت، دلپذیر سرورق جسے پاکستان کے نامور آرٹسٹ موجد نے تیار کیا ہے۔
قیمت: تیس روپے (زیر طبع)
(آج ہی اپنی کاپی بک کرائیے)
ساحر پبلشنگ ہاؤس
"پرچھائیاں" اے۔ بی۔ نائر روڈ، جوہو چرچ، بمبئی ۴۰۰۰۴۹
فون: 8202837
جاری کردہ
انور سلطانہ

نثری نظم ہو یا انشائیہ، دونوں کا مقصد پڑھنے والوں کو اذیت پہنچانا ہے

اُردو ادب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اُسے ڈاکٹر وزیر آغا جیسا صاحبِ فکر نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار ملا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید جیسا بالغ نظر عقیدت مند اور طرف دار ملا۔ ڈاکٹر انور سدید کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انھیں ہم جیسا حوصلہ مند قاری ملا۔ اور ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم ڈاکٹر انور سدید کی بیس عدد تصانیف کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ ہماری صحت بھی اتنی اچھی ہے کہ ان کی زیرِ طبع نصف درجن کتابوں کے انتظار میں ہم زندگی کے دن ایسی بے چینی سے کاٹ رہے ہیں، جیسے کوئی مجرم عمر قید کی سزا کاٹتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر کی تصانیف کے جملہ حقوق تو انھیں کے نام محفوظ ہیں، لیکن خود ڈاکٹر وزیر کے جملہ حقوق ڈاکٹر انور سدید نے اپنے نام محفوظ کرا رکھے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ حقوق حاصل کرنے والے پر بعض فرائض کی ادائی بھی واجب ہوتی ہے، لہٰذا حقوق و فرائض میں انھوں نے توازن کی ایک خوبصورت مثال قائم کی ہے۔ ایک طرف وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی حریفوں سے نبرد آزما رہتے ہیں اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کے ادبی کاموں اور کارناموں کی تعبیر و تشریح میں عالمانہ تحریریں لکھتے رہتے ہیں۔ مخالفوں سے ڈاکٹر انور سدید کا سلوک خاصا ناگفتہ بہ قسم کا ہے۔ اگر ڈاکٹر وزیر آغا کی ناک پر مکھی بیٹھ جائے، تو وہ نہ صرف اس بچاری کی سات پشتوں میں نقص نکال لیتے ہیں، بلکہ اس کی آیندہ نسلوں کے سرگودھا میں داخلے پر پابندی بھی لگا دیتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی حیثیت اتنی مستحکم ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید کے دفاعی اقدامات کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں،

> ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی حیثیت لاکھ مستحکم سہی، آخر انور سدید نے بھی تو فنِ سپہ گری میں کمال حاصل کیا ہے اس کمال کے اظہار کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ سو وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے حریفوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے کاغذی توپیں داغتے رہتے ہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب ڈاکٹر وزیر آغا کے سب حریف کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے تو پھر ڈاکٹر انور سدید کیا کریں گے؟ یہ سوال قبل از وقت ہے، لہٰذا اس کا قبل از وقت جواب یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید خود ہی اپنے ممدوح کے خلاف ایک آدھ مضمون لکھ کر مختلف قلمی ناموں سے اس کے دس بارہ جواب چھپوا دیا کریں گے۔ لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے، انشاء اللہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ڈاکٹر انور سدید کے دفاعی مضامین سے مشتعل ہونے والے ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے اور دونوں طرف سے "محبت نامے" کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں انور سدید دو کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ ایک تو "وزیر آغا، ایک مطالعہ" ہے اور دوسری "وزیر آغا کے خطوط"۔ پہلی کتاب ایک نہایت عمدہ تنقیدی مطالعہ ہے، جس میں موضوع کے فکر و فن کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ بلاشبہ اُردو میں اس نوعیت کی کتابیں کم لکھی گئی ہیں۔ اس وقت ڈاکٹر انور سدید کی تیسری کتاب ہمارے سامنے ہے جس کا نام ہے "شام کا سورج"۔ اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت اور فن کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کی لکھی ہوئی وہ تحریریں یکجا کی گئی ہیں، جو ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید، شاعری اور افسانہ نگاری کے بارے میں جو بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں، ان کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔ لکھنے والوں میں ہمارے عہد کے تقریباً سبھی اہلِ قلم شامل ہیں۔ ہم نے اس کتاب کے بیشتر مضامین پہلے سے پڑھ رکھے ہیں، اور بعض ایسے ثقیل ہیں کہ انھیں پہلے پڑھا، نہ اب پڑھنے کی ہمت ہے۔ البتہ اس کتاب کا ایک باب ایسا ہے، جسے ہم نے ذوق و شوق سے پڑھا۔ یہ وہ باب ہے، جس میں وزیر آغا کے نام ان کے معاصرین کے خطوط جمع کیے گئے ہیں۔ تقریباً تین درجن مشاہیر ادب کے ان خطوں میں، جہاں بہت سے علمی ادبی اور ذاتی مسائل زیر بحث آئے ہیں، وہیں کچھ دلچسپ باتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مکتوب نگاروں کو کیا معلوم تھا کہ وزیر آغا کے نام وہ جو راز کی باتیں لکھ رہے ہیں، انھیں انور سدید منظرِ عام پر لے آئیں گے۔

قیوم نظر بزرگ شاعر ہیں، لیکن دیکھیے ایک خط میں وہ کتنے معصوم نظر آتے ہیں۔ "میرا اپنا خیال ہے کہ گیتوں کی دنیا میں بیسویں صدی میں بہت کم لوگ مجھ تک پہنچ پاتے ہیں۔ میرا جی مرحوم نے پہلے پہل مجھے اس زمین میں دریافت کیا تھا۔ ان کے نزدیک مجھے گیتوں کی بہت اچھی سوجھ بوجھ تھی۔۔۔۔۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آج کی ڈاک ہی سے مجھے ایک خط ملا ہے، جس کے لکھنے والے کو "پون جھکولے" کا ایک خستہ حال نسخہ کہیں سے مل گیا ہے اور وہ اسے پڑھ کر میرا حد درجہ عقیدت مند بن گیا ہے۔" "پون جھکولے" کا خستہ حال نسخہ دستیاب ہونے پر جس شخص کا یہ حال ہوا ہے، اگر اُسے اس کتاب کا کوئی صاف ستھرا نسخہ مل جاتا، تو معلوم نہیں اس پر کیا گزرتی!

نظیر صدیقی لکھتے ہیں۔ "ضیا جالندھری۔۔۔۔ نے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے مجھے بارہا مشورہ دیا کہ میں سی ایس ایس کے امتحان میں ضرور بیٹھوں۔ لیکن محض اس خیال سے کہ میری ادبی صلاحیتیں سرکاری فائلوں کے انبار۔۔۔ میں دب کر نہ رہ جائیں میں نے ضیا کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ اگر میں چاہتا تو کسی اچھی فرم کا نمائندہ بن کر اس وقت اچھی زندگی گزار رہا ہوتا، لیکن میں نے مادی آسائشوں پر اپنے

ادبی ذوق کی تکمیل کو ہمیشہ ترجیح دی۔" ہمارا خیال ہے کہ ضیاؔ جالندھری نے جو مشورہ دیا تھا، وہ نظیر صدیقی کے مفاد میں نہیں، ادب کے مفاد میں تھا۔ نظیر صدیقی اب بھی اس مشورے پر عمل کر سکتے ہیں۔ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے اور ادب کا بھی!

اپنے بارے میں افتخار جالب کی کسی تحریر کو پڑھ کر ن م راشد نے پہلے تو یہ بتایا کہ افتخار جالب کی "حرکت" ویسی ہی ہے، جیسے کوئی اخبار میں نام چھپوانے کے لیے کسی پر قاتلانہ حملہ کر دے، اور پھر یہ لکھا ہے: "ایک اور سبب جو نفسیاتی ہے یہ ہے کہ افتخار جالب کے کردار میں AMBIVALENCE ہے۔ اس نے اپنی کتاب اپنے والد محترم کے نام معنون کی ہے، لیکن ساتھ ہی اس کی نظموں میں وہ عناصر ملتے ہیں، جن میں ولادت کے شرف کو کم کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ میں بھی، جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، FATHER IMAGE دیکھتا ہے۔ اس لیے وہ میری تعریف بھی کرتا ہے اور مذمت بھی۔ یہ ایک طرح سے آج کل کے ہر نوجوان کا مسئلہ ہے۔ لیکن افتخار جالب کے معاملے میں اس نے گویا شدت اختیار کر لی ہے۔

زیر نظر کتاب کے ایک باب میں خود ڈاکٹر وزیر آغا کے بھی بہت سے خط جمع کر دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی مکتوب نگاری تفصیلی مطالعے کے مستحق ہے، وہ ایک صاحب طرز مکتوب نگار ہیں اور یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس کو کیسا خط لکھنا چاہیے مثلاً منظر علی خان منظر کو وہ لکھتے ہیں۔ "آپ کی علالت کا پڑھ کر پریشانی ہوئی۔ خلقِ خدا کو مسرت کے لمحات عطا کرنے والے شخص کو بیمار نہیں ہونا چاہیے تھا بیماری تو صرف اذیت والوں بالخصوص نثری نظموں کے ذریعے اذیت پہنچانے والوں کے لیے مختص ہونی چاہیے ویسے آپ کی بیماری تو مجھے خللِ معدہ (خللِ دماغ نہیں) کے سوا کچھ نظر نہیں آتی۔"

واضح رہے کہ قوسین کے الفاظ بھی ڈاکٹر صاحب کے ہیں، یہ اضافہ ہم نے نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی کہ

> منظور علی خان منظور جہاں ایک طرف مزاحیہ مضامین لکھ کر مسرت کے لمحات عطا کرتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف غزلیں لکھ کر ان لمحات کو واپس بھی لے لیتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک خط ہمارے نام بھی ہے، جس میں ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں: "انشائیہ نگاری کے سلسلے میں آپ مجھے ہمیشہ رعایتی نمبر دے کر پاس کر دیتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بیس پچیس سال کی مختصر مدت میں ہمارے ہاں اعلا پائے کے انشائیے لکھے گئے ہیں، یقیناً آپ ان سے محظوظ ہوئے ہوں اور یہ سب انشائیے دوسروں نے لکھے ہیں۔ یہ سب لوگ اس بات پر رنجیدہ ہیں کہ خامہ بگوش نے انھیں کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ کسی وقت ان کے آنسو بھی پونچھ دیجیے۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔" ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ ہم ایک وقت میں دو کام نہیں کر سکتے۔ لکھنے والوں کے بھی آنسو پونچھیں اور پڑھنے والوں کے بھی۔ انشائیہ نگاری کے سلسلے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر

ہے کہ علاوہ کسی نے اس صنف ادب کے مزاج کو نہیں سمجھا۔ وہ اردو کے پہلے اور اب تک آخری انشائیہ نگار بھی ہیں۔ باقی انشائیہ نگاروں کا وہی حال ہے جو نثری نظم لکھنے والوں کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ادیب کے اقتباس میں فرمایا ہے کہ نثری نظم لکھنے والے، پڑھنے والوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ انشائیہ نگاروں کے بارے میں ہماری رائے بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شوخیِ تحریر کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ ساقی فاروقی کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں "الفنسو آم کی ایک قسم ہے جو صرف میرے باغ میں ہوتی ہے۔ بہرحال اس کے پودوں پر ۲۸۲ آم لگتے ہیں اور ان دوستوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، جو زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ چونکہ آم بہت ہی شیریں ہے، اس لیے دوست جب اُسے کھاتے ہیں، تو شیرینی سے ان کے لب جڑ جاتے ہیں اور وہ کئی ماہ تک بات نہیں کر سکتے۔ زبان بندی کی یہ بہترین صورت ہے۔ آپ آیندہ سال جون کے آخری ہفتے میں پاکستان آیئے، پھر ہم آپ کی زبان بندی کا تماشا دیکھیں گے، بلکہ آپ کے رخِ زیبا کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ کیونکہ باتیں کرتے ہوتے آدمی کو کون دیکھ سکتا ہے!"

ڈاکٹر تنویر احمد خاں
338, BATLA HOUSE,
JAMIA NAGAR,
NEW DELHI-110025.

۲۰ر فروری ۱۹۸۹ء کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر دہلی میں پریس ایشیا انٹرنیشنل فورم کی جانب سے پاکستان سے آئے مہمان ادیب، محقق، نقّاد اور دانشور ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید صاحبان کے اعزاز میں ایک محفل مذاکرہ منعقد کی گئی اپنی نوعیت کے اس شاندار اجتماع میں مذاکرہ کا موضوع "تخلیق اور تنقید کا رشتہ" رکھا گیا۔ جلسے کی نظامت کے فرائض فورم کے سکریٹری جناب اختر الواسع صاحب نے انجام دیے اور صدارتی ذمّے داریاں حسبِ سابق فورم کے صدر اور معروف ادیب، صحافی اور دانشور دیوان بیریندر ناتھ صاحب ظفر پیامی نے سنبھالیں۔ ناظم جلسہ نے معزز مہمانوں اور حاضرینِ جلسہ کا استقبال کیا اور مہمان ادیبوں کو ان کی علمی کاوشوں کے پیشِ نظر دائرہ معارف اور عارف کے القاب سے یاد کیا۔ صدر جلسہ ظفر پیامی صاحب نے مذاکرہ کا آغاز کرتے ہوئے تخلیق اور تنقید کے رشتے کو ساس بہو کا رشتہ قرار دیا۔ انھوں نے تنقید اور تخلیق کی نسبت سے بہت سے سوالات اٹھاتے ہوئے کہا کہ ادیبوں کو نقّادوں سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ نقّادوں کو ادیبوں اور ادیبوں کو نقّادوں سے شکایت زوال پذیر معاشرہ کی علامت ہے۔ انھوں نے تخلیق کار کی ذہنی مرعوبیت اور پستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پذیر زبانوں میں نقّاد فن کاروں پر لکھ کر اپنی حیثیت منواتے ہیں مگر ہمارے یہاں فن کار اپنی شناخت کے لیے نقّادوں کی بہت ساری آرا کا سہارا لیتے ہیں۔ محفل مذاکرہ کے مباحث کا باقاعدہ آغاز معروف ترقی پسند افسانہ نگار اور ادیب جناب جوگیندر پال کی گفتگو سے ہوا۔ انھوں نے پاکستانی مہمان ادیبوں کو بیک وقت تخلیق کار اور تنقید نگار دونوں حیثیتوں سے شامل قرار دیتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ آج کے موضوع کی اصل گرہیں کھل سکیں گی اور ہم فطری پھیلاو کی طرف بڑھ سکیں گے۔ جناب انور سدید صاحب نے تخلیق اور تنقید کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق کو بہر حال تنقید پر فوقیت حاصل ہے، انھوں نے کہا کہ تنقید کا عمل تخلیق کے باطن سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب پارہ جو لکھا گیا ہے تنقید نگار نے تنقیدی زاویے اور اصول اسی سے نکالے ہیں۔ انھوں نے نقّاد کے فرائض کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ بہت سے عناصر لاشعوری طور پر تخلیق میں شامل ہو جاتے ہیں ان پوشیدہ عناصر کو تلاش کرنا نقّاد کا کام ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ نقّاد کو چاہیے کہ وہ تخلیق کو محبت کی نظر سے دیکھے تاکہ وہ تخلیق کے لطف میں شریک ہو سکے اسی ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ فن پارے کے باطن تک پہنچانے کا کام نقّاد کا ہے اس لیے نقّاد کو چاہیے کہ وہ تخلیقِ مکرر کے عمل سے گزر کر ان ہی پوشیدہ عناصر کو تلاش کرے۔

انور سدید صاحب نے تخلیق کار اور تنقید نگار دونوں کو ایک سکّے کے دو پہلو قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے تخلیق اور تنقید کے رشتے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اچھی تخلیق دائمی ہوتی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے انھوں نے کہا کہ وقت خود سب سے بڑا نقاد ہے اس لیے تخلیق ایسی ہو جو ہر زمانے کو منعکس کر سکے۔ تخلیق کار ختم ہو جاتا ہے تو تنقید زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے لیکن نقاد ہر زمانے میں زندہ رہتا ہے چنانچہ فن پارے کے نئے زاویوں کو بروئے کار لانا نقاد کا کام ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے تنقید کے مختلف مکاتب فکر کا تذکرہ کیا اور تخلیق و تنقید کو ہم رشتہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ قاری تخلیق کا حصّہ ہے جب تک قاری تخلیق کی پرتوں کو نہ کھولے تخلیق پوری نہیں ہوتی۔ قاری یا نقاد نئے نئے معانی تلاش کرتا ہے تو تخلیق تکمیل کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تخلیق و تنقید کی وسعتوں کو لامحدود قرار دیتے ہوئے کہا کہ تنقید و تخلیق دونوں ناظر و منظور ہیں اور یہ دونوں دو آئینوں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے کے سامنے رکھے جاتے ہیں تو عکسوں کا لامتناہی سلسلہ سامنے آتا ہے جس میں کوئی عکس آخری عکس نہیں ہوتا اس طرح تخلیق کے مختلف پہلو ہیں جن میں کوئی بھی پہلو آخری نہیں ہوتا۔

اُردو ادب کی مایۂ ناز ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس بات سے انکار کیا کہ تنقید خالص معروضی نہیں ہو سکتی انھوں نے تنقید اور تخلیق کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں خود کسی نظریے کے تحت نہیں لکھتی بلکہ خود کو ظاہر کرنے کے لیے لکھتی ہوں، انھوں نے کہا کہ نقاد کا کام تخلیق کا سوشیالوجیکل بیک گراونڈ سمجھ کر تنقید پر عمل پیرا ہونا ہے۔ انھوں نے اس بات کو پُر زور لہجے میں کہا کہ تخلیق کار نقادوں کے تابع نہ رہے جیسا کہ جدیدیت کے اثر سے ایک خاص طریقے سے لکھنا فیشن بن گیا اور رائٹر نقاد کا تابع فرمان ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے سوشل بیک گراونڈ کے نظریے سے ترقی پسند نقادوں کو ترجیح دی اور کہا کہ اُن جیسے نقاد ابھی تک نہیں آئے موصوفہ نے نقاد کو حرفِ آخر تسلیم کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ کسی بھی تخلیقی پارے کے پڑھنے والوں پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح سمجھتے ہیں۔

معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر قمر رئیس صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کو تنقید کی ORGANIC THEORY یاد دلائی اور اس بات پر زور دیا کہ تنقید کو معروضی ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ معروضی تنقید کے نتیجہ ہی میں تنقید کے عمل میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور تخلیق کے ساتھ ناانصافیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نقاد اور تخلیق کار کا رشتہ ماہر فلکیات اور آسمان کا رشتہ قرار دیا اور تخلیق و تنقید کے حوالے سے کہا کہ تنقید کا اصل مقصد بنیادی سچائیوں تک رسائی حاصل کرنا اور فن پارے کی ماہیت اور جڑوں کا سُراغ لگانا اور اس کے سوشیالوجیکل عناصر کا پتا لگانا ہے انھوں نے فن پارے پر عمرانی اثرات کے تعلق سے کہا کہ ادب صرف لاشعور سے ہی عمل میں نہیں آتا اس لیے اس کو لسانی سماجی اعتبار سے دیکھنا ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ نقاد اور تخلیق کار کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے پروفیسر موصوف نے نقاد کو تخلیق کا حصّہ ماننے سے یکسر انکار کرتے ہوئے کہا کہ نقاد تو کیا خود تخلیق کار بھی دوبارہ اسی تخلیقی عمل سے نہیں گزر سکتا اس لیے یہ تصور ایک پُر فریب تصور ہے انھوں نے بھی تنقید پر شخصی خوف کے اثرات کے متعلق کہا کہ ہم عصر ادب کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدیدیت کے علم بردار نقاد پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے کہا کہ نقاد عام قاری کے مقابلہ زیادہ تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ عام قاری اپنے تجربے کو دوسروں کے سامنے نہیں رکھ پاتا لیکن نقاد ان ارتسامات کو ضابطے کی شکل میں پیش کر دیتا ہے انھوں نے کہا کہ ہر

فن پارہ اپنے طور پر نقاد کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ تنقید کو سائنس کا آئیڈیل بنانے کی کوشش بے معنی ہے ہر اچھی تخلیق پڑھنے والے پر اپنی شرطیں قائم کرتی ہے انھوں نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تنقید کو کسی ایک مکتب فکر کا پابند نہ بنایا جائے

پروفیسر موصوف نے تمام تنقیدی مکاتب فکر کے نتیجہ میں ایک آزاد اور منصفانہ نظریہ "تنقید" بین العلوم"، "تنقیدی نظریہ پیش کیا اور کہا کہ ہم ادب میں اقدار سے الگ ہو کر معنی خیزی یا غیر معنی خیزی کا فیصلہ نہیں کر سکتے اچھی تنقید فن کار کے قریب لے جانے میں معاون ہوتی ہے اور وہی کارگر تنقید بھی ہے جو کسی خاص تنقیدی نظریے سے نہیں تمام تنقیدی نظریات کے مجموعی مطالعے " بین العلوم تنقید" سے ممکن ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی صاحب نے تصوف کے نقطۂ نظر سے کئی سوالات اٹھائے انھوں نے نقاد کے تخلیقی کرب سے گزرنے کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ مختلف اصناف کا تخلیقی عمل بھی مختلف ہوتا ہے انھوں نے سوالوں کی شکل میں غزل اور نظم، افسانہ اور ناول کے تخلیقی عمل کو الگ الگ قرار دیا۔ انھوں نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بعض اصناف میں شعور غالب ہوتا ہے اور بعض کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے اور دونوں کے تخلیقی عمل میں فرق ہوتا ہے۔ انھوں نے تخلیق اور تنقید کے عمل کو بعد المشرقین قرار دیتے ہوئے کہا کہ تخلیق میں موجود سماجی عناصر سے تو نقاد گزر سکتا ہے لیکن روحانی تجربوں سے ناآشنا نقاد تصوف کے روحانی اور وجدانی نظریوں سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے تنقید کو حقیقت کا صرف ایک رُخ قرار دیا اور تنقید پر تخلیق کو فوقیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر تنقید تخلیق سے بڑھ جاتی تو قرآن سے تفسیر اور اپنشد سے اس کی تفسیریں بڑھ جاتیں۔
انھوں نے عصری تخلیق کے حوالے سے کہا کہ آج کی تخلیق کا المیہ ہے کہ تخلیق کار نقاد سے ڈرتا ہے۔ پروفیسر حنیف کیفی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جب تنقید نگار غالب آجاتا ہے تو تخلیق سچائی سے ہٹ جاتی ہے آج کے ناقد کے پیش نظر تخلیق کے بجائے تخلیق کار ہوتا ہے اور یہیں سے تمام تعصبات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جناب کمال احمد صدیقی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق میں تخلیقی شعور شامل ہوتا ہے تخلیقی شعور زندگی کے شعور سے الگ نہیں ہے، تنقید تخلیق سے پہلے ہی اس کا حصہ بن جاتی ہے۔ تخلیق کار نظر ثانی پر خود اپنا نقاد بن جاتا ہے پہلے زمانے میں فن کار خود نقاد ہوا کرتے تھے۔ ہیرانند سوز صاحب نے بھی تخلیقی کرب کے گزر سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ نقاد کو تخلیقی اذیت کا احساس نہیں ہو سکتا یہ درد تخلیق کار ہی سہ سکتا ہے۔ پروفیسر پرتپ اور برجن چاولہ کمار نے بھی بحث میں حصہ لیا اس خوشگوار تنقیدی مباحثے کے بعد مذاکرے کا اختتام بڑی خوش اسلوبی سے ہوا محترمہ منورما دیوان صاحبہ کے علاوہ جلسہ کے اہم شرکاء میں جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب شریف الحسن نقوی، پروفیسر اکمل ایوبی (علی گڑھ)، پروفیسر ریاض پنجابی (کشمیر) ڈاکٹر ایوب مرزا (پاکستان)، جناب شمیم الحق (سفارت خانہ پاکستان) پروفیسر شعیب اعظمی، ڈاکٹر زبیر فاروقی، ضیاء الحسن ندوی ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، ڈاکٹر صغرا مہدی، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، جناب رحمان نیّر، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، جناب زبیر رضوی، جناب انجم عثمانی، جناب خالد علوی، ڈاکٹر محمود فیاض، جناب شمس تبریزی، جناب اختر الحسنین اور ڈاکٹر وہاج الدین علوی، جناب شاہد علی خاں (منیجر مکتبہ جامعہ) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جلسہ کے اختتام پر ناظم جلسہ نے مہمانوں کو وداعیہ کلمات سے نوازا اور حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اردو میں کلاسیکی تنقید

مصنف پروفیسر عنوان چشتی

قیمت : ۴۸ روپے

ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مبصر : (مولانا) نعیم الدین رضوی

پروفیسر عنوان چشتی کا نام اردو کے ممتاز نقادوں اور محققوں میں شامل ہے۔ انھوں نے گزشتہ بیس برس میں لگاتار علمی کام کرکے اس سمت میں پیش قدمی کی ہے۔ لیکن گزشتہ ۴، ۵، برس سے انھوں نے اردو کی قدیم تنقید پر خاص توجہ کی ہے۔ اور عصر حاضر میں اس کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کتاب "عروضی اور فنی مسائل" ۱۹۸۵ء میں شائع ہوکر ارباب علم وفن سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اب اس انداز کی دوسری کتاب "اردو میں کلاسیکی تنقید" منظر عام پر آئی ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اس کتاب کا مقدمہ "پیمانۂ صفات" کے عنوان سے خود تحریر فرمایا ہے۔ اور متعدد اسالیب نقد کا جائزہ لے کر اردو کی کلاسیکی تنقید کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

> "اردو کی کلاسیکی تنقید کا انحصار عربی و فارسی شعریات پر ہے اور عربی و فارسی شعریات کا دائرہ علم بدیع و بیان اور معانی کے ساتھ علم عروض و قواعد پر محیط ہے۔ اساتذۂ سخن نے ان علوم کی روشنی اور اپنے تجربے کی وساطت سے بعض اصول وضع کیے ہیں اور جن پر دبستانِ دہلی و لکھنؤ کے اساتذۂ فن اور ثقہ شعرار نے عمل کیا ہے۔"

پروفیسر عنوان چشتی نے انھیں لسانی، فنی اور عروضی مسلمات کی روشنی میں شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی نئی معنویت تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی نے نظریاتی اور عملی تنقید کو بڑی جامعیت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ابواب اس طرح ہیں۔

۱۔ عروض میں صورت اور نام کا رشتہ (وتد مجموعی و مفروقی کی تحقیقی بحث)

۲۔ نقد معائب (تعقید اور شتر گربہ جیسے عیوب کا تجزیہ اور معاصر شاعری کا جائزہ)

۳۔ نئی اردو ہندی غزل کا عروضی مطالعہ (اردو میں ہندی چھندوں اور ہندی میں اردو (عربی) بحروں کی نشاندہی

۴۔ جوش ملسیانی؛ نظریۂ فن اور عملی تنقید (جوش کے نظریۂ فن اور ان کی اصلاحوں کا معروضی جائزہ اور اخذ نتائج)

۵۔ مراثی دبیر کا عروضی جائزہ (دبیر کے مراثی کا عروضی جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ انھوں نے ۹ اوزان میں

شاعری کی ہے۔)
۶۔ ابر احسنی ؛ نظریۂ فن اور عمل تنقید (ابر احسنی کے فنی نظریات اور ان کی اصلاحوں کا بے لاگ جائزہ اور اخذ نتائج)
۷۔ اصلاحِ سخن اور مسائلِ فن (اصلاحِ سخن کی روایت کے اثرات اور نتائج پر بحث)
۸۔ نئے شعری تجربے۔ (۱۸۵۷ء کے بعد اردو میں نئے شعری اور ہیئتی تجربوں کا بلیغ جائزہ)

پروفیسر عنوان چشتی نے کلاسیکی تنقید کے اصول اور نظریات پس لئے مواد کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اور ان کو روشن کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے معروضی انداز میں معاصر شاعری پر ان اصولوں کا اطلاق کیا ہے۔ اس میدان میں وہ تنہا نقاد ہیں۔ جن کے تجزیاتی طریقۂ کار، تحقیقی دیانت، روشنی طبع اور معروضی انداز فکر کا اعتراف تمام مخلص علمائے ادب نے کیا ہے اس کتاب کی اہم خوبی یہ ہے کہ موصوف نے اہم اور دقیق مسائل فن کو سلیس اور سادہ زبان میں دلچسپ انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر ایک طرف یہ کتاب اردو کی قدیم تنقید کی بوطیقا ہے تو دوسری طرف جدید اور معاصر شاعری کی جعلی زبان اور گمراہ کن اندازِ بیان کے خلاف ایک شدید ردّ عمل بھی ہے۔ جس کا مطالعہ ہر شخص کے لیے ناگزیر ہے

رن آنگن
(مراٹھی ناولٹ)

مترجم : پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات : ۱۳۹ قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : شعبۂ اردو بمبئی یونی ورسٹی
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳
مبصر : سلام بن رزاق

رن آنگن ۱۹۴۷ء سے قبل لکھے گئے مراٹھی کے شاہکار ناولٹوں میں سے ایک ہے۔ وشرام بیڈیکر نے آج سے تقریباً ۵۰ برس پہلے اسے تصنیف کیا تھا۔ یہ ان کا پہلا اور آخری ناولٹ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ادبی کارنامے کی دھوم صرف تین سال قائم رہتی ہے۔ اور اگر یہ تیس سال قائم رہ جائے تو اسے شہرت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا چرچا تین سو سال تک ہوتا ہے تو یہ لافانی ہو جاتا ہے۔ اب جبکہ رن آنگن شہرت کے آنگن سے نکل کر شہرت دوام کے وسیع میدان میں قدم رکھ چکا ہے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ رن آنگن مراٹھی کے ان معدودے چند ناولٹوں میں سے ایک ہے جن کے سر پر لافانیت، کا تاج رکھا جا چکا ہے۔

رن آنگن دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔ ناولٹ کی پوری فضا پر جنگ کا غبار چھایا ہوا ہے مگر باب اور ہرٹا کی محبت اس دھند میں یوں داخل ہوتی ہے جیسے کسی اندھیرے کمرے میں سورج کی کرن در آئے۔

یہ ایک مہاراشٹرین نوجوان چکر دھر عرف باب اور ایک جرمن یہودی لڑکی ہرٹا کی دس روز کی داستان محبت ہے۔ چکر دھر اُما نام کی ایک لڑکی سے محبت میں ناکام ہو جانے کے بعد محبت سے بدگمان ہو چکا ہے۔ ہرٹا جرمنی میں نازیوں کے مظالم سے تنگ آکر ترکِ وطن پر مجبور ہو چکی ہے۔ دُخانی جہاز پر دونوں کی ملاقات ہوتی ہے اور ایک نامعلوم کشش دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔ ہرٹا جرمنی میں کارل فرائڈ، نام کے ایک جرمن

سپاہی سے محبت کرتی تھی مگر جب اسے ترکِ وطن پر مجبور کیا گیا تو کارل فرائز بھی سوائے بے بسی کے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کر پایا بعد میں خبر ملتی ہے کہ جنگل میں کارل فرائز کی لاش پائی گئی۔ ہرٹا کا دل کارل فرائز کی موت پر خون کے آنسو بہاتا ہے مگر اس کے دل میں زندہ رہنے کی بے پناہ خواہش اسے پوری طرح بکھرنے نہیں دیتی۔ بعد ازاں چیکر دھر کی محبت اسے جینے کا نیا حوصلہ دیتی ہے۔ جہاز جب بمبئی کی بندرگاہ پر لگتا ہے تو چیکر دھر کی کوشش اور ہرٹا کی خواہش کے باوجود ہرٹا کو ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ کیوں کہ ہرٹا جرمن ہونے کے ناتے انگریزوں کی دشمن قرار دی جاتی ہے۔ باب کی جدائی کے بعد اسے زندگی میں چاروں طرف اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ آخر وہ ہانگ کانگ میں سمندر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ یہاں چیکر دھر عرف باب کی جدائی کو ہرٹا کیوں برداشت نہیں کر پاتی؟ جبکہ اس نے اپنے پہلے محبوب کارل فرائز کی موت کو برداشت کر لیا تھا۔ یہاں محبت کی ناکامی کے علاوہ اسے اس بات کا صدمہ ہے کہ باب کے ساتھ اسے ہندستان میں داخلہ نہ دے کر اس سے انسان کی حیثیت سے جینے کا بنیادی حق چھین لیا گیا ہے۔ اس کی عزتِ نفس پر یہ ایسی چوٹ ہے جسے وہ برداشت نہیں کر پاتی۔

یہ ایک ناکام محبت کی درد بھری کہانی ہے جو اپنے اختتام کو پہنچتے پہنچتے قاری کے دل میں ایسی کسک چھوڑ جاتی ہے جس کی ٹیس تادیر محسوس کی جا سکتی ہے۔

کامیاب کہانی کی خوبی یہی بیان کی گئی ہے کہ کہانی قرطاس پر اختتام کو پہنچ جائے مگر بعد میں قاری کے ذہن میں جاری رہے۔ 'رن آنگن' کی کہانی بھی ایسی ہی کہانی ہے۔ 'رن آنگن' یعنی میدانِ جنگ۔ رن آنگن کی کہانی دو سطحوں پر چلتی ہے۔ کہانی میں خارجی طور پر دوسری جنگِ عظیم کا پس منظر ہے۔ مگر داخلی سطح پر یہ انسانی جذبات اور اس کے احساسات کے تصادم، اُمید و بیم کی کشمکش، غم و انبساط کی دھوپ چھاؤں اور انسانی اور غیر انسانی رویوں کے ٹکراؤ کی کہانی ہے جو ایک نقطے سے شروع ہو کر دھیرے دھیرے ایک بڑے کینوس پر پھیل جاتی ہے۔

'رن آنگن' میں باب اور ہرٹا کی محبت کے علاوہ اس کے متوازی ایک اور انوکھی محبت کی کہانی بھی چلتی ہے۔ لوئی اور شندرے کی محبت ــــ لوئی ایک خوبصورت سا جرمن بچہ ہے۔ سندرے کے دل میں اس بچے کے لیے جانے کہاں سے اس قدر ممتا اُبل پڑتی ہے۔ لوگ اس پر فقرے بھی کستے ہیں کہ وہ بچے کے بہانے اس کی ماں کو پھانسنے کی فکر میں ہے۔ مگر شندرے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوئی بھی اس سے اس قدر ہل گیا ہے کہ ایک لمحے کے لیے اس سے جدا ہونے کو تیار نہیں ہے۔ یہ محبت باب اور ہرٹا کی محبت سے مختلف ہے۔ مختلف، سادہ مگر خالص انسانی۔

بادی النظر میں باب اور ہرٹا کی محبت پر نفس کا غلبہ نظر آتا ہے مگر جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے، نفسانی خواہشات کی تطہیر سی ہونے لگتی ہے اور اپنے کلائمکس پر پہنچ کر تو محبت کی پاکیزگی کے آگے نفسانی خواہش ایک نقطۂ موہوم کی مانند معدوم ہو جاتی ہے۔

ناولٹ میں باب اور ہرٹا کی محبت کے علاوہ نازیوں کا غیر انسانی رویہ، اسرائیلی اور فلسطینی مسئلہ، دوسری جنگِ عظیم کے پس پشت سرمایہ داروں کی سازشیں، سامراجیت کے بڑھتے اثرات جیسے عالمی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے،

'رن آنگن کی زبان جذبات سے مغلوب اور شعریت سے بھرپور ہے۔
خصوصاً باپ اور ہرٹا کی دلی کیفیات اور جنسی التفات کو اس ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ کہ رومانی اسلوب کا ایک اعلاترین معیار قائم ہو گیا ہے۔ اس لیے آج پچاس برس کے بعد بھی یہ داستانِ محبت تازہ کار اور تازہ خیال معلوم ہوتی ہے۔
پروفیسر عبدالستار دلوی نے اس شاہکار ناولٹ کو اردو کا لباس پہنانے میں کافی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ ترجمے میں نہ صرف زبان کا اعلا معیار اور اسلوب کی انفرادیت برقرار ہے بلکہ داستان کی اصل روح بھی ترجمے کے قالب میں پوری طرح ڈھل گئی ہے۔
اردو میں گاہے گاہے چند معیاری ناولوں کے تراجم ہوتے رہے ہیں۔ 'رن آنگن' بھی اردو ترجمہ کی روایت کی ایک اہم کڑی ہے۔

پرواز
(انشائیے)

مصنفہ: رشیدہ قاضی
مبصّر: یعقوب راہی
قیمت: چالیس روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

"پرواز" رشیدہ قاضی کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ہے جسے کوکن اردو رائٹرز گلڈ (شاخ کینیا) کی طرف سے بڑی آب و تاب سے شائع کرکے ادب کے طرفداروں کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔
اردو میں انشائیوں کی روایت داستانوں اور مثنیوں کی طرح قدیم نہیں ہے۔ یہ تو غالباً سرسید کے زمانے سے شروع ہوئی جو ابتدا میں پند و موعظا کا رنگ لیے ہوئے تھی لیکن اردو کا جادو سر چڑھ کر بولا، اس نے اپنا رنگ جمایا، جوہر دکھلایا اور پچھلی چار پانچ دہائیوں کے دوران ایک سے ایک انشائیہ نویس پیدا ہوئے، کچھ زندہ ہیں، کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔
انشائیوں میں حقیقت نگاری، عصری حسیّت، دردمندی، سماجی اور سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ سلامت روی، زبان کا چٹخارا، طنز کی نشتریت اور تبسم زیرِ لب والے مزاح کا سلسلہ ابراہیم جلیس سے چلا اور اس روایت کو آگے بڑھایا، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے اور ان سب کے بعد چونکا دیا رشیدہ قاضی نے — اوپر انشائیوں کے جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب کے سب رشیدہ قاضی کے یہاں جلوہ گر ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے بالکل الگ تھلگ اور منفرد نظر آتی ہیں۔ ان کی اپنی خلاقی انفرادیت ہے، ان کی تحریریں اپنے قاری کے ذوق کی تربیت خود کرتی ہیں۔ دیکھیے ایک جگہ زبان کا چٹخارا، مزاح اور سماجی شعور کس طرح اکٹھا نظر آتے ہیں۔ چھوٹا بھائی بڑی بہن سے کہتا ہے:

"مٹھو پال لیجیے۔ آپ اٹھیں گی تو کہے گا ننھی بی بی سلام۔ میک اپ کریں گی تو تعریف کرے گا، ماشاءاللہ چشم بد دور، چھینکیں گی تو بول اٹھے گا۔ الحمدللہ"
"اور مریں گی تو پڑھے گا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

ابا کے زوردار قہقہے نے میز ہلا دی۔ دادی اماں تک نے میری تجویز کو سراہا مگر جسے پالنا تھا وہ صاف انکار کر بیٹھی۔ وجہ پوچھی تو جواب عالمانہ ملا۔

"پرندے سرد دل ہوتے ہیں"۔
" چہ خوب بجیا، یہ آپ ہارٹ اسپیشلسٹ کب سے ہوگئیں؟" میں نے پوچھا۔
"تم کیا جانو میاں، عورتیں پیدائشی ہارٹ اسپیشلسٹ ہوتی ہیں"
ابا نے کنکھیوں سے امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
ہنستے ہنستے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ (بجیاتے بلی پالی)
دیکھا آپ نے کیسی کھلی ہوا اور آزاد فضا ہے، نہ عامیانہ پن نہ گھٹن، مہذب اور شایستہ انداز اور ان سب کے باوجود کوئی مردہ دل ہی اپنی مسکراہٹ پر قابو پا سکے گا۔
یہ اور اس طرح کے دوسرے انشایئے اپنے قاری کو نئے جہانوں کی سیر کراتے ہیں جیسے "افواہ گرم ہے" ملاحظہ فرمایئے:

"افواہ بطور مونث مستعمل ہے۔ ہماری حقیر رائے میں صیغۂ تانیث کا استعمال طبقۂ نسواں کے خلاف اہلِ زبان کی ایک منظم سازش ہے۔ جب ہم نے اپنے دوست سقراط کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا تو حضرت فرطِ مسرت سے کھل اُٹھے ـــــ
"قاضی جی کیوں دُبلے شہر کے اندیشے میں۔ عورتیں فطرتاً چٹخارے دار چیزوں کی شائق ہوتی ہیں۔ روزمرہ کی باتوں کے پھیکے پن کے مقابلے میں افواہ کا چٹخارا انھیں زیادہ مرغوب ہے، لہذا وہ بڑھ چڑھ کر افواہیں گڑھتی ہیں، پھیلاتی ہیں ـــ افواہ کو مونث قرار دے کر اہلِ زبان نے افواہ بازی کے سلسلے میں عورتوں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔"

گاے، ثریا سے زمین پر، کرشمہ سازیاں الیکشن کی، سورج نے زباں کھولی، اور مسز بھروچہ (خاکہ) اپنی جگہ بھرپور اور اپنے موضوعات سے انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔ 'گاے' میں ہمارے سماج میں عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کی بھرپور اور دلچسپ عکاسی ہے۔ حوالے دینے سے طوالت کا خطرہ ہے اس لیے صرف نفسِ مضمون کی جانب اشارے کر رہا ہوں۔ 'ثریا سے زمین پر" میں تعلیم کی اہمیت اور اپنے محکمے میں ہونے والی چالاکیوں کے بارے میں بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ "سورج نے زباں کھولی" میں سائنس جیسے خشک موضوع پر رنگین پیرائے میں روشنی ڈال کر انشائیہ نویسوں کے لیے نئے میدان فراہم کرنے کی شاندار کوشش کی ہے۔ "مسز بھروچہ" بہت شاندار اور دردمندانہ خاکہ ہے جو سچ مچ کام کو عبادت سمجھنے اور پرخلوص قومی یکجہتی کی ترغیب دلاتا ہے۔
سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب اگر رشیدہ مُلّا جو ترقی کرتے کرتے پرنسپل رشیدہ قاضی بن چکی ہیں۔ بامحاورہ، رنگین، چٹ پٹی اردو جواب تک بہار اور یوپی والوں کی مملکت سمجھی جاتی تھی، اس مملکت پر رشیدہ قاضی نے فاتحانہ انداز میں قدم رکھا ہے۔ بی ریختہ کے لیے کوکن کی اس بیٹی کو گلے لگاتے ہی بنے گی جس سے اس کے ہی خلوت اور آنگن، ڈیوڑھی اور دالان کی زینت بڑھے گی۔ اگر تقریر کو حسنِ صورت کا ایک حصہ کہیں اور تحریر کو حسنِ سیرت کی عکاس تو رشیدہ قاضی صورت اور سیرت دونوں ہی میں ماشاءاللہ سبحان اللہ۔ مجھے یقین ہے کہ "پرواز" کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی، مانگ کر پڑھنے والے لوگ اسے خریدنے پر مجبور ہوں گے۔ اس لیے کہ ایک ہی کتاب بار بار مانگ کر نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہاں! ہیرا پھیری کی بات الگ ہے ـــ ●

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

● فروری ۸۹ء کے مہمان اداریہ میں علوی صاحب کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ میں نے اپنی کتاب "قرۃ العین حیدر کا فن" میں نسیم حجازی کو قرۃ العین سے بڑا ناول نگار قرار دیا ہے، بلکہ میرے خیال میں اردو کی سب سے بڑی ناول نگار قرۃ العین ہی ہیں اور صرف تاریخی ناول نگاری کے سلسلے میں میں نے نسیم حجازی کی بعض خوبیوں اور کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی پٹنہ

● مارچ کے شمارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں ایک انتہائی فاش غلطی ہوئی ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو کہ انٹرنیشنل حافظ سیمینار میں حافظ پر مقالہ پڑھ چکے ہیں ان سے ایسی شدید لغزش ہو جائے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے اختتام پر یہ شعر حافظ سے منسوب کیا ہے ؎

حاصل عمر نثار رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

یہ شعر شہزادہ سام میرزا کا ہے۔ خاندان صفویہ کے اس بدقسمت شہزادے کی آنکھیں خود اس کے والد نے نکلوا دی تھیں۔

ڈاکٹر یعقوب عمر۔ حیدر آباد

● "کتاب نما"، مارچ ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا مضمون "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟" پڑھا۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ بحساب ابجد ہر چیز کے نام میں 'اسم محمدؐ' کی جلوہ گری کے بارے میں عرصۂ دراز سے یہی جانتا ہوں کہ یہ طریقہ گرو نانک کی طرف منسوب ہے۔ جناب باہر براری نے اگر اسے اپنا نتیجۂ فکر بتایا ہے تو غلط ہے۔ "الرسول القائد"، کے علاوہ بھی دوسری کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ فی الوقت دوسرا حوالہ تو ممکن نہیں ہے ہاں مولانا محمد عثمان معروفی مدظلہٗ کی 'ایک عالمی تاریخ'، کا درج ذیل اقتباس لائق توجہ ہے :-

"نام محمدؐ کی جلوہ گری"

یہ ایک حیرت انگیز حسابی حقیقت ہے کہ بحساب ابجد دُنیا کی ہر چیز کے عدد میں مندرجہ ذیل قاعدے سے ۹۲ کا عدد نکلتا ہے جو لفظ محمدؐ کا عدد ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر شے کے عدد کو چار گنا کر کے اس میں دو جوڑ دیجیے پھر اس عدد کو پانچ سے گنا کر کے ۲۰ سے تقسیم کیجیے اور جو عدد باقی بچ جائے اسے پھر نو گنا کر کے اس میں دو جوڑ دیجیے تو ۹۲ نکل آئے گا۔ مثلاً دُنیا کا عدد ۶۵ ہے اسے چار ۴ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ۲۶۰ ہوا اس میں دو جوڑ دیا ۲۶۲ ہو گیا اس کو پھر پانچ سے ضرب دیا تو حاصل ضرب ۱۳۱۰ ہوا اس کو ۲۰ سے تقسیم کیا تو ۱۰ باقی بچا۔ ۱۰ کو ۹ سے ضرب دیا تو ۹۰ ہوا پھر اس میں ۲ جوڑ دیا ۹۲ ہو گیا۔ اس طرح ہر ایک عدد سے ۹۲ ہی نکلے گا۔"

ایک عالمی تاریخ صفحہ ۱۲۷ مصنفہ مولانا محمد عثمان معروفی مدظلہٗ
مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء

مذکورہ بالا طریقہ کے علاوہ ناچیز کے نزدیک درج ذیل طریقہ بھی ہو سکتا ہے جو زیادہ سہل بھی ہے۔ وہ یہ کہ کسی بھی عدد کو لے لیں اور اسے بیس سے ضرب کریں اور حاصل ضرب میں دس جوڑ دیں۔ حاصل جمع کو پھر بیس سے تقسیم کریں جو باقی بچے اسے نو سے ضرب دیں اور حاصل ضرب میں دو جوڑیں تو ۹۲ نکلے گا۔

جیسے دُنیا کے اعداد ۶۵ ہیں

یا پھر رام کے اعداد ۲۴۰

```
۲۴۰
×۲۰
----
۴۸۰۰
+۱۰
----
۲۰) ۴۸۱۰ (۲۴۰
۴۰
----
۸۱
۸۰
----
۱۰
×۹
----
۹۰
+۲
----
۹۲
```

```
۶۵
×۲۰
----
۱۳۰۰
+۱۰
----
۲۰) ۱۳۱۰ (۶۵
۱۲۰
----
۱۱۰
۱۰۰
----
۱۰
×۹
----
۹۰
+۲
----
۹۲
```

محمد ضمان اللہ ندیم غفرلہ، بھپورہ، بھوانی پور، بھروارہ
ضلع دربھنگہ (بہار) ۸۴۷۱۰۴

● وارث علوی کا اشاریہ: وارث علوی کے اشاریے میں اور کچھ ہو یا نہ ہو "ذہن" ضرور ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھا جائے تو اردو کا ادب واقعی زوال پذیر ہے۔ یہ زوال اس لیے ہے کہ اردو قوم رو بہ زوال ہے ـــــ مجھے یقین ہے کہ بہت سے "حیات اور کارنامے" قسم کے اردو کے نکتہ سنج "عالم" وارث علوی کو پاگل قرار دیں گے۔ کیوں کہ وہ مدیروں کی خوشامد اور گروہ بازی کر کے نمایاں طور پر رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اور وارث علوی نے رسالوں کے ان اوراق کو ہی ان کا مدفن کہہ دیا۔ وہ یہ بھی کہیں گے کہ وہ سال بہ سال ادبی رفتار کی سالانہ رپورٹ کو فاضلانہ مضمون کی صورت دینا، کسی طرح غیر اہم ادبی خدمت نہیں۔ صحیح فرمائیں گے وہ۔ لیکن وارث علوی جو بول رہا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ صحیح ہے۔ اپنی ایک چھوٹی سی حسین دُنیا بنا لینا اور اسی کے حسن پر نازاں اور مطمئن رہنا بہت قابلِ تعریف بات نہیں۔ دنیا بڑی وسیع، متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ کاش اردو کے بہت سے "عالم" کبھی اپنی دُنیا سے بھی نکلتے!

افروز عالم، دربھنگہ (بہار)

● معمولی سی تبدیلی نے پرچہ کو بے حد دلچسپ اور معلوماتی بنا دیا ہے۔ اشاریہ کے تحت مہمان مدیر کے اداریے کے سبب پرچہ کو نیا رنگ روپ مل گیا ہے۔ ہر فنکار کے ذہن میں بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے تحت کچھ نہ کچھ خیالات و احساسات پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر اظہار کے بغیر ان کے ذہن کے تہہ خانے میں ہی گھٹ کر رہ جاتے ہیں وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس اظہار کا کوئی وسیلہ نہیں۔

اسد بدایونی کا خط 'کتاب نما' کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں مطالعہ سے گزرا۔ ان کا لہجہ ذرا تیکھا ہو گیا

ق صاحب نے دراصل اردو کے استاد و طالب علم کی تساہلی اور تن آسانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔
، فنکاروں کی حیات و خدمات پر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آسانی سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل
ہے۔ اور اکیڈمی کے تعاون سے مقالے بھی چھپ جاتے ہیں، مگر ادب کی دُنیا میں سچ تو یہ ہے کہ
فہ نہیں ہوتا۔ فاروقی صاحب نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک
ہے۔ اسد بدایونی کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر فاروقی صاحب نے کسی راز کو منکشف
سارت کی ہے تو محض اس لیے کہ ان کا تعلق شعبۂ تعلیم سے نہیں، یہ حقیقت مسلم ہے کہ ہر فنکار اس
ں ہوتا کہ اس کی حیات و خدمات پر کام کیے جائیں۔ ہر چیز کی قیمت بازار میں یکساں نہیں ہوتی۔ یہ تو اسد صاحب
ہے کہ وہ کم معروف یا غیر معروف ادیبوں پر کام کرنا زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔ ویسے عام طور پر یہ دیکھا
کہ مشہور فنکاروں کے سلسلہ میں ہی کچھ نہ کچھ ہوتا رہا ہے۔ جدید ادب پر میں نے جو بھی مضامین دیکھے
ں ہندستان کے کچھ مشہور شعراء کا ہی نام لیا گیا ہے۔ خود انھوں نے اپنے مضمون جو "دائرہ" میں
،، بہار کے سلطان اختر، علیم اللہ حالی اور پرکاش فکری کا نام نہیں لیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے
ں شعراء بہار سے باہر مشہور ہی نہیں ہیں۔ ورنہ اسد صاحب ان کا نام اپنے مضمون میں ضرور
۔ ویسے یہ انکشاف ضروری ہے کہ "نئے نام" (نئی شاعری کی دستاویز) میں تینوں شعراء موجود ہیں
کرر مطالعہ کے لیے ذیل کا جملہ ان کے مضمون سے پھر نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔
کوئی رسالہ کھولیے، کوئی مجموعہ پلٹیے، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ شاعر نے اپنے محلّے کے باہر والے
پڑھا ہے"
شاہد کلیم۔ دودھ۔ کٹورا۔ آرا

اس بار کے مہمان مدیر وارث علوی ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید کو ایک نیا طرز اور اسلوب
۔ اور بات ہے کہ ان کا انداز کبھی کبھی اتنا جارحانہ ہو جاتا ہے کہ قاری بھی تلملا اُٹھتا ہے تاہم ان کی حقیقت پسندی
نہیں کیا جا سکتا۔ اس اشاریے میں انھوں نے جتنی بھی باتیں کہی ہیں ان سے میں صد فی صد اتفاق کرتا ہوں
شخص اتفاق کرے گا جو ادب میں غیر جانبدارانہ رویے کا قائل ہوگا۔ آج کے نقاد بزدلی، خوشامد پسندی اور
صبیت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا ادب غلط سمت کی طرف گامزن ہے۔ ادب کے نام
یں پیش کی جا رہی ہیں وہ معمّا اور چیستاں ہو کر رہ گئی ہیں اور الزام قارئین کے سر دھرا جا رہا ہے کہ وہ ناقص العقل
کے پلّے کچھ پڑتا ہی نہیں۔ وارث علوی نے اس قسم کے ادیبوں اور ناقدوں کی جس انداز سے خبر لی ہے
أت کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ مگر علوی صاحب کا یہ اداریہ اتنا مختصر ہے کہ پورے ۲۷ صفحہ کو محیط ہے۔
، اگر تفصیل سے کہی جائیں تو دس صفحے میں بھی آسکتی تھیں"۔ پھر بھی قابلِ مبارکباد ہیں علوی صاحب کہ
نے ایک مقالہ نما اشاریہ لکھ کر جرأتِ رندانہ کا ثبوت دیا۔

حکیم محمد حسین خاں کی تحقیق اس لحاظ سے بیحد اہم ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے عالم اور صاحبِ طرز
، اوّلیں تصنیف منظرِ عام پر آگئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک عالم اور صاحبِ طرز ادیب تھے
ایکتا کے علمبردار بھی تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مولانا مودودی (مرحوم) کا نام سُنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانیوں پر
تے ہیں اور بعض خوف سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں کہ شاید وہ کوئی جرم تو نہیں کر رہے ہیں اور اس طرح کی تحریروں کی اشاعت
[illegible]

کا شکار ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مقالہ "اردو میں جاسوسی ادب" بھی انتہائی اہم ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک اردو ادب کے ٹھیکیدار اور ناقدین جاسوسی تخلیقات کو اچھوت سمجھ کر ادب کی سرحد میں داخل ہی نہیں ہونے دیتے تھے۔ خیر اب وہ جاسوسی ادب تو کہلایا۔

مظہر امام کا مقالہ "ترقی پسند ادبی تحریک بے سمت سفر" ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا تھا، اگر یہ انھیں دنوں شائع ہوتا تو دھاکہ خیز ثابت ہوتا اور مظہر امام تمام عمر ترقی پسندوں کے وار بچاتے بچاتے بے حال ہو جاتے۔ پھر بھی انھوں نے اتنی جرأت تو کی کہ اس تنظیم سے وابستہ ہونے کے باوجود اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک اسی زمانے میں دم توڑ چکی تھی گرچہ اس کے نام لیوا آج بھی باقی ہیں اور مُردہ گھوڑے کو گھاس کھلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ میں ۱۹۷۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین رانچی یونٹ کا جوائنٹ سکریٹری تھا انھیں دنوں میں نے اپنے مقالہ "مخدوم۔ رومان سے انقلاب تک" مطبوعہ زبان و ادب پٹنہ۔ میں ترقی پسند ادبی تحریک کے زوال کی بات کہی اور دوسرے مقالہ "پریم چند۔ اور میدان عمل" مطبوعہ ہماری زبان دہلی میں "میدان عمل" پر بے لاگ تنقید کی تو مجھے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے نہ صرف یہ کہ جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ سے ہٹا دیا بلکہ میری ممبرشپ بھی ختم کر دی گئی۔ جس کا مجھے قطعی غم نہیں ہے، لیکن آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔

اس شمارہ میں احمد ندیم قاسمی کا انٹرویو بھی خاصے کی چیز ہے۔

منصور عمر شعبۂ اردو۔ سی۔ ایم۔ کالج۔ دربھنگہ

● فروری ۸۹ء کا "کتاب نما" بصر نواز ہوا۔ مشمولاتات بے حد معیاری اور معلوماتی ہیں بالخصوص قتیل شفائی اور ساحل احمد کی غزلیں قابلِ صد تحسین ہیں۔ مگر قتیل شفائی کے مطلع کا مصرع ثانی کاتب کی بے اعتنائی کے باعث ناموزوں چھپ گیا ہے۔ مطلع کا دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے۔

"پھینکے گئے ہیں سمندر میں ہم پھر بھی اپنا خشک بدن ہے"

منیر الدین احمد کی احمد ندیم قاسمی سے گفتگو دلچسپ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل حقیقت ہے کہ ایک شخصیت میں دو اوصاف کا مجتمع ہو جانا ایک غیر معمولی بات ہے۔ اردو ادب کے مایۂ ناز شاعر و افسانہ نگار کی پُر اثر گفتگو میرے دل کی عمیق گہرائی میں اترتی چلی گئی۔

پنجابی کہانی "سفید پوش" پسند آئی۔ علی امام نقوی کا افسانہ "کھوئی" متاثر نہ کر سکا۔ "کھلے خطوط" کا سلسلہ نئے قلمکاروں کے لئے بہت اچھا ہے۔ خصوصاً ممتاز شعرائے کرام کے خطوط قابلِ غور ہیں۔ "کتاب نما" دن دونی رات چوگنی نکھرتا اور سنورتا جا رہا ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

عبدالشکور شکور۔ کٹک۔ (اڑیسہ)

● "کتاب نما" مارچ پیش نگاہ ہے۔ قمر رئیس صاحب کا مضمون پسند آیا۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے اپنے مضمون میں ماہر براری کا جو قطعہ لکھا ہے وہ ظاہر ہے آج سے بہت پہلے گرونانک اور سنت کبیر سے منسوب ہے۔ شمیم طارق نے جو قطعہ لکھا ہے جس پر یحییٰ نشیط صاحب نے اپنے شک کا اظہار ہے وہ بالکل درست ہے دراصل یہ قطعہ شمیم طارق صاحب نے غلط نوٹ کیا ہے ملاحظہ فرمایئے سب رنگ ڈائجسٹ دہلی مئی ۷۴ء کا شمارہ جس کا صفحہ نمبر ۱۹۵ ہے۔ وہ قطعہ اس طرح ہے۔

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کر لو وائے
دو ملا کے پچگن کر و بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کو نو گن کر لو دو اس میں دو ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو نام محمد آئے

میرے خیال سے یہ دوہا کبیر ہی کا جسے گرو نانک سے منسوب کر دیا گیا۔ گوہر شیخ پوروی
تیلیا باغ بنارس ۲۲۱۰۰۲

● "کتاب نما" کا اپنا ایک پرکشش اسٹائل ہے مجھے اس کا یقین ہے کہ "کتاب نما" کا یہ اسٹائل اردو کی ترقی کی طرف ایک معتبر قدم ثابت ہوگا۔ جنوری ۸۹ء کے شمارے میں مہمان مدیر شمیم حنفی کا اداریہ پڑھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ ادب عوامی مسائل اور اپنے ثقافتی روایت سے کٹ کر کوئی قابل قدر کام انجام نہیں دے سکتا! دیگر مشمولات بھی پسند آئیں۔ "مانگے کا اجالا" کا تو جواب نہیں۔ یہ ایک دلچسپ اور اچھا سلسلہ ہے۔

"گوشۂ احمد جمال پاشا" نے اس شمارے کی افادیت اور اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ پاشا صاحب پر قاضی عبدالستار، یوسف ناظم اور اعجاز علی ارشد نے اچھے مضامین لکھے ہیں۔ محترمہ سرور جمال کے مضمون نے علم میں اضافہ کیا۔ "بقلم خود" کے تحت آپ نے پاشا صاحب کی اچھی اور نمایندہ تخلیقات جمع کر دی ہے۔ اس کے لیے آپ کو کتنی محنت کرنی پڑتی ہوگی ہم جیسے دور افتادہ صرف اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خدا آپکو بعافیت رکھے!

خالد عبادی۔ پورہ۔ ڈاکخانہ دھوئی۔ دربھنگہ

ادبی اور تہذیبی خبریں

بازگوئی پر ادبی مذاکرہ

بمبئی۔ برسوں بعد ادبی گڑھ کرلا میں نثری جمود کو توڑنے کے لیے تکمیل رائٹرس گروپ کی جانب سے ملک کے نامور، معتبر اور مستند افسانہ نگار جناب سریندر پرکاش کے تیسرے افسانوی مجموعہ (جسے شائع ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ بیت گیا ہے) باز گوئی پر بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کی گئی۔ اس مذاکرہ میں شہر اور بیرون شہر کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

سب سے پہلے نوجوان اور ابھرتے شاعر جناب قاسم امام نے تکمیل رائٹرس گروپ کی جانب سے تمام مہمانوں اور سامعین کا استقبال کیا۔ اور مشتاق مومن کو نظامت کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی۔

مشتاق مومن نے کہا کہ سریندر پرکاش بہت بچتے رہے اور اپنے آپ کو بچاتے رہے۔ آخر انھیں ہم نے راضی کر ہی لیا۔ سب سے پہلے جناب انور قمر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مقصود اظہر اور مظہر سلیم (کنوینر نشست) اور ادارہ تکمیل کو مبارکباد پیش کی کہ ان نوجوانوں نے اتنی کم مدت میں ایک پر تکلف نشست کا انعقاد کیا۔ انور قمر صاحب کے بھرپور مضمون سنانے کے بعد مراٹھی کے مشہور ادیب و شاعر جناب رام پنڈت نے اپنا مختصر مگر جامع مضمون پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سریندر پرکاش دراصل ایک عہد کا نام ہے۔ ایک دور کا نام ہے۔

ان کے بعد جدید ترین افسانہ نگار انور خاں نے الزام لگایا کہ سریندر پرکاش کے افسانوں میں ہر جگہ بلراج مینرا آجاتے ہیں۔ سریندر جی نے اپنا ذاتی منتھ اختراع کرنے کی کوشش کی ہے بازگوئی اور بجوکا سے سریندر پرکاش کے فن کا عروج ہوتا ہے۔

مضامین کے دور کے بعد اظہار خیال اور کھل کر بحث کرنے کا دور پر سکون ماحول میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے جناب جاوید ناصر نے بحث کا آغاز کیا۔ انھوں نے کہا سریندر جی جب نیند سے چونکتے ہیں تو "بجوکا" سرزد ہو جاتا ہے یا کٹا ہوا سر لکھ جاتے ہیں۔ سلام بن رزاق نے کہا کہ علاقائی ادب کے شاہکار افسانوں میں سریندر جی کے افسانے رکھے جا سکتے ہیں۔ جناب یعقوب راہی نے کہا کہ ان میں یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ انھیں کسی بزرگ کو دھکا دینے کی نوبت پیش نہیں آئی مشہور محقق ڈاکٹر یونس اگاسکر نے رام پنڈت کے مضمون میں منتھ کی چوری اس جملے سے بحث شروع کی اور سریندر جی کے افسانوں میں اسالیب کے تعلق سے کہتے ہوئے اپنی بات ختم کی نوجوان افسانہ نگار مظہر سلیم نے کہا کہ سریندر جی قاری اور افسانے کے درمیان پل کا کام انجام دیتے ہیں رام پنڈت نے منتھ کے استعمال پر انتظار حسین کی نرناری پر چوری کا الزام لگایا۔ ہندی کے مشہور کوی جناب آتما رام نے منتھ کے تعلق سے پر مغز تقریر کی اور دنیا کے عظیم اسکالرس کے حوالے بھی حسب معمول دیے۔

مستند و معتبر افسانہ نگار جناب سریندر پرکاش نے تکمیل رائٹرس گروپ کا شکریہ ادا کیا اور سلام بن رزاق اور انور خاں و دیگر شرکا کے سوالوں کے جواب دیے۔ بازگوئی کے تعلق سے غلط فہمیوں کو دور کیا۔ سریندر جی نے آخر میں اپنا نیا افسانہ "دو آدمی" نذر سامعین کیا۔

اس پر تکلف نشست کی صدارت اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب ساگر سرحدی صاحب نے فرمائی۔ انھوں نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ سریندر جی اور ان کے فن کو سمجھنے کے لیے یہ نشست نیک شگون ہے۔ اس پر تکلف نشست میں پرویز یداللہ مہدی، جاوید صدیقی، شاہد ندیم، سعید راہی، قاسم امام، شاہد لطیف، اقبال نیازی، اسلم پرویز اور

بھیونڈی سے اقبال عثمان مومن، ایم مبین اور سہیل احمد قریشی بھی شریک رہے۔

آخر میں کنوینر نشست جناب مقصود اظہر نے تمام مہمانان سامعین اور انجمن تبلیغ الاسلام کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

جناب جلال اصغر کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

مظفرپور اور نئی نسل کے باشعور اور صاحب نظر شاعر و ادیب جناب جلال اصغر فریدی کو بہار یونی ورسٹی مظفرپور نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند سے نوازا ہے۔ مقالے کا موضوع تھا "حیات اللہ انصاری کی حیات و خدمات"

ڈاکٹر جلال اصغر فریدی کے تحقیقی مقالے کے نگراں جناب ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی، پروفیسر شعبۂ اردو بہار یونی ورسٹی مظفرپور تھے اور ممتحن ڈاکٹر ظفر ادگانوی، صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونی ورسٹی اور ڈاکٹر محمود الہٰی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونی ورسٹی صاحبان تھے۔

اردو کے ممتاز شاعر خضر برنی نہیں رہے

نئی دہلی۔ یکم مارچ۔ اردو کے ممتاز شاعر اور جنگ آزادی کے مجاہد سیّد خضر برنی کل رات مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ خضر برنی اردو کے صاحب دیوان شاعر اور صحافی تھے۔ موصوف طویل عرصہ سے اوکھلا نئی دہلی میں مقیم تھے۔ تقسیم وطن سے پہلے خضر برنی نے بلند شہر اور اس کے اطراف میں آزادی وطن کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی ولولہ انگیز اور قومی نظموں کی وجہ سے ایک عرصہ تک انگریز حکومت کے عتاب کا نشانہ بنے رہے۔ آزادیِ وطن کے بعد خضر برنی دِلّی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

مولانا فاروق کا انتقال

نئی دہلی ۵ مارچ۔ ٹیلی فون سے آمدہ اطلاع کے مطابق یوپی کانگریس کے سکریٹری و مہتمم مدرسہ امینیہ مولانا سیّد محمد فاروق کا آج شب ۱۱ بجے انتقال ہو گیا۔ وہ گزشتہ کئی دن سے علیل تھے ان پر فالج کا اثر ہوا تھا اور پچھلے ایک ہفتہ سے ان پر بیہوشی طاری تھی۔ نماز جنازہ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں اور تدفین نیا قبرستان دِلّی میں ہوئی۔

محمد محسن اختر کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری

محمد محسن اختر کے تحقیقی مقالے "اقبال اور تصوف" پر بھاگلپور یونی ورسٹی، بھاگلپور نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے زیر نگرانی مکمل ہوا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سیمینار

نئی دہلی ۱۸ر فروری۔ آج شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے زیر اہتمام مولانا آزاد اور فارسی زبان و ادب پر سیمینار کے اختتام پر ایک قرارداد منظور کر کے حکومت سے درخواست کی کہ مولانا آزاد کی یاد میں ایک عربی و فارسی اکادمی قائم کی جائے۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے استاد فارسی پروفیسر عبدالودود اظہر نے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ مولانا آزاد کو سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا۔

سیمینار کے آغاز سے قبل صدر شعبۂ فارسی پروفیسر شعیب اعظمی نے فارسی ادب سے مولانا آزاد کے والہانہ شغف کا تذکرہ کیا۔ سیمینار کا آغاز صابر علی شاگرد فارسی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ صدر اجلاس مالک رام نے بھی اپنے خیالات سے نوازا۔ نائب شیخ الجامعہ محمد نسیم نے فارسی کی ترویج و اشاعت پر زور دیا اور فارسی کا رواج کم ہونے پر افسوس ظاہر کیا۔ تمام مقالہ نگاروں نے مولانا آزاد کی فارسی دانی اور فارسی ادب سے ان کے شغف اور لگاؤ کا ذکر کیا۔ مقالہ نگاروں نے کہا کہ مولانا آزاد مشرقی تہذیب و تمدن کے نمائندے اور علمبردار تھے اور ایران اور افغانستان میں ان کو متعارف کروانے کی شدید ضرورت ہے۔ اس سیمینار میں کابل یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر احمد جاوید، ریاض شروانی، ڈاکٹر محمد اسلم خاں، ڈاکٹر شریف حسین

فارسی، پروفیسر ستیہ نند جاوا، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر ترغفار اور مسیح الحسن نے اپنے مقالے پیش کیے۔ مسٹر ستیہ نند جاوا نے اپنے مقالے میں مولانا کی فارسی شاعری کا بھرپور جائزہ لیا۔ اختتامی اجلاس کے صدر پروفیسر امیر حسن عابدی نے اپنے قیمتی خیالات سے نوازا۔

بامقصد شاعری

قمر فری لائبریری (سورت) کی توسیع کے لیے گاندھی سمرتی ہال سورت میں ایک شاندار مشاعرہ زیر صدارت قمر جلال آبادی منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر نظام الدین نظام نے انجام دیے۔ ندا فاضلی، عزیز قیسی، حسن کمال ظفر گورکھپوری، قیصر الجعفری، ممتاز راشد اور عبدالاحد ساز کے ساتھ ہندستان کے کئی شاعروں نے شرکت کی۔

وجے دیو سنگھ کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری

جناب وجے دیو سنگھ کو ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالے "پروفیسر محمد مجیب کے ڈراموں کا فنی اور تنقیدی جائزہ۔ اسٹیج ڈرامے کی روایات کی روشنی میں" پر جموں یونی ورسٹی جموں نے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی ریڈر شعبۂ اردو اور معاون نگراں پروفیسر دیویندر سنگھ صدر شعبہ اور پنجابی یونی ورسٹی آف جموں کے زیر نگرانی لکھا گیا۔

مہاراشٹر اردو اکادمی میں سمینار

مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے چپلون (رتناگری) میں اردو مراٹھی ادب کا آدان پردان کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت محمد حسین دلوائی (ممبر راجیہ سبھا) نے فرمائی۔ صدارتی خطبہ میں آپ نے فرمایا کہ آج کے ماحول میں زبانوں کا آپسی لین دین بہت ضروری ہے آج کے حالات میں جب مذہب دلوں کو جوڑنے میں ناکام ہو رہا ہے تو تہذیبی ادبی اور ثقافتی محاذ پر قومی یک جہتی کے لیے کام کیا جانا چاہیے۔

مقامی کنوینر جناب مغل اقبال اختر نے حاضرین کا استقبال کیا اور سمینار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔

خالدہ آرائی نے مراٹھی میں اردو غزل پر اپنا تعارفی مضمون پیش کیا۔ شرف کمالی نے اردو مراٹھی ادب کا آدان پردان ضرورت اہمیت پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

رتنا ٹیک گندھے نے مراٹھی میں ڈراموں کی روایت اور اردو ڈراموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔

سلام بن رزاق نے مراٹھی اردو افسانے پر اظہار خیال کیا اور آپ نے اپنی کہانی کا مراٹھی روپ بھی پیش کی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ بھالچند دیوا کر (مدیر مراٹھی روزنامہ ساگر) نے ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، پر اپنا طویل مقالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی (صدر شعبۂ اردو یونی ورسٹی بمبئی) نے اپنی تقریر میں اردو مراٹھی کے تراجم اور ان کی تاریخ اور روایت پر روشنی ڈالی اور تخلیقی ادب کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ترجمے کی اہمیت پر زور دیا۔

سید وقار حسن قادری (سپرنٹنڈنٹ ایگزیکیٹو اردو اکادمی) نے سمینار کی نظامت فرمائی اور ان کے شکریہ کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

کلیاتِ وجد "جمالِ اجنتا جلال ہمالہ" کی اجرا

اورنگ آباد۔ نائب صدر ہند عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ہاتھ سے انڈو پاک کے مشہور شاعر پدم شری سکندر علی وجد مرحوم کے کلیات "جمال اجنتا جلال ہمالہ" کی رسم رونمائی بروز ۹ جنوری بمقام مولانا آزاد کالج کیمپس انجام پائی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا چانسلر جامعہ اردو علی گڑھ نے وجد مرحوم کی خدمات کو سراہتے ہوئے مولانا آزاد تعلیمی سنگھ کے نائب صدر اور اردو کے شاعر کی حیثیت سے ان کے رویہ کی ستائش کی۔ ڈاکٹر منظر محی الدین پرنسپل مولانا آزاد کالج نے تعارف کروایا اور نائب صدر ہند نے کتاب کا پہلا نسخہ بیگم وجد زبیدہ خاتون کے حوالے کیا۔ اس کتاب کی اشاعت کے لیے مہاراشٹر اردو اکادمی نے ۲۰ ہزار روپے کی مالی اعانت دی ہے۔ ۱۰۰۰ صفحات پر مشتمل وجد مرحوم

کی زندگی کا تمام تر کلام اس کتاب میں یکجا کیا گیا ہے۔ اور اس کی قیمت ۵۰ روپے رکھی گئی ہے۔ جو مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے پتے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

جن وادی لیکھک سنگھ کی مہاراشٹر کانفرنس

جن وادی لیکھک سنگھ کی مہاراشٹر کانفرنس کے موقع پر بمبئی کے مندرجہ ذیل اہم اردو مصنفین نے جن وادی لیکھک سنگھ کی باضابطہ رکنیت قبول کر لی ہے اور کانفرنس میں بھی شریک ہوئے

ڈاکٹر ظ انصاری۔ اصغر علی انجینیر۔ سلام بن رزاق۔ یعقوب راہی، انور خاں۔ ساجد رشید مدیر اردو "ٹائمز"۔ علی امام نقوی۔ افتخار اعظمی۔ انور ظہیر صاحبان۔

واضح رہے کہ حسن کمال صاحب مدیر اردو بلٹز، حسن نعیم اور محمود ایوبی صاحبان پہلے ہی سے جن وادی لیکھک سنگھ کے رکن ہیں۔

مہاراشٹر جن وادی لیکھک سنگھ کی تیسری سالانہ کانفرنس ۱۴ اور ۱۵ جنوری ۸۹ء کو بمبئی میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح پروفیسر محمد حسن نے کیا۔ ریاستی شاخ کے سکریٹری ڈاکٹر دسرت سنگھ (شعبہ ہندی، بمبئی یونیورسٹی) نے رپورٹ پیش کی اور جناب حسن کمال نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ کانفرنس نے اتر پردیش میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیے جانے کے مطالبے کی حمایت میں تجویز بھی منظور کی۔

غلام رسول ساجد کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

علمی و ادبی حلقہ میں یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ جناب غلام رسول ساجد کو بمبئی یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ "اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ" پر۔ پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے یہ کام مہارشی دیانند کالج، پریل، بمبئی کے ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کی نگرانی میں مکمل کیا۔

کالج کے اردو دوست پرنسپل پروفیسر جی، بی شرلواستو، بھی قابل مبارکباد ہیں کہ موصوف کے کالج سے کسی بھی سبجکٹ میں یہ پہلی ڈگری ہے جو کہ اردو کے ایک طالب علم کو ملی ہے۔

محترمہ طاہرہ بنارسی صاحبہ کو
پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری

محترمہ طاہرہ حلیم بنارسی نے اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور ان کے ادبی نقوش پر بمبئی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ محترمہ نے یہ مقالہ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر کی نگرانی میں تیار کیا۔

مینکش بدایونی چل بسے

اردو کے مشہور شاعر مینکش بدایونی کا دل کی حرکت بند ہو جانے سے ۲۱ فروری کی صبح آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال ہو گیا۔ مینکش صاحب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔

ایک دیا اور بجھا
نسیم انہونوی

اردو کے مشہور ناول نگار، ادیب، صحافی اور پبلشر جناب نسیم انہونوی کا ۴ مارچ کو لکھنؤ میں انتقال ہو گیا ان کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔

نسیم صاحب مجموعی طور پر ۲۵ ناولوں کے مصنف ہیں انھوں نے ۱۹۲۸ء میں خواتین کے لیے ایک رسالہ 'حریم' کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۳۱ء میں ہفتہ وار 'سرپنچ' نکالا مرحوم بہت سی ادبی، سماجی اور اصلاحی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ نسیم بکڈپو کے نام سے انھوں نے ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا جس نے ملک کے مشاہیر ادیبوں، نقادوں اور ناول نگاروں کی کتابیں شائع کیں جن کی مجموعی تعداد ایک ہزار تین سو چونتیس ہے۔ نسیم صاحب کی حیات اور کارناموں پر حال ہی میں بنگال کے عبدالجبار صاحب نے اپنا مقالہ مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے

ہڑک مہلک ہوتا ہے
مگر آپ اسے روک سکتے ہیں
یہ ہوتا کیسے ہے؟
ہڑک، پاگل جانور، زیادہ تر کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔
ہڑک ہو جائے تو موت ہو جاتی ہے۔
کیونکہ اس سے شفا کا کوئی علاج نہیں ہے۔
احتیاطی تدابیر
مگر ہڑک سے بچا جا سکتا ہے، اپنے تمام پالتو کتوں کو ہڑک کا ٹیکہ لگوالیں۔
آوارہ کتوں کو پکڑنے اور ختم کرنے میں حکام کی امداد کریں کیونکہ آوارہ کتوں کو ہڑک
(پاگل پن) لاحق ہوتا ہے اور وہ پالتو کتوں کو کاٹ
کر انھیں بھی اس مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔
اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو زخم صابن اور پانی سے
اچھی طرح دھو ڈالیں اور فوراً نزدیکی اسپتال
یا شفاخانے میں جائیں۔
ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ
ڈاکٹر کے مشورے سے ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوائیے۔
سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی۔ جی۔ ایچ۔ ایس، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی۔
davp 88/782

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

مئی ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۵

فی پرچہ	۴/=
سالانہ	۲۵/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	۱۰۰/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	۲۲۰/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	۴۵/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

چند مشہور طبیب اور سائنس داں (بچوں کے لیے) ۹/-
تعلیمی خطبات (دنیا اڈیشن تعلیم) ڈاکٹر ذاکر حسین ۳۶/-
پیغام ہفتہ وار مکمل فائل (جرنلزم) خدا بخش لائبریری پٹنہ ۹۶/-
مضامین سیدین (مضامین) ڈاکٹر علیم الشان صدیقی ۴۰/-
مسلم پرسنل لا (حصہ دوم) (قانون) ایم شفیق انصاری ۳/-
صہبائے سہند (شعری مجموعہ) نشور واحدی ۸۰/-
فراق کی شاعری (مقالہ) ڈاکٹر انعان اللہ خاں ۱۲۵/-
سب رنگ (شاعری) الفت امین آبادی ۵۰/-
کائنات راز 〃 راز لائلپوری ۳۵/-
نازش ادب کالی داس گپتا رضا ڈاکٹر تارا چند رستوگی ۳۵/-
غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے اعجاز سبحانی ۸/-
اپنا خون (دنیا اڈیشن) ناول مسرور ۳۶/-
آدمی اور سکے 〃 〃 زلیخا حسین ۲۹/-
اکیلی 〃 〃 شرت چندر ۳۸/-
ربطہ 〃 〃 رضیہ بٹ ۳۵/-
شاہینہ 〃 〃 رضیہ بٹ ۵۰/-
بشرا 〃 〃 مینا ناز ۳۵/-
آن 〃 〃 رئیس احمد جعفری ۳۵/-
کاغذی حکم (شاعری) علیم جہاں گیر ۲۰/-
اردو میں بچوں کا ادب (تحقیقی مقالہ) ڈاکٹر خوشحال زیدی ۲۰/-
دو آدھے (افسانے) شمیم نکہت ۶۰/-
فتنہ جہیز (مذہب) عبدالرحمن کوندو ۲/-
موضوعات (مضامین) ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ۶۰/-
مکاشفۃ القلوب اردو (مذہب) تقدس علی خاں ۵۶/-
اردو ادب کی ایک صدی (دنیا اڈیشن) (ادب) ڈاکٹر سید عبداللہ ۳۶/-
اقبال فکر و فن (اقبالیات) ڈاکٹر سید محمد ہاشم ۶۰/-
حرف امتحان (شاعری) شہاب الدین ثاقب ۲۰/-

خون جگر (شعری مجموعہ) دھرم پال عاقل ۳۰/-
ان سے ملیے (خاکوں کا مجموعہ) مظفر گیلانی ۳۰/-
بساط (۱۰۰ کی غزلوں / آزاد غزلوں کا انتخاب) مناظر عاشق ہرگانوی / شاہد نعیم ۲۵/-

عبدالمغنی
"WARSI KUNJ,"
ALAM GANJ
PATNA-800007.

اشاریہ

ہندستان میں مشترکہ کلچر کی اصطلاح تقریباً ستر سال سے بہ کثرت استعمال کی جاتی رہی ہے۔ پوری خلافت تحریک گویا اس کلچر کی بنیاد پر چلی، اس لیے کہ اس نے آزادی کی جدوجہد میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور پارسی کو ایک محاذ پر جمع کردیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک میں فرقہ وارانہ سوال نے سیاسی شدت اختیار نہیں کی تھی، حالاں کہ چند سال پیش تر ہی تقسیم بنگال کے خلاف چلائی جانیوالی بہ ظاہر قوم پرستانہ مہم سے اس فرقہ پرستی کے آثار نمایاں ہو چکے تھے جس کو پھیلانے کا مکمل منصوبہ برطانوی سامراج ۱۷۵۷ء کے فوراً بعد بنا چکا تھا اور اس کی تکمیل کے لیے اس نے تہذیبی تفرقے کا حربہ اختیار کیا تھا، چناں چہ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ہندستانی زبان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے قیام کا ایک مطلب یہ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارے میں ہندستانی کا جو شعبہ تشکیل دیا گیا اس کے تحت اردو رسم خط ہی میں ہندی نام کی ایک نئی زبان بنائی گئی۔ اس کے باوجود ۱۸۶۹ء میں غالب کی وفات تک اردو برصغیر کی واحد قومی زبان کی حیثیت سے مروج و مقبول رہی اور یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں ملک کے سب سے بڑے شاعر نے اپنے خطوط کے ایک مجموعے کا نام "اردوے معلی" رکھا تو دوسرے کا "عود ہندی" لیکن ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ان میں اس وقت کے سب سے بڑے قومی رہنما سرسید کو محسوس ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے تہذیبی تقسیم کا جو منصوبہ بنایا گیا ہے وہ کامیاب ہو چکا ہے اور اب ہندستانیوں کا ایک بڑا طبقہ اپنی قومی زبان کو چھوڑ کر ایک فرقے کی زبان کو آگے بڑھا رہا ہے۔ یہ ملک میں سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ تہذیبی انتشار کا نمایاں رجحان تھا جسے ۱۹۲۰ء کے آس پاس خلافت تحریک نے گویا روکنے کی کوشش کی اور تقریباً ایک دہائی تک بعض اوقات ایسا محسوس ہوا جیسے قومی تفریق کا رجحان بدل جائے گا، مگر برطانوی سازش نے بالآخر برصغیر کو تقسیم کردیا۔

تقسیم ہند کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ ہندستان میں مشترکہ کلچر کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے جمہوریۂ ہند میں قومی یک جہتی کی تحریک سرکاری سرپرستی میں چلائی گئی، دستور میں ہر زبان، کلچر اور مذہب سے تعلق رکھنے والے شہریوں کو برابر کی سطح پر بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی، دفعات ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۱۲۰، ۲۱۰، ۳۵۰ اور ۳۵۰ الف سب کا مفہوم یہ ہے کہ عقیدہ و زبان وغیرہ کی بنیاد پر کسی شہری کے خلاف کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا اور قانون کی نگاہ میں سبھی شہری مساوی ہوں گے، ان کے مذاہب کا یکساں

احترام کیا جائے گا اور حکومت سب کی مدد کرے گی۔ یہی مطلب قومی ریاست کے سیکولر یعنی مذہبی طور پر غیر جانب دار ہونے کا بھی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر طبقے کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا ان کی مادری زبان میں بندوبست کرنے کی ذمّے داری آئینی طور پر اپنے سر لینے کے ساتھ ساتھ حکومت نے ثانوی سطح پر ایک سہ لسانی فارمولا وضع کر کے مادری زبان کے علاوہ ایک جدید ہندستانی زبان نیز ایک غیر ملکی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دستور کی ضمانتوں اور انتظامیہ کی یقین دہانیوں پر صحیح مکمل اور موثر طریقے سے عمل درآمد نہیں ہو سکا۔ اب مختلف زبانیں اپنے اپنے خانوں اور علاقوں میں بند ہو کر گویا اپنی اپنی تہذیبوں کی اشاعت اور اپنی اپنی قومیتوں کے فروغ کا سامان کر رہی ہیں، جس کے نتیجے میں تعلیمی، سیاسی اور معاشی انتشار بڑھتا چلا جا رہا ہے اور قومی یک جہتی کا خواب پریشاں ہوتا نظر آ رہا ہے۔

اس تشویش ناک صورتِ حال کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ آزاد ہندستان زبان کا مسئلہ حل کرنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔ ۴۷ء کے تہلکے کے زیر اثر دستور سازی کے وقت ۴۹ء میں فضا کی فرقہ واریت نے سیاست دانوں کے حواس اس درجہ مختل کر دیے کہ صحیح و سالم قومی زبان، ہندستانی بہ خطِ اردو و ہندی کو نظر انداز کر کے فقط صدرِ دستور ساز اسمبلی کے کاسٹنگ ووٹ سے دیوناگری ہندی کو قومی سطح پر ملک کی واحد سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا اور اردو کو شیڈول ۸ کی ایک درجن سے زیادہ قومی زبانوں کے خانے میں ڈال دیا گیا وہ بھی اس شان سے کہ نہ تو اس کے استعمال کا کوئی علاقہ متعین کیا گیا نہ اسے کسی ریاست میں سرکاری حیثیت دی گئی، حالاں کہ اس مقصد کے لیے آئین میں دفعہ ۳۴۷ بھی موجود ہے اور دفعہ ۳۴۵ بھی جن کے مطابق علی الترتیب اردو کے لیے یہ دونوں ضروری کام کیے جا سکتے تھے۔ اردو دوستوں نے ۵۰ء کے بعد جمہوریہ کے آغاز میں ہی اہلِ سیاست کی غلطی محسوس کر لی اور وہ ایک دہائی تک اردو کی علاقائی حیثیت تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے لیکن دفعہ ۳۴۷ میں معتدبہ تعداد کی نامعقول شرط نے جدوجہد کو ناکام بنا دیا۔ اس نامرادی سے سبق حاصل کر کے ۶۰ء سے اردو دوستوں کے بعض اہم حلقوں نے دفعہ ۳۴۵ کے تحت اردو کی سرکاری حیثیت کا مطالبہ شروع کر دیا اور اسے منوانے کے لیے ایک جمہوری و عوامی مہم چلائی، یہاں تک کہ بالآخر ۱۹۸۰ء میں ریاست بہار کی ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا وزارت نے باضابطہ سرکاری زبان کے ایکٹ میں اسمبلی کے ذریعے ترمیم کرا کے اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان بنا دیا اور ۸۱ء سے اس قانون پر بہ تدریج عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔ جب کہ اتر پردیش کی وزارتوں نے ابھی تک وعدے اور فیصلے کے باوجود اردو کو اس کی جائز قانونی حیثیت نہیں دی ہے۔ دیگر ریاستوں اور مرکزی علاقوں کا بھی یہی حال ہے۔

اردو کی حق تلفی سے سب سے زیادہ نقصان قومی یک جہتی کو پہنچا ہے اور ملک کی دوسری زبانوں کے شیداؤں کو یقین ہو گیا ہے کہ جب شمالی ہند میں اردو جیسی مقبول عوامی زبان کے لیے بھی گنجائش نہیں تو ہندی کے جنونی اپنی نام نہاد اکثریت کے بل پر کسی بھی قومی زبان کو حق الوسع پنپنے کا موقع نہیں دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اردو کے مرکزی علاقے کو فقط ہندی علاقہ قرار دے لیا ہے اور اردو فلموں کو ہندی فلموں کا نام دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ سہ لسانی فارمولے میں وہ دوسری زبان کے طور پر بھی جدید ہندستانی زبان کی حیثیت سے اپنے بچوں کو اردو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں اور صرف ایک پُر فریب سودا بازی کے لیے جنوبی ہند کی زبانوں کو اختیار کرنے کی باتیں بنا رہے ہیں۔ حالاں کہ اردو والے اپنی حد تک اس یک طرفہ رواداری کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دوسری زبان کے طور پر اپنے بچوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح جس چیز کو مشترکہ قومی تہذیب کہا جاتا رہا ہے

اس کی پاس داری کا بار تنہا اردو پر آ پڑا ہے اور ہندی گویا اس سے بری الذمہ ہو گئی ہے، اس لیے کہ جب تک اردو کو وہی قانونی مقام نہیں دیا جائے گا جو ہندی کا ہے اور ہندی بولنے والے اس طرح اردو نہیں پڑھیں گے جس طرح اردو پڑھنے والے ہندی پڑھ رہے ہیں اہلِ ملک میں وہ لسانی اتحاد پیدا نہیں ہوگا جو وحدتِ قومی کا موثر ترین عامل ہے۔

بہرحال، اردو تہذیب کے مستقبل کا تحفظ کم از کم اردو بولنے والوں کی ذمے داری ہے جسے کما حقہ ادا کیے بغیر وہ عزت کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس لیے کہ جدید ہندستان میں دوسری کوئی زبان ان معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی ترجمانی نہیں کر سکتی جو اردو آبادی کے لیے سرمایۂ وجود ہیں۔ بروقت اس بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ایک تہذیب مذہب کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے یا زبان کی بنیاد پر۔ اس لیے کہ کم از کم یہ حقیقت عیاں ہے کہ آج اردو زبان ہی ایک ایسی عظیم الشان تہذیب کا ذریعۂ اظہار ہے جو پچھلی صدیوں کے اندر ہندستان میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ خواہ تقسیم ہند کے تہلکے نے اس کی ترقی میں جو رکاوٹ بھی ڈالی ہو۔ اردو ابھی تک پورے ملک بلکہ برصغیر میں رابطے کی واحد زبان ہے اور بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے انگریزی اور چین کے بعد دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اردو کی یہ بین الاقوامی حیثیت ایک لحاظ سے اس کے تحفظ کی ضامن ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان ہونے کے علاوہ اردو کی تعلیم اور اس کے ادب وصحافت کی تخلیق واشاعت دنیا کے تقریباً سبھی اہم ممالک میں ہو رہی ہے اور اس کے شیداؤں کا حلقہ عالمی سطح پر بڑھ رہا ہے۔

تقسیم ہند کے باوجود اردو تہذیب منقسم نہیں ہوئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان اور پاکستان اردو کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان مشترکہ تہذیبی قدریں اردو ہی کے ذریعہ اظہار سے فروغ پا رہی ہیں۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اردو کا مقابلہ کہیں بھی وہاں کی علاقائی زبانوں سے ہے۔ کچھ تنگ نظر افراد جو بھی سوچیں، اس لیے کہ اردو کی آفاقیت اپنے دامن میں بھی ان زبانوں کے بہترین عناصر سمیٹے ہوئے ہے اور وہ سب زبانیں گویا اس کے سایے میں پروان چڑھ رہی ہیں جن سے سابقہ اسے اپنی تشکیل وترقی کے دوران میں پڑا ہے۔ اس سلسلے میں فرقہ وارانہ تعصبات اور طبقہ وارانہ مفادات بھی اردو کے راستے میں مزاحم نہیں ہیں۔ چاہے فسطائی اور بعض اشتراکی عناصر کتنی ہی ریشہ دوانیاں کریں۔ البتہ تشویش کی بات یہ ہے کہ آزاد ہندستان میں اردو اپنی تمام وسعتوں کے باوجود سیاسی طور پر جس خاص تہذیبی حلقے سے وابستہ کر دی گئی ہے اس کے ابن الوقت اور مفاد پرست افراد بدلے ہوئے حالات میں اردو کو اس طرح نہیں چھوڑ دیں جس طرح ماضی میں انھوں نے یکے بعد دیگرے عربی اور فارسی کو چھوڑ دیا۔ یہ افراد اپنی نئی نسلوں کے مستقبل کا سوال اٹھاتے ہیں اور تصور کرتے ہیں کہ ان کے مقدر کی تعمیر اردو کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ جس زبان کا تعلق معیشت اور معاشرے سے باقی نہیں رہتا۔ جس میں روزگار وکاروبار کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں اور جو کام کے بجائے محض شوق کی زبان بن کر رہ جاتی ہے جب کہ دفتروں اور محکموں میں اس کا کوئی استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے دن گنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی کے سوتے سوکھ جاتے ہیں اور وہ مرنے لگتی ہے۔ لیکن ہندستان میں اردو کا یہ انجام کیوں ہو؟ کیا اردو والوں میں کوئی غیرت باقی نہیں رہی ہے۔ ان کی عقل ماری گئی ہے۔ ان کی ہمت پست ہو چکی ہے، وہ ایک شکست خوردہ طبقہ ہیں۔ ان کا سینہ آرزوؤں سے اور ان کا دل حوصلوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے؟ اگر ان سوالوں کے جواب اثبات میں ہیں تو ظاہر ہے کہ اردو تہذیب کا مستقبل تاریک ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ

اردو آبادی میں جوشِ حیات پایا جاتا ہے اور اس کے جذبے بیدار ہیں۔ جو کبھی کبھی بہت پُرشور بھی ہو جاتے ہیں اور اپنی آبرو کے لیے وہ جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ تاریخ کی ایک عجیب و غریب حماقت ہوگی اگر اردو آبادی اپنے تہذیبی ذریعۂ اظہار کی حفاظت اپنی جان اور اپنے ایمان کی طرح نہیں کرے اور تہذیبی اشغال میں زبان کی اہمیت سے غافل ہو کر انتہائی نادانی سے خودکشی کر لے۔ جس طرح اردو تہذیب کا مستقبل اردو آبادی پر منحصر ہے اس طرح اردو آبادی کا مستقبل بھی اردو تہذیب پر منحصر ہے۔

اردو آبادی کو اپنے مستقبل کے لیے جو کچھ کرنا ہے وہ اس سے کم نہیں کہ جمہوریۂ ہند میں اس کے جتنے آئینی حقوق ہیں ان کے حصول کی موثر جد و جہد اس کا پیدائشی حق بھی ہے اور اجتماعی فرض بھی۔ لہٰذا اس حق کو لینے اور اپنا فرض ادا کرنے کے لیے اسے ہر ممکن جمہوری کوشش سے کام لینا ہی ہے اور اس سلسلے میں پوری بصیرت و جرأت سے کام لے کر اپنی آبرو کے تحفظ اور اپنی آرزو کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا ہے۔ خواہ اس کے لیے حکومت سے لڑنا پڑے یا فرقہ پرست وحشیوں سے جو درحقیقت کسی بھی زبان اور اس کی تہذیب کی بقا کے روادار نہیں ہیں۔ گرچہ ابھی اس بات کا امکان بالکل ختم نہیں ہوا کہ اردو دوستوں کے عزائم دیکھ کر ہندی اور دیگر زبانوں کے حامی "جیو اور جینے دو" کی پالیسی پر کاربند ہونا پسند کریں۔ بہرحال، اردو تہذیب کے علم برداروں کو تہیہ کرنا پڑے گا کہ ——

۱۔ وہ اردو رسم خط میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوئی تجویز برداشت نہیں کریں گے۔

۲۔ مختلف ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں اردو کی سرکاری حیثیت سے کم کوئی چیز قبول نہیں کریں گے۔

۳۔ پرائمری سے یونی ورسٹی تک اردو کی تعلیم میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل کر کے رہیں گے۔

۴۔ ابتدائی ثانوی اور اعلا تعلیم کی سطحوں پر اردو کے ذریعے تمام مضامین کی تدریس کے لیے معیاری نصابی کتابوں سے لے کر ذریعۂ امتحان تک کی تمام ضروری تیاریاں کرائیں گے اور اردو کے ذریعہ ہر قسم کے امتحانات مقابلہ کا بندوبست کرانے کی موثر کوشش کریں گے۔

۵۔ اپنے کاموں میں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تمام تقریبات اردو ہی کے ذریعے انجام دیں گے۔

۶۔ اردو میں نشر و اشاعت کی جدید ترین آسانیاں پیدا کریں گے۔

۷۔ اردو ادب کی ترقی کے لیے صرف بامعنی اور مفید تجربوں سے کام لیں گے۔ ●●

باقر مہدی
E/1,Ravi Darshan,
Cartor Road,
Bandra,
BOMBAY
400050

ایک کالی غزل

(مغنی تبسم کے نام)

شہر میں جانے کیا کیا بونے آیا تھا!
گاؤں میں سب کچھ اپنا کھونے آیا تھا!
قدم قدم پہ ٹھوکر کھا کر آخر وہ
ناکامی کی دھند میں سونے آیا تھا!
چُپ رہنا آسان نہ تھا وہ کرتا کیا
بیداری کے خواب میں چھونے آیا تھا!
قحط تھا ایسا پانی کا وہ تنگ آکر
بالوں سے کاغذ کو بھگونے آیا تھا!

آنسو بن کر ڈھل نہ سکا اور درد بنا
کرب مری آنکھوں میں رونے آیا تھا!
مغنی کے دکھ درد سے تجھ کو کیا لینا
باقرؔ تو لفظوں کو سمونے آیا تھا!

ننھے منّے بچّوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
جادو کی ہنڈیا
4/50
شیر اور بکری
5
دُم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
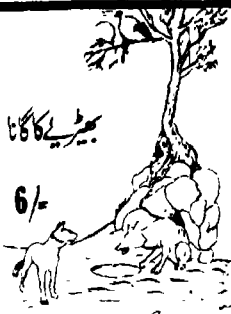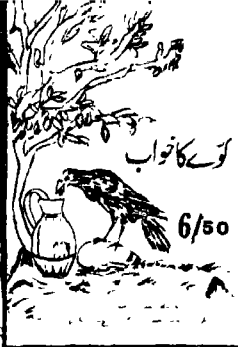
ڈاکٹر اسلم فرخی
"Qaumi Zaban"
Monthly,
Baba-i-Urdu Road,
KARACHI (PAKISTAN)

نوادر کتب خانۂ خاص

لارڈ بیکن

اس کے حالات زندگی اور اس کا فلسفہ

مصنفہ: مولوی محمد عبدالستار صاحب فرنگی محلی مرحوم و مغفور۔ مرتبہ: مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، اڈیٹر "دلگداز"

مولوی عبدالحلیم شرر اُردو ادب کی تاریخ میں اپنے ناولوں اور انشا پردازی کی وجہ سے ممتاز و معروف ہیں۔ ناول نگاری اور انشا پردازی ان کی علمی و ادبی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ بنیادی طور پر وہ تاریخ اور معقولات کے عالم تھے۔ تاریخ فلسفۂ تاریخ اور فلسفے پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے بعض بڑے قابلِ قدر کام انجام دیے ہیں۔ تاریخ بنی اسرائیل، تاریخ سندھ، گزشتہ لکھنو اور بے شمار دوسری کتب و مضامین تواریخ ان کے کمالاتِ علمی کے یادگار ہیں۔ شرر مشرقی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود استفادۂ مغرب کے بہت قائل تھے۔ سرسید احمد خاں کی طرح انھیں بھی یہ احساس تھا کہ مغربی فکر اور علوم و فنون سے استفادے کے بغیر زندگی کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں لیکن وہ مغربی فکر اور علوم و فنون سے مرعوب نہیں تھے بلکہ علومِ مشرق کے امتزاج سے انھیں اپنے لیے زیادہ قابلِ قبول اور کارآمد بنانے میں کوشاں رہے۔

تاریخ کی طرح شرر کو فلسفے سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ انھوں نے معقولات کا مطالعہ بڑی توجہ سے کیا تھا اور اپنے عہد کی مغربی فکر سے بھی آگاہی حاصل کی تھی لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ "فکر و خیال کو عملی دنیا سے وابستہ ہونا چاہیے اس سے انسانی تمدن کو فائدہ پہنچے اور دماغِ انسانی کی حکومت وسیع ہو۔ قدیم فلسفیوں کی طرح غلط استقرا میں اپنی صلاحیت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ فلسفے اور زندگی میں بُعد کے تصور سے بے اختیار علامہ اقبال کا مصرع "ہے فلسفہ زندگی سے دوری" ذہن میں آتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ فلسفے کے اس رُخ سے پوری طرح آگاہ تھے۔

شرر نے مغربی فکر کو عام کرنے اور فلسفہ و زندگی میں مطابقت تلاش کرنے کی غرض سے یہ کوشش کی کہ لارڈ بیکن کے حالات اور کارنامے اُردو میں قلم بند ہو جائیں اور آسان و سلیس زبان میں ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس سے عام قاری بھی فائدہ اٹھا سکے۔ مولوی محمد عبدالستار فرنگی محلی نے اس کام کا ذمہ لیا اور میکالے کی لائف آف بیکن کو اُردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ لیکن کام مکمل نہ ہو سکا اور مولوی محمد عبدالستار اچانک وفات پا گئے۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد یہ کام معرضِ التوا میں رہا تا آنکہ شرر کو اس کی تکمیل کا خیال آیا اور جو حصہ ترجمہ ہونے سے باقی رہ گیا تھا اسے انھوں نے خود مکمل کر کے کتا۔ ...

"لارڈ بیکن" ایک دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں شرر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی بہت اہم اور معنی خیز ہیں۔ شرر لکھتے ہیں: "ہندستان کا موجودہ زمانہ ایک نہایت ہی نا[illegible] حالت میں ہے۔ پرانے خیالات، پرانے علوم اور پرانی باتوں کی وہ اگلی کامیابی باقی نہیں رہی اور نئے علم ہنوز اچھی طرح فتح نہیں پائی۔ جو لوگ پرانے مذاق کی پابندی کا دعوا کرتے ہیں ان کے اخلاق و عادات میں جدید تہذیب کی بہت سی باتیں داخل ہو گئی ہیں اور جو جدید تہذیب کے دیوانے ہیں ان سے ابھی بہت پرانے مذاق اور پرانے رنگ کی باتیں نہیں چھوٹیں۔ لہٰذا موجودہ ہندستان ایک عجیب گوگو کی حالت پڑا ہوا ہے۔ نہ ادھر میں ہے نہ ادھر میں۔ ایسے نازک وقت اور ایسی خطرناک حالت میں ایک ایسے رسالے کا پیش کر[illegible] جو صاف طور پر اور وضاحت کے ساتھ بتا دے کہ فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید، یا اگلے اور پچھلے تمدن میں [illegible] فرق ہے نہایت ضروری ہے۔"

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے شرر لکھتے ہیں: "انگریزی تہذیب اور یوروپین علوم کو [illegible] پر حکومت کرتے ہوئے تقریباً سو برس گزر گئے۔ اگرچہ دارالعلوم اور یونیورسٹی کی بنیاد بعد میں پڑی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں سے ملنے جلنے، ان کے اخلاق و عادات کے حاصل کرنے اور برتنے [illegible] ہی اکثر لوگ انگریزی علوم و یوروپین معاشرت کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے اردو زبان [میں] ایسی خاص تصنیف نہیں موجود ہے جو بہت ہی سلجھا کے اور بڑی صفائی کے ساتھ بتا دے کہ فلسفۂ [قدیم اور] جدید میں کیا فرق ہے۔ کچھ پرانے مذاق والوں ہی کو الزام نہیں دیا جاتا کہ جدید علوم کی برکتوں اور خوبیو[ں سے] ناآشنا ہیں۔ بلکہ موجودہ علوم سیکھنے والے بھی بالکل نہیں جانتے کہ فلسفہ و منطق کا قدیم مذاق کیا تھا [اور] علما و فضلا جن کے ہاتھ میں دینی اور قومی تعلیم کی باگ ہے۔ اگر اس رسالے کو ملاحظہ فرمائیں گے اور [غور سے] پڑھیں گے تو ہمیں امید ہے کہ نئے خیال کے عالموں اور نئے اسکول کے طالب علموں سے اتنے ناآشنا نہ ہیں گے جتنے کہ فی الحال ہیں۔"

شرر نے بیکن کے "اسیز" کا ترجمہ بھی اردو میں شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ لیکن وہ ا[س] کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ بہرحال لارڈ بیکن کے حالاتِ زندگی اور اس کے فلسفے کے بیان سے شرر کی [ر]وا[داری،] ان کی علمی اور قومی تڑپ، تعلیمی امور سے ان کی گہری دلچسپی اور ذہن کو وسعت دینے کی شدید [خواہش] کا اندازہ ہوتا ہے۔

شرر نے ۱۹۰۰ء میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ۸۸ برس گزر جانے کے باوجود علمی سطح پر قد[یم و جدید] میں وہ مفاہمت پیدا نہیں ہو سکی جو شرر کا مطمحِ نظر تھی۔ دونوں آج بھی ایک دوسرے کو شک و[شبہ کی نظر] سے دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ دونوں کے امتزاج سے نئی اور بہتر صورت میں نہیں آ سکی۔

لارڈ بیکن کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ بیکن کے خیالات اور نظریات کی توضیح بڑ[ے صاف] اور دل نشیں انداز میں کی گئی ہے۔ کہیں کوئی الجھاؤ نہیں۔ بڑے بڑے مشکل مباحث کو بڑی آسانی او[ر خوبی سے] بیان کیا گیا ہے۔ پیچیدہ علمی بحثوں کو اتنے سلیس انداز میں پیش کرنا شرر کا بہت بڑا کارنا[مہ ہے۔] یہ نئے لکھنے والوں کے لیے ایک مفید، فعال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع کتنا ہی

پیچیدہ کیوں نہ ہو لیکن اگر لکھنے والوں کو اس پر عبور حاصل ہے تو اس کی توضیح و تشریح میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

اتنی صفحے کی یہ کتاب آج بھی دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ ہم نے مغرب کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں آج بھی معروف ہیں۔ شرر کا یہ رسالہ اس سلسلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ترجمے کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

لارڈ بیکن ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی طبع اول ۴۰۰ کتابوں پر مشتمل تھی۔ غالباً یہی اس کی طبع آخر بھی تھی۔ لارڈ بیکن کے نسخے عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے اس کی کمیابی اور مثالی حیثیت نے اسے نوادر کتب خانۂ خاص کا حصہ بنا دیا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی
پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری
اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف
اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کو مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی
شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ۔ اردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت
"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم
طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی
ممتاز ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ
ناول نگاری کا جائزہ
"اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

حکیم محمد حسین خاں شفا
RAZA LIBRARY
RAMPUR.(U.P.)

تحریکِ خلافت کی انقلابی آوارہ گرد نظمیں؟

ہندو پاک کی تاریخ میں تحریکِ خلافت کا اہم مقام ہے اس تحریک کے اثرات و نتائج نے ایشیا کی تاریخ اور تحریکِ حریت پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں مگر اس سے متعلق منظومات آج بھی آوارہ گرد ہیں اور کچھ اہم تخلیق کار گمنام ہیں۔ اس تحریک کا مقبول ترین ترانہ۔ بولیں امّاں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دیدو بعض محققین نے دانستہ اور بعض[۱] نے نادانستہ غلط لوگوں کے نام منسوب کر دیا ہے کچھ نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبد الماجد[۲] دریا بادی اور قاضی عدیل عباسی[۳] صاحب نے حقیقتِ حال سے باخبر ہونے کی اپیل کی تھی۔ ہمیں ذخیرۂ رام پور میں ایسے ماخذ دستیاب ہو گئے ہیں کہ جس سے اس بات کا حتمی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ تحریکِ خلافت کی آوارہ گرد نظموں کا شاعر شفیق رامپوری ہے۔ راقم الحروف نے شفیق صاحب کی شخصیت فن اور کلام پر تحقیقی کام کیا ہے جس کا کچھ حصہ شائع ہو گیا ہے چوں کہ شفیق صاحب سے متعلق کچھ اہم مآخذ ان کے احباب کے پاس سعودی عرب میں ہے جو مجھے دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس بنا پر اپنے مقالہ کا کچھ حصہ میں ابھی شائع نہیں کر سکا ہوں۔

شفیق صاحب علی برادران کے دوست، محلّہ دار اور خاندانی تعلقات کی بنا پر گویا اس گھر کے ایک فرد تھے۔ علم کا ذوق، حبّ الوطنی، جرأت و بیباکی قدرت نے فراوانی سے عطا کی تھی اپنے ہم عصر طلبہ میں بہت ممتاز تھے۔ پہلے مدرسۂ عالیہ رامپور سے سندِ فراغ حاصل کی اس کے بعد پنجاب یونی ورسٹی لاہور اور دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔

مشاہیرِ ملک و ملت سے اچھے روابط تھے شفیق صاحب کے والد شیخ بندہ علی نواب کلب علی خاں م ۱۸۸۸ء کے مطبخ میں ملازم تھے۔ شفیق صاحب بھی نواب حامد علی خاں کے عہد میں ریاست کے ملازم رہے لیکن ان کی نواب صاحب سے ناراضگی ہو گئی جس کی وجہ سے یہ جلا وطن کر دیے گئے۔ شفیق صاحب رام پور سے ہجرت کر کے بمبئی گئے ور وہاں سے مولانا محمود حسن صاحب کی تحریک پر اتحادِ اسلامی حریت ہند اور انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی

۱۔ مجلہ علم و آگہی نیشنل کالج کراچی مقالہ خواجہ اسرار احمد ۱۹۷۹ء ۔ ۲۲۳ فاران کراچی ستمبر ۱۹۸۰ء مقالہ سید ضمیر جعفری ۔ ۲ محمد علی کی ذاتی ڈائری از عبد الماجد ۳ تحریکِ خلافت از قاضی عدیل عباسی مطبوعہ ۱۹۸۲ء صفحہ ۱۴۰ ۔ صفحہ ۱۰۵ معارف پریس ۱۹۵۴ء۔

کے لیے حجاز چلے گئے جہاں تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد کچھ اہم مجاہد پہنچ گئے تھے اور انگریزوں کے خلاف صف آرا رہے جن کے اخلاف باقی تھے شفیق صاحب بھی ان میں شامل ہو گئے اور ملک و ملت کا کام کرتے رہے آپ چوں کہ عربی فارسی اور انگریزی کے ماہر تھے نثر و نظم پر حاکمانہ قدرت حاصل تھی ترکوں کے شیدائی اور بقائے خلافت کو مسلمانوں کی موت و زیست کا مسئلہ شمار کرتے تھے ان مسائل میں عربوں سے اختلاف ہو گیا اور حجاز سے بھی ملک بدر کیے گئے۔

پھر اسلامی ممالک کی سیاحت کرتے ہوئے بمبئی آ گئے اس خانہ بدوشی میں سارا علمی اثاثہ اور تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری کا ذخیرہ تباہ ہوتا رہا آپ کی قومی و ملی نظموں کا ایک مجموعہ بقول مصنف تذکرہ شعرائے حجاج ۱۹۲۰ء میں گلزار احمدی پریس بمبئی سے شائع ہوا ایک دوسرا مجموعہ تحریک خلافت سے متعلق نظموں کا خلافت کمیٹی بمبئی نے الناظم پریس دہلی سے ۱۹۲۱ء میں شائع کیا۔ اس پر یہ بھی نوٹس ہے بغیر اجازت کوئی صاحب نہ چھاپیں اس مجموعہ میں وہ مشہور نظم "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" شامل ہے اس میں شفیق تخلص ہے زبان و بیان، رنگ کلام، لفظیات الغرض اس کا ہر ہر لفظ کلام شفیق ہونے پر دال ہے۔

متنازع نظم زیر بحث لانے سے قبل مناسب ہوگا کہ شفیق صاحب کا غیر معروف منتشر کلام اور ان کی شاعرانہ ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے۔

شفیق صاحب کو بچپن سے علوم و فنون سے دلچسپی اور حالی کی طرز کی اصلاحی شاعری کا شوق تھا چنانچہ ریاست رام پور کے سرکاری گزٹ، اخبار دبدبہ سکندری، مدرسہ عالیہ رام پور کے ریکارڈ تذکرہ کلیم وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے جہاں شفیق صاحب اپنے عہد کے ممتاز طالب علم رہے وہاں بحیثیت شاعر کے بھی ممتاز رہے چنانچہ مدرسہ عالیہ کی روداد میں ۱۸ اگست ۱۸۹۰ء کی ایک طویل نظم اس عنوان سے موجود ہے۔

قصیدہ جلسہ تعلیم و تقسیم انعام رام پور
شفیق الرحمٰن طالب علم مدرسۂ عالیہ

وہ مرض کیا ہے جو زندوں کو بنائے مرد　　جان مُردوں میں پڑے جس سے تبا دردہ دوا
زندہ درگور ہوا علم نہ سیکھا جس نے　　شیخ زندہ ہے لکھا جس نے شفا کا نسخہ

سو کی ایک بات کہوں ورنہ جاؤ سن لو　　لکھنؤ ہے جو یہ پورب کا معظّم بلدا
نام زندہ نہیں واں کوئی مگر عبد الحی　　یوں تو رہنے کو وہاں رہتے ہیں سب ہما و شما

رام پور آج ہے دنیا میں سنو دار العلوم　　کہ یہی شہر تو یونان آجڑ کر ہے بسا
یاں وظیفے بھی کتابیں بھی سبق بھی تم بھی　　جب ہو یہ مدرسہ پھر تم کو ہے کس کی پروا

بس کر اب وقت میں وسعت نہیں مایوس حزیں　　باندھ دے مدرسے کے سر سے دعا کا سہرا
میرے اللہ شب و روز کا جب تک رہے عقد　　مدرسہ رکھیو سجا جیسے دلھن کا ڈولا

۱۴ دسمبر ۱۸۹۳ء کے سرکاری گزٹ میں شفیق صاحب کا ایک ۱۸ اشعار کا مسدس موجود ہے جس میں شفیق صاحب نے ملت اسلامیہ ورام پور کی تعلیمی حالت کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

اے طالبانِ علم و جوانانِ خوش نہاد ۔۔۔ تم کس کی یادگار ہو کچھ بھی تمہیں ہے یاد
کس بزمِ دل فریب کے ہو شمع بامراد ۔۔۔ کس بوستاں کے گل ہو کہ یادش بخیر یاد
کس کے دلِ شکستہ حسرت کے پارے ہو
کس آسماں جناب کے آنکھوں کے تارے ہو

چمکی ہے ان کی ذات سے یاں ایجوکیشنل ۔۔۔ یہ ان کی مہر رائے کا ادنا سا ہے عمل
پنجاب کا وہ مدرسہ اورینٹل ۔۔۔ شرمندہ رام پور سے ہے وہ بھی آج کل
اے رام پور تجھ کو یہ سینٹر بنائیں گے
اب کوئی دن میں ذرے سے خاور بنائیں گے
جو کہنا تھا سو کہہ دیا ختم کلام ہے
آخری شفیق کا یارو سلام ہے

راقم محمد شفیق الرحمٰن مولوی فاضل و منشی فاضل۔

گزٹ میں یہ نوٹس موجود ہے مولوی شفیق الرحمٰن جو لاہور یونی ورسٹی سے مولوی فاضل کی سند لے کر پاس ہو کے آئے ہیں انھوں نے یہ مسدس پڑھا جس پر ان کو ۵۰ روپے کا انعام دیا گیا اس کے ساتھ ملازمت شفیق صاحب کو ملازمت کی پیش کش کی گئی اسی سلسلہ کا ایک واقعہ۔

مولانا وجیہ الدین احمد خاں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے استاد مولانا وزیر محمد خاں اور مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ہم درس اور دوست تھے محکمۂ تعلیم رام پور میں ایک جگہ شفیق الرحمٰن صاحب کے لیے نکالی گئی لیکن جب حسب قاعدہ پوسٹ کا اعلان کیا گیا تو اس کے لیے جناب مولوی وزیر محمد خاں صاحب نے بھی درخواست دی۔ جب انٹرویو کے لیے پہنچے تو شفیق صاحب اور مولوی وزیر محمد خاں صاحب کی ملاقات ہوئی اس سے قبل وزیر محمد خاں حقیقت حال سے بے خبر تھے۔ شفیق صاحب نے وزیر محمد خاں سے ان کے آنے کا سبب معلوم کیا۔ انھوں نے اپنی درخواست اور ملازمت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد شفیق صاحب شریک انٹرویو نہیں ہوئے۔ بلکہ انھوں نے وزیر محمد خاں صاحب کے لیے کوشش کی مولانا وزیر محمد خاں کو اصل واقعہ بعد میں معلوم ہوا جس کا وہ اکثر اپنے احباب و شاگردوں سے تذکرہ کرتے تھے اور شفیق صاحب کے ایثار کے مداح تھے۔

شفیق صاحب نے پنجاب یونی ورسٹی سے فراغت کے بعد بھی مزید تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا دیوبند سے حدیث کی سند لی اور طب کی تکمیل کی اس کے بعد حکیم اجمل خاں صاحب کے سکریٹری کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اور جب حکیم اجمل خاں کا اطبا لکھنؤ سے کچھ طبی علمی مسائل میں اختلاف ہوا تو شفیق صاحب نے حکیم صاحب کی حمایت میں عربی میں رسائل لکھے جو موجود ہیں۔ حکیم فیروز الدین صاحب نے ایک رسالہ کا حکیم اجمل خاں کے نام غلط انتساب کر دیا ہے۔ حکیم ظل الرحمان صاحب نے شفیق الرحمان کو حکیم اجمل خاں کا شاگرد تحریر

گیا تھے ۔ اس عہد کے گلدستوں اور رودادِ مشاعرہ میں شفیق صاحب کا کلام موجود ہے ۔ چنانچہ اگست ۱۸۹۷ء
میں شفیق صاحب نے ایک طرحی مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی جس کا رودادِ مشاعرہ میں اس طرح اندراج
ہے ۔

شفیق ۔ جناب مولوی محمد شفیق الرحمٰن خاں صاحب رام پوری ۔
پیشکار جناب حکیم محمد اجمل صاحب دہلوی ۔

غزل

دل جلا کر مرا اغیار سے کہا دیکھا — آپ نے خوب ہی گھر پھونک تماشا دیکھا
ناز ہو یا ہو حیا سادگی ہو یا بیداد — ہم نے جس رنگ میں دیکھا تمھیں یکتا دیکھا
خاک چھانا کیا جنگل کی ہمیشہ جوں قیس — جس نے نقشِ قدمِ ناقۂ لیلیٰ دیکھا
کس سے ہم چشمی کا دعوا ہے تجھے اے خودبیں — پھوٹی آنکھوں سے بھی کچھ نرگسِ شہلا دیکھا
دیدۂ ہر بُنِ مُو محوِ تصور ہے شفیق — کیا کہیں انجمنِ حسن میں کیا کیا دیکھا

شفیق صاحب عالم باعمل اور مجاہد تھے ۔ طبیعت موزوں تھی علم والفاظ کی کوئی کمی نہیں تھی ۔ لیکن معروف معنی میں شاعر کہلانا یا شاعری کرنا انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا ہاں وملکی و ملی ضرورت یا احباب کی فرمایش پر کبھی کلام موزوں کرنے میں کوتاہی نہیں کی چنانچہ ۱۸۹۹ء میں مدار المہام ریاست رام پور جرنل اعظم الدین خاں نے کمیٹی برائے تدوین تاریخ رام پور مقرر کی اور خاندان سادات مولانا رستم علی صاحب وغیرہ کے حالات مرتب کرنے کا کام مولوی سید محمد نثار علی صاحب کے سپرد کیا ۔ مولانا نے تواریخ عجیبہ کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی اور اس میں خاندان قادریہ کا شجرہ منظوم کرنے کی فرمایش شفیق صاحب سے کی چنانچہ شفیق صاحب نے شجرۂ خاندان قادریہ منظوم کیا ۔ جو مخطوطہ تواریخ عجیبہ اردو قلمی ومکتوبہ ۱۹۱۵ء ص ۶۷ مملوکہ رضا لائبریری میں موجود ہے[۲]۔
شفیق صاحب نے مختلف اوقات میں عربی فارسی اردو میں بہت کچھ لکھا ۔ مختلف جلسوں میں تقاریر کیں ۔
خلافت کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت آپ کا محبوب موضوع تھا ۔ لیکن محفوظ کم رہا ہے آپ کے نگارشات کا اکثر حصہ ضائع ہوگیا ۱۹۱۶ء میں آپ مدینہ منورہ میں تھے اس کے بعد دیگر ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی ۱۹۱۹ میں بمبئی آگئے ۱۹۲۰ء کے اوائل میں احباب نے آپ کی قومی و ملی نظموں کا مجموعہ گلزار احمدی پریس بمبئی سے شائع کیا مولانا امداد صاحب صابری کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ پیر خاں محمد قریشی مدینہ منورہ میں دیکھا ہے ۔ نیز مخطوطہ تذکرہ شعرا حجاز آب زم زم مرتبہ مولانا عبدالوہاب دہلوی ثم مدنی میں شفیق صاحب

---

[۱] طب کا ایک اہم اخلاقی مسئلہ ہے کہ جو ہر دماغ یعنی بھیجا حساس ہے یا بے حس اس موضوع پر حکیم شفیق الرحمٰن صاحب کے عربی میں ایقاظ النعسان فی انما یطا الاستحسان مطبوعہ لبنانی ۱۸۹۷ء ۴۰ صفحات شائع کیا جو رضا لائبریری طب نمبر ۶۱ پر موجود ہے لیکن رموز الاطبا مطبوعہ ۱۹۱۳ء صفحہ ۹۱ پر حکیم اجمل خاں کی عربی تصانیف میں یہ شامل ہے جو غلط ہے ۔ تذکرہ خاندان عزیزی صفحہ ۲۳ ۔

[۲] تواریخ عجیبہ کا نادر یکتا مخطوطہ رضا لائبریری میں نمبر ۱۹۸ پر مندرج ہے جس کے صفحات ۴۰ ہیں صفحہ ۶۷ تا ۸۹ پر شفیق صاحب کا منظوم کردہ شجرہ ہے ۔ چند شعر دیار یا ہے اے یار ئیاں نے کوسوں دور ۔ گمان ہو پہلے ہی منزل میں تھک کے چکنا چور

کا تذکرہ شاعر حجاز کی حیثیت سے ہے۔ ریشمی رومال سازش کیس میں سی آئی ڈی C.I.D نے شفیق صاحب کا تذکرہ خطرناک باغی کی حیثیت سے کیا ہے شفیق صاحب کے لڑکے عتیق الرحمن کلیم نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ رضا لائبریری میں نہیں ہے۔ اس میں بھی شفیق صاحب کا تذکرہ بحیثیت شاعر کے موجود ہے۔ شفیق صاحب کے چار نظموں کا مجموعہ خلافت کمیٹی نے ۱۹۲۱ء میں پہلے بمبئی سے اور پھر الناظم پریس دہلی سے شائع کیا اس میں دو نظمیں تحریکِ خلافت سے متعلق ہیں ایک علی برادران اور ایک مولانا حسین احمد مدنی سے ان دو نظموں کا تعلق مقدمہ کراچی سے ہے تحریک خلافت سے متعلق۔ دونوں نظمیں سمرنا سے متعلق ہیں چوں کہ برطانیہ کے تعاون سے جب یونان کی فوجوں نے سمرنا وغیرہ ترک علاقوں پر قبضہ کرلیا تو وہ ظلم ڈھائے جس سے انصاف پسند دنیا چیخ گئی۔ اس کی طرف شفیق صاحب نے دونوں نظموں میں اشارہ کیا ہے مثلاً نظم نمبر ایک میں کہتے ہیں۔

جو خلافت پہ دل سے فدا ہوگیا ۔۔۔ وہ تو قرضوں سے اپنے ادا ہوگیا
ترک مارے گئے بھوک میں پیاس میں ۔۔۔ سمرنا مقتلِ کربلا ہوگیا

اسی طرح دوسری نظم میں فرماتے ہیں۔

خلافت مصطفےٰ کی خاطر ہر اک بشر کو بلا رہا ہے ۔۔۔ زمین والوں کی بے کسی پر فلک بھی آنسو بہا رہا ہے
ستم کے بادل ہیں سمرنا پر اٹھو مدد کو تمام رہبر ۔۔۔ کہ شاہ یونان ظلم پھر و رنئے نئے ظلم ڈھا رہا ہے

شفیق صاحب نے یہ نظم ۱۹۱۹ء میں کہی تھی جب یونان کی فوج نے سمرنا پر قبضہ کرلیا تھا اور ان کے ظلم کی داستانیں مشہور ہوگئیں تھیں اس کے بعد ترکی فوج کو جوش آیا اور انھوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو پھر سمرنا واپس لے لیا اس مجموعہ کی مشہور اور متنازعہ نظم "جان بیٹا خلافت پہ دیدو" اواخر ستمبر ۱۹۲۱ء میں کہی گئی تھی جب علی برادران اور مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھیوں پر کراچی میں جرم بغاوت کے تحت مقدمہ قائم ہوگیا اور مولانا محمد علی کو مدراس جاتے ہوئے والسرا اسٹیشن پر ۱۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ۲ بجے دن گرفتار کرلیا گیا۔ شفیق صاحب نے بی اماں کی زبانی اس شعر میں میرے بچوں کو پکڑا سفر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چوں کہ مقدمہ کراچی میں ماخوذ مجاہدین میں شفیق صاحب کا قریبی تعلق علی برادران اور مولانا حسین احمد مدنی صاحب سے تھا۔ اسی بنا پر ان حضرات کے سلسلے میں نظمیں ہیں اور دیگر منظومات میں پوری تفصیل ہے شفیق صاحب کا تحریک خلافت سے متعلق مجموعہ جو مادر ہند کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس میں جان بیٹا خلافت پہ دیدو والی نظم میں بھی شامل ہے اس مجموعہ میں اور شفیق صاحب کے سرکاری گزٹ وغیرہ میں شائع شدہ کلام میں مکمل یکسانیت ہے وہی لفظیات، لہجہ جذبہ و رنگ کلام ہے حجاز سے آکر شفیق صاحب ۱۹۲۳ء میں سندو میں رہے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں خلافت کانفرنس میں تقریر کی ۱۹۲۵ء میں پھر حجاز چلے گئے چوں کہ وطن میں آنے پر پابندی تھی ۱۹۳۰ء میں بمبئی آگئے اور وہیں ۱۵ رمضان کو وفات ہوئی اور ذکریا مسجد میں دفن ہوئے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل چند روز کے لیے رامپور تشریف لائے تھے۔

چوں کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تحریک خلافت کی نظمیں خاص طور پر جان بیٹا خلافت پہ دیدو والی نظم شفیق صاحب کی ہے مزید ثبوت میں کتابچہ کا عکس ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس بنا پر زیادہ بحث کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی شفیق صاحب کے سلسلہ میں راقم اگست ۱۹۷۹ء کے "آج کل" دہلی اور روشِ ادب ۱۹۸۲ء دہلی میں سیاسی علمی ادبی زندگی پر مقالات لکھ چکا ہے۔ کتابچہ مادرِ ہند منسلک ہے۔ ●●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

لسان الصدق 　　 مدیر مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہوار رسالے کا مکمل فائل، اس کا مقدمہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۷۵

نظام رنگ 　　 ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوکر انسانیت کو وقار بخشا۔ =/۱۵

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۷۵

پُرانی بات ہے (سلسلۂ نظمیں) 　　 زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں کے روپ بدل گئے ہیں۔ =/۳۰

غزل نما 　　 تصحیح و ترتیب

(طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے) 　　 ادا جعفری

قدیم شعرا محمد قلی قطب شاہ سے لے کر میاں داد خاں سیاح تک کلام کا جامع انتخاب اور تعارف جس کو ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور گہرے مطالعے کے بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ 　　 =/۷۵

سازِ سخن 　　 ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل، محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہوسکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن 　　 پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ 　　 =/۸

نذرِ مختار 　　 مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختارالدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھبیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

سریندر پرکاش
YOGI RAJ ASHRAM,
NEW LINK ROAD, KALINA,
BOMBAY-400098.

آؤ اور ہمارے گرجا گھر کی گھنٹیوں کی آواز سنو

(۱)

مندرجہ بالا عبارت میرے افسانے کا عنوان نہیں ہے۔ یہ تحریر میں نے کہیں دیکھی تھی اور اپنے پاس محفوظ کر لی۔ ویسے ہی جس طرح سفر میں لوگ اپنے بچوں کے لیے تحائف محفوظ کر لیتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک عجیب وغریب واقعہ ہوگیا ہے۔ جس کا کوئی عنوان نہیں ہوسکتا۔ کہ میرے بہت ہی قریبی دوستوں کی زندگیوں میں اس عمر میں بیویوں کے علاوہ عورتیں آگئی ہیں۔ وہ عورتیں اس دولت کی طرح ہیں۔ جو کسی کو غیر متوقع طور پر ہاتھ آجاتی ہے۔ اور اس غیر متوقع دولت پانے کے ساتھ ہی اس دولت کے کھو جانے کا خوف ان کے دلوں میں بری طرح سے گھر کر گیا ہے۔ وہ یا تو اللہ کی طرف دھیان لگائے بیٹھے رہتے ہیں یا پھر ہر وقت اس دولت کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سارے عمل میں جہاں اُن کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام ہوگیا ہے۔ میں اکیلا پڑ گیا ہوں۔ بالکل اکیلا۔ تن تنہا۔ اس عمر میں آدمی اگر زندگی بھر کی رفاقت سے محروم ہو جائے تو اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

اُن کے گھروں کے ٹیلی فون اکثر ڈیڈ رہتے ہیں۔ دفتروں میں اُن کی غیر حاضری ایک معمول ہوگئی ہے۔ ایک دوست تو ایک پتلے میں سما گیا ہے۔ جو وقت مقررہ پر سر ہلاتا ہے۔ چائے پینے کی اداکاری کرتا ہے۔ ڈھیر ساری سمجھداری کی باتیں کرتا ہے۔ اور اپنی سمجھداری کی باتوں سے لوگوں کو دکھی ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور پھر پتلا بے کار و بے حرکت ہو جاتا ہے۔ اگلے مقررہ وقت تک اور میرا وہ دوست اس پتلے میں سے نکل کر جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ ویسے ہی جیسے روح اس قفس عنصری سے نکل کر کہیں چلی جاتی ہے۔

دوسرے دوست کی حالت کچھ اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اس کی پرابلم یہ ہے کہ اپنی پہلی بیوی کو وہ کبھی سمجھ ہی نہیں پایا۔ اور بیوی کی شکایت یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر نامدار کو کبھی سمجھ نہ پائی اور آخر اس عمر میں اس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا

میں دوسرے دوست کی زندگی میں داخل ہونے والی عورت کے بارے میں کچھ نہ کہوں

گا ۔ کہ تاریخ اس کی عظمت سے آنٹ پڑی ہے۔ اور جب کسی شخص کی حیثیت تاریخی ہوجائے تو وہ ہماری دسترس سے باہر ہوجاتا ہے ۔ اب تو حالت یہ ہے کہ میں ساحل پر کھڑا غائب میں سے نمودار ہونے والی اس کشتی کا انتظار کر رہا ہوں۔ جس میں سوار ہوکر میں دوسرے ساحل تک چلا جاؤں۔ نئی دوستیاں نئی رفاقتیں پاؤں۔

"کشتی چاہیے؟"

ارے یہ آواز ۔۔۔! یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا مگر کوئی بولنے والا دکھائی نہ دیا ۔ پھر اچانک سمندر کی سطح پر ایک کشتی تیرتی ہوئی میری طرف آتی دکھائی دی۔

"کشتی ۔۔۔!"

میں حیران ہوا ۔ پھر خوفزدہ ہوگیا ۔ یہ کشتی جو آرہی ہے مجھے کہاں لے جائے گی ۔؟ مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا۔ کشتی تو بہرحال ساحل سے آلگی تھی۔

"لو آگئی کشتی ۔"

آواز پھر سنائی دی ۔ میں نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں کشتی کی طرف بڑھا۔

"ذرا رُکو ۔"

آواز آئی ۔ میں رُکا ۔ اب بولنے والے کو ڈھونڈنا فضول تھا۔ میں اس کی عادت سے واقف ہوچکا تھا۔ وہ غائب ہی میں رہ کر مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"یہ کشتی اس لیے ہے کہ تم ایک لمبے سفر پر نکل جاؤ ۔"

"لمبے سفر پر ۔۔۔! لیکن کہاں ۔۔۔؟"

"یہ کشتی اپنی منزل جانتی ہے ۔ اور تمھیں کیا جاننا ہے ؟ سفر کا لُطف اُٹھاؤ ۔ اور ایک کام بھی سرانجام دے دو ۔"

"کام ۔۔۔! کیسا کام ۔۔۔؟"

"مشکل کچھ نہیں ۔ ایک پیغام ہے ۔ جو تمھیں لے کر جانا ہے ۔ اُس پیغام کے اوپر اس آدمی کا پتا لکھا ہے ۔ جسے وہ پیغام پہنچانا ہے ۔ اور پھر بس ۔ تم آزاد ہو ۔۔۔ جہاں چاہے جاؤ ۔ جو چاہے کرو ۔"

مجھے تجربہ تھا ۔ آزادی کے بارے میں، میں بہت کچھ جانتا تھا ۔ جب میں ایک شہر کے چوک میں غلام کے طور پر نیلام ہوا تھا ۔ تو میرے پہلے آقا نے مجھے آزاد کر دیا تھا ۔

جب میں نے مذہب کی آغوش میں پناہ لی تھی ۔ تو میری گردن میں آزادی کا طوق ڈال دیا گیا تھا اور پھر جب جمہوریت کا تاج میرے سر پر رکھا گیا ۔ تو زمین سے سانپوں کی طرح رینگ کر کئی زنجیریں میرے جسم سے لپٹ گئیں ۔

"آزاد ۔۔۔؟"

"ہاں ، تم آزاد ہو ۔ اس کے بعد تم پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ رہے گی ۔ کسی فرض کی

ادایگی لازم نہ ہوگی۔"

"وہ پیغام کیا ہے؟"

"پیغام تمھیں مل جائے گا۔ لیکن تم اُسے پڑھ نہیں سکتے۔ وہی آدمی اُسے پڑھ سکتا ہے جس کے نام وہ پیغام ہے۔ ورنہ وہ ایک سادہ قرطاس ہے۔ اس پر اس شخص کا سرنامہ بھی اس وقت اُبھرے گا۔ جب یہ کشتی تمیں تمھاری منزل تک پہنچا دے گی۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ سوچنے لگا ــــ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میری زندگی کی ساری مصیبتیں اسی لیے ہیں کہ میں سوچتا ہوں۔ میں خوف زدہ سا ہوگیا۔ میں نے سر اٹھایا۔

"تو پھر منظور ہے؟" مجھ سے سوال کیا گیا۔

میں تو مرا پڑا تھا۔ رفاقتیں محبتیں کھو جانے سے بے حال تھا۔ "یہاں کیا رکھا ہے؟" میں بڑبڑایا ــــ "وہاں جاؤں گا۔ نیا شہر ہوگا۔ نئے دوست ہوں گے۔ نئی رفاقتیں ہوں گی۔"

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میرے پاس ایک پیغام ہوگا۔ ایک ایسے شخص کا دیا ہوا۔ جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ اور جس کے نام وہ پیغام ہوگا وہ بھی تو منتظر ہوگا۔ اس پیغام سے ضرور اُس کا کوئی مفاد وابستہ ہوگا۔ میں زمانے کے چلن کو جان گیا تھا۔ بغیر فائدے کے نہ کوئی کچھ دیتا ہے۔ نہ کوئی کچھ لیتا ہے۔

"ہاں منظور ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ اور کشتی کا رخ اپنے آپ ہی سمندر کی وسعت کی طرف ہو گیا۔ میں نے دور تک دیکھا۔ آسمان جھک کر سمندر کے ہونٹوں پر بوسہ دے رہا تھا۔ اور کشتی کی سطح پر ایک حکم نامہ طرح کی چیز رکھی تھی۔ وہ ریشمی کپڑا تھا۔ جس کا رنگ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"میں آگے بڑھا۔"

"رُکو۔" آواز آئی۔

میں رُک گیا۔

"میں تمھیں اُس شخص کا حلیہ بھی بتا دیتا ہوں۔"

اور اُس آواز نے مجھے اس شخص کا حلیہ بیان کر دیا۔ تصور کی آنکھ سے میں نے دیکھا۔ وہ دنیا کا حسین ترین شخص تھا۔ میرے ذہن میں ہندو دیوتاؤں کے خوبصورت مجسمے گھوم گئے۔ جن کا ایک ایک انگ اور خد و خال انتہائی فنکاری سے تراشے گئے تھے اور ان کے جسموں پر گپتا دور کے آبھوشن سجے تھے۔

کشتی روانہ ہوئی۔ سمندر معمول کے خلاف خاموش اور پُر امن تھا۔ کشتی کی لکڑی بڑی مضبوط اور ملائم تھی۔ اور اس کی رفتار بڑی سبک تھی۔

(۲)

تب اندھیرا تھا۔ جب کشتی ساحل پر لگی۔ میں کشتی سے اترا۔ پانو زمین پر رکھے۔ ریت

میرے وزن سے دب گئی — مگر کہیں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سوائے اس شہر کے نقوش کے جو ساحل سے دور آباد تھا۔ ایسے لگتا تھا۔ جیسے شہر نہیں لکیروں کا ایسا نظام ہے جو شہر کی سی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ میں اُجالا ہونے کا انتظار کرتا۔ کہ پیغام پر اُبھرنے والا سرنامہ بھی تو اندھیرے میں نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

خدا خدا کر کے دن چڑھا۔ سمندر کی سطح پر سورج کی کرنوں نے صبح کا رقص کیا اور پھر اپنے بھیگے ہوئے لباس سمیٹیں آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرائیں اور ایک عجیب طوفانی نغمہ سنائی دینے لگا۔ اور وہ کشتی جس پر سوار ہو کر میں آیا تھر تھر کانپنے لگی۔

میں کشتی کے قریب گیا۔ اس کو چھو کر دیکھا۔ جہاں میرا ہاتھ لگا تھا وہاں کی لکڑی بھربھرا کر پانی کی سطح پر پھیل گئی۔ مطلب یہ کہ جانے کب میں چلا تھا اور کب یہاں پہنچا کہ کشتی کی لکڑی نے اپنی زندگی پوری کر لی۔ اور اب میں چاہوں بھی تو اس کشتی پر بیٹھ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ اور دور دور تک کوئی اور کشتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ شاید اس شہر کے لوگ ابھی سمندری سفر سے واقف نہ ہوئے تھے کہ ان کے ساحل پر سمندر تھا۔ لیکن ان کے پاس کوئی کشتی نہ تھی۔

میں نے پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا۔ شہر جاگ گیا تھا۔ اس کی فصیل کے اندر سے بے بنیاد آوازیں آ رہی تھیں۔ بے ربط آوازیں۔ بے معنی آوازیں۔ اور میں نے سوچا جب ہزاروں برس بعد ان آوازوں کو پگھلا کر سنا جائے گا تو اس وقت کے آدمی کے ہاتھ کیا آئے گا؟

میں کیوں سوچتا ہوں —؟

جب جانتا ہوں کہ ساری مصیبتیں سوچنے کی وجہ سے ہیں۔ لیکن مجبور ہوں مجھے آنے والی پیڑھیوں کو جواب دینا ہے۔ جو میری کرتوتیں دیکھ کر کہیں گی۔ "افسوس اس نے ہمارے بارے میں ذرا بھی نہ سوچا۔"

میں نے لپٹا ہوا پیغام اٹھایا۔ اسے سینے سے لگایا اور شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ عجیب شہر تھا میں جتنے قدم اس کی طرف بڑھتا وہ اتنے ہی قدم میری طرف بڑھ آتا۔ جب میں شہر کے بلند دروازے پر پہنچا تو پیغام کھول کر دیکھا۔ وہاں اس شخص کا سرنامہ درج تھا۔ جسے یہ پیغام پہنچانا تھا۔

میں شہر میں داخل ہوا تو دور کہیں زور زور سے گرجا گھر کے گھنٹے بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ شہر ایک نظر میں کسی شہر کے ماڈل کی طرح بے حرکت دکھائی دیتا۔ جس میں نفوس بے جان مجسموں کی طرح دھرے ہوں اور پھر پلک جھپکتے ہی سارا شہر حرکت میں آ جاتا۔ زندگی کا سارا کاروبار چلتا دکھائی دیتا۔ بھیڑ بھاڑ، شور شرابا، گاڑیاں ٹھیلے، لین اور تکرار۔

میں فوراً ہی اس بھیڑ میں کھو گیا اور شہر کے وسطی علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا شہر کے وسط میں ایک بڑا سا عالی شان گرجا گھر ہے۔ جس کی گھنٹیاں لگاتار بج رہی ہیں۔ میں سوچنے لگا۔ میں کیوں بار بار سوچنے لگتا ہوں۔ جبکہ سوچنے کی سزا جانتا ہوں۔ کہیں سوچنا میری بری عادتوں میں تو نہیں، اسی لیے تو مجھے ہر بار نیا شہر بسانا پڑتا ہے۔ اور پھر اسے اپنی آنکھوں سے مسمار ہوتے دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا گرجا گھر پہلے بنا تھا اور پھر اس کے گرد شہر بسا دیا گیا یا پہلے شہر بسا اور پھر گرجا گھر

ضرورت محسوس کی گئی اور وسط میں اُسے تعمیر کیا گیا۔

بھیڑ میں کھویا ہوا اچانک جیسے میں بیدار ہوا۔ اور مجھے ذمّے داری کا احساس ہوا جس سے سبکدوش ہو جانے کے بعد مجھے بالکل آزاد ہو جانا تھا۔

تو اصل مسئلہ تھا۔ اس شہر میں رہنے والے کسی ذمّہ دار آدمی سے اس شخص کا پتا معلوم کرنا جس کا سرنامہ میرے پاس موجود تھا۔ تاکہ میں جلد سے جلد یہ پیغام جو کہ بہت ضروری تھا۔ اس تک پہنچا سکوں۔

کافی غور و خوض کے بعد اور دیکھ بھال کے بعد مجھے ایک معقول آدمی ملا۔ جو بظاہر میری طرح کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ اور ہر چیز کو انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے اس شخص کا پتا دریافت کیا تو وہ اچانک خوف زدہ ہو گیا۔ اور پھر میں نے دیکھا بازار میں دوڑ بھاگ شروع ہو گئی ہے۔ ایک ہراس سا ہے۔ ہر آدمی جلدی سے کہیں پہنچ جانا چاہتا ہے۔ شاید کسی محفوظ جگہ پر۔

پھر ایک دین نظر آئی جس پر لاؤڈ اسپیکر لگے تھے۔ اور ان لاؤڈ اسپیکروں سے آواز آ رہی تھی۔

"گھبرانے، ڈرنے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ٹینک آپ پر چڑھانے کے لیے نہیں لائے جا رہے ہیں۔ یہ تو شہر کے وسط میں بنے گرجا گھر کی حفاظت کے لیے ہیں۔ پبلک سے درخواست ہے کہ وہ حسب معمول اپنا اپنا کاروبار کرتی رہے۔"

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک طرف سے ٹینکوں کی ایک قطار شہر کے وسط کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور گرجا گھر کی گھنٹیاں لگاتار بج رہی ہیں۔

وہ شخص جسے میں نے معتبر سمجھ کر پتا دریافت کیا تھا۔ آپ ہی آپ بڑبڑایا — "گھبرانا، خوف زدہ ہونا اور پریشان ہونا بھی تو ہمارے روز مرّہ کے کاروبار میں شامل ہے۔"

"کیا کہا —؟" میں نے پوچھا۔

"جو بات ہزاروں بار کہی جا چکی ہے اُسے دوہرانے کی اب کیا ضرورت ہے؟" اس نے جواب دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ ٹینک دو دو کر کے گرجا گھر کے چاروں طرف جا کھڑے ہوئے۔ اُن کی توپوں کا رُخ گرجا گھر کے چاروں طرف بنے مکانوں کی طرف تھا۔

میں نے کہا — "میں نے آپ سے کسی شخص کا پتا پوچھا تھا۔"

"ہونہہ —" وہ چونکا۔

"ہاں وہ شخص میں ہی ہوں۔" اس نے بڑی عجلت میں کہا۔ اس سے پہلے کہ میں اطمینان کی سانس لیتا۔ وہ لوگوں کے ایک ریلے میں شامل ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا جو ہراس کی وجہ سے ایک سمت بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

"ہاتھ آیا ہوا آدمی نکل گیا۔ مجھ میں اور میری آزادی کے درمیان ایک سانس کا فاصلہ تھا۔ مگر افسوس، صد افسوس۔"

میں نے سوچا — (پھر سوچ؟)

اچانک گرجا گھر کی گھنٹیاں خاموش ہو گئیں۔ شہر پر سنّاٹا برف کے تودوں کی طرح

گرا اور سورج وقت سے پہلے ہی غروب ہو گیا۔

(۳)

شراب خانے میں بڑی بھیڑ تھی۔ سارے دن کے کام کاج سے تھکے ہارے لوگ کوشش کے باوجود کام نہ پانے والی عورتیں اور اچھی کمائی کرنے والے تاجر سب وہاں موجود تھے۔ شراب کے نشے میں اپنی کلفتیں گھول رہے تھے۔

میں نے سب طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ مگر مجھے وہ آدمی نظر نہ آیا جو ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔

جھوٹ کیوں بولوں، شراب میں نے بھی پی۔ یہاں کی شراب بڑی سوندھی اور لذیذ تھی۔ اس کا نشہ آہستہ آہستہ چڑھتا تھا۔ اور نشے میں ہر چیز اپنے اصلی حسن سے کئی گنا حسین نظر آنے لگتی تھی۔

مجھے یہ سب اچھا لگا۔ میں نے ان دوستوں کو یاد کیا جن کی رفاقتیں مجھ سے چھن گئی تھیں۔ پھر خواہش ہوئی۔ کاش وہ یہاں ہوتے۔ میرے ساتھ اور اس رنگ میں رنگ جاتے۔ اُن کے پاس بھی ایک پیغام ہوتا۔ جو کسی کو دینا ہوتا۔ اور وہ آدمی ہاتھ آکر کھو گیا ہوتا۔ میں اٹھا اور ایک عورت کے قریب گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُسے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

"کب آئے بیٹے؟" اس نے پوچھا۔ وہ میری ماں تھی۔ جو مجھے جنم دینے کے بعد میرے ایک دوست کے گھر کے ٹیلی فون کی طرح ڈیڈ ہو گئی تھی۔

"مجھے وقت کا احساس نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن آپ یہاں؟"

"ہاں بیٹا یہ رسم تھی کہ جب چھاتیوں میں دودھ اُتر آئے تو یہاں آجاؤ۔ اس شہر میں اپنے بچے کو چھوڑ کر اور یہاں رؤسا کے بچوں کو دودھ پلاؤ۔"

"مگر اس شراب خانے میں اتنی جان ....؟"

"ہوا یہ ہے کہ اب رؤسا کے بچے اناج کھانے لگے ہیں۔ اور انھیں عورت کی بجائے چوپایے کا دودھ درکار ہے۔ اس شراب خانے کا مالک ایک ایسا عمل جانتا ہے۔ جس سے عورت کا دودھ شراب میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور میں اپنی باری کے انتظار میں ہوں۔"

میں نے سوچا۔ (باز نہیں آؤ گے احمق پھر سوچنے لگے۔ اس آدمی سے بھی نہیں ڈرتے جو ہر سوچنے والے آدمی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اس کے بعد ہم کبھی نہیں مل رہے۔")

"وہ کیسا اچھا زمانہ تھا۔ جب آدمی کی چھاتیوں میں بھی دودھ اترتا تھا۔"

"تب شراب ارزاں تھی۔" میری ماں نے جواب دیا اور پھر اُسے پکار لیا گیا۔ وہ اپنی بہتی ہوئی چھاتیوں پر ہاتھ رکھے اندر چلی گئی۔ باہر لوگ شراب پیتے رہے۔ ہاؤ ہلڑ مچاتے رہے۔ اپنے غم سے نجات پانے کی سعی کرتے رہے۔

میں وہاں کھڑا اپنی ماں کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اچانک گرجا گھر کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ میں شراب خانے سے باہر نکلا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ شہر جاگ گیا تھا۔ ہر چیز حرکت میں آگئی

تھی۔

میں نے شہر کے وسط میں جاکر دیکھا۔ فوجی ٹینکوں پر لگی توپوں کے کل پرزوں کو تیل دے کر رواں کر رہے تھے۔

(۴)

یہ وہی جگہ تھی۔ جہاں وہ آدمی مجھے ملا تھا۔ ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔ میں نے سوچا۔ ؟ کل کا بھولا شاید آج یہاں آجائے۔ میں نے بہت انتظار کیا مگر وہ نہ آیا

پھر ایک طرف کچھ بھگدڑ سی مچی۔ میں نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ کچھ لوگ سر پر کفن باندھ کر فوجی قواعد کرتے ہوئے شہر کے وسط کی طرف آ رہے ہیں۔

"چپ ــــ راست"

"چپ ــــ راست"

وہ چلا رہے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں۔ لیکن وہ ہتھیار بند فوجیوں سے زیادہ خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔

اچانک گرجا گھر کے گرد تعینات فوجی آگے بڑھے اور انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ ہنسنے لگے۔ آپس میں ٹھٹھے کرنے لگے۔

فوجیوں نے انھیں توپوں کے نشانے پر ہی زمین میں گڑی لکڑی کی بُرجیوں سے جکڑ دیا۔ وہ پھر بھی اس طرح دکھائی دیے جیسے ریل گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے مسافر اپنے دوستوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ اور پھر کل وار توپوں نے انھیں اپنے نشانے پر لے لیا۔ ایک طرف سے کاشن آیا اور پھر دھائیں۔ دھائیں کی آوازیں سنائی دیں۔ اب بُرجیوں سے ان لوگوں کے جنجیرے جھول رہے تھے۔ اور توپوں کی زد میں آئی ہوئی عمارتیں بھی مسمار ہو گئی تھیں۔ اسی وقت سرکاری عملہ آگے بڑھا بڑی بڑی جریبوں سے تباہ شدہ علاقہ ناپا جانے لگا۔ نقصان کا اندازہ لگایا گیا اور اخباروں کے نمایندوں کو پریس نوٹ ایشو کر دیے گئے۔ گرجا گھر کی گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔

"یہ عمارتیں جلد ہی پھر بنا دی جائیں گی۔"

میرے کانوں میں ایک مانوس آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہ وہی آدمی تھا۔ جو ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔ میں نے لپک کر مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

(۵)

اس نے کہا ــ "مجھے چھوڑ دو، کوئی فائدہ نہیں۔"

ہم وہاں نہ تھے، ایک ایسے گھر میں تھے۔ جہاں ایک کمرے میں اس شخص کی لاش فرش پر پڑی تھی ــ جسے میں پکڑ کر یہاں تک لایا تھا۔

"مگر یہ سب ہوا کیا ــ؟"

"کچھ نہیں — میں اس پہلی ٹکڑی میں تھا۔ جس کو کئی صدی پہلے برجیوں سے باندھ کر توپوں سے اڑادیا گیا تھا۔ مگر میں اپنی لاش یہاں تک گھسیٹ کر لانے میں کامیاب ہوگیا۔"

"مگر یہ سب کیوں ہوتا ہے؟"

"اس طرح سے مرنا ثواب ہے۔ گرجاگھر کی گھنٹیوں کو غور سے سنو ان میں ایک پیغام پوشیدہ ہے۔ جو ان موتوں کے بعد مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ ان لوگوں کی روحوں کے حق میں دعا کرتا ہے جو توپوں کے گولوں سے اڑا دیے جاتے ہیں۔"

"مگر اس پیغام کا کیا ہوگا۔ جو میں تمھارے لیے لے کر آیا ہوں۔ جسے تم تک پہنچانے کے بعد میں آزاد ہوجاؤں گا۔"

"میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں زندہ ہوتا تو وہ پیغام پڑھ سکتا تھا۔ کس نے دیا تھا تمھیں وہ پیغام۔؟"

"میں نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔"

"لاؤ دیکھیں۔"

میں نے اپنی بغل میں سے لپٹا ہوا پیغام اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے کھولتا گیا۔ اس پر جگہ جگہ اس آدمی کا سرنامہ لکھا تھا۔ اور کوئی لفظ نہ تھا۔

"ارے یہاں تو سوائے تمھارے سرنامے کے اور کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں ہی اسے پڑھ سکتا تھا۔ یہ ایک پوشیدہ تحریر تھی۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ میں تو مرچکا ہوں۔ یہی رسم تھی یہی حکم تھا۔"

"تو اس کا مطلب ہے۔ میں کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔؟" میں نے سوال کیا۔

"میں کیا کہہ چکا ہوں۔ میں تو مرچکا ہوں۔"

"حیرانی ہے۔ بہت حیرانی ہے۔ اس نے جو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے ایک ایسے آدمی کے لیے پیغام دیا۔ جو عمر عزیز گزارنے کے بعد ملا۔ مگر وہ مرچکا تھا۔ اور مرے ہوئے آدمی کے لیے وہ پیغام کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اس نے کیوں کیا —؟"

وہ آدمی اپنی لاش کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ اور قریب رکھے پانی کے لوٹے میں سے پانی لے کر لاش کا منہ دھلانے لگا۔

(۶)

میں تھکا ہارا ساحل پر پہنچا۔ کشتی ہوا کے تھپیڑوں سے تنکا تنکا بکھر چکی تھی۔ واپس جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میں نے کشتی کی طرف رخ کیا سامنے سمندر کی وسعت تھی اور دور بہت دور آسمان جھک کر سمندر کے ہونٹوں پر بوسہ دے رہا تھا۔

میں چلایا۔

"یہ تم نے کیا کیا میرے ساتھ۔؟ مجھے وہ بصیرت عطا کر کہ میں تیرا دیا ہوا پیغام پڑھ سکوں۔ یا پھر مجھے وہ آزادی دے۔ جس کا تم نے وعدہ کیا تھا۔"

میری آواز میں اتنی شدت تھی کہ سمندر کی سطح پر ارتعاش پیدا ہوا اور کشتی جو تنکوں میں بکھری پڑی

منیر الدین احمد
Deutsches Orient-Institut
Mittelweg 150
2000 Hamburg 13
West Germany

رستہ

لوک داستانوں کا ہیرو
اپنی مہموں کے دوران
ایک چوراہے پر پہنچتا ہے
جہاں پر ایک سنگ میل لگا ہوا ہے
اس پر لکھا ہے کہ
جو کوئی یہاں سے دائیں ہاتھ
یا بائیں ہاتھ کو مڑے گا
یا ناک کی سیدھ میں آگے جائے گا
اس کا استقبال موت کرے گی

مجھے خبر نہیں ہے کہ ہیرو نے
کون سا رستہ اختیار کیا تھا
میں صرف یہ جانتا ہوں کہ
مجھے سنگ میل کے سامنے کھڑے ہوئے
ایک عمر بیت چکی ہے
اور میں نہیں جانتا کہ
مجھے کون سا رستہ لینا چاہیے
واپسی کا رستہ مسدود ہے
پلوں کو اپنے پیچھے
میں نے توڑ دیا ہے اور
کشتی کو نذر آتش کر چکا ہوں

نصیر ملک
VAEREBROVEJ 20 - 4 - 3
DK-2880 BAGSVAERD
COPENHAGEN DENMARK
Tel 02 98 25 71

شب رہائی

یہ میری شب رہائی نہیں
پتھر کی سلیں
بستر میرا، مجھ سے "بیزار" سہی
یہ میری شب رہائی نہیں!

برف کے صحراؤں میں بھٹکتا
محض وقت گزاری کر رہا ہوں
ان برفیلے صحراؤں میں، میری وسعت
سکڑ کر اک قطرے کے برابر ہو چکی ہے۔

وہ جو میرے ساتھی تھے، کل انھیں
شہر کے چوراہے میں، پھانسی چڑھا دیا گیا۔
میں نے اپنی "محبوبہ" کو
بادِ صبا کے سپرد کر دیا ہے، تاکہ،
پھانسیوں پر لٹکے ہوئے میرے ساتھی
صبح کی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیں خود بھی
کہ وہ آزاد ہیں اب سب
اور میں بدبخت، پتھر کی سلوں پہ
بھڑکتے شعلوں کی مانند جل رہا ہوں
پتھر کی یہ سلیں، بستر میرا،
مجھ سے "بیزار" ہے، تبھی تو
امشب میری رہائی نہیں!
میرے بستر کی میرے ساتھ یہ عداوت
مجھے زندہ بھی تو مرنے نہیں دیتی!

کرامت بخاری
DEPUTY DIRECTOR,
REVENUE RECEIPT AUDIT,
LAHORE.(PAKISTAN)

خزاں

اگر ہوا کا مزاج بدلے تو اس سے کہنا
میں زندگی کی اُداس شاخوں کا زرد پتّہ
تمھاری تند اور تیز لہروں سے گر پڑوں گا
مگر یہ موسم، اداس منظر، ہوا کے جھونکے
انھیں بتا دو کہ شاخِ جاں پہ جو زخم ہوگا
بدلتے موسم کی زندگی اس کو پُر کرے گی
حقیقتوں کے حصار سے اپنا رنگ لے کر
ہر ایک پتّہ نظامِ نو کی نوید ہوگا

وجاہت علی سندیلوی
NUSRAT MANZIL
SANDILA. (U.P.)

غزل

انقلاب آج ہے لایا نئے آغاز کا رنگ
اب ممولا بھی اڑانے لگا شہباز کا رنگ

آ گیا صرف میں کانٹوں کے لہو میرا تو کیا؟
سُرخیٔ گل سے عیاں ہے بُتِ طنّاز کا رنگ

ہو گئی بزمِ طرب ایک ہی پل میں برہم
کیسا بدلا یہ تری چشمِ فسوں ساز کا رنگ

لالہ و گُل سے ٹپکتا ہے مرا خونِ جگر
اب ہے گلچیں کے ستم میں ترے انداز کا رنگ

نبضِ دوراں ہے رُکی حسنِ بیاں سے تیرے
ہر خموشی میں ہے پنہاں تری آواز کا رنگ

جشنِ گل ہم بھی قفس ہی میں ہیں مناتے یارو
تم نے دیکھا ہی نہیں حسرتِ پرواز کا رنگ

جاں کنی تم نے تو انجام کی دیکھی ہے فقط
کاش دیکھو کبھی ہر رقص کے آغاز کا رنگ

محمد علوی

آنکھوں میں نفرتوں کا سمندر لیے ہوئے
خود کو تلاش کرتا ہوں خنجر لیے ہوئے

جانے دو یار رات کا اب کیا گلہ کریں
آیا ہے دن بھی ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے

دیکھوں گا اس جہاں کو خلاؤں میں ڈوبتا
جاؤں گا اپنے ساتھ یہ منظر لیے ہوئے

نیندیں نہ رہ گئی ہوں کہیں گھر میں دیکھنا
نکلے تو ہو مکان سے بستر لیے ہوئے

ہم سائے کے درخت کی اک شاخ صبح دم
کھڑکی میں آ گئی تھی گلی تر لیے ہوئے

اکبر علی خاں عرشی زادہ
PHULWAR,
RAMPUR-244901.

اِس شہر کی پہچان

دیوانہ نہ کہیے اُسے ہشیار بہت ہے
جس کو ابھی فرقِ در و دیوار بہت ہے

اقرار سے ڈرتا ہوں نہ مٹ جائے تمنّا
تسکیں کو مری لذّتِ انکار بہت ہے

مل کر بھی تو اس سے نہ کھُلا ہم پہ یہ اب تک
دلدار بہت ہے کہ دلآزار بہت ہے

کس سر کو ہوا اب دیکھیے توفیقِ چراغاں
اک تیرگی مدّت سے سرِ دار بہت ہے

پیمانہ اُسی رند کو زیبا ہے کہ جس کو
مستی میں بھی اندازۂ گفتار بہت ہے

اِس شہر کی پہچان بھی ہے بس وہی اک شخص
رسوا جو سرِ کوچہ و بازار بہت ہے

ایم۔ قمرالدین
120, LAWYERS CHAMBERS,
SUPREME COURT,
NEW DELHI-110001.

غزل

زمیں ہی پہ، فلک سی کروں بسر، اے کاش
کہ سیکھ جاؤں اُس اک شخص کا ہنر، اے کاش

ہوئے ہو تم جو مرے ہمسفر، تو ہے یہ دُعا
نہ ختم ہو کہیں ہرگز۔ مرا سفر، اے کاش

وہ، جس کے زیر، سمٹ آئے چار سمت کی دھوپ
لگا سکے کوئی ایسا بھی اک شجر، اے کاش

یہ سچ ہے مجھ پہ ہی مرکوز ہے، ہر اک نظر
مگر جو دیکھ تجھی لے، ایک ہی نظر، اے کاش

تو سو کے پچھلے پہر، دوپہر کو اُٹھ، لیکن
تو خواب ہی میں کبھی دیکھ لے سحر، اے کاش

سید وقار حسین
Goshna-i-Afiyat
Sir Syed Nagar
Doodh Pur
ALIGARH-202001

موپاساں کے ناول کا مرکزی کردار BEL AMI

Bel Ami

پیرس کے ایک مشہور روزنامے کا چیف ایڈیٹر Baron Du Roy de Cantel جب اپنی دوسری شادی کے بعد چرچ سے باہر آرہا تھا تو وہاں جمع سارے لوگ اُسے اور اس کی کم سن بیوی کو رشک سے دیکھ رہے تھے۔ Duroy کے سامنے ایک روشن مستقبل تھا اور وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن اُسے منسٹر بننا ہے۔ اخبار کے مالک کی بیٹی سے Duroy کی شادی کس طرح ہوئی۔ اس کا قصہ ابھی تھوڑی دیر میں سنیے گا۔ اِس وقت تو پیرس کی Rail Road کمپنی کے ایک کلرک کی یہ تصویر دیکھیے: مہینے کے آخری دن ہیں اور ہمارے کلرک کی جیب میں کل تین فرانک بچے ہیں۔ راستہ چلتے ہوئے وہ حساب لگا رہا ہے کہ آج اگر دو گلاس بیئر پی لی تو کل دوپہر کا کھانا گول۔ جی ہاں یہ تصویر بھی اُسی کامیاب صحافی کی ہے جس نے ابھی ابھی اپنے اخبار کے مالک کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ ۱۸۸۵ء میں چھپے موپاسان کے ناول Bel Ami کے ہیرو Georges Duroy کی جو تصویریں آپ کے سامنے رکھی گئیں اُن سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اِس ناول میں موپاسان نے ایک گمنام اور مفلوک الحال شخص کی کامیابی کی کہانی بیان کی ہے۔ Duroy کو اس کی جاننے والی خواتین پیار سے Bel Ami کہتی تھیں جس کا ترجمہ یارِ طرحدار ہوگا اور Duroy تھا بھی طرحدار آدمی: خوش قامت، خوش بدن، نیلی آنکھیں، بل دار مونچھیں، بالوں میں گھنگھر — اُسے دیکھ کر داستانوں کے ہیرو یاد آتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ Bel Ami کا لقب اُسے دس سال کی ایک لڑکی نے دیا تھا جو پیرس میں اس کی محبوب ترین خاتون میرل کی بیٹی تھی۔ Duroy کی جب پہلی شادی ہوئی تو دس برس کی اس لڑکی کو اس قدر حسد ہوا تو اس نے Bel Ami کو پھر کبھی منہ نہ لگایا۔ اس چھوٹی سی لڑکی سے لے کر دو جوان بیٹیوں کی ماں مادام والٹر تک ساری ہی خواتین اِس سابق فوجی پر فدا تھیں جو ایک گاؤں کی سرائے کے میاں بھٹیارے کا بیٹا تھا اور جس نے بڑی مشکل سے کالج کی تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر فوج میں بھرتی ہو کر دو سال افریقہ میں رہا۔ ملٹری میں دل نہ لگا تو پیرس آکر قسمت آزمائی کی ٹھانی۔ Rail Road کمپنی میں بہت معمولی تنخواہ پر کلرک ہوا۔ بہ مشکل گزارا ہوتا تھا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ افلاس سے کس طرح چھٹکارا پائے کہ ایک دن اتفاقاً راستے میں

ملٹری کے ایک پرانے ساتھی Forestier سے ملاقات ہوگئی جو پیرس کے ایک اخبار کا اڈیٹر تھا۔ اسی دوست اور اس کی بیوی نے Duroy کو اخبار نویس بنایا جب کہ ان حضرت کو لکھنا لکھانا کچھ نہیں آتا تھا۔ جب Duroy پہلی بار Forestier کے گھر کھانے پر گیا تو اس نے FORESTIER کے دیے ہوئے پیسے سے شاید کرایے پر لیا ہوا ایک سوٹ پہن رکھا تھا اور اپنے آپ پر اسے ذرا اعتماد نہ تھا۔ ہال کے باہر لگے آئینے میں وہ اپنی شبیہہ دیکھ کر اس طرح ٹھٹکا گویا یہ کسی اور شخص کا عکس ہے۔ ناول میں کئی بار Duroy آئینے میں اپنے عکس سے ٹکراتا ہے۔ شخص اور عکس کے اس ٹکراو کو موپاساں نے دروں بینی اور خود نگری کی ناکام کوشش کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے کہ حقیقت اور فریب میں تمیز مشکل ہے۔ ع: ہاں وہی ہے جو اعتبار کیا۔

Duroy بہت جلد سمجھ گیا کہ سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص درحقیقت کیا ہے۔ اصل شے اس کی وہ امیج ہے جو معاشرے کے ذہن میں بنتی ہے اور اسی امیج کی وجہ سے وہ کامیاب یا ناکام ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی مقناطیسی کشش ہے جس کے باعث خواتین خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔ پھر کیا تھا اس نے اپنی اس خداداد صلاحیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مادام میرل تو اس کی گرویدہ تھیں ہی اور انھوں نے صرف اپنے Bel Ami سے ملنے کے لیے ایک مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ مادام میرل کو Duroy کا دوسری خواتین سے میل جول ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر Duroy کہاں ماننے والا تھا۔ کئی بار لڑائی ہوئی۔ مار پیٹ کی نوبت بھی آئی لیکن کسی نہ کسی طرح صلح ہو جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مادام میرل کو چھوڑ کر دوسری سب ہی خواتین سے Duroy نے اپنی دنیوی ترقی کے لیے دوستی کی تھی مثلاً مادام فورسیٹر بڑی ذہین اور زمانہ شناس خاتون تھیں۔ اخبار کے لیے Duroy کا پہلا مضمون ان ہی نے لکھ کر دیا تھا۔ Duroy کی محبوبہ بننے سے تو مادام فورسیٹر نے انکار کر دیا لیکن دوست بنے رہنے کا وعدہ کیا۔ جلد ہی موسیو فورسیٹیر مرگئے اور اُن کی لاش کے سامنے بیٹھے Duroy نے بغیر کوئی وقت ضائع کیے مادام فورسٹیر سے اپنی شادی کی تجویز پیش کر دی۔ کچھ عرصے بعد شادی بھی ہوگئی۔ شادی سے پہلے بھی مادام فورسٹیر کو Duroy کے مستقبل سے دل چسپی تھی۔ مثلاً اُن ہی کے اشارے پر Duroy مادام والٹر سے ملا تھا جو اخبار کے منیجر اور مالک کی بیوی تھیں۔ مادام والٹر کی سفارش پر Duroy کو اخبار کے ایک سیکشن کا اڈیٹر بنا دیا گیا۔ مادام والٹر ایک معمر مذہبی خاتون تھیں جنھیں Duroy سے افلاطونی قسم کی محبت تھی لیکن Duroy نے اپنی ترقی اور دنیوی عروج کے لیے مادام والٹر سے عشق کا ڈھونگ رچایا۔ یہ بچاری اپنی مرضی اور ضمیر کے خلاف Duroy کی محبت میں پاگل ہو کر اس کی ہر بات ماننے لگیں۔ اس پر ستم یہ کہ مادام کی بیٹی Suzzane بھی Duroy کے عشق میں گرفتار ہوگئی اور ایک گھاگ شکاری کی طرح Duroy نے Suzzane کو پھانسنے میں ہر طرح کی منفعت

دیکھی۔ ایک عرصے سے اُسے اپنی بیوی پر شک تھا۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی
کا پیچھا کیا اور پولیس کمشنر کو لے کر ایک ایسے مکان پر پہنچ گیا جس کے اندر سے
اُس کی بیوی اور فرانس کے وزیرِ خارجہ برآمد ہوئے۔ طلاق ہوگئی۔ اب میدان صاف
تھا۔ Duroy کے منصوبے کے مطابق موسیو والٹر کی بیٹی Suzzane اپنے گھر سے بھاگ کر
Duroy کے ساتھ پیرس کے باہر چلی گئی۔ موسیو والٹر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ دونوں کی
شادی ہوجائے کہ اُن کی نظر میں Duroy کا مستقبل روشن تھا۔ شادی ہوگئی۔ ماں
اور بیٹی ایک دوسرے کی رقیب بن گئیں — تو یہ ہے Georges Duroy کی کہانی جس کو
baron کا خطاب اُن ہی منسٹر صاحب نے دلوایا تھا جنھیں Duroy کے زورِ قلم کی تاب نہ
لاکر استعفیٰ دینا پڑا — لیکن صحافت میں Duroy کے کارنامے، اُس وقت کی اخباری
دنیا یا فرانس کی سیاست موپاساں کا اصل موضوع نہیں ہیں۔ ناول میں ساری تفصیلات
مرکزی کردار کو نمایاں کرنے کا وسیلہ ہیں۔ Bel Ami کو موپاساں نے ایک بدمعاش
کی تاریخ کہا ہے۔ ناول کے ذیلی عنوان میں اس ایک لفظ بدمعاش سے قطع نظر موپاساں
نے Bel Ami کے کردار کا کوئی اخلاقی محاسبہ نہیں کیا ہے۔ موپاساں کو یقین تھا کہ کسی کردار
کو اس کے عمل کے ذریعے پیش کرنے کا معروضی طریقہ ہی سب سے بہتر طریقہ ہے —
نفسیاتی تجزیے پر موپاساں کو کچھ زیادہ اعتبار نہ تھا کہ اُس کے خیال میں ہم کسی دوسرے
شخص کے ذہن کی پیچیدگی کو نہیں سمجھ سکتے bel Ami میں کہیں کہیں Duroy کو تنہائی اور
خود بینی سے دوچار دکھایا گیا ہے۔ مثلاً اس وقت جب اُس کو بلاوجہ ایک اخبار نویس
سے duel لڑنی پڑی تھی۔ اس duel میں کوئی فریق زخمی نہیں ہوا۔ لیکن صاف ظاہر
ہے کہ موپاساں کو نفسیاتی محرکات کی کھوج سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور جو اس کے
ذریعے تجربے میں آنے والی حقیقت ہی اس کے نزدیک سب کچھ ہے۔ اب سوال یہ ہے
کہ Bel Ami کے کردار میں وہ کون سی صفت ہے جس کی وجہ سے ہم اُس کو یاد رکھتے
ہیں۔ اپنی ظاہری وضع سے قطع نظر وہ ایک معمولی آدمی ہے، کوئی خاص صلاحیت نہیں
رکھتا، محض اپنی جنسی کشش اور عیاری کے بل پر پیرس کی فیشن ایبل سوسائٹی کی
اپنے گھروں سے اُکتائی ہوئی خواتین کو رام کرکے اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے۔ غرض کہ
اس میں کوئی ایسا وصف نظر نہیں آتا جو اخلاقی اعتبار سے پسندیدہ ہو — تو کیا موپاساں
نے ایک بے ضمیر معاشرے میں ایک بے ضمیر شخص کے عروج کی داستان بیان کی ہے؟
آپ چاہیں تو ایسا سمجھ سکتے ہیں لیکن ناول نگار موپاساں اپنی کوئی رائے نہیں
دیتا۔ اُس نے تو Bel Ami کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ایک ناقابلِ تردید انسانی
حقیقت کا مظہر بن گیا ہے۔ Bel Ami علامت ہے جنسی کشش کے پُراسرار اور ناقابلِ
بیان ہونے کی اور اس امر کی کہ مرد اور عورت کا رشتہ کسی منطق کا تابع نہیں ہوتا اور نہ زندگی

ڈاکٹر یعقوب عمر
26-6-263/4,
Kucha-e-Naseem,
HYDERABAD-A.P.
500002

بیگم کا نوحہ

ایک شاعر نے لکھا بیگم کا نوحہ شاندار
پھر اسے اخبار میں چھاپا بطورِ اشتہار
بن بیاہی لڑکیاں جتنی بھی تھیں اس شہر میں
سب کے سب نوحے کو پڑھ کر رو پڑیں بے اختیار
ایک بولی "ہائے میں مر جاؤں! میں ہوتی اگر
اپنے شوہر سے نہ کرواتی کئی سال انتظار"
ایک کہتی ہے کہ "اس کم بخت کے نوحے سے آج
ماند ہو کر رہ گئی ہے تاج جیسی یادگار
آج اگر ممتاز بھی ہوتی تو کرتی آرزو
کاش یہ ہوتا مرا سرتاج، میرا تاجدار"
ایک بولی "یہ شرف حاصل اگر ہوتا مجھے
میں اسے دو سال کے اندر ہی کرتی سوگوار"
ایک کہتی ہے "برس بھر بعد عزرائیل کو
اپنے گھر بلوا ہی لوں گی بھیج کر ارجنٹ تار"
ایک نے آواز دی ہے "میں فقط نو ماہ میں
اس کو ٹاٹا کر کے ہو جاؤں گی ڈولے میں سوار"
ایک کا ارشاد تھا یہ "میں فقط چھے ماہ میں
چھوڑ کر اس کا فلیٹ آباد کر لوں گی مزار"
ایک کہتی تھی کہ "چھے دن میں ہی ویزا کے بغیر
میں تو کر لوں گی سفر ملکِ عدم کا اختیار"
ایک نے فرمایا "بس کافی ہے پہلی رات بھی
اس نے بڑھ کر مجھ سے نوحے کا نہ ہوگا انتظار"
بول اٹھی بنتِ دکن "میرا پلان چ[1] اور ہے
اس کو بی[2] سنگات[3] لیکو[4] جوں[5] گی میں زیرِ مزار
دوسروں کے نوحے نئیں[6] لکھنا مرے بعد اس لیے
اس سے جنت میچ[7] لکھواؤں گی نوحہ ایک بار"

---

[1] پلان چ : پلان ہی۔ [2] کوبی : کو بھی۔
[3] سنگات : ہمراہ۔
[4] لیکو : لے کر۔
[5] جوں گی : جاؤں گی۔
[6] نئیں : نہیں۔
[7] میچ : میں ہی۔

اسد رضوی
MOHAMMAD PUR MOBARAK,
P.O. PRUSHOTTAM PUR,
MUZAFFARPUR-842001.

غزل

تغافل ہم سے وہ کرتا بہت ہے
ہمارے دل پہ جو چھایا بہت ہے
اُسی کوچے میں جانے سے ہوں لرزاں
اُسی کوچے میں جی لگتا بہت ہے
کہاں اُگتا ہے کوئی شب میں سورج
ہتھیلی میں تو یوں لکھا بہت ہے
سُنا ہے ان دنوں پھر شاعری میں
ہمارے عہد کا چرچا بہت ہے
گریزاں ہے زمانہ اُس سے لیکن
اسدؔ وہ آدمی سچا بہت ہے

مظہر امام

AMIR MANZIL, QILAGHAT,
DARBHANGA-846004.
(BIHAR)

ادیبوں کی تنظیم کیوں؟

پرانے کاغذات میں مجھے اپنے ایک خط کی نقل ملی جو اب سے تیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کلکتہ میں طویل قیام کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو کر کٹک (اڑیسہ) آئے مجھے صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ اس خط میں ادبی انجمن اور تنظیم سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ کم از کم اُس وقت بڑی اہمیت کے حامل تھے، اور آج بھی توجہ طلب ہیں۔

یہ خط شہزاد منظر کے نام ہے جو اس وقت پاکستان میں اُردو افسانے کے ایک اہم ناقد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ افسانہ نویس اور ناول نگار کی حیثیت سے بھی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ صحافت ان کا پیشہ ہے۔ کلکتہ ان کا وطن ہے اور اُن دنوں وہ وہیں اردو اخباروں سے وابستہ تھے۔

—— مظہر امام

کیسر پور
کٹک ۱
۲۰ مارچ ۱۹۵۹ء

برادرم شہزاد منظر صاحب: ہدیۂ خلوص

آج صبح سویرے ریڈیو اسٹیشن آیا تو آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اس تفصیلی خط کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ خط کی طوالت سے میں قطعی "بور" نہیں ہوا، حالانکہ آپ سے "بوریت" کی توقع اکثر ہوتی ہے۔ بلکہ میری دلچسپی اس قدر بڑھی کہ میں نے ڈیوٹی کے اوقات میں ہی اسے بہت توجہ سے پڑھ ڈالا۔ (واضح رہے کہ ٹرانسمیشن ڈیوٹی کے دوران ہم لوگوں کو خطوط، اخبار یا کتابیں پڑھنے کی "ممانعت" ہے) آپ کے خط کا جواب تفصیل طلب ہے اور میرے "ذوق تن آسانی" کا تقاضا یہ ہے کہ میں "اطمینان اور سکون" کے انتظار میں خط کا جواب تاخیر سے دوں، لیکن آپ کے خط سے کچھ ایسی تحریک پیدا ہوئی کہ میں فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

بھائی اس دور میں مخلص لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ خلوص سے کچھ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی قدر کون کرے گا۔ آپ کو قدم قدم پر دشواری کا سامنا ہوگا۔ اور اس جاں فشانی کا نتیجہ؟ ——

ترقی پسند ادبی تنظیم ختم ہو چکی۔ سجاد ظہیر نے آپ لوگوں سے ٹھیک ہی کہا کہ انجمن کسی زمانے میں بھی مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں تھی۔ کمزوریاں اور خامیاں اپنی جگہ، لیکن اس تحریک نے بہر حال ایک شاندار ادبی رول ادا کیا ہے۔ انجمن کے ختم ہونے میں جن عوامل کا ہاتھ رہا ہے۔ اُن پر بحث کی اس وقت ضرورت نہیں۔ یہ باتیں بہت پرانی ہو چکیں۔ سجاد ظہیر سے مجھے اتفاق ہے کہ اب یہ انجمن دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ کرشن چندر نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن "اُردو کے ادیبوں کے لیے ایک کُل ہند تنظیم کی ضرورت ہے"۔ یہ سوال بار بار اٹھایا گیا ہے اور عموماً ترقی پسندوں ہی کے حلقے سے اٹھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تین تجویزیں سامنے آئی ہیں:

(۱) انجمن ترقی پسند مصنفین کی از سرِ نو تنظیم کی جائے (اس کی حمایت ہنوز کچھ لوگ کر رہے ہیں)۔

(۲) مارکسسٹ ادیبوں کی ایک علاحدہ انجمن قائم کی جائے (جیسا کہ کرشن چندر نے کہا تھا یا آپ کی تحریر کے مطابق اس بار کلکتہ میں بعض احباب نے کہا)۔

(۳) وسیع بنیادوں پر ایک انجمن کی بنیاد رکھی جائے جس کا مقصد صحت مند، جمہوری اور انسان دوست ادب کی تخلیق ہو۔

سجاد ظہیر اس آخری تجویز کے حق میں ہیں۔ آپ بھی یہی چاہتے ہیں۔ اُردو کے بہت سے اہم اور غیر اہم ادیب بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہیں۔ "اکابرین ادب" کے سامنے اپنی حقیر رائے کا اظہار چھوٹا مُنہ بڑی بات ہوگی۔ لیکن اللہ نے "چھوٹا مُنہ" دیا ہے تو ناشکری کیوں کروں اور "بڑی بات" کیوں نہ کروں! بحیثیت ادیب یا شاعر کے میں کسی "شمار قطار" میں نہیں ہوں، لیکن ادب کا ایک "سنجیدہ اور پرخلوص طالب علم" ضرور ہوں اور مجھے اپنی اس حیثیت کو منوانے پر اصرار ہے ۴۳ء سے ادب کا خصوصاً نئے اور ترقی پسند ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ ۳۰ء کے بعد ظہور میں آنے والے قابلِ ذکر، قابلِ بحث اور قابلِ توجہ ادب کا بیشتر حصہ پڑھ چکا ہوں۔ (بہت کچھ سمجھے بغیر ہی سہی، لیکن کتنوں نے سمجھا ہے !!) ترقی پسند ادبی تحریک نے جو "قلابازیاں" کھائی ہیں، ان سے باخبر ہوں۔ بھیمڑی کانفرنس کے بعد ترقی پسند ادیبوں کے دو بڑے اجتماع ہوتے۔ ایک مارچ ۵۳ء میں دہلی میں انجمن کی چھٹی کل ہند کانفرنس اور دوسری مؤناتھ بھنجن میں مارچ ۵۶ء میں۔ دونوں میں شریک رہا ہوں۔ "بڑے ادیبوں" کی باتیں سُنی ہیں۔ نسبتاً "چھوٹے ادیبوں" سے گفتگو کی ہے یا خط و کتابت کی ہے۔ ادب کی رفتار سے بہت حد تک آشنا ہوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی نفسیات، ان کے کردار اور قول و عمل سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔ اس لیے پیغمبر یا صوفی سنت نہ ہونے کے باوجود مجھے "پیشن گوئی" کرنے دیجیے۔ کہ انجمن کی تنظیم کے سلسلے میں مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں سے ایک صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آپ میرا یہ خط محفوظ رکھیے۔ ایک دو سال میں میری بات کی صداقت کا امتحان ہوا جاتا ہے:

کیوں؟

(۱) انجمن ترقی پسند مصنفین بدنام ہو چکی۔ اب ہزار نئے "منشور" بھی اس کا کھویا ہوا گڈول واپس نہیں لا سکتے۔ اس انجمن کے تعلق سے جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں، انھیں دور نہیں کیا جا سکتا۔

سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ تین چار سال پہلے جب بمبئی میں انجمن قائم تھی اور مہندر ناتھ سکریٹری تھے، کرشن چندر، بیدی، عصمت وغیرہ اپنی غیر معمولی "مصروفیات" کے باعث انجمن کے ایک جلسے میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ انجمن کی نشستیں اسی بلڈنگ میں ہوا کرتی تھی۔ جہاں سردار جعفری رہتے تھے۔ کلکتہ میں انجمن کا جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ذمہ داری مظہر امام کے سر ہے، لیکن یقین جانیے، مظہر امام کے شانے اتنے کمزور ہیں کہ وہ کسی انجمن کا جنازہ بھی نہیں اٹھا سکتے۔

(۲) مارکسسٹ ادیبوں کی انجمن کا قیام ایک مضحکہ خیز سی بات ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم کھلی فضا میں سانس لیں۔ ادب کو اور محدود کرنے کا خیال کہاں کی دانش مندی ہے! پھر "مارکسزم" کی اصطلاح بھی بہت مبہم ہے۔ ذرا ایمان داری سے کلکتہ کے (دوسرے علاقوں کی بات جانے دیجیے) کسی ایک ادیب یا شاعر کا نام بتایئے جو "مارکسزم" کو سمجھتا ہو اور اسے ادب میں برت سکتا ہو۔ (دعوا کرنے کی بات اور ہے!) پھر مارکسسٹ ادیبوں کی انجمن کیا؟ ویسے مارکسزم کا مصنوعی خاکہ تو ہر "ایرے غیرے" کے ذہن میں ہے!

(۳) گذشتہ بیس پچیس سال تک اُردو کے ادیب اور شاعر (میں صرف اُردو تک ہی محدود رہنا چاہتا ہوں) ایک انجمن کی قید میں اس طرح جکڑے رہے ہیں کہ وہ سردست کسی اور "قفس" میں آنے کے لیے تیار نہیں۔ خواہ اس کا دائرہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ "صحت مند، جمہوری اور انسان دوست" ادب کی تخلیق کے لیے کسی تنظیم کی ضرورت نہیں ہے "غیر صحت مند، غیر جمہوری اور انسان دشمن" ادب کی تخلیق کرنے والے ہندستان میں اردو کے کتنے ادیب ہیں؟ کسی بھی قابلِ ذکر ادیب کا نام بتایئے۔ موجودہ ادب پر آپ کی اچھی نگاہ ہے۔ ایک نام بھی لیجیے۔ گوپال متل؟ مجھے تو اس سے بھی اتفاق نہیں۔ وہ کمیونسٹ دشمن سہی، لیکن اُن کی ایک بھی ایسی نظم یا غزل دکھایئے جو رجعت پرست، غیر جمہوری اور انسان دشمن ہو۔ سجاد ظہیر صاحب کو "امریکی ہوّا" خوابوں میں آکر ستاتا ہے۔ آخر وہ کون سے کمیونسٹ دشمن ادیب ہیں (اُردو کے) جو امریکی اثرات کے تحت منظم ہو رہے ہیں اور ان کے "کئی رسائل" نکل رہے ہیں۔ مجھے تو "تحریک" کے علاوہ کسی اور رسالے کا علم نہیں۔ جماعت اسلامی کے رسالوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو اور بات ہے! جو لوگ حقائق پر نگاہ نہیں رکھتے بلکہ صرف خواب دیکھنے کے عادی ہیں، انھیں "ڈراؤنے خواب" بھی نظر آئیں گے ہی!

گذشتہ سال جب سجاد ظہیر کلکتہ آئے تھے تو انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اِدھر تم نے کیا کچھ لکھا ہے؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ لوگوں کی طرف سے کوئی رہنمائی نہیں ہو رہی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا لکھا جائے۔ پرویز شاہدی بھی اس وقت موجود تھے۔ سجاد ظہیر نے جواب دینے کی بجائے، مجھ سے ہی سوال کیا: "غالب کی رہنمائی کون کرتا تھا؟"

میں غالب نہیں ہوں، لیکن سجاد ظہیر نے کیا بالواسطہ یہ نہیں کہا کہ مجھے (یعنی کسی بھی لکھنے والے کو) رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ سجاد ظہیر بھی ادب میں رہنمائی کے

قائل نہیں رہے۔

آج کا ادب کوئی منشور نہیں چاہتا، تخلیق چاہتا ہے۔ حالی نے اپنے زمانے کی تعفن آمیز ادبی فضا کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے محمد حسین آزاد وغیرہ کے ساتھ مل کر ایک انجمن کی بنیاد بھی رکھی، مگر اس انجمن سے زیادہ خود حالی کی تحریریں ادب پر اثر انداز ہوئیں۔ اقبال نے اپنے نظریات مضامین کی صورت میں بھی پیش کیے، لیکن ان کی شاعری ہی تھی جس نے ہمارے ادب پر، ہماری قومی سیاسی اور سماجی زندگی پر انقلابی نوعیت کے اثرات مرتسم کیے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم نے کوئی بڑا تیر نہیں مارا، البتہ اس مدرسۂ فکر نے بڑا کام کیا ہے جسے ہم ترقی پسند ادبی تحریک کے نام سے جانتے ہیں۔ اب کل ہند تنظیم سے کیا ہوگا؟ ایک دو بڑی کانفرنسیں ہوں گی۔ زعمائے ادب" لمبی لمبی تقریریں کریں گے۔ ایک ہی طرح کی باتیں اور بار بار کی دہرائی ہوئی باتیں جنھیں سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ لیکن ان "عظیم دانشوروں" کا نام تو اخباروں میں چھپے گا۔

ہمیں یہ جاننا ہے کہ اس دور میں ادب کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کے لیے ہمیں اپنی ادبی روایات، اپنی قومی تاریخ اور بین الاقوامی مسائل کو سمجھنا ہے، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، مغربی افکار و ادبیات کا مطالعہ کرنا ہے۔ کیا اس کے لیے کسی کل ہند تنظیم کی ضرورت ہے؟ آرام و آسایش کے دیوان پر جام بدست بیٹھ کر ادیبوں کی تنظیم کی بابت باتیں کرنا سجاد ظہیر کے لیے آسان ہے، کیوں کہ وہ "ادبی راہ نما" ہیں۔ ادبی تخلیق سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے (پہلے بھی کون سا تھا!) کرشن چندر مطمئن ہیں کہ جیسی انجمن بھی قائم ہو وہ "گدھے کی سرگذشت" جیسی چیزیں لکھ کر اور سرمایہ داروں پر ایک آدھ طنز کر کے اپنا کام چلالیں گے۔ سردار جعفری جانتے ہیں کہ انھیں جو لکھنا تھا، وہ لکھ چکے۔ اب نظموں میں چند پیش پا افتادہ باتیں دہرا کر اپنے "وجود" کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔ مشکل نئے لوگوں کے لیے ہے۔ مظہر امام اور شہزاد منظر کے لیے ہے۔ میں نو پانچ سال سے اسی کوشش میں ہوں کہ ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالاروں کا ایک آدھ جملہ بھی ایسا پڑھوں یا سنوں جس سے روشنی مل سکے۔ مگر اب تک تو محرومی ہی ہے (شاید اپنی بصارت اور سماعت کا قصور ہو!)

آپ لوگوں نے "انجمن مصنفین اردو" بنائی۔ بہ اچھا کیا۔ ایسی انجمنوں کی بہر حال ضرورت ہے جہاں مقامی طور پر سنجیدگی سے ادب کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے ادیب اور شاعر جمع ہوسکیں اور اپنی تخلیقات ایک دوسرے کے سامنے پیش کر کے استفادہ کرسکیں۔ کلکتہ میں ایسی انجمنیں اور بھی ہیں۔ جہاں لوگ سنتے سناتے ہیں۔ ان کا دائرہ عمل محدود سہی، لیکن اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کے لیے اس طرح کی انجمن بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کا کل ہند تنظیم سے کیا واسطہ؟ میری سنیے تو منشور وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیے۔ ویسے اگر آپ نے کوئی خاکہ تیار کیا ہو تو مجھے بھجوایئے تاکہ میں بھی ایک نظر دیکھوں۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ آپ انگریزی کا وہ ڈرافٹ مینی فسٹو بھیج رہے ہیں جسے سجاد ظہیر نے آپ کو دیا تھا۔ آپ کے لفافے میں نہیں ملا۔

میری نیک خواہشات آپ کی انجمن کے ساتھ ہیں۔ اگر میں کلکتے میں ہوتا تو ہر جلسے میں شریک ہونے کی کوشش کرتا۔ لیکن مجھے اس انجمن کی کامیابی میں بھی شبہ ہے۔ اگر آپ اسے پچیس سال سے

کم عمر کے ادیبوں اور شاعروں تک محدود کردیں اور اسے ایک "کلب" کی حیثیت دے دیں تو شاید کامیابی کے نسبتاً زیادہ امکانات ہوں۔ "جوش وخروش" نوعمر لوگوں میں ہوسکتا ہے، ورنہ "زبانی ہمدردی" کرنے والے بہت ملیں گے۔ ل۔ احمد اکبرآبادی یا مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو جلسوں میں لانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ سعید احمد صاحب سے آپ ہر جلسے میں تقریر کرا سکتے ہیں، لیکن آپ کی انجمن کے لیے شاید وہ کوئی مفید چیز نہ ہوگی۔ ان کا ادب دوسری نوعیت کا ہے جس پر مذہب، فقہ اور اسلامی تاریخ کی چھاپ ہے۔ ل۔ احمد صاحب آپ کے ہر جلسے میں بلاتکلف شریک ہوسکتے ہیں، لیکن شاید ہم نوجوان اُن کا خاطر خواہ احترام نہ کرسکیں، یا اگر کریں تو اُن کی موجودگی میں "بہت کھل کر" تخلیقات پر رائے زنی نہ کریں۔ پرویز شاہدی کو اب جلسوں اور انجمنوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ ہر جلسے کے وقت یا تو ان کی "طبیعت خراب" ہوجائے گی" یا انھیں بہت ضروری کام "نکل آئے گا۔ اس لیے ابتدائی ایک دو جلسوں کے بعد ان کی شرکت ہمیشہ مشکوک رہے گی۔ ابراہیم ہوش اپنے اخبار میں انجمن کی پبلسٹی کرسکتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ کی توقع آپ اُن سے ہرگز نہ رکھیے۔ آپ کے کسی جلسے میں وہ شریک ہوجائیں تو حیرت کی بات ہوگی۔ لے دے کر ایک سالک لکھنوی ہی کی ایسی ہستی رہ جاتی ہے جن سے آپ ہر ممکن تعاون کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ وہ بزرگوں میں بزرگ اور جوانوں میں جوان ہیں۔ ان کی بعض کمزوریوں سے قطع نظر کلکتے میں ان کی شخصیت غنیمت ہے اور اس طرح کی انجمنوں کے لیے ان کا وجود مفید ہے۔ اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ آپ لوگوں کے حصول مقصد کے لیے انجمن ترقی اردو کا پلیٹ فارم کیا بُرا تھا؟ اس کو آپ لوگ اپنے انتظام اور انصرام میں لے سکتے تھے۔ کیا اس انجمن سے وہ کام نہیں لیا جاسکتا؟

یہ خط تلخ لہجے میں لکھا گیا ہے، لیکن میرے تجربات نے اسی نوع کے تلخ تاثرات مجھے ودیعت کیے ہیں۔ اس سے کسی کی تنقیص یا عیب جوئی مقصود نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کلکتہ اور کلکتہ سے باہر کے جن ادیبوں اور شاعروں کا ذکر اس خط میں آیا ہے ان سے میرے ذاتی تعلقات بہت اچھے ہیں، اور اکثر کے ساتھ بہت قریبی مراسم ہیں۔ لیکن اسی "اپنائیت" کی بنا پر میں اظہار صداقت سے گریز مناسب نہیں سمجھتا۔ اس لیے اگر یہ خط ان حضرات کی نظر سے بھی گزر جائے تو کوئی حرج نہیں!

ادب ۔ تنقید ۔ تذکرہ

کتاب	مصنف	قیمت
محب وطن پریم چند اور دیگر مضامین	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	۔/۶۰
ادبی تنقید کے اصول	کلیم الدین احمد	۔/۶
خندہ ہائے بیجا	وارث علوی	۔/۵۱
رشید احمد صدیقی آثار و اقدار	اصغر عباس	۔/۴۰
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں	خواجہ غلام السیدین	۔/۳۰
فن اور فنکار	صالحہ عابد حسین	۔/۳۵
غبارِ کارواں	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۔/۴۰
کانٹوں کی زبان	ظ۔ انصاری	۔/۷۵
اشارے منزل کی طرف	شاہ محمد عثمان	۔/۴۰
بیدی نامہ	ڈاکٹر شمس الحق عثمانی	۔/۱۵۰
کالی داس ایک مطالعہ	شبانہ شبنم	۔/۴۵
باقیات عظیم الدین احمد	ادارہ تحقیقات پٹنہ	۔/۱۵
یادوں کی پرچھائیاں	رحمت امروہوی	۔/۴۰
ہندستان کدھر ہے	پروفیسر آل احمد سرور	۔/۳
ہماری تعلیمی صورت حال	پروفیسر آل احمد سرور	۔/۴
جواہر لال نہرو	ظ۔ انصاری	۔/۵
مضامین ڈاکٹر عبدالودود	مرتبہ: صفیہ ودود	۔/۳۰
پرانی یادگاریں	غلام ربانی	۔/۳۰
تحریر ہمہ رنگ	محمد اسد اللہ	۔/۲۰
نقد ادبیات فارسی	ڈاکٹر سمیع الدین	۔/۲۶
فارسی زبان و ادب	" "	۔/۱۵
اردو شعریات	پروفیسر آل احمد سرور	۔/۶۰
ہندستان میں تصوف	" "	۔/۲۰
اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب	ڈاکٹر محمد شکیل خاں	۸۸
محمد مجیب حیات اور خدمات	ڈاکٹر صادقہ ذکی	۔/۵۰
احوال و افکار آثار عماد الملک	ڈاکٹر قمر الدین	۔/۵۰
ادبی زاویے	فخر الاسلام اعظمی	۔/۱۴
چند مصری ناول اور افسانے	ڈاکٹر بدر الدین الحافظ	۔/۵۰
نگار حکمت	محمد فضل الرحمٰن	۔/۶
یادگاری خطبات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۔/۱۵
رہنما و رہبر	محمد برہان حسین	۔/۱۰
جدید دنیا میں اسلام	پروفیسر آل احمد سرور	۔/۴۰
آرٹ	سید حبیب اللہ	۔/۲۰
سیر المصنفین	محمد یحییٰ تنہا	۱۵
توفیق الحکیم	ڈاکٹر بدر الدین الحافظ	۔/۷
پیرس و پارس سفرنامہ	پروفیسر ثریا حسین	۔/۲۷
تذکرہ کاملان رامپور	حافظ احمد علی خاں شوق	۔/۵۰
تاریخ اسلام عہد نبوی تا خلافت راشدہ	ڈاکٹر اقبال اختر	۔/۱۲
کشتہ جات	حکیم شاہ نور فیصل	۔/۲۵
اسوۂ رسول اکرمؐ	ڈاکٹر عبدالحی	۔/۵۰
محمد حسین آزاد، بحیثیت محقق	قاضی عبدالودود	۔/۱۰
جدید غزل گو	عابد رضا بیدار	۔/۲۵
آئینۂ ابوالکلام	مرتبہ: عتیق صدیقی	۔/۲۰
تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی	محمد رضا انصاری	۔/۴۰
مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ	ثمامہ بلال	۔/۴۰
آزادی کی کہانی انگریزوں، اخباروں کی زبانی	غلام حیدر	۔/۳۰
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط	عتیق صدیقی	۔/۲۰
ضیا فتح آبادی شخص اور شاعر	مالک رام	۔/۱۵
جہات و جستجو	ڈاکٹر مظفر حنفی	۔/۲۰
جوہر آئینہ	طالب کشمیری	۔/۲۵
دنیا میرا گاؤں	خواجہ غلام السیدین	۔/۶۰
اردو ادب کی بازیافت رسالہ زبان	خدا بخش لائبریری	۔/۵۰
ظرافت اور تنقید	احمد جمال پاشا	۔/۲۵
تلاش فن	سید رضا زیدی	۔/۶
کاشف الحقائق ایک مطالعہ	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۔/۹۰
احوال و افکار (خان آرزو)	ڈاکٹر ریحانہ خاتون	۔/۵۰
اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	ممتاز انور	۔/۵۰
نقد نفس	نسیم عباسی	۔/۲۰

عبدالقوی دسنوی

اردو، اردو والوں سے تعاون انصاف کی طالب

"انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند" کی اپیل "۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء کو یوم اردو منائیے"، پر کچھ اساتذہ اور طلبہ نے غور و خوض کیا۔ جس میں حسب ذیل نتائج سامنے آئے۔

عام طور سے:

- اردو کی صورتِ حال تشویش ناک ہے۔
- اردو اپنے گھروں سے بے گھر ہو رہی ہے۔
- اردو والوں کے گھروں میں، اردو اخبارات یا رسائل خریدے نہیں جاتے۔
- اکثر جگہوں میں اردو تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہے۔ نہ بچوں کے والدین ہی اردو پڑھانے کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔
- گھروں میں اردو تہذیب بھی بے آبرو ہو رہی ہے۔
- اردو کی خدمت کا دعوا کرنے والے بھی اردو کے لیے وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں جو ان کو کرنا چاہیے۔ ان کے گھروں کا بھی وہی حال ہے جو عام اردو والوں کا ہے اور اردو اساتذہ بھی کسی طرح ان سے پیچھے نہیں ہیں۔
- بہت سے اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔
- جہاں ہے وہاں اکثر جگہوں پر اردو کے اساتذہ نہیں رکھے جاتے۔
- جہاں رکھے جاتے ہیں وہاں عموماً اردو اساتذہ اردو پڑھانے سے دلچسپی نہیں لیتے۔ اکثر سننے میں یہ بات بھی آتی ہے کہ اردو کے اساتذہ طلبہ کو اردو بحیثیت مضمون لینے سے منع کرتے ہیں۔ تاکہ پڑھانے کی زحمت سے بچے رہیں۔
- یہی حال کالجوں کا ہے جہاں پڑھانا لکھانا اساتذہ کے MOOD پر ہے۔ بعض اساتذہ کو پڑھانے لکھانے کا پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مجبوراً کبھی کبھی کلاس جانے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ اردو کے بعض اساتذہ احساس کمتری کے اس حد تک شکار ہیں کہ وہ پڑھانے لکھانے یا پڑھنے لکھنے کے علاوہ، وہ سب کام کرتے ہیں۔ جن کا تعلق ان کی ملازمت یا منصب سے نہیں ہے۔ اس سے ان کو دو فائدے ہوتے ہیں ان کے اندر کے " " میں، کو تسکین بھی ہوتی ہے اور پڑھانے لکھانے سے بچ بھی جاتے ہیں۔
- اگر اردو کے اساتذہ کسی کالج میں ایک سے زیادہ تعداد میں ہیں تو ان کا بیشتر وقت ایک دوسرے کی مخالفت میں گزرتا ہے۔ بعض اوقات ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں ان کی ساری زندگی صرف ہو جاتی ہے۔ پھر بات طلبہ تک پہنچتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ایک دوسرے کے طالب علموں کو نقصان پہنچاتے میں دریغ نہیں کرتے۔ اگر اساتذہ دو مختلف کالجوں کے ہیں تو مختلف کالجوں کے طلبہ، مختلف کالجوں کے اساتذہ کا نشانہ بنتے رہتے ہیں اور نقصان اٹھاتے رہتے ہیں۔
- کالج کے اردو اساتذہ بھی دوسرے کالج کے اساتذہ کو ذلیل و رسوا کرنے اور بے صلاحیت ثابت کرنے کی کوشش میں عمر کا بڑا حصہ صرف کر دیتے ہیں۔ اس کوشش

میں ایک دوسرے کے طلبہ کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔

- ان حالات میں خود غرض اور غیر ذمہ دار اساتذہ کی چالاکیاں اچھے اور ایماندار اساتذہ کو اس انداز سے نشانہ بناتی ہیں کہ وہ آخر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنے فرائض سے لاپروائی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
- نتیجہ یہ ہے کہ کالجوں میں بھی اردو کا ماحول ختم ہوتا جا رہا ہے اور اردو کی کس مپرسی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ پڑھانے لکھانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا۔ اگر پڑھانے سے کوئی دلچسپی لے تو یہ اس کا اپنا عمل ہے جسے وہ خود جھیلتا رہتا ہے۔ اس کی اس کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔
- یونی ورسٹیوں کے حالات اردو کے تعلق سے جو کچھ ہو رہے ہیں ان سے کون واقف نہیں ہے۔ یونی ورسٹیوں کے شعبہ اردو عام طور سے اکھاڑے کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، پڑھائی لکھائی کا ماحول اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کم ہوتا جا رہا ہے۔
- مرکزی حکومت نے اردو کے فروغ کے لیے ترقی اردو بورڈ قائم کی ہے اور بعض صوبائی حکومتوں نے اپنے یہاں اردو اکادمی کی بنیاد رکھی ہے ان کے علاوہ اردو کے نام پر کئی دوسرے ادارے قائم ہیں ان کا حال جو کچھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے یہ ادارے اکثر مفاد پرستوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتے ہیں، یا مفاد پرست کے ہاتھوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان اداروں سے وہ کام اردو کی ترقی کے لیے نہیں لیا جا سکتا جو ان کے قیام کا مقصد ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر اکیڈمیوں میں کتابوں کی اشاعت سے لے کر انعامات کی تقسیم تک سب متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور جس کی وجہ سے بے اطمینانی، مایوسی، اور گندی سیاست کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں۔
- اردو اخبارات بھی عام طور سے اردو کی فروغ کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھ رہے ہیں اور وہ بھی اکثر غلط لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہو کر اردو کی دنیا میں انتشار پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اشتہارات یا دوسری مراعات حاصل کرنے کی امید میں وہ سچ کو سچ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ یا جھوٹ یا دوسری برائیوں اور مفاد پرستوں کے خلاف آواز اٹھانا نہیں چاہتے۔
- اردو والوں کو ان حالات کے علاوہ دوسرے حالات جن سے وہ آگاہ ہیں یا جو ان کے تجربے میں آتے رہتے ہیں۔ ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اور ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے اردو کے لیے کام کرنے والے صحیح سمت میں کام کر سکیں، اردو کے اساتذہ اپنے فرائض صحیح طور سے ادا کر سکیں، اردو کے شعبے اور ادارے اپنی ذمہ داریاں سمجھیں، اردو والے خود اپنے گھروں میں اردو کے جائز مطالبات سے باخبر ہونے کی کوشش کریں تاکہ دوسرے بھی اردو کے ساتھ ناانصافی اور حق تلفی کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔
- یہ سچ ہے اردو کو جب اپنے گھروں میں انصاف ملے گا تو باہر کی دنیا بھی اسے انصاف دینے پر مجبور ہو گی۔
- اردو خود اردو والوں سے مدد اور انصاف چاہتی ہے۔

طاہر مسعود
TEACHERS FLATE NO. 6
UNIVERSITY CAMP,
KARACHI UNIVERSITY,
KARACHI. (PAKISTAN).

یوسف ناظم سے ایک مکالمہ

تمہید

یہ طنز و مزاح کی صنف کی مقبولیت کا دور ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی لحاظ سے
انتشار اور تشویش کے اس دور میں طنز و مزاح کے فن کی مقبولیت بظاہر تعجب خیز محسوس
ہوتی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ایسے ہی زمانے میں ہنسنے ہنسانے کی ضرورت کا احساس بڑھ جاتا ہے
لوگ زندگی کی تلخیوں اور بوجھل پن سے فرار چاہتے ہیں اور ایسی تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں جو انھیں
سکون اور مسرت بخش سکے شاید اسی لیے پاکستان اور بھارت ہر دو ممالک میں طنز و مزاح لکھنے والے
عام پڑھنے والوں میں بے پناہ مقبول ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان کی کتابوں کے اڈیشنوں اور تعداد اشاعت
سے لگایا جا سکتا ہے۔

فی زمانہ طنز و مزاح نہ صرف لکھا جا رہا ہے بلکہ اب تو طنز و مزاح کانفرنسیں بھی باقاعدگی سے منعقد
ہو رہی ہیں۔ کراچی میں ہونے والی ایسی ہی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندستان کے معروف
[مزا]ح نگار تشریف لائے انھیں میں یوسف ناظم بھی شامل تھے۔ اگر آپ نے یوسف ناظم کی کتابیں نہیں
[پڑ]ھیں تو مزاح کے ایک مختلف ذائقے سے محروم رہے اور آپ یوسف ناظم سے نہیں ملے تو پھر آپ نے
[گو]یا ایسے شخص کو کھو دیا جس سے ملاقات ہنسی، بے فکری اور گرمجوشی سے عبارت ہوتی ہے۔

وہ کراچی کی گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھکن آلود شام تھی جب میں ناظم آباد کی ایک کوٹھی پر یوسف ناظم
[ص]احب سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ "آئیے آئیے، میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا!" انھوں نے مسکراتے
[ہو]ئے کہا۔ پھر ہم کوٹھی کی اوپری منزل پر ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ پست قامت، چہرے پر چیچک کے ہلکے
[دا]غ، سفید بال، روشن آنکھیں اور ہنسنے ہنسانے میں نہایت فراخدل ـــ یہ تھے یوسف ناظم جو اپنی
[تحر]یروں میں جتنے شگفتہ مزاج ہیں، عام زندگی میں ان کی شگفتہ مزاجی اس سے کہیں سوا ہے ان سے
[میر]ی پہلی ملاقات مشفق خواجہ صاحب کے گھر ایک دعوت پر ہوئی تھی جہاں میں نے ان سے اپنی نیاز
[من]دی کا اظہار کرنا چاہا تو گرمجوشی سے ہاتھ دبا کر بولے "تکلف سے کام نہ لیجیے ورنہ میں آپ
[س]ے زیادہ باتکلف واقع ہوا ہوں۔" بلاشبہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن سے پہلی ملاقات
برسوں پرانی ملاقات کا گمان گزرتا ہے عمر کے سرسٹھویں سال میں بھی وہ مجھے ایک ایسے نیک
[سیر]ت بچے کی طرح دکھائی دیے جس میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ ہماری گفتگو نہایت

رسمی انداز میں شروع ہوئی اور پھر غیر رسمی صورت اختیار کر گئی۔ پھر رات ہوگئی۔ یوسف ناظم صاحب کو کسی عزیز کے گھر دعوت پر جانا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی اور یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ اگر یوسف ناظم صاحب کا قیام مستقلاً کراچی میں ہوتا تو ایسی کتنی ہی شامیں ضائع ہونے سے بچ جاتیں۔

کوائف:- یوسف ناظم صاحب کا اصلی نام سید محمد یوسف ہے۔ شاعر ہونے کی وجہ سے ناظم تخلص کیا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے ۱۹۴۴ء میں ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں بزم اقبال حیدر آباد کی جانب سے منعقد مقابلۂ مضمون نگاری میں حصہ لیا اور اوّل انعام حاصل کیا۔ بعد ازاں طنز و مزاح لکھنا شروع کیا تو اب تک دس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان میں سے متعدد کتابوں کو ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ۶۷ سالہ یوسف ناظم بچوں کے لیے بھی چار کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ترجمے اور تالیفات اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) کیف و کم (۲) فٹ نوٹ (۳) دیوار ہے (۴) زیر غور (۵) سایہ ہمسایہ (۶) فقط (۷) البتہ (۸) ذکر خیر (۹) بالکلیات (۱۰) فی الحال

بچوں کے لیے:- (۱) پلک نہ مارو (۲) الف سے یے تک (۳) مرغی کی چار ٹانگیں (۴) گاندھی جی جنوبی افریقہ میں

ترجمہ:- ارمغان سنسکرت (بھرتری ہری کا منظوم ترجمہ)

تالیفات:- (۱) وجد نمبر (کتاب نما) (۲) ہندستانی مزاح نمبر (شگوفہ) (۳) گوشہ مجتبیٰ حسین (کتاب نما)

زیر طباعت:- (۱) نوائے کبیر (۲) فی الفور (مضامین)

بات چیت

سوال:- پاکستان آپ پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں۔ اس موقع پر آپ کے تاثرات۔؟

یوسف ناظم:- تاثرات کیا ہوں گے، محرومی کے تاثرات ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہاں طنز و مزاح کانفرنس میں کرنل محمد خاں، سید ضمیر جعفری اور محمد خالد اختر سے ملاقات ہوگی لیکن بدقسمتی سے کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اس محرومی کے احساس کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ بہر کیف یہ طنز و مزاح کانفرنس بارش کا پہلا قطرہ تھی۔ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے اور جو کمی اس کانفرنس میں رہ گئی ہے وہ آیندہ کی کانفرنس میں دور ہو جائے گی۔ مزاح نگاروں کو یہاں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کی مجھے بہت خوشی ہے۔

سوال: یہاں سے آپ کیسی یادیں لے کر واپس جا رہے ہیں؟

یوسف ناظم: میں ایک خواب اور گرم موسم کا تاثر لے کر جا رہا ہوں۔ اس شہر میں بے محابا ٹریفک ہے۔ شہری شعور بھی کم ہے، گاڑی چلانے والوں کو اپنی جان کی پروا نہیں ہے تو دوسروں کی جان کی پروا کیا ہوگی۔ لوگ ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ ہم لباسی اچھی چیز ہے اس سے اسٹیٹس کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ہندستان میں تو آدمی لباس سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں میں ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ راستہ پوچھیے تو کام چھوڑ کر راستہ بتاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی عادتیں کھانے پینے کے معاملے میں ہم سے مختلف ہیں ہم پھل زیادہ

کھاتے ہیں آپ حلوا پوری کھاتے ہیں ـــــ یہاں زندگی اتنی تیز رفتار نہیں جتنی بمبئی میں ہے لیکن یہاں لوگ سحر خیزی کے فائدے نہیں اٹھاتے۔

سوال: آپ ہندوستان کے ایک معتبر مزاح نگار ہیں آپ کی جتنی کتابیں اور مضامین میری نظر سے گزرے ہیں ان میں میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے مزاحیہ مضامین کے موضوعات عام طور پر ادب، ادیب اور ادبی صورت حال سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

یوسف ناظم: چونکہ میرا حلقہ ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل رہا ہے اور میرا مشاہدہ بھی ان ہی لوگوں کا ہے تو گویا میں ان موضوعات پر لکھ کر آئینہ دکھاتا ہوں۔ لیکن میں نے ان موضوعات پر اب تک دس پندرہ مضامین ہی لکھے ہیں۔ پھر یہ کہ ادب کی نئی نئی تحریکات سامنے آتی ہیں تو میں ان پر بھی لکھتا جاتا ہوں۔

سوال: آپ کے ذہن میں مزاح کا کیا تصور ہے؟

یوسف ناظم: میں مکالماتی مزاح کو کمزور مزاح سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جب تک آپ مکالمات کا سہارا نہیں لیں گے۔ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میں واقعاتی مزاح کو مشکل سمجھتا ہوں۔ قصے کہانی کو مزاح کے طور پر پیش کرنا دشوار گزار کام ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ ہمارے ہاں یہ کام مرزا عظیم بیگ چغتائی کرتے تھے۔

مزاح کا تعلق خوش طبعی سے ہے۔ اس میں مزاج کا دخل زیادہ ہے۔ طنز میں تلخی سے زیادہ دانش مندی ہوتی ہے۔ طنز کے لیے مطالعہ، مشاہدہ، ذہن ضروری ہے۔ جب کہ مزاح کے لیے صرف خوش طبعی کافی ہے۔

سوال: گویا مزاح طنز کے مقابلے میں ادنا درجہ کی چیز ہے؟

یوسف ناظم: ادنا نہیں، خداداد چیز ہوئی۔ منٹو کے طنز کو مزاحیہ طنز نہیں کہیں گے۔ ہمارے ہاں طنز کا مقصد صرف نشتر زنی نہیں ہے۔

سوال: طنز بہرحال مقصد سے وابستہ ہوتا ہے۔

یوسف ناظم: مزاح میں بھی مقصد کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً ایک شخص آتا ہے وہ کہتا ہے "میں بکری خریدنا چاہتا ہوں۔" میں اسے جواب دیتا ہوں کہ لیکن میں بکری بیچنا نہیں چاہتا۔ وہ پوچھتا ہے "آپ بکری کیوں نہیں بیچنا چاہتے ہیں۔" میں کہتا ہوں "اس لیے کہ میرے پاس بکری نہیں ہے۔" یہ مزاح ہے۔ لیکن فرض کیجیے اگر اسی سوال کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میں آپ جیسے نادہندہ شخص کو بکری نہیں بیچ سکتا کیوں کہ میرے پاس بکری نہیں ہے، تو یہ طنز ہوتا۔

سوال: اردو میں قابل ذکر مزاح نگار گنتی کے ہیں۔ یہی پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمن، ابن انشا اور چند ایک مزید۔ ان مزاح نگاروں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

کی مزاح نگاری کی شہرت کے پیچھے ان کی شخصیت کا پرتو زیادہ ہے۔ ورنہ ان کا کینوس محدود ہے۔ وہ مزاح کو LOCALISED کردیتے ہیں۔ وہ اتنے خوش طبع نہیں تھے جتنا تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ہاں وہ بڑے دانشور اور نقّاد ضرور تھے۔ پطرس بخاری کے پاس اسپارک زیادہ ہے۔وژن زیادہ ہے۔ان دونوں بزرگوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے۔ اور اپنے آپ کو دس پندرہ مزاحیہ مضامین کی حد تک محدود رکھا ہے۔ظاہر ہے کہ میں پانچ صفحے لکھوں گا تو پانچ غلطیاں کروں گا اور اگر پچاس صفحے لکھوں گا تو پچاس غلطیاں کروں گا۔ میں ابن انشا کو بہت پسند کرتا ہوں۔ وہ آخری عمر تک نہیں تھکے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے گئے۔ جب کہ فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی کے پاس مواد ختم ہوگیا تھا۔ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی دونوں اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں اور کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ مزاح نگار کے لیے انشا پرداز ہونا ضروری ہے۔

ہر دو حضرات اس شرط کو پورا کرتے ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اختصار مزاح کا حُسن ہے اور وہ ابن انشا کے پاس ہے۔قول محال کی صورت ابن انشا کے پاس ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب اب جو کچھ لکھ رہے ہیں ان کی عمر یا تجربے اور انشا پردازی کے ساتھ جو کچھ انھیں دینا چاہیے وہ انھوں نے نہیں دیا۔ان کی کتاب "زرگزشت" یا "حویلی" (زیر طبع) کا میں نے مطالعہ کیا۔ان میں "چراغ تلے" اور "خاکم بدہن" جیسی شوخ شگفتگی اور حسن نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے سب سے اچھے شعر آخری عمر میں کہے تھے۔

سوال: آپ کے خیال میں اس کا کیا سبب ہے کہ بعض اوقات کم وبیش یکساں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے دو مزاح نگاروں میں سے ایک جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسرے کی تحریر کی تازگی برقرار رہتی ہے۔جیسا کہ آپ نے ابن انشا کے متعلق فرمایا کہ وہ آخر وقت تک تھکے نہیں تھے۔ جب کہ یوسفی صاحب کی تحریر جمود کا شکار ہوگئی ہے۔

یوسف ناظم: اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ملنسار اور مجلسی ہونا۔ رشید احمد صدیقی اور یوسفی صاحب کم آمیز شخصیات ہیں۔جب کہ پطرس بخاری اور ابن انشا مجلسی آدمی ہیں۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ شخصیت کا کھلا ہونا ضروری ہے۔

یوسف ناظم: بہت ضروری ہے۔مارک ٹوین ادیب سے بڑا سیاح ہے۔اس کا آدھے سے زیادہ مزاح سیاحت کی دین ہے۔اردو شاعری میں اس کی مثال غالب ہے۔ جس نے جوا کھیلا، جیل خانہ گیا اس کی شاعری اور خطوط پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہماری آپ کی طرح کا آدمی ہے۔

سوال: یہ تو لائف اسٹائل کی بات ہے۔لیکن کیا یہ لائف اسٹائل شعوری کوشش سے بنایا جاتا ہے۔

یوسف ناظم: یہ ریاض ہے۔گویا آواز اچھی ملی ہے لیکن آپ نے اس آواز کی تربیت نہیں کی۔ دیکھیے

میں بھارت سے کراچی آیا۔ یہاں آنے سے مجھے لکھنے کے لیے بہت سے موضوعات ملے جو ظاہر ہے گھر بیٹھے رہنے سے مجھے نہیں مل سکتے تھے۔

سوال: آپ تحریر پر محنت کرنے کے کس حد تک قائل ہیں؟

یوسف ناظم: اس سے برجستگی ختم ہو جاتی ہے۔ جب آپ کوئی مضمون لکھ لیتے ہیں تو اس پر لاکھ نظرثانی کریں، بات آگے نہیں بڑھے گی وہیں رہے گی۔

سوال: پاکستان اور بھارت میں جس درجے کی مزاح نگاری ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

یوسف ناظم: اب جب کہ موضوعات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ معاشی، اقتصادی، سماجی مسائل پیچیدہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ افسوس کہ اس پر مزاح نگار نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ کالم نگار لکھ رہے ہیں۔

سوال: کیا یہ صحیح ہے کہ بھارت میں اردو کالم نگاری دم توڑ رہی ہے؟

یوسف ناظم: جی ہاں ــــ مزاحیہ کالم نگاری تو اب پاکستان ہی میں رہ گئی ہے۔ ایک اور بات بھی ہے پہلے ادیب صحافت میں آتے تھے۔ اب صحافی ادب میں آ رہے ہیں۔ مولانا آزاد، ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، یہ سب بڑے ادیب تھے جو صحافت میں آئے تھے۔ بنیادی طور پر ایک کالم نگار کے لیے ادیب ہونا ضروری ہے "اودھ پنچ" میں لکھنے والے سب کے سب ادیب تھے۔ کیونکہ جب ادیب کالم نگاری کرتے ہیں تو ان کے کالموں میں ادب کی چاشنی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صحافی ادیب نہیں بن سکتا۔ صحافی پر ادب کے دروازے بند نہیں ہیں۔ لیکن اس کے لیے اسے مشق کرنی ہوگی۔

سوال: مزاح لکھنا مشکل کیوں ہے؟

یوسف ناظم: اس میں اوریجنلٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سنجیدہ تحریر میں موضوع کا خاکہ سامنے ہوتا ہے۔ افسانے میں پلاٹ مل جاتا ہے۔ لیکن مزاح میں بات سے بات پیدا کرنی ہوتی ہے۔ کمزور شعر سنیں تو طبیعت منغض نہیں ہوگی۔ لیکن کمزور مزاح سے طبیعت میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔

سوال: تنقیدی سطح پر مزاحیہ ادب کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے، اس رویّہ کی آپ کیا توجیہ کریں گے؟

یوسف ناظم: میں مانتا ہوں کہ مزاحیہ ادب دوسرے درجے کا ادب ہے کیونکہ پہلے درجے کا ادب لکھا ہی نہیں گیا۔ کوئی صنف پہلے یا دوسرے درجے کی نہیں ہوتی اس لیے مزاحیہ مضامین تو دوسرے درجے کے ہو سکتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاح دوسرے درجے کی کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسا اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں دربار میں مسخروں کو رکھا جاتا تھا جو ہنسنے ہنسانے کا کام کرتے تھے۔ انشاء اللہ خاں انشا تک کو دربار میں رکھا گیا تھا تاکہ وہ لطیفے سنائیں حالانکہ وہ اردو کے بہت بڑے آدمی ہیں۔

سوال: آج کے عہد میں جو بڑے بڑے مسائل ہیں، طنز نگار ان مسائل کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ خود ساختہ کرداروں کی مضحک حرکتوں کے بیان میں سارا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔

یوسف ناظم: آج کے ادیبوں کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی ہے۔ میں ایک اچھا مزاح لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جب لکھتا ہوں تو کسی کی تعریف میں لکھتا ہوں۔ یعنی قدرت نے مجھے صلاحیت دی ہے لیکن میں اپنی مصلحت اندیشی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے اس صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھا رہا ہوں، تو یہ مسئلہ آج کے بیشتر ادیبوں کے ساتھ ہے۔ اب جو نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں انھوں نے کلاسیکس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی صرف اپنی انشا پردازی کی وجہ سے جو مزاح پیدا کرتے تھے اب وہ مزاح میرا بچا پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس نے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا نئے لکھنے والے زبان نہ جاننے کو عیب نہیں حسن سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زبان بے معنی چیز ہے حالانکہ مزاح لکھنے کے لیے زبان جاننا بہت ضروری ہے۔ ابن انشا کے مزاح کا حسن ان کے ایجاز و اختصار میں ہے اور یہ اختصار کا فن انھوں نے شاعری سے سیکھا۔ وہ شاعر تھے اس لیے دریا کو کوزے میں بند کرنا جانتے تھے۔

سوال: ایک تاثر یہ بھی ہے کہ مزاح نگار پڑھنے والوں پر سنجیدہ مقاصد کے لیے اثر انداز نہیں ہو سکتے؟

یوسف ناظم: انگریزی ادب میں یہ بات سوئفٹ کی حد تک صحیح نہیں ہے لیکن مارک ٹوئن کی حد تک درست ہے۔ سوئفٹ نے تو اپنی قوم کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ لوگ جو لباس پہنتے تھے۔ سوئفٹ کی تحریروں کو پڑھ کر انھوں نے وہ لباس پہننا چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ ایک چھوٹا ملک تھا وہاں کمیونیکیشن زیادہ تھا۔ معیارِ تعلیم بلند تھا۔ ہمارا مزاح تو عوام تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ جو کچھ پہنچتا ہے وہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے۔

سوال: اکبر الٰہ آبادی کی شاعری تو پہنچ گئی اور وہ بھی اس وقت جب انھیں ریڈیو اور ٹی وی میسر نہیں تھے۔

یوسف ناظم: شاعری کا پہنچنا آسان ہے لوگ مشاعرے میں جاتے ہیں اور شعر سن لیتے ہیں لیکن نثر کیسے سنیں۔ اس لیے دیکھیں کہ غالب کی غزل کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی ساحر کی نظموں کو۔ کیوں؟ اس لیے کہ پسند آ گیا اور میرا کلاسیکی شعر دھرا رہ گیا لیکن اس سے طنز کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ طنز بہت جلدی آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے اکبر کی عشقیہ غزلیں دھری رہ گئیں اور ان کی ظریفانہ شاعری مقبول ہو گئی۔

سوال: انگریزی کا مزاحیہ ادب اردو میں بہت کم منتقل ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاعری کی طرح مزاح کا ترجمہ بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر قوم کا اپنا تصور مزاح ہوتا ہے اور ہر مزاح اپنے کلچر اور فضا سے اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یوسف ناظم: مزاح میں اگر مقامی رنگ زیادہ ہو تو ترجمہ مزہ نہیں دیتا۔ مجھے انگریزی مزاح

پسند آتا ہے لیکن میں مترجم نہیں ہوں۔ بہت اچھے مترجم ہوں گے لیکن ممکن ہے کہ ان میں ترجمے کا ذوق نہ ہو۔ کسی کی کہانی میں اگر صرف الفاظ کا مزاح ہو تو ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لطیف مزاح کا ترجمہ آسان ہے لیکن لاؤڈ مزاح کمزور ہے ترجمہ مشکل ہے۔ مثلاً ووڈہاؤس کے مزاح کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اسٹیفن لیکاک کا ترجمہ آسان ہے لیکن مزاح کمزور ہے ووڈہاؤس کے ایک ایک جملے میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے۔ مارک ٹوئن کے پاس اندرونیت کم ہے۔ اس نے خارج کی دنیا سے مزاح اخذ کیا ہے۔ اس کا مزاح ڈارک روم سے نکلی ہوئی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چاند کی بیٹی (باتصویر)	۴/۵۰
دُم کٹی لومڑی "	۶/:
جادو کی ہنڈیا "	۴/۵۰
شیر اور بکری "	۶/:
کوّے کا خواب "	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا "	۶/:
چالاک بلّی "	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری "	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
پراسرار غار	۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/:

کتاب	قیمت
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/:
سہانے ترانے	۶/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
شریر شیرا	۳/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵۰
ظالم ڈاکو	۶/:
مہکتی کلیاں	۶/:
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ بونے	۳/:
ایک دیس ایک خون	۳/:
جیت کس کی	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
ذرّے کی کہانی	۲۱/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نانی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:
بی مینڈکی اور کوا	۳/:
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۵۰
لال مرغی	۳/:

کتاب	قیمت
ننھا منّو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلامہ صمصامہ	۵/:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ایک کھلا راز	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۳/:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا ناصح	۳/:
ہار کی تلاش	۶/:
سُرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۶/:
ننھا فرشتہ	۲/۵۰
جوہر قابل	۳/:
بھیڑیے کے بچے	۳/:
ننھا جھبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۶/:
بچوں کے افسر	۶/:
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/:
شیر خاں	۳/:
رحمت شہزادہ	۴/:
لومڑی کے بچے	۳/:
اس نے کیا کرنا جانا	۳/:
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
امیر خسرو	۳/:
بہادر سیاح	۳/:
دادا نہرو	۶/:
جادو کا گھر	۴/:
جگنو کی بلّی	[illegible]
کٹا ہوا ہاتھ	۶/۵۰

مانگے کا اجالا

جوش بلاشبہ بڑے شاعر ہیں لیکن راغب مرادآبادی نے انہیں بہت چھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے

جوش ملیح آبادی بلاشبہ ہماری زبان کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور آیندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن جیسی کتاب راغب مرادآبادی نے شائع کی ہے، ویسی کسی نے اب تک لکھی ہے نہ آیندہ کوئی لکھے گا۔ ہمارے کالم میں چونکہ لاغر مرادآبادی کا ذکر آتا رہتا ہے، اس لیے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ راغب و لاغر دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ اگرچہ دونوں کے تخلص چار حرفی ہیں اور ان میں سے تین حرف (الف۔ غ۔ ر) مشترک ہیں، اس کے باوجود ان دونوں میں کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ راغب صاحب فی البدیہہ شعر کہنے میں اپنی مثال آپ ہیں، اسی لیے ان کا کلام ان شاعروں سے مختلف ہے، جو غور و فکر کے بعد اور سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ راغب صاحب کی فی البدیہہ گوئی کا کمال دیکھنا ہو تو کسی مشاعرے میں چلے جائیے جہاں وہ معلن کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ وہ ہر شاعر کو بذریعہ رباعی متعارف کراتے ہیں۔ رباعی کے چار مصرعوں میں وہ شاعر کا نام، ولدیت اور سال پیدایش اس خوبصورتی سے نظم کر دیتے ہیں کہ ان کی قوت شعرگوئی اور سننے والوں کی قوت برداشت پر حیرت ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ ان کی روزمرہ گفتگو بھی بحر ہزج مثمن سالم میں ہوتی ہے اور ردیف و قوافی کا اہتمام ایسا ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ عروض پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

راغب صاحب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ حضرت جوش ملیح آبادی سے بہت قریب تھے۔ ان کا خاص الخاص مصاحب کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جوش صاحب انھیں بیحد عزیز رکھتے تھے، جس کا ثبوت جوش صاحب کے وہ خطوط ہیں جو ماہنامہ "افکار" کراچی کے شمارہ خصوصی "بیاد جوش" (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوئے تھے۔ بے تکلفی کا اظہار خطوں ہی سے نہیں، لفافوں سے بھی

ہوتا ہے۔ "افکار" کے مذکورہ شمارے میں تین لفافوں کے عکس شائع کیے گئے ہیں۔ ان پر راغب صاحب کا نام بخطِ جوش اس طرح درج ہے۔

۱۔ حضرت راغب مراد آبادی
(کاش ان سے ہوتی میری شادی)

۲۔ حضرت راغب مراد آبادی
سراپا ایک صاحبزادی
دوشیزۂ کوہ و وادی

۳۔ اقلیمِ جمال و مقال کی شاہ زادی
مس راغب مراد آبادی

ان لفافوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خطوں میں کیا کچھ ہوگا۔

راغب صاحب نے جوش سے اپنے بے تکلفانہ مراسم کا یہی فائدہ نہیں اٹھایا کہ ان سے اپنے کلام کے بارے میں کئی تعریفی اسناد لکھوائیں، بلکہ یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ ان سے بہت سے سوالوں کے جواب حاصل کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیے۔ اس وقت یہی کتاب ہمارے پیشِ نظر ہے جو "مکالماتِ جوش و راغب" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب اس طرح وجود میں آئی کہ راغب صاحب ایک کاغذ پر کچھ سوال لکھتے، جوش صاحب کو پڑھ کر سناتے اور ہر سوال کے آگے جوش صاحب کا جواب لکھ کر کاغذ کے آخر میں موصوف سے دستخط کرا لیتے۔ راغب صاحب نے کل ۵۰۵ سوال کیے۔ جوش صاحب نے چند سوالوں کے جواب مصلحتاً نہیں دیے، باقی سب سوالوں کے جواب عنایت فرمائے۔ بیشتر جواب دو تین لفظوں میں ہیں۔ کہیں کہیں آٹھ دس لفظ بھی نظر آتے ہیں۔

راغب صاحب نے کتاب کو "مستند" بنانے کے لیے اصل مسودات کے عکس شائع کیے ہیں۔ حضرت لاغر مراد آبادی کا کہنا ہے کہ یہی بات کتاب کو غیر مستند بناتی ہے کیونکہ سوال و جواب دونوں راغب صاحب کے قلم سے ہیں، نیز سوالوں اور جوابوں کے درمیان سادہ جگہ خاصی ہے، اس لیے اس کا امکان ہے کہ کاتب نے جوش صاحب کے دستخط حاصل کرنے کے بعد بھی اضافے کیے ہوں یا جوابات کو تبدیل کر دیا ہو۔ لاغر صاحب نے اس کے ثبوت میں یہ دلیل دی ہے کہ کتاب کے صفحہ ۱۰۷ پر یہ سوال ملتا ہے۔ "میر تقی میر نے سودا اور خواجہ میر درد کو پورا اور میر سوز کو آدھا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اپنے معاصرین میں آپ کن شعرا کو پورا کن شعرا کو آدھا شاعر مانتے ہیں؟" جوش صاحب کی طرف سے اس کا یہ جواب درج کیا گیا ہے "راغب مراد آبادی اور فراق گورکھ پوری"۔ گویا راغب پورے شاعر ہیں اور فراق آدھے۔ جوش صاحب لاکھ "راغب پسند" ہوں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ فراق کو ان کے مقابلے پر آدھا شاعر کہیں۔

لاغر صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی جب احمد مشتاق کو فراق سے بڑا شاعر قرار دے سکتے ہیں تو جوش کے لیے فراق کو راغب کے مقابلے پر آدھا شاعر قرار دینے

میں کیا قباحت ہوسکتی ہے؟

لائق صاحب نے ایک اور سوال اور اس کے جواب (ص ۲۲) کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ دونوں جوش کی وفات کے بعد کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے۔ "راغب صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" جوش کا جواب یہ ہے۔ "راغب صاحب کا زود گوئی میں کوئی جواب ہی نہیں اور یہ خوش گو بھی ہیں، جو ایک نادر بات ہے۔" راغب صاحب نے سوال کے آگے توسین میں یہ لکھا ہے۔ "یہ جناب زیبا ردولوی نے پوچھا۔" لائق صاحب فرماتے ہیں کہ جوش اور زیبا دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ ہم کس سے پوچھیں کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

لائق صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ بدگمانی اچھی چیز نہیں۔ جوش صاحب جب اپنے قلم سے راغب صاحب کو "سراپا ایک صاحبزادی" لکھ سکتے ہیں تو خوش گو کیوں نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب مذاق کی باتیں ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کتاب کے فلیپ نگار محمد علی صدیقی فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ایسا آئینہ ہے جو "مفکر جوش نے شاعر جوش کو دکھایا ہے۔" لیکن افسوس کہ ہمیں اس کتاب میں مفکر جوش نظر آیا نہ شاعر جوش۔ آئینہ ضرور نظر آیا، لیکن وہ راغب صاحب کے سامنے ہے۔ موصوف کے بیشتر سوال ایسے ہیں، جیسے وہ جوش جیسے عظیم شاعر سے نہیں، کسی فلم ایکٹر سے انٹرویو لے رہے ہوں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

سوال : آپ کو کون سے پھل پسند ہیں؟

جواب : آم، میٹھا لیموں اور گنا۔

س : سبزیاں؟

ج : صرف بھنڈی۔

س : دالیں؟

ج : ماش کی دھوئی دال۔

س : خشک میووں میں؟

ج : پستہ۔

س : پھولوں میں؟

ج : موگرا۔

س : عطر؟

ج : ہماری کوئی خاص پسند نہیں۔

س : مٹھائی؟

ج : برفی۔

س : آپ صبح اور شام نہاتے ہیں۔ ایک بار نہانے میں کتنا وقت صرف فرماتے ہیں؟

ج : میرے چالیس منٹ دونوں وقت میں صرف ہوجاتے ہیں۔

س : چائے دن میں کتنی بار پیتے ہیں؟

ج : صرف دو بار۔

محمد علی صدیقی سے گزارش ہے کہ ان سوال وجواب میں اگر مفکّر جوشؔ اور شاعر جوشؔ کا سراغ ملے تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ راغبؔ صاحب نے یہ کتاب جوشؔ صاحب کو بدنام کرنے کے لیے شائع کی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کتاب میں اس قسم کے سوال وجواب شامل نہ ہوتے۔

س : ہم جنس پرستی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : یہ بھی فطری جذبہ ہے۔ ہر فطری جذبے کے روکنے سے نفسیاتی بیماری پیدا ہو جاتی ہیں۔

افسوس کہ اس قسم کے بہت سے سوال اور ان کے جواب ہم نقل نہیں کر سکتے۔ شاید ایسے ہی سوالات سے بیزار ہو کر ایک جگہ جوشؔ صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے "آج کے تمام سوالات احمقانہ ہیں" (ص ۱۴۶) ممکن ہے بعض لوگوں کو اس کتاب کے تمام سوالات احمقانہ نظر آئیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض سوالات "مفکّرانہ" بھی ہیں۔ مثلاً:

س : آپ نے متعدد شہروں کی طوائفوں کو دیکھا ہوگا، ان کا گانا سنا ہوگا۔ کس شہر کی طوائفوں کو حسن وجمال اور تہذیب کے اعتبار سے بہتر پایا؟

ج : لکھنؤ۔

س : ایک خاندان میں کتنے بچّے ہونا چاہئیں؟

ج : ایک بھی نہ ہو، تو اچھا ہے۔ زندگی کے درندے کی خوراک ہم کیوں پیدا کریں۔

س : آپ نے انگریزی، اردو اور دیگر مشرقی السنہ کے کن نقادوں کی کتابوں کا مطالعہ ہے؟

ج : یاد نہیں۔

س : آپ نے اپنی محبوباؤں سے مراسلت بھی کی ہوگی؟

ج : مواصلت زیادہ اور مراسلت کم رہی۔

س : کیا آپ نے اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ تصویر کھنچوائی ہے؟

ج : ہاں ہاں کھنچوائی ہے۔

س : صنف نازک میں آپ نے اودھ، یوپی، جنوبی ہند، پنجاب، سندھ، کس صوبے یا قطعۂ ارض کی عورت کو سب سے بہتر پایا، باعتبارِ کشش حسن وجمال؟

ج : ہمارا تو سابقہ یوپی سے پڑا۔

جوشؔ ملیح آبادی بلاشبہ ہماری زبان کے ایک بڑے شاعر ہیں، مگر اس کتاب میں ان کی بڑائی، راغبؔ مرادآبادی کی فنکاری کے سامنے ماند پڑتی نظر آتی ہے۔

دلیپ سنگھ
59/4, Rajinder Nagar,
NEW DELHI-110060

نا گُم شدہ کی تلاش

اردو میں بھلے ہی پڑھنے والوں کی تعداد میں دن بدن کمی ہو رہی ہو لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو ادب میں ریسرچ خوب رہی ہے ۔ مجھے کل ہی ایک پروفیسر بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر اقبال نے شاید اتنے شعر نہیں لکھے جتنی ڈگریاں لوگوں نے ان پر ریسرچ کر کے لی ہیں۔ میں نے جب پوچھا کہ آپ نے لفظ "شاید" کیوں استعمال کیا تو کہنے لگے :

"ابھی تک میں اس موضوع پر ریسرچ کر رہا ہوں اور جب تک میری ریسرچ مکمل نہ ہو جائے میں کوئی فیصلہ کُن رائے نہیں دے سکتا۔"

انھوں نے مجھ سے گزارش کی کہ میری ریسرچ کو صیغۂ راز میں رکھیے گا کیوں کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی میرا موضوع ہی لے اُڑے اور میں دیکھتا رہ جاؤں۔

میرے خیال میں وہ خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ اگر کوئی ان کا موضوع لے بھی اڑا تو گھبرانے کی بات نہیں اردو میں ابھی ریسرچ کے سیکڑوں موضوع ریسرچرز کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مثلاً ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ اقبال کو رائتا پسند تھا یا کھیر۔ غالب کے معاشقوں کے سلسلے میں صرف ایک ڈومنی پر ریسرچ کی گئی ہے۔ باقی اور ڈومنیاں بھی تو ہوں گی جن کے ہاں اُن کے پھیرے ہوتے تھے اور جو ابھی تک زیر بحث یا زیر ریسرچ نہیں لائی گئیں۔

میرے خیال میں ریسرچ کے معاملے میں اردو ادب ایک ایسا کنواں ہے جس کا مستقبل قریب میں سوکھنے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خود ریسرچرز جب کسی موضوع پر ریسرچ کرتے ہیں تو اپنی تھیسس کے آخر میں اس بات کا انتظام کر جاتے ہیں کہ اُن کی اولاد بھی اسی موضوع پر کام کر کے ڈگریاں کماتی رہے۔ آپ نے ریسرچ کی کتابوں کا آخر میں یہ جملہ پڑھا ہو گا کہ " میری ریسرچ حرفِ آخر نہیں ہے۔ میں نے تو بس بحث کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ تو ایک طرح کی دعوت ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے کہ وہ اب اس پر مزید کام کریں۔" گویا انھوں نے غالب کے معاشقوں کی ایک ڈومنی دکھا دی ہے۔ باقی ڈومنیوں کو تلاش کرنا آنے والی نسلوں کا کام ہے۔

ہمارے ریسرچرز یوں بھی بڑے کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ جب بھی کوئی موضوع چنتے ہیں تو عام طور پر اس کے ذرا سے حصّے پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔ ہمارے عرب دوستوں کی طرح نہیں کہ زمین میں

تیل مل گیا تو دھڑا دھڑ نکال کر بیچنا شروع کر دیا اور اسی طرح جو رقم ہاتھ لگی اس سے دھڑا دھڑ شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ان شادیوں سے جو اولاد ہوگی وہ کیا بیچ کر کھائے گی۔ ہمارے ریسرچرز اس معاملہ بڑے سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اگر مزاح نگاروں پر تھیسس لکھنا چاہتے ہیں تو کبھی یہ موضوع نہیں چنیں گے۔ "اردو ادب کے مزاح نگار" بلکہ موضوع کا انتخاب یوں ہوگا " دلی میں جمنا پار کے اردو مزاح نگار" یعنی ایک بڑے دستر خوان سے کباب کا صرف ایک ٹکڑا اٹھا لیا اور بس! اس طرح ہزاروں لوگوں کا پیٹ بھر سکتا ہے۔ گویا ہندستان میں جتنے شہر ہیں وہاں کے مزاح نگاروں پر ایک ایک تھیسس لکھا جا سکتا ہے اور بالفرض کسی شہر میں کوئی مزاح نگار نہیں ہے تو تھیسس میں یہ بھی تو ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہندستان کا یہ واحد ایسا شہر ہے جو مزاح نگاری کے نقطۂ نظر سے ویران ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ریسرچ کی بہت سی کتابوں کا موضوع کسی ادیب کا فن اور شخصیت ہوتی ہے۔ ہم نے ریسرچ کر کے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں ہے؟ پتا چلا کہ ایسی ریسرچ کا موضوع عام طور پر ادیب کا فرزندِ ارجمند چنتا ہے۔ اُسے آسانی یہ رہتی ہے کہ اس نے اپنے والد کو کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دیکھا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ آسانی سے لکھ سکتا ہے کہ والد صاحب کو کھچڑی بہت پسند تھی۔ لکھتے وقت آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے۔ سوتے وقت سرہانے سے پرہیز کرتے تھے۔ والدہ سے بات کرتے وقت کبھی آواز اونچی نہیں کرتے تھے۔ وغیرہ۔

حال ہی میں، ہمیں اس نوعیت کی ایک تھیسس پڑھنے کو ملی۔ شاعر صاحب کے فرزندِ ارجمند نے ان تمام پہلوؤں پر خوب روشنی ڈالی تھی۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ والد صاحب کو کھچڑی کیوں پسند تھی۔ یا والدہ محترمہ سے باتیں کرتے وقت وہ آواز اونچی کیوں نہیں کرتے تھے۔ مجھے اُن کی ریسرچ میں تشنگی کا احساس ہوا۔ اس لیے خود ہی ریسرچ کے اس میدان میں کود پڑا۔ شاعر مذکور کے پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے بات چیت کرنے پر پتا چلا کہ شاعر صاحب کو کھچڑی اس لیے پسند تھی کہ کھچڑی کے علاوہ کچھ اور کھانے کا مقدور ہی نہ تھا۔ لہٰذا کھچڑی ان کی پسندیدہ خوراک بنتی گئی۔ اور والدہ کے سامنے آواز اونچی اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اس خاتون کے آگے کوئی آواز اونچی نہیں کرتا تھا۔ کون ایسی عورت کے منہ آئے جس کی زبان کے ذخیرے میں ایسے بے شمار لفظ ہیں جن پر نقطے نہیں ہوتے۔

ریسرچ عام طور پر مردہ ادیبوں پر کی جاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ مردہ ادیب ریسرچ کی تردید کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ ریسرچ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ "تم نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ کس نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں نے آزادی کی جنگ میں قومی نظمیں لکھی تھیں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ وہ تو میری اولاد نے مجاہدِ آزادی کی اولاد ہونے کے ناتے پنشن لینے کے لیے درخواست میں لکھ دیا تھا۔ اور درخواست کے ساتھ جو نظمیں منسلک کی تھیں وہ میرے بیٹے نے دس روپے فی نظم کے حساب سے ایک زندہ شاعر سے لکھوائی تھیں۔

جس ادیب پر ریسرچ کی جا رہی ہے اس کی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک باب آسانی سے لکھا جا سکتا ہے۔ ہمارے دیش میں جہاں لوگوں کی اتنی اولاد ہوتی ہے کہ اُن کی گنتی مشکل ہو جائے۔ ہر بچے کی تاریخ پیدائش یاد رکھنا کہاں ممکن ہے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہونے کی وجہ سے قیاس آرائی

میں دس بارہ صفحے تو آسانی سے نکل جاتے ہیں۔ میں نے خود ایک مرتبہ اپنی والدہ سے اپنی صحیح تاریخ پیدائش جاننے کی کوشش کی تھی۔ کہنے لگیں "تاریخ تو مجھے یاد نہیں، ہاں اتنا یاد ہے کہ اس دن بہت بارش ہوئی تھی اور گلیوں میں گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ دائی ہمارے گھر تمہارے پیدا ہونے کے بعد پہنچی تھی" پھر کہنے لگیں تمہاری موسی کو شاید معلوم ہو کہ وہ اُن دنوں میرے ہاں آئی ہوئی تھی۔ اگر تم چاہو تو موسی کو خط لکھ کر پوچھ لو"

میں نے کہا' رہنے دو ماں، کیوں کسی ریسرچر کے پیٹ پر لات مارتی ہو۔

میں نے اس سے پہلے لکھا ہے کہ زندہ ادیبوں پر ریسرچ کرنے سے ریسرچر عام طور پر گھبراتے ہیں۔ میں اس غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ بہت سے زندہ ادیبوں پر نہ صرف ریسرچ کی جارہی ہے بلکہ ہو چکی ہے۔ اور وہ ادیب اپنی بغل میں اپنا دیوان یا افسانوں کا مجموعہ لے کر پھرنے کی بجائے اپنے ریسرچر کا تھیسس لے کر پھرتے ہیں اور یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہماری زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی چھان بین کرتے ہوئے لوگ ڈاکٹر بن گئے اور ہمیں اپنے علاج کے لیے ڈاکٹر کی فیس تک میسر نہیں۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں ریسرچ کرنے والے طالب علموں کو ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے شاعر حضرات کہتے ضرور ہیں کہ ہماری زندگی کی مکمل تصویر ہمارے اشعار ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی تاریخ پیدائش کی طرح قابل اعتبار نہیں۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ:

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ہو سکتا ہے یہ شعر پڑھنے کے بعد کوئی ریسرچر ان تصاویر اور ان خطوط کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اس لیے میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی سامان اُن کے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اپنی بات کے ثبوت میں، میں دو باتیں کہنا چاہوں گا۔ ایک تو یہ کہ کوئی بھی ذمہ دار ہندستانی شوہر، شاعر یا غیر شاعر، ایسی چیزیں اپنے گھر میں رکھتا ہی نہیں کیوں کہ بیوی کے ہتھے چڑھ جائیں تو سب شاعری دائری کرکری ہو جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ غالب کے مرنے کے بعد اس کے گھر سے صرف اس کا جنازہ نکلا تھا۔ اور کچھ نہیں۔

شبیہ عباس جارچوی

H-28-A/8,
Malier Extension Colony,
KARACHI-37.
(Pakistan)

بستی سے ایک میل دور کھیتوں اور باغوں کے درمیان لگ بھگ سولہ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا کالج ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، سیکنڈری اسکول، ہوسٹل، لائبریری ایڈمن بلاک، کینٹین وغیرہ کا نظارہ ایک منفرد منظر تھا۔ حد نظر تک کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ، کیکر اور ببول تھے، کچھ آم کے درخت بھی تھے، کچھ سبزیوں کی کاشت ہوتی تھیں اور کچھ زمین خالی پڑی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور مرکزی شاہراہ سے یہ جگہ تقریباً ایک میل دور تھی۔ طلبہ میں شاہراہ سے پیدل تانگوں میں یا اپنی ذاتی سواری میں کالج اور دیگر تعلیمی اداروں میں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک کچّی لیکن خاصی کشادہ سڑک تھی جو مرکزی شاہراہ کو کالج سے ملاتی تھی۔ شدید گرمی اور دھوپ میں طلبہ وطالبات سڑک کی بجائے، درختوں کے سایے میں چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سے جایا کرتے تھے اور ایسا ہی بارش کے زمانے میں ہوتا۔

محمد کامل انسپکٹر آف اسکولز آج اس تعلیمی ادارے میں واقع سیکنڈری اسکول کا معائنہ کرکے اپنی موٹر سائکل پر جا رہے تھے یہ وہی کچی سڑک تھی جس پر آج سے تیس سال پہلے وہ بحیثیت طالبعلم کالج میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ وہ عجیب قسم کا جوش، ولولہ اور انبساط محسوس کر رہے تھے۔ محمد کامل کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج طالب علمی کے زمانے کی طرح اس سڑک پر سیٹیاں بجائیں اور کھجور کے درختوں سے کھجوریں گرا گرا کر کھائیں لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ ایسا کرنے سے معذور تھے۔

زمانے کی طویل مسافت طے کے باوجود آج جن طالبعلم ساتھیوں اور استادوں کے نام کامل صاحب کو یاد رہ گئے تھے وہ انھیں بہت یاد آرہے تھے۔ سارے چہرے نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ حمید موٹا جس نے ایک مرتبہ تانگوں کے اڈّے پر لڑکیوں کی موجودگی کے سبب کئی تانگے چھوڑ دیے تھے۔ کلاس ٹیچر ظفر صاحب نے اُسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا ظفر صاحب جب کلاس میں آئے تو حمید غیر حاضر تھا۔ پیریڈ ختم ہونے سے چند لمحے قبل جب حمید کلاس میں آیا تو ظفر صاحب نے حمید ہونے سے کالج لیٹ آنے کا سبب پوچھا تو اُس نے جواب دیا "آج گھر پر دیر ہو گئی"، تب ظفر صاحب نے تانگہ اسٹینڈ پر لڑکیوں

کے کھردرے ہونے کے سبب تانگے چھوڑ دینے کا واقعہ سنا کر حمید موٹے کی بھری کلاس میں بے عزتی کردی تھی علیم لمبا جو تمام اُستادوں کی نقل اتارنے کا ماہر تھا۔ رئیس جو ہر لڑکی کو بہن بنانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ شوکت جو کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا۔ نعیم مولوی مشہور تھا داڑھی تھی اور پنج وقتہ نمازی بھی محبوب اور عالیہ چپ چاپ ایک دوسرے کو چاہ رہے تھے لیکن بات کرنے سے کتراتے تھے۔ پھر بھی یار لوگوں نے ان کی آنکھوں سے لفظ چُن کر دیواروں پر منتقل کر دیے تھے اور ایسے ہی کئی چہرے اور متعدد نام جو وقت گزرنے کے بعد دھندلا کر ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ جانے آج یہ لوگ زندگی کی کن راہوں پر مصروف سفر ہوں گے۔ اور اگر ان میں سے اتفاقاً آج کوئی مل بھی جائے تو انھیں اتنی فرصت کہاں کہ آپس میں بیٹھ کر بیتے ہوئے لمحوں کو دو گھڑی یاد کریں۔ رسمی سا ہیلو ہیلو اور بس اور فریدہ اُس کی زندگی اُس کی محبت اس کا عشق۔ اور سب کی طرح جانے کہاں ہوگی۔ فریدہ کا نام ذہن میں آتے ہی کالج میں اُس کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ آنکھوں میں تصویر بن کر لہرانے لگا۔ کتنے اچھے تھے وہ دن۔ کالج بھر میں دونوں کا نام تھا۔ دونوں پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ ہزار مقابلوں کے باوجود کوئی تیسرا اُن کی جگہ نہ لے سکا اوّل اور دوم پوزیشن گویا اُن دونوں کے درمیان ہی گردش کرتی تھی۔ ساتھ مل کر پڑھنا۔ لان میں بیٹھ کر باتیں کرنا ایک دوجے سے لڑنا، روٹھنا، منانا اور جب اُن کی منگنی ہوگئی تو دوستوں کا چھیڑنا، سہیلیوں کے چھیڑنے پر اس کا شرمانا کیسے کیسے لمحے یاد آرہے تھے لیکن خوش ہونے ہوتے یہ اداسی چھا گئی کہ اگلے مناظر بڑی المیہ کیفیت لیے ہوئے تھے۔

دن کتنے اچھے گزر رہے تھے۔ شادی تعلیم ختم ہونے پر مشروط تھی۔ کالج کا ابھی ایک سال باقی تھا پچھلے دو سالوں میں انھوں نے جتنے خواب دیکھے تھے ہوائی قلعے بنائے تھے اُن کو پانے کا وقت قریب آرہا تھا کہ اچانک فریدہ کی بڑی آپا چار بچوں کو بلکتا چھوڑ کر رخصت ہو گئیں فریدہ کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ دس دن تک فریدہ کالج نہیں آئی۔ وہ گھر جا جا کر تسلّیاں دیتا رہا۔ لیکن پھر ایک دن اچانک وہ ہوگیا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے محل مسمار ہوتے نظر آئے فریدہ نے کہا کامل اب تم مت آیا کرو مجھے بھولنے کی کوشش کرو شاید وہ نہ ہوسکے جو تم نے سوچا کیوں فریدہ کیوں، بس کہا نا شاید میرے نصیب میں تم نہیں ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کیا ہوا۔ مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے۔ "نہیں تم بہت اچھے ہو تم سے کوئی گناہ نہیں ہوا مگر میرا نصیب شاید راستہ بدل رہا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا فریدہ مجھے پوری بات بتاؤ شاید میں کچھ کر سکوں نہیں کامل پوری بات مجھے بھی معلوم نہیں لیکن یہ جانتی ہوں کہ تم کچھ نہیں کرسکتے کچھ نہیں کر سکو گے۔ لیکن معلوم تو ہو کیا مجبوری ہے لیکن وہ بچے جو آپا کے بعد بن ماں کے رہ گئے ہیں اُن کا بھی تو کوئی قصور نہیں نا میرے خاندان والے اس خالی ہو جانے والے خانے کو تمھاری فریدہ کی ذات سے پُر کرنا چاہتے ہیں مجھ سے اگرچہ ابھی کسی نے کوئی بات نہیں کی ہے لیکن "لیکن کیا،، تم بتاؤ کامل اگر انھوں نے مجھ سے ایسا چاہا تو مجھے کیا کرنا چاہیے' بولو۔

اور کامل کو چپ سی لگ گئی ہو لو کامل کیا میں خود غرض بن جاؤں چار معصوم بچوں کو کسی انجانی سوتیلی ماں کے آسرے پر چھوڑ دوں۔ میں یا میرا خاندان میرے بہنوئی کو دوسری شادی سے روک سکتے ہیں ؟ بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ ماں کے بغیر پرورش ناممکن اور تم بتاؤ کامل اگر میرے خاندان نے یہی فیصلہ کیا تو کیا میں انکار کر سکتی ہوں ؟ کامل دیر تک خاموش رہا آخر فریدہ نے مخاطب کیا کامل بولو بولتے کیوں نہیں یہ سب غلط ہے تو مجھے راستہ دکھاؤ کوئی ایسا راستہ جو مجھے منزل تک لے جائے اور آنے والی تباہی سے میں بچ سکوں۔ تب کامل نے صرف اتنا کہا۔" تم عظیم ہو فریدہ تم سچ کہتی ہو۔ آج کے بعد . . . . پھر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ خدا حافظ کہے بغیر نمناک آنکھیں لیے اُٹھ آئے۔ انھوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ فریدہ کن اذیتوں کا شکار ہو رہی ہے کب اُس کی شادی ہوئی انھوں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا اور آج ایک زمانے کے بعد وہ پھر اپنے آبائی شہر کی طرف لوٹ رہے تھے وہ اپنی پرانی یادوں میں گم نہ جانے کہاں نکل جاتے کہ اچانک سامنے کالج کے بورڈ سے ٹکرا گئے۔ سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے بورڈ پر نظر پڑی یہیں تو آنا تھا انھیں آج اِس اسکول کا انسپکشن کرنا تھا۔ انھوں نے خود کو الرٹ کیا۔ اور اسکول میں داخل ہو گئے سامنے ہی کمرے پر پرنسپل کے نام کی تختی لگی دیکھ کر سیدھے وہیں چلے گئے۔ پرنسپل کی کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ عجیب سادگی کا نمونہ تھا۔ کمرہ کی ہر شے صاف ستھری اور روشن لیکن ہر شے میں کسی نہ کسی حوالے سے آسمانی رنگ موجود۔ انھیں ایک بار پھر فریدہ یاد آئی کتنا پسند تھا اُسے یہ رنگ وہ قلم تک اِسی رنگ کا خریدتی تھی۔ نوٹس فائل اسی رنگ کی تلاش کرتی اور یہی کوشش کرتی کہ کاپیوں کے کور آسمانی رنگ کاغذ کے چڑھائے آہ فریدہ جانے کہاں ہوں گی تم ! اچھا خدا تمھیں خوش رکھے۔

انھوں نے قدموں کی آہٹ محسوس کی اور جب نگاہ اٹھائی تو وہ رسمی علیک سلیک بھی بھول گئے۔ پرنسپل جہاں تھیں وہیں ٹھٹک گئیں۔ کامل کو تو آنکھیں جھپکانا بھی یاد نہ رہا۔ جانے کتنے جگ بیت گئے کتنی صدیاں گزر گئیں۔ پھر یکایک لب کھلے۔ کامل تم فریدہ تم دونوں کے چہروں پر عجیب تاثرات تھے، فریدہ نے خود کو نارمل کیا اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے گھنٹی بجائی چپراسی آیا تو اس سے پانی منگایا اور ٹیچر کا مسئلہ طے کرنے لگیں اس کے جانے کے بعد بہت رکھ رکھاؤ سے پوچھا" جی کامل صاحب کیسے زحمت کی ؟ آپ ٹھنڈا لیجیے گا یا گرم" نہیں کچھ نہیں میں دراصل اِس اسکول کا انسپکشن کرنے آیا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ . . . . یہاں تم . . . . "

" کوئی بات نہیں کامل تم نے میری مجبوریوں کے ساتھ نباہ کیا ہے تم بہت عظیم ہو فریدہ تم خوش ہو نا" خوش ؟ جب آدمی قربان ہوتا ہے تو خوشی اور رضا بھول جاتا ہے کیا خیال ہے۔ فریدہ نے زخمی مسکان کے ساتھ کہا" ہاں ،، کامل نے لمبی سانس بھرتے ہوئے

کہا" تم کہو تم خوش ہو نا کا مل "؛ فریدہ ابھی ابھی تم نے جو جملہ ادا کیا وہ صرف تمہارے لیے ہے؟" اوہ نہیں کامل " اپنے گھر کی بچوں کی سناؤ خوش ہو نا! بچے کتنے ہیں؟ اُس نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔ میرے وہی چار بچے ہیں جن کی ماں مجھے دنیا نے بنا دیا اور بس۔ ...... لیکن یہ لیکن کیا؟ بچوں سے ان کا باپ چھین لیا گیا وہ کیسے ہوا یہ سب" بس نکاح کے دوسرے دن جب ابھی میں نے آپا کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھا تھا میرے بہنوئی جو نکاح نامے کی رو سے اب میرے شوہر تھے ایک حادثے میں پھر ..... پھر تم نے شادی نہیں کی؟ میرا کیا ہے میں نے سمجھ لیا میری قسمت میں مکمل گھر نہیں ہے۔ جب کبھی کوئی تمنا کی تھی کب پوری ہوئی کہ اب خواہش کرتے۔ خیر چھوڑو جو بیت گئی سو بیت گئی تم سناؤ کہاں ہو، گھر بیوی بچے کیسے ہیں، خوش ہو؛ کامل جانے کہاں کھو گیا تھا" اوں ۔ کیا؟ میں تمہارے گھر کے بارے میں بیوی بچوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں کہاں ہیں کیسے ہیں؟ میں نے تو شادی ہی نہیں کی۔ میں ہوں اور میرا ماضی بس۔ کیوں،، کسی بھی خاتون سے شادی کر سکتا تھا مگر اُس کے ساتھ بے انصافی کرنا میرے بس میں نہیں تھا میں تو خود اپنا ہی نہیں تھا اُسے کیا دیتا۔ میرے پاس اُسے دینے کے لیے کوئی خوشی نہیں تھی؟" کامل یہ تم نے کیا کیا زندگی برباد کر دی،، نہیں فریدہ کہاں برباد ہوئی ہے۔ کسی کام میں اگر دیر ہو جائے۔ راہ میں رکاوٹیں آجائیں تو کیا زندگی برباد ہو جاتی ہے؟ کیا میں اب بھی تمہارے لیے وہی کامل نہیں ہوں؟ اگر میں تمھیں کالج کی اسٹوڈنٹ فریدہ سمجھنے لگوں تو کیا غلط ہو گا؟ بولو... بولو نا فریدہ،، اور فریدہ نے سنجیدگی سے سر جھکا لیا۔" فریدہ پہلے مجھے اسکول کا انسپکشن کراؤ اور پھر ہمیں اپنے گھر جانا ہے چلو گی نا میرے ساتھ، فریدہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شرما کر منہ پھیر لیا۔ کامل کو ایسا لگا۔ جیسے وہی کالج کا زمانہ ہو کالج کا لان ہو اور فریدہ کامل کے کسی شریر جملے پر شرما گئی ہو۔ ❖

آڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

محترم احمد ندیم قاسمی صاحب، السلام علیک!

ہمارے بزرگ نسل کے دو موجود نمایندوں میں سے ایک آپ ہیں۔ ہم جس طرح علی سردار جعفری صاحب سے واقف ہیں، اُسی طرح آپ سے ــــ اور یہ بات ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔

"کتاب نما" (فروری ۸۹ء) میں آپ کا انٹرویو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نئی غزل سے متعلق آپ کی رائے جان کر خوشی ہوئی۔ یہ آپ کی فراخ دلی کا ثبوت ہے۔ نئی غزل سے متعلق آپ نے اپنے جواب میں فرمایا ہے:

> " ہمارے ہاں، پاکستان میں، پاکستان کا خصوصیت سے ذکر کر رہا ہوں۔ اگرچہ ہندستان میں بھی غزل لکھی جا رہی ہے۔ لیکن پاکستان میں جو غزل لکھی جا رہی ہے، اور خاص طور پر یہ نوجوان شعرا جو آ رہے ہیں، غزل گو شعرا، تو میں نے محسوس کیا ہے کہ نہ صرف ان کی ڈکشن diction مختلف ہے، ان کی تشبیہات اور ان کے استعارے مختلف ہیں ہم لوگوں سے، اور پرانی کلاسیکی غزل سے، بلکہ وہ سوچتے بھی کسی دوسرے زاویے سے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کسی ایسے زاویے سے جو اس عہد سے مطابقت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس غزل میں بڑی تازگی ہے اور میں غزل کے مستقبل سے پاکستان میں پُرامید ہوں۔"

نئی غزل اور نوجوان شاعروں سے متعلق آپ کی یہ مثبت سوچ قابلِ قدر ہے۔ جس طرح آپ نے ان کا اعتراف کیا ہے وہ ہمارے یہاں کے ان بزرگوں کے لیے قابلِ غور و تقلید ہے جو ابھی تک اپنے خود مسلّط عہدِ تاریک میں سانس لے رہے ہیں اور جنھیں اب تک یہ اطلاع نہیں کہ سورج کب کا طلوع ہو چکا۔

مگر محترم، آپ کی یہ فراخ دلی اور خورد نوازی اس وقت مشکوک ہو جاتی ہے، جب آپ اپنی قیمتی رائے کو پاکستان کی حد تک محدود کر لیتے ہیں ...... گویا، ہندستان کی نئی غزل آپ کی نظر میں قابلِ اعتنا نہیں، یا اس مقامِ اعتبار تک نہیں پہنچ سکی ہے کہ جہاں آپ کی نظر ہے، حالاں کہ ہمیں آپ جیسے ذمّہ دار شخص سے یہ توقع تھی کہ ایک ہی زبان کے ادب میں مقام اور فاصلے کی تخصیص و تفریق روا نہیں رکھیں گے اور ملکوں اور سرحدوں سے بلند ہو کر گفتگو کریں گے۔ مگر جب آپ نے یہ تفریق قائم ہی کر دی ہے تو کچھ ہماری معروضات پر بھی غور

فرمائیں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ادبی رسائل اس تعداد میں شائع نہیں ہوتے۔ جس تعداد میں آپ کے یہاں ہوتے ہیں۔ یہاں جو رسائل شائع ہوتے ہیں، وہ بھی اتنی کم تعداد میں کہ مشکل ہی سے آپ جیسے صاحب نظر لوگوں تک باریابی حاصل کر پاتے ہیں۔ اور ہمارے یہاں کے بیشتر GENUINE شاعروں کی نمایندگی مناسب انداز میں خود اپنے یہاں نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ۔ آپ جیسے لوگوں کا ان کے وجود سے لاعلم رہنا کوئی حیران کن واقعہ نہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک ملک کی جیتی جاگتی ایک پوری نسل کو یوں نظرانداز کر دیا جاتا، جن کی بدولت نئی غزل وقار و اعتبار کی نئی جہتوں سے آشنا ہو رہی ہے اور نئے افق و آفاق میں داخل ہو رہی ہے۔

ممکن ہے پاکستان میں ہندستان سے بہتر غزل لکھی جا رہی ہو اور وہاں کے شاعروں کا ڈکشن بھی مختلف ہو، لیکن وہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات بھی تو مختلف ہیں۔ اور پھر، فیض احمد فیض ...... خدا رکھے پاکستانی شاعری (غزل) کے سر پر ابھی تک فیض صاحب کا سایہ موجود ہے۔ وہاں کے نوجوان شعرا آج بھی اپنے ڈکشن پر فیض کے اسلوب کی سان رکھنا کسرِ شان نہیں سمجھتے۔ نہ ہی وہ فیض کے طلسماتی حصار سے باہر قدم رکھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ فیض ریکھا سے باہر ان کا سامنا راون سے ہوگا۔

ظاہر ہے، فیض کی زندگی جیے بغیر، فیض کے تجربوں کی آنچ سے گزرے بغیر، محض فیض کے ڈکشن کو اوڑھ لینا ہی تو کافی نہیں۔ اس سے وہاں کی غزل کا ڈکشن بظاہر مختلف اور پُرکشش اور خوش رنگ تو نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ڈکشن مصنوعی اور فیشن زدہ بھی لگتا ہے۔ اس میں نمایشی رنگ غالب ہوتا ہے اور زندگی کا اپنا کھُردرا سچ کہیں نظر نہیں آتا۔ شخصی تجربے کی آنچ سرد ہوتی ہے۔

ہمارا معاملہ یقیناً پاکستان سے مختلف ہے کہ ہم لوگ غزل لکھ ہی نہیں رہے ہیں، غزل جی بھی رہے ہیں اور ہم، اپنی غزل جی رہے ہیں اور اپنی زندگی لکھ رہے ہیں ...... اور ہماری زندگی تو یقیناً آپ کے سامنے ہوگی قاسمی صاحب!

عبداللہ کمال۔ بمبئی

● مہمان مدیر کا سلسلہ نہایت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ حالیہ شمارے میں جناب وارث علوی کا "مختصر ترین" اشاریہ موجودہ ادبی منظرنامے کا "طویل ترین" محاسبہ ثابت ہوا۔ موصوف نے تعمق فکر، بلند نگہی اور باریک بینی کا واضح ثبوت دیا ہے۔ ادب و قاری کے رشتے کے حوالے سے انھوں نے جس المیے کو پیش کیا ہے، چاہیے کہ ادیب اور نقاد اسے سنجیدگی سے لیں اور اب بھی وقت ہے کہ بت گری و بت پرستی کے رجحان سے دامن کش ہو کر صحت مند تخلیقی رویہ اپنائیں۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب اردو کی نوحہ خوانی کے لیے کوئی اردو زبان کا نوحہ گر بھی نہ ملے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے بلند و بانگ دعوا کرنے والے نام نہاد ہمدردانِ اردو کے لیے۔

شمارے کے دیگر مشمولات بھی کافی اہم اور گراں قدر ہیں۔ خامہ بگوش کے ساتھ ساتھ وجاہت علی سندیلوی اور دلیپ سنگھ نے طنز و مزاح کے رنگ کو مزید گہرا کر کے شمارے کو

کافی پُر لطف بنا دیا ہے ۔ " ہدایت نامہ مصنفین " اشاریہ کی توسیع محسوس ہوتا ہے ۔ یہ تال میل نہایت پُر اثر ہے ۔ پروف ریڈنگ پر مزید توجہ دیں ۔

عین سرور دربھنگہ

● محترم وارث علوی کا اشاریہ پڑھنے کے بعد مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا ۔ " کتاب نما " کے قارئین بھی اس سے محظوظ ہو سکتے ہیں ۔

مکتبہ جامعہ بمبئی کے عقب میں باب اللہ ٹینک نامی ایک میدان آج بھی موجود ہے ، میں نے اس وسیع و عریض میدان میں چند کو لٹھ بازی سکھاتے ہوئے دیکھ کر ایک روز اپنے والد سے پوچھا تھا ۔ " آپ لاٹھی چلانا جانتے ہیں ؟ " والد صاحب نے فرمایا ۔ جانتا ہوں ، لیکن ان کی طرح نہیں " کیا غلط سکھا رہے ہیں ؟ میرے دوسرے سوال پر ابا حضور نے مسکراتے ہوئے کہا تھا " نہیں ۔ لیکن یہ استاد چھوٹی جگہ پر لٹھ بازی نہیں کر سکتے ۔ کیوں کہ ہم نے کبھی انھیں چھوٹا کاوا کاٹتے یا پنجوں کے بل پینترا بدلتے نہیں دیکھا ۔

چوں کہ بات لٹھ بازی کی تکنیک کی چھڑ گئی تھی لہذا میں منہ پھاڑے ان کو دیکھتا رہا ۔ مجھے حیرت زدہ پاکر والد ماجد فرمانے لگے " یہ استاد دس فٹ کی لاٹھی چلانی جانتا ہے ۔ اور صرف بڑے میدان میں اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتا ہے ۔ کسی چھوٹی جگہ یہ گھر جائے تو یہ لاٹھی خود اس کی مصیبت کا سبب بن جائے گی ۔

اب ذرا ـــــ وارث صاحب کا یہ بیان بھی پڑھتے چلیے ۔

" نقاد کی مصیبت یہی ہے کہ فن کاری سے واقف ہوتا ہے ۔ وہ آرٹ اور نان آرٹ کے فرق کو جانتا ہے

" وہ شاعر اور ناشاعر میں تمیز کر سکتا ہے " ۔

سچ تو یہ ہے بے چارہ نقاد یہیں گڑبڑا جاتا ہے ۔ چوں کہ شاعری کا میدان وسیع ترین ہے لہذا ناقد تنقید کی دس فٹ لمبی لاٹھی چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ لیکن افسانوی قطعہ زمین کا کل رقبہ اتنی نوّے اسکوائر فٹ ہے اب مجبور نقاد کرے تو کیا کرے ؟ زمین کا حدود اربعہ بڑھانا اس کے اختیار میں نہیں ۔ چھوٹے کاوے کاٹنے کے فن سے اسے واقفیت نہیں ۔ مختصر پینترے بدلنے کا ہنر ایک آدھ ناقد جانتا ہے تو بھی اس کے مظاہرے میں وہ سبکی محسوس کرتا ہے لہذا کبھی تو وہ جھنجلاتا ہے اور کبھی چیخ پڑتا ہے ۔ قاری کدھر ہے افسانہ نگار کدھر ؟ اسے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ وہ تو بس لاٹھی گھماتا ہے ۔

مگر صاحب !

سچائی یہ ہے کہ مجھے اس میں بھی لطف آیا ۔ شاید اس لیے کہ میں ہی تو وہ زمین کا ٹکڑا ہوں جس پر کھڑے ہو کر استاد لٹھ گھما رہے ہیں ۔

علی امام نقوی بمبئی

● آپ نے تو خیر اپنے مدیرانہ اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے میرے خط کی تلخیص فرما دی لیکن کاتب صاحب نے جا بجا الفاظ اور جملے تبدیل یا حذف کر کے اصل خط کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے جس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے ۔

مثلاً خط کی چھٹویں سطر میں "گہرائی وگیرائی ہے" کی بجائے "ہے" لکھا گیا ہے۔ اور نویں سطر کے اچھے خاصے معنیٰ خیز جملے کے سر پر کاٹ کراسے مہمل بنا دیا گیا ہے۔ اگر کچھ مفہوم نکلتا بھی ہے تو اس کی قطعی ضد جو میں نے کہنا چاہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ .... وارث علوی کی تحریروں میں عالمانہ بوجھل پن اور خطیبانہ بلند آہنگی کی بجائے ہلکا پھلکا۔ سلیس، شستہ اور دلکش اور بے تکلف انداز ہوتا ہے ..... جبکہ مطبوعہ خط سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں عالمانہ بوجھل پن اور خطیبانہ بلند آہنگی" موجود ہے۔ میں نے عالمانہ بوجھل پن اور خطیبانہ بلند آہنگی" کو تحریر کے عیب سے تعبیر کیا ہے اور یہاں اسے وصف بتایا جارہا ہے۔ براہ کرم تصحیح فرمادیں۔ محبوب راہی

بارسی ٹاکلی۔ ضلع اکولہ۔

ہر قلم سے درخواست

میں اردو ذریعہ تعلیم کے اداروں اور تنظیموں کے سربراہوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے مسائل اور اغراض و مقاصد مجھے روانہ کریں۔ حکومت کی جانب سے ہونے والی ناانصافیوں کی نشاندہی زیر طبع کتاب میں کرسکوں اس کتاب میں، میں نے "اردو ذریعہ تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کا ذمہ دار کون" کے عنوان پر چند صفحات مخصوص کیے ہیں
کتاب تقریباً مکمل ہو چکی ہے جلد از جلد پریس چلی جائے گی۔ اپنے مضامین فوراً بھجوائیے۔

ایاز احمد۔ پوسٹ ساگر۔ تعلقہ شاہ پور۔ ضلع گلبرگہ۔ پن کوڈ ۵۸۵۲۲۳

● کتاب نما (مارچ ۸۹ء) دستیاب ہوا۔ "کھلے خطوط" کے عنوان کے تحت شاداب صاحب کا انگریزی زدہ مراسلہ پڑھا اور کافی دیر تک محظوظ بھی ہوتا رہا۔ میرے خیال میں شاداب صاحب مبارک کے مستحق ہیں —— پہلی بات یہ کہ انھوں نے میرے مراسلہ کو کچھ بچکانہ، قرار دے کر اپنی بزرگی و برتری جتانے کی تھوڑی بہت سعی (لا حاصل) کی ہے —— دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مراسلہ میں جس جگہ ایلیٹ کے خیالات قلم بند کیے اگر وہ چاہتے تو وہاں اردو، ہندی کے کسی صاحب طرز ادیب یا مستند نقاد کے خیالات بھی چسپاں کر سکتے تھے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ موصوف اردو زبان و ادب کے دانشوروں کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے۔ آج کل ہمارے بیشتر ادبا و ناقدین اپنے مضامین / خاکوں میں انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے علما کے اقوال بڑے احترام و اہتمام سے نقل کرتے ہیں جیسے وہ مذہبی پیشوا کا قول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خود اردو والے اردو کو گھٹیا تصور کرنے لگے ہیں اور اپنی زبان کے عالموں کو پس پشت ڈال کر دوسری زبانوں کے علما و فضلا کی قدر و منزلت کرنے کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ دراصل یہی لوگ اردو زبان و ادب کو گھٹیا سمجھنے والے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی میرے مرشد اور میرے آئیڈیل نقاد ہیں۔ نامی انصاری صاحب ان کے خلاف جس قسم کی گفتگو کرتے آئے ہیں اس کے پیچھے صرف ایک ہی مفاد پوشیدہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہے ہوس

شہرت کی !! آپ کا کیا خیال ہے۔ م۔ خاور (سونگڑہ)

● فروری ۸۹ء کے شمارے میں وارث علوی کا اداریہ بہت پسند آیا۔ دو بار پڑھ چکا ہوں۔ ادارے کی جانب سے "مختصر ترین" والا نوٹ دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ اداریہ اتنا دلچسپ ہے کہ اس کی طوالت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ایسی طوالت ایسے موضوع کے لیے ضروری بھی ہے۔ "کتاب نما" کے ہر قاری کو اس اداریہ کی اپنے حلقۂ اثر میں تشہیر کرنی چاہیے اور ہر ادیب کو اسی اداریئے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے۔

"کتاب نما" میں کبھی مہمان مدیر اور کبھی مہمان اداریہ لکھا جاتا ہے۔ عجیب سا لگتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ مدعو اداریہ یا مہمان اداریہ نگار لکھا جائے۔ ذیلی عنوان اشاریہ غیر ضروری ہے۔ ویسے بھی اشاریہ اردو میں INDEX کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ اداریہ کے لیے۔

محافظ حیدر ۔ بمبئی

● مارچ ۸۹ء کا شمارہ دیکھا۔ ابھی صرف مضامین کا حصہ پڑھا ہے، بہت جاندار ہے۔ "گردشِ رنگ چمن" کا تجزیہ پسند آیا۔ ڈاکٹر عبد المغنی صاحب نے فنی تناظر میں قرۃ العین حیدر کے فکری سوتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، جو اُن کے وسیع مطالعے پر مبنی ہے۔ تحاکیم کا انداز بھی بہت خوب ہے۔

انور سدید نے ایک اچھے پہلو کا مطالعہ کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مختلف فنی سطحوں پر بھی خواتین کے عصری شعور کا جائزہ لیا جائے۔

پروفیسر محمد حسن صاحب نے جو شعر حافظ سے منسوب کیا ہے۔ وہ دراصل سام آمری کا ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں کتابت کی خامی ہو۔

پروفیسر قمر رئیس صاحب نے ابرار حسنی جیسے معروف استاد کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ مقالہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے اچھی مثال پیش کی ہے۔ ہمارے ہاں عموماً اساتذہ کو تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن ان کی تخلیقی انفرادیت کی تلاش نہیں کی جاتی ـــــ اس نوع کے مطالعے میں صرف "رذیف نے" کا کلام زیر نظر رکھنا، کہاں کا انصاف ہے۔ اس طرح کا تنقیدی فیصلہ تو جزوی بھی ہو سکتا ہے۔ پورے مقالے میں ایک ہی شعر ملا جو دوسری ردیف کا ہے۔ صفحہ ۳۶ کے دوسرے اور تیسرے شعر میں کتابت کی غلطی موجود ہے مگر حیرت ہے کہ اسی صفحے کے پانچویں شعر کے سقم پر پروفیسر موصوف کی نظر نہیں گئی۔

کتابت کی خامیوں پر دھیان دیجیے۔ "کتاب نما" جیسے معیاری رسالے میں اس طرح کا قبیح کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

رئیس انور (دربھنگہ)

● "کتاب نما" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ ممبئی میں مکتبہ یا دوسری دکانوں پر بھی مل جاتا ہے یہ اتنا مکمل رسالہ ہے کہ اس میں مزید رائے کی ضرورت نہیں ہے تاہم اپنی ایک ناقص رائے آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں کہ آپ ہر شمارہ میں افسانوں کی تعداد کم از کم تین رکھیں اور وہ تینوں افسانے

مختلف دور، مختلف اسلوب و مزاج اور مختلف تیکنک اور مختلف موضوع کو پیش کریں۔

شہر بھیونڈی سے احباب ایک ادبی رسالہ "تکمیل" نکال رہے ہیں جو کہ سہ ماہی ہوتا ہے۔ اب تک چار شمارے آ چکے ہیں۔ آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ آئندہ شمارہ ـــــ "شاذ تمکنت" ہوگا۔ جس کی ادارت جناب یوسف ناظم کر رہے ہیں کوشش کروں گا کہ حالیہ شمارہ اور آئندہ بھی یہ رسالہ آپ تک پہنچتا رہے۔

مقصود اظہر

● مہمان مدیر حضرت وارث علوی کا اشاریہ پڑھنے کے بعد مجھے اپنی ایک نظم 'نقاد' یاد آ گئی جو ۱۹۵۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں جن حالات کا تذکرہ ہے، وہ حالات آج بھی موجود ہیں، بلکہ ان میں اور بھی شدت آ گئی ہے۔ نظم کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو 'کتاب نما' کے کسی شمارے میں شائع فرمائیں۔

'نقاد'

رضا نقوی واہی، پٹنہ

ان سے ملیے آپ ہیں جوہر شناسِ نقدِ فن — کانپتی ہے دبدبے سے آپ کے روحِ سخن
جب کہ قسمت بٹ رہی تھی عالمِ ارواح میں — آپ کو رکھا گیا تھا زمرۂ جرّاح میں
آ کے دنیا میں مگر تھوڑی سی تبدیلی ہوئی — آپ کی گردن کی رسّی اک ذرا ڈھیلی ہوئی
آپ کو تعلیم کا ماحول دنیا میں ملا — ذہن کا سانچہ مگر جیسا تھا ویسا ہی رہا
نوجوانی میں ہوا کچھ شعر کہنے کا خیال — طبعِ ناموزوں نے لیکن کر دیا دل کو نڈھال
پھر خیال آیا کہ افسانہ نگاری کیجیے — صاحبانِ علم پر یوں رعب طاری کیجیے
آپ نے یکجا کیا کچھ منتشر افکار کو — اک کہانی لکھ کے بھیجی "ہفتہ وار" اخبار کو
گو اڈیٹر سے بہت تھا دوستانہ آپ کا — نذرِ آتش کر دیا اس نے فسانہ آپ کا
ہو گئے یوں بند جب شہرت کے دروازے تمام — جاگ اٹھا پھر تو کروٹ لے کے جوشِ انتقام
مشتعل جذبات سے دل میں شرر پیدا ہوا — بوم کے سینے میں شاہیں کا جگر پیدا ہوا
لکھتے لکھتے نکتہ چینی کا طریقہ آ گیا — پنجۂ شل کو جھپٹنے کا سلیقہ آ گیا
آپ کو اہلِ قلم سے اک کدورت ہو گئی — نظم ہو یا نثر دونوں ہی سے نفرت ہو گئی
آپ کا قبضہ ہوا تنقید کے میدان پر — اک مصیبت آ گئی شعر و ادب کی جان پر
خامۂ خونخوار نے اک حشر برپا کر دیا — جو بھی زد میں آ گیا اس کا صفایا کر دیا
جس سے بگڑے اس کی مٹی آپ نے کر دی پلید — ہو گئے خوش جس سے دے دی اس کو شہرت کی کلید
آپ نے زاغِ سخن کو بلبلِ گلشن کہا — آپ نے تک بند شاعر کو امامِ فن کہا
ایک ہلڑ کر دیا برپا مذاقِ خام نے — شیخ کی پگڑی اچھالی مغبچوں کے سامنے
مشغلہ دن رات ہے اُن پہ نشتر اِن پہ طنز — میرزا غالب کے منہ آئے کیا مومن پہ طنز
آئے جب علمِ بیاں کی معنوی تفصیل میں — صنعتِ ایہام کی دُم باندھ دی تعلیل میں
استعارے کو ڈھکیلے سے کنایہ لکھ گئے — جوش میں تنقید کے، ظلمت کو سایہ لکھ گئے

الغرض جو، جی میں آیا لکھ کے شائع کر دیا
وقت اپنے ساتھ اوروں کا بھی ضائع کر دیا

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

جائزے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

زندگی کی طرف (ڈرامے)

ڈراما نگار: شمیم حنفی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵
قیمت: ۳۶ روپے
مبصر: انور صدیقی

شمیم حنفی کی تخلیقیت کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ شاعر ہیں، ناقد ہیں اور ڈراما نگار ہیں۔ ان کی تخلیقیت کی ہر جہت ایک انفرادیت رکھتی ہے اور اس کا ایک انوکھا ذائقہ ہے۔

"زندگی کی طرف" ان کے ریڈیو ڈراموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "مٹی کا بلاوا" اور "مجھے گھر یاد آتا ہے" شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان میں بعض ڈرامے کھیلے بھی جا چکے ہیں اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ وہ اگرچہ زیادہ تر ریڈیو ڈرامے لکھتے ہیں مگر ان کا تخیل بصری ہے۔ اس وجہ سے ان کے ڈرامے اسٹیج کے لیے بھی مناسب ہوتے ہیں اور کامیابی سے اسٹیج بھی کیے گئے ہیں۔

ان کے ڈراموں میں غیر معمولی واقعات نہیں ہوتے، وہ عام زندگی کے تجربوں میں ڈرامائیت تلاش کر لیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عام زندگی ڈرامائی صورت حال سے بھرپور ہے۔ اسی لیے ان کے ڈراموں میں میلو ڈرامائی کیفیت نہیں ملتی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "میں نے غیر معمولی واقعات، تجربات کے بارے میں صرف پڑھا ہے لیکن زندگی کو میں نے دیکھا ہے اس کے عام رنگوں اور عام معاملات کے واسطے سے۔ یہی واسطہ میرے لیے زندگی کی شناخت اور تفہیم، دنیا سے نفرت اور محبت، زندگی کی طرف سے مایوسی اور امید کی سطحیں فراہم کرتا ہے۔"

ان کا یہ رویہ ان کے ڈراموں میں ایک نوع کی حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے، مگر یہ حقیقت پسندی ترقی پسندی کی رائج کردہ دستاویزی قسم کی حقیقت پسندی سے مختلف ہے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ "زندگی کے بھید بہت گہرے ہیں، ناقابل فہم اور منطق سے ماورا۔" یہی

وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے سطح پر حقیقت پسندانہ ہیں، واقعات میں منطقی ترتیب بھی ہے، پھر بھی یہ اپنے باطن میں زندگی کے گہرے معنی رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے ڈرامے حقیقت پسندانہ سطح رکھتے ہوئے بھی SURREALISTIC باطن رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان کا ڈراما "ہم سفر" دراصل وجودی ڈراما ہے۔ ڈرامے میں رشید صاحب کا کردار ESSENLE پر EXISTENCE کو ترجیح دینے کی وجہ سے ایک وجودی صورت حال میں مبتلا ہے۔

کتاب کا پہلا ڈراما "اکیلا" انتہائی موثر طور پر ایک ایسے کردار کو پیش کرتا ہے جو شک کا شکار ہے۔ یہ کردار ڈرامے کے آخری مکالمے میں اپنی شخصیت کی المیاتی جہت کو محسوس کر لیتا ہے اور کہتا ہے "... میں نے دو زنجیروں میں عمر بھر خود کو اسیر رکھا۔ پہلی زنجیر شک اور بے اعتباری کی کڑیوں سے میں نے آپ اپنے لیے بنائی تھی۔ دوسری زنجیر درد اور نارسائی کے احساس کی پہلی زنجیر کا عطیہ ہے۔ یونہی زنجیروں میں عمریں گزر جاتی ہیں اختر!"

"زندگی کی طرف" کتاب کا مرکزی اور کلیدی ڈراما ہے جس میں ایک خواب پرست نوجوان خورشید کی کہانی ہے۔ خورشید کو جدید انسان کی طرح ہر وقت ویرانی کا آسیب گھیرے رہتا ہے۔ وہ ڈرامے کی ابتداء میں زندگی کی طرف اپنے رویے کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

> "چیزیں جیسی دکھائی دیتی ہیں ویسی ہوتیں تبھی تو دنیا کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ تم سب کیا جانو کہ شہر کتنے ویراں ہیں۔ چہرے کتنے ویران ہیں، آنکھیں کتنی ویران ہیں؟ کھنڈر نہ ہوں تو اس شہر میں جینا دشوار ہو جائے۔"

خورشید کا کردار ابتداء میں خاصا ALIENATED کردار ہے۔ وہ مفلوج اور بے عمل کردار ہے جسے سونے سوچنے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ کاروبار میں اس کا جی نہیں لگتا۔ بعد میں خورشید میں اس وقت تبدیلی آتی ہے جب وہ شہر چھوڑ کر گاؤں چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ کاشتکاری میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ عمل کے ذریعہ خود کو زندگی سے منسلک کر لیتا ہے اور ویرانی کے آسیب سے نجات پا لیتا ہے۔

اگرچہ شمیم حنفی انسانی صورت حال کا المیاتی احساس رکھتے ہیں پھر بھی زندگی کی طرف ان کا رویہ اثباتی ہے۔ وہ حزن و ملال سے گھری ہوئی انسانی رشتوں کی کائنات میں بھی روشنی کی کرن دیکھ لیتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے ڈراموں کی لے حزنیہ ہے اور اکثر انتظار حسین کے افسانوں کی یاد دلاتا ہے۔

کتاب کے آخری دو ڈرامے "دیوار" اور "کھڑکی" ہندو ETHOS میں ہیں اسی لیے ان کی زبان بھی قدرے مختلف ہے۔ "دیوار" ایک LESBIAN عورت کی کہانی ہے اور "کھڑکی" ایک لطیف محبت کی داستان سناتی ہے۔ کھڑکی ریڈیو ڈراما نہیں ہے بلکہ ٹیلی ڈراما ہے۔

شمیم صاحب ایک ذہین فن کار ہیں اور ڈراما نگاری کے فن سے گہری آگہی رکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں وحدتِ عمل اور وحدتِ فکر نمایاں ہے اردو میں ڈراما نگاری کے قلیل سرمایے میں "زندگی کی طرف" ایک اہم اضافہ ہے اور اس کی طباعت ایک اہم واقعہ۔

داستاں در داستاں

شاعر: مست احسنی گنوری
مرتب و ناشر: نعیم الاسلام صہبا، گلِ طارق، ہمدرد نگر، علی گڑھ
قیمت: تیس روپے اشاعت: ۱۹۸۹ء
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵-۱۱
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ اتر پردیش کے مالی تعاون سے مولانا مست احسنی گنوری کی غزلوں کا انتخاب "داستاں در داستاں" چھپا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی اور شہپر رسول کی رائیں درج ہیں۔ اس کا مقدمہ اسلم حنیف نے لکھا ہے۔ ۲۰ صفحات لکھنے میں کافی محنت کی ہے۔ لیکن FACTUAL MISTAKES موجود ہیں۔

ص ۲۶۔ "جگر بریلوی اور کفیل الدین عالی ایک مدت تک بسلسلۂ ملازمت یہاں قیام پذیر رہے"۔

بابو شیام موہن لال جگر بریلوی، گنور میں نائب تحصیل دار رہے ہیں۔
کفیل الدین عالی نام کا کوئی شخص اس دور میں اہل کار نہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ مولوی رفیع احمد عالی بدایونی وکالت کرتے تھے۔

اسی ضمن میں ص ۲۶، ۲۷ دونوں صفحات (۳) PARAPHRASING کے اصول کی شکست نے پورے متن کو ارجوجہ یا ٹریم ناسٹیک بنا دیا ہے۔

ص ۲۶۔ "ابرو مست جب استادی کے مرتبوں تک پہنچے تو آپس میں ادبی اختلاف پیدا ہو گئے یہاں کا ادبی حلقہ تین گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔"

اس عبارت میں التباس ہے اور ابہام بھی۔ اصولِ تحقیق سے انحراف بھی؟
۱۔ استادی کے مرتبوں تک پہنچنے کا کیا مطلب؟ ۲۔ کون سا ادبی اختلاف؟ اور کب پہنچے؟
۳۔ ادبی حلقہ کسے کہتے ہیں؟ اس سے گروہ کیوں کر برآمد ہوتے ہیں۔

دشواری یہ ہے کہ آج نئے لکھنے والوں کو اُس دور کے استادی شاگردی کے قواعد و ضوابط کا علم ہی نہیں۔ اسکول کی طرح شاعری کا بھی اسکول اور اس کا دستورِ نظام تھا۔ استاد یوں ہی نہیں بن جاتا تھا۔ "پروانۂ فارغ الاصلاح" جاری ہوتا تھا۔ اور اس سے پہلے "منزل" کی تکمیل ناگزیر تھی۔ اس میں برسوں لگ جاتے تھے۔ "جانشینی" کا فیصلہ "کیفیت نامہ" کی رو سے تشفی بخش کارگذاری کی روشنی میں کیا جاتا تھا۔ تفصیل بیان کرنے کو ایک کتاب لکھنے کی فرصت چاہیے۔

مولانا مست نے زندگی میں سنّتِ تلمّذ پر عمل ہی نہیں کیا۔ "داستاں در داستاں" اور اس کے مقدمہ میں کسی شاگرد کا نام نہیں ــــ تین گروہ قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے گروہ میں آپ نے مولانا ابر کے ۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں جو گنور میں مقیم نہیں ــــ وہ علی گڑھ، دہلی، کراچی اور لاہور میں مقیم ہیں۔ دو سینیئر شاگرد شرف رحمانی اور انیس عثمانی

گنور میں مقیم ہیں۔ ان کے نام درج نہیں۔ پس مان نہیں سکتا۔ کوئی مصلحت ضرور ہے۔ کسی خدشہ سے ضرور استنباط کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے گروہ میں مولانا مست کے رشتہ داروں اور اولاد کے نام درج ہیں۔ اگر گروپ یوں بنایا ہے تو مولانا ابر کے دو بیٹے (طریقت اور نزہت) اور ایک داماد افسر گنوری بھی شاعر تھے۔ ان کا ذکر کیوں نہیں کیا ـــ یہی دیانت ہے؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ مولانا مست کو "یوسف بے کارواں" ثابت کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟۔

ایک اور داستان۔ "جاہلوں کا مشاعرہ" ہے۔ اس کی نہ جہ شان نزول اور محرکین کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ مگر مقدمہ کا فرمان ملاحظہ کیجیے۔

ص ۲۷۔ "اور ایک وقت ایسا آیا بھی کہ موزوں طبع جہلا نے اپنے مشاعرے کی الگ بنیاد رکھ دی۔ پنڈال میں ہر ذی علم کی آمد ممنوع قرار دے دی گئی۔

مشاعرہ ۹ سے شروع ہو کر صبح کاذب تک چلا... صبح کو معلوم یہ ہوا کہ اس کثیر جماعت کے بہت سے ارکان کے کلام پر مست مرحوم نے اصلاح فرمائی تھی۔

۱۔ مشاعرہ کب ہوا؟ ۲۔ موزوں طبع جاہلوں میں سے ایک نام بھی درج نہیں۔ تعداد بھی نا معلوم۔ ۳۔ صدارت، نظامت اور تاثرات نیز ردعمل سب غائب۔ ۴۔ اس نشاۃ ثانیہ نے گنور کی شعری تاریخ میں کون سے سنہری اوراق بڑھا ئے؟

یہ محض STUNT ہے۔ ایک شاعر نے مدنی لائبریری کیس میں اپنی بدنامی چھپانے کو اور دوسرے شاعر نے مولانا ابر سے ذاتی دشمنی کے تحت UN-SOCIAL ELEMENTS کا سہارا لیا تھا۔ ایک صدر بنا اور دوسرا ناظم۔ کلام بھی سنایا۔ اسی ڈائس پر دو نوجوان شاعر زبردستی پہنچے اور کلام سنایا۔

اس کا ردعمل یہ ہوا کہ صدر و ناظم (محرکین) کو گنور کے مشاعروں میں پھر شرکت کی کبھی اجازت نہیں ملی۔ ان کی شاعری بھی اسی مشاعرے کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے میں دفن ہو گئی۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ ۱۹۳۵ء سے احسنی برادرس کی وفات تک گنور میں شعرا کی مجموعی تعداد پچاس سے بھی زیادہ رہی ہے ان میں تلامذۂ مولانا ابر کے علاوہ مولوی محمد یعقوب ضیاء القادری بدایونی، منشی قدرت اللہ طالب اور حضرت صدیق مارہروی (تلمیذ علامہ احسن مارہروی) کے تلامذہ بھی شامل ہیں۔ یہ سب شعرا خوشی کے ساتھ مشاعروں میں مستقل طور پر شریک ہوتے تھے۔ فہرست میرے پاس محفوظ ہے جو صاحب بھی دیکھنا چاہیں یہاں آکر دیکھ سکتے ہیں۔ نقل کی اجازت نہیں۔ داشتہ آید بکار" مقدمے میں مولانا مست کے کلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ قارئین اس کا فیصلہ خود کر لیں گے۔

اب آپ فن شعر اور تنقید پر توجہ فرمائیے:

اردو شعریات میں کلاسیکیت کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ ہئیتی تقلید ۲۔ موضوعاتی تقلید۔
اس لیے وہ شاعر جو اپنے کلام میں دونوں عناصر یا کسی ایک عنصر کو بھی اپناتے ہیں "کلاسیکی شاعر" کہے جاتے ہیں۔ ہیئت کا معاملہ تو صاف ہے۔ سانچے بنے بنائے موجود ہیں۔ دشواری موضوعات میں پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً تنقید نگار کو نقد و نظر میں۔ یہاں تفصیل کی ضرورت ہے نہ اس کا موقع! لیکن زیر نظر انتخاب غزلیات (داستاں در داستاں) کا معروضی جائزہ پیش کرنے کو چند موضوعاتی خصوصیات کا اشارہ ضروری ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ پیروی روایت ۲۔ اخلاقی اقدار کا اتباع۔ ۳۔ اشیا کا خارجی نقش قرینہ

تاریخ اردو ادب سے معلوم ہوگا کہ ترقی پسند ادب سے پہلے ایک دور شعرائے متاخرین کا گزرا ہے۔ اس میں سیماب، فانی، فراق، یگانہ، جوش، حسرت، اصغر اور جگر ہیں۔ صفی، ثاقب، عزیز وغیرہ لکھنؤ کے نمائندے ہیں ان میں فراق اور جوش کو جداگانہ امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ فراق کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے اور جوش نے کلاسیکی شاعری سے قطعی انحراف کیا ہے۔ باقی شاعروں کی فہرس میں مولانا ابر احسنی گنوری اور مولانا مست احسنی گنوری کا نام آنا چاہیے۔

میرے نزدیک یہ سب نو کلاسکیت کے نقیب ہیں۔ تنقید نے اس انداز سے غور ہی نہیں کیا۔ غزل کی کلاسیکی فضا میں یاسیت، بے ثباتی اور توجہ گر کو ساتھ رکھنے کا مقدور تک جائز ہے۔ وطنیت کا محدود تصور ہے۔ سیاست کی روشنی نہیں۔ فرسودہ سماجی اقدار سے برگشتگی نہیں۔ لیکن مغربی تعلیم، کلچر اور تحریک آزادی خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس نے عوامی حقوق کی بازیافت کے سیاسی مطالبات کیے۔ ایثار، قربانی اور شہیدوں کے خون یکسر بدل گئے۔ اردو شاعری میں اہم رجحانات پیدا ہوئے۔ مثلاً وطنیت کا محدود تصور ایک سالم جغرافیائی رقبہ میں بدل گیا "قوم" کا مفہوم بدلا۔ یعنی "قوم" اصل میں وطن سے بنتی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی نظریے شعر میں داخل ہوئے اور نئی معنویت کے اظہار کو پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھری گئی۔ حافظے کی مدد سے چند شعر نذر قارئین ہیں۔

دل میں ڈھونڈا ہے تجھے طور کی جانب نہ بلا ۔۔۔ آئینہ دیکھ کے پتھر کی طرف کیا دیکھیں
(سیماب اکبرآبادی)

فانی دکن میں آ گئے یہ عقدہ کھلا کہ ہم ۔۔۔ ہندستاں میں رہتے ہیں ہندستاں سے دور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں ۔۔۔ بجلی چمک رہی ہے مرے آشیاں سے دور
(فانی بدایونی)

سر مستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں ۔۔۔ اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے
یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ۔۔۔ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
(اصغر گونڈوی)

مجھ کو سبزۂ بیگانہ جاننے والو
مرے لہو نے نکھارا ہے لالہ زاروں کو

زندگی اس کی ظلمت میں کیوں ہو بسر		آدمی آپ خود پیکرِ نور ہے
(مولانا ابراحسنی گنوری)

"داستاں در داستان" میں مولانا مست احسنی گنوری کو، کلاسیکی شاعر بتایا گیا ہے۔ مقدمے میں کلاسیکی خصوصیات کے پیش نظر ہی ان کے محاسن کلام کو اجاگر کیا ہے اور اسی سیاق و سباق میں ان کے اشعار بطورِ سند درج ہیں۔ میں اس داستان کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میں نے ابھی کہا کہ تنقید میں یہ نو کلاسکیت کا دور ہے۔ یہاں مولانا مست گنوری احسنی کے کلام پر اسی زاویۂ نگاہ سے گفتگو ہو گی۔ ان کے یہاں کلاسیکی شاعری کی خصوصیات اور عناصر ہیں۔ لیکن نئے رجحان کی چھپ بھی ہے۔ مثلاً شاعر کے یہاں انسان، تسخیر کائنات کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ مظاہر و آثار فطرت کا احترام بھی ہے۔ ان سے زندگی میں رونق ہے لیکن ان کے سامنے سربسجود نہیں۔ شاعر کے یہاں ماحول کے تناظر میں فطرت اس کی رفیق ہے۔ جذبات کے نکھار میں کہیں کہیں اخلاقی رزمیہ بھی نظر آتا ہے۔ ذہنی تربیت کے لیے عام طور پر فطرت رسد گاہ ہے اور تخیل و تجربہ کا ماخذ بھی! مذہبی موضوعات کے بیان میں شاعر کا لہجہ، وعظ و پند کی سرحد چھو لیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ موضوع اور شعریت دونوں کے لیے اچھا نہیں۔

"حسن و عشق ایسے موضوعات ہیں جن کا رشتہ ایک طرف نفسیات و جنسیات سے پیوستہ ہے اور دوسری طرف انسانی تجربات سے جڑا ہوا ہے۔ اس لیے ان موضوعات کو برتنا کارِ گہ شیشہ گری ہے۔ روایت، سماعت اور بصارت کے شاعر اعلا عشقیہ شاعری کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اصل میں وہ شاعری نہیں بلکہ شعری داستان گوئی یا بازگوئی کا ہنر دکھاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ پاکی داماں کی حکایت بڑھانے والے بھی اس شاعری کا روپ سروپ دکھانے میں عاجز رہتے ہیں لیکن ان کے پاس نقش سلیمانی ہوتا ہے اور موقف بدلنے کا شعار بھی۔ اس لیے ان کی شاعری "گل پیادہ" ہونے سے بچ جاتی ہے۔ وہ رومانیت میں داخل کر لی جاتی ہے۔ ایسا شاعر اپنے باطن کو فطرت سے ہم آہنگ کرکے ایک خوبصورت شعر ڈھال دیتا ہے۔ اس کی ایک اور CATEGORY بھی ہے یعنی شاعر سماجی اور عصری تجربوں کے تلخ نتائج کو جواز بنا کر، التفات حسن، سے ڈرنے لگتا ہے اور رموز عشق بیان کرنے میں محتاط رہتا ہے۔ دراصل اس کو رمز وایماں کا وصف سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اصل سبب باطن کا احتساب ہی ہوتا ہے۔ اس قبیل کے شاعر کو رومانیت کا ہوش مند شاعر کہا جائے گا۔ اس باب میں مولانا مست کا نام شامل ہے۔ انھوں نے باطن اور خارجی اشیا یا مادی وجود کے تضاد کو اسی رنگین پیرہن میں پیش کیا ہے۔

اب چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہاں تک درد کو معراج حاصل ہوتی جاتی ہے
کہ ہر شے رفتہ رفتہ دہر کی دل ہوتی جاتی ہے

مصرعۂ ثانی ارفع ہے لیکن مصرع اوّل میں ردیف، غائب ہے۔ "معراج حاصل ہے یا معراج حاصل ہوتی ہے" صحیح مفہوم یہی نکلتا ہے۔ مصرع سہم نہیں پہنچ سکا۔
سنا ہے کہ یہ انتخاب کلام "عروضی نظر" کی چیز ہے۔ لیکن کتاب میں نام رمزآفاقی کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے مخاطبت انھیں سے ہے

ملائکہ سے بھی اونچا رہا مقام بشر ۔۔۔ کہ اس کے زیر قدم کائنات ہوکے رہی
یہ فصلِ پاسِ گل، یہ گھٹاؤں کا احترام ۔۔۔ توبہ کو غرق بادہ کیے جارہا ہوں میں
کہیں یہ بھی نہ بدل جائے زمانے کی طرح ۔۔۔ التفاتِ نگہِ یار سے جی ڈرتا ہے
ان کے رخسار تک آ گئی چاندنی ۔۔۔ دھوپ پر آج تو چھا گئی چاندنی
مست ہر میکدہ جگمگانے لگا ۔۔۔ نور کے جام چھلکا گئی چاندنی

سرورق عمدہ ہے۔ شاعر کی فوٹو کاپی مایوس کن۔

سوچ سمندر

شاعر: جمال قریشی
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: قصرالادب پوسٹ بکس نمبر ۵۲۷۴ بمبئی ۸

"سوچ سمندر" گجرات کے کہنہ مشق اور مخلص شاعر جمال قریشی کا شعری مجموعہ ہے۔ جو شاعر کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ "سوچ سمندر" کی غزلوں پر ایک طرف کلاسیکی رنگ چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف نئی زندگی اور اس کے تقاضوں کا اثر ہے۔ "سوچ سمندر" میں شاعر کے رنگ انشاں جذبات اور مجروح تمناؤں کے علاوہ ان کے کرب وکیف اور اقدار و افکار کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ اس لیے یہ ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں کئی رنگ کے پھول سجے ہوئے ہیں۔ اور ہر رنگ اپنی جگہ دلکش نظر آتا ہے۔
وارث علوی نے شاعر کی کتاب پر اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ گجرات کے آمر سورتی نے حضرت ابراحسنی کی تقلید میں اپنی "وضع قدیم" نبھائی۔ لیکن جمال قریشی نے محمد علوی کی "طرزِ سخن" کو اپنا لیا۔ یہ اندازِ فکر صحیح نہیں ہے۔ ایک تو وارث علوی صاحب نے ابراحسنی کا کلام پڑھا نہیں ہے۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ جمال قریشی نے محمد علوی کے طرزِ سخن کو اپنا لیا ہے۔ محمد علوی کا طرزِ سخن اپنا ہو یا نہ ہو، لیکن ایک بات جمال قریشی کی شاعری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں زبان و بیان اور عروض وفن کی ان تمام اصولوں کو برتا ہے جن پر ابراحسنی کاربند تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جمال قریشی کے یہاں وہ کچا پن بھی نہیں ہے جو محمد علوی کے یہاں ہے ــــ جمال قریشی کی غزلوں میں ایک دلکش امتزاج ہے جس میں قدیم رنگِ سخن بھی ہے اور جدید شاعری کے اثرات بھی۔ لیکن ان کے یہاں کلاسیکی نظم وضبط زیادہ ہے۔ اس لیے ان کی غزل کا نگار خانہ پختہ اور مضبوط بنیاد پر قائم ہے چند اشعار سنیے۔

سورج ڈھلا تو دن کی انا ختم ہو گئی
پنگھٹ کی شام کچے مکانوں میں سو گئی

ہر ایک چیز ہے ارزاں لہو سے خنجر تک
یہاں جو ہے تو وفاؤں کی قحط سالی ہے

آ گئے سارے پرندے لوٹ کر کہنا اسے
ایک گھر سونا ہے اب تک شاخ پر کہنا اسے

ہوں میں تو تیرا مقدر، مجھے تلاش نہ کر
تو اپنے آپ سے باہر مجھے تلاش نہ کر

جب کوئی راہ اندھیروں سے بھری ہوتی ہے
ہر مسافر کے لیے دردِ سری ہوتی ہے

"سوچ سمندر" کی غزلیں دلکش ہیں۔

میری زندگی کے ۷۵ سال

مصنّف: اعجاز الحق قدوسی
قیمت: ۶۰ روپے
ناشر: مکتبہ اسلوب کراچی

مولانا اعجاز الحق قدوسی کی ذات گرامی میں تصوّف اور علم کا سنگم ہے۔ انھیں تصوّف کی روشنی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے ملی اور علم کا نور مظاہر العلوم سہارن پور سے۔ اس لیے انھوں نے علم، تصوّف اور ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن ایسے یگانۂ روزگار عالم کی کراچی میں جو حالت ہے، اس کو پڑھ کر اہلِ علم کو افسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے ۳۱ سال پہلے بھی بے زری کا شکار تھے اور آج بھی پندرہ ہزار صفحات اور پچاس لاکھ سے زیادہ الفاظ لکھ کر ۷۶، ۷۷ سال کی عمر میں اسی طرح مفلس اور تلاشِ معاش میں سرگرداں ہیں۔"

پاکستانیوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے ــــ "میری زندگی کے ۷۵ سال" مولانا کی آپ بیتی ہے جس میں انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے کرب و کیف کی داستان بہت خوبی سے لکھی ہے۔ ان کا بچپن ضلع سہارن پور میں اور عنفوانِ شباب حیدرآباد دکن میں گزرا۔ ۱۹۵۱ء میں مولانا کراچی ہجرت کر گئے۔ کراچی کی داستاں میں کردار تو بہت سے ہیں، مگر حالات نہیں۔ اس کتاب میں مولانا اعجاز الحق قدوسی نے سیکڑوں افراد اور مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے مگر شان الحق حقی کے سوا، ہر شخص کی صفاتِ حسنہ کا ذکر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے ہر شخص کو محبت اور مروّت کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کی کتاب آپ بیتی سے زیادہ مختصر خاکوں کا گلدستہ معلوم ہوتی ہے ــــ پھر بھی اس کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی سیرت، کردار اور شخصیت کا مثبت اور تعمیری پہلو سامنے آتا ہے۔ ان کے مزاج کے علمی و ادبی رخ کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے مصائب کی کڑی دھوپ میں کس طرح ادبی اور علمی سفر طے کیا ہے۔ اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ کتاب کا اسلوب بہت دلچسپ اور سادہ و پُر وقار ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور پڑھوایا جائے۔

خطوط رشید احمد صدیقی

مرتب: لطیف الزماں خاں
قیمت: ۷۰ روپے
ناشر: مجلس ادبیاتِ مشرق، کراچی

رشید احمد صدیقی اُردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے احباب، تلامذہ اور عزیزوں کو کثیر تعداد میں خطوط لکھے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ ان کے خطوط کو شائع نہ کیا جائے۔ انھوں نے سلمیٰ صدیقی کو لکھا کہ "پڑھنے کے بعد میرے خطوط تلف کر دیا کریں۔" رشید صاحب کا خیال ہے کہ خطوط "ذاتی" نوعیت کے ہوتے ہیں اس لیے ان کو شائع نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے مجروح سلطان پوری کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ہماموٹ خطوط کو حاصل کرنے اور ان کی اشاعت کی جو مہم شروع ہوئی ہے اسے مَیں اچھا نہیں سمجھتا، اس کے باوجود پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مکاتیبِ رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے مکاتیب رشید جلد اوّل، پروفیسر مسعود حسین خاں نے رقعاتِ رشید صدیقی شائع کی ہیں۔ چوتھی کتاب لطیف الزماں خاں کی زیرِ نظر کتاب خطوط رشید احمد صدیقی ہے جس میں فاضل مرتب نے ایک مختصر مگر اہم مقدمہ شامل کیا ہے جس میں تقریباً ۲۹ اصحاب کے نام کے خطوط شامل ہیں جن میں اہم نام یہ ہیں۔ نواب احمد سعید خاں آف چھتاری، ڈاکٹر احسان رشید، سلمیٰ صدیقی، ابوالحسن علی ندوی، ضیا احمد بدایونی، ظہیر احمد صدیقی، مجروح سلطانپوری، مشفق خواجہ، محمد حسن، اسلم فرخی، ابوالخیر کشفی، نظیر صدیقی وغیرہ ـــ اس میں شک نہیں کہ خطوط لکھنے والے کی شخصیت، کردار اور مزاج کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ مکاتیب لکھنے والے کے عہد کا اشاریہ ہوتے ہیں مگر تمام خطوط میں یہ خوبیاں نہیں ہوتیں۔ اس لیے خطوط مرتب کرتے وقت اہم خطوط کو ہی اشاعت کے لیے دینا چاہیے، جن خطوط میں کچھ نہ ہو اس کی اشاعت سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجموعی طور پر خطوط رشید احمد صدیقی ایک اچھی ادبی کاوش ہے اور رشیدیات میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

مقالاتِ شام ہمدرد (۱۹۸۵ء)

مرتبہ: حکیم محمد سعید
قیمت: ۱۲۵ روپے
ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی

"مقالاتِ شامِ ہمدرد" کا موضوع ہے۔ "آؤ محبت کریں" محبت انسانی سرشت میں داخل ہے میر نے کیا خوب کہا ہے ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور ۔۔۔ محبت نہ ہوتی نہ ہوتا ظہور

اس کتاب میں محبت کو بنیاد بنا کر جو مقالے لکھے گئے اور شام ہمدرد میں پڑھے گئے، انھیں یکجا طور پر شائع کیا گیا ہے۔ مضامین کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) اقدار سے محبت، جس میں قناعت سے محبت کریں، عدل و انصاف سے محبت کریں وغیرہ مقالات شامل ہیں۔ (۲) ادب و تہذیب سے محبت، جس میں زبان سے محبت کریں اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے محبت کریں شامل ہے (۳) انسانوں سے محبت جس میں بچوں سے محبت اور اہل فکر و نظر سے محبت کریں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب میں حکیم محمد سعید،

پروفیسر ظہور احمد، بریگیڈیر گلزار احمد، ڈاکٹر محمد عالمگیر خاں، شاعر لکھنوی، ولی محمد خاں، ایس انوارالحق، محمد افضل چیمہ، ایس ایم ظفر، ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی، پروفیسر ام سلمیٰ زمن، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، عطاء اللہ سجاد، سلیم بہادر خاں، سید ہاشم رضا، بیگم ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، حاجی محمد جاوید، ڈاکٹر معز الدین، سید محمد متین ہاشمی کے مضامین شامل ہیں۔

ان دنوں دنیا کا عجیب و غریب عالم ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں مختلف اور متضاد نظریوں کا تصادم ہے۔ مفادات کا ٹکراؤ ہے۔ حصول مقاصد پر زور ہے۔ ذرائع خواہ نیک ہوں یا بد اس پر کسی کی نظر نہیں۔ جس کی وجہ سے مادّی میدان میں انسان کی ترقی نے غیر معمولی کامیابی ضرور حاصل کی ہے مگر اخلاقی اور روحانی میدان میں انسان کو دیوالیہ بنا دیا ہے۔ انسان کا انسان سے اور پوری انسانیت سے رشتہ کمزور ہو چکا ہے اس لیے ہر طرف ظلم، ناانصافی، عدم مساوات اور بدحالی نے ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ ان حالات میں یہ مضامین ریگستان میں نخلستان کا سا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور نفرت نیز تعصب کے ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر مقالات کا معیار اعلا ہے جس کی بنیاد فکر و فلسفہ اور تاریخ و تجربہ پر ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت پر حکیم محمد سعید صاحب کو مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔ یہ کتاب گھر کے ہر فرد کے لیے ہے جس کو پڑھ کر انسانی تہذیب اور تقوے کی شرافت پر ایمان تازہ ہوتا ہے۔

ششماہی غالب کراچی ۱۸

مرتبین: مختار زمن، مشفق خواجہ
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: ادارہ یادگار غالب، ناظم آباد، کراچی ۱۸

یہ 'غالب' کا مشترکہ شمارہ ہے جو جولائی تا دسمبر ۸۷ اور جنوری تا جون ۸۸ء کے شماروں پر مشتمل ہے۔ اداریہ مختار زمن نے لکھا ہے۔ زیر نظر شمارے میں غالب پر چار اور فیض پر دس مقالے شامل ہیں اس لیے اس کو فیض اور غالب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ فیض پر جو مقالات ہیں ان میں آل احمد سرور، محمد حسن، آفتاب احمد خاں، صفدر میر، اور سلیم الزماں صدیقی کے مضامین خاص ہیں۔ غالب پر آفتاب احمد خاں اور شان الحق حقی کے مضامین اہم ہیں۔ عام مقالوں میں صادقین پر مجتبیٰ حسین کا خاکہ، ڈاکٹر گیان چند جین اور نظیر صدیقی کے مضامین اہم ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کی 'ظفر کی شاعری اور میں' کے عنوان سے ایک تحریر بھی شامل ہے۔ غالب کے مقالات کا مزاج تنقیدی ہے۔ اگر یہ شمارہ صرف فیض اور غالب سے مخصوص ہوتا اور مضامین کے انتخاب میں اور سختی سے کام لیا جاتا تو ایک یادگار مجلہ بن جاتا ہے۔ موجودہ صورت میں بھی "غالب" کے بعض مقالے اہم ہیں اور دعوت فکر دیتے ہیں۔
اس شمارہ کے آخر میں محمد حسن عسکری کے غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں جن سے اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ مرتبین اردو کے اہم ادبا میں شامل ہیں، اس لیے یقین ہے کہ آئندہ شمارے اور زیادہ معیاری ہوں گے۔

دشت بے تمنا

شاعر: قیصر الجعفری
ناشر: حنا پبلیکیشنز، رشید کمپاؤنڈ کوسہ (ممبرا) ضلع تھانہ
قیمت: تیس روپے اشاعت ۱۹۸۷ء
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

قیصر الجعفری کا شعری نقش "دشت بے تمنا" مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے رنگِ حنا، نبوت کے چراغ اور سنگ آشنا کی اشاعت ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر زبردست زود گو اور نہایت خوش نصیب ہے۔

انجم فوقی نے "جدید لہجہ شاعر" کے تحت اپنی تحریر میں خلوص تمام اور سعی بسیار کا حق ادا کر دیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے۔

"وہ ایک طرف ہمیں ماضی کے تہذیبی سرمایہ کی یاد دلاتے ہیں۔ دوسری طرف حال سے نباہ کا اشارہ کرتے ہوئے مستقبل کی پریشانیوں سے بچاؤ کا شعور بھی دیتے ہیں۔"

"عرض ناشر" میں عرفان جعفری نے شاعر کی سادگی، معنویت اور رومانی لب و لہجہ کو سراہا ہے۔

"دشت بے تمنا" میں غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ قارئین اپنی پسند کے مطابق فیض پا سکتے ہیں۔ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ مگر تبصرہ نگار کا فرض "چیزے دگر" اور "حدیث دیگراں" میں داخل ہے۔

یہاں قیصر الجعفری ہی میرے سامنے نہیں بلکہ شاعروں کا ایک لشکر ہے جو موضوع و زبان کے بارے میں نئے تجربہ کا اعلان کرتا ہے اور اپنی شاعری کو نئے تجربہ کی سند بنا کر پیش کرتا ہے نئے تجربہ سے کس کافر کو انکار مگر شعری تجربہ میں نیا مواد اور نئی زبان کا مطلب کیا ہے؟ کسی مکتب خیال سے وابستہ ہونا یا غیر مشروط ہونا بھی کوئی خطرناک بات نہیں۔ سوال شعری مقصد اور فیض عام کا ہے۔

بھوپال میں عالمی شعری سمپوزیم ہوا۔ انٹرنیشنل سمینار بھی ہوا۔ موضوع تھا:۔

"THE MAKING OF AN EARTH CITIZEN"

اس میں STEPHEN SPENDER نے شاعری کے متعلق دو نکتے پیش کیے۔

1. ALL ART IS A TRANSFORMATION AND THE GREATNESS OR LITTLENESS OF A POET IN HIS POETRY LIES IN THE DEGREE OF HIS CAPACITY TO TRANSLATE THE HARSH UNPOETIC MATERIAL OFTHE WORLD INTO POETRY"

2. THE BUSINESS OF A WRITER IS "TO BEAR TESTIMONY TO HIS EXPERIENCE OF LIFE."

ان اشارات کی روشنی میں شعری تخلیقات کو پرکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاعر آج اپنی زندگی کے تجربوں کو نظر انداز کر کے چند عارضی شہرت کے تاجروں سے متاثر ہو کر تخلیق کی

...رمار کررہا ہے۔ یا رسائل و جرائد اور سیمینار کے ہنگامی و مقامی مقالات نیز پیش لفظ اور ...رمے دیکھ کر تخلیق کی بجائے شعری ورزش کرتا ہے اور اس طرح نئی TALENT کا ...ہ زیاں ہو جاتا ہے۔

"دشتِ بے تمنا" کا شاعر بھی ذہین ہے۔ شعری صلاحیت ہے، مگر وقت اور اسلوب۔ ...آندھی اور چھپّر" کی شاعری کے لیے بھی وقت ہے۔ شہروں میں رہنے والا کون شاعر جنگل، صحرا ...ؤ کی زندگی کے تجربات حاصل کرنے جاتا ہے۔ سب نئی زندگی میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ...بتوں سے بہرہ ور ہیں۔ جہاں تک سماجی، اخلاقی، اقتصادی، انتظامی، تعلیمی امور اور حقیقت ...ندی کا تعلق ہے۔ شاعر کو کس نے روکا ہے؟

قیصر الجعفری کے یہاں نامور عالمی شاعر کے نکات کی جلوہ گری بھی ہے۔ مثلاً صحت مند ...وابیت، انقلاب اور نعرۂ انا الحق، جد و جہد، وسیلہ اور مقصد، ذہنی بالیدگی کا PROCESS ...ر لفیاتی کیفیت، اسی کے ساتھ اسلوب کی چمک دمک بھی۔ چند اشعار

شاید مرے پیکر میں مٹی ہے رسولوں کی سنتی ہے مجھے دنیا، پتھر اؤ بھی کرتی ہے

سب سے پہلے ہمیں کو پکارا گیا جب کہیں کوئی مقتل سنوارا گیا

رستے میں آرام نہ کرنا منزل نے یہ شرط لگا دی

جو قفس ہے، گماں سے گزرے گا تجربہ کر کے دیکھ لو لوگو

توبہ کے بعد جام کھنکتے بھی ہیں بہت توبہ بھی ڈھونڈتی ہے بہانے شکست کے

کتاب نہایت شاندار چھپی ہے۔ شاعر کی تصویر آمادۂ تکلم ہے۔

پیامی بنیادی انگلش اردو ڈکشنری

ناشر: مکتبہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

قیمت: ۱۲ روپے

مبصر: پروفیسر شمیم حنفی

انگریزی کے کئی اساتذہ اور اسکالرز کی علمی کوششوں کا نتیجہ یہ ڈکشنری ہے۔ انگریزی ...ے پانچ ہزار لفظ اس ڈکشنری میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ مرتبین کا خیال ہے کہ یہ لفظ بنیادی حیثیت ...کھتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں بار بار ہمیں ان کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ ...گریزی ہماری زندگیوں میں اس حد تک دخیل ہو چکی ہے کہ بعض اوقات اردو میں بات چیت کے ...وران بھی ہمیں انگریزی لفظوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مرتبین نے اس لغت میں انگریزی کے ...ولفظ یکجا کیے ہیں، اچھی بات یہ ہے کہ اردو میں ان کی وضاحت سے زیادہ ان کے مترادفات ...پر توجہ صرف کی ہے۔ اس طرح اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت بھی طالب علم اس ...غت سے مدد لے سکتے ہیں۔

یہ خیال ضرور آیا کہ بہت سے عام لفظ چھوٹ گئے ہیں۔ اگر ہزار ڈیڑھ ہزار الفاظ اس ...غت میں مزید شامل کر دیے جائیں تو اس کی افادیت بہت بڑھ جائے گی۔ اپنی موجودہ ...صورت میں بھی، خاص طور سے طلبہ کے لیے، یہ ایک کارآمد اور قیمتی تحفہ ہے۔ ●

ہماری مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

ادب و تنقید

تاریخ ادبِ اردو جلد اوّل — جمیل جالبی — ۱۵۰/۰۰
" " جلد دوم (دو حصوں پر مشتمل) — ۲۰۰/۰۰
ارسطو سے ایلیٹ تک (نیا ایڈیشن) — جمیل جالبی — ۱۰۰/۰۰
محمد تقی میر — " — ۴۵/۰۰
ایلیٹ کے مضامین — " — ۶۰/۰۰
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ — " — ۴۵/۰۰
ادب کلچر اور مسائل — " — ۸۰/۰۰
نئی تنقید — " — ۸۰/۰۰
تنقید اور تجربہ — " — ۸۰/۰۰
امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر — گوپی چند نارنگ — ۴۵/۰۰
انیس شناسی — " — ۵۰/۰۰
اقبال کا فن — " — ۷۵/۰۰
اسلوبیاتِ میر — " — ۳۵/۰۰
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ — " — ۲۵/۰۰
اردو افسانہ روایت اور مسائل نیا ایڈیشن — ۱۵۰/۰۰
اقبال سب کے لیے — فرمان فتحپوری — ۷۵/۰۰
شعر و حکمت ۱ مجلّد — ۱۰۰/۰۰
" پیپر بیک — مغنی تبسم و شہریار — ۸۰/۰۰
ارمغانِ فاروقی نذرِ خواجہ احمد فاروقی — ظہیر احمد صدیقی — ۷۵/۰۰
ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال — پروفیسر گیان چند جین — ۱۲۵/۰۰
ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر — ڈاکٹر قمر رئیس — ۱۲۵/۰۰
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی — علی سردار جعفری — ۱۲/۰۰
فقراتِ سرسید — مترجم محمد حسین شفا — ۳/۰۰
سیدعابد نگارخانۂ رقصاں کی روشنی میں — نجمہ شہریار — ۲۰/۰۰
انتخابِ دواوین — مولوی امام بخش صہبائی
مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۵۰/۰۰
برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ — جیب حیدرآبادی جسٹس آف دی پیس لندن — ۷۵/۰۰
رہ و رسمِ آشنائی — (انشائیے اور مضامین) — ۳۰/-

شاعری

نسخہ ہائے وفا (کلیات) — فیض احمد فیض — ۶۰/۰۰
مہر و نیم — افتخار عارف — ۴۵/۰۰
انگلیوں سے خون — سید علی ظہیر — ۲۵/۰۰
شہرِ گمنام — منیب الرحمٰن — ۱۵/۰۰
شوخیِ تحریر مزاحیہ کلام — سید محمد جعفری — ۳۰/۰۰
غبارِ ناتواں — مظفر شکوہ — ۳۰/۰۰
تنہائی — صدیقہ شبنم — ۲۵/۰۰
ماحصل (کلیات) — اقبال عظیم — ۷۵/۰۰
سمن زار (منتخب فارسی اشعار مع اردو ترجمہ) — ضیاء احمد بدایونی — ۶۰/۰۰
صلاح الدین پرویز کے دوہے — ۲۵/۰۰
صلاح الدین پرویز کے خطوط (شاعری) — ۶۰/۰۰
کنفیشن — صلاح الدین پرویز — ۲۵/۰۰
جہاں نما! ایک ہزار رُباعیات کا مجموعہ — باوا کرشن گوپال مغموم — ۵۰/۰۰
جادۂ شوق — " " — ۶۰/۰۰
موجوں کا مکاں — وقار لطیف (لندن) — ۳۰/-
دلِ خاک بسر — شفق سوپوری — ۵۰/-

AN ANTHOLOGY OF MODERN URDU POETRY — Rs. 75
Edited by Baidar Bakht

SELECTED POEMS OF BALRAJ KOMAL — Rs. 35

ناول و افسانے

آگ کا دریا — قرۃ العین حیدر — ۱۲۵/۰
گردشِ رنگِ چمن — " " — ۱۵۰/-
چاندنی بیگم — " " — زیرِ طبع
بازگوئی — سُریندر پرکاش — ۵۰/-
ناروے کے بہترین افسانے — ہرچرن چاولہ — ۶۰/۰۰
آتے جاتے موسموں کا سچ — " — ۶۰/۰۰
جنم کہانیاں — انتظار حسین — ۱۲۵/۰۰

سفرنامہ

سفر آشنا — گوپی چند نارنگ — ۱۵/۰۰
سرسید احمد خاں پنجاب میں — مولوی سید اقبال علی — ۵۰/۰۰

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی ۶

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

برائے سال ۱۹۸۸ء
دہلی اردو اکیڈمی کے انعامات

غالب اکیڈمی کو (بہادر شاہ ظفر کل ہند ایوارڈ) جوگندر پال صاحب (اردو نثر) رفعت سروش صاحب (اردو شاعری) سردار جنگ بہادر صاحب (اردو صحافت) محترمہ شمیم بیگم۔ (بہترین استاد، اردو میڈیم اسکول)

دہلی کے مصنفین اور ناشرین کو انعامات:۔

جناب درشن سنگھ (متاع نور) جناب زبیر رضوی (پرانی بات ہے) فی ۔/4000

جناب عزیز نگہری (جہاد حرف) جناب صوفی اختر قدیر (تنویر رسالت)

جناب دیوندر اسّر (خوشبوئیں کے لوٹیں گے) 4000/
ڈاکٹر شمیم حنفی (زندگی کی طرف) 4000/-
جناب ضیاء الحسن فاروقی (شہید جستجو) 4000/-
ڈاکٹر عابدہ بیگم (اردو نثر کا ارتقاء)
جناب شاہد ماہلی (انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ)
سعید سہروردی (کچھ پھول کچھ پتھر)
جناب ڈاکٹر ظفر احمد نظامی (مولانا آزاد کی کہانی)
جناب غلام حیدر (اخبار کی کہانی) 4000/-

منشی نول کشور ایوارڈ برائے بہترین ناشر

۱۔ بیسویں صدی پبلیکیشنز　-/4000
۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس　-/4000
۳۔ مکتبہ پیام تعلیم　-/4000

۱۶ افراد غالب ایوارڈ کے لیے منتخب

نئی دہلی ۱۴ اپریل۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالب ایوارڈ ذیلی کمیٹی نے مختلف زمروں میں سولہ اشخاص کو ایوارڈ سے نوازے جانے کا اعلان کیا ہے۔

فخرالدین علی احمد غالب ایوارڈ برائے تحقیق۔ جناب شمس الرحمن فاروقی (۱۹۸۷ء) اور جناب علی جواد زیدی (۱۹۸۸ء) کو دیا گیا ہے۔ اردو نثر نگاری کے لیے مودی غالب ایوارڈ جناب کالیداس گپتا رضا (۱۹۸۷ء) اور جناب رام لعل (۱۹۸۸ء) کو عطا کیا گیا ہے۔ اردو شاعری کے لیے مودی غالب ایوارڈ جناب علی سردار جعفری (۱۹۸۷ء) اور مسٹر اختر الایمان (۱۹۸۸ء) کو دیا گیا ہے اردو ڈرامانگاری اور موسیقی پر مبنی ڈرامے کا ایوارڈ جناب رفعت سروش (۱۹۸۷ء) اور استاد حفیظ احمد خاں (۱۹۸۸ء) کو دیا گیا ہے۔ ادبی خدمات کے لیے پروفیسر عبدالمغنی (۱۹۸۷ء) اور ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ (۱۹۸۸ء) ایوارڈ سے نوازے گئے ہیں۔ اردو صحافت کے لیے بیدی سحر غالب ایوارڈ جناب حیات اللہ انصاری ممبر پارلیمنٹ (۱۹۸۷ء) اور جناب رضوان احمد ایڈیٹر عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ (۱۹۸۸ء) کو دیا گیا ہے۔ اردو مزاح نگاری کا ساگر سوری غالب ایوارڈ جناب ہلال سیوہاروی (۱۹۸۷ء) اور جناب بی۔ سی کھنہ (۱۹۸۸ء) کو ملا ہے۔ خطاطی کے لیے پدم چند گپتا غالب ایوارڈ جناب شمیم احمد انصاری اور استاد عبدالستار کو دیا گیا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایگزیکیٹو کمیٹی میں حکومت کی جانب سے ۴ نمائندے مقرر

نئی دہلی ۱۶ مارچ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایگزیکیٹو کمیٹی کے لیے حکومت نے اپنے چار نمائندوں کی فہرست جامعہ حکام کو بھیج دی ہے۔ ان میں مسٹر عابد حسین، مسز نجمہ ہبت اللہ جسٹس آنند نرائن ملا اور محمودہ بیگم شامل ہیں۔

حیات اللہ انصاری کا ایوارڈ نہ لینے کا فیصلہ

نئی دہلی ۸ اپریل۔ ممبر پارلیمنٹ مسٹر حیات اللہ انصاری نے اردو صحافت کا غالب ایوارڈ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۸۸۔۱۹۸۷ء کے لیے اردو ادب کی

تمام اصناف میں گرانقدر خدمات کے صلہ میں ۱۶ افراد کو ایوارڈ دینے کا گزشتہ ۴ اپریل کو اعلان کیا تھا۔ ان میں مسٹر حیات اللہ انصاری کا نام بھی ہے۔ مسٹر انصاری نے آج ایک بیان میں کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایوارڈ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

شام قہقہہ کی تقریب

کولار ۱۱ مارچ۔ کرناٹک اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام "شام قہقہہ" کا آغاز روزنامہ سالار کے ایڈیٹر جناب ابراہیم خلیل اللہ کے لطیفوں سے ہوا۔ اکیڈمی کی صدر ڈاکٹر لئیق خدیجہ نے مزاحیہ خطبہ صدارت پیش کیا جس کی سامعین نے زبردست داد دی اس کے بعد ہر دلعزیز ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس اور مہمان خصوصی شری یم ٹی سنگھ نے بالکل لکھنوی انداز میں مزاحیہ تقریر کی جس کی مجمع نے تالیاں بجا کر داد دی۔

اس کے دوسرے مہمان خصوصی اور ممتاز طنز و مزاح نگار جناب یوسف ناظم مائک پر آئے اور دلچسپ مضمون سے سامعین کو لوٹ پوٹ کر دیا۔ اس محفل کو جن حضرات کے مزاحیہ مضامین اور نظموں نے کامیاب کیا ان کے نام ہیں یوسف ناظم، سمیع انجم، محبوب طرائی، وسیم احمد طالب خوندمیری، مصطفےٰ علی بیگ، پاگل عادل آبادی، مگر رائچوری اور جناب اعجاز احسن۔ اکیڈمی کی تہذیبی کمیٹی کے کنوینر جناب منظر محی الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شام قہقہہ کے کنوینر جناب علی حفیظ نے خیر مقدم کیا۔ شری ٹی۔ پی نگیں آخر تک رونق محفل بنے رہے۔

اقبال متین پر پی۔ ایچ۔ ڈی

حیدرآباد کے جمیل احمد خاں نے ام فل کا مقالہ "اقبال متین شخصیت اور فن" پر لکھا تھا۔ اب وہ اقبال متین کے افسانوں میں "آج کے انسان کی الجھنیں" پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

این سی ای آر ٹی ایوارڈ

نئی دہلی ۴ اپریل۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (این سی ای آر ٹی) کے تحت پاپولر سائنس میں

بچوں کے ادب پر قومی مقابلوں میں ۱۴ زبانوں کے مصنفوں کو ایوارڈ دیا گیا۔ ایوارڈ ۵ ہزار روپیہ نقد اور ایک سند پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں یہ ایوارڈ سائنس کی دنیا کے اڈیٹر مسٹر محمد خلیل کی کتاب عجیب و غریب جانور پر دیا گیا۔

پاکستانی نقاد مجتبیٰ حسین کا انتقال

نئی دہلی۔ یکم اپریل۔ پاکستان کے سرکردہ مصنف اور نقاد مجتبیٰ حسین کا آج ایک سڑک حادثہ میں لاہور میں انتقال ہو گیا۔ یہ اطلاع ریڈیو پاکستان نے دی ہے۔ وہ ساٹھ سال کے تھے۔ مسٹر مجتبیٰ حسین بلوچستان یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور ایک کنونشن میں شرکت کے لیے لاہور گئے تھے۔

بورڈ آف مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی ۱۹۸۹ء

۱۔ جناب ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا چیرمین
۲۔ " پروفیسر جاوید خاں نائب چیرمین
۳۔ " علی سردار جعفری ڈائرکٹر
۴۔ " یوسف ناظم سکریٹری
۵۔ " ہارون رشید (دھلیہ) سکریٹری

ممبران

۱۔ ضیا انصاری ۲۔ مجروح سلطان پوری ۳۔ پی ایل دیشپانڈے ۴۔ ڈاکٹر عصمت جاوید ۵۔ ڈاکٹر شیخ فرید ۶۔ حسن کمال ۷۔ ریاض احمد خاں ۸۔ یونس اگاسکر ۹۔ سلام بن رزاق ۱۰۔ ڈاکٹر جبار پٹیل ۱۱۔ محترمہ رشیدہ قاضی ۱۲۔ محترمہ رفیعہ شبنم عابدی ۱۳۔ جناب انجم رومانی ۱۴۔ پروفیسر اکبر رحمانی ۱۵۔ خلش حیدری ۱۶۔ بشیر احمد انصاری ۱۷۔ جلیل ساز ۱۸۔ شفیع قریشی ۱۹۔ ڈاکٹر اشفاق انجم ۲۰۔ غوث محی الدین انصاری ۲۱۔ شاکر رامپوری ۲۲۔ ابوبکر صدیقی۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے انعامات

شاعری۔ دوسرا انعام تلافی۔ جاوید ناصر ۴۰۰/-
دوسرا انعام خبط و ضبط۔ حقیر آستانی ۴۰۰/-

افسانہ:۔

پہلا انعام مباہلہ علی امام نقوی ۵۰۰/-
دوسرا انعام مور، رقص اور تماشائی۔ نورالحسین ۴۰۰/-

تحقیق و تنقید:۔

پہلا انعام۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر۔
اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو ۵۰۰/-
دوسرا انعام بیگم جنیہ کچھ نئے مباحث۔ مانک ٹالہ ۴۰۰/-

بچوں کا ادب :۔

دوسرا انعام۔ انوار سہیلی کی کہانیاں / ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۴۰۰/-

دوسرا انعام پھول رانی۔ بشیر احمد انصاری ۴۰۰/-

طب، تاریخ، سفرنامہ وغیرہ :۔

پہلا انعام۔ علاج رحمت یا زحمت ڈاکٹر مرزا انور بیگ ۵۰۰/-

پہلا انعام۔ ماجرائے وطن شبیر حکیم ۵۰۰/-

دوسرا انعام سوانح حیات، ملک عنبر۔ آغا مرزا بیگ ۴۰۰/-

دوسرا انعام۔ چار کہانی ایک شہر وحید انور ۴۰۰/-

صحافت :۔

محمود راہی — انقلاب بمبئی۔ ۳۰۰/-

حسینی جاوید — اورنگ آباد۔ ۳۰۰/-

کتابت :۔

م۔ عبدالرزاق — اورنگ آباد۔ ۳۰۰/-

عبدالحی جونپوری — انقلاب بمبئی ۳۰۰/-

تدریسی خدمات :۔

عبدالغنی شرف الدین کھڑس۔ چپلون ۲۰۰/-

عبدالوہاب آکولہ ۲۰۰/-

اکاڈیمی کی بورڈ میٹنگ ۱۵ / مارچ ۸۹ء میں کل ہند ادبی خدمات کے لیے ممتاز افسانہ و ناول نگار محترمہ جیلانی بانو کو گیارہ ہزار روپے کا خصوصی انعام اور ریاستی ادبی خدمات کے لیے ممتاز مزاح نگار جناب یوسف ناظم کو سات ہزار روپے کے خصوصی انعام سے نوازا گیا ہے۔

۱۹۸۷ء کی مطبوعہ اردو کتابوں پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے انعامات

(الف) مندرجہ ذیل تین کتابوں پر تین ہزار روپے

(۱) گل بن سیدہ نسیم چشتی ۳۰۰۰/-

(۲) اردو سفرنامے انیسویں صدی میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی ۳۰۰۰/-

(۳) دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی و ادبی خدمات۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام ۳۰۰۰/-

فی کتاب

(۱) شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں سید شہاب دسنوی ۲۰۰۰/-

(۲) کانٹوں کی زبان ظ انصاری ۲۰۰۰/-

(۳) علوم و فنون عہد عباسی میں ڈاکٹر محمد رضوان علوی ۲۰۰۰/-

(۱) کارخانوں کی بنیادی تکنیک محمد صدرالاسلام ۱۵۰۰/-

(۲) تاریخ ہند کا المیہ محمد ضیاء الحسن خاں ۱۵۰۰/-

(۳) خندہ ہائے بیجا وارث علوی ۱۵۰۰/-

(۴) ملک الشعراء گرامی جالندھری از طارق کفایت ۱۵۰۰/-

(۵) حیدرآبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے / محمد معین الدین امر ۱۵۰۰/-

(۶) میرا کھویا ہوا ہاتھ سلطان سبحانی ۱۵۰۰/-

(۱) نمود سحر از سعید احمد نیر قریشی گنگوہی ۵۰۰/-

(۲) اوراق گل خیرات ندیم ۵۰۰/-

(۳) بے نام موسموں کا نوحہ عوض سعید ۵۰۰/-

(۴) نکہت الفاظ قادر صدیقی ایڈوکیٹ ۵۰۰/-

(۵) ساحل سمندر اور سیپ ہیرا نند سوز ۵۰۰/-

(۶) سحر سخن سحر بریلوی ۵۰۰/-

(۷) فردوس بہار منوہر لعل بہار ۵۰۰/-

(۸) پرندوں سے جانوروں تک شاہد عظیم ۵۰۰/-

(۹) آبشار نغمہ پریم نارائن سکسینہ ۵۰۰/-

(۱۰) سوالوں کے بوچھار رؤف جاوید ۵۰۰/-

(۱۱) ظالم ڈاکو ریاض احمد خاں ۵۰۰/-

(۱۲) کرن کرن خوشبو طفیل سیماب ۵۰۰/-

(۱۳) الہاماتِ سرمد محمد مشتاق احمد شرقی ۵۰۰/-

(۱۴) خامۂ فکر صوفی سلطان شطاری ۵۰۰/-

(۱۵) چیزیں کیسے بنتی ہیں قیصر سرمست ۵۰۰/-

(۱۶) انسانی جسم محمد عبدالرحیم ۵۰۰/-

(۱۷) ارمغانِ کندن کندن لال کندن ۵۰۰/-

(۱۸) سرمایۂ حیات شبیر حسن شبیر ۵۰۰/-

(۱۹) زر گل شیخ عبدالبصیر حاصی فائق ۵۰۰/-

(۲۰) ذکر و زبان دورآفریدی ۵۰۰/-

٢۔ مغربی بنگال ١٩٨٧ء کی مطبوعہ اردو کتابوں پر انعامات۔

(١) فریاد جرس — ڈاکٹر خلیل عباس صدیقی — ٣٠٠/-
(٢) آوارگی — جاوید دانش — ٣٠٠/-
(١) موپاساں کے شاہکار افسانے — ابو یوسف — ٢٠٠/-

٣۔ ناشرین کو انعامات

(الف) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی — ١٠٠٠/-
(ب) مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی — ١٠٠٠/-
(ج) مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی — ٥٠٠/-
(د) ایڈشاٹ پبلی کیشنز بمبئی ٤٠٠٠١ — ٥٠٠/-

٤۔ اچھی طباعت پر انعامات

(الف) آبادی پبلی کیشنز کلکتہ کو "فریاد جرس" کی طباعت پر — ٥٠٠/-
(ب) ناولستان جامعہ نگر نئی دہلی کو "بنجر بادل" کی طباعت پر — ٥٠٠/-

اتر پردیش اردو اکیڈمی کے انعامات

لکھنؤ۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی جناب رام لعل اور فضا ابن فیضی کو مجموعی خدمات پر دس دس ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

تین تین ہزار روپے کے دو انعامات

١۔ تدریس تاریخ — خلیل الرب
٢۔ شہید جستجو — ضیاء الحسن فاروقی

دو دو ہزار روپے کے سترہ انعامات

١۔ اردو ادب میں تمثیل نگاری — ڈاکٹر غلام رسول بکرانی
٢۔ انیسویں صدی میں اردو کے تصنیفی ادارے — ڈاکٹر سمیع اللہ
٣۔ نیاز فتحپوری فکر و فن — ڈاکٹر اختر یزداں الحسن
٤۔ اردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی
٥۔ ہندوستانی تہذیب "بوستان خیال" کے تناظر میں — ڈاکٹر ابن کنول
٦۔ فراق کی شاعری — ڈاکٹر انعام اللہ خاں
٧۔ فرہنگ کلیات میر — ڈاکٹر فرید احمد برکاتی
٨۔ اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو — ڈاکٹر یونس اگاسکر
٩۔ میخانہ شارب — شارب لکھنوی
١٠۔ پرانی بات ہے۔ — زبیر رضوی
١١۔ پچھلے موسموں کا پھول — مظہر امام
١٢۔ دھنک احساس کی — راج نرائن راز
١٣۔ جواب دوست — نسیم انصاری
١٤۔ فسانۂ اعجاز — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
١٥۔ دو گز زمین — پروفیسر عبد الصمد
١٦۔ زندگی کی طرف — شمیم حنفی
١٧۔ مبادی کتابیات — کرشن کمار اور شہاب الدین انصاری

ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے کے انتیس انعامات

١۔ جہان افکار — ڈاکٹر سید سجاد حسین رضوی
٢۔ گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات — ڈاکٹر ناہید عارف
٣۔ اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب — ڈاکٹر محمد شکیل خاں
٤۔ خواجہ سید فخر الدین حسین سخن دہلوی (حیات اور ادبی خدمات) — ڈاکٹر محمد نسیم خاں
٥۔ ملا وجہی اور انشائیہ — ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
٦۔ چہرہ چہرہ دھرتی — نسیم فاروقی
٧۔ نوک غزل — شہاب اشرف
٨۔ شہر گماں — آشفتہ چنگیزی
٩۔ تابشیں — سید نور الحسن نور گورکھپوری
١٠۔ شہر صدا — عمر قریشی
١١۔ منزل بہ منزل — جی پیام
١٢۔ بادۂ احمر — احمر گورکھپوری
١٣۔ نوائے دل — رونق بدایونی
١٤۔ حرف امتحان — شہاب الدین ثاقب
١٥۔ عکس غالب — مسلم انصاری
١٦۔ فصیل جاں — احسن نشاط
١٧۔ دھڑکنوں کا سفر — محمد علی شیدا لکھیم پوری

۱۸۔ سامان سرخوشی — کلیات سہائے ماہر لگرامی
۱۹۔ صدف سمندر — شہپر رسول
۲۰۔ آفتاب کی سازم — سید غلام محی الدین عزمی
۲۱۔ سفر جاری ہے — صلاح الدین نیر
۲۲۔ ساحل، سیپ سمندر — سیدہ شان معراج
۲۳۔ آہٹ — ملیحہ سمیع الزماں
۲۴۔ بیت الحکمت کی طبی خدمات — وسیم احمد اعظمی
۲۵۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ — شاہد ماہلی
۲۶۔ خوشبو بن کے لوٹیں گے — ڈاکٹر دیویندر اسر
۲۷۔ صاحب نظراں — غلام رضوی گردش
۲۸۔ فی الفور — یوسف ناظم
۲۹۔ خبر نگاری — شافع قدوائی

ایک ایک ہزار روپے کے ۱۵۹ انعامات

۱۔ مراثی انیس میں مناظر قدرت — جناب سید منظر جعفری
۲۔ جدید فارسی شاعری — ڈاکٹر محمد نقی علی
۳۔ زیر غور — ذکاء الدین شایاں
۴۔ البیرونی کے جغرافیائی نظریات — ڈاکٹر حسن عسکری ناظم
۵۔ انیس اور فردوسی کا تقابلی مطالعہ — ڈاکٹر سید فدا حسین
۶۔ اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی — ڈاکٹر محمد امین انصاری
۷۔ نشور واحدی — اوما چکبست
۸۔ اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں — ڈاکٹر منظر اعظمی
۹۔ سرہند میں فارسی ادب — ڈاکٹر ادریس احمد
۱۰۔ پریم چند کے کچھ نئے مباحث — جی کے مانک ٹالا
۱۱۔ تحقیقی مباحث — لالہ رام رتن پنڈت دلوی
۱۲۔ معیار سخن — تاجدار احمد تاج لکھنوی
۱۳۔ اوج ثریا — اسلم بارہ بنکوی
۱۴۔ تنویر غزل — اقبال سہارنی
۱۵۔ خلوتِ دل — جوہر رحمانی
۱۶۔ گلشن تخیل — کرشن مراری ضیا مراٹھی
۱۷۔ میری قومی نظمیں — جعفر ملیح آبادی
۱۸۔ صبح کی کرن — رشید خاں راہی
۱۹۔ نقوش زریں — ڈاکٹر ایم۔ اے طارق ابنزایانی
۲۰۔ اعراب — شمیم شہزاد
۲۱۔ نگار شب — قربان انصاری
۲۲۔ کہکشان شعور — علی حمزہ خاں شعور ملیح آبادی
۲۳۔ کلام نشتر — نشتر قاسم گنجوی
۲۴۔ صفر — ثروت اللہ خاں ثروت شفائی
۲۵۔ بکھرے پھول — مرتضیٰ فہیم
۲۶۔ سبزہ و گل — شاداں بدایونی
۲۷۔ کلیات جوہر — جوہر دیوبندی (بدھ پرکاش)
۲۸۔ آگہی کے لمس — ڈاکٹر مبارک انصاری
۲۹۔ غبار — صالح ندیم
۳۰۔ حادثے — کرشن موہن جوہری بدایونی چشتی بدایونی
۳۱۔ برگ آفتاب — جلیس نجیب آبادی
۳۲۔ شہر احساس — نسیم سامانی
۳۳۔ نشاط درد — عبرت بہرائچی
۳۴۔ تصویر سخن — سعید قریشی مرادآبادی
۳۵۔ کہکشاں کہکشاں — محشر بریلوی
۳۶۔ دست رس — محمد عرفان
۳۷۔ نوائے سرور — سید محمد سرور
۳۸۔ اعجاز کمال — کمال مدراسی
۳۹۔ بوند بوند — عشرت دھولپوری
۴۰۔ متاع نور — درشن سنگھ
۴۱۔ من کی گنگا — من موہن لال چھابڑا
۴۲۔ پھول کانٹوں کی سیج پر — شبنم گورکھپوری
۴۳۔ انسانیت زندہ ہے — شوکت عظیم
۴۴۔ تذکرہ میکشان وارث — سید حیات وارثی
۴۵۔ گلدستۂ سخن — گنپت سہائے سری واستو
۴۶۔ آخری زیور — سلمان علی خاں
۴۷۔ پگھلتے لمحوں کے لوگ — اسلم واحدی
۴۸۔ خوشبو — روشن تقی
۴۹۔ جوہر کا کلام — تزئین عاشقہ تاج

۵۰۔ طبیعیات (معالجاتی سیلو) ڈاکٹر محمد احسان
۵۱۔ اصول نسخہ نویسی محمد آفتاب احمد
۵۲۔ معالجات امراض اطفال سید علی حیدر جعفری
۵۳۔ کلینیکل بائیو کیمسٹری ڈاکٹر حکیم مرزا محمد امین
۵۴۔ امید کی کرن نسکین زیدی
۵۵۔ تتلیوں کے گیت عبدالمتین نیاز
۵۶۔ گول مال شفیقہ فرحت
۵۷۔ اردو الفاظ ایک بین الاقوامی راستہ
محمد نعیم اللہ خیالی
۵۸۔ کمپیوٹر کا اصول صلاحیت اور پروگرامک
مع اندرونی ساخت سید محمد صدر الاسلام
۵۹۔ شہنشاہ اسمار عام تاباں نقوی امروہوی

ناشرین کو انعامات

۱۔ نصرت پبلشرس	(لکھنؤ)	دو ہزار روپے
۲۔ مکتبہ دین وادب	(لکھنؤ)	ایک ہزار روپے
۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	(دہلی)	ایک ہزار روپے
۴۔ غالب اکادمی نجیب آباد	(بجنور)	پانچ سو روپے
۵۔ مرزا محمد یوسف	(لکھنؤ)	پانچ سو روپے

لیتھو پریس انعام

۱۔ نامی پریس	(لکھنؤ)	ڈیڑھ ہزار روپے

کاتب انعام

۱۔ محمد شعیب	(گورکھپور)	ڈیڑھ ہزار روپے
۲۔ سلام فیضی	(گورکھپور)	پانچ سو روپے
۳۔ وقار احسن	(لکھنؤ)	پانچ سو روپے

مصنف اور قاری کے درمیان کی اہم کڑی نظر انداز

دہلی۔ دہلی اردو اکیڈمی کے جلسہ تقسیم اسناد میں کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق نے فرمایا کہ اردو اکیڈمیاں مصنف، ناشر اور خوش نویس حضرات کو انعامات دیتی ہیں۔ یہ بہت اچھی اور قابل تعریف بات ہے لیکن مصنف اور قاری کے درمیان ایک اور اہم کڑی بک سیلرز کی بھی ہے۔ جہاں تک اردو کی کتابوں کی فروخت کا تعلق ہے وہ ہماری آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں بک سیلرز کے دل میں اگر اردو سے محبت نہ ہو تو وہ اس جگہ کوئی دوسرا کاروبار کر کے زیادہ منافع کما سکتے ہیں۔ اردو کے کئی بک سیلرز جنھوں نے مجبور ہو کر اردو کی کتابوں کی سیل بند کر کے دوسرا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ ان کی مالی حالت بھی بہتر ہو گئی ہے۔ یہ رجحان ہمارے نظر انداز کرنے کی وجہ سے اور بڑھ سکتا ہے۔ اس سے اردو کی کتابیں، رسائل عام خریداری تک پہنچنے میں کتنی دشواری ہو گی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اردو اکیڈمیوں کو چاہیے کہ اس طرف بھی توجہ دیں۔

کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے خلاف دہلی میں پبلشروں و پرنٹروں کی ریلی

نئی دہلی ۱۹ اپریل۔ کاغذ کی قیمتوں میں آئے دن ہونے والے غیر معمولی اضافہ کے خلاف بطور احتجاج آج دہلی کے پبلشروں پرنٹرز اور مصنفین نے بوٹ کلب تک مارچ کیا۔ ایسوسی ایشنوں کے جوائنٹ ایکشن کمیٹی نے مرکزی وزیر صنعت مسٹر ونگل راؤ کو ایک میمورنڈم دیا جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر فوراً روک لگائی جائے گی اور لوگوں کو مناسب داموں پر کاغذ مہیا کیا جائے۔ اس ریلی سے مختلف ایسوسی ایشنوں کے لیڈروں نے خطاب کیا ایکشن کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ طلبہ اور کاغذ سے متعلق تمام اداروں کی مشکلات کو کم کرنے کے لیے ڈیوٹی فری کاغذ کی درآمد کی اجازت دے۔

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے ۲۵ سال

پاکستان کے نیک نام ادارے سنگ میل پبلی کیشنز جس کو اردو کے

ممتاز ادیبوں کا سرپرستی حاصل ہے) نے اپنی زندگی کے ۵۰ سال نہایت کامیابی کے ساتھ پورے کر لیے۔ ادارہ مکتبہ جامعہ کتاب نما اور پیام تعلیم جس کے مالکان، کارکنان کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہے کہ سنگ میل پبلی کیشنز برابر ترقی کرتا رہے۔ آمین۔

خوبصورت نثر اور شعر کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔ مکتبہ مرحوم کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر کی تلقین دے۔ آمین۔

ڈاکٹر قنبر احمد رضوی نہیں رہے

مکتبہ جامعہ کے سابق کارکن ڈاکٹر قنبر احمد رضوی جنھوں نے ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۴ء بہ حیثیت انچارج دہلی برانچ مکتبہ جامعہ کی خدمت کی تھی۔ ۱۶ اپریل ۸۹ء کو اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ قنبری صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ دوست بنانے اور دوستی کو قائم رکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ مکتبہ جامعہ سے چلے جانے کے باوجود اہل مکتبہ انھیں ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کرتے رہے۔ پچھلے کئی برسوں سے قنبر صاحب اے۔ کے کالج شکوہ آباد میں بہ حیثیت وائس پرنسپل کام کر رہے تھے۔

مکتبہ کے کارکن کو صدمہ

مکتبہ جامعہ کے مخلص کارکن محمد ذکی صاحب کی والدہ صاحبہ مختصر بیماری کے بعد ۱۳ اپریل ۸۹ء کو انتقال کر گئیں۔ مرحومہ اپنے خاندان کی بڑی ہردلعزیز خاتون تھیں۔ پاس پڑوس کے لوگ ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اہل مکتبہ جناب محمد ذکی صاحب اور ان کے عزیزوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

• • •

مجروح سلطانپوری، ظ۔ انصاری اور ندا فاضلی
لوک سبھا کے چناؤ میں اردو کے امیدوار

ملک کے نامور بزرگ، ترقی پسند شاعر مجروح سلطان پوری نے آنے والے انتخابات میں وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کے حلقہ امیٹھی کے نزدیک سلطان پور کے حلقے سے اردو کے امیدوار کی حیثیت سے لوک سبھا کے انتخابات میں حصہ لینے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ یہ انکشاف عالمی اردو کانفرنس کے بانی مسٹر علی صدیقی نے نمائندہ "اخبار نو" سے ایک ملاقات کے دوران کیا ہے۔ مسٹر علی صدیقی نے اس سلسلے میں جناب مجروح سلطانپوری کی تحریر نقل بھی پیش کی جس میں مجروح صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں اور اگر اردو کے نام پر الکشن لڑنے سے اردو کے کاز کو تقویت ملتی ہے تو وہ حلقہ سلطانپور سے آنے والے الکشن میں لوک سبھا کے انتخاب میں حصہ لینے کے لیے بھی تیار ہیں۔ مسٹر علی صدیقی نے کہا کہ انھوں نے عالمی اردو کانفرنس کے دوران اردو مورچہ کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان کیا تھا۔ مجروح صاحب اسی اردو مورچہ سے لوک سبھا کے امیدوار ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پارلیمنٹ میں اردو کا چاہے ایک ہی نمائندہ کیوں نہ ہو مگر وہ حسرت موہانی جیسا انسان ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مجروح صاحب اردو کے ایک عظیم مجاہد ہیں۔ اگر اردو والوں نے مجروح صاحب کو پارلیمنٹ میں بھیج دیا تو یہ حسرت موہانی کو پارلیمنٹ میں بھیجنے کے مترادف ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ سلطانپور میں اردو کا ووٹ فیصلہ کن ووٹ رکھتا ہے۔ یہی نہیں وزیر اعظم راجیو گاندھی کے حلقے میں بھی چالیس فی صد اردو ووٹ ہیں۔ مجروح صاحب اردو کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیتے ہیں تو امیٹھی کے چالیس فی صد اردو ووٹ پر بھی اس کا اثر ضرور پڑے گا۔ اور حکومت کو اردو کے سلسلے میں واضح پالیسی اپنانی پڑے گی۔

بمبئی سے ملنے والی ایک اور اطلاع کے مطابق مشہور شاعر ندا فاضلی اور نامور ادیب صحافی و نقاد جناب ظ۔ انصاری بھی اردو امیدواروں کی حیثیت سے آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اپنے لیے حلقوں کی تلاش میں ہیں جہاں اردو ووٹ کثیر تعداد میں موجود ہوں۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

جون ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۶

فی پرچہ ۴/-
سالانہ ۳۵/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) ۱۰۰/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک) ۲۲۰/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے ۴۵/-

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی

مطبوعات

بہادر شاہ ظفر کا افسانۂ غم (تاریخ) } ۱۵/-
عبداللہ فاروقی مرحوم

تذکرہ و کلام معاصر سخن وران جے پور (شعری مجموعہ) ۲۵/-
ایم محمود خاں

ادبی تنقید اور اسلوبیات (تنقید) پروفیسر گوپی چند نارنگ ۱۲/-
مظفر پور علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز (ادب) محمد حامد علی خاں ۴/-
دیوان غالب (دیوان) مرزا اسد اللہ خاں غالب ۵/-

RELIGIO LEGAL SYSTEM OF ISLAM
BY GHULAM MOHAMMAD
۲۵/-

ننھا پودا (معلومات) نجمہ صالح ۱۲/-
نٹ کھٹ چنو " تنویر حیدر ۱۲/-
چار سہیلیوں کی کیاریاں " غلام حیدر ۱۲/-
پھول کے مہمان " ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی ۱۵/-
تتلی کے بچے " زاہدہ خاتون ۱۵/-
کاربن تندرستی کا انمول عطیہ " طلعت عزیز ۱۵/-
پرندوں کی دنیا " مرزا عصمت اللہ بیگ ۱۰/-
مختصر تاریخ ادب ہندی (ادب) سید عبدالقادر اشرفی ۲۵/-
واہیات (شعری مجموعہ) رضا نقوی واہی ۵/-
ہوا زنجیر (") رہبر جونپوری ۲۰/-
جلیل مانک پوری حیات و فن ڈاکٹر عبدالخالق ذکی انصاری ۸/-
اڑیسہ کی لوک کہانیاں مرتبہ: محمود بالیسری ۱۵/-
اردو لغت کا شرعی محاسبہ شمس بدایونی ۱۵/-
اظہار۔ علیم اللہ حالی مرتب ذہین حیدری ۲۰/-
دیار فکر (شعراء کے منتخب اشعار) مرتبہ شاہد ساگری ۲۷/-

پاکستانی مطبوعات

معروف عورت (افسانے) خالدہ حسین ۵۰/-
سرخ فیتہ (مجموعہ مضامین اور افسانے) } ۱۲۰/-
قدرت اللہ شہاب
دیار صبح بہار (سوویت یونین کا سفرنامہ) } ۶۵/-
حمیرا ہاشمی
رزق ہوا (شعری مجموعہ) فیاض تحسین ۶۰/-

مہمان اداریہ
شہزاد منظر
A-36, WAJID SQUARE,
BLOCK 16,
GULSHAN-E IQBAL,
KARACHI-47.
(PAKISTAN)

اشاریہ

اردو تنقید کا زوال

کیا اُردو میں تنقید انحطاط پذیر ہے؟ یا ناقدوں نے تنقید کے اصل منصب کو فراموش کر کے شاعر و ادیب کی صرف مدح سرائی کو تنقید سمجھ لیا ہے؟ یہ ہیں وہ سوالات جو آج ہندستان اور پاکستان کے سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں کیے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو کے ادبی رسالوں میں تنقید کے نام پر جو کچھ شائع ہو رہا ہے اس نے ہر علمی و ادبی حلقوں کو اس سوال پر غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اس سے قبل کہ اس بحث کو آگے بڑھایا جائے، تنقید کے منصب اور اس کے مقاصد کے بارے میں دو چار باتیں ہو جائیں تو مناسب ہے۔

ادب میں تنقید کی اہمیت کیا ہے؟ اور اس کی کوئی ادبی اہمیت ہے بھی یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے، جس پر برسوں سے بحث و تمحیص جاری ہے اور اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ ایک طبقہ تنقید کو ادب کی تفہیم کے لیے فضول اور غیر ضروری سمجھتا ہے اور دوسرے طبقے کا خیال ہے کہ تنقید کے بغیر ادب کی صحیح تفہیم ممکن ہی نہیں ہے۔ اوّل الذکر طبقے کا خیال ہے کہ تنقید، تخلیق کے براہِ راست مطالعے اور مصنّف کی تفہیم میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور وہ قاری کے تخلیق کے براہِ راست مطالعے سے لطف اندوز ہونے میں مانع ہے اور اس طرح تنقید قاری کی رائے کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے برعکس موخرالذکر طبقے کا خیال ہے کہ تنقید، قاری کی ذہنی تربیت کرتی ہے اور اس میں تخلیق سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ایک تربیت یافتہ ذہن ہی فنّی تخلیقات سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتا ہے، اس لیے تنقید ادب کے لیے ضروری ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تخلیق، تنقید سے بہت قبل وجود میں آئی ہے۔ اگر لوک ادب کو (لوک گیت اور لوک کہانی کو) ادب تسلیم کر لیا جائے تو اس کا وجود بنی نوعِ انسان کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اگر صرف تحریری ادب کو روایتی مفہوم میں ادب تصوّر کیا جائے تو بھی اس کا وجود پانچ ہزار سال سے کم نہیں ہے۔ "جاتک کتھا" کا زمانۂ تحریر گوتم بدھ کے بعد کا زمانہ ہے جو پانچ ہزار سال قبل از مسیح کا زمانہ ہے دنیا کی پہلی تنقیدی تصنیف "بوطیقا" کی اشاعت

کو بھی ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اس طرح تنقید کی تاریخ بھی تحریری ادب کی تاریخ سے کم پرانی نہیں ہے۔ افلاطون (۴۲۷ء ، ۳۴۷ ق م) نے اپنی تصنیف "جمہوریہ" میں کئی جگہ تنقیدی اشارے کیے ہیں اور ارسطو کی "بوطیقا" (۳۸۵ - ۳۲۲ ق م) اور بھرت منی کی "ناٹیہ شاستر" تو قطعی تنقید کی کتابیں ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ تنقید فضول شے ہے۔ اور تخلیق کی تفہیم اور تحسین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فن (رقص، موسیقی، ڈراما اور شاعری) کی تخلیق کے ساتھ ساتھ نظریۂ فن بھی وجود میں آیا ہے اور فنی نظریات نے مختلف فنون کے نشو و نما اور ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کی مختلف ممالک کی تواریخ ادب شاہد ہیں کہ تخلیق (فن) اور تنقید (نظریۂ فن) شانہ بہ شانہ ترقی کرتی اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

تخلیق کی اوّلیت اور تنقید کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ تنقید کی علاحدہ سے کوئی حیثیت ہے یا نہیں، یعنی تنقید، تخلیق سے الگ ہو کر اپنی کوئی حیثیت رکھتی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ناقدین میں اختلاف ہے۔ محمد حسن عسکری کا خیال ہے کہ تنقید کی حیثیت محض کائی کی سی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ تنقید نے اگر تخلیق سے الگ ہو کر ابھی تک اپنی علاحدہ شناخت اور خود مختارانہ حیثیت تسلیم نہیں کروائی ہے تو اس کے لیے خود ناقدین ذمّہ دار ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے تنقید کو آج تک تخلیق کا طفیلی اور تابع دار بنائے رکھا، یعنی تنقید کو تخلیق کے محاسن و معائب کے تذکرے اور فنی اور ادبی قدروں کے تعیّن سے آگے بڑھنے نہیں دیا، جبکہ تنقید کو اپنی علاحدہ شناخت منوا لینی چاہیے تھی۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ تنقید نے بیسویں صدی میں بہت حد تک اپنی حیثیت منوالی ہے اور اب تنقید کا مقصد محض کسی فن پارے کے محاسن و عیوب کی نشان دہی یا ادبی اور فنی قدروں کے تعیّن تک محدود نہیں رہا، بلکہ تنقید کے مقاصد میں زندگی کی معنویت کی تلاش اور حیات و کائنات کی تعبیر و تشریح بھی شامل ہو گئی ہے۔

تنقید کا ابتدائی مقصد تو وہی ہے جو تخلیق (یعنی ادب) کا ہے۔ ایک دور میں ادب کا مقصد محض تفریح طبع اور انبساط، اخلاقی تعلیم اور اصلاحِ معاشرہ تصوّر کیا جاتا تھا۔ اسی لیے میتھو آرنلڈ نے ادب کو تنقیدِ حیات قرار دیا، لیکن اب ادب کا مقصد محض تنقیدِ حیات نہیں، تعبیر و تشریح حیات بھی تصوّر کیا جاتا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے ادیب ادب کا یہی مقصد تصوّر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے ادب میں ہمیشہ حیات و کائنات کے مابعد الطبیعیاتی مسائل زیرِ بحث رہے ہیں۔ اس طرح تنقید کا مقصد بھی تخلیق کے مقصد کی طرح تشریح و تعبیرِ حیات ہو گیا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل اردو میں تنقید کا اتنا چرچا نہیں تھا۔ جتنا اس وقت ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی تک اُردو میں تخلیق کا زور تھا۔ بڑے بڑے ادیب بڑے پیمانے پر افسانے، ناول، نظمیں، غزلیں اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھ رہے تھے۔ ایسی بات نہیں کہ اس زمانے میں تنقید نگار نہیں تھے یا تنقیدیں نہیں لکھی جا رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں کلیم الدین احمد، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن عسکری، فراق، اعجاز حسین، سجاد ظہیر، احتشام حسین ،

ممتاز حسین اور ممتاز شیریں وغیرہ بڑے پیمانے پر تنقیدی مضامین لکھ رہے تھے، لیکن ان کے تنقیدی مضامین تدریسی نوعیت کے نہیں تھے اور نہ تنقید نے تخلیق کو اس کی مسند سے ہٹا کر خود اس پر قبضہ کر لیا تھا چنانچہ اس دور میں تخلیق اور تنقید شانہ بہ شانہ چل رہی تھی، لیکن سنہ کی دہائی کے بعد ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں صورتِ حال بالکل بدل گئی اور تخلیق کا زور ٹوٹتے ہی تنقید اُردو ادب پر چھا گئی۔ آج کے دور میں تنقید کا ادب پر مسلّط ہو جانے کی بہت سی وجوہ میں ایک وجہ حصولِ آزادی کے بعد اعلا تعلیم کا فروغ اور جامعات میں ایم۔اے کی کلاسوں میں تنقید کا لازمی پرچہ بھی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹریٹ کرنے کی آسانی اور لیکچرر شپ کے لیے ڈاکٹریٹ لازمی قرار پانے کی وجہ سے بھی اُردو میں تدریسی تنقید کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو کا ہر لیکچرر سند یافتہ ناقد بھی ہو گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جامعات کے ذریعے تنقید کے غیر معمولی فروغ سے ادب کو فائدہ پہنچا ہے یا نہیں؟ اور تدریسی تنقید کی افادیت ہے یا نہیں؟ جہاں تک تدریسی تنقید کی افادیت کا تعلق ہے اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ تنقید کے لازمی پرچے کی وجہ سے ادب کے طالب علموں میں نہ صرف مختلف تنقیدی نظریات سے واقفیت پیدا ہوتی ہے، بلکہ ان میں تنقیدی شعور اور شعر و ادب کی صحیح تفہیم و تحسین کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی جامعات میں تنقید نگاری کو غیر معمولی فروغ ہوا ہے اور وہاں تنقید کا ایک نیا اسکول پیدا ہوا جو "نئی تنقید" کے نام سے موسوم ہے، لیکن تدریسی تنقید کی بھی اپنی حدود ہوتی ہیں اور اسے صرف تنقید کی تدریس تک محدود رہنا چاہیے، اس لیے کہ اس نوع کی تنقید کا اوّلین مقصد طالب علموں کو اصل تصنیف کا متن پڑھانا اور اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا ہوتا ہے، چنانچہ ایسے مضامین صرف جامعات کے مجلّوں تک محدود رہتے ہیں۔ سنجیدہ اور خالص ادبی رسائل کی زینت نہیں بنائے جاتے، لیکن اُردو میں معاملہ اس کے . . . برعکس ہے۔ اُردو کا لیکچرر تنقید کے نام پر جو کچھ بھی لکھتا ہے اسے ادبی رسائل میں بھیج دیتا ہے اور ہمارے مدیرانِ کرام ایسے مضامین کو بڑی شان سے شائع کرتے ہیں۔ تدریسی تنقید کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ قطعی نصابی طرز کی ہوتی ہے اور اس میں وہ وژن نہیں ہوتا جو تنقید اور تنقید نگاری کے لیے ضروری، بلکہ لازمی ہے۔ تنقیدی بصیرت کے بغیر تنقید، تنقید نہیں ہوتی اور یہ بصیرت صرف ادبیات کے مطالعے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے لیے مختلف علوم و فنون کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے جو عام تدریسی ناقد کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے ایسے ناقدین کی تحریروں میں کوئی مفکرانہ گہرائی نہیں ہوتی اور ان کی تحریر کی سطحیت چھپی نہیں رہتی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُردو کے زیادہ تر اچھے نقّاد جامعات میں مدرس رہ چکے ہیں۔ صرف اُردو میں ہی نہیں، انگریزی اور دنیا کی دوسری زبانوں کے بڑے ناقدین اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تدریس کے پیشے سے وابستہ ناقد اچھے یا بڑے ناقد نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں تنقید میں بنیادی اہمیت تنقیدی بصیرت

کی ہے۔ یہ وصف جس ناقد میں جتنا زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی بڑا نقاد ہوگا، لیکن زیادہ تر مدرّس نقّاد کا چوں کہ اپنا کوئی ادبی نظریہ یا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر نہیں ہوتا اور وہ خود کو محدود دائرے میں محصور کر لیتے ہیں اس لیے ان کی تحریریں تدریسی تنقید کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتیں ورنہ کسی ناقد کا درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہونا نااہلی کا ثبوت نہیں ہے، لیکن تدریسی تنقید کو ادبی تنقید کا ہم پلہ قرار دینا بھی غلط ہے۔ اس وقت اُردو میں تنقید کے زوال کا ایک سبب تدریسی تنقید کی فراوانی بھی ہے۔

مختلف ادوار میں تنقید کے مختلف نظریے اور مسالک مقبول اور مروّج رہے ہیں۔ ان میں کلاسیکی تنقید، رومانی تنقید، تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، ساختیاتی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام تنقیدی نظریات کا مقصد ادب کی تفہیم و تحسین کے ساتھ ساتھ ادب پارے کی پرکھ کے لیے معیار مہیّا کرنا بھی ہے، چنانچہ یہ تمام تنقیدی نظریات اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں اور ادب میں ان کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن اُردو میں گذشتہ چند برسوں سے ایک خاص قسم کی تنقید عام ہو گئی ہے جسے عرف عام میں "تقریباتی تنقید" کا نام دیا جا رہا ہے۔ اسے آپ فرمایشی تنقید بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی ناقد یہ تنقید مصنّف کی فرمایش پر اس کی کتاب کے بارے میں لکھتا ہے۔ فرمایش پر لکھنا نہ کوئی عیب ہے اور نہ نئی بات۔ اُردو ادب میں اس کی روایت بہت پرانی ہے، لیکن ماضی میں اس کے لیے تنقید کے بجائے تقریظ کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی یعنی کسی کتاب یا تحریر پر رائے دیتے ہوئے اپنے دوست کی تعریف کرنا جبکہ تنقید سے مراد کسی ادب پارے کے عیوب و محاسن کا سراغ لگا کر اس کی فنّی قدر و قیمت کا تعیّن ہے، لیکن آج کے دور میں تقریظ اور تنقید کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباتی تنقید میں تنقید کے اصل منصب کو فراموش کر کے مصنّف کی صرف مدح سرائی کی جاتی ہے اور پھر اسے ہی تنقید نگاری کا اعلا اور بے مثال نمونہ قرار دے کر بڑے اہتمام کے ساتھ ادبی رسائل میں شائع کروایا جاتا ہے اور ہمارے ناقدین اپنی جھوٹ اور منافقانہ تنقید پر قطعی نہیں شرماتے بلکہ نہایت فخر کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ "میں نے فلاں شاعر یا فلاں افسانہ نگار کے بارے میں اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ جھوٹ کا پلندا ہے" اس تنقید کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں مصنّف کی بڑی سے بڑی خامی اور کوتاہی سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور مصنّف کو دَورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر یا افسانہ نگار قرار دیا جاتا اور اس کی تعریف میں ایسی صفات استعمال کی جاتی ہیں جو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے لیے بھی بہت کم استعمال میں آتی ہیں۔ اگر کسی اللہ کے بندے سچّے ناقد نے کسی مصنّف یا تصنیف کے بارے میں سچ سچ باتیں لکھ دیں اور مصنّف کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بعض کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کر دی تو صاحبِ کتاب نہ صرف اس سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے بلکہ اس پر الٹا تقریب کو خراب کرنے کا الزام عائد کر دیا چنانچہ اب ایسے تنقیدی مضامین میں صرف کتاب اور صاحبِ کتاب کی تعریف

میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور ایسے ہی آج کے دور میں تنقید کہا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کا سنجیدہ ادبی حلقوں میں ردِ عمل ظاہر ہونا شروع ہو چکا ہے اور سوال کیا جا رہا ہے کہ تنقید کا مقصد تو ادب پارے کی پرکھ کے لیے معیار مہیّا کرنا ہے۔ یہ کس قسم کی تنقید ہے جس کا مقصد صرف مصنفین کی مدح سرائی ہے؟ آخر کسی ادب پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے اس تنقید کے پاس کیا معیار ہے؟

میرے خیال میں اردو میں تنقید کے زوال کی دوسری سب سے بڑی وجہ تقریباتی تنقید ہے۔ اس گمراہ کن اور منافقانہ تنقید نے نہ صرف نو آموز ادیبوں کو گمراہ کیا، بلکہ کہنہ مشق مصنفین کی کوتاہیوں کی نشان دہی سے گریز کر کے انھیں بھی ان کی کمزوریوں سے بے خبر رکھا۔ اس تنقید کی وجہ سے ناقدین سہل انگاری کے شکار ہو گئے اور عصرِ حاضر کے زندہ مسائل اور موضوعات پر لکھنے سے جی چرانے لگے اور خود کو صرف ان کتابوں یا مصنفین کے تذکرے تک محدود کر لیا جو ان کے حضور میں حاضر ہو کر مضامین لکھنے کی درخواستیں کرتے ہیں۔ ان باتوں کا اثر یہ ہے کہ علمی اداروں سے شائع ہونے والے مجلّوں سے قطع نظر کوئی بھی ادبی جریدہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں اکثریت ایسے تنقیدی مضامین کی ہوگی جو یا تو کسی کتاب کی اجرائی تقریب کے لیے لکھے گئے ہیں یا پھر کسی ادیب کے اعزاز میں منائی جانے والی شام کے لیے۔ ان رسائل میں شاذ و نادر ہی ایسے مضامین نظر آئیں گے جو ادبی مسائل یا ادبی اصول اور نظریے کے بارے میں ہوں۔ اردو میں خواہ کتنا ہی اہم ناول اور شعری اور افسانوی مجموعہ کیوں نہ شائع ہوا ہو یہ ناقدین اس کی جانب توجہ تک دینا ضروری تصوّر نہیں کرتے اور نہ اپنی مرضی سے اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں۔ اردو میں تنقید کے زوال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اب رسائل و جرائد میں ادبی نظریے سے بحث و تمحیص کا سلسلہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا زور ٹوٹنے، جدیدیت کی شدّت میں کمی آنے۔ اسلامی ادب کی بحث کا از رفتہ ہو جانے اور محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اب کوئی ایسا ناقد نہیں رہا جو کسی نئے ادبی اور نظریاتی مباحث کا آغاز کرے۔ محمد حسن عسکری اور سلیم احمد اسکول کے ناقدین کی جانب سے رینے گینوں کے حوالے سے مغرب کو مسترد کرنے اور مشرق کی عظمت کا راگ الاپتے ہوئے تصوف میں پناہ لینے کی تلقین کے باوجود اس کا تخلیقی ادب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوا ہے۔ ابتدا میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تردید میں ادب کے ادبی اور غیر ادبی معیار کی بحث شروع کی تھی لیکن ادب میں اپنی جگہ بنا لینے اور اپنی شناخت منوا لینے کے بعد وہ بھی میرؔ اور غالبؔ کے کلام کی شرح لکھنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ہندستان میں گوپی چند نارنگ کی اسلوبیاتی تنقید کی بحث زیادہ نہ چل سکی۔ باقر مہدی، وارث علوی اور فضیل جعفری کی ترقی پسندوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے کے باوجود وہ کوئی نیا ادبی نظریہ نہیں پیش کر سکے۔ پاکستان میں زمین کے حوالے سے قومی اور تہذیبی تشخص کی بحث چند سال کے بعد ختم ہو گئی اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ آج کے دور کی تنقید کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ نظریہ سازی

کررہی ہے اور نہ عہد کے تقاضے پوری کررہی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اجرائی تقاریب میں پڑھے جانے والے تمام تنقیدی مضامین ایک جیسے اور غیر معیاری ہوتے ہیں؛ کسی تنقید کے بارے میں فیصلہ تو صرف اس کے معیار ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ جہاں بھی پڑھی جائے۔ اس سوال میں یقیناً وزن ہے اور اس پر ضرور غور کیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ یقیناً معدودے چند ایسے ناقدین ہیں، جو مصنف سے تعلقات اور مراسم کی پروا کیے بغیر صاف اور سچی باتیں لکھتے ہیں، لیکن ایسے ناقدین کو اولاً تو اجرائی تقریب میں مدعو نہیں کیا جاتا اور اگر مدعو کیا جاتا ہے تو عین وقت پر انھیں پڑھوایا نہیں جاتا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ایک معروف ادیب نے سلیم احمد سے اپنی کتاب کی اجرائی تقریب کے لیے مضمون لکھوایا اور انھیں جب معلوم ہوا کہ اس میں ان کی تعریف کے ساتھ ساتھ بعض فنی کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے تو انھوں نے سلیم احمد سے مضمون نہیں پڑھوایا۔ میری دانست میں صرف ایک شاعر کی ایک ایسی مثال ہے، جنھوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ سلیم احمد نے دیرینہ دوستی کے باوجود انھیں نہیں بخشا ہے، اپنی کتاب کی اجرائی تقریب میں ان سے مضمون پڑھوایا اور انھیں دل کھول کر داد دی۔ ایسا ظرف کتنے ادیبوں میں ہے؛ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اجرائی تقاریب میں پڑھے جانے والے اچھے اور برے تنقیدی مضامین کے درمیان فرق کرنا چاہیے اور تقاریب میں پڑھے جانے والے تمام مضامین کو یکسر قلم زد نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس دلیل کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن ہمارے بامروت مشرقی معاشرے میں ایسے ناقدین بہت کم ہیں جو نجی مراسم، سماجی تعلقات اور ہر قسم کے تکلفات کو ایک طرف رکھ کر کسی ادب پارے کے بارے میں سچی اور بے لاگ رائے کے اظہار کی جرأت رکھتے ہیں۔ نظیر صدیقی نے اس ضمن میں بڑی اہم بات لکھی ہے کہ "دیانت دارانہ اختلاف رائے۔ بڑی صلاحیت، بصیرت، جرات، دیانت اور ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ اختلاف رائے ایک قسم کی بغاوت سہی، لیکن یہی بغاوت انسان کو دیدہ دلیری اور پیغمبری کے درجے تک پہنچاتی ہے۔" ہمارا نقاد پیغمبری کے جھنجھٹ میں پڑنے کے بجائے اپنی مصلحت کوشی میں ہی خوش ہے پیغمبری کے درجے تک پہنچنے کا راستہ خشت باری اور آزمائشوں سے ہوکر گزرتا ہے۔ اور ہمارا نقاد یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پبلک ریلیشنگ کے اس دور میں مصلحت کوشی آج کے نقاد کا شیوہ بن چکا ہے اور وہ تقاریب کے لیے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں جس دیدہ دلیری کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے نہیں بولتا۔ ایسی صورت میں تنقید کے زوال کی اگر کسی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو یہ تدریسی اور تقریباتی تنقید لکھنے والوں پر ہوتی ہے ان کے سوا کسی اور پر نہیں۔ ❖

بلراج کومل

E-139 KALKAJI,
NEW DELHI-110019

میں رقم کرتا ہوں لمحہ لمحہ کوئی صبح نگاریں
کوئی جلتا دن، کوئی تازہ تصادم
خون کی جولانیوں میں
کوئی ڈھلتی شام، جشنِ وصل کی یا
قتل کی، اسرار کی کوئی نسردہ یا فروزاں
موجِ شب

اک صحیفہ ہیں یہ میرے ذہن و دل آویزشوں کا
نت نئی بنتی بگڑتی صورتوں کا
آرزو کی تشنگی کا
جسم کی سیرابیوں کا
تیرہ غاروں، دور کے مبہم ستاروں سے لپکتے
خنجروں کا
کون ہے؟ کوئی تو ہے زیرِ زمیں
کون ہے؟ کوئی تو ہے
آسماں میں یا کہیں پنہائیوں میں
ماورائے آسماں

روز و شب آواز دیتا ہے مجھے
روز و شب آواز دیتا ہے مجھے
گونجتی ہے چار سو
اک صدائے کارِ خاک
اک صدائے آسماں
اک صدائے ماورائے آسماں

آنکھ کی نعمت عطا کی تھی خدا نے
آنکھ کے دم سے ہوا تھا خلقِ رنگِ کائنات
مضطرب ہوں میں ازل سے
میرا نقشِ ناتمام
دیدۂ تاریک کا صیدِ نہاں
حرفِ ناگفتہ
بیاضِ بدگماں۔

قاصر مجیبی
25/B,ZAKARIA STREET,
CALCUTTA-700073.

ٹوٹے پھوٹے خواب بہت ہیں
جینے کے اسباب بہت ہیں

خواہش کی ہر ڈال سے پنچھی
اُڑنے کو بیتاب بہت ہیں

اُن پر کیسی رُت آئی ہے
اب کے وہ شاداب بہت ہیں

کچھ بادل ایسے برسے تھے
اب بھی ہم سیراب بہت ہیں

گاؤں میں ممتا تنہا تنہا
شہروں میں احباب بہت ہیں

ٹیس اُٹھے تو کاغذ رنگنا
رونے کے آداب بہت ہیں

مت دیکھو قاصر کی آنکھیں
تہ در تہ سیلاب بہت ہیں

ہارون فراز
8671,BELBAGH-
MALIGAON-423202.

اُداس خوشبو بھٹک رہی ہے اُداس پھولوں کے قافلے ہیں
نظر نظر میں ہیں زخم پنہاں سُلگتے خوابوں کے سلسلے ہیں

چراغ کوئی نہ سر اٹھائے دمکتے چہروں کو ماند کر دو
شجر اُمیدوں کے کاٹ ڈالو سیاہ راتوں کے فیصلے ہیں

سُلگتا موسم، برہنہ شاخیں، ستم کی آندھی، شکستہ بازو
ہزار ٹوٹیں بلائیں لیکن جواں پرندوں کے حوصلے ہیں

پڑے ہیں نفرت کے بیج دل میں برس رہا ہے لہو کا ساون
ہری بھری ہیں سروں کی فصلیں بدن پہ زخموں کے گل کھلے ہیں

فراز رنگت اڑے گی اپنی بنیں گے خوابوں کا ہم بھی حصّہ
قدم قدم پر بچھڑتے رستے، بکھرتی سانسوں کے مرحلے ہیں

پروفیسر عنوان چشتی

B.117,Jamia Nagar,
NEW DELHI-25.

شاہ نصیر

شاہ نصیر اپنے دور کے ان باکمالوں میں شامل ہیں۔ جنھوں نے اپنے دور کی شاعری اور لسانی محضر پر اپنے فکر و فن کی مہر لگائی ہے۔ اور اردو بازار سے لے کر قلعۂ معلی کے دربار تک پورے منظر نامہ کو متاثر کیا ہے۔ یادش بخیر یہی وہ شاہ نصیر ہیں، جن کے تلامذہ میں بہادر شاہ ظفر، شیخ ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن اور نواب الٰہی بخش خاں معروف شامل ہیں۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے علاوہ اس دور کے اکثر بڑے اور ممتاز شاعر، شاہ نصیر کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔

شاہ نصیر کی پیدائش کا صحیح سنہ تو معلوم نہیں۔ قیاس ہے کہ ان کی پیدائش ۱۱۷۵ھ کے قریب ہوئی تھی۔ لفظ شاہ نام کا جز ہے، جو تصوف اور سادات سے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ شاہ نصیر کے والد کا نام شاہ غریب اللہ عرف شاہ غریبؒ تھا۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے صوفیہ میں ہوتا تھا۔ جو شاہ صدر جہاںؒ کی اولاد میں تھے۔ اس طرح شاہ نصیر نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی، جو تہذیب و تصوف کا گہوارہ تھا۔ کہتے ہیں، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، شاہ نصیر کو ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ اور وہ بچپن ہی میں شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ایک روایت کے مطابق شاہ محمدی مائل کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ نصیر نے شاعری اور زبان کے میدان میں وہ گل کھلائے کہ اردو زبان آج تک ناز کرتی ہے۔ شاہ نصیر نے اپنی خداداد صلاحیت اور محنت کا سکہ دہلی میں تو جمایا ہی تھا، لکھنؤ اور حیدرآباد میں بھی اپنی زبان دانی اور قادر الکلامی کا لوہا منوایا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ اور دہلی کا کئی بار سفر کیا تھا۔ حیدرآباد کے آخری سفر میں وہیں کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" (۱۲۵۴ھ) سے تاریخ وفات نکالی ہے جس سے ۱۲۵۴ھ برآمد ہوتا ہے۔

یوں تو متعدد تذکروں میں شاہ نصیر کے سوانحی اشارے بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شاہ نصیر کا جو قلمی چہرہ لکھا ہے، وہ اپنی جگہ بہت دلکش ہے اور اہم بھی۔ آزاد لکھتے ہیں

> "شاہ صاحب نہایت نفیس الطبع اور لطیف مزاج تھے۔ خوش پوشاک و خوش لباس رہتے تھے۔ اور اس میں ہمیشہ ایک وضع کے پابند تھے۔ جو دہلی کے قدیمی خاندانیوں کا قانون ہے۔ ان کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت اور ادب پیدا کرتی تھی۔ وہ اگرچہ رنگت کے گورے نہ تھے۔ مگر نور معنی سر سے پانو تک چھایا ہوا تھا۔ بدن

چھریرہ اور کشیدہ قامت تھے۔ جس قدر ریش مبارک اور وجاہت ظاہری کم تھی، اس سے ہزار درجہ خلعت کمال نے شان وشوکت بڑھائی تھی۔ بعض معرکوں یا بعض شعروں میں وہ اسی بات پر اشارہ کرتے تھے، تو ہزار حسن قربان ہوتے تھے۔"

تو یہ تھے شاہ نصیر، جن کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت اور ادب پیدا کرتی تھی۔ اور اس عظمت کی بنیاد کمالِ فن پر تھی، جس کا دائرہ زبان اور شاعری دونوں پر محیط ہے۔

شاہ نصیر ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اُس دور میں فنی اور لسانی آگہی نیز قادر الکلامی کی زبردست اہمیت تھی۔ شاعر کی عظمت کا انحصار اس پر تھا کہ وہ بدیہہ گوئی اور قادر الکلامی کے میدان میں کس پایے کا ہے۔ چنانچہ شاہ نصیر ایک ایسے شاعر ہیں، جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اُن کے کلام میں مشکل اور سنگلاخ زمینوں اور اجنبی قوافی کا خاصا ذخیرہ ہے۔ نامانوس بحروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ شاہ نصیر لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے نئے انداز کی زمینیں تراشیں۔ جن کے ردیف وقوافی اس نوع کے تھے۔

چمن سُرخ ترا		دہن سُرخ ترا

یا

فانوس ہیں گویا		مانوس ہیں گویا

اور ان سے بھی زیادہ ٹیڑھی زمین

کفن کی مکھی		سخن کی مکھی

وغیرہ زمینوں میں غزلیں پڑھیں۔ لکھنؤ کے اربابِ کمال متوجہ ہوئے۔ اور ناسخ و آتش سے معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ غرض دلی ہو یا حیدر آباد، کوئی اور شہر ہو یا لکھنؤ شاہ نصیر نے اپنی استادی کی دھاک بٹھادی۔

قادر الکلامی اور بدیہہ گوئی کا ذکر آگیا ہے تو ایک واقعہ پیش کرتا چلوں۔ اس زمانے کی دلی میں ایک مشہور طوائف تھی۔ جو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ متموّل بھی تھی۔ اس کو سیر سپاٹے کا شوق تھا۔ چنانچہ سیر کی غرض سے اس نے ایک خوبصورت اور زرق برق رتھ بنوایا۔ جس پر یہ سوار ہو کر نکلتی تھی۔ دلی میں اس رتھ کا چرچا عام تھا۔ ایک دن یہ طوائف اپنے رتھ پر سوار ہو کر دلی کے بازاروں کی سیر کو نکلی۔ خلوقِ خدا بھی اُمنڈ پڑی شاہ نصیر اور ان کے ایک شاگرد بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر تماشائیوں میں تھے۔ شاگرد نے اس صورت حال پر استاد سے شعر کہنے کی درخواست کی۔ استاد کے سمندِ ذوق پر تازیانہ لگا۔ اور فی البدیہہ یہ قطعہ موزوں کر دیا۔ آپ بھی سُنیے۔

اُس کے رتھ کا کلس سنہری دیکھ		شب، کہا ماہ نے یہ پرویں سے

بہرِ پرواز یہ نکالی ہے		چونچ بیضے سے مُرغِ زریں نے

اس طرح کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ جن سے شاہ نصیر کی قادر الکلامی، بدیہہ گوئی ذہانت اور ذہنی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے شاہ نصیر کی ان خصوصیات کو میناکاری کا نام دیا ہے۔ انھوں نے کُلیات شاہ نصیر کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"شعر کی ظاہری فن کاری کو صرف افکار سے وابستہ کرنا صحیح نہیں وہ اسلوب سے بھی متعلق ہے۔ انسان کے تخلیقی جذبے نے مختلف ادوار میں مختلف رُوپ اختیار کیے ہیں۔

کہیں وہ دیوزادوں کا تخیل بن کر سامنے آتا ہے، اور کہیں صناعوں کی میناکاری۔ شاہ نصیر کی شاعری اسی میناکاری کے دائرہ میں آتی ہے "۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ نصیر نے شاعری کے خارجی اور ظاہری پہلو پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ ان کا یقین تھا کہ شعر کی جمالیات میں اس کی ہیئت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے لسانی، قواعدی، عروضی اور فنی قاعدوں اور ضابطوں کو بطور خاص اپنی شاعری میں برت کر دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو دنیا ان کا کلام سند میں پیش کرتی ہے۔

شاہ نصیر نے اپنے کلام کو عروضی، فنی اور لسانی صحت کا آئینہ بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے روزمرہ اور محاوروں کو لسانی اصولوں کی روشنی میں صحیح انداز سے برتنے پر زور دیا۔ عروضی نکات کا خیال رکھا اور فنی چابک دستی کو شاعری کا لازمہ قرار دیا۔ قدیم دبستانِ تنقید کی بنیاد عربی و فارسی شعریات پر ہے۔ جس میں علم بدیع، بیان اور معانی کی خاص اہمیت ہے۔ زبان اور قواعدِ زبان کے ساتھ عروضی مسلمات کا احترام اور ان پر پوری طرح عمل درآمد بھی ضروری ہے۔ شاہ نصیر نے ان تمام باتوں کو اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا۔ مثلاً

دل تجھے، یار کی کیوں زلف کا سودا ہوتا — تو اگر، آج کو سیکھا کوئی لٹکا ہوتا
قیس آوارہ بیاباں میں نہ پھرتا ہوتا — کاش سایہ بھی مرے ساتھ نہ میرا ہوتا

سنبل کو میں اُس زلف کے ہم سر نہیں پاتا — شمشاد کو قامت کے برابر نہیں پاتا
جز دیر و حرم، کوئی ترا گھر نہیں پاتا — میں خانۂ دل سے تجھے باہر نہیں پاتا

زندگی ہوتی نہیں، مرنا مقدر ہو چکا — کیا اُمید اس کام کی، جو کام ابتر ہو چکا
دیکھیے ہوگی صفائی کیونکر اے آئینہ رو — تیرے ہاتھوں سے تو دل اپنا مکدّر ہو چکا

ہم ہیں مُریدِ سلسلۂ عشق، ناصحا — دامن کشاں ہے خانۂ زنجیر کی صدا
محوِ خیال خط کی ترے ہے زبان بند — سرسبز کیا ہو، طوطیٔ تصویر کی صدا

ان اشعار میں اگرچہ فنکارانہ جمال آفرینی پر خاص توجہ ہے۔ لیکن یہ معنویت کے حسن سے بھی خالی نہیں ہیں۔ جن میں سنبل و زلف، قیس و بیاباں، شمشاد و قامت، دیر و حرم، آئینہ و دل عشق و زنجیر اور خط و تصویر کے استعاروں میں شاہ نصیر نے ایک طرف تہذیبِ عاشقی کو مجسّم کیا ہے۔ اور دوسری طرف اُس دور کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار اور سماجی معنویت کو اُجاگر کیا ہے۔ شاہ نصیر کی شاعری کو، اگر ان کے اپنے دور کے سیاق و سباق میں رکھ کر پڑھا جائے، اور اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں پرکھا جائے تو ایک طرف ایک نئے جہانِ معنی کا انکشاف ہوگا۔ اور دوسری طرف ان کی خارجی میناکاری یا جمال آفرینی کے پردے میں نئی تہذیبی معنویت جلوہ گر ملے گی۔

شاہ نصیر کے کلام میں سنجیدہ افکار رقص کرتے ہیں۔ جن میں متصوفانہ خیالات اور تہذیبی اقدار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ شاہ نصیر نے زبان اور اسلوب کی صحت پر توجہ دی ہے۔ لیکن یہ کیا

کم ہے کہ انھوں نے افکار و اقدار کا نگار خانہ سجانے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی عام طور پر شاہ نصیر کو کلاسیکی انداز کا شاعر کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ابھی تک ان کے کلام کا ہمدردانہ تجزیہ نہیں ہوا ہے۔ اُردو کے بعض ناقد نومولود افسانچہ نگاروں اور نابالغ تشاعروں پر تو مشق ناز کرتے ہیں۔ لیکن اپنے کلاسیکی سرمایے سے صرف نظر کرتے ہوئے نہیں جھجکتے۔ انھوں نے کلاسیکی شاعری بلکہ ادب کے خلاف ایک فضا بنا دی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہ نصیر اور ان کے معاصرین کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے، اور ان کے افکار و اقدار کی نُدرت اور فنکارانہ نصرت تک رسائی حاصل کی جائے۔ (بشکریہ ال انڈیا ریڈیو)

شرر فتحپوری

FATEHPURI (KURUKSHETRA)

132024

نلسن منڈیلا

(۷۰ ویں سالگرہ)

۱

ایک چوتھائی صدی بیت گئی!

وہی زنداں کی سلاخیں ہیں، وہی زنجیریں

وہی قانون کے پہرے ہیں، وہی تعزیریں

سطوتِ جبر وُہی، ظلم کی ایجاد وُہی

حلقۂ دام وُہی، حکمتِ صیاد وُہی

۲

عمر کا پچھلا پہر ہے یارو!

دُور منزل ہے سفر باقی ہے

جانے کس موڑ پہ تھک کر رہ جاؤں!

مجھ سے لے لو، یہ مری جہدِ مسلسل کا علَم

بر لبط و سازِ مرا، لوح و قلم

۳

معرکہ گرم ہے آزادی کا

یہ گراں باریٔ زنجیر ہے کیا؟

طوق برداریٔ تعزیر ہے کیا؟

توڑ کر حلقۂ زنداں نکلو

ہمت و جرأتِ احرار لیے

شعلۂ جذبہ پیدا کیے

۴

آؤ! آزادیٔ جمہور کا پرچم لے کر

قہر و غارت کی کمیں گاہوں پر،

بڑھ کے یلغار کریں

نسل اور رنگ کی دیواروں کو

مل کے مسمار کریں

اور اک ضربِ گراں،

ضربِ گراں،

ضربِ گراں

مسعود احمد برکاتی
EDITOR NAUNEHAL MONTHLY,
HAMDARD FOUNDATION,
NAZIMABAD,
KARACHI-18
(PAKISTAN)

بچے اور کلاسیکی ادب

بچے جب پڑھنا سیکھ لیتے ہیں تو اُن کو کتابیں پڑھنے میں مزہ آنے لگتا ہے۔ کتاب کا مطالعہ ان کے لیے ایک ذہنی تجربہ ہوتا ہے۔ یہ تجربہ ان کے دوسرے تجربات سے مختلف ہوتا ہے۔ کتاب کی دنیا اس کی دیکھی ہوئی برتی ہوئی دنیا سے الگ ہوتی ہے۔ اس کو اپنے ساتھیوں اور بھائی بہنوں سے ملنے جلنے اور کھیلنے میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کتاب پڑھنے کی مسرت مختلف ہوتی ہے۔ کتاب کی سیر اس کو وسیع تر دنیا میں لے جاتی ہے۔ مختلف قسم کے لوگوں سے ملواتی ہے۔ کتاب اس جستجو کی تسکین ہی نہیں کرتی اس کو بڑھاتی بھی ہے۔ بچے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ اور مہم جوئی کے جذبے کی تسکین کرتی ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو بھول کر کتاب کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جب کتاب ختم ہوتی ہے تو وہ اس طلسم سے باہر آتا ہے جس سے وہ باہر آنا نہیں چاہتا اور وہ بہت جلد ایک اور کتاب حاصل کر کے پھر اسی دنیا میں کھو جانا چاہتا ہے۔ یہ لمحہ اور یہ مرحلہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اگر ہم اس وقت محنت کریں اور بچے کے مطالعے کو صحیح رخ پر ڈال دیں تو ہم اسے ایک بڑا آدمی بنا سکتے ہیں۔

اگر ہم اس زمانے میں بچوں کو صحیح اور اچھی کتابیں پڑھا سکیں اور اس کے ذوقِ مطالعہ کی تربیت کر سکیں تو ہم بڑا کام کریں گے۔ یہ تو ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ بچوں کو جبر کر کے نہیں پڑھایا جا سکتا۔ جبرًا اور امتحان میں کامیابی کے نام پر جو کتابیں پڑھوائی جاتی ہیں وہ ذہن میں کس حد تک رہتی ہیں اس کا اندازہ تو ہمیں آج کے سند یافتہ اور فارغ التحصیل افراد کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ سند لینے کے بعد مطالعے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اکثریت کتاب سے واسطہ نہیں رکھتی۔ گویا کتاب کا تعلق امتحان اور سند سے تھا اور سند کمانے کا پرمٹ ہے۔ علم و دانش اور تہذیب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ درس گاہ کی تعلیم تو تعلیم حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے اور یہ سکھاتی ہے کہ علم کیسے اور کہاں سے ملتا ہے۔ درس گاہ سے رخصت ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ اب علم کے دروازے بند ہو گئے بلکہ درس گاہ سے باہر آنے کے معنی یہ ہیں کہ اب علم کی بے کنار دنیا کے دروازے طالب علم پر کھل گئے۔ لیکن اس طرزِ فکر کی بنیاد بچپن ہی میں ڈالی جا سکتی ہے۔ کتاب کے مطالعے کی مسرت سے روشناس کرانے میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ابتدا ہی میں بچوں

کو معیاری کتابیں پڑھوانی چاہییں۔ جس بچے کو بچپن میں معیاری ادب میسر آگیا اس کی زندگی سنور گئی اور اپنی آیندہ زندگی میں علم کے نئے نئے افق تلاش کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔

بچے کا کوئی ماضی نہیں ہوتا یا بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس کے لیے پچھلی باتوں میں کوئی کشش نہیں ہوتی۔ وہ حال ہی میں دل چسپی لیتا ہے۔ اس لیے بچوں کی کتابوں کے ذخیرۂ الفاظ اور مواد کے انتخاب میں بڑی توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ جن چیزوں کے نام لکھے جائیں وہ بھی وہ ہوں جن کو وہ دیکھتا ہو۔ برتتا ہو یا دیکھ سکتا ہو۔

ان چیزوں کا ذکر نہ کیا جائے جو اب متروک ہیں بعض اشیا آج تو ہو جاتی ہیں، لیکن ان کا رواج صرف بڑے شہروں یا مخصوص طبقے تک محدود ہوتا ہے۔ بالکل چھوٹے بچوں کے ادب میں ان اشیا کا حوالہ بھی نہ آئے تو اچھا ہے۔

فنِ طباعت کی ترقی نے تصاویر کی شمولیت و اشاعت کو سہل بنا دیا ہے۔ اس سے یقیناً فائدہ اٹھانا چاہیے۔ پُرکشش اور واضح تصاویر بنوانی چاہییں۔ تصویروں سے بچوں کو بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ تصویروں کی مدد سے وہ الفاظ کے حقیقی مفہوم تک نہ صرف آسانی سے پہنچ سکتے ہیں بلکہ وہ مفہوم حافظے میں محفوظ بھی رہ جاتا ہے۔

الفاظ بھی ممکن حد تک وہ لیے جائیں جو بچہ بولتا یا کم سے کم سنتا رہتا ہے۔ غیر مانوس الفاظ سے دلچسپی میں کمی ہو جاتی ہے، تاہم یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی کم مانوس یا نیا لفظ استعمال ہی نہ کیا جائے۔ نئے الفاظ بھی بہر حال سکھانے یا یاد کرانے ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے الفاظ کا تناسب اتنا زیادہ نہ ہو کہ بچے کو تمام عبارت ہی نامانوس معلوم ہونے لگے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جس محفل میں جانے پہچانے لوگ زیادہ ہوں اور نئے لوگ کم ہوں وہ محفل مجموعی طور مانوس معلوم ہوتی ہے۔ اور چند نئے لوگ بھی ایسی محفل میں کھپ جاتے ہیں، لیکن جس محفل میں اجنبی لوگوں کی اکثریت ہو اور متعارف لوگوں کی اقلیت، وہ محفل، غیر کی محفل معلوم ہوتی ہے الفاظ بھی زندہ وجود رکھتے ہیں۔ الفاظ بھی اپنے اور پرائے ہوتے ہیں۔ ان میں بھی دوست اور دشمن ہوتے ہیں۔ بچہ دوستوں اور رفیقوں کی محفل میں دلچسپی لیتا ہے، انجانے لوگوں سے گھبراتا ہے۔ اس کو مانوس و معروف الفاظ سے نامانوس الفاظ کی طرف بتدریج لے جانا چاہیے۔ بچوں کے لیے لکھی جانے والی تحریروں کو لکھنے کے بعد ایک بار نہیں کئی بار محض اس خیال سے پڑھنا چاہیے کہ کن الفاظ کو مزید سہل الفاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔

ادب عالیہ یا کلاسیکی ادب کی اہم خصوصیات میں ان کی آفاقیت اور طویل مدت مقبولیت بھی شامل ہیں۔ اس کا مواد ایسی ثقافت میں رچا بسا ہوتا ہے جو مخصوص خطّے اور قوم سے متعلق ہونے کے باوجود عمومیت اور وسعت رکھتی ہو۔ کلاسیکی ادب میں جو زندگی منعکس ہوتی ہے اس میں دائمی پہلو ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب کی زبان بھی جمالیاتی ہم آہنگی اور حسن کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید کا معیاری امتزاج رکھتی ہے۔ بچہ جب اپنے دور کی زبان کا ابتدائی ذوق پیدا کرے اور اس میں ہم عصر لکھنے والوں کی تحریروں سے کسی حد تک لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا

ہو جائے تو اس کو بتدریج کلاسیکی ادب کے مطالعے کی جانب لانا چاہیے۔

بچوں کے لیے کلاسیکی ادب کے ان حصوں اور پاروں کا انتخاب کرنا چاہیے جو اپنی طوالت کے لحاظ سے اکتا دینے والے نہ ہوں۔ حکایات، قصص اور کہانیوں سے اس کی ابتدا کرنی چاہیے۔ ذاتی مطالعے کی ابتدا بالعموم کہانیوں سے ہوتی ہے۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے کی تربیت کا ذریعہ بھی کہانیوں کو ہی بنایا جا سکتا ہے۔ کہانی میں واقعات سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ واقعات کے سہارے عجیب دغریب کردار بھی مانوس ہونے لگتے ہیں۔

کلاسیکی ادب کے مطالعے میں بچوں کے لیے ایک رکاوٹ اس کی زبان ہے۔ ظاہر ہے کہ کلاسیکی ادب اپنے مغز اور مواد کے علاوہ زبان کے لحاظ سے بھی اعلا سطح کا حامل ہوتا ہے۔ بچوں کے نقطۂ نظر سے زبان کی تسہیل ضروری ہے۔ مشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ اور نامانوس محاوروں اور تشبیہات و استعارات کے بجائے سادہ و سلیس الفاظ سے مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ زبان کا مجموعی مزاج اور معیار کا طرز نہ بدلنے کیوں کہ جب کسی تحریر کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے تو اس میں خیال اور معنیٰ کی آفاقیت وسعت، بلندی اور گہرائی کے ساتھ ہیئت اور اسلوب کی عمدگی بھی شامل ہوتی ہے، لہٰذا کلاسیکی ادب کے اختصار اور تسہیل میں معنی اور زبان دونوں کے معیار و مزاج کو مجروح ہونے نہ دینا چاہیے۔

بچوں کے لیے ادب عالیہ کے انتخاب میں اخلاقی پہلو کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ادب عالیہ اپنے مقصد کے لحاظ سے اخلاقی محاسن کا حامل ہوتا ہے، لیکن اس مقصد کے لیے کہانی اور کردار یا جذبات کے اظہار کے لیے بالغ پیرایۂ بیان، بچوں کے کچے ذہن کے لیے غیر مناسب ہو سکتا ہے۔ اس لیے بچوں کے لیے ایسے فن پاروں کا انتخاب کیا جانا چاہیے جو بظاہر بھی صاف ستھرے اور پاکیزہ ہوں۔ بچوں کو طلسم ہوش ربا کی کتابیں پڑھانے کی سفارش تو نہیں کی جا سکتی لیکن ایسی داستانوں میں لیسے بے شمار ضمنی ٹکڑے، قصّے اور حکایات مل سکتی ہیں، جو اُن کو چکھائی جا سکتی ہیں۔ منہ جل نہ جائے اس لیے ان میں نمک مرچ کم کرنا مناسب ہوگا۔ ان داستانوں میں جو تحیر، تجسس اور مسرت افزائی ہے ان سے بچوں کے احساسات وجذبات اور تخیل کی دنیا میں وسعت اور بلندی پیدا ہوتی ہے، اسی لیے بچوں کی ذہنی تعمیر اور کردار سازی میں قصے کہانیوں کی افادیت ساری دنیا میں مسلم ہے۔ ان کے مطالعے سے بچوں کی جذباتی نشو و نما اور ذہنی و نفسیاتی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کا علم بھی بڑھتا ہے۔ الفاظ کا ایک مختلف ذخیرہ ان کے سامنے آتا ہے۔ اس طرح ان میں اظہار خیال کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے۔ ان کے مطالعے سے بچے ادبی روایات کے ساتھ تہذیبی مزاج اور اقدار سے بھی مانوس ہوتے ہیں۔ آج کے ادب کی پشت پر جو تہذیبی اور لسانی روایات ہیں ان کا بھی بچوں کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلاسیکی ادب اور خصوصاً داستانوں کی تہذیبی اہمیت اور سماجی اہمیت بھی ہے۔ بقول گارساں دتاسی "باغ و بہار" اس زمانے کے تمدن و معاشرت کا آئینہ ہے اسلامی عقائد اور ضعیف الاعتقادیاں

رسم ورواج، طعام ولباس، مشاغل و معمولات، آداب و اخلاق غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ گارساں نے تو یہ بات باغ و بہار کے سلسلے میں کہی ہے۔ لیکن یہ بات دوسری اکثر داستانوں پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ فسانۂ عجائب، باغ اردو، رانی کیتکی، اخلاق ہندی، خرد افروز، توتا کہانی، آرائش محفل اور بیتال پچیسی میں زندگی سے بظاہر دوری کے باوجود زندگی کا عکس ہے۔ ان میں جہاں لطف بیان ہے وہاں اپنے دور کے سماج کی رنگا رنگ تصویریں بھی ہیں۔

نظم میں حالی، اسماعیل میرٹھی، اقبال، حفیظ، افسر، صوفی تبسم اور شفیع الدین نیر بچّوں کے کلاسیکی مطالعے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

کلاسیکی ادب کی ضرورت، افادیت اور اہمیت اپنی جگہ، لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ بچّوں کے مطالعے کی ابتدا عصری ادب سے ہی ہونی چاہیے۔ ایک طرف بچّے کی حال سے وابستگی اور واقفیت اس مطالعے کو دلچسپ اور بامعنی بناتی ہے دوسری طرف مروّج زبان کا استعمال مطالعے میں سہولت پیدا کرتا ہے اور بچّہ مطالعے کی پوری مسرّت حاصل کرتا ہے۔ مطالعے کا چسکا پڑنے کے بعد بچّہ آسانی سے پیچھے جاسکتا ہے اور اپنے بزرگوں سے مانوس ہوسکتا ہے۔

نصابی کتابوں میں کلاسیکی ادب کے انتخابات عام طور پر تاریخی ترتیب سے دیے جاتے ہیں۔ میر کے بعد غالب اور غالب کے بعد حالی اور اقبال، لیکن میری رائے یہ ہے کہ یہ ترتیب الٹی ہونی چاہیے، یعنی پہلے اقبال، پھر حالی، غالب اور میر۔

ظاہر ہے کہ زبان اور اسلوب ارتقائی منازل طے کرکے آج جس مقام پر ہیں ان سے بچّہ زیادہ مانوس ہے۔ صوفی تبسم کی زبان، غالب کی زبان کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ قابل فہم ہے، تو مانوس سے نامانوس کی طرف سفر ہی نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔

کلاسیکی ادب کے مطالعے کے بغیر ادب کا ذوق سیراب نہیں ہوتا اور ادب کا مطالعہ نامکمل رہتا ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت بچّوں کے ذہن نشین کرنی چاہیے اور ان کی ذہنی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ادب کی باریکیوں اور نزاکتوں سے مستفید ہوتے رہیں اور اعلا ادبی ذوق کی پرورش کرسکیں۔

احمد علی خاں
DEPT. OF PERSIAN,
SHYAM NANDAN COLLEGE,
MUZAFFARPUR

پروین اعتصامی فن اور شخصیت

ایران کے جدید شاعروں میں خانم پروین اعتصامی ایک بلند اور منفرد مقام کی حامل ہیں۔ حشمت موید کے مطابق ان کی پیدائش ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں تبریز میں ہوئی۔ بچپن میں ہی وہ ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئیں۔ چوں کہ ان کی پرورش بغیر ماں کے ہوئی اس لیے ان کے خیالات ایک مخصوص سیرت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھوں نے ایام طفولیت میں ہی اپنے والد مرزا یوسف خاں اعتصامی کے ساتھ تہران آکر مستقل سکونت اختیار کر لی، تہران ان کا وطن ثانی تھا۔ عربی و فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ان کے والد مشہور ادبی رسالے "بہار" کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور عربی کی متعدد کتابوں کے مترجم ہوکر ادبی حلقوں میں کافی نام پیدا کر چکے تھے۔ انھوں نے پروین کو فارسی اور مغربی ادب دونوں کی تعلیم دی اور اپنی فرانسیسی، ترکی اور عربی تصانیف کو فارسی جامہ پہنانے کی حوصلہ افزائی کی۔

پروین اعتصامی انگریزی تعلیم کے لیے امریکن گرلس کالج تہران میں داخل ہوئیں اور ۱۳۰۲ھ شمسی میں وہیں سے گریجویٹ ہوئیں۔ جشن فارغ التحصیل کے موقع پر انھوں نے "نہال آرزو" کے عنوان سے یہ نظم پڑھی ؎

ای نہال آرزو خوش زی کہ بار آوردہ ای
غنچہ بی باد صبا گل بی بہار آوردہ ای

پروین اعتصامی کی شروع کی نظمیں ادبی میگزین "بہار" میں شائع ہوئیں اور بعد کی نظمیں دوسرے فارسی جرائد میں۔ ملک الشعرا بہار کے مطابق آٹھ سال کی عمر ہی سے انھوں نے شاعری شروع کر دی تھی۔ کتاب "ماڈرن ایران" کے مصنف پروفیسر مولوی کے بیان کے مطابق پروین اعتصامی، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بڑی اچھی استعداد رکھتی تھیں۔ چنانچہ علوم مشرقی کے یورپین ماہرین بھی ان کے شاعرانہ اور عالمانہ کمالات کے معترف ہیں۔ وہ بڑی سنجیدہ اور باحیا خاتون تھیں۔

پروین کی زندگی کا سب سے دردناک واقعہ ان کی شادی خانہ بربادی ہے۔ تفصیل

تو معلوم نہیں لیکن ۱۹۳۴ء میں ان کی شادی چچازاد بھائی سے ہوگئی۔ لیکن یہ رشتہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا اور صرف ڈھائی مہینے کے بعد ہی طلاق کی نوبت آگئی۔ سسرال سے میکے چلی آئیں اور نو مہینے کے بعد طلاق یا خلع ہو گیا۔ پروین کے ان اشعار میں ان کے خونِ حسرت کی چھینٹیں محفوظ ہیں۔

ای گل تو ز جمعیت گلزار چہ دیدی
جز سرزنش و بدسری و خار چہ دیدی

اس سانحہ کے بعد ۱۹۳۸ء تک اپنے والد کے ساتھ رہیں۔ والد کی موت شاعرہ کے لیے ایک عظیم المیہ ثابت ہوئی اور جس کے غم پر وہ کبھی قابو نہ پا سکیں۔ والد کی موت کے صرف چار سال بعد یعنی ۱۹۴۱ء میں ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہوئیں اور ۳۴ برس کی عمر میں رحلت کر گئیں۔ انھیں "قم" میں سپردِ خاک کیا گیا۔

پروین جیسی بالغ نظر، پختہ گو اور لطیف بیان شاعرہ تو آج تک فارسی زبان میں پیدا نہ ہوئی۔ جوانی میں ہی حکیمانہ نظر کا پیدا ہو جانا عطیۂ خداوندی ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں جن ایرانی خواتین نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے ان میں پروین اعتصامی کو سب سے اہم جگہ دی جاتی ہے۔ ایران کے لیے ایسی باکمال شاعرہ یقیناً قابلِ فخر ہے۔ پروین کی کچھ بہترین نظموں میں ایک بغیر ماں کے بچے کے شدید رنج و غم کی عکاسی ملتی ہے۔ دوسرا اہم موضوع ماں کے پیار کی عظمت اور شان کا تذکرہ ہے۔ ان کی شاعری اخلاقی مضامین کی حامل ہے جن میں کہیں کہیں تصوّف کی بھی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ یہ مضامین بنیادی طور پر وہی ہیں جنھیں کلاسیکی شاعری بارہا دہرا چکی ہے۔ ان میں سے اکثر طرزِ بیان اور اندازِ نظر کی تازگی بھی نہیں رکھتے اور روایتی شاعری کی آواز بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی ان میں دورِ حاضر کا شعور جھلک اٹھتا ہے اور یہ ایک نئی معنویت اختیار کر لیتے ہیں۔ شعر و شاعری کی دنیا میں اوّل تو شاعرات بہت کم نظر آتی ہیں اور جو نظر آتی بھی ہیں تو ان کا کلام اتنا مختصر اور کمتر درجے کا ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ہی کھینچ تان کر دوسرے درجے کے شاعروں کی صف میں آتی ہیں اور اوّل درجے کے شاعروں کی صف میں کوئی بھی شمار نہیں ہوتیں۔ لیکن پروین اعتصامی ہر لحاظ سے ایک کامیاب شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنا مکمل دیوان شائع کیا۔ شاعرانہ خصوصیات کے علاوہ ان کے کلام کی مقدار ان کی شاعرانہ عظمت کی بین دلیل ہے۔ ان کا دیوان پانچ ہزار چھ سو چھے ابیات پر مشتمل ہے جس میں تقریباً دو سو نظمیں ہیں۔ چھوٹی نظمیں بہت کم ہیں۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کے علاوہ ستر ستر ابیات کی نظمیں دیوان میں شامل ہیں۔ پروین کے کلام کا مجموعہ "دیوان پروین" کے نام سے ان کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال کی تھی۔ زندگی میں ہی ان کی شاعرانہ عظمت اس حد مسلّم ہو چکی تھی کہ اکابر شعرائے ایران کے تذکرے پروین کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے اپنی مختصر عمر میں انھوں نے ایسی شہرت حاصل کی کہ شاہِ ایران رضا شاہ پہلوی نے ملکہ اور

شاہزادہ کی تعلیم کے لیے کئی بار منتخب کیا لیکن ہر بار انھوں نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ پروین اپنی قوّت شعر گوئی، قادر الکلامی، پختہ کاری، فن کاری، جوشش بیان، تاثیر کلام حکیمانہ افکار، واعظانہ پیغامات اور عارفانہ نکتہ پروری سے صف اوّل کے شاعروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ ملک الشعرا بہار ان کے دیوان کو "گلدستۂ روح نواز" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروفیسر مولوی "ماڈرن ایران" میں پروین کو FIRST RATE اور LITERARY GAINT شاعرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

دیوان پروین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پروین کا دیوان پیغامات کا ایک دفتر ہے پروین اپنے والد کی تربیت کے زیر اثر نہ صرف شاعرانہ کاوشوں کو بروئے کار لائیں بلکہ کلاسیکی اسلوب میں (جو وزن اور بحر کے پیچیدہ قوانین کی حامل ہے) زبردست مہارت حاصل کی پروین کی نظر بڑی نکتہ بین واقع ہوئی تھی۔ ان کو حقیر سے حقیر چیز میں بھی ایک نکتہ دکھائی دیتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں کوئی چیز بے حقیقت نہ تھی پروین نے اپنے پیغامات کو زیادہ تر مناظرہ یا سوال و جواب کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان کا دیوان قصائد، مثنویات، تمثیلات، قطعات اور مفردات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے والد کے مقبرہ کے کتبے کے لیے بھی کچھ اشعار کہے ہیں۔ پروین کے تمام قطعات میں نرگس و لالہ کے مناظر ہوں یا چند و طوطی کے مکالمے ایسے حکیمانہ اور عارفانہ بیانات ملتے ہیں جن سے عام لوگوں کو بھی انسانیت کا سبق ملتا ہے ؎

ہزار نکتہ ز باراں و برف می گوید
شگوفہ ای کہ در فصل بہار در چمن است

پروین نے اپنے قصائد میں سبک خراسانی کی پیروی کی ہے۔ خصوصاً ناصر خسرو کے اسلوب کا تتبع کیا ہے۔ مثنویات میں عطّار و رومی کے کلام کا خاص اثر ہے۔ قطعات میں انوری و سنائی سے متاثر ہوئی ہیں۔ بہرکیف ان کے دیوان میں اسلوب کی سادگی اپنی منفرد شان رکھتی ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ عمدہ و حسین ہے۔ پورے دیوان کی زبان نرم و نازک لطیف و رواں ہے شدید احساسات و جذبات کا اظہار شاذ و نادر ہی ہے۔ کلام میں زیادہ تر یکسانیت پائی جاتی ہے۔

جدید شعرا کا ایک دستہ روایتی اسلوب میں روایتی موضوعات پیش کرنے کا عادی ہے۔ دوسرا دستہ تازہ سماجی اور سیاسی مسائل پیش کرتا ہے۔ پروین کی زیادہ تر شاعری روایتی مفہوم پیش کرتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں مخصوص موضوعات کو روایتی ہیئت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ ان کے نئے موضوعات جدید شعرا سے بہت کم کم مشابہت رکھتے ہیں۔ ان انھوں نے اپنے وقت کے سیاسی حالات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ تازہ سماجی مسائل ان کی بہت کم نظموں میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں کے موضوعات و مفاہیم روزانہ زندگی کے عام حالات ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں ان کی شاعرانہ استعداد کی عکّاس ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ پروین ہی تھیں جنھوں نے فارسی شاعری میں عورتوں کی شمولیت کی راہ ہموار کی۔ ان میں سے اکثر جدید اسکول کی پروردہ ہیں۔ اور

موضوع و مواد دونوں میں جدّت کی طالب ہیں۔

پروین کی اکثر نظمیں نصیحت آموز، اخلاقی، معاشی اور حقیقت پسندانہ ہیں، عورت، معشوق اور شراب (جو فارسی شاعری کی روح ہیں) ان کی تخلیقات میں بالکل نا پید ہیں، تاریخی، صوفیانہ اور مذہبی خیالات وغیرہ پر بھی بہت کم توجہ کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دیوان میں بہت سے صوفیانہ اور مذہبی الفاظ و اصطلاحات موجود ہیں۔

پروین نے اپنے زمانے کی عورتوں کو نرم و نازک، محکوم و بے بس تصور کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان کا لہجہ بھی نرم و نازک ہے۔ جذبات کی تندی اور لہجے کا زور بہت کم ہے۔ خوشی و غم، محبت و نفرت کے اظہار میں بلا کی شدّت نہیں پائی جاتی۔ جذبات کو بلا واسطہ بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ الفاظ کا استعمال بھی اکثر بلا واسطہ ہے بالواسطہ نہیں انھوں نے اپنے ملک کی عورتوں کی اصلاح کی ضرورت شدّت سے محسوس کی ہے۔ لیکن اکثر مناظرات و تمثیلات کا سہارا لیا ہے۔

پروین ہمیشہ غریبوں، بے کسوں اور مظلوموں کی ہمدرد ہیں، درد و غم ان کی شاعری کا سرمایہ ہے۔ ان کی شاعری غریبی، ضعیفی، آنسو اور دکھ درد کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے۔ جب ہم پروین کے موضوعات سخن کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اعمال حسنہ، خیالات پاکیزہ، صفائے قلب، امیروں کی خود پرستی، اہل حکومت اور اقتدار کا حسن ظاہری و قبح باطنی اور طبقاتی نظام کے زیر اثر غریبوں کی دردناک زبوں حالی اور ان کے حقوق کی پامالی ان کے خاص الخاص موضوعات ہیں۔ ان سب باتوں کو مناظرہ کی شکل میں، کبھی براہ راست انسان کی زبان سے اور کبھی حیوانات کی زبان سے بیان کرتی ہیں۔ عام فہم الفاظ کے ذریعے اپنے گہرے احساسات و تعبیرات کو پُر تاثیر انداز سے پیش کیا ہے۔ کسی دوسرے شاعر کے یہاں دنیا کے دکھ درد کی اتنی عمدہ تصویر کشی نہیں ملے گی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت کی حیثیت سے ان کے اپنے ذاتی تجربات و احساسات ہیں۔

سعید نفیسی کے مطابق غریبوں اور بے کسوں کے تئیں انھوں نے اپنے گہرے تاثرات بہت ہی ہیجانی انداز میں پیش کیے ہیں وجہ یہ ہے کہ وہ ایک عورت ہیں اور ایسے حالات سے ان کے دل کا دُکھنا ناگزیر ہے۔ ایک ماں کے پیار، یتیم بچوں اور ضعیف عورتوں کے رنج و غم کے بیان میں وہ اوروں سے سبقت لے گئی ہیں۔ ان نظموں میں الفاظ کا استعمال بہت سلیقے سے کیا ہے۔ ساتھ ساتھ عام اور سہل الفاظ کے ذریعہ اپنے بلند خیالات پیش کرنے میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں جو بچے سے متعلق ہیں ان میں ایک ماں کے احساسات و جذبات کسی پرندہ یا دوسرے مجبور و بیکس پرندے کی زبان سے ادا کیے ہیں۔ بطور ثبوت درج ذیل مثالیں ملاحظہ کریں۔

اپنی نظم "مادر دور اندیش" میں ایک ماں دنیا کے بچوں کو ہشیار کرتی ہے اور شکاری پرندوں کی نظر سے بچنے کی تلقین کرتی ہے "آرزوے پرواز" میں ایک چھوٹا سا کبوتر اپنے گھونسلے سے تھوڑی دور اڑ تا ہے اور آخر کار تھک جاتا ہے۔ ماں اپنے بچوں کو نصیحت کرتی ہے کہ پہلے

خود کو مضبوط بناؤ۔ تبھی اپنے گھونسلے سے باہر کی دنیا میں پرواز کرنے کی کوشش کرو۔ ان نظموں میں ماں ایک شفیق محافظ اور معلّم کی حیثیت رکھتی ہے جو اپنے بچّوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ یہ دنیا بڑی سنگدل ہے وہ اپنے بچّوں کو اپنے گھونسلے سے باہر کی دنیا کے لائق بننے کی تربیت کرتی ہے۔
ان کی ایک نظم "طفل یتیم" میں ایک یتیم بچّہ ایک مگ توڑ دیتا ہے۔ وہ روتا ہے اور کہتا ہے میں گھر نہیں جا سکتا۔ میں اپنے مالک کو کیا جواب دوں گا۔ میں نے اپنی ماں کا چہرہ تک نہیں دیکھا ہے لڑکے چلاتے ہیں لیکن میرے پاس چلّانے کا وقت نہیں۔ جب کبھی میں کسی عورت کے پاس دوڑ کر جاتا ہوں اور نہایت شادمانی کے ساتھ ماں کہہ کر پکارتا ہوں وہ کہتی ہے میں تیری ماں نہیں ہوں۔
پروین کی دوسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جن میں سماجی ظلم و ستم کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اپنی نظم "گنج ایمن" میں وہ ایک بچّے کا ذکر کرتی ہیں جو سر پر پھولوں کا تاج رکھ کر اپنا مقابلہ شاہوں سے کر رہا ہے اتفاقاً ادھر سے ایک دانا کا گزر ہوتا ہے۔

بروگزشت حکیمی و گفت ای فرزند
مبرہن است کہ مثل تو پادشاہی نیست
ہنوز روحِ تو زآلایش بدن پاک است
ہنوز قلب تو را نیت تباہی نیست

ان کی سبھی نظمیں نصیحت آموز اور فلسفیانہ نہیں ہیں۔ ایک لمبی نظم "ای گربہ" ان کا شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی اخلاقی تعلیم نہیں دی گئی ہے لیکن یہ نظم ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے جدید رجحانات کی حامل ہے۔ اس میں اپنی بلی کی گم شدگی سے پیدا شدہ شدید غم کے تاثرات کو پیش کیا ہے۔

ای گربہ ترا چہ شد کہ ناگاہ
رفتی و نیامدی دگر بار
بس روز گزشت و ہفتہ و ماہ
معلوم نہ شد کہ چوں شد این کار

صدیوں سے عربی اور فارسی شعرا اونٹ اور گھوڑے کی تعریف بیان کرتے تھے۔ پروین پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے ایک گھریلو جانور کو نظم کا موضوع بنایا ہے۔ پروین نے اپنی ایک نظم "نہالِ آرزو" میں عورتوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ وہ جہالت کو عورتوں کی زبوں حالی کی ذمہ دار ٹھہراتی ہیں عورتوں سے متعلق پروین کی بیداری مغرب کی رہین ہے۔ ان کی نظم "زن در ایران" اشارہ کرتی ہے کہ پروین عورتوں کی آزادی کی دلدادہ تھیں۔
پروین نے اپنی نظموں میں دنیا کی بے ثباتی کو بھی بڑے ہی موثر اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے جس کا بیّن ثبوت پروین کی نظم "یاد یاراں" سے ملتا ہے محترمہ فروغ فرخ زاد اور پروین دونوں نے ایک ہی زمانے میں شاعری شروع کی اور دونوں کی موت

ہی کم عمر میں ہوئی پھر بھی معاشرتی مسائل کو دونوں نے جس انداز میں پیش کیا ہے اس میں زبردست اختلاف ہے۔ پروین نے اپنی تمثیلات اور مناظرات کے مسائل بیان کیے ہیں جبکہ فروغ فرخ زادے نے صاف اور صریح تفظوں میں۔ اس صاف گوئی کی وجہ سے فروغ فرخ زاد شدید تنقید کا شکار رہیں، لیکن پروین نے خود کو تنقید کا نشانہ نہیں بننے دیا اور آزادی کے ایک خاص دائرے کے اندر رہ کر اپنے خیالات پیش کیے۔

پروین اعتصامی کی موت ۳۴ برس کی عمر میں ہوئی۔ اگر وہ اپنی عمر کی آخری بہار تک بقید حیات رہتیں تو اور زیادہ بیباکی اور آزادی کے ساتھ عورتوں کے مسائل اور سماجی مسائل کے متعلق لکھتیں۔

ولی احمد صباغ
PILGRIM LODGE,
COMPOUND,
MILLI . AL,
NANITAL-363001.
(U.P.)

غزل

فروغِ حسن سے اس گھر کو زندگی دیدے
مرے جنوں کو بھی اندازِ سروری دیدے

نفس نفس پہ ہے بے نام سی طلب حاوی
خموش گونج کو اک لحنِ آگہی دیدے

حسیں ہے موت جو راز و نیاز میں آئے
مری حیات کو بھی زہرِ دلکشی دیدے

کلی کھلے جو چمن میں تو بس محبت کی
رسومِ دیر و حرم کو شگفتگی دیدے

نگاہِ شست نہ رکھنا سدا ہی دنیا پر
کبھی تو قلب کو نعرہ قلندری دیدے

محبوب پاشا
AMEER MAHAL,
(CAMPUS)
MADRAS-600014.

غزل

عجب رنگین، گلدستہ سجا ہے
یہ نظّارہ، بظاہر خوشنما ہے

فقیہ شہر کی، حالت نہ پوچھو
سرِ منبر عمامہ بیچتا ہے

سمجھ کر، سوچ کر، گھر سے نکلنا
دھماکے ہیں، دھواں ہے شور سا ہے

مرا ہونا، نہ ہونا، سب برابر
تری محفل میں کیا تیرے سوا ہے

مآلِ عاشقی، صحرا نوردی
جنوں کی جیب میں بس اور کیا ہے

اب آئے ہو، تو یہ منظر بھی دیکھو
لبِ ساحل، سفینہ، ڈوبتا ہے

ڈاکٹر جمال شاہد
DR. FATAHULLAH LANE,
RANCHI-1
(BIHAR)

جینت پرمار
300/a, ambali falia, sarkiwad,
shahpur, ahmedabad - 380 001.

دردو آلام سے روتا ہوا صحرا دیکھا
حدّتِ مہر سے جلتا ہوا دریا دیکھا

میں نے پتھر میں بھی چبھتے ہوئے کانٹے دیکھے
اور کبھی پھول سے سہما ہوا تیشہ دیکھا

سرخ لمحوں کے بھیرتے ہوئے تیور دیکھے
اور کبھی وقت کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا

موسمِ گل میں سسکتی ہوئی کلیاں دیکھیں
آگ کے ڈھیر میں کھلتا ہوا غنچہ دیکھا

برگِ تازہ کو سسکتا ہوا پایا میں نے
سوکھے پتّوں میں مگر زیست کا سایہ دیکھا

گھر سے نکلا تھا تو سر پہ آسماں تحریر تھا
میری قسمت میں یہی اک سایباں تحریر تھا

عمر بھر لڑتے رہے ہم سیپیوں کے واسطے
ایک نفرت کا سمندر درمیاں تحریر تھا

شہسواراں تیرگی کے جنگلوں میں کھو گئے
خواب کی سرحد پہ تاروں کا دھواں تحریر تھا

ہیں جنوں کی کشتیوں کے بادباں روشن بہت
اور پسِ دیوار نادیدہ جہاں تحریر تھا

طائرِ شب سے اکیلا سر پھرا لڑتا رہا
اس کی آنکھوں میں نیا اک آسماں تحریر تھا

منیر سیفی
6-CIRCULAR ROAD,
PATNA-800001.

وفا کا، سنگ دل چھت کے تلے، پیکر نہیں ہوتا
بڑے شہروں میں اپنے گانو سا چھپر نہیں ہوتا

ہزاروں سوئیاں سی تیرتی پھرتی ہیں نس نس میں
جہنم بھی شکم کی آگ سے بڑھ کر نہیں ہوتا

زمیں سے آسماں تک ہم تو ہیں بکھرے ہوئے یارو!
ہمارے خون سے خالی کوئی منظر نہیں ہوتا

یہ سونا، چاندی، موتی، ہیرے سب بیکار ہیں یارو!
حیا سے بڑھ کے عورت کا کوئی زیور نہیں ہوتا

مرا "میں" اور اہلِ سلطنت کی سختیاں سیفیؔ
اگر یہ جانتا تو میں پولس افسر نہیں ہوتا

مصطفیٰ مومن
RAHMAT GANJ,
P.O.POLYTECHNIC,
DHANBAD-826001.

قبائے گُل میں جو غم کا نشاں سلامت ہو
مہکتے شعلوں میں کیوں جسم و جاں سلامت ہو

کتابِ زیست کی تدوین اس طرح کرنا
ورق ورق رہے اور داستاں سلامت ہو

ہر ایک شاخ میں پنہاں رہے بہار کا رنگ
ہوائے گل میں ہمارا مکاں سلامت ہو

زباں نہ کام کرے مُہرِ خامشی کے سبب
یہ اور بات کہ لفظ و بیاں سلامت ہو

بکھر رہے تھے شرارے بدن کے صحرا میں
تپی ہواؤں میں کوئی کہاں سلامت ہو

سید فرید پربتی
SANGEEN DARWAZA,
SRINAGAR,
KASHMIR

نفاستوں کا لبادہ اُتار کر آیا
برنگِ بوے سمن خود کو ہار کر آیا

تجھے یقین نہیں ہے تو اپنے آپ سے پوچھ
بچا کے لایا جسے میں، وہ وار کر آیا

وہ حق پرست نہ تھا عاقبت کا سودائی
ہوائے دہر پہ مجھ کو سوار کر آیا

ملا بھی کیا اُسے جز یاس و درد و ناکامی
گلی گلی میں تجھے جو پکار کر آیا

کبھی یہ پوچھنا فرصت میں موجِ طوفاں سے
وہ کس طرح سے سمندر کو پار کر آیا

وہ گرد گرد صداؤں کے آسرے پہ فرید
زیاں رسیدہ بگولے شمار کر آیا

مجاز نوری
EDITOR RAFTAR-E-NOW,
URDU HOUSE,
RAHAM KHAN,
DARBHANGA
PIN 846004

تھا نہ یہ رنگ رہ و رسمِ وفا سے پہلے
مسکرائے نہ تھے یوں آپ ادا سے پہلے

منزلِ قافلۂ شوق یہاں ہے کہ نہیں
کم سے کم پوچھ تو لو راہ نما سے پہلے

اب تو تلوار بھی پڑتی ہے تو بچ جاتے ہیں
قتل ہو جاتے تھے قاتل کی ادا سے پہلے

دشمنی بھی تو نہیں شہر میں کرتا، کوئی
لوگ ملتے تھے محبت سے وفا سے پہلے

جب سے دیکھا ہے تمہیں رنگ فزوں ہے دل کا
خونِ دل شوخ نہ تھا رنگِ حنا سے پہلے

عشق کے ہم ہی اکیلے تو نہیں ہیں مجرم
تم نے دیکھا تھا محبت کی ادا سے پہلے

غزلیں

نجم عثمانی
C/o S.A.QASIM,
C.M.P.F. OFFICE,
DHANBAD. (BIHAR)

ڈاکٹر خاور خان سرحدی
SARAI MIYAN,
DELHI GATE,
ALIGARH-202001.

آنکھوں میں اگر یاد کا منظر نہیں ہوگا
غم خانۂ تاریک، منوّر نہیں ہوگا

نورتنوں کو دربار کی زینت جو بنائے
اب دیش میں پیدا کوئی اکبر نہیں ہوگا

ہر سو نظر آئیں گے لٹیروں کے مکانات
اس شہر میں میرا ہی کوئی گھر نہیں ہوگا

رشوت کی حسینہ کے قدم جس میں نہ پہنچے
شاید یہاں ایسا کوئی دفتر نہیں ہوگا

احساس کی دُنیا سے نکل جاؤں میں کیسے
شاعر کا یہ دل ہے کبھی پتھّر نہیں ہوگا

شعرگوئی کے لیے جادو بیانی چاہیے
تشنہ لب کو اور کیا دو گھونٹ پانی چاہیے

ورنہ یہ آکر مری پلکوں پہ سب کہہ دیں گے حال
غم کے ان باغی فرشتوں سے بنانی چاہیے

آنکھ میں آنسو ہے دل میں غم، خدا کا شکر ہے
آپ کو اب اور کیسی مہربانی چاہیے

پھول میں خوشبو کہاں وہ رنگ موسم میں کہاں
آج ہم کو پھر غموں کی مہربانی چاہیے

اس قدر نزدیکیاں اچھّی نہیں خاورؔ کہ اب
درمیاں دیوار اب خود ہی اٹھانی چاہیے

صبا بیہری
A.G.ANSARI,
M.A.(URDU)
H.S.S.JATARA (TK.G)
472118

غزل

مت پوچھ کیا اثر ہوا تیری جفاؤں کا
کیسا صلہ ملا مجھے میری وفاؤں کا
رنگِ حنا ہی سمجھے ہے تو میرے خون کو
ہوگا کبھی حساب ان قاتل اداؤں کا
چل اے صبا یہاں سے کہ موسم خزاں کا ہے
برہم ہوا مزاج چمن کی فضاؤں کا

ڈاکٹر اختر عبد الرشید
ANJUMAN TARAQQI URDU,
AMETHI,
FARAKHABAD

غزل

بات جو لکھ شاہانہ لکھ
دل کو دولت خانہ لکھ
آنکھیں بھیگی سوکھے لب
ان کا بھی افسانہ لکھ
جس گھر میں گھبرائے دل
اس گھر کو ویرانہ لکھ
دکھ میں شامل کون رہا؟
اپنا! یا بیگانہ لکھ
درس محبت کے بدلے
دستورِ مے خانہ لکھ
کفر نہیں اختر دل کو
کعبہ یا بت خانہ لکھ

صابر ابوہری
C/o AGRO KINGS,
COURT ROAD,
JAGADHARI
PIN 135003

نہرو کا احساسِ فرض

بہت دلکش ہیں گلشن کے نظارے
مجھے پر پھول کرتا ہے اشارے
گھڑی بھر کے لیے آرام کر لو
مداوائے غم و آلام کر لو
مجھے لیکن ابھی فرصت نہیں ہے
ٹھہرنے کی ذرا مہلت نہیں ہے
مجھے کچھ کام کرنا ہے جہاں میں
جنوں کو عام کرنا ہے جہاں میں

ستیہ پرکاش سالک
THE RETREAT,
NEAR GREEN VIEW PARK,
HOSHIARPUR

غزل

وہ ہم شوریدہ سر ایسے جنوں کو واسطہ دے کر
چمن میں روک لیں گے اب اگر فصلِ بہار آئی
نہ نکلا کوئی لفظ ان خشک ہونٹوں سے مگر پھر بھی
تری ساقی گری کو تشنگی میری پکار آئی
نہ آیا عشق کامل تو کبھی ناصح کی باتوں میں
جب آئی اس کے بہکانے میں عقل خام کار آئی
کوئی تک بھی ہے اس بے وقت فیاضی کی اے داتا
ہوئی جب زندگی کی شام تو صبح بہار آئی

محمد سالم
"KASHANA-AKHTAR"
MOHALLA MAHDAULI,
DARBHANGA-6.
(BIHAR)

مجروح سلطانپوری کی غزل گوئی

۱۸۵۷ء کے بعد موضوع و مواد کے لحاظ سے نظم نگاری کو بہت اہمیت دی گئی اور غزل زیادہ تر تنقید کا نشانہ بنی رہی جس کی وجہ سے نظم ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال تک شعرا کی توجہ کا مرکز بنی رہی اور اس طرح غزل کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے پھلنے پھولنے میں بہت دقت پیش آئی۔ کتنی بار اس کی گردن زدنی کے منصوبے بنے مگر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ان ہی حالات میں کچھ پرانے قسم کے شعرا غزلوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ یعنی ان شعرا نے غزل کو داغ اور امیر مینائی کی روایت میں زندہ رکھا۔ پھر ایسا ہوا کہ غزل کا مزاج اور رنگ بدلا اور اس کے اندر کچھ حد تک خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔ یہ دیکھ کر ناقدین ذرا چونکے اور غزل کے بارے میں انھوں نے اپنی رائے پر نظر ثانی کی۔ پھر ان کی تنقید میں غزل کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ بہرکیف غزل گوئی کی فضا میں نئی تازگی لانے والے شعرا میں حسرت فانی، جگر اور یگانہ قابل ذکر ہیں۔ غزل در اصل شاعر کے جذبات، محسوسات اور تجربات کے اظہار کا خوبصورت ذریعہ ہے۔ اس لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر عہد کی غزل اپنے عصری حالات اور تہذیبی تجربات کی نشاندہی تو کرتی ہے مگر ساتھ ہی اس کا انداز داخلی اور ایمائی ہوتا ہے۔ غزل وہی کامیاب ہوتی ہے جب تجربات و محسوسات کے اظہار میں جمالیاتی رنگ کارفرما ہو اور یہ رنگ اسی وقت پیدا ہوگا جب داخلی عناصر کو فنکاری سے برتا جائے۔ غزل کی اس خوبی سے کسی شاعر کے اسلوب کی شناخت ہوتی ہے۔ آیئے، اب غزل کی اس تمہید کے بعد مجروح کی غزل گوئی پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

مجروح ۴۲ - ۱۹۴۱ء کے ترقی پسند شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، ساحر، مخمور، غلام ربانی تاباں، پرویز شاہدی وغیرہ شامل ہیں۔ شعرا کا یہ گروہ بھی شعر و ادب کو سماجی جدوجہد اور عوامی مفاد کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس گروہ کا یہ بھی خیال تھا کہ ادب تو انقلاب نہیں لا سکتا ہے مگر وہ انقلابی شعور کی تربیت کر سکتا ہے اور اس طرح شعر و ادب کے ذریعے مستقبل میں کسی تہذیبی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ

مجروح ابتدا ہی سے ذہنی طور پر ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر تھے مگر باضابطہ طور پر ۱۹۴۶ء میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہوئے اس سے قبل ۱۹۴۵ء میں وہ بمبئی آکر فلموں میں گیت لکھنے لگے تھے یعنی انھوں نے فلم کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا تھا۔ عام طور پر ترقی پسند شاعروں نے براہ راست خطیبانہ انداز اپناکر مارکسی خیالات کی تشہیر کے لیے نظم نگاری کو اولیت دی تھی لیکن مجروح نے شاعری کے میدان میں اپنے نظریئے فکرو احساس اور ذاتی تجربات کو براہِ راست مگر رمز و ایما کے خوبصورت پیکروں کے ذریعے پیش کیا جن سے ان کا ترقی پسند اسلوب نکھر کر سامنے آیا۔ اس طرح یقیناً انھوں نے ترقی پسند غزل کو ایک نئی شان دی۔ میں نظریاتی طور پر ترقی پسندوں سے ان کی یکسانیت، تنگ نظری اور انتہا پسندی کے باعث اختلاف رکھتا ہوں مگر ایسا بھی نہیں کہ ترقی پسندوں کے ہر ہر حرف کو میں مردود قرار دوں اس میں شک نہیں کہ مجروح بقول ڈاکٹر محمد حسن "غزل کے قتیل ہیں" ان کے یہاں روایت کی گہری وابستگی جھلکتی ہے۔ انھوں نے میرؔ، غالبؔ، حسرتؔ وغیرہ کی روایتوں کے زندہ عناصر کو اپنے اندر جذب کرکے اپنی غزلوں کو ترقی پسندیت کا جامہ پہنایا ہے۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ مجروح نے کسی شہرت کی خاطر ترقی پسند اسلوب کو اپنایا نہیں بلکہ غالباً کافی غور و فکر کے بعد غلط یا صحیح اشتراکی خیالات کو اپنا مسلک بنایا تھا۔ شہرت کے لیے فلمی زندگی ان کے لیے کافی تھی اور تبھی تو فلمی گیت کے ذریعے انھوں نے ہندستان گیر شہرت حاصل کرلی ہے۔ وہ ترقی پسند ضرور ہیں۔ مگر انتہا پسند نہیں۔ ان کے شعر حسین تراکیب اور خوبصورت استعاروں سے سج کر دلآویز پیکروں میں ڈھلتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی یہ شعر آدمی کے اندر سماجی تبدیلی کی خواہش کے بیدار کرنے میں معاون ہوں

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ترقی پسند شاعروں میں فیض وہ تنہا خوش نصیب شاعر ہیں جن پر کلیم الدین احمد نے اپنی کڑی تنقید کے باوجود نظموں میں فیض کے نظم و ضبط اور خود ضبطی کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ فیض اگرچہ بنیادی طور پر نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہیں مگر ان کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک خاص اسلوبی کشش اور تازگی رکھتی ہیں۔ فیض نے ترقی پسند اسلوب میں ایک الگ راہ متعین کی۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے مغربی جدید شعرا کے زیر اثر علامتی وایمائی

[illegible] ایک [illegible]
کی تشکیل کی جس سے ان کے مخصوص لہجے کی شناخت ہوتی ہے مگر یہاں بھی ان کی خود ضبطی [illegible]
شگفتگی اور نرم آہنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ وہی خود ضبطی اور شائستگی مجروح
کے بیشتر اشعار میں آپ محسوس کریں گے۔ اگرچہ ان کے للکارتے ہوئے شعر میں الفاظ کے صوتی آہنگ
کی وجہ سے بلند آہنگی تو ملتی ہے۔ پھر بھی ایک طرح کا توازن برقرار رہتا ہے۔ مجروح کے سماجی و
سیاسی محسوسات میں گھن گرج کی فضا پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لہجے میں ایک طرح کی نرمی
کا احساس ہوتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح اپنے نظریے کی تبلیغ میں
اس طرح نہیں ڈوبتے کہ ان کی توجہ شعر کے فنی پہلو پر کچھ کم ہو جاتی ہو بلکہ وہ اپنی تخلیقی بصیرت سے
تخلیقی جوہر کو کام میں لاکر اپنے سیاسی و سماجی موضوعات کو ہنر مندی سے برتتے ہیں اور یہ بات
قابلِ غور ہے کہ وہ عشقیہ مضامین میں اتنے ہی کامیاب ہیں جتنا کہ غیر عشقیہ مضامین ہیں۔ غیر عشقیہ مضامین
کا کامیاب ہونا بہت مشکل کام ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر اپنے تجربات و محسوسات کو جمالیاتی
انداز میں ہنر مندی سے برتے۔ عشقیہ اور غیر عشقیہ مضامین کے ضمن میں چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے:

۱۔ دور دور وہ ہم سے اس طرح خراماں ہیں ہر قدم ہے نقشِ دل، ہر جگہ رگِ جاں ہے
۲۔ جمالِ صبح دیا رُوئے نو بہار دیا مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو
۳۔ دلِ سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے
۴۔ وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر اڑی زلف چہرہ پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے
۵۔ میرے عہد میں نہیں ہے یہ نشانِ سربلندی یہ رنگے ہوئے عمامے، یہ جھکی جھکی کلاہیں
۶۔ ترے پاؤں میں پہ رکے رکے ترا سر فلک پہ جھکا جھکا کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو
۷۔ گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی
۸۔ ہجومِ دہر میں ہم سے ہوئی نہ وضعِ خرام گرہ کی کلاہ، ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے
۹۔ ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
۱۰۔ ہو تیغ اثر زنجیرِ قدم پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم زخموں سے چراغِ راہ گزر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں
۱۱۔ روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح ہم تو آواز ہیں دیواروں سے چھن جاتے ہیں
۱۲۔ شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی، راہی بھی
۱۳۔ تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

پہلے چار شعر کا محور عشق ہے اور تشبیہوں اور استعاروں کے تخلیقی استعمال کے ذریعے خوبصورت امیجری
کی تعمیر کی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موضوعِ سخن کے گرد شعور کی کرنیں جھلملا رہی ہیں جو شعر
کو زبان و بیان اور صوری و معنوی حسن کے لحاظ سے آراستہ کر رہی ہیں۔ ان کے اندر رجائیت
کی جڑیں پوری طرح مضبوط نظر آتی ہیں، جس کی وجہ سے لہجے میں ایک نئی تازگی کا احساس ہوتا
ہے اور عشقیہ مضامین کی تصویر ہو بہو ہماری آنکھوں میں گھوم جاتی ہے اور میرے خیال میں یہی بات
مجروح کے عشقیہ شعر کو وقار بخشتی ہے۔ اگلے تینوں شعر مارکسی خیالات کے ترجمان ہیں [illegible]

ہواؤں یا جھکی جھکی کلاہوں کا نشان سربلندی نہ ہونا، زمین پہ پاؤں کا رگڑ کا رہنا، فلک پہ سر کا جھکا جھکا رہنا، گنبدوں سے اپنی صدا کا پلٹنا وغیرہ جیسے خوبصورت اور نئے استعارے مجروح کے اندر سماجی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی آواز میں روحِ عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہی خیالات دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں بھی مل سکتے ہیں مگر مجروح کے یہاں خیال کی یکسانیت محسوس نہیں ہوتی بلکہ انھوں نے بڑی چابک دستی سے اس مضمون کو شعر کے پردے میں رمزیاتی انداز میں پیش کیا ہے جس سے شعر کے جمالیاتی رنگ میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔ اس کے بعد کے چاروں اشعار میں لفظیات اور استعاروں کے استعمال سے مجروح کے زبردست تخلیقی جوہر کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے وضاحتی رمزیت میں زندگی اور سماج کے منفی اندازِ فکر پر مثبت رویے کو فوقیت دی ہے۔ غالباً وہ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ انسان کو کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے مثلاً اپنے ہی بانکپن میں رہنا، ستون دار پر سروں کے چراغ رکھنا، زنداں میں زخموں سے چراغِ راہ جلا کر بیٹھنا، آواز کا دیواروں سے چھن جانا وغیرہ استعارے شاعر کے مافی الضمیر تک پہنچنے میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ استعارے اپنے اندر روایت کی روشنی اور تجربے کی تازگی رکھتے ہیں۔ آخر کے باقی اشعار سے آپ کو انسان کی قوت اور ساتھ ہی اس کی انفرادی اور اجتماعی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ دراصل مجروح نے امید کو مایوسی پر، جمود پر حرکت کو، اقدار کے زوال پر، اقدار کے اثبات کو ترجیح دی ہے۔ ایسے ہی جانے کتنے اشعار ہیں جن میں زندگی کا حوصلہ ہے اور حال کی تیرگی میں بھی مستقبل کی شمع روشن ہے۔

مجروح کے چالیس سالہ شعری سفر کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ شعری سفر بڑی سست رفتاری سے جاری رہا ہے کیونکہ اب تک انھوں نے اپنا ایک ہی شعری مجموعہ 'غزل' ترقی پسند ادب کو دیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی فلمی مصروفیتوں نے ان کو غزل لکھنے کی کم مہلت دی۔ دوسری یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک اپنی یکسانیت، تنگ نظری اور انتہا پسندی کے باعث جدیدیت کی نئی لہر کے مقابلے میں بتدریج کمزور پڑتی گئی جس کے اثر سے ترقی پسند حضرات کی تخلیقی قوت میں کمزوری آتی گئی۔ اس طرح مجروح بھی متاثر ہوئے۔ ویسے بھی وہ کم گو ہیں اور ادبی جرائد میں کم کم چھپتے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ شعر ٹھہر ٹھہر کر کہنے کے قائل ہوں۔ پھر بھی جدیدیت کے فروغ کے زمانے میں بھی شعر و ادب کے ترقی پسند نظریہ کو سست رفتاری ہی سے سہی مگر وہ اپنا شعری سفر طے کرتے رہے۔ بہرکیف مجروح ایک اچھے اور سجیلے غزل گو تصور کیے جاتے ہیں۔ بالعموم ان کے شعر نغمگی اور شعریت سے معمور ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں مریضانہ ذہنیت کا نام و نشان نہیں۔ اگرچہ ان کے لب و لہجہ میں شکوہ کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے پھر بھی ناامیدی اور شکستگی کا تاریک سایہ ان کے کسی شعر میں نہیں ملتا۔ یہ الگ بات ہے کہ محدود طرزِ فکر اور احساس کی شاعری میں جو فنی کمزوریاں ملتی ہیں ان کی بعض کمزوریوں سے مجروح بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یعنی ان کے بعض بعض اشعار میں خطابت اور تشہیر کا پہلو نمایاں ہے۔

(باقی صفحہ ۔۔۔)

ناصر بغدادی
E-2,6/14, MAYAR SQUARE
BLOCK NO.14.
GULSHAN-E-IQBAL,
KARACHI-74800.

"پستی"[1] ــــــ کامیو کا ایک ناول

ادب اور فلسفہ کی تغیر پذیر جہتوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں پرکھنے والوں کے لیے البیر کامیو کی ناگہانی موت حقیقتاً ایک عظیم ترسانحہ تھی۔ اُس کی موت ایک ایسے نابغہ روزگار کی موت تھی جس نے اپنے اطراف کی غیر منطقی اور لایعنیت ABSURDITY کی حامل دنیا میں منطقی بنیادوں کو مقیاس بنا کر اٹل حقیقت اور معروضی صداقت کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اپنے خیالات کی وسعت اور پھیلاؤ اور تحریروں کی توانائی اور جدت طرازی کے اعتبار سے وہ ایک بلند قامت ادیب اور فلسفی تھا۔ اس نے عملی زندگی کے ژولیدہ اور تہ دار موضوعات پر چابک دستی سے طبع آزمائی کرتے ہوئے جو کچھ تخلیق کیا ہے۔ اُس کا مطالعہ ایک ذہین قاری کو سوچ اور فکر کا وافر مواد فراہم کرتا ہے! متھ آف سسی فس MYTH OF SISYPHUS اور "اجنبی" سے جلاوطنی اور بادشاہت" تک کامیو کا تخلیقی سفر کئی حیثیتوں سے اہم ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہی کہا جاسکتا ہے! کامیو کی تحریروں کا غائرانہ مطالعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُس نے روایتی قدروں اور مروجہ ضابطوں سے اعراض برتتے ہوئے ادب اور فلسفہ میں نئے ابعاد اور نئی جہتوں کو تدقیقی تگ و دو سے دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی خلاقانہ بصیرت اور تخلیقی اُپچ کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان اور عملی دنیا کے تناظر میں اہم مجرّد اور غیر مجرّد موضوعات پر لکھتے ہوئے ادب اور فلسفہ کی سرحدوں کو بہت دور تک پھیلایا ہے!

اُس کی موت پر دنیا کو وراثت کی شکل میں اُس کی فکر انگیز تحریروں کا اچھا خاصا ذخیرہ تو ملا ہے۔ مگر یہ ایک المیہ ہے کہ ناگہانی موت کے باعث وہ اپنے نقطہ نظر کو کسی مخصوص تصوراتی جہت کے تناظر میں جزئیات کے ساتھ پیش نہ کر سکا تھا۔ اور یوں برسوں تک روغن نیم شبی جلانے کے باوجود وہ اپنے خیالات اور تصورات کو کسی حد کی فلسفہ کا مصدر و ماخذ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا ــــ ــــ اُس نے عرصۂ دراز تک اپنے اطراف کی دنیا میں بدلتی ہوئی قدروں اور ارتقا کی نمو پذیری کو شفافیت کے ساتھ محسوس کیا۔ اُس کے تخلیقی عمل کے اجزائے ترکیبی اس تغیر پذیری سے اثر پذیر ہوتے ہوئے اس کی تحریروں پر اپنے واضح اثرات مرتب کرتے رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ فکری فکر کی براگندگی کے باعث اس کی تحریروں میں اس کے خیالات کی نہیں نئی معنویت کے ساتھ پیچیدگی اختیار کرتی گئی ہیں!! اس نے آج کی

---

[1] THE FALL BY ALBERT CAMUS

دنیا کے انسان کی ذہنی پراگندگی اور عدم تحفظ کی کیفیت کو اطراف کے لایعنی واقعات سے مربوط کرنے کی کوشش تو کی ہے مگر اس باب میں کوئی قابلِ قبول متبادل حل پیش نہ کر سکا ______ اگر ان معنوں میں ہم اس کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو ان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہم اس کو کسی مخصوص مکتب فکر کا موید نہیں کہہ سکتے !!

کامیو "پستی" کو اپنی کہانیوں کے مجموعہ "جلا وطنی اور بادشاہت" میں شامل کرنا چاہتا تھا اور جب اس موضوع پر اس نے لکھنا شروع کیا تو اس کو یہ قطعی علم نہ تھا کہ کہانی کا پلاٹ دلچسپ طوالت کے سبب پھیلتے پھیلتے ایک ناول کی شکل میں اپنے اختتام کو پہنچے گا۔ اس کے اندازے کی غلطی اور قلم کی معجز نمائی کے سبب اس ناول کو قلیل ہی عرصے میں بین الاقوامی سطح پر عدیم المثال شہرت حاصل ہو گئی۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے چند برسوں میں اس کا ترجمہ کئی ترقی یافتہ زبانوں کے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ اگر کامیو اس کو قطع و برید اور سخت گیر تدوین کے بعد کہانی کی شکل میں شائع کرتا تو ممکن تھا کہ ناول کے مقابلے میں اس کو اتنی ہمہ گیری مقبولیت حاصل نہ ہوتی !!

"پستی" میں کامیو نے اپنے سابقہ ناول "اجنبی" کے مرکزی خیال اور اسلوب فکر کو نئے فکری پیرہن میں پیش کر کے نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ژاں بیپٹیس کلے مینس JEAN-BAPTISTE CLAMENCE فی الاصل "اجنبی" کے ہیرو MEURSAULT کے عملی رویوں، اصولی قدروں کی انتہا پسندانہ اور جارحانہ انداز میں عکاسی کرتا ہے "اجنبی" کے موضوعات THEMES اور بعض غریب الہیت (GROTESQUE) علامتوں اور تمثیلوں کو "پستی" میں نئے ابعاد کے اضافے کے ساتھ بلند آہنگ لہجے اور غیر الہامی استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ! بعض جگہوں پر کامیو کا لہجہ غیر محتاط مدتک تلخ اور جارحانہ ہے !!

کامیو نے بالواسطہ بحث کے ذریعہ ان اہم مسائل کا احصار کیا ہے جو خارجی حالات اور داخلی احساسات کے پس منظر میں انسانی سوچ اور انسانی زندگی پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ موت کے تعلق سے پیدا شدہ ٹھوس اور سیال حقیقتوں کا جائزہ لیتے ہوئے انسانی زندگی کے دیگر متعلقہ شعبوں کا احاطہ کرتا ہے ! اس سلسلے میں وہ انسان کے باب میں انسانی سرد مہری اور بے اعتنائی، جدید زندگی سے وابستہ کھوکھلا پن اور بے شناختی، فردی زندگی پر مسلط کردہ جرم اور معصومیت کے نظریات اور اقدار، عملی زندگی میں لایعنی اور ناقابل یقین واقعات کا ظہور، اور ہر دور میں بدلتے ہوئے جذباتی اور ذہنی رویوں کی بابت اپنے خیالات کرداروں کے لایعنی افعال کے ذریعہ ہم تک پہنچاتا ہے !

موضوع کے اعتبار سے یہ ناول کلے مینس نامی ایک سابق وکیل کے غیظ اور تاسف سے بھرپور اعترافات ہیں جو فکری عمق کے ساتھ بلند آہنگ لہجے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اب یہ شخص تائب منصف کی حیثیت سے نہ صرف اپنے ارتکاب کردہ گناہوں پر شد و مد سے اظہار تاسف کرتا ہے بلکہ ضمیر کے آئینے میں جھانک کر خود کو شدید الفاظ میں مطعون بھی کرتا ہے۔ اس سے اعتراف کا انداز اور لب و لہجہ سینٹ آگسٹائین اور روسو سے کلیتاً مختلف ہے۔ مغلوب الغضب ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتیت پر تسمہ پا بن کر اس کے ذہن اور قلب پر سوار ہے۔ نرم خرام لہجہ کی بجائے اس کی آواز میں تندی اور ترش روئی ہے۔ اور اس پر مستزاد وہ ترحم کے احساسات سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے۔ کلے مینس اپنے اعترافات

سو ناخوشگوار واقعہ کی طرح بیان کرتے ہوتا تسف کے منفی جذبات کو نقطۂ عروج پر لے جانے کی کوشش کرتا ہے ; وہ اپنے ماضی کو تمام تر جزئیات کے ساتھ دوبارہ زندہ کرتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے ماضی میں جو کچھ کیا تھا وہ اس کے لیے اب سرمایۂ افتخار نہیں ; مگر اس کے اعترافات لاطائل نہیں۔ وہ فی الحقیقت آج کی دنیا کے تناظر میں ایک عام انسان کی زندگی کے منفی پہلوؤں اور تلخ حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آج کے مجبورِ محض انسان کے پیچیدہ داخلی احساسات اور اس کے عملی کردار کے تضادات اور تناقضات پر سے پردہ اٹھاتے ہیں ! !

ایمسٹرڈم کو اس جدید، انہونی دنیا کا اسٹیج منتخب کیا گیا ہے جہاں لوگ سرد مہرانہ انداز میں بے روح کٹھ پتلیوں کی طرح اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں ! ان کے چہروں سے بے اعتنائی مترشح ہے اور آنکھوں میں بھرپور عصبیت کی کیفیات براجمان ہیں۔ ان کا انداز، ان کا طرزِ عمل مخصوص بورژوا طبقے کی غمازی کرتا ہے ——— ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کامیو کا ایمسٹرڈم فی الحقیقت ایمسٹرڈم شہر نہیں۔ وہ صرف جدید دنیا کے گنجان آبادی والے شہر کے حوالے سے وہاں کی زندگی کے اذیت ناک حقائق کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ دنیا کا کوئی بھی بڑا شہر ہو سکتا ہے ! ——— شہر کی بھیڑ میں انسانی جذبات کی کم مائیگی اور بے بضاعتی، ہجوم میں گھرے ہوئے انسان کے اندر کی تنہائی کا روح فرسا احساس' لوگوں کے آشنا چہروں سے اُبلتا ہوا بے اعتنائی کا زہر ——— کامیو چابکدستی سے ہجوم میں گھرے ہوئے بے بس انسان کی بیکراں تنہائی کے احساسات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بلا تذبذب اور ہچکچاہٹ عصرِ حاضر کے جدید ترین شہروں کو بورژوا طبقے کے جہنم کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک آج کا جدید تقاضوں سے ہم آہنگ شہر اپنی اذیت کوشیوں کے سبب دانتے کے تخلیق کردہ جہنم سے کسی طرح کم نہیں ! آج کا انسان شہر کی بلند قامت عمارتوں کے سامنے متعفن تنہائیوں کے پاتال میں ڈوبا ہوا اپنی گمشدہ تشخص کی بازیافت میں مصروف تو ہے مگر اُسے امید نہیں کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے ! کامیو کا ناول انسانی اقدار کی پستی کی بھرپور نشاندہی کرتا ہے مگر وہ اس سلسلے میں کوئی متبادل نظامِ عمل پیش کرنے سے قاصر رہا ہے !

ناول کا آغاز ایمسٹرڈم کے میکسیکو سٹی نامی ایک شراب خانہ میں ہوتا ہے اور قاری اس ناول کے مرکزی کردار کلے مینس کو تحیر خیز مکالمہ گوئی میں مصروف پاتا ہے۔ یہ مکالمہ گوئی غریب البیتی کا اعلا نمونہ ہے۔ ناول کی ابتدا سے اختتام تک کلے مینس (CLAMENCE) کی باتیں سننے والا کسی بھی موڑ پر نہ تو اس کی کسی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ کسی طور اپنے کسی ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے مگر سامع کی جانب سے غیر مختتم خاموشی کے باوجود ہم اس کی موجودگی کو غیر مجرد اور غیر محسوس انداز میں سہی مگر محسوس ضرور کرتے ہیں ! ! قاری کے لیے حرفِ آخر تک اس پُراسرار شخص کی شناخت ممکن نہیں وہ بس ذہن پر زور دے اٹکل پچّوانہ انداز میں سامع کی بابت قیاس آرائیاں کر سکتا ہے اور یوں سسپنس اور تحیر کے احساسات کلائمکس پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں ! !

ادھیڑ عمر کا کلے مینس متواتر پانچ دنوں تک اپنی زندگی کے حالات اس غیر شناخت شدہ اجنبی کے گوش گزار کرتا ہے جس سے وہ اسی شراب خانہ میں ملا تھا۔ موضوعِ گفتگو اس کی اپنی ذات

ہے۔ ماضی کو دہرانے کے عمل کو اس کی گمشدہ زندگی کی بازیافت کا ایک مرحلہ بھی کہا جا سکتا ہے
اس ضمن میں اس کی زندگی سے متعلق بے شمار واقعات لاشعور کے اندھے کنوئیں سے اُبھر کر کسی خا
کہانی اور مناظر کی طرح تواتر کے ساتھ اسے یاد آتے ہیں۔ وہ اُن حالات کو یاد کرتا ہے جن کی سنگینی
زیر اثر اس سے گناہ سرزد ہوئے تھے اور پھر اپنے بدلتے ہوئے ذہنی اور جذباتی رویّوں کی م
سے وہ اپنی زندگی کو منفی اقدار کے خول سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

تائب منصف ماضی کے حوالے سے اپنی مختلف النوع سرگرمیوں کے پس پردہ کارفرما غایات کی تفص
توجاہت پیش کرتا ہے وہ اس وقت کو یاد کرتا ہے جب وہ سر سے پاؤں تک ایک بناوٹی انسان ت
دوسروں کے ساتھ اس کا سلوک برفانی سرد مہری کا حامل ہوتا تھا۔ حقیقی دوستی کے حقیقی مفہوم کو اس
کبھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس کی فطرت کا جذباتی آہنگ انسانی ذات کے خود غرضانہ پہلوؤں
وابستہ ہوتا تھا اور اس کا ذوق تفنن دوسروں کے لیے نشتر زنی کا کام کرتا تھا! ______

پھر اچانک اسے خیال آیا کہ زندگی کو قابلِ برداشت بنانے کے لیے قابلِ قدر" کارناموں" کا انجام دینا از
ضروری ہے۔ پھر اس کی زندگی تیز خرام تغیر سے متعارف ہو گئی۔ اس کے ساتھ اس کا نیا اثباتی طرزِ عمل
و ضمیر سے ممزوج ہو کر ذہنی طمانیت کا موجب بننے لگا۔ زندگی سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں اس کو بے
مسرت اور بے پایاں خوشی سے ہمکنار کرنے لگیں ______ مثلاً بس میں کھڑے ہوئے کسی شخ
کو اپنی نشست پیش کر کے، یا کسی نابینا کو سڑک پار کراتے ہوئے اس کی اپنی حیثیت خود اس کی
میں برتر ہو جاتی۔ وہ اپنی ذات میں فوق البشر کی بالیدہ فکری کو اجاگر ہوتے ہوئے محسوس کرتا۔ پھر و
شخصی مخاصمت اور نجی مصلحتوں سے بلند تر ہو کر روحانی ارتفاع کے حصول کی کوشش میں اقدار کے رہ
تصور کا داعی بن گیا! مگر اس کے باوصف اُس نے محسوس کیا کہ وہ ہنوز زندگی کی حقیقتوں سے
ناواقف ہے! جن روزمرّہ کے واقف کاروں سے اس کا قریبی تعلق تھا، جن کتابوں کو اس
پڑھا تھا، جن کے مقامات سے وہ گزرتا رہا تھا، جن اقدار نے اس کی زندگی کو تیز خرام تغیر سے متع
کرایا تھا، ان سب کے حوالے سے اس کو حقیقت اور صداقت کا ماورائی اور غیر ماورائی ادراک مطل
نہ ہو سکا تھا!! وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جس خوشی، جس سکون کو اس نے اپنی زندگی سے ہمکنار
ہوئے محسوس کیا تھا وہ مریضانہ کھوکھلا پن کے سوا کچھ نہ تھا!! جب اس نے اس مسئلہ پر مز
غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ عصرِ حاضر کی زندگی نے انسانوں کو ایسی چلتی پھرتی کٹھ پتلیوں میں متبدّل کر د
ہے جن کا مقدر محض بے نامی اور گمنامی ہے اور شاید زندگی کی بے شناختی اور عدم تشخّص کی بنا
وہ مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکیں!!

اور پھر ایک شام پیرس کی ایک آرٹس گیلری سے گزرتے ہوئے اس نے عقب سے ایک بل
آہنگ قہقہے کی گھن گرج بازگشت سنی۔ اس نے فوراً مڑ کر دیکھا مگر وہاں تو دور دور تک کسی ذی
نفس کا کوئی پتا نہ تھا۔ فی الحقیقت یہ خود کلے مینس تھا جو اپنی ذات پر اس بیدردی سے قہقہہ ز
ہوا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس بے اس طنزیہ قہقہے کا زہر جیسے اس کے کام و دہن سے گزرتا ہو
اس کی روح میں اتر گیا۔ اس کا سارا وجود جیسے برفانی ٹھنڈک کے زیرِ اثر منجمد ہو کر رہ گیا ہو!!

جتنی صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ گئیں۔ وہ اپنے اندر زلزلے کے شدید جھٹکے محسوس کرنے لگا۔ اس کی شخصیت اس کی اپنی نظروں میں زمین بوس ہوگئی تھی اور وہ یوں خود سے کترانے لگا جیسے بھرے مجمع میں برہنہ کھڑا ہزاروں آنکھوں کا ہدف بنا ہوا ہو!! یہ اس کی تذلیل، اس کی پستی کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس قہقہے کی دو دھاری تلوار سے بچنے کی کوشش میں جب وہ اپنی شخصیت کے شکستہ آئینے کو ہر کا بسیے گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے اردگرد کا ماحول ہنوز اس قہقہے کی آسیبی گونج سے لرز رہا ہے ———

اسی شام جب وہ خونفزدگی اور ژولیدہ فکری کا شکار بنا آئینے میں دیکھ رہا تھا تو اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ پھیلتے پھیلتے دوہری ہوگئی ہے! فی الاصل یہ قہقہہ ہی تھا جس نے کلے مینس کو احساس گناہ کے اسفل السافلین میں ڈھکیل دیا تھا۔ جیسے اس کی بند آنکھیں زندگی میں پہلی مرتبہ کھلی تھیں۔ اب وہ ہر واقعہ کے تناظر میں زندگی کے کھوکھلا پن اور لایعنیت کو بخوبی دیکھ سکتا تھا!!

اس واقعہ کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کی خود اعتمادی اور اس کی عملی قوتوں کو دھچکا لگا ہے۔ اس کی زندگی پر سریع الاثر تبدیلی کے واضح اثرات مرتب ہونے لگے۔ اچانک اسے وجودیاتی بے معنویت اور لاشیئیت (NOTHINGNESS) کا شدومد سے احساس ہوا۔ جیسے زندگی کے کھوکھلے پن کا عفریت بانہیں پھیلائے اس کی سمت بڑھتا جا رہا تھا اور فرار کی راہیں یکے بعد دیگرے اس پر پابند ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ مزید شکست و ریخت سے بچنے کے لیے اپنے فکری نظام کو منضبط انداز میں چلانا ضروری ہے!

اس نے وکالت کے پیشے کو خیرباد کہہ دیا اور تائب منصف کی حیثیت سے گناہ و ثواب کے تناظر میں عملی زندگی کی جہت کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس کے تحقیقی ادراک نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ معصومیت اور برابری کا دعوا ایک کھلا جھوٹ ہے۔ اب اس کے نزدیک معصومیت اور عصیان کے خود ساختہ انسانی نظریات جعلسازی کے سوا کچھ نہ تھے! اس کے خیال میں انسان نے انسان کو دھوکا دینے کے لیے یہ نظریات وضع کیے تھے جو نہ صرف انسانی ادراک کی ناپختگی کے عکاس تھے بلکہ ہر دور میں مناقشات اور تعصّبات کی خلیجوں کو وسیع تر کرتے رہے تھے!!

لیکن بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہ ہنوز وہی پرانا کھیل کھیل رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار اس کا کردار پرانے کھیل سے نئے ضوابط کے تحت بدل گیا تھا! کلے مینس ماضی میں زندگی کی عملی سرگرمیوں سے ذہنی رویوں کو ہم آہنگ کرکے دوسروں کی نسبت خود کو برتر سمجھتا تھا لیکن اب اس نے اسی احساس برتری کے حصول کی خاطر ایک دوسرے انتہا پسندانہ تصور کے مدار پر اپنی تمام تر زندگی کو رکھ دیا تھا! اب وہ مسلسل اور بے تکان انداز میں ہر بات کے لیے خود کو موردِ الزام ٹھہراتا اور اپنی ذات کو لعن طعن کرکے نہ صرف برتر سمجھتا بلکہ اپنے اس طرزِ عمل سے خود کو دوسروں سے ممیز اور ممتاز کرتا تھا!! اب اسے سکون اور ابتہاج کے جو لمحات مل رہے تھے وہ ماضی میں ایک مختلف دائرہ کار میں رہ کر ملنی والی خوشی سے زیادہ مختلف نہ تھے! مسرت اور بہجت کی لذت وہی تھی مگر اب اس کا مصدر و ماخذ بدل گیا تھا! زندگی کے متعلق اس کا یہ نیا نقطۂ نظر مختلف

معتقدات کے تناظر میں ایک شدید قسم کا ردعمل تھا۔

اگر کلے مینس کے بدلتے ہوئے داخلی میلانات کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہم کو پاسکل PASCAL کے انحراف (DIVERSION) اور خود فریبی کے تصورات کا اتباع کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی حقیقی شناخت کو نظر انداز کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اپنی ذات کے مدار سے خود کو ہٹاتا جائے اس کی ارتفاع پسند اور انا پرست برتری اس کے لیے وجودیاتی ضرورت بن کر رہ جاتی ہے۔ اپنی ذات سے انحراف کا عمل اس کی زندگی میں لایعنی اور غریب الہیت (GROTESQUE) سرگرمیوں کو جنم دیتا ہے جو اس کے لیے عارضی طمانیت اور وقتی نروان کا موجب بن جاتے ہیں!

خود کو ہر طرح سے بچانے کی کوشش کے باوجود کلے مینس کا اپنا وجود ابلیسانہ قہقہے کے زیر اثر عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی چپکے سے دبے پاؤں نہ معلوم کہاں سے وارد ہو کر یہ قہقہہ تہدیدی انداز میں اس کے اعصابی نظام کے لیے اختلال کا باعث بن جاتا تھا۔ یہ صرف قہقہہ ہی نہ تھا جو ناگہانی آفت کی شکل میں اس کے حواس پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی تھا جو اس کے لیے اضمحلال، ذہنی انتشار اور پراگندہ خیالی کا سبب رہا تھا۔ اس واقعہ کو فراموش کرنے کی بہترین کوششوں کے باوجود اس کی یادداشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے گئے تھے ——— یہ واقعہ ایک عورت کی ذات سے متعلق تھا۔ اس قہقہے سے پیدا شدہ جہنمی عذاب میں گرفتار ہونے سے تقریباً دو تین سال قبل نومبر کی ایک بے حد سرد رات کو جب وہ پیرس کے ایک پل کو پار کر رہا تھا کہ اس نے ایک عورت کو ریلنگ پر جھکے ہوئے دیکھا۔ پل سے گزرنے کے فوری بعد اس نے پانیوں کے شور اور یخ لہروں کے پس منظر میں کئی چیخوں کی گونج کو سنا جو چند لمحوں بعد اطراف کی دبیز خاموشیوں سے سر ٹکرا کر معدوم ہو گئی۔ اب فضا میں پھر سناٹوں کی حکمرانی تھی! ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے دوبارہ پل کی جانب لوٹنے کے خیالوں کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اس نے کسی کو اس حادثہ کی بابت کچھ بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اور رات کی سیاہی میں خود کو خود سے چھپاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح کلے مینس نے وجودیاتی فیصلہ کرنے سے گریز کیا تھا! یہ اس کے دائرہ اختیار میں نہ تھا کہ مخصوص حالات اور واقعات سے مطابقت رکھنے والے مخصوص عملی فیصلے کر سکتا! یہ اس کا فطری وطیرہ تھا کہ واقعات سے ہم آہنگ فیصلوں کو قصداً ٹالتا رہے۔ اپنی اسی "صلاحیت" کے ذریعہ وہ قنوطیت، یاس اور ناکامی کو عارضی طور پر اپنے قابو میں کر لیتا تھا وہ دراصل بھول جانے کی موثر قوت کے ذریعہ فرار کی نئی راہیں تلاش کرتا تھا۔

کامیو نے پروست (PROUST) کے یاد کے نظریہ (CONCEPT OF REMEMBRANCE) کو معکوس کر دیا ہے۔ پروست کا خیال تھا کہ خوشی کو پیدا کرنے اور طویل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ انسان ذہن میں مسرت و بہجت کے گزرے ہوئے لمحوں کو دوبارہ زندگی بخشے۔ ماضی کی خوشی کا احساس حال کی پراگندگی کو فرو کرنے یا دکرنے والوں کو بالیدگی اور مثبت جذباتی ارتفاع سے بہرہ ور کر سکتا ہے! اس کے علی الرغم کلے مینس ماضی سے وابستہ واقعات اور یادوں سے خوفزدہ ہے۔

وہ صرف انھیں واقعات کو یاد کرنے کا اہل ہے جن کے باب میں اس نے وجودیاتی ضرورت کے تحت اہم فیصلوں سے گریز کیا تھا اور بعدازاں یاد کرتے ہوئے تخویف کے شدید احساسات سے خود کو ہمکنار پایا تھا کہ اس نے اس وقت ایسا کیوں کیا تھا؟ ناول اس مرکزی کردار کے اس واضح تاثر پر منتج ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ وجودیاتی ضرورت کے تحت فیصلہ کن قدم اٹھاتے وقت تاخیر کو طول دیتا رہے گا ۔ انسانی زندگی میں فرار کا یہ راستہ زندگی سے متعلق ایک نئے تصور کی ترجمانی کرتا ہے !

کامیو زندگی کی یک رنگی اور یکسانیت کو تنقید کا ہدف بناتے ہوئے آج کے انسان کی برفانی بے اعتنائی کے مختلف النوع پہلوؤں سے بحث کرتا ہے ۔ وہ استراد کی روح ہے اور فکری نظام کے ڈھانچے کو بدلنا وقت کی اہم ضرورت متصور کرتا ہے ۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مروجہ اقدار حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے کے سبب غریب الہیت GROTESQUE اور لایعنی ABSURD واقعات کو جنم دیتے ہیں ۔ کامیو نے اس ناول میں زندگی کی بے معنویت اور لاشئیت کے نظریہ کا از سر نو جائزہ لیتے ہوئے اس سے وابستہ مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔ اس کے نزدیک کوئی شے اپنے مخالف کی عدم موجودگی میں نمو پذیری اور ارتقا کا مرحلہ طے نہیں کر سکتی !
نیکی اور بدی، معصومیت اور گناہ ______ زندگی اور موت کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ارتقائی منازل طے کر سکتے ہیں وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ فکر و عمل کے تناظر میں ان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے ۔ کامیو کے خیال میں انسان اپنی نقل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔

(بقیہ صفحہ ۲۴)

جس کی وجہ سے شعری حسن مجروح ہوتا ہے ۔

مثلاً

میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تیرگی دشمن
صبح نو عبارت ہے میرے مسکرانے سے
عہد انقلاب آیا، دورِ آفتاب آیا
منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

مگر ان کے بیشتر اشعار اپنے فنکارانہ جوہر کی وجہ سے شعری حسن رکھتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجروح نے ترقی پسند خیالات و افکار کو نئی لفظیات کی صورت میں بڑی بے باکی اور فنی چابک دستی سے غزل کے داخلی اور ایمائی انداز میں پیش کر کے ترقی پسند غزل کو ایک نئی آن بان بخشی ہے

مکتبہ جامعہ بُک کلب

پروفیسر اکبر رحمانی
EDITOR "AMOZGAR" MONTHLY"
KASHANA-E-SUHEL,
57, BHAVANI PETH,
JALGAON-425001.

اُردو ادب اور مشترکہ تہذیب

برّصغیر ہندو پاک میں اگر کوئی زبان مشترکہ تہذیب، قومی یک جہتی اور ملے جلے کلچر کی نمائندہ ہوسکتی ہے تو وہ لشکروں اور بازاروں میں پیدا ہوئی اور خانقاہوں میں تربیت پائی ہوئی اُردو زبان ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے مختلف تہذیبوں کے اختلاط نے جنم دیا اور مختلف قوموں کے افراد نے جس کے علم وادب کی رونق اور رنگینی میں اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ اردو مختلف قوموں کے میل جول ہی سے پروان چڑھی۔ اپنے ارتقائی مراحل میں بھی اس نے کبھی کسی تہذیب یا کسی زبان کے ساتھ بیر نہ رکھا۔ ہر ایک سے فیض اٹھایا۔ مشہور ومعروف محقق اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری، اردو کی اس سیّال فطرت کے بارے میں فرماتے ہیں :

"منطق کی طرح اردو کٹر اصول پرست نہیں۔ سیّال اور لچکیلی زبان ہے۔ الفاظ کی حد تک اُردو بڑی آزاد منش اور ملنسار واقع ہوئی ہے۔ اس نے ہر زبان سے فیض اُٹھایا۔ عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، پوربی، برج، پرتگال، اطالوی، انگریزی ہر زبان کے الفاظ اس نے دل کھول کر قبول کیے۔ جہاں کوئی لفظ نظر پر چڑھا اس نے آنکھوں سے لگایا اور ادنا تصرّف کے بعد اپنایا۔"

(داستان زبان اُردو)

آج ملک کی بیشتر زبانیں سیاسی وجغرافیائی حد بندیوں میں محصور ہوکر رہ گئی ہیں لیکن صرف اردو ایک ایسی زبان ہے جو نہ کل کسی علاقے تک محدود تھی نہ آج محدود ہے۔ اس کی ہمہ گیریت اور بین علاقائیت کی شان آج بھی برقرار ہے۔ اردو زبان کے غیر علاقائی ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ مختلف علاقوں میں وہ مختلف ناموں سے موسوم ہوئی۔ امیر خسرو نے اسے 'زبان دہلوی' کہا تو دکنی شاعر نصرتی نے ؎

ہے دکھنی میں مجھکوں مہارت بہتی
کہ النصر منکم سکے نصرتی

دکن ہی کے ایک شاعر آگاہ (المتوفی ۱۲۲۰ھ) نے اُسے بجائے 'دکھنی' کے اُسے 'زبان ہندی' لکھا ؎

وے بعض یاروں کا ایما ہوا
سو ہندی زباں ، یہ رسالہ ہوا

گجرات میں اُسے 'گجری' کہا گیا۔ دکن اور شمالی ہند میں اردو کا ایک اور نام 'ریختہ' بھی استعمال ہوا ہے۔ اسے سب سے پہلے ولی نے استعمال کیا تھا ؎

یہ ریختہ ولی کا جاکر اُسے سنادے
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند

شمالی ہند کے شعرا لفظ ریختہ کو عام طور پر استعمال کرتے تھے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

لوگوں نے ریختہ کا مطلب گری پڑی زبان لیا ہے جب کہ ریختہ موسیقی کی اصطلاح ہے جو آگے چل کر مخلوط زبان کے معنوں میں استعمال ہونے لگی۔ ریختہ کہ کر اردو زبان کو حقیر اور معیوب گردانا گیا۔ لیکن اس ادنا اور حقیر لفظ میں اردو زبان کی ایک طویل تہذیبی و فکری ارتقا کی تاریخ مضمر ہے بقول ڈاکٹر وزیر آغا :-

"..... یہ لفظ (ریختہ) بجائے خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ زبان ایک طویل عرصے پر پھیلی ہوئی تہذیبی آمیزش بلکہ آویزش کو خود میں سمیٹتی چلی گئی "

(نیرنگ خیال راولپنڈی ۱۹۷۵ء)

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اُردو زبان ہند آریائی عناصر کی پروردہ ہے۔ اس لحاظ سے اردو زبان میں وہ تمام مشترک قدریں ملتی ہیں جو آریائی، ایرانی اور موہن جوڈارو اور ہڑپا کی تہذیبوں میں تھیں اگرچہ عرب تاجروں اور حکمرانوں کے اثرات نے بھی اس جدید زبان کا ہیولا تیار کرنے میں تعاون کیا لیکن ترک ایرانی مسلمانوں کے اثرات اس نے سب سے زیادہ قبول کیے۔ ایرانی و فارسی اثرات اردو زبان و ادب کو ایسا رنگ و آہنگ دیا جس میں من و تو کا امتیاز نہ رہا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد خیالی، وسیع المشربی اور رواداری اردو ادب کا مزاج بن گئی۔ مشہور نقاد ڈاکٹر محمد حسن اردو زبان و ادب کی فکری اور جذباتی بنیاد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :-

" اردو ادب کا فروغ تہذیبوں کے اختلاط سے ہوا مگر ان تہذیبوں کو غالباً ہندستانی اور ترک ایرانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہندستانی اور ترک ایرانی تہذیبیں خود کئی منازل و مراحل سے گزری ہیں اور کئی تہذیبی وحدتوں سے مل کر بنی ہیں لیکن ہندستانی اور ایرانی دونوں آریائی تہذیبیں تھیں اور چونکہ ان دونوں میں نسلی مناسبت تھی لہٰذا مشترک اقدار و تصورات کا ذخیرہ بھی موجود تھا۔ اردو زبان و ادب کی فکری اور جذباتی بنیاد انھیں مشترک ذخیرۂ اقدار پر ہے

اور انھیں ذرائع سے آزادیِ فکر، رندی وقلندری، رواداری، وفا پیشگی، وحدت الوجود اور انسان دوستی کی عظیم روایات ہمارے شعروادب تک پہنچیں اور یہ رنگ و آہنگ اس انداز سے مقبول ہوا کہ اس کی گونج ملک بھر میں سنائی دی۔"

(اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر)

اردو زبان جس مشترکہ تہذیب کی امین و ترجمان ہے اس کا نمایاں اظہار اُن اوّلین نثری شہ پاروں میں نظر آتا ہے جو اولیا و صوفیۂ کرام کے ملفوظات، اقوال اور تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ ان صوفیۂ کرام نے اپنے پیغام اور معرفت میں ڈوبی ہوئی باتوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے انھیں کی زبان کو وسیلہ بنایا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ معراج العاشقین، شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کی بحر الحقائق، شیخ خوب محمد چشتی کی امواج خوبی اور خوب ترنگ، شاہ برہان الدین جانم کی کلمۃ الحقائق علاوہ ازیں ملّا وجہی کا ادبی شاہکار اور صوفیانہ تمثیل سب رس چند ایسے اردو کے نثری شاہکار ہیں جن میں انسان دوستی، مشترک اقدار، رواداری اور مشترکہ تہذیب کی روایات ملتی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "اردو کا کلاسیکی ادب فکر اور اسلوب دونوں اعتبار سے تصوف سے متاثر رہا ہے تو غلط نہ ہو" تصوف نے اردو غزل کو بھی متاثر کیا اور اس طرح غزلوں میں آزاد خیالی، رواداری، سرمستی اور انسان دوستی کی روایات فروغ پائیں۔ گل و بلبل، ساغر و مینا، کفر و ایماں، شمع پروانہ اور دیر و حرم کے استعاروں میں کٹر پن کی جگہ آزاد خیالی اور قلندری کے مضامین مقبول ہوئے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اردو شاعری کی یہ سیکولر روایات مشترکہ تہذیب ہی کی بدولت فروغ پائیں۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ہمارے گھر کے پہلو سے دین کی راہ یاد آوے — صنم رکھتے ہیں جس کو دیکھ کر اللہ یاد آوے
معتقد ہرگز نہیں ہیں کفر اور اسلام کے — گر مرید اس دور میں ہیں ہم تو پیر جام کے
جلوہ تو خدا کا دیکھا ہے بتوں ہی میں — سمجھانے کو پھر آگے اک بات بنالی ہے

اردو شاعری مشترکہ تہذیبی اقدار سے مالا مال ہے۔ اس میں کسی مخصوص فرقے یا مذہب کی چھاپ نہیں بلکہ مختلف تہذیبوں، فرقوں اور مذاہب کی تاریخی و نیم تاریخی روایات اور رسم و رواج نیز طرزِ معاشرت کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ یہاں آپ کو شبِ برات کے ساتھ دیوالی کے جلوے بھی دکھائی دیں گے اور عید کے ساتھ دسہرا اور ہولی کی رنگینیاں بھی نظر آئیں گی۔ خصوصاً اردو مثنویوں میں ہندستانی یا مشترکہ تہذیب کے عناصر کی جلوہ گری سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ مشہور محقق رشید حسن خاں فرماتے ہیں:

"ان مثنویوں میں ہندستان کے موسموں کی رنگینیاں، یہاں کی مذہبی وغیرہ

مذہبی رسموں کی تفصیلات اور خالص مذہبی تلمیحیں بھی ملتی ہیں اور اس ملے جلے کلچر کی رنگارنگ ترجمانی بھی ملتی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے ساتھ رہنے سے عالم وجود میں آیا۔"

ان مثنویوں کے قصّے اگرچہ ایرانی ہیں لیکن پورا ماحول، رسم و رواج اور مناظر ہندستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مثنوی سحرالبیان ہو یا گلزارِ نسیم ان سب میں اس زمانے کی ہندستانی معاشرت اور مشترکہ تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات سامنے آجاتی ہیں۔ غرض اردو کی مثنویاں صحیح معنی میں مشترکہ تہذیب کی ترجمان ہیں کیونکہ بقول رشید حسن خان:

"ان میں ہندستان کے موسموں، منظروں، شہروں اور ہندستان کی روایتوں کے خزانے محفوظ ہیں۔ رسم و رواج کے افسانے درج ہیں ان میں بہادری کی داستانیں بھی ہیں اور محبّت کی کہانیاں بھی۔ ان داستانوں میں رنگ و نسل کے امتیاز کی حدیں ٹوٹ گئی ہیں۔ سماجی سطح پر سیکڑوں برس تک ہندستان میں جس ہم رنگی و یک رنگی کی روایت پروان چڑھتی رہی اس کی تفصیلات بکھری ہوئی ہیں۔"

شرون کمار ورما
180, KUCHA LAMBAN,
AMRITSAR
PIN 143006

کچھ نہیں ہوگا

"اس ظالم راکھشس سے ہمیں کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔" برہمن نے اداسی اور چنتا سے کہا۔ "جس دیش کا راجا کمزور، نااہل اور ڈرپوک ہو، وہاں کے لوگوں کو نہ تو شادی کرنا چاہیے، نہ بچے پیدا کرنا چاہییں کہ باعزت متمدن اور پُرمسرت زندگی صرف ایک نیک حوصلہ مند اور طاقتور بادشاہ کے تحت ہی ممکن ہے۔"

(مہابھارت کے ایک باب 'بھاکا سُر' سے)

اچانک انہونی ہوگئی۔

اب پانچ چھے ہزار سال بعد، شہر کے باہر، چوراہے پر پڑی اس لاش، جسے بھیم نے وہاں رکھ دیا تھا۔ میں حرکت سی ہونے لگی تھی۔ سب سے پہلے یہ تماشا ایک بچے نے دیکھا تھا۔ وہ ڈر کر ماں کے پاس بھاگ آیا۔ لیکن گھر میں کسی نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ دانشمندوں کا خیال تھا کہ اس نے کھلی آنکھوں سپنا دیکھا ہے۔ ایسا بھلا ہو سکتا ہے! ہزاروں سال پرانے پنجر میں حرکت ــــ ناممکن ــــ بھیم نے تو اس راکھشس کی ہڈی ہڈی علاحدہ کر دی تھی۔

لیکن اس رات شہر میں کوئی سویا نہیں۔ وہ سب کھڑکیوں، منڈیروں اور چھتوں سے اس پنجر کو دیکھتے رہے۔ جب چاند مشرق میں درختوں کی سیاہ قوس سے اوپر اٹھا اور چاندنی سارے میں پھیل گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ پنجر نے حرکت کی ہے۔ کچھ کو تو اپنی ہی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، لیکن اس رات وہ سب ٹولیوں میں بٹے۔ اس پنجر کی ہی باتیں کرتے رہے اور خوفزدہ رہے۔

صبح ہوتے ہی کچھ ذمہ دار، جہاندیدہ بزرگ اس پنجر کو دیکھنے گئے۔ وہ پرانا ہڈیوں کا ڈھیر ویسے ہی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ خوش خوش لوٹے اور شہر والوں کو تسلی دی لیکن جنھیں اپنی آنکھوں اور دماغ پر بھروسا تھا، ان بزرگوں سے متفق نہ ہو سکے۔

رات کو پھر شہر والے کھڑکیوں، منڈیروں اور چھتوں سے جا چپکے، چاند، درختوں کے

پیچھے سے نمودار ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ پنجر نے پھر حرکت کی ہے۔ ہڈیوں کے ہلنے اور جڑنے کی آواز بھی سنی گئی۔ شاید کتے بھی روئے تھے۔ لوگ سہم گئے۔ اب کیا ہوگا۔ لب خاموش تھے لیکن چہروں پر یہ سوال، لکھا ہوا تھا۔

اگلے دن گھروں میں نہ چولھے جلے، نہ عورتیں ترنجن، اور پنگھٹ پر دکھائی دیں بچے گھروں سے نہ نکلے۔ مرد کام پر نہیں گئے۔ بڑے بوڑھوں نے پھر جاکر دیکھا ــــ پنجر حرکت تو نہیں کر رہا تھا لیکن ہڈیوں کے ڈھیر میں ترتیب سی پیدا ہو چلی تھی۔ انھیں تشویش ہوئی لیکن اس بات کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا کہ پانچ چھے ہزار سال بعد اس ہڈیوں کے ڈھیر میں یہ ترتیب آئی کیسے ــ! اگر یہ لاش دوبارہ زندہ ہوگئی تو ــــ! اس خیال نے تجربہ کار بزرگوں کو بھی خوفزدہ اور پریشان کر دیا۔ لیکن وہ شہر والوں کو ہراساں نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک بزرگ نے کہا:

"یہ کمزور دلوں کا وہم ہے ــــ لاش بھلا زندہ ہو سکتی ہے! وہ بھی ہزاروں سال بعد، یہ ناممکن ہے۔"

"لیکن چاچا ــــ لوگوں نے خود دیکھا ہے ــ" ایک نوجوان نے کہا۔

"یہ لوگ نادان ہیں۔"

ہڈیوں کے ڈھیر میں ترتیب آنے لگی ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا سروں پر خطرہ منڈلا رہا ہے اور ــــ" دوسرے نے کہا ــــ "اتنے ہزار سال ہو گئے، لاش نہ گلی، نہ سڑی، آندھیاں آئیں اور ہڈیاں بکھری نہیں"

"آخر راکھشس بھا کا سر کی ہڈیاں ہیں ــــ" ایک اور بولا۔

بزرگ خاموش ہو گیا۔ یہ کڑوا سچ تھا۔

بات وہاں ٹھہر تو گئی، ختم نہیں ہوئی۔ اب شہر والے رات رات بھر جاگ کر شہر کے باہر پڑے اس پنجر کو دیکھتے رہتے۔ بچوں نے کھیلنا اور عورتوں نے بتیانا بند کر دیا تھا۔ سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔ شہر میں کام کاج ٹھپ ہو گیا تھا۔ اب شہر والے صرف اس پنجر کی باتیں کر رہے تھے۔ اور کسی خطرے کے منتظر رہتے تھے۔

حاکم شہر کو کام کاج بند ہو جانے سے گہری تشویش ہوئی اس نے اعلان کرایا کہ لوگ وہم چھوڑیں اور کام کریں، دھمکیاں بھی دیں اور لالچ بھی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت ہر طرح سے خبردار ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ ہونے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حکومت ان کی سلامتی کا پورا دھیان رکھے گی۔

اس رات ہی ایک عورت نے ہڈیوں کے آپس میں جڑنے کی آواز سنی تو اس نے اپنے خاوند کو جگایا۔ مرد نے اٹھ کر دیکھا ــــ پنجر سچ مچ ہل رہا تھا۔ ہڈیوں میں انسانی ڈھانچے والی ترتیب پیدا ہو رہی تھی۔ پنجر کا دایاں ہاتھ مکمل ہو چکا تھا اور اب وہ جسم کی دوسری ہڈیاں مناسب جگہ جوڑ رہا تھا۔ شاید اس نے بیٹھنے کی بھی کوشش کی تھی ــــ کروٹ تو ضرور بدلی تھی اور اب

وہ شہر کی طرف دیکھ رہا تھا ــــ آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھوں میں الاؤ دہک رہے تھے۔ مرد نے اپنے پڑوسی کو جگایا ــــ پھر دوسرے پھر تیسرے کو اس طرح پورا شہر جاگ گیا ــــ اور دیکھتے الاؤ دیکھ کر وہ سب ڈر گئے ــــ چھتوں سے اتر کر کمروں میں بند ہو گئے، کھڑکیاں، دروازے مقفل ہو گئے بتیاں بجھ گئیں شہر پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کبھی راکھشس کی ہڈیوں کے کھٹاک سے جڑنے کی آواز لگائی دیتی۔ کتے ڈراؤنی آواز میں رونے لگے۔

نہ رات کی نیند، نہ دن کا چین ــــ لوگوں کا جینا دوبھر ہو گیا۔ وہ جلوس کی شکل میں حاکم شہر کی اونچی، مضبوط حویلی تک گئے۔ چوکیداروں نے پھاٹک بند کر دیا اور سنگینیں تان لیں اور دیواروں پر مستعدی سے پہرہ دینے لگے۔ حویلی میں ہل چل مچ گئی۔ حاکم کو جگایا گیا۔ پہلے تو اس نے اس وقت لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیا پھر اس اطلاع پر کہ وہ سب نہتے ہیں، اس شرط پر رضامند ہوا کہ ان کے دو چار نمایندے اندر جا کر اسے صورت حال سے آگاہ کریں گے۔ کچھ دانا و تجربہ کار بوڑھے اندر بھیجے گئے۔

ایسا نہیں کہ حاکم کو اس پنجر کے بارے میں کوئی علم نہ ہو ــــ شہر کی تمام خبریں خفیہ ایجنسی اسے پہنچاتی رہتی تھی لیکن اس کی حویلی کی دیواریں اتنی اونچی اور مضبوط تھیں اور پہرہ اتنا سخت تھا کہ وہ ڈرتا نہیں تھا۔ کچھ اپنے رتبے اور عہدے کے خیال سے بھی اظہار تشویش اور سراسیمگی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے نہایت اطمینان سے لوگوں کی پتا سنی تمام وقت سکون سے مسکراتا رہا اور انھیں یقین دلایا کہ حکومت اپنی ذمہ داریاں بخوبی سمجھتی ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لے گا۔ مشیروں سے مشورہ کرے گا اور جلد ہی سمسیا کا کوئی ٹھوس اور پایدار حل ڈھونڈ نکالے گا۔

شہر والوں کو واپس بھیج کر حاکم نے مشیروں کا ہنگامی اجلاس بلایا۔ اس مصیبت کا علم تو سب کو تھا۔ لیکن وہ انجان ہی بنے رہے اور حاکم کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ سب جنتا کا وہم ہے اور کہ اس بے ہودہ، بے معنی شکایت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لوگ دھیرے دھیرے اس کے عادی ہو جائیں گے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر ایسے پروگرام پیش کیے جائیں، جس سے لوگوں کو یقین ہو جائے کہ یہ سب تماشا ہے۔

"ٹھیک ہے، لیکن یہ پنجر کل میرے اور آپ کے لیے بھی مشکل پیدا کر سکتا ہے۔"
مشیروں نے اس طرح تو سوچا ہی نہیں تھا، انھیں یقین ہو گیا، تاکہ وہ، جنتا سے الگ اور اونچی کوئی چیز ہیں۔

"اسے گہرا دفنا دیا جائے ــــ" مولوی صاحب نے رائے دی ــــ "میں کلمہ پڑھ کر اس کی تمام تر نحوست زائل کر دوں گا"

"نہیں مہاراج، اسے دفنایا نہیں جا سکتا۔" پنڈت جی نے اعتراض کیا ــــ "یہ مہابھارت کے سمے کی لاش ہے۔ اس کا انتم سنسکار کرنا ہی اچت ہو گا سمے پر داہ سنسکار نہ کیے جانے کے کارن اس کی گتی نہیں ہو سکتی۔ میں وید منتروں کے شدھ اچارن سے اس کی

گتی کروں گا۔ اب یہی ایک ماتر اُپائے ہے۔۔۔"

غلط جناب عالی ۔۔۔ " پادری نے اپنی موجودگی ثابت کی ۔ " اس کی روح کو تبھی قرار آئے جب مقدس باپ اسے معاف کر دے گا۔ میں یسوع مسیح سے پرارتھنا کروں گا کہ وہ اس کو نجات دلائے "

ہمیں سوچنے کا موقع دو۔۔۔ " حاکم نے سنجیدگی سے کہا " ہم سیکولرازم، جمہوریت اور روچار کی آزادی میں یقین رکھتے ہیں۔ کسی کو بھی ناراض نہیں کر سکتے۔۔۔ "

تب حاکم شہر کے مشیر خاص نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ حاکم اطمینان سے مسکرایا اس نے مولوی، پنڈت اور پادری کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ اہل کاروں کو چھٹی دی اور جب وہ اور مشیر خاص کمرے میں رہ گئے تو بہترین شراب اور بڑھیا کھانے منگوائے کھا پی کر اپنی اونچی کھڑکی سے جو راستے پر پڑی لاش کو دیکھا۔

اس وقت وہ پنجر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور ان ہیبت ناک گڑھوں میں الاؤ جل رہے تھے۔ اور وہ شہر کو دیکھ رہا تھا۔

" ہمیں اس کی نیت صاف نظر نہیں آئی "

" حضور فکر مند نہ ہوں ۔ " مشیر خاص نے اعتماد سے کہا ۔۔۔ " میں سب سنبھال لوں گا، حضور کی تحریری اجازت درکار ہے "

حاکم خوش ہوا۔ ایک جام اور چڑھایا۔ کھڑکی بند کی اور مشیر خاص کو تحریری اجازت دے کر نشچنت ہو گیا۔

اگلی صبح شہر میں اعلان ہوا، پوسٹر لگے کہ وہ خطرناک پنجر جو راستے سے ہٹا دیا گیا ہے اور اب لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنا کام کریں۔ شہر کے امن و امان کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

شہر والے خوش ہو گئے۔ لوگوں نے جا کر دیکھا۔ سچ مچ وہ پنجر اب یہاں نہیں تھا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اب وہ اس بلا سے محفوظ تھے۔ اب وہ چین کی نیند سو سکیں گے۔ اسکول اور کھیل کے میدان بچوں سے بھر گئے۔ تر نجن اور پنگھٹ پھر آباد ہو گئے۔ راگ رنگ کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ زندگی معمول پر آ گئی۔ لوگوں نے حاکم شہر کو صدق دل سے دعائیں دیں۔ اتفاق رائے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور سدا وفادار رہنے کا عزم بھی۔

پھر ایک صبح کتھا سنانے کے بعد پنڈت جی نے سوال اٹھایا۔

" آخر وہ پنجر گیا کہاں ۔ اس کا انتم سنسکار تو ہوا نہیں، اس لیے خطرہ ابھی ٹلا نہیں "

مولوی صاحب نے کہا کہ لاش کی بے حرمتی ہوئی ۔ پادری نے بتایا کہ بنا تابوت اور پرارتھنا کے روح کو شانتی نہیں ملتی۔

بات سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ پھر پریشان ہو گئے۔ پنجر کہاں گیا۔۔۔ نوجوان

جنگل، کھنڈرات، یہاں تک کہ اس غار، جہاں بھاگا بنجر، رہا کرتا تھا میں جاکر دیکھ آئے۔ وہ بنجر کہیں نہیں تھا۔ یہ بات اور بھی زیادہ تشویش ناک تھی۔ شہر میں ایک بار پھر بے چینی پھیل گئی۔ شکوک ذہنوں کو دھندلا رہے تھے، سوچیں زخمی ہو رہی تھیں۔ اب پھر ہر جگہ بنجر کی باتیں ہونے لگیں تھیں، حاکم شہر کو پتا چلا تو وہ ناراض ہوا۔ اس کی ناراضگی سے ڈر کر لوگوں نے اکٹھے ہونا چھوڑ دیا۔ خاموشی ہو گئے۔ حاکم شہر کا بھی یہی حکم تھا لیکن وہ بنجر اب لوگوں کے ذہنوں میں جاگھسا تھا۔
مولوی، پنڈت اور پادری نے لوگوں کو یقین دلایا کہ حاکم شہر جنتا کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اس پر حاکم شہر نے ان تینوں کو خلوت میں طلب کیا۔ جب وہ واپس آئے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔

پنڈت جی کا مکان دو منزلہ ہو گیا۔

مولوی صاحب کے دونوں بیٹے برسرِ روزگار ہو گئے۔

پادری کو گرجا گھر کی توسیع کے لیے اور زمین الاٹ ہو گئی۔

لیکن لوگوں میں بے چینی، ہراس اور عدم تحفظ کا احساس بڑھتا گیا۔ شہر ویران رہنے لگا۔

بنجر کہاں گیا — !

اگر وہ دوبارہ آگیا تو — !

ہمیں بتایا کیوں نہیں جاتا !

مولوی، پنڈت اور پادری جھوٹے، مکار اور دغا باز ہیں

باہر نہ پاکر اب شہر والے اس بنجر کو شہر کے اندر ڈھونڈنے لگے۔ کسی گھر میں تو وہ بنجر تھا نہیں۔ ایک شام اچانک ایک نوجوان نے آکر بتایا کہ وہ بنجر ایک سرکاری دفتر کی اونچی کرسی پر بیٹھا دیکھا ہے۔ ایک عورت نے انکشاف کیا کہ اس نے بنجر کو کچہری کی ہر کرسی پر براجمان دیکھا ہے — پھر تو وہ بنجر سرکاری کرسیوں پر جگہ جگہ دکھائی دینے لگا۔ ان باتوں نے لوگوں کو اور بھی پریشان کر دیا۔ ایک بزرگ نے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہا کہ اس نے وہ بنجر شہر کے تھانے میں دیکھا ہے — بادردی۔

لوگ پھر جلوس کی شکل میں حاکم شہر کی حویلی تک گئے۔ اس مرتبہ ان پر لاٹھی چارج ہوا آنسو گیس پھینکی گئی، گولی چلی، لوگ زخمی ہو کر بکھر گئے۔ حاکم نے لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیا۔
صبح مشیر خاص نے اعلان کیا کہ اس کی اطلاع کے مطابق شہر والے پاگل ہو چکے ہیں اس لیے آیندہ ان سے اسی طرح نبٹا جائے گا۔ لوگوں نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ نعرے لگائے جلوس نکالے، ہڑتالیں کیں۔ جواب میں وہی لاٹھی چارج، آنسو گیس اور گولی — زخم، موت اور پھر وہی اعلان

"لوگ پاگل ہو چکے ہیں"

اب شہر والے رات دن اس چوراہے پر، جہاں وہ بنجر پڑا رہتا۔ کھڑے رہتے ہیں کہ کب مہابھارت کا یگ آئے اور وایو پتر بھیم پیدا ہو — شاید وہ سچ مچ پاگل ہو چکے ہیں۔

ننھے منّے بچّوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
جادو کی ہنڈیا
4/50
شیر اور بکری
6/=
دُم کٹی لومڑی
6/=
بھیڑیے کا گانا
6/=
کوّے کا خواب
6/50
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
چالاک بلّی
6/=
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

رپورٹ

ادب کے ذریعے ہم خوبصورتی کی تخلیق کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ بھی تخلیق کرتے ہیں جو خوبصورت نہیں : (ہربھجن سنگھ)

اگر ادب کے معنی کار آمد ہونے کے ہیں تو میں ادب کے اس تصور سے انکار کرتا ہوں ——— (شمس الرحمٰن فاروقی)

ادبی انجمن "ذہنِ جدید" کے تحت ۱۱ فروری ۸۹ء کو وٹھل بھائی پٹیل ہاؤس میں عصری زندگی میں ادب کی اہمیت، کے عنوان سے سیمینار ہوا۔ اس میں اردو، پنجابی اور ہندی کے ۵۰ سے زائد ادیبوں نے شرکت کی۔ سیمینار کا افتتاح جناب جناب آنند سروپ چیرمین نیشنل بک ٹرسٹ کو کرنا تھا۔ وہ ٹھیک تین بجے سہ پہر سیمینار ہال میں پہنچ گئے لیکن حاضرین کی خاطر خواہ حاضری نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دیر انتظار کے بعد ایک دوسری مصروفیت کی تکمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ جلسے کی صدارت پنجابی ادیب ڈاکٹر ہربھجن سنگھ نے کی۔ ان کی افتتاحی تقریر سے قبل زبیر رضوی نے 'ذہن جدید' کی تجدید کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات تشویش کا باعث ہے کہ عصری زندگی میں ادب اور ادیب دونوں ہی اپنی افادیت اور اہمیت کے رائیگاں جانے کا دکھ جھیل رہے ہیں۔ ترسیل کے جدید ترین ذرائع نے ادب کے گراف کو کچھ زیادہ ہی گھٹا دیا ہے۔ ادبی حلقہ اور اس کے حلقے سے سوچ، فکر، انحراف وانکار اور اعتراف کے جو دھارے اپنے اثرات خارجی زندگی پر مرتب کرتے تھے اس کی قلت پر نہ ایسا کسی کو رنج ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی آنکھ نمناک ہوتی ہے۔ ذہن جدید کی کوشش یہ ہے کہ لکھنے والے کبھی کبھی تخلیق اور ترسیل کے مسائل پر آپس ہی میں محاسبہ اور محاکمہ کر لیں تو آئینے پر گرد جمنے کا موقع نہیں ملے گا۔ چوں کہ تخلیق کا کرب جھیلنے میں درد ایک مشترک میراث کی صورت رکھتا ہے اس لیے لکھنے والے آپس میں درد کے اس چراغ کو روشن رکھیں تو زیادہ بہتر ہے۔ عصری زندگی میں ادب کی اہمیت کا سوال کوئی نیا نہیں ہے۔ اس پر مباحث پہلے بھی ہوئے ہیں آیندہ بھی ہوں گے، لیکن ہر دور میں تخلیق کار ادب کی اہمیت پر اپنے انداز سے روشنی ڈالتا رہا ہے کسی کے نزدیک یہ ایک ذاتی عمل ہے تو کوئی اسے وسیع تر خارجی تناظر میں رکھ کر اس پر رائے زنی کرتا رہا ہے۔ آج کے جلسے کا مقصد پھر ایک بار ان مباحث کو تازہ

آسیجن پہنچاتا ہے۔ جو بے جان ہوتے جارہے تھے یا پھر جنھیں سیاسی شعبدہ بازوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔

سیمنار میں سب سے پہلے پنجابی ادیب پروفیسر ہربھجن نے مائک سنبھالا، اور پھر ہندی کے ادیب رگھوویر سہائے اور اردو ادیب شمس الرحمن فاروقی نے بات کو آگے بڑھایا:

ہربھجن سنگھ: کسی پینٹر سے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تم پینٹ کیوں اور کس کے لیے کرتے ہو۔ کسی گائک سے بھی نہیں پوچھا جاتا کہ تم کیوں مختلف راگ گاتے ہو اور ان راگوں کا زندگی سے کوئی تعلق ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال ضرور ابھرا کہ جب فنون لطیفہ سے وابستہ دوسرے فنکاروں سے ان کے آرٹ کی افادیت کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا تو یقینی طور پر یہ بات ابھری کہ ادب مکمل طور سے فنون لطیفہ نہیں ہے یا اس میں کچھ ایسے عناصر ہیں جو فنون لطیفہ کے زمرے میں نہیں آتے۔ ادب کے ذریعہ ہم خوبصورتی کی تخلیق کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی تخلیق کرتے ہیں جو خوبصورت نہیں ہے تو اس طرح ادب میں ان دونوں پہلوؤں کی افادیت کے بارے میں سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ میں اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ میں لکھتا ہوں تو کیا جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کا کوئی مصرف ہے۔ کیا وہ میری آس پاس کی زندگی پر اثر انداز ہوگا یا میں کچھ اس طرح کی بات لکھوں کہ جسے دنیا صحیح طور سے قبول کرے اور جس سے دنیا کو آگے بڑھنے میں مدد ملے۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس زاویے سے تو میں کورا ہوں، میں نے کبھی اس طرح سوچا نہیں۔ لیکن جب ذہن جدید نے میری توجہ اس طرف دلائی تو میں نے ہم عصر زندگی میں ادب کی افادیت پر سوچنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ ابھی جب زبیر رضوی نے ادب، ادیب اور ترسیل کی بات کی تو مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ مسئلہ دراصل کمونیکشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس کو اسی نقطے سے دیکھنا چاہیے۔ ترسیل میں ہمیشہ ہی دو فریق ملوّث ہوتے ہوتے ہیں ایک سنتا ہے اور دوسرے رسیو کرتا ہے، جو رسیو کرتا ہے وہ بھی بولتا ہے وہ سننے کے بعد ہی نہیں بولتا وہ سننے سے پہلے بھی بولتا ہے کیوں کہ جو بولنے والا ہوتا ہے اس کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اسے کوئی سن رہا ہے۔ اور جو سننے والا ہوتا ہے اسے ذہن میں رکھ کر وہ کوئی بات کہہ رہا ہوتا ہے جو بولنے والا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک دنیا ہے۔ دراصل دنیا بولنے والے کو گفتگو کا مواد فراہم کرتی ہے، دنیا خود اپنی جگہ ایک "تخلیق" کی طرح ہے جسے بولنے والا دیکھ یا سن رہا ہوتا ہے اور اس سنے ہوئے کو وہ دوسروں تک پہنچا رہا ہوتا ہے اور جو سن رہا ہے اس کا بھی کچھ ہاتھ ہے اس کی تخلیق میں تو یہ باتیں سوال کی صورت میں ابھری ہیں اور آپ دنیا سے بھی یہ سوال کرسکتے ہیں کہ اس کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری تخلیق کا میرے سننے والے سے وہی تعلق ہے جو دنیا کا مجھ سے۔ میری کہی ہوئی بات پر اگر کوئی سننے والا دھیان دے رہا ہے تو اس کی وجہ اس کا شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنا ہے کہ میری کہی ہوئی باتیں اس کے لیے کوئی معنی یا مقصد رکھتی ہیں، اگر آپ باتوں کے بامعنی/ بامقصد ہونے کی وضاحت چاہیں گے تو شاید آپ کو کوئی جواب نہ ملے۔ آج ہمارا اکٹھا ہونا دراصل

ہمیں اسی سمت میں سوچنے کی تحریک دیتا ہے! میرے خیال میں دو سوال بنتے ہیں ایک تو کوگنیشن کا اور دوسرا نقطۂ نظر ہے نفسیاتی تجزیے یا نفسیات کا، ان سوالوں کا جواب آسان نہیں اور نہ ہی بہت جلد ہمارے لیے ممکن ہے کہ کسی فیصلے پر پہنچ جائیں، ادب کا اپنا ایک خاصہ ہوتا ہے جو دوسرے طرح کے علم اور گیان کے مطالعہ میں نہیں ملتا، ادب ہی ایک ایسا ہنر ہے جس کے دونوں کناروں پر جو کچھ مٹی سے تخلیق ہو رہا ہے یا جو تخلیق کر رہا ہے اس کے دونوں کناروں پر صرف انسان ہے جب کہ سائنس کے تعلق سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ یہ بات دوسرے فنون لطیفہ میں نہیں ہے۔ ہم جب انسانوں کی بات کرتے ہیں تو در اصل ہم TEXT کی بات کرتے ہیں یہ عام مٹی سے ہونے والی تخلیق نہیں۔ یہ انسان کے بطن سے نئے انسان کی تخلیق کرنے کا عمل ہے، یہ ضروری نہیں کہ تخلیق جن مقاصد یا حالات کو سامنے رکھ کر ظہور پذیر ہوئی آپ بھی اسے اسی زاویے سے دیکھیں۔ آپ کے اور تخلیق کار کے درمیان مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں آپ نے تخلیق کے لیے فضا بنائی، انسپائر کیا اور ایسا کرتے ہوئے آپ نے کچھ مقاصد بھی سامنے رکھے مگر یہ ضروری نہیں کہ تخلیق آپ کے مقاصد یا آپ کی فضا سے ہم آہنگ ہو۔ آپ ادب سے متعلق اپنے مقاصد میں FANATIC ہو سکتے ہیں مگر تخلیق کار کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ کچھ خیالات تھے جو میرے ذہن میں آئے 'ذہن جدید' کی دعوت اس لیے قبول کی کہ شاید ان سوالوں کا جواب میں اپنے ڈھنگ سے آپ کی طرف سے ہونے والی گفتگو میں ڈھونڈ سکوں، سیمینار کے پروفیسر ہربھجن سنگھ کے بعد پنجابی اردو کے ادیب کرتار سنگھ دُگل سے کہا گیا کہ وہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

کرتار سنگھ دُگل | مجھ سے زبیر رضوی نے جب اس سیمینار میں بولنے کے لیے کہا تو میں نے سوچا کہ شاید ریڈیو کی اصطلاح میں کوئی DEVIATION ہوا ہے اور مجھے اس کی جگہ بلا لیا گیا ہے، یہاں اب تک ساری باتیں ہندی میں ہو رہی ہیں، میرے پاس انگریزی میں لکھا ایک مضمون ہے جو پنجابی ادب اور پنجاب کی موجودہ صورت حال کے بارے میں ہے۔ آپ کہیں تو میں وہ سناؤں؟ آوازیں سنائیے سنائیے ہم انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔

آوازیں | پنجاب کی موجودہ صورت حال اور پنجابی ادب میں اس کی گونج کے بارے میں کرتار سنگھ دگل نے اپنے مضمون میں بہت سی باتیں کیں انھوں نے بات یہاں سے شروع کی کہ ادب سماجی حقیقتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے پنجابی ادب بھی اس تعریف کی ذیل میں آتا ہے، پنجاب کی موجودہ صورت حال اور پنجابی ادب میں اس کی عکاسی تک میں اپنی بات محدود رکھوں گا۔ دراصل آج کا پنجابی ادب پنجابی ادیب کی فکری اور ذہنی کش مکش کی کہانی ہے۔ اور یہ کہانی اور ادب میں اس کی گونج پنجاب میں آپریشن بلو اسٹار کے عمل سے شروع ہوتی ہے۔ تقسیم ملک کے وقت ہوئے فسادات سے زیادہ ہولناک اور اور بھیانک صورت حال پنجاب میں دیکھنے کو ملی ہے۔ پنجابی شاعری میں اس ہولناکی نے جس طرح راہ پائی ہے اس کی وضاحت کے لیے کرتار سنگھ دُگل نے پنجابی شاعری اور افسانوی ادب سے کئی مثالیں پیش کیں۔ انھوں نے اصل موضوع پر اظہار خیال نہیں کیا ان کے مضمون کا اصل مدعا یہ تھی کہ پنجاب کی پیچیدہ

سیاسی صورت حال نے پنجابی ادب کے دانشوروں کو غور و فکر کی دعوت دی اور انھیں صورت حا
کو ایک ادیب کے زاویے سے دیکھنے کی تحریک ملی۔ پروفیسر ہربھجن سنگھ نے ان خیالات سے
سیمینار کی فضا بنائی، ان کے بعد ہندی ادیب رگھوویر سہائے کو موضوع پر اظہار خیال کی دعو
دی گئی۔

رگھوویر سہائے | کوی سمیلن اور مشاعرے ہماری ساہتک پرم پرا میں اپنا ایک استھان رکھ
تھے۔ اسی کوی سمیلن نے بچن کی مدھوشالا کو ہم تک پہنچایا، ہندی کویتا کا کوئی مجموعہ شاید ہ
اتنا لوک پریہ ہوا ہو، اس کے علاوہ ایک زمانہ اور بھی تھا جب ایشیا میں ایک جاگرن شروع
کئی دیش آزاد ہوئے بھارت بھی آزاد ہوا اور تب ہندی والوں کو یہ خیال تھا کہ ایک بہت بڑ
پری ورتن ایشیا کے علاقے میں ہو رہا ہے اس وقت ایک بڑی مشہور کویتا تھی شیومنگل سنگ
سمن کی "آج ایشیا میں جاگ اٹھی ہے ایک چنگاری"! اس کو بھی نوجوان کوی سمیلن میں سن
بڑے بے تاب رہتے تھے اور کوی سمیلن اس کویتا کے بنا ادھورے سمجھے جاتے تھے۔ پر وہ
بھی ختم ہو گیا۔ اب میڈیا نے بول کر سنانے والی کویتا کا دوسری حیثیت سے استعمال کرنا شروع
اس میں ہمارے کویوں کی ذمہ داری بھی ہے لیکن کویتا بہت جلد ان کے ہاتھ سے نکل گئی کو ی
سمیلن کی جو زبردست لوگ پریتا تھی اس کا استعمال سماج کو بدلنے یا آدمی کے دماغ کو بدلنے یا اس
کی سمجھ میں پری ورتن لانے کے لیے کویتا کوی سمیلن کے اندر جاکر کچھ زیادہ نہیں کر پائی اس
تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ کویتا کو بول کر سنانے کا جو مادھیم کوی سمیلن کی صورت میں تھا
اور جس کا سمرتھن کر رہا ہوں اس میں بھی گراوٹ آئی۔ اور مشکل ہو گیا اس مادھیم کی پرانی پرم پرا
باقی رکھنا اور یہ دکھانا کہ کویتا کوی سمیلن میں رہ سکتی ہے اور ساہتیہ کا حصہ بھی بن سکتی ہے اب بہ
سے اچھے اور ساہتک کویوں نے کوی سمیلن میں حصہ لینا چھوڑ دیا ہے کیوں کہ وہ ماننے لگے ہیں
کوی سمیلن کا جو اثر پہلے ہوتا تھا وہ اب نہیں ہوتا اب دوسری اور باتیں ہیں جو ساہتیہ کے کر
دھرتاؤں کو خود کو RELEVANT رکھنے اور اس سوچ بچار کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں سمج
ہوں کہ ہر ساہتیہ کے پیچھے کہیں نہ کہیں یتھارتھ کو برابر پہچاننے اور اس کی بدلتی ہوئی شکل کے س
ساتھ اس سے نکلنے والی نئی صورتوں کو پہچاننے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور یہ بات ہندی میں کا
ہوئی ہے مگر لگتا ہے کہ وقت ایسا آگیا ہے کہ اس درستی کو ویاپک بنانے اور دور دور تک دی
اور یتھارتھ کے سب ہی اندھیرے کونوں کو دیکھنے کا، یہ بھی ہوا ہے کہ ہم نے اپنی بھاشا کو بہت آسان بنا لیا ہے تاکہ
زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے اور اس کا ایک نقصان بھی ہوا ہے۔ نقصان یہ ہوا ہے کہ ہندی میں سرل۔ آسان چیزوں کی بھرما
گئی ایک وقت آیا کہ آپ کے پاس کوئی مشکل بات کہنے کو نہیں رہی ہر بات سرل سمجھ لی گئی۔ اور جب تک سرل بات میں کوئی جٹل
نہ چھپا ہو بات بنتی نہیں، آج کے دور میں ساہتیہ سے جڑے ہوئے لوگ اس بات پر وچار کر
ہیں کہ ہم کہاں سے اپنے لیے شبد لائیں وہ نئے شبد لائیں جن کی ضرورت ہے کیوں کہ ارتھ
ہمارے پاس مگر اس کے لیے ٹھیک شبد نہیں ہے۔ ہندی میں نئے لکھنے والوں کو یہ اح
ہو گیا ہے کہ سرل بولی میں شبد ملنا اور آس پاس بکھرے ارتھوں کو شبدوں کے روپ میں ڈھ

کٹھن ہے لیکن وہ اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش میں لگے ہیں اور یہ ایک اچھا شگون ہے (تالیاں)
ہندی شاعر رگھو ویر سہائے نے اپنی بات ORAL میڈیا سے شروع کی تھی اس سلسلے میں انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ دونوں ہی میڈیا مقبول میڈیا ہیں۔ لیکن جہاں تک ساہتیہ کا تعلق ہے یہ دونوں ہی میڈیا ساہتیہ کار کی دسترس میں نہیں ہیں۔ ٹی وی پر اشتہار، تجارتی پن اور سرمایہ دار اس قدر چھایا ہوا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ساہتیہ کار کو اپنا ساہتیہ درشک تک پہنچانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ریڈیو بھی ساہتیہ کو شروتاؤں تک یا سامعین تک پہنچانے میں وہ بھومیکا نہیں نبھا پا رہا ہے جو کتاب یا رسالہ ادا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ساہتیہ اور ساہتیہ کار کا دائرہ سمٹ ہی جاتا ہے۔

دلیپ سنگھ | میں تو آج کے جلسے میں سننے آیا تھا سیکھنے آیا تھا، دگل صاحب چلے گئے ان کے بارے میں تو اتنا ہی کہوں گا کہ آج کوئی اور جلسہ بھی اگر ہوتا تو دگل صاحب اپنا وہی پیپر پڑھتے جو انھوں نے یہاں سنایا ہے، مجھے ان کے پیپر کا آج کے موضوع سے کوئی فوری ربط نہیں معلوم ہوا۔ میرے خیال میں یہ بات کہ ادب کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے کافی پرانی ہو چکی ہے اور کچھ ادیب کہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے لکھتے ہیں، اندر سے آواز آتی ہے لیکن جو کچھ بھی ہو لکھنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا تو ہے خواہ وہ پوشیدہ یا پُراسرار ہی کیوں نہ ہو، رگھو ویر سہائے صاحب نے ساہتیہ کے ذریعے ادب کو سنوارنے کی بات کہی ہے میرے خیال میں بہت سی چیزیں ٹھیک چل رہی ہیں انھیں ہم نکھارے سنوارنے کی کوشش کریں تو اچھا ہے خزاں میں مرجھائے پتّوں کی جگہ ہرے پتّوں کی بات کرنا اچھا لگتا ہے لیکن موسم بہار میں ہرے پتّوں کو بدلنے کی بات غیر متعلق لگتی ہے۔

دوسری بات میں میڈیا کے بارے میں کہوں گا ریڈیو اور ٹی وی کا ادب کے بارے میں غیر دوستانہ رویّہ رکھنے کی بات کی گئی، میں میڈیا سے جڑا ہوں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ ریڈیو اور ٹی وی کے اپنے تقاضے ہیں پبلشر اور رسالے بھی وہ چیز نہیں چھاپتے جو ان کے مطلب کی نہ ہو۔ وہاں بھی جہاں بیٹھک اور عوامی پسند کا پیمانہ ہے تو ہمیں اس پابندی کے اندر رہ کر لکھنا چاہیے۔ اگر دور درشن پر پابندیاں ہیں تو ہوا کریں یقین کریں کہ میں نے خالص ادبی رنگ کی تحریروں کے، ڈرامے وغیرہ بنا کے دور درشن کو دیے ہیں اور ان کو پتا نہیں لگنے دیا کہ میں انھیں ادب دے رہا ہوں تو صاحب ایسا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل کام نہیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ اچھے ادبی پرچوں میں شائع ہونے کے بعد بھی لوگ ادیب کو نہ جانتے ہیں اور نہ پہچانتے ہیں۔ ان رسائل میں بھی آپ کی چیزیں ضائع جاتی ہیں میرے خیال میں کوئی ادیب زندگی یا سماج سے کٹ کر رہ نہیں سکتا اسے حالات سے متاثر ہونا ہی پڑتا ہے چاہے وہ پنجاب کا مسئلہ ہو یا افغانستان کا! وہ ان مسائل سے بچ نہیں سکتا ہاں اتنا ہو گا کہ وہ کبھی کھل کر لکھے گا یا پھر اشاروں میں لکھے گا۔

ڈاکٹر خلیق انجم | رگھو ویر سہائے صاحب نے بڑی اہم باتیں ادب کے بارے میں کہی ہیں، لیکن

ایک بات جو انھوں نے بار بار بطور زور دے کر کہی وہ یہ تھی کہ ادیب ہمارے سماج کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے ادیب ہوئے ہیں انھوں نے سماج کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور نہ یہ کام ان کے بس کا ہے۔ سماج کو ادیب نہیں بدلتا وہ بدلتے ہوئے سماج کی عکاسی کر سکتا ہے، ہمارے یہاں ترقی پسند تحریک کے ذریعے ادب کے واسطے سے سماج کو بدلنے کی شعوری کوشش کی گئی جو ناکام رہی۔ وہ محض نعرہ بازی تھی میرا خیال ہے جن ترقی پسندوں نے سماج کی عکاسی کو اپنا شعار ٹھہرایا وہ بہتر ادب پیدا کر سکے ان کے مقابلے میں جو ادب کو نعرہ بازی کا مطمع بنلئے رہے۔ میرے خیال میں سماج کو بدلنے والی کچھ تاریخی قوتیں ہوتی ہیں اور ادیب ایسی تغیر پذیر قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔ (تالیاں)

رگھوویر سہائے | میں نے یہ کہا ہے کہ ادیب سماج کو بدلنے کی خواہش کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔ اگر اس میں سماج کو بدلنے کی خواہش نہیں تو پھر اس کے یہاں لکھنے کا اضطراب بھی نہ ہوگا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ساہتیہ سماج کو بدل دے، یہ اتنی موٹی بات ہے کہ شاید میرے منہ سے نہ نکلے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سماج کو بدلنے کے کیا معنی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں رہنے والے سب ہی انسان خوشیوں کو حاصل کرنے کی قوت رکھیں بودے انسانوں کا بنایا ہوا عالیشان سماج ہمارا مقصود نہیں، ادیب سماج کو بدل نہیں سکتا تو کم از کم وہ ایک بدلے ہوئے سماج کی کلپنا تو ضرور ہی کر لیتا ہے اور یہ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔

دیوندر اسر | ادیب سماج کو بدلتا ہے یا نہیں یہ مجھے نہیں معلوم ہاں سماجی تبدیلی کا کوئی عمل ضرور ہوتا ہے۔ اور تبدیلی کا یہ عمل کئی مرحلوں سے گزرتا ہے۔ اس عمل میں دلکشی پیدا کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے اور پھر لوگ طے کرتے ہیں کہ انھیں کس راہ سے گزرنا چاہیے۔ یہ جو لوگوں کے اندر رد و قبول کی کیفیت یا مرحلے ہوتے ہیں ادیب ان کا ادراک رکھتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ لوگ تبدیلی کے حق میں ہیں یا نہیں، میرے خیال میں ادب سب سے بڑا MEDIATION ہوتا ہے۔ جہاں تک ادیب کے رول کا معاملہ ہے تو میں کہوں گا کہ سماج میں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں کچھ وہ ہوتے ہیں جو INNOVATIVE NATURE کے ہوتے ہیں نئے خیالات سامنے لاتے ہیں کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان نئے خیالات کی تائید اور تبلیغ کرتے ہیں اور تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان نئے خیالات کے پیرو کار ہوتے ہیں، ادیب دراصل ان سب کے درمیان کا ایک کردار ہوتا ہے پریم چند نے کوئی نیا خیال ہمیں نہیں دیا اپنے زمانے کے مروجہ خیالات کو افسانوں کا موضوع بنایا عکاسی کی، میرے خیال میں کوئی ادیب INNOVATIVE NATURE رہا ہو ایسا نہیں ہوا ہاں ادیب اس کو پیش کرنے والے کی بھومیکا ضرور نبھاتے رہے ہیں۔ ہم ادب کو اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں حقیقت کو پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ادب کے بجائے ہم اخبار پڑھیں، ہم حقیقت کی اپنے طور پر تعمیر نو کرتے ہیں۔ اس کی تشکیل کرتے ہیں اور پھر اسے ادب میں پیش کرتے ہیں، نئے ماخذ بناتے ہیں نئے دھانچے تعمیر کرتے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے یہ اچھی بات کہی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے بارے میں ہمارا

ایک عجیب رویّہ ہوگیا ہے۔ ہم ادب اور میڈیا کو CONFUSE کر رہے ہیں جبکہ اصل مسئلہ یا ٹکراؤ
کتاب اور الیکٹرانک میڈیا کے درمیان ہے۔ جس طرح الیکٹرانک میڈیا ہارڈ ویر ہے اسی SOFTWARE
طرح تخلیق بھی سافٹ ویر ہے۔ ادب چاہے آپ لکھ کر پیش کریں بول کر یا تصویر کشی کے ذریعے
وہ بہرحال ادب رہے گا سوال صرف کتاب کو درپیش خطرے کا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بھی وہم ہے
ہر میڈیا اپنا RELEVANCE رکھتا ہے کتاب کی اشاعت گھٹ نہیں رہی ہے برابر بڑھ رہی
ہے۔ ادب امتیاز کرنے کی قوت اور فکر کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ (تالیاں)

رگھوویر سہائے کے خیالات پر اس بحث کے بعد اردو ادیب شمس الرحمٰن فاروقی کو
موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔

شمس الرحمٰن فاروقی | اگر ادب کے RELEVANT ہونے کے معنی، کارآمد یا یوس فل ہونے کے
ہیں تو میں ادب کے اس تصور سے انکار کرتا ہوں، اس معنی میں ادب کبھی RELEVANT تھا
نہ ہو سکتا ہے اور نہ ایسے ہونا چاہیے، یہ POWER GROUP کی ایک چال ہے کہ وہ ادیب کو یہ
تاثر دیتے ہیں کہ دیکھو تمہیں خود کو معاشرے کے لیے کارآمد بنانا چاہیے، آپ فکر کرنے والے اور
سوچ بچار کرنے والے ہیں، قلم بڑا طاقتور ہوتا ہے اس کا کارآمد استعمال ضروری ہے یہ سب
استحصالی چالیں ہیں چوں کہ ادیب ARTICULATE ہوتا ہے جو کچھ میں دیکھتا ہوں یا آپ دیکھتے
ہیں چاہے میں بس کا سفر کر رہا ہوں یا کچھ اور ایک غیر ادیب ہونے کے ناتے اسے بیان کرنے کی
قدرت مجھ میں نہیں ہوتی لیکن ادیب بڑے سے بڑے واقعے کو چاہے وہ پنجاب کا مسئلہ ہو، افغانستان کا
یا ویت نام کا وہ اس سب کو ادبی پیرائے میں بیان کرنے کی صلاحیت اور طاقت رکھتا ہے۔
ادیب کی اسی ARTICULATION والی طاقت کی بنا پر اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ
سماج کو بدلنے کا جتن کرے اور وہ لکھے یا اس ڈھنگ سے لکھے جو POWER BLOCK
چلتا ہے، اسی لیے میرے خیال میں ادب کی افادیت سے متعلق جو سوال ہے وہ قطعاً غیر ادبی
سوال ہے۔ ہمارے ادب میں خاص طور پر ہندستانی ادب، ایشیائی اور عربی ادب میں یہ سوال
کبھی اٹھا ہی نہیں کہ لکھنے والا کس قدر کارآمد یا مفید شخص ہے۔ دراصل یہ تصور افلاطونی مکتب
فکر کا ہے جس کے نزدیک ادب کو ایک کارآمد شے مانا گیا ہے اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر اس کی
کوئی جگہ اس کے تصور کردہ معاشرے میں نہیں ہے۔ یہ پاور گروپ کی استحصالی تکنیک کا کمال
ہے کہ اس نے ادیب کو یہ باور کرایا ہے کہ وہ سماج کے لیے ایک کارآمد شخص ہے۔ جبکہ صورت
حال اس کے برعکس ہے ادیب کا اس طرح RELEVANT ہونا یا اسے RELEVANT
بنانے کی اس طرح کی کوشش میرے نزدیک قابل قبول نہیں ہے، ہاں اگر میں زندگی کے بارے
میں یا اپنے بارے میں یا آپ کے بارے میں یا سب کے بارے میں کوئی معنی خیز بات کہوں
یا ایسی بات کہوں کہ جس کی بنا پر وہ ACTIVICITY جو کل تک آپ کے لیے معمولی تھی آج
MEANINGFUL ہوجائے تو میں RELEVANT ہوں اور اس معنی میں ادب ہمیشہ RELEVANT ہوتا
ہے۔ میرے دو TEXT ہیں پہلا TEXT میر درد کا شعر ہے۔

— عالم ہو قدیم خواہ حادث
جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے

یہ کائنات چاہے تو ETERNAL ہو........ اگر میں نہیں ہوں تو نہیں ہے، ادبی سرگرمیاں تو یہ ہوتی ہیں کہ وہ اپنی کائنات یا وہ کائنات جسے میں دیکھ رہا ہوں اسے REFASHION کرتا ہوں روز مرہ کی سب ہی سرگرمیوں کو ادیب بامعنی بناتا ہے۔

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
بھری محفل میں بے دھڑکے یہ سب اسرار کہتے ہیں

اس میں دو لفظ غور طلب ہیں، اسرار، اسرار یہ نہیں کہ شہر میں راشن کی فراہمی کی صورت حال کیا ہے۔ کس کو مکان ملا اور کس کو کپڑا۔

میں یہ سب جاننے کے لیے پریم چند کو نہیں پڑھتا۔ اس کو معلوم کرنے کے لیے میں چیخوف کو نہیں پڑھتا کہ اس کے کوچوان کے گھر میں کتنے کمرے تھے، ہاں میں اس کی INNER REALITY کے لیے چیخوف کو پڑھتا ہوں، غالب کو پڑھتا ہوں، تو یہ اسرار اور ان کو جاننے کا معاملہ ہے، یہ وہ اسرار نہیں ہیں جو اخبار کے صفحات پر ملتے ہیں۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں اخبار کے صفحات کو نظم کا روپ دیدوں اور تب میں RELEVANT ہوں گا تو میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ میرے ملک کی POETICS میں نہیں ہے، انڈو مسلم یا عرب یا ایرانی اور سنسکرت POETICS میں تو صاف لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ قانون کی زبان اور ہوتی ہے، کہانی میں بات کو کسی اور ڈھنگ سے کہا جاتا ہے، شاعری کی زبان ایک ہی بات کو ہزار پیرایے میں کہتی ہے نوجہاں تک ہمارے ملک کی POETICS کا تعلق ہے، بات کو بے دھڑک، بلا خوف اور نڈر ہوکر کہنے کی بات تو ملتی ہے کسی شاعر کو اس بنا پر سوائے جعفر زٹلی کے، کسی حاکم وقت نے موت کی سزا نہیں دی کہ اس کا کلام RELEVANT نہیں، نعمت خاں نے اورنگ زیب کی سو طرح کی برائیاں کیں مگر اورنگ زیب نے اتنا کیا کہ اسے اپنی سرپرستی سے محروم کر دیا۔ میں وقتی موضوعات یا مسائل پر شاعرانہ ردعمل کے خلاف ہوں، ادب کو اس معنی میں RELEVANT کہنا درست نہیں، ادب کے RELEVANT ہونے کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے المناک فسادات کا ایک بھرپور حقیقی تجزیہ پہلی فسادات کے دس بارہ سال بعد راجندر سنگھ بیدی کی کہانی "لاجونتی" میں ملتا ہے، یہ کہانی اس وقت وجود میں آئی ہے جب فسادات کی آگ کو بجھے برس ہو چکے تھے اور اخباروں میں ان کی روداد بھلائی جا چکی تھی اور جب زخم مندمل ہو گئے تھے۔ "لاجونتی" پوری انسانی دردمندی کا جوہر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے آپ مجھ سے پوچھیں کہ ادیب کی حیثیت سے میرا RELEVANCE کیا ہے تو میں "لاجونتی" کی مثال دوں گا۔ میری کوشش ہو گی کہ آپ کو اپنے شعوری تجربے اور مشاہدے میں شامل اور شریک کروں اور آپ کو خود کو سمجھنے میں مدد دوں اس خیال سے کہ میری بیان کردہ سچائی آپ کے لیے بھی ایک سچائی کا درجہ حاصل کرے۔ کیوں کہ ہر REALITY اپنے PERCIEVER کی

بنا پر بدلی جاتی ہے، کوئی REALITY ایسی نہیں ہے جو دیکھنے والے کے بغیر EXIT کرتی ہو، زبیر رضوی نے ایک بات شروع میں یہ کہی کہ ادیب اور شاعر جو ایک زمانے میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے اب نہیں رکھتے اس کی وجہ کیا ہے۔ یہ دراصل ادبی سوال نہیں ہے یہ ایک سماجی نوعیت کا سوال ہے مگر ہے اہم، اس کی وجہ بالکل سامنے کی ہے۔ اب نہ ہم میں اتنی حکمت ہے کہ ہم سارے حقائق کو طشت از بام کرسکیں اور نہ پاور گروپ کی دھوکے بازیوں کی بنا پر ہم لوگوں کی BRAIN-WASHING اتنی ہو چکی ہے کہ ہم بقول رگھو ویر سہائے خود ہی کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ ساہتیہ کے ذریعے لوگوں کے ذہن بدل جائیں اور ہوسکتا ہے ساہتیہ کے ذریعے لوگوں کو اچھائیاں نظر آنے لگیں۔ میرے خیال میں سب کی اچھائیاں سب کے لیے قابل قبول نہیں ہوتیں۔ ہوسکتا ہے میری اچھائی آپ کی اچھائی سے ٹکراتی ہو دراصل یہی تو پاور گروپ کی حکمت عملی ہے کہ وہ اپنی اچھائی کو ہمارے منہ سے اچھائی کہلوا کر اپنی حکمت عملی کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتا ہے اور یہ تصور دینا چاہتا ہے کہ یہ اچھائی ہر بھجن سنگھ یا فاروقی کی بھی اچھائی ہے۔ اسی لیے ادیب کے کارآمد یا مفید ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ریڈیو، ٹی وی، اخبار زیادہ مفید اور کارآمد ہیں ادیب ان کے لیے کم مفید اور کارآمد ہے۔ اگر میری نظم پانچوں آدمیوں تک بھی پہنچتی ہے تو یہی ٹھیک ہے۔ ایک زمانے میں مشاعرے میں شاعر اپنی ادبی پہچان کرالیتا تھا مگر کو مشاعرے کا اعتبار انھیں ادبی اعتبار تک لے آیا تھا ابھی یہ پچاس سال کے اندر اندر کی بات ہے کہ ادب میں لوگوں کا PARTICIPATION تھا رات بھر ہزاروں کا مجمع مشاعرے میں شاعری کی داد دیتا تھا اقبال تک کو مشاعرے میں شرکت سے شرم نہیں آتی تھی مگر اب ہمیں آتی ہے کیوں کہ مشاعرہ اب ان معنی میں سرگرم ادبی سرگرمی کے طور پر اپنی پرانی روایت سے بالکل کٹ گیا ہے دوسرے اس ACTIVITY پر فوقیت رکھنے والی دوسری سرگرمیاں اور ذرائع سامنے آگئے ہیں۔ اس لیے ادب میں MASS PARTTICIPATION کے فقدان پر اظہار افسوس کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ اگر یہ MASS PARTICIPATION اور کثیر الاشاعتی کے چکر میں آپ پڑے تو پھر آپ کو احساس رنج کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ عمیق حنفی کا انتقال ہوا کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ کون اس کی پروا کرتا ہے کہ کون ادیب بچھڑ گیا یا چلا گیا۔ ذرا سی اخبار میں خبر آجائے تو آجائے جبکہ ہمارے آپ کے نقطۂ نظر سے معمولی لوگوں کی موت کی خبر اخبار کا اچھا خاصا SPACE گھیر لیتی ہے۔ اگر آپ اس طرح کے دکھوں کو اپنا لوگے تو پھر پاور بلاک آپ کا استحصال کرے گا آپ کو کارآمد اور مفید بنانے کے چکر میں ڈالے گا اگر یہ سب منظور نہیں تو پھر معاشرے میں اپنی کلیدی حیثیت پر اصرار نہ کیجیے ایک اور بات عرض کروں، ہمارا جو ہندستانی کلچر ہے اس کی بنیاد میں ہے کہ وہ ORAL یعنی بول کر اپنی بات دوسرے تک پہنچانے کا کلچر رہا ہے۔ اردو شاعری کا اور خاص طور سے غزل کا کلچر اب بھی اسی زبانی ترسیل کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذرائع ORAL میڈیم کے ذرائع ہیں مگر بدلے ہوئے روپ میں یہ دونوں ہی لکھے ہوئے کو زبانی بیان کرنے کے نئے ذرائع ہیں جو ORAL ترسیل کی روایت سے الگ جڑے ہوئے نہیں ہیں ORAL ادب اسی ذریعے کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے اور اپنے سننے والے

تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ ادب اب کم ہوتا جارہا ہے ہم اسے جس حد تک بچا سکیں ضرور بچائیں! اب میں پھر اپنے درد والے TEXT کی طرف لوٹتا ہوں،

جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے

ہمیں اپنی خلّاقانہ انفرادیت اور آزادی کو برقرار اور قائم رکھنا چاہیے اور میرؔ کی طرح اسرار و رموز کو بے دھڑک اور بے کھٹکے کہنے کی عادت ہونی چاہیے۔ اور آخر میں اپنی بات کی مزید وضاحت کے لیے ایک شعر اور جو میرے میں شامل نہیں ہے عرض کر دوں۔

شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتی ہم کو بتاتے جاؤ

یہاں بھی شاعر نے ساری اہمیت ابیات اور اشعار کو دی ہے کہ وہی حقیقتوں کے اظہار و انکشاف کے پیرایے ہیں، وسیلے ہیں۔ یہاں بھی ادب یا شاعری کو کارآمد اور مفید بننے یا بنانے کے نظریے اور نعرے سے گریز کیا گیا ہے اور ادب کو RELEVANT بنانے کی کوششوں کو رد کرنے کی بات کی گئی ہے:

(پرشور تالیاں)

انور عظیم | دوستو! میں فاروقی صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں، باتیں، کرنی چاہئیں اور ہم وہی کر رہے ہیں، موضوع پر اب تک مختلف آرا ہمارے سامنے آئی ہیں، بات دراصل یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ بات چاہے ادب کی ہو، موسیقی کی یا مصوّری کی، یہ دراصل کمونیکیشن ہے، خود کلامی، باتیں کرنے کا جتن دو طرح سے، ایک تو صاف اور سیدھے انداز میں اور دوسرے تراش خراش کے، قابل قبول بنانے کے خیال سے بات کو سنوارنا اور سجانا۔ اب سوال یہ ہے کہ میں اگر اپنے آپ کے ساتھ سچا نہیں ہوں RELEVANT نہیں ہوں اپنی گفتگو میں تو پھر میں دوسروں کے ساتھ گفتگو میں کیسے سچا ہو سکتا ہوں، دوسری بات جب میں تخلیقی اظہار کرتا ہوں تو وہ محض شاعری یا افسانہ لکھنا نہیں بلکہ وہ ایک زمانے کے مشاہدے، تجربے اور تہذیب و تمدن کا ایک لمبا سفر ہے۔ جس کا تجربہ چھن چھنا کر مختلف تجربوں کی صورت میں جس حد تک میری بساط ہے میرے اندر موجود ہے اور اسے میں اپنے زمانے کے تجربے سے اپنی ذات کے تجربے سے نکھارتا بھی ہوں۔ بگاڑتا بھی ہوں اور دوسروں تک پہنچاتا بھی ہوں۔ اب اگر اس ادب کے آج کی زندگی میں RELEVANT ہونے کی بات چل رہی ہوتی ہے تو پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ آج کی زندگی ہے کیا، دراصل میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے شعر کا آج RELEVANT ہونا کا مطلب ہے ادب کا ایک عہد سے دوسرے عہد میں داخل ہونا اس سے متعلق ہونا ہے آخر زمان و مکان کی سرحدوں کو پار کرنے کا یہ عمل ادب کے حوالے سے ہے کیا۔ یہ سچائی اور حسیّت کا معاملہ ہے، اس میں اظہار بھی شامل ہے اور یہ سب مجموعی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں اور تخلیقی معجزہ ایسا ہے جو انھیں کسی نہ کسی پیکر میں تراشتا ہے۔ آج کی زندگی کا مسئلہ کافی دلچسپ ہے۔ اسے میڈیا کی طرف سے سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے حالاں کہ میڈیا زندگی کے اندر ہے۔ یہ میڈیائی بحث کافی پرانی ہے اور FORM اور تخلیقی اظہار اور احساس کی بات طرح طرح کہی جاچکی ہے۔ پہلے لوگ پتوں، پتھروں

پر لکھتے تھے پھر حرف کی چھپائی کا مرحلہ بھی آیا اور اب ہم کمپیوٹر تک آ گئے ہیں جو ہمارے اظہار کے لیے استعمال ہونے لگا ہے اس سے ہم بے حد خوف زدہ ہیں ہم RELATE نہیں کر پائے ہیں خود کو فقط بھی ایک سمبل ہے اس کی معنویت کو ہم کئی مرحلوں اور کئی سطحوں پر طے کر چکے ہیں ٹیکنالوجی کے غیر معمولی فروغ کے اس دور میں، میں میڈیا سے خائف نہیں ہوں، آپ کا یا میرا ادب اگر زندہ نہیں رہے گا تو اس کی وجہ اس کی کمزوری ہوگی، سماج اور زندگی کو CORRELATE کرنا درست نہیں زندگی کے معنی سماج کے نہیں ہیں، زندگی کو صرف سماج کے حوالے سے سمجھنا ضروری نہیں اس خول یا دائرے کو اندر رکھ کر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں، بہت سی چیزیں پچھلے زمانے میں جس کا سلسلہ انیسویں صدی کی مادّیت پرستی سے شروع ہوتا ہے اور بیسویں صدی میں آکر اس کا انقلابی صورت میں اظہار ہوتا ہے اور سماج بدلتے ہیں تو ادب کا زندگی سے RELEVENCE ہے یا نہیں اس کے بارے میں، میں نے دگل صاحب کے مضمون پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ نے اپنی بات کو سمٹ کر ایک مخصوص فرقے اور خطّے تک محدود کر دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اظہار میں SCHEMING کا التزام ادب نہیں ہے اس سلسلے میں فاروقی صاحب کا بیان بہت صحیح ہے، میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ انسان کا ادب یا کوئی بھی تخلیقی عمل شروع ہوتا ہے اپنی ذات سے، اگر میں اپنی ذات اور اپنے وجود سے سچا ہوں تو میرا کیا ہوا کام کسی نہ کسی شکل میں RELEVANT ہے زندگی کے لیے۔ (تالیاں)

انور عظیم کے بعد شانتی ویر کول نے ایک اہم سوال یہ اٹھایا کہ کیا ادب اپنے قاری تک پہنچ رہا ہے اور کیا آج کے ادب کا کوئی قاری ہے بھی یا نہیں۔ اور کیا آج لکھے جانے والے ادب کو آج کا قاری اہم یا افادی سمجھ کے پڑھتا ہے یا نہیں۔ بلراج کومل نے فاروقی کی باتوں سے اتفاق کیا ان کے خیال میں ادب پہلے بھی اور آج بھی صلہ اور ستائش کی تمنا کے بغیر تخلیق کار کو مضطرب رکھتا ہے۔ اس اضطراب کو کوئی راہ یا رنگ دیا جا سکتا ہے تو وہ بھی تخلیق کار کے ذریعے آخر میں قمر رئیس نے فاروقی کے خیالات پر اظہارِ خیال کیا۔

قمر رئیس | سب سے پہلے میں زبیر رضوی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ذہنِ جدید، کی اس محفل میں آج کے ایک اہم مسئلہ کو گفتگو کا موضوع بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا احاطہ ایک مذاکرہ میں ممکن نہیں۔ ابھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنی گفتگو میں جو نکات اٹھائے ہیں وہ سب بحث طلب ہیں لیکن مختصر گفتگو میں ان سب پر اظہارِ خیال بھی ممکن نہیں۔ انھوں نے شروع میں مانا ہے کہ ادیب زندگی سے ناخوش یا برہم ہوتا ہے اور یہی ناخوشی تخلیق کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن وہ ادب کی کسی بھی طرح کی افادیت سے انکار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے عالمی ادب خصوصاً مشرقی ادب اور شعریات کے جو حوالے دیے ہیں ان پر گفتگو ہو سکتی ہے لیکن اس کا یہ موقع نہیں۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے "ادب برائے ادب" کے تصوّر یا FORMULATION کو ثابت کرنے کے لیے اٹھارویں صدی کے جن دو اردو شاعروں کے دو اشعار کا انتخاب کیا ہے اپنے استدلال کے لیے ان اشعار کی افادیت

[illegible]
کو نہیں پہنچا۔ اس لیے کہ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی بھرپور ترجمانی ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کے تضادات اور آویزشوں کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کیا ہے۔ میرے نزدیک تو میر کی شاعری بھی نہ صرف اس عہد کے عام انسان کی محرومیوں کی حکایت ہے بلکہ اس میں انھوں نے غزل کے رمزی پیرایہ میں سماجی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر صرف دو شعر دیکھیے۔

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہماں رہے گا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمین میں ہاتھ کسی داد خواہ کا

دونوں اشعار میں ظلم و جبر اور استحصال کی قوتوں کے خلاف شاعر نے اپنے تیکھے ردِ عمل کو ظاہر کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا کو ان قوتوں سے پاک دیکھنا چاہتا ہے اور یہ وژن ہر تخلیقی فنکار کے شعور کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ اس لیے میں رگھوویر سہائے جی کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ادب کی تخلیق میں زندگی کو بدلنے کی خواہش شامل ہوتی ہے۔ یہی بات سارتر نے اپنی کتاب یا رسالے WHAT IS LITERATURE کے پہلے حصّہ میں کہی ہے۔ وہ ادب کی تخلیق کو سماجی عمل مانتا ہے۔ کیوں کہ اس کی اساس دوسروں سے کچھ کہنے اور دنیا کو بدلنے کی خواہش پر ہے۔ سارتر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جس دنیا کے ایک بڑے حصّے میں بھیانک غریبی اور بھک مری ہو وہاں یورپ کے ادب کا بڑا حصّہ معنی ہے۔ لیکن سارتر کے اس خیال کی مخالفت کسی اور نے نہیں ایک مارکسی ادیب فشر نے اپنے مشہور مقالے THE NECESSITY OF ART میں کی اور صحیح کی لیکن اس خیال کی تردید مشکل ہے کہ ادب کی تخلیق کے پیچھے دنیا کو بدلنے کی خواہش اور خواہش سے جنم لینے والے خواب چھپے ہوتے ہیں۔ داتس کو سغش میں تخلیق کار انسان اور کائنات کے رشتوں کے اسرار کو بھی بے نقاب کرتا ہے، ادب کی معنویت کو بھی اسی حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ کچھ طاقتیں ادیبوں سے خاص موضوعات پر ادب تخلیق کرا کے ان کا استعمال کرتی ہیں۔ ہر دور کے کچھ قومی اور فکری تقاضے ہوتے ہیں اور کچھ موضوعات خاص توجہ کا مرکز ہوتے ہیں اگر اپنے عہد کے بعض مسائل کو لے کر ترقی پسند ادیبوں نے خاص کر دوسرے درجہ کے ادیبوں نے کچھ سطحی اور ہنگامی نظمیں لکھیں یا افسانے لکھے تو اس میں قصور ان ہی کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسند دانشوروں نے کبھی کسی خاص موضوع پر لکھنے کی ہدایت نہیں کی۔ ہدایت اور قلم سے کبھی ادب تخلیق نہیں ہوتا، موقف کا اظہار نہیں کیا ہے۔

آخر میں میں آپ سب دوستوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ترقی پسند تحریک کا کڑا وقت بھی دور بہت پہلے گزر گیا۔ جدیدیت کی لہر بھی ختم ہو گئی۔ نئی نسل نئے امکانات، نئے افق تلاش کر رہی ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ نیا مکالمہ شروع ہو۔ افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہو۔ ہم مل بیٹھیں اور آج کے ادبی مسائل پر نئے ذہن اور نئے زاویوں سے غور کریں۔

ذہن جدید کے سمینار میں حسب ذیل ادیب شریک رہے۔

شمیم حنفی، محمود سعیدی، مجتبیٰ حسین، اجیت کور، نند کشور وکرم، وشوناتھ درد، آر ایس یادو، جیندر بھان خیال، راج نرائن راز، شفیع جاوید، اقبال عمر، ہرچرن چاولہ، خلیق انجم، ساقی نارنگ، انجم عثمانی، عظیم الشان صدیقی، بلراج کومل، کمار پاشی، محسن زیدی، کنور سین، سوم آنند، شجاع خاور، تارا سنگھ کامل، لوچن بخشی، اندر دت نادان، صدیق الرحمٰن قدوائی، کیلاش ماہر، اسلم پرویز، امیر آغا، زاہدہ زیدی، شمس الزماں، خوشحال زیدی، کیول سوری اور منیر نیازی، بیگم منیر نیازی وغیرہ۔

بقیہ صفحہ ۸۶ کا

دو اعداد ۴ × ۵ = ۲۰ کی تقسیم ہی کا عمل ہوگا اور باقی دس یعنی ۲ × ۵ = دس ہی بچے گا۔ اس دس کو ۹ نو سے ضرب دینے اور اس میں دو جمع کرنے سے ۹۲ کا عدد نکالنا معجزہ نہیں بلکہ حساب کا معمولی سا عمل ہے۔ محمد ضمان صاحب نے جو آسان نسخہ پیش کیا ہے وہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اس میں بھی آخری عمل یعنی ۹ کو ۱۰ سے ضرب دینے اور پھر حاصل ضرب دینے میں ۲ جمع کرنے کا عمل ہی بنیادی ہے۔ سابقہ تمام عمل بے معنی، بے کار، شعبدہ بازی ہے۔ اور چنداں قابل غور نہیں۔ کبیر نے اس عمل کو بڑی خوبی سے دوہے میں پرو دیا ہے جس سے زود اعتقاد لوگ حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

منیر احمد شیخ نے پاکستان میں ادبی صورت حال کی تعبیر شاید " منسٹری آف انفرمیشن کی نئی ضرورتوں کے مطابق کی ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں یہ بحث پاکستان میں چلانی چاہیے تھی۔ تاکہ کھل کر بات ہو سکتی۔ یہاں میں اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ان کے بیشتر نتائج درست نہیں۔ مثال کے طور پر افسانے میں علامت اور تجرید کا چلن چھٹی دہائی کے آخر میں شروع ہو گیا تھا۔ گذشتہ دس بارہ سال کے عرصے میں تو اس کے خلاف مثبت ردعمل سامنے آیا ہے۔ اور کہانی کا چہرہ واقعہ اور کردار کی اساس پر ابھرا ہے۔ علامت اور تجرید کو فروغ دینے والے لوگوں میں انتظار حسین، خالدہ حسین، رشید امجد، اسد محمد خاں محمد منشا یاد سب شامل تھے لیکن شیخ صاحب نے انھیں اس تجربے سے خارج کر کے انھیں زندگی کو فنی اور ٹیکنیکی حسن کے ساتھ پیش کرنے والوں میں جگہ دے دی ہے۔ بے شک انھوں نے اردگرد کی زندگی کو اہمیت دی، فنی اور ٹیکنیکی حسن کو ابھارا لیکن اس عمل میں انھوں نے علامت اور تجرید کو کامیابی سے استعمال کیا۔

جوگندر پال صاحب کو ایک نقاد نے تنقید سے اجتناب کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا اشاریہ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر وہ افسانے کی تنقید نہیں لکھیں گے تو یہ افسانے کے فن پر ظلم ہوگا۔ افسانے کے فن کو جس داخلی لگن سے انھوں نے سمجھا ہے اور جس والہانہ محبت سے اسے برتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور شاید بہت سے نقاد جو اشتہاری ضرورتوں کے غلام ہیں افسانے پر اسی طرح بحث نہ کر سکیں جس طرح جوگندر پال نے کی ہے۔ میں نے اس اشاریہ سے استفادہ کیا ہے۔ روشنی کی کرنیں حاصل کی ہیں میں جوگندر پال اور کتاب نما کا ممنون ہوں۔ ●●● انور سدید ۱۷۲ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن۔ لاہور (پاکستان)

تلوری وناگیشور راؤ
مترجم: شری نواس لاہوتی

حق

بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی جیسے آدمی نہیں، جانور بھر دیے گئے ہوں۔ شادیوں کا موسم تھا اس لیے کنڈکٹر کسی کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جس جگہ بس رکتی لوگ قطاروں میں دوڑ پڑتے کہ کہیں کھڑے رہنے کو جگہ مل جائے۔ "نندی ویلگو" تک آتے آتے بس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ یہاں چوں کہ کچھ مسافر اترنے والے تھے اس لیے کنڈکٹر نے "نندی ویلگو" میں بس روک دی ——— بس کے رکتے ہی انسانوں نے اس کا گھراؤ کر دیا مگر کنڈکٹر نے کسی کو چڑھنے نہیں دیا۔ مجبورًا ایک مسافر کو بس میں چڑھانا پڑا۔

"نندی ویلگو" سے خیر و خوبی کے ساتھ بس روانہ ہو گئی۔

راؤ صاحب! آپ کو تو دوسری بس سے آنا چاہیے تھا ——— دیکھیے نا! اس بس میں کتنی بھیڑ ہے" کنڈکٹر نے اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا جو "نندی ویلگو" سے سوار ہوا تھا۔

"بھائی! مجھے بارہ بجے تک "تنالی" پہنچنا ضروری ہے۔ وہاں آر۔ ڈی۔ او (ریونیو ڈویژنل آفیسر) سے ملنا ضروری ہے۔ اپنی پنچایت سمیتی کی طرف سے معذوروں کے لیے جو ہاسٹل قائم ہو رہا ہے۔ اس کی افتتاحی رسم اس مہینے کی پہلی تاریخ کو مقرر ہوئی ہے اور آر۔ ڈی۔ او صاحب کے دست مبارک سے یہ رسم انجام پانے والی ہے۔" اس شخص نے اپنے زودار رومال بارڈر والی دھوتی اور کرتے کی سلوٹیں دور کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں صاحب! جب سے آپ اس پنچایت سمیتی کے صدر منتخب ہوئے ہیں اس کا ہر کام بڑے سلیقے سے ہونے لگا ہے۔ آپ کو معذوروں سے جو ہمدردی ہے۔ وہ بڑی قابل تعریف ہے۔" کنڈکٹر نے یہ الفاظ پنچایت سمیتی کے صدر نارائن راؤ کے ہاتھ میں ٹکٹ تھماتے ہوئے کہے۔

پنچایت سمیتی کے صدر بس میں کھڑے کھڑے سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے بیٹھے ہوئے تمام مسافروں پر ایک طائرانہ نظر اس امید کے ساتھ ڈالی کہ کوئی شخص ان کے رتبے کا خیال کر کے فورًا اپنی نشست خالی کر دے گا تاکہ وہ براجمان ہو سکیں ——— مگر ایسا نہیں ہوا۔

نارائن راؤ کو بس میں کھڑے کھڑے سفر کرنے پر اپنی توہین محسوس ہونے لگی۔ انھیں

اسں بات کی بھی کوفت ہونے لگی کہ ان سے بدتر لوگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آرام سے سفر کر رہے ہیں اور ایک پنچایت سمیتی کا صدر بس میں کھڑا لڑکھڑا رہا ہے۔

بس زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ نارائن راؤ جی فرمانے لگے "کنڈکٹر! مجھے کہیں بیٹھنے کے لیے سیٹ دلواؤ بھئی! نارائن راؤ جی نے کنڈکٹر سے یہ بات اس طرح کہی جیسے یہ ان کا حق ہو ——

جی۔ کیا فرمایا؟ بیٹھنے کے لیے جگہ دلواؤں؟ صاحب! میں نے تو شروع ہی میں کہا تھا کہ بس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے۔ آپ کو جلدی تھی اس لیے میں نے آپ کو سوار کرایا تھا —— یہ جمہوریت کا دور ہے۔ میں کسی کو بھی سیٹ پر سے اٹھنے کے لیے نہیں کہہ سکتا اور میرے لیے ایسا کہنا مناسب بھی نہیں ہے" کنڈکٹر نے ٹرپ شیٹ TRIP SHEET پر ٹکٹوں کے نمبر نوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

کنڈکٹر کے جواب سے نارائن راؤ نے کھسیانا پن محسوس کیا اور اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی تقریباً پچھلے پانچ سال سے جب سے کہ انھوں نے سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی وہ کافی موٹے تگڑے ہو گئے تھے۔ ان کا وزن دو سو پونڈ کے لگ بھگ تھا۔ موٹاپے کی بنا پر وہ بس کے جھٹکوں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ ان کا تمام جسم چور چور ہو گیا تھا۔ اور موٹی گردن میں درد ہونے لگا تھا۔

نارائن راؤ کی نظر یکایک سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک ایسے مسافر پر پڑی جو دیکھنے میں گنوار تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے، وہ انتہائی کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے۔ یہ شخص اپنی سیٹ پر تن کر بیٹھا ہوا تھا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ جب میں نے پیسے دے کر ٹکٹ خریدا ہے تو اطمینان سے سفر کیوں نہ کروں۔ اس طرح سے بیٹھنا میرا حق ہے۔

سمیتی کے صدر نارائن راؤ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا حق چھین لیا ہو۔ اچانک اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اپنے رتبے کے بل پر اس مریل آدمی کو زبردستی سیٹ پر سے اتار دوں۔

کون ہو تم؟" نارائن راؤ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گرجدار آواز میں دریافت کیا۔ "جی! میں ایک غریب آدمی ہوں"

"کہاں جا رہے ہو"

اس شخص کو یہ سوال بڑا عجیب معلوم ہوا۔ پھر بھی اس نے جواب دیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کے جواب سے نارائن راؤ کو تشفی نہیں ہوئی۔

"کنڈکٹر! اس مردود کو سیٹ سے اتار دو"

"کیوں صاحب! کیا ہوا؟" کنڈکٹر نے جواب دیا۔

"شراب کی بدبو آ رہی ہے اس کے منہ سے —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوب پی کر

آیا ہے۔ شراب کی بد بو سے میری ناک پھٹی جا رہی ہے۔" نارائن راؤ نے گرج کر کہا۔
وہ آدمی سکتے میں آگیا اور نارائن راؤ کی طرف تعجب خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔
"جی! کیا فرمایا آپ نے؟ میں شراب پی کر آیا ہوں یا آپ؟" اس نے ڈٹ کر جواب دیا۔
"ہاں ہاں، تو پی کر آیا ہے۔"
بس کے تمام مسافران دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔
"پہلی تم اپنی سیٹ خالی کر دو۔ نہیں تو پولیس کو بلوا کر تمھیں جیل بھجوا دوں گا۔" نارائن راؤ نے بڑے زور سے دھمکانا شروع کیا۔
"ہاں بابو جی! آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ پولیس کو بلوا کر مجھے جیل بھجوا دیں۔ زندگی مشکل سے کٹ رہی ہے۔ جیل میں دو وقت کی روٹی تو مل جائے گی۔" سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔
اس شخص کے جواب نے کٹے پر نمک چھڑکنے کا کام کیا۔ نارائن راؤ کا پارا اور چڑھ گیا۔
"تم جانتے ہو میں کون ہوں؟" نارائن راؤ نے چلا کر کہا
آپ کوئی بھی ہوں گے، مجھے کیا پڑی ہے۔ میں آپ کے گھر کا نوکر نہیں ہوں۔ سب لوگوں کی طرح سے میں نے بھی ٹکٹ خریدا ہے اور سیٹ پر بیٹھنے کا حق رکھتا ہوں۔ آپ ہوتے کون ہیں مجھے اپنی سیٹ سے اٹھانے والے۔
نارائن راؤ کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ پنچایت سمیتی کے صدر ہیں تو اس آدمی پر بڑا غصہ آیا اور انھوں نے اس کو اپنی توہین سمجھا۔ وہ شرم کے مارے دوسرے مسافروں سے اپنی نظریں چار نہیں کر سکے اور جل بھن کر خاک ہو گئے۔
یکا یک بس رک گئی۔ ایک مسافر اترا اور بس روانہ ہو گئی۔
نارائن راؤ سوچ رہے تھے کہ اس آدمی سے کس طرح بدلہ لیا جائے کہ بس پھر رک گئی۔
"بابو جی! آپ کو بیٹھنے کے لیے سیٹ چاہیے نا؟ میں اتر رہا ہوں، آپ بیٹھ جائیے۔"
یہ کہہ کر وہ مسافر اٹھا اور سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی بیساکھیوں کا سہارا لے کر بس سے اترنے لگا۔ اس کے ایک ٹانگ نہیں تھی۔ وہ لنگڑا تھا۔ کنڈکٹر نے اسے سہارا دے کر بس سے اترنے میں مدد دی۔ نارائن راؤ کو کاٹو تو اس کے بدن میں خون نہیں تھا۔

جگن ناتھ آزاد کا نیا مجموعۂ کلام

"بُوئے رسیدہ یا بُوئے عمر رسیدہ"

یہ سال اس اعتبار سے بہت مبارک ہے کہ پاکستان اور ہندستان کے درمیان ادبی تعلقات خاصے خوشگوار ہو رہے ہیں۔ پاکستان سے اکٹھے چالیس ادیب دہلی کی اُردو کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے۔ یہ کانفرنس علی صدیقی نامی اردو کے ایک بہی خواہ کی کوششوں سے منعقد ہوئی تھی۔ گویا علی بابا ہندستان کا تھا اور چالیس ادیب پاکستان کے۔ خوشی کی بات ہے کہ ان چالیس ادیبوں میں سے بیشتر انواع و اقسام کے ایوارڈ لے کر واپس آئے۔ مزید خوشی اس کی ہے کہ جن کو پاکستان میں نہیں پوچھا جاتا، ان کے پوچھنے والے بلکہ آنسو پونچھنے والے ہندستان میں پائے جاتے ہیں۔

اس سال ہندستانی ادیب بھی خاصی بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ ان میں زیادہ تر مشاعروں کے شاعر تھے، جن کے نام پہلی اور آخری بار ایک ہی مرتبہ سننے میں آئے۔ کچھ شاعرات بھی تھیں، جن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت، اُن کا ترنّم تھا، یعنی اگر ان کی شاعری سے اُن کا ترنّم الگ کر دیا جائے، تو باقی کچھ نہیں بچتا، لیکن ہندستان سے بعض ایسے اہلِ قلم بھی آئے، جن کے لیے اہلِ پاکستان نے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے، مثلاً مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر شمیم حنفی، جیلانی بانو، ڈاکٹر احمد سجّاد، شمس الرحمٰن فاروقی اور جگن ناتھ آزاد، ہمیں افسوس ہے کہ ان بلند مرتبہ اہلِ قلم سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ یہ تمام ادیب اپنے اپنے میزبانوں کی خواہشوں کے اسیر تھے، ہم جیسے عام لوگوں کی اِن تک رسائی ہوتی تو کیسے؟ صرف جناب جگن ناتھ آزاد سے ملنے کی خوشی حاصل ہو سکی اور یہ ظاہر ہے کہ اُن سے ملنا پورے ہندستان سے ملنے کے مترادف ہے۔

جگن ناتھ آزاد ہندستان کے اُن ڈیڑھ دو شاعروں میں سے ہیں، جو پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ وہ ہر سال نہیں، تو ہر دوسرے سال پاکستان ضرور تشریف لاتے ہیں۔ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے اور کبھی علاّمہ اقبالؒ کے حوالے سے کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنے کے لیے۔ یہاں آتے ہی وہ اپنے چاہنے والوں میں تبرّک کی طرح تقسیم ہونے لگتے ہیں۔ ایک ایک دن میں اُن کی دس دس دعوتیں ہوتی ہیں۔ خوش اخلاق وہ اتنے ہیں کہ ہر دعوت قبول کر لیتے ہیں اور

ہر دعوت کے بعد کلام بھی سناتے ہیں۔ لیکن وہ صرف شاعر نہیں، پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں، اس لیے ہر محفل میں گفتگو بھی خوب کرتے ہیں اور یہ گفتگو بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ انھوں نے حافظ بلا کا پایا ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں شعر یاد ہیں۔ اپنے ہی نہیں، دوسروں کے بھی۔ اپنا کلام تو ہر شاعر کو یاد ہوتا ہے، لیکن آزاد صاحب کو دوسروں شاعروں کے شعر بھی بڑی تعداد میں یاد ہیں۔ علامہ اقبال کا تو انھیں پورا کلام حفظ ہے۔ محتاط اتنے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے شعر علامہ اقبالؒ کے نام سے یا علامہ کے شعر اپنے نام سے سنا دیے ہوں، حالانکہ علامہ سے اُن کی عقیدت ایسی ہے کہ من و تو کا فرق مٹ جائے، تو کوئی تعجب نہیں۔

اب کے آزاد صاحب کی گفتگو کا مرکزی خیال جموں کا سیلاب تھا، جس میں ان کا ذاتی کتب خانہ برباد ہوگیا۔ وہ اس سیلاب کا ذکر خصوصاً اپنی کتابوں کی "غرقابی" کا تذکرہ بڑے درد انگیز انداز میں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ نہ صرف مطبوعہ کتابیں ضائع ہوئیں، اُن کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی برباد ہو گئے۔ ایک محفل میں جب ہم نے آٹھویں مرتبہ سیلاب کی داستانِ دلخراش سنی، تو عرض کیا، اگر آپ اجازت دیں تو ایک درد انگیز واقعہ بلا تشبیہ ہم بھی سنائیں۔

آزاد صاحب نے نہایت خوش دلی سے اجازت دے دی، حالانکہ محفل میں وہ کسی دوسرے کو بولنے کی اجازت ذرا مشکل ہی سے دیتے ہیں۔ ہم نے جو واقعہ سنایا یہ تھا کہ چند برس قبل ایک مشہور ادیب کے گھر میں اتفاق سے آگ لگ گئی۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں جل گئیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف کے کئی مسوّدے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہار ہمدردی کے لیے ان کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقع پر اظہار افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے نئے انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے، لیکن یاد رکھیے ہر شر میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے، وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے۔"

اس واقعے سے آزاد صاحب بھی محظوظ ہوئے۔ فرمایا، "چونکہ یہ واقعہ آپ نے بلا تشبیہ سنایا ہے، اس لیے آپ کی نیک نیتی پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔"

آزاد صاحب کی کراچی تشریف آوری سے کچھ دن پہلے اُن کا نیا مجموعۂ کلام "بوئے رسیدہ" کے نام سے نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا تھا۔ یہ موصوف کا ساتواں مجموعۂ کلام ہے، جو پہلی مرتبہ پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ آزاد صاحب کی کراچی میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتاب کے ناشر طارق اقبال اور بزرگ ادیب خواجہ حمید الدین شاہد نے "بوئے رسیدہ" کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا، جس میں کراچی کے کئی مشہور نقادوں نے جو مقالے پڑھے، ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی تمام نقادوں نے جو مقالے پڑھے، وہ بوئے رسیدہ کی بجائے تقریب کے دعوت نامے کے مطالعے کا نتیجہ تھے۔ ایک مقالہ نگار سے ہم نے کہا، حضرت! آپ نے کتاب کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں،

آزاد صاحب کے بارے میں سامنے کی باتیں کہہ دی ہیں۔ انھوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا: "بات یہ ہے کہ تقریب سے صرف چند گھنٹے پہلے مجھ سے مقالہ لکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔ کتاب مجھے اس وقت ملی جب میں مقالہ لکھ چکا تھا۔"

آزاد صاحب کو بھی اس کا احساس تھا کہ مقالہ نگاروں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم نے ان کی دلجوئی کی خاطر عرض کیا۔ "پاکستان میں یہی رواج ہے کہ کتابوں کی رونمائیوں میں جو مقالات پڑھے جاتے ہیں، وہ متعلقہ کتابوں کو پڑھے بغیر لکھے جاتے ہیں۔" آزاد صاحب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس کا سبب پوچھا، تو ہم نے بتایا "کتاب پڑھنے کے بعد اس کی خوبیاں تلاش کرنے کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔"

آزاد صاحب کو اس کا بھی غم تھا کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "بوئے رمیدہ" رکھا تھا، لیکن ناشر نے اسے "بوئے رسیدہ" بنا دیا۔ آزاد صاحب چاہتے تھے کہ کتاب کا نام تبدیل کر دیا جائے۔ کیونکہ "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب ہے، لیکن ناشر اس پر آمادہ نہیں کیونکہ اس نے کتاب کا خوبصورت سرورق کئی رنگوں میں بڑی محنت سے تیار کیا تھا اور خاصی رقم صرف کر کے اُسے چھپوایا تھا۔ آزاد صاحب نے "بوئے رسیدہ" کی بے معنویت کا ذکر کئی مرتبہ کیا۔ ایک محفل میں استاد لاغر مراد آبادی بھی موجود تھے۔ انھوں نے فرمایا: "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب نہیں ہے۔ چونکہ اس مجموعے میں آپ کا ادھیڑ عمری کے زمانے کا کلام شامل ہے، اس لیے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات آتی ہے کہ "بوئے رسیدہ" سے مراد "بوئے عمر رسیدہ" ہے۔"

آزاد صاحب جن دنوں کراچی میں تشریف رکھتے تھے، حسنِ اتفاق سے اُنھیں دنوں ایک کتب فروش نے ہندستانی کتابوں کی نمایش کا اہتمام کیا۔ اس نمایش سے ہم نے محمد ایوب واقف کی مرتّبہ کتاب "جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ" کا نیا اڈیشن خریدا تاکہ اس پر آزاد صاحب سے بطورِ یادگار دستخط کرا لیے جائیں۔ ہم نے جب کتاب اُن کے سامنے رکھی اور دستخط کرنے کی درخواست کی، تو انھوں نے فرمایا: "یہ میری تصنیف تو ہے نہیں، جو میں اس پر دستخط کروں۔" ہم نے عرض کیا "یہ درست ہے، لیکن اس کتاب کے وجود میں آنے کا سبب آپ ہی ہیں۔ ہم نے تو یہ کتاب خریدی ہی اس لیے ہے کہ اس پر آپ سے دستخط کرائیں گے۔" فرمایا: "دستخط میں اس شرط پر کروں گا کہ آپ اسے پڑھیں بھی۔" ہم خاموش رہے کہ معزز مہمان کے سامنے لب کشائی کرنا کوئی اچھی بات نہیں، ورنہ جی چاہتا تھا کہ ہم یہ کہیں: "ایک معمولی سی عنایت کا آپ اتنا بڑا معاوضہ کیوں طلب کر رہے ہیں۔"

یہ تو خیر مذاق کی بات ہے، ورنہ محمد ایوب واقف کی مرتّبہ کتاب ایک قابلِ قدر ادبی کام ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر آزاد صاحب کی خوبصورت شخصیت اور بے مثال شاعرانہ کمالات کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں جن اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں، ان میں سے صرف چند کے نام ملاحظہ فرمایئے: سیّد احتشام حسین، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر گیان چند، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر قمر رئیس۔ ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، دل سے لکھا ہے اور سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ غالب کی طرفداری نہیں کی، سخن فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب اتنی اچھی ہے کہ جی چاہتا ہے ہندستانی کتابوں کے غیر قانونی اڈیشن چھاپنے والے ناشروں میں سے کوئی اس کتاب کو بھی چھاپ دے۔ پاکستان میں آزاد صاحب سے محبت کرنے والے بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گی۔

پرویز یداللہ مہدی
210 Behram Nagar
Bandra,
BOMBAY. 51.

خودستائشی

ایک زمانہ تھا جب اپنے مُنہ سے اپنی تعریف کرنا' اپنی ذاتِ بابرکات میں موجود ولاموجود' خوبیوں کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانا معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ شرفا کا دستور تھا کہ دوسروں کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ریشۂ خطمی ہوجایا کرتے تھے کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر ریشۂ خطمی ہوجانا اگلے وقتوں میں شرافت کی دلیل ہوا کرتا تھا، لیکن اب یہ انوکھی ترکیب لغات میں بھی نہیں ملتی ۔ خیر یہ تو ہوا شرفا کا حال' اب رہے امرا تو وہ ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر تعریف کرنے والے کا مُنہ موتیوں سے بھر دیا کرتے تاکہ مدّاح کی مدح سرائی میں آٹومیٹک' بریک لگ جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ اپنی نیکیوں اور خوبیوں کو اس طرح چھپایا کرتے تھے۔ جس طرح آج دو نمبر کے تاجر کالا دھن چھپاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو شخص اس زمانے میں جتنا عالی مرتبت ہوتا، دوسروں کے روبرو خود کو اتنا ہی ادنا اور احقر بنا کر پیش کرتا، چنانچہ جو لوگ اپنی زبان سے خود کو حقیر فقیر پُرتقصیر عاصی پُرمعاصی وغیرہ کے القابات سے نوازا کرتے ان کا شمار اپنے وقت کے بڑے لوگوں میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج زمانہ یکسر بدل چکا ہے' قدریں بدل چکی ہیں پہلے لوگ نیکی کر کے دریا میں ڈال دیا کرتے تھے جبکہ آج خدا کے بندے نیکی کرنا تو دور نیکی کی بات تک نہیں سوچتے بلکہ اگر کوئی بھولا بھٹکا بندہ غلطی سے نیکی کر بیٹھتا ہے تو اُسے اس کی نیکی کے ساتھ دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ قدروں کی اس ادلا بدلی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج عیب و ہنر آپس میں اس قدر گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ کل تک جو ہنر تھا وہ عیب میں اور عیب ہنر میں بدل چکا ہے نتیجہ اس الٹ پھیر کا یہ ہوا کہ جو لوگ حقیر فقیر پُرتقصیر کہلانے کے بھی مستحق نہیں وہ خود کو اعلا اور ارفع یکتا، دانا و بینا ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اس کے لیے وقت پڑنے پر گدھے کو باپ اور باپ کو گدھا کہنے سے بھی نہیں چوکتے ۔ دورِ حاضر میں گدھوں کی ترقی اور باپوں کی تنزلی کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ آج جگہ جگہ گدھے پچکارے اور باپ' دھتکارے جاتے ہیں۔ ہمارے ایک پڑوسی طاہر بھائی چاندی والا

نے تو انتہا کر دی باپ دادا بلکہ آباو اجداد تک کو نہیں بخشا' ایک زمانہ تھا جب موصوف کے باپ دادا' چور بازار کی چندی گلی میں سکینڈ ہینڈ کپڑوں کا بیوپار کیا کرتے تھے اور اسی مناسبت سے چندی والا کہلاتے تھے لیکن ایک روز خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایسی چندی گلی میں کسی کباڑی کے ہاں چاند پور کے ایک رئیس خاندان کا پرانا البم طاہر بھائی کے ہاتھ لگ گیا جس کے نام لیوا یا تو مرکھپ چکے تھے یا پھر سرحد پار جا بسے تھے۔ طاہر بھائی نے موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے حقیر فقیر آبا و اجداد کے ڈانڈے ناجائز طور پر اس امیر کبیر البمی خاندان سے جوڑ کر دیکھتے ہی دیکھتے اپنی آبائی عرفیت چندی والا کو چاندی والا میں بدل دیا اور دو نمبر کے کاروبار کی بدولت چندی گلی سے نکل کر چاندی والا اسٹیٹ کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھے، لیکن خاندانی معاملے میں چونکہ 'تازہ گھس پیٹھ' کی تھی اسی لیے ہر محفل ہر پارٹی میں دو تین پیگ' کے بعد ہی اپنے نو دریافت شدہ حسب نسب' کی تعریف میں خود ستایشی کے ڈھنڈورے پیٹنے لگتے، نہ تو طاہر بھائی اپنی جنت مکانی دادیوں نانیوں کی ناموس پر کیچڑ اچھالتے شرماتے ہیں اور نہ ہی لوگ باگ انھیں ٹوکتے ہیں۔ ظاہر ہے جس سماج میں خود ستایشی نے فن کا درجہ حاصل کر لیا ہو اپنے منہ میاں مٹھو بننا جہاں ہنر سمجھا جاتا ہو وہاں بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے ؛ یوں بھی جس حمام میں سبھی ننگے ہوں وہاں ستر پوشی کے تعلق سے لیکچر دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

خود ستایشی کے معاملے میں شیطان' شاعر' شرابی اور شر پسند کو تو کھلی چھوٹ حاصل ہے یہاں ہمیں ان شاعر موصوف کی یاد آرہی ہے جنھوں نے خودستایشی کے زعم میں خود کو ملک الشعرا کے لقب سے مشہور کر رکھا ہے۔ موصوف کا برسوں سے یہ معمول رہا ہے کہ مقامی ریڈیو اسٹیشن پر اپنا کلام بلاغت نظام ریکارڈ کرواتے ہی معاوضہ کی رقم کا پچیس فیصد حصہ مختلف فرضی ناموں سے ریڈیو اسٹیشن کے نام تعریفی خطوط پوسٹ کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ ان توصیفی خطوط کے ذریعہ ریڈیو اسٹیشن کے ارباب مجاز کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی سعی نامشکور فرماتے ہیں کہ میر و غالب کے بعد اردو غزل کی آبرو آپ ہی کے دم قدم کی بدولت ہے بلکہ کبھی کبھی تو خود ستایشی میں اس حد تک غلو کر جاتے ہیں کہ خود کو میر و غالب سے بھی بڑا شاعر ہونے کی سند دے دیتے ہیں۔ محض اس بنا پر کہ میر و غالب مرحوم ہو چکے ہیں اور آپ ابھی زندہ ہیں۔ شاعر موصوف کے خود ستایشی سے لبریز فرضی خطوط کا بھانڈا اصل میں اس وقت پھوٹا جب پچھلے دنوں ایک مہان نیتا کے سورگ باشی ہو جانے کے باعث ریڈیو کے روزمرہ کے شیڈول کو منسوخ کرکے تین روز تک ماتمی سنگیت نشر کیا گیا، اس طرح موصوف کی چوری پکڑی گئی اور کلام کے نشر ہونے سے پہلے ہی تعریفی خطوط ریڈیو اسٹیشن کے متعلقہ ارباب مجاز تک پہنچ گئے۔ ایسی ہی ایک زندہ مثال ہمارے ایک مزاح نگار دوست ہیں جو خود ستایشی

کے ہاتھوں مجبور ہوکر آئے دن اس بات کا کھلم کھلا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ اردو کے طنزو مزاحیہ ادب نے تاحال صرف دو عدد طنزو مزاح نگار پیدا کیے ہیں، شمال میں رشید احمد صدیقی اور جنوب میں جناب والا! ایک روز ہم نے ان کی اس خود ستایشی سے بور ہو کر شمال اور جنوب کی خصوصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طنز کیا۔ "گویا طنزو مزاح کے میدان میں اوپر رشید احمد صدیقی اور نیچے آپ ہیں۔!"

خود ستایشی کی اس روز افزوں پھولتی پھلتی ہوئی وبا، کو پڑھا لکھا طبقہ پی آر شپ کہتا ہے، یعنی پبلک ریلشن شپ" گویا اب کسی بھی شاعر یا ادیب کی مقبولیت میں اس کی ادبی صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کا اتنا عمل دخل نہیں جتنا کہ اس کی پی۔ آر شپ کا ہے، پی آر شپ جتنی مضبوط ہوگی، ادیب یا شاعر کا مقام اتنا ہی بلند ہوگا۔ مرزا غالب نے برسوں پہلے فرمایا تھا ؎

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

جبکہ آج بیشتر شاعر و ادیب اپنی مضبوط پی۔ آر شپ کے بل بوتے پر دو چار قصیدہ گو عرف ستایش گر حضرات کی فل ٹائم، خدمات حاصل کر کے ادب کی منڈی میں اپنا کھوٹا سکہ بھی کامیابی سے چلاتے نظر آتے ہیں۔ یہ نام نہاد ادیب و شاعر حضرات جہاں جس ادبی محفل میں تشریف لے جاتے ہیں ان کے پالتو ستایش گر بھی سایے کی طرح ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ ستایش گر عموماً اردو کے پی۔ ایچ۔ ڈی ہوتے ہیں اور ان کا کام ہر محاذ ہر مورچے پر اپنے ممدوح کی شاعرانہ و ادیبانہ عظمت کے جھنڈے گاڑنا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی یہ ستایش گر حضرات، زورِ خطابت میں جھنڈے کے ساتھ ممدوح کو بھی گاڑ دیتے ہیں تاہم ایسا شاذو نادر ہی ہوتا ہے۔ اتفاق سے ہم ایک ایسے شاعر سے واقف ہیں جن کا چند برس پیشتر تک یہ عالم تھا کہ ؎

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

لیکن جب سے موصوف خلیجی ممالک سے نیز ہوڈا لڑ کما کر لوٹے ہیں۔ جغادری نقاد بھی ان کے نام اور کلام ہر دو کی مالا جپنے لگے ہیں کبھی جس شاعر کو منہ لگانا بھی کسرِ شان سمجھا جاتا تھا اب اس کے کلام کو جھک جھک کے سلام کرنا شعرو ادب کی صحیح خدمت تصور کی جانے لگی ہے۔ اس زبردست ادبی دھاندلی کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ خلیجی ممالک سے لوٹتے ہی شاعر موصوف نے اپنی پی۔ آر شپ کے زور پر ان ستایش گر حضرات کی دکھتی رگوں پر وہ امپورٹیڈ اشیا رکھ دیں جن سے یہ حضرات محروم تھے یعنی کسی کی دکھتی رگ پر جاپان کا کلر ٹی۔ وی رکھ دیا تو کسی کی دکھتی رگ پر ولایتی ٹیپ ریکارڈ رکھ دیا۔!

یہاں تک تو خیر خود ستایشی کی ان مثالوں کا ذکر ہوا جو چیدہ چیدہ افراد تک محدود ہیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے دورِ حاضر میں خود ستایشی کے فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ

اب یہ صرف انفرادی عمل نہیں، اجتماعی فعل بن گیا ہے۔ مختلف قسم کے ملبوسات تیار کرنے والی ملیں، صابن تیل، پاوڈر و دیگر آرائشی و زیبائشی مصنوعات تیار کرنے والی کمپنیاں بڑے بڑے ستایش گروں عرف اشتہاری اداروں کی خدمات معقول معاوضے کے عوض حاصل کر کے اپنے چار آنے کے مال پر بارہ آنے کی پبلیسٹی کرتی ہیں اور یوں یہ اشتہاری ادارے اپنے موکل کی تیار کردہ مصنوعات کی شان میں سپاس یشی ڈھول پیٹ کر عوام الناس کی جیب پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ترسیل و ابلاغ کا ایک بھی ذریعہ ایسا نہیں جس کے توسط سے خودستایشی کی یہ بازگشت سنائی نہ دیتی ہو۔ بالخصوص دوردرشن پر تو اُن ستایش گروں کی مکمل اجارہ داری ہے۔ چنانچہ یہ اپنے دلفریب اشتہارات کی لگاتار نمایش کر کے ناظرین پر اس قدر نفسیاتی دباو ڈالتے ہیں کہ وہ آنکھ بند کر کے اس بات پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں کہ دوردرشن سے مشتہر کی جانے والی ہر شے کی خریداری ہی میں سمجھداری ہے۔

خودستایشی کے اس لاعلاج مرض کی ابتدا کب ہوئی اور کہاں ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا کم سے کم ہمارے لیے ٹیڑھی کھیر ہے تاہم مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس وبا کو پھیلانے میں بلاشبہ خواتین کا ہاتھ رہا ہے، ویسے بھی خواتین کا ہاتھ کہاں اور کس معاملے میں نہیں ہے۔ یوں بھی جذبۂ خودنمائی اور خودستایشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور چولی دامن دونوں ہی کا شمار خواتین کے مرغوب ترین جاموں میں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خودنمائی اور خودستایشی کے معاملے میں مرد عورت کے سامنے ٹک نہیں سکتا اس لیے کسی شاعر کے اس شعر پر ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں ذرا سے تصرف کے ساتھ کہ ؎

خودستائی جو کسی کو بجز خدا پھبتی نہیں
آ کے بن جاتی ہے "عورت" کی زباں پر خوش نما

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں

۱۔ اُمّ الکتاب (تفسیر سورۃ فاتحہ)	.. ۳۲		
۲۔ اصحاب کہف	.. ۸	۹۔ عزیمت و دعوت	.. ۱۸
۳۔ انتخاب الہلال	.. ۳۵	۱۰۔ قول فیصل	.. ۱۰
۴۔ جامع الشواہد	.. ۸	۱۱۔ مسئلہ خلافت	.. ۲۵
۵۔ حقیقت الزکوٰۃ	.. ۵	۱۲۔ مسلمان عورت (ترجمہ)	.. ۲۰
۶۔ حضرت یوسف علیہ السلام	۷.۵۰	۱۳۔ ولادت نبوی	.. ۹
۷۔ شہادت حسینؓ	۷.۵۰	۱۴۔ ہجر و وصال	.. ۱۵
۸۔ طنزیات آزاد	.. ۱۵	۱۵۔ انسانیت موت کے دروازے پر	.. ۲۲

انور سدید
172, Satlag Block,
Iqbal Town,
Lahore,
Pakistan-18

کچھ وقت پاکستانی کتابوں کے ساتھ

غالب کا علمی سرمایہ — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے جملہ علمی سرمایے پر یہ مبسوط کتاب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مرتب کی ہے اس مقالے پر معین الرحمٰن صاحب کو ۱۹۷۲ء میں سندھ یونی ورسٹی جام شورو (پاکستان) نے پی ایچ ڈی کی سندِ فضیلت عطا کی تھی۔ لیکن گزشتہ سولہ برس کے دوران ڈاکٹر صاحب اس میں ترمیم و اضافہ کرتے رہے، اس عرصے میں انھیں بہت سا نیا مواد بھی دستیاب ہوا جو اس کتاب کا قیمتی عنصر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

"غالب کے ایک سو پچھترویں جشن ولادت (۱۹۷۲) کے موقع پر یہ مقالہ پی ایچ ڈی کے لیے منظور ہوا تھا۔ اور اب اسے مرزا غالب کی ایک سو بیسویں برسی (۱۹۸۹) کی مناسبت سے شائع کیا جا رہا ہے۔"

اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اسے گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک سو پچیسویں سالِ تاسیس کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا ہے جس کا جشن ان دنوں منانے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن اسی کالج میں شعبۂ اردو کے صدر نشین ہیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کی منفرد خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ادبی شخصیت کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اپنے لیے ادب کا صرف ایک شعبہ مختص کر لیا ہے۔ اور یہ ہے "غالبیات" چنانچہ ہندستان غالبیات کے سلسلے میں جو مقام مالک رام، مختار الدین احمد اور مولانا امتیاز علی عرشی کو ہے وہی مقام مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ پاکستان میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کو حاصل ہے۔ اول الذکر اصحاب کے ہاں غالب کے اثبات کے زاویے ابھرتے ہیں تو کہیں کہیں تشکیک کے آثار بھی نظر آتے ہیں اور بحث میں گرم گفتاری بھی در آتی ہے۔ معین الرحمٰن کے ہاں غالب ادب کا موضوع نہیں۔ اس کی تلاش و جستجو ان کی عقیدت کا عمل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے درست لکھا ہے کہ

"غالبیات میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی گرفت نرم سہی، لیکن یہ نرمی ان کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

انھوں نے مطالعہ غالب میں نرم مزاجی کے ساتھ حق گوئی کا نرالا اسلوب نکالا ہے۔ جو وقیع بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی"

زیرِ نظر کتاب ان کی تلاش و جستجو اور مسلسل محنت اور لگن کا ایک ثمرِ شیریں ہے۔ اس کتاب پر کام شروع کرنے

سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے سامنے سر سید احمد خاں کی یہ رائے تھی کہ جو انھوں نے غالب کے علمی سرمایے کے بارے میں لکھی تھی کہ یہ

"عد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیروں ہے"

ان کی نگہ حقیقت جو سے ممتاز غالب شناس مالک رام صاحب کی یہ رائے بھی گزری کہ

"غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور دو نثریں لکھیں سارے اردو میں ان کا سارا سرمایہ ایک مختصر دیوان اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ تین چار اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کی لمبی عمر کا یہ ثمرہ بہ لحاظ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجہ یا اہتمام الشان نہیں ہے"

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس کتاب کی تدوین سے ثابت کیا ہے کہ غالب کا تصنیفی سرمایہ "عد شمار سے افزوں" اور "ظرفِ حصر سے بیروں" نہ سہی لیکن بہ لحاظ مقدار یہ کچھ ایسا کم بھی نہیں ہے۔

یہ کتاب نو ابواب پر مشتمل اور ۴۲۴ صفحات پر محیط ہے۔ پہلے دو ابواب میں نظم و نثر کی کتابوں پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب فارسی کتبِ نظم و نثر کے لیے وقف ہے۔ قضیۂ برہان پر فارسی اور اردو کے الگ الگ ابواب باندھے گئے ہیں۔ ایک باب انتخاب و متفرقاتِ غالب پر ہے۔ ایک باب غیر مطبوعہ تصانیف اور آخری باب معدوم تصانیف غالب پر ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے زیادہ تر بنیادی مآخذات پر انحصار کیا ہے تاہم جہاں اصلی مآخذ خاموش یا مخدوش ہے وہاں انھوں نے ثانوی مآخذ سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن صداقتِ تحقیق کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس ضمن میں انھوں نے سب سے زیادہ تعاون خطوطِ غالب سے حاصل کیا ہے اور یہ شہادت حقیقی بھی ہے اور مستند بھی، جس طرح مولانا مہر نے خطوط سے غالب کی سوانح مرتب کی تھی اسی طرح غالب کے خطوط نے سید معین الرحمٰن کی رہنمائی ان کی تصنیفات کی طرف کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ خوش وضع اسلوب اور رواں دواں زبان یہ تمام روداد اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ ان کی تحقیق کا منظر نامہ خوش نگاہ اور جاذبِ قلب محسوس ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن خنک مزاج اور آہستہ قدم محقق ہیں، وہ چیونٹی کی طرح اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پھر اچانک ان کا ثمر دل رس اہلِ ادب کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کی زیرِ نظر کتاب بھی ان کی محنت، لگن اور غالب سے محبت ہی کا ایک ثمر ہے، جو غالب دوستوں سے ہمیشہ داد حاصل کرتا رہے گا۔

انگور کی بیل: سلیم آغا قزلباش

اردو ادب میں سلیم آغا قزلباش کی اولیں نمود انشائیہ سے ہوئی تھی، اس کے انشائیوں کے دو مجموعے "سرگوشیاں" اور "آمنا سامنا" چھپ چکے ہیں۔ اس صنف میں تازہ وارد ہونے کے باوجود سلیم آغا قزلباش کی انفرادیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد سلیم آغا کو محسوس ہوا کہ :

"کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے"

چنانچہ اب اس نے افسانہ کے ساتھ ربطِ محبت قائم کیا۔ اس کا پہلا افسانہ اوراق میں چھپا تو اہلِ ادب نے اسے سلیم آغا کا انشائیہ سمجھ کر ہی پڑھا۔ وجہ یہ کہ اس نے عام روش سے ہٹ کر ایک ایسی کہانی لکھی تھی جس میں زندگی اپنی نمود باندازِ دگر کرتی ہے اور انشائیہ کی طرح نئے حقائق کو منظر پر لے آتی ہے۔ لیکن پھر

جب اس کے متعدد افسانے مثلاً "تاش کے پتے" "چڑیاں"۔ "شبنو نند پور کی"۔ "بروگن" اور "انگور کی بیل" وغیرہ چھپے تو اس کی طرف غور سے دیکھا جانے لگا اور تسلیم کیا گیا کہ "معاشرتی حقیقت نگاری میں اب ایک نیا ستارہ ابھرا ہے جو اپنے الگ سے تجربے کے ساتھ اپنی انفرادیت پیدا کرے گا۔"

"انگور کی بیل" اس نئے افسانہ نگار کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ انتظار حسین نے لکھا ہے کہ "افسانے کی دُنیا میں سلیم آغا قزلباش کی یہ پہلی اڑان ہے۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، پوت کے پاؤں تو پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں۔ ان افسانوں سے افسانہ نگار کے تیوروں کا پتا چلتا ہے۔"

فرخندہ لودھی نے اور اشفاق احمد نے سلیم آغا قزلباش کے فن کی داد دی ہے، اسے ایک ایسا ہم سفر قرار دیا ہے جس کی شمولیت سے زبان و ادب کو معتبر اضافے کا احساس ہوگا۔ جوگندر پال نے اسے ادب کا ایک ایسا نووارد شمار کیا ہے جس کی آمد سے زندگی کا حُسن انحطاط پذیر نہیں ہوتا۔

"انگور کی بیل" سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے شہر اور دیہات کے سنگم پر پیدا ہوئے ہیں، افسانہ نگار نے اپنے پاؤں دیہات کی دھرتی پر پختگی سے جمار کھے ہیں لیکن وہ شہر کو بھی غائر نظروں سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے قدامت اور جدیدیت کے دھاروں کو دیکھا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔ اس نے اطمینان کی دولت بھی سمیٹی ہے اور عدم طمانیت کا نظارہ بھی کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس نے اپنے مشاہدات کو اپنی آنکھ سے چنا ہے۔ اور بقول اشفاق احمد اس نے کسی شعر سے، کسی نظریے سے، کسی گیت سے۔ یا کسی خبر سے متاثر ہو کر افسانہ نہیں لکھا۔ افسانہ تو سلیم آغا کے اندر کہرام بپا کرتا ہے اور کاغذ پر اس وقت اترتا ہے جب یہ کہرام اس کے اندر سما نہیں پاتا۔ چنانچہ مہر بلب، عذاب، سایہ۔ سل۔ شہاب ثاقب، دھول، بروگن سب حقیقی زندگی کی قاشیں ہیں جو ہمیں حقیقت سے آشنا کرتی ہیں اور زندگی کی دوسری حقیقت کو زیر سطح دیکھنے پر آمادہ کرتی ہیں، ان افسانوں میں کہیں تنہائی زہر بن جاتی ہے اور کہیں مرد تنہائی کا شوہر بن کر نمودار ہوتا ہے اور اسے بے اختیار اپنے آغوش میں لے لیتا ہے۔ یہ افسانے زندگی کا انوکھا پن آشکار کرتے ہیں اور اپنا نیا ذائقہ ہونٹوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ خوبصورت کتاب مکتبہ فکر و خیال ۲-۱۷ سنج بلاک، اقبال ٹاؤن۔ لاہور نے شائع کی ہے۔

ارمغانِ خالد۔ مرتبہ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

اردو کے قادر الکلام شاعر عبدالعزیز خالد نے اپنی زندگی میں جتنا لکھا ہے اس سے کہیں زیادہ ان کے فکر و فن کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ سیارہ کا ضخیم خالد نمبر اُن کے قلزم فن کو پوری طرح سمیٹ نہ سکا تو حنیفا صدیقی صاحب نے "تحریریں" کے تین ضخیم خالد نمبر پیش کر دیے۔ خالد صاحب اپنی زندگی کا ساٹھواں سال عبور کر چکے اور سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تو ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اعتراف فن کے لیے "ارمغانِ خالد" مرتب کیا جو گیارہ صد بڑے صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ

عظیم انسانوں کو ان کا فن یا کارنامہ زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ لیکن بہت کم مشاہیر عالم کی عظمت کو ہم عصروں نے پہچانا اور ان کی وہ قدر کی جس کے وہ مستحق تھے۔ خالد بھی ہم عصری چشمک کا شکار رہیں۔ لیکن اہل نظر نے دیکھ لیا کہ اردو ادب کے جہانِ تازہ میں ایک آفتاب تازہ نمودار ہوا ہے۔ جس نے اپنی تب و تاب

جاودانی سے اسے حسین و منور بنادیا ہے۔

"ارمغانِ خالد" میں اس دور کے تمام صاحبانِ علم و ادب شامل ہیں، کوئی نام اگر اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو یہ اس کی اپنی محرومی یا معاصرانہ شکر رنجی کا نتیجہ ہے۔ خالد صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان کے فکر و فن کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ بھی سامنے آتا ہے۔ شخصیت کے تحت خالد آشناؤں نے ان کے خاکے لکھے ہیں۔ ایک باب میں ان کی کتابوں کے مطالعے جمع کیے گئے ہیں۔ تاثرات۔ کالم۔ مکالمے، انگریزی مضامین الگ ہیں۔ سب سے دل نشیں اور شاید سب سے اہم خطوط کا گوشہ ہے جس میں عبدالعزیز خالد اور محترمہ عفت موہانی ہم کلام ہیں۔ یہ گوشہ چار صد صفحات پر محیط ہے اور افلاطونی محبت کو حصارِ اخلاق سے آشکار کرتا ہے۔ اردو ادب میں اس قسم کا ارمغانِ عقیدت شاید پہلے کبھی نہیں چھپا۔ یہ اظہارِ عقیدت کی روشن ترین مثال ہے۔ جس کی تقلید بھی کی جاسکتی ہے لیکن شاید یہ ردِ عمل بھی پیدا کرے اور حریفانہ جذبے کو فروغ بھی دے۔

نسیم احمد نسیم
KALI BAGH,
BETTIAH-895438
(BIHAR)

مٹھی بھر لوگ

اور اسے بیٹھے بیٹھے اچانک کیا سوجھی کہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کی بھاگ دوڑ کی زد میں آکر کئی بچے جو کہ گلی میں گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے، چوٹ کھا کر چیخنے لگے۔ فضا میں بچوں کی چیخوں اور ان کے والدین کی بد دعاؤں کی ملی جلی آوازیں ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ "کیا بے سرا ہے، گھوڑے کی طرح بھاگا جا رہا ہے، دماغ چل گیا ہے۔ موئے کا۔" "تمھیں تو پتا ہوگا کہ وہ کیوں بھاگا جا رہا ہے۔" وہ جو کہ کھڑا ساری باتیں سن رہا تھا، اس سے پوچھا گیا۔ "شاید وہ ڈر گیا ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا اور پیچھا چھڑا کر چلتا بنا۔ سوال کرنے والے متحیرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

تبھی بے ہنگم سے شور کے ساتھ بہت سے نوجوان ان کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے اور یک لخت ایسے نظروں سے گزر گئے تھے کہ راجدھانی ایکسپریس، صرف دو چار جملے وہ بھاگتے ہوئے تماشبوں کی طرف اُچھال گئے تھے۔ جیسے لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مثلاً "بھاگو" "تم لوگ بھی بھاگو، جلدی کرو ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔" "کیوں" پوچھنے پر ان میں سے ایک نے جلدی میں کہا "کیونکہ بھاگنے میں بڑی تسکین و آسودگی محسوس ہو رہی ہے، آجاؤ شامل ہو جاؤ۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ سارے یہ جا وہ جا ـــ جب تک لوگ ان کی بات سمجھ کر کوئی فیصلہ کرے وہ غائب ہو چکے تھے۔ ایک بوڑھے نے خاموشی کے سینے میں خنجر گھونپا۔ "آج سارے نوجوانوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ جس کو دیکھو وہی مُنہ اٹھائے دوڑا چلا جا رہا ہے۔" بوڑھے کا ایک ہم عمر دہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے اچانک کہا "آؤ ہم بھی بھاگتے ہیں" اور فوراً اس کی تکمیل میں کاربند بھی نظر آیا۔ دوسرے بوڑھے اس کے بے تکے مشورے اور پھر اس پر فوری عمل سے خوف زدہ ہوئے۔ اب تو نوجوانوں کے پیچھے پیچھے عمر رسیدہ لوگوں کی پوری جماعت اس دوڑ میں شامل ہو چکی تھی۔ حالانکہ ان کی دوڑ کافی مضحکہ خیز تھی۔ پھر بھی دوڑے چلے جا رہے تھے۔ انجان منزل کی اور عمر رسیدہ خواتین نے جب یہ سُنا کہ ان کے میاں بھاگتے ہوئے فلاں سمت کو نکل گئے تو انھوں نے سوچا ضرور کوئی خطرہ ہے۔ اور یہ سوچنے کے بعد ایک ہی کام تھا ان کے لیے اور اس پر انھوں نے عمل بھی کیا۔ یعنی سبھوں نے بہ اتفاق ایک ساتھ دوڑ

لگادی۔ جب یہ بات نوجوانوں کی بیویوں تک پہنچی تو وہ سب گھروں سے نکل نکل کر جوق در جوق شامل ہوئیں۔ اور بوڑھیوں کے تعاقب میں نکلیں۔ بچے اس معاملے میں بھلا پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ انھوں نے تقریباً اس ریس میں اپنے بڑوں کا ساتھ دیا۔ کیونکہ یہ ایک انوکھا تماشا تھا ان کے لیے اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی اپنی ماؤں کے آس پاس دوڑ رہے تھے۔

بوڑھے، نوجوان، بچے تقریباً سارے لوگ بُری طرح تھک چکے تھے۔ لیکن رفتار میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی تھی۔ کچھ بوڑھی عورتیں تھکان سے چور ہو ہو کر سڑک پر گر گر پڑتی تھیں۔ پھر بھی گھسٹ گھسٹ کر اس طرف بڑھ رہی تھیں جدھر سارے لوگ چلے جا رہے تھے۔ راہ میں کچھ مسافروں نے اس مضحکہ خیز دوڑ پر تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔ اور خصوصاً بوڑھیوں کی کوشش ناکام کا مذاق اُڑانے لگے۔ اس سے پہلے کہ قہقہوں کی باری آتی، ایک نوجوان نے نکل کر درشت لہجے میں انھیں ڈانٹ پلائی۔ "شرم نہیں آتی تم لوگوں کو۔ ایسے سادہ دل لوگوں پر ہنس رہے ہو۔ اپنی خیر بیت چاہتے ہو تو تم لوگ بھی ان کے پیچھے لگ جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ نوجوان سر پر پیر رکھ کر دوڑنے لگا۔ باقی لوگوں میں سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ انھوں نے بھی آخر کار کچھ نہ سوچتے ہوئے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

یہاں تک کہ اب سارا شہر ہی بھاگا جا رہا تھا۔ بھگوڑوں کی اگلی صف سے کچھ لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اب رات ہو گئی۔ اس لیے تھوڑی دیر رُک کر دم لے لیں۔ اس پر بہتوں نے زوردار مخالفت کی "نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب تو بھاگنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ سورج کی کرنوں کے نیزے سے زیادہ چاند کی ٹھنڈی روشنی ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے اس لیے رکو نہیں، بھاگتے رہو جب تک کہ بھاگ سکو۔" رائے دینے والوں کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ رہی اور وہ پھر سے اپنی رفتار بڑھانے لگے۔

یہ اس لمبی دوڑ کا تیسرا دن تھا۔ بہت سے لوگ راہ میں جاں بحق ہو چکے تھے۔ سورج ابھی ابھی مشرق سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک زبردست شور آگے دوڑتے والوں کے بیچ سے اُٹھا۔ اور پھر سارے لوگ خلاف توقع یک لخت مڑے اور بالکل مخالف سمت میں بڑھے اور دوگنی رفتار سے ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے آگے بڑھنے کی سعی کرنے لگے۔ چاروں طرف چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہوئیں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ خوف دہراس کے مارے سب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کچھ بوڑھے جو کہ کافی سخت جان نظر آ رہے تھے۔ ابھی تک جمے تھے البتہ بوڑھی خواتین پسپا پھیر چکی تھیں۔ اور جستہ جستہ راہوں میں پڑی اپنی اپنی سانسوں کو درست کرنے میں لگی تھیں، جس میں بہتوں کو ناکامی ہوئی۔

تبھی دوڑتی ہوئی بھیڑ سے آواز آئی "رک جاؤ! بھائیو رُکو! اب دوڑنا بے سود ہے۔ ہم بالکل نڈھال ہو چکے ہیں۔ اب ہم سے اور نہ بھاگا جائے گا۔ اس پر کچھ نوجوانوں نے آگے بڑھ کر آواز لگانے والوں کی پھر خبر لی "خاموش رہو کاہلو! دوڑنا ہماری سرشت میں ہے، دوڑنا ہماری زندگی کی ضمانت ہے۔ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی دوڑنا ہوگا اس لیے ہم عمر بھر

دوڑتے رہیں گے۔" اور ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے دوڑ کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ سروں کا سیلاب بہتا ہوا کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایک بار پھر بھیڑ سے یہ آواز بلند ہوئی "اب ہم کسی قیمت پر نہیں بھاگ سکتے۔ اب ہم میں بالکل سکت نہیں رہی۔ بلکہ اب ہم تعاقب کرنے والوں کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ یہ ہماری بزدلی اور کم عقلی ہے کہ ہم مٹھی بھر لوگوں کو اپنا اور اپنے ملک کا ہمدرد سمجھتے ہیں لیکن اب سارے پردے چاک ہو چکے ہیں۔ ہم سب مل کر مقابلہ کریں گے۔" اور پھر سب کی آواز ایک ساتھ فضا میں تیرنے لگی۔ جس میں پختہ عزم تھا۔ بلند حوصلہ تھا، نئی روشنی تھی۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

"کتاب نما" دسمبر ۸۸ء ایک دوست کے پاس دیکھا۔ یوں تو پنجاب خاص طور پر امرت سر میں اردو جرائد نظر نہیں آتے۔ نئی نسل اردو کے نام سے ہی واقف ہے۔ پرچہ پڑھا تو احساس ہوا کہ سچ مچ ایک خالص ادبی اور سنجیدہ جریدہ اردو کو مل گیا ہے۔

آج لوگ کس طرح انعام واکرام کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں، اس کا رونا رونے سے فائدہ۔ ایسا کب نہیں ہوا۔ غالب کے زمانہ میں کیا ہوتا تھا۔ "اکادمیاں" ادب اور ادیبوں کے لیے تو قائم کی نہیں جاتیں۔ ان کے پیچھے حکومت اور اس کی ڈفلی بجانے والوں کی ذہنیت کام کر رہی ہوتی ہے قصیدے پہلے بھی لکھے جاتے تھے، آج بھی وہی حال ہے، آیندہ بھی یہی سب ہوگا۔ جنھیں تخلیقی لگن ہے وہ کام کرتے رہتے ہیں۔ بلونت سنگھ کی موت پر ادب کے سمندر میں ہلکی سی لہر بھی پیدا نہیں ہوئی کیوں ہوتی۔۔؟ بلونت سنگھ نہ تو کسی تحریک سے جڑے، نہ کسی کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے رہے اور نہ ہی "تو مرا حاجی بگو" کے قائل ہوئے۔ آج کیا ہو رہا ہے۔ اگر آپ کسی کو خوش کر سکے ہیں تو وہ اپنی تیار کردہ فہرست میں آپ کا نام شامل کرے گا" ورنہ نہیں۔ پھر حیرت یا دکھ کیوں۔ دنیا اسی کا نام ہے

مخدوم صاحب پر مضمون قابل تعریف ہے۔ مضمون نگار نے بے لاگ بات کی ہے۔ زبیر رضوی کہتے ہیں تو تے نہیں اڑے۔ مٹی کے توتے اڑا نہیں کرتے۔ انور سدید واقعی گوشہ کے حق دار ہیں وہ جس محنت اور لگن سے کام کر رہے ہیں۔ وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

شرون کمار ورما۔ امرت سر

کتاب نما وقتاً فوقتاً احباب کے پاس دیکھتا رہا ہوں۔ اب گزشتہ چند ماہ سے "دائرے" میں پابندی کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ بڑا اچھا اور معیاری رسالہ ہے۔

اتفاق سے وہ شمارہ نہیں دیکھ سکا تھا جس میں آپ نے بلونت سنگھ پر خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔ ایک دوست کے ہاں دیکھا تو خیال آیا کہ کاش اس حصے میں بلونت سنگھ کے اپنے تحریر کردہ حالات زندگی بھی شامل ہو جاتے تو اور اچھا ہوتا۔ ۵۴ برس قبل بشیر ہندی نامی ایک صاحب نے بعض افسانہ نگاروں کی خود نوشت کے ہمراہ ان کی ایک ایک کہانی بھی شائع کی تھی۔ بلونت سنگھ

نے بھی اپنے حالات اسی سلسلے کے لیے لکھے تھے۔ کیا بلونت سنگھ والے شمارے کی ایک کاپی آپ از راہ کرم بھیج سکتے ہیں؟۔

مشرف احمد۔ کورنگی ۲۔ کراچی۔ پاکستان

کتاب نما کا جنوری ۸۹ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ مہمان اداریوں کا سلسلہ خوب چل رہا ہے۔ یہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی افادی پہلو بھی اپنے اندر سموتے ہوئے ہیں۔ ظفر پیامی، شمس الرحمن فاروقی، فضیل جعفری اور کلام حیدری کے اداریے اردو کے مسائل کا اچھا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں کبھی کبھی کہیں کہیں جذباتیت در آئی ہے۔ لیکن مصنف انسان بھی ہوتا ہے اور حالات سے متاثر ہو کر غصہ اور جھنجھلاہٹ بھی اس میں فطری ہے۔ موجودہ دگرگوں حالت میں ان کی یہ جھنجھلاہٹ کی قلم بندی بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ ہاں اس تسلسل میں زیر نظر شمارے میں شمیم حنفی کا اداریہ کچھ بوجھل اور عام "قاری کی دسترس سے باہر کی چیز ہو گیا ہے۔

میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مہمان اداریوں کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور اس کے توسط سے ہندستان کے مختلف اردو خطوں میں رہنے والوں سے اردو کے مسائل پر اداریے قلم بند کروانے چاہئیں۔ عام طور پر شمالی اور مغربی ہندستان اور بہار کے نقطۂ نظر سے اردو دنیا واقف نہ ہو سکی ہے۔ لیکن وسط، جنوبی ہند اور مشرقی بعید کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے اور یہ مشکل سے معلوم ہو پاتا ہے کہ ان علاقوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور یہاں کے لوگ اردو کے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں۔ بہتر ہو اگر آپ ان علاقوں کے ادیبوں سے رابطہ قائم کر کے انھیں مہمان اداریے لکھنے پر آمادہ کر سکیں۔ وسط ہند میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ہیں۔ جن سے مہمان اداریے لکھوائے جا سکتے ہیں۔ اور اس طرح یہاں کے مسائل بھی اردو دنیا کو معلوم ہو سکیں گے۔

مثال کے طور پر وسط ہند سے اردو کا کوئی رسالہ نہیں نکلتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے ادیبوں اور فنکاروں کو اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے دوسرے علاقوں سے نکلنے والے رسائل پر منحصر رہنا پڑتا ہے اور ان رسالوں کی اپنی حد بندیاں، اپنے مسائل اور اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں اور وہ عموماً اپنے علاقوں سے باہر کے نئے ادیبوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یوں نہ جانے کتنے فنکاروں کو تھک ہار کر گوشہ نشینی، اختیار کر لینے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

یہ تو ایک مسئلہ ہے ایسے نہ جانے کتنے مسائل ہیں جن کی طرف ان علاقوں میں رہنے والے لوگ نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہندستان بھر میں اردو مسائل اور مختلف علاقوں کے لوگوں کا انداز فکر سامنے آ جائے گا۔

یعقوب یاور کوٹی، چرچ روڈ، جہانگیر آباد۔ بھوپال

آپ کا تازہ شمارہ فروری ۸۹ء کا نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب اور مظہر امام صاحب کا مضمون "ترقی پسند ادبی تحریک" اردو میں جادوسی ادب "جدید پسند آیا۔" مانگے کا اجالا" کا تو جواب نہیں "جشن بہاراں کی رسم اجرا" وجاہت علی سندیلوی نے بھی

کافی محنت سے لکھا ہے۔

آپ کا رسالہ قابلِ ستائش ہے۔ اسے میں کافی عرصہ سے پڑھتا رہا ہوں۔ ادبی رسالوں میں "کتاب نما" کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

"کتاب نما" اس قدر معیاری ہو چکا ہے کہ اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کتابت و طباعت، ترتیب و تزئین ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ مستقبل میں بھی مقبول ہوتا رہے۔

محمد علی جوہر، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

"کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" سید یحییٰ نشیط کے سلسلے میں عرض ہے کہ کسی عدد سے بھی کوئی عدد حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دیے ہوئے عدد کو صفر سے ضرب دے کر حاصل ضرب میں مطلوبہ عدد جوڑ دیجیے، مطلوبہ عدد مل جائے گا وہ فارمولا جو کبیر، گرونانک یا دیگر بزرگوں سے منسوب ہے ایسی ہی سادہ منطق پر مبنی ہے۔ علم حساب سے ایسی معصومیت پر حیرانی ہوتی ہے۔

بیدار بخت، ٹورنٹو، کنیڈا

"اسم محمدؐ کی جلوہ گری" کے بارے میں جو کچھ کتاب نما میں شائع ہوا ہے وہ بے بنیاد توہم پرستی کا کرشمہ ہے۔ ایک زندہ اور فعّال قوم کے علمی قوئی میں جب انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو وہ اس قسم کی طفلانہ شعبدہ بازی میں اسیر ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کے اسم گرامی کے علاوہ عرب میں ایک اور نام "کعب" بھی مشہور تھا۔ اس کے عدد بھی ۹۲ ہی ہیں۔ کعب نام لاکھوں عرب نژاد مسلمانوں، نصرانیوں اور یہودیوں میں مروّج تھا۔ چنانچہ اسلام کے ایک بہت بڑے دشمن یہودی سردار کا نام بھی کعب (کعب بن اشرف) تھا جسے آنحضرتؐ کے حکم پر ایک کمانڈو دستے نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اسی طرح حضورؐ کے ایک جلیل القدر صحابی کا نام بھی کعبؓ (کعبؓ بن مالک) تھا جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

جو حسابی معمّا اس سلسلے میں ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو:۔ چار سے ضرب، دو کی شمولیت، پانچ سے ضرب اور بیس سے تقسیم۔

دوسرا پہلو: خارج قسمت کو ۵ سے ضرب اور ۲ کی شمولیت۔ پہلے پہلو کی رو سے دنیا کی ہر شے کے ابجدی اعداد کا جب حساب کیا جائے گا تو نتیجے میں دس (۱۰) کا عدد حاصل ہوگا۔ اس عدد کو دوسرے پہلو کی رو سے نو (۹) سے ضرب دے کر حاصل ضرب میں دو شامل کیے جائیں گے۔ اس طرح ہمیشہ ۹۲ کا عدد ہی حاصل ہوگا۔ اس طریقے کی رو سے دنیا کی ہر شے کا معمّا بنایا جا سکتا ہے۔ بس اتنی تبدیلی کرنی ہوگی کہ حساب کے دوسرے پہلو میں اس شے کے ابجدی اعداد کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر رام۔ الیاس اور پوپ پال۔ کے ابجدی اعداد کا معمّا اس طرح بنایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کسی بھی شے کے ابجدی اعداد کا معمّا کریں تو نتیجے میں۔ رام۔ الیاس۔ اور۔ پوپ پال۔ ہی کے عدد ہاتھ آئیں گے۔

(۱) الیاس کی مثال:۔ الیاس کے عدد ۱۰۲ ہیں۔ پہلے پہلو کی رو سے دنیا کی کسی بھی شے کے ابجدی اعداد کا نتیجہ دس کی شکل میں ہاتھ آئے گا۔

دس (۱۰) سے ضرب اور (۲) کی شمولیت سے اور معمّا یوں بنے گا ؎

عدد نکالو ہر چیز کے، چوگن کر لو وا ئے دو ملا کر پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کو دس گن کر لو اس میں دو کو ملائے کہت کبیر سنو بھئی سادھو نام الیاس کا آئے

(۲) رام کی مثال :- رام کے عدد ۲۴۱ ہیں۔

پہلے پہلو کی رو سے دنیا کی کسی بھی شئے کے ابجدی اعداد کا نتیجہ دس (۱۰) کی شکل میں ہاتھ آئے گا۔ اب دوسرے پہلو کو اس طرح بنایا جائے گا۔ ۲۴ سے ضرب اور ایک (۱) کی شمولیت سے معمّا یوں بنے گا ؎

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کر لو وائے۔ دو ملا کر پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی کو چوبیس گن کر لو، دیدو ایک ملائے کہت کبیر سنو بھئی سادھو، رام کا نام آجائے

(۳) پوپ پال کی مثال :- پوپ پال کے عدد ۳۴ ہیں

پہلے پہلو کی رو سے دنیا کی کسی بھی شئے کے ابجدی اعداد کا نتیجہ دس (۱۰) کی شکل میں ہاتھ آئے گا۔ اب دوسرے پہلو کو یوں بنایا جائے گا۔ ۳ سے ضرب اور ۳ کی شمولیت۔ معمّا یوں بنے گا ؎

عدد نکالو ہر چیز سے چوگن کر لو وائے
دو ملا کر پچگن کر لو بیس کا بھاگ لگائے
باقی بچے کو چوگن کر لو، اس میں تین ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو، پوپ پال آجائے

ڈاکٹر یعقوب عمر۔ حیدر آباد

اپریل ۸۹ء کا کتاب نما نظر نواز ہوا۔ ۸۰ صفحات کے اس مختصر سے ماہ نامہ میں چند مضامین اتنے خیال انگیز ہیں کہ ذہن کو مہمیز لگانے اور اظہار خیال پر مائل کرتے ہیں، میری مراد جوگندر پال صاحب کے اشاریہ (موضوع اردو افسانہ) ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالہ "آزاد نظم" منیر احمد شیخ کے مقالہ "پاکستان میں ادبی صورت حال" سے ہے۔ "تحقیق و تنقید کار شتہ" پر ڈاکٹر تنویر احمد خاں کی رپورٹ نے بھی توجہ کھینچی۔ اور خامہ بگوش صاحب کے ارشادات کا بیشتر روئے اظہار میری جانب تھا۔ اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب وزیر آغا صاحب کے مقالے پر لکھنے سے گریز کر رہا ہوں۔ البتہ چند باتیں اجمال سے کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

سب سے پہلے مجھے یہ عرض کرنا ہے محمد ضمان اللہ ندیم غفرلہٗ بھیرہ، بھوانی پور، بھرواره، ضلع دربھنگہ (بہار) کا مکتوب گرامی اعداد کے ایک ایسے کرشمے کو سامنے لاتا ہے جسے پڑھ کر حیرت جاگ اٹھتی ہے لیکن ذرا غور کریں تو یہ محض شعبدہ بازی نکلتی ہے۔ اور اس سے تقدّس کا کوئی پہلو نہیں ابھرتا۔ وضاحتاً عرض ہے کہ کسی شئے کے عدد کو ہم گنا کر کے اس میں (۲) جوڑ دینے سے بعد جب حاصل جمع کو (پانچ) گنا کر دیں تو دو کا عدد پانچ سے ضرب کھانے کے بعد ۱۰ بن جائے گا اور جب اسے ۲۰ سے تقسیم کریں گے تو یہ تقسیم سابقہ

(بقیہ صفحہ ۷۵ پر)

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہم اُردو کیسے پڑھائیں

مصنف : معین الدین
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵
مبصر : ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
قیمت : ۴۵ روپے

کسی بھی زبان کی بقا کے لیے جہاں اس کا عوامی طبقے سے گہرا تعلق ضروری ہے، وہیں اسی کی تدریس بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جب تک کوئی مدرّس یا معلّم کسی زبان کو صحیح طریقے سے نہیں پڑھائے گا، اُس وقت تک اس زبان کی لطافتیں، نزاکتیں اور باریکیاں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ زبان کی تدریس اسی لیے بہت اہم ہے۔ زبان کو محض امتحانی نقطۂ نظر سے پڑھا لیا جائے اور صرف درسی کتب کے طے شدہ نصابی اسباق تک محدود رکھا جائے تو زبان کے پڑھنے کا لطف نہیں آتا۔ زبان کو صحیح معنوں میں زبان سمجھ کر پڑھنا اور پڑھانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ مدرّس خود اُس زبان کے طریقۂ تدریس سے واقف ہو۔ کیونکہ ہر زبان کا اپنا مزاج، اپنا لب ولہجہ، اپنا ڈکشن اور اپنا تہذیبی و ثقافتی سرمایہ ہوتا ہے، جس میں وہ پروان چڑھتی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک تاریخی و معاشرتی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ ایک مدرّس کا فرض ہے کہ وہ اس پس منظر سے بخوبی واقف ہو۔ تاکہ طالب علم کو اس قابل بنا سکے کہ وہ زبان کی خوبیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ اُردو زبان کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہمارے یہاں ابتدا ہی سے ایسی کتابوں کا فقدان ہے جو طریقۂ تدریس سے کماحقہٗ واقفیت دلا سکیں۔ ہمیں زیر تربیت اساتذہ کے لیے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ مواد فراہم کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اصول تدریس سے بہرہ ور ہو سکیں مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے لہٰذا اس کا طریقۂ تدریس بھی کسی حد تک اس کے اپنے مزاج کے موافق اور مناسب ہونا چاہیے۔ اُردو میں تدریسی کتابوں کی کمی نے ہمارے اساتذہ کو بہت حد تک ناقص طریقۂ تدریس کا شکار بنا رکھا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں طریقۂ تدریس کے موضوع پر مختلف اور متعدد کتابیں لکھی جائیں جو معیاری بھی ہوں اور اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہوں۔ نیز ہمارے مدرّسین کے لیے ممد ومعاون اور مشعلِ راہ ثابت ہوں۔ اس لحاظ سے جناب معین الدین قابلِ مبارک باد ہیں کہ

انھوں نے اس قسم کی کتابوں کے لکھنے کی زحمت کی اور مکتبہ جامعہ ان سے زیادہ تحسین کا مستحق ہے، جس نے ایسی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔

معین الدین چونکہ گذشتہ چھبیس ستائیس برس سے تربیت اساتذہ کی ذمہ داری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ابتدائی اور ثانوی دونوں سطحوں پر طریقۂ تدریس اُردو" کا مضمون پڑھاتے رہے ہیں اور اس طرح گویا اُن کی ایک عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے، لہٰذا یہ کام ان کے لیے کوئی ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ اسی ضمن میں ان کی ایک اور کتاب "اردو زبان کی تدریس" پہلے ہی منظرِ عام پر آچکی ہے اور زیرِ نظر کتاب "ہم اردو کیسے پڑھائیں" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۲ باب ہیں۔ پہلے پانچ باب زبان سے متعلق ہیں جن میں عمومی طور پر زبان کی نوعیت، اہمیت اس کی تعلیم سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ نیز اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زبان بہ حیثیت علامت کس طرح وسیلۂ اظہار بنتی ہے۔ ان تمام ابواب میں خاص طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہر زبان کا اپنا ایک نظام ہے۔ ایک ایسا نظام جو مختلف سطحوں پر کارفرما اور مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔ ان میں صرفی، نحوی خصوصیات، الفاظ اور جملے بنیادی ساخت کا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا زبان کی بنیادی ساخت کا علم حاصل کیے بغیر زبان سیکھنا مشکل ہوتا ہے۔" نیز یہ کہ جن قوموں کو اپنی تہذیب سے محبت ہوتی ہے وہ اپنی زبان سے بھی محبت کرتی ہیں اور جو لوگ اپنی تہذیب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ زبان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔" کیونکہ زبان انسان کے ذہنی ارتقا میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اسی لیے زبان کی تعلیم، تدریس کے میدان میں سب سے زیادہ اہم سمجھی گئی ہے۔

چھٹے باب میں اُردو زبان کے تعارف کے ساتھ ساتھ اس کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ماہرین لسانیات کے خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آخری چار باب "تدریس اردو" سے متعلق ہیں۔ سب سے پہلے تدریس اردو کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ انھیں سمجھے بغیر تدریس کا عمل بے معنی لگتا ہے۔ ایک مدرس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تدریس سے پہلے اس کے مقاصد کو ذہن نشین کرے۔ یہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے کہ تدریس اُردو کے عام مقاصد وہی ہیں جو کسی بھی زبان کی تدریس کے ہوسکتے ہیں البتہ خاص مقاصد کی دو سطحیں ہیں۔ ایک تو ابتدائی مدارس میں تدریس کے مقاصد کچھ اور ہوں گے۔ دوسرے ثانوی مدارس میں کچھ اور ابتدائی مدارس میں تدریس اُردو کے خاص مقاصد جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔ بولنا سکھانا، پڑھنا سکھانا، لکھنا سکھانا اور سمجھنا سکھانا وغیرہ۔ ثانوی سطح پر ان مقاصد میں چند باتوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً استحسانِ ادب، شعورِ شعری وغیرہ، اس کے بعد اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں اُردو کا نصاب کیا ہونا چاہیے۔ اور ثانوی سطح پر اس میں کیسے اسباق کا انتخاب کرنا چاہیے۔ پھر "سماعت اور گفتگو" کے عنوان سے ایک پورا باب اس امر پر روشنی ڈالتا ہے کہ زبان کی تدریس میں سماعت و گفتگو کے عمل کا جو اہم رول ہے، اُسے کس حد تک موثر اور فائدہ مند بنایا جاسکتا ہے۔

نیز زبان کی تدریس میں سماعت و گفتگو کے پیش نظر کون سی دلچسپیاں پیدا کی جاسکتی ہیں پھر کون سی ہم نصابی اور غیر نصابی تحریکات عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً سماعت کی بہتر تربیت کے لیے بعض دلچسپ کھیل کھلائے جاسکتے ہیں۔ اور بچوں کی عمر اور ان کی دلچسپیوں کے لحاظ سے ایسے مشاغل شروع کرائے جاسکتے ہیں جن میں بچے خود شریک کرسکیں۔ اسی طرح گفتگو کی تربیت کے لیے تقریری مقابلے منعقد کرائے جاسکتے ہیں۔ نظم خوانی کے مقابلے منعقد کیے جاسکتے ہیں۔ قصہ خوانی کے مقابلوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ دسواں باب خواندگی کے عمل سے متعلق ہے۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ "پڑھنا، ایک ایسا عمل ہے جس کے تحت لکھنے والے کے خیالات سے آگاہی پیدا کی جاتی ہے اور اس مواد کی تفہیم میں مدد ملتی ہے جو اس عبارت میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا پڑھنا لفظوں کو صرف زبان سے ادا کر دینے کا نام نہیں بلکہ یہ آموزش کا ایک پیچیدہ تجربہ ہے۔" اس ضمن میں آگے چل کر پڑھنا سکھانے کے مختلف طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً ترکیبی و تحلیلی طریقہ، حروف تہجی کا طریقہ، صوتی طریقہ، لفظ داری کا طریقہ، جملہ داری کا طریقہ اور قصہ داری کا طریقہ وغیرہ۔ پھر لکھنا سکھانے کے بھی مختلف طریقوں کی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ جیسے ابجدی طریقہ، پستالوزی طریقہ مانٹیسوری طریقہ اور پڑھو اور لکھو طریقہ وغیرہ۔

اس کے بعد کے چار باب "تدریس اردو" کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں بالترتیب تدریس نثر، تدریس نظم تدریس انشا اور تدریس قواعد کے کامیاب طریقوں پر بحث کی گئی ہے، جن کا جاننا اردو کے ایک مدرّس کے لیے بے حد ضروری ہے۔

آخری پانچ باب طریقہ تدریس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً طریقہ امتحان اور جانچ، امدادی اشیا اور دیگر وسائل، درسی کتب، بچوں کا ادب، سبق کے اشارات وغیرہ۔

اس طرح یہ کتاب "طریقہ تدریس اُردو" کے موضوع پر ایک فائدہ مند کتاب ہے۔ اس کتاب کو ٹریننگ کالجوں کے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ہے تاکہ اُردو کے زیر تربیت اساتذہ اور طلبہ اس سے استفادہ کرسکیں ہمارے یہاں اس قسم کی کتابوں کی اشاعت بے حد ضروری ہے۔ امید ہے مکتبہ جامعہ اس طرف توجہ دے کر صرف زبان ہی نہیں بلکہ اُردو ذریعۂ تعلیم سے دیگر مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ریاضی وغیرہ کی تدریس اور ان کے اصول تدریس سے متعلق بھی کتابیں شائع کرکے اُردو کے تدریسی ادب میں اضافہ اور اُردو کے اساتذہ کے لیے ایک رہنمائی کا کام کرے گا۔

پھول جیسے لوگ

مصنف : انور خاں
ناشر : تخلیق کار پبلیشرز ۴۰۷ فراش خانہ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مبصر : م۔ ناگ
قیمت : چالیس روپے

ناول "پھول جیسے لوگ" انور خاں کا تازہ ناول ہے۔ انور خاں ۷۰ء کے بعد والی افسانہ نگاروں کی کھیپ کے ایک ذمہ دار اور خوبصورت افسانہ نگار ہیں۔ جن کے تعلق سے مشہور ہے کہ وہ کسی

بھی وقت غیر معمولی کہانی دے سکتے ہیں! اس لیے انور خاں نے شاید اپنا کوئی امیج کبھی بننے نہ دیا۔ نہ اپنی تخلیقات کا کوئی ساختہ بتایا نہ فریم۔ اعلا تخلیقی قوت والے فنکار کی یہ بھی ایک پہچان ہے کہ انور خاں نے فکشن کے مروجہ اصول اور سانچوں کو کبھی برقرار نہیں رکھا۔ توڑ پھوڑ کرتے رہے۔ انھیں اپنے طور پر شیپ دیتے رہے۔ اس ناول میں بھی یہی ہوا ہے۔ پلاٹ واقعات کردار ان کے لیے مٹی کا ایک پونڈا ہے جسے نفسیاتی ٹریٹمنٹ کے چاک پر انھوں نے گردش دی اور اپنے طور پر ایک شیپ دے دیا۔

پھول جیسے لوگ کا ماحول اور فضا فلمی ہے۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں داخل ہونے کی پے در پے کوششیں۔ ناول کی کہانی کوئی غیر معمولی نہیں ہے اور نہ ہی موضوع بھاری بھرکم۔ مگر ٹریٹمنٹ اور اندازِ بیان نے اسی ناول کو اہم بنا دیا ہے۔ سب سے پہلے زبان کا ذکر کروں گا۔ انور خاں نے بہت پیاری سادہ برجستہ اور شستہ زبان استعمال کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے دل کو چھینے والے گدگدانے والے مکالمے۔ یہ زبان ٹریٹمنٹ کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔ منظر کشی ماحول سازی اور جزئیات نگاری کو پُر اثر بنانے میں زبان کا بڑا ہاتھ ہے۔ سجے ہوئے الفاظ نہیں ہیں اور نہ بھاری بھرکم تراکیب۔ بلاشبہ ایسی زبان انور خاں ہی لکھ سکتے تھے۔

ناول کا ہیرو اپنا اعمال نامہ سامنے رکھے اپنے ذہن کی موت کا انتظار کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ سائنس کا ایک FREAK حادثہ ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ اس قدر حساس ہو گیا ہے کہ موت ہی نصیب نہیں ہو رہی۔ اس کے اعمال نامے میں سوائے غلطیوں کے اور کچھ نہیں۔

ناول میں چند خامیاں بھی ہیں۔

— جیسے، فوزیہ جیسی لڑکی جو بمبئی شہر میں ملازمت کرتی ہے۔ اس کا حالات کے آگے اس طرح سپر ڈال دینا گویا وہ ایک گھریلو لڑکی ہو عجیب لگتا ہے — شیلا بھاگ کر کہاں گئی؟ یہ جاننے کے لیے سعید اور جاوید ریلوے اسٹیشن جا کر RESERVATION کا رجسٹر چیک کرتے ہیں! اس طرح بھاگ جانے والی لڑکیوں کو تلاش کرنے کا انور خاں ایک اور سُوتر دیتے ہیں!

ناول میں سعید اور شیلا کے کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہے مرکزی کردار سعید کو بڑی شدت سے اٹھایا گیا ہے اس کے خدوخال واضح ہیں۔ شخصیت کے نشیب و فراز، خامیاں، بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے شب و روز کے دلچسپ بیورے دیے گئے ہیں مگر اس کردار کو کھڑا کر جب جب انور کہانی کی طرف مڑے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہے اور بہاؤ میں درمیانی کردار بہہ گئے ہیں جن میں فوزیہ جیسے کردار کی بلی چڑھ گئی ہے۔

جزئیات نگاری پر اور توجہ دی جاتی تو بہتر تھا جب کہ خاصی گنجایش تھی۔ نصف ناول کے بعد منظر نگاری بہت کم ہے اور سارا زور مکالموں پر ڈال دیا گیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ کہانی مرکزی کردار خود بیان کر رہا ہے۔

یوں تو بمبئی کے ماحول اور فضا کو لے کر کئی کامیاب کہانیاں اور ناول لکھے گئے مگر یہ

ایک الگ انداز سے لکھا گیا ناول ہے — ایک اور پسندیدہ پہلو یہ ہے کہ ہمارے بعض فکشن نگاروں کی مانند انور خاں نے کہیں بھی خواہ مخواہ اپنی کہانی پر فلسفے یا "پرت داری" کا ملمع چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا مقصد تھا ایک سبک رفتار اور عام فہم ناول لکھنا اور اس میں یقیناً وہ کامیاب رہے ہیں۔ کہانی کی روانی اور پلاٹ کے ربط سے ان کے قلم کی قوت بھی ظاہر ہے اور ڈرامائی صلاحیت بھی۔

لگ بھگ دو سو صفحات کے اس ناول کی قیمت چالیس روپے ہے۔ اپنے انوکھے طرزِ بیان اور خوبصورت نثر کے لیے یہ ناول یاد کیا جائے گا۔

کہا سنا معاف

مصنّف : داؤد کشمیری
مبصّر : انور خاں
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

'کہا سنا معاف' کے عنوان سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ مصنّف کی پہلی اور آخری کتاب ہے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو کیونکہ بمبئی کی اردو دنیا کے لوگ جانتے ہیں کہ اس منحنی شخص کے اندر کتنا بارود بھرا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے قارئین کو بھی اس کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔
کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے مضامین میں طنز کی مقدار مزاح سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں طنز ہی طنز ہے لیکن کپور اور فکر ہی کی طرح طنز مزاح پر کبھی بار نہیں ہوتا۔ جس طرح کپور کی سفّاک کاٹ آپ کو متبسّم کر دیتی ہے۔ اسی طرح داؤد کشمیری کے مضامین پڑھ کر آپ مسکرا اٹھتے ہیں۔ یہاں کپور سے یا فکر سے موازنہ مقصود نہیں۔ داؤد کشمیری کی یہ پہلی کتاب ہے۔ یہ بات بہرحال خاطر نشان رہنی چاہیے۔ آج کل مزاح نگار بہت ہیں اور بیشتر زبان کی شگفتگی کو کافی سمجھ کر مضامین کے انبار لگائے جا رہے ہیں۔ موضوعات برسوں سے وہی چلے آ رہے ہیں۔ قرض رشوت، سیاست، کرکٹ، لیڈر وغیرہ۔ یہ موضوعات اس کتاب میں بھی ہیں لیکن طنز کی دھار انھیں اس نوع کے لکھنے والوں سے الگ کر دیتی ہے۔ کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو روایتی نہیں۔ جیسے آوازوں کا سیمینار، اردو سینا، بنجر زمین کی کھیتی وغیرہ ان تحریروں کے پیچھے بہرحال ایک سوچنے والے ذہن کا پتا چلتا ہے۔ جا بجا تیکھے جملے ملتے ہیں جیسے "جب تک پڑھے لکھے لوگوں کو کمپیوٹر کا استعمال نہیں آتا۔ تب تک ان پڑھ لوگوں کو پڑھا لکھا نہیں بنایا جا سکتا ورنہ بیسویں صدی کے پڑھے لکھے اکیسویں صدی میں ان پڑھ تسلیم کیے جائیں گے۔"

حکومت کے موڈ کو پالیسی، پولس کے موڈ کو ظلم اور عوام کے موڈ کو انقلاب کہتے ہیں۔

قرض کئی طرح کا ہوتا تھا۔ ماں کے دودھ کا قرض، احسان کا قرض، دوستی کا قرض، استاد کا قرض۔ پھر قرض کی یہ قسمیں ختم ہو گئیں اور نئی قسمیں سامنے آئیں جیسے سماج کا قرض، وطن کا قرض، قوم کا قرض۔

دیباچہ ظ۔ انصاری نے لکھا ہے اور مصنف کی شخصیت اور تحریر کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ مزید لکھنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

کتاب بڑی صاف ستھری چھپی ہے۔ ساجد رشید کا بنا ہوا ٹائٹل سادہ، خوبصورت اور معنی خیز ہے۔

دو مسافر، دو ملک

مصنف : مسعود احمد برکاتی
مبصر : شمیم حنفی
ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی قیمت : ؟

اُردو میں سفرناموں کی باڑھ آئی ہوئی ہے۔ ہمارے ادیب سفر بھی بہت کرتے ہیں اور پھر مزے لے لے کر اپنی کامرانیوں کے قصّے سناتے ہیں۔ لیکن یہ کتاب بچوں کا پہلا سفرنامہ ہے اور ایک ایسے ادیب کے قلم سے نکلا ہے جس نے اپنی بیشتر کوششیں بچوں کی ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی تربیت کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔

برکاتی صاحب نے علمی، ادبی، فنّی مضامین بھی لکھے ہیں اور بچوں کے لیے قصّے کہانیاں بھی۔ انھیں موضوع اور مخاطب کے مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے، اپنی بات کہنے کا غیر معمولی سلیقہ حاصل ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے سفرنامہ بھی لکھا تو اس طرح کہ لندن اور پیرس کی گائڈ بک بن کر نہ رہ جائے۔ یہ سفرنامہ ایک مکمل انسانی تجربے کی روداد سامنے لاتا ہے حکیم محمد سعید صاحب اور مسعود احمد برکاتی صاحب نے لندن اور پیرس کو صرف دو بستیوں کے طور پر نہیں دیکھا، ان کا مشاہدہ انسان کے تہذیبی سفر کی دو منزلوں کے طور پر بھی کیا ہے۔

برکاتی صاحب اشاروں میں گہری باتیں بھی کہہ جاتے ہیں اور نو عمر پڑھنے والوں تک یہ باتیں انسانی واردات کے سیاق میں ایک جیتی جاگتی معنویت کے ساتھ پہنچتی ہیں۔

یہ سفرنامہ اپنے واقعات، مشاہدوں، تجربوں سے قطع نظر، اپنے اسلوب کے لحاظ سے بھی بہت پُرکشش ہے

ادبی اور تہذیبی خبریں

ڈاکٹر سید ظہور قاسم، نئے شیخ الجامعہ

نئی دلی ۔ ۲۸ راپریل۔ ڈاکٹر سید ظہور قاسم نے آج جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال لیا۔ صبح ساڑھے نو بجے جب آپ رجسٹرار آفس پہنچے تو جامعہ برادری نے آپ کا استقبال کیا اور آپ کو وائس چانسلر کے دفتر لے گئے۔ وہاں آدھ گھنٹہ رہنے کے بعد شیخ الجامعہ صاحب کسی میٹنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ دفتر میں ان کے ساتھ یونیورسٹی کے رجسٹرار خواجہ محمد شاہد، سبکدوش ہونے والے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف اور پرو وائس چانسلر موجود تھے۔

وہاں موجود جامعہ کے کارکنان سے موصوف کا تعارف کرایا گیا۔ اس سے قبل یونی ورسٹی کیمپس میں پہنچتے ہی ڈاکٹر سید ظہور قاسم نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔

ڈاکٹر سید ظہور قاسم ملک کے پہلے سائنس داں ہیں جن کی قیادت میں انٹارکٹیکا کی مہم سر کی گئی تھی۔ الہ آباد اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ متعدد یونی ورسٹیوں میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ مختلف تنظیموں کی جانب سے آپ کو کئی ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔ ملک اور بیرون ملک کے مقبول جرائد میں آپ کے ۱۹۰ سے زائد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر قاسم کو ۱۹۷۳ء میں پدم شری اور ۱۹۸۲ء میں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے

اردو افسانے پر یک روزہ سیمی نار

۵ راپریل ۱۹۸۹ء کو مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی کے نمائندہ افسانہ نگاروں پر مشتمل "افسانہ ۸۰ء" کے عنوان کے تحت "نیا اردو افسانہ" پر ایک روزہ سیمینار انجمن اسلام پیربھائی ہال میں منعقد کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صدر نشین اردو اکادمی نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ اکادمی نے صنف افسانہ کی فروغ و ترقی میں ہمیشہ ایک مثبت رول انجام دیا ہے ہمیں فخر ہے کہ مہاراشٹر کے افسانہ نگاروں نے اس فن کو زندہ اور پائدار رکھا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر اور سریندر پرکاش (جو آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں) نے افسانہ کی جو شمع روشن کی تھی اس کے بعد آنے والی نسل جس میں انور خاں، سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید، مشتاق مومن، علی امام نقوی، م ناگ اور اسلم پرویز شامل ہے اس شمع کو روشن رکھا ہے۔ ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کے ہمراہ بمبئی کے سابق میئر مدھو جوشی ایم۔ ایل نے بھی اس اجتماع میں شرکت کی۔ اکادمی کے ڈائرکٹر علی سردار جعفری نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں خاص طور سے بمبئی میں اہل اردو کو کبھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں رہا، بمبئی میونسپل کارپوریشن نے اردو کے نام پر باندرہ میں کرشن چندر مارگ نام کی سڑک کی اجازت دی اب میری خواہش ہے کہ جوہو تارا روڈ کو خواجہ احمد عباس کے نام سے منسوب کیا جائے۔

سکریٹری اردو اکادمی ہارون رشید علیگ جو صبح کے سیشن کی نظامت کر رہے تھے۔ انھوں نے اسلم پرویز کے نام سے اس پروگرام کا آغاز کیا۔ اسلم پرویز نے اپنا افسانہ "سوالیہ نشان" پیش کیا۔ اس کے بعد ساجد رشید نے کہانی "شام کے پرندے" سنائی۔ مشتاق مومن نے کہانی "رانتھا" کی کا جدید قصہ" سنائی۔ مشتاق مومن کے بعد انور قمر نے اپنا افسانہ "پرندوں کے سائے" پیش کیا۔

ان چار افسانوں کا تجزیہ جناب محافظ حیدر نے پیش کیا جسے سامعین نے بیحد سراہا۔ اتنا جامع تبصرہ بہت کم سننے یا پڑھنے میں آتا ہے۔ اخیر میں سریندر پرکاش نے اپنے

خطبۂ صدارت میں چند بنیادی سوالات اٹھاتے اور یہ اہم سوال پیش کیا کہ آخر آج کے دور میں بڑا فنکار کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ دوسرے سیشن کی صدارت اردو کی صاحب طرز افسانہ نگار عصمت چغتائی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض مشتاق مومن نے انجام دیے۔ سب سے پہلے ما نک ٹالا کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہانی گھروندہ سنائی۔ علی امام نقوی نے کہانی "خمیر" پیش کی۔ انور خاں نے افسانہ "حسرت حاصل" پیش کیا۔ سلام بن رزاق نے "ایک خیالی کہانی" عنوان کے تحت اپنا افسانہ سنایا۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر نے ان چاروں کہانیوں پر اپنا تبصرہ پیش کیا اور مندرجہ بالا کہانیوں کے اسرار و رموز پیش کیے۔ اس سیمینار میں پڑھی گئی تمام کہانیاں پسند کی گئیں۔ آخر میں مائک عصمت چغتائی کے سامنے رکھ دیا گیا۔ عصمت چغتائی نے کہا کہ تقریباً ہر کہانی میں عورت کے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ سسٹم ہمیں چوری اور بے ایمانی پر اکساتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے بدلا جائے۔

آخر میں یوسف ناظم، سکریٹری اردو اکادمی کے شکریہ کے ساتھ یہ جلسہ برخاست ہوا۔

تصوّف کی سماجی معنویت پر کل ہند دو روزہ سمینار

عبدالرحیم خانخاناں میموریل سوسائٹی کے تحت دلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں تصوف اور اس کی سماجی معنویت پر کل ہند دو روزہ سمینار منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح ڈاکٹر شنکر دیال شرما نائب صدر جمہوریہ ہند نے فرمایا۔

افتتاحی اجلاس میں پروفیسر مشیر الحق، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی اور جناب رگھوویر سہائے (ہندی کے مشہور شاعر) نے کلیدی مضامین پڑھے۔ قاضی جلیل عباسی ایم پی اور صدر سوسائٹی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ شیخ سلیم احمد جو پروگرام کے کنوینر تھے سمینار کے موضوع پر روشنی ڈالی اور جلسہ کی کارروائی چلائی۔

پہلی بار صوفیوں اور خانقاہوں کے رول کو تاریخی اور مثبت ڈھنگ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی اور ایک مشترکہ قومی کلچر کے فروغ میں انھوں نے جو رول ادا کیا اسے اجاگر کیا گیا۔

ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والے اسکالرس نے اس سمینار میں حصہ لیا۔ تین اسکالر ہندوستان کے باہر سے بھی تشریف لائے تھے۔ تصوف کی اسلامی اساس اور بھکتی اور ہندوی پہلوؤں پر مقالے پیش کیے گئے۔ اس کے علاوہ انفرادی صوفی سنتوں کی زندگی اور کارناموں پر مباحثہ ہوا جن میں جائسی۔ دادو دیال۔ داراشکوہ۔ مظہر جانجاناں۔ شاہ مدار (مکن پور) اور صوفی عنایت خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بھکتی تحریک اور چشتی خانقاہوں سے متعلق بھی مقالے پڑھے گئے۔ مولانا وحید الدین خاں اڈیٹر الرسالہ نے ایک سیشن کی صدارت کی۔

اردو میں پتے لکھنے کی مہم کامیاب

انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو میں پتے لکھنے کی جس مہم کا آغاز کیا ہے اس کو تیز تر کرنے میں "کتاب نما" بھی پیش پیش ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ کتاب نما کے قارئین نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور روزانہ ڈاک سے آٹھ دس خط ایسے موصول ہو رہے ہیں جن پر اردو میں پتا لکھا ہوتا ہے۔ البتہ محکمۂ ڈاک کے کارکن غالباً پوسٹ مین کی سہولت کی خاطر یا اردو سے اس کی ناواقفیت کی بنا پر، اُس پتے کو انگریزی میں بھی لکھ رہے ہیں۔

عبید صدیقی کو برلا نیشنل ایوارڈ
بائیولوجی میں خدمت کا صلہ

بمبئی ۶ ارمارچ۔ مہاراشٹر کے گورنر مسٹر کاسو برہمانند ریڈی نے پروفیسر عبید صدیقی کو آر ڈی برلا نیشنل ایوارڈ عطا کیا۔

پروفیسر صدیقی ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ میں
سینیئر سائنسداں ہیں۔ انھوں نے مولی کیولر بائیولوجی
(حیاتیاتی سائنس) میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں مسٹر
ریڈی نے مسٹر صدیقی کی خدمات کو سراہا۔ ان کو اور بھی بہت
سے اعزازات مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند ملازمت سے سبکدوش

ڈاکٹر گیان چند مرکزی حیدرآباد یونی ورسٹی کی پروفیسری
سے ۳۰ راپریل ۱۹۸۹ء کو ریٹائر ہو گئے۔ انھوں نے جولائی
۱۹۵۰ء میں حمیدیہ کالج بھوپال سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔
اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جموں یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر
ہو کر گئے۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں الہ آباد یونی ورسٹی میں پروفیسر
ہوئے۔ مارچ ۱۹۷۹ء میں حیدرآباد کی مرکزی یونی ورسٹی
میں آئے جو ان کا آخری پڑاؤ تھا۔

اردو رابطہ کمیٹی اترپردیش

یو پی کے وزیر اعلا جناب نرائن دت تیواڑی نے ریاست
میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے قیام کا اعلان کر کے اردو اور اردو
والوں کے ساتھ نہایت بھونڈا مذاق کیا ہے۔ اردو رابطہ کمیٹی
اترپردیش اس وقت تک تحریک جاری رکھے گی جب تک کہ ریاست
میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں دے دیا جاتا اور
یہ کام یو پی آفیشل لینگویج ایکٹ میں مناسب ترمیم کے ذریعہ ہی
ہو سکتا ہے لیکن کانگریس "آئی" جان بوجھ کر یہ ضروری قدم نہیں
اٹھا رہی ہے جب کہ یو پی ایوان اسمبلی میں اس کی اکثریت بھی
ہے۔ اگر وہ چاہے تو نہایت آسانی سے اردو کے حق میں بل پاس
کرا سکتی ہے۔ اپنے مطالبہ پر زور دینے کے لیے اور کانگریس
(آئی) کی اردو کش پالیسی کو آشکارا کرنے کے لیے اردو رابطہ
کمیٹی اترپردیش تاریخ ۱۵ رمئی سے پوسٹ کارڈ مہم کا آغاز
کرے گی۔ یہ پوسٹ کارڈ اردو والوں کی جانب سے اردو والوں
کو ارسال کیے جائیں گے۔ جن کے ذریعے وہ اپنے دوستوں
اور عزیزوں سے گذارش کریں گے کہ کانگریس (آئی) نے اپنے
انتخابی منشور میں کیے گئے وعدے پر عمل نہ کر کے اردو کے ساتھ
کھلواڑ کیا ہے۔ اس لیے اب آپ بھی کانگریس (آئی) کے ساتھ کوئی تعاون نہ کریں۔

ایم شفیق انصاری ایڈوکیٹ۔ جنرل سکریٹری۔ A
کیمپ آفس اردو رابطہ کمیٹی مرادآباد

یوسف سعید کو گراں قدر اعزاز

۱۳ رمئی ۱۹۸۹ء کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ادارہ تہذیب
الاخلاق کی جانب سے کنیڈی ہال میں ایک پر وقار تقریب
منعقد ہوئی جس میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے
مسلم یونی ورسٹی کے گریجویٹ اور ماس کمیونی کیشن جامعہ
ملیہ اسلامیہ کے موجودہ طالب علم یوسف سعید کو ان کے
بہترین مضمون "خلا میں انسان کے قدم" پر پہلا انعام
مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے اور توصیفی سند عطا کی۔ ہم ان کی
اس کامیابی پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ہم بھی غم میں شریک ہیں

جامعہ کے سینیر استاد شیخ توفیق علی کو صدمہ

۲۲ رمئی ۱۹۸۹ء۔ آج صبح چھ بجے اہلیہ توفیق علی صاحب
(ریڈر شعبۂ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵)
مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ
راجعون۔ محترمہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں اور ہر دلعزیز
تھیں۔ غریبوں اور مستحق لوگوں کا خاص طور پر خیال رکھتی
تھیں۔ ادارہ کتاب نما اور مکتبہ جامعہ توفیق صاحب کے
غم میں برابر کا شریک ہے اور مرحومہ کے لیے دعائے
مغفرت کرتا ہے۔

الفت ایمن آبادی کا انتقال

نئی دہلی۔ ۲۰ راپریل۔ معروف شاعر اور صحافی ٹھاکر داس
الفت ایمن آبادی کا کل شام دل کا دورہ پڑنے سے
انتقال ہو گیا۔ آج صبح ان کی آخری رسوم ادا کر دی گئیں
مرحوم کے پس ماندگان میں ۳ لڑکے ہیں۔ ۷۸ سالہ الفت
ایمن آبادی روزنامہ پرتاپ اور روزنامہ تیج سے وابستہ رہ
چکے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

"اشاریہ آج کل" کی رسمِ اجرا

"اردو کی کتابوں میں عام طور پر انڈکس نہیں ہوتے بلکہ ریسرچ کی کتابوں میں بھی اشاریے غائب رہے ہیں۔ اردو میں اشاریہ سازی کی کمی ہے اور اس طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دوسری زبانوں میں اس پر خاصا کام ہوا ہے۔ میں قانون کا آدمی رہا ہوں۔ قانون کی کتابوں میں اشاریہ کے بغیر کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ "اشاریہ آج کل" اس طرف ایک خوش گوار قدم ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ مولانا آزاد صد سالہ تقریب کا سال ہے۔ اس موقع پر الہلال، البلاغ اور ان کے مضامین کا اشاریہ بھی تیار ہونا چاہیے۔" آج شام ۵½ بجے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما 'اشاریہ آج کل' مرتبہ جمیل اختر کی رسمِ اجرا کے موقع پر تقریر کر رہے تھے۔ اس تقریب کا اہتمام 'ادارہ پبلی کیشنز ڈویژن' نے نائب صدر جمہوریہ کی قیام گاہ پر کیا تھا۔ جس میں بڑی تعداد میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

مہمانِ خصوصی جناب ایل۔ پی شاہی وزیر تعلیم و ثقافت حکومتِ ہند نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کی تخلیقات کا ہمارے ادب میں زبردست رول رہا ہے۔ جناب جمیل اختر نے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اردو کسی ایک خاص قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کی زبان ہے جو ایک قوم اور کلچر پر یقین رکھتے ہیں اس کی ترقی میں تمام فرقوں کے لوگوں نے اہم حصہ لیا ہے۔ جنگِ آزادی میں اردو کا اہم رول رہا ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے نئی نسل کے فنکاروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے قلم کا استعمال اس طرح کریں کہ تمام قوموں کے دلوں کو جوڑا جا سکے اور قومی یکجہتی میں مدد ملے۔

اس موقع پر اردو کے اہم دانشوروں بشمول پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب سید شریف الحسن نقوی، پروفیسر حنیف کیفی، اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے "اشاریہ آج کل" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تمام مقرروں نے مؤلف کی تحسین کی اور اس اہم کام کی اشاعت پر مبارک باد دی۔ نظامت اور تعارف کے فرائض ڈاکٹر نجیب اختر نے انجام دیے۔ جناب انور پاشا ڈپٹی ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ جناب منظر مہدی معاون اڈیٹر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ادیب گورودت کا انتقال

نئی دہلی ۹ اپریل۔ ہندی کے مقبول ادیب اور آیور ویدک طبیب گورودت طویل علالت کے بعد کل یہاں فوت ہوگئے ان کی عمر ۹۵ سال تھی۔ مسٹر دت نے ۲۰۰ ناول، کئی افسانے اور مضامین لکھے۔ انھوں نے ویدک دھرم اور سیاسی موضوعات پر بھی لگ بھگ ۲۵ کتابیں لکھیں۔

جناب خیرات ندیم کا انتقال

حیدرآباد ۹ مئی۔ یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ حیدرآباد کے ممتاز شاعر جناب خیرات ندیم کا آج ۳½ بجے دوپہر اپنے گھر پر شدتِ تنفس سے انتقال ہوگیا۔ عید کے دن ہی سے ان کے تنفس پر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گذشتہ کئی مہینوں سے ندیم صاحب تنفس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ خیرات ندیم خوددار، پر وقار، مہذب شائستہ انسان کی حیثیت سے ہی نہیں ایک ممتاز شاعر کی حیثیت سے کافی مقبول تھے۔ انھوں نے اپنے غم کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ان کے احباب کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ ہر مکتب خیال کے شعرا و ادیب ان سے مل کر مسرت محسوس کرتے تھے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نائب صدر رہے تھے۔ خیرات ندیم کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی، تین نواسے اور دو نواسیاں ہیں۔

ماہنامہ

جولائی

ہونے وا...

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ اہم علمی خزانہ۔ =/۵،

نظامِ رنگ
ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ کا ادبی خاکہ — یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

شہیدِ جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مردِ درویش تھے جن کا انداز خسروانہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مردِ مومن تھے، ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کی شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ =/۵،

پُرانی بات ہے (سلسلہ وار نظمیں)
زبیر رضوی

زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و واردات کی جن سچائیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے وہ ہمارے اپنے عہد کی سچائیاں ہیں، بس سچائیوں

بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہ اسے ادا جعفری کا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰ =/

سازِ سخن
ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اول محترمہ ادا جعفری کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔ =/۴۵

ترجمۂ قرآن
پروفیسر مشیر الحق

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش)

پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب میں پیش کیا گیا۔ =/۸

نذرِ مختار
مالک رام

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر مختار الدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما، نائب صدر جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا جس میں اُردو کے ممتاز چھتیس ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ =/۱۰۱

مہمانی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما

جولائی ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۶

فی پرچہ	5/-
سالانہ	45/-
غیر ممالک سے	
(بذریعہ بحری ڈاک)	110/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	230/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	65/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اسلام کے جاں نثار // رفیع الزماں زبیری ۳/-
کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں (سوانحی سلسلہ) مالک رام ۵۱/-
اقبال کے کرم فرما (اقبالیات) ماسٹر اختر حسین ۳۵/-
تلاشِ حق (مذہب) انیس آزاد بلگرامی ۱۵/-
میکیاولی اور میکیاولیت (معلومات) انوار الحق حقی ۸/-
انتخاب کلام حسرت (شاعری) ڈاکٹر فضل امام ۹/-
کربِ انا (شاعری) اکرم جاوید ۵۰/-
مومنانہ زندگی کے اوصاف (مذہب) سلطان احمد اصلاحی ۲۲/-
رسول خدا کا طریق تربیت // سراج الدین ندوی ۱۶/-
پنج آہنگ میں مکاتیب غالب (غالبیات) مرتبہ کالی داس گپتا رضا ۱۲۰/-
تکملہ (جلد اول) عنایت اللہ المشرقی ۳۶/-
فراق کی شاعری (تذکرہ) ڈاکٹر افغان اللہ ۱۲۵/-
کھلی بن (پاکستانی) (شاعری) سعادت سعید ۴۰/-
مانوس سہسرامی (سوانح) ڈاکٹر خالد سجاد ۴/-
انداز آگہی ڈاکٹر شعیب راہی ۵۰/-
اردو میں اسلوبیات (ادب) شمشاد زیدی ۵۰/-
انیس اور فردوسی کا تقابلی مطالعہ / ڈاکٹر سید فدا حسین (تنقید) ۵۰/۲۰
اردو ادب میں تمثیل نگاری (ادب) ڈاکٹر غلام رسول مکرانی ۸۰/-
دو گز زمین (ناول) عبد الصمد ۱۵/-
ہوتی ہے سحر پیدا // بدنام ربیعی ۲۰/-
اقبال فکر و فن (اقبالیات) ڈاکٹر سید محمد ہاشم ۶۰/-

سرورق:- ڈاکٹر قمر رئیس
مصوّر:- شکیل اعجاز (اکولہ)

حرف امتحاں // شہاب الدین ثاقب ۳۰/-
تذکرہ شعرائے منیر شریف // سید شاہ مراد اللہ منیری ۲۰/-
اردو شاعری میں لاادریت (تنقیدی مضامین) / ڈاکٹر اسلام سندیلوی ۲۵/-
محب وطن پریم چند اور دیگر مضامین / شمس الحق عثمانی ۶۰/-
اقبال کے کرم فرما (اقبالیات) ماسٹر اختر ۳۵/-
اردو زبان اور ادب کا خاکہ (تحقیق) خوشحال زیدی ۴۰/-
قانون فطرت مسلم پرسنل لاء (قانون) / ایم شفیق انصاری ایڈوکیٹ ۳۰/-
منتخب ہائیکو (پاکستانی) (شعری مجموعہ) نسیم سحر ۳۰/-
علم تجوید کے فروغ پر کار آمد تجاویز (پاکستانی) / (مذہب) محبوب علی
سراپا (پاکستانی) (شعری مجموعہ) اشتیاق طالب ۳۰/-

مہمان مدیر
ڈاکٹر محمود الہی
Head of the Urdu Department,
GURAKHPUR UNIVERSITY,
GORAKHPUR.

اشاریہ

اردو کا تعلیمی محاذ

خدا کرے میری یہ تحریر صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے اور خدا کرے کہ ادھر کچھ دنوں سے لرزہ براندام کر دینے والے جو خواب میں دیکھتا رہتا ہوں ، ان کی تعبیر اُلٹی نکلے ۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے شاعر، ادیب، نقاد اور دوسرے اہلِ قلم اردو شعر و ادب کے فروغ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں، اچھی سے اچھی کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور مباحث کا معیار بھی خاصا بلند ہو گیا ہے لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ ان کتابوں کا قاری ناپید ہوتا جا رہا ہے اور ان مباحث سے استفادہ کرنے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس زوال کے اسباب اور عوامل نگاہ کے سامنے ہیں، ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم انھیں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہے ہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو اس لیے کچھ نہیں کہتے کہ ہماری مشرقی روایات لب کشائی کی اجازت نہیں دیتیں۔

میں مستثنیات کی بات نہیں کر رہا ہوں کیونکہ یہی مستثنیات تو آج سدِ رمق کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں! عمومی صورت حال یہ ہے کہ کم از کم اُتر پردیش میں اُردو کا علم دم توڑ رہا ہے ـــــ یہ علم اعلا سطح کا ہو یا ابتدائی اور سکنڈری سطح کا۔ آپ کسی جماعت کے اوسط درجے کے طلبہ سے ملیے تو وہ صرف و نحو کی آسان سے آسان اصطلاحوں کے بارے میں بھی آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ املا، تلفظ، ترکیب اور اضافت کی تصریحات سے تو آپ کے حواس مختل ہو جائیں گے۔

بات یہ ہے کہ اُردو کی زبوں حالی اور کس مپرسی دیکھ کر ہمارے قبیلے میں کچھ ایسے لوگ در آئے ہیں جن کا ذریعۂ معاش اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اردو کے نام پر عوام اور حکومت دونوں سے چندے اور گرانٹ وصول کرتے رہیں اور گرانٹ کی توجیہہ میں ہمیں مختلف کھلونوں سے بہلاتے رہیں نتیجہ یہ ہوا کہ ہم تعلیم کے بنیادی مگر مقدس فرض سے بے پروا ہونے لگے اور ہم پر یہ تاثر قائم ہو گیا کہ یہی غرض کے بندے اردو کے مسائل بھی حل کریں گے۔

یہ مفاد پرست حضرات بتِ ہزار شیوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سماج کے مختلف

مقتدر حضرات کے پاس جاتے ہیں اور ہر ایک کو اپنی کسی نوزائیدہ انجمن کا کوئی نہ کوئی عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں اور پھر ان معصوم عہدے داروں کے سہارے حکومت سے (اور برگزیدہ عوام سے بھی) مالی امداد حاصل کرتے ہیں۔ ان کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ یہ بڑے خلوص کے ساتھ اردو کے خادموں کو آپس میں کٹ مرنے کے لیے تیار کر دیں گے تاکہ جو لوگ ان کی گرفت کر سکتے ہیں، وہ اندیشہ ہائے دور و دراز کے شکار ہو جائیں۔

کیا اردو والوں میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ ان خود غرضوں اور مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں سے اردو کو بچا سکیں اور اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے جدّوجہد کا ایک ایسا باب شروع کریں جو ان کے سایے سے بھی محفوظ ہو۔

اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے جو جدّوجہد جاری ہے، اسے مزید شدّ و مد کے ساتھ جاری رہنا چاہیے لیکن اس محاذ کے علاوہ ایک محاذ اور بھی ہے جسے ہم اردو تعلیمی محاذ کہہ سکتے ہیں۔ اب ایک ایسے تعلیمی محاذ کی ضرورت ہے جو یکسر غیر سرکاری ہو۔ اس کا کام صرف یہ نہ ہو کہ جہاں اردو کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے، وہاں اس کے لیے کوشش کی جائے بلکہ اس کا یہ کام بھی ہونا چاہیے کہ وہ اس بات پر نگاہ رکھے کہ جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے، وہاں معلم اور متعلم اپنے اپنے کام میں تن دہی کے ساتھ مصروف ہیں کہ نہیں۔ وہ یہ بھی دیکھے کہ جس تعلیمی ادارے میں اردو کی پڑھائی کا بندوبست ہے، وہاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ داخلہ کیوں نہیں لیتے۔

اس مجوزہ محاذ کے نصب العین میں یہ نکتہ بھی شامل کر لینا چاہیے کہ وہ کسی سے مالی امداد نہیں لے گا اور رضاکارانہ طور پر اردو تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لیے کام کرے گا۔

میرا خیال ہے کہ اردو کے اساتذہ وقت کی اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہیں!! وہ خود آگے بڑھ کر اس محاذ کی تشکیل کریں گے۔ میری تجویز ہے کہ اس محاذ کی شاخیں گانو گانو اور محلّے محلّے میں قائم کی جائیں۔ اس محاذ کو اپنا ایک اخبار بھی نکالنا چاہیے جس کے مالی وسائل اساتذہ اپنی جیب سے فراہم کریں۔ آج اردو کے بیسیوں اخبارات نکلتے ہیں جنھیں حکومت سے اشتہارات کے نام پر خطیر رقم ملتی ہے لیکن ان میں سے بعض اخبارات ایسے ہیں جو "ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" کے دائرے میں آتے ہیں یا "جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"!!

کیا اساتذہ مل جل کر ایک ایسا ہفت روزہ یا پندرہ روزہ اخبار نہیں نکال سکتے جو اردو کے تعلیمی مسائل کے لیے وقف ہو۔

جس دن اساتذۂ اردو یہ ذمّے داری قبول کریں گے تو اردو کی تعلیمی جدّوجہد کا منظر نامہ کچھ اور ہو جائے گا! ● (بہ شکریہ خبر نامہ اترپردیش اکیڈمی)

ڈاکٹر عابد رضا بیدار
DIRECTOR, KHUDA BAKSH
ORIENTAL LIBRARY, PATNA.

طلسم ہوشربا کا خدا بخش اڈیشن

داستان امیر حمزہ صاحبقراں،
جس کے آٹھ دفتر ہیں۔ دفتر پنجم
طلسم ہوشربا
جو کل داستان امیر حمزہ کی جان ہے
اور جس کی سات جلدیں ہیں
اس کی اوّل چار جلدوں کا ترجمہ منشی محمّد حسین جاہ مرحوم
نے اور آخری تین جلدوں کا ترجمہ منشی احمد حسین قمر نے فرمایا۔

طلسم ہوشربا (طبع سوم)، د/۱ خاتمۃ الطبع، از جانب مطبع / ۶۶۴

آٹھ دفتروں کی چھیالیس جلدوں پر مشتمل تقریباً پچاس ہزار صفحات پر پھیلی داستان امیر حمزہ کا یہ پانچواں دفتر 'طلسم ہوشربا'، جو قریب دس ہزار صفحات پر پھیلا ہوا اردو زبان کا طویل ترین نثری شاہکار ہے جسے اردو کی اپنی چیز اور نخالص تصنیف ہونے کے باوجود اس کے لکھنے والے (کبھی کبھی بہک جانے کی بات اور ہے! ہ خاکساری اور انکساری سے ترجمہ ہی کہتے رہے!) اور جو ۱۹ ویں صدی میں اس طویل داستانی سلسلہ کی شائع ہوکر منظر عام پر آنے والی 'پہلی کتاب ہے'، پیش خدمت ہے۔

طلسم ہوشربا، جس کا محض نام ہی ہمیں یکایک ایک طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے، اس معنی میں اردو نثر کا شاہکار ہے کہ اردو میں اتنے وسیع اور متنوّع پیمانہ پر نثر کا استعمال کسی دوسری جگہ نہیں ملتا —— اور نہ اتنے بڑے پیمانے پر رزم (= حمزہ وغیرہ) بزم (= عاشقی وغیرہ) اور عیاریاں (= عمرو وغیرہ) کہیں اور مل سکیں گی۔

آٹھ دفتری داستان امیر حمزہ کے اس پانچویں دفتر یعنی 'طلسم ہوشربا' کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ داستان کے بقیہ سات دفتروں کی تو، تھوڑی بہت، فارسی بنیادیں مل جاتی ہیں —— لیکن دفتر پنجم یعنی طلسم ہوشربا خالص ہندستانی تخلیق ٹھہرتی ہے، اور اس لحاظ سے ہندستان کو اردو زبان کا ایک نادر تحفہ، جس کا پہلا ڈھانچہ سن ستّاون سے قبل رام پور میں میر احمد علی نے کھڑا کیا، اور جسے ان کے بعد اگلی پیڑھی کے انبا پرشاد (شاگرد میر احمد علی) نے (اس سماعی روایت کو) اور مضبوط کیا اور پھر ان کے بیٹے غلام رضا نے 'سمع' کو 'بصر' میں ڈھال کے سُنی جانے والی داستان کو پڑھی جانے والی کتاب میں ڈھال دیا جو چودہ جلدوں میں، 'غیر مطبوعہ'

رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

طلسم ہوشربا اصلاً سات بلکہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے (کہ جلد ۵ کے ۲ حصے ہیں) اور ۲ جلدیں مزید بقیہ طلسم ہوشربا کی آئیں، اس طرح اس کی کُل دس جلدیں ہوتی ہیں۔ گویا پوری ۴۶ جلدی داستان حمزہ کے دس یعنی ایک چوتھائی سے کچھ ہی کم حصے پر ہوشربا حاوی ہے۔ یہ دو داستان گویوں کا کارنامہ ہے: محمد حسین جاہ نے اوّلین چار جلدیں لکھیں احمد حسین قمر نے بقیہ ساری جلدیں تمام کیں۔

یہ داستانیں لکھی بعد میں گئیں، سنائی پہلے! اس لیے لکھت میں آنے سے قبل ہی مشہور ہو جاتیں، اور لکھ جانے کے بعد بھی سُنائے جانے میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ داستان امیر حمزہ، اور اس داستانی سلسلے کی اہم ترین کڑی طلسم ہوشربا کو، اردو میں جتنا پڑھا گیا، اور جتنا سُنا گیا، اردو کی کوئی اور مخیل تخلیق، اس اعتبار سے، اس کے نصف قد کو بھی نہیں پہنچتی۔ عوام النّاس سے لیکر نوابوں اور بادشاہوں تک، غربا سے امرا تک، شعرا ادبا تک (مرزا غالب بھی!) سب اس کی زلف کے اسیر تھے! پہلی جنگ اور پھر دوسری جنگ عظیم تک یہ محیط کل کی روایت کسی نہ کسی طور جاری رہی، اگرچہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں گھٹیا درجہ پر ندیم صہبائی فیروز پوری، اونچے درجہ پر ظفر عمر (بہرام کی گرفتاری، نیلی چھتری وغیرہ) اور خالص ترجمہ کے درجہ پر تیرتھ رام فیروز پوری خاموشی سے طلسم کی جگہ لیتے چلے گئے! فرصت اور مہلت کے اوقات سکڑ رہے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سُننے سُنانے سے زیادہ اب پڑھنے کا دور حاوی آچکا تھا۔ تاہم وہ کرشمہ زائیاں اور سحر طرازیاں، وہ تخیّل کی آزاد اُڑان، وہ نیکی اور بدی سے ملی جُلی زندگی کا تنوّع اور اس میں ہیرو کی حیرت ناک غیر معمولی بہادری اور ذہانت اور ان کے بل پر اعلا ترین کامرانی ——— اس سب کو دیکھنے کی خو تو تھی ہی، وہ داستان امیر حمزہ نہ سہی تیرتھ رام فیروز پوری کے اسرار دربار لندن اور گردش آفاق کا مترجم سلسلہ سہی! بہرام کے کارنامے ہی سہی! وقت سکڑ رہا تھا اس کے ساتھ حجم بھی سکڑتا رہا۔ یہاں تک کہ آزادی کے بعد وہ سیل بیکراں 'جاسوسی دُنیا' اور 'طلسمی دُنیا' جیسی جوئے کم آب میں سمٹ آیا۔ 'طلسمی دُنیا' مقبول نہ ہو سکا کہ، وقت جو بدل چکا تھا، اس کا اندازہ اس کے سنچالکوں کو نہ ہو سکا۔ 'جاسوسی دُنیا' البتہ اتنا ہی مقبول رہا جیسا اپنے زمانے میں طلسم ہوشربا تھا، اور یہ مقبولیت اس درجہ پر رہی کہ ابن صفی کے انتقال کو کئی سال گزر گئے، لیکن پھر بھی 'جاسوسی دُنیا' ابھی ایک دو سال قبل تک اسی پابندی کے ساتھ ماہنامہ کی شکل میں پُرانے شماروں کو چھپا تا اور دھوم دھام سے فروخت ہوتا رہا ہے ——— اور سرحد پار متعدد مقبول ڈائجسٹ جاسوسی دُنیا کی پوری پوری کہانیاں اپنے یہاں تمام وکمال یا قسط وار دیتے رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی طور تحیّر زائی اور اس میں انسانی دلچسپی اسی طرح نئے نئے نقش بناتی رہی ہے!

ہند ایرانی کلچر کی جو باقیات بیسویں صدی کے اوائل تک جتنی، اور جس حد تک، محفوظ رہ گئی تھیں، ہوشربا میں اس کلچر کے تقریباً ہر پہلو کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ یہ کلچر جو ہند آریائی تہذیب کے دو دھاروں کا ملن تھا۔ عیسیٰ سے گیارہ بارہ سو سال پہلے کا دھارا اور عیسیٰ سے گیارہ بارہ سو سال بعد کا دھارا: جس میں دونوں نے اپنی اپنی حسین ترین روایتوں کو ہم آمیز کر کے دُنیا کے ایک شکیل ترین تہذیبی آمیزہ کو جنم دیا۔ ھوشربا میں عالمی تاریخ و تہذیب کی اس خوبصورت یادگار کو بڑی تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دور کی تہذیب، سماج اور زبان، ان تینوں کے مطالعہ کے لیے ہوشربا ایک قیمتی خزانہ ہے۔

طلسم ہوشربا کا رشتہ اردو داستان کے رشتہ سے فارسی داستانِ امیر حمزہ صاحبقراں (= قصّہ امیر حمزہ

= حمزہ نامہ = رموزِ حمزہ = اسمار الحمزہ) سے جوڑا جاتا رہا ہے جو روایتاً تو فیضی کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہے لیکن جو واقعتاً فیضی سے قبل ہمایوں (م ۹۶۳ھ) کے عہد میں بھی موجود تھی اور اس دھوم دھام سے موجود تھی کہ ہمایوں نے اس عہد کے بہترین ایرانی فن کاروں کو اسے مصوّر کرنے پر مقرر کیا، اور پھر اکبر کے عہد میں یہ کام انجام کو پہنچا اس مصوّر حمزہ نامہ کے منتشر اوراق چند سال قبل آسٹریا سے طبع ہو چکے ہیں۔ یہ اشاعت صرف تصاویر پر مشتمل ہے اور متن سے عاری ہے) (مصوّری پر جو مواد سامنے آیا ہے اس میں آسانی سے یہ تذکرہ مل جاتا ہے۔ اکبر کے عہد میں مغل مصوّری اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی ہندستانی اور ایرانی مصوّر مل کر فن مصوّری نے جو شاہ کار تخلیق کر رہے تھے ان میں حمزہ نامہ بھی شامل ہے۔ اور ان میں خدا بخش لائبریری کا تاریخ خاندانِ تیموریہ کا مصوّر نسخہ بھی شامل ہے جو مصوّری کی دُنیا کا تاج محل کہلاتا ہے —— یعنی قدیم زمانے کے حمزہ نامہ کو اکبر کے عہد میں بس مصوّر کیا گیا! اور یہ جو فیضی کا نام بار بار اس کے مصنّف کی حیثیت سے آتا رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ جس طرح تاریخ خاندانِ تیموریہ میں قدیم تر تاریخوں سے مدد لیکر تاریخی متن بھی شامل رکھا گیا اسی طرح حمزہ نامہ کو دوبارہ لکھا گیا ہو اور لکھنے میں فیضی شامل رہے ہوں) اتنی اہمیت جس داستان کو عہد ہمایوں میں حاصل ہو جائے، تو، وہ جو ایک دوسری روایت کے مطابق اسے عہد تغلق کی چیز کہا گیا ہے، اور ایک تیسری روایت کے مطابق عہد غزنوی کی چیز —— تو کوئی عجب نہیں کہ یہ سچ مچ اتنی ہی قدیم رہی ہو۔ فی الحال تو بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا بخش لائبریری میں ایک داستان فارسی میں زبدۃ الرموز کے نام سے موجود ہے جس کے موٗلف حاجی قصہ خواں ہمدانی نے ۱۰۲۲ھ / ۱۶۱۳ء میں —— حیدر آباد پہنچ کر اسے عبداللہ قطب شاہ کے لیے لکھا —— لکھتے وقت ہمدانی کے پاس داستان حمزہ کے کئی نسخے تھے جن میں ابوالمعالی نیشاپوری، جلال بلخی، اور سلطان حسین مشتاقی کے فارسی ورژن قابلِ ذکر ہیں۔ یعنی داستان کے متعدد نسخے ۱۶۱۳ء سے قبل بھی موجود تھے۔

داستان امیر حمزہ فارسی میں جو بھی ملتی ہے ایک جلد میں[1] یا چھوٹی چھوٹی دو جلدوں میں[2] دستیاب ہے۔ اردو میں بھی یہ داستان فورٹ ولیم کالج کے توسط سے، خلیل علی خاں اشک کے قلم سے (۱۸۰۱ء) ایک ہی حصّہ میں آگئی۔ نصف صدی بعد امان علی خاں غالب لکھنوی نے (۱۸۵۵ء میں) اپنا ورژن اُردو دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس آخرالذکر کو یا دونوں ورژنوں کو سامنے رکھ کر مطبع نولکشور نے عبداللہ بلگرامی کے قلم سے تیسرا ورژن (۱۸۷۱ء) پیش کیا جو معمولی ترمیموں کے ساتھ پہلے سید تصدق حسین رضوی اڈیشن (۱۸۸۷ء) کی شکل میں، اور پھر آخری بار عبدالباری آسی (م ۱۹۴۵ء) اڈیشن کی صورت میں سامنے آیا۔

پنج تنتر/ کلیلہ و دمنہ/ انوار سہیلی اور الف لیلیٰ کے نمونے سامنے تھے ہی، کہانی میں کہانی سننے کے لیے داستان طرازی کا مزاج کافی تھا۔ محلوں کے تھکے ہارے مکینوں کو اپنی آنکھیں تھکانے اور اپنا ذہن خرچنے کی کیا ضرورت، جب وہ کسی دوسرے کی زبان اور ذہن کچھ دیر کے لیے خرید کے ایک داستان سن کے خوابِ خرگوش میں چلے جاتے تھے۔ محلوں سے ہوتی یہ داستانیں شدہ شدہ گلیوں اور گھروں تک پہنچتی گئیں، اور داستان گو اعلا اور ادنا دونوں

---

[1] رموزِ حمزہ تہران سے بھی شائع ہوئی اور نولکشور سے بھی۔ حال ہی میں تہران سے 'قصّہ حمزہ یا حمزہ نامہ بھی (مرتبہ جعفر شعار) معمولی ضخامت کی دو جلدوں میں شائع ہوا ہے، جو ایک قول کے مطابق 'تہران سے ۱۲۷۴ھ میں سات' جلدوں' میں چھپا (خدا بخش کیٹلاگ ۱۸۱/۸)، خدا بخش کیٹلاگر کو غلط فہمی ہوئی، یہ سات جلدیں نہیں سات حصّے تھے جو دو[2] جلدوں میں سما گئے ہیں۔

طبقوں کے مزاق کا خیال رکھتا ہوا کلی پھندنے لگاتا چلا گیا۔ تاہم یہ کہنے اور سننے کی حد تک محدود داستان، سننے سنانے میں ایک، محلّے یا ایک شہر تک ہی محدود رہتی؛ مطبع والوں نے اندازہ لگا لیا کہ انھیں چھاپ دیا جائے تو اس میں دلچسپی لینے والوں کا جو وسیع تر متوقع حلقہ موجود ہے اسے اس کی من چاہی چیز ملے گی تو وہ اس کا بہتر بدل دے گا (جس پر دُنیا چل رہی ہے یعنی مالی منفعت!)۔ چنانچہ داستان گویوں کو داستان نویسوں میں تبدیل کر دیا گیا اور داستان امیر حمزہ کی مختصر سی ایک جلد ۴۶ ضخیم جلدوں میں ڈھلتی چلی گئی۔ داستان گو (جو اب داستان نویس تھے) اسے ترجمہ بھی کہتے رہے (کہ رشتہ ماضی سے رکھنا اس عہد کا شیوہ تھا) تصنیف بھی (کہ واقعتاً تو یہ تصنیف ہی تھی!)۔

طلسم ہوشربا تصنیف ہے ترجمہ نہیں! طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ کا ایک حصّہ بتایا جاتا رہا ہے۔ اور خود داستان ——— ایک قدیم تر فارسی قصہ داستان امیر حمزہ سے ماخوذ بتائی جاتی رہی جبکہ ——— کوئی ایسی قدیم فارسی داستان امیر حمزہ دستیاب نہیں، موجودہ ضخیم داستان امیر حمزہ اردو جس کا ترجمہ قرار دی جا سکے ——— اور کوئی فارسی یا اردو داستان امیر حمزہ ایسی موجود نہیں کہ طلسم ہوشربا جس کا ترجمہ کہی جا سکے، بجز اس کے کہ داستان امیر حمزہ اردو اس نام کی قدیم فارسی داستان کا چربہ ہے یا اُسے اپنا سرچشمہ بنایا ہے ——— اور طلسم ہوشربا قدیم داستان یا اردو داستان سے مستفاد ہے تو محض اس حد تک کہ ناموں میں خاصا اشتراک ہے اور، کارناموں میں بھی جا بجا اشتراک ہے۔

دراصل اردو والوں نے عظیم تر ادبیات فارسی سے ناتا جوڑنے کی کوشش میں یہ کہنے میں فخر محسوس کیا کہ وہ طلسم خود تصنیف نہیں کر رہے، بلکہ داستان کے ایک اسی نام کے حصّے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ تاہم چونکہ یہ امر خلاف واقع تھا اس لیے ایک ہی سانس میں اسے ترجمہ کے ساتھ تصنیف بھی قرار دیتے رہے۔ اس میں ان طلسم کاروں کے ساتھ مطبع کے کارپردازوں اور مالکوں کو بھی برابر کا یا کچھ زیادہ ہی دخل رہا جنھوں نے اسے کبھی اپنی بزنس یا تجارتی گُر کا حصّہ جانا کہ فارسی والوں سے رشتہ ظاہر کیا جاتا رہے کہ انیسویں صدی کے اواخر تک تنہا اردو میں وہ عظمت نہیں تھی جو فارسی کے نام سے وابستگی میں پیدا ہو جاتی تھی۔ ورنہ یہ سب کیا تھا کہ تسلسل کے ساتھ، بلکہ فقہی اصطلاح میں تو تواتر کے ساتھ، یہ روایت لکھنؤ اور دہلی دونوں میں عام ہے کہ بڑے داستان گو لکھتے نہیں تھے سُناتے تھے ——— لکھنے والے 'کاتب' اسے سُن کے لکھتے جاتے تھے۔ اور پھر، جب یہی کچھ چھپ کر آتا تھا تو مصنّف پوری خاکساری سے اور طابع پوری تاجرانہ دانشوری کے ساتھ اس کارنامے کو تصنیف کے ساتھ ساتھ 'ترجمہ' بھی لکھ دیتا تھا۔

تصنیف کو ترجمہ کہہ کر پچھلوں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش دراصل اس وقت کی ایک اہم قدر کا شریفانہ اظہار تھی کہ کسی سے کچھ لو تو احسان کا تقاضا ہے اس سے زیادہ بتاؤ جتنا اس کا حق ہے۔ اگر پچھلوں نے کوئی طلسم ہوشربا لکھی تھی تو وہ اگلوں کے لیے انسپریشن تو بہر حال بنی: اس کے کردار لیے، اس کے عیّار لیے، اور بھی کچھ باتیں آنے میں نمک کے طور سے لے لیں۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ اصل ۲۵ صفحے کی داستان ترجمے میں نو دس ہزار صفحوں پر پھیل گئی۔ اگر خیال اصلاً پیشرو کا ہے تو اس پر چاہے ایک پوری عمارت کی تعمیر ہو جائے، عمارت کا نام اس خیال آفریں کے نام پر ہی رہے: ایسی قدریں، اب اس عہد میں، جب پیشروؤں کے پورے پورے افکار پس رو اپنے ناموں میں ٹانک لیتے ہیں، سمجھ میں آ بھی تو نہیں سکتیں!

جن پیشرو داستان نویسوں کے نام طلسم ہوشربا کے 'مترجم مصنفوں' نے لکھے ہیں وہ پرانے زمانے کے فیضی بلکہ نئے عہد کے انبا پرشاد، غلام رضا اور میر احمد علی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میر احمد علی اور انبا پرشاد کی روایت سے انبا پرشاد کے بیٹے غلام رضا کی تصنیف کردہ طلسم ہوشربا چودہ جلدوں میں، طلسم باطن ہوشربا اور طلسم ہوشربا سے باطن کے نام سے رام پور میں مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے۔ یعنی اردو میں یہ داستان۔ ایسی ہی ضخامت کے ساتھ قبلاً وجود میں آچکی تھی۔ لیکن جس طرح ان لوگوں نے بھی 'اصل فارسی' کو اپنا سرچشمہ بنایا تھا، مطبوعہ طلسم ہوشربا کے مصنفوں نے بھی 'اصل فارسی' کو اپنا ماخذ قرار دیا، یہ اور بات ہے کہ دونوں کا سرچشمہ یا ماخذ محض ایک خیالی وجود ہے یا 'اقلیدس کا ایک فرضی نقطہ'، جو زیادہ سے زیادہ پھیل سکا تو نیشنل لائبریری کے بوہار کلیکشن کے 'قصہ فیلسوف' تک، جسے فہرست نگار (عبدالمقتدر) نے ہوشربا والا قصہ ٹھہرایا، جو صحیح بات نہیں!

داستان امیر حمزہ، رموز حمزہ، قصہ امیر حمزہ، اسمار الحمزہ، حمزہ نامہ، زبدۃ الرموز کہیں بھی طلسم ہوشربا کا نشان نہیں ملتا۔ دراصل یہ فارسی میں تھی ہی نہیں۔ اسے تو میر احمد علی اور میر قاسم علی اور ان کے شاگردوں نے اردو ہی میں لکھا۔ یہ اس کا پہلا نقش تھا (رام پور میں یہ داستانیں ۱۸۴۰ء - ۱۸۶۵ء کے درمیان لکھی گئیں) جو نولکشور سے قبل کی بات ہے۔ خود احمد حسین قمر نے اس کا اعتراف کیا ہے (ہوشربا ۵: ۲/۶۲۶) کے مصنف اول احمد علی ہیں۔

وہ مشہور روسی حکایت آپ تک بھی پہنچی ہوگی جس میں ہم جو جب ساری منزلیں سر کرکے اس چٹان تک پہنچ جاتا ہے جہاں اب وہ بسہولت اپنا نام لکھ کر بقاے دوام کی ضمانت حاصل کرسکتا ہے تو اسے وہاں یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ ناموں کے لیے مخصوص ساری جگہ بھر چکی ہے، اب مزید گنجائش نہیں۔ لکھنا چاہو تو بیشک لکھ سکتے ہو لیکن بس آخری نام کھرچ کے! اس ہدایت نامہ میں یہ بات محذوف تھی کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا کہ تمہارے بعد آنیوالا بالکل اسی طرح تمہارا نام کھرچ کے اپنا نام لکھتا جائے گا اور اس کے بعد اس کا نام کوئی اور کھرچے گا اور اس کے بعد۔۔۔

ہماری اقدار ایک ایک کرکے ریزہ ریزہ بکھر رہی ہیں۔ ایک اعلا قدر کبھی یہ بھی رہی تھی کہ گزرے ہوؤں کے نیک نام کو ضائع نہ کرو ("نام نیک رفتگاں ضائع مکن")، شعر کے دوسرے حصہ میں ایک لالچ بھی دیا گیا ہے (کاش نہ دیا گیا ہوتا!) کہ جانے والوں کا نام قائم رکھوگے تو آنے والے تمہارا نام بھی بچالیں گے ("تا بماند نام نیک برقرار") اقوام متحدہ کے سربراہ اور عظیم صوفی ہیمر شیلڈ کی وہ دلدوز چیخ آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے کہ آخر نام میں کیا رکھا ہے! آخر ہم سب کی یہ کوشش کیا ہے؟ کہ جب ہم دنیا سے گزر جائیں تو زندوں کے خیالات بار بار ہمارے نام کے گرد گھومتے رہیں! ہمارا نام! بے نام ابدیت سے تو ہم بچ ہی نہیں سکتے۔ ہماری زندگی اور ہمارے اعمال کے نتائج کھرچے تو نہیں جا سکتے! نہ انہیں امتیاز یا نشانات ملنے سے روکا جاسکتا ہے!! وہ عزت کا باعث ہوں یا شرمندگی کا!!!

کسی گزرے ہوئے کا نام ضائع مت کرو، کوئی پچھلا نام کھرچو مت، مت کھرچو، کہ تمہارا نام وہاں آجائے! بالآخر تو تم بھی کھرچ دیے جاؤ گے!!

کتنے ہی معاملوں میں ہمارے پیشرو ہم سے بہت بڑے تھے، زیادہ خوش نصیب تھے مثلاً یہی کہ ان کے پاس وقت بہت تھا) طلسم ہوشربا کا خصوصاً اور داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال وغیرہ کا عموماً جیسا

تفصیلی مطالعہ ان لوگوں نے کیا اور اپنے مطالعہ کے جو نتائج قلمبند کیے وہ آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان داستانوں کا دور بظاہر گزر چکا۔ ہمارے ہم عصروں میں بس شاید دس پندرہ لکھنے والوں نے یہ داستانیں الف سے یے تک پڑھی ہوں! اتنا ہی بہت ہے ہمارے لیے کہ کسی نے بھی، ادب دوستی میں، اتنی فرصت نکالی؛ اور، شکر گزار ہونا چاہیے ہمیں ان محسنوں کا، جنھوں نے ہم پر روشن کیا کہ چالیس پچاس ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ان "خاکساران جہاں" فنکاروں کو حقارت سے نہ دیکھیں، کون جانے کب اس گرد میں سے کسی سوار، کسی شہسوار، کا چہرہ چمک اُٹھے!

قبلاً، کوئی کسی موضوع پر اچھا کام کر چکا ہو تو اس سے بہتر خراجِ تحسین اور کوئی ہے بھی نہیں جس کی طرح ہم نے ڈالی ہے؛ اس طور پر، کہ پیشروؤں نے فنِ داستان گوئی پر، داستان امیر حمزہ پر اور خصوصاً طلسم ہوشربا پر جو کچھ لکھا ہے اس کا متعلقہ حصہ طلسم ہوشربا کے اس نعدا بخش، ۲ ڈیشن کے ساتھ اقتباساً یکجا کر دیا جائے: پہلے تنقیدی اور تحسینی تحریریں ہوں جس سے قاری موضوع سے قریب ہوتا چلا جائے؛ درمیان میں، برزخی، تحریریں ہوں، جن میں تحسین کے ساتھ تحقیق بھی جڑی ہوئی ہے؛ اور آخر میں خالص تحقیقی تحریریں!

سو، یہ تحسینی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں مصنفوں کے لیے شکر گزاری کے ساتھ مقدمہ طلسم ہوشربا کے طور سے پیش خدمت ہیں۔

تہذیب، سماج اور زبان —— تینوں کے مطالعہ کے لیے طلسم ہوشربا ایک اہم ماخذ ہے۔ تہذیب اور سماج کو کچھ آپ خود تلاش کرلیں، کچھ ہم مدد کرتے ہیں!

زبان ایک سماجی عمل بھی ہے، تہذیبی وسیلۂ اظہار بھی۔ اس کے پیشِ نظر لفظیات کی شکل میں بازیافت کی ایک کوشش کی گئی ہے: یہ فرہنگ نہیں، یہ فرہنگ کا بدل بھی نہیں ہے۔ یہ صرف جاتے ہوئے زمانے کو لفظوں کے واسطے سے اسیر کرنے کی ایک آرزو ہے جسے صفحہ صفحہ اور سطر سطر تلاش کر کے یکجا کر دیا گیا ہے کہ ان لفظوں، محاوروں، اصطلاحوں اور استعمالوں کے آئینہ میں بیسویں صدی کے اوائل تک کا رواج عام اور اس کے توسط سے، ممکن حد تک، وہ تہذیب اور سماج سامنے آجائے جسے تاریخ سے زیادہ معتبر اور بے میل صورت میں ادب محفوظ رکھنا جانتا ہے! لفظیاتِ طلسم ہوشربا کو مقدمہ طلسم ہوشربا کی مانند مستقل بالذات الگ جلد کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے، اس امید کے ساتھ کہ یہ دونوں ساتھی جلدیں اپنی حقیر جسامت کے باوجود متن کی دیو قامت جلدوں کے مطالعہ کی راہیں روشن کرنے میں معاون ہوں گی •••

شمیم حنفی
B,114, Zakir Bagh,
M.M.Ali Road,
New Delhi-25

اردو طنز و مزاح اور ہماری معاشرتی صورتِ حال

ہر صبح کا اخبار ایک آزمایش ہوتا ہے، کرپشن، قتل و غارت گری اور انواع و اقسام کے دوسرے جرائم کی خبروں سے بھرا ہوا۔ یہ آزمایش ہمارے دل و دماغ، اعصاب اور حواس کے لیے ایک بوجھ ہوتی ہے اور ہمیں تہذیبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی زوال کے ایک اندوہ ناک احساس تک لے جاتی ہے۔ ڈی ہیومنائزیشن اور ڈپریشن کی کیفیت، ایک نیم فلسفیانہ اداسی اور بیزاری کی کیفیت، ایک گہرے اشتعال اور برہمی کی کیفیت۔ زوال کے اس احساس کی ہم رکاب ہوتی ہیں۔ کامیو نے غلط نہیں کہا تھا کہ آیندہ زمانوں میں ہمارا عہد اخبار پڑھنے والوں کا عہد کہا جائے گا۔

اخبار سے یہ شغف ہمارے انتخاب سے زیادہ ہماری مجبوری اور عادت ہے۔ چاروں طرف ہر روز، ہر پل، غیر معمولی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اخبار کا پیٹ "خبروں" سے بھر جاتا ہے۔ خبروں اور اشتہاروں کی غذا پر پلنے والی بصیرت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اخبار اور اشتہار دونوں، ہمارے ارادے کی آزادی اور انتخاب و اختیار کی آزادی کے دشمن ہوتے ہیں۔ اشتہار ہماری بصیرت کو کند کرتے ہیں، خبروں کی یورش ہمارے ادراک کو۔ شاید اسی لیے، اخبار کا پہلا صفحہ سامنے آتا ہے تو سب سے پہلے میری نگاہ لکشمن کے کارٹون پر پڑتی ہے۔ گنتی کی چند لکیروں اور نقطوں کے واسطے سے لکشمن ہمیں جس واردات کا چہرہ دکھاتے ہیں وہ "خبر" سے زیادہ "نظر" کا منطقہ فراہم کرتی ہے۔ ہمارے معمول کا حصہ بن جانے والی غیر معمولی انسانی صورتِ حال کو ایک نیا تناظر بخشتی ہے۔ آگہی کا یہ سرد سامان ہاتھ نہ آئے تو اظہار کی ہیئت چاہے لفظوں پر منحصر ہو یا رنگوں اور لکیروں پر، اس کا عمل ناقص اور نامکمل رہ جائے گا۔

کارٹونسٹ ہو یا طنز نگار، دونوں میں ایک وصف مشترک ہے۔ یہ کہ دونوں حماقتوں کے تئیں بے صبر ہوتے ہیں۔ مزاح نگار، ایک حد تک، انسانی فکر و عمل کی بوالعجبیوں کو جھیلنا جانتا ہے اور اپنی طبیعت کے نظم و ضبط کو سنبھالے رکھتا ہے۔ اس معاملے میں ردِ عمل کی جس حد پر اس کی ہمت جواب دینے لگتی ہے، دراصل وہیں سے وہ طنز کی مملکت میں

داخل ہو جاتا ہے۔ مزاح بیشتر صورتوں میں طنز کا لباس ہوتا ہے۔ بقول نطشے، اگر کسی کا مضحکہ اس حد تک اڑایا جائے کہ اس کے تئیں ہمدردی کا عنصر غالب ہوتا نظر آئے تو گویا ہم مزاح کے دائرے سے نکل کر طنز کی حدوں میں آجاتے ہیں۔

اس موقعے پر ایک اور کارٹونسٹ کی بات یاد آتی ہے۔ ایک بار ابوابراہام نے کہا تھا — "ذرا سوچیے کہ جانور کیوں نہیں ہنستے؟ سیدھا جواب ہے، اُن کے پاس کسی پر ہنسنے کا جواز نہیں ہے کیونکہ وہ سب ایک جیسے ہیں۔ ایک جیسے نہ ہوتے تو ایک دوسرے پر ہنستے اور طنز کرتے" گویا کہ طنز ہو یا مزاح، دونوں کی نمود معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی ناہمواریوں کے پس منظر میں ہوتی ہے۔ اسی لیے طنز اور مزاح کی پوری روایت میں ذہنی، فکری، جذباتی، نفسیاتی، سماجی، تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی ناہمواریوں کو ایک ترغیبی طاقت کی حیثیت حاصل رہی ہیں۔ زندگی افراد کی ہو یا معاشروں کی ہم اسے ایک نہایت پیچیدہ مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں۔ زندگی کی بساط پر قہقہوں اور آنسوؤں کا سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ نشاط میں افسردگی کا رنگ چھپا ہوتا ہے اور افسردگی میں نشاط کا۔ چنانچہ زندگی کے تضادات کا ایک ساتھ احاطہ کرنے والی بصیرت مزاح کے پردے میں بھی اپنی متانت کو چھپا نہیں پاتی۔ ہم جس دور میں زندہ ہیں، اس میں مزاح نگار کو مسخرہ سمجھنے کا میلان کب کا ختم ہو چکا۔ اس کے برعکس، مزاح نگار کو اب ایک سماجی مفکر اور دانشور کے طور پر دیکھنے کی روش عام ہو چلی ہے۔

یہاں ایک اور واقعے پر دھیان دینا ضروری ہے۔ طنز اور مزاح لکھنے والوں کے سلسلے میں یہ امر عام ہے کہ بالعموم یہ STATUSQUO کے حامی ہوتے ہیں۔ ہر وہ انسانی صورتِ حال جو روایت بن کر ان کے شعور میں رچ بس جاتی ہے، اُن کے نزدیک مثالی ہوتی ہے۔ اس مثالی صورتِ حال میں ہر انحراف کو وہ طنز اور تضحیک کا نشانہ جو بناتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ اُن کے مزاج کا محور کچھ NORMS ہوتے ہیں۔ اس محور سے اُن کا تعلق اتنا مستحکم ہو جاتا ہے کہ اپنے آزمودہ NORMS میں ذراسی ردّ و بدل بھی اُن کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ غالباً اسی لیے اعلا درجے کا مزاح اور طنز کسی PERMISSIVE سماج میں کبھی ترقی نہیں کرتے۔ وہاں بھونڈی سے بھونڈی بات بھی کسی کے لیے انہونی نہیں ہوتی۔ ایسے معاشروں میں عام ذہنی رواداری کے سبب ہر قسم کے NORMS یعنی تہذیبی، اخلاقی اور فکری ضابطوں کی عدم موجودگی یا ان سے لاتعلقی ایک طرح کی بے لگامی کے فروغ کا بہانہ بن جاتی ہے۔ بڑی سے بڑی بے راہ روی اور بے ضابطگی لوگوں کو پریشان نہیں کرتی۔ طنز اور مزاح ڈائنا مائٹ کا ذخیرہ نہ سہی جو ایسی کسی معاشرتی تنظیم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دے، مگر طنز اور مزاح سے اُن معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی تو ہو ہی جاتی ہے جو اپنی تنظیمی بنیادوں کو اندر ہی اندر کمزور کرتی رہتی ہیں موجودہ معاشرتی ماحول کے پیشِ نظر ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔

فرائڈ نے مزاح کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک وہ جو بے ضرر اور معصوم ہوتا ہے، ہر طرح کے پیچ اور گھماو پھراو سے عاری اور کسی بڑے مقصد کی اطاعت سے آزاد۔ ایسا مزاح بس وقت گزاری کا سیدھا سادا ذریعہ ہوتا ہے اور دل لگی کا بہانہ۔ بے شک اس کی ضرورت اپنی جگہ پر کہ زندگی صرف متانتوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن اظہار کی تمام ہیئتوں کی طرح، اس مزاح کا مفہوم بھی بالآخر اس کے مقاصد ہی کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بے ضرر اور ذہین بصیرتوں سے خالی مزاح معمولی درجے کا ہوتا ہے۔ لیکن مزاح کی وہ دوسری قسم، جسے فرائڈ نے سنجیدہ میلانات اور مقاصد سے منسوب کیا تھا، اپنے طور پر ایک دور رس سماجی رول کی ادائگی بھی کرتی ہے۔ در اصل یہی مزاح (نارتھ روپ فرائی کے لفظوں میں) ایک "اخلاقی معیار کی تعمیر کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ مزاح سچویشنز اور اشخاص سے" کھیلتا تو ہے، مگر اس کھیل کی حیثیت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ تمام اشیا اور اشخاص، اور انسانی صورت حال کے تمام زاویے جو اپنے مرکز سے کھسک گئے ہوں، جو بے ڈول دکھائی دیں، مزاح کی اسی قسم کا ہدف بنتے ہیں۔ اس مزاح میں طنز کے عنصر کی شمولیت کے سہارے، لکھنے والا ایسی تمام صورتوں اور سچویشنز پر وار کرتا ہے جو اسے مہمل یا عجیب الوضع دکھائی دیں۔ ظرافت کی حس، آگہی کی اس سطح کو دریافت کرنے کے بعد ہی زندگی کو برتنے اور سمجھنے کا ایک اسلوب، ایک زاویۂ نظر، ایک بڑا ذہنی رویّہ بنتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ اعلا درجے کی ظرافت جلن سے زیادہ جلال کی پیداوار ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ معمولی درجے کا مزاح نگار آگہی کے اس سطح اور بصیرت کے اس منطقے سے، جو طنز اور ظرافت کو ایک زاویۂ نظر میں منتقل کرنے پر قادر ہو، محروم ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت جلال کے اُن کیفیتوں کا بار اُٹھا ہی نہیں سکتی، جو رشید صاحب کے نزدیک اعلا درجے کی ظرافت کا شناس نامہ بنتی ہیں۔ ادنا درجے کی ظرافت اور طنز کا چلن اردو میں کچھ بہت زیادہ ہیں۔ اس کی اساس بالعموم واقعاتی SITUATIONAL ہوتی ہے، یا پھر لطیفوں کی مدد سے طنز و مزاح کا ایک طلسم تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے بیشتر مزاح نگار اس رمز کو لائق توجہ نہیں سمجھتے کہ اعلا درجے کی ظرافت خیال کی ظرافت ہوتی ہے۔ مزید برآں، اس کے لیے زبان و بیان کے آہنگ اور اسالیب پر مضبوط گرفت ہونی چاہیے۔ اردو طنز و مزاح میں اس لحاظ سے بھی ترقی کی خاص گنجائش دکھائی دیتی ہے۔

اس مضمون کے ابتدائی مباحث میں طنز اور مزاح کی بابت جو وضاحتی اشارے کیے گئے، ان کا مقصد یہ تھا کہ آج کے معاشرتی صورت حال کے سیاق میں ہم اپنے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو ایک فکری اور اصولی تناظر مہیا کر سکیں۔ اپنی نارسائیوں کے اسباب پر غور کر سکیں اور اُن ذہنی بنیادوں کو سمجھنے کی جستجو کریں جن پر ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی تعمیر کے نتائج ہرگز ایسے نہیں ہیں جنھیں تشفی بخش کہی جا سکے۔ لسانی اعتبار سے اردو

میں ہماری کسی علاقائی زبانوں کی بہ نسبت طنز اور ظرافت کے بہتر امکانات موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا طنز اور مزاح کا سرمایہ فکر کی سطح پر تا حال بہت محدود اور قلیل ہے۔ ہماری روایت نے طنز اور مزاح کے ادب کو جو پس منظر فراہم کیا تھا، میرا خیال ہے کہ فکری تن آسانی کی عادت کے سبب ہم نے اس پس منظر کو سمیٹ دیا اور توانائی کے جو سادھن اس پس منظر میں چھپے ہوئے تھے، اردو طنز و مزاح کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ذہن اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ ہم نے ان کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ جعفر زٹلی کی جگہ تو خیر تاریخ میں ہے، اور اردو طنز و مزاح کی روایت بنانے والوں میں سودا، انشا، نظیر، غالب، منشی سجاد حسین، سرشار، اکبر، رشید احمد صدیقی اور پطرس کے انداز و اسالیب یا اُن کے فنی اور لسانی حربوں کی تقلید سے گریز کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ پھر بھی ایک سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، یہ کہ ہمارے عہد میں اردو طنز و مزاح کے اُس میلان کو غلبہ کیوں کر حاصل ہوا جس میں ہمارے پیش رووں کے ذہنی اور جذباتی سروکار یا اپنے معاشرے کے تئیں اُن کی وابستگی کے نشانات بہت دھندلے ہیں۔ جو نہایت سطحی، سستے اور محدود موضوعات کے پھیرے سے بالعموم باہر نہیں نکلتا۔ جو انحطاط پذیر اور تھکے ہارے زمانوں کی یاد تازہ کرنے والے پھکڑپن اور لسانی داؤں پیچ کے سحر سے آزاد نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ خالص ادب کی طرح خالص مزاح کی اصطلاح بھی موجودہ معاشرتی صورت حال کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے، آج بے معنی محسوس ہوتی ہے۔ بے شک ہنسنا بہت ضروری ہے، اپنے حال پر بھی اور اپنی دنیا پر بھی، تاکہ ہم اپنے آپ کو انتشار اور ابتری سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور ہنسنے کا جواز بھی ہر طرف موجود ہے کہ زندگی کی اوپری سطح پر ہمارے سیاسی اور معاشرتی اداروں کے فیض سے حماقت اور مہملیت کا بازار خوب گرم ہے۔ یہ صورتِ حال اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے لگا سکتی ہے۔ چنانچہ اس صورتِ حال پر ہنسی کے ذریعے، وقتی طور پر ہی سہی، کم سے کم اپنی ہوشمندی کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ مگر مزاح کے عمل کو بس یہیں تک محدود کر دینا کافی نہیں ہے۔

اپنی ایک گفتگو میں (قومی زبان، کراچی، نومبر ۱۹۸۸ء) یوسف ناظم کہتے ہیں کہ "اب جب کہ موضوعات بہت زیادہ ہو گئے ہیں، معاشی، اقتصادی، سماجی مسائل پیچیدہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ افسوس کہ ان پر مزاح نگار نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ کالم نگار لکھ رہے ہیں"۔ اس لحاظ سے اردو طنز و مزاح کے موجودہ منظر نامے پر فکری سناٹے کی جو کیفیت چھائی ہوئی ہے وہ افسوس سے زیادہ تشویش کی بات ہے۔ مزید برآں، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو کے مقابلے میں طنز و مزاح کے لیے ہماری دوسری زبانیں جو بظاہر کم سواد اور جن کی روایت اردو طنز و مزاح کی روایت کے مقابلے میں کمزور دکھائی دیتی تھیں، گرد و پیش کی زندگی، اپنے زماں اور مکاں سے وابستگی کے معاملے میں آج اردو سے آگے ہیں، تو ہماری پریشانی کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ اپنی اس پس ماندگی کا تجزیہ

کیا جائے تو چند باتیں بہت صاف طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ یہ کہ ہمارے طنز و مزاح کی روایت میں کمزوریوں کو ترقی دینے کا رجحان آج بھی مضبوط ہے۔ مثال کے طور پر مزاح کے خالص تفریحی تصور سے شغف یا سماجی اور معاشرتی ذمے داریوں سے اور زندہ مسائل سے لاتعلقی کا رویہ۔

۲۔ اسی طرح پھکڑپن، لطیفے بازی، زبان و بیان میں صنعتوں اور رعایتوں کے استعمال سے غیر ضروری حد تک دلچسپی بصیرت کے سفر کو مسدود کر دیتی ہے۔

۳۔ اس نکتے سے عام لکھنے والوں کی بے خبری کہ طنز اور مزاح کے لیے صرف ایسے "موضوعات" کافی نہیں ہوتے جو طنز اور مزاح کا نشانہ بن سکیں اس سے زیادہ اہمیت "اُس نظر" کی ہے جو عام انسانی مسئلوں اور تجربوں میں بھی طنز اور ظرافت کے پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے۔

۴۔ اچھی ظرافت کے لیے اعلا درجے کی نثر پر گرفت ناگزیر ہوتی ہے جو اردو میں ابھی کمیاب ہے اور اس میں بہتری کی صورتیں بھی نظر نہیں آتیں۔ یوسف ناظم کی اُس گفتگو میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے، یہ جملے بھی شامل ہیں کہ "نئے لکھنے والے زبان نہ جاننے کو عیب نہیں حسن سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ زبان بے معنی چیز ہے حالانکہ مزاح لکھنے کے لیے زبان جاننا بہت ضروری ہے"

اگر پورے برصغیر کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو سامنے رکھا جائے تو صورت حال اس درجہ مایوس کن نظر نہیں آتی۔ پاکستان میں طنز اور مزاح کی روایت زیادہ موقر ہے۔ جیسا کہ میں یہاں عرض کر چکا ہوں، ہندستان میں ہمارا آج کا طنزیہ اور مزاحیہ ادب اپنی لسانی تیزی، طرّاری اور ترقی یافتگی کے باوجود دوسری کئی ہندستانی زبانوں کی بہ نسبت اپنے مجموعی وژن کی خامی، اپنے موضوعات کی تکرار، اپنی بصیرت اور فکر کی محدودیت کے اعتبار سے کم تر دکھائی دیتا ہے۔ ایک زبان جس کی تحریر میں ترجمے کے بغیر براہ راست پڑھ سکتا ہوں اس سے اپنی صورت حال کا موازنہ ذہن کو اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ اپنی کم تری کی ذمے داری نہ تو ہم اپنی روایت پر ڈال سکتے ہیں نہ اپنے لسانی اور ذہنی وسیلوں پر۔ اصل قصور ہماری اپنی فہم اور رسائی کا ہے۔ مثال کے طور پر، ہندی میں طنز اور مزاح کی روایت ادب کی تمام صنفوں کا حصّہ بن چکی ہیں۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ، ESSAY یا نثر کے دوسرے میدانوں میں بلاشبہ ہندی کا حال کئی سطحوں پر اردو سے بہتر ہے۔ ناول میں شری لال شکل (راگ درباری، مکان، آدمی کا زہر)، ہری شنکر پرسائی (رانی ناگ پھنی کی کہانی) اور ناگارجن (رتی ناتھ کی چاچی)، کہانی میں شرد جوشی اور پرسائی، ناٹک میں سردیشور دیال سکسینہ (بکری)، اور لکشمی نرائن لال (ایک سیتا ہرش چندر) اس سلسلے کی چند نمایاں ترین مثالیں ہیں۔ ایسا نہیں کہ اردو طنز و مزاح لکھنے والے اس معیار تک رسائی کی قوت نہیں رکھتے۔ ابن انشا، شفیق الرحمن اور

محمد خالد اختر کا تعلق بہر حال کسی گم شدہ نسل کے ادیبوں سے نہیں ہے۔ ہندی میں ابن انشا کے تراجم کی مقبولیت اور پچھلے چند برسوں میں سیاسی کلچر کی ابتری اور میڈیا پر سرکاری اقتدار کے جبر اور اس نوع کے دوسرے مسئلوں پر، محمد خالد اختر نے جو مضامین اپنے منفرد انداز میں لکھے ہیں ان سے ہندی کے قارئین کی دل چسپی، ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اردو طنز و مزاح جب آج کی معاشرتی صورت حال کے پس منظر میں اپنی صحیح سمت پا جاتے ہیں تو کیسے کیسے جادو جگاتے ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے طنز اور مزاح کے قدم اگر اپنی زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے نہ ہوں تو بات نہیں بنتی۔ ایلیئٹ نے کہا تھا کہ طنز اور مزاح میں PLAYFULNESS کھلواڑ کا ایک عنصر بھی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ کھیل تماشا اگر آپ اپنا مقصد بن کر رہ جائے تو بہت جلد اپنی طاقت اور طلسم کھو بیٹھتا ہے۔ مشاعروں میں زیادہ تر جو مزاحیہ شاعری سنائی جاتی ہے، اُس کا المیہ یہ ہے کہ اپنے فوری اور براہ راست ابلاغ کی وجہ سے اُس پر داد تو مل جاتی ہے، لیکن اس کے مقاصد ہمہ گیر اور اثرات دیر پا نہیں ہوتے۔ اردو اور ہندی، دونوں زبانوں میں طنزیہ اور مزاحیہ نثر کے مقابلے میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی قدر و قیمت جو کم ہوئی ہے تو اسی لیے کہ کوی سمیلنوں اور مشاعروں کی سطح میں پستی اور بد مذاقی بہت آگئی ہے۔ شگفتہ طبعی اور پھوہڑپن میں فاصلہ بس ذرا سا ہوتا ہے۔ معمولی بھول چوک پلک جھپکتے میں اس فاصلے کو مٹا دیتی ہے۔ اسی لیے طنز اور مزاح لکھنا، طنز اور مزاح کو "کھلواڑ" یا مسخرہ پن سمجھنے والوں سے زیادہ ایسوں کو زیب دیتا ہے جو طنز اور مزاح کے عمل، مقصد اور ردِ عمل کے سلسلے میں سنجیدہ ہوں۔ سودا کی ہجو میں اسی سطح پر جعفر کی زٹل سے کہیں زیادہ بامعنی نظر آتی ہیں اور اسی سطح پر اکبر، سرشار سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اُن کے لب آشنائے خندہ سہی مگر دل محیطِ گریہ ہے۔ ہمارے فکشن لکھنے والوں میں کرشن چندر، اور شاعروں میں جوش مزاح آمیز طنز پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے، لیکن طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو ان کی توجہ خاطر خواہ طور پر مل نہیں سکی۔

اردو میں اگر کالم نگاری کو الگ کر دیا جائے تو طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی موجودہ صورتِ حال اور موجودہ معاشرتی صورت حال میں ہم آہنگی اور مناسبت کا دائرہ بہت سمٹ جاتا ہے۔ ہندی میں تیزی سے بدلتے ہوئے قصباتی ماحول کا مسئلہ، شہر اور گانو کی کھینچ تان کا مسئلہ، تعلیم، پولیس، اسپتال اور سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والے ایسے بہت سے اداروں کا مسئلہ ہو یا ضمیر کی آزادی اور سیاسی و سماجی جبر کے مقابلے میں آزادیٔ افکار کا مسئلہ، ان سب کی لئے خاصی اونچی ہے۔ ہندی طنز و مزاح پر ایک بات چیت (بتاریخ ۲۰، فروری ۱۹۸۸ء) میں ہندی کے ایک معروف طنز نگار (وجیند رسناتک) نے کہا تھا کہ آج ہمارے لیے دو موضوع بہت اہم ہیں — ایک سیاست دوسرا مذہب اسی طرح نوکر شاہی کے تماشے بھی کارٹونسٹ اور مزاح نگار کے لیے بصیرتوں کے اظہار

کا [illegible]
ذہنی [illegible] اور [illegible] کے بدلتے ہوئے [illegible]
رشتوں کا مسئلہ [illegible] طنز و مزاح کے لیے ایک میدان کھلا ہوا ہے۔ اس
میں ایک اور مثبت واقعہ یہ ہے کہ طنز اور مزاح کے لکھنے والے نظریاتی اور نسلی اختلافات
کے چکر میں نہیں پڑتے۔ تنقید، شاعری، افسانہ نگاری، ان سب میں نئے اور پرانے، روایتی
اور جدید، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا جھگڑا چلا۔ ہمارے طنز و مزاح لکھنے والے اس
معاملے میں زیادہ روادار اور فراخ دل ہیں۔ مگر گھوم پھر کر ایک ہی بات سامنے آتی ہے
یہ کہ موجودہ معاشرتی صورت حال اور طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی صورت حال میں مطابقت
اور رابطوں کا ماحول کچھ اور مستحکم ہونا چاہیے۔ اردو طنز و مزاح سے جھانکتی ہوئی بصیرتیں
ابھی بہت متروض ہیں۔ اس مسئلے کا فوری حل تلاش نہ کیا گیا تو پھر ایک سنگین تہذیبی بحران
سے دوچار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ دنیا لفظوں سے نہیں بدلتی، لیکن لفظ کا
وار صحیح ہو تو کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے۔ طنز اور مزاح لفظوں کو بھی چارج کرتے ہیں، افراد
اور معاشروں کو بھی۔ ×-×-×

پروفیسر وہاب اشرفی
HEAD OF THE URDR
DEPARTMENT,
RANCHI UNIVERSITY,
RANCHI.(Bihar)

اردو اور کلچر کی تقسیم

اردو کے لسانی ڈھانچے کی معمولی سی واقفیت اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ یہ ایک سیکولر زبان ہے، اس کی ابتدا اور ارتقا کی کہانی بھی اس امر پر دال ہے۔ اردو زبان اور اس کے ادب کے ڈول اور کینڈے کی ابتدائی صورت ہندستان کے مشترکہ کلچر کا بیّن ثبوت ہے، اردو کی یا قدیم اردو کی اوّلین شعری تخلیق کدم راو پدم راو فخر دین نظامی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس نے بھی یہ مثنوی پڑھی ہوگی اُسے حیرت ہو سکتی ہے کہ تصورِ تبدیلِ قالب سے مسلمانوں کا کوئی ذہنی رشتہ نہیں ہے نہ ہی ان کے روحانی ترفع کی کوئی صورت ہے لیکن ہندوؤں کے یہاں یہ تصور ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے ایسے ہی نظامی کے تصورِ تبدیلِ قالب کا سلسلہ کتھا سرت ساگر، پارس ناتھ چرنتر، دکرم چرترا پربندھ چنتامنی وغیرہ سے ملتا ہے، صاف ہے کہ نظامی اپنے عقیدے کو پس پشت ڈالتا ہے، اور ہندو عقیدے کی اساس پر اپنی تخلیقی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے، معراج العاشقین کس کی تصنیف ہے فی الحال مجھے اس سے بحث نہیں ہے تھوڑی دیر کے لیے مانیے کہ یہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں ہے، مخدوم شاہ حسینی کی ہے۔ اس میں پانچ عناصر پچیس گن دراصل تن ناسوتی کے عناصر ہیں مسلمانوں کے عقیدے میں صرف چار عناصر آب، آتش، خاک اور باد ہے جو ایمپ ڈوکلس کا بھی نظریہ ہے لیکن یہ حق ہے کہ پانچواں عنصر یعنی خالی یا خلا یا آکاش ہندو فلسفے کی دین ہے، یہ دراصل ہندو مسلم کلچر کے اشتراک کا ایک پہلو ہے۔ شاہ اشرف بیابانی کی مثنوی نو سرہار واقعۂ کربلا سے متعلق ہے لیکن اس میں حضرت زینب کا جیسا سراپا پیش کیا گیا ہے کیا وہ خالص ہندو عورت کی تصویر نہیں ہے؟ شاہ میراں جی شمس العشاق کی منظوم تصنیف خوش نامہ خوشی کی تعریف کے لیے الفاظ میں باتی بھوتی پرم پیاری، سوبھاننی، گن ونتی اور ستی اسی طرح شاہ برہان الدین جانم کے کلام میں شری کرشن کی روایت کے تعلق سے سولہ ہزار گوپیوں اور ان کے تلازمے خاصے نمایاں ہیں شاہ امین الدین اعلیٰ کے یہاں کرشن بھگتی کا جو میلان ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح شیخ بہا الدین باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی جیو گام دھنی، خوب محمد چشتی، محمد قلی قطب شاہ، مُلّا وجہی، ابراہیم عادل شاہ ثانی، عبدل، سلطان عبداللہ قطب شاہ، محمود، ابن نشاطی، علی عادل شاہ ثانی شاہی، نصرتی، فائز دکنی، قاضی محمود بحری، وغیرہ کے یہاں مشترکہ کلچر کے

کے نمونے ملتے ہیں۔

اب تک ولی کا دور آچکا تھا' نزاعی صورت یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پہلے یہ دیکھ لیں کہ ایک ہندو محقق ڈاکٹر پرکاش مونس ولی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

"ولی اصلاً دکنی شاعر ہے اور اس کے کلام میں وہ تمام ہندی، ادبی، مذہبی، معاشرتی اور تاریخی عناصر تاباں و درخشاں ہیں جو ہمیشہ دکنی شاعری کی خصوصیت میں شامل رہے ہیں، ہندو دیومالا، رام لکشمن، کرشن، کاشی، ہردوار اور جمنا جیسے تصورات جنھیں فارسی شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ولی کے کلام میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں' اس کے یہاں معتدبہ تعداد ایسے اشعار کی ہے جن میں محبوب اپنی تمام نسوانی لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے' کہیں ہندی شاعری کی تقلید میں اس جان غزل کی زبان سے اظہار جذبات ہے تو کہیں خود شاعر کا روئے سخن اس زہرہ جبیں کی طرف ہے' ولی کا محبوب پی' پیا' پیو' پیتم، دھن ساجن' مندر اور موہن جیسے القاب سے ملقب ہے۔"

یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ ولی کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا اور اسی سال اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔

اردو سے نفرت کرنے والے اور اسے کلچر کی تقسیم کا سبب ٹھہرانے والے اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اول اول اردو ہندی سے الگ کوئی زبان تھی ہی نہیں' دکنی کا سارا سرمایہ ہندی ہے' ولی کے بعد سے اردو کا رشتہ ہندستان کی سرزمین سے ٹوٹ گیا، یعنی اس کے مزاج میں عربی اور فارسی عناصر زیادہ دخیل ہو گئے۔ اسی باب میں شاہ گلشن کی ہدایت کام آگئی۔ اردو جو ولی تک ہندوی تھی اب عربی و فارسی عناصر کے ساتھ نئے آب و رنگ میں ڈھلنے لگی، ہندی الفاظ ترک کیے جانے لگے، ہندستانی تلمیحات رد کر دی گئیں۔ اور اک نئی زبان اور نیا کلچر جو ہندستانی کلچر سے مختلف تھا وجود میں آنا شروع ہوا، اس نقطۂ نظر سے گفتگو کرنے والے اردو ادب کے ارتقائی سفر پر نگاہ نہیں رکھتے، نہ ہی کسی زبان کے فطری ارتقا اور ادغامی اثرات سے انھیں غرض ہوتی ہے' ان کا مدعا اردو کی جڑیں اکھاڑنا ہے' چنانچہ ایک طرف تو وہ اٹھارویں صدی کے اوائل تک کہ اردو ادب کو ہندی میں ضم کرنا چاہتے ہیں گویا اردو کی جھولی سے ہمیشہ کے لیے یہ سرمایہ چھین لینا چاہتے ہیں دوسری طرف یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ تو اٹھارویں صدی کے اوائل سے شروع ہوتی ہے اور ایک طرح سے انبوہِ زوال پرستاں کی ایک حقیر نشانی کے طور پر ہندستان اور ہندی کی چھاتی پر مونگ دل رہی ہے' یہ اور بڑی وضاحت سے امرت رائے کی کتاب A HOME DIVIDED میں بیان کیے گئے ہیں، موصوف کا کہنا ہے کہ اردو زبان کی اصلاح کی ساری کوششیں ہندی یا ہندو کی کے خلاف سازش تھی ورنہ محض رسم خط کے علاوہ اردو ہندی ادبیات میں کوئی فرق نہ تھا۔ امرت رائے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو کا فروغ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ شروع ہوا' اردو کو پاک کرنے یعنی عربی و فارسی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ مسلم...

It is noteworthy that although the Sufi poets were religious missionaries

their language does not give evidence of any extra concern for building their Islamic identity with the language. It is possible as we have said earlier, that with Muslim Empire firmly established no such need was felt. Moreover, the Compulsion of getting the message across to the people for whom it was intended did not give the speaker any option in the matter---The language was naturally Sanskrit based and so had to be used as the people knew it. It is when the empire declines that a feverish concern for Islamic identity in the language becomes notice-able in these aristocratic circles, and an organised campaign to change the character of the language is mounted. Further it seems that as the substance of Muslim Power was evoked it yielded place more painted to what could be called a general Muslim identity.

گویا اردو ادب کی ساری ارتقائی صورت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے سامنے شناخت کا مسئلہ تھا، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دکنی اردو تو ہندو مسلمان کی مشترکہ کلچر کی آئینہ دار ہی نہیں دونوں کی میراث تھی، اردو کی ترقی یافتہ صورت صرف مسلمانوں کی میراث ہے اور اس کے فروغ میں زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ مسلمانوں کا یہ خوف تھا کہ مسلم حکومت کے خاتمے سے ان کی شناخت ختم ہو رہی ہے لہٰذا زبان اور اس کے ادب کو نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ لسانی اور تاریخی پس منظر میں ادب کا ایک معمولی طالب علم بھی ایسے نتائج کو تعصب اور فرقہ پرستی کی علامت باور کرے گا، یہ ایک طرح کا لسانی تشدد ہے۔ امرت رائے سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہندو ادیب جو اردو کی ترقی یافتہ شکل سے مسلسل اور اٹوٹ طریقے پر وابستہ رہے ہیں اُنھیں کس طرح کی شناخت مطلوب تھی، ان سے یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ انگریزی ادب میں چاسر اور لینگ لینڈ کی زبان کو ہی کیوں ہمیشہ کے لیے STANDARD زمان لیا گیا، وہاں جو زبان کی پالشنگ ہے مقامی الفاظ کا اخراج ہے وہ کس طرح کی شناخت کا مسئلہ پیش کرتا ہے؟ علم اللسان کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ کسی زبان کا ابتدائی ادب انتہائی علاقائی ہوتا ہے جب بھی ادب فروغ کی سمت اختیار کرتا ہے تو ترقی یافتہ زبانوں کی طرف راجع ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جدید اور جدید تر اردو ادب کئی غیر ملکی زبان و ادب سے اپنی سیرابی کر رہا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ دخیل الفاظ کی بنیاد پر کسی زبان کی گردن نہیں ماری جا سکتی، کیا ایسا نہیں ہے کہ انگریزی زبان میں فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کی کثرت ہے اس حد تک کہ ایک فرانسیسی نے ایک انگریز سے مزاحاً یہ کہا کہ ہم آپ کے ادب میں صرف کھانے کے فرانسیسی الفاظ واپس لے لوں تو آپ لوگ کھانے پینے سے محروم ہو جائیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اردو میں ہمیشہ اتنا کس بل رہا ہے کہ وہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کو ضم کر کے اپنا بنا لے اور یہ سلسلہ جاری و ساری ہے زندہ زبانیں ایسا ہی کرتی ہیں، لیکن امرت رائے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں

بھی یہ منطق ہے کہ اردو کا عربی و فارسی الفاظ سے وابستہ ہونا ایک نئے کلچر کی بنیاد ہے اور بنیادی کلچر کے لیے چیلنج ہے۔ امرت رائے یہ بھی کہتے ہیں کہ نئے الفاظ سے مملو نئے کلچر نے نیا ذہن مرتب کیا۔ قومی یک جہتی اور مشترکہ تہذیب میں دراڑیں پیدا کیں۔ لہٰذا تقسیم کلچر آخرش تقسیم ملک کا تقاضا سامنے لایا۔ اردو کے ساتھ تشدد کا یہ آخری اور شاید کامیاب حربہ کتنے ذہنوں کو برباد کر سکتا ہے۔ موصوف نے تبدیلیِ رسم الخط پر ایک بار پھر بڑا زور صرف کیا ہے۔ بڑی چالاکی سے یہ کہتے ہیں کہ بقول شخصے جب کمال اتاترک نے عربی خط کو ترکی سے بدل ڈالا تو ان کے مذہب پر تو کوئی اثر نہیں پڑا، اگر فارسی خط دیوناگری میں تبدیل کر دیا جائے تو کیا مسلمان مسلمان باقی نہیں رہیں گے۔ موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ دیوناگری رسم الخط دنیا کا بہترین خط ہے۔ جب میں یہ پڑھ رہا تھا تو فراق گورکھپوری سے منسوب ایک واقعہ ذہن میں آگیا، اسے بیان کرنے سے پہلے معذرت خواہ ہوں۔ ایک صاحب جن کا شین قاف درست نہ تھا ایک گھنٹے سے فراق صاحب سے گفتگو کر رہے تھے، صوتی کراہت سے مغلوب ہو کر فراقؔ بول پڑے، بھئی ایک گھنٹے سے آپ مسلسل میرے کان میں پیشاب کر رہے ہیں۔ غالباً اردو کا رسم الخط اتنا ہمہ گیر ہے کہ تمام تر صوتی نظام اس کے تابع ہیں۔ یہاں میں اپنے رسم الخط کی حمایت کرتا ہوں۔ اور یہ کہ اردو ایک مشترکہ تہذیب کی ضمانت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

اشتیاق طالب
S.ONE 363, MASOODABAD,
KARACHI-3.

پلک پلک پہ ستارے سجائے رکھتے ہیں
اندھیری شب میں دیے ہم جلائے رکھتے ہیں

گزر نہ جائے کہیں قافلہ بہاروں کا
اُداس راہوں پہ نظریں جمائے رکھتے ہیں

زمانہ کہتا ہے شوریدہ سر ہمیں لیکن
حضورِ دوست تو ہم سر جھکائے رکھتے ہیں

ترے بدن کی وہ خوشبو جسے صبا ڈھونڈے
ہم اپنے دامنِ جاں میں بسائے رکھتے ہیں

ہمارے دل میں ہیں پیوستہ نشترِ غم و رنج
مگر لبوں پہ تبسّم سجائے رکھتے ہیں

حیاتِ نو کے ہیں پیغامبر وہی طالب
قدم قدم پہ جو طوفاں اُٹھائے رکھتے ہیں

بیدار بخت
WHITE LEAF CRESCENT
SCORBOROLEGH,
ONTARIO,
CANADA MIV. 361.

اندر سے خاموش سمندر باہر شور مچائے
جتنا گہرا نیلا پانی، اتنے راز چھپائے

سایے کی آغوش میں تپتی دھوپ بھی آ سستائے
لیکن اپنی پیاس کو لے کر سایہ کس گھر جائے

جنگل لاج سے بیر بہوٹی، چاہت سے مغلوب
سرد ہوا کا رستہ دیکھے کب گھونگھٹ سرکائے

ضبطِ جنوں کے کالے بادل آنکھ میں جمتے جائیں
برسوں کا گہرا اندھیارا، برسے تو کھل جائے

لگتا ہے احساس کی بستی اب بھی ہے آباد
یادوں کے موہوم کھنڈر میں کچھ سایے لہرائے

انجم مظہری
Red Dane Project,
Dairy Form,
MUNIRABAD-583233.

نسخۂ حیات

بیضۂ خاک کو
نور کا ٹمپریچر عطا کیجئے
اور پھر دیکھیے
روح کا مرغ
علیم، کلیم، سمیع، بصیر
نکل آئے گا موت کے غار سے
بال و پر
آسمانوں پہ پھیلائے گا

مختار شمیم
F.2.Government Girls p.g.
College Campus,
INDORE.

غزل

سجائے ہیں نہ جانے کتنے ہم نے آئینہ خانے
مگر افسوس اپنی شکل و صورت ہم نہ پہچانے

کہیں نشتر زنی ہے تو کہیں سنگِ ملامت ہیں
مگر اے زندگی کچھ لوگ آئے پھول برسانے

یہ رشتہ کیسا رشتہ ہے، تعلق کیا تعلق ہے
جسے دیکھا نہیں ہم نے اسے ہم خوب پہچانے

پروئے ہیں اسی تارِ نفس میں عشق کے موتی
اسی زنار میں پائے گئے تسبیح کے دانے

انھیں سادہ سے لفظوں میں کہیں اک استعارہ ہے
شمیم ابہام کی صورت نہ میرا شعر پہچانے

ساحل احمد
DEPARTMENT OF URDU,
CHRISTIAN COLLEGE,
ALLAHABAD.

غزل

سنگ ریزوں کو اکٹھا کرلو
اک بہم ریت کا دریا کرلو

اپنی آنکھوں میں سجا کر جگنو
اپنے غم خانے کا پردا کرلو

ہو جو ممکن تو ہوا کی خاطر
روزنِ در کو ذرا وا کرلو

اپنے چہرے کو چھپالو خود سے
اپنے پندار سے پردا کرلو

ریت اُڑاتی ہے ہوا کی شہ پر
بند اپنا ہی دریچا کرلو

ہوگا درجہ بھی تمہارا اونچا
نامِ احمدؐ کا وظیفہ کرلو

ملکہ نسیم
E7/ M.I.G.273,
AREA COLONY.
BHOPAL.

غزل

نظر میں یاد کے منظر سمیٹ کر رکھنا
میں جیسا چھوڑ کے آئی ہوں ویسا گھر رکھنا

اداس آنکھوں سے ہوں زندگی کی برساتیں
تم اپنے بھیجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا

رہی ہے جھوٹ کی کوشش ہر اک زمانے میں
سجا کے نیزوں پہ سچائیوں کے سر رکھنا

تمھیں ملا ہے کھلا آسمان، پھیلی زمین
یہ ہے بزرگوں کا ورثہ سنبھال کر رکھنا

نہ ٹوٹ جائیں کہیں حوصلے اڑانوں کے
قفس سے دور پرندوں کے بال و پر رکھنا

زمیں کا قرض اتارو تو اپنے کاندھوں سے
پھر اس کے بعد قدم مہر و ماہ پر رکھنا!

سوال پوچھے گی دنیا قدم قدم پہ نسیم
نظر کو گردشِ دوراں سے باخبر رکھنا

اخترشاہجہاں پوری
RANGIN CHAUPAL
SHAHJAHANPUR.
242 001

عزیز بہارتی
12-1-922, Asif nagar.
HYDERABAD-500028.

اندھے علَم اٹھائے جو بینائیوں کے ہیں
سامان آنکھ والوں کی رسوائیوں کے ہیں

جن میں نہ رنگ روپ نہ خوشبو نہ تازگی
وہ پھول مفلسی کی ہی انگنائیوں کے ہیں

ہم کیا خوشی کی بات کریں مسکرائیں کیا
منظر نظر میں ڈوبتی پرچھائیوں کے ہیں

میدانِ کارزار میں بڑھنے لگے قدم
آثار خوشگوار یہ پسپائیوں کے ہیں

یہ منصفانِ شہر ہیں یہ پاسبانِ شہر
ان کو بتاؤ نام جو بلوائیوں کے ہیں

اختر جو ناشناس ہیں الزام کیا انھیں
دل پر جو زخم ہیں وہ شناسائیوں کے ہیں

بظاہر وہ مری، سنتا بہت ہے
وہ اپنے آپ میں، رہتا بہت ہے

چلے آؤ، اسی رستے پہ ہوں میں
مگر یہ راستہ لمبا بہت ہے

سبھی کچھ دے کے، تیرا قرب پانا
یہ سودا آج بھی، سستا بہت ہے

تمھاری دید کا رنگیں وہ لمحہ
صدی کی بھیڑ میں تنہا بہت ہے

تعارف پوچھ لو، میرا اُسی سے
کہ مجھ کو برق نے سمجھا بہت ہے

عزیز اس آدمی کو کیا کہوں میں
جو اپنے آپ پر ہنستا بہت ہے

منصور آذر
257/3, Jamia Nagar,
OKHLA. (New Delhi)

پرندہ

فضاؤں میں اک گھومتا تھا پرندہ
ہواؤں کے لب چومتا تھا پرندہ
دھنک ایک جھولا تھی اور اُس پہ وہ
بہت دیر سے جھولتا تھا پرندہ
یکایک وہ بارش کی سیڑھی سے اترا
تو دیکھا ہر اک بولتا تھا پرندہ
کہیں اور جانا ہے اس کو یہاں سے
یہی سوچ، پَر تولتا تھا پرندہ
اک ایسی جگہ پہ نشیمن جہاں ہے
جہاں اس کے ساتھی کا بھی آشیاں ہے
یہی سوچ، پَر تولتا تھا پرندہ

رفعت عزمی
Habib Kada,
358 Qaziana,
P.O.RUDAULI.
Barabanki-225411.

کبھی شعلہ کبھی شبنم کبھی پتھر چہرے
وقت کے ساتھ بدلتے ہیں برابر چہرے
دل سخاوت میں لٹا دیتا ہے سب کچھ اپنا
مل ہی جاتے ہیں کبھی اُس کو منور چہرے
کبھی ماحول کو گلزار بنا دیتے ہیں
کبھی حالات کو کر دیتے ہیں ابتر چہرے
صبح ہوتے ہی سیاہی کی طرح جاتے ہیں
شب کو خوابوں میں چلے آتے ہیں اکثر چہرے
بمبئی تیرے لیے اتنا کہے دیتا ہوں
بستیاں، دھند، گھٹن، رات، سمندر، چہرے

سری نیواس لاہوٹی —
URDU HALL,
HIMAYAT NAGAR,
HYDERABAD.500029 (A.P.)

جنگ آزادی میں حیدرآباد کی اُردو صحافت کا حصّہ

میں اپنے اس مضمون کو صرف تین صحافیوں کی حد تک محدود رکھوں گا۔ اس لیے کہ حیدرآباد کی صحافتی تاریخ جو مخالف سامراج اور مخالف شاہی رہی ہے ان میں یہ تین نام مولوی محب حسن، قاضی عبدالغفار اور منڈ مول نرسنگ راؤ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جب حیدرآباد کی مستند صحافتی تاریخ قلم بند ہوگی تو اس کے سرِورق پر یہ تین نام نمایاں رہیں گے۔

حیدرآباد کی اُردو صحافت کی بحیثیت مجموعی یہ خصوصیت رہی ہے کہ جہاں وہ مخالف سامراج تحریکوں کو بڑھاوا دیتی ہے وہیں اس کا یہ وطیرہ بھی رہا ہے کہ اس نے سامراجی پیادوں کی آبیاری بھی کی ہے۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کو سماجی تحریکوں سے وابستہ کرنے اور مخالف سامراج عناصر کو بڑھاوا دینے میں جس شخص نے پہل کی ان کا نام محب حسن تھا۔ دُنیا کے بڑے انقلابی اور مخالف سامراج شیخ جمال الدّین افغانی سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔

محب حسن، نواب محسن الملک کی دعوت پر ۱۸۷۷ء میں حیدرآباد آئے۔ معتمدی مال میں مترجم کی حیثیت سے ان کی تعیناتی عمل میں آئی۔ لیکن اپنی اعلا صلاحیتوں کی بنا پر مختصر سی مدت میں انھوں نے یہاں کے صحافتی حلقوں میں ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔ اس تعلق سے قاضی عبدالغفار تحریر فرماتے ہیں کہ محب حسن۔ "اسی حیاتِ نو کا ایک پیغام تھے۔ جس نے جمال الدین افغانی کی مخالف سامراج آواز کو افغانستان، مصر و حجاز اور یورپ تک پہنچایا تھا۔" حیدرآباد میں مولوی محب حسن کی صحافتی، قومی، سماجی اور سیاسی زندگی کی ابتدا ۱۸۸۰ء میں ہوئی جب انھوں نے جمال الدین افغانی کی ایما پر ایک رسالہ "معلم شفیق" نکالنا شروع کیا اور اس کے دو سال بعد اسے ہفتہ وار میں تبدیل کردیا۔ لیکن اس وقت کی شاہی حکومت نے اس کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی پابندی عائد کردی اور اخبار بند ہوگیا۔ اس کے دس بارہ سال بعد ۱۹۰۴ء میں محب حسن نے "علم و عمل" کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس اخبار کو اس وقت کے کوتوال شہر نواب اکبر جنگ کی سرپرستی حاصل تھی۔ محب حسن کی صحافتی خدمات کے بارے میں قاضی عبدالغفا تحریر فرماتے ہیں کہ "۱۹۰۴ء کا زمانہ تمام ایشیا میں ایک انقلاب کا زمانہ تھا اور اس کا عکس اس اخبار کے صفحات پر نمایاں ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حیدرآباد میں وطن پرست صحافت کے معماروں کی

نیثیت سے مولوی محب حسن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

"رعیت" کے مدیر اعلیٰ ۔ نرسنگ راو صحافتی زندگی میں داخل ہونے سے قبل پیشہ وکالت سے وابستہ
رہے ہیں۔ ان کی اخبار نویسی کی ابتدا ۱۹۲۷ء میں ہفتہ وار "رعیت" کی اجرائی سے عمل میں آئی۔ لیکن درمیان
یں کچھ عرصہ کے لیے یہ ہفتہ وار بند کر دیا گیا اور اس کا دوسرا دور ۱۹۳۱ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء
تک یہ روزنامہ کی حیثیت سے جاری رہا۔ یہ زمانہ سیاسی حیثیت سے بہت ہی نامساعد حالات سے گزر رہا تھا۔
یوں کہ نرسنگ راو صاحب حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس اور آندھرا مہا سبھا جیسی سیاسی تنظیموں سے وابستہ
تھے اور یہ دونوں ادارے مخالف سامراج اور مخالف نظام شاہی تھے اس لیے اس کا پرتو اس روزنامہ
یں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ نرسنگ راو صاحب اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے قائل تھے کہ

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

۱۹۴۷ء کے ہیجانی دور میں جب "رعیت" کو بند کر دینا پڑا تو انھیں کے ایک ساتھی شعیب اللہ خاں
نے "امروز" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا لیکن ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن سے عین قبل کی حیدرآباد کی
عسکری قوتوں نے ان کا سفاکانہ قتل کر دیا اور یہ روزنامہ بند ہو گیا جو یقینی طور پر شاہی اقتدار کے خلاف تھا۔

قاضی عبدالغفار نے ۱۹۳۵ء میں جب روزنامہ "پیام" جاری کیا تو وہ صحافت کا بڑا تجربہ رکھتے تھے
، نہ صرف مخالف سامراج تحریکوں سے وابستہ تھے بلکہ قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیل چکے تھے اور انھوں نے
ولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الصباح" میں بھی نمایاں حیثیت
سے کام کیا تھا اور جب سامراجی حکام وقت نے ان دونوں اخباروں کو بند کر دیا تو انھوں نے "جمہور"
نکالنا شروع کیا لیکن بہت جلد ہی اس جریدے کو بند کروا دیا گیا۔ قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر محمد احمد انصاری
ایما پر حیدرآباد آئے تھے تاکہ ہندستان میں سامراجیوں کے ایک بڑے گڑھ میں شگاف ڈال سکیں اور
ہوں نے ابتدا ہی سے اس مسلک کو اپنایا اور آخر تک اس پر کاربند رہے اور انھیں مجبوراً ۱۹۴۷ء میں
یدرآباد سے فرار ہونا پڑا۔

قاضی صاحب کی صحافتی زندگی کا دور مطلق العنانی کا دور تھا اس دور میں صحافتی آزادی مفقود
ی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی بات شاہی کے خلاف یا کسی عہدے دار
خلاف اخبار میں شائع ہو جاتی تھی تو پولیس کا انسپکٹر اخبار کے اڈیٹر کو اپنے تھانے پر بلوا کر باز پرس کیا
تا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ قاضی صاحب کے ساتھ پیش آیا اور جب انسپکٹر پولیس نے ان کو طلب
تو انھوں نے پولیس اسٹیشن جانے سے انکار کر دیا۔ جب اس بات کی رپورٹ کوتوال وقت کو ہوئی تو
وں نے بذریعہ تحریر قاضی صاحب کو بلا بھیجا۔ جب یہ کوتوال شہر کے سامنے پیش ہوئے تو انھوں نے
ب اور تحکم کے ساتھ دریافت کیا کہ آپ نے اپنے اخبار میں فلاں خبر کیوں شائع کی ہے۔ اس پر قاضی صاحب
کہا کہ میں اس کے لیے آپ کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔ آپ میرا چالان کیجیے میں عدالت میں اس کا
ب دوں گا اور وہ کوتوال شہر کے اجلاس سے اٹھ کر چلے آئے۔ یہ واقعہ خود کوتوال شہر کے لیے نیا تھا
ن اس کے بعد سے پولیس کے رویہ میں صحافت کے تعلق سے نمایاں تبدیلی عمل میں آئی اور "پیام" میں
وہ خبر شائع ہونے لگی جو مخالف سامراج اور مخالف شاہی [illegible]

کی آبیاری میں روزنامہ "پیام" نے جو نمایاں رول ادا کیا ہے وہ حیدرآباد کی سیاسی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔

۱۹۴۴ء میں سر مرزا اسماعیل کی وزارت کے خاتمے کے بعد حیدرآبادی سیاست تین گروہوں میں بٹ چکی تھی ایک گروہ تو وہ تھا جو "وابستگان آصف جاہی خاندان" کہلاتا تھا جن کا وطیرہ ہر روز "کنگ کوٹھی" کا طواف کرنا تھا جنھیں صرف اپنے اقتدار کی فکر تھی تو دوسرا گروہ رضاکاروں کا تھا جن کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں پرچم آصفی لہراتا تھا جو بادشاہ کو مسلمانوں کے اقتدار کا مظہر قرار دیتے تھے مگر تیسرا گروہ قوم پرستوں کا تھا جو آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ اس تیسرے گروہ کی تائید کرنے میں "رعیت" اور "پیام" کا بہت بلند مقام تھا۔ ان روزناموں نے مخالف سامراج تحریکوں کو اس حد تک پروان چڑھانے میں مدد دی کہ آزادیٔ وطن کا پرچم بلند ہوا اور شاہی کا خاتمہ عمل میں آیا جو قوم پرست اور مخالف سامراج صحافت کی دین ہے ...

علی احمد فاطمی
DEPARTMENT OF URDU,
ALLAHABAD UNIVERSITY.

غزل کے نئے جہات

تبصرہ و تجزیہ

پروفیسر سید محمد عقیل اردو کے ان معدودے چند نقادوں میں ہیں جو بہ یک وقت مشرقی و مغربی اور قدیم و جدید ادب پر یکساں نظر رکھتے ہیں۔ ایک طرف اگر انھوں نے اردو مثنوی پر باقاعدہ کتاب لکھ کر کلاسیکی ادب پر اپنی گرفت کا اظہار کیا تو دوسری طرف نئی علامت نگاری جیسے موضوع پر صفحات رقم کرکے جدید ادب کے تعلق سے اپنی گہری واقفیت اور تنقیدی شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ ان کے مضامین کے مجموعے تنقید اور عصری آگہی اور سماجی تنقید اور تنقیدی عمل میں ہر طرح کے مضامین ہیں جو ان کی ہمہ جہتی اور وسیع النظری کے بہترین مظہر ہیں ان کی تازہ ترین کتاب غزل کے نئے جہات خالصتاً جدید ادب اور جدید غزل کے تعلق سے ایک غیر معمولی کارنامہ ہے جس میں نئی غزل سے متعلق رنگارنگ۔ مختلف النوع مضامین ہیں ایسے مضامین جن کا مطالعہ ان کی بصیرت کی غمازی تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی نئی نسل کے تخلیق کاروں کے تئیں ان کے خلوص و محبت کا بھی اظہار کرتا ہے کیوں کہ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ادب میں جب سے نسلوں اور عہدوں کی بات چل پڑی ہے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم نے خود ہی حدیں قائم کرکے تخلیق و تنقید کو صرف دو خانوں میں ہی نہیں کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ عقیل صاحب کے یہ مقالے ایسے تمام مفروضات توڑتے نظر آتے ہیں۔

آیئے اب مضامین کا جائزہ لیں۔

اس کتاب میں کل آٹھ مضامین ہیں جن میں ابتدائی چار مضامین غزل کی تدریس اور عملی تنقید نئی غزل کی زبان الفاظ کی داخلی اور خارجی دنیا۔ نئی علامتی غزل ان کے نسبتاً پرانے مضامین ہیں۔ لیکن موضوع کی انفرادیت اور یکسانیت کے پیش نظر ان مضامین کی شمولیت نئی غزل کی تاریخی و تنقیدی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اور ایک نیا لطف دیتی ہے اور ساتھ ہی عقیل صاحب کو اس بے بنیاد الزام سے بری بھی کرتی ہے کہ ترقی پسند نقادوں کی تنقید موضوعاتی سطح پر انتشار کا شکار رہی ہے۔ ان میں موضوعاتی وحدت اور یکسانیت کم رہی ہے۔ کتاب کے آخری چار مضامین غزل کی بدلتی ہوئی سماجیات۔ پریم چند گفتگو عوام سے ہے۔ نئی غزل کا بدلتا ہوا رنگ اور اکیسویں صدی میں۔ ایک اندازہ بالکل نئے مضامین ہیں جو پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون غزل کی تدریس اور عملی تنقید عقیل صاحب کے علم و آگہی اور ان کی تدریسی تجربات کا وہ عطر ہے جسے انھوں نے ایک عمر گزارنے کے بعد اپنے وجدان میں بسایا ہے۔ یہ مضمون بظاہر دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ غزل کی تدریس کے عملی و علمی تجربہ پر ہے دوسرا عملی تنقید سے متعلق ہے لیکن سچ یہ ہے کہ دونوں کا تعلق عملی تنقید سے ہی ہے جس طرح آئی۔ اے۔ رچرڈس کے عملی تجربے، شاعروں کا ایک

[illegible] روایت [illegible] غزل

[illegible] میں [illegible] اپنے معیار و مذاق کے اعتبار سے [illegible] ہے اس

دوسرے حصے میں عقیل صاحب کا اپنا علم اور ذوق بولتا ہے تو پہلے حصے میں ان کی فکر اور استادانہ [illegible] زبان و بیت کے اعتبار سے دلچسپ اور منفرد ہے۔

دوسرا مضمون 'نئی غزل کی زبان' ہے جو صرف اس کتاب کا ہی نہیں بلکہ نئی غزل پر لکھے ہوئے چند مضامین میں سے ہے جس میں غزل کی بدلتی ہوئی لسانی اور اسلوبیاتی تہذیب کو سماج اور معاشرے [illegible] ہوتے رنگ کے ساتھ بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غزل بقول عقیل صاحب close c[illegible] کا فن ہے اور اس میں زبان کو ایک ایک حرف کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ایسی [illegible] زبان حرف وصوت ایمجیری کی متبدل ہیئتوں اور ان کی نزاکتوں پر اس سے اچھی بحث [illegible] گئی ہے۔

الفاظ کی داخلی اور خارجی دنیا عقیل صاحب کے چند ایسے مضامین میں سے ہے جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے [illegible] غیر معمولی تنقیدی شعور اور تاریخی اور سماجی بصیرت کا اظہار کریں گے۔ شاعری میں استعمال ہونے [illegible] الفاظ اپنے پس منظر میں کس کس طرح کے تاریخی اشارے، سماجی واقعات پوشیدہ رکھتے ہوئے اپنے [illegible] معنوی تہداریاں رکھتے ہیں کہ جن کو اور جن کی تہذیب کو سمجھے بغیر شعر کی تفہیم ممکن ہی نہیں۔ تنقید و [illegible] کے اس مشکل عمل کو عقیل صاحب نے جس عرق ریزی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ [illegible] کو اس کام و احترام اس وقت ملتا رہتا ہے جب وہ قدم قدم پر شعری حوالے پیش کرتے ہیں [illegible] ہر دور کا سماج اور اس کی تہذیب بولتی نظر آتی ہے۔ مزید تقویت کے لیے وہ انگریزی ادیبوں اور [illegible] وں کے حوالوں سے اپنی بات مکمل اور مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔ عقیل صاحب کا یہ مضمون ان کے [illegible] ادراک اور شعری فہم کا زبردست مظہر تو ہے ہی ساتھ ہی ان کی تاریخی معلومات، سماجی شعور اور [illegible] ادب کے وسیع مطالعہ کا خوبصورت اظہار بن کر سامنے آتا ہے۔ چوں کہ مضمون ایک خاص نہج اور [illegible] سے لکھا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے نظریہ سے ان کا دوست بھی اختلاف کرتے لیکن ان کی علمیت [illegible] ف تو ان کا دشمن بھی کرے گا۔

اگلا مضمون 'نئی علامتی غزل' ہے چونکہ یہ مضمون ان کی کتاب نئی علامت نگاری سے ماخوذ ہے اور [illegible] پہلے ہی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ اس پر خاطر خواہ تبصرے بھی ہو چکے ہیں اس لیے اس پر [illegible] کرنا مناسب نہیں۔

غزل کی بدلتی ہوئی سماجیات میں وہ میر۔ درد۔ سودا۔ ناسخ۔ شاد وغیرہ سے لے کر جذبی۔ مجروح۔ مجاز۔ [illegible] وزیر آغا۔ ساقی فاروقی۔ ظفر اقبال۔ نشتر خانقاہی۔ باقر مہدی وغیرہ جیسے جدید شاعروں میں [illegible] سماجی تبدیلیاں کس کس طرح شعری اظہار کا ایک رویہ اور شاعرانہ تہذیب کی صورت اختیار کرتی [illegible] ہیں مدلل بحث کی ہے۔ مثلاً ؂

صبح پیری شام ہونے آئی میر　　تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا　　میر

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا　　تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے　　فیض

یکس کے ہوسے نئے شہر چلے   سپرمارکیٹ اور مکاں کیسے کیسے   باقر مہدی

ان اشعار کا سرسری مطالعہ توان کو باہم الگ نہیں کرتا لیکن سنجیدہ قاری یا ناقد کا عمیق مطالعہ ان اشعار کے پیچھے ان کے دور کی روح تک پہنچتا ہے۔ اس دور کے سماج کی مسرتیں اور اذیتیں تلاش کر لیتا ہے جو لاشعوری طور پر شاعر کے وجدان سے لیکر شعری تخلیقی منزل تک انتہائی خاموشی سے اپنا سفر طے کرائی ہے۔ یہ خاموش اور کبھی چیختی ہوئی تبدیلی کس طرح شاعر کی نفسیات اور شاعری کی لفظیات و اسلوبیات کے پیمانے بدل دیتی ہے اس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

"پر مجھے گفتگو عوام سے ہے"، میر کے اس مصرع کو عنوان بنا کر میر کے ہی حوالے سے غزل میں تلخ و شیریں عوامی تجربات۔ عوامی زندگی کے کیف وکم اور عوامی درد میں شرکت اور روزمرہ کی عوامی زندگی سے متعلق اچھے اچھے گوشے اٹھائے ہیں۔ غزل۔ غزل گو دونوں کی نزاکتیں عالمی شہرت رکھتی ہیں پھر میر جیسا شاعر جو عام آدمی سے بات کرنا پسند نہیں کرتا کہ اس کی زبان خراب ہو جائے گی اور یہ رقیہ عام زندگی میں ہے لیکن وہی شاعر جب شاعری کرتا ہے تو اپنا نقطۂ نظر اس طرح ظاہر کرتا ہے ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے تعلق سے یہ ایک عجیب تضاد ابھرتا ہے۔ اس تضاد کو عقیل صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہتے ہیں ؎ " ایک طرف وہ بد دماغی، عامۃ الناس اور عمائدین سے دور رہنے کی کوشش، دوسری طرف یہ عوامی تجربے۔ زندگی کے پُرکیف وکم میں ڈوب جانے کی تمنا۔ انقلاب زمانہ سے انتباہ اور پھر اپنے اشعار کو شعر شور انگیز بنانے کی خواہش۔ یہ بوالعجبی حیرت انگیز بھی ہے، حیران کُن بھی اور تفتیش طلب بھی۔" ص ۱۳۶۔ عقیل صاحب نے اس مقالے کی ابتدا میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی نفسیات کو پیش کرکے لاشعوری طور پر عوام سے فطری وابستگی دکھا کر غزل اور غزل گو کی وسعتِ فکر کا اظہار تو کیا ہی ہے ساتھ ہی وہ اپنی نظریاتی وسعت کا بھی اظہار کرتے چلتے ہیں۔ غزل کو عام طور پر اوپری طبقہ کی شے سمجھا گیا ہے جبکہ یہ پورے طور پر سچ نہیں ہے۔ اسے عوامی ثابت کرنے میں عقیل صاحب کامیاب تو ہیں ہی ساتھ ہی وہ اپنی ترقی پسندانہ اور عوامی اپروچ کا پتا بھی دیتے رہتے ہیں۔

نئی غزل کا بدلتا ہوا رنگ میں بھی غزل کا بڑھتا ہوا سفر، بڑھتے ہوئے قدم دکھائے گئے ہیں لیکن ہر ہر قدم پر غزل کو کس کس قسم کی تبدیلیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس مضمون میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ کون کون سے نئے خیالات، اصطلاحیں غزل کے احاطے میں داخل ہو رہی ہیں اور غزل انھیں کس طرح ASSINALATE کرتی چل رہی ہے کہاں پر REJECT اور کہاں پر ACCEPT کرتی چل رہی ہے اس کی طرف بھی اشارے ہیں مثلاً ہجرت۔ دربدری۔ واقعۂ کربلا کی اشاریت۔ بڑے شہروں کی ہنگامیت پر اچھی بحثیں ہیں اس مضمون کے آخر میں ایک اچھی بحث غزل کی بدلتی ہوئی جمالیات پر ہے۔ جمالیات کا روایتی تصور۔ بدلتا ہوا تصور۔ فراق صاحب کے خیالات غرضکہ نئی غزل اور نئی جمالیات پر معنی خیز اور کارآمد بحثیں ہیں اردو کے بالکل نئے شعرا کی مثالیں دیتے ہوئے اردو شاعری کی نئی جمالیات کس کس طرح کے نئے الفاظ، نئے پیکر اور نئی اصطلاحیں تلاش کی ہیں اور کس طرح محسوساتی عمل میں قدیم اور جدید جمالیات

باہم متصادم ہے اور نئی جمالیات ایک نئی دُنیا اور ایک نئی حیثیت سے دوچار ہو رہی ہے اس کی ایک اچھی جستجو ہے اور شاید اچھا تجزیہ بھی۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"نئی جمالیات میں اندرونی احساس سے سب کچھ انفرادی تجربوں کے اجتماع کے باعث وجود میں آتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بیرونی حالات اور ماحول کہیں کہیں اس اندرونی احساس کو سہارا دیتے ہیں اور یہ صورت سماجی تجزیوں سے ذہن پر منتقل ہوتی ہے پھر اندرونی احساس اور مظاہر حسن ایک طرح کا آمیزہ بن کر فکری اظہار کی سطح پر اُتر آتے ہیں اُن میں جنسی جبلت SE INSTUICT کی حیثیت صرف زیریں لہروں جیسی ہوتی ہے جو جمالیات کا اصل دھارا نہیں بنتی ہیں بس نئی غزل کا یہی نیا جمالیاتی تجربہ معلوم ہوتا ہے۔" ص ۱۹۴

اس کتاب کا آخری مضمون "غزل اکیسویں صدی میں ایک اندازہ"، جس کی ابتدا میں ہی کہہ دیا گیا۔ "یہ ابھی سے کون کہہ سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو غزل کی کیا صورت ہوگی"؛ ظاہر ہے کہ غزل کا مخصوص مزاج، بدلتے ہوئے تیور، بڑھتے ہوئے قدم۔ امکانات اور اندیشوں کو دیکھتے ہوئے صرف قرائن ہی پیش کیے جا سکتے ہیں اور اس مضمون میں جا بجا قرائن ہی پیش کیے گئے ہیں۔ اپنی دور بینی اور دوراندیشی کی بنیاد پر عقیل صاحب اکیسویں صدی کی غزل گوئی کا صرف ایک اندازہ لگاتے ہیں کہ آج کے ہنگامی حالات میں غزل کی "تحریم" اور اس کا بنیادی کردار کہاں تک باقی رہ سکے گا۔ یہ خیال اس لیے بھی کہ سائنسی زندگی کے اثرات و نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ نہ صرف پُرانی تہذیب اور قدریں بدل رہی ہیں بلکہ عشق و محبت کے تعلق سے پرانی تمام داستانیں بدل رہی ہیں مزاجِ عشق۔ طریقۂ عشق اور تصورِ عشق بدل رہا ہے تو ایسی صورت میں اکیسویں صدی میں غزل کا مزاج اور اس کا تغزل کیا ہوگا! اس طرح کے کچھ اچھے معنی خیز سوالات عقیل صاحب نے اٹھائے ہیں جن میں بیشتر کے جواب بھی (قرائن کی حد تک) انھوں نے دیے ہیں۔ عقیل صاحب نے غزل کے لیے عشق۔ جذبات اور احساسِ غم جیسی چیزوں کو ضروری سمجھا ہے اور کہیں "جنوں صفاتی" کو اہمیت دی ہے اور یہ ساری چیزیں بدلتے ہوئے سماج اور سائنسی و اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی شکل و صورت بدلیں گی تب ایسے میں غزل کا کیا روپ بنے گا یہ ایک سوال ہے جس نے عقیل صاحب جیسے سنجیدہ ناقد کو پریشان کر رکھا ہے اور وہ اس پریشانی میں غزل کے تمام شائقین کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اسی مضمون میں بعض مقامات پر کچھ ایسے جملے، فیصلے آگئے ہیں جن پر نیا غزل گو بطورِ خاص بحث کر سکتا ہے مثلاً "نئی غزل کا تغزل کچھ ہے ہی نہیں! "نئی نسل کے تغزل کی پہچان کیا ہے؟ "نئی نسل معشوق کی عشوہ طرازیوں سے شاید رشتہ توڑ لے پھر غزل کے لیے کیا رہ جائے گا؟ ان سوالوں کو اٹھانے کے بعد انھوں نے اپنے مضمون میں ایسے اشعار کی مثالیں دی ہیں جن میں تغزل یا ترنم نہیں ہے جس کی وجہ سے پروفیسر محمد حسن صاحب جیسے دوست اور نقاد کو یہ کہنا پڑا کہ عقیل صاحب کو خراب شعر زیادہ یاد رہتے ہیں حالاں کہ ان اشعار سے ذرا قبل عقیل صاحب نے اسی نسل کے بعض ایسے شاعروں کے اشعار پیش کیے ہیں جن میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو عقیل صاحب غزل کے لیے یا نئی غزل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تجربے اور صلاحیت کی بنا پر اچھے اور بُرے اشعار ہر دور میں کہے جاتے رہے ہیں۔ کل کے بُرے شعر اپنا وجود کھو چکے ہیں اسی طرح آج کے بُرے شعر کل ختم ہو جائیں گے یا نہیں ختم ہوں گے تو کس صورت میں یاد کیے جائیں گے ابھی سے

نہیں کہا جا سکتا۔ عقیل صاحب ایسے نقاد ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے اور غزل کی تمام جہتوں پر اُن کی گہری نظر ہے اسی لیے وہ اپنی بات کو تقویت پہنچانے کے لیے ہر طرح کے شعر پیش کرتے جاتے ہیں۔ غزل کے تمام جہتوں کو پیش کر دینا اور پھر اس میں صحت مند آثار تلاش کرنا، زندہ رہنے والی روایات سے اس کے رشتے استوار کرنا یہ ایک اچھے نقاد کا کام ہے۔ اور یہی کام عقیل صاحب نے نہ صرف اس مضمون میں بلکہ پوری کتاب میں کیا ہے۔
اب اس کے باوجود قارئین کو ان کے نظریات۔ طریق فکر اور تنقیدی عمل سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کا حق سنجیدہ قاری اور اس سے بھی زیادہ ان غزل گویوں کو بہر حال ہے جن کے اشعار بطور تعریف یا تنقیص پیش کیے گئے ہیں۔ کوئی چاہے تو ان سے یہ سوال بھی کر سکتا ہے کہ انھیں کے تنقیدی روّیے اور نظریے کے مطابق جب نیا سماج آئے گا تو اسے یہ حق بھی ہے کہ وہ اپنے نئے تجربے بھی لائے۔ یہ تجربے عشقیہ زندگی کے بھی ہو سکتے ہیں اور ایک عام زندگی کے بھی اور ان تجربوں میں یہ ضروری نہیں کہ غزل کی وہ ساری نفسیات شامل ہو جو اس کی تاریخ میں ملتی ہے۔ ایسی صورت میں تجربے۔ لفظیات اور تجربوں کا اس سماجی سطح سے کیا ہوا مزاج جس سے نئے شاعر کا سماج گزر رہا ہے جب آئے گا اب اس میں غزل کی وہ کلاسیکیت باقی رہتی ہے یا منتشر ہو کر ایک نیا فریم ورک اپنے لیے بناتی ہے شاید نئے شاعر کا یہ اپنا روّیہ ہوگا اور اس کا حق اسے ملنا بھی چاہیے۔ غزل کے نقاد پرانے اور نئے سب اس سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن زندگی کی بدلتی ہوئی صورتیں بھی اپنا اعلان کرتی رہیں گی
پروفیسر سید محمد عقیل ترقی پسند نقاد ہیں۔ زندگی۔ سماج اور ادب کے تئیں متبدل ہیئتوں اور صداقتوں کا انھوں نے ہمیشہ استقبال کیا ہے اسی لیے وہ تمام صحت مند تبدیلیوں کا بھی استقبال کرتے ہیں۔ غزل کا بدلتا ہوا رنگ بھی انھیں منظور ہے لیکن کہیں کہیں پرانی قدروں کی پاسداری بھی انھیں عزیز ہے۔ غزل کی کلاسیکیت، قدیم لب و لہجہ۔ حسن و عشق کی بجھتی ہوئی چنگاریاں اور بدلتی ہوئی شرافت اور حرمت پر پسِ پردہ وہ کفِ افسوس بھی ملتے نظر آتے ہیں کہ بہر حال وہ اس نسل کے نقاد ہیں جہاں غزل نے کلاسیکیت کا لباس اُتار کر پہلے ترقی پسند شاعروں کی برہمی اور برہنگی دیکھی پھر جدید شاعروں کے تجریدی علائم کے سیاہ لباس بھی دیکھے ہیں اور غزل کا اصل کردار اور چہرہ مسخ ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ وہ غزل کو حسن ہزار شیوہ، جمال و جلال کی نزاکتوں و لطافتوں کا بہترین مظہر مانتے ہیں ساتھ ہی زندگی کی رعنائیاں۔ تنہائیاں اور جلوہ سامانیوں کے اظہار کا آلۂ کار بھی۔ وہ تہذیب و ادب کے اس دوراہے پر کھڑے ہوئے نقاد ہیں جو نیا راستہ اپنانا بھی چاہتا ہے ساتھ ہی اپنی پرانی ڈگر چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ یہ سب باتیں وہ براہِ راست نہیں کہتے ان کے مضامین کے بطن سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ عقیل صاحب کا یہ احساس کہیں کہیں ان کے فکر و شعور کا فطری اظہار بن کر سامنے آتا ہے اور کہیں احساس و ادراک کے حوالے سے سائنسی خیالات کا مظہر بنتا ہے کہیں وہ ناسٹالجیا کا شکار ہوتے ہیں، کہیں ایک بزرگ، مشفق استاد اور ناقد کی حیثیت سے نئے غزل گویوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور خوشگوار تبدیلیوں کا استقبال کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی پیٹھ ٹھونکتے اور شاباشی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عقیل صاحب کے دل کی یہ کسک اور ذہن کا یہ فطری روّیہ ان کا اپنا ذاتی ہے لیکن ان سب پر علم و فضل اور صحت مند نظریہ کی ایک ایسی گہری چھاپ ہے کہ جس سے پرانی غزل

اور نئی غزل کے باہمی اشتراک و اختلاف۔ تال میل اور افہام و تفہیم کے نئے نئے گوشے وا ہوتے ہیں۔

نئی غزل کے مختلف گوشوں اور رجحانات پر لکھے گئے یہ مضامین اکثر ایک دوسرے سے بہت قریب اور ملتے جلتے نظر آتے ہیں لیکن بغور ان کا مطالعہ کیا جائے تو قاری کی باریک نگاہ اس کی گہرائی و گیرائی فرق اور مسائل کو سمجھ لے گی اور ساتھ ہی نئی غزل اور غزل گویوں سے متعلق ان کے خلوص کو قدر کی نگاہوں سے بھی دیکھے گی کہ ایک سینیر نقاد نے جونیر شعرا کی غزلیہ شاعری کو اتنے قریب اور اتنے خلوص سے دیکھا پرکھا ہے۔ غزل کے نئے جہات نئی غزل اور اس کے جہات اور رجحانات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایک غیر معمولی کتاب ہے جسے نئے شاعروں اور طالب علموں کو تو پڑھنا ہی چاہیے ساتھ ہی ان بزرگوں کو بھی پڑھنا چاہیے جو کلاسیکیت اور جدیدیت دونوں کو مجرد اور متشدد انداز میں لیتے اور لادتے ہیں جو غزل میں سمائی اور بدلتی ہوئی صورتوں کو صرف اسلوب و آہنگ۔ زبان و بیان اور حرف وصوت کے حوالے سے ہی پہچاننے کی ناکام اور محدود کوشش کرتے ہیں۔ یہ مضامین اسلوبیاتی۔ تجزیاتی اور عملی تنقید کا خوشگوار مرکب تو ہیں ہی ساتھ ہی صالح ترقی پسندی اور معقول جدید تنقید کا بے مثال نمونہ پیش کرتے ہیں ...

انور خاں
48/22,sk.b.Qamruddin St.,
BOMBAY-400008.

سریندر پرکاش کے افسانے

۱۹۶۸ء میں سریندر پرکاش کی کتاب 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' شائع ہوئی تو بڑا شدید ردّ عمل دیکھنے میں آیا۔ کچھ قارئین اور نقادوں نے سریندر پرکاش کو اس دور کا بہترین افسانہ نگار قرار دیا۔ کسی نے مصنف کو نمائشی قسم کے ادیبوں میں شامل کر دیا کہ وہ 'بلقارس' جیسے افسانوں سے لوگوں کو چونکانا چاہتے ہیں۔ کسی کو شکایت تھی کہ ان کے افسانوں میں زبان و بیان کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بیدی کے مجموعے 'اپنے دکھ مجھے دے دو' (۱۹۶۵ء) کرشن چندر کے مجموعے 'سپنوں کا شہزادہ' (۱۹۶۴ء) پر گفتگو چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ اگر آپ قرۃ العین حیدر کی کتاب 'پت جھڑ کی آواز' (۱۹۷۰ء) کو بھی شامل کر لیں تو یہ ردّ عمل غلطی نہیں معلوم ہوگا یعنی تقریباً وہی صورت حال تھی جو انتظار حسین کی کتاب 'شہر افسوس' اور سریندر پرکاش کی کتاب 'بازگوئی' کے ساتھ اگر آپ ساجد رشید، عبدالصمد یا انور قمر کے افسانے پڑھیں تو محسوس ہوگی۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کتاب میں دو افسانے 'دوسرے آدمی ڈرائنگ روم' اور 'رونے کی آواز' ایسے افسانے تھے جو آج بھی ایک نئے طرزِ احساس اور بیان کا پتا دیتے ہیں۔ یہ دو افسانے بلاشبہ اب ہمارے ادب میں سنگِ میل کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان دنوں انتظار حسین، انور سجاد، میرزا اور خالدہ حسین کے افسانوں کے ساتھ ان افسانوں پر بڑے زوروں کی بحث جاری تھی جیسے آج نئے ادیبوں پر چل رہی ہے اور کچھ ایسا ہی ردّ عمل تھا جیسا آج نئے افسانوں کے تعلق سے ہے۔

" دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" میں چودہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ابھی تشکیلی دور میں ہے۔ وہ ایک نئے اسلوب کی تلاش میں ہے۔ رفتہ رفتہ اپنی نثر کے آہنگ، موضوعات اور اندازِ بیان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شاید انھوں نے بہت جلد اپنا اسلوب دریافت کر لیا ہوتا اگر صحیح یا غلط بلراج مین را سے حریفائی کا احساس ان کی جان کا روگ نہ بن جاتا۔ اس مجموعے کے افسانوں میں جگہ جگہ مین را ان کے اور کہانی کے درمیان آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'منادی' ایک بہت اچھا افسانہ ہوسکتا تھا اگر کہانی لکھتے وقت وہ مین را کو بھول گئے ہوتے۔ کہانی کا نصف حصہ وہ لکھ چکے ہیں۔ اپنی پہلی نشست میں انھوں نے کہانی کے مرکزی کردار

کو خاصا ڈیولپ کر دیا ہے۔ شام کو ان کی ملاقات کافی ہاؤس میں مین راسے ہوتی ہے اور اُن کا نٹ کھٹ چنچل ذہن کہانی کو ایک نئے انداز سے آگے بڑھانے کی سوچ لیتا ہے۔ چنانچہ یہ پیراگراف دیکھیے:

"....اس رات میں نے خوب پی رکھی تھی۔ اور نشے کی وجہ سے ہر چیز میں گہرائی بڑھ گئی تھی۔ جس دوست کے ساتھ بیٹھ کر میں نے پی تھی وہ ایک "ادبی آدمی" تھا۔ دبلا، پتلا، منحنی سا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ کبھی کبھی مجھے گمان ہونے لگتا کہ شاید وہ روح ہی روح ہے۔ اور جسم ابھی اسے ملا نہیں ہے اور نہ جانے کب یہ روح جسم کی تلاش میں فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ ایک بار میں نے اس سے مذاق میں پوچھ لیا کہ بھئی تمھارا جسم کہاں ہے؟ تو وہ تن گیا اور بولا، جانتے نہیں میں جدید ترین ادیب ہوں۔ میرے وجود کا تعلق ذہن سے ہے جسم سے نہیں!" چونکہ وہ ادیب تھا۔ سماج کی ذہین ترین جنس اس لیے اس کا ایک نظریۂ حیات ہونا بہت ضروری تھا۔ اور ایک مخصوص رویہ بھی۔"

اس طرح کہانی آگے بڑھتی ہے۔ پھر ایک بار پھر منادی کا ذکر آتا ہے جو بیمار ہے۔ کہانی کے آخر میں مصنف کا دوست پھر کہانی میں داخل ہوتا ہے۔ ٹی ہاؤس میں اجینت پر گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے تو افسانہ نگار کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی ڈمرو لے کر بجانے لگے گا۔

دونوں کردار اس قدر مختلف ہیں کہ کہانی بالکل غیر متوازن ہو گئی۔ کرم سنگھ یعنی منادر کا معصوم کردار اس قدر خوبصورت ہے کہ ایک یادگار کردار بن سکتا تھا۔

'رونے کی آواز' اور 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' کے بعد سریندر پرکاش نے اپنا انداز پالیا۔ دیو مالائی عناصر ان دنوں ان کی کہانیوں میں کم تھے۔ یہاں انھیں انتظار حسین سے مدد ملی جیسا کہ روزنامہ جنگ کے ایک انٹرویو میں انھوں نے اعتراف کیا کہ کلچر اور اس کی شاخوں کو جاننا کتنا ضروری ہے یہ انھوں نے انتظار سے سیکھا۔ گودو کے انداز میں پہلے جیسی ژاں لکھی، پھر برف پر مقالہ اور جنوز العزیم شائع ہوئے۔ ان کہانیوں میں ذاتی متھ بنانے کی بہت اچھی کوشش ملتی ہے۔ خوبصورت نرم، گداز، نغماتی نثر، تحیر کا عنصر اور سماجی و سیاسی سیاق اور معمولی چیزوں کو گھما پھرا کر بیان کرنے کے انداز نے کہانیوں کو ایک انفرادی رنگ دے دیا جو سریندر پرکاش سے مخصوص ہے۔ اس مجموعے کے بعد ان کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں جیسے 'مردہ آدمی کی تصویر'، 'سم باڈی'، 'ڈیڈ باڈی'، 'نو باڈی' اور 'کٹا ہوا سر'، یہ ساری کہانیاں ان کی ذہانت کی نذر ہو گئیں۔

'بجوکا' اور 'بازگوئی' سے سریندر پرکاش کی افسانہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں فکر کا غلبہ زیادہ ہے، چونکانے کی کوشش کم۔ ذہن جو انوکھے پن کی کوشش میں دھندلا گیا تھا اب واضح ہو کر سامنے آتا ہے اور ایک نئی میچوریٹی کا پتا دیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نئے افسانہ نگار جو تکنیک اور انوکھے پن کے بجائے فکری رویے پر زور دے رہے تھے۔ افسانوی منظر نامہ بدلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اگرچہ ابھی تک ان کی اپنی نمایاں تخلیقات زیادہ تعداد میں سامنے نہیں آئی تھیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ قاری کم از کم

بڑھے لکھے قاری تک اُن کی بات ضرور پہنچنی چاہیے۔ یہاں میرا ادبی منظر نامے سے غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اسلوب جو اُن کی شناخت تھا اس نئی فضا میں کوئی اثر مرتب کرنے سے قاصر تھا۔

'بازگوئی' سریندر پرکاش کی سب سے اچھی کتاب ہے۔ دوسرے مجموعوں کی طرح اس میں بھی کئی بہت خوبصورت کہانیاں ہیں اور کئی اوسط درجے کی۔ بازگوئی کا جمنورہ الفریم، رُک جاؤ، ساحل پر لیٹی عورت اور چھوڑا ہوا شہر، ان کے مخصوص اسلوب کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ ان میں سریندر پرکاش کا فن عروج پر ہے۔ ایلو پیشیا، سرنگ، آرٹ گیلری اور سرکس اس مجموعے کی کمزور کہانیاں ہیں۔ سب سے پہلے ہم جمنورہ الفریم کو چنتے ہیں کیونکہ اس کہانی میں ہمیں وہ تاریخی شعور اور وژن صاف طور سے نظر آتا ہے، جو ان کی تمام کہانیوں میں پس منظر کا کام کرتا ہے۔

اس کہانی کے تین کردار ہیں۔ نوتیج جس کی زبانی کہانی کہی جا رہی ہے۔ حامد مرزا اور بربل کمار کہانی ایک کنویں کے ذکر سے شروع ہوتی ہے جو دو ہزار ایک برس پرانا ہے۔ کنواں دلدل سے بھرا ہوا ہے۔ نہ کوئی اس میں جاسکتا ہے، نہ اس میں سے کچھ برآمد ہوسکتا ہے۔ کنواں ایک آسان سا سمبل ہے ماضی کا۔ یہ بات کہ کنواں اٹا ہوا ہے بربل کمار نے بتائی ہے۔ حامد مرزا نوتیج سے کہتا ہے کہ اس میں بربل کمار کی بات کا یقین نہیں کرنا چاہیے۔ اور خود جا کر دیکھنا چاہیے کیونکہ دلدل سے اٹا ہوا کنواں ہماری زندگیوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک رات تینوں کنویں پر جاتے ہیں۔ وہاں انھیں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص نظر آتا ہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے وہ شخص کنویں کی منڈیر پر چڑھتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے گویا کنویں میں سیڑھیاں بنی ہوں۔

اگلے روز وہ آدمی انھیں چائے خانے میں ملتا ہے۔ یہ لوگ اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ وہ اس کنویں کی طرف بڑھتا ہے اور ان کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کنویں پر چڑھتے ہیں تو وہ بالکل عام سا کنواں نظر آتا ہے جس میں نیچے اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ انھیں حیرت ہوتی ہے۔ بہر حال کنویں میں سے اس شخص کے ہنسنے کی آواز برآمد ہوتی ہے اور پھر اس کا ایک ہاتھ جس کی شکل بھیڑیے کی تھوتھنی جیسا ہے باہر نکلتا ہے اور انھیں کنویں میں لے جاتا ہے۔ یہ ایک ایک سیڑھی اترنے لگتے ہیں اور ان کے نتھنے عجیب سی بو سے بھر جاتے ہیں۔ ان کے ذہن ماؤف ہونے لگتے ہیں اور وہ خود کو ماضی کے اس لمحے میں پاتے ہیں۔ جب وہ تینوں ایک ہی انسانی جمعیت کے افراد تھے۔ انھیں پیشوں میں بانٹا جا رہا تھا۔ پھر انھیں تین مختلف قبیلوں میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ الگ ہو گئے یہاں تک کہ ایک دوسروں کے نام تک بھول گئے۔

اب مصنف تہذیب کا مزیدار تقابیان کرتا ہے۔ نوتیج جس قبیلے میں ہے اُس کے سردار کا نام جبارا ہے۔ وہ مختلف لوگوں کو ان کے کام تفویض کرتا ہے۔ بلفارمس کے کہنے پر نوتیج کو تحریر کا کام سونپا جاتا ہے۔ جس کا مقصد قبیلے کی تاریخ لکھنا ہے۔ جبارا کی مورتی بنائی جاتی ہے اور

اس کی پوجا ہونے لگتی ہے ۔ ایک دن پروہت کا کمہار سے کچھ چھوٹے موٹے دیوی دیوتاؤں کی مورتی کی خرید پر تنازعہ ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ پروہت کم دام دینا چاہتا ہے ۔ پنچایت میں اس کا فیصلہ نہیں ہو پاتا تب تلقارمس جبارا کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب لوگ کھلے میں ایک ساتھ رہتے ہیں ۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں ۔ ان سب کا مفاد سانجھا ہے ۔ اگر سردار رہنا چاہتے ہو تو انھیں گھروں میں تقسیم کر دو ۔ ان کے گرد دیواریں کھڑی کر دو ۔ حفاظت کے نام پر ان کے سروں پر چھت جتا کر دو ۔ انھیں اپنی عورتوں کے ساتھ تنہائی میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر مباشرت کرنے پر اکساؤ ۔

اس طرح لوگ پہلے پیشوں میں اور پھر گھروں میں بٹ جاتے ہیں ۔ اس کے بعد دوسرے قبیلے کے لوگ حملہ کر کے انھیں غلام بنا لیتے ہیں ۔ تلقارمس کے اشارے پر حملہ آور قبیلے کا سردار ان کے قبیلے کی ایک خوبصورت عورت سے شادی کر لیتا ہے تاکہ دونوں قبیلے ایک ہو جائیں ۔ ان سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ حامد مرزا سے مشابہ ہے ۔ یہ لڑکا سردار کو قتل کر دیتا ہے ۔

تینوں کنوئیں سے باہر آتے ہیں ۔ اب تینوں کو اپنے نام یاد آ جاتے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت لمبا فاصلہ پیدا ہو گیا ہے ۔

کہانی وہی ہے ، وحدت آدم کی کہانی کہ تمام انسان ایک ہیں ۔ وقت نے انھیں مختلف قبیلوں ، مذہبوں ، پیشوں ، رنگوں اور نسلوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔ موضوع نیا نہیں لیکن سریندر پرکاش کے افسانوں میں وہ ایک اچھوتے ڈھنگ سے آتا ہے ۔ یہ اس کی فکر کا بنیادی پتھر ہے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم اور رونے کی آواز سے لے کر خواب صورت اور آدمی تک یہی فکر جاری وساری ہے ۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں ماضی کی کئی ہزار سال کی تاریخ بولتی ہے لیکن ان کے افسانے واقعات کی کھتونی نہیں بنتے ۔ وہ معلومات کا بکھان نہیں کرتے ۔ نہ ہی قاری پر رعب جھاڑتے ہیں ۔ کہیں کرداروں کے نام کسی واقعے کے سرسری ذکر یا کسی تلمیح کے سہارے وہ اپنی بات کہہ جاتے ہیں ۔ اس طرح کہ افسانے کا فریم جو بظاہر حال سے جڑا ہوا ہے سالم رہے اسے دھکا نہ پہنچے ۔ اس طرح اُن کی کہانی کا حوالہ کسی مخصوص عہد یا تہذیب کا نہ رہ کر انسانی تہذیب کے پورے سفر سے جڑ جاتا ہے ۔ اور ان کے افسانوں کو ایسی بنیاد عطا کرتا ہے جو کہانی کو ایک بلند معیاری سطح دینے میں معاون ثابت ہوتی ہے ۔ ایک معمولی کردار موضوع یا واقعہ بھی بہت اہم ہو جاتا ہے ۔ پرانوں سے انھوں نے یگ یگ کی کتھائیں کہنی سیکھیں لیکن ساتھ ہی وہ حال کے بھی افسانہ نگار ہیں وہ اس وقت بیت رہا ہے ، صدیوں پہلے بھی بیت چکا ہے ۔ جو صدیوں پہلے بیت چکا ہے وہ اس وقت گھٹ رہا ہے ۔ اس طرح ان کے افسانوں میں ایک اور سمت (DIMENTION) آ جاتی ہے ۔ اس سے ہمارا ذہن جو صدیوں کے پھیلاؤ میں سوچنا چاہتا ہے تشفی حاصل کرتا ہے ، ایک گڑ بڑ البتہ اس طرح یہ ہوتی ہے کہ آج ہمارے سماج میں جو ناانصافیاں ہیں ، برائیاں ہیں ان کے خلاف ہمارا غصہ کم ہو جاتا ہے ۔ بحیثیت ایک افسانہ نگار وہ یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ

یہ ان کا کام نہیں لیکن بہرحال یہ نقصان ہے تو سہی۔ 'بازگوئی'، 'بجوکا' اور 'ایلوپیشیا' میں البتہ ان کا سیاسی شعور پوری طرح حاوی ہے اور کھل کر آیا ہے۔

افسانہ 'خواب صورت' ان کے انداز فکر کے ایک اور پہلو کو واضح کرتا ہے۔ اس کے بنیادی کردار فاطمہ، رام پیاری اور مارگریٹ زرعی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس معاشرے میں انسان انسانی سطح پر ملتا ہے۔ فاطمہ، رام پیاری اور مارگریٹ میں کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ ان میں انسانیت ہے۔ انسانی رشتوں کا احترام ہے۔ یہ صورت حال آج کے صنعتی معاشرے میں مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ آج ہم اپنی زندگیوں کو صرف اپنی ضروریات کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اب ہم کنزیومر ہیں۔ اپنی وہ انسانی شناخت، اکائی کھو چکے ہیں جو صدیوں سے ہمیں جوڑے ہوئے تھی۔ ہماری زندگیوں کو ایک معنی عطا کرتی تھی۔ وہی مارگریٹ جسے وہ اپنی بہن سمجھتا ہے اس کے ساتھ خواب میں وہ خود کو ایسی حالت میں دیکھتا ہے کہ شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ یعنی اب جنس بھی اشیائے صرف میں شامل ہے اور وہ تہذیبی وحدت جو انھیں جوڑے ہوئے تھی پارا پارا ہو چکی۔ افسانہ نگار شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے کیونکہ اس صنعتی مزاج کو اس نے اب تک قبول نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ یہ اس کے پورے تہذیبی ورثے کی تنسیخ کرتا ہے۔

آدیواسی عورت آج کے صنعتی معاشرے سے کٹی ہوئی ہے۔ وہ ہینڈ پمپ کی پوجا کرتی ہے لیکن اپنی دھرتی، اپنی دیو مالا سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ فاطمہ، رام پیاری اور مارگریٹ الگ الگ مذہبوں سے تعلق رکھنے کے باوصف تہذیبی سطح پر جڑے ہوئے ہیں اور مذہب یا انسان کی روح سے آج کی بہ نسبت زیادہ قریب ہیں جو مذہب اور کائنات کو عقلی سطح پر سمجھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے، معاشرے سے کٹتا جا رہا ہے۔

سریندر پرکاش کی کہانیاں ہماری خانہ بند تنقید کے لیے آسانی سے چارہ نہیں بنتیں اس لیے انھیں پڑھتے ہوئے ہم تخلیق سے براہ راست حظ اٹھا سکتے ہیں۔ یعنی افسانے کو افسانے کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ ہم اسے سماجی، سیاسی تاریخ کے حوالے سے نہیں پڑھتے وہ بڑی نزاکت اور ہنرمندی سے ہماری صدیوں کی زندگی کو جوڑ دیتا ہے اس طرح کہ کہیں جوڑ نظر نہیں آتا۔ ایک اچھے کرافٹ مین کی طرح اس کے افسانوں میں دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اس کا تخیل زرخیز ہے۔ نثر پانی کی طرح بہتی ہوئی۔ اس کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہم خالدہ حسین کے اس خیال سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ بات محض فن کے حصے میں آئی ہے کہ وہ عجائبات کی ایک دنیا ہم پر کھولتا ہے اور اس دنیا کے ساتھ بھی ہمارا تعلق نہیں ٹوٹتا بلکہ ہم اس زندگی کو بہتر طریق پر دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں کیونکہ زندہ رہنے والا فن اس دنیا اور روزمرہ زندگی کی ہر چیز ہمارے لیے نئی اور حیران کرنے والی بنا دیتا ہے۔ حیرتوں کا گم ہو جانا انسانی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے اور سچا فن میکانکی تسلسل میں مر جانے والی حیرتوں

کو زندہ کرتا ہے ایک چیز کی تہ میں ان گنت چیزوں کے دفینے دکھاتا ہے ہزار سمت وژن کے دروازے ہم پر کھولتا ہے۔

سنگ ایلو پیشیا، آرٹ گیلری اور سرکس کمزور افسانے ہیں۔ ان کمزور افسانوں میں بھی سریندر پرکاش کی کرافٹنگ، ذہانت اور چالاکی نمایاں ہے۔ چند خوبصورت جملے مل جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں ایلو پیشیا، آرٹ گیلری اور سرکس ایمرجنسی کے دور میں لکھے گئے افسانے ہیں۔ انھیں پڑھ کر خیال آتا ہے کہ جب سریندر پرکاش کسی ہنگامی موضوع کو لے کر افسانہ لکھتے ہیں یا کسی نجی واقعہ پر کہانی بنتے ہیں تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ ساحل پر لیٹی عورت اس سے مستثنیٰ ہے لیکن اس میں سیاسی حوالہ براہِ راست شناخت میں نہیں آتا۔ پوری کہانی دیو مالا کی سطح پر چلتی ہے۔ ایک اور خامی ان میں یہ ہے کہ بار بار وہ کہانی اور قاری کے بیچ آ کھڑے ہوتے ہیں۔ جب کسی اچھی کہانی میں یہ ہوتا ہے تو قاری جھنجلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب میں نے 'بازگوئی' شروع کی تو بڑا لطف آیا۔ اتنی خوبصورت کہانی، اتنا پیارا انداز، ایسی رواں نثر لیکن جوں جوں آگے بڑھتی گئی مجھے غصہ آنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کہانی کار کچھ زیادہ ہی مداخلت کر رہا ہے۔ جیسے بار بار وہ کہنا چاہتا ہو کہ دیکھا میں کتنا بڑا فنکار ہوں۔ آخر میں تو قلم اس کے ہاتھوں سے چھوٹ ہی گیا۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ دیکھا میں کتنا بڑا فنکار ہوں۔ یہ کہانی میری ہے۔ اسے میرے علاوہ کوئی نہیں لکھ سکتا۔ یہ تضاد سریندر پرکاش کی شخصیت کا تضاد ہے۔ سریندر پرکاش بہت اچھا فنکار ہے۔ موضوع اس کے ہاتھوں میں پگھل جاتا ہے اس کا تخیل زرخیز ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باطن میں ایک مکالمہ مسلسل جاری رہتا ہے کہ کیا یہ افسانہ نگار سریندر پرکاش میں ہی ہوں! نہیں اتنا بڑا فنکار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں تو پہلے ہی دن اسکول سے بھاگ آیا تھا۔ مجھے پرکاش پنڈت نے کبھی شاہراہ میں نہیں چھاپا کیونکہ وہ مجھے جاہل اور ان پڑھ سمجھتے تھے۔ مجھے تو میرا نے بھی بہت دنوں تک تسلیم نہیں کیا۔ جب یہ احساس لکھتے وقت بیدار ہو جاتا ہے تو غصہ میں وہ سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

افسانوں کا ڈھب اب تیزی سے بدل رہا ہے۔ اساطیری، تمثیلی، تجریدی کہانیوں سے قاری اکتا گیا ہے۔ کمپیوٹر ایج میں اسے کسی اور ڈھب کی کہانیاں چاہیے۔ لیکن سریندر پرکاش جیسے اوریجنل لکھنے والوں کے لیے میدان آج بھی خالی ہے۔ ہاں اس کی بھونڈی نقل کرنے والوں کا بے موت مرنا یقینی ہے۔ اردو افسانے میں ان کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔ خوبصورت، قاری کو چکرا دینے والا اسلوب جو بار بار احساس دلاتا ہے کہ بظاہر ایک سیدھی سی بات کے پیچھے کوئی پیچیدہ بصیرت کارفرما ہے۔ اس کی نقل ممکن نہیں کیونکہ کسی بھی اچھے افسانہ نگار کا اسلوب اس کے مزاج، عادات و اطوار، فکر، وژن اور لسانی رویے سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے اور کوئی دو اشخاص ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اِدھر افسانہ آدمی سے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ علامتی تمثیلی افسانوں کے تعلق سے سریندر پرکاش کا ایک نیا رویہ سامنے آیا ہے۔ جو میرے خیال میں ان کے لیے فالِ نیک نہیں کیونکہ تصورات جب جیتے جاگتے آدمیوں کی جگہ لے لیں تو افسانہ نگار رسالوں سے کھیلتا رہ جاتا ہے۔

انور سدید
172, Satlaj Block,
Iqbal Town,
LAHORE -8,
PAKISTAN

کچھ وقت پاکستانی کتابوں کے ساتھ

سائنسی انقلاب — یقین سے امکان تک شہزاد احمد

شہزاد احمد کا شمار اردو غزل کے ان خوش فکر شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد غزل کو اپنے گردوپیش سے متعارف کرایا۔ اس وقت غزل کے افق پر خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی اور ابن انشا، قطبی ستارے کی طرح چمک رہے تھے، ان کے بعد اردو ادب میں غزل کی جو طلائی تثلیث پاکستان میں مرتب ہوئی ان میں شکیب جلالی، ظفر اقبال اور شہزاد احمد کے نام بہت اہم ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کا تجدد فن اردو شاعری کا مزاج میں آشکار کیا۔ لیکن بعد میں ان کے ارتقائے فن کا تجزیہ کیا تو لکھا کہ شکیب جلالی نے خودکشی کرکے اپنی شاعری کے امکانات کا خاتمہ کردیا۔ ظفر اقبال لسانی تعلقات کے تجربے میں جا گھسے اور یوں انھوں نے اپنی شاعری کا خود گلا گھونٹ دیا۔ گویا یہ بھی ایک طرح خودکشی ہی تھی۔ اور اب ہم آبِ رواں کے ظفر اقبال کو تلاش کرتے ہیں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ اعزاز صرف شہزاد احمد کو حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے فن کے یقین کو متزلزل نہیں ہونے دیا اور امکانات کی تلاش سے روگردانی اختیار نہیں کی، اس عمل میں انھوں نے زندگی کا بوقلموں زاویوں سے مشاہدہ بھی کیا اور اپنے ذہن کے افق کو اپنے نئے مطالعے کی روشنی میں وسیع تر کرنے کی سعی کی، "صرف، جلتی بجھتی آنکھ، خالی آسمان، ادھر کھلا دریچہ کے بعد ان کی شاعری کی نئی کتاب "بکھر جانے کی رُت" چھپ کر آگئی ہے۔ لیکن اس عرصے میں شہزاد احمد نے ہمیں اپنے مطالعے کے ثمرات سے بھی باخبر رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کی کتاب ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر" چھپ کر آئی تھی تو اسے شہزاد احمد کے فکر کی نئی جہت قرار دیا گیا تھا۔ ان کی تازہ ترین کتاب "سائنسی انقلاب — یقین سے امکان تک" ہے۔ اور اس میں انھوں نے طبیعیات، فلسفہ، عمرانیات بیالوجی، نفسیات، انتھروپالوجی وغیرہ سے استفادہ کرکے گردوپیش کے بارے میں نئے سوالات اٹھانے اور پھر ان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

شہزاد احمد بنیادی طور پر نفسیات کے طالب علم ہیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ صرف ظاہر تک اپنا مشاہدہ محدود نہیں کرتے بلکہ پسِ آئینہ دیکھنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ "سائنسی انقلاب" ایک ایسی ہی علمی کاوش ہے جس میں یقین کے جمود کو متزلزل کیے بغیر امکان کی چاندنی کو اپنے اوپر نچھاور کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان کے سامنے زندگی پر افشاں ہے۔ انھوں نے خارج کی سطح پر حرارت کو حرکت میں

تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ پھر قوت کا سرچشمہ ایٹم قرار پا گیا تو انھوں نے ایک ذرّے کے اندر پرورش پانے والے انقلاب کا تماشا بھی دیکھا ہے۔ لیکن شہزاد احمد کے سامنے تو وہ انسان ہے جو خود ایک بے پناہ قوت ہے۔ انرجی اس کی دسترس میں ہے۔ ایٹم کو پاش پاش کر چکا ہے اور اب تسخیر کائنات اس کا مطمح نظر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس خوف میں بھی مبتلا ہیں کہ آدم تو اور پوری کائنات انہدام کی زد میں ہے اور ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑے ہیں، اس خوف سے شہزاد احمد نے انسان کے داخلی سکون کا سوال اٹھایا ہے اور فرد کو ایسی اخلاقیات مرتب کرنے کی دعوت دی ہے جو تعمیر میں معاون ہو اور عالمی معاشرے کی تشکیل کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے سائنس کے بے محابا سفر کی مخالفت کی ہے اور اسے ایک مضبوط اخلاقیات کا پابند بنانے کا مشورہ دیا ہے۔

اردو ادب میں "سائنسی انقلاب" اپنی نوع کا واحد مطالعہ ہے جس میں ایک وسیع کینوس پر نئے خطوط ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مسائل بھاری بھر کم ہیں لیکن شہزاد احمد نے انھیں بڑے سہل انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حسن عسکری اور وزیر آغا کی خوبی یہ ہے کہ انھیں پڑھتے وقت ان کے گرد و پیش میں بھی بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ شہزاد احمد کی یہ کتاب پڑھ کر ہماری ملاقات آرتھر کوسلر، کالسن ولسن، سوسن لینگر، آلڈس ہکسلے، ٹرنگ، ڈی۔ ایچ۔ لارنس، فرائیڈ، سارتر، جیمز ولیم، اریبا ژونگ، ایلون ٹافلر، ایرا پروگوف اور متعدد غیر ملکی مصنفوں سے ہوتی ہے اور شہزاد احمد کی مرتبہ کتابیات کے مطابق مطالعہ بڑھانے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اس زاویے سے بھی یہ کتاب خیال انگیز ہے۔ مکتبہ سنگ میل لاہور نے یہ کتاب حال ہی میں شائع کی ہے۔ اور یہ تازہ کتابوں میں بے حد اہم کتاب ہے۔

خطوط رشید احمد صدیقی۔ مرتبہ لطیف الزماں خان

رشید احمد صدیقی کے دو سو ستر خطوط کا یہ نادر مجموعہ لطیف الزماں خان نے مرتب کیا ہے اور اسے رشید احمد صدیقی کی وفات کے ۱۲ سال بعد شائع کیا ہے۔ رشید صاحب اپنے بچوں کو اور دوستوں کو کہا کرتے تھے کہ

"پڑھنے کے بعد میرے خطوط تلف کر دیا کرو، اس پر مجھے برابر اصرار ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی اور نہیں تو میری اولاد اس پر عمل کرے۔"

(سلمیٰ صدیقی کے نام۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۷۴ء)

رشید صاحب کو یہ تشویش بھی رہتی تھی کہ ان کے بعد ان کے خطوط شائع کیے جائیں گے۔ زیر نظر کتاب سے ان کا یہ خدشہ تو درست ثابت ہو گیا ہے تاہم اس کا نقصان رشید صاحب کو نہیں ہوا۔ البتہ اردو ادب کو فائدہ بے بہا ہوا ہے۔ یہ خطوط اگر رشید صاحب کے ارشاد کے مطابق ضائع کر دیے جاتے تو نقصان زیادہ ہوتا اور ہمارے سامنے وہ رشید صاحب ابھر نہ سکتے جن کے لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ کھیلتی تھی، جو ہمہ تن حیوانِ ظریف تھے اور عوام میں مسکراہٹیں تقسیم کر کے خوش ہوتے تھے لیکن اندر سے ٹوٹے ہوئے انسان تھے۔ پریشانیوں نے یلغار کر رکھی تھی اور مصائب کی یورش تھی۔ خطوط کے اسر

ے میں ہمارے سامنے وہ بذلہ سنج اور شگفتہ نگار ادیب کی صورت میں نہیں آتے۔ اب تو وہ ہولناک
ہائی کا سامنا کر رہے ہیں، ذہنی اور جسمانی معذوریوں میں مبتلا ہیں، نظر کمزور ہو چکی ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ
ہے۔ لیکن وہ زندگی سے بھیک نہیں مانگتے، اپنے حالات کا سامنا کر رہے ہیں، تنہائی کاٹ رہے ہیں
ور مجبوریوں کو گلے سے لگا رہے ہیں۔ چنانچہ اب جو انسان ہمارے سامنے آتا ہے وہ معاشرے کے
ساتھ بے حد مخلص ہے۔ وہ اپنی شرافت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا، اپنی عظمتِ فن کے گن نہیں گاتا۔ اور
تجربات کی صورت میں زمانے سے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے پوری ایمانداری سے آنے والی نسلوں کو لوٹا رہا ہے۔
رانی یادیں انھیں ملول نہیں کرتیں۔ بلکہ تازہ دم کر دیتی ہیں، بیٹے اور بیٹیاں ان سے دور ہیں لیکن وہ
سی کو بھی زندگی کی جنگ سے بھاگ آنے کا مشورہ نہیں دیتے اور اپنا تنہائی کو معطر بنانے کے لیے کسی
سے اپنا روحانی رشتہ بھی قائم نہیں کرتے۔ ایک وضعدار بزرگ، ایک تہذیبی شخصیت، ایک باوقار انسان،
یک وضعدار ادیب —— جس کی متاعِ گراں مایہ ان کی تصنیفات ہیں۔ جن کا اعزاز ان کے دوست ہیں،
جن کا سرمایہ ان کے احباب ہیں —— وفات سے ذرا قبل انھوں نے سلمیٰ صدیقی کو ایک خط میں لکھا

حافظ نے کہا ہے "حافظ بوڑھے ہو چکے ہو، مے خانہ سے نکل جاؤ" —— ستم ظریفی
یہ کہ میں ہی بوڑھا نہیں ہوں۔ جن کو صلاح و مشورہ دیتا ہوں، وہ بھی بوڑھے ہو چکے
ہیں، لیکن بے راہ روی اور خود رائی میں "ٹین ایجرز" سے بھی آگے ہیں۔"

بس یہی مقام تھا جب رشید احمد صدیقی اپنی عمر کے بوڑھے ٹین ایجروں کی خود رائی اور بے راہ روی
نہ دیکھ سکے اور دنیا سے کوچ کر گئے۔ لطیف الزمان خان نے اس کتاب میں ۱۹۶۵ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۵ء
تک رشید احمد صدیقی کے بہت سے احساسات و جذبات کو مجتمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب رشید صاحب
کے داخلی مطالعے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے۔ لطیف الزماں کی محنت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے
سلمیٰ صدیقی، مشفق خواجہ، عذرا صدیقی، مرزا ظفر الحسن، راحت سعید چھتاری، اکمت المسعود، ڈاکٹر
احسان رشید، ابوالحسن علی ندوی، نادرہ رشید، ضیا احمد بدایونی، ظہیر الدین صدیقی مجروح سلطان پوری،
ڈاکٹر محمد حسن، آمنہ مشفق، انجم اعظمی، اسلم فرخی، ابوالخیر کشفی، سلیم تمنائی اور نظیر صدیقی سے خطوط کا یہ
گراں بہا ذخیرہ حاصل کیا۔ یہ کتاب مشفق خواجہ نے مجلس ادبیاتِ مشرق۔ ناظم آباد کراچی سے شائع کی ہے۔

ضربِ لطیف۔ انجینیر خواجہ رحمت اللہ جری

خواجہ رحمت اللہ جری صاحب کی داستانِ حیات میں سارے رنگ ان کی محنت نے بھرے ہیں۔ وہ
حیدرآباد دکن کے ضلع کریم نگر میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے سول انجینیرنگ کی ڈگری لی، نوکری نہ ملی
تو تدریس کا کام کرنے لگے، دو سال بعد ہجرت کر کے ۱۹۶۸ء میں پاکستان آ گئے اور پھر نوکری کی تلاش
میں سعودیہ پہنچ گئے۔ بظاہر تنہائی نے ہی انھیں شاعر بنایا ہے لیکن یہ بیج اچانک نہیں پھوٹا۔ شاعری
کے بیج کی آبیاری وہ اپنے بچپن سے کر رہے تھے، حضرت فصاحت جنگ جلیل ان کے دادا استاد
ہوتے ہیں۔ ان کے شاگرد احمد علی شاب سے جری صاحب نے اوائل عمری ہی میں تلمذ اختیار کیا تھا۔ ان
کا تخلص جری بھی عطیۂ استاد ہے۔ ابتدا میں افسانے لکھتے تھے۔ لیکن ۱۹۵۴ء کے بعد پورا وقت شاعری

کو دینے لگے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "ضرب لطیف" خواجہ حمید الدین شاہد کے ادارہ ایوانِ اردو کراچی سے شائع ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کا اپنا تاثر یہ ہے کہ

"جناب جری کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری کا اپنا ایک اسلوب ہے، جس میں سادگی اور بے ساختگی نمایاں ہے۔"

جری صاحب نے حمد، نعت، غزل اور نظم ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ تاہم یوں لگتا ہے کہ غزل ان کے تخلیقی مزاج سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور وہ مشاہدے کو بیضوی صورت دے کر اُسے عوام الناس کا تجربہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ تلاشِ معاش کی تگ و تاز، غریب الوطنی، حصول رزق کے لیے تن سوختگی، اور ڈوبی ہوئی کشتیوں کی بازیافت جری کی شاعری کے مستقل موضوعات ہیں۔ وہ کبھی انسان کے غم کو اپنے دل پر وار د کرتے ہیں اور کبھی اپنے اندوہ کرب میں ڈوب جاتے ہیں، ان کا ایک سہارا ان کی نعت بھی ہے۔ چنانچہ وہ دل کے آئینے میں جب مدینۃ النبی دیکھتے ہیں تو ان کی لوحِ دل پر پھولوں کے نقش ابھرنے لگتے ہیں، اور کبھی آنسو ستارہ بن کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ مجھے ان کی شاعری میں امکانات کی روشنی نظر آتی ہے۔ ان کا نقشِ ثانی یقیناً نقشِ اوّل سے بہتر ہوگا۔

جرمن زبان سے براہِ راست

از: ہائنرخ بوئل ۔ ترجمہ: رتی سجاد ۔
NASHEMA.J,
CHOONI MANDI,
LAHORE.
(Pakistan)

ہمہ صفت باپ

میں ہر بات کو ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن رائن کی شوخی اور چنچل پن کو مان لینا بڑی مشکل ہے ۔ میں اس میں یہ صفات تلاش کرنے کے باوجود نہیں پا سکا ۔ ہو سکتا ہے میں کسی فریبِ نظر کا شکار ہوں یا پھر میں ایسے جذبات سے سرشار ہی نہیں جو اس تلاش میں میری مدد کریں ۔

میرا رائن تو بوجھل اور تاریک ہے مکار دریا ۔ کیا اسے جوان کہنا بجا ہوگا ۔؟

رائن پر میں نے بہت سفر کیا ہے ۔ دور دور تک ۔ ایک شہر سے دوسرے شہر ، خزاں ہو یا بہار اس پر بہتا ہی رہا ہوں لیکن میں نے اسے کبھی جوان نہیں پایا ۔

میرا رائن میرے بچپن کا رائن ہے ۔ تاریک اور بوجھل ، جس سے میں خوف زدہ بھی تھا اور محبت بھی کرتا تھا ۔ یہ میری جنم بھومی جو ٹھہرا ۔ بچپن میں نے اس کی آغوش میں گزارا ۔ اس کے کنارے پیڑوں کے سائے تلے ۔ میں اسے کاغذ کی کشتیوں سے سجاتا اور ان کے پیچھے بھاگتا ۔

خزاں کے موسم میں ایک طوفان بھری صبح ، آسمان میں مچلتے بادل ، رائن پر سجی کشتیوں کی بو ، پُر سکون صندلی شام ۔ لائٹ ہاؤس کی روشنی دھند کو چیرتی ، کناروں پر کھیلی مچلتی ۔ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر اس منظر میں کھو جاتے ۔ موسم سرما کی آمد سے ہر طرف تہ در تہ سفید چادر بچھ جاتی ۔ ان سرد فضاؤں میں رائن پُر سکون ہوتا اور پرندوں کے پروں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا ۔ پرندے ، جو اپنے خوبصورت ، نرم ، خوابیدہ پروں کے سہارے ہالینڈ کی جانب پرواز کرے

کچھ عرصہ رائن یوں ہی خاموش رہتا ، کمزور لہریں جاندار سفید تہ سے ٹکراتیں اور سی گل پل کی جانب اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی برف کے سفید ستونوں سے ٹکراتیں ۔ فروری مارچ میں سرد ہواؤں کا تصور ہی منجمد کر دیتا ۔ ان ہواؤں کے ہمراہ جو سفید چادر کا پہاڑ آتا تو اسے دیکھ کر یقین نہیں ہوتا کہ یہ وہی رائن ہے جس کے کنارے شراب جنم لیتی ہے ۔ شاندار شراب ، اپنی پوری قوت سے سفید چادر کو چیرتی ، ٹکراتی ، ڈراتی ، بے خوف ، کولون کی جانب بڑھتی ۔ بے شک یہ ایک اور ہی رائن تھا ۔ جہاں کی شناسائی مشہور تھی ۔ جہاں جرمن قوم کی قربانیوں کی آگ سلگتی تھی ۔ اب پسینوں کا دھواں نظر آتا ہے ۔ کولون سے لے کر شمال کی طرف بڑھتے ہوئے لال پیلے سبز شعلے ۔ خوفناک رنگ ۔ رائن کا مغربی کنارہ چرواہوں کے ایک کھیت کی مانند تھا ۔ مویشی ، بید مجنوں کے درخت ، سہ کنڈے روئی سا ہوا ، کے قدموں کے نشان ، ہوا ...

انھوں نے اس کنارے پر نظر ڈالی۔ وینس کے رقص میں مست، آگرپّینا کے جنم کی خوشیاں مناتے رائن کی دوشیزہ دختر جرمنا کو سس جو کالی گولا کی پوتی تھی۔ نیرو کی ماں یعنی کلاڈئیس کی بیوی اور اس کی قاتل جو پھر اپنے بیٹوں کے ہاتھوں ہی ماری گئی۔ نیرو کی رگوں میں رائن دھڑکتا تھا۔

یہ سب بارکوں کے بیچ دنیا میں آئے، قسم قسم کی بارکیں اور مغرب میں کاروباری حضرات کے بنگلے، افسروں کے بنگلے، گرم حمام، پیراکی کے تالاب اور بہت سی جگہیں جو ابھی آنے والے وقت میں چھپی تھیں۔

رائن نے بہت سی فتحیں اور فاتح دیکھے۔ زور دار کہانیاں۔ وہ فوجی جو دور دور سے آئے۔ دنیا کے ہر گوشے سے جنھوں نے رومیوں سے ٹکر لی۔ بے شمار آمد و رفت، بے شمار کہانیاں رائن سے منسوب تھیں اس کے بوجھل پن اور تاریکی کو تو میں مانتا ہوں لیکن اس کی شگفتہ ہریالی میرے لیے قابل قبول نہیں۔ وہ تاریک کھنڈر ایک ایسے ناخوشگوار وقفے کی یاد دلاتے ہیں جس میں پابندیاں ہی پابندیاں تھیں وہاں کے رہنے والے بھی ایسے لوگ نہ تھے کہ جن کی طرف طبیعت مائل ہو۔ خون ان کا سکہ تھا جس کی ایک طرف وفاداری کندہ تھی اور دوسری طرف بے وفائی۔

بونن تک کا رائن شراب کا رائن ہے جو کولون تک پہنچتا ایک چوکور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں سے شناپس کا رائن شروع ہوتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ رائن یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن میرا رائن یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اپنی ہیئت اور بھاری پن بدل لیتا ہے۔ یہ بھولے بغیر کہ اونچائیوں میں اس نے کیا سیکھا تھا، مزید سنجیدگی اختیار کرتا ہوا بالآخر شمالی سمندر میں اتر جاتا ہے۔

اور میرا رائن سرما کا رائن ہے۔ پرندوں کا رائن جو شمال کی جانب پرواز کرتے ہیں۔ رنگا رنگ لہروں میں جھلمل جھلمل کرتے گھر جو ابھی موسم گرما کے انتظار میں ہیں۔ پرسکون رائن جو ابھی اتنا جوان اور حرکت سے بھرپور ہے کہ پرندوں مچھلیوں اور برف کو پیچھے چھوڑ جائے۔ لیکن بہار میں میں اس کا قہر دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ گھٹنوں تک گھروں میں پانی، بہاؤ میں آئے مویشی، جڑوں سے اکھڑے درخت جن پر لگی تختی پر "خبردار" لکھا گیا ہے، اور یہ طوفان سا بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ایسا ناہوشیار رائن جو بچوں کے خوابوں سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ میں اس رائن سے خوف زدہ ہوں، تاریک دیوتا جو اب بھی قربانی کا پیاسا ہے۔ بدفطرت رائن جس میں ذرّہ برابر پیار نہیں پایا جاتا، سمندر کی طرح پھیلتا گھروں کی بنیادوں تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ سرپٹکتا شوریدہ سر لہروں میں ڈھلتا ہر موڑ کے ساتھ پوری قوت سے ٹکراتا ہے اور بچوں کو بہا لے جاتا ہے —— قوت سے بھرپور، متحرک، ہمہ صفت باپ۔

نیل کنٹھ مہاجن رمگاؤں
مترجم : معین الدین عثمانی۔
264, Shahu Nagar,
JALGAON-925001.(M.S.)

(مراٹھی سے ترجمہ)

عذاب گزیدہ

ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ ٹرین رک گئی۔ مسافر حیران ہو گئے۔ کیا ہوا ہوگا۔ ؟ ایک سوال ماہبن کر سب کے چہرے پر نمایاں ہونے لگا۔ کوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تو کوئی اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کس سے دریافت کروں ؟ ڈبے میں سارے لوگ اجنبی تھے۔ شہر بھی نیا تھا، راستے انجان، سبھی کچھ، میرے لیے نیا تھا۔ کیا ہوا ہوگا ؟ یہ سوچ کر خوف کا عفریت میرے سامنے منڈلانے لگا۔ دل ودماغ میں سوالات کا سمندر ٹھاٹھے مارنے لگا۔ میں نے قرب وجوار کے ڈبوں پر نظریں دوڑائیں۔ ہر کوئی پریشان تھا۔ سبھی کے چہروں پر خوف وہراس کے اثرات نمایاں تھے۔ میں دوسروں کے چہروں پر لکھے تاثرات پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اور ہر کوئی الگ الگ راستوں کے ذریعہ فرار کی راہ تلاش کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں سارے مسافر غائب ہو گئے۔ میں راستے میں اکیلا رہ گیا۔ اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں تو چاروں طرف پُرہول سناٹا تھا۔ لوگ گھروں کے کھڑکیاں و دروازے بند کر رہے تھے۔ راستے میں کسی سواری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں غیر ارادی طور پر ایک انجان راہ پر چل پڑا۔

"شاید اس شہر کے لوگ مجھ پر تنہائی کا عذاب نازل کرنا چاہتے ہیں"۔ ذہن کے کسی گوشے سے ایک سرگوشی اُبھری۔ تبھی تو شہر کی ہوٹل۔ راستوں کی سواریاں، عمارتیں اور لوگ مجھے کسی ناکردہ گناہ کی سزا دے رہے تھے۔

اچانک ایک چیخ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گئی " اے لوگو خدا کے لیے مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میں تمھارے شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔ چند لمحوں تک میری آواز صدائے بازگشت کی طرح میرے ہی کانوں میں گونجتی رہی۔ اور پھر وہی خاموشی۔

خوف سے میرے قدم رُک گئے۔ کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کا سورج بھی دور کی عمارتوں کے پیچھے سر چھپائے فرار کی راہ اختیار کرنے لگا تو میرے خوف میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے معبود کو پکارنے لگا۔ وقفے وقفے سے آنے والی دھماکوں کی آوازیں میرے وجود کو لرزہ رہی تھیں۔ کہیں سے کسی بھی سمت پیدل گھوما

ہے۔ شاید راستے میں کوئی مل جائے۔ جو اس سنسان علاقے میں میری مدد ضرور کرے گا۔

پھر اچانک سامنے سے ایک خالی بس آتی ہوئی نظر آئی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ مجھے لگا شاید یہ بس نہیں بلکہ میری پناہ گاہ ہے۔ دنیا میں اس بس سے زیادہ رحم دل اس وقت کوئی نہ ہو گا۔ میں دل ہی دل میں آتی ہوئی بس کو دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ اے بس جلدی آ۔ مجھے یہاں سے لے چل۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس شہر کے لوگ میرے ساتھ اتنا سنگین مذاق کریں گے۔ اب اس شہر میں کبھی نہیں آؤں گا۔ شاید میری کیفیت معلوم ہونے پر ہی مجھے اس جان لیوا تنہائی سے نجات دلانے کو یہ بس ادھر نکل آئی ہو گی۔

لیکن یہ کیا ہو گیا؟ اچانک بس میں آگ لگ گئی۔ مجھے لگا میرے مکان کو کسی نے برباد کر ڈالا۔ میں دوڑنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اطراف سے گولیوں کی بوچھار شروع ہو گئی۔

مجھے اس جان لیوا تنہائی سے نکلنے نہ دیا جائے۔ میری مدد کرنے کوئی نہ آئے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھ پر یہ عذاب نازل کیا جا رہا تھا۔ مجھے جان بوجھ کر عذاب میں ڈھکیلا جا رہا تھا۔ لیکن عذاب کا سلسلہ تو پچھلی کئی نسلوں سے برابر جاری تھا۔ ہم ایک عرصے سے عذاب سہتے آ رہے تھے۔ مگر یہ عذاب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا۔ میرے آباؤ اجداد نے شروع شروع میں پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان عذاب سہتے سہتے زندگیاں گزار دی تھیں۔ پھر جب شعور کی آنکھ ذرا بیدار ہوئی تو کچھ عرصہ سکون رہا۔ مگر بعد میں ہم اپنوں ہی کے غلام بنا دیے گئے۔ انھوں نے جو کچھ دیا ہم نے اسی کو سب کچھ سمجھ کر قبول کر لیا۔ جو کچھ کہا اسی کو حرفِ آخر سمجھا۔ ہماری اپنی زمین ہی ہم پر تنگ کر دی گئی۔ مگر پھر بھی ہم کچھ نہ بولتے۔ اپنی حکمرانی کو قائم رکھنے کے لیے۔ انھوں نے ہمارے درمیان تفرقے پیدا کیے۔ یہاں تک کہ جاتے جاتے ہی انھوں نے ہمیں تقسیم کر دیا۔ ہم اپنے گھر میں دیوار بنا کر بٹ گئے۔ آج بھی ہم دو حصوں میں بٹ کر عذاب سہہ رہے تھے۔ یہ سب کچھ کافی نہ تھا کہ آج اچانک میرے لیے ......!

نہیں نہیں اے لوگو — کیا تم بھول گئے کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ پھر تم اتنے سنگ دل کیوں ہو گئے ہو۔ کیا یہ انسانوں کی بستی نہیں ہے۔ پھر تم کو مجھ پر رحم کیوں نہیں آ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیوں کر رہے ہو۔ مجھے منزلِ مقصود کی جانب لے جانے والی ٹرین تم نے رکوا دی۔ مجھے بچانے والی بس کو آگ لگا دی۔ آخر کیوں تم میرے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہو۔ تمھیں رحم کیوں نہیں آ رہا ہے۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے۔

لیکن تم کیسے جواب دے سکتے ہو، تمھارے پاس تو بولنے کے لیے اب کچھ رہا ہی نہیں۔ تمھارے لفظوں کے ذخائر تو کبھی کے ختم ہو چکے ہیں۔ تم ایسی قوم کے افراد ہو جن کے پاس جواب نہیں ہوتا ہے لگتا ہے تمھاری آنکھوں کی مستی بھی چھین لی گئی ہے۔ اور کانوں کے سوراخ آوازیں سن سن کر بند ہو گئے ہیں۔ شاید تمھاری سانسوں پر بھی پابندی لگ چکی ہے۔ اور ہاتھ پاؤں کٹ چکے ہیں ــــ مگر یہ تو تمھارا معاملہ ہے

مجھے اس دوزخ سے باہر نکلنے دو۔ پھر کبھی اس شہر میں نہیں آؤں گا ___ تم منصوبے بند طریقے سے اذیت دینے کا ہنر خوب جانتے ہو۔ شاید ایک یہی وصف اب رہ گیا ہے۔

اچانک مجھے کسی کے پیروں کی چرچراہٹ محسوس ہوئی۔ گرد آلود فضا میں کوئی سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ کپڑوں کی رنگت اور ہاتھ میں اسٹین گن دیکھ کر لگا کہ شاید وہ کسی تحریک یا گروہ کا آلۂ کار ہے۔ بندوق تنی ہوئی دیکھ کر میں حواس باختہ ہوگیا۔ اور خوف سے چیخ پڑا ___ "مجھے مت مارو"

"پھر تم یہاں کیوں کھڑے ہو" فوجی کی کڑک دار آواز فضا میں گونجی۔

"میں ___ میں اس شہر میں نیا ہوں۔ اور یہاں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ باہر نکلنے میں کوئی بھی میری مدد نہیں کر رہا ہے۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے" ___ اور ہم تمھیں اس وقت حراست میں لیتے ہیں ___

لیکن کیوں ___ ؟ اپنے وجود کی اتھاہ گہرائیوں سے میری آواز نکلی ___

"مجھے شک ہے تم یقیناً یہاں کسی خطرناک ارادے سے کھڑے ہو ___

میرا دل بے تحاشا رونے کو چاہا۔ آخر یہ لوگ کیوں میرا استحصال کر رہے ہیں۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔

پھر پتا نہیں کیا سوچ کر اس فوجی نے کہا۔ لیکن ایسی حالت میں اب تم کہاں جاؤ گے۔

چلے جاؤں گا کسی بھی طرف ___ اب میں یہاں ایک پل بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا ہوں۔

"ٹھیک ہے ___ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ"

میں نے ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھنے کو تیزی سے سیدھی طرف قدم بڑھائے تو وہ فوجی چیخ پڑا۔

خبردار ___ اس طرف مت جانا اس طرف فرقہ وارانہ فسادات کا ننگا ناچ شروع ہے"

میں نے جلدی سے دائیں طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ پھر چیخ پڑا۔

"اس طرف سرکاری عملہ نے بغاوت کر رکھی ہے۔ پتھروں کی بارش ہو رہی ہے۔

میرے لیے فیصلہ کرنا محال تھا۔ میں ناک کی سیدھ میں بڑھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ تو فوجی نے میرے ارادے کو بھانپتے ہوئے کہا "اس طرف مِل مزدوروں کا ہنگامہ شروع ہے"

میں پریشانی کے عالم میں پیچھے کی طرف مڑنے لگا تو اس نے کہا۔ "ادھر سے ایک ریلی آنے والی ہے" میں خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ میری نظریں آسمان کی طرف چلی گئیں۔ زبان سے دعا نکلنے لگی۔ اے خدا اب تو ہی میری حفاظت فرما۔

فوجی نے اوپر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ___ دیکھو آسمان میں فوجی طیارے منڈلا رہے ہیں۔ لگتا ہے تھوڑی ہی دیر میں بم برسائے جائیں گے۔ میں نے مارے خوف کے زمین پر نظریں گاڑ دیں۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مجھے اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ نئی نویلی دلھن کی طرح سجی سنوری عمارتیں مجھے ہچکولے کھاتے ہوئے محسوس

ہونے لگی۔

اب میں کدھر جاؤں ؟ ایک سوال عفریت بن کر میرے سامنے رقص کرنے لگا۔ لیکن مجھے اس طرح سے کیوں پھنسایا جا رہا ہے۔ کیوں۔ کیوں۔ آخر کیوں۔ ؟ مجھے یہ اذیت کیوں دی جا رہی ہے۔ مجھے بچاؤ رے۔ کوئی مجھے اس دوزخ سے نکالو۔

اچانک وہ فوجی حرکت میں آگیا۔ جیسے اس نے بجلی کے تار کو چھو دیا ہو۔ ایک کار سامنے آکر رُک گئی۔ ایک خوش پوش شخص کو رازدارانہ انداز میں اس نے کچھ کہا۔ وہ کار سے باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کی افسردگی پھیلی ہوئی تھی۔ اطراف میں انسانی جسموں کے جلنے کی سڑانڈ پھیل رہی تھی۔ کہیں کہیں سے بوڑھے بچوں کی کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ ارے۔ ارے یہ تو وہ ہے۔ میرے محسن میرے کرم فرما۔ یہ تو میرے مستقبل کے خواب سجانے والا تھا۔ وہ اکثر میرے گاؤں آیا کرتے تھے۔ مجھے ایک کرن نظر آئی۔ شاید اس جہنم سے اب میں ضرور نکل جاؤں گا۔

"ہم تمھیں محفوظ جگہ پہنچانے آئے ہیں"

ہاں ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ آپ واقعی میرے محسن ہیں۔ آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ انھوں نے جب مجھے ساتھ چلنے کو کہا تو میں فوراً ساتھ ہو لیا۔ ہر سو سناٹا تھا۔ کبھی کبھار گولیوں کے چلنے سے ماحول میں زندگی کا احساس ہو جاتا تھا۔ آتے جاتے وردی پوش انھیں ادب سے سلام کر رہے تھے۔ لوگوں کو انھیں سلام کرتا دیکھ کر مجھے بھی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اب میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات میرے چہرے پر ابھار رہے تھے۔ رات کا کون سا پہر ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ فضا اب بھی گرد آلود تھی۔

پھر اچانک ایک جگہ کار رُک گئی۔ اس خوش لباس شخص نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ سے کچھ کہا تو کچھ لوگوں نے کھینچ کر مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہاں پہلے سے ہی بہت سے لوگ میری طرح موجود تھے۔

ادھر ٹی وی پر دھیمی دھیمی آواز میں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ وہ خوش لباس شخص عوام سے سکون برقرار رکھنے کی اپیل کر رہا تھا۔

مانگے کا اُجالا

ڈاکٹر نارنگ "ساختیات" ہی کے نہیں
"خود ساختیات" کے بھی ماہر ہیں

ہندستان سے ہمارے سیاسی تعلقات کیسے ہی
ہوں، ادبی مراسم نہایت خوش گوار ہیں۔ یہاں کے ادیب
وہاں اور وہاں کے ادیب یہاں کثرت سے دکھائی دیتے
ہیں۔ اس وجہ سے ادب ادب نہیں رہا، سیر و سیاحت
کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اس صورتِ حال سے بہت
سے جعلی ادیبوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے جنھیں
اپنے ملک میں کوئی نہیں پوچھتا، وہ دوسرے
ملک میں جاکر "مشاہیر" میں اپنا شمار کراتے ہیں۔
وہاں ریڈیو کی اردو سروس میں خارج از آہنگ
انٹرویو دیتے ہیں، یہاں مشاعروں میں خارج از
وزن و معنی شعر سنا کر سامعین کا مذاق اور اپنا
گلا خراب کرتے ہیں۔ بعض "مشاہیر" سفرنامے
بھی لکھتے ہیں، جنھیں لکھنے کے لیے صرف ارادے
کی، اور پڑھنے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔
ہندستان سے آنے والے ادیب کئی طرح
کے ہوتے ہیں کچھ تو وہ ہیں جنھیں تفریحی مقاصد
کے لیے بلایا جاتا ہے۔ وہ "اسی سے خانہ کی مٹی
اسی مے خانے میں" کے مصداق مشاعروں میں
صرف یا خرچ ہوجاتے ہیں۔ کچھ وہ ہیں، جو "تبادلے"
کی اسکیم کے تحت تشریف لاتے ہیں۔ جس طرح بعض
ممالک میں قیدیوں کا تبادلہ ہوتا ہے، اسی طرح پاک
و ہند کے درمیان غیر سرکاری سطح پر ادیبوں کا تبادلہ ہوتا
ہے وہ یوں کہ کچھ پاکستانی ادیب اپنے وسائل یا اثرات
سے کچھ ایسے ہندستانی ادیبوں کو ادبی جلسوں میں مدعو
کرتے ہیں، جو اپنے ملک میں باوسیلہ اور با اثر ہوتے
ہیں پھر وہ جوابی کارروائی کے طور پر اپنے پاکستانی
دوستوں کو ہندستان بلاکر حساب برابر کر دیتے ہیں۔
کچھ ہندستانی اہلِ قلم ایسے ہیں جو صرف علمی و ادبی
مقاصد کے تحت تشریف لاتے ہیں۔ وہ علمی و ادبی
مجالس میں شرکت کرتے ہیں، اہلِ علم سے ملاقاتیں
کرتے ہیں۔ پاکستان کی ادبی صورتِ حال کا مطالعہ
کرتے ہیں اور نہایت خوشگوار اثر چھوڑ کر رخصت
ہوجاتے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں جگن ناتھ آزاد، علی سردار
جعفری، ڈاکٹر خلیق انجم، جیلانی بانو، علی جواد زیدی،
شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور
دوسرے کئی اہلِ قلم شامل ہیں۔ اس فہرست میں ڈاکٹر
نارنگ کا نام دیکھ کر ممکن ہے بعض لوگ زیرِ لب
مسکرائیں اور یہ کہیں کہ وہ تو ادب سے زیادہ تعلقاتِ
عامّہ کے حوالے سے سفر کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے
اتفاق نہیں ہے۔ ڈاکٹر نارنگ علم کا سمندر ہیں

اسی سمندر میں تعلقاتِ عامہ کی حیثیت محض ایک گلیشیر کی سی ہے۔ گلیشیر کا کام صرف اتنا ہے کہ بھولے بھٹکے جہاز اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہیں۔ ڈاکٹر نارنگ اپنے علم سے لوگوں کو فیض یاب کرتے ہیں، تعلقاتِ عامّہ سے حریفوں کو نیچا دکھاتے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ جب پاکستان تشریف لاتے ہیں تو یہاں کی ادبی دنیا میں زلزلہ سا آجاتا ہے۔ عام زلزلے سے زیرِ زمین سطح پر ارتعاش پیدا ہوتا ہے ڈاکٹر نارنگ قصرِ زمین برسرِ زمین کے قائل ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے لوگ بیتاب ہوتے ہیں اور وہ خود بھی سراپا اشتیاق بن جاتے ہیں۔ ہر ایک سے اس طرح ملتے ہیں، جیسے صرف اسی سے ملنے کے لیے، انھوں نے زحمتِ سفر اٹھائی ہو۔ پچھلے ہفتے کراچی میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر نارنگ کے حوالے سے خلوص و محبت کے بے مثال مناظر دیکھنے میں آئے۔ اس مرتبہ موصوف کی آمد کا سبب عالی صاحب تھے اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ مئی کے دوسرے ہفتے میں کسی عرب امارت میں عالی صاحب کا جشن منایا گیا۔ نارنگ صاحب نے اس جشنِ طرب میں شرکت کی اور ان کی شان میں ایک خوبصورت مقالہ پڑھا۔ اس مقالے میں عالی صاحب کی اتنی تعریف کی کہ ان کے لیے اکیلے واپس آنا مشکل ہو گیا، لہٰذا نارنگ صاحب انھیں کراچی چھوڑنے آئے۔

کراچی میں نارنگ صاحب کا قیام ایک ایسے علاقے میں تھا جو شہر سے بہت دور ہے۔ اس لیے خیال تھا کہ وہ ہجومِ عاشقاں سے محفوظ رہیں گے اور عالی صاحب کے بارے میں مقالہ لکھنے سے جو تھکن ہوئی ہے، اس کا ازالہ کریں گے۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ صبحِ کاذب ہی سے عشاق ان کے ہاں پہنچ جاتے تھے، کوئی اخبار کے لیے انٹرویو لیتا تھا، کوئی اپنی کتاب رائے کے لیے پیش کرتا تھا۔

اور کوئی اپنے ہاں مدعو کرنے کے لیے تحریری درخواست سامنے رکھتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے بھی انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ حالانکہ ترقی پسند ڈاکٹر نارنگ سے اتنا ہی پرہیز کرتے ہیں جتنا خالص ادب سے۔ لیکن ڈاکٹر عالیہ امام بہت فراخ دل ہیں۔ وہ خاص خاص رجعت پسندوں کو بھی شایانِ توجہ سمجھتی ہیں۔ خود ڈاکٹر نارنگ بھی فراخ دلی میں کچھ کم نہیں۔ ترقی پسندوں سے وہ بہت محبت سے ملتے ہیں جیسے ساتھ کے کھیلے ہوں۔ ایک محفل میں تو انھوں نے پروفیسر ممتاز حسین کو اپنا معنوی استاد بھی کہہ دیا۔ اس پر استاد لاغر مرادآبادی نے فرمایا۔ "ڈاکٹر نارنگ ساختیات کے ماہر ہیں، ساختیات میں لفظوں سے بحث ہوتی ہے، معنوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس لیے معنی استاد کا مطلب ہے لفظی استاد۔"

نارنگ صاحب کے اعزاز میں یوں تو کئی جلسے ہوئے اور بے شمار نجی دعوتوں میں انھوں نے شرکت کی، لیکن انجمن ترقی اردو کا جلسہ بہت شاندار تھا (انجمن اب جلسے کرنے کے لائق ہی رہ گئی ہے) نیپا کے وسیع ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی بلکہ بقول شخصے تل تو بڑی چیز ہے ڈاکٹر نارنگ جیسے ماہرِ لسانیات کے جلسے میں کوئی مصوتہ یا مصمتہ دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ موصوف کی تقریر کا موضوع ساختیات تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی ساری تقریروں کا یہی موضوع تھا۔ ساختیات عام دلچسپی کی چیز نہیں، اس لیے عام لوگوں نے "ساختیات" کو "خود ساختیات" قسم کی چیز سمجھا۔ بعض اہلِ علم نے نارنگ صاحب پر اعتراضات بھی کیے۔ خصوصاً پروفیسر ممتاز حسین، احمد ہمدانی اور سجاد میر نے بڑے سلیقے سے اختلافِ آرا کا اظہار کیا۔ نارنگ صاحب نے ہر اعتراض کا مدلل جواب دیا اور جہاں کوئی دلیل

ملی وہاں وہ طلاقتِ لسانی سے غالب آگئے۔
نارنگ صاحب تحریر ہی میں نہیں، تقریر میں بھی بے مثال ہیں۔ وہ ایسے خوبصورت انداز میں تقریر کرتے ہیں کہ سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔ سامعین کی اس حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نارنگ صاحب "جو جی میں آتا ہے" کہہ جاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں غالب کے بارے میں لکھا ہے " بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے"۔ ڈاکٹر نارنگ نے بھی ساختیات کا نقارہ اس زور سے بجایا ہے کہ سننے والوں کے کان گنگ اور دماغ ماؤف کر دیے ہیں۔ سمجھنے والے خاموش ہیں اور نہ سمجھنے والے واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

نارنگ صاحب کی کراچی میں موجودگی کے دوران، انتظار حسین نے بھی لندن جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کراچی میں قیام کیا۔ لندن کے اردو مرکز میں ان کے ساتھ ایک شام منائی جا رہی ہے۔ کراچی کی ایک دعوت میں ڈاکٹر نارنگ اور انتظار حسین کی ملاقات ہوئی۔ کسی نے انتظار حسین سے پوچھا۔ "آپ لندن اکیلے جا رہے ہیں یا آپ کے ساتھ کوئی مقالہ نگار بھی جا رہا ہے؟" انھوں نے ڈاکٹر نارنگ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں جمیل الدین عالی کی طرح صاحبِ مقدور نہیں ہوں کہ نوحہ گر کو ساتھ رکھوں"۔

نارنگ صاحب کا نیا تنقیدی مجموعہ "ادبی تنقید اور اسلوبیات" حال ہی میں شائع ہوا ہے اس کا ایک نسخہ انھوں نے ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ یہ نہایت فکر انگیز مقالات کا مجموعہ ہے۔ اردو میں ایسے تنقیدی مجموعے کم شائع ہوئے ہیں، جن میں روایتی تنقید سے ہٹ کر بات کی گئی ہو۔ اس میں میر، انیس، اور اقبال کی اسلوبیات کے تجزیے ہیں۔ فیض و غالب کے معنیاتی نظام کے جائزے ہیں۔ شہریار، بانی، ساقی فاروقی اور افتخار عارف کی شاعری کے توصیفیے ہیں۔ نثری نظم کی شناخت بتائی ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی نثر کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ مجموعہ ضرور پڑھنا چاہیے کہ ان کی شاعری کی اتنی تعریف کسی دوسری جگہ نہیں ملے گی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ان دونوں پر لکھتے ہوئے قلم توڑ دیا ہے۔ انھوں نے یہ اچھا ہی کیا۔ اگر وہ خود قلم نہ توڑتے تو اس کتاب کے پڑھنے والے توڑ دیتے۔

اس کتاب کے تقریباً سبھی مضمون ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ البتہ پہلا مضمون (ادبی تنقید اور اسلوبیات) ہمارے لیے نیا ہے۔ اس مضمون کے پہلے پیراگراف کا کچھ حصہ اس لائق ہے کہ ہمارے قارئین کی نظر سے بھی گزرے۔ اس میں نارنگ صاحب نے اپنے مزاج کے خلاف اپنے تین ہمعصروں کی ساختیات و پرداختیات" پر روشنی ڈالی ہے فرماتے ہیں ..... "بعض لوگ اسلوبیات کو ایک ہوّا سمجھنے لگے ہیں .... اردو کے ایک جدید نقاد جنھوں نے بالقصد تنقید کو "خارزار" بنایا ہے تاکہ لوگ "آبلہ پائی کی لذت سے آشنا ہو سکیں" اس بات کا اکثر ماتم کرتے ہیں کہ جدیدیت ایک "شعلہ بکف بغاوت" تھی۔ لسانی نقادوں نے اسے ٹھنڈا کر دیا .... ایک اور کرم فرما ہیں جنھیں اونچی سطح سے بات کرنے کا مرض ہے گویا انوار انھیں پر نازل ہو رہے ہیں۔ وہ "اخلاقیات تنقید" کی دہائی دیتے ہوئے نہیں تھکتے، حالانکہ

ادبی ریاکاری کو آرٹ بنانے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ ان کے نزدیک دانشوری یہی ہے کہ اسلوبیات کے بارے میں جلے بازی کرتے رہیں۔ اور یوں اپنے احساس کمتری کے زخموں کو سہلاتے رہیں۔ تنقید نگار تو خیر سمجھ میں آتا ہے کیونکہ بقراط بننے کا اسے حق ہے، لیکن اس لائق احترام قبیلے میں ایک سر برآوردہ تخلیق کار بھی ہیں جو فکشن میں اپنی ناکامیوں کا بدلہ تنقید سے لیتے رہتے ہیں اور تنقید میں بھی لسانی تنقید کو برا بھلا کہہ کر اپنی بھکشوؤں والی بے تعلقی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا کرنے سے ان کے فکشن کا بھلا ہو سکتا ہے تو لسانی تنقید کو اُن کی معصومیت پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

نارنگ صاحب نے اشاروں کنایوں میں بات کی ہے۔ اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کن حضرات کی شان میں کف در دہان ہیں۔ اگر ہمارا یہ کالم وارث علوی، ظ انصاری اور جوگندر پال کی نظر سے گذرے تو اُن سے درخواست ہے کہ وہ اس عقدے کو سلجھانے میں ہماری مدد کریں۔

فرحت جہاں
"COMPEL"E-69, Ed Ghah Hil
BHOPAL-462001.

تلاش ایک کرایہ دار کی

عجب سی بیقراری تھی ان دنوں ہمارے اندر۔ ہر آہٹ پر دانہ چگنے والے پرندے
طرح چونک پڑتے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کو گھور گھور کر دیکھتے۔ ان کی
ل ڈھال سے ایک ماہر نفسیات کی طرح ان کے ارادوں کو جاننے کی کوشش کرتے۔
ین کیا مجال جو کوئی ہماری طرف متوجہ ہو جائے — کل شام چلتے چلتے ایک راہ گیر نے
اری طرف دیکھا۔ ہم سمجھے یہ وہی ہے جس کی ہم کو اور اس کو ہماری تلاش ہے۔ جب ہی
ہماری طرف غور سے دیکھ رہا ہے۔ خوشی کی لہر پورے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس
رئی۔ لیکن ابھی خوشی کی موجوں میں ہاتھ پیر مار ہی رہے تھے کہ احساس ہوا کہ
ہماری طرف نہیں بلکہ اپنی بھینگی آنکھ سے سڑک پر ایک حسینہ کو دیکھ رہا ہے اور اس کوشش
ں اس کی ترچھی نگاہ ہماری نگاہ سے مل گئی۔ یہ دیکھ کر سخت مایوسی سے دوچار ہوئے۔
ین ہمارے کان بھی نک سک سے درست تھے۔ اس لیے جیسے ہی ایک شام فون کی
نٹی بجی ہم چیزوں کو الانگتے پھلانگتے فون تک پہنچے۔

"ہیلو — ہیلو — "کیا آپ نے کرایہ کے مکان کے لیے اخبار میں اشتہار دیا ہے۔"

"آپ شبہ نہ کریں۔ ہم ہی مالک مکان ہیں" خوشی دل کے کناروں سے ٹکرانے
ی۔

"کیا مکان دیکھنے کے لیے ہم آ سکتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں، ضرور قدم رنجہ فرمائیے۔ ہم چشم براہ ہیں۔ زبان دانی کا رعب جھاڑنے
ں ہمیں بہت مزہ آیا۔

"دیکھیے ایسے کٹھن شبد مُنہ سے نہ نکالیے۔ آپ کی بھاشا سے تو مانسک ویدنا ہونے
ی۔ ہم نے گھبرا کے فون کا سلسلہ منقطع کرنا مناسب سمجھا کہ دو عجیب الطرفین ایک گھوڑے
س طرح سوار ہو سکتے ہیں۔ نہ لگام رہے گی نہ گھوڑا اور سوار چاروں خانے چت۔
اب روز ہمارا معمول بن گیا کہ جیسے ہی صبح اٹھتے۔ معمولات سے فارغ ہو کر اپنی کھڑکی
ں جا بیٹھتے۔ آنکھوں کو سڑک کے نظارہ پر تعینات کرتے۔ ٹرین، بسیں، رکشائیں، سائکل

سوار، پیدل چلنے والے سب کو اپنی اپنی راہوں پہ گامزن پاتے۔ ان کی بے نیازی دیکھ دیکھ کر اس امکان پر غور کرتے رہتے کہ کیا لوگوں نے لامکان رہنے کا ارادہ کر لیا ہے اس بھیڑ بھاڑ میں ایک سہمے سکڑے آدمی کو جاتا دیکھا۔ سوچا ہو نہ ہو یہ ہی ہے وہ۔ دیکھو تو کس قدر غم زدہ لگ رہا ہے مکان نہ ملنے پر۔ آنکھیں دھنس رہی ہیں۔ چہرہ پیلا پڑ رہا ہے۔ ہڈیاں نکل رہی ہیں۔ اس کی حالت زار دیکھ کر ہم بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ضرور اسی کو مکان کی تلاش ہے۔ ہم ہمیشہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔ کبھی اس کا دل نہیں دکھائیں گے۔ کس قدر نازک ہوگا اس کا شیشۂ دل۔ بس یہ ہمارا راستہ پوچھتے پوچھتے آنے ہی والا ہے۔ چلو سر سے بوجھ اترا۔ مکان کرایہ پہ چڑھنے ہی والا ہے۔ لیکن ابھی اس کے غم میں ہماری پلکوں سے آنسو ڈھلکنا بند بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ ناتواں و کمزور آدمی چوراہے پہ جا کے نقطۂ معدوم بن گیا۔

یہ دیکھ کے ہم نے سوچا یہ دنیا اوپر سے کچھ اور ہے اور اندر سے کچھ اور ——

ابھی ہم ان فلسفیانہ خیالات میں الجھے ہی تھے اور سوچ کا سرا نہ ملنے پر پریشان ہو ہی رہے تھے کہ دروازہ پر اسکوٹر رکنے کی آواز آئی۔ اجنبی چہرہ دیکھ کر ہم نے چلا کر کہا "لو وہ آگئے" "کون آیا بھئی" "کرایہ دار — ہاں ہاں کرایہ دار" "آنے دو آنے دو — اتنی مت گھبراؤ" باتھ روم میں سے آدھا صابن لگے چہرہ کے ساتھ نکلتے ہوئے شوہر نے کہا۔ ہم نے ان کی آواز میں ارتعاش کی لہروں کو محسوس کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن ازدواجی رشتہ میں الزام تراشیوں سے معاملہ بگڑتے دیکھا ہے۔ سنورتے کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے ہونٹوں پہ ضبط کی مہر ثبت کی۔ جب دروازے پہ دستک ہوئی تو شوہر نے پھر ہدایت کی "دیکھو مالک مکان اس طرح نہیں گھبرایا کرتے۔ اپنے چہرہ پہ وقار پیدا کرو" ہم نے خود کو ہر طرح سنبھالنے کی کوشش کی۔

"کیا آپ کے مکان کا کوئی حصہ خالی ہے۔ اخبار میں اشتہار پڑھا تھا" آنے والے نے پوچھا۔ ہم نے شوہر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نگاہ اس کے چہرہ سے ہٹا کر آسمان میں اڑتی ہوئی چیل کے پروں پہ لگا دی۔ جب چیل بھی کسی نکلتی روح کو پرواز کرتا دیکھنے کے لیے دوسری جانب اڑ گئی تو پھر مسجد کے میناروں کے سونا لگے کناروں کو دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس وقت ہم بھی بلندیوں سے ہم کنار تھے۔ فرش پہ کھڑے ہو کر عرش کو دیکھنے پہ اترا رہے تھے۔ ذہن کا شکستہ لباس جلدی جلدی تبدیل کرتے ہوئے تنے چہرہ اور اٹھتی بھنووں کے ساتھ بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا "جی ہاں اشتہار تو دیا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی غیر اہم بات نہ ہو۔

"کیا مکان دکھلانے کی تکلیف کریں گی"

ہم نے آگے بڑھ کر خالی مکان کا دروازہ کھول دیا۔

"دیکھیے۔ اچھی طرح دیکھیے۔" لالوں کے لال کو بھی کوئی اس طرح فخر سے نہیں دکھا

جس طرح ہم نے مکان دکھانا شروع کیا۔

وہ گہری گہری نظروں سے درودیوار کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ دیواروں کی خستہ حالی کو تو وہ کسی مفلس کی پشت پر پھٹے پیرہن کی طرح برداشت کر گیا لیکن چھت کی شکستگی اور زبوں حالی کی وہ کسی طرح برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

"نہیں گرے گی۔ کبھی نہیں گرے گی۔ اس طرح مت دیکھیے۔ ہاں نہیں آپ کی نظر بد سے نہ گر جائے۔" ہم نے اس کو ٹوکا۔

"ٹھیک ہے آپ کہتی ہیں تو نہیں گرے گی" عجب مایوس لہجے میں وہ بولا۔

"اب کرایہ کی بات کرلیں۔ مکان کی ہم کو بہت سخت ضرورت ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ معاملہ طے ہو جو بات ہمارے دل میں تھی اس کو زبان پر لانا ضروری سمجھا۔

"بھائی صاحب! کیا آپ شادی شدہ ہیں۔

انھوں نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ نہ جانے کیا مطلب نکالا۔

"جی ہاں۔ شادی شدہ ہیں اور طواف کرتی مکھیوں کے درمیان ہماری بیگم گم سم بیٹھی پل پل ہماری راہ تک رہی ہوں گی۔ اس لیے ذرا جلدی کیجیے۔"

"اچھا تو آپ کی اولاد نرینہ کتنے ہیں اور دختر نیک اختر کتنی ہیں؟"

"چار ہونہار بیٹے ہیں اور پانچویں کی آمد آمد ہے۔"

"کیا کہا آپ نے۔ پانچویں بچے کی آمد ہے۔ آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں گویا بہار کی آمد کی اطلاع دے رہے ہوں۔"

"بے شک" لفظ "بیشک" پر تو ہمارا خون کھول گیا۔ ہم نے گھبرا کے اپنی ننھی منی کیاری کی طرف دیکھا جس کو خون پسینا کر کے ہم سینچتے رہتے تھے۔ عاشق و محبوب بننے کا زمانہ تو اب رہا نہیں تھا۔ نظروں کو جب کوئی کام نہ ملا تو ہم نے پھولوں اور پتوں کو دیکھنے پر لگا دیا۔ کب کون سی پنکھڑی شاداب ہوئی۔ کب اداس ہوئی۔

حزن و انبساط کے دائرہ سے نکلنا بھی تو آسان کام نہیں۔

ہم نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آپ بچوں کی باتیں کرتے ہوئے بالکل بچہ نظر آرہے ہیں۔ جائیے اور بچوں میں بچہ بن کر ہنسیے بولیے" وہ غصے میں یا تو ٹیکتے ہمارے گھر پر حقارت کی نظریں ڈالتے روانہ ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی فکروں نے ہمیں چاروں طرف سے آڑے ہاتھ لیا۔

پھول پتوں کی وجہ سے کرایہ دار کو بھگا دیا۔ فطرت کے نظاروں کی اگر اتنی ہی دیوانگی ہے تو جاؤ جنگل جنگل اور ہوا پھانکو" ضرورتوں نے ہمیں خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کے شرمندہ کرنے پر ہم نے پھر انتظار کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ہمارا سانس پھولنے لگا۔ لیکن اس بدحالی میں بھی شہادت کی انگلی سے امید کی ڈور کو

پڑے رہے کوئی نہ کوئی آئے گا ضرور۔
خدا کا کرنا کیا ہوا کہ تیسرے دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نئے چہرے دیکھ کر دل پھر خوشی سے حلق میں آگیا۔ "کرایہ کے لیے مکان" "جی ہاں، جی ہاں" ہم نے ان کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ "ذرا مکان کا وہ حصہ دکھلا دیجیے۔"
میاں بیوی کی صورت اور لباس نے ہمیں حد درجہ متاثر کیا۔ عورت کے ماڈرن طرز کے بلاؤز اور خوبصورت ساری کو ترچھی ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہم نے دروازے کھول دیے۔ کچھ دیر بعد جب وہ دیکھ کر نکلے تو ہم نے ان کے چہروں کو فوراً پڑھ لیا۔ یوں لگا جیسے یہ دونوں کش مکش کے گرداب میں پھنسے ہوں۔ ایک لہر آگے بڑھاتی ہے تو دوسری پیچھے گھسیٹتی ہے۔ جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو شوہر کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ آپ ان کو باتوں میں لگائیے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"
کچن میں جا کے فوراً چائے کا پانی چڑھایا اور نمک پارے تلنے لگے۔ یہ سوچ کر ہمارا نمک کھا کے یہ لوگ ہمیں بے نمک نہ کریں گے۔ پھر دروازے کی آڑ سے آنکھوں کے اشاروں سے شوہر کو بلانا چاہا۔ شوہر اُن سے باتیں کرتے کرتے ہمارے اشاروں کو دیکھنے اور مسکرانے لگتے ہم اشارے کرتے رہے۔ وہ مسکراتے رہے۔ جب اشاروں سے بات نہ بنی تو ہم نے جھنجھلا کر کہا "ادھر تو آئیے ذرا۔" گھبرا کے انھوں نے ہمارے قریب آ کے پوچھا۔
"اس وقت گزرے دنوں کی یادگیوں تازہ کر رہی ہو۔ اشارے تو ہم شادی سے پہلے کرتے تھے۔ اب ہمیں کس کا ڈر ہے اپنے گھر میں۔ بولو کیا بات ہے۔"
"اوہ۔ تو آپ عہد ماضی میں غلطاں تھے اس وقت۔ ہم تو اس حال کی بات کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جو مکان دیکھنے آئے ہیں۔ ان کو کسی قیمت پر بھی جانے نہ دیجیے۔ میں چائے بھیجتی ہوں آپ باتوں میں لگائیے۔"
"چائے کی کیا ضرورت ہے؟"
"یہ لوگ اچھے دکھائی پڑتے ہیں؟"
"کون" ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
ہم نے گھبرا کے کہا "یہ عورت۔ آدمی نہیں۔ دیکھو نہ عورت کس قدر خوبصورت ہے۔ گھنیری لانبی چمکیلی زلفیں۔ اور پھر ساری۔" لیکن جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بولے۔
"دیکھتی نہیں اس کی زلفیں تو تراشیدہ ہیں۔"
— "ہاں ہاں۔" ساری کو دیکھ کر ہمارے خیالات کی رو نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچی تھی۔ ہماری اس سے خوب نبھے گی۔ کبھی اس کی ساری ہمارے پاس ہوگی۔ کبھی وہ ہماری ساری پہنے گی۔ اس ادلا بدلی میں سوشل اسٹیٹس میں کتنا فرق پڑ جائے گا۔ گویا ایک پنتھ دو کاج۔ ہمارے دماغ میں برقی لہر دوڑ رہی تھی کہ شوہر نے کہا "ہم میاں بیوی کو نہیں

رکھیں گے۔ کنوارے یا رنڈوے کو رکھیں گے۔"

"کیوں بھلا"

"اس لیے کہ دو عورتیں ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتیں جیسے ایک میان میں دو تلواریں۔"
ہاں آدمی شر کو رفع کرتا ہے۔"

لیکن ہمارے ذہن کو اکھاڑا بنا کر وہ ہلکے ہلکے گرجتے بادلوں کی طرح اپنی بات کہتے ہوئے چلے گئے۔ ہم نے جلدی سے چائے کا پانی چولھے سے اتارا۔ اپنے جذبات کی طرح ان کو بھی ٹھنڈا کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

اب پھر وہی شام و سحر تھے۔ وقت گزرنے لگا۔ ایک مہینا اور گزر گیا۔ گھر بیوہ کے مایوس و اداس چہرہ کی طرح مضمحل اور نڈھال ہوتا گیا۔ کوئی تو آئے کہ یہ کمبخت اجاڑپن ختم ہو۔

ایک دوپہر جب کہ سورج کی تند و تیز کرنیں جسم و جاں میں آگ لگا رہی تھیں۔ پرندے آشیانوں میں، امیرزادے خس خانوں میں اور نحیف و نزار مزدور سڑکوں پہ ہانپ رہے تھے۔ اس وقت کسی سے انصاف مانگنے جیسے انداز میں اتنی زور سے دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی کہ سوتے ہیں ہمارے خرّاٹے لرز گئے۔ خوابوں کی چھوٹی سی چادر جس سے اگر پانو ڈھکتے تھے تو سر کھل جاتا تھا جلدی سے اسے پھینک پھانک باہر آئے۔

"معاف کیجیے اس وقت آپ کو تکلیف دی۔ ہم کو مکان کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ دکھلا دیجیے" پھر مکان کی رونمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن جلد ہی ختم ہو گیا۔ کیونکہ آنے والے کی نگاہوں میں پسندیدگی کی قوس قزح لہرا رہی تھی۔ ہم نے حافظوں کی طرح شرائط کی گردان شروع کی۔ اس نے ہر بات خوشی خوشی قبول کی۔

"جی ہاں کرایہ بھی واجبی ہے۔ آپ لوگ بہت شریف جان پڑتے ہیں۔"

"اجی نہیں صاحب شریف تو آپ ہیں۔ جو اتنی جلدی ہر چیز قبول کر لی۔"

"ٹھیک ہے آپ ہم کو شریف کہہ رہے ہیں تو ہم بھی آپ کو دو مہینے کا کرایہ ایڈوانس کل آ کے دیں گے۔" شوہر نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ابھی اس کی بیٹھ پوری طرح مڑی بھی نہ تھی تو ہم نے مہینے کا بجٹ بنانا شروع کر دیا۔ ضرورتیں الانگتی پھلانگتی ہمارے پاس آنے کے لیے بیقرار ہونے لگیں۔ اوپر تلے گرنے پر ہم نے ان کو لاکھ منع کیا۔ غصہ کیا۔ آنکھیں دکھلائیں۔ لیکن کیا مجال کہ اس وقت وہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹیں۔ ہر ایک ہمارے سر پہ سوار ہونا چاہتی تھی۔ سب کی نظریں ایڈوانس پر لگی ہوئی تھیں۔ آخر ہم نے سب کو بلایا۔ ان کی کھلی کھلی ہتھیلیوں کو پیسے سے گرم کرنا شروع کیا۔ وہ کرایہ دار کو دعائیں دیتی شاداں و فرحاں اپنی اپنی جگہ لوٹیں۔ اس دلفریب منظر کو دیکھ کر ہماری آنکھیں خوشی سے بھیگنے لگیں۔ پھر بھیگی بھیگی آنکھوں سے ہم نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"کل کرایہ دار آئے گا۔ یہ سوچتے ہی ہماری نگاہ دیوار پہ لگی عہد وسطیٰ کی گھڑی

کی سوئیوں پر جم گئی۔ لیکن ان کو قرار کہاں تھا۔ بڑی آگے تو چھوٹی پیچھے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہماری نگاہ دو بیویوں والے شوہر کی طرح کبھی بڑی پر ہے تو کبھی چھوٹی پر۔ کبھی بڑی سبقت لے جاتی ہے اور چھوٹی پیچھے رہ جاتی ہے۔

گھڑی کی سوئیاں اپنی اپنی چال میں مست تھیں۔ اس بات سے قطعی انجان کہ کون بیٹھا گھڑی گھڑی گن رہا ہے۔ کس کو کس کا انتظار ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک وقت کا پینڈولم اپنی عادت کے مطابق ہلتا رہا۔ چھوٹی بڑی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہیں اور اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے۔

وارث مظہری
Rampur, Waris Nager,
SAMASTIPUR-848133.
(Bihar)

اندھیرے میں لپٹی ہوئی صبح

ایک دن!

"سنیے" — میں نے پیچھے مڑکر دیکھا چیتھڑوں میں ملبوس ایک شخص دست سوال دراز کیے کھڑا ہے۔ "کیا ہے" — میری زبان سے غیر ارادی طور پر نکلا اور مجھے اپنی حماقت پر آپ ہنسی آگئی۔ "کیا آپ مجھے پانچ پیسے دے سکتے ہیں" صرف پانچ! کیوں دس نہیں لوگے "نہیں" — میں اس غیر متوقع جواب پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ "کیوں بھئی آخر کیوں؟" "مجھے اس کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانے پڑیں گے" — "دونوں ہاتھ....." میں چونک پڑا اور اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر طرح کے تصنع و تکلف اور یاسیت و تفکر سے بے نیاز اس چہرے پر مجھے غیر معمولی بشاشت اور شادابی نظر آئی۔ پھر بھی میں نے کہا "کیا تمھیں اپنی زندگی پر افسوس نہیں ہوتا" "افسوس!" — وہ مسکرایا، "بھائی جی! میں تن کے لیے نہیں روح کے لیے جیتا ہوں" وہ روح کہ جو، جسم کے کیچڑ میں دھنس جانے پر پھول بن جاتی ہے" اور پھر زندگی کے تمام راز مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ جسم کھو جانے پر پھر مل سکتا ہے لیکن روح ایک دفعہ کھو جانے کے بعد پھر نہیں مل سکتی۔ میں سناٹے میں آگیا۔ کتنی حقیقت ہے اس کی باتوں میں اور کیسی صداقت۔ اے کاش!....
"لیکن میں اس سے زیادہ کچھ اور نہ سوچ سکا۔ "آپ کیا کچھ دے سکیں گے یا نہیں۔" میری خاموشی کو بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسے پانچ پیسے دیے اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا —؟

دوسرے دن پھر وہی مانوس سی آواز "کیا آپ مجھے پانچ پیسے دے سکتے ہیں —" "کیوں نہیں، لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے" (خاموشی) "کیا نہیں بتاؤ گے" (خاموشی) آخر کون سی قباحت ہے بتانے میں" — بہ خود میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہ کی کہ میرا نام کیا ہے۔ "تو پھر باپ کا نام تو جانتے ہوگے" (ایک طویل خاموشی) خیر اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں" پھر میں نے اسے پانچ پیسے کا سکہ دیتے ہوئے کہا "تم مجھ سے ہر روز

جاتا تو ہم پیچھے سے لینا۔" اس نے متشکر نظروں سے میری طرف دیکھا اور اپنی مخصوص چال چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر اس سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک دن میں نے کہا "ایک بات کہوں" بشرطیکہ تمھیں اسے ماننا پڑے گا۔" وہ خاموش رہا۔ "تم میرے گھر چلو، وہاں تمھیں کسی چیز کی دقت نہ ہو گی۔" اس نے پہلو تہی کرنا چاہی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرا دل نہ توڑو۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کھاؤ۔" میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا، پتا نہیں یہ کون سا جذبہ تھا یہ کون سی قوت تھی جو مجھ سے یہ سب کہلوا رہی تھی۔ پہلے تو وہ بوکھلایا۔ لیکن پھر ساتھ چلنے پر رضا مند ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے۔

دو چار روز بعد جب ایک صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ اس کا بستر خالی پڑا ہے بہت متعجب ہوا، حد درجہ تلاش کی لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملا!!

ہفتہ دس روز بعد ایک صبح لوٹتے ہوئے اس پر نظر پڑ گئی، اس کے چہرے پر بیحد اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے میلے کچیلے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ میں نے قریب ہوتے ہوئے اسے پکارا "س۔۔۔۔ن۔۔۔۔و" اس نے بیچارگی سے میری طرف دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ارے تم تو رو رہے ہو!" میں نے حیرت سے کہا مگر وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ٹالنا چاہا۔ لیکن میرے اصرار پر اس نے کہنا شروع کیا۔ "کئی سال ہوئے میں نے ایک خوشنما پھولوں اور پھلوں کا بیج بویا تھا۔ ابتداءً تو اسے نمو پذیر ہونے میں ستمگر پیروں نے کافی گزند پہنچایا لیکن پھر جب پودا نکلا، اور نکل کر کچھ بڑھا، پتے نکلے، اور شاخیں پھوٹیں تو میں اس کی صحت و شادابی کے لیے شب و روز کوشاں رہنے لگا۔ ایک ایک لمحہ میں اس کی حفاظت کرتا لیکن اس چار روزہ کی غفلت نے، جو آپ کے یہاں گزارے اس کی شادابی چھین لی، اس کے پتے مرجھا گئے وہ سوکھنے کے بالکل قریب آ چکا۔ ایک لمحہ کو وہ رکا۔ آنسوؤں کو اپنی میلی کچیلی آستین سے پونچھا اور کہنے لگا "ارے جب تک وہ اپنی اصلی حالت میں نہ آ جائے میں آپ سے نہیں مل سکتا، ہرگز نہیں۔" مجھے افسوس تو بہت ہوا۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا!!

پھر مہینوں وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے دیکھنے، اور اس سے باتیں کرنے کو میری طبیعت مضطرب رہی، دل بے چین رہا، میں پہروں بیٹھ کر سوچتا کیا وہ انسان تھا یا کوئی اور مخلوق ــــ جس کا کوئی جواب میری عقل کے پاس نہ تھا۔ سوتے جاگتے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی باتیں متشکل ہو گئی ہوں اور کہہ رہی ہوں "میں محض ایک قول ہی نہیں ایک مجسّم فعل بھی ہوں، قول اور فعل میں بڑا تضاد ہے۔ پھر تم کیوں نہیں سمجھتے۔ زندگی کو حسین سے حسین تر بنانے کو کیوں سرگرداں و پریشاں ہو۔ جگنو آفتاب سے اس لیے محبت رکھتا اور اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ مجسّم نور ہے۔ اس کے برعکس آفتا

اس لیے جگنو سے محبت رکھتا اور اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ کسی جائے معیّن کا پابند نہیں۔ وہ ہر اس جگہ ضوفشانی کر تا اور کر سکتا ہے کہ جہاں تاریکی مسلّط ہو۔ یہ آفتاب کا جذبۂ احتساب نہیں تو اور کیا ہے کہ جو ایک حصّے سے نہ تو اپنا اہم صفت بلکہ اس سے زیادہ سمجھتا ہے۔"

ایک زمانہ گزر گیا۔ دن ہفتے میں، ہفتے مہینے میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کی یادوں کے نقوش اب دھندلے پڑتے جا رہے تھے کہ ایک دن وہ مجھے بھرے بازار میں ایک ٹیلے پر کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"لوگو! ہوشیار ہو جاؤ، کل کا دن؟ ہاں کل کا دن وہ جنگل کی رات سے زیادہ ڈراونا ماحول خوفناک اور پُراسرار ہو گا۔ وہ دن ایسا ہو گا کہ سورج تو نکلے گا لیکن اس کی روشنی خلا میں ہی بھٹکتی پھرے گی۔ زمین پر آنا اس کے بس سے باہر ہو گا۔ چاند تارے معدوم ہو جائیں گے۔ دن اور رات میں کوئی تفاوت باقی نہ رہے گا۔ سرسراتی چیختی ہوائیں ساکت ہو جائیں گی۔ نغموں سے معمور آبشار دم توڑ دیں گے گنگناتی ہوئی ندیاں خاموش ہو جائیں گی۔ درخت پھل پھول دینا چھوڑ دیں گے۔ زمین سبزے اگانا چھوڑ دے گی۔ اس وقت انسان بہت کچھ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن کچھ نہ کر سکے گا۔ وہ چاہے گا کہ درخت پھر پھل پھول دینے لگیں، ندیوں کا پانی ریت سے پھر سر ابھارے آبشاروں سے نغمے پھوٹیں۔ لیکن اس کی یہ خواہش اس وقت دم توڑ دے گی جب وہ یہ دیکھے گا کہ اس کے ہاتھ پانو مفلوج ہو چکے ہیں وہ کبھی متحرک نہیں ہو سکتے۔"

یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی میرے ہاتھ پانو شل ہونے لگے ہیں اور نظام جسمانی میں غیر معمولی تبدیلی پیدا ہونے لگی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں مزید تیز ہو گئیں اور سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور سمت کا تعیّن کیے بغیر ہی وہاں سے بھاگا۔ تھوڑی دیر بعد جب سانسیں معمول پر آئیں۔ خوف و ہراس میں کچھ کمی آئی تو میں نے ہر عضو کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا "کسی قسم کی تبدیلی تو واقع نہیں ہوئی؟" اور پھر سب چیزوں کو اپنی جگہ مکمل پا کر مجھے چند لمحے کے لیے سکون ہوا۔ البتہ پریشانیوں پر مکمل گرفت نہ ہو سکی۔ تبھی اس کی آوازیں ایک بار پھر میرے پردۂ سماعت کو پاش پاش کرنے لگیں۔ میں نے حیرانی و پریشانی کے عالم میں اپنے آگے پیچھے دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر میں نے مسجد، مندر، گرجا۔ تمام جگہوں کو چھان مارا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کی آوازیں اب بھی بدستور جاری تھیں اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ آوازیں کہیں اور سے نہیں بلکہ میرے دل سے آرہی ہیں۔ گویا وہ کہیں میرے دل میں ہی چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔"

ایک دن شام گئے دفتر سے لوٹتے ہوئے وہ مجھے نظر آیا۔ کوڑوں کے ڈھیر پر! جہاں کتوں اور خنزیروں کا بسیرا ہوتا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہ نکلے، دل مضطرب ہو گیا، غم واندوہ سے سینہ پھٹ پڑا۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے اس

سے مخاطب ہوا۔ "کیا اب تمھیں پیسوں کی ضرورت نہیں پڑتی" "پڑتی ہے" وہ ایک ذرا سوچنے کے بعد بولا۔ "تو پھر ــــ" "میں تمام ضرورتوں کو جمع کر رہا ہوں وہ میری اکٹھی کام آئیں گی" "لیکن پھر کھانا پینا اور دیگر ضروریات؟" "بھائی جی! وہ پھر فقیرانہ آواز میں گویا ہوا۔ میں کھانے پینے کے معاملے میں جانوروں میں اور خود میں کوئی فرق نہیں پاتا اور پہننے اوڑھنے کے معاملے میں میں بالکل بیباک ہوں۔ صرف ایک گدڑی بس....." میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ حسرت و یاس کے دریا میں دل کی کشتی ہچکولے کھانے لگی۔

ایک روز! ــ دو روز! ـــ تین روز ـــ اور پھر مسلسل کئی روز وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ جیسے علاقے ہی چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

پھر ایک دن پتا چلا کہ وہ بیمار ہے، دکھرن موچی کے گھر کے سامنے والے پیپل کے پیڑ کے نیچے پڑا ہے، مجھے جیسے ہی یہ خبر معلوم ہوئی، میرے ہوش و حواس گم ہوگئے۔ میں بلا تاخیر وہاں پہنچا۔ دیکھا وہ پیپل کے تنے پر سر رکھے بے چینی سے کروٹ لے رہا ہے۔ میں نے خیریت دریافت کی لیکن وہ کچھ بول نہ سکا۔ شاید اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی۔ پھر ایک دم اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا اور اس کا جسم ساکت ہوگیا۔ جیسے اسے میری موجودگی کا علم ہوگیا ہو۔ میں نے ایک نظر اس کے پھیلے ہوتے ہاتھ پر ڈالی اور مجھے ایسا لگا جیسے اس کے لب ہل رہے ہوں اور وہ کہہ رہا ہو "کیا آپ مجھے پانچ پیسے دے سکتے ہیں، صرف پانچ"۔؟؟

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

'کتاب نما' ماہ اپریل کا شمارہ اس وقت پیش نظر ہے۔ جوگندر پال کا مہمان اداریہ دعوت فکر دیتا ہے۔ 'پاکستان میں ادبی صورتِ حال' بھی بڑا معلوماتی مضمون ہے، گو تشنہ ہے۔ 'مذاکرہ' کے عنوان سے 'تخلیق و تنقید کا رشتہ' خاصے کی چیز ہے۔
بلاشبہ 'کتاب نما' اردو کی ترقی کی طرف ایک معتبر قدم ہے●

محمد رفیع انصاری۔ بھیونڈی، تھانہ (مہاراشٹر)

'کتاب نما' ایک مدت سے پابندیٔ وقت کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ تازہ شمارے میں مہمان مدیر جوگندر پال کا اشاریہ کافی جاندار ہے اور ان کا یہ کہنا کہ "کہانی دراصل ایک ندی ہے جو اپنے نشیب پر آپ ہی آپ بہتی چلی جاتی ہے" صدفی صد صحیح ہے۔
بھئی آپ کے یہاں خطوط کا کالم بڑا دلچسپ ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنے تعمیری مقاصد سے دور ہوتے ہوئے بھی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس بار بھی کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں وارث علوی کے اشاریے کو تنقیدی میزان پر رکھا گیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے اس سے بھی تعمیری پہلو نکلتے ہیں۔ میں ان خطوط پر اپنے خیالات کا اظہار تو نہیں کروں گا۔ البتہ "موجودہ اردو ادب اور ادیب" کے سلسلے میں کچھ رقم کرنا چاہوں گا۔
کیا یہ سچ نہیں کہ آج ہم گروہ بندی کر کے اردو کے حلقے کو محدود کر رہے ہیں۔ اگر آپ صاف صاف سننا پسند کریں گے تو میں یہ کہوں گا کہ یہاں سرکاری وظیفے بھی انھیں شاعروں و ادیب کو ملتے ہیں جو یہاں کے سیاسی ناخداؤں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ جو ادب عالیہ سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی "ساہتیہ سمراٹ" کہلاتے ہیں اور ادب کے قطب مینار پر بیٹھ کر اردو کا استحصال کر رہے ہیں۔
جیسا کہ 'مانگے کا اُجالا' کے تحت خامہ بگوش صاحب لکھتے ہیں "نثری نظم لکھنے والے پڑھنے والوں کو اذیت پہنچا رہے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ہمارے کچھ ادیب و نقاد آزاد غزل اور نثری نظم کے نام پر بازاری ادب پیش کر کے اپنی کم علمی کا ثبوت دے

رہے ہیں۔

مگر آپ صحیح طور پر تجزیہ کریں گے تو پائیں گے کہ ہمارے ادیب اور نقاد کا نظریہ ادب برائے ادیب اور ادب برائے پبلسٹی ہے۔

اگر آپ اپنی کتابوں پر تبصرہ لکھوائیں گے تو اُسے ایلیٹ، شیکسپیئر، ڈانٹے، کانٹ وغیرہ کا حوالہ دے کر عصری تقاضے کا غماز قرار دیں گے۔ کیونکہ فرانسیسی، روسی، جرمن کے قول کو یاد کرنے کے سوا انھوں نے اردو کے لیے کیا کیا ہے۔

سلام بن رزاق کی کہانی خبر پہلے بھی کسی رسالے میں پڑھ چکا ہوں۔ دوسری تخلیقات ابھی زیرِ مطالعہ ہیں●

شیدا بگھونوی۔ شاہ پور بگھونی، سمستی پور (بہار)

'کتاب نما' کے مئی کے شمارے میں یہ خبر پڑھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ جناب حیات اللہ انصاری نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اعلان کردہ غالب ایوارڈ قبول نہ فرمانے کے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے۔ عزتِ نفس کا تقاضا بھی یہی تھا۔

وہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے اردو ادب وصحافت کی خاموش خدمت کرتے چلے آرہے ہیں جس کے صلے میں انھیں تیسرے درجے کا انعام پیش کر کے ان کی بے عزتی کی گئی ہے۔ اس سے بہتر تو یہی تھا کہ کسی بھی انعام یا ایوارڈ کے لیے ان کا نام سرے سے پیش ہی نہ کیا جاتا۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ انھیں ایسے لوگوں کی صف میں کھڑا کیا گیا ہے جو ادب یا صحافت کے صحیح تلفظ سے بھی واقف نہیں ہیں۔

خاموش خدمت انجام دینے والوں کا اکثر و بیشتر یہی انجام ہوتا ہے۔ بہرحال انصاری صاحب نے یہ انعام ٹھکرا کر بہت مستحسن کام کیا ہے۔

میں جناب حیات اللہ انصاری کو ان کے اس اقدام پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں●

مانک ٹالا - پالی ہل - بمبئی ۔

اس بار بھی حصۂ نثر حاوی ہے۔ جوگندر پال کا اداریہ خوب ہے۔ پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مواد کم ہو تو لفظوں کی کاریگری سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔

'پاکستان کی ادبی صورت حال' میں منیر احمد شیخ کا جھکاؤ (پتا نہیں کیوں) شاعروں کی طرف زیادہ ہے۔ ڈاکٹر قاسم دہلوی نے اپنے مضمون میں مولانا واصف دہلوی سے ایک پُر لطف ملاقات کروادی ان کا شکریہ۔ اور یہ خامہ بگوش وزیر آغا اور انور سدید کو بدنام کر رہے ہیں یا مشہور؟

افسانے عنوانات کے اعتبار سے دو ہیں مگر پڑھو تو لگتا ہے کہ سلام بن رزاق

کے (ادھورے) افسانے "خبر" کو شمس فرخ آبادی کا افسانہ "مراکو" اور آگے بڑھا کر ایک مکمل کہانی کی شکل عطا کر رہا ہے۔ جس خبر کا سلام کے کرداروں جو انتظار تھا وہ شمس کا مرکزی کردار بوڑھا آرٹسٹ سناد یتا ہے۔ پتا نہیں ان افسانوں کو آپ نے ایک ساتھ دانستہ شائع کیا یا یہ محض اتفاق ہے، جو بھی ہو مزہ آگیا۔

ڈاکٹر توقیر احمد کی تحریر (رپورتاژ) "تخلیق و تنقید کا رشتہ ایک مذاکرہ"، اصولاً تو ادبی اور تہذیبی خبریں، کا حصہ تھی۔ مگر اسے مضامین میں شامل کر کے آپ نے غالباً ظفر پیامی کے اس جملے کی طرف توجہ مبذول کروانی چاہی ہے کہ:

"نقادوں کو ادیبوں اور ادیبوں کو نقادوں سے شکایت زوال پذیر معاشرے کی علامت ہے"

حیرت ہے! ظفر صاحب یہ کیسے لکھ گئے جب کہ اسی کتاب نما کے مہمان اداریے میں بہ حیثیت ادیب انھوں نے ناقدوں کو "ادب کی بانجھ دائیاں" کہا تھا●

نظام الدین نظام۔ بمبئی

'کتاب نما' میں "ادبی اور تہذیبی خبریں" نام کے تحت جو خبریں دی جاتی ہیں اُن میں اکثر ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ کرنے والوں کو مبارک باد دینا ضروری ہوتا ہے۔ آپ اُن لوگوں کا پتا بھی شائع کر دیا کریں تو بہتر ہے●

ڈاکٹر اسحاق حسین البدایونی، اقبال کلینک، غنی چوک، بدایوں (یوپی)

مئی ۱۹۸۹ء کا رسالہ 'کتاب نما' نظر نواز ہوا۔ مہمان مدیر جناب عبدالمغنی صاحب کا اشاریہ "حق گوئی و بے باکی کا شاہکار ہے●

محبوب پاشا، امین منزل، مدراس

مہمان مدیر جناب عبدالمغنی کا اداریہ بصیرت افروز ہے۔ انھوں نے اردو کے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ ان کی تجاویز بھی قابل قدر ہیں۔ لیکن انھوں نے ان افراد پر، جو اپنے بچوں کو ہندی یا انگریزی میڈیم سے تعلیم دلوا رہے ہیں۔ ابن الوقت اور مفاد پرست ہونے کا الزام لگا کے زیادتی کی ہے۔ میں جناب عبدالمغنی سے دست بستہ ملتجی ہوں کہ بس ایک بار وہ اردو میڈیم اسکولوں کا "انسپکشن" فرمالیں۔ یہ بات آپوں آپ ان پر آئینہ ہو جائے گی کہ لوگ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں کیوں داخل نہیں کرتے۔

ابتدائی، ثانوی اور اعلا سطح پر اردو کے ذریعے تمام مضامین کی تدریس کے لیے جو کچھ ہوگا۔ اس کے لیے تہ دل سے میری دعا ہے کہ اسے شاندار کامیابی نصیب ہو۔ ایسا ہونا بہت زیادہ مشکل ہے بھی نہیں۔ خلوص اور لگن کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ کامیابی

ضرور نصیب ہوگی۔ لیکن تب تک کیا کیا جائے؟ والدین کی، اپنے بچوں کو بہتر تعلیم دلوانے کی خواہش کو مفاد پرستی اور ابن الوقتی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے؟ ہم جو اپنے بچوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں، یہ ہماری رواداری نہیں، مجبوری ہے۔ وقت کا تقاضا ہے۔ اسی وقت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب تعلیم سے روٹی روزی کا سوال جڑا ہو۔

کتنا بڑا المیہ ہے، کہ زبان، جو انسان سے انسان کا رشتہ جوڑنے کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اب اس کو لے کر دلوں کے رشتے توڑے جا رہے ہیں۔ مذہب اور زبان جب سیاست کا آلہ کار بن جائے تو یہی ہوتا ہے۔ لوگ اسے خنجر بنا کر ایک دوسرے کو لہولہان کرنے لگ جاتے ہیں۔ اردو کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ویسے، کس کی مجال ہے جو اردو کو ختم کر سکے۔ ہو سکتا ہے بیشتر لوگ اسے دیوناگری لپی میں لکھیں، لیکن لکھیں گے اردو ہی۔ میں نے اہل سادات کی نئی پود کو میر انیس کے مرثیے نہایت فصاحت سے پڑھتے دیکھا ہے، جو ان کی بیاض میں دیوناگری لپی میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ وہ بدترین ہے جو پیش آ سکتا تھا لیکن یہ سانحہ تو ہو چکا۔ اب ہمیں اس بدترین کا بہترین چن چن کے جمع کرنا ہوگا۔ اپنی تہذیب اور ثقافت کو بچائے رکھنے کے لیے ہمیں اردو رسم الخط کی حفاظت کے ساتھ اپنا تہذیبی اور دینی سرمایہ جلد سے جلد دیوناگری لپی میں منتقل کرنا چاہیے۔ نہیں تو اردو سے تقریباً نابلد اس نسل کو ان کی روایت اور تہذیب کے عظیم ورثے سے محروم کر دینے کے لیے ذمہ دار ہم خود ہوں گے۔

عبداللہ کمال نے احمد ندیم قاسمی صاحب سے شکوہ بیجا تو نہیں کیا ہے، لیکن جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہاں سے جو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ وہ کم تعداد میں ہیں اور اُن سے ہمارے جینئس شعرا کی نمایندگی نہیں ہو پاتی، تو ایسی صورت میں کسی سے کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے میرے بھائی! ۔ ویسے انھوں نے احتجاج کرکے اچھا ہی کیا۔ آیندہ لوگ محتاط رہیں گے۔

سریندر پرکاش نے متاثر کیا۔ افسانہ ختم کرتے کرتے میرے دل سے بھی صدا نکلی کہ "یہ کیا کیا تم نے میرے ساتھ!!!"۔ غزلوں نظموں کا حصّہ پھیکا ہے۔ ایک شعر نے بھی دامنِ نگاہ نہیں تھاما۔ دلیپ سنگھ خوب رہے۔ (ماشاء اللہ) ہاں "پیوستہ شجر" پڑھنے کے بعد میں نے جلدی رسالہ پلٹ کر دیکھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں میں "بانو" یا "بیسویں صدی" تو نہیں لے رکھا۔ آپ نے انگور کی بیل میں سردہ لٹکا دیا، یہ کیا کیا! ●

بلقیس ظفیر الحسن۔ پونا۔ بمبئی۔

شمارہ حال میں شامل مہمان مدیر عبدالمغنی کا اداریہ اردو کے بارے میں سنجیدہ غور و فکر

کا نتیجہ ہے۔ مگر اس سلسلے میں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ صرف غور و فکر کے بعد لکھے گئے اس طرح کے مضامین ہی اردو کی قسمت نہیں سنوار سکتے۔ اس کے لیے میدان عمل میں اُترنا ہوگا میدان عمل میں اگرچہ اردو کی ترقی کے لیے مغنی صاحب بہت پہلے سے کوشاں ہیں۔ مگر انھیں مزید قربانیاں دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مظہر امام کا مضمون نما خط بھی نئے سرے سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہمیں ایک بار ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں۔ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیوں چاہتے ہیں ..... ؟؟؟

اسی شمارے میں شامل عبداللہ کمال کا خط بھی اپنی طرف دھیان کھینچتا ہے۔ ان کی باتیں قابل قدر ہیں مگر انھوں نے یہ کیا لکھ دیا ہے کہ "خدا رکھے پاکستانی شاعری (غزل) کے سر پر ابھی تک فیض صاحب کا سایہ موجود ہے"۔ شاید یہ صحیح ہو۔ مگر کیسے ؟ ●

خالد عمادی، دربھنگہ (بہار)

اردو زبان کے حوالے سے عبدالمغنی صاحب کا اداریہ یا اشاریہ پڑھا۔ سچ یہ ہے کہ اردو کیا ہندستان کے کسی بھی معاملے کو حل کرنے میں ہندستانی بیوروکریٹ سب سے زیادہ مزاحمت کھڑی کرتے ہیں۔ اور اُن مسائل پر زیادہ شدّت اختیار کرتے ہیں۔ جن کا تعلق مسلمانوں سے ہو۔ ہندستانی بیوروکریسی نہیں چاہتی کہ ہندستان کے مختلف لسانی، مذہبی اقلیتوں کے مسائل باعزت طور پر حل ہو جائیں۔ چونکہ وہ پردے کے پیچھے رہتے ہیں۔ اس لیے عوامی سطح پر ان کی شناخت آسانی سے نہیں ہو پاتی۔

اردو کے اشتراکی ادیب بھی اب کسی قسم کے جھانسے میں نہیں آنے والے ہیں۔ کچھ ادیبوں نے ہندی والوں کے بہکاوے میں تبدیل رسم خط کے متعلق بیانات دیے تھے لیکن وہ بہت پہلے غابت ہو چکے ہیں۔ سوائے عصمت چغتائی کے جو تبدیل رسم خط پر اصرار کرتی ہیں۔ ویسے پورے کے پورے ترقی پسند ادیب اردو کے موجودہ رسم خط کے ساتھ ہی اردو زبان کو تسلیم کرتے ہیں ●

اسلم پرویز، رانچی (بہار)

مئی ۸۹ء کا شمارہ پڑھا۔ بہت پسند آیا۔ خاص طور سے اشاریہ بہت پسند آیا جس میں عبدالمغنی صاحب نے نہایت باریک بینی سے ہندستان میں اردو زبان پر ہو رہی ناانصافی پر روشنی ڈالی اور میں ان کی اس بات سے متفق ہوں کہ اردو تہذیب کے مستقبل کا تحفظ کم از کم اردو بولنے والوں کی ذمّے داری ہے ●

عبدالرؤف، دھول (مہاراشٹر)

اشاریہ پروفیسر عبدالمغنی۔ لارڈ بیکن ڈاکٹر اسلم فرخی۔ تحریک خلافت کی انقلابی آواز نظمیں

ادیبوں کی تنظیم کیوں۔ مظہر امام۔ سخن در سخن وغیرہ وغیرہ تمام دل پسند ہیں۔ ممکن ہے اور بہت سے گوہرِ بے بہا باقی ہوں کہ جن کی خوبیوں تک ابھی نظریں نہیں پہنچی ہیں۔ ایسے ٹھوس جریدے انگلستان تک کم پہنچتے ہیں۔

میں کوئی نقاد، ادیب یا شاعرِ عظیم نہیں ہوں بلکہ خادمِ اردو ادب ہوں اس ناتے چند باتیں آپ سے عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مجبوراً لکھ رہا ہوں، امید ہے آپ خفا نہ ہوں گے بلکہ مجھ ناچیز کی کچھ ہمت افزائی فرمائیں گے تو اردو تہذیب کا بھلا ہوگا اور آپ کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔

ماشاءاللہ ہماری اردو زبان اب اس حد تک ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ہمیں اپنی اردو زبان کے ادیب، شاعر، نقاد اور دانش ورکے خیالات کا حوالہ دینا چاہیے۔ یورپ کے دانش وروں کے اقوال اور حوالے اب کوئی مناسب نہیں معلوم ہوتے جب کہ ہمارا ادب خود ہی اس قدر پروان چڑھ چکا ہے تو اپنی زبان کے علما اور محققین کو پس پشت ڈالنا باعث افتخار نہیں ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا فرمائیے؟

دیگر عرض یہ ہے کہ اگر یہ کتاب نما لندن سے شائع ہوتا تو ۹۰ صفحات کے بجائے تقریباً ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہوتا اور سائز بھی بڑا ہوتا۔ کاغذ بھی اچھا لگایا جاتا کیونکہ ہم لوگ یورپ میں رہ کر کچھ ان چیزوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ کتابت اس سے دبیز قلم سے کھلی کھلی ہوتی کاتب صاحب اپنا کام نہ کر پاتے جو کر گزر رہے ہیں —— مگر اخراجات بھی چھے گنے زیادہ ہوتے اور اس کی ضخامت و دیدہ ریزی کے اعتبار سے قیمت میں بھی اضافہ ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ قیمت کی زیادتی کی وجہ سے خریدار کم ہو جاتے کیونکہ بدقسمتی سے ہماری اردو قوم کتاب اخبار وغیرہ خرید کر بہت کم پڑھنا جانتی ہے حالانکہ بہت ترغیب دلائی جاتی ہے اس کے باوجود بھی لوگ اس کے قائل نہیں ہوتے۔ میں ان مراحل سے گزرا ہوں اس وجہ سے مجھے آپ کی دشواریوں کا احساس ہے۔ میری تحریر میں کچھ تلخی ضرور پائی جاتی ہے مگر اس میں خلوص اور اپنائیت بھی ہے جس کی وجہ سے میں نے اظہار صداقت کا دامن نہیں چھوڑا اور بلا جھجھک لکھ دیا۔ بندہ نواز آپ کی تنقیص یا عیب جوئی مقصود نہیں۔ اس سے مراد قطع تعلق نہیں مجھے ●

سید محمود دیوان - لندن۔

کتاب نما جون ۸۹ء کا مہمان اداریہ کافی حد تک کم معیار نظر آیا بہ نسبت ان مہمان اداریوں کے جو پچھلے شماروں میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو تنقید انحطاط پذیر ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا لیکن اس ماہ مہمان اداریہ یقیناً زوال پذیر تنقید کا نمونہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تنقید صرف تنقید ہوتی ہے اس کے اپنے معیار ہوتے ہیں۔ پھر زمانے کی چھلنی میں چھن کر صرف معیاری تحریر باقی رہتی ہے اور غیر معیاری تحریر خود ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اب

قید کے سلسلے میں تدریسی تنقید اور فرمایشی تنقید کی اصطلاح گڑھنے کی کیا ضرورت
تی رہ گئی ہے اگر کوئی مدرّس تنقیدی مضمون لکھتا ہے تو وہ تدریسی تنقید کے زمرے میں
گئی، اگر کسی کا پیشہ تجارت ہے اور وہ تنقیدی مضمون لکھتا ہے تو اس کی تنقید تاجرانہ
و گئی اور اگر کوئی شاعر تنقید نگاری کرتا ہے تو اس کی شاعرانہ ہو گئی۔ یعنی پیشے کے اعتبار
سے تنقید کے مختلف رنگ سامنے آئیں گے۔ اگر اس طرح سوچنے کی اجازت دی گئی تو
نقید ہی پر کیا منحصر ہے افسانہ، ناول اور غزل لکھنے والوں کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے
ر یہ تدریسی افسانہ ہے اور یہ تدریسی غزل۔

پھر تدریسی تنقید کے ساتھ غیر تدریسی تنقید کی اصطلاح بھی رائج ہو گی پھر کہاں سے
نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مدرّس جب تنقید کرے گا تو وہ تدریسی تنقید ہو گی اور غیر
معیاری ہو گی۔ ایک غیر مدرّس تنقید کرے گا تو وہ غیر تدریسی تنقید ہو گی اور معیاری
ہو گی۔ یہ عجیب انداز ہے مدرّس اور غیر مدرّس کی تنقید کے معیاری اور غیر معیاری
ہونے کا۔

شہزاد منظر کے اس مہمان اداریے کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تدریسی
تنقید کو بنظر خود غیر معیاری سمجھتے ہیں لیکن ثابت نہیں کر پا رہے ہیں اس لیے ان کے خیالات میں
تضاد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس ہاں اور نہیں کے پیچھے کچھ الجھاؤ ان
کے ذہن میں ہے جسے وہ کہہ نہیں پا رہے ہیں●

سیّد محی رضا۔ بمبئی۔

'کتاب نما' کی خوب سے خوب تر کی طرف تیز گامی، فضائے اردو ادب میں بلند پروازی
ور دریائے صحافت میں کامیاب غواصی مبارک ہو۔

جون کے شمارے میں "اردو تنقید کے زوال" پر شہزاد منظر کا فکر انگیز اشاریہ اردو
تنقید پر بہترین تنقید ہے۔ درحقیقت "تقریباتی" اور "تدریسی" تنقید DELHI MADE
ELECTRICALS کی طرح ہیں جو ظاہراً اصل کی ہو بہو نقل ہوتی ہیں لیکن باطناً پرلے درجے
کی ناکارہ۔ ہاں! ان میں بعض تنقیدیں اچھی بھی ہوتی ہیں جیسا کہ اس وقت میرے سر
کے اوپر پھرتا ہوا یہ پنکھا کہ باوجود DELHI MADE ہونے کے ابھی تک اصل کی طرح
بغیر کسی بگاڑ کے کام دے رہا ہے۔

اجرائی تقریب میں پڑھے جانے والے تنقیدی مضامین (تبصروں) کے غیر معیاری
ہونے کا اظہار کرنے والے صاحب کتاب کا ایک واقعہ اگر تعلّی اور خود ستائی پر محمول
نہ کیا جائے تو میں بھی عرض کرتا چلوں۔ گذشتہ رمضان میں اردو کے ایک صاحب طرز ادیب
و ناقد کی کتاب پر میرا ایک مضمون بمبئی کے ایک روزنامے میں چھپا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی اثنا
میں موصوف کی کتاب کی رسم اجرا دہلی میں عمل میں آئی تھی۔ اس تقریب میں ہند و پاک کے نامور ادیب

نقاد شریک تھے، لیکن اخبار میں میرا مضمون پڑھنے کے بعد صاحبِ کتاب نے مدیر کو جو خط لکھا تھا اس کے چند جملے یہ بھی تھے:

"یہاں پس منظر کے طور پر ایک شام کا ذکر بے محل نہ ہوگا..... (تاریخ) کی شام ساڑھے پانچ بجے سے دس بجے تک یعنی پورے ساڑھے چار گھنٹے اس کتاب (کتاب کا نام) پر نئی دہلی میں یادگار سیمینار رہا۔ (بارہ نامور ادیبوں کے نام) نے تحریری یا تقریری تبصرے کیے۔ مگر ان میں کوئی تبصرہ یا اظہارِ خیال سید یحیٰی نشیط آپ کے تبصرہ نگار کی گہری نظر سے زیادہ گہرا اور متوازن نہیں تھا۔"

اس واقعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تقریباتی تنقید عموماً مصلحت کوشی کا شکار ہو جاتی ہے، یا اگر چاپلوسی مقصود نہ بھی ہو تو خوف دل آزاری ناقد کو سطحی تبصرہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اب رہی تدریسی تنقید۔ تو اردو پروفیسرس اور لیکچررس کے تنقیدی مضامین نہ صرف یہ کہ سنجیدہ اور خالص ادبی رسائل میں جگہ پاتے ہیں بلکہ تنقید کے نام پر کتابی شکل میں بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اقبالیات پر کئی تنقیدی کتابیں اسی تدریسی تنقید کی مرہونِ احسان رہی ہیں جن کے نام ہی گنوانا چاہیں تو خط طویل ہو جائے گا۔

شہزاد منظر کے مضمون میں بعض تاریخی ستم در آئے ہیں۔ مثلاً جاتک کتھاؤں کو شہزاد صاحب نے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تصنیف کہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ گوتم بدھ کے بعد یہ لکھی گئیں" اور یہی رائے صحیح بھی ہے۔ چونکہ بدھ کی وفات ۴۸۳ ق.م میں ہوئی تھی۔ اس لیے جاتک کتھاؤں کا زمانہ دو، سوا دو ہزار سال قدیم مانا جا سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پانچ ہزار سال ق.م۔؟

موصوف نے بوطیقا کی اشاعت کا زمانہ ایک ہزار سال قدیم بتایا ہے۔ جب کہ اس کے عربی ترجمہ ہی کو گیارہ سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ ترجمہ نصرانی المذہب حنین بن اسحاق نے نویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل میں کیا تھا اور وہ بھی بالراست یونانی سے نہیں بلکہ کسی سریانی ترجمہ سے کیا تھا۔ رومن ادب میں، باوجود یونانیوں سے کچی ہونے کے بوطیقا کا کافی اثر تھا، چنانچہ رومن شاعر ہوریس نے اسی کی بنیاد پر "فن شاعری" پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ہوریس کا زمانہ ارسطو کے بعد کا ہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بوطیقا کی اشاعت کو صرف ایک سال ہی نہیں ہوئے، بلکہ کم و بیش دو ہزار سال ہو چکے ہیں۔

شہزاد صاحب نے دو جگہ "۵۰ء کی دہائی" لکھا ہے۔ دونوں جگہ موصوف کی مراد غالباً بالترتیب قبل از ۵۰ء اور بعد از ۵۰ء ہے۔

پروفیسر اکبر رحمانی نے شیخ خوب محمد چشتیؒ کی "خوب ترنگ" کو نثری اور "امواج خوبی" کو اردو تصنیف لکھ کر فاش غلطی کی ہے۔ دراں حالیکہ اوّل الذکر اردو مثنوی ہے اور ثانی الذکر اس کی فارسی شرح ●

ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط، وارود

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مولانا آزاد کی کہانی

مصنف: ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
قیمت: ۱۸ روپے
مبصر: شمیم حنفی

ایک زمانے میں ظفر احمد نظامی کہانیاں لکھتے تھے اور شعر کہتے تھے۔ پھر ان کی تصنیفی زندگی کا وہ دور آیا جب انگریزی اور اردو میں وہ سیاسیات، خاص طور پر ہندستانی سیاست میں مسلمانوں کے رول سے متعلق کتابیں اور مضامین لکھنے لگے۔

اب ان کی یہ نئی کتاب آئی ہے جو لکھی تو گئی بچوں کے لیے، لیکن اپنی دلچسپیوں کے اعتبار سے ایسی ہے کہ بڑے بھی اسے شوق سے پڑھیں گے۔ مولانا کے سوانح سے متعلق ضروری معلومات اس کتاب میں یکجا کردی گئی ہیں۔ اس کی ترتیب میں سلیقہ بہت ہے۔ زبان صاف اور سہل، بیان پر لطف اور رواں دواں ہے۔

ان دنوں مولانا کی شخصیت، مولانا کی خدمات اور مولانا کے افکار سب پر ہر طرف بحثیں اور مذاکرے ہو رہے ہیں۔ سو، نوعمر طالب علموں کے لیے اس کتاب کی اشاعت بر وقت ہی ہے۔

نشیب و فراز

شاعر: امیر چند بہار
ناشر: ہریانہ اردو اکادمی (پنچکولہ)
اشاعت: ۱۹۸۸ء قیمت: تیس روپے
ملنے کا پتا: ہریانہ اردو اکادمی۔ ۸۷، سیکٹر ۹ پنچکولہ (ہریانہ)
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

"نشیب و فراز" امیر چند بہار کا شعری نقش ہے۔
اس میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں، قطعے اور معرا شاعری کے الگ الگ رنگ نظر آتے ہیں۔
امیر چند بہار اصل میں رباعی کے فن کار ہیں اور اسی صنف سخن میں ان کا فن کھلتا ہے۔
جاتا ہے کہ انھوں نے سات سو سے زائد رباعیاں کہی ہیں۔
ان کے شعری نقوش میں ارمغان بہار، نسیم بہار، دہنی دو نیا اور نسیم مغرب شامل ہیں۔

آخر الذکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔

"نشیب و فراز" میں ہر صنفِ سخن میں اخلاقی، اصلاحی اور مذہبی تصورِ حیات ملتا ہے۔ زیرِ نظر رباعیوں میں وہ چمک دمک اور چونکا دینے والے موضوعات اور اسلوب ناپید ہیں جن کو پہلے چھپے ہوئے اڈیشن میں قدر عزیز اور متاعِ گراں کی حیثیت حاصل تھی ۔ نظموں میں شخصیات، ماحول، کردار اور وطن بہت کچھ ہے۔ مگر براہِ راست تخاطب نے ان کو وعظ و پند و للکار میں بدل دیا ہے "محبتِ وطن" میں بھی عظمتِ اسلاف کا واسطہ دیا گیا ہے "خونِ ناحق" نہایت اہم موضوع ہے۔ اس میں "سنجے اور گیتا" کا المیہ ہے لیکن اس دور کی مرکزی سرکار کے خلاف ایک مصرع بھی نہیں۔ روداد و الم بیان کر دی ہے اس میں تاثیر ندارد۔ اور آخر میں " بلّہ رنگا" کا مقدمہ روزِ محشر میں رنگ لانے کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ "میرا لڑکپن" عمدہ نظم ہے۔

خاص طور پر ابتدائی حصہ معترا نظموں میں بیشتر ترنم سے عاری ہیں اور بعض مقامات پر ایک مصرع کی لسانیاتی ساخت دوسرے مصرع سے وصل میں بے رنگ نظر آتی ہے۔ غزلیں سپاٹ ہیں۔ شاعر کسی شعر میں محبوبِ حقیقی کے پاس نہیں جاتا اور محبوبِ مجازی کبھی شاعر کے پاس نہیں آتا۔ قطعے اس کتاب کی رونق اور عظمت ہیں۔ "تنوع، مشاہدہ، تجزیہ، تخیل ہیئت اور اسلوب ہر اعتبار سے قاری کو متوجہ کرتے ہیں۔ مثلاً۔

میرے احساس سے اے بادِ صبا چھیڑ نہ کر   جم چکی میرے خیالوں پہ بہت گردِ ملال
طبعِ افسردہ پہ چلتا ہی نہیں کوئی فسوں   میں نے مانا کہ بہت خوب ہے قدرت کا جمال

⁂

میری تسکین کی نکلے گی نہ کوئی صورت   درد تھا دل میں جو پہلے وہ ابھی کم تو نہیں
یہ بجا ہے کہ بڑی چیز ہے قدرت کا طلسم   پاس قدرت کے مگر زخم کا مرہم تو نہیں

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی کی رائے۔ سکریٹری کشمیری لال ذاکر کا "پیش لفظ" ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مقدمہ اور ماہرِ غالبیات مالک رام کا فرمودۂ صدرِ انجمن اس کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔

خندۂ گل

شاعر: شیخ غلام علی بلبل کاشمیری
ناشر: ادارۂ فروغِ اردو، لاہور
اشاعت: ۱۹۸۷ء   قیمت: ۴۵ روپے
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

شاعری میں پہلی تلاش تخلص کی ہوتی ہے۔ مگر نیا تخلص ملنا ہی نہیں۔ اور یہ کاوش محض نئی امنگ کی پیداوار ہوتی ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے۔

نام رکھنے سے کہیں ذوقِ نظر کھلتا ہے   "مینا بازار" جہاں گیر کا بازار نہیں (سیفی) ہرا

اقبال نے کہا ہے۔ "بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ"

شیخ غلام علی نے اپنا تخلص بلبل اور غلام محمد نے اپنا تخلص طاؤس رکھ لیا۔ اپنے کردار، فن اور شیخ سے تخلص کو دلربائی اور آبرو عطا کر دی۔ غور کیجیے تو سودا، غالب، داغ کون سے اچھے تخلص ہیں۔

ان شاعروں کی بھرپور شخصیت نے ان میں بھی دلنوازی اور حسن پیدا کر دیا ہے۔

شیخ غلام علی بلبلؔ کاشمیری کا CHEQTERED CAREER رہا ہے۔ سری پرتاپ کالج سری نگر میں تعلیم پانے کے بعد جہادِ روزگار شروع ہوا۔ دوسری عالم گیر جنگ میں کبھی کارگل کبھی برما کے محاذِ جنگ پر اڑان۔ کبھی شملہ، دیپاپور، اور سنگاپور میں تعمیرِ آشیاں ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں براجمان، مگر قوتِ پرواز نے پھر دل کو اکسایا اور لندن میں مستقل "آشیانہ" بنا لیا۔

"خندۂ گل" زندگی کے اسی عقاب اور شاعری کے بلبل کا نقشِ دوام ہے۔ اس کے خندۂ گل میں بلبل ہزار داستان کی نیرنگی جلوہ طراز ہے۔ گوشۂ فرنگ و رنگا رنگ نظمیں جوے شیر غزلیات، کم کلامی قطعات، تضمین، نمک پارے اور آئینِ خیال۔ نظموں میں انگلستان، لندن کی رات، فرنگی بس بس میں، بیاض چوری ہو جانے پر۔ اپنی انفرادیت اور اسلوب کی رعنائی کے باعث اپیل کرتی ہیں۔ بعض نظموں میں غزل کے لوازم سمو کر دو آتشہ بنا دیا ہے۔ تلازمات تمام تر غزل سے لیے گئے ہیں۔ ان کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔ فروٹی غزل، ریٹی غزل، طبی غزل، نوجی غزل، موٹر غزل، جغرافیائی غزل کراوی غزل، وغیرہ۔ قطعات میں مشرقی و مغربی کلچر، تعلیم، سماج، اقتدار، موسم، ٹکنالوجی، مولوی ور زندگی کی نئی پرانی اقدار پر طنز و مزاح بہت کچھ ہے۔

قطعۂ تضاد۔

مشرق کے طور اور ہیں، مغرب کے طور اور
دونوں کے طرز و طور میں کتنا تضاد ہے
مغرب میں آنکھ مارنا، معمول کا سلام
مشرق میں یہ معاملہ، وجہ فساد ہے

زل کے موضوعات اور آہنگ و اسلوب میں ندرت، صفائی اور خارجی دنیا کی حقیقت پسندانہ تعبیریں یں۔ چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

حسن راشن کارڈ پر اور پیار راشن کارڈ پر
رفتہ رفتہ آگئی سرکار راشن کارڈ پر

مختلف شہروں میں ان کے آٹھ بنگلے بن گئے
شوق ہے لیڈر کو کتنا قوم کی تعمیر کا

مشرقی دنیا میں بیوی ہے اگر نوکر کا نام
مغربی دنیا میں شوفر جانیے شوہر کا نام

لوگ مغرب میں کھڑے ہو کر کیا کرتے ہیں پیار
اس سند سے پیار کا معیار اونچا ہو گیا

میم جس جیب کے پیسوں پہ نظر رکھتی ہے
اپنے ہونٹوں کی نوازش بھی ادھر رکھتی ہے

رخِ گل رنگ پہ، پوڈر کی زیبائش کا کیا کہنا
یہیں تو دودھ کے اوپر یہ بالائی نظر آئی

کچھ دن یہی مذاقِ سیاست اگر رہا
مرغے لڑیں گے "مجلسِ آئین ساز" میں

کبھی فیشن سے پڑھتے ہیں نمازیں ہم برہنہ سر
کبھی روزے بھی رکھتے ہیں تو انگریزی میں رکھتے ہیں

ولایت کے سبھی تالے بہت مضبوط ہیں لیکن
علی گڑھ میں جو بنتے ہیں وہ تالے اور ہوتے ہیں

سید ضمیر جعفری نے "بلبل شیریں فعال" کے تحت بڑا پیارا، نکتہ رس اور ادا شناس تعارف ایا ہے۔

یہاں طنز و مزاح کی تاریخ اور محاسن گنانا بے سود۔ وہ سب جانتے ہیں۔ لیکن بلبل کے

فنی وصف کے بارے میں یہ اشارہ ضروری ہے۔ انھوں نے میر غلام ناز کی اور حکیم غلام نبی جیسے دیدہ ور اور عارف عروض شخصیات سے فیض پایا ہے۔ اس لیے کلام میں پختگی کا رنگ اور محاسن شعری کی تجلی ہے۔ ایک اور وصف یہ ہے کہ اس صنف سخن کا شاید ہی کوئی شاعر مغربی دنیا میں پہنچا ہو۔ اور اگر کسی کو موقع ملا بھی تو اس کو "سیر مغرب" کہا جائے گا۔ باقی مغربی جلوے، تحکم، کلچر اور معیار سب کچھ ہندستان میں دیکھا اور سنا۔ مگر بلبل نے مشرق میں پہاڑوں، جنگلوں، دیہات، شہروں اور محاذ جنگ پر بھی بسیرا کیا اور آخر میں "اپنا آشیانہ" مغرب میں بنا لیا۔ یہ علم و تجربہ کس کی میراث ہے؟ شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔

اب نقد و نظر کی بات کر لیجیے۔ طنز و مزاح کی عدالت میں بلبل نے کہیں جج کا منصب نہیں سنبھالا۔ بعض اقدار و کردار کے قضیہ میں وہ وکیل استغاثہ ضرور نظر آتے ہیں لیکن باقی پورے کلام میں وہ وکیل صفائی ہیں۔ مخلص، محنتی اور جانکار ۔۔ اصل میں بلبل کا اپنا PRABOLA ہے۔ محور سے افقی اور عمودی خطوط کھینچتے ہیں۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز، سرد و گرم، سود و زیاں کرب و نشاط، نامرادی و شادکامی اور بہت سے پیراہن چھو کر واپس آتے ہیں۔ ان کا محور زیرفانوس ہے جس میں وطن پرستی، انسان دوستی، اور امن عالم کی شمعیں روشن ہیں۔ "خندۂ گل" کا صوری حسن بھی دیدنی ہے۔ شاعر کی تصویر، رجائی زندگی، متبسم لب اور نگاہ کے تیور مزاح و طنز کی توضیح کرتے ہیں۔ شاعر و ناشر کو مبارک باد۔

تنویرات

مصنّف: قیوم خضر
مبصر: عبدالمغنی
پتا: اشارہ پرکاشن، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸
قیمت: ۳۰ روپے

جناب قیوم خضر پچھلے پچاس سال سے مسلسل علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی خدمت متعدد جہتوں سے انجام دے رہے ہیں، وہ شاعر بھی ہیں، نثار بھی، ادیب بھی، صحافی بھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قومی تحریکات میں بھی حصہ لیا ہے اور معاشرتی مہمات میں بھی۔ لہٰذا ان کی اپنی ایک عوامی زندگی اور سماجی حیثیت بھی ہے۔ انھوں نے پہلے گیا اور پھر پٹنہ سے ایک مدت تک ماہنامہ "اشارہ" شائع کر کے کئی نسلوں کے ذوق و شعور کی پرورش و تربیت کی ہے اور آج کے متعدد قابل ذکر ادبا و شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اپنے ادبی کردار کی ابتدائی مشق "اشارہ" کے صفحات میں کی۔

ادب میں قیوم خضر صاحب کا پسندیدہ موضوع قومی یک جہتی اور تصوف ہے، جس پر وہ کتابیں بھی لکھ چکے ہیں اور وہ اہل علم کے حلقوں میں پسند کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف وقتوں میں قیوم خضر صاحب نے برسوں عام دلچسپی اور فائدے کے ایسے مضامین تحریر اور لیبا اوقات ریڈیو سے نشر کیے ہیں جو بعض تاریخی حقائق کو روشنی میں لا کر فرقہ وارانہ مفاہمت و اتحاد کا سبق ادا

اور پیغام دیتے ہیں۔ ان مضامین کی پذیرائی کبھی عوام و خواص میں ہوتی رہی ہے۔ مگر اب تک یہ زیادہ تر رسالوں کے صفحات میں بکھرے یا مسوّدات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔

اب اپنے ان ہی مضامین کو مرتب کرکے قیوم خضر صاحب نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور اس مجموعے کا نام خیال انگیز طریقے پر "تنویریات" رکھا ہے۔ جن موضوعات پر یہ تنویرات سامنے آئی ہیں ان میں کچھ مذہبی و تاریخی ہیں۔ کچھ تحریکی و سیاسی۔ مثال کے طور پر "قومی معاشرہ کی تشکیل میں اسلام کا نقطۂ نظر" "ہندوستانی مسلم معاشرے کی تعمیر میں خواجہ اجمیریؒ کا حصّہ" "شہید وطن" "ٹیپو سلطان" "ہیرآزادی" "پیرعلی" اس قسم کے مضامین میں بہترین اور طویل ترین مطالعہ "تحریک آزادی میں اہل صادق پور کی قربانیاں" کے عنوان سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کے ایک اہم مرکز، خانوادے اور علاقے کا ہے۔ قدیم ہند اور ہندی فکر کے مطالعے میں "کرشن جی کا ایک سرسری مطالعہ"، "مہابھارت میں یقین کامل بر ذات مطلق کا تصور" اور "جین دھرم کا بانی۔ مہاتما مہابیر" اچھی، معلومات افزا اور فکر انگیز کوششیں ہیں۔ معاشرتی مسائل میں "فرد اور سماج کا رشتہ" "نسلی غرور کا صنم اکبر" (جو دراصل اسلام کے دور زرّیں کا ایک باب ہے) اور سیاسی موضوع پر "قومی وقار" (جو امام ابن تیمیہؒ کی سیرت سے متعلق ہے) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر مباحث ہیں۔

یہ مضامین علمی نوعیت کے ہونے کے باوجود ادبی چاشنی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مصنّف کا اسلوب بیان شگفتہ، سلیس، شستہ اور رواں ہے، وہ اپنی بات ایک خاص ڈھنگ سے کہتے ہیں، جو دلچسپ بھی ہے، معنی خیز بھی، ان کی ساری نکتہ سنجیاں انشا پردازی کے آب و رنگ کے ساتھ ہیں، البتہ کہیں کہیں انشا کے زور میں خطیبانہ انداز بھی پیدا ہو جاتا ہے جس پر مولانا ابوالکلام آزادؒ کا اثر نمایاں ہے۔ بہرحال۔ یہ ایک عمدہ نثر ہے جس کی ساخت و پرداخت سلیقے سے کی گئی ہے اور اس میں انشائیے کا پورا لطف ملتا ہے۔ وقیع مواد کے ساتھ انشا پردازی کے ایسے پُرلطف نمونے اب کم یاب ہیں۔

زیر نظر مضامین کی ادبی اہمیت اس لحاظ سے بھی واضح ہے۔ مصنّف دماغوں کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی اپیل کرتا ہے اور گرچہ بعض اوقات اپیل میں جذبات کی کچھ رقّت نظر آتی ہے اس سے مصنّف کے قلب میں ایک سوز و گداز کا سراغ ملتا ہے کم از کم بعض قیمتی تصورات اور تہذیبی اقدار کے ساتھ ان کی ذہنی وابستگی کا پتا چلتا ہے۔

اردو سانٹ
تعارف و انتخاب

مرتّب: ڈاکٹر حنیف کیفی
مبصّر: پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی
صفحات: ۱۷۶　　قیمت: ۵۰ روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کسی بھی جیتی جاگتی زبان کا ادب ہر عہد میں نئے نئے سرچشموں سے تازگی اور بالیدگی

حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اردو نے بھی ہر دور میں مختلف سمتوں سے بہت کچھ قبول کیا اور اس کی یہ فراخدلی ہی اس کے فروغ کی ضمانت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے۔ انیسویں صدی سے مغرب کے اثرات دھیرے دھیرے ہمارے سارے معاشرے پر پڑنے لگے۔ خصوصاً پڑھے لکھے طبقے کو تازہ طور پر سوچنے کا موقع ملا۔ اس کا اثر اردو شعر و ادب پر بھی بہت نمایاں ہے۔ ہمارے یہاں انیسویں صدی سے مغربی اصناف ادب سے استفادہ کیا جانے لگا تھا۔ چنانچہ شاعری میں بعض اور اصناف کے ساتھ سانٹ کو بھی آزمایا گیا اور اس صنف میں نہایت دلکش تخلیقات ظہور میں آئیں۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے اردو سانیٹ کے تفصیلی مطالعہ کی طرف توجہ دی جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر اس کی ایک کتاب شائع ہوکر اہل نظر سے پہلے ہی داد حاصل کر چکی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تازہ تر کتاب "اردو سانٹ: تعارف و انتخاب" بھی توجہ کی مستحق ہے۔ کتاب کا آغاز دیباچے اور تفصیلی مقدمے سے ہوتا ہے۔ مقدمہ میں سانٹ کی صنفی خصوصیات سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مغربی ادب میں سانٹ نیز اردو سانٹ کا مختصراً تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف شعرا کی تخلیقات کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حصہ قارئین کے لیے معلومات آفریں ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی اپنے موضوع پر پوری گرفت ہے۔ انھوں نے انگریزی کے ذریعے مغرب کے ذخیروں کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے۔ مقدمہ کے بعد ۱۲۱ سانٹوں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ حنیف کیفی صاحب نے سانٹ کے مختلف طرزوں کی نشاندہی کر کے ہر طرز کے سانیٹ الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر اردو شاعری کی ایک نئی جہت روشن ہو جاتی ہے۔ سانٹوں کے ساتھ مآخذ کے مکمل حوالے بھی دیے ہیں۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک قابلِ قدر تحفہ ہے جس کے لیے ڈاکٹر حنیف کیفی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آبشارِ نغمہ

شاعر: پریم نارائن سکسینہ رازؔ ایم اے
ناشر: شریمتی آشا سکسینہ، ایم اے
اشاعت: ۱۹۸۷ء قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتا: ایف ۹۶ نارودجی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۹
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

کایستھوں نے اردو فارسی ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ تذکروں اور تاریخ ادب میں محفوظ ہیں۔ پریم نارائن سکسینہ رازؔ نے اپنی شعری تخلیق "آبشارِ نغمہ" پیش کر کے ایک نئے ورق کا اضافہ کیا ہے۔ سرورق موضوع کی حسین اور فنکارانہ توضیح کرتا ہے۔ کتابت اور طباعت نے بھرپور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ شاعر کی تصویر نے جلوہ سامانی کو فروغ بخشا ہے

اس حسین پیش کش میں غزلیں، نظمیں، رباعیاں اپنی اپنی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ شاعر کو پنڈت رام کرشن مضطر سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ استاد نے شاگرد کی صلاحیت کا اظہار کیا ہے:

"جناب پریم نارائن سکسینہ راز، نئے دور کے ان شعرا میں سے ہیں جو مضمون آفرینی اور جدّتِ فکر کے ساتھ زبان و بیان اور فنی محاسن کا حسن و جمال قائم رکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر شارب ردولوی، برہمانند جلیس اور الفت امین آبادی نے اپنے اپنے شعری نظریے اور تجربے کی روشنی میں شاعر کے کلام پر جی بھر کر بحث کی ہے اور خیر سگالی کا فرض ادا کیا ہے۔

یہاں نظموں اور رباعیوں پر گفتگو کا موقع نہیں اور تبصرے میں کفایتِ وقت اجازت بھی نہیں دیتی۔ غالب سرمایہ غزل ہے۔ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

میں نے پریم نرائن سکسینہ راز کو نوکلاسکیت کا شاعر مانا ہے۔ اس شاعر کے یہاں ایک علامت "کرن" ہے۔ اسی علامت نے اس کو فن کار بنایا ہے اور اس کی شاعری کے کینوس کو وسعت عطا کی ہے۔

ایک بات بے تامّل واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ہر شاعر کے یہاں زبان و بیان اور عروض کے اسقام پائے جاتے ہیں۔ شاعری کوئی آسمانی صحیفہ نہیں جس میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہ ہو۔ چنانچہ "آبشار نغمہ" میں بھی بعض مقامات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ مثلاً ص ۴۰

صدقے اترا ہوں ترے سو جان سے
مجھ سے دامن مت چھڑا، اے زندگی

"صدقے اترنا" محاورہ نہیں۔ اردو محاورہ "صدقے اُتارنا" ہے۔

ص ۵۵ جس اوج کو ہ فن پہ کوئی دوسرا نہیں لے آئے ہیں اڑا کے وہاں بال و پر مجھے

مصرع اوّل میں "کوہ" حشو ہے۔ اس نے مصرع کی ہمسری بھی چھین لی۔

ص ۵۶۔ "ہم چلتے پھرتے سایے ہیں زندانِ جہاں کی سیاہی میں"

اس مصرع میں "سیاہی" قافیہ نہیں جچتا۔

ص ۵۹۔ "پی کر جیسے وہ شوق سے اب تک نشے میں تھا" "نشے" مشدّد لکھنا چاہیے۔

اس سے اردو تہذیب و تزئین کی جھلک دکھانی مقصود ہے۔ حریفوں کو چونکنے کا موقع نہیں۔ شاعر نے سنگلاخ زمینوں میں اچھے اچھے شعر نکالے ہیں۔ طویل اور مختصر بحروں میں سعیِ مسعود کی ہے۔

میں نے ابھی کہا۔ "کرن" ایک علامت ہے۔ اب کہتا ہوں۔ جاندار علامت ہے۔ شاعری کا محور ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

رنگ برسا رہے ہیں دھنک کی طرح میری غزلوں میں اس کے خطوطِ بدن

چند اشعار پڑھ کر شاعر کے ذہن اور دل کو سمجھا جا سکتا ہے۔

تھا وہ انساں میں جہرومہ کا وجود گردِ غبار سا ہے
فلک نشینوں کو سجدہ کرنا خرد کو اب ناگوار سا ہے

رقص کرتی ہے تصور کی حسین وادی میں
اس کی پازیب سے چھنکتی ہوئی ہر شام ابھی

راحت ملی، سکون ملا، آگہی ملی
وہ کیا ملے کہ ہم کو نئی زندگی ملی

نہ ٹوٹا ترکِ تعلق کے بعد بھی یہ ربط
کسی کو دیکھ کے دل آج بھی دھڑکتا ہے

ابھی افق پہ سرخ سحر کی کرنیں ہیں بکھری بکھری
دن کو منظم ہو جانے تک لمحہ لمحہ دیکھو تم

نفس نفس مجھے ان کا، انھیں میرا غم ہے
دلوں پہ ایک محبت کی چوٹ کیا کم ہے

دن میں ذہن کا کہنا مان
دل کی حکایت رات میں سن

شاعر کا اسلوب، مانوس اور رچا ہوا ہے۔ اس نے زندگی اور کائنات سے موضوعات اخذ کیے ہیں۔ وطن پرستی، انسان دوستی اور بہبود عوام نیز امن عالم۔ اس کے شعری دائرے میں روشن عناصر ہیں۔ اس نے کائنات کی پرستاری نہیں کی بلکہ تسخیر کائنات اس کے مشن میں داخل ہے۔ تنہائی، علاحدگی، انتشار، بے ثباتی اور بیت جھڑ جیسی مہلک چیزیں اور داخلیت کا راگ اس کی زندگی میں کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ فلسفہ ہی قوم، ملک، فروغ زندگی اور سائنسی ذہن کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ اس لیے شاعر 'روشنی' اور رجائیت کا پرستار ہے۔ یہی اس کا پیغام ہے۔ اس کے یہاں NOSTALGIA کی نمود رجعت پرستی کا عنصر نہیں بنی۔ بلکہ محبت کے حسین لمحوں کی بہشت بازیافت ہے جس سے انسانی محبت کے تسلسل کا سراغ ملتا ہے۔ جس نے فن کار کو اپنے ماحول اپنے معاشرے اور انسانی زندگی سے پیار کرنا سکھایا ہے۔ اس قدر وفا پر اعتماد نے اس کی شاعری، زندگی اور ذہنی افق کو تابانی اور رفعت عطا کی ہے۔

"آبشار نغمہ" شاعر کے اپنے PRABOLA کی تعبیر بھی ہے۔

اشاریہ 'آج کل' (جلد اوّل)

مرتبہ: جمیل اختر
ناشر: اردو اکادمی، دہلی
قیمت: ۷۷ روپے
مبصر: شکیل الرحمٰن

جمیل اختر نے ایک عمدہ کام کیا ہے، اب تک جو اشاریے مرتب کیے گئے ہیں ان میں اشاریہ آج کل کو یقیناً ایک ممتاز مقام حاصل ہو گا۔

جمیل نے سائنسی بنیاد کو اہمیت دی ہے اور اپنے منصب کی شناخت کرتے ہوئے اشاریہ کی سائنسی بنیاد قائم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشاریہ اپنی مثال آپ ہے اشاریہ مرتب کرنے والوں کے لیے ایک عمدہ معیار ہے۔ ایسے اچھے کام کے لیے انھیں مبارکباد دیتا ہوں، بلاشبہ یہ اردو اکادمی دہلی کا بھی ایک کارنامہ ہے۔ مرتب کی محنت لگن اور عرق ریزی متاثر کرتی ہے۔ پرانے اور نئے محققین اس کتاب سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

"آج کل، دہلی نے ابتدا سے ایک معیار قائم رکھا ہے۔ ایک ادبی جریدے کی حیثیت سے اس کے کارنامے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو کے ادیبوں اور فن کاروں نے اسے ہمیشہ سنوارا ہے، بعض مدیروں نے عمدہ خاص نمبر شائع کیے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔

کسی ایسے ادبی جریدے کا اشاریہ تیار کرنا آسان نہ تھا کہ جو ۱۹۴۲ء سے شائع ہو رہا ہے۔ ابتدا میں پندرہ روزہ رہا پھر ماہنامہ بنا۔ کم و بیش چھیالیس برسوں کے شماروں کی ایسی چھان بین اپنا لہو جلانا ہے، ایک نوجوان محقق نے یہ کام جس طرح کیا ہوگا اس کا تصوّر کر کے حیرت زدہ ہوں۔ جمیل اختر کا یہ کام زندہ رہے گا، تحقیق کرنے والے مواد کی تلاش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کتاب کی ضرورت محسوس کریں گے۔ کتب خانے اتنے غریب ہو گئے ہیں کہ کسی بھی رسالے کے تمام شمارے عموماً محفوظ نہیں رہ پاتے۔ ضرورت ہے ایسے اشاریے شائع کیے جائیں اور ایسا ہر کام جمیل اختر جیسے ذی ہوش، باشعور اور محنتی شخص ہی کے سپرد کر دیا جائے۔

"اشاریہ آج کل" کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حروف تہجّی کی ترتیب عنوانات کے اعتبار سے ہے جو جدید سائنسی طریقہ ہے۔ مرتّب نے "حرفے چند" میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس اشاریہ میں مضامین کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حصہ اوّل مضامین سے متعلق ہے اور دوسرا ادب کے علاوہ دیگر مضامین سے متعلق۔ ادبی حصّے کا نام 'مقالے' اور دوسرے کا 'مضامین' رکھا گیا ہے دوسرے کئی عنوانات اور افراد ایسے ہیں جن پر مقالے مختلف حروف تہجّی کے تحت مرتّب کیے گئے ہیں۔

کتاب میں مدیران اور نائب مدیران کی فہرست کے علاوہ 'آج کل' کی تاریخ کا ایک جائزہ بھی ہے اور 'آج کل' کے موضوعات' رسالے کی ادبی حیثیت' اس کے خاص نمبر اور ادارے وغیرہ کی تصویریں پیش کی گئی ہیں جن کی وجہ سے "اشاریہ آج کل" کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس اشاریے کی وجہ سے "آج کل" دہلی کی ادبی، تاریخی ثقافتی و تمدّنی عوامل کی ایک بڑی تصویر ادب کے نگارخانے میں سج گئی ہے اور میں اسے جمیل اختر کا ایک کارنامہ تصوّر کرتا ہوں۔

اشاریہ کی تفہیم میں بھی یہ کتاب نوجوان مرتّبین کی مدد کرتی رہے گی، اس عمدہ کام کے اثرات دور رس ثابت ہوں گے اس کا مجھے یقین ہے۔ جمیل اختر نے یہ کام کر کے ایک نئی روایت کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ جسے کبھی فراموش نہ کیا جائے گا۔ یہ کتاب اشاریہ سازی کے تعلق سے چند بنیادی نکات سے باخبر کرتی ہے۔

مجھے یقین ہے کتاب مقبول ہوگی۔ دنیا کے ایسے ملکوں میں بھی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جائے جہاں اردو زبان و ادب میں تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ مرتّب کی محنت، لگن اور عرق ریزی کی داد یقیناً ہر جگہ ملے گی۔

ایسے کام کی ذمہ داری قبول کرنے سے قبل جمیل اختر کے تجسّس کی پہچان ہو جاتی ہے اردو اکادمی نے انھیں تحریک نہ بخشا ہوتا تو ایسے تجسّس کی پہچان بھی ممکن نہ ہوتی۔

اشاریہ مرتب کرتے ہوئے جمیل نے اپنی حیرت انگیز محنت سے تکنیک میں جو نئی جہتیں پیدا کی ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔

اردو ادب میں "اشاریہ آج کل" اور اس کے نوجوان مرتب جمیل اختر کا استقبال کرتا ہوں۔

پچھلے موسم کا پھول

شاعر: مظہر امام
قیمت: ۵۰ روپے
مبصر: منصور عمر
ناشر: آدرش بک ہاؤس سری نگر۔

اردو شاعری میں مظہر امام کی شناخت محض اس لیے نہیں ہے کہ وہ آزاد غزل کے بانی و موجد ہیں۔ کیونکہ انھوں نے آزاد غزل کی نشو و نما میں کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔ پھر بھی مظہر امام اور آزاد غزل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔

مظہر امام کے ادبی کارناموں میں شاعری اور نثر دونوں شامل ہیں۔ وہ تقریباً پچھلی پانچ دہائیوں سے اردو شاعری کی زلفیں سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اب تک "زخم تمنا"، "رشتہ گونگے سفر کا" اور "پچھلے موسموں کا پھول" جیسے اہم اور قابل قدر مجموعے اردو دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "آتی جاتی لہریں" بھی علمی و ادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

"پچھلے موسم کا پھول" مظہر امام کی تازہ ترین غزلوں کا مجموعہ ہے، جو پچھلے دنوں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ غزلیں شامل ہیں جو کشمیر میں قیام کے دوران لکھی گئی ہیں اور "کشمیر کی غزل" کے عنوان سے ہندو پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مظہر امام اس مجموعہ کا نام شاید "کشمیر کی غزلیں" رکھنا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے البتہ غزلوں کی ترتیب سے پہلے اندرونی صفحہ پر ضمنی عنوان کے تحت "کشمیر کی غزلیں" لکھ کر اپنی دیرینہ آرزو پوری کیے بغیر رہ بھی نہ سکے۔

اس مجموعہ کی ترتیب روایتی انداز میں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے کہ سب سے پہلے ۷ اشعار کی ایک "حمد" کو رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ حمد روایتی نہیں ہے بلکہ بالکل جدید لب و لہجے میں ہے۔ جہاں عابد اپنے معبود کے سامنے خود کو سوالیہ نشان بنا کر پیش کرتا ہے ملاحظہ ہو:

ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری؟　　　چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے
دیا ہے کیوں مجھے لوح و قلم کا بار گراں؟　　　کہ گردشیں بھی تری آسماں بھی تیرا ہے
میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں؟　　　فنا بھی تیری ہے نام و نشاں بھی تیرا ہے

"پچھلے موسم کا پھول" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مظہر امام نے زندگی کو قریب سے دیکھا بھی ہے اور اسے برتا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں زندگی کے تمام اسرار و

رموز اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ بروئے کار آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ چند اشعار ؎

زندگی کا وشِ باطل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ تو ہی اک عمر کا حاصل ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

ہم کو ملا تو سایۂ ابر سیہ ملا ورنہ اس آسمان پر شمس و قمر بھی تھے

کہا یہ سب نے کہ جو وار تھے اسی پر تھے مگر یہ کیا، کہ بدن چور چور میرا تھا

اوروں سے مرا نام الجھتا ہے تو الجھے شکوہ مجھے کیوں ہو کہ میں تیرا تو نہیں ہوں

فن کار جس عہد اور ماحول سے متعلق ہوتا ہے اس کی پوری پوری ــــ فن پر ضرور ہوتی ہے۔ چونکہ "پچھلے موسم کا پھول" کی غزلیں قیام کشمیر کے دوران لکھی گئی ہیں اس لیے ان غزلوں میں وادیٔ کشمیر کا حسن اور اس کی رعنائی و دلکشی کہیں تو براہ راست اور کہیں زیریں لہروں کی طرح جاری و ساری ہے ؎

گر رہے ہیں زرد پتے پیڑ سے فالج کی طرح وادیٔ کشمیر ہے بیمار کا بستر ابھی

تجھ کو پانے کے لیے اس کو بھلانے کے لیے ارضِ کشمیر کی وادیٔ جناں بھی کم ہے

کشمیر کی غزلوں پہ احسان اسی کا ہے لفظوں کو قبا دی ہے، ہونٹوں کو نوا دی ہے

یہ ساری برف گرنے دو مجھی پر تپش تم سے سوا ہے اور میں ہوں
پہاڑوں پہ کہیں بارش ہوتی ہے زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں

جلتی ہوئی سڑک پہ اکیلا رہا سفر جب برف گر رہی تھی ترا ساتھ ہو گیا

یہ پہلی برف ہے آنکھوں میں بھر لو یہ موسم پھر کبھی اجلا نہ ہوگا

نیوکلیائی عہد کی فکری و ترقیاتی کائنات کا دائرہ جہاں وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور انسان زمان و مکان کی تمام حدود کو توڑتا ہوا لامکان کی طرف گامزن ہے وہاں اس کی دنیا بہت ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ قرب و جوار سے اس کا تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے بدن وہ اپنے خول میں سمٹتا جا رہا ہے۔ یہ سمٹاو انسانی سماج کے نچلے طبقے ہی میں نہیں ہے بلکہ متو اعلا طبقہ ہی اس لعنت کا شکار ہے۔ متوسط طبقہ تو اس لیے کہ اس کا بیشتر وقت گھر اور

کی نذر ہو جاتا ہے اور اعلا طبقہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ احساس برتری کا شکار رہ کر اپنی بنائی ہوئی عیش و عشرت کی دنیا میں مگن رہتا ہے اور باہر کی دنیا سے تعلق نہ رکھنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس غلاظت و نجاست اور تباہی و بربادی کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے، لیکن وہ چونکہ وہ عوام کی گرفت سے باہر ہے اس لیے اپنے دریچوں پر سجے ہوئے خوبصورت پردوں کی اوٹ سے باہر پھیلے ہوئے قیامت کے منظر سے باخبر ہو کر بھی بے خبری کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور انتہائی بے حیائی کے ساتھ اپنے شہر کے شہری کو بے گھر ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اس کے دیوار و در و بام منقش کیسے رہ سکیں گے اس پس منظر کے پیش نظر مظہر امام نے جو غزل کہی ہے اس کے صرف تین اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؂

پھر شہر میں آئے ہیں ستم گر، تو ہمیں کیا! سڑکوں پہ ہیں سفّاکوں کے لشکر تو ہمیں کیا!
ہم نے تو دریچوں پہ سجا رکھے ہیں پردے باہر ہے قیامت کا جو منظر، تو ہمیں کیا!
دیوار و در و بام ہمارے ہیں منقش شہری ہوتے اس شہر کے بے گھر تو ہمیں کیا!

اس مجموعہ میں صرف تین آزاد غزلیں شامل ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مظہر امام نے آزاد غزل پر زیادہ طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ وہ آزاد غزل کے موجد ضرور ہیں لیکن انھوں نے بمشکل دس بارہ آزاد غزلیں کہی ہوں گی!

مظہر امام کا ایک شعر ہے ؂

صرف تعداد نہ دیواں کی بڑھا چند اشعار بھی دیوان میں رکھ

"پچھلے موسم کا پھول" محض تعداد بڑھانے کے لیے نہیں پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ اس مجموعہ میں "چند اشعار" ہی نہیں بلکہ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اردو شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار ؂

اس نے ہمت جو بڑھائی بھی تو رکھا یہ لحاظ کوئی بزدل نہ بنے، کوئی دلاور نہ رہے

جاگتی آنکھیں لٹاتی ہیں زر و گوہر ابھی شہر سے لوٹے نہیں خوابوں کے سوداگر ابھی
سانپ کاٹیں گے اسے اور زہر ہم تک آئے گا یہ تماشا بھی دکھائے گا وہ بازی گر ابھی۔

ہر کھیل بھول بھلیاں میں ہم نے کھیلا بھی تیری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

دل اکیلا ہے بہت لالۂ صحرا کی طرح تم نے بھی چھوڑ دیا ہے مجھے دنیا کی طرح

ایک تیغِ انا تھی جیسے سب جرم اپنے تھے اب کے سر مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا

پیاسے تھے تو پانی کو پکارا تھا ہمیں نے ندی ادھر آئی ہے تو گھر لے کے گئی ہے

شکریہ تیرا کہ غم کا حوصلہ رہنے دیا بے اثر کر دی دعا، دستِ دعا رہنے دیا

ہاتھ اٹھتے ہیں کہاں، چلیے یہاں سے چلیے کیا دعا، کیسی دعا، چلیے یہاں سے چلیے

جس طرح سے کشمیر حسن و خوبصورتی کی آماجگاہ ہے اور سیاحوں کے لیے دلفریبی و دلکشی کا باعث ہے اسی مناسبت سے "پچھلے موسم کا پھول" بھی انتہائی خوبصورت، دیدہ زیب اور پرکشش اور قارئین کو نہ صرف یہ کہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے بلکہ مطالعہ پر بھی مجبور کرتا ہے

بازیافت

مصنّفہ: فرحت جہاں
قیمت: پندرہ روپے
پتا: مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال
مبصّر: ضیاء الرحمٰن صدیقی

اردو میں افسانہ مغرب کے اثر سے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو نثر کی مقبول صنف بن گیا۔ اردو افسانے کی عمر زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود اردو میں افسانے کی روایت خاصی وقیع ہے۔ پریم چند سے آج کے دور تک پہنچتے پہنچتے اردو افسانے نے کئی رنگ بدلے اور کئی روپ اختیار کیے ہیں اردو غزل کی طرح آج کا افسانہ بھی اب سے پچاس سال پہلے کے افسانے سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔

فرحت جہاں نئی نسل کی ابھرتی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق سرزمین بھوپال سے ہے۔ جو علمی و ادبی لحاظ سے بڑا مردم خیز خطہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ انھوں نے ان افسانوں کو لکھنے میں پوری طرح اپنے تخلیقی شعور اور فنکارانہ صلاحیتوں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ افسانے کی بنیادی خصوصیات، کہانی پن ان کے افسانوں کا بنیادی وصف ہے۔ علامتی افسانہ نگاری کے برعکس وہ اپنے قاری کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہیں اور افسانے کی حسن کارانہ ترسیل ان کا مطمحِ نظر ہے جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ سے ظاہر ہے:

"ادب میں تجربے ہوتے ہیں اور ہونا چاہییں۔ یکسانیت سے گریز لازمی ہے۔ لیکن مصنّف کی تخلیقی صلاحیت اور صناعیت اس پر منحصر ہے کہ وہ جدید رنگ کو اپنے افسانے میں اس ہوشیاری اور کامیابی سے پیش کرے کہ ترسیل بھی قائم رہے اور حسن کا دامن بھی نہ چھوٹے۔

اپنے اس نظریے پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے فرحت جہاں کے افسانوں میں ایک سنجلی

ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔ سماج کے ایک ذمہ دار فرد اور ایک ذمہ دار فن کار کی حیثیت سے انھوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات کو گہرائی سے دیکھا اور اپنے مشاہدات و تجربات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ بازیافت، پناہ گاہ، داغ داغ اجالا جیسے افسانے ایسے ہی ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چند افسانے ایسے بھی ہیں جن کی بنیاد رومانیت پر رکھی گئی ہے۔ کسی بھی حال میں انھوں نے فن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ فرحت جہاں کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ افسانوں کا پلاٹ گٹھا ہوا اور بیان دلچسپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بات ابتدا سے آخر تک قاری کے ذہن میں اترتی چلی جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ زیر تبصرہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اہل نظر ایک ابھرتی ہوئی افسانہ نگار کی خاطر خواہ ہمت افزائی کریں گے جس کی وہ مستحق ہے۔

خیر مقدم کیا۔ ممتاز اناؤنسر حضرت والی آسی لکھنوی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر نور اللہ خاں کے شکریہ پر یہ شاندار مشاعرہ رات کے تین بجے اختتام کو پہنچا۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

دھلی یونی ورسٹی کے طالب علم کو تین ایوارڈ

دہلی۔ ۱۶ اپریل۔ آج دہلی یونی ورسٹی کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد نائب صدر جمہوریہ اور دہلی یونی ورسٹی کے چانسلر شنکر دیال شرما کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس موقع پر ڈاکٹر شرما نے مختلف مضامین میں ممتاز طلبہ و طالبات کو ایوارڈ و گولڈ میڈل تقسیم کیے۔ مسٹر عقیل احمد کو ۳ ایوارڈ دیے گئے ہیں جن میں پہلا پروفیسر خواجہ احمد فاروقی گولڈ میڈل، دوسرا عرش ملسیانی گولڈ میڈل اور تیسرا مرزا غالب پرائز ہے۔ دونوں گولڈ میڈل انھیں دو خصوصی مطالعہ والے پرچوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر دیے گئے جب کہ مرزا غالب پرائز ایم اے اردو کے امتحان میں اول مقام حاصل کرنے پر دیا گیا۔

حضرت عروج زیدی مرحوم کے جواں سال صاحبزادے شھزاد زیدی اسکوٹر کے حادثہ میں جاں بحق

رام پور۔ ۲ مئی۔ مقامی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس اور ملال کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ نامور شاعر حضرت عروج زیدی مرحوم کے فرزند اصغر سید شہزاد علی زیدی کا اسکوٹر حادثہ میں زخمی ہو جانے کے باعث انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۳۲ سال تھی۔ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رامپور سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے محکمہ انڈسٹری میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

مجلس بلدیہ ناندیڑ کا کل ہند غزلیہ مشاعرہ

مجلس بلدیہ ناندیڑ (مہاراشٹر) کے زیر اہتمام حسب روایت کلا مندر ناندیڑ (مہاراشٹر) میں ایک کل ہند غزلیہ مشاعرہ علامہ صابر شاہ آبادی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ مشاعرہ میں ڈاکٹر ساغر اعظمی لکھنوی، حضرت حبیب ہاشمی کلکتوی، حضرت تبشر نواز، شاہین ظفر (اورنگ آباد)، محترمہ انجم رہبر، حضرت راحت اندوری، جناب نواز دیوبندی، جناب اختر الزماں ناصر، جناب سعید راہی (بمبئی)، جناب خواہ مخواہ (بمبئی)، جناب اسماعیل ظریف وغیرہ کے علاوہ صدر مشاعرہ حضرت صابر شاہ آبادی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ خصوصاً حضرت ساغر اعظمی، حبیب ہاشمی، نواز دیوبندی، محترمہ انجم رہبر و صدر مشاعرہ علامہ صابر شاہ آبادی کو بہت پسند کیا گیا۔ کنوینر مشاعرہ پروفیسر نور اللہ خاں نے شعرا کا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نئی نسل کے ممتاز شاعر شہپر رسول کے شعری مجموعے "صدف سمندر" کی رسم اجرا

۱۴ اپریل (علی گڑھ) مسلم یونی ورسٹی کے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں اردو کے ممتاز شاعر شہپر رسول کے شعری مجموعے "صدف سمندر" کا اجرا اردو کے عظیم نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے انجام دیا۔ اس موقع پر پروفیسر سرور نے فرمایا کہ شہپر رسول کی شاعری عہد حاضر میں، صحت مند، بالغ نظر اور منفرد شاعری کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے اپنا ایک مخصوص اسلوب بنا لیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ نئے شعرا کے یہاں جو کیاں اور قواعد و فن سے فرار کی جو کیفیت نظر آتی ہے۔ شہپر رسول کا کلام اس سے پاک ہے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر قاضی عبد الستار نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ شہپر رسول کو میں گزشتہ ۱۰۔ پندرہ برس

سے پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے اپنے خصوصی شعری اظہار کے ذریعے اردو ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ اردو میں شعر کہنا بہت آسان ہے لیکن اردو کے شعر کہنا بہت مشکل ہے اور شہپر رسول اردو کے شعر کہتے ہیں۔

فارسی کے سابق صدر شعبہ پروفیسر وارث کرمانی نے فرمایا کہ شہپر رسول کی شاعری اور شخصیت دونوں کی سنجیدگی، ذہانت اور دلکشی نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے وہ نئے عہد کے ممتاز اور باوقار شاعر ہیں "صدف سمندر" کی اشاعت پر میں ان کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

شعبۂ لسانیات کے استاد ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ نے اپنے مقالے میں شہپر رسول کی شاعری میں زبان کے تخلیقی استعمال، اسلوب کی ندرت اور شاعر کی مخصوص پیکر تراشی سے بحث کی۔ ان کے خیال میں شہپر رسول ہند و پاک کے ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جو ہم عصر شعری ادب میں اپنے مخصوص اسلوب اور خصوصی ذاتی شعری تجربات کی بنیاد پر اپنی شناخت پیدا کر چکے ہیں۔

نئی غزل کے منفرد شاعر اور نقاد اسعد بدایونی نے اپنے مقالے میں شہپر رسول کی انفرادیت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ شہپر رسول اپنے معاشرے سے قطعی ذاتی طور پر تجربات حاصل کرتے ہیں اور ان کو قطعی ذاتی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں ندرت، انفرادیت اور کلام میں وسعت ہے۔ اسی انفرادیت کی وجہ سے "صدف سمندر" شہپر رسول کا شناخت نامہ بن گیا ہے۔

منظور ہاشمی نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے اور ریحانہ ہاشم نے شہپر رسول کا کلام اپنے سحر انگیز ترنم میں پیش کیا۔ دیگر شرکا میں پروفیسر شہریار، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، پروفیسر شفیق انجم، ڈاکٹر اصغر عباس، ڈاکٹر معظم علی خاں، ایس ایم ین شاہ، بزمی بھارتی، جنا پرشاد راہی ڈاکٹر ہلال فرید، نسیم الاسلام صہبا، رئیس الدین رئیس اور قمر الہدا فریدی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

انجمن ترقی اردو بہار کے نئے سکریٹری

پٹنہ ۲۰ رجون۔ جناب مخدوم عالم کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی تھی۔ اس پر انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری کی حیثیت سے مسٹر فخر الدین عارفی کو نامزد کیا گیا ہے۔

فخر الدین عارفی صاحب گزشتہ کئی برسوں سے انجمن کے بعض شعبوں میں دفتری امور انجام دیتے رہے۔ توقع ہے کہ وہ انجمن میں اپنے نئے عہدے کے فرائض حسن وخوبی انجام دیں گے۔

سلامت علی مہدی کو خراج عقیدت

میرٹھ ۲۰ رجون۔ انجمن ترقی اردو شاخ میرٹھ کی ایک تعزیتی میٹنگ اردو میڈیم ماڈل اسکول شاہ پیر گیٹ میں منعقد ہوئی جس میں معروف اردو صحافی اور ناول نگار سلامت علی مہدی کے انتقال پر اظہار افسوس کیا۔ آغا احمد۔ عارف الدین صابری۔ بیگم شہناز اور عبدالجبار نے مرحوم کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور مغفرت کی دعا کی۔

سنت درشن سنگھ کا انتقال

نئی دہلی ۳۰ رمئی۔ مشہور روحانی رہنما اور ساون کرپال روحانی مشن کے سربراہ سنت درشن سنگھ مہاراج کا آج صبح پونے ۸ بجے یہاں وجے نگر میں واقع کرپال آشرم پر انتقال ہو گیا۔ آپ اردو کے اچھے شاعر بھی تھے اور ان کے ۹ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے "منزل نور" اور "متاع نور" کو دہلی و اتر پردیش کی اردو اکاڈمیوں سے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر کبیر جائسی پروفیسر کے عہدے پر

علی گڑھ ۲۰ رجون۔ مشہور محقق و نقاد اور شاعر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامک

اسٹڈیز میں پروفیسر کے منصب پر فائز کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر جانسی کا قلم گزشتہ ۳۰ برسوں سے علم و ادب کی آبیاری میں رواں دواں ہے۔ ان کی اس کاوش مسلسل کا اعتراف ان انعامات کی صورت میں کیا گیا ہے جو ان کو ہندستان کی مختلف اردو اکیڈمیوں نے دیے ہیں۔ اس کے علاوہ نقوش (لاہور) ایوارڈ کمیٹی کے اراکین نے بھی ڈاکٹر جانسی کو ۱۹۸۹ء کا نقوش ایوارڈ دے کر ان کی علمی و ادبی کاوشوں کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر کبیر احمد جانسی کی اب تک ۱۳ کتابیں اور تقریباً ڈیڑھ سو مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

ممتاز نقاد و شاعر حضرت صابر شاہ آبادی

پر ایم۔ فل کے لیے ریسرچ

حضرت ڈاکٹر راہی قریشی صاحب ریڈر گلبرگہ یونیورسٹی کی نگرانی میں حضرت صابر شاہ آبادی۔ حیات و ادبی خدمات تحقیقی موضوع پر محترمہ شمیم رفیق جہاں لکچرار کو اسی سال ایم۔ فل میں درجہ اوّل میں کامیابی حاصل ہوئی۔

حمید الماس کی خدمات کا اعتراف

حمید الماس کی۔ اردو اکاڈمی بنگلور نے ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۸ء کے ریاستی انعام کے لیے ممتاز شاعر حمید الماس کو منتخب کیا ہے۔ ۵۰۰۰ روپوں کا یہ انعام جلد ہی ان کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

اردو رابطہ کمیٹی اترپردیش کی شاخیں قائم کیجیے

محترم محبان اردو۔

اردو رابطہ کمیٹی اترپردیش ریاست یو پی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے کئی برسوں سے تحریک چلا رہی ہے۔ اترپردیش کے مختلف علاقوں میں اب تک اردو رابطہ کمیٹی اترپردیش کی ۔۔ سے زائد ذیلی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ کا علاقہ میں اردو رابطہ کمیٹی کی کوئی ذیلی شاخ قائم نہ ہوئی ہو تو براہ کرم فعال اردو دوستوں کو اپنے ساتھ لے کر اردو رابطہ کمیٹی کی ذیلی شاخ قائم کرکے مندرجہ ذیل پتہ پر مطلع فرمائیں یا تفصیلات کے لیے لکھیں۔

ایم شفیق انصاری ایڈوکیٹ (جنرل سکریٹری)

اردو رابطہ کمیٹی اترپردیش

کیمپ آفس: قصر قمر۔ بارہ دری مرادآباد۔ ۲۴۴۰۰۱

یوسف ناظم سے ایک ملاقات

۲ رفروری ۱۹۸۹ء کی حسین شب کو نشاط لائبریری کے ہال میں مالیگاؤں کے مقتدر شعراء و ادباء نے ملک کے مشہور طنز و مزاح نگار ادیب جناب یوسف ناظم صاحب کے اعزاز میں منعقدہ ادبی مجلس میں شرکت کی۔ شعرا و ادبا کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں ادب نواز حضرات بھی حاضر تھے۔

صدر مجلس جناب ہارون بی۔ اے نے اپنے مخصوص انداز میں یوسف ناظم کا تعارف کرایا اور کہا کہ ناظم صاحب تمام اردو مراکز پر اپنی مخصوص صنفِ ادب کے ساتھ حاضر رہتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے اردو حلقوں نے آپ کو جو اعزاز بخشا وہ ہمارے ملک اور ہماری اردو تحریک کے لیے ایک باعث فخر مثال ہے۔

پروگرام کے پہلے نثری دور میں جناب اسحاق خضر صاحب نے انشائیہ چوری پڑھ کر داد حاصل کی۔ اس کے بعد مہمان ادیب یوسف ناظم نے اپنا طنز و مزاح سے بھرپور مضمون "ذرا مسکرائیے" پڑھا جس سے پوری محفل میں ایک شگفتہ لہر دوڑ گئی۔

منظوم دور میں جن شعرا نے کلام سنائے ان کے اسمائے گرامی بالترتیب حمید انصاری، احمد شناور، ارشد نظر، بسمل کاملی، بدرالدین بادل، اسماعیل راز۔ ڈاکٹر نایاب لکھنوی۔ مختار یوسفی۔ رامش مالیگانوی۔ جمیل گونڈوی۔ ظہیر قدسی اثر صدیقی۔ نسیم میانگری اور مہمان ادیب و شاعر یوسف ناظم

ہیں۔

زندہ دلان مالیگاؤں کی صحت مند طریقہ پر تجدید کرنے کے سلسلہ میں پروفیسر امان اللہ خاں مختار یوسفی، ظہیر قدسی اور یوسف ناظم کے درمیان کار آمد گفتگو ہوئی۔ اس کے لیے یوسف ناظم صاحب ہر قسم کا تعاون پیش کرنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق مارچ کے مہینہ میں ایک آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین، مالیگاؤں کی اس مجلس کی خوبصورت نظامت انصاری عثمان غنی (داسکس) نے کی شب میں تقریباً ڈیڑھ بجے مجلس کا اختتام ہوا۔

اردو کے مشہور محقق اور آزاد شناس جناب مالک رام کو مولانا آزاد ایوارڈ

۲۰ رمئی ۸۹ء۔ آج نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی شائع کردہ الہلال عکسی اڈیشن کے ساتھ مولانا آزاد کی جملہ کتب کی رونمائی فرمائی۔ اس کے ساتھ جناب مالک رام کو مولانا آزاد ایوارڈ (۱۵ ہزار روپے کا چیک، اور ایک شال) پیش کی۔ نائب صدر جمہوریہ ہند نے اتر پردیش اکیڈمی کی اردو خدمات کی دل کھول کر داد دی۔ اس جلسے میں نائب صدر جمہوریہ ہند کے علاوہ دیگر مقررین نے پروفیسر محمود الہیٰ کی اردو خدمات کو سراہا۔ اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں نے شرکت کر کے اس جلسے کی رونق کو دوبالا کر دیا۔

اردو سوسائٹی، بیتیا کی اہم نشست

۱۰ رمئی بیتیا کی بے حد فعال ادبی انجمن ادارہ اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی جس میں لگ بھگ دو درجن کے علاوہ کوئی ایک سو سامعین موجود تھے۔

نشست کا آغاز پروفیسر اشوتی کی راشرف کی نعت شریف سے ہوا اور اختتام صدر نشست جناب اشرف قادر کا کے صدارتی کلمات سے ہوا۔ ان کے علاوہ جناب ناظم بھارتی حسرت شادانی، شاکر کریمی، منظر سلطان، ابوالخیر نشتر، ایس۔ اے۔ شکیل، نسیم احمد نسیم، ساجد شمس، قمر الزماں قمر، ظفر امام، عظیمی ہاشمی، گنگا سرن جما کلا دھر کنور لال انشو مالی، آزاد اظہر، ذاکر حسین ذاکر، شگفتہ جمال، مرزا تصوّر بیگ، ذ تنّا ر روحی صاحبان نے اپنی غزلوں، نظموں سے نشست کے وقار میں اضافہ کیا۔ نظامت کے فرائض جناب صفدر امام قادری نے انجام دیے۔

اندر جیت لال کو فکر تونسوی ایوارڈ

غالب کلچرل اکادمی بنگلور نے سال رواں کا فکر تونسوی ایوارڈ اردو کے جانے پہچانے ادیب صحافی جناب اندر جیت لال کو دینے کا انتخاب کیا ہے۔ ایوارڈ موصوف کو ان کی طنزیہ ومزاحیہ تحریروں پر دیا جائے گا۔

ننھے منّے بچّوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
باوؤں کی ہنڈیا
4/50
شیر اور بکری
6/=
دُم کٹی لومڑی
6/=
بھیڑیے کا گانا
6/=
چالاک بلّی
6/=
کوّے کا خواب
6/50
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

غزل نما　ادا جعفری　۷۵/-
سازِ سخن　" "　۴۵/-
ترجمۂ قرآن　پروفیسر مشیر الحق　۸/-
تحقیقی مضامین　(تحقیق)　مالک رام　۶۰/-
باتیں کچھ سریلی سی　(سوانح ماہرین موسیقی)　داؤد رہبر　۳۶/-
خسرو نامہ　(تحقیق)　مجیب رضوی　۲۱/-
تعلیم و تربیت اور والدین　(تعلیم)　ڈاکٹر محمد اکرام خاں　۵۱/-
کولمبس کے دیس میں　(سفرنامہ)　جگن ناتھ آزاد　۴۵/-
پتھر بولے چمن...　(ڈرامے)　عمیق حنفی　۴۵/-
ریت کی دیواریں　(ناول)　رفعت سروش　۲۱/-
بنجر بادل　(ناول)　کشمیری لال ذاکر　۳۳/-
دائروں میں پھیلی لکیر　(شعری مجموعہ)　کشور ناہید　۳۰/-
آنکھ میں سمندر　(شعری مجموعہ)　زاہد ڈار　۳۰/-
تذکرہ　(ناول)　انتظار حسین　۵۴/-
ذرے کی کہانی　(سائنس)　مہدی جعفر　۲۱/-
حیات جامی　(سوانح)　مولانا اسلم جیراجپوری　۱۲/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات　(خطبہ)　پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی　۸/-
نقشِ ذاکر　(مضامین)　مرتب: عبد الحق خاں　۵۱/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ)　شمس الرحمٰن محسنی　۵۰/-
دنیا کے بڑے مذہب　(علمی)　عماد الحسن آزاد فاروقی　۸۵/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین　(مضامین)　ڈاکٹر سلامت اللہ　۳۵/-
تعلیم اور رہنمائی　(تعلیم)　ڈاکٹر محمد اکرام خاں　۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں　(تعلیم)　معین الدین　۱۵/-
یادوں کا اجالا　(آپ بیتی)　بھگوان سنگھ / مترجم شمیم حنفی　۴۰/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات　(مضامین)　مرتبہ: عماد الحسن آزاد فاروقی　۴۰/-

پشکن کے دیس میں　(سفرنامہ)　پروفیسر جگن ناتھ آزاد　۱۵/-
آنکھ اور خواب کے درمیان　(شعری مجموعہ)　ندا فاضلی　۲۱/-
سدا بہار چاندنی　(افسانے)　رام لعل　۳۰/-
دل دریا　(افسانے)　شرون کمار ورما　۲۵/-
رانگ نمبر　(انشائیے)　شفیقہ فرحت　۱۶/-
رات کے مسافر　(شعری مجموعہ)　مرتبہ انور سجاد　۲۸/-
زوال کا عروج　(ڈراما) بریخت　مترجم: انور عظیم　۳۶/-
اثبات و نفی　(تنقیدی مضامین)　شمس الرحمٰن فاروقی　۴۰/-
مالک رام ایک مطالعہ　(مجموعہ مضامین)　مرتبہ علی جواد زیدی　۵۰/-
فی الحال　(مزاحیہ مضامین)　یوسف ناظم　۱۸/-
حرف حرف روشنی　(شعری مجموعہ)　حمایت علی شاعر　۳۵/-
فرار　(ناول)　ظفر پیامی　۱۴/-
تین چہرے تین آوازیں　(افسانے)　صالحہ عابد حسین　۱۸/-
نقدِ حرف　(تنقیدی مضامین)　پروفیسر ممتاز حسین　۲۴/-
گدازِ شب　(شعری مجموعہ)　معین احسن جذبی　۴۰/-
سرسید کی تعلیمی تحریک (روداد) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد　اختر الواسع　۲۵/-
گفتارِ غالب　(مضامین)　مالک رام　۴۸/-
تعلیم اور اس کے مسائل　(تعلیم)　ڈاکٹر محمد اکرام خاں　۳۶/-
تحفۃ السرور　(آل احمد سرور پر مضامین)　مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی　۷۵/-
غالب اور صفیر بلگرامی　(تحقیق)　مشفق خواجہ　۳۶/-
جائزے　(تبصرے)　مرتبہ مظفر حنفی　۴۵/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ　(مجموعۂ مضامین)　مرتبہ خلیق انجم　۳۰/-
مجھے گھر یاد آتا ہے　(ڈرامے)　شمیم حنفی　۲۱/-
رسول اکرمؐ اور یہود حجاز　(علمی)　سید برکات احمد۔ ترجمہ مشیر الحق　۲۰/-
تاریخ انگلینڈ (ایک مختصر خاکہ ۱۴۸۵ء-۱۹۰۱ء) (خاکہ)　سید محمد عزیز الدین حسین　۹/-
محبوب الارث　(علمی)　مولانا اسلم جیراجپوری　۴/-
دردِ دل　(افسانے)　تعارف قرۃ العین حیدر۔ ستارہ جعفری　۱۸/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیب یعنی دین اور فنون لطیفہ)　مرتبہ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی　۴۰/-

☆☆☆

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب		قیمت
چاند کی بیٹی	(باتصویر)	۴/۵۰
دُم کٹی لومڑی	"	۶/:
جادو کی ہنڈیا	"	۴/۵۰
شیر اور بکری	"	۶/:
کوّے کا خواب	"	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا	"	۶/:
چالاک بلّی	"	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری	"	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
پراسرار غار	۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/:

کتاب	قیمت
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/:
سہانے ترانے	۶/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
شریر شیرا	۳/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵۰
ظالم ڈاکو	۶/:
مہکتی کلیاں	۶/:
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
لوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ بونے	۳/:
ایک دیس ایک خون	۳/:
جیت کس کی	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
ذرّے کی کہانی	۲۱/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نائی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:
بی مینڈکی اور کوّا	۳/:
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۵۰
لال مرغی	۳/:

کتاب	قیمت
ننھا نٹو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلامہ ممسامہ	۵/:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰
ایک کھلا راز	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۳/:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا نامع	۳/:
ہار کی تلاش	۶/:
سُرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۶/:
ننھا فرشتہ	۲/۵۰
جوہر قابل	۳/:
بھیڑیے کے بچے	۳/:
ننھا جبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۶/:
بچوں کے افسر	۶/:
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/:
شیر خاں	۳/:
رحمت شہزادہ	۴/:
لومڑی کے بچے	۳/:
اس نے کیا کرنا چاہا	۳/:
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
امیر خسرو	۳/:
بہادر سیاح	۳/:
دادا نہرو	۶/:
جادو کا گھر	۳/:
جگنو کی بلی	۲/:
کٹا ہوا ہاتھ	۴/۵۰

دگنی سے زیادہ پیداوار سے
اناج میں ہم خود کفیل۔
ہر چار میں سے تین گاؤں میں بجلی۔
آبپاشی کا آراضی علاقہ دوگنا۔
BANK
کمزور طبقوں کی
فلاح کے لئے
خصوصی پروگرام۔
بہت سی منزلیں
طے کر لی ہیں
گزشتہ پانچ برسوں میں
دس کروڑ سے زیادہ لوگ
خط افلاس سے اوپر آگئے۔
چیچک، پلیگ کا خاتمہ، صحت
سے متعلق سہولیات میں مزید بہتری
بہتر صحت۔ لمبی عمر
تعلیمی اداروں اور ان میں تعلیم پانے
والوں کی تعداد میں سہ گنا اضافہ۔
زیادہ لوگ اب پڑھ لکھ سکتے ہیں۔
پیداوار میں ۹ فیصد سالانہ کے
اضافے سے ترقی پذیر ممالک
میں بھارت کا شمار۔
ہمیں اپنی ترقی پر ناز ہے

اس شمارے میں

ماہنامہ

کتاب نما

اگست ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۸

فی پرچہ	5/-
سالانہ	45/-
غیر ممالک سے	
(بذریعہ بحری ڈاک)	110/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	230/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	65/-

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پرنٹر پبلشر سید ...کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

نئی مطبوعات

خواجہ میر درد (تنقیدی و تحقیقی مطالعہ) مرتبین شاہد صدیقی اشعر ۶/-
جدید اردو شاعری اور خلیل الرحمن اعظمی (تنقید) مظہر احمد ۵۰/-
انتخاب خطوط غالب (خطوط) مرتبہ خلیق انجم ۲۵/-
آزادی (ناول) قاضی مشتاق احمد ۳۰/-
دی پرافٹ (سوانح) خلیل جبران ۴۰/-
اقبال کے شعری اسالیب (اقبالیات) ڈاکٹر عبدالحق ۱۰۰/-
ادبیات شناسی (ادب) محمد حسن ۱۲/۵۰
اردو افعال (گرامر) سونیا چرنیکووا ۲۴/-
ستارہ جو ٹوٹ گیا جلد دوم (تاریخی ناول) عنایت اللہ التمش ۳/-
عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں (مذہب) ڈاکٹر احتشام احمد ندوی ۶/-
قانون ابن سینا اور اس کے شارحین (طب) حکیم سید ظل الرحمن ۵۰/-
شب گزیدہ (شاعری) رفعت شمیم ۴۰/-
مافی الضمیر (") ضمیر کاظمی ۴۰/-
اردو میں ادبی نثر کی تاریخ (ادب) ڈاکٹر طیبہ خاتون ۱۰۰/-
شمع جلتی رہے (ناول) رضیہ حکیم ۳۰/-
علامہ خضر برنی شخص اور شخصیت (سوانح) مرتبہ نظر برنی مرلقا ملک ۲/-
بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ (ادب) شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۳/-
یادوں کے ستم (ناول) زلیخا حسین ۳۰/-
خاموش حسن (") ٹیگور ۲۴/-
بوستاں کی کہانیاں (کہانیاں) علقمہ شبلی ۶/-
مرزا فرحت اللہ بیگ حیات و ادبی خدمات (ادب) ڈاکٹر محمد عبدالحق صدیقی ۶/-
کلیات ذوق نیا ایڈیشن (شاعری) تنویر احمد علوی ۲۴/-
علامت قدیم ہندوستانی جمالیات کی روشنی میں | پروفیسر شکیل الرحمن ۵/-

سرورق :	وارث علوی
مصور :	شکیل اعجاز

افراط و تفریط (مذہب) محمد یوسف احمد صدیقی ۵۰/-
اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش | تصوف | پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۱۲/-
جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ سوانح محمد ایوب واقف ۱۰۰/-
دل خاک بسر شاعری شفیق سہارنپوری ۵۰/-
تنویر قدیری۔ شعری مجموعہ صوفی اختر قدیری گیسپوری 25/-
جہانِ بصارت۔ " جلال اکبر سنبھلی ایم اے ۱۰/-
غمزہ بہ غمزہ۔ " آر پی شوخ 50/-
تلاش۔ افسانے۔ مشتاق احمد نوری 30/-
مکان (ناول) پیغام آفاقی ۱۰۰/-

مکتبہ جامعہ کی پیش کش

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست
کل اور آج
پروفیسر مشیر الحق
(شیخ الجامعہ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر)

یہ تیسرا سرسید یادگاری خطبہ ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے جلسہ میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ کو پیش کیا گیا جس میں پروفیسر مشیر الحق نے گزشتہ چالیس برسوں کی مسلم سیاست کی داستان بڑے واقعاتی اور تجزیاتی انداز میں سنائی ہے۔ قیمت ۸ روپے

ذکر شہادت
سید علی موسیٰ رضا حسینی

ترتیب و تعارف : علی جمیل خسرو

یہ کتاب آج سے ایک سو چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس کے اسلوب بیان میں وہی روانی اور سلاست ہے جو مرزا غالب کی نثر کا اہم اور امتیازی پہلو ہے۔ قارئین ذکر شہادت کی نثر کا خود ہی مطالعہ کر کے قربانی اہل بیت سے واقفیت اور ذکر حسین کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

قیمت : ۴/۵ روپے

مظہر امام

اشاریہ

ایک لہر، آتی ہوئی

۱۹۸۸ء میں شائع شدہ دو کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے ایک عالم خورشید کا مجموعۂ کلام "نئے موسم کی تلاش" ہے، جس کے دیباچے میں وہ رقم طراز ہیں:

"میں شعر و ادب میں کسی رجحان تحریک یا نظریہ کا قائل نہیں .... ادب تو آزاد ذہن کی آزاد اڑان ہے ..... بدلتے ہوئے وقت اور زندگی کی رفتار کے ساتھ شعر و ادب کے رنگ روپ میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ ادب بہرحال وقت اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے .... میں بھی وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا احترام کرتا ہوں، کیوں کہ یہ تبدیلیاں ادب کے لیے نئے دریچے وا کرتی ہیں... ... یکسانیت خواہ وہ خوشگوار ہی کیوں نہ ہو۔ رفتہ رفتہ بوریت کا باعث بن جاتی ہے ...... میں نہیں چاہتا کہ میری شاعری کو روایت، ترقی پسندی یا جدیدیت سے منسوب کیا جائے ......"

دوسری کتاب ڈاکٹر عطاء الرحمٰن کے تحقیقی مقالے کی تلخیص "مخدوم محی الدین؛ حیات اور شاعری" ہے، اس کا دیباچہ خورشید اکبر نے لکھا ہے۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اردو ادب میں ایک ذہین، حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آ رہی ہے، جو تحقیق، تنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے۔ یہ نئی کھیپ ماضی کے صحت مند اقدار کی بازیافت، حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کے لیے مصروف ریاضت ہے۔ اسے اپنی شناخت کے لیے کسی محمد حسن یا کسی فاروقی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اپنے ادبی ورثے اور موجودہ سرمایہ کی چھان پھٹک کے لیے اسے اپنی تنقید خود پیدا کرنی ہوگی۔"

عالم خورشید اور خورشید اکبر دونوں شاعروں کی جدید ترین نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بیانات صاف، سیدھے اور سریع الفہم ہیں۔ وہ ترقی پسند مکتبۂ فکر کو تو رد کرتے ہی ہیں، جدیدیت

کے رجحانات سے بھی برگشتہ اور منحرف ہیں۔ وہ اردو کے ناقد نہیں۔ فکر اور انداز نظر کے ناقد ہیں۔ یہ دو نام (محمد حسن اور شمس الرحمٰن فاروقی) بالترتیب ترقی پسندی اور جدیدیت کی علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ دو نام اہم نہیں ہیں (کیوں کہ ان کی جگہ دوسرے نام بھی آسکتے ہیں) دراصل وہ نقاط نظر اہم ہیں جن کی بدولت یہ نام لیے گئے ہیں۔

گزشتہ پچاس سال سے اردو کے ادیب اور شاعر کے لیے لازمی قرار پایا ہے کہ وہ اپنی پیشانی پر ہمہ وقت ایک لیبل چسپاں کیے رہے۔ تب ہی اُس کی شناخت ہو سکتی ہے۔ ادیب کا ادب سے واسطہ ہو یا نہ ہو، لیکن وہ ادیب کہلائے گا ضرور۔ بس شرط یہ ٹھہری کہ لیبل پر "ترقی پسند" یا "جدید" لکھا ہوا ہو۔ اگر یہ لیبل نہیں ہے تو پھر ——— کس کی پُرسد کہ بھیّا کون ہو!

ہر نئی نسل پیش رو نسل کو رد کرتی ہے۔ ایسا ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے، اس سے بحث نہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور جہد للبقا کا حصّہ ہے۔ یہ اسی جبلّت کا تقاضا ہے جو اپنا اثبات چاہتی ہے۔ یوں بھی نئی نسل کے پاس اس کے سوا چارہ کیا ہے۔ وہ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے جو تم بیزار کا مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ ادب کے بے کنار سمندر میں یہ لہریں اُٹھیں، آئیں اور چلی گئیں۔ اب ایک نئی لہر آرہی ہے جو اپنے پیش روؤں کے خس و خاشاک کو بہالے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اسے کامیابی ہوگی یا نہیں، نئی نسل کا انحراف کسی اثبات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن نہیں بھولنا چاہیے کہ مستقبل ہمیشہ نئی نسل کا ہم سفر ہوتا ہے۔

اردو کی جدید ترین نسل ان رجحان سازا کابرین ادب کے لیے خطرہ بن گئی ہے جو اپنے پروردہ رجحان کو حرف آخر سمجھ بیٹھے ہیں۔ جدیدیت کے سب سے بڑے مبلغ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے حالیہ مضمون "موجودہ ادبی صورت حال" (مطبوعہ پیش رو ع ۲) میں فرماتے ہیں۔

> "...وہ لوگ کون ہیں جن کی شعریات اور جن کی شناخت جدیدیت سے الگ ہے؟ ...... میں نئے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ تم لوگوں نے جدیدیت کے انحراف کی کیا راہ نکالی ہے! ...... تمھارے تنقیدی نظریات کیا ہیں؟ اور وہ کس قسم کے ادب کے بنیاد گزار ہیں؟ یا وہ تنقید کون سی ہوگی جو تمھارے ادب کی تفہیم اور تعیّن قدر کر سکے؟ یا تمھارے ادب کو کس قسم کی تنقید درکار ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی تنقید کا تقاضا کرتا ہے؟ اگر تمھارے ادب کے لیے محمد حسن اور محمد عقیل کی تنقید کافی ہے تو وہ آج کا ادب نہیں ہے۔ اگر اس کے لیے فاروقی اور نارنگ اور وارث علوی کی تنقید کافی ہے تو وہ بھی آج کا ادب نہیں ہے۔"

یہاں بھی نام غیر اہم ہیں۔ اہمیت انھیں مکاتیب فکر کو حاصل ہے، جن کی تبلیغ یہ حضرات کرتے ہیں۔ جب جدیدیت کا بول بالا ہونے لگا تو ترقی پسندوں نے مثالیں دے کر یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ جدیدیوں کی لفظیات کہاں کہاں ترقی پسندوں کی لفظیات سے ماخوذ ہیں اور کہاں کہاں ان کے خیالات ترقی پسندانہ افکار کی صدائے بازگشت ہیں۔ اس لیے اگر جدید ترین

نسل، جدیدیت کے نقوشِ پا پر اپنے پاؤں رکھتی ہوئی اور انھیں مٹاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے تو ہمیں اس کی شناخت میں دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ ادعائیت نے ترقی پسندی کا خانہ خراب کیا تھا۔ اب جدیدیت بھی اسی خنجر سے خودکشی کر رہی ہے! مندرجہ بالا آخری دو جملوں میں فاروقی جو بات کہی ہے، بالکل وہی بات خورشید اکبر ان سے پہلے کہہ چکے ہیں۔

فاروقی نے "تنقید تنقید" کا اتنی بار ورد کیا ہے، جیسے اگر نئے لوگوں "نے اپنے نقادوں کا طے کرلیا تو ان کے سارے درد دُور ہو جائیں گے اور وہ کچھ لکھے پڑھے بغیر راتوں رات بڑے ادیب اور شاعر بن بیٹھیں گے۔ بہر حال۔ میں کہہ نہیں سکتا جدید ترین نسل تنقید کے ضمن میں جدیدیت کے سوا کا جواب کیا دے گی۔ البتہ میں تو یہی جانتا ہوں کہ جب ہمارے یہاں تنقید نہیں تھی تو میر، سودا، غالب اور مومن پیدا ہوتے تھے۔ اقبال نے "کاشف الحقائق" اور "مقدمہ شعر شاعری" پڑھ کر شعر کہنا نہ سیکھا تھا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ "ادب کی تفہیم اور تعینِ قدر" تو ہو رہی ہے۔ مگر ادب عنقا ہو گیا میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کے تخلیقی ذہن کے لیے نقاد کا پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ قاری کہاں آئے گا۔ وہ تو ادبی منظر نامے پر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ آپ گلی گلی صدا لگائیے، مگر کسی قاری کی آواز سنائی نہیں دے جدیدیت نے قاری پیدا نہیں کیے۔ نقاد پیدا کیے اور قاری کو سات سمندر پار ڈھکیل دیا کیوں کہ وہ "بے دم تھا۔ تجریدیت پرستی" اور "علامت بازی" نے قاری کا قلع قمع کر دیا۔ ترقی پسندوں نے قاری پیدا کیے تھے دور میں وہ اپنی ہر دلعزیزی کے نشے میں چور ادب کے ڈکٹیٹر بن بیٹھے اور ان کا وہی حشر ہوا جو ڈکٹیٹروں کا ہوتا ہے۔

نئی نسل کا مسئلہ نقاد پیدا کرنا نہیں ہے۔ اس کا مسئلہ ادب پیدا کرنا اور قاری پیدا کرنا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قاری سے جڑا ہوا مسئلہ زبان کا بھی ہے، یعنی اردو زبان کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ نئی نسل کی حوصلہ مندی پھر اسی طرح اپنا اثبات چاہتی ہے، جس طرح اب سے پچیس تیس پہلے ترقی پسندی سے منحرف ہونے والی نسل نے چاہا تھا:

اور پھر یہ ہوا
ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب
ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
اور پھر اپنے چہرے میں
اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لیے آپ اپنی کتابیں لکھیں!

("نیا آدمی"، خلیل الرحمٰن اعظمی) ●●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور تنقید نگاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۲۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیّدین — مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم — ناول نگاری کا جائزہ — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۷/=

باقر مہدی
ای/۱ روی درشن
کارٹر روڈ۔ باندرہ (ویسٹ)
بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

ایک کالی نظم

(وارث علوی کی نذر)

کچھ نہ کرنے کا مجھے غم کیوں ہو —— ؟
چند اچھی سی کتابیں مل جائیں
بس یہی فکر رہا کرتی تھی
کاش —— ! میں دوڑ میں پیچھے رہ جاؤں
پھر کہیں بیٹھ کے سوچوں، یہ زمانہ کیا ہے؟
سارے رشتے، یہ حوادث، یہ فسانہ کیا ہے؟

دیکھتے دیکھتے —— بدلی دُنیا —— !
خوف اور خون کے جلے سایے
مجھ پہ کیوں ٹوٹ پڑے ؟

اور اب —— تنہا، ہراساں، خاموش
تیز رفتار زمانے کو —— گھورا تکتا ہوں !

میں بھکاری بھی نہیں
میرے ہاتھوں میں نہ کشکول نہ ہونٹوں پہ دُعا
اور سب چاروں طرف
حکمرانوں کی بخشی ہوئی کشکول لیے پھرتے ہیں !

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج
سیٹیلائٹ ٹاؤن
راولپنڈی (پاکستان)

غزل گو

یہ ۲۰ ویں صدی کی نویں دہائی ہے اور ایشیا کا شدید بحرانی علاقہ ہمارا اپنا گھر ہے۔ آج
ادبی منظر نامے پر ایک سرسری نظر بھی یہ بات واضح کر دے گی کہ آج کی تخلیق اگر کلاسیک کی نسب
زیادہ بھرپور نہیں تو نہ سہی آج کے فن کار کے خالصتاً نجی منطقے کا منفرد اظہار ضرور ہے۔

یوں بھی محض گرد و پیش کا بیان تخلیق کار کے فرائض میں شامل نہیں اور ہر تخلیق کار خ
قدیم ماضی کا ہو یا ماضی قریب کا اس بات کا پابند کبھی نہیں رہا۔ کچھ لوگوں کے خیال میں ا
گرد کی بنتی بگڑتی سیاسی اور معاشرتی صورت حالات کا بیان فن کار کی مجبوری بنتا ہے اور اس
لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوتوں کا ایک یونٹ بھی کسی دوسری طرف ضائع نہ کرے۔ ادیب اور شا
سے ایسی توقع باندھنے والے دراصل اسے مروّج اصطلاح میں "معاشرے کا ترجمان" دیکھنا چاہتے ہ
لیکن کیا ضروری ہے کہ ہر تخلیقی فن کار خود بھی ایسا کچھ ہی چاہتا ہو؟ بہت ممکن ہے وہ چاہتا ہو
محض اپنی ذات کے اندر اٹھتی گرتی لہروں کی بات کرے یا فرد کی اجتماعی نفسیات کے پاتال میں اتر
رہے یا اپنی ذات کے سناٹے کا کھوج لگائے۔

یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اب تک ادب اور عوام کا رابطہ ہی ممکن نہیں ہو سکا اور نہ
مستقبلِ قریب میں یہ رابطہ بحال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے ادب میں اپنے ادوار کا جائزہ لینے کی کوششیں بھی خوب ہوئیں۔ ہر بحرانی
کے انتشار، انفعالیت اور تکنیک کی پہچان کروائی گئی۔ ادیب اور شاعر نے مسائل کا شعور د
کی کوشش بھی کی ہے، لیکن شعور کس کے لیے؟ معاشرے اور ادیب کا تو رابطہ ہی ٹوٹا ہوا
یہ ادیب ہی ہے کہ جو کہتا ہے کہ اس کی بیشتر تخلیقات اپنے دور کے بحران کو مختلف زاویوں سے
پیش کرتی رہی ہیں، لیکن اس کی بھی سنیے جو خود کو معاشرے کا ترجمان تصور نہیں کرتا۔ وہ ا
تو ادب تخلیق کرتا ہے۔

ادب زندگی کا کُل نہیں ہے۔ لخت لخت زندگی کے رنگ میں رنگا متحرک ٹکڑا ہے ا
اصنافِ ادب اس کی مختلف قاشیں ہیں جنھیں تخلیق کار اپنی شخصیت سے ملا ملا کر ایک
ہیئت میں ڈھالتا ہے۔ وہ کبھی حال کا تجزیہ کرتا ہے، کبھی مستقبل کا خواب بنتا اور کبھی ما

...ناسف کی نگاہ ملتا ہے۔ لمحہ لمحہ ٹکڑوں میں یعنی لامحدود زندگی کے ان چھوٹے متحرک ٹکڑوں کے خالق ...ہیں اور شاعروں نے اپنے تئیں ایک نئی ہیئت بخشی ہے۔ جملہ اصنافِ ادب کو ملا کر دیکھنے سے شاید ہماری زندگی کا کل اپنے ظاہر و باطن سمیت دکھائی دے جائے۔ ممکن ہے یہ ہیولیٰ رفتہ رفتہ ہمارے اردگرد پھیلی زندگی میں واضح ہوتا چلا جائے، لیکن میں اس ضمن میں زیادہ پُرامید کبھی نہ رہا۔

اب رہ گیا ادیب یا شاعر کا ڈھیٹ بن کر اپنے تئیں معاشرتی ترجمان بننے (یا کہلانے) کی کوشش کرنا، تو اس کے لیے وہ محض یک طرفہ آمد و رفت تک پہنچ پاتا ہے۔ ترقی پسند غزل، نئی غزل اور جدید غزل کے شاعر نے ماضی قریب میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ 'معاشرے کا ترجمان' کہلانے کا جتن کیا ہے۔ کیا میرا ور غالب کی غزل معاشرے کی ترجمان نہیں؟ لیکن میر اور غالب نے نری ترجمانی پر ہی زور نہیں دیا۔ وہ تو بس غزل کے ساتھ نباہ کر رہے تھے۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی انھیں ترقی پسند کہتا ہے یا رجعت پسند خیال کرتا ہے۔

غزل خالصتاً مشرقی شعری اظہار ہے۔ رالف رسل کے توسط سے غالب کی غزل برآمد کرنے اور مغرب میں اس کی نشوونما کا تجربہ ناکام رہا ہے۔ اس کی صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ غزل کہنے اور کیمیا دانی کا عمل اپنے تجربے کے نوع میں یکساں ہے۔ سو مغربی فضا میں یہ مشرقی کونپل جڑ نہیں پکڑتی، سوکھ جاتی ہے۔

ہمارے یہاں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد نے غزل کے مقابلے میں نظم (نئے ہیئتی سانچوں) کو یعنی کیمیا گری کو کیمیا دانی کے مقابلے میں فوقیت دلانا چاہی اور اس میں ناکام ہوئے۔ یہ مانا کہ نظم نے کچھ پرپُرزے مشرق میں نکالے لیکن ایڑی چوٹی کا زور لگانے اور نرسریاں بنانے پر بھی غزل کی جگہ تاحال نہ لے سکی۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال ہماری غزل کا تھوڑا بہت تجزیہ چاہتا ہے۔

سب سے پہلے کلاسیکی غزل کو لیجیے جس کی نمایاں پہچان اس کا ہیئتی تعین اور بے عیبی ہے۔ کلاسیکی غزل میں نفس مضمون اور ہیئت کے درمیان نہ صرف توازن تھا بلکہ دونوں کا درجہ خوبی بلند تر تھا۔ علاوہ بریں کلاسیکی فن کار فطرت کے مظاہر کی تقلید نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی کج رویوں، بوالعجبیوں اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو نظر انداز کر کے ان کے سب سے عمومی اور مستقل اوصاف کو ہی ظاہر کرنے کا جتن کرتا تھا، لیکن کچھ اس قرینے کے ساتھ کہ اسے اس سے پہلے کسی نے نہ چھوا ہو۔

ترقی پسند غزل کو سماجی حقیقت نگاری کی چاٹ میں غزل کے اس مخصوص رکھ رکھاؤ سے تہی دست ہو گیا، جو کلاسیکی غزل گو کا طرۂ امتیاز تھا۔ نتیجہ میں مجاز، جذبی، علی سردار جعفری اور نصیر کاشمیری جو بہت بڑی صلاحیتوں کے حامل شعراء تھے۔ ترقی پسند مینی فیسٹو کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ...صرف کر پورا فیض احمد فیض، نصف احمد ندیم قاسمی، نصف مخدوم محی الدین، نصف مجروح

سلطان پوری اور نصف مصطفےٰ زیدی بچ رہے ۔

۱۹۵۵ء تک حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا نے غزل کے مقابلہ میں نظم پر بڑی واہ واہ کی ٹی ہاؤس ہوٹل لاہور میں نئی پود گروپ کی اوّلین میٹنگ ہوئی تو اس میں اس دور کے شعرا خصوصاً ناصر کاظمی، احمد مشتاق، مظفر علی سید، شہزاد احمد اور غالب احمد کے لیے شیخ صلاح الدین نے شاعری کا نیا منشور پیش کیا۔ خیریت تو یوں گزری کہ شیخ صاحب کا وہ منشور مظفر علی سید کے ایک ہی جملے سے ذبح ہوگیا۔ مظفر علی سید نے صرف اتنا کہا تھا کہ یہ شاعری کی بجائے اس سے متعلق پیش بندی کرنے والی انجمن کا منشور لگتا ہے جو SPACEWAR کے بعد اقوام متحدہ طرز کے اداروں میں پیش کیا گیا ہو۔

اس کے بعد یوں تو نئی پود گروپ کے اجلاس ہوتے رہے لیکن اوّلین اجلاس کی اس گفتگو نے نئی پود گروپ کی منشور سازی کو حرفِ غلط کی طرح کاٹ کر رکھ دیا جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق اس نوع کی منشور سازی کی باڑھ سے صحیح سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

'شب خون' کے نئے غزل گو شعرا خصوصاً ظفر اقبال، شمس الرحمٰن فاروقی، شہریار، عادل منصوری، محمد علوی اور کمل کرشن اشک نے غزل کے کلاسیکی مزاج کو رد کر کے غزل کا ایک نیا لحن ایجاد کیا اور انفرادی سطح پر اُن کی پہچان بھی ممکن ہو سکی لیکن کیا آج ہم اس تازہ لحن کو ظفر اقبال کے علاوہ کوئی اور نام دے سکتے ہیں؟

یہی وہ زمانہ ہے جب اچھے خاصے غزل گو شعرا نے 'نئی شاعری' کے کھاتے میں نام درج کروانے کی خاطر غزل کہنا ترک کیا اور نظم کی طرف آ گئے۔ اس وقت نہیں کہا جا سکتا تھا کہ غزل کے کلاسیکی مزاج کے رسیا ناصر کاظمی اور نئی شاعری کے پُرجوش علمبردار افتخار جالب میں سے کون سچا ہے۔

'نئی غزل' کے بیشتر شعرا ذاتی علامتی پیرایے اور محدود تر شعری کائنات کے ایسے اسیر ہوئے کہ کسی کے کھاتے میں سے محض چند اشعار نکلے اور کوئی بشیر بدر کی طرح محض ایک غزل کے سر پر اپنے زندہ ہونے کا واویلا تا حال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

'نئی شاعری' اور 'شب خون' کے بیشتر نئے ناموں کے علاوہ کمار پاشی، اسلم انصاری، ساقی فاروقی، مراتب اختر اور نذیر قیصر اپنے محدود تر شعری دائرے کے پابند رہے۔ اور ہمارے بہت بڑے غزل گو ظفر اقبال نے بھی 'گلِ آفتاب' اور 'رطب و یابس' مکمل کر کے ہی دم لیا۔ اس وقت جی چاہتا تھا کہ کاش ظفر اقبال 'آبِ رواں' کے تسلسل میں اپنا شعری سفر طے کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ ظفر اقبال اتنا طاقتور نکلا کہ بہت کچھ نئی شاعری پر خرچ کر چکنے کے بعد بھی اس کے پاس وہ کچھ بچ رہا جو اس کے دیگر معاصرین کے نصیب میں نہیں۔

ان نئے غزل گو شعرا نے ہیئتی سطح پر تو جیسے تیسے غزل کے سانچے کو قبول کر لیا تھا لیکن غزل کے معروف علامتی نظام کو ترک کرتے ہوئے انھوں نے نئے استعاراتی، علامتی اور حسی اظہار کو اپنی واحد پہچان بنایا۔ اس سے پہلے کہ یہ عناصر ایک نامیاتی مرکب میں ڈھلتے اور غزل کا نیا

نے نظام اپنی پہچان مکمل کروا تا" نئی شاعری کے پاؤں اکھڑ گئے اور جدید غزل کا چرچا شروع ہوا۔ جدید
والے نئے شعرا کو ان ہی بنیادوں پر رد کیا جن بنیادوں پر کلاسیکی اور ترقی پسند شعرا کو نئے شعرا نے رد کیا تھا۔ اب
غزل کے مقابل جدید غزل گو خم ٹھونک کر سامنے آئے لیکن لے دے کر شکیب جلالی کی "روشنی اے
روشنی" سے ابتدائی پندرہ غزلیں اور اقبال ساجد کی مضحکہ خیز غزل ہی قابلِ ذکر ٹھہری۔

یہ تو تھی ماضی قریب کے نئے اور جدید شعرا کی بات' جدید ترین دور میں کلاسیکی غزل کو رد
کرتے کرتے سہل پسندوں نے غزل کو 'آزاد غزل' بنا کر چھوڑا۔ اب یہ کام آسان تھا' سو محض چند برسوں
میں آزاد غزل کے کئی سو شعرا انجم رومانی کی غزل کے ایک استعارے صفدر میر کی طرح کھلے
بندوں دندناتے پھرتے ہیں۔

دیکھیو رکھیو نہ کوئی در کھلا
پھر رہا ہے شہر میں صفدر کھلا

سبحان اللہ! استاد انجم رومانی نے کس خوبصورتی کے ساتھ 'نئے' 'جدید' اور 'جدید ترین شاعر کی پہچان
کروائی ہے

دیکھا اور سوچا چاہیے کہ 'ترقی پسند غزل' 'نئی غزل' 'جدید غزل' اور 'جدید ترین غزل' نے
ہماری غزل کے کلاسیکی مزاج سے بغاوت کی تو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۰ء یعنی اقبال ساجد کی مضحکہ خیزی
میں درجۂ کمال تک پہنچنے کے ۳۴ برسوں میں ہمیں مکمل فیض احمد فیض، نصف احمد ندیم قاسمی'
نصف مخدوم محی الدین، نصف مجروح سلطان پوری اور نصف مصطفےٰ زیدی کل پانچ شاعر نصیب ہوئے
جب کہ یاس یگانہ چنگیزی اور فراق گورکھپوری کے بعد کلاسیکی مزاج کی پروردہ غزل سے حفیظ
ہوشیارپوری، انجم رومانی، باقی صدیقی، ناصر کاظمی، عزیز حامد مدنی، منیر نیازی، محشر بدایونی'
سلیم احمد' احمد مشتاق، محبوب خزاں، انور شعور' جون ایلیا اور سب سے بڑھ کر 'آب رواں' والا
ظفر اقبال۔ تیرہ ایسے شعرا ملے جن میں سے ہر ایک کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے فیض کے علاوہ
اوّل الذکر شعرا سے بڑھ کر ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی گرد اڑانے اور نئے پرانے کا جھگڑا اکھڑا کر کے ہاتھ
کیا آیا؟ ترقی پسندوں میں فیض، ندیم، مخدوم، مجروح اور مصطفےٰ زیدی ہی کی غزل کیوں معتبر
ٹھہری؟ نئے شعرا کی بہت بڑی تعداد میں ظفر اقبال ہی کیوں قابلِ اعتبار رہا؟ جدید اور جدید تر
غزل کی بھیڑ میں شکیب جلالی کی پندرہ غزلیں ہی کیوں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں؟

ان سوالات کا جواب بہت پہلے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے روایت سے متعلق اپنے مضمون۔
TRADITION AND INDIVIDUALS TALANT. میں یوں دیا تھا:

"حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں نئے پن کی سنک کی یہ بھول ہے کہ وہ اظہار
کے لیے نئے انسانی جذبات ڈھونڈتی ہے۔ یہ غلط جگہ پر جدّت کی تلاش ہے
اور اس تلاش کی بدولت جدت تو ہاتھ آتی نہیں، البتہ گمراہی ضرور حاصل
ہوتی ہے"

سب جانتے ہیں کہ یہ ایک روایت سے ماضی پرستی مراد نہیں لیتا۔ اس کے نزدیک ماضی کے ان زندہ عناصر کا شعور روایت کا شعور کہلاتا ہے جو حال میں بھی قائم رہتے ہیں، مرتے نہیں، البتہ اس زندہ روایت کو کھوجنا پڑتا ہے۔ روایت سب کو ترکے میں نہیں ملا کرتی، اس تک جانکاہی سے پہنچا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے بعد گنتی کے چند غزل گو شعرا نے ترقی پسند، نئی، جدید اور جدید تر غزل کے تجربات سے بہت کچھ سبق سیکھا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی منشور سازی کے غزل کا قبلہ درست کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ یہ غزل گو تعداد میں زیادہ نہیں۔ یہاں میرا اشارہ پاکستان کے محمد خالد، ثروت حسین، شبیر شاہد، محمد اظہار الحق، صابر ظفر، انفعال سید، شاہدہ حسن، جمال احسانی، سلیم کوثر، خالد اقبال یاسر، غلام حسین ساجد اور بھارت کے عرفان صدیقی کی طرف ہے۔ ان لوگوں نے غزل کی نزدل روایت کو کھوج کر کلاسیکی شعرا کی طرح غزل کہنے کے عمل کو نہ صرف باوقار بنایا بلکہ غزل کی زندہ روایت کے تسلسل میں نئی روایت ڈھالنے کی خاطر غزل گوئی کو مشکل بنایا ہے۔ یہ سب لوگ مشکل کوش ہیں۔ سہل پسندوں کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی یہ ادا پسند ہے۔

ان کا چلن عام ہو جائے تو ہر ایرا غیرا غزل کہنے کا دعویدار نہ رہے۔ نئے اور جدید تر شعرا نے تو نئے پن کی سنک میں اچھے اور برے غزل گو کے مابین امتیازات کو ختم کر دیا۔ امتیازات نہ ہوں تو برے بھلے کی پہچان کیسے ممکن ہو؟

جدید اور جدید تر شاعر تو ترنم اور تغنم کے معنی نہیں جانتا۔ عربی اور فارسی سے نابلد ہے اور غزل کہتا ہے۔ مشکل بحر میں شعر کہنا تو کجا، ٹھیک طرح پڑھنے سے قاصر ہے۔ لفظ کی شناخت اسے نہیں، اجنبی اور غریب لفظ اس کے ہاں چلے آتے ہیں اور بے گھر دکھائی دیتے ہیں۔ قافیہ اور ردیف کو محض نبھاتا ہے، اس کے پُراثر استعمال پر قادر نہیں۔ تلازمہ سازی سے ناواقف، ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے کا نہ تو سلیقہ ہے اور نہ مہارت۔ یہ جدید شاعر اپنی تخفیف شدہ کائنات کا اسیر رہتے ہوئے بھی غزل گو کہلانے پر مُصر ہے۔

اب آئیے غزل کی نزدل روایات کو کھوج کر غزل کا قبلہ درست کرنے میں غلام حسین ساجد کے حصے پر بات کریں۔

غلام حسین ساجد اپنے دیگر مشکل کوش ہمراہیوں کی طرح فیشن اور فارمولے کی شاعری سے بہت دور رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی شاعری کے چند نئے مستحکم ناموں خصوصاً جارج بارکر، ایلزبتھ جیننگز، گریگوری کارسو، ایلن جینسبرگ، جارج میکبتھ، کنگسلے ایمز اور ولیم کارلوس ولیمز کو پڑھ کر کتنی بھولی بسری آوازیں یاد آ جاتی ہیں، اسی طرح غلام حسین ساجد کے لحن میں بھی رفتگاں کی آوازوں کا سراغ ملتا ہے۔ یوں ساجد کے شعری آہنگ کی گونج نزدل کلاسیکی شاعری کے مجموعی آہنگ میں مدغم ہو کر اردو غزل کی دائم زندہ رہنے والی آواز کا ایک حصہ بن جاتی ہے

لیکن الگ رکھ رکھاؤ اور منفرد شعری خصوصیات کے ساتھ۔ جس طرح جدید ایلیٹ کو پڑھتے ہوئے براؤننگ کا سارا عہد ہمارے ساتھ گفتگو کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح غلام حسین ساجد زبان کے ورتاوے کی سطح پر اساتذہ کے رکھ رکھاؤ کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

غلام حسین ساجد نے اپنی پہلی کتاب "موسم" میں ہمارے قدیم ماضی کی بھولی بسری شعری صنف رتو سنہار کی بازیافت کی اور اب عناصر کی غزلوں میں مٹی، پانی، آگ، ہوا اور خواب کے بنیادی استعاروں کے ذریعے اردو غزل کو موضوعاتی سطح پر ایک نئے منطقے سے روشناس کرایا ہے۔ ساجد کی غزلیں اپنے قاری کو فلسفے کی دنیا سے باہر نکال کر فکرِ عمیق کی طرف بلاتی ہیں۔

گوتم بدھ نے فلسفے سے ہمیشہ اجتناب برتا اور فکرِ عمیق سے رغبت دلائی۔ جب گوتم سے خدا کے متعلق استفسار کیا جاتا تو وہ جواب میں عناصرِ فطرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کرنے والے کے ہاتھ میں سوکھا ہوا پتّہ تھما دیا کرتا تھا۔ کیا ہم نے کبھی ایک سوکھے ہوئے پتّے پر غور کیا ہے؟

غلام حسین ساجد نے عدم اور وجود کے مسائل کو چھوڑ دیا ہے اور صرف فکرِ عمیق کی دعوت دی ہے۔ فکرِ عمیق جو ہمیں بدل کر رکھ دیتی ہے۔ عدم سے متعلق زندگی میں کیا سوچا جائے؟ جب وجود عدم میں ڈھلے گا تو سب کچھ جان لیں گے۔ ابھی صرف عناصر سے متعلق کیوں نہ سوچا جائے۔؟

گوتم نے شاعر ہونے کا کبھی دعوا نہیں کیا۔ اس نے کبھی کوئی تصویر پینٹ نہیں کی، لیکن اس کی فکرِ عمیق INCONO GROPHY تھی۔ وہ جس سمت نگاہ اٹھاتا تھا شاعری جنم لیتی تھی۔ وہ رقاص نہیں تھا لیکن اس نے رقص کیا۔ گھنے برگد کے نیچے تم نے اسے محوِ رقص نہیں دیکھا؟ وہ رقص جو کسی کو نظر نہ آیا، لیکن ہوا۔

گوتم کی وفات کے بعد اس کی فکر سے متعلق فلسفے کے ۳۶ اسکول آف تھاٹ وجود میں آئے۔ مجھے خبر نہیں کہ غلام حسین ساجد کے فکرِ عمیق کی طرف اس بلاوے کو فلسفہ کس نام سے یاد کرے گا، لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح گوتم کا چپ ایک مسئلہ بنی اور لوگ باگ اس گفتگو پر چپ کرتے ہیں، اسی طرح غلام حسین ساجد کی یہ اپنے آپ میں مگن شاعری جو بظاہر بہت شانت دکھائی دیتی ہے اپنے جلو میں غصے اور اداسی کی بہت بڑی طاقت چھپائے ہوئے ہے۔

محبت کی شاعری نے کلاسیکی غزل سے بغاوت کے رستے دکھائے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ ہم آج تک محبت میں "آہ" اور "واہ" کا فرق ہی نہ جان سکے۔ غلام حسین ساجد نے محبت کی شاعری کو ہمارے لیے الگ باندھ رکھا ہے۔ وہ تو عناصر کی غزلوں میں ہمیں فی الحال غصے اور اداسی سے روشناس کروا رہا ہے۔ گیانی رجنیش کی طرح اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غصے کو بھی قبول کرو اور اداسی کو بھی۔ محبت کی طرح یہ بھی طاقت ہے اور اگر ہم اس

طاقت سے محروم رہ گئے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے ایک بڑی طاقت کا خزانہ جان بوجھ کر کھو دیا۔

ریزہ خیالی غزل کی خوبی بھی شمار کی گئی ہے اور خامی بھی۔ خوبی اس اعتبار سے کہ بہت سے تحت لفظ اشعار بیشتر غزل گو شعرا کی پہچان بنے اور خامی اس اعتبار سے کہ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد جیسے ہم نے نظری سطح پر تنگنائے غزل کے ظرف کو چھوٹا کہا۔ یہ الگ قصہ ہے کہ محمد حسین آزاد کی نظم محض لغات سازی کے کام آئی اور حالی نے لے دے کر مسدس مدوجزر اسلام، یادگار چھوڑی جس کی آج محض ایک تاریخی حیثیت ہے۔ حالی شیفتہ کے اثر سے باہر نہ نکل سکے اور عظمت اللہ خاں کا نام ذہن پر زور دے کر یاد کرنا پڑتا ہے۔

یہاں فطری طور پر غالب کے اس شعر کی طرف بھی دھیان جاتا ہے، جس میں انھوں نے تنگنائے غزل کی بات کی تھی۔ افسوس کہ لوگ باگ ادھوری بات کو لے اڑے اور کسی ایک نے بھی پورے سیاق وسباق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جب کہ مرزا غالب صرف یہ کہہ رہے تھے کہ غزل میں نواب تجمل حسین خاں کی تعریف ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل کی صنف سے قصیدہ کا کام لیا جائے گا تو غالب جیسا شاعر بھی ہانپ کر رہ جائے گا۔

نئے جدید اور جدید تر غزل گو شعرا نے اپنی غزل کو نادر شئے بنانے کی بھاگ دوڑ میں ریزہ خیالی کو تضاد خیالی میں بدل دیا اور بڑے زور وشور سے 'اینٹی غزل' لکھی گئی۔ لیکن یہی زمانہ ہے جب ناصر کاظمی نے یک کیفیتی غزلوں کی پہلی کتاب 'پہلی بارش' مکمل کی۔

۱۹۷۰ء کے بعد شبیر شاہد، محمد خالد، عرفان صدیقی، افضال احمد سید، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، اور غلام حسین ساجد نے خصوصی طور پر اس تضاد خیالی سے اپنا پہلو بچایا ہے۔ ناصر کاظمی کی 'پہلی بارش' کے بعد خصوصاً زندگی کو سفر بناکر غزل میں مسافرت کا انداز سمیٹتے ہوئے شبیر شاہد نے 'مسافت' کی غزلیں مکمل کیں۔ محمد خالد نے ساختیاتی سطح پر اس روایت کو آگے بڑھایا، عرفان صدیقی، افضال احمد سید، محمد اظہار الحق اور خالد اقبال یاسر نے رزم گاہ کو حوالہ بنایا اور اب غلام حسین ساجد مٹی، پانی، آگ، ہوا اور خواب سلسلے کی غزلوں میں اس روایت کے سب شعرا سے الگ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

غلام حسین ساجد بنیادی طور پر یک کیفیتی غزل کا شاعر ہے۔ وہ اپنا جوہر اکلوتے اشعار میں پیش نہیں کرتا۔ اس لیے اس کی غزل میں سے، خواہ 'موسم' کی غزلیں ہوں یا 'عناصر' کی اشعار کا انتخاب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ کمال مہارت سے اشعار کی انفرادی اکائیوں کو ضعف پہنچائے بغیر اپنی غزل میں کیفیات کا بیان نظم کی طرح کرنے پر قادر ہے۔ ساجد کی اس شاعرانہ خوبی سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ 'عناصر' کی غزلوں میں برتے گئے مظاہر کے زمرے ملاحظہ کیے جائیں۔

مجموعی طور پر غلام حسین ساجد کی غزل میں مظاہر کے زمرے میں کچھ یوں بنتے ہیں:

۱۔ سفر سے متعلق مظاہر:

مٹی، پانی، ہوا، مشکیزہ، چھاگل، سیل رواں، سمندر، دریا، نہر، کارواں، خیمے، الاؤ، خیمہ،

سمندر، دست سے، پھول، خورشید، مہتاب، مہر جہاں تاب، نیلگوں چراغ، شہر عذاب، مطالع ... ماہ،
چراغ احمر، دشت، سراب، شمع، نینوا۔

۲۔ طلسمی مظاہر:

جادوگر، طلسم سامری، ساتویں در، طلسمی دائرے، طلسمی کنجیاں، طلسمی بادل، آہنی مخلوق، ہلالی آئینہ، طلسمی اسپ، سنہری ہونٹ، حصارِ آتش رنگین، آگ، چراغ، آئینہ۔

۳۔ مطلق العنان بادشاہوں کے عہد سے متعلق مظاہر:

اقلیم، قصر، فصیلِ شہر، لشکر، سپاہ، باغ، چمن، جھروکے، محراب، مشعل، شراب، شہد، جام، محاذ جنگ، دار و رسن، خندق، زنجیر، قید خانے، کمند، طنابیں اور خیمے۔

۴۔ آسمانی مظاہر:

دستِ غیب، دستِ مہرباں، آسمانی حور، عرش، غیبی شمع اور غیبی ستارہ۔

محولہ بالا چار طرح کے مظاہر کو غلام حسین ساجد نے واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ سورما کے ایک ہی بنیادی استعارے کی تار میں پرو دیا ہے۔ کہیں تو یہ سورما اپنے عہد میں جیتا ہے اور کہیں خدا کے اوتار میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

میں اس کوزے کی مٹی سے کوئی شمشیر ڈھالوں گا
اور اس کو آئینے سے آب دوں گا صبر مٹی سے

اتاروں گا ابھی ایک آہنی مخلوق میدان میں
اور اس کے بعد بھی اک فوج ہے تیار مٹی کی

کہیں ٹکنے نہیں دیتیں تھکے ہارے سفینے کو
الگ اک روز کر دوں گا میں ان لہروں کو پانی سے

ساجد کی یہ کیفیتی غزلیں اپنے اندر ایتھنز (یونان) کے عظیم ڈراما نگار ایسکائی لس (پ ۵۲۵ ق م) کے پرومی تھیوس زنجیر بستہ کا سا دبدبہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ زنجیر بستہ کا جائے وقوع سمندر کے کنارے ایک اونچی چٹان ہے۔ زیوس کے کارندے زنجیروں میں جکڑے ہوئے پرومی تھیوس کو گھسیٹتے ہوئے آگ کے محافظ دیوتا سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"آؤ اب اس باغی کو ہمیشہ کے لیے اس چٹان سے باندھ دیں۔ جس نے آگ کی گلنار تابانی کو چوری چھپے انسانوں کے حوالے کر دیا۔ دیوتاؤں کے نزدیک یہ ناقابل معافی جرم ہے، سو پرومی تھیوس کو اس جرم کی سزا بھگتنی چاہیے تاوقتیکہ زیوس کی خدائی کو تسلیم کر لے اور نسل انسانی کی اعانت سے باز آ جائے۔"

غلام حسین ساجد کی ہمدردیاں پرومی تھیوس کے ساتھ ہیں:

آسماں ہے ایک شمع نور سے روشن اگر   میری خلعت آئینہ ہے میرا زیور آگ ہے

مری بے خواب آنکھوں کا الاؤ بجھ چکا ہے   مگر کیوں ہاتھ اب تک مل رہا ہے آگ میری

سبھی پر ظاہر ہے ہوائے دشتِ پرعشّاق کا   پوچھیے گا شہر والوں کی حقیقت آگ ہے

میں تزک و احتشام سے بڑھوں گا شہر کی طرف   کہ اب مرے جلو میں ہے سوار میری آگ کا

غلام حسین ساجد کی غزل ڈرامائی، جسارت آمیز اور تحیّر خیز لہجے کی حامل غزل ہے لیکن ساخت کے اعتبار سے ساجد نے لسانی توڑ پھوڑ، ہیئت اور آہنگ کا غیر رسمی تجربہ کرتے ہوئے سرپھرے پن کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ بلاشبہ آج کے دور میں یہ صبرِ صمیم کی مثال ہے۔

ساجد ایک ایسا غزل گو ہے، جس نے تجربے کو کھرے فن کار کی آنکھ سے دیکھا اور اسے عامیانہ صداقتوں سے ملوّث نہیں ہونے دیا۔ اس کے ہاں حفظِ وضع کا پاس ہے، ضبط اور ٹھہراو ہے۔

غلام حسین ساجد کی غزلیں زمینی رشتوں سے الگ نہیں ہوتیں، لیکن اس نے تراکیب اور تلازمات کا کچھ ایسا نظام وضع کیا ہے جس کی مار فرش سے عرش تک ہے۔

میں اگلے جشن میں چوموں گا ان بے داغ ہاتھوں کو
کہ جن ہاتھوں نے ڈھالا ہے چراغِ ابر مٹّی سے

چراغ و آئینہ حیران ہیں ایک مدّت سے
لگائی عرش پر ایسی زقند مٹّی نے

ان غزلوں میں شعری کردار کی کلّیت ساجد کی غزل کے تمام گوشوں کو اس کی غزل کی تمام تر جہات کے ساتھ مضبوط اور مستحکم رکھتی ہے۔ کہیں گماں بھی نہیں گزرتا کہ غزل کی فنّی روایت سے متعلق کسی لفظ یا لہجے کی ہیئت نے اس کے اظہار کو مجروح کیا ہے:

کہاں جی شاد رہتا ہے فقط کارِ محبّت میں
کہ ورثے میں ملا ہے آدمی کو جبر مٹّی سے

کسی مغرور لشکر کے تھکے ہارے چراغوں نے
طلب کی ہے ٹڑاد کی اجازت میری مٹّی سے

بس ایک ساعتِ نامہرباں نے خاک کیے
فصیلِ خواب ہوا نے، کمند مٹّی نے

اک شمع دمکتی ہے اس گھر کے اندھیرے میں
طاقِ شبِ ہجراں پر تصویر ہوا کی ہے

ان اشعار میں زبان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ غلام حسین ساجد کے ہاں منفرد طرزِ احساس کے ساتھ اظہار کی سطح پر ہیئت کا تنوع اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ جدید شعرا کی پسندیدہ بحور کے مقابل نسبتاً کم روی، اور پیچیدگی کی حامل بحروں کو ساجد نے نہایت مہارت سے برتا ہے۔

غلام حسین ساجد کی لفظیات اکہرے مطالب کی پابند نہیں بلکہ کئی جہات میں مار کرتی ہے۔ مسافرت، طلسم، مطلق العنان بادشاہوں اور آسمانی مظاہر ہمیشہ سے فکشن یا رزمیہ سے متعلق رہے ہیں اس لیے میں نے جب جب ساجد کی غزل کا مطالعہ کیا ہے، اپنے آپ کو قدیم سمندری مملکت یونان میں سانس لیتا ہوا محسوس کیا جو سورماؤں اور جیوٹ ملاحوں کا وطن ہے۔

قدیم سے عہدِ حاضر تک کی انسانی شکوہ اور عظمتوں کی پامالی اور خاک زدگی کو ساجد نے اپنی مخصوص رزمیاتی لفظیات میں کچھ اتنے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی غزل بڑی فکشن اور بڑی شاعری کا مقامِ اتصال بن گئی ہے۔ ● ●

مصطفےٰ کریم

5, CAMPION CLOSE
SCALBY- SCARBOROUGH.
U.K.

نقشِ فریادی اور حسن

(جمالیات)

فیض کی شاعری کو جمالیات کی روشنی میں سمجھنا کیا اب بھی ضروری ہے؟ ممکن ہے قارئین کا جواب نفی میں ہو۔ کیونکہ فیض کو اُن کی زندگی میں وہ بلند مقام مل گیا تھا جو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کو ان کی وفات کے بعد ملا۔ لیکن فن کی عظمت کسی ایک بلند مقام پر محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ وقت اور زمانے کے ساتھ مسلسل نئی شاہراہوں کا رخ کرتی رہتی ہے۔ اس رفتار کو جمالیات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن جمالیات کیا ہے۔ حسن کا دائمی احساس۔ کبھی دھیما اور کبھی شوخ؟ اگر یہ جواب درست ہے پھر حسن کیا ہے؟ بقول افلاطون[1] حسن کسی شے کو پسند اور حاصل کرنے کا عمل ہے۔ افلاطون کو وہ شے انسان ہی نظر آیا تھا۔ اسی لیے اب تک افلاطونی[2] محبت کی اصطلاح رائج ہے اور اس کا استعمال انسان ہی کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ حقیقتاً افلاطون کا تصورِ حسن کبھی قبول عام نہیں ہوسکا چونکہ اس طرح ہر وہ شے جو انسان نہیں ہے وہ حسین نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے ہم لوگ اس مقولے کو قبول کرنے میں جھجکتے ہیں۔ افلاطون کی تعریفِ حسن کے دوسرے حصّے کو بھی قبول نہیں کیا جا سکتا یعنی ہم نے جسے پسند کیا اسے حاصل کر لینا ضروری ہے۔ ہم کسی بزرگ خاتون کو اس کے وقار اور تمکنت کی وجہ سے پسند کر سکتے ہیں، اس کی شیریں گوئی کے گرویدہ ہو سکتے ہیں، لیکن اسے حاصل کرنے کی خواہش نہیں کرتے۔

بقول سروانٹس[3] CERVANTES تصور ہماری آنکھوں کا ہے۔ ورنہ ہمارے گرد حسن ہی حسن ہے۔ اس نکتہ کو تسلیم کرنا بھی مشکل ہے۔ ہم سبھی زیادہ تر جو دیکھتے ہیں وہ اگر بد نہیں تو حسین بھی نہیں کہا جا سکتا، یہی نکتہ فن کی بابت بھی درست ہے۔

---

۱ Principles OF ART - COLLINGWOOD (PAGE 18)

۲ PLATONIC LOVE

۳ Cervantes - Don Quixote

درحقیقت احساس پسندیدگی حسن ہے۔ لیکن حسن کا رشتہ جمالیات سے کس طرح ہے۔ حسن وجمال کیا ایک صفت کے دو نام نہیں۔ کیا جمالیات، حسینوں کے جھرمٹ (خواہ وہ حسین پھولوں کا کیوں نہ ہو) کو نہیں کہہ سکتے؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں دینے میں مجھے ہمیشہ جھجک محسوس ہو گی۔ فنی حسن کی تخلیق کن شعوری اور لاشعوری اصولوں کے تحت کی گئی۔ ان اصولوں کو سمجھنے کا نام جمالیات ہے۔ اگر یہ قبول نہیں ہوگا پھر AESTHETICS. کے لیے اردو داں طبقہ کو کوئی اور نام تلاش کرنا ہوگا۔

نقش فریادی کے پہلے حصہ کو خود فیض نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ اس دور کی نظمیں ہیں جب کہ خوشحالی تھی اور زندگی کی تلخیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس لیے ذہن میں رومانیت رچی بسی تھی جس کی جھلکیاں ان کی نظموں اور غزلوں میں نمایاں ہیں۔ یقیناً فیض نے یہ سارے جملے استعمال نہیں کیے لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے یہی معنی نکلتے ہیں۔ فیض کی شاعری کے اہم نقادوں نے بھی فیض کے اس دور کی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ چونکہ بقول کلیم الدین احمد[2] نوجوانی کے تجربات کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہوتیں، لیکن یہ لکھنے کے باوجود محترم نقاد نے فیض کی نظم 'انتظار' کو ان کی بہترین نظموں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ یہ نظم 'نقش فریادی' کے حصہ اوّل میں ہے۔

رومانس یا محبت کوئی انوکھی کیفیت نہیں۔ اردو، شاعری، یا افسانہ اور ناول محبت کی واردات سے بھری پڑی ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جس سے ہر انسان آشنا ہوتا ہے۔ محبت، جذب کی کیفیت ہے جس میں راحت بھی ہے اور اذیت بھی ہے۔ جو مختصر بھی ہو سکتی ہے اور طویل بھی۔ یہ جو کچھ بھی ہو۔ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس لیے نقش فریادی کے پہلے دور کی نظموں کو نظر انداز کرنا مشکل ہے اور ان میں جمالیات کی تلاش لطیف جستجو ہے۔

فیض نے نقش فریادی میں دور اوّل کی نظموں اور غزلوں کی بابت لکھا ہے کہ ان میں وہی رنگ ملے گا جو راشد، مخدوم، مجاز، اختر شیرانی کی اس دور کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت ہے؟ افسوس اختر شیرانی اور مجاز کا مجموعۂ کلام میرے پاس نہیں۔ لیکن نفس مضمون کی وضاحت کے لیے جوش، مخدوم اور راشد کے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جو اسی دور کے ہیں۔

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں
ہائے فرقت کی چاندنی راتیں
آفتیں جمع ہیں خدائی کی
چاندنی رات ہے جدائی کی
کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے
رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

---

[1]. متاع لوح وقلم۔ فیض احمد فیض۔ صفحہ ۵۹۔ مکتبہ دانیال کراچی

[2]. کلیم الدین احمد۔ اردو شاعری پر ایک نظر

کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو
نیند آتی نہیں کسی پہلو

جوش

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

انتظار۔ مخدوم

آسماں دور ہے لیکن یہ زمیں ہے نزدیک
آ اِسی خاک کو ہم جلوہ گہ راز کریں
روحیں مل سکتی نہیں ہیں تو یہ لب ہی مل جائیں
آ اسی لذتِ جاوید کا آغاز کریں
صبح جب باغ میں رس لینے کو زنبور آئے
اس کے بوسوں سے ہو مدہوش سمن و گلاب
شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

اتّفاقات۔ راشد

ان اشعار کو اس صدی کی تیسری دہائی میں تین مختلف شاعروں نے لکھا تھا۔ ان اشعار کی
دگی سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ وہ خیالات جن کا اظہار ان اشعار میں ہے۔ نوجوانی میں شاید ہمارے
ل میں بھی یہی ہوں گے۔ لیکن الفاظ کی صناعی پر ہمیں قدرت نہیں تھی اور نہ ہی ان خیالات کا
مری اظہار ہمارے لیے ممکن تھا۔ اگر ان شاعروں کے ان اشعار پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ جوش
اشعار میں فراق کی کسک ہے، محبوبہ کے خدوخال نہیں۔ مخدوم کے یہاں ان کی محبوبہ ان کی روح میں
، چکی ہے۔ پھر بھی اس کا انتظار ہے چونکہ شاعر کی تشنگی نہیں بجھی اور راشد نے اپنے اشعار میں
ی وصل کو لذتِ جاوید کہا۔ تینوں شعرا کے یہاں حسن کا شدید احساس ہے۔ پھر بھی یہ سوچنا پڑتا
ے کہ کیا اس احساس کی کوئی اور بلند سطح بھی ہو سکتی ہے؟ اور جب فیض کے ان اشعار کی یاد آتی
ہے

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

تو کہنا پڑتا ہے کہ احساس پسندیدگی یا حسن کی اور بھی بلند سطحیں ہیں۔ فیض کے ان اشعار میں ہر فرد کی جوانی کا دلنواز عکس ہے۔ یہاں جس محبوبہ کی جانب اشارہ ہے، یقیناً اس سے بے پناہ محبت ملی ورنہ یہ آسودگی ممکن نہیں ہوتی۔ یہی تصوّر ان اشعار کا جمالیاتی پس منظر ہے۔ لیکن وہ محبوبہ کون تھی۔ کیسے تھے اس کے خدوخال۔ اس کی طلب میں کیا سحر تھا؟

خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گُل تر سے جیسے سیلِ شمیم
اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں،
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں
تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

تہِ نجوم کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے قاری کی محبوبہ کو دیکھا اور اس کے سراپا کو بیان کرنے کے بعد چپ چاپ کہیں چلا گیا۔ یہ بھی احساسِ حسن کی معراج ہے جہاں شاعر کسی کو اپنی نازک خیالی سے پیکرِ جمال بنا دیتا ہے، اور اپنی مترنم سرگوشیوں سے اس کی اطلاع کچھ اس طرح دیتا ہے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو دیکھ رہا ہے۔ جمالیات کا کمال یہی ہے کہ کسی فن میں ایک عام انسان اپنی بہترین آرزوؤں کی آسودگی محسوس کر سکے۔

تہِ نجوم کے شاعر کا اپنا محبوب بھی ہے جس سے وہ اس طرح مخاطب ہے ۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے
خدا وہ وقت نہ لائے...

اس خطاب میں شیرینی کچھ اس لیے بھی زیادہ ہے چونکہ اس نظم میں اپنی بعض دیگر نظموں کی طرح فیض نے غزل کی ہیئت استعمال کی ہے۔ اس لیے اس نظم کی غنائیت میں نہ صرف اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کے تاثر میں بھی سحر ہے۔ فیض نے غزل کا لب ولہجہ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس نظم کے ہر بند کے بعد ایک نیا مصرع لکھ کر نہ صرف نیا تجربہ کیا بلکہ اس نظم کی ترنم خیزی میں

قابل قدر اضافہ کر دیا۔ ممکن ہے کسی ناقد کو خیال آئے کہ نظم میں غزل کی ہیئت درست نہیں چونکہ اس طرح جدت طرازی مجروح ہوتی ہے۔

غزل گوئی اردو شاعری کی روایت اور حقیقت ہے۔ ہر فنکار اپنے فن کی روایتوں میں تجربے کرتا ہے۔ جب بھی یہ تجربے کامیاب ہوتے ہیں تو نہ صرف ان روایتوں کی تابندگی برقرار رہتی ہے بلکہ یہ مخصوص فنی تجربے ہمارے لطیف احساس کو مزید وسیع کرتے ہیں۔ خدا وہ وقت نہ لائے... نام کی نظم میں ایک مخصوص فنی تجربے کا مخصوص حسن ہے۔ یہی حسن اس نظم کو پُرکشش بناتا ہے۔

شاعری اور جادوگری میں کیا رشتہ ہے؟ فیض کی نظم سرودِ شبانہ پڑھتے وقت یہ خیال میرے دل میں بارہا آیا۔ مسحور ہونا وہ کیفیت ہے جب انسان اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہی مناظر آتے ہیں جنھیں جادوگر بیان کرتا ہے۔ اس جادوگری میں گھومتے وقت کانوں میں میٹھی بولیاں آتی ہیں اور آنکھیں حسین خواب دیکھتی ہیں۔

آج کے دور میں باشعور انسان کو اس سحر کا احساس کسی فن سے محظوظ ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ سرودِ شبانہ کے زیرِ عنوان دو نظمیں ہیں۔ جس نظم کی جانب میرا اشارہ ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

سادہ اور دلربا الفاظ اور ایک مختصر بحر۔ انسان کو ایک طلسماتی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ یہ نظم نہیں ہے بلکہ نغمۂ شب ہے۔ ایک ایسی رات جو نصف سے زائد گزر چکی ہے۔ چونکہ گھنے درختوں پہ اب تھکی ہوئی چاندنی ہے۔ فیض کے محترم ناقدوں نے ایسی بندشوں پر سخت

تنقید کی ہے۔ کہیں چاندنی کی بھی آواز ہوتی ہے؟ کیا آواز کا سایہ ہوتا ہے؟
چند لمحوں کے لیے سوچیں تو چند حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ شب رفتہ کے ساتھ چاندنی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہی ماندگی اس کی تھکان ہے۔ اس چاندنی کو دیکھ کر انسان بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اس کے منہ سے گنگناہٹ، سسکی یا آہ نکل جاتی ہے۔ اس انسان کو بہت کچھ یاد آتا ہے جو مکمل یا نامکمل الفاظ میں ادا ہوتا ہے۔ یہی چاندنی کی آواز ہے جو نہ ہوتی تو یہ صدا کبھی بلند نہیں ہوتی۔ سرودِ شبانہ میں چاند تھک گیا ہے۔ چاندنی بھی تھک گئی ہے۔ چونکہ نصف سے زیادہ شب کا سفر طے ہو چکا ہے۔ لیکن شاعر جاگ رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہم سب جاگ رہے ہیں۔ چونکہ۔

کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

اور

سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

آخری مصرع لافانی اور اس نظم کی معراج ہے عسکیت IMAGERY کی ایسی مثال اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ کوئی بھی مصرع تشریح کا محتاج نہیں۔ حسین خیال اور حسین بیان کا یہ توازن۔ یا احساس پسندیدگی کا ایسا غیر معمولی تنوع ہمیں خوش کر دیتا ہے۔

نقش فریادی کے حصہ اوّل میں اور بھی نظمیں ہیں جن میں تخلیق حسن کے اصول تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے اب ان نظموں کی جانب متوجہ ہونا چاہتا ہوں جو نقش فریادی کے حصہ دوم میں ہیں۔ فیض نے ان نظموں کا آغاز نظامی کے اس شعر سے کیا ہے

دل بفروختم جانے خریدم

یعنی میں نے دل بیچ دیا اور جان خرید لی یا جان کے ساتھ رشتہ جوڑ لیا اور اب جو گزرتی ہے وہ جان ہی پر گزرے گی۔ دل کا رشتہ شاعر دل نے محبت کے ساتھ ہمیشہ جوڑا ہے۔ اس لیے فیض نے واضح کر دیا کہ جو واردانیں دل کو پریشان کر دیتی تھیں ان کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی اور انھوں نے اب جان کے ساتھ سودا کر لیا۔ اس سودے میں منافع بھی تھا اور زیاں بھی۔ منافع اردو ادب کو ہوا، جسے ایک بار پھر منفرد اور ساتھ ہی عظیم شاعری کا ورثہ ملا۔ زیاں فیض کو ہوا۔ اس سودے میں فیض کی جان پہ جو گزر گئی اس سے ہر شخص واقف ہے۔ شاعر نے جو عہد کیا اسے نبھا دیا۔

لیکن دل کو بھلا کر جان ہتھیلی پر رکھ لینا کیا حسن کا کوئی معیار ہے؟ کیا یہ خود اذیتی کی ابتدائی مثال نہیں، پہلے سوال کا جواب اثبات میں اور دوسرے کا نفی میں ہوگا۔

ن کسی ایک معیار کا پابند نہیں ہوتا۔ ارض و سما کی طرح، دنیا کی ہر شے کی طرح
ن بھی بے قرار اور رواں ہے۔ وہ چہرہ جو آج بھلا لگتا ہے، وہ کل بھی حسین
وس ہو گا۔ حالانکہ آج اور کل کے درمیان اس میں تغیر آچکا ہے۔ آج شام کے
ت جو پھول خوبصورت نظر آیا۔ کل اس پر صبح کی دھوپ کے باعث کچھ اور ہی حسن ہوگا۔
یے جب فیض نے اپنی محبوبہ سے پہلی جیسی محبت نہ کرنے کا عذر پیش کیا اور یہ کہا۔

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اُن کا اشارہ اس طرف ہے۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں (چند روز اور مری جان!)

نکہ اس کے بعد جو دور آئے گا اس میں بقول فیض۔

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

سن کا ایک بلند معیار یہ بھی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جو حرماں نصیب مخلوق کو جس دن میسر
ہو گا تو مرجھائے ہوئے چہروں پر شگفتگی نکھر جائے گی۔ یہی وہ منزل ہے جس کی جانب
یض کی شاعری کا حسن اس سنگ میل سے رواں ہوتا ہے۔

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جوئے نور نہاں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں (ایک منظر)

اور اسی مبارک ساعت پر آکے ٹھہر جاتا ہے۔ جس کا بیان فیض نے اپنے اس شعر میں کیا ہے
جسے میں نے اوپر لکھا ہے۔

ساری دنیا سے دور ہو جائے جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

[illegible] ناقدین کو خیال ہے کہ حسن کے جس معیار کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے اس کے پرستار کیا دوسرے افراد نہیں تھے؟ بے شک تھے۔ فیض نے اپنی نظم "رقیب سے" میں اسی جانب شعری وضاحت کی ہے۔ افسوس کہ وہ محترم ناقدین جنھوں نے اس نظم پر اظہار خیال کیا ہے وہ بتانے سے معذور ہیں کہ یہ رقیب کون ہے؟

نظم کا عنوان ہے۔ رقیب سے! یہ نشان! NOTE OF EXCLAMATION ہے جس کے معنی ہیں[a1]۔ خوشی کا اظہار، اظہار افسوس، ایک لطیف طنز۔ جب کوئی اپنے رفیق کو پیار سے دشمن کہے۔ آخر الذکر ہی معنی فیض کی نظم رقیب سے! یہاں موزوں ہے چونکہ۔

آکہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا (رقیب سے!)

فیض کا رقیب نہ صرف ان کا عزیز دوست ہے بلکہ اسے بھی اسی عورت سے محبت تھی جسے فیض چاہتے تھے۔ فرق اس محبت میں صرف اتنا تھا کہ اس محبت میں ان کا دوست کامیاب رہا۔ لیکن پھر بھی فیض کو وہ دوست پیارا ہے جبھی وہ اسے بلا رہے ہیں جیسا کہ مصرع اول سے ظاہر ہے اور دوست کی محبت میں کامیابی ان اشعار سے ظاہر ہے۔

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے (رقیب سے!)

ہماری تہذیب میں چند سال پہلے تک دوستی کو جو احترام حاصل تھا، اس سے ہم خوب واقف ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب کہ دو دوستوں کو ایک ہی لڑکی سے محبت ہوتی تھی تو ایک دوست محض دوستی کی خاطر اس لڑکی یا عورت سے دست بردار ہو جاتا تھا۔

نظم رقیب سے! میں وہ عشق ہے جس نے فیض اور ان کے دوست کو وہ فلسفۂ حیات دیا جس سے کم از کم فیض تادم حیات منکر نہیں ہوئے۔ جب ہم سبق ہوں، حاصل سبق بھی ایک ہی درس ہو۔ پھر رقیب کیسا؟ وہ تو رفیق ہوا۔ بے پناہ طور پر عزیز رفیق۔

نظیر صدیقی نے رقیب سے! کی بابت درست لکھا ہے۔ حقیقتاً اس شعری پارے میں عشق محبوبہ سے ماورا ہو کر انسانیت کے حق میں تابندہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رقیب میں جمالیات کا ایک نیا نکتہ نمایاں ہے۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

---

a1. EVERYMAN'S GOOD ENGLISH GUIDE. BY HARRY FIELDGOUSE P 184 - DENT

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے (رقیب سے ۱)

فیض کی شاعری جس کسی کے زیرِ مطالعہ رہی ہے وہ فیض کی نظم 'تنہائی' سے ضرور متاثر ہوگا۔ یہ نظم وہ مرقعِ حسن ہے جس کا مطالعہ میں جب بھی کرتا ہوں تو مجھے اپنے احساسات میں ایک روشن دنیا کی جگمگاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ چونکہ نظم 'تنہائی' اس زبان میں ہے جو میری زندگی کا راز ہے۔

کلیم الدین احمد مرحوم نے 'تنہائی' کو فیض کی سب سے عمدہ نظم کہا ہے۔ (فاضل نقاد کے زیرِ نگاہ اس وقت تک صرف نقشِ فریادی اور دستِ صبا تھی) لیکن انھوں نے جس طور سے اس نظم کا تجزیہ کیا ہے اسے تسلیم کرنا مشکل ہے۔ نظیر صدیقی نے اس نظم کو مبہم اور کثرتِ تعبیر کا شکار لکھا ہے۔

شاعری ہشت صفت ہوتی ہے۔ یقیناً نظیر صدیقی کو مجھ سے بہتر اس کا علم ہوگا حیرت ہے وہ نظم 'تنہائی' کے 'ابہام' اور کثرتِ تعبیر پر کیوں الجھن میں گرفتار ہوگئے۔

کلیم الدین احمد نے تنہائی کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنی محبوبہ کا انتظار ہے اور نظم میں اسی انتظار کا اضطراب ہے۔ نیز محبوبہ کے نہ آنے سے شاعر کو جس تنہائی کا احساس ہوا وہی نظم کا موضوع ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی نظم یا غزل کو سمجھنے کے لیے اس نظم یا غزل کے الفاظ ہی پر غور کرنا پڑتا ہے اور ان سے جو معنی نکلتے ہیں وہی نظم یا غزل کے نفسِ مضمون کا پتا دیتے ہیں۔ لیکن جب نظم کسی مجموعہ میں ہو تو اسے دوسری نظموں اور غزلوں کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسا خود کلیم الدین احمد نے کیا ہے۔ فیض کی نظم 'انتظار' کا رشتہ 'تنہائی' کے ساتھ جوڑا ہے۔ لیکن محترم نقاد اور دیگر سخن شناسانِ ادب، جنھیں کلیم الدین احمد کی رائے سے اتفاق ہے، یہ سوچنا گوارا نہیں کیا کہ تنہائی ان نظموں اور غزلوں کے درمیان ہے جن کی ابتدا فیض نے تعلق کے اس شعر کو سامنے رکھ کر کی — دلے بفروختم جانے خریدم۔

اس لیے جب شاعر کا دل سے واسطہ ہی نہیں رہا پھر محبوبہ کا انتظار کیسا؟ فیض کی وہ نظم جس کی تعبیر زیرِ سوال ہے، وہاں جان کی تنہائی ہے۔ لیکن کس کی جان کی؟ کیا فیض نے صرف اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی۔ کیا انھیں دوسروں کی جان سے سروکار نہیں تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے پھر شاعر کیوں یہ لکھتا ہے —

ؔ نظیر صدیقی۔ فیض احمد فیض (نقشِ فریادی سے زنداں نامہ تک) یہ مضمون نگار جون ۵۰ تا فروری ۸۵ء کے کسی شمارہ میں ہے۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

(مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ)

ان اشعار میں جن کی جانب اشارہ ہے۔ ان ہی کی جان سے فیض کو گہرا لگاؤ تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر لاشعوری طور پر کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جس سے اس شاعر کی کسی نظم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ نقش فریادی کے دوسرے حصّہ کی شاعری پر، فیض نے اپنی رائے کا اظہار جہاں کیا ہے، وہاں یہ لکھا ہے کہ بعض شریف گھرانوں کی لڑکیاں بازاروں میں آ بیٹھیں (یقیناً تنگدستی سے مجبور ہو کر)

ہر گھرانا شریف ہوتا ہے۔ ذلیل معاشرہ سے غربت کی ذلّت ملتی ہے۔ کسی لڑکی کا بازار میں آ بیٹھنا وہ المیہ ہے جس پر معاشرہ کے بانی جتنے بھی شرمسار ہوں کم ہے۔ انسانی وقار سے محروم عورت جب جسم فروشی سے اپنا پیٹ پالنے لگتی ہے تو نہ اسے ماں باپ کی محبت نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی سچا چاہنے والا ہوتا ہے۔ اگر اسے صحبت ملتی بھی ہے تو ان افراد کی جو محض چند لمحوں کے لیے اس کے پاس آتے ہیں، جھوٹی سچی باتیں کرتے ہیں، پھر اس بدنصیب عورت کے جسم میں اپنی روح کی غلاظت تھوک کر چلے جاتے ہیں جب یہ افراد بھی نہ ہوں پھر تنہائی ہوتی ہے، ایک روح فرسا تنہائی۔

پھر کوئی دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا   (تنہائی)

[illegible] اب

ہ محروم نصیب [illegible] جہاں اسے شیدائی

ں جاتے تھے اب تو اسے انتظار میں گھڑیاں گننی پڑتی ہیں۔ اس بے سود انتظار میں اچانک کسی

ں آہٹ سی کر اپنے ستم زدہ دل کو آمد کی اطلاع دیتا۔ لیکن آنے والا راہرو ہے جو چپ چاپ

زر گیا۔ رات ڈھل چکی ہے، تاروں کا غبار بکھر گیا ہے۔ چراغ جن کا جلنا موہوم سا تھا۔ وہ

بھی ٹمٹما کر اب بجھنے والے ہیں۔ وہ جو اپنی کوٹھریوں سے نکل کر راستہ پر ٹہل ٹہل کر اپنے گاہکوں

کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار، وہ بھی اب سو گئی ہیں۔

جہاں آشنا قدموں کے نشان تھے وہاں اب دھول ہے۔ اس اجنبی خاک سے کیوں کر مناسبت

ہو سکتی ہے۔ شاید کچھ دیر میں صبح ہونے والی ہے۔ اس لیے شمعیں بجھا دو۔ ساغر و مینا

ہٹا دو۔ وہ دروازے جو کسی کے انتظار میں مسلسل کھلے رہے ہیں انھیں مقفل کر لو۔ اور

آخری مصرع جو نظم کی معراج ہے ایک دردناک چیخ بن کر ڈس لیتا ہے۔

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

دانش وروں نے جمالیات کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت میں یہ بھی لکھا ہے کہ کسی ایک شاہکار فن میں، اس فن کے ہر جزو کو ایک دوسرے میں جذب ہو کر سامنے آنا چاہیے۔ 'تنہائی' میں یہی خوبی ہے۔ اس نظم کے الفاظ نہ صرف ہمیں شدت سے مضطرب کرتے ہیں بلکہ شعلے کی طرح ایک دوسرے پر لپکتے ہیں اور ان میں ضم ہو جاتے ہیں۔ اشعار کی روانی بھی ہے۔ افسوس بحر و عروض کے قواعد، اس روانی کی تشریح، یا اس روانی کو گرفت میں لانے کی ترکیب کو واضح کرنے سے قاصر ہیں۔ اس روانی کا انحصار شاعرانہ ادراک اور فکر پر ہے۔

نظم 'تنہائی' حسن کے معیار کو کس طرح بلند کرتی ہے؟ کیا ہمیں اس نظم کو پڑھ کر ایک خوشگوار طمانیت کا احساس ہوتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے پھر ہمیں ایک بیسوا کے وجود کو نہ صرف قبول کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کی زندگی کا وہ رخ بھی ہے جسے شعری سطح پر جاننے کے بعد ہمیں دائمی مسرت نصیب ہوتی ہے۔ یقیناً ایسا سوچنا درست نہیں بلکہ ایک بیمار ذہن کی علامت ہے۔

حرماں نصیب طوائف کا وجود ہمارے لیے کبھی باعث خوشی نہیں ہو سکتا اس کی بے بسی کا غم ہر شریف انسان کو ہے۔ جب ہمیں اس کی 'تنہائی' کا شدید احساس دلایا جاتا ہے تو ہمیں اور بھی اذیت ہوتی ہے۔ جبھی تنہائی کا آخری مصرع ہمیں ڈس لیتا ہے۔ لیکن ہم خود اذیتی کے شکار نہیں۔ نیز اذیت حسن کا معیار نہیں۔ بلکہ بے قراری کی ایک کیفیت ہے جس سے نجات کی خواہش فطری ہے۔ اب ہم اس طوائف کی مخصوص تنہائی کی بابت سوچیں، جس نے ہمیں ایک کرب میں گرفتار کر دیا ہے تو اس کرب سے نجات اسی وقت ممکن ہے جب عورت کا وجود ایک بیسوا کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔ اس طرح سوچنا نیک فریضہ ہے۔ اگر کوئی فن پارہ انسان کو

"نقش فریادی" میں فیض کی شاعری کا جو حسن مجھے نظر آیا اور اس کی تخلیق کے پس منظر میں جو اصول مجھے ملے، ان کی وضاحت کے لیے میں نے نقش فریادی سے محض چند نظموں کا انتخاب کیا ہے۔ اس امید میں کہ اس حسن کی تلاش شاید مجھے فیض کے دیگر شعری مجموعوں کی جانب کبھی کبھی رجوع کرے۔ ●●

شاہد میر
صدر شعبہ بوٹنی گورنمنٹ کالج بانسواڑہ راجستھان

دوہے

پنکھ سمیٹے کس لیے او پنچھی نادان
اُڑنے سے آکاش میں ہے تیری پہچان

برف پگھلتا جائے گا بکھرے گا ہر رنگ
جس جانب تو جائے گا دھوپ چلے گی سنگ

کیسے سمجھ میں آئے گا یہ کومل احساس
خاموشی میں ہے چھپا شبدوں کا اِتہاس

آنسو بھیگی اوڑھنی پھیکا پھیکا رنگ
گوری کے سکھ ہو گئے رُخصت ساجن سنگ

کجرارے وہ نین ہیں آنسو دھوپ سمان
شام و سحر کی ہو گئی آج ہمیں پہچان

دُکھ آئے سکھ چل دیے دل کا چھوڑ کے دُوار
راج محل میں جس طرح بدلیں پہرے دار

پتھر کی چٹان سے بہتا دیکھا خُون
ہاتھ ہمارے آ گیا دوہے کا مضمون

آنکھوں کی دہلیز پر رکھ کر دیکھو پاؤں
لُٹ جائے گا خواب کا رنگ رنگیلا گاؤں

دن ڈوبا تو ہو گئی راتوں کی یلغار
دُکھ کے ساگر کا نہیں شاہد کوئی پار

منیر الدین احمد
Deutsches Orient-Institut
Mittelweg 150
2000 Hamburg 13
West Germany

سایوں کی بہتات

پرانے وقتوں میں
چین کے صحرائی شہر کوچا میں
مجرموں کو سزائے موت کی بجائے
سزائے حیات دی جاتی تھی
طلوعِ شمس کے وقت مجرموں کو
ایک درخت کے سامنے کھڑا کر کے
ان کے سائے کو درخت کے تنے پر
نقش کر دیا جاتا تھا
آنے والے سالوں میں سایہ
معاشرے میں ان کی قائم مقامی کرتا تھا۔
خود مجرموں کو ان کے اپنے گھروں میں
بند کر دیا جاتا تھا۔
میل ملاقات اور بات چیت کی
ممانعت کے ساتھ

ہمارے وقتوں میں
درختوں کی قلت ہی
اس روایت کے احیا
کے رستے میں روک نہیں ہے
بلکہ یہ امر بھی کہ
ایک ایک آدمی میں
کئی کئی سائے بسنے لگے ہیں

عبداللہ کمال —
POST BOX NO. 47283
ANDHERI
BOMBAY

غزل

کس کے غم کا ستارہ ہے، داغ ہے کیا ہے
نفس کدے میں مرے اک چراغ ہے کیا ہے

یہاں بھی آگ کو پانی بنا رہا ہے وہ
یہاں بھی غم کی علامت ایاغ ہے، کیا ہے

وہ جانتا ہے ہنر خواب جینے کا
وہ خود فریب ہے، اک سبز باغ ہے، کیا ہے

میں منتشر رہتا ہوں غزالہئیں درندوں کی
مرا وجود کوئی دشت و راغ ہے، کیا ہے

وہی ہے سو سر نیزہ، وہی علم اس کا
کمال ہے کہ وہی بد دماغ ہے، کیا ہے

نصر ملک
VAERERSOVEJ 10-4-3,
DK-2880 BAGSVAERD,
COPENHAGEN-DENMARK

کیا تم میرا ساتھ دو گے

میں اپنا توازن کھو چکا ہوں
پھر بھی مسلسل چل رہا ہوں
کُہرے اَٹی ہوئی وادیوں میں
برف کے صحراؤں میں
ہر گام بدلتی راہوں پہ،
مسلسل چل رہا ہوں!
اجنبی راہوں پہ خوف کا سایہ
سحر کا نور یہاں اور نہ شام کا سایہ
یہاں سمندر و دریا عجب منظر دکھاتے ہیں
سفینے ڈوبتے ہیں ابھرتے ہیں، ڈوب جاتے ہیں
میں مسلسل چلتا رہتا ہوں!!
میرا ہمراہی سورج مجھے جب اکیلا چھوڑ جاتا ہے
میری راہوں میں چاند، نور کی چادر بچھاتا ہے
مجھے الفاظ کے معنی بھول جاتے ہیں
کئی مصرعے میرے ہونٹوں پہ آکر بھول جاتے ہیں
میرے اندر کا "میرا پن" مجھے اکسانے لگتا ہے
"نجانے اس سفر کی ابتدا کیا تھی ؟ —
نجانے اس سفر کی انتہا کیا ہو" ؟
مگر میں ابتدا و انتہا سے لاتعلق ہوں
مسافر ہوں،
مسلسل چلتے رہنا زندگی ہے!
زندگی ہے!!
اسی زندگی کی خواہش میں
میں مسلسل چل رہا ہوں!!!
کیا ساتھ نہیں دو گے میرا تم؟

شجاع خاور

کمشنر آف پولیس

۴ر آفیسرز فلیٹس پولیس اسٹیشن، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱

ذرا دیکھو کہانی میں بھی یہ منظر نہیں ملتے
بڑا انبار ہے جسموں کا لیکن سر نہیں ملتے

پرانے فن کے ماہر شہر میں پہلے ہی عنقا تھے
نئے فن کے بھی اب معقول کاریگر نہیں ملتے

تخیل کی صداقت دن بہ دن کم ہوتی جاتی ہے
خیالستان میں بھی اب پری پیکر نہیں ملتے

میرے وہ شعر جو سارے زمانے کو پسند آئے
تعجب ہے مرے دیوان کے اندر نہیں ملتے

فلک پر روز کوئی کام پڑ جاتا ہے دنیا کا
جبھی نورات کو ہم اپنے بستر پر نہیں ملتے

کسی موسم میں دونوں خواہشیں پوری نہیں ہوتیں
چمن میں پھول ہوں تو دشت میں پتھر نہیں ملتے

منظور ہاشمی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

سرور ذکر سے مستی بیاں سے آئے گی
وہ نام لوں گا تو خوشبو زباں سے آئے گی

اُجال دے گا مجھے اس قدر خیال اُس کا
کہ روشنی سی مرے جسم و جاں سے آئے گی!

اگر بڑھی نہ زمینوں کی پیاس کی شدت
تو بادلوں میں روانی کہاں سے آئے گی؟

ہمارے دل میں ترازو ہوا بھی تیر تو کیا!
ہماری چیخ تو تیری کماں سے آئے گی!!

اسی اُمید پہ میں لو لگائے بیٹھا ہوں
کہ اب یقیں کی بشارت، گماں سے آئے

شمس فرخ آبادی
سمرو منزل۔ گولا گنج۔ لکھنؤ۔

اس شہر میں تم سا کہیں، ڈھونڈیں بھی اگر ہم
لائیں گے کہاں سے کوئی، پتھر کا جگر ہم

کیوں آئے گا ہم تک کوئی، کیا پائے گا ہم سے
منزل ہیں، نہ ساحل ہیں، نہ ہیں شاخِ ثمر ہم

سہمے سے گذرتے ہیں، مگر یاد ہے اتنا
بہکے تھے انھیں راہوں پہ، بے خوف و خطر ہم

کیوں چرخِ ستمگر نے ہدف ہم کو بنایا
کب کس سے کہا ہم نے کہ ہیں اہلِ ہنر ہم

اب کان ترستے ہیں، اُس، آوازِ جرس کو
مدت سے کسی آس میں ہیں، پابہ سفر ہم

تھا شہرِ دل آباد کبھی جن کی بدولت
پھر اُن کے سبب شمس ہوئے شہر بدر ہم

عالم خورشید
معرفت۔ ڈی۔ اے (ایجی)
پٹنہ ۱

یہاں پہ جو بھی ہے رشتہ وہ تاجرانہ ہے
ہزاروں سال سے دنیا خمار خانہ ہے

یہاں تو ایک ہی شانے پہ ہیں کئی چہرے
یہ شہر، شہر نہیں ہے نگار خانہ ہے

بڑی صفائی سے وہ مجھ کو مات کر دے گا
کہ اس کے وار کا انداز مخلصانہ ہے

ہوا بھی ہو گئی شامل عدو کی سازش میں
وہ جانتی ہے کہ کس کا دیا نشانہ ہے

انا ہی جھکنے نہیں دیتی ہے ہمیں ورنہ
ہمارے پاؤں کے نیچے بھی اک خزانہ ہے

پناہ لینے کہاں آ گئے ہو تم عالم
تمھیں پتا ہے یہ دشمن کا شامیانہ ہے

آزاد گورداسپوری
مکان نمبر ۴۳، بلاک نمبر ۵۲/۲، روڈ نمبر ۱۷
آدیتیہ پور۔ جمشید پور (بہار)

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ نزد اسپتال
لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۴

تُو نے کہاں کس دشت میں پہنچا دیا آوارگی
مجھ کو خود اپنے آپ سے ڈرنا پڑا آوارگی

کیسی کٹی فٹ پاتھ پر مجھکو بتا آوارگی
کچھ حال اپنا میں کہوں کچھ تو سُنا آوارگی

کہتے ہیں سب منزل جسے وہ جستجو کی موت ہے
تیرا سہارا اس لیے لینا پڑا آوارگی

مدت سے تیرا ساتھ ہے اک عمر کی پہچان ہے
پھر تجھ کو کیسے چھوڑ دوں تو ہی بتا آوارگی

اس نے کہا کیا چاہیے، میں نے کہا کچھ بھی نہیں
اس نے کہا کچھ تو کہو، میں نے کہا آوارگی

لبوں میں بوئے گُل پلکوں میں دلداری بھی رکھی ہے
ان آنکھوں میں کوئی رنگین چنگاری بھی رکھی ہے

ہمارے دل میں یوں تو سادگی کے پھول کھلتے ہیں
ضرورت کے لیے تھوڑی اداکاری بھی رکھی ہے

زمیں کو مرتے مرتے نذر کر جاتا ہوں زرخیزی
مری فطرت نے مٹی سے وفاداری بھی رکھی ہے

حواس و ہوش پہلے ڈوبتے ہیں اس کی آنکھوں میں
کسی کی بے ہنر باتوں میں فنکاری بھی رکھی ہے

ابھی تاریخ کی آنکھوں میں کچھ مخصوص چہرے ہیں
اسی دھرتی میں اس دھرتی کی غداری بھی رکھی ہے

یہ جالے آبرو ہیں ان دنوں دیوار و روزن کی
انہی پردوں کے پیچھے میری ناداری بھی رکھی ہے

معصوم عزیز کاظمی (آئی۔پی۔ایس)
سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
مغربی چمپارن۔ بتیا۔ (بہار)

کلیم صاحب

زندگی میں قدر و منزلت انھیں فنکاروں کا مقدر ہے جو اپنی فکر کی گہرائی اور علم کی گیرائی سے نئی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایسے فنکار زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہیں انھیں دوام حاصل ہے۔

کلیم الدین احمد بھی ایسے ہی فنکار ہیں جنھوں نے اردو فنِ نقد کو نئی روشنی اور نئی سمت عطا کی اردو ادب میں ان کا مقام مستند اور ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ کلیم الدین احمد کی ذات سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ میں خود کو خوش قسمت گردانتا ہوں کیوں کہ مجھے نہ صرف ان کا دیدار نصیب ہوا بلکہ وقت اور حالات نے مجھے ان سے قربت کے مواقع بھی فراہم کیے۔ میرے فرائض اور کلیم صاحب کے منصب میں زمین و آسمان کا فرق تھا بہ الفاظ دیگر "چہ نسبت خاک را بہ این عالم پاک"

کلیم صاحب سے میری پہلی شناسائی گیا کالج، گیا میں ہوئی کالج کے پہلے سال میں اُردو میرا اختیاری مضمون تھا اور اساتذہ کرام میں ڈاکٹر سید محمد حسنین بھی شامل تھے وہ اردو شاعری کا درس دیا کرتے تھے۔ ہر لکچر میں اردو شعراء کرام کے ساتھ ذکر کلیم بھی سنائی پڑتا تھا۔ میری صلاحیت اور واقفیت یوں بھی محدود تھی اس لیے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کلیم الدین احمد کوئی ایسی قد آور شخصیت ہے جو اردو کے ہر شاعر کا مقام متعین کرنے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اپنے ذہنی حالات کا ذکر جب کبھی دوسرے طلبہ سے کیا کرتا تو ان میں سے کچھ اپنی فکر کی تیز روشنی مجھ پر ڈالتے اور کچھ باخبر حضرات یہ گل افشانی کرتے کہ ڈاکٹر سید محمد حسنین جنھیں بہار میں اردو کے پہلے پی ایچ۔ ڈی ہونے کا شرف حاصل ہے، انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ کلیم الدین احمد کی نگرانی میں مکمل کیا ہے اور ہر لکچر میں ذکرِ کلیم نفسیاتی مرعوبیت کا ایک کھلا اظہار ہے۔ گیا کالج کے ایام طالب علمی ایسے نفسیاتی نکتوں کی گرہ کشائی میں گذر گئے۔ پٹنہ کالج میں بی۔ اے۔ میں داخلہ کے بعد کلیم صاحب کے نام کے ساتھ ان کی تصنیف تک باضابطہ رسائی حاصل ہوئی۔ نصاب میں "اردو شاعری پر ایک نظر" شامل تھی اور ڈاکٹر ممتاز احمد اُسے

پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کا انداز بھی احترامانہ اور عقیدتمندانہ تھا اور انھیں بھی کلیم صاحب کی تنقید میں کسی اضافی سے انحراف تھا۔ اردو شعرا پر کلیم صاحب کی تنقیدیں ذہن کو تو قابلِ قبول تھیں لیکن دل انھیں تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس صورت حال میں نظر اور نظریے کی بجائے اُردو سے فطری محبت کو زیادہ دخل تھا۔ بی۔ اے کی تعلیم کے بعد کلیم صاحب کا ذکر بدستور قائم رہا۔ اقبال ہوسٹل میں جہاں مختلف شعبے کے طلبہ رہا کرتے تھے، کلیم صاحب کے نظریات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ پٹنہ یونی ورسٹی میں چہار سالہ قیام کے دوران مجھے کلیم صاحب کا دیدار نصیب نہ ہوا۔ کالج اور یونی ورسٹی کے جلسوں میں دیگر معزز حضرات کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا لیکن کلیم صاحب نے ان جلسوں میں کبھی شرکت نہ کی۔ طلبہ کی مختلف انجمنوں نے جب کبھی کلیم صاحب کو ان جلسوں میں شرکت کی دعوت تب مایوسی ہی ان کے حصے میں آئی۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کلیم صاحب تنہائی پسند انسان ہیں اور خود پرستی انھیں کسی مجلس میں شریک ہونے سے باز رکھتی ہے۔ پٹنہ میں قیام کے دوران دیگر مشغولیات کے ساتھ اردو کتب و رسائل میں میری دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ کلیم صاحب کے مضامین نظر سے گذرتے رہے اور ان کی تحریروں کا رعب دن بہ دن بڑھتا گیا۔ لیکن میں خود میں اتنی ہمت نہ پیدا کر سکا کہ کبھی کلیم صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر شرف نیاز حاصل کرتا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد تلاشِ معاش کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر اس سلسلے سے مقابلے کے امتحانات جُڑ گئے۔ اُن امتحانات میں اردو پھر میرا اختیاری مضمون تھا۔ کلیم صاحب کی تصانیف پھر میرے زیر مطالعہ آئیں۔ "اردو شاعری پر ایک نظر" اردو تنقید پر ایک نظر، "فنِ داستان گوئی" اور "عملی تنقید" کے از سرِ نو مطالعے سے حقیقتوں کا ایک نیا دبستان اور معنی و فکر کی ایک نئی دُنیا نظر کے سامنے آباد ہو گئی۔ انہی دنوں رسالہ "آہنگ" گیا میں جسے کلام حیدری مرتب کیا کرتے تھے، کلیم صاحب کی خود نوشت "اپنی تلاش میں"، قسط وار شائع ہونے لگی۔ اس خود نوشت کی پہلی قسط اتنی دلنواز اور مسحور کن تھی کہ میں اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ کلیم صاحب کی آپ بیتی سے جگ بیتی کا علم و احساس ہوا اور ساتھ ساتھ وہ پس منظر، ماحول اور تاریخ واضح طور پر اُجاگر ہوئے جس کے کلیم صاحب پروردہ تھے۔ سوانح اور خود نوشت سوانحوں کا مطالعہ میری کمزوری ہے۔ مجھے اس اعتراف میں ذرا بھی تامل نہیں کہ کلیم صاحب کی خود نوشت "اپنی تلاش میں" کی پہلی جلد کے پایہ کی تصنیف اُردو میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس اعتراف کا بھرپور اظہار رسالہ "آہنگ" کے صفحات میں شائع خطوط سے ہوا۔ رسالہ "آہنگ" میں اس کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ کلام حیدری نے رسالہ میں یہ اطلاع شائع کی وہ اسے جلد ہی کتابی صورت میں شائع کرنے جا رہے ہیں۔ میں نے اس خود نوشت کو کتابی شکل میں حاصل کرنے میں جو تگ و دو کی ہے اس کی روداد کافی طویل ہے۔ محکمۂ پولیس منتخب ہونے کے بعد زندگی کی روش ہی بدل گئی۔ جرائم کا مطالعہ اور مقابلہ، مطالعہ ادب کو ختم تو نہ کر سکا لیکن وہ اس شوق پر یقیناً غالب آیا۔ ۱۹۷۷ء میں میری تقرری محکمۂ وجی لنس میں ہوئی اور میرا تبادلہ شہر گیا میں ہو گیا ــــ کلیم صاحب کے ذکر کے ساتھ اپنا ذکر کچھ ناگزیر ہے اس لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ گیا جس کا اپنا ایک ادبی ماحول ہے اس نے میرے دبے ہوئے ذوق کو پھر اُبھارا۔ خلیل الرحمٰن شمسی صاحب جو عرف عام میں ننھے بھائی کے نام سے مقبول ہیں۔ پیشۂ کتب فروشی کے ساتھ کتب بینی کا بھی ذوق رکھتے ہیں

انھوں نے کتب فروشی سے جب اشاعت کتب کی جست لی تو ان کی یہ کوشش میرے لیے ابر رحمت ثابت ہوئی۔ ننھے بھائی نے ایک نشست میں اپنے بلند قہقہوں کے درمیان یہ خوش کن اطلاع دی کہ وہ کلیم صاحب کی ایک تصنیف شائع کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کلیم صاحب کی خود نوشت تحریر حاصل کی اور کاتب کی رسائی سے پہلے میں نے ان اوراق کا مطالعہ کیا۔ تراش وخراش سے مبرا کلیم صاحب کی صاف وشفاف تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ کلیم صاحب اپنی تحریروں پر نظر ثانی نہیں کرتے، ان کی پہلی تحریر ہی شائع ہوتی ہے تو کلیم صاحب کی عظمت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔

"اقبال ایک مطالعہ" کے کچھ صفحات جب کاتب صاحب نے تصحیح کے لیے مرحمت فرمائے تب ننھے بھائی نے مجھ سے یہ عرض کی کہ جب میں اپنے سرکاری فرائض کے لیے پٹنہ کا قصد کروں تو ان کتابت شدہ صفحات کو کلیم صاحب تک پہنچا دینے کی زحمت بھی برداشت کروں ـــ اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ دیرینہ خواہش کی تکمیل کا موقع جب مجھے دستیاب ہوا تو میں خوشی کے ساتھ کچھ خوف بھی محسوس کرنے لگا۔ دل میں یہ وسوسے اٹھنے لگے کہ دوران ملاقات گفتگو میں اگر اپنی سطحیت اجاگر ہوئی تب کیا ہوگا۔ بہرحال جب میں پٹنہ پہنچا تو دفتری آداب کا خیال رکھتے ہوئے میں نے کلیم صاحب سے ملاقات کے لیے وقت کا تعین کرنا چاہا۔ فون پر مختصر تعارف کے بعد میں نے کام کی نوعیت بتائی اور وقت دینے کی گزارش کی۔ فون پر ہی کلیم صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ "اگر فرصت میسر ہے تو ابھی آجایئے"۔ دو ڈھائی بجے دن کا وقت تھا کہ میں ۷/ بی سری کرشنا پوری پہنچا۔ مکان کے برآمدے میں قدم رکھتے ہی اس سے متصل ایک دفتر نما کمرے میں کلیم صاحب کو موجود پایا۔ کلیم صاحب سے یہ میرا پہلا شرف نیاز تھا لیکن انھیں دیکھ کر ذہن نے یہ باور کرایا کہ نظروں کے سامنے جو ہستی ہے وہ کلیم الدین احمد ہی ہیں۔ میانہ قد، کتابی چہرہ، سفید رنگت، متناسب جسم، چھٹی دار بال، کلین شیو، چہرہ پر غور وفکر کے نشانات، آنکھوں پر دبیز شیشے کا چشمہ اور قمیص پاجامہ میں ملبوس کلیم الدین احمد ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جھجکتے ہوئے میں نے انھیں کتابت شدہ صفحات پیش کیے۔ اور کچھ دیر کے بعد میں نے پوچھا کہ تصحیح شدہ صفحات حاصل کرنے کو کب حاضر ہو جاؤں؟ کلیم صاحب نے کہا کہ کل آپ کسی وقت آکر یہ صفحات لے جائیں۔ میں نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تب انھوں نے کہا کہ آپ سخت دھوپ میں آئے ہیں کچھ دیر ٹھہر جائیں۔ اندر جا کر وہ ایک گلاس مشروب لے آئے اور اس مشروب نے میرے ذہن سے سارا رعب اور خوف مٹا ڈالا۔ کلیم صاحب نے مجھ سے میری مصروفیات کے بارے میں پوچھا مختصر جواب کے بعد اجازت چاہی اور رخصت ہو گیا۔ دوسرے دن تصحیح شدہ مسودہ حاصل کرنے کو حاضر ہوا تو واضح کا وہی انداز تھا۔

"اقبال ایک مطالعہ" کی کتابت اور اشاعت کے درمیان میں مختلف مواقع پر کلیم صاحب کے گھر پر حاضری دیتا رہا۔ ان ملاقاتوں میں مجھے مختلف موضوعات پر کلیم صاحب کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔ ایک ملاقات میں کلیم صاحب سے میں نے مودبانہ عرض کی کہ لوگ ان کی تنقید کو منفی تنقید کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کلیم صاحب نے دانستہ طور پر اردو ادب کے تاریک پہلوؤں کو اپنی تنقیدی تحریروں میں اجاگر کیا ہے۔ کلیم صاحب نے کچھ دیر خاموشی اختیار کر لی۔ میرا یہ خیال تھا کہ کلیم صاحب اس سوال پر کچھ برہمی کا اظہار کریں گے لیکن انھوں نے بہت ہی پُرسکون انداز میں کہا کہ جہاں تنقید کا تصور خام ہو وہاں صحیح تنقید

کو قبول کرنے کی گنجایش کم ہوتی ہے ۔ اردو ادب کی عمر کم ہے اور اردو تنقید کی عمر اس سے بھی مختصر اس لیے کچھ حضرات تنقید کی صحیح روایات اور منصب سے ناآشنا ہیں اور وہی صحیح تنقید کو منفی تنقید کا نام دے بیٹھے ہیں ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو ادب کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ اردو کے محقق اور نقاد اردو ادیبوں کا تقابلی مطالعہ مغربی ادیبوں سے تو کرتے ہیں لیکن مغربی ادب کا ان کا مطالعہ بالواسطہ نہیں ہے ۔ ذوقِ تحقیق کے فقدان کے ساتھ ذوقِ نقد بھی عنقا ہے ۔ یہ کچھ اہم وجوہات ہیں جو اردو میں صحیح تنقید کی جڑوں کو پنپنے نہیں دے رہی ہیں ۔ مغربی ادب سے آشنا کچھ نقاد بھی اردو سے اپنی فطری محبت کی وجہ سے اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی ادب کے شاعروں اور ادیبوں کی صف میں کھڑا تو کر دیتے ہیں لیکن جب ان کی تحریروں کا مطالعہ کیجیے تو یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ جو بساط بچھائی گئی ہے وہ صحیح اور باضابطہ نہیں ہے ۔ اردو کے کسی شاعر کی نظم میں اگر 'گلاب' کا ذکر مل گیا اور انگریزی کی کسی نظم میں بھی اگر "گلاب" کا ذکر مل گیا تو پھر اس کا تقابلی مطالعہ کر لیا جاتا ہے اور نتیجے اخذ کر لیے جاتے ہیں لیکن ایسے مطالعوں سے نتیجے اخذ کرتے وقت دونوں نظموں کے پس منظر، ان میں کارفرما نظامِ فکر، شاعر کے احساسات وجذبات اور ان جذبات کا شعری اظہار کس صورت میں ہوا ان پر نظر نہیں ڈالی جاتی ۔ ایسی صورت میں صحیح تقابلی مطالعے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں اُردو کے نقاد فکر پر تو کبھی کبھی نظر ڈال لیتے ہیں لیکن فورم اور اسلوب ان کی نظر سے برابر اوجھل رہتا ہے اور اس طرح سارا مطالعہ ناقص رہ جاتا ہے اور فنِ تنقید کا حق ادا نہیں ہو پاتا ۔ اردو ادب کا یہ بھی المیہ ہے کہ آج تک اس میں تنقید کے صحیح اسلوب اور زبان کا فروغ نہیں ہو سکا ہے ۔ تنقید کی بہت سی تحریروں پر اب انشائیہ کا گمان ہوتا ہے ۔

کلیم صاحب اپنی تحریروں میں دو ٹوک باتیں کہنے کے عادی تھے ۔ گفتگو میں بھی وہ اپنے خیال کا برملا اظہار کرتے تھے ۔ ایک نشست میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ غزل سے متعلق ان کے خیالات میں اب کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں ۔ ؟ تو انھوں نے کہا کہ غزل سے متعلق رائے میں کسی تبدیلی کا امکان کہاں ہے ۔ اردو غزل تو کوئی آج بھی اسی ڈگر پر گامزن ہے ۔ غزل کی دنیا محدود ہے اور کچھ دیر کے لیے اگر غزل کے مضامین کو اہمیت دے بھی دی جائے تو غزل کا فورم اس صنف میں کسی بڑی شاعری کی اجازت نہیں دیتا ۔ قافیہ، ردیف کی بندشیں اور ہر شعر کی اکائی صورت اس میں خیال کی ایک رو کے اظہار کی اجازت تو دیتی ہے لیکن نظامِ فکر وفلسفہ کو پیش کرنے کی اس میں گنجایش نہیں ہے ۔ غزل میں ایک خیال، الفاظ کا جامہ تو پہن سکتا ہے لیکن خیال مسلسل اور فکر پیہم کو پیش کرنا ناممکن ہے ۔ غزل میں ڈرامائی عنصر کو ابھارنے کی بھی گنجایش نہیں کیوں کہ اس میں ارتقائی نظام کارفرما نہیں رہتا ۔ اور اس میں پیش کیے جانے والے خیال کی ابتدا، انتہا اور اختتام کو تلاش کرنا ازحد دشوار ہے ۔ اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کلیم صاحب نے کہا کہ کافی عرصہ پہلے علی گڑھ میں خواجہ منظور حسین نے مجھ سے کہا تھا کہ غزل پر میرے اعتراضات بجا نہیں ہیں ۔ میں نے خواجہ منظور حسین سے کہا کہ آپ انگریزی ادب کے اُستاد ہیں اور ساتھ ساتھ آپ کی اردو ادب پر بھی نظر گہری ہے ۔ آپ WORDS WORTH کی ایک مختصر نظم STRANGE FITS OF PASSION کے خیال کو غزل کے ایک شعر میں پیش کر دیں تو میں غزل پر اپنے سارے اعتراضات واپس لے لوں گا ۔ خواجہ منظور حسین کچھ دیر فکر میں ڈوبے رہے اور پھر انھوں نے

اپنی بات بدل ڈالی۔ میں نے جب کلیم صاحب سے غزل مسلسل کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ اردو میں اب غزل مسلسل کا تجربہ ہو رہا ہے اور ایک ہی موضوع پر قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ غزل مسلسل لکھی جا رہی ہے لیکن قافیہ ردیف کی پابندی ایک بڑے کینوس کو شعری جامہ پہنانے میں مانع ہوتی ہے۔ اردو ادب میں جدید غزل، آزاد نظم، اور نثری نظم کا بھی شہرہ ہے لیکن یہ سب تجربات مغربی ادب کی متروکہ وراثت ہیں نثری نظم کا تجربہ فرانسیسی ادب میں سو سال پیشتر کیا جا چکا تھا۔ اور اسے غیر مقبول صنعت سمجھ کر ترک کر دیا گیا ہے۔ اردو کے شعراء اسے ایک نئی صنعت سمجھ کر موجد ہونے کا خطاب حاصل کرنے کے لیے طبع آزمائی کر رہے ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی نہیں کہ نثری نظم کا فورم ہی ناقص ہے۔ شعر کا بنیادی وصف نغمگی (MELODY) ہے اور اگر شعر سے یہ وصف ہی خارج کر دیا گیا تو پھر شاعری کیا۔ خیال کا اظہار نثر میں بھی ممکن ہے لیکن شاعری کو نثر پر اس بنا پر فوقیت حاصل ہے کہ اس میں کسی خیال کا جامع اظہار ہوتا ہے جس کا اظہار دیرپا ہے۔

"اقبال ایک مطالعہ" کی طباعت دہلی میں تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہے کہ اس تصنیف کی موجودہ شکل میں اس ناچیز کو بھی کچھ دخل ہے۔ کلیم صاحب نے اس کتاب کا جو خاکہ تیار کیا تھا اس میں اس کا آخری باب بعنوان "اقبال اور ملٹن" شامل نہ تھا۔ ایک ملاقات میں انھوں نے کتاب کی طباعت کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا اور میں نے انھیں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ طباعت قریب الاختتام ہے۔ کلیم صاحب میری بات سن کر کچھ دیر خاموش ہو گئے اور پھر انھوں نے کہا کہ اقبال سے متعلق ایک اہم مضمون انھوں نے لکھا ہے اور اس میں بھی انہی نکتوں پر خیال آرائی کی گئی ہے جو اقبال ایک مطالعہ کے مختلف ابواب میں اٹھائے گئے ہیں۔ کتاب کی طباعت جب قریب الاختتام ہے تب اس مضمون کا بصورت آخری باب اس میں شامل ہونا شاید اب ممکن نہ ہو ——— میں نے عرض کی کہ وہ مضمون مجھے عنایت کر دیں، میں کوشش کروں گا کہ مضمون کتاب میں شامل ہو جائے۔ کلیم صاحب نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مسوّدہ میرے حوالہ کر دیا۔ میں نے اس کی کتابت چار دن میں مکمل کرائی اور دہلی پہنچا۔ چنانچہ وہ مضمون "اقبال ایک مطالعہ" میں شامل کیا گیا۔ "اقبال ایک مطالعہ" کلیم صاحب کی دیگر تحریروں کی طرح ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ کچھ اقبالیے نہ صرف برہم ہوئے بلکہ انھوں نے یہ بھی سوال اٹھایا کہ کلیم صاحب کو اقبال کی شاعری اور فکر پر اعتراض کرنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اسلوب احمد انصاری کے رسالہ "نقد و نظر" میں زیڈ۔ اے۔ عثمانی کا ایک طویل تبصرہ شائع ہوا جس میں کلیم صاحب کے نظریات و خیالات کے ساتھ ساتھ تبصرہ نگار کو "عرضِ ناشر" پر بھی اعتراض تھا ——— "عرضِ ناشر" میں نے لکھا تھا اور اس میں کلیم صاحب کو دُنیائے ادب کا مستند نقاد تسلیم کیا گیا تھا ——— زیڈ۔ اے۔ عثمانی کا لب و لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ انھیں اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ جو لقب وہ کسی اور ہستی کے لیے مخصوص کیے بیٹھے تھے اسے کلیم صاحب کی ذات کے لیے کسی نے کیوں استعمال کیا۔ اس تبصرہ کی اشاعت کے بعد میں جب کلیم صاحب سے ملنے گیا تب انھوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "عرضِ ناشر" پر زیڈ۔ اے۔ عثمانی کے اعتراض کا ذکر کیا۔ "اقبال ایک مطالعے" کی جلد میں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری صدر شعبہ اردو کراچی یونی ورسٹی کو پیش کی تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اس وقت کلیم صاحب اور قاضی عبدالودود کی عظمت میں رطب اللسان ہو گئے لیکن جب انھوں نے رسالہ "نگار" میں اپنا تبصرہ شائع کیا تو ان کی تحریر میں ان کی مجبوری کا

اظہار صاف جھلک رہا تھا۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان نے کلیم صاحب کی ساری تصانیف کا حق اشاعت حاصل کیا لیکن "اقبال ایک مطالعہ" کو خارج کر دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے جو میرے استاد رہے ہیں سخت تبصروں کی اشاعت اور نشریے پر اکتفا نہ کیا بلکہ "اقبال ایک مطالعہ" کے جواب میں انھوں نے "اقبال اور عالمی ادب"، جیسی ضخیم تصنیف کر ڈالی۔ پیش لفظ میں انھوں نے صاف لکھا کہ اس تصنیف کی تحریک ہیں نے کی تھی ــــ "اقبال اور عالمی ادب"، جب شائع ہوا تو بہت سے حضرات حیران تھے کیوں کہ بات دفاعِ اقبال سے ذاتِ کلیم تک پہنچ گئی تھی۔ اس تصنیف کی اشاعت کے بعد مجھے یہ اطلاع ملی کہ کلیم صاحب مجھ سے بہت برہم ہیں کیوں کہ "اقبال اور عالمی ادب"، کا محرک ڈاکٹر عبدالمغنی نے مجھے بتایا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے جو باتیں لکھی تھیں وہ حرف بہ حرف صحیح تھیں اور آج بھی میں اس خیال کا قائل ہوں کہ اپنے خیالات و نظریات کو پیش کرنے کی آزادی ہر شخص کو حاصل ہے۔ کچھ لوگوں کی اطلاع کے بموجب میں کچھ دنوں تک کلیم صاحب کے پاس خواہش کے باوجود نہ جاسکا۔ ذہن میں یہ خیال تھا کہ کلیم صاحب کو اگر تکلیف پہنچی ہے تو یقیناً یہ میرے لیے افسوس کا مقام ہے۔ کئی مہینوں کے بعد میں اپنی ساری ہمت اور حوصلے سمیٹ کر کلیم صاحب کے سامنے موجود تھا کلیم صاحب نے مجھ سے جو پہلا سوال کیا وہ یہ تھا کہ میں اتنے عرصے تک کہاں غائب رہا؟ میں نے اپنی مصروفیتوں کا بہانہ تراشا اور اس بات کا منتظر رہا کہ کچھ دیر کے بعد کلیم صاحب ضرور اپنی خفگی کا اظہار کریں گے اور میں ان سے معافی مانگ لوں گا لیکن دل کی آرزو دل ہی میں رہی۔ کلیم صاحب نے مجھ سے کبھی بھی "اقبال اور عالمی ادب"، سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی اور ہر موقع پر انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا۔

بعض مواقع پر کلیم صاحب ذاتی مسائل کا بھی ذکر مجھ سے کیا کرتے تھے۔ ترقی اردو بورڈ کی اردو انگریزی لغت کا منصوبہ جب انھیں سونپا گیا تب اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے انھیں مناسب آدمیوں کی تلاش تھی۔ انگریزی اردو لغت کی تکمیل میں جو حضرات ان کے معاون تھے وہ دیگر مناصب پر فائز ہو چکے تھے۔ لغت کا منصوبہ ایک مستقل کام نہ تھا اس لیے بہت سے حضرات کو اس سے منسلک ہونے میں تامل تھا۔ کلیم صاحب نے ایک بار مجھ سے اس کا ذکر کیا تو میں سید اسد ظہیر کو لے کر ان کے پاس حاضر ہوا ــــ انھوں نے دیگر امور کے متعلق دریافت کرنے کے بعد صرف اتنا کہا کہ اگر یہ لگن اور دلچسپی سے کام کرنا چاہیں تو لغت سازی کے منصوبہ میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے وقت کی پابندی پہلی شرط ہے ــــ کلیم صاحب اردو انگریزی لغت بھی، انگریزی اردو لغت کی طرح وقت مقررہ سے پہلے مکمل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ منصوبے کی تکمیل کے لیے میعاد مقرر کی گئی ہے اس میں اضافہ انھیں قبول نہ ہوگا۔ اس بات کا انھیں ازحد افسوس تھا کہ ترقی اردو بورڈ دہلی کے دیگر پروجکٹ میعاد ختم ہونے کے بعد بھی ادھورے پڑے ہیں اور بار بار میعاد میں اضافے کے بعد بھی جس رفتار سے کام چل رہا ہے اس سے ان کا مکمل ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ کلیم صاحب نے انگریزی اردو لغت کے ساتھ "فرہنگ ادبی اصطلاحات"، بھی ترقی اردو بورڈ کو اشاعت کے لیے دی تھی انھوں نے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ انگریزی اردو لغت جسے انھوں نے چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا تھا ان کی زندگی میں شائع ہو جائے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ ایک ملاقات میں جب میں نے ان سے اس لغت کی اشاعت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بہت مایوس کن انداز میں کہا کہ لغت کا مسودہ جب ترقی اردو بورڈ کو سونپا گیا تھا تب حیدر آباد کے کسی صاحب نے اس پر کچھ غلط اور

بے جا اعتراضات کیے تھے جس کا جواب دیدیا گیا تھا —— ترقی اردو بورڈ نے بار بار یہ اعلان بھی شائع کیا کہ انگریزی اردو لغت جلد شائع ہو رہی ہے لیکن اب یوں معلوم پڑتا ہے کہ یہ لغت شاید میری زندگی میں شائع نہ ہو اور لوگ بعد از مرگ لغت کو میری قبر پر لیکر آئیں —— کلیم صاحب کا یاس بھرا یہ جملہ PROPHETIC ثابت ہوا۔

ترقی اردو بورڈ کی انگریزی اردو لغت کے ساتھ کلیم صاحب بہار اردو اکادمی کی سہ لسانی لغت بھی مرتب کر رہے تھے۔ ان دو منصوبوں کے ساتھ کچھ اور بھی کتابیں زیر تصنیف تھیں —— اردو میں ناول نگاری اور انیس کی شاعری پر کلیم صاحب کافی کچھ لکھ چکے تھے۔ ان دونوں کتابوں کے متعلق جب مواد فراہم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تب انھوں نے اُردو کے کچھ ناول اور انیس کے مرثیوں کے مختلف اڈیشن مجھ سے طلب کیے میں نے جب ان سے یہ کہا کہ یہ ساری کتابیں خدابخش خاں لائبریری سے بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہیں تب انھوں نے فرمایا کہ خدابخش خاں لائبریری میں مطلوبہ کتابیں اور دواوین دستیاب ہیں لیکن ارباب اقتدار انھیں ایک خاص مدت کے بعد لائبریری سے باہر رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حسب ارشاد میں نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے مطلوبہ کتابیں فراہم کر دیں۔ کلیم صاحب انیس کی شاعری بالخصوص مرثیہ نگاری کو عظیم شاعری تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس صنف میں شاعری کرنا ایک مذہبی فریضہ ہو وہاں مبالغہ آرائی سے گریز ممکن نہیں اور جس شاعری میں رونا اور رُلانا ایک مقصد ہو وہاں بے جا مقصدیت صحیح جذبۂ شاعری پر حاوی ہو جاتی ہے جس سے حقیقت مجروح ہوتی ہے۔ ایسی شاعری لمحاتی جذبے کو تسکین بخش سکتی ہے لیکن یہ ذوقِ سلیم پر ایک بار ہے اور ایسی شاعری کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا اردو ناول پر جس کتاب کا منصوبہ کلیم صاحب نے بنایا تھا اس میں اردو کے مستند ناول نگاروں کے کامیاب ناولوں کا مطالعہ ہی مخصوص تھا اور پھر عملی تنقید کے تحت ان کا مقام متعین کرنے کا خیال تھا۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ یہ دونوں کتابیں کس حد تک مکمل ہو پاتی لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان کے کچھ ابواب مکمل کر لیے گئے تھے —— "معاصر" پٹنہ میں ان دونوں کتابوں سے متعلق کچھ ابواب شائع بھی ہوئے تھے۔ اگر یہ کتابیں مکمل ہو جاتی تو ان موضوعات پر کام کرنے والوں کو ایک نئی سمت حاصل ہوتی۔ کلیم صاحب اپنے ساتھ کچھ حسرتیں لیے رخصت ہوئے۔ عملی تنقید کی باقی سات جلدیں اور "تاریخ ادب اردو" وہ مکمل نہ کر پائے۔ عملی تنقید کا بہت سا مواد سیلاب کی نذر ہو گیا اور "تاریخ ادب اردو کا منصوبہ قاضی صاحب کی خوب سے خوب تر کی جستجو کی وجہ سے تکمیل نہ پا سکا۔ "تاریخ ادب اردو" کے متعلق کلیم صاحب نے یہ بتایا تھا کہ اس منصوبہ کا خاکہ یہ تھا کہ انگریزی ادب کی تاریخ کو بنیاد بنا کر اردو ادب کی تاریخ مرتب کی جائے اور قاضی صاحب اس کی تفصیل اور حدود طے کر دیں۔ مواد کی فراہمی کے بعد کلیم صاحب اسے ضبط تحریر میں لائیں اور قاضی صاحب کی نظر ثانی کے بعد اسے شائع کیا جائے لیکن اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے قاضی صاحب کو مناسب فرصت میسر نہ آسکی۔

کلیم صاحب زندگی کے آخری لمحے تک مطالعہ، تصنیف و تالیف میں غرق رہے۔ ان کی زندگی خدمتِ ادب کے لیے وقف تھی۔

رسالہ "سریر" نے جب "کلیم الدین احمد نمبر" کی اشاعت کا اعلان کیا تو میں نے انھیں اس کی اطلاع دی

اور تعاون کی گذارش کی۔ کلیم صاحب نے کہا کہ اس پتھر کو چومنے کا قصد نہ کریں کیوں کہ ایسی کوششیں بارور نہ ہوں گی۔ بہت کم ہی حضرات مضامین لکھنے کی گذارش پر لبیک کہیں گے اور پھر زندگی میں جس شخصیت پر مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں صحیح محاکمے کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں میں نے اپنی کم علمی کے باوجود مضمون لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ کوشش کر ڈالیے —— مواد کی فراہمی اور بالخصوص ان رسائل جن میں کلیم صاحب پر اعتراضات کیے گئے تھے اور جن کا انھوں نے جواب دیا تھا کہ فراہم کرنے کی گذارش میں نے کی تب انھوں نے کہا کہ اعتراض کا جواب دینا انھوں نے برابر غیر ضروری سمجھا ہے —— بے جا معرکہ آرائی میں وقت ضائع کرنا لاحاصل ہے۔ صرف ایک بار رسالہ "اردو" میں شائع "اردو شاعری پر ایک نظر" پر عبدالحق کے تبصرہ کا جواب دیا گیا تھا لیکن اب وہ شمارے تلف ہو چکے ہیں —— میں نے رسالہ "نقوش" کے شمارہ نمبر ۹۰ (نوے) میں شائع علی عباس حسینی کے مضمون کا ذکر کیا تب انھوں نے کہا کہ یہ شمارہ بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ اس مضمون کا جواب شاید ڈاکٹر سید محمد حسنین نے رسالہ "صنم" میں شائع کیا تھا جواب دستیاب نہیں ہے —— کلیم صاحب نے یہ بھی مشورہ دیا کہ کسی بھی ادیب پر لکھنا مقصود ہو تو اس کی تصانیف کا بالواسطہ مطالعہ کیا جائے اور کسی کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اپنے خیالات پیش کیے جائیں —— میں کلیم صاحب کی گرانقدر رائے حاصل کر کے رخصت ہوا —— مضمون نصف ہی مکمل ہوا تھا کہ کلیم صاحب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ دل کی آرزو دل ہی میں رہ گئی۔

کلیم صاحب تا عمر اپنے علم و آگہی سے شعر و ادب کے اسرار و رموز اور پوشیدہ نکات کی نشاندہی کرتے رہتے —— صحت مند اور جامع رجحانات کی داغ بیل ڈالنے والی عہد ساز شخصیت اب خاموش ہے —— ایک عہد اختتام تک پہنچ چکا ہے۔ روشن چراغ کی لو بجھ چکی ہے لیکن آنے والی نسلوں کے لیے روشنی برقرار ہے ●

اہلِ قلم حضرات سے درخواست

اس وقت دفتر میں خاصی تعداد میں مضامین، کہانیاں، نظمیں، غزلیں جمع ہو چکی ہیں۔ اہلِ قلم حضرات سے ہماری مؤدبانہ درخواست ہے کہ تا اعلان ثانی بلا طلب اپنی تخلیقات روانہ نہ فرمائیں۔●

خورشید
172, Satlaj Block,
Iqbal Town,
LAHORE -8,
PAKISTAN

کچھ وقت پاکستانی کتب اور رسائل کے ساتھ

موسم کا مسیحا ——— محمود واجد

محمود واجد کے افسانوں کی کتاب "موسم کا مسیحا" پڑھ کر سب سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے پنا تخلیقی سفر ایک حقیقت بیں افسانہ نگار کی حیثیت میں آغاز کیا تھا، پھر جیسے جیسے ان کا تجربہ اور مشاہدہ وسعت اختیار کرتا گیا اور زندگی کی بوقلمونی ان پر اپنی گوناگونی منکشف کرتی گئی ان کا فن تجریدی ہیئت اختیار کرتا گیا ور اب ان کے افسانوں میں زندگی کا کٹا پھٹا چہرہ اس طرح سامنے آتا کہ اسے جوڑنے کے لیے قاری کو بھی اپنی ذہنی تخلیق کاری سے کام لینا پڑتا ہے معنویت کی گرہ کھلتی ہے تو قاری پر جہان دیگر آشکار ہو جاتا ہے۔ اس سے شاید یہ اندازہ لگایا جائے کہ محمود واجد آسان سے مشکل کی طرف آئے ہیں، میرے خیال میں، یہ درست نہیں، محمود واجد نے درحقیقت خود ارتقا کی طرف قدم بڑھایا تو اپنے ساتھ قاری کو بھی اہل بہ ارتقا رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز نومبر ۱۹۵۶ء میں افسانہ "چاند کی بیٹی" سے ہوا اور اس کتاب میں شامل افسانہ "گڈریا۔ بھیڑیں اور چراگاہ" کا سالِ اشاعت ۱۹۸۸ء۔ اوّل الذکر افسانہ سیاق و سباق کو ماحول اور کرداروں کے وسیلے سے مرتب کرتا ہے اور موخر الذکر افسانے میں کہانی کے بیرونی خطوط بھرپور تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ ان دونوں کہانیوں کے درمیان بائیس سال کا فاصلہ، انھیں کہانیوں اور افسانوں کے فن پر محمود واجد کا تفکر جو تنقید کی صورت میں سامنے آتا، باسلسلہ درسلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اور یہ محمود واجد کے عرفانِ فن کا پتا دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت نگاری کا اسلوب اب محمود واجد کو مرغوبِ خاطر نہیں اور تجرید نگاری ہی آخر ان کا فن ٹھہرا ہے۔ اس عمل میں انھوں نے اساطیر، قدیم داستانوں اور لوک کہانیوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے انھوں نے قدیم کو نہ صرف جدید آنکھ سے دیکھا ہے بلکہ ماضی کی بازیافت زمانۂ حال میں بھی کی ہے۔ اور یوں اس سچ کو آشکار کیا ہے جس کا ایک ہی روپ ہے اور جس پر زمانہ گرد نہیں ڈال سکتا۔ اس مجموعے میں "درد کے رشتے"۔ "آدھا سفر"۔ "مدار کا چاند۔ جاگتے لمحوں کا خواب" تجرباتی نوعیت کے افسانے ہیں اور یہ آپ کو ذہنی آسودگی فراہم کرنے کے بجائے آپ کی سوچ کو مائل بہ طغیان کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کے ناشر "دبستانِ جدید" کراچی ہیں، اور قیمت چالیس روپے ہے۔

علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب ــــــ محمد صدیق

"بزم اقبال" لاہور کے معتمد اعزازی کی حیثیت میں ڈاکٹر وحید قریشی نے "اقبالیات" کے جو مفید سلسلے شروع کیے ہیں ان میں سے ایک اہم سلسلہ "تحقیقاتِ اقبال کا ہے۔ اس عنوان کے تحت ایسے تحقیقی مضامین یکجا کیے جا رہے ہیں جو پہلے رسائل میں بکھرے ہوئے تھے۔ پروفیسر محمد صدیق کی کتاب "علامہ اقبال اور ان کے بعض احباب" اسی سلسلے کی ایک عمدہ کتاب ہے۔ جس میں اقبال پر سات منتشر مقالات کو کتابی صورت دی گئی ہے۔

اقبال کثیر الاحباب شخصیت تھے، ان کے احباب میں کچھ لوگ ان کے دوست تھے، کچھ ان کے اساتذہ اور کرم فرما تھے جن سے اقبال کے روابط دوستانہ تھے، ایک بڑی تعداد ایسے احباب کی تھی جو فیض حاصل کرنے کے لیے ان کے ہاں مسلسل حاضری دیتے تھے، اس کتاب میں پروفیسر ابوالخیر عبداللہ، جناب مینون، بیرسٹر شیخ محمد اکرام اور سردار امراؤ سنگھ شیرگل مجیٹھیا کے بارے میں بنیادی معلومات اور اقبال سے ان کے روابط کا اجمال پیش کیا گیا ہے پروفیسر صدیق صاحب نے روابط کا یہ اجمال مختلف ذرائع سے حاصل کیا ہے اور اس کے لیے دستاویزی شہادت بھی پیش کی ہے۔ ابوالخیر عبداللہ کا تعلق علامہ اقبال سے تحریک شبان المسلمین کے سلسلے میں پیدا ہوا اور پھر عمر بھر قائم رہا۔ اقبال جب پیرس گئے تو ان کی ملاقات برگساں سے تو نہ ہو سکی لیکن منصور حلاج کے رسالہ کتاب الطواسین" کے مؤلف فرانسیسی سکالر مینون سے ملنے کا موقع انھیں مل گیا اور پھر یہ سلسلہ بھی تا زندگی قائم رہا۔ اس کتاب کی بیشتر معلومات اس نوعیت کی ہیں جن تک عام قاری کی رسائی نہیں ہے۔ پروفیسر محمد صدیق صاحب نے انھیں کتابی صورت دے کر ایک اچھی خدمت سر انجام دی ہے۔

اس کتاب میں تین اور مضامین ــــ "علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج"۔ "علامہ اقبال کا ذاتی کتب خانہ" اور اقبال کے کتب خانے میں چند قانونی کتب ــــ بھی شامل ہیں جو کسی نہ کسی انداز میں اقبال کی زندگی اور ان کے مطالعے کی جہات پر قابلِ قدر روشنی ڈالتے ہیں، اول الذکر موضوع پر ڈاکٹر وحید قریشی بہتر انداز میں دادِ تحقیق دے چکے ہیں، پروفیسر محمد صدیق صاحب نے وہ حواشی اور نوٹ بھی شائع کر دیے ہیں جو اقبال مطالعہ کے دوران کتابوں پر لکھتے جاتے تھے۔ اس سے علامہ کے مطالعے کا انداز اور ان کی فکر کے زاویوں کو زمانی اعتبار سے بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب "اقبالیات" کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات اور قیمت ۵۵ روپے ہے۔

چراغ آفریدم / عبدالرؤف عروج

عبدالرؤف ترقی پسند تحریک کے ان شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد مطلعِ ادب پر نمودار ہوئے اور جن کی نظمیں اس دور کے اہم رسائل مثلاً شاہراہ، ادبِ لطیف، صبا، سب رس، نظام، تحریک، نصرت اور مشرب وغیرہ میں نمایاں طور پر شائع ہوتی رہیں، اب ان کا مجموعۂ کلام نفیس اکادمی کراچی سے "چراغ آفریدم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"یہ مستی اندیشہ ہائے افلاکی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے میں اس زمین کے ہنگامے سہل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

عبدالرؤف عروج کا تصور انسان دھرتی کے حقائق سے مرتب ہوا ہے، ان کی شاعری سے ان کا حاصل حیات چنداں خوش نظر محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن انھوں نے محنت کش انسان سے اپنا بندھن مضبوطی سے قائم رکھا اور کسی سیاسی انسان کو مثالی حیثیت دے کر اسے محورِ حیات بنانے کی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری زندگی سے مخلص نظر آتی ہے اور وہ کائنات اور بہبودیِ انسان کے بارے میں مسلسل سوچنے والے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ "وہ خارجی زندگی کی کروٹوں ہی کو محسوس کرنے پر قادر نہیں بلکہ اندر کی دُنیا کے بھی اچھے نبّاض ہیں، وہ چشمِ نیم باز کی جھری سے عالمِ اصغر اور عالمِ اکبر دونوں کو دیکھتے چلے گئے ہیں اور وہ ان لمحات کی تجسیم کر کے شاعری کے خوبصورت نمونے تخلیق کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔"

اس کتاب کی نظم اور غزل کی نسبت سے عبدالرؤف عروج کی انفرادیت آشکار ہوتی ہے تاہم میرا خیال ہے کہ عروج کا جمالیاتی زاویہ غالب سے اور سماجی زاویہ فیض سے ہم رشتہ ہے۔ انھوں نے اپنی امیجری کی کلاسیکی صورت تراشنے میں اقبال سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور یوں لفظ و معنی کو ایک نیا ارتباط فراہم کر دیا ہے۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ

"ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں اردو شاعری کی بہترین روایتوں کی آئینہ دار ہی نہیں، ان روایتوں کی توسیع بھی ہیں اس مجموعے میں یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک سچا فنکار اپنے ذاتی دُکھوں اور عہد کے کرب سے یکساں طور پر عہدہ برآ ہوتا ہے۔"

۲۱۶ صفحات کی یہ کتاب نفیس اکادمی کراچی سے ۵۰ روپے میں دستیاب ہے۔

تخلیق / مرتب اظہر جاوید

اظہر جاوید کا رسالہ "تخلیق" بہت سے گرم اور سرد زمانے دیکھنے کے بعد اب زندگی کے بیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ حال ہی میں اس کا نیا شمارہ ـــــ مارچ اپریل ۱۹۸۹ء ـــــ تب و تاب جاودانہ سے شائع ہوا ہے۔ اس پرچے میں شبنم شکیل کی شاعری پر ایک گوشہ ان کی نئی کتاب "شب زاد" کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی، اشفاق احمد، منیر نیازی اور کشور ناہید کے علاوہ متعدد دوسرے ادیبوں نے شبنم شکیل کے فن کی تحسین کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے کہ

"شبنم شکیل نے زندگی کو بقراط بن کر نہیں ایک عورت بن کر دیکھا ہے، اس کی شاعری ایک گرہستی عورت کی شاعری ہے۔"

رعنا اقبال نے وزیر آغا کے انٹرویو میں ان سے یہ دلچسپ سوال پوچھا ہے کہ کیا آپ کی بیگم صاحبہ بھی آپ کی تحریریں پڑھتی ہیں اور ان کی رائے آپ کی تحریروں کے متعلق کیا ہے؟

وزیر آغا نے جواب دیا "اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے اپنی آٹو بیوگرافی لکھی اور بیگم کو پڑھنے

کے لیے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پڑھ کر رائے ضرور دیجیے گا۔ تقریباً ایک سال تک انھیں فرصت ہی نہ ملی کتاب کو چھونے کی۔ پھر میں نے کہا "اس میں آپ کی کہانی میں نے بڑی تفصیل سے لکھی ہے۔ آپ پڑھیے' ضرور لطف اندوز ہوں گی۔ اب پچھلے دنوں انھوں نے مجھے بتایا کہ پہلے ساٹھ ستر صفحے انھوں نے پڑھ لیے ہیں اور کافی "انجائے" (بھی کیا ہے۔ تو اس طرح آٹھ یا دس سال میں وہ پوری کتاب پڑھ لیں گی اور رائے دے دیں گی تو آپ کو ضرور بتا دوں گا"

رعنا اقبال نے اس قسم کے نجی سوالات سے انٹرویو کو جگمگا دیا ہے۔

"تخلیق" کے افسانوں میں اس دفعہ سب سے اچھا افسانہ مرجب قاسمی کا ہے۔ عنوان ہے "کنواری عورت کا بوسہ" ——— مقالات میں امجد علی شاکر کا " ہمارے ادیب اور روحانی واردات؟ ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ قارئین کی ایک کہکشاں "انجمن خیال" میں سجی ہوئی ہے۔ قارئین کے خطوط پر مشتمل یہ حصہ تخلیق کا سب سے دلچسپ اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا حصہ ہے۔ اس میں احمد بشیر، ضمیر جعفری، محشر بدایونی، سید محمد تقی، الطاف پرواز، آفاق صدیقی، خالد بزمی، ستار طاہر، قمر ہاشمی، ناصر شہزاد، اکبر کاظمی، جاوید اختر بھٹی، نصر ملک، اقبال ناظر، عالیہ ہالہ بخاری اور نوید بخاری عرشی کے خطوط شیریں، ترش اور کچھ تلخ مباحث کو ہوا دے رہے ہیں۔ تخلیق، بھگوان سٹریٹ پرانی انارکلی لاہور سے شائع ہوتا ہے ●

جناب عابد سہیل
نصرت پبلشرز، امین آباد لکھنؤ

نسیم انہونوی مرحوم

مرحوم صاحب طرز ناول نگار تھے اور کہنہ مشق صحافی اور ادیب۔ وہ کوئی ۲۵ ناولوں کے مصنف تھے۔ ان کے انتقال سے زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچا ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں۔ (ادارہ)

کم و بیش دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کام کرنے کے باوجود اگر کوئی شخص ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکے تو اس کے کیا معنی ہوئے ؟ یا تو اسے کام کرنا نہیں آتا تھا، یا اس کام میں مالی منفعت اتنی نہیں تھی یا یہ کہ اس نے دونوں ہاتھوں سے کمایا اور دونوں ہی ہاتھوں سے لٹایا۔ اس کے علاوہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی لیکن لے کیا کیجیے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت نہ تھی۔ وہ شخص اپنے کام کے رنگ و ریشے سے واقف تھا۔ کام بھی ایسا تھا جس میں چند ہی برسوں میں ایسے ایسے کیسے کیسے بن جاتے ہیں۔ اور اس نے جو کمایا اسے دونوں ہاتھوں سے لٹایا بھی نہیں۔ مکروہاتِ زمانہ سے وہ کوسوں دور تھا، عیش و عشرت کو اس نے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ اور شان و شوکت کی زندگی اس نے نہ گزاری۔ پھر بھی شدید خواہش کے باوجود وہ ایک موٹر کار بھی نہ خرید سکا۔

ذکر ہے نسیم انہونوی مرحوم کا جنھوں نے ٹھیک ساٹھ سال قبل ۱۹۲۹ء میں ایک نہایت قلیل رقم سے "طرز زندگی" نام کے اپنے ہی ناول کے ایک اشاعتی ادارہ کی بنیاد ڈالی جس نے ساٹھ برسوں میں بچوں کی کتابوں کے علاوہ تیرہ سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ گم نام لوگوں کو بام شہرت تک پہنچایا۔ آندھی آئے یا طوفان بلا مبالغہ کم از کم دس گھنٹے روزانہ کام کیا اور تجارت میں معاملت کے وہ معیار قائم کیے جن کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

نسیم بک ڈپو میں ہر کام کے لیے وقت اور تاریخ مقرر تھی۔ ملازمین کو تنخواہ کی ادائیگی مہینا کے آخری دن ہوتی اور اگر اس دن چھٹی ہوتی تو تنخواہ ایک دن قبل ادا کر دی جاتی۔ کاغذ کی خریداری کے بلوں کی ادائیگی مہینا کے ابتدائی دنوں میں ایک مخصوص تاریخ کو ہوتی اور پریس کے بلوں کے رقوم بھی ایک مخصوص تاریخ کو ادا کی جاتیں۔ زمین شق ہو جائے۔ آسمان پھٹ پڑے لیکن اس پروگرام میں فرق نہیں پڑے گا۔ اٹھاون سال سے ماہنامہ "سرپنچ" اور ۴۸ سال سے ماہنامہ "حریم" اسی

نسیم بک ڈپو، لکھنؤ کے بانی اور مالک جناب نسیم انہونوی کا ۴ مارچ ۱۹۸۹ء کو تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا

ادارہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کی اشاعت میں ایک دن کی بھی تاخیر ہوئی ہو۔ نسیم انہونوی انسان تھے یا گھڑی۔ اور گھڑی کی رفتار بھی تو سست و تیز ہو جاتی ہے برقی گھڑیاں بھی بجلی فیل ہو جانے سے رک جاتی ہیں اور سیل سے چلنے والی گھڑیاں سیل کمزور ہو جانے کی وجہ سے اپنی رفتار دھیمی کر دیتی ہیں۔ یا اللہ تو نے نسیم انہونوی میں کون سی مشین فٹ کر دی تھی جو رک تو سکتی تھی اور وہ بھی ایک اور آخری بار لیکن اپنی رفتار کم نہیں کر سکتی تھی۔

بلاشبہ نسیم انہونوی نے جو کچھ بھی کمایا اور وہ کچھ ایسا کم بھی نہ تھا۔ نسیم بک ڈپو اور کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت ہی سے کمایا۔ لیکن اگر وہ یہ دو لاکھ بیس ہزار گھنٹے کسی اور کام میں صرف کرتے، کوئی دوسرا کاروبار کرتے، اور وہ سب کچھ کرنے سے احتراز نہ کرتے جو آج کی اقدار سے عاری ہوتی ہوئی دنیا میں سکۂ رائج الوقت بن گیا ہے تو کروڑوں میں کھیلتے اور ان الزامات سے بھی محفوظ رہتے جو ان کی طرح کے ہر ناشر کا مقدر ہیں۔ مصنف، ناشر اور کتب فروش، کتابوں کے کاروبار کے تین ایسے سرے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا شاکی رہتا ہے۔ مصنف نالاں رہتا ہے کہ ناشر اس کا خون چوستا ہے۔ ناشر پریشان رہتا ہے کہ جھوٹا بھر روپے خرچ کر کے کتاب چھاپی جاتی ہے اور رقم کی واپسی دس۔ دس۔ بیس۔ بیس روپوں کی شکل میں چھ سے دس سال میں ہوتی ہے۔ اور کتب فروش کے خیال میں اول الذکر دونوں تو مزے میں رہتے ہیں اور وہ نقد یا چند ماہ کے قرض پر کتابیں خرید کر لائبریریوں کے حوالے کر دیتا ہے جہاں سے بلوں کی ادائیگی سال دو سال میں ہو جائے تو غنیمت جانیے۔ سچ پوچھیے تو ان میں سے کسی کی بھی شکایت بے بنیاد نہیں ہے۔ رائلٹی اول تو مصنف کو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو بقدر اشک بلبل۔ ناشر کتابوں کی فروخت کی سست رفتاری سے پریشان رہتا ہے اور کتب فروش ناشروں کے تقاضوں سے۔ لیکن اصل سبب پر کوئی غور نہیں کرتا۔ اردو کتابوں کی تعداد اشاعت اس قدر کم اور نکاسی کی رفتار اس قدر سست ہوتی ہے کہ ننگی کیا اوڑھے کیا بچھائے؟ آخر بنگالی یا ملیالم کے ادیب، ناشر، کتب فروش اس صورت حال سے کیوں دوچار نہیں۔ مغربی ممالک میں جہاں رائلٹی کی شرح دو ڈھائی فیصد ہونے کے باوجود ایک کتاب کی اشاعت سے مصنف مکان بنوا لیتا ہے صورت حال اردو سے بالکل مختلف کیوں ہے؟ کتاب جب تک تیزی سے فروخت نہ ہو گی نہ مصنف کی شکایت دور ہو گی نہ ناشر کی، نہ کتب فروش کی۔

الزام تراشیوں کے شکار نسیم صاحب بھی تھے لیکن انھوں نے کسی الزام کا کبھی جواب نہیں دیا اور نہر کی پن چکی کی طرح دُھن کے پورے اور کام کے پکے بنے ساری زندگی کرم یوگی کی طرح کام کرتے رہے۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ بونس کا طریقہ عام ہونے سے قبل ہی سے نسیم بک ڈپو کے ملازمین کو سال میں تیرہ مہینے کی تنخواہ ملتی تھی۔ ہر سال تنخواہوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ عید میں کپڑے بنوا لئے جاتے تھے متعدد غریب اور نادار طلبہ کی فیس ادا کی جاتی تھی۔ بیواؤں کے لیے مستقل مالی امداد جاری تھی ادارہ کے ملازمین کی لڑکیوں کی شادی کے موقع پر تنخواہ بونس

اور دوسری مراعات کے علاوہ ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو اور نسیم صاحب رات رات بھر جاگتے، کروٹیں بدلتے اور متوقع آمدنی اور واجب الادا رقوم کے پلڑوں کو کھینچ تان کر برابر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔

نسیم انہونوی کو میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۵۸ء میں دیکھا ان دنوں کرشن چندر اکثر لکھنؤ آتے تھے۔ سورج ڈھلے وہ کتابی دنیا آجاتے اور بار بار گھڑی دیکھتے "اب چار منٹ رہ گئے ہیں، اب دو منٹ باقی ہیں۔ اب نسیم صاحب آتے ہی ہوں گے" اور نسیم صاحب اسی لمحہ پہنچ جاتے اور کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی صاحب کے ساتھ یہ دونوں چہل قدمی کے لیے نکل پڑتے۔

گندمی رنگ، چوڑی مہری کا پائجامہ، کرتے پر شیروانی، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر سنجیدگی، جس میں خشونت نام کو نہ ہوتی بلکہ ایک ایسی مسکراہٹ ہوتی جسے مسکراہٹ کہنا بھی کسی قدر بے بیانی ہوگا۔ یہ تھا نسیم صاحب کا حلیہ اس دن کے بعد انتقال سے چند ماہ قبل تک جب آخری ملاقات کتابوں کے قومی میلے میں ہوئی۔ ان کو اسی طرح پایا۔ عمر، تفکرات اور موت کے سلسلے ان کے جسم اور چہرے پر اثر انداز ضرور ہوتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت اور چہرہ مہرہ میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

نسیم صاحب ناول نگار تھے لیکن تنقیدی کتابوں اور مضامین میں ان کی ناول نگاری کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کے فن پر مضامین بھی نہیں لکھے گئے، نہ تعریف میں، نہ تنقیص میں۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کے ناول ایسے ہیں کہ انھیں نظر انداز کیا جا سکے بلکہ یہ ہے کہ بطور ناشر ان کی شخصیت اس طرح چھا گئی کہ اس پہلو پر کسی نے غور ہی نہیں کیا۔ ایک دوسرا ممکن سبب یہ ہے کہ نسیم صاحب ان اقدار کے پاسدار تھے جن کو کامیابی سے ہم کناری کو قدر اوّل کا درجہ دینے والے سماج نے از کار رفتہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے جس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور ناول نگاری شروع کرتے کرتے اور زندگی کی آخری سانسوں تک جس دنیا میں رہے جن قدروں کو سینے سے لگائے رہے ان کا ہر ناول انہی اقدار کی بازگشت ہے اس دوران ادب کے معیار بدل گئے۔ ناول نگاری ارتقا کے مدارج طے کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی 'مقصد' ایک بڑے حلقۂ ادب میں شجر ممنوع بن گیا اور افسانوی ادب لکھنے والوں سے کم VEGETARIAN ہونے کی فرمائشیں کی جانے لگیں۔ ایسے میں نسیم صاحب کے ناولوں کو کون اہمیت دیتا کہ "اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں"۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نسیم صاحب کے ہر ناول کے کئی کئی اڈیشن چھپے انھیں بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں نے پڑھا جب کہ ان کے حسن و قبح کے بارے میں فیصلہ کرنے والوں کے ناموں سے بھی اس تعداد کے عشر عشیر لوگ بھی واقف نہ ہوں گے، نسیم صاحب کو کسی سرٹیفکیٹ، کسی سند، کسی توصیف کی ضرورت نہ تھی کہ ان کے اور قاری کے درمیان براہ راست اور زندہ تعلق قائم تھا اور کوئی تنقید یا توصیف نہ اس میں کمی کر سکتی تھی نہ اضافہ۔

زندگی اس قدر تیز رفتار اور زمانہ اس قدر بے رحم ہے کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا اٹھ جانا بھی ندی میں بھی چند دائرے بناتا ہے اور پھر وقت کا پانی سابقہ رفتار سے بہنا شروع کر دیتا ہے لیکن

نسیم صاحب ان لوگوں کو جنھوں نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ نسیم صاحب کو دعائیں دیں گے وہ طالب علم جن کی مالی اعانت کرتے تھے وہ بیوائیں جن کے کڑھے کوسوں میں وہ فرشتہ بن کر آتے تھے۔ ان کے ادارے کے وہ کارکن جن کی ہر غلطی ہر کوتاہی کو وہ درگزر کر دیا کرتے تھے ان کو یاد رکھیں گے وہ ادیب جن کی رائلٹی کی رقم مقررہ وقت پر ادا کرتے تھے اور درجنوں، جی ہاں درجنوں ادیب جن کو نسیم صاحب نے ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ نسیم صاحب کو وہ لوگ بھی یاد رکھیں گے جنھوں نے ان کی ناولوں کے کرداروں کے ساتھ قہقہے لگائے۔ آنسو بہائے، جن میں انھوں نے خود کو تلاش کیا اور اپنی زندگی کی کوئی لہر، کوئی لے، کوئی ادا، ان میں پاکر فخر محسوس کیا اور پشیمان ہونے پر افسردہ ہوئے۔ ان کی وہ ہزاروں ان دیکھی ان جانی، منہ بولی بہنیں انھیں یاد رکھیں گی جن کے ہر غم کے مقصد پر نسیم صاحب دلداری کے خطوط لکھتے تھے اور جن کی مسرتوں کے موقعوں پر ان کی شگفتہ تحریر ان خوشیوں کو دوبالا کر دیتی تھی ان کو وہ لوگ یاد رکھیں گے جو اصولوں کی زندگی گزار کر اندھیروں میں چراغ جلا رہے ہیں ان کو وہ بھی یاد رکھیں گے جو تجارت کو عبادت اور خوش معاملگی کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔

نسیم صاحب کو یاد کرے گی۔ یاد رکھے گی، اور ان کی یاد میں زندگی بھر آنسو بہائے گی، ان کی بیٹی نجم السحر جس کو سولہ برسوں سے اس کی شادی کے بعد سے وہ ہر روز خط لکھتے تھے بلا مبالغہ ہر روز اور ان کے ہوش وحواس کا آخری کام بھی یہی خط تھا۔ جو انھوں نے بستر مرگ سے املا کرایا تھا۔ اس معمول میں ایک دن کی بھی خطا نہیں ہوئی کہ قبل اس کے کہ اگلے دن کا سورج طلوع ہو، نہ ان کے ہاتھ میں جنبش تھی نہ آنکھوں میں دم۔

نسیم صاحب ایک فرد تھے لیکن ایک انجمن بھی تھے۔ نسیم صاحب ناشر تھے لیکن ایک ادیب بھی تھے انھوں نے اپنی دنیا خود بنائی تھی اور یہ دنیا ایسی بھرپور تھی کہ کامیاب سے کامیاب زندگی گزارنے والے اس پر رشک کریں۔

ایسی دلکش شخصیتیں، معاملت ایسے چوکھے، بات کے دھنی، کام کے پکے، باوضع اور نام ونمود سے بے نیاز افراد خدا کرے جنم لیتے رہیں کہ اے خدا تیری دنیا میں روشنی کے چراغ کم سے کم ٹمٹماتے ہی رہیں

از — اوٹو فلیک
براہ راست ترجمہ : رتی سجاد
NASHEMAN,
CHOONI MANDI,
LAHORE.
(Pakistan)

ایک تصویر

(جرمن کہانی)

خوشیوں سے لدی ریل گاڑی کھیتوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس کی منزل سمندر کے کنارے ایک شہر ہے جہاں ایک خاتون اس گاڑی میں بیٹھے شخص کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہے۔ ایک خوبصورت اور جوان عورت، جو اس کی بیوی سے زیادہ جوان ہے۔

ایسے شخص کو پیار میں اندھا ہی کہا جا سکتا ہے جو اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکلتا ہے اور اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہے ——— یوں تو اسے اپنی سالی سے ملنے میں کوئی قباحت نہیں جو کہ راستے ہی میں رہتی ہے لیکن وہ اپنے اصل مقصد کو کیسے چھپائے ——— ؟! بیوی اور رشتے داروں سے چھپتے پھرنا اچھا بھی تو نہیں لگتا۔

آج کا دن، خوشگوار ترین دن ہے، گاڑی تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ یوں ہی چلتی چلی جائے۔ کتاب اور سگریٹ بہترین ساتھی ——— یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنی ذاتی گاڑی میں سفر کر رہے ہوں۔ باہر آسمان کا رنگ چاندی سا نظر آ رہا تھا۔

ایک اشارے سے اس کے سب کام ہو سکتے تھے لیکن وہ خود ہی اپنا سوٹ کیس ٹھیک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور ٹھیک کرنے کے بعد گرد و پیش دیکھتا ہے۔ اسے ایک تصویر دکھائی دیتی ہے جسے وہ فوراً ہی پہچان نہیں پاتا پر ذرا غور کرنے کے بعد اسے پتا چلتا ہے کہ یہ اس کی بیوی کی جوانی کی تصویر ہے۔ اتنے میں اس کی سالی داخل ہوتی ہے، وہ اسے دیکھ کر اپنے اندر کی ہلچل کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے ——— یہ جذبات اس کی سمجھ سے باہر ہیں۔

جب بھی وہ تصویر کے پاس سے گزرتا، اسے دیکھے بغیر رہا نہ جاتا، اپنی بیوی کا یہ حسین جوبن تو اس نے کبھی دیکھا تھا۔ جب اس سے ملاقات ہوئی تھی تب وہ پچیس برس کی تھی۔ تصویر میں وہ کوئی بیس برس کی ہوگی۔ اس سے رہا نہ گیا، وہ تصویر کو دیوار سے اتار کے اسے ہر زاویئے سے دیکھنا چاہتا تھا ——— کیا روشن آنکھیں چمکتے گیسو، بھرا بھرا سینہ۔ وہ تو اس تصویر میں ڈوب کر گویا عشق میں ڈوب گیا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اجنبیوں سے ملنے آیا ہے۔ اس نے اس تصویر میں بہت اپنائیت پائی خواہش، شدت اختیار کر رہی تھی۔ آخر اسے اپنی سالی سے پوچھنا پڑا کہ یہ کون ہے؟ سالی اس کی دلچسپی دیکھ کر ایک ایم۔ آئی ایم میں اس تصویر کے علاوہ اس کی بیوی کی کچھ عرصہ بعد میں اتری ہوئی تصویر بھی تھی۔ اتنی سیک

اور نازک۔

وہ ماضی میں کھو گیا اور اسے اپنی بیوی کے ساتھ پہلی ملاقات یاد آئی۔ وہ ہر انداز میں حسین نظر آتی تھی۔ اس لیے اس کے جذبات مچل گئے۔

اس تصویر کے ذریعے وہ جوانی تک پہنچتا ہے جب اس نے ابھی اظہارِ محبت نہیں کیا تھا لیکن اس کا جادو اس پر چل چکا تھا۔

شادی کے پندرہ برسوں میں اس نے جو بھی اُمیدیں اپنی بیوی کے ساتھ وابستہ کی تھیں اس نے پوری کی تھیں۔ وہ اس تصویر کو یوں دیکھتا ہے جیسے ایک بادشاہ اپنی ہونے والی ملکہ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ چاہتیں، وقت ابھی جوان ہے۔

وہ اپنی شادی کی پندرھویں سالگرہ کے موقع پر اتاری گئی تصویر البم سے نکالتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اس تصویر کو دیکھتا ہے کہ کہیں یہ کمرے میں لگی پندرہ سال پہلے کی تصویر سے کسی طور کم تو نہیں ——— ؟ اچہرہ بدل چکا ہے۔ وقت نے اپنے آثار یقیناً چھوڑے ہیں۔ وہ دونوں تصویریں ساتھ ساتھ رکھتا ہے ——— وہ اس بیس سالہ لڑکی کے لیے پیار چالیس سالہ عورت میں ڈھونڈتا ہے۔ لڑکی کا چہرہ عورت کے چہرے میں اُبھرتا ہے اس کے دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔

وہ سوچتا ہے۔ "آہ ——— وہ مختصر سے پندرہ برس کتنی جلد بڑھاپے میں ڈھل گئے۔ یہ ایک اتنی بھیانک حقیقت ہے کہ صرف بھلائی ہی کام دیتی ہے اور بھلائی اسی میں ہے کہ اس حقیقت کو مانا جائے۔"

اور بھلائی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی ہم سفر کو ٹھیس نہ پہنچائے اور ظاہر ہے کہ اس کی خواہش یہی ہوگی کہ وہ اس عورت کے ساتھ سمندر کے کنارے نہ جائے۔

سو، وہ اس کی خواہش کا احترام کرتا ہے۔ بے یقینی کے عالم میں جیب سے اپنی محبوبہ کی تصویر نکالتا ہے۔ اسے دیکھتا نہیں اور اسی طرح الٹی ہی، اپنی بیوی کی دونوں تصویروں کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ کیا اس کی محبوبہ کی تصویر اس کی بیوی سے بیس سال عمر والی تصویر کی طرح اس پر جادو کر سکے گی اور یہ حسین چہرہ پہلے چہرے کو مٹا دے گا؟

اس میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی محبوبہ کی الٹی تصویر کو پلٹائے۔ کیا وہ اسے چھوڑ سکے گا؟ تصویر اٹھانے یا نہ اٹھانے کا فعل خاصی آزمائش کا فعل ہے، اس کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔ پھر لمحہ بھر کے لیے سب کچھ علامتی رنگ اختیار کر لیتا ہے جو تصویر کو نہ اٹھانے میں ڈھل جاتا ہے ۔۔
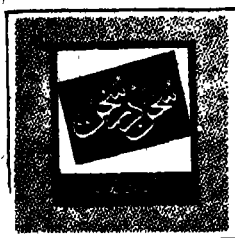
"ذکرِ شہاب" میں بہت کچھ ہے لیکن قدرت اللہ شہاب نظر نہیں آتے۔

قدرت اللہ شہاب مرحوم کے بارے میں ایک مرتبہ ہم نے لکھا تھا: "ان میں بے شمار خوبیاں تھیں، مگر عیب صرف تین تھے۔ ابنِ انشا، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔ شہاب صاحب اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، مگر اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ان میں عہدیداروں والی خُو بُو پیدا نہ ہو سکی۔ سول سروس کے اراکین ان میں ہمیشہ آوٹ سائڈر سمجھتے رہے۔ اس طرح ان کی زندگی میں جو مجلسی خلا پیدا ہوا، اسے انھوں نے ادب سے پُر کرنے کی کوشش کی۔ ادب ان کی زندگی میں آیا تو اہلِ ادب سے بھی شناسائی پیدا ہوئی۔ یوں تو متعدد ادیبوں سے ان کے تعلقات تھے۔ لیکن ابنِ انشا، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی ادب کے راستے ان کی زندگی میں داخل ہو گئے۔ ان تینوں کی وجہ سے شہاب صاحب کی تنہائی ختم ہوئی اور شہاب صاحب کی وجہ سے ان تینوں کی بہت سی محرومیوں کا ازالہ ہوا۔ یہ تینوں شہاب صاحب سے ملنے سے پہلے بے روزگار یا "کم روزگار" تھے بعد میں اعلا عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کے جواب میں ان تینوں نے شہاب صاحب کو وہ منصب عطا کیا، جو برگزیدہ نفوس ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اچھے خاصے بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کو ولی اللہ بنا دیا اور ان سے ایسے ایسے واقعات منسوب کیے، جو صوفیہ اور اولیاء کے تذکروں ہی میں پڑھنے میں آتے ہیں۔

ابنِ انشا، شہاب صاحب کی زندگی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اس لیے انھیں شہاب صاحب کے روحانی کمالات کے بیان کی کچھ زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ باقی دونوں خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے۔ انھوں نے مادی سطح پر شہاب صاحب سے، جو کچھ حاصل کیا تھا، اسے روحانی سطح پر لوٹانے میں شب و روز مصروف ہیں۔ ان دونوں کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں سلسلۂ شہابیہ ایک فعال تنظیم کی صورت اختیار کر چکا ہے اور وہ دن دور

نہیں جب تصوف کے دیگر سلسلوں کی طرح سلسلۂ شہابیہ بھی عالمگیر حیثیت اختیار کرے گا اور شہاب صاحب کی آخری آرام گاہ قوالیوں کا آخری پناہ گاہ بن جائے گی۔ اس ضمن میں جو تازہ ترین اطلاعات ملی ہیں ان میں قابل ذکر یہ ہے کہ لاہور میں ہر ہفتے عقیدت مند کے ہاں شہاب صاحب کی یاد میں ایک محفل منعقد ہوتی ہے، جس میں خود شہاب صاحب بھی شرکت کرتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک عرصے تک شہاب صاحب کو غلام محمد، سکندر مرزا اور ایوب خان جیسے آمروں کا قرب حاصل رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو برسرِ اقتدار آئے، تو انھوں نے بھی شہاب صاحب پر اعتماد کا اظہار کیا۔ وہ خود اختیاری جلاوطنی ترک کرکے بھٹو صاحب کی حکومت میں ایک اعلا منصب پر فائز ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی، تو انھوں نے بھی شہاب صاحب کو ایک اعلا عہدے کی پیشکش کی، لیکن اس مرتبہ انھوں نے کوئی عہدہ قبول نہ کیا، کیوں کہ سرکاری ملازمت سے اکتا چکے تھے۔ غلام محمد کو سکندر مرزا نے چلتا کیا۔ سکندر مرزا کو ایوب خان نے تخت سے اتارا، ایوب خان کو ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سے الگ کیا اور بھٹو صاحب کو جنرل ضیاء الحق نے رخصت کیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ یہ سربراہانِ مملکت، جن میں سے ہر ایک نے اپنے پیشرو کا تختہ الٹا، شہاب صاحب کو اس قدر عزیز کیوں رکھتے تھے؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہاب صاحب نہایت زیرک، معاملہ فہم اور مردم شناس بیوروکریٹ تھے۔ ان کا ذاتی کردار بے داغ تھا۔ وہ نہایت سادہ طریقے سے زندگی گزارتے تھے۔ دولت دنیا کو سمیٹنے کی کوشش کرتے تھے نہ اپنے عہدے سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ہمیشہ اُسی کا فائدہ ملحوظ رکھتے تھے، جس کی وہ نوکری کرتے تھے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں، جن کی ہر سربراہ مملکت نے قدر کی۔ لیکن یہی سوال اگر ممتاز مفتی اور اشفاق احمد سے کیا جائے، تو وہ یہ جواب دیں گے کہ شہاب صاحب چوں کہ روحانیت کے بلند درجے پر فائز تھے اس لیے ہر سربراہ مملکت کو غیب سے اشارہ ملتا تھا کہ انھیں اپنے قریب رکھے۔

ممتاز مفتی چوں کہ اشفاق احمد سے زیادہ تجربہ کار اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہیں۔ اس لیے انھوں نے شہاب صاحب کی زندگی ہی میں ان کی روحانیت کا چرچا شروع کر دیا تھا، جس کو اوّل اوّل شہاب صاحب نے پسند نہ کیا اور آخر آخر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ "شہاب نامہ" میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی بیگم نے شہاب صاحب سے متعلق ممتاز مفتی کی بعض تحریروں پر تعجب کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا۔ "تم ممتاز مفتی کو جانتی ہو۔ بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر سبز عمامہ باندھ کر اور اس پر مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے ایک عجیب و غریب پتلا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ عقیدے سے بھاگتا ہے اور عقیدت کا روگ پالتا ہے، اس کی کسی بات پر دھیان نہ دو۔"

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد بھی ممتاز مفتی نے مضامین کی صورت میں مرحوم کے روحانی درجات کی بلندی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اور سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب لکھ رہے ہیں، جو ضخامت میں "علی پور کا ایلی" کو مات کر دے گی۔ اشفاق احمد نے شہاب صاحب کی زندگی میں بوجوہ ان کے بارے میں کچھ لکھنے سے اجتناب کیا، تاہم زبان و کلام کی حد تک وہ

شہاب صاحب کی روحانیت کا چرچا کرتے رہے۔ شہاب صاحب کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک کتاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ کتاب "ذکرِ شہاب" کے نام سے گزشتہ مہینے شائع ہوئی ہے۔ یہ شہاب صاحب کی شخصیت اور "شہاب نامہ" کے بارے میں مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس کے آخر میں شہاب صاحب کی کچھ متفرق تحریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ممتاز مفتی کا ہے اور آخری اشفاق احمد کا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مطالبِ کتاب کی حدود متعین ہیں اور ان حدود سے کوئی لکھنے والا تجاوز نہیں کر سکتا۔

اشفاق احمد، بقول شخصے، ڈراما نگار بھی ہیں اور ڈراما باز بھی۔ اس لیے ان سے کسی سنجیدہ علمی و ادبی کام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، تاہم شہاب صاحب سے انھیں جو قربت حاصل تھی، اس کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ وہ ایک ایسی کتاب مرتب کر دیں گے، جو شہاب صاحب کے بارے میں ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کرے گی۔ افسوس کہ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ رسمی و روایتی قسم کے مضامین کے اس مجموعے سے شہاب صاحب کے بارے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے اصل کام کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ ان کے ادبی کاموں کے بارے میں کوئی مضمون اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔ شہاب صاحب کچھ بھی ہوں، ان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ "یا خدا" جیسی لازوال تخلیق کے مصنف ہیں اور کئی ایسے افسانوں کے خالق ہیں، جو اردو ادب میں ناقابلِ فراموش اضافہ ہیں۔ شہاب صاحب کی ادبی حیثیت کی نفی کر کے اشفاق احمد نے اپنے "گرو" کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔

"شہاب نامہ" یقیناً ایک اہم کتاب ہے۔ نثر کے اعتبار سے یہ ایک اعلا درجے کی تصنیف ہے۔ لیکن جہاں تک مطالب کا تعلق ہے۔ اس کی حیثیت متنازع ہے۔ اس کتاب کے بعض بیانات نیم صداقت کا درجہ رکھتے ہیں، بعض آرایشِ بیان کے ذیل میں آتے ہیں اور بعض محض "بیانِ صفائی" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کتاب پر ایسے لوگوں سے لکھوایا جاتا، جو شہاب صاحب کے بیانات کو پرکھنے اور صداقت اور نیم صداقت کے درمیان امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر نئے مضامین لکھوانے ممکن نہیں تھے، تو کم از کم ان "تنقیدی" تبصروں ہی کو زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ جن سے تصویر کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔

شخصیت پر لکھنے والوں نے عقیدت کے بے پناہ پھول برسائے ہیں۔ شہاب صاحب کا چہرہ پھولوں سے اس طرح ڈھک گیا ہے کہ دیکھنے والے کو پھولوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ان پھولوں کی خوشبو مسحور کن سہی۔ لیکن آنکھیں اُس قدرت اللہ شہاب کو ڈھونڈتی ہیں۔ جو دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دنیا دار انسان بھی تھا اور دنیا کو برتنے کا ہنر جانتا تھا۔ اشفاق احمد نے اپنے مضمون میں شہاب صاحب کی یک رخی تصویر پیش کرنے پر ان لفظوں میں معذرت کی ہے۔

"شہاب صاحب کی جوانی کے قصے بہت ہی بھرپور اور بے حد رس بھرے، میں نے ان لوگوں سے سنے، جو انھیں ان کی جوانی کے وقت سے جانتے تھے۔ پھر ان کے سینیر افسروں، ساتھی افسروں اور ماتحت عملے سے وہ کچھ بھی معلوم ہوا، جو عام طور پر بڑے بیوروکریٹ افسروں کے بارے میں مشہور

ہوتا ہے۔

ان کے ہمعصر ادیبوں سے انسانی کمزوری کے ایسے واقعات بھی معلوم ہوئے، جن کا براہ راست تعلق شہاب صاحب کی ذات سے تھا۔ اپنے نفس کی تشفی کے لیے میں نے چند کہانیاں اور بھی حاصل کر کے رکھیں، لیکن ان سب کو جوڑ جاڑ کر بھی شہاب صاحب کی تصویر مکمل نہ ہوئی۔ سیدھی تصور تو کیا بنتی، ایک تجریدی تصویر بھی نہ بن سکی۔ شہاب صاحب کو کلی طور پر سمجھنے کے لیے ان کے ایک محرم راز قریبی دوست سے درخواست کی کہ وہ ان کے منفی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے کچھ لکھیے تاکہ ہمارے دلوں کا بوجھ لٹھے۔ لیکن انھوں نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ حضرت عمرؓ کی بائیوگرافی ان کے فاروق اعظم بننے سے پہلے کوئی معنی نہیں رکھتی۔" (ص ۴۹-۲۸۴)

سوال یہ نہیں کہ شہاب صاحب کی انسانی کمزوریاں تلاش کی جائیں اور منفی پہلو تلاش کیے جائیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اُس قدرت اللہ شہاب کو تلاش کیا جائے، جو عام انسانوں جیسا ایک انسان تھا اس سلسلے میں زیر نظر کتاب ہماری کوئی مدد نہیں کرتی اور اشفاق احمد کے مضمون سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا موضوع خود ان کی اپنی شخصیت ہے یا شہاب صاحب کی شخصیت۔ آدھے سے زیادہ مضمون میں اشفاق احمد نے اپنی مدح سرائی کی ہے اور اس قسم کی نادر معلومات فراہم کی ہیں۔"

"اپنی کسی چیز کے ساتھ شیئر کرنے یا اپنی چیز کسی کو دینے یا اپنے مال میں سے کچھ کسی کو عطا کرنے کے خیال سے مجھ پر خفقان کی اور اس کے بعد ہذیان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اپنی معمولی سے معمولی سی چیز بھی " رینی ڈے " کے لیے سنبھال کر رکھتا ہوں۔ گو ابھی تک کوئی رینی ڈے تو نہیں آیا (نہ ہی اب امید ہے) البتہ میرے پاس چیزوں کے خزانے جمع ہو چکے ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" (ص ۲۵۹)

ہمیں شہاب صاحب سے دلی ہمدردی ہے کہ ایسا مادیت پرستانہ رویہ رکھنے والے ان کے روحانی مدارج کی گواہی دے رہے ہیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ اشفاق احمد کو اپنے مال میں سے کسی کو کچھ ادا کرنے اور یہ مضمون لکھنے کا خیال ساتھ ساتھ آیا ہو۔ اپنے مال میں سے کسی کو کچھ عطا کرنے کے خیال کے بعد کی کیفیت اس مضمون میں بھی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ کے استعمال میں انھوں نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اوپر جو اقتباس درج کیا گیا ہے، اس میں شہاب صاحب کو حضرت عمرؓ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ کوئی معقول بات نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ وہ شہاب صاحب کے عجز و انکساری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔" وہ غیرت اور خودداری اور پاس ناموس سے قطعاً ناآشنا تھے۔" شہاب صاحب جیسی محترم شخصیت کے بارے میں ان الفاظ کا استعمال دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے ع

"ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"

اس کتاب میں بعض جگہ حواشی کی ضرورت تھی، لیکن جناب مرتب نے اس قسم کی کوئی زحمت نہیں اٹھائی۔ مثلاً جمیل اللہ شہاب نے لکھا ہے۔ " بابائے اردو سے ان کا لگاؤ بہت گہرا تھا ہفتے میں ایک آدھ بار ان کے یہاں حاضری دیتے اور انجمن ترقی اردو کے کام میں بہت فرحت محسوس کرتے۔" (ص ۹۳) بابائے اردو کے اپنی زندگی میں شہاب صاحب کو زیادہ سے چھ سات مرتبہ

ایک مرتبہ گلڈ کے افتتاحی جلسے میں اور چار مرتبہ شہاب صاحب کے دفتر میں۔ بابائے اردو اپنے آخری دنوں میں کراچی کے فوجی اسپتال میں زیرِ علاج تھے، تو وہاں بھی شہاب صاحب دو ایک مرتبہ تشریف لائے تھے۔ لیکن جہاں تک بابائے اردو کے ہاں حاضری دینے کا تعلق ہے، ہفتے میں ایک آدھ بار تو کیا، شہاب صاحب نے اپنی پوری زندگی میں بھی ایک آدھ بار اس قسم کی زحمت نہیں اٹھائی۔

اسی طرح ایم بی خالد نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ "ایک وقت آگیا جب شہاب نے محسوس کیا کہ خوشامدی لوگ صدرِ پاکستان (صدر ایوب) کے حلقہ تنگ سے تنگ کر رہے ہیں اور صدر صاحب کی بصارت ضعیف ہو کر ان کی بصیرت پر اثر انداز ہونے لگی ہے، تو انھوں نے نوکری سے آزادی کی درخواست گزار دی۔" (ص ۲۰۱) ایم بی خالد وہی صاحب ہیں، جن کی کتاب "ایوانِ صدر میں سولہ سال" خاصی مقبول ہوئی ہے۔ "شہاب نامہ" میں شامل مضمون انھوں نے پہلے لکھا تھا، مذکورہ کتاب بعد میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں شہاب صاحب کے استعفے کا جو متن شامل ہے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہاب صاحب خود بھی ان لوگوں میں شامل تھے، جو صدر ایوب کے گرد حلقہ تنگ سے تنگ کر رہے تھے۔ اس استعفے کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "جناب صدر نے ملک میں نئی زندگی کا احساس پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں الگ ہو کر اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرا مشن ہی جنابِ صدر کے افکار اور فلسفے کی تشریح ہوگا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے میں صرف عام قسم کا... فائل ورک کر سکتا ہوں۔ الگ ہو کر میں ان کے افکار کو پھیلانے اور عام کرنے کے لیے کتابیں لکھ سکوں گا، لیکچر دے سکوں گا۔"

ایسے اور بھی مقامات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جہاں مرتب کی طرف سے حواشی کی ضرورت تھی۔

اس کتاب میں شہاب صاحب کے کچھ خطوں کے عکس بھی شامل ہیں۔ بانو قدسیہ کے نام کے ایک خط میں شہاب صاحب فرماتے ہیں.... "مجھے نہ پیری پسند ہے نہ فقیری۔ میں تو محض ایک سیدھا سادا سا عیش پسند انسان ہوں۔ جب عیش میسر ہو تو اللہ کا احسان ہے۔ جب نہ ہو تو تب بھی اس کی دین ہے۔ پتا نہیں کس طرح۔ لیکن کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کر اب میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں، جہاں میرے لیے مدح و ذم یکساں ہیں۔ اس منزل میں میری واحد آزمائش مفتی جی ہیں۔ وہ چابک مار مار کر حکم دیتے ہیں کہ اپنی تعریف سنو اور خوش رہو۔ میں تعریفیں سنتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔" (ص ۱۲۴)

ترتیب
اوالکلام قاسمی

اداریہ

شہریار کا شمار اب صفِ اوّل کے ان شعرا میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے ادب کی وقتی تحریکات یا رجحانات کی افراط و تفریط سے بلند ہو کر، فنی پختہ کاری اور تخلیقی توانائی کے بل بوتے پر اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے۔ کتاب نما کا "گوشۂ شہریار" شہریار کی شاعرانہ قدر و قیمت کے صحیح تعین کی طرف ایک ایسا اقدام قرار دیا جاسکتا ہے جس کی مدد سے کسی شاعر کے بارے میں معروضی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ گوشہ شہریار کی شخصیت اور شاعری کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس گوشے میں شہریار کے تمام مجموعہ ہائے کلام اسم اعظم، ساتواں در، ہجر کے موسم، خواب کا در بند ہے اور قافلے یادوں کے، میں شامل نظموں اور غزلوں کا ایک جامع انتخاب بھی شامل ہوتا، مگر صفحات کی تحدید کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ تاہم مضامین کے علاوہ نمونے کے طور پر شہریار کی چند تازہ نظمیں اور غزلیں بھی شائع کی جارہی ہیں۔

خواب کا در بند ہے، شہریار کا وہ مجموعۂ کلام ہے جس پر ساہتیہ اکادمی کا انعام مل چکا ہے، یہ انعام صرف شہریار کے لیے ہی اعزاز کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے خود ساہتیہ اکادمی کی قدر شناسی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس انعام و اعزاز کی مناسبت سے 'خواب کا در بند ہے' پر ایک تبصراتی مضمون گوشہ شہریار میں شامل کیا گیا ہے۔

توقع ہے کہ یہ گوشہ شہریار شناسی میں معاون ثابت ہوگا۔

مہمان مدیر

ابوالکلام قاسمی

ڈاکٹر افتخار عالم خاں
جنرل ایجوکیشن سینٹر
اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

شہریار

شہریار صاحب کو بزعم خود میں اپنا عزیز ترین دوست سمجھتا ہوں۔ شہریار کے یہاں "جنریشن گیپ" نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میرے والد کو بھی شہریار سے دوستی کا اتنا ہی دعوا ہے جتنا مجھ کو۔ اور اب میرا بیٹا بھی عمر کی اس سیڑھی پر ہے جہاں سے ایک قدم آگے بڑھانے کے بعد شہریار صاحب کے دوستوں کی صف میں کھڑا نظر آئے گا۔

شہریار کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس نے انھیں ہر عمر کے لوگوں میں مقبول کر دیا ہے۔ شاید اسی لیے ہر دور میں نئی نسل کے شاعر کہلائے جاتے رہے ہیں اور آیندہ بھی انشاءاللہ نئی نسل ہی میں ان کا شمار ہوتا رہے گا۔

بقول شہریار : کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا سراب سب کا ہے
سبھی ہیں پیاس کے مارے سبھی برابر ہیں

مجھے اپنی ادبی صلاحیت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اپنے کو شہریار کی شاعری پر کوئی تبصرہ یا تنقید کرنے کے اہل نہیں سمجھتا۔ میں تو صرف یہ ہی کہہ سکتا ہوں کہ شہریار کے اشعار مجھے پسند ہیں۔ بقول انھیں کے : عذاب کوئی بھی تنہائیوں کا سہہ نہ سکا
ہر ایک شخص نے ایک انجمن بنالی ہے

شہریار ہماری انجمن ہیں۔ بہت ہی ذاتی انجمن اور آج میں صرف ان کی ذاتیات ہی کے بارے میں کچھ کہنے پر اکتفا کروں گا۔

شہریار بولتے بہت آہستہ ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اگر آن کے احباب کو خود اپنے اوپر شہریار تیماردار بہت اچھے ہیں۔ کوئی دوست یا عزیز بیمار ہو جائے تو تیمارداری کے فرائض بہت تندہی سے انجام دیتے ہیں ـــــ لیکن اگر خدا نخواستہ خود بیمار ہو جائیں تو تیمارداری کرنے والوں سے گھبراتے ہیں۔ نہرو جی کے بارے میں مشہور تھا کہ اپنی بیماری سے اس قدر خجل ہوتے تھے کہ چھٹی کی درخواست کے پہلے جملے میں لکھتے تھے کہ مجھے شرمندگی ہے کہ آج میں بیمار ہو گیا ہوں۔

شاید ایسا ہی حال کچھ شہریار صاحب کا بھی ہے۔ بیمار پڑ جائیں اور کوئی مزاج پرسی کو جائے تو شرمندہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک دو دن سے زیادہ بیمار رہتے ہیں نہ رہنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

شہریار جدید شعرا کی صف اوّل میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ جدید شاعروں نے کنکریٹ کے جنگل

بے سنگلاخ شہروں کی افراتفری اور ہما ہمی میں اپنے وجود کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی ۔ شہریار کی شاعری میں ان شہروں کی کسیلی فضا ملتی ہو یا نہ ملتی ہو لیکن آج بھی ان کے اشعار سے کھیت کی مٹی کی سوندھی خوشبو آتی ہے ۔ میں اپنے الفاظ میں شہریار کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں بس یہ ہی کہہ سکتا ہوں ۔

اُس کی شخصیت میں اپنایت ہے
اُس کی اپنایت میں ہے محبت کا خلوص،
اُس کے خلوص میں دہقان کا پیار
اُس کے پیار میں مٹی کی سوندھی خوشبو
نیم کا گھنا سایا
سرسوں کے کھیت کا رنگ

شکریہ ۔

اب میں ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس شام شہریار کے جلسہ کی آگے کی کارروائی شروع کریں ۔

شک ہونے لگتا ہے کہ شاید انھیں ہی سماعت کمزور ہے ۔

شعر اچھے کہتے ہیں ۔ لیکن اچھے شعر کہنے میں اتنے اچھے انداز سے شعر پڑھتے نہیں ہیں ۔ مگر اس کو کیا کیا جائے ـــــــ کہ ان کے اکثر معتقدین ان کے اسی شعر پڑھنے کے انداز کے شیدائی ہیں ۔

کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر ہیں ۔

دوستوں کی محفل ہو ۔ اور یہ خوش ہوں تو "بے تکلفی" سے بھی کبھی کبھی بات کر لیتے ہیں لیکن غصہ میں ہمیشہ "آپ جناب" سے ہی بات کرتے ہیں ۔ بلکہ جتنے زیادہ برہم ہوں گے اتنی ہی شستہ زبان کا استعمال کریں گے ۔

فلمیں لکھتے ہیں ۔ لیکن فلمی شاعری کے تذکرے تک سے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے ۔ ان کے شاعر ہونے سے ایک نقصان ضرور ہوا ہے ۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی ہوتے ۔ ویسے "چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا" ہاکی کا کیسا بھی میچ ہو ۔ شہریار آج بھی شائقین کے درمیان کسی کونے میں بیٹھے ضرور بلائیں گے ۔

کنور اخلاق محمد خاں شہریار جیسے صنفیں نام کے ساتھ یعنی راجپوت ہوتے ہوئے اتنے خوبصورت شعر کہہ لیتے ہیں معجزہ معلوم ہوتا ہے ۔

لیکن یہ نام کے ہی نہیں بلکہ بہت سی عادتوں میں بھی راجپوتی شان کے حامل ہیں ۔ جو بات پسند نہیں آتی اُس کی مخالفت بانگ دہل کرتے ہیں ۔

غیبت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں ۔

بقول شہریار : عمر بھر سچ ہی کہا سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

ٹیڑھی بات کی برداشت کم ہے لیکن کوئی میٹھی زبان سے بولے تو شاید اپنا دیوان تک اس کے نام سے چھپوا دیں ۔

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

مہتاب حیدر نقوی

دستک، درِ خواب پر
(شہریار کے لیے)

دن ڈھلا شام ہوئی دل کو ڈبونے والی
ایک دروازہ کھلا
دوست سبھی جمع ہوئے چھوٹے بڑے
ایک خاموش سا چہرہ ہے کہ لگتا ہے اُداسی کی ہجو
ہم سبھی اس کی طرف دیکھتے ہیں
اس کی آنکھیں ہیں کہ خوابوں کا جزیرہ کوئی
اُن سے گر بات کرو
وہ بہت بولتی ہیں
ہم تو حیران سے رہ جاتے ہیں!

دوست پھر جمع ہیں اور رات کی تاریکی ہے
وہی کمرہ ہے، وہی دوست ہیں، محفل ہے وہی
ہم سبھی شعر سناتے ہیں
وہ کہتا ہے میاں ــــ دیکھو!
کچھ خواب بُنو ــــ عشق کرو

تھوڑے نادان بنو اور پھر شعر کہو
اور یہ کہ کے ہر اک دوست کے ماتھے پہ کئی چاند بنا دیتا ہے
اور ہم سوچتے ہیں
اپنے خوابوں کی حقیقت کیا ہے؟
خواب کے دَر تو سبھی بند ہوئے۔
عشق کرنا کوئی آسان نہیں
شعر پھر کیسے کہیں!
اور مغموم سے، ہو جاتے ہیں
اور پھر رات گئے
اپنے گھر لوٹ کے آجاتے ہیں اس فخر کے ساتھ
شہریاروں سے ہمیں نسبت ہے۔

شہریار

زندہ رہنے کا یہ احساس

ریت مٹھی میں کبھی ٹھہری ہے
پیاس سے اس کو علاقہ کیا ہے
عمر کا کتنا بڑا حصّہ گنوا بیٹھا میں
جانتے بوجھتے کردار ڈرامے کا سا
اور اس رول کو، سب کہتے ہیں
ہوشیاری سے نبھایا میں نے
ہنسنے کے جتنے مقام آتے ہنسا
بس مجھے رونے کی ساعت پہ خجل ہونا پڑا
جانے کیوں رونے کے ہر لمحے کو
ٹال دیتا ہوں کسی اگلی گھڑی پر
دل میں، خوف و نفرت کو سجا لیتا ہوں
مجھ کو یہ دُنیا بھلی لگتی ہے
بھیڑ میں اجنبی لگنے میں مزہ آتا ہے
آشنا چہروں کے بدلے ہوئے تیور مجھ کو
حال سے ماضی میں لے جاتے ہیں
کہنیاں زخمی ہیں اور گھٹنوں پر
کچھ خراشوں کے نشاں
سوندھی مٹی کی مہک کھینچے لیے جاتی ہے
تتلیاں، پھول، ہوا، چاندنی، کنکر پتھر
سب مرے ساتھ میں ہیں

سانس بے خوفی سے لیتا ہوں
لبوں پر میرے
اک تواتر سے کئی نام مچل اٹھتے ہیں
ایک نام ان میں ہر اک نام سے پہلے پھر بعد
زندہ پیکر میں بدل جاتا ہے
میں اُسے چھونے کو جب بڑھتا ہوں
کوئی دیوار مرے بیچ میں آجاتی ہے
میں ٹھہر جاتا ہوں
سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں
زندہ ہونے کا یہ احساس بہت کچھ ہے مگر
زندگی یہ تو نہیں
وہ کہاں ہے
مرے اطراف اس کے کوئی آثار نہیں
زندہ رہنے کی ریاکاری میں مشاق رہوں
دن ہو یا رات
کس ہنر کتنے سلیقے سے ادا کرتا ہوں یہ رول
تماشائی سب
خضر کی عمر ملے مجھ کو، دعا دیتے ہیں
مستحق جس کا نہیں میں
وہ صلہ دیتے ہیں

شہریار

کیوں خود کو بچا لایا

بناتے تھے ہوس گھیرے
دریچوں میں سجے چہرے
گلی کی آخری حد تک
میں اپنی آنکھ میں نقشا
کسی اجڑے ہوئے گھر کا
لیے واپس چلا آیا
یہ پچھتاوا اُسی کا ہے
کہ کیوں خود کو بچا لایا

کھیل کا نتیجہ

کیوں ملول ہے اتنا
ہار جیت میں تم کو
فرق کیوں نظر آیا
کھیل کا نتیجہ تو
کھیلنے کی لذت ہے
جو تمہارے حصے میں
اور لوگوں کی نسبت
کچھ زیادہ آتی ہے
پھر ملال کیا ہے!

مری آنکھ خوف تہی رہی

چلی رات بادِ ہوس عجب
جو چراغ تیرے خیال کے
بڑی خامشی سے بجھا گئی
کوئی گونج شہر فلک میں تھی
تری شکل پلک میں تھی
نئے حادثات کی منتظر
مری آنکھ
خوف تہی رہی

شہریار

ہم اہل دل کی شہر میں رسوائی تو نہ ہو
اِک بیوفا کی اتنی پذیرائی تو نہ ہو

افراد قصہ جیسے ہیں ویسے دکھائی دیں
زائل تماشا گاہ میں بینائی تو نہ ہو

ہر اک ادا پسند ہے معشوق کی ہمیں
ظالم ہو، بد دماغ ہو ہرجائی تو نہ ہو

موجود ہوں رقیب یہ برداشت ہے ہمیں
بزم خیال ناز میں تنہائی تو نہ ہو

ہم خواب دیکھتے ہیں مخالف نہیں ترے
اے رات یوں حریفِ شکیبائی تو نہ ہو
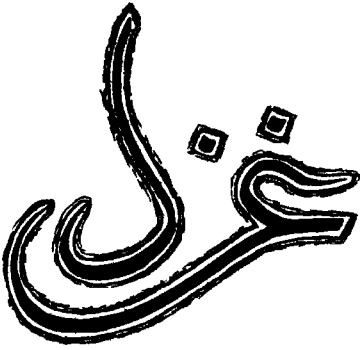
میں نے جس کو کبھی بھلایا نہیں
یاد آنے پہ یاد آتا نہیں

دل میں تا عمر تو خوشی سے رہ
اس مکاں کا کوئی کرایہ نہیں

عکس مہتاب سے مشابہ ہے
تیرا چہرہ تجھے بتایا نہیں

تیرا اُجلا بدن نہ میلا ہو
ہاتھ تجھ کو کبھی ملایا نہیں

زد میں سرگوشیوں کی پھر تو ہے
یہ نہ کہنا مجھے جگایا نہیں

باخبر میں ہوں تو بھی جانتا ہے
دُور تک اب سفر میں سایا نہیں

شہریار

گمس کو قید کہ پرچھائیں کو زنجیر کریں
ساعت ہجر تجھے کیسے جہاں گیر کریں

پانو کے نیچے کوئی شے ہے زمیں کی صورت
چند دن اور اسی وہم کی تشہیر کریں

شہر اُمید حقیقت میں نہیں بن سکتا
تو چلو اس کو تصوّر ہی میں تعمیر کریں

اب تجھے لے دے کے یہی کام ہے ان آنکھوں کا
جن کو دیکھا نہیں ان خوابوں کی تعبیر کریں

ہم میں جرأت کی کمی کل کی طرح آج بھی ہے
تشنگی کس کے لبوں پر تجھے تحریر کریں

عمر کا باقی سفر کرنا ہے اس شرط کے ساتھ
دھوپ دیکھیں تو اسے سایے سے تعبیر کریں

باعثِ وحشت جنوں کہتے ہیں سب کچھ اور ہے
وجہ سکوں تو یہی غم کا سبب کچھ اور ہے

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کر لیا
ورنہ ہمارے دور میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے

پلکوں پہ روکتے رہو، کاری ہیں وار خواب کے
کافی تو ڈھل چکی ہے یہ تھوڑی سی شب کچھ اور ہے

پانی کی ایک بوند سے پیاس کی ابتدا کرو
چشمے پہ جب رسائی ہو کہنا طلب کچھ اور ہے

دید سے لمس تک ہمیں کیا کیا نہ تجربے ہوئے
دیکھنے میں اور کچھ تھا وہ چھونے پہ اب کچھ اور ہے

خورشید احمد

اُستاذ، شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

شہریار کی نظم "اُڑان" ایک تجزیہ

تری گرم سانسوں کی سرگم سے بدمست ہونے لگیں
شاخِ تنہائی کی نرم بھیگی ہوئی پتّیاں
ہر گذرگاہ پر لڑکھڑانے لگیں
سرمئی سبز پرچھائیاں
آسماں پر اُفق تا اُفق لہلہانے لگیں
خواب کی کھیتیاں
موج در موج سرگوشیوں کی صبا
سُرخ ہونٹوں کو بوسوں سے سرشار کرنے لگی
اِک نیا جُرم کرنے پہ اصرار کرنے لگی
جھاڑیوں میں ہوا سرسرانے لگی
جسم پگھلی ہوئی آگ میں غسل کرنے لگے

اس نظم میں ایک مرد اور ایک عورت فطرت کی کُھلی فضا میں کہیں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔ مرد کی خصوصیت یہ ہے کہ تنہائی اس کا مقسوم ہے اور عورت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حسین ہے۔ ان دونوں خصوصیات کا علم ہمیں صرف دو لفظوں کے حوالے سے ہوتا ہے: "تنہائی" اور "سرخ ہونٹ"۔ اس کے علاوہ گذرگاہ، آسمان اور جھاڑیوں کے ذکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جائے ملاقات ہوٹل کا کوئی کمرہ یا حجلۂ عروسی نہیں بلکہ دامنِ فطرت ہے۔ ان تفصیلات سے جو منظر نامہ مرتب ہوتا ہے، وہ رومانی عشقیہ شاعری کا معروف منظر نامہ ہے۔

نظم کے ابتدائی دو مصرعوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ متکلم ایک نسوانی جسم کی قربت سے مدہوش ہے۔ یہاں دوسرا مصرع قابلِ توجہ ہے۔ اگر شاعر صرف "شاخِ تنہائی کی پتّیاں" کہتا، تو قاری کو یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ ابھی اور کچھ بیان ہونے سے رہ گیا۔ مگر جب وہ "شاخِ تنہائی کی نرم بھیگی ہوئی پتّیاں" کہتا ہے، تو تنہائی کے ساتھ دوسرے تاثرات بھی وابستہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے "بھیگی ہوئی" کو لیجیے۔

میر کے لیے تو پسینے میں بھیگی ہوئی چولی لطف اندوزی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی چیز کا بھیگا ہوا ہونا اس کی افسردگی، اور اضمحلال کو ظاہر کرتا ہے۔

چنانچہ "بھیگی ہوئی پتیاں" تنہائی سے پیدا ہونے والے اضمحلال کا تاثر قائم کرتی ہیں اور یہ درست ہے کہ جب پتیاں بھیگ جائیں تو نرم بھی ہو جاتی ہیں مگر یہاں "نرم" کی صفت برائے بیت نہیں بلکہ اس سے بھی کام لیا گیا ہے۔ چونکہ "نرمی" کے ساتھ ناگواری کا نہیں، پسندیدگی کا تصور وابستہ ہے، اس لیے اب "نرم بھیگی ہوئی پتیاں" سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ تنہائی کا زائیدہ اضمحلال ایسا ہے جو لذت انگیز بھی ہے۔ اس سے رومانی تنہائی کی ایک سنگین صورت حال سامنے آتی ہے۔ بہر کیف، اس صورت حال میں ایک نسوانی پیکر کی موجودگی —— پر تپاک موجودگی —— ذہنی اور جذباتی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ اور یہ ذہنی تبدیلی متکلم کو جنسی فینٹسی کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ گذرگاہوں پر نظر ڈالتا ہے تو اسے لڑکھڑاتی ہوئی سرمئی سبز پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پھر اس کی نگاہ زمین کی پگڈنڈیوں سے آسمان کی طرف اٹھتی ہے (زمین کے ذکر کے بعد آسمان کے ذکر میں تقابل کا حسن موجود ہے) تو اسے خواب کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں نظر آتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سرمئی اور سبز کیوں؟ فیض نے کہا ہے: "سرمئی رنگ کہ ہے ساعت بیزار کا رنگ"۔ مگر سرمئی رنگ بیزاری، اداسی اور اکتاہٹ کے علاوہ اپنے انسلاکات کے باعث مردانہ رنگ بھی ہے۔ اسی طرح سبز رنگ تازگی، نابختگی، زرخیزی، صحت اور جوانی کے علاوہ نسوانی رنگ بھی ہے۔ اس لحاظ سے سرمئی سبز پرچھائیوں کی جنسی نوعیت قائم ہو جاتی ہے۔ مزید برآں اس بات کا قوی امکان ہے کہ لڑکھڑاتے ہوئے رنگ برنگ سایوں کا ماخذ پردۂ سیمیں پر نظر آنے والا محو رقص جوان جوڑوں کا عکس ہو۔ اس صورت میں اس پیکر کی جنسی اپیل کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ اب "خواب کی کھیتیاں" پر غور کیجیے۔ تخم ریزی اور زرخیزی کے سبب کھیتی کو جنسی عمل سے متعلق کرنے کا استوری حوالہ قدیم سے موجود ہے یہی اسطوری حوالہ قرآن میں بھی موجود ہے جہاں عورت کو مرد کی کھیتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے خواب کی لہلہاتی کھیتیاں موجودہ نظم کے تناظر میں جنسی آرزوؤں کی تکمیل کا اشاریہ بن جاتی ہیں۔

بہر حال فینٹسی کی فضا تا دیر قائم نہیں رہتی۔ کیوں کہ بوسوں کے مقابلے میں سرگوشیاں زیادہ اشتعال انگیز ثابت ہوتی ہیں۔ اس شدید تر جذباتی ہلچل سے فینٹسی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور متکلم طبعی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب آمادۂ وصال ہے (سرخ ہونٹوں کا بوسوں سے سرشار ہونا اس نسوانی پیکر کی سپردگی اور حوالگی کو ظاہر کرتا ہے)۔ عین اس وقت اس کے ذہن میں ایک خیال سر ابھارتا ہے —— جرم کا خیال۔ یہ خیال اس کی خلوت میں اس کے سماجی شعور کی مداخلت ہے۔ مگر جنسی جبلت سماجی پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔ چنانچہ جسمانی اتصال کی آرزومندیوں کی آخری علامات ظاہر ہوتی ہیں، جنھیں شاعر نہایت خوبصورتی سے ایک خارجی منظر کے ذریعے یوں بیان کرتا ہے: "جھاڑیوں میں ہوا سرسرانے لگی"۔ —— سرسراہٹ کا احساس پُراسرار طور پر جنسی احساسات سے متعلق ہے۔ شہریار سے پہلے میراجی نے سرسراہٹ کی جنسی کشش کو ہر رنگ میں محسوس کیا ہے۔ مثلاً "پیرہن کی سرسراہٹ آرزو انگیز ہے"، یا "لچکتی ہوئی ٹہنیوں کی

گھنی پتیوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے / ہوا کس لیے سرسرانے لگی ہے" وغیرہ۔

آخری مصرع جسمانی اتصال کا منظر پیش کرتا ہے: "جسم پگھلی ہوئی آگ میں غسل کرنے لگے" یہ مصرع کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ GASTON BACHELORD نے دُنیا کے عظیم شاعروں کا مطالعہ کرکے بتایا ہے کہ سرشاری کی شدید ترین کیفیت کے اظہار کا بہترین ذریعہ آب و آتش کا غیر منفک ادغام ہے۔ محبت کو آگ سے تعبیر کرنا تو اُردو فارسی شاعری میں عام ہے ہی۔ فارسی اردو شاعری میں آتشِ سیّال یا آتشِ محلول کی ترکیب بھی دیکھنے میں آتی ہے، جس کے بارے میں اہلِ لغت کا خیال ہے کہ یہ شراب کا استعارہ ہے۔ "پگھلی ہوئی آگ" میں آتش اور آب دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے ہیں، کیونکہ سیّال ہونا پانی کی خاص صفت ہے، جس کا انطباق آگ پر کیا گیا ہے۔ یوں اس قدیم استعارے کو شہریار نے بالکل نئے سیاق وسباق میں وصل کی انتہائے سرشاری کے لیے استعمال کیا ہے۔

آخری مصرعے پر ایک اور لحاظ سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مصرعے کی امیجری باقی مصرعوں کی امیجری سے مختلف ہے۔ پچھلے تمام پیکروں میں کسی نہ کسی سطح پر جنسی حوالے موجود ہیں۔ لیکن آگ میں غسل کرنے کا پیکر مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ مخدوم محی الدین کی طرح شاعر یہ نہیں کہتا کہ "دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے"، بلکہ آگ میں غسل کرنے کی بات کرتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آگ کا استعمال روحانی پاکیزگی اور تطہیر کے لیے مذہبی رسوم میں داخل ہے۔ اس طرح یہ نظم اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر جنس کی جسمانیت ہی کی نہیں، جنس کی روحانیت کی بھی نظم بن جاتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ شاعر نے اس نظم کا عنوان "اڑان" کیوں رکھا۔

اس تجزیے کی روشنی میں دو باتیں بہت صاف ہیں۔ پہلی یہ کہ اس نظم میں وحدت موجود ہے، مگر وہ وحدت منطقی نہیں، نفسیاتی ہے۔ دوسری یہ کہ اس نظم کے الفاظ ـــــ کلیدی الفاظ ـــ اپنے لغوی معنوں میں نہیں، بلکہ انسلاکاتی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور وہ انسلاکات اتنے دور کے ہیں کہ پُراسرار بھی معلوم ہوتے ہیں اور پُرکشش بھی۔

اس نظم کے لُطف و اثر کے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ مثلاً اس کا صوتی آہنگ۔ اس آہنگ کی تشکیل میں تین طرح کے صوتی پیٹرن نمایاں ہیں۔ ایک پیٹرن سر حرفی صنعت سے مرتب ہوا ہے: سانسوں کی سرگم، سُرمئی سبز، سرگوشیوں کی صبا، سُرخ اور سرشار۔ دوسرا صوتی پیٹرن ہے: لڑکھڑانا، لہلہانا، سرسرانا۔ تیسرا ہے: پتّیاں، پرچھائیاں، کھیتیاں۔ لطف کا دوسرا سبب اس کی امیجری بھی ہے۔ عام طور پر نظموں میں جامد بصری پیکر زیادہ ہوتے ہیں اور لمسی و حرکی پیکر کم سے کم۔ لیکن اس نظم میں لمسی اور حرکی پیکر ہی سب سے زیادہ ہیں جو اس نظم کے موضوع سے مطابقت رکھتے ہیں کیوں کہ جنسی جذبات کی بنیاد زیادہ تر لمس ہی پر قائم ہوتی ہے۔ صرف شروع کے دو مصرعے دیکھیے:

تری گرم سانسوں کی سرگم سے بدمست ہونے لگیں :: شاخِ تنہائی کی نرم بھیگی ہوئی پتّیاں

یہاں چار صفات میں سے تین صفتیں "گرم" "نرم" اور "بھیگی ہوئی" ہماری قوّتِ لامسہ کو مہمیز کرتی ہیں اور ان مصرعوں کا خاص لطف اسی لمسیت میں ہے۔

"اڑان" شہریار کی بہترین نظموں میں سے ایک تو ہے ہی، اس کا شمار اردو کی خوبصورت ترین عشقیہ نظموں میں بھی ہوگا۔ ••

شافع قدوائی
شعبۂ صحافت۔ کینیڈی ہاؤس
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (علی گڑھ)

"رات سے خواب تک"

زندگی کے مختلف النوع احساسات، تجربی صداقتوں اور حسّی تجربوں کو ایک مرکزی یا تنظیمی استعارے کے حوالے سے مربوط اکائی کی شکل میں پیش کرنا اور چند الفاظ کو اپنی شعری کائنات کا مستقل جزو بنانا نیز اس لفظیاتی نظام کے توسط سے انفرادی تجربے کی تنظیم یہ عمل میں لانا شہریار کے شعری طریقہ کا نمایاں وصف ہے۔ ان کا پورا شعری منظر نامہ اسی مرکزی نقطے سے متور بھی ہوتا ہے اور متشکل بھی۔ شہریار کا یہ مرکزی استعارہ "خواب" ہے جس کا تفاعل مروجہ انداز سے یکسر مختلف ہے۔ مذکورہ مرکزی استعارے "خواب" سے نہ تو اقدار یا آدرش کی نمایندگی ہوتی اور نہ اس سے متعلق عام تصور تمنّا یا آرزو کی۔ اسی طرح اسے رومانی پناہ گاہ یا فن کار کی تخیلاتی دُنیا کا علامیہ قرار دینا بھی زیادہ مناسب نہیں ہے اگرچہ بعض مقامات پر خواب حقیقت اور التباس کے مابین تعلق کا استعارہ بن جاتا ہے مگر شاعر نے اصلاً "خواب" اور اس کے تلازمات نیند، آنکھ اور رات کی وساطت سے ایک مخصوص مفہوم یعنی بظاہر تخلیقی امکانات کی فراوانی کے باوجود تخلیقی قوتوں کے زوال، اجتماعی بے ثمری، لاحاصلی اور بانجھ پن کے احساسات کی ترسیل کی ہے۔ شہریار نے اپنے تجربے کے بیان TELLING کے علاوہ اسے دکھانے SHOWING کا خاص التزام رکھا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں بصری پیکروں کی بہتات نظر آتی ہے نیز اسے ایک خارجی ہیئت میں بیان کرنے کی غرض سے "خواب" کا استعارہ استعمال کیا جسے علامتی استعارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مزید برآں بیشتر مقامات پر یہ فنی التزام بھی رکھا ہے کہ اگر اس سے مماثل احساسات، ایقانات اور ارتعاشات منصۂ شہود پر لاتے ہیں تو مذکورہ استعارے سے متعلق الفاظ مثلاً سکوتِ شب، پرچھائیاں، دھند اور بیداری وغیرہ ضرور استعمال کیے ہیں تاکہ نہ تو کلام میں کسی نوع کے عدم ارتباط کا احساس ہو اور قاری کے ذہن سے اس مخصوص تاثر کا نقش محو ہوسکے۔

شہریار کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں اوّلاً رات اور اس کے تلازمات اور ثانیاً خواب کا ذکر ہے۔ اکثر صورتوں میں خواب تخلیقی قوت کا علامیہ بن کر سامنے آتا ہے جب کہ رات بدیہی طور پر تخلیقی امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔ ایک حدیث ہے کہ خالق کائنات نے تاریکی میں اپنی مخلوق پیدا کی اور پھر اُن پر اپنے نور میں سے کچھ ڈالا۔ اس حدیث کی روشنی میں حضرت مجدد الفِ ثانی کائنات کا تخلیقی مادّہ دراصل

عدمی اور ظلمتی حصے کو قرار دیتے تھے۔ تاریکی عدم بھی ہے اور وجود کا نقطۂ آغاز بھی۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے شہریار کے تازہ ترین مجموعہ کلام "خواب کا در بند ہے" میں شامل اوّلین نظم "خواب کا در بند ہے" پر غور کرنا ضروری ہے جو اس مجموعے میں سرنامے کے بطور درج ہے ؎

میرے لیے رات نے
آج فراہم کیا
ایک نیا مرحلہ

نیندوں سے خالی کیا
اشکوں سے پھر بھر دیا
کاسہ مری آنکھ کا

اور کہا کان میں
"میں نے ہر اک جرم سے
تم کو بری کر دیا
میں نے سدا کے لیے
تم کو رہا کر دیا

جاؤ، جدھر چاہو تم
جاگو کہ سو جاؤ تم
خواب کا در بند ہے"

نظم کے ابتدائی مصرعوں میں اوّلارات اور کاسۂ چشم کو نیند سے خالی کرنے اور پھر اسے آنسوؤں سے بھرنے سے واضح طور پر تخلیقی امکانات کی نشان دہی ہوتی ہے۔ پانی اور تخلیقی قوت کا تعلق بہت صاف ہے اور رات (تاریکی) کا بیان اس پر دال ہے۔ شہریار نے پانی کے مختلف مظاہر مثلاً دریا ندی اور آنسو وغیرہ کو تخلیقی قوت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ نظم کے آخری مصرعے جو شاعر کی باطنی زندگی کے انکشاف کی حیثیت رکھتے ہیں، خود کلامی کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخری تین مصرعوں "جاؤ جدھر چاہو تم"، جاگو کہ سو جاؤ تم" اور "خواب کا در بند ہے" کے حوالے سے اجتماعی لاحاصلی اور بے ثمری کے احساسات نظم کیے گئے ہیں۔ چونکہ موجودہ زر پرست معاشرہ اپنی اصل کے اعتبار سے نمو سے عاری ہو چکا ہے لہٰذا ہر قسم کا معاشرتی عمل لایعنیت کا شکار ہے جو تخلیقی امکانات کے معدوم ہو جانے کا اشاریہ بھی ہے۔ نظم کا آٹھواں اور نواں مصرع "میں نے ہر اک جرم سے" "تم کو بری کر دیا" شاعر کی IRONICAL بصیرت کا آئینہ دار ہے کیوں کہ ایک بے نمو معاشرہ میں سونا اور جاگنا دراصل ایک لایعنی عمل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور خواب (تخلیقی قوتوں کا اثبات) دیکھنا فی نفسہٖ جرم کے مترادف ہو جاتا ہے ؎

تمام خلقِ خُدا دیکھ کے یہ حیراں ہے
کہ سارا شہر مرے خوابوں سے پریشاں ہے

منحرف خوابوں سے ہوئے جب لوگ
سوئیں یا جاگیں سب برابر ہے

شہریار نے اپنی ایک مختصر نظم میں زبردست خواہش یا تمنا کے باوجود خوابوں سے دوری کی توثیق کی ہے ؎

مائل بہ کرم ہے راتیں
آنکھوں سے کہو اب مانگیں
خوابوں کے سوا جو چاہیں

شاعر کے نزدیک خواب تخلیقی قوتوں کا علامیہ ہونے کے علاوہ یادوں کا منبع اور مخرج بھی ہے۔ خواب میں شامل حقیقت کے خلقی عنصر کی یاد اپنی تمام ترکات اور اثر انگیزی کے ساتھ شاعر کے حافظہ میں موجود ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ان خوابوں کا تعلق جوہر ESSENCE سے ہے جو نفس کو وجود کے فوق الصوری مراتب سے منسلک کرتے ہیں اور مختلف درجوں میں کائناتی حقائق کا اظہار کرتے ہیں۔ عالم ناسوت میں ہر شئے تعینات کی اسیر ہے شاعر خوابوں کے حوالے سے سبلائم کے احساس کو اجاگر کرتا ہے جو اصلاً فن کار کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ شاعر اشیا کے ادراک کے لیے جذبے اور وجدان کا سہارا لیتا ہے اور یہ باور کراتا ہے کہ عالم بیداری میں شعور تمام ذہنی افعال کو محیط نہیں ہوتا نیز شعور انسانی زندگی کے اساسی محتویات سے قاصر ہے۔ ژنگ کے اس نقطۂ نظر کا بھی اثبات ہوتا ہے کہ ایک خواب دیکھنے والا حالت بیداری کی بہ نسبت اپنے خوابوں میں زیادہ ذہین ثابت ہوتا ہے کیوں کہ جدید زندگی عمل کے جو سانچے لوگوں پر مسلط کرتی ہے وہ خاص طور پر غیر عقلی ہیں۔ شہریار کی نظموں میں واقعاتی حوالوں کی کمی نظر آتی ہے اور بیشتر نظموں کی زبان استدلالی یا منطقی ہونے کے بجائے تمثالی ہوتی ہے ؎

وہ اندھیری رات کی چاپ تھی
جو گذر گئی
کبھی کھڑکیوں پہ نہ جھک سکی
کسی راستے میں نہ رک سکی
اسے جانے کس کی تلاش تھی
مری آنکھ اوس سے تر رہی
مجھے خواب بُننے کی لت رہی
کبھی ایک سونی سی رہگذر پہ کھڑا تھا میں
کبھی دور ریل کی پٹریوں پہ پڑا تھا میں
وہ کسی جسم کی چاپ تھی
جو گذر گئی

مرے دل کے دشت کی ریت ہی میں گھلی تھی وہ
مجھے اک گلی میں ملی تھی وہ
اسے مجھ سے شوق وصال تھا
مرے خواب مجھ سے خفا ہوئے
مجھے نیند آئی میں سو گیا
یہی رت جگوں کا زوال تھا

(رت جگوں کا زوال)

اپنے عہد کی عمومی معاشرتی صورت حال پر بھی شہریار نے بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں "بے بسی کا اعتراف" "چوکور زمین گول ہوئی" "نفی سے اثبات تک" "رہائی کے بعد" اور "ایک اور التجا" وغیرہ نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ آخرالذکر نظم میں واقعاتی بیان کو استعارہ سے باہم آمیز کیا گیا ہے اور پیرایۂ بیان تمثیلی ہے ؂

اے ہوا
طائروں کی توتلی آواز کو
اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہی ہے تو کہاں
دیکھ
چٹانیں زمیں کے گوشے گوشے سے ابھرتی ہیں
اور کالے پتھروں کے جسم سے
ہونٹ، آنکھیں، ہاتھ پیدا ہو رہے ہیں"

(ایک اور التجا)

اس نظم کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی کا خیال ہے کہ شہریار کے یہاں واقعی صورت حال کے اظہار کے لیے اعضائے جسم کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نظم شاعر کے اس خوف کا اظہار کرتی ہے کہ جو اسے ایک لاتعلق اور معاندانہ جذبات سے بھرپور معاشرہ میں محسوس ہوتا ہے۔

ایک دوسری نظم "آبشاروں کی صدا" میں الفاظ کا دروبست، مصرعوں کی نشست اور متحرک آہنگ کے حوالے سے حقیقت اور واہمہ کی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی طرح شہریار نے صحرا، ریت، پتھر، دھند، سایے، افق اور پرچھائیں کے توسط سے بے چارگی، موت، تنہائی، لامعنویت اور بانجھ پن کے احساس کو اجاگر کیا ہے ان الفاظ کے لغوی معنوں کے بجائے ان کی رمزیت پر EMPHASIS ہے جس سے مفہوم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔

تخلیقی فن کار کبھی مروجہ معاشرتی اقدار یا رسوم کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور اکثر صورتوں میں یہ صورت حال اس کے لیے انتہائی روح فرسا اور کرب ناک ہوتی ہے چنانچہ ناسازگار معاشرتی صورت حال طنز کی راہ ہموار کرتی ہے اور شاعر معاشرہ کے اندرونی تضادات کو طنز کی وساطت سے نمایاں کرتا ہے۔ شہریار نے بھی مروجہ معاشرتی رسوم کو قبول نہیں کیا اور اس ناسازگار ماحول کو کسی حد تک قابل قبول بنانے کی

خاطر IRONY میں مضمر امکانات سے کام لیا ہے۔ اس طنزیہ پیرایۂ بیان میں کرب ناک المیے کے آثار نظر آتے ہیں ؂

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا
ہو مبارک آرزوے خار و خس پوری ہوئی

رگوں میں سب کی اب تک برف کی تہ جم چکی ہوگی
خدا کا شکر ہے ہم میں کوئی بھی رسوا نہ ہوگا

جان بوجھ کر سوچ سمجھ کر میں نے بھلا دیا
ہر وہ قصہ جو دل کو بہلانے والا تھا

ان معروضات سے قطع نظر شہریار کا مرکزی مسئلہ تخلیقی قوتوں کے زوال کو جو دراصل موت کی ایک شکل ہے، اُجاگر کرنا ہے اور اس مرکزی موضوع کی تعبیر و تشریح کے لیے انھوں نے خواب اور اس سے متعلق تلازمات کی مدد سے استعاراتی نظام خلق کیا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہریار کے شعری سفر کا نقطۂ آغاز رات اور نقطۂ عروج "خواب" ہے اور ان کی پوری شاعری ایک دائرے کی شکل میں حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ رات سے خواب تک کا سفر خوش آیند بھی ہے اور شاعر کی تخلیقی اپج کا مظہر بھی۔

ابوالکلام قاسمی
ہیڈ شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (علی گڑھ)

خواب کا در بند ہے

شہریار کے شعری سفر کی حکایت بیس سال سے زیادہ کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسمِ اعظم (۱۹۶۵ء) شہریار کے شعری اظہار کا پہلا مرحلہ تھا۔ اسمِ اعظم کی اشاعت نے جہاں اردو کی جدید شاعری میں ایک نئے ذائقے اور لہجے کا اضافہ کیا تھا وہیں شاعر کے تجربے کی تخلیقی صداقت کا ایسا یقین بھی دلایا تھا جو شاعر کے مستقبل سے بہت سی توقعات وابستہ کر لینے کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے۔ ساتواں در، اور ہجر کے موسم، ان توقعات کو حق بجانب قرار دینے اور شاعر کی تخلیقی توانائی اور تازہ کاری کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں توجہ طلب وسائل بن کر منظرِ عام پر آئے۔ 'خواب کا در بند ہے، شہریار کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے، جس کا ظاہری حسن بجائے خود معنوی خوبیوں کا متقاضی معلوم ہوتا ہے۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ظاہر و باطن کی ہم آہنگی کی اُمید کو یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ شہریار کی شاعری کے چار مجموعے بتلاتے ہیں کہ ان کا شعری سفر صرف ایک خطِ مستقیم پر نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں ارتقاء کی افقی اور عمودی، دونوں جہات ہمیں صاف دکھائی دیتی ہیں، عمودی اس لیے کہ وقت کے ساتھ شاعر نے اپنے تجربے اور شعری لہجے کو مزید تیکھا بنانے کی کوشش کی ہے اور افقی اس لیے کہ اپنے آپ کو نئے سرے سے تخلیق کرنے اور اپنی تازہ کاری کی کوئی نہ کوئی نئی جہت دریافت کرتے رہنے کا سُراغ ہمیں ہر مرحلے پر ملتا ہے۔

شہریار کا شاعرانہ امتیاز ان کے ضبطِ نفس اور تہذیبِ جذبات میں مضمر ہے۔ وہ زندگی کے تجربات کو شاعری میں من و عن قبول کرنے کے بجائے، ان کو تخلیقی صداقت کا حامل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں زندگی کی سچائیاں ایک خاص تبدیلی اور تعمیم کی کیفیت کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں۔ لب و لہجے کی خوابناکی ان کو برہنہ گفتاری کے عیب سے پاک رکھتی ہے، اور طول کلامی سے اجتناب جہاں ان کو کفایتِ لفظی کا ہنر سکھلاتا ہے وہیں نفسی کیفیات اور انسانی جذبات کی قلب ماہیت کے رمز سے بھی آشنا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں خاصی ریاضت کے بعد پیدا ہوتی ہیں مگر ریاضت کے ساتھ شہریار کی افتادِ طبع کو بھی اس میں خاصا دخل رہا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'اسمِ اعظم' کو پڑھ کر بھی لگایا جا سکتا ہے، کہ شعری سفر کی ابتدائی منزل میں بھی شہریار کی شاعری میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ خوابناکی اور دھندلکے کی فضا بہت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ شہریار

کے شعری اسلوب میں بلند آہنگی کے بجائے خود کلامی کا دھیما پن ہے۔ داخلیت پسندی -INTROV
ERTNESS. - کی وجہ سے ٹھہراؤ اور اعتدال کی کیفیت کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی خود
کلامی، داخلیت پسندی کا نتیجہ ہے۔ خود کلامی کا یہ اسلوب کبھی استفہامیہ انداز اختیار کرتا ہے، کبھی خود احتسابی
کا روپ دھارتا ہے اور کبھی سرگوشی کا سا تاثر دیتا ہے۔ وہ بلند آہنگی جس سے شاعری میں اکثر و بیشتر کھرے
بیان اور لفظی بازی گری کا خطرہ لاحق رہتا ہے، شہریار کا غالب اسلوب اسے اپنے قریب بھی نہیں آنے
دیتا۔ آپ ان اشعار میں خود کلامی کے ساتھ دھیمے آہنگ اور استفہامیہ اور استعجابیہ لہجے کے مختلف
رنگ اور انداز کو محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے
ترے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے

ہر ایک شخص پہ تیرا گمان ہوتا ہے — یہ دیکھنا ہے کہ رہتا ہے یہ جنوں کب تک
یہ کیا ہے محبت میں تو ایسا نہیں ہوتا — میں تجھ سے جدا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوتا
میں اپنی آنکھوں کو کیوں بند کر نہیں لیتا — تمام لوگوں کی رسوائی کا سبب میں ہوں

ہوس کے زہر کی ہر بوند پی چکے تھے ہم
رگوں میں جمتی ہوئی ریت سے مفر کیا تھا

ان شعروں میں استفہام کا انداز بھی ہے استعجاب کا لہجہ اور طنزیہ طرز اظہار بھی مگر سب سے اہم بات یہ ہے
کہ مخصوص طرزِ اظہار اور اسلوب نے ان میں سے بعض بیانات کو بیانِ محض کی منزل سے بلند کر کے شعری
بیان کے عروج تک پہنچا دیا ہے۔ ان شعروں کو بیانِ محض سے محفوظ رکھنے اور شعریت کی صفت سے
متصف کرنے میں اہم رول شاعر کا لہجہ اور آہنگ ادا کر رہا ہے۔ وہ استفہامیہ انداز جو اپنے احتساب، اپنے
رویوں پر نظر ثانی اور اپنے افعال و اعمال پر حیرت کے اظہار کی شکلیں اختیار کرتا ہے، دراصل خود کلامی ہی
کے اسلوب کی توسیع ہے۔ وہ طنزیہ لہجہ جو ع رگوں میں جمتی ہوئی ریت سے مفر کیا تھا یا ع یہ دیکھنا ہے
کہ رہتا ہے یہ جنوں کب تک، جیسے مصرعوں میں ظاہر ہوتا ہے، اپنی تخلیقی شخصیت کی بازآفرینی، اور
زندگی کے اپنے رویوں کی بازدید کے بغیر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ شہریار کے لہجے اور اسلوب کی تشکیل میں ان کی
رومانیت ROMANTICISM, بھی ایک اہم محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ رومانیت، خواب پرستی، یادوں
کی بازگشت، مظاہر فطرت میں استعارے کی جستجو اور تخیّل کی جست سے عبارت ہے۔ شہریار کی شاعری
میں دشت و صحرا، شجر، دھوپ، ریت، پانی، ہوا، سمندر، شام، پرچھائیں، رات اور خواب کے استعارے
اس رویے کے تحت اپنی تازہ کاری دکھلاتے ہیں، اور اپنے مخصوص سیاق و سباق میں تجربات کی خاص
وسیع دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ ان استعاروں کا دائرہ کچھ اور چھوٹا کیجیے تو رات اور خواب، پر
ہماری نگاہ ٹھہرتی ہے۔ خواب اور رات، اور ان کے تلازمات کا سلسلہ غزلوں کے اشعار کے ساتھ نظموں کے
بڑے حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ 'خواب کا در بند ہے'، میں متعدد نظموں کے صرف عنوانات پر بھی نگاہ ڈالی
جائے جب بھی مرکزی استعارات کے تسلسل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صدائے شب، شب بیداری
کی حمایت میں، لے رات، رات جدائی کی رات، رت جگوں کا زوال، آخری رات، رات کے سمندر کے
اس طرف اور سفر کی شام جیسے عنوانات کی نظمیں محولہ بالا مفروضے کی توثیق کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ کہ

ان کے علاوہ دوسری نظموں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ شہریار کی شاعری میں رات اور خواب کے تلازمات سے ہی ان کی سوچ کا پیٹرن متعین ہوتا ہے۔ غزلوں کے بعض اشعار میں خواب کی مختلف استعاراتی جہات کا مطالعہ خاصا غور طلب ہے۔

یہ جب ہے کہ اک خواب سے رشتہ ہے ہمارا — دن ڈھلتے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے ہمارا

یا اتنی نہ تبدیل ہوئی ہوتی یہ دُنیا — یا میں نے اسے خواب میں دیکھا نہیں ہوتا

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا — آنکھیں اگر ملی تھیں کوئی خواب دیکھتے

ایک خواب دیکھنے کی آرزو رہی — اس لیے تمام عمر سو نا پائے ہم

زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے — خوابوں کی کوئی دُنیا آباد کریں پھر سے

آج کی رات میں گھوموں گا کھلی سڑکوں پر — آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے

مجھے نیند مت دے کہ میں خواب سے منحرف ہو گیا ہوں — مگر رات بھر جاگنے کے لیے کوئی ساماں کر دے

ان شعروں میں سیاق و سباق کی تبدیلی کے ساتھ خواب اپنی علامتی اور استعاراتی جہتیں تبدیل کرتا ہے۔ کبھی خواب سے آدرشں کی نمایندگی ہوتی ہے، کبھی اقدار کی، کبھی خواب، تلخ حقائق سے گریز کے بعد پناہ دینے کا کام کرتا ہے تو کبھی شاعر کی تخیلاتی دُنیا کا علامیہ بن جاتا ہے۔ موخر الذکر دو شعروں میں خواب سے انحراف اور خوابوں سے فرصت کی باتیں درحقیقت IRONY کی شکلیں ہیں، چونکہ طنز، IRONY یا استفہام انکاری میں مفہوم مخالف کا اثبات ہوتا ہے اس لیے ایسے مواقع پر خواب سے منکر یا منحرف ہونا بھی خواب کو پناہ گاہ سمجھنے کے تصور کا ہی زائیدہ ہے۔ اس پس منظر میں اگر زیر بحث مجموعے کے نام 'خواب کا در بند ہے'، پر غور کیجیے تو اس میں 'خواب کا در باز رکھنے کی تمنا' چھپی دکھائی دیتی ہے۔

شہریار کا وہ شعری اسلوب اور لہجہ جس کا سُراغ غزلوں کے متفرق اشعار سے ملتا ہے اس لہجے اور اسلوب کو منضبط اور منظم صورتیں، 'خواب کا در بند ہے'، کی نظموں میں بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شہریار کی نظمیں اپنے اختصار اور جامعیت سے یہ ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ وہ ناگزیر مصرعوں کا مجموعہ ہیں۔ مصرعوں کی ناگزیری ان میں عضویاتی وحدت کو بھی برقرار رکھتی، وحدت تاثر کو بھی زائل نہیں ہونے دیتی اور شاعر کو طول کلامی کے عیب سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ شہریار کی نظموں میں کبھی کبھی سماجی اور واقعاتی حوالے بھی آتے ہیں، مگر اتنی خاموشی کے ساتھ اور ایسی شعریت سے قالب میں کہ ان کی دلالت ہمیں ایک سے زیادہ معنوی امکانات تک لے جاتی ہے۔ شہریار فلسفیانہ سچائی کو شعری صداقت سے ہم آہنگ کرنے کا فن جانتے ہیں، اس لیے ان کی بعض نظموں کی فلسفیانہ سچائی اپنی تعمیم کی وجہ سے اتفاق یا اختلاف کا مسئلہ نہیں پیدا کرتی۔ کم و بیش یہی صورتِ حال زیر بحث مجموعے کی ان نظموں میں بھی نظر آتی ہے جو جسمانی رشتوں اور جذباتی سہاروں کے گرد گھومتی ہیں۔ اس قسم کی نظمیں، جذبے کے بیان سے زیادہ قاری کو جذبے کی تطہیر کے عمل سے گذارتی ہیں۔

شہریار کی نظموں میں رات، نیند، خواب اور بیداری کا کبھی کبھی ایسا تفاعل سامنے آتا ہے کہ یہ چیزیں مستقل کردار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی لیے ان نظموں میں خود کلامی کے ساتھ بسا اوقات ڈرامائی اور مکالماتی فضا بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ صدائے شب، فیصلے کی گھڑی، نفی سے اثبات تک، لمحہ نایاب

کرن دو کرن دھوپ اور ریت جگنوں کا زوال، فنی اعتبار سے زیر بحث مجموعے کی بڑی نظمیں ہیں۔ جہاں تک غزلوں کا سوال ہے تو ان پر بعض باتیں ابتدا میں عرض کی جا چکی ہیں، تاہم مزید دوسرے پہلوؤں کا احاطہ کرنے اور خواب کا در بند ہے، میں شامل غزلوں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کی غرض سے یہ اشعار بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ تو خیر ہوئی دریا نے رُخ تبدیل کیا — میرا شہر بھی اس کی زد میں آنے والا تھا
اسی اُمید پہ ہم آج تک بھٹکتے ہیں — ہر ایک شخص کا کوئی ٹھکانا ہوتا ہے
میں اپنے جسم کی سرگوشیوں کو سُنتا ہُوں — ترے وصال کی ساعت نکلتی جاتی ہے
اے شہر ترا نام و نشاں بھی نہیں ہوتا — جو حادثے ہونے تھے اگر ہو گئے ہوتے
آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا — ہو مبارک، آرزوے خار و خس پوری ہوئی

کھلے خطوط

پہنچ رہا ہے، نہایت ممنون ہوں اور
ہوتا ہوں۔
بڑے سے لفظ "تئیں" کا استعمال
ہوتا ہے، لیکن بے جا، بے موقع اور مبہم طور پر
کے تازہ شمارے (جولائی ۱۹۸۹) میں بھی
دو جملے نظر سے گزرے جہاں تئیں کے کچھ
نہیں کھلے:
"کارٹونسٹ ہو یا طنز نگار، دونوں میں
مشترک ہے۔ یہ کہ دونوں حماقتوں کے
بے صبر ہوتے ہیں۔" بے صبر غالباً انگریزی
کی جگہ آیا ہے۔)
"بقول شخصے، اگر کسی کا مضحکہ
اڑایا جائے کہ اس کے تئیں ہمدردی
ہوتا نظر آئے تو گویا ہم مزاح کے
سے نکل کر طنز کی حدود میں آجاتے ہیں۔"
"تئیں" اٹھارویں انیسویں صدی کا
لفظ ہے جس کا استعمال دلی میں
صدی تک تقریباً ختم ہو چکا تھا، صرف
بڑھیاں بولتی تھیں،
مثلاً: "تم کیوں ناحق اپنے تئیں ہلکان
" یا "جو جس کا ہے اس کے تئیں پہنچا
" یہ روگ ایک سے دوسرے کے
تا ہے۔"
تئیں کے معنی ہیں کو اور تک، جیسے کہ

"خدا کے تئیں" یعنی خدا تک۔
میر سوز کہتے ہیں:

دلا تو کب تئیں میرا جگر جلا دے گا
میں پوچھتا ہوں کبھی تجھ کو چین آئے گا

"کب تئیں" یعنی کب تک۔
ولی:

بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں
کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا

دل کے تئیں یعنی دل کو۔
وعلیٰ ہذا القیاس "اپنے تئیں" کے معنی خود کو، اپنے آپ کو، اپنی ذات کو۔
تئیں کے استعمال کی کچھ اور مثالیں یوں ہوں گی:
"آخر وہ اپنے تئیں کیا سمجھتا ہے۔ خدا کے تئیں دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ کسی کے تئیں دکھ نہیں دینا چاہیے۔"
قواعد کی رو سے تئیں حرف ہے، جیسے کو اور تک حروف جار ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ چھوٹ گیا ہے۔ نور اللغات نے اس کی تشریح یوں کی ہے:
"تئیں۔ ذات۔ کسی زمانے میں کو کی جگہ تئیں بھی بولتے تھے، اب نظم میں مستعمل نہیں، نثر میں بعض حضرات دہلی اب بھی لکھتے ہیں۔ جب لفظ اپنے مفعول واقع ہو تو اس کے ساتھ اکثر تئیں لاتے ہیں اور اپنے تئیں بولتے ہیں۔"
مولوی نور الحسن نیر کو مغالطہ ہوا۔ یہ ان کے علاقے کا لفظ نہیں تھا۔ تئیں کے معنی ذات درست نہیں۔ ذات اسم ہے۔
تئیں حرف۔ اپنے تئیں کے معنی اپنی ذات کو بطور تشریح درست ہیں، لفظاً تئیں کے

ری کے آس پاس کے علاقوں میں سُنا جا سکتا تھا۔ مثلاً : دوائی کے لیے شہر تائیں جانا پڑا، گوڑوں نائیں پانی میں سے چل کر آیا (گھٹنوں تک پانی میں سے)، کھیتی بیس ایک دن تائیں پک جاوے گی۔

ہندی میں تئیں نہیں صرف تائیں ہے جو شبد ساگر میں درج ہے۔ میری رائے ناقص میں اس کا سلسلہ فارسی کے "تا" سے ملتا ہے، مثلاً: تابشہر، تابزانو، تاچندروز۔

شان الحق حقی
ڈیفنس سوسائٹی۔ کراچی

● کتاب نما کا شمارہ نمبر ۵ بابتہ مئی ۸۹ء نظر سے گزرا۔ اس شمارے کا اشاریہ پروفیسر عبدالمغنی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے تاریخی تناظر میں اردو کے مسئلہ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ ہر چند کہ اس جائزے کے ادراک PERCEPTION میں کئی مقامات پر اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن اشاریہ اسی اعتبار سے اپنے مقصد میں کامیاب ہے کہ اس کا سارا زور اردو والوں کی رگِ حمیت کو پھڑکانے پر ہے تاکہ وہ اردو تہذیب کی بقا و تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔ اشاریہ کا اختتام سات نکاتی پروگرام پر ہوتا ہے جس کی عملی آوری میں اردو تہذیب کے علم برداروں کو تہیہ کرنا چاہیے۔

پروفیسر عبدالمغنی اردو کے معاملات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو کے مسائل پر ان کی آواز معتبر اور لائق توجہ ہوتی ہے، لیکن اشاریہ میں پروفیسر موصوف نے دو اہم باتیں ایسی لکھی ہیں جو محل نظر ہیں۔

۱۔ حکومت نے ثانوی سطح پر ایک سہ لسانی فارمولا وضع کر کے مادری زبان کے علاوہ ایک جدید ہندستانی زبان نیز ایک غیر ملکی زبان کی تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کی (صفحہ ۳ اوپر سے تیسری سطر)

۲۔ صدر دستور ساز اسمبلی کے کاسٹنگ ووٹ سے دیوناگری کو قومی سطح پر ملک کی واحد سرکاری زبان تسلیم کر لیا (صفحہ ۳ پیرا ۲ چوتھی سطر)

راقم السطور نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ ہیں نہ جانے کس راہ سے اردو والوں کے ذہن میں یہ دونوں خیالی باتیں اس طرح بیٹھ گئی ہیں کہ ان کا تدارک مشکل نظر آتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ پروفیسر عبدالمغنی جیسا محقق اور صاحب بصیرت بھی اس بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

راقم السطور کی دانست میں مرکزی سطح پر سہ لسانی فارمولے کی جو شکل وزرائے اعلاکی دو روزہ کانفرنس منعقدہ اگست ۱۹۶۱ء سرکاری طور پر منظور ہوئی وہ یہ تھی :۔

۱۔ علاقائی زبان اور مادری زبان (اگر علاقی زبان سے مختلف ہو)

۲۔ دستور ہند کی کوئی زبان جو نمبر ۱ پر نہ لی گئی ہو۔

۳۔ کوئی جدید یورپی زبان

یہ ضرور ہے کہ سہ لسانی فارمولے کو مندرجہ بالا شکل میں منظور کیے جانے سے پہلے ۱۹۵۶ و ۱۹۵۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایما پر سنٹرل ایڈوائزری تعلیمی بورڈ نے دو فارمولے تیار کیے تھے۔ اور دونوں میں جدید ہندستانی زبان کا ذکر ہے۔ وزرائے اعلاکی مذکورہ کانفرنس میں یہ دونوں فارمولے زیر غور اور زیر بحث رہے مگر فارمولے کو قطعی شکل دیتے وقت لفظ "جدید" کو نکال کر اس کی جگہ کوئی ہندستانی زبان کر دیا گیا۔ چوں کہ دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں جن زبانوں کی صراحت ہے ان میں سنسکرت شامل ہے اس طرح سرکاری طور پر منظور شدہ سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت نے جگہ پائی۔ یہ بحث علاوہ اور نفس مضمون سے غیر متعلق ہے کہ آٹھویں شیڈول میں جدید

ہندستانی زبانوں کے ساتھ ایک کلاسیکی زبان سنسکرت کا کیا جواز تھا۔ وہ ملک کے کس خطے، کس علاقے اور کس طبقے کی زبان مادری ہے؟ لسانی شاد نیت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

اس فارمولے پر جمعیۃ العلماء ہند کی طرف سے احتجاج کیا گیا اور مولانا حفظ الرحمٰن ممبر ودھان سبھا کی قیادت میں ایک وفد بھی جواہر لال نہرو سے ملا۔ وفد نے اس فارمولے کے مضمرات اور اس کے دوررس مضر اثرات سے نہرو جی کو آگاہ کیا۔ وفد کے ایک ممتاز رکن مولانا شاہد فاخری مرحوم ناقل تھے کہ وفد کی بات سن کر نہرو جی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ نہرو جی نے وفد کے ذریعہ پیش کردہ میمورنڈم پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلا یو۔پی کو بھیج دیا۔ یہ میمورنڈم اتر پردیش لنگویج کمیٹی ۱۹۶۲ء (جو کرپلانی کمیٹی کے نام سے زیادہ مشہور ہے) کے زیر غور آیا مگر کمیٹی نے یہ دلیل دے کر اسے نامنظور کر دیا کہ چوں کہ فارمولا مرکزی حکومت کا منظور کردہ ہے اس میں کسی قسم کی ترمیم کا اختیار اس کمیٹی کو نہیں پہنچتا۔

اب دوسری بات کو لیجیے۔

راقم السطور کو اچھی طرح یاد پڑتا ہے کہ ۳،۴ سال پہلے عبداللطیف اعظمی صاحب نے یہ مسئلہ چھیڑا تھا۔ اس کے جواب میں کسی صاحب کا تفصیلی مضمون 'ہماری زبان' میں چھپا تھا جس میں اعداد و شمار دے کر یہ بات واضح کی گئی تھی کہ دستور ساز اسمبلی میں ہندی بخط دیوناگری سرکاری زبان کی حیثیت سے خاصی اکثریت سے منظور ہوئی تھی یہ اردو والوں کی من گھڑت ہے کہ صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندی سرکاری زبان قرار پائی۔

اردو کے تعلق سے اب یہ بحثیں صرف اکاڈمک نوعیت کی ہیں جن کا کچھ حاصل نہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ان کی اصلیت کی تحقیق و تصدیق ہو جائے۔ یہ تحقیق خود پروفیسر عبدالمغنی کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں خلیق انجم صاحب اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں رہیں گے۔ وہ سرکاری طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ وزارت تعلیم سے رابطہ قائم کر کے دونوں باتوں کی اصلیت معلوم کر سکیں۔

خلیل الرب۔ الہ آباد

● مئی ۸۹ء کے "کتاب نما" میں تحریک خلافت کی انقلابی آوارہ گرد نظمیں۔ اہم مضمون ہے۔ اس سے کئی غلط فہمیاں رفع ہو گئیں —— باقر مہدی نے اپنی اچھی خاصی غزل کا عنوان نہ جانے کیوں "کالی غزل" رکھا ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ کالی روشنائی سے چھپی ہے اس میں اور تو کوئی "کالا پن" نہیں ہے۔ کافی عرصے کے بعد ایک اچھا افسانہ پڑھنے کو ملا —— میری مراد سریندر پرکاش کے افسانے "آؤ ہمارے گرجا گھر کی گھنٹیوں کی آواز سنو:

آپ نے بھی نثری نظمیں شائع کرنا شروع کر دی ہیں (کم از کم پہلے میری نظر سے نہیں گزریں) اچھی تبدیلی ہے۔ منیر الدین احمد اور نصر ملک کی نظمیں "رستہ: اور "شب ربائی" اچھی لگیں۔ میرے نزدیک "شب ربائی" واقعی نثری نظم ہے جب کہ "رستہ: علامتی افسانے کا ایک کامیاب پیراگراف ہے۔ منیر الدین احمد نے "رستہ: میں سنگِ میل کو نشانِ راہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جو غلط ہے۔ سنگِ میل سیدھا سادہ مائل اسٹون کا اردو ترجمہ ہے۔ نشانِ راہ (روڈ سائن) سہ راہوں یا چوراہوں پر مختلف منزلوں کی رہنمائی کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ محمد علوی کی غزل عرصے کے بعد دیکھنے کو ملی۔ تازہ بھی ہے اور توانا بھی!۔ ان کے اس شعر میں جو ڈائنمک فورس ہے اس کی داد کم ہی لوگ دے سکیں گے۔

دیکھوں گا اس جہاں کو خلاؤں میں ڈوبتا
جاؤں گا اپنے ساتھ یہ منظر لیے ہوئے

محسن بھوپالی۔ ناظم آباد۔ کراچی

● جون کا "کتاب نما" دیکھ کر رہا گیا۔
پرویز یداللہ مہدی کا مزاحیہ مضمون غالباً آپ کی نگاہوں سے گزرا نہیں ورنہ اس میں دو ایک جملے آپ ضرور کاٹ دیتے انھوں نے حیدر آباد کے ایک ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے متعلق انتہائی فحش کلمات تحریر کیے ہیں جو ادبی بددیانتی کی تعریف میں آتے ہیں۔ اُن سے معذرت ضرور تحریر کروایئے اور ان سے کہیے کہ پہلے وہ اردو سیکھ لیں اور بعد میں نامور ادیبوں کے منہ آئیں۔ ان کے مضمون کا انتہائی "غلط عنوان" "خود ستائشی" جو "خود ستائی" ہونا چاہیے اس بات کی دلیل ہے کہ موصوف خود کتنے پانی میں ہیں۔

اب کے نظم کا حصہ بھی اچھا خاصا ہے اور بعض منظومات خصوصاً اثر فتحپوری اور بلراج کومل کی نظمیں خوبصورت ہیں شہزاد منظر کا اداریہ فکر انگیز ہے عنوان چشتی، مسعود احمد برکاتی محمد سالم اور رشون کمار ورما کی نگارشات معیاری ہیں۔ کھلے خطوط میں انور سدید جیسے نامور اور مشہور ادیب کے خطوط اس کالم کی جہانگیری کا ثبوت ہیں۔

"خامہ بگوش" کی پرواز بیکراں ہے۔ اس کے اشہب قلم کو کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے ایسے جملے اس نے تخلیق کیے ہیں جو ایک بیکراں سمندر کو سمیٹے ہوئے ہیں خصوصاً پاکستانی ادیبوں کے آنسو پونچھنے، علی بابا کی تمثیل اور بوئے رعیدہ کے ساتھ بوئے رسیدہ اور بوتے عمر رسیدہ سے جو مزاح وہ تخلیق کر گیا ہے وہ آپ اپنا جواب ہے۔

یعقوب عمر۔ حیدر آباد

● "کتاب نما" میرے لیے اور ادب کے دیگر طالب العلموں کے لیے بیشک ادبی راہنما ہے۔ مہمان مدیر شہزاد منظر نے جون ۸۹ء کے شمارے میں جو تنقید کے زوال کا تذکرہ کیا ہے اس کا تعلق موجودہ تنقید میں جو کمیاں موجود ہیں، اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے بقول شہزاد منظر:

"اس دور میں مصلحت کوشی آج کے نقاد کا شیوہ بن چکا ہے اور وہ تقاریب کے لیے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں جس دیدہ دلیری کے ساتھ جھوٹ بولتا ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے نہیں بولتا۔" ص: ۸

شہزاد منظر نے اس زوال کی ذمہ داری جن پر ڈالی ہے وہ یقینی طور پر ناقابلِ معافی ہیں کیوں کہ اس سے غیر صحت مند غور و فکر کے دروازے کھل جاتے ہیں اور تنقیدی دیانت داری کا خون ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایسی صورت میں تنقید کے زوال کی اگر کسی پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے تو یہ تدریسی اور تقریباتی تنقید لکھنے والوں پر ہوتی ہے ان کے سوا کسی اور پر نہیں۔" ص: ۸

شہزاد منظر حق بجانب ہیں اور تنقید محض ایک طرح کا اسٹریو ٹائپ تحریر ہو کر رہ گئی ہے۔

کامیو کا ایک ناول 'پستی'، پر ناصر بغدادی کا مضمون معلوماتی بھی ہے اور اس میں سیر حاصل بحث سے ناصر بغدادی کی علمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'اردو ادب اور مشترکہ تہذیب'، پر پروفیسر اکبر رحمانی کا ایک مختصر مضمون ہے لیکن اہم باتوں کو سمیٹنے میں کامیاب ہیں۔ محمد سالم کا مضمون، مجروح سلطان پوری کی غزل گوئی، ان کی فہم و فراست کی عکاس ہے۔

ولی احمد صباغ، محبوب پاشا، ڈاکٹر جمال شاہد، نجم عثمانی، مجاز نوری، ڈاکٹر خاور خان سرحدی اور ڈاکٹر اختر عبدالرشید کی غزلیں پسند آئیں۔ بلراج کومل کی نظم 'نامکمل انسان کے وجود کی اُن گتھیوں کو کھولنے کی کوشش کرتی ہے جو آج تک نہیں سلجھی اور اتنے پردے حائل ہیں جن کو اٹھانا ایک دشوار عمل ہے۔ ایک اچھی نظم ہے جس میں فکر بھی ہے، احساس بھی اور سوچنے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی۔

امام اعظم قلعہ گھاٹ دربھنگہ

● جولائی کے شمارہ میں مضامین کا حصہ کافی جاندار ہے خاص کر ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور سری نیواس لاہوٹی کے مضامین بہت معلومات افزا ہیں۔ "اردو طنز و مزاح اور"...... کے عنوان سے شمیم حنفی نے بھی خوب حق ادا کیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے حصہ میں بھی خوب سے خوب تر انتخاب ہے۔ اشتیاق طالب "اداس راہوں پہ نظریں جمائے رکھتے ہیں" خوب تخیل ہے اور اُمید سے بھرپور ایسا کیوں نہ ہوں جب وہ خود ہی کہتے ہیں کہ —— لبوں پہ تبسم سجائے رکھتے ہیں"۔ خدا بیدار بخت کے "احساس کی بستی کو آباد رکھے" اور ان کو آنکھوں کو ضبط جنوں کے کالے بادل" جمانے کی بجائے "برسانے" کی توفیق دے۔ بادل وہی، جو برسے نہ کہ جمارہے۔ کیوں بیدار بھیا —— کیا خیال ہے؟ مانگے کا اُجالا —— کیسا ہی ہو میں اسے "اجالا" نہیں کہہ سکوں گا وہ اجالا ہی کیا جو مانگا جائے، ہاں آپ کی جرات پر داد دیتا ہوں کہ آپ مانگے کے اُجالے کو "مانگے کا اُجالا" ہی رکھتے ہیں تبھی تو شاید "کتاب نما" میں جس "غیر جانبدارانہ روایت" کو آپ نے شروع کیا تھا وہ ابھی تک پھل پھول رہی ہے۔ جرمن افسانہ "ہمہ صفت باپ" بھی خوب ہے اور اس کے مترجم —— رتی سجاد کی ترجمہ کرنے کی کاوش بھی بھلی لگی۔ رتی سجاد، نام میرے لیے نیا ہے شاید اس کی وجہ پچھلے سولہ برسوں سے اپنی دھرتی سے کٹے رہنا ہے۔ "کتاب نما" کے مہمان مدیران کے "اشاریہ" خوب ہوتے ہیں یہ سلسلہ مسلسل جاری رہنا چاہیے ایک گزارش ہے کہ کتاب نما کے سرورق پہ آپ ہر ماہ جس شخصیت کا "خاکہ" شائع کرتے ہیں اس کا نام گرامی بھی ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ اُمید ہے اس پر غور کریں گے۔

نصر ملک۔ ڈنمارک

● تازہ شمارے میں مہمان مدیر ڈاکٹر محمود الٰہی کا اشاریہ مختصر ہوتے ہوئے بھی جامع اور چست ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اچھی اچھی کتابوں کا قاری ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا درست ہے مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فن کار کو چاہیے کہ پہلے قاری پیدا کرے اور تب اپنا تخلیقی جوہر دکھائے۔ الٰہی صاحب نے اداریے میں جن کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں اگر تمام اساتذہ اور محبانِ اردو اس پر عمل کریں تو اردو کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

انور خاں کا مضمون "مُرینا رپر کاش کے افسانے" بھاگل پور یونی ورسٹی کے طلبہ کے لیے مفید ہے۔ کالم "مانگے کا اُجالا" میں خامہ بگوش نے جس طرح دونوں ملکوں کے ادیبوں کی نقاب کشائی کی ہے کوئی دوسرا نہیں کر پاتا۔ کھلے خطوط کا کالم دلچسپ ہی نہیں معلوماتی بھی ہے۔ کاغذ کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک روپے کا اضافہ گراں نہیں گزرتا۔

محمد حسن امام پرویز۔ جبار چک۔ بھاگلپور

بقیہ صفحہ ۹۱

میں ڈھل کر اپنی صورت تبدیل کر لیتی ہے:

غرض کہ "اس آزاد مثنوی" کے ذریعے وزیر آغا نے زندگی کی پُراسرار حقیقتوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ دورِ جدید میں صنفِ مثنوی کی جو کمی محسوس ہوتی ہے، اُسے خوبصورت استعارات، تازہ کار تشبیہات، واضح علامات اور پیکر تراشی اور تجسیم کاری کی خوبصورت مثالوں سے بھرپور یہ نظم کسی حد تک پورا کرتی ہے۔ جانے کیوں اس نظم کو پڑھ کر اقبال کے "ساقی نامہ" اور سردار جعفری کی "میرا سفر" کی یاد آجاتی ہے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تاریخ ہند کا المیہ

مصنّف: محمد ضیاء الحق خاں
قیمت: پچیس روپے   اشاعت: ۱۹۸۷ء
ملنے کا پتا: طفیل سیماب، سیماب پریس، جلال پورہ
کھام گاؤں، ضلع بلڈانہ۔ مہاراشٹر
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

"تاریخ ہند" کا المیہ، محمد ضیاء الحق خاں کی تصنیف ہے۔ اس کا دیباچہ، بشمبر ناتھ پانڈے گورنر اڑیسہ نے رقم فرمایا ہے۔ "حرفے چند" ڈاکٹر سیّد عبدالرحیم، صدر شعبۂ عربی، ناگپور یونیورسٹی کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ "مقدمہ" مصنّف نے خود لکھا ہے۔ یہ ضروری بھی تھا۔ اس لیے کہ نفس مضمون انھیں کے احساس اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ سے قاری کو مذہبی اور تاریخی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔

مصنّف نے عالمگیر مذاہب اور ہند کے قدیم و متوسّط حکمرانوں کا تذکرہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ ہندستان میں مسلم اور غیر مسلم آبادی اور حکمرانوں کے بیچ مذہبی منافرت اور نفاق نہ تھا۔ برٹش حکمرانوں نے اپنی سلطنت کو استحکام دینے کی غرض سے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی۔ انھوں نے مسلم تاجداروں خصوصاً اورنگ زیب اور شیوا جی کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا اس طرح فساد اور نفرت کا تناور درخت پروان چڑھایا۔ اس ضمن میں بشمبر ناتھ پانڈے کی تحقیق سے استفادہ کیا ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر وڈ اور جارج فرانسس ہملٹن کے دستاویزی ثبوت درج کیے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض ہندستانی مورّخین کے غلط بیانات کی تردید کی ہے۔ مقصد یہ کہ اس دور میں تاریخی نصاب کی صحت کی جائے اور نفرت انگیز مواد خارج کر کے صحیح تاریخ طلبہ تک پہنچائی جائے تاکہ ملک میں امن و اتحاد، ہم آہنگی اور یک جہتی کی فضا قائم ہو۔

اس نیک مقصد سے کسی ہندستانی کو انکار نہیں۔ لیکن اب فن تاریخیت سے لوگ واقف ہو گئے ہیں۔ تاریخی شعور پیدا ہوا ہے۔ تاریخی تصوّر بدل گیا ہے۔ شہنشاہوں کے خاندان اور جنگوں کی فہرست کا نام تاریخ نہیں رہا ہے۔ اورنگ زیب اور شیوا جی کا معاملہ نئی نسل میں فساد کی بنیاد نہیں بلکہ ذہنوں کو مسموم کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخی نقطۂ نظر سے نہ دیکھا جائے۔ مذہبی عینک سے تاریخ کا مطالعہ زہر پھیلاتا ہے۔

زیر نظر کتاب کے مطالعے سے تبصرہ نگار کے ذہن میں کئی سوال ابھرتے ہیں۔

۱۔ شنکراچاریہ کے حوالے سے ہندو مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔
شنکراچاریہ کا زمانہ (۷۸۸ء تا ۸۲۰ء) ہے۔ ان کا گیان مارگ اسکول مشہور ہے۔ شیو کی پوجا پر اصرار کیا گیا۔ راما نج کا دور (۱۰۱۶ء) ہے۔ ان کا بھکتی مارگ اسکول ہے۔ وشنو کی پوجا پر زور۔ ہندو مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا تصور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ بعض مورخین نے گپت عہد میں ہندو مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا شوشہ چھوڑا ہے۔ وہ بھی نشاط ثانیہ نہیں۔ ہندو مذہب کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر ہی کیا۔
۲۔ "ہندو" یہ اصطلاحی لفظ بھی تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے۔ گپت عہد کے بعد سب سے پہلے عربوں نے اس کا استعمال ہند (انڈیا) کے باشندوں کے لیے کیا تھا۔ بعد میں یہ لفظ مذہب کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور اب اس کا استعمال عام ہو گیا۔
۳۔ انڈو گریس، شناک، ہن یہاں تک کہ موریا کسی نے کبھی اپنے آپ کو "ہندو" نہیں کہا۔
۴۔ وشنو کا اوتار کرشن جی کو تسلیم کر لیا گیا۔ انھوں نے بھکتی کا تصور پہلی مرتبہ خود بھگوت گیتا میں پیش کیا ہے۔
اس کے بعد بودھ مذہب سے اس کو مستعار لیا گیا۔ جین مت اور بدھ مت میں اہنسا کا فلسفہ ملتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہابیر جین اور سدھارتھ گوتم بدھ دونوں ATHEIST تھے۔ انھوں نے عملاً اپنی زندگی میں ورن (تقسیم ذات) کے خلاف اقدام کیا۔ یہاں تک کہ گوتم بدھ کی وفات ایک شودر کے یہاں سور کا گوشت کھانے کے بعد ہوئی۔
۵۔ گپت عہد سے پہلے عیسائی لوگوں نے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہ مالابار میں آباد ہوئے۔ ایک شامی گرجا گھر بنایا گیا اور فارس (ایران) سے ایک بشپ بلایا گیا۔
مصنّف نے محمد بن قاسم سے اورنگ زیب تک کی تاریخ کے پرکر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے غیر مسلموں کے ساتھ بے انصافی اور ظلم کا سلوک نہیں کیا۔ اورنگ زیب پر جتنے الزامات لگائے گئے ہیں ان کی تردید تاریخی نقطۂ نظر سے کی ہے۔ مورخین کی تاریخی غلطیوں کی صحت کی ہے۔ اورنگ زیب کے ۱۴ فرمان شامل متن ہیں جن سے ثابت ہے کہ شہنشاہ نے مندروں اور پجاریوں کے لیے جاگیریں اور رقوم عطا کیں۔ اس کے علاوہ شیواجی سنبھاجی اور ساہو کے ساتھ حسن سلوک اور عزت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مہاراجا جسونت سنگھ کی لغزشوں کو بار بار معاف کیا اور عہدہ و منصب بحال کیا۔ آخری صفحات میں سرحدی قبائل، مراٹھے، شیعہ، راجپوت جینی سنت سادھوؤں کا تذکرہ ہے۔ اورنگ زیب نے سب کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ سب الزام بے بنیاد ہیں۔ اورنگ زیب معصوم عین الخطا تھا۔
قارئین کو مطمئن ہونا چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ مصنف نے شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی کیا ان چند جین اور حد یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی مورخین بنا دیا ہے۔ عہد جدید کے کسی مسلم مورخ کا نام نہیں۔ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ انگریز کا حادو اس کتاب میں بھی ہے۔ "خاندان غلامان" کا عنوان بدستور قائم

ہے۔ اگرچہ اب تاریخ میں "سلاطین دہلی" لکھا جاتا ہے۔

ایک اور بات حیرت انگیز ہے۔ اورنگ زیب کو غیر متعصب اور انصاف پسند شہنشاہ ثابت کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کے یہ اشعار بھی درج ہیں۔ ص ۱۱۵۔

پایۂ اسلامیاں برتر ازو　　احترام شرع پیغمبر ازو
درمیان کارزار کفر و دیں　　ترکش مارا خدنگ آخرین
تخم الحادے کہ اکبر پرورید　　باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دیں در سینہ ہا روشن نہ بود　　ملت ما از فساد ایمن نہ بود
حق گزید از ہند عالم گیر را　　آن فقیر صاحب شمشیر را
از پئے احیاے دیں مامور کرد　　بہر تجدید یقیں مامور کرد
برق تیغش خرمن الحاد سوخت　　شمع دیں در محفل ما برفروخت

گویا اسلام میں نظام شہنشاہیت جائز ہے۔ خلافت اور جمہوریت بے معنی۔ یا پھر اورنگ زیب کو اقبال اور ضیاء الحق دونوں "خلیفۃ المومنین" سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ص ۱۵ دیکھیے۔ اکبر اعظم کی جی بھر کے مذمت کی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل تحریر ہے۔

"دین الٰہی" اس کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن اس سے تعلیمات اسلامی پر جو خراب اثر پڑا۔ اس کو دور کرنے کے لیے اس کے جانشینوں خصوصاً اورنگ زیب عالمگیر کو اپنے دور حکومت میں بڑی زحمت اٹھانی پڑی۔"

مصنف نے اس بڑی زحمت کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے 'دین الٰہی' کی تاریخی ریسرچ بھی نہیں کی۔ اکبر اعظم نے یہ اقدام ہی نہیں کیا۔ بدایونی اور ابوالفضل دونوں نے آئین راہنموئی بتایا ہے۔ بلاک مین نے طریقہ اور روش کا ترجمہ "دین الٰہی" کر دیا۔

مصنف نے تخت نشینی کی جنگ کا تذکرہ کر کے اورنگ زیب کو داد شجاعت دی ہے۔ فراست کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اورنگ زیب کو بادشاہت کی کیوں سوجھی؟ اپنے بھائیوں میں شجاع مراد، دارا کا قتل کس لیے اور کیوں کرایا۔؟ اپنے باپ شاہجہاں کو کس قصور میں قید رکھا گیا؟۔ ان چیزوں کا شرعی جواز کیا ہے؟ کیوں کہ بقول اقبال (احترام شرع پیغمبر ازو)

بہر حال ہمیں تاریخ کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ مذہبی رنگ کی آمیزش سے آویزش ناگزیر! ذہن کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ انسان دوستی اور امن و اتحاد کے لیے ہمیں اپنے دل اور ذہن کا محاسبہ بھی کرنا چاہیے●

آدھی صدی کے بعد

شاعر : وزیر آغا
ناشر : اردو رائٹرز گلڈ۔ الٰہ آباد : ۲۵ روپے
مبصر : ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت بہ حیثیت شاعر، بہ حیثیت ادیب و نقاد اور بہ حیثیت انشائیہ نگار

برصغیر میں محتاج تعارف نہیں۔شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، غزلیں، اور نردبان کے
خالق کا ایک اور شعری کارنامہ "آدھی صدی کے بعد" منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں ان کے
پچھلے شعری مجموعوں کی طرح نہ محض نظمیں ہیں اور نہ محض غزلیں بلکہ یہ ایک طویل آزاد نظم ہے۔
جسے جدید دور کی مثنوی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس نظم کا موضوع دراصل اپنے ماضی کی طرف
ایک بازرفت ہے۔ جس کے بارے میں خود وزیر آغا لکھتے ہیں۔

"میری طویل نظم آدھی صدی کے بعد، دراصل میری اس واپسی کے سفر ہی کی داستان ہے
بلکہ یہ تو بجائے خود ایک مہم ہے کیونکہ واپسی کے سفر میں مجھے پہلی بار وہ سب کچھ نظر آ رہا ہے جو
ان طویل مسافتوں میں ہمہ وقت دعوت نظارہ تو دیتا ہے مگر مجھے اپنے سفر کے دوران اس لیے
نظر نہیں آیا تھا کہ میری آنکھ بیدار نہیں تھی۔"

یوں یہ نظم رواں صدی کے تقریباً پچاس سالوں پر محیط ہے۔ مگر اس صدی کے مختلف
انقلابات و حادثات اس کا موضوع نہیں، اور یہ بات بھی قدرے اہم ہے کہ اس میں شاعر نے
کائنات کے حوالے سے ذات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ ذات کے وسیلے سے کائنات کی
تفسیر کا فرض انجام دیا ہے۔ تقریباً نصف صدی کے طویل عرصے میں زندگی نے شاعر کو جو بھی دیا ہے
یا اس سے جو بھی لیا ہے، چھینا ہے، لوٹا ہے، اس کا ایک احتساب اس نظم میں ملتا ہے گویا یہ
نظم شاعر کی زندگی کا میزانیہ ہے جس میں ہم سود و زیاں کا منظر نامہ دیکھ سکتے ہیں اور حساب لگا سکتے
ہیں کہ اس مسافت میں اس نے کیا کھویا کیا پایا ہے۔ اور اس طرح ہم موجودہ صدی کے
انسان کے "کھونے اور پانے" کا اندازہ کرسکتے ہیں

"نظم" زندگی ہی کی طرح چار حصّوں میں تقسیم ہے۔ ویدک دور کے چار آشرموں کی طرح
جنھیں بالترتیب برہم چاری آشرم، گرہست آشرم، بان پرستھ آشرم اور سنیاس آشرم کہتے ہیں۔
پہلے حصّے کو شاعر نے "جھرنے" کا نام دیا ہے۔ یہ گویا بچپن کی علامت ہے۔ انسانی زندگی ایک
بہتے ہوئے دھارے سے کم نہیں۔ زندگی کی جوئے کم آب نہ جانے کتنی صدیوں سے یوں ہی اچھلتی
کودتی، مچلتی تڑپتی، دوڑتی بھاگتی چلی جارہی ہے۔ اقبال نے اس کے "دمادم رواں" ہونے کی
طرف بہت پہلے اشارہ کیا تھا۔ وزیر آغا نے اس بہتی ہوئی آب جُو کے چار ٹکڑے کر دیے ہیں۔
اس کا پہلا رُوپ 'جھرنے' کی طرح صاف، سجل پانی سے بھرا ہوا ہے۔ یہ معصومیت اور پاکیزگی کی
دلیل ہے۔ اسی لیے عہد طفلی کی علامت بن گئی ہے۔ نظم کی ابتدا رات کے اس پچھلے پہر سے ہوتی
ہے جب ستارے پھڑ پھڑا رہے ہیں اور گھنی گھاس کی نوک پر آسماں سے ایک نمی اُتر رہی ہے۔
اور چاند پورب کے ماتھے پر قشقے کا مدھم نشان بن کر جگمگا رہا ہے۔ ایسے میں شاعر برسوں بعد ایک
شکستہ سی بیل گاڑی پر بیٹھا ہوا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور مچلتی ہوئی آرزوؤں کے ساتھ اپنے وطن
کی طرف لوٹ رہا ہے۔ منظر نگاہ کے سامنے آرہے ہیں اور پس منظر میں تبدیل ہوتے جارہے
ہیں اور ہر نیا منظر نصف صدی پہلے کے پرانے منظر کا تصور پیدا کر رہا ہے۔ شاعر بے چین ہے کہ فوراً
اپنے گاؤں پہنچ کر ماں کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما جائے۔ اور اس کی محبت کی برستی ہوئی شبنم میں

نہا کر خوب ہنسے۔ رات کا پچھلا پہر عمر رسیدگی کا استعارہ ہے۔ شکستہ سی بیل گاڑی اُن ناکام کوششوں ذریعوں اور وسیلوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کامرانیوں تک پہنچنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر زندگی کی معصومیت مختلف مناظر کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ گائے کے نازک تھنوں سے اُترتی ہوئی دودھ کی دھار، تازہ پکتے ہوئے گرم تنور کی کوکھ سے سنہری چنگیروں میں بڑھتی ہوئی روٹیاں، اور اُن پر جھپٹتے ہوئے معصوم ہاتھ، رکابوں میں سجی ہوئی گول بوٹیاں، ان پر لپکتے ہوئے بچے، بزرگوں کی ڈانٹ اور بچوں کی چھینا جھپٹی۔ پھر دوپہر کی دہکتی ہوئی زمین نہر میں نہاتے ہوئے ننھے منے برہنہ بدن، پروائی کے مست جھونکے، تتلیوں کا تعاقب اور ان کو پکڑنے کی خواہش، رنگوں کو جاننے کا تجسس ــ یہ وہ مناظر ہیں جو انسانی شعور کی ابتدائی منزلوں اور معصومیتوں کے مظہر ہیں۔ اس کے بعد نظم نئے بند کے ساتھ شعور کے ارتقا اور جنس کی بالیدگی کی پہلی منزل کی طرف بڑھتی ہے جسے وزیر آغا یوں ادا کرتے ہیں۔

ننھے سینوں کے /جھرنوں کے اندر/ چھلکتی ہوئی /بے قراری کا/ سمندر کے اندر/ سمندر اور جذبات کی اس تیز دھوپ والی دوپہر کے بعد سوندھی سی خوشبو لیے ہوئے شام ــ جو دن بھر کے جذبات کی درماندگی اور سکون و راحت کی غماز بن کر آتی ہے۔ پھر کالی قبا اوڑھے ہوئے کالو کی رات ــ اس رات میں کھیلے جانے والے کھیل ــ کبڈی ــ آنکھ مچولی ــ مسرت بھری چیخیں، چاند جسموں کی لہریں، بپھرتا ہوا شور ــ یہ سب علامتیں جنسی آسودگی کی تکمیل کی طرف اشارہ کناں ہیں پھر نصف شب میں ممتا کا لطف۔ آغوشِ مادر کا سکون ــ لوری/ سات رنگوں کے پر والی پری، پہاڑوں کی جانب جاتا ہوا شاہزادہ اور اس کا طویل سفر۔ انسانی خوابوں کی داستان ہے۔ تخیل کی جنت ہے۔ غرض کہ نظم کے اس حصے میں شاعر بیتے ہوئے بچپن اور زمین کے حسین و پُرامن منظروں کو یاد کرتا ہے جو انسانی روح کی معصومیت کے پیغمبر ہیں اور موجودہ زمانے پر خندہ زن ہیں۔

نظم کا دوسرا حصہ 'ندی' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ زمانے کا بھیگا ہوا چابک انسان کے بدن پر مسلسل ایک اندھے سفر کی کہانی لکھ رہا ہے۔ 'ندی' دراصل 'جھرنے' کا توسیعی روپ ہے۔ یعنی 'جھرنا' اگر بچپن کا استعارہ ہے تو 'ندی' جوانی کا۔ جب عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور شاعر ہوش سنبھالتے ہی اپنے قلم کا، اپنے حروف کا، اپنے خیالوں کا زمانے کے ساتھ سودا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے موضوعات بے کراں ہیں، پرندے کی منقار، دیپک کی لَو، بھیگے ہوئے تارے، چوڑیوں کی کھنک اور زندگی کے بے شمار دُکھ درد، خوشیاں اور مسرتیں۔ یہ تمام تجربات اسے محبت کے اوّلین احساس سے لذت آشنا کرتے ہیں۔ ہر جذبہ عارض کی رنگت میں گھل جاتا ہے۔ چنبیلی کی خوشبو میں ڈھل جاتا ہے۔ اور دھڑکتی ہوئی سانس بن کر پگھلتی ہوئی موم بتی کی رستی ہوئی آنکھ میں ڈولتا ہے۔ جب شاعر کی نگاہ ہر شے میں حُسن تلاش کرتی ہے اور ہر گھونگٹ، ہر چلمن اور ہر چق کے پسِ پردہ خوبصورت چہرے اور تکتی ہوئی شوخ آنکھوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے جو انی جنسی شعور کی بیداری کا اعلان کرکے گھر کی دہلیز پار کرتی ہے اور کھلے شہر میں تیز خوشبو کی طرح مشتہر

ہوجاتی ہے۔ ہر گھڑی خواب بننے میں مصروف نظر آتی ہے۔ شاعر کی ذات گویا ہوا کے سمندر میں ٹھہرا ہوا ایک جزیرہ ہے۔ رگوں میں خون موج زن ہے اور سارا زمانہ اس رنگ کے انتشار کا منتظر۔ ساری کائنات یعنی معصوم ستارے، لوٹتا ہوا آئینہ، کم سن زمین، بوڑھا فلک، سبھی اُسے اپنے ہمراز نظر آتے ہیں۔ اپنے غلام، دست بستہ اس کے حکم کے منتظر۔ اگلے بند میں یہ جنسی احساس سماجی شعور سے گلے ملتا نظر آتا ہے۔ اور حقائقِ حیات سے اُلجھ کر یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ زمین ایک کنکر ہے۔ حیات ایک پھپھوندی ہے۔ ڈائن ہے جو اپنے ہی اعضا کو رغبت سے کھاتی ہے اور ساری کائنات اسی 'بھوک' کا شکار ہے۔ ہر زندہ شے، دوسری زندہ شے کا نوالہ بنی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ آسمان — جو سب سے عظیم ہے، اشرف المخلوقات ہے، اپنے ہی ساتھی کا تازہ لہو پی رہا ہے۔ زمانے کے یہ بدصورت اور کریہہ مناظر اس کے احساس پر ضرب لگاتے ہیں لطیف جذبات کو مجروح کرتے ہیں۔ زمانے کی عیاریاں ناقدریِ فن کے درد کو گہرا کر دیتی ہیں۔ ساری کائنات اُسے لایعنی محسوس ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات کا تحفظ اور اپنی انفرادیت کی بقا ایک سوال بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور کوئی اس کے اندر یوں بولنے لگتا ہے۔

کہاں پھر رہے ہو؟
یہاں لفظ کا کوئی معنی نہیں ہے۔
یہاں تو فقط گیلی مٹی ہے
مٹی کی شکلیں ہیں۔
بارش کا پہلا ہی چھینٹا پڑا
تو پگھل جائیں گی
اور کیچڑ سے بازار بھر جائیں گے
تم بھی مٹی کے پُتلے ہو
برکھا کے آنے تلک
اپنی صورت کو باقی رکھو۔

اس کے بعد بددلی کی کیفیت روح میں در آتی ہے بے مقصد جدوجہد کا سلسلہ۔ ناآسودگی یاسیت، عدم 'نشاطیت' بے اطمینانی — غرض کہ مکمل Frustration (فرسٹریشن) جو آج کے فرد کا المیہ ہے اور خودکشی کی طرف جاتا ہوا راستہ — موت کی آرزو، رشتوں کی شکستگی کا غم، زر پرست سماج کے ہاتھوں فن کا استحصال۔ شاید یہیں خودکشی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک دن / میں نے دیکھا / میں اک نور کے دائرے میں / کھڑا تھا / مرے گرد سونے کا کنگن کا / حلقہ بنا تھا۔ زندگی کی اس تلخ سچائی پر آکر نظم کا یہ حصہ ختم ہو جاتا ہے گویا ندی یہاں آکر بڑے دریا جیسے سماج، کہہ سکتے ہیں ضم ہو جاتی ہے۔

اسی لیے نظم کا تیسرا حصہ 'دریا' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ فرد کے لامحدود ہونے کی کہانی۔ عمر رسیدگی کا استعارہ۔ زندگی کے وسیع تجربات کی پختگی کا اشارہ۔ یہاں وقت بے بس لگتا ہے اور

انسان لامحدود، طاقتور اور عظیم ساری کائنات اس کی غلام۔ اس کے آگے ہوا بیاضِ زمین، کھول رہی ہے۔ لفظ جملوں کی شاخوں سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ حشرات الارض، چرند پرند اور فطرت کے سارے نظارے ابن آدم کی عظمت کی داستان سُنا رہے ہیں۔ انسانی روح بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔ عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ یہ تکمیلِ ذات کی منزل ہے۔ معراجِ وجود کا مرحلہ ہے۔ پھر انسانی جدوجہد محنت کی روشنی زمین کو آباد کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سبز باغات، پنچھی، کسانوں کے گھر، کھیتیاں، گندم کے خوشے، بارِ ثمر سے جھکے ہوئے اشجار، درانتی کی زبان، بیل گاڑی، سڑکیں، سبھی انسانی عظمت کی اسیر ہیں۔ اور اس کی محنت کشی کی داستان سنا رہے ہیں۔ معاش کی کشاکش اور رنج و غم۔ اس کی زندگی کے شام و سحر انھیں دائروں میں گھومتے ہیں اور آخر میں اُسے تھکن کا احساس ہوتا ہے۔ ایک نیند کی خواہش ــ تھکن سے بھرپور ــ ایک ابدی نیند کی آرزو۔ مٹی کو مٹی کا بُلاوا۔ شاعر اس موڑ پر کھڑے رہ کر گزرے زمانے پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ تاریخ کا ارتقا منزل بہ منزل اس کے سامنے ہے۔ ابن آدم کی ترقی۔ اس کی محنت ــ جفاکشی۔ ایجادات، تحقیقات ــ سب کچھ ایک سمندر۔ ایک دریا کی طرح امڈتے چلے آرہے ہیں۔ مگر اس موڑ پر کھڑے ہو کر وہ محسوس کرتا ہے گویا یہ دریا، یہ سمندر، یہ ندیاں ــ کچھ بھی نہیں ــ محض چھوٹے چھوٹے جوہڑ ہیں۔ ٹھہرے ہوئے باسی پانی کے اندھے گڑھے ہیں۔ اور کچھ بھی نہیں۔ تو کیا یہ طویل سفر یوں ہی بے معنی تھا؟ ــ اجل کے قدموں کی آہٹ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بار بار وہ اُسے اپنی طرف بُلاتی ہے۔ اشارہ کرتی ہے اور ہر بار وہ اُسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اُسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر کب تک؟ ــ "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" اسی لیے آخری بند روح کے ابدی سکون کا مظہر ہے۔ جیسے ذات کائنات میں سما گئی ہو۔ قطرہ سمندر میں مل کر بے کراں ہو گیا ہو۔

نظم کا آخری حصہ "سمندر" ہے۔ جو ذات سے کائنات تک کے اس طویل سفر کو ظاہر کرتا ہے۔ ذات کائنات میں سما کر وسیع تر ہو جاتی ہے۔ لا محدود ہو جاتی ہے۔ گویا زندگی ایک بڑ کا درخت ہے۔ جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اپنی شاخوں، جڑوں، سبز پتوں میں ــ نیلے سمندر کی صورت رواں دواں پتے آتے ہیں۔ جھڑ جاتے ہیں۔ شاخیں ٹوٹتی ہیں۔ پھر پھوٹتی ہیں۔ مگر درخت باقی رہتا ہے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے ۔۔۔ اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

یعنی اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات۔ غرض کہ دائرہ در دائرہ زندگی کا یہ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ فرد مٹ جاتا ہے، مگر انسان زندہ رہتا ہے۔ ایک ان دیکھی، انجانی قوت اسے زندہ رکھتی ہے۔ شاید اسی قوت کا نام سمندر ہے، ہم سب جس کے حقیر قطرے ہیں۔ شاید یہ وہی طاقت ہے جو ہمیں اپنے "ہونے" کا عرفان عطا کرتی ہے۔ فاختہ، ستارے، گھنی گھاس، روشنی، دھرتی، کہکشاں، جھروکے، مسکراتے ہوئے لب ــ سب کے سب اسی کے اوتار ہیں۔ اسی کی آنکھیں ہیں اور اسی کی تلاش میں سرگرداں ــ خود وزیر آغا کی زبان میں ــ

"جھرنا، ندی، دریا اور سمندر تو محض سانچے ہیں۔ پانی کی سیال رو جب گزرتی ہے تو ہر سانچے

(باقی صفحہ ۸۴ پر)

ادبی تہذیبی خبریں

تارہ علی بیگ کا انتقال

نئی دہلی - ۱۱ر جولائی (ی ن ا) ممتاز ادیبہ اور کا بین اقوامی کونسل برائے بہبود اطفال مسز تارہ علی بیگ کا آج رات مدراس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۲ سال کی تھیں۔

دہلی میں ایک اور یونی ورسٹی کا اضافہ

نئی دہلی وزارت انسانی وسائل (محکمہ تعلیم) نے اپنے نوٹی فکیشن کے ذریعہ جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر کو یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا ہے۔ اس طرح دہلی میں ایک اور یونی ورسٹی جامعہ ہمدرد کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس یونی ورسٹی کے پہلے چانسلر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم عبدالحمید ہوں گے۔

سرکردہ گجراتی ادیب کا انتقال

احمد آباد: ۳۰ر جون (ی ن ا) گجراتی ادیب یشودھر مہتہ کا آج یہاں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً ۲۵ کتابوں کے مصنف تھے۔

قدیم ترین دیسی روزنامہ
کاغذ کی قلت نے ہفت روزہ بنا دیا۔

بمبئی - یکم جولائی (ی ن ا) ملک کا دوسرا قدیم ترین روزنامہ جام جمشید اب ہفت روزہ ہو گیا۔ اب یہ ہر اتوار کو شائع ہوا کرے گا۔ ۱۵۰ سال سے زیادہ پرانے اخبار کے ایک ترجمان نے بتایا کہ کاغذ کی قلت کی وجہ سے یہ اقدام اٹھانا پڑا۔

آل اڑیسہ مشاعرہ

اڑیسہ "گلشن ادب" (سونگڑہ) کی جانب سے ۱۱ر مارچ کو ایک آل اڑیسہ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مولانا سراج الساجدین قاسمی نے صدارت فرمائی اور فرزان سیفی نے نقابت کے فرائض انجام دیے۔ درج ذیل شعرائے کرام نے اپنی اپنی تخلیقات پیش کیں۔

ساجد اثر، ظفر صدیقی، اسمٰعیل آذر، راشد شبنم، عبدالحق بیتاب، معشوق خاور، عبدالحفیظ بسمل، نیر دانش، ریاض تشنہ اور فرحان احمد فرحان، شب دو بجے مشاعرے کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔

مہر نگار کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

محترمہ بی بی مہر نگار کو ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالہ "بہار میں اردو افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد" پر بھاگلپور یونی ورسٹی بھاگلپور نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے یہ کام ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نگرانی میں مکمل کیا۔ اس مقالہ کے ممتحن پروفیسر ڈاکٹر عبدالواسع (صدر شعبۂ اردو، بہار یونی ورسٹی، مظفر پور) اور ڈاکٹر محمد انصار اللہ (شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) تھے۔ پتا: بی بی مہر نگار، کوہسار، برہ پورہ بھاگلپور (بہار)

"صحرانورد کے خطوط" کا پچاس سالہ ایڈیشن

میرزا ادیب کی مقبول ترین تصنیف "صحرانورد کے خطوط" آج سے پچاس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے ایک درجن سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس کی بنا پر اسے ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں مقبول اکیڈمی لاہور نے اس کا خوبصورت پچاس سالہ ایڈیشن شائع کیا ہے، جس کے دیباچے میں میرزا ادیب نے لکھا ہے... "مجھے ابھی اس نقاد کا انتظار ہے، جو اس کتاب کی روح میں اترے گا اور طلسماتی ماحول میں دبی ہوئی ان چنگاریوں کو بھی دیکھ

لے گا، جو میرے سینے کے آتش کدے سے نکل کر وہاں تک پہنچی ہیں اور جن کی حرارت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔"

منظور وقار کو سروش ایوارڈ

گلبرگہ ۲۶ر اپریل ۸۹ء

کرناٹک کے ممتاز افسانہ نگار منظور وقار کو غالب کلچرل اکیڈمی (بنگلور) کی جانب سے "سروش ایوارڈ" دیا جا رہا ہے۔ منظور وقار کے بے شمار افسانے اور مزاحیہ مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر محمد علی صدیقی کے ساتھ ایک شام

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، غالب اکیڈمی اور قلمزاد کی جانب سے پاکستان کے ممتاز دانشور نقاد اور صحافی پروفیسر محمد علی صدیقی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی گلپوشی کے بعد کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری پروفیسر قمر رئیس نے اپنی تعارفی تقریر میں محمد علی صدیقی کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ ربع صدی کا زمانہ پاکستان کے روشن خیال ادیبوں اور دانشوروں کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا لیکن محمد علی صدیقی کے قدم نہیں لڑکھڑائے۔ وہ ایک باشعور اور عوام دوست ادیب صحافی اور دانشور کی حیثیت سے پوری ذمہ داری اور جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ انھوں نے اب سے دس سال پہلے ساختیاتی تنقید کے تصورات کو اُردو میں متعارف کرایا۔ معروف افسانہ نگار جناب جوگندر پال نے پروفیسر صدیقی کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض ادیب ماحول کے دباؤ میں آکر جب گھٹن محسوس کرتے تھے تو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے تھے لیکن محمد علی نے ایسے حالات میں بھی اپنے نظریہ کو جیالے پن اور بے خوف ہو کر آزادانہ سوچنے کی ترغیب دی۔ شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے صدر اور ممتاز ناول نگار پروفیسر قاضی عبدالستار نے بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ پروفیسر محمد علی صدیقی کا استقبال کیا۔ مہمان جلسہ پروفیسر محمد علی صدیقی نے اپنی تقریر میں پاکستانی ادب کے رجحانات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اُردو کو پاکستانی کے سیاق و سباق میں دیکھا ہے۔ پاکستان میں اُردو کی ابتدا ولی دکنی سے پہلے ہوتی ہے۔ جدید رجحانات کے ذیل میں ساختیات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اب یہ بھی پرانی چیز ہو گئی ہے اور آج کا ادب اس سے بہت آگے پہنچ چکا ہے۔ ساختیات کا مطلب صرف انفرادی محسوسات پر مبنی ہے اور اگر کوئی اپنی پسند کو دوسروں پر زبردستی لادے تو وہیں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر صدیقی نے ترقی پسند نظریے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند لکھنے والوں پر جو الزام ہے کہ وہ ایک ہی سطح کی بات کرتے ہیں وہ غلط ہے بلکہ گزشتہ دس گیارہ سال میں ترقی پسند ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ آمریت کے دور میں لکھا گیا ہے۔ بعض ترقی پسند ادیبوں نے علامتوں کے سہارے اپنی بات کہی ہے۔ پورے پاکستان میں ترقی پسند ادب کو دبانے کا عمل جاری رکھا لیکن جب کوئی عمل ہوتا ہے تو اس کا ردِ عمل بھی ہوتا ہے اس لیے اس کے حق میں بھی بہت کام ہوا۔ پروفیسر صدیقی نے مزید کہا کہ مجھے پاکستان میں اُردو کی صورتحال زیادہ بہتر نظر آتی ہے۔ دہلی میں اُردو کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے لیکن لاہور میں داخل ہونے کے بعد آپ کو یہ محسوس نہیں ہوگا کہ یہاں اُردو کلچر نہیں ہے۔ اس جلسہ میں اُردو کے ممتاز دانشوروں اور ادیبوں نے شرکت فرمائی۔ جس میں غلام ربانی تاباں، رتن سنگھ، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر شارب ردولوی، جناب اظہار اثر، جناب مظہر امام،

پروفیسر شمیم حنفی، جناب ذہین نقوی، جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر جلال انجم، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر محمود فیاض اور جناب خالد علوی قابلِ ذکر ہیں۔

(ڈاکٹر) ابنِ کنول دہلی

اُردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش

رام پور —— اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش کے مطالبہ کی تائید کرتے ہوئے روہیل کھنڈ کے ۲۴ اردو ادیبوں اور دانشوروں نے ایک مشترکہ بیان میں کانگریس (ا) سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۴ کے اپنے انتخابی منشور کے وعدہ کے مطابق ریاست اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے اور اسمبلی کے اجلاس باراں میں ایک بل لاکر یو۔پی آفیشل لینگویج ایکٹ میں مناسب ترمیم کرے اور بل کو پاس کرانے کے لیے وہپ جاری کرے۔ صولت پبلک لائبریری میں منعقد ہونے والے جلسہ میں ایک میمورنڈم کا مسودہ بھی تیار کیا گیا جس میں کہا گیا ہے کہ یو۔پی میں اردو کو قانونی تحفظ نہ دیے جانے کی وجہ سے اردو والے نہایت غمزدہ ہیں اور اب ان کی آنکھوں سے اشکوں کے بجائے لہو ٹپکنے لگا ہے۔ یہ میمورنڈم جناب نرائن دت تیواڑی وزیر اعلیٰ یو۔پی کو اردو رابطہ کمیٹی اتر پردیش کے کیمپ آفس کے ذریعہ بھیج دیا گیا ہے

ڈاکٹر حسنین کے ادبی خدمات کی پزیرائی

پروفیسر سید محمد حسنین کو ان کے پچھلے بیالیس (۴۲) سالہ تصنیفی اور تدریسی کاموں کے پیش نظر یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن، دہلی نے "امیرے ٹس فیلو شپ Emeritus Fellowship" کا موقر اعزاز پیش کیا ہے۔ اُمید ہے اس پیش کش کے تحت ڈاکٹر حسنین عنقریب شعبہ اردو پٹنہ یونی ورسٹی جوائن کریں گے۔

ڈاکٹر حسنین کا خاص میدان جدید نثری ادب ہے اور مقالہ، خاکہ، رپورتاژ اور انشائیہ جیسے اصناف پر انھوں نے گراں قدر بنیادی کام انجام دیا ہے۔ ہندو پاک میں انشائیہ کے نقاد اور تخلیق کار کی حیثیت سے ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر حسنین بارہ (۱۲) کتابوں کے مصنف ہیں۔

بوسیلہ: ڈاکٹر شاہد اقبال، قاضی عبدالودود کمپاؤنڈ برلا مندر روڈ۔ پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۴

پندرہ روزہ "حق و باطل" کی دوبارہ اجرائی

حیدر آباد... پندرہ روزہ حق و باطل نئے انتظامات کے ساتھ حکیم محمد مسیح الدین صدیقی کے زیر ادارت جولائی ۸۹ء سے دوبارہ منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ حق و باطل ملت کی تعمیر نو کے لیے مخلصانہ جدوجہد کرے گا۔ سالانہ چندہ -/25 روپے

پندرہ روزہ حق و باطل 17-3-213
رنگیلی کھڑکی۔ حیدر آباد 23

محمد محسن کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی

محمد محسن ولد محمد مقبول ساکن جین ڈاکخانہ اما شیونور ضلع مظفر پور، کو بہار یونی ورسٹی نے فارسی میں ان کے تحقیقی مقالہ بعنوان "ہندوستان میں فارسی قصیدہ نگاری کا ارتقا (1556 AD-1707 AD)" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ موصوف نے اپنا مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر متین احمد یونی ورسٹی پروفیسر صدر شعبہ فارسی بہار یونی ورسٹی مظفر پور، تیار کیا اور سالِ رواں ۸۹ء میں مذکورہ ڈگری سے سرفراز ہوئے۔

فاتح اعظم خاں کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری

مظفر پور۔ امیر فاتح اعظم خاں ابن جناب عبدالرازق خاں متوطن، مہنار، ضلع ویشالی (بہار)

کو بہار یونی ورسٹی مظفر پور نے علم سیاسیات میں ان کے تحقیقی مقالہ پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی ہے موصوف نے اپنا مقالہ زیر نگرانی ڈاکٹر آر۔ این کنور پروفیسر علم سیاسیات بہار یونی ورسٹی مظفر پور تیار کیا اور سال رواں (۱۹۸۹) میں ڈگری مذکورہ سے سرفراز ہوئے۔

خواجہ میر درد۔ تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کی رسم اجرا

نئی دلی ۲۷ جون ۸۹ء آل انڈیا اردو اسٹینو گرافرز ایسوسی ایشن اور تنظیم مساوات کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر، نئی دلی میں جناب ثاقب صدیقی اور انیس احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب "خواجہ میر درد۔ تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" کی تقریب رسم اجرا زیر صدارت ڈاکٹر خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) منعقد ہوئی، رسم اجرا جناب راجیشور ٹھاکر (ایم پی) چیرمین ایسوسی ایٹڈ جرنلس لمیٹڈ نے انجام دی، جناب ذہین حسن نقوی، سکریٹری غالب اکیڈمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے نقوی صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں نوجوان مولفین کو مبارکباد دی اور کہا کہ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ غالب صدی تقریبات سے اردو کتابت و طباعت کے معیار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

ممتاز ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کی خدمات کا اعتراف

گذشتہ دنوں لدھیانہ میں اردو ہندی اور پنجابی کے مشہور ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کی پچاس سالہ گرانقدر ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں "جشن دھیر" کمیٹی کے زیر اہتمام ایک شاندار و پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر کمیٹی ہذا کی طرف سے ڈاکٹر دھیر کو طلائی سند، شال اور مبلغ ایک لاکھ روپئے کی تھیلی پیش کی گئی۔ اسی موقع پر ان کی 51 ویں کتاب "خوشبو کا سفر" (سفرنامہ پاکستان) اور ہندی کہانیوں کی نئی کتاب "لہو کا رنگ" بھی ریلیز کی گئیں۔ بھارت کی 31 سرکردہ ادبی، علمی اور سماجی انجمنوں و اداروں نے بھی اس موقع پر ڈاکٹر کیول دھیر کی عزت افزائی کی۔ آل انڈیا اردو ہندی سنگم لکھنؤ کی طرف سے ڈاکٹر دھیر کو "اندرا گاندھی قومی یکجہتی ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ اس موقع پر جن انجمنوں و اداروں کی طرف سے ڈاکٹر دھیر کی عزت افزائی کی گئی ان میں شمع گروپ آف جرنلزم نئی دہلی۔ ادارہ بیسویں صدی نئی دہلی۔ پنجابی ساہتیہ اکادمی۔ پنجاب ہندی پریشد۔ ہند سماچار گروپ آف نیوز پیپرز جالندھر۔ اکاڈمک کونسل آف انڈیا فلم سوسائٹی آف انڈیا بمبئی۔ ادیب انٹرنیشنل اور ادبی سنگم سونی پت کے نام قابل ذکر ہیں۔

سید اعجاز حسن امام اعظم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی

سید اعجاز حسن امام اعظم کو ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالے بعنوان "مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ" پر ال۔ این متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر محمد طیب صدیقی کی نگرانی میں جمع کیا گیا اور ان وایوا کے ممتحن ڈاکٹر حفیظ اللہ نول پوری (بھدرک کالج بھدرک) اڑیسہ تھے۔

امام اعظم
اردو، ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ
دربھنگہ
(بہار)

نئی مطبوعات

مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست مشیر الحق ۸/-
معاشیات کے اصول عزیز احمد قاسمی ۲۱/-
آسان اردو ورک بک شکیل اختر فاروقی ۲۴/-
ننھا سیاح (بچوں کا ناول) محمد زکریا مائل ۷/-
مولانا ابوالکلام آزاد (سیمینار میں پڑھے گئے مضامین) ۱۷/-
مکتوبات شہباز مرتبہ ڈاکٹر سید صابر حسن ۲۲/-
[illegible] کے بعد دہلی میں اردو غزل (ادب) مرتبہ عنوان چشتی ۶۱/-
مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین (انتخاب) مرتبہ اسلم پرویز ۲۴/-
لمعات طولیٰ (مجموعہ قصائد) عالم لکھنوی ۵۰/-
شاہین (جلگاؤں) (انتخاب افسانہ) مرتبہ معین الدین عثمانی ۱۴/-
تجلی (اخلاقیات) شاہ بلیغ ۸۰/-
ہونہار بچے (مضامین) ڈاکٹر راجندر تیس ۱/-
ہریانوی برج کے میگھ ملہار (گیت) ڈاکٹر جاوید وششٹ ۳۰/-
بساط فکر (انتخاب شاعری) ساحر ہوشیارپوری ناشر نقوی ۵۵/-
انقلابی شخصیات (مذہب) مصطفیٰ محمد طحان ۲۵/-
مراۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (احادیث) تفسیر الحدیث مفتی احمد یار خاں ۶۵۰/-
اوپری لشر (ناول) ایس فضیلت ۵/-
تمہارے لیے " جوشی ۵/-
شہید بھگت سنگھ نیا اڈیشن (سوانح) کے کے کھلر ۷۵/-
اردو گیت (گیت) پروفیسر ڈاکٹر بیگم بسم اللہ نیاز ۲۵/-
کرشن چندر اور اشتراکیت (تنقید) پروفیسر عبد السلام ۱۵/-
اردو تنقید افادیت اور اہمیت (تنقید) انور کمال حسینی ۵/-
داستان ناول اور افسانہ (ادبی مضامین) دردانہ قاسمی ۲۰/-

سرورق : شریف الحسن نقوی
مصور : شکیل اعجاز

[illegible]

علامت قدیم ہندستانی جمالیات کی روشنی میں پروفیسر شکیل الرحمٰن ۵/-
علامہ خضر برنی شخص اور شخصیت۔ نظر برنی مرتبہ ملکہ ۲۰/-
فردوس غزل (شعری مجموعہ) مختار احمد عاصی ۲۰/-

مکتبہ جامعہ کی تازہ مطبوعات

تیسرا سرسید یادگاری خطبہ

مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست کل اور آج

پروفیسر مشیر الحق

اس خطبے میں پروفیسر مشیر الحق نے گزشتہ ۱۴۰ برسوں کی مسلم سیاست کی داستان بڑے واقعاتی اور تجزیاتی انداز میں سنائی ہے۔ قیمت : آٹھ روپے

معاشیات کے اصول

عزیز احمد قاسمی

عزیز احمد قاسمی مرحوم، سابق استاد دارالعلوم دیوبند نے معاشیات جیسے مشکل مضمون کو جس سادہ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ طلبہ کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت -/۲۱ روپے

آسان اردو ورک بک

شکیل اختر فاروقی

اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی ورک بک جو اردو لکھنے پڑھنے والے خواہش مند طلبہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ قیمت -/۲۴ روپے

مہمان مدیر
شریف الحسن نقوی
سکریٹری دہلی اردو اکادمی
گھٹا مسجد۔ دہلی ۲

اشاریہ

شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے مری بات

اردو زبان اپنے آغاز ہی سے مختلف الخیال اور مختلف العقائد افراد اور گروہوں کو باہم دگر قریب لانے کا خوش گوار فریضہ ادا کرتی رہی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ زبان اسی ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور پھر اس نے اس اہم تاریخی اور تمدنی ضرورت کو جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا۔ اس میں کوئی دوسری ہندستانی زبان مشکل ہی سے اس کی برابری کا دعوا کر سکتی ہے۔ آج بھی ملک گیر رابطے کی زبانیں دو ہی ہیں۔ ایک ہندی جسے ملک کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور دوسری اردو جسے نہ تو مرکز اور نہ بیشتر ریاستوں میں کوئی سرکاری حیثیت ملی ہے۔ لیکن جو کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جسے دوسری زبانوں والے بھی، غیر زبان والوں کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے میں کام میں لاتے ہیں۔

ماہرین لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں لیکن جداگانہ تہذیبی اور ادبی پس منظر میں پروان چڑھنے کی وجہ سے دو مختلف زبانیں بن گئی ہیں۔ دونوں کے درمیان سب سے نمایاں فرق رسم الخط کا ہے۔ لیکن اس اختلاف اور فرق کے باوجود یہ دونوں زبانیں جتنی ایک دوسرے سے قریب ہیں، ہندستان کی دوسری کوئی دو زبانیں آپس میں اتنی قریب نہیں۔ اس صورت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ آپس میں سگی بہنوں کی طرح مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار و معاون ہوں لیکن بدقسمتی سے ایک تاریخی موڑ پر ملکی حالات نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ ان کے باہمی رشتے کو رقابت کی شکل دے دی گئی۔ آزادی کے بعد ہندستان میں اردو پر واقعی بڑا برا وقت پڑا تھا۔ اور اس ہر دل عزیز زبان کے خلاف شکوک اور شبہات کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کے قدرتی ارتقا کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آزاد ہندستان کا پہلا وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جیسے

وسیع النظر اور روشن خیال سیاست داں بنا۔ انھوں نے اردو زبان اور ادب اور ان گنگا جمنی تہذیبی اقدار کی جن کی ترجمانی یہ زبان وادب کرتے تھے، بدلے ہوئے حالات میں بھی پُرزور وکالت کی یہ انھیں جیسے قومی رہنماؤں کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ دھیرے دھیرے شکوک وشبہات کے گہرے گھنے بادل چھٹنا شروع ہوئے اور محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں سرکاری سطح پر کئی ایسے عملی اقدامات کیے گئے جو اُردو کی ترویج وترقی میں معاون ہو سکے۔ ان اقدامات کا ایک حصہ مرکز میں ترقی اردو بورڈ اور متعدد ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام تھا۔ عوامی حلقوں میں بھی اس زبان کے خلاف جو بے جا تعصب تھا وہ بڑی حد تک دور ہو چکا ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اردو کی سرگرم مخالفت کا زور باقی نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ مخالفت بالکل ختم ہو چکی ہو۔ خصوصیت سے اردو کی تعلیم کی راہ میں جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں، انھیں نہ صرف باقی رکھا جا رہا ہے بلکہ نئی مشکلات بھی پیدا کی جا رہی ہیں۔ جہاں تک اردو والوں کا تعلق ہے مقام شکر ہے کہ ان کے دلوں میں ہندی کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے اور انھوں نے اس حقیقت کو بخوبی سمجھ لیا ہے کہ ہندی کی ترویج وترقی سے اردو کو کسی طرح کا نقصان پہنچنے والا نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر کچھ فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے لیکن ہندی دوستوں کے بعض حلقوں میں یہ بدگمانی اب بھی پائی جاتی ہے کہ اردو کی ترویج وترقی ہندی کے راستے کا روڑا بن سکتی ہے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس بدگمانی کا شکار وہ لوگ بھی ہیں جو خود کو دانشور کہلانا پسند کرتے ہیں مثال کے طور پر امرت رائے اور ڈاکٹر نامور سنگھ کے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی اردو دشمن تحریریں پچھلے دنوں اردو اخبارات ورسائل میں تعریض وتنقید کا ہدف بنی ہیں۔ اس قسم کی تحریروں سے اردو کے خلاف ایک عام فضا بھی بنتی ہے اور انتظامیہ کے اس حصے کو جو بوجوہ اردو کی مخالفت میں مستعد ہے، اخلاقی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ گزرتا ہوا وقت اس قسم کی دیدہ ودانستہ پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا خود ہی ازالہ کر دے گا لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا فرض کر لینا ضرورت سے زیادہ خوش فہمی کے مترادف ہوگا۔ ان تحریروں کا رَد ضروری ہے لیکن صرف اردو اخبارات ورسائل میں نہیں۔ اردو والے تو حقیقت حال سے آشنا ہی ہیں، اس قسم کی تحریریں زیادہ تر انگریزی یا پھر ہندی میں شائع ہوتی ہیں اس لیے ان کا ازالہ بھی انھیں زبانوں میں ضروری ہے۔ ان نفاق انگیز تحریروں کے رَد کے ساتھ ساتھ اردو کے دانشوروں، ادیبوں اور اس کے تحفظ وبقا کی جدوجہد کرنے والوں کو انگریزی اور ہندی کے اخبارات ورسائل میں ایسے مضامین اور مراسلات شائع کرانے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان دونوں زبانوں کی مشترکہ بنیادوں کو سامنے لانے والے ہوں۔ اس زہر کا ایک توڑ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندی کے غلط اندیش بہی خواہوں کے ساتھ براہ راست رابطے اور گفتگو کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اگر باہمی تبادلۂ خیال نیک نیتی کے ساتھ ہو تو ہمیشہ مثبت نتائج پیدا کرتا ہے۔ حال ہی میں اس سلسلے

کی جن وادی بیلھک سنگھ کی کوششیں بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔

یہ نکتہ ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ اگر کسی زبان کی تعلیم کے راستے مسدود ہو جائیں تو وہ زبان اپنی عمومی چلن کی بنا پر بول چال کی زبان کے طور پر تو شاید زندہ رہ سکتی ہے لیکن دھیرے دھیرے تحریری یا علمی زبان کی حیثیت سے یقیناً مردہ ہو جائے گی۔ اردو کو اس وقت بھی اندیشہ لاحق ہے اس لیے جو لوگ اس زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں ان پر دُہری ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ اولاً یہ کہ وہ اس زبان کے بارے میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں کو دور کرنے میں سرگرمی دکھائیں، اس کے جمہوری اور آئینی حقوق کی بحالی کے لیے متعلقہ اداروں اور افراد تک اپنے مطالبات پورے زور کے ساتھ پہنچاتے رہیں، نیز انتظامی سطح پر جہاں جہاں ان کی زبان کی حق تلفی ہو رہی ہے اسے سامنے لانے اور دور کرنے کی موثر کوششیں کریں، دوسرا کام جو پہلے سے کسی طرح کم اہم نہیں، یہ ہے کہ اپنی آیندہ نسلوں کو اردو کی تعلیم سے بے بہرہ نہ رہنے دیں۔ خواہ اس کا انتظام بعض حالتوں میں نجی طور پر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ نظام تعلیم میں جو نصابات مروّج ہیں وہ کافی بوجھل ہیں اور ان کی موجودگی میں بچے پر ایک اور زبان کی پڑھائی کا بوجھ ڈالتے ہوئے والدین کو ہچکچاہٹ ہو سکتی ہے لیکن اگر ہمیں اپنی زبان کو اور اس کے وسیلے سے اپنی اس قدیم تہذیبی اور تمدّنی روایت کو جس کی تشکیل و تعمیر میں صدیاں صرف ہوئی ہیں، زندہ رکھنا ہے تو ایسا کرنا ضروری ہے۔

ہندستان میں بے شمار تنظیمیں اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہی ہیں یا کم از کم اس کی دعوے دار ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامی نوعیت کی ہیں لیکن کچھ ریاستی سطح پر اور کچھ ملک گیر پیمانے پر بھی سرگرم ہیں۔ مقامی انجمنیں زیادہ ادبی نشستوں اور مشاعروں وغیرہ کے انعقاد تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھتی ہیں۔ ادبی نشستیں اور مشاعرے بظاہر اردو کے حق میں کسی دور رس اور پایدار افادیت کے حامل نہیں لیکن یہ اردو والوں کے ادبی اور شعری ذوق کو جو ایک قابلِ لحاظ تہذیبی وصف ہے، زندہ رکھنے اور اسے تازگی بخشنے کا وسیلہ ضرور ہیں۔ ان میں شرکت کی بدولت بہت سے غیر اردو داں بھی اردو کے قریب آ جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ لسانی تعصّب جو محض ناواقفیت کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں جگہ بنائے ہوتا ہے، کم ہو جاتا ہے جو اُردو کے لیے یقیناً ایک نیک شگون ہے۔ اس افادیت کے باوجود ہمیں مشاعروں پر نسبتاً کم اور تعلیم پر نسبتاً زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کے میدان میں یہ مقامی انجمنیں یقیناً زیادہ اہم اور موثر رول ادا کر سکتی ہیں۔

ریاستی اور ملکی انجمنیں اردو کے تعلیمی مسائل سے بھی دلچسپی لیتی ہیں اور اکثر ریاستی و مرکزی سرکاروں تک اپنے مطالبے پہنچانے کے لیے عوامی تحریکیں بھی چلاتی ہیں لیکن اب تک یہ کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ ان کوششوں کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟ کوشش

کرنے والوں کے کردار و عمل کی کوئی خامی اور کوتاہی یا اردو کے مطالبات کی طرف سے اردو عوام کی بے توجہی اور عدم دلچسپی، غور کیا جائے تو دونوں ہی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی نظر آئے گی۔ جو لوگ اردو تحریک کے قائدین میں شمار ہوتے ہیں ان میں اتحاد عمل کی بہت کمی ہے اور کچھ لوگ اپنا اخلاقی بھرم بھی کھو چکے ہیں۔ عام لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ اردو کو زینہ بنا کر ذاتی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کیونکہ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جو اس خیال کی توثیق کے لیے کافی ہیں۔ لیکن ایسے بے غرض اور بے لوث اردو قائدین بھی موجود ہیں جو محض زبان کی محبت میں کام کر رہے ہیں۔ ہم اردو کے ایسے بہی خواہوں سے درخواست کرتے رہے ہیں اور کریں گے۔ کہ وہ لوگ اپنے باہمی اختلافات کو جو زیادہ تر شخصی تحفظات و تعصبات پر مبنی ہیں دور کرنے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر بے غرضانہ انداز میں کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ جہاں تک اردو عوام کا تعلق ہے انھیں یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کہ اردو سے دست برداری اپنے تہذیبی تشخص اور تاریخی شناخت دونوں سے دست برداری کے مترادف ہے اور یہ نقصان ایسا نہیں جسے کچھ معزوضہ وقتی مصلحتوں کی خاطر برداشت کر لیا جائے۔

روٹی روزی کا سوال یقیناً اہم ہے لیکن کچھ دوسرے معاملات و مسائل بھی ہیں جو کم اہم نہیں۔ پھر یہ محض ایک واہمہ ہے کہ اردو پڑھنے والی نسلیں معاشی ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گی۔ اردو پڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کے بچے دوسرے نصابی مضامین نہیں پڑھیں گے۔ اگر بچہ اردو پڑھ رہا ہے تو اسے ہندی یا انگریزی یا کوئی اور زبان پڑھنے سے کون روک سکتا ہے اور جو دوسرے ضروری مضامین ہیں ان سے بھی اسے کیونکہ نابلد رکھا جا سکتا ہے۔ اب ہر مضمون پر اردو میں معیاری کتابیں موجود ہیں اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اردو پڑھنے والا بچہ اپنے ہم سبقوں سے پیچھے رہ جائے۔ اس کے برعکس عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے اور ممتاز ماہرین تعلیم یہ کہتے بھی رہے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم پانے والا بچہ ان بچوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو غیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس پر اصرار بے جا ہو گا کہ آپ اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے ہی پڑھائیں، چاہیں تو انھیں ہندی میڈیم سے پڑھائیں، چاہیں تو انگریزی میڈیم سے لیکن ایک زبان کے طور پر انھیں اردو بھی پڑھائیں۔ یہ آگے چل کر ان کے حق میں ضرر رساں نہیں، مفید ہی ثابت ہو گا۔ کئی سرکاری محکمے مثلاً پولیس کا محکمہ، ڈاک اور تار کا محکمہ، عدالتیں، سرکاری لائبریریاں اسکول وغیرہ ایسی جگہیں ہیں۔ جہاں ملازمت کے لیے اردو جاننا ایک اضافی قابلیت ثابت ہو سکتا ہے۔

کبھی کبھی خیال گزرتا ہے کہ یہ غلط فہمی جس میں اردو کے بعض دانشور بھی گرفتار ہیں اردو کے مخالفوں کی پھیلائی ہوئی تو نہیں: معاش کا مسئلہ ہمیشہ اہم رہا ہے اور موجودہ

زمانے میں تو یہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ معاشی تحفظ کی ضمانت ہر شخص کی پہلی ترجیح بن گئی ہے اور بننا بھی چاہیے۔ اندریں حالات اگر کسی گروہ کو یہ باور کرا دیا جائے کہ کوئی خاص زبان پڑھنے سے اس کا اور اس کی آنے والی نسلوں کا معاشی مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے تو باوجود اس کے کہ وہ زبان اس کے تہذیبی تشخص کا ذریعہ ہو اور وہ اس کے ساتھ جذباتی وابستگی بھی رکھتا ہو، اس سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے۔ اردو کے بارے میں یہ بے بنیاد خیال اگر اس کے مخالفوں نے پھیلایا ہے تو ہمیں ان کی غیر معمولی ذہانت کا قائل ہو جانا چاہیے اور اگر ہم نے اسے بغیر کسی غور و فکر کے قبول کر لیا ہے تو اپنی کم فہمی بلکہ نافہمی کا ماتم کرنا چاہیے۔

میں اوپر یہ عرض کر چکا ہوں اور پھر زور دے کر کہتا ہوں کہ حکومت اور انتظامیہ سے ہمارے جو مطالبات ہیں انھیں منوانے کے لیے ہمیں تمام آئینی طریقے اختیار کرنے چاہییں اور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ختم ہوں لیکن اس کے ساتھ ہمیں خود اپنی ذمّے داریوں کو بھی سمجھنا اور پورا کرنا چاہیے۔ آخر اُردو کی تعلیم اور اس کے چلن کو فروغ دینے کے لیے ہم بھی تو کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچّوں کو اردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے ماہانہ بجٹ میں اردو کے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی خرید کا بھی خیال کر سکتے ہیں۔ آخر اپنے مطالعے کی میز پر ہم صرف انگریزی مطبوعات رکھ کر کیوں کر خوش ہوتے ہیں جو اُردو مطبوعات سے کئی گنا مہنگی ہوتی ہیں؛ اپنی نیم پلیٹوں، دکانوں اور دفتروں کے سائن بورڈوں پر اُردو کو جگہ دینے سے ہمیں کون روکتا ہے؛ اپنے کاروبار کا حساب اردو میں رکھنے کا ہمیں حق حاصل ہے اور اگر ہم اپنی تقریبوں کے دعوت نامے اردو میں چھپوائیں تو ہم پر کون معترض ہو سکتا ہے؛ ہم اپنے خطوں پر پتے اردو میں کیوں نہیں لکھتے؟ کیا اس اندیشے سے کہ پتا اردو میں لکھا گیا تو خط منزلِ مقصود پر نہیں پہنچے گا؛ یہ اندیشہ بے بنیاد ہے۔ ہزاروں لاکھوں خطوں کو محکمۂ ڈاک ضائع نہیں کر سکتا۔ شروع شروع میں یہ ہوگا کہ ایسے خطوں کے پتے محکمہ ہندی، انگریزی میں منتقل کرا کے انھیں مکتوب الیہ تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔ پھر یہ نوبت آ سکتی ہے کہ ڈاک رسانوں کے لیے اردو جاننا ایک اضافی قابلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا ہوا تو اس سے اردو کی تعلیم اور چلن دونوں کو فروغ ہوگا۔

اپنے ماہانہ بجٹ میں اردو مطبوعات کی خریداری کے لیے ایک رقم مخصوص کر دینا بھی دور رس نتائج پیدا کرے گا۔ ہندستان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں اردو جاننے والے ہیں اگر وہ سب ایسا کرنے لگیں تو اردو کی کساد بازاری کی جو عام شکایت ہے وہ دور ہو سکتی ہے اور اردو کے اشاعتی ادارے مضبوط مالی بنیادوں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ عادت کہ اردو مطبوعات دوسروں سے مانگ کر پڑھ لی جائیں یا اعزازی طور پر حاصل کی جائیں اردو کو بہت نقصان پہنچانے والی ہے۔ سرکاری یا سرکار سے امداد یافتہ اداروں کی طرف سے

شائع ہونے والے رسائل وکتب کے بارے میں خاص طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اعزازی طور پر حاصل ہوں۔ یہ درست ہے کہ ان اداروں کا مالی خسارہ سرکار پورا کر دیتی ہے لیکن ان رسائل وکتب کی خریداری یا عدم خریداری سے اس زبان کی مقبولیت اور اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے جس میں یہ شائع ہو رہے ہیں۔ خریداروں کی تعداد کم ہے تو حکومت اس زبان کو غیر مقبول یا مردہ سمجھ کر اس میں اپنی اشاعت کا سلسلہ بند بھی کر سکتی ہے۔ ماضی میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اور اگر ہم نے اپنا طرزِ فکر نہ بدلا تو آیندہ بھی ایسی مثالیں سامنے آسکتی ہیں۔

اردو اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں ہر طرح کی سرکاری سرپرستی سے محروم تھی لیکن پھر بھی وہ پھولتی پھلتی رہی کیونکہ اس کے بولنے والے اسے سینے سے لگائے رہے۔ اردو اب ترقی کی جن منزلوں تک آپہنچی ہے وہاں اس کے بولنے والے، اس کے چاہنے والے ہی اگر اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں تو دوسری کوئی طاقت اسے اپنے فطری ارتقا کی تازہ تر منزلیں سر کرنے سے نہیں روک سکتی۔

ضروری گزارش

ہمارے بعض مضمون نگار حضرات اپنے ایسے مضامین بھی کتاب نما میں اشاعت کے لیے بھیج دیتے ہیں جو پہلے کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو چکے ہیں براہِ کرم اس سے پرہیز کریں اور صرف غیر شائع شدہ مضامین سے ہی کتاب نما کو نوازیں۔

(ادارہ)

بلراج کومل
ای۔۱۳۹، کالکاجی
نئی دلی ۱۱۰۰۱۹

خط لکھوں گا آج میں

خط لکھوں گا آج میں
ایسے کچھ لوگوں کے نام
جن کو میں نے بارہا
رہ گزر کی بھیڑ میں
دور سے دیکھا تو تھا
یہ بھی سوچا تھا کبھی
چند لمحوں کے لیے
ان سے کچھ باتیں کروں
اپنے دل کی بھی کہوں
ان کے دل کی بھی سنوں
گزرے برسوں میں مگر
ان سے میں بچھڑا رہا
کچھ نہ ان سے کہہ سکا

خط لکھوں گا ان کے نام
خط لکھوں گا ان کے نام

ایسے کچھ لوگوں میں وہ
چاند سی لڑکی بھی تھی
سادہ و معصوم سی
خود تو شبنم تھی مگر
ڈھونڈتی تھی دشت کی
چلچلاتی دھوپ میں
پیڑ کا سایہ کوئی
شام تک جلتی رہی
راکھ ہوکر سو گئی

خط لکھوں گا اس کے نام
خط لکھوں گا اس کے نام

رہ گزر کی بھیڑ میں
طفلِ ناداں تھا کوئی
کہہ رہا تھا باربار
اس برس یہ کیا ہوا
موسموں کے قہر میں
آنگنوں کی نرم دھوپ
ریزہ ریزہ ہو گئی
میری تتلی کھو گئی

خط لکھوں گا اس کے نام
خط لکھوں گا اس کے نام

رہ گذر کی بھیڑ میں

کام پر جاتے ہوئے
گھر کو لوٹ آتے ہوئے
سادہ و بے نام سے
مرد و زن طفل و جواں
خوف و دہشت میں گھرے
کٹ گئے یا جل گئے
ان کا دشمن کون تھا؟
جرم ان سے کیا ہوا؟
خط لکھوں گا ان کے نام
خط لکھوں گا اُن کے نام

رہ گذر کی بھیڑ میں
چل رہا تھا ایک سایہ
ایک سایہ اس کے ساتھ
ان کے بھی تھے کچھ عزیز
جو تلاشِ زر میں تھے
گھر سے وہ ایسے گئے
کہ گئے تھے آئیں گے
سُرخ رو اور شادماں
لوٹ کر آئے نہیں
ایک مدت ہو گئی
کھو گیا نام و نشاں

خط لکھوں گا ان کے نام
خط لکھوں گا ان کے نام

رہ گذر کی بھیڑ میں
ایک میں بھی ہوں یہاں
کچھ تھکا ماندہ سا ہوں
پُشت پر گذرے برس
آنکھ میں ناکام خواب
سر میں کچھ برگشتگی
ذہن و دل میں اضطراب
اور ہونٹوں پر دُعا
سرخوشی قائم رہے
روشنی دائم رہے
جذب ہو جاؤں گا میں
ایک دن گرداب میں
وقت کے سیلاب میں

خط لکھوں گا اپنے نام
خط لکھوں گا اپنے نام

رہ گذر کی بھیڑ میں
لوگ کچھ ثابت قدم
بامُراد و برقرار
ہیں ابھی محوِ سفر
عزم ہے جن کا جواں
سوئے منزل ہیں رواں

خط لکھوں گا ان کے نام
خط لکھوں گا ان کے نام

خط لکھوں گا آج میں
ایسے سب لوگوں کے نام
جن سے میں بچھڑا رہا
کچھ نہ جن سے کہہ سکا

ڈاکٹر اسلم فرخی
انجمن ترقی اردو (پاکستان)
باباے اردو روڈ، کراچی ۱ (پاکستان)

نوادرِ کتب خانۂ خاص

"تحفۂ ایبٹ"

تواریخ نادر العصر (نام تاریخی) ۱۸۶۳ء
مرتبہ: منشی نول کشور

عام دستور ہے کہ جب کوئی سرکاری اہل کار مدتِ ملازمت پوری کر کے سبک دوش ہوتا ہے تو اسے الوداعیہ دیا جاتا ہے۔ اہل کار بلند منصب پر فائز ہو تو سپاس نامے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کی خدمات کو سراہا جاتا ہے۔ آج کل اس روایت میں یہ خوش گوار اضافہ ہوا ہے کہ اگر اہل کار علمی مذاق کا حامل ہے یا کوئی صاحبِ علم ہے تو اس کی سبک دوشی یا کسی خصوصی سال گرہ کے موقعے پر ایک یادگار مجلہ یا کتاب مرتب کر کے اس کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ نذرِ رحمان، نذرِ عرشی، نذرِ ذاکر اسی قسم کی یادگاری کتابیں ہیں جن میں ممدوح کے بارے میں مضامین بھی ہیں اور بعض اہلِ قلم نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر خصوصی مضامین بھی ان یادگاری کتابوں کے لیے قلمبند کیے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ منشی نول کشور نے ۱۸۶۳ء میں اس روایت کی ابتدا کی تھی۔ ان کی تالیف "تحفۂ ایبٹ" اس علمی روایت کا ابتدائی نقش ہے۔

منشی نول کشور علوم مشرقی کی اشاعت کے حوالے سے ایک معتبر اور مستند شخصیت ہیں۔ ان کا تعلق اُتر پردیش کے ضلع علی گڑھ سے تھا۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے آگرے آئے مگر سولہ سال کی عمر میں تعلیم کو خیرباد کہا اور ایک اخبار جاری کیا۔ سولہ برس کی عمر میں صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کرنے سے منشی جی کی بلند ہمتی، خود اعتمادی اور استقلال مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگرے سے وہ لاہور گئے اور منشی ہرسکھ رائے کے مشہور مطبع کوہ نور سے وابستہ ہوئے۔ یہاں انھوں نے اپنی محنت سے امتیازی حیثیت حاصل کی۔

منشی جی ۱۸۵۸ء کے بعد لکھنؤ پہنچے اور فدائے لکھنؤ ہو کر رہ گئے۔ یہاں انھوں نے نول کشور پریس قائم کیا جو اس عہد میں علوم شرقی کا سب سے اہم اور بڑا اشاعت گھر بن گیا۔ منشی جی نے اپنی زندگی میں چار ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کیں۔ ان میں اعجازِ خسروی، طلسم ہوشربا اور فسانۂ آزاد جیسی ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ منشی نول کشور نے ہمارے علمی اور ادبی سرمایے کو شائع کر کے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ منشی جی نے بے شمار مصنفوں کی حوصلہ افزائی کی۔ قدیم کے ساتھ جدید موضوعات پر کتابیں لکھوائیں۔ ترجمے کرائے۔ اہلِ علم سے کتابوں کی صحت کرائی۔ حال ہی میں

ایک نامور اہلِ علم نے مجھ سے بیان کیا کہ اگر آج کوئی شخص منشی نول کشور کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست مرتب کردے تو یہ بڑا گراں قدر علمی اور تحقیقی کارنامہ ہوگا۔

صحافت، منشی نول کشور کی اوّلین اور بنیادی دلچسپی تھی۔ مطبع نول کشور قائم کرنے کے بعد انھوں نے اودھ اخبار جاری کیا۔ ابتدا میں یہ ہفت روزہ تھا، پھر سہ روزہ اور دو روزہ رہا اور آخر میں روزنامہ ہوگیا۔ اودھ اخبار بھی مطبع نول کشور کی طرح ایک علمی اور ادبی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر جیسے لکھنے والوں نے صحافتی نامہ نگاری کی ابتدا اودھ اخبار ہی سے کی تھی۔

منشی جی کو رفاہِ عامہ کے کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں لکھنؤ کے بڑے اہم شہری سمجھے جاتے تھے بے شمار رفاہی انجمنوں کو ان سے فیض پہنچا۔ ان کی رفاہی خدمات کے صلے میں ۱۸۸۸ء میں۔ انگریزی حکومت نے انھیں سی آئی ای کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں منشی جی کا انتقال ہوا۔

منشی نول کشور کی زندگی کا یہ مختصر خاکہ میں نے اس لیے قلم بند کیا ہے کہ عام قاری ان کے نام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے اشاعتی کارناموں کے ذور سے پوری طرح آگاہ نہیں منشی جی کے تفصیلی حالات امیر حسن نورانی کی کتاب "منشی نول کشور" "نیا دور" لکھنؤ "فروغِ اردو" لکھنؤ اور ماہنامہ "آج کل" کے نول کشور نمبر میں ملتے ہیں۔

لکھنؤ کے کمشنر کرنیل ایبٹ منشی جی کے سرپرست تھے۔ اس سرپرستی کی روداد منشی جی نے تحفۂ کرنیل ایبٹ میں یوں بیان کی ہے:

> "اخیر ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ کا اتفاق ہوا۔ یہاں جناب فیض مآب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کی ملازمت کیمیا خاصیت سے ساعت سعید میں عزت و امتیاز حاصل کی۔ فرطِ عنایت جناب ممدوح سے باوجود کم بضاعتی کے اسباب و آلات کلکتے سے یہاں لایا۔ اس وقت سے آج تک باوجود نشیب و فراز زمانہ خاص خاوندی جناب محتشم الیہ کے سبب یوماً فیوماً ترقی رہی۔"

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مطبع نول کشور کے قیام اور ترقی میں کرنیل ایبٹ کی اعانت شامل تھی۔ ۱۸۶۳ء میں کرنیل ایبٹ نے پندرہ مہینے کی رخصت لے کر ولایت کا قصد کیا۔ اس موقع پر متعدد تقریبیں ہوئیں، سپاس نامے پڑھے گئے اور بقول منشی نول کشور:

> "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ حقیر نے بھی موقع مناسب سمجھ کر ہفتے عشرے کے اندر یہ تالیفات قدیمہ سے انتخاب کرکے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھا کر اس بضاعت مزجات کو پیش کش خدام عالی مقام کیا تاکہ تا تشریف آوری بطور یادگار تعویذ بازوئے روزگار رہے اور اس نام نامی سے مجھ کو اور میرے مطبع کو تبرک حاصل ہو۔"

ہفتے عشرے میں دو سو صفحے کی کتاب تالیف کرکے شائع کردینا معمولی اشاعتی کارنامہ نہیں۔ اوّل تو

تالیف بطور خود مشکل پھر کتابت، طباعت، جلد بندی اور اس عہد میں جب سارا کام ہاتھ کی مشینوں پر ہوتا تھا متن اور تصاویر دونوں کی بروقت طباعت، یہ سب خاصا مشکل کام تھا۔ آج کے دور میں خود کار مشینیں عام ہیں۔ طباعت بہت آسان ہوگئی ہے۔ لیکن ساری سہولتوں کے باوجود ایک ہفتے میں کتاب مرتب کرکے شائع کر دینا آسان نہیں۔ یہ کارنامہ منشی نول کشور ہی انجام دے سکتے تھے۔

"تحفۂ ایبٹ" میں منشی جی کے ابتدائیے کے بعد کرنل ایبٹ کی تصویر اور ہندستان میں ان کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء میں کرنل ایبٹ کی عمر ۵۲ برس کی تھی۔ چونتیس برس انھوں نے ہندستان میں گزارے تھے اور مختلف عہدوں پر مامور رہے تھے۔ اس کے بعد وہ سپاس نامہ درج کیا گیا ہے جو رؤسا و عمائد شہر لکھنؤ کی جانب سے ۲۴ر مارچ ۱۸۶۳ء کو جلسۂ عام میں پیش کیا گیا تھا۔ کرنل صاحب کے جواب کے یہ جملے قابلِ غور ہیں:

"اسی عرصے میں شہر لکھنؤ باغیان سے صاف ہوا۔ یہ باغیان ایسے نمک حرام تھے کہ سرکار گورنمنٹ سے جس نے سو برس تک ان کی پرورش کی برخلاف ہوئے اور تمام ملک ہندستان میں علمِ بغاوت بلند کیا۔ شہر لکھنؤ میں بکثرت مورچہ وناکہ بندیاں و ویرانگی تھی۔ رعایائے شہر فرار ہوگئی اور شہر بعد فتح فوج سرکاری کے ہاتھ بدمعاشان وڈکیتان سے غارت ہوتا رہا بلکہ یہ صورت عرصے تک رہی۔"

ان جملوں سے اس عہد کے انگریز حکمرانوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ممکن ہے۔ سرکار نے سو برس تک نمک حرام باغیوں کی پرورش کی یا بھولے بھالے شہریوں کا استحصال کیا۔ مگر کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔

سپاس نامے کے جواب کے بعد منشی جی نے کرنیل صاحب کی ذاتی لیاقت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے اور ان کی اس الوداعی دعوت کا حال لکھا ہے جو نواب محسن الدّولہ کی جانب سے ۲۵ر مارچ ۱۸۶۳ء کو ہوئی تھی۔ مرزا تسیم کے دو قطعے، منشی طوطا رام شایاں کا ایک قصیدہ اور مردان علی رعنا کا قطعۂ تاریخ ان بیانات کا اختتامیہ ہیں۔ اس طرح کرنیل ایبٹ کی مدح و ثنا کا باب مکمل ہوگیا ہے۔ یہ حصہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ادبی اور سوانح اعتبار سے اسے قابلِ ذکر کہا جا سکتا ہے۔

"تحفۂ ایبٹ" کا موضوع ہندستان اور خاص طور پر اودھ کی تاریخ ہے۔ منشی جی نے ہندستان کی تاریخ کے بیان میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ ابتدا میں ہندو راجاؤں کا بیان ہے۔ ہندوؤں کے علم اور مذہب کا سرسری جائزہ ہے۔ ہند اور اس کے باشندوں کے حال میں صرف دو پیراگراف ہیں تاہم جدول معدنیات ہند دو صفحوں پر محیط ہے۔ شاہانِ اسلام کا احوال اس کے بعد ہے۔ سرسری اور سطحی ۹ صفحات انگریزی تسلط کے بیان کی نذر کیے گئے ہیں۔ غدر کا مختصر احوال ہے۔ ۵۴ ہندستانی ریاستوں کا احوال ایک جدول کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ سارا احوال صرف ۳۲ صفحوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔

اودھ کا تذکرہ صفحہ ۴۴ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بھی حالات مختصر ہیں۔ اس زمانے میں اودھ کا علاقہ تین کشنریوں پر مشتمل تھا۔ لکھنؤ، خیرآباد، فیض آباد۔ ان تینوں کشنریوں اور ان کے اضلاع کے مختصر بیان کے بعد یہ نوٹ بھی ملتا ہے کہ "یہ کیفیت نہایت ہی مختصر ہے۔ دوسری کتاب مفصل حالات ملک اودھ میں عنقریب طبع ہونے والی ہے۔"

صفحہ ۵۲ سے نوابانِ لکھنؤ کا بیان ہے۔ ان کی تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ منشی جی نے نوابانِ اودھ کی تاریخ میں اس قسم کے جملے بھی لکھے ہیں :

"اس میں روایتیں بہت کچھ ہیں۔ مصلحتِ وقت سے زبانِ قلم پر نہیں آسکتیں۔"

"واجد علی شاہ تو ایسے عیاش اور کاہل و آرام طلب اور ان کی ایک خادم حضرت بیگم نام اور ۱۵ سالہ فرزند ایسا بیباک اور جری نکلے جس کی آنکھ توپ تلوار سے بھی نہ جھپکی۔"

نوابانِ اودھ کا تذکرہ ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ اگرچہ اجمالی ہے مگر اس سے درباری سازشوں، ریشہ دوانیوں، قومی اضمحلال، پست ہمتی اور غفلت کا احساس ہوتا ہے۔ منشی جی کا نقطۂ نظر ہمدردانہ ہے۔ بین السطور میں ان کی محبت اور ہمدردی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے لیکن تاریخ، محبت اور ہمدردی سے عبارت نہیں۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

آخر میں تعمیرات اور لکھنؤ کے باشندوں کا مختصر بیان ہے۔ مختلف کوٹھیوں، باغوں، امام باڑوں، مقبروں، پلوں اور مچھی بھون کا مختصر تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے۔ سرورق کے مطابق کتاب میں "نقشہ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنل صاحب مشار الیہ جس سے محلّے محلّے کے حدود اور بعد مسافت سڑکوں اور عمارتوں کا باہم دریافت ہو" بھی شامل تھا۔ مگر کتب خانۂ خاص کے نسخے میں یہ نقشا موجود نہیں ہے۔

اگرچہ "تحفۂ ایبٹ" عقیدت و محبت کی بنا پر مرتب نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کا مقصد کاروباری مصلحت، وفاداری سرکار برطانیہ کا اظہار اور ذاتی و شخصی تعلق کا استحکام اور حکّام رسی تھا۔ تاہم یہ ایک یادگار کوشش اور مفید علمی روایت کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ منشی نول کشور محض ایک ناشر اور اخبار نویس ہی نہیں تھے بلکہ تالیفی کام بھی انجام دیتے تھے۔ یہی ایک کتاب ہے جو اُن کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس وجہ سے بھی یہ قابل ذکر ہے۔

ممتاز محقق ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی اپنے ایک مضمون "منشی نول کشور بحیثیت مورّخ" میں منشی جی کی اس علمی کوشش کا محققانہ جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی رائے میں یہ کتاب اہم معلومات اور دلچسپ واقعات کے بیان سے خالی نہیں ہے۔

متروک، گراں اور ناپسندیدہ

زحاف اور رُباعی

غالب نامہ بابتہ جولائی ۱۹۸۳ء جلد ۴ شمارہ نمبر ۲ میں جناب کالی داس گپتا رضا نے ایک مضمون بعنو
"غالب کی ایک متنازعہ رباعی پر ایک نظر" قلم بند کیا ہے۔ رُباعی یہ ہے ؎

دکھ جی کو پسند ہوگیا ہے، غالب
دل رک رک کر بند ہوگیا ہے، غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
مرنا سوگند ہوگیا ہے، غالب

اس رباعی سے متعلق لوگوں نے بہت کچھ لکھا۔ دوسرے مصرع کے شروع میں ایک سبب خفیف یا
زائد ہونے کے سبب رُباعی ناموزوں ہوجاتی ہے۔ لیکن "خَزْم" کے عمل سے یہ رُباعی اعتراض کی گرفت سے اس
نکل جاتی ہے کہ زحاف خزم ایک مصرع کے شروع میں ایک حرف سے چار حروف تک بڑھانے کی اجازت دیتا۔

تعریف خزم: مصرع اوّل یا دوم کے صدر و ابتدا سے پہلے ایک سے چار حروف تک زیادہ کر۔
خزم کہتے ہیں۔ یہ زیادہ کردہ حروف تقطیع میں شمار نہیں ہوتے۔

موصوف نے زرِ کامل عیار (اسیر لکھنوی) ترجمہ معیار الاشعار (محقق طوسی) (مطبوعہ نول کشور)
کی فصل ہشتم (ص ۲۲۲) کے اردو متن کا ضروری حصہ بھی نقل کیا ہے جو اس طرح ہے:

"ص ۲۲۲..... فصل ہشتم، بیان تغیرِ زیادت میں کہ ارکان سے تعلق نہیں رکھتا......
اس کو خزم کہتے ہیں..... وہ نہایت گراں اور ناپسندیدہ ہے۔ اور کسی رکن، کسی بحر کے ساتھ
خاص نہیں..... اور زیادہ ایک حرف سے بھی لائے ہیں، چار حروف تک .....؛"

موصوف نے خزم کے تحت "زرِ کامل عیار" سے سات مثالوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔

اب میں زار علّامی کہتا ہوں کہ جب "خزم" پر زحاف کی تعریف ہی صادق نہیں آتی تو اس کو

اگر موصوف نے یہ قطعہ "خزم" کے تحت تخلیق کیا ہے تو اس لیے مناسب نہیں کہ خزم کے تحت صرف ایک مصرع کے شروع میں حرف یا حروف بڑھائے جاتے ہیں۔ اور یہاں دونوں مصرعوں میں زیادت ہوئی ہے۔
رضا صاحب اور جوشؔ صاحب دونوں کو وزن کے تعین میں دھوکا ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ رضا صاحب نے اس قسم کا قطعہ تخلیق فرماکر کوئی خاص جدّت پیدا کی ہو تو یہ بھی نہیں۔ "فاعلاتن مفاع لن فعلن" کے شروع میں ایک حرف بڑھانے کے بعد دونوں مصرعے بحسن وخوبی مندرجہ ذیل حقیقی اوزان میں غوطہ کھاتے ہیں:

۱۔ بحر مقتضب مثمن : فعولُ — مس تف علن — فعولن — فع
مرفوع ومخبون — سالم — مرفوع ومخبون — مجنون واحذّ مخنق

۲۔ بحر منسرح مسدس : مفاعلن — فاعِ لاتُ — مفعولن
مخبون — مطوی — مطوی مسکّن

اس سے قطع نظر کہ حضرت جوشؔ ملسیانی عروض سے کتنا واقف تھے اور اس قطعے کا صحیح وزن قائم بھی کرسکے تھے کہ نہیں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ وہ "خزم" کے حق میں نہیں تھے۔
رودکی نے بحر ہزج کی ایک بیت کے (صدر وابتدا میں) موفور یعنی مفاعیلُ اور اخرب یعنی مفعولُ کو جمع کیا ہے۔

"موفور" یعنی وافر کیا ہوا۔ زیادہ کیا ہوا۔
مفاعیلُ (موفور) اور مفعولُ (اخرب) کو جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو "خزم" سامنے آجاتا ہے اور یہ خزم ہی تو ہے۔ صرف نام بدلا ہوا ہے۔
موفور یا خزم کا تعلق چونکہ کسی بحر، کسی وزن اور کسی رکن سے نہیں اور اس پر زحاف کی تعریف بھی صادق نہیں آتی۔ لہٰذا "خزم اور موفور" دونوں کا استعمال قطعاً ناجائز
جناب شمس الرحمن فاروقی اپنی تصنیف عروض وآہنگ وبیان صفحہ ۲۷ پر فرماتے ہیں:
"ایک یا ایک سے زیادہ حرف مصرع کے شروع میں زائد کرنا اور تقطیع میں نہ شمار کرنا بھی فارسی میں زحاف خزم کے تحت موجود ہے۔ متاخرین نے اسے ترک کیا تو کیا ہوا۔ کتابی جواز تو ہے ہی۔ کیونکہ محقق طوسی نے بھی زحاف خزم کو منسوخ نہیں کیا...."
فاروقی صاحب کا خزم کے متعلق یہ کہنا کہ کتابی جواز تو ہے ہی کوئی ٹھوس دلیل نہیں۔ کتابوں میں تو معلوم نہیں کیا کیا لکھا ہوا مل جاتا ہے۔ اگر فاروقی صاحب کتابی جواز کہ کر ہر غلط سلط کو قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں تو ہم خزم کیا ہر عروضی غلطی کے ضمن میں علاوہ خاموشی اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔
رباعی کا موجد رودکی ہے اس کو سبھی مانتے ہیں اور بحر ہزج کو بحر رباعی بھی سبھی تسلیم کرتے ہیں حضرت علّام سحرؔ عشق آبادی مرحوم سے پہلے رباعی کو صرف ۲۴ اوزان پر مشتمل سمجھا جاتا تھا۔ حضرت علّام نے ان اوزان

میں ۱۲ اوزان کا اضافہ کیا۔ اب میں نے (زار علامی) رباعی کے اوزان میں مزید ۱۸ اوزان کا اضافہ کر کے رباعی کے اوزان کی تعداد ۵۴ اوزان تک پہنچا دی ہے۔ اب رباعی کے اوزان میں افزونیت کی کوئی گنجایش نہیں۔

رباعی کی تشکیل میں دو قوانین سے کام لیا گیا ہے۔

۱۔ حکم معاقبہ

۲۔ سبب پے سبب است و وتد پے وتد است

رباعی کے جملہ اوزان " رودکی کے ایجاد کردہ ۲۴۔ علام کے ایجاد کردہ ۱۲۔ زار علامی کے ایجاد کردہ ۱۸" ان دونوں قوانین کے مرہونِ منت ہیں اور پوری پابندی کے ساتھ ان دونوں قوانین پر پورے اُترتے ہیں لہٰذا کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

آج سے دو ڈھائی برس پہلے جناب سرور تونسوی نے (اڈیٹر شانِ ہند۔ دہلی) اپنے ایک مراسلہ میں مجھ سے معلوم کیا تھا کہ اگر رباعی کے اوزان میں "موفور" لکھ کر اوزان رباعی میں اضافہ کر لیا جائے تو آپ ان اوزان کو جائز کہیں گے یا ناجائز؟ انھوں نے فرمایا کہ

"رکن موفور" رکھنے کا جواز یہ ہے کہ موجد رباعی نے بحر رباعی کے ایک وزن میں موفور رکن سے کام لیا ہے۔

میں نے اپنا جواب سرور صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا اور صاف طور پر یہ واضح کر دیا تھا کہ زار موفور رکن کے حق میں نہیں۔

اب میرے ایک عزیز ڈاکٹر ذاکر حسین نقوی ہیڈ شعبۂ فارسی، پنجابی یونی ورسٹی پٹیالہ نے بحوالہ معیار الاشعار اسی سوال کو پھر دوہرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"رکن موفور کی مدد سے رباعی کے اوزان ۵۴ سے بڑھ کر ۱۰۸ ہو سکتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟"

ذاکر چونکہ تفصیلی جواب سے مطمئن ہوتے ہیں لہٰذا ان کے سوال کا جواب انھیں بھیج دیا گیا۔ چونکہ سوال نہایت اہم ہے لہٰذا بذریعہ "کتاب نما" دوسرے لوگوں تک بھی پہنچا رہا ہوں۔ ذیل میں دیکھیے۔

۱۔ خزم کہیے کہ موفور دونوں میں کوئی فرق نہیں محض نام بدلے ہوئے ہیں۔

۲۔ دونوں کا تعلق نہ کسی رکن سے ہے اور نہ کسی بحر و وزن سے۔ ان کے عمل سے بڑھائے ہوئے حرف یا حروف تقطیع سے باہر رہتے ہیں۔

۳۔ خزم یا موفور کا تعلق بیت کے صرف ایک مصرع سے ہے۔ دونوں مصرعوں میں رکھنے سے نہ "خزم" خزم رہتا ہے اور نہ "موفور" موفور۔

۴۔ رباعی کے کسی بھی وزن پر جب موفور کے عمل سے نیا وزن پیدا کیا جائے گا تو یہ رباعی کا وزن نہیں رہے گا

اور: اس وزن میں رُباعی تخلیق کی جا سکے گی اس لیے کہ رُباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جبکہ رُکن موفور کا تعلق ایک بیت سے ہوتا ہے۔ اسے یوں سمجھیے:

وزنِ رباعی: مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل

موفورصورت: م + مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل

یعنی

مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل

موفورصورت "مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہی وزن" بحرِ مُقتَضَب مثمن" سے حاصل ہوجاتا ہے۔

بحرِ مُقتَضَب مثمن: مفعولاتُ مس تف علن مفعولاتُ مس تف علن

جن زحافات کے عمل سے موفور وزن حاصل ہوتا ہے: ۱۔ خبن ۲۔ حذذ

تعریف خبن: رُکن کے شروع سے دوسرا حرف ساکن ساقط کرنا بشرطیکہ وہ سببِ خفیف کا ساکن ہو۔

اس زحاف کے ذریعے: مفعولات کا 'ف' ساقط ہوا۔ م عولات رہا جس کو مفاعیلُ میں بدل لیا گیا۔

مس تف علن کا 'س' ساقط ہوا۔ م تف علن رہا جس کو مفاعلن سے بدل لیا گیا۔

تعریف حذذ: رکن کے آخر سے وتدِ مجموع ساقط کرنا۔ یہ زحاف عروض وضرب سے مخصوص ہے۔

بحرِ مقتضب کے عروض وضرب کا رکن "مس تف علن"، خبن کے عمل سے 'مفاعلن' حاصل ہوا۔ مفاعلن پر حذذ کے عمل سے آخری وتدِ مجموع 'علن' ساقط کیا۔ "مفا" رہا جس کو فَعَل سے تبدیل کرلیا گیا۔ بحرِ مقتضب مثمن مخبون، مخبون، مخبون احذ کا وزن یہ ہوا۔ مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلُ فَعَل۔ یہی رُباعی کے موفور وزن کی صورت ہے۔ اگر موفور والے وزن پر چار مصرعے تخلیق ہوں گے تو انھیں بجائے 'رُباعی' قطعہ کہنا ہی مناسب ہوگا موفور رکن سے رُباعی کے اوزان میں اضافہ کرنا سراسر غلط ہوگا۔

ننھے منّے بچوں
کے
لیے
جادو کی ہنڈیا
4/50
چاند کی بیٹی
4/50
شبیر اور بکری
دُم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلّی
6/-
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

شائستہ خاں
خدابخش فیلو
خدابخش لائبریری، پٹنہ

مولانا آزاد کے صحیح سالِ پیدائش کا انکشاف

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳۰۵ھ میں نہیں ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کا ثبوت ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ خط ہے جس کا عکس نیچے دیا جا رہا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ خط ان کی تاریخ پیدائش سے متعلق خصوصاً اور ان کی سوانح حیات کے بارے میں عموماً اہم ترین دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں متعدد انکشافات ہیں جو پہلی بار اہل علم کے سامنے آ رہے ہیں۔

یوں تو مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۳۰۵ھ مانی جاتی رہی ہے اور اس پر بالعموم اتفاق بھی کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم کم سے کم دو بار اس تاریخ پر شک کا اظہار کیا گیا (ابوسعید بزمی، بیدار) اور ایک بار اس کا ذکر چھوٹ کے رہ گیا (مالک رام: کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں)۔

۱۳۰۵ھ کو تاریخ پیدائش قرار دینا تذکرہ کی اشاعت (۱۹۱۹ء) سے قبل کہیں نہیں ملتا، لیکن یہ خط جو جولائی ۱۹۰۳ء کا ہے اتنی قدیم شہادت ہے کہ مولانا نہ تو ابھی ملک گیر سطح کے صف اوّل کے قائد بنے ہیں، نہ اردو کے سب سے بڑے جریدے الہلال کے اڈیٹر، نہ ہندستان کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والے باغی سرفروشوں کے سرگروہ، نہ ایک نئی طرز انشا کے بانی، نہ وکیل امرتسر اور دارالسلطنت کلکتہ کے اڈیٹر۔ الندوہ کی معاون ادارت سنبھالنے میں بھی ابھی کئی برس ہیں۔ ابھی تو خود ان کا پرچہ لسان الصدق بھی نہیں نکلا ہے۔ یعنی ابھی ان کی مصروفیات اتنی گوناگوں نہیں ہوئی ہیں کہ حافظے پر اثر انداز ہونے لگیں۔ (عام طور سے ان کے حافظے کے بارے میں جو کچھ مریداں می پرانند، ہم وبیا اس لیے نہیں مانتے کہ آخر کو وہ بھی انسان ہی تھے۔)

۱۹۰۳ء کی ان کی اپنی تحریری شہادت کو اسی روشنی میں دیکھ کر بغیر کسی تعصب کے قبول کر لینا چاہیے (تعصب ہم نے اس لیے کہا کہ آبا واجداد سے ملے عقیدت یا برسوں سے کانوں میں پڑی باتیں دماغ میں ایسی راسخ ہو جاتی ہیں کہ پھر کوئی سچا عقیدہ، سچی بات سامنے آتی ہے تو اسے قبول کرنے کے بجائے ذہن رد کرنے کی فکر پہلے کرتا ہے۔) تو پہلے خط کا عکس ملاحظہ ہو:

مولانا آزاد کا یہ خط رنجور عظیم آبادی کے نام ہے۔ اس خط میں مکتوب الیہ کا نام درج نہیں
ر دور تک یہ خط معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ یہ کوئی خط ہے یا مضمون۔ لیکن اس کو خط ماننے کے لیے
ی جواز یہ ہے کہ خط کی طرح شروع میں مولانا نے اپنا پتا درج کیا ہے اور دوم یہ کہ خط کی اکیسویں
طر میں جہاں لکھا ہے "اس سے تم کو معلوم ہو گیا ہوگا" اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خط ہی ہے اور
سی قریبی دوست یا عزیز کو لکھا جا رہا ہے۔ سوم یہ کہ دوسرے خطوط جو مولانا نے رنجور کو لکھے
ہ۔ ان میں بجا بجا انھیں "تم" کہہ کر مخاطب کیا ہے گویا اس سے قربت اور اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔
ر مزید یہ کہ یہ خط انھیں تاریخوں اور سال کا ہے جب مولانا رنجور کو اور خطوط بھی تحریر کر رہے
ہ۔

خط کا جتنا حصہ امتداد زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچا ہے وہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ
مکمل خط معلوم ہوتا ہے۔ امکان ہے کہ یہ اتنا ہی لکھا گیا ہو اور لکھتے لکھتے چھوڑ دیا ہو کہ آیندہ
تکمیل کی جائے گی۔ یا پھر ایک حصہ باقی ہو تو ہم تک نہیں پہنچا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ
قیہ خط میں کچھ اور ایسی باتوں کا ذکر ہو جس کے بارے میں ہم ابھی تک غلط فہمی میں رہے ہیں۔
کیا عجب کہ وہ حصہ کچھ دن بعد زمانہ ہم تک پہنچا دے۔

مکتوب الیہ رنجور کا پورا نام محمد یوسف جعفری ہے یہ شہر پٹنہ کے معزز ترین خاندان صادق پور
سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے آبا نے آزادی کے لیے اپنی جان اور مال کی قربانیاں دیں۔ رنجور کے
والد کو بھی کالے پانی کی سزا دی گئی تھی۔ مولانا آزاد اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ مولانا کے انگریزی
کے استاد بھی تھے (انڈیا ونس فریڈم، نیا اڈیشن، دیباچہ ص ۳)۔ رنجور کلکتے میں انگریزوں کو
اردو سکھانے کے سسٹم (SYSTEM) میں اورینٹل اگزامینر (ORIENTAL EXAMINER) کے عہدے
پر فائز تھے۔ ان سے مولانا کے اس قدر گہرے روابط تھے کہ اپنے ذاتی عقائد کے بارے میں
بھی بہت سی ایسی باتیں جو انھوں نے شاید کسی کو بھی نہ لکھی ہوں انھیں (رنجور کو) لکھ دیتے تھے اسی
لیے اپنے ذاتی احوال و کوائف کے بارے میں اس طرح کا خط شاید وہ (مولانا آزاد) دنیا میں صرف
رنجور ہی کو لکھ سکتے تھے۔

اب سطر بہ سطر اس خط کی صاف نقل ملاحظہ ہو:

"۱ مرتلہ لین ۱۱ کلکتہ ۱۵ رجولائی ۱۹۰۳ء

"میرا نام محی الدین ہے۔ ۱۳۰۳ ہجری میں میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولوی
محمد خیر الدین دہلی کی قدیم سوسائٹی کی یادگار ہیں جن کا خاندان بغداد سے پنجاب آیا۔ اور پنجاب سے شاہ عالم
کے زمانے میں دہلی پہنچا۔ غدر سے کچھ پہلے میرے والد بمبئی آئے اور بمبئی سے مکہ معظمہ چلے گئے۔
وہاں ایک مدت رہ کے پھر ہندستان آئے۔ اور ہندستان میں کچھ عرصہ رہ کر بغداد کربلائے معلیٰ،
نجف اشرف، مصر، قسطنطنیہ، بیت المقدس وغیرہ کی سیر کر کے پھر مکہ معظمہ آئے اور وہیں میں پیدا ہوا۔
میری والدہ کا نام زینب تھا۔ اور میرے والد جہاں جہاں گئے وہ ساتھ رہیں۔ اس میں کوئی شک

[نہیں] کہ میرے والد کو والدہ سے بہت محبت اور الفت تھی۔

۱۳۰۴ھ کے اوائل میں یکایک والدہ کو ہندستان کے مشہور مقامات دیکھنے کا شوق ہوا اور والد صاحب کو بھی حب الوطنی نے اس تحریک کو عملی صورت میں لانے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اور سننے والوں نے تعجب سے سنا کہ مولوی خیرالدین صاحب بمبئی آ گئے ہیں۔

۱۳۰۴ [ہجری] کے اواخر میں اجمیر، اکبرآباد وغیرہ مقامات کی سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور حاجی واحد نا جو یہاں کے مشہور رئیس اور والد صاحب کے معتقد تھے۔ انھیں اپنے گھر لے گئے۔ کلکتہ پہنچے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ میری والدہ یکایک سخت بیمار ہو گئیں اور بیماری سے دو ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

والدہ کا انتقال ایسا نہیں تھا جو والد کو نہایت ملول نہ کرتا، بہت غمگین رہے۔ نہایت ملول ہوئے۔ مکہ معظمہ کے جانے کا ارادہ پھر ہوا لیکن بعض مذہبی بحثوں کے چھڑ جانے اور والدہ کے مزار کے تیار کرنے کے خیال نے رکاوٹ پیدا کر دی۔ انھیں دنوں میں کلکتہ کی بڑی مسجد میں ان کا ہر جمعہ کو وعظ ہوا کرتا تھا۔ لوگ جوق جوق مرید ہو رہے تھے۔ ایمان آباء و اجداد اور حضرت رسول کی بحث ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی ایک قدیم تصنیف جو اسی موضوع پر لکھی تھی ترمیم کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی تھی۔ اور اسی لیے ایک پریس جاری کیا تھا۔ غرض ایسے تعلقات پیدا ہو گئے تھے کہ دوستانِ کلکتہ کو کئی برس تک روکنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب ضرور ہے کہ میں یہاں اپنے اور بھائی بہنوں کا نقشا درج کر دوں تاکہ آیندہ واقعات ذہن نشیں ہو جائیں:

اولاد اناث	اولاد ذکور
خدیجہ۔ ۱۲۹۱ ہجری سال پیدائش	غلام یاسین۔ ۱۳۰۱ ہجری
فاطمہ۔ ۱۲۹۷ ہجری	محی الدین۔ ۱۳۰۳ ہجری
حنیفہ۔ ۱۲۹۹ ہجری	

اس سے تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ بڑی اولاد خدیجہ ہے۔ ۱۲۹۱ ہجری میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے جب والدہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۵ ہجری میں خدیجہ کی عمر چودہ برس کی تھی مگر خدا جانے کیوں اس زمانے میں شادی نہیں ہوئی اور اسی نہ ہونے نے آج وہ فساد اور جھگڑا پیدا کر دیا جس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے اور خودکشی پر آمادہ ہوں۔

میری والدہ کے بھائی محمد ہاشم نے مکہ معظمہ میں ایک کپڑوں کی دکان کر لی تھی جو خوب چلتی تھی۔ محمد ہاشم کے تین لڑکے تھے۔ محمد شفیع، محمد سعید، محمد مکی۔ جہاں تک میں نے واقعات سے نتیجہ نکالے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ والدہ مرحومہ کا ارادہ تھا کہ وہ تین بہنوں کو انھیں تین لڑکوں کے ساتھ منسوب کریں۔ محمد شفیع اسی خیال سے کلکتہ آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ والدہ کو انتقال کیے دو تین برس ہو گئے تھے اور والد کا رنگ کلکتہ میں خوب جما ہوا تھا۔ محمد شفیع اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوا اور خدا جانے کیوں والد نے شادی نہیں کی۔ بالآخر وہ ناراض ہو کر اور انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹ کر رنگون چلا گیا اور پھر ایسا

نقود الخبر ہوا کر آج تک کوئی پتا ۔۔۔"

مولانا آزاد کے قلم سے لکھی ہوئی اس اہم تحریر سے ہمیں مندرجہ ذیل اہم اطلاعیں ملتی ہیں:

(۱) **تاریخ پیدائش:** ۔ مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش ۱۳۰۵ھ نہیں ۱۳۰۳ھ ہے۔

(۲) **جائے پیدائش سفر:** ۔ مولانا آزاد مکہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۴ھ کے اوائل میں والدہ والد کے ساتھ پہلے بمبئی پہنچے پھر کلکتہ۔ کلکتہ میں والد قیام پذیر ہو گئے۔

(۲ الف) **نام:** ۔ اپنا نام محی الدین (نہ کہ غلام محی الدین) لکھا ہے۔

(۲ ب) **بھائی:** بھائی دو سال بڑے تھے ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ نام غلام یاسین تھا۔

(۲ ج) **بہنیں:** ۔ مولانا آزاد کی تین بہنوں کے نام اس طرح ہیں۔ خدیجہ، فاطمہ، حنیفہ۔ ان ناموں کے برخلاف جو نام دوسری جگہوں پر ملتے ہیں، فاطمہ کا نام آرزو، حنیفہ کا نام آبرو، وہ صحیح نہیں۔ نام تو یہی ہیں آرزو اور آبرو تخلص ہیں۔ اسی طرح حنیفہ کا نام محمودہ بتانا بھی صحیح نہیں یا پھر یہ بعد کی فکر ہے۔ ان بہنوں کی صحیح تاریخ پیدائش بالترتیب یہ ہے۔ ۱۲۹۱ھ، ۱۲۹۷ھ، ۱۲۹۹ھ۔

(۳) **والدہ:** ۔ والدہ کا نام زینب تھا۔ (اس کے علاوہ جو نام دوسری جگہ ملتے ہیں وہ بعد کے اضافے ہیں۔)

(۴) والدہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ میں کلکتہ میں ہوا۔

(۴ ب) **ننھیالی خاندان:** ۔ والدہ کے بھائی محمد ہاشم مکہ میں کپڑوں کی دکان تھی۔ ہاشم کے تین لڑکے شفیع، سعید اور محمد مکی، جن سے والدہ انہیں تین لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتی ہی تھیں رجو نہیں ہو سکیں)۔

(۵) **ددھیالی خاندان کا پنجاب میں قیام:** ۔ والد محمد خیر الدین کا خاندان بغداد سے پنجاب آیا اور یہ لوگ شاہ عالم کے زمانے تک پنجاب میں مقیم رہے۔

(۶) **خاندان کا دہلی میں قیام:** ۔ عہد شاہ عالم میں خاندان (۱۱۷۳ھ - ۱۲۲۱ھ) دہلی پہنچا۔ اس طرح پنجاب و دہلی دونوں سے قدیم وابستگی کی روایات جو مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں ان کی توثیق ہوتی ہے۔

(۷) **والد:** ۔ والد غدر سے کچھ پہلے دہلی سے بمبئی آ گئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام رہا۔ بمبئی سے مکہ معظمہ چلے گئے جہاں ایک مدت قیام رہا۔ پھر ہندستان آئے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام رہا پھر عراق، مصر، ترکی وغیرہ میں گھومتے پھرتے رہے اور بالآخر پھر مکہ واپس آ گئے۔ مکہ سے ۱۳۰۴ھ میں ہندستان آئے پہلے بمبئی اور پھر کلکتہ۔

(۸) **والد کی تصنیف:** ۔ جس کتاب کا ذکر مولانا اس خط میں کر رہے ہیں وہ آزاد بھون (دہلی) میں مولانا آزاد کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کا نام درج الدرر البہتیہ فی الایمان الآبار والامہات المصطفویہ ہے۔ جلد اوّل، عقائد خیوریہ، مطبع توفیقی کلکتہ ۸۹۶ ص ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵/۱۸۹۶) مثنوی کی بحر میں ہے۔ اس میں دو حصے ہیں، پہلے کا نام البصائر العشرہ الجلیلۃ ہے، دوسرے کا وہ جو کتاب کا عنوان ہے۔ پہلے حصے میں نثر بھی ہے لیکن دوسرے میں سراسر نظم ہی نظم ہے۔

(۵)

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی (مرتبہ ملیح آبادی) کو ابھی تک بعض لوگ ملیح آبادی کی اختراع سمجھتے ہیں۔ شبہہ صحیح نہیں ہے اور قوی ثبوت بہم پہنچ چکے ہیں کہ یہ مولانا کی اپنی تالیف ہے پیش نظر خط سے بھی اس طور سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ اس کے متعدد بیانات آزاد کی کہانی میں جوں کے توں مل جاتے ہیں (صرف دو سالہ فرق کو نظر انداز کرنا پڑے گا) ملاحظہ ہو:

پہلے پیراگراف میں خاندان کا بغداد سے پنجاب سے دہلی آنا، پھر والد کا بمبئی کا سفر اور بمبئی سے مکہ جانا پھر ہندستان آنا، پھر عراق، مصر، قسطنطنیہ کا سفر اور پھر مکہ واپسی: ص ۵۹، ۶۸، ۶۷، ۶۸۔

دوسرے اور تیسرے پیراگراف میں مذکور بمبئی آنے کی بات، کلکتہ اور کلکتہ کے واحدنا کا ذکر اور پھر اس کے بعد والدہ کے انتقال کی بات: ص ۷۰، ۹۵، ۹۶، ۹۔

چوتھے پیراگراف میں مذکور بیانات کے تو متعدد جملے جوں کے توں آزاد کی کہانی میں مل جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: ص ۱۰۲ اور ص ۱۰۱، جہاں انھوں نے لکھا ہے کہ "جمعہ بڑی شان وشوکت سے پڑھایا۔ ... اس دوسرے سفر میں ان کی آمد کے غلغلہ سے لوگ جوق جوق آنے اور مرید ہونے لگے ... ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

جہاں تک پانچویں پیراگراف کا تعلق ہے آزاد کی کہانی کے متن (ص ۸۱ - ۱۸۰) میں بہنوں کے نام تو نہیں آئے لیکن ملیح آبادی صاحب نے حواشی میں ان کے تخلص البتہ درج کر دیے ہیں۔

چند باتیں اور عرض کر دی جائیں:

● نون غنہ میں نقطہ دیتے ہیں یعنی مین، میں ایسے لفظوں کو ملا کر لکھتے ہیں جنھیں عام طور سے ملا کر نہیں لکھا جاتا۔ جیسے رہکر، رہ کر یا لیگئے، لے گئے۔

● دوچشمی "ھ" کے بجائے چھوٹی "ہ" لکھتے ہیں جیسے کچہ، کچھ، ساتہہ، ساتھ، پہر، پھر۔ اس زمانے کے عام قاعدے کے موافق پیش "و" کو واو سے ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے اوسے، اسے، اولفت، الفت اونکا، انکا، روکاوٹ، رکاوٹ۔

● جا بجا لفظ چھوڑ جاتے ہیں مثال کے طور پر:۔ چوتھی سطر میں لفظ "شک" کے بعد "نہیں" چھوڑ دیا ہے اسی طرح تیرھویں سطر میں اجداد میں "د" چھوڑ دی ہے۔ اور آٹھویں سطر میں ہجری کی "ی" چھوڑ دی ہے۔

● کہیں کہیں حرف / ہندسے بھی آگے پیچھے لکھ جاتے ہیں۔ جیسے: "ل" "م" کو کسی لفظ کے ساتھ ملا کر لکھنا ہے تو ل، م کا آگے پیچھے ہو جانا مثلاً ایک سطر میں عملی کو علمی لکھ گئے ہیں۔ ہندسے کے آگے پیچھے ہو جانے کی بھی ایک مثال ملتی ہے جیسے سطر اکیس پر ۱۲۹۱ کی جگہ لکھا ہے ۱۲۱۹۔

● نہ ملنے والے الفاظ کو جا بجا ملا کر لکھ دیتے ہیں مثلاً والدہ، والدہ، ہوگیہ، ہوا، نہ کرتا، نہ کرتا۔

● اکبرآباد اور بالآخر میں مد نہیں لگایا ہے اور اس طرح بغیر مد کے (سطر آخری) اکبراباد اور بالاخر لکھا ہے۔

● سطر ۱۳ میں "وعظ" کو واو کے بعد الف سے لکھنا چاہ رہے تھے لیکن پھر درست کر کے الف

کاٹ دیا ہے۔

● سطر ۱۱ میں "نہایت" پہلی بار استعمال ہوا ہے جو قطعی غیر واضح ہے جسے کوئی بھی عام قاری "سنا ہے" تو پڑھ سکتا ہے "نہایت" نہیں پڑھ سکتا۔

● کہیں جلدی میں ضمیر کا دوبارہ استعمال بھی کر دیتے ہیں۔ مثلاً: "وہ رنگون" ؛ آخری سطر خط کی) اور "وہ ناراض" "اس میں سے ایک "وہ" ہم نے حذف کر دیا ہے۔ مولانا نے یہاں بے جا صوہ دوبارہ استعمال کیا ہے۔

● پندرھویں سطر میں مولانا نے تعلقات گویا بمعنی وجوہات استعمال کیا ہے۔ اس موقع پر علائق کا استعمال بھی کیا جاتا ہے جس کا مادّہ وہی ہے جو تعلقات کا، اس لیے مولانا جو عربی کے آدمی تھے، علائق کی جگہ تعلقات استعمال کر گئے کیونکہ لفظی طور سے یہ وہی معنی دیتا ہے جو مولانا لینا چاہتے ہیں۔

● پیراگراف بنانے کا خوبصورت طریقہ: مولانا کی تحریر کی ایک اور خصوصیت بھی واضح ہے۔ نئی سطر اور پچھلی سطر کے درمیان فاصلہ بڑھا دیتے ہیں لیکن نئی سطر کا پہلا لفظ لکھنے میں اس سطر کا ابتدائی حصہ خالی نہیں چھوڑتے ہیں بلکہ اوپر کی تمام سطوروں کے بالکل متوازی رکھ کر لکھتے ہیں۔ ہمارے عہد میں یہ طریقہ مالک رام صاحب نے اپنی نگرانی میں چھپوائی ہوئی کتابوں میں برقرار رکھا ہے۔ اب غالباً انھیں کی تقلید میں خدا بخش لائبریری میں بھی یہ طریقہ رائج ہے۔

● طیار (تیار) کا "ط" سے املا صفحہ ا سطر ۱۲، قدیم زمانے کا عام املا ہے اور جیسا کہ اس لفظ کی اصل اور تاریخ کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے (طیر سے مشتق)۔ لیکن اردو نے اب عام طور سے اسے "ت" سے لکھنا مرجح قرار دیا ہے اس لیے ہم نے بھی اسے "ت" سے لکھنا بہتر سمجھا۔

● داستان سرائی کا انداز جو پہلے "الہلال" کے افسانوں میں نمودار ہوا اور پھر "غبار خاطر" کے بعض خطوں میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، اس خط میں اس کی جھلکی سطرے میں ملی ہے "اور سننے والوں نے الخ"۔

● صفحہ ۲ کی سطر ۵ پر "والد کا رنگ کلکتہ میں خوب جما ہوا تھا" اس جملے سے کچھ ایسا اظہار ہوتا ہے کہ والد سے دوری، ان سے مخالفت اور بغاوت اور ان کے خیالات و نظریات سے اختلاف کا بیج مولانا کے دل میں جگہ بنانے لگا تھا جو آگے چل کر تناور درخت بن گیا۔ اور پیری مریدی سے بھاگ کر پہلے سرسید کے دامن میں پناہ لی پھر صحافت میں اور بالآخر سیاست کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گئے۔

انیس سلطانہ
۶۳ - موتی مسجد کے پیچھے
بھوپال - ایم - پی

ناوک نازِ شام کی سنتے رہے کہانیاں
ہنستے رہے چراغ سب، چہرہ گرد دھواں دھواں
زندہ دلوں کی بستیاں، نوحہ کناں جہاں تہاں
خوف کے سایے سے اماں، مانگ رہی تھی ہر زباں
موت کا خوف چارسو، زہر سے تیز و تندخو
موجِ شمیم لائی تھی زہر میں ڈوبی برچھیاں
میرے جنوں کے ہاتھ سے بجھنے لگے تھے سب دیے
شام الم تھی اک طرف، ضبط کا میرے امتحاں
صحبتِ شب بکھر گئی، شامِ الم کا ذکر کیا
لالہ و گل کا پاس تھا اور تو سب جہاں تہاں
مستِ جنوں رہی خزاں، شاخ و ثمر نہ برگ و گل
بادِ سموم چھو گئی، چہرہ بہار کا دھواں
رمز شناس تتلیاں گھوم رہی ہیں چارسو
صبح کی کاکلیں کہاں، الجھی ہوئی ہیں گتھیاں
مستِ مے ازل رہا پھول کے ساتھ خار بھی
چاک رفو سے کہاں، گل کو لگی ہیں دھجیاں
آخرِ شب کے ہم سفر ڈھونڈ رہے تھے منزلیں
تارے تھٹک کے رک گئے سمجھے یہیں ملی اماں

ط۱ بھوپال گیس المیہ کے تاثر نے یہ غزل جسے "کالی غزل" کہیے تو ، "زہریلی غزل" لکھوائی۔

ظفر گورکھپوری
اے - ۳۰۲ - فلوریڈا
شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸

دھوپ ہے کیا اور سایہ کیا ہے، اب معلوم ہوا
یہ سب کھیل تماشا کیا ہے، اب معلوم ہوا

ہم برسوں کے بعد بھی اس کو اب تک بھول نہ پائے
دل سے اس کا رشتہ کیا ہے، اب معلوم ہوا

صحرا صحرا پیاسے بھٹکے، ساری عمر جلے
بادل کا اک ٹکڑا کیا ہے، اب معلوم ہوا

ہنستے پھول کا چہرہ دیکھوں اور بھر آئے آنکھ
اپنے ساتھ یہ قصہ کیا ہے، اب معلوم ہوا

سینے پر اک بوجھ اٹھائے مانگو در در قرض
کاروبارِ تمنا کیا ہے، اب معلوم ہوا

اپنے سارے زیست کا حاصل لے دے کر اک درد
کھویا کیا ہے، پایا کیا ہے، اب معلوم ہوا

ایک مسلسل پیاس ظفرؔ کُل جیون کا مفہوم
پانی کیا ہے، دریا کیا ہے؟ اب معلوم ہوا

کامران نجمی
شعبۂ اُردو
ایس۔ کے کالج
(راجستھان)

ہر پل نیا محاذ نئی جنگ ہے میاں
جینے کا عہدِ نو میں یہی ڈھنگ ہے میاں

جائیں کہیں بھی یادِ وطن کی ستائے ہے
اپنے لیے زمین بڑی تنگ ہے میاں

اک لفظ سرخوشی کی توقع بھی ہے عبث
دُنیا غمِ حیات کی فرہنگ ہے میاں

کرتے رہے ہیں چاک بدن کو رفو مدام
اپنا یہی طریق یہی رنگ ہے میاں

ہوتا ہے نور دل پہ نزول شگفتگی
روشن ابھی ضمیر کا آہنگ ہے میاں

اک حرفِ جانفزا ہے کہ بنتا نہیں غزل
اک نقشِ بے نمو ہے کہ ارژنگ ہے میاں

نجمی غزل کہیں بھی تو کیونکر کہ ان دنوں
اپنا تو قافیہ ہی بڑا تنگ ہے میاں

ایوب اثر
محلہ دلازاک چو کی چُنگی
شاہ جہاں پور ۲۴۲۰۰۱
(یو۔ پی)

غزل

وقت ایسا بھی کبھی آئے گا یہ سوچا نہ تھا
میرا سایہ مجھ سے کترائے گا یہ سوچا نہ تھا

دُور تک راہوں میں کوئی نقشِ پا ملتا نہیں
جانے والا اس طرح جائے گا یہ سوچا نہ تھا

ہم نے تنہا کاٹنا چاہا تھا چاہت کا سفر،
دل تو آخر دل ہے گھبرائے گا یہ سوچا نہ تھا

چاند کو پانے کی پیہم کوشش کرتے رہے،
رفتہ رفتہ دل ہی بجھ جائے گا یہ سوچا نہ تھا

موسمِ گُل کی دُعائیں مانگتا تھا ہر شجر،
پتہ پتہ بھینٹ چڑھ جائے گا یہ سوچا نہ تھا

خود شناسی کی تمنا کس قدر مہنگی پڑی،
آئینہ اک روز تڑپائے گا کہ یہ سوچا نہ تھا۔

دوستوں سے ہم کو وابستہ تھیں اُمیدیں بہت
اعتبار اپنا بھی اُٹھ جائے گا یہ سوچا نہ تھا

روشنی والے اندھیروں کی طرف بڑھنے لگے،
آدمی خود سے بھی شرمائے گا یہ سوچا نہ تھا

گنگناتے ہیں مرے اشعار اب وہ بھی اثرؔ،
آسماں بھی پھول برسائے گا یہ سوچا نہ تھا

ابہام راشد
اے۔ ۲۲۔ گل مہر سوسائٹی
مکتم پورہ
احمد آباد۔ ۳۸۰۰۲۸

(۱)

ستارے
اپنا سب نور رچ گئے ہیں
اندھے آسمان کے نیچے
بیٹھا ہوا
میں
سوچتا ہوں
اپنا نوحہ لکھوں

(۲)

ان کی جبینوں سے
پھوٹنے والی
نور کی کرنوں سے
تم کب تلک
اپنی ظلمتوں کو بچا پاؤ گے

پرکاش تیواری
۲۱۵۹۔ لودھی روڈ کمپلیکس
نئی دلی ۳

شب و روز ہی درد ڈھونا ہے یارو
یہاں زندگی کیا ہے! رونا ہے یارو

فقط دل کا رونا نہ رونا ہے یارو
غزل میں ہر اِک غم پرونا ہے یارو

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو
جگر کا مگر داغ دھونا ہے یارو

ابھی سے مری فصل کیوں کاٹتے ہو
ابھی تو مجھے کھیت بونا ہے یارو

کہاں تک لگاؤں میں زخموں پہ مرہم
یہ تو زندگی بھر کا رونا ہے یارو

غمِ زیست کی فکر پرکاش کیوں ہو
وہی ہو رہے گا جو ہونا ہے یارو

ظفر اقبال
۱۷۱۔ خیلدار۔ فتح پور
۲۱۲۶۰۱

آئینے سچے تھے اور چہرے غلط
کس طرح سچائی کو لکھتے غلط

کوئی دستک اور نہ اب تازہ ہوا
گھر میں روزن اور دروازے غلط

لکھتے لکھتے رک گیا میرا قلم
ذہن کے جیسے تھے سب خاکے غلط

نفرتیں ہی نفرتیں ہیں ہر طرف
ہیں ہماری سوچ کے دھارے غلط

کام آخر کو وہی آیا مرے
جس کے بارے میں تھے اندازے غلط

پھول جیسی بات بھی پتھر لگی
دوستوں کے تھے ظفر لہجے غلط

اندر سروپ سری واستو
سابق پرنسپل
۷۶۰۔ سواتی۔ فتح پور۔ ۲۱۲۶۰۱

تصویر میری مجھ کو دکھاتا ہے کہ "میں ہوں"
ہر روز کوئی مجھ کو بتاتا ہے کہ "میں ہوں"

ٹوٹے ہوئے چہرے کو میرے جوڑ کے ہر دن
آئینہ کوئی مجھ کو دکھاتا ہے کہ "میں ہوں"

پھیلا ہوا، سویا ہوا تنہائی کا عالم
ہر شب مجھے احساس دلاتا ہے کہ "میں ہوں"

میں اپنے ہی ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں ہوں
یہ کون ہے جو مجھ کو بتاتا ہے کہ "میں ہوں"

باہر نہیں ملتا ہے مجھے جس کا نشاں تک
اندر وہی آواز لگاتا ہے کہ "میں ہوں"

عزیز پری ہار
شعبہ انگلش
گورنمنٹ کالج ۔ لدھیانہ

اک پرندہ آنکھ سے اوجھل ہوا اچھا لگا
دے گیا نظروں کو میری اک خلا اچھا لگا

وہ دھنک ہے خواب ہے یا پھر کوئی خاموش رنگ
اس کے میرے درمیاں کا فاصلہ اچھا لگا

ایک ہوا کا تیز جھونکا چھیڑتا ہے رات دن
روز برپا ذہن میں اک شور سا اچھا لگا

ایک مدھم ساز کے دھیمے سُروں کا بانکپن
دھوپ نکلی، خواب دیکھے، دن ڈھلا اچھا لگا

اک سمندر سامنے تھا اور اُوپر آسماں
وسعتوں کا سلسلہ در سلسلہ اچھا لگا

ایک مرکز، ایک پیکر، ایک خوشبو، ایک غم
جس میں تھی اس کی رضا اس نے دیا اچھا لگا

سُلیمان خمار
بیجاپور
کرناٹک ۵۸۶۱۵۱

رُت کوئی متوالی دے
صحرا ہوں، ہریالی دے

تھوڑی سی مُسکانیں بھیج
مٹھی بھر خوشحالی دے

گھر گھر گھور اندھیرا ہے
گھر گھر کو دیوالی دے

کب تک کُہرے میں ٹھٹھروں
صبح کے رُخ پر لالی دے

بیچ سمندر ہے کشتی
موجوں کی رکھوالی دے

ذہن کی کھیتی بانجھ نہ ہو
ہر اک سوچ سوالی دے

یہ دھرتی تو دیکھ چکے
دُنیا نئی نرالی دے

رفعت رضوانہ

مولانا ابو الکلام آزاد
کے بارے میں ایک تاریخی تحریر اور ایک غیر مطبوعہ خط

مولانا آزاد نہ صرف عربی اور فارسی کے مستند عالم تھے بلکہ انھوں نے شستہ اور پاکیزہ صحافت نگاری کا بھی ڈول ڈالا تھا۔ اعلا ادیب، باکمال صحافی ہونے کے علاوہ وہ ایک مستقل مزاج اور صائب رائے سیاست داں بھی تھے۔ مولانا کو بچپنے میں ہی لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ وہ بلا کے ذہین اور غیر معمولی فہم و فراست اور اعلا تدبّر کے مالک تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب "ذکر آزاد" میں ان کی ان تالیفات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۱۲ برس کی عمر سے قبل اور ۱۸ برس کی عمر تک شائع کی تھیں۔ یہ تصانیف اب نادر و نایاب ہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ علاوہ میگزینوں اور اخبارات کے آرٹیکل کے:

(۱) اعلان الحق (۲) احسن المسالک (۳) دیوانِ غزلیات (۴) عمرِ خیّام (۵) خاقانی (۶) ضوِ غیر مرئی (۷) العلوم الجدیدہ و الاسلام (۸) المراۃ المسلمہ (۹) الثیۃ راسۃ النوی (۱۰) المعتزلہ (ناتمام) (۱۱) کشش مادہ اور کشش عشق (۱۲) اسلامی توحید اور مذاہبِ عالم (۱۳) چہار مقالہ (۱۴) فرہنگِ جدید (۱۵) قانون نشو و ارتقا اور قرآن (۱۶) خصائصِ مسلم (۱۷) القول الثابت (۱۸) اتحاف الخلف (۱۹) البرہان (۲۰) الدین الخالص (۲۱) الحریۃ فی الاسلام (۲۲) احرام الاسلام (۲۳) سیرۃ ابن تیمیہ (۲۴) الدین القیم (۲۵) جامع الشواہد (۲۶) تذکرہ (۲۷) تاریخ دعوت اسلام (۲۸) خلافت و جزیرۃ العرب (۲۹) ترک موالات (۳۰) ہندستان اور افغانی حملہ (۳۱) ترجمۃ القرآن (۳۲) تفسیر البیان فی مقاصد القرآن (۳۳) مقدمۂ تفسیر۔

ان تصانیف کے علاوہ مولانا کے متعدد علمی اور فلسفیانہ مضامین "ادیب" الہ آباد، "العصر" لکھنؤ، "صوفی" راولپنڈی، "مخزن" لاہور اور نیرنگِ خیال وغیرہ میں موجود ہیں۔ یہ رسالے نادر و نایاب ہیں اور اکثر و بیشتر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد، سالار جنگ میوزیم ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اردو ریسرچ سنٹر میں موجود ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔

ایک اعلا پایہ اور سنجیدہ مصنف کے علاوہ مولانا مملکت صحافت نگاری کے بے تاج بادشاہ تھے۔ دس برس کی عمر میں لاہور کے مشہور "اخبار عام" میں "اخبار کی بہار" کے عنوان سے ایک

مستقل فیچر شائع کرتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی میں "ارمغانِ فرخ" کے نام سے ایک گلدستہ چھپتا تھا۔ اس رسالے کے لیے ایک غزل کہی۔ مصرع یہ تھا۔

مصرع
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

اس مصرع پر آزاد تخلص کیا۔

آزاد نے سب سے پہلے ایک گلدستہ "نیرنگِ عالم" کے نام سے اجرا کیا۔ آٹھ مہینے کے بعد اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد "المصباح"، "احسن الاخبار"، "تحفۂ محمدیہ" اور "خدنگِ نظر" لکھنؤ، "لسان الصدق" "الندوہ"، "وکیل" امرتسر، "دارالسلام" کلکتہ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہفت روزہ "الہلال" کا پہلا شمارہ شائع کیا۔ موصوف کو صحافت کی پاکیزگی دل سے زیادہ عزیز تھی۔ پہلے ہی شمارہ میں "الہلال" سے متعلق اپنے خلوص کا اظہار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "اگر وہ مجھ میں سچائی اور خلوص کی کوئی سرگرمی دیکھتا ہے۔ اگر اس کی ملت مرحومہ اور اس کے کلمۂ حق کی خدمت کی کوئی سچی تپش میرے دل میں موجود ہے۔ اور اگر واقعی اس کی راہ میں فدویت اور خود فراموشی کی ایک آگ ہے جس میں برسوں سے بغیر دھویں کے جل رہا ہوں تو اپنے فضل و لطف سے مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ اپنے بعض مقاصد کے نتائج اپنے سامنے دیکھ سکوں۔ لیکن اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار اور ایک دکان دارانہ شغل ہیں جن میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے۔ اور میرے تمام کاموں کو ایک دن ایک لمحہ کے لیے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے۔ باغوں کے سرسبز و ثمر دار درختوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مگر جنگل کے خوشں درختوں کو جلانا ہی چاہیے" (الہلال جلد ۱ نمبر ۱، ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء)

پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی تصنیف صحافت پاکستان و ہند میں "آزاد اور اردو صحافت" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "آپ نے اردو زبان میں پہلا باتصویر سیاسی جرنل جاری کیا جو اپنی اعلا ترتیب و تزئین، ٹھوس مقالوں اور تصاویر کے لحاظ سے صحافتی تکنیک میں ایک زبردست ترقی کا مظہر تھا۔ ایسا ہفت روزہ آج تک نہیں نکلا۔

مولانا آزاد نے پہلی مرتبہ اردو قارئین کو موضوعات کے تنوع سے آشنا کیا۔ چنانچہ "الہلال" میں مذہب، سیاست، معاشیات، نفسیات، جغرافیہ، تاریخ، عمرانیات، سوانح، ادب اور حالاتِ حاضرہ پر اعلا معیار کے مضامین اور فیچر چھاپے گئے۔ گویا آنے والوں کو راستہ دکھایا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

آپ نے اردو صحافت میں ایک ایسے خطیبانہ اسلوب نثر کو رواج دیا جو ایجی ٹیشن کے زمانے میں بہت موثر اور مفید رہا۔ محمد علی اور ظفر علی خاں نے بھی یہی اسلوب اختیار

کیا تھا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ جو تاثیر اور خوبصورتی آزاد کی نثر میں ہے۔ اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔" (ص ۲۱۳، ۲۱۴)

آزاد کی تحریروں نے سامراج حکومت کے خلاف بم قاتل کا کام کیا۔ اس لیے انگریز ہمہ وقت آپ کی زبان خاموش کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کئی مرتبہ طلاقتِ زبان اور آتش بیان تقریروں کی وجہ سے گرفتار کیے گئے تھے۔ آپ کی ضمانت ضبط کی جاتی تھی اور ہمیشہ پولیس کی نظر میں زندگی گزارتے تھے۔ سامراجیوں کے ظلم و استبداد کے خلاف آزادی کی خاطر آزاد کی شعلہ بیانی کی چنگاریاں ہندستان کے طول و عرض پھیلی تھیں۔ دوست اور دشمن ان کی سیاست دانی کا لوہا مان چکے تھے۔ سیاست میں ان کا مقام کیا تھا اس سے ہمیں بحث نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایسے صاحبِ کمال ادیب، صحافی اور جنگِ آزادی کے بے لوث اور بغیر شمشیر سپاہی کو انگریزوں نے کیا کیا تکلیفیں دی تھیں۔ جب وہ ۱۹۱۶ء میں رانچی جیل سے رہا ہو گئے تھے تو ان کی نقل و حرکت پر ایک اخلاقی قیدی کی طرح نا قابلِ برداشت پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ راقم کو ایک معاصر اخبار "شیعہ کالج نیوز" لکھنؤ کے کچھ پرچے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا کے خلاف جو پابندیاں لگائی گئی تھیں ان کا تفصیلی ذکر ۲۹ دسمبر ۱۹۱۶ء صفحہ ۳ میں اس طرح درج ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد سابق اڈیٹر الہلال والبلاغ کو نظربندی کے متعلق جو حکم گورنمنٹ بہار اڑیسہ نے دیا تھا اس کا لب لباب حسب ذیل ہے:

(۱) تم اس حکم کے پانے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس رانچی کے پاس حاضر ہو۔

(۲) تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنی تصویر اور انگوٹھے کا نشان افسر مذکور کی ہدایت کے مطابق دے دو۔

(۳) تم اپنی تحریر اور دستخط کے جتنے نمونے افسر مذکور مانگے دے دو۔

(۴) اس کے بعد تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ رانچی پولیس اسٹیشن شہر رانچی کے افسر انچارج کو وقت اور جگہ مع جو سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر کرے، اپنی اطلاع دیا کرو۔

(۵) تا حکم ثانی تم شہر رانچی میں اس مکان کے اندر جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تجویز کرے اور اس کی حد میں جو وہ بتائے قیام کرو۔

(۶) تم کو چھ بجے شام سے صبح تک اپنے مکان سے نکلنے کی ممانعت ہے۔ کسی ملاقاتی کو بھی اس درمیان نہ آنے دو۔

(۷) تم سوائے ان لوگوں کے جو پولیس اسٹیشن رانچی کی حد میں رہتے ہوں اور کسی باہر کے شخص سے بغیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی اجازت کے نہیں مل سکتے۔

(۸) تم تمام تار ڈاک یا کسی قسم کے مراسلات مع پارسل اور ایسی چیزوں کو جو تمہارے پاس کسی طرح پہنچائی گئی ہوں فوراً بغیر کھولے افسر انچارج پولیس اسٹیشن کو دے دو۔

(۹) تم کوئی تحریر خط و کتابت کسی شخص کے ساتھ نہیں کر سکتے جب تک وہ افسر انچارج پولیس کی نظر سے نہ گزر جائے۔

(۱۰) تم دن میں ایک مرتبہ ایسے وقت جو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مقرر کیا ہو، افسر انچارج پولیس کے پاس حاضر ہوا کرو۔ اور رانچی پولیس اسٹیشن کے حدود سے باہر نہ جاؤ۔

(۱۱) تم اپنے مکان میں ہر وقت فی الحال انچارج پولیس اسٹیشن رانچی یا کسی مجسٹریٹ یا پولیس افسر انچارج پولیس اسٹیشن رانچی سے عہدہ میں بڑا ہو، بلا روک ٹوک آنے کی اجازت دیا کرو۔

(۱۲) اگر تم کسی وقت سخت بیماری کی وجہ سے یا کسی روز علالت کے باعث حاضر نہ ہو سکو جیسا کہ تم کو دفعہ ۱۰ میں ہدایت کی گئی ہے۔ تم فوراً اپنے نہ آنے کی اطلاع افسر پولیس اسٹیشن کو دے" اور کسی ایسے افسر کو جو کانسٹبل کے عہدہ سے بڑا ہو اور جو اس کام کے لیے متعین کیا گیا ہو اور تمھارے مکان میں آنا چاہے، آنے کی اجازت دو۔ تاکہ وہ شخص خود امتحان کرکے اپنی تسلی کرے کہ جو کچھ تم نے بیان کیا ہے وہ صحیح ہے۔

(۱۳) اگر تم جان بوجھ کر اس حکم کی کسی ہدایت کی تعمیل نہ کروگے سوائے اس حکم کے جو دفعہ ۲، ۲ میں درج ہے تو تم ایسی سزا کے مستحق ہوگے جو قید سخت یا محض تین برس تک ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس کے تم پر جرمانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر تم ان ہدایات کی تعمیل نہ کروگے جو دفعہ ۲، ۲ میں دی گئی ہے۔ یا اس سے بچنے کی کوشش کروگے تو تم کو سزا دی جائے گی۔ جس کی میعاد چھ مہینے سے کم نہیں بلکہ زائد پر بھی اختیار ہے۔ یا مع جرمانہ جو ایک ہزار سے زائد ہوگا یا دونوں۔

بہرحال یہ شرائط مولانا کی نظر بندی کے متعلق ہیں۔ اس پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

گُل و گلچیں کا گلہ بلبل خوش لہجہ نہ کر تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

دہلی ۱۱ - فروری

[illegible]

مترجم: راشد مفتی
بی۔۲، پہلی منزل، بلاک نمبر ۲
الکرم اسکوائر، کراچی ۱۹

شیخ ایاز سے ایک مکالمہ

شیخ ایاز کو سندھی ادب کا تخلیقی جینئس سمجھا جاتا ہے۔ ان کا نام سندھیوں کی قومی بیداری سے وابستہ رہا ہے۔ وہ چھٹی دہائی کے آخر میں سندھ میں چلنے والی ون یونٹ مخالف تحریک میں سرگرم رہ چکے ہیں۔ اُس وقت تک وہ سندھیوں کے لیے قومی شاعر کا غیر متنازعہ درجہ رکھتے تھے، لیکن جب انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں سندھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کرنے پر رضامندی ظاہر کی تو انھیں متنازعہ شخصیت سمجھا جانے لگا۔ اور جب وہ جنرل ضیا کے تحت بھی یہ فرائض انجام دیتے رہے تو سندھ کے نوجوان اُن پر برسرِعام تنقید کرنے لگے۔ اِس بات نے اُنھیں منظرِعام سے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی نو تازہ کتابوں پر کام کرنے لگے۔ ابھی حال ہی میں وہ اپنی خود عائد کردہ قیدِ تنہائی سے باہر آئے اور کراچی پریس کلب میں سندھی ادبی سنگت کے پلیٹ فارم سے سامعین کو مسحور کر دیا۔ ذیل میں ان کے انٹرویو کے اقتباسات ہیں جو سندھی ادبی جریدے 'برسات' میں چھپا ہے۔ یہ انٹرویو سندھی ادیب و صحافی ف م لاشاری نے لیا اور اسے انگریزی کے قالب میں انور پیرزادہ نے ڈھالا، جن کی بدولت اس کا اردو ترجمہ ممکن ہو سکا۔

سوال: عام تاثر یہ ہے کہ شاعری کے نفسِ مضمون سے قطعِ نظر آپ ایک صَرف شدہ تھکے ہوئے آدمی ہیں۔

جواب: میں روزانہ دس سے بارہ گھنٹے تک کام کرتا ہوں گذشتہ تین سالوں میں میری نو کتابیں چھپی ہیں اور چار مزید چھپنے والی ہیں۔ اتنا کام کرنے کے بعد تکان اور اضمحلال کا ہونا فطری ہے۔ لیکن اگر آپ کا اشارہ روحانی تکان کی طرف ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ مجھ میں اب بھی اتنی قوت ہے کہ اگر کسی مرجھائے ہوئے درخت کو کھلنے کا حکم دوں تو ہرا ہو جائے۔ میرا قلم ہمیشہ راست رہا ہے۔ کسی بوڑھے ڈھانچے کی طرح کبھی نہیں جھکا۔ آپ میری تازہ ترین کتابوں کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ میں نے سندھی شاعری کی تمام پرانی اصناف کو بدل ڈالا ہے۔ اپنے فن کو نئی شاعرانہ اصناف کے ساتھ

آمیخت کرنا اس عمر میں بھی ممکن ہوگیا ہے۔ آپ فیض جیسی تکان، جو اُن کے آخری مجموعے "مرے دل مرے مسافر" میں نظر آتی ہے، مجھ میں نہیں دیکھ سکتے۔ نہ آپ مجھے چھڑی کے سہارے اس طرح چلتا پائیں گے جس طرح انگریز شاعر ایذرا پاؤنڈ اپنے آخری دنوں میں چلتا تھا۔
دوستو وسکی کی طرح میں نے بہت روحانی کرب سہا ہے لیکن اس کی طرح مسیحیت یا کسی اور مذہب میں کبھی پناہ نہیں ڈھونڈی۔

سوال:۔ آپ سیاست میں بہت فعّال ہوا کرتے تھے لیکن اب خاموش ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

جواب:۔ میں نے سیاست میں از خود دلچسپی نہیں لی تھی۔ سیاست مجھ پر تھوپ دی گئی تھی۔ سو میں نے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور ایوّب مخالف قوتوں کا کھل کر ساتھ دیا۔ میری کتابوں پر پابندی کے نتیجے میں رجعت پرستوں اور ترقی پسندوں کے درمیان ادبی اور نظریاتی محاذوں پر تضادات واضح تر ہو گئے۔ اس طرح ایک عوامی تحریک نے جنم لیا جس کے سیاسی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ سیاست میں میری موجودہ غیر فعالیت کی چند وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میری صحت اجازت نہیں دیتی۔ پھر یہ کہ اگر سیاست کو وقت دوں تو ادبی کام نہیں کر سکتا۔ اب میری شاعری ہی میری سیاست ہے، کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ میں نے اسے کبھی ترک نہیں کیا۔

سوال:۔ آپ اس فرق کو کیسے بیان کریں گے جو شاعر شیخ ایاز اور اُس شیخ ایاز میں ہے جو وائس چانسلر تھا؟

جواب:۔ یہ بالکل ایسا ہی فرق ہے جو ادیب محمد ابراہیم جویو اور اُس محمد ابراہیم جویو میں ہے جو سندھ ٹیکسٹ بورڈ کا سکریٹری تھا، جو سب سے بڑے سندھی افسانہ نگار جمال ابڑو اور اس جمال ابڑو میں ہے جو سندھ اسمبلی کا سکریٹری تھا۔ وائس چانسلری محض ایک ملازمت تھی، ایک نوکری تھی جو میں نے منتخب حکومت میں سال بھر سے کچھ زیادہ کی اور بقیہ مارشل لا حکومت میں۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ جہاں تک شاعر شیخ ایاز کا تعلق ہے وہ ایک آزاد آدمی ہے۔

سوال:۔ آپ کس ادبی فلسفے یا ادبی نظریے میں یقین رکھتے ہیں؟

جواب:۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے۔ تمام نظریے خزاں رسیدہ ہیں لیکن زندگی کا سنہرا درخت سدا بہار ہے۔

سوال: آپ آزادیِ اختیار میں کہاں تک یقین رکھتے ہیں؟

جواب:۔ بے حد و حساب۔ اس سلسلے میں میں جن لوگوں سے متاثر ہوا ہوں، وہ روسی ناول نگار دستو وسکی، جرمن فلاسفر ہیگل اور فرانسیسی ناول نگار سارتر ہیں۔ میں نے بھٹائی کی گائی ہوئی سندھی عوامی کہانیوں کو از سرِ نو لکھا ہے اور اس فلسفۂ حیات

کے متعدد عنصر شامل کیے ہیں، جس میں مَیں یقین رکھتا ہوں۔ میں آزادیِ اظہار کا زبردست حامی ہوں۔

سوال:۔ آپ نے اپنی ایک کتاب میں انسانی معاشرے کو جال سے تشبیہ دی ہے۔ کیا انسان معاشرے کے بنیادی تصور سے بغاوت کو اپنا جائز حق کہہ سکتا ہے؟

جواب:۔ معاشرے سے بغاوت عظیم ادب کو جنم دیتی ہے۔ ہر ہوش مند اور ایماندار ادیب بدی کے مقابلے میں نیکی کا ساتھ دیتا ہے، بدی کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا حتیٰ کہ اشتراکی انقلاب کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ غیر منصفانہ سماج کے خلاف بغاوت کے عنصر نے میری شاعری کی ہر سطح میں آگ بھر دی ہے۔ میں نے اپنی ساری ادبی زندگی اسی عمل میں گزاری ہے۔ میں ہر معاشرے کے ہر ادیب کے لیے اسی حق کا مطالبہ کرتا ہوں۔

سوال:۔ آپ نے اپنی ایک کتاب میں سولزے نتسن کو اپنا بھائی قرار دیا ہے۔ آپ کے خیال میں اس نے امریکا میں پناہ لے کر دنیا کی اشتراکی برادری کے مقابلے میں اپنے آپ کو سامراجی قوتوں سے وابستہ نہیں کر لیا؟

جواب:۔ بلا شبہ میں سولزے نتسن کے فن سے متاثر ہوں۔ لیکن میں اس کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ زار کا روس آج کے سوویت روس سے بہتر تھا تو میں اسے بھی درست نہیں سمجھتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ روس میں اس کے فن کی مناسب پذیرائی نہیں ہوئی اور پھر اسٹالن نے اسے طویل عرصے تک بیگار کیمپوں میں قید رکھا۔ اس وجہ سے اس کا ردِ عمل بہت زیادہ مخالفانہ ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ سوویت یونین کو اشتراکی سماج میں سولزے نتسن جیسے ادیب کو برداشت کرنا چاہیے تھا۔ اب اس کا کردار امریکا کے ایجنٹ کا سا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا ادبی قامت بری طرح متاثر ہوا ہے۔

سوال:۔ گارشیا مارکیز کی حقیقت پسندی کیا ہے؟ مارکیزی حقیقت پسندی اور اشتراکی حقیقت پسندی میں کیا تضادات ہیں؟

جواب:۔ گبریئل گارشیا مارکیز کو ۱۹۸۳ء میں نوبل پرائز ملا ہے۔ ان دنوں لاطینی امریکا میں میکسیکو سے لے کر ارجنٹائن تک انقلابی ادب پیدا ہو رہا ہے۔ ایسا ہے جیسے گوگول، دوستووسکی، تالستائی اور چیخوف کا عہد روئے زمین پر لوٹ آیا ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے روس اور بیسویں صدی کے لاطینی امریکا میں بہت فرق ہے۔ پھر بھی آج کے لاطینی امریکا میں جبر و استبداد کی سطح انیسویں صدی کے روس کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ لاطینی امریکا کے خلاف خارجی قوتیں اسی طرح مصروفِ کار ہیں جس طرح زار کے روس میں تھیں۔ اس طرح لاطینی امریکا پر مسلط آمریت اور زارشاہی کی

آمریت میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس صورت حال نے لاطینی امریکا میں بڑے شاعروں کو جنم دیا ہے۔ چلی کے پابلو نرودا اور گبریئل مسترال کو پہلے ہی نوبل پرائز مل چکا ہے۔ ہیبرز رویلیو اور آرمینڈو والدریس، جنھیں کاسترو نے بیس سال قید رکھا، اہم شاعر ہیں۔ جہاں تک مارکیز کا تعلق ہے نہ تو وہ کسی اشتراکی جماعت کا رکن ہے اور نہ ہی شولوخوف جیسی انقلابی ترقی پسندی کا حامل۔ اس کی شہرت کا واحد سبب تیسری دنیا سے اس کی ہمدردیاں ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکا جو تیسری دنیا پر استبداد کرنے والی قوتوں کا سرخیل اور تیسری دنیا کے ہر آمر کا فعال حامی ہے، مارکیز کو نوبل پرائز دلوانے پر کس طرح آمادہ ہوا؟ نوبل پرائز دینے والی کمیٹی بہرحال امریکا نواز تھی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سارتر نے نوبل پرائز واپس کر دیا تھا۔ پیسترناک کو ڈاکٹر ژواگو پر نوبل پرائز دیے جانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے ناول میں مارکسیت کو للکارا ہے۔ لیکن مارکیز مارکسیت کا مخالف نہیں ہے۔ تو پھر دنیا کی بورژوا قوموں نے اسے نوبل پرائز سے کیوں نوازا؟ مغرب کے فن و ادب میں ترقی پسندانہ حقیقت پسندی کا عنصر بمشکل ہی نظر آتا ہے۔ ایملی ژولا کے بعد فرانس میں حقیقت پسندانہ ادب کی حوصلہ افزائی کبھی نہیں کی گئی۔ لیکن وجودیت یورپ کو بہلے گئی، اس حقیقت کے باوجود کہ سارتر ایک زمانے میں روس کا حامی اور سامراجیت کا دشمن تھا۔ لیکن اس کے پس پشت اصل وجہ یہ تھی کہ فلسفۂ وجودیت تاریخ کے روسی تصور اور جدلیاتی مادیت کی بنیادوں کی نفی کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں کے ابتدائی تضادات کے دور میں سارتر اشتراکی نظام کا حامی تھا۔ اس نے اسٹالن کے عہد کے استبداد سے صرف نظر کر لیا تھا جب کہ کامیو نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا کامیو یورپ کے بورژوائی فلسفیوں کی آنکھ کا تارا بن گیا کیونکہ اس کا بنیادی فلسفہ ہی مارکسیت کے خلاف تھا۔ بالکل اسی انداز میں مارکیز کی جادوئی حقیقت پسندی (میجیکل ریئل ازم) کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جس کا مقصد لاطینی امریکا میں مارکسیت سے متاثرہ ادب کی حوصلہ شکنی کرنا ہے۔ میں نے مارکیز کی پانچ چھے کتابیں پڑھی ہیں جنھوں نے مجھے صرف بور ہی کیا ہے۔ میرا ایقان ہے کہ ہمارے ادب پر مارکیز کا اثر سودمند نہیں ہوگا۔ سلمان رشدی اور اطیلو کالوینو ایسے تجربات پہلے ہی کر چکے ہیں جن سے میں قطعاً متاثر نہیں ہوں۔

سوال:۔ دنیا کے کون سے حصوں میں بہترین ادب تخلیق ہو رہا ہے؟

جواب:۔ لاطینی امریکا اور جنوبی افریقا میں۔ لاطینی امریکا کے انقلابی مسیحی ایران کے امام خمینی کے برعکس اپنے فلسفیانہ تصورات اور فنکارانہ نقطۂ نظر میں زیادہ ہوشمند ہیں۔ جنوبی افریقا میں لکھے جانے والے ناولوں میں نسلی امتیاز کے خلاف نفرتوں کی آگ نے انھیں دنیا بھر میں مقبول بنا دیا ہے۔ پولینڈ اور جرمنی میں بھی جاندار ادب لکھا جا رہا ہے۔ تاہم عالمی ادب کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آمریت سے ٹکرانے

والے ادیب ہی عظیم ادیبوں کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ایک بار میں نے دو ایسے ادیبوں کے بارے میں پڑھا جنھیں ایک ایسی آمرانہ حکومت کے خلاف احتجاجی مراسلے پر دستخط کرنے کو کہا گیا جس نے ملک میں دہشت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار کر دیا: میں تنہا نہیں ہوں، میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ دوسرے نے اپنا قلم نکالا اور دستخط کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے دستخط ضرور کرنے چاہییں کیونکہ میرا ایک بیٹا بھی ہے!" پہلے ادیب کو اپنے ذاتی تحفظ کی فکر تھی، سو اس نے دستخط نہیں کیے۔ لیکن دوسرے کو اپنے بیٹے کی سلامتی دستخط کرنے میں نظر آئی۔ اسے اپنے معاشرے کے مستقبل کا تحفظ درکار تھا۔ ہر ادیب کا یہی مسئلہ ہے۔

ال:۔ پاکستان کے حوالے سے انقلاب کے بارے میں آپ کا کیا تصور ہے؟

اب:۔ موجودہ صورتِ حال ایسی ہے کہ اگر مذہبی رواداری کے ساتھ مکمل جمہوریت بحال ہو جائے تو یہ بات بھی انقلاب سے کم نہیں ہو گی۔ اشتراکیت کا مرحلہ تو بہت بعد کی بات ہے۔ تاہم سارے برِصغیر کے حوالے سے میرا تصورِ انقلاب ہنوز میرے ذہن میں ہے جس کا عکس آپ میری شاعری میں دیکھ سکتے ہیں۔

ل:۔ جدید سندھی شاعری میں محبوب کا تصور، احترام، برابری اور جنسِ مخالف کے لیے جذبۂ آزادی سے تہی ہے۔ گویا محبوب چاہنے کی شے نہیں، فقط جنسِ تجارت ہو۔ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں؟

ب:۔ ہاں۔ اس کا سبب غیر ملکی، خاص طور پر مغربی شاعری کا اثر ہے۔ سندھی غزل نے فارسی اور اردو شاعری سے جو روایت اخذ کی ہے اس میں محبوب جنسِ تجارت نہیں ہے۔ اس روایت میں محبت واحترام کا عنصر تو ہے لیکن برابری اور عزت کا تصور نہیں ہے۔ اس میں محبوب عام طور پر اس کربِ جدائی سے لاتعلق رہتا ہے جو عاشق سہتا ہے۔ محبوب کو بت بنا کر پوجا جاتا ہے، اور بس۔ لیکن برِصغیر کی ہندی اور سندھی کلاسیکی شاعری میں محبوب بھی اتنی ہی محبت کرتا ہے اور اتنا ہی دکھ سہتا ہے۔ لیلا، مومل اور سسی میں، جو بھٹائی اور دوسرے کلاسیکی سندھی شاعروں کی ہیروئن ہیں، محبت ایک دوطرفہ سلسلہ ہے، ایک باہمی معاملہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سندھی شاعری کی ہیروئن عاشق کی حیثیت سے زیادہ وقیع ہیں۔ تاہم جدید سندھی نثر اور خاص طور پر فکشن میں، میں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ محبوب کو ایک خوبصورتی کی شے سمجھا جاتا ہے۔ جس کا مقصد فقط عاشق کی دلداری ہے۔ یہی وہ مغربی اثر ہے۔ جس کی طرف میں اشارہ کر رہا تھا۔ مغرب کی سرمایہ دارانہ ثقافت کے نزدیک "جنس" فقط جنسِ تجارت ہے۔ اس معاشرے میں کوئی انسانی قدر نہیں ہے۔ انسانی قدریں حصولِ زر کی دوڑ میں غائب ہو چکی ہیں۔ گاڈ فادر جیسے ہزاروں ناول

محبوب کے تصور سے تہی ہیں۔ جدید مغربی ادب میں جس شے پر زور ہے وہ صرف جنس ہے۔ برابری اور آزادی کے کچھ عنصر کے باوجود جدید مغربی ادب بنیادی طور پر عزتِ زن کے تصور سے خالی ہے۔ ایسے رجحانات آپ کو اشتراکی ادب میں کہیں نہیں ملیں گے۔ اشتراکی ادب میں جنس خرید و فروخت کی چیز نہیں ہے۔ روسی سماج میں عورت کو برابری، احترام اور آزادی حاصل ہے اور جاگیردارانہ ثقافتی اقدار، جن میں عورت کو فقط مرد کا ذریعۂ تفریح سمجھا جاتا ہے، سخت قابلِ نفرت ہیں۔ روسی ناول ڈاکٹر ژواگو میں لارا کا کردار اس امر کی نمایاں مثال ہے۔

سوال:۔ جدید سندھی ادب میں فلسفۂ تصوف کس حد تک سمویا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ تصوف ایسا فلسفہ ہے جو مذہبی جنون اور مذہبی تعصب سے بالکل متضاد ہے۔ تصوف مذہبی رواداری کا درس دیتا ہے اور انسانوں کی برابری اور ان سے محبت پر یقین رکھتا ہے۔ "جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا"، تصوف کا بنیادی اصول ہے۔ تصوف زمین پر موجود انسان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تاہم جدید انسان کے لیے تصوف کو مکمل فلسفے کی حیثیت سے قبول کرنا قدرے دشوار ہے۔

سو فلسفۂ تصوف دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا جز ولاینفک ہے۔ میں نے مسیحیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے بہت سے دلچسپ کرداروں کے بارے میں پڑھا ہے، جن کا زندگی کی جانب ردِعمل تصوف اور اس کے مثالیے سے مشابہ ہے۔ تصوف کے انسانی پہلوؤں اور کسی سائنسی فلسفے کا کوئی ہم آہنگ امتزاج ہونا چاہیے۔

سوال:۔ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک متحدہ جماعت بنانے کی جو کوششیں جاری ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ میں اس خیال کی مکمل حمایت کرتا ہوں۔ یہ کام بہت ضروری ہے اور ہر قیمت پر کیا جانا چاہیے۔

سوال:۔ ترقی پسند سندھی ادیبوں کے لیے آپ کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟

جواب:۔ سیلاب کے ریلے کو جب روکا جاتا ہے تو موجیں پیچھے ہٹ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن پھر بھی اگر زندہ قوم کی حیثیت سے جینا ہے تو اپنی کمزوریوں کو طاقت میں ڈھال کر متحد ہونا ہوگا۔ آپ چاہے جی ایم سید کے پیرو ہوں یا بے نظیر بھٹو کے حامی، رسول بخش پلیجو کے معتقد ہوں یا جام ساقی کے۔ اپنے آپ کو الگ اکائی کی حیثیت سے شناخت کروا کے منقسم نہ ہوں۔ تنکوں کو چن کر انھیں یکجا کر لو، مبادا وقت کا ریلا سب کچھ بہا لے جائے۔ سندھی ادبی سنگت کو ان خطوط پر استوار کریں۔ ●●

دلیپ سنگھ
۵۹/۴ راجندر نگر نئی دہلی ۶۰

مرنا تری گلی میں

اُردو ادب میں ہزاروں ایسے شعر ہیں جن میں شعرا حضرات نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی گلی میں مرنا چاہتے ہیں۔ اتنے سارے شعر پڑھنے کے باوجود میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ اس خواہش کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے محبوب کو اپنے دل میں بسانا چاہتا ہے تو بات میری سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ کم ازکم شاعروں کا خیال ہے کہ اگر محبوب دل میں رہتا ہو تو اس کی صورت دیکھنے میں آسانی رہتی ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ اگر کوئی اپنے محبوب کے گھر کے سامنے مکان کرایے پر لینا چاہتا ہے تب بھی بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس طرح تانک جھانک کے موقع آسانی سے ملتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی قبر اسی قبرستان میں ہو جس میں اس کا محبوب دفن ہے تب بھی بات سمجھ میں آتی ہے کیونکہ روزِ قیامت جب مردے اٹھا کر قطار میں کھڑے کیے جائیں گے تو ممکن ہے کہ شاعر اور محبوب ایک ہی قطار میں ہوں اور ایک دوسرے کی خیریت پوچھ سکیں۔ لیکن محبوب کی گلی میں مرنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔

یوں بھی مرنا کوئی ایسا عظیم کارنامہ نہیں جسے سرانجام دینے کے بعد آدمی یہ سمجھے کہ میں نے بڑا تیر مارا ہے۔ اگر کوئی زندگی میں کچھ بھی نہ کرے تو بھی ستر اسی سال کی عمر میں مر ضرور جاتا ہے۔ بلکہ اگر دلی کی بسوں یا ہسپتالوں کی مدد لے تو یہ کارنمایاں جلدی بھی ممکن ہے۔ مرزا غالب جیسے سمجھ دار آدمی نے موت کے بارے میں فرمایا ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے جس کا ہمیں پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا۔ عام طور پر موت جب آتی ہے تو آدمی چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رہا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اگر چاہے بھی تو محبوب کی گلی تک پہنچ نہیں سکتا۔ پھر یہ خواہش کس لیے؟

ہمارے ہاں کی گلیوں کی حالت کچھ اس طرح کی ہے کہ اُن میں مرنا تو درکنار چلنا پھرنا بھی دشوار ہے۔ اگر دلی کے چاندنی چوک کے ارد گرد کی گلیوں میں کبھی آپ کا گزر ہوا ہو تو آپ کی سمجھ میں شاید آجائے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ آپ گلی میں سے گزر رہے ہیں کہ آپ کے سر پر کوڑے کا ڈھیر آپڑا۔ بجائے اس کے کہ کوئی آپ کے کپڑے جھاڑے، لوگوں نے آپ کی بگڑی ہوئی

صورت پر قہقہے بلند کیے۔ گلیاں تنگ و تاریک اتنی کہ دن میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ باہر آندھی چل رہی ہو تو ان گلیوں میں یوں لگتا ہے جیسے کوئی اپنے لاڈلے کو پنکھا کر رہا ہے۔ ان گلیوں میں ایک بار گھس جاؤ تو باہر آنے کا راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ جو استاد ذوق کا شعر ہے ناکہ

آج کل دکن میں گرچہ بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

کئی سال تک میں اس شعر کا مطلب یہ سمجھتا رہا کہ مان لیا دکن میں قدرِ سخن ہونے کی وجہ سے کمائی کی صورت ہو سکتی ہے لیکن میں جو دلّی کی گلیوں میں پھنسا ہوا ہوں، ان سے نکلنے کا مجھے راستہ ہی سجھائی نہیں دیتا تو میں دکن جاؤں کیسے۔ بعد میں کسی شفیق استاد سے معلوم ہوا کہ یہ بات نہیں تھی، ذوق کو راستہ تو معلوم تھا لیکن محبت کی وجہ سے وہ دلّی کی گلیاں چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ٹھیک ہے صاحب لوگوں کو خرگوشوں اور گلہریوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ کبوتروں اور بلیوں سے محبت ہو جاتی ہے، یہ تو پھر دلّی کی گلیاں ہیں۔

ہو سکتا ہے ہمارے شعرا کو خیال ہو کہ اگر محبوب کی گلی میں اُن کی موت ہو جائے تو شاید وہ اُن کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اور بال کھول کر زار و قطار روئے اور اس طرح انھیں اپنے محبوب کے حُسن کو بغور دیکھنے کا موقع ملے۔ اُن کو شاید اس بات کا احساس نہیں کہ مُردے کی بینائی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں جس محبوب نے اپنی زندگی میں انھیں گھاس نہ ڈالی وہ بھلا مرنے کے بعد اُن کا سر اپنے زانو پر کیوں رکھے گا۔ لیکن یہ ٹھہرے شاعر لوگ، یہ کہاں سمجھنے والے ہیں۔

اگر آدمی اپنے گھر میں اپنے عزیز و اقارب کے درمیان مرے تو اس کے کئی فائدے ہیں۔ یہاں وہ لوگ بھی آپ کی موت پر آنسو بہاتے ہیں جو درحقیقت آپ کی موت پر شیرینی بانٹنا چاہتے ہیں۔ آپ کی لاش کو لوگ عزت سے کندھوں پر اُٹھا کر قبرستان تک لے جاتے ہیں اور نہایت حفاظت کے ساتھ آپ کو قبر میں اس طرح اتارا جاتا ہے کہ آپ کو کہیں چوٹ نہ لگے۔ لیکن گلی میں مرنے والے کی لاش کو عام طور پر میونسپلٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اور میونسپلٹی مُردوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے وہ تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا سلوک وہ عام طور پر زندہ لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

شاعروں کا تو خیر باوا آدم ہی نرالا ہے لیکن اتنا میں ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ کئی بار کوئی بہت ہی حسین جگہ دیکھ کر وہاں مرنے کو جی مچل اُٹھتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان کوئی خوبصورت جگہ دیکھ کر کسی نہ کسی طرح اُس کا حصہ بن جانا چاہتا ہے اور ایسا سوائے وہاں دفن ہونے کے ممکن نہیں۔ میں نے بچپن میں اپنی کورس کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک دفعہ ایک انگریز اپنی بیوی کو ساتھ لے کر تاج محل دیکھنے آیا۔ بیوی تاج محل کو دیکھ کر اس قدر مسحور ہوئی کہ اُس نے وہیں اُسی وقت مرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ساتھ ایک شرط بھی لگا دی۔ اس نے اپنے خاوند سے کہا۔

"ڈارلنگ میں آج اِسی وقت مرنے کو تیار ہوں اگر تم میری قبر پر ایسا ہی مقبرہ بنانے کا

وعدہ کرو۔"

انگریز شوہر اپنی آزادی کی خبر سن کر خوش تو بہت ہوا لیکن تاج محل کی بنوائی کے خرچ کا حساب لگا کر کہنے لگا: "نہیں ڈارلنگ میں تمھیں ہرگز مرنے نہیں دوں گا۔ تمھاری موت تو مجھے برباد کر دے گی۔"

چار پانچ سال پہلے میں ملازمت کے سلسلے میں مغربی یوروپ کے ملک آسٹریا کی راجدھانی وی آنا میں رہ رہا تھا۔ یہ شہر دنیا کے حسین ترین شہروں میں گنا جاتا ہے۔ اس کے حسن کو دیکھ کر میرے دل میں بھی خیال آیا تھا کہ میں اگر یہاں مر جاؤں تو میں بھی اس حسن لازوال کا حصہ بن سکتا ہوں۔ لیکن وہاں مرنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اگر میں یہ حرکت کر گزروں تو میری لاش کو ٹھکانے لگانے پر کیا خرچ ہوگا۔ کنبے کے باقی افراد پر کیا گزرے گی، وغیرہ۔ اس لیے میں اپنے ارادے کو ملتوی کرتا گیا۔

اس طرح دو تین سال گزر گئے۔

یوروپین لوگ پتا نہیں کس طرح ہماری خفیہ خواہشات کا پتا لگا لیتے ہیں۔ ایک دن مجھے ایک دعوت نامہ ملا جس میں لکھا تھا کہ آسٹرین سرکار کی طرف سے فلاں مقام پر ایک سیمنار ہوگا جس میں اس بات پر بحث ہوگی کہ اگر کوئی غیر ملکی وی آنا میں مر جائے تو اس پر کیا گزرے گی۔

دعوت نامہ پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ آسٹرین سرکار محض میرے ذہن میں ابھرے ہوئے سوالات کا جواب دینے کے لیے یہ سیمنار کروا رہی ہے۔

سیمنار میں کیا ہوا، اس کا ذکر تو بعد میں کروں گا۔ پہلے ذرا دعوت نامے کا مضمون سن لیجیے۔ لکھا تھا۔

"ہمیں اعتراف ہے کہ وی آنا میں مرنے کے کچھ نقصانات ہیں۔" یہاں تک پڑھ کر مجھے ایسے لگا جیسے دعوت نامہ بھیجنے والے یہ کہہ رہے ہوں کہ اور کہیں مرنے میں فائدے ہی فائدے ہوں۔ آگے لکھا تھا۔

"چونکہ لوگ عام طور پر موت کے تصور سے ہی گھبرا جاتے ہیں اور اس کے نتائج پر غور کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس لیے آسٹرین سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ اس زمین دوز مضمون پر بحث کرنے کے لیے ایک سیمنار کیا جائے اور اس معاملے کی تہ تک پہنچا جائے۔"

میں جب سیمنار میں پہنچا تو وہاں لوگوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میری طرح ہزاروں اور لوگ وی آنا میں مرنے کے خواہش مند ہیں۔

پہلی تقریر وہاں کے نیشنل بینک کے گورنر کی تھی جس نے اس بات پر زور دیا کہ مرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اگر اس کا پیسا ہمارے بینک میں ہے تو اپنے وارثین کے نام ہمیں بتا کر جائے۔ میں نے اس کی تقریر سنی ان سنی کر دی کہ میرا اس کے بینک میں کچھ تھا ہی نہیں۔ ویسے بھی ہم ہندستانیوں کا عقیدہ ہے کہ:

کوڑی نہ رکھ کفن کو
دے گا خدا دفن کو

دوسرا مقرر امی گریشن آفیسر تھا جس نے اس نکتے کی وضاحت کی کہ اگر کوئی غیر ملکی آسٹریا میں مر جائے گا تو اس کے کنبے کے دوسرے لوگوں کو اس ملک سے جانا ہوگا۔ ازراہِ نوازش اس نے یہ بات صاف کر دی کہ کنبے کے لوگوں کو وہاں نہیں جانا ہوگا جہاں مرنے والا جارہا ہے۔ بلکہ وہاں جانا ہوگا جہاں سے وہ آیا تھا۔

لیکن اصل دلچسپ اور ضروری تقریر کفن دفن کرنے والی ایک فرم کے جنرل منیجر کی تھی۔ اس نے نہایت دلچسپ انداز اور رہتاشں بشاش لہجے میں اس سفر کے تمام پڑاؤں کا ذکر کیا جن سے ایک مُردے کو اپنے مالکِ حقیقی سے ملنے کے لیے گزرنا ہوگا۔ کہنے لگا۔ "جنّت کی راہ بڑی کٹھن ہے۔ میّت کتنا بھی زور لگائے، کتنا بھی دوڑے، ایک ہفتہ تو محض قبرستان کے انتظامیہ سے ملاقات ہونے میں لگ جاتا ہے۔ "لیکن" وہ کہنے لگا کہ "ہم (اور لفظ "ہم" پر زور دینے کی غرض سے اس نے جو میز پر مکّا مارا تو وہ زمین دوز ہوگیا۔) کسی جلد باز میّت کے لیے پندرہ ہزار روپے کی معمولی فیس لے کر اُسے پہیئے لگا دیں گے۔"

وہ کہنے لگا۔ "آپ لوگوں کے لباس اور چہرے مُہرے سے عیاں ہے کہ آپ جب مریں گے تو کوئی معمولی مُردے نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ چاہیں گے کہ آپ کا کفن دفن اعلا درجے کا ہو۔ ہم آپ کے لیے یہ کریں گے معمولی سی فیس لے کر، اور وہ فیس ہے پچھتّر ہزار روپے کی حقیر رقم۔ اس معمولی رقم میں اگر آپ چاہیں گے تو ہم آپ کی قبر تیار کروا دیں گے اور چاہیں گے تو آپ کو نذرِ آتش کریں گے۔ یہ مت سمجھیے کہ ہمارے ہاں شمشان نہیں ہیں۔ ہیں صاحب، اور کیا شمشان ہیں صاحب کہ انھیں دیکھ کر میّت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ آپ کی لاش کو لفٹ کے ذریعے بیس منٹ میں لے جایا جائے گا اور جب تک آپ کے وارثین تین گنے گیں۔ آپ اپنے مالکِ حقیقی کے قدموں میں بیٹھے ہوں گے۔ ہم نہ لکڑی جلائیں گے اور نہ کوئلہ۔ اور آپ کا کام تمام ہو جائے گا۔ بس دھوئیں کا ایک ہلکا سا بادل فضا میں اُبھرے گا اور آپ کے وارثین میر کا یہ مصرعہ حیران ہو کر پڑھیں گے کہ۔

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

تقریر جاری رکھتے ہوئے اُس نے کہا کہ "اگر آپ کی میّت پر آنسو بہانے والے کسی اور ضروری کام میں مصروف ہوں یا کسی خاص وجہ سے رونے دھونے پر رضامند نہ ہوں تو ہم آپ کے لیے یہ خدمت بھی سر انجام دیں گے۔ آپ کا مقدور ہونا چاہیے، نوحہ گر ہم مہیا کریں گے۔"

اس کے علاوہ بھی اس سیمنار میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ پُرجوش اور پُرمغز۔ میں نے یہ سب تقریریں سنیں اور ان پر غور و خوض کرنے کے بعد بادلِ نخواستہ

س نتیجے پر پہنچا کر دی آنا ہیں مرنے کی لاکھ خواہش میرے دل میں سہی لیکن اس شہر میں
ندہ رہنا کہیں زیادہ لذت بخش اور کہیں زیادہ سستا ہے۔ انگریز عورت کے خاوند کی طرح میری
بلیہ کا بھی خیال تھا کہ اس خوبصورت شہر میں مرنے کی بجائے میرے زندہ رہنے میں ہی ہم سب
کی بھلائی ہے۔ ●●

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی اور دیگر تصانیف کے آئینہ میں

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

لسان الصدق۔ اڈیٹر۔ مولانا آزاد ۷۵/۰۰
مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/۰۰
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں۔ مالک رام ۵۱/۰۰

دیگر اداروں کی مطبوعات

۱۔ فائل مکمل الہلال۔ مولانا آزاد ۶۰۰/۰۰
۲۔ الہلال کے منتخب افسانے " ۱۰/۰۰
انتساب تذکرہ " ۱۲/۰۰
" ہمدرد " ۱۵/۰۰
" زمیندار " ۱۳/۰۰
" مدینہ بجنور " ۱۲/۰۰
" خطبات جمعیۃ علمائے ہند " ۱۳/۰۰
" خلافت " ۱۵/۰۰
یادگار آزاد " ۱۲/۰۰
الہلال کے تبصرے " ۱۸/۰۰
انتساب غبار خاطر " ۳/۰۰
" ہفتہ وار پیغام " ۸/۰۰
تذکرہ مرتبہ مالک رام ۶۰/۰۰
غبار خاطر " ۴۰/۰۰
خطبات آزاد " ۵/۰۰
ترجمان القرآن ۳ چار حصے ۳۰۰/۰۰
ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی ۲۰/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد۔ مجموعہ مضامین ۱۸/۰۰
عزیمت و دعوت ۱۸/-
ام الکتاب تفسیر سورۂ فاتحہ ۳۲/-
حواشی ابوالکلام آزاد مرتب مسیح الحسن ۶۲/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے ڈاکٹر خلیق انجم ۴۸/-
ابوالکلام آزاد نمبر ایوان اردو ۹/۰۰

خطوط شبلی بنام آزاد۔ مرتبہ ڈاکٹر سید حسنین ۲۰/۰۰
مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد۔ عبدالقوی دسنوی ۱۵/-
ہفتہ وار پیغام۔ مولانا آزاد ۱۰۰/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد (ہندی) ۱۵/۰۰
مضامین البلاغ۔ مولانا آزاد ۲۰/۰۰
اصحاب کہف " ۱۵/۰۰
آزاد کی تقریریں " ۲۷/۰۰
حضرت یوسف السلام " ۱۰/۰۰
تحریک آزادی " ۲۵/۰۰
ہجر و وصال " ۲۰/۰۰
جامع الشواہد " ۸/۰۰
فلسفہ " ۱۰/۰۰
عیدین " ۷/۰۰
ولادت نبوی " ۹/۰۰
صدائے حق " ۷/۰۰
مقالات آزاد " ۱۰/۰۰
قرآن کا قانون عروج و زوال ۱۵/۰۰
مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری ۶۰/۰۰
مولانا آزاد فکر و فن ۶۰/۰۰
انسانیت موت کے دروازے پر ۲۲/۰۰
انڈیا ونس فریڈم مع ۳۰ صفحات انگلش ۷۵/-
ہماری آزادی " " اردو زیر طبع
مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی کچھ میری زبانی ۳۰/۰۰
شہید اعظم ۷/- ● آئینہ ابوالکلام آزاد ۲۰/۰۰ ● البیرونی اور جغرافیہ عالم ۱۴/- ● غالب اور ابوالکلام آزاد ۳۰/- مولانا آزاد فکر و نظریے کے آئینے میں ۳۰/-
اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ ۲۲/-
مولانا آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل ۳۰/-
مولانا آزاد البم ۹۰۵/-
مسلمان عورت ۲۰/-
مسئلہ خلافت ۲۵/-

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵۔ بمبئی ۳۔ علی گڑھ ۱

انور سدید
۱/۲ استیلے بلاک اقبال ٹاؤن
لاہور ۵۴۵۷۰ پاکستان

کچھ وقت پاکستانی کتب و رسائل کے ساتھ

دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا/ڈاکٹر آغا سہیل

ڈاکٹر آغا سہیل افسانہ نگار ہیں، نقاد ہیں، استادِ ادب ہیں، لکھنوی تہذیب کے پروردہ ہیں اور اب دبستانِ لکھنؤ کے داستانی ادب کے ارتقا کا تحقیقی مقالہ لکھ کر بجا طور پر محقق بھی تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اس مقالے کو جزوی طور پر مغربی پاکستان اردو اکادمی لاہور نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اور یہ اس سلسلے کی ایک تابندہ کڑی ہے۔ جس کے تحت ڈاکٹر وحید قریشی صاحب پی۔ایچ۔ ڈی کے مقالات تحقیق کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اور یوں اس کام کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں جس کی اشاعت پر منافع سند تجارتی ناشر تیار نہیں ہوتا اور تحقیقی مقالے یونی ورسٹی لائبریریوں تک ہی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل تھا۔ لیکن پہلا باب جس میں آغا سہیل صاحب نے اپنی سمتِ تحقیق متعین کی ہے۔ اور داستان کی فنی بحث پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے اس کتاب میں شامل نہیں۔ بقول ان کے "بابِ اول کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ بعض تفصیلات اور ان کی جزئیات نیز حواشی مفصل صورت میں ضبطِ تحریر میں آجانے سے یہ باب تھوڑا سا بوجھل ہو گیا تھا" اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے ایک علاحدہ کتاب کی صورت دے دی اور اس کی تلخیص زیرِ نظر کتاب میں شامل کر دی ہے۔ جس سے کتاب کا داخلی ربط مجروح نہیں ہوتا۔

کتاب میں شامل تلخیص سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سہیل صاحب نے ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب کے سابقہ کام پر تنقیدی اور تحقیقی نظر ڈالی ہے اور ان سے واضح اختلاف بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر بخاری نے لکھا تھا کہ "داستان فورٹ ولیم کالج میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں اس پر شباب آیا اور رام پور میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جب کہ اختلافی زاویے سے ڈاکٹر آغا کا خیال ہے کہ۔

"اصل داستان لکھنؤ میں پیدا ہوئی، لکھنؤ ہی میں اس پر شباب آیا اور لکھنؤ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔" ڈاکٹر آغا سہیل نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے اصل مقالے اور نظرِ ثانی شدہ اڈیشن کے مابین وہ بُعد پیدا کر دیا ہے کہ دونوں کا پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ بالخصوص دوسرے اڈیشن میں موصوف نے سہیل بخاری کے مقالے سے بہت سی چیزیں بغیر کسی حوالے کے درج کی ہیں جس نے کچھ عجیب خلطِ مبحث پیدا کر دیا ہے۔"

اس سب کے باوجود انھوں نے ان دونوں بزرگوں کی کد و کاوش کو احترام فائقہ کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا سہیل صاحب کے مقالے کا وہ حصّہ جس میں سرگرم بحث ابھاری گئی ہے۔ وہ فی الحال الگ باندھ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور زیر نظر کتاب میں صرف وہی حصّے شامل ہیں جو غیر اختلافی ہیں۔ اب یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں لکھنؤ کے تہذیبی پس منظر اور داستان کے اوّلین نقوش کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور اس باب ہی میں انھوں نے ۳۵ داستانوں کی تفصیل فراہم کی ہے جن کا تعلق دبستانِ لکھنؤ سے ہے۔ ایک باب تحسین اور نو طرزِ مرصّع کے لیے اور دوسرا باب "رجب علی بیگ سرور اور فسانۂ عجائب" کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ ایک اور باب میں فسانۂ آزاد سے داستانی عناصر تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ چھٹا اور ساتواں باب حاصلِ مطالعہ سمجھیے۔ ان میں لکھنویت کے عناصر طلسمات اور مہمات کی داستانوں سے تلاش کیے گئے ہیں، اور آخر میں یہ معنی خیز نتیجہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ۔

"دہلوی اور لکھنوی حوالہ ایک مخصوص اور بیمار ذہنیت کا پتا دیتے ہیں اور ان فرسودہ عوامل کو اردو کے وسیع تر مفاد میں ختم کر دینا ہی مناسب ہے۔"

اور خود ڈاکٹر آغا سہیل نے دبستان لکھنؤ کے حوالے سے بات کی ہے تو اس سے ان کا کا مقصد محض زمینی دائرے یا خطّے کا تعین ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے داستان کا مطالعہ لکھنؤ کے تہذیبی ماحول کے نسبت سے کیا ہے۔ اور وہ چونکہ خود بھی اسی خطّے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ انھوں نے داستان کے داخلی عناصر کا سراغ لگانے اور اسے خنک مزاجی سے پیش کرنے میں بہت محنت کی ہے جس کی داد کے وہ مستحق ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کا جو پہلا باب حذف کر دیا گیا ہے اسے بھی ڈاکٹر صاحب جلدی چھپوا دیں تاکہ ان کے کام کا موازنہ ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر گیان چند جین کے کام سے کیا جا سکے۔ یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ ضخامت ۲۷۴ صفحات۔ اور قیمت ۹۰ روپے ہے۔ ملنے کا پتا مغربی پاکستان اردو اکادمی ۳۰، این سمن آباد۔ لاہور۔

مہران نقش / ڈاکٹر وفا راشدی

اردو ادب کی تاریخ نگاری میں ڈاکٹر وفا راشدی کا نام ان لوگوں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو کی جڑیں ہندستان کے مختلف خطّوں میں تلاش کرنے کی کاوش کی، ان کی ممتاز اور وقیع کتاب "بنگال میں اردو" ایک طویل عرصے سے "دکن میں اردو" "سندھ میں اردو" "پنجاب میں اردو" اور "سرحد میں اردو" جیسی کتابوں کے ساتھ حوالے کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ وفا راشدی ہستہ روی اور خنک مزاجی سے کام کرنے والے ادیب ہیں اور مناسب وقفوں سے ان کا وقیع کام نظرِ عام پر آتا رہتا ہے۔

ان کا تازہ ترین کارنامہ "مہران نقش" ہے اور یہ اس قریبی مشاہدے کا نتیجہ ہے جو وفا راشدی

صاحب نے سندھ کی سرزمین پر قیام کے دوران اخذ کیا۔ ڈاکٹر راشدی کی کتاب "بنگال میں اُردو" ان کی بنگال کی دھرتی سے محبت کا حاصل تھی۔ ان کی کتاب "مہران نقش" ان کی سندھ کی سرزمین سے گہری وابستگی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے سندھ کے ادب ہی کو موضوع نہیں بنایا بلکہ ادب کے وسیلے سے سندھ کے تہذیب، تمدن اور ثقافت کی روح میں اترنے کی کوشش بھی کی ہے اور اب جو مجموعی نقش تیار ہوا ہے اسی کا نام "مہران نقش" ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کچھ عرصہ قبل پاکستان کے اخبارات و رسائل میں ڈاکٹر صاحب کے سندھ کے بارے میں لکھے گئے تہذیبی و ثقافتی مضامین چھپ رہے تھے۔ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے سندھ کے موضوع پر مربوط اور گہری نظر ڈالنے کی سعی کی ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اپنے ہمدردانہ رویے، موضوع کے ساتھ دلی وابستگی اور جستجوئے صداقت کی لگن کی وجہ سے اس کتاب ایک روشن اور پُرنور کتاب بنا دیا ہے۔

یہ کتاب چار حصّوں میں منقسم ہے۔ ہر حصّے کو نقش کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے نقش میں سندھی ادب کا اجمال اسی طرح پیش کیا گیا ہے کہ ہمارے سامنے سندھ میں پرورش پانے والی سوچ کی لہر موجزن ہو جاتی ہے۔ دوسرا نقش سندھ میں فروغ پانے والے اردو ادب کے بارے میں ہے۔ اور اس میں ہماری ملاقات میر عبدالحسین سانگی، عبدالحکیم عطا ٹھٹوی، غلام محمد شاہ گدا، شمس الدین بابل، محمد محسن بیکس اور متعدد سندھی شعرا سے ہوتی ہے۔ جنھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت سندھ کے دور افتادہ علاقوں میں کی۔ تیسرے حصّے میں اردو اور سندھی کی ادبی روایت کو فارسی زبان و ادب کے بڑے دھارے سے منسلک کیا گیا ہے اور لعل شہباز قلندر، سچل سرمست، خواجہ حسن سرہندی جیسے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے نہ صرف سندھ میں فارسی شاعری اور زبان و ادب کا چراغ روشن کیا بلکہ عوام کی ثقافتی اور تہذیبی تربیت میں بھی حصّہ لیا اور سندھ میں تصوّف کی روایت کو فروغ دیا۔ چوتھے حصّے میں سندھ کی چند علمی شخصیات کا تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور اس میں خواجہ محمد حسن جان سرہندی، مخدوم امیر احمد، ڈاکٹر شیخ محمد اسمٰعیل خلیل جیسے بزرگوں کے کارناموں کا اور قومی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہاں مجھے اس بات کا اظہار بھی کرنا ہے کہ سندھ کے بارے میں اب اردو زبان میں معتدبہ تحقیقی کام منظرِ عام پر آنے لگا ہے۔ اس سلسلے حسام الدین راشدی صاحب، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اور کامل القادری مرحوم کے کام اور کتابوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں اظہر جاوید نے سندھ کی ممتاز ادیبہ مرحب قاسمی کے تعاون سے "تخلیق" کا "سندھی ادب و ثقافت نمبر" شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر وفا راشدی کی زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک قابلِ قدر کتاب ہے جس میں سندھ کی ادبی تاریخ ہی پیش نہیں کی گئی بلکہ اس خطّے کے باشندوں میں اردو اور فارسی زبانوں کے مثبت کردار اور اظہار کی جہات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اجمال قدرے کھٹکتا ہے اور قاری کا ذوق اس موضوع پر مزید مطالعے کے مواد کا تقاضا کرتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ وفا راشدی صاحب اس سلسلے کو جاری رکھیں گے اور ہمیں اپنے نوادراتِ تحقیق سے فیض یاب کرتے رہیں گے۔ یہ کتاب

مکتبہ اشاعتِ اردو فیصل ٹاؤن کراچی سے ۲۳۲ صفحات کی ضخامت میں چھپی ہے۔ اور قیمت ۵۰ روپے ہے۔

نیا دور / مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی

کراچی کے ادبی مجلّہ "نیا دور" کا شمار چند ایسے موقر ادبی جرائد میں ہوتا ہے جن کی ہر اشاعت اپنے ساتھ تخلیقی اور تنقیدی ادب کے تازہ جھونکے لے کر آتی ہے۔ نیا دور اگرچہ باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتا تاہم جب بھی اس کا نیا پرچہ منظرِ عام پر آتا ہے تو اس کی مندرجات پر ایک طویل عرصے تک بحث ہوتی رہتی ہے۔ اب حال ہی میں "نیا دور" کا شمارہ نمبر ۸۳۔۸۴ شائع ہوا ہے۔ اس پرچے کے اہم حصے تو وہ گوشے ہیں جو افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی، جمیلہ ہاشمی اور ن۔م۔ راشد کے لیے مرتب کیے گئے ہیں، اور ان کے فن کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ راشد پر ایک طویل عرصے کے بعد ڈاکٹر آفتاب احمد نے ایک عمدہ تجزیاتی مضمون لکھا ہے۔ اور ان سے اپنی نجی ملاقاتوں کو تازہ کیا ہے۔ اس حصے میں راشد کے خطوط کو بھی نوادرات کا درجہ حاصل ہے۔ رام لعل کے نام عبدالرحمن چغتائی، کرشن چندر اور رضیہ سجاد ظہیر کے خطوط بھی شخصیت کے چند روشن زاویوں کے مظہر ہیں۔ افسانوں کے حصے میں ممتاز مفتی، جوگندر پال، انتظار حسین، الطاف فاطمہ، منشا یاد، خالدہ حسین، تقی حسین خسرو کے نام اہم ہیں۔ ہندی افسانہ نگار عالم شاہ خاں کے افسانے "کرائے کی کوکھ" کا ترجمہ مرزا حامد بیگ نے کیا ہے اور یہ افسانہ بے رحم حقیقت نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس شمارے میں پرتو روہیلہ شہرت بخاری۔ فاروق حسن۔ جمیل یوسف۔ ساقی فاروقی کی متعدد شعری تخلیقات پیش کی گئی ہیں۔ کلچر کا مسئلہ" پر کرار حسین صاحب کی گفتگو بے حد خیال انگیز ہے۔ ۵۰۴ صفحات کے اس پرچے کی قیمت ساٹھ روپے ہے۔ ملنے کا پتا پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۵۔

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۲۶۵۷۲
بحرین (عربین گلف)

کاجی

لال ڈھانگ کا وہ گھنا اور ڈراونا جنگل مجھ سے کتنا مانوس تھا۔ بچپن میں اس کے اُونچے دیو قامت برگد اور ڈھاک کے درختوں کے نیچے سے جب گزرتا تو وہ بے پروائی کے انداز سے سر اٹھائے کھڑے رہتے۔ موسم بہار میں ڈھاک کے درخت اپنے سُرخ پھولوں سے تمام جنگل میں گویا آگ لگا دیتے تھے۔ وہاں کے چھوٹے چھوٹے دوڑتے دبکتے جانور ہم سب کو خفیہ طور سے تاڑتے ہوں گے۔ لیکن جب کبھی مجھے کسی دوڑتی ہوئی چیتل یا کاکڑ کی دُم بھی نظر آجاتی تو میں اپنی چھوٹی بہن سلمہ کو بلا کر ضرور دکھا دیتا۔ اور وہ تمام گھر میں یہ خبر پھیلا دیتی۔ جنگلاتی بنگلہ لال ڈھانگ کے جنگل کے عین وسط میں واقع تھا اور ابّا وہاں کے فارسٹ رینجر تھے۔ بنگلے کے افراد میں ابّا، امّی، میں اور سلمہ کے علاوہ ایک اور ہستی تھی ــــ کاجی ــــ ابّا کا مُنہ چڑھا نوکر۔ ابّا اُسے میدانی علاقے سے لائے تھے اور خود کو وہ روہیلہ قوم کا بتاتا تھا۔

دورا اور شکار ابّا کے لیے روز کا معمول ہو کر رہ گیا تھا کبھی پہاڑ پر ہیں تو کبھی میدان میں، کبھی ترائی کے علاقے میں گھوم رہے ہیں تو کبھی لاسی ندی کے کنارے کنارے عجب عجب قسم کے پرند، جانور اور اُن کی پُر تعفن کھالیں لائی جاتیں۔ لمبے، چمکدار اور نوکیلے سینگوں سے کمرے کی دیواریں بھر گئی تھیں۔ بطخوں اور تیتروں کے ملائم پر اکٹھے کر کے تکیوں میں بھرنے کے لیے جمع کیے جاتے کاجی مردہ ریچھ اور گلداروں کے پیٹ چاک کر کے اور مسالوں سے دھو کر، آلائش صاف کر کے، کھال بنانے والوں کی فیکٹری میں بھیج دیتا۔ ابّا کے بعد کاجی ہی کا اتنا دل گردہ تھا کہ تن تنہا مردہ گلدار یا چیتے کو دونوں ٹانگیں پکڑ کر بیل گاڑی یا جیپ سے نیچے اتار لاتا۔ کاجی واقعی ان کا بہت وفادار نوکر تھا۔ ابّا اس کی بہت قدر کرتے تھے شکار میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے وہ بہترین بیل ہانک سکتا تھا۔ اور مزیدار کھانے پکا سکتا تھا۔ بیل حالانکہ اپنے مالک کو پہچانتے ہیں۔ اور جو شخص انھیں پہلی بار ہانکنا شروع کرے تو وہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ان کی لگام ایک بودے آدمی کے ہاتھ میں ہے یا ایک تنومند اور تیز شخص کے۔ کاجی جوئے کے پیچھے بیٹھتے ہی ہاتھ میں لگام پکڑتا اور منٹوں میں بیلوں کو ہوا کر دیتا۔ اس کے ہاتھ اوپر اٹھتے ہی بیل ایسے بھاگتے جیسے بلّی کو دیکھ کر چوہا۔ کڑکتے جاڑوں میں کھلی ہوا کے سفر اور سخت محنت نے اس

کی کھال کو کھردرا کر دیا تھا۔ ہزاروں بار برسات کی راتوں میں وہ جنگل میں سخت طوفانی بارش میں گھر چکا تھا اور ساری ساری رات پیڑ پر بیٹھ کر گزار چکا تھا۔

گرمیوں کی راتوں میں وہ برآمدے میں بیٹھ کر مجھے اور سلمہ کو قصے سناتا چلا جاتا اُس وقت قریب سرکنڈے کے جھنڈوں میں جھینگر اپنا بے سُرا راگ الاپتے ہوئے نمناک ہوا میں اُن کی آواز اور بوجھل معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت اندھیری رات میں آسمان پر تارے زیادہ چمکدار دکھائی دیتے تھے اور اُن تاروں کے نیچے ہمارے بنگلے کے اردگرد نہ معلوم کتنے حشرات الارض اور جانور انتہائی خاموشی سے دوڑتے بھاگتے ہمیں دیکھتے ہوں گے مگر ہم انھیں نہ دیکھ سکتے تھے۔ کسی کو نظر نہ آؤ، بس یہی جنگل اور اس کے ساکنین کا قانون ہے۔ کبھی دور شمال کی طرف ڈھلانوں سے کسی چیتل یا جھانک کی خطرے کے موقع پر کرخت للکار کی آواز آتی جو رات کی سیاہی میں تن آور اور دیو قامت درختوں سے ٹکرا کر کچھ ایسی صدا پیدا کرتی جیسے کہ وہ تن آور درخت کوئی خوفناک خواب دیکھ کر یک لخت چیخ اٹھے ہوں لیکن کاجی اپنا قصہ جاری رکھتا۔ حتیٰ کہ ہم دونوں اونگھنے لگتے۔ میری پھیلی آنکھیں نیند سے نیم وا، اور پھر بالکل بند ہو جاتیں۔ تب شاید کاجی اپنے قصے کو نامکمل ہی چھوڑ دیتا اور ہم دونوں کو اٹھا کر خاموشی سے چارپائیوں پر لٹا دیتا، اماں سے اجازت چاہتا اور دبے پاؤں بنگلے سے نکل جاتا۔ اس کی جھونپڑی بنگلے سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔ گھاس پھونس کا بنا ہوا یہ پلندا بانس کی کھپچیوں سے چاروں طرف سے جکڑ دیا گیا تھا اور زمین سے تقریباً ایک گز کی اونچائی تک باہر کی طرف خاردار تار کا جال بُن دیا گیا تھا تاکہ کوئی خونخوار جانور رات کی تاریکی میں شب خون نہ مار سکے۔ کاجی روز اپنی جھونپڑی سے بنگلے تک اَن گنت چکر لگاتا ہوگا جب ہی تو اس کے سخت پیروں نے دونوں رہائش گاہوں کے درمیان ایک بٹیا کا نشان ڈال دیا تھا۔ کاجی جب کہتا کہ اُسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی وہ راستہ صاف نظر آتا ہے تو ہم دونوں اس کی اندر دھنسی ہوئی تیز چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے لگتے اور کھِل کھِلا کر ہنس پڑتے۔ تب کاجی کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی اور وہ سلمہ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر اچھالنے لگتا۔ اونچا — اور اونچا حتیٰ کہ سلمہ مارے ڈر کے رونے چیخنے لگتی اور وہ اچھالنا بند کر کے پیار سے اُسے سینے سے لگا لیتا۔

کاجی اور ابّا جنگلات میں ساتھ ساتھ گشت کے لیے نکل جاتے تو بعض اوقات دو دو، تین تین دن تک نہ لوٹتے تھے۔ اس وقت ہم لوگ امی کو بہت پریشان کرتے اُن سے کہانیاں سنانے کے لیے اصرار کرتے۔ امی کہانی شروع کرتیں کبھی بادشاہ کی اور کبھی پریوں کی تو ہم شور مچاتے کہ ہم تو شیر بھیڑیوں کی کہانیاں سنیں گے۔ شاید جنگل کے ماحول میں انسان ہمارے لیے ایک غیر دل چسپ شے ہو کر رہ گیا تھا۔ اور پھر اماں کاجی کو بکنے، کوسنے دینے لگتیں کہ اس کم بخت نے موئے درندوں کے قصے سنا کر ہمیں ڈھیٹ کر دیا ہے وقت بے وقت جنگل میں نکل گئے تو کوئی جانور لے کر فرار ہو جائے گا۔ انھوں نے سیکڑوں بار کاجی کو شیر، بھیڑیوں کے قصے سنانے پر ڈانٹا، ڈپٹا لیکن وہ تابعدارانہ ہنسی ہنسنے لگتا۔ اس وقت ایسا لگتا کاجی بھی ہماری طرح اس گھر کا ننھا منا بچہ

ہے!

اتفاق کی بات کہ ابا اور کاجی دونوں شکار کے دیوانے تھے۔ دوسرے پر نہ ہوتے تو ابا یوں ہی بندوق اٹھا کر چلے جاتے اور دن چھپتے چھپتے ایک دو تیتر یا مرغ پیٹ لاتے خالی ہاتھ تو کبھی کبھار واپس آتے۔ کاجی ہمیشہ سایے کی طرح اُن کے ساتھ رہتا۔ جنگل میں دالڑ کرتے وقت اُن کے اشارے سمجھتا اور اشاروں پر ناچتا تھا۔ زخمی جھانکوں اور چیتلوں پر لپکتا تھا ان کا پیچھا کرتا اور میل میل بھر ان کے تعاقب میں نکل جاتا۔ اور جب جانور بلکان ہو کر گر جاتا تو وہ اُسے پکڑ کر، سر پر اٹھائے ابا کو راستے میں ہی آن ملتا۔ ابا کبھی کبھی کاجی سے کہتے۔ کاجی! تو آدمی نہیں۔ بیل ہے بیل، ابا اس کی تعریف اس کے مُنہ پر بہت کم کرتے تھے کہتے تھے کہ نوکر کو مُنہ نہیں لگانا چاہیے لیکن اس کی غیر موجودگی میں اس کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے تھے، کہتے کہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈو تو ایسا وفادار نوکر نہ ملے گا۔ میں اس وقت اچھے نوکر کی خصوصیات اور اس کے معنی نہ سمجھتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ کاجی بہت اچھا ہے۔

ابا کا حقّہ تازہ کرنا اور دن میں تین چار مرتبہ چلم بھر کر دینا بھی کاجی کے فرائض میں سے تھا کاجی خود بھی حقّہ پینے کا عادی تھا۔ لیکن اس کا حقّہ دیکھ کر کھیت میں چلتے ہوئے ہل کی تصویر سامنے آجاتی تھی۔ بھدی، سرخ اور کالے رنگ کی پیٹوں سے بندھی ہوئی حُقّے کی نَے ہر وقت مٹی کی فرشی میں منہ ڈالے پڑی رہتی تھی، جب کہ ابا کا حقّہ سلما ستارے کے کام سے مزین، بھرت کی فرشی میں بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا جب کبھی شام کو برآمدے میں بیٹھ کر جنگل کے پیٹرول اور بیل داروں کو اگلے دن کے لیے احکام صادر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سامنے رکھا ہوا حقّہ محکمانہ انداز میں ان کی تائید کر رہا ہے۔ صرف اُن کا حقّہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کے لیے ہی کاجی صبح سویرے اُٹھ بیٹھتا۔ حالانکہ تمام دن دوڑ دھوپ کرتے کرتے وہ اس قدر تھک چکا ہوتا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

برسات کی ایک شام ابا نے کاجی کو بُلایا اور دوسرے دن کے لیے سامانِ سفر درست کرنے کو کہا۔ وہ قریب کے علاقے میں دورے پر جا رہے تھے اور اگلے دن کاجی نے صبح سویرے احتیاط کے ساتھ، سفر کی تمام ضروری اشیا، خیال سے بیل گاڑی میں رکھ دیں آخیر میں ابا کا حقّہ رکھا گیا تاکہ اوپر رہے اور بوقتِ ضرورت کام میں لایا جا سکے امی، سلمہ اور میں نے دونوں کو جنگل کی شاداب، گھاس سے ڈھکی ہوئی کچی سڑک پر بیل گاڑی کو دور تک جاتے ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

اندھیرا پڑتے امی جب ہمارے پلنگوں پر مچھر دانیاں تان رہی تھیں تو ہم نے دور سے بیل گاڑی کے پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ محسوس کی، امی برآمدے میں آگئیں، پیچھے پیچھے میں اور سلمہ بھی نکل آئے۔ گھڑ گھڑاہٹ قریب ہوتی گئی اور چاند کی ہلکی ہلکی چاندنی میں گاڑی کا متحرک ہیولا سیدھی سڑک پر نظر آنے لگا۔ گاڑی اور قریب آگئی پھر کاجی کی آواز آئی ہانپنے کی اور گھبرائی ہوئی،

گاڑی برآمدے کے قریب آکر رک گئی۔ اور یہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ گاڑی کے جوئے کو ایک طرف سے بیل اور دوسری طرف سے کاجی اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے تھا دوسرا بیل غائب تھا۔ کاجی کے سینے کا زیر و بم دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ اس کی کنپٹیاں پسینے سے بھیگی ہوئی تھیں اور اس کی ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مشکل ہی سے ایک دو منٹ کھڑا رہ سکے گا۔ گاڑی میں ابا ڈھیر ہوئے پڑے تھے وہ کراہ رہے تھے اور بار بار اٹھنے کی کوشش کرتے تھے کاجی نے آہستہ سے اپنے کندھے پر سے جُوا اتار کر بیل کو کھولا اور وہیں کچھ کہے بغیر زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔

امی دوڑ کر ابا کے قریب پہنچیں وہ اس وقت ٹھیک طرح بول بھی نہ سکتے تھے ان پر غشی سی طاری تھی بنگلے کے عقب میں دو چوکیدار بیٹھے تھے وہ دیکھتے ہی بھاگ کر آئے اور ابا کو سہارا دے کر بٹھایا۔ سنبھال کر اتارا اور کمرے میں لاکر بستر پر لٹا دیا۔ امی نے گھبراہٹ میں دو تین کمبل اُن کے اوپر پھیلا دیے۔ چوکیدار سہمے ہوئے کبھی امی کی طرف اور کبھی ابا کی جانب ایسے دیکھتے جیسے وہ ہی حادثے کے ذمہ دار ہوں۔ امی نے ابا کو ہلایا چوکیداروں نے دبی زبان سے سرکار، حضور سے مخاطب کیا۔ وہ بدستور خاموش رہے۔ امی نے اُن کے چہرے پر پانی چھڑکا تو انھوں نے سسکی سی لی اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ یکایک وہ چلا اُٹھے۔ کاجی! سنبھل۔ اور پھر کچھ لمحات کے لیے ان پر غشی طاری ہوگئی، امی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے کے قریب تھیں کہ ابا کو ہوش آنے کے آثار معلوم ہونے لگے۔

ایک دم آنکھیں کھول کر انھوں نے میری جانب دیکھا اور کھینچ کر مجھے اپنے قریب کر لیا پھر دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر سلمہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ وہ اٹھ کر بیٹھے۔ کچھ دیر کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے، سوچتے رہے جیسے گذشتہ واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر چونک کر انھوں نے پوچھا "کاجی! کاجی کہاں ہے؟" "وہ باہر لیٹا ہے" امی نے جلدی سے کہا۔ وہ متفکر ہو کر دیکھنے لگیں۔

"آپ لیٹے رہیے" امی نے تاکیداً اُن سے کہا اور ابا نے بغیر سنے ہی اپنے جسم کے جوڑوں اور ہڈیوں کو دبا دبا کر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں وہ اپاہج نہ ہو گئے ہوں۔ بائیں ہاتھ کی کہنی بُری طرح چھل گئی تھی لیکن ہڈی اور جوڑ کو کوئی گزند نہ پہنچا تھا۔ "اُف" انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا "مرتے مرتے بچے" "آخر ہوا کیا؟" امی نے پوچھا۔

"سرکار! چوٹ کاری تو نہیں آئی" چوکیدار بیچ میں بول پڑا ابا سر جھکائے بیٹھے رہے پھر بولے "بس خدا نے بچا لیا" انھوں نے پُر درد آواز میں کہا "کاجی، کم بخت بیلوں کو بھگائے لیے جا رہا تھا ایک ڈھلان پر آکر انھوں نے نہ جانے کس جانور کی بُو سونگھ لی کہ وہ ایک دم مُڑ گئے اور سڑک چھوڑ کر گاڑی کو جنگل میں لے کر گھس گئے۔ بچاس گز بھی نہیں گئے ہوں گے کہ اس اندھا دھند دوڑ میں بیلوں نے گاڑی کو ایک موٹے درخت سے ٹکرا دیا درخت کو قریب ہوتے اور گاڑی کو ٹکراتے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جیسے

اسس اچانک جھٹکے نے مجھے اٹھا کر دور پھینک دیا ہو" وہ خاموش ہوگئے پھر کچھ دیر سوچ کر انھوں نے جلدی سے کہا" اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا"

"کاجی کیا کر رہا ہے؟" انھوں نے پھر پریشان ہوکر پوچھا۔ امی نے کہا" وہ باہر لیٹا ہے اُسے آرام کرنے دیجیے۔ آپ کو معلوم نہیں وہ ایک بیل کی مدد سے ہی آپ کو یہاں تک کھینچ کر لایا ہے" یہ سُنا تو ابا ہکا بکا ہوکر امی کا مُنہ تکنے لگے۔"اور دوسرا بیل کہاں گیا" انھوں نے پوچھا۔ "حجور! سانڈ گلے کا رستا تڑا کر بھاگ جات ہے ایسے موکوں پر۔ بھاج گیا ہوگا" چوکیدار نے بتایا۔ ابا یکایک گہری سوچ میں پڑ گئے مجھے ان کی آنکھوں میں کاجی کا عکس ناچتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک مندر میں کاجی کی مورتی، صاف سفید پتھر کی تراشی ہوئی مورتی رکھی ہے اور اسس کے حضور میں سیکڑوں سر عقیدت سے جھکے ہوئے ہیں۔

اس رات دونوں چوکیداروں کی ڈیوٹی بجائے بنگلے کے ابا کی دیکھ بھال کرنے کے لیے لگادی گئی امی بار بار اٹھ کر انھیں گلوکوز کا پانی دیتی رہیں اور جیسا کہ امی نے بتایا کہ ان کی آنکھ تھوڑے وقفے سے کھلتی رہی صبح سلمہ نے بڑی زور زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔

"کا۔جی" اسس کے مُنہ سے اتنا نکلا اور وہ رو پڑی اور جب میں اُٹھ کر سلمہ کے ساتھ باہر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ برآمدے کے سامنے جہاں بیل گاڑی آکر رُکی تھی، کاجی اب بھی وہیں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا بدن سخت ہوکر اینٹھ چکا تھا۔

اور میں نے پہلی بار اُسس دن ابا کو روتے ہوئے دیکھا۔

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

غزل نما — ادا جعفری — ۷۵/-
ساز سخن — " — ۴۵/-
ترجمۂ قرآن — پروفیسر بشیرالحق — ۸/-
تحقیقی مضامین (تحقیق) مالک رام ۶۰/-
باتیں کچھ سریلی سی (سوانح ماہرین موسیقی) داؤد رہبر ۴۶/-
خسرو نامہ (تحقیق) مجیب رضوی ۲۱/-
تعلیم و تربیت اور والدین (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵۱/-
کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
پتھر بولے چین... (ڈرامے) عمیق حنفی ۴۵/-
ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر ۳۳/-
دائروں میں پھیلی لکیر (شعری مجموعہ) کشور ناہید ۳۰/-
آنکھ میں سمندر (شعری مجموعہ) زاہد ڈار ۳۰/-
تذکرہ (ناول) انتظار حسین ۵۴/-
ذرے کی کہانی (سائنس) مہدی جعفر ۲۱/-
حیات جامی (سوانح) مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات (خطبہ) پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۸/-
نقشِ ذاکر (مضامین) مرتب: عبدالحق خاں ۵۱/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ) شمس الرحمٰن محسنی ۵/-
دنیا کے بڑے مذہب (علمی) عمادالحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۳۵/-
تعلیم اور رہنمائی (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں (تعلیم) معین الدین ۱۵/-
دھل کا اجالا (آپ بیتی) بھگوان سنگھ / مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات (مضامین) مرتبہ: عمادالحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

پشکن کے دیس میں (سفرنامہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
آنکھ اور خواب کے درمیان (شعری مجموعہ) ندا فاضلی ۲۱/-
سدا بہار چاندنی (افسانے) رام لعل ۳۰/-
دل دریا (افسانے) شرون کمار ورما ۲۵/-
رانگ نمبر (انشائیے) شفیقہ فرحت ۱۶/-
رات کے مسافر (شعری مجموعہ) مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
زوال کا عروج (ڈراما) بریخت مترجم: انور عظیم ۳۶/-
اثبات و نفی (تنقیدی مضامین) شمس الرحمٰن فاروقی ۴۰/-
مالک رام ایک مطالعہ (مجموعہ مضامین) مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
فی الحال (مزاحیہ مضامین) یوسف ناظم ۱۸/-
حرف حرف روشنی (شعری مجموعہ) حمایت علی شاعر ۳۵/-
فرار (ناول) ظفر پیامی ۴/-
تین چہرے تین آوازیں (افسانے) صالحہ عابد حسین ۱۸/-
نقدِ حرف (تنقیدی مضامین) پروفیسر ممتاز حسین ۴۰/-
گدازِ شب (شعری مجموعہ) معین احسن جذبی ۴۰/-
سرسید کی تعلیمی تحریک (روداد) اختر الواسع — مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صد سالہ سفر کی روداد ۲۵/-
گفتارِ غالب (مضامین) مالک رام ۴۸/-
تعلیم اور اس کے وسائل (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
تحفۃ السرور (آل احمد سرور پر مضامین) مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی ۵/-
غالب اور صفیر بلگرامی (تحقیق) مشفق خواجہ ۳۶/-
جائزے (تبصرے) مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ (مجموعۂ مضامین) مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
مجھے گھر یاد آتا ہے (ڈرامے) شمیم حنفی ۲۱/-
رسول اکرمؐ اور یہود حجاز (علمی) سید برکات احمد۔ ترجمہ بشیرالحق ۴۰/-
تاریخ انگلینڈ (ایک مختصر خاکہ ۱۴۸۵ء-۱۹۰۱ء) (خاکہ) سید محمد عزیزالدین حسین ۹/-
محبوب الارث (علمی) مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
دردِ دل (افسانے) تعارف۔ قرۃ العین حیدر۔ ستارہ جعفری ۱۸/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقا (تہذیب یعنی دین اور فنون لطیفہ) مرتبہ۔ عمادالحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

☆☆☆

ڈاکٹر سید حامد حسین
ای۔۲/۱۸۴ پروفیسر کالونی
بھوپال ۴۶۲۰۰۲

طنزیہ

بشارت حضرت اقبال کی

میں حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ادنا عقیدت مند ہوں اور بچپن سے ہی میرا اُن سے روحانی تعلق ہے۔ جس دن حضرت علامہ نے وصال فرمایا اس دن میری عمر چار سال سات ماہ اور اُنیس دن کی تھی اور والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ تب سے ہی اٹھتے بیٹھتے ایسے الفاظ میرے جزو کلام ہیں جنھیں حضرت علامہ نے استعمال فرمایا تھا جیسے تھا، ہے، کہ، اور، وغیرہ۔

میں نے کلام اقبال سے پہلی بار اس وقت فال نکالی جب میں نویں درجے میں دوسری بار فیل ہوا تھا اور میری عمر کوئی پندرہ برس کی تھی۔ فال میں جو شعر نکلا اس سے نہ صرف میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے بلکہ جذبات بلوغ بھی بیدار ہو گئے۔ شعر مشہور ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اس وقت میں گلی میں اجو میاں تانگے والے کی لڑکی ستارہ اور ہلکے لال دھوبی کی لڑکی تارو بائی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ انھیں چھوڑ میں نے اپنے سے عمر میں پانچ سال بڑی مسرت جہاں کا پیچھا کیا اور شوخی میں اس کا دوپٹا کھینچ کر نالی میں پھینک دیا۔ کمبخت نے نہ صرف خود میرے گال پر زناٹے دار تماچا رسید کیا بلکہ والد صاحب سے بھی شکایت کر کے پٹوایا۔ یہ تو شادی کے بعد پتا چلا کہ مسرت جہاں نہیں بلکہ جہاں آرا مجھے دلچسپی کی نظر سے دیکھتی تھی۔

بچپن سے ہی مجھے ایسے خوش قسمتوں سے ملاقات کا موقع ملا جنھیں حضرت علامہ کی صحبت کا شرف حاصل رہا تھا۔ ہمارے یہاں ایک بڑی بی کام کرتی تھیں۔ ان کا نام تھا رحیمن بی۔ وہ بتاتی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت علامہ کے خاص باورچی تھے۔ نام تو سکندر خاں تھا لیکن حضرت علامہ مزاحاً انھیں منشی سکندر خاں کہتے تھے پھر سب ہی انھیں منشی جی کہنے لگے۔ منشی جی بتاتے تھے کہ حضرت علامہ کو ہرے دھنیے اور کچے آم کی چٹنی بے حد پسند تھی۔ اور منشی جی سے فرمایش کر کے تیار کرواتے تھے۔ فرماتے تھے کہ وہ جرمنی اور فرانس میں رہے لیکن ایسی

لذیذ چٹنی انھوں نے وہاں بھی نہیں چکھی۔ منشی جی یہ بات بھی بڑا لطف لے لے کر بتاتے تھے کہ حضرت علامہ ہمیشہ یہ ہدایت فرماتے تھے کہ انڈے کو نوکیلے حصّے کی جانب سے ہی توڑا جائے۔ حضرت علاّمہ یہ بھی کہتے تھے کہ مرغی جو انڈا طلوعِ آفتاب سے پہلے دیتی ہے اُس کے کھانے سے حافظہ اچھا ہوتا ہے۔

راقم الحروف کو اچھے میاں بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ کسی زمانے میں پہلوان رہے ہوں گے۔ میں نے جب دیکھا تو کمر جھک گئی تھی۔ بھویں سفید ہو کر آنکھوں پر لٹک آئی تھیں۔ کہتے تھے سر راس مسعود نے اُن کا نام افراسیاب ہند رکھا تھا۔ بتاتے تھے کہ جب حضرت علاّمہ بھوپال تشریف لاتے تو نماز ظہر کے بعد قیلولہ سے پہلے اچھے میاں بلا ناغہ حضرت علاّمہ کے پیر دبایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسی وقت دوسرے خدّام بھی حضرت علاّمہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ وقت حضرت علاّمہ نے صرف خدّام کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ اور کسی اور کو اس وقت دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار محل سے طلبی ہوئی لیکن حضرت علاّمہ تشریف نہیں لے گئے اور کہلوا دیا کہ میں ایسے دوستوں کے ساتھ مصروف ہوں جو سب سے زیادہ میرا خیال رکھتے ہیں۔ اچھے میاں کا کہنا ہے کہ ہاتھ پیر دبانے وقت ہر خادم کا مقام مقرر تھا۔ اور اگر کوئی خادم اُس پیر کو تھام لیتا جسے دوسرا خادم دبایا کرتا تھا تو حضرت علاّمہ ناراضگی کا اظہار فرماتے اور کہتے تھے کہ ہر ایک کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ اس موقع پر حضرت علاّمہ اُن خدّام کے ذاتی حالات اور ان کے اہل خانہ کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک خادم نے اپنی بچّی کا نام تجویز کرنے کی فرمایش کی۔ حضرت علاّمہ نے اس کا نام "یغما" رکھ دیا۔ کم علم خادموں نے اسے "چکما" کر دیا۔ بعد میں جب کسی نے سر راس مسعود کو بتایا کہ حضرت علاّمہ نے "چکما" نام رکھا ہے تو انھوں نے حضرت علامہ سے استفسار کیا۔ حضرت علاّمہ نے اس واقعہ سے لطف لیا۔ اور نیا نام بلبل تجویز کیا۔ لیکن عجب اتفاق تھا کہ اسی درمیان دس سال کی عمر میں اس لڑکی کی شادی ہونے کے بعد اپنی بیٹی کو جنم دیتے ہوئے وہ فوت ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس کی لڑکی کا نام بلبل رکھ دیا گیا۔ برسوں بچّی کا نانا لوگوں کو یہ بتا بتا کر فخر محسوس کیا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی اور نواسی دونوں کے نام حضرت علاّمہ نے رکھے تھے۔

گپّو دادا بھوپال کے ایک پُرانے گداگر تھے۔ جب حضرت علاّمہ بھوپال تشریف لاتے تو یہ نماز فجر سے پہلے شیش محل کی سیڑھیوں پر جا بیٹھتے۔ نماز فجر کے بعد جب حضرت علاّمہ سیر کے واسطے باہر تشریف لاتے تو یہ دستِ سوال دراز کرتے۔ ایک بار انھوں نے بھولے سے دائیں ہاتھ کی بجائے بایاں ہاتھ حضرت علاّمہ کے سامنے پھیلایا۔ حضرت علاّمہ نے چھڑی سے ان کا بایاں ہاتھ نیچے کرتے ہوئے نرمی سے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے سوال کرنا مُحسن کی توہین ہوتی ہے۔ گپّو دادا یہ قصّہ بھی سناتے تھے کہ ایک بار حضرت علاّمہ نے اُن کے ہاتھ پر ایک روپیا کا سکّہ ڈالا جو پھسل کر زمین پر گر گیا اور اوپر وہ پہلو آ گیا جس پر انگریز بادشاہ جارج کی تصویر تھی۔

حضرت علامہ فوراً جھکے، سکہ اٹھایا اور دادا کے ہاتھ پر اوندھا کرکے رکھ دیا۔ حضرت علامہ کو انگریزوں سے اس قدر نفرت تھی کہ انگریز بادشاہ کے چہرہ کو بھی اپنے سامنے رکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔

نجو خاں کے ذمہ حضرت علامہ کی نشست کی صفائی تھی۔ وہ بہت سے قصّے سناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ حضرت علامہ کے کمرے سے روز ایک دو نب ضرور نکلا کرتے تھے۔ جیسے ہی نب میں کھرکھراہٹ آتی حضرت علامہ اُسے پھینک دیتے تھے۔ اُن کے پاس حضرت علامہ کے پندرہ بیس نب تھے جسے وہ اپنی صندوقچی میں تالا لگا کر رکھتے تھے۔ جب ان کی بینائی کمزور ہوگئی تو ایک دن اس کے پوتے نے موقع پاکر صندوقچی کھول لی۔ کوئی قیمتی چیز نہ ملی تو کھسیا کر اس نے نبوں کے ساتھ تالا اور کنجیاں بھی تول کے بھاؤ بیچ کر ریوڑیاں کھائیں۔ نجو خاں بتاتے تھے کہ حضرت علامہ بعض اوقات لیٹے لیٹے چٹکیاں بجایا کرتے تھے اور اس وقت وہ کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن غریب کو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ غالباً حضرت علامہ اس وقت فکر سخن کرتے ہوں گے۔ نجو خاں حضرت علامہ کی حرکات و سکنات کا بڑا تفصیلی نقشا کھینچا کرتے تھے مثلاً انھوں نے بتایا کہ حضرت علامہ جب کسی چیز کو بتانا چاہتے تو سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے لیکن اشارہ کرتے وقت ان کا ہاتھ کبھی کندھے سے اوپر نہیں جاتا۔

حضرت علامہ اکثر خدام کو قرآنی آیات حفظ کرایا کرتے تھے۔ منشی سکندر خاں بتاتے تھے کہ انھیں قل ہو اللہ یاد نہیں تھی۔ حضرت علامہ نے ایک ہفتہ محنت کرکے انھیں یہ سورۃ یاد کروائی پھر بھی انھیں کفواً احد یاد نہیں ہوتا تھا۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ آج سے منشی کا نام کفواً احد ہوا۔ پھر جب ہر شخص انھیں اس نام سے پکارنے لگا تو کچھ دن میں منشی کو خود بخود کفواً احد یاد ہوگیا۔

سب سے حیرت انگیز کہانی تو کامریڈ لوبوکی ہے۔ سیفیہ کالج کے شمال میں جہاں گڑھ بہتا ہے ایک مجذوب صفت بزرگ جنھیں لوگ ولی صاحب کہتے تھے ایک بوسیدہ اوورکوٹ میں ہر وقت دکھائی دیتے تھے۔ گھنٹوں کسی ایک قبر کے تکیے پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہتے اور پھر اچانک کھڑے ہوکر روسی انداز کی فوجی قواعد کی طرح قدم قدم پھینک پھینک کر اس طرح مارچ کرنے لگتے جیسے کوئی پہرہ دار ڈیوٹی پر ہو۔ برسوں تک جب بھی موقع ملتا انھیں میں کچھ کھانا پہنچا آتا۔ مجھے ۲۲ جنوری ۱۹۵۲ء کی وہ کڑاکے کی سردی کی رات یاد ہے جب فتو گورکن کا لڑکا مجھے بلانے آیا کہ ولی صاحب گر گئے ہیں اور اُن کی حالت خراب ہے۔ اُن کی سانس پر سردی کا شدید اثر ہوا تھا۔ میں نے انھیں اٹھانا چاہا تو انھوں نے اشارہ سے منع کردیا اور مجھے اپنے قریب بیٹھ جانے کو کہا۔ بولے آخری وقت آگیا ہے۔ کچھ ضروری باتیں سن لو۔ انھوں نے اٹک اٹک کر جو اپنی عجیب و غریب کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ روس کے حصّہ تاجکستان کے رہنے والے تھے۔ فارسی اچھی جانتے تھے۔ روس کے انقلاب کے بعد حضرت علامہ نے لینن کو مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ کچھ سال بعد ان دونوں کے درمیان رسمی کی بجائے خفیہ خط کتابت شروع ہوگئی اور ولی صاحب کی فارسی دانی کو دیکھتے ہوئے لینن نے انھیں اپنے ذاتی ایلچی کی حیثیت سے بھیجا۔ اس

پیغام رسانی سے حضرت علاّمہ سے بھی ان کے مخلصانہ تعلقات ہو گئے۔ حضرت علاّمہ انھیں کامریڈ لوبو کے نام سے پکارتے تھے۔ لینن کا ایک خط لے کر آ رہے تھے کہ راستے میں لینن کی موت کی خبر ملی۔ پھر یہ وطن واپس نہیں گئے اور حضرت علاّمہ کی خدمت میں رہ گئے۔ کامریڈ لوبو نے بتایا کہ لینن کی موت کی وجہ سے حضرت علاّمہ کے لینن کے ساتھ ربط میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لوگوں کو نہیں معلوم کہ حضرت علاّمہ کو روحوں کو بلانے اور اُن سے بات چیت کرنے کا زبردست ملکہ تھا۔ ہر رات ڈھائی سے ساڑھے تین بجے تک بلا ناغہ روحوں کا دربار لگتا تھا۔ اگر ترجمہ کی ضرورت نہ پڑتی تو کامریڈ لوبو کو بھی اس زبردست راز کا پتا نہ چلتا۔ ہوا یوں کہ لینن کی موت کے بعد اس روحوں کے دربار میں لینن کی روح کی بھی پابندی سے حاضری ہوتی تھی۔ دشواری یہ پیدا ہوئی کہ حضرت علاّمہ کو روسی زبان پر عبور نہیں تھا اور لینن کو فارسی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ ترجمان کی حیثیت سے کامریڈ لوبو کو اس محفل نیم شبی میں داخلہ ملا۔ کامریڈ لوبو نے ایک نہایت دلچسپ بات بتائی کہ موت کے فوراً بعد لینن کی روح نے بتایا کہ وہ شدید اذیت میں مبتلا ہے۔ دوسرے ہی دن حضرت علاّمہ نے اپنی مشہور نظم "لینن خدا کے حضور میں" لکھی اگلی بار لینن کی روح نے نمودار ہوتے ہی حضرت علاّمہ کا شکریہ ادا کیا۔ کہا کہ اُن کی نظم کا اثر ہوا اور اُسے جہنّم میں بی کلاس مل گیا ہے۔ لینن نے حضرت علاّمہ کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ خدا سے اچھے تعلقات رکھیں۔ اس نے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا کہ اس نے کمیونسٹ نظام میں خدا کی کوئی گنجائش نہیں رکھی لیکن اب احساس ہوا کہ خدا سے بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ کامریڈ لوبو نے بتایا کہ لینن شروع سے یہ چاہتا تھا کہ حضرت علاّمہ ہندستان میں انقلاب کی فکری رہنمائی کریں لینن کے مشورے پر حضرت علاّمہ نے کمیونسٹ مینی فیسٹو کا منظوم ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا اور ہندستان میں قائم ہونے والی اشتراکی حکومت کا آئین بھی مرتّب کر لیا تھا۔ یہ دستاویزات اور روسی لیڈروں سے اپنی خط کتابت حضرت علاّمہ لکڑی کی ایک منقش صندوقچی میں سفر و حضر میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے اور کسی حالت میں اپنے سے جدا نہیں کرتے۔ بھوپال میں ان کے آخری قیام کے دوران کسی بدخواہ نے اس بات کا کسی طرح پتا کر کے نواب صاحب بھوپال کے کان بھرنا چاہے کہ حضرت علاّمہ روسیوں کے ایجنٹ ہیں۔ لیکن نواب صاحب کو اس بات کا یقین نہیں ہوا۔ حضرت علاّمہ کو بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ محفل نیم شبی میں انھوں نے لینن کی روح سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ اس نے تجویز کیا کہ رفع شر کے لیے حضرت علاّمہ دستاویزات کو فی الوقت اپنے سے جدا کر دیں۔ ظاہر ہے اس کام کے لیے حضرت علاّمہ نے کامریڈ لوبو سے زیادہ کسی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا۔ چنانچہ صندوقچی اُن کے حوالے کر کے حکم دیا کہ جب تک وہ خود نہ کہیں اُسے اپنے سے جدا نہ کریں۔ دوسرے دن ہی حضرت علاّمہ بھوپال سے روانہ ہو گئے۔ بھوپال میں کامریڈ لوبو کی موجودگی خفیہ تھی۔ اور یہاں اُن کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ صندوقچی کی حفاظت کا انھیں صرف ایک طریقہ سوجھا کہ وہ صندوقچی کو قبرستان میں دفن کر کے اس کی دن رات نگرانی کریں اور ایک وفادار خادم کی طرح اگلے حکم کا انتظار کریں اور وہ ابھی تک حضرت علاّمہ کے

حکم کے انتظار میں ہیں۔ ان کو پتا بھی نہیں تھا کہ حضرت علامہ کے انتقال کو برسوں گزر چکے ہیں۔
اس لمبی کہانی کے دوران کامریڈ لولو برابر اپنے چیتھڑوں کو جگہ جگہ ٹٹول رہے تھے۔ پھر وہ اُن
مل ہی گئی۔ ایک پرانی زنگ کھائی ہوئی کنجی۔ انھوں نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے اُسے
میری طرف بڑھایا ہی تھا کہ کنجی نیچے گر گئی اور ساتھ ہی اُن کا ہاتھ بھی۔ اُن کی روح پرواز کر چکی
تھی۔ اس کے بعد میں نے قبرستان میں تقریباً ایک سال تک ہر اس مقام پر کھدائی کروائی
جہاں کامریڈ لولو کو بیٹھا ہوا دیکھا گیا تھا۔ لیکن صندوقچی کہیں نہیں ملی۔ ظاہر ہے کہ پندرہ بیس
سال بعد لکڑی کی صندوقچی اور کاغذات قبرستان کی مٹی کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ کنجی البتہ میں نے
سینے سے لگا کر رکھی ہے۔ ہر سال یوم اقبال کے موقع پر اُسے لوگوں کی زیارت کے لیے رکھتا
ہوں۔ بہر حال میری یہ تمنا ہے کہ اگر میں کبھی صاحب اختیار ہوا تو میں قبرستان کے اس جنوبی گوشے
میں ایک یادگاری منار ضرور تعمیر کرواؤں گا جس پر کندہ ہوگا؛

مدفن جو اقبال کے خوابوں کا کہیں ہے
واللہ یہیں ہے وہ یہیں ہے، وہ یہیں ہے

تو حضرات یہ اور ایسے ہی درجنوں واقعات راقم الحروف نے بھوپال کے گلی کوچوں، کھنڈروں اور
ویرانوں میں شب و روز گھوم گھوم کر یکجا کیے ہیں۔ لوگوں نے آسیب اقبال، جاروب کش اقبال،
ملبع تراش اقبال وغیرہ طرح طرح کے ناموں سے مجھے پکارا لیکن مجھے اس پر کبھی ملال نہ ہوا۔
حضرت علامہ سے نسبت ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔

لیکن اس وقت یہ ساری تمہید میں نے آپ کو ایک نوید جانفزا سنانے کے لیے باندھی
ہے۔ گذشتہ جمعہ کی شب میری زندگی کی سب سے بیش قیمت رات تھی۔ اس رات میرے
خواب میں حضرت علامہ نے ظہور فرمایا۔ کمال شفقت سے انھوں نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا
جس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سکون و راحت کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت
کر گیا۔ پھر فرمایا میرے بیٹے میں ہر سال اپنے کسی عقیدت مند کو اپنی زندگی کا ایک راز
بتاتا ہوں۔ اس بار تیری باری ہے۔ تو سن۔ میری نظم "مسجد قرطبہ" جس کے بارے میں
عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ میں نے اسپین میں لکھی تھی اس کے آخری دو بند میں نے
موتی مسجد کے شمال زینے کی مغربی سیڑھیوں میں سے اوپر سے ساتویں سیڑھی پر قبلہ رو بیٹھ
کر تحریر کیے ہیں۔ یہ شعر میرے کسی دیوان میں نہیں ہیں کیونکہ میں نے بامید برکت ایک
بلور سے میں سر بمہر کر کے شاہ علی شاہ کے تکیے کے پائنتی دفن کر دیا ہے۔ اور تیری تسلی کے
لیے بتائے جاتے ہوں کہ موتی مسجد کی سیڑھیوں پر میری نشست کا یہ نشان ابھی بھی باقی ہے
اس خوشخبری کے ساتھ حضرت علامہ واپس تشریف لے جانا ہی چاہتے تھے کہ میں نے
ان کے قدم پکڑ لیے اور عرض کیا کہ "آقا کچھ اور بھی عطا کیجیے"۔ حضرت علامہ نے نگاہِ شفقت مجھ
پر ڈالی اور فرمایا برخوردار بے صبری ٹھیک نہیں۔ اگلی بار آؤں گا تو تیرے نام ایک خط تجھے
لکھوا جاؤں گا۔ اس پر میں نے عرض کی کہ حضرت جب آپ نے وفات پائی تو اس وقت میری

رصرف ساڑھے چار سال کی تھی اس بات کو کون مانے گا۔" حضرت علامہ نے خندہ فرمایا
ر کہا "میرے نام سے نسبت ہی تیری قسمت کو بدلنے کے لیے کافی ہے۔ رہا تحقیق کا
ب تک لوگ تحقیق کے کرتب دکھائیں گے تیرا نام سمرقند و بخارا تک پہنچ چکا ہوگا
یہ طنزیہ علامہ اقبال کے بھوپال میں قیام کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس قیام کے
دوران علامہ کچھ عرصہ شیش محل میں رہے۔ اس عمارت کے مشرق میں بھوپال کی مشہور
موتی مسجد واقع ہے۔ اس کے سامنے واقع میدان کو اب اقبال میدان کہا جاتا ہے
یہاں ایک مینار تعمیر کیا گیا ہے جس کے اوپر تاروں اور لوہے کے ٹکڑوں سے جو شکل
بنائی ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چشم بینا رکھنے والوں کو شاہین نظر
آتی ہے۔ شاہ علی شاہ قدیم بھوپال کے ایک بزرگ تھے جن کا مزار بھوپال کی بڑی جھیل
میں واقع ایک جزیرے پر ہے۔

غزلوں کا بھلا مشاعروں میں پڑھی ہیں۔"
یہ لطیفہ ہم نے اس لیے نہیں سنایا
کی شاعرانہ عظمت کے قائل نہیں ہیں
شاعرانہ عظمت کے تو ہم اس وقت بھی
جب انھوں نے شاعری شروع نہیں
یہ لطیفہ سنانے کا مقصد صرف یہ ہے
"در شہر" کے اسلوب سے اپنے قارئین کو
سکیں کہ کس طرح بات سے بات نکال
سنایا جاسکتا ہے۔ امجد کا کمال یہ ہے
کے حالات بیان کرتے ہوئے اس کثرت
سناتے ہیں کہ اگر ان کے سفرنامے سے لطیفے خارج
جائیں تو جو کچھ باقی بچے گا وہ بھی سفرنامہ نہیں
لطیفہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لطیفے
مزے کے ہیں، لیکن افسوس اس کا ہے کہ
سے لطیفے یہ کہ کر انھوں نے نہیں سنائے
قابلِ اشاعت ہیں۔ موجودہ زمانے میں
ہمارے مطبوعہ ادب کا بڑا حصہ ناقابلِ اشاعت
پر مشتمل ہے۔ امجد کو لطیفوں کے سلسلے میں اس
احتیاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔
ہمیں تو یہ معلوم تھا کہ امجد بہت اچھے
اور ڈراما نگار ہیں، لیکن اس کا علم نہیں تھا
گوئی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ بلکہ
در شہر" پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہی
کا خاص میدان ہے۔ لطیفے وہ کس رفتار سے
ہیں، اس کا اندازہ خود انھیں کے ایک
سے کیجیے۔ "میں نے ہوائی سفر سے متعلق
سنانے شروع کر دیے۔ تیسرے لطیفے پر جہاز
ٹیک آف کیا اور پانچویں پر ہمارے آگے کی
بیٹھے ہوئے ایک گرگ باراں دیدہ نے
طرح گھور کر دیکھا جیسے اسے گوروں کی

اگلا لطیفہ میں نے آواز کا والیوم مزید بلند کر کے سنایا۔"
گویا لطیفے امجد کے نزدیک وقت ناپنے کا پیمانہ ہیں
بلکہ وہ آدمی کو بھی اسی پیمانے سے ناپتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ
لکھتے ہیں "ان کے قد کی مناسبت سے ملاقات کے
پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے میں نے انھیں
ایک لطیفہ سنایا۔"
امجد کے پاس لطیفوں کا اتنا اسٹاک ہے کہ
ملاقات کے پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے کیا
سننے والے کے اختتام تک بھی وہ اگر لطیفے سناتے
رہیں تو یہ اسٹاک ختم نہیں ہوگا۔
اس لطیفے بازی کی وجہ انھوں نے یہ بتائی ہے
"لطیفہ پوری نسلِ آدم کی میراث ہوتا ہے، اس لیے
جہاں تک ہو سکے اسے خلقِ خدا تک پہنچنا چاہیے۔
اتنی TENSE اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے
ہونے کا احساس ہو۔"
اس لطیفہ گوئی کی وجہ سے امجد کو یہ نقصان
بھی پہنچا کہ سفر کے دوران بعض لوگ ان کی شاعری
سے زیادہ ان کے لطیفوں کے قدرداں ہو جاتے
تھے۔ انبالے کے ایک پولیس افسر کی بیوی تو انھیں
شاعر کی بجائے لطیفہ گو ہی سمجھتی رہی۔ پولیس افسر
بیوی سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ وہ مشاعرے میں
امجد کے شعروں پر قہقہے لگا کر داد دیتا رہا۔
امجد نے یوں تو مشاعرے پڑھنے کے لیے سفر کی
مشکلیں اٹھائی تھیں، لیکن اصل مقصد سفرنامہ
لکھنا تھا۔ وہ سفر کے آغاز سے اختتام تک ڈائری
لکھتے رہے تاکہ بعد میں ان یادداشتوں کو سفرنامے
کی صورت دی جا سکے۔ لندن میں جب اردو کے
سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی
کو اس خطرناک منصوبے کا علم ہوا تو انھوں نے امجد
کو سفرنامہ نہ لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد کی

کی زبانی سنیے۔ "میری حیرت اور پریشانی دیکھ کر کہنے لگے "مجھے خدانخواستہ آپ کے لکھنے کی اہلیت پر شک نہیں ہے۔ دراصل مجھے سفرناموں کی کثرت نے حیران اور ان کی سطح، انداز اور داستان طرازی نے پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ایسی ایسی بوگس، من گھڑت اور افسانوی باتیں پڑھی ہیں کہ اس صنف ادب سے میرا ایمان ہی اٹھ گیا ہے۔" میں نے ابن انشا، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد خالد اختر، اشفاق احمد، جمیل الدین عالی اور محمد کاظم کی مثالیں دیں کہ دیکھیے ان لوگوں نے کیسے کیسے مزیدار سفرنامے لکھے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمان کے رپورتاژوں کا حوالہ دیا مگر ان کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا۔ کہنے لگے "آپ شاعر، ڈراما نگار، نقاد اور مترجم ہیں اور خیر سے خاصے مشہور بھی ہیں، اگر سفرنامہ نہیں لکھیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔" میں نے انھیں اپنے سفرنامے کے متوقع محاسن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں ان تمام برائیوں سے احتراز اور گریز کا ارادہ رکھتا ہوں، جن کی وجہ سے وہ سفرنامے سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ہوٹل آگیا اور بات درمیان میں رہ گئی۔"

اچھا ہوا کہ بات درمیان میں رہ گئی ورنہ یوسفی صاحب جب امجد کو سفرنامہ نہ لکھنے پر آمادہ کر لیتے تو اس کے بعد شاعری ترک کرنے کا مشورہ بھی دیتے۔ یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر کسی بزرگ کا ایک مشورہ مان لیا جائے تو دوسرے مشورے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم پھر ایک واقعہ سنانے کے لیے مجبور ہیں۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے چہیتے شاگرد تھے۔ زیبا صاحب نثر بھی لکھتے تھے اور غزل بھی کہتے تھے۔ ایک روز رشید صاحب نے ان کی غزل سن کر کہا۔ "تم اتنی عمدہ نثر لکھتے ہو تمھیں غزل کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" چند روز بعد زیبا صاحب نے اپنا ایک مقالہ استاد کو پڑھنے کے لیے دیا۔ رشید صاحب نے مقالہ پڑھ کر کہا "تم اتنی عمدہ غزل کہتے ہو، نثر نویسی میں وقت ضائع نہ کرو۔" شاگرد نے عرض کیا "چند روز پہلے آپ نے مجھے غزل کہنے سے منع کیا تھا اور اب آپ نثر لکھنے سے منع کر رہے ہیں، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" رشید صاحب نے نہایت شفقت سے فرمایا۔ "جب تک میرا مطلب سمجھ میں نہ آئے، تمھیں اجازت ہے کہ نثر بھی لکھتے رہو اور غزل بھی کہتے رہو۔"

خیر یہ تو مذاق کی باتیں تھیں، اصل بات یہ ہے کہ امجد نے یوسفی صاحب کے مشورے پر عمل نہ کر کے بہت اچھا کیا۔ اگر خدانخواستہ وہ اس مشورے کو قبول کر لیتے تو اردو ادب ایک خوبصورت سفرنامے سے محروم ہو جاتا۔ اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ امجد نے اسے تاریخی و جغرافیائی معلومات سے گراں بار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتلایا کہ کولمبس نے امریکہ کو کب دریافت کیا تھا اور ٹاور آف لندن کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا تھا۔ انھوں نے تو بس اپنے سفر کے حالات، سفر کے دوران اپنی ذہنی کیفیات بیان کرنے اور گرد و پیش کی تصویر کشی تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سفرنامہ نہیں پڑھ رہا بلکہ امجد کے ساتھ خود بھی سفر کر رہا ہے۔ اسی لیے تو ہم نے اس کالم کے شروع میں یہ کہا ہے کہ امجد کی طبع کی روانی ہی اس کی نثر کی روانی بن جاتی ہے جس کے ساتھ قاری خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔

(باقی آئندہ)

ادب - تنقید - تذکرہ

ب وطن ... چند اور دیگر مضامین۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی -/۶۰
بی تنقید کے اصول — کلیم الدین احمد -/۶
ندہائے بیجا — وارث علوی -/۵۱
شید احمد صدیقی آثار و اقدار — اصغر عباس -/۴۰
جے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں — خواجہ غلام السیدین -/۳۰
ن اور فنکار — صالحہ عابد حسین -/۳۵
بارِ کارواں — ڈاکٹر محمد زماں خازردہ -/۴۰
انٹوں کی زبان — ظ۔ انصاری -/۷۵
شارے منزل کی طرف — شاہ محمد عثمان -/۴۰
بیدی نامہ — ڈاکٹر شمس الحق عثمانی -/۱۵۰
الی داس ایک مطالعہ — شہانہ شبنم -/۴۵
اقیات عظیم الدین احمد — ادارہ تحقیقات پٹنہ -/۱۵
ادوں کی پرچھائیاں — رحمت امروہوی -/۴۰
ہندستان کدھر ہے — پروفیسر آل احمد سرور -/۲
ہماری تعلیمی صورت حال — پروفیسر آل احمد سرور -/۴
جواہر لال نہرو — ظ۔ انصاری -/۵
مضامین ڈاکٹر عبدالودود — مرتبہ: صفیہ ورود -/۳۰
پرانی یادگاریں — غلام ربانی -/۳۶
تحویر ہمہ رنگ — محمد اسد اللہ -/۲۰
نقد ادبیات فارسی — ڈاکٹر سمیع الدین -/۳۶
فارسی زبان و ادب — " " -/۱۵
اردو شعریات — پروفیسر آل احمد سرور -/۶۰
ہندستان میں تصوف — " -/۲۰
اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب — ڈاکٹر محمد شکیل خاں -/۸۸
محمد مجیب حیات اور خدمات — ڈاکٹر صادقہ ذکی -/۵۰
احوال و افکار آثار عماد الملک۔ ڈاکٹر قمر الدین -/۵۰
ادبی زاویے — فخر الاسلام اعظمی -/۱۲
چند مصری ناول اور افسانے۔ ڈاکٹر بدر الدین الحافظ -/۵۰

[illegible] محمد فضل الرحمٰن -/۶
یادگاری خطبات — ڈاکٹر نثار احمد فاروقی -/۱۵
رہنما و رہبر — محمد برہان حسین -/۱۰
جدید دنیا میں اسلام — پروفیسر آل احمد سرور -/۴۶
آرٹ — سید حبیب اللہ -/۲۰
سیر المصنفین — محمد یحییٰ تنہا /۱۵
توفیق الحکیم — ڈاکٹر بدر الدین الحافظ -/۷
پیرس و پارس سفرنامہ۔ پروفیسر ثریا حسین -/۲۷
تذکرہ کاملان رامپور۔ حافظ احمد علی خاں شوق -/۵۰
تاریخ اسلام عہد نبوی تا خلافت راشدہ — ڈاکٹر اقبال اختر -/۱۲
کشتہ جات — حکیم شاہ نور فیصل -/۲۵
اسوۂ رسول اکرمؐ — ڈاکٹر عبد الحی -/۵۰
محمد حسین آزاد بحیثیت محقق — قاضی عبد الودود -/۱۰
جدید غزل گو — عابد رضا بیدار -/۳۵
آئینۂ ابوالکلام — مرتبہ: عتیق صدیقی -/۲۰
تذکرہ حضرت سید صاحب بانسوی۔ محمد رضا انصاری -/۴۰
مثنویات میر کا تہذیبی مطالعہ — شمامہ بلال -/۴۰
آزادی کی کہانی انگریزوں، اخباروں کی زبانی۔ غلام حیدر -/۳۰
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط — عتیق صدیقی -/۲۰
ضیا فتح آبادی شخص اور شاعر — مالک رام -/۱۵
جہات و جستجو — ڈاکٹر مظفر حنفی -/۳۰
جوہر آئینہ — طالب کشمیری -/۲۵
دنیا میرا گاؤں — خواجہ غلام السیدین -/۶۰
اردو ادب کی بازیافت رسالہ زبان۔ خدا بخش لائبریری -/۵۰
ظرافت اور تنقید — احمد جمال پاشا -/۲۵
تلاش فن — سید رضا زیدی -/۶
کاشف الحقائق ایک مطالعہ — ڈاکٹر وہاب اشرفی -/۱۶
احوال و افکار (خان آرزو) ڈاکٹر ریحانہ خاتون -/۵۰
اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ — مہناز انور -/۷۵
نقد فیض — نسیم عباسی -/۲۰

گوشۂ محسن احسان

چند غیر فانی واقعاتِ حیاتِ فانی
۱۔ کبھی میں احسان الٰہی تھا
۲۔ کبھی احسان الٰہی محسن تھا
۳۔ کبھی احسان نیز بھی تھا
۴۔ کبھی میں احسان محسن تھا
۵۔ اب محسن احسان بھی ہوں

ڈاکٹر اشرف عدیل
شعبہ فلسفہ پشاور یونی ورسٹی

محسن احسان: ایک نقاد شاعر

اُردو کی عصری شاعری پر کئی حوالوں سے سیر حاصل بحث ابھی ہونا باقی ہے۔ ڈکشن ہی کو لیجیے۔ عصری شعرا کا ایک مخصوص ڈکشن ہے۔ اس ڈکشن کے ارتقا، اُردو کے کلاسیکل شعرا کے ڈکشن کے ساتھ اس کے تعلق، اور اس ڈکشن سے مختص عصری مسائل، ان سبھی پہلوؤں پر خاصی بحث کی گنجایش بلکہ ضرورت ہماری تنقید میں فی الحال موجود ہے۔ اسی طرح ادب میں ایک بڑا سوال COMMINTMENT کا بھی ہے۔ ہمارے ہاں اس طرح کی بحث اس سوال پر فی الحال نہیں ہوئی کہ کس قسم کے فلسفیانہ نکتۂ نظر کے ہوتے ہوئے COMMINTMENT کا سوال SORMULATE کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ سوال کس فلسفیانہ تناظر میں بامعنی اور کہاں بے معنی ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں عصری شعرا نے آخر اپنے شاعرانہ وجدان کی سطح پر اس سوال اور اس کے مضمرات کو کس طرح برتا ہے؟ پھر یہ بھی کہ کون سے شاعرانہ رویّے کے ہوتے ہوئے یہ سوال ایک شاعر کے لیے بامعنی سوال بنتا ہے، اور کیا ایسے شاعرانہ رویّے بھی ہو سکتے ہیں جو اس سوال کی معنویت ہی کو شک میں ڈال دیں۔

پھر عصری شعرا جن اقدار کو اہم گردانتے ہیں اور مستقبل کا جو وژن اُن کی شاعری میں موجود ہے، اس کا بھی فلسفیانہ محاکمہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ شاعری کے لیے اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں کوئی مربُوط نظامِ فکر موجود ہو، پھر بھی شاعری ہمارے رویّوں کو متاثر کرتی ہے اور اس لیے اس میں پیش کی گئی اقدار اور وژن محاکمے کے بغیر قبول کر لینا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا۔

اس مضمون میں محسن احسان کی غزلیہ شاعری کا جائزہ مندرجہ بالا سوالات میں سے چند ایک کے حوالے سے نسبتاً سرسری طور پر لیا جائے گا۔ سرسری طور پر اس لیے کہ یہ سوالات بہت بڑے ہیں، اور ان کا احاطہ ایک مضمون یا ایک شاعر کے حوالے سے کرنا مجھے ممکن نہیں لگتا۔ ارادہ یہ ہے کہ اسی نکتۂ نظر سے چند دوسرے عصری شعرا پر بھی مضامین لکھے جائیں۔ بہرحال مراد اس سے یہ قطعاً نہیں کہ مندرجہ بالا پہلوؤں ہی سے شاعری کا جائزہ لیا

جا سکتا ہے۔ اور بھی بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔

کئی سال پہلے جب محسن احسان کی پہلی کتاب "ناتمام" چھپی تو اس کے بغور مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ محسن احسان بنیادی طور پر ایک نقاد شاعر ہے۔ نقاد شاعر سے میری مراد یہاں ایسا شاعر ہے جو شعر میں اپنے معاشرے کے رویوں اور اقدار کا محاکمہ کرے۔ اس کی شاعری زندگی کی طرف ہمارے سماجی اور ذاتی رویوں اور اقدار پر ایک مسلسل تنقید ہے۔ اب "ناگزیر" کے چھپنے پر میری اس رائے کو مزید تقویت ملی ہے۔ یقیناً محسن احسان کی یہ تنقید شاعرانہ اور تخلیقی ہے، لیکن اس تنقید کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ تخلیق کے عمل کو بھی تنقیدی عمل سمجھتی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں محسن احسان کے نقاد شاعر ہونے کے سلسلے میں اس کے کلام سے حوالے پیش کروں، یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ عصری فلسفۂ علم و سائنس کے حوالے سے انسانی تہذیب و ثقافت کے لیے تنقید کے عمل کی اہمیت پر چند باتیں عرض کرتا جاؤں۔ فلسفۂ علم و سائنس میں تنقیدی عمل کی اہمیت پر سب سے زیادہ زوردار اور اہم فلسفیانہ نکتۂ نظر مغرب کے زندہ فلسفیوں میں سر کارل پاپر کا ہے۔ پاپر کے خیال میں سائنسی عقلیت کے دو اہم پہلو ہیں: شاعرانہ اختراعیت اور تنقید۔ سائنس پاپر کے نزدیک، استقرائیہ طریق کار پر مبنی نہیں، بلکہ سائنس دراصل مفروضہ جات کی تعمیر، مفروضہ جات کے مشاہداتی نتائج اخذ کرکے یہ دیکھنے کا نام ہے کہ کون سا مفروضہ تجربے یا مشاہدے کے ساتھ ٹکرا رہا ہے۔ پاپر کے نزدیک ایک مفروضے کے مشاہداتی نتائج ہمارے تجربے کے مطابق ہونا اتنا اہم نہیں جتنا یہ ہے کہ مشاہداتی نتائج ہمارے تجربے سے ٹکرا نہیں رہے۔ یعنی کسی مفروضے کے لیے اثباتی شہادت ڈھونڈنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس مفروضے کے خلاف منفی شہادت موجود ہے یا نہیں۔ جب تک منفی شہادت مشاہدے میں نہ آئے مفروضہ ہمارے لیے قابلِ قبول رہتا ہے۔ اثباتی شہادت کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ تقریباً ہر دور از کار مفروضے کے لیے اس طرح کی شہادت کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے سو اصل بات سائنس میں مفروضے تعمیر کرکے انھیں غلط ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ ظاہر ہے نئے نئے اور دلچسپ مفروضے تعمیر کرنے کے لیے شاعرانہ اختراع کی ضرورت ہوتی ہے اور انھیں غلط ثابت جید تنقید ہی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ جونہی کسی مفروضے کے خلاف منفی شہادت سامنے آجائے سائنس دان اس کی جگہ اس سے بہتر مفروضہ تعمیر کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ یوں ہر آنے والا مفروضہ پاپر کے نزدیک سچائی کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اگرچہ مکمل سچائی کو گرفت میں لے آنا کسی مفروضے کے بس میں نہیں ہوتا۔

سائنس، پاپر کے نزدیک، اسی مستقل عمل کا نام ہے، جس میں ہم مفروضے تعمیر کرکے انھیں غلط ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ساری انسانی

...زندگی کا دارومدار اختراع اور تنقید پر ہے

سائنس چونکہ عقلیت کا ایک بہترین اور کامیاب نمونہ ہے کہ علم سارے کا سارا
...دراصل اختراع اور تنقید پر مشتمل ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر میرے خیال میں
...بھی قسم کے ذمہ دار نقاد کے کام کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ میں محسن احسان کو
...تناظر میں رکھ کر نقاد شاعر کی حیثیت میں دیکھ رہا ہوں۔ دعوا یہ نہیں کہ محسن احسان عصری
...میں اس اعتبار سے منفرد ہے۔ دوسرے بہت سارے شعرا کو اسی نکتۂ نظر سے پڑھا
...سکتا ہے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ محسن احسان نقاد شاعر ہے، آیئے اس کی شاعری کا جائزہ پہلے
COMMINTMEN... کے سوال کے حوالے سے لیں۔ ناتمام اور ناگزیر دونوں میں محسن احسان
...نے کئی ایسے اشعار کہے ہیں، جنھیں اس سوال کے حوالے سے دیکھنا مجھے مفید اور اہم لگتا
...ہے۔ مثال کے طور پر ناگزیر کے ان دو اشعار کو لیجیے:

گزر رہی ہے تذبذب میں زندگی اپنی
نہ ہم یقین کی جانب، نہ ہم گماں کی طرف

جُدا رہا مرا اندازِ زندگی محسنؔ
نہ میں فلاں کا مصاحب، نہ میں فلاں کی طرف

...پہلے شعر میں مجھے لگتا ہے، اس مسئلے کی طرف اشارہ ہے کہ عصری انسان کے لیے کسی نظریۂ حیات
...مکمل یقین کے ساتھ اپنا لینا اکثر اوقات خاصا مشکل ہوتا ہے۔ تذبذب، غیر یقینی یا تشکیک
...عصری انسان کا ایک مخصوص مسئلہ یا پہچان ہے۔ اس تذبذب یا تشکیک کے ہوتے ہوئے
...انسان اپنے آپ کو کسی ایک آئیڈیالوجی کے ساتھ مکمل طور پر منسلک آسانی کے ساتھ
...نہیں کر سکتا۔ دوسرے شعر میں محسن احسان اپنی زندگی کو گروہی وفاداریوں سے بالاتر
...بتاتا ہے۔ اگرچہ اس شعر میں اس کی وجہ نہیں بتائی گئی لیکن اندازِ کلام سے اندازہ ہوتا ہے
...محسن احسان سچائی کو گروہی وفاداریوں سے بالاتر آئیڈیل سمجھتا ہے۔ اور اسی
...آئیڈیل کی خاطر وہ اپنی زندگی کو گروہی وفاداریوں سے بالاتر رکھنا چاہتا ہے۔ اگر دوسرے شعر
...کی یہ تعبیر درست ہے تو پھر میرے خیال میں یہ شعر ایک فکری مغالطے پر مبنی ہے۔ اول
...یہ کہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی گروہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی یہ گروہ اس کا اپنا منتخب کردہ ہوتا
...ہے اور کبھی وہ اس سے پیدائش کی بنیاد پر منسلک ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ
...سچائی کا ہر انسانی ادراک اور آئیڈیل کسی نہ کسی نظامِ فکر کا حصہ ہوتا ہے۔ مشہور امریکی فلسفی
...کوائن QUINE کے الفاظ میں ایسی کسی سچائی کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو ہر نظامِ فکر سے بالاتر
...یعنی EXTRA-THEORETICAL ہو۔ اس دعوے کے پیچھے موجود منطق بالکل واضح ہے۔ انسان
...کسی بھی موضوع پر رائے قائم کرتے وقت، ظاہر ہے اپنے فکر و زبان سے بالاتر نہیں ہو سکتا اس لیے

کتاب نما

سچائی کا ہر انسانی ادراک کسی نہ کسی نظامِ فکر کا حصہ ہوتا ہے۔ یہ باتیں اگر درست ہیں، یعنی انسان نہ آئیڈیالوجی اور نظامِ فکر وغیرہ سے بالاتر ہو سکتا ہے اور نہ ہی گروہی مخالطے سے تو پھر یقیناً مندرجہ بالا شعر ایک فکری مغالطہ ہے۔

ان دو اشعار پر گفتگو سے ادب میں COMMITMENT کے سوال پر دو باتیں سامنے آئی ہیں۔ عصری تذبذب یا تشکیک، اور یہ کہ سچائی کا ہر ادراک کسی نہ کسی نظامِ فکر کا حصہ ہوتا ہے۔ تذبذب یا تشکیک کے ہوتے ہوتے انسان ایک گروہ سے بظاہر منسلک ہوتے ہوئے بھی اپنی وفاداریوں کے بارے میں ابہام کا شکار ہو سکتا ہے۔ محسن احسان کو اس عصری المیہ کا میرے خیال میں گہرا احساس ہے۔ اس لیے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان تشکیک و تذبذب کی وجہ سے کسی بھی نظامِ فکر کو قبول کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ اس کا یہ رویہ بذاتِ خود ایک فکری رویہ ہوتا ہے۔ محسن احسان کا ایک نقاد شاعر کی حیثیت سے یہاں کمال ان سوالات کو اٹھانا ہے، نہ کہ ان کا حل پیش کرنا۔

اب چند دوسرے اشعار بھی دیکھ لیجیے جن کا تعلق مجھے اسی عمومی موضوع سے لگتا ہے۔

اپنی آواز کے سناٹے سے ہول آتا ہے
میں بیابانِ تمنا میں صدا کیا کرتا

یہاں پہ لوگ نہیں سائے چلتے پھرتے ہیں
یہ شہر وہ ہیں جو کوئی صدا نہیں رکھتے

ان دو اشعار میں محسن احسان کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ شہر اور صدائیں اپنی پہچان کھو بیٹھی ہیں۔ COMMITMENT کے حوالے سے ان اشعار کی تعبیر کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ جدید انسان اپنی وفاداریوں اور اپنے نظامِ فکر کا واضح انتخاب بسا اوقات نہیں کر سکتا۔ اور یوں اپنی پہچان کے خدوخال واضح نہیں کر سکتا۔ متشککین (SKEPTIC S) کے نزدیک ہمارے پاس کسی بھی نظامِ فکر کو قبول کرنے کے لیے کبھی فیصلہ کن شواہد موجود نہیں ہوتے۔ اس لیے کسی نظامِ فکر یا آئیڈیالوجی کے ساتھ COMMIT ہو جانے کو متشککین DOGMATISM سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کے لوگوں کے لیے COMMITMENT ایک منفی رویہ یا قدر ہے۔ اُوپر کے دو اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ محسن احسان COMMITMENT کو نہیں بلکہ COMMITMENT کی غیر موجودگی کو ایک منفی قدر سمجھتا ہے اس طرح وہ متشکک تو نہیں، البتہ نقاد اس لیے ضرور ہے کہ اس نے اوپر والے دو اشعار سے پہلے دیے گئے اشعار میں COMMITMENT کے سوال کے بارے میں ایسے سوال اٹھائے ہیں جو عمومی آرا کو قبول کرنے والا شخص نہیں بلکہ ایک نقاد ہی اٹھا سکتا ہے آئیے اب اقدار اور اقدار کے بحران کے حوالے سے محسن احسان کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں۔ محسن احسان کو ہمارے جدید معاشرے میں اقدار کے بحران کا شدید احساس ہے اور اس کی شاعرانہ قوت

بیشتر حصہ اسی بحران پر تنقید میں صرف ہوتا ہے۔ ناتمام اور ناگزیر دونوں میں محسن احسان نے ہمارے معاشرے کی جن منفی اقدار کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں: قیادت کا زوال، منافقت، سچی اقدار کی PERVERSION یعنی حق و باطل کی تمیز کا اُٹھ جانا، خوف و دشمنی اور نفرت، ظلم، اہلِ مذہب کا مذہب کو تباہ کرنا، مصلحت پرستی، فرقہ بازی، بے وقاری، مقاصد کے بارے میں ابہام، دوستی کا بحران، ناعاقبت اندیشی، تخلیقی جمود، خود غرضی، جھوٹ اور فریب، سچائی کا ناپید ہو جانا اور کوششوں کی بے مصرفی وغیرہ۔ ان سب موضوعات پر محسن احسان نے خوبصورت اشعار کہے ہیں۔

خود ہم نے کاٹ کاٹ دی زنجیر سانس کی
خود ہم نے زندگی کا سفر مختصر کیا

نہ جانے ختم ہو کب گلستاں کی یک رنگی
ترس گئی ہے نئے منظروں کو بینائی

ہم شہرِ ہوس میں جی رہے ہیں
اوروں کا ہمیں خیال کیا ہو

امتحانِ دنیا میں دین بھی نہ کام آیا
اہلِ حق بھی حرفِ حق بے خطر نہیں کہتے

بالوئے شہرِ ادب کے لیے اس عہد میں حرف
کتنا بے مایہ و محروم صداقت اُترا

قبولیت کے لیے آسماں کا در نہ کھلا
مری دُعا کا سفر کتنا رائیگاں نکلا

یہ محسن احسان کی ہمارے موجود سماج پر تنقید کے کچھ پہلو ہیں۔ اس کے کینوس کی وسعت ان اشعار کے موضوعات کے تنوع سے واضح ہے۔

جہاں تک محسن احسان کے مستقبل کے لیے وژن کا تعلق ہے تو لگتا ہے کہ اُس نے ابھی تک کسی مربوط نظامِ اقدار کو اس سلسلے میں اپنی شاعری کا مرکزی نکتہ نہیں بنایا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ناتمام اور ناگزیر دونوں میں فیملی، جمال، محبت، برابری اور بلند ہمتی جیسی اقدار

پر اچھے اشعار موجود ہیں۔ تاگزیر میں حمد و نعت کے بعد پہلی نظم اولاد پر کہی ہے۔ جمال پرستی طرح کے اشعار بھی چونکا دینے والے ہیں:

اسلوبِ جمال تیرا پڑھنے
ماہتاب طلوع ہو رہا ہے

یہ کائنات جلال و جمال کھو بیٹھے
جو لمحہ لمحہ مژہ کی کشاد و بست نہ ہو

محبت اور بلند ہمتی کے حوالے سے ان اشعار کو دیکھیے۔

جب آفتابِ محبت غروب ہونے کو تھا
تو ایک شخص بڑے پیار سے بلانے لگا

دیکھ میری بلند پروازی
اُڑ رہا ہوں شکستہ پر لے کر

محبت کی قدر کے کچھ اور پہلو بھی دیکھیے:

حدیثِ دردِ زمانہ بجا سہی لیکن
مزا بیاں کا فقط دل کی واردات میں ہے

کون دریاؤں پہ اب پیاس بجھانے جائے
ہم نے دیکھے ہیں سمندر تری پیشانی میں

مری آنکھوں میں ترے شہر کی تصویریں ہیں
یہ اثاثہ ہے بہت بے سرو سامانی میں

یہی مزاج ہے اپنا کسی کا دل نہ دُکھے
جدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

یہ ساری قدریں محسن احسان کے لیے بہت اہم ہیں۔ اور اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ آگے چل کر اس طرح کی اقدار اور ان کے گرد تعمیر شدہ مستقبل کا ایک وژن محسن احسان کی شاعری کا مرکزی نکتہ بن جائیں۔

آخر میں مجھے محسن احسان کے ڈکشن کے بارے میں بہت ہی سرسری کچھ کہنا ہے۔ محسن احسان کا ڈکشن دوسرے عصری شعرا سے الگ تھلگ نہیں۔ اشعار کے لیے الفاظ کا چناؤ وہ احتیاط کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے مصرعوں کی روانی اور اس کے لہجے

...نی، میرے خیال میں، اس کے ڈکشن ہی کی عطا ہے۔ الفاظ کو سلیقے سے برتنے کا انداز
... دیکھیے:

بکھر گئے تو سمیٹا نہ زندگی نے ہمیں
نکھر گئے تو دمکتے رہے موتیوں کی طرح

دل بھی آباد ہے اک شہرِ خموشاں کی طرح
ہر طرف لوگ، مگر عالمِ تنہائی ہے

ہم اُسی کی خاک سے اُٹھے ہیں کُندن بن کے آج
دوستو! جس شہر میں رسمِ وفاداری نہ تھی

...ں طرح کے ڈھیر سارے اشعار محسن احسان کی دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ ان اشعار
...ں معنوی حسن تو موجود ہے ہی لفظوں کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی یہ اشعار منفرد ہیں۔
...وسرے شعر ہی کو لیجیے۔ "شہرِ خموشاں کی آبادی" سے بہتر ہم کن لفظوں میں دل پر لوگوں کے
...دم کے درمیان طاری عالمِ تنہائی کو بیان کر سکتے ہیں۔ محسن احسان نے اسی خوبی کے ساتھ
...مری مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی غزل و نظم میں "وجود کا دوزخ"، "بارشِ سنگ"، "گونگے
...نظ"، "خالی نقطے"، "معنی کا صحرا"، "بانجھ خیال"، "رمِ شعلۂ حنا"، "مشرقِ سبو" اور "شملۂ عزت"
...سی اچھوتی تراکیب کو بڑی شاعرانہ چابک دستی اور نزاکت کے ساتھ برتا ہے۔ اس لیے
...ہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈکشن اور نقادانہ فکر دونوں کے اعتبار
...سے محسن احسان کا فن بلند تر منزلوں کی طرف بڑھنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک
...قادشاعر کی حیثیت سے محسن احسان کے فن کا مقصد ایک پوری تہذیب کا محاکمہ ہے اور
...ناتمام و ناگزیر اس مقصد کے حصول کی طرف انتہائی اہم پیش رفت ہیں۔

حاشیے

۱ سسکارل پاپر کا پرچہ "THE MYTH OF FRAMEWORK" جو RATIONAL CHANGES - IN SCIENCE - نامی کتاب کہ جسے REDEL نے ۱۹۸۷ء میں چھپایا ہے، میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں بہت مفید تفصیلات سے بھری پڑی ہے۔

۲ ڈبلیو۔ وی۔ کوآئن، THEORIES AND THINGS ہارورڈ یونی ورسٹی ۱۹۸۱ء صفحات ۲۲-۲۱۔

۳ SKEPTICSM پر مزید تفصیلات کے لیے رچرڈ پاپکن کی THE HISTORY OF SKEPTICISM ERASMUS TO DESCARTES نیدرلینڈز ۱۹۶۰ء۔

ثروت محسن احسان

خدا جانے یہ مشرقی عورت کا مقدر ہے۔ یا محض اس کی عادت کہ میاں چاہے کیسا ہی کیوں نہ ہو اس پر مر مٹتی ہے۔ محسن احسان تو اچھی خاصی گوارا بلکہ پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ اگر بغیر لگی لپٹی کے بھی اس کے بارے میں کوئی شریفانہ رائے دی جائے تو اسے مر مٹنے ہی کی ایک صورت سمجھا جائے گا۔ حالانکہ میں مر مٹنے سے زیادہ لڑ مرنے کی قائل ہوں اور یہ محسن احسان بھی کچھ ایسے سیدھے نہیں ضرورت پڑے تو غصے کا اظہار بخوبی کر سکتے ہیں شعر میں جھول آئے تو آئے لیکن زندگی میں جھول نہیں آنے دیتے۔ ایسے میں وہ ہر ایک کو معاف کر سکتے ہیں۔ سوائے میرے۔ مجھے یاد ہے آغاز سفر میں محسن نے کہا ؎

میں تری آنکھ سے ٹپکا ہوا اک آنسو ہوں
تو اگر چاہے بکھرنے سے بچالے مجھ کو

میں نے سنا، سمجھا اور عمل کی کوشش کی۔ کب اور کیسے۔ اس تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ جس میں محسن برابر کے شریک ہیں۔ زندگی کی شکست و ریخت میں ہم بار ہا بگڑے اور سنورے اور بار ہا ہم نے ایک دوسرے کو بکھرنے سے بچایا یوں "ناتمام" وجود میں آئی۔ جب محسن احسان نے اقبال کے الفاظ میں مجھے یاد دلایا کہ

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا — تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام

تو میں نے ایک بار پھر سر تسلیم خم کیا اور ہم "ناتمام" سے ناگزیر کی طرف بڑھنے لگے۔ اس احساس کے ساتھ کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ذات و حیات کی بھول بھلیوں میں ہم نے اکثر ایک دوسرے کو کھویا اور پایا ہے۔ غنیمت ہے کہ جستجو کا یہ سفر جاری ہے اور زندگی اتنی سپاٹ نہیں ہوئی کہ خط مستقیم بن جائے۔

محسن بظاہر خاصی متوازن شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ شاعری ان کے اختیار میں ہے وہ شاعری کے اختیار میں نہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ بلکہ بعض کی ادائیگی میں تو غیر شاعرانہ حد تک باقاعدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اکثر موڈ کو فرض پہ قربان

ریں۔ خاص طور پر جب موسیقی کے اچھے خاصے پروگرام کا حبروں کی خاطر گلا گھونٹ دیا جاتا ہے
موچ کر معاف کرنا پڑتا ہے کہ اچھی بات ہے کم سے کم حقائق پر نظر تو رکھتے ہیں۔
یہ درست ہے کہ زندگی میں کافی حد تک سنبھل کر چلنے کے عادی ہیں یہ اور بات کہ گاڑی
کے وقت چال کچھ بہکی بہکی ہوجاتی ہے۔ ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر یہ احساس ہوتا ہے
ستے میں پتھر ہیں کوئی کہکشاں نہیں ہے۔ شاعرانہ بے ترتیبی کا دوسرا شاہکار ان کے مطالعے
رہ ہے جو مقفل نہ ہونے کے باوجود مقفل ہے۔ کیوں کہ کسی کتاب تک رسائی ان کی مدد کے
مکن نہیں ہو سکتی۔ بے ترتیبی کا یہ عالم ہے کہ آپ خود کو اس کمرے میں کھو سکتے ہیں لیکن مطلوب
ب بر وقت نہیں پا سکتے۔
سنا ہے۔ بعض لوگ غصے میں برتنوں کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہیں اور یوں اپنی مردانہ
ی کا رعب بچاری عورت پر جماتے ہیں۔ محسن ان لوگوں میں سے نہیں۔ ہمارے گھر میں اگر
ن ٹوٹتے ہیں تو محسن کے جذبۂ ہمدردی و محبت کے تحت۔ مجھے اور بیٹی کو باورچی خانے
کام کرتے دیکھ کر محسن بہت ترس کھاتے ہیں۔ مدد کے طور پر جب برتن اٹھا کر کمرے
لے جانا چاہتے ہیں تو ایک آدھ ضرور راستے ہی میں رہ جاتا ہے۔ اس لیے بیٹی کی پوری
شش ہوتی ہے کہ ابو کے آنے سے پہلے ہی میز لگ جائے اور اسے جھجکتے ہوئے یہ کہنا نہ پڑے
ے کہ ابو آپ کا WRISTE BALANCE کچھ ٹھیک نہیں ہے۔
محسن کی جو بات مجھے سب سے زیادہ کھلنے لگی ہے۔ وہ ان کا روز بروز بڑھتا ہوا احساس
ت ہے۔ شعر کی حد تک مجھے اعتراض نہیں کہ اگر وہ کہیں کہ

یہی مزاج ہے اپنا کسی کا دل نہ دکھے

لیکن عملاً اس کا اطلاق کبھی کبھی کوفت کا باعث بنتا ہے۔ خصوصاً جب صنف نازک
ی CURTESY کی زد میں ہو تو چند ایک کا کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوجانا تو غیر معمولی بات
ں۔ ایسے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کوسا کس کو جائے۔ میرا بس چلے تو محسن کی ڈکشنری سے
CURTESY کا لفظ نکال دوں۔ بہت سمجھایا ہے کہ جب اللہ میاں سب کو خوش نہیں کر سکتے تو
ے میاں کو ایسی کیا پڑی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے کہ محبت اور ہمدردی
س سمندر کی جولانیوں میں میرا ظرف ایک تنکے کی طرح نہ بہہ جائے۔ کیونکہ میری بساط ہی کیا ہے
ر ایک کا درد میرے دل میں سما سکے۔ یقیناً اس فیاضی میں محسن کا ساتھ نہیں دے سکتی۔
محسن احسان نے پشاور کے اس دلکش اور خوبصورت حصے میں زندگی کا بیشتر وقت
کیا ہے۔ جہاں پھولوں، رنگوں اور خوشبوؤں کی کوئی کمی نہیں۔ جہاں پت جھڑ ہو یا بہار۔
موسم سارے رنگوں خوشبوؤں اور سبج دھج کے ساتھ آتے ہیں۔ یہ وہ دیار ہے جہاں کیٹس
رواتی دنیا کا گمان ہوتا ہے۔ محسن نے کئی دوسری ملازمتوں کو صرف اس لیے ٹھکرایا کہ اسے یہ
ش ماحول بڑا عزیز ہے۔ صبح کی سیر نے محسن کے ذوق جمال کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ اسے بعض
خوبصورت اشعار بھی دیے ہیں۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں ؎

خوشبو مرے بدن سے [illegible] پریشاں تھی — محسن یہ کس دیار سے میں نے گزر کیا

مرے ذوقِ حسن وجمال نے تری خوشبوؤں کو چرا لیا — ترے خدوخال میں کھل اٹھے پھول شوقِ وصال کے

خاک اڑاتی ہوئی جب موجِ صبا آتی ہے — شاخ سے پتّوں کے گرنے کی صدا آتی ہے

اپنا سر پیٹتی رہتی ہیں برہنہ شاخیں — جب کبھی پت جھڑ میں ذرا تیز ہوا آتی ہے

شام گزری ہے شفق رنگ قبا میں ملبوس — رات اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا آتی ہے

پاؤں کس احتیاط سے دھرتی ہے چاندنی — کرنوں کی سیڑھیوں سے اترتی ہے چاندنی

محسن یہ سوچتا ہوں قدم جھک کے چوم لوں — جب چودھویں کی رات نکھرتی ہے چاندنی

ایسے میں سیر کا لطف کچھ اور بڑھ جاتا ہے اور زندگی کی ہر مشکل آسان نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محسن ایسا باہمت اور توانا سہارا ہے کہ جس کے ساتھ چل کر تھکن تازگی میں بدل جاتی ہے مجھے ان کی جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کے مزاج کی شگفتگی ہے جو ان کے مثبت اور تعمیری رویّوں کی غمّاز ہے۔ اُن کا خلوص، ان کی شخصیت کا حسن ہے۔

محسن کی زندگی کا سب سے دلچسپ پہلوان کا حلقۂ احباب ہے جو اتنا وسیع اور اتنا متنوع ہے کہ اس میں عمر، پیشہ اور ذوق کی کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ بعض باقاعدہ متصادم شخصیات بھی اس حلقے میں شامل ہیں (یہ خوش نصیبی ہے کہ محسن کے لیے سب خلوص ہی خلوص رکھتے ہیں۔ اگر کسی سے کبھی زک پہنچے بھی تو محسن کو معاف کرنا آتا ہے) حیرت ہے کہ اس قدر انواع واقسام کے لوگ ایک ہی زلف کے اسیر کیسے ہوگئے۔ شاید اس لیے کہ جوابی گرمجوشی بھی کچھ کم نہیں۔ دوستوں کی محفل سجتی ہے تو وقت کی کوئی اہمیت وحیثیت نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ ان کے بعض دوستوں کی محبت بچوں کو ورثے میں مل گئی ہے اور وہ بھی فلاں فلاں چچا کے ذکر سے کھل اٹھتے ہیں۔

بچے محسن کی کمزوری ہیں اور ان کو بگاڑنا ان کا محبوب مشغلہ۔ یہ تو غنیمت ہے کہ بچے کچھ سمجھدار واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ انھوں نے تو ان کو بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ بچوں کی ہر خواہش محسن کو مقدم ہے۔ لہٰذا گھر کی سیاست پر محسن کی مکمل اجارہ داری ہے۔ بچوں کے ووٹ مستقل طور پر ان ہی کے لیے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں تمام خوشگوار ذمہ داریاں تو انھوں نے اپنے سر لے رکھی ہیں۔ مثلاً گھنٹوں بچوں سے گپ لگانا۔ کرکٹ کھیلنا (جیسی بھی آتی ہے) انتہائی تحمل سے شاپنگ کروانا، گھمانا پھرانا اور بھولے سے کبھی یہ نہ پوچھنا کہ کس نے کتنے گھنٹے پڑھا۔ [illegible]

محسن احسان
Chairman,
Department of English,
Islamia College,
Peshawar (PAKISTAN)

ہوائے تند زیاں کار بے نظر رکھیے
طنابِ خیمۂ اُمید کھینچ کر رکھیے

یہ اور بات کوئی پھل بھی دسترس میں نہ ہو
مگر نگاہ میں اشجارِ باثمر رکھیے

زمانہ بے ہنری کو ہنر سمجھتا ہے
ہے یہ کمالِ ہنر دست بے ہنر رکھیے

کسی کو بھی نہیں اب اختیارِ سنگ زنی
دکان شیشہ گراں دن میں کھول کر رکھیے

سمیٹ کر نہ کوئی ریگ کہکشاں لایا
مہ و نجوم پہ کس واسطے نظر رکھیے

کھلے ہیں ہم پہ بتدریج سب محاسن شیخ
دلوں میں بغض و عداوت، نظر میں ڈر رکھیے

ہوا میں کیجیے نہ تعمیرِ بام و در محسن
ذرا مکاں کی بنیاد پر نظر رکھیے

محسن احسان

غزل

خلوص ہو تو دعا میں اثر بھی آتا ہے
شجر ہرا ہو تو اس میں ثمر بھی آتا ہے

مری سماعت و بینائی چھیننے والے
میں سُن بھی سکتا ہوں مجھ کو نظر بھی آتا ہے

تمھیں چراغ بجھانے کا زعم ہے لیکن
ہمیں طلوعِ سحر کا ہُنر بھی آتا ہے

کلیسا و حرم و دیر محترم لیکن
انھیں کی زد میں کہیں میرا گھر بھی آتا ہے

فلک نشیں سہی میرا خُدا مگر محسنؔ
کبھی کبھی وہ زمیں پر اُتر بھی آتا ہے

محسن احسان

کیا گزری ہے دورانِ مہ و سال نہ لکھا
ہم نے دلِ افسردہ کا احوال نہ لکھا

وہ شدّتِ وابستگیِ حرص رہی ہے
کچھ عیبِ رفیقانِ زر و مال نہ لکھا

صحرا کا کڑی دھوپ سے رشتہ ہے پرانا
لیکن جو بگولوں کا ہوا حال نہ لکھا

تجھ کو بھی نہ سمجھا کبھی پابندِ محبّت
خود کو بھی گرفتارِ خد و خال نہ لکھا

ہاں نشّۂ پندارِ سخن سر میں بہت ہے
ہاں تذکرۂ حشمت و اجلال نہ لکھا

کچھ ایسے بزرگانِ جہاں تھے کہ جنھوں نے
صد شکر مرا نامۂ اعمال نہ لکھا

محسن یہ ہمیں فخر ہے دیوانِ سخن میں
ہم نے کوئی مضموں کبھی پامال نہ لکھا

محسن احسان
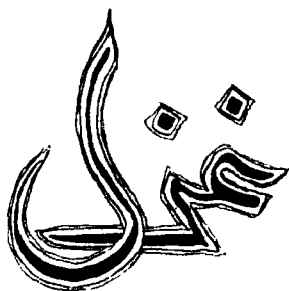
سرنامۂ قانونِ جفا بھی نہیں لکھّا
دستِ تہی کو ننگِ دُعا بھی نہیں لکھّا

کیوں زاہدِ شیطاں زدہ درپے ہے ہمارے
جب قصّۂ دستار و قبا بھی نہیں لکھّا

تقدیر میں کچھ غم کی گرہ ایسی پڑی ہے
احوالِ دلِ عقدہ کشا بھی نہیں لکھّا

اب مدّعیِ غیرتِ گلزار بنا ہے
جس نے کوئی دستورِ صبا بھی نہیں لکھّا

آنکھوں سے رواں خون کا سیلاب تھا لیکن
اِک بوند کو ہمرنگِ حنا بھی نہیں لکھّا

مخلوقِ ستم پیشہ کو ہم نے کبھی محسن
بُت بھی نہیں لکھّا تو خدا بھی نہیں لکھّا

ناگزیر

شاعر: محسن احسان
ناشر: نیاز احمد۔ سنگِ میل
پبلی کیشنز، لاہور
اشاعت: ۱۹۸۸ء
قیمت: ساٹھ روپے
مبصر:۔ ڈاکٹر سیفی پریمی

محسن احسان کا شعری نقش "ناگزیر" نظر نواز اور دورنگوں میں موضوعات کی توضیح کرتا ہے۔ نام پر قدرے تامل ہوا۔ یہ بھی کہیں سارتر ے اور کیمس کی میراث نہ ہو۔ ورق گردانی نے اُجالا کر دیا ص "۔ ثروت نے لکھ دیا۔

"ہم ناتمام" سے ناگزیر کی طرف بڑھنے لگے۔ اس احساس کے ساتھ کہ اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں "

محسن احسان کے لیے "ناگزیر" پر پیش لفظ اور مقدمہ لکھوانا معمولی سی بات تھی ــــــ مگر انھوں نے "ہم سخن، ہم نفس" کے فرض کی ادائیگی ثروت محسن کو سونپ دی۔ یہ بھی بڑی خوبی ہے۔ اُن کی حیثیت یہ ہے کہ رفیق بھی رازدان بھی اور محاسب بھی! چنانچہ معمولات، مزاج، رویہ، موڈ ، کردار اور شعرستان۔ تمام عناصر پر گہری نظر ہے۔

ثروت نے سات پسندیدہ شعر بھی درج کیے ہیں۔ یہ اشارات، سیاق وسباق سے الگ ہو کر بھی ایک معنی آفریں تصویر بناتے ہیں۔ محسن کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار ہے اس لیے وہ FRANK ہے مگر باپ کی مزاج آشنا، اس لیے عملاً محتاط اور فرض شناس بھی!

محمد احمد شمسی کی رائے ہے:

'جذبہ، عروقِ شعر میں خونِ زندگی کی طرح جاری وساری رہتا ہے۔ اور فکر کی لَو ہمیشہ روشن رہتی ہے "

اس شعری نقش میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ نظموں میں ہیئت کی کئی شکلیں ہیں۔ مگر آزاد نظموں میں کھلی فضا، آہنگ و اُسلوب اور ابلاغ و ترسیل کی رعنائی اور معانی کی گہرائی اور گیرائی ہے موضوعات میں تنوع اور معروضی نقطۂ نظر کارفرما ہے۔ رومان، سیاست اور سماجی اقدار خصوصی دائرے ہیں۔ اس قبیل کی نظموں میں قرب، صداکار، ہم یہاں ہیں، وقت کب وہ آئے گا، چراغ چہرے شامل ہیں۔ میرے نزدیک "ہم یہاں ہیں" بہتر اور "وقت کب وہ آئے گا" بہترین نظم ہے۔ اس میں ایک جری قوم ایک شاداب مُلک کی تاریخ ہے جس کو اس کے مفاد پرست لیڈروں نے ظلمت کے حوالہ کر دیا۔ محنت کش طبقہ اور شفیق مائیں اپنی نئی نسل کے مستقبل سے ہراساں ہیں اور شاعر، عوام سے سوال کرتا ہے۔

کچھ تجھے بتاؤ بھی	وقت کب وہ آئے گا
چاند کب وہ نکلے گا	نور کب وہ برسے گا
جب زمیں کا سینہ	تھاپ سے کُدالوں کی
خوش لباس گندم کی	بالیاں اُگائے گا
جب ترستے ہاتھوں میں	اُن کے کام کا ثمرہ
بے عرق جبینوں سے	آسماں کے زینوں سے
باوقار آئے گا	جب ترستی آنکھوں میں
ابر، ابر، اندیشہ	بُوند بُوند آنسو کو
بے نشان پائے گا	روشنی سجائے گا
وقت کب وہ آئے گا	وقت کب وہ آئے گا

اس سے شاعری کی وطن پرستی، امن وخوش حالی کی ذمہ داری اور انسان دوستی کا ثبوت ملتا ہے
رجراٰت اظہار کا حوصلہ ! یہی عشق کا لازوال مقام ہے۔
اس نقش حیات وکائنات میں کہیں کہیں جدیدیت کی تنہائی اور بت جھڑ کا منظر بھی ہے۔ اور
یسے شعر بھی شاید نکل آئے در یہیں پر ـــــ دیوار کو کھٹکھٹا رہا ہوں اصل میں یہ پُوری غزل ہی درخور
تخاب نہ تھی۔

دل سرائے میں تمنائیں ہیں سرنہوڑائے
کون لبستی میں وہ مہمان حسرت اُترا

بھی وہی نور باطن کا فیضان ہے۔" سرنہوڑانا مقامی رنگ ہے۔ اردو محاورہ نہیں۔
اب بزم غزل کی سیر کیجیے :-

فقیہہ شہر نے بیزار کردیا ورنہ	دلوں میں قدر بہت خانۂ خُدا کی تھی
اُسے پکار چکا، زندگی میں ہار چکا	مرا خدا تھا، تو پھر میری التجا سُنتا
میں کس حساب میں لکھوں وہ ہجر کے لمحے	کہ جن میں تو نہ مِلا، اور نہ تیری یاد آئی
کوئی طائر مرے گلشن کا نوا ریز نہیں	کیا کوئی سانپ تہہ سایۂ گل بیٹھا ہے
ہمیں عدو سے ہو محسن گلہ تو کیوں کر ہو	ہمارے شہر کو ویران کر گئے اپنے

بہہ شہر = اقتدار بالا ـــ طائر = شاعر، INTELLECTUAL گلشن = مُلک،
نپ = عوام دُشمن، نام نہاد حکمراں ـــ شہر = مُلک ـــ اپنے مفاد پرست کنبہ پرور حکم
ہین بآسانی شاعر کے تخیل، فکر و نظر اور حسیت سے آگاہ ہوسکتے ہیں۔ حالات کے تحت آواز میں
انے کی تکنک اور لہجہ میں دھیماپن ہے۔ رومان میں بھی آشفتگی اور شوریدہ سری نہیں۔ لیکن جذبہ
رفکر کا اظہار اپنی شناخت کرا دیتا ہے۔ اور یہ بہت کافی ہے۔ مطالعہ کلام سے واضح ہے کہ تخلیق
مقصدیت اور سماجی حقیقت پسندی کی چمک دمک اور ارغوانی رنگ ہے۔ عوامی شاعر کی یہی
پان ہے وہ IMAGE-MAKERS کا کھلونا نہیں بن سکتا۔
ناگزیر" میں شاعر کی تصویر، تخلیق کی توضیح کرتی ہے۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھُلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

ایک نظم بعنوان "محقق" ارسال خدمت ہے۔ اس نظم کے لکھنے کی تحریک درج ذیل واقعہ سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اختر اورینوی (مرحوم) نے اپنے ڈی لٹ کا مقالہ جب کتابی شکل میں چھپوایا تو اسے پڑھ کر قاضی عبدالودود (مرحوم) سخت برہم ہوئے۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ اختر اورینوی کا مقالہ "غلطہائے مضامین" سے پُر ہے۔ منجملہ اور غلطیوں کے ایک غلطی یہ تھی کہ بہار کے ایک صوفی شاعر کے انتقال کا سن مہینا اور دن تو درست تھے، لیکن وقت غلط تھا۔ شاعر کی موت شام کے چھے بجے ہوئی تھی، جب کہ اختر اورینوی کی تحقیق کے مطابق دو گھنٹے قبل ملک الموت نے روح قبض کی تھی۔ قاضی صاحب نے بمبئی کے ایک ماہنامہ میں جسے پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم نکالتے تھے، قسط وار مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا، جس کے ذریعہ انھوں نے ثابت کیا کہ اختر اورینوی کا تحقیقی مقالہ ناقص ہے اس لیے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری نہیں ملنی چاہیے تھی۔ اس واقعہ کو میں نے منظوم لطیفے کی شکل میں لکھ کر "ہماری زبان" کو بغرض اشاعت بھیج دیا۔ اس زمانے میں "ہماری زبان" علی گڑھ سے نکلتا تھا اور پروفیسر آل احمد سرور اس کے مدیر اعلا تھے۔ نظم چھپی تو ادبی حلقوں میں پسند کی گئی۔ لیکن قاضی صاحب اب کے پروفیسر سرور سے ناخوش ہوگئے اور انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سخت الفاظ میں ان سے بازپرس کی کہ یہ نظم کیوں چھاپی گئی جو محققوں کے خلاف ہے۔ سرور صاحب نے قاضی صاحب کو کیا جواب دیا، اس کا تو مجھے علم نہیں، لیکن انھوں نے قاضی صاحب کے عتاب نامے کا خلاصہ مجھے لکھ بھیجا۔

میری یہ نظم ۳۳ سال پرانی ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔

مُحقق

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں گورستان سے
یہ نہ سمجھیں آپ ہیں بیزار اپنی جان سے

آپ کو یوں ہی ہے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ
جس طرح چوناٹلی کنجے کو نسبت پان سے

آپ کو قبروں سے الفت، عشق ویرانے سے ہے
آپ گھبراتے ہیں جیتے جاگتے انسان سے

کوئی کتنا ہی بڑا ہو فلسفی، شاعر، ادیب
عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے

ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات
آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے جان سے

سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد
پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے

طول و عرضِ قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ
گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

ہیں بہ زعمِ خود محقق آپ ہندستان کے
آپ نے نقطے گنے ہیں میرؔ کے دیوان کے

زیرِ تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے
کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومنؔ خان کے

پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر
داغؔ نے توڑا تھا دم زانو پہ منی جان کے

رندؔ نے ایک بے وفا کے عشق میں کھائے تھے جو
وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے

دھن ہے یہ ثابت کریں، ولیؔ تھا ملٹن کا وطن
اور سوداؔ کے چچا بوچر تھے انگلستان کے

الغرض رہتی ہے روز و شب یہی بس ایک فکر
کوئی گلدستہ اتاریں طاق سے نسیان کے

آپ کو ہے والہانہ عشق مخطوطات سے
جیسے سناٹے کو الفت ہے اندھیری رات سے

کرمِ خوردہ اور بوسیدہ کتابوں کے ورق
ڈھونڈھ کر لاتے ہیں آپ اس شہر اس دیہات سے

لے کے ان اوراقِ پارینہ کو یوں آتے ہیں خوش
لوٹتے ہوں جس طرح نوشہ میاں بارات سے

پھر مہینوں تک عرق ریزی کیا کرتے ہیں آپ
جوڑتے ہیں سلسلہ اس ڈال کا اس پات سے

سرحدِ وہم و گماں کو چھوڑ کر میلوں پرے
کھیلتا ہے ذہن دور از عقلِ امکانات سے

اُس پہ یہ طرّہ کہ رکھتے ہیں کھلے بندوں جناب
دل میں بغض للّٰہی اوروں کی تصنیفات سے

گر کسی نے لکھ دیا یہ میرؔ کے دو ہاتھ تھے
آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے

آپ کی تحقیق یہ ہو گی کہ لولھا تھا غریب
اور اسے ثابت کریں گے اس کے کلیات سے

(رضا نقوی واہی۔ پٹنہ)

اگست کے شمارے میں محترمی خلیل الرب صاحب نے "کتاب نما" بابت مئی ۸۹ء میں میرے اشاریے سے متعلق دو سوالات اٹھائے ہیں جن کے جوابات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں دوسری زبان کے طور پر ہندستانی کے بجائے جدید ہندستانی زبان کی بات میں نے ان ہی بحثوں کے پیش نظر کہی ہے جو خود خلیل الرب صاحب نے کی ہیں، ورنہ میرا مقصد سہ لسانی فارمولے کی تاریخ بیان کرنا نہیں تھا۔

(۲) اردو ہندی پر مشتمل ہندستانی کے بجائے صرف ہندی کے کاسٹنگ ووٹ سے سرکاری زبان ہونے کی بات اتنی معروف و مسلّم ہے کہ جب تک دستاویزات سے تحقیق کر کے اسے غلط ثابت نہیں کر دیا جائے کسی شخص کے ذاتی بیان سے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔ اس میں اردو دوستوں کی خوش فہمی کا کوئی سوال نہیں، معاملہ ایک واقعے کا ہے۔

(ڈاکٹر عبدالمغنی، وارثی گنج، عالم گنج، پٹنہ ۸۰۰۰...)

کتاب نما کے حالیہ شمارے میں لفظ تئیں کی "نشاۃ ثانیہ" سے متعلق محترم حقی صاحب کا محققانہ مراسلہ میرے لیے استفادہ کا سبب بنا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ چھوٹ گیا ہے۔" حقی صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ حضرت مولانا واصف دہلوی کے کتب خانہ میں فرہنگ آصفیہ کا جو نسخہ (۱۹۱۸ء کا مطبوعہ) موجود ہے اس میں یہ لفظ جلد اول کے صفحہ ۶۵۹ پر درج ہے اور مؤلف کی عبارت یہ ہے:

"تئیں۔ حرف ربط۔ کو، واسطے، لیے۔ (یہ لفظ اپنے کے ساتھ مستعمل ہے جیسے اپنے تئیں کچھ غرض نہیں۔ پہلے غیر کے ساتھ بھی بولتے تھے جیسے ترے تئیں اس کے تئیں وغیرہ۔ اس لفظ پر ایک مرتبہ ایک لکھنوی صاحب زبان اور حضرت غالبؔ کے درمیان ایک عجیب لطیفہ سرزد ہوا۔ دہلی میں 'اپنے تئیں' 'آپ کو' کی بجائے بہت بولا جاتا تھا لیکن لغت تراشانِ لکھنؤ نے اسے بالکل ترک کر دیا تھا اور اس کی بجائے لفظ آپ کو ترجیح دیتے تھے۔ حضرت غالبؔ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک لفظ اپنے تئیں بہتر ہے یا آپ کو۔ انھوں نے جواب دیا میں تو آپ کو حقیر ذلیل نالائق نابلد سمجھتا ہوں، کسی اور سے بھی مشورہ لیجیے کہ ایسے موقع پر "اپنے تئیں" خوشنما ہے یا 'آپ کو' میرے نزدیک اپنے آپ کو کہنے سے یہ ستم نکل جاتا ہے)۔"

محمد قاسم دہلوی۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

'کتاب نما' جولائی کی کم و بیش سبھی تخلیقات جالبِ توجہ ہیں۔ انجم منظری کی نظم تخلیق کو نئے رخ سے دیکھنے کی عمدہ مثال ہے۔ نظم کے درمیان مصرعوں میں:

روح کا مُرغ

علیمؔ، کلیمؔ، سمیعؔ، بصیرؔ۔

وہ ایک فنی غلطی کر گئے ہیں۔ مرغ کے غ میں غ کو واصل کر کے فاعلن کے وزن پر مرغلی باندھا ہے جو قطعی غلط ہے۔ علیم کے بجائے الف سے شروع ہونے والا کوئی اور لفظ ہوتا تو وہ فنی رعایت اٹھا سکتے تھے۔ ملکہ نسیم کی غزل اچھی خاصی ہے لیکن اس کے ایک شعر سے فضا مزاحیہ ہوگئی وہ شعر یہ ہے:۔

اداس آنکھوں سے ہوں زندگی کی برسائیں تم اپنے بھیجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا!

لفظ بھیجے کے استعمال نے (شاید انھیں خبر نہ ہو) شعر کو مزاح کا رنگ دے دیا جب کہ پوری غزل سنجیدہ فضا میں کہی گئی ہے۔ اگر بھیجے کے بجائے ذہن کا لفظ استعمال کیا جاتا تو بھیجے کی لے گرنے کے عیب سے بھی بچ جاتیں اور مزاحیہ رنگ سے بھی! ویسے بھی ذہن، ہنر کے قبیلے کا لفظ ہے جب کہ بھیجے کے قبیلے کے الفاظ گُنی، کلا وغیرہ ہیں۔ مصلحت پر ساحل احمد کا یہ شعر پسند آیا:۔

اپنے چہرے کو چھپا لو خود سے اپنے پندار سے پردہ کر لو!

توقع ہے کہ حصۂ نظم پر اور توجہ دیں گے۔ حصۂ نثر میں شمیم حنفی کا مضمون اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا تحقیقی اور پر مغز 'لفظ پیش' خاصے کی چیز ہیں۔ دوسرے مستقل عنوانات کے تحت ہمیشہ کی طرح قاری کے لیے بھرپور مواد موجود ہے۔

(محسن بھوپالی۔ ناظم آباد۔ کراچی۔ پاکستان)

آج نئے لکھنے والوں کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ کوئی کہتا ہے "اصلاح شدہ" کا سرٹیفکٹ لگاؤ تو کوئی کہتا ہے اپنی ۸ر۔ا چیزیں بیک وقت ارسال کرو! میں پوچھتا ہوں۔ کیا اصلاح شدہ کا سرٹیفکٹ لگانے سے تخلیقات معیاری ہو جاتی ہیں؟ کیا بیک وقت ۸ر۱۰ چیزیں ارسال کرنے سے اڈیٹر کو اپنی پسند کی کوئی ایک چیز حاصل ہو جاتی ہے؟ شاید نہیں! پھر یہ اصرار کیوں؟ اگر تخلیقات معیاری اور عمدہ ہیں تو چھاپیں ہمت افزائی کریں۔ بصورت دیگر خامیوں کی نشان دہی کر کے انھیں اپنی کمزوریوں کا احساس دلائیں۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پتہ نہیں کیوں؟

پیش نظر شمارے میں مہمان مدیر نے اردو حقوق کی بازیابی کے لیے اردو تعلیمی محاذ کا بڑا کارآمد منصوبہ دیا ہے۔ فی الفور اسے عملایا جانا چاہیے کہ۔ یہی کچھ کرنے کا وقت ہے۔ شمیم حنفی اور ڈاکٹر وہاب اشرفی کے مضامین بھی اچھے اور پڑھنے کے ہیں۔ انور خاں کا مضمون سر سینڈر پر کاش کے افسانے اچھا ہو یا نہ ہو دلچسپ ضرور ہے۔ مجھے تو بہت پسند آیا۔

غزلوں میں اشتیاق طالب اور بیدار بخت کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ افسانے متاثر نہ کر سکے۔ ترجمہ زادۂ ہمہ صفت باب اور "عذاب گزیدہ" سے بھی تشفی نہ ہو سکی۔

(خالد عبادی، اردو بازار، دربھنگہ۔ (بہار)

جون کا "کتاب نما" پڑھنے کے لیے اب وقت نکال سکا۔ مہمان اداریہ میں شہزاد منظر نے اسٹنٹ بازی سے کام لے کر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شروع کی باتوں میں کچھ دم ہے لیکن صفحہ ۷ پر جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ "اردو میں تنقید کے زوال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اب رسائل وجرائد میں پاکستان میں زمین کے حوالے سے قومی اور تہذیبی تشخص کی بحث چند سال کے بعد ختم ہو گئی اور اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

تو ان کے مطالعے پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ غالباً وہ رسائل نہیں پڑھتے یا ان رسائل تک ان کی رسائی نہیں ہوتی جن میں نئے ادبی اور نظریاتی مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کی ساختیاتی اور اسلوبیاتی تنقید کی بحث ابھی اردو میں چل رہی ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے کی تنقید نظام صدیقی لکھ رہے ہیں۔ "تخلیقیت"، کے میلان و رجحانات کو پہلی بار اردو میں متعارف کرانے کا سہرا نظام صدیقی کے سر ہے۔ یہ اردو ادب میں بیسویں صدی کے ربع آخر کا سب سے اہم، دوررس، معنویت آگیں اور جس بہ در جہت نما ہے جس کے درخشاں نتائج اکیسویں صدی پر محیط ہوں گے۔ بیشتر جدید ترین عالمی تنقید کے ساختیاتی اور ما بعد ساختیاتی تنقید کے منظر نامہ پر رونما ہونے ہونے والے نت نئے مباحث کے جنگلوں میں "تخلیقیت" کی بابت ابھی صرف تنقیدی اشارات و کنایات ہی دستیاب ہوتے ہیں جو اس اہم سوال کو بے محابا انگیخت کر رہے ہیں کہ ساختیات اور ما بعد ساختیات کے علمبردار عملی طور پر شعر و ادب سے ان اساسی اقداری عناصر کو "ادب بدر" کر رہے ہیں جن پر انسانی فنون و علوم کی معنویت اور اہمیت منحصر ہے۔ جدید اطالوی، اسپینی اور فرانسیسی ادب میں اس نے

باقاعدہ تخلیق کے میلان کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس سے بہت حد تک فیضان حاصل کرتے ہوئے نظام صدیقی نے اپنی غیر معمولی تنقیدی بصیرت، تخیلاتی قوت، بے لاگ صداقت کوشی اور ناقابل تسخیر تلاش مدام تلاش کے باعث طبع زاد طور پر تخلیقیت کے رجحان کو اردو ادب میں مثبت اور منضبط ڈھنگ سے نظریاتی بنیادوں پر نہایت اعلا سنجیدگی اور ذہنی سلامت روی سے بے محابا پیش کیا ہے۔ یہ ایک نیا اور تازہ کار مربوط اور مرتب جامع نظام تنقید ہے جس کے پورے نظام قدر اور حسن کو متضاد نظام ہائے اقدار سے صرف متصادم کرنے کے بجائے نظام صدیقی نے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اس کے وسیع تر آداب و آئین اور تجزیے اور تفہیم کے معیار اور پیمانے بھی وضع کیے ہیں اور تخلیقیت پسند نظام تنقید کو پوری جامعیت اور معنویت کے ساتھ نہ صرف روشناس بلکہ روح شناس کرا رہے ہیں۔ پھر وزیر آغا نے "لکھنے کے عمل" اور "رشتے کی قدر" کی اہمیت کو خاص طور پر اجاگر کیا ہے اور ادب فہمی کے عمل میں زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا کی ہے۔ حقیقی آگہی کو انور سدید بھی تنقید کی شکل میں مسلسل پیش کر رہے ہیں۔

نئی جمالیات اور اخلاقیات کے متوازن مرکب کی تلاش کے معنی آگیں رجحان پر آج جب بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے اور ناقدین نیا کچھ دے رہے ہیں پھر شہزاد منظر جیسے لوگ بے سروپیر کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ اردو دنیا میں زمین کے حوالے سے قومی اور تہذیبی تشخص کی بحث آج بھی ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ نظر اور سمجھ کی ضرورت ہے۔

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی مارواڑی کالج بھاگلپور)

کتاب نما جون ۸۹ء کا شمارہ بے حد تاخیر سے ملا۔ شہزاد منظر کا اشاریہ "اردو تنقید کا زوال" پڑھا۔ اردو تنقید کے زوال کے اسباب سے متعلق موصوف نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں اس قدر الجھے نظر آتے ہیں کہ ان کا موقف غیر واضح اور تشنہ رہ گیا ہے۔

ایسا تو ہر زمانے میں ہوا ہے کہ تنقید کے ذریعے اپنے قبیلے یا گروہ کی مدح سرائی سے ناقدین گریز نہیں کرتے۔ تذکروں کے دور سے لے کر موجودہ عہد کے انتقادی ادب میں اس قسم کی بیشمار مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ تنقید کی تحسین اور تنقیص کا ہمیشہ سے ہی دو طبقہ رہا ہے۔ یہ بحث عالمی سطح پر بھی اٹھائی گئی ہے لیکن تنقید کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عسکری اور علیم الدین اردو تنقید کی دو برگزیدہ ہستی ہیں۔ لیکن دونوں کے اثرات کو خاطر خواہ طور پر بعد کے ناقدوں نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بہت سارے اسباب ہیں۔ بیسویں صدی میں بقول شہزاد منظر تنقید نے اپنی اہمیت منوالی ہے تو زوال کی بات کیوں کرتے ہیں۔ حصول آزادی کے بعد ایم اے میں تنقید کا پرچہ لازمی طور پر پڑھایا جائے اور اردو کا ہر لکچرر بقول شہزاد منظر سند یافتہ ناقد۔ یہ تو محض موصوف کی خام خیالی ہے۔ اردو کا لکچرر کیا اردو کا سند یافتہ پروفیسر بھی سند یافتہ ناقد نہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو فاروقی صاحب کو اردو کے پروفیسر اور اسکالر سے چڑ کیوں ہوتی؟ اب تو جامعات سے فارغ طلبہ زبان و قواعد کی ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتا چہ جائیکہ تنقیدی مضامین کا لکھنا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایم اے کی زبانی امتحان میں ایک امیدوار سے سوال کیا گیا کہ ایم اے میں نثر کی کون کون سی کتابیں

داخل نصاب ہیں۔؟ اس نے برجستہ جواب دیا" رانی کیتکی" انشا اللہ خاں انشا جس کے مصنف ہیں۔ ممتحن آبدیدہ ہوگیا اور امیدوار کو رخصت کر دیا" (بحوالہ خبرنامہ، اتر پردیش اردو اکادمی صفحہ ۳)

تدریسی تنقید کے متعلق موصوف کا خیال درست لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اعلا تعلیم کی صورتِ حال ناگفتہ بہ ہوں اور تخلیق کے نام پر واجب یا بس کا انبار ایسی صورت میں تنقید کا تقریباتی ہونا لازمی ہے۔

فاروقی نارنگ، وارث علوی، باقر مہدی اور فضیل جعفری کے متعلق شہزاد منظر نے جس قدر سطحی بیان دیا ہے، بیان کی ہرزہ سرائی اور معاندانہ روش کی مثال ہے۔ کیا فاروقی کے مضامین میں آج بھی وہی توانائی اور کس بل باقی نہیں؟ کیا نارنگ کے خیالات کی تازہ کاریاں ان دنوں زیادہ نہیں؟ رہی بات وارث علوی کی تو ان کو کبھی بھی تنقید کا ANGRY YOUNG MAN کہا جاتا ہے۔ کتاب نما میں وارث علوی کا مختصر ترین اداریہ شہزاد منظر کی نظروں سے بھی گذرا ہوگا۔ میرے خیال میں پچھلے دس سالوں میں زبان، ادب اور کلچر سے متعلق اتنی دو ٹوک باتیں اردو کے کسی دوسرے ناقد نے نہیں کہا ہوگا۔ انھوں نے اسی اداریے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "کرم کتابی نہیں ہوں کتابوں کا عاشق ہوں۔ ادب کا وہ عیاش جو عیاشی کے آداب جانتا ہے۔ ادب میرے لیے نہ وقت گزاری ہے اور نہ عقدہ کشائی، اس لیے تفریحی ادب سے اتنا ہی دور رہتا ہوں جتنا چینیان ادب سے، بازاری عورت اور صبر آزما بیوی دونوں سے معشوق طرحدار مختلف ہوتے ہیں اور میں اس کی اداؤں کو پہچانتا ہوں۔" رہی بات نظریہ سازی کی تو اس کا دعوا اچھے اچھوں کو نہیں۔ باقر مہدی اور فضیل جعفری نے لکھا کم ہے، لیکن اپنی آن بان اور شان کو برقرار رکھا۔ شہزاد منظر صاحب کو شکایت ہے کہ موجودہ تنقید اپنے عہد کے تقاضے کو پورا نہیں کر رہی ہے اور نہ ہی اس میں نظریہ سازی کی گنجایش باقی رہ گئی ہے۔ اس سلسلے میں جرمن عالم ادب کا ایک قول ہے کہ "ایک دیدہ ور ادبی نقاد کی پیدایش اور ظہور کے لیے تین سو سال کی مدت درکار ہوتی ہے۔"

قیصر زماں گریڈیہہ (بہار)

کتاب نما کے تازہ شمارہ (اگست ۸۹ء) میں "گوشۂ شہریار" کے مرتب اور مہمان مدیر کی حیثیت سے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس گوشے میں شامل بعض تحریروں میں کتابت وطباعت کی جو غلطیاں رہ گئی ہیں ان کی نشان دہی کر دوں۔

ڈاکٹر افتخار عالم کے تحریر کردہ خاکہ "شہریار" کے صفحات کچھ اس طرح بدل گئے ہیں کہ پورے خاکے کا تاثر مجروح ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے اگر اس شخصی خاکے کو اگلے کسی شمارے میں دوبارہ شائع کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈاکٹر شہریار کی جو غزلوں کے مطلعے اس طرح ہیں۔

(۱) لمس کو قید، کہ پرچھائیں کو زنجیر کریں ساعت ہجر تجھے کیسے جہاں گیر کریں

(باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شکستِ شب

مصنف : محسن بھوپالی
ناشر : ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی
قیمت : ۵۰ روپے
مبصر : احمد ہمدانی

اس وقت ہمارے سامنے محسن بھوپالی کے کلام کے دو مجموعے ہیں۔ ایک ان کا پہلا مجموعۂ کلام "شکستِ شب" جو پہلی بار ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اور اب ۸۹ء میں مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ چھپا ہے۔ دوسرا مجموعہ "گرد مسافت" جو ان کا اب تک آخری مجموعہ ہے۔ ان دونوں مجموعوں کو دیکھ کر فن پر گرفت کے ارتقائی مراحل کے ساتھ محسن کی شخصیت و فکر کی وحدت و سالمیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہم بہت سے شاعروں کے ایک ہی مجموعہ میں مختلف شخصیتوں اور فکر کی بے ربط لہروں سے دو چار رہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی ایک ہی شاعر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔ ان دو زیرِ نظر مجموعوں کے علاوہ محسن کے بعض اور مجموعے "جستہ جستہ" "نظمانے" اور "ماجرا" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان تمام مجموعوں کے مطالعہ سے جو خصوصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں محسن کی شخصیت کی وحدت و کلیت کہیں بھی ٹوٹتی یا بکھرتی نظر نہیں آتی۔ آخر محسن کی شخصیت کی اس وحدت کی نوعیت ہے کیا؟ اس سلسلے میں خود محسن کہتے ہیں کہ "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں انفرادی جذبات اور داخلی احساسات کی بجائے خارجی حقیقتوں اور ان کی ہیتی تبدیلیوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہوں۔ اسی لیے میری بیشتر تخلیقات اجتماعی زندگی اور اس کے گوناگوں محرک عوامل کا مظہر ہیں"۔ اس احساس سے محسن کے مزاج کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ لوگ خارجی دنیا کو داخلیت کی عینک سے دیکھتے ہیں اور کچھ لوگ خارجی دنیا سے اثر قبول کر کے اپنے احساس کی صورت گری کرتے ہیں یعنی کچھ لوگ دروں بینی اور کچھ لوگ جہاں بینی کے سہارے فنی تخلیق کا سفر طے کرتے ہیں۔ محسن یہ سفر جہاں بینی کے سہارے طے کرتے ہیں جب ہم کسی فن کار زادِ راہ اس کی جہاں بینی کو ٹھہراتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ احساس یا جذبہ سے خالی ہوتا ہے کیوں کہ احساس یا جذبہ فنی تخلیق کا جزو لازم ہے۔ سوال اس جزو لازم کی تشکیل و تعمیر اور صورت گری کا ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں محسن اپنے جذبہ کی تشکیل و تعمیر جہاں بینی کی مدد سے کرتے ہیں یعنی ان کے احساس کا سفر خارج سے داخلیت کی طرف ہے نہ کہ داخلیت سے خارج کی طرف۔ ان کے سفر کا یہ انداز ان کے ہر مجموعۂ کلام میں برقرار نظر آتا ہے جو ان کی شخصیت کی وحدت کا واضح ثبوت ہے۔

شاعری ایک پراسرار عمل ہے چنانچہ سچی شاعری کا کوئی ایک حتمی معیار تلاش کرنا ممکن نہیں البتہ کسی شاعر کے پورے کلام میں کسی ایک ہی شخصیت کے محوِ گفتگو رہنے کا احساس ایک ایسا معیار ہے جس کی بنا پر ہم کسی شاعر کو سچا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ہمیں نہ تو ٹی ایس ایلیٹ کی شخصیت سے فرار والے نظریئے سے کوئی سروکار ہے اور نہ ساختیات کے حامیوں سے کوئی بحث ہے جو شعر سے شاعر کو خارج کرنے پر حد درجہ زور دیتے ہیں۔ ہمیں یہ سارے نظریئے حقیقت سے فرار اور محسن بھوپالی ۱۹۴۸ء سے شعر لکھ رہے ہیں اور ان کا شمار ان خوش نصیب شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی زمانہ میں بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ مثلاً ان کا ۱۹۵۴ء کا یہ شعر

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

قبولِ عام کے اعزاز سے نوازا گیا اور آج تک نہ صرف زبان زد خاص و عام ہے بلکہ ہماری جدوجہد آزادی اور اس کے بعد مصلحتوں اور سازشوں کے دور کی تاریخ کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اسی طرح ان کے بہت سے دوسرے اشعار ہیں جو ہمارے پورے معاشرے کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ انھوں نے آئینہ دکھانے کا کام احساس سے خالی ہو کر یا اپنی ذات کو منہا کر کے کبھی نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی شاعری نری خطابت اور رپورٹنگ کے زمرہ سے ہمیشہ باہر رہی۔ وہ احساس کے تاروں کو مرتعش کر کے ذہنوں میں روشنیاں بکھیرتے ہیں انھیں احساس کو خیال اور خیال کو احساس بنانے کا ہنر خوب آتا ہے اور شاید اسی ہنر کا نام شاعری ہے۔

آج کل احساسِ بیگانگی اور اجنبیت کے شکوے بہت عام ہیں۔ یوں تو یہ شکوہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہر زمانہ کے شاعر اس کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ لیکن روایتی شعراء کے یہاں اس کا رُخ مابعد الطبیعاتی تھا جبکہ عہد جدید میں یہ اب تک خالص مادی اور زمینی حقیقت ہے۔ مثلاً رامبو کا یہ شکوہ I IS THEOTHER پورے معاشرہ کو ایک ایسا بوجھ ظاہر کرتا ہے جس میں اس کا وجود غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے اس حقیقت کا اظہار ایک لفظ IS کے استعمال سے کیا ہے۔ محسن اپنے طور پر بیگانگی کے دُکھ کو بیان کرتا ہے۔

عمر مصروف کوئی لمحہ فرصت ہو عطا
میں کبھی خود کو میسر نہیں ہونے پاتا

یہاں معاشرہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی کوشش نہیں ہے تاہم کچھ وقت خود کو سمجھنے یا عرفان ذات کے لیے بھی درکار ہے جسے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے یہ صرف دراصل منفی اور مثبت رویوں کا فرق ہے رامبو بہت بڑا شاعر ہے لیکن اس کا رویہ خالص منفی ہے جبکہ محسن کا رویہ مثبت ہے اس کے اس مثبت رویہ کے عکاس کچھ شعر سنیئے۔

لئے دن آہن و آتش سے گزرتا ہے مگر
دل وہ کافر ہے کہ پتھر نہیں ہونے پاتا

رات بھر جلنے سے کیا شمع شبستاں کی طرح
ایک لمحہ ہے بہت شعلہ رقصاں کی طرح

تمھیں آسائش منزل مبارک
ہمیں گرد مسافت بھی بہت ہے

ابھی تو خودی سے ہی فارغ نہیں ہیں اہلِ جمال
ابھی کہاں دلِ اُمیدوار کا موسم
جہاں گرے گا لہو پھول بھی کھلیں گے وہیں
کسی کے بس میں نہیں ہے بہار کا موسم

یہ اور بہت سے شعر محسن کی صحت مند فکر اور مثبت رویہ کے عکاس ہیں اس کی شاعری ہمارے عہد کے دکھوں اور شکھوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں محسن کے اپنے لہو کے رنگ بھرے نظر آتے ہیں۔

"شکستِ شب" اور "گردِ مسافت" دونوں مجموعے کتابت و طباعت کے لحاظ سے نہایت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا گیا۔ دونوں کتابوں کے سرورق خوبصورت ہونے کے ساتھ فکر انگیز بھی ہیں۔

ارضِ تمنّا

مصنف : غلام الثقلین نقوی
ناشر : فیروز سنز لاہور
قیمت : ساٹھ روپے
مبصر : رشید نثار۔

سید غلام الثقلین نقوی تخلیقی سطح پر زندہ رہنے والی شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے افسانے، ناول اور سوانحی خاکوں کے ذریعے خود متعارف کرایا اور اب انھوں نے "ارضِ تمنّا" کے خوبصورت نام سے سفرنامہ تخلیق کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ان کے "سفرِ مکّہ و مدینہ" کو محیط ہے۔

عمرہ بذاتہ ایک بہت بڑی سعادت ہے لیکن جب اسے اپنی ذات اور شخصیت کی دریافت کے لیے بروئے کار لایا جائے تو یہ عمل ایک تخلیق بن جاتا ہے۔ سید غلام الثقلین نقوی نے اس مقدس سفر کی روداد لکھنے میں بڑی فنی ریاضت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اس "احساس" کی نشاندہی بھی کی ہے کہ جسے کیفِ ذات اور تہذیبِ نفس کہا جاتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی سفرنامے کے آغاز میں لکھتے ہیں "میں نے آج تک کوئی سفرنامہ نہیں لکھا۔ میں نے سفر ہی کون سا کیا ہے۔ میں ایک تن آسان آدمی ہوں۔ سفر کی صعوبتیں میرے بس کی چیز نہیں۔" اس کے باوجود کہ یہ سفر نہایت آسان تھا، اُنھوں نے اس کی روداد لکھ دی۔ تخلیق کار کے لیے سفر طلسم کشائی سے بڑھ کر ایک تجربہ ہے۔ لہٰذا سچا تخلیق کار اس جوکھم سے آشنا ہونے کے لیے ازل سے پابہ سفر ہے۔ یہی کیفیت نقوی کے اس سفرنامے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس سفر کے آخر میں وہ 'کایا کلپ' کے عمل سے بھی گزرے ہیں۔ میرے نزدیک تخلیق کار کا سفر ہمیشہ 'کایا کلپ' پر منتج ہوتا ہے۔ سفرنامے کے آخر میں وہ کہتے ہیں "میں اس معجزے کو تسلیم کرتا ہوں کہ مکّے اور مدینے میں جو دن بسر ہوئے، اُن میں چند لمحے ایسے ضرور آئے کہ جب میں ایک انوکھے اور گریزپا روحانی تجربے سے گزرا۔ یہ روحانی تجربہ اپنی لطافت و نظافت کے باعث الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتا۔

مصنف کے لاشعور میں ان کے اپنے نظریات، زندگی کے عملی تاثرات، آباو اجداد کے تجربات حتیٰ کہ یادداشتیں سب محفوظ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سفرنامے میں تاریخی شعور سے بہت کام لیا ہے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے انھوں نے انوکھے واقعات منتخب کیے ہیں اور ان سے خدا اور انسان کے درمیان جو رشتے قائم ہو

ہیں، ان کی تصویر کشی نہایت ڈرامائی انداز میں کی ہے۔ اس میں افسانہ نگاری کا کمال بھی شامل ہے۔ تاریخ کے حوالے سے وہ منظر کی بازیابی کس فنی کمال سے کرتے ہیں، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو" عین اُس لمحے اُس یہودی کی نظر کالے پتھروں کے پس منظر اور ستمبر کی تیز دھوپ میں سفید کپڑوں میں ملبوس نورِ مجسّم کی ایک جھلک پاکر یہ تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ وہی پاک نفس ہے کہ جس کی راہ میں قُبا کے انصار اور مہاجر صبح سے آنکھیں بچھائے کھڑے تھے اور ابھی ابھی مایوس ہو کر گھروں کو لوٹے ہیں۔ وہ چلّا کر کہتا ہے" مسلمانو! وہ آ گیا جس کا تھیں انتظار تھا" میں بھی اس کی آواز سنتا ہوں جو نہ جانے تاریخ کے کس صفحے پر ٹیپ ہوئی تھی۔ اور میں دائیں بائیں دیکھتا ہوں کہ یہ آواز کس پہاڑی سے آئی اور پہاڑیاں ہیں کہ تیزی سے گزرتی چلی جا رہی ہیں۔"

چنانچہ سفرنامے کے تمام لوازم بیک وقت ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے امتزاج کے ساتھ قاری کو ہر موڑ پر نئے خیال، نئے تجربے اور نئے فکر سے آشنا کرتے ہیں۔ ایک پھیلتی ہوئی خوشبو، مختلف رفتار میں بہتے ہوئے انسانوں کے دھارے، آفاق سے اُبھرتے ہوئے نئے خیالات اور فکر و شعور کے ملاپ سے پیدا ہونے والی تاریخ سب کے سب ارضِ تمنّا میں جذب ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں گویا 'ارضِ تمنّا' جذب کی کیفیت اور قربت کی لذت بخشتی ہے اور انسان کے دل میں چھپی ابدی رشتوں سے تعلقِ خاطر کی آرزوئیں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔ اور یہی خوبی "ارضِ تمنّا" کا انوکھا رُوپ دکھاتی ہے۔ ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

"میرا دوست میری اُنگلی پکڑ لیتا ہے اور پھر ہم اور وہ ایک عمارت کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ مغرب اور عشا کے درمیان کا وقت ہے اور یہ عمارت نہایت مدھم اور مُلائم روشنیوں میں نہائی ہوئی ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ایک سڑک حائل ہے جس پر کاریں چل رہی ہیں۔ وہ اس عمارت کے سب سے اُونچے مینار کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے "اس عمارت کو پہچانتے ہو؟"

"کیوں نہیں! اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ حرم کعبہ ہے۔"

اور میرا دوست میری اُنگلی چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔"

"ارضِ تمنّا" کی یہ عمارت غیر منقسم اور مربوط عالمی وحدت کا شاہکار ہے۔ اس کا ایک نظارہ انسان کو اپنے اجزا میں تحلیل ہونے کی تحریک بخشتا ہے اور پھر کائناتی تخلیق کو ایک ترتیب و تنظیم بھی بخشتا ہے جس کا انسان ایک جزو ہے۔ چنانچہ "حرم کعبہ" کی روشنیاں، سائے، قوسیں، زاویے، لکیریں اور ان میں چھپی ہوئی نامحسوس سی خوشبو اور موسیقی ایسے عناصر ہیں جن سے "ارضِ تمنّا" کی تخلیق کائنات کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔

"ارضِ تمنّا" اسلوب کے اعتبار سے کہانی کا رُوپ رکھتی ہے لیکن 'خیال' کے لحاظ سے ایک تصوراتی ہستی کی تخلیق کرتی ہے کہ جس کے بطن سے ایک روشنی پھوٹتی ہے اور یہ روشنی وہی ہے جسے قرآن نے نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض " کہا ہے۔ یہ روشنی پورے عالم کو منور کرتی ہے۔ اس کی ایک چھوٹ نقوی صاحب کے قلب و ذہن پر پڑی ہے اور "ارضِ تمنّا" کا روپ دھار گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سفرنامے کے بیان میں ایک نامحسوس سی اسراریت ہے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ انھیں روحانی تجربات سے گزرتا ہے جن سے نقوی صاحب گزرے ہیں۔

بلاشبہ "ارضِ تمنّا" بے قیدِ زماں ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ اس کی نثر بے عیب ہے.... نہایت بے ساختہ اور رواں دواں..... ایک نرم خرام ندی جس کا دھیما نغمہ قاری کے کانوں میں مسلسل رس گھولتا

[illegible] ممتاز
[illegible] اس جملے سے اب اندازہ ہوا کہ راقم الحروف کا خیال دعلاتِ عمل[illegible] ناقص نہیں تھا۔

[illegible] کی تا تالیا وِشنو یسکیا کے مضمون "پریم چند کو پڑھتے ہوئے" (جس کا ترجمہ وہاج الدین علوی نے کیا ہے۔) ممتاز حسین کے ۱۹۵۶ء کے مضمون 'ناول نگار منشی پریم چند' کی اس طرح توثیق کی کہ روسی ادیبہ نے بھی پریم چند کے ٹالسٹائی سے متاثر ہونے کی بات یوں کہی ہے "حقیقت یہ ہے کہ پریم چند نے 'ٹالسٹائی' کی طرف اچانک ہی رُخ نہیں کیا تھا۔ ہندستان اور کئی دوسرے مشرقی ممالک کے ادیب اس روسی ادیب کی تخلیقات سے متاثر ہوئے تھے۔" ممتاز حسین کا تجزیہ کچھ اس طرح کا ہے "منشی پریم چند کے ساتھ دشواری یہ تھی کہ وہ عمل کے ساتھ ساتھ عدم تشدد بھی چاہتے تھے جو گاندھی اور ٹالسٹائی کی تکنیک تھی۔ خواجہ غلام السیدین نے یہ بات بہت پہلے کہہ دی تھی "پریم چند کا ایک نہایت گہرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے نیک بندوں کو ایک ایسی روحانی قوت دی ہے جس کے ذریعے وہ نہتے تمام دُنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں" (پریم چند کی دُنیا) اور پروفیسر محمد عقیل اپنے مضمون 'پریم چند ایک سماجی حقیقت نگار' میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "یہی نکتہ اس آخری وقت میں 'ٹالسٹائی' کی بورژوا حقیقت نگاری سے نکال کر پریم چند کو گورکی کی سوشلسٹ حقیقت نگاری کا جلوہ دکھاتی ہے۔"

پروفیسر شمیم حنفی کا مضمون 'پریم چند کی معنویت کا مسئلہ' اہم ہے جس میں انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "یہی معاملہ پریم چند کی معنویت کا بھی ہے۔ ٹھیک ہے، ہم اسے مسترد نہیں کر سکتے مگر اسے تمام و کمال قبول کرنا بھی ہمارے لیے سود مند نہیں ہے تاوقتیکہ ہم اپنے عہد کے مطالبات اور پریم چند کے معیارات دونوں کے ساتھ زیادتی پر کمربستہ نہ ہوں۔" فاضل مضمون نگار نے یہ بھی کہا ہے کہ "اس سلسلے میں ہندی تنقید جس نے پریم چند کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش اُردو تنقید سے زیادہ ہمہ گیر اور معنی خیز سطحوں پر کی ہے صاف طور پر دو خانوں میں بھی نظر آتی ہے۔" راقم الحروف کا معروضہ یہ ہے کہ اگر اس نمبر میں ایسا کوئی مضمون بھی شامل ہوتا جس سے شمیم حنفی صاحب کے بیان کی توثیق ہو جاتی تو اس پریم چند نمبر کی شان دو چند ہو جاتی ــــــ اس نمبر میں گو ہندی کے اساتذہ کے مضامین شامل ہیں لیکن ان کا مزاج مصالحانہ اور روادارانہ ہے جب کہ ہمیں اُس ہمہ گیری اور معنی خیزی کی تلاش تھی جس کا ذکر شمیم حنفی نے کیا ہے۔

اس نمبر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اڈیٹر نے نئے اور پُرانوں کے بیچ کی خلیج کو پاٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے ــــــ 'زمانہ' پریم چند نمبر پر شاہد احمد دہلوی کے تبصرہ اور شوکت تھانوی کے شیش محل کے اقتباس کے ساتھ ساتھ پریم چند کے تین خط بھی موجود ہیں جو انھوں نے خواجہ غلام السیدین کو لکھے تھے ــــــ ان دونوں کو پڑھ کر خوشی تو ہوئی لیکن یہ دُکھ بھی ہوا کہ اب کوئی مصنف رائے کسی خواجہ کو ایسے خط نہیں لکھتا۔

ڈاکٹر شاہدہ بانو کا مرتبہ گوشہ تاثراتی ہے لیکن اچھا ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم کی دقتِ نظر اور محنت کی داد دینی چاہیے۔ ان کی مرتبہ وضاحتی فہرست تو بجائے خود کسی لائبریری کا کیٹلاگ ہے۔

ہندی کے ادیبوں کے مضامین نے بھی اس نمبر کی رونق بڑھائی ہے رام پرشاد
اُنھیں شکل ہونا چاہیے) ڈاکٹر عبدل لبسم اللہ، پروفیسر مجیب رضوی، مُرلی منوہر پرساد سنگھ اور
محمد اعظم اس فہرست میں شامل ہیں۔ "منشی پریم چند کا کسان اور جا فالگان" اپنے عنوان کی بنا
نئی چیز معلوم ہوتا ہے۔ فاضل مضمون نگار جناب محمد اشتیاق نے (صرف انھی کے نام کے سا
لفظ جناب، استعمال ہوا ہے) بڑی تفصیل سے "گوشۂ عافیت" اور "میدانِ عمل" پر تبصر
اور کہا ہے کہ پریم چند کی اِن ناولوں نے ایک تحریک کو جنم دیا ـــــ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

فاضل اڈیٹر نے اپنے اداریے میں یہ لکھا ہے لکھنے والوں کی طرف سے ہمیں خاطر
تعاون نہیں ملا۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نمبر کے مشمولات میں بیشتر مضا
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے تعلق رکھنے والے اساتذہ ہی کے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی
کہ صغرا مہدی کے خط اتنے، کارگر نہیں ہوتے جتنی کہ اُن کی زبان۔

ایک بات اور۔ اس پورے نمبر میں صرف ایک بات کھٹکی ـ نہایت معمولی سی بات۔ اتنے خوبصو
سرورق کے بارے میں جو غضنفر زیدی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ یہ الفاظ "فائنل ڈیزائن" ز
نہیں دیتے ـــــ کیا صرف 'سرورق' لکھنا کافی نہیں تھا۔ (سرورق پریم چند کی شبیہ کے ساتھ ا
ایک عکسی خط بھی ہے)

صاف نظر آرہا ہے کہ صُغرا مہدی بہت زیادہ فعال اور مستعد ہوگئی ہیں اس پریم چند نمبر کی اشا
سے وہ ایک مستند مُدیرہ کے درجے پر پہنچ چکی ہیں۔ انھیں یہ ترقی مبارک ہو۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

محسن بھوپالی لندن چلے گئے

کراچی ۱ دیکم جولائی) ممتاز شاعر محسن بھوپالی آپریشن سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کے علاج اور چیک اپ کے لیے اپنے ذاتی وسائل واحباب کے تعاون سے لندن روانہ ہو گئے۔ وفاقی وزیر صحت نے محسن بھوپالی کے بیرون ملک علاج کے لیے محکمہ صحت کو واضح ہدایات دی تھیں مگر محکمہ صحت کے ذمہ داروں نے اس سلسلے میں کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی کوئی کارروائی نہیں کی۔

روزنامہ جنگ لندن

جمعرات ۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۸۹ء • ۱۰ر ذوالحجہ سنہ ۱۴۰۹ھ

جمیل الدین عالی

مشہور شاعر محسن بھوپالی پچھلے سال گلے کے سرطان میں مبتلا ہو کے انگلستان لے جائے گئے آپریشن ہوا۔ اب وہ ایک مصنوعی نظام تنفس کے ذریعہ بات چیت کرتے ہیں۔ دوسرا آپریشن اسی ہفتے میں متوقع تھا۔ ان کی حیثیت اتنی نہیں کہ اپنے خرچ پر دوبارہ انگلستان جانے۔ باقاعدہ میڈیکل بورڈ کی سفارشات حکومت کو بھجوائی گئیں کہ مناسب سمجھے۔ اس درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ ادھر برطانوی ڈاکٹر انھیں مدتے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً محسن صاحب یہ امید لے کر ۱۵ دن کے لیے گی ۱۰ر جولائی کو انگلستان چلے گئے۔

ہمارے معاشرے میں ایک شاعر کی زندگی ان بے شمار سرکاری، نیم سرکاری اور تجارتی اداروں اور دوسرے ایگزیکٹوز کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو جنھیں سرکاری ادارے ہر سال لاکھوں ڈالر خرچ کر کے علاج ہی نہیں وہ چیک اپ" کے لیے بھی بھیجتے ہیں لیکن جب ادیبوں کے لیے وفاقی حکومت کے پاس ایک فنڈ بھی موجود

ہے تو اس کو بروقت استعمال کیوں ہونا چاہیے۔ سنا ہے کہ اس وقت یہ اختیارات بنڈ یا سا کادمی ادبیات پاکستان وزارت ثقافت کے پاس ہیں۔ کیا اسلام آباد کی با اثر ادیب برادری مستعد ہو کر اس میں کچھ دوڑ بھاگ کر سکتی ہے؟ مانا کہ بندہ کراچی کا ہے مگر ہے تو برادری کا..... بتائیے اور میں کس طرح لکھوں!

محسن بھوپالی علاج کے بعد گلاسگو سے لندن پہنچ گئے ہیں یہاں وہ ایک بہتر قیام کریں گے۔ پاکستان کے وفاقی وزیر صحت امیر حید کاظمی کی حمایت اور میڈیکل بورڈ کی سفارش کے باوجود محکمہ صحت اور محکمہ ثقافتی امور سے انھیں علاج کے لیے ابھی تک کوئی رقم نہیں ملی۔

سندھ سے سرمائے کا فرار، مزید بے روزگاری سے آگے

وزارت ثقافت اور تحقیقی جائزہ

پچھلے دنوں کئی مرتبہ بتایا کہ وزارت تعلیم میں پچھلے بجٹ نے ایک بڑا فنڈ اس امر کے لیے مختص کیا تھا کہ پاکستانی ادبا، علما، فضلا، شعرا کا اجتماعی بیمہ صحت و حیات ہو جائے۔ حکومت ضرور تبدیل ہو رہی تھی اور ہوتی مگر وزارتوں کے بہت سے کام اسی طرح چلتے بھی رہے جیسے چلنے چاہئیں۔ ایک بدیہی معاملہ غیر مختتم تعویق یا تعطل میں کیوں ڈال دیا جائے... پھر نئی حکومت آئی اور کوئی دو مہینے ہوئے تین کروڑ کی رقم سے ایک فاؤنڈیشن قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس ناچیز نے اس فیصلے پر اس کا اظہار یہ میں بڑی واہ واہ کر رکھی ہے لیکن ابھی فاؤنڈیشن قائم ہوگی، سرمایہ کاری کرے گی تب آمدنی ہوگی۔ پھر کچھ خرچ شروع ہوگا... اس وقت تک خدانخواستہ کا امنڈ کرنی پڑ جائے! اس معاملے کو ہنگامی بنیادوں پر لے کر جلد از جلد فیصلہ کیا جائے۔

سنا کہ سکھر میں پاکستان کا ایک عظیم شاعر شیخ ایاز کئی عوارض میں مبتلا ہو رہا ہے۔ شیخ ایک بہت خوددار انسان بھی ہیں۔ وکالت سے کماتے تھے مگر عارضۂ قلب نے سست اور شاید بددل اور کمزور کر دیا ہے، میں ان سے کوئی تین برس پہلے ملا تھا۔ خط کتابت بھی نہیں ہے لیکن احباب احوال بتلاتے ہیں۔ اللہ صحت دے۔ اگلے دنوں ان سے بہت کچھ لینا

صوبائی اور وفاقی حکومت کا فرض ہے کہ وہ شیخ ایاز کو
بہترین علاج معالجے کے لیے فوراً باہر بھیجے۔ ایاز کے لیے پیر
حسام الدین راشدی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ اور سچل
سرمست کے بعد سندھی کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ برادرم حمایت علی
شاعر اور برادرم آفاق صدیقی اور عزیزہ فہمیدہ ریاض نے ایاز
کی سندھی تخلیقات اور کافیات پر اردو میں بھی خاصا کام کر
رکھا ہے۔ لیکن یوں بھی نہ ہوتا تب بھی یہ تو حقیقت ہے کہ
سندھی ہماری ایک بڑی اہم زبان اور شیخ ایاز اس کا ایک عظیم افتخار
سرمایہ ہیں جو صحت مند رہے تو بڑھتا ہی رہے گا۔ اگر میری اپنی
قربانی سے ان کی جان بچ سکتی تو واللہ میں انھیں اپنی جان
پیش کر دیتا... ہماری دوستی نہ سہی۔ میں تو اب سیاست سے
محروم ہوں مگر ان کا سیاسی ماضی کچھ حلقوں میں متنازعہ فیہ
رہا ہے۔ سو اس ملک میں قائد اعظم کے بعد کون متنازعہ فیہ
رہا۔ بات علم و ادب کے حوالے سے ہو رہی ہے اور اس حوالے
سے شیخ ایاز پاکستان کے عظیم ترین فرزندوں میں شامل ہیں۔ ان
کی زندگی نہ صرف سندھی زبان اور سندھ بلکہ تمام پاکستانی
زبانوں تمام پاکستان کے لیے انتہائی قیمتی ہے اسے بچانے کے لیے سب
کو سب کچھ کرنا چاہیے۔

حیدرآباد میں کل ہند اردو ریسرچ اسکالرس کونسل کا قیام

حیدرآباد۔ ڈاکٹر یوسف سرمست پروفیسر شعبہ اردو جامعہ
عثمانیہ اور پروفیسر ثمینہ شوکت صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل
یونی ورسٹی کی سرپرستی میں اردو ریسرچ اسکالرس کی ایک تنظیم۔
"آل انڈیا اردو ریسرچ اسکالرس کونسل" کے نام سے قائم کی گئی
پچھلے ایک سال سے اردو اسکالرس کے تحقیقی موضوعات پر ماہانہ
سیمینار بڑی کامیابی سے منعقد ہوتے آ رہے ہیں۔ اس دوران اسکالرس
نے یہ محسوس کیا کہ مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والے اسکالرس
کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے جہاں انھیں ایک
دوسرے کے خیالات اور تجربات سے آگاہی اور استفادہ کرنے
کی سہولت میسر ہو۔ لہٰذا ایک ایسی کونسل کا قیام عمل میں
دیا گیا جو ملکی سطح پر مختلف جامعات میں اردو تحقیق کو [illegible]
لینے کے علاوہ ریسرچ اسکالرس میں ان کی صلاحیتوں کو [illegible]
کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں ممد و
معاون ہو۔ اس سلسلے میں تمام جامعات کے صدر شعبہ ہائے
اردو سے تعاون کی خواہش کی گئی ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) گلبرگہ

گلبرگہ۔ یکم جولائی ۱۹۶۰ء کے بعد اردو ادب میں لایعنی تخلیقات
نے اردو ادب کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر
جو ادب تخلیق ہوا ہے وہ ایک خاص سازش کا نتیجہ ہے جس
نے اردو کی ایک نسل کو گمراہ کر دیا ہے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر
طیب انصاری نے انجمن ترقی پسند مصنفین گلبرگہ کے ماہانہ
ادبی اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں کیا جو کہ ۲۰ جون کو
شام الامین ہائی اسکول میں منعقد ہوا۔

جلسہ کی ابتدا میں جناب رشید جاوید (نائب صدر) نے خیر
مقدم کیا۔ نئی نسل کی معروف افسانہ نگار محترمہ کوثر پروین نے
اپنا افسانہ پیش کیا ممتاز شاعر جناب محب کوثر نے اپنا [illegible] کلام

۷۰ویں سالگرہ پر ڈاکٹر اقبال ماہر کو اعزاز

الہ آباد ۲۰ جون ۱۹۸۹ء: کسی بھی شعبۂ حیات میں اپنی
خدمات کے لیے ہم پیشہ معاصرین سے اعزاز پانا زبردست
افتخار کی بات ہوتی ہے اور یہ فخر گذشتہ دنوں دنیائے ادب
و شعر کے مقبول و معروف بزرگ شاعر و ادیب ڈاکٹر اقبال ماہر
کو حاصل ہوا جب یہاں کی مقامی انجمن "بزم جمال" کے زیر
اہتمام ان کی ۷۰ویں سالگرہ کے موقعے پر منعقدہ جلسے میں
شاعروں اور ادیبوں نے ان کی طویل خدمات کے لیے انھیں [illegible]
جلسہ کی صدارت الہ آباد یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر
سید محمد عقیل رضوی نے اور نظامت جناب سید محفوظ الاسلام نے فرمائی
اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر رضوی نے کہا کہ ایک مدت
سے ہند و پاک کے چوٹی کے رسائل میں چھپنے والے ڈاکٹر اقبال
ماہر کی تخلیقات ان رسائل میں چھپنے والے دیگر قلم کاروں

نفسیات سے کسی بھی حالت میں کم تر نہیں ٹھہرتی تھا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ڈاکٹر ماہر کو وہ مقام نہیں دیا جا سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

الٰہ آباد یونی ورسٹی کے ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے کہا کہ ڈاکٹر اقبال ماہر کی بابت اس سوال کے لیے ہم عصر ناقدین جواب دہ ہوں گے کہ انھیں ان کا جائز مقام کیوں نہیں دیا گیا۔ نفسیات داں ادیبہ بیگم نوشابہ اسلام نے اپنے پیش کردہ مقالہ میں ڈاکٹر ماہر کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں صفِ اوّل کے شعرا میں مقام دیا۔

تکمیل کا شاذ تمکنت نمبر منظرِ عام پر

سہ ماہی رسالہ "تکمیل" اردو ادب کی عمومی خدمت کے نقطۂ نظر سے جاری کیا گیا ایک غیر تجارتی رسالہ ہے جو اصغر حسین قریشی اور مظہر سلیم کی ادارت میں بھیونڈی سے شائع ہوتا ہے۔ حسبِ اعلان "تکمیل" کا تازہ شمارہ حیدرآباد کے مایۂ ناز شاعر "شاذ تمکنت" پر خصوصی شمارہ ہے۔ جسے یوسف ناظم نے ترتیب دیا ہے جس میں سردار جعفری، یوسف ناظم، ڈاکٹر انور معظم، اقبال متین عزیز قیسی، عوض سعید، راشد آزر اور شہزاد تمکنت کی نگارشات کے علاوہ کئی شعرا کا منظوم نذرانۂ عقیدت بھی شامل ہے اس خصوصی نمبر کی قیمت صرف دس روپے ہے جسے مالن چال، گلزار نگر، غیبی پیر روڈ، بھیونڈی (مہاراشٹر) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عزیز وارثی کا انتقال

نئی دہلی۔ ۲۹ر جولائی۔ انجمن اتحاد وارثیہ کی ایک پریس ریلیز کے مطابق دہلی کے معروف شاعر عزیز وارثی کا طویل علالت کے بعد آج شام ساڑھے ۶ بجے انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۰ برس کے تھے۔ پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ جنازے کی نماز کل اینگلو عربک سینیر سکنڈری اسکول اجمیری گیٹ کی مسجد میں ۱ بجے دن ہوئی اور تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم انجمن اتحاد وارثیہ کے جنرل سکریٹری تھے۔

ادبی مرکز، پٹنہ

۹ر جولائی ۸۹ء کو "ادبی مرکز" پٹنہ کے زیرِ اہتمام، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کی رہائش گاہ پر ایک شعری نشست منعقد ہوئی۔ مشاعرے کے قبل ۲½ بجے دن ادبی مرکز کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت صدر ادبی مرکز ڈاکٹر شکیب ایاز نے فرمائی۔ عاملہ نے یہ طے کیا کہ شاد کے معاصر ادیب و شاعر و صحافی علامہ فضل حق آزاد پر اکتوبر ۸۹ء میں سیمینار اور مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر تجویزیں بھی منظور ہوئیں۔ نیز صوبہ بہار میں مزید گیارہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے نفاذ کے لیے عاملہ نے حکومت بہار کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی پروفیسر سید حسین سرمد اور عظیم الدین مخمور کی رحلت، تعزیتی تجویز منظور ہوئی اور جناب معین کوثر (جنرل سکریٹری) ادبی مرکز کے شکریے کے ساتھ عاملہ کی نشست اختتام کو پہنچی۔

شعری نشست کی صدارت جانشین شاد پروفیسر عطاالرحمٰن عطا کاکوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض صاحب خانہ نے انجام دیے۔ نشست میں جن بیرونی اور مقامی ادبا شعرا اور افسانہ نگاروں نے شرکت کی ان کے اسما درج ذیل ہیں۔

پروفیسر عطا کاکوی، پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر شکیب ایاز، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، اختر عظیم آبادی، کوثر ہاشمی، نیّن عمادی، خورشید اکبر، فیاض الرحمٰن شارق، فراہم احمد شارب، معین اثر فریدی، رحمان شاہی، احسن راشد، اشفاق عادل، ضیاء الرحمٰن ضیا، افتخار عاکف، ڈاکٹر شمیم احمد شمیم اور دوا۔

پُر تکلف ناشتے کے بعد مشاعرہ ۳½ بجے دن کو شروع ہوا اور ۶ بجے شام اختتام پذیر ہوا۔ اخیر میں ڈاکٹر شکیب اعجاز کے شکریہ کے بعد صدر جلسہ کی اجازت سے نشست برخاست ہوئی۔

ضیاء الرحمٰن صدیقی کو پی ایچ۔ڈی

نئی نسل کے تازہ کار ادیب ضیاء الرحمٰن صدیقی کو "تحریکِ آزادی اور اردو نثر" کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ یونی ورسٹی

پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر حنیف کیفی کی نگرانی میں لکھا گیا۔

پاکستان میں مجتبیٰ حسین کے منتخب مضامین کے مجموعہ کی اشاعت

کراچی کے مکتبہ ہم زبان نے ہندستان کے مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا ایک انتخاب "قطع کلام" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کو پاکستان کی مشہور افسانہ نگار اور ادیبہ محترمہ رضا فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ مرزا ادیب نے مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مجتبیٰ حسین کے منتخب مزاحیہ مضامین کے علاوہ ان کے لکھے ہوئے بعض شخصی خاکے اور سفرنامے بھی شامل ہیں۔

اپیل

"میں ندا فاضلی: حیات، شخصیت اور فن" پر پروفیسر عزیز انصاری صاحب کی نگرانی میں بھوپال یونی ورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہا ہوں۔ نقادوں اور شناساؤں سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں جو تحریریں یا خطوط جو بھی ہوں براہ کرم مجھے عنایت فرمائیں۔ میں استفادے کے بعد شکریہ کے ساتھ واپس کروں گا۔

(رابطہ: سہ ماہی "انتخاب" سیفی لائبریری سرونج (ایم پی))

افسانہ نگار الیاس احمد گدی کو صدمہ

مشہور افسانہ نگار الیاس احمد گدی کی اہلیہ حمیدہ بیگم کا ۱۶ر جولائی بروز بقر عید انتقال ہوگیا۔ مرحومہ کینسر کے مرض میں گرفتار تھیں۔

مرسلہ: تصور ربانی خلف جناب غیاث احمد گدی مرحوم

محمد صبیح سالم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

محمد صبیح سالم کو پٹنہ یونی ورسٹی سے سوشولوجی میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کر دی گئی۔ موصوف کے مقالے کا عنوان ہے۔

MUSLIM VILLAGE IN TRANSITION

(A Sociological Study in Purnia District)

اردو پورے بہار میں دوسری سرکاری زبان

پٹنہ ۱۶ر اگست۔ اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے اس طرح بہار ملک کی پہلی ریاست ہے جسے یہ امتیازی شان حاصل ہے۔ راج بھاشا پریشد اردو کے ڈائرکٹر کے مطابق اردو پہلے ہی سے پلاموں، روہتاس، دمکا، رانچی، سنگھ بھوم، سارن، بھوجپور، جہان آباد اور راجپور ضلع میں دوسری سرکاری زبان بنائی گئی تھی۔ ریاستی وزیر اعلا مسٹر ایس۔ این سنہا نے اپنی یوم آزادی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ اردو کو پوری ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا اور اسے ریاست کے باقی ماندہ ۱۹۳۵ ضلعوں میں فوری طور پر نافذ کیا جائے گا۔

اب ریاست کے سبھی سرکاری دفاتر میں سبھی سرکاری نوٹیفکیشن اردو میں بھی جاری ہوں گے اور اردو میں لکھی درخواستیں قبول کی جائیں گی۔

رجسٹریشن دفاتر کو بھی اردو میں تیار کی گئی دستاویزات قبول کرنی پڑیں گی اور سبھی ضلع گزٹ اردو میں بھی ترجمہ کیے جائیں گے۔ سرکاری اشتہارات بھی اردو میں جاری ہوں گے۔

سبھی اضلاع کی انتظامیہ اور حکام کو ہدایت جاری کی گئی ہے کہ اردو سے متعلق سرکاری فیصلے کو فی الفور نافذ العمل کیا جائے۔ اس کے لیے متفرق دفاتر میں خصوصی عملے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

وزیر اعلا نے مارچ میں ایک انٹرویو میں اس بابت اشارہ کیا تھا کہ وہ اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کی پیش قدمی کرنے سے پہلے اردو کی عمل آوری کا جائزہ لیں گے۔

انجمن ترقی اردو بہار کے صدر ڈاکٹر عبد المغنی نے حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے وزیر اعلا کا شکریہ ادا کیا ہے۔

مسٹر طارق انور ممبر پارلیمنٹ نے بھی بہار میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے نصاب کی کتابیں

کتب برائے ابتدائی

پرچہ اول نثر اردو

۱۔ منتخبات اوّل نثر و نظم ۔۔۔ ۱۰/۰۰
۲۔ غالب کی کہانی ۔۔۔ ۶/۰۰

پرچہ دوم نظم اردو

۱۔ منتخبات اوّل نثر و نظم ۔۔۔ ۱۰/۰۰
۲۔ غالب کی کہانی ۔۔۔ ۶/۰۰

پرچہ سوم انشا، قواعد و معلومات اور ہندی یا فارسی

۱۔ گلزار انشا ۔۔۔ ۷/۵۰
۲۔ عام معلومات ۔۔۔ ۵/۵۰
۳۔ آسان قواعد ۔۔۔ ۳/۵۰
۴۔ نصاب فارسی یا ۔۔۔ ۵/۰۰
پرائمیک ریڈر ۔۔۔ ۳/۰۰

دیگر مفید کتب

فیروز اللغات (جیبی) ۔۔۔ ۱۲/۰۰

۲۔ اردو صرف و نحو (حصہ اول صرف) عبدالحق ۔۔۔ ۱۵/۰۰
۳۔ نوبہارتی حصہ اوّل ۔۔۔ ۲/۶۰

پرچہ چہارم، فارسی، معلومات عامہ، اصولِ صحت، عربی اور انگریزی

(مندرجہ بالا پانچ مضامین میں سے کوئی دو مضمون اختیار کرنا ہوگا۔)

۱۔ غنچۂ فارسی ۔۔۔ ۳/۵۰
۲۔ عام معلومات ۔۔۔ ۱۰/۰۰
۳۔ رہبر صحت ۔۔۔ ۱۲/۰۰
۴۔ مرقاۃ العربیہ حصہ اول ۔۔۔ ۵/۰۰
۵۔ سمپل انگلش پروز ۔۔۔ ۷/۰۰
۶۔ سمپل انگلش پوئم ۔۔۔ ۵/۰۰
۷۔ انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر، ایم۔ اے۔ شہید ۔۔۔ ۸/۰۰

دیگر مفید کتب

۱۔ شرح منتخبات حصہ دوم نثر و نظم ۔۔۔ ۱۲/۰۰
۲۔ شرح غنچۂ فارسی ۔۔۔ ۲/۵۰
۳۔ فیروز اللغات (جدید) ۔۔۔ ۳۵/۰۰

کتب برائے ادیب

پرچہ اوّل، نثر اردو

۱۔ منتخبات حصہ دوم (حصہ نثر مع حصہ نظم) ۔۔۔ ۱۵/۰۰
۲۔ اردو کی کہانی ۔۔۔ ۵/۰۰
۳۔ شیخ نیازی ۔۔۔ ۷/۰۰

پرچہ دوم، نظم اردو

۱۔ منتخبات حصہ دوم (حصہ نظم مع حصہ نثر) ۔۔۔ ۱۵/۰۰
۲۔ منتخب نظمیں ۔۔۔ ۳/۵۰
۳۔ اصناف ادب ۔۔۔ ۷/۵۰

پرچہ سوم، انشاء و قواعد اردو ہندی

۱۔ گلدستہ مضامین (انشاء پردازی حصہ اول) یا جدید مضامین ۔۔۔ ۱۰/۰۰

کتب برائے ادیب ماہر

پرچہ اول۔ نثر اردو

۱۔ منتخبات حصہ سوم (حصہ نثر مع حصہ نظم) ۔۔۔ ۱۵/۰۰
۲۔ ہم نفسانِ رفتہ ۔۔۔ ۱۰/۰۰
۳۔ اصنافِ ادب ۔۔۔ ۷/۵۰

پرچہ دوم۔ نظم اردو

۱۔ منتخبات حصہ سوم (حصہ نظم مع حصہ نثر) ۔۔۔ ۱۵/۰۰

۲. شعرِ عصر ۳/۰۰

پرچہ سوم۔ تاریخ ادب اُردو

۱. اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ ۲/۵۰
۲. اردو ادب کی تاریخ (از عظیم الحق جنیدی) ۱۵/۰۰
یا اردو ادب کی تاریخ (نسیم قریشی) ۱۵/۰۰

پرچہ چہارم۔ انشاء قواعد اردو، ہندی

۱. گلدستہ مضامین و انشا پردازی حصہ دوم ۱۲/۰۰
۲. اردو صرف و نحو (حصہ نحو) عبدالحق ۱۵/۰۰
۳. نوبہارتی دوم ۲/۸۵
۴. آسان ہندی دیاکرن ۳/۵۰

پرچہ پنجم۔ فارسی، معلومات عامہ، خانہ داری، انگریزی اور عربی

(مندرجہ بالا پانچ مضامین سے کوئی دو مضمون انتخاب کرنا ہوگا۔)

۱. گلدستۂ دانش ۳/۵۰
۲. ایرانی زبان کا قاعدہ ۷/۰۰
۳. ایجادات کی کہانی ۸/۰۰
۴. علم امور خانہ داری یا گھریلو سائنس (۸) ۱۲/۰۰
۵. مرقاۃ العربیہ حصہ دوم ۵/۰۰
۶. سلیکٹڈ انگلش پروز اینڈ پوئٹری ۶/۰۰
۷. انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم اے شہید ۱۰/۰۰

دیگر مفید کتب

۱. شرح منتخبات جامعہ حصہ سوم ۱۲/۰۰
۲. شرح گلدستہ دانش ۴/۰۰
۳. فیروز اللغات (جدید) ۳۵/۰۰

کتب برائے ادیب کامل

پرچہ اوّل۔ نثر

تفصیلی مطالعہ

۱. منتخبات حصہ چہارم (نثر) ۱۰/۰۰
۲. انتخاب نثر ۶/۰۰
۳. انتخاب خطوط غالب خلیق انجم
۱. انارکلی ۱۲/۰۰
۲. باغ و بہار ۲۱/۰۰

امدادی کتب

۱. داستان تاریخ ادب اردو نایاب
۲. نیا افسانہ ۲۰/۰۰
۳. اردو انشاء کا ارتقاء نایاب
۴. اردو ناول کی تاریخ ۱۰/۰۰
۵. اردو ڈراما تاریخ و تنقید ۲۵/۰۰

پرچہ دوم۔ نظم

تفصیلی مطالعہ

۱. منتخبات چہارم (نظم) ۱۵/۰۰
۲. مثنوی سحرالبیان ۶/۰۰

امدادی کتب

۱. جدید شاعری ۴۰/۰۰
۲. لکھنؤ کا دبستان شاعری نایاب
۳. دہلی کا دبستان شاعری ۲۵/۰۰
۴. اردو شاعری پر ایک نظر ۳۵/۰۰

پرچہ سوم۔ تاریخ زبان و ادب اُردو

امدادی کتب

۱. مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۵/۰۰
۲. اُردو کی لسانی تشکیل ۳۰/۰۰
۳. جدید شاعری ۴۰/۰۰
۴. مختصر تاریخ ادب اردو ۳۰/۰۰
۵. اردو مثنوی کا ارتقاء ۱۵/۰۰
۶. دکنی ادب کی تاریخ ۱۰/۰۰
۷. اردو میں قصیدہ نگاری ۲۰/۰۰
۸. دلی کا دبستان شاعری ۲۵/۰۰
۹. اردو مرثیہ نایاب
۱۰. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ۴۵/۰۰

۱۱۔ جدید غزل ۔۔/۶ ۱۲۔ اردو قصیدہ نگاری ۱۶/۔

پرچہ چہارم۔ تنقید

۱۔ اردو تنقید کا ارتقاء از عبادت بریلوی ۔۔/۳۵
۲۔ تنقیدی نظریات حصہ اوّل و دوم مکمل ۔۔/۵۰
۳۔ مقدمہ شعر و شاعری ۔۔/۱۴
۴۔ ہماری شاعری ۔۔/۱۵
۵۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔۔/۲۵
۶۔ جدید اردو تنقید اصول اور نظریات ۔۔/۴۰

پرچہ پنجم۔ انشاء، قواعد، بلاغت و عروض

۱۔ نسیم البلاغت ۔۔/۷
۲۔ آئینۂ بلاغت ۔۔/۱۲
۳۔ قواعد اردو ۔۔/۲۵
۴۔ اردو اسینز ۔۔/۱۸

پرچہ ششم۔ ہندی، فارسی، عربی، علم خانہ داری، انگریزی، ثقافت اسلامی

(مندرجہ بالا چھ مضامین میں سے کوئی دو مضمون اختیار کرنا ہوگا)

۱۔ نوبہارتی حصہ سوم ۔۔/۳
۲۔ پُشپ واٹکا ۔۔/۳
۳۔ قصہ مہر افروز (ہندی) ۔۔/۸
۴۔ انتخاب فارسی ۔۔/۴
۵۔ ایرانی زبان کا قاعدہ ۔۔/۷
۶۔ مرقاۃ العربیہ سوم ۔۔/۵
۷۔ علم خانہ داری ۔۔/۲۰
۸۔ انوی ٹیشن ٹو انگلش پروز ۔۔/۸
۹۔ سلیکٹڈ انگلش پوئم ۔۔/۲
۱۰۔ انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر ایم۔ اے۔ شہید ۔۔/۸
۱۱۔ ثقافت اسلامی ۔۔/۱۲
۱۲۔ تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات ۔۔/۱۵

پرچہ ہفتم۔ خصوصی مطالعہ (کسی ایک موضوع کا خصوصی مطالعہ)

اردو ناول

تفصیلی مطالعہ:

۱۔ امراؤ جان ادا ۔۔/۱۸
۲۔ میدانِ عمل ۔۔/۶۰
۳۔ ایک چادر میلی سی ۔۔/۱۲
۴۔ رضیہ ڈاکٹر رفیق زکریا ۔۔/۵۰

غیر تفصیلی مطالعہ:

۱۔ ناول کا فن ۔۔/۱۵
۲۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید ۔۔/۲۵
۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ۔۔/۱۰
۴۔ ناول کیا ہے ۔۔/۸
۵۔ پریم چند اور تصانیف پریم چند ۔۔/۴۵
۶۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ۔۔/۳۵
۷۔ پریم چند فن اور تعمیر فن ۔۔/۴۰

سرسید احمد خاں

تفصیلی مطالعہ:

۱۔ انتخاب مضامین سرسید مرتبہ آل احمد سرور ۔۔/۸
۲۔ آثار الصنادید ۔۔/۶۰

غیر تفصیلی مطالعہ:

۱۔ حیات جاوید ۔۔/۳۰
۲۔ مطالعہ سرسید احمد خاں ۔۔/۱۵
۳۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ۔۔/۳۰
۴۔ سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ ۔۔/۲۰

علامہ اقبال

تفصیلی مطالعہ: ۱۔ کلیاتِ اقبال ۔۔/۴۰

غیر تفصیلی مطالعہ: ۱۔ روح اقبال (زیر طبع)

۲۔ فکر اقبال ۔۔/۵۰
۳۔ اقبال کامل ۔۔/۳۰
۴۔ اقبال بحیثیت شاعر ۔۔/۴۵

(بقیہ: صفحہ ۹۲)

میں نے جس کو کبھی بھلایا نہیں یاد آنے پہ یاد آیا نہیں

(۲)

گوشۂ شہریار، کی پیش کش کے قدرے بدلے ہوئے انداز کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس میں شامل تحریریں دراصل علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جانب سے منعقدہ 'شام شہریار' میں پڑھے گئے مضامین اور منظومات پر مشتمل ہیں۔ شام شہریار کا انعقاد اے ایم یو لٹریری کلب نے شہریار کے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازے جانے کے موقع پر کیا تھا۔

(ابوالکلام قاسمی، شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

- چاند کی بیٹی (باتصویر) ۴/۵۰
- دم کٹی لومڑی 〃 ۶/:
- جادو کی ہنڈیا 〃 ۴/۵۰
- شیر اور بکری 〃 ۶/:
- کتے کا خواب 〃 ۶/۵۰
- بھیڑیے کا گانا 〃 ۶/:
- چالاک بلی 〃 ۶/:
- گدھے نے بجائی بانسری 〃 ۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

- چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۹/-
- چور پکڑو ۳/-
- چالاک خرگوش کے کارنامے ۷/۵۰
- مولانا آزاد کی کہانی ۱۸/:
- خالی ہاتھ ۹/:
- حاجی بابا کی ڈائری ۶/۵۰
- بہادر علی ۷/۵۰
- کھلونا نگر ۷/:
- ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی ۶/:
- قصہ اژدھا پکڑنے کا ۵/:
- ننھا سراغ رساں ۵/:
- ابو علی کا جوتا ۵/:
- پراسرار غار ۵/:
- عرب ملکوں کی عوامی کہانیاں ۶/۵۰
- بچوں کے ذاکر صاحب ۶/:

- بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/:
- سہانے ترانے ۶/۵۰
- پانچ جاسوس ۸/۵۰
- جنگل کی ایک رات ۶/:
- ہرن کا دل ۲/:
- اچھی کہانیاں ۲/۵۰
- دریا کی رانی ۲/:
- گوہر شہزادی ۳/:
- شریر شیرا ۲/:
- پری رانی ۳/:
- خطرناک سفر ۳/۵
- ظالم ڈاکو ۶/:
- مہکتی کلیاں ۶/:
- پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
- ٹوٹے کھلونے ۵/:
- اندھے کا بیٹا ۳/۵۰
- پانچ بونے ۳/:
- ایک دیس ایک خون ۳/:
- جیت کس کی ۲/۵۰
- انعامی مقابلہ ۳/۲۵
- ذرے کی کہانی ۲۱/:
- تین اناڑی ۶/:
- چوری کی عادت ۳/۵۰
- شرارت ۳/:
- دلی کی شادی ۴/:
- گاندھی جی دکنی افریقہ میں ۲/:
- بندر اور نائی ۳/۵۰
- رنگوں کی بستی ۴/:
- بی مینڈکی اور کوا ۳/:
- مرغی کی چار ٹانگیں ۳/۵۰
- لال مرغی ۳/:

- [illegible] ۴/:
- آؤ ڈراما کریں ۲/:
- سلام مصافحہ ۵/:
- مچھیرا اور اس کی بیوی ۲/۵۰
- ایک کھلا راز ۲/۵۰
- بھوتوں کا جہاز ۱/۵۰
- صحت کی الف بے ۵/:
- لومڑی کا گھر ۳/:
- بچوں کی کہانیاں ۳/:
- بابا ناچ ۳/:
- ہار کی تلاش ۶/:
- سرخ جوتے ۳/۵۰
- اندرا گاندھی ۶/:
- ننھا فرشتہ ۲/۵۰
- جوہر قابل ۳/:
- بھیڑیے کے بچے ۳/:
- ننھا جبرو ۳/۵۰
- پلک نہ مارو ۶/:
- بچوں کے افسر ۶/:
- پہاڑ کی چوٹی پر ۶/:
- شیر خاں ۳/:
- رحمت شہزادہ ۴/:
- لومڑی کے بچے ۳/:
- اس نے کیا کرنا چاہا ۳/:
- بچوں کے اقبال ۴/۵۰
- امیر خسرو ۳/:
- بہلول سیاح ۳/:
- دادا نہرو ۶/:
- جادو کا گھر ۴/:
- جنگل کی بلی ۲/:
- کٹا ہوا ہاتھ ۹/۵۰

اخبارِ نو کا عالمی اردو نمبر

ایک ایسی تاریخی دستاویز جسے آپ ریکارڈ کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھنا پسند کریں گے

چند جھلکیاں

- کیا اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے ؟
- کیا ۲۵ سال کے بعد اردو جاننے والے ناپید ہو جائیں گے ؟
- کیا اردو کے خلاف سازشیں کامیاب ہو جائیں گی ؟
- کیا اردو ایک دم توڑتی ہوئی زبان ہے ؟
- کیا اردو ووٹ کی طاقت بن سکے گی ؟
- اردو کے سلسلے میں حکومت کے منصوبے کیا ہیں ؟
- ہندوستان کے باہر اردو کی حالت کیا ہے ؟
- کیا بین الاقوامی سطح پر اردو ایک طاقت بن کر ابھر رہی ہے ؟
- اردو اور اس کا مستقبل ـــــ ؟

۳۲ صفحات
پن شدہ
دیدہ زیب چار رنگ کا ٹائٹل
قیمت صرف چھ روپے

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر سے فوراً مطلع کریں دوبارہ بھیجے جانے والے آرڈر کی تعمیل نہ ہوسکے گی

یہ اور اس سے جڑے ہوئے ان گنت سوالوں کے جواب دیں گے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب جیسے احمد فراز (پاکستان) میر خلیل الرحمٰن (پاکستان) اخترالایمان، حسرت جے پوری، پروفیسر نامور سنگھ معین احسن جذبی، ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر ہرمن ایچ والفن (امریکہ) لدمیلا واسیلیوا (روس) کملیشور، مجتبیٰ حسین، صلاح الدین پرویز (سعودی عربیہ) جسٹس آنند نرائن ملّا، راجندر ناتھ ستھی عطاء الحق قاسمی (پاکستان) حمایت علی شاعر (پاکستان) بخش لائل پوری (لندن) حنیف اخگر (کینیڈا) نور پرکار (کویت) مظفر شکوہ (نیویارک) وغیرہ۔

نوٹ :۔ رجسٹری سے منگانے کے لئے -/5 روپے مزید ادا کرنے ہوں گے۔
بیرون ہند کے لئے مع ڈاک خرچ کل -/25 روپے قیمت ہوگی۔ فوراً اپنی رقم درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔

ione :
59 70

منیجر ہفت روزہ اخبار نو ۲۱۳۴، ترکمان گیٹ، دہلی ۶۔۔۔۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما

اکتوبر ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۱۰

فی پرچہ 5/-
سالانہ 45/-
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید مسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات، زیر غور اسلوب تنقید، حضرت لطیف اسلکے جمول کا سفر، دو آتشہ، اقبال کے کرم فرما، پرندوں کی دنیا، ذرا سی بات، کلام حامد، نیم چہرہ شام، نئی مطبوعات اور ادبی تہذیبی خبریں۔

نئی مطبوعات

مکتبہ جامعہ کی نئی مطبوعات

صاحب جی سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
چند تصویر نیکاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۵/۲
سنہرے اصول (ادارہ) بچوں کے لیے ۳/-
غذا کی کہانی " ۳/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں " ۶/-
زیور " ۶/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی " ۶/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے " ۶/-
ننھا سیاح " ۶/-
ابوخاں کی بکری " ۱۵/-
پرواز کی کہانی " ۳/-
جادو کا چھلا " ۳/-
جادو کی سارنگی " ۳/-
نرالے گویے " ۴/-
بانونی کچھوا " ۴/-
بدر شہزادی ۶/-

دیگر اداروں کی مطبوعات

آثار شق مولانا ابراہیم عماری
غالب اور تنقیدی شعور (ادب) محمد مشتاق شارق ۴/-

سرورق : خلیق انجم

پرویز شاہدی حیات و خدمات (ادب) ڈاکٹر عبدالمنان ۴۵/-
اختلاف ملت اور رواداری (مذہب) علی اصغر چودھری ۱۴/-
منتخب افسانے شمارہ (افسانے) نند کشور ۴/-
فکر و نظر (رسالہ) ابوالکلام آزاد نمبر ۸۹ء (رسالہ) مدیر: شہریار ۲۰/-
سکون طب اور اخلاقی بیماریاں (مذہب) علی اصغر چودھری ۱۴/-
سائنس کوئز (معلومات) مرتب: شوکت قدیر ۱۸/-
طب کوئز (طب) حکیم میاں عبدالقادر ۱۲/-
افضل الاخلاق (اقوال) مولوی بدرالدین بدر جالندھری ۴/-
علامت قدیم ہندستانی جمالیات کی روشنی میں (ادب) پروفیسر شکیل الرحمان ۵/-
تحریک آزادی میں اردو کا حصہ (اول) (ادب) ناشر نقوی ۳۵/-
رینگنے والے جانور (معلومات) قیصر سرمست ۱۲/-
ہندستانی ادب کے معمار تلوک چند محروم رام لعل نابھوی ۵/-
ہندستانی ادب کے معمار انشاء اللہ خاں انشاء ایم حبیب خاں ۵/-
تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں (تعلیم) محمد اسحاق ۲/-
اصلاحیات مولانا ابوالحسن علی ندوی ۲۵/-
لہجے کے چراغ (شعری مجموعہ) عروج زیدی مرتب: عرفان زیدی ۹/-
ذخیرۃ الملوک (اردو) سید امیر کبیر ہمدانی ۵۰/-
حقیقت بھی کہانی بھی۔ سید بدرالدین احمد (ایڈوکیٹ) ۴/-

مہمان مدیر
ڈاکٹر خلیق انجم
انجمن ترقی اردو (ہند)
راؤز ایونیو۔ نئی دہلی ۲

اشاریہ

۱۶ راگست ۱۹۸۹ء کو ہندستان کی جمہوریت پسند طاقتوں کی ایک بہت بڑی فتح اس صورت میں ہوئی کہ اُردو کو پورے بہار صوبے کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ یہ عمل ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے اُردو کو بہار کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا تھا اور اس کا نفاذ بہار کے پندرہ صوبوں میں کیا تھا۔ پچھلے دنوں جب ستیندر نرائن سنہا صاحب بہار کے وزیر اعلا منتخب ہوئے تو انھوں نے گیارہ مزید اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ اور کچھ ہی دن بعد اردو کو پُورے بہار کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ ہم ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا اور جناب ستیندر نرائن سنہا کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو کو اس کا جائز حق دیا۔ اور انجمن ترقی اُردو (بہار) کے صدر پروفیسر عبدالمغنی اور ان کے ساتھیوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ جن کی لگاتار جدوجہد نے اردو کو اس کامیابی سے ہم کنار کیا۔

حکومتِ بہار نے اردو کو سرکاری زبان بنا دیا لیکن اس کی بقا و ترقی اور فروغ کی ذمّہ داری خود اُردو والوں پر ہے۔ یہ کام حکومت کا نہیں ہے کہ اردو والوں کو ترغیب دے کہ وہ اپنے بچّوں کو اُردو پڑھائیں۔ یا اُردو کی ترقی اور فروغ کے لیے کام کریں۔ یہ کام تو خود ہمیں کرنا ہوگا۔

ہندستان کی جنگ آزادی میں تمام سیاسی جماعتیں اس طرح مصروف تھیں کہ انھیں مُلک آزاد کرانے کے سوا اور کسی چیز کا دھیان نہیں تھا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو جب آزادی ملی تو مجاہدین آزادی کو پتا چلا کہ ان کے کاندھوں پر اچانک ایسی ذمّے داری آگئی، جس کا انھیں پُوری طرح احساس نہیں تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ آزادی کی جنگ کے داؤ پیچ سے تو وہ خوب واقف ہیں لیکن ایک آزاد ملک کی ذمّے داریوں کو سنبھالنے کے فن سے پوری طرح واقف نہیں یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ آزاد ہندستان کی باگ ڈور ایسے رہنماؤں کے ہاتھوں میں آئی، جنھوں نے کسی بڑے نقصان کے بغیر مُلک کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا۔ اس وقت یہی حال بہار میں اردو کا ہے۔ بہار میں اردو سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ لیکن یہ کامیابی ہماری منزل نہیں بلکہ اصل منزل کی جانب ایک نئے اور طویل سفر کا آغاز ہے۔

پچھلے چالیس برسوں میں ہندستان اور خاص طور سے شمالی ہند میں اردو کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو والوں نے اپنے بچّوں کو اردو پڑھانا بند کر دیا۔ اس صورتِ حال کی ذمّے داری صوبائی حکومت کی اردو مخالف پالیسی، محکمۂ تعلیم کی سازشیں اور والدین کی حوصلہ شکنی پر ہے۔ بعض

رقہ پرست اور اُردو مخالف سیاسی اور تہذیبی جماعتوں نے ایک گہری سازش کے تحت بڑے پیمانے پر یہ پروپگنڈا کیا کہ اگر بچوں نے اُردو کے ذریعے تعلیم پائی یا اردو بحیثیت مضمون کے پڑھی تو انھیں ملازمت نہیں ملے گی۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اردو کا روزی روٹی سے تعلق ختم ہو گیا ہے۔ اس پروپگنڈا کا آلۂ کار پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹروں اور استادوں کو بنایا گیا۔ اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب بھی والدین بچے کو داخلے کے لیے اسکول میں لے کر جاتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ ان کے بچے کا ذریعہ تعلیم اردو ہو تو داخلہ دینے والا استاد، والدین اور بچے کا ہمدرد بن کر اُردو کی زبوں حالی کا ایسا رونا روتا ہے کہ والدین یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اگر اُن کے بچے نے اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کی یا اردو بحیثیت مضمون پڑھی تو زندگی بھر بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لیے گھومتا رہے گا۔ کیوں کہ معاش کے سارے ذرائع اُس پر بند ہو جائیں گے۔

اُردو کے خلاف یہ پروپگنڈا اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا کہ خود اُردو والے اس کا شکار ہو گئے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے اس غلط، بے بنیاد اور مہمل پروپگنڈے کے خلاف مہم شروع کی اور اس سلسلے میں دلی اور اُتر پردیش میں کانفرنسیں منعقد کر کے اُردو عوام کو یقین دلایا کہ مہاراشٹر، مغربی بنگال، آندھرا، کرناٹک وغیرہ میں ہزاروں کی تعداد میں اُردو میڈیم، پرائمری اور سیکنڈری اسکول ہیں۔ ان اسکولوں کے بچے مُلازمت کے میدان میں کسی اور ذریعۂ تعلیم کے بچوں سے کم نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے بچے مراٹھی بہت اچھی طرح پڑھتے ہیں۔ اسی طرح مغربی بنگال میں ہمارے بچے بنگالی پر اور کرناٹک میں کنڑ پر پوری قدرت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں ملازمت میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

انجمن ترقی اُردو (بہار) کو اس لغو پروپگنڈے کے خلاف زبردست مہم شروع کرنی ہوگی۔ صرف انجمن ہی نہیں بلکہ سب اُردو تنظیموں کو یہ کام کرنا ہوگا۔ ہمیں اُردو والوں کو بتانا ہوگا کہ اُردو پڑھنے سے ملازمت کے مواقع بڑھتے ہیں کم نہیں ہوتے میں یہاں ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں کچھ سال پہلے آل انڈیا ریڈیو میں سات اردو پروڈیوسروں اور گیارہ ہندی پروڈیوسروں کی جگہیں مشتہر ہوئیں۔ انجمن نے اُردو کے کچھ اُمیدواروں کو اکٹھا کیا اور ریڈیو کے ایک ایکسپرٹ کو بُلا کر پندرہ دن تک ان امیدواروں کی تیاری کرائی۔ ہم نے ان امیدواروں سے ہندی اور اردو دونوں جگہوں کے لیے درخواستیں دلوائیں۔ اُردو کے سات امیدواروں میں سے ہمارے تین اُمیدوار منتخب ہو گئے۔ اور تین میں دو اُمیدوار ایسے تھے جو ہندی اور اُردو دونوں جگہوں کے لیے منتخب ہوئے۔ یہ صرف اردو اُمیدواروں کے لیے ہی ممکن تھا۔ کیوں کہ وہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ جس اُمیدوار نے صرف ہندی پڑھی ہے، وہ اردو پروڈیوسر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے صرف ہندی کا میدان ہے۔ یہی بات ہمیں شہر شہر اور گاؤں گاؤں جا کر اردو عوام کو سمجھانی پڑے گی۔

یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ اردو تعلیم عام طور سے نچلے طبقے تک محدود ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جو لوگ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور حکومت سے اردو کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ اردو میڈیم کے اسکول پرائیوٹ ہوں یا سرکاری دونوں کی حالت بہت خستہ ہے۔ ان اسکولوں سے تعلیم پائے ہوئے بچے عام طور سے ذہنی طور پر دوسرے اسکولوں کے بچوں سے کمتر ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے

یہ بچے ایسے گھروں سے آتے ہیں کہ جہاں ماں باپ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے۔ اس لیے بچے بس اتنا ہی پڑھتے ہیں جتنا انھیں اسکول میں پڑھایا جاتا ہے۔ مجھے اور صوبوں کا تو حال نہیں معلوم، لیکن دہلی کے اسکولوں کا کچھ تجربہ ہے۔ اس شہر کے پرائمری اسکولوں میں استاد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی شاگرد کو فیل کر سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پانچویں کلاس تک بچے آرام سے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے مگر میں عینی شاہد ہوں کہ دہلی کے ایک اسکول کے چھٹی جماعت کے بچے اردو میں اپنا اور اپنے باپ کا نام نہیں لکھ سکتے تھے۔ یہ دو تین سال پہلے ہی کی بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہار کے حالات بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔ ہمیں ان اسکولوں کے اساتذائے کرام سے درخواست کرنی ہوگی کہ اگر وہ اردو کی بقا اور اس کی ترقی اور فروغ کے خواہاں ہیں تو انھیں اپنی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ ماں کی گود کے بعد اگر بچے کی ذہنی تربیت کا کوئی دوسرا اہم مقام ہے تو وہ استاد کی صحبت ہے۔ اُستادوں کو بچوں میں کلاس اور کلاس کے باہر دلچسپی لینی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض اساتذہ اپنی آمدنی بڑھانے کے مختلف طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی استاد ٹیوشن کرتا ہے کوئی جز وقتی نوکری اور کوئی کاروبار میں مصروف رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسکول کے اُستادوں کی تنخواہ اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہیے لیکن ایک ترقی پذیر ملک کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ یہ پیشہ بہت مقدس ہے اس کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ یہی باتیں ہمیں اپنے اُستادوں کو سمجھانی ہوں گی۔

اسکول کے بچوں کی نصابی کتابیں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ بہار کی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اردو نصابی کتابوں کا مسئلہ حل کر رکھا ہے۔ لیکن ایک اور مسئلہ ہے جس پر ہمیں توجہ دینی ہوگی وہ یہ کہ بچوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کے لیے صرف نصابی کتابیں ہی کافی نہیں ہوتیں۔ بچوں کے ادب اور امدادی کتابوں کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ہندستان کی بہت سی جدید زبانوں میں ایسی کتابیں شاندار طریقے سے اعلا پیمانے پر چھاپی گئی ہیں۔ لیکن اردو بچے ابھی تک اس نعمت سے محروم ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فرض مرکز میں ترقی اردو بورڈ اور بہار میں اردو اکیڈمی کا ہے۔ اس وقت ہمیں چاہیے کہ چند برسوں کے لیے میر و غالب اور افسانہ اور غزل کو طاق پر رکھ کر کوشش کریں کہ بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کتابیں تیار کریں۔ اگر ان بچوں میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا نہیں ہوگا تو ہماری میر و غالب پر لکھی گئی کتابوں کے پڑھنے والے بھی نہیں ملیں گے۔ ہم ان لوگوں کو ہدفِ ملامت ضرور بناتے ہیں جو اپنے بچوں کو پبلک اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ جن لوگوں کی آمدنی اچھی ہے، اور جو بچوں کی تعلیم پر دل کھول کر خرچ کر سکتے ہیں۔ کیا ایسا کوئی اردو میڈیم اسکول ہے جس کا معیار ایسا ہو کہ وہ لوگ اپنے بچوں کو اس اسکول میں بھیج دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا کوئی اسکول نہیں ہے۔ ہم اردو والوں کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہر شہر میں کم سے کم ایک ایسا اردو میڈیم اسکول قائم کریں جس کا معیار کسی بھی پبلک اسکول سے کم نہ ہو۔ جب تک اس طرح کے اسکول قائم نہ ہوں اس وقت تک اردو والوں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو گھر پر اردو پڑھائیں، اور بچوں میں اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا کریں۔ یہ بھی کوشش کی جائے کہ شہر کے پبلک اسکولوں میں اردو بہ حیثیت مضمون پڑھائی جائے تاکہ ہمارے بچے اردو کی تعلیم سے بالکل محروم نہ رہ جائیں، جن بچوں کو گھر میں اردو پڑھائی جائے اور پھر سہ لسانی فارمولے کے تحت تین سال وہ اسکول میں اردو پڑھیں انھیں اردو پر اتنی قدرت ضرور حاصل ہو جائے گی کہ کالج میں اردو بہ حیثیت

مضمون کے پڑھ سکیں۔ ہمیں یہ مہم بھی شروع کرنی چاہیے کہ جو اردو والوں کے بچے اردو سے ناواقف ہیں اُن کی مذمت کی جائے۔ اگر وہ لوگ اردو کے ادیب یا شاعر ہیں تو سیمناروں اور مشاعروں میں ان کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ اردو کی بقا کے لیے ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔

سہ لسانی فارمولے کا ذکر کیا جا چکا ہے اگر بہار میں اس فارمولے کا نفاذ ایمانداری سے کیا جائے۔ جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ کیا جائے گا تو بہار میں اُردو کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا۔ اردو والوں کے جو بچے رُدو میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکے وہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کلاسوں یعنی تین سال تک اُردو ڑھ سکتے ہیں، اگر بہار کے تمام اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو پڑھانے کا انتظام کر دیا جائے ین ایک یا دو استاد مقرر کر دیے جائیں تو میرا تجربہ اور یقین ہے کہ غیر اردو داں بچے ذوق و شوق سے اردو ڑھیں گے۔ میں یہاں دہلی کے سردار پٹیل پبلک اسکول کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ تین سال پہلے اس اسکول یں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھائی شروع کی گئی اس وقت ڈیڑھ دو سو بچے اردو پڑھ رہے ہیں ن میں نوے فیصدی بچے غیر مسلم ہیں۔ بہار میں اردو والوں کو اس پر ہرگز زور نہیں دینا چاہیے کہ غیر سلم بچے بھی اردو پڑھیں ہاں ہمیں یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت ہر اسکول ں استادوں کا تقرر کیا جائے اگر یہ سہولت فراہم کر دی گئی تو مجھے یقین ہے کہ بہت بڑی تعداد میں یر مُسلم بچے بھی اردو پڑھیں گے۔ ہندوؤں میں ایسے لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں جو اُردو سے محبت رتے ہیں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہتے ہیں لیکن اردو تعلیم کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں ں ــــ یہاں تک تو بات تھی اردو تعلیم کی اب کچھ اور مسائل۔ پورے اتر پردیش میں گھومیے تو مراد آباد، م پور، شاہجہاں پور اور بریلی وغیرہ میں تو کچھ دُکانوں پر اُردو میں لکھے گئے بورڈ نظر آئیں گے باقی پورے ۔پی اور لکھنؤ شہر میں اردو میں لکھے گئے بورڈوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔ بہار میں اردو میں ے گئے بورڈ نظر تو آتے ہیں لیکن بہت کم تعداد میں ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اردو بہار اور بہار کی وسری اردو تنظیمیں یہ مہم شروع کریں کہ دُکان دار اردو میں اپنی دُکان کے بورڈ تیار کرائیں یا کم سے کم ندی کے ساتھ اردو میں بھی بورڈ لکھے جائیں۔ اس معاملے میں ہمیں تشدد سے ہرگز کام نہیں لینا گا بلکہ پیار، محبت اور اپنے دلائل سے ہمیں دُکانداروں کو سمجھانا ہوگا۔ اسی طرح ہمیں یہ کوشش بھی نی ہوگی کہ سرکاری دفتروں کی ناموں کی تختیاں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہوں۔ اگر ہم اپنے اس صد میں کامیاب ہو گئے تو پورے بہار میں اردو کے لیے ایک نفسیاتی فضا بن جائے گی۔ جو لوگ اُردو کے ستقبل سے مایوس ہو کر اردو کے استعمال سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ وہ پھر اس طرف متوجہ ہوں گے۔ اور الوگوں نے اردو نہیں پڑھی، اُنھیں اردو پڑھنے کی ترغیب ہوگی۔ چوں کہ اردو بہار کی سرکاری زبان ہے ،لیے وہاں کے ریلوے اسٹیشن سے جو ٹکٹ دیے جائیں اُن پر اردو میں بھی عبارت ہو۔ ڈاکخانوں سے ،جانے والے مختلف فارموں پر ہندی اور اُردو دونوں ہونی چاہیے۔ اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے رصے سے "اردو میں پتے لکھو" مہم شروع کر رکھی ہے۔ یہ مہم فی الحال دہلی، بہار اور اتر پردیش تک ود ہے۔ دہلی اور بہار میں ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اُتر پردیش میں ڈاکخانے کے لوگ ہنک اُردو کے خلاف تعصب سے آزاد نہیں ہوئے۔ ہمیں بہار میں بہت بڑے پیمانے پر یہ مہم شروع کرنی

چاہیے کہ اردو والے خطوں پر پتے اردو اور صرف اردو میں لکھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کچھ عرصے بعد ہر ڈاک
میں اردو والوں کا تقرر کیا جائے گا یا موجودہ ملازمین کو اردو پڑھنے پر مجبور کیا جائے گا۔

حکومت بہار نے ۱۹۸۰ء میں جب اردو کو بہار کی سرکاری زبان تسلیم کیا تھا اور ابتدا میں بیت
اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی تھی تو یہ احکامات بھی صادر کیے گئے تھے کہ دفتروں اور عدالتوں
میں درخواستیں اردو میں قبول کی جائیں گی اور ان کا جواب بھی اردو ہی میں دیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے
بلاک سطح سے لے کر ضلعے کی سطح تک مترجم ملازم رکھے گئے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اردو والوں نے اس سہولت
کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ چند مہینے پہلے میں پٹنہ میں تھا وہاں ایک محفل میں میرے دوست نے ایک صاحب
سے میرا تعارف کرایا۔ بتایا گیا کہ وہ صاحب حکومت کے دفتر میں اردو کے مترجم ہیں۔ ایک اور صاحب نے ان کے
سامنے ہی یہ اطلاع دی کہ پرسوں انھوں نے ایک سرکاری دفتر میں درخواست دی لیکن درخواست ہندی میں
تھی۔ وہ صاحب کچھ پریشان ہو گئے اور کافی دیر تک مجھے سمجھاتے رہے کہ ہندی میں درخواست دینے کے
کیا کیا فائدے ہیں۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ ہم تھوڑے سے ایثار کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اُردو
میں اس لیے درخواست نہیں دیتے کہ درخواست کا پہلے اردو سے ہندی میں ترجمہ کیا جائے گا۔ پھر متعلقہ
افسر کو بھیجی جائے گی متعلقہ افسر ہندی میں جواب دے گا۔ ترجمہ سیل اس کا اردو میں ترجمہ کر کے ان کے پاس
بھیجے گا۔ اس عمل میں پانچ چھے دن مزید لگ جائیں گے۔ اگر ہم اتنے خود غرض ہو گئے ہیں اور اردو کی ترقی اور
فروغ کے لیے تھوڑی سی قربانی بھی دینے کو تیار نہیں ہیں تو حکومت اُردو کو جا ہے جتنی سہولتیں فراہم کرے
اردو کی بقا مشکل ہے۔ انجمن کو یہ کام بھی مہم کے طور پر کرنا چاہیے۔ ہمیں اردو والوں کو یہ سمجھانا ہوگا کہ تین چار دن
کی تاخیر کی پریشانی کچھ ہی عرصے کی ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ تعداد میں، اردو میں درخواستیں دیں۔ بہت جلد
وہ وقت آجائے گا جب حکومت مترجموں کا تقرر کرنے کی بجائے موجودہ ملازمین ہی کو اردو پڑھنے پر مجبور کرے گی۔

ہمیں بہار میں اُردو تاجروں سے یہ درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اپنے حساب کتاب کو اردو میں رکھیں
اور جہاں تک ممکن ہو مراسلت بھی اردو میں کریں۔

میں جانتا ہوں کہ میں نے جن ذمّے داریوں کا ذکر کیا ہے وہ بہت زیادہ ہو گئی ہیں اور کسی ایک انجمن
یا ادارے کے لیے ان سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ انجمن ترقی اردو بہار کے
صدر پروفیسر عبدالمغنی بہار کی ان تمام انجمنوں اور اداروں کا ایک جلسہ بلائیں اور کوشش کریں کہ یہ ذمّہ داریاں
مختلف ادارے قبول ہیں۔ اگر کام کی تقسیم صحیح ہو گئی اور اداروں نے اپنی ذمّے داریوں کو قبول کر لیا تو یہ کام نسبتاً
آسان ہو جائے گا۔ ...

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

صاحب جی سلطان جی
ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطین دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک نہایت اہم کتاب۔

قیمت -/۲۰

ہمارے دینی علوم
مولانا اسلم جیراج پوری

علم تفسیر، تفسیر بالروایت، علم حدیث، حقیقتِ حدیث اور علم فقہ جیسے اہم موضوعات پر نہایت عالمانہ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت -/۱۸

چند تصویرِ بتاں
مولانا عبدالسلام قدوائیؒ
ترتیب
پروفیسر مشیرالحق

یہ کتاب مولانا صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے بعض اساتذہ، معاصرین علما نیز اپنے ساتھیوں اور دوستوں کی یاد میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ ان مضامین کی نوعیت نہ تحقیقی ہے اور نہ تنقیدی، بلکہ اس میں اُن کے ذاتی تاثرات ہیں جو الفاظ کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ قیمت -/۴۵

تیسرا سرسید یادگاری خطبہ

مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست کل اور آج
پروفیسر مشیرالحق

اس خطبے میں پروفیسر مشیرالحق نے گزشتہ ۱۰۰ برسوں کی مسلم سیاست کی داستان بڑے واقعاتی اور تجزیاتی انداز میں سنائی ہے۔ قیمت: آٹھ روپے

معاشیات کے اصول
عزیز احمد قاسمی

عزیز احمد قاسمی مرحوم، سابق استاد دارالعلوم دیوبند نے معاشیات جیسے مشکل مضمون کو جس سادہ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ طلبہ کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت -/۲۱ روپے

آسان اردو ورک بک
شکیل اختر فاروقی

اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی ورک بک جو اردو لکھنے پڑھنے والے خواہش مند طلبہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ قیمت -/۲۴ روپے

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں
مالک رام

آزاد شناس جناب مالک رام صاحب کے مضامین کا تازہ ترین مجموعہ

قیمت -/51 روپے

کشمیری لال ذاکر
26 سیکٹر ۱۵-اے
(چنڈی گڑھ)

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یہ شعر داغ نے اس وقت کہا تھا جب واقعی سارے جہاں میں اُردو زبان کی دھوم تھی۔ یہ کئی سو برس پہلے کی بات ہے۔ ہمیں اُردو کو آج کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا ہوگی کہ اب اس زبان کی دھوم کہاں تک ہے۔ کتنے لوگ اس کو خود پڑھتے ہیں اور کتنے لوگ دوسروں کو اردو خواں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت یقیناً حالات تسلی بخش نہیں ہیں اور ہم دعوا کرتے ہیں کہ اُردو زبان ہندستان کے ہر صوبے میں سمجھی اور بولی جاتی ہے اور کہ غیر ممالک میں اردو جاننے والے اور اسے پڑھنے والے سمجھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کی گواہی کے لیے ہم ان چند لوگوں کے نام گنوا دیتے ہیں جو دور دراز ملکوں میں بیٹھے ہوئے کہانیاں لکھ رہے ہیں، سفرنامے لکھ رہے ہیں، شعر کہہ رہے ہیں اور اس قسم کی دوسری تخلیقی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ بات کہ ہم خوش فہمی میں تو مبتلا ہو سکتے ہیں کہ اُردو کا مستقبل روشن ہے لیکن عوام کو اس خوش فہمی میں مبتلا کرنا آسان نہیں۔

مجھے یاد ہے، قریب قریب ۲۰ برس پہلے، گجرال کمیٹی اندر کمار گجرال صاحب کی صدارت میں اپنے کچھ ممبروں کے ساتھ ہندستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرتے کرتے چنڈی گڑھ بھی پہنچی تھی۔ گجرال کمیٹی کے ممبروں نے غالباً اپنے لیول پر ہر صوبے کے کچھ ادیبوں اور شاعروں کے نام نوٹ کر رکھے تھے۔ جن سے وہ انٹرویو کرنا چاہتے تھے ان دنوں میں ہریانہ کے محکمہ تعلیم میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر کام کر رہا تھا اور میری پوسٹنگ چنڈی گڑھ تھی تھی۔ جب گجرال کمیٹی نے ہریانہ کے ادیبوں، شاعروں، اور اُردو سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں سے انٹرویو کرنا شروع کیا تو مجھے بھی اس کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملا۔ میں نے گجرال صاحب سے انٹرویو شروع ہونے سے

پہلے پوچھا تھا، کہ وہ میرا انٹرویو بحیثیت ہریانہ سرکار کے ایک افسر کا لینا چاہتے تھے۔
ایک ادیب کی حیثیت سے مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھے ان کا جواب سن کر
خوشی ہوئی۔ جب انھوں نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے بحیثیت ادیب کے بات کرنا چاہتے تھے
اور اُردو کے مسائل کے بارے میں میرے خیالات جاننا چاہتے تھے۔ آج اتنے برس
گزر جانے کے بعد بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے یہ کہا تھا کہ سرکار نے اُردو
زبان کے مسائل جاننے کے لیے جو ۲۰ برس لگا دیے تھے۔ اس تاخیر کا جواز سرکار کے
پاس نہیں تھا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اگر سرکار حصول آزادی کے فوراً بعد اُردو کے مستقبل کے
بارے میں سوچتی تو شاید وہ کچھ ایسے قدم اٹھا سکتی، جن کی وجہ سے اردو زبان نئی
نسل تک پہنچ سکتی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو بچے تقسیم سے کچھ برس پہلے پیدا ہوئے
تھے یا تقسیم کے بعد پیدا ہوئے تھے، انھیں اُردو پڑھنے کی کسی قسم کی کوئی سہولت بہم
نہیں پہنچائی گئی تھی۔ پرائمری اسکول سے لے کر کالج کی سطح تک اردو پڑھانے کا کوئی
بندوبست نہ تھا۔ اس صورت میں اردو، صرف آبادی کے اُن لوگوں تک محدود رہ گئی
تھی جن کی عمر ۴۰ سے اوپر تھی اور اب جن کی عمر کم سے کم ۶۰ سے اوپر ہے۔ آبادی کا یہی
وہ حصہ ہے جو اس وقت بھی اُردو کے اخبار پڑھتا ہے اور اردو کے رسائل دیکھتا
ہے۔ نوجوان طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد میں اردو جاننے والوں کی تعداد اتنی کم ہے
کہ اسے نہ کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو سوال میں نے آج سے ۲۰ برس
پہلے نگراں کمیٹی کے سامنے رکھے تھے۔ وہی سوال آج بھی جوں کے توں موجود ہیں اور اپنا
جواب پانے کو ترس رہے ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ ہمیں بڑی سنجیدگی سے یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم ایمانداری
سے یہ دعوا کر سکتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ساتھی اُردو زبان کے فروغ اور اس کی ترقی کے
لیے خاطر خواہ قدم اٹھا رہے ہیں؟ میں انھیں سوالوں کی توجہ اپنے دوستوں کی طرف
دلانا چاہتا ہوں جو سوال میں نے اکثر ادبی انجمنوں، ادبی جلسوں اور دوستوں کی محفلوں
میں اٹھائے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی آبادی کی اکثریت انھیں لوگوں کی ہے۔
جو سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں نوکریاں چاہتے ہیں۔ آپ دو تین صوبوں کی باتیں چھوڑ دیجیے
(حالانکہ وہاں کے حالات بھی کوئی زیادہ روشن نہیں ہیں) باقی صوبوں میں نوکریاں حاصل
کرنے کے لیے اپنی اپنی مادری زبان میں قابلیت حاصل کرنے کے لیے سرٹیفکیٹ کی
شرط ہے۔ ان صوبوں میں جن میں ہندی بولنے والے کہا جا سکتا ہے۔ وہاں ہندی کی
قابلیت کی وجہ سے ہی لوگوں کو ملازمتیں مل سکتی ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبان کا تعلق
روٹی روزی سے بھی ہے اور یہ بہت اہم اقتصادی مسئلہ ہے اور جب تک اس مسئلے کا حل
نہیں ہوگا، لوگ اس زبان کو پڑھنا نہیں چاہیں گے۔ جس میں استعداد حاصل کرنے کے بعد
انھیں کوئی سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں نوکریاں نہیں مل سکتیں

میں اپنے ہی صوبے ہریانہ کی بات کرتا ہوں۔ یہ بھی لگ بھگ ۲۰ برس کی بات ہے۔ ان دنوں میں ضلع گوڑگانو میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھا۔ ضلع گوڑگانو کا ایک حصّہ میوات کا علاقہ ہے جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ جب میں نے سرکاری دوروں کے دوران اسکولوں میں جانا شروع کیا تو میں نے دیکھا، اس علاقے میں بھی بچے ہندی پڑھ رہے تھے۔ حالانکہ ان کا سارا ماحول اُردو کا تھا۔ میں نے جب یہ سوال بچوں کے والدین سے کیا تو ان کا جواب وہی تھا جس کا تعلق روزی روٹی سے تھا۔ انھوں نے یہی کہا کہ سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کے لیے ان کے بچوں کو اُردو زبان کی قابلیت کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ان کے پاس اس بات کا ثبوت ہونا ضروری تھا کہ انھوں نے میٹرک لیول تک ہندی پڑھی تھی۔ اسی سے جڑا ہوا دوسرا سوال ایک اور بھی تھا جہاں کہیں اُردو پڑھانے کی سہولت مہیا کرنے کی کوشش کی وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اُردو پڑھانے والے استادوں کی بھی کمی تھی۔ تو اس سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ آپ جب تک زبان کو روزی روٹی حاصل کرنے کے مسئلے سے نہیں جوڑیں گے لوگ اس زبان کو خوشی سے سیکھنا نہیں چاہیں گے اور اس میں اتنی دلچسپی نہیں دکھائیں گے جتنی کہ دکھائی چاہیے۔ زبان کے فروغ کے لیے اسے پڑھانے والوں کی بھی ضرورت ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ تھری لینگویج فارمولا میں آئینی لحاظ سے یہ گنجائش ہے کہ اگر کسی کلاس میں ۱۰ بچے ہوں یا اسکول میں ان بچوں کی تعداد ۱۰۰ ہو جو اُردو پڑھنا چاہیں تو ان کے لیے اُردو پڑھانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ کسی کلاس میں اردو پڑھنے والے بچوں کی اتنی تعداد ہوگی جتنی آئین کی رو سے چاہی گئی ہے۔ تو معاملہ تو بس یہیں ٹھپ ہوگیا۔ نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

لیکن جب تک ہم اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کریں گے، اُردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جائے گی۔ اور یہ ساٹھ برس سے اوپر والا گروپ بھی دس سالوں میں ختم ہوجائے گا۔ پھر یہ ادیب لوگ جو اتنی کتابیں لکھ رہے ہیں کس کے لیے لکھیں گے اور کون انھیں چھاپے گا؟ چھپ جائیں گی تو خریدے گا کون؟ خریدی بھی جائیں گی تو کتنی تعداد میں؟ اور لکھنے والے کو اس سے ملے گا کیا؟ اس وقت کتابوں کی صورت یہ ہے کہ جہاں اُردو کتابوں کا پہلا اڈیشن لگ بھگ دو ہزار ہوتا تھا اب بڑے بڑے سے پبلشر بھی پانچ سات سو سے زیادہ نہیں چھاپتے۔ جس زبان میں صرف کتاب کا اڈیشن ۵۰۰ ہو اس زبان کا ارتقا کتنا روشن اور کتنا محفوظ ہے؟ یہ سوال میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں؟ بلکہ اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ شاعری کی کتاب تو کوئی پبلشر چھاپنے کو تیار ہی نہیں۔ رہ گیا فکشن، تو اس میں بھی صورت یہ ہے کہ آپ اپنا مسودہ لے کر پبلشروں کے حضور میں چکر لگائیے اور کوئی پبلشر اسے چھاپنے کو تیار نہیں۔ اگر تیار ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ کتاب چھاپنے کے لیے آپ اسے زیادہ سے زیادہ کتنی رقم دے سکیں گے اور چھپنے کے بعد

ہری میں اس کی کیا مدد کریں گے۔ یہ ٹھیک ہے جب سے ملک میں اردو اکادمیاں قائم کی گئی ہیں یہ مسئلہ کسی حد تک کم ہوگیا ہے۔ لیکن اُردو اکادمیوں کے مالی ذرائع بھی تو محدود ہیں۔ اس لیے وہ بھی ادیبوں کو ان کی کتابیں چھاپنے کے لیے زیادہ مالی امداد فراہم نہیں کرسکتیں۔ تو دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ کتابیں چھپنے اور ان کے بکنے کا بھی ایک زبردست مسئلہ ہے جس کی طرف دھیان دینا ضروری ہے۔

اردو اکادمیوں کا ذکر آیا تو اس سلسلے میں ایک اور بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ مسئلہ ہے کتابت کا۔ اچھے کاتبوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ نیا کام ہاتھ میں لیتے ہی نہیں۔ لے لیں تو پھر اتنا انتظار کرواتے ہیں کہ آپ تھک جاتے ہیں یہ سوچ سوچ کر کہ آپ کی کتاب کب تک چھپے گی۔ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ مان لیجیے کسی کاتب نے میرا ناول کتابت کے لیے لے لیا۔ میرا پبلشر اس سے جس ریٹ پر کتابت کرا رہا ہے۔ اگر اُسے اس سے زیادہ ریٹ پر کتابت کرنے کے لیے پیش کش ہوگئی تو میرا ناول وہ ایک طرف رکھ دے گا۔ اور دوسرا ناول ہاتھ میں لے لے گا۔ اب اس کے ساتھ ہی جڑا ہوا طباعت کا مسئلہ بھی ہے۔ بعض کتابیں اتنی گھٹیا چھپتی ہیں اور اس میں کتابت کی اتنی غلطیاں رہ جاتی ہیں کہ جب ادیب کو اپنی چھپی ہوئی کتاب پبلشر سے ملتی ہے تو اسے اپنی کتاب کو دیکھ کر بہت خوشی نہیں ہوتی۔ اپنے پڑوسی ملک پاکستان کی بات کرتا ہوں۔ تھوڑا عرصہ ہوا مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت سے نئے اور پرانے دوست ملے۔ بہت سی کتابیں بھی انھوں نے مجھے دیں۔ ایک بھی ایسی کتاب نہیں تھی جس کی کتابت اور چھپائی اعلا درجہ کی نہ ہو۔ بلکہ اپنی ایک کتاب جب میں اپنے ایک دوست کو پیش کر رہا تھا تو میں نے کہا "تمھاری اتنی خوبصورت کتاب دیکھ کر اپنی کتاب دینے کا حوصلہ نہیں ہو رہا!"

وہ مسکرایا اور میری کتاب مجھ سے لے کر اُسے چوم لیا۔ مگر یہ صرف دوستی کی وجہ سے تھا کتاب کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں۔

اُردو پبلشر جتنی رائلٹی دیتے ہیں اس سے شاید وہ خرچہ بھی نہیں نکلتا جو ادیب نے پیڈ خریدنے پر، ناول کو ٹائپ کرانے اور ٹائپسٹ کو اجرت دینے پر خرچ کیا ہے۔ ہاں جب وہی ناول ہندی میں یا کسی اور زبان میں چھپ جاتا ہے تو اسے معقول رائلٹی ملتی ہے۔ تب اسے حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ناول اور لکھ لے۔ یہ مسئلہ مجھے اور میرے دوسرے ساتھی ادیبوں کو بھی پیش آرہا ہے۔

اُردو کو ان حالات میں زندہ رکھنے کے لیے، اُردو زبان میں لکھنے والوں کا یا اُردو پڑھنے والوں کا اتنا کنٹری بیوشن نہیں ہے، جتنا گلوکاروں کا ہے۔ جو غزلیں دیوناگری لپی میں لکھتے ہیں اور انھیں گاتے ہیں۔ یہ خدمت کسی حد تک فلموں نے بھی سرانجام دی ہے۔ اگر آپ فلموں کے نام اور ان میں استعمال کی جانے والی زبان اور گیتوں کے مصرعوں

کی طرف دھیان دیں تو آپ کو یقیناً اندازہ ہوگا کہ اس ادارے نے ان ڈائرکٹ طور پر اُردو زبان کو دوسروں تک پہنچانے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ چلیے کم سے کم یہی کیجیے کہ جو فن کار آپ کی غزلیں گانا چاہتا ہے اس پر یہ شرط تو عائد کر دیجیے کہ وہ اس زبان کو سیکھ بھی لے۔

انتخابات نزدیک آنے والے ہیں اس لیے مرکزی حکومت کو اور صوبائی حکومتوں کو ووٹوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا آنے والے کچھ مہینوں میں اردو کے تحفظ اور اس کے فروغ اور اس کو زندہ رکھنے کے لیے کئی ایسے اعلانات ہوں گے جن کا اثر صرف وقتی طور پر ہوگا۔ بہت دنوں کے بعد وہ اعلانات اور وعدے دفتر کی فائلوں کے جُزو بن کر رہ جائیں گے اور دعوے جو حکومتیں کریں گی یا کر رہی ہیں پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

آپ سمجھیں گے کہ میں نے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت حوصلہ شکن ہیں اور ان سے اُردو کی کوئی روشن تصویر سامنے نہیں آتی۔ یہ تصویر کا ایک ہی رخ ہے جو میں نے پیش کیا ہے۔ دوسرا رخ بھی بہت اُجلا نہیں ہے۔ لیکن اس میں اگر کچھ رنگ بھرے جائیں تو شاید تصویر کچھ زیادہ شوخ اور جاذب نظر دکھائی دینے لگے۔

میں اس مضمون کے اگلے حصے میں کچھ ایسی باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جن سے اُردو کے ارتقا اور فروغ میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ زیادہ سے زیادہ اُردو کلاسیں کھولنا۔

۲۔ اردو اکادمیاں اگر صرف کتابیں چھاپنے، سیمنار کرنے، مشاعرے کرنے، انعامات تقسیم کرنے تک ہی اپنے آپ کو محدود نہ رکھیں بلکہ فنڈ کا کچھ حصہ اردو کلاسیں کھولنے میں لگائیں تو اُردو کی ترقی کے لیے یقیناً یہ ایک مناسب قدم ہوگا۔

۳۔ ان کلاسوں میں جو کتابیں استعمال کی جائیں وہ کتابیں بھی ایک خاص ڈھنگ کی ہوں گی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں اس گروپ کے کام نہیں آئیں گی۔ کیونکہ ان کی ذہنی ضرورتیں اور دلچسپیاں بچوں سے مختلف ہیں۔

۴۔ جہاں بھی کہیں اردو کلاس کھولی جائے اس بات کا ضرور دھیان رکھا جائے کہ جن لوگوں نے اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے انھیں فالو اپ FOLLOW UP کرنے کے لیے کچھ سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ جہاں اُردو کلاس کھولی جائے اس علاقے یا محلّے میں ریڈنگ روم اور لائبریری کا انتظام بھی کیا جائے۔

۵۔ میرے تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ وکلا صاحبان اور پولیس کا عملہ اور محکمہ مال میں لگے پٹواری اردو زبان نہ جاننے کی وجہ سے تعزیرات ہند، جیسی کتابیں اور اس قسم کے دوسرے میٹریل کو پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا گروپ ہے۔ جس کے لیے

خاص طور پر اُردو کے سینٹر کھولے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُردو اکادمیاں سرکار کی توجہ اس طرف دلا کر پولیس اور محکمۂ مال کے کرمچاریوں کو اردو سکھانے کا انتظام کر سکتی ہیں۔

۶۔ اس وقت مجموعی طور پر خواندگی کی در سارے ملک میں ۳۶ فیصد کے قریب ہے عورتوں کی خواندگی کی در ۲۰ فیصد سے بھی کم ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مجموعی طور پر ملک میں خواندگی کی در اتنی کم ہے، تو اردو جاننے والوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہوگی۔ اس زبان کو بھی سکھانے کے لیے تعلیم بالغان جیسے پروگرام سرکار کی طرف سے چلائے جائیں تو اس کے خاطر خواہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس میں رضاکارانہ انجمنیں بھی بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہیں، جن میں اُردو اکادمیاں بھی شامل ہیں۔ اس پروگرام بلکہ اس قومی سطح کی تحریک کے لیے خاص قسم کی کتابیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔

آج نیشنل لٹریسی مشن کا بڑا چرچا ہے اور حکومت کے ٹارگیٹ کے مطابق اس صدی کے آخر تک ۱۵ اور ۳۵ برس کے ۴ کروڑ لوگوں کو پڑھا لکھا بنانے کی اسکیم ہے۔ اس بڑی تحریک میں سبھی لوگ حصّہ لے سکتے ہیں۔ طلبہ، سرکاری افسر، عورتیں، بچّے، ریٹائرڈ لوگ سبھی شامل ہیں۔ ہم لوگ بھی یقیناً اس میں اپنا تعاون دے سکتے ہیں۔

۸۔ جس طرح ون نوٹ ون ووٹ ONE NOTE ONE VOTE کا نعرہ لگ رہا ہے اسی طرح ہم اگر ایچ ون ٹیچ ون EACH ONE TEACH ONE, کا نعرہ لگائیں اور اُردو جاننے والا ہر شخص یہ وعدہ کرے کہ کم سے کم وہ ایک آدمی کو ضرور اُردو پڑھائے گا تو آنے والے برسوں میں اُردو جاننے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

۹۔ آج کل بچّے سستے کامکس لے کر پڑھتے ہیں۔ انھیں (خاص طور سے اُردو میں) اچھی کتابیں نہیں ملتیں۔ اگر ملتی ہیں تو وہ اتنی مہنگی ہیں کہ ہر ایک بچّہ انھیں خرید کر نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے بچّوں کے لیے اچھی کتابیں لکھی جائیں، لکھوائی جائیں اور کم داموں پر بیچی جائیں۔ اگر ادب میں تجارتی مفاد کو کچھ کم کر دیا جائے تو اس سے یقیناً کچھ فائدے بھی ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ دوسری زبانوں کی اچھی کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا جائے اور اُردو جاننے والے لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اُردو کی اچھی کتابیں جن میں کلاسکس بھی شامل ہیں، انھیں دیوناگری میں چھاپا جائے تاکہ ہندی جاننے والے لوگ اردو کے بیش بہا ادب اور اس زبان کی شاندار روایات سے واقف ہو سکیں۔ ہریانہ اردو اکادمی نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلے ہیں۔

تصویر کے دونوں رخ پیش کرنے کے بعد میری گزارش یہ ہے کہ زبانیں اسمبلیوں میں قانون پاس کرنے سے یا سرکاری طور پر اعلان کرنے سے نہیں بنتیں۔ زبانیں پروان چڑھتی ہیں، عوام کی وجہ سے۔ جو زبان ایک آدمی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کی عکاسی کرتی ہے وہی مقبول ہوتی ہے۔ جس زبان میں دل کی دھڑکنیں سنائی دیں، محبت اور بھائی چارے کی نغمگی ہو وہی زبان عوام کی زبان ہے۔ زبانیں گلی کوچوں میں

رہنے والے عام لوگوں کی کوشش سے بنتی ہیں۔ جب تک کوئی زبان اپنی جڑیں اس دھرتی تک نہیں پہنچاتی جس دھرتی پر اپنے غم اور خوشیاں لے کر عام انسان جیتے ہیں۔ تب تک وہ زبان پروان نہیں چڑھتی۔

میں گزارش کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے گھروں میں اس زبان کو استعمال کریں، اپنے بچوں کو اس کے گراں قدر ورثہ سے آشنا کرائیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بڑی سے بڑی سازش جو اُردو کے خلاف کی جائے وہ بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ غالب، میر ذوق، کرشن چندر، بیدی، فراق، جاں نثار اختر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور دوسرے درجنوں ادیب اور شاعر جب تک زندہ رہیں گے۔ جب تک ہم ان کی تخلیقات کو خاندان کے افراد، دوستوں، ہمسایوں اور دور دراز کے آشناؤں تک پہنچاتے رہیں گے۔ شاید فیض کا یہ شعر میرے اس مضمون کا مناسب مقطع ہوسکتا ہے۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے ●●
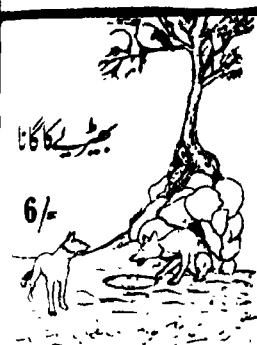
ننھے منّے بچوں
کے
لیے
چاند کی بیٹی
4/50
جادو کی ہنڈیا
4/50
شیر اور بکری
دم کٹی لومڑی
6/=
بھیڑیے کا گانا
6/=
گدھے بجائی
بانسری
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
6/50
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

شان الحق حقی
۱۷-اے خیابانِ تنظیم
ڈیفنس سوسائٹی
کراچی (پاکستان)

گزر گئی سر سے موجِ طوفاں مگر نہ پائی نگاہِ ساحل
سفینہ گُم ہو گیا تو اُبھرا اُفق پہ خطِ سیاہِ ساحل

کرشمہ تھا موجِ بے اماں کا ملی جو ہم کو پناہِ ساحل
نہ ہم نے مانگی امانِ منزل نہ ہم نے پکڑی تھی راہِ ساحل

اسی نظارے سے خوش ہیں نظریں کہ رنگ ہی ہے ہری بھری سی
نہ جانے کس وقت ڈوب جائے یہ کشتِ حسرت گیاہِ ساحل

میں ایک چھوٹا سا سنگ ریزہ مگر مجھے مانتے ہیں گویا
یہ شورِ بے زینہار دریا یہ وسعتِ بے پناہِ ساحل

تمام آشوبِ شب سمٹ کر جب اس کی زلفوں میں آگیا تھا
مری نگاہوں میں ہے ابھی تک وہ منظرِ صبح گاہِ ساحل

اُدھر وہی لطفِ بے ارادہ اِدھر وہی بازوئے گشادہ
ابھی ہے موجِ گریز پا سے اُسی طرح رسم و راہِ ساحل

میانِ طوفاں بھٹک گیا تھا کہ زورِ طوفاں نہ سہہ سکا تھا
یہ کندۂ نابکار کشتی یہ لاشۂ روسیاہِ ساحل

بس ایک احساس کا زیاں ہے وگرنہ سودا گراں نہیں ہے
بغیر تکلیفِ ناخدائی ملے اگر عز و جاہِ ساحل

مرے سفینے کو تو بالآخر تھا یوں ہی ٹکرا کے ٹوٹ جانا
نہ اس میں کوئی خطائے دریا نہ اس میں کوئی گناہِ ساحل

ملال کیسا کبھی تو آخر چلے گی بادِ مراد حقی
کسے خبر تھی کہ جا رہے ہیں بسوئے طوفاں براہِ ساحل

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

صاحب جی سلطان جی — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۰/-
چند تصویرِ بتاں — مولانا عبدالسلام قدوائی — ۴۵/-
ہمارے دینی علوم — مولانا اسلم جیراجپوری — ۲۸/-
درک تک (داستان اردو) — شکیل اختر فاروقی — ۲۴/-
معاشیات کے اصول — عزیز احمد قاسمی — ۲۱/-
کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں — مالک رام — ۵/-
لسان الصدق — اڈیٹر ابوالکلام آزاد — ۷۵/-
اردو میں کلاسیکی تنقید — عنوان چشتی — ۴۸/-
شہید جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — ضیاءالحسن فاروقی — ۷۵/-
تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری — ۴۰/-
قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — مجیب اشرف — ۱۲/-
زندگی کی طرف — شمیم حنفی — ۳۶/-
گول مال — شفیقہ فرحت — ۱۸/-
فی الفور — یوسف ناظم — ۳۰/-
مولانا آزاد کی کہانی — ظفر احمد نظامی — ۱۸/-
پرانی بات ہے — زبیر رضوی — ۳۰/-
نظام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۱۵/-
پیامی ہوم ڈکشنری — اردو انگلش — ۱۴/-
پیامی بنیادی ڈکشنری — انگریزی اردو — ۱۲/-
غزل نما — مرتبہ ادا جعفری — ۷۵/-
ساز سخن — مرتبہ ادا جعفری — ۴۵/-
ترجمۂ قرآن — پروفیسر مشیر الحق — ۸/-
تعلیم و تربیت اور والدین (تعلیم) — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۵۱/-
کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) — جگن ناتھ آزاد — ۴۵/-
پتھر بولے جیسے... (ڈرامے) — عتیق حنفی — ۴۵/-

ریت کی دیواریں (ناول) — رفعت سروش — ۲۱/-
بنجر بادل (ناول) — کشمیری لال ذاکر — ۳۲/-
دائروں میں پھیلی لکیر (شعری مجموعہ) — کشور ناہید — ۳۰/-
آنکھ میں سمندر (شعری مجموعہ) — زاہد ڈار — ۳۰/-
تذکرہ (ناول) — انتظار حسین — ۵۴/-
ذرے کی کہانی (سائنس) — مہدی جعفر — ۲۱/-
حیات جامی (سوانح) — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱۲/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات (خطبہ) — پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی — ۸/-
نقشِ ذاکر (مضامین) — مرتب: عبدالحق خاں — ۵۱/-
ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ) — شمس الرحمٰن محسنی — ۵۰/-
دنیا کے بڑے مذہب (علمی) — عمادالحسن آزاد فاروقی — ۸۵/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین (مضامین) — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۳۵/-
تعلیم اور رہنمائی (تعلیم) — ڈاکٹر محمد اکرام خاں — ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں (تعلیم) — معین الدین — ۱۵/-
یادوں کا اجالا (آپ بیتی) — بھگوان سنگھ / مترجم شمیم حنفی — ۴۰/-
ہندستان میں اسلامی علوم وادبیات (مضامین) — مرتبہ: عمادالحسن آزاد فاروقی — ۴۰/-
تحقیقی مضامین (تحقیق) — مالک رام
باتیں کچھ سریلی سی (سوانح ماہرینِ موسیقی) — داؤد رہبر — ۳۶/-
خسرو نامہ (تحقیق) — مجیب رضوی — ۲۱/-
رانگ نمبر (انشائیے) — شفیقہ فرحت — ۱۶/-
رات کے مسافر (شعری مجموعہ) — مرتبہ انور سجاد — ۲۸/-
زوال کا عروج (ڈراما) — بریخت، مترجم: انور عظیم — ۳۶/-
اثبات و نفی (تنقیدی مضامین) — شمس الرحمٰن فاروقی — ۴۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان (شعری مجموعہ) — ندا فاضلی — ۲۱/-
سدا بہار چاندنی (افسانے) — رام لعل — ۳۰/-
فی الحال (مزاحیہ مضامین) — یوسف ناظم — ۱۸/-
حرف حرف روشنی (شعری مجموعہ) — حمایت علی شاعر — ۳۵/-

باقر مہدی
۱ی/۱ روی دوش
کارٹر روڈ۔ باندرا (ویسٹ)
بمبئی ۔ ۴۰۰۰۵

پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں

(احتشام صاحب کی پندرھویں برسی کے موقع پر ایک کالی نظم شائع کی جارہی ہے)

ایک جواں برگد کی موت !
میری ایسی پتھریلی دھرتی پہ جینے والی پیلی بیل
رگ رگ میں دکھ کو
کتنا سمجھے — کتنا جانے — !

میں نے مر مر کر سرکش رہنے کا — دشوار ہنر
کچھ کچھ سیکھ لیا ہے !
لیکن کتنے طائر، کتنی بیلیں، اپنا نشیمن، اپنا سہارا
کھو بیٹھیں !
کتنے مسافر سایے سایے — ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جائیں گے !
کھو جائیں گے !
برگد ایک تھا — لیکن اس کا گہرا لمبا سایہ
کتنے شہروں پر پھیلا تھا
ایک جواں برگد کی موت !

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

اند کی بیٹی (باتصویر)	۴/۵۰
م کٹی لومڑی "	۶/:
ادو کی ہنڈیا "	۴/۵۰
شیر اور بکری "	۶/:
کتے کا خواب "	۶/۵۰
ھیڑیے کا گانا "	۶/:
چالاک بلی "	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری "	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

غنوا کی کہانی	۳۰/-
زیور	۴/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوا	۶/-
یک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/-
سنہرے اصول	۳/-
نرالے گویّے	۴/-
بالونی کچھوا	۴/-
بدر شہزادی	۶/-
جادو کی سارنگی	۳/-
جادو کا چھلا	۳/-
ننھا سیاح	۷/-
ابو خاں کی بکری	۱۵/-
پرواز کی کہانی	۳/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/-
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:

خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بہا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدھا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/:
سہانے ترانے	۶/۵۰
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
دادا نہرو	۶/-
ذرّے کی کہانی	۲۱/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
ولی کی شادی	۴/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نانی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:
پُراسرار غار	۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/:

ننھا شتو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلام مصافحہ	۵/:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۳/۵۰
ایک کھلا راز	۳/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۳/:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا ناصح	۳/:
ہار کی تلاش	۶/:
سُرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۶/:
ننھا فرشتہ	۳/۵۰
جوہر قابل	۳/:
بھیڑیے کے بچے	۳/:
ننھا جبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۶/:
بچوں کے افسر	۶/:
شریر شیرا	۳/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵۰
ظالم ڈاکو	۶/:
مہکتی کلیاں	۶/:
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
لوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ بونے	۳/:
ایک دیس ایک قوم	۳/:
جیت کس کی	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵

اردو دوسری سرکاری زبان

بہار کے بعد ہی صحیح مگر آخر کار اتر پردیش میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ ریاستی کابینہ نے کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بل کا مسودہ بھی منظور کر لیا گیا ہے جو اسمبلی کے ۲۵ ستمبر سے شروع ہونے والے اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا۔ وزیر اعلا مسٹر نرائن دت تیواری اور ان کے کابینی ساتھی نیز اردو کے حقوق کی بحالی کے لیے جدّ وجہد کرنے والے اور اس کی بقا اور ترقی سے دلچسپی رکھنے والے تمام ادارے اور افراد ایک پرانے وعدے کی ایفا اور ایک لمبی جدّو جہد کی کامیابی کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ریاست کے گورنر مسٹر محمد عثمان عارف نقش بندی نے ۱۵ ر اگست کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلا کو اس مسئلے کی طرف توجّہ دلائی تھی۔ کئی بار اردو کے لیے ریاستی حکومت آرڈی ننس بھی جاری کر چکی ہے لیکن عدالت نے اس بات کو نامناسب قرار دے دیا کہ ایک قانون بنانے کے بجائے بار بار آرڈی ننس جاری کیے جاتے رہے ہیں۔ بظاہر ریاستی حکومت نے یہ طریقہ اس وجہ سے اختیار کیا تھا کہ اسے اردو کا حق بحال کرنے کی فکر کے ساتھ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اسمبلی میں بل کی مخالفت کی جائے گی اور بل کے قانون بننے میں لمبی مدت لگ جائے گی۔

کچھ لوگوں نے اردو کے سرکاری حیثیت دیے جانے کے قانونی اور آئینی جواز کو بھی چیلنج کیا تھا۔ لیکن ملک کے آئین میں اردو کا ذکر موجود ہے اور گھر بازار کی بول چال میں اردو کا استعمال ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے اسی لیے کانگریس نے اپنے الکشنی مینی فیسٹو میں وعدہ کیا تھا کہ اردو کو یو پی اور بہار میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دے دی جائے گی۔ آئین میں اس کی گنجائش واضح ہے اردو کو یہ حیثیت دیے جانے کی مخالفت بہار میں بھی بعض حلقوں کی طرف سے کی گئی تھی مگر اس زمانے کے وزیر اعلا مسٹر جگن ناتھ مشرا کانگریس کا الکشنی وعدہ پورا کرنے اور وہاں کے اردو دوست یہ وعدہ پورا کرانے کے لیے بضد تھے۔ اسی لیے ۱۹۸۰ء میں اردو کو اس کے حقوق کی پہلی قسط دے دی گئی اور دس ضلعوں میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت مل گئی۔ اس کامیابی کے بعد بھی جدّ وجہد جاری رہی اور ۳ ر مئی ۱۹۸۹ء کو موجودہ وزیر اعلا مسٹر ستیندر نرائن سنہا نے انجمن ترقی اردو کے ایک وفد سے کہا تھا کہ مزید کچھ اضلاع میں اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دے دی جائے گی مگر اگست میں اردو کو پوری ریاست بہار میں سرکاری زبان کی حیثیت دے دی گئی۔

یہ اندیشہ اب بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کہ اردو ہندی سے رقابت رکھتی ہے یا اس

دراج سنگھاسن سے ہٹانا چاہتی ہے۔ اردو کے شاعر، ادیب، دانشوروں میں سے کسی نے کبھی ایسی
ئی بات نہیں کہی اور اسی لیے اردو کی جدوجہد کو ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں کے بولنے
ر لکھنے پڑھنے والے فاضلوں کی حمایت حاصل ہوگئی جس کا ان لوگوں نے علی الاعلان اظہار بھی
دیا۔ عام ہندی والے بھی اردو کے مخالف نہیں رہے اور ریاستی حکومت اردو اداروں کو جو مدد
تی رہی ہے نیز اس مد میں مسٹر نرائن دت تیواری نے جو اضافہ کر دیا ہے اس کی کسی طرف سے
ئی مخالفت نہیں کی گئی ہے۔ جیو اور جینے دو والی اس فضا نے مسٹر تیواری کے لیے اردو کے
قوق کی بحالی اقدام کو آسان بنا دیا ہے بظاہر یہ فیصلہ وزیراعلا نے اب سے بہت پہلے کر لیا
تھا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ مزید کارروائی کے لیے بہار کا
ونہ موجود ہے۔ اسے سامنے رکھ کر اس سے اچھا نقشہ بنایا جا سکتا ہے۔ اردو کے دوسری
سرکاری زبان تسلیم کر لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری دفتروں عدالتوں میں اردو میں
درخواستیں دی جا سکیں گی اور ان کا جواب لازماً اردو میں ملے گا۔ سرکاری گزٹ، اطلاعات
اشتہارات، ووٹروں کی فہرست اور دوسرے اہم کاغذات اردو میں بھی شائع کیے جائیں گی
ور اردو کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دیا جائے گا۔

جب اردو کا رشتہ روزی روٹی سے جڑ جائے گا تو لوگوں میں اردو تعلیم کا شوق بڑھ جائے
ا۔ حکومت نے اردو کی تعلیم کے سلسلے میں بیسیوں احکام جاری کر رکھے ہیں، ہزاروں ٹیچر مقرر کر
رکھے ہیں، اردو اداروں کو لاکھوں روپے بطور گرانٹ دیا جاتا ہے اور اردو پڑھنے والے طلبہ کو
ان اداروں سے وظیفے بھی ملتے ہیں لیکن موجودہ بندوبست کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔
سرکاری اسکولوں میں بے پروائی برتی جاتی ہے اور امداد پانے والے ادارے امداد کی رقم کا بہت
کم حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ بعض ادارے تو فرضی حساب بنا کر یا جھوٹی رسیدیں لکھوا کر روپے
خرد برد کر لیتے ہیں جو سرکاری افسر خود بھی گھپلے کرتے ہیں۔ وہ ان گھپلوں کی طرف سے چشم پوشی
کرتے ہیں۔ حکومت سمجھتی ہے کہ وہ اردو کے فروغ کے لیے بہت کچھ کر رہی ہے مگر عملاً اردو کا
بھلا نہیں ہو رہا ہے۔ اب جب کہ اردو کو حکومت نے دوسری سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے
صرف اس کی ذمہ داری نہیں بلکہ خود اردو کے پرستاروں اور حمایتیوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ
اس قسم کے گھپلے نہ ہونے پائیں کیونکہ اردو کے سرکاری زبان بن جانے کے بعد بھی اگر اس
کی تعلیم کا معقول بندوبست نہ ہوا تو وہ ترقی نہیں کر سکے گی اور سرکاری کاموں میں استعمال
نہیں کی جا سکے گی۔　　　(اداریہ "قومی آواز")

غر پیامی
یس ایشیا انٹرنیشنل
، مہو پارک
نئی دھلی

باتیں میری باقی اُن کا

اُردو بچاؤ مُفت خور مہربانوں سے

کچھ سال پہلے اخباروں کی اشاعت اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد کا ایک سرکاری سروے کروایا گیا تھا۔ ہیں جائزہ لیا گیا تھا کہ مختلف زبانوں میں جو اخبارات چھپتے ہیں۔ انھیں پڑھنے والے کتنے اور کیسے ہیں۔ اس روے کا اہم ترین انکشاف یہ تھا کہ ہندستان میں اخبار کی ایک کاپی کو اوسطاً تقریباً ۵ افراد پڑھتے ہیں گویا اخبار ب ہوتا ہے اور پڑھنے والے پانچ۔

اخبار اور قاری کا یہ تناسب دُنیا کے اور کسی بڑے مُلک میں پایا نہیں جاتا۔ امریکا اور برطانیہ میں ے اخبار صرف ایک آدمی پڑھتا ہے۔

ہندستان میں سب سے "طاقتور" اور بارسوخ" اخبارات انگریزی کے ہیں۔ اور ان ہی کے فی کاپی پڑھنے الوں کی تعداد سب سے کم ہے یعنی ایک اخبار اور چار پڑھنے والے۔ ہندی کا ایک (٦) آدمی پڑھتے ہیں پنجابی مراٹھی۔ یالم، تامل اور بنگلہ چار اور پانچ کے درمیان۔

اُردو سے متعلق اسی سروے نے انکشاف کیا کہ اوسطاً ایک اردو اخبار سات آٹھ افراد پڑھتے ہیں ہمیں یہ پڑھ کر برت نہیں ہوئی بلکہ شک ہوا کہ اوسط نکالنے کے چکر میں سروے کرنے والے دھوکا کھا گئے۔ ہمارے مشاہدے ے مطابق ایک اُردو اخبار کو سات آٹھ افراد نہیں بلکہ کم از کم دس لوگ پڑھتے ہیں۔

ایک اخبار اور دس بیمار کے اس تناسب پر ہم یقیناً فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن ضرورت اظہار مسرت کی نہیں بلکہ اظہار افسوس کی ہے۔ اردو اخباروں اور رسالوں کی مقبولیت کا یہی عالمی ریکارڈ اُردو اخباروں کی ترقی کی راہ یں بڑی رُکاوٹ بن گیا ہے۔ اخبار بکتا کم ہے اور پڑھا جاتا ہے زیادہ اس کا نقصان ناشروں اور کارکنوں ہی کو نہیں ہوتا بلکہ خود قاریوں کو بھی ہوتا ہے اخبارات اپنی محدود آمدنی کے باعث وہ سب کچھ اپنے قاریوں کو نہیں ے سکتے۔ جو دورِ جدید کے ایک اخبار میں ہونا چاہیے۔ مالی ذرائع کی کمی کے باعث اعلا صلاحیتوں کے ذہین نوجوانوں کو اُردو صحافت کا پیشہ پُرکشش دکھائی نہیں دیتا۔ کم اشاعت کے باعث اشتہاری کمپنیاں بھی اردو کی جانب کم ہی توجہ کرتی ہیں۔ حالاں کہ اس کی وجوہ میں مشتہرین کے فرقہ وارانہ تعصب اور بیشتر اخبارات کے مالکوں کی جدید کاروباری دُنیا کے طور طریقوں سے ناواقفیت بھی ہے۔ مگر ایک بڑی وجہ محدود اشاعت بھی ہے۔ جس کی بنیاد وہ ذہنیت ہے۔ جس کے تحت اخبار یا کتابت خرید کر پڑھنا یا تو عیاشی سمجھا جاتا ہے یا گناہ۔

عادت سے مجبور:۔ دفتروں، اسکولوں، چائے خانوں، ہیئر کٹنگ سیلونوں ڈھابوں اور

گلی محلے کے مطابق، ڈاکٹروں اور حکیموں کی دکانوں پر اخبار آتا بعد میں ہے۔ ورق ورق ہو کر ہاتھوں ہاتھ پہلے بٹ جاتا ہے۔ اخبار کے پرخچے اڑانے کے بعد بھی جو لوگ محرومِ مطالعہ رہتے ہیں۔ وہ کسی کتاب سے نقل کی کوشش کر رہے ہوں۔

برسوں پہلے ہمارے پڑوس میں ایک چائے خانے پر ایک صاحب منہ اندھیرے آکر بیٹھ جاتے ایک اسپیشل چائے کا آرڈر دیتے اور اس انتظار میں رہتے کہ سب سے پہلے وہی پورے اخبار کے حرف حرف کو پڑھ کر فارغ ہو جائیں۔ ان صاحب سے ہماری اچھی خاصی جان پہچان بھی تھی۔ ایک دن ہم نے پوچھ ہی لیا کہ آپ یہاں آکر چائے کیوں پیتے ہیں۔ کیا گھر میں چائے نہیں بنتی؟

بولے بنتی ہے اور بہت بنتی ہے۔ مگر گھر پر اخبار نہیں آتا۔ ہم نے انھیں سمجھایا کہ اگر صرف یہی بات ہے تو گھر پر چائے پییں۔ اور اخبار منگوالیں پیسے اتنے ہی صرف ہوں گے۔ مگر اخبار اطمینان سے خود بھی پڑھیں اور بچوں اور بیگم کو بھی پڑھالیں۔ بولے میاں مسئلہ مالی نہیں۔ اخلاقی ہے گھر میں اخبار آنے سے بچوں کی تعلیم اور خواتین کا اخلاق خراب ہو جاتا ہے۔ اخبار میں چوری۔ ڈکیتی، مار دھاڑ، اغوا، اور آبروریزی کی خبریں عام ہوتی ہیں۔ اور سیاسی معاملوں پر بحث ہوتی ہے

اس لیے عورتوں اور بچوں کو دوری رکھنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اصل وجہ ان کی عادت کی مجبوری تھی نا کہ اہلِ خانہ کے "اخلاق" کی حفاظت کا خیال۔

اردو اخباروں اور کتابوں کی خریداری اُن اردو داں علاقوں میں بھی بہت کم رہتی ہے۔ جہاں سینما کے ٹکٹوں کے لیے شائقین کی بھیڑ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ دہلی ہی کے اردو بازار میں کبھی کتابوں کی بائیس دکانیں تھیں اب صرف دو رہ گئی ہیں۔ بقیہ ویڈیو کیسیٹوں کی لائبریریوں، ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور ٹیپ ریکارڈوں کی دکانوں اور ریسٹورانوں میں بدل گئی ہیں۔ گویا ایک بڑا مسئلہ قوتِ خرید کا نہیں عادت کا ہے۔

الہ دین کا چراغ:- اب آپ سے کیا چھپائیں دوسروں سے اخبار مانگ کر پڑھنے کے شوق اور اور اخبار خریدنے کے خوف سے ہم نے کبھی کبھی ذاتی طور پر خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔ خصوصاً ٹرین اور بس کے سفر میں جس زمانے میں خانہ بدوشی ہمارا پیشہ تھا۔ سفر کاٹنے کے لیے ہم دو چار اخبار اور تین چار رسالے ساتھ رکھ لیا کرتے تھے۔

ان میں بعض ایسے رسالے بھی شامل ہوتے جو عموماً ہم نہیں پڑھتے۔ تجربے سے ہمیں احساس ہوا کہ اس قسم کی فضول خرچی مہنگا سودا نہیں ہے ان فالتو اخباروں اور رسالوں کی بدولت کئی بگڑے کام بن جاتے۔ مثلاً جو نہی گاڑی چلی تو لوگوں کی نگاہیں ہماری بغل میں اڑسے ہوئے اخباروں اور رسائل پر جم گئیں۔ کوئی ذرا کھسک کر آپ کو سیٹ دینے کے لیے جگہ بنا رہا ہے۔ کوئی ہمارے سامان کو ڈھنگ سے رکھوا رہا ہے۔ کوئی برتھ حاصل کرنے میں آپ کی مدد پر کمربستہ ہے۔ کئی مرتبہ تو انہی اخباروں اور رسالوں کی بدولت ہمیں ناشتے دان کی نعمتوں میں شریک ہونے پر بھی مجبور کیا گیا غرضیکہ مال کی قیمت مع منافع وصول ہو گئی۔ اپنے جانشین و خانہ بدوشوں کو ہمارا پرخلوص مشورہ ہے کہ سفر میں دو تین رسالے اور اخبار ہمیشہ ساتھ رکھیں کہ یہ الہ دین کا کام دیتے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ جو لوگ محض سیر تفریح کے لیے ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کر سکتے ہیں چار چار روپے کے

کولڈ ڈرنکس اور پانچ پانچ روپے کی آئس کریم بخوشی خرید کر پی اور پلا سکتے ہیں اور ہزار دو ہزار کے سوٹ اور ساڑھی کو مہنگا سودا نہیں سمجھتے وہ بھی اخبار یا کتاب کی خریداری مشکل ہی سے کرتے ہیں۔ خصوصاً اردو والے اس شان بے نیازی کا ذرا زیادہ ہی لحاظ رکھتے ہیں۔

علم سے گریز کی یہ بیماری صرف عام پڑھے لکھے متوسط طبقے یا دولتیوں کی پھیلتی ہوئی نئی نسل ہی تک محدود نہیں ہے اس کا سب سے بڑا شکار وہ لوگ ہیں جو عرف عام میں اہلِ علم اور اہلِ ادب کہلاتے ہیں۔

وہ دن اب ہوا ہوئے جب سُنا کرتے تھے کہ فلاں صاحب علم نے اپنے اجداد کی زمین اور حویلیاں بیچ کر ایک عظیم الشان ذاتی لائبریری بنا ڈالی۔ اب ان کے وارث اور نام لیوا لائبریریاں بیچ کر کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن رہے ہیں۔

مُفت خور مجاور: مُفت خوری کا مرض سب سے زیادہ ان لوگوں میں ہے۔ جو اُٹھتے بیٹھتے اردو کی کس مپرسی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے پروفیسر، نقاد، شاعر ادیب، صحافی اور لیڈر سب ہی شامل ہیں۔ یہ حضرات اردو کتابوں کے لیے بڑی بڑی گرانٹیں دیتے بھی ہیں۔ اور لیتے بھی ہیں۔ لیکن اردو کتاب یا رسالہ خریدتے ہوئے ہم نے انھیں آج تک نہیں دیکھا اکثر لکھنے والے یوں بھی بہت کم پڑھتے ہیں مگر رسالہ یا کتاب خرید کر پڑھنا ہر اعتبار سے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ ایک بہت بڑے نقاد ایک بہت بڑی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اُردو کے کئی سرکاری اداروں کے روحِ رواں بھی ہیں۔ اور دس پندرہ ہزار ماہانہ میں کھیلتے ہیں یہ صاحب ایک رسالے کے اڈیٹر سے صرف اس لیے خفا ہیں کہ اس غریب نے اُنھیں اپنے نئے پرچے کی اعزازی کاپی نہیں بھیجی۔

ایک اور صاحب نے جو اُن سے بھی زیادہ متموّل ہیں خود ہم سے شکایت کی کہ اپنا ناول ہم نے انھیں پیش نہیں کیا۔ اگر چاہتے تو یہ صاحب نہ صرف آسانی سے کتاب یا رسالہ خود خرید سکتے تھے۔ بلکہ اپنے ادارے کی لائبریری سے خرید وا کر بھی اسے حاصل کر سکتے تھے مگر صاحب کتاب پڑھنے کے لیے کون لینا چاہتا ہے۔ کتاب تو یہ دکھانے کے لیے ہوتی ہے کہ ہند و پاک کا کوئی ادیب ایسا نہیں۔ جس نے ہمیں نذرانۂ عقیدت پیش نہ کیا ہو!

مُفت کی کتاب سے محرومی کو اپنی ذاتی ہتک عزّت سمجھنے والے ان ادیبوں اور نقادوں کو بھلا کون سمجھائے کہ ہم اس بارگراں کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ عام طور پر مدّاحوں، دوستوں اور سرپرستوں کو ادیب اپنی کتاب یا تو خود چھپوا کر پیش کرتا ہے۔ یا پبلشر سے خرید کر دیتا ہے اُردو ایک ایسی عجیب زبان ہے۔ جس کا غریب ادیب کتاب چھپوانے پر بہت کچھ گنواتا ہے۔ کماتا کچھ بھی نہیں

ہمارے ہاں اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے شاعر یا ادیب کی کتاب دو چار سو سے زیادہ نہیں بکتی اور وہ بھی ان لائبریریوں اور اداروں کے طفیل جہاں انھیں کوئی نہیں پڑھتا۔ اسی ہندستان میں بنگلہ اور ملیالم ایسی زبانیں بھی ہیں۔ جہاں ایک ہی سال میں ایک ادبی کتاب کے دو تین اڈیشن نکلنا یا اس کا پانچ چھے ہزار تک چھپ جانا عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔

حفیظ جالندھری برسوں پہلے ایسے ہی ایک صاحب میری غیر حاضری میں ہمارے ہاں تشریف لائے کچھ دیر بیٹھے میری بیوی سے چند باتیں کرنے کے بعد جاتے وقت ایک ادبی رسالے کا تازہ شمارہ

اٹھایا اور بولے بھائی یہ لے جارہا ہوں ۔ پڑھ کر واپس کردوں گا ۔ ان کی بدقسمتی تھی کہ قبلہ حفیظ جالندھری مرحوم ہمارے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے پیشتر اس کے کہ ان کی مُنہ بولی بیٹی منور دیوان کچھ کہتیں وہ بول اُٹھے "میرے عزیز یہ رسالہ تم ضرور لے جاؤ مگر اپنی چپل اُتار کر یہاں چھوڑ جاؤ کہ میرے داماد کی چپل ٹوٹ گئی ہے اور وہ چپل مانگنے شاید تمہارے ہاں گیا ہے ۔ ابا جی محترم کی باتیں سن کر یہ صاحب (جو بہت بڑے سرکاری ادیب ہیں) ہکا بکا رہ گئے لیکن بڑے میاں برس پڑے ۔۔ آپ لوگ کبھی مانگے کا جوتا یا بنیان نہیں پہنتے ۔ کبھی مُفت کا سینما نہیں دیکھتے کبھی اُدھار کی لنگوٹی نہیں لگاتے ۔ لیکن مُفت کے یا اُدھار کے اخبار رسالے اور کتابیں فوراً ہضم کر لیتے ۔

تم لوگ ادیبوں کے دوست یا مداح نہیں اُن کے سب سے بڑے دُشمن ہو ۔ حفیظ صاحب نے اپنی کتابیں مُفت میں پڑھنے کے لیے کسی کو نہ دیں اس سے انھیں ادبی شہرت کے معاملے میں خاصا نقصان بھی ہوا ۔ نقادوں نے اُن کا تقریباً بائیکاٹ کر دیا ۔

لیکن اخباروں اور کتابوں کے مُفت خور قاریوں کے خلاف بیس سال پہلے انھوں نے جو بھی کہا تھا ۔ وہ آج اُردو زبان کی تلخ ترین حقیقت بن چکی ہے ●

عبدالقوی دیسنوی
صدر شعبۂ اُردو۔ سیفیہ کالج
بھوپال۔ ایم۔ پی

غریب اُردو اور ہمارا عجیب و غریب رویّہ

کتاب نما کے پرانے شماروں کو دیکھ رہا تھا کہ جون ۱۹۸۸ء کے اداریہ "اپنی بات" پر نظر پڑی اور اس کے یہ جملے ذہن میں گونجنے لگے اور دل کو مضطرب کرنے لگے:

"انجمن ترقی اردو (ہند) کے نئے صدر سید حامد کی پوری توجہ اس امر پر ہے کہ اُردو تحریک زیادہ سرگرم، زیادہ فعال اور زیادہ موثر ہو کر اپنا رول انجام دے سکے، ہمارے ادب کی بقا کا انحصار، ہماری زبان کی بقا پر ہے۔ اُردو کے راستے میں جو دشواریاں ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، ان دشواریوں سے نجات کی صورت یہی ہے کہ زبانی جمع خرچ کے بجائے ہم اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ عملی اقدامات کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ سید حامد صاحب کی قیادت اُردو تحریک کو ایک نیا مزاج عطا کرے گی۔"

اسی کے ساتھ جولائی ۸۸ ۱۹ء کے شمارے میں آپ کے اداریہ کے سلسلہ میں اپنے مراسلہ پر نظر پڑی۔ میں نے لکھا تھا:

"اس نئی قیادت سے اردو تحریک کو نیا مزاج ملے گا یا نہیں اس بارے میں کچھ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونا درست نہیں ہے لیکن دل سے دعا نکل رہی ہے کہ آپ کی بات سچ ہو"

اب سال بھر بعد ۲ ستمبر ۱۹۸۹ء کو پچھلی اُردو کے سلسلے میں تگ و دو اور کوشش و کاوش کا جائزہ لیتا ہوں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ سارے ہندستان میں (صوبۂ بہار کو چھوڑ کر) اُردو وہیں کھڑی ہے جہاں پہلے کھڑی تھی۔ بیمار، کمزور، دواؤں سے محروم، معالج کی غفلت کا شکار، نام نہاد ہمدردوں کی ہمدردیوں میں محصور، محافظوں کی خود غرضیوں میں گرفتار۔

محترمی سید حامد کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی پُر مغز تقریروں سے اُردو کے رضاکاروں، بہی خواہوں، شیدائیوں کے دلوں کو گرماتے رہے اور واہ واہ سے لطف اندوز ہوتے رہے اور اطمینان کا سانس لیتے رہے کہ اُردو کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ تازہ شمارہ ہماری زبان ۸ ستمبر کا آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ سید حامد صاحب لکھتے ہیں:

"اُردو والوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، بلکہ کچھ اور بھی۔ ایک طرف وہ بے حسی کے جال میں پھنس گئے جس سے نکلنا اور کوئی مفید مطلب کام کرنا بالعموم ممکن نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ان میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو بغیر آنکھ جھپکائے رات کو دن کہنے کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔

انھیں حلقہ گروں میں ساز دلبری نظر آتا تھا اور ساز کے مفہوم کو بدلتے ہوئے اس ساز کی
آواز کو بند قفس کرنے میں انھیں کوئی باک نہ تھا۔ یہ ابنائے وقت مرکز اور اصل سے بے تعلق تھے
انھیں حواشی اور فروع سے سروکار تھا۔ انھوں نے اپنی مثال سے ثابت کر دیا کہ یہ کہنا غلط ہے
کہ حکومت کی پالیسی نے اردو کا ناتہ روزگار سے توڑ دیا، انھیں تو اردو ہی نے روزگار دلایا"

آگے لکھتے ہیں :

"عبرت کا مقام ہے کہ اردو کے بعض نمایندوں اور سربراہوں نے ان موٹی موٹی باتوں سے
اغماز برتنا شروع کیا اور فروعی موشگافیوں اور ارزاں شکر گزاریوں کو اپنا شیوہ بنایا۔"

اور ـــ "ہوا یہ کہ دورِ انحطاط میں بعض کیمیاگروں نے اردو زبان کے زوال کو اپنے ذاتی عروج اور
معاش کا ذریعہ بنا لیا۔ اور یہ بات اتنی عام ہوگئی کہ غایت اشتہار کی بنا پر موردِ توجہ ہی نہ رہی
یہ بات مسلمات میں سے تھی کہ اردو کا جھنڈا لیکر جو شخص کھڑا ہوگا، چند مستثنیات سے
قطع نظر، وہ جھنڈے کو ذاتی ارتفاع کا زینہ بنا کر دم لے گا۔ ان حضرات کا رویہ بعض اوقات
ٹریڈ یونینوں کے بعض عہدہ داروں سے ملتا تھا جو احتجاج مزدوروں کی طرف سے کرتے
ہیں اور داد مل مالکوں کی طرف سے پاتے ہیں لیکن ٹریڈ یونینوں میں ایسی مثالیں کم ہیں
اور اردو سربراہوں میں بے شمار کہ شعار ہی ان کا یہی ہے"

اور بات یہاں تک پہنچتی ہے :

"..... اردو کے رہنماؤں اور ترجمانوں کا قافلہ بھیس بدل بدل کر مراحمِ خسروانہ سے
مختلف سطحوں پر فیضیاب ہوتا رہا اور اردو کی جان پر بنی رہی"

سید حامد صاحب نے "رہنماؤں کو چھوڑ کر" عام لوگوں کے لیے بھی یہ بات کہی ہے :

"... اپنے بچوں کو گھر پر اردو نہیں پڑھائیں گے، پڑوس میں نہیں پڑھوائیں گے، مگر کس
کے میدان میں خود نہیں اتریں گے"

یہ بات "رہنماؤں کو چھوڑ کر" کیوں کہی گئی ہے۔ عوام سے زیادہ یہ بات تو انھیں پر صادق آتی ہے۔ ان کے گھروں
میں عام طور سے اردو کے چراغ گل ہو رہے ہیں۔ بے چارے عام لوگ تو اپنے چہیتے رہنماؤں کے نقشِ قدم پر چلنے
کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اپنے رہنماؤں کی طرح انھیں ابھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ نہ وہ ان کی طرح
اپنی مادری زبان کے معاملے میں بے راہ روی پر انعام واکرام پاتے ہیں، نہ مسندِ صدارت اور نظامت سے نوازے
جاتے ہیں نہ وہ اپنی خود غرضیوں اور چالاکیوں کا خراج وصول کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں
کے اردو اساتذہ کے بارے میں سید حامد صاحب رقمطراز ہیں :

"... کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو پڑھانے کے لیے مامور ہوئے، انھوں نے
زبان کی بقا اور اشاعت و ترویج کی فکر سے اپنی آسایش اور طمانیت پر ایک پل آنچ
آنے نہ دی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بعض سال خوردہ اور جہاں دیدہ اور شہرت گزیدہ
پروفیسروں کا گزر شاذ ہی لکچر روم کی طرف ہوتا تھا۔ مدرسے کے معلموں کی طرح محنت
اور باقاعدگی سے پڑھانا ان کے لیے کسرِ شان تھا"

جی نہیں بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آپ کا گزر صرف پروفیسروں وہ بھی سالخوردہ پروفیسروں تک ہی ہوا ہے۔ نے اساتذہ بھی ان سے کسی بات میں پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ پڑھانے لکھانے سے زیادہ وہ تعلیم گاہ اور بیرونِ تعلیم گاہ کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں گروہ بندی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کلاس میں نہ جایا جائے تو بھی گروہ کے لوگ ہر جگہ کہتے رہیں گے کہ وہ برابر کلاس لیتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے اگر تعلق نہیں رکھتا ہے تو بھی اس کے ساتھی اس کے لکھنے پڑھنے کی تعریف کریں گے، اور اس کے غبی ہونے کے باوجود اس کی ذہانت اور ذکاوت کے چرچے ہوں گے۔ پڑھنے پڑھانے کا وقت تعلیم گاہوں سے بچا کر وزیروں، سکریٹریوں اور شہر کے دوسرے اہم لوگوں کی خدمت میں لگاتے ہیں تاکہ اچھے وقت میں ان سے فائدہ حاصل کریں اور بُرے وقت میں ان سے کام نکال سکیں۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ ایسے اساتذہ کی شان آن بان کچھ اور ہوتی ہے۔

اور اُردو کے وہ اساتذہ جو ایمان داری سے اُردو کی خدمت کرتے ہیں وہ بے چارے شرمندہ شرمندہ رہتے ہیں کہ گھر میں بچے اور بیوی بھی ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے باہر تو وہ بے قیمت رہتے ہی ہیں۔ یہاں کہ اُردو اکیڈمیاں، اور دوسری انجمنیں بھی نہیں پوچھتی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے دروازے بھی ان کے لیے بند ہیں اور ترقی اردو بورڈ، تو وہاں تک پہنچنے کے لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ ادارے تو اُن لوگوں کے لیے ہیں جو ان کے اداروں کے لیے نہیں ان کے کارکنوں کے لیے مُفید ہوں۔

پچھلے ہفتہ ۲۶ اگست ۱۹۸۹ء کے بلٹز میں فضیل جعفری صاحب نے "عالمی مراٹھی کانفرنس۔ اردو والوں کے لیے ایک سبق" کے تحت تحریر کیا ہے:

"اس کانفرنس کی سب سے روشن خصوصیت تھی ادب اور ادیب کی قدر و منزلت۔ چنانچہ مرکزی وزراء کابینہ شری نرسمہا راؤ اور شری وسنت ساٹھے نیز مہاراشٹر کے وزیر اعلا شری شرد پوار کی موجودگی کے باوجود کانفرنس میں حقیقی اور سب سے زیادہ اہمیت گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر شری وی وی شرواڑکر (کسما گرج) کو ہی حاصل تھی۔

لیکن اُردو میں اس طرح کی کوئی بات اس لیے نہیں پائی جاتی کہ فضیل جعفری صاحب کے لکھنے کے مطابق:

"ایک طرف تو اُردو والے زبردست قسم کے احساس کمتری کے شکار ہیں دوسری طرف اردو سے متعلق ہر شخص جس کی کوئی حیثیت ہے اپنی روٹی پر دال گھسیٹنے پر مصروف ہے۔"

"اسی ذہنی رویے کا فیض ہے کہ ہم ہر چیز کو محض دوستی اور دُشمنی کے معیار پر پرکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے یہاں دوستی کا مطلب ہے چاپلوسی اور خوشامد، اختلاف رائے کو دُشمنی پر محمول کیا جاتا ہے۔"

"ہمارے یہاں تو وزیروں، سفیروں اور امیروں کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنا ایمان کا جزو سمجھا جانے لگا ہے۔ اگر آپ جلسے میں موجود، یا جلسے کے صدر وزیر محترم کی کسی بات سے اختلاف کا اظہار کریں تو اسے نہ تو وزیر موصوف برداشت کر پاتے ہیں اور نہ ہی منتظمین جلسہ۔"

فضیل جعفری صاحب کی اردو سے متعلق یہ ساری باتیں نہایت اہم اور غور طلب ہیں لیکن انھوں نے بے چارے وزیروں کے ہی متعلق بدگمانی کیوں ظاہر کی اردو کے ہر ادارے کا یہی حال ہے چاہے وہ ترقی اردو

بورڈ ہو، چاہے انجمن ترقی اردو ہو، چاہے اردو اکیڈمی ہو۔ سچی اور اچھی بات تو انھیں برداشت سے ہی نہیں۔ ہر جگہ گروہ بندی ہے اور ان سے وابستہ اُن کے مفادات ہیں۔

ترقی اُردو بورڈ کا دعوا ہے کہ اس نے ملک میں غالباً چالیس کتابت اسکول قائم کیے ہیں۔ جہاں غالباً ہر سال ۸۰۰ کاتب تیار ہوتے ہیں۔ یہ عمل تقریباً ۸ سال سے یا اس سے زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔ پھر کاتبوں کی کمی کیوں ہے؟۔ کبھی اس نے اپنے مراکز سے حقیقت جاننے کی کوشش کی؟ یہ قومی سرمایہ ضائع ہو رہا ہے یا واقعی کاتب تیار ہو رہے ہیں۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اراکین نے کبھی اسے ہندستان گیر بنانے کی کوشش کی ہے؟ اور بہار کی انجمن ترقی اردو کی طرح گھر گھر پہنچنے میں کامیابی حاصل کر سکی ہے۔ اسے اُردو عوام سے دُور رکھنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے۔ اردو عوام کے دل میں یہ بات کیوں نہیں پیدا کی جاتی کہ یہ ادارہ ان کا اپنا ہے اور انجمن کا ہر فیصلہ ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ اور انجمن کا آگے بڑھنے والا ہر قدم ان کا اپنا قدم ہے۔

اردو اکادمیوں کو بھی اردو کے مُفید کام کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اُردو کے ادیبوں، فن کاروں، اساتذہ اور طلبہ اور انجمنوں اور رہنما کاروں سے تعلق رکھنا چاہیے۔ اور ہر ممکن تعاون دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کے سبھی اداروں، تعلیم گاہوں، فنکاروں، اُستادوں، خدمت گزاروں، مادری زبان کا دعوا کرنے والوں، طالب علموں کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اپنی زبان کو بچانے کے لیے اور اس کی قدر وقیمت میں اضافہ کرنے کے لیے اتحاد و اتفاق، اخلاص و ایثار سے کام لیں اردو کی خدمت کے لیے آگے بڑھیں کرسی حاصل کرنے اور اپنی خدمت کے لیے مظلوم اُردو اور پریشان حال اردو والوں کی پریشانی میں اضافہ نہ کریں۔ ان کی اردو کے لیے یہ خدمت بھی بڑی ہوگی کہ وہ اردو کا دامن چھوڑ کر کسی اور زبان کا دامن پکڑیں جس سے انھیں اپنے مقصد میں بڑی کامیابی ہو اردو تو خود مدد کی طالب ہے، ان کی شہرت اور عزت کے سلسلے میں کیا مدد کر سکے گی۔ خدا کے لیے وہ یہ سوچنا چھوڑ دیں :

میں چمن میں چاہے کچھ نہ کروں میرا حق ہے فصل بہار پر

—— میں نے جولائی ۱۹۸۸ء کے مراسلے میں لکھا تھا کہ اردو :

"اس طرح زندہ رہ سکتی ہے جس طرح ہندی والوں نے ہندی کو زندہ رکھا ہے"

لیکن اب میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اردو والوں کو ہندستان کی دوسری زبانوں کے بولنے والوں سے سبق لینا چاہیے کہ وہ اپنی مادری زبان کو اپنے خون سے بھی سینچنے سے دریغ نہیں کرتے۔ چھوڑنے اور نقصان پہنچانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ

"اردو کو اپنے بولنے والوں کی محبت کی زیادہ ضرورت ہے وہ انھیں کے تعاون سے زندہ رہ سکتی ہے"

اردو والوں کو صوبہ بہار سے سبق لینا چاہیے اور باعمل بننا چاہیے —— ●●●

حکیم محمود احمد برکاتی
۲۴۶/۱۵۔ دستگیر سوسائٹی
کراچی ۳۸

بسمل خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی

حافظ محمد حسین بسمل خیرآبادی اب تو بھلا دیے گئے ہیں، لیکن اپنے دور میں وہ معروف شاعر تھے، علامہ فضل حق خیرآبادی کے نواسے تھے۔ علامہ کی سب سے بڑی صاحبزادی سعید النسا، سید احمد حسین رسوا کے عقد میں تھیں، یہ بڑی عالمہ فاضلہ تھیں، شعر بھی کہتی تھیں، حرماں تخلص تھا۔ ان کے چند فارسی اور اردو اشعار جو ضائع ہونے سے رہ گئے ہیں یہاں درج کرتا ہوں تاکہ یہ بھی ضائع نہ ہو جائیں:

آئنہ پیش تو اے دوست رسیدن نہ دہم
رشک من بیں کہ ترا ہم بتو دیدن نہ دہم
درد عشق تو نگویم بطبیباں ہرگز
گر جنوں دست دہد جامہ دریدن نہ دہم
گر حنا خوں شود از شوق قدم بوسی تو
بوسہ ہرگز بکف پائے تو چیدن نہ دہم

نالہ کرنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے
خانۂ یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں
جیسا اشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

دردِ دل، دردِ جگر، کاوشِ دل، کاہشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجا میرا

اب لذتِ دردِ جگری پوچھتے کیا ہو　　جب تم ہو نمک پاش تو پھر کیوں نہ مزہ ہو

میری سرگشتگیِ بخت کو لکھتے لکھتے
آخرش کاتبِ اعمال کو چکّر آیا

کیا کیا مجھ کو قتل قاتل، ہُوا ہوا خون مجھ حزیں کا
ترا گریباں نہ کوئی پکڑے ہو تو دھو ڈال آستیں کا

حرماں کے شوہر سید احمد حسین رسوا، ریاست ٹونک کی طرف سے متعدد ریاستوں میں سفیر رہ چکے تھے، رسوا کے والد اور بسمل کے دادا تفضّل حسین خاں بھی ریاست کی طرف سے وکیل تھے، تفضّل حسین خاں اپنے عہد کی ایک اہم شخصیت تھے، اپنے دور کے اکابر ادب سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ مومن خاں سے خاص تعلق تھا۔ انھوں نے مومن کے بیٹے احمد نصیر کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ انشائے مومن میں ان کے نام مومن کے کئی خط ہیں۔ مومن نے ان کے ایک سفر (۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۱ء) کی تاریخ کہی ہے۔ ان کے ایک باغ کی تعمیر (۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کی تاریخ کہی ہے، ان کے مکان کی تعمیر کی تاریخ کہی ہے، ان کے بیٹے میر نواب کی شادی کی تاریخ کہی (۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) تفضّل حسین کے مرزا غالب سے بھی تعلقات تھے، "سبد باغ دو در" میں ان کے نام سات خط ہیں۔ تفضّل حسین خاں علّامہ فضل حق کے سمدھی تھے۔ ان کے بیٹے احمد حسین رسوا سے علّامہ کی بیٹی سعید النسا منسوب تھیں۔ جن سے محمد حسین بسمل اور افتخار حسین مضطر پیدا ہوئے گویا بسمل اور مضطر علّامہ کے نواسے تھے اور تفضّل حسین خاں کے پوتے۔ تفضّل حسین خاں کا انتقال ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا۔ ان کے بیٹے میر نواب سن ستاون کے ہنگامہ جہاد میں مجاہدین کی طرف سے دہلی کے گورنر مقرر کیے گئے تھے (غدر کی صبح و شام ص: ۱۰۲)۔

بسمل کی ولادت تقریباً ۱۸۴۸ء میں ہوئی تھی، حفظ قرآن کے بعد ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے پائی جب درسِ نظامی کی تحصیل کا آغاز ہوا تو اپنے فاضل روزگار نانا علّامہ فضل حق کے پاس دہلی بھیج دیے گئے، جہاں ان کے ساتھ بارہ دری شیر افگن خاں میں رہنے لگے۔ سن ستاون کے جہاد آزادی کی قیادت کے جرم میں سزایاب ہو کر علّامہ تو انڈمان بھیج دیے گئے مگر بسمل اپنے ننہال میں ہی رہتے تھے اور اب نانا کے بجائے ان کے عزیز دوست مرزا غالب سرپرستی کرنے لگے۔ مرزا غالب اور علّامہ کے مکانات قریب قریب ہی تھے۔ بارہ دری شیر افگن خاں سے سو دو سو قدم کے فاصلے پر وہ مسجد تھی۔ جس کے ہم سایہ مرزا غالب تھے۔ بسمل علّامہ کی طرح مرزا غالب کو بھی نانا جان ہی کہتے تھے اور ان ہی کے زیر تربیت تھے۔ ۱۸۶۰ء میں شیخ محمد ریاض الدین امجد سندیلوی نے اپنے سفرنامہ "سیر دہلی" میں لکھا ہے:

"(مرزا غالب کے پاس) ایک لڑکا خیرآباد کا رہنے والا، آفت کا پرکالہ،

مولوی فضل حق کا نواسا، بسمل میں نوشا نا، قلبی میر قلبی پڑھتا، بات بات پر لڑتا
جھگڑتا رہتا۔ ۴۹ احوال غالب از مختار الدین احمد آرزو)۔

بسمل ۱۸۷۱ء کے قریب، بیس بائیس سال کی عمر میں ٹونک پہنچے۔ ریاست ٹونک سے ان کے متعدد بزرگوں کا تعلق رہا تھا، ان کے والد (رسوا) اور چچا (سید ضامن علی) ریاست کے سفیر تھے۔ دادا (تفضل حسین خاں) ریاست کے وکیل رہے تھے۔ دادا کے ماموں برکت علی خاں (ف ۱۸۴۳ء) وکیل رہے تھے۔ دادا کے بھائی ارشاد حسین خیرآبادی وکیل رہے تھے، نانا کے عم زاد الٰہی بخش نازش (ف ۱۸۷۴ء) سفیر و وکیل رہے تھے۔ ان ہی تعلقات کی بنا پر بسمل ٹونک پہنچے تھے۔ چنانچہ والی ٹونک کے میر منشی (پرائیوٹ سکریٹری) مقرر ہوئے۔ ایک مدت کے بعد ریزیڈنسی (کوہ آبو) میں وکیل مقرر ہوئے۔ والی ریاست (نواب ابراہیم علی خاں) کے مشیر سخن (استاد) بھی رہے اور ملک الشعرا، لسان الملک کا خطاب بھی پایا۔ نازک مزاجی کی بنا پر کئی بار ملازمت ترک بھی کر بیٹھے تھے۔ ایک بار ناخوش ہوکر وطن واپس چلے گئے۔ ریاست کی طرف سے تنخواہ بھیجی گئی تو منی آرڈر واپس کر دیا۔ آخرکار ایک سال بعد قدر شناس نواب نے ایک موثر وسیلہ اختیار کرکے منالیا۔ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں اجمیر میں وصال ہوا اور جامع التمش (ڈھائی دن کا جھونپڑا) کے عقب میں دفن کیے گئے۔

(ص: ۴۸۳ "ومابعد" غالب نام آورم" از نادم سیتاپوری، ص: ۱۰۰ "خیرآباد کی ایک جھلک" از مولانا نجم الحسن سیتاپوری، ص: ۴۲۷ "حدیقۂ راجستھان" از علی اصغر آبرو، ص: ۶۹ "باغی ہندستان" از مولانا عبدالشاہد خاں شروانی، "تاریخ ٹونک" از اعجاز محمد خاں)۔

بسمل کی شادی اپنے ماموں علامہ عبدالحق خیرآبادی کی صاحبزادی بی بی عائشہ سے ہوئی تھی۔

ٹونک میں بسمل کا حلقۂ احباب وہاں کے امرا، شرفا، سخن وروں اور اہل علم پر محیط تھا۔ ان میں سے مولانا سید برکات احمد اور مولوی عبدالرحمٰن[1] سکریٹری کونسل ریاست سے خصوصی اور پُرخلوص و بے تکلف مراسم تھے۔ مولانا سید برکات احمد کو ان سے ایک نسبت بھی تھی جس کی ان کے نزدیک خاص اہمیت تھی۔ بسمل ان کے استاد گرامی علامہ عبدالحق کے خواہرزادہ اور داماد تھے۔ بسمل بھی مولانا سے قلبی محبت رکھتے تھے اور باہم اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ بسمل کو کبوتر بازی کا بھی شوق بلکہ جنون تھا۔ مولانا کو یہ بات پسند نہیں تھی مگر وہ اس سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ ایک زمانے میں بسمل کے اہل و عیال خیرآباد گئے ہوئے تھے وہاں ان کے ایک جواں سال فرزند ایک شدید مرض میں مبتلا تھے۔ خیرآباد سے مرض میں شدت، علاج کی ناکامی اور ضعف و نقاہت میں اضافے کی خبریں آرہی تھیں۔

---

[1] مولانا حکیم نصیرالدین ندوی (رفقائی دواخانہ کراچی) کے جدِ امجد۔

سے مایوسی ہورہی تھی۔ مولانا سید برکات احمد اور مولوی عبدالرحمن دوسرے تیسرے روز بچے کی خیروعافیت معلوم کرنے بسمل کے یہاں جایا کرتے تھے۔ ایک روز یہ حضرات پہنچے تو بسمل کو بہت مغموم اور صدمے سے نڈھال پایا۔ وہ رنج و محن کا پیکر بنے بیٹھے تھے۔ یہ رنگ دیکھ کر ان حضرات نے سوچا کر شاید حادثہ رونما ہوگیا اور بچہ گزر گیا۔ مگر احتیاطاً دریافت کیا کہ خیرآباد سے خیروعافیت کا خط آیا؟ اس کے جواب میں بسمل خاموش رہے اور کچھ دیر بعد خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئے:

"کیسا جوان رعنا تھا، کس قدر حسین
کیسی موہنی صورت پائی تھی، کیسی
پیاری ادائیں تھیں، کس محبت اور
کس لاڈ پیار سے میں نے اسے پالا تھا"

ان دکھ بھرے الفاظ اور بسمل کے مغموم چہرے سے ان حضرات کا گمان یقین میں بدل گیا کہ جس خبر کا دھڑکا تھا وہ آگئی اور بسمل کے جواں سال فرزند جاں بر نہ ہوسکے۔ اس تاثر سے یہ حضرات بھی مغموم ہوگئے۔ بسمل کا سلسلہ خود کلامی جاری تھا:

"آج مجھے اس کی ایک ایک ادا یاد آکے تڑپا رہی ہے، اس کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ اس کی موہنی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے داغ جدائی دے جائے گا۔ میں تو اس غم سے نیم جاں ہورہا ہوں"

یہ پُر درد کلمات سن کر اور بسمل کی یہ حالت زار دیکھ کر ان لوگوں کی بھی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور بسمل کی تسکین قلب اور تلقین صبر کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بسمل نے پھر "مرحوم" کے محاسن و اوصاف کا بیان شروع کیا اور کہنے لگے:

"اس کی کس کس خوبی کا ذکر کروں، اس کی تو ہر ہر ادا دل کش تھی۔

وہ جب اڑان بھرتا تھا..."

ہیں! "اڑان! کون؟ مولوی عبدالرحمن چیخ پڑے۔

"وہی میرا لقا کبوتر" بسمل نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "لاحول ولاقوۃ" مولوی صاحب گرجے، "ہم بچے کی خیروعافیت دریافت کرنے آئے ہیں اور یہاں مرحوم و مغفور لقا کا مرثیہ نثر کیا جارہا ہے" اور سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ معلوم ہوا کہ تازہ خبر کے مطابق خیرآباد میں جواں سال فرزند روبہ صحت ہے۔

بسمل کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ان کی والدہ (حرماں) اور مرزا غالب کے حسن تربیت نے جلا دی۔ بعد میں انھیں امیر مینائی سے نسبت تلمذ رہی۔ کیسی حسرت ہوئی ہے یہ سوچ کر کہ جس شخص نے برسوں والی ٹونک کی طرف سے سیکڑوں غزلیں کہی ہوں، بکثرت امرائے ٹونک کے لیے استادی کے پردے میں خود شعر کہتا رہا ہو، دیوان کے دیوان اپنے صاحب

ثروت شاگردوں کے لیے مرتب کر دیے ہوں، خود اس کے شعر نایاب ہوگئے ہوں اور سو دو سو شعر بھی دستیاب نہ ہوں، اُن کے برادر زادہ جاں نثار اختر مرحوم سے کئی بار تقاضا کیا کہ ان کا دیوان مرتب کر دیں۔ خود اختر کو ہزاروں شعر یاد تھے اور کہتے تھے کہ میرے پاس ان کا کلام محفوظ ہے۔ فرصت ملے تو یہ کام کروں، مگر اس قسم کی فرصت ان کو کبھی نہیں ملی، بہر حال چند شعر جو مل سکے ہیں:

کٹے گی رو رو کے رات ساری، تڑپ کے اب دن تمام ہوگا
لگا کے دل یہ کسے خبر تھی کہ ہائے جینا حرام ہوگا
جناب خواجہ کا آستانہ ہے بے کسوں کے لیے ٹھکانا
جو بسمل اپنا ہے آب و دانہ تو چل کے واں پر قیام ہوگا

ہیں بدن میں زخم ہزار ہا، وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں
مرے درد کو تو نہ پوچھیے کہوں کیا کہاں ہے کہاں نہیں
یہ الم یہ صدمہ و رنج و غم وہ لے لب پہ آہ و فغاں نہیں
وہ دہن ہوں جس میں زباں نہیں وہ زباں ہوں جس میں بیاں نہیں
وہ نگاہِ ناز پڑی جدھر سبھی بزم ہوگئی بے خبر
کوئی خاک پر ہے تڑپ رہا، کسی خستہ تن میں جاں نہیں

مضطر خیرآبادی

بسمل کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی تھے۔ ۱۲۷۲ھ/۵-۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے لفظ "افتخار" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنی عالمہ و فاضلہ والدہ سے حاصل کی، پھر دوسرے اساتذہ سے تحصیل علم کر کے ریاست ٹونک کا رخ کیا۔ ریاست نے انھیں سفیر بنا کر ریزیڈنسی (کوہ آبو) میں متعین کر دیا، پھر ریاست کے ایک ضلع نیماہیڑہ میں ناظم عدالت دیوانی بنا دیے گئے۔ بڑے بھائی بسمل کے بعد والیِ ریاست کے مشیر سخن بھی رہے اور اس کی وجہ سے بیشتر امرائے ریاست بھی ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ افتخار الشعراء اعتبار الملک کے خطاب ملے تھے۔ کسی وجہ سے ٹونک کی ملازمت چھوڑ کر گوالیار چلے گئے، وہاں جج اور مجسٹریٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ وہاں سے بھوپال جا کر محکمۂ جنگلات کے سکریٹری ہو گئے، پھر اندور چلے گئے وہاں جاگیروں کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں خیرآباد چلے گئے اور کہنہ و طحال کی شکایات میں مبتلا رہے۔ آخر میں پھر گوالیار لوٹ گئے اور ۲۶ ر رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۷ء) کو انتقال فرمایا۔ "حیاتِ جاوداں" مادہ تاریخ وفات ہے۔

مضطر کو شعر و سخن کا ذوق والد اور والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ ابتدائی مشق بھی والدہ کی نگرانی میں کی پھر امیر مینائی سے استفادہ کیا۔ شعر گوئی کا ملکہ عطا ہوا تھا، پُرگوستھے

وہ ملک کے غیر موزوں طبع مگر باذوق امرا کو کثرت سے غزلیں لکھ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ اشعار کی تضمین کا خاص ذوق اور ملکہ تھا۔ قدسی کی نعت۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی

کی تضمین کی تھی جو معروف و مقبول ہوئی۔ فارسی اور اردو کے ساتھ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ حمدیہ اور نعتیہ مجموعہ ہائے کلام "نذر خدا" اور "نیاز مصطفٰے" کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ خواجہ بزرگ اجمیری کی منقبت میں بھی کثرت سے شعر کہتے تھے۔ اجمیر شریف اکثر حاضر ہوتے تھے۔ اور وہیں قیام کی آرزو رکھتے تھے:

غزلوں کا ضخیم مجموعہ جاں نثار اختر کے پاس تھا، معلوم نہیں اب کہاں ہے۔ چند شعر:

توڑ کر تختۂ مرقد کو نکل آؤں گا
بے کسی نام نہ لینا سرِ مدفن ان کا

وقت بگڑا تو کوئی حال کا پُرساں نہ ہوا
میرا سایہ بھی شریکِ شبِ ہجراں نہ ہوا

نقدِ جاں، جلوۂ جاناں پہ تصدق کردو
جب میں جانوں گا کہ مضطر ہو بڑے دل والے

دمِ آخر مرے بالیں پہ ہے مجمع حسینوں کا
پھر آنا اے قضا اس وقت پردہ ہو نہیں سکتا

لگائے سیکڑوں تیرِ نظر اس نے کلیجے پر
بس اب چلنے کو تیغِ ابروئے خم دار باقی ہے

کہیں جی لگا نہ امنگ میں، کٹی عمر ایک ہی رنگ میں
وہ سحر ہوں جس کی نہ شام ہے وہ ہوں شام جس کی سحر نہیں
نہ کسی کا جوشِ شباب ہوں نہ کسی کا نام و خطاب ہوں
میں وہ پچھلی رات کا خواب ہوں کہ جو یاد وقتِ سحر نہیں

مضطر کے ہندی اشعار میں ان کا یہ گیت بہت مشہور رہا:

چھا گئی کالی گھٹا جیا مورا گھبرائے ہے

ایک اور گیت:

او جگ داتا! داتا جگ کے! او پرکھن ہارے رنگ رنگ کے!

او مالی گلزارِ جہاں کے | او گلچیں صحن بستاں کے
کانٹوں سے تو پھول نکالے | پھولوں میں تو کانٹے ڈالے
او بن گن کے ناو کھویا ! | او بیڑے کے پار لگیا !

ٹونک میں جب عدالت دیوانی کے ناظم (مجسٹریٹ) مقرر ہوئے تو کہا:
"جس عدالت کا میں ناظم ہوں وہ دیوانی ہے"۔ اپنے عدالتی فیصلوں میں بھی اشعار استعمال کیا کرتے تھے۔

مضطر کے کئی صاحبزادے تھے۔ ان میں سے ایک تو مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار حسین اختر تھے، جن سے جب بھی مضطر کا ذکر آتا تو چونکہ حافظہ ایسا قوی پایا تھا کہ میں نے اس کی چند مثالیں زندگی میں دیکھی ہیں، مضطر کے سیکڑوں اشعار بلکہ پوری پوری غزلیں سنا دیا کرتے تھے مگر افسوس کر قدر شناس نہیں تھے۔ والد اور چچا کے محفوظ مگر غیر مرتب کلام کو مرتب اور شیرازہ بند نہیں کیا۔ دوسرے صاحبزادوں کے نام اعتبار حسین برتر، یاور حسین نشتر اور ایک کا نام محفوظ نہیں رہا۔ تخلص بھائیوں کا ہم قافیہ خوشتر تھا۔ ●●

غزلیں

عین تابش
محلہ شاہ ہارون
پوسٹ سہسرام
روہتاس (بہار)

نہ غم سے کوئی سبیل نکلی نہ کوئی ابرِ وصال اُترا
جلائیے خیمۂ جنوں کو کہ نشۂ احتمال اُترا

وہ بے ہنر تھے کہ جب کبھی کوچۂ ہنر میں صدا لگائی
ثمر یہ پایا کہ داغِ دل بن کے کوئی تازہ سوال اُترا

ورق پہ خطِ نگار کھینچا بدن پہ زخمِ بہار لکھا
وہ افترا تھا کلامِ ناگفتنی بھی کچھ باکمال اُترا

تمام تھے جسم و جاں سلامت مگر غمِ امتحاں سلامت
کہ موسمِ تازہ کار بھی دل پہ بن کے گردِ ملال اُترا

کبھی جو بیٹھے کہ اتفاقاً ہی شوق کی محفلیں سجائیں
تو قطرۂ اشک کے بہانے عرقِ عرقِ انفعال اُترا

یعقوب یاور کوئی
نگار فوٹو اسٹوڈیو
چرچ روڈ۔ بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۸

بڑا مشکل عمل تھا یار کھونا
چلو اچھا رہا کردار کھونا

درختوں کی نوازش ساحری ہے
ٹھہر جانا بھی ہے رفتار کھونا

ترے ہاتھوں سنہری آگ خوش ہے
مری قسمت میں ہے گھر بار کھونا

یہی شے زندگی کی ہے مسرت
تو پھر کیوں میر کا آزار کھونا

زمانہ چپ ہے یاور آگہی پر
یہ چپ ہے جرأتِ اظہار کھونا

ڈاکٹر سید محمود دیوآن
(لندن)

وحشت سے دل میں درد تھا، ہجراں نصیب تھے
اب سوچیے ہم آپ سے کتنے قریب تھے

طوفاں نے یہ سمجھنے کا موقع ہی کب دیا
ساحل قریب تھا کہ سفینے قریب تھے

ماضی کی تلخیوں کا مزہ بھولتا نہیں
دل میں امنگ تھی تو وہ دن بھی عجیب تھے

زہرابِ حادثات کو امرت نہ کہہ سکے
جینا تو ٹھیک تھا مگر ہم ہی عجیب تھے

کانٹوں پہ نیند آگئی شعلوں پہ چل دیے
ہم بھی جنونِ عشق میں کتنے عجیب تھے

تاریخِ عشق پڑھ کے یہ اکثر ہوا گماں
ہم سے بھی اس جہان میں کچھ بدنصیب تھے

دیوآن اس نگاہِ کرم میں کمی نہ تھی
بد کیا کریں جو بیچ میں حائل رقیب تھے

کیلاش ماہر
۱/۱-۱ اے وکرم وہار
نئی دہلی ۲۴

غزل

اب کے ہوگا نہ تماشا کوئی ہونے والا
جا چکا خون میں پوشاک بھگونے والا!

اہلِ غم، سارے سکندر کی طرف جا بیٹھے
اب سرِ دار چراغاں نہیں ہونے والا

جس سے تا حشر رگِ جاں میں اُجالا رکھتے
داغ ہوتا کوئی بے داغ نہ ہونے والا!

تک رہا ہوں بڑی حسرت سے بڑی مدت سے
گھر کی دہلیز پہ بیٹھا ہے کھلونے والا!

میرِ منزل بھی تباہی کا سبب کیا جانے
دُور بیٹھا ہے سفینے کو ڈبونے والا!

تم بھی اس شہر میں بن جاؤ گے پتھر جیسے
ہنسنے والا ہے یہاں کوئی نہ رونے والا

خواب در خواب ہے وہ تیرہ شبی کا موسم
تو بھی آئے تو چراغاں نہیں ہونے والا

چادرِ گل کے پرستار! کہاں ہو ماہر
ڈھونڈتا ہے تمھیں صحرا میں بچھونے والا!

بلقیس ظفیر الحسن
۷۳- شاستری اپارٹمنٹ
بلڈنگ نمبر ۲- مول دینا روڈ پونا

غزل

بجھ بجھ کے جل رہی ہے، دھواں ہو رہی ہے آگ
کیوں گیلی لکڑیوں کو جلانے چلی ہے آگ

سوزِ وفورِ اشک کے پھونکے ہوئے ہیں ہم
کس کو خبر تھی پانی کے اندر چھپی ہے آگ

ایسا جلا ہے دل کہ نشاں تک نہیں رہا[1]
اب کیا کُرید! راکھ ہوئے پر بجھی ہے آگ

وہ قربتوں کی نرم تمازت کدھر گئی؟
اس بار سردیوں میں ٹھٹھری ملی ہے آگ

چنگاریوں کا کھیل ہمیں راس ہی نہیں
ہر بار ہی کہیں نہ کہیں لگ گئی ہے آگ

رگ رگ کو دل کی چھیڑ گیا چودھویں کا چاند
جلتا ہے داغ داغِ جگر، چاندنی ہے آگ

گھر راکھ ہو رہا ہے بجھانے کو آئے کون؟
اک بحث درمیاں ہے کہ کس سے لگی ہے آگ!

یوں ہی تو کوئی خاک نہیں ہوتا اس طرح
بلقیسؔ دل میں تیرے کہیں تو دبی ہے آگ

---

[1] کیسے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے
کیسے کہوں کہ تھی تو مگر بجھ گئی ہے آگ
(شمس الرحمٰن فاروقی)

عزیز بھارتی
۱۰۱/۹۲۲-۱-۱۲، آصف نگر
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸

غزل

بات ہم نے کھری کھری کر لی
وقت سے آج دشمنی کر لی

اک ستارہ بھی، اس کا نہ اُگا
ختم آنکھوں میں، رات بھی کر لی

یہ نہ سوچا کہ وہ عدو ہے مرا
وقت سے تم نے دوستی کر لی

پونچھ کر اشک، ایک دوجے کے
ہم نے امدادِ باہمی کر لی

بات بڑھ کر، نہ آگ ہو جائے
اختیار ہم نے خامشی کر لی

اُن کی یادوں کے جگنوؤں سے عزیز
بند مٹھی میں، روشنی کر لی

غزلیں

عرفان پربھنوی
بھوئی گلی پربھنی ۴۳۱۴۰۱

جب کوئی زندگی کی دعا دے گیا مجھے
"اِک پھول کھل کے درسِ فنا دے گیا مجھے"

تھا سامنے تو اُس کی مجھے کچھ خبر نہ تھی
وہ کھو گیا تو اپنا پتا دے گیا مجھے

ملتا نہیں کسی سے بھی آئینے کے سوا
جاتے ہوئے وہ اپنی ادا دے گیا مجھے

آنکھوں سے نیند کی وہ شناسائی اب کہاں
اک شخص جاگنے کی سزا دے گیا مجھے

ہر رات ایک کرب کے عالم میں کاٹ دی
ہر روز ایک زخم نیا دے گیا مجھے

عرفان آندھیوں کو بھی دعوت اسی نے دی
وہ شخص جو چراغِ وفا دے گیا مجھے

شیدا بھگونوی
پوسٹ شاہ پور بھگونی
سمستی پور ۸۴۸۱۳۱

مت کرو انتخاب شیشے کا
ٹوٹ جائے گا خواب شیشے کا

اس کی ہر اک کرن تھی پتھر کی
اور وہ آفتاب شیشے کا

زندگی کی کتاب میں رکھیے
ایک رنگین باب شیشے کا

حسن، جادو، حسین، پری پیکر
ہے تعارف جناب شیشے کا

گھر کے گلدان میں کبھی شیدا
مت سجانا گلاب شیشے کا

نوشاد احمد
گنج نمبر ۱۔ بتیا۔ (بہار)

غزل

ہر ہاتھ خنجروں کا مقدر بنا رہا
ظلم و ستم ہی شہر کا منظر بنا رہا

کہرا میرے وجود پہ چھایا کچھ اس طرح
سایہ سا ایک دھند کے اندر بنا رہا

سوکھی ہوئی گلاب کی ٹہنی کو توڑ کر
طوفان خوشبوؤں کا سکندر بنا رہا

مجھ پہ اثر ہوئے تھے عجیب حادثات کے
میں لمحہ، لمحہ حرفِ مکرر بنا رہا

سچائیوں کی پیٹھ میں خنجر اُتار کر
ہر شخص اشتعال کا پیکر بنا رہا

طوفان مرے شیشۂ دل میں تھا موجزن
خالق مرے وجود کا پتھر بنا رہا

محبوب راہی
بارسی ٹاکلی
آکولہ ۴۴۴۴۵۱

پیچ در پیچ سوالوں کی طرح برتا ہے
ہم کو لوگوں نے مثالوں کی طرح برتا ہے

اہلِ ادراک نے تابندہ حقائق کو بھی
وسوسوں اور خیالوں کی طرح برتا ہے

ہم نے اے روشنیِ طبع! ترے پرتو میں
تیرگی کو بھی اجالوں کی طرح برتا ہے

میں سر دار رہا زندہ علامت بن کر
مجھ کو دُنیا نے حوالوں کی طرح برتا ہے

ہم نے کانٹوں کو بھی اعزاز دیا پھولوں کا
شب کو بھی دن کے اجالوں کی طرح برتا ہے

ہم نے بے مہریِ احباب کو دل کے اندر
کربِ احساس کے چھالوں کی طرح برتا ہے

تیرے ہر کرب کو سر آنکھوں پہ رکھ کر ہم نے
زندگی! تجھ کو جیالوں کی طرح برتا ہے

میں نے ہر سنگِ سرِ راہگزر کو راہیؔ
روشنی بانٹنے والوں کی طرح برتا ہے

عبداللطیف اعظمی
۳۴۹۔ ذاکر نگر، جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

مولانا آزاد کے خط کے دور رس اثرات

جناب شاہد علی خاں صاحب کی عنایت سے، عزیزہ شایستہ خاں صاحبہ کا مضمون نظر سے گذرا، جس میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایک اہم خط مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۳ء کا عکس شامل ہے، جس میں مولانا آزاد نے اپنا ہجری سن پیدائش، ۱۳۰۵ھ کے بجائے ۱۳۰۳ھ لکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت ہی اہم بات ہے، اسی لیے فاضل مضمون نگار نے بجا طور پر اس تضاد کی طرف ماہرینِ ابوالکلامیات کو توجہ دلائی ہے، مگر مجھے اس عکسی تحریر سے اس وجہ سے خاص طور پر بہت خوشی ہوئی کہ ایک طویل مدت سے میں مولانا آزاد کی والدہ اور ان کی بہن کے نام معلوم کرنے کی کوشش میں تھا، مگر قطعیت کے ساتھ کوئی واضح اور یقینی معلومات حاصل نہ ہو سکی تھیں، خدا کا شکر ہے کہ اس تحریر سے یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا۔

جو مسئلہ میری ذہنی الجھن کا باعث تھا، اس کی تفصیل یہ ہے۔ میرا ایک طویل مضمون: "سوانح مولانا ابوالکلام آزاد —— سیاسی سرگرمیوں کی روشنی میں" ماہنامہ آجکل (نئی دہلی) کے آزاد نمبر بابت ماہ نومبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا ہے، جس میں مولانا کا شجرۂ نسب بھی شامل ہے۔ اس وقت تک چونکہ مولانا آزاد کی والدہ کا نام مجھے معلوم نہیں تھا، اس لیے ان کا نام نہیں لکھا تھا، البتہ جناب مالک رام صاحب کے مشورے پر مولانا کی سب سے بڑی بہن کے نام "زینب" کا اضافہ کر دیا تھا اور ان ہی کے ارشاد پر اس نام کے ساتھ سوالیہ نشان لکھ دیا گیا تھا، تاکہ تحقیق کا دروازہ کھلا رہے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد اس سلسلے میں کچھ مزید معلومات سامنے آئیں۔ کم و بیش اسی زمانے میں میرے مرتبہ شجرۂ نسب کے علاوہ تین نسب نامے اور شائع ہوئے تھے، ایک انگریزی کے مشہور ہفتہ وار اخبار "کرنٹ" ویکلی (بمبئی) میں، دوسرا دہلی کے ایک پندرہ روزہ اردو اخبار: "کاشت" میں اور تیسرا مولانا آزاد کے حقیقی بھتیجے جناب نورالدین صاحب کے صاحبزادے فیروز بخت احمد صاحب نے شائع کر کے تقسیم کیا تھا۔ ان تینوں شجرۂ نسب میں بالاتفاق مولانا آزاد کی والدہ کا نام زینب بی بی لکھا تھا۔ اوّل الذکر دو نسب ناموں میں

ڑی بہن کا خانہ خالی تھا، البتہ فیروز بخت احمد صاحب کے مرتبہ شجرۂ نسب میں بڑی بہن کا نام خدیجہ درج تھا۔ یہ نام پہلی مرتبہ میری نظر سے گذرا تھا، اس لیے میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ انھوں نے فرمایا کہ غالباً والد صاحب سے معلوم ہوا تھا۔ چوں کہ انھوں نے "غالباً" کا لفظ استعمال کیا تھا، اس لیے میں نے ان سے گزارش کی کہ دوبارہ اس نام کی تصدیق کر کے ممنون فرمائیں۔

مولانا آزاد کے ایک عزیز جناب باقر حسین صاحب دہلی میں رہتے ہیں جو مولانا کی بھانجی محترمہ آمنہ بیگم کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ایک روز میں نے ان کو فون کیا، وہ گھر پر موجود نہیں تھے، مگر اُن کی اہلیہ نے بہت یقین کے ساتھ بتایا کہ مولانا کی والدہ کا نام زینب بی بی تھا۔ بڑی بہن کے بارے میں فرمایا کہ ان کے اصلی نام سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں ہے، ان کے بھائی بہن انھیں "اُختی" [میری بہن یا آپا جان] کہا کرتے تھے۔ ان معلومات کی روشنی میں، میں نے "ضروری تصحیح" کے عنوان سے آج کل کو ایک خط لکھا، جس میں مولانا آزاد کی والدہ کا نام زینب لکھا اور بڑی بہن کے بارے میں، باقر حسین صاحب کی اہلیہ کے بیان کے مطابق لکھ دیا کہ ان کے اصلی نام سے اس وقت کوئی واقف نہیں ہے، بھائی بہن انھیں "اُختی" (میری بہن) کہا کرتے تھے۔ چونکہ "خدیجہ" کے بارے میں اس وقت تصدیق نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس کے متعلق میں خاموش رہا۔ میرا یہ خط آج کل کے فروری ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد بھوپال کے ایک صاحب نے ہفتہ وار ہماری زبان" کو ایک خط لکھا جو "عبداللطیف اعظمی کی تحقیقی غلطیاں یا سہو" کے عنوان سے ۱۵ اپریل ۸۶ء کے شمارے میں شائع ہوا، جس میں جناب مالک رام صاحب کے ایک مضمون: "مولانا ابوالکلام آزاد پہلے بیس برس)" مطبوعہ سہ ماہی "تحریر" (جلد ۲ شمارہ ۱) بابت ۱۹۶۸ء کے حوالے سے لکھا کہ مولانا آزاد کی سب سے بڑی بہن کا نام زینب تھا۔ اس کے بعد آج کل کے مدیر محترم جناب راج نرائن راز صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: مولانا آزاد کی والدہ کا نام عالیہ تھا۔ چوں کہ اب تک میں اس نام سے واقف نہیں تھا اور صحیح نام معلوم کرنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا، اس لیے اس انکشاف پر حیرت اور خوشی سے واقعی اُچھل پڑا۔ میں نے فوراً سوال کیا کہ یہ کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا: جناب مالک رام صاحب کے، ان کے پاس مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے، جس میں یہی نام لکھا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا رسالہ "تحریر" بابت ۱۹۶۸ء میں جو مضمون: "مولانا ابوالکلام آزاد (پہلے بیس سال)" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اسی میں والدہ کا نام عالیہ اور بڑی بہن کا نام زینب شائع ہوا ہے۔ میں نے اس مضمون کو کئی مرتبہ پڑھا تھا، مگر عجیب اتفاق ہے کہ مجھے یہ دونوں نام بالکل یاد نہیں تھے۔ ان معلومات کے بعد میں نے "مولانا کی والدہ اور بڑی بہن کے نام" کے عنوان سے ایک اور مضمون لکھا جو ہماری زبان مورخہ ۲۲ر جون ۸۹ء میں شائع ہوا، جس میں مولانا کے شجرۂ نسب میں تیسری مرتبہ ترمیم کرنی پڑی۔ چوں کہ اس وقت تک خدیجہ کے نام کی تصدیق نہیں ہوئی تھی، اس لیے مضمون میں اس نام کا ذکر تو کیا، مگر اس پر زور نہیں دیا۔ ترمیم کرتے وقت میں نے لکھا: "یہ بات میں نے اس لیے نہیں مان لی کہ مالک رام صاحب نے لکھا ہے۔ تحقیق میں کسی محکم اور ٹھوس دلیل اور مستند حوالے کے بغیر کوئی دعوا محقق نہیں سمجھا جاتا، مگر چونکہ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ میرے پیش نظر مولانا آزاد کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے جسے مولانا

نے جناب عبدالشاہد خاں شروانی مرحوم کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا، اس لیے میں نے بے چون وچرا ان کی بات مان لی۔ میں نے اس مضمون کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا: "کچھ دنوں پہلے تک ان دونوں ناموں کے سلسلے میں میری حالت یہ تھی:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں، ابھی راہ بر کو میں

مگر خدا کے فضل سے اب یہ کیفیت نہیں رہی"۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ دو سوا دو ماہ کے بعد، مولانا آزاد کے شجرۂ نسب میں مجھے چوتھی بار ترمیم کرنی پڑے گی۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ تحقیق میں کوئی فیصلہ آخری اور مختتم نہیں ہوتا، مگر مجھے امید ہے کہ مولانا آزاد کے زیرِ بحث خط، مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۰۳ء کے بعد، کم از کم ان دونوں بزرگ خواتین کے ناموں کے بارے میں یہ آخری فیصلہ ہوگا۔

عزیزی شائستہ خاں نے اپنے مضمون میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ مولانا آزاد کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس تحریر کی روشنی میں محققینِ آزاد کو مولانا کے سنہ ولادت پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ مگر چوں کہ پہلی تاریخ پیدائش ــــ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بھی مولانا آزاد ہی کے قلم کی مرہونِ منت ہے، نیز ان کی زندگی میں یہ بار بار چھپتی رہی ہے اور انھوں نے کبھی اس کی تردید نہیں کی، اس لیے دوسرے سنہ ولادت ــــ ۱۳۰۳ھ کو ممکن ہے، سہو قلم قرار دیا جائے، مگر اُن کی والدہ ماجدہ اور سب سے بڑی بہن کے ناموں کے سلسلے میں اب تک مولانا آزاد کی کوئی تحریر ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے ان کے بارے میں، کم از کم فی الحال، سہو قلم نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دوں کہ مالک رام صاحب کے جس مضمون کا گزشتہ سطور میں ذکر آیا ہے وہ ان کی تازہ ترین کتاب: "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں"، بھی شامل ہے۔ اس مضمون کو لکھتے وقت اس پر بھی میں نے ایک نظر ڈال لی ہے۔ مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ محترمہ عالیہ کے سلسلے میں تو انھوں نے یقیناً مولانا آزاد کی غیر مطبوعہ تحریر کا حوالہ دیا ہے۔ (صفحہ ۲۹)، مگر سب سے بڑی بہن محترمہ زینب کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰ کے بالکل شروع میں مولانا خیر الدین مرحوم کی پانچوں اولاد کے نام، بغیر کسی حوالے کے لکھا ہے۔ چار نام تو بہت زیادہ معروف ہیں، ان کے حوالے کی تو یقیناً کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر پہلی اولاد کا نام، جہاں تک مجھے علم ہے، سب سے پہلے مالک رام صاحب ہی نے لکھا ہے، اس لیے اس نام (زینب) کے حوالے کی بیحد ضرورت تھی۔ ایسی حالت میں جب اس نام کے لیے کوئی مصدقہ ثبوت نہیں ہے تو اس کے بجائے خدیجہ نام کو قبول کرنے میں، بہ ظاہر کسی کو کوئی عذر نہیں ہوگا۔

اس خط کی اشاعت سے نہ صرف مولانا کی والدہ ماجدہ اور سب سے بڑی بہن کے ناموں کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو گیا، بلکہ مولانا کے بھائی اور بہنوں کی بہت سی تاریخیں محض قیاس کی بنیاد پر لکھی جاتی تھیں، ان کے لیے بھی اب ٹھوس بنیاد مل گئی۔ ایسی چند مثالیں پیش کرتا ہوں جو اس خط کی وجہ سے غلط ہو گئی ہیں۔ مولانا آزاد پر لکھنے والوں میں جناب مالک رام صاحب سب سے زیادہ بزرگ اور معتبر شخصیت ہیں، اس لیے ان کے دو مضمون: "مولانا ابوالکلام آزاد (پہلے بیس برس)" اور "ابوالنصر غلام یٰسین آہ" سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جو لکھے تو بہت پہلے گئے ہیں، مگر اُن کی تازہ ترین کتاب: "کچھ ابوالکلام آزاد

کے بارے میں " میں شامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

۱۔ "آرزو بیگم [حنیفہ] کا بھی ۱۳ را پریل ۱۹۶۶ء کو ۸۲ سال کی عمر میں بھوپال میں انتقال ہو گیا۔" (صفحہ ۳۰)
تاریخ وفات کے لیے موصوف نے ہندستان ٹائمز دلی ، ۱۴ را پریل ۱۹۶۶ء، صفحہ ۱۴ کا حوالہ دیا ہے ، مگر ۸۲ سال کی عمر نہ جانے کس بنیاد پر لکھی ہے ۔ بہر حال مولانا آزاد نے اس خط میں محترمہ حنیفہ کا ہجری سنہ پیدائش ۱۲۹۹ھ لکھا ہے ، جس کے مطابق عیسوی سنہ ۱۸۸۱ء/۱۸۸۲ء ہوتا ہے ، اس لحاظ سے وفات کے وقت ان کی عمر ۸۵/۸۶ سال ہونی چاہیے

۲۔ مولانا آزاد کی غیر مطبوعہ تحریر کے حوالے سے موصوف نے لکھا ہے : مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ ، ان سے [یعنی مولانا آزاد سے] دو برس بڑے تھے ، گویا ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے ۔" (صفحہ ۳۳) اسی کتاب کے دوسرے مضمون : " ابوالنصر غلام یٰسین آہ " میں مرحوم کا سنہ ولادت ۱۸۸۵ء/۱۸۸۶ء لکھا ہے (صفحہ ۱۸) اور آزاد کی کہانی (صفحہ ۱۲۵) کے حوالے سے مرحوم کا سنہ وفات ۱۹۰۶ء لکھا ہے ، اس لحاظ سے انھوں نے لکھا ہے : " وفات کے وقت ان کی عمر یہی ۲۰ ۔ ۲۱ سال کی رہی ہوگی ۔" (صفحہ ۱۸) ، مگر زیر تذکرہ خط کے مطابق مولانا غلام یٰسین مرحوم کا سنہ پیدایش ۱۳۰۱ھ ہے ، یعنی ۱۸۸۳ء/۱۸۸۴ء ، اس لحاظ سے وفات کے وقت ان کی عمر ۲۳/۲۲ سال ہونی چاہیے ۔

۳۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں : " جہاں تک کھوج لگا سکا ہوں ، آخری مرتبہ وہ [یعنی مولانا خیر الدین] ۱۸۹۸ء میں ہندستان آئے ۔" (صفحہ ۳۴) مولانا آزاد نے زیر بحث خط میں لکھا ہے : " ۱۳۰۴ھ کے اواخر میں اجمیر ، اکبر آباد وغیرہ مقامات کی سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے ... " گویا اس کے مطابق مولانا کا خاندان ۱۸۹۸ء میں نہیں ۱۸۸۶ء/۱۸۸۷ء میں آیا ۔

۴۔ مالک رام صاحب کے مطابق : " ۱۸۹۹ء میں ان کی بیوی (یعنی مولانا آزاد کی والدہ) کا انتقال ہو گیا ۔" (صفحہ ۳۵) اس خط میں مولانا آزاد نے لکھا ہے : " والدہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ میں ہوا " ، یعنی ۱۸۸۷ء/۱۸۸۸ء میں ۔

ان مثالوں کو پڑھ کر کوئی صاحب جلد بازی میں یہ نتیجہ نہ نکال لیں کہ راقم الحروف نے خدانخواستہ مالک رام صاحب کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ۔ یقیناً ایسا نہیں ہے ، کیوں کہ اس خط کی اشاعت سے قبل یہ معلومات ہمارے علم میں تھیں ہی نہیں ، اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ حالات اور واقعات کی روشنی میں اندازے اور قیاس کے ذریعے سنین اور تاریخوں کا فیصلہ کیا جائے اور یہی مالک رام صاحب نے کیا ۔ ان کے نتائج ، تاریخوں اور سنین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کے متعدد سوانح نگاروں اور مصنفوں نے ان سے استفادہ کیا ہے اور بیشتر نے بغیر کسی حوالے کے ان کو اس طرح اپنی کتابوں میں درج کیا ہے ، گویا خود ان کی تحقیق ہے ، مثالیں بہت ہیں مگر اس وقت ان پر لکھنے کے لیے مناسب موقع نہیں ۔

ابراہیم یوسف
۱۹، نعیم روڈ۔ امامی گیٹ
(بھوپال)

آغا حشر اور محقق

آغا حشر اُردو کے وہ خوش نصیب ڈراما نگار ہیں جن کی اہمیت ان کی زندگی ہی میں تسلیم کر لی گئی تھی۔ نور الٰہی و محمد عمر کی ناٹک ساگر، رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو اور سیّد بادشاہ حسین کی اردو میں ڈراما نگاری ان کی زندگی میں لکھی گئیں اور ان میں آغا حشر کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ان تینوں کتابوں میں تحقیق کے مقابلہ میں ان کے فن پر تنقید و تبصرہ زیادہ کیا گیا ہے یہاں تک کہ آغا صاحب کے ڈراموں کے صحیح ناموں کے بارے میں بھی تلاش اور جستجو نہیں کی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ناٹک ساگر ہی نے ڈرامے کی اہمیت کا احساس دلایا لیکن اسے تحقیقی کتاب کا درجہ دینا مناسب نہیں ہے اس لیے کہ اس میں اردو ڈرامے کا باب سنی سنائی باتوں اور روایات پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ ناٹک ساگر میں تاریخی تسلسل کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ احسن، بیتاب اور آغا حشر کا ذکر پہلے کیا گیا ہے ظریف، حافظ عبداللہ اور نظیر بیگ کا بعد میں۔ رونق کے لیے صرف ایک جملہ لکھا گیا ہے اور آرام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہی حال رام بابو سکسینہ کا ہے وہ آغا حشر کے صرف چھے اردو اور تین ہندی ڈراموں کے نام لکھ کر فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ آغا صاحب کے پہلے ڈرامے "آفتاب محبت" کا ذکر نہ نور الٰہی و محمد عمر صاحب کرتے ہیں اور نہ سکسینہ صاحب۔ سیّد بادشاہ حسین اپنی کتاب "اردو میں ڈراما نگاری" میں آغا صاحب کے فنی پہلو کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور انھیں ڈراما نگاری کے سلسلے میں مشورے دیتے ہیں تحقیق پر دھیان نہیں دیتے۔ اس طرح آغا صاحب کی زندگی میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا اس کی کوئی تحقیقی حیثیت نہیں اگرچہ تنقیدی حصہ قابلِ غور ہے۔

آغا حشر کے انتقال کے بعد سیّد طفیل احمد بدر امروہوی نے "تجلیات حشر" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں مولانا ظفر علی خاں، پروفیسر علم الدین سالک، چراغ حسن حسرت اور ضیا عظیم آبادی کے مضامین شامل ہیں جو تاثراتی ہیں ان کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری کتاب جمیل احمد کندھاپوری نے "یادگار حشر" کے نام سے لکھی اس میں بھی آغا حشر کے

فن پر تنقید و تبصرہ ہے تحقیقی حصہ نہیں۔ اردو ڈرامے پر تحقیق کا کام آزادی کے بعد شروع ہوا جب ڈرامے کی طرف سے تعصب کے بادل چھٹے اور ڈرامے کو ادب میں جگہ دی گئی۔ ڈرامے پر سب سے پہلا کام جو یونی ورسٹی میں ڈگری کے لیے کیا گیا وہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا اردو تھیٹر ہے یہاں ہمیں پورے مقالے کی تحقیقی حیثیت سے بحث نہیں صرف آغا حشر ہمارے پیش نظر ہیں۔ ڈاکٹر نامی نے اردو تھیٹر جلد دوم میں تقریباً بتیس صفحات آغا صاحب کے لیے وقف کیے ہیں۔ جن میں آغا صاحب کی مختصر سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے تحریر کردہ ڈراموں پر فرداً فرداً معلومات فراہم کی ہیں لیکن تنقید اور تبصرہ سے پرہیز کیا ہے۔ ڈاکٹر نامی آغا صاحب کے اردو ہندی ڈراموں کی تعداد بتیس بتلاتے ہیں جن میں سے بائیس ڈراموں کے پلاٹ بھی بیان فرماتے ہیں گویا یہ ڈرامے ان کی نظر سے گزر چکے ہیں باقی دس ڈراموں کو انھوں نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ مزید یہ کہ رستم و سہراب اور عشق و فرض کو دو علاحدہ علاحدہ ڈرامے مانتے ہیں جب کہ وہ ایک ڈراما ہے۔ صفحہ ۴۴۲ پر صید ہوس کا جو پلاٹ دیا گیا ہے وہ صید ہوس کا نہیں ہے۔ بہرحال ڈاکٹر نامی کے اردو تھیٹر میں آغا حشر کے بارے میں کوئی ایسا انکشاف نہیں ہے جسے کوئی اہم تحقیقی کارنامہ کہا جا سکے سوائے ڈراموں کی فہرست کے جو جزوی اختلاف کے بعد تقریباً صحیح ہے۔

ڈاکٹر عطیہ نشاط کے مقالے "اردو ڈراما روایت اور تجربہ" کا موضوع اردو ڈرامے کی روایت اور ان تجربوں کی کھوج کرنا ہے جو ابتدا سے مقالہ لکھے جانے تک کیے جاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط کے مقالے میں روایتی انداز کی تحقیق نہیں ہے نہ تو اس میں ڈراما نگاروں کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اور نہ مقام پیدائش اور تاریخ پیدائش جیسے مسائل اٹھائے گئے کیونکہ یہ سب کچھ ان کے مقالے کے لیے غیر ضروری تھا۔ ڈاکٹر عطیہ نشاط نے آغا حشر کے ان تجربات کی نشاندہی کی ہے جو انھوں نے اردو ڈرامے کا مزاج بدلنے کے لیے آہستہ آہستہ کیے ہیں کہ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز تو روایتی انداز سے کیا لیکن پھر کس طرح مکالموں میں نظم کے ساتھ نثر کو داخل کیا گانوں کی تعداد کو کم کیا اور اپنے آخری دور کے ڈرامے رستم و سہراب میں گانوں، مقفیٰ عبارت اور منظوم مکالموں کو بالکل خیرباد کہہ دیا اور خارجی تصادم کے ساتھ داخلی تصادم کو ڈرامے میں شامل کیا بہرحال ڈاکٹر عطیہ نشاط کے مقالہ سے آغا حشر کے ذہنی سفر کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے ان سے پہلے وقار عظیم اور عشرت رحمانی ان مراحل کی نشاندہی کر چکے ہیں۔

اس وقت ہمارے پیش نظر دو تحقیقی مقالے ہیں جو آغا حشر پر ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں پہلا انجمن آرا انجم کا "آغا حشر کاشمیری اور اردو ڈراما" جو پروفیسر آل احمد سرور کی زیر نگرانی لکھا گیا اور جس پر علی گڑھ یونی ورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی عطا کی۔ (مطبوعہ ۱۹۷۹ء ڈگری ۱۹۷۰ء میں دی گئی) دوسرا ڈاکٹر محمد شفیع کا "آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ" (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) جو ڈاکٹر محمد صدیق کی زیر نگرانی لکھا گیا اور جس پر

مسلم یونی ورسٹی نے ڈاکٹر شفیع کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ ان دونوں مقالوں پر تفصیل بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ ان میں آغا حشر کی ڈراما نگاری کے کچھ نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔
انجمن آرا انجم صاحبہ کے مقالہ کا پہلا باب تو وہی ہے جو اردو ڈرامے کی تحقیق کے گلے کا ہار بنا ہوا ہے یعنی ہندوستان میں ڈرامے کی روایت اور پھر سنسکرت ڈرامے کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر علیہ نشاط نے بھی اپنے مقالہ کا ایک باب سنسکرت اور یونانی ڈرامے کے اصولوں کے لیے وقف کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع نے گو مختصر سہی مگر روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سنسکرت ڈرامے کو تبرک کے طور پر ضرور شامل کیا ہے حالاں کہ نور الٰہی و محمد عمر کے "ناٹک ساگر" مسعود راہ کے "ہندوستانی ڈراما" اور محمد عزیز مرزا کے "ہوکرم اروسی" کے ترجمہ کے دیباچہ میں سنسکرت ڈرامے کے فن اور لوازمات پر اس قدر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اس میں مزید اضافہ کی مشکل ہی سے گنجائش ہے اس لیے یہ بات غیر ضروری سی ہو گئی ہے۔ اس کی اسی وقت افادیت ہو سکتی ہے جب سنسکرت ڈرامے کے اصولوں اور لوازمات کو پیش نظر رکھ کر اردو ڈرامے میں ان کے آثار تلاش کریں کیونکہ اردو کے ابتدائی ڈراموں میں ان کی موجودگی کو یک قلم خارج نہیں کیا جا سکتا ہم اردو ڈرامے پر مغربی ڈرامے کے اثرات کی کھوج تو جی جان سے کرتے ہیں جیسا کہ انجمن آرا صاحبہ نے اپنے مقالے کے دوسرے باب میں کی ہے (اس سلسلے میں بادشاہ حسین صاحب نے کہیں زیادہ معلومات فراہم کی ہیں) مگر سنسکرت ڈرامے اور لوک ناٹک سے اردو ڈرامے نے کیا استفادہ کیا ہے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انجمن آرا اور ڈاکٹر محمد شفیع نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا ہے۔ تیسرا باب آغا حشر کی سوانح اور شخصیت سے متعلق ہے اور روایتی انداز کا ہے۔ دراصل اس مقالے کا سب سے اہم چوتھا باب ہے جس میں آغا حشر کے ڈراموں کے ماخذ سے بحث کی گئی ہے اس باب کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے میں مغربی ماخذ، دوسرے میں مشرقی اور تیسرے میں طبع زاد ڈراموں سے بحث کی گئی ہے جس میں مغربی ماخذ والا حصہ سب سے اہم ہے مختصراً ان ماخذ کی فہرست درج ذیل ہے۔ ۱۔ مریدِ شک شیکسپیر کے اتھیلو سے۔ ۲۔ اسیر حرص شیریڈان کے پزارو سے۔ ۳۔ شہید ناز شیکسپیر کے میزر فار میزر سے۔ ۴۔ سید ہوس شیکسپیر کے کنگ جان سے۔ ۵۔ سفید خون شیکسپیر کے کنگ لیر سے۔ ۶۔ سلور کنگ آرتھر جونز اینڈ ہنری ہرمن کے سلور کنگ سے۔ ۷۔ خواب ہستی شیکسپیر کے میکبتھ سے۔ ۸۔ یہودی کی لڑکی ڈبلیو۔ ٹی۔ ماںکریف کے دی جیوس سے استفادہ کرکے لکھے گئے ہیں۔ سیتا بن باس، بھیشم پرتگیا اور رستم و سہراب کے ماخذ رامائن، مہابھارت اور شاہنامہ ہیں باقی ڈرامے طبع زاد ہیں۔ جہاں آغا صاحب نے مغربی ڈراموں کے پلاٹ سے استفادہ کیا ہے وہیں بعض ڈراموں کے کچھ حصوں کو ترجمہ کرکے اپنے ڈراموں میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر انجمن آرا نے نہ صرف ان حصوں کی نشاندہی کی ہے بلکہ ان حصوں کا انگریزی متن و نیز آغا صاحب کا کیا ہوا ترجمہ بھی دیا ہے جس سے آغا صاحب کے ترجمہ کرنے کی صلاحیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آغا صاحب نے مغربی ڈراموں سے جو پلاٹ مستعار لیے ہیں ان میں صاحب

ضرورت تبدیلیاں بھی کی ہیں ڈاکٹر انجمن آرا نے ان تبدیلیوں پر روشنی ڈالی ہے پورے مقالہ کا یہی باب حاصل مقالہ ہے۔ پانچواں باب آغا حشر کی کردار نگاری، چھٹا حشر کے ڈراموں میں اشعار اور قوافی کا استعمال اور ساتواں آغا حشر کا فن کے لیے وقف ہیں آٹھویں باب پیروان حشر سے متعلق ہے یہ باب روایتی انداز کے ہیں۔ بہر حال یہ پہلا مقالہ ہے جس سے ہمیں ان حصوں کا علم ہوتا ہے جہاں جہاں آغا صاحب نے براہ راست مغربی ڈراموں سے استفادہ کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے اس نے ڈرامے کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد شفیع کا مقالہ "آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ" ایک ضخیم مقالہ ہے جسے دیکھ کر پورا پڑھنے کے تصور سے بدن میں کپکپی کی لہر دوڑ جاتی ہے لیکن اسے پورا پڑھے بنا چارہ بھی نہیں ہے اول تو اس لیے کہ اس میں کچھ ایسے تحقیقی مسائل اٹھائے گئے ہیں جو اس سے پہلے نہیں اٹھائے گئے تھے اور جن پر محقق سرسری نظر ڈال کر گزر جاتے تھے جیسے آغا صاحب کا مقام پیدائش اور تاریخ پیدائش اور ان کے ڈراموں کی تعداد کا تعین دوسرے اس مقالہ سے آغا صاحب کی زندگی اور ان کے ڈراموں کے کچھ نئے گوشے سامنے آئے ہیں اور ڈاکٹر شفیع نے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے "رام اوتار" کی دریافت کا بھی دعوا کیا ہے نیز یہ کہ ڈاکٹر شفیع نے مغربی ڈراموں کے پلاٹ میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان پر ڈاکٹر انجم آرا کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ان وجوہات سے اس مقالے کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

آغا حشر کا مقام پیدائش بنارس ہے یا امرتسر اس پر محققین کو اختلاف ہے بعض اسے بنارس بتلاتے ہیں تو بعض امرتسر سب سے پہلے لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں ان کا مقام پیدائش امرتسر لکھا جسے نور الٰہی و محمد عمر صاحبان اور رام بابو سکسینہ نے تسلیم کر لیا لیکن ڈاکٹر عبد العلیم نامی، ظفر علی خاں، عشرت رحمانی، آغا حشر کے چھوٹے بھائی آغا محمود، آغا محمود کے حوالہ سے انجمن آرا اور آغا صاحب کے دیگر اہل خاندان ان کی پیدائش بنارس کی بتلاتے ہیں۔ لالہ سری رام کے بیان کے بارے میں علم الدین سالک لکھتے ہیں کہ "گو لالہ سری رام ایم۔ اے نے اپنی مشہور کتاب خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ آپ کا مقام ولادت امرتسر ہے۔ مگر اس کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش نہیں کر سکے جس سے ثابت ہو کہ آپ درحقیقت امرتسر میں پیدا ہوئے اس میں شک نہیں کہ امرتسر بھی کشمیری شال کی تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز ہے اور اہل خطۂ کشمیر کی ایک زبردست جماعت وہاں رہتی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آغا صاحب وہیں پیدا ہوئے ہوں[1]" اس طرح لالہ سری رام کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی بھی آغا حشر کا مقام پیدائش بنارس لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر محمد شفیع یہ کہہ کر اسے مشکوک قرار دیتے ہیں کہ چونکہ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے آغا حشر کا سنہ ولادت

---

[1] تجلیات حشر، مرتبہ سید طفیل احمد بدر امروہی: ص ۲۵۔

۱۸۶۹ء لکھا ہے۔ جب کہ ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۹ء ہے اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلام صاحب نے بنارس میں پیدا ہونے والی بات بھی تحقیق سے نہیں لکھی بلکہ کہیں سے اخذ کر کے ان کی جائے پیدائش اور سنہ پیدائش درج کر دیا۔[1] ممکن ہے کہ ۱۸۶۹ء کتابت کی غلطی ہو اور اگر کتابت کی غلطی نہ بھی ہو تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ڈاکٹر سلام کے ہر بیان کو غلط قرار دے دیا جائے۔ عبدالقدوس نیرنگ جو آغا صاحب کے بھانجے ہیں دعوا کرتے ہیں کہ آغا صاحب کا زائچہ موجود ہے جس کی رو سے آغا صاحب کی پیدائش ۱۴ اپریل ۱۸۷۹ء کو بنارس میں ہوئی لیکن ڈاکٹر شفیع اس بنا پر شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ بنارس میں مسلمانوں میں زائچہ بنوانے کا رواج نہیں تھا اس لیے آغا صاحب کا زائچہ کیوں کر بنا۔ یہ بھی کوئی ایسی دلیل نہیں کہ اس سے زائچہ کی موجودگی سے انکار کیا جائے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوستی یا عقیدت کے باعث کوئی شخص ایسا کام کر دیتا ہے جو عام رواج کے منافی ہوتا ہے اس لیے زائچہ کی موجودگی کو یک قلم خارج نہیں کیا جا سکتا ہاں ہم آغا صاحب کے اہل خاندان سے بجا طور پر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس زائچہ کو شائع کرا دیں۔ عبدالقدوس نیرنگ نے لکھا ہے کہ آغا حشر بنارس میں اپنے آبائی مکان نمبر ۱۳۶/۴۳ محلہ گوبند پورہ کلاں ہلکا چوک وارانسی میں پیدا ہوئے جو آج بھی موجود ہے لیکن ڈاکٹر شفیع اس پر شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء میں جب آغا صاحب بنارس آئے تو وہ اس مکان میں نہیں رہتے تھے بلکہ انھوں نے اپنا پتا معرفت حکیم سید محمد حسین صاحب راجہ دروازہ بنارس سٹی لکھا تھا۔ حکیم سید محمد حسین آغا حشر کے بہنوئی اور عبدالقدوس نیرنگ کے سسر تھے آغا صاحب چند دن کے لیے بنارس آئے ہوں گے اور اپنے آبائی مکان میں نہ رہ کر اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ قیام کیا ہوگا اور وہیں کا پتا درج کر دیا اس لیے یہ دلیل عبدالقدوس نیرنگ کے دعوے کو غلط ثابت کرنے کا جواز نہیں بن سکتی۔ ڈاکٹر شفیع لکھتے ہیں کہ "ان کے (آغا حشر کے) امرتسر میں پیدا ہونے کی ایک دلیل اور بھی دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر آغا حشر بنارس میں پیدا ہوئے تھے تو وہ اپنے کو بنارسی کیوں نہیں لکھتے تھے وہ ہمیشہ اپنے تخلص کے ساتھ کاشمیری لکھتے تھے چونکہ امرتسر خطۂ کشمیر کا ہی ایک خوبصورت شہر ہے ہو سکتا ہے آغا حشر اسی وجہ سے اپنے کو کاشمیری لکھتے ہوں۔"[2] یہاں ڈاکٹر شفیع کو زبردست سہو ہوا ہے۔ امرتسر کشمیر کا شہر نہیں بلکہ پنجاب کا شہر اور سکھوں کا مقدس مقام ہے۔ کسی امرتسر میں پیدا ہونے والے نے کبھی خود کو کشمیری نہیں لکھا۔ چونکہ آغا صاحب کے والد صاحب کشمیر سے تشریف لائے تھے اس تعلق سے آغا صاحب خود کو کشمیری لکھتے تھے اس طرح ڈاکٹر شفیع کی ہر دلیل کو رد کیا جا سکتا ہے۔ ظفر علی خاں کے بیان کو غیر مصدقہ نہیں کہا جا سکتا اگر آغا صاحب امرتسر میں پیدا ہوئے ہوتے تو ظفر علی خاں پنجاب کے بجائے یہ کریڈٹ

---

[1] آغا حشر کاشمیری: ڈاکٹر محمد شفیع: ص ۴۸۔
[2] ایضاً ص ۵۰۔

بنارس کو ہرگز نہ دیتے۔ لیکن پھر بھی ایک بات ایسی جس کا جب تک کوئی تحریری ثبوت نہ مل جائے ڈاکٹر شفیع کا شک اپنی جگہ قائم رہے گا۔ خمخانۂ جاوید، ناٹک ساگر اور رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں آغا صاحب کی پیدائش امرتسر لکھی ہے اور یہ تینوں کتابیں آغا صاحب کی زندگی میں لکھی جا چکی تھیں کیا آغا صاحب یا ان کے کسی ہم عصر نے اس کی تردید کی۔ جب تک ایسی کوئی تحریر نہیں مل جاتی آغا صاحب کے مقام پیدائش کا مسئلہ موجود رہے گا۔ ذاتی طور پر میں آغا صاحب کا مقام پیدائش بنارس مانتا ہوں۔

آغا حشر کے ڈراموں کی تعداد کا تعین کرنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے کہ مختلف مصنفین ڈراموں کی تعداد علاحدہ علاحدہ بتلائی ہے۔ ناٹک ساگر اور تاریخ ادب اردو آغا صاحب کے انتقال سے پہلے کی کتابیں ہیں اس لیے ان میں ان کے ڈراموں کی مکمل فہرست کا امکان نہیں ہے بعد کے مصنفین نے جو تعداد لکھی ہے ان میں اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی ڈراما مختلف ناموں سے کھیلا جاتا رہا ہے اور غلط فہمی کی وجہ سے ان کو علاحدہ علاحدہ ڈرامے تسلیم کر لیا گیا جس کی وجہ سے کنفیوژن پیدا ہوا چنانچہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی ان کے ڈراموں کی تعداد بتیس بتلاتے ہیں اور رستم و سہراب اور عشق و فرض کو دو علاحدہ ڈرامے تسلیم کرتے ہیں جب کہ وہ ایک ڈراما ہے اس طرح تعداد اکتیس رہ جاتی ہے۔ عبدالقدوس نیرنگ نے ستائیس کی معلومات فراہم کی ہے۔ میں جس وقت اردو کے اہم ڈراما نگار لکھ رہا تھا تو اس کی تیسری جلد آغا حشر کے لیے وقف کی تھی میں نے آغا جمیل (آغا حشر کے بھتیجے) سے رجوع کیا تھا انھوں نے جو فہرست عنایت فرمائی وہ "اردو کے اہم ڈراما نگار" جلد سوم آغا حشر کے صفحہ نمبر ۱۳۹ - ۱۴۰ پر درج ہے انھوں نے ڈراموں کی تعداد چھتیس بتلائی ہے جس میں بارہ ہندی کے اور باقی اردو کے ہیں۔ ڈاکٹر محمد شفیع نے اپنے مقالہ کے صفحہ نمبر ۱۹۰ تا ۱۹۳ آغا صاحب کے ڈراموں کی فہرست دی ہے جس کی رو سے تعداد اڑتیس ہوتی ہے جس میں پانچ فلمی ڈرامے ایک غیر مطبوعہ ڈراما اور ایک مزاحیہ ڈراما "بیوقوفوں کی ٹکر" بھی شامل ہے۔ یہ مزاحیہ ڈراما علاحدہ سے کوئی ڈراما نہیں ہے بلکہ یہودی کی لڑکی کا کامک ہے ان سات ڈراموں کو نکال دینے سے تعداد اکتیس رہ جاتی ہے۔ دو ڈراموں شام جوانی اور نعرۂ توحید کے متعلق وہ کوئی معلومات فراہم نہیں کر سکے۔ شیر کی گرج نعرۂ توحید کی عرفیت ہے علاحدہ سے کوئی ڈراما نہیں۔ خود پرست اور جرم نظر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ آغا حشر کے لکھے ہوئے ہیں ان چار ڈراموں کو نکال دینے سے تعداد ستائیس رہ جاتی ہے جو عبدالقدوس نیرنگ اور آغا جمیل کی دی ہوئی تعداد کے تقریباً برابر ہے۔ ڈاکٹر شفیع نے ان میں سے پچیس پر تفصیل سے بحث کی ہے ڈاکٹر شفیع بھیشم پرتگیا کو آغا حشر کا ڈراما تسلیم نہیں کرتے بلکہ حکیم احمد شجاع کا ڈراما قرار دیتے ہیں جس کا دعوا حکیم صاحب نے اپنے ڈرامے "باپ کا گناہ" میں کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نامی اردو تھیٹر جلد دوم صفحہ نمبر ۲۵۸ پر اسے آغا حشر کا ڈراما قرار دیتے ہیں اور پہلی شب میں جن ایکٹروں نے اس ڈرامے میں کام کیا تھا ان کی فہرست بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ عشرت رحمانی

لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء میں لاہور آئے اور اپنے شہرۂ آفاق شاہکار بھیشم پرتگیہ کو فلمانے کی تیاری کرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو معمولی علالت کے بعد انھوں نے وفات پائی"۔[۶۱]
حکیم احمد شجاع نے اپنے مقدمہ میں کہیں یہ دعوا نہیں کیا کہ آغا صاحب ان کا ڈراما فلما رہے تھے اس لیے اس حقیقت کو مان لینے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی کہ بھیشم پرتگیا آغا حشر نے بھی لکھا اور حکیم احمد شجاع نے بھی۔ ڈاکٹر محمد شفیع نے آغا حشر کے ایک غیر مطبوعہ ڈرامے "رام اوتار" دریافت کر کے اس کی تفصیلات دی ہیں جو تسی گوکل پرشاد دھولیا کے مطابق ۱۹۲۷ء میں چھرکھاری میں لکھا گیا تھا۔ آغا حشر کے سلسلہ میں یہ ایک اضافہ ہے۔

آغا حشر کے ڈراموں کی تاریخ تصنیف کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ مختلف مصنفین نے علاحدہ علاحدہ تاریخیں درج کی ہیں۔ ڈاکٹر شفیع نے یہ سب ایک چارٹ کے ذریعہ ظاہر کر دی ہیں۔ اور پھر جہاں فرداً فرداً ڈراموں سے بحث کی ہے وہاں ان تاریخوں کو پیش نظر رکھ کر نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے اور ہر ڈرامے کی تاریخ تصنیف کا تعین کیا ہے جس سے یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا ہے لیکن ایک بات ضرور حیرت میں ڈالتی ہے ڈاکٹر شفیع نے ناٹک ساگر کو بھی چارٹ میں شامل فرما کر اس سے تاریخیں لکھی ہیں۔ میرے پاس ناٹک ساگر کے دو اڈیشن ہیں اور دونوں میں ڈراموں کا سنہ تصنیف درج نہیں ہے اس طرح بادشاہ حسین صاحب کی کتاب میں ڈراموں کے کھیلے جانے کی تاریخیں درج کی گئی ہیں۔ سنہ تصنیف نہیں۔ ڈاکٹر شفیع نے یہ تاریخیں کن اڈیشنوں سے لی ہیں یہ تو وہی بتلا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیع نے آغا حشر کی زندگی پر بڑی چھان بین کی ہے خاص طور پر ریاست چھرکھاری میں ان کے قیام کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ آغا حشر کی زندگی کا یہ گوشہ جو تاریکی میں تھا۔ ان کی کوششوں سے روشنی میں آیا ہے۔

ڈاکٹر محمد شفیع کے مقالہ کا سب سے اہم چوتھا باب ہے جس میں انھوں نے فرداً فرداً ہر ڈرامے پر بحث کی ہے۔ ہر ڈرامے کا سبب تالیف، ڈرامے کا پلاٹ اور پلاٹ کے ماخذ، ڈرامے کا سیاسی اور سماجی پس منظر تفصیل سے لکھا ہے۔ ڈرامے کے نثری اور منظوم حصہ پر بحث کی ہے۔ پہلے مغربی ڈراموں کے پلاٹ بیان کیے ہیں اور پھر آغا صاحب نے ان میں جو تبدیلیاں کی ہیں ان کی نشاندہی کی ہے۔ ان سے پہلے انجمن آرا صاحبہ بھی ان کی نشاندہی کر چکی تھیں لیکن ڈاکٹر شفیع کے یہاں زیادہ تفصیل ملتی ہے۔ ڈاکٹر شفیع کے مقالہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے آغا حشر کے ڈراموں میں اس زمانے کی سیاست اور آزادی کی جدوجہد کی کھوج کی ہے۔ رستم و سہراب میں تو حب الوطنی کا جذبہ بڑے واضح طور پر موجود ہے لیکن اس کے علاوہ وہ ڈرامے جن میں وزیر یا کوئی دوسرا شخص اپنی چالاکی سے حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے اور پھر معزول بادشاہ اور اس کے اہل خاندان پر ظلم کرتا ہے، ۱۸۵۷ء کے

---

[۶۱] اردو ڈرامے کا ارتقا: عشرت رحمانی: ص ۲۰۵۔

بعد بہادر شاہ ظفر اور ان کے اہل خاندان پر انگریزوں کے مظالم کی یاد تازہ کرتے ہیں۔
آغا حشر کے ڈراموں کے سب سے قابل اعتراض حصے کامک سین ہیں جو ابتذال کی حد میں
پہنچ جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر شفیع ان میں اصلاح معاشرت کے عناصر تلاش کر لیتے ہیں مختصر
یہ کہ ڈاکٹر شفیع نے آغا حشر کی سوانح اور ڈراموں میں کچھ نئے گوشے تلاش کیے ہیں جن پر
مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود ان سے بعض زبردست سہو بھی ہوئے
ہیں مثلاً لکھتے ہیں کہ "نوشیروان جی مہروان جی آرام کی وکٹوریہ ناٹک منڈلی نے گجراتی زبان
کے مصنف ایدل جی کھوری کے سونا مول خورشید کا ترجمہ نور جہاں کے نام سے پیش
کیا۔[1]" دوسری جگہ آرام کا نام خورشید جی مہروان جی لکھا ہے اور یہ دونوں نام غلط ہیں۔
آرام کا نام نسروان جی مہروان جی تھا اور وہ وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مالک نہیں صرف ڈراما
نویس تھے اس طرح کھوری کے گجراتی ڈرامے کا نام "سونا مول خورشید" نہیں بلکہ "سونا نا مونی
خورشید" تھا اور اس کا ترجمہ آرام نے نہیں بلکہ بہرام جی فردون جی مرزبان خورشید کے نام
سے کیا تھا نور جہاں کے نام سے نہیں۔ اس ڈرامے کو گجراتی رسم خط سے اردو رسم خط میں منتقل
کر کے امتیاز علی تاج نے مجلس ترقی ادب لاہور سے اور ڈاکٹر مسیح الزماں نے کتاب نگر لکھنؤ
سے شائع کر دیا ہے۔ درحقیقت اس ڈرامے کے بارے میں غلط فہمیاں قمر اعظم ہاشمی صاحب
نے اپنی کتاب "اردو ڈراما نگاری" میں پھیلائی ہیں اور ڈاکٹر شفیع نے بلا تحقیق کیے انھیں قبول
کر لیا ہے۔ اسی طرح بعض ڈراموں کے ناموں میں بھی ڈاکٹر شفیع سے سہو ہوا ہے مثلاً ایک ڈراما
کا نام انھوں نے فتنہ خانم لکھا لیکن اس نام کا کوئی ڈراما اردو میں نہیں ہے بلکہ فتنہ و خانم ہے
جس کی کہانی الف لیلہ کی تیسری جلد میں موجود ہے۔ یہ غلطیاں اور دیگر نظر ثانی کے بعد دوسرے
اڈیشن میں نکالی جا سکتی ہیں۔

اس جائزے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آغا حشر اردو کے سب سے
زیادہ مقبول ڈراما نگار ہیں ڈرامے کے میدان میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ان کے ابتدائی
ڈراموں سے ہی لگا لیا گیا تھا اور ان کے ڈراموں پر تنقید و تبصرہ ان کی زندگی ہی میں شروع
ہو گیا تھا لیکن ان پر تحقیقی کام ان کے انتقال کے ۳۵-۴۰ سال بعد شروع ہوا۔ ڈاکٹر نامی نے
ان کے ڈراموں کی فہرست مرتب کی، ڈاکٹر علیہ نشاط کا دائرہ تحقیق محدود ہے انھوں نے صرف
آغا حشر کے فن کے ارتقائی منازل کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر انجمن آرا انجم نے اپنے مقالے میں آغا
صاحب کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن ان کی تحقیق کا اہم
موضوع ان مقامات کی تلاش ہے جہاں آغا حشر نے مغربی ڈراموں کے کچھ حصوں کے ترجمے
کر کے اپنے ڈراموں میں شامل کیے ہیں اس تلاش سے مقالے کی اہمیت اور افادیت بہت
بڑھ گئی ہے۔ اور آغا حشر کے فن کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع کے مقالے
کچھ ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جو اس سے پہلے نہیں اٹھائے گئے تھے مثلاً آغا حشر

---

[1] آغا حشر کاشمیری، ڈاکٹر محمد شفیع، ص ۴۱۔

کام پیدائش کا مسئلہ، ڈراموں کی تاریخ تصنیف کا تعین، جنگ آزادی میں آغا حشر کے ڈراموں
کردار اور ان ڈراموں کا سیاسی وسماجی پس منظر۔ اس طرح آغا حشر پر جو کام ہوا ہے وہ مایوس
کن نہیں ہے لیکن پھر بھی کچھ پہلو ابھی تشنہ ہیں جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے مثلاً آغا حشر
کے ڈراموں پر سنسکرت اور لوک ناٹکوں کے اثرات، ان کے ڈراموں میں خارجی تصادم
کے ساتھ داخلی تصادم کی تلاش۔ اسی کے ساتھ آغا حشر کے ڈراموں کے معتبر متن شائع
کیا جانا بہت ضروری ہے اگر یوپی اردو اکادمی اس طرف توجہ دے اور ان کے کم از کم اردو
ڈراموں کے ہی متن شائع کر دے تو یہ ایک مستحسن اقدام ہوگا اور یوپی اردو اکادمی کے لیے
کوئی بڑا کام بھی نہیں ہے۔

آصف فرخی
بی- ۱۵۵ بلاک-۵
گلشن اقبال کراچی
(پاکستان)

قصہ اندوزی

اجنبی دیس میں پہلا موسم تھا جب میں نے اس داستان گو کو اپنی داستان کہتے سُنا۔ ان دنوں میں سے ایک جب موسم تبدیلی سے ہم کنار ہوا چاہتا ہے۔ ہواؤں میں بھی آنے والے دنوں کا لمس گھلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ چند دن پہلے ہی موسم معتدل سے زمستانی ہوا تھا، جو سال کے باقی ماندہ، رینگتے ہوئے دنوں کے عین مطابق تھا۔ موسم کی تبدیلیوں کے آثار واضح تھے اور اٹل، مگر میں بھلا کس طرح اپنے آپ کو نقطۂ انجماد سے نیچے زندہ رہنے اور مسلسل کام کرنے کا عادی بنا تا۔ میرے تو لہو کے حافظے اور پور پور میں دھوپ بھرے میدانوں کی تپش بسی ہوئی تھی۔ اور یہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے سیر کے واسطے جو تھوڑی سی فضا دی گئی ہے وہ دوزخ کا ٹھنڈا طبقہ ہے اور اس میں زندگی گزارنا ایک عذاب۔ چہار سمت برف کی سِل ہے کہ جس میں میں قید ہوں۔ برف کی اس شفاف دیوار کے اندر بند شہر میں زندگی اپنے معمول کے مطابق چل رہی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے آپ کو اس یخ بستہ رفتار کا عادی بنانا ہوگا۔ حالاں کہ یہ معلوم ہو جانے سے کام آسان نہیں ہوتا۔ ایسے میں اس لکچر کا دعوت نامہ ملا تو میں سردی اور اپنی ذعمل بے یقینی کے باوجود چلا ہی گیا۔ پہلے موسم ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بوسٹن کے باسی زندگی کے تئیں کوئی بھی رویہ اختیار کریں، لکچروں کے تمام و کمال سنجیدگی سے قائل ہیں۔ جب بات ثقافت کی آ جائے تو ایسے معاملوں میں بوسٹن کے لوگ امریکا کے یو۔ پی والے ہیں۔ انھیں اپنے ٹکسالی مزاج کا وہی غرّہ ہے۔ (اس کیفیت کو ہنری جیمز نے اپنے اس ناول میں بڑی لطافت اور طنز ملیح کے ساتھ برتا ہے جو بوسٹن والوں کے بارے میں ہے۔ مگر ہنری جیمز بھی ان ہی میں سے ایک ہے جنھیں باقی امریکی لوگ ناک سکیڑ کر 'بوسٹن کے براہمن' کہہ دیتے ہیں۔) کسی نے بوسٹن والوں کی نفسیات کے متعلق لطیفہ گھڑا ہے کہ اگر دو دروازے ہوں، ایک پر لکھا ہو 'بہشت' اور دوسرے پر لکھا ہوا ہو: "بہشت کے متعلق لکچر"، تو بوسٹن والا فوراً دوسرے دروازے میں داخل ہو جائے گا۔ دھال ہی میں، یہاں کتاب شائع ہوئی ہے: 'بہشت کی تاریخ'۔ بوسٹن میں اس وقت کوئی نہ کوئی آدمی یقیناً بیٹھا ہوا اس سے اگلی کتاب لکھ رہا ہوگا ـــــ 'تاریخ خداوندی'۔) لکچر میں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ داستان الاؤ کے گرد بیٹھ کر تو نہیں سُنی جا سکتی تھی۔ اس کے کہنے سُننے کی شرط تو اب پوری ہوتی ہے مصنوعی حرارت سے دہکا ہوا ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک کمرہ، خطبہ گاہ کے سامعین، دُنیا کے کسی دور افتادہ گوشے سے آیا ہوا وہ زرد رو، منحنی شخص، جس کے خال و خد، رنگ و نسل اور جس کی واردات کسی اور وقت، کسی اور جگہ سے آئے ہوئے تھے، تالیوں کی گونج اور حاضرین کے

پر تو تیج تجستس کے دوران دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور ہاتھ باندھ کر کس سادگی سے اپنی بپتا سُنانے لگا کہ مجھ پر کیا بیتی (مگر اس نے اپنے ہاتھ کیوں باندھے ہوئے ہیں؟ میں نے سوچا۔ جنوب مشرقی ایشیا کی ثقافت کی ایک اور عادت؟ یا سامعین کا احترام اور رعب سے بڑھ کر خوف کہ یہ لوگ معزز، اہم بدیسی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محفوظ ہیں۔ اس طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا تو مجھے نماز میں سکھایا گیا تھا۔ کیا اس شخص کو بھی اپنے کام میں عبادت کا سا انہماک، وارفتگی قلب اور کسی نادیدہ پروردگار سے لو لگائے رہنے کا احساس ہے؟) پچھلی صفوں کے اونگھتے، ٹھنڈاتے نیم اندھیرے میں میرے حواس پوری طرح بیدار ہو چکے تھے۔

یہ جو آج یہاں موجود ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، جو سُنا رہا ہے اس کی معنویت، اس کے وجود اور اس کے الفاظ سے زیادہ پُرمفہوم ہے۔ یہ آج کا داستان گو ہے۔ اس کی داستان، آج کے افسانہ نگار کی داستان ہے۔ آج کا افسانہ نگار جو قسم ہے عصر کی، اور بھی خسارے میں ہے۔ وہ اپنی کہے جاتا تھا اور میں دم سادھے سُنتا رہا کہ اس کی سرگزشت میرے لیے کہانی ہوئی جا رہی تھی۔ کہانی جس سے میں ہوں، اور جس میں میں ہوں۔ مگر اس وقت کا تاثر اور ہی طرح کا تھا۔ دراصل مجھے ایسے لوگ بھید بھرے اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں جو خود ہی داستان بن جاتے ہیں۔ ان میں اور ان کی کہانی کے درمیان جو خطِ امتیاز ہوتا ہے وہ دھندلا پڑ کر معدوم ہونے لگتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس کیفیت کو پہچان کر اس علت کا نام پکار اُٹھے اور مجھے سرِ محفل رسوا ہونا پڑے، خود ہی اعتراف کرتا چلوں کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ نقطۂ نظر سرتاسر رومانی ہے۔ یہ کیفیت مجھے جس مشکل میں ڈال دیتی ہے اس کا مؤثر ترین اظہار بھی رومانوی شاعری کے خاتم، ڈبلیو، بی، ئیٹس کے ہاں ہوا ہے۔ میں اس کے یہ مصرعے زیرِ لب یوں دہراتا ہوں گویا یہ اشلوک ہوں:

O BODY SWAYED TO MUSIC, O BRIGHTENING GLANCE,

HOW CAN WE KNOW THE DANCER FROM THE DANCE ?

کیا یہ بھی معرفت کی کوئی منزل ہے یا فنا کا درجہ، جب فن کار آپ اپنے فن کا جزو بن کر رہ جاتا ہے اس کمہار کی طرح جو مٹی کے برتن گھڑتے گھڑتے کھو یا گیا تو پیالے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ملا۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ رقص میں سما جانے والے رقاص سے زیادہ پیچیدہ معاملہ افسانہ نگار کا ہے کہ اس نے اپنا فن آخر جس کو ٹھہرایا ہے وہ زندگی کے عمل کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور یوں ساتھ چل کر اس کی عکاسی و ترجمانی کرتا ہے جب کہ یہ فن اور اس فن کا وظیفہ کرنے والا، دونوں اسی برتر اور حاوی عمل کا ایک جزو ہی تو ہیں۔ جو کہانیاں ہم سُناتے ہیں وہ ہماری اپنی کہانیاں ہوتی ہیں، ہر چند کہ اپنی کہانی ہم نے پوری سُنی ہی کہاں ہے۔ یہ تو حکایتِ ہستی ہے کہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ جتنی سُنی ہے وہ بھی سمجھے بغیر۔ کیوں کہ سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس سے آگے کہانی کدھر چلے گی؟ ہماری کہانیاں جس "نقطے" پر ٹکی ہوئی، لہو کی بوند کی طرح تھرتھرا رہی ہیں، اس کی شناخت ہندی شاعر اگیے کی نظم ایک نقطے تک میں کتنے بلیغ طور پر ہوتی ہے:

کہانی ہم بناتے ہیں

جس سے آگے
کہانی نہیں بتاتی ہے
اس نقطے کی صحیح پہچان
کیا ہمیں آتی ہے ؟

ایلو۔ یہ تو میں نے اپنی کتھا شروع کردی، جب کہ داستان تو میں اس کی سُننے آیا تھا۔ داستان اور داستان گو کے درمیان تفریق مٹانے کا یہی نقصان ہے کہ نظر ذرا چوکی اور پھر وہی نری ادھر اُدھر کا تاثر بیت۔ لہٰذا اب کہانی سُنانے والے کی طرح سیدھے سبھاو بتاتا ہوں کہ پھر کیا ہوا۔ "کمبوڈیا کا داستان گو" کے عنوان سے اس لکچر کا اہتمام بوسٹن کے برائٹن پبلک ہیلتھ سنٹر سے وابستہ ماہرین نفسیات، ڈاکٹروں، نرسوں اور سماجی کارکنوں کے ایک گروپ نے کیا تھا جو جنوب مشرقی ایشیا سے آنے والے پناہ گزینوں کی حالت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اگرچہ ان کا مقصد RELIEF WORK اور ان افتادگان کی ذہنی و نفسی آبادکاری کی کوشش ہوتا ہے جس سے مجھے کچھ ایسا سروکار نہیں۔ لیکن REFUGEE TRAUMA PSYCHIATRY میں جو بھی سرگرمیاں ہوتی ہیں، ان کی MAILING LIST پر میرا نام بھی رکھ چھوڑا تھا۔ جب اس داستان سرائی کا دعوت نامہ ملا، تو چوں کہ میں اپنے ساتھ زادِ سفر میں انتظار حسین کی ضخیم کہانیاں نہیں لا سکا تھا ــــــ بھاری بہت پڑ رہی تھیں ــــــ اس لیے سوچا کہ چلو، آج یہی دیکھتے ہیں۔ وقت رخصت، کراچی کی طیارہ گاہ کے لیے سوار ہوتے ہوئے کتابوں کی الماری پر الوداعی نظر ڈالتے ڈالتے میں نے بالکل غیر ارادی طور پر قرۃالعین حیدر کی "سیتا ہرن" اٹھائی اور اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ کسی روسی ادیب نے گوگول کی کہانی کے حوالے سے کہا تھا کہ ہم سب اوور کوٹ سے نکل کر آئے ہیں۔ وہ یہ کہنا بھول گیا کہ بالآخر ہم سب اوور کوٹ کی جیب میں لوٹ جائیں گے۔ اس واپسی ہی میں ہماری پوری کہانی ہے اور اس کا انجام بھی۔ اور ان دونوں کے درمیان ماندگی کا ایک وقفہ ہے تو کہانی کے کہنے، سُننے تک۔

اس کی کہانی بھی زندہ بچ جانے اور باقی رہ جانے کے بارے میں تھی۔ اس کی SURVIVAL STORY کا تعارف کراتے ہوئے، گروپ نے اپنے کام کی غرض و غایت بتائی کہ ہمارے پروگرام PSYCHIATRIC SERVICES کے تحت ترتیب دیا گیا ہے، اپنے کلینک میں ہم THERAPEUTIC SITUATIONS کو WORK OUT کرتے ہیں، اور آج جو کچھ پیش ہوگا اسے دو CONTEXTS میں دیکھنا ضروری ہے۔ اولاً قصہ گو کی قوت (POWER) کا اظہار اور ثانیاً اپنی جیون کتھائیں یا داستانِ زندگی (اصطلاحاً LIFE NARRATIVES) بیان کرنے کی اس خواہش اور ضرورت (URGE) کے طور پر، جسے صرف وہی لوگ محسوس نہیں کرتے جو آزمائش کے وقت سے گزرے ہوں بلکہ کم و بیش ہم سبھی محسوس کرتے ہیں (شاید یہ ہماری نسلی حافظے کا حصّہ ہے یا ہماری جبلت کا، جو ہم پر اس وقت منکشف ہوتا ہے جب ہم اپنی زندگی اور اپنے تجربے کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں، جس کے ذریعے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے عمل کو کہانی کی صورت میں سمجھا اور محفوظ کیا جا سکتا ہے۔) انھوں نے بتایا کہ مسٹر کاسی نیو (KASSIE NEOU) کمبوڈیا کے SURVIVOR سے کمبوڈیا کے STORY-TELLER بن گئے ہیں۔ وہ بی بی سی کی نشریات سے سن چکی کہ

جانوروں کی کہانیاں ترجمہ کرتے تھے، مگر انھیں اپنا کام روک دینا پڑا جب کمپوچیا میں کھمیر روژ (KHMER ROUGE) نے اقتدار پر قبضہ کر کے ایک عہد ستم کی بنیاد ڈال دی جسے ماہرین نے نسل کشی کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ جب حکام کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ کاسی کو انگریزی آتی ہے تو انھیں تفتیش کی غرض سے نظر بند کر دیا گیا۔ یہ قید اور اذیت رسانی کا پیش خیمہ تھا۔ اس قید کے دوران، کاسی نے جانوروں کی وہ کہانیاں جو انھیں یاد تھیں کھمیر روژ کے محافظ سپاہیوں کو سنانی شروع کر دیں، جن میں سے کئی ایک نوعمر تھے۔ سپاہی ان کہانیوں سے مسحور ہو گئے۔ جب قیدیوں کو سزائے موت دینے کے لیے کیمپ سے باہر لے جایا جاتا، تو سپاہی کاسی کو یہ کہہ کر روک لیتے کہ اُسے رہنے دو، یہ تو ہمارا داستان گو ہے۔ ایک مدت کے بعد کاسی اس کیمپ سے فرار ہوا، سرحد پار کر کے تھائی لینڈ آیا اور جان جوکھم میں ڈال کر امریکا پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں اب وہ رہتا ہے۔ تو تعارف کی تان یہاں آ کر ٹوٹی۔ اس جملے کے بعد جب اُس سے ڈائس سنبھالنے کے لیے کہا گیا تو وہ مجھے بہت قابلِ نفرت معلوم ہوا، بالکل حقارت انگیز۔ اپنی رام کہانی سُنانے کو اس نے پیشہ بنا لیا ہے اور یہ لوگ اسے استعمال کر رہے ہیں۔ اسے جگہ جگہ لیے پھرتے ہیں، اور یہ سدھائے ہوئے بندر کی طرح اپنا تماشا دکھاتا ہے اور اسی میں مگن رہتا ہے، یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کے گلے میں رسّی ہے جس کے دوسری جانب مداری ہے، اور یہ سارا سوانگ جو رچایا گیا ہے یہ بھی اس کے لیے ایک اور طرح کی قید ہے۔ کیا اُسے احساس نہیں؟ میں نے سوچا۔ اگر اُسے نہیں معلوم تو یہ سادہ دل سے زیادہ احمق ہے، اور اگر معلوم ہوتے ہوئے بھی چپ ہے تو موقع پرست ہے۔

"میں آپ سب سے پوچھتا ہوں اور ساری دُنیا سے سوال کرتا ہوں ــــــ کیوں؟ آخر کیوں؟ کس لیے؟ انسان دوسرے انسانوں کو اس بے دردی سے موت کے گھاٹ کیوں اُتارتا ہے؟ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کی انتہا کیوں کر دیتا ہے؟" وہ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز جذبات سے لبریز تھی۔

شاید یہ ان معنوں میں بھی آج کے فن کار کی طرح معصوم ہے، میں نے دل میں سوچا کہ اتنی سخت مذمت بھی ٹھیک نہیں۔ آخر کچھ تو ہم دردی اور دل سوزی چاہیے۔ وہ تو جو کر سکتا ہے، کیے جاتا ہے۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے کام سے کس کا VESTED INTEREST پورا ہو رہا ہے۔ اپنی ابتلا کے اس مرحلے پر وہ PARTISAN نہیں رہا۔ کیا اس کی یہ ناواقفیت مجرمانہ ہے؟ اس میں وہ خود کس حد تک قصوروار ہے؟ کیا فن کار کو اس خطرے سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے کام کو کس طرح مسخ کر کے ان اقدار کے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جن سے وہ متنفر ہے۔ کیا ایسی صورت حال میں اس کا اپنی دھن میں مگن اپنا کام کیے جانا بھی ایک نوع کا BETRAYAL نہیں ہے؟

ان سوالوں کا میرے پاس کوئی آسان جواب نہیں ہے۔ اور نہ اس صورتِ حال پر منطبق کر کے تلاش کر پایا کہ مجھے اس قسم کی عقلی کدّ و کاوش کی مہلت دینے کے بجائے۔ کاسی کا بیانیہ میری توجہ کو پوری طرح اپنی جانب مبذول کر رہا تھا، اور کولرج کی نظم میں شادی پر آئے ہوئے مہمان کی طرح میں اس بوڑھے ملاح کا قصہ سُننے کے لیے رُک گیا، اور ایک بار رُکا تو پھر کھو یا گیا کہ اس کے سحر میں آ چکا تھا، اور کہانی اپنا جادو جگا رہی تھی۔

کاسی کہہ رہا تھا: "ساری دُنیا میں ایسا ہو رہا ہے۔ کئی ملکوں میں ہو رہا ہے۔ یہ میرے گھر والوں

کے ساتھ ہوا اور میرے ساتھ ہوا۔

'ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم VICTIMS بن جائیں گے۔ ہم تو چین آرام سے رہنا چاہتے تھے۔ اچانک ایک دن میرے دفتر میں لوگ گھس آئے۔'

اس کا بیان اثر انگیز اور ڈرامائی تھا۔ وہ بہت سیدھے سادے، معمولی الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ زبان" پر جو گرفت اسے حاصل نہیں تھی، اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اشاروں سے کام لے رہا تھا۔ خود وہ حرکت کر کے بتاتا۔ چہرے کے اتار چڑھاو کے ساتھ آواز کانپ رہی تھی۔ سامعین دم بخود بیٹھے ہوئے اس خاندان کی آزمائش کا حال سن رہے تھے جو ٹوٹتے ہوئے سیاسی نظام کی زد میں آگیا، اور زوال کے اس لمحے میں یوں پھنس گیا جیسے ناو گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔

'میں نے عبرت انگیز منظر دیکھے ——— بہت، بہت ساری لاشیں جو عام شہریوں کے لباس میں تھیں۔ میں سوچ رہا تھا: اب کیا ہونے والا ہے۔

(اب میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس نے جو اندازِ بیان اختیار کیا تھا اس کی زبان بچکانہ حد تک سادہ تھی۔ روزمرہ کی سیدھی سپاٹ زبان۔ جس میں آٹا اور ترکاری خریدتے ہیں۔ اس زبان میں قید، اذیت، غریب الوطنی کے تجربے کو بیان کرنے کی پوری صلاحیت بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کے بیان میں نشتریت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ تو بعد کا تجزیہ ہے۔ اس وقت ہم سب اس کے قصے میں یکسر محو تھے، ورنہ دیکھنے والی بات تھی کہ جس طرح اپنی سپاٹ زبان سے وہ اپنی اور اس کی بساط سے بڑھ کر کام لینا چاہ رہا تھا، اس سے ایک المیہ شان پیدا ہو گئی تھی۔ زبان بھی اس کی بے چارگی اور مجبوری میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کی زبان بھی اس کے BETRAYAL میں شریک ہو گئی تھی، ہر چیز کی طرح۔ ہر ایک چیز، سوائے اس ایک ہنر کے، جس کا نام داستان گوئی ہے۔)

'جو لوگ تعلیم یافتہ تھے، انھیں اپنے نشانہ بنائے جانے کا احساس ہونے لگا وہ VICTIMS بننے لگے۔ ہم قید خانے میں ڈالے گئے بغیر قیدی بن چکے تھے۔ ہم کو ڈرایا گیا کہ اگر تم اپنا فرض ٹھیک طرح سے پورا نہیں کرو گے تو تمھیں "دوبارہ تعلیم حاصل کرنے کے مرکز" (RE-EDUCATION CENTRE) لے جایا جائے گا۔ ہم سے کہا گیا کہ اندھے، گونگے اور بہرے ہو جائیں۔ میں یہ نہیں کر سکا۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں سن سکتا ہوں۔ میری زندگی کے کچھ معنی ہیں۔

وہ بہت دھیمے LOW-KEY انداز میں بتا رہا تھا کہ کس طرح اس نے جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی۔ اس نے کیمپ کے حکام سے کہا کہ وہ اس دفتر میں دربان تھا۔ جھوٹ سے کم، یہ ایک اور داستان تھی کہ جس کے ذریعے اپنے آپ کو بچایا جا سکے۔ بعد میں، میں نے اپنی کہانی بدل ڈالی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ٹیکسی چلاتا تھا۔

"وہ بچوں کے ذریعے ہم پر جاسوسی کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے بچوں کو ہمارے خلاف استعمال کیا۔ انھوں نے میری بچی سے میرے بارے میں معلومات اگلوا لیں۔"

"انھوں نے مجھے رسی سے باندھ دیا جس کا دوسرا سرا سپاہی کی سائیکل سے بندھا ہوا تھا۔ سائیکل کے پیچھے پیچھے، وہ مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑاتے رہے کیوں کہ میں "امریکی" زبان

('AMERICANISM') بول سکتا تھا۔

• وہ مجھ سے بار بار سوال کرتے رہے:

اپنے آقاؤں کے نام ہمیں بتا دو۔

تم کس کے لیے کام کرتے رہے ہو۔

اپنے جرائم کا اعتراف کر لو۔

انھیں یہ باور کرانا بہت مشکل تھا کہ میں کسی کے لیے کام نہیں کر رہا تھا۔"

وہ قید خانے میں اپنی تفتیش کا بیان کر رہا تھا اور اس کے الفاظ مجھے ایک بار پھر OMINOUS معلوم ہو رہے تھے۔ آج کے معاشرے میں فن کار کی اُفتاد (PREDICAMENT) کیا یہی نہیں ہے؟ معاشرہ اس کی آزادی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چوں کہ فن کار کے مقاصد و منتہا معاشرے سے قدرے مختلف ہیں، اس لیے یہ یقیناً کسی نہ کسی بیرونی قوت کا آلۂ کار ہوگا ——— "وہ میرے جواب کو تسلیم کیے بغیر بار بار یہی سوال تازیانے کی طرح مجھ پر مارتے رہے: ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ضرور کسی کے لیے کام کرتے رہے ہو۔ تم مان کیوں نہیں لیتے؟۔ انکار کا مطلب تھا مزید اذیت۔ انھیں بس میرا اعتراف چاہیے تھا۔ جب تک میں اعتراف نہیں کروں گا، اذیت رسانی ختم نہیں ہوگی۔"

اسے اپنے ناکردہ جرائم کا اعتراف کرنا ہے۔ اپنی معصومیت کو بار بار دہرانے یا اس پر اصرار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ یقین نہیں کریں گے۔ وہ اذیت دیے جائیں گے۔ وہ THE TRIAL کے جج اور جیوری ہیں۔ وہ THE CASTLE کے افسران ہیں۔ کافکا والے 'بھوک کے فن کار' کی طرح وہ 'اذیت کا فن کار' ہے۔ اذیت اس کا ذریعۂ اظہار ہے، اس کی صنفِ سخن ہے۔ اس کی واحد گواہ کہانی ہے، جو ایک بار پھر جلاد کے خنجر کی نوک پر تھمی ہوئی ہے۔

یہ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ تفتیش کرنے والے غلطی پر ہیں، یا یہ مقدمہ مہمل ہے۔ وہ درست کہہ رہے ہیں۔ اسے اپنے جرائم کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ سرِ فہرست اس کا سب سے بڑا جرم درج ہے: اس کا وجود اس کا سب سے بڑا جرم ہے۔

اور گویا کہ یہ کافی نہ تھا۔ اس کی واردات اس کے جرم پر مستزاد۔

مگر وہ کہے جا رہا تھا۔ وہ اس اذیت کی تفصیل سُنا رہا تھا جو اس نے سہی۔ اور پھر اس نے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں مروں گا نہیں۔ زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔

وہ اپنی داستان سنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ نہیں تھا جس پر اس نے یہ سارے واقعات لکھ رکھے ہوں۔ شاید اس کے لیے ان سب باتوں کو لکھ لینا ایک غیر اہم اور فروعی عمل ہوگا۔ اس کے حافظے میں ایک ایک تفصیل زندہ تھی۔ وہ SPONTANEOUSLY سُنا رہا تھا۔ اس کے بیان میں ذرا سی بھی خود ترحمی یا رقت خیزی نہ تھی۔ اس کے برخلاف، اس کے بیانیے میں جا بجا ظرافت کا شائبہ سا۔ اس نے اپنی تکلیف کی بعض تفصیلات اس طرح بتائیں کہ جیسے ان کی مضحکہ خیزی سے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔ ——— "ہمیں جو کچھ مل جاتا ہم چبا ڈالتے۔ بانس کی کونپلیں، درخت کے پتے، گھاس۔ ان میں سے کئی چیزیں مزے میں ایسی بُری بھی نہ تھیں۔ بلکہ بعض تو قید خانے کے کھانے سے اچھی تھیں۔

"رات کو ہم اپنی مقررہ حدود کے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر کسی کو ضرورت پڑ جاتی تو اس کام کے لیے کھانے کا برتن استعمال کرنا پڑتا۔

ہم دھوپ یا بارش میں جبری مشقت کرتے رہتے اور ہماری نگرانی کرنے والے سپاہی چھاؤں میں کھڑے سیٹی بجاتے رہتے۔"

اس کے بیان میں گلہ نہ تھا۔ تلخی نہیں تھی۔ شاید اسی لیے اس کا صداقتی اثر زیادہ تھا۔

"سپاہی عورتوں کو لے جاتے اور بعد میں انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ ایک کمزور قیدی سے کہا گیا: تمھاری ضرورت نہیں ہے، اور اسے گولی سے اُڑا دیا گیا۔

"ایک سپاہی اپنی ڈیوٹی پر اُوب گیا۔ اس نے مجھے لات مار کر جگایا ـــــ اس نے جوتے جو پہن رکھے تھے۔ وہ موٹر کے ٹائر کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ مجھے کوئی کہانی سُناؤ۔ تمھیں یہاں کا قانون پتا ہے ورنہ .....

اس دن سے میں کہانی سُنانے والا بن گیا۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ ایسی کہانیاں چنیں جن میں انسان نہ ہوں۔ میں ان کو جانوروں کی کہانیاں سُنانے لگا۔

میں اپنی مرضی کے خلاف داستان گو بن گیا۔

میری داستان گوئی جان بچانے کے لیے تھی۔ زندگی کی خاطر۔

(اپنی داستان گوئی کی داستان سُناتے ہوئے کاسی کا چہرہ پیچھے سے آنے والی روشنی کی زد میں آ کر اس وقت ماورائی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں سے یہ دوسرا چہرہ کس کا جھانک رہا تھا؟ شہرزاد کیا ایسی نظر آتی تھی؟)

"ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ کہانیوں کی فرمائش کرنے لگے۔ جس وقت سپاہیوں کی شفٹ شروع ہوتی، وہ وہیں آ جاتے۔ ایک ہی کہانی تھی جو ان کی شفٹ بدلنے کے ساتھ بار بار دُہرائی جاتی۔ تاوے (بوڑھا آدمی)، ہمیں کہانی سُناؤ، وہی والی کہانی۔ وہ مجھے تاوے کہنے لگے۔ حالاں کہ میری عمر پینتیس سال کی تھی۔ محض اس لیے کہ میں کہانیاں سُناتا تھا۔

"دوسرے قیدی سو جاتے تھے۔ مجھے کہانیاں سُنانی پڑتی تھیں۔

رات رات بھر۔

دن کے وقت اُن کی تفتیش اور جسمانی مشقت جو ہماری RE-EDUCATION میں شامل تھی۔ رات گئے انھیں کہانیاں سُناتا۔

"میں تھک کر چور ہو جاتا۔ لیکن جسمانی طور پر جتنا تھکا دینے والا تھا، یہ سلسلہ میرے لیے اتنا ہی حوصلہ افزا تھا۔ اُن کی نظروں میں بھی میرا رتبہ بدل گیا۔ اب میں دشمن کے آلۂ کار کے بجائے کہانیوں والا تاوے تھا۔

"ہر رات میں خدا سے دُعا مانگتا کہ آج کی رات میرا نام نہ نکلے۔ مجھے ایک دن اور زندہ رہنے دے۔ خُدا کے واسطے۔

(کس قدر حیرت انگیز تھی اس شخص کی جینے کی اُمنگ۔ کس شدت سے وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ایسا

گلا تھا لکھنے کی خواہش کی شدت کو ہاتھ بڑھا کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کہانی سنانے کا جذبہ کیا یہیں سے پھوٹتا ہے؟ زندگی کی قیمت کے طور پر کہانیاں سناتا۔)

"ایک دن میری باری آگئی۔ جن قیدیوں کو موت کی سزا دی جاتی تھی، اُن کو گردن سے ہاتھ باندھ کر ایک قطار میں باہر لے جایا جا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے مجھے پکڑ کر قطار میں سے باہر گھسیٹ لیا۔ اس نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ اسے رہنے دو، یہ کہانیاں سناتا ہے، اس نے دوسرے سپاہی سے کہا۔

میری جگہ کسی اور کو لے جایا گیا۔

جان بچ جانے پر میں نے خدا کا اور بی بی سی کا شکر ادا کیا۔"

کاسی دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس نے پانی کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے رومال نکالا اور پسینا پونچھنے لگا۔ تمام تر جوش و جذبے کے باوجود، اپنی داستان کے اس موڑ کو بیان کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ اُم القصص شہرزاد کے لیے بھی نہ ہوگا کہ جس نے کہانی کے نقطۂ عروج کو اپنی جان بچانے کا بہانہ بنا لیا تھا۔ اس نے بھی تو کہانی سُنا کر اپنی جان بچائی تھی۔ کیا کاسی کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی داستان، ایک اور داستان میں مضمر ہے۔ اس کی کہانی کے تمام لوازمات، تمام اجزائے ترکیبی ایک اور کہانی کی پیش بینی میں موجود تھے، اور اس نے کسی دوسرے زمان و مکان میں انھیں محض دُہرا دیا تھا۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ، اپنی کہانی میں سچّے۔ کہانی کی اس قوّت کی مثال جو جاں بخش بھی ہے اور دل سوز بھی۔ دونوں کی کہانی / زندگی کا انجام بھی ایک ہے: ہم اپنی کہانیوں سے زندہ رہتے ہیں۔

اب وہ اپنی داستان کو سمیٹنے لگا۔ "جب میری RE-EDUCATION مکمل ہو گئی تو انھوں نے مجھے بھینسوں کی دیکھ بھال کے کام پر لگا دیا۔ میں دن بھر بھینسوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ ایک دن مجھے کھیت میں ٹھوکر لگی۔ میں سمجھا کوئی ناریل ہوگا۔ مگر وہ کھوپڑی تھی۔ میں موت کے کھیتوں میں سے گزرتا رہا۔ میں اپنے دوستوں کو غائب ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں دربدر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن میں سرحد پار کر گیا اور وہ میرا پہلا دن تھا۔

پناہ گزینوں کے کیمپ میں اس نے جو تکلیفیں اُٹھائیں، ان کی داستان بھی کچھ کم دل خراش نہیں۔ وہاں سے اس نے ایم نیسٹی انٹرنیشنل کو خط لکھا۔ "۱۹۸۳ء سے میں امریکا میں ہوں۔ میں جگہ جگہ جا کر اپنی کہانی سُناتا ہوں۔ اس اُمید پر کہ دُنیا آیندہ ایسے HOLOCAUSTS برپا ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔ میں اس اُمید کی خاطر اپنے دکھ درد سب کو بتاتا پھرتا ہوں۔ ایک میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے جیسے اور بھی ہیں۔ ساری دُنیا میں ہیں۔ جگہ جگہ ہیں۔ دُنیا ان کی کہانی کو نہ بھولے۔

"قید خانے میں، میں اپنی جان بچانے کے لیے کہانیاں سُناتا تھا۔ اب ان واقعات کا ذکر یہ آس لے کر کرتا ہوں کہ شاید یہ دُنیا اپنے طور طریقے بدل ڈالے۔

اُمید پرستی کی اس انتہا پر پہنچ کر وہ مجھے ڈان کیہوتے معلوم ہو رہا ہے۔ بالکل ہی ناممکن العمل قصد پر نکلا ہوا، جس کی احمقانہ مہم جوئی پر ایسے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ پگلا کہیں کا۔ بھلا کہانیاں کہنے سے کہیں دُنیا بدلتی ہے۔ مگر اس خواب میں کیسی عظمت ہے کہ اس پر یقین لانے کو جی چاہتا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔

اس کے پاس سُنانے کے لیے اس خواب کے حصول کا قصہ ہی بہت ہے۔

"پہلے مجھے پروا نہیں تھی۔ میں بس کہانیاں سُن لیتا تھا۔ مگر اب اور بات ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کا دیکھنا مجھے یاد ہے۔ میں اُسے بھول نہیں سکتا۔ میری زندگی بدل گئی ہے۔"

وہ واپس جانے کے لیے مُڑتا ہے۔ "مگر اب کی کیا بات ہے؟" "آج کل ـــــ میں واشنگٹن میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔ گزر اوقات کے لیے گاڑیوں کی مرمت بھی کرتا ہُوں۔ میں نے قید خانے کے حکام کو اس وقت اپنا پیشہ یہی بتایا تھا۔ میں نے کہانی گھڑلی تھی۔ اب وہی میرے آگے سچ ہوکر آگئی۔" کیا کہانیاں یوں سچ ہوکر سامنے آجاتی ہیں ـــــ اپنے سُنائے جانے کی سزا بن کر؟ مگر مجھے کاسی ٹیکسی والے پرچیوٹ کا کوچوان یاد آگیا۔ کیا وہ ٹیکسی میں بیٹھنے والے مسافروں کو اپنی کہانی سُناتا ہے۔ کیا وہ سُنتے ہیں، یا گاڑی کا انجن ہی اس کا سامع رہ جاتا ہے۔

مگر ترجیح کسے ملنی چاہیے؟ ٹیکسی کے انجن یا گاڑی میں جُتے ہوئے گھوڑے کو، اگر وہ توجہ سے سُن رہے ہوں، یا بوسٹن کے ان SOPHISTICATED سامعین کو، جو داستان کے ختم ہوتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں۔ ان کے تمام تر سوالات سیاسی ہیں۔ ان کو اس بیانیے میں اسی حد تک دل چسپی ہے کہ وہ واقعات کا سیاسی تجزیہ کہاں تک کرسکتا ہے۔ سیاہ اور سُرخ قوتوں کو کس حد تک الگ الگ شناخت کرسکتا ہے ("کسی بھی گروہ میں مجھے دل چسپی نہیں ہے۔ اب ہمارے لیے کوئی باقی نہیں رہا جس پر اعتبار کرسکیں۔" کاسی سوال کا جواب دیتا ہے)" ـــــ ان میں سے کسے اس بات سے دل چسپی ہے کہ ابھی ابھی جو کچھ انھوں نے سُنا ہے وہ داستان گو کی قوتِ بیانیہ کی اعلا مثال ہے۔ ایک شخص اپنے زندہ تجربے کو کس طرح بیانیے میں ڈھالتا ہے۔ اور پھر اپنا تجربہ اوروں تک پہنچاتا ہے، ان کے شعور کو بدل ڈالنے کی اُمید کے ساتھ۔

مجھے سامعین کے رویّے پر تعجب کیوں ہوا؟ ان سے اسی رویّے کی توقع رکھنی چاہیے تھی۔ آخر کو ہر شخص وہی کہانی سُنتا ہے جو وہ سُننا چاہتا ہے۔ ہمیں وہی کہانیاں ملتی ہیں جس کے ہم مستحق ہیں۔ اور زندگی کا کتنا بڑا حصہ اپنی کہانی کی غلط تعبیر کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ خیر، مجملاً حاضرینِ محفل کو ان کی اپنی اپنی کہانیاں مُبارک۔ میں بھی ان میں سے اپنی کہانی اخذ کروں گا۔ میرے لیے زیادہ توجہ طلب کاسی کی داستان میں پنہاں ایک اور ہی داستان ہے۔ داستان در داستان۔ یہ داستان گوئی کی اپنی مشکلات کی کہانی ہے۔ وہ ماضی کا افسانوی بادشاہ ہو یا کسی جدید ریاست کا آمر، داستان گو کا وجود ـــــ کاسی، شہرزاد، آج کا افسانہ نگار ـــــ ان کی حقارت آمیز بے توجہی کا سزاوار ہوتا ہے کیوں کہ انھیں معلوم نہیں ہوتا ـــــ اور معلوم ہو بھی کیسے جب تک کہانی آگے نہ بڑھے ـــــ کہ اس کی جبلتِ تخلیق، اس ہنرِ داستان سرائی میں سرکشی کے آثار ہیں۔ منتری، خودسر اُمنگ جو جینا چاہتی ہے۔ اب وہ ایک ہی کام کرسکتا ہے، اس کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ کہانی کہتا رہے۔ وہ کہانیاں کہہ کہہ کر موت کو ملتوی کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کہانی پوری ہوجائے۔ یہ کہانی کی قوت ہے، داستان گو کے ہنر کا کرشمہ ہے کہ اندھی راج ہٹ کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑتا ہے۔ کہانی نے اپنے کہنے والے کی موت کو ایک دن اور دور کردیا۔ کہانی اپنے کہنے والے اور موت کا درمیانی فاصلہ بن گئی ہے۔ پہلے سے بھی کہیں زیادہ، آج کے افسانہ نگار کو کہانی اس طرح کہنی ہے کہ اس کا قتل ایک دن اور ٹل جائے۔ کاسی کی داستان ہم سے یہ کہتی ہے کہ آج افسانہ نگار کے لیے کہانی وقت گزاری کا مشغلہ نہیں، زندگی

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

(دوسری قسط)

امجد اسلام امجد کا سفرنامہ ان کے بعض دوستوں کا اعمال نامہ بھی ہے

امجد اسلام امجد کے سفرنامے کا نام "شہر در شہر" کی بجائے "شخص در شخص" ہوتا تو بہتر تھا۔ اس میں شہروں کا ذکر کم ہے اور اشخاص کا زیادہ۔ جمیل الدین عالی، پروین شاکر، اور عطاء الحق قاسمی ہمسفر تھے، اس لیے ان کا جا و بے جا ذکر تو ہونا ہی تھا، بیشمار لوگ سفر کے دوران ملے۔ ہوائی جہازوں کے مسافر، مشاعروں کے سامعین، اپنے گھروں پر دعوتیں کرنے اور اپنی کاروں میں گھمانے والے عقیدت مند سفرنامے میں ان سب کا ذکر ملتا ہے۔ ہر شخص کو اس کے مرتبے یا بساط کے مطابق یاد کیا گیا ہے۔ کسی کا ذکر ایک سطر میں ہے کسی کا ایک پیراگراف میں اور کہیں پورا ایک صفحہ کسی کی نذر کیا گیا ہے۔ کسی کے گھر اگر ایک دن سے زیادہ قیام رہا تو اسی نسبت سے ذکر خیر کے صفحات کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔

اس سفرنامے میں کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کا امجد کے سفر سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً صہبا لکھنوی، نظیر صدیقی، ڈاکٹر انور سدید۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان تینوں سے امجد کے کوئی خاص مراسم نہیں، اس کے باوجود امجد نے جس بے تکلفی و گرم جوشی سے ان کا ذکر کیا ہے، اس پر حیرت ہوتی ہے۔

صہبا لکھنوی کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ ایک روز شکاگو کی ایک محفل میں کسی نے اقبال کا کوئی شعر پڑھا جس میں "افکار" کا لفظ آیا تھا چونکہ "افکار" اور صہبا لکھنوی لازم و ملزوم ہیں، اس لیے دونوں کا ذکر چل نکلا۔ پروین شاکر نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ لندن میں قیام کے دوران صہبا لکھنوی نے یہ کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ لندن سے بھی "افکار" جاری کیا جائے، مگر میرے وسائل اجازت نہیں دیتے۔ اس پر کسی نے صہبا صاحب سے کہا، "لندن والوں کا ضابطہ اخلاق بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی ایسا رسالہ شائع کیا جائے جو صرف مشتہرین کے لیے ہو۔"

عام ضابطۂ اخلاق یہ ہے کہ کسی غیر ملک میں غیروں کے سامنے اپنے ملک کے داخلی مسائل پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ پروین شاکر کو یہ نہیں چاہیے تھا کہ وہ صہبا لکھنوی کے بارے میں شکاگو میں اس قسم کا واقعہ سنائیں اور اگر غلطی سے انھوں نے یہ واقعہ سنا ہی دیا تھا تو امجد کو نہیں چاہیے تھا کہ وہ اسے اپنے سفرنامے میں شامل کرتے۔ یہ درست ہے کہ غالب و میر کی طرح صہبا لکھنوی ایک بین الاقوامی شخصیت ہیں، تاہم وہ ہمارے

...ک کا ایک داخلی مسئلہ بھی ہیں؟ ان کے بارے میں
...یفے گھڑنا اور شائع کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔
نظیر صدیقی کا ذکر اس کتاب میں دو جگہ
...ملتا ہے اور دونوں جگہ موصوف کے شایان شان نہیں ہے
...برس کی سیر کرتے ہوئے امجد نے نظیر صدیقی
...ے تنقیدی مجموعے "تاثرات وتعصبات" کے
...والے سے کوئی بات کہی۔ عالی صاحب نے اس
...ات کو تو نظر انداز کر دیا اور نظیر صدیقی کی کتاب
کے بارے میں اپنے تاثرات وتعصبات اس طرح
ظاہر کیے: "میں داد دیتا ہوں آپ کے مطالعے
کی۔ کیا کیا چیزیں آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔" یقین
نہیں آتا کہ عالی صاحب اس قسم کی بات کہہ سکتے
ہیں۔ "تاثرات وتعصبات" وہ تاریخی کتاب ہے
جس میں عالی صاحب کی شاعری پر ایک طویل مضمون
شامل ہے۔ یہ عالی صاحب کی شاعری کا پہلا مفصل
تنقیدی جائزہ ہے۔ محض اس مضمون کی وجہ سے
عالی صاحب نظیر صدیقی کی پوری کتاب سے دل برداشتہ
ہو گئے۔ حالانکہ اس کتاب کے باقی مضامین خاصے فکر انگیز ہیں۔

دوسری مرتبہ نظیر صدیقی کا ذکر ساقی فاروقی کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ چند سال پہلے نظیر صدیقی لندن گئے تو ساقی نے انھیں کیٹس کا مکان دکھایا۔ مکان کے اردگرد پھیلے ہوئے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساقی نے کہا "یہ ہے وہ باغ جس کے درختوں سے اڑنے والی بلبلوں کے پیچھے کیٹس نے بے پناہ نظمیں لکھی ہیں۔" نظیر صدیقی نے بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا اور پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا۔ "کس درخت سے اڑی تھی وہ بلبل؟"

ہمیں اس واقعے کی صداقت پر شک ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے راوی ساقی فاروقی ہیں، جن کی سخن گوئی کی طرح سخن سازی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود نظیر صدیقی نے اپنے سفر نامۂ لندن میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ ان کا سفرنامہ پہلے ایک رسالے میں چھپا تھا اور اب "دو سفرنامے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے ساقی فاروقی کے ساتھ کیٹس کا مکان دیکھنے کا اعتراف کیا ہے، لیکن باغ اور بلبل وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ جب نظیر صدیقی نے کیٹس کے مکان کے اردگرد پھیلا ہوا باغ دیکھا ہی نہیں تو وہ اس باغ کے کسی درخت اور اس سے اڑنے والی بلبل کے بارے میں کوئی سوال کیسے کر سکتے تھے۔

دراصل قصہ یہ ہے کہ نظیر صدیقی سے ساقی فاروقی اس بات پر ناخوش ہیں کہ انھوں نے پروین شاکر پر تو ۲۵ صفحات کا مقالہ لکھا، لیکن ساقی کی شاعری پر ۵ صفحے بھی نہیں لکھے۔ بلبل والا لطیفہ سنا کر ساقی نے اپنی اس ناخوشی کا اظہار کیا ہے۔ بیجا نہ ہوگا، اگر یہ بھی بتا دیا جائے کہ ساقی فاروقی کی شکایت جب نظیر صدیقی تک پہنچی، تو انھوں نے کہا: "ساقی فاروقی کی شاعری پر پانچ صفحے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ میں پروین شاکر کی شاعری پر مزید ۲۵ صفحے لکھ دوں۔"

ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں امجد نے اپنے سفرنامے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نیازمندی کی بنا پر ہم ان سب باتوں کو نقل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے، البتہ اسلام امجد امجد سے ہمارے جو خوشگوار مراسم ہیں، ان کی وجہ سے کچھ خاص خاص باتیں نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "انور سدید ایک نقاد تھے۔ اب محقق، شاعر اور انشائیہ نگار ہیں۔ ایم اے اردو میں فرسٹ آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے

شہروں کے محکمے میں انجینیر ہیں۔ اصل میں وہ وسیع المطالعہ طالب علم ہیں، لیکن ان کے سارے علم اور مطالعے کا واحد مقصد ڈاکٹر وزیر آغا کو مشہور کرنا اور ان کے خلاف یا بارے میں لکھی جانے والی ہر تحریر کے جواب میں "ردِ عمل" لکھنا ہے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے عمدہ نقاد، اچھے ادیب اور نہایت نفیس اور ادب پرور شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ انور سدید کے چلائے توپ کے گولے، پورس کے ہاتھیوں کی طرح ان ہی کی صفوں کو روندتے رہتے ہیں اور ان خواہ مخواہ کے ادبی جھگڑوں کی وجہ سے ان کا ادبی مقام بڑھنے کی بجائے گھٹ رہا ہے۔"

ان باتوں پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ تبصرہ کرنے کے لیے ڈاکٹر انور سدید بذاتِ خود موجود ہیں۔ بہر حال ہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ امجد نے اپنے سفر نامے کو ڈاکٹر انور سدید کا اعمال نامہ بنا کر اچھا نہیں کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کو ڈیڑھ درجن مضامین لکھنے کے لیے ایک نہایت عمدہ موضوع دے دیا ہے۔ اب امجد اسلام امجد جانیں اور ڈاکٹر انور سدید۔ ہم دونوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔

اور اب آخر میں افتخار عارف کے بارے میں ایک اقتباس بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔"

افتخار عارف نے بطور شاعر اپنے لیے جو مقام پیدا کیا ہے اس کے حوالے سے اب وہ جدید نسل کے شعرا کی پہلی صف میں شامل ہے... بطور انسان وہ ایک انتہائی نفیس، ملنسار اور پسندیدہ شخصیت کا حامل ہے۔ اس کی پی۔ آر کا دائرہ اب کراچی اور لاہور کی تنگنائے سے نکل کر تین براعظموں کے پھیلاؤ پر محیط ہے۔ اگرچہ اتنے زیادہ دوست رکھنے والوں کی دوستی مشکوک ٹھہرتی ہے، پھر بھی ذاتی طور پر گزشتہ دس برس میں میں نے اسے ایک اچھا دوست پایا ہے۔ وہ حسبِ معمول بہت جوش اور تپاک سے ملا، لیکن اس کی آنکھوں کی الجھن اور بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی وجہ وہاں پروین شاکر کی موجودگی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پروین جب شاعری کے میدان میں نو وارد تھی اور ایف اے کی طالبہ کی حیثیت میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لیا کرتی تھی، تو اس وقت افتخار ایک بڑے بھائی اور سینیر کی طرح اس کے دوستوں میں پیش پیش تھا، پھر پروین کی خوشبو آئی اور آتے ہی پھیل گئی، تو پتا نہیں کس رو میں افتخار نے مختلف احباب کو ایک خط لکھ مارا جس میں "خوشبو" کے چار پانچ مصرعوں پر اپنا حق جتایا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ مختلف رسائل میں انٹرویو دیتے ہوئے بھی اس نے اس مسئلے کو خاص طور پر اچھالا۔ پروین کا دکھ اور غصہ تو اپنی جگہ، مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال دونوں کے مشترکہ دوستوں کے لیے پیدا ہو گئی اور پھر ہوتی ہی چلی گئی۔ معاملہ کچھ ایسا نازک اور جذباتی تھی کہ اگر شروع میں سنبھل جاتا تو سنبھل جاتا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلوں میں پڑی ہوئی گرہیں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں اور اگرچہ ایک وقت میں افتخار نے کچھ احباب کو بیچ میں ڈال کر وضاحت کی اور صلح صفائی کی بھی کوشش کی، مگر اس وقت پروین نے مذاکرات سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ مسئلہ پر کسی قسم کی بات کرنا اور سننا نہیں چاہتی...

افتخار کے بار بار کہنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے باہر رکھا اور افتخار کو بھی مشورہ دیا کہ اتنی بگڑی ہوئی بات ایک دم نہیں بن سکتی... یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چارٹ جیسے ذہین، صلح کل، ذمہ دار اور محتاط شخص نے ایسا غیر محتاط بیان کیسے اور کیوں دیا تھا؟ آسکر وائلڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے اپنے خلاف لگائے گئے ایک الزام کو عدالت میں چیلنج کیا تھا اور اس کے بعد کیس ہار کر، خود اندر ہو گیا تھا۔ ●

بقیہ صفحہ ۶۳

کے عمل کا وسیلہ اور زندگی کا جواز ہے، زندگی کی قیمت ہے۔ جینے کی یہ مہلت ایک کہانی کے کہنے سننے پر منحصر ہے۔ آج کے افسانہ نگار کو کہانی اس احساس کے ساتھ کہنی ہے گویا اس کی زندگی کا دارومدار داستان گوئی کے اس عمل پر ہو ——— کہانی کا تانا بانا نہ پھیلایا تو آنے والے دن کا اُجالا دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ فجر کے وقت سے پہلے لاش بے گور و کفن پڑی ہوگی (عام شہریوں کے لباس میں) اور سر فصیل شہر سے لٹکا ہوا ہوگا۔ سر پر ننگی تلوار ہٹے گی تو کہانی کے اعجاز سے۔ ہمارے واسطے جان بخشی ہے تو کہانی کے دم قدم سے۔

(طویل مضمون کا اقتباس)

انور سدید
۱۷۲- ستلج بلاک- اقبال ٹاؤن
لاہور- ۵۴۵۷۰ پاکستان

کچھ وقت پاکستانی کتب و رسائل کے ساتھ

اُردو نثر میں سیرت رسولؐ

ڈاکٹر انور محمود خالد

ڈاکٹر انور محمود خالد اُردو ادب میں ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت میں رونما ہوئے تھے، ان کی شاعری کا مجموعہ "پہلا پتھر" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ پھر وہ درس و تدریس کے میدان میں کارہائے نمایاں دکھانے لگے اور ان دنوں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں، صدر شعبہ کے تنظیمی امور میں کھو جانے سے قبل ڈاکٹر صاحب نے ایک دقیع کام اپنے ذمّے لیا اور اسے بے حد محنت اور جگر کاوی سے معینہ وقت میں تکمیل تک پہنچا دیا۔ ان کا یہ تحقیقی اور علمی کام "اردو نثر میں سیرت رسولؐ" کے عنوان سے چھپ کر سامنے آگیا۔ پنجاب یونی ورسٹی نے اس مقالے پر مصنف کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی، اور یہ چند ایسے تحقیقی مقالات میں سے ہے جس پر پنجاب یونی ورسٹی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں "سیرت" کی تعریف و توضیح پیش کی گئی ہے اس باب میں ڈاکٹر انور محمود خالد نے اس کتاب کی حدود کا تعین کیا ہے۔ انھوں نے سیرت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کے علاوہ اس لفظ کے اوّلیں استعمال، تاریخ سے استفادہ اور حضورؐ کی سیرت میں احادیث کے استعمال پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب سیرت رسولؐ کے مآخذ و منابع پر روشنی ڈالتا ہے۔ تیسرے باب میں اُردو نثر میں سیرت رسولؐ کے ابتدائی نمونے تلاش کیے گئے ہیں، اور پس منظر کے طور پر برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور اردو نثری تصانیف کے آغاز کا احوال پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ

> "اردو میں اگرچہ منظوم کتب سیرت کا آغاز گیارھویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا لیکن نثر میں ان کی ابتدا تیرھویں صدی ہجری میں ہوئی۔ اس سلسلے میں پیش قدمی کا شرف دکن کو حاصل ہوا۔ جنوبی ہند کا سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی، لسانی، علمی اور ادبی ماحول اس کے لیے خاصا سازگار تھا" (ص ۲۱۹)۔

انھوں نے ریاض السیر۔ ممتاز التفاسیر اور فوائدِ بدریہ کو دکنی نثر میں اُردو کی ابتدائی کتب سیرت میں شمار کیا ہے اور ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی کی تحقیق کی توثیق کی ہے۔ کتاب کے چوتھے باب میں "اردو سیرت نگاری کے باقاعدہ آغاز و ارتقا" پر بحث کی گئی ہے۔ یہ باب ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک کی کتب سیرت کا احاطہ کرتا ہے۔ کتاب کا پانچواں اور چھٹا باب آزادی سے قبل کے دور پر محیط ہے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد نے اسے اُردو سیرت نگاری کا عہد زریں شمار کیا ہے۔ آخری باب میں آزادی کے بعد کے دور کو (۱۹۸۵ء تک) زیر بحث لایا گیا ہے یوں یہ کتاب ہمارے سامنے اردو نثر کی ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک کی سیر حاصل مطالعہ پیش کر دیتی ہے۔ اور ہمارے سامنے ان افکار کو مجسم کر دیتی ہے جو اُردو زبان کے اتنی

ی تعداد میں کتب سیرت پیش کر کے حاصل کر لیا ہے۔

اس کتاب کو دیکھ کر سب سے پہلے ڈاکٹر انور محمود خالد کی محنت، موضوع کے ساتھ ذہنی لگن اور تلاش کتب سیرت اور حوالہ کے لیے نئے ماخذات کی دریافت پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیشتر بنیادی ماخذات تک رسائی حاصل کی اور مطالعے کے بعد اپنے نتائج آزادانہ طور پر نکالے۔ چنانچہ اس کام کو اگر انسائیکلو پیڈیائی کہا جائے تو یہ درست ہوگا۔ انور محمود خالد صاحب نے یہ کام آج سے کم و بیش آٹھ سال قبل ختم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے اقبال اکادمی لاہور سے چھاپنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ڈاکٹر صاحب کو یہ کتاب زیادہ سے زیادہ مستند اور جامع بنانے کا خیال پیدا ہوا انھیں نیا مواد ملتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کتاب میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ اب ہمارے سامنے ایک ایسا تحقیقی مقالہ آگیا ہے جو ۸۵۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اپنی نظیر آپ ہے۔ اس موضوع پر اتنی جامع تالیف پہلے کبھی پیش نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر انور محمود خالد کے اسلوب نثر کو ان کی شاعری نے متاثر کیا ہے۔ اُن کی نثر کو تخلیقی اور رومانی قرار دیا جائے تو یہ درست ہوگا۔ زیر نظر کتاب ایک تحقیقی کتاب ہے۔ انور محمود خالد نے اپنی تحقیق کے ثمرات اس خنک مزاجی سے پیش کیے ہیں کہ قاری ان کے مطالعے میں نفاست اور لطافت محسوس کر لیتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اقبال اکادمی پاکستان کے لیے بھی سرمایۂ افتخار ہے۔

اقبال پر تحقیقی مقالے

(ڈاکٹر صدیق جاوید)

ڈاکٹر صدیق جاوید اردو ادب کے ایک زیرک ناظر اور ایک عمدہ "کتاب دوست" ہیں، اچھی کتاب کی تلاش میں وہ پوری زندگی صرف کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں، اور حسبِ مطلب کتاب مل جائے تو اُسے خریدنے کے لیے اپنی ساری جائیداد فروخت کرنے سے بھی گریزاں نہیں ہوتے۔ لاہور میں ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب وقیع ہی نہیں بلکہ بہت سے سرکاری کتب خانوں سے بلحاظ مواد قیمتی ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کی دوسری خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تالیف و تصنیف کا فریضہ قبول کیا تو خود کو موضوعات میں بکھرنے نہیں دیا اور اپنے لیے اقبالیات کو منتخب کیا تو اس کے لیے ہمہ جہت مطالعے کو اساس بنایا۔ ان کی گراں قدر تنقیدی کتاب "بالِ جبریل کی غزل" اہلِ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ایک اور ضخیم کتاب "اقبال کے عمرانی نظریات" کے بارے میں ہے اور ان دنوں زیرِ اشاعت ہے۔ اقبال سے ان کی عقیدت و محبت اس حقیقت سے بھی عیاں ہے کہ ان کے سامنے اقبال پر جو کام بھی آتا ہے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے اور جہاں اسقام نظر آتے ہیں مزید تحقیق و جستجو سے دور کرنے میں کوشاں ہو جاتے ہیں اس طرح جو نیا مواد میسر آتا ہے وہ ایک مقالے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب "اقبال پر تحقیقی مقالے" اسی نوع کی کتاب ہے جو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے اہتمام سے بزمِ اقبال لاہور نے شائع کی ہے، اور اس میں حیاتِ اقبال کے بعض ایسے حقائق اور واقعات کی تنقیح کی گئی ہے جو روایت و درایت کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

آٹھ ابواب پر مشتمل یہ کتاب مختلف شخصیات سے اقبال کے تعلق اور عقیدت آشکار کرتی ہے۔ "حضرت نظام الدین اولیا اور اقبال" "آرنلڈ اور اقبال"۔ "پروفیسر براؤن اور اقبال"، "حضرت بلالؓ اور اقبال" جیسے عنوانات پر ڈاکٹر صدیق جاوید نے وہ تمام مواد فراہم کر دیا ہے جن سے اقبال کے روابطِ محبت آشنا

ہوتے ہیں۔ ایک گراں قدر مضمون "تنقید غالب میں اقبال کا حصہ" ہے، ایک اور مضمون میں مسجد قرطبہ میں اقبال کی حاضری کے آثار پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ایک اساسی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے ماخذات تک رسائی حاصل کی گئی ہے جو بالعموم نظر سے اوجھل ہو گئے تھے اور اب فراہم کر دیے جانے کے بعد تحقیق و تنقید میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

بزم اقبال لاہور ایک طویل عرصے تک اپنی تحقیقی سرگرمیوں سے بے نیاز سی ہو گئی تھی، ڈاکٹر وحید قریشی نے اب اس میں نئی روح پھونک دی ہے اور گذشتہ دو سال کے عرصے میں اقبالیات کے موضوع پر گراں قدر ذخیرہ کتب فراہم کر دیا ہے۔ زیر نظر کتاب "تحقیقات اقبال" کے سلسلے کی ایک قیمتی کڑی ہے۔ اور اقبال دوستوں کو بنیادی نوعیت کا مواد فراہم کرتی ہے۔ ●●

از :۔ وینکٹیش ماڈگولکر
مترجم: سری نواس لاہوٹی
۱۸ دوہال حمایت نگر
حیدرآباد

ولایتی مرغی

(طنزیہ کہانی مراٹھی سے)

صبح کے ناشتے کے بعد گانو والے اپنے کھیتوں کی طرف جانے لگے۔ گانو کا پٹیل اپنی شکستہ حویلی کے سامنے صحن میں مرغیوں کو دانا چگاتا ہوا دکھائی دیا۔ صبح کی سنہری دھوپ میں پٹیل مٹھیاں بھر بھر کر دانے پھینک رہا تھا اور دو ولایتی مرغے ان دونوں کو چگنے جا رہے تھے۔

گھر کے کام کاج میں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے والا پٹیل آج مرغیوں کو دانا چگا رہا تھا، گانو والے سوچ میں پڑ گئے۔ ہاتھ میں ہنسیا اور رسّی لیے دس پانچ گانو والے پٹیل کے صحن میں جمع ہو کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

پٹیل گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اپنی بنڈی کی جیب سے سفید جوار کے دانے نکال کر مرغوں کی طرف پھینک رہا تھا۔ پرانی کیڑا لگی جوار کو چھوڑ کر وہ صاف اور نئی جوار کیسے چگائے جا رہا تھا۔ لوگ تعجب میں پڑ گئے۔ وہ پٹیل کی اس کارستانی کو سمجھ نہ سکے۔

ہاں یہ بات سچ تھی کہ دانہ چگنے والے مرغا اور مرغی بالکل نئی قسم کے تھے۔ گانو کے بڑے سے بڑے مرغے کے مقابلے میں وہ خوبصورت اور موٹے تازے تھے۔ بڑا مرغا چونچ کے اوپر کی بھاری بھرکم کلغی ہلاتے ہوئے دانہ چگ رہا تھا۔ سفید رنگ کا یہ مرغا کسی پولس افسر سے شان میں کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گردن اوپر کر کے لوگوں پر ایک نظر ڈالتا اور پھر دانہ چگنے میں مصروف ہو جاتا۔

ویسے ہی مرغی بھی تھی۔ دیکھنے میں حسین مگر جسامت میں بالکل کسی بڑے افسر کی بیوی نظر آتی تھی۔ ایک عجیب شان سے چلتی تھی اور گردن کو مٹکا کر دانے چگتی تھی۔

بے شک مرغیاں اچھی ہیں مگر اس کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہے کہ پٹیل خود انھیں دانا چگائے؟ ان ولایتی مرغیوں کو بوئی جانے والی جوار چگائی جا رہی تھی، ویسے دیکھا جائے تو اتنے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر اس کا کوئی اثر پٹیل کے چہرے پر نہیں تھا۔ جیسے کوئی کسی افسر سے برتاو کرتا ہو۔ اسی طرح پٹیل مرغیوں کے ساتھ برتاو کر رہا تھا۔ بڑے ادب کے ساتھ بڑے اپنے پن سے۔ لیکن آخر یہ سب کیا ہے؟

بھولا سے نہ رہا گیا۔ ایک بار کھنکھار کر کہا، تھوک کر دھیرے سے بولا۔ "ولایتی جوڑا

کہاں سے خرید لائے ہو "؟

"جوڑا ولایتی لائے کیا"؟

"ہاں۔ ہاں"

اتنی ہامی بھر کر پٹیل پھر مرغیوں کی طرف ادب سے دیکھنے لگا۔

"بکریاں چرانے والا لڑکا دل کو لگنے والی بات کہ گزرا"

"بھولا چار سیر گوشت تو نکلے گا ہی ان کا۔ کیوں؟"

ہاتھ پیچھے کر کے کھڑا ہوا ہلکو بولا" بے شک۔ ہمارے گانو کے مرغے تو اس کی پاسنگ بھی نہیں اترتے"۔ لوگوں میں اس جوڑے کی چرچا ہونے لگی۔

"بھائی، کون سے دیس کی ہیں؟"

"میں سمجھتا ہوں ولایتی نہیں ہیں۔ جرمنی کی دکھائی دیتی ہیں"۔

"جرمنی، کیا؟"

"ایک ملک ہے وہیں کی ہوں گی"۔

"تو نے کیسے جانا"۔

"بمبئی میں ہمارے صاحب کے پاس بھی ایسی ہی تھیں"۔

دانے چگتے چگتے مرغے کو ہڑک سوار ہوئی اور وہ مرغی کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ پر پھیلا کر گھومنے لگا۔ وہ بھاگنے لگی۔ گردن لٹکا کر وہ پیچھا کرنے لگا۔ مرغی کنکڑوں کوں، بول کر چلانے لگی۔ صحن بھر میں ہو ہلّہ شروع ہو گیا۔

پٹیل بیڑی کا کش کا لیتے ہوئے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

ہلکو نے پوچھا۔ "جوڑی کتنے کی پڑی، پٹیل؟"۔

"ہلکو، میری نہیں ہیں یہ مرغیاں"۔

"پھر نئی دکھائی دے رہی ہیں۔ سوچا تمھاری ہی ہوں گی"۔

"نہ"۔

"مہمان لے آئے کیا؟"

"نہ، سرکاری ہیں"۔

"سرکاری؟"

"ہاں، ہاں۔ اپنے گانو کے لیے سرکار نے بھیجی ہیں۔

سب تعجب میں پڑ گئے۔ سرکار سزا دیتی ہے۔ انعام دیتی ہے۔ لیکن مرغے؟

گانو کو مرغے دینے والی کون سی سرکار ہے؟ سوچنے کی بات ہے" بھولا بولا۔

گانو میں افسر آتے ہیں۔ انھیں کھانا کھلایا ہی جاتا ہے۔ گانو کے مرغے انھیں کیوں کر پسند آئیں گے۔ اسی لیے سرکار نے مرغے بھیجے ہیں۔

اس پر پٹیل نے مسکراتے ہوئے کہا "ارے، پاگل۔ افسروں کو مرغے؟

"پھر کس لیے؟"

مرغی ہار گئی تھی۔ اس کی چونچ پر کی کلغی لال لال ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ مرغے کے پاس پاس ل رہی تھی۔ مرغے نے رک کر، بایاں پاؤں اٹھا کر، سینہ تان کر، ایک لمبی بانگ دی۔

بانگ سن کر، پڑوسی سنار باہر آیا اور مجمع میں شامل ہو گیا۔

ولایتی مرغے دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "بانگ اس نے دی؟"

سنار بوڑھا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے۔ پوپلا منہ، کان اور سینے کے بال سفید ہو چکے تھے۔ لوگوں کے ہاں کہنے پر وہ ہاتھ کا چھتا اوپر کر کے کہنے لگا۔ "آج اتنے سال سے مرغے کی بانگ سنتا ہوں۔ مگر آج صبح جیسی بانگ کبھی نہیں سنی تھی۔" پٹیل بھولا نہیں سمجھا۔ کہنے لگا۔ "آج صبح نا؟ پھر وہ بانگ تو ان سرکاری مرغوں کی تھی۔"

سنار خوش ہو گیا۔ اور بولا۔ "سرکاری ہیں نا، چلو بات ختم ہوئی۔ روپے ادا کیے ہوں گے تم نے ؟"

"ہاں،" پٹیل نے صفائی پیش کی۔ "سرکار اب گانو میں مرغیوں کی افزائش نسل کو ترقی دے گی۔ اور یہ مرغے ہم سنبھالیں گے۔ تاکہ پانچ سال میں ان مرغیوں کی اتنی نسل بڑھ جائے گی کہ گانو میں سوائے اس نسل کے اور کسی دوسری نسل کے مرغے باقی نہ رہیں۔"

سب کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بھولا نے کہا۔ "اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جوڑی سرکار نے بھیجی ہے۔"

"اور کیا۔"

"لیکن، پٹیل کہیں بیماری سے مر گئیں تو پھر کیا ہو گا۔ سرکار دام وصول کرے گی ؟"

بھولا، کا یہ اندیشہ ٹھیک تھا۔ پٹیل بھی سوچ میں پڑ گیا اس مسئلہ پر پٹیل نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ تھوڑی دیر رک کر بولا۔ "ارے بھولا، ان ولایتی مرغیوں کو بیماری ہی نہیں لگتی اور اگر بیمار ہو ہی جائیں تو سرکار نے انتظام کیا ہے۔ دوائی کی پیٹی بھیجی ہے۔ جو میرے پاس ہے دوائی دیتے ہی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

"اچھا، پھر ہماری مرغی بیمار پڑے تو لائیں تمہارے پاس ؟"

"ہٹ۔ ارے پاگل۔ وہ ولایتی دوائی گانو کی مرغیوں پر اثر نہیں کرے گی۔" پٹیل کی باتیں سن کر گانو والوں نے اپنا راستہ لیا۔

آٹھ دس دن گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک دن تحصیل دار صاحب کا تانگا گانو میں آکر رکا۔ گانو کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرنے۔ پٹیل گھبرا گیا۔

ہنومان جی کے مندر میں شطرنجی اور تکیے بچھائے گئے چپراسی نے پٹیل سے پانی منگو لیا ہاتھ منہ دھو کر صاحب تیار ہوئے اور پٹیل سے معائنہ کے لیے کاغذات منگوائے۔ کاغذات آتے ہی معائنہ شروع ہوا۔ اور غلطیاں پکڑی جانے لگیں۔ پٹیل اور اس کا کارندہ بستے کے کنارے منہ لٹکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ گانو کے کچھ سرکردہ لوگ کوٹ، ٹوپی اور شملہ باندھے بیکار سے کھمبے کا سہارا لیے کھڑے تھے۔ کچھ گانو والے سامنے کے میدان میں بیٹھے زمین پر لکیریں کھینچ

بیٹھے تھے۔ سب لوگ اس طرح سے خاموش تھے جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صاحب کاغذات شغول تھول کر غلطیاں پکڑنے میں مصروف تھے اور چپراسی دیوار کا سہارا لیے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ کھونٹی پر صاحب کی نیلے رنگ کی شیروانی لٹکی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں بیڈ نگ، توشہ دان، چھتری اور چمڑے کا بیگ رکھا ہوا تھا۔ پھر یکایک گرجدار آواز میں تحصیلدار صاحب کہنے لگے "گدھے کہیں کے۔ کام کرتے ہو یا حجامت؟ بے شرم، پاجی، حرامخوری کی تنخواہ پاتے ہو؟ اب کون تمہارا باپ ٹھیک کرے گا اسے؟"

پٹیل اور کارندے کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ افسر ان کی چمڑی ادھیڑنے پر تلا ہوا ہے۔

آس پاس کے لوگ سہم گئے۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں صاحب ان پر بھی برس نہ پڑیں۔

صاحب کے چہرے پر ایک رنگ جا رہا تھا اور ایک رنگ آ رہا تھا۔ ان کی زبان سے الفاظ بھی ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"کیوں جی پٹیل؟ نوکری کیوں کرنے بیٹھے، حجام کی دکان کیوں نہیں کھول لی، غنڈا گردی کرتے ہو، پیسے کھاتے ہو، لوگوں کا خون چوستے ہو، حرام خور، پاجی، الّو کہیں کے!!"

پٹیل ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ گڑگڑا کر کہنے لگا "اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ صاحب۔ مہربانی کیجیے، مجھے بچا لیجیے!"

"کیا بچاؤں؟ خاک! شرم نہیں آتی غلطیاں کرتے؟ کتنا پیسا ہضم کر لیا اور ڈکار بھی نہیں لی"

پٹیل کے اوسان خطا ہو گئے۔ کھانے کے وقت تک تحصیلدار صاحب بولے چلے جا رہے تھے۔ لاکھ غلطیاں تلاش کر ڈالیں۔ صاحب کھانا کھانے کے لیے اٹھے۔ توشہ دان میں سے کھانا نکالا گیا ـــــ کھانے کے بعد آرام کرنے لگے۔ بھوک سے کانپتے ہوئے پٹیل کو ایک طرف لیجا کر چپراسی کہنے لگا ـــــ "رات کو اچھا کھانا پکواؤ۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بہت اچھا۔ مگر کھانا میٹھا ہو یا نمکین؟" پٹیل نے دریافت کیا۔

"میٹھا کاہے کے لیے؟ ارے مرغی کا تو مرغی۔ مزہ آ جائے ایسی بناؤ۔"

"بہت اچھا۔ صاحب۔"

پٹیل واپس گھر آیا اور بیوی کو حکم دینے لگا۔ "صاحب۔ رات کو یہیں ٹھہرے گا۔ عمدہ کھانا پکاؤ۔ مگر مرغی بھی ہونی چاہیے۔"

پٹیل کی بیوی نے عمدہ کھانا بنایا۔ چپراسی توشہ دان بھر کر لے گیا۔ کھانے کے بعد صاحب ٹھنڈا پڑ گیا اور لہجے میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ صبح اچھی خاصی ہدایتیں دیکر جاتے وقت پٹیل سے کہنے لگا "کھانا تو خوب بنایا، پٹیل رات میں۔ اتنی اچھی مرغیاں تمہارے پاس ہیں اس کی خبر ہی نہیں تھی۔"

پٹیل ایکدم ہنس دیا اور بولا۔ "ضرورت ہو تو ایک دو ساتھ لے جائیے۔" صاحب اس پر خاموش ہو گئے۔ لیکن چپراسی پٹیل کے اطراف گھومنے لگا۔ پٹیل گھر جا کر بیوی سے کہنے لگا "وہ مرغی چاہتا ہے

کہتا تھا۔ "ایسی مرغیاں تمھارے پاس ہیں اس کی خبر ہمیں نہیں تھی۔"
پٹیل کے جملہ ختم کرتے ہی اس کی بیوی کہنے لگی یہ صاحب کی بڑی خوشامد کرنے لگے تھے۔ وہ مرغی مانگتا ہے؟ ہماری مرغیاں کہاں اچھی ہیں وہ تو اپنی ہی مرغیاں کھا کر جا رہے ہیں۔"

"کس منہ سے ایسا کہوں۔"

"پھر کیا کریں؟ روز تمھارا صاحب آئے گا اور مرغی مانگے گا پھر ایک بھی مرغی باقی نہیں بچے گی۔ رات میں بچی ہوئی مرغیاں اپنی تھوڑے ہی تھیں۔

"پھر پٹیل سناٹے میں آگیا۔"

"سرکاری مرغیاں پکائی گئی تھیں۔" پٹیل کی بیوی نے جواب دیا۔

پٹیل ایک دم زمین پر بیٹھ گیا اور اس کی زبان سے نکلا۔ ہائے بھگوان۔ اب تو میں مرگیا۔" باہر کھڑے ہوئے۔ چپراسی نے سب سن لیا تھا۔ وہ سیدھا صاحب کے پاس پہنچا۔ اور تمام باتوں کی انھیں رپورٹ دے دی۔

تانگا چلنے لگا تب پٹیل اپنی بیوی کے پاگل پن کی وجہ سے پریشان ہو کر تانگے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

صاحب نے دریافت کیا۔ "پٹیل مرغی لائے؟"

پٹیل چاپلوسی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "دیسی مرغیاں اب نہیں رہیں، صاحب!"

"دیسی یعنی کیسی؟"

"اچھا ولایتی مرغیاں بھی تم پالتے ہو؟"

"میں نہیں صاحب ... وہ مرغیاں ...!"

"بولو، کہو! کیوں خاموش ہو؟"

"نہ صاحب ... پر ...!"

"بولو، کیا بات ہے؟"

"بچالو صاحب مجھے۔ بیوی نے غلطی کی ہے۔ میرے پیچھے سرکاری مرغیاں کاٹ کر پکادیں۔ آپ کے لیے!"

"پاجی، بے شرم!"

"صاحب پھنکارنے لگے۔ پٹیل نے تانگے میں بیٹھے ہوئے صاحب کے قدم تھام لیے اور عرض کرنے لگا۔ "سنبھال لو صاحب! اب آپ کے ہاتھ میں ہوں۔"

"کیا سنبھالوں، خاک؟ اب کلکٹر مجھے کچا چبائے گا۔ اب میں کیا کروں؟"

"میری غلطی نہیں ہے صاحب! بیوی نے ایسا کر دیا۔ مجھے پتا تک نہیں چلا۔ بچالو صاحب اب کی بار بچالو!!"

"بے وقوف؟ اوپر سے منہ چلاتا ہے۔ تیری بیوی بے عقل ہے اس سے مجھے کیا سروکار؟"

تانگا آگے اور پٹیل پیچھے پیچھے۔ صاحب گالیاں دیتے رہے اور پٹیل ان کے پیر پڑتا رہا۔ یہ سلسلہ ایک میل تک چلتا رہا۔ آخر میں صاحب نے کہا۔

"جاؤ۔ دفان ہو یہاں سے۔ درخواست دو مجھے کہ مرغیاں بیماری سے مرگئیں۔ میں تصدیق کردوں گا۔ جاؤ پاگل، بے شرم کہیں کے!!!؟ ● ●

اڈیٹر کتاب نما کے نام کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

شہزاد منظر نے "اردو تنقید کا زوال" کے زیر عنوان حسب معمول ادب کے ایک بنیادی مسئلہ کے جانب متوجہ کیا ہے اور حسب معمول ان کی تحریر خیال انگیز اور بروقت ہے۔ شہزاد منظر کی یہ تحریر ان کی دردمندی اور ادب سے ان کی گہری اور استوار وابستگی کی آئینہ دار ہے۔ بے جا طنز اور تعریض ان کا شیوہ نہیں۔ اردو کے تنقید نگاروں سے ان کو جو گلے شکوے ہیں وہ مربیانہ نہیں ہیں خلوص نیت پر مبنی ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ حقیقت ہے کہ اردو تنقید کی موجودہ روش سے متعلق ان کی تشویش تنہا ان کی تشویش نہیں ہے ان کا اظہار جا بجا مختلف اطراف سے کیا جاتا رہا ہے۔ بایں صورت اس پر غور کرنا ہم پر لازم ہے کہ آیا اردو تنقید کی موجودہ حالت اور اس کا مستقبل اتنا ہی تاریک اور مایوس کن ہے جتنا کہ انھوں نے پیش کیا ہے:

ان کا اداریہ/مضمون کی تلخیص ان پانچ نکتوں کے تحت کی جاسکتی ہے:

۱۔ ادبی تنقید اپنے وجود کا معقول جواز رکھتی ہے اور ادب کی تفہیم، تعبیر اور قدر کے لیے ایک ناگزیر اور مفید کردار ادا کرتی رہی ہے۔

۲۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد تنقید تخلیق پر حاوی ہوگئی تھی اور ان کے نزدیک یہ مرحلہ خوش آیند نہیں تھا۔

۳۔ تدریسی تنقید مضامین اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے ذریعہ اردو تنقید کے زوال کا پہلا سبب ہے

۴۔ تقریباتی تنقید میں مصنفین کی مبالغہ آمیز مدح سرائی تنقید کے زوال کا دوسرا سبب ہے۔

۵۔ تنقید کے زوال کی ایک نشانی یہ ہے کہ آج کل نظریاتی تنقید کی سست رفتاری ہے۔

۱۔ جہاں تک پہلے نکتہ کا تعلق ہے اس میں شہزاد منظر نے اختلاف کی گنجایش بہت کم چھوڑی ہے اس لیے اس پر زیادہ تفصیلی اظہار غیر ضروری ہے۔ البتہ جہاں انھوں نے آرنلڈ کے مشہور قول کو نقل کیا ہے وہاں ہمیں کچھ دیر کے لیے رکنا پڑتا ہے:

"میتھیو آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات قرار دیا ہے لیکن ادب کا مقصد محض تنقید حیات نہیں تعبیر و تشریح حیات بھی تصور کیا جاتا ہے" (ص ۲)

تعبیر و تشریح تنقید کے بنیادی اور داخلی اجزا میں شامل ہیں اور آرنلڈ کے منشا میں بھی۔ اس لیے ان کا علاحدہ ذکر غیر ضروری تھا۔ عام طور پر یہ تصریح بھی غیر ضروری ہوتی لیکن جس سیاق و سباق میں شہزاد منظر نے اسے پیش کیا ہے یہ صراحت ناگزیر بن گئی ہے۔

۲۔ یہاں بھی شہزاد منظر کا رویہ کچھ مبہم سا ہو گیا ہے فرماتے ہیں:

"۱۹۶۵ء کی دہائی کے بعد ہندستان اور پاکستان دونوں میں صورت حال بالکل بدل گئی اور تخلیق کا زور ٹوٹتے ہی تنقید اردو ادب پر چھا گئی" (ص۵)

بین السطور سے ظاہر ہے کہ شہزاد منظر ایسی صورت حال کو خوش آیند تصور نہیں کرتے۔ تخلیق پر چھا جانے والی تنقید سے ان کی مراد تنقید کے معیار کی بلندی نہیں، تدریسی اور تقریباتی تنقید کی فراوانی ہے:

۳۔ شہزاد منظر کا اس ضمن میں یہ کہنا ہے کہ:

"اس وقت اردو میں تنقید کے زوال کا ایک سبب تدریسی تنقید کی فراوانی ہے" (ص۶)

وہ تدریسی تنقید کی افادیت کے یکسر منکر نہیں ہیں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

"تنقید کے لازمی پرچے کی وجہ سے ادب کے طالب علموں میں نہ صرف مختلف تنقیدی نظریات سے واقفیت پیدا ہوتی ہے بلکہ ان میں تنقیدی شعور اور شعر و ادب کی صحیح تحسین و تفہیم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے" (ص۵)

اس سلسلے میں ان کی اصل شکایات دو ہیں:

الف "اردو کا لیکچرر تنقید کے نام پر جو کچھ لکھتا ہے، اسے ادبی رسائل میں بھیج دیتا ہے اور ہمارے مدیران کرام ایسے مضامین کو بڑی شان سے شائع کر دیتے ہیں" (ص۵)

ب "لیکچرر شپ کے لیے ڈاکٹریٹ لازمی قرار پانے کی وجہ سے بھی اردو میں تدریسی تنقید کو غیر معمولی فروغ ہو رہا ہے" (ص۵)

جس صورتِ حال کو شہزاد منظر نے پیش کیا ہے اس سے کچھ اختلاف نہیں۔ یہ بیان واقعہ کے لحاظ سے حرف بہ حرف صحیح ہے پھر بھی بہت سے امور وضاحت طلب ہیں:

"پہلا سوال یہ ہے کہ کیا بری اور غیر معیاری تنقید پر مدرسوں کی اجارہ داری ہے۔ مدرس حضرات صرف تنقید پر قانع نہیں ہوتے۔ شاعری اور افسانہ نگاری سے بھی شغف رکھتے ہیں اور وہ اسی معیار کی ہوتی ہیں جس معیار کے ان کے مضامین ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود تدریسی غزل یا تدریسی افسانے کی اصطلاح سننے میں نہیں آتی ہے۔ ہاں البتہ ریختہ کے استاد کا ذکر ہو جاتا ہے۔

اس بذلہ سنجی سے قطع نظر، شہزاد منظر اس شکایت میں حق بجانب ہیں کہ تدریسی تنقید ادبی رسائل میں کیوں شائع کی جاتی ہے۔ ان کی جگہ یقیناً ادبی رسائل میں نہیں ہوتی اور کس وجہ سے نہیں ہوتی اس کا ذکر ان کی تحریر میں نہیں ہے۔

تدریسی تنقید کی اصطلاح کو تحقیر کے طور پر اتنا رائج کیا گیا ہے کہ کوئی غور نہیں کرتا کہ تدریسی تنقید کیا ہوتی ہے اور اس کا دائرہ عمل کیا ہے۔ تدریسی تنقید مختلف درجوں کی نصابی ضرورت کے تحت لکھی جاتی ہے اور اس میں طبع زاد تنقید کی جگہ ایک مختصر مقدار سے زیادہ نہیں ہوتی طالب علم کو ایسا علم فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے جو صرف ایک اعلا ناقد کے طبع زاد نکات سے زائد ہو۔ چنانچہ تنقید سخت محنت اور تربیت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ محض نوائے سروش کی ہدایت پر نہیں لکھی جا

[illegible] اور ذہن بندی کی بنا پر تنقید دوسری یا تیسری سطح [illegible] آتی ہے لیکن عمداً ہوا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تحریریں ادبی رسائل کے دائرہ کار سے علاقہ نہیں رکھتیں جن تنقیدی نگارشات کا ذکر شہزاد منظر کر رہے ہیں وہ تدریسی کا تقاضا پورا نہیں کیا کرتیں وہ صرف غیر معیاری ہوا کرتی ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہم بیک وقت اس کی شکایت کرتے ہیں کہ رسائل میں غیر معیاری ادب کی فراوانی ہوتی ہے اور یہ کہ اردو میں رسائل کا فروغ روز بروز محدود ہوتا جا رہا ہے۔

۴۔ رہی تقریباتی تنقید تو دراصل یہ ادب کی اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں شہزاد منظر نے یہ بات بہت پتے کی کہی ہے کہ پہلے ایسی تحریریں تقریظ کہلاتی تھیں اب تنقید کہلاتی ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ تقریظ کی اصطلاح اس وقت رائج ہوئی جب تنقید کی اصطلاح عام نہیں تھی۔

دیگر یہ کہ تحسین پسندی کی خو کچھ موجودہ زمانے سے مخصوص نہیں۔ اگر خود پسندی نہ بھی ہو تو پھر بھی اختلاف رائے کو قبول کرنا مشکل رہا ہے۔ سر سید نے تصحیح آئین اکبری پر غالب کی منظوم تقریظ کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ غالب نے کتاب کی افادیت پر شک کا اظہار کیا تھا۔ یہ صاحب تصنیف کا عمل تھا اب تقریظ نگاروں کے عمل کو بھی ملاحظہ کیجیے:

جب یگانہ کا پہلا مجموعہ کلام "نشتر یاس" شائع ہوا تو اس میں نواب انجم، بندۂ کاظم جاوید اور فصاحت لکھنوی جیسے موقر حضرات کی تقریظیں ہی نہیں تھیں، ان کی صف میں مرزا اوج فرزند دبیر، عارف نبیرہ انیس اور رشید نبیرۂ عشق جیسے مستند حضرات بھی شامل تھے۔ جب یگانہ کے مخالف گروہ معیار پارٹی نے ان تقریظوں پر اعتراض کیا تو ان تمام تقریظ نگاروں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں ان کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے وہی کچھ لکھا تھا جو ایسے موقعوں پر لکھا جاتا ہے۔

سند یں دے کے بناتے ہیں مجھے سب شاعر   لکھنؤ والوں کی سنجیدہ ظرافت دیکھی

وقت نے ثابت کر دیا کہ ان حضرات کی رائے درست تھی اور ان کی پسپائی غلط۔ جب ایسے موقعوں پر صحیح رائے بغیر خلوص کے دی جاتی رہی ہو تو پھر غلط رائے کا کیا حساب؟

۵۔ شہزاد منظر کا آخری نکتہ سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے یعنی یہ کہ اس وقت نظریاتی سطح پر تنقید میں سرد بازاری پائی جاتی ہے۔ یہ نکتہ اہم اس لیے ہے کہ تنقید کا تخلیقی حصہ بیشتر نظریہ سازی میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن ان ہی کی دی ہوئی مثالوں سے واضح ہے کہ جب تک معاشرہ کے مسائل یا معروضی صورتِ حال متقاضی نہ ہو محض ذاتی یا گروہی اپج سے نظریہ سازی دیرپا کردار نہیں کر پاتی۔ یہ تنقیدی معیار کی وہ جہت ہے جو انفرادی صلاحیت کی دسترس میں نہیں ہوا کرتی۔

شہزاد منظر نے غیر معیاری تنقید کی جس فراوانی کی شکایت کی ہے وہ غلط نہیں کی ہے۔ بے شک مدیرانِ جرائد اور پی۔ ایچ ڈی کے نگراں اساتذہ پر لازم ہے کہ وہ سختی برتیں۔ اگر انھو

نے ایسا کیا [illegible] کی تنقید زیادہ معتبر کردار ادا کر سکے گی۔ [illegible] پہلے [illegible] کی تنقید تو وہ ایسی سختی سے بے نیاز ہے۔ گویا بہتری کی بہت گنجائش ہے لیکن اس کے باوجود صورتِ حال مایوس کن نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا اعلا سطح کی تنقید اپنے دامانِ علم، اپنے تجربہ اور اپنی بصیرت میں گذشتہ نسل کی تنقید پر اضافہ کر سکی ہے یا نہیں۔ سو میں اس سلسلے میں آج نہیں لکھ رہا ہوں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میری نظر میں چند ایسے ناقدین ہیں جنھوں نے میرے بعد لکھنا شروع کیا ہے اور جو کم از کم مجھے تو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ میں صرف جدید تر نسل کی حیثیت سے ان کی نظر قربت کی بات نہیں کر رہا ہوں مجموعی بصیرت کی بات کر رہا ہوں۔

شہزاد منظر کی ایک دیرینہ شکایت ہے کہ ہمارے ناقدین افسانوی ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ اگر اسی شعبے میں دیکھیں تو مہدی جعفر، آصف فرخی اور اعجاز راہی کی نگارشات نہایت قابل قدر ہیں (آخرالذکر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے)، شعری تنقید میں بھی پیش رفت ہوئی ہے اور اس شعبے سے صرف ایک مثال کافی ہوگی، قاضی افضال حسین کی میر کی شعری لسانیات، زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر عہد میں اعلا تنقید کا تناسب ادنا تنقید کے مقابلے میں بہت کم رہا ہے۔ ہر عہد میں دیباچہ نگاری میں اخلاق کا لحاظ رکھا جاتا رہا ہے لیکن اس نے تنقید کے سفر کو کبھی متاثر نہیں کیا ہے۔

محمد رضا کاظم، ۱۳۵ جی صنوبر کاٹیج، سیکٹر ۱۱۔ کے نارتھ۔ کراچی

جون ۹۸ء کے مہمان اداریے میں شہزاد منظر صاحب نے اردو تنقید کے زوال پر اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے تدریسی تنقید کی افادیت کو تو تسلیم کیا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا کام تنقید کی تدریس ہو اور ایسے مضامین جامعات کے مجلوں تک محدود ہوں۔ سنجیدہ ادبی رسائل کی زینت نہ بنیں۔

پاکستان میں اردو کی پیش رفت کو اپنی نظر میں رکھتے ہوئے شہزاد صاحب نے یہ بات لکھی ہے۔ ہندستان میں اردو کے پس منظر میں یہ کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہاں جامعات کے اردو مجلے شائع ہی کتنے ہوتے ہیں؟ اور جو ہوتے بھی ہیں ان کی اشاعت عام کہاں؟ یونیورسٹی کے اردو طالب علم سنجیدہ اور خالص ادبی رسائل میں شائع ہونے والے تدریسی تنقید کے مضامین سے مستفید ہو کر اپنی صلاحیتوں کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ رسالے اگر شہزاد صاحب کا مشورہ قبول کرلیں تو یہاں اردو ادبی رسائل سے جو تھوڑی بہت دلچسپی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

جہاں تک تقریباتی تنقید کی بات ہے، شہزاد صاحب نے صحیح گرفت کی ہے۔ شرون کمار ورما صاحب نے "کچھ نہیں ہوگا" کو ایک چونکا دینے والے اقتباس سے شروع کیا اور وقت کے سلگتے ہوئے ایک مسئلہ کا بہت خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ رکھشس کا پنجرہ ہر سرکاری کرسی پر نظر تھانے میں باوردی دیکھا گیا۔ بلکہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں ورما صاحب نے حاکم کے مشیر خاص کو معاف کر دیا ہے یا یہ کہ انھوں نے "ہر کرسی میں اس مناص کرسی" کو

میں ہی شایع ہو چکی تھی اور مولانا آزاد نے ۱۳۰۵ھ کو ۱۳۰۳ھ میں تبدیل کرنے کی بھی کبھی خواہش نہیں
کی۔ راقم الحروف کی رائے میں مولانا آزاد نے بالکل صحیح کیا۔ ان کے پاس ہزاروں مسائل تھے۔ سب
سے بڑا مسئلہ تو تقسیم ہند کا تھا۔ اب ان حالات میں وہ کہاں اپنی تاریخ پیدایش کی تصحیح کرتے۔
ان کا یقیناً یہی خیال رہا ہوگا کہ آدمی ایک مرتبہ پیدا ہو گیا تو کافی ہے۔ دو سال پہلے، اور دو سال
بعد پیدا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وزراء صاحبان ممکن ہے قانون کی نظر میں ملازم سرکار ہوتے
ہوں گے لیکن وزرا میں سنیارٹی وغیرہ کا جھگڑا انہیں ہوتا ورنہ انھیں اپنی تاریخ ولادت کے بارے
میں کوئی حلف نامہ پیش کرنا پڑتا ہے (حلف نامے بھی کہاں حرفِ آخر ہوتے ہیں) مولانا آزاد
کے دونوں خط جو ان کے قلمی ہیں ہمیں تسلیم۔ ایک البلاغ ایک الہلال۔

اعظمی صاحب نے لکھا ہے کہ محققین کو مولانا آزاد کی تاریخ پیدایش پر از سرِ نو غور کرنا
چاہیے۔ میں محقق تو نہیں ہوں لیکن غور کرنے میں ہمیشہ پیش رہتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ مولانا
آزاد کی تاریخ پیدایش ۱۳۰۵ نہیں، ۱۳۰۳ نہیں، ۱۳۰۴ ہجری طے ہو جانی چاہیے۔ سنہ عیسوی
البتہ ۱۸۸۸ء ہی رہنا چاہیے۔ کیونکہ سنہ عیسوی سے مولانا کو اور ہمیں کیا لینا دینا ہے۔

یوسف ناظم، ۱۹ الہلال۔ ۱۳۰۔ باندرہ ریکلیمیشن، باندرہ۔ بمبئی

جناب مصطفیٰ کریم صاحب نے اپنے دلچسپ اور خیال انگیز مضمون "نقش فریادی اور حسن"
(مطبوعہ کتاب نما اگست ۸۹ء) میں فیض کی مشہور نظم "تنہائی" کے بارے میں یہ لکھ کر کہ اس میں ایک طوائف کی
"حالت انتظار" کو پیش کیا گیا ہے، اس نظم کو خاصا محدود کر دیا ہے۔ ایک اچھی نظم کا امتیازی وصف
ہے کہ اسے کئی سطحوں پر محسوس کیا جا سکتا ہے اور ایک اچھے قاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ محض ایک سطح پر
ابھرے ہوئے نقوش سے نظم کی کہانی مرتب نہیں کرتا بلکہ نظم کے بطون میں موجود اس "احساس" کو گرفت
میں لینے کی کوشش کرتا ہے جو کسی خاص معنی پر منتج ہونے کے بجائے معانی کے در کھول دینے پر قادر
ہوتا ہے اور امکانات کی ایک متحرک تصویر کو سامنے لے آتا ہے۔ بے شک نظم "تنہائی" کو طوائف سے
منسلک کیا جا سکتا ہے بلکہ اسے کسی بھی ایسے دکاندار کی کہانی قرار دیا جا سکتا ہے جو منڈے کے دن مندے
میں گاہکوں کا انتظار کرتے کرتے بے حال ہو جاتا ہے مگر کیا ایسا کرنے سے نظم میں وہ بات باقی رہ سکتی ہے
کہ جو دل کے تاروں کو مرتعش کر کے تنہائی کے کرب کا منظر دکھا سکے بلکہ میں تو یہ تک کہوں گا کہ اگر یہ نظم
محض شاعر کی شخصی تنہائی کو بیان کرتی تو ہر چند کہ طوائف کی کہانی کے معروضی بیان سے افضل اور
برتر قرار پاتی۔ پھر بھی شخصیت کے بوجھ تلے یقیناً کراہ رہی ہوتی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے یوں ہی تو شخصیت
سے فرار کا نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ شاعر کا شخصی غم اگر سبکبار نہ ہو تو شعر گوئی نوحہ گری بن جائے۔ کہنے
کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شاعری میں شخصی غم منہدم ہو جانا چاہیے بلکہ یہ کہ اس کی قلب ماہیت
اس طور ہو کہ وہ انسان کے اعماق میں موجود اس اجتماعی غم کی تفسیر بن جائے جو لاتعداد پرتوں پر مشتمل
ہوتا ہے۔ "تنہائی" میں پہلی سطح پر آپ ایک طوائف کے "انتظار" کو یقیناً نشان زد کر سکتے ہیں
لیکن دوسری سطح پر جیسا کہ کلیم الدین احمد کا موقف تھا آپ کو یہ ایک ایسے شخص کی کہانی نظر آئے گی جسے

اپنے محبوب کا انتظار ہے۔ وہ اپنے گھر کے دروازے وا کیے انتظار کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ ہر چاپ پر اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس کے محبوب کے قدموں کی چاپ ہے مگر چاپ آہستہ آہستہ دوریوں میں تحلیل ہو جاتی ہے تب وہ مے و مینا کا سہارا لیتا ہے تاکہ انتظار کے کرب سے نجات پا سکے لیکن یہ بھی مداوا نہیں ہے۔ بالآخر جب رات ڈھلنے لگتی ہے تو وہ مایوس ہوکر خود سے کہتا ہے کہ مے و مینا کو ہٹا دو، روشنی گل کر دو، دروازے کو مقفل کر دو کیوں اب کوئی نہیں آئے گا۔ چونکہ "انتظار" فیض کا محبوب موضوع ہے اور اس سلسلے میں ان کی مشہور نظم "انتظار" سے ہر کوئی واقف ہے نیز فیض کی ساری شاعری میں ایک مسلسل انتظار کی کیفیت ملتی ہے جو محبوبہ کے انتظار سے لے کر "روشن سحر" کے انتظار تک پھیلی ہوئی ہے لہٰذا اس سیاق و سباق میں "تنہائی" میں ابھرنے والے انتظار کو محض طوائف کے کاروباری انتظار تک محدود کر دینا نظم کی ایک ایسی توجیہہ پیش کرنے کے مترادف ہے جسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "تنہائی" میں فیض نے انسان کی ازلی و ابدی تنہائی کو موضوع بنایا ہے یعنی اس تنہائی کو جو ایک مسلسل انتظار سے عبارت ہے۔ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہو سکتا کیونکہ انتظار تو صرف مرئی چیزوں کا ختم ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ انسان کے ہاں کسی شے کے چھن جانے کا احساس ہمیشہ سے رہا ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ سر اٹھاتی رہی ہے کہ اس کی روح اور بدن کا وہ حصہ اسے دوبارہ مل جائے جو اس سے چھن گیا تھا تاکہ وہ جڑ کر مکمل ہو سکے چنانچہ وہ سدا سے اس شے کا منتظر ہے جسے وہ گم کر بیٹھا ہے۔ جنت گم شدہ کی بازیابی کی خواہش کسی REDEEMER کے آنے کی توقع۔ کسی یوٹوپیا یا آئیڈیل تک رسائی کی تمنا — یہ سب اسی انتظار کے محرکات ہیں۔ گویا انسان کے ہاں انتظار کا ایک مستقل عالم اس شے کے لیے ہے جو اس سے چھن چکی ہے یا اس ہستی کے لیے ہے جو اس شے کی بازیابی میں اس کی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں صورتوں میں فیض کی تنہائی عدم تکمیلیت کے کربناک احساس سے عبارت ہے اور اس آزار کا چارہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ کوئی آکر اس عدم تکمیلیت کو ختم کرے تاکہ وہ اندر اور باہر سے جڑ کر دوبارہ مکمل ہو جائے۔ فیض کی نظم تنہائی کی یہی خوبی دامن کش دل ہے کہ اس میں فیض نے کسی طوائف یا شخص کے احساس تنہائی سے کہیں زیادہ انسان کے احساس تنہائی کو موضوع بنایا ہے جو کسی ایسی شے یا ہستی کی بازیابی یا آمد پر ہی فرد ہو سکتا ہے جس کے خد و خال تک سے بھی وہ واقف نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ فیض نے نظم "تنہائی" کو نقش فریادی کے اس حصے میں شامل کیا ہے جس کی پیشانی پر "دے بقدر ختم جانے خریدم" کے الفاظ درج ہیں اور جس میں "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" اسی نظم میں موجود ہے جس میں شاعر نے خود کو "دل" سے یکسر منقطع کر لیا ہے لہٰذا اسے خرید و فروخت، کے عمل سے منسلک قرار دیا جائے تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اوّل تو نظم کی تفہیم کے لیے خود شاعر کے "ہدایت نامہ" کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے بلکہ نظم کے معنی کو نظم کے پیکر سے برآمد کرنا چاہیے۔ دوسرے "مجھ سے پہلی سی بات" اسی منصوبہ بندی کے تحت لکھی گئی نظم کو اشاریہ بھی قرار نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ ہر چند کہ فیض بظاہر ایک خاص نعرے سے متاثر ہو کر محبت سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر رہے تھے تاہم بباطن وہ محبت (دل) کی تپش سے بے نیاز ہرگز نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اچھا شعر تخلیق کرنے کی صلاحیت ہی گنوا بیٹھتے۔

"کتاب نما" کا دوسرا قابلِ ذکر مضمون ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا "غزل گو" ہے۔ اصلاً یہ مضمون غلام حسین ساجد کی غزل سے متعلق ہے اور غالباً ساجد صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی کے سلسلے کا ایک مضمون ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کا ایک بڑا حصہ ترقی پسند غزل، نئی غزل، جدید غزل اور جدید تر غزل کے شعرا کے لیے مختص کر دیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض ایسی چونکا دینے والی باتیں کہی ہیں جن سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا۔ اصولاً اس قسم کے مضمون میں CATEGORICAL STATEMENTS سے اجتناب ہی کرنی چاہیے۔ اگر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ایسا کرتے تو پھر کلاسیکی مزاج کی پروردہ غزل کے صرف تیرہ شعرا کا نام لے کر ان متعدد شعرا کو مسترد نہ کرتے جو اس خاص میلان میں ان تیرہ شعرا سے کسی طور بھی کم مرتبہ نہیں رکھتے بلکہ اگر موازنہ کیا جائے تو یہ شاید بہتر ہی ثابت ہوں۔ مثلاً اس فہرست میں انھوں نے شہزاد احمد، ریاض مجید، کشور ناہید، حامد سروش، افتخار عارف، احمد ظفر، خورشید رضوی، ساقی فاروقی، عارف عبدالمتین اور متعدد دیگر بہت اچھے شعرا کا نام نہیں ہے (یہ میں نے صرف پاکستان کی حد تک نام لیے ہیں) اسی طرح انھوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے جدید پاکستانی غزل گو شعرا میں رشید قیصرانی، ضیا شبنمی، نصیر احمد ناصر، اکبر حمیدی، جلیل عالی، سبط علی صبا، ریاض رام، حیدر قریشی، سیما شکیب، اظہر ادیب، اسلم کولسری، انجم نیازی وغیرہ کا نام تو نہیں لیا۔ لیکن ان سے کم تر درجے کے شعرا کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ یہاں بھی ان کا انداز حتمی اور فیصلہ کن ہے جس سے زیادہ تر تلخیاں ہی جنم لیں گی۔ ظفر اقبال کی غزل کے سلسلے میں ان کے دل میں کچھ زیادہ ہی نرم گوشہ موجود ہے ورنہ کون نہیں جانتا کہ "آب رواں" کے بعد ظفر اقبال کی شاعری کا گراف بتدریج سربسجود ہوتا چلا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک بڑا حصہ تک بندی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پایا۔ میری ناچیز رائے میں وہ زیادہ سے زیادہ غزل کے ایک درمیانے درجے کے شاعر ہیں۔ دوسرے متعدد بہت اچھے شعرا کے مقابلے میں صرف ظفر اقبال کو "قابل اعتبار شاعر قرار دینا" لفظ "اعتبار" کو نا قابل اعتبار قرار دینے کے مترادف ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا۔ سول لائنس، سرگودھا (پاکستان))

عزیز مکرم قاسم صاحب نے درست فرمایا کہ لفظ "تئیں" فرہنگ آصفیہ کی جلد اوّل کے صفحہ ۶۵۴ پر درج ہے، یعنی جلد اوّل کے آخری صفحے کا آخری لفظ ہے جس پر "ت" کی تقطیع تمام ہوتی ہے۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے اس کا املا "ت ی ء ں (غنہ)" قرار دیا ہے، جو میری فہم ناقص میں درست نہیں۔ میں نے صحیح مقام پر تلاش کیا تھا اور وہاں یہ موجود نہیں تھا۔

لفظ تئیں کی کچھ اور مثالیں یہ ہیں:

مظفر گجراتی کا گرفتار ہونا اور اپنے تئیں ہلاک کرنا — ذکاء اللہ، تاریخ ہندستان جلد ۵ ص
کوئی سکتا حیرت سے ان کے تئیں — کوئی کہتا یہ تو قصائی نہیں — مثنویات حسن ص
ہر شخص اپنے تئیں لفظ ہم سے تعبیر کرتا ہے — ابن الوقت ص
میرے تئیں جس قدر طعنے دوگے میری جان خوش ہوگی — مکتوبات سر سید ص

یہ لوگ اپنے تئیں عربی النسل کہتے تھے۔ شبلی: سفرنامہ روم و مصر و شام ص۱۳۲

اپنے تئیں انسانیت کے اعلا درجے تک پہنچایا۔ حیات سعدی ص۲۵

لفظ دکھنی میں بھی تھا۔ قلی قطب شاہ کے ہاں بھی ہے ؛

آئینہ قرآن نازل جوں ہوا حضرت کے تئیں
مرتضیٰ! تیں بس دو جگ میں جیوں محمد بے نظیر کلیات قلی قطب شاہ ص۲۳

"تئیں" لکھنوی مصنفین کے ہاں بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً

ابھی تک یہ لوگ اپنے تئیں اہل زبان خیال کرتے تھے۔ مضامین چکبست ص۱۷

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی برتا ہے

اپنے تئیں اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو (مضامین ابوالکلام آزاد ص۳۵)

(اس آیت قرآنی کا لفظی ترجمہ وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَه)

مولانا نے درد کا ایک شعر غبار خاطر میں نقل فرمایا ہے۔ اتفاقاً اس میں بھی یہ لفظ آیا ہے :

آجائے ایسے جینے سے اپنا تو جی تنگ جیتا رہے گا کب تئیں اے خضر مر کہیں

مگر مولانا نے سہواً "کب تئیں" کو کب تلک بنا دیا ہے۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے غالب والا لطیفہ آب حیات میں بھی مذکور ہے۔

شان الحق حقی ۱۷۔اے خیابان تنظیم ڈیفنس سوسائٹی۔ کراچی ۴/۶

"کتاب نما" کا مجھے جولائی ۸۹ء کا شمارہ نہیں ملا۔ ستمبر کے شمارے سے پتا چلا کہ جولائی میں آپ نے مجھ پر نظر کرم کیا تھا یعنی کہ میری ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ وہ پتا مجھے یوں چلا کہ کتاب نما کا ایک گوشہ جو کہ کھلے خطوط سے منسوب ہے اس میں جناب مجسوں بھوپالی کا خط تھا۔ آپ نے میری غزل کا ایک شعر جو کہ اس طرح ہے ؎

اداس آنکھوں سے ہوں زندگی کی برساتیں تم اپنے لہجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا ،

تو کتابت کی غلطی نے شعر کو یوں کر دیا کہ تم اپنے بھیجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا۔

براہ کرم آپ اس غلطی کی تصحیح فرمالیں۔ عنایت ہوگی۔

(ملک نسیم۔ بھوپال)

(تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات

مصنّف: ڈاکٹر مجیب اشرف
مطبوعہ: نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
مبصّر: اوم پی گپتا

ضیاء الدین برنی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ "تاریخ نویس تاریخ لکھتے و
کسی خاص قوم یا فرقہ کی حمایت نہ کرے اور نہ ہی جھوٹ کو سچ کے ساتھ ملاتے۔"

مندرجہ بالا کتاب "ہندستان کی سیکولر روایات" برنی کے قول کی روشنی میں تاریخ نویسی کی بہترین مثال ہے۔ یہ کتاب ۱۸ باب اور ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنّف نے یہ کتاب اردو میڈیم کے اسکولوں کے ان طلبہ کے لیے لکھی ہے جن کے درسی نظام میں ہندستان کی قدیم تاریخ کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ حالانکہ کتاب ضرورت سے زیادہ مختصر ہے لیکن پھر بھی ہندستان کے قدیم دور سے لے کر "سلطنت دہلی" کے قیام تک کا حال بے لاگ اور سادہ زبان میں کیا گیا ہے۔ کتاب میں انگریزی اور ہندی کے مستند تاریخی کتابوں کے حوالے بھی شامل ہیں اور انگریزی الفاظ کے اردو ہم معنی الفاظ کے ساتھ ساتھ اصل انگریزی الفاظ بھی دیے گئے ہیں تاکہ طالب علم کی انگریزی کی معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے۔

تاریخ کی درسی کتاب پر طبع آزمائی کرنے کا حق ہر مصنّف کو حاصل ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مصنف کے اندر ایک ایمان دار اور حقیقت شناس شخص کی روح ہو۔ مذہبی تعصّب کے زیر اثر تاریخ نویسوں نے اپنی قوم کے گزشتہ کارناموں کو جہاں سنہرے الفاظ دینے کی کوشش کی ہے وہاں مخالف قوموں کے بزرگوں کے کردار اور کارناموں کے ذکر میں تنگ نظری سے کام لیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں نہ صرف طلبہ کے ذہنوں میں بغض و نفرت کے جراثیم پیدا کرتی ہیں بلکہ ان کے دل جھوٹی تعریف کے زیر اثر سچائی کو پرکھنے میں بھی ناکام رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مجیب اشرف نے اپنی کتاب میں قدیم ہندستان کے تاریخی واقعات کا ذکر بڑی ایمان داری سے کیا ہے۔ وہ قدیم ہندستان کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں لکھتے ہر کسی بھی مقام پر مذہبی تعصب کا شکار نہیں ہوتے۔ انھوں نے ویدوں کے بارے میں لکھا "وید کے معنی پاک علم ہے (صفحہ ۳)۔ مقدس ویدوں کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے

علوم جاری کیے گئے (صفحہ ۱۳) راماین میں شری رام چندر جی کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے (صفحہ ۱۴)
جہاں اردو میں لکھی دیگر کتابوں میں ہمیں مسلمان بادشاہوں اور حملہ آوروں کے لیے
"غازی" کا لقب ملتا ہے (جیسے غازی محمد بن قاسم) وہاں ہندوؤں کی قدیم عظیم شخصیتوں کے
نام کے ساتھ کوئی خطاب نہیں ملتا لیکن مجیب اشرف صاحب کا "شری رام چندر جی" استعمال
ان کو "کمیونل تاریخ نویسی" کے الزام سے آزاد رکھتا ہے۔ ان کی حقیقت پسندی اور سچائی
کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آخری باب "بیرونی حملوں کی نوعیت" میں لکھا ہے "جہاں
تک مندروں کو توڑنے اور دولت لوٹنے کا سوال ہے یہ کام شریعت کے خلاف ہے" (صفحہ ۹۸)
[جب کہ کچھ مصنف سومناتھ کی بت شکنی کو سنت ابراہیمی بتاتے ہیں]

کتاب میں ایک دو جگہ باریک سی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن وہ مصنف کی غلط گوئی کا ثبوت
نہیں بلکہ غلط العوام سمجھنی چاہییں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہندی اور انگریزی کے کئی مخصوص الفاظ
جب اردو میں ہم معنی الفاظ بنا کر پیش کیے جاتے ہیں تو اصل ہندی یا انگریزی کے الفاظ کے
معنی یا مطالب پھر بھی پورے نہیں ہو پاتے دوسری طرف ڈاکٹر مجیب اشرف قدیم ہندستان
کی تاریخ یعنی "اینشینٹ انڈیا" کے ماہر نہیں ہیں۔ وادیٔ سندھ کے لوگوں کے مذہب کے بارے
میں لکھتے ہیں۔ "اس زمانے میں دیوی ماتا کی پوجا عام تھی" مصنف نے انگریزی کے "مدر گاڈیس"
کو "ماتا دیوی" نہ لکھ کر "دیوی ماتا" لکھ دیا ہے۔

مجموعی طور پر کتاب نہ صرف اسکولوں کے درسی نصاب میں شامل کرنے کے لیے ایک
نایاب تصنیف ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی یہ کتاب آئینۂ تاریخ ہے جو کم وقت میں اور
ایک نظر میں قدیم ہندستان کی سیاست، مذہب، تہذیب اور تمدن کی پائیدار روایتوں کو
صحیح طور پر جاننا چاہتے ہیں۔

خاص طور پر کم عمر بچوں کے ذہنوں میں گزرے زمانے کے تاریخی واقعات کے
عکس ابھارنے کی مصنف کی ایماندارانہ کوشش قابلِ احترام بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔

زیرِ غور

یوسف ناظم کے طنزیہ و مزاحیہ اور شخصی خاکوں کا انتخاب

مرتبہ: رعنا فاروقی
پبلشر: مکتبہ ہم زبان کراچی (پوسٹ بکس ۱۱۵۳۳) پاکستان
مبصر: عزیز قیسی
قیمت: ۴۵/- روپے

یوسف ناظم کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ ۱۹۷۶ء میں "زیرِ غور" کے عنوان سے چھپ
چکا ہے۔ یہ کتاب اس مجموعہ مضامین کا دوسرا اڈیشن بھی ہے۔ بلکہ یہ یوسف ناظم کی گیارہ کتابوں سے
چنے ہوئے ۴۳ مضامین کا مجموعہ ہے اور یہ انتخاب پاکستان کی ادیبہ رعنا فاروقی نے کیا ہے کیوں کہ
ہندستان اور پاکستان کے درمیان ادبی رسائل و جرائد کا تبادلہ مسدود ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ

رستان کے قارئین رعنا فاروقی سے واقف نہ ہوں۔ وحقیقت یہ ہے کہ یہ تبصرہ نگار بھی واقف
ں ہے) اس کتاب سے نہ صرف ان سے واقف ہو جائیں گے بلکہ ان کی خوش ذوقی اور وسعت نظر
قائل بھی ہو جائیں گے۔ کتاب کے قلب پر تعارفی شذرہ طاہر مسعود نے لکھا ہے۔ طاہر مسعود
پنے لیے ہوئے یادگار انٹرویو پر مشتمل کتاب ”بہ صورت گر کچھ خوابوں کے“ کے وسیلے سے ہندوستانی
زبین سے متعارف اور اہل ذوق میں مقبول ہیں اور بقول طاہر مسعود ”رعنا فاروقی پاکستان میں
دو صحافت کا جانا پہچانا نام ہے اور ”تین عورتیں تین کہانیاں“ کے حوالے سے عام پڑھنے والوں
ا عرصہ دراز سے قابل رشک حد تک مقبول ہیں۔“

زعنا فاروقی نے اس انتخاب کا نام ”زیر غور“ کیوں رکھا۔ اس دیباچہ میں یہ بات بڑی
سادگی سے بتلادی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے مجتبیٰ حسین کے انتخاب والا نسخہ استعمال کیا ہے۔
یعنی یہ کہ جس کے مضامین ہیں نام بھی اس کا تجویز کردہ ہونا چاہیے۔ ”زیر غور“ یوسف ناظم کے
یک مجموعے کا نام ہے مجھے یہ اچھا لگا۔ اس لیے یہ زیر نظر انتخاب اسی نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔
مجتبیٰ حسین کے انتخاب والا نسخہ یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کے منتخب مضامین کا نام ”قطع کلام“ رکھا
گیا ہے۔ یہ نام بھی مجتبیٰ حسین کے ایک مجموعہ مضامین کا نام ہے جو برسوں پہلے چھپ چکا ہے۔
اور ہندوستان کے قارئین سے داد کا حقہ وصول کر چکا ہے۔ رعنا فاروقی کو جب یہ خیال آیا کہ
جس کے مضامین ہیں نام بھی اسی کا تجویز کردہ ہونا چاہیے“ تو وہ اسی خیال پر عمل کرتیں اور
یوسف ناظم سے کوئی نام تجویز کرواتیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں انھیں ایک ”مطبوعہ و مشتہر نام ہی
اچھا لگا۔ کاش انھیں یہ نام اچھا نہ لگتا۔ پاکستان کے قارئین کے لیے یہ نسخہ ”اسم نویسی“ مناسب
ہے اس لیے کہ اس دیار میں یوسف ناظم کی اس کتاب کا نام تعارفی نوعیت کا ہے لیکن جہاں
تک ہندوستان کے قارئین کا سوال ہے یوسف ناظم کی کتابوں کے نام ان کے لیے بے حد مانوس و
مشہور ہیں۔ وہ ”زیر غور“ مکرر سے کچھ ”تسامح“ کے شکار ہو سکتے ہیں۔ بہرحال نام میں کیا رکھا
ہے؟۔ دیکھنا یہ ہے کہ انتخاب کیا ہے۔

یہ ۲۴ مضامین — جن میں ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسے بین الاقوامی موضوع پر طنز کے علاوہ
یوسف ناظم کے مشہور مضامین ایک پردیسی کا سفرنامہ ہندوستان (۱، اور ۲) دولہا مارکیٹ
مرغ و ماہی، اردو کی پہلی کتاب اور غالب کی صحت جسمانی بھی شامل ہیں۔ مرتبہ کتاب کی
”نگہ انتخاب“ کی خوش نظری پر دال ہیں۔ ان کی خوش نظری کی ایک دلیل تو انھوں نے خود دی ہے کہ یوسف ناظم نے ان
کا پہلا تعارف ان کے لکھے ہوئے ایک شخصی خاکے کے ذریعے ہوا — یہ خاکہ باقر مہدی کا شخصی
خاکہ تھا۔ باقر مہدی پر لکھا ہوا یوسف ناظم کا خاکہ — نہ صرف ان کے لکھے ہوئے شخصی
خاکوں میں سب سے اچھا ہے بلکہ اردو میں اب تک لکھے گئے شخصی خاکوں میں بھی منفرد
و ممتاز ہے۔ (باقر مہدی کا خیال ہے کہ یہ یوسف ناظم کا ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا
فیض ہے۔ یوسف ناظم کا خیال ہے کہ باقر مہدی کے بیان میں لفظ شخصیت سے پہلے لفظ مزاحیہ کا اضافہ ضروری ہے)
رعنا فاروقی کے لیے یہ یوسف ناظم کا تعارف ایک PANDORA'S BOX کھلنے کے

برابر تھا کیونکہ یوسف ناظم کا بسیار نویس ہیں۔ ان کی ڈھیر سی تخلیقات سے ۴۲ مضامین چننا بڑا مشکل کام تھا (رعنا فاروقی کو صرف ان کی گیارہ کتابوں کی اطلاع ہے) ورنہ نہ جانے کتنی اور کتابیں خود یوسف ناظم کی "اطلاع" سے باہر ہیں اور نہ جانے کتنی کتابیں ابھی "پردۂ افلاک" میں ہیں)۔ اگرچہ بسیار نویسی، رطب و یابس نویسی کے مترادف سمجھی جاتی ہے لیکن یوسف ناظم کے معاملے میں استثنائی صورت حال ہے۔ ان کا ہر مضمون اور ہر خاکہ قریب قریب یکساں ادبی سطح کا ہوتا ہے اور بقول رعنا فاروقی "ان کا مزاج فکر تونسوی اور رشید احمد صدیقی کا امتزاج ضرور ہے لیکن ان کا کینوس محدود نہیں اور نہ ہی ان کا مواد صد فی صد ختم ہوا ہے۔ اس تبصرہ نگار کو رعنا فاروقی سے صد فی صد اتفاق ہے۔

یوسف ناظم کے موضوعات، متنوع ہیں۔ اسی انتخاب میں ان کے ہمہ پہلو طنز و مزاح کے موضوعات بکھرے ہوئے ہیں۔ روزمرّہ کی زندگی کے مضحک واقعات، اور متوسط طبقے کے دوہرے معیارات کے علاوہ، قومی، بین الاقوامی سیاسی، سماجی، عصری موضوعات کو ان کے ان مضامین نے احاطہ کیا ہے اور ان ۴۲ مضامین میں یوسف ناظم کی انشا پردازی، بریکٹس (قوسین) اور جملہ ہائے معترضہ (جو ان کا اسلوب ہے)، پوری روانی اور خوش سلیقگی کے ساتھ موجود ہے اور یہ انتخاب صرف پاکستان کے قارئین کے لیے نمائندہ انتخاب نہیں۔ ہندستان کے قارئین کے لیے بھی ایک خوبصورت تفصیل کا خوب سیرت ایجاز ہے۔

۱۶۰ صفحات پر پھیلے ہوئے اس کتاب کا گیٹ اپ دلکش کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ قیمت ۴۵ روپے ہے (جو پاکستان کے لیے بہت معقول ہوگی)، اور ایسے دور میں جب ہندستان اور پاکستان میں ادبی جرائد و رسائل و کتب کا تبادلہ نہیں کے برابر ہے۔ مکتبہ ہم زبان کراچی کی یہ کوشش بقول طاہر مسعود "پاکستان میں پہلی بار یوسف ناظم کی تحریروں کے تعارف کا موثر وسیلہ ثابت ہوگی"۔ ہندستان اور پاکستان کے اردو قارئین، یوسف ناظم اور مرتبہ کتاب رعنا فاروقی کو یہ انتخاب مبارک ہو۔

اسلوبِ تنقید

مصنّف: پروفیسر عبدالمغنی
ناشر: عاکف بکڈپو۔ مٹیا محل دہلی ۶
قیمت: ۹۰ روپے
مبصّر: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

ڈاکٹر عبدالمغنی اردو تنقید کی دنیا میں ایک خاص رجحان کی نمایندگی کرتے رہے ہیں۔ ان کا تنقیدی رویّہ تعمیری اور مثبت ہے "اور" نقطۂ نظر مطبوعہ ۱۹۶۵ء سے تصورات مطبوعہ ۱۹۸۸ء تک وہ برابر اس خیال کا اعادہ کرتے رہے ہیں کہ ادب کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت اس کے اخلاقی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے تنقیدی مضامین کے تازہ ترین مجموعے "اسلوب تنقید" میں بھی انھوں نے اختصار کے ساتھ اپنے ادبی نقطۂ نظر کی طرف اشارہ کیا ہے اور چونکہ

ب نما

چند برسوں میں [illegible] اسلوبیاتی تنقید کے مباحث ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس لیے مجموعے کی ابتدا
میں اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے یہ لکھ گئے ہیں:

"ادب کے کسی ایک پہلو، وہ بھی اس کے ہیئتی انداز کو لے کر اسی کو سب کچھ جو
لینا یا اس کو بہت زیادہ اہمیت دینا عدم توازن اور بے اعتدالی ہے جس سے
ذوق و شعور کی تربیت کی بجائے تخریب ہوتی ہے۔"

رائے بذاتِ خود غلط نہیں لیکن "اسلوبیاتی تنقید" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون بھی کتاب میں شریک
اشاعت ہے جس میں اسلوب اور ہیئت سے متعلق مشرقی اور مغربی روایتوں کا مختصر جائزہ
لینے کے بعد بالآخر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ادب کے سلسلے میں کوئی ایسی بحث قابل قدر نہیں کہی جا سکتی جس
میں ادب کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف لفظیات اور صوتیات کی بات اٹھائی گئی ہو۔
ظاہر ہے کہ مضمون میں بعض فکر انگیز نکتے موجود ہیں مگر اس کی ایک کمی تو یہ ہے کہ عبدالمغنی صاحب
نے اسلوب، ساخت اور ہیئت کی بحث کو خلط ملط کر دیا ہے۔ دیر سے سہی مگر دوسری زبانوں
کی طرح اردو میں بھی اسلوب کی بحث اب کافی آگے بڑھ چکی ہے اور اسلوب کو محض الفاظ کی تزئین
و آرائش یا ترتیب کا فن نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے پورے ہیئتی التزام اور اس کے ارتکاز پر محمول
کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب معنوی تلاش میں لفظوں کے رشتوں کے اٹوٹ سلسلوں کو
جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ عبدالمغنی صاحب نے جب یہ بحث اٹھائی
تھی تو انھیں مغربی ناقدین کے ساتھ ساتھ اپنے بعض ہم عصر ناقدین اردو کا بھی جائزہ لینا
چاہیے تھا۔ خصوصاً ان لوگوں کا جو مغرب کے اصولوں کو اپنے یہاں بروئے کار لانے کی کوشش
کر رہے ہیں۔ صرف محی الدین قادری زور کا تذکرہ کافی نہیں۔ کیونکہ اردو میں اسلوبیاتی تنقید
اب زور سے کافی آگے نکل چکی ہے۔

بہر حال یہ تو محض ایک مضمون کی بات ہوئی مگر مجموعے کے دوسرے تمام مضامین میں عبدالمغنی
صاحب نے اپنی استعدادِ علمی، بصیرت اور قوتِ نقد کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے عبدالحق کی تنقید نگاری
کا غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لیا ہے، عبدالغفور شہباز کی ادبی اہمیت اجاگر کی ہے۔ ماہر القادری کی
شاعری کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ زور اور شبلی کی تنقید نگاری کے خد و خال واضح کیے ہیں۔ مولانا
آزاد کی دانشوری سے متعارف کرایا ہے، راسخ عظیم آبادی اور غالب کے تغزل کا مطالعہ کیا
ہے۔ نسیم حجازی کی ناول نگاری کو موضوع بنایا ہے، قرآن مجید کے ادبی اعجاز پر اظہار خیال کیا
ہے اور تشکیل افسانہ کی صورتیں واضح کی ہیں اور تقریباً ہر جگہ مکمل تجزیے کے بعد ایک سچی تلی
رائے پیش کی ہے۔ مجموعے کا صرف ایک مضمون "اردو میں تعلیم پانے والوں کی ملازمت کا
مسئلہ" ایسا ہے جو براہ راست ادبی تنقید سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ مگر یہ اردو تحریک سے
جڑے ہوئے عبدالمغنی کی دانشورانہ فکر کا آئینہ دار ہے۔

مجموعی طور پر عبدالمغنی صاحب کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ظاہری اور معنوی خوبیوں
سے مزین ہے۔ سرورق سادہ مگر دلنشین ہے۔ کتابت و کتابت اور کاغذ عمدہ ہے۔

ضرب لطیف

شاعر: انجینیر خواجہ رحمت اللہ جری
ناشر: ایوان اردو۔ کراچی
قیمت: ۴۰ روپے
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

خواجہ رحمت اللہ جری کی زندگی، تعلیم، روزگار، شاعری، افسانہ نگاری۔ ہر موڑ پر نامساعد حالات پیش آئے مگر انھوں نے اپنی پامردی اور ذہانت سے ہر موڑ پر ناکامی کو کامرانی میں بدل لیا ان کے استاد الحاج احمد علی شاب نے "جری" تخلص تجویز کیا اور یہ تجربہ کا صحیح نتیجہ تھا۔ "ضرب لطیف" بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔

"ضرب لطیف" کا پیش لفظ۔ پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے لکھا ہے۔ نصرت ہاشمی نے تاثرات پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر حنیف شاہ خاں نے "بزم تیری جری" مرتب کی ہے۔

اس نقش میں حمد، نعت، قطعات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ قطعات اور نظموں کا کینوس وسیع ہے۔ شاعر کو مہارت حاصل ہے اس لیے ہنگامی اور ذاتی موضوعات بھی داخل ہیں۔ ایک قطعہ پڑھیے "یادشہنائی" (جہاں آرا صبیحہ سے اپنی شادی کی پہلی سالگرہ کے موقع پر)

تشنہ لب رند کو، ساقی ملا، پیمانہ ملا ساد ہ عنوان کو رنگین اک افسانہ ملا
جس نے کی آکے مرے دل میں جہاں آرائی اس نے کیا کیا نہ دیا اور مجھے کیا کیا نہ ملا

نظموں میں زندگی کے عام تجربے اور واقعات کی نشان دہی ہے یا پھر اخلاق اور مذہب کا رنگ ہے۔ میرے نزدیک شاعر کا عزیز سرمایہ غزل ہی ہے۔ یہاں زبان و بیان کے بعض مقامات نظر ثانی کے طلب گار ہیں اور موضوعات بھی تفہیم طلب!

ص ۷۰۔ ذرا سی بات پہ کیوں ہیں خفا نہیں معلوم کہاں سے عود کے آئی، انا نہیں معلوم
(کہاں سے عود کے آئی) اردو محاورہ نہیں۔ اس نے مصرع کو بھی بدرنگ کر دیا۔

ص ۱۴۴۔ راہ کا پتھر ہٹا اور مجھ کو منزل مل گئی وہ ہوئے مجھ سے جدا اور مجھ کو منزل مل گئی

راہ کا پتھر محبوبہ۔ اس رکاوٹ کے دور ہونے کا ماحصل۔ (۱) خیال میں رچی بسی کوئی اور محبوبہ (۲) محبوب حقیقی یعنی معرفت کی منزل۔ اور یہ دونوں صورتیں اخلاق اور طریقت کے منافی۔ محبوب مجازی کو وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ صنعت کے بغیر ذات کی شناخت ممکن نہیں۔ اس لیے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں برتا گیا۔

شاعر نے مختصر اور طویل بحروں میں غزلیں کہی ہیں۔ تازگی اور برجستگی نمایاں ہے۔ زبان سادہ اور تراکیب مانوس ہیں۔ ایک غزل فانی بدایونی کی زمین میں کہی ہے۔ ردیف دشوار ہے مگر شاعر نے مہارت اور پختگی فن کا ثبوت دیا ہے۔ اور چار مطلع نکالے ہیں۔ ایک مطلع

جب ہم رکے ہیں راہ میں وہم وگماں سے دور کچھ آشیانے اور بنے آشیاں سے دور

چند شعر پڑھیے اور شاعر کی فنی خوبیوں، تھیما اور اسلوب کا اندازہ کیجیے

کچھ درد ملا تم سے کچھ درد زمانے سے — ہر رنگ جھلکتا ہے اب میرے فسانے سے
درد کے دینے والوں میں — کوئی درد شناس تو ہو
عمر بھر جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں — ایسے دیکھے ہوئے خوابوں پہ ترس آتا ہے
جو کسی نے ہار مان لی — تو رنگ داستاں گیا

"ضرب لطیف" میں شاعر کی تصویر، خیالات اور حوصلہ مندی کا اظہار کرتی ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

سلگتے خیموں کا شہر

مصنف: فخرالدین عارفی
ناشر: مکتبہ مریخ، اردو بھون، پٹنہ۔ ۴
مبصر: ڈاکٹر عبدالمغنی

یہ نوجوان افسانہ نگار فخرالدین عارفی صاحب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ عنوان کتاب کی کہانی سی قصے کے ماجرا پر مبنی نہیں۔ صرف فن کار کے ان شدید احساسات کا اظہار ہے جو حوصلہ شکن حالات کے ردِ عمل سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ اظہار نئے لکھنے والوں کے درمیان عام ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ حسین کے لفظوں میں "اداس نسلیں" جمیلہ ہاشمی کے ایک ناول کے عنوان کے مطابق "تلاش بہاراں" میں ناکام ہو کر مایوس ہو رہی ہیں۔ یہ مایوسی ان کے احساسات کو مجروح اور جذبات کو مشتعل کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم جدید افسانہ نگار فکری و فنی ضبط و تحمل سے کام لے کر قصے کی تخلیق و ترتیب پر بہت کم توجہ دے رہے ہیں اور صرف اپنے خیالات کے اظہار کو کافی سمجھتے ہیں۔ یہ اظہار کبھی فلسفیانہ ہوتا ہے، کبھی صوفیانہ اور بعض اوقات دونوں کا مرکب۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افسانہ نگاری انشائیہ نگاری بن جاتی ہے اور قصے کی دلچسپی، جو افسانہ نگاری کی جان ہے۔ باقی نہیں رہتی۔

ایک جدید افسانہ نگار ہونے کے باوجود، زیرِ نظر مجموعے کے چند افسانے فخرالدین عارفی صاحب کے فن کو اس انجام سے بچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر "دیوار" "ایک اور طوفان" اور "تاریک راہوں کے ہم سفر" کے عنوانات سے لکھے ہوئے افسانے کچھ قصے سناتے ہیں اور ان کو پڑھتے ہوئے افسانے کے ماجرا کا ایک ہیولا ابھرتا نظر آتا ہے۔ یہ تینوں افسانے ناکام محبت کے قصے ہیں۔ ان میں عشق کی بے تابی بھی ہے اور فراق کی بے قراری بھی۔ کرداروں کے وجود میں ایک گہری تشنگی ہے۔ ان کی آرزو پوری نہیں ہوتی اور ان کی تمنا ناکام ہے۔ یہ ناکامی محبت میں شدت پیدا کرتی ہے، مگر یہ افسانہ نگار کے ذہن کی سلامتی ہے کہ اس شدت سے کرداروں کے تعلقات میں کوئی بے اعتدالی اور کردار میں بے راہ روی نہیں پیدا ہوتی، صرف حسرت واندوہ کے بادل کرداروں کی طبیعت پر چھا جاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو ان کے ساتھ ایک ہمدردی سی ہونے لگتی ہے۔

فخرالدین عارفی صاحب اپنے افسانوی کرداروں کے احساسات و جذبات کا اچھا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے طرزِ بیان کی سلاست اس تجزیے کو قابلِ فہم بناتی ہے اور اس میں وہ علامتی ابہام نہیں پیدا ہوتا جو متعدد نامور جدید افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو ایک چیستاں بنا رہا ہے اور عام قارئین ان حل طلب معموں سے پریشان ہو کر نئے افسانوں ہی سے برگشتہ ہو رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کے برخلاف، عارفی صاحب کے مذکورہ بالا افسانے ان کے امید افزا مستقبل کا پتا دیتے ہیں اور توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اگر ماجرا سازی اور تعمیر و عروج پر زیادہ توجہ دیں گے تو آئندہ بہتر تخلیقات سے عام قارئین کو شاد کام کر سکتے ہیں۔ ●

دو آتشہ

مصنف : سرور کابری
مبصر : جمیل اختر
صفحات ۔ ۱۰۷ قیمت ۲۰ روپے
ملنے کا پتا ۔ سید محمد داؤد اختر کابری ۔
سہیر منزل ۔ کریم گنج گیا ۔

علامہ سرور کابری کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ۔ موصوف کا شمار ہندستان کے جانے مانے شاعروں میں ہوتا ہے ۔ کم و بیش دس کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ان کی تصانیف ادب اردو میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ خصوصاً شہرۂ آفاق کتاب "شاہنامۂ ہند" ہے یہ ہند کی منظوم تاریخ ہے ۔ جس پر لوگوں نے انھیں فردوسیِ ہند کا خطاب دیا تھا ۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں مرکزی حکومت مصنف کو تاحیات وظیفہ دیتی رہی ۔

سرور کابری بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں ویسے انھوں نے غزلیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں ۔ اور رباعیات کا ایک مجموعہ "مشاہدۂ حاضرہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن بہتات نظموں کے مجموعوں کی ہے اور انہوں نے منظومات کی وجہ سے ہی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے ۔

زیر تبصرہ کتاب "دو آتشہ" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے ۔ جس میں مختلف موضوعات پر ننانوے نظمیں شامل ہیں ۔ ان کی نظموں میں موضوعات کا خاصا تنوع ہے ۔ خالص تاثراتی اور احساسی کیفیات بھی ہیں ۔ جذبات کی شدت و توانائی بھی ہے ۔ اور حقیقت کی عکاسی بھی ہے ۔ متعدد نظمیں قومی اور ملکی ، ملی و معاشرتی ، تہذیبی ، و ثقافتی ، مقامی و بین الاقوامی موضوعات و مسائل پر ہیں جن سے ان کے بیدار ذہن کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کرپشن ، بدعنوانی ، مزدور اور مالک ۔ الکشن ، جمہوریت ، اور لیڈر پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ حقیقت کی آئینہ دار ہیں ۔ اور ہمارے معاشرے اور ملک کی موجودہ صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہیں

ان کی داخلی شاعری کا کینوس اتنا ہی وسیع ہے ۔ جتنا ان کی خارجی شاعری کا ہے ۔ اور یہ ان کے عظمت کی دوسری دلیل ہے ۔ اس لیے کہ ہر عظیم شاعر داخل و خارج دونوں پر حاوی ہوتا ہے ۔ اور یہی عظیم فن کاری کی دلیل ہے ۔

سرور کابری کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے نظم نگاری کی صنفی ہیئت و حیثیت کو مکمل طور پر برتا ہے ۔ منظومات میں گٹھاؤ اور پیکری سالمیت پورے طور پر موجود ہے ۔ الفاظ سادہ ، ترکیبیں سہل ہیں ۔ لب و لہجہ ۔ تصنع اور تکلف سے پاک ہے ۔ لفظی بازی گری اور مشکل ترکیبیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتیں سادہ پیرایے میں خیالات کے اظہار نے حسن کلام میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ،

حمد
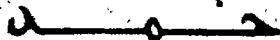
یا رب تری کیوں چشم کرم ہم سے خفا ہے کیا آج غریبوں کا خدا اور خدا ہے
جب زندگی و موت پہ ہے تیرا قبضہ اے مالک تقدیر ترے ہاتھ میں کیا ہے

۵۵ تا ۵۷

تمھیں معلوم ہے کیسے ستم ڈھائے گئے تم پر — پھر کا سریدر کے پاس نذرانے میں آیا تھا
کلیجا منہ کو آتا ہے جو یاد آتے ہیں وہ منظر — کہیں خنجر یہ خنجر تھے کہیں پھانسی کا پھندا تھا
خزاں محسوس ہوتی تھی تمھیں وصل بہاراں میں — تمھارے گلشن امید پر غیروں کا قبضہ تھا

مزدور و مالک

اے مرے مزدور تو ہر حال میں مسرور رہے — تیرا دامن صبر و استقلال سے بھرپور ہے
تیرے ماتھے کے پسینوں سے ہیں روشن بجلیاں — تیرے غم خانے میں لیکن روشنی کا نور ہے
تو بناتا ہے وہ گھر جس میں تجھے رہنا نہیں — کس قدر فیاضیوں سے دل ترا معمور ہے

ہمارے لیڈر

تخریب غرض ہے منہ سے مگر تعمیر کی باتیں کرتے ہیں
ہاتھوں میں لیے ہیں زہر ہلاہل شیر کی باتیں کرتے ہیں
جب تازہ الیکشن ہوتا ہے تب ان کو خدا یاد آتا ہے
تدبیر سے جب تھک جاتے تقدیر کی باتیں کرتے ہیں
جب ووٹ سے ہوتا ہے مطلب جب اپنی غرض کچھ ہوتی ہے
کس میٹھے میٹھے لہجے میں تسخیر کی باتیں کرتے ہیں

اس قدر سادگی سے اتنی حقیقی اور سچی باتوں کو قلم بند کرنا کسی عام فن کار کا کام نہیں یہ کوئی ماہر اور عظیم فن کار ہی کر سکتا ہے۔ اور سریر کابری کی ذات بے شک ایک عظیم فن کار کی ذات ہے۔

کتاب اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے سریر کابری کے صاحب زادے داؤد کابری نے شائع کی ہے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا پیش لفظ ہے۔

اقبال کے کرم فرما

مصنف : ماسٹر اختر
صفحات : ۱۳۴
قیمت : ۳۵ روپے
تقسیم کار : انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی

مبصر : شمس الحق عثمانی

یہ کتاب اک ایسے ادبی تنازعے کی تحقیق اور تجزیے پر مبنی ہے جو اقبال کے مجموعۂ مکاتیب اقبال نامہ حصہ اول (مطبوعہ ۱۹۴۵ء، مرتب: شیخ عطاء اللہ) میں لمعہ حیدرآبادی کے ۲۹ خطوط کی شمولیت سے پیدا ہوا تھا۔ اس دور میں یہ تنازعہ کچھ مدت جاری رہ کر ٹھنڈا پڑ گیا لیکن گزشتہ چند برسوں میں اقبال (اور نگور) سے لمعہ حیدرآبادی کے تعلقات و مراسلت کے بارے میں جناب اکبر رحمانی کے کچھ مضامین کی اشاعت سے اس تنازعے کی تجدید ہو گئی۔ علاوہ ازیں جولائی ۱۹۸۸ء میں رحمانی صاحب

اپنا مجموعہ مضامین "تحقیقات وتاثرات" شائع کیا تو اس کے ۶۸ صفحات لمعہ سے اقبال اور ٹیگور کے مراسم ومراسلت کی وضاحت وحمایت کے لیے مخصوص کیے۔

رحمانی صاحب کے برخلاف (دیگر کئی محققوں کی طرح) ماسٹر اختر کا کہنا ہے کہ لمعہ نے اقبال نامہ کے لیے جو خطوط مرتب کو دیے وہ اقبال کے نہیں بلکہ لمعہ کے خود ساختہ تھے ان میں لمعہ نے خود کو اقبال کا بے تکلف مکتوب الیہ، شاگرد اور بلند پایہ ادیب وشاعر باور کرایا تھا۔

زیر نظر کتاب کے لیے ماسٹر اختر نے اکبر رحمانی کی تمام متعلقہ تحریریں، اقبال نامہ اور متعدد افراد کی وہ سب تحریریں پیش نظر رکھی ہیں جو مذکورہ تنازعے کے دور اول اور دور ثانی میں شائع ہوئیں۔ "حرف آغاز" کے بعد کتاب میں پانچ مندرجہ ذیل حصے ہیں:

۱۔ اقبال اور لمعہ۔ ۲۔ لمعہ بنام لمعہ۔ ۳۔ ٹیگور بنام لمعہ۔ ۴۔ من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید۔ ۵۔ سخنہائے ناگفتنی۔

پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ لمعہ نے اپنے نام اقبال کے چند رسمی وغیر اہم خطوط کی روشنی میں کچھ خطوط وضع کیے تھے۔ ماسٹر اختر نے ان وضعی خطوط کے بارے میں ماہر اقبالیات عبدالواحد معینی کے وہ جملے نقل کیے ہیں جو خطوط کے جعل کو ظاہر کرتے ہیں۔ مزید براں ڈاکٹر تاثیر کا بھی ایک قول مع حوالہ درج کیا ہے جو بتاتا ہے کہ اقبال نامہ کے مرتب نے اصل خط نہیں دیکھے بلکہ لمعہ کی بقلم خود تیار کردہ نقول کافی سمجھ کر کتاب میں شامل کر لیے۔ کتاب شائع ہوئی تو ادبی حلقوں نے لمعہ کو ہدف ملامت بنایا مگر انھوں نے کسی بھی طرح اپنی صفائی پیش نہیں کی اور تاحیات (موت ۱۹۷۷ء) خاموش رہے لیکن موت سے پہلے اپنی داستان اکبر رحمانی کو قلم بند کرا دی۔ جو ہنوز غیر مطبوعہ اور رحمانی صاحب کی ڈائری میں محفوظ ہے اس کے بارے میں اختر صاحب لکھتے ہیں

"......اکبر رحمانی صاحب کی ڈائری میں محفوظ لمعہ کے بیان کو اگر بغیر کسی سند، ثبوت واقعاتی شہادت اور حالات وواقعات کی چول سے چول ملائے بغیر صحیح مان لیا جاتا ہے تو یہ ایک ایسی روایت قائم کرنا ہوگا جو محققین کے لیے ایک مستقل دردِ سر بن سکتی ہے۔ کل ہی ایسے سیکڑ افراد پیدا ہو جائیں گے جن کے بیانات تاریخ ادب کا رخ ہی موڑ کر رکھ دیں گے۔" صہ ۱۹

اس حصے کے اختتام پر ماسٹر اختر نے لکھا ہے:

"......اب یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ لمعہ ایک فریب کا نام ہے اور اکبر رحمانی صاحب ان مبالغہ آرائیوں اور ادبی فریب کے تنہا ذمہ دار۔ کیوں کہ وہ یہ کبھی ثابت نہ کر پائیں گے کہ لمعہ کے نام سے جو انکشافات وہ فرماتے رہے ہیں وہ خود ان کے دماغ کی پیداوار ہیں۔" صہ ۲۷

"لمعہ بنام لمعہ" میں ماسٹر اختر نے مذکورہ ۲۹ خطوط کا تجزیہ کیا ہے۔ تجزیے سے قبل انھوں نے اقبال کے تقریباً ساڑھے تیرہ سو اردو انگریزی مکاتیب کی روشنی میں ان کے طرز مکتوب نگاری، خطوط میں القاب اور اختتامی کلمات کی روش وغیرہ کو سمجھا اور پھر ا

نامہ میں شامل ۹۲ خطوط کے متن پر مدلل و جامع بحث کی ہے۔ اختتام بحث پر ماسٹر اختر کا کہنا ہے:

"افسوس کہ ملوہ صاحب نے ایمانداری سے صرف انھیں خطوط کو جو واقعی ان کے نام تھے بلا رد و بدل پیش کر دیا ہوتا تو ان کی شہرت دوام کے لیے وہی بہت کافی تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے تئیں علامہ کے منفی رویہ کی پردہ پوشی کے لیے اُن قیمتی خطوط میں الٹ پھیر اور خطوط سے خطوط پیدا کر کے انھوں نے اس نادر ترین سرمایہ کو تو برباد کیا ہی خود کی شکل کو بھی بگاڑ لیا" ص ۹۹

اس بحث اور تجزیے میں اختر صاحب کی محنت اور ذہانت یقیناً قابل داد ہے۔ اُن کے قلم سے کچھ ایسے الفاظ بھی ادا ہوئے ہیں جو ممکن ہے کہ بعضوں کے نزدیک نازیبا ہوں۔ مگر ادب و تحقیق کے محترم شعبوں میں جعل سازی و ہٹ دھرمی سے دراندازی کرنے والوں کے بارے میں اگر کوئی بے لوث ادب دوست ایسا رویہ اختیار کرتا ہے تو قابل درگزر ہے

کتاب کے دیگر اجزا بھی دلائل اور تحقیق سے اسی طرح مزین ہیں۔ ان پر تفصیلی تبصرہ اس لیے نہیں کیا گیا کہ قارئین کے لیے بھی تو کچھ باقی رہے اور وہ کتاب پڑھ کر سمجھ سکیں کہ ادبی جعل سازوں سے کوئی دو رعایتی نہیں رہا۔ ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ جعل سازوں کو معاون بھی ملنے لگے ہیں اور جعل سازوں کی معاونت کرنے والے کیا ہوتے ہیں؟

پرندوں کی دنیا

مصنف : مرزا عصمت اللہ بیگ
ناشر : عصمت میموریل پبلی کیشنز،
اشاعت : ۱۹۸۹ء
قیمت : دس روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
مبصر : ڈاکٹر سیفی پریمی

مرزا فرحت اللہ بیگ اور مرزا عصمت اللہ بیگ دونوں طنز و مزاح کے وہ جاندار اہل قلم ہیں جن کو تاریخ اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مرزا عصمت اللہ بیگ کی کتاب "پرندوں کی دنیا"، ادبی ٹرسٹ روزنامہ سیاست حیدرآباد، ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ، مدینہ ایجوکیشن سینٹر نامپلی حیدرآباد کی اعانت سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ "کے۔ ایم۔ عارف الدین ایڈووکیٹ نے لکھا ہے۔ دیباچہ، سجاد مرزا کے قلم کا نتیجہ ہے۔ نواب طاہر علی خاں، مصطفےٰ کمال شروانی، شیوراج دی پٹیل کی رائیں شامل ہیں۔ آرٹ پیپر پر درج ذیل پرندوں کی تصویریں رنگین اور بڑی خوبصورت ہیں۔ راہن کیزی، مرغا کویل بطخ، ترکی مرغی، نانی کور، توتا، بگلا، مرغی اور دو مرغی کے بچے، شتر مرغ، ایمو، کاک کاٹی کبوتر، ان پرندوں کا حال درج ہے۔ اس کے علاوہ راج ہنس، ابابیل، گدھ، تیتر، کوا، لوا، ابلقے، شکر خورا، کٹھ پھوڑا، کھٹ بڑھئی، رام چڑیا، سنہری عقاب، اُلو، امیری عقاب، اے پیارو دلس، ماہی خور، نیوزی لینڈ کا

[illegible] ایمو، لنگوین، کاکاتوا، نامہ بر کبوتر۔

اس کتاب میں اتنے پرندوں کی کہانی لکھی ہے۔ چونچ، پنجے، پر اور دوسرے حصوں کی ساخت [illegible] کھانا، انڈے، رہنے کی جگہ اور ان کے فائدے۔ بعض باتیں بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز [illegible] تھا۔ راج ہنس کے پروں سے قلم بنایا جاتا تھا۔ شکرخورا مکڑی کے جالے سے اپنا گھونسلا [illegible] اے پیارونس کا انڈا تین فیٹ لمبا اور ڈھائی فیٹ چوڑا ہوتا تھا۔ نیوزی لینڈ کا "ہوا" اس کا [illegible] ۱۲ فیٹ تک ہوتا تھا پر بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ شتر مرغ اڑ نہیں سکتا۔ دوڑتا ہے۔ ایک گھنٹے میں ساٹھ ستر میل کا چکر لگاتا ہے۔ اس کا انڈا مرغی کے ۲۴ انڈوں کے برابر ہوتا ہے۔ لنگوین بڑا [illegible] ہوتا ہے۔ وہ آدمی سے نہیں ڈرتا۔ کاٹ لیتا ہے یا ایک کرلات مارتا ہے۔ ایک نامہ بر کبوتر "مرغ [illegible]" کہلاتا تھا۔ عالمی جنگ میں اس نے وہ بہادری دکھائی کہ اس کو وکٹوریہ کراس کا تمغا اور سب کا خطاب ملا۔ مرنے کے بعد اس کو وائٹ ہال کے یونائیٹڈ سروسس کے عجائب گھر میں رکھا گیا۔ اس کے کارنامے اور خطاب دیوار پر کندہ ہیں ——— یہ کتاب پرندوں کی معلومات حاصل کرنے کا بہتر اور معتبر ذریعہ ہے۔ انداز بیان صاف، سلجھا ہوا، اور دلچسپ ہے۔

ذرا سی بات

(افسانوی مجموعہ)

مصنف : ابوالکلام عزیزی

قیمت : پندرہ روپے

مبصر : ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

صفحات : ۱۲۸

ملنے کا پتا : بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

ابوالکلام عزیزی افسانہ نگاری کی دنیا میں نووارد ہیں لیکن رسم و راہ منزل سے ناواقف نہیں ہیں۔ انھیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی تلخ اور شیریں حکایتوں کو افسانہ اور افسوں بنا دینے کا فن آتا ہے۔ روزمرہ کے وہ مشاہدات جنھیں سرسری طور پر ہم نظرانداز بھی کر سکتے تھے۔ افسانے کے پیکر میں ڈھل کر دلفریب نظر آتے ہیں۔ نفسیات کے بعض ہلکے پھلکے پہلوؤں کو سمیٹنے میں بھی وہ کامیاب رہے ہیں۔

ابوالکلام عزیزی کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ان کا الم انگیز اختتام ہے۔ ان کے افسانوں کے مرکزی کردار عام طور پر کسی نہ کسی ٹریجڈی کا شکار ہو جاتے ہیں اور افسانے کا ٹریجک اختتام شدت تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ "درد بھری ایک صبح" "مریض عشق" "سمجھوتہ" "قانون کی موت" اور "وارث" میں یہ صورت صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ ویسے تلک اور جہیز کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ "شہزادہ" طربیہ نقطۂ عروج کے باوجود [illegible] ہے لیکن [illegible] سے افسانوں میں نظر نہیں آتی۔

[illegible] اپنے افسانوں کو المیہ انجام سے دوچار کرتے ہیں۔ وسیم اور [illegible] اور کچل کر ہلاک نہ ہوتا تو کیا حرج تھا؟ مختار [illegible] "لمعہ" نام [illegible] خالدہ سے نامہ و پیام کرتا تھا [illegible] قبل انھوں نے اقبال کے تقریباً ساڑھے تیرہ سو [illegible] عورت جو کمرے کی کے طرز مکتوب نگاری، خطوط میں القاب اور اختتامی کلمات کی روش وغیرہ [illegible]

[illegible] ادب [illegible] کی تحقیقات [illegible] زبانوں میں ہو چکا ہے
[illegible] ان زبانوں کی بہ استثنائے انگریزی ادبیات [illegible] اردو میں بہت کم ترجمے ملتے ہیں۔ جس کے سبب
[illegible] اردو کا ایک عام قاری، اپنے ہی ملک کے دوسرے علاقوں کی ادبی رفتار و معیار سے لاعلم
[illegible] دوسری طرف اردو کے ذی مشق ادیب دوسری زبانوں کے ادبی رجحانات سے ناواقف رہتے
[illegible] سلسلے میں قابلِ ذکر نام گنے چنے ہی ہیں جنھوں نے دوسری زبانوں سے بلند پایہ ترجمے کیے
[illegible] جیسے [illegible] طباطبائی، پطرس، قرۃ العین حیدر (انگریزی سے) ڈاکٹر عبد العلیم (عربی سے) اختر حسین
[illegible] پوری (سنسکرت سے) ظ انصاری (روسی سے) اور یونس احمر (بنگالی سے)
[illegible] نئے مراٹھی افسانوں کے زیرِ تبصرہ مجموعے سے ان ناموں میں اضافہ ہوتا ہے، ڈاکٹر یونس اگاسکر
[illegible] اردو، بمبئی یونی ورسٹی میں استاد ہیں اور مہاراشٹر ادا سی ہونے اور ادبیات کا ذوق رکھنے کے
[illegible] مراٹھی زبان و ادب پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے دوسری جنگِ عظیم کے اختتام سے لے کر ۱۹۶۰ء تک
[illegible] افسانے کو ایک نئی سمت دینے والے افسانہ نگاروں، گنگا دھر گاڈگل، اروند گوکھلے، پ۔ بھا بھاوے
[illegible] ماڈگول کر، مدھو منگیش کارنک، اور شن۔ نا۔ نورسے کے بارہ نمایندہ افسانوں کا ترجمہ کیا
[illegible] قابلِ قدر ہے۔ ترجموں میں روانی ہے۔ پوری کتاب میں قاری کی دلچسپی شروع سے اخیر
[illegible] برقرار رکھتی ہے۔

اس کتاب کا سب سے اہم اور دلچسپ باب "مراٹھی نیا افسانہ: آغاز و ارتقا" ہے جس میں بڑے
[illegible] طور پر مترجم نے ان افسانہ نگاروں کے دور اور اس میں پروان چڑھنے والے رجحانات کا جائزہ
[illegible] ہے اور اس مجموعے میں شامل افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن یہاں ایک جگہ تضاد بیانی آگئی ہے۔
[illegible] فقرے میں مترجم نے یہ تاثر دیا ہے کہ نئے افسانہ نگار فرائڈ سے منحرف تھے لیکن اگلے ہی
[illegible] وہ لکھتے ہیں کہ ان افسانہ نگاروں نے شعور کی رو، کردار سازی میں نفسیاتی دروں بینی
[illegible] نفسیاتی تجزیے کے ساتھ جنس کی تحلیلِ نفسی سے مدد لی۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں سے فرائڈ کو
[illegible] نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً اسی لیے کہ وہ تحلیلِ نفسی کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں "میرا ابن باس" کے تحت اس مجموعے کی اشاعت میں تاخیر کا سبب
[illegible] بہت سی دوسری باتیں کہی گئی ہیں غیر ضروری ہیں۔ ان سے مترجم کی خود ترحمی کے شدید جذبے
[illegible] اظہار ہوتا ہے۔ کتابت طباعت اور سرورق دلکش ہیں۔ قیمت مناسب ہے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

یوپی میں بھی اردو دوسری سرکاری زبان

کابینہ کی منظوری حاصل، ۲۵ ستمبر کو بل پیش ہوگا

لکھنؤ ۱۳ ستمبر۔ حکومت اترپردیش نے بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں منگل کو ریاستی وزیر اطلاعات مسٹر نرائن دت تیواڑی کی قیادت میں کابینہ کی ایک میٹنگ ہوئی۔ کابینی فیصلہ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اخباری نمایندوں سے وزیر اطلاعات نے آج کہا کہ اس سلسلہ میں ایک بل ۲۵ ستمبر سے شروع ہونے والے مانسون اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد کی بہت زمانے سے یہ خواہش ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جانا چاہیے اور حکومت نے یہ فیصلہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو سے متعلق یہ بل اسی نوعیت کا ہوگا جو پڑوسی ریاست بہار میں منظور کیا گیا ہے۔

وزیر اطلاعات نے کہا کہ اگرچہ ماضی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے چار مرتبہ آرڈی ننس جاری کیا گیا ہے لیکن ان آرڈی ننس کی جگہ کوئی بل پیش نہیں کیا گیا۔ البتہ ۲۲ مئی ۱۹۸۰ء کو مسٹر [illegible] حکومت کے دوران وزیر پارلیمانی امور مسٹر [illegible] نے [illegible] بل پیش کیا تھا اور جو [illegible] پیش اس بل کی [illegible] کی تھی جو اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہر ممکن امداد کرنے کے حق میں تھے لیکن اس کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے خلاف تھے۔ لہٰذا اس بل پر اسی لیے بحث نہیں ہو سکی تھی کیونکہ اسپیکر مسٹر دھرم سنگھ نے [illegible] پارٹی کے ممبر مسٹر راجندر گپتا کا اعتراض منظور کر لیا تھا اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلہ کا اعلان ہونے تک اس پر بحث ملتوی کر دی تھی کیونکہ اردو سے متعلق جو آرڈی ننس جاری ہوا تھا اسے ہائیکورٹ میں ہندی سمیلن نے چیلنج کیا تھا۔

کلکتے کے ممتاز اور نیک نام ایجنٹ کے بھائی کا انتقال

۴ راگست ۸۹ء۔ کلکتے کے ممتاز اور نیک نام [illegible] ایجنٹ تجمل حسین خاں (جن کا انتقال ۱۹۸۰ء میں ہو گیا) کے چھوٹے صاحبزادے اور محمد مصطفٰے خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں صاحب انتقال فرما گئے۔ ادارہ کتاب نما اور پیام تعلیم محمد مصطفٰے خاں کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور محمد مصطفٰے خاں صاحب اور دیگر متعلقین کو صبر کی تلقین فرمائے آمین۔ ثم آمین۔

مکتبہ جامعہ کے چوکیدار کی اہلیہ چل بسیں

۱۳ راگست مکتبہ جامعہ کے سابق اور مخلص چوکیدار گوپی بہادر کی اہلیہ کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ کافی دنوں سے بیمار چل رہی تھیں۔ گوپی کی اہلیہ جن کو اہل مکتبہ بڑھی ماں کہا کرتے بڑی نیک اور جفاکش خاتون تھیں۔ بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔

[illegible] حفیظ بنارسی کو صدمہ

[illegible] اردو کے ممتاز شاعر جناب حفیظ بنارسی کی والدہ [illegible] انتقال [illegible] ستمبر ۸۹ء کو بنارس میں ہو گیا۔ محترمہ [illegible] اور بیرو احرہ خاتون تھیں۔ ادارہ کتاب نما [illegible] بنارسی صاحب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور [illegible] صاحبہ [illegible] مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

جامعہ کے ہونہار طالب علم

سڑک حادثے کا شکار

[illegible]۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ہونہار [illegible] شاعر، ادیب نیر دانش سڑک کے حادثے کا شکار ہو گئے۔ موصوف کسی مشاعرے سے اپنے دوست کے اسکوٹر پر واپس آ رہے تھے کہ ایک ٹرک نے ٹکر مار دی [illegible] میں گہری چوٹ آئی۔ چند دن اسپتال میں رہ کر [illegible] محبوب حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ متعلقین کو صبر کی تلقین فرمائے۔ آمین

"جواہر لال نہرو — اپنی تحریروں کی روشنی میں"

کی رسمِ اجرا

[illegible] گڑھ (ہریانہ) ۳۱ر جولائی۔ پنڈت جواہر لال [illegible] کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت [illegible] اردو اکادمی دی پنچکولہ نے "جواہر لال نہرو — [illegible] تحریروں کی روشنی میں" مرتبین: عبداللطیف اعظمی [illegible] لال ذاکر، ۲۱۴ صفحات کی ایک کتاب شائع [illegible] میں [illegible] مختلف زمانے اور مختلف مواقع کی آرٹ [illegible] تصویریں بھی شامل ہیں کتاب مجلد ہے اور [illegible] پنڈت جی کی سہ رنگی تصویر ہے ۳۱ جولائی [illegible] میں اس کی رسم اجرا کے لیے ایک جلسہ منعقد [illegible] [illegible]

[illegible] کی مختصر اردو تقریر کے بعد [illegible] کے صدر جناب [illegible] احمد صاحب اور سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر صاحب نے پنڈت جی اور کتاب کے بارے میں تقریریں کیں۔ اس جلسے میں کتاب مفت تقسیم کی گئی۔

اس موقع پر مشہور موسیقار اور مغنی جناب ستیش بہتر نے قدیم اور جدید اردو شعرا کے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ابوظہبی میں جشن کیفی اعظمی

امارات اردو سوسائٹی (ابوظہبی) کی جانب سے فروری ۱۹۹۰ء کے پہلے ہفتے میں برصغیر کے ممتاز شاعر جناب کیفی اعظمی کی شخصیت پر سہ روزہ جشن منایا جا رہا ہے جس میں ہندو پاک کے ممتاز ادیب شرکت کر رہے ہیں۔

اردو ادبا و شعرا کے لیے اہم اطلاع

نئی نسل کے ادبا و شعرا حضرات کو یہ اطلاع دی جاتی ہوئے خوشی ہو رہی ہے میں نئی نسل کے ادبا و شعرا نیز مضمون نگار حضرات کی معیاری و منتخب تخلیقات و مضامین کا مجموعہ تیار کر رہا ہوں جو عنقریب منظر عام پر آئے گا۔ لہٰذا حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے مضامین (علمی، ادبی، سائنسی اور تکنیکی) اور اپنی نثری و منظوم تخلیقات جلد از جلد ارسال کر دیں۔ مضامین و تخلیقات کی اشاعت کا آخری فیصلہ بہرحال مرتب ہی کرے گا مضامین و تخلیقات کے ساتھ اپنا مختصر تعارف بھی ارسال کریں۔ مضامین و تخلیقات کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا ہوا لفافہ بھی ارسال کرنا نہ بھولیں۔

پتہ: [illegible]

[illegible]

ریاستی گورنر محمد عثمان عارف کی قومی نظموں کی رسم اجرا

لکھنؤ ۴ ستمبر ۸۹ء۔ راج بھون میں غیر رسمی طور پر مسٹر محمد عثمان عارف نقش بندی کی ۱۱ طویل نظموں کا مجموعہ "قومی نظمیں" کی رسم اجرا ادا ہوئی۔ یہ کتاب ادارہ بزم خضر راہ نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس موقع پر مسٹر تسکین زیدی اعزازی ڈائرکٹر کان پور برانچ اور بزم خضر راہ کے بانی ڈاکٹر خوشحال زیدی بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے مسٹر عثمان عارف کی قومی اور وطنی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ان کو سچا محب وطن اور مجاہد آزادی بتایا۔

سید شریف الحسن نقوی سکریٹری دہلی اردو اکیڈمی نے اپنے ایک پیغام میں کہا کہ مسٹر عثمان عارف واقعی سچے محب وطن ہیں۔ ہندستان کی سرزمین کے ذرہ ذرہ سے انھیں محبت ہے اور وہ ان ذروں کو مہتاب و آفتاب بنانے کی تمنا اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

سارا جامعہ سوگوار

نئی دہلی ۵ ستمبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول کے استاد حافظ شاہد حسین کو آج یہاں جامعہ کے قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ گزشتہ بدھ کو جامعہ کیمپس کے ایک ہال میں گیس سلنڈر سے گیس نکلنے سے آگ لگ جانے کے حادثہ میں وہ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ انھیں صفدر جنگ اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں آج سویرے انتقال ہو گیا تھا۔ پسماندگان میں تین لڑکے اور سہ لڑکیاں شامل ہیں۔ واضح ہو کہ گیس سلنڈر حادثہ میں ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی جھلس گئی تھیں جن میں سے دو [illegible]۔ حافظ شاہد حسین [illegible] اور طلبہ [illegible] حافظ صاحب کی رحلت پر تمام جامعہ میں شدید رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے یہاں کسی میت کو اتنا کاندھا دینے والے نہیں دیکھے گئے۔ ادارہ کتاب نما مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

محققین سے درخواست

میں یو جی سی کے ایک منصوبے کے تحت اردو تحقیق کی مفصل تاریخ لکھ رہا ہوں۔ بہ شرط حیات تین جلدوں میں مکمل کرنے کی ہوس ہے۔ انشاء اللہ اردو کے تمام ادبی تحقیق کاروں سے درخواست ہے کہ مجھے اپنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحقیقی کتابوں اور تحقیقی مضامین کی فہرست روانہ کریں۔ ان میں تدوین کے کام بھی شامل ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کے مختلف اڈیشنوں کے ناشر کا نام اور سن اشاعت لکھیں۔ ان کے جن مجموعوں میں ایک بھی تحقیقی مضمون شامل ہو اس مجموعہ کی تفصیل لکھیں۔ جو تحقیقی مضامین ان کے کسی مجموعے میں نہیں آئے ان کے بارے میں نشان دہی کریں کہ وہ کس رسالے یا کتاب میں جگہ پا چکے ہیں۔ جن حضرات نے اپنے کسی مقالے پر پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ یا ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے، ان کا مقالہ مطبوعہ ہو کہ غیر مطبوعہ اس کے بارے میں لکھیں کہ کس یونی ورسٹی سے کس سنہ میں ڈگری ملی۔

اردو کے بڑے اہل قلم سے بطور خاص درخواست ہے کہ وہ اپنی تحقیقی تحریروں کی تفصیل عطا کرنے میں [illegible] یا اغماض سے کام نہ لیں۔ اگر تمام مضامین کی [illegible] نہ کر سکیں تو سر دست جن کے بارے میں جو کچھ [illegible] سکیں اس سے دریغ نہ کریں۔ اپنے کسی خورد کی [illegible] سے جواب عنایت کریں۔ ع شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔ اپنے استفسار کے جواب باصواب کے لیے ہر محقق کا دل سے ممنون ہوں گا اور ان کی درازی عمر کے لیے دعا کروں گا۔

گیان چند

[illegible] سنٹرل یونی ورسٹی، حیدرآباد ۱۳۴ [illegible]

اکبر علی خاں عرشی زادہ روبہ صحت

گزشتہ [illegible] اکبر علی خاں صاحب پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ کچھ دن INTENSIVE CARE میں رہے اور دس دن اسپتال میں رہ کر اب گھر آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے چند قدم چلنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔

ماہنامہ "خرام" کا اجرا

کان پور۔ "خرام" پبلی کیشنز کان پور کے زیر اہتمام [illegible] کی صنعتی راجدھانی کان پور سے ایک ادبی ماہنامہ "خرام" بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ شمارہ آفسیٹ پر شائع ہوگا اور اس کا مقصد صحت مند ادبی قدروں کو فروغ دینا ہے۔ تخلیق کار حضرات اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات مع پاسپورٹ سائز فوٹو جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ نمونہ کی کاپی ایک روپے کا ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے طلب کی جا سکتی ہے۔

(مدیر ماہنامہ "خرام" معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۹۲۴ م۔ کانپور ۱)

جدہ میں ڈاکٹر انور سدید کے اعزاز میں مشاعرہ

پاکستان میں اردو کے ممتاز تنقید نگار، محقق اور انشائیہ نگار ڈاکٹر انور سدید فریضہ حج کی ادائیگی کے سلسلہ میں سعودی عرب تشریف لائے تو ان کی پاکستان واپسی سے قبل نسیم سحر نے ان کے اعزاز میں ایک خصوصی مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں جدہ میں ممتاز شعراء کرام کے علاوہ دیگر معززین نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر بزم ہمدرد جدہ کے معتمد و بانی جناب شریف اسلم، پاک مسلم مجلس [illegible] عبداللہ رکن عاملہ جناب مکرم عبداللہ بھی شریک تھے جبکہ ممتاز ادبی شخصیت جناب سعید [illegible] بھی رونق افروز تھے۔ مکہ سے جناب [illegible] اس محفل میں شرکت کے لیے تشریف لائے [illegible]

[illegible] سر انجام دیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر انور سدید تھے اور نظامت جناب ناظر قدوائی کے سپرد تھی۔ اس موقع پر نسیم سحر نے "ڈاکٹر انور سدید۔ لیڈر آف دی اپوزیشن" کے عنوان سے مضمون پڑھا جس کے بعد مشاعرہ ہوا۔ کلام سنانے والوں میں عبدالرؤف شاہ، مہتاب قدر، ناظر قدوائی، عبدالباری انجم، نعیم بازید پوری، نسیم سحر، ظفر مہدی، ڈاکٹر انور سدید اور مرزا شکور بیگ صاحبان شامل تھے۔

فیض احمد فیض اور ابراہیم جلیس کو اعزازات

اسلام آباد (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۱۶ اگست) حکومت پاکستان نے ۱۴ اگست کو یوم آزادی پاکستان کے موقع پر بعض ممتاز شخصیتوں کو ایوارڈ دیا ہے جناب فیض احمد فیض کو نشان امتیاز، نیوکلیر سائنس داں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو ہلال امتیاز کا اعزاز دیا گیا ہے۔ جناب ابراہیم جلیس کو آزادی صحافت ۱۹۷۸ء کی تحریک کے سلسلے میں بعد از مرگ حسن کارکردگی ایوارڈ دیا ہے۔ ابراہیم جلیس پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار مساوات کے اڈیٹر تھے۔ فوجی حکومت نے پرنٹنگ پریسوں پر مساوات کی طباعت نہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔ جلیس نے چیف سکریٹری صوبہ سندھ سے اس حکم کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ تلخ گفتگو کے بعد ابراہیم جلیس دماغ کی شریانیں پھٹنے سے انتقال کر گئے تھے۔ ان کے انتقال پر پاکستان کے تمام اخبارات ایک روز بند رہے تھے۔ حکومت پاکستان نے (۳) اور صحافیوں ناصر زیدی، خاور نسیم ہاشمی اور خیال جعفری کو جنہیں فوجی حکومت نے کوڑے لگائے تھے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

مکتبہ جامعہ بک کلب

"... جمہوریت مرکز میں بیٹھے ہوئے بیس افراد کے ذریعے ... چلائی جا سکتی۔ اسے نیچے کی سطح سے ہر گاؤں کے لوگوں کو چلانا ہوگا۔"

—— گاندھی جی

عوام کے لئے اختیارات

اہم خصوصیات

پنچایتی راج بل

- گاؤں، بلاک اور ضلعی سطحوں پر پنچایتیں قائم کرنا۔
- الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی تینوں سطحوں پر تمام نشستوں کو براہ راست انتخاب کے ذریعے بھرنا۔
- پنچایت کے کام کرنے کی میعاد — ۵ سال
  اگر کسی پنچایت کو اس میعاد سے پہلے منسوخ کیا جاتا ہے تو چھ ماہ کے اندر اس کی تشکیل نو کے لئے انتخاب کرایا جائے گا۔
- درج فہرست ذاتوں / قبائل کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنا۔
- خواتین کے لئے ۳۰ فیصد نشستیں محفوظ کرنا۔
- پنچایتوں کا سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ مقامی ترقی کے منصوبے تیار کرنا اور انہیں لاگو کرنا۔
- پنچایتوں کو اپنا کام چلانے کے لئے کافی فنڈس مہیا کرنا۔

نگر پالیکا بل

- تین قسم کی نگر پالیکائیں قائم کرنا: نگر پنچایتیں، میونسپل کونسلیں اور میونسپل کارپوریشنیں۔
- الیکشن کمیشن کے زیر نگرانی براہ راست انتخاب کرانا۔
  کام کرنے کی میعاد — ۵ سال۔
- اگر کسی بھی میونسپل تنظیم کو اس کے کام کرنے کی میعاد سے پہلے منسوخ کر دیا جاتا ہے تو انتخاب چھ ماہ کے اندر کرایا جانا چاہئے۔
- وارڈ کمیٹیاں قائم کرنا تاکہ ان لوگوں کو جو ... کا جذبہ رکھتے ہیں اپنے علاقے کی خدمت کرنے کا موقع مل سکے۔
- مقامی تنظیموں کو مرحلہ وار اختیارات کی منتقلی۔
- منصوبہ بندی کے عمل میں انہیں اہم رول ادا کرنے کا موقع دینا۔
- میونسپل تنظیموں کے لئے کافی رقم مہیا کرنا۔

ترقی اور جمہوریت کو گھر گھر میں پہنچانے کے لئے ایک انقلابی قدم

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

نومبر ۱۹۸۹ء جلد ۲۹ شمارہ ۱۱

فی پرچہ 5/=
سالانہ 45/=
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

وحشت (افسانے) ظفر پیامی ۵۰/-

ہمارے دینی علوم (مذہب) مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب (ایک تنقیدی جائزہ) آل احمد سرور ۸/-

نور اللغات جلد اول (اردو لغت) مولوی نور الحسن نیر ۱۰۵/-

" جلد دوم " " " ۸۴/-

بہار میں اردو طنز و ظرافت (طنز و مزاح) سلطان احمد ۵۰/-

آصف علی (سوانح) سد عبر نیت ۱۳/-

تلاش و تحقیق (تحقیق) کاظم علی خاں ۸۰/-

آغا حجو شرف احوال آثار (تنقید) " ۵۰/-

منٹو نامہ (تحقیق) جگدیش چندر ۸۰/-

کبھی اَن کہی (شاعری) اوم کرشن راحت ۴۰/-

رنگ تماشہ (افسانہ) حمید الماس ۴۰/-

ہندستانی سائنس (معلومات) اندرجیت لال ۱۰/-

عصری ادب افسانہ نمبر (مجلّہ سہ ماہی) ڈاکٹر محمد حسن ۲۰/-

رنگا رنگ لطیفے (لطائف) شہناز ہمایوں ۳۵/-

اہل قلم کی شوخیاں (مزاح) عطش درانی ۳۰/-

محمد قلی قطب شاہ (سوانح) ڈاکٹر مسعود حسین ۵/-

دو اسلام نیا ترمیم شدہ اڈیشن (مذہب) ڈاکٹر غلام جیلانی برق ۳۵/-

دو قرآن " " " ۳۵/-

اللہ کی عادت " " " ۳۰/-

مظہر جمال مصطفائی (سوانح غوث الاعظمؒ) سید نصیر الدین ہاشمی قادری ۴۰/-

سرورق ـــــ حامدی کاشمیری

مصوّر ـــــ شکیل اعجاز

مہانند (ناول) مترجم ڈاکٹر اعجاز مدنی ۳۰/-

بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا (ادب) ڈاکٹر اختر اورینوی ۱۸/-

دلّی تاریخ کے آئینے میں (تاریخ) پروفیسر خلیق احمد نظامی ۵/-

مرزا دبیر اور ان کی مرثیہ نگاری (تنقید) ڈاکٹر نصیب فاطمہ ۴/-

آہنگ اور عروض (عروض) کمال احمد صدیقی ۱۸/-

دنیا میرے آگے (شاعری) کرشن موہن ۵۰/-

پیمانۂ امروز " نعیم صدیقی ۲۰/-

گفتار اور کردار (مضامین) فوق کریمی ۱۵/-

اسلام کی علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ (نیا اڈیشن) محمد عزیز ۵۰/-

سنگ جاں (شاعری) زاہدہ زیدی ۴۵/-

دکنی ادب کی تاریخ نیا اڈیشن (ادب) ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۱۲/-

امراض اطفال (طب) حکیم خورشید احمد ۴۸/-

یونانی ادویہ مفردہ (نیا اڈیشن) (طب) حکیم صفی الدین ۱۲/-

سلام مچھلی شہری حیات اور شاعری (سوانح) ڈاکٹر محمد اختر حسین ۲۵/-

اظہار خیال (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ۵/-

مہمان اداریہ
پروفیسر حامدی کاشمیری
شالیمار - سری نگر

اُردو زبان و اَدب کی موجودہ صُورتِ حال

اس وقت ملکی سطح پر اردو زبان و ادب کی صورتِ حال مایوس کُن ہے حصولِ آزادی کے فوراً بعد اردو کو اپنی بقا اور تحفظ کے لیے جن مسائل، آزمائشوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ آج بھی جوں کی توں قائم ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان میں رفتارِ وقت کے ساتھ ساتھ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں، اور آج واقعی صدیوں کی یہ قیمتی میراث یعنی اردو، جسے ملک کا شناخت نامہ کہا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا، حیات و مرگ کی کشمکش میں مبتلا ہے، اردو کی اس بحرانی حالت کے کئی اسباب ہیں، یہاں پر دو خاص اسباب کا ذکر مقصود ہے:

اوّل، حصولِ آزادی کے بعد سے اردو زبان کے آئینی حقوق کو پسِ پشت ڈال کر اسے کس مپرسی بے یقینی اور یتیمی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا، اس کے سیاسی وجوہات سب پر ظاہر ہیں، اہلِ اُردو ان وجوہات کی نادرستگی کو وزنی دلائل سے ثابت کرتے رہے وہ احتجاج کرتے رہے، لیکن بے سود، اہلِ سیاست کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، یہ ضرور ہے کہ طویل جدوجہد کے بعد بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا، اور اب یو۔پی سرکار نے بھی اسے دوسری زبان کا درجہ دیا ہے، لیکن کیا ان دو ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اعلان سے اردو کا مسئلہ حل ہوا؟ اس سوال پر غور کرنے سے پیشتر یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اردو کی تہذیبی، ادبی اور لسانی حیثیت کو کالعدم کرنے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں، وہ عبرتناک ہیں، مثلاً اردو کے لیے پورے ملک میں کوئی لسانی علاقہ مخصوص نہیں کیا گیا، سوائے کشمیر کے، جہاں اردو کے علاوہ کشمیری، ڈوگری، لداخی، پنجابی اور گوجری زبانیں بولی جاتی ہیں، اور اپنا حق طلب کرتی ہیں۔

دوم، تعجب ہے کہ پورے ملک میں اردو کے بولنے والے اپنی زبان کے تئیں ہونے والے غیر منصفانہ اور معاندانہ سلوک کے باوصف بے عملی، تساہل اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے رہے، اپنی زبان کو آئینی تحفظ دلانے کے لیے جس مشنری جذبے، عملی جدوجہد اور ایثار کی ضرورت ہے، اسی سے اردو کے اکابرین سے لے کر عام لوگ تک بیگانہ رہے، مقامِ تاسف یہ ہے کہ اردو کے اکابرین اردو کے نام پر صرف ذاتی منفعت اندوزی کے چکر میں رہے، اور اُردو کی ناو کو تند خو موجوں کے حوالے کر گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم نہ رہی، اور نئی نسلیں اس زبان سے قطعی نابلد ہوگئیں، یہ گویا زبان کی جڑوں کو کاٹنے کا عمل تھا جو منصوبہ بند طریقے سے روا رکھا گیا، تاہم یہ خوش آئند بات ہے کہ بہار اور یو پی میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ ملا، لیکن اس سے اُردو کی بقا اور تحفظ کی کیا صورت نکلتی ہے؟ جب تک اِن ریاستوں میں پرائمری سے لے کر ڈگری سطح تک اُردو کی تعلیم و تدریس

کا باقاعدہ، جدید اور موثر انتظام نہیں کیا جاتا، اردو کا مسئلہ بدستور قائم ہے اور پھر بنیادی بات یہ ہے کہ اُردو کی تعلیم جب تک طلبہ کے لیے حصولِ معاش کے وافر اور موثر ذرائع کو یقینی نہیں بناتی، اس وقت تک اس کی معنویت اور افادیت مشتبہ رہے گی، جب تک نہ صرف تعلیمی اداروں بلکہ دیگر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں بھی اردو کی درجہ بدرجہ اسامیاں خلق نہیں کی جائیں، جن پر اردو کے فارغ التحصیل طلبہ تعینات کیے جائیں اردو تعلیم کی جانب کوئی رجوع نہیں کرے گا، اور یہ خدشہ ہے کہ درسگاہوں میں اردو تعلیم کی سہولیات تو ہوں گی، لیکن طالب علم ندارد والا معاملہ ہوگا۔

آیئے، چند اور گمبھیر مسائل کی طرف متوجہ ہو جائیں،

سرکار نے مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیاں اس غرض کے لیے قائم کی ہیں تاکہ اردو کی ترقی و ترویج کے امکانات کو دریافت کیا جائے، اور ان کو عملی شکل دی جائے، لیکن یہ اکادمیاں اپنے اصلی کام سے منحرف ہوکر ایسے کاموں اور پروگراموں میں کھوگئی ہیں، جو زبان کے موجودہ بحرانی دور میں فروعی اور بے معنی ہیں، اردو اکادمیاں بشمول ساہتیہ اکادمی، یا تو ہر سال کتابوں پر ایوارڈ دیتی ہے یا سال خوردہ ادیبوں کو انعامات سے نوازتی ہیں، اسی کام میں صریحاً دوست نوازی اور گروہی ترجیحات و مفادات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے، اور مستحق ادیبوں کے حقوق پر شب خون ملا جاتا ہے، کیا یہ واقعہ نہیں کہ منظورِ نظر اور بارسوخ ادیبوں پر ہی انعام واکرام کی بارش ہوتی ہے؟ کیا نئی نسلوں کے کسی باصلاحیت ادیب کو کسی اعزاز سے نوازا گیا؟

اکادمیوں کا دوسرا کام یہ ہے کہ یہ ادیبوں کے مسودوں کی مالی اعانت کرتی ہے، لیکن کیا ایسا کرتے ہوئے کوئی معیار پیشِ نظر رہتا ہے؟ اِدھر کئی برسوں سے تیسرے درجے کی کتابوں کی جو بھرمار ہوتی ہے، اور جن میں کلاس نوٹس پر مبنی اُستاد نقادوں کی کتابوں کی جو بڑھتی ہوئی تعداد ہے، وہ معیار کا سارا بھرم کھول دیتی ہے، ایسے TRASHY ادب کے انبار لگانے سے اردو کا وقار خاک میں ملتا جا رہا ہے، اور پھر اکادمیوں کا ایک اور غلغلہ آفرین کام ہے، رسمی سمیناروں کا انعقاد، جن میں صرف افتتاحی اجلاس کی چمک دمک پر روپیہ بہا دیا جاتا ہے، اور بقیہ نشستیں "نشتند و گفتند... " پر ختم ہوتی ہیں، کیا سرکاری رقومات کو ان یا اس نوع کے دیگر کاموں پر صرف کرنے سے اردو کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟

یہ بات ظاہر ہے کہ زبان کی ترقی و ترویج میں اخبارات اور جرائد اہم رول ادا کرتے ہیں، اردو میں اخبارات وجرائد کی حالت ناگفتی ہے، پُورے مُلک میں چند ہی اخبارات ہیں، جو اپنی ٹانگوں پر ایستادہ ہیں نہیں تو ننّوے فیصد اخبارات مالی بحران سے گزر رہے ہیں، اردو جرائد کی حالت تو ناگفتہ ہے، "سوغات" اور "صبا" کا دم نکل چکا ہے، گفتگو خاموش ہے "سب رس" گھٹیا کاغذ اور معمولی گٹ اپ کی مثال ہے، "شب خون" عدم پابندی کا شکار ہے "کتاب نما" کتنے پیاسوں کو سیراب کر سکتا ہے؟ صرف ایک رسالہ "شاعر" ہے، جس کی بقا کے لیے ادارۂ شاعر خون پسینا ایک کر رہا ہے، لیکن کب تک؟ مجھے بتایئے کہ ریاستی اکادمیوں نے کبھی مُلک کے اخبارات یا جرائد کو زندہ رکھنے انھیں استحکام عطا کرنے اور انھیں مقبول عام بنانے کی طرف توجہ کی؟ کیا مناسب نہیں تھا کہ جو بھاری رقومات کسی ایک "سیاسی" ادیب پر ایوارڈوں کی صُورت میں نچھاور کیے جاتے ہیں، وہ کسی دم توڑتے ہوئے رسالے کو دیے جاتے، تاکہ اردو کا ایک چراغ خاموش ہونے سے بچ جاتا،

کیا اکادمیاں ریاستی سطحوں پر اسکولوں کے لیے معیاری، کارآمد اور بامعنی نصابات کی ترتیب و تدوین

ام اتو ین نہیں دے سکتی تھیں؟

کیا اکادمیاں فضول ادب کی اشاعت پر رقمات صرف کرنے کے بجائے زیر تعلیم اردو طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے معقول وظائف نہیں دے سکتی تھیں؟

کیا اردو اساتذہ کے لیے تربیتی کورسز کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا تھا؟

۱۔ موجودہ دور ذرائع ابلاغ کی مؤثر کارکردگی کا دور ہے، اگر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انفارمیشن جیسے ادارے اردو زبان کو مناسب نمائندگی دینے کی ضرورت سے صرف نظر کریں، جیسا کہ وہ کرتے رہے ہیں، تو اردو کا خدا ہی حافظ ہے، حد تو یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے ارباب اختیار اردو کو ٹیلی ویژن کے قومی پروگراموں میں اردو کے نیوز بلیٹن کو بھی شامل نہیں کرتے، اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ اردو کتنے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے۔

۲۔ فی الوقت اردو کا جو نظام تعلیم مروج ہے، وہ حد درجہ غیر تسلی بخش اور از کار رفتہ ہے۔ پرائمری سے لے کر ایم۔ اے تک اردو کی تعلیم و تدریس نظر ثانی کی محتاج ہے۔ سب سے پہلے مروجہ نصابات کو جب تک جدید سائنسی، معلوماتی، آسان اور درجہ بند نہیں بنایا جائے گا، اردو طلبہ میر اور غالب کا نام تو رٹ لیں گے، مگر ان کے شعری جینیس کو مس نہیں کریں گے، اور جدید میکانکی دنیا کے شہری نہیں کہلائیں گے۔

ایک مسئلہ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی کا بھی ہے، آج دنیا سائنسی ترقی کے عروج پر ہے، اس لیے پرانے نظریات اور روایات شدید انقلاب سے دوچار ہیں، مغربی زبانوں میں تدریسی طریقوں میں غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں، LANGUAGE کے ذریعے زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن اردو اساتذہ ابھی تک لکیر کے فقیر ہیں۔

آئیے، اب ادب کے چند مسائل کا ذکر کریں۔

میرے نزدیک، اس وقت زبان ہی کی طرح ادب کی صورت حال بھی تسلی بخش نہیں ہے موجودہ دور کے ادبی منظر نامے پر ایک نظر ڈالیے تو تعطل، یکسانیت، سطحیت، تکرار اور مقصدیت کی کار فرمائی ملتی ہے، اصل میں اردو ادب میں قدیم دور سے ہی ادب کی ماہیت اور اس کے تفاعل کے بارے میں بالعموم گمراہ کن اور غلط نظریات مروج رہے ہیں عہد ماضی سے لیکر موجودہ صدی کے آغاز تک ادب روایت کی جکڑ بندیوں کا اسیر رہا یہی وجہ ہے کہ میر اور غالب کے علاوہ اور کوئی چوٹی کا تخلیقی فنکار نظر نہیں آتا، حالاں کہ سیکڑوں صاحب دیوان شعراء گزرے ہیں، یہ شعراء روایت پرستی کے زیر اثر اپنے تخلیقی ذہن کی شناخت بھی نہ کر سکے چہ جائیکہ اس کا اظہار کراتے، جہاں تک جدید دور میں مغربی نظریات نقد کے اثر و نفوذ کے تحت نئے تنقیدی شعور کی کارکردگی کا تعلق ہے، وہ بھی حسب توقع نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا ہے، ہمارے نام نہاد نقاد ذوق ادب کی آبیاری اور ادب کی تحسین شناسی کیا کریں، وہ تو خود اعلا ادب کی تفہیم و ادراک سے عاری ہیں، مارکسی تنقید ہو یا تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید ہو یا ہیئتی تنقید، یہ سبھی تنقیدات ادب کے موضوع، مقصد اور معنی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہیں اور اسی کی بنا پر ادب کی تعیین قدر کی جاتی ہے، ظاہر ہے ہمارے نقاد ادب کے وجود سے نہیں، بلکہ کسی دوسری چیز سے سروکار رکھتے ہیں۔ اور ادب میں خلط مبحث کو راہ دیتے ہیں، مارکسی تنقید نے تو رہی سہی کسر پوری کی ہے، اس نے ادب کو سماجی مقصد کا تابع مہمل بنا کر اس کی آزاد تخلیقی حیثیت کو کالعدم کیا ہے، ان حالات میں اردو کے طلبہ نسل بعد نسل ادب کی ماہیت کے بارے میں لاعلمی کے شکار رہے ہیں، اس ضمن میں اردو ادب کی تدریس بھی گمراہیوں کی

شکار رہا ہے، ادب کی تدریس ایک میکانکی انداز کی پابند رہی ہے، معلمین کلاس میں شعر کے معنی بتاتے ہیں، اور الا اللہ خیر سلّا وہ طلبہ کو یہ سمجھانے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے کہ ادب ایک خود مختارانہ اور قائم بالذات وجود ہے، جو لسانی تجزیہ و تحلیل کی مدد سے اپنے اسرار منکشف کرتا ہے اور جمالیاتی حظ بخشتا ہے،

ادب کی تفہیم و تحسین کے اس غلط طریق کار نے خود تخلیق فنکاروں کو بھی گمراہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے، اس کی مثال ترقی پسند ادیبوں کی ہے، جو غیر معمولی تخلیقی ذہن کے وجود نظریہ پرستی، منصوبہ بندی اور مقصدیت کے دلدل میں گرفتار رہے، اور مصنوعی ادب لکھتے رہے،

اور پھر یہ بات کہ تخلیق کاروں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ حقیقت تردّد اور پریشانی میں مبتلا کیے ہوئے ہے، کہ جس زبان کو وہ ذریعۂ اظہار بنا رہے ہیں، اس کا مستقبل مخدوش ہے، یہ خوف ادب کی تخلیقی سرگرمیوں کو متاثر کرتا ہے،

بہر کیف، اس وقت اردو زبان و ادب کو چند در چند مسائل کا سامنا ہے جب تک جذبۂ ایثار، عملی قوت، خود آگاہی اور تنظیم و اتحاد کے ساتھ ان مسائل سے نمٹا نہ جائے، اُردو کی ترقی اور تحفظ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، اور یہ کام انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر کیا جانا مطلوب ہے، ●●

قتیل شفائی
غالب کالونی۔ سمن آباد
لاہور ۲۵۔ پاکستان
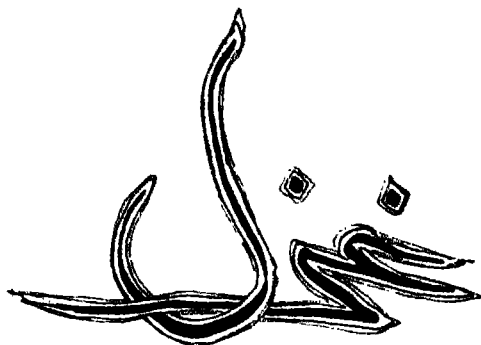
رات کے پچھلے پہر جب مہرباں ہوتی ہے نیند
میری آنکھوں کے لیے اک امتحاں ہوتی ہے نیند

کر رہا ہوتا ہوں میں جس وقت تیرا انتظار
کیا خبر اے دوست ایسے میں کہاں ہوتی ہے نیند

روٹھنا، پھر مان جانا۔ مان کر پھر روٹھنا
بچپنے کی ہر ادا لے کر جواں ہوتی ہے نیند

جسم میں جو رچ گئی ہو راحتوں کو ڈھونڈتے
گاہے گاہے اُس تھکن کا بھی نشاں ہوتی ہے نیند

آج بستر بھی مرا مجھ کو لگے کانٹوں کی سیج
لے چلو اُس دشت میں لوگو جہاں ہوتی ہے نیند

تجربہ میرا قتیل اب تو نے پوچھا ہے تو سن
جس جگہ ہوں زلف کے سایے وہاں ہوتی ہے نیند

نومبر ۱۹۸۹ء

سردش
نوئیڈا

کیفی اعظمی۔ چند تاثرات

آج سے چوالیس سال پہلے۔ یہی برسات کا موسم تھا۔ ایک سہ پہر کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے صدر دفتر
راجہ ہاؤس (بمبئی) میں کیفی اعظمی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ جیسا کہ میں نے اپنی خود نوشت "بمبئی کی بزم آرائیاں" میں لکھا ہے،
میں نیاز کا ایک تعارفی پرچہ لے کر علی سردار جعفری سے ملا، اور سردار جعفری نے میرا تعارف کیفی اعظمی سے کرایا۔ کیفی بڑے خلوص
سے ملے۔ چھریرا بدن، کتابی چہرہ، الجھے الجھے سے بال، چہرہ پُرسکون اور ٹھہراؤ، آواز میں گیرائی اور آنکھوں میں غنودگی
کی کیفیت۔ ممکن ہے کیفی نے بھی میرا نام کہیں کہیں پڑھا ہو کیوں کہ مجھے لاہور کے رسائل ہمایوں، ادبی دُنیا، شاہکار
وغیرہ میں چھپتے ہوئے دو تین سال ہو گئے تھے۔ میں نے مجاز سے کیفی کی نظم 'عورت' کی تعریف سنی تھی جس میں وہ عورت
کو شانہ بشانہ ہمراہ و عمل پر گامزن ہونے کے لیے آمادہ کرتے ہیں ؎

"اُٹھ مری جان، مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے"

میں نے انہی دنوں کیفی کی ایک رومانی نظم بھی کسی لاہوری رسالے میں پڑھی تھی جو مجھے پسند آئی تھی ؎

"اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو"

قومی جنگ' اس وقت تک میرے مطالعہ میں نہیں آیا تھا۔ 'قومی جنگ' ہفتہ وار پارٹی ہیڈ کوارٹر سے نکلتا تھا جس میں کیفی
کی تازہ بہ تازہ نظمیں محاذ جنگ کی سرگرمیوں اور روس کی سُرخ فوجوں کی پیش قدمی کی رفتار کی عکاسی کرتی تھیں ——
کیفی اور ان کی شاعری سے تعارف بمبئی ہی میں حاصل ہوا، اور ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'جھنکار' پڑھا جس میں
بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) نے کیفی اعظمی کو اردو شاعری کا سُرخ پھول کہا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس پھول کے
دلفریب رنگ نے چمنستان اُردو کے سیر بینوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس وقت دبستانِ شاعری تر و تازہ اور سدا بہار
پھولوں سے مہک رہا تھا —— اُدھر فیض، راشد، احمد ندیم قاسمی اور ساحر لدھیانوی، اِدھر مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر
—— اور پرویز شاہدی اور وامق جونپوری —— جنوب کی طرف مخدوم محی الدین، اختر الایمان اور علی سردار جعفری ——
گلستان ترقی پسندی کے ان سب پھولوں کا اپنا اپنا رنگ اور مہک تھی۔ مگر کیفی اعظمی کا اپنا ہی دلفریب رنگ و آہنگ
تھا۔ کیفی جیسے سُرخ پھول کی مہک کو محسوس کرنے کے لیے بند کمروں کی فضا ناکافی تھی، جب کیفی کو مشاعرہ میں سنا تو
ایسا لگا کہ میر انیس نوجوان ہو کر سرِ جلسہ آ گئے ہیں، اور اس دور کے یزیدوں کے خلاف گرم سخن ہیں —— ایسا جوش،
ایسا ولولہ، ایسا ٹھہراؤ اور ایسا بہاؤ۔ معلوم ہوتا تھا کہ لغت کے بے جان الفاظ کیفی کے سینے میں اتر کر اس کے ہونٹوں
سے آبِ حیات پی کر نکل رہے ہیں، لمحاتی موضوعات کو شعر میں جکڑ کر پیش کرنے کا فن شاید اس صدی میں کیفی سے

نا
بی کے پاس نہیں دیکھے، پڑھنے میں کتنے معصوم اشعار ہیں ؎

لال جھنڈا پھینک دو! اے دیش بھگتو کیا کہا!!
یہ تو ہے سرمایہ داروں اور لٹیروں کی صدا
یہ صدا اُن کی ہے جو برطانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا اُن کی ہے جو سنگھانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا اُن کی ہے ٹاٹا نے سنوارا ہے جنھیں
یہ صدا اُن کی ہے برلا نے ابھارا ہے جنھیں

یہی اشعار کیفی نے جب ایک انقلابی مشاعرے میں سنائے جس میں محنت کش طبقہ اور پسی ہوئی مخلوق سامعین
ہجوم میں تھی تو ایسا لگتا تھا کہ ہر ایک مصرع سے دھواں نکل رہا ہے اور ہر شعر سے چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں۔ ممکن
نہیں کہ کیفی کے سامعین پر وہ کیفیت طاری نہ ہو جائے جو کیفیت کیفی کے دل میں ہے۔ اور کیفی کا یہ حال آج تک
۔ کیفی کی ایک مشہور نظم تھی "حقیقتیں" ــــــ اس نظم میں متوسط طبقہ کی زبوں حالی کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا
تھا۔ نظم کا "میں" جب پہلی تاریخ کو تنخواہ گھر لے جاتا ہے تو قرض خواہوں کا خیال اسے سانپ کی طرح ڈستا
، وہ بیمار بیوی کا تصور کرتا ہے جس کے علاج کے لیے اب بھی روپیا نہیں بچا پائے گا ــــــ وہ اس حقیقت کا
تراف کرتا ہے کہ اس نے مہینا بھر محنت کر کے جو روپے کمائے ع

"حق مرا اُن پہ زیارت کے سوا کچھ بھی نہیں"

گر صرف یہی ہوتا تو وہ کیفی کی نظم نہ ہوتی۔ متوسط طبقہ کی خستہ حالی کی تصویر پیش کرنے کے بعد شاعر دبی ہوئی مخلوق کو
ر اٹھانے کی دعوت دیتا ہے اور نظم اس مصرع پر ختم ہوتی ہے۔ ع

"کہ علاج اس کا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں"

یک اور نظم تھی۔ "نوجوان"۔ اس کے اشعار میں جیسے حب الوطنی کی آگ بھری ہوئی تھی، اور اس پر مستزاد کیفی کے پڑھنے
انداز جیسے کوئی یلغار کر رہا ہو ؎

مژدہ اے ماں کہ ترے چاہنے والے آئے
تشنہ ہونٹوں کی طرف اُڑ کے پیالے آئے

س نظم کے دو مصرعے اور یاد آئے ؎

ہم وہ دیپک ہیں جو آندھی میں جلا کرتے ہیں
ہم وہ غنچے ہیں جو بجلی پہ ہنسا کرتے ہیں

اس وقت ان کی بہت سی نظموں کی گونج میرے ذہن میں ہے جو وہ منگل کروری کے انقلابی مشاعروں اور مدن پورہ،
ستان تالاب اور ناگپاڑہ کے جلسوں اور مشاعروں میں پڑھا کرتے تھے۔ بمبئی کے ہر انقلابی مشاعرے وہاں کے
محکمۂ خفیہ پولیس کے لیے دردِ سر تھے، اور ان مشاعروں میں ہم چند سر پھرے ہی شامل ہوتے تھے ــــــ انگلیوں پر
گنے جانے والے نام ــــــ سردار جعفری، کیفی اعظمی، رفعت سروش، پریم دھون، نیاز حیدر، مجروح سلطان پوری
(جو اس گروہ میں کچھ دن بعد شامل ہوئے تھے) علاء الدین صابر، کبھی کبھی ظ۔ انصاری، اور کچھ عرصہ بعد آئے ساحر
لدھیانوی اور کچھ دن کے لیے مجاز ــــــ سردار جعفری کی شاعری اور پڑھنے کے انداز میں ایک خاص رفتار سے بہنے

والے دریا کی سی روانی ہے، مگر کیفی اعظمی کی نظموں کا اُتار چڑھاؤ اور لہجہ سمندر کی طغیانی کی طرح ہے، ان دنوں سردار اپنی نظم سنانے سے پہلے مختصر سی تقریر ضرور کرتے تھے۔ مگر کیفی کبھی نثر میں بولتے ہی نہ تھے بس مائک پر آئے اور کہا نظم کا عنوان ہے ......" اور سامعین کو اپنی آواز کی رو میں بہالے گئے۔ نظم پڑھ کر اور جلسہ یا مشاعرہ کو تہ و بالا کر کے آخری شعر پڑھ کر کیفی تیزی سے اپنی جگہ پر آ بیٹھتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ——— مراقبہ کی سی کیفیت ———

دلی سے بمبئی جا کر انقلابی مشاعروں میں بے دھڑک شرکت میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا اور میں کیفی کے لہجے سے مرعوب تھا اور کچھ اسی طرح پڑھنے کی کوشش کی ع

"مگر وہ بات کہاں مالوی مدن کی سی"

وقت کے ساتھ کیفی سے روابط گہرے ہوتے گئے۔ میری شامیں کمیونسٹ پارٹی کے آفس میں گزرتی تھیں جیسے سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد اشرف، ضیاء الحسن، سبط حسن، سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے دوسرے تیسرے دن ملنے کی عادت پڑ گئی تھی

آج یہ سطور قلم بند کرتے وقت ایک ایک لمحہ یاد آرہا ہے ——— کیفی اپنی میز پر جھکے ہوئے کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے کیفی اپنے ساتھیوں سردار جعفری اور محمد علی وغیرہ کے ساتھ بھنڈی بازار میں "قومی جنگ" بیچتے ہوئے، کیفی مشاعرے میں شعلہ افشانی کرتے ہوئے ——— کیفی اپنی ٹھہری ٹھہری آواز میں کوئی لطیفہ سناتے ہوئے، کیفی ایک سکون خاموشی اور اعتماد کے ساتھ محفل میں بیٹھے ہوئے ——— کیفی اپنی مخمور آنکھوں سے سب کی باتیں سن کر صرف مسکراتے ہوئے ——— لکھنؤ کے بعد جب 'نیا ادب'، بمبئی سے شائع ہونا شروع ہوا تو کیفی اس کے ادارہ میں شامل تھے ان کے مضمون کا ایک مستقل عنوان تھا ——— "ترقی پسند کیا نہیں ہے" ——— اس سے کیفی کی نثر اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ سلسلہ چند ماہ چلا اور اس کے بعد شاید کیفی نے کبھی ادبی نثر نہیں لکھی۔ کم سے کم میری نظر سے نہیں گزری۔

حیدرآباد والی کانفرنس (اکتوبر ۱۹۴۵ء) کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین زیادہ فعال ہو گئی تھی اور اس کے ہفتہ وار جلسے بنے بھائی کے گھر ۹۶ والکیشور روڈ پر منعقد ہونے لگے تھے۔ یہ سلسلہ مستقل جاری رہا۔ میں پابندی سے اُن جلسوں میں جاتا تھا اور دیگر احباب کے ساتھ کیفی سے بھی ملاقات ہوتی تھی۔ ان دنوں انجمن کی تنقیدی نشستوں میں کیفی بحث و مباحثہ میں بہت کم حصہ لیتے تھے۔ یہ شعبہ تو سردار جعفری، وشوامتر عادل اور ظ۔ انصاری کے لیے مخصوص تھا یا پھر اپنے رُکے رُکے لہجہ میں بنے بھائی بحث کو سمیٹنے کے لیے بولتے تھے۔ ۹۶ والکیشور روڈ کی بہت سی یادیں ذہن میں محفوظ ہیں مگر سب سے خوبصورت یاد ہے۔ شوکت اور کیفی کا نکاح۔ ۱۹۴۵ء والی کانفرنس کے بعد کیفی کی حیدرآباد آمد و رفت بڑھ گئی تھی اور 'پیام' کے اڈیٹر اختر حسین کی خواہر نسبتی شوکت سے وابستگی خاطر کی مستند خبر اس انتساب نے دی جو اُن کے دوسرے مجموعہ کلام 'آخر شب' میں چھپا تھا ——— :-

"ش'! میں اپنے فن کو آخر شب تک لے آیا ہوں۔ تم آجاؤ تو سحر ہو جائے"۔ (اس وقت آخر شب میرے سامنے نہیں ہے مگر تقریباً یہی الفاظ انتساب کے طور پر چھپے تھے)

کتب پبلشرز (بمبئی) سے 'آخر شب'، غالباً ۱۹۴۶ء کے آخر یا ۱۹۴۷ء کے شروع میں چھپی تھی ——— اور اس کے کچھ عرصہ بعد ——— اور یوم آزادی سے پہلے۔ ۱۹۴۷ء میں "ش" کیفی کی زندگی میں آگئیں، وہ دن ——— نہایت مبارک دن ——— آج تک یاد ہے۔ اختر حسین شوکت کو حیدرآباد سے بمبئی لے آئے تھے۔ اور بنے بھائی کے مکان پر کیفی کا نکاح ہوا، میں بھنڈی بازار سے دُلھن کے لیے سہاگ پوڑا لیکر آیا تھا، اس تقریب میں بمبئی کے سبھی ترقی پسند

ادیب اور شاعر موجود تھے اور بنّے بھائی کا ڈرائنگ روم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ذوالفقار بخاری بھی تھے۔ اور مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ وہی شوکت کے نکاح کی باپ بنے تھے۔ اسی فلیٹ میں کیفی نے اپنی نئی زندگی شروع کی اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک بنّے بھائی کے پاکستان چلے جانے کے کچھ عرصہ بعد مالک مکان نے وہ فلیٹ کیفی اور سردار جعفری سے خالی نہیں کرا لیا۔

شوکت ایک نہایت باہمت خاتون اور بیوی ثابت ہوئیں، اور انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سعی کی۔ اور 'اپٹا' کے ڈراموں میں کام کرنے کے بعد پرتھوی راج کپور کے پرتھوی تھیٹر میں باقاعدہ ملازم ہو گئیں اور وہاں ان کی اداکاری کے جوہر کھلے۔ پھر ریڈیو اور فلم نے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا۔ اور آج کون نہیں جانتا کہ شوکت کیفی اپنے طرز کی بے مثال اداکارہ ہیں۔ اور نہ صرف یہ، بلکہ ان کی آغوش، شبانہ جیسی ہیروئن کا گہوارہ بنی'۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہو سکا جب کیفی اعظمی نے عملی طور پر اپنے آپ کو ترقی پسند ثابت کیا اور اپنی بیوی کو صحیح معنوں میں شریک حیات اور ہم سفر بنایا۔ ع

"اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے"

سردار جعفری کی شادی کیفی کی شادی کے بہت دن بعد ہوئی۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اس رنگا رنگ تقریب میں سردار اور سلطانہ کو مبارک باد دیتے ہوئے کیفی نے ایک نہایت خوبصورت بات کہی تھی:

"میں نے سردار جعفری سے بہت کچھ سیکھا ہے، مگر ایک چیز میں نے سردار جعفری کو سکھائی۔۔۔ شادی کرنا۔۔۔"

ایک بات جو کیفی اعظمی کے بارے میں بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کیفی نے کبھی روپیا بٹورنے کی کوشش نہیں کی اور دولت و شہرت کے حصول کے لیے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کیے۔ جوڑ توڑ نہیں کیا۔ کبھی انعام و اکرام کے پیچھے نہیں بھاگے۔ جو کچھ پیش کیا گیا وہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ انھوں نے بہت دنوں تک رضاکارانہ اور سپاہیانہ زندگی گزاری اور پارٹی کے کل وقتی ممبر کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت تندہی سے انجام دیے، چاہے ٹریڈ یونین کا کام ہو چاہے ادبی فرنٹ کا۔

ظ۔ انصاری اور علی سردار جعفری کی گرفتاری کے بعد ادبی فرنٹ پر اُن کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی تھی اور انجمن کے ہفتہ وار جلسوں کو منعقد کرنا اور انجمن کو فعال رکھنا کیفی اعظمی کا ہی کام تھا۔ اس زمانے میں کیفی کی تنظیمی صلاحیتیں دیکھنے کا موقع ملا۔ اب وہ میری اور ساحر کی طرح انجمن کے جلسوں میں گوشہ گیر نہیں تھے، بلکہ روحِ رواں بن گئے۔ اب شاعر کیفی اعظمی شعلہ بیان مقرر بھی ہو گیا، اور پبلک جلسوں میں بولنے لگا۔ کیفی نے انجمن کے جلسوں میں ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا،

یہ وہ زمانہ تھا جب ادب کے ماتھے پر مقصد کی چٹ لکھ کر چپکائی جانے لگی تھی، اور غیر ادیب قسم کے لوگ ادیبوں پر کیچڑ اُچھالنے لگے تھے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی ایک نشست میں میں نے ایک نظم پڑھی جس کا لب و لہجہ رومانی تھا۔ بحث شروع ہوئی۔ ایک صاحب کا مریڈ جبّار جو خیر سے مدن پورہ کے جلسوں میں تقریریں کرنے لگے تھے، اُٹھے، اور نہایت غیر ادبی لہجے میں تقریر فرمانے لگے کہ آخر اس نظم سے عوام کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور اپنی رَو میں انھوں نے کہا کہ آخر یہ ادیب اور شاعر ہم کو دیتے کیا ہیں؟۔۔۔ کیفی سے برداشت نہ ہوا۔ مگر انھوں نے غصہ روک کر نہایت بھنچے بھنچے لہجے میں کہا کہ جبّار صاحب نے۔۔۔ "یہ ادیب اور شاعر"

اس طرح کہلاتے جیسے ۔۔۔ "یہ کیڑے مکوڑے" ۔۔۔ اس طرح کی تنقید کی اجازت نہیں دی جا سکتی، ادیب اور شاعر آپ کا غلام نہیں ہے، اس کی اپنی بھی زندگی ہے، اور اسے اپنے طور پر سوچنے اور لکھنے کا حق ہے۔۔۔ کیفی کی اس بروقت گرفت سے نہ صرف اس میٹنگ کی فضا خوشگوار ہو گئی، بلکہ اس اندازِ فکر کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ چند لڑکے انجمن کی برسوں کی ساکھ غارت کر دیتے۔

ایسی ہی ایک اور میٹنگ کی یاد ذہن میں ابھر آئی۔۔۔

پروفیسر احتشام حسین اپنے کسی کام سے بمبئی آئے تو ہماری اتوار کی میٹنگ میں بھی تشریف لائے۔ احتشام صاحب کی وجہ سے اس میٹنگ کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی، جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ اتفاق سے اس دن تنقیدی پروگرام میں مجھے ہی ایک نظم پڑھنی تھی ۔۔۔ میں نے ایک تمثیلی نظم پڑھی اور احتشام صاحب نے اس نظم کے حوالے سے ہی بات شروع کی۔ اور پھر ادب کی مجموعی صورتِ حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کی تخلیقات میں تاثر کی کمی ہے جیسے اس نظم میں۔ آج ہمارا ادب ایک نازک دور سے گزر رہا ہے، پرانے لکھنے والے خاموش ہیں اور "نئے" لکھنے والے سامنے نہیں آ رہے ہیں

عصمت چغتائی سے چپ نہ رہا گیا۔ انھوں نے اپنی روائتی بیباکی اور صاف گوئی سے کہا کہ نہیں معلوم ہمارے نقاد کیا چاہتے ہیں، ہم نے لکھا ۔۔۔ نقاد مطمئن نہیں ہوا، ہم نے اور لکھا ۔۔۔ اور لکھا ۔۔۔ اور لکھتے جا رہے ہیں۔ مگر نقاد ہماری تخلیقات سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ۔۔۔ پھر کیفی اعظمی نے عصمت کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایسا نہیں ہے کہ نوجوان ادیب اور شاعر پیدا نہیں ہو رہے ہیں، یہ نوجوان شاعر آپ کے سامنے ہوں، یہ رفعت سروش ہیں، اور دوسرے ادیب اور شاعر ہیں۔ اور جب یہ تسلسل قائم ہے تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ادب کی ترقی کی رفتار رک گئی ہے۔

کیفی اعظمی ترقی پسند اسٹیج کی آبرو تھے اور ہیں۔ لیکن کیفی نے کبھی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا نہیں کی۔ البتہ ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے ہر آدمی جدوجہد کرتا ہے۔ وہ کیفی نے بھی کیا۔ فلموں میں گانے اور ڈائیلاگ لکھے۔ مگر فلمی کام حاصل کرنے کے لیے شاید کیفی نے فلمی ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ نااہلوں کی چاپلوسی نہیں کی، کسی میوزک ڈائرکٹر کا دُم چھلا بن کر نہیں رہے۔ کسی نالائق کو روشن خیال اور ترقی پسند نہیں کہا۔ نتیجہ ظاہر ہے، کیفی سے کم تر درجے کے ادیب اور شاعر نہایت آسودہ حال ہیں، اور کیفی آج بھی تقریباً اسی حال میں نظر آتے ہیں جس حال میں پہلے تھے۔ میں نے ان کی "کیمون" کی زندگی دیکھی ہے۔ کھیت واڑی مین روڈ پر کیمون میں کیفی کے پاس صرف ایک کمرہ تھا جس میں وہ بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان دنوں کا ایک دلچسپ قصہ کیفی نے سنایا تھا جو عبرت ناک بھی ہے اس لیے دہراتا ہوں۔ اسکول کے کسی ڈرامے میں کام کرنے کے لیے کیفی کے لڑکے کو ترکی ٹوپی کی ضرورت تھی۔ ایک دو دن کے لیے ترکی ٹوپی خریدنا فضول خرچی نظر آئی ہوگی۔ اتفاق سے اپنے گھر کے قریب بازار سے گزرتے ہوئے انھیں ایک آدمی نظر آیا جس نے ترکی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کیفی نے ان حضرت کو روکا اور بڑے اخلاق سے کہا کہ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ایک دو دن کے لیے مجھے اپنی یہ ٹوپی دیدیجیے۔ میرے بیٹے کو ایک ڈرامے کے لیے چاہیے ان صاحب نے بغیر کسی پس و پیش کے ٹوپی اتار دی اور کیفی کے حوالے کر دی۔ انھوں نے کہا۔ آپ مجھے اپنا گھر کا پتا بتا دیجیے۔ میں آپ کی ٹوپی پہنچا دوں گا۔ وہ صاحب مسکرائے اور بولے۔ کیفی صاحب آپ فکر نہ کیجیے۔ میں خود آپ کے گھر سے لے لوں گا۔

کیفی نے تعجب سے کہا۔ آپ میرا گھر کیسے جانتے ہیں۔ انھوں نے نہایت سکون سے جواب دیا ـــــ کیفی صاحب! میں سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہوں۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۴۸ء تک میں بمبئی رہا اور اس عرصہ میں کیفی سے نہایت دوستانہ مراسم رہے ۔ اور آخری ایک ڈیڑھ سال تو ملنا جلنا زیادہ رہا۔ اس عرصہ میں شوکت کیفی دودھ بھارتی میں میرے پروگرام "گجرا" کی اناؤنسر رہیں۔ شوکت بہت اچھی براڈکاسٹر ہیں۔

دہلی آنے کے بعد گذشتہ تیس سال میں کیفی سے بہت بار ملاقات ہوئی۔ کبھی کسی مشاعرے میں، کبھی کسی سیمنار میں، کبھی ریڈیو اسٹیشن پر۔ اور میں نے اُن کے خلوص میں کوئی کمی نہیں دیکھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے اور معاملہ بندی سے بے نیاز نظر آئے۔ اس تیس سال کے عرصہ میں اردو دُنیا میں بہت سے انقلاب آئے۔ خود کیفی نے شہرت اور مقبولیت کی بہت سی منزلیں سرکیں، ان کے مجموعۂ کلام آوارہ سجدے کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا۔ اور انھیں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، لوٹس ایوارڈ اور پدم شری پیش کیے گئے۔ ان کے گانے اور مکالمے فلموں میں مقبول ہوئے۔ اور وہ کھیت واڑی سے جانکی کٹیر اجو ہو پہنچ گئے۔ مگر کیفی کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ مغرور نہیں ہوئے۔ ان کے متعلق کوئی ایسی افواہ سننے میں نہیں آئی کہ انھوں نے دولت وشہرت کے لیے اپنے بنیادی نظریات سے روگردانی کی، کسی فرد یا جماعت کی خوشامد کی یا اپنی سالگرہ منانے کے لیے اہلِ ثروت سے جوڑ توڑ کیا اور اپنے جشن منوانے کا کاروبار شروع کیا۔ لوگ پدم شری بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ مگر کیفی کی کج کلاہی کا یہ عالم ہے انھوں نے اردو کے سوال پر پدم شری اعزاز بھی حکومت کو واپس کر دیا۔ گویا اپنے اوپر سرکاری مراعات کے دروازے بند کر لیے ـــــ اور ایسے عالم میں جبکہ وہ ایک مدت سے جسمانی طور پر کافی معذور رہیں اور ان کو اپنے ایک پاؤں اور ایک ہاتھ پر قابو نہیں ہے، مگر یہ معذوریاں ان کی ذہنی توانائی اور عظمتِ کردار پر اثر انداز نہیں ہو سکیں اور وہ اپنے نظریات میں اتنے ہی پختہ ہیں جتنے پہلے تھے، اپنے عمل میں اتنے ہی بیباک اور مخلص ہیں جتنے پہلے تھے۔ ہاں اتنا ضرور کیا ہے کہ بمبئی کی تیز رو زندگی سے اپنے آپ کو ذرا بچا کر اپنے گاؤں لوٹ آئے ہیں۔ مگر وہاں بھی ان کے فلاحی پروگرام جاری ہیں اور سنتا ہے اُن کی اَن تھک کوشش کی وجہ سے ان کے گاؤں میں زندگی کی نئی لہر آگئی ہے۔ ادب اور انسانیت کی خدمت کرنے والے ایسے بے لوث انسان نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جبلی نہایت شاندار پیمانے پر منانے میں کیفی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

ادب کے ناقدین کی محفلوں میں کیفی شروع سے ہی بحث کا موضوع رہے ہیں۔ ان کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم رہا کہ ناقدین ان کے نام کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ اگرچہ ایک عرصہ تک سیدھی، صاف اور بیانیہ نظمیں لکھنے کی وجہ سے، اور عمومی موضوعات کے باعث اُن کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں کرنے سے بعض ناقدین کتراتے رہے، کیوں کہ جب ہیئت، اور اسلوب کے نئے نئے تجربے کیے جا رہے تھے، کیفی کلاسیکل روش پر قائم تھے اور انھوں نے زیادہ تر نظمیں مثنوی کی فارم میں کہی ہیں۔ مگر کیفی نے اس پامال صنعت سے نیا کام لیکر اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی طویل مثنوی "خانہ جنگی"

مشاعروں میں اس طرح سنی جاتی تھی کہ چھتیں اور پنڈال اڑ جائیں ؎

"لوگ گھر سے نکلتے ڈرتے ہیں
راستے سائیں سائیں کرتے ہیں"

کیفی کی رومانی نظموں میں بلا کی شوخی اور جاذبیت ہے جو شاعر کی زندہ دلی کی قسم کھاتی ہے ؎

"جب بھی چوم لیتا ہوں اُن حسین آنکھوں کو
سارے غار اجنتا کے مسکرانے لگتے ہیں"

انھوں نے آزاد نظم کی صنف کو بہت دنوں بعد قابلِ اعتبار سمجھا۔ لیکن جب آزاد نظمیں کہیں تو اس صنفِ سخن میں بھی اپنا توانا لہجہ اور پُر وقار آہنگ سمویا۔

ان کی نظم 'ابنِ مریم' اس کی ایک مثال ہے۔ امنِ عالم کے موضوع پر یہ نظم بلا شبہ شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، ایک اور نظم یاد آ رہی ہے —— "عادت"۔ ؎

"زندگی چاہیے —— روشنی چاہیے"

اس نظم میں ایک بھرپور طنز کی کیفیت ہے اور جدید معاشرہ کے ایذا طلب اور نفسیاتی طور پر بیمار افراد کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ 'سومناتھ' بھی ایک کامیاب آزاد نظم ہے، اس وقت کیفی کی شاعری پر مضمون لکھنا مقصود نہیں ہے۔ محض چند تاثرات قلم بند کر رہا ہوں،

انقلاب کی للکار اور بغاوت کی ترغیب کے ساتھ لہجہ کا بانکپن اور الفاظ کا زیر و بم، اور کہیں کہیں لطیف طنز کا تیکھاپن، زبان کی سلاست اور حلاوت۔ ان تمام خصوصیات کے امتزاج کا نام کیفی کی شاعری ہے، ان کا سرمایۂ شاعری بہت زیادہ نہیں ہے۔ ایک پتلی سی کتاب —— "جھنکار" —— پھر ایک مجموعہ۔ "آخرِ شب" —— اور اس کے بہت عرصہ بعد "آوارہ سجدے" اور ۱۹۸۳ء میں اقبال کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کا تنقیدی مطالعہ —— "ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) کی صورت میں —— منظوم مطالعہ۔ اقبال کے ہی آہنگ اور لفظیات میں ؎

"کرۂ گیتی ہتھیلی پر اٹھائے شان سے
کس بلندی پر ہے لینن کا جہانِ آرزو
کر رہے ہیں عصرِ حاضر کی وہی مشاطگی
جن کو تو کہتا تھا کل آشفتہ مغز آشفتہ ہو
چھین لی ساقی سے پیاسوں نے کلیدِ میکدہ
توڑ ڈالے ناروا تقسیم کے جام و سبو"

بس یہ کُل کائنات ہے کیفی اعظمی کی —— کچھ اور تازہ نظمیں اور غزلیں ہوں گی لیکن کیا یہ بات کیفی کی عظمت کی دلیل نہیں ہے کہ وہ جودتِ فکر، نظریاتی پختگی اور خلوصِ فن کی بدولت تقریباً نصف صدی سے مطلعِ شاعری پر درخشندہ ہیں، اور جس مدار میں وہ ہیں وہاں کوئی دوسرا سیارہ نہیں پہنچ سکا۔ آج دنیا کے گوشے گوشے میں کیفی کی شاعری کے دلدادہ موجود ہیں، کیفی اردو شاعری کی آبرو ہیں۔ اور اس نازک دور میں اُردو کو اپنے تحفظ کے لیے کیفی جیسے بے لوث جیالے شاعروں کی ضرورت ہے۔ ●●●

والدۂ محترمہ کے انتقال پُرملال پر

حفیظ بنارسی
ملکی محلہ، آرا
(بہار)

میری اماں، بہت مشفق بہت ہی مہرباں اماں
تری رحلت سے دل صد پارہ ہے میرا
مرا غم کون سمجھے گا
بہت سے اشک میری آنکھوں کے کشکول سے چھلکے
بہت سے اشک ایسے تھے جو پلکوں تک نہیں آئے
سُلا کر قبر میں تجھ کو ابھی میں گھر میں آیا ہوں
جہاں ٹوٹا تھا دم تیرا اسی کمرے میں بیٹھا ہوں
بہت ہی ٹوٹا ہوں بہت ہی بکھرا بکھرا ہوں
وہی ہے کُل جہاں لیکن
مجھے لگتا ہے کچھ ایسا کہ سب کچھ کھو گیا میرا
ہر اک شے میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے
تری آواز اب تک گونجتی ہے میرے کانوں میں
ترا قرآن کا پڑھنا پڑھانا یاد آتا ہے۔
تری سادہ مزاجی، زندگیِ باصفا تیری
ہزاروں ابتلا میں تیرے صبر و شکر کا عالم
تری شب زندہ داری
وہ تیری بندگی، تیری سحر خیزی
ہے سب کچھ میری آنکھوں میں۔
تو سر تا پا محبت تھی
خدا کی ایسی نعمت تھی
کوئی جس کا بدل، ہو ہی نہیں سکتا
نہیں ہے تُو تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔
بہت سے چاہنے والے ابھی موجود ہیں میرے
مگر اے مادرِ مشفق!
تھکا ماندہ بنارس جب میں آؤں گا
کسے 'اماں' پکاروں گا؟
مجھے تیری طرح کس کی نظر دیکھے گی شفقت سے؟
غموں کی دھوپ میں بھی شادماں گذروں گا میں کیسے؟
دعاؤں کی حسیں چادر مجھے اب کون بخشے گا؟
مرا دردِ نہاں اب کون سمجھے گا؟

مری اماں ——!
مری اماں ——!
مجھے افسوس تو یہ ہے
ضعیفی میں تری خدمت جو کرنی تھی نہ کر پایا
دمِ آخر ترے دیدار کی دولت نہ مل پائی
یہ میری بدنصیبی تھی
قلق رہ جائے گا اس کا
ترے قدموں میں جنت تھی
وہ جنت چھن گئی مجھ سے
بنارس پھر میں آؤں گا
مگر وہ بات کیا ہوگی
تری موجودگی میں جو میسر تھی!
مرے زخموں پہ مرہم کون رکھے گا؟
کہے گا کون مجھ سے —'کتنے دبلے ہو گئے ہو تم!'
'تم اپنی شکل تو آئینہ میں دیکھو'
'یہ کیسے ہو گئے ہو تم!'
میں اپنا غم کسی سے کہہ نہیں سکتا
'خدا حافظ' کہا تھا آخری دیدار سے پہلے
یہی دو لفظ گونجیں گے مرے کانوں میں مدت تک
دعا لے کر ہوا تھا تجھ سے رخصت چار دن پہلے
مگر اب میں ترے حق میں بہ پیشِ داورِ محشر
دُعا کے ہاتھ اُٹھاتا ہوں
کہ تیری قبر کو پروردگار انوار سے بھر دے
ہر اک مشکل جو بعد مرگ پیش آتی ہے انساں کو
تری خاطر خدائے پاک اُسے آسان تر کر دے
وہ تیری مغفرت فرمائے، فردوسِ بریں بخشے
وہ تجھ پر کھول دے دروازے اپنی خاص رحمت کے
ترا مرقد شمیمِ خلد سے مہکے
فرشتے سایہ افگن ہوں
فرازِ آسماں سے اس پہ شبنم کے گہر برسیں!
ہمیشہ رحمتوں کے پھول تیری قبر پر برسیں!

والدہ صاحبہ کا انتقال ۲؍ستمبر ۱۹۸۹ء کو ہوا

ڈاکٹر زار علامی
13/1057، اربن اسٹیٹ
(کرنال)

رُباعیات

زخموں نے مرے ہنس کے دیا خوب مزا
یاروں کی وفاؤں کا ہے احسان بڑا
کیا کیا نہ عنایات ہوئی ہیں مجھ پر
وہ درد اُٹھا دل میں کہ جی بیٹھ گیا

موڈھ پر چڑھ کر موڈھ کو نہ کھولا جائے
غیروں سے بھی تہذیب سے بولا جائے
کچھ کہنے سے پیشتر سخن کو اے زار
اخلاق کی میزان پہ تولا جائے

کچھ خوب نہیں یہ ہوسِ سیم و زر
نادان نہ بن جان کو ہلکان نہ کر
ہم نے تو بزرگوں سے یہ سُن رکھا ہے
کاجل کی کوٹھڑی میں دھبّے کا ڈر

تضحیک سے ہوتی ہے ہمیشہ سبکی
کس کام کا وہ کام جو کردے ہیٹی
اے زار ٹھٹھول کا سلیقہ سیکھو
ہر وقت کی اچھی نہیں ہی ہی ٹھی ٹھی

دائم نہ رہے گا یہ وقارِ ہستی
کیا ہستی ہستی ہے نگارِ ہستی
تجربات کی اِک بات کہے دیتا ہُوں
کانٹے پہ رکی اوس بہارِ ہستی

آ، باز آ، فکرِ باطل سے باز آ
فردوسِ خیالی کا نہیں کچھ بھی مزا
یہ اول جلول باتیں، بیکار، فضول
رنڈوے کے سپنوں میں رکھا ہے کیا

فرزانہ بہت اور بہت ہی قابل
ہر فن میں طاق، ہر ہنر میں کامل
توقیر یہاں پاتا ہے کیا کیا جاہل
لکھا نہ پڑھا نام محمد فاضل

سُن رکھی ہے گردش کے "غرور" کی بات
معلوم ہے کیا ہے بدی کی اوقات
کتنی ہی بار آزمایش کی ہے
بس لمحوں تک ہوتی ہے بدی کی بات

کی بیٹی
4/50
بھیڑیے کا گانا
6/-
6/-

نصر ملک
کوپن ہیگن۔ ڈنمارک۔

گفتنی

مجھے خاموش ہی رہنے دو، کیونکہ
پُرسکون، خاموش دریا کے کنارے
خاموش چلنا ہی بہتر ہوتا ہے
خاموشی ہی کسی آمد کی مظہر ہوتی ہے
کسی بڑے طوفان کی بھی اور
ذہن میں تصورات و خیالات کی بھی
یا پھر، سطحِ آب پر مچھلیوں کے سر نکالنے کی
تصورات و خیالات اور مچھلیاں،
یہ بے آواز ہی تو ہیں!
چاندنی رات میں چپکے سے جب،
گھاس سر اُٹھاتی ہے تو زمین پر
سبزے کا اک قالین بچھا دیتی ہے
اور سپیدۂ سحر کے لمحوں میں، اس کا
نظارہ کرنے والوں کی خامشی
سبھی کچھ تو کہ دیتی ہے۔

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس نمبر ۲۶۵۷۲
(بحرین عربین گلف)

غزل

کسی کے کرب سے ہوتا نہیں ہے اندازہ
پُرانا زخم ہے، یا گھاؤ ہے کوئی تازہ؟

لگایا دل تو ہمیں جان کے پڑے لالے
تمام عُمر بھگتنا پڑا ہے خمیازہ

کشش ہے حُسن کی، یا برق مقناطیسی ہے
سمیٹ لیتی ہے بکھرا ہوا یہ شیرازہ

وہ ایک شخص کہ جس کے لیے ہوئے رُسوا
اُسی نے آج سرِ رہ کسا ہے آوازہ

کھُلا ہی رہتا ہے شاہدؔ برائے علاجِ درد
تمام رات یہاں میکدے کا دروازہ

کیلاش ماہر
۱/۱- اے - وکرم وہار- لاجپت نگر
نئی دلّی ۲۴

لمحہ لمحہ پیاس

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
کتابیں، قلم
میز، کُرسی یہ البم
یہ گُڈّن کا معصوم فوٹو
اُدھر شیلف سے جھانکتی میر و غالب کی روحیں
دھنک رنگ ماضی!
میری زندگی کا ایک ایک لمحہ
کوئی مجھ سے چھینے لیے جا رہا ہے
کہاں ...!
جہاں زندگی شعلۂ بیکراں ہے
ہر اِک لمحہ اک لمحۂ جاوِداں ہے
قلم جیسے بوڑھا سپاہی تماشائے اہلِ ہنر دیکھتا ہو!
میری پیاس ابدی ہے شاید
مجھے ہر جنم میں
ندیا کے [illegible] ہی جلنا پڑے گا۔

عتیق اللہ
۱۷- جی- ۲۵۲ شالیمار باغ
دہلی ۵۲

بدگماں! گمانِ بیش و کم نہ کر
جو گزر گئی اسے رقم نہ کر

رائیگاں سہی مسافتیں تمام
اپنے آسمان مجھ پہ کم نہ کر

کس اُفق سے لائے ہیں چرا کے دیکھ
اِس کرن کو ظلمتوں میں ضم نہ کر

کسی کے زخم تہ نشین ہیں یہاں
اس جگہ کو آنسوؤں سے نم نہ کر

ایک اور صرف ایک غم بہت
ایک سے زیادہ ہو تو غم نہ کر

ظفر گورکھپوری
اے ۲۲/ گلوریدہ، شاستری نگر، اندھیری ویسٹ بمبئی ۵۸

بڑا ہے درد کا رشتہ

(زیر طبع شعری مجموعہ "قیامت کا دن" کی ایک نظم)

پڑوسی کا مرے ننھا سا پوتا
بڑا ہی شوخ نٹ کھٹ اور باتونی
مرے گھر اس طرح آتا ہے
گویا
یہ اُس کا اپنا گھر ہے
مرا ٹھی بولتا ہے اور مجھے کہتا ہے
"آجو بہ"
میں اس کی مُسکراتی، گول سی آنکھوں میں
جب بھی جھانکتا ہُوں
مجھے محسوس ہوتا ہے
میں سچ مُچ اس کا دادا ہُوں
گھڑی بھر کھیل کر
ہنس بول کر
کچھ شوخیاں کرکے، چلا جاتا ہے
یہ معمول ہے اس کا
کسی دن جب نہیں آتا
تو یوں لگتا ہے گویا
کوئی شے چھن گئی مجھ سے

یہ سوچا تھا
بہو آئے گی گھر میں
اور کوئی پوتا
پکڑ کر انگلیاں میری چلے گا
ضد کرے گا، میز پر بیٹھے گا آکر
قلم ہاتھوں سے میرے چھین لے گا
لٹک جائے گا گردن میں
کبھی باہنوں میں جھولے گا
میری فائل پہ، میری ڈائری پر
لکیریں کھینچ دے گا آڑی ترچھی
کہے گا مجھ سے
دادا!

دیکھیے
کیا میں نے لکھا ہے
اسے پڑھیے
چھلک پڑتی ہیں آنکھیں دیکھ کر دیوار پر
جواں بیٹے کا چہرہ
دُعا دل سے نکلتی ہے
پڑوسی کا مرے ننھا سا پوتا
رہے ہر دم سلامت
مرے گھر روز آئے اور جائے
لہو روشن، بدن زندہ ہے اس سے

غزل

ایم، اے۔ مشتاق
سکری۔ مدھوبنی
(بہار)

کیا عجیب منظر ہے
راہزن ہی رہبر ہے
پیاس بھی بجھائے کون
تشنہ لب سمندر ہے
کچھ خفا ہے وہ مجھ سے
یہ مرا مقدر ہے
زندگی یہ فانی ہے
موت کا کسے ڈر ہے
بے حسی کے عالم میں
آدمی بھی پتھر ہے
بت گری ہے فن مشتاق
تو بھی ایک آذر ہے

پرکاش فکری

ٹولی ۔ وروندہ
رانچی (بہار)

قیدی ہم دیواروں کے ہیں پھر بھی دیکھیں خواب
پیروں نیچے سبز زمیں اور پیڑ ہرے شاداب

پھولوں کی اب چاہ نہ کوئی رنگوں کی ہے کھوج
ہم نے اپنا باغ اُجاڑا اس کے ہیں اسباب

سود و زیاں کی ساری باتیں لگتی ہیں بے سود
پلنے اور گنوانے کا پھر رکھے کون حساب

ہم ہی کب تھے سچا سونا رکھیں ان پر دوش
نہیں نہیں ہم یہ نہ کہیں گے کھوٹے تھے احباب

پل پل کی بے چینی بھی اب سوئے گہری نیند
ساری جنگیں ہار چکے ہیں تھکے تھکے اعصاب

کہنے کو یہ شہر ہے اپنا، اپنا لیکن کون
کس کو ڈھونڈیں، روئیں کس کو فکری بھی نایاب

ممنون شاہجہاں پوری

ملاخیل ۔ چھوہارے والی مسجد
شاہجہاں پور

میں جب تک اس سے وابستہ نہیں تھا
کسی نے مجھ کو پہچانا نہیں تھا

چمکتی ریت سے دھوکا نہ کھاؤ
میں دیکھ آیا ہوں وہ دریا نہیں تھا

نہ جانے کیا کسی نے کہہ دیا ہے
وہ ایسے خط مجھے لکھتا نہیں تھا

پلٹ آیا ہے پھر شاخ شجر پر
اسے موسم کا اندازہ نہیں تھا۔

ملے گی اس فقیری میں بھی شہرت
کبھی ممنونؔ یہ سوچا نہیں تھا...

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

شایستہ خان
خدابخش لائبریری، پٹنہ

رہی زندگی موت کی گھات میں

اقبال کا ایک نادر خط

اقبال نے سر علی امام کے انتقال کے دو سال بعد ان کی بیگم لیڈی انیس امام کی فرمائش پر کچھ شعر اور قطعے انھیں ایک خط میں بھیجے۔ خط[۱] کا ترجمہ اور وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں:

۳۰ر دسمبر ۱۹۳۴ء

مائی ڈیر لیڈی امام

یہ چند شعر ارسال ہیں۔ آپ ان میں سے کوئی ایک ٹکڑا منتخب فرما سکتی ہیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال، لاہور

(۱)

برون زین گنبد دربستہ پیدا کردہ‌ام راہے ۔۔۔ کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحرگاہے

زجوے کہکشاں بگذر، زنیل آسماں بگذر ۔۔۔ زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

(۲)

دلِ من رازدانِ جسم و جان است ۔۔۔ نپنداری اجل بر من گران است

چہ غم گر یک جہاں گم شد زچشمم ۔۔۔ ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

(۳)

نگردد زندگانی خستہ از کارِ جہاں گیری ۔۔۔ جہانے در گرہ بستم جہانِ دیگرے پیش است

(۴)

خوشا کسے کہ حرم را درونِ سینہ شناخت ۔۔۔ دمے پدید و گذشت از مقام گفت و شنود

(۵)

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد ۔۔۔ بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

۱؎ مندرجہ بالا خط سر علی امام کی بہو بیگم عزیز امام نے ہمیں عنایت فرمایا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ استفادہ [illegible] جو اصل خط [illegible] ہے اس کی رو سے پہلے شعر کے تیسرے مصرع کا ابتدائی لفظ "زجوے" محفوظ نہیں رہا ہے۔

(۶)

شوقِ اگر زندۂ جاوید نباشد عجب است　　　کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

(۷)

من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم　　　نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

ہم ان اشعار کی اس اہمیت اور معنویت کی طرف خصوصی توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ یہ کہیے تو جائیں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان لیکن بیک وقت اور بیک جنبشِ فکر، سہ ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو موت اور زندگی کے مسائل پر ہمہ وقت سوچنے والے متفکر شاعر کے قلم سے یک لخت و یکجا ٹپک پڑیں۔ ایسے اشعار جن میں موت پر زندگی کی فتح صاف صاف بڑی واضح اور روشن نظر آتی ہے۔ کیا یہ محض علی امام کے کتبے کے اشعار ہیں؟ کیا اس میں خود ان کے اپنے نفسیاتی فکر کا پورا پیچ و تاب، موت کے پُراسرار پردے کے پیچھے جھانکنے اور شاید اس پردے کو بیتابانہ الٹ دینے کی آخری کوشش نظر نہیں آتی ہے؟ وہ زندگی بھر اس پردے کو الٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش کی تفصیل پھر کبھی۔ لیکن ذرا دیکھیے تو:

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند　　　انسان بمیرد از بے یقینی

کے خالق نے یہاں ان کتباتی اشعار میں سے ہر شعر میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہاں سے وہاں تک کے سفر کو کس خوبصورتی سے ایک نہ ٹوٹنے والے تسلسل میں باندھ دیا ہے اور اس تسلسل کے دوسرے سرے پر آنے والے دور کو کیسی دلآویزی بخش دی ہے۔

اس خط میں منقول اشعار کی مذکورہ اہمیت اور زیادہ گہری معنویت میں ڈھل جاتی ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہے جب تصورِ موت پر فتح پا لینے والے جیالے شاعر کے مرض الموت کا آغاز ہو چکا ہے اور ابھی ساڑھے چار سال کی مدت بھی ختم نہ ہوگی کہ نئی منزلوں کا متلاشی موت کی وادی کو پھلانگ کے نئے سفر پر روانہ ہو چکا ہوگا۔ ایسے میں کیا یہ سب اشعار صرف علی امام کے لیے محدود رہ جاتے ہیں؟ یا سب کے سب خود ان اشعار کے خالق کے لیے ہیں جو موت پر فتح مندی کے بعد حقیقتِ برتر کی تلاش میں سرگرداں ہے؟ اور کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ حقیقت کا بچپن متلاشی، موت پر فتح تو اسی دن پا چکا تھا جب اس کی فکرِ شعری نے زندگی اور موت کے سانچے اس طرح ڈھالنے شروع کر دیے تھے:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند　　　ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

اور جب اس نے کہا تھا:

اُتر کر جہانِ مکافات میں　　　رہی زندگی موت کی گھات میں

(۳)

سر علی امام (۱۸۶۹ء-۱۹۳۲ء) کے نام سے اہلِ علم واقف ہوں گے، اقبال نے اپنی پہلی شعری تصنیف "اسرارِ خودی" کے پہلے ایڈیشن کو انھیں کے نام معنون کیا تھا۔ علی امام، امداد امام اثر کے صاحبزادے تھے۔
امداد امام اثر (۱۸۴۹ء-۱۹۳۴ء) اردو کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ [illegible]

شاعری با سانی انھیں اردو ادب میں اپنے عہد کی سب سے قدآور شخصیتوں میں لے آتے ہیں۔ نقاد اور سخن فہم کی حیثیت سے ان کا نام آزاد، حالی اور شبلی کے فوراً بعد آتا ہے اور شاعری خصوصاً غزل اس درجے کی ہے کہ حسرت موہانی جیسے سخن شناس بھی ان کے قائل تھے۔

امداد امام اثر کے صاحبزادے سر علی امام ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء میں نیورا (ضلع پٹنہ) میں پیدا ہوئے

ابتدائی تعلیم کے بعد بیرسٹری کے لیے لندن کا سفر کیا (۱۸۸۷ء)

پھر لندن سے بیرسٹر بن کر آئے (جون ۱۸۹۰) تو پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں اور پھر جب ہائیکورٹ پٹنہ میں کھل گیا تو ۱۹۱۴ء سے پٹنہ میں پریکٹس کی۔

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ڈھاکہ میں بنا پڑی تو اس میں حکیم اجمل خاں، علی برادران، وقارالملک، محسن الملک وغیرہ کے علاوہ سر علی امام بھی ان اہم بنیادی لوگوں میں شامل تھے اور اگلے سال جب کراچی میں اس کا اجلاس ہوا تو اجلاس کراچی کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے تھے[۱]:

مسلمانانِ ہند کو سیاسی دلچسپیوں سے کسی بھی حال میں بے توجہی نہیں برتنی چاہیے۔ حکومت ہند اُن سے مصالحت کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ اس موقعے کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر ایک بار مسلمانوں نے اپنی منزل متعین کر لی اور دوسری قوموں نے انھیں متحد دیکھ لیا تو یقیناً ان کی عزت کریں گے اور ان کے ساتھ تعاون بھی[۲]

۱۹۰۸ء کے آغاز میں وہ مسلم لیگ کی مرکزی مجلس کے ممبر منتخب ہوئے اور صوبہ بہار کی شاخ کے صدر اسی سال لیگ کے امرت سر سیشن کی صدارت کی[۳]۔ ان کے اس صدارتی خطبے کے الفاظ آج بھی وہی جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں جو اس وقت کے سننے والوں میں ہوا ہوگا۔

> "ہم ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمان دوسری ملتوں کے افراد سے کم اپنی جنم بھومی سے محبت نہیں کرتے۔ صدیوں کی مقدس وابستگی نے ہمیں اس کی محبت میں باندھ رکھا ہے اور ہم اپنی مادرِ وطن کا آدر کرنے اور اس سے پریم کرنے میں کسی سے ذرہ برابر ہرگز کم تر نہیں ہیں[۴]"

۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کا جو وفد وزیر ہند مورلے سے ملنے لندن گیا تو اس میں سر علی امام بھی شامل تھے۔ شملہ وفد کے بعد یہ پہلا تاریخی وفد تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انھیں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا[۵] اور ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ پیکٹ ہوا، جس میں لیگ اور کانگریس دونوں وطن کے لیے ایک مشترک پلیٹ فارم بنانے پر متفق ہو گئے، اس میں بھی سر علی امام ہر جگہ شریک غالب تھے۔

قومی سطح پر ہر بڑے فیصلے میں شمولیت کے علاوہ انھوں نے اپنے صوبے بہار کو ایک الگ شناخت مہیا کرنے کے لیے انھوں نے اسے بنگال سے الگ ایک باقاعدہ ریاست کا درجہ دینے کے واسطے جو شاندار جدوجہد کی، وہ تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے، جس کا ایک روشن باب وہ تھا جب انھوں نے ۱۹۰۸ء میں بہار صوبائی

[۱،۲] محمد انیس الرحمٰن انیس: سر علی امام، ص ۸ [۳،۴] ڈکشنری آف نیشنل بیوگرافی ص ۲۰۹، جلد اول [۵] ڈاکٹر سچیدا نند سنہا (SOME SMINENT BIHAR CONTEMPOTARIES) ص ۱۰۶ تا ۱۰۷ [۶] بہار کا نیا رسالہ ندیم اکتوبر ۱۹۳۲ء

کانفرنس کی صدارت کی تھی۔

اپنی قانونی شہرت اور بیرسٹری کی پریکٹس میں نمایاں کامیابی کے سبب انھیں ۱۹۱۰ء میں وائسرائے کی کونسل کا ممبر منتخب کیا گیا گویا وزیر قانون۔ کونسل کی ممبری کے دور میں جب وائسرائے چھٹی پر جاتا تو یہ قائم مقام وائسرائے کے فرائض انجام دیتے تھے۔

وائسرائے کی کونسل کی ممبری کے زمانے میں انھوں نے ہی وائسرائے کو اس طرف راغب کیا کہ وہ ان امور پر ایک تفصیلی منصوبہ بند نوٹ لندن میں وزیر ہند کو بھیجیں۔ اس نوٹ میں پہلی بار ہندستان کو صوبائی خود مختاری دینے کی واضح سفارش کی گئی تھی جو بالآخر ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی صورت میں سامنے آئی۔ اسی نوٹ میں بہار اور اڑیسہ کو بنگال سے الگ کیے جانے کی صریح سفارش شامل تھی۔ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں امور کے حصول میں تنہا ایک فرد علی امام کا ہاتھ رہا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں ان کا رول ممتاز ترین تھا۔ بہار کے معاملے میں تو اسی لیے انھیں جدید بہار کا جنم داتا۔ FATHER OF MODERN BIHAR کہا جاتا ہے۔ اس طرح بہار اور اڑیسہ کا صوبہ قائم کرنے میں سر علی امام نے ایک خاموش مدبر، بیدار مغز سیاست داں اور ایک عظیم مفکر کا کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر ہند نے بانکی پور پٹنہ کے ایک جلسے میں اس کا اعتراف کیا تھا کہ سر علی امام جدید بہار کے جنم داتا ہیں۔ SIR ALI IMAM IS THE FATHER OF MORDERN BIHAR یہ وہی دور ہے جب ان کے مشورے پر ہندستان کا دارالخلافہ بھی کلکتے سے دہلی منتقل ہو گیا تھا۔

۱۹۱۷ء میں سر علی امام پٹنہ ہائیکورٹ کے جج ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں گورنر بہار کی EXECUTIVE COUNCIL (مجلس عاملہ) کے ممبر۔ اگست ۱۹۱۹ء میں ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم ہو گئے جہاں تین سال تک کام کیا۔ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کے دور میں لیگ آف نیشنز بنی جس میں یہ ہندستان کا پہلا نمایندہ بنا کر بھیجے گئے۔

۱۹۲۲ء میں برار کو حیدرآباد کو واپس دلانے کے مقدمے کی پیروی کے فرائض سر علی امام کے سپرد ہوئے جس کے لیے یہ لندن گئے۔ برار تو نہ ملا لیکن کچھ مراعات ضرور حاصل ہو گئیں اور حیدرآباد کے ولی عہد کو پرنس آف برار (PRINE OF BARER) تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں دوبارہ پٹنہ ہائیکورٹ کے جج ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں سر علی امام نے علی گڑھ جوبلی کے موقع پر جشن کی صدارت کی۔ ۱۹۲۷ء میں نہرو رپورٹ نکلی۔ مسلمانوں میں راجہ محمود آباد، ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر انصاری کے علاوہ اس پر سر علی امام کے دستخط بھی تھے (سر علی امام اور راجہ محمود آباد آپس میں سمدھی تھے یعنی سر علی امام کا لڑکا اور راجا محمود آباد کی لڑکی) نہرو رپورٹ کی تائید میں لکھنؤ میں انھوں نے زبردست تقریر کی تھی۔ اس موقع پر جب سائمن کمیشن آیا تو اس کی مخالفت میں لیگ کے دو گروپ ہو گئے تھے۔ شفیع لیگ جس میں اقبال تھے، اس نے سائمن کمیشن کا بائکاٹ کیا تھا۔ سر علی امام اسی گروپ میں شامل تھے۔

سر علی امام عام طور سے انگریزی بولتے تھے، لیکن اردو پر بھی دسترس تھی، اور ضرورت پڑنے پر اردو میں بھی تقریر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں شرکت ان کی آخری سیاسی سرگرمی تھی۔ سر علی امام کے ساتھ بہار سے شفیع داؤدی بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ کانفرنس میں انھوں نے ایک تقریر بھی کی، پھر بیمار ہو گئے۔

---

[۱] محمد انیس الرحمن انیس سر علی امام ص ۸۔

---

[۲] حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کا قبول کرنا ان کا سب سے زیادہ غیر اطمینان بخش دور تھا۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا SOME EMENENT BIHAR CONTEMPORATIES کے خیال میں ان کی (سر علی امام کی) زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔ شاید اسی لیے وہ وہاں پانچ سال کی مدت بھی پوری نہ کر سکے۔

اس سے قبل کی کانفرنس نے ایک اعزاز جیسا ملت محمد علی کو لندن ہی میں جا ملنے لی تھی، لیکن سر علی امام ہندستان واپس آگئے۔ البتہ اس بیماری سے بہت دن تک جانبر نہ ہو سکے۔

زندگی کا آخری حصہ زیادہ تر رانچی میں کوٹھی کی تعمیر کی مصروفیت میں گزرا۔ رانچی ہی میں اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں اپنی نیم تعمیر شدہ کوٹھی ("انیس کاسل" بنوائی جس کا نام انھوں نے اپنی تیسری بیوی کے نام پر رکھا تھا) کے احاطے میں دفن ہو گئے۔ رانچی سے کئی میل کے فاصلے پر یہ ایک پُر سکون کوٹھی جس کے گرد اگرد ایک بہت بڑا باغ ہے، یہ لق و دق کوٹھی اب مدت سے ویران پڑی ہے جہاں نہ چراغ جلتے ہیں نہ پھول چڑھتے ہیں، نہ کسی شمع پر کوئی پروانہ جلنے جاتا ہے نہ کسی گل کی جستجو میں کسی بلبل کی صدائیں گونجتی ہیں۔ بس ایک ہو کا عالم ہے! رہے نام اللہ کا!!

(۴)

سر علی امام کی وفات (۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء) کے کچھ عرصے بعد جب قبر پر کتبہ لگائے جانے کی بات آئی تو لیڈی انیس امام نے اقبال سے خواہش ظاہر کی۔ جواباً اقبال نے ایک خط کے ساتھ ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۲ء کو نو شعر بھیجے۔ سب شعر فارسی کے ہیں اور خط کی تمہیدی سطریں انگریزی میں۔

اقبال کا وہ اہم خط ملاحظے کے لیے عکساً بھی درج ذیل ہے:-

Sir Muhd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. Bar-at-Law

Lahore

Dated ________ 193

30th Dec. 1932

My dear Lady Imam,

Here are the five verses. You can select one of the [illegible]

Yours sincerely
Mohammad Iqbal

(۱)

[illegible]

(۲)

[illegible]

متن درج اشعار کو یہاں اقبال کے مجموعوں میں جہاں جہاں یہ قبلاً چھپ چکے ہیں ان کے حوالے کے ساتھ درج کیا جارہا ہے۔ ایک قطعہ "پیام مشرق" سے اور ایک کے سوا باقی اشعار زبور عجم سے لیے گئے ہیں۔

(۱)

برون زین گنبد دربستہ پیدا کردہ ام راہے — کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحر گاہے
زجوے کہکشاں بگذر ز نیل آسماں بگذر — ز منزل دل بمیرد گرچہ باشد منزل ماہے

(زبور عجم، غزل نمبر ۴۳ ص ۴۹۲/۱۰۰)

(۲)

دل من رازدان جسم و جان است — نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

(پیام مشرق، نمبر ۱۱۱ ص ۲۳۲/۶۲)

(۳)

نگر دو زندگانی خستہ از کار جہاں گیری — جہانے در گرہ بستم جہان دیگرے پیش است

(زبور عجم، غزل نمبر ۴۱ ص ۴۳۶/۴۴)

(۴)

خوشا کسے کہ حرم را درون سینہ شناخت — دمے تپید و گذشت از مقام گفت و شنود

(زبور عجم، غزل نمبر ۵۰ ص ۵۱۰/۱۸)

(۵)

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد — بر تلاش خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

(زبور عجم غزل نمبر ۱ ص ۳۹۷/۵)

(۶)

شوق اگر زندہ جاوید نباشد عجب است — کہ حدیث تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

(زبور عجم، غزل نمبر ۴۴ ص ۴۳۸/۴۶)

(۷)

من اے دریائے بے پایاں بموج تو در افتادم — نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

(زبور عجم، غزل نمبر ۱۵ ص ۴۴۶/۵۴)

(۵)

یہاں ان اشعار کے معنی پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا:

(۱) بند دروازوں کے اس گنبد (آسمان) سے گھری ہوئی ہماری زمین سے باہر جانے کے لیے میں نے راستہ بنالیا ہے اور وہ بھی ایسے کہ ایک آہ سحر گاہی کا سہارا لے لیا ہے جو گمان و تخیل سے کہیں تیز تر اور دور تر پرواز کرتی ہے جوئے کہکشاں سے گذر جا! گذر جا نیلے آسمان سے!! منزل مل جائے، تو دل

مرجاتا ہے، اب وہ منزل چاہے ماہ جبلی کی منزل کیوں نہ ہو!

(۲) میرا دل جسم و جاں کے راز جانتا ہے یہ مت سمجھنا کہ موت میرے اوپر بھاری ہے۔ مجھے اس کا کیا غم کہ ایک دنیا میری آنکھ سے اوجھل ہو گئی، ابھی تو سو دنیائیں میرے اپنے ضمیر میں (پنہاں) موجود ہیں۔

(۳) دنیا کے کاروبار پر گرفت سے زندگی تھکتی نہیں ہے۔ ایک دنیا کا قصہ تو میں نبٹا چکا، اب ایک اور دنیا کا کاروبار سنبھالنے لگا۔

(۴) کیسا خوش نصیب ہے وہ، جس نے حرم کو اپنے سینے کے اندر پہچان لیا، اور، پھر، بس ایک لمحے کے لیے اس کی تپش میں جلا، اور کہنے سننے کے مقام سے گزر گیا۔

(۵) عشق شور انگیز کو تو ہر راہ تیرے کوچے کی طرف ہی لے گئی۔ اب وہ اپنی تلاش پر ناز بھی کرے تو کیا، کہ جو راہ بھی جاتی ہے وہ تیری طرف ہی لے جاتی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا درد مندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

(۶) شوق اگر زندۂ جاوید نہ ہو تو مجھے بڑا عجب سا لگے گا کہ موت آئے اور پھر یہ سمجھا جائے کہ بس اس پر آدمی کا سفر ختم ہوا! کیوں کہ تیری ہلت کہنے کے لیے ان دو ایک سانسوں سے تو کام چلنے سے رہا۔

(۷) اے میرے بے تھاہ سمندر! میں تو بس تیری لہروں میں رُل مل گیا ہوں، مجھے نہ موتی کی آرزو ہے اور نہ ساحل کی۔

▲

کتبے پر لکھے جانے کے لیے ان اشعار سے زیادہ موزوں کوئی شعر کسی بھی شاعر کے یہاں شاید ہی ملے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار گویا اقبالؔ نے صرف اور صرف سر علی امام کے کتبے کے لیے ہی لکھے ہوں علی امام جن کی وہ دل سے بے انتہا قدر کرتے تھے اور جن کے لیے یہ اشعار جیسے اقبالؔ کے دل سے اٹھے ہوں اور وہ صرف علی امام کے لیے ہی کہے گئے ہوں [حالانکہ یہ اشعار سر سید علی امام کی موت سے بہت پہلے وجود میں آ چکے تھے] اقبالؔ کے یہاں موت اور زندگی کا جو فلسفہ ہے اس کا نچوڑ (عطر) ان اشعار میں آ گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے زندگی اور موت کے بارے میں، یکجا ان کا فلسفہ، اس خوبصورتی سے کہیں اور نہیں ملے گا۔

حکیم محمد حسین خاں شفا

کیٹلاگر رضا لائبریری
(رام پور)

درج عنبریں

خلد آشیاں کی کتاب خوشبو

نواب کلب علی خاں
خلد آشیاں

ولادت ۱۹/ اپریل ۱۸۳۹ء — تخت نشینی ۲۱/ اپریل ۱۸۶۵ء — وفات ۲۳/ مارچ ۱۸۸۷ء

ادیب، شاعر مصنف کتب کثیرہ

رام پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں کچھ کتابیں صنعت و حرفت سے متعلق ہیں۔ جن میں سے زیر تعارف کتاب کا تعلق عطریات اور سنگھار سے ہے۔ اس کے مندرجات اس طرح ہیں۔ نمبر اسٹاک رجسٹر ۳۸۱۲ نمبر کتاب ۱۲۸ نام کتاب درج عنبریں، نام مصنف کلب علی خاں والیِ رام پور صفحات ۲۲۲ سطریں ۱۵ سائز ۳۵ × ۳۱ سینٹی میٹر۔ کتابت ۱۸۷۵ء سے کچھ قبل کی۔ یہ مسودہ نواب صاحب نے طباعت کے واسطے تیار کرایا تھا جو کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ اور اب عہد مصنف کا یکتا نادر مخطوطہ ہے جس میں دیباچہ بھی ہے اور مبیضہ سے متعلق و تصحیح شدہ ہے۔ نیز مختلف اہل علم کی نظر سے بطور مشورہ گزرا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کو اگرچہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہ اپنے موضوع مواد اور مندرجات کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ یہ ایک قدیم اور منفعت بخش حرفہ سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں نواب صاحب نے مختلف اقسام کی خوشبوؤں سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہے خوشبو ایک مرغوب الطبع اور انسانی جسم

رکھے ہیں۔ جو مختلف طبائع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان سے مختلف امراض کا علاج اور مختلف کیفیات کا ظہور ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف ایک زمانے سے ان کے خواص سے واقف تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے تجربات و نظریات سے متعلق فنی اعتبار سے کوئی جامع و وسیع یادگار نہیں چھوڑی۔ ماحول کو معطر و صحت مند رکھنے اور بطور سنگھار استعمال کرنے کا سب سے اچھا اور بڑا ذریعہ خوشبو ہے۔ اس کا استعمال قدیم عہد سے مختلف طریقوں سے ہوتا رہا ہے جس کو مصنف نے مندرجہ ذیل ابواب پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عطر کی شکل میں یعنی کشید کر کے۔
۲۔ تیل میں حل کر کے یا تیل نکال کر۔
۳۔ ابٹن یعنی پاوڈر یا لگدی کی شکل میں۔
۴۔ اگر بتی بنا کر
۵۔ لخلخے کی شکل میں یعنی جلا کر
۶۔ کھانے و پینے کی تمباکو کی شکل میں یعنی حقے وغیرہ میں

مصنف نے ان ہی عنوانات کے تحت مجرب نسخے اور وہ صدری فارمولے پوری تفصیلات کے ساتھ مع ذریعہ حصول اور نسخہ بتانے والے شخص کے نام کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ اس صنعت میں استعمال ہونے والے حالات کے نقشے کشید کرنے کے بھبکوں کی تصاویر بھی بنادی ہیں۔ یہ کتاب مصنف کی طویل جد و جہد کا ثمرہ ہے۔ جو پہلے ایک زمانے تک بیاضوں میں جمع ہوتا رہا اور پھر کتابی شکل میں آیا۔ حسن اتفاق سے رضا لائبریری کے فارسی و اردو مخطوطات میں نواب صاحب کے اپنے خط میں لکھی ہوئی کچھ بیاضیں بھی محفوظ ہیں۔ جن میں اس کتاب کے مندرج نسخوں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ نواب صاحب کی شروع سے عادت تھی کہ جب بھی وہ کسی اہل علم یا فن کار سے ملتے اور وہ کوئی بھی مجرب نسخہ یا کام کی بات بتاتا تو وہ اسے نوٹ کر لیتے یا کسی دوسرے سے کرا دیتے۔

یہ کتاب بھی ان مرحلوں سے گزر کر آخری شکل میں آئی۔ متن تیار ہونے کے بعد بھی نواب صاحب کو جو مجرب نسخے معلوم ہوتے۔ ان کا اندراج اس کتاب کے حواشی پر کر دیا گیا ہے۔ اس مخطوطے کے دیباچہ تا ترقیمے میں تاریخ تولیف یا تاریخ اختتام مذکور نہیں لیکن اس کے حواشی پر مذکورہ عطریات کے فارمولوں میں تاریخ و سنہ لکھا ہوا ہے جس سے عہد کا تعین ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ورق ۴۸ الف کے حاشیہ پر نرائن داس عطر فروش ساکن دہلی کی زبانی عطر ہزار گلے کا نسخہ مذکور ہے جو ۱۷ جنوری ۱۸۷۵ء کو لکھا گیا ہے۔ نیز اسی شخص کی زبانی حاشیہ پر ہی ۲۵ر جنوری کو ایک نسخہ نقل کیا گیا ہے۔ کچھ نسخے حواشی پر ہی ۱۸۷۸ء کو تحریر کیے گئے ہیں۔ عطر حنا وغیرہ کے نسخے مظفر حسین خاں کی زبانی تحریر کیے گئے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸۷۵ء میں ہوا ہے۔ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخے ان کی حیات ہی میں لکھے گئے ہیں۔ ان حواشی سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ متن ۱۸۷۵ء سے قبل تیار ہو چکا تھا اور مذکورہ عطر فروش مسلسل رام پور آیا جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ

عطر فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کو عطر کے فارمولے اس صنعت کے رموز اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ نواب کلب علی خاں صاحب کا عطر خانہ جو توشہ خانے سے متصل اور جواہر خانے ہی کا ایک حصّہ تھا۔ بڑے قیمتی ساز و سامان سے مرصّع تھا۔ اس میں ہر قسم کا عطر اور کشید کرنے کے آلات وغیرہ تھے۔ رام پور کے ساتھ دہلی و لکھنؤ کے اطبّاء و عطّار اس کے نگراں تھے۔ نواب سید مرتضیٰ علی خاں صاحب متوفی ۷ر فروری ۱۹۸۲ء نے مجھے اپنا عطر خانہ دکھایا تھا جس میں نواب کلب علی خاں صاحب متوفی ۱۸۸۵ء کے عہد کا عطر بڑے کنٹروں و قرابوں میں کافی بڑی مقدار میں موجود تھا۔ ان پر تاریخ تیاری تاریخ حصول عطر کا نام وزن وغیرہ کی تفصیل کے لیبل لگے ہوئے تھے۔ یہیں نواب صاحب کے قیمتی ادویات اور ان سے متعلق اطبّا کے کچھ خطوط بھی تھے۔ نواب کلب علی خاں صاحب جن کی پیدائش ۱۹ر اپریل ۱۸۳۵ء کو ہوئی اعلا تعلیم یافتہ، عربی فارسی اور انگریزی زبان کے ماہر تھے۔ سیاسی، سماجی اور علمی ذوق رکھنے والے ان جیسے رئیس بہت ہی کم پائے گئے ہیں۔ مورّخین کا خیال ہے کہ نواب کلب علی خاں کا دربار محمود غزنوی اور جلال الدین اکبر کی یادگار تھا۔ نواب صاحب نے خود جو تصانیف اور مسوّدات اپنی یادگار چھوڑے ہیں وہ کافی اہم ہیں اور اگر نواب صاحب کی معاونت سے جو علمی و فلاحی کام ہوئے ہیں۔ ان کا ذکر کیا جائے تو ایک طویل مقالہ تیار ہو جائے گا۔ نواب صاحب نے اپنے ابتدائے عہدِ حکومت سے ہی اردو زبان پر توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ایک جامع اردو لغت کی تدوین شروع کرائی۔ کچھ فرانسیسی نژاد اردو و فارسی جاننے والے اہلِ علم سے انگریزی فرانسیسی جرمنی اور کچھ دیگر علما سے عربی و فارسی کتابوں کے اردو تراجم کرائے جو ہزاروں صفحات پر غیر مطبوعہ مسوّدات کی شکل میں رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ چونکہ نواب صاحب سے کچھ حضرات کو نظریاتی و مذہبی اختلاف تھا اس بنا پر نواب صاحب کے علمی و فلاحی کارنامے اب تک منظرِ عام پر نہ آسکے۔ بلکہ کچھ لوگوں نے تو نواب صاحب کی کردار کشی کی ہے۔ زیرِ بحث کتاب میں نواب صاحب نے دیباچہ اپنے عہد کے مشہور ادیب و شاعر و ڈاکٹر میرزا محمد حسین لکھنوی سے لکھوایا ہے۔ میرزا محمد حسین اخبار ماتم کے مترجم و عذب البیان کے مصنّف ہیں۔ انھوں نے ۱۱ صفحات پر اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے جس میں صنائع و بدائع کی بھرمار مرصّع نگاری اور لکھنوی طرزِ تحریر کا اعلا نمونہ پیش کیا ہے۔ صنعتی اعتبار سے ان کی یہ نثر لاجواب ہے۔ لیکن کم از کم اس فنّی کتاب کے لیے یہ طرزِ تحریر غیر مناسب ہے۔ اس مخطوطے کی تصحیح کتابت و مقابلہ مسودہ کا کام منشی امیر احمد مینائی اور مولوی مہدی علی خاں تحویل دار کتب خانہ نے انجام دیا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ ان دونوں حضرات کی اصلاحیں موجود ہیں۔ اس فن پر ایک کتاب مخزن الشمائم نامی نیاز محمد خاں صاحب نے ۱۸۸۴ء میں نواب کلب علی خاں صاحب کو پیش کی ہے جو ۴۴ اوراق پر مشتمل ہے اور نواب کلب علی خاں صاحب کے نام معنون ہے۔ اس کا مخطوطہ بھی رضا لائبریری میں موجود ہے۔ نواب صاحب کی بیاضوں مذکورہ کتاب اور کچھ قدیم و جدید کتابوں سے اس کتاب کی ایڈیٹنگ میں استفادہ کیا جا سکتا ہے ●●●

سوال: [illegible] شاعر سے بہت متاثر ہیں؟

جواب: مرزا اسداللہ خاں غالب۔

سوال: آپ انگریزی کے کن شعرا کو پسند کرتے ہیں؟

جواب: بائرن، شیلے اور ورڈس ورتھ۔

سوال: فن سخن میں آپ کا استاد کون تھا؟ کیا اس فن میں آپ کے شاگرد بھی ہیں۔

جواب: نہ میرا کوئی استاد تھا نہ کوئی شاگرد ہے۔

سوال: آپ کو گیان پیٹھ ایوارڈ کب ملا؟

جواب: مجھے ۱۹۸۷ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ ۱۱ مارچ کو لوک سبھا کے اسپیکر شری بلرام جاکھڑ کے دست مبارک سے پیش کیا گیا۔

سوال: جب آپ کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا تو آپ کو کیسا لگا؟

جواب: مجھے اس اعزاز کی بے انتہا خوشی ہوئی لیکن اس سے بھی زیادہ اس بات کی خوشی ہوئی کہ مراٹھی ادب کو یہ اعزاز ملا۔

سوال: جب آپ نے شاعری شروع کی اس وقت آپ کو اس کا خیال آیا تھا کہ کیا آپ ایک روز ہندوستان کے مشہور شاعر، ممتاز ڈراما نویس اور مقبول ناول نگار بنیں گے۔

جواب: قطعی نہیں۔

سوال: غالب کی اوائل عمری میں کسی نے پیشین گوئی کی تھی کہ غالب ایک دن بہت بڑا شاعر بنے گا کیا آپ کے متعلق بھی اس قسم کی پیشین گوئی ہوئی تھی؟

جواب: جی ہاں! ۱۹۷۴ء میں جب آنجہانی وشنو سکھارام کھانڈیکر کو مہاراشٹر میں پہلی مرتبہ گیان پیٹھ ایوارڈ ملا تو انھوں نے اس وقت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میرے بعد یہ ایوارڈ شری وشنو وامن شیرواڈکر کو ملے گا اور مجھے خوشی ہے کہ ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

سوال: آپ نے اخبارات و رسائل میں کب سے لکھنا شروع کیا؟ آپ کتنی کتابوں کے مصنف ہیں؟

جواب: اخبارات اور رسائل میں میں نے ۱۹۳۰ء سے لکھنا شروع کیا۔ میں ۵۰ کتابوں کا مصنف ہوں یہ تصانیف ۱۴ شعری مجموعوں، ۱۸ طبع زاد ڈراموں، ۹ ترجمہ شدہ ڈراموں، ۳ افسانوی مجموعوں اور ۸ دیگر کہانیوں اور تبصروں پر مشتمل ہیں۔

سوال: شعر و سخن کی تعریف کے متعلق اور ادب (لٹریچر) پر کچھ روشنی ڈالیے!

جواب: تخلیق نظم یا اس معنی میں کوئی اور لٹریچر ایک دریا کے منبع کے مترادف ہے جیسے دریا جہاں سے نکلتا ہے وہاں نہیں ٹھہرتا۔ اسی طرح سخنوری اور ادب کا ہے یعنی سخنوری اور ادب جہاں سے نکلتے ہیں وہاں کیا نہیں ٹھہرتے بلکہ وہ ایک فرد واحد سے نکل کر افراد کی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں وہی شاعر کامیاب ہے جو غم جاناں کو غم جہاں میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سوال: اپنی مادری زبان اور رابطہ کی زبان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں اپنی مادری زبان کے بارے میں جھوٹے تفخر کا قائل نہیں ہوں۔ پھر بھی اس پر فخر ہے وہ لسانی تفخر جو قوم کی وحدانیت پر اثر انداز ہو قابل مذمت ہے۔ آج کل ہم مختلف صوبوں کے اتحاد سے جو مختلف بولیوں مختلف روایتوں اور مختلف خصوصیات کے حامل ہیں اس کے لیے ہمیں ایک رابطہ کی زبان چاہیے اور میرے خیال میں وہ صرف ہندی ہے لیکن ہندی غیر ہندی صوبوں میں صرف رابطہ کی زبان ہی ہونی چاہیے مختلف غیر ہندی صوبوں مثلاً مہاراشٹر میں ہندی اسکول کے کورس میں داخل ہے۔ ہندی بھاشا کے صوبوں میں بھی ہندی کے علاوہ کوئی اور زبان درس و تدریس میں شامل کرنا چاہیے

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد

سے انگریزی زبان کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے۔ کیا آپ انگریزی زبان کی افادیت کے قائل ہیں؟
جواب: ملک کی آزادی کے بعد سے انگریزی زبان کا اثر کم نہیں ہوا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے جانے کے بعد غیر ملکی زبان کا فروغ غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔ میں انگریزی کو ایک متمول زبان ہونے کے سبب سے بہت پسند کرتا ہوں۔ میں خود اس بات کا مؤید ہوں کہ انگریزی سائنس کی طرف سے نکلنے والی ایک کھڑکی ہے لیکن کھڑکی کو مکان نہیں سمجھنا چاہیے۔
سوال: آپ تنہائی پسند ہیں یا سوشل ہیں؟
جواب: میں بہت سوشل ہوں۔ تقاریب میں شرکت کرتا ہوں لیکن انفرادی طور سے افراد سے بہت کم ملتا ہوں۔ خصوصاً اپنا انٹرویو تو کسی کو نہیں دیتا جس کا آپ کو آج ہی تجربہ ہوگیا ہوگا۔
صوفی: جی ہاں!
"وائے اس بت کو التجا کرکے کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے"
سوال: کیا آپ نے ملک کی آزادی میں بھی حصہ لیا تھا؟
جواب: جی ہاں! ایک صحافی کے بطور ایک شاعر کے آزادیٔ وطن پر متفرق نظمیں لکھ کر۔
سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ملک میں آپ کی پوری قدر و منزلت ہوئی؟
جواب: جی ہاں۔ امید سے بہت زیادہ۔
سوال: آپ ہندستان کے کس لیڈر کو پسند کرتے ہیں؟
جواب: پنڈت جواہر لال نہرو کو۔
سوال: اگر آپ کو اپنی قوم پرور شاعری اور ادبی خدمات کی وجہ سے ممبر پارلیامنٹ نامزد کیا گیا تو آپ قبول کریں گے۔؟
جواب: جی نہیں مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔
سوال: آپ کی سب سے اچھی نظم کون سی ہے آپ نے یہ نظم کون سے سال میں لکھی تھی؟
جواب: 'جے جے کار کرو، کرانتی کی جے جے کار کرو' یہ نظم میں نے ۱۹۴۲ء میں لکھی تھی۔ اس نظم سے مجھے پورے مہاراشٹر میں شہرت حاصل ہوئی۔
سوال: آپ کے سب سے پہلے شعری مجموعہ کا کیا نام تھا؟
جواب: میرے پہلے مجموعے کا نام "جیون لہریں" تھا اس کو ۱۹۳۲ء میں کھانڈیکر نے اپنے ذاتی خرچ سے شائع کیا تھا۔
سوال: آپ کو پہلے پہل کس تصنیف کی وجہ سے شہرت ملی اور وہ کون سے سال میں شائع ہوئی؟
جواب: اس تصنیف کا نام تھا "وشاکھا" یہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔
سوال: آپ کا پہلا "ناٹک" کب شائع ہوا؟
جواب: ۱۹۴۶ء میں۔ یہ طبع زاد نہیں تھا بلکہ آسکر وائلڈ کے ناٹک کا ترجمہ تھا۔
سوال: آپ کو کسی ناٹک کی وجہ سے بطور ڈرامسٹ شہرت حاصل ہوئی۔؟
جواب۔ "دوسرا پیشوا" اس ناٹک کا نام تھا۔
سوال: کیا آپ اپنے چند شعری مجموعوں کا نام بتائیں گے؟
جواب: "آندھی کی بیل"، "راشٹریاترا"، "چند بھری" وغیرہ وغیرہ۔
سوال: چند ایسے ڈراموں کے بھی نام بتلائیے جو اسٹیج بھی کیے گئے۔ ان میں سب سے مشہور کون سا ڈراما تھا؟
جواب: "بیانی دلیویانی"، "نٹ سمراٹ"، "بجلی بولی دھرتی سے" اور "دستک"۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "نٹ سمراٹ" ہوا۔
سوال: آسکر وائلڈ کے ڈراما دو کے دیے گئے علاوہ آپ نے اور بھی کچھ مترجم ڈرامے پیش کیے ہیں؟
جواب: جی ہاں ہیملٹ کا ہمنت کے نام سے ترجمہ کیا تھا اور میکبتھ اور اوتھیلو کو بھی مراٹھی میں منتقل کیا تھا۔

سوال: شاعری اور ڈراما نویسی میں آپ سب سے زیادہ کس سے متاثر ہوئے؟

جواب: اوائل عمری ہی سے میں شیکسپیئر سے متاثر ہوتا گیا۔

سوال: کیا آپ نے انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کا نام سنا ہے؟

جواب: جی ہاں انھیں بھی ہندستان میں خوب شہرت حاصل ہوئی تھی۔

سوال: پروفیسر بیڈ کے "آرٹ فار آرٹ سیک" کے قائل تھے لیکن کمانڈیکر "آرٹ فار لائف سیک" کے آپ کا کیا خیال ہے۔؟

جواب: "میں "آرٹ فار لائف" کا حامی ہوں "آرٹ فار زندگی" میں مصیبت زدہ انسانیت کی ڈھارس باندھتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ناخوش لوگوں کو آشا وادی بنایا جا سکتا ہے اور تمدنی زندگی کو سنوارا جا سکتا ہے۔

سوال: آپ کے سب سے مشہور ڈرامے "نٹ سمراٹ" کا مرکزی کردار کس نے ادا کیا تھا۔؟

جواب: اس ڈرامے کا مرکزی کردار ڈاکٹر شری رام لاگو کیا کرتے تھے۔

سوال: کیا آپ نے کسی فلم میں بھی ایکٹنگ کی ہے؟

جواب: میں نوجوانی میں کافی قبول صورت تھا اور تھوڑی بہت گانے میں بھی واقفیت تھی۔ اس زمانہ میں پربھات فلم کمپنی بڑی شہرت پر چھائی ہوئی تھی جو کہ ونائک کمپنی پونا اور بمبئی چھوڑ کر اضلاع کی طرف رخ بھی نہ پھیرتی تھی۔ اسے گاؤں گاؤں بھٹکنا پڑ رہا تھا۔ ایسے حالات میں میں نے سوچا کہ فلمی صنعت سے منسلک ہو جاؤں۔ میں بمبئی گیا اور گرگام کے کانڈرم میں ٹھہرا اور روزانہ اسٹوڈیو کے چکر کاٹنے لگا۔ اس زمانہ میں فلمس کمپنیوں

طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھنے کو تیار نہ تھا اس لیے مجھے خیال ہوا کہ پونا جا کر شانتا رام بابو سے ملوں۔ جب میں نے اپنے آپ کو بطور اداکار پیش کرنے کے لیے ان سے ملاقات کی تو انھوں نے مجھے میوزک ڈائرکٹر کیشو راؤ بھولے کے پاس گانے کی ٹرائل دینے کے لیے بھیجا۔ مجھے طبلہ اور ہارمونیم پر گانے کی مطلق پریکٹس نہ تھی۔ اس لیے میں کیشو راؤ کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس پر شانتا رام جی نے مجھ سے کہا کہ ابھی ہمیں ایکٹر کی ضرورت نہیں ہے جب ضرورت پڑے گی تو آپ کو بلا لیں گے۔

سوال: آپ نے کسی فلم کے لیے کہانی لکھی۔؟

جواب: یہ بھی ایک کہانی ہے۔ جس سینما فلم کے پیچھے میں پونے اور بمبئی میں بھٹکتا رہا وہی سینما فلم ایک دن میرے دروازے پر دستک دینے لگی۔ ہوا یہ کہ جب ۱۹۳۰ء میں خاموش فلم کے بعد "ٹاکیز" کا دور آیا تو دو سو خاموش فلمیں تیار کرنے والے فلمی دنیا کے باوا آدم دادا صاحب پھالکے کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی افراد بے کار ہو گئے۔ ان میں بابا صاحب شندے، ساٹھے، پانڈورنگ نائیک جیسے ہنر مند اشخاص بھی شامل تھے۔ بابا صاحب شندے کئی فلمیں ڈائریکٹ کر چکے تھے۔ اسی طرح پانڈورنگ نائیک اچھے فلم فوٹوگرافر تھے فرق اتنا تھا کہ بولتی فلم کے لیے کسی فن کے تجربہ کار کی ضرورت تھی تو بابا شندے کولھاپور جا کر ایک ایسے تجربہ کار شخص کو ناسک لائے اب صرف انھیں کہانی کی ضرورت تھی۔ شندے "ستی سلوچنا" کی خاموش فلم ڈائریکٹ کر چکے تھے اب انھیں بولتی فلم بنانا تھی۔ سوال

زمانہ میں میں اخبارات و رسائل میں کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ ماما شنند ے ایک دن میرے بعد آئے اور کہنے لگے شیر واڈکر آپ ستی سلوچنا کی کہانی اور ڈائیلاگ مراٹھی میں لکھ دیجیے۔ ہم اسے ہندی میں تبدیل کرلیں گے۔ میں راضی ہوگیا چنانچہ گوداوری سینی ٹون کی فلم "ستی سلوچنا" کی کہانی اور ڈائیلاگ میرے قلم کا نتیجہ تھے۔

سوال: مجھے بتایا گیا کہ کل ۲۸ رمارچ یہاں (ناسک) میں ایک شاندار فنکشن تھا جس میں آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی کیا آپ بتائیں گے کہ وہ کس سلسلہ میں تھا۔

جواب: جی ہاں اگر آج کی بجائے آپ بھی کل آ جاتے تو آپ کو بھی شرکت کا موقع ملتا۔ کل میرے ہاتھوں گڈکری ایوارڈ بھولے دلیش پانڈے کو دیا گیا۔

سوال: کیا آپ کا کوئی مسلم دوست بھی ہے؟

جواب: جی ہاں پٹیل صاحب آئی۔ اے۔ ایس جو مہاراشٹر گورنمنٹ کے کچھ ڈپارٹمنٹ سے منسلک ہیں میرے نہایت گہرے دوست ہیں وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اگر موقع ملے تو آپ بھی ان سے ملیے۔ ان سے مل کر آپ کو بڑی خوشی ہوگی۔

مندرجہ بالا سوالات کے علاوہ اور کچھ سوال میرے دماغ میں کلبلا رہے تھے مگر شاعر کی نازک طبیعت کا خیال رکھتے ہوئے میں نے کسوماگرج صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت چاہی۔ واقعی میں ان کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے ہر سوال کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دیا حالانکہ صاحب موصوف پہلے تو میرے سے انٹرویو دینے کے لیے راضی نہیں ہو رہے تھے۔ کافی بحث و مباحثے کے بعد راضی ہوئے اور پھر راضی ہوئے تو ایسے ہوئے انھوں نے کبھی انکار ہی نہیں کیا تھا۔

(بہ شکریہ قومی راج)

ڈاکٹر ظفر علی راجا

صحرانورد کے خطوط۔ اپنے کرداروں کے آئینے میں

میرزا ادیب کی رومان پرور کتاب "صحرانورد کے خطوط" عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی ہے۔ جب میں نے بچپن کی سرحد عبور کر کے نوجوانی کے نخلستان میں قدم رکھا، تو مرزا ادیب کی اس کتاب سے میری ملاقات ہوئی۔ میرا اولین تاثر یہ تھا۔ کہ "صحرانورد کے خطوط" اپنے وقت کے افسانوی ادب کی سب سے زیادہ توانا اور جوان تحریر ہے۔ اور نوجوان دلوں کو اپنی سحرائیوں سے مسحور کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے ... آج جب کہ میں جوانی اور بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا ہوں۔ "صحرانورد کے خطوط" اپنی زندگی کے پچاس سال مکمل کرنے کے بعد گولڈن جوبلی اڈیشن کی صورت میں ایک مرتبہ پھر میرے پیش نظر ہے۔ اب میں نے اسے دوبارہ پڑھا ہے۔ اور میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے۔ کہ آج بھی مرزا ادیب کی یہ صحرائی کہانیاں نصف صدی پہلے کی طرح جوان اور تر و تازہ ہیں۔

اب جبکہ مرزا ادیب کی یہ صدا بہار اور مقبول ترین کتاب اردو کے افسانوی ادب میں ایک جدید کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کی اشاعتی طول عمری اور پذیرائی کا ذکر چلے، تو عام طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ داستانی پس منظر، عشقیہ جذبات نگاری، طلسماتی ماحول، حیرت انگیز واقعات، دلچسپ حادثات اور مربوط پلاٹ، وہ خوبیاں ہیں۔ جو اس کتاب کو گذشتہ تین نسلوں سے ہر نسل کی پسندیدہ کتاب بناتی چلی آرہی ہیں۔ کچھ اہل نظر کا خیال ہے۔ کہ مرزا ادیب کی ادبی چاشنی سے بھرپور تحریر، قدیم داستانوں کی روایتی طوالت سے گریز، اور جدید علامتی افسانے سے قریب تر ہونے کے باوصف "صحرانورد کے خطوط" آج کے مصروف اور سائنسی دور میں بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جارہی ہے۔

بعض نقادانِ ادب اس کتاب کی بے پناہ مقبولیت کو ایک تیسرے حوالے سے بھی مشروط کرتے ہیں۔ اور وہ ہے ... "صحرانوردی" .... ان کا خیال ہے۔ کہ صحرانوردی بجائے خود ایک ایسا عمل ہے۔ جو ایک سفرنامے کی طرح قدم قدم منظر تبدیل کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر لمحے ایک نیا ماحول ... ہر لمحے ایک نئی مہم .... ہر لمحے ایک نئی کیفیت ... ہر لمحے ایک نیا چیلنج ... پھر جب ان تمام لذات ذہنی کو ایک سانس روک دینے والی کہانی کی کمک بھی حاصل ہو، تو نتیجہ ظاہر ہے۔ ایسی کتاب کے اڈیشن پر اڈیشن نہیں چھپیں گے اور یہ ہر نسل میں گرم کیک کی طرح ہاتھوں ہاتھ نہیں لی جائے گی تو اور کیا ہوگا؟

ادبی پنچوں کا کہنا درست ... میں اس بات سے سو فی صد متفق ہوں کہ مذکورہ بالا خصائص "صحرانورد

کے خطوط" کو ایک سدا بہار کتاب بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے۔ کہ مرزا ادیب کے داستانی افسانوں کے کرداروں کو نظر انداز کرنا، ان کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔ مرزا ادیب کے تخلیق کردہ کردار ہی دراصل ان کی کہانیوں کی جان ہیں۔ مرزا ادیب نے آج سے پچاس پچپن برس قبل لاہور کے "شاہی قلعے کی تاریخ آشنا سیڑھیوں" پر بیٹھ کر یہ داستانیں اپنے تخیل میں پروان چڑھائیں اور پھر انھیں پنسل سے سفر قرطاس پر منتقل کیا۔ اس وقت ایک حرت شاہی قلعے کے اردگرد بلکہ بہت بہت دور تک پاکستان کی تحریک آزادی کا جوش و خروش فضاؤں میں بکھرا ہوا تھا۔ جہاں فروش جذبات کی، خوشبو قوم کے لہو میں تحلیل ہو چکی تھی۔ اور ایک نئی تاریخ گراں خوابی سے بیدار ہونے کے لیے پردۂ فردا میں کروٹیں لے رہی تھی۔ دوسری طرف میدان ادب میں چاروں کھونٹ رومانوی تحریک برگد کی گھنی چھاؤں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے تلے اختر شیرانی کی جذبۂ محبت میں شرابور نظمیں اور سید سجاد حیدر یلدرم۔ نیاز فتح پوری۔ مہدی افادی۔ سجاد انصاری۔ حجاب امتیاز علی۔ خلیقی دہلوی۔ لطیف الدین احمد اور قاضی عبدالغفار کی رومان انگیز تحریریں اپنا جادو جگا رہی تھیں.... تیسری طرف خود مرزا ادیب کا نفسیاتی پس منظر تھا۔ ایک چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں اسیر بچپن، تنگ دستی کے آہنی شکنجے میں جکڑا ہوا خاندان، گھر کی چار دیواری سکون نا آشنا، محبت اور روشنی سے محروم راتیں، تلاش رزق میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے دن، دوستوں اور ہمدردوں سے تہی صحرائے حیات اور ان تمام محرومیوں کے ریگ زاروں کو اپنے لاشعور میں سمیٹتا ہوا کم عمر "دلاور علی".... یہی وہ عناصر تھے، جنھوں نے دلاور علی کے چھوٹے سے پیکر کو مستقبل کے ایک بڑے قلم کار مرزا ادیب کی شخصیت میں ڈھالا۔

ایک سچا ادیب اپنی ذات کے شعوری اور لاشعوری تجربات کو اپنی تخلیقات میں ایک آفاقی سچ دھج کے ساتھ پیش کرتا ہے.... کبھی علامت، کبھی استعارے، کبھی رمز، کبھی کنایے اور کبھی ایک برہنہ سچ کی صورت میں.... مرزا ادیب نے اپنی اوّلین کتاب "صحرا نورد کے خطوط" کی آٹھ کہانیوں میں جو کردار تخلیق کیے۔ ان کے تعمیری خمیر میں یہی عناصر گندھے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ ان کرداروں میں ایک نئی آب پیدا کرنے کے لیے ہر ماہر تخلیق کار کی طرح مرزا ادیب نے اس خمیر میں اپنی نا آسودہ تمناؤں کی وہ شبنم بھی شامل کر دی ہے۔ جو اُن کے اپنے صحرائے حیات میں خوابوں کے گلستان کھلا کر ہر برگ و گل کو محبت کا گداز اور روح کی بے رنگی کو قوس قزح کے رنگ عطا کرتی رہی۔ مرزا ادیب بنیادی طور پر ایک محبت کرنے والے شخص نہیں، وہ ہمیشہ زندگی کی اچھائیوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی صحرائی کہانیوں میں افسانوی ادب کا روایتی بُرا آدمی یعنی وِلن دکھائی نہیں دیتا۔ اور اگر کہیں دکھائی بھی دیتا ہے۔ تو اس کا دل پتھر کا بنا ہوا نہیں ہوتا۔ گوشت پوست کا ہوتا ہے۔ احساسات سے پُر اور جذبات سے لبریز.... وہ دشمنی بھی کرتا ہے۔ تو ایک سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ اور جب اسے پتا چلتا ہے۔ کہ وہ حسینۂ دلرُبا جو اُس کی نظروں میں بسی ہوئی ہے۔ اس کا اپنا منظورِ نظر کوئی اور ہے۔ تو وہ اپنی تمام تر شجاعت، قوتِ بازو اور امارت کے باوجود اس کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں "صحرا نورد کے خطوط" میں شامل اوّلین داستان "افسانۂ خونیں" کے کردار ناصر کی مثال دی جا سکتی ہے.... مرزا ادیب کے ہاں کہانی کے مرکزی کرداروں کی سادہ لوحی، بدگمانی، غلط فہمی اور بسا اوقات حماقت خود وِلن کا رول ادا کرتی ہے۔ ان کے کردار خود اپنے افعال و افکار کی بنا پر مشکلات میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور پھر اپنی مشکلات کے الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھانے میں لگے رہتے ہیں....

"بالکل ہماری اپنی طرح"..... نتیجہ یہ کہ پڑھنے والا کہانی کے کرداروں کے ساتھ بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ اجنبیت کی دیواریں گر جاتی ہیں اور قاری غیر محسوس طریقے پر کہانی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

زندگی کا سفر بھی عجب سفر ہے۔ شاہراہِ حیات کے پہلو بہ پہلو بے شمار اَن دیکھی منفی قوتیں اپنی مکروہ خواہشات کی جھاڑیوں میں تاک لگائے چھپی بیٹھی رہتی ہیں۔ اور اچانک کسی موڑ پر تمام تر طوفانی اشتعال؟ کے ساتھ ساتھ سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ شاذ شاذ تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ اپنی ہوس کے لمبے نوکیلے دانت معصوم آرزوؤں کی شہ رگ میں پیوست کر کے دم لیں گی۔ ایسے نازک لمحات میں ہمدردی، ہمقدمی، دوستی، تعاون، جدوجہد اور محبت ہی وہ اساسی طاقتیں ہیں۔ جو انسان کو زندگی کے رُکاوٹوں بھرے راستے پر تیز قدمی سے آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔
مرزا ادیب کے کرداروں میں یہ مثبت طاقتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور ہر کہانی میں قدم قدم منفی قوتوں سے نبرد آزما دکھائی دیتی ہیں۔ خیر و شر کی اس جنگ میں فتح مثبت قوتوں کا مقدر بنتی ہے۔ اور منفی طاقتیں اپنی تمام تر محیّر العقول ساحرانہ قوتوں اور مکروہ منصوبوں کے باوجود بکھر بکھر جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ مرزا ادیب کے مثبت کرداروں کو یہ فتح حاصل کرنے کے لیے اکثر اوقات اپنی جان تک کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ اس طرح یہ کردار اپنی تمام تر داستانی خصوصیات کے باوجود حقیقت سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ کیا یہ اس دور کا سچ نہیں؟ کہ بُرائیوں کے خلاف جہاد جاں سپاری کے بغیر ممکن نہیں ہو پاتا..... اور یہ صرف اس دور کا نہیں، ہر دور کا سچ ہے۔ ایسا صدیوں سے ہو رہا ہے۔ اور اس وقت تک ہوتا رہے گا۔ جب تک تصورِ انسانی کا مثالی معاشرہ "یوٹوپیا"، حقیقت کا رُوپ نہیں دھار لیتا۔

جہاں تک منفی کرداروں کا تعلق ہے۔ بدصورت زندگی کی نمائندگی کرنے والے کرداروں کے لیے مرزا ادیب کا تخلیقی پیمانہ بھی منفرد ہے۔ "صحرانورد کے خطوط" میں مستند منفی قوتیں بوڑھے اور کریہہ منظر کرداروں کی صورت میں رواں دواں دکھائی دیتی ہیں۔ کتاب کے دوسرے افسانے "دُخترِ صحرا" میں نادر اور نرگس کی محبت کے درمیان دیوار بننے والی حشیشو پر ایک نظر ڈالیے ..... بڑھاپے کی آخری منزلوں کو چھوتی ہوئی مکروہ عورت مُنہ پر جھرّیاں، بدن پر جھرّیاں، انگلیوں پر جھرّیاں، منتقم مزاج، پتھر دل جادوگرنی جو خوفناک سیاہ بلی کے ہمراہ جب اور جہاں چاہتی ہے، آن موجود ہوتی ہے۔ چوتھی کہانی "مورتی" کا کردار "ساحر"... ایک سیاہ رُو بوڑھا .. خوفناک چہرہ، خونخوار سُرخ سُرخ آنکھیں، سینہ شق کر کے دل نکال لینے والا... روحیں تبدیل کرنے کا پُراسرار عمل جاننے والا ایک بے رحم فریب کار..... اور پھر اسی کہانی میں سنہری بالوں والی حسینہ "سامو" کا بوڑھا ہوس پرست عاشق ... جلتی ہوئی لکڑیاں اُٹھائے رات کی تاریکی میں وحشیانہ رقص کرتا ہوا، جنس زدہ پجاری —— ان کرداروں کی مافوق الفطرت صلاحیتیں بظاہر یہ یقین دلاتی ہیں۔ کہ یہ ظالم کردار سوزِ عشق میں ڈوبے ہوئے ایک معصوم فطرت نہتے شخص کے مقابلے میں ناقابلِ تسخیر ثابت ہوں گے۔ لیکن ہوتا یہ ہے۔ کہ محبت کے جذبے سرشار نرگس، حشیشو کے جادوئی حصار کو توڑ اس کی آنکھیں نوچ لیتی ہے۔ اور اسے شکست کھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسی طرح "مورتی" کا مظلوم عاشق "شہاب" ساحر جیسے خارق العادات بوڑھے جادوگر اور جنس زدہ پجاری کی طلسماتی شیطانی طاقتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔

منفی قوتوں کی گوناگوں سازشوں اور دہشت پہلو حملوں کے سامنے مرزا ادیب محبت کو تن تنہا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑتے۔ کہانی کے کسی نہ کسی موڑ پر اور بعض اوقات شروع ہی سے ایک بے لوث اور ہمدرد کردار،

یا محب کا ہمقدم بن جاتا ہے۔ اور کہانی کے انجام تک ثابت قدمی سے مرکزی کرداروں کا ساتھ دیتا ہے۔
رد کے تیسرے رومان "ملکۂ صحرا" کا کردار "انگیلی" اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ جو صرف یہ کہ ایک
بے آسرا بچی "یوروپا" کو سہارا دیتی ہے، ماں کا پیار مہیا کرتی ہے، پال پوس کر جوان کرتی ہے، اُسے ملکۂ مصر
ں مدد دیتی ہے۔ اور جب "یوروپا" ایک عظیم سیاسی کشمکش کے نتیجے میں موت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ تو "انگیلی"
ہر کا جام پی کر اس کے ساتھ ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ "صحرا نورد کے خطوط" کی چوتھی کہانی کے کردار
ری اور نادو" چھٹی کہانی کا "بابا حمدی یا ہرمز" اور آٹھویں کہانی کی خادمہ "مرجانہ" اور "گونگی عذرا" اس
کے ایسے نمایاں کردار ہیں۔ جو بغیر کسی ذاتی طمع کے، محبت کرنے والے مرکزی کرداروں کی حمایت کے لیے،
رمات پیش کرتے ہیں۔ حیرت انگیز قربانیاں دیتے ہیں۔ اور انسانیت و محبت کے لطیف جذبوں کی سربلندی
ے طاقت فراہم کرتے ہیں۔ مرزا ادیب کے یہ کردار اس امر کا اعلان نہیں، کہ دُنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔
ں اور محبت کا جذبہ شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ تو محبت کرنے والوں کے بازو مضبوط کرنے کے لیے غیب سے
ساماں مہیا ہونے لگتے ہیں، جو اس پاکیزہ اور لطیف جذبے کو مشکلات کے کوہِ گراں سے ٹکرا جانے کی طاقت
ہیں۔ محبت کتنی عظیم قوت ہے۔ اس کا شعلۂ خاموش اور ضبطِ مسلسل کیسی کیسی سنگلاخ چٹانوں اور کیسے کیسے
ـ لب صحراؤں کا سینہ چیر کر ٹھنڈے اور میٹھے پانیوں کے حیات افروز چشمے جاری کر سکتا ہے۔ اس کا اندازہ
، وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے "صحرا نورد کے خطوط" کا مطالعہ کیا ہے۔ یا پھر آنے والے زمانوں میں کریں گے۔

"صحرا نورد کے خطوط" کی اوّلین اشاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس تحریر کے آغاز میں مرزا ادیب کے اپنے
یاتی پس منظر کے علاوہ ۱۹۳۹ء سے قبل اُردو ادب میں رومانوی تحریک اور سیاسی میدان میں آزادی کی تحریک
ثرات کا ذکر کیا گیا تھا۔ رومانوی تحریک کے اثرات مرزا ادیب کے ان رومانی کرداروں کے توسط سے نمایاں ہوتے
، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب کچھ باتیں تحریک آزادی کے حوالے سے.... "ملکۂ مصر" "سیل حوادث" اور "سمارت
یدی" کے مرکزی کردار، جذبۂ آزادی میں شرابور دکھائی دیتے ہیں۔ اور جہاں کہیں فرض اور محبت میں سے ایک
نتخاب ضروری ہو جاتا ہے، وہ محبت کو فرض پر قربان کر کے آزادی کی راہ اپناتے ہیں۔ ملکۂ مصر کا محبوب اپنی
یز از جان محبوبہ تک کو آزادی کی خاطر قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ "سیل حوادث" کی وطن پرست "مطربہ شیریں"
ر اس کا اندھا باپ" آزادیِ وطن کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کے دلوں پر
بت کے اَن مٹ نقوش چھوڑتے ہیں۔ "سمارت کا قیدی" اس سلسلے کی شہکار کہانی ہے۔ اس کہانی کا ہیرو پاشا
نق کا اسیر ہو کر آزادیِ وطن کے تقاضوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کے بچپن کی ساتھی اور محبوبہ اور پھر
ں کی ذاتی خادمہ کے کردار اسے نفسیاتی طور پر دوبارہ وطن کی خاطر تلوار اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ
شا کا ضمیر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔ اور وہ اپنی خوبصورت محبوبہ کو اکیلا چھوڑ کر فرض کی بجا آوری کے لیے نکل کھڑا ہوتا
ہ۔ جدوجہد آزادی کی قیادت کرتا ہے۔ اور اپنی جان اس فرض پر قربان کر دیتا ہے۔ اس کی قربانی رنگ لاتی
ہ۔ اور دمِ واپسیں سے قبل وہ آخری بار آنکھ کھولتا ہے۔ تو اپنے وطن کے پرچم کو آزادی کی فضا میں لہراتا ہوا
یکھتا ہے۔

کرداروں کے حوالے سے کی گئی، مذکورہ بالا گزارشات کا تجزیہ کیا جائے۔ تو یہ بات پورے وثوق سے کہی
سکتی ہے۔ کہ صحرا نورد کے خطوط اپنی طلسماتی فضا، بھرپور ادبی طرزِ تحریر، کہانیوں کے مربوط پلاٹ، پُرجوش

جذبات محبت اور پرتجسس رومانی رنگینیوں کے لحاظ سے ایک ممتاز کتاب تو ہے ہی... کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب ایک منفرد تخلیق ہے... ایسے منفرد کرداروں کی تخلیق، خونِ جگر کے بغیر ممکن نہیں ہو پاتی۔ خود مرزا ادیب اس تخلیقی عمل کے ضمن میں کہتے ہیں کہ اس کے بارہا ان کے دن کا آرام اور رات کی نیند چھینی ہے۔ آرام اور چین لوٹ کر اضطراب اور بے قراری دی ہے۔ روح کے اندر شعلے بھڑکائے ہیں۔ میں نے اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ آنسو بہائے ہیں۔ ان کے زخموں کا کرب اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ بارہا اپنا لہو اپنے قلم کی نوک پر بکھیر دیا ہے۔ بارہا میرا احساس ان کے دکھ محسوس کرکے میرے سینے میں رک رک گیا ہے۔

مرزا ادیب کے تخلیق کردہ کردار اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں۔ کہ وہ اپنے خالق کے اضطراب، کرب، بیقراری، آنسوؤں اور نوکِ قلم پر بکھرے ہوئے خونِ جگر کو تین نسلوں کے سینے میں نہایت احسن طریقے سے منتقل کر چکے ہیں۔ ان کرداروں کے تحرک، اثر پذیری اور تازہ دم کیفیت کو دیکھ کر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ کہ ان کرداروں میں روشنی شعلۂ نوا بھی اپنی پوری آب و تاب سے بھڑک رہا ہے۔ ان کرداروں کے توسط سے ابدی سچائیوں کا ورثہ آیندہ آنے والی بہت سی نسلوں کو یونہی منتقل ہوتا رہے گا۔ اور مرزا ادیب اپنے کرداروں کے حوالے سے آنے والے زمانوں کی ادب نواز سانسوں میں خوشبو بن کر مہکتے رہیں گے۔ ●●

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج
بمبئی ۸

حدیثِ شب گزیدہ

ترقی پسند تحریک نے جہاں صدیوں پرانے بُت توڑے۔ نئے نظریات اور رجحانات کو نام دیے۔ فرسودہ خیالات کو تازہ استعارے اور علامتیں عطا کیں۔ زندگی کو حقائق سے قریب تر کر دیا وہیں کچھ ایسے بڑے نام بھی اُردو ادب کو دیے جو بذاتِ خود دیو قامت بُتوں سے کم نہیں۔ اور جن کے ذکر کے بغیر اُردو ادب کی تاریخ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایسے ہی ناموں میں ایک نام ہے سردار جعفری کا۔ سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے وہ سرگرم رُکن ہیں جنھوں نے اس تحریک کے مقاصد کو اپنی تحریروں میں لفظ لفظ پرویا ہے۔ اور پڑھنے والوں کو بہت سے وسیع موضوعات عطا کیے ہیں۔ اُن کی شاعری تقریباً نصف صدی پر بسیط ہے۔ اور 'پتھر کی دیوار'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'نئی دنیا کو سلام'، 'لہو پکارتا ہے'، اور 'ایک خواب اور' ایسے شعری مجموعے ہیں جو اُردو میں بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ صرف ترقی پسند تحریک بلکہ سردار جعفری کے اپنے ذاتی نظریات، انسان دوستی، امن پسندی اور عالمی و بین الاقوامی محبت کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ مگر سردار جعفری محض شاعر نہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت شخصیت ہے۔ ایک شاعر آتش نوا ایک خطیب بے بدل، ایک صاحب نظر نقاد ایک ذی فہم ادیب، ایک باوقار انقلابی اور ایک سنجیدہ دانشور۔ اُن کی نثر میں بھی وہی جادو موجود ہے جو اُن کے شاعرانہ اسلوب اور خطیبانہ لب و لہجے پر چھایا ہوا ہے۔ ترقی پسند ادب، اقبال شناسی، پیغمبرانِ سخن اور لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ سبھی ان کی نثر نگاری پر دال ہیں۔ خاص طور پر "لکھنؤ کی پانچ راتیں" جس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۴ء میں مکتبہ جامعہ نے شائع کیا تھا۔ اور اب زیرِ نظر دوسرا اڈیشن جو ۱۹۸۸ء میں نصرت پبلشرز لکھنؤ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے، قابلِ ذکر ہے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" ترقی پسند تحریک کا ایک اشاریہ ہے۔ ایک دستاویز ہے۔ یہ نہ تو سوانح نگاری کے ضمن میں آتی ہے۔ نہ مکتوب نگاری، نہ سفرنامہ، نہ محض افسانہ — بلکہ رشید احمد صدیقی کی "آشفتہ بیانی میری" کی طرح یادوں کی ایک برات سمجھی جاسکتی ہے۔ خود سردار جعفری اس سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"یہ اس افسانے کے چند پریشان ٹکڑے ہیں جسے زندگی کہتے ہیں اور یہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر لکھے گئے ہیں۔ اس لیے ان میں اسلوب اور بیان کی سطح کو قائم رکھنا ناممکن ہے۔"

سردار جعفری کی اس کسرِ نفسی کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے یہ تمام مضامین چاہے کسی بھی شکل میں ہوں۔ ایک مخصوص نثری اسلوب کے حامل ہیں۔ اور یہ اسلوب دلکش بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اور اس اسلوب کو پڑھ کر یہ بتانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ سردار جعفری کے قلم کی پیداوار ہے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" یوں تو قوسِ قزح کی طرح سات رنگوں سے عبارت ہے۔ پہلا مضمون "قبول بندگیم راخدائے برنمی خیزد" میں جعفری صاحب نے اپنے خاندانی پس منظر اور ماحول کا ذکر کیا ہے جو اُن کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما رہے دوسرا مضمون لکھنؤ کی پانچ راتیں' کے عنوان سے ہے۔ جس میں لکھنؤ کی اُن پانچ راتوں کا تذکرہ ملتا ہے جو جعفری صاحب کی زندگی میں یادگار راتیں تھیں۔ تیسرا مضمون، مضمون نہیں بلکہ افسانہ کہا جا سکتا ہے، جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر "خالِ محبوب اور امنِ عالم" کے نام سے سوویت دیس کی کچھ یادیں ہیں۔ اس کے بعد کا مضمون "گلینا" — افسانہ ہے یا حقیقت یہ فیصلہ خود سردار جعفری ہی کر سکتے ہیں یا پھر اس کی کہانی کے حقیقی ہیرو ترکستان کے مشہور شاعر ناظم حکمت۔ پھر "ذوقِ تعمیر" کا عنوان اسٹالن گراڈ کی نئی تعمیر کا افسانہ سناتا ہے۔ "گردشِ پیمانۂ رنگ" انسانی وحدت کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔ یہ ساتوں رنگ قوسِ قزح کی طرح بنیادی طور پر صرف ایک رنگ لیے ہوئے ہیں۔ یعنی سفید رنگ جو امن کی علامت سمجھا جاتا ہے اور یہی رنگ سردار جعفری کی تحریروں پر غالب ہے۔ بلکہ ان کی تحریر کا نمایاں رنگ ہے۔ اور اس اسلوب کا نشان وہ بھی جو ان کی شاعری میں علامتوں اور پیکر تراشی کو جنم دیتا ہے۔

اگر ان مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو "قبول بندگیم راخدائے برنمی خیزد" کو پڑھ کر نفسیات اور سائنس کے وراثت اور ماحول HEREDITY & ENVIROMENT اصول پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسے پڑھ کر جعفری صاحب کے خاندانی اور گھریلو ماحول کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک ایسے گھرانے میں ان کی پیدائش اور پرورش ہوئی جہاں مذہب اوڑھنا بچھونا رہا۔ اور زندگی عزاخانوں، امام باڑوں اور علموں اور تعزیوں کے سایے میں کٹی۔ جہاں بچپن ہی سے کانوں میں قرآن، احادیث، نہج البلاغہ اور انیس و دبیر کے مرثیے ڈال دیے گئے۔ اور امام حسینؑ اور جنابِ زینبؓ کی حق و صداقت کے واقعات سال بھر دُہرائے جاتے تھے۔ نتیجتاً حق و صداقت اور بے باکی و حق گوئی کا پہلا سبق سردار جعفری نے وہیں پڑھ لیا۔ پھر آس پاس پھیلا ہوا جاگیردارانہ ماحول اور اس ماحول کے شکار غریب کسان اور مزدور۔ اور اُن پر ہوتے ہوئے بے شمار مظالم — جن کے خلاف بغاوت کا جذبہ اور انقلاب کی خواہش اُن کے دل میں ہوش سنبھالتے ہی پیدا ہوگئی۔ اس جذبے کو جلا دی اقبال

شاعری نے لکھنؤ کے دور عروج نے گاندھی جی کی تلاش حق نے، نہرو کی تقریروں نے اور علی گڑھ آتے آتے وہ ترقی پسندی کی گھنی چھاؤں تلے آگئے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بعد ہے کہ اسے پڑھ کر ہم سردار جعفری کے ذہنی سفر اور ان کی تحریروں کے اُن محرکات تک پہنچ جاتے ہیں جنھوں نے اُن کے نظریات کی تعمیر میں زبردست حصہ لیا۔

اس مضمون کے بعض پیرایے تو کسی انشائیے سے کم دلکش نہیں۔ خاص طور پر انسانی ہاتھوں کے متعلق انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں اگر الگ سے شائع کر دیا جائے تو انسانی ہاتھ پر ایک خوبصورت اور منفرد انشائیہ ہاتھ آسکتا ہے۔ اس مضمون میں بڑے چونکا دینے والے جملے ہیں۔ جن سے خود سردار جعفری کے نظریات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل ودماغ کے عرشِ بریں سے وحی والہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔

۲۔ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے اور زندگی اور عمل کی جلا اس میں نیا نور اور نیا رنگ پیدا کر رہی ہے۔

۳۔ وقت کے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں۔ ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ تعبیروں کے تپتے ہوئے میدان سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی۔

۴۔ کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتا دیتے ہیں اور کبھی کسی عظمت کے بغیر بھی انحطاط کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لیے قدیم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے کھنڈر بھی ملتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے۔ ہر دروازہ کھلتا ہے اور دیوار کھڑی ہوتی ہے پھر بھی عمارت دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان ہوتا ہے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" اس سفر کے پانچ مرحلوں کی کہانی ہے۔ پہلی رات ۱۹۳۸ء کی رات ہے۔ اس رات سے انقلابی نوجوانوں کی آغازی کارروائیوں کا اظہار ہوتا ہے جب ترقی پسند جذبات کی سیں بھیگ رہی تھیں اور سینے میں اٹھتے ہوئے شعلے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔ بغاوت کی دبی ہوئی چنگاری چھوٹی چھوٹی شرارتوں میں بھی اپنے لیے تسکین کا سامان ڈھونڈ رہی تھی۔ صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بیڑی پینا، شراب خانوں میں نظمیں سنانا، چوراہوں پر کھڑے ہو کر سیاسی تقریریں کرنا۔ کتابیں اور رسالے شائع کرنے اور پھر علما اور پروفیسروں سے ٹیڑھے میڑھے مباحثے کرنا۔ انگریز ہندستان کے مجاہد آزادی ٹیپو سلطان سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے کتے کا نام ٹیپو رکھتے ہیں، لہٰذا انقلابی نوجوانوں کا ان جواب میں اپنے کتے کا نام "نیلسن" رکھ کر خوشی کا اظہار کرنا، پھر فلم کے خاتمے پر جب انگریزوں

کا قومی گیت بنا ہے، دانستہ بلند آواز سے انقلابی نعرہ لگاتا تاکہ قومی گیت کے بول مدھم پڑ جائیں۔ یہ سب شرارتیں بھی، مگر انقلابیت کی چنگاریاں ان میں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ اس نوعمر ٹولی میں انور جمال قدوائی، سبط حسن، فرحت اللہ انصاری، علی جواد زیدی، حیات اللہ انصاری اور یش پال وغیرہ شامل تھے۔ اور ان شرارتوں میں سردار جعفری کے ساتھ سبط حسن اور مجاز پیش پیش تھے۔ یہ ابتدائی گرم ہوکے شعلے بننے کی۔ اس کے بعد ہی لکھنؤ کی وہ دوسری رات آتی ہے جب یہ تین نوعمر ادیب "نیا ادب" کا تازہ شمارہ ہاتھ میں لیے دربدر گھومتے پھر رہے تھے۔ خالی جیب اور بھوکے پیٹ لیے۔ یہ رات جدوجہد کے لمحات کی غماز ہے۔ جب حقائقِ زندگی ترقی پسندی کو نگلنے کے درپے تھی۔ مگر تیسری رات اس سے زیادہ روشن اور صاف ہے۔ "جنونِ عشق کے انداز" اس دربدری کے باوجود بھی نہیں چھٹتے، بلکہ "جوشِ جنوں" کچھ زیادہ ہی "چاک گریبانی" پر آمادہ نظر آتا ہے۔ نتیجتاً "زنجیر و سلاسل" کی نوبت لازمی تھی۔ اور زنداں کا سفر مقدر ٹھہرا۔ سردار جعفری "انقلاب" کی سزا بھگتنے کے لیے تیار تھے۔ اس لیے کہ اس درد میں ان کے شریک سبط حسن اور مجاز ہی نہیں بلکہ چند پردہ نشیں اور خاص طور پر ایک "زہرہ جبیں" بھی تھی۔ البتہ چوتھی رات ایک طوفانِ بلاخیز کی غماز ہے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کا برف افشاں موسم اور آل انڈیا ریڈیو پر نووارد شعرا کی گرمیِ سخن۔ ایک شاندار اور یادگار مشاعرہ۔ اور وہ بھی شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کی صدارت میں۔ یہ تمام نوعمر اور نئے ذہن کے شعرا جنھیں لکھنؤ کے سامعین پہلی مرتبہ ذوق و شوق سے سن رہے تھے۔ سردار جعفری اس موقع کی بڑی خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور اپنے ہم عمروں اور ہم نواؤں کا نقشا یوں کھینچتے ہیں۔

"یہ اس عہد کے باغی ہیں۔ سرپھرے، عیش و نشاط کے دلدادہ۔ کفن بردوش۔ یہ ابھی عظیم نہیں ہیں لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کے نئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے۔ یہ نیا جذبہ، نیا احساس، نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ماضی کا سارا ورثہ ان کے پاس ہے۔ جدید تعلیم کی اعلا ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ اس لیے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ یہ پرانے ہیروں کو نئی طرح تراش رہے ہیں۔ ہجر و وصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں۔ محبوب کے وعدۂ فردا کی لذت سے واقف ہیں لیکن ہندستان کی آزادی ان کی سب سے بڑی محبوبہ ہے۔" (صفحہ ۶۴)

سردار جعفری کی یہ تصویر کشی ترقی پسندوں کے موقف کی وضاحت کرتی ہے اور یہ سوچنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ ترقی پسند شعرا کے موضوعات کیا تھے۔ شعرا کے اس گروہ میں مجاز، فیض احمد فیض، جذبی، مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر کی جو تصویریں سردار جعفری نے اپنے الفاظ میں پیش کی ہیں۔ وہ کسی پورٹریٹ سے کم نہیں۔ یہ رات جذبوں کے چڑھاو کی رات ہے۔ چمکتے ہوئے چہروں اور دہکتے ہوئے جذبوں کی رات ہے۔ البتہ پانچویں رات اپنے دامن میں اشکوں

کی سوغات لیے ہوئے آتی ہے۔ اداسیوں اور حزن وملال کے بادل ہیں اور غم واندوہ کی یورشیں۔ یہ طوفانی رات اس تند مل انقلابی کی زندگی کی آخری رات ہے جسے یار دوستوں کی مہربانی ہمیشہ کے لیے ڈوبا۔ جس کے بارے میں سردار جعفری نثر میں مرثیہ نگاری کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"وہ اپنے ہزاروں رنگ روپ میں میرے سامنے ہے۔ وہ شمشیر، جام اور ساز کا امتزاج تھا۔ کبھی شمشیر برہنہ ہو جاتی تھی تو ساز اور جام بھی کانپ جاتے تھے۔ کبھی جام چھلک اٹھتا تھا تو شمشیر بھی ڈوب جاتی تھی۔ اور آج کی رات ـــ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کی رات ـــ جو ہزاروں راتوں کی آخری رات ہے۔ مجاز خود ڈوبا ہوا ہے۔ موت کی گہری ندی میں شمشیر، ساز اور جام تیر رہے ہیں اور مجاز ڈوبا ہوا ہے۔ ہمیشہ کے لیے خاموش۔" (صفحہ ۷۴)

اس رات کے بعد سردار جعفری غالباً پھر کسی رات کو یاد نہ کر سکے۔ لہٰذا لکھنؤ کی یادگار راتوں کا یہ سلسلہ اس پانچویں رات پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔

"چھِردو مانجھی" ایک خوبصورت افسانہ ہے اور کردار نگاری کی بہترین مثال۔ چھِردو مانجھی ایک زندۂ جاوید کردار ہے۔ جو اپنے عہد کے استبداد کے خلاف ایک احتجاج کی علامت بن کر اُبھرتا ہے۔ جعفری صاحب نے اسے "رپورتاژ" کا نام دیا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ ویسے اس کہانی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ دنیا کی آٹھ دس زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ پہلا ترجمہ روسی اور پولش زبانوں میں ہوا۔ یہ بنگال کے ساحلی علاقے چٹ گانو ہی کی کہانی نہیں بلکہ ایک پورے نظام کی داستان ہے جس کا المیہ کردار وہ بوڑھا ماہی گیر ہے جو قلم کار کے سامنے اپنے درد کے دریچے یوں وا کرتا ہے۔

"پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں۔ اس کے ایک ایک چپے کو جانتا ہوں۔ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں۔ ... آسمان دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا۔ سمندر میں طوفان کب آئے گا۔ اور دریا کا پانی اُلٹا کب بہے گا؟ پچاس برس سے یہی کام کر رہا ہوں۔ .. لیکن آج تک یہ پتا نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں وہ دولت کہاں جاتی ہے؟" (صفحہ ۸۹)

یہ سوال دراصل قاری سے سردار جعفری کا کمیونسٹ اور سوشلسٹ ذہن پوچھ رہا ہے۔ اور اس کا جواب نہ پا کر وہ خود ہی ماہی گیر کی زبانی وضاحت کرتے ہیں۔

"یہ دریا ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے۔ اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے۔ ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی محنت کو نگلے لے رہا ہے۔" (صفحہ ۹۰)

چھِردو مانجھی، جس کا اصل نام گل چھِر ہے، ایک ایسی ہی مچھلی ہے جسے اس اندھے سمندر نے نگل لیا ہے۔ اور جو سمندر کے گدلے پانی سے اپنی جیسی تمام بے بس مچھلیوں کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔

"گلینا" انسانیت کا وہ حسین اظہار ہے جو ڈاکٹر کے روپ میں ایک عظیم فنکار کی ڈوبتی ہوئی دھڑکنوں اور دھڑکنوں کے واپس لوٹ آنے کے خواب دیکھتی ہے۔ اور سوکھے پودے میں پانی ڈال کر یہ سوچتی ہے کہ "ایک لمحہ ایسا ضرور آئے گا جب سوکھے ہوئے درختوں میں نئی نازک نازک پتیاں نکلیں گی اور پھر سخت ڈنٹھل کو توڑ کر ایک نرم کلی باہر نکلے گی۔ پھر دوسری کلیاں اور سارا جنگل پھولوں سے بھر جائے گا اور شاعر اچھا ہو جائے گا۔" (صفحہ ۱۴۸)

اور زندگی کی طرف لوٹنے والا فنکار یعنی ترکی کا عظیم شاعر ناظم حکمت اس راز سے پردہ یوں اٹھاتا ہے۔

"یہ اشتراکی سماج کا واقعہ ہے۔ اس میں ذرا سی بھی وہم پرستی نہیں ہے۔ گلینا سوکھے پودے میں پانی ڈال کر صرف اپنے دل کو تسکین دے رہی تھی۔ اچھا تو میں دواؤں سے ہوا ہوں۔"

یہی اس نئے سماج کی نئی انسانیت کا اظہار ہے جسے سردار جعفری اس کہانی میں اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی جذبہ "ذوق تعمیر" میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ جب روس میں ہونے والی سائنس کی ایجادات، تحقیقات اور انکشافات کے متعلق "انجستان" کا ڈائرکٹر بتاتا ہے کہ۔

"یہ ساری کوششیں ساری دنیا اور تمام عہدوں اور زمانوں کے انسانوں کو ایک برادری میں اور انسانی برادری کو ایک انسانی ذہن میں تبدیل کر دیتی ہیں اور وحدت انسان کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے جو امن عالم کا ضامن ہے۔" (صفحہ ۱۵۱)

"گردش پیمانہ رنگ" میں انسانی وحدت کا وہی جذبہ ہے جو مختلف رنگ اختیار کرکے اور مختلف مقامات کی سیر کرکے پھر وہیں آ جاتا ہے، جہاں سے چلا تھا۔ بلغاریہ کے بوڑھے شاعر لامار کی ایک طویل نظم جو اس نے اقبال کے ایک قطعہ سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ سن کر قدیم یونان، ایران، جرمنی اور ہندوستان کو یاد کرتے ہوئے سردار جعفری سوچتے ہیں۔

"یونانی فکر نے ایران اور حافظ کو متاثر کیا۔ حافظ نے گوئٹے کو اپنا گرویدہ بنایا۔ گوئٹے نے اقبال کو نغمہ سنج کر دیا۔ اور اقبال کے قطعے نے بلغاریہ کے لامار کو اتنی حسین نظم کہنے پہ اکسایا۔ بس اتنی سی بات باقی ہے کہ اگر یونانی شاعر بھی لامار کی نظم پر ایک نظم کہہ دے تو گردش پیمانہ رنگ مکمل ہو جائے گی۔" (صفحہ ۱۶۱)

غرض کہ سردار جعفری کی شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی دو اہم عناصر نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ انسانی محنت کی داستان اور اس کا قصیدہ خاص طور پر ہاتھوں کے استعارے کی مدد سے۔

۲۔ انسان دوستی، محبت، وحدت انسان اور عالمی امن کا خواب۔

ان کا نثری اسلوب بھی اُن کے شعری اسلوب کی طرح دو خصوصیات کا حامل ہے (۱) تجسیم کاری (۲) پیکر تراشی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ سپاری کے نازک درخت سر اٹھائے کھڑے تھے جیسے ابھی سمندر سے نہا کر نکلے ہوں اور دھوپ میں اپنے بال سکھا رہے ہوں۔
۲۔ اسکول شہد کی مکھیوں کے ہجوم کی طرح گنگنا رہے ہیں۔
۳۔ باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں۔
۴۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جاگتی ہے۔ ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں۔
۵۔ جب آسمان کی طرف نظر اٹھتی ہے تو کرینوں کی لمبی گردنیں نظر آتی ہیں۔ بعض کرینیں اپنے لوہے کے دانتوں میں دیو پیکر پتھروں کو اور فولادی شہتیروں کو اٹھائے ہوئے ہیں۔
۔ اس کے علاوہ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے جمے ہوئے موتی، ابروؤں کی ٹوٹی ہوئی کمانیں اور رخساروں کی بجھی ہوئی شمعیں جیسے پیکر بھی جا بجا ملتے ہیں۔

اس کتاب سے بعض زندہ کردار اور بعض زندہ جاوید شخصیتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں — سردار جعفری جن کا تعارف اپنے قارئین سے خود ہی کرواتے ہیں اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز میں اس اعتبار سے یہ کتاب شخصیتوں کا ایک تصویر خانہ ہے۔ چھوٹی اور بڑی بے شمار تصویریں — سردار جعفری ایک ماہر کیمرہ مین کی طرح ترتیب وار ان تصویروں کو فوکس کرتے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں کیمرہ "اودھ کی خاکِ حسین" کو اپنی آنکھ میں چھپاتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور بلرام پور کے اس محلّے میں آکر رک جاتا ہے جہاں ایک بہت بڑا اصطبل ہے۔ گھوڑوں کے پیچھے تھان ہیں سائیسوں کے لیے دو کوٹھریاں، اور موٹروں اور گاڑیوں کے لیے تین گیراج۔ پھر اُجڑے ہوئے اصطبل کا منظر دکھاتے ہوئے کیمرہ ایک صاف و شفاف تالاب کو فوکس کرتا ہے۔ امرود کے باغ پر سے ہوتا ہوا، اس بوڑھے برگد کے درخت پر آکر رک جاتا ہے جہاں چڑیاں سُرخ رنگ کے پھلوں کو کتر کتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے توتے ٹائیں ٹائیں کرتے ہیں۔ کیمرہ اور آگے بڑھتا ہے۔ سڑک کی دوسری طرف سرخ اینٹوں کی قدِ آدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ — اس کے دو کونوں پر لگے ہوئے لوہے کے پھاٹک، سرخ بجری کی روش — ٹینس کورٹ — عشق پیچاں کی بیلیں، مہندی کی باڑھ، بیلے اور چمپا کے پودے، اور پھر احاطے کے اندر اینٹوں کا بنا ہوا ایک بڑا صحن — اور بیچ میں ایک چبوترے پر اس قصبے کا سب سے اونچا نیم کا درخت — اس کے اطراف مکانات اور آخر میں ایک وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر — کیمرہ یہاں آکر رک جاتا ہے۔ یہی وہ آرٹ گیلری ہے جہاں سے سردار جعفری اپنی تصویروں کی نمائش شروع کرتے ہیں۔ ان کے والد، والدہ، بہن بھائی، چچا، محرم کے عزاداروں کے جلوس میں شامل چہرے، مولانا سبطِ حسن، میر انیس قرآن پڑھانے والے مولوی صاحب اکبر اور ان کی مظلوم عورتیں، ہرواہے اور ہرواہیاں، زمیندار اور ٹھیکیدار، اسکول ماسٹر منشی بدری پرشاد مفلوج زدہ میر بق چوں چوں، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، اقبال، تحصیل دار التجا حسین استخارہ نکالنے والے مجتہد صاحب، آسکر وائلڈ، گوئٹے، غالب، مجاز، رشید جہاں، محمود الظفر، شوکت عمر

(باقی صفحہ ۷۰ پر)

یہاں کے ادبی رسائل میں [illegible] آپ کے خیال میں [illegible] اس طرح کے کو بڑا
ہی حاصل کیا ہے لیکن [illegible] کیا آپ کے [illegible] کیا ہیں؟

جواب..... ہندوستان میں بہت سے [illegible] پاکستانی مزاح نگاروں [illegible] کہانی کا ادب، شاعروں کو [illegible]
اخذ کر کے پڑھتا ہوں جہاں تک مزاح نگاری کا سوال ہے تعلق ہے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے
مقابلے میں پاکستان میں مزاح نگاری کی روایت زیادہ مضبوط ہے۔ ممکن ہے اس سے بہت سے لوگ
اختلاف کریں لیکن میری رائے میں پاکستان میں جتنے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی
بہت کم لکھ رہے ہیں۔ کرنل محمد خان بھی کبھی کبھی لکھتے ہیں شفیق الرحمٰن تو شاید لکھنا ہی ترک کر چکے
ہیں۔ سید ضمیر جعفری کا [illegible] بھی مانگ ہے۔ محمد خالد اختر مجھے بیحد پسند ہیں حالانکہ وہ سوچتے
انگریزی میں اور لکھتے اردو میں ہیں۔ چونکہ میں ایک طویل عرصے تک اخبار سے وابستہ رہا ہوں۔ اس
لحاظ سے پاکستانی اخبارات بھی باقاعدگی سے میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ آپ کے
"جنگ" اخبار میں شوکت تھانوی، ابن انشاء اور ابراہیم جلیس کے ایک ساتھ کالم چھپتے تھے انھیں پڑھ کر
بہت لطف آتا تھا۔ ہمارے یہاں بھی چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری نے اردو کالم نگاری
کی روایت کو اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ بعد میں آنے والوں کے لیے راستہ ہموار تھا۔ اس وقت جو لوگ
کالم لکھ رہے ہیں ان میں انتظار حسین اور منو بھائی کے کالم مزاحیہ کالم کے ذیل میں نہیں آتے۔ کسی
زمانہ میں احمد ندیم قاسمی "حرف و حکایت" لکھتے تھے۔ ان کے کالم سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا
کیونکہ مجھے خود بھی کالم نویسی کرنی تھی۔ مجھے ان کے کالم بہت پسند بھی تھے لیکن اب ادھر میں نے ان
کے کالم دیکھے تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کے ہاں READ-EBILITY کم ہو گئی ہے۔ شاید ان کی عمر کا تقاضا
ہے۔ ادبی کالم نگاری کے میدان میں آپ کے یہاں مشفق خواجہ کا کوئی حریف نہیں۔ ان کے کالم ہندوستان
کے متعدد رسائل و اخبارات میں نقل ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہندوستانی ادیبوں کے رجحانات پر بہت
گہری ہے۔ عطاء الحق قاسمی باقاعدہ روزانہ کالم تو لکھتے نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ابن انشا اور ابراہیم جلیس جیسے
کالم نگاروں کی جگہ اب بھی خالی ہے اور ان جیسے کالم نگار ابھر کر سامنے نہیں آئے۔

سوال..... ہندوستان کے اردو اخبارات میں کالم نویسی کیسی ہو رہی ہے؟

جواب..... ہندوستان میں اردو کالم نویسی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ آخری آدمی فکر تونسوی تھے جن کا کالم
"پیاز کے چھلکے" "ملاپ" اخبار میں شائع ہوتا تھا اور صرف ان کے کالم کی وجہ سے اس اخبار کی
پانچ چھ ہزار کاپیاں فروخت ہو جایا کرتی تھیں۔ فکر تونسوی عام آدمی کے لیے لکھتے تھے۔ ان کے
دکھ اور درد کو بیان کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد "ملاپ" اخبار کی اشاعت ایک دم نیچے آ گری۔
فکر تونسوی [illegible] کی ادبی حیثیت کچھ نہیں تھی لیکن وہ [illegible] کالم نگار تھے۔ آپ کے یہاں کالموں کی ایک ادبی [illegible]
بھی ہوتی ہے [illegible] خصوصاً سیاسی اور معاشرتی حالات میں اپنی بات اشاروں اور کنایوں میں
کہنا پڑتی ہے [illegible] ادبی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ [illegible] ہندوستان میں کھل
کر سب کچھ [illegible] بات [illegible] اظہار [illegible]
[illegible]

بے معنی ہو جاتے ہیں۔ لیکن کالموں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس کی تازگی ہمیشہ باقی رہتی ہے آپ کے خیال میں وہ کون سے عناصر ہیں جو ایک کالم کو مستقل دلچسپی کا حامل بنا دیتے ہیں؟
جواب..... یہ صحیح ہے کہ صحافتی کالم روزمرہ کے موضوعات پر لکھے جاتے ہیں اور موضوع کی اہمیت کے ختم ہوتے ہی کالم بھی اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے پچاس برس پہلے جب ہندستان میں ٹریفک سگنلز نصب کیے جا رہے تھے تو ان کی بڑی شدید مخالفت ہوئی تھی اور عام رائے یہ تھی کہ یہ سگنلز اپنی سرخ و سبز بتیوں کے ذریعے ٹریفک کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ اس موضوع پر رائے عامہ کے زیر اثر میں نے بھی کئی کالم لکھے جنھیں اس وقت بہت سراہا گیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے وہ کالم نہایت احمقانہ محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود لکھنے والے کی اپنی نگاہ میں اپنے کالموں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اس کے برعکس اب بھی میں عبدالمجید سالک صاحب کے کالم پڑھتا ہوں تو اس میں ایک ادبی شان دکھائی دیتی ہے۔ چراغ حسن حسرت کے بعض کالموں کی تازگی آج بھی باقی ہے۔
سوال..... میں آپ سے یہی پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ کالموں میں تازگی کیسے باقی رہتی ہے کیا ایسے موضوعات پر لکھنے سے جن میں دلچسپی کا عنصر ہمیشہ باقی رہے یا ان موضوعات کو برتنے کے طریقہ کار سے۔
جواب..... تازگی لکھنے والے کے زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر زاویۂ نگاہ وسیع ہو تو تحریر میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ کالم نگاروں کے بہت محدود تعداد میں کالم ایسے ہوتے ہیں جن میں تازگی کا عنصر باقی رہتا ہے۔ آپ کے ہاں کالم مضمون کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً ابن انشا کے بہت سے کالم ایسے ہیں جو در حقیقت مضمون ہیں اور انھیں کالم قرار دینا درست نہیں ہوگا۔
سوال..... آپ کالم اور مضمون میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں کیا محض یہ کہ کالم مختصر ہوتا ہے اور مضمون طویل ہوتا ہے۔
جواب:..... طوالت ہی واحد معیار نہیں ہے۔ بعض مضمون چھوٹے بھی ہو سکتے ہیں پھر کالم کی طرح مضمون بھی آپ روزمرہ کے موضوعات پر لکھ سکتے ہیں مثلاً میری کتابوں میں جتنے مضامین ہیں ان میں سے کوئی بھی اخبار میں شائع نہیں ہوا۔
سوال..... اگر صرف مزاح کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو آپ کے خیال میں پاکستان اور ہندستان کے مزاح اور مزاح کو برتنے کے رویے میں کیا فرق پایا جاتا ہے؟
جواب..... آزادی کے بعد دونوں ممالک میں مزاح لکھنے کے رویے تقریباً وہی ہیں جو تقسیم سے پہلے تھے۔ سوچ کا انداز وہی ہے، سیاسی اور معاشرتی مسائل مختلف ہیں لیکن رویے زندگی کے تعلق سے دکھوں کا جس طرح ادراک کرتے ہیں وہ بہت مختلف نہیں مگر ہمارے ہاں سیاسی موضوعات اردو میں کم اور ہندی میں زیادہ ہیں۔ ہندی کے ادیب سیاسی موضوعات کی طرف راغب ہیں۔ اردو کے لکھنے والے سیاسی موضوعات پر لکھتے ہیں لیکن ان کے

پ نما ... سکتی ہیں۔ ممکن ہے وہ معاشرے میں پوری طرح INVO-
یں شدت نہیں ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ آپ کو پتا ہے ہمارے ہاں جہیز کی لعنت ہے
نہ ہوں۔ مختصر یہ کہ سیاسی طنز کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک واقعہ کو ایسا ہولناک تھا کہ تین لڑکیوں نے جہیز نہ ہونے کی بنا پر خودکشی LVE-
اموات ہو جاتی ہیں۔ ایک واقعہ تو ایسا ہولناک تھا کہ تین لڑکیوں نے جہیز نہ ہونے کی بنا پر خودکشی
لی تھی۔ مجھے اس سانحہ نے دہلا دیا لیکن میں نے اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا نہ ہی اردو کے کسی
ر مزاح نگار نے اس پر لکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے سلسلے میں ہم لوگ بے حسی کا شکار ہوتے
رہے ہیں اور دہی سیاسی طنز کنہیا لال کپور سے شروع ہوتا ہے۔
وال ..... شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" بھی تو سیاسی طنز کی ایک اعلا مثال ہے؟
واب ..... جی ہاں لیکن دیکھا جائے تو "سودیشی ریل" سیاسی طنز کی منفی مثال ہے کیونکہ یہ طنز
نگریزی اقتدار کے حق میں تھا۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ شوکت تھانوی نے پہلی بار اپنے
معاشرے کا مذاق اڑانے کی کوشش کی، یعنی اپنے اوپر ہنسنے کی ایک کوشش۔ اکبر الٰہ آبادی کو دیکھیے
ان کی شاعری سرسیّد کی تحریک کے خلاف تھی۔ انھوں نے ترقی کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن
انھوں نے یہ کام جس فن کارانہ طریقے سے انجام دیا۔ اصل اہمیت اس کی ہے۔ پطرس بخاری اور
مشتاق احمد یوسفی دونوں بڑے مزاح نگار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جتنا لکھا
ہے بہت ہی خوب ہے۔ ادبی لحاظ سے تعین کریں تو پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے بعد مشتاق احمد
یوسفی ہی کا نام آئے گا لیکن یہ تعین کرے کون ۹۔ اردو میں طنز و مزاح کا کوئی ناقد ہی نہیں ہے۔
سوال ..... کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں سنجیدہ سطح پر طنز و مزاح کو دوسرے درجے کی
چیز سمجھا جاتا ہے۔ مزاح نگاروں کو انٹرٹینر سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔
جواب ..... یہ بات بالکل درست ہے ہمارے ہندستانی نقاد شمس الرحمٰن فاروقی طنز و مزاح کو اس
لائق ہی نہیں سمجھتے تھے کہ اس پر سنجیدگی سے کوئی بات کی جائے۔ لیکن اب ان کا رویہ تبدیل
ہوا ہے۔ یہ طنز کا عہد ہے معاشرے میں اتنے تضادات پائے جاتے ہیں کہ ان کی نشان دہی
کے لیے طنز سے بہتر کوئی اور صنف نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہنسنے ہنسانے والوں کو
ابتدا ہی سے انٹرٹینر سمجھنے کی روایت رہی ہے۔
سوال ..... نقادوں کے اس رویّے کی آپ کیا توجیہہ کریں گے۔
جواب ..... مسئلہ یہ ہے کہ جو صاحب بھی ایم اے پاس کر کے اردو کے استاد ہو جاتے ہیں وہ لازماً
نقاد بھی بن جاتے ہیں۔ حالانکہ استاد انگریزی کے بھی ہوتے ہیں لیکن وہ تو نقاد نہیں بنتے۔
عثمانیہ یونی ورسٹی میں ہمارے انگریزی کے ایک استاد تھے دوراتے سوامی انھوں نے ایک بھی
تنقیدی مضمون نہیں لکھا لیکن استاد وہ بڑے تھے۔ ان کا لیکچر سننے کے لیے کلاس روم میں طلبہ
کی ایک بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ یونی ورسٹی میں اردو پڑھانے والا ہر
ٹیچر قلیپ نگاری شروع کر دیتا ہے۔
سوال ..... لیکن ان استادوں کے پاس فلیپ لکھوانے کے لیے بھی تو ادیب ہی جاتے ہیں۔
جواب ..... جی ہاں ادیب ہی انھیں نقاد بنا دیتے ہیں اور پھر ادیب ہی ان کی شکایات بھی کرتے

ہمانے مزاح کا راستہ اختیار کیا۔

سوال ..... ہندستان میں جو لوگ مزاح لکھ رہے ہیں آپ ان میں کس کس کو اہمیت دیتے ہیں؟

جواب..... ادھر پچیس برسوں میں ہندستان میں مزاح کا ایک خاص ماحول بنا ہے حیدرآباد دکن میں ہم نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی اور ۱۹۶۲ء میں ایک طنز و مزاح کانفرنس منعقد کی۔ نثر کو اسٹیج پر پیش کرنے کا تجربہ اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ دس پندرہ ہزار کے مجمع میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین پڑھے گئے۔ کرشن اس تجربے سے بہت متاثر ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح مخدوم محی الدین نے کیا تھا۔ اس وقت بھی کہا گیا تھا کہ ان مسخروں کو کیوں اہمیت دی جا رہی ہے۔ مخدوم صاحب پر دباؤ ڈالا گیا کہ اس کانفرنس میں شرکت نہ کریں۔ سنجیدہ شاعروں نے اس کانفرنس کا باقاعدہ بائیکاٹ کیا۔ لیکن یہ کانفرنس کامیاب رہی پھر یہ ہندستان کے مختلف شہروں میں ہوئی اور اب پاکستان میں طنز و مزاح کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کے لیے میں یہاں یا ہوں۔ ہماری یہ کانفرنس ہندی والوں کو بہت پسند آئی انھوں نے ۱۹۶۸ء میں "قہقہے" کے ام سے کانفرنس منعقد کی۔ ہماری کانفرنسوں میں لوگ ٹکٹ خرید کر آتے ہیں۔ یہی حال مشاعروں ا ہے جس میں بارہ پندرہ ہزار کا مجمع ہوتا ہے۔

جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے کہ مزاح کون لوگ لکھ رہے ہیں تو ایک ہمارے یوسف ناظم ماحب ہیں جنھوں نے بہت لکھا ہے پھر ہم نے بہت سے سنجیدہ لکھنے والوں کو مزاح لکھنے کی رف مائل کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں مسیح انجم، نصرت ظہیر، رشید قریشی، پرویز یداللہ مہدی، ور فیاض احمد فیاض وغیرہ ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہندستان سے زیادہ چھا مزاح لکھنے والے موجود ہیں۔ اور ہاں آپ نے جو پوچھا تھا کہ پاکستانی اور ہندستانی مزاح نگاروں ما کیا فرق ہے؟ میرے خیال میں ہندستان میں طنز و مزاح عام فہم ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ وہاں لسانی حالات بھی ایسے ہوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً یوسفی صاحب کی طرح زبان اب وہاں نہیں ھی جا سکتی۔ ابراہیم جلیس ابن انشا کی زبان چل جائے گی۔ پطرس کی زبان بھی لکھی جا سکتی ، لیکن رشید احمد صدیقی کی زبان اب نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) دستان کے مقبول ترین کالم نگار ہیں۔

ال..... کوئی اصناف جواب کہنا چاہیں؟

اب..... پاکستان میں انشائیے پر جو بحث جاری ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

ایک کتاب کا صدمہ محو نہیں ہوتا کہ ان کی دوسری کتاب چھپ جاتی ہے۔

حمزہ فاروقی خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔
کہاں تک پڑھے ہیں، اس کا علم انھیں کو ہوگا۔
یکن جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے، ہم اس کے
ی شاہد ہیں۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی
ں اور اتنی ہی زیرِ طبع ہیں۔ ان کا کتابیں لکھنے
ا طریقہ دنیا سے نرالا ہے۔ کبھی تو وہ مہینوں کے
یے گھر سے غائب ہو جاتے ہیں اور جب واپس
تے ہیں، تو ان کے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا
سودہ ہوتا ہے۔ کبھی مہینوں کے لیے گھر سے باہر
لنا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ دنیا ترک
یتے ہیں اور جب گھر سے باہر نکلتے ہیں، تو تب
ی کوئی نئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔
ہلی صورت میں وہ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں، نئی
نزلوں اور نئی وادیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، پھر
پنے اس مشاہدے کو صفحۂ قرطاس پر سفرنامے
ی صورت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے تین سفرنامے
ائع ہو چکے ہیں جو ان کی آوارہ گردی کا دستاویزی
بوت ہیں۔ یہ سفرنامے مقبول ہی نہیں ہوئے مصنف
ی رسوائی کا سبب بھی بنے ہیں، کیونکہ ڈاکٹر انور سدید
نے اپنی تحقیقی کتاب "اردو سفرنامے" میں ان
فرناموں کی خاصی تعریف کی ہے۔ مصنف کے

اور ہمارے بعد ڈاکٹر انور سدید تیسرے آدمی ہیں،
جنھوں نے ان سفرناموں کو اردو ادب میں اضافہ
قرار دیا ہے۔ جب تک کوئی چوتھا آدمی ہم تینوں
کی رائے سے اختلاف نہیں کرتا، اس وقت تک
کے لیے انشاء اللہ یہ سفرنامے اُردو ادب میں
اضافہ شمار ہوتے رہیں گے، خواہ ان کے بوجھ سے
اُردو ادب کی کمر ٹوٹ جائے۔ واضح رہے کہ ہم
تینوں کی رائے سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔
اس کے لیے حمزہ صاحب کے سفرنامے پڑھنے
ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہفت خواں طے کرنا ہر
ایک کے بس کی بات نہیں۔

حمزہ فاروقی پائے طلب توڑ کر اور دنیا
سے مُنہ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جو کام کرتے ہیں،
وہ تحقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس قسم کا ان کا پہلا
کام "سفرنامۂ اقبال" کی صورت میں منظرِ عام پر
آچکا ہے۔ اس میں اس سفر کی روداد ہے، جو
علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے
میں ۱۹۳۱ء میں کیا تھا۔ اس سفر سے متعلق معلومات
اس زمانے کے اخبارات میں بکھری ہوئی تھیں۔
حمزہ صاحب نے ان منتشر معلومات سے ایک
مربوط اور مسلسل سفرنامہ مرتب کر دیا۔ ایسا محسوس

موصوف جوش خطابت میں اسکرین توڑ کر باہر نہ آجائیں۔

مولانا نے کچھ عرصہ قبل شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ "جنھیں میں نے دیکھا" شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے ان تمام دعوتوں کا ذکر کیا تھا جو ان کے مدوحین نے ان کے اعزاز میں دی تھیں۔ کہیں بگھارے بینگنوں کا ذکر تھا اور کہیں بہاری کبابوں، قورمے اور بریانی کے مسالوں کا تذکرہ تھا۔ بہاری کے چٹخاروں کا ذکر پڑھ کر تو ہمیں بھی اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کی تقلید کے نتیجے میں معدہ کئی روز تک آہ و فغاں کرتا رہا اور ہم ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنے رہے۔ اس تصنیف لطیف کے مطالعے سے ہمیں خیال آیا کہ کاش ہم میں بھی اتنی استطاعت ہوتی کہ مولانا کی چند پُرتکلف دعوتیں کرتے اور اس طرح اس کتاب کے کسی حاشیے میں ہمارا ذکر بھی آجاتا۔

خاکوں کے اس مجموعے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کی طبیعت میں بے حد انکسار ہے۔ وزارت کے منصب عالیہ تک پہنچنے اور ہیڈ ماسٹروں جیسی وردی پہننے کے باوجود وہ بہت عاجزی کے ساتھ اہل علم سے ملتے تھے حالانکہ آپ جس منصب پر فائز تھے، اس کے حوالے سے اچھے اچھوں کو عاجز کر سکتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں مولانا کی وزارت سے زیادہ وزارت والی وردی اچھی لگتی تھی۔ یقیناً یہ وردی ان کے پاس اب بھی ہوگی۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر وہ اس وردی کو کراچی کے نیشنل میوزیم میں جمع کرا دیں، جہاں زمانۂ قدیم کے بادشاہوں کے لباس محفوظ ہیں۔ جب کبھی مولانا صاحب سے ملنے کو جی چاہے گا، ہم ان کی وردی کی زیارت کر لیا کریں گے۔

مولانا صاحب کے کمالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ سیاست، شاعری، مضمون نگاری اور صحافت کے ساتھ ساتھ بہادگی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ جس کا بہترین اظہار ایوب کی کنونشن مارکیٹ میں ہوا تھا۔ شورش کاشمیری مرحوم کے بالمقابل مولانا صاحب نے جس طرح داد شجاعت دی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس معرکے کی تفصیل مولانا صاحب نے اپنی کتاب "جنھیں میں نے دیکھا" میں دی ہے۔ یہ ان کی منکسر المزاجی تھی کہ اس معرکے میں اپنی جیت کا ذکر آپ نے دبے لفظوں میں کیا ہے اور زیادہ تر شورش مرحوم کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

مولانا نے اپنے دورِ کمال میں "دیدہ ور" لکھی اور دورِ زوال میں روس کا سفرنامہ تحریر فرمایا۔ دونوں میں واقعہ نگاری سے زیادہ شاعری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ ایک میں ان کے ممدوح بھٹو تھے اور دوسری کتاب میں گورباچوف۔ ان کتابوں کی موجودگی میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا صاحب، جس کو پسند فرماتے ہیں، اسی کے گن گاتے ہیں۔ حاسدین بد انجام ان کو ٹیڑھیاں سناتے ہیں۔ لیکن اللہ نے چاہا تو حاسدین خائب و خاسر رہیں گے اور مولانا اپنے محسنوں کے گن گاتے اور قلم بہاتے رہیں گے۔

مخلص۔ حمزہ فاروقی

ایوا زللر

مترجم: منیرالدین احمد
ہمبرگ ۱۳ ویسٹ جرمنی

مصدقہ سیاہ فام

(ایوا زللر (Eva Zeller) پیدائش ۱۹۲۳ء۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۵۶ء تک مشرقی جرمنی میں، پھر چھے برسوں تک جنوب مغربی افریقہ میں قیام کرنے کے بعد ۱۹۶۲ء سے مغربی جرمنی میں رہایش پذیر ہیں۔ ایوا زللر ان محدودے چند خاتون افسانہ نگاروں میں سے ہیں، جنھیں جرمن ادب کے ایوانوں میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ پیدا کرنے میں کامیابی ہوتی ہے۔ (مترجم)

جب ویرما اور پیڈرو مجسٹریٹ کے آفس کی طرف گئے تو ہوا چل رہی تھی۔ پرُوا ویرما کے پیٹ کو اس کے دبلے بدن پر اس طرح نمایاں کر رہی تھی، کہ زچگی کی قمیص بھی کچھ نہ چھپا پاتی تھی مگر سڑک پر کوئی شخص نہیں تھا۔ کیونکہ ایسے موسم میں انسان کسی کتے کو بھی باہر نہیں دھتکارتا۔ وہ بہت سویرے آگئے تھے۔ پیڈرو نے بند دروازے کو کھٹکھٹانے کی جرأت کی۔ ویرما نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا اس طرح کہ اس نے اپنے آپ کو دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیا۔ بچہ اس کے پیٹ میں یوں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، جیسے کانٹے پر لگی ہوئی مچھلی۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے گھٹنوں کو ٹھوڑی تک کھینچ لیا۔

پیڈرو کے پاس ایک کالی ڈائیل پلیٹ والی سنہری گھڑی تھی۔ اس پر پچیس پونڈ لگے تھے کیونکہ وہ خود بخود چابی دیتی تھی۔ ایک سیکنڈوں والی سوئی پورے بھرم کے ساتھ گھومتی رہتی تھی، جیسے روشنی کے مینار کی سرچ لائٹ راتوں میں پانی پہ۔ ویرما نے گھڑی پر دیکھا کیونکہ پیڈرو اس کے پہلو میں لکڑی کے واحد زینے پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے بازوؤں کو اپنے سینے پر خم کیے ہوئے تھا۔ نو کا وقت گزر چکا تھا۔ انھیں نو بجے آنے کو کہا گیا تھا۔

"وہ آج نہیں آئیں گے۔" ویرما نے کہا: "پرُوا چلنے پر وہ نہیں آتے۔"

"وہ ضرور آئیں گے۔"

"اگر وہ آئے تو تمھیں اندر کر دیں گے۔"

پیڈرو مسکرایا۔ اس نے ایک سگریٹ نکالا اور ہوا کے ایک جھونکے کے گزر جانے کا انتظار

گیا تا کہ لائٹر کو ہاتھ کی اوٹ میں جلا سکے۔ شعلہ اس جلتی ہوئی ہوا میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پیڈرو نے سگریٹ کو پھینک دیا اور تھوک اگل دیا کیونکہ اس کا منہ ریت سے بھرا ہوا تھا۔

مجسٹریٹ کے دفتر کے سامنے ایک باغیچہ تھا، دراصل خشکی سے گھرا ہوا ریت کا ایک ٹکڑا جس کے درمیان پرانی کھجور کا ایک درخت کھڑا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ کھجور ریت کو اپنے چھڑے جیسے پتوں سے جو ہرے نہیں بلکہ بھورے تھے اور اس روشنی میں کپڑے کے کترکوں کی طرح دکھائی دیتے تھے، تازیانے مارتی تھی۔ جب ہوا رک جاتی تھی، تو کھجور سیدھی کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنے منتشر پنکھوں کو ناقابلِ یقین سرعت کے ساتھ ٹھیک کر لیتی تھی اور پھر کھجور بن جاتی تھی سادہ، کھردری اور خوبصورت، جیسی صرف کھجوریں ہو سکتی ہیں۔ اگر ہوا تیز ہو جاتی تھی، تو وہ پھر کانپنے لگتی تھی اور کھڑکھڑانے لگتی تھی یہاں تک کہ ایسے زمین پر جھکا دیا جاتا تھا۔ پھر پیڈرو نے ویرما کا سر پکڑا اور اسے اپنے کوٹ کے نیچے ٹھونس دیا، اگرچہ طوفان دہاڑ رہا تھا، وہ اس کے دل کا اس کی پسلیوں سے لگ کر دھڑکنا سن سکتی تھی اور اس کی گھڑی، جب اس کا بازو اس کے کان کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ اس کے گلے سے پسینا رس رس کر اس کے بالوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس کے کوٹ کے تاریک غار میں ویرما ہر بار مطمئن ہو جاتی تھی مگر جب وہ ہوا کے وقفوں میں سیدھی ہو کر بیٹھتی تھی تو کانپتی تھی، کیونکہ مجسٹریٹ کو اب جلد آنا چاہیے۔

"ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم یہاں پر سے ہو گئے ہیں۔"

"اور اگر مجھے آج شام تک بیٹھنا پڑے۔" پیڈرو نے کہا۔ "آج معاملے کو درست کرنا ہوگا۔"

"وہ تمہیں اندر کر دیں گے۔ تم ابھی تک سمجھتے ہو کہ یہاں پر ویسے ہی ہے جیسے تمہارے ملک میں۔"

"اس کے برعکس میرے ننھے موتی۔ میں نے خوب تیاری کر رکھی ہے۔ تم حیران ہو کر رہ جاؤ گی۔"

پیڈرو نے پھر ویرما کا سر اپنے کوٹ کے نیچے ڈھکا اور اس کے ساتھ جھک گیا۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ ریت تھی، ہوا ریت سے بھری ہوئی تھی۔ گویا صحرا نے رختِ سفر باندھا تھا۔ آخر کار اپنی پیاس کو سمندر پر جا کر بجھانے کے لیے اور سمندر تھکے پیٹ گیا تھا اور اسے زبان نکال کر دکھا رہا تھا۔ پیڈرو دیکھ سکتا تھا، جب زہریلے نیلے رستے گزر جاتے تھے۔ روشنی کے مینار کے صرف سرخ رنگے ہوئے حصے جو اجڑ النظر آتے تھے جیسے سراب یا بعض اوقات جلتے بجھنے والی نشانیاں جو صرف اس وقت چمک اٹھتی تھیں جب ریت کا ریلا گزر جاتا تھا اور جن کا مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ سورج ایک ٹکڑے کی طرح تھا جو بے اصل رہا تھا۔

دوپہر کے لگ بھگ گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ پیڈرو اکیلا سامنے کی بار میں جا کر بیٹھ سکتا تھا۔ ایک اونچے اسٹول پر پنکھے کے قریب۔ جبکہ ویرما وہاں پر ساتھ نہ جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے پیڈرو جھکا ہوا سڑک کے پار گیا اور سوڈا واٹر اور سینڈوچ لے آیا تو ویرما کھا نہیں سکتی تھی مگر اس نے اسے اپنے کوٹ کے نیچے کھلایا، جیسے وہ پر ٹوٹا بگلا تھی۔

ایک بجے پیڈرو اکتا گیا۔ یکدم جیسے آدمی دیکھ رہا ہو، پھر ریا بال خشک کر کے بولنے لگے کو بند

[illegible] تھا کہ اسے کوئی نقصان دہ [illegible] تھا۔ [illegible] اور
کر دیتا ہے۔ [illegible] سمندر کی طرف گئے [illegible] نہیں [illegible]
پیڈرو اٹھ کھڑے ہوئے اور ساحل سمندر کی طرف [illegible]
حیران ہوتے ہیں یہ دیکھ کر کہ ساحل اور سمندر کے درمیان ایک [illegible]
نے نہیں پایا جاتا تھا۔ ایک خوبصورت [illegible] سمندر کے بیچ [illegible] جاتی
تھی۔ انھوں نے اپنے جوتوں کو [illegible] پر چلنے لگے۔ ان کے پیچھے ان کے نقش [illegible]
جلد ڈھے جاتے تھے جیسے وہاں سے کوئی [illegible] ہوں۔ پل کے ستونوں کے [illegible] جہاں تک
پانی نہیں جاتا تھا، اپنے [illegible] پایوں کو [illegible] بیٹھے تھے۔ [illegible] پل کی تعمیر [illegible] ہونے
والی تھی، مگر ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

"یہ یہاں پر تم بیٹھک [illegible] ہو۔" پیڈرو نے کہا۔ ویرما ہنس دی اور اپنی [illegible] آواز میں
گانے لگی، جس کے سبب پیڈرو کو اس سے پہلی پہل محبت ہو گئی تھی۔

اس اثنا میں وہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جسے لوگ یہاں پر [illegible] کا موڑ کہتے ہیں۔ اس
وقت آسمان قدیم چرچ کی کھڑکیوں والے نیلے رنگ کو دھار لیتا ہے اور اتنا قریب ہوتا ہے کہ
انسان گمان کرتا ہے کہ اگر وہ اچھی طرح اپنے آپ کو کھینچے تانے تو اسے چھو سکتا ہے۔ آسمان
اور ساحل کے درمیان فضا بے شمار موم بتیوں سے جیسے سنہری ہو جاتی ہے۔ ایسی سہ پہروں میں
محبت کرنے والے جوڑے ساحلی ریت کے تودوں کا رخ کرتے ہیں۔

میں ساحلی ریت کے تودوں کو دکھانا بھول گئی ہوں، اگرچہ وہ ہر طرف سے دکھائی دیتے ہیں،
کیونکہ وہ روشنی کے مینار سے بھی اونچے ہیں۔ جب تک تیز ہوا چلتی ہے، انسان بغیر بہت زیادہ قوتِ
واہمہ کے یہ تصور کر سکتا ہے کہ شیر سمندر کے سامنے پڑے ہیں، جن کے بالوں کو ہوا کھینچ رہی ہے،
جن کے رانوں کی نوکیلی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوتی ہیں اور جن کے پہلو دبے ہوئے ہیں۔ انسان انھیں
پانی کے ریلے پر غراتے ہوئے بھی سن سکتا ہے، جو ڈر کے مارے اور پھنکارتے ہوئے پسپائی
اختیار کرتا ہے جب تیز ہوا تھم جاتی ہے، تو اڑتی ہوئی ریت نے ہر تپتے ہوئے گڑھے میں ایک
بستر بچھا دیا ہوتا ہے، جو دنیا کے سارے بستروں سے زیادہ [illegible] ہے۔

ساڑھے تین بجے ویرما اور پیڈرو واپس گئے۔ ویرما رونے لگی۔ کیونکہ وہ اس کے سوا کچھ
اور نہیں سوچ سکتی تھی کہ یہ جدائی کا پیش خیمہ تھا۔ مجسٹریٹ چار بجے آیا۔ اس کی کار تیغوں کے
نیچے سے گزری۔ ویرما اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کپڑے سیدھے کیے۔ پیڈرو دیکھتا رہا اور اس نے
ایک سگریٹ سلگا لیا۔ مجسٹریٹ اور دو دوسرے آدمی ان کے پاس سے گزر گئے۔ انھوں نے دروازہ کھولا
اور اپنے پیچھے پھر بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پیڈرو کے سر کے اوپر ایک کھڑکی باہر کی طرف
کھولی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کی کارنس سے ایک بوری نیچے سرک گئی، کیونکہ گیلی بوریوں کے
ساتھ لوگ اپنی کھڑکیوں کو باہر سے ریت کے جھکڑ کے سامنے مورچہ بند کرتے ہیں۔ چونکہ بوری کو
اکثر کھارے پانی سے نچوڑا اور پھر سکھایا گیا تھا، اس لیے وہ کڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ پہلے
نمک کی [illegible] پیڈرو نے [illegible] بیچ میں پھینک دیا اور

ہکلا ہکلا کر کے اشارے کرنے لگا، یوں کہ ویرما پھر رونے لگی۔ اس سے پیڈرو میں اور بھی زیادہ دلیری آ گئی، اگر اس کا مزید کوئی امکان پایا جاتا ہے۔ وہ اٹھا اور اس نے سچ مچ سگریٹ کو اپنے ہونٹوں میں دباتے ہوئے ویرما کو پکڑا اور مجسٹریٹ کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

مجسٹریٹ کا دفتر براؤن تھا اور ایک کانے بادام کی طرح خالی، درمیان میں ایک جنگلہ اور اس کے اوپر ایک موٹی مٹی کے ذرات سے چمکتی ہوئی سورج کی کرن جو کمرے کی واحد کھڑکی سے آ رہی تھی اور کمرے کو دو تاریک حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ پیڈرو نے ویرما کو جنگلے کے اس طرف کی واحد کرسی پر بٹھایا جس کا اس معاملے میں رواج نہیں تھا، ہکلا ہکلا تے ہوئے کہنے لگا: "خبردار جو تم اٹھو، جب یہ سفید کے پھونگڑے آئیں۔"

پہلے ایک آدمی آیا جو سکریٹری نکلا اور جو وہاں پر اس لیے تھا کہ ہر لفظ کو جو بولا جائے گا، نوٹ کرتا جائے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پیڈرو سے پوچھا، اور کوئی شخص اس سے اس وجہ سے ناراض نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس گرمی میں اس سے زیادہ مودب نہ تھا۔

"ہمیں نو بجے بلایا گیا تھا" پیڈرو نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب چار بج رہے ہیں۔"

"ہم سے کیا مراد ہے۔" سکریٹری نے پوچھا۔ اس نے اس کے ساتھ کندھوں کو اوپر کی طرف کھینچا جیسے اسے سردی لگ رہی ہو، مگر وہ صرف سورج کی کرن کے پار ویرما کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"میری منگیتر اور میں۔" پیڈرو نے کہا۔ "میرا نام ایا زہے۔"

اس پر سکریٹری انبساط سے اٹھا اور مجسٹریٹ کو بلا لایا۔

مجسٹریٹ اپنے ساتھ تیسرے آدمی کو بھی لے آیا، جس کی، جیسا کہ پیڈرو نے دیکھا، صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسری کانچ کی تھی۔

"آپ افریقان بولتے ہیں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"یہ امر پیش قدمی کے مترادف ہے۔" مجسٹریٹ نے کہا۔ "اگر انسان ایک جیسی بولتا زبان ہو تو آسانی رہتی ہے۔"

جب پیڈرو نے کوئی جواب نہ دیا، تو اس نے بات کو جاری رکھا۔ "تو ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔ آپ پیڈرو ایاز ہیں، پرتگالی شہریت۔"

"جی ہاں۔"

"عمر؟"

"۲۳"

"پیشہ؟"

"میں مچھیروں کی کشتی چلاتا ہوں۔"

"پھر تو آپ کا کاروبار خوب چلتا ہوگا۔ میرا بیان ہے پیلشارڈ اور شیٹن پر اس مچھلیاں امسال خوب موٹی ہوں گی۔"

ب نما [illegible] اور شیلن پولس پہلیوں کے بارے میں لوگ باتیں کرنے [illegible]

"میرا [illegible]

"خوب" مجسٹریٹ نے اپنا سر ڈھول کی کرسی کے نیچے سے باہر نکالا" مگر جلد ہی [illegible]

، چند ھیا جانے کے سبب اسے واپس کھینچ لیا۔" ایک بہت ہی مندا قصہ ہوگیا ہے۔"

"کیسا قصہ؟"

" مہینے کی چھٹی تاریخ کو میرے سامنے پیش ہوا۔" مجسٹریٹ نے اب کھینچے ہوئے سرکاری [illegible]

یں بڑھا۔ "محترم مے نیر نیلیز فان ڈین برگ، پیشہ کے اعتبار سے آلوے ٹیکسٹائل پی ٹی وائی لمیٹڈ

کا نمائندہ، اور اس بات کے ثبوت رکھنے کا دعوا کیا کہ آپ سفید فام پرتگالی مے نیر پیڈرو

یار نے سیاہ فام ویرما ہینڈرینا مارتھا ہا ٹیلو نگو کو حمل کر دیا ہے۔ قانون کے پیشِ نظر مجھے آپ

کو بلانا پڑا، تاکہ آپ اس کا جواب دیں، کیا کہتے ہیں آپ اس بارے میں؟"

"بہت کچھ، مے نیر..."

"بہت زیادہ نہیں، اگر آپ میری بات مانیں۔" مجسٹریٹ نے پھر ایک کرسی کے نیچے سے

دیکھنے کی کوشش کی۔ "میں ایک انسان ہوں، مے نیر۔ میرے لیے آپ کا حلف کافی ہے کہ آپ

کے خلاف باتیں پھیلائی گئی ہیں۔ میں..."

"اگر کسی کو جواب دہ ہونا ہے، تو اسے بولنے کی اجازت ہے یا نہیں؟"

"خوب، تو آپ کیا کہتے ہیں۔"

"مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مے نیر فان ڈیر مروے یا فان ڈین برگ یا جو بھی اس کا نام ہے

کو اپنی ناک دوسروں کے معاملات میں نہیں گھسیڑنی چاہیے۔ اوّل و دوم میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں

کہ میں اس لنگوروں کے ملک میں کیوں اپنی منگیتر کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اب میں بول

رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ کی باری ہے۔ بشرطیکہ آپ کو کچھ کہنا ہوگا۔ آپ مجسٹریٹ ہیں اور میں

ایک پرتگالی ہوں۔ جو اپنی منگیتر کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر سب ٹھیک ہوتا، تو میں ایک

سال پیشتر یہاں پر آپ کے سامنے کھڑا ہوتا تاکہ آپ ہمارے بیاہ کو رجسٹر کرتے۔ پھر ہم دونوں کا

ایک دوسرے کے ساتھ کسی اور سلسلے میں معاملہ نہ پڑتا۔"

"آپ گویا تسلیم کرتے ہیں.....؟"

"اب میں بول رہا ہوں۔ مے نیر مجسٹریٹ۔ میں نے کچھ تسلیم نہیں کیا ہے، میری ذاتی زندگی سے

آپ کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پرتگال میں مجرموں کو جوابدہ ہونا پڑتا ہے، قاتلوں کو [illegible]

کو میں کیا جانوں اور کسے یہاں پر ہر ایک شریف آدمی کو جوابدہ ہونا پڑتا ہے جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔

یہ سب کچھ تو میں کہنا نہیں چاہتا تھا" پیڈرو نے کرب کھاتے ہوئے سوچا، جب کہ وہ [illegible]

جاتا تھا جیسے چابی لگی ہوئی ہو۔ اب منہ کو روکو اور وہ کہو، جو تم نے زبانی یاد کر رکھا ہے: اس وجہ

سے میں درخواست کرتا ہوں..... مجسٹریٹ کیسی نظروں سے ویرما کو گھور رہا ہے' ہاں میرے پیارے دوست

بعض اوقات ایسا خاندان در امتزاج پیدا ہو جاتا ہے' کیوں؟ امید ہے کہ وہ اپنی کرسی پر پیچھے [illegible]

جائے گی۔

"... مختصراً میں اس ملک کے قوانین کو جانتا ہوں، جن کی رو سے میں ایک جرم کا ارتکاب کرتا
گر میں ایک سیاہ فام کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے اس چیز کو نہیں چھپایا، جیسے شاید کوئی دوسرا
گہ پہ کرتا۔ میں ایک سال سے اس لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کامیابی
ہوتی۔ اس کا باپ سفید فام تھا اور ماں سیاہ فام تھی۔"

"پھر تو اس کو سفید فام قرار دیا جا سکتا ہے، بھائی، اگر اس کا باپ سفید فام تھا..."

اس پر پیڈرو بازوں کو خم کیے ہوئے دھول کے پار جھکا اور ایک ایسی آواز میں کہنے لگا،
وہ مجسٹریٹ کی سماعت کو ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ حساس ادراک تک رسائی چاہتا تھا۔
ہ اپنی دونوں بہنوں کی طرح باپ کے ذریعہ رجسٹر نہیں کروائی گئی، تاکہ سفید فام قرار پاتی۔
اس کی پیدائش سے تھوڑا پہلے غائب ہو گیا تھا اور ڈھونڈے سے نہیں ملتا ہے۔ ہم نے
ریوں اور مجسٹریٹوں کو لکھ لکھ کر اپنی انگلیاں زخمی کر لی ہیں۔ وہ غائب ہو گیا ہے۔ اس وجہ
میری منگیتر اپنی ماں کی طرح سیاہ فام گنی جاتی ہے۔ سمجھے آپ؟"

"کیا اس کا باپ یہاں پر مقیم رہا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"یونکرپیٹ کوک"

"پیدائش؟"

"۱۹۱۰ء کیٹ منسہوپ میں۔"

"اس کا فائل لے آؤ۔" مجسٹریٹ نے سکریٹری سے کہا۔

اس کی فائل کے آنے میں کافی وقت لگ گیا۔ جیسے کسی حکم پر تینوں مردوں نے سگریٹ سلگا لیے
ھول اور روشنی کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کرنے لگے۔

تب مجسٹریٹ نے یونکرپیٹ کوک کا فائل کھولا۔ پیدائش ۱۹۱۰ء کیٹ منسہوپ میں، جلد
نگ سفید۔ ایک بیٹی ایولن ماریا، پیدائش ۱۹ رجون ۱۹۴۴ء لیوڈے رٹمنر میں۔ ماں ہینڈے
ہائی لونگو۔ پیدائش ۱۹۳۰ء رے ہوبوٹ میں، جلد کا رنگ سیاہ فام۔ ایک بیٹی کوسٹانزیا
گے۔ پیدائش ۸ رمئی ۱۹۴۵ء وال فش بنجت میں۔ جلد کا رنگ سفید۔ ماں ہینڈے رینا ہائی
و۔ پیدائش ۱۹۳۰ء رے ہوبوٹ میں۔ جلد کا رنگ سیاہ فام۔ آگے کچھ نہیں لکھا ہے۔

مجھے پتا ہے آگے کچھ نہیں لکھا ہے اور آپ اس کے اضافے میں کچھ نہیں لکھ سکتے ہیں۔
ں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ واضح ہے کہ ہم کبھی کے میری کشتی میں چلے
ہوتے۔ انگولا میں مثال کے طور پر ہم شادی کر سکتے ہیں۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے، میرا
نگ میں نے ایک پلاٹ خریدا ہے اور اس پر ایک مکان بنانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ
ں نے مقیاس عمق البحر خریدا ہے، جس کی قیمت ابھی مجھے ادا کرنی ہے۔ میں اپنے پیچھے قرض
ڑ کے جانا پسند نہیں کرتا ہوں۔ سمجھتے ہیں آپ؟ میں اس چیز کو یہیں پر طے کرنا چاہتا ہوں۔

اس لیے میں جناب مجسٹریٹ صاحب سے ان دونوں محترم گواہوں کی موجودگی میں درخواست کرتا ہوں کہ میں پرتگالی پیڈرو ایاز، جلد کا رنگ سفید، اس ملک میں سیاہ فام قرار دیا جانا چاہتا ہوں، تاکہ میں اپنی منگیتر ویرما ہینڈے رینامار تھا باق لانگو، جلد کا رنگ سیاہ فام، جس کو میں نے حاملہ کیا ہے، کے ساتھ بالآخر بیاہ رچا سکوں۔ نظام کی پابندی ضروری ہے۔"

پیڈرو نے اپنے آپ کو زبان پر پڑھے لکھوں جیسی قدرت کے ساتھ بولتے ہوئے سنا سکریٹری کا قلم رُک گیا۔ وہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگل کے ساتھ اس سے کھینچا تانی کرنے لگا، جیسے اس کو مرمت کرنا مقصود ہو۔ مجسٹریٹ نے اپنا سر کچھوے کی طرح اندر کھینچ لیا۔ تیسرا آدمی یہ سے نیر نان ڈیمرمروے یا فان ڈیبی برگ یا جو بھی اس کا نام تھا، آنکھیں بھینچے دریا کی طرف گھورے جا رہا تھا، جیسے وہ سراب نظر تھی، جس کا اصلی مقام کہیں دور دراز تھا، مگر گرم اور سرد ہواؤں کے ملاپ کے سبب ٹوٹنے والی شعاعوں کے قانون کے باعث یہاں پر اس کا سایہ پڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ کاریخ کی آنکھ میں بھی چمک در آئی تھی۔ ان نظروں کی بربریت نے ویرما کو اٹھ جانے اور پیڈرو کے پہلو میں جا کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"لکھیں" مجسٹریٹ چلایا۔

"... معززشاہدوں..." سکریٹری ہکلایا۔

"... کہ میں پرتگالی پیڈرو ایاز..." پیڈرو نے لکھوایا۔

"میں امید کرتا ہوں کہ آپ کوئی مذاق نہیں کر رہے ہیں۔" مجسٹریٹ نے تھکاوٹ سے چور ہو کر کہا۔

"میں امید کرتا ہوں مے نیر مجسٹریٹ، کہ جلد ایک کاغذ میرے ہاتھ میں ہوگا جس پر لکھا ہوا ہوگا کہ میں آج سے سیاہ فام ہوں۔"

انور سدید
۱۷۲۔ ستلج بلاک۔ اقبال ٹاؤن
لاہور ۵۴۵۷۰ (پاکستان)

کچھ وقت پاکستانی کتب و رسائل کے ساتھ

کتاب شناسی / مدیران سید عارف نوشاہی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی

"کتاب شناسی" کے عنوان سے سید عارف نوشاہی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ایک نئی وضع کا تحقیقی رسالہ اسلام آباد سے جاری کیا ہے۔ تا حال اس کے دو شمارے خوبصورت ٹائپ میں اور سفید کاغذ پر شائع ہو چکے ہیں۔ اس رسالے کا مقصد کتاب سازی کے فن اور کتاب شناسی کے ذوق کو فروغ دینا اور اس نوع کے قیمتی نوادرات کو منظر عام پر لانا ہے۔ چنانچہ پہلے پرچہ میں "فن جلد سازی" پر روشنی ڈالی گئی تھی اور حافظ محمود شیرانی کی کتاب شناسی پر ایک قیمتی اور معلوماتی مقالہ پیش کیا گیا تھا۔ زیر نظر اس رسالے کا دوسرا شمارہ ہے جس میں ایک نادر مضمون "دیوان غالب" نسخۂ حمیدیہ کی تدوین۔ نو۔ تسوید سے طباعت تک" ہے۔ یہ نسخہ پروفیسر حمید احمد خاں نے مرتب کیا تھا اور مجلس ترقی ادب سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب اس نسخے کی ترتیب و تدوین کے دوران حمید احمد خاں کے معاون تھے۔ وہ ان تمام تبدیلیوں کے شناسا ہیں جو اس کتاب کے مسودے کی تسوید سے طباعت تک عمل میں لائی جاتی رہیں۔ گوہر نوشاہی صاحب نے اس تفصیل کو تحقیقی نظر سے دیکھا اور دستاویزی ثبوت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اس پرچے کے دوسرے قیمتی مضامین میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب کا تحقیقی مقالہ "کبیر کا الف نامہ" اور محمد اقبال مجددی کا "تاریخ قصور کے مآخذ" شامل ہیں۔ کتابت کے لوازم کی تفصیل بیاض خوشگو سے فراہم کی گئی ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے "ہندستانی فارسی میں تلفظ اور املا کے بعض مسائل" کو تدوین کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ تبصرہ کتب کے تحت اشارات تنقید (از سید عبد اللہ) اور مغرب کے تنقیدی اصول (از سجاد باقر رضوی) پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ دفتر کتاب شناسی۔ ۶۹ ماڈل ٹاؤن اسلام آباد سے ۷۰ روپے میں دستیاب ہے۔

غنیمت / زمان کنجاہی

"کاغذی مکان" کے منفرد و ممتاز شاعر زمان کنجاہی نے "رسالہ غنیمت" حال ہی میں

لاہور سے جاری کیا تو اسے خطۂ کنجاہ کے نامور قدیم شاعر مولانا غنیمت کنجاہی سے موسوم کیا۔ اس پرچے
کے پس منظر میں زمان کنجاہی کا ذوق وشوق اور خدمت ادب کا ولولہ موجزن نظر آتا ہے اور انھوں
نے غنیمت کو علمی اور ادبی تحریروں کا ایک قابل قدر مجموعہ بنانے کی پوری کاوش کی ہے۔ چنانچہ مضامین
کے حصے میں سید مسعود ہاشمی کا مقالہ "گجرات میں شاعری" اور جائزے کے تحت بشیر احمد بشیر کا
مطالعہ "طلوع" (محمد فیروز شاہ) اور نئی شاعرہ روزینہ قریشی پر اعزاز احمد آذر کا مقالہ خاصے
کی چیزیں ہیں۔ افسانوں کے حصے میں جمیل زبیری اور طاہر اسلم گورا کے افسانے توجہ کھینچتے ہیں۔
شاعری کے حصے میں محشر بدایونی، آفتاب اقبال شمیم، اقبال کوثر، غلام محمد قاصر، محمد فیروز شاہ
اور جینت پرمار جیسے شعرا شامل ہیں۔

"حرف آغاز" میں زمان کنجاہی نے شکوہ کیا ہے کہ "ادب کا قاری بے حس ہو گیا ہے" اور
لکھنے والے بھی اب تخلیقی سرگرمیوں سے تغافل برت رہے ہیں۔ ان کا تجزیہ یہ ہے کہ۔

"وقت کی اس دوڑ میں ہر آدمی اپنی ذات میں گم دائیں بائیں دیکھے بغیر دوڑا چلا
جا رہا ہے۔"

"غنیمت" کا سرورق بھارت سے جینت پرمار کا تحفۂ محبت ہے۔

کہانی بولتی ہے / آغا بابر

اردو افسانے میں آغا بابر کا طلوع ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ہوا تھا۔ لیکن دلچسپ بات
یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے اثرات کو قبول کرنے کے بجائے زندگی کو ذہین نظر
دیکھا۔ اور اس کے بہت سے انجانے زاویوں کو افسانے کی بنت میں شامل کر دیا۔ ان کے بیشتر
معاصرین اب فن کی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن آغا بابر پر تا حال تھکن کے آثار ہو
نہیں ہوتے۔ آغا بابر نہ صرف مسلسل لکھ رہے ہیں بلکہ وہ سحر بے نام بھی پیدا کر رہے ہیں
جو قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اسے لطافت و مسرت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ لب
"چاک گریباں"، "اڑن طشتریاں" اور "پھول کی کوئی قیمت" جیسے لذیذ مجموعوں کے بعد اب
حال ہی میں آغا بابر نے اپنے افسانوں کا نیا مجموعہ "کہانی بولتی ہے" فیروز سنز لاہور جیسے و
اشاعتی ادارے سے پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا طویل ترین افسانہ "خس کم" ہے جو ۹۵ صفحات پر محیط ہے اور مختصر افسا
ہے جو صرف سات صفحات میں سما گیا ہے۔ ان دو افسانوں کے ساتھ ہماری ملاقات "خالہ تا
"نسوانی آواز"، "نادر علی"، "روشنی کا ڈبہ"، "صبح و شام"، "نیا کاروبار"، "پانڈے"، "وقت
اور "اللہ جانتا ہے" جیسے افسانوں کے ساتھ ہوتی ہے اور ہر افسانہ ہمارے سامنے ایک
جہان حقیقت آشکار کر دیتا ہے۔

آغا بابر کا افسانہ "نسوانی آواز" ان ہری چگ مردوں کا افسانہ ہے جو نئے جنسی ذا
تلاش کرتے کرتے مروجہ اخلاقی حدود عبور کر جاتے ہیں۔ "خالہ تاج" اور "دلاور علی" میں

اجتماعی بدی کا ہدف ہے۔ "روشنی کا ڈبہ" میں زندگی میٹھے معشوقوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ آغا بابر نے افسانے کے ذریعے انسان کے احساس ندامت کو جگانے کی کوشش کرتے اور وہ ہمیشہ ایک مثبت نتیجے کی طرف لاتے ہیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر ایک ایسے تماشا پسند ہیں جو مشہور حقیقت کو بالائے بام رکھ کر خود بھی لذت اندوز ہوتے ہیں اور قاری کو بھی لذت یاب کرتے رہیں۔ ان کا افسانہ پڑھے جانے اور قاری کو اپنے ساتھ بہلائے جانے کی عمدہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر داؤد رہبر کا "پیش لفظ" بھی خاصے کی چیز ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو رنگا رنگ اور متنوع کہانیوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ آغا بابر جہاں جاتے ہیں ڈھکی چھپی حقیقتوں کو پکڑ لاتے ہیں۔ اس قسم کی حقیقت نگاری ایک نقش کہاں تک لے گئے ہیں۔ فسانے ترے" میں ابھرا ہے جو محمد طفیل مدیر نقوش کا خاکہ ہے اور آغا بابر کے افسانے کی طرح لذیذ ہے۔ کتاب کے آخر میں محمد طفیل کا خاکہ "آغا بابر" پیش کیا گیا ہے۔ اس میں محمد طفیل نے آغا بابر کو سامنے لانے کی کامیاب کاوش کی ہے جیسے کہہ رہے ہوں۔

"ہماری نظر سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟

(بقیہ صفحہ ۴۹)

خواجہ منظور حسین، محمد جیسا باد فانوکر، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر علیم، احمد علی، ملک راج آنند، ٹیگور، ڈاکٹر حسین ظہیر اور ان کی بیگم صاحبہ، بیرسٹر صاحب، رشید احمد صدیقی، لکھنؤ جیل کا بڑی بڑی موچھوں والا جیلر سردار چندر سنگھ گڑھوالی، ڈاکٹر گیا پرشاد، جے دیو کپور، شیو ورما، گوہر سلطان، شیخ حبیب اللہ، انصار ہروانی، منشی بلرام سنگھ، اور لکھنؤ جیل میں ملاقات کے لیے آنے والی وہ ہمدرد لڑکی جس کا نام جعفری صاحب نے دانستہ نہیں لکھا، جوش ملیح آبادی، پروفیسر ڈی پی مکرجی، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، فیض احمد فیض، جذبی، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، پال رابسن، ڈاکٹر انصاری، جگر مراد آبادی، چہرہ مانجھی، بوڑھا ماہی گیر، گلینا، ناظم حکمت، آپا عصمت چغتائی، افغانستان کا ڈاکٹر، بلغاریہ کا شاعر لامار، حافظ، رومی وغیرہ۔ غرض کہ سردار جعفری کی یہ تصویریں اپنے گھر سے شروع ہو کر ساری دنیا کی شخصیتوں پر آکر مکمل ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے اتنا بڑا نگار خانہ دیکھ کر کون خوش نہ ہوگا! ●●

ذرا ان کا بھی خیال رکھیے

اگر آیندہ ماہ کا کتاب نما آپ کو نہ ملے تو اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ اور اگر آپ کے ایجنٹ کے پاس نہ پہنچے تو ہو سکتا ہے اس نے اپنا بقایا ادا نہ کیا ہو۔ ایسی صورت میں ایک خط لکھ کر ضرور معلوم کر لیجیے۔
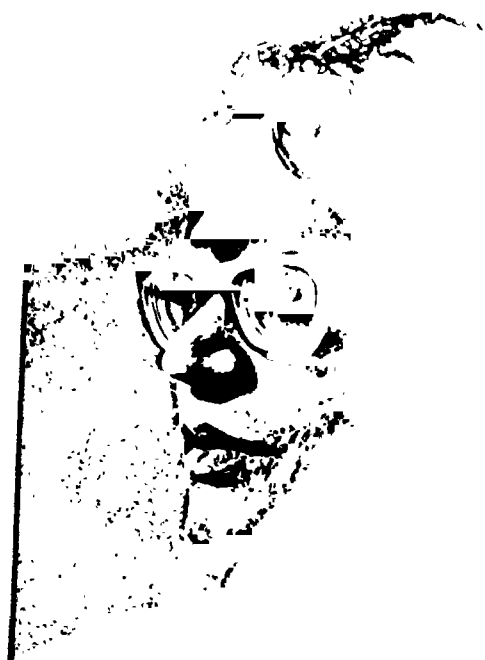
گوشۂ افتخار عارف

پروفیسر مجتبیٰ حسین
(صدر شعبہ اُردو بلوچستان یونی ورسٹی)

افتخار عارف کی شاعری

آج ہمارے شاعروں کے سامنے ایک تشویشناک، زچ کردینے والا اور اسی کے ساتھ بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے —— بلکہ دوسروں سے ہٹ کر کیسے کہا جائے۔

یہ مسئلہ یوں تو ہر دور کے شاعروں کو ستاتا رہا ہے مگر اتنی آزمائش میں ڈالنے والے سفاکانہ انداز میں اس نے شاعروں کو کبھی نہیں للکارا تھا۔ یہ ان شعرا کے لیے بھی عذاب بنا ہوا ہے جو شاعری کو شعور کی اولاد نہیں سمجھتے۔ اپنی تمام غیر شعوری یا بے شعور ذہنی قلبی یا حسّی تحریکات کے باوصف ان شعرا کو یہ بات ہمہ وقت یاد رہتی ہے کہ ان کی شاعری کو بہر طور منفرد ہونا چاہیے۔

"کیا کہا جائے اور کیسے کہا جائے؟" جدید شعراء کے لیے ایک چیلنج بلکہ الجھن کا باعث بن گیا ہے۔ ابھی زیادہ عرصے کی بات نہیں ہے کہ ناقدوں اور شاعروں نے آپس میں ساز باز کر کے جدید لسانی تشکیل، جدید علامت تراشی، غریب تلمیحات، نامانوس تراکیب اور فریبِ معنی میں مبتلا کرنے والے اسلوب بے اسلوب کے ذریعے سے ایک ایسی شاعری کو رواج دینے کی کوشش کی تھی جو اپنی شدید انفرادیت نہیں بلکہ انفرادیت کو قائم کرنے کی سعی کی بنا پر جدید کہلائے مگر یہ کوشش "عنفوانگی" تک بھی نہیں پہنچ سکی اور مرجھا کر رہ گئی۔

ہمارے بعض شعراء جو مغربی ممالک میں جا بسے ہیں وہ بھی اس کوشش میں شریک تھے یا شریک ہیں۔ وہاں سے جو سوغات انھوں نے بھیجی ہے یا بھیج رہے ہیں اس میں اسلوب کی دہشت پسندی، لفظوں کے تجربہ خانوں اور فکری پاگل خانوں کی تعمیر کا جذبہ ہی نہیں شوق بھی پایا جاتا ہے۔ مگر دقت یہ آن پڑی ہے کہ قارئینِ ادب پڑھنا چاہتے ہیں شعری دہشت پسندی کے بلیٹن پڑھنا نہیں چاہتے۔ ٹکنیکل زبان میں شعر کہنے والے یہ شعرا حقِ جدیدیت یقیناً ادا کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ ٹکنیشین پڑھے نہیں جاتے۔

اب دیکھیے نا —— وہ کئی لفظ جنھیں ناقدینِ ادب پناہ، بڑے چاہ پیار سے برتا کرتے تھے (اور شاید کچھ اب بھی برت رہے ہوں) مر چکے ہیں یا اب گور میں۔ ان میں سے چند الفاظ کے چہروں سے کفن سرکایئے، اور ان کی "بے زبانی دیکھتے" جایئے —— آشوب۔ آشوب۔ آشوبِ ذات، آشوبِ آگہی، زخمِ آگہی، انا، شکستِ انا، تجربات کی صداقت اظہار وغیرہ۔ وغیرہ۔

یہ سارے الفاظ، ساری باتیں، یا دش بخیر، جدید حسیت کی مظہر تھیں۔ مگر اب شاعری اور تنقید نگاری

یں ان کا استعمال اگلی برس کی تتلیاں ہو گیا ہے۔
تو اب کیا کیا جائے —— شاعری کے اس کیس کو جاری رکھا جائے —— یا واقعی شاعری کی جائے —!
اس کا جواب جدید شاعروں کو دینا یا کم از کم سوچنا چاہیے۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ "واقعی شاعری" کیا بلا ہے۔
اس کی پہچان، اس کی تعریف کیا ہے —!؟

پہچان —— !!
پہلی تو یہ ہے کہ وہ بہت سے شعرا جو بہت جدید تھے اب اتنے جدید بننے کے لیے بے تاب نہیں ہیں
وہ اب ایسا اسلوب اختیار کر رہے ہیں جسے پڑھ کر لوگ بدحظ نہیں ہوتے۔
دوسری پہچان کے لیے اردو کے کم از کم نصف صد ایسے شاعروں کے نام گنائے جا سکتے ہیں جنھیں پڑھ کر
معلوم کیا جا سکتا ہے کہ "واقعی شاعری" کیا ہوتی ہے۔ ان شعرا میں رند، صبا اور وزیر کو بھی شمار کر لیجیے ——
ریاض خیرآبادی اور وحید الہ آبادی کو بھی شامل کر لیجیے —— جی ہاں۔ جی ہاں! شاعری سے ان کا تعلق اتنا
گہرا ہے جو بہت کم نوجوان شعرا میں پایا جاتا ہے ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا، ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی۔

ہاں جناب دنیا بدل گئی —— !
تیسری پہچان !؟—— میرے بھائی اگر آپ شاعر ہیں تو آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ آپ نے
کب اور کون سا شعر اچھا کہا ہے —— دل ہوتا ہے تیر نشانے پر پڑا، یہ شکاری کو دیکھے بغیر ہی معلوم ہو جاتا ہے۔
ممکن یہ بہت داخلی بات معلوم ہو۔ مگر چونکہ معاملہ ذوق شعر کا ہے لہذا داخلی بات پر بھی تھوڑا بہت بھروسا کر لیجیے۔
اب چوتھی اور آخری پہچان وہ اجتماعی ثقافتی تربیت ہے جو ایک اجتماعی ذوقِ شعر کی پرورش کرتی اور
ہمیں "انارکی" سے بچاتی ہے۔ جو مذاقِ شعر کو اس قدر منفرد اور شخصی نہیں بناتی کہ ہمارے آپ کے درمیان
ثقافتی تاریخ کی ارتقائی تربیت کا ہر رشتہ ٹوٹ جائے اور ہم شیخ ابراہیم ذوق کو رد کر کے شاہ نصیر کو پسند
کرنے لگیں۔
تو اب بات پھر کے وہیں آ گئی کہ جدید شعرا کیا کریں۔ مصرعوں کو رسی کی طرح بٹنے اور لفظوں کا پھندا
بنانے سے شاعری آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ شاعری کو پڑھنے والے اس فن کاری کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں اور
اس سے اوب چکے ہیں۔
پھر اچھے شعر کیسے کہے جائیں؟ (یہ کون بتا سکتا ہے) سوال سیدھا سا ہے اور بہت ٹیڑھا بھی
جدید شعرا اس سلسلے میں تجربات کے مرحلوں سے گزرتے رہے ہیں۔ یہ حوصلے کی بات ہے۔ مگر اب انھیں
تجربات کی منزل پر بھی پہنچنا چاہیے۔ دورِ جدید کی توڑ پھوڑ اور ہر لحظہ منقسم ہوتی ہوئی زندگی کو اچھے شعر
نہ کہہ سکنے کا جواز یا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا۔
آج اسلوب اور مفاہیم کے مابین ایک بحران پیدا ہو چکا ہے۔ اسے دور کیسے کیا جائے ——
اصل مسئلہ یہ ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جدید شعر میں جدید اسلوب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی روایات سے
بے تعلقی کے اظہار کو کم کیا جائے۔ لفظ کو خواہ مخواہ معمہ بنانے کی جگہ اسے مفہوم کی سیاحت پر مائل کیا جائے

ایسے شاعر کا لہجہ دائمی شعر میں رہتا ہے۔

ایک بات اور ـــــ اگر آپ خفا نہ ہوں۔ شعر ایسے کہے جائیں جو سمجھ میں آ جائیں۔ ان معروضا
رکھتے ہوئے ذرا سوچیے کہ نئے شاعروں میں کتنے ایسے ہیں جو اس بحران سے نکل چکے ہیں یا جن کی شع
تربیت نے ان کے یہاں اس بحران کو پیدا ہونے ہی نہیں دیا

افتخار عارف کو پڑھ کر دیکھیے۔ شاید آپ اتفاق کریں کہ وہ بڑی حد تک اُن خطرناک مرحلوں کو د
طے کر چکے ہیں جو ہر جدید شاعر کی راہ میں آتے ہیں۔ وہ تمام ترغیبات جو جدید شاعر کو لطفِ سخن پیدا کرنے
بیگانہ کر دیتی ہیں۔ افتخار عارف کے یہاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ وہ شعر گوئی کے سلیقے سے آگاہ ہیں۔ اُن
غزل کوئی سی نظم لے لیجیے۔ لطفِ سخن سے خالی نہیں ہوگی۔ لہجے کی ثقاہت استقامت، صیاگفتاری نکھ
نے انھیں جدید شعرا میں منفرد ہی نہیں خوش اسلوب شاعر بھی بنا دیا ہے۔

میں یہاں اُن کی دیس پردیس کے درمیان سفر کرتی ہوں، شام ہونے سے پہلے گھر لوٹ آ
کرتی ہوئی، اجڑی حویلی کی خوف زدہ آواز میں بولتی ہوئی اور ذہنی قرض خواہوں کو خود مقروض بناتی ہوئی
کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ صرف دھُن اُس خوش دوئی کا ذکر مقصود ہے جس نے ا
سے واقعی شعر کہلائے ہیں۔

بڑی نستعلیق شاعری ہے اُن کی۔ مجاز کے بعد لکھنؤ کی "صبحِ نو" سے طلوع ہونے والے سب
شاعر افتخار عارف ہیں۔ وہ کراچی میں رہیں یا لندن میں یا اور کسی جگہ اپنی خصوصیات میں وہ جدید لکھنؤ کی آ
جو بین الاقوامی آواز میں مل کر اور سُریلی ہو گئی ہے۔

اگر آپ کان لگا کر اُن کے مصرعوں کو سُنیں تو ان کے پیچھے آتش اور یگانہ دونوں کی دو ٹوک فیصلہ
کن آواز مل جائے گی۔ لیکن افتخار عارف نے ان سے براہِ راست اثر نہیں لیا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا
وہ کچھ مدت اِن کے پڑوس میں رہے ہیں

افتخار عارف کی شاعری کا طنطنہ، دبدبہ اور سرفروشانہ انداز آتش اور یگانہ سے ذرا مختلف
اُن کی شاعری میں کسی فاتح کا طنطنہ نہیں ہے ـــــ شہادت کی فتح بول رہی ہے۔ اور یہ بڑی بات
افتخار عارف کی شاعری، افتخار عارف ہی کو یاد دلاتی ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے ●●●

(افتخار عارف)
URDU MARKAZ
28 SACKVILLE STREET
PICCADILLY, LONDON
WIXIDA

بدشگونی

عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو بلا رہے تھے
مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا
نظر میں ایک اور ہی جہاں تھا
نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں
نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں
صلہ، جزا، خوف، ناامیدی
اُمید، امکان، بے یقینی
ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں
اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں
عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو
عجب نہیں آج بھی مری راہ دیکھتی ہو
چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو
ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کر دیں
عجب نہیں میرے لفظ مجھ کو معاف کر دیں
عجب گھڑی تھی
کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

بارھواں کھلاڑی

خوشگوار موسم میں
اَن گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارھواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملہ خوش کُن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہو جائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہو جائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا
عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وسل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی افتخار عارف
بارہویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے
تم بھی افتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

صحرا میں ایک شا

دشتِ بے نخیل میں
بادِ بے لحاظ نے
ایسی خاک اُڑائی ہے
کچھ بھی سوجھتا نہیں

حوصلوں کا سائبان
راستوں کے درمیان
کس طرح اُجڑ گیا
کون کب بچھڑ گیا
کوئی پوچھتا نہیں

فصلِ اعتبار میں
آتشِ غبار سے
خیمۂ دُعا جلا
دامنِ وفا جلا
کس بُری طرح جلا
پھر بھی زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں
کچھ بھی سوجھتا نہیں
کوئی پوچھتا نہیں
اور زندگی کا ساتھ ہے کہ چھوٹتا نہیں

اور ہوا چپ رہی

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اُجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کی تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اُڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور منادی کرادی گئی
جب کبھی رنگ کی خوشبوؤں کی اُڑانوں کی آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب اِن زمینوں پہ آتے رہیں گے۔

خوں بہا

اپنے شہسواروں کو
قتل کرنے والوں سے
خوں بہا طلب کرنا
وارثوں پہ واجب تھا
قاتلوں پہ واجب تھا
خوں بہا ادا کرنا
واجبات کی تعمیل
منصفوں پہ واجب تھی
وقت کی عدالت میں
ایک سمت مسند تھی
ایک سمت خنجر تھا
تاجِ زر نگار اک سمت
ایک سمت لشکر تھا
اِک طرف تھی مجبوری
اِک طرف مقدر تھا
طائفے پکار اُٹھے
تاج و تخت   زندہ باد !
ساز و رخت   زندہ باد !
خلق ہم سے کہتی ہے سارا ماجرا لکھیں
کس نے کس طرح پایا اپنا خوں بہا لکھیں
چشمِ نم سے شرمندہ
ہم قلم سے شرمندہ سوچتے ہیں کیا لکھیں

آخری آدمی کا رجز

مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے
اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
فغانِ خلق اہلِ طائفہ کی نذر ہو گئی
متاعِ صبر وحشتِ دعا کی نذر ہو گئی
اُمیدِ اجر بے یقینیِ جزا کی نذر ہو گئی
نہ اعتبارِ حرف ہے نہ آبروئے خون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبینِ شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں
سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
خلیجِ اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولتِ غنیم بانٹ دی گئی
طنابِ خیمۂ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبین شاہ مطمئن، ہوئے کہ سرفراز سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں
اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

اگست کا کتاب نما نظر نواز ہوا.... مہمان مدیر کا سلسلہ، یہ تجربہ سود مند ثابت ہو رہا ہے نظریات و خیالات کا کھل کر اظہار ہو رہا ہے اور سود مند بحث کے دروازے بھی وا ہو رہے ہیں۔ مظہر امام کا اشارہ دعوت فکر و نظر دیتا ہے۔ جناب عالم خورشید کے مجموعے سے اقتباس۔

"میں شعر و ادب میں کسی رجحان، تحریک یا نظریہ کا قائل نہیں، میری شاعری کو روایت، ترقی پسندی یا جدیدیت سے منسوب نہ کیا جائے۔ ادب بہرحال وقت اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے میں بھی وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا احترام کرتا ہوں۔"

ان کی یہ بات اچھی لگی... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی تو ایک نظریہ ہی ہے۔ کسی مطمح نظر، زاویہ اور نظریے کے بغیر اچھا ادب ممکن نہیں ہے۔ بھلے ہی ہم اس پر کوئی لیبل چسپاں نہ کریں لیکن اب اس کا کیا علاج کہ ہمارے ادیب و شعراء کے ساتھ ساتھ ہمارے نقادوں نے بھی اپنے ماتھے پر لیبل چسپاں کر رکھے ہیں ایماندارانہ تنقید عنقا ہو گئی ہے۔

مظہر امام کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جب ہمارے یہاں تنقید نہیں تھی تو میر، غالب، سودا اور مومن پیدا ہوتے تھے... تنقید پیدا کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا آج ہمارے کچھ نقاد جدیدیت کا علم اٹھائے پھر رہے ہیں۔ کچھ ترقی پسندی کو رد کرنے میں سارا زور بیان صرف کر رہے ہیں۔ غرض کسی کو گرانے، کسی کو اٹھانے، کسی کو رد کرنے میں فکر میں سرگرداں ہیں۔ گوپی چند نارنگ، صلاح الدین پرویز اور افتخار عارف کی قصیدہ خوانی میں لگے ہوئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو ہندستان اور پاکستان میں ایک ہی شاعر نظر آتا ہے۔ رہے وارث علوی، تو ان کا انداز سب سے جدا اور نرالا ہے وہ ہر ایک کی بات کو رد کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو اس رد کرنے کی گردان اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اپنی کہی ہوئی بات بھی رد کر دیتے ہیں... وارث علوی کی نئی کتاب "خندہ ہائے بیجا" کا مسودہ مکتبہ جامعہ میں جناب شاہد علی خاں کو بھیجا گیا۔ ظاہر ہے مکتبہ جامعہ بہت معروف ادارہ ہے اس کے پاس کام بہت ہوتا ہے۔ کسی کتاب کی اشاعت میں کبھی کبھی تو ایک سال سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ تقریباً ایک سال کے بعد جب "خندہ ہائے بیجا" کا کتابت شدہ مسودہ وارث علوی کے پاس بغرض پروف ریڈنگ گیا تو مسودے کے کتابت شدہ پچھتر صفحات رد کر دیے گئے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ جب کتاب کا مسودہ

[illegible] فاروقی نے "شب خون"
[illegible] علوی نے بھی فاروقی کی
[illegible] بلوایا جب [illegible] خوب بھاڑ سی چھپ رہی تھی
[illegible] فاروقی کو خدا بنا کر اس پر چڑھا رکھا تھا۔ لیکن جب کتاب کا مسودہ کتابت ہو کر
[illegible] علوی [illegible] انتقال ہو چکے تھے۔ "درد ہے ہر کس [illegible]" پھر بھلا اب وہ اپنی کتاب میں
تعریف و توصیف والے [illegible] صفحات کیسے شامل کر لیتے۔ تو یہ حال ہماری تنقید اور نقادوں کا ہے۔
[illegible] عالم [illegible] شبہات کہ میں نے کوئی لیبل چسپاں نہیں کیا ہے درست ہے۔ اچھا ادب بغیر لیبل
کے بھی تخلیق ہو سکتا ہے لیکن مطمح نظر، زاویۂ نگاہ اور کسی نظریے کے بغیر ممکن نہیں۔ ادب زندگی کا
[illegible] ہوتا ہے۔ بیشک ہمارا ادب زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ ہے زندگی اور
[illegible] کے دھارے سے کٹ کر ہم اچھا ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔۔۔ مظہر امام کے اشاریہ میں خاص طور
[illegible] زبان اور اس کے تحفظ و بقا کا مسئلہ۔ جو بہت اہم ہے۔ اگر نئی نسل اپنی زبان کا تحفظ نہ کر
سکی تو نہ اچھا ادب تخلیق ہوگا اور نہ ادب کو اس کا قاری ملے گا۔ آج تک ہم بڑے فخر سے کہتے آئے
ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے یہ ایک مشترکہ زبان ہے جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی
سب کا حصہ ہے اور یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی سچائی بھی ہے جس میں کسی شک شبہ کی گنجائش
نہیں ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ گذشتہ بیس پچیس سال سے اردو کو مسلمانوں کی جھولی میں
پھینک دیا گیا ہے۔ اس کا بٹوارا کر دیا گیا ہے اور یہ کہہ دیا گیا ہے کہ یہ اب تمھاری زبان ہے اور اب
تم ہی اس کی حفاظت کرو۔ گویا زبردستی اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا ہے۔ مجھے اپنے غیر مسلم دوستوں
سے معذرت اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آئندہ بیس سال کے بعد ہمارے یہاں نہ تو کوئی مالک رام
ہوگا نہ آنند نرائن ملا، نہ جگن ناتھ آزاد، نہ رام لعل، نہ تارا چند رستوگی، نہ کالی داس گپتا رضا، نہ
[illegible] فراق، نہ کنور مہندر سنگھ بیدی، نہ گوپی چند نارنگ۔ گنے جائیے۔ پرشکوہ و پرعظمت ناموں کا
ایک سلسلہ ہے۔ نئی نسل ماہر غالبیات اور ماہر لسانیات کو ترس جائے گی۔ پورے ہندوستان کا جائزہ
لے لیجیے نئی نسل کے کتنے غیر مسلم اردو پڑھ رہے ہیں۔ نتیجہ صفر میں ہی آئے گا۔ ایسی صورت میں
ادب تخلیق کرنا اور قاری پیدا کرنا ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے کھڑا ہے مگر ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے
ہمارے ساتھ غیر مسلم ادیب و شعرا کا ایک بڑا قافلہ ہے جو سب ہمارے ہم نوا ہیں اور صورت حال سے
واقف ہیں۔ اگر اس وقت ہم نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تو بہت بڑے خسارے میں آ جائیں
گے۔ میری تمام ادیب شعرا اور تنقید نگاروں سے استدعا ہے کہ یہ وقت کسی کو گھٹانے بڑھانے اور
[illegible] کا نہیں ہے اور نہ ہی ترقی پسندی و جدیدیت کی بحث میں الجھنے کا۔ ہم سب کو مل کر زبان
[illegible] و بقا کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے ہیں اگر اس وقت ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو یہ ایک
اہم [illegible] ہوگا۔ یہ بنیادی کام ہوگا جو قاری اور ادب کے مسئلے کو خود بخود حل کر دے گا۔ [illegible] امید ہے کہ
[illegible] ادیب شعرا [illegible] سنجیدگی سے غور کریں گے۔

● ماہ اگست کے کتاب نما میں جناب مظہر امام کا اشاریہ ایک لہراتی ہوئی اتنا پسند نہیں آیا جتنا ستمبر میں مہمان مدیر شریف الحسن نقوی کا اشاریہ شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات "تفصیل سے بات پھر ہوگی۔ فی الحال میں شریف الحسن نقوی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے ظرف جانبداری سے کام لیتے ہوئے اشاریہ لکھا ہے۔ دلیپ سنگھ کا طنز و مزاح "مرنا تیری گلی میں" بہت ہی خوبصورت اور دل کو لبھانے والا لگا۔ شاہد مجیب آبادی کا افسانہ "کاجی" بہت ہی پسند آیا۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اظہر حسین انصاری، موتی ہاری، بہار

● ملک کی کئی ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم ہیں اور اکثر حکومت کی جانب سے ان کے وجود کو اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے ایک موثر قدم اور اپنا ایک کارنامہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ ان اداروں کی تشکیل کس طرح کی جاتی ہے تو غالب کا یہ مصرع بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔ ؏ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔

میں صرف اتر پردیش اکادمی کے دستور العمل کو جانتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اسی انداز کے دوسری اکادمیوں کے بھی دستور العمل ہوں گے۔ اکادمی کی مجلس عام اور مجلس انتظامیہ کے جملہ اراکین صدر، چیرمین، وائس چیرمین اور سکریٹری کو ریاستی حکومت براہ راست خود نامزد کرتی ہے۔ ان نامزدگیوں کا معیار صرف حکومت کی خوشنودی ہوتا ہے۔ یہ کبھی صحیح بھی ہوتی ہیں لیکن بیشتر جوڑ توڑ اور سیاسی مصالح کی مرہون منت ہوتی ہے۔

آج جب دیہات کے زیادہ تر ناخواندہ اور جمہوری روایات سے بیگانہ افراد کو پنچایتی راج کے قانون کے ذریعے جمہوریت کے نام پر ایسے اختیارات دیے جا رہے ہیں کہ ان میں ریاستی حکومت بھی براہ راست کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی تو کیا حکومت اردو کے حامیوں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اس بات کا اہل نہیں سمجھتی کہ وہ اپنی زبان کی اکادمیوں کی تشکیل خود کر سکیں؟

یونی ورسٹیوں میں رجسٹرڈ گریجویٹ کی طرح کسی معیار کا تعین کر کے ایک ایسا حلقہ انتخاب بنایا جا سکتا ہے جس سے اکادمیوں کی مجلس عام کا براہ راست انتخاب کیا جا سکے اور پھر یہ مجلس عام اپنی مجلس انتظامیہ اور اپنے عہدے داروں کو منتخب کر سکتی ہے۔

موجودہ صورت میں اکادمیوں کے بیشتر اراکین کو براہ راست نامزدگی کے پچھلے احسان اور آئندہ نامزدگی کی توقع کے مابین بڑے ذہنی تحفظات کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اگر اردو کی حمایت میں کوئی حکمنامے جاری کرتی ہے تو اس کے حکام ان کی علی الاعلان خلاف ورزی کرتے ہیں اور نام نہاد اکادمیاں ان کے خلاف کوئی موثر آواز بلند نہیں کر پاتیں غرض یہ کہ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا یہاں صرف ایک جمہوری حق کے مطالبے کے سلسلے میں چھیڑنا ضروری نہیں ہے۔

میں آپ کے موقر ماہنامے کے ذریعے اردو کی انجمنوں، اداروں اور عام حامیوں سے گذارش [illegible] اکادمیوں کے براہ راست نامزدگی

بہتر یہ ہے کہ تمام صوبوں کی اپنی زبانوں کی اکادمیوں کی تشکیل کا اختیار ان کو خود سونپا جائے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے کی منزل کی طرف یہ ایک بڑھتا ہوا خوش آیند قدم ہوگا۔

وجاہت علی سندیلوی ایڈوکیٹ۔ سندیلہ

● کتاب نما کا اگست کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اس مرتبہ کے مہمان مدیر مظہر امام کا "اشاریہ" فکر انگیز ہونے کے علاوہ کئی حقائق پر مبنی ہے۔ مظہر امام نے اردو ادب کی جدید ترین نسل کے رجحانات کو بروقت اور بہتر طریقے سے محسوس کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مصطفےٰ کریم اور معصوم عزیز کاظمی کے مضامین معلوماتی اور معیاری ہیں۔ عابد سہیل کے مضمون نسیم انہونوی مرحوم کی پیشانی سے ادارتی نوٹ ہٹا دیا جائے تو نسیم انہونوی کی شناخت صاحب طرز ناول نگار، صحافی اور ادیب کے بجائے صرف ایک نیک انسان اور کامیاب ناشر کی حیثیت سے ہی ہو پاتی ہے۔

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی کی پیش کش "گوشۂ شہریار" حاصل شمارہ ہے۔ سرورق پر شہریار کا اسکیچ ہوتا تو اچھا تھا۔ منیر الدین احمد اور باقر مہدی کی نظمیں اچھی ہیں۔ عبداللہ کمال، منظور ہاشمی، شجاع خاور، عالم خورشید اور آزاد گورداسپوری کی غزلیں پسند آئیں۔

ابوبکر عباد۔ شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

● اب آپ کے یہاں لکھنے والوں کی اس قدر کمی ہوگئی ہے کہ آپ مظہر امام جیسوں سے مہمان اداریہ لکھوانے لگے۔

فاروقی صاحب نے اپنے "پیش رو" والے مضمون میں آزاد غزل والوں کو "بے خبر لوگ" کیا لکھ دیا کہ مظہر امام صاحب کف در دہان ہوگئے۔ افسوس یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دروغ گوئی کے لیے "کتاب نما" کو استعمال کیا اور آپ خوشی خوشی استعمال ہوگئے۔ فاروقی صاحب کا مضمون "پیش رو" میں چھپا تھا۔ ادبی اور صحافتی دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر بحث بھی وہیں ہوتی لیکن مظہر امام صاحب کا مسئلہ غالباً یہ تھا کہ "پیش رو" کے پڑھنے والوں کے سامنے فاروقی صاحب کا مضمون بھی ہوگا اس لیے وہاں ان کا جھوٹ کھل جائے گا۔

مظہر امام صاحب لکھتے ہیں کہ فاروقی نے تنقید، تنقید کا ورد بار بار کیا ہے۔ کیا پرانے زمانے میں شاعر نہیں ہوتے تھے؟ اس زمانے میں کون سا نقاد تھا جب میر اور غالب اور مومن پیدا ہوتے تھے۔ مظہر امام صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ فاروقی صاحب کے مضمون میں تنقید، تنقید کی رٹ نہیں ہے بلکہ آج کی ادبی صورت حال پر تبصرہ ہے۔ ان کا مضمون شروع ہی ہوتا ہے اس بحث سے کہ شاعر کا کیا مرتبہ ہے اور اس کا کیا مقام ہے۔ اس بحث کو انھوں نے پولینڈ کے نوبل انعام یافتہ شہرۂ آفاق شاعر کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ رہا سوال کہ میر و غالب کے زمانے میں تنقید تھی کہ نہیں تو اس کا جواب وہ تذکرے اور استادی، شاگردی کے وہ سلسلے ہیں جن کے ذریعہ شعرا کی شہرت قائم ہوتی اور بگڑتی تھی۔ کیا تنقیدی شعور کے بغیر تخلیق ممکن ہے؟

مظہر امام صاحب لکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا عیب اس کی ادّعائیت تھی اور اب جدیدیت بھی اس خنجر سے خودکشی کر رہی ہے۔ اس بات کے ثبوت میں انھوں نے فاروقی صاحب کا ایک اقتباس اسی پیش رو" والے مضمون سے دیا ہے۔ اس سارے اقتباس میں ادّعائیت کا شائبہ تک نہیں۔ لطف یہ ہے کہ مظہر امام صاحب نے جناب فاروقی کی اہم ترین عبارت جان بوجھ کر چھوڑ دی ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات سے کوئی خوف نہیں آتا کہ نئے لکھنے والے جدیدیت سے انحراف کریں گے یا نہ کرنا چاہیں گے۔ ادبی اصول و نظریات کو میں ترقی پسندوں کی طرح مطلق اور آفاقی اور ہمہ وقتی نہیں سمجھتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ادب کے بارے میں کئی طرح کے نظریات صحیح ثابت ہو سکیں گے۔ جدیدیت کوئی مذہب نہیں کوئی الہامی فلسفہ نہیں جس سے انحراف کفر ہو۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ ابھی تک تو جدیدیت سے انحراف کی کوئی شکل سامنے نہیں آئی ہے۔۔۔ ایک دن وہ بھی ہوگا جب جدیدیت اپنا کام اچھا یا برا کر چکے گی۔ کوئی اور نظریۂ ادب اس کی جگہ لے گا۔ میں اس دن کا منتظر ہوں۔"

ملاحظہ فرمائیے۔ اگر یہ فاروقی صاحب کی ادّعائیت ہے کہ وہ جدیدیت کو مذہب یا الہامی فلسفہ ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس دن کے منتظر ہیں جب کوئی اور نظریۂ ادب جدیدیت کی جگہ لے گا تو کاش ایسی ادّعائیت ہم سب میں ہوتی (یا شاید مظہر امام صاحب ادعائیت کے معنی نہیں جانتے)

حسن عزیز، کان پور

● "کتاب نما" ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں اردو کے مسائل پر چار تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری، جناب کشمیری لال ذاکر ایک ادیب، اردو کے اخبار "قومی آواز" کا اداریہ جناب ظفر پیامی اردو صحافی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی اردو کے پرانے خدمت گار اور شیدائی۔ نقاد اور محقق اس طرح اردو کے مسائل پر چاروں زاویوں سے روشنی پڑتی ہے۔

خلیق انجم صاحب کا "اشاریہ" انجمن ترقی اردو بہار کی کسی کانفرنس کا خطبہ صدارت معلوم ہوتا ہے جس میں بہار کے اردو دوستوں سے بطور خاص خطاب کیا گیا ہے۔ بہار سے پہلے اور بہتر طریقے سے تدریسی کتب کا کام مہاراشٹر میں ہوا ہے۔ جن اردو دوستوں کے بچے اردو سے ناواقف ہیں صرف ان کی مذمت سے کام نہیں چلے گا۔ اگر مذمت کرنا ہی ہے تو پھر ان تمام اردو اداروں سے وابستہ حضرات کی مذمت بھی کرنا ہوگی جن کی طرف پروفیسر دسنوی نے اشارہ کیا ہے۔ تحریک ملامت سے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے "اردو دوستوں" کو برابر اردو دوستی کی طرف متوجہ کرتے رہیں۔ ادھر انجمن نے بہاری زبان کو نیا لہجہ دیا ہے جو قابل تعریف ہے۔ صدر انجمن کی صلاحیتوں اور خلوص سے انکار ممکن نہیں۔ انھیں اردو ادیبوں، صحافیوں، ناقدوں، محققوں اور شاعروں سے اور قریبی رابطہ رکھنا چاہیے۔ ساتھ ہی بہار کی زبان کے پرانے شماروں کا مطالعہ کر کے اردو زبان کی تحریک کے نشیب و فراز کی کلی واقفیت ضروری ہے۔ ابھی تک انھوں نے سید ہاشم علی صاحب کے لیے اردو کے لیے ایک ادارہ "رسم خط" قبول کرنے اور خسرو صاحب کے اس بیان کہ "عوام اردو سے محبت تو کرتے ہیں رسم خط

نہیں دیے مضرت پر کوئی بیان نہیں دیا ہے۔ بہت سی اکادمیوں کے قیام اور ان کے طباعتی و اشاعتی نظام کے بعد انجمن کو کتابیں شائع کرنے کے منصوبوں کو ترک کر کے "ہماری زبان" اور "اردو ادب" اور اردو تحریک اور اس کی تنظیم پر توجہ دینا چاہیے۔

جناب کشمیری لال ذاکر صاحب کے خیالات نہایت واضح اور حقائق پر مبنی ہیں۔ اکادمیوں کو ادب سے زیادہ زبان کی ترقی پر توجہ دینا چاہیے۔ ریجنل کالج بھوپال میں غیر اردو داں کو اردو پڑھانے کا پروگرام کئی برسوں سے جاری ہے اور ہمارے کالج کے ایک طالب علم جناب خضر حیات اور ان کے بھائی ناگپور میں کئی برسوں سے یہ کام کر رہے ہیں اور مہاراشٹر اردو اکادمی نے ان کے کام کا انعام دے کر اعتراف بھی کیا ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب پاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا کام نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا اور ساہتیہ اکادمی نے کیا ہے اسے اور بڑھانے کی ضرورت ہے جو اردو زبان خوشی سے سیکھ رہے ہیں ان پر کسی قسم کی پابندی ضروری نہیں۔

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نے غیر رسمی تعلیم کے لیے اردو میں جو کتب شائع کی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ذاکر صاحب نے "اصحاب اختیار" کی اس اشاعتی عیاشی کی طرف توجہ نہیں دی ہے جس کے نتیجہ میں سیمیناروں اور مضامین کے قیمتی مجموعے شائع ہو رہے ہیں اور ان "اصحاب اختیار" کے دباؤ کے تحت کالجوں کے چھوٹے چھوٹے بجٹ سے صرف چھپے کتابیں خریدنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اشاعتی اداروں کو پیپر بیک میں سستی کتابیں شائع کرنا چاہیے

قومی زبان کا اداریہ یوپی میں اردو کا جائزہ تو ہے مگر اس نے ذمہ دارانہ صحافت کے فرائض انجام نہیں دیے۔ ماضی میں جب اردو کے لیے کچھ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھے۔ قومی آواز کو اس طرف متوجہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو بدایوں میں اتنا جانی نقصان نہ ہوتا۔

ظفر پیامی کی اخبار خرید کر نہ پڑھنے کی شکایت جائز ہے مگر ہم اس کو کیا کریں کہ اردو اخبار کے ساتھ ہمیں ایک اور انگریزی اخبار اس لیے خریدنا پڑتا ہے کہ ہم تازہ خبروں اور واقعات سے بر وقت واقف ہونا چاہتے ہیں۔ اردو اخبارات کا آخری صفحہ کبھی آسودگی نہیں بخشتا جس میں مقامی خبریں ہوتی ہیں۔

پروفیسر دسنوی نے بڑے درد سے اردو کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ بیان "اردو کے وہ اساتذہ جو ایمانداری سے اردو کی خدمت کرتے ہیں وہ بچارے شرمندہ شرمندہ رہتے ہیں کہ گھر میں بیوی اور بچے بھی ان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے باہر تو وہ بے قیمت رہتے ہی ہیں" توجہ چاہتا ہے اور یہ دعوت فکر دیتا ہے کہ اردو کے بے لوث سپاہی آج ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟۔

مناسب سمجھیں تو ایک شمارے میں اردو مسائل سے اتنی بہت سی تحریریں شائع نہ فرمائیں تفصیل سے ایک ایک مضمون پر گفتگو ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ پروفیسر [illegible]

(تبصرہ نگار کا ادارے سے نظریہ کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں

مصنف : مالک رام
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵
قیمت : 51/- روپے
مبصر : پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک عالم دین بھی ہیں اور صحافی بھی۔ انشائیہ اور ادب کے جو راستے انھوں نے متعین کیے وہ مستقبل کے لیے مشعل راہ تھے۔ مولانا پر ہر نقطہء نظر سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہر بڑے ادیب کی طرح مولانا کی شخصیت بھی متنازعہ فیہ رہی ہے مگر نقطہء نظر کے اختلاف کے باوجود کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو مولانا کے علم و فضل کا منکر ہو۔

ابھی حال میں مولانا آزاد پر ایک دلچسپ کتاب "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" دیکھنے میں آئی۔ اس کتاب کے مصنف ملک کے ممتاز محقق مالک رام صاحب ہیں۔ اس کتاب میں گیارہ مضامین ہیں۔ دس مضامین مولانا آزاد سے متعلق ہیں اور ایک مضمون مولانا آزاد کے بھائی ابوالنصر غلام یسین آہ پر بھی ہے۔

مالک رام صاحب کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کتاب کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں اگر ایک طرف محقق کی تلاش و جستجو ہے تو دوسری طرف ایک ناقد کی باریک بیں نظر بھی شامل ہے۔ تحقیق بغیر تنقید کے ممکن نہیں ہے مگر تنقید کا جو مزاج ہے اس سے عام طور سے ہمارے محققین نے گریز کیا ہے۔ مگر مالک رام صاحب کے بعض مضامین "غالب اور ابوالکلام آزاد" "مولانا آزاد بہ حیثیت صحافی"، "غبار خاطر" "مولانا آزاد کے احسانات اردو پر" یہ وہ مضامین ہیں جن میں تنقید نے تحقیق پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ تحقیق کے نقطہء نظر سے ان کے مضامین "مولانا آزاد کی تاریخ ولادت"، "مولانا ابوالکلام آزاد" "تحریک آزادی کی مذہبی بنیاد" اپنے پڑھنے والوں سے داد کے طالب ہیں۔

اس مجموعہ کا ہر مضمون اپنے پڑھنے والوں کو نئی روشنی دیتا ہے مگر "تحریک آزادی کی مذہبی بنیاد" نے مختلف موضوعات اور مباحث کو ایک جگہ سمیٹ لیا ہے۔ فاضل مصنف نے قرآن اور حدیث اور مختلف رجحانات کی روشنی میں افکار آزاد کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید اور آزاد کے نظریاتی تصادم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے "جادو کے اس حصار کو پہلی مرتبہ مولانا آزاد اور الہلال نے توڑا ہے۔" مالک رام صاحب کی عقیدت مولانا آزاد سے ہے مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ سرسید کے نظریات کا حصار (مذہبی افکار

تقریروں اور تحریروں میں اظہار کر چکے ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مولانا آزاد، سید کے نظریات کو سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہے۔

مالک رام صاحب کا مضمون "غالب اور ابوالکلام آزاد" چونکا دینے والا مضمون ہے۔ مالک رام صاحب کی وسعت نظر ہے کہ انھوں نے دونوں دیوپیکر شخصیتوں میں ہم آہنگی کے اجزا تلاش کر لیے۔ شخصیت کے دوسرے عناصر کی ہم آہنگی کے ساتھ دو باتوں پر خاص طور سے زور ملتا ہے۔ مالک رام صاحب کے الفاظ میں "دونوں پیدائشی باغی تھے۔ دونوں نے آبائی عقائد سے بغاوت کی" اور دوسری صفت "دونوں کی اَنا بہت شدید اور ہمہ گیر تھی۔" مالک رام صاحب نے اپنے دونوں دعووں کو جس خوبی سے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اس نے ناقدین کے لیے سوچنے کا نیا مواد فراہم کر دیا ہے۔

مولانا آزاد پر ملک میں کثرت سے سیمنار اور مباحثے ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مالک رام صاحب نے بعض اہم کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "کچھ کام کرنے کے" ان میں کچھ کام نہیں ہوئے ہیں اور کچھ ادھورے ہیں جن کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ پر بھی ایک مضمون ہے اور ان کا جو کلام دستیاب ہو سکا اس کو بھی شامل کر دیا ہے یہ مضمون بظاہر یہاں انمل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر اس کا جواز یہ ہو سکتا ہے کہ اگر مولانا کی نسبت سے ان کے بھائی کا تذکرہ نہ کیا جاتا تو شاید زمانے کے حوادثات میں کہیں دب کر رہ جاتا۔

آزاد شناسی کے سلسلے میں اب تک جو مضامین اور کتابیں ہمارے سامنے آچکی ہیں یہ کتاب بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ مضامین خواہ متفرق ہوں مگر وہ ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ مکمل اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کلّیاتِ جلال

شاعر : محمد جلال الدین جلال
مرتب : ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں
ناشر : فاروقی پبلی کیشنز
قیمت : بیس روپے
اشاعت : ۱۹۸۶ء
مبصر : ڈاکٹر سیفی پریمی

محمد جلال الدین جلال پیلی بھیت (یوپی) کے باشندے اور مرزا داغ دہلوی کے ہم عصر تھے "کلیات جلال" کا چوتھا اڈیشن نذر قارئین ہے۔ اس سے مشترک ادب میں بھی ظاہر ہے۔ اور اس دور میں اس کی برکتوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض مضمون، شجرہ مصنف کلیات جلال اور خاندانی افراد کی مختصر سوانح، آرٹ پیپر پر ۱۹ فوٹو، مولانا محمد جلال الدین جلال کے کچھ خاندانی افراد کا مختصر تعارف (اس میں ۲۲ نام شامل ہیں)۔ آخر میں ذکاءالدین شایاں کی ۴۲ فارسی غزلیں چھپی ہیں۔

کلیات کا پیش لفظ ذکار الدین شایاں نے لکھا ہے۔ "ہندوستانی بیاہ" "سچی کہانی" خواب نامۂ جلال اور "آثار موت مع ہدایت نامہ" بہ طرز مثنوی طویل بیانیہ نظمیں ہیں جن میں کہانی کے ذریعہ مصنف نے اپنے عہد کے واقعات، تجربات، مشاہدات کی روشنی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اور نفسیاتی سطح پر کرداروں کے توسل سے مسلم طبقے کی سماجی ذہنیت کو واضح کیا ہے۔ ایک کردار اور ناظر کی حیثیت سے مصنف بھی خود اس میں شریک ہے۔

"التماس" میں محمد تاج الدین تاج نے حالات زندگی کے ساتھ ایک کتاب "ذرۃ الرحمن" کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ تاج کی قومی نظم بھی شامل اشاعت ہے۔ محمد جلال الدین ۱۸۶۱ء میں موضع بہادر گنج، تحصیل ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں انتقال ہوا۔

کلیات میں نظموں کے علاوہ ذاتی تجربات کو واقعات کی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔ چند موضوعات پیش ہیں

(دربیانِ دشمنی) دشمنی تیری جس سے ہو جاوے، کوئی صدمہ جو اس سے تو پاوے
پھر اسے دوست تو بنا دے گا، پہلے صدمہ کو پھر اٹھا دے گا

(دربیانِ غیبت) اور کو جو کہے برا آکر، وہ کہے گا تجھے وہاں جاکر
اس سے مت کہہ تو اپنے دل کی بات، گر کہے گا، تو لائے گی آفات

اس میں نہال الدین نہال کی ۴ غزلیں اردو میں۔ اور ایک غزل فارسی درصنعت توشیح درج ہے۔ نہال کا ایک مطالعہ پڑھیے۔

حال دل کہنے نہ پایا تھا خدا تھے سامنے	آگیا اتنے میں وہ بت مسکرا کر سامنے

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلم معاشرے میں جو خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی تاریخ پرانی ہے۔ اصلاح کی کوشش برابر جاری رہی ہے مگر ہنوز روز اول "دور است"۔ کتاب ٹھیک چھپی ہے۔

گلاب رُت

شاعر و ناشر: مصطفےٰ مومن، رحمت گنج،
۸۲۴۰۰۱ - (بہار)
اشاعت: ۱۹۸۸ء
قیمت: سات روپے
تقسیم کار: ریڈرس ڈپو، بھولی روڈ دھنباد
مبصر: ڈاکٹر مسیفی پریمی

مصطفےٰ مومن کا نقش غزل "گلاب رُت" نام سے چھپا ہے۔ اس کی اشاعت فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے ہوئی ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ "ان غزلوں کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں ایک تہذیبی اکائی موجود ہے۔ جو اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔ بقول فیض احمد فیض۔ "ادب کے نقار خانے میں ہر طوطی کی آواز کا سنائی دینا محال ہے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار کوئی ایسی آواز بھی بلند ہوتی ہے جو اپنے سوز و ساز اور جذب و خلوص کے سبب، قلب و گوش تک پہنچ جاتی ہے"

مصطفٰی مومن کی آواز بلا شبہ ایسی ہی ہے"

اب "گلاب رت" کے چند اشعار:

تمام رات ملا بولتا ہوا کوئی — مجھے سکا نہ مگر جسم کی صدا کوئی

یہ کس کے جسم کی خوشبو سے بھر گئی ہے فضا — گلاب رُت میں لکھو کس کا نام پتوں پر

پیڑ تلے میں سو تو جاؤں — یہ فلک ہے میرے اوپر

وہ بھی موسم کی طرح لوٹ کے آئے گا ضرور — زرد فصلوں میں کوئی رنگ بھی بھر سکتا ہے

خشک پتے تازہ گئے پیچھے — اب ہواؤں کو ہم سفر کر دے

"گلاب رت" میں تمام تر خوشبو، تازگی، نئی زندگی اور شادابی کا ایک جہان بقا معمور ہے۔ شاعر نے اس نقش غزل میں زیادہ تر فطری مناظر کی امیجری سے کام لیا ہے لیکن صفات اور ان کے تاثرات کو بلند برتا ہے۔ اپنی طرف سے فیشن اور مصنوعی طور پر انسان اور فطرت کو INDUSTRIAL LIFE کا لقمہ اجل نہیں بنایا ہے۔ اس شاعری میں سماجی حقیقت پسندی، جذباتی نکات، نفسیاتی رمز اور انسان کے خلاف تخریب کاری کے اندیشہ کا احساس جاگتا ہے مگر زندگی انسانی تدبر اور نوید فردا پر بھرپور یقین ہے۔

ص ۲۳۔ پر کتابت کی غلطی ہے۔ مصرع اول۔
"کتاب زیست کی تردین اس طرح کرنا"
یہاں "تدوین" ہونا چاہیے۔

شاعر کا کلام۔ نام کی اور سرورق، کلام کی توضیح کرتا ہے۔ شاعر کی تصویر چھپی ہے۔ تعجب ہے۔ گلاب رُت کی قیمت اور اتنی کم!

درد کا گلاب

مصنف و ناشر : صبوحی طارق
نیو تیواری ٹینک روڈ، رانچی۔
اشاعت : ۱۹۸۶ء
قیمت : بیس روپے
مبصر : ڈاکٹر سیفی پریمی

صبوحی کا افسانوی نقش "درد کا گلاب" بہار اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے

ش اختر نے دیباچہ لکھا ہے۔
"صبوحی طارق کے موضوعات تیکھی اور بکھری زندگی سے اُبھرے ہیں۔ اس لیے ان میں تنوع ہے"

"درد کا گلاب" ۱۴ کہانیوں کا نقش ہے۔ آخری کہانی یہی ہے اور یہی کتاب کا نام ہے۔ اس کہانی میں "درد کا گلاب" صابر کے والد کی زبان میں بیٹی کی شادی کے بعد باپ کے گھر سے رخصت ہونا اور اس کا کرب ہے۔ اس کہانی میں حارث اور صابی دو کردار ہیں۔ دونوں کے دل محبت کے جلوہ گاہ ہیں۔ اور دونوں کی رومانی زندگی نے ازدواجی زندگی میں رنگ بھر دیا ہے۔ افسانہ نگار نے پوری کہانی کو NOSTALGIA کے وسیلے سے بیان کیا ہے۔ اس لیے اجمال کی صفت کے ساتھ درد کی لہریں ہیں۔ ماں باپ اور بھائی کی خاموش محبت ہے۔ حارث کی فرض شناسی اور صابی کو سسرال اور میکے دونوں طرف کا لحاظ اور عورت کا بے مثال روپ اور اس کا رول ادا کرنا پڑا ہے۔

صبوحی کی کہانیوں میں گھریلو زندگی اور رومان کے علاوہ سماج کے کمزور طبقوں کے کردار بھی مرکز توجہ ہیں۔ ان کی زندگی اور مستقبل کے لمحات کی تصویر اور تفسیر ملتی ہے۔ لیکن افسانہ نگار کے یہاں ہمدردی اور مدد کا جذبہ، اخلاقیات کی پیداوار ہے۔ ان کی زندگی کی المناکی کے اسباب پر سیاسی نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا گیا اس لیے وہ مدد کے مستحق ہیں مگر حل سامنے نہیں۔

بعض کہانیوں میں نفسیاتی الجھن اور جنسی مسئلہ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن Tragedy کا گہرا رنگ ناپید ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کسی پلیٹ فارم کسی موڑ اور کسی مکان سے جدا ہوتے ہیں۔ کندھوں کا کنبہ اور "اذانوں کے پہرے" دونوں میں سماج اور انسان کو مذہبی احتساب کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہاں آہنگ اور اسلوب اصل میں انشائیہ کے قریب آگیا ہے۔ علامات اور تلمیحات بھی مذہبی ہیں۔ اس لیے عام قاری کی فہم اور دلچسپی سے باہر کی کہانیاں ہیں۔

صبوحی کی کہانیوں میں ایک خوبی کا قاری کو اعتراف کرنا پڑے گا۔ ہر کہانی کی تمہید نئے انداز اور نئے معنی خیز جملوں سے شروع ہوتی ہے۔ اور بعض کہانیوں میں یہ آغاز ہی انجام کو اسی جملے کی ساخت میں نمایاں کر دیتا ہے۔ تصدیق متن کا کام کرتا ہے۔

سرورق اور افسانہ نگار کی تصویر دونوں میں آرٹ کا جلوہ ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

چہرہ چہرہ دھرتی

شاعر و ناشر: تسنیم فاروقی
اشاعت: ۱۹۸۸ء
قیمت: ۱۷ روپے
ملنے کا پتا: دانش محل، امین آباد پارک لکھنؤ
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

تسنیم فاروقی کی تخلیق "چہرہ چہرہ دھرتی" حکومت اتر پردیش فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا پیش نامہ شاعر نے خود لکھا ہے۔ کتاب کی اشاعت کا اہتمام ہوجانا شاعر کی زندگی میں ایک لمحۂ مسرت ہوتا ہے مگر یہاں اردو دستور قلندری ملاحظہ کیجیے۔
"اردو ایک زبان ہی نہیں، دراصل تہذیب کی ارفع علامت ہے" ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے تعارف لکھا ہے۔

ص ۹۔ "کلام سے ایسا واضح ہوتا ہے کہ فیض اور ساحر وغیرہ ان کے مطالعہ میں زیادہ رہے ایک طرف فن شعر اور زبان میں حضرت سراج (لکھنوی) کی تقلید اور دوسری طرف جدیدیت کی رو — دونوں کے تاثرات نے مل کر کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے موصوف نے بیشتر ہیئتوں میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔
جدیدیت کے کارواں کو آگے بڑھانے میں تسنیم صاحب کے حصے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا"
اس بیان پر معروضی نقطۂ نگاہ سے غور کیجیے۔
(۱) فیض و ساحر وغیرہ کا مطالعہ زیادہ (۲) سراج لکھنوی کے شاگرد لہٰذا تقلید۔ (۳) جدیدیت کی رو۔ اس لیے کلام دو آتشہ (۴) جدیدیت کے کارواں کو آگے بڑھانے میں تسنیم صاحب کے حصے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ (آپ کو اقرار ہے تو پھر کس کی مجال، جو انکار کر سکے)۔ فیض و ساحر وغیرہ کا اثر کچھ نہیں۔ سراج لکھنوی کی تقلید محض ہیئت تک! مگر کلام دو آتشہ؟
ڈاکٹر اختر بستوی کی رائے ہے۔
"خصوصاً رعایتِ لفظی کے بہت ہی خوبصورت نمونے ان میں جگہ جگہ ملتے ہیں جن کی خوبی یہ ہے کہ معنویت ان کی وجہ سے دبتی نہیں بلکہ اور اثر انگیزی کے ساتھ ابھر آتی ہے۔ مثال کے طور پر "لکشمن پارک" کا یہ آخری مصرع دیکھیے:-
"ایک سیتا کو لے آبرو کر گیا لکشمن پارک میں"
اس میں سیتا اور لکشمن میں جو رعایت لفظی ہے اس سے صرف اس مصرے ہی کا نہیں بلکہ پوری نظم کا معنوی تاثر کئی گنا بڑھ گیا ہے"
"لکشمن پارک" کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) پولس انسپکٹر کی ہجو قبیح (۲) فکر تونسوی کے کالم "پیاز کے چھلکے" کا منظوم اشاریہ! اس کا تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔ رعایت لفظی آج "چہ معنی دارد؟ اول تو یہاں رعایت لفظی کہاں ہے؟ دونوں اسم معرفہ ہیں۔ اس کو تلمیحاتی تلازمہ کہتے ہیں مگر وہ بھی ادھورا ہے۔ لفظ "راون" غائب۔ ہیروئن موجود اور ہیرو ندارد! ایک صفت، پوری نظم کی معنویت بڑھا دیتی ہے۔ کیا خوب لوگ زخموں پہ حنا باندھتے ہیں۔
ڈاکٹر خواجہ عبدالغفور، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر فضل امام کی رائیں درج ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے تاثرات رقم کیے ہیں۔
"زیر نظر مجموعۂ کلام "چہرہ چہرہ دھرتی"۔ ان کی نظمیہ شاعری کا تیسرا کتابی ثبوت ہے۔ ان کے یہاں ملکی سماج کے حقائق اور عروج و زوال کی درد مندانہ سوجھ بوجھ بھی ہے اور قوم و وطن کے خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں۔"

"چہرہ چہرہ دھرتی" میں نظمیں ہیں۔ مجھے کو صرف ایک گیت (دیپک کا گیت) شامل ہے۔ اس میں بھی گیت کا کوئی قرینہ نہیں۔ اصل میں تسنیم فاروقی کا اصل جوہر، پابند اور آزاد دونوں قسم کی نظموں میں اُن کا وسیع علمی ذخیرہ، معیاری لفظیات، متین اور موثر لہجہ نیز اسلوب کی مانوسیت ہے۔ اس میں روانی اور ترنم کا عنصر، تخلیق کی جانب قاری کو متوجہ کراتا ہے۔ نظموں کا ایک حصہ تاثراتی نظموں پر مشتمل ہے۔ شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس سے شاعر کے جذبۂ عقیدت اور حسنِ اخلاق کا پتا چلتا ہے۔ میرے نزدیک شاعر کی بہترین نظموں میں سرگوشی، بددعا، رقص کی رات، بے عنوان، اصرار ہیں۔ "اصرار" میں تخیل وجذبے کی مدد سے حسین اور فطری فضا پیدا کی گئی ہے لیکن اس کا آخری بند۔ ANTICL — ہے۔ اس نے نظم کی حسین فضا اور وحدت تاثر کو تباہ کر دیا ہے۔ IMAX

نظم "بے عنوان" کو اکسی تخلیق کی شاہکار نظم کا درجہ حاصل ہو موضوع و مواد اور ہیئت کے جلووں میں قاری کو ہمارے معاشرے اور سیاسی اور سرمایہ داری کردار۔ امن وانصاف، اور قانون واقتدار کی اصلی شکل رمز وایما کے وسیلے سے صاف نظر آتی ہے۔ شاعر کا فنی کمال جزئیات میں آشکارا نہیں بلکہ صرف ایک بول میں نظر آتا ہے۔ اس کی آواز میں تاثر اور ساخت میں معنویت اُجاگر ہے۔ یعنی۔

"تو مجھ سے گیت سنو گے"؟

یہ شائستہ طنز، تاریخ کا ایک باب ہے اور نہایت موثر! — آخری بند پیش ہے۔

پتی پتی کاتن چھدرے کانٹوں کی نگرانی
آگ چھپنا، امن بڑھاپا، اور بارود جوانی
کاغذ کے گھر، موم کی جنتا، روئی کے راجا رانی
ٹھنڈی ہو یہ جنگ کی جوالا، یہ دن جائیں بیت
تو مجھ سے گیت سنو گے!

کتاب کا سرورق آرٹ کا نمونہ اور شاعر کی تصویر دیدنی ہے

ریت کے محل

ڈراما اُسٹ: ناشر: فضل حسنین
قیمت: ۱۲ روپے اشاعت: ۱۹۸۶ء
ملنے کا پتا: کتابستان ۳۰ چک الہ آباد۔ ۳
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

"ریت کے محل" فضل حسنین کے اسٹیج ڈرامے ہیں۔ اس سے پہلے ایک مجموعہ "روشنی اور دھوپ" چھپا اور اترپردیش اردو اکادمی سے انعام پایا۔ زیرِ نظر کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں تین ڈرامے شامل ہیں۔

۱۔ ریت کے محل ۲۔ منزلیں اور بھی ہیں ۳۔ تجارتی اسکول۔

پہلے ڈرامے کا موضوع کرپشن اور ایک سرکاری ایماندار ملازم کا اعلا کردار ہے۔ گھریلو زندگی میں کشمکش، احساسِ کمتری، زندگی کی تمام سہولتوں کی فراہمی کا ارمان۔ دوسری طرف

شکیل کی زمانہ سازی، عیش و فراغت کی زندگی۔ انجام کار پچاس روپے کا غبن۔ انکوائری آفیسر اگرچہ دوسری کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ اشرف کی پاکیزہ زندگی اور منصب و عظمت سے متاثر ہے۔ مگر اشرف نے اپنے سالار جنگ کی سفارش نہیں کی۔ کوئی مدد نہیں لی۔ انکوائری آفیسر نے رقم جمع کرنے کا حکم دیا۔ جیل اور زندگی بھر کی بے حرمتی سے بچا دیا۔ یہ رقم زیورات بیچ کر ادا کی گئی۔ بڑا بننے کے سارے سپنے ریت کے محل بن گئے۔

"منزلیں اور بھی ہیں" اس ڈرامہ میں جاگیرداری کی پرانی رسوں، لڑکیوں کی اعلا تعلیم، جہیز، طبقاتی سماج میں رشتوں کی مشکلات، ساس اور بہو کی نوک جھونک۔ پرانے اور نئے ذہن کا ٹکراؤ دکھایا ہے۔ اس کا کینوس وسیع ہے۔ دلچسپی کے عناصر زیادہ ہیں۔ کرداروں کی اپنی زبان ہے۔ خوبی یہ ہے کہ گھریلو زندگی کے پیچیدہ معاملات کو بات چیت اور حکمت عملی کے ذریعے طے کر لیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے ذہن اور مزاج کو سمجھ کر سنجیدگی اور ضبط و نظم کی فضا میں گفتگو اور عملی اقدام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ خوشگوار زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ کرداروں میں دادی، بیٹیا، بہو اور پوتے پوتی شامل ہیں۔

اس ڈراما میں اسی طرح کی پر چلت تعلیمی دکان کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۸۴)

غیر قانونی طور پر شکار کھیلنے والوں کی اصطلا میں شامل ہو رہی ہیں اور ایک سنجیدہ موضوع کو VULGARIZE کیا جا رہا ہے۔

اکبر رحمانی صاحب کی طرح ماسٹر صاحب نے بھی کوئی مکتوب اقبال بنام لمعہ تلاش نہیں کیا ہے۔ سارے فیصلے متضاد اور وصفی ہیں۔ ماسٹر صاحب تو خطوط دیکھ کر بھی خطوط اقبال اور خطوط اقبال بخط اقبال میں فرق نہیں کر پاتے۔ اسلوب بیان اور اندرونی شہادتوں کو سمجھنا کہیں مشکل کام ہے

علامہ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں اور رابندر ناتھ ٹیگور کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا۔ مکتوب ٹیگور بنام لمعہ حیدرآبادی مورخہ ۷ فروری ۱۹۳۳ء نیرنگ خیال کے خاص نمبر ۱۹۳۶ء میں یعنی اقبال کے انتقال سے تقریباً دو برس اور ٹیگور کے انتقال سے تقریباً پانچ برس قبل ایک خاص ادبی رسالے کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

۱۳ اگست ۱۹۳۷ء کو جو مکتوب لمعہ کو تحریر کیا گیا تھا وہ اقبال کا نہیں محمد شفیع کا ہے کسی کا پیغام بھیجنے اور کسی کا خط کسی کے نام لکھنے میں فرق ہے۔

اس دور کا المیہ یہ بھی ہے کہ پہلے بھی ادبی سازشیں ہوا کرتی تھیں مگر ان میں ذہین اور سمجھدار لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ پڑھتے اور لکھتے وقت سوچ اور فکر کو طاق پر رکھ دیا جاتا ہے۔

اخلاق اثر۔ بھوپال

ں اور تہذیبی خبریں

ے نئے جریدے کا اجرا

ں گڑھ ۱۶ر اکتوبر (اپنے نمائندے سے)
، ایک نئے پندرہ روزہ جریدہ "جہاں نگہ"
رتے ہوئے مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر
ں الرحمن نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ یہ اخبار
ں خیز صحافت سے اجتناب کرتے ہوئے
فتی صداقت اور تحقیق پر مبنی صحت مند
باکر اپنی ڈگر اور راہ کا تعین از خود کرے گا۔

کان" کا اجرا

ے اچھوتا ناول" — قمر رئیس،

نئی دہلی - ۲۱ر اکتوبر — آج یہاں مسلم یونی ورسٹی
ز ایسوسی ایشن دہلی کے زیر اہتمام سرسید ڈے
ریب میں سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج میرا بہن
ں نے پیغام آفاقی کے ناول "مکان" کا اجرا

"مکان" پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر
نے کہا کہ برسوں کے تعطل کے بعد اردو میں
سا ناول آیا ہے جو موضوع، اسلوب اور تکنیک
سے اچھوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک
شکن تخلیق ہے۔ اس سے نئے امکانات اور
ں کی نئی جہتیں روشن ہوئی ہیں اور اب سوال
ہ اردو ناول کی تاریخ میں اس کے مقام کا
س طرح کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ "مکان" کا
کار بے انتہا تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے۔

شاعر کے اعزاز میں نشست

امروہہ ۲۱ر اکتوبر۔ مقامی بزم حیات کی جانب سے حضرت بہجت فرخ آبادی اور خان فہیم امروہوی کے اعزاز میں ایک یادگار شعری نشست منعقد ہوئی۔ محفل کی صدارت مقامی ڈگری کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر سیادت نقوی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض جناب شمیم امروہوی نے انجام دیے۔ نواب بہجت فرخ آبادی، خان فہیم، نعمت نواز، سہیلی امروہوی، ڈاکٹر شفاعت، فہیم بیباک امروہوی، شمیم امروہوی، شبیم عباسی، خلاق حیدر ندیم، اولیس امروہوی، حافظ شمیم، تاثر نقوی، لیاقت امروہوی، صائم رضا، مولانا غضنفر کوثر، ڈاکٹر لاڈلے رہبر اور مولانا مظفر کوثر وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اپیل

انجمن ترقی اردو (ہند) نے بدایوں میں دو لسانی گروہوں کے طلبہ کے درمیان ہونے والے تصادم پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اس لسانی فساد میں ۸ قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔ انجمن نے اپنے بیان میں پُرزور طریقے سے پھر اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ اردو والے ہندی کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اگر یہ دونوں زبانیں ہندی اور اردو قریب آئیں گی تو اس سے دونوں زبانوں کی ترقی کی رفتار تیز ہوگی۔ انجمن ہندی والوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اترپردیش میں اردو کو دوسری زبان بنانے کے فیصلے کو نہ صرف خوشی سے قبول کریں بلکہ اس کا خیر مقدم کریں۔

انجمن اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہندی اور اردو بولنے والوں کی غیر معمولی اکثریت ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ کے ساتھ رہنی چاہتی ہے۔ ہم لوگوں نے صدیوں میں ایک مشترک کلچر کو جنم دیا ہے اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں تقسیم کر سکے ہم سب قومی اتحاد کے حامی ہیں۔

پروفیسر سید ظہور قاسم کو اعزاز

بنگلور۔ ۱۲ر اکتوبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونی ورسٹی کے

[illegible] چانسلر پروفیسر سید ظہور قاسم کو [illegible] ایوارڈ
[illegible] کیا گیا ہے جو ملکی سطح کی بادر [illegible] کے لیے دیا
جاتا ہے۔ یہاں ایک تقریب میں [illegible] ایوارڈ
پیش کیا جائے گا۔

یہ اعلان کرتے ہوئے [illegible] تعلیمی ادارہ کے سربراہ مسٹر
[illegible] رحمٰن خاں ممبر کونسل نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ اس
میں دس ہزار نقد انعام کے علاوہ ایک نقرئی تختی بھی دی
جاتی ہے۔ پروفیسر قاسم کو جنھوں نے انٹارکٹکا کے لیے
ہندوستان کی پہلی سائنسی مہم جو ٹیم کی قیادت کی تھی، ملک
کی بیش بہا خدمات کے صلے کے طور پر یہ ایوارڈ عطا کیا جا رہا
ہے۔ اسے قبول کرنے کے بعد پروفیسر قاسم "[illegible] سلطان [illegible]"
پر سالانہ یادگار لیکچر دیں گے۔

عصمت چغتائی کو "اقبال سمان"

نئی دہلی ۱۵ر اکتوبر۔ اردو کی معروف ناول نگار عصمت
چغتائی کو مدھیہ پردیش حکومت کا اردو کا اعلیٰ ترین اعزاز
"اقبال سمان" دیا گیا ہے۔

'اقبال سمان' میں ایک لاکھ کا نقد انعام ایک شال
اور ایک خصوصی تختی بھی شامل ہے اردو ادب میں بیش بہا
دینی اور تخلیقی کارناموں اور خاص کر افسانہ نویسی پر
عصمت چغتائی کو اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ وہ علی گڑھ
مسلم یونی ورسٹی کی طالبہ تھیں اور ۱۹۳۸ء میں افسانہ نویسی
شروع کی تھی۔

آل احمد سرور کو ڈی لٹ

علی گڑھ ۱۵ر ستمبر۔ اردو کے ممتاز اسکالر اور مسلم یونی ورسٹی
کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر آل احمد سرور کو کشمیر
یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کی ہے۔

ہریانہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ جلد متوقع

نئی دہلی۔ ہریانہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر دیوی لال نے آج
یہاں جنتا دل کی سیاسی امور سے متعلق کمیٹی کی میٹنگ میں
بتایا کہ ان کی حکومت ریاست کے کچھ اضلاع میں اردو کو دوسری
سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا جلد اعلان کر دے گی۔

پاکستانی شاعر شان الحق حقی کا خیر مقدم

نئی دہلی ۱۸ر اکتوبر۔ انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے
پاکستان کے ممتاز شاعر و ادیب شان الحق حقی کے اعزاز
میں گذشتہ دنوں اردو گھر میں ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا
ابتدا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے حقی صاحب کا تعارف کراتے
ہوئے کہا کہ ان کی جائے پیدائش دہلی ہے۔ ۱۹۴۳ء میں
وہ ماہ نامہ "آج کل" کے نائب مدیر تھے۔ ادبی خدمات
کے اعتراف میں امریکہ کی ڈی لا ویر یونی ورسٹی نے انھیں ڈی
لٹ کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ اور حکومت پاکستان نے
تمغۂ قائد اعظم اور ستارۂ امتیاز کے اعزاز دیے ہیں۔

ممتاز ترقی پسند ادیب اجمل اجملی کو صدمہ

۱۳ر اکتوبر۔ اردو کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور
صحافی جناب اجمل اجملی کی اہلیہ کا یرقان کے مرض میں
انتقال ہو گیا۔ مرحومہ بستی جامعہ نگر کی خواتین میں بےحد
مقبول تھیں۔ ادارہ مکتبہ جامعہ مرحومہ کے لیے دعائے
مغفرت کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اجمل اجملی
صاحب اور ان کی بچیوں کو اس صدمۂ عظیم کو صبر کے ساتھ
برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائیے۔ آمین

ممتاز سنگ ساز محمد ظفر نہیں رہے

۹ر اکتوبر۔ اردو اور عربی کے ممتاز سنگ ساز اور [illegible]
جامعہ کے مخلص دوست محمد ظفر صاحب اچانک حرکت قلب
بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم نہایت نفیس، ملنسار اور
ہمدرد تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ مکتبہ جامعہ مرحوم کے لیے
دعائے مغفرت کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ متعلقین کو
صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اقبال پروفیسر کا عہدہ سنبھال لیا

اردو کے ممتاز شاعر اور معتبر نقاد ڈاکٹر مظفر حنفی نے ۱۹ ستمبر ۸۹ء کو کلکتہ یونی ورسٹی میں اقبال پروفیسر کا چارج سنبھال لیا اور یونی ورسٹی کے متعلقہ افسر سے ملاقات کر کے انھوں نے ضروری کارروائیاں مکمل کیں مظفر حنفی صاحب کے کلکتہ پہنچنے پر علمی و ادبی حلقوں میں مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

بہار اردو اکادمی ایوارڈ برائے سال ۸۹-۱۹۸۸ء اور ۹۰-۱۹۸۹ء

بہار اردو اکادمی نے درج ذیل شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو اکادمی ایوارڈ برائے سال ۸۹-۱۹۸۸ء اور ۹۰-۱۹۸۹ء دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایوارڈ کی رقم ۵۰۰۰ روپے فی ایوارڈ ہے۔

۱۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ)
۲۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (دہلی)
۳۔ ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی (بھوپال)
۴۔ ڈاکٹر شمیم احمد (آرہ)
۵۔ جناب غلام سرور (پٹنہ)
۶۔ جناب الیاس احمد گدی (جھریا)
۷۔ ڈاکٹر نریش (چندی گڑھ)
۸۔ جناب رضا علمد پوری (پورنیہ)
۹۔ سردار جوگا سنگھ انور (جمشید پور)

بنگلور یونی ورسٹی میں اردو پروفیسر شپ

شعبۂ اردو بنگلور یونی ورسٹی میں بہت جلد اردو پروفیسر شپ قائم ہو جائے گی۔ اس بات کی یقین دہانی ڈاکٹر ڈی ایم نمبنڈیا وائس چانسلر بنگلور یونی ورسٹی نے ایک مکتوب میں کی ہے۔ آپ نے یہ خط جناب سید منظور احمد کنوینر رابطہ کرناٹک انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند و صدر شعبہ اردو جے ایس ایس کالج میسور کے نام لکھا ہے۔

توی امید ہے کہ ریاست کے گورنر شری پی وینکٹ ستیا جو یونی ورسٹی کے چانسلر بھی ہیں۔ جلد از جلد حکومت کی منظوری دے کر اپنی ادب نوازی اور اردو دوستی کا ثبوت دیں گے۔

آزادی کی ترجمان اور جمہوریت ساز اردو زبان کے لیے حق و انصاف کا مطالبہ ہندستان کے ضمیر کی آواز ہے

کرناٹک میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کرنے کے لیے اردو رابطہ کمیٹی کا پُرزور اصرار

ہندستان میں اردو یونی ورسٹیوں کے قیام کے لیے کل کرناٹک اردو کانفرنس کی قرارداد متفقہ طور پر منظور

بنگلور شہر میں مورخہ ۸ اکتوبر بمقام اسٹیٹ یوتھ سنٹر، کرناٹک اردو رابطہ کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ کل کرناٹک اردو کانفرنس کا افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے سابق نائب صدر جمہوریہ ہند شری بسان بی۔ ڈی جتی نے اردو کی شیرینی پاکیزگی، جاذبیت، موسیقیت، لوچ، فصاحت، بلاغت اور عظمت کو خوبصورت الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس کی بین الاقوامی اہمیت اور مقبولیت کا اعتراف کیا۔ کلیدی خطبہ پروفیسر سید اقبال قادری صدر شعبۂ اردو میسور یونی ورسٹی نے پیش کیا۔ حکیم محمد امام صاحب ساقی، جناب یم بشیر احمد، عبدالحلیم الامین، قیاس قریشی، منیر احمد صاحب، گوگا رشید احمد، ایس ایم بشیر سادات، عثمان اعجاز، مشتاق انجم اور راز امتیاز انصاری نے جلسہ کو خطاب کیا۔

اردو تعلیمی مرکز کا قیام

عام دلچسپیوں کے پیش نظر اڑیسہ اردو اکادمی کی جانب سے ۲۳ ستمبر ۸۹ء کو اتکل سنگیت مہاودیالیہ بھونیشور میں

اردو تعلیمی مرکز (بالغان) کا قیام عمل میں آیا۔ جلسے کا آغاز اردو اکادمی کے سکریٹری جناب سید منظور احمد صاحب قاسمی کی افتتاحی تقریر سے ہوا۔ اس سہ ماہی کورس کا افتتاح کرتے ہوئے ریاستی وزیر برائے ثقافت و سیاحت و نائب صدر اکادمی جناب سرت راؤت نے کہا کہ "اردو دنیا کی مشہور اور نہایت شیریں زبان ہے اس کی آبیاری و ترقی کے لیے اڑیسہ میں حالات بہت سازگار ہیں۔"

جناب سرت راؤت نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس میں داخلے کے لیے جو درخواستیں ہمیں موصول ہوئی ہیں وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ حوصلہ افزا ہیں۔ نیز ان میں ان لوگوں کی درخواستیں دو تہائی ہیں جن کی مادری زبان اڑیا ہے اور وہ اردو سیکھنا چاہتے ہیں انھوں نے مزید کہا کہ "ان دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے اکادمی ریاست کے دیگر بڑے شہروں میں جلد اس طرح کے مراکز کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

آخر میں جوائنٹ ڈائریکٹر آف کلچر ڈاکٹر ارجن جوشی اور اتکل سنگیت مہاودیالیہ کے پرنسپل جناب دھریندر ناتھ پٹنائک نے اپنی تقریروں سے سامعین کو محظوظ فرمایا اور رسمی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔

وکیل بھوپالی کا استقبال

اہل بھوپال نے ادب میں مردہ پرستی کی روایت سے انحراف کا عملی ثبوت دیتے ہوئے موجودہ شعرا اور ادیبوں کی قدر افزائی کا جو سلسلہ حضرت کیف بھوپالی کے استقبال سے شروع کیا ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے گذشتہ ۳۰ستمبر کو بھوپال کی ایک ادبی تنظیم نے مدھیہ پردیش کے بزرگ شاعر جناب وکیل بھوپالی کا استقبال کیا۔ اس موقع پر انھیں سپاس نامہ اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی جانب سے ڈھائی ہزار روپے پیش کیے گئے۔

تقریب استقبال کی صدارت بی۔ڈی۔اے کے چیرمین ملا فخرالدین صاحب نے فرمائی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے حکومت مدھیہ پردیش کے وزیر اردو اکادمی وقف و صحت جناب رسول احمد صاحب صدیقی شریک ہوئے۔

تذکرۂ مشائخ قادریہ رضویہ کا افتتاح

سلسلۂ قادریہ برکاتیہ رضویہ کے مشائخ کرام کے تذکرے پر اب تک کوئی جامع کتاب نہ تھی۔ مولانا عبدالمجتبیٰ رضوی سندر پوری (فاضل جامعہ فاروقیہ بنارس) عالم ہیں۔ انھوں نے تلاش و جستجو اور کد و کاوش کے بعد ایک ضخیم تذکرہ ۵۶۰ صفحات پر مشتمل تحریر فرمایا جو چھپ کر منظر عام پر آگیا۔

(المعلن ایم سلطان احمد نوری منیجر المجمع الاسلامی ضلع مئو)

انجمن ترقی پسند مصنفین گلبرگہ کا ادبی اجلاس

گلبرگہ ۲ راکتوبر۔ فن کار کو چاہیے کہ وہ اپنے معاشرہ کے تئیں باشعور، ذمہ دار اور ذہین ہونے کا ثبوت دے اس طرح ایک کھلے ذہن کے ساتھ ایک رنگارنگ صحت مند اور ترقی پسند معاشرہ کی تشکیل میں مدد ملے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ترقی پسند تحریک اپنی اس معنویت کے ساتھ بہت جلد اردو ادب میں اور پھر عالمی سطح پر اپنا کام کر جائے گی۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر طیب انصاری نے اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک" میں کیا جو کہ انجمن ترقی پسند مصنفین گلبرگہ کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔ جناب مجیب الرحمٰن نے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک کوئی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک ادبی رویّہ ہے جو عقلیت پسندی اور سائنٹیفک رجحان پر مبنی ہے۔ یہ تعصبات اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ گلبرگہ کے ابھرتے شاعر جناب وقار ریاض نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

اک دیا اور بجھا

الٰہ آباد۔ طویل علالت کے بعد راجیہ سبھا کے ریٹائرڈ ممبر اور ممتاز صحافی سید ہاشم رضا عابدی الٰہ آبادی کا ۷ راکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ ادارہ کتاب نما مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے نصاب کی کتابیں

کتب برائے ابتدائی

پرچہ اول نثر اردو
1. منتخبات اول نثر و نظم 10/00
2. غالب کی کہانی 6/00

پرچہ دوم نظم اردو
1. منتخبات اول نثر و نظم 10/00
2. غالب کی کہانی 6/00

پرچہ سوم انشا، قواعد و معلومات اور ہندی یا فارسی
1. گلزار انشا 4/50
2. عام معلومات 5/50
3. آسان قواعد 3/50
4. نصاب فارسی یا 5/00
پرائمری ریڈر 3/00

دیگر مفید کتب
فیروز اللغات (جیبی) 12/-

2. اردو صرف و نحو (حصہ اول صرف) عبدالحق [illegible]
3. نوبہاری حصہ اول [illegible]

پرچہ چہارم، فارسی، معلومات عامہ، اصول صحت، عربی اور انگریزی
(مندرجہ بالا پانچ مضامین میں سے کوئی دو مضمون اختیار کرنا ہوگا۔)

1. غنچہ فارسی [illegible]
2. عام معلومات [illegible]
3. رہبر صحت [illegible]
4. مرقاۃ العربیہ حصہ اول [illegible]
5. سمپل انگلش پروز [illegible]
6. سمپل انگلش پوئم [illegible]
7. انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر، ایم اے۔ شہید [illegible]

دیگر مفید کتب
1. شرح منتخبات حصہ دوم نثر و نظم [illegible]
2. شرح غنچہ فارسی [illegible]
3. فیروز اللغات (جدید) [illegible]

کتب برائے ادیب

پرچہ اول، نثر اردو
1. منتخبات حصہ دوم (حصہ نثر مع حصہ نظم) 15/00
2. اردو کی کہانی 5/00
3. [illegible] 4/00

پرچہ دوم، نظم اردو
1. منتخبات حصہ دوم (حصہ نظم مع حصہ نثر) 15/00
2. [illegible] 3/50
3. [illegible] 4/50

پرچہ سوم انشا، قواعد اردو و ہندی
[illegible]

کتب برائے ادیب ماہر

پرچہ اول۔ نثر اردو
1. منتخبات حصہ سوم (حصہ نثر مع حصہ نظم) [illegible]
2. ہم نفسان رفتہ [illegible]
3. اسالیب ادب [illegible]

پرچہ دوم۔ نظم اردو
1. منتخبات حصہ سوم (حصہ نظم مع حصہ نثر) [illegible]

[illegible] تاریخ ادب اُردو

۱۔ اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ [illegible]

۲۔ اردو ادب کی تاریخ (از عظیم الحق جنیدی) ۱۸/۰۰

یا اردو ادب کی تاریخ (نسیم قریشی) ۱۸/۰۰

پرچہ چہارم۔ انشا، قواعد اردو، ہندی

۱۔ گلدستۂ مضامین و انشا پردازی حصہ دوم ۱۲/۰۰

۲۔ اردو صرف و نحو (حصہ نحو) عبدالحق ۱۹/۰۰

۳۔ نو بہار ہندی دوم ۷/۸۵

۴۔ آسان ہندی ویاکرن ۳/۵۰

پرچہ پنجم۔ فارسی، معلومات عامہ، خانہ داری، انگریزی اور عربی

(مندرجہ بالا پانچ مضامین سے کوئی دو مضمون انتخاب کرنا ہوگا۔)

۱۔ گلدستۂ دانش ۳/۵۰

۲۔ ایرانی زبان کا قاعدہ ۴/۰۰

۳۔ ایجادات کی کہانی ۸/۰۰

۴۔ علم امور خانہ داری یا گھریلو سائنس (۸) ۱۲/۰۰

۵۔ مرقاۃ العربیہ حصہ دوم ۵/۰۰

۶۔ سلیکٹڈ انگلش پروز اینڈ پوئٹری ۶/۰۰

۷۔ انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر، ایم اے شہید ۱۰/۰۰

دیگر مفید کتب

۱۔ شرح منتخبات جامعہ حصہ سوم ۱۲/۰۰

۲۔ شرح گلدستۂ دانش ۴/۰۰

۳۔ فیروز اللغات (جدید) ۳۵/۰۰

کتب برائے ادیب کامل

پرچہ اوّل۔ نثر

تفصیلی مطالعہ

۱۔ منتخبات حصہ چہارم (نثر) ۱۶/۰۰

[illegible] ۸۹

۲۔ انتخاب خطوط غالب، خلیق انجم [illegible]

۳۔ [illegible]

۴۔ باغ و بہار [illegible]/۰۰

امدادی کتب

۱۱/۰۰

۱۔ داستان تاریخ ادب اردو نایاب

۲۔ نیا افسانہ ۲۰/۰۰

۳۔ اردو انشائیہ کا ارتقاء نایاب

۴۔ اردو ناول کی تاریخ ۱۰/۰۰

۵۔ اردو ڈراما تاریخ و تنقید ۲۵/۰۰

پرچہ دوم۔ نظم

تفصیلی مطالعہ

۱۔ منتخبات چہارم (نظم) ۱۵/۰۰

۲۔ مثنوی سحر البیان ۶/۰۰

امدادی کتب

۱۔ جدید شاعری ۴۰/۰۰

۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری نایاب

۳۔ دہلی کا دبستان شاعری ۲۵/۰۰

۴۔ اردو شاعری پر ایک نظر ۳۵/۰۰

پرچہ سوم۔ تاریخ زبان و ادب اُردو

امدادی کتب

۱۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۵/۰۰

۲۔ اُردو کی لسانی تشکیل ۲۰/۰۰

۳۔ جدید شاعری ۴۰/۰۰

۴۔ مختصر تاریخ ادب اردو ۳۰/۰۰

۵۔ اردو مثنوی کا ارتقاء ۱۵/۰۰

۶۔ دکنی ادب کی تاریخ ۱۰/۰۰

۷۔ اردو میں قصیدہ نگاری ۲۰/۰۰

۸۔ دلی کا دبستان شاعری ۲۵/۰۰

۹۔ اردو مرثیہ نایاب

[illegible]

[illegible] ۔/۲۸ [illegible]

[illegible] ۱۰/۰۰

[illegible] امتحان [illegible] ۱۵/۰۰

[illegible]تب برائے معلم اردو
([illegible] کے لیے قواعد و نصاب ملاحظہ کریں)

[illegible] اصول تعلیم

[illegible]امدادی:

- جدید تعلیمی مسائل — ضیاالدین علوی — ۲۰/۰۰
- اصول تعلیم — ڈاکٹر ضیاالدین علوی — ۲۰/۰۰
- تعلیم، فلسفہ اور سماج — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۲۸/۰۰
- زبان، زندگی اور تعلیم — خواجہ غلام السیدین — ۱۰/۰۰
- اکابر تعلیم — سید انصاری — زیر طبع
- اصول تعلیم — خواجہ غلام السیدین — ۲۲/۰۰

[illegible] پرچہ۔ تعلیمی نفسیات

[illegible] امدادی:

- جدید تعلیمی مسائل — ضیاالدین علوی — ۲۰/۰۰
- تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — مسرت زمانی — ۲۰/۰۰
- جدید تعلیمی نفسیات — ڈاکٹر عبدالرؤف — ۲۵/۰۰
- بچوں کی نفسیات — ۱۸/۰۰

[illegible] پرچہ۔ استادوں کے تنظیمی فرائض

[illegible] امدادی:

- تنظیم مدرسہ — ۵/۵۰

چوتھا پرچہ۔ طریقۂ تدریس

کتب امدادی:

۱۔ ہم کیسے پڑھائیں — ڈاکٹر سلامت اللہ — ۲۸/۰۰
۲۔ اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۱۲/۰۰
۳۔ اردو کیسے لکھیں — رشید حسن خاں — ۱۰/۰۰
۴۔ آیئے اردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ — ۱۰/۰۰
۵۔ اردو املا کی چند نارمکیں — نایاب

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہم کتاب

ایف، وائی، بی، اے (لازمی اردو)

کے طلبہ کے لیے

شعورِ ادب
(انتخاب نثر و نظم)

اس انتخاب میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ اپنی زبان اور ادب کے عہد بہ عہد ارتقا اور تدریجی تسلسل کا شعور ان اسباق سے خود بہ خود حاصل کر سکیں۔

قیمت ۔/۱۸

ضروری اطلاع

ملک میں عام انتخابات کے اعلان کے سبب جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات [illegible] میں شرکت کرنے والے امیدواروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ امتحانات اب ۱۳ دسمبر سے [illegible] منعقد ہوں گے۔ پرچوں کی ترتیب پروگرام حسب سابق رہے گی۔

رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب		قیمت
چاند کی بیٹی	(باتصویر)	4/50
...م کی لومڑی	"	6/:
جادو کی ہنڈیا	"	4/50
شیر اور بکری	"	6/:
کوّے کا خواب	"	6/50
بھیڑیے کا گانا	"	6/:
چالاک بلی	"	6/:
گدھے نے بجائی بانسری	"	6/50

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	9/-
چور پکڑو	3/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	7/50
مولانا آزاد کی کہانی	18/:
خالی ہاتھ	9/:
حاجی بابا کی ڈائری	6/50
بہادر علی	7/50
کھلونا نگر	7/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	4/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا	5/:
ننھا سراغ رساں	5/:
ابو علی کا جوتا	5/:
پراسرار غار	5/:
[illegible] کی عجیب کہانیاں	4/50
[illegible]	4/:

کتاب	قیمت
...ترانے	6/50
باغ بہار...س	8/50
جنگل کی ایک رات	6/:
ہرن کا دل	2/:
اچھی کہانیاں	2/50
دریا کی رانی	2/:
گوہر شہزادی	3/:
شریر شیرا	3/:
پری رانی	3/:
خطرناک سفر	3/5
ظالم ڈاکو	6/:
مہکتی کلیاں	6/:
پرندوں سے جانوروں تک	4/50
ٹوٹے کھلونے	5/:
اندھے کا بیٹا	3/50
پانچ بونے	3/:
ایک دیس ایک خون	3/:
جیت کس کی	2/50
انعامی مقابلہ	3/25
ذرّے کی کہانی	21/:
تین اناڑی	6/:
چوری کی عادت	3/50
شرارت	3/:
دلی کی شادی	4/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	2/:
بندر اور نائی	3/50
رنگوں کی بستی	4/:
بی مینڈکی اور کوّا	3/:
مرغی کی چار ٹانگیں	3/50
لال مرغی	3/:

کتاب	قیمت
آؤ ڈراما کریں	3/:
سلامہ صمصامہ	5/:
مچھیرا اور اس کی بیوی	3/50
ایک کھلا راز	3/50
بھوتوں کا جہاز	6/50
صحت کی الف بے	5/:
لومڑی کا گھر	3/:
بچوں کی کہانیاں	3/:
بابا ناصح	3/:
ہار کی تلاش	6/:
سرخ جوتے	3/50
اندرا گاندھی	6/:
ننھا فرشتہ	3/50
جوہرِ قابل	3/:
بھیڑیے کے بچے	3/:
ننھا جبرو	3/50
پلک نہ مارو	6/:
بچوں کے افسر	6/:
پہاڑ کی چوٹی پر	6/:
شیر خاں	3/:
رحمت شہزادہ	[illegible]
لومڑی کے بچے	[illegible]
اس نے کیا کرنا چاہا	[illegible]
بچوں کے اقبال	[illegible]
امیر خسرو	[illegible]
بہادر سیاح	[illegible]
دادا نہرو	[illegible]
چاند کا گھر	[illegible]
جنگل کی بلی	[illegible]
کٹا ہوا ہاتھ	[illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی اور دیگر تصانیف کے آئینہ میں

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

لسان الصدق۔ اڈیٹر۔ مولانا آزاد ۷۵/۰۰
مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/۰۰
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں۔ مالک رام ۵۱/۰۰

دیگر اداروں کی مطبوعات

فائل مکمل الہلال۔ مولانا آزاد ۶۰۰/۰۰
الہلال کے منتخب افسانے 〃 ۱۰/۰۰
انتساب تذکرہ 〃 ۱۲/۰۰
〃 ہمدرد 〃 ۱۵/۰۰
〃 زمیندار 〃 ۱۲/۰۰
〃 مدینہ بجنور 〃 ۱۲/۰۰
〃 خطبات جمعیۃ علمائے ہند 〃 ۱۳/۰۰
〃 خلافت 〃 ۱۵/۰۰
یادگار آزاد 〃 ۱۲/۰۰
الہلال کے تبصرے 〃 ۱۸/۰۰
انتساب غبار خاطر 〃 ۳/۰۰
〃 ہفتہ وار پیغام 〃 ۸/۰۰
تذکرہ مرتبہ مالک رام ۶۰/۰۰
غبار خاطر 〃 ۴۰/۰۰
خطبات آزاد 〃 ۵/۰۰
ترجمان القرآن ۴ چار حصے ۳۰۰/۰۰
ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی ۲۰/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد۔ مجموعہ مضامین ۱۸/۰۰
دعوت و عزیمت ۱۸/۰۰
انتساب تفسیر سورۂ فاتحہ ۳۲/۰۰
نوادر ابوالکلام آزاد مرتب مسیح الحسن ۶۲/۰۰
ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے ڈاکٹر خلیق انجم ۴۸/۰۰
ابوالکلام آزاد نمبر ایوان اردو ۶/۰۰

نوادر مسائل ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ ڈاکٹر سید حسنین ۰۰
مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد۔ عبدالقوی دسنوی ۰۰
ہفتہ وار پیغام۔ مولانا آزاد ۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد (ہندی) ۰۰
مضامین البلاغ۔ مولانا آزاد ۰۰
اصحاب کہف 〃 ۵/۰۰
آزاد کی تقریریں 〃 ۲۷/۰۰
حضرت یوسف السلام 〃 ۱۰/۰۰
تحریک آزادی 〃 ۲۵/۰۰
ہجر و وصال 〃 ۲۰/۰۰
جامع الشواہد 〃 ۸/۰۰
فلسفہ 〃 ۱۰/۰۰
عیدین 〃 ۷/۰۰
ولادت نبوی 〃 ۹/۰۰
صدائے حق 〃 ۷/۰۰
مقالات آزاد 〃 ۱۰/۰۰
قرآن کا قانون عروج و زوال ۱۵/۰۰
مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری ۶۰/۰۰
مولانا آزاد فکر و فن ۶۰/۰۰
انسانیت موت کے دروازے پر ۲۲/۰۰
انڈیا ونس فریڈم معہ ۳۰ صفحات انگلش ۷۵/۰۰
ہماری آزادی 〃 اردو زیر طبع
مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی کچھ میری زبانی ۳۰/۰۰
شہید اعظم ۷/۰۰ ● آئینہ ابوالکلام آزاد ۴۰/۰۰ ● البیرونی اور جغرافیہ عالم ۱۲/۰۰ ● غالب اور ابوالکلام آزاد ۳۰/۰۰ مولانا آزاد فکر و نظریے کے آئینے میں ۳۰/۰۰
اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ ۲۲/۰۰
مولانا آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل ۳۰/۰۰
مولانا آزاد البم ۹۷۵/۰۰
مسلمان عورت ۲۰/۰۰
مسئلہ خلافت ۲۵/۰۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

نئی مطبوعات

عورت اور اسلامی تعلیم (نیا اڈیشن) مالک رام -/۳۰
دلّی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی -/۵۱
کلیات اقبال (اردو) (نیا اڈیشن) (شاعری) اقبال -/۳۵
برف کے پھول (افسانے) حسنیٰ سرور -/۴۰
نخلِ جنوں (شاعری) علیم اللہ حالی -/۴۰
اللہ کی عادت (مذہب) ڈاکٹر غلام جیلانی برق -/۳۰
دو اسلام " " -/۳۵
دو قرآن " " -/۳۵
دروازہ ناول دیپک کنول -/۲۵
مفرور " رئیس احمد جعفری -/۴۵
خطا " قیس رام پوری -/۴۵
عجیب مخلوق (اپنی نگارشات کے آئینے میں) بدرالدین الحافظ -/۹۵
شکنتلا " راجندر بہادر موج فتح گڑھی -/۳۰
سکت لالی (نعتیہ شاعری) حزیں کاشمیری (پاکستانی) -/۳۵
۱۸ ویں صدی کی اردو شاعری فرہنگ (ادب) ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں -/۳۰
کھلاڑی (آٹھواں حصہ) (جاسوسی سیریز) الف صدیقی -/۳۵
" (نواں حصہ) " " -/۳۵
گراہ (ہفتم) (جاسوسی سیریز) جبار توقیر -/۳۵
" (ہشتم) " " -/۳۵
" (نہم) " " -/۳۵
" (دہم) " " -/۳۵

سرورق	عبدالقوی دسنوی
مصور	شکیل اعجاز

تنقیدی مضامین (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی) -/۱۲
خدنگ جستہ (عزیز احمد کا ناولٹ) مرتبہ مناظر عاشق ہرگانوی -/۱۵
بہار میں اردو افسانہ نگاری (افسانوی ادب) مرتب: وہاب اشرفی -/۴۰
رنگ ہزاروں خوشبو ایک (شاعری) بیکل اتساہی -/۲۸
کلیات مکاتیب اقبال (مکاتیب) جلد اول سید مظفر حسین برنی ۱۴۰

مہمان اداریہ

عبدالقوی دسنوی
صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج
بھوپال۔ ایم۔ پی

انشائیہ

مسئلہ مادری زبان اُردو کا

جب بھی میں اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتا ہوں، اور اس کی بدحالی، کم مایگی اور بے بسی دیکھ کر فکرمند ہو جاتا ہوں تو بار بار یہ خیال دماغ میں گونجتا ہے اور مجھ سے آڑے، ٹیڑھے اور ترچھے سوال کرتا ہے کہ کیا ہندستان کی دوسری ریاستی زبانوں کا حال اُردو ہی کی طرح بُرا ہے اور کیا عام طور سے اپنے بولنے والوں میں وہ زبانیں بھی ناقدری، خود غرضی اور مصلحت اندیشی کا شکار ہیں؟ یا ان زبانوں کی جڑیں اپنے علاقوں میں مضبوط ہیں؟ اگر ان کی جڑیں مضبوط ہیں تو کیوں ہیں؟ انھیں اپنے بولنے والوں میں ہردلعزیزی کیوں ہے؟ اور ان کے مٹ جانے کا خطرہ لاحق کیوں نہیں ہے؟ اور ہم اردو والوں کو اپنی مادری زبان کا مستقبل مایوس کُن کیوں نظر آتا ہے؟ اور دوسری زبانوں کے لوگ اپنی مادری زبان کے روشن مستقبل پر یقین کیوں رکھتے ہیں؟

تو اُردو زبان سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے آتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے کہ وہ کروڑوں ہندستانی جو اردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں کیا اردو سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی دوسری زبانوں کے بولنے والے اپنی مادری زبان سے کرتے ہیں؟ کیا ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو ہر زمانے میں حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے؟ اور اسی سرپرستی میں ان کی ترقی اور بقا کا راز مضمر ہے اور کیا اُردو زبان کو ابتدا ہی سے سرکاری سرپرستی حاصل رہی تھی اور اب نہیں رہی ہے؟ اس لیے اس کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے؟

ان حقائق کی روشنی میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ کسی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے حکومت کی سرپرستی سے زیادہ اس زبان کے بولنے والوں کی اس سے محبت، دلچسپی اور تعلق کو اہمیت حاصل ہے۔ ایسے بولنے والوں ہی کے سہارے زبانیں زندہ رہتی ہیں طاقتور بنتی ہیں، مقبولیت حاصل کرتی ہیں، نئے علاقوں میں داخل ہوتی ہیں اور مقبولیت کی نئی فتوحات حاصل کرتی ہیں اور دور دور تک اپنا اثر و رسوخ جماتی ہیں۔ حکومت بلاشبہ آسانیاں پیدا کر سکتی ہے لیکن زبانیں بولنے، پڑھنے اور سیکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ کسی زبان کے لیے محبت پیدا نہیں کر سکتی۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حکومت کے سہارے کے بغیر عوام کے گہرے تعلق سے زبانیں زندہ رہ سکتی ہیں یا ترقی کر سکتی ہیں لیکن عوام کی محبت کے بغیر صرف حکومت کے [illegible]

شاید اسی وجہ سے اردو مجھے اکثر زندگی کے مختلف موڑ پر روک کر سوال کرتی ہے کہ کیا اسے مادری زبان کہنے والے واقعی اس سے محبت کرتے ہیں؟ اور اس کی بقا کے لیے فکرمند رہتے ہیں؟

اور جب میں مادری زبان کہنے والوں کی اُردو سے محبت کا جائزہ لیتا ہوں اور غور کرتا ہوں کہ کب کب وہ اسے اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور کن کن موقعوں پر اسے اپنے ساتھ رکھنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں تو کچھ اس طرح کی سچائیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

آج عام طور سے اردو دُنیا میں ایک ایسا طبقہ ابھر رہا ہے جو اپنے گھروں میں اردو کو مجبوراً استعمال کرتا ہے جس دن اس سے فائدے کی اُمید باقی رہے گی اس کا اس سے تعلق منقطع ہو جائے گا اور مجبوری ختم ہو جائے گی۔

اسی لیے عام طور سے اُردو دولت مندوں اور مہذب کہے جانے والے گھروں سے نکل چکی ہے یا نکل رہی ہے۔ وہ اردو کے مستقبل کی نہیں صرف اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ اُنھیں اردو کے ذریعہ اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اور اپنے گھر میں اردو کے وجود سے انھیں شرمندگی ہوتی ہے اس لیے ان کے نام کی تختی اردو میں نظر نہیں آتی اور عام طور سے اردو اخبارات اور رسائل کو ان کے گھر کا پتا نہیں معلوم ہے اردو کتابیں ان کو بڑی حسرت سے دیکھتی ہیں۔ شادی اور دوسری تقاریب کے موقعوں پر اردو میں دعوت نامہ چھپوا کر وہ اپنے آپ کو تنگ نظر کہلانا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ان کے بچے اور گھر کے دوسرے افراد کی زبان پر اجنبی الفاظ چڑھ رہے ہیں اور روز بروز ان کا استعمال بڑھ رہا ہے اس لیے انھیں اب غیر اردو داں حضرات کے سامنے کسی قسم کی ذلت کا خیال بھی جاتا رہا ہے۔

عام اُردو داں حضرات سے ہٹ کر اردو تاجروں کا رویہ بھی اردو کے سلسلے میں کچھ اچھا نہیں ہے نہ ان کی دُکانوں کے سائن بورڈ اردو میں نظر آتے ہیں نہ ہی ان کی دُکانوں پر اردو اخبارات اور رسائل ملتے ہیں۔ نہ اُن کے حساب کتاب اُردو میں ہوتے ہیں نہ ان کے گھروں میں اردو کے لیے جگہ ہوتی ہے نہ وہ اس موضوع سے متعلق کچھ سوچنا چاہتے ہیں بڑے تاجروں کا حال تو اور بُرا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول اردو کے ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ اردو ان کے گھروں میں کب کی اجنبی بن چکی ہے۔

اردو سیاست دانوں کا حال اردو تاجروں سے اور زیادہ افسوسناک ہے۔ اب اردو زبان ان کے کسی کام کی نہیں رہی ہے اس لیے ان کے گھروں میں اس کے لیے کوئی جگہ نظر نہیں آتی ہے۔ البتہ ان کی سیاست کو توانائی بخشنے کے لیے کبھی کبھی اردو ان کے ڈرائنگ روم میں لائی جاتی ہے، اور بس۔

لیکن اردو کے لیے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے اساتذہ کا ایک حصہ اس کا صحیح معنوں میں وفادار نہیں رہا ہے۔ انھوں نے تعلیمی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے دوسری ذمہ داریوں کو مالی منفعت یا جھوٹی شہرت کی خاطر اپنا لیا ہے اور اب وہ اس کے بوجھ تلے اس قدر دب گئے ہیں کہ پڑھانے لکھانے اور اردو کے طلبہ میں علمی ادبی ذوق و شوق پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں رہے ہیں اس لیے وہ ایسے سب کام کرنے پر مجبور ہیں جن سے ان کو بے مقصد شہرت ملے، معاشرے میں نمائشی عزت ملے، حکمرانوں میں ان کی پہنچ ہو، بس ایسے ہی کھلونوں میں وہ خوش رہتے ہیں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انھیں کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ اخبارات کے دفتروں کے وہ چکر لگاتے ہیں، صاحب اقتدار کے آگے پیچھے وہ رہتے ہیں غیر متعلق جلسے جلوس میں وہ شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے پاس وقت کہاں رہتا ہے کہ طلبہ کی طرف توجہ کر سکیں۔ چنانچہ کالج میں کلاس میں جانے سے بچنے کے لیے طلبہ کو اردو پڑھنے سے منع کرتے ہیں،

اکثر کمزور طلبہ کو اچھے طلبہ پر محض فائدے کے لیے ترجیح دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ملازمتوں کے حصول میں اچھے طلبہ کو کمزور طلبہ کے مقابلہ میں منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں اکثر اسی اصول پر تقسیم کی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی معیار، تحقیقی معیار، اور علمی معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ ان حالات نے نہ صرف اچھے طلبہ اور اچھے اساتذہ ہی کا مستقبل خطرے میں ڈال دیا ہے بلکہ خود اردو کا مستقبل بھی تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

تعلیم گاہوں کے علاوہ اُردو کے دوسرے ادارے بھی جو اُردو کو فروغ دینے کے لیے وجود میں آئے ہیں اپنے بے صلاحیت اور خود غرض کارکنوں کے ہاتھوں خود بھی نقصان اٹھا رہے ہیں اور اردو کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے کم صلاحیت کے لوگوں کو نوازنا شروع کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اردو والے مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں اور تعمیر کے بجائے تخریب میں لگ گئے ہیں ان حالات میں بھی اردو کو شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

عام طور سے اردو اخبارات کا حال بھی بے حد بُرا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو اخبارات بغیر کسی مُفید مقصد کے نکل رہے ہیں، رموز صحافت سے ناآشنا لوگ محض دو پیسے کمانے کے لیے ان اخباروں میں ملازمت حاصل کرتے ہیں اور پھر محض اپنی ناتجربہ کاری، ذہنی ناپختگی اور بے راہ روی کی وجہ سے صحت مند اندازِ فکر دینے کے بجائے اپنے قارئین کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ پُرانی خبریں، بے مقصد باتیں، مطبوعہ تحریریں، بے کار مضامین شائع کر کے اخبارات کے اوراق سیاہ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ ان کو اردو تحریک سے مطلب ہے نہ ملک کی سیاسی حالات سے واقفیت ہے نہ وہ سماجی برائیوں سے عوام کو باخبر رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ اچھے بُرے کا فرق محسوس کرتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس نے خوش کر دیا اس کی بے مقصد تحریریں جلی حروف میں جگہ پانے لگتی ہیں۔ جو حضرات ملیے ہاتھ نہیں رکھتے ان کی بامقصد تحریریں ان اخبارات میں جگہ نہیں پا سکتیں۔ ایسے اخبارات کے چلانے والوں کو یہ خبر نہیں کہ "اخبار" قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ صحافیوں کو صحیح معنوں میں ایمانداری کے ساتھ قوم کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ اسی میں ان کی کامیابی ہے۔ ایسے حالات میں اگر لوگ اُردو اخبارات کی جگہ انگریزی یا کسی دوسری زبان کا اخبار خریدیں تو اس میں ان کا کتنا قصور ہے۔ ان کے اس طرح سوچنے پر مجبور کرنے کی ذمہ داری بھی ان غیر معیاری بے مقصد اخبارات اور ان کے سطحی انداز سے چلانے والے بے صلاحیت اور غیر ذمہ دار عملہ پر ہے۔

اردو اور اس کے ماحول کا حال سازگار نہ ہونے کی وجہ سے اردو والوں کے ایک حلقہ کے اندازِ فکر میں پستی اور بے عملی جیسی برائیاں راہ پا رہی ہیں اور ان کے خود غرضانہ رویّہ کو فروغ مل رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے باصلاحیت افراد، ادیب اور شاعر بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اعلا ادب کی تخلیق کو نقصان پہنچا ہے جس کا اندازہ بارہا مشاعروں اور سیمناروں میں ہوتا ہے۔ مشاعروں میں عام طور سے شعراء اپنا پُرانا یا سطحی کلام سُنا کر "آہ واہ" کی دولت سے مالا مال ہونا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات ایک ہی غزل مختلف مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور سامعین کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان حالات میں اکثر مشاعرے عبرت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اس پر ناظم مشاعرہ کی اکثر بے تُکی اور غیر معیاری باتیں سُننے کو ملتی ہیں۔ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے ان کی لن ترانیاں سامعین کو اور زیادہ بدحظ کرتی ہیں۔

مشاعروں سے سیمیناروں کی طرف آئیں تو وہاں کا رنگ کچھ اور ملے گا، مشاعروں کے شاعروں کی طرح سیمینار کے لیے بھی کچھ سیمینار یے مخصوص ہو گئے ہیں جو بغیر فکر اور محنت کے اپنے مقالات سُنانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس کچھ الفاظ ہوتے ہیں جو ذرا آگے پیچھے ترتیب دینے کے بعد مقالہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کچھ سیمینار یے اس قدر مشاق

[illegible] کی فکر نہ سے فائدہ
اٹھانے کے لیے اور فائدہ پہنچانے کی ہیں۔ ان حالات نے اچھے فنکاروں کی فکر کو نقصان پہنچانے اور نئی پود کو بے راہ روی
اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ادھر چند برسوں میں گرانی کی زیادتی نے کتابوں اور رسالوں کی قیمتوں میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے
کہ عام طور سے اردو والوں کی معاشی حالت اچھی نہیں ہے اس لیے کتابیں خرید کر پڑھنا اہم مسئلہ بنتا جا رہا ہے جس کے بُرے
اثرات اُردو کے پبلشروں اور تاجروں پر پڑ رہے ہیں۔ اردو والوں کے یہاں کتب خانوں، دارالمطالعوں اور ایسے اداروں کا
فقدان ہے جہاں اچھی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ خریداری ہو سکے۔ اسکولوں میں کتابیں بہت کم خریدی جاتی ہیں، کالجوں کا بُرا حال
ہے تو کتابیں کس طرح جلد نکلیں گی اور نئی کتابیں کس اُمید پر پبلشر شائع کرنے کی کوشش کریں گے اور جب کتابیں
شائع نہیں ہوں گی تو لکھی کیوں جائیں گی۔

اس پس منظر میں اسکولوں کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو تعلیم کو فروغ کس طرح حاصل ہوگا؟ اور اس کا
معیار کیوں کر تشفی بخش رہے گا؟ اور طلبہ اور اساتذہ کس طرح صحیح سمت سوچیں گے؟ وقت کا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے پھر جب
اردو شاعروں، نثر نگاروں اور فنکاروں کی دوڑ سستی شہرت، ذاتی منفعت، انعام واکرام اور حصولِ دولت کے سوا
کچھ اور نہ رہے گی اور ان میں بیمار سیاست کی دخل اندازی، آپسی رقابتیں اور دوسروں کو ذلیل کرنے کی سازشیں اور نقصان
پہنچانے کی سرگرمیاں سر اٹھاتی رہیں گی اور مستحق قلمکار اپنے حقوق سے محروم کیے جاتے رہیں گے محنتی اساتذہ اپنی سادگی اور
سیاسی جوڑ توڑ کی صلاحیت سے محرومی کی وجہ سے نقصان اٹھاتے رہیں گے۔ اچھے اور دیانت دار طلبہ اپنی محنتوں کا پھل اپنے
بے صلاحیت اور بد دیانت اساتذہ کی وجہ سے نہیں پائیں گے، تو اردو زبان بھی اپنے حقوق سے محروم ہوتی جائے گی اور
ہم بے بسی سے اس کی حق تلفی کچھ اپنوں کے ہاتھوں بہت کچھ غیروں کے ذریعہ دیکھتے رہیں گے، اور کسی قسم کی تلافی نہیں
کر سکیں گے۔

اِدھر دُنیائے اردو نے دیکھا کہ اہلِ بہار نے اپنی محنت، اتحاد، اور قربانی کی قوت سے پوری ریاست میں اُردو
کو دوسری سرکاری زبان بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ بہار ہی کی کامیابی نے اُتر پردیش میں
اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے میں رہنمائی کی ہے۔ اردو والوں کی ان کامیابیوں نے ان کی ذمہ داریوں میں اور زیادہ
اضافہ کر دیا ہے۔ اردو کے لیے یہ اہم "موڑ" ہے "منزل" نہیں ہے اس وقت اگر اردو جیت گئی تو ہندستان کے
دوسرے حصّوں میں بھی اردو کے حقوق ملیں گے۔ اردو والوں کو اس سچائی کو سمجھنا چاہیے اور سارے ہندستان میں
اردو کے ہر گھر کو اردو کی محافظت کے لیے مضبوط قلعہ بنا دینا چاہیے۔ جس قدر زیادہ اردو کو پڑھنے والے اور اردو سے
سچی محبت کرنے والے پیدا ہوں گے اردو کی جڑیں اتنی ہی مضبوط ہوں گی ——— اسی لیے اردو کے روشن مستقبل کے لیے
اردو کے رفیق اور اردو کے رقیب میں فرق کرنا ہوگا۔ ••

ضروری گزارش

ہمارے بعض مضمون نگار حضرات اپنے ایسے مضامین بھی کتاب نما میں اشاعت کے لیے بھیج
دیتے ہیں جو پہلے کسی دوسرے رسالے میں شائع ہو چکے ہیں براہ کرم اس سے پرہیز کریں
اور صرف غیر شائع شدہ مضامین سے ہی کتاب نما کو نوازیں۔ (ادارہ)

باقر مہدی
۱۶/۱ - مہدی درشن
کارٹر روڈ - باندرہ
(بمبئی)

ایک کالا نوحہ

آنکھیں —— آنسو —— خون بہانا چھوڑ چکی ہیں
ماتم کے انداز بدلتے جاتے ہیں
وحشت —— کب سے بینائی بن کر بیٹھی ہے ؟

ٹوٹے اُجڑے گھر کے اُوپر لہراتے ہیں —— بھگوا جھنڈے !
اینٹوں کی پُوجا ہوتی ہے
'ہائے رام'* —— سُننے والا کوئی نہیں ہے ؟

راتوں کے سناٹے میں
خاموشی کا درد —— فریادی بن کر روتا ہے !
سادے سادے کاغذ پر
کالے کالے دھبّے ہیں !
کوئی مورخ لکھے گا کیا
اپنے زخمی قلموں سے ؟
—— کچھ ہے یا کچھ بھی نہیں —— !

(* گاندھی جی کے آخری الفاظ)

وسف سرمست
۱/۱/۹۲۹-۸۰۲
دنمبر ۱۲ - بنجارہ ہلس
حیدرآباد ۳۴

چائے کے باغ

قرۃ العین کا یہ مختصر ناول کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عینی نے اس چھوٹے
ے کینوس پر زندگی کی بڑے ہی وسیع انداز سے عکاسی کی ہے۔ صرف کرداروں کو دیکھا جائے
حیرت ہوتی ہے کہ اتنے مختصر ناول میں ایسے اور اتنے کردار اس قدر بھرپور طریقے سے پیش
ردئے ہیں۔ راحت کاشانی، فرحت کاشانی، صنوبر، شمشاد، قاسم، واجد، زرینہ، ارسلان، غفور میاں
ربیتی جن سے ہر کردار منفرد ہے اور بڑا گہرا اثر قاری کے ذہن پر چھوڑتا ہے۔ اس کے
لاوہ دوسرے کئی اور چھوٹے کردار ہیں جن کی اہمیت اور انفرادیت سے ناول کا تاثر
ر گہرا ہوتا ہے۔ ان بیسویں کرداروں کے ساتھ بچاسوں مسائل ہیں جن کو اس فنکارانہ خوبی
ے نمایاں کیا گیا ہے کہ ہر مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ توارث کا مسئلہ
احول کا کردار اور شخصیت پر اثر، تقسیم ملک کے بعد کے مسائل، نئے دولت مند طبقے کا
بھرآنا جن کی زندگی کا مقصد صرف دولت ہے، اس کا اثر زندگی پر، اہم اقدار کا زوال،
نسیاتی الجھنیں، امیر اور غریب طبقے کی زندگیوں کا بُعد، صنعتی اور شہری زندگی کے شاخسانے،
سرحد کی تقسیم سے دلوں کی تقسیم کی ناکام کوشش، مغربی پاکستان والوں کی بنگال کے عوام سے
بے تعلقی، ان سارے مسائل کا احاطہ جس فنکارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ عینی نے کیا ہے وہ اس
ول کو گراں قدر بناتا ہے۔ ان سب باتوں پر مستزاد ناول کی بے حد اچھوتی ٹیکنک ہے۔ شاید
ی ٹیکنک کی وجہ سے اتنے سے مختصر ناول میں عینی نے اتنی ساری باتیں کہ دی ہیں۔ اس ناول
ں غزل کا اختصار اور اس کی سادگی اور پرکاری ملتی ہے۔ کسی بھی بات کو شرح و بسط کے
اتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اشاروں کنایوں میں بات کہ دی گئی ہے۔ مختلف حقائق
ا بیان یوں ہوا ہے کہ ان کی معنویت پوری طرح سامنے آجائے اسی وجہ سے وارن بیچ نے
ہا ہے کہ حقائق فسانہ میں FICTION اسی وقت اہمیت رکھتے ہیں جب وہ حقائق نہیں
ہتے بلکہ معنوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔" چائے کے باغ" میں حقائق معنی خیز بن جاتے
ہں۔ ناول میں واقعات کی پیش کشی یعنی اس کی ٹیکنک ہی ناول میں یہ وصف پیدا کرتی ہے

ہر اچھا بڑا اور سنجیدہ ناول نگار اپنے مواد کے مطابق اس کی ٹیکنک میں تبدیلی پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ 'چاے کے باغ' میں اتنی سنجیدگی اور گہرائی ہے کہ عام قاری اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیونکہ اس ناول میں ذہن کو چوکنا رکھنا ہوتا ہے۔ مختلف کرداروں اور واقعات کے سرے ایک لڑی میں پروئے نہیں ہیں ان کرداروں اور واقعات کے تسلسل کو پانے کے لیے ناول کو ایک سے زیادہ بار پڑھنا پڑتا ہے۔ قاری کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ مختلف واقعات کو اپنے ذہن میں رکھے اور ذہن کو چوکس رکھے تاکہ وہ مختلف واقعات اور پلاٹ کو اپنے طور پر مربوط کر سکے۔ پھر یہ کہ واقعات کی پیش کشی سے قاری کو خود نتائج اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ سنجیدہ ناول جو اخلاقی سبق ہوتا ہے وہ کبھی بھی راست انداز میں نہیں ہوتا۔ اس لیے مقبول ناولوں کے قاری کے لیے یہ ذہنی ورزش بڑی شاق گزرتی ہے۔ اس لیے عام قاریوں کے لیے ایسے ناولوں کو پسند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس ناول میں فلش بیک ہی نہیں بلکہ فلش بیک در فلش بیک ہے جو کرداروں اور واقعات کو الجھا سا دیتا ہے۔ قاری کو ان الجھاؤں کو سلجھانا پڑتا ہے۔

عینی نے 'چاے کے باغ' میں سو ڈیڑھ سو صفحات میں کئی کہانیاں، بہت سے کردار، بے شمار واقعات، زندگی کے مختلف گوشے سمیٹ لیے ہیں۔ ناول خود ناول نگار شروع سے آخر تک موجود ہے۔ اس کی اپنی کہانی صرف اس قدر ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے سابق مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش ڈوکومنٹری فلم بنانے کے لیے بھیجی جاتی ہے۔ اور یہاں مختلف واقعات اس کے سامنے پیش آتے ہیں۔ دوسرا کردار زرینہ کا ہے جو خود بھی اس ناول کی قصہ گو ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے اور ارسلان سے جو چاے کے باغ میں بڑا افسر ہے اس کی شادی طے کر دی جاتی ہے۔ زرینہ اور ارسلان شادی سے پہلے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کو قید کرتے ہیں، شادی کے بعد باوقار زندگی بسر کرتے ہیں۔ زرینہ کے برعکس کاشانی بہنوں اور صنوبر کے کردار ہیں اور ان کی کہانیاں اور ان سے وابستہ شمشاد قاسم اور واجد کی کہانیاں ہیں اور یہاں غریب طبقے کے کرداروں کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جس میں غفور میاں اور پاربتی کی محبت کی کہانی بھی شامل ہے۔

ناولوں کی ایک طرح سے مرکزی کہانی اس وقت ہی شروع ہوتی ہے۔ جب ناول نگار اسٹیشن پر ایک دیو ہیکل امریکن اور اس کی سنہری بالوں والی میم کو دیکھتی ہے۔ ناول نگار پھر اس میم سے کلب میں دوچار ہوتی ہے جہاں اس کی بہن اور سہیلی زرینہ یکایک اس میم کے تعلق سے انکشاف کرتی ہے۔ یہ عورت امریکن ہرگز نہیں ہے۔ ہندستانی میرا مطلب ہے، پاکستانی ہے۔ شرط لگا لو۔ اور جب سنہری بالوں والی میم اپنا نام "ریٹا فریزر" بتاتی ہے تو زرینہ کہتی ہے۔ اور تو اور یہ نام بھی بوگس ہے۔ "شرط لگا لو۔" اور امریکہ کے متعلق جب ریٹا کچھ کہتی ہے تو زرینہ بتاتی ہے۔ "یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ امریکہ آج تک نہیں گئی۔" اور یوں ناول کے اہم کردار راحت کاشانی سے قاری کا تعارف ہوتا ہے۔ لیکن زرینہ جو اس ناول کی قصہ گو بھی ہے جب

[illegible] داستان شروع کرتی ہے وہ علی بیگ سے کام لیتی ہے۔ جس میں خود ابتدا میں راحت
نشاں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بلکہ داستان شروع ہوتی ہے۔ صنوبر کی زندگی کی کہانی سے۔ مقام
بدلتا ہے۔ یہاں صنوبر کی شادی شمشاد سے ہوتی ہے جو اسے پرستش کی حد تک چاہتا ہے۔
تقسیم ملک کے بعد یہ تینوں ڈھاکہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ شمشاد کے ساتھ اس کے دونوں
دوست قاسم اور واجد بھی رہتے ہیں۔ جنھیں شمشاد سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا ہے۔ اور پھر
پینہ کہتی ہے۔ "اب میں تم کو ایک بات بتادوں"

"یہ چاروں شمشاد، صنوبر، قاسم اور سب ہی اوسط درجے کے لوگ تھے۔
ان کو کتابوں سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی شعور اور آرٹ وارٹ سے کوئی
ربط نہ تھا۔ ہلکے پھلکے لوگ تھے۔ جو اس قبیل کے ہیں ہر جگہ نظر آتے ہیں، اچھی
ملازمتیں مستقبل کی ترقی اور آسایش ان کی زندگیوں کے محور تھے۔ صنوبر بھی
سیدھی سادی لڑکی تھی اور خود کو بہت ٹھسے کی لکھنوی بیگم سمجھنے کی شوقین تھی،
قصہ کوتاہ چاروں اپنی اپنی جگہ بہت شریف اور ڈھنگ کے لوگ تھے۔ ان میں
آوارہ اور گھٹیا کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔"

یہ کہہ کر پڑھنے والے کے لیے ایک اور سوالیہ نشان ناول نگار نے چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ
ان تمام باتوں کے باوجود شمشاد کی غیر موجودگی میں قاسم اور صنوبر "ایک دوسرے کے بیحد قریب
گئے" اگرچہ صنوبر ایک بچّے کی ماں بن چکی تھی۔ لیکن پھر بھی عشق، وحشت تک پہنچ جاتا ہے۔ صنوبر
شمشاد سے طلاق لے لیتی ہے، لیکن صنوبر اپنے بچّے کے لیے تڑپتی ہے تو قاسم اس پر یوں
برس پڑتا ہے۔ "علامہ راشد الخیری کی اس ٹریجک ہیروئن نے خدا کی قسم اب مجھے بور کر دیا
ہے۔" لیکن ایسے میں واجد ہمیشہ صنوبر کی دل دہی کرتا ہے یہ کہہ کر "تم اپنی کشتیاں جلا چکی
ہو۔ اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ کہیں کی نہ رہو گی۔" وہ مزید روتی اور واجد
مزید دلاسے دیتا۔" صنوبر کو اور دو بچیاں ہو جاتی ہیں اور وہ بظاہر مطمئن اور خوش باش زندگی
گزارنے لگتی ہے۔ لیکن ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آتا ہے۔

"ایک چھوٹا سا سفر۔ ایک بظاہر غیر اہم ملاقات، ایک منظر کی سرسری
جھلک، ایک مختصر سا خط، ایک تحریر، بے دھیانی میں کہے ہوئے چند الفاظ،
زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ ایک لمحہ جہنم کو جنت اور جنت کو جہنم میں تبدیل
کرنے پر قادر ہے، ایک لمحہ، صرف ایک لمحہ۔"

ناول کا یہ اقتباس ناول نگار کی بڑائی اور زندگی کے غائر مطالعہ کا ایک چھوٹا سا
ثبوت ہے۔ اصل میں ناول کے واقعات کے سلسلے میں ایسے ہی فکر انگیز ٹکڑے پورے ناول
کی فضا کو بناتے ہیں اور ان ہی سے ناول نگار کے درجے کا تعین ہوتا ہے۔ زندگی کو دیکھنے
اور دکھانے کے یہی زاویے کسی بھی ناول میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان ہی سے درجۂ
اوّل کے ناول نگار، دوسرے درجے کے ناول نگاروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ بہرحال جو واقعہ

یں آتا ہے وہ یہ ہے کہ قاسم [illegible] ہے۔ [illegible]

دوست نے یہ صلاح دی کہ میں راحت کا لڑکی اور جنرز مرد ہپکا دینی فرحت کا لڑکی بمبئی کی سیر کے لیے اس کی بہترین گائیڈ ثابت ہوں گی۔ قاسم کو مخالفت ۔تا ہے لیکن صنوبر ان دونوں کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ اسی نکتہ پر ناول میں ایک دوسرا 'فلش بیک' شروع ہوتا ہے۔ اور خود داستان گو کے الفاظ میں 'فلش بیک در فلش بیک' شروع ہوتا ہے۔ ناول میں کہانی کہنے کی یہی منفرد ٹیکنک عام قاری کو گڑبڑا دیتی ہے۔ اور اسی وجہ سے ناول نگار کا اصرار ہے کہ صنوبر کی کہانی اس نکتہ تک ذہن میں رکھو۔"

دوسرے فلش بیک میں راحت اور فرحت کی پچھلی زندگی بیان کی گئی ہے۔ راحت کلکتہ میں وار پبلسٹی کے محکمہ میں اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر تھی اور سارے کلکتہ میں تہلکہ مچائی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت وطن عزیز اس قدر ماڈرن نہیں ہوا تھا مگر یہ حسینہ نازنین کلکتے کے لوئیر سرکلر روڈ کو پیرس کا لیٹن کوارٹر گردانتی تھی اور واجد صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔"

گو واجد، راحت کے ساتھ رہتا تھا لیکن وہ راحت سے اس لیے شادی نہیں کرتا ہے کہ وہ اس سے 'محبت' کرتا ہے لیکن اس کی عزت نہیں کرتا۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ راحت نے کسی لوفر نواب زادے سے شادی کر لی ہے۔ چند دن میں طلاق بھی ہو جاتی ہے۔ فرحت اسی زمانہ میں کلکتے میں آتی ہے۔ گو وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی لیکن وہ گھوڑوں سیکس اپیل رکھتی ہے۔ یہیں قاسم سے اس کے معاشقہ کا آغاز ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد فلمی دنیا کے شوق میں دونوں بہنیں بھی چلی جاتی ہیں۔ لیکن شکلیں چونکہ کیمرے کے لیے موزوں نہ تھیں اس لیے فلم اسٹار نہ بن سکیں۔ فرحت ایک فلمی ہیرو سے سول میرج کر لیتی ہے اور راحت ایک غیر فلمی ہیرو "سے گندھروواہ رچا لیتی ہے۔ فرحت کا ہیرو لاکھوں روپے اس کے نام منتقل کر کے کہیں چلا جاتا ہے اور یہ قاسم کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔ صنوبر ایسی ہی حالت میں اسے دیکھ لیتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خون کا گھونٹ پی کر وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی کیونکہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی تھی۔ یہاں آکر گویا ایک اور فلش بیک شروع ہوتا ہے۔ زرینہ اپنی شادی کے سلسلے میں جب ڈھاکہ جاتی ہے تو پھر اس کی ملاقات راحت سے ہوتی ہے۔ زرینہ کلکتہ میں اس سے پہلی بار مل چکی تھی۔ راحت صرف پچاس روپے لے کر ہندستان سے چلی تھی۔ لیکن چند ہی روز میں وہ ڈھاکہ کے مہنگے ترین ہوٹل میں اٹھ آتی ہے۔ کیونکہ ایک جرمن اب اس کی ناز برداریاں کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں فرحت بھی بینک ڈور سے ڈھاکہ اپنا روپیا منتقل کرتی ہے۔ اور خود بھی یہیں آجاتی ہے۔ فرحت کے ڈھاکہ آجانے سے قاسم کی محبت جاگ اٹھتی ہے اور وہ صنوبر سے بیزار ہو جاتا ہے۔ دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے لگتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد زرینہ کی جب فرحت سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ قاسم کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی ہے اور

راحت جرمن کے بجائے امریکن سے شادی کرنے والی لگتی اور بجائے راحت کاشانی کے ریتا فریزر اپنے آپ کو کہلوانا چاہتی ہے۔ یہ وہی سنہری بالوں والی میم صاحب ہیں جو زرینہ کو پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ چند دن کے لیے جب فریزر کہیں چلا جاتا ہے تو راحت ہربرٹ کے ساتھ رہنے لگتی ہے اور فریزر اُن دونوں کو ساتھ دیکھ کر ہربرٹ کو قتل کر دیتا ہے۔

اس طرح فلش بیک در فلیش بیک کے ذریعہ کرداروں کے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں زرینہ کی شادی کا واقعہ بیان کر دیا گیا ہے اور غریب طبقے کے غفور میاں اور پاربتی کا رومان، اور اس رومان کے نتیجے میں ان کے سرحد پار کرنے کا واقعہ بھی قصہ گوئی کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ماضی کے ان تمام واقعات کو سمیٹتا اور ان کو حال سے وابستہ کرتا ہوا اور کئی سوالیہ نشان چھوڑتا ہوا یہ ناول اختتام کو پہنچتا ہے جو قرۃ العین حیدر کے ناول کی ٹیکنک پر غیر معمولی عبور کی دلیل ہے۔ اصل میں ٹیکنک پر یہ قابو ہیگل کے کہنے کے مطابق فکر، محنت اور مشق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وارن بیچ کے کہنے کے مطابق ٹیکنک ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اسی لیے ناول کا مجموعی تاثر اور اس کی فکر انگیزی بعض وقت بالکلیہ ٹیکنک سے وابستہ ہوتی ہے۔ راحت کاشانی کی مخصوص زندگی اپنے تمام ماحول اور پس منظر کے ساتھ بڑی تکمیل کے ساتھ اور صد در صد سوالیہ انداز میں اس مخصوص ٹیکنک کی وجہ سے اُبھر آئی ہے۔ ناول کے آخری حصہ میں راحت کاشانی کا ایک خط ملتا ہے جو ناول کے سارے واقعات اور راحت کاشانی کی پوری زندگی پر پھر سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

"میرے پیارے ابا جی۔ تسلیم، راشدہ پھوپھی کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں نے اندور کے ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کا انتظام کروا دیا ہے۔ آپ آپریشن کے لیے فوراً وہاں داخل ہو جائیے۔ میرا دل آپ کو دیکھنے کے لیے تڑپتا ہے اور بے حد پریشان ہوں اور جلد آپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین۔

آپ کی تابعدار بیٹی، محمودہ!!

محمودہ کا راحت کاشانی بن جانا سماجی المیہ ہے۔ محمودہ کیوں اور کن حالات کی وجہ سے راحت کاشانی بن گئی۔ یہ سماج کا ایک اہم مسئلہ بھی ہے۔ یہی محمودہ، واجد کے ساتھ رہ کر کلکتہ کو پیرس بنا لیتی ہے، مسز نوفرنواب، مسز غیاث الدین، مسز ہرسگر ڈمحان باخ، مسز چارلس فریزر اور نہ جانے کیا کیا محمودہ بن گئی۔ آخر کیوں؟

محمودہ کا یہ فریب مسلسل یوں اور کس لیے ہے؟ یہ بات بڑی سوالیہ علامت بن کر قاری کے ذہن پہ چھا جاتی ہے۔ خود ناول نگار کا بھی یہی سوال ہے؟

"محمودہ بنت عبدالصمد، تم کو اس پیہم خود فریبی، اس فرارِ مسلسل سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ بتاؤ ۔ کچھ تو کہو۔"

آیئے اس فکر انگیز سوال کا جواب خود ناول میں تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہاں کئی جواب ملیں گے، توارث، نسلی خصوصیات اور خاندانی ماحول بھی ایک جواب ہوسکتا ہے۔ راحت ایک خانہ بدوش عورت کی لڑکی ہے۔ اس لیے اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہی سے شاید وہ واقف نہ ہوسکی۔

"راحت آپا کی ممی خانہ بدوش ہیں یعنی جپسی اور فورٹ سنڈیمن اور لورالائی سے لے کر تبت تک ان کے قبیلے کی گھنٹیاں صحرا کی چاندنی میں گونجتی رہتی ہیں۔ ... واجد چچا کی بہنوں نے ..... طعنہ دیا کہ تم آخر ہو کون۔ اٹھائی گیری، اُچکی۔ اِدھر اُدھر ڈاکے ڈالتی پھرتی ہو، تباہ و برباد کر ڈالتی ہو لوگوں کو۔"

ہوسکتا ہے کہ اسی پس منظر کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیسا اور دولت ہی زندگی میں سب کچھ بن کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ ہماری زندگی کی یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اس میں پیسا قدرِ اول کی حیثیت حاصل کر چکا ہے اس کے آگے کوئی قدر باقی رہی ہے اور نہ ہی کوئی اخلاقی ذمہ داری۔ آج کے سماج میں زندگی میں کامیابی کا یہی واحد پیمانہ بن گیا ہے!

"آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولت مند طبقہ اُبھرا حصولِ زر جس کا واحد آدرش تھا اور جو ہر قسم کی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے تعلق تھا۔ شراب نوشی، فیشن ایبل عیاشی اور ریاکاری کے اس عظیم الشان دور نے ایسی روایات کو جنم دیا۔ جس کے آگے بے چاری راحت کا شاتی بھی ماند پڑگئی۔ اب راحت اور فرحت کا ٹائپ انوکھا نہیں رہا تھا۔"

آزادی کے بعد اس طبقے کا اُبھر آنا ہماری زندگی کی کتنی بڑی ٹریجڈی ہے اور اس ٹریجڈی کو ہم کس کس طریقے سے بھگت رہے ہیں۔ یہ بات اب کسی بھی باشعور آدمی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن زندگی کی ان بھیانک حقیقتوں کو اس قدر خوبصورت انداز سے بے نقاب کرنا اور اس قدر فکر انگیز انداز سے ایسے گمبھیر مسائل کو اُٹھانا صرف سنجیدہ ناول نگاری ہی سے ممکن ہے۔ اس مسئلہ کی وجہ سے ہر قسم کی ملاوٹ اور گراوٹ ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ بہرحال حصولِ زر کے لیے راحت کا شاتی فلم انڈسٹری کا رُخ کرتی ہے۔ لیکن اُسے یہاں ناکامی ہوتی ہے!

"یہ اس کے لیے بڑا المیہ۔ تھا احمق الدین، خالی الذہن چھوٹی کی فلم اسٹار بن کر لاکھوں کما رہی تھی اور ایک عالم میں مشہور ہو گئی تھی مگر راحت اپنے غیر معمولی حسن، ذہانت، فنی صلاحیت اور اخلاقی آزادروی کے باوجود

دھار پر سے گزر گئی:
چونکہ دولت کمانے کا بہترین طریقہ فلم انڈسٹری تھی۔ اور جب اُسے وہاں ناکامی ہوتی ہے تو وہ ہر جگہ سونا کھودتی پھرتی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نفسیاتی الجھن اُسے ایسے حالات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ راحت کی فطرت میں شدید نمائش پسندی تھی اور بقول کسے نمائش پسندی خواہ کسی صورت میں ہو VULGAC ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے راحت اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے:

"انسانی جسم کے متعلق سارا مسئلہ رویے کا ہے۔ ڈاکٹروں کا رویہ، شاعروں، سنگتراشوں اور مصوروں کا جمالیاتی رویہ اور سیدھی سیدھی جنسی اپروچ جس میں صحت مند اور مریضانہ رویے شامل ہیں۔ یہ واقعہ کہ راحت نے مجھے غسل خانے میں بلایا اس کی جسمانی نمائش پسندی یعنی EXHIBITIONISM کا غماز تھا۔ راحت کو اپنے خوبصورت جسم کا شدید احساس تھا۔"

راحت کے کردار کی یہی تہہ دار گتھیاں اس کے متعلق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ راحت مسلسل اپنے آپ کو فریب دیتی ہے۔ وہ طرح طرح کے دل خوش کن جھوٹ بولنے کی بے حد شوقین اور عادی ہے، شاید یہی جھوٹ اس کی زندگی کا سہارا بن چکے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے کو بے حد غیر محفوظ محسوس کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود کو ایسے لوگوں سے ماثل کرے جن کے قدم زندگی میں مضبوطی سے جمے ہیں۔

محمودہ کو راحت کا ثانی بنانے والے کئی عوامل ہیں۔ اپنے باپ کی یہ تابع دار بیٹی جو باپ کی صحت اور آرام کا ہر ممکن طریقے سے خیال رکھتی ہے۔ جب طرح طرح کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے تو ایک باشعور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسی کیوں ہے اور کس لیے؟ شاید یہ صنعتی اور شہری زندگی کی ایسی لعنت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔

"کوئی چار مہینے کی بات ہے، میں ڈھاکہ گئی ہوئی تھی۔ وہاں اب ریسٹوران اور نائٹ کلب کھل گئے ہیں۔ اور ڈھاکہ وہ پہلا سا خوابیدہ پرفسوں شہر نہیں۔ بہرحال، تو وہاں ایک دُکان سے نکل رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ قصبہ ریسٹوران کے سامنے ایک چمکدار تھنڈر برڈ کھڑی ہے جس کا ہڈ اترا ہوا ہے اور پچھلی سیٹ پر فرحت اور عصمت کا شانی نواب زادیوں کے انداز میں بڑے ٹھسے سے بیٹھی ہیں۔"

نئے دولت مند طبقے کا اُبھر آنا اور دولت کا ہر چیز کے لیے معیار بن جانا مختلف اندا[ز] کے زوال کا ایک ایسا پہلو ہے جس کی طرف یوں بے حد اچھوتے انداز سے دعوتِ فکر دینا ایک بڑے فنکار ہی سے ممکن ہے۔ اب اس لعنت سے گریز ممکن ہے یا نہیں۔

[illegible]

مشتق، سوفیسٹی کیٹڈ (SOPHISTICATED) بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز
قلب ماہیت کی ایک علامت یہ چمکیلی تھنڈر برڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹوران
کے سامنے کھڑی ہے"۔

"لیکن ملک کی اس خوش آیند ترقی کے ساتھ یہ شاخسانے ناگزیر ہیں،
ہمیں اس چمکدار تھنڈر برڈ کو بھی غالباً قبول کرنا ہوگا"۔

سنجیدہ ناول نگاری یوں طرح طرح سے ذہن اور فکر کے دریچوں پر دستک دیتا ہے لیکن
ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم اس کی آواز پر کان دھریں، اگر ہم اس کے پیش کردہ
مسائل پر غور نہیں کر سکتے تو اس میں ہمارا قصور ہے نہ کہ ناول نگار کا۔ ناول کو مجموعی طور پر
سمجھنا ہوتا ہے۔ صرف راحت کا شانی کے برہنہ بٹ میں بیٹھ جانے کو ہی سب کچھ سمجھ لینا،
اس کے مختلف آدمیوں سے تعلقات ہی پر توجہ کر کے یا منور کے شوہر بدلنے کو ہی پیش نظر
رکھ کر کوئی حکم ناول کے متعلق لگانا صحیح نہیں ہے۔ بعض وقت ان باتوں کا محاسبہ بڑی شدومد
سے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں والڑ نے جو بات کہی ہے۔ ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس
کا کہنا ہے کہ کتاب اچھی ہوتی ہے یا بری، وہ اخلاقی یا غیر اخلاقی نہیں ہوتی۔ اس حقیقت سے
انکار ممکن نہیں کیونکہ اچھی کتاب کسی طور پر اور کسی صورت میں بھی غیر اخلاقی نہیں ہوسکتی اور
بری کتاب کے اخلاقی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج کا سنجیدہ لکھنے والا بھی پرانے
انداز سے یعنی راست انداز سے اخلاقی سبق نہیں دیتا۔ کیونکہ سنجیدہ لکھنے والے باشعور قاری
کو پیش نظر رکھ کر لکھتے ہیں۔ مقبول ناولوں کے پڑھنے والے یا اسی انداز میں سوچنے والے
سنجیدہ لکھنے والے جو اخلاقی سبق دیتے ہیں ان کو حاصل نہیں کر سکتے یا حاصل کرنے کی زحمت گوارا
نہیں کرتے۔ کیونکہ آج کا بڑا فنکار اخلاقی حقیقتوں کا اظہار مانوس طریقے پر نہیں کرتا کیونکہ مانوس
طریقے بقول الڈوس ہکسلے کوئی شاک SHOCK نہیں پہنچاتے، اس لیے قابل توجہ نہیں بن
سکتے۔ اس لیے آج کے سنجیدہ لکھنے والے شاک دے کر اخلاقی سبق بھی دیتے ہیں اور زندگی
کی حقیقتوں اور سچائیوں کا اظہار کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے بھی ہماری موجودہ زندگی کے تلخ حقائق کو بے حد فنکارانہ انداز میں پیش
کیا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو بڑا ہی واضح اور اہم اخلاقی سبق بھی دیا ہے۔ لیکن چونکہ تلخی شکر
میں لپٹی ہوتی ہے اس لیے صرف سطح کو دیکھنے والے غلط نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس
سبق کو پانے کے لیے تحلیل و تجزیہ کی ضرورت ہے جیسا کہ فرانک نوا س نے کہا ہے ہر
ناول کا کوئی نہ کوئی مقصد PURPOSE ہوتا ہے لیکن اچھا ادب مقصدیت کا شکار نہیں
ہوتا۔ اس کا کہنا کہ ہر ناول تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی وضاحت لازمی طور پر کرتا
ہے۔ (۱) یا تو وہ کوئی بات بیان کرتا ہے (۲) یا کسی چیز یا بات کو پیش کرتا یا دکھاتا ہے (۳)
یا کوئی بات ثابت کرتا ہے۔ معمولی ناول میں کسی چیز کا بیان ملتا ہے۔ اس سے بہتر ناول کسی
چیز کو دکھاتے یا کسی بات کی وضاحت کرتا ہے۔ اور سب سے اچھا ناول کسی بات کو ثابت

کرنے کے لیے پہلے اسے بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی وضاحت کرنی پڑتی ہے اور پھر کہیں اسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

چائے کے باغ، میں یہ تینوں باتیں ملتی ہیں۔ عینی نے یہ ثابت کیا ہے (اگرچہ اس طرح کی تشریح سے ناول کا حسن متاثر ہوتا ہے اور یوں خواہ مخواہ بدذوقی کا مرتکب ہونا پڑتا ہے) کہ غلط طریقے سے زندگی گزارنے کے نتائج بھی بُرے ہی نکلتے ہیں۔ اگر زرینہ، صنوبر اور راحت کی زندگی کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ زرینہ صرف داستان گو نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کی زندگی بھی ناول میں پیش کی گئی ہے تاکہ اس کی زندگی کو سامنے رکھ کر صنوبر اور راحت کی زندگیوں کو دیکھا جائے۔ صنوبر شوہر بدلتی ہے لیکن ہر بار اپنے کیے کی سزا پاتی ہے۔ وہ شمشاد سے دغا کرتی ہے لیکن اپنے لڑکے کے لیے اُسے تڑپنا پڑتا ہے اور جس بے وفائی اور بے حیائی سے وہ شمشاد کو دھوکا دیتی ہے۔ قاسم اس سے بالکل اسی انداز سے بے وفائی کرتا ہے۔ اور اُسے دھوکا دیتا ہے۔ صنوبر کو نہ صرف اپنے کیے کی سزا ملتی ہے بلکہ وہ سماج میں بھی لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہے جو بجائے خود ایک سزا ہے۔ زرینہ کی بہن کھلے الفاظ میں صنوبر کی سرزنش یوں کرتی ہے۔

> "بیٹا جس مرد کے ہاتھ میں تمھارے باپ نے تمھارا ہاتھ دیا، اسے تم بلا قصور ٹھکرا کر چلی آئیں۔ کیا قاسم سے بیاہ کرتے وقت تم کو معلوم نہ تھا کہ یہ دراصل کس قسم کا انسان ہے؟ "خود کردہ را علاج نیست" بی بی اب صبر کرو۔"

> یہاں چلتے چلاتے ناول نگار نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ یہ اندازِ فکر قابلِ قدر ہے گو اب معدوم ہو رہا ہے۔ "تم جانتی ہو آپا اُن پتی ورتا عورتوں میں سے ہیں۔ جن کا میاں ہے کہ اگر شوہر شرابی، بدمعاش، جرائم پیشہ بھی ہو تب بھی بیوی کو مرتے دم تک اس کے ساتھ نباہ کرنا چاہیے۔" آپا ڈولا آئے اور جنازہ نکلے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں (اور صد افسوس کہ یہ مدرسۂ فکر تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے) چنانچہ اصولی طور پر اس حرکت کو ناپسند کرتی تھیں کہ وہ اپنا شوہر اور بچہ چھوڑ کر دوسرے آدمی کے گھر آ گئی۔"

صنوبر اپنی آنکھوں سے قاسم اور فرحت کو ایک ساتھ دیکھ کر خاموش رہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اُس کے لیے کیا سزا ہو سکتی ہے۔ اور پھر وہ جس ذہنی کرب اور انتشار سے گزرتی ہے یہ بات بھی خود اخلاقی سبق رکھتی ہے۔

صنوبر سے زیادہ راحت کاشانی کا کردار اخلاقی سبق دیتا ہے۔ راحت کاشانی اپنا سب کچھ بھی داؤ پر لگا کر کہیں کی بھی نہیں رہتی، وہ سماج میں جتنا گرا ہوا مقام رکھتی ہے۔

اول کے شروع سے آخر تک ظاہر ہے۔ زرینہ جس طرح راحت کا شادی کا ذکر کرتی ہے، واجد کی بہنیں جس طرح ذلیل کر کے اسے واجد کے گھر سے نکالتی ہیں۔ زرینہ کی بہنیں جس طرح اس قسم کی لڑکیوں سے نہ ملنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اسی طرح جگہ جگہ راحت کی ذلت آمیز زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ گو راحت اور فرحت جیسی لڑکیاں نواب زادیوں کے جیسے ٹھٹے سے رہتی ہیں۔ عالی شان کاروں میں گھومتی پھرتی ہیں۔ لیکن راہ گیروں کے فقرہ کسنے سے سماج میں ایسی عورتوں کی جو عزت ہے وہ بڑی عمدگی سے ظاہر کی گئی ہے یعنی سونا کھودنے والی پبلک سیکرٹری راحت زندگی میں اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے مماثل کرنے کی کوشش کرتی ہے جن کے قدم مضبوطی سے جمے ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ اب بہت دور نکل آئی تھی۔ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ زرینہ کی طرح ایک باعزت اور شریفانہ زندگی بسر کرتی ہے۔ راحت جیسے کرداروں کا زندگی اور سماج میں جو حشر ہوتا ہے۔ اس کو قرۃ العین نے ہر ممکن طریقہ سے نمایاں کیا ہے۔ راحت اپنا سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہیں پا سکی، راحت کا خط جو پچھلے صفحات پر پیش کیا جا چکا ہے اس کی پریشانی اور شدید کرب کو ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ وہ زندگی میں کئی آدمیوں سے وابستہ رہتی ہے۔ لیکن اس کی زندگی جس درجہ تنہا ہے اس کو ناول نگار نے بڑی ہی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے۔ جو ناول نگار کی اعلا فنکاری کی روشن دلیل ہے۔
راحت کے خط کے ساتھ ایک کاغذ بھی ملتا ہے جس پر:

> آڑی ترچھی لکیریں بنی تھیں، پانچ چھے مرتبہ دہرایا گیا تھا میں کہاں کہاں سے گزر گئی۔ میں کہاں کہاں سے۔
>
> اور اس کے بعد ایک کونے میں لکھا تھا۔ شاید کہ چمن دہکا، شاید کہ بہار آئی، دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی۔"

راحت کی یہ ٹریجڈی اپنے اندر زبردست اخلاقی سبق رکھتی ہے۔ قرۃ العین نے زرینہ صنوبر اور راحت کی زندگیوں کو پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ کس طرح صنوبر اور راحت مختلف راہوں پر بھٹکتی رہیں۔ ان کی زندگیاں پریشان بھی رہیں اور منتشر بھی، لیکن زرینہ کی زندگی نہایت خوش باش اور مطمئن تھی۔ زرینہ ایک جگہ خود بتاتی ہے کہ وہ اپنا راستہ صنوبر اور راحت کی زندگیوں کو دیکھ کر متعین کرتی ہے۔ گویا ان کی زندگی سے سبق لیتی ہے۔

> "سچی بات یہ ہے کہ ابا میاں کی بیماری اور صنوبر وغیرہ کی تنہائی کنفیوزڈ اور بے تکی زندگیوں کا مرقع دیکھنے کے بعد بھیا میں نے ہڑبڑا کر ہاں کر دی۔ (اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنے اس فیصلے سے بے حد، بے حد خوش ہوں)۔"

ان تینوں کی زندگی اس شعر کی تفسیر ہے ؎

وابستگان منزل کی سیدھی سی ایک راہ تھی گم کردگان منزل کی بے شمار راہیں اور راحت کی زندگی جو ہمیں سبق دیتی ہے گویا اس شعر کی پوری وضاحت ہے۔

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

ان اعتراضات کے علاوہ بعض حضرات 'چاۓ کے باغ' پر یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ اس میں غریب طبقے کی زندگی جس تفصیل کے ساتھ پیش کی جانی چاہیے تھی پیش نہیں کی گئی یا پھر ظفور اور پاربتی کے کرداروں سے بہت کام لیا جا سکتا تھا لیکن ناول نگار نے توجہ نہیں کی۔ لیکن یہ اعتراض بھی ناول کو غائر نظر سے نہ دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ ناول نگار نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے غریب طبقے کی زندگی کو پیش نہیں کیا ہے:

"مگر ایک قسم کی زندگی اور بھی ہے۔ جس کو میں اس سرزمین پر سارے میں کھوجتی پھرتی ہوں۔ وہ چاروں طرف بکھری نظر آتی ہے، جس کو میں لکھے ہوۓ الفاظ اور سلولائڈ کی ریل کی گرفت میں لانا چاہتی ہوں مگر وہ زندگی اتنی زخمی، اتنی گمبھیر، اتنی وسیع و عظیم ہے۔ کہ اس کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے دل و جگر کا خون کرنا ہوگا۔ پھر بھی کامیابی مشکل ہے۔ یہ میرا قلم۔ کتنا کمزور اور ناکافی اور بے معنی اور مجبور ہے۔"

اصل میں ناول نگار کے قلم کی یہی کمزوری اس کی قوت ہے۔ ہر اچھے اور بڑے ناول نگار کا اس کا اپنا ایک RANGE 'دائرۂ عمل' ہوتا ہے۔ اور بڑے ناول نگار کو اسی بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اگر اپنے 'دائرۂ عمل' سے نکل جائے گا۔ تو اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ لیکن معمولی درجے کے ناول نگار ہر جگہ ہاتھ مارنے کی کوشش کرتے ہیں اسی وجہ سے کہیں سے بھی کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ جین اسٹین نے زندگی بھر متوسط طبقے کی زندگی اور ایک خاص ماحول کو پیش کیا۔ اسی طرح ورجینا وولف کا بھی اپنا ایک مخصوص دائرۂ عمل ہے۔ اس مخصوص دائرۂ عمل کی وجہ سے ان کی عظمت پر کسی بھی اچھے اور بڑے نقاد نے حرف گیری نہیں کی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ ایک ایسے مصور سے جو پورٹریٹ بنانے میں کمال رکھتا ہو اس پر یہ اعتراض کیا جاۓ کہ وہ لینڈ سکیپ کیوں نہیں بناتا۔ یا کہ کسی مصور نے کار بنائی ہے اور پس منظر میں رکشا دکھائی ہے تو اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ اس نے رکشا کو اہمیت کیوں نہیں دی۔ کار کو کیوں پس منظر میں نہیں رکھا۔

اس سلسلے میں امریکی ناول نگار تھامس وولف نے جو بات کہی ہے وہ بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی بھی فن پارے میں ہر چیز بدل جاتی اور منقلب ہو جاتی ہے۔ فنکار کی شخصیت کی وجہ سے غیر محدود انسانی زندگی فنکار کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی اس کے اپنے تجربہ کی شدت اور گہرائی۔ قرۃ العین کے ناول کو اہمیت بخشنے والی چیز تجربہ کی یہی شدت اور گہرائی ہے۔

تجربہ کی یہی شدت اور گہرائی ناول کو فکر انگیز بناتی ہے۔ ناول کے گوناگوں واقعات خود زندگی کے تعلق سے سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ زندگی کیوں ہے؟ کس لیے ہے؟ یہ بنیادی

سوال اچھے ادب کی نشانی ہے۔ ہر اچھا ادب زندگی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

"اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذات مطلق نے دنیا بنائی ہی کیوں۔ یہ لیلاکس لیے رچائی آخر۔ ؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ بھی دراصل ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے، یہ نروان وغیرہ سب اسی کا نتیجہ تھا۔ اور اگر۔ اگر پانچ منٹ کے لیے فرض کر لو کہ آپ سے آپ ارتقا ہو گیا۔ تو ارتقاء بھی کیوں ہوا بھائی ۔ ؟ کوئی تک تھی ؟ وجہ تھی ۔ ؟"

اختر شاہجہاں پوری
رنگین چوپال۔ شاہجہاں پور-۲۴۲۰۰۱

...رے ہمسایے مجھ کو اس طرح ہشیار کرتے ہیں
...رہ رہ کر وہ ہنگامہ پسِ دیوار کرتے ہیں

...شکستہ ناؤ ہو یا دِ مخالف کے تھپیڑے ہوں
...ہیں عزم و عمل والے وہ دریا پار کرتے ہیں

...ہے کیا فرق پڑتا ہے زمانے کے تغیر سے
...د کام احباب کو کرنے تھے اب اغیار کرتے ہیں

...رشی ہو کہ ہو الفت ہو کہ نفرت ہو مگر لوگو
...ہیں باظرف وہ کھل کر کہیں اظہار کرتے ہیں

...رول پر دھوپ لے کر سایہ دیتے ہیں مسافر کو
...ہ غور سے دیکھو جو کام اشجار کرتے ہیں

...لی کے ظلم کے قصّے بیاں ہم ہی نہیں اختر
...ہوئیں تو یہ تو گھر کے در و دیوار کرتے ہیں

فریاد آزر
۱۵۳-اے، ہری نگر آشرم
نئی دہلی ۱۴-۱۱

اس نے کب کرب کے صحرا میں بسایا ہے مجھے
دھوپ خود ساختہ دیوار کا سایہ ہے مجھے

پہلے مٹی کو ہواؤں کے کرم پر چھوڑا
اور پھر آگ کے دریا میں گرایا ہے مجھے

مجھ کو بپھرے ہوئے دریاؤں کی لہروں میں ڈھونڈ
مجھ سے ٹھہرے ہوئے پانی نے چُرایا ہے مجھے

کیوں مری روح ہوئی جاتی ہے چھلنی چھلنی
کس لیے کرب کا بیروت بنایا ہے مجھے

پھر ہواؤں پہ وہی نقشِ صدا ہے آزر
پھر سرابوں کے سمندر نے بلایا ہے مجھے

محمد سالم
محلہ مادھوپور - دربھنگہ
(بہار)

غزل

ایک بھی گھر تھا کہاں نقلِ مکانی کے لیے
ہم کھنڈر ہی میں رہے مرثیہ خوانی کے لیے

وادیِ جاں کو جو مہکا گیا زخموں سے مری
دے گیا لذتِ غم بھی وہ نشانی کے لیے

پیاس کے شہر میں دریا بھی سرابوں کا ملا
منزلِ شوق ترستی رہی پانی کے لیے

پیکرِ شعر میں تصویر اُتاری میں نے
یوں تراشے نئے الفاظ معانی کے لیے

درد کی آگ میں جلتا ہے ہر اک حرف مرا
دیکھ! یہ عرضِ ہنر شعلہ فشانی کے لیے

موجزن ہے مرے جذبوں کا سمندر لیکن
یاد نے اور بڑھا دی ہے روانی کے لیے

راشد انور راشد
اولڈ ہزاری باغ
نزد چوتا بستہ
پوسٹ میڈیکل کالج۔ رانچی-۹

ہاتھوں میں اک سوالوں کی موٹی کتاب لے
دُنیا سے کر سوال، خدا سے جواب لے

آلام کے بھنور میں پھنسا ہے ہر اک بشر
کس کو پڑی ہے جو ترے غم کا حساب لے

جو خرچ ہو گئے ہیں شب و روز بے حصول
اے زندگی نہ مجھ سے تو اُن کا حساب لے

دیں گی تجھے ضرور سہارا یہ ایک دن
اچھے دنوں کے دیکھے ہوئے سارے خواب لے

راشد جہاں میں گر تجھے بننا ہے معتبر!
خوشیوں کو بانٹ، سر پہ دُکھوں کا عذاب لے

گوہر شیخ پوری

۲۸/۳۸ تیلیا باغ بنارس ۲۲۱۰۰۲

جو ایک دن کی بھوک گوارا نہ کر سکے
وہ اپنے تجربوں میں اضافہ نہ کر سکے

کرسیِ اقتدار پہ قبضہ نہ کر سکے
وہ لوگ جو ضمیر کا سودا نہ کر سکے

مانا ضرور اُن کی بھی مجبوریاں ہیں کچھ
دروازہ اپنے گھر کا جو اونچا نہ کر سکے

میری طرف اٹھاتے رہے انگلیاں وہی
جو اپنی خامیوں کا احاطہ نہ کر سکے

غم سے کچھ ایسا واسطہ گوہر رہا ہمیں
ہم لوگ ذکرِ سلمیٰ و عذرا نہ کر سکے

ابہام رشید

ل ۲۲ گل مہر سوسائٹی۔ مکتم پورہ

نظم

(۱)

اکثر
میں آسمانوں کو تکا کرتا ہوں
تاریک دِنوں کا سلسلہ ختم کرنے
سُنا ہے
وہاں سے اترتا ہے کوئی

(۲)

میرے جنگل پر بہاریں چھا رہی ہیں
اس سے پھوٹ نکلنے والی آوارہ خوشبوئیں
برہنہ ہواؤں کے کاندھوں پہ چڑھ کر
وہاں تک پہنچ رہی ہیں
جہاں تم بے حسی کی بنجر چٹانوں کے پیچھے
کہیں چھپ گئے ہو
میرا جنگل تمہاری خوشیوں کو صدا دے رہا ہے

(۳)

ہواؤں سے اُلجھنے والی شاخیں
نہیں جانتیں
کہ
سمندروں کا سفر
کتنا تھکا دیتا ہے اُن کو

شہزاد

شکریہ اُس کا، کہ آنکھوں میں نمی رہنے نہ دی
غم نہیں اس کا کہ ہونٹوں پر ہنسی رہنے نہ دی

رُخ پہ گو گردِ کدورت بھی جمی رہنے نہ دی
بے کراں افسردگی میں بھی کمی رہنے نہ دی

تشنگی کا پاس بھی رکھا بحُسنِ احتیاط
بھر دیے سب جام مے میں سرخوشی رہنے نہ دی

اے خُدا! ممنون ہوں تیرا کہ میرے ہاتھ میں
اِک قلم دے کر تہی دستی ہری رہنے نہ دی

یہ بھی ہے شہزاد اُس کی خوبیِ دستِ ہنر
بتیاں ساری جلادیں، روشنی رہنے نہ دی

شاہد کلیم

دودھ کٹورا
آرا۔ (بہار)

غزل

دیکھ! میرا ظرف تجھ کو جام و ساغر دے دیا
تشنگی کے نام پر میں نے سمندر دے دیا

تو ہی کہہ دے اور کیا انصاف کرنا تھا مجھے
خار میں نے رکھ لیے، تجھ کو گلِ تر دے دیا

درحقیقت رات کے انجام سے غافل تھا میں
گھر میں رکھ لی تیرگی اور نور باہر دے دیا

شاید اس کی تشنگی میرے لہو سے بجھ سکے
میں نے اس کے ہاتھ میں ایک تیز خنجر دے دیا

میں اسے بھولوں نہیں، وہ بھی مجھے بھولے نہیں
اُس کا پیکر لے لیا اور اپنا پیکر دے دیا

اس طرح مٹ جائے شاید حادثہ کا غم کلیم
اب کے جس کا گھر جلا میں نے اسے گھر دے دیا

یوسف ناظم
۱۹- الہلال - ۱۲- باندرہ
ریکلیمیشن - باندرہ (بمبئی)

ادب کی ملکہ معظمہ عصمت چغتائی

جی تو چاہتا ہے کہ میں عصمت چغتائی صاحبہ کو اردو ادب کی مدر ٹریسا کہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کی سب سے زیادہ مخالفت اور وہ بھی شد و مد کے ساتھ خود عصمت چغتائی کریں گی۔ شد و مد کے ساتھ اس لیے کہ وہ جب بھی کسی بات کی مخالفت کرتی ہیں تو شد و مد کے ساتھ ہی کرتی ہیں۔ وہ یہی کہیں گی کہ مدر ٹریسا کا یہاں کیا ذکر ہے انھیں مت گھسیٹو۔ مجھ میں اور ان میں تو بعد المشرقین کا فرق ہے۔ وہ بے حد منضبط، مقطع، متین، دنیا کے ہر قاعدے قانون کی پابند اور امن پسند خاتون ہیں اور میں ۔۔؟ اور اس سے پہلے کہ اس "میں" کے بعد وہ اپنے بارے میں کیا کیا نہ کہیں میں خود ہی وہ کیوں نہ کہہ دوں جو ایک مدت سے کہنا چاہ رہا ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ عصمت چغتائی اپنی مثال خود آپ ہیں اور ان کا کسی دوسری خاتون سے موازنہ کرنا، یا کسی اور کو ان کا نمونہ بتانا، خواہ مخواہ کی ضد اور بے وجہ انھیں پریشان کرنا ہے۔ لیکن ادب میں اور خاص طور پر اردو ادب میں غالباً میر امّن دہلوی کے زمانے سے یا شاید اس سے بھی پہلے سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ عوام النّاس کی سہولت کی خاطر کوئی نہ کوئی مثال ضرور دی جاتی ہے۔ ادب تو ادب، تاریخ میں بھی مثالیں دینے کا رواج عام ہے۔ اس لیے میں اس روایت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی مثال دیے بغیر آگے نہیں بڑھوں گا اور عصمت چغتائی کو اردو ادب کی کوئین وکٹوریہ کہوں گا اور اب اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا۔ کوئین وکٹوریہ کو میں نے بچشم خود نہیں دیکھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے عصمت چغتائی کو تو دیکھا ہے۔ کوئین وکٹوریہ کی ان تصویروں کے پیش نظر جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میمنت لزوم میں جگہ جگہ پائی جاتی تھیں میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئین وکٹوریہ میں تھوڑی سی مشرقیت ہوتی اور اپنے جہیز میں بمبئی شہر کے شامل کیے جانے کی خوشی میں انھوں نے تھوڑی بہت گجراتی مراٹھی آمیز اردو سیکھ لی ہوتی تو وہ یقیناً عصمت چغتائی کی وہ ہوتیں جسے فلمی زبان میں ڈبل اور علمی زبان میں مثنیٰ کہا جاتا ہے۔ کوئین وکٹوریہ کے حوالے سے عصمت چغتائی کا ذکر کرنے کا جواز یہ ہے کہ

ان میں وہی دبدبہ اور رعب پایا جاتا ہے جو ملکہ معظمہ قسم کی خواتین کے لیے مخصوص ہے۔ صوری
طور پر تو خیر ظاہر من الشمس ہے ہی لیکن معنوی طور پر بھی یہ مثال اس لیے صحیح اور درست ہے کہ
عصمت چغتائی نے اپنے قلم سے جو بھی لکھا فرمان خسروی ہوگیا اور اپنی زبان سے جو بھی کہا
آرڈی نینس کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ اپنے قدیم مشرقی وضع اور طور طریق کے گھرانے میں بھی
مطلق العنان حاکم کی طرح رہیں تو ظاہر ہے گھر کے باہر کی کھلی فضا نے ان کے عزائم اور ذہن میں
کتنی جولانی اور وسعت نہیں پیدا کی ہوگی۔ ۱۹۳۰ء کے ارد گرد ہندستانی مسلم خواتین کا لکھنا
تو ایک طرف رہا پڑھنا بھی اچنبھے کی بات ہے اور عصمت چغتائی نے اس زمانے میں جس قسم
کی کہانیاں لکھیں وہ مثنوی زہر عشق سے لذت میں کچھ کم نہیں تھیں۔ مثنوی زہر عشق اس زمانے میں
گھروں میں شوق سے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن سب سے چھپ کر۔ تقریباً یہی صورت عصمت
چغتائی کی کہانیوں کی تھی۔ مرزا شوق خوش قسمت تھے کہ انھیں عدالت نہیں جانا پڑا۔ اس کی
وجہ شاید یہ ہوگی کہ ہمارے یہاں نثر کے مقابلے میں، شاعری کو زیادہ مراعات حاصل ہیں۔
عصمت چغتائی اگر نثر کی بجائے شاعری کرتیں تو ان کا کلام بھی مستند ہوتا اور سب یہی کہتے
کہ اس میں کیا کلام ہے۔ عصمت چغتائی نے پتا نہیں کتنے قلم توڑے اس کا حساب انھوں
نے نہیں رکھا گویا انھوں نے کس چیز کا حساب رکھا ہے۔ انھوں نے لکھنے کے لیے روشنائی بھی
استعمال نہیں کی۔ اپنے قلم کو بس آگ میں بجھایا اور لکھا۔ اسلحہ ساز خنجر وغیرہ بناتے ہیں تو
انی بنانے پر کتنی محنت کرتے ہیں اور عصمت چغتائی نے گھر بیٹھے اپنے قلم کی نب کو اتنی آسانی سے انی
بنا دیا جیسے رومال کے کونے پر کشیدہ کاری فرمائی ہو لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں بیل بوٹے
نہیں بناتے۔ چکیاں نہیں ٹانکیں بلکہ کچھ ایسی چیزیں رقم کیں کہ ان کی وضاحت کے لیے
انھیں عدالت جانا پڑا۔ اس عدالتی کارروائی سے بھی وہ کچھ کم خوش نہیں ہیں۔ جب بھی اس
واقعے کا ذکر کرتی ہیں خوشی سے پھولے نہیں سماتیں۔ کہتی ہیں جب ہم پر مقدمہ چل رہا تھا تو
بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ ہمیں لے جایا جاتا۔ جوق در جوق لوگ ہمیں دیکھنے آتے۔
اسٹیشنوں پر، ہوٹلوں پر، گھروں پر اور عدالت کے احاطوں میں لوگ ہی لوگ ہوتے اور ان
سب کی توجہ کا مرکز ہم ہوتے۔ وہ تو یہ کہنے میں بھی تکلف نہیں کرتیں کہ ہاں ہاں ہم نے
گالیاں بھی کھائی ہیں تو کیا ہوا! گالی کھانا تو کوئی بری بات تھوڑے ہی ہے اور ان گالیوں کا
نتیجہ کیا نکلا؟ عدالت نے ہمیں صاف بری کر دیا۔ ان کی گفتگو اور طرز بیان سے تو کوئی بھی سننے
والا یہی محسوس کرے گا کہ وہ عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہیں اور غالباً وہ چاہتی تھیں کہ
عدالت واقعی انصاف کرے۔ محترمہ نے کچھ ایسا ہی مزاج پایا ہے۔ انھیں آج تک معلوم ہی نہیں
ہو سکا کہ وہ چاہتی کیا ہیں۔ انھیں شاید یاد نہیں رہا کہ ان کے معروف و مشہور مقدمے کا فیصلہ
ایک ایسے ناظم عدالت کے زور قلم کا نتیجہ ہے جو ریاست حیدرآباد کے محکمۂ عدالت سے تعلق رکھتا
تھا اور حیدرآباد کے قضاۃ عدالت عام طور پر باعزت بری کیے جانے کے فیصلے لکھنے کے عادی تھے۔
[illegible] حکومت کا قابل قدر [illegible] اقبال [illegible] ملا تو انھیں شکایت

یہ پوچھا ہوگی کہ یہ لوگ ایوارڈ وغیرہ کیوں دیا کرتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ کیا یا لکھا اپنے لیے کیا۔ ان سے کیا لینا دینا ہے۔ بھوپال جانے کے تعلق سے بھی کچھ ایسی ہی ویسی بات کی۔

کچھ دن پہلے میں نے اپنی نادانی کی بنا پر انھیں حیدرآباد چلنے کی دعوت دی۔ بعد خوش ہوگئیں۔ کہنے لگیں ہاں ہاں حیدرآباد ضرور چلوں گی۔ برسوں ہوگئے وہاں گئے۔ عطاء الرحمٰن اور فضل الرحمٰن سے ملوں گی۔ میرے تو وہاں اور بھی کئی لوگ ہیں۔ جیلانی بانو کے ہاں ٹھیروں گی۔ انھیں فون کردوں گی یا تم فون کردینا۔ پیسے مجھ سے لے لینا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے تو ان کی باتیں سن کر تقریباً سکتہ ہوگیا کہ اتنی آسانی سے حیدرآباد جانے کے لیے رضامند کیسے ہوگئیں۔ حد یہ ہوگئی کہ انھوں نے فرمایا میں ٹرین ہی سے چلوں گی اور جب میں نے انھیں دو تین دن بعد بتایا کہ ان کا ریزرویشن ہوگیا ہے تو یکلخت بکھر گئیں۔ بکھر کیا گئیں باضابطہ بپھر گئیں۔ پوچھا آخر میں وہاں کیوں جا رہی ہوں کسی نے مجھے دعوت تو دی نہیں ہے۔ میں نے کہا ان لوگوں نے مجھے ذمّہ دار بنایا ہے۔ اب مجھے آپ سے کیا چھپانا ہے کہ یہ سن کر انھوں نے کیا فرمایا۔ بولیں 'تم کون ہوتے ہو مجھے لے جانے والے۔ کیا میں آم کے اچار کی ہنڈیا ہوں کہ جو چاہے مجھے اٹھا لے جائے۔ میں نے لاکھ کہا کہ آپ کے کہنے ہی پر تو ریزرویشن ہوا ہے۔ صاف مُکر گئیں کہ میں نے ہرگز نہیں کہا تھا اور میں ٹرین میں کیوں جاؤں۔ ٹرین تو بہت ہلتی ہے یوں بھی اور یوں بھی۔ میں نے عرض کیا کہ ٹرین تو برسوں بھی ہلتی تھی جب آپ نے اسے سفر کے لیے پسند فرمایا تھا۔ بولیں کچھ بھی ہو میں حیدرآباد نہیں جاؤں گی۔ میں نے پھر ڈرتے ڈرتے کہا کہ وہ عطاء الرحمٰن اور فضل الرحمٰن۔ فرمایا۔ میں بعد میں کبھی چلی جاؤں گی۔ میں نے بہرحال ان سے یہ نہیں کہا کہ بیرسٹر عطاء الرحمٰن برسوں سے علیل ہیں۔ میرے علم میں تو کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے کہ عصمت چغتائی کو کسی نے بھی جواب دیا ہو۔ اگر کسی نے جواب دیا ہے تو بس ان کے حافظے نے دیا ہے۔ اب تو وہ اپنی عمر بھی دس سال زیادہ بتانے لگی ہیں۔ ہیں اٹھہتر کی لیکن کہتی ہیں کہ میں اٹھاسی کی ہوگئی ہوں۔ جب ۸۸ کی ہوں گی یقیناً کہیں گی کہ میری سنچری ہوگئی ہے لیکن کون نہیں چاہے گا کہ وہ سنچری مکمل کریں۔ ابھی حال میں انھوں نے ایک اہم فیصلہ کیا ہے وہ یہ کہ آیندہ وہ اپنے نام آئے خط نہیں کھولا کریں گی۔ ڈرتی ہوں گی کہ معلوم نہیں کس خط میں کس ایوارڈ کی اطلاع جائے۔

ان کے بارے میں تو اتنی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ ڈھیر لگ جائے حالانکہ میں زیادہ کچھ جانتا نہیں ہوں۔ تاہم دو تین باتیں سن لیجیے۔ عصمت چغتائی کا حیدرآباد سے دیرینہ تعلق ہے۔ ان کے ایک بہنوئی سراج الدین صاحب حیدرآباد میں منصف تھے اور یہ پہلی مرتبہ جب حیدرآباد آئیں تو اپنے بہنوئی ہی کے گھر کاچی گوڑہ میں ٹھیریں اور یہ اتفاق ہے کہ سراج الدین صاحب سے میرے خورد و کلاں کے تعلقات تھے وہ اس طرح کہ مرحوم اپنے زمانۂ ملازمت میں اور میرے زمانۂ طالب علمی میں میرے وطن جالنہ میں بھی برسرِ کار رہے اور مجھے بحیثیت خورد ان کے ہاں آنے جانے کا موقع ملا۔ یہ غیر ضروری تفصیل اس لیے درمیان میں آگئی کہ میں فرحت رابسلط

اور اطمینان و احتشان کے ساتھ بیان کر سکوں کہ محترمہ عصمت چغتائی سے مجھے اس وقت نیاز حاصل ہوا جب اس صدی کی چوتھائی دہائی کی شروعات تھی۔ انھیں حیدرآباد کے ایک قدیم ہوٹل برکانزا میں استقبالیہ دیا گیا تھا۔ سنہ ہوگا ۴۳ یا ۴۴ء۔ اس زمانے میں سارے ہندستان میں بالعموم اور ریاست حیدرآباد میں بالخصوص سخت گوشے پردے کا رواج تھا بلکہ اس کا اہتمام اور اس کے ساتھ ساتھ احترام کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کی خواتین تو گاڑھے پردے کی عادی تھیں اور مردوں کی گاڑھی کمائی زیادہ تر اسی مد میں خرچ ہو جاتی تھی لیکن اس رواج کی پابندی میں خود مرد بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرتے تھے (ویسے حوصلے ان کے بلند تھے) جب لال ٹیکری پر موقوعہ ہوٹل میں عصمت چغتائی بے محابا پہنچیں اور انھوں نے بڑی فراخدلی کے ساتھ مردوں کی طرف اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا تو کئی کمزور دل مرد مارے حجاب کے کٹ کٹ گئے۔ حیدرآباد میں یہ ان کی اوّلین رونمائی تھی۔ اوّلین کا لفظ شاید یہاں زیادہ ہے کیونکہ رونمائی تو ہوتی ہی اوّلین ہے (میں یہ لفظ واپس لیتا ہوں) عصمت چغتائی نے اس محفل میں وہی کیا جو نپولین نے روم میں کیا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ آئیں دیکھا اور محفل کو زیر کر لیا۔ نپولین کے تعلق سے جو کچھ مشہور ہے ممکن ہے اس میں مبالغے کا عنصر شامل ہو۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ مبالغے سے مبرّا ہے۔ قلی قطب شاہ کے دیس میں مبالغے کا رواج کم ہی ہے۔

بمبئی میں تو وہ ہر محفل کی خاتون اوّل رہی ہیں اور ہر محفل میں اب میں فحاشی اور عریانی سے متعلق اپنی اس رائے کا اظہار کرتی ہیں جسے لوگ دلچسپی سے اس لیے سنتے ہیں کہ وہ ایک ہی رائے مختلف پیرایوں میں بیان کرتی ہیں اور یہ رائے ہمیشہ نئی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی ابھی حال میں انھوں نے ایک افسانوی نشست کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے ہمیں قمیص پاجامہ پہنا کر نہیں پیدا کیا ہے۔

اب میں آپ سے کیا عرض کروں کہ انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا کہ میں نے شادی تو فلیٹ حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ کیا کرتی اکیلی تھی۔ کوئی مجھے اپنا فلیٹ کرایے پر دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسکول انسپکٹرس تھی جس سے بھی مکان کے لیے کہتی وہ انکار کر دیتا۔ عجیب عجیب مفروضات کا سہارا لیتا۔ مجھے مجبوراً شادی کرنی پڑی۔ میں نے کہا جانے دیجیے مرد بھی تو اسی مجبوری کی وجہ سے شادی کرتے ہیں۔ بولیں ہاں زمانہ ہی خراب آگیا ہے۔

ایک مرتبہ معلوم نہیں ان کے جی میں کیا سمائی مجھے کھانے پر بلالیا اور کہا بیوی کے ساتھ آنا۔ کھانے پر بیٹھے تو خیال آیا کہ آج تو ہماری حیثیت مہمان کی ہے شاید وہ اچھی باتیں کریں گی۔ ایک ہی لمحے میں یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ ڈانٹ پڑی کہ اب کیا دیکھ رہے ہو۔ کھاؤ۔ میں خاطر واطر نہیں کروں گی۔ عصمت چغتائی کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں ادب کی مدر ٹریسا کہوں لیکن اب تو میں انھیں کوئن وکٹوریہ کہہ چکا۔ کہا تو کوئن ہے لیکن ان کے حق میں دعا بھی کروں گا کہ

ڈاکٹر حسن الدین صدیقی
۸-۴-۳/۴۴ منصور پور
اورنگ آباد (بہار)

نیاز حیدر

(کچھ یادیں، کچھ باتیں)

نیاز حیدر سے پہلی بار میری ملاقات محترمہ خورشید نذیر کے دولت کدے گلستاں میں ہوئی تھی۔ وہ شاعری میں پروفیسر عبد القیوم خاں باقی سے اصلاح لیتی تھیں لیکن آئیڈیالوجی کے اعتبار سے کامریڈ مخدوم محی الدین کو اپنا رہنما تسلیم کرتی تھیں۔ اسی لیے ہم انھیں کامریڈ آپا کہتے تھے۔ سقوط حیدرآباد سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے ادبی سنگم نامی ایک لٹریری ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی۔ آج کل ضعف بصر کی وجہ سے خانہ نشینی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے نیاز حیدر نے ایک مرتبہ کامریڈ آپا کے بارے میں کہا تھا کہ انھیں دیکھ کر فرانس کی ان ذہین اور ادب نواز خواتین کا خیال آتا ہے جن کے SALONS سے شاعر، ادیب اور آزادی کے متوالے تربیت پاکر نکلتے تھے۔

نیاز حیدر ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا کے ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے اور دوسرے کو بہت کم بولنے کا موقع دیتے تھے۔ نیاز حیدر اس قدر زود گو شاعر تھے کہ چند اشعار سے ان کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ غضب کا حافظہ پایا تھا سو ڈیڑھ سو بند کی نظم بغیر کسی بیاض کا سہارا لیے خطیبانہ انداز میں سناتے تھے۔ اس وقت بھی لوگ انھیں شاعری کی حد تک ایک VERSIFIER سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتے تھے۔

۱۹۵۴ء کے بعد روزگار کی مصلحتوں نے مجھے حیدرآباد سے دور کر دیا تھا۔ اگلے دو سال کے اندر اندر ریاستوں کی لسانی تشکیل جدید (اکتوبر ۱۹۵۶ء) نے میری تقدیر کو مہاراشٹر اسٹیٹ سے ہمیشہ کے لیے جوڑ دیا۔ تب ہی سے عروس البلاد بمبئی اکثر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ انھی دنوں مکتبہ جامعہ بمبئی کے سربراہ شاہد علی خاں صاحب سے راہ و رسم بڑھی۔ شاہد صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ مکتبہ جامعہ کہنے کو تو اردو کتابوں کی فروخت کا مرکز تھا لیکن سرشام شاہد صاحب کی شخصیت کی کشش بمبئی میں مقیم شعرا اور ادبا کو وہاں کھینچ لاتی تھی سقوط حیدرآباد کے کافی عرصہ بعد ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے دولت کدہ ۳۲ شیریں ولا بمبئی میں نیاز حیدر سے دو تین بار ملاقات ہوئی۔ اب وہ صرف نیاز حیدر ہی نہیں رہے تھے بلکہ بابا نیاز حیدر کہلاتے تھے۔ سفید داڑھی، گھنا چہرے مہرے سے وہ مجھے سقراط کی طرح لگتے تھے، سقراط کو اس کے ہم وطن اس کی بدنمائی UGLINESS

کی دجہ سے (UNBELIEVING) کہتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے جسم میں ایک خوبصورت روح رکھتے تھا۔ واضح ہو کہ میں نے صرف جسمانی طور پر نیاز حیدر کا سقراط سے تقابل کیا ہے۔ جہاں تک ان کی روحانی زندگی کا تعلق ہے نیاز حیدر پکے NIHILIST تھے۔ منکر خدا اور مذہب بیزار انھیں کا ایک شعر ہے ؎

نہیں میرا کوئی مذہب نہیں ہے
خدا سے مجھ کو کچھ مطلب نہیں ہے

فضیل جعفری نے اردو بلٹز میں نیاز حیدر کو، اردو کا آخری لوہیمین شاعر کہا ہے اور یہ چند الفاظ نیاز حیدر کی شخصیت کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ روایتی مفہوم میں نیاز حیدر گھریلو آدمی (FAMILYMAN) نہیں تھے۔ ان کے اپنے بھائی خورشید حیدر سے میں کئی بار پربھنی (مہاراشٹرا کا ایک ضلع) میں مل چکا ہوں۔ عادات و اطوار میں بالکل اپنے بھائی کے جانشین ہیں۔ جب ترنگ میں ہوتے ہیں تو اپنے بھائی نیاز حیدر کے اشعار سناتے ہوتے بار بار انگریزی میں یہ اعلان کرتے ہیں۔ "نیاز حیدر ایک عظیم شاعر ہے" اقبال سے بھی عظیم تر شاعر۔ اور پھر اپنے بھائی کو ایک موٹی سی گالی دیکر خورشید حیدر رونے لگتے ہیں۔ نیاز حیدر کی والدہ کا پربھنی میں انتقال ہو گیا اور مہینوں تک انھیں اطلاع نہ مل سکی اور جب ملی تو آنسو کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ لیکن وفورِ غم میں رات بھر شغل کرتے رہے۔ بہرکیف نیاز حیدر ایک ایسا درویش تھا جو کبھی اہل و عیال کے موہ کے بندھن میں گرفتار نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ اورنگ آباد کے کوالٹی انجینیرنگ کے ٹیریس پر بیٹھ کر (بقول ان کے دھرم چکر پری ورتن مدرا میں) انھوں نے اعلان کیا۔ "کل رات کو ٹھیک بارہ بجے میں نے نروان پراپت کر لیا"

ڈاکٹر ظ انصاری کے فرزند ارجمند خورشید انصاری (مجروح سلطان پوری کے داماد) نے اورنگ آباد کے انڈسٹریل سیکٹر میں ایک شٹر (SHUTTER) بنانے والی فیکٹری کھولی تھی۔ خورشید کی شادی کے بعد اسی فیکٹری کے کھلے میدان میں RECEPTION رکھا گیا تھا جس میں شرکت کے لیے بمبئی سے قرۃ العین حیدر، موسیقار نوشاد علی اور کتھک کی مشہور ڈانسر ستارہ دیوی اور دوسرے کئی VIP's آئے ہوئے تھے۔ نیاز حیدر بھی آنے والے تھے مگر خود ان کا بیان ہے کہ دہلی سے تو وہ روانہ ہوئے تھے لیکن راستہ میں کہیں گم ہو گئے۔

۱۹۷۴ء کے آس پاس ڈاکٹر ظ انصاری نے مجھے اس مضمون کا خط لکھا تھا۔

"برادرِ عزیز۔ میں نے نیاز حیدر سے بات کر لی تھی۔ وہ راضی بھی ہو گئے تھے اسے اس ظالم پر کوئی اچھا سا مضمون لکھ دیجیے۔ سوانح حیات جمع کر کے! صاحب کمال شخص یونہی ضائع ہوا جا رہا ہے۔ کون جانے، ہم پہلے بجھ جائیں یا وہ"

پھر ایک روز نیاز حیدر اچانک اورنگ آباد پہنچ گئے۔ ان کے قیام کا بندوبست کوالٹی انجینیرنگ کے گیسٹ ہاؤس پر کیا گیا۔ طعام کے علاوہ ان کی روزانہ خوراک (وہسکی) پر بھی بھاری

دو تین گانے انھیں سنا کر محظوظ بھی کیا۔ تھیٹر کے بارے میں بابا ڈیڑھ دو گھنٹے تک بے تکان بولتے رہے۔ خود کے ترجمہ کیے ہوئے کلاسیکل ڈراموں شکنتلا اور مٹی کی گاڑی کے کچھ حصے اپنے مخصوص انداز میں سنا کر سامعین سے بے پناہ داد حاصل کی اورنگ آباد کے محل وقوع اور یہاں کی معتدل آب و ہوا سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آرٹ اسکول کے سامنے ایک تھیٹر کامپلکس کا نقشہ بھی رکھا جس پر ان کے تخمینے کے مطابق پندرہ تا بیس لاکھ کا خرچ بیٹھتا تھا۔ ایسے معاملوں میں بابا نیاز حیدر عملی انسان کم اور آئیڈیلسٹ زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ ہاں اگر حکومت کی کسی بااقتدار ہستی حتیٰ کہ وزیر اعظم کے دفتر یا گھر کے سامنے دھرنا دینا ہو تو عواقب کی پروا کیے بغیر اس کے لیے وہ ہمہ تن تیار رہتے تھے۔ جتنے دنوں تک اورنگ آباد میں قیام رہا حیدر آبادی پکوان مثلاً — بریانی اور خاص طور پر بگھارے بینگن کی بار بار فرمائش کرتے رہے

بابا نیاز حیدر کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان کے سامنے کوئی متعین منزل نہیں ہوتی تھی۔ نہ تو انھیں اور نہ ہی ان کے میزبان کو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کب تک ایک ہی جگہ دھونی رمائے بیٹھے رہیں گے۔ جب خورشید اور ان کے رفیق کار اقبال انصاری بابا نیاز حیدر کی خاطر تواضع (طعام کم اور دوسری چیز زیادہ) کا بار اٹھانے کے قابل نہ رہے تو یہ طے پایا کہ انھیں کسی نہ کسی طرح بمبئی روانہ کر دیا جائے اس طرح ایک روز بمبئی جانے والی لگژری بس میں ان کا ریزرویشن کروایا گیا۔ ایک والنٹیر انھیں بس اسٹیشن لے گیا اس کا بیان ہے کہ بس ٹھیک وقت پر بمبئی کے لیے روانہ ہوئی۔ بابا نیاز حیدر نے ہاتھ ہلا کر اسے رخصت بھی کیا۔ ابھی مشکل ہی سے آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ کوالٹی انجینئر نگ کے آہنی پھاٹک پر ایک آٹو رکشا رکا۔ بابا نیاز حیدر اپنی کپڑے کی بڑی تھیلی لٹکائے رکشا سے برآمد ہوئے۔ (اس تھیلی میں عام طور پر ایک بشرٹ اور پاجامہ ایک چھوٹا سا تولیہ دو تین رسالے یا کوئی کتاب ہوتی تھی۔ بس یہی ان کا اثاثہ ہوتا)

میزبان کے دریافت کرنے پر بس سے لوٹ کر آنے کی انھوں نے دو وجہیں بتائیں۔ ایک تو ان کے لیے ان کی مخصوص خوراک کا مناسب بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ایمرجنسی میں بمبئی جانے والے ایک مسافر کی بس کنڈکٹر سے منت سماجت کا سماں دیکھ کر ان پر رقت طاری ہوگئی اور انھوں نے بس کے پہلے ہی اسٹیج (غالباً پرنٹ شرادل) پر اپنا ٹکٹ اس مسافر کے حوالے کیا

"اور ٹکٹ کے روپے؟"

"انھیں روپوں ہی سے تو آج رات اور کل کی خوراک کا بندوبست کیا گیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ دوسرے دور کی میزبانی کا سلسلہ اگلے چند دنوں تک چلتا رہا۔ دوسری بار انھیں رخصت کرنے کے لیے والنٹیر کو کافی دور تک بھیجا گیا تھا۔

بہر حال ایسے تھے ہمارے مست قلندر نیاز بابا! اگر انھیں تصوف سے ذرا بھی رغبت ہوتی تو ان کا شمار یقیناً ملامتیہ فرقے کے صوفیوں میں کیا جاتا۔

انگریزی اخبار کے ایک جرنلسٹ مسٹر ستیندر سنگھ جو کسی زمانے میں بابا نیاز حیدر کی

طرح کمیونسٹ تحریک سے وابستہ تھے یا با نیاز حیدر کے عنوان کے تحت فری پریس جرنل میں لکھتے ہیں کہ نیاز حیدر باتوں کے سوداگر تھے (بالکل یہی الفاظ انھوں نے رومن حروف میں لکھے ہیں) ایک طفیلیے کی طرح زندگی گزارنے کے فن میں انھیں مہارت حاصل تھی۔"

"INFACT, HE PERFECTED THE ART OF PARASITIC LIVING"

یہی وجہ ہے کہ اکثر احباب ان سے دور بھاگنے لگے تھے۔ پتا نہیں راجد صاحق دہلی کے سکھ ٹیکسی ڈرائیور بابا نیاز حیدر کے اس قدر معتقد کیوں بن گئے تھے کہ ان سے ٹیکسی کا کرایہ لینا تو دور رہا الٹا ان کی من پسند خوراک کا اپنی جیب سے بندوبست کرتے تھے۔

جنوری ۱۹۷۶ء میں جب میں امیر خسرو انٹرنیشنل سیمنار میں شرکت کی غرض سے دہلی گیا تھا تو ایک سردار جی ٹیکسی ڈرائیور نے برسبیل تذکرہ نیاز بابا کے بارے میں مجھ سے یہ کہا تھا۔

"سویرے نیاز بابا جس گڈی (گاڑی) میں بیٹھ جائیں تو واہے گرو کی کرپا سے اس کی خوب روزی روٹی چلتی ہے۔"

بالفرض منٹو یہ الفاظ سن پاتے تو نیاز بابا کو ضرور بہت بڑا فراڈ کہتے۔ یہ بات نہیں کہ نیاز حیدر خود کمانے کی فکر نہیں کرتے تھے۔ صاحب کمال شخص تھے۔ (بعض پراجکٹ کی تکمیل پر انھیں کافی روپیا ملتا تھا۔ جب تک اسے اپنے پر اور اپنے احباب کی ضیافت پر خرچ نہ کر لیتے انھیں چین نہ آتا تھا) اس ضیافت سے محظوظ ہونے والوں میں تنگ دست ادبا وشعرا کے علاوہ محنت کش مزدور بھی ہوتے تھے۔

نیاز حیدر کی شاعری سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان کی شخصیت کے دوسرے کئی اہم ابعاد (DIMENSIONS) بھی تھے۔ نیاز حیدر کو سنسکرت، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ مغربی ادب کے شہ پاروں سے بھی وہ بڑی حد تک واقف تھے۔ موسیقی سے بھی انھیں خاصا لگاؤ تھا۔ ہندستانی کلاسکی ناٹکوں میں سے انھوں نے شکنتلا اور مٹی کی گاڑی کا کامیاب ترجمہ کیا تھا۔ اس طرح ان کے ترجمہ کیے ہوتے اور طبع زاد ناٹکوں کی تعداد بارہ تک پہنچتی ہے۔ فلمی دنیا میں بھی انھوں نے قدم جمانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں رہے۔ غالباً رامانند ساگر نے کافی عرصے ایک فلم "لالہ رخ" کے نام سے بنانے کا اعلان کیا تھا اور اس کا اسکرپٹ نیاز حیدر تیار کر رہے تھے۔ مگر کو وہ فلم آج تک نہ بن سکی۔ سننے میں آیا ہے کہ اسکرپٹ کے معاملے میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہماری فلمی دنیا میں زیادہ تر مرضی پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی چلتی ہے۔ اسکرپٹ رائٹر تو بس قلم کا مزدور ہوتا ہے۔

نیاز حیدر ہی ٹی وی سیریل جہانِ عالم، کے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ ستیندر سنگھ کا خیال ہے کہ نواب واجد علی شاہ کو ایک نیشنل ہیرو کا درجہ دے کر نیاز حیدر نے تاریخ کا منہ چڑایا تھا حالانکہ واجد علی شاہ کا امیج ایک عیاش اور ناکارہ بادشاہ کا ہے۔

جہاں تک جدید ہندوستانی تھیٹر کے احیا کا تعلق ہے نیاز حیدر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عرصہ تک وہ IPTA سے بھی وابستہ رہے مگر ۱۹۵۵ء کے آس پاس بیگم

قدسیہ زیدی اور وہ انکی معاونت سے انھوں نے ہندوستانی تھیٹر کی بنیاد رکھی اور چند ناقابل فراموش ڈرامے پیش کیے۔ محمود کا قدسیہ زیدی کا ترجمہ کیا ہوا ہنرک اپسن کا ڈراما گڑیا گھر DOLLS HO-USE بے حد مقبول ہوا۔ استیندر سنگھ کا بیان ہے کہ ہندوستانی تھیٹر کی طرف سے پیش کیے جانے والے ڈراموں کے ناظرین میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مارشل ٹیٹو اور مصر کے جمال عبد الناصر بھی شامل تھے۔

بابا نیاز حیدر سے واقف کار اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایک کٹر مارکس وادی اور ترقی پسند ادبی تحریک کے حامی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ نیاز حیدر کی شاعری بقول فضیل جعفری منظوم صحافت سے زیادہ نہیں ہے مگر تحریک سے ان کی پُر خلوص وابستگی کا تحریری اعتراف بھی ضروری تھا۔ فضیل جعفری کے الفاظ میں "خود ترقی پسندوں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ان کے ساتھیوں نے انھیں لاوڈ اسپیکر کے طور پر تو یقیناً استعمال کیا لیکن بطور شاعر کوئی اہمیت نہیں دی" (اردو بلٹز ۱۸ فروری ۸۹ء) میرا خیال ہے کہ بابا نیاز حیدر پر OUTSIDER کا اطلاق پوری طرح منطبق ہوتا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مانگے کا اُجالا

سخن در سخن
خامہ بگوش کے قلم سے

مہان لیکھک اوپندر ناتھ اشک
۸۱ برس کے جوانِ رعنا ہیں

ممتاز ہندستانی ادیب اوپندر ناتھ اشک ایک طویل عرصے سے پانچ حصّوں پر مشتمل ناولوں کا ایک سلسلہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا ناول "گرتی دیواریں" اور تین دوسرے ناول شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں ناول زیرِ تحریر ہے۔ اس میں لاہور کے ان علاقوں کا تفصیلی ذکر ہے، جہاں آج سے پچاس برس قبل اشک صاحب کا قیام تھا۔ ان علاقوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھنے کے لیے وہ لاہور آئے، تو اکادمی ادبیات نے انھیں اسلام آباد اور کراچی کی سیر بھی کرادی۔ پچھلے دنوں کراچی میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہی۔ وہ یہاں کے ادیبوں سے ملے اور ان کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔

اشک صاحب، چشمِ بد دور، ۸۱ برس کی عمر میں بھی اپنی حرکات و سکنات سے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے ۸۱ کے ہندسوں نے اپنی جگہ تبدیل کرلی ہو۔ دیکھنے میں وہ بزرگ ہیں، لیکن بات کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی جوان رعنا بول رہا ہے۔ تقریر کرتے ہیں تو جوانانِ رعنا بھی ان کے سامنے گھاس کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گھنٹوں بے تکان تقریر کرتے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور جب تقریر ختم ہوتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے، تقریر نہ تھی، غالب کا دریائے معاصی تھا جو تنک آبی سے خشک ہو گیا۔

کراچی میں انجمن ترقی اردو اور ادارہ یادگارِ غالب کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اشک صاحب کو دیکھنے اور سننے کے لیے دور دور سے اتنے لوگ آئے کہ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ جلسے کا آغاز مختار زمن کے مضمون سے ہوا، انھوں نے اشک صاحب کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مختار زمن ڈیڑھ سال پہلے الٰہ آباد میں اشک صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس ایک ملاقات کے حوالے سے انھوں نے موصوف کی ایسی تصویر کھینچی، جیسے ان کی آدھی نہیں تو چوتھائی زندگی اشک صاحب ہی کے ساتھ گزری ہو۔

مختار زمن کے بعد اشک صاحب مائیک پر آئے۔ ہمارے قریب استادالاعزاز مراد آبادی بھی بیٹھے تھے۔ اشک صاحب کو دیکھ کر کہنے لگے "یہ بزرگ تقریر کیا فرمائیں گے، ان کا گریہ تو ضعف سے مبدل بہ دمِ سرد ہو جائے گا" ـــــ لیکن لاعزصاحب کا خیال غلط نکلا۔ اشک صاحب نے سماں باندھ دیا۔

۵۰ برسوں کی اپنی تخلیقی زندگی کے اوراق یوں پلٹے کہ ہماری ادبی تاریخ کا پورا ایک دور آنکھوں کے سامنے آگیا۔ انھوں نے بہت سے دلچسپ واقعات سنائے، بہت سی ادبی شخصیات کا تذکرہ کیا۔ مختصر یہ کہ اپنے تجربات و مشاہدات کا مینا بازار سجا دیا ان کے ایک ایک لفظ کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنا گیا۔

اشک صاحب کی تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے ہم عصر ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ہر اہم تحریر ان کی نظر سے گزری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے میرا جی کا وہ خاکہ بھی پڑھ رکھا تھا، جو آج سے ۳۰ برس پہلے سحاب قزلباش نے لکھا تھا، اور جس کے لکھے جانے کا علم کم لوگوں کو ہے۔ اشک صاحب نے فرمایا، اُردو میں جو چند بہترین شخصی خاکے لکھے گئے ہیں، میرا جی کا خاکہ ان میں سے ایک ہے۔ اتفاق سے سحاب بھی اس جلسے میں موجود تھیں۔ وہ اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہوئیں۔ اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی تعریف سن کر ہم بھی خوش ہوئے کہ ۳۰ برس بعد انھیں ان کی محنت کی داد ملی۔ ہم نے محترمہ کو مبارک باد دی اور عرض کیا کہ یہ خاکہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم اسے پڑھ لیں۔ کہنے لگیں۔ "میرے شخصی خاکوں کا مجموعہ عنقریب شائع ہو رہا ہے" انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس مجموعے میں فیض، جوش، ن م راشد، ذوالفقار علی بخاری، محمود نظامی، مختشب جار چوی، ابن انشا اور دوسرے بہت سے ادیبوں کے خاکے شامل ہیں۔ یہ تفصیل سن کر ہم نے عرض کیا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ نے شاعری چھوڑ کر نثر میں ایک مفید کام انجام دیا"۔ محترمہ نے پہلے تو اس کی تردید کی کہ انھوں نے شاعری ترک کر دی ہے اور پھر فرمایا۔ "کیا شاعری مفید کام نہیں ہے؟" ہم نے کہا۔ "اگر یہ کام مفید ہوتا تو اشک صاحب آپ کی شاعری کے حوالے سے بھی آپ کا ذکر کرتے"۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا اُردو کے بہترین شخصی خاکوں کا۔ ہمارا خیال ہے کہ اشک صاحب نے منٹو کا جو شخصی خاکہ (منٹو: میرا دشمن) لکھا ہے وہ بھی ان کے چند بہترین خاکوں میں شامل ہے۔ اس خاکے کا نمایاں وصف یہ ہے کہ منٹو کی شخصیت کے ساتھ ساتھ خود اشک صاحب کی شخصیت بھی پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔ انھوں نے جتنی بے باکی کے ساتھ منٹو کے عیب گنوائے ہیں، اس سے کہیں زیادہ حق گوئی کا ثبوت اپنے عیوب کے بیان میں دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عام لوگ، جنھیں عیب سمجھتے ہیں، اشک صاحب کے نزدیک وہ خوبیاں ہیں۔

منٹو اور اشک کے تعلقات عجیب و غریب تھے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ محبت بھی کرتے تھے اور نفرت بھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ بظاہر دوستانہ لیکن بباطن منافقانہ رویہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کو خوش دیکھ کر رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اشک نے اپنے ڈراموں کے مجموعے "چرواہے" کا انتساب منٹو کے نام ان الفاظ کے ساتھ کیا تھا۔ "منٹو کے نام، جو مجھے کبھی اچھا لگتا ہے اور کبھی سخت بُرا"۔ اشک کے بارے میں منٹو کی رائے بھی ایسی ہی۔ اس نے ایک مرتبہ اشک سے کہا تھا۔ "میں تمھیں پسند کرتا ہوں، حالانکہ مجھے تم سے نفرت ہے"۔ منٹو نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت کے زمانے میں اشک کی تذلیل کی۔ اس کے جواب میں اشک نے سازش کر کے منٹو کو ریڈیو کی ملازمت چھوڑنے اور دہلی سے بمبئی بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ منٹو

نے بھی پہنچ کر اشک کو بھی اصرار کرکے وہیں بلالیا۔
بعد میں بھی دونوں ایک دوسرے کے لیے پریشانی
کا باعث بنتے رہے۔ یہ صورت احوال کچھ ایسی ہے
جیسے دونوں (منٹو کے الفاظ) ایک دوسرے کے لیے
استروں کی مالا بن گئے تھے۔ جس کا پہننا بھی مشکل
اور اتارنا بھی مشکل۔

اشک صاحب نے اپنے ایک مضمون
میں لکھا ہے انھوں نے اوائل عمر جب شاعری شروع
کی تو اُن کے والد نے ان کے شعر سن کر کہا
تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ٹیگور اور شیکسپیر
کے کان کاٹے گا۔ اشک جب بڑے ہوئے تو
ٹیگور اور شیکسپیر کے کان تو ان کے ہاتھ نہیں آئے
لیکن منٹو کی گردن پر اُن کی نظر رہی، جسے وہ کاٹنے
کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ لیکن انھیں جلد ہی
اندازہ ہو گیا کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے۔
یہی وجہ ہے کہ آج وہ افسانہ نگار منٹو کے سب سے
بڑے مداح ہیں۔

کراچی میں اشک صاحب کے اعزاز میں
ایک جلسہ اکادمی ادبیات کی طرف سے بھی ہوا جس
کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں ہو سکیں، بالکل اسی
طرح جس طرح آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اکادمی
ادبیات کا مصرف کیا ہے۔ البتہ بعض نجی محفلوں میں
ہم نے اشک صاحب کا کلام بلاغت نظام سنا۔ اشک صاحب
کی شاعری کے تمام مجموعے ہندی رسم الخط میں چھپے
ہیں، اس لیے ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس
درجے کے شاعر ہیں۔ وہ پنجابی، ہندی اور اُردو
تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور جب کسی محفل
میں سناتے ہیں تو تینوں زبانوں کا کلام سناتے
ہیں۔ افسوس کہ بعض لوگ ان کے پنجابی کلام کو
ہندی، ہندی کلام کو اُردو اور اردو کلام کو پنجابی
سمجھ کر داد دیتے رہے۔ اس میں لوگوں کا کوئی
قصور نہیں تھا، اشک صاحب کو پہلے سے بتا دینا
چاہیے تھا کہ کون سی نظم کس زبان میں ہے۔ خیر اس
سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اشک صاحب کا کلام جس
زبان میں بھی ہو، داد کے لائق ہوتا ہے۔ ان
کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی
زبان ہی سے اچھا لگتا ہے۔ اس قسم کا کلام اگر
کوئی دوسرا شاعر سنائے تو سننے والوں سے اس
کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔

چند برس پہلے اشک صاحب نے الٰہ آباد
میں اپنے گھر کے ایک حصے میں پرچون کی دکان کھولی
تھی، جو خاصی منافع بخش ثابت ہوئی تھی۔ اس دکان
کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ اخباروں میں کئی مضمون چھپے۔
بی بی سی لندن سے رضا علی عابدی نے "جرنیلی سڑک"
کے نام سے جو سلسلہ وار پروگرام نشر کیا تھا، اس میں
بھی اس دکان کا ذکر آیا تھا۔ اشک صاحب نے
دراصل دو دکانیں کھول رکھی ہیں گھر میں پرچون کی
اور ادب میں تھوک کی دکان ہے۔ انھوں نے اتنا
لکھا کہ برصغیر کے کسی ادیب نے شاید اتنا نہیں لکھا
ہوگا۔ پنجابی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں میں ان کی
کتابیں موجود ہیں۔ ہندی میں ستر اور اُردو میں چالیس
کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اردو افسانوں کی
تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے۔ ان میں سے بیشتر کتابی
صورت میں مدون نہیں ہوئے۔ مختصر یہ کہ اشک صاحب
نے جتنا لکھا ہے، اتنا تو ہمارا عام ادیب اپنی پوری
زندگی میں پڑھتا بھی نہیں۔

اشک صاحب کی شخصیت میں بڑی رنگا رنگی ہے۔
وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس
طنز و مزاح اور ڈراما نگار ہیں۔ یاد نگاری میں
انھیں کمال حاصل ہے۔ اپنی یادوں کے حوالے
انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ عملی زندگی میں بھی
خاصے سرگرم عمل رہے ہیں۔ صحافی، استاد اور ا

سری حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ فلمی دنیا میں
ںوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ کئی فلموں
نیاں، مکالمے اور گانے لکھے ہیں۔ اور تو اور
ں میں اداکاری بھی کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
سب کام چھوڑ کر اداکاری ہی کرتے تو اچھے
لمی ستاروں کے چراغ گل ہو جاتے۔

کوشلیا اشک نے اپنے نامور شوہر کا جو خاکہ
لکھا ہے، اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اشک اپنے
و "مہان لیکھک" سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ایک
بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ اشک صاحب نے
ا سے اپنی لکھنے پڑھنے کی میز صاف کرنے کے
ہا۔ میز کی صفائی کے دوران ایک موٹی سی کتاب
نیچے ایک پلیٹ اور دو چمچے دبے رکھے تھے۔ یہ
ں دیکھ کر کوشلیا نے حیرت سے اشک صاحب
ف دیکھا۔ اشک صاحب نے فرمایا۔ "ارے
، آدمی دب جائے تو خبر نہ ہو۔ تم پلیٹ اور چمچوں
ت کرتی ہو۔ یہ ایک مہان لیکھک کی میز ہے، کسی
ناتے کی میز نہیں۔" اشک صاحب نے صحیح فرمایا۔
، لیکھک وہی ہوتا ہے، جس کی کتابوں تلے آدمی
جائیں اور اشک صاحب کی کتابیں تو تعداد میں
ہیں کہ آدھا الہ آباد شہر اُن کے نیچے دب جائے،
ی کو خبر نہ ہو۔

اشک صاحب خوش قسمت ہیں کہ ان
ہم عصروں نے ہمیشہ اُن کی تعریف کی ہے۔
شن چندر، بلونت سنگھ اور راجندر سنگھ بیدی نے
محبت سے ان کے بارے میں مضامین لکھے
کرشن چندر نے لکھا ہے کہ اشک کو اپنے آپ
لنے کا فن آتا ہے۔ وہ جملوں سے کام نہیں چلاتے
ذاق بھی کرتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو دو آدمیوں
وا ہی دیں گے۔ بلونت سنگھ کا خیال ہے کہ
کا دل پسند مشغلہ اپنے بارے میں غلط فہمیاں
پھیلانا ہے۔ جب یہ غلط فہمیاں حد سے بڑھ جاتی ہیں
تو پھر اپنے بارے میں وہ خوش فہمیاں پھیلانے لگتے
ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی انھیں "ترک قمرہ زن" کہتے
ہیں اور بتاتے ہیں کہ لڑنا جھگڑنا ان کا خاندانی پیشہ
ہے۔ ایک مرتبہ اشک اور ان کے پانچ بھائیوں نے
مل کر اپنے سارے محلے والوں کو اتنا مارا کہ نوبت اسپتال
اور بعد نے کچہری تک جا پہنچی۔

راجندر سنگھ بیدی کی یہ بات اگر سچ ہے تو
پھر ہمیں یہ کام یہیں ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اشک صاحب
ہندستان واپس جاتے ہوئے یہ خوشخبری سنا گئے ہیں کہ وہ
اگلے سال پھر پاکستان آئیں گے۔ ہمارے قلم سے اگر
ایسی ویسی کوئی بات نکل گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ
اگلے سال اپنے پانچوں بھائیوں کو ساتھ لیتے آئیں ●

معذرت: ملک میں عام چناو اور غیر یقینی
حالات کی وجہ سے "کتاب نما" کی ترتیب اور
طباعت میں تاخیر ہو گئی ہے اس لیے ہم
معذرت خواہ ہیں (ادارہ)

مہمان مدیر
علی احمد فاطمی

گوشۂ وامق جونپوری

ترتیب: علی احمد فاطمی
شعبہ اردو
الہ آباد یونیورسٹی

سوانحی خاکہ ۔ وامق جونپوری

نام : احمد مجتبیٰ زیدی تخلص ۔ وامق

والد کا نام : سید محمد مصطفےٰ

پیدائش : ۲۳ر اکتوبر ۱۹۰۹ء بمقام کجگاؤں ۔ جونپور

تعلیم : بی ۔ اے ۔ ۱۹۳۵ء ایل ۔ ایل ۔ بی ۱۹۳۸ء لکھنؤ یونیورسٹی

وکالت : ۱۹۴۰ ۔ ۱۹۴۲ء ۔ فیض آباد

اس ۱۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی

ملازمت : ہوڈنگ اینڈ پرافیٹرنگ پریوینشن انسپکٹر بنارس ۱۹۴۲ء

ایریا راشننگ آفیسر ۱۹۴۵ء

ڈپٹی ٹاؤن راشننگ آفیسر

ٹاؤن راشننگ آفیسر

ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر ۱۹۵۰ء

۱۹۵۰ء میں حکومت کی بندشوں کے خلاف ملازمت سے استعفا

علی گڑھ میں ملازمت : آفس سپرنٹنڈنٹ انجینئرنگ کالج علی گڑھ ۔ ۶۰ ۔ ۱۹۵۴ء

سری نگر میں ملازمت : ڈپٹی رجسٹرار ریجنل انجینئرنگ کالج ۔ سری نگر ۔ ۶۹ ۔ ۱۹۶۱ء

کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی ۶۴ ۔ ۱۹۴۹ء

ادارت : شاہراہ ۵۴ ۔ ۱۹۵۳ء

مجموعے : ۱۔ چیخیں ۔۔۔ ۱۹۴۸ء

۲۔ جرس ۔۔۔ ۱۹۵۰ء

۳۔ شب چراغ ۔۔۔ ۱۹۷۸ء

زیرِ اشاعت : ۱۔ سفرِ ناتمام (شعری مجموعہ)

۲۔ گفتنی ناگفتنی (خود نوشت سوانح) زیرِ اہتمام خدا بخش لائبریری

ایوارڈ : ۱۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۸۰ء

۲۔ امتیازِ میر ۱۹۸۱ء

۳۔ اردو اکادمی کا خصوصی ایوارڈ ۸۷ ۔ ۱۹۸۶ء

پتا : لال کوٹھی ۔ کجگاؤں ۔ ضلع جونپور

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

اداریہ

اردو کے مشہور ترقی پسند و بزرگ شاعر حضرت وامق جونپوری نے اس سال اپنی عمر طبیعی کے اسّی سال اور عمر شعری کے تقریباً پچاس سال پورے کر لیے۔ وامق صاحب اردو کے ترقی پسند شعرا میں بالخصوص اور دیگر ممتاز شعرا میں حضرت ملیکش اکبرآبادی کو چھوڑ کر سب سے معمر اور بزرگ شاعر ہیں۔ جو شاعر گزشتہ پچاس برس سے اردو شاعری اور اردو مشاعرے دونوں میں یکساں طور پر نہ صرف ممتاز و مقبول رہا ہو بلکہ ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں اردو نظموں اور گیتوں میں انقلاب برپا کر دیا ہو کہ جس کی گونج آج بھی دلوں کو گرما دیتی ہے اردو کی عوامی شاعری کو حلقۂ خواص میں بھی ایک درجہ دلایا ہو، اردو شاعری کو فنی و ہیئتی سطح پر طرح طرح کے کامیاب تجربے کیے ہوں اور جو آج بھی عمر کی اس منزل پر پوری پختگی اور توانائی کے ساتھ تخلیقی عمل میں مصروف ہو اس جیسے بزرگ و تجربہ کار اور مشہور شاعر کے سلسلے میں کتاب نما کا گوشہ نکلنا اس کی بے پایاں خدمات کا ایک مختصر سا اظہار و اعتراف ہے۔ آج جبکہ معمولی سے معمولی ادیب، نام نہاد شاعر اپنا نمبر، گوشہ یا خصوصی شمارہ نکالنے یا نکلوانے کے سلسلے میں کیسی کیسی ناروا اور غیر اخلاقی کوششیں کرتے ہیں تو ایسے میں جب میں وامق صاحب جیسے نامور شاعر کی زندگی اور کارناموں کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وامق صاحب آج کی دنیا کے آدمی نہیں ہیں وہ تو اس وقت بھی اس دنیا اور اس سماج کے فرد نہیں لگتے تھے جب وہ خود اور ان کی شاعری دونوں شباب پر تھے اور پورے ملک میں ان کی نظموں کا طوطی بول رہا تھا۔ بھوکا ہے بنگال۔ مینا بازار۔ پنجاب۔ نیلا پرچم اور اسی طرح کی دوسری نظموں کا جادو اس عہد کے قارئین و سامعین کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا اور پھر یہ جادو اردو سماج میں ہی نہیں بلکہ عوامی مشاعروں کے توسط سے کسانوں اور مزدوروں کے درمیان ہوتا ہوا ہندستانی سماج میں اپنا اثر دکھاتا ہے اور اردو شاعری گھر گھر عام ہوتی ہے۔ چیخیں سے لے کر جرس تک کا یہ سفر مقبولیت و شہرت سے اس قدر لبریز تھا کہ جس کو دیکھ کر دیگر ترقی پسند شعرا کو رشک ہوا اور حسد بھی۔ سجاد ظہیر نے روشنائی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ وامق کی نظم بھوکا ہے بنگال سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ وامق صاحب چاہتے تو اپنی شہرت و عظمت کو کیش کر سکتے تھے لیکن اس کے برعکس انھوں نے حکام وقت کی بندشوں کے خلاف ملازمت چھوڑی۔ گھر بار چھوڑا اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر اس کے اصل منشور کو ذہن میں اور وقت کی آواز کو دل میں بسائے سڑکوں اور گلیوں۔ دیہات اور قصبات میں بھٹک کر، ٹھوکریں کھا کر ہندستانی عوام کے درمیان آزادیٔ ملک اور آزادیٔ ذہن کا صور پھونکتے رہے اور اصلاً ترقی پسند شاعری اور شاعر کا حق ادا کرتے رہے اور پوری زندگی اس

نیک کام اور اعلا مقصد کے لیے وقف کردی اور کہیں کسی موقع پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں انقلابیت و ہنگامیت اور شاعری میں عوامی مسائل اور عوا
لب و لہجے کے تعلق سے منفی اور مثبت دونوں طرح کے ادب کو تخلیق کیا ہے جنھوں نے رطب و یابس دیا ان
فہرست طویل ہے لیکن جنھوں نے اضافے کیے ان میں چند نام ہیں جن میں وامق صاحب تنہا ایسے ہیں جنھوں ۔
عوامی شاعری اور گیت کے لب و لہجے کو ایک سنجیدہ نام اور احترام دیا۔ انھوں نے اردو شاعری کے محاسن۔ معیا
مذاق کا پورا پورا خیال رکھا۔ مینا بازار ایک طرح سے اردو شاعری کا پہلا سٹائر ہے۔ بھوکا ہے بنگال تے
بعد مینا بازار وامق صاحب کی دوسری نظم ہے جو عوام میں بے حد مقبول ہوئی ساتھ ہی اس نے اردو کے سنجی
نقادوں کو بھی متوجہ کیا۔ احتشام حسین مینا بازار کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

"وامق کی نظموں میں مینا بازار مخصوص توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں شاعری اور مقصد کا حسین امتزاج ہے مرقع خوبصورت، پُراثر اور متنوع ہیں۔ موسیقی دھیمی اور غمناک ہے الفاظ رواں اور سادہ ہیں۔ علامتیں واضح اور خلوص گہرا ہے۔ اس میں سماجی حقیقت نگاری کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔۔۔۔ اس نظم میں وامق کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔" (پیش لفظ۔ جرس)

نظم زمین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اردو کی یہ پہلی اوڈ (ODE) ہے۔ فن میں جس طرح انھوں نے موضوعا
جامعیت اور حسنِ اسلوب کا تجربہ کیا ہے اس کو آج بھی لوگ پسند کرتے ہیں۔ وقت اور سفر ناتمام ایسی نظمیں
ہیں جن میں فکر و خیال کے ساتھ ساتھ ہیئت و اسلوب کے بھی تجربے ہیں۔ وامق صاحب نے بچوں کے لیے بھی
نظمیں کہیں۔ منظوم ڈرامے تخلیق کیے۔ طنز و مزاح کی شاعری کی۔ ہجو ملیح کے تجربے بھی کیے بہر حال جنھوں نے
وامق صاحب کی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے ان کو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے شاعری کی ہر سطح پر روایتی شاعری
سے انحراف کیا۔ زمین اوزان و بحور ردیف و قافیوں کے تجربے کیے۔ عروضی طریقِ کار میں تبدیلیاں کیں ۔
صوتی و صوری تجربے کیے۔ دوسری زبانوں کی ہیئت۔ الفاظ۔ محاورات کو داخلِ ادب کیا کہ آج بھی وہ الفاظ
کی نت نئی شناخت کرتے رہتے ہیں۔ وہ کلاسیکی حدوں میں نئی کلاسیکیت کو تلاش کرکے اسے ایک روپ دینا چا
ہیں غرض کہ وامق صاحب کی پوری زندگی عوامی اور شعری خدمات کے لیے وقف رہی۔ شعر و ادب سے ان کی وابستگی
انتہائی مخلصانہ اور ایماندارانہ رہی یہی وجہ ہے کہ جس دور میں فیض۔ مخدوم۔ مجاز، سردار جیسے شعرا چھائے ہوئے تھے
وامق نے بھی نہایت خاموشی اور شائستگی سے اپنی شناخت تو قائم کی لیکن انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حق دار تھے
یہ ایک غور طلب اور بحث طلب مسئلہ ہے۔ بقول وامق صاحب اس کی ذمہ داری بعض ترقی پسند شاعر دوستوں کے سازشی
ذہن، ناقدین کی عدم توجہ اور خود ان کے قلندرانہ مزاج پر آتی ہے۔ اپنے آپ کو منظم ڈھنگ سے پیش کرنے کا جو
ہنر ہوا کرتا ہے وہ اس سے واقف نہیں اس کا بھی وہ اعتراف کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسّی برس کے اس طویل سفر
میں شاید وامق صاحب معدودے چند ترقی پسند شاعروں میں سے ہیں جن کی شخصیت بے داغ ہے آئینے
کی طرح پاک صاف ہے۔ اب رہی ان کی شاعری اور اس کے مقام و منصب کی بات تو اس کا فیصلہ آنے والا وقت
کرے گا کہ جو فیصلہ ہماری تساہلی اور عدم توجہ کی وجہ سے نہیں ہو پاتا ہم اسے بڑی آسانی سے وقت کے دھارے
پر چھوڑ دیتے ہیں۔

گذشتہ آٹھویں برس سے واثق صاحب اوران کی شاعری ہندی کی ترقی پسند شاعری وتنقید کے درمیان بہت مقبول ہوئی ہے بالکل نظیر اکبرآبادی کی طرح کرجسے ابتداً اردو والوں نے مُنہ نہیں لگایا اوراس کی موت کے سو سال بعداس کی طرف متوجہ ہوئے کم وبیش واثق صاحب کے ساتھ بھی ہمارا یہی سلوک ہے کہ اردو کے اس ہردلعزیز عوامی اور تجرباتی شاعر، ایک ایسے شاعر جو عوام وخواص میں یکساں مقبول رہا ہو ہم نے اس کی زندگی میں اس کو بھلا دیا۔ آج سے پانچ برس قبل ہندی والوں نے ان کی عالی شان پچھترویں سالگرہ منائی اوراب ۸۰ ویں سالگرہ بھی منانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ ہندی ادب میں باقاعدہ واثق کی شاعری پر تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جارہے ہیں اردو والے یہاں بھی پیچھے ہیں۔ اس کے پس پردہ خود واثق صاحب کی بے نیازی کا دخل تو ہے ہی ساتھ ہی اردو دُنیا کی بے توجہی اور بے حسی کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب کی معیار پرستی اور مفاد پسندی بھی کام کررہی ہے اوراب تو سازش اورسفارش بھی کام کرنے لگی ہے لیکن واثق صاحب ہمت ہارنے والے انسان نہیں ہیں ان کا خیال ہے کہ کبھی تو وقت آئے گا جب ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا ان کی زندگی میں نہ سہی ان کی زندگی کے بعد سہی —— ان کا خیال بڑی حد تک درست ہے کہ ہم ہمیشہ سے مُردہ پرست زیادہ رہے ہیں زندوں کی تلاش وتحقیق ہمارا شیوہ نہیں پتا نہیں جوہر شناسی، ادب دوستی اورانسان دوستی کا یہ درد ہمارے اندر کب پیدا ہوگا اور یہ ہنر ہمیں کب آئے گا کہ ہم شاعر کی ادب دوستی، عوام دوستی اور ایماندارانہ جہاد بھری خدمات کا اعتراف کریں اور شاعر کی آنکھیں بند ہونے سے قبل ہم اپنی آنکھیں کھول لیں ●●

بقیہ صفحہ ۵۸ کا

اس کی آواز بعض اوقات بڑے بڑے تاج وتخت کو ہلا دیتی ہے واثق صاحب کی شاعری نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے تو پھر واقعی اردو تنقید اس قدر خاموش کیوں ہے۔ کیا واقعی کوئی سازش کام تو نہیں کررہی ہے اگر کررہا ہے تو پھر اس کا فیصلہ بھی وقت کردے گا ●●●

اہل قلم سے درخواست

براہ کرم اپنے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہرگز نہ بھیجا کیجیے بلکہ اصل مسودہ بھجوائیں اور فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی میں اکثر وبیشتر حروف اڑجاتے ہیں اس سے پروف ریڈر اور کاتب حضرات کو بڑی پریشانی اٹھانا پڑتی ہے

فخر الکریم صدیقی

وامق کی فکری و فنی جہات

اردو کی شعری دُنیا میں وامق کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ 'بھوکا ہے بنگال'، 'پنجاب'، اور 'مینا بازار' کے خالق کو کون نہیں جانتا۔ ان کا شمار موجودہ دور کے بزرگ اور معتبر ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی اور ادب کے عصری تقاضوں اور دھاروں سے اپنے قلم اور اپنی ذات کو برابر ہمکنار رکھا ہے اور اپنے زاویۂ فکر اور نظریۂ حیات کو محدود اور مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس سے ان کو ذاتی طور پر تو نقصان ہوا مگر ان کی شاعری کی فضا بے پناہ وسیع ہوگئی۔ اس میں حقیقت اور سچائی کے ساتھ ساتھ آفاقیت کے عناصر بھی شامل ہوگئے۔ اس سے ان کی شہرت اور مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری کی گونج ہر طرف سُنی جاسکتی تھی۔ اور جن نظموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حد سے زیادہ مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ پروفیسر سید محمد عقیل کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> "یادش بخیر ۱۹۴۸ء کا زمانہ تھا جب ہم لوگ بی۔ اے کے طالب علم تھے اور وامق صاحب ایک افسر کی حیثیت سے تعینات تھے مگر افسر کم اور شاعر زیادہ .... وامق صاحب کی نظم 'بھوکا ہے بنگال رے ساتھی' سے ہندستان کی فضا گونج رہی تھی کہ ابھی قحط بنگال کو ختم ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے پھر اس نظم سے متاثر ہوکر جو فلم 'بھوکا ہے بنگال' بنی تھی اس نے وامق صاحب کی شہرت میں اور چار چاند لگا دیے تھے۔ ہم لوگوں کی ادنا سی درخواست پر وامق صاحب نے اپنی نظم 'پنجاب' سنائی اور پھر 'مینا بازار' اور جیسے ایک سماں بندھ گیا...... مینا بازار کی مقبولیت جس نے دیکھی ہے وہی اسے سمجھ سکتا ہے۔ چار پانچ ہزار کا مجمع دم بخود وامق کی نظم سُنتا رہتا تھا اور ایسا سناٹا چھا جاتا تھا جیسے ہر ذہن صرف وامق کے مصرعوں کے زیرِ اثر مسحور ہے۔"

اس طویل اقتباس کے پیش کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ان نظموں کی شہرت اور مقبولیت میں ان کے ترنم اور خوش گلوئی کا بھی دخل ہے لیکن اس کی حیثیت جزوی اور ضمنی ہے۔ دراصل ان نظموں کا عوامی لہجہ انسان دوستی اور وطن اور ملک سے محبت کا جذبہ ہی وہ اہم عنصر ہے جس کی وجہ سے یہ پڑھنے والوں کے دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔ وامق کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ ہندستان کی آزادی، سرمایہ داری کا خاتمہ، سوشلزم کا قیام، سماجی انصاف و مساوات، مزدوروں اور دبے کچلے عوام کی آواز ان کی شاعری کے موضوعات بن گئے۔

'چیخیں' سے شروع ہوکر 'جرس' اور 'شب چراغ' تک کا یہ شعری سفر اپنے اندر وامق کی شاعرانہ شخصیت کے مدوجزر، پیچ و خم کو سموئے ہوئے ہے۔ ابتدا میں روایت، ماحول اور کم عمری کے فطری جذبے یا پھر محض مشقِ سخن کے طور

پر انھوں نے کچھ روایتی قسم کی شاعری کی جس کا مزاج غزل کے رچاؤ اور کلاسکیت کی فضا سے ہم آہنگ تھا۔ جب واثق ع

یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد
جیسے کوئی شراب ملادے شراب میں

جیسی غزلیں کہہ رہے تھے قومی اور بین الاقوامی زندگی شدید بحران سے دوچار تھی اور بقول پروفیسر احتشام حسین (مرحوم) "انسانیت، کلچر اور ادب کے بقا کے لیے موت کے مقابلے میں زندگی کا، جنگ کے مقابلے میں امن کا، ظلم کے مقابلے میں انصاف کا اور طبقاتی استحصال کے مقابلے میں مساوات کا انتخاب کرنا ضروری ہوگیا تھا۔"

ہندستان کی جنگ آزادی، تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور ہر طرف سے تنگ ہوتی ہوئی زندگی اور اس کے بے شمار مسائل نے تمام دردمند ادیبوں اور شاعروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور انھیں اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ صرف گھونگھٹ، پازیب کی جھنکار، سرو سنبل، گل و بلبل۔ ہجر و وصال اور محبوب کے لب و رخسار کی باتیں ادبی بددیانتی ہے۔ "جرس" کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"اس وقت جنگِ عالم گیر پورے شباب پر تھی۔ سارے ملک میں بھوک اور برہنگی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ فرنگی اور امریکی سپاہی سڑکوں اور گلیوں کو روندتے پھر رہے تھے۔ پست، متوسط طبقے اور غریبوں کے گھر ویران اور چکلے خانے آباد ہو رہے تھے۔ مذہبی رہنما، جنت اور دوسرے جنم کی بشارت دے دے کر صبر و شکر کی تلقین فرما رہے تھے۔ مختصر یہ کہ ہر جانب زندگی اور اس کی حسین قدریں فاشیت کے ہاتھوں دم توڑ رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ جس قسم کی روایتی شاعری میں کر رہا ہوں وہ ایک ناقابلِ معافی اخلاقی جرم ہے۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ملک کے رجعت پسند ادیب ادب برائے زندگی کے مقابلے میں اپنے آخری مورچے سے جنگ کر رہے تھے۔ اس جنگ سے مجھ کو بڑا فائدہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیے...."

ان حالات میں ۳۶ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ایک ایسا انقلابی قدم تھا جس نے تمام ادبی نظریوں کا رُخ موڑ دیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں عشقیہ شاعری کی رنگین فضا سے نکال کر نظم کے کشادہ میدان میں لاکر کھڑا کر دیا۔ یہیں سے ان کے صحیح وجدانِ مقصد کے دور کا آغاز ہوا اور نظمیں اس عہد کی آواز سے ہم آہنگ ہوگئیں۔ واثق کا یہی سیاسی اور سماجی شعور نیز جمالیاتی احساس ان کی نظموں میں جابجا بکھرا ہوا ہے۔ قومی یکجہتی، انسان دوستی اور فرقہ واریت کے موضوع پر "آنکھیں"، "دوسری منزل"، اور "تقسیم پنجاب"، بین الاقوامی مسائل پر "نیلا پرچم" اور "جہاں نما" جیسی نظموں کے توسط سے انھوں نے عالمی پیمانے پر رنگ و نسل کی بنیادوں پر پھیلے ہوئے استحصال، جنگ کی تباہ کاریاں اور اخلاقی گراوٹ کی عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بربریت کے ہوس خانے ہوئے پھر آباد
پھر اٹھالے گیا سیتا کو کوئی راون آج

جسم پر دروپدی کے نہیں باقی اب کوئی تار
عصمت مریم وحوا کی حقیقت ہوئی خواب
ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔

تقسیم پنجاب

ذہن کرتا نہیں اب یکھو کھلی باتوں کو قبول
ایسے موضوع پہ ہوتا ہے قلم بھی مجہول
نعرۂ یکجہتی ملک میں تب تک ہے فضول
جب تلک قوم کا کردار نہ ہوگا معقول

اس لیے قوم کا ڈھانچا ہی بدلنا ہوگا
ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھلنا ہوگا

آنکھیں

آنا فاناً اس دُنیا کے ہوگئے حصے چار
پُورب پچھم اُتر، دکھن سمتوں میں تکرار
کالے گورے نیلے پیلے رنگوں کے بازار
جس میں ہر گاہک ہے اپنی مرضی کا مختار
اس کے حق سے ہے لیکن تاجر کو انکار
اخلاقی معیار ہے گویا اک ٹوٹی تلوار
یہ کیسا بیوپار ہے یارو یہ کیسا بیوپار
حیرت میں ہے سنسار یار و حیرت میں سنسار

جہاں نما

نہ گھر رہے گا نہ گھر کی رونق
نہ جانے یہ جنگ کیا کرے گی
بس ایک سناٹا ایک وحشت
مہیب چیخیں قدم قدم پر
ہوا میں گولی کی سنسناہٹ

نیلا پرچم

داعی کی شاعری عصری تہذیب اور سماج پر بھر پور طنز بھی ہے اور زندگی میں رچی ہوئی فرسودہ یوں سے بیزاری بھی۔ اس ضمن میں ان کی نظم مینا بازار کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم ان کے فکروفن مکمل نمایندگی کرتی ہے جس میں تاریخ کا جبر، وقت کی ستم ظریفی اور تغیر سب کچھ موجود ہے۔ یہ نظم ری توجہ کا مرکز اس لیے بھی بن جاتی ہے کہ اس میں عورت کا مقدر، اس کی مجبوریاں اور اس کے

استعمال کا سلسلہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ اگرچہ کہیں پر بھی وامق نے اپنا مقصد واضح کرنے کی کوشش نہیں کی ہے وہ تھکے ہوئے نظام کی ایک شام جو کچھ دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں قلم بند کر لیتے ہیں لیکن سماجی اصلاح اور ایک بہتر نظامِ حیات کی ضرورت کا احساس خود بخود بیدار ہو جاتا ہے۔ اپنی اکہری کیفیت کے ساتھ پوری نظم دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ شام کے وقت رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی فضا کی عکاسی شاعری کی بھی بھرپور تصویریں پیش کرتی ہے۔ اس نظم کا بہترین تجزیہ پروفیسر احتشام حسین (مرحوم) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

"وامق کی نظموں میں 'مینا بازار' مخصوص توجہ کی مستحق ہے۔ اس میں شاعری اور مقصد کا حسین امتزاج ہے۔ مرقع خوبصورت اور پُراثر متنوع ہے موسیقی دھیمی اور غمناک ہے۔ الفاظ رواں اور سادہ ہیں۔ علامتیں واضح اور خلوص گہرا ہے۔ اس میں سماجی حقیقت نگاری کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔" (پیش لفظ۔ جرس)

وامق کے یہاں ہمیں مفلسی، بیکاری، مجبوری، سرمایہ داری، کسان اور مزدور وغیرہ کے مسائل اور انقلابی رجز خوانی مختلف انداز سے نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ فکر کی تلخی، بے یقینی، تشکیک اور کھوئے ہوئے سکون کی حسرت سب کی جلوہ فرمائی نمایاں ہے۔

جنگ سے نفرت اور امنِ عالم کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔

وامق نے مغربی ادب کی چند مخصوص اصناف سے اردو ادب کو روشناس کرایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'زمین' ODE TO EARTH ہے۔ ODE کے لیے لفظیات کے جس رچاؤ کی ضرورت ہوتی وہ اس نظم میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی معرّا اور آزاد نظمیں ہیئت کے اعتبار سے اس قدر رواں دواں ہوتی ہیں کہ قاری کو کسی قسم کی بے کیفی کا احساس نہیں ہوتا۔ جو عام طور پر اس صنف ہیئت کی کمزوری تصور کی جاتی ہے۔ 'میر کارواں'، کے عنوان سے گاندھی جی کے قتل پر لکھی گئی نظم ان کی قادر الکلامی پر دلالت کرتی ہے۔ اُن کی نظم 'وقت' شاعری اور فلسفہ کا خوبصورت امتزاج ہے جس میں وقت کی ماہیت، ہمہ جہتی اور ہمہ گیری پر بہت ہی رواں، عام فہم تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ابتدا کوئی نہ اس کی نہ کوئی اس کا عدم
ایک وحدت جو کبھی بیش نہ کم
اس کا خالق نہیں کوئی نہ کوئی اس سے بڑا
یہی شاید ہے خدا ۔۔۔۔۔۔ !

'وقت'

نظموں کے علاوہ وامق نے ایسی غزلیں بھی کہی ہیں۔ جن میں عصری زندگی کے بعض پہلو بہت ہی روشن ہیں۔ اُن میں زندگی کی حرکت اور اس کی سماجی صورتوں کا اظہار بہت ہی واضح ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار اور مثالوں کی کمی نہیں جن میں ایک طرح کا عزم ہے تو وہیں عصری زندگی کے بعض مسائل اور اس کی سچائیاں بھی ہیں۔ حالاں کہ ان کی نظموں میں وقت کی روح کو اور زندگی کی انقلابی کیفیات کو جس توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے وہ صورتیں غزلوں میں کم ہیں پھر بھی انھوں نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ

ہوئے ایسے موضوعات کو جمالیاتی چاشنی کے ساتھ غزل میں داخل کیا ہے جس کا تعلق ان کے عہد کے سیاسی اور سماجی رجحانات سے رہا ہے اور اس طرح وامق کے یہاں بھی وہی کچھ ہے جو اس تحریک کے بعض دوسرے شاعروں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عصری زندگی کے اظہار میں غزل کی مخصوص ہیئت اور اس کی نزاکتوں کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان کی آواز میں کڑک اور دھمک کے بجائے ایک طرح کی نرمی اور رسیلا پن ہے۔ اب ان کی غزلوں سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ے مجھے اس سحر کی ہو کیا خوشی جو ہو ظلمتوں میں گھری ہوئی
مری شامِ غم کو جو لوٹ لے مجھے اس سحر کی تلاش ہے

ے ابنِ آدم خوشۂ گندم پہ ہے مائل بہ جنگ
یہ نہ ہے مسجد کا قصہ اور نہ بتخانوں کی بات

ے پابندیوں میں تھے تو دکھاتے تھے معجزے
آزادیوں میں شعبدہ گر ہو کے رہ گئے

ے درِ میکدے کا بند حرم کا چراغ گل
خونِ جگر پییں کہ لہو سے وضو کریں

ے قریب تھے تو قیامت کا لطف آتا تھا
ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

ے آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجیے

ان کی غزلوں میں اس نوع کے اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن کو طوالت کی وجہ سے یہاں پیش کرنا ممکن نہیں اس طرح سے ان کی غزل گوئی میں سیاسی معنویت اور سماجی صورتوں کا عکس بہت ہی واضح ہے۔ اس میں گھٹن اور مایوسی کی کیفیت بہت کم ہے اور اگر کچھ ہے بھی تو اس کو محبوب کی دلکشی اور اس کے حسن کا سہارا لے کر گوارا بنا لیا گیا ہے۔

'شب چراغ' میں کچھ رباعیاں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ ہمارے یہاں رباعیوں کا رواج رفتہ رفتہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ جوش اور فراق کے بعد جن شاعروں نے رباعیوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے ان میں ایک نام وامق کا بھی ہے۔ ان کی زیادہ تر رباعیاں محبوب کے حسن اور اس کے سراپا کی عکاس ہیں جس میں حسن کی مختلف صورتوں اور کیفیات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

وامق کی شاعری میں کلاسکیت اور ترقی پسندی نے تحلیل ہو کر ایک نیا انداز اختیار کر لیا ہے جس میں زندگی کے تمام گوشوں کو سمیٹنے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری میں ایک خاص نوع کا اکہرا پن ہے۔ اس میں وہ علامتی ہمہ جہتی اور نفسیاتی دروں بینی بھی نہیں جو فکری اور فنی اعتبار سے انھیں نظیر، اقبال، جوش اور فیض کے ہم پلہ کھڑا کر سکے۔ شاید اس کی وجہ ان کی شاعری میں پیش کردہ مسائل اور ان کا وہ عوامی لہجہ ہے جہاں باتوں کو سیدھے سادے ڈھنگ سے پیش کرنے میں ہی شاعر یا ادیب اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن آج بھی ان کے فکر و نظر میں جو گرمی اور قلم میں جو جولانی موجود ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے فن کو مزید بلندیوں تک پہنچائیں گے۔

———

علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو الٰہ آباد یونی ورسٹی

وامق جونپوری سے گفتگو

شہر جون پور کی جتنی اپنی تاریخی و تہذیبی اہمیت ہے کم و بیش اتنی ہی اس کے قصبات و مضافات [illegible]
بھی ہے چنانچہ جب ہم اس چھوٹے لیکن پرکشش شہر سے نکل کر حضرت وامق جونپوری کے اصل وطن کجگاؤں
کی طرف روانہ ہوئے تو شہر لمحوں میں ختم ہو گیا اور دائیں بائیں کھیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے۔ چاروں طرف
ہریالی، کھیتوں میں جھومتے لہلہاتے قد آور مکئی کے پودے اپنی جوانی اور شادابی کا کھلا اعلان کر رہے تھے
ان کھیتوں کو کاٹتی ہوئی پتلی مگر پختہ ڈامر کی سڑک اپنے بھیگے ہوئے سرمئی بدن میں بڑی بھلی لگ رہی تھی۔
میرے ساتھ ہندی بھون جونپور کے سکریٹری اور ہندی کے ترقی پسند شاعر و ادیب اجے کمار بھی تھے جو مجھ
سے کہیں زیادہ وامق صاحب سے عقیدت رکھتے ہیں اور ہمہ وقت کجگاؤں چلنے کو تیار رہتے ہیں، اپنی اسی
عقیدت کا اظہار وہ وامق صاحب کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر ہندی بھون میں جشن وامق کے طور پر
کر چکے ہیں جس میں پورا جون پور پلٹ پڑا تھا کیا ہندی کیا اردو —— کیا ہندو کیا مسلمان کیا مزدور کیا
کسان۔ اس دن مجھے وامق صاحب کے چاہنے والوں اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھنے والوں کا عجب منظر
دیکھنے کو ملا تھا بالکل نظیر میلے کی طرح —— مجھے یاد ہے کہ اس جشن کی صدارت مشہور ترقی پسند شاعر
کیفی اعظمی نے کی تھی اور بے تکلف ہو کر کہا تھا۔ وامق صاحب ان بزرگ شاعروں میں سے ہیں جن سے
ہم لوگوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کا گیت بھوکا ہے بنگال کی شہرت دیکھ کر ہمیں رشک بھی ہوا اور حسد بھی

جونپور اور وامق جونپوری لازم و ملزوم ہیں۔ جونپور کو فیروز شاہ۔ اور اس کے بعد شرقی خاندان نے بسایا
لیکن آج عوام میں کتنے لوگ اس بات سے واقف ہیں۔ جونپور اپنی بڑی بڑی مسجدوں کے ذریعہ بہت زیادہ
اپنی شناخت نہ بنا سکا، مرحوم حفیظ جونپوری، شفیق جونپوری استاد شعرا تھے لیکن آج ان کے دو [illegible]
ایک ایک شعر ہی یاد رہ گئے ہیں، جونپوری، اصل شہرت و شناخت کا باعث ہوئے حضرت وامق جونپوری
اپنی عوامی شاعری کے ذریعہ اور مشاعروں کے ذریعہ انھوں نے اس شہر کو جو شہرت دلائی اور سارے ملک میں [illegible]
شاعری کی جو خوشبو پھیلائی وہ جون پور کا عطر بھی نہ پھیلا سکا۔ یہ بات کم از کم جونپور والوں کے لیے باعث فخر [illegible]
ہی اور میرے لیے بھی کہ میرے جذباتی ڈانڈے جونپور سے ملتے رہیں کہ یہ چھوٹا سا تہذیبی شہر میرا ننھیال [illegible]
بچپن میں اپنی والدہ۔ خالہ۔ ماموں وغیرہ کے ذریعہ کھیل کود۔ مولوی مدرسہ اور مدار شاہ کے ساتھ ساتھ وامق
جونپوری کا نام بھی کانوں میں پڑتا رہا اور مانوس ہوتا رہا۔ پھر ذرا بڑے ہوئے تو ان کی نظم مینا بازار کے چرچے
ہوتے۔ ہر محفل میں وامق صاحب کا ذکر ہر جگہ وامق صاحب موجود کیا مجلس کیا میلاد اور مشاعروں پر [illegible]

[illegible] جیسے

[illegible] کے لیے جونپور کا مرحوم کی [illegible] آباد میں اُردو

[illegible] کی حیثیت سے میری ان سے ملاقات ہوئی۔ جونپور درمیان میں ایک ایسا [illegible] تھا اور پھر اس

[illegible] ادیب کی حیثیت سے ترقی پسند شاعری اور شاعروں کے قریب آیا تو وامق صاحب سے

[illegible] کی اعتبار سے جذباتی ہوگئی۔ اس درمیان پتا چلا کہ وہ جونپور شہر میں نہیں بلکہ گاؤں میں رہتے

[illegible] ایسا گاؤں جو [illegible] ہے لیکن وہاں کے لوگ بہت سیدھے ہیں اور وامق صاحب تو بہت ہی سیدھے،

[illegible] اور نہایت سادہ لوح اور شیشے کی طرح آرپار دکھنے والے جس میں کوئی جھلک نہیں، کوئی دھند نہیں۔

[illegible] انھوں نے کہا تھا

آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں جھک تو سکتا نہیں توڑ دیجیے

[illegible] جونپوری نے اپنی عمر کے اسّی سال پورے کر لیے ہیں اتنے لمبے زندگی کے سفر میں انھیں کیا کیا جھیلنا پڑا اس کی ایک

[illegible] ہے اس درمیان تھوڑی بہت میری سمجھ میں بھی اضافہ ہوا ترقی پسند ادب، شاعری کو سمجھنے کا شعور حاصل ہوا۔

[illegible] پسند شاعروں کے افکار، گفتار اور کردار کو بھی قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کے مواقع ملے اور اس کے بعد

[illegible] وامق صاحب پر نظر ڈالتا ہوں اور ان سے گفتگو ریکارڈ کرنے کے سیلم کے گاؤں کی پگڈنڈی پر چلتا ہوں تو ساون

[illegible] اس موسم میں عقیدت اپنے بال و پر کھول لیتی ہے جو اچھے اور سچے انٹرویو کے لیے عین نقصان دہ ہے۔

[illegible] سڑک پر ہلکی ہلکی سی بارش میں، میں اور راجے کمار دونوں اپنے آپ کو بھگو لیتے ہیں تاکہ ہماری عقیدت پر برسات

[illegible] چھاجائے اور جب ہم لکھوری اینٹوں سے بنی ایک پرانی حویلی میں داخل ہوئے تو ہم کسی حد تک اس میں کامیاب

[illegible] ہو چکے تھے لیکن جیسے ہی ڈھلے ڈھلائے شفاف کرتے پاجامے میں تقریباً بچوں کی طرح اچھلتے ہوئے

[illegible] صاحب کمرے سے باہر نکلے اور پرتپاک خیر مقدم کیا تو ہم بھول گئے کہ وامق صاحب اسّی برس کے ہوگئے

[illegible] اسّی برس کا یہ نوجوان ہمارے سفر کی روداد، مقصد دریافت کرتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ اسّی برس کا یہ

[illegible] جو ایک خاندانی اور پڑھا لکھا انسان ہے اور جس نے انگریزی حکومت میں ایک معزز عہدے سے اپنی

[illegible] کی شروعات کی اور خوب ترقی کر سکتا تھا لیکن اس کے اندر کے شاعر نے کبھی کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا

[illegible] اس وقت تک ترقی پسند شاعروں میں سمجھوتے کی رسم ایجاد نہیں ہوئی تھی لیکن اس شاعر نے تو اس وقت بھی

[illegible] نہیں کیا جب آزادی کے بعد سمجھوتے کی رسم عام ہو چلی اور پھر ہوتی ہی چلی گئی اور آج بھی وامق صاحب

[illegible] گاؤں کی اس خاندانی اور تقریباً ویران سی حویلی میں اپنے اندر کے باکردار، باہمت ترقی پسند شاعر کو زندہ و

[illegible] رکھے ہوئے اور اپنی بے داغ، پاک و صاف شخصیت کو سمیٹا شعر و ادب کے تخلیقی عمل میں ہمہ تن

[illegible] ہیں۔ عمر کی اس منزل پر شاید وہ واحد شاعر ہیں جو آج بھی پوری تازگی اور توانائی کے ساتھ [illegible]

[illegible] رہے ہیں اور اس تنہائی میں وہ افکار و گفتار کی بھیڑ میں گھرے رہتے ہیں اور جب کبھی گھبرا جاتے

[illegible] اپنے پاس رکھی ہوئی شہد کی مکھیوں سے کھیلنے لگتے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کا پالنا ان کا شوق ہے

[illegible] انھیں، ان سے حوصلہ، شیرینی اور اجتماعی اسپرٹ کا جذبہ ملتا ہوگا۔

[illegible] اپنی عقیدت بھری گفتگو میں مصروف رہے اور میں اندر ہی اندر اپنے انٹرویو کی فضا بنا تا

رہا، جب ہم چائے پی چکے اور اپنی گفتگو سے قدرے تھک کر سگریٹ بنانے لگے تو میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

فاطمی۔ وامق صاحب خدا آپ کی عمر دراز کرے آپ نے اپنی عمر کے اسّی برس پورے کر لیے اور شاعری کے تقریباً پچاس برس یا شاید اس سے بھی زیادہ میری خواہش ہے کہ عمر و تجربے کی اس منزل پر پہنچ کر میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے آپ کے ماضی کی طرف لے چلنا چاہتا ہوں تاکہ تھوڑا سا محاسبہ ہو جائے کہ آپ اپنی زندگی میں بطور شاعر کیا کرنا چاہتے تھے اور کیا کر پائے پھر میں آپ کی شاعری اور ہم عصر شاعری پر بھی باتیں کروں گا لیکن سب سے پہلے میں ایک ذاتی نوعیت کا سوال کرنا چاہتا ہوں ———

وامق جونپوری۔ جب آپ اتنی دور چل کر میرے غریب خانے پر آئے ہیں، میرے خورد ہیں تو آپ جو چاہتے ہیں آپ کی ہر بات کا جواب دوں گا۔

فاطمی۔ سب سے پہلے آپ ہمیں اپنے تہذیبی پس منظر کے بارے میں بتایئے کہ کون سے ابتدائی حالات تھے جس نے آپ کو شعر و ادب کی طرف موڑ دیا۔ میں یہ سوال اس وجہ سے بھی کر رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ باقاعدہ ایک ایسی ملازمت سے وابستہ رہے ہیں جس کا زبان و ادب سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے پھر وہ کون سے عوامل و محرکات تھے جس نے آپ کو ایک اچھی اور بامقصد شاعری کی طرف موڑ دیا۔؟

وامق فاطمی صاحب! میں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں نے چاروں طرف اپنے جن بزرگوں کو دیکھا تو ان میں زیادہ تر سرکاری نوکر تھے۔ اچھے اچھے عہدوں پر تھے خود میرے والد جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب میں پیدا ہوا تو اسی سال وہ ڈپٹی کلکٹر ہوئے میرے دادا بھی ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میرے چچا انکم ٹیکس آفیسر تھے۔ میرے پرنانا مولوی احمد علی ہائی کورٹ میں زبردست وکیل تھے اور نواب یوسف کے والد کے ہم عصر تھے میرے نانا بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک بزرگ گھر میں رہتے تھے جو ساری جائیداد وغیرہ کا انتظام دیکھتے تھے باقی سب نوکریاں کرتے تھے اور بڑے اعزاز و انکسار کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے تو یہ مجھے ماحول ملا ———

فاطمی۔ تو آپ کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے بزرگوں کے ذریعہ جو ابتدائی ماحول ملا وہ بالکل فیوڈل تھا ———

وامق جی ہاں بالکل فیوڈل اور خالص امپریلسٹک لیکن ساتھ ہی ایک بات اور بھی تھی۔ جب کبھی میرے والد چھٹیوں میں وطن آتے تو اپنے زمینداروں سے حساب لیتے اور اکثر نقصان رہتا یا بقایا رہتا تو لوگ رائے دیتے کہ کچھ تو بے دخل کر دیا جائے یا زبردستی وصول کیا جائے تو وہ منع کر دیتے ——— نہیں ——— نہیں یہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کبھی ان کو مقدمہ چلاتے نہیں دیکھا اور کبھی کسی مزدور یا کسان سے سخت لہجے میں بولتے نہیں دیکھا جبکہ وہ ڈپٹی کلکٹر بھی تھے۔ بظاہر یہ تضاد ہم دیکھا تھا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ اس کے پس پردہ ہماری خاندانی تہذیب کام کر رہی ہے جو کبھی بھی چھوٹوں پر ظلم پسند نہیں کرتی۔ ہم نے اپنے گھر میں کبھی کسی نوکر کو مار کھاتے نہیں دیکھا، ہم اپنی شرارتوں پر پٹا کرتے تھے لیکن ملازموں کو ہم نے کبھی ڈانٹ کھاتے نہیں دیکھا۔

فاطمی۔ یہ نرمی اور شرافت تو آپ کے چہرے سے بھی جھلکتی ہے بہرحال اس طرح کے ماحول نے آپ کو سرکاری ملازمت کی طرف موڑ دیا اور آپ سپلائی آفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ آپ کے با

گھر میں کسی کو شعر و ادب سے کوئی شغف تھا یا نہیں یا یہ شوق آپ کا انفرادی ہے؟

وامق۔ میری ننھیال میں اچھے شاعر گزرے ہیں مولوی ابو محمد ثمر بہت اچھے مرثیہ گو تھے انیس کے شاگردوں میں سے تھے دس پندرہ اچھے مرثیے کہے ہیں لیکن اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ شرافت تو مجھے ورثے میں ملی شاعری نہیں ملی لیکن یہ ضرور تھا کہ ہمارے گھر میں سنجیدہ اور مہذب ماحول تھا جب ہم اور ہمارے بزرگ ایک ساتھ بیٹھتے، باتیں کرتے تو شعر و شاعری بھی گفتگو کا موضوع بنتی۔

ہمارے بچپن میں شبلی کا بڑا زور تھا۔ ابوالکلام آزاد کے چرچے تھے چنانچہ ان کی باتیں ہوتی تھیں ان کی تصنیف و تالیف پر باتیں ہوتی تھیں تو بچپن سے ان لوگوں کے نام میرے کانوں میں پڑے اور واقفیت ہوئی اور غالب و میر اور خاص طور پر انیس کے اتنے چرچے ہوتے تھے کہ بات بات میں ان کا ذکر آتا تھا —— یہ ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی شاعر و ادیب نہ تھا لیکن سب کے سب بیحد ادب نواز، مطالعے کے شوقین لوگ تھے۔ ہمارا اپنا ایک خاندانی کتب خانہ بھی تھا ——

فاطمی۔ وامق صاحب آپ کو یاد ہے کہ ایسے خوبصورت تہذیبی ماحول میں پہلی بار آپ کو شعر کہنے سے رغبت اور ضرورت کب پڑی —— ؟

وامق۔ میری شاعری کچھ عجیب غیر سنجیدہ طریقے سے شروع ہوئی۔ میں نے بی۔ اے۔ ایل ایل بی لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا ہے تو جس وقت میں بی۔ اے۔ میں تھا اس زمانے میں اقتصادیات کے ایک سینیئر لکچرر ہوا کرتے تھے ڈی۔ پی۔ مکرجی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے وہ بیک وقت بہت اچھے موسیقار تھے۔ بہت اچھے مصور تھے۔ شانتی نکیتن سے تعلیم پائے ہوئے تھے گفتگو جب کرتے تھے تو ہم لوگ مسحور ہو جایا کرتے تھے وہ مجھے بہت عظیم السان لگتے تھے ان کی گفتگو میں آزادیِ ذہن و آزادیِ خیال کا جو جذبہ کارفرما رہتا تھا اُس نے مجھے بہت متاثر کیا، ان کی صحبت میں پہلی بار مجھے اصل آزادی کا عرفان حاصل ہوا کہ اصل آزادی تو ذہن کی ہوتی ہے۔ ذہن کو کسی روایت کا پابند نہیں ہونا چاہیے اگر وہ پابند ہے تو پھر آپ کچھ سوچ نہیں سکتے۔

فاطمی۔ مکرجی کی شخصیت نے سماج اور معاشرے کے تئیں کچھ سوچنے پر ضرور مجبور کیا لیکن آپ کی شعری حس کب اور کس طرح بیدار ہوئی ؟

وامق ابھی نہیں۔ ابھی شعر کہنے سے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی ہاں شعر سننے اور شاعروں کو سننے اور دیکھنے سے دلچسپی ضرور پیدا ہو چلی تھی۔ جگر صاحب۔ اصغر صاحب : ظریف لکھنوی۔ ثاقب، ماملی۔ بیخود دہلوی سب کے نام چل رہے تھے اور سب سے میں واقف تھا اور چونکہ اس وقت تک مجھے شعر کہنا نہیں آتا تھا اس لیے ان لوگوں کو میں مافوق البشر شخصیتیں سمجھتا تھا اور بڑی عزت کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اتنے بڑے کام کی ہمت مجھ میں کہاں چنانچہ میں نے شعر کہنے کی جرات نہیں کی۔ ہاں جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا تو اس وقت یونی ورسٹی میگزین کے لیے مجھ سے کچھ مانگا گیا تو میں کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ کیا لکھوں بالآخر میں نے کیٹس کی ایک نظم کا منظوم ترجمہ کیا اسے آپ میری پہلی کاوش کہہ سکتے ہیں، پہلا شعر کہہ سکتے ہیں وہ نظم جب چھپی تو مجھے بیحد مسرت ہوئی۔

فاطمی۔ آپ کی اپنی اوریجنل شاعری کب شروع ہوئی ؟

واثق۔ ایک طویل وقت گزر چکا ہوں۔ میری شاعری کئی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ اس کی اصل ابتدا ۱۹۴۰ء کے اوائل میں ہوئی جب میں نے فیض آباد میں وکالت شروع کی۔ اس درمیان ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی اور سجاد ظہیر کا گروپ سامنے آیا۔ ہم نے قریب سے اس کانفرنس کو دیکھا۔

فاطمی۔ آپ نے انجمن کی اس پہلی کانفرنس میں شرکت کی؟

واثق۔ شرکت بس یونہی دور سے ایک OBSERVER کی حیثیت سے، کوئی ادیب کی حیثیت سے نہیں اس وقت تک میں کوئی ادیب و شاعر کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ سجاد ظہیر کے چھوٹے بھائی باقر ظہیر میرے کلاس فیلو تھے جب کانفرنس ختم ہوئی تو باقر میرے پاس انگارے کی دو سو کاپیاں لے کر آئے اور کہا کہ تم انہیں بیچو گے اور تنخواہ تم لے لو۔۔۔ میں نے خاموشی سے اسے بیچ ڈالا۔۔۔۔۔

فاطمی۔ انگارے تو ۳۲ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد ضبط بھی ہو گئی

واثق۔ لیکن یہ واقعہ ۳۶ء کا ہے۔ بہر حال میں نے انگارے بیچ ڈالا اور اس کے بعد ترقی پسند ادب منشور پڑھا۔ ترقی پسند ادیبوں کو قریب سے دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ یہ لوگ مجھے بہت عظیم لگے اپنے اندر بھی یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ کاش میں بھی کچھ لکھ سکتا۔ اس جذبے اور پس منظر کے ساتھ جب میں نے ۴۰ء میں فیض آباد میں وکالت شروع کی تو ماحول پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں فیض آباد میں میرے ایک دوست تھے حکیم سبحان میرے ساتھ رہتے تھے اور حکمت کی پریکٹس کرتے تھے۔ ایک ڈاکٹر قریشی تھے جن کے مکان میں ہم لوگ رہتے تھے ان کے گھر پر پندرہ روزہ طرحی نشست ہوا کرتی تھی، میں بھی اس میں شرکت کرتا اور سنتا تھا۔ انھیں دنوں مجھے ایک شرارت سوجھی میں نے ایک غزل تیار کی قطعی بالغو اور مہمل ردیف قافیہ موجود، الفاظ موجود لیکن معنی ندارد ——— میں نے اسے ایک نوجوان کو دیا کہ آج کے مشاعرے میں پڑھ دینا۔ صاحب وہ پڑھی گئی اور مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی جب اس غزل کی بے حد تعریف ہوئی۔ حکیم مجھے جب نشست سے واپس ہوئے تو کہنے لگے کہ تمھاری غزل تو ہٹ ہو گئی لیکن اس شرارت کی کیا ضرورت تم باقاعدہ خود پڑھو۔ میں نے کہا بھائی اس غزل میں تو ذرا بھی معنی نہیں ہیں اور معنی دار غزل کہنا بہت مشکل کام ہے۔ مجھ سے بولے ——— کچھ بھی ہو اس کا اندازہ بہر حال ہوتا ہے کہ تمھارے اندر شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ کچھ دنوں تک میں خاموش رہا۔ ڈاکٹر قریشی نے اصرار اور دوسرے احباب نے بھی کہا تو میں نے کہنا شروع کیا ضرور اور اس محفل میں پڑھنے بھی لگا لیکن اس سے میرا دل کسی طرح مطمئن نہ تھا۔

فاطمی۔ اگر آپ کو اس عہد کے دو ایک شعر یاد ہوں تو سنایئے۔

واثق۔ ۱۹۴۰ء - ۴۲ء تک فیض آباد کی ان محفلوں میں میں نے جو کچھ بھی کہا وہ سب تلف ہو گیا اور اس کا افسوس بھی نہیں ہے اس لیے کہ جس طرح کی شاعری میں نے ان دنوں کی اس کا کوئی مقصد نہ تھا

فاطمی۔ ایسا آپ آج محسوس کرتے ہیں یا اُن دنوں بھی آپ نے ایسا ہی محسوس کیا؟

واثق۔ میں نے ان دنوں بھی یہی محسوس کیا اس لیے کہ میرا گھریلو ماحول، ابتدائی تعلیم، ڈی۔ پی۔ مکرجی کی انجمن کا قیام اس سے وابستگی ان سب کو دیکھتے ہوئے مقصد میرے لاشعور میں رچ بس گیا

[illegible] ہمارے بہت بڑے [illegible] کر دیا گیا [illegible] میری [illegible] رسالات بھی چھاپے جاتے۔ ہاں یاد آیا
[illegible] نکلنے میں لگے تھے۔ ۵۰-۶۰-۷۰ والے نوجوان شعرا کی غزلیں فراہم کر رہے تھے تاکہ وہ ان کو اپنے آرٹسٹ
[illegible] سکیں چنانچہ مجھ سے بھی مانگی ہوئی میں نے دو تین غزلیں بھیج دیں۔ ان میں سے ایک غزل الہ آباد کی
[illegible] نے گائی۔ اس کا ایک شعر دیکھیے یاد آ رہا ہے

ہمیں سے ہمارا فسانہ نہ پوچھو
جلا کس طرح آشیانہ نہ پوچھو

یہ شعر مجھے اس لیے یاد رہ گیا کہ میری غزل کو موسیقی کے ساتھ گائیکی میں پیش کیا گیا۔

ظفی۔ یہ رہا آپ کی شاعری کا پہلا دور جس کا ذکر آپ جرس میں بھی کر چکے ہیں۔ دوسرا دور کب اور کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

اشفاق۔ جی ہاں اس کے بعد موڑ آتا ہے میری سنجیدہ شاعری اور ترقی پسند شاعری کا۔ میں دھیرے دھیرے رسائل منگانے لگا۔ ترقی پسند شاعری اصلاً کیا ہے اسے میں پڑھنے اور سمجھنے لگا، اپنی روایت کو سمجھنے لگا۔ آزاد۔ شبلی۔ اقبال وغیرہ کو پڑھنے لگا۔ انگریزی ادب سے کم وبیش واقف ہی تھا۔ ابتدائی ترقی پسند شاعری کو پڑھنے لگا۔ فیض کو پڑھا۔ مخدوم کو پڑھا ان سب نے مجھے بہت متاثر کیا اور میں دھیرے دھیرے اپنی آواز کو بھی ترقی پسند نغمے سے آہنگ کرنے لگا۔ تمام رسائل میں چھپنے لگا۔ اب میری چیزوں کا ایک مقصد ہوتا تھا اور میں کسی حد تک اس سے مطمئن بھی تھا۔

ظفی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کو یہ شکایت رہی ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں بعض بُت ایسے چھائے رہے کہ آپ پر تنقید کی نظر گئی ہی نہیں۔ خاص طور پر ترقی پسند تنقید نے ایسا کیا؟

اشفاق۔ صاحب ترقی پسند تنقید ابھی لکھی ہی نہیں گئی ابھی تو صرف وہ اصول بنا رہی ہے۔ کہاں تک آپ اصول بناتے رہیں گے؟ کب تک آپ گڑے مُردے اکھاڑتے رہیں گے۔ آپ عملی میدان میں آئیے۔ عملی تنقید کیجیے۔ آج اس وقت بین الاقوامی ادب میں، ورلڈ لٹریچر میں تنقیدی دُنیا میں کوئی اصولی بحث نہیں کرتا، ہاں اس کی عملی تنقید میں اس کا اپنا زاویہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو ہم کو اچھا لگے گا ہم اسی انداز سے تخلیقات کو جانچیں گے پرکھیں گے۔

ظفی۔ یہ صحیح ہے کہ آج دُنیا میں تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ تنقید نے بھی نئے نئے زاویے تراشے ہیں لیکن کیا تنقید کے سلسلے میں یہ آزادانہ روش صحت مند تنقیدی روایت کے لیے سودمند ہوگی؟

اشفاق۔ کیوں نہیں سودمند ہوگی —— اسے آگے تو آنے دیجیے۔ پھیلنے۔ ابھی پچھلے انداز میں کب تک لے چلیں گے۔

ظفی۔ واثق صاحب۔ یہ ایک الگ بحث ہے اس پر ہم پھر باتیں کریں گے۔ دیکھیے ترقی پسند ادب پر دو کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں ایک تو ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب دوسری علی سردار جعفری کی کتاب۔ خلیل صاحب نے اپنی کتاب ایک خاص کیفے سے لکھی ہے لیکن سردار جعفری کی کتاب کو پڑھتے وقت ہمارا تقاضا بہرحال ہو جاتا ہے کہ وہ اس تحریک سے متعلق لکھی جانے والی کتاب کہ جس سے وہ ساری زندگی سے وابستہ رہے ہوں اس کو پوری دیانت داری اور وسعت کے ساتھ لکھیں گے۔

واسق۔ صاحب، سیر کتاب ایمانداری سے لکھی جانی چاہیے۔ تخلیق کو بھی ایمانداری سے لکھنا چاہیے تھا۔ ان کو اگر کسی سے شکایت تھی تو اس کو صاف صاف لکھنا چاہیے تھا ——

فاطمی۔ لیکن سردار جعفری صاحب پر ذمہ داری دوگنی ہو جاتی ہے انھوں نے بعض اہم ترقی پسند شاعروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ آپ کی نظموں نے کیسے کیسے غیر معمولی کام انجام دیے ہیں۔ عوامی شاعری ایک نیا باب وا ہے۔ لیکن ترقی پسند تنقید میں ایسی نظموں کا ذکر تک نہیں ملتا بلکہ ایک بار شاہراہ ۵۳ء میں جب عوامی شاعری کی بحث چلتی ہے تو سردار جعفری آپ کے خلاف بولتے نظر آتے ہیں، خیر یہ تو علمی بحث ہو سکتی ہے —— آپ کے تخلیقی ادب کے بارے میں یہ سب کیا رائے رکھتے ہیں اس کا صحیح اندازہ تو نہیں ہو پا، لیکن آپ اپنے معاصرین کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ان کے نظریات و تخلیقات کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ آپ کی کھری شخصیت آپ کو بے لاگ تبصرہ کرنے سے روکے گی نہیں۔

وامق۔ میں مختصراً یوں عرض کروں کہ یہ سب میرے ساتھی ہیں، ہمیشہ مل کر کام کرتے رہے ہیں، رہا سردار جعفری کا معاملہ تو انھوں نے میرے ہی معاملے میں کیا بہت سے معاملات میں دیانت داری سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے لاشعور میں ہمیشہ یہ بات پوشیدہ رہی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی یا کسی دوسرے کی تحریر کی مدد سے اُن سے زیادہ بلند پایہ ادیب نظر آنے لگے۔

فاطمی۔ آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ تحریک کی نظم و ضبط میں اور اس کی ترقی میں سردار جعفری کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے؟

وامق۔ کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے تحریک کے لیے بہت کچھ کیا، بڑی محنت کی، ہمیشہ اچھے عہدوں پر رہے اور بعد میں اسے کیش بھی کیا اور آخیر آخیر میں انھوں نے تحریک کو نقصان بھی بہت پہنچایا۔ یہ ایک سچ ہے تاریخ اس کو کبھی جھٹلا نہ سکے گی۔

فاطمی۔ آپ اپنے دیگر معاصرین کے بارے میں بھی کچھ فرمایئے۔

وامق۔ میں بحیثیت ایک شاعر کے۔ پتا نہیں آپ اس سے اتفاق کریں گے یا نہیں اس لیے کہ آپ ادب کے استاد ہیں۔ تنقید لکھتے رہتے ہیں —— "میں کیفی کو سردار سے بدرجہا بہتر شاعر سمجھتا ہوں، کیفی بہت اچھا شاعر ہے" میں اپنے دوستوں میں جذبی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ غزل کا بہت سنجیدہ اور اچھا شاعر ہے۔ ادھر جو وہ غزلیں کہہ رہے ہیں اگرچہ ان میں نیا پن نہیں لیکن ان کی دیگر غزلوں میں جو دھیمی دھیمی آنچ کا لطف ہے وہ آج بھی زندہ ہے۔ مخدوم۔ مجاز یہ سب میرے دوست رہے ہیں ان سب کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ بڑی خدمات ہیں ان کی۔ میں ایک بات بطور خاص ریکارڈ کروانا چاہتا ہوں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سربراہ ہیں جو یہ ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے وہ اتنا ہی خطرناک ہے جیسا کہ تھا یعنی اپنی شاعری کے منصب کے بارے میں سوچنا اور اصرار کرنا کہ اس وقت ہم غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں تاباں صاحب کو دیکھیے ان کی پریشانی بھی یہی ہے جبکہ تاباں صاحب کی غزل میں بہت کم کیفیت پاتا ہوں غزل کو ہم خیالات کی لغت تھوڑے ہی تیار کرتے ہیں بلکہ خوبصورت قول ہونا چاہیے اسے سیدھے دل میں اتر نا چاہیے یا کم از کم غزل ایسی تو ہونی

چاہیے کہ آپ کو سُننے پر مجبور کر دے۔ آپ سُننے والوں سے کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ یہ
چیزیں تاباں صاحب کے یہاں مفقود ہیں مگر جب ہمارے ترقی پسند نقادوں نے کسی پر کچھ نہیں لکھا
تو تاباں پر کیا لکھا جاتا۔ بہرحال پرکھ کا اس کا فیصلہ وقت ہی کرے گا۔

فاطمی۔ آپ کی رائے صائب اور آپ کی شکایت درست کہ ترقی پسند تنقید بڑی حد تک ترقی پسند تخلیقی ادب کا
معروضی انداز سے جائزہ نہیں لے سکی ہے جبکہ اس کی شدید ضرورت ہے۔ اصل میں تنقید کی بھی اپنی
کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں، اپنی حدیں ہوتی ہیں۔ اگر اخلاقیات سے داری کے تحت تنقید لکھی جانے لگے تو
پھر دوسری قسم کی مشکلیں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ یہ مسئلہ تو ہر دور کی تنقید کے ساتھ رہا ہے کہ اس نے
تخلیق یا تخلیق کار کی پیاس نہیں بجھائی ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ نے اب جبکہ عمر کے
اسّی سال پورے کر لیے ہیں۔ عمر اور تخلیقی سفر کی اسی منزل پر آپ اپنے اندر کے تخلیق کار کو کس حد تک
مطمئن پاتے ہیں جو آپ کی خدمات ہیں عملی اور علمی دونوں سطح پر آپ اس کو RESPONSE
ملا؟ آپ کو نوازا گیا یا نہیں؟ میں یہ سوال اس لیے بھی کر رہا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کی
پوری زندگی مجاہدانہ رہی ہے، آپ نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا ——

اسحق۔ میں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا —— دوسری بات یہ ہے کہ ادب میں متوجہ کرنا اور اپنا مقام حاصل
کرنا یہ بھی اپنی جگہ ایک آرٹ ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ آرٹ مجھے نہیں آتا۔ میں سمجھتا
ہوں کہ میرا کام شعر کہتے رہنا ہے باقی کام دوسروں کا ہے مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ تھوڑے
بہت پروپیگنڈے کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے اگر کسی شاعر کا کلام اس کے اصل سُننے والوں تک
نہیں پہنچ رہا ہے تو اسے پہنچانا چاہیے ظاہر ہے کہ اس کے لیے مشینری چاہیے، مواقع چاہیے۔
میری غلطی یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے ان مواقع کا استعمال کیا نہ اس مشینری کا اور مدتوں بے نیاز
رہا اور سوچتا رہا کہ آج recognation نہیں مل رہا ہے تو نہ سہی کل ملے گا اس خیال کے تحت
پچھڑ گیا اور مجھے نقصان پہنچا صرف ان معنوں میں کہ میرے کلام کا وہ تجزیہ نہ ہو سکا جس کی میں
امید رکھتا تھا، اگر کوئی تجزیہ کرنے کے بعد میرے کلام کو تیسرے درجے کا کلام سمجھتا ہے تو میں اس پر
خوش اور راضی لیکن افسوس تو یہ ہے کہ میرے کلام کو ٹھیک سے پڑھا ہی نہیں گیا توجہ بھی نہیں دی گئی۔

فاطمی۔ کیا اس عدم توجہ کی وجہ آپ کے کلام کی عدم اشاعت یا آپ کے سرمایۂ کلام کا کم ہونا ہے۔ جس طرح سے
آپ کے معاصرین شعرا بے تکان چھپ رہے تھے دھڑا دھڑ مجموعے آ رہے تھے اور باقاعدہ اس مشینری
کے ذریعے اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ آپ کا سب سے پہلے
ایک پتلا سا مجموعہ چیخیں (۱۹۴۸ء) میں آیا اس کے بعد جرس (۱۹۵۰ء) اور پھر ایک طویل عرصہ کے بعد
شب چراغ (۱۹۷۸ء) میں چھپ کر آیا جب کہ آپ کے معاصرین کے پاس دس دس پندرہ پندرہ مجموعے
ہیں باقاعدہ چھپ رہے ہیں۔ بِک رہے ہیں ——

اسحق۔ میری شاعری کا حجم بہت زیادہ نہ سہی تو کم بھی نہیں ہے خاصی اچھی تعداد میں میں نے نظمیں، غزلیں کہی
ہیں اور ان میں بیشتر شائع بھی ہوئی ہیں۔ پھر حجم کی زیادہ حیثیت نہیں ہوتی، آپ نے کتنے اچھے شعر
کہے ہیں یہ بات زیادہ اہم ہے میر کا مطالعہ کیجیے تو اس کے شاعرانہ حجم کو دیکھتے ہوئے کتنے اچھے اشعار

ملتے ہیں؟ پہلا دیوان تو اچھا نہیں ہے زیادہ سے زیادہ پانچ سو اشعار ہوں گے باقی ایسے ہیں جن کو آپ تاریخی حیثیت ـــــــ سے لائبریری میں ڈال دیجیے۔ آپ نے نئی دُنیا کا سلام پڑھا ہوگا اور آپ نے معصوم رضا راہی کی ۱۸۵۷ء بھی پڑھا ہوگا مجھے تو بعد کی نظم زیادہ اچھی لگتی ہے لیکن اس نظم کو لوگ کم جانتے ہیں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا ہے؟ جبکہ وہ ایک حسین ترین نظم ہے چنانچہ وہ دل برداشتہ ہوگیا اس نے راہ بدل دی اور فلم میں لکھنے لگا پیسا کمانے لگا۔ اسی طرح پرویز شاہدی، بہت عمدہ شاعر لیکن اس کو ان لوگوں نے رگڑ رگڑ کر ختم کر دیا اس حد تک کہ کلکتے میں جب انجمن کی کانفرنس ہوئی تو اس میں بھی اس کی ضمنی حیثیت بھی نہیں ملی۔ مخدوم کو لے لیجیے اتنا اچھا اور بڑا شاعر لیکن اسے وہ مقام ملا جو ملنا چاہیے۔؟

فاطمی۔ اس کی کیا وجہ آپ سمجھتے ہیں؟

وامق۔ اس کی سیدھی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سر براہین نے یہ سمجھ لیا کہ یہ تو با صلاحیت انسان ہے اگر اس کو ذرا بھی انگلی دی گئی تو یہ کلائی پکڑ لے گا اور ان کا چراغ گل ہو جائے گا۔

فاطمی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انجمن میں غیر دیانت دار اور بے ایمان قسم کے لوگ بھی رہے ہیں؟

وامق۔ بے شک رہے ہیں جس کی وجہ سے آج مجھے سچ بولنا پڑ رہا ہے۔ ہماری نئی نسل نے ہم سے بار بار کہا کہ سچ بتائیے کہ یہ سب کیوں ہوا اور کس طرح ہوا اگر آپ نہیں بتائیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ بھی انھیں بے ایمانوں میں سے ہیں انھیں لفظوں میں ہندی کے ایک نئے نقاد نے ہم سے پوچھا تو ہمیں سچ بولنا پڑا۔ صرف چند لوگوں نے باہمی تعریف و توصیف کی ایک فضا بنا لی چلیے ہم کچھ بھی نہیں تو مخدوم پرویز وغیرہ کو وہ مقام کیوں نہیں ملا۔؟

فاطمی۔ وامق صاحب آپ کے خیال میں یہ مقام جس کی آپ بار بار شکایت کر رہے ہیں، یہ مقام کون دیتا ہے؟ کیا نقاد دیتا ہے؟

وامق۔ کوئی نہیں دیتا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی دیتا ہے مستقبل فیصلہ کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ لیکن یہ مسئلہ تو آپ لوگوں نے ہی اٹھایا ہے اسی لیے جواب دے رہا ہوں۔

فاطمی۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وقتی مایوسی سے گھبرا کر ادھر اُدھر بہک جاتے ہیں جیسے ابھی آپ نے معصوم رضا راہی کی بات کی کیا یہ فنکار کے لیے مناسب ہے؟

وامق۔ ہرگز نہیں۔ مجھے دیکھیے میں کبھی گھبرایا؟ آج اس عمر میں جوانی سے زیادہ غزلیں و نظمیں کہہ رہا ہوں اور مجھے کسی بات کی فکر نہیں۔

فاطمی۔ وامق صاحب۔ اب ذرا میں اپنی نسل کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ جس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کم و بیش میں بھی اسی کا قائل۔ اس میں شک نہیں ترقی پسند تحریک ادب کی ایک بڑی اور انقلابی تحریک رہی ہے لیکن ہر تحریک کا اپنا ایک رول ہوتا ہے، اپنی ایک عمر ہوتی ہے۔ ہم نے جب تحریک و تنظیم کو دیکھا تو وہ انتشار کا شکار تھی ـــــ

وامق آپ نے تو مُردہ تحریک کو دیکھا ہے۔ تحریک کیا اس کی لاش کو دیکھا ہے۔ ہم نے تو اسے جوان دیکھا ہے اور جب اس کا قتل ہوا تو اس کا دم گھٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

فاطمی۔ اگر آپ کی نظر میں تحریک مُردہ ہو چکی ہے تو پھر آپ لوگ اس مُردہ لاش کو کیوں ڈھو رہے ہیں آپ بھی تو

اس کی ضرورت ختم ہو گئی ہے؟

وامق۔ یہ خیال غلط ہے کہ تحریک کا رول ختم ہو چکا ہے اس کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ میر کے زمانے میں بھی یہ تحریک تھی غالب کے زمانے میں بھی تھی مگر اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکا تھا۔

فاطمی۔ میں اس وقت اس تحریک و نظریہ کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس تحریک کی بات کر رہا ہوں جو ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی اور آج آپ کے قول کے مطابق مردہ ہو چکی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں نئے لکھنے والوں کی تسلی بخش تعداد کیوں نہیں ہے؟

وامق۔ نوجوان اس لیے نہیں ہیں کہ ان میں جو بوڑھے ہیں وہ آج بھی اس تحریک سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لینا چاہتے ہیں، اس کا پنڈ نہیں چھوڑنا چاہتے اگر وہ اس تحریک سے الگ ہو جائیں گے تو انھیں پوچھے گا کون؟ سماج کی طرح ادب میں بھی ایک جنگ جاری رہتی ہے، بہت سے لوگوں نے حکومت سے خاموش سمجھوتہ کر لیا ہے اور اس تحریک کے اس آدرش کو ختم کر دیا جس کو یہ لے کر چلی تھی اگرچہ یہ ساری باتیں کاغذ پر نہیں ہیں لیکن ایسا ہوا تحریک سے متعلق یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن فاطمی صاحب ایسے بھی بزرگ ہیں جو آج بھی یہ سوچتے ہیں کہ تحریک کو اسی زور و شور سے چلنا چاہیے جیسا کہ پہلے تھی اس لیے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جو مسائل سے خالی رہا ہو —— پھر فاطمی صاحب! بزرگوں کو جو برا بھلا کرنا تھا کر چکے اب نوجوانوں کو سامنے آنا چاہیے۔ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ تحریک اسی انداز سے چلے یہ اپنا روپ بدل سکتی ہے اپنا انداز بدل سکتی ہے لیکن اس کی روح وہی رہنی چاہیے آپ جیسے نوجوانوں کو چاہیے کہ سب سے پہلے ان سربراہوں سے کہیں کہ وہ ادیبوں کی کل ہند کانگریس کریں اپنی کارکردگی پیش کریں اگر نئی نسل ان سے مطمئن نہیں ہے تو نئے لوگوں کو سامنے آنا چاہیے۔ اکثر نئے ادیبوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ ترقی پسندی اصلاً ہے کیا؟ منشور کیا ہے؟ انھیں ترغیب دینے کی، متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن انھیں تو کچھ پتا ہی نہیں۔

فاطمی۔ وامق صاحب اس مفید مشورے کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں —— میں اب آپ کا ذہن دوسری طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ نہ صرف ممتاز ترقی پسند شاعر ہیں بلکہ مشاعرے کے اسٹیج کے بھی مقبول شاعر ہیں۔ ہندستان کا کوئی بھی بڑا مشاعرہ آپ کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ آپ نے وہ مشاعرے بھی دیکھے ہیں جس میں جوش۔ جگر جیسے شعرا شریک ہوا کرتے تھے اور مشاعرے کا اپنا ایک وقار و معیار ہوا کرتا تھا اور اب آج کے مشاعرے دیکھ رہے ہیں تو مشاعرے کی بدلتی ہوئی فضا اور اردو شاعری کی یہ تخریبی تہذیب کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

وامق۔ جی ہاں میں نے مشاعرے بہت دیکھے ہیں، مشاعروں کا وہ دور بھی دیکھا ہے جس میں اردو کے مایہ ناز شعرا کی شرکت ہوا کرتی تھی اور جن کی شرکت کو وجہ افتخار سمجھا جاتا تھا اور آج کے مشاعروں میں بھی گاہے بگاہے شرکت کرتا رہتا ہوں اگرچہ میں نے بہت کم کر دیا ہے لیکن بے حد اصرار پر چلا جاتا ہوں۔ آج کے مشاعرے تو مشاعرے رہ ہی نہیں گئے ہیں بالکل مذاق ہو کر رہ گیا ہے اس کے ذمہ دار ہیں ہمارے شعرا اور مشاعرے کے ناظم حضرات۔ میں ایک بات کہوں کہ اس کو بھی خراب کرنے میں بھی ترقی پسند شعرا کا ہاتھ رہا ہے۔

فاطمی۔ دیکھیے؟

وامق۔ پوری اردو شاعری پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے بحران کا اثر پڑا ہے اس بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے شاعری کی صورت ایک ایسے جہاز کی طرح ہو گئی جس کا لنگر ٹوٹ گیا ہو اور جس کے لیے کوئی راستہ نہ ہو چنانچہ وہ سب کے سب انتشار کا شکار ہوئے جس کی وجہ سے ہماری وہ تہذیب بھی انتشار کا شکار ہوئی جو کبھی اردو شاعری کی تہذیب ہوا کرتی تھی چنانچہ مشاعرے کے اسٹیج پر نام نہاد شاعروں کا قبضہ ہو گیا اور ادھر عوام میں شاعری کا مذاق ختم ہونے لگا۔ ادھر مجھے کوئی ایسا مشاعرہ نہیں ملا جس میں میں نے جی لگا کر کلام پڑھا ہو اس سے بہتر تو مختصر نشستیں ہوتی ہیں۔ مشاعرے کی خرابی و بربادی کی اور بھی وجہیں ہیں جن پر تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے۔

فاطمی۔ اچھا یہ بتائیے کہ اسّی برس کی اس عمر میں آج آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ میری مراد ہے کہ جب کبھی آپ خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوں گے تو یہ خیال ضرور آتا ہوگا کہ آپ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو کیا دینا چاہتے تھے اور کیا دے پائے، آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟

وامق۔ میں نے اس سلسلے میں ایک جگہ لکھا بھی تھا آپ سے بھی وہی بات دہراتا ہوں کہ فنکار کا اپنی خدمات یا اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہو جانا ناپیدا کنار امکانات کو جھٹلانا ہے تاہم میں بڑی حد تک اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہوں اور اس پر بھروسا رکھتا ہوں کہ اس میں میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیا ہے اور اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا اس کے لیے میں کسی عصری سند کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

فاطمی۔ ایک طرف آپ سند کی ضرورت محسوس نہیں کرتے دوسری طرف آپ نقادوں کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی کرتے ہیں ——

وامق۔ دیکھیے یہ ایک فطری بات ہے میں بھی آخر انسان ہوں میں نے اس انجمن کے سایے میں پچاس برس سے زیادہ گزارے ہیں، تکلیفیں برداشت کی ہیں، ملازمت چھوڑی ہے اور پھر ایک زمانے میں میری شاعری کا طوطی بول رہا تھا میرا گیت بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔ اس زمانے کا سب سے اچھا انقلابی و عوامی گیت سمجھا گیا۔ سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا۔ وامق کی یہ نظم سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ تعجب ہے کہ ترقی پسند ادب کی تاریخ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد میں نے اردو زبان و ادب کا پہلا اسٹائر لکھا مینا بازار جو بہت پسند کیا گیا لیکن آج تک کسی بڑے نقاد نے اس کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ آزادی کے بعد تقسیم پنجاب اور گاندھی جی کے قتل پر میری نظمیں اب تک رطب اللسان ہیں بمبئی کی ایک ادبی نشست میں کرشن چندر نے تقسیم پنجاب کو سن کر کہا تھا کہ منٹو کے ٹھنڈا گوشت کا اس سے بہتر جواب نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۵۱-۵۲ء میں عالمی امن میں نے ایک طویل نظم نیلا پرچم لکھی تھی جو عوام و خواص میں بیحد مقبول ہوئی اس کی گونج سوویت یونین تک پہنچی مگر وہ بھی بلیک آوٹ کا شکار ہو گئی۔ میں نے اردو میں پہلی اوڈ ODE لکھی زمین چوم اسلوب و ہیئت و ترتیب کے اعتبار سے ایک استاد تھی علی گڑھ کے ایک انگریزی کے پروفیسر نے کہا کہ زمین انگریزی کے تمام اوڈوں سے بہتر ہے۔ علی عباس حسینی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی

کے کرتا تھی کی رہی ہے ...... نظم ہے جو نقاد ...... بھی کام ...... کے وہ سنگار تے ہیں اس کے بعد
میں نے اپنی نظم لکھی جس کی موضوعاتی جامعیت اور حسن اسلوب نے بڑے بڑوں کو حیران کر دیا مگر ادب
میں اس کا بھی حوالہ نہیں ملتا۔ کشمیر میں میں نے دو مسترے لکھی جو بہت دنوں تک موضوع بحث بنی رہی
اس کے بعد وقت اور سفر نامہ بڑی ہٹ ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعد کی ان نظموں نے ہندی کے
نئے ادیبوں اور نقادوں کو چونکایا اور وہ نئے سرے سے میری طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آج ہندی میں
کئی جگہ میری شاعری پر کام ہو رہا ہے۔

فاطمی۔ کام تو خیر اردو میں بھی ہو رہا ہے۔ لیکن اس بے اعتنائی کی بنیادی وجہ آپ کیا سمجھتے ہیں؟

وامق۔ اردو تنقید کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ابھی بھی نظریہ سازی اور اصول سازی میں الجھی ہوئی ہے اس
نے عملی تنقید [illegible] ہی نہیں ایسا کرنے سے نقاد ڈرتے ہیں پھر ان کی اپنی مصلحتیں ہیں، کمزوریاں ہیں،
اپنے معاصرین پر لکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

فاطمی۔ چلیے اردو تنقید کی اس کمزوری کو تسلیم کر بھی لیا جائے لیکن آپ تو ان بے نیاز شاعروں میں سے
ہیں جس نے سارا کا سارا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا ہے یہ ایک اچھی بات ہے کچھ تو فیصلہ وقت کر رہا ہے
کچھ آگے چل کر کرے گا۔ آپ کی باقاعدہ ایک حیثیت ہے۔ ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے آپ کی اپنی
شناخت رہی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گی لیکن وامق صاحب آپ نے تو غزلیں بھی کہی ہیں۔

وامق۔ جی ہاں میں نے غزلیں بھی کہی ہیں جن میں آپ کو نئے مضامین، نئی علامتیں اور نیا فکری لہجہ ملے گا۔
مقام استعجاب ہے کہ وہ بھی اردو کے نقادوں کی نظروں سے نہیں گذر سکیں۔ میں نے شاعری میں
معنوی، صوتی اور صوری اسلوب بیان کے بڑے تجربے کیے ہیں۔ اختراعات و اجتہادات سے کام لیا
ہے۔ پوربی بولی میں لوک گیت اور بچوں کے لیے سن و سال کی مناسبت سے چھوٹی بڑی اور آسان
زبان میں نظمیں کہی ہیں ——— آج سوچتا ہوں کہ کیا واقعی میں نے ادب کو کچھ نہیں دیا یا اس سکوت
یا بلیک آؤٹ کے پس پشت، کوئی بڑی سازش کام کرتی رہی ہے یا اہل قلم کی نااہلی ہے یا کسی غلطی کا
احساس و اعتراف پست اور چھوٹے اذہان و طبائع کے بس کی بات نہیں ہے۔

وامق صاحب پورے فارم پر تھے ان کو اردو کے نقادوں سے شکایتیں ضرور تھیں مگر وہ مایوس
ہرگز نہیں تھے اسی لیے کہ انھیں پتہ ہے کہ اردو کے عوام میں، اردو سماج میں وہ بیحد مقبول ہیں ان کی شاعری
اور ان کے بعض مصرعے محاوروں کی طرح عوام کی زبان پر رچے بسے ہیں۔ میرے ذہن میں کچھ اور باتیں تھیں
لیکن میں نے قصداً انھیں روکا اور وامق صاحب کو تھوڑی دیر کے لیے آرام اور خاموش رکھنا مناسب سمجھا
کیونکہ ان کی گفتگو میں کمزوری جھلک پڑی تھی۔ چائے پھر آئی اور ہم چائے کے گھونٹ کے ساتھ وامق صاحب
کا تازہ کلام سنتے رہے، محظوظ ہوتے رہے۔ اس عمر میں ان کی اسپرٹ۔ جوش و ولولے سے ہم ایک نیا عزم
و حوصلے کا سبق لیتے رہے اور جب لال کوٹھی کے عالی شان پھاٹک سے نکلے تو چشم فلک سے قطرے ٹپک
رہے تھے جو ہمارے قلب و جگر میں پیوست ہو رہے تھے اور صاف یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس عظیم المرتبت
فنکار اور باہمت شاعر نے جتنی باتیں کہیں، جتنی شکایتیں کیں ان میں بڑی حد تک سچائی ہے۔ اس شاعر نے ہمیں
بہت کچھ دیا لیکن ہم اسے کیا دے سکے ——— شاعرہ کہنے کا اسود ا ہے، ایک جنونی عمل ہے لیکن پھر بھی

(باقی صفحہ ... پر)

الحمدللہ

زی پور، الہ آباد

حرفِ آخر

(حضرت وامق جونپوری کی نذر)

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

ی نوک میں سُورج کی روشنی بھرکر

ں نکتوں کو جب تم زبان دینے لگے

یات کی وادی میں نقرئی پریاں

رے لفظوں کے ہمراہ رقص کرنے لگیں

ے اُٹھے ہیں تصور میں اَن گنت جگنو

الے زلفِ پریشاں ہیں تم نے تاکم نے لیے

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

بح نو ہو کہ ہو شام کا حسین منظر

یب تک کی جنبش لہو اُگلتی رہی

ت قریب سے دیکھی ہے زندگی کی تپش

ایک شے میں تمھیں کرب ہی نظر آیا

صول زیست کی خاطر، سکونِ دل کے لیے

اں گئے وہیں لاشوں کے آبشار ملے

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

شعور و فکر کا شہپر کسی طرح نہ رُکا

عبور کرتا رہا جو کہ مغربی ابہام

جہاں پہ سانسوں کی رفتار سرد پڑ جائے

پناہ لیتے ہیں بھوں کے کوہِ قاف جہاں

وہیں سے گذرے ہو تحریکِ زندگی لے کر

سکوت توڑ دیا تم نے ان جزیروں کا

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

یہ کس نے آہنی زنداں سے دی ہیں آوازیں

کہاں سے آتی ہے زنجیر ٹوٹنے کی صدا

نکل پڑے ہیں بگولے لیے ہوئے پرچم

صدائیں دیتے ہوئے انقلاب زندہ باد

مورخوں کے قلم لکھ رہے ہیں تاریخیں

کہ پر بریدہ پرندے ہیں مائلِ پرواز

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

زبانِ ظلم پہ شمشیر تم نے رکھی ہے

لہو نچوڑ کے کاغذ کو شعلہ بار کیا

قلم سے تم نے تراشے ہیں عصرِ نو کے صنم

رگِ نفاق پہ نشتر تمھاری تحریریں

جو ارتقا کے پجاری ہیں وہ بھی واقف ہیں

وہ جس کے بعد نہیں کچھ وہ حرفِ آخر تم

سخنوری کے پیمبر، چراغِ علم وادب

واثق جونپوری

نظمیں

سفرِ ناتمام

زندگی کون سی منزل پہ رُکی ہے آکر
آگے چلتی بھی نہیں راہ بدلتی بھی نہیں
سُست رفتار ہے یہ دورِ جمہوری کتنا
سخت و بیجان ہے یہ پیکرِ نوری کتنا
چاند اک خواب جو تھا
شہرِ امید تہِ آب جو تھا
حُسن کے ماتھے کا تنہا ٹیکا
پلّے آدم کے تلے آتے ہی
اترے چہرے کی طرح ہو گیا کتنا پھیکا
ہم جنوں کیش و طرحدار ہمیشہ کے جو تھے
بھاگتے سایوں کے پیچھے دوڑے
داہنے بائیں جو ڈالیں نظریں
ہو کے بے کیف ہٹا لیں نظریں
موت افلاس جفا عیاری
بھوت عفریت چڑیلیں خواری
ناچتی گاتی تھرکتی ہنستی
قہقہے گالیاں لڑتی ڈستی
ہڈیاں چوستی یرقان زدہ لاشوں کی
بدلے جاروب کے پنجوں میں لیے تارِ کفن
شعلہ دہن
بستی کی بستیاں جھلساتی ہوئی
شہر پہنچیں تو کھلے دریائے
چڑھ گئیں سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کھٹ
بند ہونے لگے پٹ
لے لیا دانتوں میں شریانوں کو
دریا نوش کی طرح
زندگی کون سی منزل پہ رُکی ہے آکر
آگے چلتی بھی نہیں راہ بدلتی بھی نہیں
مسئلہ یہ نہیں یہ مسئلے حل کون کرے
مسئلہ یہ ہے کہ اب اس میں پہل کون کرے
آسماں دور زمیں چور
کہاں جائے کوئی
کاش ایسے میں چلا آئے کوئی
دلِ آشفتہ کو بتلائے کوئی
کس طرح پھوٹتی ہے خشک شجر میں کونپل —
آؤ — تعمیر کریں حرفوں کا اک تاج محل
جس کو کہتے ہیں — غزل
جنسِ الفت کی وہ اب گرمیِ بازار نہیں
سب دکان دار ہیں کوئی بھی خریدار نہیں
دلِ وحشی پہ وہ اب تیروں کی بوچھار نہیں
دام افگن ہیں بہت کوئی کماندار نہیں
قدر اندازوں کے انداز ہیں بدلے بدلے
زخم لگتے ہیں مگر کچھ بھی مزیدار نہیں
غیرتِ شوق کہاں مر گئی اے اہلِ جنوں
آج عاشق کوئی رسوا سرِ بازار نہیں
دعوۂ عشق تو ہے بوالہوسوں کا شیوہ
اس کو عاشق نہ سمجھنا جو سردار نہیں
جانے کیا پھولوں سے کہتی ہوئی گزری ہے نسیم
مسکرانے پہ کلی اب کوئی تیار نہیں
زندگی کون سی منزل پہ رُکی ہے واثق
کوئی رہوار نہیں راہ بھی ہموار نہیں

وامق جونپوری

ایک دو تین (ایک مختصر طویل نظم)

کتنے شیریں دہناں ہفت زباں
آج کیوں گنگ نظر آتے ہیں
زخم فریاد کناں
رہگزر ٹوٹے کھنڈر عظمت ماضی کے نشاں
حرفِ تہذیب و علاماتِ کمال
بے صدا جن کی فغاں گھٹتی رہ جاتی ہے
بھک سے اڑ جاتے ہیں بارود مثال
سرد آہوں کی کھلے بال پری
ڈھونڈتی پھر رہی ہے راکھ کے انباروں میں
اپنے محبوبوں کا گلپوش مکاں
خواب اگتے تھے جہاں
اب وہاں پھول نہ پھل
دیکھنے میں نہیں آتی کوئی زنبور عسل
صرف زخموں کے وہاں جن میں نہیں کوئی زباں
کوئی تعبیر نہیں خوابوں کی
خواب اک وحشی پرند
ذہن کے کھنڈ پہ آ بیٹھتا ہے
ایک کہانی کہہ کر پھر سے اڑ جاتا ہے صحرا کی طرف
ایک کہانی جس کا ہے کوئی اور نہ چھور
اس کی تصویر بنا سکتا ہے کون
اس کی تعبیر بتا سکتا ہے کون
ڈھول تاشے کی کڑک
دست چلاچل کی جھنک
بھانگڑا ۔ ڈمرو ۔ کتھک
دھوم دھڑکا ہلچل
اک برات ایک ہار کوتل
کوئی نوشاہ نہیں
ایک چوپالا دلہن سے خالی
ایک قزاق اجل ہانکتا سب کو چلا جاتا ہے
شہر خموشاں کی طرف
قبریں تیار ہیں پہلے ہی سے
منتظر گھاٹ ہیں من گنگا کے
سب براتی بندھے زنجیروں میں
اپنے خلیوں میں زقندیں بھر کر
خاک بنتے خاک سے جا ملتے ہیں
ایک دو تین دھماکے جھکڑ
شعلیں بجھ گئیں سب
کھڑکھڑانے لگے دروازے ہوا کی زد سے
بن گئے تیشے دریچوں کے جو شیشے ٹوٹے
اڑ گئی نیند۔ ننگی آنکھیں ۔ حدیدی سانسیں
ٹینٹوا کھینچ رہا ہے کوئی
کوئی آواز نہ چیخ
محو سرگوشی ہے ہر موئے بدن
منہ سے بہتی ہوئی رال
ایک نابینا گراں گوش سبکدوش بلانوش
مے پندار میں مست
تخت پر جھوم رہا ہے یک لخت
کوبرا طیش میں کاڑھے ہوئے پھن
نوع آدم کا ازل سے دشمن
سامنے اونگھتی فوجوں کی صفیں
زرد جوہر کے بنے جن کے بدن
کانٹے ایندھن سے اٹے جن کے دہن

کھیل

ایک دو تین دھماکے گھن سے گھن
کھل گیا قفلِ جہنم گویا
سارا جہاں گونج اٹھا
پیروں کے نیچے زمین سلگنے لگی
آگ کی طرح ہوا جلنے لگی
پگھلی مٹی کی ندی بہنے لگی
سو گئی ہو گئی سورج کی کرن
ایک دو تین جوابی حملے
ہر طرف پھٹنے لگے گولے مسائل روکٹ
ہر طرف چیخ پکار، ایک انبوہ فرار
فطری بھگدڑ ہے مگر سب بیکار
سب کے اعضائے جسد کٹنے لگے
ٹکڑوں میں بٹنے لگے
جسم و تن گھٹنے لگے
زخم ہی زخم ہیں سب جن میں نہیں کوئی زباں
رہگذر ٹوٹے کھنڈر عظمتِ ماضی کے نشاں
اڑ گئے بن کے دھواں خواب پریشاں کی طرح
بھورے لاوے کی اُبلتی ندیاں
پی گئیں پانی سمندر کا سب
قہر شوریدن کے کاندھوں پہ سوار
بھاپ اور تیل کا ابرِ باراں
بکھرے آب کے کاسے میں سجائی گئی ہیں
بریاں وہیلیں
ناشتا جیسے عزازیل کا ہو
کہیں ملتی نہیں انسان کی لاش
جل بجھا ذخیرے کے مانند جہانِ حیواں
اب ہمالہ کی جگہ آگ کی نہریں ہیں رواں
ایک طولانی پہاڑی ہے جہاں گنگا تھی
اک بڑی کھولتے پتھر کی جھیل سر و تبت کا
[کر لیا تھا جہاں
ایک انگاروں کا بھوبھل جنگل الوزیکا تھا جہاں

اپنے جیسے تھے پٹا کا مقیم
دم بخود چینی سے ہے دو نیم
روس۔ امریکا۔ کناڈا۔ یورپ
ایشیا مرکزِ قتل
چل گیا سب پہ فنا کا رولر۔ نیوکلیر بلڈوزر
تاج۔ مینار ایفل۔ ہیرو۔ فلک بوس عمارات عظیم
کھیل کے میدان بنے
نہیں مندر ہے نہ کعبہ نہ کلیسا کوئی
وید و قرآن و زبور و انجیل
مونا لیزا۔ مڈونا۔ وینس و گورنیکا تھے کبھی اب نہ رہے
زلف و شنگرف کی باقی نہ رہی کاہکشاں
عطر و سنجاب و چکن کی دکان
مل کے مزدور جوان۔ کشتِ زرکار کا مالک دہقاں
اب کہاں اب تو یہاں
ایک اولمپک یونیورسل ہوگا
زحل و مریخ کے باشندے جہاں آئیں گے
طشتِ خلائی پہ سوار
اپنے کھیلوں کی نمائش کرنے
شوخ شپٹ جن کے مسائل رفتار۔ اجنبی طرزِ گفتار
روحِ آدم کی تواضع کے لیے فرشِ گیتی پہ کریں گے اک رقص
اور ہمیں دے کے چلے جائیں گے ایک ناگفتنی و غیر مہذب سا خطاب

کیا ہوا کیسے ہوا کتنے سوال
کوئی زندہ نہیں جو دے سکے ان سب کا جواب
غالباً نیوکلیر جنگ کا وہ کمپیوٹر
موت کا ایک کلیدی محور شورش سرکش جو ہوا
اور کسی کو نہ ہوئی جس کی خبر ایک دو تین سیکنڈ
سننے والے نہ رہے اور نہ رہے اہلِ سخن
اب رہا باقی کوئی دوست نہ دشمن نہ وطن
"اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا"
ایک دو تین، نہیں لاکھوں برس

وامق جونپوری

میں ایک طائر آوارہ اضطراب پسند
قفس دری تو کبھی بازیِ عقاب پسند

ہر انقلاب نئے انقلاب کا ہے نقیب
مزاجِ وقت ہے کس درجہ انقلاب پسند

ہمارا ذوقِ تجسس صنم تراشی ہے
ہمیں ہے حسن پس پردۂ حجاب پسند

الٹ کے آئینہ ہر بچہ دیکھتا ہے ضرور
سکونِ قلب ہے کس درجہ اضطراب پسند

وہ پوچھتے ہیں سبب میری تلخ کامی کا
مگر نہ آئے گا ان کو مرا جواب پسند

شرابیں جتنی ہیں سب اپنے اپنے وقت کی ہیں
تو کیا بتائیں کہ ہے کون سی شراب پسند

جو اس کو پڑھتے ہیں تفریح کے لیے وامق
کبھی نہ آئے گی ان کو مری کتاب پسند

...امتی جونپوری

ایک آواز کبھی نغمہ کبھی رعد فلک
کبھی سناٹے کا سرگم کبھی ٹاپوں کی دھمک

ایک خواب ایسا بدن لپٹا ہوا پھولوں میں
بار صد رنگ اٹھائے ہوئے ڈالی کی لچک

ایک وعدہ کی خلش کر گئی جو نیند حرام
کبھی آہٹ کبھی کھٹکا کبھی دھڑکن کبھی شک

ایک خوشبو کہ نفس میں نہیں جس کا کوئی نام
اس کی قربت کا یقیں غیر شعوری سی مہک

ایک گلزارِ تصور ہے بہت تیرے لیے
بلبلِ شوق ابھی اور چہک اور چہک

ایک تہذیب ہے فنکار کی آشفتہ سری
اے جنوں اور بہک اور بہک اور بہک

ایک تشکیک ہے بوجھل ہے فضائے گلشن
اے گلِ زخمِ جگر اور مہک اور مہک

ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش
جامِ لبریزِ غمِ زیست چھلک اور چھلک

ایک پیچیدہ عمل فکرِ سخن ہے وامق
[illegible]

وامق جونپوری

غزل

رات کے سمندر میں غم کی ناؤ چلتی ہے
دن کے گرم ساحل پر زندہ لاش جلتی ہے

اک کھلونا ہے گیتی توڑ توڑ کے جس کو
بچوں کی طرح دُنیا روتی ہے مچلتی ہے

فکر و فن کی شہزادی کس بلا کی ہے ناگن
شب میں خون پیتی ہے شب میں زہر اگلتی ہے

مفلسی کی حیثیت بوند جیسے پانی کی
ناچتی ہے شعلوں پر چشمِ نم میں جلتی ہے

بھوک پیٹ کی ڈائن سوتی ہی نہیں اک پل
دن میں دھوپ کھاتی ہے شب میں پی کے ملتی ہے

پتّیوں کی تالی پر جاگ اُٹھے چمن والے
اور پتّی پتّی اب بیٹھی ہاتھ ملتی ہے

گھُپ اندھیری راہوں پر مشعلِ حسامِ زر
ہے لہو میں ایسی تر بجھتی ہے نہ جلتی ہے

خلفشارِ دوراں سے کچھ تو کہتی ہی ہوگی
تیز ریل گاڑی جب پٹریاں بدلتی ہے

تشنگی کی تفسیریں مثلِ شمع ہیں وامق
جو زباں کھلی ہے اس سے لَو نکلتی ہے

اسحٰق جونپوری

(حروف زدی ہم آواز حروف میں)

ہے خونِ دل سے عبارت ہمارے فن کی بیاض
سفر طویل بہت ہے دمِ حیات ہے شاذ

تمام راہیں محبت کی جاتی ہیں فردوس
تو کس لیے یہ تقاضے کہاں تلک یہ وعظ

بساطِ فکر پہ ہیں جمع بے شمار افواج
بس ایک صاحبِ وجدان اور لاکھوں محاذ

جہانِ کُل کو بنا دے وہ مملکت کہ جہاں
کبھی نہ ہو کوئی محمود اور نہ کوئی ایاز

خراب اتنا بھی کیا جتنا ہو گیا بدنام
بجا وہ تجھ سے نہیں اے زمانے کچھ تو لحاظ

ہے ذہن معجزہ گر ساحری ہے کسبِ نظر
پیمبری ہے مقدر قلندری ہے ریاض

بدل رہے ہیں جہاں اتنی تیزی سے حالات
وہاں خطائیں بھی ہوتی نہیں خطائیں بعض

یہاں کا وہ بھی نہیں ہم کو غیر جو سمجھے
مغالطے کی ہے بنیاد فطرتِ امتیاز

کتاب ۱

وامق جونپوری
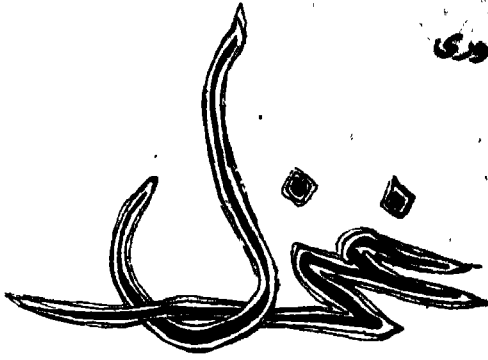
زندگی موت سے لڑتی ہی چلی جائے گی
سینۂ دار پہ چڑھتی ہی چلی جائے گی

عشق پر زور تو چل سکتا ہے یادوں پہ نہیں
یاد ناگن ہے جو ڈستی ہی چلی جائے گی

مہر بے سایہ کی جھلسن نہ رہے گی دن بھر
دوپہر ہے یہ تو ڈھلتی ہی چلی جائے گی

آہنی لوری سے فتنوں کو سلادو ورنہ
آگ جنگل کی بھڑکتی ہی چلی جائے گی

سخت حالات بھی کر سکتے نہیں فن کو فنا
سنگ پہ ہر دھات پھسلتی ہی چلی جائے گی

چھوڑنا مذہبِ اجداد کا آسان نہیں
نشہ کی پیاس ہے بڑھتی ہی چلی جائے گی

اعتقادات میں منطق نہیں چلتی وامقؔ
اندھے کی لاٹھی ہے چلتی ہی چلی جائے گی

...اشق جونپوری
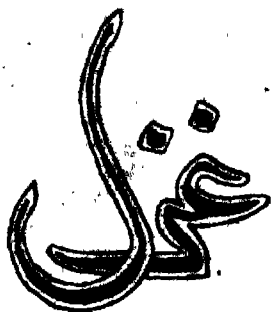
خاک بر سر پانیاں کیا کیا
کر رہی ہیں کہانیاں کیا کیا

کر رہی ہیں زبانِ حال سے کچھ
چپکتی بے زبانیاں کیا کیا

سطح پر اک جمود سا طاری
زیرِ دریا روانیاں کیا کیا

شمع خاموش و عرصۂ شب کی
ہم کریں ترجمانیاں کیا کیا

رکھ کے شہ رگ پہ تیغ پہنچے وہاں
تھیں جہاں بدگمانیاں کیا کیا

باتیں خوشبو خطوط شاخِ گلاب
یادیں کیا کیا نشانیاں کیا کیا

کرتی آئی ہے بے حسی تاراج
پہلے بھی راجدھانیاں کیا کیا

خواب عبرت کے ہیں، یہ تعبیریں
رانیاں نوکرانیاں کیا کیا

لاؤ واپس وہ انگلیاں جو کبھی
بنتی تھیں جامدانیاں کیا کیا

اس قلم کا اتار دو سر یارو
لکھ رہا ہے کہانیاں کیا کیا

بانکپن جن کو دے گئیں وامق
[illegible]

واثق جونپوری
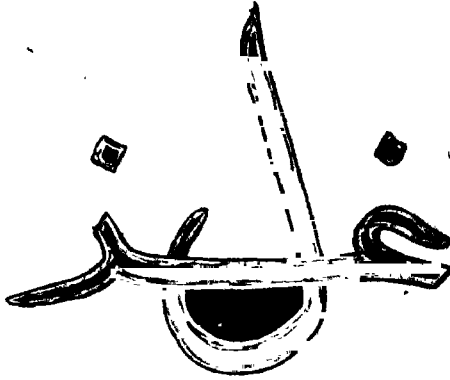
نہ بھٹکیں ظلمتوں میں شمعِ دل جلائیں سب
سب اس کو مانیں تو ہم بخش دیں خطائیں سب

جو بزمِ شعر سے اُٹھ اُٹھ کے جا رہے ہیں اُنھیں
غزل اک ایسی سُناؤ کہ لوٹ آئیں سب

یہ رات اژدہے کا بطن ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ
دکھائی دیتا نہیں راہیں جھائیں جھائیں سب

ہر ایک سانس میں بارود سا مہکتا ہے
بدل نہ جائیں کہیں شعلوں میں ہوائیں سب

ہجوم بڑھتا چلا جا رہا ہے سڑکوں پر
سلامتی ہے اسی میں کہ بائیں جائیں سب

ہماری باتوں کا دیتا نہیں جواب کوئی
اُڑاتے رہتے ہیں بس آئیں بائیں شائیں سب

کمی تھی ہم میں ہی کچھ ورنہ یہ نہیں ہوتا
کہ گھُٹ کے رہ گئی ہوں ماؤں کی دُعائیں سب

ادا شناس ہم اپنے کو جانتے تھے بہت
بدل دیں اس نے قریب آتے ہی ادائیں سب

نظامِ عدل ہے واثق مثالِ کجدمِ سگ
جدید جُرم، پُرانی مگر سزائیں سب

ـمق جونپوری

متفرق اشعار

آہن نہیں کہ چاہیے جب موڑ دیجیے
شیشہ ہوں مُڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجیے

وہ چاہے کچھ بھی نہ ہو اس کے پاس کھولی میں
فقیر رکھتا ہے نشۂ سرور جھولی میں
صحیح وقت پہ جب داد فن ملی واحمق
ہمارا ہوگیا نیلام ایک بولی میں

ب ابھی جا کر شبِ تار کا یہ سناٹا
ہمارے کانوں کو لگتا ہے گالیوں کی طرح

ان پہ بن تو گئی تجھ کو مگر پا گئے ہم
وشنی تو نے یہ رفتار کہاں سے پائی

سنتے ہیں اہلِ نظر ہوتے ہیں پاگل پیدا
ٹھیک ہے خاک سے ہوتے نہیں بادل پیدا
ہنے صحراؤں میں دیکھی ہیں کچھ ایسی آنکھیں
رتی جن میں ہوا کرتا ہے کاجل پیدا

قوت نامیہ حیواں کی نہیں انساں میں
آج ہم سے وہ بڑا ہے جو ہوا کل پیدا

ہم کہتے ہیں کچھ اور سمجھتے ہیں وہ کچھ اور
سمجھانا جو چاہو تو الجھتے ہیں وہ کچھ اور

نہ ہو جھنکار جس میں اس کو ہم نغمہ نہیں کہتے
صدائے مضمحل میں شاعری یوں ہی سی ہوتی ہے
نہ جلتے ہیں نہ بجھتے ہیں بہت سے ہم نے دیکھے ہیں
چراغ ایسے بھی جن میں روشنی یوں ہی سی ہوتی ہے

بس اک اُتھل پتھل کے سوا کچھ نہیں ہوا
ہر شے کا نام بدلا بھلا کچھ نہیں ہوا
خبروں میں اس کا نام نہ تھا شور مچ گیا
اخبارِ شہر بند ہوا کچھ نہیں ہوا

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

([illegible])

"کتاب نما" کے جولائی اور اگست کے شماروں میں رتی سجاد کے "جرمن زبان سے براہ راست ترجمہ" دو افسانے چھپے ہیں۔ میں نے دونوں کا (باستثنیٰ بوتل کی تحریر سرے سے افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ دریائے دانش پہ انشائیہ ہے) اصل متن کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ دونوں تحریروں میں ایک فقرہ بھی ترجمہ کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ رتی سجاد نے بچپن کے کچھ سال جرمنی میں گزارے ہیں، اس لیے انھیں بول چال کی جرمنی آتی ہوگی، مگر ادب پاروں کی زبان ان کی گرفت سے باہر ہے۔ اس لیے وہ ترجمہ نہیں کرتیں بلکہ جو کچھ ان کے سمجھ میں آجاتا ہے، اُسے اٹکل کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔

ذیل میں اوٹو فلیک (اصل تلفظ: اُدو فلاکے) کے افسانے "ایک تصویر" کے پہلے چار پیروں کا تقابلی ترجمہ ملاحظہ کریں، جو رتی کے ہاں صرف دو پیراگراف بن کر رہ گئے ہیں۔

رتی سجاد کا ترجمہ: "خوشبوؤں سے لدی ریل گاڑی کھیتوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ اس کی منزل سمندر کے کنارے ایک شہر ہے، جہاں ایک خاتون اس گاڑی میں بیٹھے شخص کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہے۔ ایک خوبصورت اور جوان عورت (عورت ؟ ناقل) جو اس کی بیوی سے زیادہ جوان ہے"

"ایسے شخص کو پیار میں اندھا ہی کہا جا سکتا ہے جو اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورت کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکلتا ہے ——— یوں تو اسے اپنی سالی سے ملنے میں کوئی قباحت نہیں ہو کر راستے ہی میں رہتی ہے۔ لیکن وہ اصل مقصد کو کیسے چھپاتے ———؟! بیوی اور رشتے داروں سے چھپتے پھرنا اچھا بھی تو نہیں لگتا۔" (کتاب نما۔ اگست ۸۹ء ص ۵۲)

منیر الدین احمد کا ترجمہ: "ایک گاڑی رکاوٹوں اور ڈھنگروں سے بھرے ہوئے سرسبز میدانوں میں سے موڑ کاٹنے کے بغیر کچھ ایسے جا رہی ہے، کہ وہ ایک تیر سے مماثلت رکھتی ہے، جس کی نوک اپنے نشانے پر جا کر لگے گی۔ حتیٰ کہ ملک کی سرحد بھی اس کو نہیں روک سکتی، وہ اس پر سے پرواز کرتا ہوا گزر جائے گا۔"

"وہ منزل سمندر کے کنارے واقع ایک شہر ہے۔ جہاں پر اس کا انتظار ایک نوجوان عورت کر رہی ہے، اس مرد کی بیوی سے کم عمر، جو گاڑی میں بیٹھا ہے۔ اور جسے یوں لگتا ہے جیسے وہ خود وہ تیر ہو، جسے اشتیاق کی قوت نے کمان میں سے (تان کر) چھوڑ دیا ہو۔"

"ایک آدمی جو اپنی بیوی کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اکیلے تعطیلات پر جاتے ہوئے۔ جہاں"

[illegible] نہیں ہو گا۔ اس نے بچے کے بچپن ہیں۔ اسے پہ ہے کہ وہ ان عام لوگوں سے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ آدمی کی ایک بہن دوسرے شہر کے قصبے میں رہتی ہے (جہاں وہ پہنچا) گاڑی کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

گاڑی والا آدمی سائی فور ہیرلف کے ہاں کبھی نہیں گیا۔ اس نے ایسا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے جو بھی اس کا اس علاقے میں آنا ہو گا۔ اس بڑے مسئلے کے ساتھ جس کا اسے سامنا ہے اور جس کا تعلق اس کی بیوی سے اور اس ایڈونچر کے ساتھ ہے، ایک چھوٹا مسئلہ شامل ہو جاتا ہے گاڑی سے جڑے ہے پیرانگی اور فلن مینگ کھیلنا۔ جب وہ رشتہ داروں سے ٹکراتا ہے تو وہ فلن مینگ کھیلتا ہے۔ خود اپنے آپ سے کٹی کاٹنے پر غصہ آتا ہے۔

یہ صورت حال سارے افسانے کے اندر ہے اور ان کے دوسرے تمام تراجم میں جملہ تک میری نظر سے گذرے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کر وہ جرمن زبان سیکھنے کی طرف توجہ دیں۔ جس کے مواقع وہاں ہیں موجود ہیں ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کرنے کے لیے یہ بھی لکھ رہا ہوں کہ وہ منظور الٰہی سے قطع تعلق نہیں ہے۔

ذخیرالدین احمد مزولا جرمنی ہمبرگ

● کتاب نما اکتوبر ۱۹۸۹ کا شمارہ نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر خلیق انجم اردو زبان کی ترقی و بقا اور فروغ کے لیے جن خیالات کا اظہار کیا وہ تمام اردو والوں کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔ اردو کی ترقی اور بقا کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ خود اردو والوں پر عائد ہوتی ہے۔ مگر یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ جن کی شہرت اور روٹی کا سہارا اردو ہے وہی اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے تیار نہیں۔

خامہ بگوش کی شگفتہ نگارش نے اس بار بھی کافی لطف دیا۔ کالم نگاری، ایک آرٹ ہے اردو میں ابن انشا کے بعد مشفق خواجہ ہی واحد کالم نگار ہیں جنھوں نے فن کالم نگاری، کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کی ژرف نگاہی، ندرت خیال، دلآویز اسلوب، طنز ملیح اور تیسری آنکھ سے شے کے اندرون میں جھانکنے کا فن ایسی خوبیاں ہیں جس نے ان کے کالم کو پڑھنے کے لائق بنا دیا ہے اور جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

اس بار کتاب نما میں ماسٹر اختر کی کتاب: اقبال کے کرم فرما، پر شمس الحق عثمانی کا تبصرہ پڑھ کر نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ پروفیسر اکبر رحمانی کی کتاب تحقیقات و تاثرات، میں پڑھ چکا ہوں۔ عطیہ اور اقبال کے تعلق پر ان کے مضامین بھی میری نگاہ سے گزر چکے ہیں۔ انھوں نے اقبالیات کے ایک ایسے پہلو پر روشنی ڈالی ہے جو اب تک محققین اقبال سے اوجھل رہا ہے۔ ان مضامین کی وجہ سے عطیہ کی فرضی شخصیت کا تصور تار تار ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ عطیہ کے نام اقبال کے خطوط متنازعہ فیہ رہے ہیں۔ لیکن اب تک کسی نے دلائل و براہین سے عطیہ کے نام خطوط اقبال کا مشکوک اور جعلی ہونا ثابت نہیں کیا ہے۔ اور خطوط کے اصلی اور جعلی ہونے کا فیصلہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب اصل خطوط سامنے ہوں۔ تبصرے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ماسٹر اختر کے

ا مکتوب اقبال مجموعہ اقبال پیش نہیں کیا ہے۔ اس لیے بلا سند ان خطوط کو وضعی
یا اصول تحقیق کے خلاف ہے۔ جس طرح مصنف نے اکبر رحمانی کے ملہ سے متعلق
بی سند، ثبوت اور واقعاتی شہادت کے تسلیم نہیں کیا ہے اسی طرح ان کے بھی
وکر یہ خطوط اقبال کے نہیں بلکہ ملہ کے خود ساختہ ہیں اور شیخ عطار اللہ نے اصل خطوط
بلا سند اور ثبوت کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھوس ثبوت اور معتبر شہادت و سند
در آبادی پر جعل سازی کا الزام لگانا ناانصافی اور سراسر زیادتی ہوگی۔ کتاب نما میں
ن کا بھی ایک معیار ہوتا ہے۔ اب تک کسی مبصر نے شرافت اور تہذیب کا دامن
نہیں چھوڑا ہے لیکن مذکورہ تبصرے میں مبصر کے قلم سے نازیبا الفاظ بھی نکل گئے
ں میں اس سے پرہیز لازمی ہے۔ جب تک خطوط جعلی اور وضعی نہ ثابت ہو جائے
ق بالاتفاق رائے اس کا اعلان نہ کر دے اس کے بغیر ملہ مرحوم کو ایک فریب کا
بن جعل ساز کہنا اور ان پر لکھنے والوں یا ان کی تائید کرنے والوں کو جعل سازوں
پناہ غیر ادبی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔ جس کے لیے تبصرہ نگار کو معافی مانگنی چاہیے

معین الدین عثمانی، ساہو نگر، جلگاؤں

تاب نما ستمبر ۱۹۸۹ء نظر نواز ہوا۔ شریف الحسن نقوی کا اشاریہ، شاہد نجیب آبادی کا افسانہ
امہ بگرش کا "سخن در سخن" "یگوشہ محسن احسان" بلراج کومل کی نظم اور کامران نجمی کی غزل
ں متاثر کیا۔ بالخصوص موخر الذکر کا یہ شعر دل میں اتر گیا

آئیں کہیں بھی یاد وطن کی ستائے ہے — اپنے لیے زمین بڑی تنگ ہے میاں

اکٹر زار علامی کے مضمون نے بھی متوجہ کیا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مدلل مکتوب بھی
ترم رضا نقوی واہی کے خط نے قاضی عبدالودود کی یاد تازہ کر دی۔ قاضی صاحب کی شخص
بن اردو تحقیق کو انھوں نے جو اعتبار بخشا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

قمر الہدیٰ فریدی۔ علی گڑھ

تاب نما نے کم سے کم عرصے میں بہت بڑی مسافت طے کر لی ہے۔ خدا کرے یہ استقامت
قائم رہے۔ آپ کی خوش نفاست پسندی کا پہلے بھی قائل تھا اور اب کتاب نما کے حوالے سے
ہاتھ تو بس یہی کہوں گا کہ

نظر لگے نہ کہیں تیری حسن کاوش کو

مضامین کے انتخاب میں تنوع اور معیار کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ اردو سے متعلق مسائل پر بھی آپ
کی مضمون یا اداریہ ضرور پیش کرتے ہیں۔ ان مسائل سے ہماری ادبی رسائل و جرائد بالعموم
ں برتتے ہیں۔ شاید ان کی نظر میں ان کی حیثیت بھی وقتی اور ہنگامی ہے۔
توقع ہے کہ آپ نے کتاب نما کے لیے جو خطوط قائم کیے ہیں ان پر بدستور قائم رہیں گے۔

ڈاکٹر عتیق اللہ۔ شالیمار باغ دہلی ۵۲

مجھے پسندیدہ شاعر شہریار پر گوشہ پسند آیا۔ حالانکہ بہت مختصر ہے۔ جرمن افسانہ "ایک تصویر" مجھے بہتر ہے۔ رسالہ واقعی شکریانی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب ہے۔

پرویز مظفر، محلہ قاضی سرائے چاندپور۔

● کتاب نما میں اس بار مظہر امام صاحب کا اداریہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے "نئے موسم کی تلاش" اور "عدم حیات" اور "کانامے" کے حوالے سے نئے لکھنے والوں کی کاوشوں کی داد دی ہے اور خود مظہر امام صاحب جذبۂ اجتہاد سے سرشار ہیں۔ ہمیشہ کی طرح خامہ بگوش کا ایک ایک جملہ لطف دے گیا۔ "تکبیر نہ سہی اقامت ہی سہی" ہمارا گزارا ہو ہی جاتا ہے۔ گوشۂ شہریار بہت خوب ہے۔ شہریار کی وہ غزل ہوتی تو اور مزہ آجاتا جس کا حربہ انھوں نے اپنی ہی مقبول غزل میں خود اٹھایا ہے کہ

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

رؤف خیر۔ حیدرآباد

● مرزا حامد بیگ کا نہایت مایوس کن مضمون "غزل گو" شامل اشاعت ہے۔ موصوف نے ایک دوسرے درجے کے پاکستانی شاعر غلام حسین ساجد کو ادب و شعر کا سقراط ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے اور ہند و پاک کے دیگر بہت اہم شعرا کو نظر انداز کیا ہے۔

سلمان احمد خیری۔ علی گڑھ

● کتاب نما کا شمارہ برائے ماہ اگست ۱۹۸۹ء پیش نظر ہے۔ اس شمارے کے مشمولات میں گوشۂ شہریار کو چھوڑ کر کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو قارئین کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے۔ باقر مہدی کی نظم پر البتہ نظر ٹھٹھکی جس کا عنوان ہے "ایک کالی غزل (وارث علوی کی نذر)" معاً مجھے یاد آیا کہ فروری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں ان کی کالی غزل (مغنی تبسم کے نام) چھپ چکی ہے۔ خدا جانے یہ عنوان کس رعایت سے رکھے گئے ہیں اور ان تخلیقات کو وارث علوی اور مغنی تبسم سے کیا نسبت خاص ہے۔ اس رمز کو صرف باقر مہدی واضح کر سکتے ہیں۔

زیر نظر شمارے کا اداریہ مہمان مدیر مظہر امام کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں اس ادبی لہر کا سرسری نوعیت کا جائزہ ہے جو "ترقی پسند ادب" اور "جدیدیت" سے گریز پا نئی نسل کے شاعر و ادیب تخلیق کر رہے ہیں۔ شعر و ادب کی بات کسی نہج سے چلے مظہر امام کی تحریروں میں ترقی پسند ادبی تحریک پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے والا لہجہ میں تندہی و تلخ نوائی ضرور ملے گی۔ شاید ترقی پسند ادبی تحریک کی الرجی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ ورنہ ۳۰۔۳۵ سال پرانے مضامین کی اس وقت اشاعت کیا معنویت اور افادیت رکھتی ہے (حوالے کے لیے دیکھیے کتاب نما کے شمارے بابتہ فروری ۸۹ء میں ۳۷ سالہ پرانا مضمون "ترقی پسند ادبی تحریک۔ بے سمت سفر" اور مئی ۸۹ء کے شمارے میں "ادیبوں کی تنظیم کیوں؟")

ان مضامین میں چھیڑے گئے مسائل پر تنقید یا تبصرہ راقم سطور کا منصب نہیں لیکن صفحہ ۵ پر اردو زبان کے تحفظ و بقا سے متعلق بیان وہ اپنے آپ کو اظہار خیال کا اہل ضرور سمجھتا ہے۔ مظہر امام کا خیال ہے "نئی نسل کا مسئلہ نقاد پیدا کرنا نہیں ہے اس کا مقصد ادب پیدا کرنا اور قاری پیدا کرنا ہے اور قاری سے جڑا ہوا مسئلہ زبان کا بھی ہے یعنی اردو زبان کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ" یہ ایک انتہائی اہم اور صراحت طلب مسئلہ ہے جسے مظہر امام نے صرف ایک جملے میں نپٹا دیا۔

اس متنازعہ بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ جدیدیت کی رو کے پروردہ شاعروں اور ادیبوں نے کس نوع اور کس معیار کے ادب کی تخلیق کی راقم سطور کو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کے سر یہ الزام لگانا کہ وہ قاری نہ پیدا کر سکے بے معنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جدیدیوں کی اکثر تخلیقات عام قاری تو کیا طبقۂ خواص کے قاریوں کے لیے چیستاں ہوتی ہیں مگر اس بات کا تعلق قاری کے پیدا کرنے یا نہ کرنے سے نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ترسیل و تفہیم کے المیے کا ہے۔ ہر دور میں ایسے ادیب و شاعر ملیں گے جن کے کلام کا خاصا حصہ زبان و بیان دونوں اعتبار سے ادق اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ دراصل قاری کا مسئلہ براہ راست جڑا ہوا ہے تعلیم و تدریس سے۔

جاریہ صدی کے پانچویں دہے تک اردو کے سنجیدہ قاری موجود تھے کیونکہ نظام تعلیم میں اردو کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ لائق اساتذہ دستیاب تھے جن کی توجہ سے ہونہار طلبہ کا ادبی ذوق پروان چڑھتا تھا۔ لوگ کتابیں خریدتے اور پڑھتے تھے۔ اردو قاری کے ناپید ہونے کا سلسلہ چھٹے دہے سے شروع ہوتا ہے جب کہ اردو زبان پر افتاد پڑی اور نظام تعلیم کے ہر مرحلہ سے اس کا عملاً اخراج ہو گیا اور اردو تعلیم کے ذرائع محدود و مسدود ہو گئے۔ اب اردو والوں کے سامنے اصل مسئلہ نظام تعلیم میں اردو کے جائز مقام کی بحالی کا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ مسئلہ اردو کو دوسری زبان بنانے سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس وقت شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور اردو دوستوں کو خواہ ان کا تعلق کسی نسل یا مکتب فکر سے ہو یہ غور کرنا ہے کہ وہ نظام تعلیم میں اردو کی بازیابی اور بحالی کے لیے کیا عملی کردار ادا کر سکتے ہیں (جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ مظہر امام نے اپنے مضمون کے صفحہ ۳ کی آخری سطر میں مکتبۂ فکر کی ترکیب استعمال کی ہے جو غالباً درست نہیں ہے) اردو کے حق میں مراعات کے جو خوش آیند اعلانات وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں ان سے اردو والوں کو دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ ملک کے تناظر میں اس بحث کو طول دینے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تاہم مسئلہ کی نزاکت کا اہمیت واضح کرنے کے لیے چند اعداد و شمار پیش ہیں جن کا تعلق اُتر پردیش سے ہے جو کبھی اردو کا گہوارہ تھا۔

محکمۂ تعلیمات اُتر پردیش کی سالانہ رپورٹ برائے ۸۹-۱۹۸۸ء کے مطابق پرائمری سطح کے اسکولوں کی تعداد ۷۵ ہزار سے کچھ زائد ہے۔ ان میں نام نہاد اردو میڈیم کے صرف اکیس سو اسکول ہیں۔ ثانوی سطح پر اسکولوں کی تعداد ۵ ہزار کے قریب ہے ان میں ایک اسکول بھی سرکاری یا غیر سرکاری اردو میڈیم کا نہیں ہے۔ یوپی بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ۱۹۵۲ء سے اردو میڈیم سے تعلیم کی سہولت ختم کر دی ہے۔ ہائی اسکول درجات کی اردو کتابیں ۳۵-۳۶ سال پرانی ہیں۔ ۱۹۸۸ء

دسمبر ۱

کے ہائی اسکول کے سالانہ امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ کی کل تعداد چھ لاکھ اڑتیس ہزار تھی ان میں اردو مضمون کے ساتھ امتحان دینے والے طلبہ کی تعداد صرف ۱۹ ہزار ۸ سو تھی۔

اردو تعلیم کی اس ابتر اور مایوس کن صورت حال میں سنجیدہ ادب کے قاری کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ نئی نسل کے شاعر و ادیب چاہے وہ کوئی ادبی لیبل لگائیں یا نہ لگائیں محض اپنی تخلیقات کے بل بوتے پر سنجیدہ قاری پیدا نہ کر سکیں گے۔

خلیل عرب۔ ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن، الہ آباد، یو۔پی

نومبر ۱۹۸۹ء کے کتاب نما میں حامدی کاشمیری کا اداریہ بلاشبہ ایک دلِ دردمند کا آئینہ دار ہے مگر اردو زبان و ادب کے مسائل پر لکھنے والوں سے میری درخواست ہے کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں میں اردو کی صورت حال سے واقفیت فراہم کرنے کے بعد ہی قلم اٹھایا کریں تو بہتر ہے ورنہ خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ حامدی صاحب نے بھی شاید اعداد و شمار فراہم کرنے میں دلچسپی نہیں لی اس لیے کئی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور بہت سے ایسے نکات جن کی طرف انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے، برسوں سے بہار اردو اکادمی کے دائرہ عمل میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان کے مفید نتائج بھی سامنے آ چکے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اداریے کے آخر میں ترقی پسندوں پر خواہ مخواہ طنز و ملامت کے تیر چلائے گئے ہیں۔ آخر کیوں؟

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ پٹنہ

کتاب نما میں کئی مہینوں سے لگاتار آپ یہ ہدایت چھاپتے ہیں: "کیا آپ اردو کے اخبار اور رسائل خرید کر نہیں پڑھتے؟ بڑے دکھ کی بات ہے۔"

جناب میں یہ بات تو سمجھتا ہوں کہ آپ کسی خاص اخبار یا کسی خاص رسالے کی سفارش نہیں کر سکتے۔ آپ کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے مگر مسئلہ ہے جناب کہ اگر میں چاہوں کہ کوئی معیاری روزنامہ پڑھوں تو اتنے دور دراز علاقے سے مجھ جیسے کو ایک ٹکے کا بھی IDEA نہیں ہے کہ کون سا اخبار یا کتاب نما کے علاوہ کون سا رسالہ منگایا جائے۔ کہاں سے اسے فراہم کریں کس کو لکھوں؟ سالانہ چندہ کیا ہوگا، وغیرہ۔ آپ جو اشتہار چھاپتے ہیں وہ تو دہلی اور دیگر بڑے مرکزی شہروں کے باشندوں کے لیے ہے۔ یہاں ایک اخبار جالندھر سے آتا ہے "اردو کا ہند سماچار"۔ مگر اس میں خبروں کا بیشتر حصہ صوبہ پنجاب کے بارے میں ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اردو تو میں نے اپنے شوق سے سیکھی ہے۔ املا میں کئی غلطیاں کرتا ہوں۔ خدا حافظ با تقدیم احترام۔

ارادت مند۔ سید احمد منالی۔ مدھیہ پردیش

ابوالکلام قاسمی کا ترتیب دیا ہوا "گوشہ شہریار" پڑھا، پسند آیا۔ مگر تشنگی باقی رہی، کچھ غزلیں نظمیں اور شامل کی جاتیں تو لطف آ جاتا۔ خورشید احمد، شافع قدوائی اور خود ابوالکلام قاسمی نے شہریار کی نظموں کا بہت اچھا تجزیہ کیا۔ خورشید احمد کا اندازِ تحریر بہت پسند آیا کیونکہ میرے لیے یہ نیا نام ہے۔

لطیف الزماں۔ لاہور

ادبی اور تہذیبی خبریں

نسیم سحر کے تیسرے شعری مجموعہ "دریچۂ شب" کی تعارفی تقریب

جدّہ میں مقیم معروف پاکستانی شاعر اور ادیب نسیم سحر کے تیسرے مجموعہ کی تعارفی تقریب سید ظفر مہدی کے ہاں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت تسنیم الٰہی زلفی نے اور نظامت انجم رضوی نے کی۔ اس موقع پر نسیم سحر کے بارے میں شخصی خاکے بھی پڑھے گئے اور ان کے فکر و فن کے حوالے سے "دریچۂ شب" میں شامل نظموں کے جائزے پر مبنی مقالے بھی پیش کیے گئے۔ جدّہ میں مقیم معروف پاکستانی اور ہندستانی شعرائے کرام نے نسیم سحر کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ ان شعرا میں نعیم بازید پوری، ناظر قدوائی، مسرور انیس اور ظفر مہدی شامل تھے۔

تقریب رونمائی کے آغاز میں جناب عارف قریشی نے "دریچۂ شب" کا ایک نسخہ صاحبِ صدر کی خدمت میں پیش کیا اس کے بعد محمد اکرم باجوہ کا تحریر کردہ مضمون اور میجر صادق نسیم کا تحریر کردہ خاکہ پیش کیا گیا۔ اکرم باجوہ نے مضمون میں کہا کہ نسیم سحر کی سوچ کی اڑان بیک وقت جدید شعری رجحانات، روایتی انداز سے وابستہ ہے۔ میجر صادق نسیم کے تحریر کردہ خاکے میں نسیم سحر کے خاندانی پس منظر کے حوالے سے کہا گیا کہ اتنی ادبی شخصیتیں بیک وقت شاید ہی کسی خاندان میں موجود ہوں۔ تسلیم الٰہی زلفی نے کہا کہ نسیم سحر کے تینوں شعری مجموعوں میں ان کا شعری سفر جگنوؤں اور ستاروں کے حوالے سے بتدریج کہکشاؤں کی سمت جاری ہے۔ [illegible] نے اپنے مقالے میں کہا کہ نسیم سحر کی نظموں میں موضوعات کا تنوع، تجربات کی آنچ اور لفظیات کا موزوں استعمال ملتا ہے اور شاعر کو اپنے عہد کے انسان اور اس کے مسائل کا، اپنے تہذیبی ورثے کا اور موجودہ محرومیوں کا گہرا احساس ہے۔ شجاعت علی راہی نے کہا کہ اس ستھرا اِ سخن نے درد کا زہر پی کر اپنے فن کو نکھارا ہے اور ان کے یہاں فن کا صحیح تناسب ملتا ہے۔

صاحبِ صدر کے اختتامی کلمات سے قبل صاحبِ کتاب سے ان کی متعدد نظمیں سماعت کی گئیں۔

اس موقع پر جناب شاعر لکھنوی کی وفات کے سلسلے میں ایک تعزیتی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

تحقیقی مقالے کے لیے تعاون کی درخواست

شہر مالیگاؤں کی ایک خوش فکر اور نوجوان شاعر ہارون فراز صاحب "جیل کی شاعری" کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ اس تحقیقی کام میں اردو کے ایسے تمام شعرا کے حالاتِ زندگی۔ نمونۂ کلام جیل جانے کے اسباب اور دیگر ادبی سرگرمیاں شامل ہوں گی جنھوں نے اپنی زندگی کے روشن لمحات کو جیل کی تاریکی کی نذر کیے۔ اس تحقیقی مقالے کا دائرہ عہدِ قدیم سے دورِ حاضرہ تک پہنچتا ہے۔ گذارش ہے کہ ایسے تمام شعرا جو اس ضمن میں آتے ہیں وہ اپنے حالاتِ زندگی نمونۂ کلام (جیل کے باہر اور جیل کے اندر کہے جانے والے کلام) فراہم کر کے محقق کے ساتھ تعاون فرمائیں یا ایسے شعرا جو قیدِ حیات سے رہائی پا چکے ہیں ان کے لواحقین اور متعلقین اپنے بزرگوں کے شعری سرمایہ کے ذریعے موصوف کی اعانت کریں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اور واقعات خط کے ذریعے یا موصوف کو اپنے مقام پر بلا کر عنایت کر سکتے ہیں — رابطہ قائم کرنے کا پتا

ہارون فراز ۸۹۷ بیلہ باغ
مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳۔

ممتاز دانشور رضی الحسن چشتی نہیں رہے

نئی دہلی ۱۸ نومبر۔ جناب رضی الحسن چشتی سابق پالیسی چانسلر کشمیر یونیورسٹی و شریک کار جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کل سہ پہر کوان کی رہائش گاہ ۵۰۰ ذاکر باغ میں انتقال ہوگیا۔ آپ ۷۰ برس کے تھے آپ کے دوستوں اور ساتھیوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اہل جامعہ سے بھی آپ کے بڑے قریبی تعلقات تھے ادارہ کتاب نما و مکتبہ جامعہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ بیگم سیدہ نسیم چشتی و دیگر متعلقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کا اعزازی جلسہ اور "امکان" کی رونمائی

اقبال سمان یافتہ شاعر اختر الایمان نے مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے یکم اکتوبر ۸۹ء کو منعقدہ اعزازی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا، اقبال سمان تخلیقی کام کا صلہ ہے ورنہ شاعری کو روپوں پیسوں میں تولا نہیں جا سکتا۔ یہ بس ایک طرح کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری نائب صدر اردو اکادمی نے استقبالیہ تقریر میں فرمایا کہ اختر الایمان کی شاعری بے سروسامانی کی شاعری ہے۔ زندگی کے گرم و سرد تنہائی کا عذاب اور کرب جھیلنے کے باوجود ان کا وجود مستحکم ہے۔ ایک چٹان کی طرح اپنی شاعری میں انھوں نے دانستہ جلیبی اور نامانوس لفظوں کو ہٹا کے اور نا تراشیدہ لفظوں کا استعمال کیا ہے ان کے ہاں گرد و پیش کا شدید احساس ہے مگر وہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتا آپ نے اردو اور مراٹھی کے ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے اقبال سمان ملنے پر مبارکباد پیش کی۔

بنگلہ دیش سے آئی مہمان پروفیسر کلثوم بشر نے بنگلہ زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے اختر الایمان کو مبارکباد پیش کی۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے ادبی جریدے "امکان" (مراٹھی اور اردو عصری ادب کا انتخاب) کی رونمائی جناب اختر الایمان کے ہاتھوں ہوئی۔ ممتاز مراٹھی ادیب کیشو میشرام نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مراٹھی "امکان" میں اردو کی ۱۸ کہانیاں شریک ہیں۔ آسمان ادب کے بہت سے ہیں اس طرح ہم دوسری زبان کو سمجھتے ہیں۔ انسانوں کو اور ان کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ قریب آتے ہیں۔ اردو اکادمی نے جو کام کیا ہے وہ فی الحال اور کوئی نہیں کر رہا ہے اس لیے اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے۔

"امکان" کے کنوینر قاضی سلیم نے فرمایا کہ "امکان" میں بہ حیثیت مجموعی تمام اہم رجحانات اور ادیبوں کی نمائندگی ہوگئی ہے۔

گاندھی جینتی کے موقع پر منعقد اس جلسہ میں پروفیسر یونس اگاسکر نے گاندھی جی اور ہندستانی معاشرہ کی تشکیل نو اور شمیم طارق نے گاندھی جی کی لسانی پالیسی پر گفتگو کی۔

جناب رحمت امروہوی کو اعزاز

احمد آباد ۱۲ اکتوبر۔ جناب رحمت امروہوی کی ادبی اور شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے احمد آباد کی پنجابی ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی نے آپ کا استقبال کیا اور سپاس نامہ پیش کیا اس موقع پر پنجابی تنظیم کی جانب سے موصوف کو گجرات کے روزگار منتری جناب بھیس منگھ بھلا پٹیل کے ہاتھوں ایک بیش قیمت شال اور ۱۲۰۱ کا ایک چیک پیش کیا گیا۔

بطور مہمان خصوصی نامور شاعر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے شرکت کی اور رحمت امروہوی کی خد

کو سراہتے ہوئے [illegible]
نے ایک اردو شاعر [illegible] کا ثبوت
دیا ہے۔ ممبر پارلیمنٹ جناب [illegible] بھائی سنگھ نے
بھی سوسائٹی کے اس اقدام کو قابلِ تحسین گردانا۔
پنجابی ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے صدر
شری پی۔ سی چھابڑا اور تنظیم کی جنرل سکریٹری محترمہ
ڈاکٹر انجنا سندھیر نے رفعت امروہوی کی شاعری
اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور دعاگو
ہوئے کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ڈاکٹر انجنا سندھیر جنرل سکریٹری

اسٹیشنوں کے نام اردو میں !

بھوپال۔ قلم کار پریشد کے صدر جناب علی عباس
امید نے وزیر برائے ریل شری مادھو راؤ سندھیا سے
اپیل کی ہے کہ جن ریلوے اسٹیشنوں پر نام یا اطلاعات
اردو زبان میں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر غلط، بدخط اور نہ
پڑھے جا سکنے والے حروف میں ہیں لہٰذا انھیں درست
کرایا جائے۔

اس کے جواب میں محکمۂ ریل نے امید صاحب کو لکھا
ہے کہ ایسے اسٹیشنوں کے نام بھیجیے جہاں غلط، بدخط
اور ناقص اردو حروف کا استعمال کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ شکایت عمومی ہے لہٰذا محبانِ اردو سے
گزارش ہے کہ ادارہ اردو نوازی اپنے علاقہ کے ریلوے
اسٹیشنوں کے نام ذیل کے پتہ پر اس درخواست کے
ساتھ بھیجیں کہ ان کو درست کرایا جائے۔ [illegible] ضرور لکھیں۔

Ref. No:-Hindi-89/Ra Bha1/8/2 dated 27.10.89

TO,
SANTOSH KUMAR SACHDEVA
DEPUTY DIRECTOR
RAJ BHASHA, RAILWAY BOARD,
RAIL BHAVAN, NEW DELHI-110001

یہ گزارش کریں کہ مسافروں کو دیگر اطلاعات بھی [illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے عابد علی خاں کے اعزاز میں تہنیتی جلسہ

نئی دہلی ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء۔ انجمن ترقی اردو ہند کے
زیرِ اہتمام اردو گھر میں روزنامہ "سیاست" حیدرآباد
کے ۴۰ سال مکمل ہونے پر اس کے ایڈیٹر جناب عابد علی خاں
کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا جس
کی صدارت پاکستان کے معروف نقاد ممتاز حسین صاحب
نے فرمائی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تعارفی تقریر سے جلسے کا آغاز ہوا۔
خلیق انجم صاحب نے کہا کہ عابد علی خاں صاحب نے
ایک فرد کی حیثیت سے "سیاست" کو جو اعلیٰ معیار عطا کیا
ہے اس کے لیے وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ عابد صاحب
پہلے اردو ایڈیٹر ہیں جو پی۔ ٹی۔ آئی کے ڈائرکٹر ہیں اور یہ
صحافت میں ان کے اعلیٰ مقام کا واضح اعتراف ہے۔

جناب سید حامد نے کہا کہ "روزنامہ سیاست" کا سب
سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس نے صحافت کے مزاج
کو بدلا ہے اور سنجیدہ و تعمیری خبروں کو اپنے کالم
میں جگہ دی ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملا صاحب
نے فرمایا کہ ۴۰ سال قبل ۱۵ اگست سے "سیاست"
کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ اشاعت کے لیے آزادی
کے دن کا انتخاب خود اس کے سیکولر کردار اور قومی
محبت کا آئینہ دار ہے۔

جناب ظفر پیامی نے کہا کہ عابد علی خاں کے ظاہر
و باطن میں کوئی فرق نہیں ہے اور وہ "سیاست"
کو قومی اخبار بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ پروفیسر
قمر رئیس نے کہا کہ روزنامہ "سیاست" نے آزادی
کے بعد اردو داں طبقے میں اعتماد اور وطن سے محبت
کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ مولانا محمد طاؤس صاحب نے کہا
کہ "سیاست" نے آزادی کے بعد پیدا بحران کو ختم کر کے
اردو طبقے میں ذہنی سکون فراہم کرنے میں اہم کردار ادا

پرواز کی کہانی
انسان کو اُڑنے کا
خیال پرندوں کو
دیکھ کر آیا اس خیال
کو عملی جامہ کس کس
نے پہنایا؟ تفصیل
اس کتاب میں
پڑھیے
علی ناصر زیدی
قیمت ۳/-
غذا کی کہانی
قیمت ۳/-
مزیدار
کہانیاں
قیمت ۶/-
شہنشاہ نے کہا:
میں مفلس ہوں
قیمت ۶/-
دلچسپ کہانیاں
ایک دلچسپ ناول
سام پر کیا گزری
سید اظفر مہدی
قیمت: ۳/۵۰
بڑے بچوں
کے لیے
مکتبہ
پیامِ تعلیم
کی
دلچسپ کتابیں
ننھا سیاح
(ناول)
محمد زکریا مائل
عجیب و غریب جزیرے میں
ایک ننھے سیاح کے سفر کے
حیرت انگیز واقعات - ایک
دل چسپ اور چونکا دینے
والا ناول - قیمت
سمندری طوفان
اور
تین لڑکے
انتہائی دلچسپ
ولولہ انگیز اور غور و فکر
پیدا کرنے والی
کہانیوں کا مجموعہ
جسے ایک بار نہیں
بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔
قیمت ۶/- روپے
بچوں کے
نرالے گویے
باتونی کچھوا
بدر شہزادی
جادو کی سارنگی
جادو کا چھلا

ننھے مُنّے بچّوں
کے
لیے
جادو کی ہنڈیا
4/00
چاند کی بیٹی
4/50
شیر اور بکری
دم کٹی لومڑی
6/-
بھیڑیے کا گانا
6/-
گدھے نے بجائی
بانسری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلّی
6/-
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

مکتبہ جامعہ کی اہم مطبوعات

مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست کل اور آج / پروفیسر مشیر الحق ۸/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب پروفیسر آل احمد سرور ۸/-

صاحب جی سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-

چند تصویر بتاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-

ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۲۸/-

ورک بک (داستان اردو) شکیل اختر فاروقی ۲۴/-

معاشیات کے اصول عزیز احمد قاسمی ۲۱/-

کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں مالک رام ۵/-

لسان الصدق اڈیٹر ابوالکلام آزاد ۷۵/-

اردو میں کلاسیکی تنقید عنوان چشتی ۴۸/-

شہید جستجو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) ضیاء الحسن فاروقی ۷۵/-

تفہیم و تنقید حامدی کاشمیری ۴۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات مجیب اشرف ۱۲/-

زندگی کی طرف شمیم حنفی ۳۶/-

گول مال شفیقہ فرحت ۱۸/-

فی الفور یوسف ناظم ۳۰/-

مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/-

پرانی بات ہے زبیر رضوی ۳۰/-

نظام رنگ ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵/-

پیامی ہوم ڈکشنری اردو انگلش ۱۲/-

پیامی بنیادی ڈکشنری انگریزی اردو ۱۲/-

غزل نما مرتبہ ادا جعفری ۷۵/-

ساز سخن ادا جعفری ۴۵/-

ترجمۂ قرآن پروفیسر مشیر الحق ۸/-

تعلیم و تربیت اور والدین (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵۱/-

کولمبس کے دیس میں (سفرنامہ) جگن ناتھ آزاد ۴۵/-

پتھر بولے چھین... (ڈرامے) عتیق حنفی (زیر طبع)

ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش -

بنجھ بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر -

دائروں میں پھیلی لکیر (شعری مجموعہ) کشور ناہید -

آنکھ میں سمندر (شعری مجموعہ) زاہد ڈار -

تذکرہ (ناول) انتظار حسین ۴-

ذرے کی کہانی (سائنس) مہدی جعفر -

حیات جامی (سوانح) مولانا اسلم جیراجپوری

مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات (خطبہ) / پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی -

نقش ذاکر (مضامین) مرتب عبداللطیف خاں -

ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ) (تاریخ) شمس الرحمٰن محسنی -

دنیا کے بڑے مذہب (علمی) عمادالحسن آزاد فاروقی -

تحلیل نفسی کے پیچ و خم اور دیگر مضامین (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ -

تعلیم اور رہنمائی (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں -

ہم اردو کیسے پڑھائیں (تعلیم) معین الدین -

یادوں کا اجالا (آپ بیتی) بھگوان سنگھ، مترجم شمیم حنفی -/-

ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات (مضامین) / مرتبہ: عمادالحسن آزاد فاروقی -/-

تحقیقی مضامین (تحقیق) مالک رام ۱۰/-

باتیں کچھ سریلی سی (سوانح ماہرین موسیقی) داؤد رہبر ۹/-

خسرو نامہ (تحقیق) مجیب رضوی ۱/-

رنگ نمبر (انشائیے) شفیقہ فرحت ۹/-

رات کے مسافر (شعری مجموعہ) مرتبہ انور سجاد ۸/-

زوال کا عروج (ڈراما) بریخت مترجم: انور عظیم ۶/-

اثبات و نفی (تنقیدی مضامین) شمس الرحمٰن فاروقی /-

آنکھ اور خواب کے درمیان (شعری مجموعہ) ندا فاضلی ۱۱/-

سدا بہار چاندنی (افسانے) رام لعل ۳۰/-

فی الحال (مزاحیہ مضامین) یوسف ناظم ۸/-

حرف حرف روشنی (شعری مجموعہ) حمایت علی شاعر ۵/-

یہ تھا وہ مردِ مجاہد
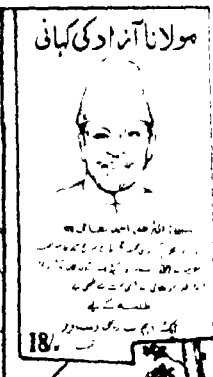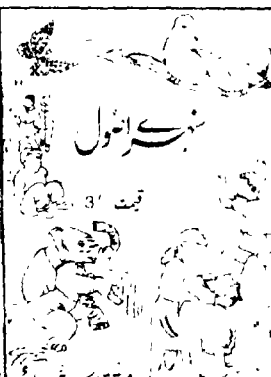
اگر ہماری قوم بھی ...
کا نصف حصہ ...
ملک کیونکر ترقی کر ...
اُٹھا کر اُنہوں نے ہندوستان
کی فلاح و بہبود کے لئے ...

مجھے چاہئیے عوام اور ...
مجھے خاص ہے کامیابی سے
مجھے ایسے اشخاص درکار
جو مجاہدوں کی مانند کام ...

اُسے بھارت اور اس کے عوام
سے بے پایاں محبت تھی اور
اس کے عوض اُنہوں نے
بھی اُسے دل کھول کر اپنا
بے پناہ پیار دیا۔

دُبلے پتلے، کم نصیب اور
مظلوم لوگوں کے لئے وہ
مجسم نجات بن گیا۔

بھارت کی تعمیر کا اُس پر بھوت سوار تھا

davp 89/738

"KITAB NUMA"

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب		قیمت
چاند کی بیٹی	(باتصویر)	۴/۵۰
ذہین لومڑی	"	۶/:
جادو کی ہنڈیا	"	۴/۵۰
شیر اور بکری	"	۶/:
کوے کا خواب	"	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا	"	۶/:
چالاک بلی	"	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری	"	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
پراسرار غار	۵/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۶/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۶/:

کتاب	قیمت
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳:
سہانے ترانے	۲.۵۰
پانچ جاسوس	۱.۵۰
جنگل کی ایک رات	۶:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
شریر شیرا	۲/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵
ظالم ڈاکو	۶/:
ہنستی کلیاں	۶/:
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ بونے	۳/:
ایک دیس ایک خون	۳/:
جیت کس کی	۲/۵۰
انعامی مقابلہ	۳/۲۵
ذرے کی کہانی	۲۱/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/۴
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نانی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:
بی مینڈکی اور کوا	۲/:
مرغی کی چار ٹانگیں	۳/۵۰
لال مرغی	۳/:

کتاب	قیمت
ننھا منو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلام صمصامہ	۵:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۳.۵۰
ایک کھلاڑی	۳ ۵۰
بھوتوں کا جہاز	۶/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۳/:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا ناصح	۳/:
ہار کی تلاش	۶/:
سرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۶/:
ننھا فرشتہ	۳/۵۰
جوہر قابل	۳/:
بھیڑیے کے بچے	۳/:
ننھا جھبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۶/:
بچوں کے افسر	۶/:
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/:
شیر خاں	۳/:
رحمت شہزادہ	۴/:
لومڑی کے بچے	۳/:
اس نے کیا کرنا چاہا	۳/:
بچوں کے اقبال	۴/۵۰
امیر خسرو	۳/:
بہادر سیاح	۳/:
دادا نہرو	۶/:
جادو کا گھر	۳/:
جگنو کی بلی	۲/:
کٹا ہوا ہاتھ	۶/۵۰

کتاب نما

مولانا ابوالکلام آزاد

اپنی اور دیگر تصانیف کے آئینہ میں

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

لسان الصدق۔ اڈیٹر۔ مولانا آزاد ۷۵/۰۰
مولانا آزاد کی کہانی ظفر احمد نظامی ۱۸/۰۰
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں۔ مالک رام ۵۱/۰۰

دیگر اداروں کی مطبوعات

۱۔ فائل مکمل الہلال۔ مولانا آزاد ۶۰۰/۰۰
۲۔ الہلال کے منتخب افسانے ″ ۱۰/۰۰
انتساب تذکرہ ″ ۱۲/۰۰
″ ہمدرد ″ ۱۵/۰۰
″ زمیندار ″ ۱۳/۰۰
″ مدینہ بجنور ″ ۱۲/۰۰
″ خطبات جمعیۃ علمائے ہند ″ ۱۳/۰۰
″ خلافت ″ ۱۵/۰۰
یادگار آزاد ″ ۱۲/۰۰
الہلال کے تبصرے ″ ۱۸/۰۰
انتساب غبار خاطر ″ ۳/۰۰
″ ہفتہ وار پیغام ″ ۸/۰۰
تذکرہ مرتبہ مالک رام
غبار خاطر ″ ۴۰/۰۰
خطبات آزاد
ترجمان القرآن ۴ چار حصے ۳۰/۰۰
ابوالکلام آزاد عبدالقوی دسنوی ۲۰/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد۔ مجموعہ مضامین ۱۸/۰۰
عزیمت و دعوت ۱۷/۰۰
ام الکتاب تفسیر سورۂ فاتحہ ۳۲/۰۰
حواشی ابوالکلام آزاد مرتب مسیح الحسن ۶۲/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے ڈاکٹر خلیق انجم ۴۸/۰۰
ابوالکلام آزاد نمبر ایوان اردو ۶/۰۰

خطوط شبلی بنام آزاد۔ مرتبہ ڈاکٹر سید حسین ۲۰/۰۰
مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد۔ عبدالقوی دسنوی ۵/۰۰
ہفتہ وار پیغام۔ مولانا آزاد ۱۰/۰۰
مولانا ابوالکلام آزاد (ہندی) ۵/۰۰
مضامین البلاغ۔ مولانا آزاد ۲۰/۰۰
اصحاب کہف ″ ۵/۰۰
آزاد کی تقریریں ″ ۲۰/۰۰
حضرت یوسف السلام ″ ۱۰/۰۰
تحریک آزادی ″ ۲۵/۰۰
ہجر و وصال ″ ۲۰/۰۰
جامع الشواہد ″ ۹/۰۰
فلسفہ ″ ۱۰/۰۰
عیدین ″ ۷/۰۰
ولادت نبوی ″ ۵/۰۰
صدائے حق ″ ۷/۰۰
مقالات آزاد ″ ۱۰/۰۰
قرآن کا قانون عروج و زوال ۱۵/۰۰
مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری ۶۰/۰۰
مولانا آزاد فکر و فن ۶۰/۰۰
انسانیت موت کے دروازے پر ۲۲/۰۰
انڈیا ونس فریڈم مع ۳۰ صفحات انگلش ۵/۰۰
ہماری آزادی ″ ″ اردو زیر طبع
مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی کچھ میری زبانی ۳۰/۰۰
شہید اعظم ۷/۰۰ ● آئینہ ابوالکلام آزاد ۲۰/۰۰ ● البیرونی اور جغرافیہ عالم ۱۴/۰۰ ● غالب اور ابوالکلام آزاد ۳۰/۰۰ مولانا آزاد فکر و نظریے کے آئینے میں ۳۰/۰۰
اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ ۲۲/۰۰
مولانا آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل
مولانا آزاد
مسلمان عورت
مسئلہ خلافت

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵۔ بمبئی ۳۔ علی گڑھ ۱